فی ظلال القرآن

سید قطب شہیدؒ

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

جلد ششم

پارہ ۲۷ تا ۳۰

ادارہ منشوراتِ اسلامی

بالمقابل منصورہ ملتان روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

تفسیر	-------	فی ظلال القرآن
مصنف	-------	سید قطب شہید ؒ
مترجم	-------	سید معروف شاہ شیرازی
ناشر	-------	سید عارف شیرازی
جلد ششم	-------	پارہ ۲۷ تا ۳۰
تعداد	-------	۱۱۰۰
مطبع	-------	عید محمد پرنٹرز لاہور
ھدیہ	-------	۳۷۵ روپے
اشاعت اول	-------	جولائی ۱۹۹۷ء

---OOO---

عرض ناشر

شہید اسلام سید قطبؒ ۔ سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریک دور میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچا۔

سید قطب ۱۹۰۳ء میں مصر کے ایک صوبہ ''اسیوط'' کے ایک گاؤں ''موشاء'' میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔

آپ نے ثانوی تعلیم ''تجہیزیہ دارالعلوم'' نامی ایک اسکول میں حاصل کی۔ اس اسکول میں طلباء کو دارالعلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۵۴ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۴ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے۔ اور ۲ جولائی ۱۹۵۴ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشرواشاعت کے اخبار ''الاخوان المسلمون'' کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطب ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست ۱۹۶۴ء میں مرحوم عبدالسلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب' اور تحریک اسلامی' ان کا خاص موضوع رہا۔

تفسیر فی ظلال القرآن ۔ مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی اثر انگیزی جس نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی' کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیا علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آپہنچی۔ آپ صلعم کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ سید کا ہی حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان کہا جا سکتا ہے۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ ممتاز ترین تفسیر ہے۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے 'الفاظ اور معنی کا دریا ہے۔ جس میں تحقیقی' علمی' وجدانی' اور ادبی نکات جابجا موجود ہیں۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیاں میں ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور اسرائیلیات سے خالی ہے۔ اسلام کا جامع تصور لئے ہوئے' اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے۔ غرض اخلاص' روح ایمان' عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ پندرہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ

جیل میں لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مترجم سید معروف شاہ شیرازی ۔ سید معروف شاہ شیرازی ۱۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں ھروڑی میں پیدا ہوئے' ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں حاصل کی حصول علم کا شوق بچپن ہی سے انتہائی زیادہ تھا جس کی وجہ سے سرحد اور پنجاب کے مختلف دینی مدارس اور معروف علماء کرام سے تعلیم حاصل کرتے رہے' پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں منشی فاضل اور ۱۹۵۳ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اگلے ہی سال مشہور دینی درس گاہ جامعہ اشرفیہ لاہور سے دورہ حدیث کر کے سند فراغت حاصل کی' جبکہ ۱۹۶۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا' اور بعد میں ۱۹۶۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔

درس نظامی پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۵ تا ۱۹۶۵ گورنمنٹ ہائی سکول بٹل میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن بعد میں اس پیشہ کو ترک کر کے تصنیف و تالیف اور صحافت کے شعبہ سے منسلک ہو گئے۔ ایک سال تک ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی کے ایڈیٹر رہنے کے بعد اپنا رسالہ "اسوہ" راولپنڈی سے نکالنا شروع کیا لیکن بعد میں کراچی منتقل ہونے کی وجہ سے کراچی سے "اسوہ ڈائجسٹ" کے نام سے یہی رسالہ شائع کرتے رہے۔

اس دوران ادارہ معارف اسلامی کراچی میں ریسرچ اسکالر کے طور پر کام کرتے ہوئے مختلف عربی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا جو "اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو" "اسلام میں جرم و سزا" (دو حصے) "حسن البناء شہید کی یادداشتیں" اور "نشانات راہ" کے ناموں سے شائع ہوئیں۔

لیکن ۱۹۷۰ء میں ناسازی طبع کی بناء پر کراچی سے آبائی علاقہ میں منتقل ہو گئے اور وہاں ضلع مانسہرہ کی تحصیل بٹگرام میں وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے اور ۱۹۹۲ء تک اسی پیشہ سے منسلک رہے۔ پیشہ وکالت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس دوران "سیرت القرآن" حصہ اول دوم "اسلامی انقلاب کا منہاج" "اسلام اور جمہوریت ججوں اور جرنیلوں کے زیر سایہ" "مدارس عربیہ اور اسلامی انقلاب" "سید مودودی کے فکری کام کا ایک جائزہ" "جماعت اسلامی انصاف کے دروازے پر" اور انگریزی کی کتاب "The Shape Of Basic Organs in Islamic State" ادارہ منشورات اسلامی منصورہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

گزشتہ ۲۹ سال میں دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ سید قطب شہید کی تفسیر فی ظلال القرآن کے اردو ترجمے کا کام بھی جاری رہا جو اکتوبر ۱۹۹۵ء میں مکمل ہوا۔

سید معروف شاہ شیرازی دوران تعلیم ہی سید مودودی " سے متعارف ہوئے اور اکثر عصری مجالس میں حاضر رہتے تھے' تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ مولانا مودودی " کے ساتھ بھی رہے' جبکہ مولانا مودودی " اکثر انہیں مسکین شاہ صاحب کے نام سے یاد فرماتے تھے' ۱۹۶۲ء میں جماعت اسلامی کے رکن بنے اور ہمیشہ تحریکی سرگرمیوں میں مصروف رہے' قومی اتحاد کی تحریک کے دوران ہری پور جیل میں بھی رہے۔ موصوف آجکل نائب امیر جماعت اسلامی ضلع مانسہرہ کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں اور جماعت اسلامی صوبہ سرحد کی شوریٰ کے بھی منتخب رکن ہیں۔

فی ظلال القرآن کے ترجمہ کے بعد موصوف اپنی زیر تکمیل کتب "حرمت سود" "تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" "کتاب نکاح" "تحریکات اسلامیہ" "غربت اسلام کی نظر میں" "مغلیہ دور حکومت میں سرحد کے صوفیاء کرام کا کردار" کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

الحمد للہ اب تفسیر فی ظلال القرآن کی آخری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ قرآن کی اس خدمت کو قبول فرمائے' عوام الناس کی فلاح کا ذریعہ اور میرے لئے توشۂ آخرت بنا دے۔ آمین ثم آمین (سید عارف شیرازی)

جلد ششم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست جلد ششم

پارہ نمبر۔ ۲۷-------- الذّٰریٰت ۔ ۵۱

سورۃ الطّور ۔ ۵۲

سورۃ النجم ۔ ۵۳

سورۃ القمر ۔ ۵۴

سورۃ الرحمٰن ۔ ۵۵

سورۃ الواقعۃ ۔ ۵۶

سورۃ الحدید ـ ۵۷

پارہ ـ ۲۸ ـــ سورۃ المجادلہ ـ ۵۸

سورۃ الحشر ـ ۵۹

سورۃ الممتحنۃ ـ ۶۰

سورۃ الصف ـ ۶۱

سورۃ الجمعۃ ـ ۶۲

سورۃ المنافقون ـ ۶۳

سورۃ التغابن ـ ۶۴

سورۃ المزمل ۔ ۷۳

سورۃ المدثر ۔ ۷۴

سورۃ القیامۃ ۔ ۷۵

سورۃ الدھر ۔ ۷۶

سورۃ المرسلت ۔ ۷۷

پارہ ۔ ۳۰ ۔۔۔ سورۃ النباء ۔ ۷۸

سورۃ النزعت ۔ ۷۹

سورۃ عبس ۔ ۸۰

سورۃ التکویر ۔ ۸۱

سورۃ الانفطار ۔ ۸۲

سورۃ المطففین ۔ ۸۳

سورۃ الانشقاق ۔ ۸۴

سورۃ البروج ۔ ۸۵

سورۃ الطارق ۔ ۸۶

سورۃ الاعلیٰ ۔ ۸۷

سورۃ الغاشیۃ ۔ ۸۸

سورۃ الفجر ـ ۸۹

سورۃ البلد ـ ۹۰

سورۃ الشمس ـ ۹۱

سورۃ اللیل ـ ۹۲

سورۃ الضحیٰ ـ ۹۳

سورۃ الم نشرح ـ ۹۴

سورۃ التین ـ ۹۵

سورۃ العلق ـ ۹۶

سورۃ القدر ـ ۹۷

سورۃ الماعون ـ ۱۰۷

سورۃ الکوثر ـ ۱۰۸

سورۃ الکافرون ـ ۱۰۹

سورۃ النصر ـ ۱۱۰

سورۃ اللھب ـ ۱۱۱

سورۃ الاخلاص ـ ۱۱۲

سورۃ الفلق ـ ۱۱۳

سورۃ الناس ـ ۱۱۴

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ۔۔ ۲۶

سورۃ الذّٰریٰت ۔ ۵۱

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۳۰

سورۃ الذّٰریت ایک نظر میں

اس سورت کی ایک خاص فضا ہے ' اس کا آغاز کلام چار قوتوں کے ذکر سے ہوتا ہے ۔ ان قوتوں کا تعلق امرالٰہی سے ہے ۔ ان کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا گیا ہے جن کا مفہوم مبہم ہے ۔ پہلی ہی نظر میں انسان کے پردہ احساس پر یہ تاثر نمودار ہوتا ہے کہ یہ امور سری ہیں جن پر اللہ تعالیٰ قسم اٹھا رہا ہے ۔

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا (١) فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا (٢) فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا (٣) فَالْمُقَسِّمٰتِ أَمْرًا (٤) إِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ (٥) وَّإِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ (٦) (٥١ : ١ تا ٦) "قسم ہے ان ہواؤں کی جو گرد اڑانے والی ہیں ' پھر پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھانے والی ہیں ' پھر سبک رفتاری سے چلنے والی کشتیوں کی قسم اور پھر ایک بڑے کام کی تقسیم کرنے والوں کی قسم ' حق یہ ہے کہ جس چیز کا تمہیں خوف دلایا جا رہا ہے وہ سچی ہے اور جزائے اعمال ضروری پیش آنی ہے"

ذاریات ' حاملات ' جاریات اور مقسمات کے کوئی متعارف مفہوم نہیں ہے ۔ ان الفاظ کا مفہوم اشاراتی ہے اور ان مفہوم کے بارے سوالات اٹھ سکتے ہیں ۔ خود ان الفاظ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر اجمال اور غموض ہے اور شاید اس سورۃ کی فضا کے ساتھ اس قسم کے الفاظ لانا مقصود تھا ۔

اس پہلی قسم کے متصلاً بعد دوسری قسم ہے ۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (٥١ : ٧) "قسم ہے مختلف شکلوں والے آسمان کی اور اس قسم کا جواب یا مقسم علیہ یہ حقیقت ہے"۔

إِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ (٥١ : ٨) "تمہاری بات ایک دوسرے سے مختلف ہے" یعنی تمہاری باتیں نہ مستقل ہیں اور نہ باہم مربوط اور متناسب ہیں ۔ یہ محض ظن و تخمین پر مبنی ہیں ۔ علم اور یقین پر مبنی نہیں ۔

لیکن اس مجمل اسلوب کے ساتھ آغاز کے بعد اس سورۃ ' اس پوری سورۃ کا ہدف اور مقصد ایک ہی ہے اور بالکل واضح ہے ۔ یہ کہ انسانی قلب کو عالم بالا سے منسلک کر دیا جائے اور انسان کا دل اس پوشیدہ امر سے مربوط ہو جائے جسے اللہ نے مخفیہ رکھا ہے ۔ غرض زمین کی آلائشوں سے انسان کو پاک کرنا اور ان تمام بندشوں سے اسے آزاد کرنا جو اس کے سامنے اخلاص ' اللہ کی بندگی اور اللہ کی طرف مکمل فرار کے معاملے میں رکاوٹ بنتے ہیں اور اسے اس کے لئے پوری طرح تیار کرنا کہ وہ اس آیت پر لبیک کہے ۔

فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ (۵۰:۵۱) "پس دوڑو اللہ کی طرف" اس سورۃ کا ہدف ہے کہ تمام لوگ اللہ کے بندے بن جائیں جس طرح کہا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۶:۵۱) "اور میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ میری بندگی کریں" انسان کے لئے اس دنیا میں سب سے بڑا مسئلہ اس کی معیشت کا ہے کہ اسے رزق تلاش کرنا ہوتا ہے اور قدرت نے ہر شخص کا رزق مقدر کرکے اسے خفیہ رکھا ہے۔ اس سورۃ کا ایک اہم مضمون یہ ہے کہ انسان کو فکر معاش کی غلامی سے آزاد کر دیا جائے۔ اسے یہ یقین دلایا جائے کہ اللہ نے رزق کے سلسلے میں ہر کسی کے لئے جو حصہ مقرر کر دیا ہے وہ ضرور اسے ملے گا۔ لہٰذا دل کو صرف تلاش معاش کا اسیر ہی نہ بناؤ بلکہ عالم بالا سے تعلق پیدا کرو۔ اس نکتے کی طرف اس سورۃ میں بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔ براہ راست یا بالواسطہ ' مثلاً۔

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (۲۲:۵۱) "آسمان ہی میں تمہارا رزق بھی ہے اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے"۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۸:۵۱) "اللہ تو خود ہی رزاق ہے ' بڑی قوت والا اور زبردست" اور کبھی اشارہ کیا گیا ہے مثلاً اپنے بندوں کا حال بیان کرتے ہوئے کہا گیا۔

وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۱۹:۵۱) "ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لئے" ابراہیم علیہ السلام کی صفات بیان کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مہمانوں کے لئے پورا بچھڑا بھون کر تیار کیا حالانکہ وہ تعداد میں کم تھے۔ مہمانوں کے پہنچتے ہی وہ جلدی سے تیار کر لائے حالانکہ ابھی محض علیک سلیک ہوا تھا۔ حال احوال بھی نہ پوچھا تھا۔

یوں دل کو زمین کی رکاوٹوں سے آزاد کرایا جاتا ہے اسے رزق کی پریشانی سے بھی آزاد کیا جاتا ہے اور اس کی توجہ کو عالم بالا کی طرف پھیرا جاتا ہے۔ اس کی دلچسپیاں عالم بالا کے ساتھ منسلک ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے خالق کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کے سامنے پھر کوئی زمینی رکاوٹ نہیں رہتی اور وہ دوڑ کر اللہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ تمام موضوعات و مسائل کی غرض و غایت یہی ہے جو اس سورۃ میں لئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز قدرے مجمل اور ناقابل فہم کلمات سے کیا گیا۔ اس لئے آسمان سے قسم کھائی گئی اور مجمل الفاظ میں بھی اشارہ آسمانی قوتوں کی طرف کیا گیا۔

سورۃ کے آغاز میں خدا سے تعلق رکھنے والے متقین کی تصویر کشی بھی کی گئی اور ان کی صفات بھی گنوائی گئیں کہ وہ کس قسم کے لوگ ہیں جو قرآن کو مطلوب ہیں۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ (۱۵) اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ (۱۶) كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ (۱۷) وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ

يَسْتَغْفِرُوْنَ (۱۸) وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۱۹) (۵۱: ۱۵ تا ۱۹) "بے شک متقی لوگ اس روز باغوں اور چشموں میں ہوں گے جو کچھ ان کا رب انہیں دے اسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے' وہ اس دن کے آنے سے پہلے نیکو کار تھے ۔ راتوں کو کم ہی سوتے تھے ۔ پھر وہ رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لئے" یہ اللہ کی طرف نظریں بلند رکھنے کی صورت ہے ۔ اللہ کے لئے خالص ہونے کی تصویر ہے ۔ رات کو اس کی عبادت میں مشغولیت نظر آتی ہے تو صبح کو ہونٹوں پر استغفراللہ ہے اور رات اور دن مال کمانے کی بجائے وہ خرچ کرتے ہیں ۔ سائل اور محروم کو اپنے ساتھ حصہ دار بھتے ہیں ۔ یوں ان پر جمع مال کا کوئی دباؤ نہیں ہے ۔

اسی حوالے کے ساتھ متوجہ کیا جاتا ہے کہ زمین میں صرف رزق ہی تلاش نہ کرو' آیات الہیہ کی تلاش بھی کرو ۔ دل کو آسمانوں سے اٹکا دو کہ تمہارا رزق آسمانوں میں ہے ۔ صرف زمین کے قریبی اسباب اس لئے تمہیں دھوکہ نہ دے دیں ۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ (۲۰) وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۲۱) وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (۲۰) (۵۱: ۲۰ تا ۲۲) "زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی ہیں ۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟ آسمان ہی میں ہے تمہارا رزق اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے"

اسی غرض کے لئے یہاں اشارہ کیا گیا کہ اللہ نے آسمان کو بڑا وسیع بنایا ہے اور زمین کو بطور فرش بچھایا ہے اور اس کے اندر ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے گئے ہیں ۔ یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں اس لئے اللہ کی طرف دوڑو

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۴۷) وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ (۴۸) وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۴۹) فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۵۰) (۵۱: ۴۷ تا ۵۰) "آسمانوں کو ہم نے اپنے زور سے بنایا اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں ۔ زمین کو ہم نے بچھایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں ۔ شاید کہ تم اس سے سبق لو ۔ بس دوڑو اللہ کی طرف میں تمہارے لئے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں ۔"

اور اسی مقصد یعنی تعلق بالسماء کے لئے سورۃ کے آخر میں صاف صاف بتایا گیا کہ جنوں اور انسانوں کی تخلیق کا مقصد کیا ہے ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ(۵۶) مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ(۵۷)اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ(۵۱: ۵۸) "میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں ۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں ۔ اللہ تو خود ہی رزاق ہے ۔ بڑی قوت والا اور زبردست" عرض قلب و خرد کی تاروں پر مسلسل ایک ہی ضرب ہے ۔ ایک ہی مضراب ہے لیکن اس نے متعدد نغمات نکلتے ہیں اور ان کے اثرات اور ان کی آوازوں میں یہی صدا ہے کہ دوڑو' دوڑو اللہ کی طرف جو آسمانوں میں ہے ۔

اس سورۃ میں حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کے قصے کی بھی ایک جھلک موجود ہے ۔ قصہ موسیٰ اور قصہ عاد اور قصہ ثمود اور قصہ نوح کی طرف بھی سرسری اشارات موجود ہیں ۔ ابراہیم کے قصے میں بھی مال و اولاد کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا کہ رزق و اولاد آسمانوں میں ہے ۔ کس طرح حضرت ابراہیم اور اس کی بیوی کو غیر متوقع طور پر اولاد دی گئی اور باقی حصص میں اس آنے والی عظیم حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس پر آغاز سورۃ میں قسمیں کھائی گئیں ۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ(۵۱: ۵) "تم سے تو وعدہ کیا جا رہا ہے وہ یقیناً سچا ہے" اور سورۃ کے آخر میں بھی اس کی طرف دھمکی آمیز اشارہ ہے ۔

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ(۵۱: ۵۹) "پس جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حصے کا بھی ویسا ہی عذاب تیار ہے جیسے لوگوں کو ان کے حصے کا مل چکا ہے ۔ اس لئے یہ لوگ مجھ سے جلدی نہ مچائیں ۔" جیسا کہ اس سے قبل بھی ان کو ایسی ہی دھمکی دی گئی کہ ان کا رویہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سابقہ لوگوں کا رہا ہے ہمیشہ یہی بات سب کرتے رہے ہیں ۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ(۵۱: ۵۲) اَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ(۵۱: ۵۳) "یونہی ہوتا رہا ہے ان سے پہلے قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ہے ۔ کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں ۔"

یوں اس سورۃ کے تمام قصص سورۃ کے محور کے ساتھ مربوط ہیں یعنی اس مقصد کے لئے کہ دلوں کو اللہ کی بندگی کے لئے خالص کر دیا جائے ۔ اس راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے اور اسے آسمان کے ساتھ جوڑ دیا جائے اور ایمان و یقین دل میں یوں بیٹھ جائے کہ تمام پردے دور ہو جائیں ۔ تمام رکاوٹیں خود بخود راستے سے ہٹ جائیں ۔ تمام دوسرے مسائل رکاوٹ نہ بنیں اور انسانی روح پھڑ پھڑاتی ہوئی اس بلند افق کی طرف اڑ جائے ۔

درس نمبر ۲۵۰ تشریح آیات

۱ ـ ـ تا ـ ـ ۶۰

سُورَةُ الذّٰرِيٰتِ (۵۱) مَكِّيَّةٌ (۶۷)
آيَاتُهَا ۶۰ رُكُوعَاتُهَا ۳
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝۱ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝۲ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۝۳ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝۴
اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

"قسم ہے ان ہواؤں کی جو گرد اڑانے والی ہیں' پھر پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھانے والی ہیں' پھر قسم ہے سبک رفتاری کے ساتھ چلنے والی کشتیوں کی' پھر ایک بڑے کام (بارش) کی تقسیم کرنے والوں کی' حق یہ ہے کہ جس چیز کا تمہیں خوف دلایا جارہا ہے وہ سچی ہے اور جزائے اعمال ضرور پیش آنی ہے"۔

یہ سرسری اور مختصر آیات وضربات ہیں۔ ایسے الفاظ کے ساتھ جن کا مفہوم واضح نہیں ہے جیسا کہ ہم نے کہا پردہ احساس پر ایک خاص تاثر چھوڑتی ہیں۔ دل کو ایک نہایت ہی اہم بات سے جوڑ دیتی ہیں اور ایسے معاملے کی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ جو توجہ کا مستحق ہے۔ جن لوگوں نے قرآن کریم کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سنا ان کو بھی ان الفاظ کا مفہوم ایک دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت پیش آئی کہ ذاریات' حاملات' جاریات اور مقسمات کا مفہوم کیا ہے۔

علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں' شعبہ ابن الحجاج نے روایت کی' سماک ابن خالد ابن عرعرہ سے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ سے سنا نیز روایت کی شعبہ نے قاسم ابن ابوبزہ سے' انہوں نے ابوطفیل سے' انہوں نے بھی حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے سنا اور ان کے علاوہ بھی کئی لوگوں کے ذریعہ حضرت علی ابن ابوطالب رضی اللہ عنہ سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ کوفہ میں ممبر پر چڑھے اور کہا' تم قرآن کی کسی آیت کے بارے میں مجھ سے پوچھو یا سنت رسولؐ کے بارے میں مجھ سے پوچھو تو میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ ابن کواء کھڑا ہوا اور دریافت کیا امیرالمومنین کہ اللہ کے کلام

الذاریات ذروا.... کے کیا معنی ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا "ہوا" تو اس نے پوچھا فالحاملات وقرا کے معنی؟ تو انہوں نے فرمایا "بادل" تو اس نے پوچھا فالجاریات یسرا کے معنی تو آپ نے فرمایا "کشتیاں" اس نے کہا فالمقسمات امرا؟ تو انہوں نے فرمایا "فرشتے"۔ ایک شخص صبیغ ابن عسل تمیمی حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور حضرت عمر سے ان الفاظ کے معنی پوچھے 'تو حضرت عمر نے بھی حضرت علی کی طرح جواب دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ شاید وہ دشمنی اور عناد کی بنا پر سوال کر رہا ہے تو آپ نے اسے سزا دی اور حکم دیا کہ وہ لوگوں کے پاس نہ بیٹھے۔ یہاں تک کہ اس نے توبہ کی اور سخت قسموں کے ساتھ حلف اٹھایا کہ آپ نے جو محسوس کیا ہے میرے دل میں وہ بات نہ تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان الفاظ کے مدلول اور معنیٰ کا احتمال اہل عناد اور دشمنان اسلام کو یہ موقع دے رہا تھا کہ وہ ان کے بارے میں لوگوں سے سوال کرتے پھریں۔ اگر کوئی محسوس کرتا تو وہ کہتے ہم تو صرف معنی پوچھتے تھے۔ یہی تفسیر ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ مجاہد' سعید ابن جبیر' حسن' قتادہ' سدی وغیرہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابو حاتم نے اس کے علاوہ کوئی اور تفسیر نقل نہیں کی۔ (ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ ان ہواؤں کی قسم اٹھاتا ہے جو گرد اڑاتی ہیں جو بیجوں کو ادھر ادھر اڑاتی ہیں اور جو پھولوں پر گرد کو اڑاتی ہیں اور بادلوں کو اڑاتی ہیں۔ نیز دوسری چیزوں کو اڑاتی ہیں جو انسان کے علم میں ہوں یا نہ ہوں اور پھر قسم ہے ان بادلوں کی جو پانی کے بوجھ کو اٹھائے ہوئے ہیں اور پھر جہاں اللہ کا حکم ہوتا ہے برس جاتے ہیں۔ پھر ان کشتیوں کی قسم جو بڑی سہولت سے چلتی ہیں۔ یہ سطح سمندر پر تیر رہی ہوتی ہیں کہ ان کے مواد میں اور پانی میں اللہ نے ایسی خصوصیات ودیعت کی ہیں اور اس کائنات میں اللہ نے ایسی خصوصیات رکھ دی ہیں جو ان کشتیوں کی رفتار کو آسان کرتی ہیں پھر ملائکہ کی قسم جو اللہ کے احکام کو تقسیم کرتے ہیں۔ یہ اللہ کے پیغام کو تقسیم کرتے ہیں۔ یہ اللہ کا پیغام اس کی مرضی سے تقسیم کرتے ہیں۔ یہ پیغامات مختلف معاملات کے متعلق ہوتے ہیں اور پوری کائنات میں تقسیم ہوتے ہیں۔

ہوا' بادل' سفینے اور فرشتے اللہ کی مخلوقات میں سے مخلوق ہیں۔ اللہ ان کو اپنی قدرت کا سبب اور آلہ بناتا ہے۔ یہ اللہ کی مشیت کا ایک پردہ ہیں اور ان کے ذریعہ اللہ زمین پر اپنی مرضی چلاتا ہے۔ اللہ ان چیزوں کے ساتھ قسم اس لئے اٹھاتا ہے کہ یہ بہت ہی اہم چیزیں ہیں اور انسانوں کو اس طرف متوجہ ہونا چاہئے اور ان کے پیچھے جو قوتیں کام کرتی ہیں ان پر غور کریں اور پھر انسان ان چیزوں پر غور کریں کہ اللہ نے کس طرح ان کو پیدا کیا ہے وہ ان کے ذریعے سے اس دنیا میں کیا کیا تصرفات کرتا ہے اور اپنی اس تقدیر کو پردے سے باہر لاتا جاتا ہے جو اس نے پہلے سے طے کر رکھی ہے۔ یہاں اس سورۃ میں ان چیزوں کا تذکرہ ایک مخصوص انداز میں کیا گیا ہے اور اس لئے کیا گیا ہے کہ انسانی دل و دماغ ان کے اسرار و رموز کو جان سکیں اور پھر ان چیزوں کو کرشمہ قدرت قرار دے کر تعلق باللہ قائم کریں۔

پھر ان چیزوں کا رزق کے ساتھ ایک گونہ تعلق بھی ہے اور اس سورۃ کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسان کو اس رزق کی فکر سے ذرا نکلنا بھی چاہئے کہ رزق بھی آسمانوں میں مقرر ہے۔ ان چیزوں میں سے ہواؤں' بادلوں اور کشتیوں کا تعلق تو رزق سے بالکل ظاہر ہے۔ اب فرشتے جو رزق تقسیم کرتے ہیں تو من جملہ اور احکام کے وہ احکام رزق بھی تقسیم کرتے ہیں لہٰذا ان تمام چیزوں کا تعلق رزق سے زیادہ واضح ہو جاتا ہے جس کا تذکرہ اس سورۃ میں کئی جگہ آیا ہے۔

جس غرض کے لئے اللہ ان چار امور پر قسم اٹھاتا ہے وہ یہ ہے کہ ۔

اِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ (٥) وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ (٥١ : ٦) "جس چیز کا تمہیں خوف دلایا جارہا ہے وہ سچی ہے اور جزائے اعمال ضرور پیش آئی ہے۔" اللہ نے لوگوں کے ساتھ یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ احسان کے بدلے احسان کرے گا اور برائی کا بدلہ برائی سے دے گا۔ اس دنیا میں تو اس نے تمہیں مہلت حساب دی ہے لیکن آخرت میں کوئی مہلت نہ ہوگی لہذا وہاں حساب لازمی ہوگا۔ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ (٥١ : ٦) "جزائے اعمال ضرور پیش آئی ہے" لہذا یہ وعدہ سچا ہے دنیا کا ہو یا آخرت کا۔ اور جو وعدہ اس نے کئے ہیں ان میں رزق کا بھی وعدہ ہے۔ رزق وہ دے گا کسی کو زیادہ کسی کو تھوڑا۔ اپنی مشیت کے مطابق۔ یہ وعدہ بھی سچا ہے جس طرح اللہ تمام معاملات میں سچا ہے۔ لہذا اللہ نے لوگوں کے ساتھ جو وعدہ کیا ہے وہ سچا ہے اور وہ پورا ہوگا جس طرح اللہ چاہتا ہے اور جس وقت وہ چاہے گا ایسا ہوگا۔ اللہ کی جانب سے اس پر کسی قسم کی ضرورت نہ تھی لیکن اللہ اپنی بعض مخلوقات کی قسم اس لئے اٹھاتا ہے کہ لوگ ان چیزوں کی طرف متوجہ ہوں جیسا کہ پہلے بھی کیا گیا' اور ان چیزوں کے اندر جو کمال تخلیق ہے اور ان کی تدبیر میں قدرت الٰہیہ جس طرح کام کر رہی ہے اس پر غور و فکر کریں اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کریں کہ اللہ کا وعدہ حشر و نشر برحق ہے کیونکہ اللہ کی اس تخلیق اور اس کے اس نظام کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ حشر و نشر ہو اور اس میں اچھائی اور برائی اور صلاح اور فساد پر لوگوں کا محاسبہ ہو کیونکہ اس کائنات کی ساخت کا یہ تقاضا ہے کہ یہ عبث نہیں ہے۔ نہ اتفاقاً وجود میں آگئی ہے۔ یوں یہ مخلوق جس کی قسم اٹھائی گئی ہے یہ اس قسم کی وجہ سے حشر و نشر پر ایک دلیل و برہان بن جاتی ہے اور انسان اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور انسانی احساس و شعور اس پر غور کرتا ہے۔ یہ قرآن مجید کی تعلیم و تربیت کا ایک انداز ہے۔ قرآن مجید انسانی فطرت کو کائناتی زبان میں براہ راست خطاب کرتا ہے اور یہ خطاب نہایت موثر ہوتا ہے۔

---ooo---

اور یہی مفہوم اور مقصد ہے دوسری قسم کا:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ﴿٧﴾ اِنَّكُمْ لَفِىْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ﴿٨﴾ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ﴿٩﴾

"قسم ہے بنے ہوئے آسمان کی' (آخرت کے بارے میں) تمہاری بات ایک دوسرے سے مختلف ہے اس سے وہی برگشتہ ہوتا ہے جو حق سے پھرا ہوا ہے"۔

یہاں اللہ آسمان کی قسم اٹھاتا ہے جس کی بناوٹ محکم اور مرتب ہے۔ اس طرح جس طرح زرہ کے حلقے نہایت ترتیب سے بنے ہوئے ہوتے ہیں بعض اوقات آسمانوں میں بادلوں کی یہی صورت ہوتی ہے کہ یہ بادل زرہ کی طرح بنے ہوئے نظر آتے ہیں اس طرح پیچدار نظر آتے ہیں جس طرح پانی کی لہریں یا ریت کی لہریں جن پر ہوا ایک ہی رفتار سے چل رہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ آسمانوں کے اندر جتنے مدار ہیں وہ مراد ہوں کیونکہ یہ مدار ایسے ہیں کہ اگر ان کو رنگ

دار لکیروں سے ظاہر کیا جائے تو وہ زرہ کے حلقوں کی طرح نظر آئیں ۔ اس نہایت ہی اچھے طریقے سے بنے ہوئے آسمان کی قسم اٹھا کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے بارے میں تمہاری باتیں یکساں نہیں ۔ تمہارے دلائل میں اضطراب ہے ۔ ان میں نہ مضبوطی ہے اور نہ قرار ہے بلکہ یہ تمہاری باتیں حیرانی اور پریشانی کی عکاسی کرتی ہیں جو چاہے ان باتوں سے پھر جائے اور جو چاہے ان پر جما رہے ۔ نہ صرف یہ کہ ان میں کوئی قرار و ثبات نہیں بلکہ ہمیشہ حیرت اور قلق اور بے یقینی پر مشتمل باتیں ہیں اور باطل موقف ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے ۔ متزلزل اور متغیر اور آئے دن بدلنے والا ۔ باطل ہمیشہ سرگرداں رہتا ہے ۔ اس کے سامنے نہ نشانات راہ ہوتے ہیں اور نہ روشنی ہوتی ہے جس میں وہ راہ پر صحیح طرح چل سکے ۔ پھر باطل کا کوئی اصول بھی نہیں ہوتا ۔ وہ ڈولتا رہتا ہے کیونکہ اس کی کوئی مضبوط اساس نہیں ہوتی اور نہ اس کا کوئی متعین پیمانہ ہوتا ہے ۔ اگر اہل باطل کبھی کسی بات پر مجتمع بھی ہو جائیں تو بھی ایک عرصے کے بعد وہ باہم لڑ پڑتے ہیں اور ان کے درمیان اختلافات اور دشمنیاں قائم رہتی ہیں ۔

اہل باطل کا اضطراب ' ان کا اختلاف اور ان کے متذبذب خیالات اس وقت اور اچھی طرح ظاہر ہو جاتے ہیں جب ان کو نظام سماوی کے رنگ میں دیکھا جائے جو نہایت ہی مضبوط ہے اور جس کے حلقے ایک دوسرے سے پیوست ہیں اور مرتب ہیں ۔

یہی بیان آگے جاری ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ محض ظن و تخمین بلکہ وہم کی دنیا میں بستے ہیں ۔ آخرت کے بارے میں ان کے خیالات حق و یقین سے ماخوذ نہیں ہیں ۔ حق تو بالکل عیاں ہے لیکن اس موضوع پر ان کے افکار پریشاں ہیں ۔ اس کے بعد ان کے افکار پریشان کا ایک ایسا منظر پیش کیا جاتا ہے جسے آنکھیں اس طرح دیکھ رہی ہیں جس طرح اسکرین پر چل رہا ہو ۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ﴿۱۱﴾ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۴﴾

"مارے گئے قیاس و گمان سے حکم لگانے والے جو جہالت میں غرق اور غفلت میں مدہوش ہیں ۔ پوچھتے ہیں آخر وہ روز جزاء کب آئے گا؟ وہ اس روز آئے گا جب یہ لوگ آگ پر تپائے جائیں گے ۔ (ان سے کہا جائے گا) اب چکھو مزا اپنے فتنے کا 'یہ وہی چیز ہے جس کے لئے تم جلدی مچا رہے تھے"۔

خَرَّصَ کے معنی ظن 'گمان ' اندازے کے ہیں 'یعنی ایسی سوچ جو کسی گہرے اور یقینی معیار پر مبنی نہ ہو اور جس کا کوئی صغریٰ کبریٰ نہ ہو ۔ ایسے لوگوں کے لئے اللہ بددعا فرماتا ہے کہ وہ قتل ہوں اور اللہ کی طرف سے بددعا کے معنی ہیں "بس قتل ہوئے"۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ (۵۱:۱۰) "مارے گئے قیاس و گمان سے حکم لگانے والے" اور ان کی ذرا مزید وضاحت کی جاتی ہے ۔

الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ غَمْرَۃٍ سَاھُوْنَ (۵۱:۱۱) "جو جہالت میں غرق اور غفلت میں مدہوش ہیں" ان کے افکار باطل خیالات سے لبالب ہیں اور یہ اوہام میں مدہوش ہیں ' نہ ہوش میں آتے ہیں اور نہ جاگتے ہیں ۔ انداز تعبیر ایک خاص رنگ اور تصور دے رہا ہے ۔ ان کی تصویر کچھ ایسی بنتی ہے ۔ وہ غفلت میں سوئے ہوئے ہیں یا بے ہوش ہیں ' مست پڑے ہیں اور انہیں اپنے ماحول کے بارے میں کوئی احساس نہیں ہے اور وہ کوئی فکر بھی نہیں کرتے اور ان کے ذہن اور دماغ کام نہیں کر رہے جس طرح نشے میں ہوں ۔ اس لئے کہ ایک واضح بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی ۔ لیکن کہ ہر ہوشمند شخص اسے دیکھتے ہی سمجھ لے اور ان کی حالت یہ ہے ۔

یَسْئَلُوْنَ اَیَّانَ یَوْمُ الدِّیْنِ (۵۱:۱۲) "پوچھتے ہیں آخر وہ روز جزا کب آئے گا" وہ جس طرح پوچھتے ہیں اس سے ان کا مقصد طلب علم یا طلب معرفت نہیں ہے بلکہ وہ منکر ہیں ' جھٹلاتے ہیں اور اسے ایک ناممکن بات سمجھ کر پوچھتے ہیں کیونکہ "ایان" کے لفظ کو ایسے ہی مواقع پر بولا جاتا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے انداز میں قیامت کی ایک جھلک جلدی سے دکھا دیتا ہے کہ دیکھو یہ ہے جس کو تم ناممکن سمجھتے ہو ۔ وہ اس طرح اس میں جل جاتے ہیں جس طرح کسی دھات کو جلا کر اس کی حقیقت معلوم کی جاتی ہے ۔

یَوْمَ ھُمْ عَلَی النَّارِ یُفْتَنُوْنَ (۵۱:۱۳) "جب یہ لوگ آگ پر تپائے جائیں گے" اور پھر اس منظر ہی میں انہیں شرمندہ بھی کیا جاتا ہے جس سے ان کے رنج میں اضافہ ہوتا ہے جبکہ وہ تو پہلے سے مشکل میں ہیں ۔

ذُوْقُوْا فِتْنَتَکُمْ ھٰذَا الَّذِیْ کُنْتُمْ بِہٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (۵۱:۱۴) "اب چکھو مزا اپنے فتنے کا ' یہ وہی چیز ہے جس کی تم جلدی مچا رہے تھے" .... اس سوال کا مناسب جواب یہی تھا اور مدہوشی اور گہری نیند میں سوئے ہوئے غافلوں کے لئے اس منظر میں یہ تختی نہایت ہی موزوں اور مطابق حال ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ان کے لئے بددعا کی ' نہایت سخت انداز میں قتلا مارے گئے اور آگ پر ان کو اس طرح تپایا جائے گا جس طرح کسی دھات کو تپایا جاتا ہے کہ اس سے کھوٹ نکالا جائے ۔

اب ذرا فریق مقابل ' ذرا دوسرے پلیٹ فارم پر جائیں اور کتاب کا دوسرا صفحہ الٹیں ' وہاں دوسرا فریق کھڑا ہے جو وہم و گمان کی بات نہیں کرتا جس کی باتوں میں تزلزل نہیں ہے ۔ یہ متقی ہیں متکبر نہیں ۔ یہ جاگ رہے ہیں ' عبادت گزار ہیں ' استغفار کرنے والے ہیں اور اپنی عمر مدہوشیوں میں ضائع نہیں کرتے ۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۱۵﴾ اٰخِذِیْنَ مَاۤ اٰتٰھُمْ رَبُّھُمْ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُحْسِنِیْنَ ﴿۱۶﴾ کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ﴿۱۹﴾

"البتہ متقی لوگ اس روز باغوں اور چشموں میں ہوں گے' جو کچھ ان کا رب انہیں دے گا اسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے۔ وہ اس دن کے آنے سے پہلے نیکو کار تھے' راتوں کو کم ہی سوتے تھے' پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے' اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لئے"۔

یہ گروہ گروہ متقین ہے۔ یہ جاگنے والے ہیں۔ یہ شدید احساس رکھتے ہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے نفس کے بارے میں بھی حساس ہیں۔ یہ لوگ۔

فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ (۱۵:۵۱) "باغوں اور چشموں میں ہوں گے" اور۔

اٰخِذِیْنَ مَآ اٰتٰھُمْ رَبُّھُمْ (۱۶:۵۱) "جو کچھ ان کا رب انہیں دے گا اسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے"' رب کے فضل' اس کے انعامات وصول کر رہے ہوں گے ان اعمال کے بدلے جو انہوں نے حیات دنیا میں کیے۔ انہوں نے اس کی عبادت اس طرح کی گویا اسے دیکھ رہے ہیں اور یہ یقین کرتے ہوئے کہ وہ دیکھ رہا ہے اور۔

اِنَّھُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُحْسِنِیْنَ (۱۶:۵۱) "وہ اس دن کے آنے سے پہلے نیکوکار تھے اور ان کی نیکی کی تصویر بھی بڑی دلکش ہے' نہایت ہی چمکدار اور حساس :

کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ (۱۷) وَبِالْاَسْحَارِ ھُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ

(۱۸:۵۱) "راتوں کو کم سوتے تھے' پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے" وہ رات کے پچھلے حصے میں جاگ رہے ہوتے ہیں جبکہ لوگ سوتے ہیں۔ وہ اپنے رب کی طرف توبہ و استغفار کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں' اللہ سے رحم کی درخواست کرتے ہیں' وہ بہت کم اونگھتے ہیں اور بہت کم سوتے ہیں۔ رات کے اندھیروں میں وہ اپنے رب کے ساتھ ہمکلام ہوتے ہیں۔ ان کے پہلو اپنے بستروں سے دور ہو جاتے ہیں اور اللہ کی طرف دیکھنے کا شوق انہیں ہلکا کر دیتا ہے اور نیند ان کے جسم کو بوجھل نہیں کر سکتی۔

امام حسن بصری کہتے ہیں۔

کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ (۱۷:۵۱) "یعنی وہ مشقت سے قیام لیل کرتے ہیں' وہ رات کو کم سوتے ہیں اور انہوں نے عمل میں رات بسر کی اور اپنے قیام کو صبح تک طویل کیا۔ یہاں تک کہ استغفار صبح کے وقت ہوا۔

قتادہ احنف ابن قیس سے نقل کرتے ہیں۔

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ (۵۱ : ۱۷) یعنی وہ کم سوتے تھے اور پھر انہوں نے کہا کہ میں اس آیت والوں میں سے نہیں ہوں۔

حسن بصری فرماتے ہیں کہ احنف ابن قیس فرمایا کرتے تھے میرے اعمال اہل جنت کے اعمال کے مقابلے میں پیش کیے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے اور ہمارے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ چونکہ ہم ان کے اعمال تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ وہ لوگ تھے جو رات کو کم سوتے تھے اور میں نے اپنے اعمال جہنمیوں کے اعمال پر پیش کیے تو اہل جہنم میں کوئی بھلائی نہ تھی۔ انہوں نے اللہ کی کتاب کو جھٹلایا۔ حشر و نشر کو جھٹلایا' میں دیکھا کہ وہ لوگ بھی ہم سے اچھے ہیں جنہوں نے کچھ تو اچھے کام کیے تھے اور کچھ برے کیے تھے۔

عبدالرحمن ابن زید ابن اسلم نے کہا بنی تمیم کے ایک شخص نے میرے باپ سے کہا "ابواسامہ' ایک صفت ہے جو ہم میں نہیں ہے اللہ نے ایک ایسی قوم کا ذکر کیا ہے۔

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ (۵۱ : ۱۷) "جو راتوں کو کم سوتے تھے" اور ہم تو ایسے ہیں کہ راتوں کو کم اٹھتے ہیں۔ تو میرے باپ رضی اللہ عنہ نے کہا خوش خبری ہے اس شخص کے لئے جو اونگھا تو سو گیا اور جو جاگا تو استغفار کیا اور اللہ سے ڈرا۔

یہ ہے وہ حالت جس کے لئے تابعین' ایسے تابعین جو ایمان و یقین میں بہت بڑے مراتب رکھتے ہیں' آرزومند ہیں اور وہ اپنے آپ کو اس سے فروتر سمجھتے ہیں۔ بہرحال امت میں کچھ لوگ اللہ نے اس مقام کے لئے چن رکھے ہیں جو ان آیات کا حق ادا کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ اللہ کے ہاں محسنین کی لسٹ میں درج ہیں۔ یہ تو ہے ان کا تعلق اپنے رب کے ساتھ 'لوگوں کے ساتھ ان کا تعلق کیا ہے' وہی تعلق جو ایک نیک آدمی کے لائق ہے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۵۱ : ۱۹) "اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لئے" وہ اپنے اموال میں اس سائل کا حصہ بھی رکھتے ہیں جو مانگتا ہے اور اسے دے دیا جاتا ہے اور اس محروم کا بھی حق مقرر کرتے ہیں جو خاموش رہتا ہے' حیا کرتا ہے اور محروم رہ جاتا ہے۔ وہ ان دونوں قسم کے لوگوں کے لئے اپنے اموال میں حق رکھتے ہیں۔ وہ خود اس حق کو اپنے اوپر فرض کر لیتے ہیں اور یہ حق غیر محدود ہے متعین نہیں۔

یہ اشارہ سورۃ کے محور کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ رزق آسمانوں میں ہے تاکہ انسانوں کا دل کنجوسی' بخل اور رات اور دن جمع مال میں مشغولیت سے ذرا آزاد ہو جائے اور یہ سورۃ کے اس اہم حصے کے لئے تمہید ہے جبکہ یہ متقین اور محسنین کی تصویر کا آخری رنگ بھی ہے۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٢١﴾ وَ

۱ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿٢٢﴾ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ

ع ۲۳

۱۸ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿٢٣﴾

" زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے اور خود تمہارے اپنے وجود میں ہیں۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟ آسمان ہی میں ہے تمہارا رزق بھی اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے۔ پس قسم ہے آسمان اور زمین کے مالک کی، یہ بات حق ہے۔ایسی ہی یقینی جیسے تم بول رہے ہو"۔

اس آیت کے ذریعے انفس و آفاق میں موجود نشانیوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ تمہارے لئے رزق کے جو ذرائع مقرر کر دیئے ہیں وہ آسمان سے مقرر ہیں اور اللہ اپنی ذات کی قسم اٹھاکر فرماتا ہے یہاں ذات باری کو رب سماء اور ارض کہا گیا جن کا ذکر اس سبق میں ہو چکا ہے اور جواب قسم یہی اہم سوال ہے یعنی حشر و نشر۔

وَفِیْ الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ (۵۱:۲۰) وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱:۲۱) " زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے اور خود تمہارے وجود میں ہیں کیا تم کو سوجھتا نہیں" یہ چھوٹا سا سیارہ جس کے اوپر ہم رہتے ہیں یہ ایک بہت بڑی نمائش گاہ ہے۔ان آیات و عجائبات کے لئے جو اس میں اللہ نے رکھے ہیں۔اس نمائش گاہ میں اس دنیا کے عجائبات میں سے بہت ہی کم ابھی تک نمائش کے لئے رکھے جا سکے ہیں۔ آئے دن نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں اور نئے نئے عجائبات ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔اسی قسم کی ایک نمائش گاہ خود ہماری ذات ہے۔نفس انسانی، اس کی پراسرار نفسیاتی دنیا، اس حضرت انسان کے اندر بھی اس کائنات کے اسرار موجود ہیں۔صرف زمین کے اسرار نہیں بلکہ پوری کائنات کے اسرار۔

ان دو نمائش گاہوں کی طرف ان آیات میں مختصر اشارہ ہے کہ ان دونوں نمائش گاہوں کے دروازے تمہارے لئے کھولے جارہے ہیں لیکن فائدہ اسی شخص کو ہو گا جو ان کو دیکھنا چاہے اور جو یقین کرنا چاہے اور اپنی زندگی کی نعمتوں اور خوشیوں سے بھرنا چاہے جو علم و معرفت اور دانائی اور عبرت حاصل کرنا چاہے جن سے اس کا دل زندہ ہو گا اور عمر زیادہ ہوگی۔

اللہ نے اپنا یہ کلام اس طرح بنایا ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے ہر سطح کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ہر صورت حال اور ہر قسم کے معاشروں کے لئے وہ رہنما ہے۔ ہر شخص، ہر نفس اور ہر سطح کی عقل و ادراک کے لئے اس کلام میں ہدایت اور دلچسپی اور علم ہے۔ ہر شخص اپنی عقلی قوت ہاضمہ کے مطابق اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ جوں جوں انسان علم و معرفت میں ارتقائی منازل طے کرتا ہے، جوں جوں اس کا دائرہ ادراک وسیع ہوتا ہے، اس کی معلومات بڑھتی ہیں، اس کے تجربات آگے بڑھتے ہیں اور وہ نفس اور کائنات کے اسرار حاصل کرتا ہے تو اس کا حصہ اس قرآن میں بھی بڑھ جاتا ہے۔اس کے علوم قرآنی میں اضافہ ہوجاتا ہے اور اس کی زاد راہ اور اس کا رزق اس قرآن میں بڑھ جاتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے "جس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے اور زیادہ استعمال سے یہ پرانا نہیں ہوتا۔" یہ وہ الفاظ ہیں جو اس کے بارے حضور اکرمؐ نے فرمائے کیونکہ اس کے اسرار و رموز سے زیادہ واقف حضورؐ ہی ہیں۔یہ زندہ تجربہ تھا جو آپ کو قرآن کے بارے میں ہوا اور جس کو آپ نے ان الفاظ میں بیان کیا ﷺ

جن لوگوں نے پہلی مرتبہ قرآن کو سنا تھا انہوں نے اس کائنات میں پائے جانے والے دلائل و نشانات کو اور خود ان کے نفوس کے اندر جو دلائل و نشانات تھے ان کو اس وقت کے علم و معرفت کے مطابق سمجھا تھا۔ان کے بعد آنے والی

نسلوں نے بھی اپنے علم و معرفت اور اپنے تجربات کے مطابق ان آیات کو سمجھا اور بیان کیا۔ آج ہم بھی اپنا حصہ پا رہے ہیں جس قدر علم و معرفت اور جس قدر تجربات و انکشافات ہمارے سامنے آج تک آچکے ہیں' آج ہم تک جو علوم اور تجربات پہنچے ہیں وہ اس عظیم کائنات اور انسان کے پر پیچ نفس کے آیات و نشانات میں سے بہت ہی قلیل حصہ ہیں۔ ہم سے بعد میں آنے والی نسلوں کو ہمارے مقابلے میں زیادہ آیات و نشانات ملیں گے۔ اس کائنات میں بھی اور نفس انسانی میں بھی اور قیامت تک اس نمائش گاہ عالم اور نمائش گاہ نفس انسانی میں نئے نئے عجائبات برائے نمائش رکھے جاتے رہیں گے۔

یہ زمین 'زندگی کے لئے تیار شدہ سیارہ' جو زندگی کا گہوارہ ہے اور جسے زندگی کی تمام ضروریات سے لیس کیا گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس عظیم اور ہولناک کائنات میں یہ واحد سیارہ ہے جسے حیات کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں ایک جگہ رکے ہوئے ستارے بھی ہیں اور مداروں میں چلنے والے سیارے بھی ہیں۔ ان میں سے جو ہمیں معلوم ہیں ان کی تعداد اربوں میں ہے اور یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس کائنات کا جو حصہ معلوم ہے وہ نسبتاً بہت ہی کم ہے۔ اس میں کئی ملین کہکشاں ہیں اور ہر کہکشاں کے کروڑہا ستارے ہیں اور ان کے کواکب ہیں جو ان ستاروں کے ارد گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔

ان سیاروں میں سے صرف یہ زمین ہی ایک سیارہ ہے جسے اس پر موجود زندگی کے لئے عجیب خصوصیات دی گئی ہیں۔ ان میں سے ہر خصوصیت ایک نشانی ہے۔ اگر ان خصوصیات میں سے ایک خصوصیت بھی ختم ہو جائے یا اس کے اندر کچھ رد و بدل ہو جائے تو زمین کے اوپر سے ہر قسم کی زندگی کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ اگر اس زمین کا حجم بدل جائے 'ٹیڑھی ہو جائے یا چھوٹی' اگر سورج سے اس کا فاصلہ بدل جائے 'کم ہو جائے یا زیادہ' اگر سورج کا حجم بدل جائے اور اس کا درجہ حرارت بدل جائے اور یہ زمین اپنے محور پر جس طرح جھکی ہوئی ہے اگر اس کے اس جھکاؤ میں کوئی تغیر واقع ہو جائے اگر اس کی گردش محوری میں یا سورج کے گرد اس کی سالانہ گردش میں کمی بیشی آجائے اگر چاند کا حجم متغیر ہو جائے یا زمین سے قریب یا دور ہو جائے۔ اگر زمین کے اندر تری اور خشکی کی نسبت بدل جائے' غرض اگر' اگر' اگر.... اور ہزار ہا اگر' اگر ان ہزار ہا موافقات اور سہولیات میں سے کوئی ایک بھی بدل جائے تو اس سیارے پر سے اس خوبصورت زندگی کا نام و نشان ہی ختم ہو جائے۔

کیا یہ ایک چیز نشانی نہیں 'کیا یہ سب چیزیں نشانات نہیں جو بتاتی ہیں کہ ایک ذات ہے جس نے ان کو منظم کیا ہے' فراہم کیا ہے۔

اور خوراک اور زرق کی مختلف اقسام جو اس زمین پر رہنے والی اور بستے والی مخلوقات کے لئے اللہ نے فراہم کی ہیں۔ یہ مخلوقات سطح زمین کے اوپر رہتی ہوں 'فضا میں تیر رہی ہوں' یا پانی میں تیر رہی ہوں یا زمین کے غاروں میں رہتی ہوں یا اس کے پہاڑوں میں رہتی ہوں یا اس کی وادیوں اور بستیوں میں اندر رہتی ہوں 'سب کے لئے خوراک تیار ہے۔ بعض کی مرکب ہے اور بعض کی بسیط شکل میں ہے۔ بہرحال یہ ان زندہ چیزوں کے وجود کے لئے قابل قبول ہے اور ان لاتعداد زندہ اشیاء کی ضروریات پوری کرتی ہے جس طرح زندہ مخلوقات لاتعداد انواع و اقسام کی ہیں اسی طرح ان کی خوراک بھی لاتعداد و انواع و اقسام کی ہے۔ یہ انواع خوراک جو زمین کے اندر ہیں جو بہتی اور چلتی ہیں جو ہوائیں ہیں جو سطح زمین پر اگتی ہیں جو سورج سے آرہی ہیں جو دوسرے جہانوں سے آرہی ہیں جو تمہیں معلوم ہی نہیں لیکن یہ ہر قسم کی خوراک ان زندہ اشیاء کے لئے ہر طرف سے چلی آرہی ہے اور بڑی مقدار میں چلی آرہی ہے۔ اللہ کی مشیت اور اس کی تدبیر کے مطابق یہ

ایک عظیم خزانہ اور اسٹور ہے جو ان لاتعداد انواع و اقسام کے کھانے والوں کے لئے سپلائی پوری کراتا ہے ۔ یہ ہے ربانی سٹور الرزاق کا انتظام ۔

پھر اس زمین کے مناظر و مشاہد کی رنگارنگی ' جہاں تک بھی نظر جاسکتی ہو جہاں جہاں بھی قوم جاسکے ہوں یہ بھی اپنی جگہ عجائبات ہیں جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتے ۔ یہ تنگ گڑھے اور کشادہ نالے ' وادیاں اور پہاڑ ' سمندر اور بحیرے ' نہریں اور نالیاں اور باغات کے ٹکڑے ٹکڑے ' انگور اور کھجور ' اکہرے اور دوہرے ' یہ سب مناظر اور مشاہد ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنانے والے کے کمالات کا یہ عجوبہ ہیں ۔ ان میں مسلسل تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور یہ کسی وقت بھی ایک حالت میں نہیں ہوتے ۔ انسان ایک زمین پر گزرتا ہے تو وہ خشک اور قحط زدہ نظر آتی ہے یہ بھی ایک منظر ہے اور پھر کیا دیکھتا ہے کہ وہ سرسبز اور نعمتوں اور چارہ سے بھری ہوتی ہے تو یہ بھی ایک منظر ہے ۔ کبھی نہایت ہی سرسبزی اور شاداں ہوتی ہے ۔ یہ ایک منظر ہے ۔ کبھی وہ دیکھتا ہے کہ تمام زمین زرد اور خشک ہوگئی اور فصل کٹنے والی ہے ۔ یہ بھی ایک منظر ہوتا ہے اور وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوتا ہے بالکل ادھر ادھر نہیں گیا ہوتا ہے ۔

وہ تمام مخلوقات جو اس زمین کو آباد کر رہی ہیں مثلاً زندہ مخلوقات نباتات و حیوانات ' مچھلیاں اور پرندے چوپائے اور حشرات اور انسان قرآن نے ان کا تذکرہ ایک ہی آیت میں کیا ہے ۔

یہ مخلوقات جن کی انواع و اقسام کی تعداد کا بھی پوری طرح ہمیں علم نہیں ہے یہ تو دور کی بات ہے کہ ایک نوع کے افراد گنے جاسکیں ۔ یہ تو محال ہے ۔ ان میں سے ہر نوع کی مخلوقات ایک امت ہے اور ان کا ہر ایک فرد ایک عجوبہ ہے ۔ ہر حیوان ' ہر پرندہ ' ہر چرندہ اور ہر کیڑا ' ہر پودا نہیں بلکہ ہر پودے کی ہر شاخ اور ہر شاخ کا ہر پتہ اور ہر شاخ کا ہر پھول اور ہر پھول کی ہر پتی یہ اللہ کی ایک نمائش گاہ ہے جس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے ۔

اگر انسان بیان کرنے لگے بلکہ تمام انسان بیک وقت بیان کرنے لگیں وہ غور کریں اور لکھیں اور بیان کریں کہ اس زمین میں کیا کیا نشانات الہیہ ہیں اور کیا کیا عجائبات ہیں تو نہ ان کی بات ختم ہو اور نہ ہی عجائبات و اشارات ختم ہوں ۔ قرآن کی یہ آیت تو صرف اس قدر بیان کرتی ہے کہ انسان کا دل و دماغ غور و فکر کے لئے بیدار ہو جائے اور اس عظیم الشان نمائش میں جو چیزیں قدرت نے رکھی ہیں ان کو دیکھیں اور روشنی میں لائیں سمجھیں اور سمجھائیں ۔ ہنسیں اور ہنسائیں اور یوں اس کرہ ارض پر اپنے اس مختصر سفر کو خوشگوار بنائیں ۔

لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ان عجائبات کا ادراک وہی کر سکتا ہے اور ان کے ذریعے زندگی کے اس مختصر سفر کو وہی خوشگوار بنا سکتا ہے جس کا دل یقین سے بھر چکا ہو ۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ (۵۱ : ۲۰) "اور زمین میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین کرتے ہیں" یہ یقین ہی ہے جو آنکھوں کو بینائی فراہم کرتا ہے تو وہ دیکھتی ہیں ۔ یہ ایمان ہی ہے جو زمین کے ان مظاہر قدرت کو زندگی دیتا ہے اور وہ اپنے اسرار اور رموز بتاتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ان کی پشت پر دست قدرت کی کیا کیا کارستانیاں ہیں ۔ بغیر ایمان کے یہ سب مناظر و مشاہد مردہ پڑے رہتے ہیں ۔ جامد ہو جاتے ہیں اور مفہوم سے خالی ہوتے ہیں ۔ یہ ایمان سے خالی دل سے ہمکلام نہیں ہوتے ۔ وہ اس کے ساتھ ہمقدم ہو کر نہیں چلتے ۔ کئی ایسے انسان ہیں جو اللہ کی اس

نمائش گاہ میں چلتے پھرتے ہیں لیکن انہیں اس میں نظر کچھ نہیں آتا۔ ان کو یہ کائنات زندہ اور گویا نظر نہیں آتی ۔ وہ اس کی زبان نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے دلوں کو ایمان کے لمس سے زندگی نہیں بخشی ۔ ان کے لئے ان کا ماحول زندہ نہیں ہے ۔ بعض ایسے لوگوں میں بڑے بڑے علماء اور سائنس دان بھی ہو سکتے ہیں ۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا "مگر وہ اس دنیا کی زندگی کے صرف چھلکے کے عالم ہیں" رہی اس دنیا کی اندرونی حقیقت تو وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہے کیونکہ کوئی بھی دل اس کائنات کی حقیقت کو ایمان کی کنجی سے کھول سکتا ہے کوئی بھی آنکھ صرف ایمان کی روشنی سے ان حقائق کو دیکھ سکتی ہے ۔ صدق اللہ العظیم . . . . .

اب ان عجائبات میں سے دوسرا عجوبہ ۔

وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱ : ۲۱) "اور خود تمہارے وجود میں ہیں کیا تمہیں سوجھتا نہیں" یہ حضرت انسان تو عجائبات عالم میں سے ایک عظیم عجوبہ ہے لیکن اس کی قسمت کیا ہے ۔ اس کا مقام کیا ہے اور اس کی ذات کے اندر کیا اسرار و رموز ہیں ۔ اس سے وہ غافل ہے اور غافل اس وجہ سے ہے کہ وہ ایمان و یقین کی نعمت سے محروم ہے ۔

یہ انسان اپنی جسمانی ساخت میں بھی عجوبہ ہے ۔ جسم کے اسرار میں عجوبہ ہے ۔ روحانی دنیا میں عجوبہ ہے ۔ نفسیات کا تو عالم ہی جدا ہے ۔ غرض اپنے ظاہر میں اور اپنے باطن میں عجوبہ ہے ۔ یہ انسان اس کائنات کا عناصر کا نمونہ ہے اور پوری کائنات کے اسرار و رموز اس کے اندر پوشیدہ ہیں ۔

وتزعم انك جرم صغير
و فيك انطوى العالم الاكبر

"تو سمجھتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جرثومہ ہے .... لیکن تیرے اندر ایک عظیم جہاں آباد ہے ۔"

جب انسان خود اپنی ذات اور اپنے نفس کے عجائبات دیکھتا ہے تو حیران اور ششدر رہ جاتا ہے ۔ اس کے اعضاء کی تشکیل اور تقسیم ' پھر اس کے اعضاء کے فرائض اور ان کے انداز عمل ' مثلاً ہضم اور خوراک حاصل کرنے کا عمل ' سانس لینے کا عمل اور جلانے کا عمل ' دل اور شریانوں میں خون دوڑنے کا عمل ' اعصابی نظام اور اس کا پورے جسم کو چلانا ' غدود اور ان کا جسم کو چلانا اور بڑھانا ' پھر ان تمام چیزوں کا باہم اتحاد و اتفاق اور ہم آہنگی اور ان کا پوری طرح ہمسفر اور ہمقدم ہونا ' پھر عجائبات کے اندر جو تفصیلی عجائبات ہیں اور ہر جز کے اندر جو خارق عادت معجزات ہیں ان میں سے ہر ایک محیرالعقول ہے ۔

پھر انسان کی روحانی طاقتیں ' جن میں سے کچھ تو معلوم ہیں اور کچھ مجہول ہیں ۔ اس کا اشیاء کا ادراک کرنا اور پھر ادراک کا میکانزم ' پھر مدرکات کا حفظ کرنا اور اسکے بعد ان کو یاد کر لینا ' یہ معلومات اور ذہن کے خزانوں میں ان کی تصاویر ' یہ کہاں ہوتی ہیں اور کس طرح محفوظ ہوتی ہیں ۔ یہ تصاویر اور یہ تمثیلات اور یہ مشاہد اور ان کے نقوش یہ کس طرح نقش ہوتے ہیں اور کس طرح یہ تصاویر بنائی جاتی ہیں ۔ یہ تو ہیں ان قوتوں کے وہ پہلو جو ہمیں معلوم ہیں ۔ لیکن وہ قوتیں جو ہمیں معلوم نہیں تو وہ بہت ہی بڑی ہیں ۔ بہت ہی بڑی ۔ کبھی کبھی ان کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں ۔ کبھی کبھی ذہن

انسانی پر ایک ایسا اشراق اور ایک ایسی روشنی ڈالی جاتی ہے اور اس کے اندر ایک ایسی چمک پیدا ہوتی ہے کہ انسان پر عالم غیب دور تک کھل جاتا ہے لیکن یہ لمحات کم ہوتے ہیں۔

پھر جنس انسان کے وہ اسرار و رموز جو اس کے قواعد تناسل کے سلسلے کے اندر پائے جاتے ہیں۔ایک نہایت ہی چھوٹا خلیہ جس کے اندر جنس انسانی کے تمام خصائص موجود ہوتے ہیں اور اس کے اندر ماں اور باپ اور دونوں اطراف کے قریبی اجزاء کے خصائص بھی موجود ہوتے ہیں۔یہ تمام خصائص اس نہایت ہی چھوٹے سے خلیے کے اندر کہاں اور کس طرح رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور کس طرح یہ ہر خلیہ ان تمام خصائص کے ساتھ خود کار انداز میں اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کرتا ہے کہ اس کے اندر جنس انسانی کے تمام خصائص موجود ہوتے ہیں اور یہ پوری طرح جنس انسانی کا اعادہ ایک دوسرے فرد کی شکل میں کرتا ہے؟!!

وہ لمحات جن میں ایک بچہ اس زمین پر زندگی شروع کرتا ہے' ماں سے جدا ہوتا ہے اور اپنے نفس پر اعتماد کرکے زندگی بسر کرنا شروع کرتا ہے اور اس کے قلب اور پھیپھڑوں کو حرکت کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ان لمحات پر قدرے غور کرنے ہی سے انسان حیران کیا دہشت زدہ ہو جاتا ہے اور عقل دنگ رہ جاتی ہے۔نفس انسانی حیرت و استعجاب سے بھی بھر جاتا ہے اور پھر ایمان بھی بھر جاتا ہے۔یہ ایک ایسا منظر ہے کہ انسان کے دل و دماغ حیرت کے باعث کام چھوڑ دیتے ہیں۔ انسان ششدر رہ جاتا ہے۔

پھر وہ وقت بھی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے کہ بچہ ٹوٹی پھوٹی زبان میں باتیں شروع کرتا ہے پھر کلمات و عبارات بناتا ہے بلکہ صرف گفتگو پر غور کیجئے۔اس زبان سے ٹکڑے آوازیں نکالنا اور پھر گلے سے آوازیں یہ بھی ایک عجوبہ ہے۔اس چیز کا انوکھا پن ہمیں اس لئے نظر نہیں آتا کہ یہ ہر وقت یہ باتیں کرتے ہی رہتے ہیں لیکن اگر انسان ایک لحظہ اس پر غور کرے تو محض انسان کی یہ قدرت کہ وہ اظہار مافی الضمیر کرتا ہے۔یہی ایک عجوبہ ہے اور قدرت الٰہیہ پر ایک بدیہی اور ایک کافی دلیل ہے۔

غرض انسان کی زندگی کا کوئی جزوی واقعہ بھی ایک معجزہ ہے اور انسان اس سے متعجب ہو سکتا ہے اور یہی مراد ہے درج ذیل فقرے سے۔

وَفِیٓ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ (۵۱ : ۲۱) "اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی کیا تمہیں سوجھتا نہیں" جنس انسان کا ایک ایک فرد بھی ایک جہاں ہے۔ہر فرد ایک آئینہ ہے جس میں یہ تمام عالم نظر آتا ہے اور ہر فرد کے وجود میں گویا اس پوری دنیا کا ظہور بار بار ہوتا ہے۔ہر شخص اپنے ابنائے جنس میں اپنی شکل اپنے خد و خال' اپنی عقل' اپنے علم' اپنے مدرکات' اپنی روح اور اپنے شعور کے اعتبار سے بالکل جدا ہے۔ہر شخص کے ذہن میں اس کائنات کا جو تصور ہے وہ دوسرے افراد سے مختلف ہے۔اب دیکھئے کہ اس خدائی نمائش گاہ میں لاکھوں افراد ہیں اور ہر فرد ایک علیحدہ نمونہ ہے اور ہر فرد کا مزاج بالکل الگ ہے اور ویسا شخص دوبارہ پیدا نہیں ہوتا۔اس شخص کے اندر یہ پوری کائنات گزر جاتی ہے اور اس کی صورت کی نقل نہیں کی جاسکتی۔یہاں تک کہ انگلیوں کی لکیریں بھی دنیا میں ہر شخص کی جدا ہوتی ہیں اور انہیں دہرایا نہیں جاسکتا۔گزرے ہوئے زمانوں میں بھی جو لوگ گزرے ہیں ان میں سے بھی کسی شخص کی انگلیوں کی

لیکن دہرائی نہیں جا سکتیں۔

جنس انسانی کے عجائبات میں سے بہت سے عجائبات ایسے ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ہماری آنکھیں ان کو دیکھ رہی ہیں۔

وَفِىٓ أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (۵۱ : ۲۱) "اور تمہارے اپنے وجود میں بھی کیا تم دیکھتے نہیں"

اور انسانی آنکھیں جن عجائبات کو بھی دیکھیں یہ عالم غیب کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہم نشانات ہیں ایک بنانے والے خالق کے۔

نفس انسانی کے اندر جو عجائبات اور معجزات ہیں ان کو ایک کتاب میں قلم بند نہیں کیا جا سکتا۔ آج تک جو عجائبات ہمیں معلوم ہو چکے ہیں اور جن کا انکشاف ہو گیا ہے ان کے لئے بھی کئی جلدیں درکار ہیں اور اس سلسلے میں جو مجہول ہیں' ماضی کے تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت زیادہ ہیں۔ قرآن کریم نے ان کو گنوایا نہیں ہے۔ ہاں قرآن کریم نے دل و دماغ کو جھنجوڑا ضرور ہے کہ جاگو اور غور و فکر کرو' احساس کرو اور اللہ کے اس عجائب گھر میں آنکھیں کھول کر چلو' غور و فکر کرو اور اس کائنات سے بھی پہلے اپنے نفس میں غور و فکر کرو' تم جس طرح آفاق سے غافل ہو اس طرح اپنی ذات سے بھی غافل ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے خوشگوار لمحات وہی ہوتے ہیں جن میں انسان اپنی تخلیق اپنی خصوصیات اپنے خد و خال اپنی حرکات اور اپنی عادات پر غور کرے اور ایک عابد بندے کی طرح اللہ کے اس عجائب گھر کی سیر کرے اور دیکھے کہ اللہ کس قدر برکت والا ہے لیکن انسان ہے کہ ایک طویل عمر اس عجائب گھر میں گزار رہا ہے اور بغیر احساس کے گزار رہا ہے۔

اس طرح احساس عطا کر کے قرآن مجید انسان کو بالکل ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ ایک جدید شعور' ایک جدید سوچ' ایک جدید زندگی اور یہ شعور پسندیدہ متاع حیات ہے کہ اس دنیا کی کوئی بھی نعمت اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

تامل اور ادراک کے اس اسلوب کے ساتھ قرآن انسان کی تربیت کرتا ہے لیکن اس تربیت کا بنیادی نکتہ ایمانی ہے۔ اگر ایمان نہ ہو تو قرآن جو کچھ انسان کو دینا چاہتا ہے وہ اسے اخذ نہیں کر سکتا۔ ایمان ہی انسان کو اس متاع حیات کے لائق بناتا ہے۔ یہ نہایت ہی اونچا اور برتر اور عالم بالا کا متاع حیات ہے۔ انسان کے پاؤں زمین پر ہوتے ہیں اور اس کا شعور عالم بالا میں ہوتا ہے۔

پہلے انسان کو اس کائنات کی جھلک دکھائی گئی' پھر اسے اس کے نفس کے عجائبات کی ایک جھلک دکھائی گئی' اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ انسان کا رزق اس کی تقسیم اور اس کا حصہ رسدی بھی آسمانوں سے تقسیم ہوتا ہے اور تمہاری آخری منزل بھی آسمانوں ہی میں ہے۔

وَفِى ٱلسَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (۵۱ : ۲۲) "آسمان ہی میں ہے تمہارا رزق بھی اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔" بظاہر یہ ایک عجیب ہدایت اور توجہ مبذول کرنے کا ایک اشارہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اسباب رزق زمین میں ہیں انسان ان اسباب کے اندر جدوجہد کرتا اور اس سعی اور جہد کے نتیجے میں بھی رزق کا انتظام کرتا ہے لیکن قرآن انسان کی نظروں کو آسمانوں کی طرف پھیرتا ہے۔ عالم ظاہر سے عالم غیب کی طرف لے جاتا ہے تاکہ

وہ وہاں سے اپنے نصیبہ رزق کی امید کرے ۔ رہی یہ بات کہ زمین اور اس کے اندر اسباب رکھے گئے تو یہ تو یقین کرنے والوں کے لئے آیات ہیں ۔ ان آیات و نشانات کو دیکھ کر انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تاکہ اللہ سے بہتر رزق کا امیدوار ہو اور زمین کے بوجھ اور زمین کی پستیوں سے وہ آزاد ہو ۔ اس طرح رزق کے اسباب ظاہرہ سے بھی آزاد ہو ۔ یہ نہ ہو کہ یہ ظاہری اسباب انسان اور خالق الاسباب کے درمیان حائل ہو جائیں اور وہ ان ظاہری اسباب ہی کے اندر گم ہو جائے ۔

دل مومن اس ہدایت کو ایک حقیقت کے طور پر لیتا ہے ۔ اسے سمجھتا بھی ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ اس ہدایت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ زمین اور زمین کے اسباب سے صرف نظر کر دیا جائے ۔ اس لئے کہ انسان زمین کے اسباب کو کام میں لانے اور یہاں زمین کے اوپر فریضہ خلافت الٰہیہ کے تقاضے پورے کرنے کا مکلف ہے ۔ مقصد یہ ہے کہ وہ دل کو اسباب ارض کے ساتھ نہ باندھ دے اور اس زمین کی تعمیر اور ترقی میں مصروف ہو کر خدا کو نہ بھلا دے بلکہ اس کا رویہ یہ ہو کہ وہ زمین میں کام کر رہا ہو اور اس کی نظریں آسمانوں پر ہوں ۔ وہ اسباب کو کام میں لائے مگر یقین یہ کرے کہ وہ اسباب اس کے فرائض نہیں ہیں بلکہ رازق آسمانوں میں ہے اور یہ اللہ کا وعدہ ہے اور ہوتا وہی ہے جو اللہ نے فرمایا ۔

یوں ایک مومن کا دل ان اسباب کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے جو زمین میں ہیں بلکہ وہ ان اسباب کے ذریعے ہی آسمانوں کی بادشاہت تک پہنچتا ہے ۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ ان اسباب کے اندر بھی عجائبات ہیں جو خالق اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں تو وہ انہی کے ذریعہ خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے ۔ اگرچہ اس کے پاؤں زمین پر انہی اسباب کے اندر ہوتے ہیں لیکن اس کی نظریں آسمان پر ہوتی ہیں ۔ یہی طریقہ ہے جو اللہ نے انسان کے لئے پسند کیا ہے اور یہی طریقہ اللہ نے اپنے ان بندوں کے لئے تجویز کیا ہے جن کو اس نے مٹی سے پیدا کیا ۔ ان میں اپنی روح پھونکی اور انہیں اس جہاں کی تمام مخلوقات پر فضیلت دے دی ۔

ایمان ایک وسیلہ اور سبب ہے اس بات کا کہ انسان بہترین حالات زندگی میں ہو جب انسان ایمان کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ اس حالت میں ہوتا ہے جس میں اسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ۔ یہ اللہ کی اس فطرت پر ہوتا ہے جس پر اللہ نے اسے پیدا کیا ہے ۔ انسان پر حالت فساد اور حالت گمراہی بعد میں طاری ہوتی ہے ۔

ان تین جھلکیوں کی طرف متوجہ کرنے کے بعد یعنی زمین کی نشانیوں نفس کی نشانیوں اور آسمانوں کی نشانیوں کی طرف متوجہ کرنے کے بعد اللہ اپنی ذات کی قسم اٹھا کر یقین دلاتا ہے کہ یہ باتیں اسی طرح سچ ہیں جس طرح تمہاری باتیں ۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ (۵۱ : ۲۳) "پس قسم ہے آسمان اور زمین کے مالک کی 'یہ بات حق ہے' ایسی ہی یقینی جیسے تم بول رہے ہو ۔" یہ بات کہ وہ بیٹھے ہوئے مصروف گفتگو ہیں 'ایک حقیقت ہے ۔ اس میں شک نہیں ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے نہ اس میں کوئی کلام ہے ۔ اسی طرح یہ کلام ایک یقینی کلام ہے اور اللہ سب سے زیادہ سچائی والا ہے ۔

اصمعی نے ایک عجیب بات نقل کی ہے اور علامہ زمخشری نے کشاف میں اسے نقل کیا ہے ۔ روایت کی صحت کے بارے میں تحفظ رکھتے ہوئے ہم اسے یہاں اس لئے نقل کرتے ہیں کہ بات بڑی عجب ہے ۔ کہتے ہیں "میں بصرہ کی جامع مسجد سے واپس آ رہا تھا کہ ایک دیہاتی اپنے سواری کے اونٹ پر نمودار ہوا ۔ اس نے کہا" تمہارا تعلق کس قبیلے سے

ہے۔" میں نے کہا "بنی اصمع سے" اس نے کہا "تم کہاں سے آئے ہو" میں نے کہا "ایک ایسی جگہ سے جس میں رحمان کا کلام پڑھا جاتا ہے۔" اس نے کہا تو مجھ پر پڑھئے! تو میں نے پڑھا۔

و الذاریات . . . . جب میں یہاں تک پہنچا۔

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (۵۱ : ۲۲) "آسمانوں ہی میں ہے تمہارا رزق بھی اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے۔" اس نے کہا بس یہ کافی ہے۔ وہ کھڑا ہوا اور اپنے اونٹ کو ذبح کر دیا اور راستے پر جو آتا جاتا ان پر تقسیم کرتا جاتا۔ اس نے اپنی تلوار اور تیر کو زمین پر دے مارا اور توڑ دیا اور چلا گیا۔ جب میں ہارون الرشید کے ساتھ صبح کے وقت طواف کرنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی شخص میرے ساتھ نرم آواز سے گفتگو کر رہا ہے۔ میں نے اسے پہچان لیا کہ یہ تو وہی اعرابی ہے۔ یہ دبلا پتلا اور زرد رنگ کا ہے۔ تو اس نے سلام کیا جب میں اس جگہ تک پہنچا۔

وَمَا تُوعَدُونَ (۵۱ : ۲۲) تک تو اس نے پکار کر کہا۔ حقیقت ہے کہ ہمارے رب نے ہمارے ساتھ جو وعدہ کیا تھا میں نے اسے پا لیا ہے۔ پھر اس نے کہا کہ اس کے سوا اور بھی کوئی بات ہے تو میں نے پڑھا۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ (۵۱ : ۲۳) "پس قسم ہے آسمان اور زمین کے مالک کی یہ بات حق ہے" اس شخص نے آواز بلند کیا اور کہا یا سبحان اللہ! کون تھا جس نے رب ذوالجلال کو اس قدر غصہ دلایا کہ اسے حلف اٹھایا؟ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بات کی تصدیق نہ کی۔ یہاں تک کہ رب کو قسم اٹھانے پر مجبور کیا۔ یہ بات اس نے تین بار کہی اور اس کی روح پرواز کر گئی۔" یہ ایک عجیب کہانی ہے۔ صحیح ہوگی یا نہ ہوگی لیکن ہم نے اسے یہاں اس لئے نقل کیا ہے کہ رب ذوالجلال کی قسم کی وجہ سے اس بات کی اہمیت اور زیادہ ہوتی ہے جس پر قسم اٹھائی گئی جبکہ بغیر حلف اور قسم کے بھی وہ عظیم حقیقت ہے۔

---ooo---

یہ تو تھا اس سورۃ کا پہلا حصہ، دوسرے حصے میں حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت موسیٰ، عاد قوم ہود، ثمود قوم صالح اور حضرت نوح علیہم السلام کے قصص کی طرف مختصر اشارات ہیں۔ یہ حصہ بھی ماقبل اور مابعد سے مربوط ہے۔

هَلْ أَتٰكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرٰهِيمَ الْمُكْرَمِينَ ۝ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلٰمًا ۖ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُونَ ۝ فَرَاغَ إِلٰٓى أَهْلِهِ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ ۝ فَقَرَّبَهٗٓ إِلَيْهِمْ قَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ۝ فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۖ قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ وَبَشَّرُوهُ بِغُلٰمٍ عَلِيمٍ ۝ فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهٗ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ

عَقِیْمٌ ۝ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِیْمُ الْعَلِیْمُ ۝

”اے نبیؐ، ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تمہیں پہنچی ہے؟ جب وہ اس کے ہاں آئے تو کہا آپ کو سلام ہے۔ اس نے کہا ”آپ لوگوں کو بھی سلام ہے.... کچھ ناآشنا سے لوگ ہیں۔“ پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا اور ایک ”بھنا ہوا“ موٹا تازہ بچھڑا لاکر مہمانوں کے آگے پیش کیا۔ اس نے کہا آپ حضرات کھاتے نہیں؟ پھر وہ اپنے دل میں ان سے ڈرا۔ انہوں نے کہا ڈریئے نہیں اور اسے ایک ذی علم لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا۔ یہ سن کر اس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی 'بوڑھی' بانجھ' انہوں نے کہا ”یہی کچھ فرمایا ہے تیرے رب نے۔ وہ حکیم ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔“

اس دوسرے حصے میں بھی نبیوں کی تاریخ سے آیات الہیہ کا ذکر ہے جس طرح پہلے حصے میں آیات تکوینی اور آیات وانفس کا ذکر ہوا تھا اور یہ بھی اللہ کے سچے وعدے تھے اور انہوں نے حقیقت کا روپ اختیار کیا جس طرح پہلے حصے میں اللہ کے سچے وعدے کا ذکر تھا۔

بات کا آغاز حضرت ابراہیم کے مہمانوں کے بارے میں ایک سوال سے ہوتا ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ ضَیْفِ اِبْرٰهِیْمَ الْمُكْرَمِیْنَ (۵۱ : ۲۴) ”اے نبی کیا ابراہیم .... کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تمہیں پہنچی ہے؟“ اس سوال میں اس بات کی طرف اشارہ ہے یا ذہنوں کو اس حکایت کے لئے تیار اور متوجہ کرتا ہے اور مہمانوں کے لئے ”مکرمین“ کا لفظ استعمال ہوا ہے یا تو وہ اللہ کے نزدیک مکرم اور معزز تھے یا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ حضرت ابراہیم ؑ کے معزز مہمان تھے اور انہوں نے ان کی تکریم کی۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ کس قدر کریم اور سخی تھے اور کس طرح مہمان نوازی پر مال لٹاتے تھے۔ ادھر سے مہمان آتے ہیں ان کو سلام کرتے ہیں اور وہ بھی سلام کرتے ہیں۔ آپ ان مہمانوں کو پہچانتے نہیں اور علیک سلیک کے بعد اہلیہ کو جاکر کھانا تیار کرنے کا حکم دیتے ہیں اور یہ کھانا بھی آناً فاناً تیار ہوتا ہے اور جلدی ایک وافر مقدار میں ایک بھنا ہوا بچھڑا مہمانوں کے سامنے حاضر ہے جو دسیوں آدمیوں کے لئے کافی ہے۔

فَرَاغَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ (۵۱ : ۲۶) فَقَرَّبَهٗۤ اِلَیْهِمْ (۵۱ : ۲۷) ”پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا اور ایک بھنا ہوا موٹا تازہ بچھڑا مہمانوں کے آگے پیش کیا۔“ حالانکہ روایات کے مطابق ان کی تعداد تین تھی۔ ان کے لئے تو ایک بازو ہی کافی تھا۔

قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ (۵۱ : ۲۷) ”اس نے کہا آپ حضرات کھاتے نہیں؟“ یہ سوال انہوں نے تب کیا جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے اور نہ کوئی ایسے آثار ہیں کہ وہ کھانا کھائیں گے۔

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً (۵۱ : ۲۸) ”پھر وہ دل میں ان سے ڈرا“ یا تو اس لئے کہ آنے والا اجنبی اگر

کھانا نہیں کھاتا تو اس کی نیت خراب ہے ۔ وہ کوئی شر یا خیانت کرنے کی نیت سے آیا ہے یا یہ کہ حضرت ابراہیم نے ان فرشتوں کے اندر کوئی عجیب علامات دیکھ لیں ۔ جب انہوں ان ے ان کے چہرے پر خوف کے آثار دیکھے تو انہوں نے اپنا تعارف کرا لیا ۔ ان کو اطمینان دلایا اور آپ کو ایک بیٹے کی بشارت دی ۔

قَالُوْا لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (۵۱ : ۲۸) ''انہوں نے کہا ڈرو نہیں اور اسے ایک ذی علم لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا ۔'' یہ بشارت حضرت اسحاق کے بارے میں تھی جو ان کی بانجھ بیوی سے پیدا ہوئے تھے ۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ (۵۱ : ۲۹) ''یہ سن کر ان کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی بوڑھی بانجھ'' اس نے یہ خوشخبری سن لی تھی ۔ اچانک یہ خوشخبری ! اس کی تو چیخ نکل گئی اور عورتوں کی عادت کے مطابق اس نے اپنا چہرہ پیٹ لیا اور یہ کہہ دیا میں بوڑھی ہوں بانجھ ہوں تو یہ سب امور اس کے لئے خوشگوار حیرت کے باعث ہوئے اور درحقیقت وہ بانجھ تھی اور یہ خبر اس کے لئے اچانک خوشی کی خبر تھی جس کی وہ کسی طرح توقع نہ کرتی تھی لیکن وہ یہ بات بھول گئی کہ یہ خوشخبری تو فرشتے دے رہے ہیں تو فرشتوں نے اسے متوجہ کیا کہ یہ تو قدرت الٰہیہ ہے اور اس جہاں میں تمام امور علم الٰہی کے مطابق رونما ہوتے ہیں ۔

قَالُوْا كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ (۵۱ : ۳۰) ''انہوں نے کہا'' یہی کچھ فرمایا ہے تیرے رب نے وہ حکیم ہے اور سب کچھ جانتا ہے ۔'' یعنی اللہ جس چیز کو کہہ دے کہ ہو جا تو ہو جاتی ہے اور اللہ نے ایسا کہہ دیا ہے تو اس کے بعد اب شک کی گنجائش کیا ہے ۔ کسی کام کا عادی ہونا اور اس کام کا آنکھوں کے سامنے ہوتے رہنا ایسی باتیں ہیں جو انسانی ادراک کو بیڑیاں پہنا دیتا ہے اور اشیاء کے بارے میں انسان کا تصور محدود ہو جاتا ہے ۔ پھر جب انسان اس عادی اور روٹین کے طریق کار سے کوئی مختلف بات دیکھتا ہے تو وہ ششدر رہ جاتا ہے اور وہ تعجب کرتا ہے کہ یہ کیسے ہوگیا ۔ بعض اوقات پھر وہ کبر کرتے ہوئے اس کا انکار کر دیتا ہے لیکن اللہ کی مشیت تو اپنی راہ لیتی ہے ۔ وہ لوگوں کی مالوفات کی پابند نہیں ہے ۔ انسان کا دائرہ ادراک اور اس کا دائرہ امور عادیہ بہت محدود ہے جبکہ اللہ کی قدرتیں بہت ممدود (پھیلی ہوئی) ہیں ۔

---ооо---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ۔۔ ۲۷

سورۃ الذّٰریٰت ۔ ۵۱	آیات ۳۱ ۔۔ تا ۔۔ ۶۰
سورۃ الطّور ۔ ۵۲	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۴۹
سورۃ النجم ۔ ۵۳	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۶۲
سورۃ القمر ۔ ۵۴	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵۵
سورۃ الرحمٰن ۔ ۵۵	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۷
سورۃ الواقعۃ ۔ ۵۶	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۹۶
سورۃ الحدید ۔ ۵۷	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۲۹

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۳۱﴾ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُجْرِمِينَ ﴿۳۲﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ طِينٍ ﴿۳۳﴾ مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ ﴿۳۴﴾ فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿۳۷﴾

”ابراہیم نے کہا ”اے فرستادگان الٰہی کیا مہم آپ کو درپیش ہے؟“ انہوں نے کہا ”ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسا دیں جو آپ کے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لئے نشان زدہ ہیں ۔“ پھر ہم نے ان سب لوگوں کو نکال لیا جو اس بستی میں مومن تھے اور وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا ۔ اس کے بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی ان لوگوں کے لئے چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہوں“ ۔

جب حضرت ابراہیم نے اپنے مہمانوں کی حقیقت معلوم کرلی تو وہ پوچھنے لگے کہ ان کا مشن کیا ہے ۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ (۵۱ : ۳۱) ”انہوں نے کہا اے فرستادگان الٰہی آپ کو کیا مہم درپیش ہے ۔“ تو انہوں نے جواب دیا ۔

قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُجْرِمِينَ (۵۱ : ۳۲) ”ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں“ یہ قوم لوط کے لوگ تھے جیسا کہ دوسری سورتوں میں تصریح ہے ۔

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ طِينٍ (۵۱ : ۳۳) مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ

(۵۱ : ۳۴) ”تاکہ اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسا دیں جو آپ کے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لئے نشان زدہ ہیں ۔“ یہ مٹیالے پتھر تیار شدہ اور نشان زدہ تھے اور اللہ نے ان کو مسرفین کے لئے تیار کیا تھا اور یہ مسرف قوم لوط کے لوگ تھے جنہوں نے حدود سے تجاوز کرلیا تھا ۔ وہ فطرت کی راہ سے تجاوز کرکے غیرفطری عمل کرتے تھے ۔ جو حق اور دین کے خلاف راستہ تھا ۔ ان پتھروں کے بارے میں کوئی بات اس سے مانع نہیں ہے کہ وہ آتش فشانی کے عمل کے نتیجے میں برسنے والے پتھر ہوں کیونکہ گرم لاوا جب ہوا میں اڑتا ہے تو وہ پتھر بن جاتا ہے اور یہ رب تعالیٰ کی طرف سے مسلط ہوتا ہے اور اس کے قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے مطابق کام کرتا ہے اور اسی شخص پر جاکر پڑتا ہے جس کے بارے میں حکم الٰہی ہو اور ہر پتھر کے لئے اللہ نے اپنے علم سے زمان و مکان مقرر کردیا ہے کہ اس نے اسی جگہ فلاں کو کرلینا ہے اور ہر پتھر کو فرشتوں کے ذریعہ اللہ نے پھینکنا طے کردیا ہے پھر ہمیں فرشتوں کی حقیقت کا بھی تو پوری طرح علم

نہیں ہے اور یہ بھی ہمیں معلوم نہیں کہ اس کائنات کے ساتھ فرشتوں کا تعلق کیا ہے پھر جن قوتوں کو ہم جانتے ہیں اور جن کے انکشافات ہمارے سامنے ہوتے رہتے ہیں اور ہم ان قوتوں کے اپنی جانب سے نام رکھتے رہتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے؟ ہماری کیا مجال ہے کہ ہم اللہ کی اس اطلاع پر اعتراض کریں کہ اس نے اپنی بعض قوتوں کو بعض مسرفین پر مسلط کر دیا اور کسی خاص جگہ ایسا کر دیا۔ ہمیں بہرحال اللہ تعالیٰ کی اس اطلاع پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کائنات کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی محدود ہیں اور مفروضوں پر مبنی ہیں بلکہ وہ نظریات ہیں اور بالکل ان چیزوں کی سطحی تاویلات ہیں۔ ابھی تک بہت کم معلومات ہیں جو حقائق بن سکے ہیں۔ غرض یہ آتش فشانی کے عمل میں پتھر ہوں یا اور پتھر ہوں۔ بہرحال وہ دست قدرت کا کرشمہ تھے۔ ان کی تخلیق کا عمل تھے اور وہ کیسے تھے یہ بھی ایک غیب ہے۔

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۱:۳۵) "پھر ہم نے ان سب لوگوں کو نکال لیا جو اس بستی میں مومن تھے" تاکہ وہ نجات پالیں، ان کے لئے یہ اللہ کی حمایت تھی۔

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۵۱:۳۶) اور وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا" یہ نبی زمان حضرت لوط کا گھر تھا جیسا کہ دوسری جگہ تفصیلات آتی ہیں۔ ماسوائے اہلیہ لوط علیہ السلام باقی لوگ نجات پاگئے۔

وَتَرَكْنَا فِيْهَا اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (۵۱:۳۷) "اس کے بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی ان لوگوں کے لئے چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے تھے" جو لوگ عذاب سے ڈرتے ہیں وہی نشانیاں بھی دیکھ سکتے ہیں اور ان کو سمجھ سکتے ہیں اور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ رہے دوسرے لوگ تو وہ اندھے ہوتے ہیں۔ ان کو اس پوری کائنات میں اللہ کی نشانیاں نظر نہیں آتیں نہ زمین میں نہ ان کے نفوس میں اور نہ تاریخ میں۔

اب دوسری نشانی قصہ حضرت موسیٰ میں۔ اس قصے کی طرف بھی ایک سرسری اشارہ ہے کیونکہ یہاں انبیاء کی تاریخ سے نشانات راہ گنوا کر بتاتے ہیں۔

وَفِيْ مُوْسٰىٓ اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ
وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ
مُلِيْمٌ ﴿۴۰﴾ وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ
عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾ وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾
فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوْا
مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا

۴

۲۳ ع فٰسِقِیْنَ ۝

۱

"اور تمہارے لئے نشانی ہے موسیٰ کے قصے میں جب ہم نے اسے صریح سند کے ساتھ فرعون کے پاس بھیجا تو وہ اپنے بل بوتے پر اکڑ گیا اور بولا یہ جادوگر ہے یا مجنون ہے۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور سب کو سمندر میں پھینک دیا اور وہ ملامت زدہ ہو کر رہ گیا۔ اور (تمہارے لئے نشانی ہے) عاد میں' جبکہ ہم نے ان پر ایک ایسی بے خیر ہوا بھیج دی کہ جس چیز پر بھی وہ گزر گئی اسے بوسیدہ کرکے رکھ دیا۔ اور (تمہارے لئے نشانی ہے) ثمود میں جب ان سے کہا گیا تھا کہ ایک خاص وقت تک مزے کرلو مگر اس تنبیہ پر بھی انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی۔ آخر کار ان کے دیکھتے دیکھتے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب نے ان کو آلیا۔ پھر نہ ان میں اٹھنے کی سکت تھی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کر سکتے تھے۔ اور ان سب سے پہلے ہم نے نوح کی قوم کو ہلاک کیا کیونکہ وہ فاسق لوگ تھے"۔

وہ صریح دلیل اور سند جس کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا' وہ صریح اور قاطع دلیل تھی اور وہ عظیم الشان رعب تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت میں تھا اور موسیٰ اور ہارون کے ساتھ ذات باری تھی جو سنتی تھی اور دیکھتی تھی لیکن فرعون غرور کرکے منہ پھیر گیا اور اس نے واضح سچائی دیکھتے ہوئے بھی اور قاطع دلیل دیکھتے ہوئے بھی پہلوتہی سے کام لیا۔ اس نے حضرت موسیٰ خدا کے نبی کو کہا کہ وہ ساحر اور مجنون ہے حالانکہ انہوں نے اس کو ایسے معجزات دکھا دیئے تھے جن کے سامنے وہ لوگ لاجواب ہوگئے تھے۔ اس طرز عمل سے معلوم ہو گیا کہ جب کوئی ہدایت کے لئے تیار نہ ہو تو اسے بڑے سے بڑا معجزہ بھی ہدایت پر لانے کے لئے کارگر نہیں ہو سکتا اور نہ کسی ایسی زبان کو خاموش کرایا جاسکتا ہے جو باطل پر مصر ہو۔

یہاں سیاق کلام میں اس قصے کی تفصیلات نہیں دی جاتیں بلکہ یہاں اس کا فقط انجام دے دیا جاتا ہے جو اس قصے سے بطور نشانی اور تاریخی سبق ہمیشہ کے لئے باقی ہے۔

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ وَهُوَ مُلِیْمٌ (۵۱ : ۴۰) "آخر کار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور سب کو سمندر میں پھینک دیا اور وہ ملامت زدہ ہو کر رہ گیا" یعنی اس نے جو سرکشی کی اور حق کو جھٹلایا اس کی وجہ سے وہ ملامت کا مستحق ہو کر رہ گیا۔

انداز تعبیر میں واضح طور پر یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کو اور اس کے لشکروں کو براہ راست اللہ نے پکڑا اور دریا میں پھینک دیا۔ یہ پہلو اس لئے اجاگر کیا گیا کہ حضرت موسیٰ کے قصے میں نشانی کا پہلو ظاہر ہو جائے کیونکہ یہاں آفاق و انفس اور تاریخ سے اللہ کی نشانیوں کو گنوایا جارہا ہے۔ تاریخ سے رسولوں کے قصص دراصل نشانات راہ ہیں۔

---ooo---

اور پھر ایک دوسری تاریخی نشانی قوم عاد پر ایک نظر

وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ (۴۱) مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِیْمِ (۵۱ : ۴۲) "اور (تمہارے لئے نشانی ہے) عاد میں' جبکہ ہم نے ان پر ایک ایسی بے خیر ہوا بھیج دی کہ

جس چیز پر بھی وہ گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا"۔

اور قوم عاد پر جو ہوا بھیجی گئی اسے یہاں عقیم (بانجھ) کہا گیا ہے۔یہ اس لئے کہ اس ہوا میں نہ پانی تھا نہ خیر کی کوئی چیز جو سبب حیات ہو جیسا کہ اس ہوا سے قوم عاد توقع کرتی تھی۔اس کے برعکس اس میں تباہی اور ہلاکت ہی تھی۔یہ ہوا جس چیز کو بھی لگتی اسے مردہ کر دیتی تھی۔اس طرح جس طرح کوئی مردہ بوسیدہ ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ہوا ان کائناتی قوتوں میں سے ایک قوت ہے اور یہ اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے اور اللہ کے لشکروں کو اللہ ہی جانتا ہے۔ ان لشکروں کو اللہ اپنی مشیت اور ناموس کے دائرے کے اندر بھیجتا ہے اور ان لشکروں کے کام کا انداز مختلف ہوتا ہے۔یہ لشکر جس پر جاتے ہیں اللہ کے ارادے سے اس کے مقرر وقت پر جاتے ہیں کسی کو ہلاک و تباہ کر دیتے ہیں اور کسی کو زندہ و تابندہ کر دیتے ہیں لہٰذا ایسے مقامات پر کسی کو ان سطحی اور سادہ اعتراضات کا کوئی حق نہیں ہے کہ ہوا تو کائناتی نظام کے مطابق چلتی ہے اور یہ ادھر اور ادھر طبیعاتی عوامل و اسباب کے مطابق چلتی ہے ہم کہتے ہیں کہ یہ طبعی نظام اور کائناتی عوامل بھی خالق ہی چلاتا ہے وہ اپنی تدبیر اور تقدیر کے ساتھ کسی کو تباہ اور کسی کو زندہ کر دیتا ہے۔یہ عوامل اس نے پیدا کئے اور اسباب اسی کے ہیں اور طبیعاتی اصول اسی نے وضع کئے ہیں اور انہی کے ساتھ وہ ان عوامل کو کسی پر مسلط کرتا ہے 'اگر کوئی خالق کائنات کو مانتا ہے تو پھر ایسے اعتراضات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

---ooo---

اور تیسری نشانی قوم ثمود کی

وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ (٤٣) فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (٤٤) فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّ مَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ (٤٥) (٥١: ٤١ تا ٤٥) "اور (تمہارے لئے نشانی ہے) ثمود میں جب ان سے کہا گیا تھا کہ ایک خاص وقت تک مزے کر لو مگر اس تنبیہ پر بھی انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی۔آخر کار ان کے دیکھتے دیکھتے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب نے ان کو آلیا۔پھر نہ ان میں اٹھنے کی سکت تھی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کر سکتے تھے"۔

اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ (٥١: ٤٣) "ایک خاص وقت تک مزے کر لو" سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کو تین دنوں کی مہلت دی گئی تھی یعنی قتل ناقہ کے بعد جیسا کہ دوسری جگہ ہے۔

قَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ پھر صالح نے ان کو خبردار کر دیا کہ بس اب تین دن اپنے گھروں میں اور رہ لو" اور اس سے مراد وہ وقت بھی ہو سکتا ہے یعنی رسالت کرنے سے قتل ناقہ تک کا وقت جبکہ انہوں نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہوئے ناقہ کو قتل کر دیا اور ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو گیا۔

قوم لوط پر پتھروں کی بارش ہوئی ان کے بارے میں ہم نے جو کچھ کہا ہے وہی بات اس ہوا کے بارے میں بھی ہے جو قوم عاد پر بھیجی گئی اور وہی بات اس چیخ کے بارے میں بھی ہے جو قوم ثمود پر آئی۔یہ تمام کائناتی قوتیں ہیں جو اللہ کی تدبیر

سے کنٹرول ہوتی ہیں ۔ یہ اللہ کی مشیت اور اس کے قوانین کے مطابق چلتی ہیں اور اپنے قوانین کے دائرے کے اندر اللہ جس قوم پر چاہتا ہے ان کو بطور عذاب مسلط کر دیتا ہے ۔ لہٰذا یہ قوتیں وہی کام کرتی ہیں جو اللہ ان کے حوالے کرتا ہے اور اللہ کے لشکر لاتعداد اور بے مثال ہیں ۔

وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ (٥١ : ٤٦) "اور ان سب سے پہلے ہم نے نوح کی قوم کو ہلاک کیا کیونکہ وہ فاسق لوگ تھے"۔

یہ قصہ نوح کی طرف نہایت ہی سرسری اشارہ ہے ۔ بغیر تفصیلات کے اور بغیر اضافوں کے کہ ذرا قوم نوح کو بھی یاد کرلو' جہاں قوم نوح کے قصے میں (فی نوح) کی بجائے (قوم نوح) کے الفاظ آئے ہیں اصل عبارت یوں ہے ۔

اُذْكُرْ قَوْمَ نُوحٍ کہ قوم نوح کا تذکرہ بھی کردے اور اس کے بعد آیات کا آغاز ہوتا ہے ۔

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا کو اس پر عطف کیا گیا ہے تو قوم نوح کی نشانی ایک تاریخی نشانی ہے اور آسمان کی نشانی تکوینی نشانی ہے ۔ یہاں دونوں کو باہم حرف عطف کے ذریعے مربوط کر دیا گیا اور ان دونوں کے ذریعے اس پیراگراف کو اس سورۃ کے تیسرے پیراگراف سے مربوط کر دیا گیا۔

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ ۝ وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ
الْمَاهِدُونَ ۝ وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ فَفِرُّوا إِلَى
اللَّهِ ۖ إِنِّي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ ۖ إِنِّي لَكُم
مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ كَذَٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا
سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ۝ أَتَوَاصَوْا بِهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ۝ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا
أَنتَ بِمَلُومٍ ۝ وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ
الْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ ۝
إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ۝ فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذَنُوبًا مِّثْلَ
ذَنُوبِ أَصْحَابِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُونِ ۝ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن ۳
يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ۝ ۱۴ع
۲

"آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی وسعت رکھتے ہیں ۔ زمین کو ہم نے بچھایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں ۔ شاید کہ تم اس سے سبق لو ۔ پس دوڑو اللہ کی طرف میں تمہارے لئے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں ۔ اور نہ بناؤ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود ' میں تمہارے لئے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والوں ہوں ۔ یونہی ہوتا رہا ہے ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ۔ کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے ؟ نہیں بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں ۔ پس اے نبی' ان سے رخ پھیر لو تم پر کچھ ملامت نہیں ۔ البتہ نصیحت کرتے رہو کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کے لئے نافع ہے ۔ میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں ۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں ۔ اللہ تو خود ہی رزاق ہے بڑی قوت والا اور زبردست ۔ پس جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حصے کا بھی ویسا ہی عذاب تیار ہے جیسا انہی جیسے لوگوں کو ان کے حصے کا مل چکا ہے ' اس کے لئے یہ لوگ مجھ سے جلدی نہ مچائیں ۔ آخر کو تباہی ہے کفر کرنے والوں کے لئے اس روز جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے" ۔

اب روئے سخن پھر اس کائنات کی نمائش گاہ کی طرف لوٹ جاتا ہے جس کے ساتھ اس سورۃ کا افتتاح ہوا تھا ۔ اس کائنات میں قلب و نظر کے جلا کے لئے کئی تصاویر ہیں تو اب اس کائنات کے البم سے ایک نئی تصویر آپ کے سامنے لائی جاتی ہے اور اس کے ذریعے اس نمائش گاہ کائنات میں اللہ کی نشانیوں کو تلاش کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے ۔ یوں حضرت نوح کے قصے کی نشانی اب زمین و آسمان کی تصویری کہانیوں کے ساتھ مل جاتی ہے اور اس کے بعد پھر انسانوں کو بلند آواز سے پکارا جاتا ہے کہ دوڑو اللہ کی طرف ! خالص نظریہ توحید کے ساتھ ۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۵۱ : ۴۷) "آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا اور ہم بہت ہی وسعت رکھتے ہیں ۔" لاید سے مراد قوت ہے ۔ ہولناک وسیع اور عریض آسمانوں کی تخلیق اور ان کو ضبط میں رکھنے ہی سے اللہ کی عظیم قوت ظاہر ہے ۔ آپ آسمان کے لفظ سے جو بھی مراد لیں خواہ آپ اس سے سیاروں کے مدارات لیں یا اس سے آپ مراد ستاروں کے مجموعے کہکشاں کو لیں جس میں کئی ملین ستارے ہوتے ہیں یا آپ اس سے مراد بلند فضاؤں کے وہ طبقات لیں جن کے اندر یہ ستارے اور سیارے بکھرے ہوئے ہیں یا اس کے علاوہ اس لفظ کا کوئی بھی مفہوم لیں بہرحال یہ کرشمہ قدرت الٰہیہ ہے ۔

اسی طرح وسعت سے مراد بھی یہی سیارے ہیں جو بڑے بڑے حجم والے ہیں اور ملین کی تعداد میں ہیں اور یہ اس ہولناک اور سر چکرانے والی وسیع فضائے کائنات میں بکھرے پڑے ہیں جس طرح ذرات بکھرے ہوئے ہیں بس یہی وسعت ہے ۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وسعت سے مراد وہ خزانے ہوں جو اللہ نے انسانوں کے رزق اور خوراک کے لئے رکھے ہوئے ہیں اور یہ خزانے آسمانوں میں ہیں ۔ اس سورۃ میں یہاں آسمان سے مراد صرف وہ ہو گا جو اللہ کے ہاں ہے لیکن قرآن کا انداز تعبیر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے اندر کسی لفظ کے مفہوم کی طرف ایک اشارہ ہوتا ہے ۔ تعبیر پر اس مفہوم کا سایہ

ڈالا جاتا ہے اور یہ بالا ارادہ ہوتا ہے تاکہ انسانی شعور اس سے تاثر لے۔
ایک اشارہ یہاں بچھائی ہوئی زمین کی طرف بھی آتا ہے۔

وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ (۵۱ : ۴۸) "اور زمین کو ہم نے بچھایا ہے اور ہم بہت اچھے ہموار کرنے والے ہیں" اللہ نے اس زمین کو تیار کیا کہ یہ زندگی کے لئے ایک گہوارہ ثابت ہو جس طرح اس سے قبل ہم نے تفصیل دے دی ہے۔ فرش انسان کے لئے آرام اور راحت کا سبب ہوتا ہے۔ زمین کو اس طرح تیار کردہ ہموار کردہ اور سہولتوں کا اور زندگی کا گہوارہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے فرش سے تعبیر کیا گیا۔ اس کی ہر چیز کو نہایت ہی گہرائی سے زندگی کی کفالت کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ (۵۱ : ۴۸) "ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں"۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۵۱ : ۴۹) "اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے شاید کہ تم اس سے سبق لو" یہ ایک عجیب حقیقت ہے جو اس زمین کی تخلیق کا بنیادی اصول بتاتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہی اصول پوری کائنات میں بھی کارفرما ہو کیونکہ انداز تعبیر میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ صرف زمین کے اندر ہی یہ اصول کارفرما ہے۔ یہ اصول تخلیق میں زوجیت اور جوڑے کا اصول' زندہ چیزوں میں زوجیت کا اصول تو بالکل ظاہر و باہر ہے لیکن "شئی" کے لفظ کا اطلاق دوسری چیزوں پر بھی ہوتا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ تمام اشیاء بھی زوجیت کے اصول پر تخلیق کردہ ہیں۔

جب ہم اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ ہم چودہ سو سال سے اس آیت کو پڑھ رہے ہیں اور زوجیت کے اصول کی اس قدر ہمہ گیری کا تصور اس وقت نہ تھا جو اب ہوگیا ہے' اس وقت تو زندہ چیزوں میں بھی یہ اصول اس قدر ہمہ گیر متصور نہ تھا چہ جائیکہ کوئی تمام اشیاء کے اندر زوجیت کا تصور کرتا۔ اگر ہم یہ حقیقت سوچ لیں تو پھر ہمارے سامنے ایک عجوبہ آجاتا ہے اور یہ ہمیں بتایا ہے کہ اس پوری کائنات کی ہر چیز زوجیت کے اصول پر ہے۔

یہ آیت ہمیں یہ حقیقت بھی بتاتی ہے کہ دور جدید کے تمام انکشافات ہمیں حقیقت کبریٰ کے بہت قریب کرتے جارہے ہیں۔ تمام تحقیقات اس پر متفق ہوتی جارہی ہیں کہ کائنات کی تخلیق ذرے سے ہوتی ہے اور ذرہ دو کہربائی جوڑوں سے مرکب ہے۔ مثبت اور منفی لہٰذا جدید طبیعی تحقیقات اس حقیقت کے ثبوت کی طرف جارہی ہیں۔

عبارت اور الفاظ کے لحاظ سے چھوٹے اور مختصر اور مفہوم کے اعتبار سے بڑے اور محیرالعقول اشارات کی روشنی میں آسمان کی دوریوں' زمین کے اطراف و اکناف اور مخلوقات کے انفس کے مکالمے اور مشاہدے کی روشنی میں اب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو نہایت ہی بلند آواز سے پکارتا ہے کہ دوڑو خالق ارض و سماء کی طرف' خالص ہو کر' تمام بوجھ اپنے کاندھوں سے پرے پھینک کر' ہلکی روح' بے قید دل کے ساتھ اور توحید کے جھنڈے ہاتھوں میں لئے ہوئے دوڑ پڑو۔

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۵۱ : ۵۱) "اور نہ بناؤ اللہ

کے ساتھ کوئی دوسرا معبود' میں تمہارے لئے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں"۔ اللہ کی طرف آنے کو فرار سے تعبیر کرنا درحقیقت ایک عجیب اور معنی خیز تعبیر ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ اس زمین میں انسانوں کو کس طرح ناجائز طور پر برباد کر دیا گیا۔ کس طرح اسے پابندیوں میں جکڑ دیا گیا ہے کس طرح اسے بیڑیاں پہنا کر جیلوں کے گڑھوں میں بند کر دیا گیا ہے جنہوں نے انسانوں کو اس زمین کے ساتھ چپکا دیا ہے' اس پر گرا دیا ہے اور اس کو قسم قسم کے بندھنوں سے باندھ دیا گیا ہے۔ خصوصاً رزق اور مال و دولت کی لالچ کے ذریعے اور اپنے حصے کا رزق حاصل کرنے کے لئے ظاہری اسباب رزق میں انسانوں کو منہمک کر دیا گیا ہے۔ اس لئے انسانوں کو ان بندھنوں سے چھڑانے کے لئے بھی نہایت ہی زوردار دعوت اور بلند آواز کے ساتھ پکار کی ضرورت تھی اور الفاظ کے استعمال میں بھی ایسا لفظ لیا گیا کہ شدت سے بھاگو' اور بھاگو بھی اللہ کی طرف بغیر کسی کو شریک ٹھہرائے ہوئے اور حجت تمام کرنے کے لئے کہا گیا۔

اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۵۱ : ۵۰) "میں تمہارے لئے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں" دونوں آیات کے اندر اس بات کا تکرار تاکید مزید پر دلالت کرتا ہے۔ پہلی آیت میں بھی کہا گیا۔

اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۵۱ : ۵۰) یہ تکوینی آیات اور نشانات آسمانوں کی نشانیوں' زمین کی نشانیوں' تخلیق کی نشانیوں اور ان کے ساتھ رسولوں کی تاریخ کے نشانات یہ ایک مسلسل بیان تھا نشانات الہیہ کے لئے اور۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا (۵۱ : ۴۷) بھی انہی کا نتیجہ تھا۔ اس لئے اب رسولوں کی تاریخی نشانیوں پر ایک تبصرہ آتا ہے اور آپؐ کو تسلی دی جاتی ہے۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (۵۲) اَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۵۳) فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ (۵۴) وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۵) (۵۱ : ۵۲ تا ۵۵)

"یونہی ہوتا رہا ہے ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون۔ کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں۔ پس اے نبیؐ ان سے رخ پھیر لو تم پر کچھ ملامت نہیں۔ البتہ نصیحت کرتے رہو کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کے لئے نافع ہے"۔

تمام رسولوں کے مخالفین اور مکذبین کی فطرت ایک ہی رہی ہے۔ گمراہوں نے ہمیشہ رسولوں کی دعوت کے مقابلے میں یکساں ردعمل کا اظہار کیا۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (۵۱ : ۵۲)

"یونہی ہوتا رہا ہے ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا

مجنون" جس طرح مشرکین مکہ کہہ رہے ہیں۔ گویا اگلے پچھلے کافروں نے آپس میں مشورہ کرلیا ہو۔ انہوں نے آپس میں مشورہ تو نہیں کیا مگر سرکشی ، گمراہی ، ظلم کا مزاج ہی ایک ہوتا ہے۔ اس لئے اگلے پچھلے اس روش پر جمع ہو گئے ہیں۔

منکرین کے مسلسل ایک ہی موقف سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ رسول ﷺ ان لوگوں کی تکذیب کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ ان لوگوں نے اس رویہ پر گویا اتفاق کرلیا ہے لہٰذا رسول ﷺ اس پر ملامت زدہ نہیں ہیں۔ ان کو چاہئے کہ کوئی پرواہ نہ کریں۔ وہ تو محض یاد دہانی کرانے والے ہیں اور یاد دہانی وہ جاری رکھیں۔ اگرچہ لوگ اعتراض کریں اور منہ موڑیں۔

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۱: ۵۵) "البتہ نصیحت کرتے رہو کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کے لئے نافع ہے۔" اور دوسروں کے لئے نافع نہیں ہے کیونکہ انہوں نے انکار کا فیصلہ کرلیا ہے۔ تذکیر اور دعوت رسولؐ کے فرائض میں سے ہے اور ایمان لانا نہ لانا رسول کے فرائض سے باہر ہے۔ یہ اللہ کا کام ہے جو آسمان اور زمین اور انسانوں کا خالق ہے۔ اب اس سورۃ میں عقل و خرد کے تاروں پر آخری ضرب لگائی جاتی ہے اور اس میں فرار الی اللہ کے معنی کی وضاحت کی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ زمین کے بوجھوں اور گراوٹوں سے نجات کس طرح مل سکتی ہے۔ وہ یوں کہ انسان اور جن جس مقصد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں وہ فریضہ ادا کریں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۶) مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ (۵۷) اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۸) (۵۱: ۵۶ تا ۵۸) "میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ اللہ تو خود ہی رزاق ہے بڑی قوت والا اور زبردست"۔

یہ چھوٹی سی آیت دراصل ایک عظیم حقیقت پر مشتمل ہے۔ یہ اس کائنات کی وہ عظیم حقیقت ہے کہ جہاں انسان کی زندگی اس پر عمل کرنے کے سوا درست نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی ہو یا عالمی زندگی اور ہر دور میں یہ حقیقت اپنی جگہ پکی رہی ہے اور رہے گی۔

یہ عظیم حقیقت عالم انسانیت کے نہایت اہم گوشے اور خفیہ معانی پر کھلتی ہے اور یہ معانی اور گوشے وہ ہیں جن پر پوری اجتماعی زندگی قائم ہے۔

اس کا پہلا پہلو یہ ہے کہ جن و انس کے وجود کا خاص مقصد ہی یہ ہے اللہ کی بندگی کی جائے۔ اس مقصد کے لئے اللہ نے چند فرائض مقرر فرمائے ہیں جس نے یہ فرائض ادا کئے گویا اس نے مقصد زندگی پالیا اور جس کسی نے ان فرائض میں کوتاہی کی یا ان سے منہ موڑا تو اس نے گویا مقصد زندگی ہی گم کر دیا اور وہ شخص بے مقصد اور بے کار ہو گیا اور اس کی زندگی بے معنی ہو گئی اور اسکی کوئی قدروقیمت نہ رہی کیونکہ صرف اسی مقصد کے ذریعے ہی زندگی بامعنی ہو سکتی ہے۔ یہ شخص اس ناموس فطرت سے نکل آیا جس کے لئے اسے اللہ نے پیدا کیا تھا اور یہ گویا بالکل ضائع ہو گیا جس طرح ہر وہ چیز

جو اپنا فرض منصبی ادا کرنا چھوڑ دے وہ بے کار ہو جاتی ہے کیونکہ مقصد زندگی ہی درحقیقت کسی شخص کے بقاء کا ضامن ہوتا ہے۔ مقصد وجود پورا نہ کرنے والی چیز اگر زندہ رہے یا موجود بھی وہ ردی ہو جاتی ہے۔ یہ مقصد زندگی جو جن و انس کو ناموس فطرت سے مربوط کرتا ہے وہ کیا ہے؟ یہ عبادت اللہ کی بندگی یعنی ایک بندہ ہو گا اور ایک اس کا رب ہو گا۔ بندہ بندگی کرے گا اور اس کا رب معبود ہو گا اور بندے کی پوری زندگی کو اس مقصد کے مطابق استوار ہونا ضروری ہے۔ گویا عبد نے معبود کی مکمل بندگی کرنی ہے۔

یہاں آکر پھر اس عظیم حقیقت کا دوسرا پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ بندگی سے مراد پوری زندگی میں بندگی ہے اور بندگی سے مراد صرف مراسم عبودیت یا پرستش کے طریقے نہیں ہیں بلکہ اس کا مفہوم بہت وسیع ہے کیونکہ جن اور انسان اپنی پوری زندگی رات اور دن صرف عبادت میں نہیں گزارتے۔ اللہ نے لوگوں کو اس بات کا مکلف نہیں بنایا کہ وہ رات اور دن بندگی اور پرستش کریں بلکہ اللہ نے ان کو مختلف قسم کی زندگی گزارنے کا مکلف بنایا ہے۔ جنوں کی سرگرمیوں کا تو ہمیں علم نہیں ہے لیکن انسانوں کی سرگرمیوں کا ہمیں علم ہے۔ قرآن مجید نے انسان کی تخلیق کی سکیم بتائی ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً "جب اللہ نے فرشتوں سے کہا کہ میں انہیں میں خلیفہ بنانے والا ہوں" لہٰذا زمین میں فریضہ خلافت ادا کرنا بھی انسان کی ذمہ داری ہے اور خلافت کی ذمہ داری میں مختلف قسم کی سرگرمیاں شامل ہیں یعنی زمین کی قوتوں میں تصرف کرنا' اس کے اندر پوشیدہ ذخائر کو تلاش کر کے انسانیت کی خدمت کے لئے استعمال کرنا' زمین کے اوپر انسانی زندگی کو ترقی دینا' اس طرح خلافت کی ذمہ داریوں میں سے یہ بھی ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوں وہ اللہ کی شریعت قائم کریں اور جس طرح کائنات میں اللہ کی مرضی چلتی ہے اسی طرح انسان کی اختیاری زندگی میں بھی اللہ کی مرضی کو نافذ کیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فعل عبادت جو انسان کا مقصد زندگی ہے وہ زیادہ وسیع اور جامع مفہوم رکھتا ہے اور اس سے مراد صرف مراسم عبودیت نہیں ہیں اور زمین پر اللہ کی خلافت کے فرائض سرانجام دینا بھی عبادت میں شامل ہے لہٰذا اسلامی عبادت کے دو پہلو ہیں۔

1۔ پہلا یہ کہ اللہ کی بندگی کا مفہوم ذہن میں پوری طرح بیٹھ جائے۔ یہ شعوری اقرار کہ ایک بندہ ہے جو بندگی کرتا ہے اور ایک رب ہے جس کی بندگی کی جاتی ہے اور اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک طرف سے بندگی اور غلامی ہے اور دوسری جانب آقا و خالق ہے۔ ادھر عبد ادھر معبود ہے۔ رب واحد ہے اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں اور اس کے سوا جس قدر مخلوق ہے وہ سب کے سب عابد اور غلام ہیں۔

2۔ دوسرا پہلو اس حقیقت عظمٰی کا یہ ہے کہ انسان اپنی ہر قلبی حرکت اور توجہ اور اپنی جسمانی حرکت اور اس کا رخ زندگی کے ہر موڑ میں اللہ کی طرف پھیر دے۔ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہو اور اللہ کے سوا ہر شعور کو اپنے دل سے نکال دے اور اللہ کی بندگی کے سوا ہر حرکت اپنی زندگی سے خارج کر دے۔

ان دو پہلوؤں سے عبادت کا مفہوم پوری طرح وجود میں آتا ہے اور ہر عمل ایک عبادت بن جاتا ہے اور بندگی کے مراسم اس طرح بن جاتے ہیں جس طرح کوئی اس زمین کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہو اور پھر زمین کی تعمیر و ترقی کا کام جہا

فی سبیل اللہ بن جائے گا اور جہاد فی سبیل اللہ یوں ہوتا ہے جس طرح ایک انسان مشکلات میں صبر کرے ۔ (یعنی زندگی کی ہر حرکت اور ہر کام عبادت بن جاتا ہے ۔) اور یہ تمام کام وہ مقصد پورا کر رہے ہوں گے جس کے لئے اللہ نے جن و انس کو پیدا کیا ہے اور جس مقصد کو پوری کائنات پورا کر رہی ہے ۔

جب یہ نظریہ اور عقیدہ کسی ذہن میں بیٹھ جائے تو وہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے ۔ وہ اس لئے یہاں آیا ہے کہ زندگی کے اس مختصر حصے میں وہ اس فریضہ کو ادا کرے ۔ اللہ کی بندگی ' اللہ کی پرستش اور بس اس کے سوا اس کا کوئی مقصد نہ ہو ۔ اس سے اس کا کوئی مفاد وابستہ نہ ہو ۔ فقط اطاعت اور اس کا جو اجر وہ چاہتا ہو وہ صرف یہ ہو کہ اللہ اس سے راضی ہو ۔ اسے اس بات پر اطمینان ہو ۔ وہ اپنے عمل اور اپنے حالات پر مطمئن ہو کہ اللہ اس سے راضی ہے ۔ رہی افرادی جزا تو وہ اللہ کا ایک فضل و کرم ہو گا ۔

اگر ایک شخص اس مقام تک پہنچ جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ درحقیقت وہ اللہ کی طرف دوڑ گیا ہے ۔ اس نے اس زمین کی گراوٹوں ' اس کی رکاوٹوں اور اس کی تمام دامن گیریوں کو عبور کر کے اور ہر چیز سے اپنے آپ کو چھڑا کر اللہ کی طرف فرار اختیار کر لیا ہے ۔ وہ اس آزادی کے ذریعے زمین کی تمام پابندیوں سے آزاد ہو گیا اور اللہ کے لئے وقف ہو گیا اور وہ اس کائنات کے اصل مقام پر پہنچ گیا یعنی اللہ کی بندگی کے مقام پر جس کے لئے اللہ نے اسے پیدا کیا تھا ۔ اب یہ اپنے صحیح مقام پر جا کر کھڑا ہو گیا ۔ اس نے اپنا مقصد وجود پورا کر دیا ۔ لہٰذا عبادت الٰہی کے تقاضوں میں سے یہ تقاضا بھی ہے کہ انسان اس زمین کے اوپر فرائض خلافت ارض بھی پورے کرے ۔ یہاں اپنی ذمہ داریاں ادا کرے ۔ اس زمین کے ثمرات سے آخری حد تک استفادہ کرے لیکن اس حال میں کہ وہ ان سے اپنے ہاتھ بھی جھاڑ رہا ہو اور اس کا دل اس زمین کی دھوکہ دینے والی اور پرکشش چیزوں سے آزاد و بے نیاز ہو ۔ یوں کہ اس دنیا کے ثمرات اور لذات وہ صرف اپنی ذات کے لئے نہ سمیٹ رہا ہو بلکہ اسے فریضہ حیات کے طور پر عبادت کے طور پر اور فرار الی اللہ کے طور پر کر رہا ہو اور بقدر ضرورت کر رہا ہو ۔

اس تصور اور اس عظیم حقیقت کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ انسان اعمال کے نتائج پر نظر نہیں رکھتا بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ یہ اعمال کس نیت سے کر رہا ہے ۔ نتائج چاہے جو ہوں انسان نتائج کا ذمہ دار نہیں ہے ۔ وہ تو صرف امتثال امر اور عبادت کا ذمہ دار ہے کیونکہ اس کا اجر اس کے اعمال کے نتائج نہیں بلکہ اس کا اجر یہ ہے کہ وہ بندگی کر رہا ہے یا نہیں کر رہا ۔

اس حقیقت عظمیٰ کو پا لینے کے بعد فرائض ' واجبات اور اعمال کے بارے میں انسان کا نقطہ نظر یکلخت بدل جاتا ہے ۔ وہ ہر کام میں یہ دیکھتا ہے کہ وہ فریضہ عبادت پورا کر رہا ہے یا نہیں ۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس نے عبادت کر لی تو اس کا کام ختم ہو گیا ۔ اب نتائج چاہے جو ہوں سو ہوں کیونکہ کاموں کے نتائج اس کے فرائض میں داخل نہیں ہوتے نہ اس کی طاقت میں یہ بات ہے کہ وہ نتائج پیدا کر سکے کیونکہ نتائج تو اللہ کی مشیت اور تقدیر کے مطابق نکلتے ہیں ۔ وہ اس کی جدوجہد اس کی نیت اس کا عمل تو تقدیر الٰہی کا ظہور ہوتے ہیں ۔

جب انسان اس معنی میں جدوجہد کرے اور نتائج سے ہاتھ جھاڑ لے اور یہ شعور پا لے کہ اس نے اپنے حصے کا کام کر دیا ہے اور یہ کہ اس کی جزا اللہ پر ہے کیونکہ اس کا کام تو یہ تھا کہ اللہ کے حکم کو مانو ۔ لہٰذا اب اس دنیا کے حوالے سے

اس کی کوئی آرزو ہی نہیں رہتی ۔ وہ اس دنیا میں کسی مقصد کے لئے کسی سے کوئی پرخاش نہیں رکھتا اور نہ اس دنیا کی اغراض میں سے کسی غرض کے لئے اس کے دل میں کوئی چاہت ہوتی ہے ۔ اس نے اپنی طاقت کے مطابق جدوجہد کرلی ۔ اس دنیا میں اپنی ذمہ داریاں اداکر دیں اور اپنے حصے کے فرائض پورے کر دیئے اور اس دنیا کے نتائج اور اغراض سے بھی اپنے ہاتھ جھاڑ لئے اور اپنی جدوجہد کے ثمرات کے حصول کی آرزو بھی دل سے نکال دی کیونکہ جب اس نے بندگی کر دی تو اس کا ثمرا سے حاصل ہو گیا ۔ رہے ذاتی مفادات تو یہ اس کا مقصد ہی نہ تھا ۔

قرآن کریم اس قسم کے احساسات کو غذا دیتا ہے ۔ ایسے تصورات کو تقویت دیتا ہے ۔ انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ رزق کا غم مت کرو ' رزق کی ذمہ داری اللہ پر ہے ۔ اللہ نے اپنے بندوں کے رزق کی ذمہ داری لی ہوئی ہے ۔ اللہ خود بھی کسی رزق اور طعام کا محتاج نہیں ہے ۔ اس نے یہ انتظامات بندوں کے لئے تو کئے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو محتاجوں اور غریبوں پر انفاق کے جو احکام دیتا ہے وہ بھی خود ان کے مفاد میں ہیں ۔

مَآ اُرِيۡدُ مِنۡهُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ وَّمَآ اُرِيۡدُ اَنۡ يُّطۡعِمُوۡنِ (۵۷) اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الۡقُوَّةِ الۡمَتِيۡنُ (۵۱ : ۵۸) "میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں ۔ اللہ خود ہی رزاق ہے بڑی قوت والا اور زبردست ہے ۔"

اس دنیا میں فرائض خلافت اداکرتے ہوئے ایک مومن کے اندر صرف حصول رزق کا داعیہ نہیں ہوتا بلکہ یہ داعیہ اللہ کی بندگی کا داعیہ ہوتا ہے اور عبادت تب پوری ہوتی ہے جب انسان اس جہاں میں امر الٰہی کو تسلیم کرتے ہوئے پوری جدوجہد کرے ۔ اس لئے یہاں ایک مومن کی جدوجہد کے پیچھے اللہ کی بندگی اور اطاعت کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے اور اس جذبے میں اس دنیا کے مفاوات میں سے کوئی مفاد بھی نہیں ہوتا کیونکہ اس دنیا میں اونچے مقاصد کے لئے جدوجہد ایک عظیم بلند فعل ہے اور یہ کسی بلند تصور اور جذبہ کے تحت ہی ہو سکتا ہے ۔

آج انسانیت اگر اس رزق بلند سے محروم ہے تو وہ اس لئے محروم ہے کہ جس طرح دور اول کے مسلمان قرآن کی تعلیمات کے سایہ میں زندگی بسر کرتے تھے یہ لوگ نہیں کر رہے اور انہوں نے اپنے اصول زندگی قرآنی دستور سے اخذ نہیں کئے ۔

جب کوئی انسان اور کوئی سوسائٹی اس افق تک بلند ہو جاتی ہے یعنی بندگی اور غلامی کے افق تک اور اس پر جم جاتی ہے تو اس کی عزت نفس کسی بھی خسیس ذریعہ سے کوئی بلند مقصد حاصل کرنے سے انکار کر دیتی ہے ۔ اگرچہ یہ مقصد اسلام کی سربلندی ہو اور اسلام کے غلبہ کا مقصد ہو کیونکہ خسیس ذرائع اللہ کی بندگی کے پاک مقصد کو ختم کر دیتے ہیں ۔ نیز جب کوئی اس مقام تک پہنچ جائے تو وہ نفس کو منزل تک پہنچانے کی فکر نہیں کرتا بلکہ وہ اس فکر میں مبتلا ہوتا ہے کہ ہم نے اپنا فریضہ پورا کر دیا ہے یا نہیں ۔ یعنی اللہ کی بندگی کے مفہوم اور حقیقت کبریٰ کو پاتے ہوئے ۔ جہاں تک حصول مقاصد کا تعلق ہے تو یہ تو اللہ کے حوالے ہیں ۔ اللہ نے اپنی تقدیر میں جس طرح کے نتائج طے کر رکھے ہیں وہ پس پردہ تقدیر ظاہر ہو جائیں گے ۔ لہٰذا ہمیں یہ نہیں چاہئے کہ ہم نتائج حاصل کرنے کے لئے غلط ذرائع اختیار کریں جبکہ نتائج کا ظہور اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ ایک مومن کے ذمہ داری میں نہیں ہے جو صرف اللہ کی بندگی کرنے والا ہے ۔

بندہ عبادت گزار کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے' اس کا نفس برقرار ہوتا ہے ۔ اس کا دل تمام حالات میں صحیح و سلامت ہوتا ہے ۔ چاہے اسے اپنے عمل کے ثمرات نظر آرہے ہوں یا نہ آرہے ہوں ۔ یہ نتائج اس کی نیت اور عمل کے مطابق ہوں یا اس کے برعکس نکل رہے ہوں کیونکہ عبادت کے اس مفہوم کے مطابق اس نے اپنا کام کر دیا ہے ۔ اس کی جزاء کی ضمانت اللہ نے دے دی ہے ۔ اب وہ خوش و خرم ہے ۔ اس کے بعد عملاً کیا ہوتا ہے یہ اس کے دائرہ فرائض سے خارج ہے کیونکہ اس نے یہ بات بیان کی ہے کہ وہ بندہ ہے لہٰذا وہ اپنے شعور اور فکر کے اعتبار سے یا اپنی تجاویز اور مطالبات کے لحاظ سے عبدیت کی حدود سے آگے نہیں جاسکتا ۔ اس کو معلوم ہوگیا ہے کہ اللہ رب ہے ۔ اس لئے یہ ان کاموں میں دلچسپی نہیں لیتا جو رب العلمین کے دائرہ کار میں آتے ہیں ۔ اس کے جذبات یہاں اگر رک جاتے ہیں تو اللہ اس سے راضی ہو جاتا ہے اور وہ اللہ سے راضی ہو جاتا ہے ۔

یہ ہیں بعض پہلو اس عظیم حقیقت کے جس کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے ۔ یہ نہایت ہی مختصر آیت ہے ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱ : ۵۶) "میں نے جن و انس کو اس کے سوا کسی اور کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں" ۔ یہ حقیقت اگر کسی کے دل و دماغ میں بیٹھ جائے تو وہ اس شخص کی زندگی کا نقشہ بدل دیتی ہے ۔

آخر میں اس حقیقت کی روشنی میں ظالموں کو ڈرایا جاتا ہے جو ایمان نہیں لاتے' قیامت کی تکذیب کرتے ہیں اور اس کے آنے میں شتابی کرتے ہیں ۔ اس زبردست ڈراوے پر سورت ختم ہوتی ہے ۔

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ (۵۹) فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ (۵۱ : ۶۰) "پس جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حصے کا بھی ویسا ہی عذاب تیار ہے جیسا انہی جیسے لوگوں کو ان کے حصے کا مل چکا ہے' اس کے لئے یہ لوگ مجھ سے جلدی نہ مچائیں ۔ آخر کو تباہی ہے کفر کرنے والوں کے لئے اس روز جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے" ۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ۔۔ ۲۷

سورۃ الطور ۔ ۵۲

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۴۹

سورۃ طور ایک نظر میں

یہ سورۃ انسانی قلب پر ایک پر تاثیر اور گہرا حملہ ہے اس میں ان شکوک و شبہات اور باطل خیالات کا پیچھا کیا گیا ہے جو دل پر ہمیشہ حملہ آور ہوتے ہیں۔ جو خفیہ طور پر گھس کر دل کے اندر چھپ جاتے ہیں۔ اس سورۃ میں ہر باطل دلیل کی سختی سے تردید ہے۔ ہر عذر کا معقول جواب ہے جس کے بہانے کوئی انسان جادہ حق سے ادھر ادھر بھٹک سکتا ہے اور راہ ایمان سے ٹیڑھا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا زبردست حملہ ہے کہ کوئی دل اس کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا اگر وہ پتھر نہ ہوگیا ہو۔ یہ سورۃ اس تیزی سے دلوں کا تعاقب کرتی ہے کہ یقین آنے اور تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔

اس حملے میں الفاظ اور عبارات کے ہتھیار بھی استعمال ہوئے ہیں۔ معانی و مدلولات بھی استعمال ہوئے ہیں۔ تصاویر اور پرتو بھی شامل ہیں۔ آیات کے سجع اور مقفیٰ خاتمے اور ان کا زبردست ترنم سب کے سب شامل ہیں۔ سورۃ کے آغاز سے اختتام تک یوں نظر آتا ہے کہ مسلسل گولہ باری ہورہی ہے۔ اس قسم کے دھماکے ہورہے ہیں کہ گویا بجلی کی کڑک ہے۔ ایسی جھلکیاں اور ایسے رنگ ہیں کہ گویا پردہ احساس پر ارتعاش پیدا کرنے کے لئے مسلسل شدید کوڑے برسائے جارہے ہیں۔ آغاز سے انجام تک انسان کے دل و دماغ کو ذرا مہلت بھی نہیں دی جاتی۔

سورۃ کے آغاز میں زمین اور آسمان کے مقدسات کی قسم کھائی گئی ہے۔ بعض مقدس چیزیں کھلی ہیں اور بعض پردہ غیب میں ہیں۔

وَالطُّوْرِ (۱) وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ (۲) فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۳) وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ (٤) وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ (٥) وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (٦) (۵۲: ۱ تا ٦) "قسم ہے طور کی اور ایک کھلی کتاب کی جو رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے اور آباد گھر کی اور اونچی چھت کی اور موجزن سمندر کی۔"

یہ قسم کس بات پر ہے۔ ایک نہایت ہی خوفناک امر پر جس کے تصور سے دل کانپ اٹھتا ہے۔ احساسات مرعوب ہوجاتے ہیں۔ اس کی لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تعبیرات ہولناک ہیں۔ ایک ایسے منظر کی شکل میں جس کو دیکھ کر انسان کے قدم تھم نہیں سکتے۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ (۷) مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ (۸) يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا (۹) وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا (۱۰) (۵۲: ۷ تا ۱۰) "کہ تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ وہ اس روز واقع ہوگا جب آسمان بری طرح ڈگمگائے گا اور پہاڑ اڑے اڑے پھریں گے۔"

اور اس خوفناک منظر کے درمیان ہم ایک تنبیہہ جھڑکی آتی ہے جو دلوں کو ڈرا دیتی ہے اور وہ مرعوب ہو جاتے ہیں ۔ ہلاکت و بربادی اور خوف و ہراس ہے ۔

فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۱۱) الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ (۱۲) يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا (۱۳) هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ (۱۴) اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ (۱۵) اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶) (۵۲ : ۱۱ تا ۱۶) "تباہی ہے اس روز ان جھٹلانے والوں کے لئے جو آج کھیل کے طور پر اپنی حجت بازیوں میں لگے ہوئے ہیں جس دن انہیں دھکے مار مار کر جہنم کی طرف چلایا جائے گا ۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے ۔ اب بتاؤ' یہ جادو ہے یا تمہیں سوجھ نہیں رہا ہے ؟ جاؤ اب جھلسو اس کے اندر ۔ تم خواہ صبر کرو یا نہ کرو ۔ تمہارے لئے یکساں ہے تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جارہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے ۔"

یہ تو تھا حملہ اور تعاقب لیکن اس کے بالمقابل ایک دوسرا رنگ اور دوسرا منظر بھی ہے جن لوگوں نے پہلا خوفناک منظر دیکھا انہیں امید دلانے کے لئے امن اور نعمتوں سے بھرا ہوا ایک منظر دیکھ لیجئے ۔ متقی لوگوں کے شب و روز اور ان کے اعزاز کے لئے ہونے والے انتظامات نہایت وسیع پیمانے پر عیش و عشرت کے لئے بھی دیکھ لیجئے ۔ یہ ایک طویل منظر ہے ۔ اس کی تفصیلات فرعیات تک دی جارہی ہیں ۔ کئی رنگ کی تیاریاں جس کے نتیجے میں احساس اور روح دونوں میں ایک جوش پیدا ہوتا ہے ۔ اس سے قبل تو ہولناک منظر دیکھا تھا اب ایک ایسا منظر جسے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں ۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ (۱۷) فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (۱۸) كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۹) مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (۲۰) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (۲۱) وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ (۲۲) يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ (۲۳) وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ (۲۴) وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (۵۲ : ۲۵) قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ (۵۲ : ۲۶) فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ (۵۲ : ۲۷) اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ (۵۲ : ۲۸) (۵۲ :

(۵۲: ۱۷ تا ۲۸) "متقی لوگ وہاں باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے لطف لے رہے ہوں گے ان چیزوں سے جو ان کا رب انہیں دے گا اور ان کا رب انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے گا۔ ان سے کہا جائے گا کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے بدلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ وہ آمنے سامنے بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے اور ہم خوبصورت آنکھوں والی حوریں ان سے بیاہ دیں گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد بھی کسی درجہ ایمان میں ان کے نقش قدم پر چلی ہے ان کی اس اولاد کو بھی ہم ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل میں کوئی گھاٹا ان کو نہ دیں گے۔ ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے۔ ہم ان کو ہر طرح کے پھل اور گوشت، جس چیز کو بھی ان کا جی چاہے گا خوب دیئے چلے جائیں گے۔ وہ ایک دوسرے سے جام شراب لپک لپک کر لے رہے ہوں گے جس میں نہ یاوہ گوئی ہو گی، نہ بدکرداری اور ان کی خدمت میں وہ لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ان کی خدمت کے لئے مخصوص ہوں گے۔ ایسے خوبصورت جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے حالات پوچھیں گے۔ یہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے گھروں میں ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے آخر کار اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں جھلسا دینے والی ہوا کے عذاب سے بچالیا۔ ہم پچھلی زندگی میں اس سے دعائیں مانگتے تھے۔ وہ واقعی بڑا ہی محسن اور رحیم ہے۔"

اس سورۃ کے حصہ اول میں ہم نے عذاب کے لگتے ہوئے کوڑے بھی دیکھ لئے۔ دوسرے حصے میں نعمتوں اور رحمتوں کے مناظر بھی دیکھ لئے۔ اب تیسرا حصہ آتا ہے اس میں ان تخیلات اور سوالات کا پیچھا ہو رہا ہے۔ شبہات اور مغالطہ اندازیوں کو لیا جاتا ہے۔ حجت بازیوں اور جھوٹے عذرات کو رد کیا جاتا ہے اور حقائق کو صاف ستھرا کر کے سادہ اور سخت انداز میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ ایسے منطقیانہ اور واضح انداز میں جس کے اندر کوئی تاویل ممکن نہیں ایسے سیدھے انداز میں جس میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ یوں اہل باطل کی گردنیں یقین اور تسلیم کرتے ہوئے جھک جاتی ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ یہ گردنیں مروڑ دی جاتی ہیں۔ اس حصے میں آغاز خطاب نبی ﷺ سے ہے کہ آپ یاد دہانی کراتے رہیں۔ اگرچہ ان لوگوں کا رویہ آپ کے ساتھ درست نہیں ہے اور ان کی سرزنش اس قسم کی سیدھی سیدھی باتوں سے کی جاتی ہے۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (۲۹) اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (۳۰) قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ (۳۱) اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۳۲) اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۳۳) فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (۳۴) اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ (۳۵) اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ (۳۶) اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ (۳۷) اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۳۸) اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ (۳۹) اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا

فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (٤٠) اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ (٤١) اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ (٤٢) اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (٤٣) (٥٢: ١٩ تا ٤٣) "پس اے نبیؐ تم نصیحت کیے جاؤ اپنے رب کے فضل سے نہ تم کاہن ہو نہ مجنون۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے جس کے حق میں ہم گردش ایام کا انتظار کر رہے ہیں؟ ان سے کہو اچھا انتظار کرو' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ کیا ان کی عقلیں انہیں ایسی ہی باتیں کرنے کے لئے کہتی ہیں۔ یا درحقیقت یہ عناد میں حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اس شان کا ایک کلام بنا لائیں۔ کیا یہ کسی خالق کے بغیر خود پیدا ہوگئے ہیں یا زمین و آسمان کو انہوں نے پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے۔ کیا تیرے رب کے خزانے ان کے قبضے میں ہیں؟ ان پر انہی کا حکم چلتا ہے؟ کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ عالم بالا کی سن گن لیتے ہیں۔ ان میں سے جس نے سن گن لی ہو وہ لائے کوئی کھلی دلیل۔ کیا اللہ کے لئے تو ہیں بیٹیاں اور تم لوگوں کے لئے ہیں بیٹے۔ کیا تم ان سے کوئی اجر مانگتے ہو کہ یہ زبردستی پڑی ہوئی چٹی کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں؟ کیا ان کے پاس غیب کے حقائق کا کوئی علم ہے کہ اس کی بنا پر یہ لکھ رہے ہوں؟ کیا یہ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو کفر والوں پر ان کی چال الٹی ہی پڑے گی۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود رکھتے ہیں؟ اللہ پاک ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔"

ان مسلسل سوالات اور اس آتش بار گولہ باری کے بعد جس نے باطل کو تہس نہس کر کے رکھ دیا' معاندین اور مکابرین اور ہٹ دھرمی کرنے والوں کو مشکل میں ڈال دیا اور ہراس زبان کو خاموش کر دیا جو حق سے برگشتہ ہوگئی تھی۔ ان کارگزاریوں کے بعد اب ان کے عناد' ہٹ دھرمی اور ضد کی ایک محسوس تصویر پیش کی جاتی ہے۔

وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ (٥٢: ٤٤) "یہ لوگ آسمان کے ٹکڑے بھی گرتے دیکھ لیں تو کہیں گے یہ بادل ہیں جو امڈے چلے آ رہے ہیں" حالانکہ آسمان کے ٹکڑے میں (اگر وہ گرے) اور بادلوں کے تہ بر تہ ڈھیر میں فرق بالکل واضح ہے لیکن یہ لوگ حق میں رخنہ اندازی کے لئے ہر شبہ تلاش کر لیتے ہیں۔

اب ان پر آخری گولہ پھینکا جاتا ہے۔ زبردست تہدید کہ تمہیں ایک ایسے عذاب کے سامنے پیش ہونا ہوگا جو خوفناک ہوگا۔

فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ (٥٢: ٤٥) يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (٥٢: ٤٦) "اے نبی ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو یہاں تک کہ یہ اپنے اس دن کو پہنچ جائیں جس میں یہ مار گرائے جائیں گے جس دن نہ ان کی کوئی اپنی چال ان کے کسی کام آئے گی نہ کوئی

ان کی مدد کو آئے گا۔" نیز ان کو یہ دھمکی بھی دی جاتی ہے کہ قیامت کے عذاب سے پہلے بھی ان پر عذاب الٰہی آسکتا ہے۔

وَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِکَ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۵۲:۴۷)

"اور اس وقت کے آنے سے پہلے بھی ظالموں کے لئے ایک عذاب ہے مگر ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔"

سورۃ کا خاتمہ ایک نہایت ہی نرم اور خوش آئند ضرب پر ہوتا ہے۔ رخ رسول اللہ کریم کی طرف ہے کہ یہ لوگ آپ کے بارے میں کہتے ہیں۔

شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲:۳۰) "یہ شاعر ہے اور ہم اس کے بارے میں گردش ایام کا انتظار کر رہے ہیں۔" اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کاہن اور مجنون ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تسلی دیتا ہے۔

وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِیْنَ تَقُوْمُ (۵۲:۴۸) وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ (۵۲:۴۹) اے نبی اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، تم ہماری نگاہ میں ہو۔ تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو رات کو بھی اس کی تسبیح کیا کر، اور تارے جب پلٹتے ہیں اس وقت بھی۔"

یہ ایک آخری ضرب ہے بلکہ تھپکی ہے اور اس سے مقصود نبی ﷺ کو ان اذیتوں پر تسلی دینا ہے جو آپ کو معاندین کی طرف سے مل رہی ہیں جن پر اس سورۃ میں اس قدر زور دار حملے کیے گئے اور ان کو دور تک بلکہ جہنم کے دھانے تک بھگایا گیا۔

---ooo---

درس نمبر ۲۵۱ تشریح آیات

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۴۹

سُوْرَةُ الطُّوْرِ (۵۲) مَكِّيَّةٌ (۷۶)
آیاتها ۴۹ — رکوعاتها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالطُّوْرِ ﴿۱﴾ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ﴿۲﴾ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ﴿۳﴾ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ﴿۴﴾ وَ
السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ﴿۵﴾ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ
مِنْ دَافِعٍ ﴿۸﴾ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ﴿۹﴾ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ﴿۱۰﴾ فَوَيْلٌ
يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى
نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ
اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ
مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے طور کی اور ایک ایسی کھلی کتاب کی جو رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے اور آباد گھر کی اور اونچی چھت کی اور موجزن سمندر کی کہ تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ وہ اس روز واقع ہو گا جب آسمان بری طرح ڈگمگائے گا اور پہاڑ اڑائے اڑے پھریں گے۔ تباہی ہے اس روز ان جھٹلانے والوں کے لئے جو آج کھیل کے طور پر اپنی حجت بازیوں میں لگے ہوئے ہیں جس دن انہیں دھکے مار مار کر نار جہنم کی طرف لے چلا جائے گا اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ "یہ وہی آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ اب بتاؤ' یہ جادو ہے یا تمہیں سوجھ نہیں رہا ہے؟ جاؤ اب جھلسو اس کے اندر تم خواہ صبر کرو یا نہ کرو' تمہارے لئے یکساں ہے تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم

عمل کر رہے تھے۔"

یہ مختصر آیات اور زمزمہ خیز مسجع آیات اور ان آیات کے آخری الفاظ کی صوتی ہم آہنگی ' پوری سورۃ میں جاری ہے۔ پہلی آیت میں ایک لفظ پھر دو الفاظ ' پھر آہستہ آہستہ الفاظ کی تعداد کا بڑھتے چلے جانا ' یہاں تک کہ پیراگراف کے آخر میں الفاظ کی تعداد ۱۲ کلمات تک پہنچ جاتی ہے اور الفاظ بدستور پرشوکت اور زور دار رہتے ہیں۔

والطور (قسم ہے طور کی) طور ہراس پہاڑ کو کہتے ہیں جس میں درخت ہوں۔ واضح قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہی کوہ طور ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں مشہور ہے اور جس پہاڑ پر تورات کی تختیاں نازل ہوئی تھیں۔ اس لئے کہ یہاں فضا مقدس مقامات کی ہے اور ان کی اللہ تعالیٰ قسم اٹھاتا ہے اور یہ قسم بھی ایک عظیم امر پر ہے۔

وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ (۲:۵۲) فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۳:۵۲) "ایسی کتاب کی قسم جو رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے" زیادہ قریب بات یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ کی کتاب ہے جو تختیوں پر لکھی ہوئی تھی۔ اس تفسیر کے مطابق طور کے ساتھ مناسبت پوری ہو جاتی ہے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ مراد لوح محفوظ ہے۔ اس لئے کہ اس کے بعد البیت المعمور کی قسم ہے اور السقف المرفوع کی قسم ہے اور یہ مفہوم بھی ممکن ہے۔

البیت المعمور (آباد گھر کی قسم) اس سے مراد کعبۃ اللہ بھی ہو سکتا ہے واضح یہ ہے کہ مراد وہ بیت المعمور ہے جو فرشتوں کی عبادت کی جگہ ہے کیونکہ صحیح احادیث میں اور حدیث اسراء میں آتا ہے "اس کے بعد مجھے بیت المعمور کی طرف اٹھایا گیا۔ اس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں ہوتا۔" یعنی یہ فرشتے وہاں اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور وہ اس کا اسی طرح طواف کرتے ہیں جس طرح اہل زمین ' زمین کے کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔

وَ السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ (۵:۵۲) "اور قسم ہے اونچی چھت کی" اس سے مراد آسمان ہے۔ سفیان ثوری کی یہی رائے ہے اور ابوالاحوص نے سماک ابن خالد ابن عرعرہ سے انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہی رائے نقل کی ہے۔ سفیان ثوری کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت علی نے یہ آیت پڑھی۔

وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّهُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا مُعْرِضُوْنَ "اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا اور یہ لوگ اس کی نشانیوں سے منہ پھیر رہے ہیں۔"

وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (۶:۵۲) "اور قسم ہے موجزن سمندر کی" یعنی بھرے ہوئے سمندر کی۔ سمندر کا ذکر آسمان کے مقابلے میں زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہ بہت وسیع ہے۔ بھرا ہوا ہے اور طویل و عریض ہے۔ یہ ایک ایسی نشانی ہے جس میں خوبصورتی بھی ہے اور اس میں عظمت اور خوف بھی ہے اور یہ مذکورہ بالا دوسری نشانیوں کے ساتھ زیادہ نصیحت آموز ہے۔ مسجور کا معنی وہ جس میں آگ لگی ہوئی ہو۔ دوسری سورۃ میں کہا گیا۔

وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ "جب سمندروں کو بھڑکایا جائے گا" اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد یعنی۔

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (۶:۵۲) سے مراد آگ کا کوئی سمندر ہو جیسا کہ ۔

الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ سے مراد ایک غیبی عبادت گاہ ہے ۔ ان عظیم چیزوں کی قسم اٹھا کر جس عظیم حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے اور جس کے لئے اب ذہن تیار ہو گیا ہے وہ ہے ۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ (۷:۵۲) مَّا لَهُ مِنْ دَافِعٍ (۸:۵۲) "کہ تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں ہے ۔"

یہ عذاب یقیناً ہونے والا ہے اور اسے کوئی طاقت روک نہیں سکتی ۔ ان دونوں آیات کا اثر اور ان کا ہج دونوں فیصلہ کن ہیں ۔ الفاظ کے ترنم سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ واقع ہونے والا ہے اور اس میں کوئی دوسری بات ممکن نہیں ہے اور اس سے کوئی بچانے والا نہیں ہے ۔ جب یہ اثر انسان کے پردہ احساس پر پڑتا ہے اور براہ راست پڑتا ہے تو یہ دل کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی حالت بدل کر رکھ دیتا ہے ۔ حافظ ابوبکر ابن ابی الدنیا نے نقل کیا ہے اپنے باپ سے انہوں نے موسیٰ ابن داؤد سے 'انہوں نے صالح مری سے 'انہوں نے جعفر ابن زید عبدی سے وہ کہتے ہیں حضرت عمر ایک رات مدینہ میں گشت کے لئے نکلے 'وہ مسلمانوں کے گھروں میں سے ایک گھر کے پاس سے گزرے ' دیکھا تو ایک شخص نماز میں کھڑا ہے ۔ حضرت عمر کھڑے ہو گئے اور اس کی تلاوت سننے لگے ۔ اس شخص نے سورۃ طور پڑھنا شروع کی ۔ جب یہاں تک پہنچا ۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ (۷:۵۲) مَّا لَهُ مِنْ دَافِعٍ (۸:۵۲) "کہ تیرے رب کا عذاب واقع ہونے والا ہے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں ۔" تو حضرت عمر نے فرمایا رب کعبہ کی قسم یہ حق ہے حضرت عمر اپنے گدھے سے اتر گئے اور ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور کچھ دیر بیٹھے رہے ۔ پھر وہ اپنے گھر کی طرف لوٹ گئے ۔ پورا ایک ماہ لیٹ گئے ۔ لوگ ان کی عیادت کرتے لیکن معلوم نہ تھا کہ آپ کو کیا بیماری لاحق ہے ۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو یہ سورۃ اس سے پہلے بھی سنی تھی اور بار بار سنی تھی ۔ انہوں نے خود بھی اسے پڑھا تھا ۔ نماز میں پڑھایا تھا ۔ رسول اللہ ہمیشہ مغرب کی نماز میں اسے پڑھا کرتے تھے اور حضرت عمر اسی بات کو جانتے تھے اور اس طرح آپ بھی مغرب میں اس سورۃ کو پڑھتے ۔ اسوہ رسول پر عمل کرتے ہوئے لیکن اس دن ان پر اس کا بہت اثر ہو گیا کیونکہ ان کا دل اس تاثر کے لئے کھلا تھا ۔ ان کے احساسات اس دن اثرات قبول کرنے کے لئے تیار ہوں گے اس لئے ان معانی نے ان کے دل میں نفوذ کر لیا اور ان پر اس طرح اثر انداز ہوئے جس طرح اس روایت سے معلوم ہوتا ہے ۔ جب یہ آیات اپنے پورے وزن ' پوری شدت اور پوری حقیقت کے ساتھ براہ راست ان کے دل میں اتریں ۔ بعض اوقات دلوں پر ایسے اثرات پڑا کرتے ہیں ۔ یہ دراصل وقت کی بات ہوتی ہے ۔ ایک خاص وقت میں یہ اثرات دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور یہ اس وقت اترتے ہیں جب وہ براہ راست دلوں کو مس کر لیں ۔ ان لمحات میں دل ان آیات کو اپنے اصل سرچشمے سے لے لیتے ہیں جس طرح قلب رسول پر ان کا الہامی اثر تھا اس طرح سننے والے کے دل پر اثر ہو جاتا ہے ۔ قلب رسول پر تو ہر بار یہ ہوتا تھا اور اللہ نے قلب رسول کو یہ صلاحیت دی تھی بعض اوقات دوسرے

لوگوں پر بھی یہ معجزانہ اثر ہو جاتا ہے جس طرح حضرت عمرؓ پر ہو گیا۔

اب اس عظیم اور خوفناک حقیقت کے بعد ایک خوفناک منظر:

يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَاءُ مَوْرًا (۵۲:۹) وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا (۵۲:۱۰) "وہ اس روز واقع ہوگا جب آسمان بری طرح ڈگمگا رہا ہوگا اور پہاڑ اڑے اڑے پھریں گے" یہ آسمان جو ٹھہرا ہوا ہے اور نہایت پختگی سے تعمیر شدہ ہے۔ یہ اچانک اضطراب میں مبتلا ہوگا اور اس طرح الٹ پلٹ ہوگا جس طرح سمندر میں امواج اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ یہ امواج ادھر سے ادھر جاتی ہیں اور ان کے اندر کوئی قرار نہیں ہوتا اور پھر اس زمین پر پائے جانے والے پہاڑ جو اونچے اور پختہ جمے ہوئے ہیں یہ اس طرح ہلکے ہو جائیں گے کہ وہ اڑنے لگیں گے اور ان سے ثبات و قرار ختم ہو جائے گا۔ یہ منظر ایک ہوشربا اور پریشان کن منظر ہے اور یہ ایک ایسے ہولناک صورتحال کی نشاندہی کرتا ہے کہ جس میں آسمان اور پہاڑ بھی ہل جائیں تو اس قدر خوفناک منظر میں اور ہولناک صورتحال میں یہ ضعیف انسان کیا ٹھہر سکے گا۔

غرض اس قسم کے خوفناک اور ہولناک حالات میں مکذبین کو ایک ایسی بات بتائی جاتی ہے جو ان کو بہت زیادہ خائف کر دینے والی ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کی جانب سے ان کو بددعا دی جاتی ہے اور اللہ کی بددعا تو گویا فیصلہ ہوتا ہے تباہی کا۔ جس بات کی بددعا دی گئی گویا وہ واقع ہو گئی۔ اللہ کو کوئی روکنے والا نہیں ہے اس فیصلے سے اور یہ ہو گئی عملاً

فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۵۲:۱۱) الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ (۵۲:۱۲)

"تباہی ہے اس روز مکذبین کے لئے جو آج کھیل کے طور پر اپنی حجت بازیوں میں لگے ہوئے ہیں" یہ تباہی اس دن آئے گی جس دن آسمان ڈگمگائے گا اور پہاڑ اڑ رہے ہوں گے۔ یہ خوفناک منظر اور یہ خوفناک بربادی۔ یہ ان جھٹلانے والوں کا حصہ ہے جو لگے ہوئے تھے اپنی حجت بازیوں میں۔

سب سے پہلے تو یہ صفت منطبق ہوتی ہے مشرکین مکہ کے افکار پر اور ان کے تصورات اور معتقدات پر جو نہایت سطحی اور بچگانہ تھے اور ان کی پوری اس زندگی پر یہ صفت منطبق ہے جو ان تصورات اور معتقدات کی اساس پر قائم تھی۔ قرآن کریم نے کئی مقامات پر اس پر تبصرہ کیا ہے کہ یہ ایک کھیل ہے جس میں کوئی سنجیدگی نہیں ہے۔ یہ اس کھیل میں اس طرح مصروف ہیں جس طرح حوض میں لوگ نہانے کے لئے اترتے ہیں اور اچھلتے کودتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ پانی میں تیر کر کسی ہدف کی طرف بڑھیں یا کنارے پر لگ جائیں۔ ان کا مقصد صرف حوض میں اچھلنا کودنا ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس لفظ کا اطلاق قرآنی نظریات کے علاوہ تمام نظریات پر کرتا ہے اور قرآنی طریقہ زندگی کے علاوہ تمام دوسرے اسلوب ہائے زندگی پر کرتا ہے کہ یہ کھیل تماشا ہے اور یہ ایک بڑی حقیقت ہے جو قرآن کریم نے واضح کی ہے اور اسے وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو قرآنی نظریات کے علاوہ تمام نظریات کا گہرا جائزہ لے اور وہ یہ جائزہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظریہ کائنات کی روشنی میں لے۔ کسی بھی گہرے جائزے سے معلوم ہوگا کہ تمام لوگوں کے نظریات اور معتقدات افسانے ہیں بلکہ بڑے بڑے فلسفے انسانی تاریخ کے وہ بڑے فلسفیانہ تصورات جن پر انسان ناز کرتے ہیں' وہ بھی بچوں کا کھیل معلوم ہوتے ہیں۔ اسلامی تصور حیات اور عقائد میں جو حقائق نہایت ہی سادگی' قوت' صفائی اور سنجیدگی سے بیان کئے گئے اور خصوصاً وہ باتیں جو قرآن میں بیان کی گئی ہیں وہ سب فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور وہ فطرت کے

ساتھ بغیر کسی مشکل سے ملتی جلتی ہیں کیونکہ قرآن کا مطالعہ فطرت نہایت حقیقت پسندانہ ہے۔ اس سے اس کائنات کے عجوبے کی بھی خوبصورت تفسیر ہوتی ہے اور اس تفسیر کے مطابق اس کے خالق کائنات کے ساتھ تعلق کی بھی تشریح ہوتی ہے اور یہ سب تصورات اور تشریحات حقیقت پسندانہ بھی ہیں۔

جب میں فلاسفہ کے خیالات پڑھتا' بڑے بڑے فلاسفہ کے خیالات دیکھتا ہوں کہ اس کائنات کے عجوبے کے حل میں وہ تھک کر چور چور ہوگئے اور وہ اس کی صحیح تفسیر نہ کر سکے نہ ہی کائنات کے مختلف حقائق کو باہم مربوط کر سکے۔ ان کے خیالات اس طرح معلوم ہوتے ہیں جس طرح ایک بچہ ریاضی کا کوئی مشکل مسئلہ حل کرنے کی سعی کرے۔ یہ اس لئے کہ میرے سامنے اس مسئلے کا قرآنی حل موجود تھا جو واضح' صاف' سہل فطری اور دلچسپ تھا جس میں کوئی ٹیڑھ نہ تھی نہ پیچیدگی تھی اور نہ تذبذب۔ قرآن نے اس کائنات کی جو تشریح کی ہے وہ اس طرح ہے جس طرح ایک شخص اپنی بنائی ہوئی مشینری کی تشریح کرتا ہے۔ رہے فلاسفہ تو وہ اس کائنات میں سے چند جزوی حقائق لے کر ان کو کل پر منطبق کرتے ہیں اس لئے وہ بری طرح فیل ہوجاتے ہیں اور ان کے تصورات تضادات کا شکار ہوجاتے ہیں۔

جب ہم ان فلاسفہ کے تصورات کا مقابلہ قرآن سے کرتے ہیں تو یہ عبث کھیل' خلط بحث کا بھونڈا نمونہ پیش کرتے ہیں اس لئے کہ قرآنی نظریات مکمل پختہ اور مطابق فطرت اور مطابق حقیقت ہوتے ہیں اور قرآن کے مقابلے میں ان کے خیالات ناپختہ' محال اور متناقض ثابت ہوجاتے ہیں۔

جب انسان عظیم فلاسفہ کے نظریات پڑھتا ہے تو انسان کے تصورات میں تمام مسائل میں اضطراب پیدا ہوجاتا ہے۔ گمراہانہ تصورات سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ دراصل یہ تصورات مسئلہ کائنات کے حل کے لئے انسانی کوششیں ہیں اور اس کے بعد جب انسان قرآنی آیات پر غور کرتا ہے جو اس موضوع پر ہوتی ہیں تو اس کے ذہن میں آہستہ آہستہ روشنی داخل ہوتی ہے۔ اس کا قرار و ثبات اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنی جگہ پر درست رکھی ہوئی ہے۔ ہر بات اپنی جگہ پر ہے۔ ہر حقیقت اپنی جگہ بیٹھی ہوئی ہے اور کسی چیز میں کوئی اضطراب نہیں ہے۔ انسان فی الفور محسوس کرلیتا ہے کہ وہ حقیقت تک پہنچ گیا۔ اسے آرام اور سکون نصیب ہوتا ہے۔ اس کا دل آرام اور قرار پکڑتا ہے۔ عقل مطمئن ہو جاتی ہے۔ ہر قسم کی الجھنیں دور ہوجاتی ہیں۔ تمام مسائل حل ہوجاتے ہیں کیونکہ وہ ایک واضح حقیقت تک پہنچ چکا ہوتا ہے۔

عقائد کے بعد جب لوگ ان عقائد پر اپنی عملی زندگی استوار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ کھیل کود میں مصروف ہیں کیونکہ ان کی زندگی کی ترجیحات اسلامی ترجیحات کے مطابق بچگانہ کھیل نظر آتی ہیں۔ اسلام انسان کو جس قدر بلند ترجیحات دیتا ہے اس کے مقابلے میں یہ دوسرے فلسفے جو ترجیحات متعین کرتے ہیں وہ نہایت حقیر، معمولی اور بے رنگ معلوم ہوتی ہیں۔ اسلام جب ان لوگوں کی مشغولیات کو دیکھتا ہے پھر یہ دیکھتا ہے کہ ان کی نظروں میں ان مشغولیات کی اہمیت کیا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ ان میں وہ سراسر غرق ہیں اور اس سلسلے میں ان کی گفتگو کو سنتا ہے جو ان کی نظروں میں ایسی ہوتی ہے جیسا کہ وہ کسی بڑے کائناتی مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں' اسلام اس قسم کے لوگوں پر جب نظر ڈالتا ہے تو یہ لوگ اسے بچوں کے پارک میں کھیلتے ہوئے بچے نظر آتے ہیں جو گڑیوں اور کھلونوں سے کھیل رہے ہوتے ہیں جن کو وہ حقیقی اشیاء سمجھتے ہیں اور ان کھلونوں کے ساتھ وہ ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ گویا وہ حقیقی اشخاص ہیں۔

اسلام جس طرح اس پوری کائنات کے بارے میں ایک ارفع اور برتر تصور دیتا ہے اس طرح وہ اس کائنات

میں انسان کو اعلیٰ اور برتر ترجیحات بھی دیتا ہے ۔ اسلام انسانوں کو بتاتا ہے کہ ان کے اور اس کائنات کے وجود کی علت اور سبب کیا ہے اور ان کا انجام کیا ہونے والا ہے ۔ وہ یہ سوالات اس طرح قدرتی طور پر حل کرتا ہے کہ ان کے جواب کو ہر شخص سمجھ سکے کیونکہ یہ سوالات ہر شخص کے ذہن میں اٹھتے ہیں کہ وہ کہاں سے آیا؟ کیوں آیا ہے اور اس نے کہا جانا ہے؟

اسلام نے ان سوالات کا جو جواب دیا ہے اس جواب سے خود اس کا وجود اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی اس وسیع کائنات کے وجود کا صحیح تصور ذہن میں آتا ہے کیونکہ انسان دوسری مخلوقات سے کوئی الگ چیز نہیں ہے ۔ ان ہی مخلوقات میں سے وہ ایک مخلوق ہے جہاں سے دوسری مخلوقات آتی ہیں ۔ وہاں سے وہ بھی آیا ہے ۔ ان سب چیزوں کے وجود کا سبب ایک ہے ۔ جہاں وہ دوسری مخلوقات جائے گی یہ بھی جائے گا لہٰذا اسلام کا جواب ایک مکمل جواب ہے اور یہ کائنات اور انسان دونوں باہم مربوط ہیں اور تمام مخلوق پھر خالق سے مربوط ہے ۔

اس کائنات کی قرآنی تشریح کا عکس پھر انسانی ترجیحات پر پڑتا ہے اور یہ ترجیحات اس تصور کی سطح تک بلند ہو جاتی ہیں ۔ یوں ایک مسلم کے شعور میں دوسرے لوگوں کی ترجیحات بہت ہی حقیر نظر آتی ہیں جو اپنے تصورات کے مطابق اپنے اعلیٰ فرائض میں مشغول ہوتا ہے اور یہاں اپنے مقصد وجود کے مطابق کام کرتا ہے ۔ ان اعلیٰ تصورات اور اعلیٰ ترجیحات کی روشنی میں ایک مسلم کو دوسرے لوگ بچوں کے کھیل میں مصروف نظر آتے ہیں ۔

ایک مسلم کی زندگی ایک عظیم زندگی ہے ۔ اس لئے کہ اس کے مقاصد اونچے ہیں اور یہ مسلم اس عظیم کائنات کے ساتھ مربوط ہے ۔ وہ اس عظیم کائنات کے وجود میں موثر ہے ۔ یہ حقیقت اس حقیقت سے زیادہ عزیز ہے کہ ایک انسان اپنی زندگی کو عبث اور بے مقصد کاموں میں ضائع کرے جس طرح دوسرے لوگ ضائع کرتے ہیں ۔ مسلم کی ترجیحات کے مقابلے میں اکثر لوگوں کی ترجیحات و مصروفیات عبث نظر آتی ہیں ۔ محض مقاصد زندگی کی بلندی کی وجہ سے اور اس کائنات کے تصور کی بلندی کی وجہ سے جو لوگ اس کائنات کے بارے میں ایسا تصور رکھتے ہیں جس طرح بچے کھیل رہے ہوتے ہیں ان کے لئے ہلاکت ہے ۔

يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا (۵۲ : ۱۳) "جس دن انہیں دھکے مار مار کر جہنم کی طرف چلایا جائے گا ۔" یہ بھی ایک نہایت ہی پر آشوب منظر ہے ۔ الدع کے معنی ہوتے ہیں پیچھے کی طرف دھکیلنا ۔ یہ ایک ایسی حرکت ہے جو ان لوگوں کے حالات کے عین مطابق ہے جو تصور کائنات کے بارے میں طفلانہ تصورات رکھتے ہیں جو سنجیدہ نہیں ہوتے اور جو اپنے اردگرد میں چلنے والے معاملات پر غور نہیں کرتے ۔ یوں ان کو چلایا جائے گا جہنم کی طرف مگر پیٹھ پر بھی دھکے مار مار کر ۔

اس طرح دھکیل دھکیل کر جب ان کو جہنم کے کنارے پہنچا دیا جائے گا تو کہا جائے گا ۔

هٰذِهِ النَّارُ الَّتِىْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ (۵۲ : ۱۴) "یہ وہی آگ ہے جسے تم جھٹلاتے تھے ۔"

یہ لوگ ابھی اسی حالت میں ہوں گے ادھر سے دھکے ادھر آگ ، مجبور و مقہور تو ان کو بطور سرزنش اور گوشمالی یہ کہا جائے گا ۔ اشارہ ہوگا ان کے ماضی کی طرف ۔

افسحر ھذآ ام انتم لا تبصرون (۵۲ : ۱۵) "یہ جادو ہے یا تمہیں سوجھ نہیں رہا ہے" یہ لوگ دنیا میں قرآن کے بارے میں کہتے تھے یہ جادو ہے۔ طنزاً کہا جاتا ہے کیا یہ آگ بھی محض جادو ہے یا حقیقت ہے اور ایک خوفناک حقیقت ہے یا صورت یہ ہے کہ تم اس آگ کو اسی طرح نہیں دیکھ رہے جس طرح تم قرآن کو نہ دیکھتے تھے۔

جب یہ سزا یہ سرزنش اور گوشمالی ختم ہوتی ہے تو جلدی انہیں سنجیدگی سے مایوس کر دیا جاتا ہے۔

اصلوھا فاصبروا او لا تصبروا سواء علیکم انما تجزون ما کنتم تعملون

(۵۲ : ۱۶) "جاؤ، اب جھلسو اس کے اندر تم خواہ صبر کرو یا نہ کرو، تمہارے لئے یہ یکساں ہے تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے۔" اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خواہ کوئی صبر کرے یا نہ کرے عذاب جاری رہے گا۔ کوئی اسے روکنے والا نہیں ہے۔ اگر صبر کرے تو دردو ہی اگر نہ کرے تو دردو ہی۔ جہنم میں رہنا اپنا مقدر ہے خواہ چیخو یا چپ ہو جاؤ۔ یہ اس لئے کہ یہاں تو جزاء و سزا اعمال پر ہے جو کچھ ہو چکا اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ان الفاظ پر یہ منظراب ختم ہوتا ہے اور یہاں یہ پہلا حصہ بھی ختم ہوتا ہے۔

اس سورۃ کا دوسرا حصہ بھی فکر انگیز ہے لیکن اس میں نرم خوشحالی اور عیش و عشرت ہے خصوصاً پہلے منظر کے بعد جس میں سخت عذاب کا ذکر تھا۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَعِيمٍ ﴿١٧﴾ فَاكِهِينَ بِمَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ وَ
وَقَاهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿١٨﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾
مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ سُرُرٍ مَصْفُوفَةٍ ۖ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ﴿٢٠﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَ
اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ
مِنْ شَيْءٍ ۚ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ﴿٢١﴾ وَأَمْدَدْنَاهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَلَحْمٍ مِمَّا
يَشْتَهُونَ ﴿٢٢﴾ يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ ﴿٢٣﴾ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ
غِلْمَانٌ لَهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَكْنُونٌ ﴿٢٤﴾ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢٥﴾
قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ﴿٢٦﴾ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ ۱
السَّمُومِ ﴿٢٧﴾ إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ ۖ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ﴿٢٨﴾ ع ۲۸
۳

متقی لوگ وہاں باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے 'لطف لے رہے ہوں گے ان چیزوں سے جو ان کا رب انہیں دے گا اور ان کا رب انہیں دوزخ کا عذاب سے بچالے گا۔ان سے کہا جائے گا کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔وہ آمنے سامنے بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے اور ہم خوبصورت آنکھوں والی حوریں ان سے بیاہ دیں گے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انکی اولاد بھی کسی درجہ ایمان میں ان کے نقش قدم پر چلی ہے ان کی اس اولاد کو بھی ہم (جنت میں) ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل میں کوئی گھاٹا ان کو نہ دیں گے۔ ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے۔ہم ان کو ہر طرح کے پھل اور گوشت جس چیز کو بھی ان کا جی چاہے گا خوب دیئے چلے جائیں گے وہ ایک دوسرے سے جام شراب لپک لپک کر لے رہے ہوں گے جس میں نہ یاوہ گوئی ہوگی نہ بدکرداری اور ان کی خدمت میں وہ لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو انہی (کی خدمت) کے لئے مخصوص ہوں گے ایسے خوبصورت جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے (دنیا میں گزرے ہوئے) حالات پوچھیں گے۔یہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے آخر کار اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں جھلسا دینے والی ہوا کے عذاب سے بچالیا۔ہم پچھلی زندگی میں اسی سے دعائیں مانگتے تھے وہ واقعی بڑا ہی محسن اور رحیم ہے۔

یہ منظر نعمتوں کے قریب ہے جو روز اول سے ان لوگوں کے شعور میں رچی بسی تھیں جن سے مخاطب ہے۔لہذا یہ منظر لوگوں کے لئے ان کے پاکیزہ اور حسی اللذائذ کے اعتبار سے بہت ہی پرکشش ہے اور یہ مناظر اس سخت اور ہولناک عذاب کے عین مقابل ہیں اور متضاد ہیں جو اوپر خشک اور طفلانہ دلوں کے بارے میں پیش کیے گئے تھے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ (۱۷) فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ وَ وَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (۵۲ : ۱۸) "متقی لوگ وہاں باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔لطف لے رہے ہوں گے ان چیزوں سے جو ان کا رب انہیں دے گا اور ان کا رب انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے گا۔" اس جہنم سے بچالینا ہی بہت بڑی کامیابی ہے جس کے مناظر بھی ابھی پیش کیے گئے اور یہاں تو اس بچاؤ کے ساتھ نعمتیں بھی ہیں۔جنات نعیم بھی ساتھ ہیں یہاں وہ اللہ کی نعمتوں سے لذت حاصل کریں گے۔

ان نعمتوں اور لذتوں کے ساتھ ساتھ پھر استقبال اور تکریم بھی۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵۲ : ۱۹) "کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کر رہے تھے" یہ کہ عالم بالا سے ان کو پکارا جائے گا بذات خود ایک بلند مرتبہ و اعزاز یہ کہا جائے گا کہ تم اس کے مستحق ہو۔

مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ (۵۲ : ۲۰) "وہ آمنے سامنے بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے" یہ تختے آمنے سامنے بچھے ہوں گے۔بڑی اچھی ترتیب کے ساتھ اور اس میں دوسری لذتوں کے علاوہ اپنے بھائیوں سے وہ ملیں گے۔

وَزَوَّجْنٰهُم بِحُوْرٍ عِيْنٍ (۵۲ : ۲۰) "اور خوبصورت آنکھوں والی حوریں ان کو بیاہ دیں گے" اور یہ وہ اعلیٰ ترین نعمت ہے جس کا کوئی انسان تصور کر سکتا ہے۔

اب ان کا یہ اعزاز ایک قدم اور آگے جاتا ہے۔ ان کی مومن اولاد بھی ان کے ساتھ جمع کر دی جاتی ہے اور وہ بھی ان نعمتوں میں شریک ہوتے ہیں اور یہ ان پر عنایات مزید ہیں۔ اگرچہ اولاد کے اعمال معیار کے اعتبار سے ان متقین سے کم ہی ہوں لیکن اگر اولاد مومن ہے تو اسے آباء سے ملا دیا جائے گا اور آباء کے درجات میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ ہر شخص وہاں اپنے اعمال کا ذمہ دار اور حقدار ہوگا۔ یہ اصول اپنی جگہ رہے گا لیکن یہ اللہ کا فضل ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ

عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (۵۲ : ۲۱) "جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد بھی کسی درجہ ایمان میں ان کے نقش قدم پر چلی ہے ان کی اس اولاد کو بھی ہم ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل میں کوئی گھاٹا ان کو نہ دیں گے۔ ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے۔"

یہ منظر جاری ہے۔ جنت کی نعمتوں کا بیان ہو رہا ہے۔ یہ نعمتیں قسم قسم کی ہیں۔ پھل آرہے ہیں، قسم قسم کے گوشت چلے آرہے ہیں جو بھی وہ چاہیں وہ وہاں ایک دوسرے سے جام شراب لے رہے ہوں گے۔ یہ شراب دنیا کی شراب نہ ہوگی جس کے استعمال کے بعد لوگ یاوہ گوئی کرتے ہیں یا فحش حرکات کرتے ہیں بلکہ یہ مصفی اور پاک شراب ہوگی۔

لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ (۵۲ : ۲۳) "جس میں نہ یاوہ گوئی ہوگی اور نہ بدکرداری" وہ یہ جام شراب ایک دوسرے سے چھین رہے ہوں گے اور ایک دوسرے کو پکڑا رہے ہوں گے تاکہ زیادہ محبت و لذت حاصل ہو اور جب یہ اس قسم کی لذتوں کے اندر ہوں گے تو ان پر خوبصورت چاند جیسے مکھڑے والے لڑکے پھر رہے ہوں گے۔ پاک اور صاف اور تر و تازہ۔

كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ (۵۲ : ۲۴) "ایسے خوبصورت جیسے چھپائے ہوئے موتی" جن کی وجہ اس مجلس کا لطف روحانی اور جسمانی اعتبار سے دوچند ہو جائے گا۔ اس منظر اور مجلس کی تکمیل کے لئے ان کی باہم گفتگو بھی پیش کی جاتی ہے۔ ان کے ماضی پر ان کا مذاکرہ بھی دیا جاتا ہے اور وہ جس مقام تک پہنچ چکے ہیں اس کے اسباب بھی گنوائیں گے کہ کس وجہ سے وہ اس امن، رضامندی، امن و محبت اور وسیع سامان زندگی تک پہنچے ہیں۔ یوں وہ اپنے دلوں میں وہاں بھی اپنی اس حالت کے اسباب گنوا رہے ہوں گے اور اس منظر میں اہل دنیا کو بتایا جاتا ہے کہ اس مقام تک پہنچنے کا یہ راستہ ہے۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (۲۵) قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ

(۲۶) فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ (۲۷) اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ اِنَّهٗ هُوَ

الْبَرُّ الرَّحِيْمُ (۲۸) (۵۲ : ۲۵ تا ۲۸) "یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے (دنیا میں گزرے

ہوئے) حالات پوچھیں گے - یہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے - آخر کار اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں جھلسا دینے والی ہوا کے عذاب سے بچالیا - یہ پچھلی زندگی میں اس سے دعائیں مانگتے تھے - وہ واقعی بڑا ہی محسن اور رحیم ہے -"

راز یہ ہے کہ انہوں نے اس دن سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کی - وہ اللہ کی ملاقات سے ڈرتے تھے - اللہ کے سامنے حساب و کتاب کا انہیں ڈر تھا - وہ اپنے اہل و عیال میں تھے لیکن ڈرتے تھے - بظاہر وہ اس دنیا کے جھوٹے امن و عافیت میں تھے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو دھوکہ نہ دیا - اس جہاں میں لہو و لعب کا مشغلہ جاری تھا مگر وہ اس میں شریک نہ ہوئے -

اللہ نے ان پر احسان کیا اور ان کو سخت گرم ہوا کے عذاب سے بچایا - اس ہوا کو السموم اس لئے کہا گیا کہ یہ سم اور زہر کی طرح جسم میں حرارت داخل کرتی تھی جو نیش زن تھی اور اس عذاب سے اللہ نے ان کو محض اپنے فضل و کرم سے بچایا کیونکہ اللہ نے جان لیا کہ یہ لوگ ڈرنے والے ' محتاط اور خضوع و خشوع والے ہیں اور ان کو معلوم ہے کہ یہ ان کی صفات ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ عمل کے ذریعے کوئی بھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا - اگر اس کے ساتھ اللہ کا فضل و کرم نہ ہو کیونکہ عمل تو صرف یہ شہادت ہے کہ صاحب عمل نے جدوجہد کی اور اللہ کے ہاں جو انعامات ہیں ان کی خواہش کی - یہ بات اللہ کے فضل کی اہلیت ہے اور اللہ سے ڈرنے اور خائف ہونے کے ساتھ وہ اپنی مشکلات میں اللہ ہی کو پکارتے تھے -

اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ (۲۸ : ۵۲) "ہم پچھلی زندگی میں اس سے دعائیں مانگتے تھے" اور اللہ کی ان صفات کو جانتے تھے کہ وہ البر اور العظیم ہے -

اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ (۲۸ : ۵۲) وہ واقعی بڑا محسن اور رحیم ہے" یہ ہے راز ان لوگوں کے جنت تک پہنچنے کا - یہ مباحثہ کرتے ہیں یہ کامیاب لوگ دارالنعیم میں فی الواقع مکرم لوگ ہیں -

---ooo---

اس سورۃ کے پہلے پیراگراف میں ہم نے اچھی طرح جان لیا کہ عذاب الٰہی کیا ہوگا اور دوسرے پیراگراف میں ہم نے اللہ کی انعامات کے بارے میں جان لیا - یوں حقائق معلوم کرنے کے لئے ہمارا احساس خوب تیز ہو گیا چنانچہ سیاق کلام نہایت تیزی سے ' مختصر جملوں اور زوردار الفاظ میں نفس انسان کے پردہ احساس کے سامنے حقائق پیش کرنا شروع کرتا ہے - نفس کے اندر جو وسوسے آتے ہیں ان کا تعاقب کیا جاتا ہے اور یہ حقائق سوالات کے ذریعے ذہن انسانی پر اتارے جاتے ہیں جن کا انداز سرزنش کا ہے - چیلنج کا ہے اور بہت زوردار ہے - ان سوالات اور چیلنجوں کے سامنے انسان نہیں ٹھہر سکتا ہے -

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿٢٩﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿٣٠﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ

الْمُتَرَبِّصِينَ ﴿٣١﴾ أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُم بِهَٰذَا ۚ أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ﴿٣٢﴾ أَمْ
يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ ۚ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٣﴾ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا
صَادِقِينَ ﴿٣٤﴾ أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ﴿٣٥﴾ أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضَ ۚ بَل لَّا يُوقِنُونَ ﴿٣٦﴾ أَمْ عِندَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ
الْمُصَيْطِرُونَ ﴿٣٧﴾ أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ ۖ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُم بِسُلْطَانٍ
مُّبِينٍ ﴿٣٨﴾ أَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمُ الْبَنُونَ ﴿٣٩﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ
مُّثْقَلُونَ ﴿٤٠﴾ أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿٤١﴾ أَمْ يُرِيدُونَ كَيْدًا ۖ فَالَّذِينَ
كَفَرُوا هُمُ الْمَكِيدُونَ ﴿٤٢﴾ أَمْ لَهُمْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٤٣﴾ وَإِن
يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ ﴿٤٤﴾

"پس اے نبی تم نصیحت کیے جاؤ، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص شاعر ہے جس کے حق میں ہم گردش ایام کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان سے کہو اچھا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ کیا ان کی عقلیں انہیں ایسی ہی باتیں کرنے کے لئے کہتی ہیں؟ یا درحقیقت یہ عناد میں حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں؟ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اسی شان کا ایک کلام بنا لائیں۔ کیا یہ کسی خالق کے بغیر خود پیدا ہو گئے ہیں؟ یا یہ خود اپنے خالق ہیں یا زمین اور آسمانوں کو انہوں نے پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے۔ کیا تیرے رب کے خزانے ان کے قبضے میں ہیں؟ یا ان پر انہی کا حکم چلتا ہے؟ کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ عالم بالا کی سن گن لیتے ہیں؟ ان میں سے جس نے سن گن لی ہو وہ لائے کوئی کھلی دلیل۔ کیا اللہ کے لئے تو ہیں بیٹیاں اور تم لوگوں کے لئے ہیں بیٹے؟ کیا تم ان سے کوئی اجر مانگتے ہو کہ یہ زبردستی پڑی ہوئی چٹی کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں؟ کیا ان کے پاس غیب کے حقائق کا علم ہے کہ اس کی بنا پر لکھ رہے ہوں؟ کیا یہ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو کفر کرنے والوں پر ان کی چال الٹی ہی پڑے گی۔ کیا اللہ کے سوا یہ کوئی اور معبود رکھتے ہیں؟ اللہ پاک ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ آسمان کے ٹکڑے بھی گرتے ہوئے دیکھ لیں تو کہیں گے یہ بادل ہیں جو امڈے چلے آ رہے ہیں"۔

نبی ﷺ کو ہدایت کی جاتی ہے آپ یاددہانی کیے جائیں اور ان لوگوں کی بدسلوکی سے متاثر نہ ہوں اور ان لوگوں کی جانب سے جو اتہامات لگائے جا رہے ہیں ان کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ وہ کبھی یہ الزام لگاتے تھے کہ آپ "کاہن" ہیں۔

کبھی وہ کہتے تھے کہ آپ مجنون ہیں اور یوں وہ درپردہ ایسے الزامات لگاتے تھے جو ان کے درمیان مشہور تھے کہ کاہن اور مجنون دراصل شیاطین سے ہدایات لیتے ہیں اور شیاطین بعض لوگوں کو خبط میں مبتلا کر کے مجنون کر دیتے ہیں ۔ گویا ان دونوں صفات کی پشت پر ان کے نزدیک شیطان کام کرتا تھا اور یہ لوگ اسی وجہ سے حضور اکرمؐ پر یہ الزامات عائد کرتے تھے ۔ پھر وہ نبی ﷺ پر ساحر اور جادوگر ہونے کا الزام لگاتے تھے ۔ یہ وہ اس لئے لگاتے تھے کہ وہ قرآن کریم کے فصیح و بلیغ انداز کے سامنے ششدر رہ گئے تھے ۔ یہ قرآن اس قدر معجز تھا کہ اس قسم کا کلام کبھی انہوں نے دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ اپنی جگہ یہ اپنے آپ کو قادر الکلام سمجھتے تھے ۔ اپنی دینی بیماری کی وجہ سے یہ لوگ چونکہ اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ قرآن کو اللہ کا کلام تسلیم نہیں کریں گے ۔ اس لئے وہ اس کلام کے بارے میں کوئی نہ کوئی تاویل کرنے پر مجبور تھے ۔ کبھی کہتے ہیں حضور کو یہ کلام جن سکھاتے ہیں ۔ حضور کاہن ہیں جو جنوں سے یہ کلام لیتے ہیں ۔ یا جادوگر ہیں جو جنوں سے جادو سیکھتے ہیں یا شاعر ہیں اور خیالات جن ان پر القاء کرتے ہیں یا آپ مجنون ہیں اور شیطان نے آپ کو چھو لیا ہے اور یہ باتیں آپ سے کراتا ہے جو عجیب ہیں۔

یہ باتیں نہایت ہی جھوٹی بری اور شرمسار کنندہ اور پریشان کن ہیں لیکن اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو تسلی دیتا ہے کہ آپ ذرا بھی ان کی پرواہ نہ کریں ۔ آپ پر تو فضل و کرم ہے ۔ آپ نہ کاہن ہیں اور نہ مجنون ہیں۔

فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (۵۲ : ۲۹) "اپنے رب کے فضل سے آپ نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون" اس کے بعد ان کے اس قول پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ حضور اکرم پر شاعر ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲ : ۳۰) "کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے جس کے حق میں ہم گردش ایام کا انتظار کر رہے ہیں" انہوں نے یہ بات کہی تھی ۔ وہ ایک دوسرے کو یوں تسلی دیتے تھے یعنی اس تحریک کے مقابلے میں صبر کرو اور اپنے دین پر ثابت قدم رہو ۔ اپنے وقت پر یہ شخص مرجائے گا۔ یوں ہماری جان چھوٹ جائے گی ۔ ایک دوسرے کو کہتے کہ صبر کرو کہ یہ مرجائے ۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ سے کہا جاتا ہے کہ آپ ان کو ذرا دھمکی آمیز انداز میں کہہ دیں اچھا۔

قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ (۵۲ : ۳۱) "ان سے کہو اچھا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں" اور تمہیں جلدی معلوم ہو جائے گا کہ اچھا انجام کس کا ہونے والا ہے اور کس کو فتح و کامرانی نصیب ہوتی ہے ۔

قریش کے اکابر کو کہا جاتا تھا کہ یہ ذوی الاحلام ہیں۔ اشارہ اس طرف تھا کہ یہ بہت عقلمند ہیں اور معاملات بڑی دانشمندی سے چلاتے ہیں ۔ قرآن مجید ان کے ساتھ ان کی اس دانشمندی پر سنجیدہ مزاح کرتا ہے کہ ان کا طرز عمل تو عقل و دانش کے سراسر منافی ہے ۔ پوچھا جاتا ہے کہ حضرت محمد کے بارے میں ان کی رائے اور وحی و رسالت کا انکار کیا ان کی وہ دانشمندی ہے بلکہ یہ سرکش ہیں اور ان کی عقل جس بات کو تسلیم کرتی ہے یہ لوگ اس سے سرتابی کرتے ہیں ۔

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۵۲ : ۳۲) "کیا ان کی عقلیں انہیں ایسی ہی باتیں کرنے کے لئے کہتی ہیں؟ یا دراصل یہ عناد میں حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں" پہلے سوال میں مزاح ہے اور دوسرے سوال میں ایک ذلیل حرکت کا الزام ہے اور ان لوگوں کا جو موقف ہے اس پر ان میں سے کوئی ایک بات چسپاں ہے۔

رسول اللہ کے بارے میں ان کی زبانیں اس قدر دراز تھیں کہ انہوں نے یہ الزام لگایا کہ آپ یہ کلام اپنی جانب سے بناتے ہیں۔ اس پر بھی ایک سوال کیا جاتا ہے جو ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ اگر وہ ایسا کہتے ہیں تو یہ ان کو نہیں کہنا چاہئے۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ (۵۲ : ۳۳) "کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ خود گھڑ لیا ہے" اور اس کے بعد جلد ہی اصل حقیقت بتا دی جاتی ہے۔

بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۵۲ : ۳۳) "اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے" ان کے دلوں کو شعور ایمان حاصل نہیں ہے۔ یہی بے شعوری ہے جو ان کے منہ سے یہ بات کہلواتی ہے اور یہ قول یہ لوگ تب ہی کہتے ہیں کہ ایمان کی نعمت سے یہ لوگ محروم ہیں۔ اگر یہ قرآن کی حقیقت کا ادراک کر لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ انسان کا بنایا ہوا کلام نہیں ہے اور اس کے حامل صادق و امین ہیں۔

چونکہ اس کلام کی حقیقت ان کی عقل کے ادراک سے باہر ہے اور وہ اسے پا نہیں سکتے تو ان کو یہ چیلنج دیا جاتا ہے کہ اگر ایسا کلام اپنی جانب سے گھڑا جا سکتا ہے تو ذرا گھڑ لائیں۔

فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (۵۲ : ۳۴) "اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اسی شان کا کلام بنا لائیں" قرآن کریم میں اس چیلنج کو بار بار دہرایا گیا ہے اور منکر اس کو قبول کرنے سے عاجز رہے ہیں بلکہ نہایت بے بس رہے ہیں اور اسی طرح قیامت تک لوگ اس سے عاجز رہیں گے۔ قرآن کریم میں ایک راز ہے جو شخص بھی اس کی آیات کو پہلی بار پڑھتا ہے وہ ان کے اندر یہ خصوصیت پاتا ہے۔ چاہے اس کو اس کے اعجاز کی وجوہات معلوم ہوں یا نہ ہوں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کی عبارت میں ایک خاص قوت ہے۔ صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معانی اور تعبیرات کے علاوہ بھی قرآن کریم میں ایک خاص چیز ہے۔ قرآن مجید کو سنتے ہی اس کی یہ خصوصیت ذہن پر اثر کرتی ہے۔ بعض لوگ اسے واضح طور پر پاتے ہیں اور بعض اسے ذرا اجمال اور غموض کے ساتھ لیکن ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ قرآن کی یہ خصوصیت کیا ہے اور اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ اس کا تعین کرنا مشکل ہے۔ یا یہ اثر قرآن کے معانی کا ہے یا قرآن مجید کی صورتوں و مناظر کا ہے یا یہ اثر کلامی ہے کہ انہی لغات سے بنائے ہوئے دوسرے کلاموں اور قرآن میں یہ فرق ہے یا یہ سب امور مجتمع طور پر اعجاز فراہم کرتے ہیں یا یہ کوئی ایسی چیز ہے جو ان سے بھی ماوراء ہے۔

یہ ایک راز ہے جو ہر قرآنی آیت میں پوشیدہ ہے جو بھی قرآنی آیات کو پڑھتا ہے وہ یہ راز محسوس کرتا ہے۔ اس کے بعد ہر کوئی اپنے ظرف کے مطابق اس کے اسرار و رموز تلاش کرتا ہے اور یہ تدبر اور غور و فکر سے معلوم ہوتے ہیں اور پورے قرآن میں موجود ہیں۔

مثلاً یہ اعجاز اس کامل اور صحیح تصور کے اعتبار سے بھی ہے جو قرآن عقل و خرد کو دیتا ہے۔ وجود انسانی کی حقیقت کا تصور اس کائنات میں وجود کا تصور اور اس حقیقت "اولی" کا تصور جس سے تمام حقائق پھوٹتے ہیں یعنی اللہ کا تصور۔

پھر اس کے طریقے اور اسلوب میں بھی اعجاز ہے جس کے مطابق قرآن مجید انسان کے تصورات کی تعمیر کرتا ہے۔ قرآن کریم انسان کو فطری انداز سے خطاب کرتا ہے اور اسکا انداز تخاطب بھی مخصوص ہے۔ تمام زبانوں کے انسانی اسالیب کلام میں یہ انداز نہیں ہے۔ قرآن کریم انسانی دل اور عقل و خرد کو ہر پہلو سے پھیرتا ہے۔ اس کے اندر صالح افکار ہر جانب سے داخل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ انسان کے ساتھ اس طرح معاملہ کرتا ہے جس طرح ایک پوری طرح خبردار ذات کسی کے ساتھ کرتی ہے۔

قرآن کریم جو ہدایات دیتا ہے ان ہدایات کے اندر ایک زبردست جامعیت ہے۔ توازن ہے اور مکمل ہم آہنگی ہے اور یہ پورا کلام ایک ہی سطح اور ایک ہی معیار کا ہے۔ انسانی کلاموں میں یہ بات ہرگز نہیں پائی جاتی۔ انسانی کلام ایک حال پر نہیں ہوتے ایک سطح پر نہیں ٹھہرتے اور ہر پہلو سے معیار کو قائم نہیں رکھ سکتے اور توازن قائم کرنا تو ان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی معاملے میں کوئی زیادتی نہ ہو کوئی نقص نہ ہو۔ کوئی افراط و تفریط نہ ہو اور مکمل ہم آہنگی ہو اور کلام میں کسی جگہ تعارض یا تضاد نہ ہو نہ اصول میں نہ فروع میں۔

یہ ظاہری امور جن کا ادراک کیا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ خفیہ معجزانہ اثر جس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا اس بات کے دلائل ہیں کہ یہ معجزانہ کلام ہے اور یہ چیزیں مل کر قرآن کو صفت اعجاز دیتی ہیں۔ قرآن کی صفت اعجاز وہ چیز ہے جس میں کوئی شخص اب کلام نہیں کر سکتا جس کے حواس بحال ہوں جو محترم ہو جو حقیقت پسند ہو اور جو قرآن کا مطالعہ قوت گہرائی اور وضاحت سے کرتا ہو اور قرآن مجید کا مطالعہ قلب سلیم کے ساتھ کرتا ہو۔

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ (۵۲ : ۳۴) ”اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اس شان کا ایک کلام بنا لائیں۔“ دوسرا سوال خود ان کے وجود کی حقیقت کے بارے میں ہے۔ خود ان کے اپنے وجود کی حقیقت یہ تو ایک حقیقت ہے جس سے وہ انکار نہیں کر سکتے کہ وہ ہیں اور قرآن کے بغیر بھی اگر وہ عقلمند ہیں تو وہ اس کی کوئی تفسیر کریں گے۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ایک خالق ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اس کی تعبیر ہم اللہ سے کرتے ہیں۔ وہ بذاتہ موجود ہے اور یہ انسان مخلوق ہیں۔

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ (۵۲ : ۳۵) ”کیا یہ کسی خالق کے بغیر پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود اپنے خالق ہیں“ ان کا وجود کسی چیز کے بغیر اس طرح ہونا فطرت کی منطق کے خلاف ہے اور اس نکتے پر کسی طویل یا کثیر جدل و جدال کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات کہ یہ خود اپنے آپ کے خالق ہیں تو اس کا کوئی قائل نہ تھا نہ وہ لوگ اس کے قائل تھے اگر یہ دونوں باتیں فطری استدلال کے خلاف ہیں تو پھر تیسری صورت وہی رہ جاتی ہے جسکی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے کہ یہ سب اللہ کی مخلوق ہیں اور اس تخلیق میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ لہذا ربوبیت، عبادت اور اطاعت میں بھی اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ نہایت سادہ اور فطری حقیقت ہے۔

ان کے تصور کو ذرا آسمانوں کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے کیا اس وسیع کائنات کی انہوں نے تخلیق کی ہے۔ یہ کائنات خود بھی اپنی خالق نہیں ہے جس طرح یہ اپنے نفوس کے خود خالق نہیں۔

اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ (۳۶:۵۲) "یا زمین و آسمانوں کو انہوں نے پیدا کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے" یہ لوگ بھی اور ہر عقلمند شخص جو فطری انداز میں سوچتا ہو اس بات کا قائل نہیں ہو سکتا کہ زمین اور آسمانوں نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا یا بغیر خالق کے پیدا ہوئے یا خود انہوں نے یعنی کسی انسان نے ان کو پیدا کیا ہے۔ یہ سوالات ہیں جن کا جواب ہر کسی کو دینا ہے اور ان کا حال تو یہ تھا کہ جب ان سے یہ سوال کیا جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ اللہ نے پیدا کیا ہے لیکن یہ حقیقت ان کے ادراک میں اس قدر واضح نہ تھی کہ وہ ان کے دلوں اور ان کی سوچ اور ان کے طرز عمل میں کوئی تغیر پیدا کرے اور وہ کوئی واضح عقیدہ اپنائیں۔

بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ (۳۶:۵۲) "اصل بات یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے" اب تخلیق سے ذرا نیچے آکر ذرا کم درجے کا سوال کیا جاتا ہے چلو تم اپنے آپ کے اس کائنات کے خالق تو نہیں ہو تو کیا تم زمین کے خزانوں کے حوالدار ہو۔ کیا تم لوگوں کے معاملات کے اختیاری ہو۔ اللہ ہی ہے جو کسی کو تھوڑا کسی کو زیادہ دیتا ہے۔ وہی مدبر اور متصرف ہے اور یہی تفسیر قابل عمل ہے اور دل لگتی ہے۔ اسی صورت حالات کی جو اس جہان میں چلتی ہے جب اللہ کے خزانوں کے مالک یہ نہیں اور زمین کے معاملات ان کے اختیار میں نہیں تو پھر اللہ کے سوا اور کون ہے؟

اب ایک درجہ اور نیچے آکر ان سے بات کی جاتی ہے۔ کیا تم قرآن کو منجانب اللہ نہیں سمجھتے تو اللہ کے ہاں تمہاری رسائی کا کوئی ذریعہ ہے جس سے تمہیں معلوم ہو گیا کہ قرآن وہاں سے نہیں ہے۔

اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ یَّسْتَمِعُوْنَ فِیْهِ فَلْیَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (۳۸:۵۲) "کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ عالم بالا کی سن گن لیتے ہیں؟ ان میں سے جس نے سن گن لی ہو وہ لائے کوئی کھلی دلیل۔" حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور ان کی طرف وحی آتی ہے اور یہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور یہ لوگ تکذیب کرتے ہیں۔ کیا ان کے پاس عالم بالا کے معلومات کا کوئی ذریعہ ہے؟ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی نہیں کی جاتی اور سچائی اور ہے لہٰذا اس قسم کی سن گن رکھنے والا کوئی دلیل لے آئے۔ ایسی دلیل کہ وہ بذات خود اپنی قوت اپنے اندر رکھتی ہو جس کے نتیجے میں انسان تصدیق کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اس میں اشارہ ہے ان دلائل کی طرف جو قرآن دیتا ہے کہ یہ دلائل دراصل سلطان مبین ہیں اور دل و دماغ کو فوراً قبضے میں لیتے ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں یہ لوگ عناد اور ہٹ دھرمی کرتے ہیں۔

اب اللہ کے بارے میں ان کے اس قول کو لیا جاتا ہے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور یہ خطاب براہ راست مشرکین مکہ سے کیا جاتا ہے اور یہ ان کو زیادہ شرمندہ اور ذلیل کرنے کے لئے ہے۔

اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ (۳۹:۵۲) "کیا اللہ کے لئے تو بیٹیاں ہیں اور تم لوگوں کے لئے ہیں بیٹے" ان کے خیال میں بیٹیاں بیٹوں سے کم درجے کی مخلوق تھیں۔ یہاں تک کہ جب کسی کو بتایا جاتا کہ اس کے ہاں بچی پیدا ہوئی ہے تو وہ غم پریشانی اور ناپسندیدگی کی وجہ سے سیاہ رو ہو جاتا تھا لیکن اپنے ان خیالات کے باوجود وہ اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت میں شرم محسوس نہ کرتے تھے۔ یہاں اللہ خود ان کے رواج اور رسم کے مطابق ان پر اعتراض کرتا ہے

تاکہ وہ ذرا اپنے اس دعویٰ پر شرم محسوس کریں حالانکہ ان کا یہ خیال بھی غلط اور قابل اصلاح تھا۔

نبی ﷺ ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ اسے وہ ایک بڑا بوجھ محسوس کرتے تھے حالانکہ آپ دعوت خالص فی سبیل اللہ دیتے تھے۔ کوئی اجر طلب نہ فرماتے تھے نہ ان پر کوئی ٹیکس لگانا چاہتے تھے۔ ان کو چاہئے تو یہ تھا کہ اس مفت تعلیم کی وجہ سے حضور کے ساتھ احسان کرتے اور اگر قبول نہ کرتے تھے تو بھی شریفانہ انداز میں اسے قبول نہ کرتے۔ لہذا ان کا رویہ بالکل بے جواز ہے۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (۵۲ : ۴۰) "کیا تم ان سے کوئی اجر مانگتے ہو کہ یہ زبردستی پڑی ہوئی چٹی کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں" یعنی یہ اس مالی بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتے جو تم ان پر ڈال رہے ہو۔ تو اگر واقعہ یہ ہے کہ نہ تو اجرت طلب ہو رہی ہے اور نہ تم پر کوئی بوجھ ڈالا جا رہا ہے تو پھر تمہارا رویہ کس قدر قبیح اور ذلیلانہ ہے۔ تمہیں اپنے رویہ پر سوچ کر شرمندہ ہونا چاہئے؟

اس کے بعد دوبارہ ان کے سامنے ان کے وجود اور اس کائنات میں ان کے حالات کو پیش کیا جاتا ہے کہ یہ بندے ہیں اور ان کے کچھ حدود ہیں۔ اس کائنات میں ان پر بہت ہی امور مخفی ہیں اور کچھ تھوڑے ہی امور ایسے ہیں جن کے بارے میں وہ جانتے ہیں باقی امور سب راز ہیں اور ان کو اس کائنات کا مالک ہی جانتا ہے۔ عالم غیب کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ اس کے اندر نہیں جا سکتے کیونکہ یہ بندے ہیں۔

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ (۵۲ : ۴۱) "کیا ان کے پاس غیب کے حقائق ہیں کہ اسکی بنا پر یہ لکھ رہے ہیں" ان کو معلوم ہے کہ ان کے پاس غیب کا علم نہیں ہے اور نہ وہ غیب کے علم سے لکھ رہے ہیں نہ ان کو اس پر قدرت ہے کہ غیب میں وہ کوئی فیصلے لکھیں۔ یہ اللہ ہی ہے جو غیب کی کتابوں میں بندوں کی تقدیر لکھتا ہے۔

جو ذات غیب جانتی ہے وہی تدبیر امور کر سکتی ہے۔ تقدیروں کے فیصلے کر سکتی ہے۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ غیب نہیں جانتے اور غیب کے ذخائر میں وہ کچھ بھی ثبت نہیں کر سکتے۔ اس لئے وہ آپ کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ نہ یہ لوگ آپ کے مستقبل میں تصرف کر سکتے ہیں نہ کوئی سازش کر سکتے ہیں۔

اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ (۵۲ : ۴۲) "کیا یہ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں اگر یہ بات ہے تو کفر والوں پر ان کی چال الٹی پڑے گی) یعنی اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب ہے اس کی تدبیر ان کو گھیر لے گی اور اللہ کی تدبیریں ان پر پڑیں گی کیونکہ اللہ بہت ہی بہترین تدبیریں کرنے والا ہے۔

اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ (۵۲ : ۴۳) "کیا اللہ کے سوا یہ کوئی اور معبود رکھتے ہیں" جو ان کو بچانے والا ہے اور اللہ کے عذاب سے وہ ان کو بچا لے گا۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۵۲ : ۴۳) "اللہ پاک ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں" اللہ کے بارے میں وہ جو تصورات رکھتے ہیں وہ باطل ہیں۔

رد شرک پر اب یہ حملہ اختتام پذیر ہوتا ہے جو ایک منظم حملہ تھا اور جس کا ہر قدم دوسرے قدم پر منظم تھا جس کے ہر فقرے کا بہت بڑا اثر ہوا۔ اس حملے میں ان تمام شبہات تمام دلائل اور تمام خیالات کو رد کر دیا گیا اور وہ بے بس کر کے رکھ دیئے گئے اور یہ بات ثابت کر دی گئی کہ یہ لوگ حقیقت کا انکار کرنے والے ہیں۔ عناد کرنے والے ہیں۔ واضح حق میں شک کرنے والے ہیں اور دور دراز کے شبہات کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں بلکہ یہ لوگ ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔

وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ (۵۲: ۴۴) "یہ لوگ آسمان کے ٹکڑے بھی گرتے دیکھ لیں تو کہیں گے کہ یہ بادل ہیں جو امنڈے چلے آرہے ہیں" مطلب یہ ہے کہ اگر ان پر عذاب بھیجا جائے اور یہ اسے دیکھ لیں کہ وہ ایک آسمان کے ٹکڑے کی شکل میں آرہا ہے اور ان پر گرنے ہی والا ہے اور اس سے وہ ہلاک ہونے والے ہیں تو پھر بھی یہ کہیں گے کہ سحاب مرکوم (کہ یہ بادل ہے جو امنڈتا چلا آرہا ہے) اور اس میں پانی ہے جو ان کے لئے سبب حیات ہوگا۔ یہ بطور ہٹ دھرمی ایسا کہیں گے۔ یہ کسی صورت میں بھی حق کو تسلیم کرنے والے نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کے سروں پر تلوار لٹک رہی ہو۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں اس میں اشارہ قوم عاد کے واقعہ کی طرف ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ طوفان باد و باراں آرہا ہے تو کہا۔

عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (یہ بادل ہے جو بارش برسائے گا) اور وہاں ان کو یہ جواب دیا گیا تھا۔

بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا "بلکہ یہ تو وہ چیز ہے جس کی تم جلدی مچا رہے تھے ایک ہوا جس کے اندر دردناک عذاب ہے یہ اللہ کے حکم سے ہر چیز کو نیست و نابود کرنے والی ہے"۔

ان کے عناد اور ہٹ دھرمی کی اس تصویر کشی کے بعد اگرچہ ان کے سروں پر لٹکتی ہوئی تلوار کی طرح عذاب بھی آجائے، روئے سخن اب نبی ﷺ کی طرف پھر جاتا ہے تاکہ ان کے معاملے سے ہاتھ جھاڑ کر ان کو اس انجام سے دوچار ہونے کے لئے چھوڑ دیں جس کا ذکر اس سورۃ کے آغاز میں آیا ہے۔ اور اللہ کی طرف سے ایک سے ایک سخت عذاب ان کے انتظار میں ہے اور اللہ کے احکام کا انتظار کریں جو زبردست ہے اور جو آپ کا نگہبان ہے اور ہر وقت آپ پر نظر رکھتا ہے اور اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ صبح کے وقت جب اٹھو اور رات کے وقت جب اٹھو اور اس وقت جب ستارے غائب ہو جائیں۔

فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ۝ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ
عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ
ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ
بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ

۲

۲۱ع وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾

۴

"پس اے نبیؐ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، یہاں تک کہ یہ اپنے اس دن کو پہنچ جائیں جس میں یہ مار گرائے جائیں گے جس دن نہ ان کی اپنی کوئی چال ان کے کسی کام آئے گی نہ کوئی ان کی مدد کو آئے گا اور اس وقت کے آنے سے پہلے بھی ظالموں کے لئے ایک عذاب ہے مگر ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں"۔

اے نبیؐ اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، تم ہماری نگاہ میں ہو تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، رات کو بھی اس کی تسبیح کیا کرو اور ستارے جب پلٹتے ہیں اس وقت بھی۔

یہ مخالفین پر ایک نیا تنقیدی حملہ ہے۔ اس کا آغاز ایک شدید دھمکی اور تہدید سے ہوتا ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو یہ سب لوگ مار گرائے جائیں گے اور یہ واقعہ حشر و نشر اور قیامت میں اٹھانے سے قدرے پہلے ہوگا۔ اس دن ان کی کوئی تدبیر ان کے کام نہ آئے گی۔ آج تو یہ لوگ تحریک اسلامی کے خلاف کچھ نہ کچھ تدابیر کرتے ہیں لیکن اس دن کوئی تدبیر ان کے کام نہ آئے گی۔ قیامت سے پہلے بھی ان پر عذاب آنے والا ہے لیکن ان کو پتہ نہیں ہے۔

اس آخری دھمکی کے بعد مکذبین کے معاملے سے یہ حملہ فارغ ہو جاتا ہے۔ اس سے قبل اس سورت نے ان کا خوب تعاقب کیا اور سخت حملے ان پر کئے اور آخر میں کہہ دیا کہ قریبی عذاب بھی ان کے انتظار میں ہے اور دور کا عذاب بھی ان کے انتظار میں ہے۔ اب روئے سخن نبی کریم ﷺ کی طرف ہے جن پر زیادتیاں کرنے والے زیادتی کرکے طرح طرح کی باتیں آپ کے خلاف بناتے تھے۔ آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں۔ یہ مشکلات دور ہونے والی ہیں۔ یہ مکذبین خود عذاب سے دوچار ہونے والے ہیں دعوت کا راستہ دشوار گزار ہے اور طویل ہے اور اس پر صبر ہی کرنا طریقہ دعوت ہے۔ انجام اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔ فیصلہ اسی نے کرنا ہوتا ہے۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ (۵۲ : ۴۸) "آپ اپنے رب کے فیصلے تک صبر کریں" لیکن صبر کے حکم کے ساتھ ساتھ آپ کو ایک زبانی اعزاز بھی دیا جاتا ہے۔ اللہ کی عنایت کے لئے آپ مستحق قرار پاتے ہیں۔ آپ کو ایسی محبت دی جاتی ہے کہ اس دست محبت سے آپ کے تمام الم اور تھکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور یہ فرمایا جاتا ہے کہ مشکلات پر صبر اللہ کے نزدیک بہت ہی محبوب اور پسندیدہ امر ہے اور یہی اس اعزاز کا ذریعہ اور نسبت ہے۔

• صْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (۵۲ : ۴۸) "اے نبی اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، تم ہماری نگاہ میں ہو" کیا ہی خوبصورت تعبیر ہے اور کیا ہی بہترین تصویر ہے اور کس قدر بڑا اعزاز ہے۔

یہ وہ مقام اعزاز ہے جس تک کوئی انسان نہیں پہنچ سکا۔ پورے قرآن میں اس مقام کو اس قدر خوبصورت انداز میں نہیں دکھایا گیا یہاں تک کہ دوسرے نبیوں کے لئے ایسی ہی ہدایات کے موقع پر بھی کوئی ایسی خوبصورت تعبیر نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ ؑ کو کہا گیا۔

• انا اخترتك فاستمع لما يوحى "اور میں نے آپ کو چن لیا ہے لہٰذا جو آپ کی طرف وحی کی جاتی

ہے اسے سفو" اور یہ بھی کہا گیا تھا۔

وَ اَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ "اور میں نے اپنی طرف سے تم پر ایک محبت ڈال دی تاکہ تمہاری پرورش میری آنکھوں کے سامنے ہو۔" اور دوسری جگہ کہا گیا۔

وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ "میں نے تجھے اپنے لئے بنایا ہے" یہ سب تعبیرات بتاتی ہیں کہ حضرت موسیٰ ؑ کا مرتبہ نہایت ہی بلند تھا لیکن اس کے مقابلے میں حضور اکرم کے لئے جو الفاظ استعمال ہوئے وہ یہ ہیں۔

فَاِنَّكَ بِاَعْیُنِنَا (۵۲ : ۴۸) "تم ہماری نگاہ میں ہو" یہ ایک ایسا انداز ہے جس میں خصوصی اعزاز نظر آتا ہے۔ خصوصی محبت نظر آتی ہے۔ اس میں ایسے رنگ ہیں جو نہایت ہی لطیف اور حسین ہیں۔ انسانی لغت تعبیرات پیش کرنے سے عاجز ہے۔ ہمارے لئے یہ کافی ہے کہ ہم ان رنگوں میں زندگی بسر کریں اور صرف اس طرف اشارہ کر دیں۔ اس محبت کے ساتھ دائمی ربط کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِیْنَ تَقُوْمُ (۵۲ : ۴۸) وَ مِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ (۵۲ : ۴۹) "تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو، رات کو بھی اس کی تسبیح کیا کرو اور ستارے جب پلٹتے ہیں اس وقت بھی۔" رات دن، سونے سے اٹھتے وقت، رات کے وقت اور صبح کو جب ستارے ڈوب جاتے ہیں۔ یہ وہ اوقات ہیں جن میں اس محبت کے تعلق سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اللہ کی تسبیح ایک زاد راہ ہے۔ محبت الٰہی ہے اور دلوں کی مناجات ہے پھر محبت کرنے والے دل سے ہو تو اس کے کیا کہنے؟

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ـ ۲۷

سورۃ النجم ـ ۵۳

۱ ـ تا ـ ۶۲

سورۃ النجم ایک نظر میں

یہ سورت اپنی عبارت کے لحاظ سے اپنے اندر نظم اور موسیقی رکھتی ہے اور نغمہ پرور ہے۔ اس کی لفظی ساخت میں نغمہ سرایت کئے ہوئے ہے اور اسکی آیات کے آخر میں جو سجع اور قافیہ ہے وہ بہت ہی موزوں اور نغمہ بار ہے۔ اس سورۃ کی موسیقی اور اس کا ترنم اس کے آغاز سے انتہا تک نظر آتا ہے۔ بعض مقامات تو ایسے ہیں جن میں صاف نظر آتا ہے کہ قافیہ کی خاطر ایک لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے یا قافیہ والے لفظ کو ترجیح دی گئی ہے تاکہ ترنم اور اس کا اثر جاری رہے لیکن معانی اور مفہوم اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک ادا کئے گئے ہیں مثلاً۔

اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی (۱۹) وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی (۵۳ : ۲۰) "اب ذرا بتاؤ، تم نے کبھی اس لات اور عزیٰ اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر غور کیا ہے۔" اگر یہاں صرف یہ کہا جاتا۔

وَمَنٰوۃَ الْاُخْرٰی (۵۳ : ۲۰) تو آیات کا وزن ٹوٹ جاتا اور اگر یہ کہا جاتا۔

وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ (۵۳ : ۲۰) تو قافیہ اور آیت کے آخری سجع کا اثر ختم ہو جاتا اور معنوی اعتبار سے بھی ہر لفظ کی ایک معنوی اہمیت ہے لہٰذا وزن اور قافیہ کی رعایت بھی یہاں ملحوظ نظر آتی ہے۔ اسی طرح اس کے بعد کی آیت میں لفظ اِذًا کو کس خوبصورتی کے ساتھ بڑھایا گیا ہے۔

تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی (۵۳ : ۲۲) "یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہے" یہاں اذن کا لفظ وزن کے لئے ضروری تھا۔ اگرچہ عبارت میں فنی ادائیگی مطلب کے لئے ضروری نہ تھا۔

سروں کی یہ موزونیت اپنے اندر ایک خاص موسیقی کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ آواز اس طرح رواں ہے جس طرح لہریں اٹھ رہی ہیں یا ندی کا بہاؤ ہے۔ خصوصاً سورۃ کے پہلے پیراگراف اور آخری پیراگراف میں۔ پہلے پیراگراف میں جن تصاویر اور جن سایوں کا ذکر ہے وہ عالم بالا کی پھڑ پھڑاتی تصاویر ہیں جبکہ آخری پیراگراف میں بھی عالم بالا کی فضا اور حساسیت ہے اور درمیانی پیراگرافوں میں بھی یہ موزونیت حسب ضرورت ہے اور ان دونوں پیراگرافوں کے قریب قریب ہے۔

پہلے پیراگراف کی تصاویر اور رنگ ڈھنگ کا تعلق عالم بالا کے نورانی واقعات کے ساتھ ہے کیونکہ اس پیراگراف میں عالم بالا کے مناظر بیان ہوتے ہیں۔ روح الامین کی حرکات و تصرفات جبکہ وہ رسول اللہ کے سامنے آتے ہیں چنانچہ تصاویر، حرکات، مشاہد اور ان کی روحانی فضا موزوں سروں میں دیر تک چلتی ہے اور اس پیراگراف میں الفاظ کی موزونیت اور ترنم اور ہم آہنگی بہت ہی عجیب ہے۔

یہ رنگ و بو پوری سورۃ کی فضا پر چھائی ہوئی ہے اور دوسرے پیروں میں بھی اس کے آثار موجود ہیں اور سب سے آخر میں نہایت ہی موثر اشارات ہیں جن کے سامنے انسان وجود کا ذرہ ذرہ کانپ اٹھتا ہے اور لبیک کہنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اس سورت کا موضوع وہی ہے جو بالعموم مکی سورتوں کا ہوتا ہے۔ اسلامی عقیدہ اور نظریہ اور اس کے اساسی عناصر۔ یعنی وحی ' رسالت ' وحدانیت اور آخرت۔ یہ سورت ایک متعین زاویہ سے ان موضوعات کو لیتی ہے مثلاً وحی کی صداقت اور اس کی پختگی ' عقیدہ شرک اور اس کی کمزوری اور اس کے اساس کی کمزوری اور افسانوی حیثیت۔

پہلے حصے میں حقیقت وحی ' وحی کا مزاج ' وحی کی نوعیت اور وحی سے متعلق دو مناظر اور ان مناظر کی شکل میں وحی کا ثبوت اور اس کی صحت اور وقعیت اور یہ تاکید کہ حضور ﷺ نے یہ وحی جبرائیل سے حاصل کی۔ آپ نے ان کو دیکھا اور اللہ کی آیات کبریٰ کو دیکھا۔

دوسرے پیراگراف میں مشرکین کے خود ساختہ الہوں کا ذکر ہے۔ لات ' منات اور عزیٰ کا۔ پھر فرشتوں کے بارے میں ان کے جو واہی خیالات تھے اور جو افسانے انہوں نے تصنیف کر رکھے تھے ان کی طرف اشارات ہیں کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور اس قسم کے عقائد کا ماخذ ان کے ہاں محض ظن و گمان تھا جو حق کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا جبکہ رسول اللہ ﷺ ان کو جس بات کی دعوت دے رہے تھے وہ یقینی ' ثابت اور آپ کی دیکھی ہوئی تھی۔

تیسرے پیراگراف میں حضور کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ آپ ان لوگوں سے منہ موڑ لیں جو لوگ ہر حال میں سرکشی پر تلے ہوئے ہیں اور جن کی ترجیحات میں بھی دنیا اور اسکی زندگی ہے جو بس اس دنیا کے کنارے تک سوچتے ہیں اور اس سے آگے کچھ نہیں جانتے۔ یہاں آخرت کا نقشہ بیان کیا جاتا ہے جو کہ اعمال پر مبنی ہے۔ اللہ کے پورے علم پر ہے اور اللہ ان کے تمام اعمال کو اس وقت سے جانتا ہے جب یہ ماؤں کے پیٹ میں جنین تھے۔ وہ خود ان کے اپنے اپنے بارے میں علم سے بھی ان کے بارے میں زیادہ جانتا ہے۔ لہٰذا ان کا حساب و کتاب علم و یقین پر ہوگا' ظن و تخمین سے نہ ہوگا اور اس طرح ان کا تصفیہ ہوگا۔

آخری پیراگراف میں اسلامی نظریہ حیات کے اصول لئے گئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ تمام رسولوں کے ہاں یہی اصول دعوت رہے ہیں۔ یہ کہ ہر شخص اپنے اعمال کا حقدار و ذمہ دار ہے۔ حساب و کتاب صحیح ہوگا۔ منصفانہ ہوگا اور تمام لوگ آخر کار رب تعالیٰ کے سامنے جائیں گے اور یہ کہ اس دنیا میں اللہ ہی اپنی مخلوق میں تصرفات کرتا ہے۔ یہاں امم سابقہ کی طرف بھی اشارات ہیں اور آخری نغمہ ہے۔

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى (۵۶) اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ (۵۷) لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ (۵۸) اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ (۵۹) وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ (۶۰) وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ (۶۱) فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۵۳: ۶۲) ع (السجدۃ) (۵۳: ۵۶ تا ۶۲) "یہ ایک تنبیہہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے۔ آنے والی گھڑی قریب آ لگی ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اس کو ہٹانے والا نہیں۔ اب کیا یہی وہ باتیں ہیں جن پر تم اظہار تعجب کرتے ہو؟ ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو اور گا بجا کر انہیں ٹالتے ہو۔ جھک جاؤ اللہ کے آگے اور بندگی کرو"

درس نمبر ۲۵۲ تشریح آیات

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۶۲

سُورَةُ النَّجْمِ (۵۳) مَكِّيَّةٌ (۲۳) — اٰيَاتُهَا ۶۲ — رُكُوْعَاتُهَا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝۱ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝۲ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳
اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝۵ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۝۶ وَهُوَ
بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝۷ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝۸ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝۹ فَاَوْحٰى
اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۝۱۰ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝۱۱ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝۱۲
وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝۱۳ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝۱۴ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝۱۵
اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝۱۶ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝۱۷ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ
رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝۱۸

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے تارے کی جب کہ وہ غروب ہوا۔ تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے۔ وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔ یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔ اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے۔ جو بڑا صاحب حکمت ہے۔ وہ سامنے آکھڑا ہوا جبکہ وہ بالائی افق پر تھا۔ پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہوگیا۔ یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اسے پہنچانی تھی۔ نظر نے جو کچھ دیکھا، دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا۔ اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے؟ اور ایک مرتبہ پھر اس

نے سدرۃ المنتہی کے پاس اس کو اترتے دیکھا جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے ۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں" ۔

اس پیراگراف میں ہم نہایت ہی بلند روشن اور پھڑپھڑانے والے افق پر ہیں جہاں حضرت محمد ﷺ کے قلب مبارک نے چند خوبصورت اور نورانی لمحات عالم بالا کے ساتھ گزارے ۔ ایک نہایت ہی نرم' دھیمی موجوں پر مشتمل اور ترکیب پانے والے ترنم میں ۔ ہم ان پرکیف لمحات کے رنگ ڈھنگ اور اشارات سنتے ہیں ۔ الفاظ ان کی موسیقیت اور ماحول سب ہی پرکیف ہیں ۔

یہ واردات قلب محمد ﷺ کے وہ لمحات ہیں جن میں آپ کی نظروں کے سامنے سے تمام حجابات ہٹا دیے گئے ہیں اور آپ عالم بالا سے ہدایات اور وحی لے رہے ہیں' دیکھ رہے ہیں اور سن رہے ہیں ۔ آپ کا قلب حفظ کر رہا ہے ۔ یہ لمحات کیسے تھے اس کا صحیح احساس تو صیقل شدہ قلب محمدؐ ہی کو ہو گا لیکن اللہ کا کرم کہ اس نے ہم بندوں کے لئے اس واردات کو الفاظ میں بیان کر دیا ۔ نہایت ہی موثر انداز میں ایسی موسیقی کے ساتھ جو پانی کی طرح بہتی ہے جس میں تلمیحات کے رنگ ڈھنگ اور ماحول اور اشارات کو ہماری طرف منتقل کیا گیا ہے ۔ یہ اس صیقل شدہ دل کا سفر تھا اور عالم بالا کی وسعتوں میں تھا ۔ ایک ایک قدم کی تصویر ہماری نظروں میں آ رہی ہے ۔ ایک ایک منظر' ایک ایک قدم اور اس انداز میں کہ گویا ہم ابھی دیکھ رہے ہیں ۔

آغاز ایک قسم سے ہوتا ہے ۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۵۳ : ۱) "قسم ہے تارے کی جب غروب ہو" ستارہ غروب ہوتا ہے زمین کے قریب ہو کر اس کی قسم ہے اور جس بات پر قسم ہے وہ یہ ہے کہ حضرت جبریل یوں تھے ۔

وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (۵۳ : ۷) ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى (۵۳ : ۸) فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (۵۳ : ۹) فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (۵۳ : ۱۰) "جبکہ وہ بالائی افق پر تھا پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا ۔ یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ فاصلے پر رہ گیا ۔ تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اس نے پہنچائی" تو ستارے کی حرکت اور حضرت جبرائیل کی حرکت کے درمیان نہایت ہم آہنگی اور یکرنگی ہے ۔ یوں اس منظر میں ماحول' حرکت اور موزونیت ابتدا ہی سے چلتی ہیں ۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۵۳ : ۱) "قسم ہے ستارے کی جب غروب ہو" کی تفسیر میں مختلف تفسیریں نقل کی گئی ہیں ۔ زیادہ قریب الفہم یہ تفسیر ہے کہ اس سے شعریٰ ستارہ مراد ہے کیونکہ بعض عرب اسے پوجتے تھے اور بعد میں اس سورۃ میں اس کا ذکر بھی آیا ہے ۔

وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى (۵۳ : ۴۹) "اور وہی شعریٰ کا رب ہے" پرانے لوگ شعریٰ ستارے کو بہت اہمیت دیتے تھے ۔ یہ مشہور ہے کہ پرانے مصری یہ کہتے تھے کہ جب شعریٰ اعلیٰ افلاک کو عبور کرے تو نیل میں پانی کا

طوفان آجاتا تھا۔ اس لئے وہ شعریٰ کو دیکھتے رہتے تھے اور اسکی حرکت کو نوٹ کرتے تھے۔ ایرانیوں اور عربوں دونوں کی روایات میں اس کے بے شمار افسانے مشہور ہیں۔ لہٰذا یہاں ستارے سے مراد یہی شعریٰ ہے اور یہاں قسم اور مقسم علیہ کے درمیان ہم رنگی بھی مقصود ہے جو اس ستارے کے غروب سے ظاہر ہے۔ پھر یہاں یہ اشارہ بھی دینا مقصود ہے کہ ستارہ اگر بہت بڑا ہی کیوں نہ ہو' وہ غروب اور غائب ہونے والا ہے۔ معبود تو وہ ہونا چاہئے جسے زوال و غروب نہ ہو۔ یہ تو تھی قسم جس بات پر قسم اٹھائی گئی ہے وہ یہ ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (٥٣ : ٢) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (٥٣ : ٣) اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (٥٣ : ٤) "تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے۔ وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔ یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل ہوجاتی ہے۔" تمہارا ساتھی صحیح راہ پر ہے وہ گمراہ نہیں ہوا۔ وہ صراط مستقیم پر ہے۔ کسی ٹیڑھی راہ پر نہیں چل رہا ہے۔ وہ مخلص ہے' مطلب پرست نہیں ہے۔ وہ حق کی تبلیغ کر رہا ہے نہ وہم پرست ہے نہ افترا پرداز ہے اور نہ بدعتی ہے اور نہ وہ تمہیں جو تبلیغ کر رہا ہے اس میں اس کے ہوائے نفس کا کوئی دخل ہے۔ وہ وہی کچھ کہتا ہے جو وحی ہوتی ہے اور وہ صادق و امین ہے۔ اس لئے وہ سچ کی تبلیغ کرتا ہے۔

اس وحی کے حاملین معلوم ہیں اس کا طریقہ کار متعین ہے اور اس کو لانے والوں کو حضور نے خود دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے۔ یہ محض کوئی موہوم بات نہیں ہے نہ آپ کو کسی غیبی قوت نے دھوکہ دے دیا ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى (٥) ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى (٦) وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (٧) ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى (٨) فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (٩) فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى (١٠) مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (١١) اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى (١٢) وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (١٣) عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (١٤) عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (١٥) اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (١٦) (٥٣ : ٥ تا ١٦) "اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے جو بڑا صاحب حکمت ہے۔ وہ سامنے آکھڑا ہوا جبکہ وہ بالائی افق پر تھا پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہوگیا یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اسے پہنچانی تھی۔ نظر نے جو کچھ دیکھا دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا۔ اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے۔"

یہ شدید القویٰ اور ذو مرہ (یعنی قوت والے) کون ہیں؟ یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ وحی سکھائی ہے جسے وہ آپؐ کو پہنچا رہے ہیں۔ یہی راہ ہے اور یہی سفر ہے اور اس راہ و رسم کے تمام منازل اور مقامات واضح ہیں۔ اعلیٰ افق پر وہ سیدھے سیدھے کھڑے تھے۔ حضور اکرمؐ نے انہیں دیکھا۔ یہ آغاز وحی

کا منظر ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام کو اس صورت میں دیکھا جس پر اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے۔ یہ بہت ہی عظیم خلقت والے ہیں۔ جب حضورؐ کو نظر آئے تو پورے افق پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ حضورؐ کے قریب آتے گئے۔ وہ بہت قریب آگئے۔ دو کمانوں کے فاصلے سے بھی قریب۔ تو اس قریب کی حالت میں انہوں نے حضورؐ کی طرف وحی فرمائی جو کچھ انہوں نے وحی کرنا تھا۔ کر دیا "جو کچھ وحی کرنا تھا" یہ اجمال دراصل وحی کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جبرائیل علیہ السلام کا ظہور تو دور افق اعلیٰ پر ہوا لیکن وحی کی تلقین انہوں نے نہایت ہی قریب آکر کی اس لئے اس کی تلقی اور اخذ میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے حضرت جبرائیل کو ایسی حالت میں دیکھا ہے کہ وہ بہت ہی یقینی حالت ہے۔ اس دیکھنے میں کوئی اشتباہ نہ تھا نہ غلط فہمی کا کوئی احتمال تھا اور نہ شک اور بحث کی گنجائش ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (۱۱) اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى (۵۳: ۱۲) "نظر نے جو دیکھا دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا۔ اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے" نہ صرف نظر سے دیکھا ہے آپ نے بلکہ دل سے بھی دیکھا ہے اور نظر میں تو فریب نظر ہو سکتا ہے لیکن دل میں فریب ممکن نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا اور آپ کے قلب نے یقین کیا کہ یہ فرشتہ ہے۔ حامل وحی ہے 'اللہ کا فرستادہ ہے۔ آپؐ کی طرف تاکہ آپ کو وحی دے اور آپ تبلیغ کریں اور یہ جھگڑا اب ختم ہے کیونکہ آپ کے قلب نے اس حقیقت پر یقین کر لیا ہے اور آپ صادق و امین ہیں۔

پھر محمد ﷺ نے اس فرشتے کو صرف ایک ہی مرتبہ نہیں دیکھا۔ دوسری بار بھی دیکھا ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (۱۳) عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (۱۴) عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (۱۵) اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (۱۶) مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (۱۷) لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (۱۸) (۵۳: ۱۳ تا ۱۸) "اور ایک مرتبہ پھر اس نے سدرۃ المنتہی کے پاس اس کو اترتے دیکھا جہاں پاس ہی جنت الماوی ہے۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا نگاہ نہ چندھائی نہ حد سے متجاوز ہوئی اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں"

یہ واقعہ واضح روایات کے مطابق شب معراج میں پیش آیا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام آپؐ کے قریب آئے اور وہ اس ہیئت اور خلقت میں تھے جس پر اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اس وقت یہ سدرۃ المنتہی کے پاس تھے۔ سدرہ ایک درخت ہے۔ بیری کا درخت۔ المنتہی کے معنی یہ ہیں کہ جہاں کوئی حد آکر ختم ہوتی ہے اور وہیں جنت الماوی ہے۔ یہ وہ حد ہے جہاں تک شب معراج کو آپ کی سواری گئی۔ جہاں جاکر حضور اکرم اور جبرائیل علیہ السلام کی رفاقت ختم ہوئی۔ جہاں جبرائیل جاکر رک گئے اور حضرت محمد ﷺ اس سے بھی آگے گئے۔ اس مقام تک جو عرش ربی کے زیادہ قریب تھا۔ بہر حال یہ سب باتیں وہ ہیں جن کا تعلق عالم بالا اور عالم غیب سے ہے۔ اس کی حقیقت اللہ کو معلوم ہے یا اللہ کے بندے

المصطفیٰ کو معلوم ہے ۔ بس اسی قدر ہمیں روایات سے معلوم ہوتا ہے ۔ اگر کوئی روایت نہ ہو تو یہ اس سلسلے میں عقل کے گھوڑے نہیں دوڑا سکتے ۔ اس موضوع پر انسان وہی کچھ معلوم کر سکتا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ سے ملے ۔ جو ملائکہ کا بھی خالق ہے جو انسان کا بھی خالق ہے اور دونوں کے خصائص کو وہ خوب جانتا ہے ۔

البتہ یہاں اللہ تعالیٰ سدرۃ المنتہیٰ کے کچھ حالات بتا دیئے ہیں تاکہ بات یقینی ہو جائے ۔ اس سفر کو یقینی اور تاکیدی بنانے کے لئے ۔

اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی (۵۳ : ۱۶) "اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا" اسکی تفصیلات نہیں دی گئیں اور نہ تعین کیا گیا ہے کہ وہ کیا چھا رہا تھا ۔ وہ اس قدر عظیم اور ہولناک چیز تھی کہ اس کا بیان مشکل ہے اور اس کا تعین کرنا مشکل ۔ غرض وہ ایک عظیم حقیقت تھی ۔

اور یہ مشاہدات بھی حق اور یقینی ہے ۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (۵۳ : ۱۷) "نگاہ نہ چندھائی نہ حد سے متجاوز ہوئی" یہ نہ تھا کہ نظر پکا چوند ہو گئی اور وہ اچھی طرح نہ دیکھ سکی ۔ نہ یہ ہوا کہ نظر آگے بڑھ گئی اور ہدف کو دیکھ نہ سکی بلکہ یہ مشاہدات واضح ' صاف اور ایک حقیقت اور ٹھوس شکل میں تھے جن میں کوئی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں تھی اور ان مشاہدات میں صرف یہ باتیں نہ تھیں جو بتائی گئی ہیں بلکہ آپ کو اپنے رب کی بہت عظیم عظیم دوسری نشانیاں بھی بتائی گئیں اور اس کائنات کی حقیقت آپ کو بالکل کھول کر براہ راست دکھائی گئی ۔

لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وحی وصول کرنے کا معاملہ ایک مشاہدہ ہے ۔ حقیقی طور پر آپ نے عالم بالا کو دیکھا ہے ۔ آپ یقین محکم سے یہ بات فرماتے ہیں ۔ براہ راست آپ کا عالم بالا سے رابطہ ہے ۔ یہ علم اور معرفت نہایت ٹھوس اور یقینی ہے ۔ آپ نے حسی طور پر یہ رابطے قائم کئے ہیں ۔ یہ سفر بھی حسی اور حقیقی ہے اور یہ تفصیلات جو دی جا رہی ہیں یہ حقیقی ہیں تمثیلات نہیں ہیں اور تمہارے صاحب کی دعوت ایسے یقینی مشاہدات پر مبنی ہے اور تم جو انکار کر رہے ہو تو ان باتوں کا کر رہے ہو جو آپ کی دیکھی ہوئی ہیں اور نزول وحی میں شک کر رہے ہو اور تمہارے صاحب کے بارے میں تم اچھی طرح جانتے ہو' اسے صادق و امین مانتے ہو وہ تم میں کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں ۔ تمہارا رب قسم اٹھا کر اس کی تصدیق اور توثیق کرتا ہے اور یہ تفصیلات دیتا ہے کہ اس وحی کی کیفیت کیا رہی اور یہ پیغام کس کے ہاتھوں پہنچ رہا ہے اور کہاں جبرائیل اور محمد ﷺ کی ملاقات ہوئی اور سدرہ پر جو کچھ تھا تو وہ تھا ہی ....

غرض یہ تو یقینی امر ہے جس کی طرف محمد ﷺ بلا رہے ہیں ۔ اب ذرا تم غور کرو کہ تمہارے تخیلات اور مفتریات اور الٰہ کیسے لوگ ہیں اور ان کی افسانوی حقیقت کیا ہے تم جو لات ' منات اور عزیٰ کی عبادت کرتے ہو ان کی الوہیت کا ثبوت کیا ہے ۔ تم جو دعویٰ کرتے ہو کہ لات منات اور عزیٰ ملائکہ ہیں تو ان کو کس نے دیکھا ہے؟ کیا ثبوت ہے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں ۔ کیا ثبوت ہے کہ اللہ کے ہاں ان کی سفارش چلے گی؟ دلیل و حجت بھی تو لاؤ؟ آخر تمہارے ان اوہام و خرافات اور کہانیوں اور افسانوں کی کیا دلیل ہے ۔ کوئی عقلی یا نقلی دلیل ۔

أَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿١٩﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿٢٠﴾ اَلَكُمُ
الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿٢١﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿٢٢﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ
اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا
تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿٢٣﴾ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿٢٤﴾ ۱
ع ۲۵ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ﴿٢٥﴾ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا
۵ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴿٢٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴿٢٧﴾ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ
يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ﴿٢٨﴾ فَاَعْرِضْ عَنْ
مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٢٩﴾ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ
ربع الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿٣٠﴾
وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ
يَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿٣١﴾ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ
۲ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ
ع ۷ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿٣٢﴾
۶

"اب ذرا بتاؤ تم نے کبھی اس لات اور اس عزیٰ اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا ہے؟ کیا بیٹے تمہارے لئے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لئے؟ یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی ـ دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی ـ حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم وگمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں ـ حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے ـ کیا انسان جو کچھ چاہے اس کے لئے وہی حق ہے؟ دنیا اور آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے ـ آسمانوں

میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں۔ ان کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آ سکتی۔ جب تک کہ اللہ کسی ایسے شخص کے حق میں اس کی اجازت نہ دے جس کے لئے وہ کوئی عرض داشت سننا چاہے اور اس کو پسند کرے مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ اس معاملہ کا کوئی علم انہیں حاصل نہیں ہے وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔ پس اے نبی ' جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ان لوگوں کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے۔ یہ بات تیرا رب ہی زیادہ جانتا ہے کہ اس کے راستے سے کون بھٹک گیا ہے اور کون سیدھے راستے پر ہے اور زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے۔ تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور ان لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنہوں نے نیک رویہ اختیار کیا ہے جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں۔ الا یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائے۔ بلاشبہ تیرے رب کا دامن مغفرت بہت وسیع ہے۔ وہ تمہیں اس وقت سے خوب جانتا ہے جب اس نے زمین سے تمہیں پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں ابھی جنین ہی تھے۔ پس اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی متقی کون ہے"۔

لات ایک سفید پتھر تھا جس پر نقش و نگار تھے۔ طائف میں اس کے اوپر ایک مکان اور درگاہ بنی ہوئی تھی جو طائف میں تھی اور اس کے اوپر پجاری متعین تھے۔ اس درگاہ کے ارد گرد ایک بڑی چار دیواری تھی اور اہل طائف اس کا بہت احترام کرتے تھے یعنی فخر کرتے تھے ماسوائے قریش کے کہ ان کے پاس کعبہ تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ لات کا لفظ مونث ہے اللہ کا جو اس سے پاک ہے۔

اور عزی ایک درخت تھا جس کے اوپر بھی ایک عبادت گاہ بنی ہوئی تھی اور پردے تھے اور یہ نخلہ کے مقام پر تھی جو مکہ اور طائف کے درمیان تھی۔ اس کی تعظیم قریش بھی کرتے تھے جس طرح احد کے دن ابو سفیان نے کہا۔

لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ "ہمارا عزی ہے اور تمہارا کوئی عزی نہیں" تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ جواب دو۔

اَللّٰهُ مَوْلَنَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ "اللہ ہمارا مولی ہے اور تمہارا کوئی مولی نہیں ہے" اور العزی عزیز کی مونث بتلائی جاتی ہے۔

مناۃ کا بت قدید کے قریب مشلل میں تھا جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے۔ خزاعہ ' اوس اور خزرج اس کی تعظیم کرتے تھے اور قدید یا مشلل سے مکہ کے لئے احرام باندھتے تھے۔ مناۃ کے احترام میں۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت بت تھے جن کو عرب میں پوجا جاتا تھا مگر یہ تین بڑے آستانے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ تینوں نام تین ملائکہ کے نام تھے جنہیں عرب اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اور اسی وجہ سے یہ ان کی عبادت کرتے تھے اور جس طرح اصول ہے کہ چلتے چلتے یہ تینوں بذات خود معبود ہو گئے اور جمہور عوام نے اللہ کو بھلا کر ان بتوں کو بذات خود معبود مطلق سمجھ کر پوجنا شروع کر دیا۔ کم ہی لوگ اس قسم کے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کی عبادت اس وجہ سے ہے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

ان معبودوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی تعجب انگیز انداز میں کیا جس طرح کہ عبارت سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے ۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى (١٩) وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى (۲۰:۵۳) "اب ذرا بتاؤ تم نے کبھی اس لات اور اس عزیٰ اور تیسری ایک دیوی مناۃ کی حقیقت پر غور کیا ہے؟" تعجب لفظ افرء یتم (ذرا بتاؤ کیا تم نے سوچا ہے؟) سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس فعل کو نہایت ہی مضحکہ خیز سمجھتا ہے لیکن اس تعجب کے اظہار کے بعد ان پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ یہ اللہ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں اور اپنے لئے بیٹے ۔

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى (۲۱:۵۳) تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (۲۲:۵۳) "کیا بیٹے تمہارے لئے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لئے ہیں ۔ یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی" اس سے یعنی ان بتوں کے تعجب خیز ذکر کے بعد یہ تنقید بتاتی ہے کہ یہ تینوں بت دراصل فرشتوں کے ناموں کے رمز تھے جن کو وہ اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے ۔ ان کی حالت اپنے ہاں یہ تھی کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹیوں کی ولادت کو سخت مکروہ سمجھتے تھے لیکن اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرنے میں شرم محسوس نہ کرتے تھے حالانکہ وہ فرشتوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہ جانتے تھے اور نہ معلومات تھیں ان کو کہ جن کی بناپر وہ یوں کہتے ہوں ۔

اللہ تعالیٰ خود ان کے تصورات اور ان کے افسانوی عقائد کی رو سے ان پر تنقید فرماتا ہے بلکہ ان کا تمسخر اڑاتا ہے کہ کیا خوب کی ۔

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى (۲۱:۵۳) "کیا بیٹے تمہارے لئے اور بیٹیاں خدا کے لئے" یہ تقسیم تو غیر منصفانہ ہے ۔ اپنا حصہ تم نے کیا رکھا ہے اور اللہ کا حصہ کیا رکھا ہے ۔

تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (۲۲:۵۳) "یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہے" جبکہ حقیقت پسند نظر سے دیکھا جائے تو اس تصور کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے ۔ عقل و دانش کے زاویہ سے دیکھا جائے تو کوئی عقلی و نقلی دلیل اس پر نہیں ہے ۔

اِنْ هِىَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (۲۳:۵۳)

"دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں ۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے ۔"

یہ نام لات 'منات اور عزی وغیرہ کو معبود کہنا' ان کو فرشتے کہنا' فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہنا یا فرشتوں کو عورتیں کہنا' یہ

سب الفاظ ہیں لیکن جن معانی کے لئے یہ لوگ ان کو بولتے ہیں وہ تو سرے سے ہیں ہی نہیں نہ اس قسم کے دعاوی پر کوئی حجت ہے ـ اللہ نے ایسی کسی بات کی تصدیق نہیں کی ہے ـ لہٰذا ان دعاوی پر کوئی دلیل نہیں ہے ـ حقیقت کا اپنی جگہ ایک وزن ہوتا ہے ـ حقیقت کی اپنی جگہ قوت ہوتی ہے ـ رہا باطل تو وہ ضعیف اور ہلکا ہوتا ہے کمزور ہوتا ہے اور اس کے اندر گرفت کی قوت نہیں ہوتی ـ

اس آیت کے نصف میں ان کو ان کے اوہام و خرافات میں غرق چھوڑ دیا جاتا ہے ـ ان سے مکالمہ ختم کر دیا جاتا ہے اور ان سے نظر پھیر دی جاتی ہے ـ یوں کہ وہ گویا مکالمہ کے اندر تھے ہی نہیں ـ اب وہ غائب کر دیئے جاتے ہیں اور ان پر تبصرہ ہوتا ہے ـ

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ (۲۳:۵۳) "حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ محض ظن و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں ـ" لہٰذا ان کے پاس نہ حجت ہے نہ علم ہے اور نہ یقین ہے ـ ان کے عقائد محض ظن و تخمین پر مبنی ہیں ـ ان کی خواہشات ان کی دلیل ہیں حالانکہ عقائد و نظریات میں ظن اور خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا ـ اس میں حقیقت یقین اور ہوا و ہوس سے پاک اور غرض اور مطلب سے دور اور پاک رویہ درکار ہے جبکہ ان کے پاس محض ظن ، خواہش اور اغراض دنیاوی کے سوا کچھ بھی نہیں ـ

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (۲۳:۵۳) "حالانکہ انکے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے" لہٰذا اب تو ان کے پاس یہ عذرات بھی نہیں رہے ـ

معاملہ اگر خواہشات نفسانیہ تک پہنچ جائے اور خواہشات پر فیصلے ہونے لگیں تو انسان کی کوئی کل سیدھی نہیں رہ سکتی ـ پھر ہدایت کا اور تبلیغ کا کوئی فائدہ نہیں رہتا کیونکہ ہدایت کو رد کرنے کی وجہ یہ نہیں رہتی کہ ان کو معلوم نہ تھا بلکہ یہ ہوتی ہے کہ وہ چاہتے یہ تھے ـ پہلے انہوں نے خواہش نفس کے تحت فیصلے کر لئے ہیں اب وجہ جواز تلاش کر رہے ہیں جب نفس انسانی یہاں تک گر جائے تو پھر اس کے لئے ہدایت مفید ہی نہیں ہوتی ـ دلیل کا اثر ہی نہیں ہوتا ـ اس وجہ سے اللہ سخت ناپسندیدگی کے ساتھ سوال سوال فرماتا ہے ـ

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى (۲۴:۵۳) "کیا انسان جو کچھ چاہے اس کے لئے وہی حق ہے" یوں کہ وہ جو چاہے حقیقت بن جائے ـ اس کی خواہشات واقعہ بن جائیں لیکن معاملہ ایسا نہیں ہے ـ حق حق ہوتا ہے اور واقعہ واقعہ ہوتا ہے ـ کوئی جس قدر بھی چاہے اس کی چاہت سے واقعات اور حقائق نہیں بدل سکتے ـ انسان تباہ ہی تمناؤں کے ہاتھ سے ہوتا ہے اور ہلاکت کے گڑھے میں پڑتا ہی خواہشات نفس سے ہے ـ اس لئے خواہشات اور تمنائیں حقیقت نفس الامری کو بدل نہیں سکتیں ـ دنیا اور آخرت کے حقائق میں تغیر و تبدل کوئی نہیں کر سکتا ـ یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جو حق ہے ـ

فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى (۲۵:۵۳) "دنیا و آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے" یہاں اللہ تعالیٰ نے دنیا سے آخرت کا ذکر پہلے کیا تاکہ لفظ اولیٰ سورت کے انداز گفتگو اور قافیہ کے مطابق ترنم پیدا کر دے جبکہ معنوی اعتبار سے بھی اہمیت آخرت

کی ہے ۔ قرآن کا انداز ہی ایسا ہے کہ مراعات لفظی کے نتیجے میں معنی میں فرق نہیں پڑتا کیونکہ کلام کا کمال و جمال تو اس میں ہے کہ وہ لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے مقتضی الحال کے مطابق ہو اور نہایت ہی برمحل اور موزوں ہو۔

جب آخرت اور دنیا کے تمام معاملات میں اختیار اللہ کا ہے تو مشرکین کے یہ جو خیالات ہیں کہ وہ فرشتوں کی بندگی اس لئے کرتے ہیں کہ ان کو اللہ کے قریب کر دیں یہ بالکل باطل ہیں ۔ فرشتوں کو تو سفارش کا اختیار ہی نہیں ہے ۔ قیامت میں سفارش کا اختیار صرف ان لوگوں کو ہو گا جن کو اللہ کی طرف سے اذن ہو گا۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (۵۳ : ۲۶) "آسمان میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں ۔ ان کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آ سکتی جب تک کہ اللہ کسی ایسے شخص کے حق میں اس کی اجازت نہ دے جس کے لئے وہ کوئی عرضداشت سننا چاہے اور اس کو پسند کرے ۔" لہٰذا ان کا دعویٰ بے بنیاد ہے اس سے پہلی آیات میں بھی ان کا بطلان ثابت کر دیا گیا ہے اور عقائد کو ہر قسم کے شبہات اور ملاوٹ سے پاک قرار دیا گیا ہے ۔ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت دونوں میں فیصلے کا اختیار اللہ کو ہے اور انسان کی تمنائیں اور خواہشات حق میں تبدیلی نہیں لا سکتیں ۔ سفارش کی اجازت اللہ کے اذن کے بغیر نہ ہو گی ۔ لہٰذا آخری فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہو گا۔

اس پیراگراف کے آخر میں مشرکین کے اوہام کو آخری بار رد کیا جاتا ہے کہ فرشتوں کے بارے میں مشرکین کے خیالات کسی اصل پر قائم نہیں ہیں ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى (۲۷) وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۵۳ : ۲۸) "مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ اس معاملہ کا کوئی علم انہیں حاصل نہیں ہے ۔ وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔"

یہ آخری تبصرہ بھی بتاتا ہے کہ لات منات اور عزیٰ کا تعلق اس افسانہ سے تھا جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینے کے متعلق انہوں نے گھڑ رکھا تھا ۔ یہ ایک بے بنیاد افسانہ تھا ۔ محض ظن و تخمین اور سنی سنائی باتوں پر مبنی تھا کیونکہ ان کے پاس ایسا کوئی ذریعہ علم ہی نہ تھا کہ وہ فرشتوں کی حقیقت کو سمجھیں ۔ فرشتوں کی نسبت اللہ کی طرف کرنا تو باطل محض تھا ۔ وہم کے سوا اس پر کوئی دلیل ہی نہ تھی اور سچائی اوہام اور افسانے سے ثابت نہیں ہوتی ۔ حق اور سچائی کو وہ چھوڑ چکے ہیں لہٰذا اس متاع گم گشتہ کی جگہ اور کوئی چیز لے ہی نہیں سکتی ۔

---○○○---

جب اہل شرک کے عقائد کو یہاں تک لے لیا گیا کہ عقائد شرکیہ اس قدر بے اصل ہیں اور جو لوگ شرک کرتے ہیں اور آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے ہیں اور فرشتوں کو بیٹیاں کہتے ہیں ان کے عقائد

ظن اور وہم پر مبنی ہیں تو اب نبی ﷺ کو کہا جاتا کہ آپ ان لوگوں کو نظر انداز کر دیں ۔ ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں ۔ اللہ نیکوکاروں اور بدکاروں کو اچھا جانتا ہے ۔ وہ اہل ہدایت اور اہل ضلالت دونوں کو جزا اور سزا دے گا ۔ اس کے ہاتھ میں زمین و آسمان کے اختیارات ہیں ۔ دنیا آخرت کے امور ہیں ۔ وہ سب کے ساتھ حساب عدل سے کرے گا ۔ کسی پر ظلم نہ کرے گا اور جو لوگ گناہوں پر اصرار نہیں کرتے اللہ ان کی چھوٹی موٹی غلطیاں معاف کرتا ہے ۔ وہ نیتوں اور رازوں کو جانتا ہے کیونکہ وہ انسانوں کا خالق ہے اور اپنی مخلوق کو وہ دوسروں کے مقابلے میں اچھا جانتا ہے ۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا (۲۹) ذٰلِکَ مَبْلَغُھُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اھْتَدٰی (۳۰) وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی (۳۱) اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّکَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَۃِ ھُوَ اَعْلَمُ بِکُمْ اِذْ اَنْشَاَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّۃٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ فَلَا تُزَکُّوْٓا اَنْفُسَکُمْ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی (۳۲) ع (۵۳: ۲۹ تا ۳۲) "پس اے نبیؐ ' جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دو ۔ ان لوگوں کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے ۔ یہ بات تیرا رب ہی زیادہ جانتا ہے کہ اس کے راستے سے کون بھٹک گیا ہے اور کون سیدھے راستے پر ہے اور زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے ۔ تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور ان لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنہوں نے نیک رویہ اختیار کیا ہے جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں ۔ الا یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائے ۔ بلاشبہ تیرے رب کا دامن مغفرت بہت وسیع ہے ۔ وہ تمہیں اس وقت سے خوب جانتا ہے جب اس نے زمین سے تمہیں پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں ابھی جنین ہی تھے ۔ پس اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو ۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی متقی کون ہے"۔

اعراض اور روگردانی کرنے کا حکم ان لوگوں کے لئے دیا گیا ہے جو اللہ کی یاد سے اعراض و روگردانی کرتے ہیں ۔ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور صرف حیات دنیا چاہتے ہیں ۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا جاتا ہے کہ ان مشرکین کو چھوڑ دیں جن کے عقائد اور رویہ کا بیان اس سورۃ کے ابتدا میں ہوا اور جن کے اوہام و خرافات پر مبنی عقائد کا رد کیا گیا ۔

رسول اللہ کے بعد یہ خطاب ہر مسلم داعی کو ہے جس کو اس قسم کے لوگوں سے واسطہ ہو جو اللہ کی یاد سے غافل ہوں جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہ لاتے ہوں اور جن کا نقطہ نظر محض سیکولر ہو ۔ دنیا سے آگے وہ دیکھنے والے ہی نہ ہوں ۔ آخرت کا حساب و کتاب ان کی نظروں میں نہ ہو اور وہ دیکھتے ہوں کہ بس ان کا مقصد وجود صرف اس دنیا کی زندگی ہے ۔ "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" اور وہ اس دنیا میں اپنی زندگی کو اسی انداز پر استوار کرتے ہوں وہ انسان کے شعور کو

اس بات سے الگ کر دیتے ہیں کہ ایک ایسا الٰہ بھی ہے جو لوگوں کے امور کا مدبر ہے اور یہ کہ وہ الٰہ اس دنیا کی مختصر زندگی کے بعد اعمال کا حساب و کتاب لے گا اور ہمارے دور میں مادیت اور الحاد کے پیروکار ایسے ہی لوگ ہیں۔

جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ ایسے لوگوں میں دلچسپی نہیں لے سکتے جو آخرت سے غافل ہیں اور نہ ایسے لوگوں کے ہمقدم زندگی بسر کر سکتے ہیں جو آخرت کے منکر ہیں کیونکہ دونوں قسم کے لوگوں کے منبع زندگی اس قدر متضاد ہوتے ہیں کہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتے کیونکہ زندگی کے نکات میں سے وہ باہم کسی نکتے پر بھی متفق نہیں ہو سکتے۔ ان کی زندگی کی قدریں اور پیمانے ہی الگ ہوتے ہیں۔ اہداف مختلف ہوتے ہیں، تصورات مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بھی نہیں کر سکتے۔ وہ اس زمین پر ایک جگہ کوئی سرگرمی نہیں رکھ سکتے کیونکہ ان کی زندگی کے پیمانے، قدریں اور مقاصد مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی دوڑ دھوپ کا منہاج مختلف ہو گا اور غرض و غایت جدا ہوگی۔ جب دونوں کے درمیان کوئی یکسانیت اور یکجہتی نہیں ہے تو ایک دوسرے میں دلچسپی کیا ہوگی؟ اگر کوئی مومن ایسے لوگوں میں دلچسپی لیتا ہے جو اللہ کے ذکر سے منہ موڑتے ہیں اور سوائے حیات دنیا کے اور کچھ نہیں چاہتے تو وہ ایک سراسر ایک عبث کام کرتا ہے اور وہ بے مصرف اپنی قوت کو خرچ کر رہا ہے۔

پھر اعراض اور روگردانی سے ایک اور غرض بھی ہے یہ کہ جو لوگ اللہ پر ایمان نہ لانے پر تلے ہوئے ہوں ان کو نظرانداز کرنا، ان کو اہمیت نہ دینا بھی اپنی جگہ ایک مقصد ہے جو لوگ صرف دنیا کے بندے ہوں ان کو اس لئے نظرانداز کیا جاتا ہے کہ وہ ہیں ہی اس قابل کہ ان کو نظرانداز کیا جائے۔ وہ حق سے دور ہیں۔ حق کے ادراک کے اہل نہیں۔ یہ پردوں کے پیچھے کھڑے ہیں ان کے اور حقیقت کے درمیان حجاب ہے۔ یہ اس دنیا کے دائرے اور حدود سے باہر نکل نہیں سکتے۔

ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (۵۳ : ۳۰) "ان کا مبلغ علم بس یہی ہے" یہ پہنچ بہت ہی معمولی ہے۔ اگرچہ بظاہر وہ بہت بڑے پہنچ والے نظر آئیں۔ یہ کوتاہ دست ہیں۔ اگرچہ ان کے ہاتھ لمبے نظر آئیں وہ گمراہ ہیں اگرچہ تیزی سے فاصلے طے کر رہے ہوں۔ اس لئے کہ جو شخص اپنے دل کے احساس اور عقل کے لحاظ سے اس دنیا میں قید ہو وہ کولہو کے بیل کی طرح اس میں چکر کاٹے گا، آگے نہیں بڑھ سکے گا حالانکہ ان کی نظروں کے سامنے یہ عظیم کائنات پڑی ہے۔ اس کائنات نے اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا اور اس دنیا کا خود بخود وجود میں آنا ایک ایسا نظریہ ہے جو بداہتہً غلط ہے پھر یہ دنیا عبث بھی پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کا کوئی خالق ہے اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہی دنیا ہے اور یہی زندگی ہے تو اس طرح یہ تخلیق عبث ثابت ہوتی ہے لہٰذا اس دنیا پر جس حیثیت سے بھی غور کیا جائے۔ ایمان لانا لازمی قرار پاتا ہے اور ایمان کا یہ حصہ بھی لازمی قرار پاتا ہے کہ آخرت میں حشر و نشر لازمی ہے ورنہ یہ عظیم اور محیر العقول کائنات کا عبث پیدا ہونا لازم ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ جو شخص ذکر الٰہی سے منہ موڑتا ہے اور صرف دنیا کے کاموں میں مشغول رہتا ہے اس کو نظرانداز کرنا ضروری ہے۔ یہ اعراض اس لئے ضروری ہے کہ اپنے اہتمام، توجہ اور محنت کو بے محل کاموں میں نہیں صرف کرنا چاہئے اور جن لوگوں کی دلچسپیاں صرف اس دنیا تک ہی محدود ہوں ان کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے بھی ان کی طرف سے منہ

موڑنا ضروری ہے۔ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ایسے لوگوں سے منہ موڑ دو اس لئے ہمیں چاہئے کہ ایسے لوگوں کو نظر انداز کر دیں کیونکہ اطاعت امر ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہودیوں کی طرح ہم کہیں۔ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا اللہ ہمیں اس رویہ سے بچائے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى (۵۳: ۳۰) "یہ بات تیرا رب ہی زیادہ جانتا ہے کہ اس کے راستے سے کون بھٹک گیا ہے اور کون سیدھے راستے پر ہے۔" اللہ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ گمراہ ہیں۔ اس لئے اللہ نے نبی اور ان کے ساتھیوں کے لئے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہ اپنے آپ کو گمراہ لوگوں کے ساتھ فضول مصروف رکھیں یا ان کے ہم محفل ہوں یا ان کے دوست بنیں نہ ان کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ جانتے بھی ہوں کہ یہ شخص گمراہ ہے اور اس کی سرگرمیاں صرف دنیا تک محدود ہیں۔ وہ حقیقت کا ادراک کرنے کی کوشش یا ارادہ نہیں کرتا اور جان بوجھ کر ایمان نہیں لاتا۔ آخرت پر ایمان نہیں لاتا اور اسکی تمام دلچسپیاں اس دنیا کی مختصر زندگی تک محدود ہیں۔ ایسے شخص پر محنت کریں۔

وہ علم جو ان کوتاہ بینوں اور گمراہوں کو حاصل ہوتا ہے وہ بظاہر عوام الناس کی نظروں میں بہت بڑا نظر آتا ہے وہ لوگ جن کا دل قوت مدرکہ اور احساس عامی ہوتا ہے اس لئے ان کو عملی زندگی میں وہ موثر نظر آتا ہے لیکن ان لوگوں کا یہ علم ان سے گمراہی کی صفت دور نہیں کر سکتا نہ ان سے صفت جہالت اور کوتاہ بینی کو دور کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کائنات اور اس کے خالق کے درمیان رابطہ اور انسانی عمل اور اس کی جزاء سزا کے درمیان رابطہ دونوں ایسی حقیقتیں ہیں جو ہر علم کے لئے ضروری ہیں اور ان دونوں حقیقتوں سے خالی جو علم بھی ہو گا وہ سطحی ہو گا اور وہ انسانی زندگی میں پوری طرح موثر نہ ہو گا نہ اسے ترقی دے سکے گا اور نہ اسے بلند کر سکے گا۔ ہر علم کی قدروقیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ انسانی نفس پر اثر انداز ہو اور اسکی وجہ سے ایک انسان اور انسان کے درمیان ادبی رابطہ قائم ہو۔ ورنہ تمام علوم صرف ٹیکنالوجی قرار پائیں گے۔ انسانیت کا تنزل شمار ہوں گے۔ علوم کا ٹیکنیکل پہلو جس قدر آگے بڑھتا ہے ان کا انسانی پہلو اس قدر گرتا ہے۔

انسان کا یہ شعور کہ اس کا ایک خالق ہے اور اس خالق نے اسے پیدا کیا ہے اور اس کائنات کو بھی پیدا کیا ہے اور یہ انسان اور یہ کائنات ایک ہی انداز تخلیق رکھتے ہیں۔ انسان کے شعور حیات اور شعور ماحول کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ انسان کے وجود کی ایک قیمت ابھرتی ہے اور انسان کا مقصد وجود زیادہ جامع اور ارفع ہو جاتا ہے اور اس کا وجود اس کے محدود خاندان سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس کا وجود اسکی قوم سے بڑا اور ارفع ہو جاتا ہے۔ اس کا وجود اس کے وطن سے زیادہ قیمتی ہو جاتا ہے۔ انسان طبقاتی کشمکش سے بالا ہو جاتا ہے اور اس قسم کی تمام تشکیلات اور اجتماعیتوں سے بالا ہو جاتا ہے۔

پھر انسان کا یہ شعور کہ اس کا خالق آخرت میں اس سے حساب لے گا اور اس کو جزا و سزا دے گا' انسان کے جذبات 'انسان کے مقاصد' انسان کے پیمانے اور قدریں بدل دیتا ہے۔ انسان کے تصورات کا انداز ہی بدل جاتا ہے۔ انسان کا انجام اس کے اخلاق کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے۔ یوں انسان کی قوت اور اس کی فعالیت میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ اس کی ہلاکت یا اس کی نجات اس کی نیت اور عمل میں جوابدہی کے احساس پر موقوف ہو گا۔ یوں انسانی شخصیت کے اندر "انسانیت" قوی ہو گی کیونکہ انسان کے اندر یہ شعور ایک نگران کی طرح بیدار ہوتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ آخری

حساب و کتاب ابھی باقی ہے ۔ غرض اللہ پر ایمان لانا اور آخرت پر ایمان لانا ایک بہت ہی اہم اور بڑا مسئلہ ہے اور انسانی زندگی میں اس کی بنیادی اہمیت ہے ۔ہم سمجھتے ہیں کہ انسان کے لئے یہ مسئلہ روٹی 'کپڑے اور مکان سے زیادہ اہم ہے ۔اگر یہ عقیدہ اور شعور ہو گا تو یہ مخلوق "انسان" ہو گا اگر نہ ہو گا تو یہ محض جانور ہو گا ۔

جب معیار بدل جائیں 'مقاصد بدل جائیں 'ہدف بدل جائے اور زندگی کے سب تصورات بدل جائیں تو پھر انسان اور انسان کے درمیان کوئی مابہ الاشتراک امر نہیں رہتا ۔باہم تعامل اور تعاون نہیں رہتا بلکہ باہم تعارف بھی نہیں رہتا اور لوگ ایک دوسرے کو سمجھ بھی نہیں سکتے 'چہ جائیکہ وہ باہمی انصاف کر سکیں ۔

یہی وجہ ہے کہ ایک مومن باللہ اور ایک خالص دنیا پرست 'مفاد پرست کے درمیان کوئی صحبت شرکت 'تعاون اور لین دین نہیں ہو سکتا ۔ یہ تو ہے اصل بات اور حقیقت اس کے سوا اور جو بات بھی کوئی کرے گا وہ محض دکھاوا ہو گا اور امرالہی کے خلاف بات ہوگی ۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۵۳: ۲۹) "پس اے نبیؐ جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں اسے اس کے حال پر چھوڑ دے ۔"

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (۵۳: ۳۱) "اور زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور ان لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنہوں نے نیک رویہ اختیار کیا" یہ کہ اللہ زمین و آسمانوں کی تمام چیزوں کا مالک ہے ۔ اس سے آخرت کے عقیدے میں قوت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے کیونکہ جس نے آخرت پر حساب و کتاب کو مقدر کیا ہے وہی مالک ہے زمین اور آسمانوں کا ۔ لہذا وہ جزا و سزا پر قدرت رکھتا ہے ۔ یہ کام صرف اسی کا ہے اور وہی ان کے اسباب کا بھی مالک ہے اور اس حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مکمل اور عادلانہ جزاء و سزا دے ۔

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (۵۳: ۳۱) "تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور ان لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنہوں نے نیک رویہ اختیار کیا"

اس کے بعد ان لوگوں کا تعین کر دیا جاتا ہے جنہوں نے نیک عمل کئے اور جن کو جزائے حسن دی جاتی ہے ۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳: ۳۲) "جو بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں اور یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائے ۔" بڑے گناہوں سے مراد بڑی نافرمانیاں '

فواحش سے مراد بھی بڑے گناہ ہیں لیکن خصوصاً وہ جن کے اندر فحاشی ہو۔ "الا اللمم" کے بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ استثنا منقطع ہے۔ (استثنا منقطع وہ ہے جہاں استثنا کردہ چیز اس مجموعے کی فرد نہ ہو جس سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔) کیونکہ لمم چھوٹے گناہوں کو کہا جاتا ہے یعنی چھوٹے چھوٹے اعمال' امام احمد نے روایت کی ہے ' عبدالرزاق سے انہوں نے معمر سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے لمم کے ساتھ زیادہ مشابہت کرنے والی کوئی چیز اس سے بڑھ کر نہیں دیکھی جو حضرت ابو ہریرہ نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے۔ رسول اللہؐ فرماتے ہیں "جب للہ تعالیٰ نے ابن آدم پر زنا کا جرم لکھ دیا تو وہ اسے پائے گا یعنی اس کی سزا اسے لازماً ملے گی' آنکھ کا زنا نظر ہے زبان کا زنا بات ہے اور نفس کی تمنا اور اشتہا ہوتی ہے اور انسان کے اندام نہانی اس کی تصدیق کرتے ہیں یا تکذیب" (صحیحین)

ابن جریر نے روایت کی ہے ' محمد ابن عبدالاعلی سے انہوں نے ابن ثور سے انہوں نے معمر سے انہوں نے اعمش سے انہوں نے ابوالضحی سے کہ ابن مسعودؓ نے فرمایا "آنکھ کا زنا نظر ہے ہونٹوں کا زنا بوسہ لینا ہے' ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے' پاؤں کا زنا چل کر جانا ہے اور انسانی اعضا اس کی تکذیب کرتے ہیں یا تصدیق۔ اگر اس کا فرج آگے بڑھا تو یہ زانی ہوا ورنہ لمم کا مرتکب۔ یہی بات مسروق اور شعبی نے کہی ہے۔

عبدالرحمن ابن نافع کہتے ہیں (ان کو ابن لبابہ طائفی بھی کہتے ہیں) میں نے ابو ہریرہ سے "لمم" کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا بوسہ دینا' دیکھنا' آنکھ سے اشارہ کرنا' ہاتھ لگانا اور جب فریقین کے اعضائے نہانی باہم مل جائیں اور غسل واجب ہو جائے تو یہ زنا ہے۔ یہ تو ہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملتے جلتے اقوال لمم کے بارے میں لیکن کچھ دوسرے اقوال بھی ہیں۔

علی ابن طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے الا اللمم یعنی ماسوائے اس کے جو گزر گیا یہی قول زید ابن اسلم کا ہے۔ علامہ ابن جریر روایت کرتے ہیں ابن مثنیٰ سے وہ محمد ابن جعفر سے وہ شعبہ سے وہ منصور سے وہ مجاہد سے انہوں نے الا اللمم کا معنی یہ کہا کہ وہ شخص جو گناہوں کا ارتکاب کرے اور پھر چھوڑ دے۔

ابن جریر نے روایت کی ہے سلیمان ابن جبار سے انہوں نے ابو عاصم سے انہوں نے زکریا سے انہوں نے ابن اسحاق سے انہوں نے عمر ابن دینار سے انہوں نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے۔

الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳ : ۳۲) "وہ لوگ جو بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں اور یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائیں" انہوں نے کہا اس سے مراد وہ شخص ہے جو فحاشی کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر توبہ کر لیتا ہے اور رسول اللہؐ نے فرمایا۔

ان تغفر اللّٰھمّ تغفر جما
و ای عبدلك ما الما

"اے اللہ اگر آپ معاف کریں تو سب کچھ معاف کر دیں اور آپ کا کون سا ایسا بندہ ہے جس نے کوئی قصور نہیں

کیا" اس طرح امام ترمذی نے روایت کی ہے احمد ابن عثمان بصری سے انھوں نے ابو عاصم النبیل سے اور اس کے بعد انھوں نے کہا یہ حدیث صحیح حسن اور غریب ہے اور صرف زکریا ابن اسحاق کے واسطہ سے ہم تک پہنچی ہے۔ بزاز نے بھی کہا ہے کہ یہ حدیث متصل صرف اس سند کے ساتھ ہے۔

ابن جریر نے روایت کی ، محمد ابن عبداللہ ابن بزیع سے انھوں نے یزید ابن زریع سے انھوں نے یونس سے انھوں نے حسن سے انھوں نے ابو ہریرہؓ سے (میں سمجھتا ہوں اس نے اس روایت کو حضورؐ تک پہنچایا) اس آیت کے بارے میں۔

الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ (۵۳: ۳۲) "جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں اور یہ کہ کچھ قصور ان سے سرزد ہو جائے) یہاں مراد یہ ہے کہ وہ زنا کا مرتکب ہو جائے اور پھر توبہ کرے اور چھوڑ دے یا وہ چوریاں کرے اور پھر چھوڑ دے اور وہ شراب پیئے اور ترک کر دے تو اس کے بعد کہا کہ یہ ہے المام اور ارتکاب۔ اس قسم کی روایت حسن سے بھی مروی ہے لیکن موقوف روایت ہے...... غرض یہ روایات کا دوسرا مجموعہ ہے اور یہ لمم کا بالکل ایک دوسرا مفہوم بتاتا ہے۔

ہمارے خیال کے مطابق یہ آخری رائے اس کے بعد آنے والی آیت کے زیادہ مناسب ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ (۵۳: ۳۲) "بے شک تیرے رب کا دامن مغفرت بہت ہی وسیع ہے" اللہ کے مغفرت کے دامن کی وسعت کے ذکر کے ساتھ مناسب یہی ہے کہ لمم سے مراد گناہ کبیرہ اور فواحش کا ارتکاب ہو۔ پھر توبہ ہو جائے اور استثنا متصل ہو اور محسنین ہی وہ لوگ ہوں جنھوں نے کبائر گناہوں کا ارتکاب کیا ہو یا فواحش کا ارتکاب کر لیا ہو اور اس کے بعد وہ جلدی سے توبہ کر کے تائب ہو گئے ہوں اور انھوں نے اصرار نہ کیا ہو جیسا دوسری جگہ آتا ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ

وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۳: ۱۳۵)

"اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو اور وہ کبھی دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔" اور ان لوگوں کو قرآن کریم نے متقین کہا اور ان کے ساتھ مغفرت اور جنت کا وعدہ فرمایا جن کی وسعت زمین اور آسمانوں سے زیادہ ہے لہٰذا یہ مفہوم اللہ کی رحمت اور مغفرت کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اللہ وسیع المغفرت ہے۔

اور خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ کی منصفانہ جزاو سزا اللہ کے وسیع علم پر مبنی ہے۔

هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُونِ

اُمَّهٰتِكُمْ (۵۳ : ۳۲) "اور وہ تمہیں اس وقت سے خوب جانتا ہے جب اس نے زمین سے تمہیں پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں ابھی جنین ہی تھے۔" تمہارے تمام ظاہری اعمال کو جانتا ہے۔ یہ علم ہر ثابت حقیقت کے ساتھ وابستہ ہے جسے یہ لوگ نہیں جانتے اور اللہ ہی ہے جو اپنی مخلوق کے بارے میں جانتا ہے۔ اللہ اس وقت بھی جانتا تھا جب یہ نہ تھے اور وہ ان کو زمین سے پیدا کر رہا تھا۔ پھر جب یہ ماؤں کے پیٹوں میں جنین تھے اور اس دنیا میں انہوں نے آنکھ ہی نہ کھولی تھی۔ اللہ ظاہری علم سے پہلے حقیقی علم بھی رکھتا تھا عملاً ان کے وجود میں آنے سے بھی پہلے۔

جس ذات کے علم کی نوعیت یہ ہو تو انسان اگر اس ذات کو اپنے بارے میں کوئی معلومات دیتا ہے تو یہ نہایت گستاخی ہے کیونکہ یہ گویا اللہ کو اپنی حقیقت دکھاتا ہے اور اللہ کے سامنے یہ کہتا ہے کہ میں یہ ہوں اور یوں۔

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (۵۳ : ۳۲) "پس اپنے نفسوں کی پاکی نہ بیان کرو وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی متقی کون ہے۔"

اللہ کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تم اللہ کو اپنے نفوس کے بارے میں اطلاع کرو یا اللہ کے سامنے اپنے اعمال کا مول تول کرو، اللہ کا علم کامل ہے اس کی جزاو سزا منصفانہ ہے۔ اللہ کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔

اب آخری پیراگراف آتا ہے۔ یہ پیرا نہایت ہی نغمہ بیز ہے اور یہ پہلے پیراگراف کے مماثل ہے۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کے اساسی عناصر کو بیان کرتا ہے جس طرح حضرت ابراہیم ﷺ نے اسلامی نظریہ حیات اور دین حنیف کے لئے طے کئے تھے۔ اس میں انسانوں کا تعارف خالق تعالیٰ سے کرایا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی میشت تمہاری زندگی میں فعال ہے۔ تخلیق کر رہی ہے اور نہایت ہی موثر ہے اور اللہ کی مشیت کے آثار ایک ایک کر کے گنوائے جاتے ہیں اور نہایت ہی موثر انداز میں جو انسانی وجدان کے ساتھ پیوست ہو جاتے ہیں اور انسان اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ کانپ اٹھتا ہے۔ جب یہ پیرا آخر میں پہنچتا ہے تو پڑھنے والے کے احساسات پوری طرح متاثر ہوتے ہیں اور انسان پر کپکپی طاری ہوتی ہے اور رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور وہ سرشار ہو کر لبیک کہنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿۳۴﴾ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ
يَرٰى ﴿۳۵﴾ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ﴿۳۷﴾ اَلَّا تَزِرُ
وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ
يُرٰى ﴿۴۰﴾ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴿۴۱﴾ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ
وَاَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾

مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ
اَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾ وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾ وَ ثَمُوْدَاۡ فَمَآ
اَبْقٰى ﴿۵۱﴾ وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ﴿۵۲﴾ وَالْمُؤْتَفِكَةَ
اَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ
النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿۵۶﴾ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾ اَفَمِنْ
هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَ اَنْتُمْ
سٰمِدُوْنَ ﴿۶۱﴾ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾

"پھر اے نبی ؐ تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جو راہ خدا سے پھر گیا اور تھوڑا سا دے کر رک گیا۔ کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھ رہا ہے؟ کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور اس ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا؟" یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی پھر اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی اور یہ کہ آخر کار پہنچنا تیرے رب ہی کے پاس ہے اور یہ کہ اسی نے ہنسایا اور اسی نے رلایا ہے اور یہ کہ اسی نے موت دی اور اسی نے زندگی بخشی اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا۔ ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے اور یہ کہ دوسری زندگی بخشنا بھی اسی کے ذمہ ہے اور یہ کہ اسی نے غنی کیا اور جائیداد بخشی اور یہ کہ وہی شعریٰ کا رب ہے اور یہ کہ اسی نے عاد اولیٰ کو ہلاک کیا اور ثمود کو ایسا مٹایا کہ ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا اور ان سے پہلے قوم نوح کو تباہ کیا کیونکہ وہ تھے ہی سخت ظالم و سرکش لوگ اور اوندھی گرنے والی بستیوں کو اٹھا پھینکا' پھر چھا دیا ان پر وہ کچھ جو (تم جانتے ہی ہو کہ) کیا چھا دیا۔ پس اے انسان' اپنے رب کی کن کن نعمتوں میں تو شک کرے گا؟ یہ ایک تنبیہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے۔ آنے والی گھڑی قریب آلگی ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اس کو ہٹانے والا نہیں۔ اب کیا یہی وہ باتیں ہیں جن پر تم اظہار تعجب کرتے ہو؟ ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو؟ اور گا بجا کر انہیں ٹالتے ہو؟ جھک جاؤ اللہ کے آگے اور بندگی بجا لاؤ۔

کون ہے یہ شخص۔

اَلَّذِیْ تَوَلّٰی (۳۳) وَاَعْطٰی قَلِیْلًا وَّ اَکْدٰی (۵۳: ۳۴) "جو راہ خدا سے پھر گیا اور تھوڑا سا دے کر رک گیا" اور اللہ تعالیٰ اس کی روش کو تعجب انگیز قرار دیتا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ ایک متعین

شخص تھا جس نے اللہ کی راہ میں تھوڑا سا خرچ کیا اس کے بعد وہ خرچ کرنے سے رک گیا۔ اس لئے کہ وہ فقیر نہ ہو جائے۔ کشاف میں علامہ زمخشری نے اس کا تعین کیا ہے کہ یہ حضرت عثمان ابن عفان ﷺ ہیں لیکن حضرت عثمان ﷺ کا جو مقام و مرتبہ تھا اور انہوں نے تحریک اسلامی کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا' بغیر کسی توقف اور بغیر کسی حساب کے وہ معلوم ہے اور ان کا جو عقیدہ تھا وہ بھی معلوم ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور کوئی دوسرا شخص ذمہ داری نہیں لے سکتا ہے اور جس روایت کا علامہ زمخشری نے ذکر کیا ہے وہ اسلام کے اس بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ روایت یہ ہے کہ حضرت عثمان کار خیر میں خرچ کرتے تھے۔ عبداللہ ابن سعد ابن ابو سرح نے کہا جس طرح تم خرچ کر رہے ہو اسی طرح تو تمہارے پاس کچھ نہ رہے گا۔ یہ حضرت عثمان کے رضاعی بھائی تھے۔ حضرت عثمان نے کہا کہ میں نے بہت گناہ کئے ہیں اور میں اللہ کی راہ میں خرچ کرکے معافی چاہتا ہوں تو عبداللہ نے کہا مجھے اپنی ناقہ اس کے کجاوے کے ساتھ دے دو اور میں تمہارے تمام گناہ اپنے سر لیتا ہوں چنانچہ اس کو انہوں نے ناقہ دے دی اس سودے پر انہوں نے گواہ بھی ٹھہرائے اور حضرت عثمان انفاق سے رک گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ روایت ظاہرا باطل ہے کیونکہ یہ قرآنی اصول کے خلاف ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد ایک متعین شخص ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے مراد ہو لوگوں کا ایک نمونہ جو اس قسم کے ہوتے ہیں مثلاً وہ لوگ جو اسلامی نظریہ حیات کی راہ میں خرچ کریں اور پھر رک جائیں تو اللہ کے نزدیک ایسا شخص قابل تعجب ہے۔ ایسے شخص کی طرف اشارہ کرکے قرآن مجید صحیح تصورات کی توضیح کرتا ہے۔

اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى (۳۵:۵۳) "کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھ رہا ہے۔" غیب کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے اور اللہ کے سوا کسی کو غیب کا علم نہیں ہوتا۔ لہذا عالم غیب میں انسان کے لئے جو کچھ پوشیدہ ہے انسان اس سے مامون نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ ہروقت نیک عمل کرتا رہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا رہے اور پوری زندگی میں محتاط رہے اور اپنے اعمال کو تسلسل دے۔ یہ نہ ہو کہ کچھ تھوڑا سا انفاق کرے پھر چھوڑ دے اور غیب مجہول کے دفاع میں اس کو یہی ضمانت حاصل ہے کہ وہ احتیاط کرے اپنے عمل کو جاری رکھے اور مسلسل رکھے اور اللہ کی مغفرت کا امیدوار ہو اور دعا کرے کہ اس کے اعمال قبول ہوں۔

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى (۳۶:۵۳) وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى (۳۷:۵۳) "کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور اس ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوئی جس نے وفا کا حق ادا کر دیا" یہ سیدھا دین وہ ہے جو تمام پیغمبروں کے ہاں ایک ہی رہا ہے اور اس کے اصول اور بنیادیں ایک ہی رہی ہیں۔ تمام رسولوں کی کتابیں اور دعوتیں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ اگرچہ زمان و مکان کا اختلاف ہے۔ یہی اصول صحف موسیٰ میں تھے۔ یہی ملت ابراہیمی کے اصول تھے۔ حضرت ابراہیم وہ تھے جنہوں نے بہت بڑی وفاداری کا ثبوت دیا۔ ہر چیز کو پورا پورا ادا کیا۔ مطلقاً وفادار تھے۔ یہاں وفا کا ذکر اکدیٰ کے مقابلے میں ہوا۔ اکدیٰ انقطاع کو کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے وفّی کا لفظ تشدید سے آیا ہے تاکہ قافیہ اور ترنم میں فرق نہ آئے۔ سوال یہ ہے کہ صحف ابراہیم میں کیا تھا؟

الّاتزرُ وازِرَۃٌ وِّزرَ اُخرٰی (۵۳ : ۳۸) "یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"، کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا نہ اپنے نفس کا بوجھ وہاں ہلکا کیا جا سکے گا اور نہ دوسرے کا بوجھ لے کر اسے بری الذمہ کیا جا سکے گا۔ لہٰذا کوئی نہ کسی دوسرے کا بوجھ اٹھا سکتا ہے اور نہ دوسرے پر ڈال سکتا ہے۔

وَاَن لَّیسَ لِلاِنسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳ : ۳۹) "اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں مگر وہ جس کی اس نے سعی کی"، یعنی انسان کے حساب میں وہی لکھا جائے گا جو اس نے کیا۔ اس کے اعمال کے ساتھ دوسروں کے اعمال نہ لکھے جائیں گے نہ اس کے اعمال سے کمی کر کے کسی دوسرے کی کمی پوری کی جائے گی اور یہ دنیاوی زندگی فرصت عمل ہے تاکہ وہ عمل کرے اور جدوجہد کرے۔ جب مر گیا تو اس کا فرصت عمل ختم ہو جائے گا اور اس کے اعمال کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ ہاں صرف وہ اعمال رہ جائیں گے جن کے بارے میں حدیث میں نص وارد ہے۔

اذا مات الانسان انقطع عملہ الا من ثلاث من ولد صالح یدعولہ او صدقۃ جاریۃ من بعدہ او علم ینتفع بہ "جب انسان مر جائے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ ماسوائے تین شعبوں کے اس کا صالح بیٹا ہو اور وہ اس کے لئے اس کے بعد دعا کرتا ہو۔ یا اس نے کوئی صدقہ جاریہ کیا ہو یا اس نے کوئی علمی کام کیا ہو جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہوں" (مسلم) یہ تینوں شعبے دراصل اس شخص کے اعمال جاریہ ہیں۔ اس حدیث سے امام شافعیؒ اور آپ کے متبعین یہ مسئلہ نکالتے ہیں کہ قرات قرآن کا ثواب مردوں کو نہیں پہنچتا کیونکہ یہ قرات ان کے عمل اور کسب سے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلے میں امت کو کوئی ہدایت نہیں فرمائی نہ اس کی تاکید فرمائی نہ کسی نص میں یا اشارے میں اس کی ہدایت فرمائی۔ صحابہ کرام میں سے بھی کسی صحابی سے یہ منقول نہیں ہے کہ انہوں نے قرآن پڑھ پڑھا کر ایصال ثواب کیا ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو وہ کس طرح اس سے پیچھے رہ سکتے تھے۔ پھر عبادات اور ایصال ثواب کے مسائل ایسے ہیں جن میں قرآن و سنت کے نصوص پر اکتفا کرنا چاہئے۔ ایسے معاملات میں رائے اور قیاس کی گنجائش نہیں ہے۔ رہی دعا و صدقہ تو اس پر اجماع ہے کہ اس کا ثواب مردوں کو پہنچتا ہے۔ (ابن کثیر)

وَاَنَّ سَعیَہٗ سَوفَ یُرٰی (۵۳ : ۴۰) ثُمَّ یُجزٰہُ الجَزَآءَ الاَوفٰی (۵۳ : ۴۱) "اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی پھر اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی" لہٰذا کسی انسان کی سعی، اس کے کسی عمل اور کسب کو ضائع نہ کیا جائے گا، اور کوئی چیز اللہ کے علم اور اس کے ترازو سے چھوٹ نہ جائے گی۔ ہر شخص کو اس کی جدوجہد کا پورا پورا اجر دیا جائے گا نہ کمی ہوگی اور نہ ظلم ہوگا۔

یوں انفرادی ذمہ داری کا اصول طے کر دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ یقین دہانی بھی کر دی جاتی ہے کہ مکمل انصاف ہوگا۔ یوں انسان کے لئے انسانی قیمت متعین ہوگی کہ وہ ایک عقلمند، ذمہ دار، قابل اعتماد مخلوق ہے اور خود مختار ہے۔ یہ ایک مکرم مخلوق ہے۔ اس کے لئے عمل کی فرصت فراہم ہوگی اور پھر وہ اس موقعہ پر جو عمل کرے گا اس پر اسے جزا و سزا ہوگی اور اسی جزا و سزا میں مکمل انصاف ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ مطلق انصاف ہوگا اس میں کسی کی خواہش نفس کا دخل نہ ہوگا اور نہ کسی جہالت کی وجہ سے کوئی حقیقت شمار سے رہ جائے گی۔

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی (۵۳ : ۴۲) "اور یہ کہ آخر کار پہنچنا تیرے رب ہی کے پاس ہے" لہٰذا کوئی اور راستہ نہیں ہے جو بھی راستہ ہے اس کی انتہا اللہ کے دربار پر ہوتی ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اور جائے پناہ نہیں۔ صرف اس کی پناہ گاہ ہے یا جنتوں میں ہے اور یا دوزخ میں ہے۔ اس حقیقت کا اثر انسانی شعور انسانی تصور اور انسانی عمل پر بہت ہی گہرا ہوتا ہے۔ جب انسان یہ محسوس کرے گا کہ آخر کار اسے اللہ کے پاس جانا ہے اور یہی ہر چیز کا انجام ہے۔ ہر فرد بشر کا انجام ہے تو انسان محسوس کرتا ہے کہ اللہ کے حضور حاضری کے سوا تو کوئی چارہ نہیں لہٰذا وہ اپنے طرف عمل اور اپنے نفس کو اس کے لئے تیار کرتا ہے اور اس معاملے میں وہ سب کچھ کرتا ہے جو اس کے استطاعت میں ہو اور اس کا قلب ونظر اپنے آخری انجام کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں اور اس کی نظریں آخری انجام پر لگی ہوتی ہے۔

انسانی سوچ کو اس آخری انجام اور آخری منزل تک پہنچا کر اسے پھر دنیا کے معاملات کی طرف واپس لایا جاتا ہے کہ اس دنیا میں بھی تمام امور اللہ کی مشیت کے مطابق طے ہوتے ہیں۔ اگرچہ انسان مختار ہے اور ذمہ دار ہے۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰی (۵۳ : ۴۳) "اور یہ کہ اس نے ہنسایا اور اسی نے رلایا" اس آیت کے ضمن میں بہت ہی بڑے حقائق آتے ہیں اور اس آیت میں حکمت و دانش کے کئی رنگ ہیں کئی تصاویر ہیں۔ پہلا معنی تو یہ ہے کہ اللہ نے انسان کے اندر ہنسنے اور رونے کی صلاحیت رکھی۔ یہ دونوں صفات اسی انسان کی تخلیق کے رازوں میں سے راز ہیں۔ انسان کو معلوم نہیں کہ وہ کس طرح روتا ہے اور ہنستا ہے۔ انسان کی پیچیدہ تخلیق میں کس طرح ان دونوں متضاد صفات اور تاثرات کو ایک جگہ رکھ دیا گیا ہے۔ انسان کی نفسیاتی پیچیدگیاں اس کی عضویاتی پیچیدگیوں سے کم نہیں ہیں اور اس کے اندر کی عضویاتی اور نفسیاتی جذبات اور موثرات ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں اور اس کے اعضاء اور نفسیاتی عمل رونے اور ہنسنے کے عمل میں باہم اشتراک سے کام کرتے ہیں۔

اس نے ہنسایا اور رلایا یعنی بیک وقت انسان روتا بھی ہے اور ہنستا بھی اور اللہ نے اسباب فراہم کر دیے اور ان دونوں صفات کو ایک پیچیدہ راز قرار دیا کہ بعض اسباب پر انسان رونے لگتا ہے اور بعض پر ہنسنے لگتا ہے۔ آج ایک چیز اسے رلاتی ہے اور کل اسی کی وجہ سے وہ ہنستا ہے اور آج وہ ہنستا ہے اور کل اسی کی وجہ سے روتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اسے جنون لاحق ہوتا ہے نہ وہ بھول جاتا ہے بلکہ نفسیاتی حالات ایسے ہوتے ہیں۔ نفسیاتی حالات میں تبدیلی ہوتی ہے۔ بعض اقدار' بعض اسباب' بعض تقریبات اور بعض محرکات ایسے ہوتے ہیں جو کبھی رلاتے ہیں اور کبھی ہنساتے ہیں اور انسانی شعور ایک ہی حالت میں نہیں رہتا۔

یہ بھی ایک رنگ ہوتا ہے کہ ایک ہی واقعہ سے ایک فریق روتا ہے اور دوسرا اس واقعہ سے ہنستا ہے۔ ایک ہی واقعہ کا اثر دونوں پر الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ ہوتے ہیں حالات موثرات اور کسی ایک واقعہ کے بارے میں نفسیاتی رد عمل۔ ایک ہی واقعہ پر ایک ہی شخص کبھی روتا ہے کبھی ہنستا ہے۔ آج کسی واقعہ پر وہ خوش ہے ہنستا ہے لیکن کل اسی واقعہ کے برے نتائج سامنے آتے ہیں تو روتا ہے۔ اس وقت اسکی تمنا ہوتی ہے کہ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ کئی ایسے لوگ ہیں جو اس دنیا میں رات اور دن ہنستے ہیں اور قیامت میں روئیں گے۔

یہ ہیں مختلف نقشے' مختلف حالات اور مختلف موسم اور اس آیت سے ہم ہزار ہا نفسیاتی کیفیات کا اخراج کر سکتے ہیں۔

یہ حس و شعور کی بات ہے ۔جس قدر کوئی زیادہ نفسیاتی تجربے کرے گا اسے معلوم ہوگا کہ ہر تجربے کے بعد جو نفسیاتی صورت حال پیدا ہوتی ہے اس سے انسان ہنستا ہے یا روتا ہے ۔یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ وہ چند الفاظ کے اندر ایک ایسا آئینہ پیش کرتا ہے کہ اس میں جو چاہے جہاں چاہے اپنی صورت دیکھے ۔

وَ اَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَ اَحْيَا (۵۳ : ۴۴) ”اور یہ کہ اس نے موت دی اور زندگی بخشی“ اسی طرح اس آیت سے بھی موت و حیات کی لاتعداد صورتیں نکلتی ہیں اور انسان اپنے احساس کو تیز کر کے گنوا سکتا ہے ۔اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اللہ نے موت و حیات کو پیدا کیا جیسا کہ دوسری سورت میں کہا ہے ۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيَاةَ ”جس نے موت و حیات کو پیدا کیا“ موت و حیات دونوں کا تکرار انسانی سوسائٹی میں ہوتا رہتا ہے لہٰذا ہر کوئی موت و حیات کو جانتا ہے لیکن اگر انسان موت و حیات کا راز معلوم کرنا چاہے تو یہ بہت ہی سربستہ راز ہو جاتے ہیں ۔موت کی حقیقت کیا ہے اور حیات کا راز کیا ہے ؟ تو انسان ان کی حقیقت کی تعبیر اپنے الفاظ میں نہیں کر سکتا نہ ان کی کوئی شکل و صورت متعین کر سکتا ہے ۔ایک زندہ انسان کے ڈھانچے میں حیات کس طرح داخل ہوگئی ۔یہ ہے کیا اور کہاں سے آتی ہے اور اس انسانی ڈھانچے کے روئیں روئیں میں کس طرح آگئی ۔یہ کس طرح اس زندہ انسان یا زندہ کائنات میں سرایت کر گئی ؟ اور موت کیا ہے ؟ کس طرح یہ زندگی نکلی اور موت آگئی ۔یہ ایک راز ہے اور پس پردہ ہے اور اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔

اس نے زندہ کیا اور مارا ' اس سے موت و حیات کی کئی ملین صورتیں سامنے آتی ہیں ۔اس زمین میں زندہ چیزوں کے کئی جہاں ہیں ۔ایک لمحے میں کئی کئی ملین چیزیں مرتی ہیں اور کئی کئی ملین زندہ ہوتی ہیں ان میں زندگی داخل ہوتی ہے اور اس راز کو آج تک صرف اللہ ہی جانتا ہے ۔کئی ایسی اموات ہیں جو دوبارہ زندگیوں کا باعث اور سبب بنتی ہیں ۔صدیوں سے یہ صورتیں ظاہر ہوتی چلی آئی ہیں ۔جب انسان صدیوں کا تصور کرتا ۔انسان کی پیدائش سے بھی پہلے کے زمانے سے تو یہاں موت و حیات کی کئی قسمیں جاری ہیں ۔

یہ تصاویر کی لاانتہا تعداد ہے جو نمودار ہوتی ہے ۔ان مختصر کلمات سے یہ تصاویر ظاہر ہوتی ہیں اور انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔انسان اپنے اوپر کنٹرول اور ضبط نہیں کر سکتا اور اس پر عجیب اثر ہوتا ہے ۔

وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى (۵۳ : ۴۵) مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى (۵۳ : ۴۶) ”اور اس نے نر اور مادے کا جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے“ یہ بھی ایک عظیم حقیقت ہے جو اس دنیا میں ہر لمحے میں واقع ہوتی ہے چونکہ یہ عظیم واقعہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے ۔اس لئے انسان اسے بھول جاتا ہے حالانکہ یہ ایک ایسا معجزہ اور عجوبہ ہے جو تمام تخیلاتی عجوبوں سے زیادہ عجیب ہے ۔

ایک نطفہ ' ایک بوند جو گرتی ہے جو انسانی جسم کا ایک لیسدار مادہ ہے اور یہ اسی قدر زیادہ ہے جس طرح پسینہ ' آنسو اور دوسرے مواد ۔ایک وقت گزرنے کے بعد یہ کیا سے کیا بن جاتا ہے پھر یہ مرد اور عورت کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔مذکر و

مونث بن جاتا ہے اور یہ معجزہ کس طرح رونما ہوتا ہے۔ اگر یہ واقع نہ ہوتا تو ہم اس کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ یہ انسان جو ایک قوی اور شدید اور سخت بازی رکھتا ہے۔ یہ کہاں تھا؟ یہ اس سیال نطفے میں کہاں چھپا ہوتا تھا بلکہ اس نطفے کے کئی ملین اجزاء میں سے یہ ایک تھا۔ اس کی ہڈیاں کہاں تھیں۔ گوشت کہاں تھا جلد اور رگیں کہاں تھیں۔ بال اور ناخن کہا تھے اور اس کی خصوصیات اور صلاحیتیں کہاں تھیں اور اس کے اخلاق اور اس کا مزاج کہاں تھا۔ ایک مائیکروسکوپ سے دیکھا جانے والا خلیہ جس کے ساتھ اور کئی ملین ایسے خلیے موجود ہیں اور یہ سب ایک ہی نطفے میں ہیں جو بوند کی شکل میں نکلتا ہے۔ اس خلیے میں خصوصاً مذکر و مونث کا نقشہ کیا تھا۔ آخر کار یہ نقشہ جنین کے اندر ظاہر ہوا۔

کوئی ایسا ذی عقل انسان نہیں ہو سکتا جو اس عظیم حقیقت پر تدبر کرے اور پھر وہ ششدر نہ رہ جائے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ اس عظیم معجزے کا کوئی انکار کر دے اور غرور و سرکشی کر کے یہ کہے "بھائی یہ اسی طرح ہوتا ہے بس جائیے والسلام" اور یہ کام یونہی ہو گیا فقط "اسی طرح مرد و عورت پیدا ہو گئے اور بس 'ہم زیادہ نہیں جانتے" یا کوئی زیادہ تعلیم یافتہ بننے کی کوشش کرے اور کہے کہ یہ واقعات اس طرح ہوئے کیونکہ اس مواد میں از روئے فطرت یہی استعداد تھی اور تمام زندہ چیزوں کے اندر تناسل کی یہ صلاحیت ہے لیکن اس کا جواب پھر سوال اور تشریح کا محتاج ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ استعداد کس نے ودیعت کر دی اور یہ جذبہ کس نے ہر چیز کو دیا کہ وہ خود کار طریقے سے حفظ نوع اور تسلسل حیات کے لئے کام کرے۔ پھر یہ قوت ان چیزوں کو کس نے دی کہ وہ ایک ضعیف حالت سے تومند حالت تک پہنچیں۔ یہ راستہ کس نے بتایا اور یہ خواہش کس نے رکھی اور ہر چیز کے اندر اس کے نوع کے خواص کس نے رکھے اور ان کے اندر اس نوع کی چیزوں کو دوبارہ پیدا کرنے کے خواص کس نے رکھے۔ ظاہر ہے کہ ایک قوت مدبرہ ہے جو اپنے ارادے اور حکم اور اذن سے ان معاملات کو چلا رہی ہے اور ہر چیز کو ایک متعین راہ اور طریقے پر چلاتی ہے۔

اور پھر اس پہلی پیدائش سے جو ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اللہ انسان کو دوسری پیدائش کی طرف متوجہ فرماتا ہے۔

وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى (۵۳ : ۴۷) "اور یہ کہ دوسری زندگی بخشنا بھی اس کے ذمہ ہے"

دوسری زندگی تو ایک غیب ہے لیکن پہلی زندگی دوسری پر دلیل ہے۔ دلیل یوں ہے کہ جب پہلی بار ایک قوت نے انسان کو پیدا کیا تو دوسری بار بھی وہ پیدا کر سکتی ہے۔ وہ ذات جس نے زوجین کو ایک نطفے سے پیدا کیا اور یہ تمہارا مشاہدہ ہے۔ اس بات پر قادر ہے کہ ان ہڈیوں اور مٹی کو دوبارہ جمع کر کے تمہیں اٹھا دے کیونکہ ہڈیوں اور مٹی کو جمع کرنا نطفے کے پانی کے اندر موجود ایک خلیے سے بڑھا کر پیدا کرنے سے مشکل نہیں ہے۔ یہ کام دوبارہ بھی واقع ہو سکتا ہے مثلاً وہ تدبیر جس کے نتیجے میں ایک نطفہ نہایت ہی چھوٹے جرثومے سے ایک طویل راہ سے گزر کر ایک مکمل مرد اور عورت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی تدبیر کے ذریعے سے اللہ قیامت میں سب کو اٹھائے گا تاکہ ہر کسی کو اس کے کئے کے مطابق جزا و سزا دے۔ کیونکہ دوبارہ اٹھانے کا مقصد زندگی کی تکمیل ہے جو یہاں مکمل نہ تھی۔ عالم آخرت میں ہر چیز اپنے کمال کو پہنچے گی لہٰذا ضروری ہے کہ اس میں تخلیق کی ٹیکنالوجی بھی اس دنیا کی تخلیق سے زیادہ پیچیدہ ہو۔ لہٰذا پہلی تخلیق کی دلالت دوسری تخلیق پر دو طرح کی ہے ایک یہ کہ دوسری تخلیق ممکن ہے اور دوسری یہ ہے کہ وہ ضروری ہے کہ وہاں مکمل جزا و سزا مل سکے اور ادھوری زندگی مکمل ہو۔ اور اس زندگی میں اور دوسری زندگی دونوں میں اللہ جسے چاہے غنی اور مالدار بنا دے۔

وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰى (۵۳ : ۴۸) "اور یہ کہ اس نے غنی کیا اور جائیداد بخشی" اس نے دنیا میں جس کو چاہا مختلف پہلوؤں سے غنی بنا دیا۔ مال کے لحاظ سے غنی' صحت کے لحاظ سے غنی' اولاد کے لحاظ سے غنی' فکر کے لحاظ سے غنی اور اللہ کے تعلق کے لحاظ سے غنی اور یہ سب سے بڑا غنی ہوتا ہے اور جسے وہ چاہے گا آخرت میں غنی کر دے گا۔

اسی طرح جو جائیداد وہ چاہے دیدے' یہاں دیدے یا آخرت میں دیدے۔ لوگ تو فقرا اور محتاج ہیں۔ یہ غنی اور مالدار اللہ ہی کے خزانوں سے ہو سکتے ہیں۔ وہ دولت دیتا ہے اور وہی جائیداد دیتا ہے۔ یہ تو وہ بات ہے جسے وہ عملاً پاتے ہیں اور ان کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جن کو اللہ نے دیا اس لئے انہیں جگایا جاتا ہے کہ اللہ ہی کے خزانہ عامرہ کی طرف نظریں اٹھاؤ۔ اللہ کے سوا دوسرے خزانے ہیچ اور خالی ہیں۔

وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى (۵۳ : ۴۹) "اور وہی شعریٰ کا بھی رب ہے" شعریٰ وہ ستارہ ہے جو سورج سے بیس گنا بڑا ہے اور وہ سورج سے بھی دور کئی ملین دور ہے۔ عربوں میں بعض لوگ اس ستارے کو پوجتے تھے۔ بعض لوگ اسے ایک ذی شان ستارے کے طور پر دیکھتے تھے۔ لہٰذا یہاں یہ تاکید کرنا کہ اللہ شعریٰ کا بھی رب ہے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے خصوصاً ایسی سورت میں جس میں ستارے کی قسم اٹھائی گئی ہے اور جس میں عالم بالا کے سفر کا ذکر ہو اور جس میں عقیدہ توحید اور رد شرک موضوع ہو۔

یہاں آکر انفس اور آفاق کا یہ طویل مطالعاتی سفر ختم ہوتا ہے اور اس کے بعد اب انسانی تاریخ کی وادی میں ہم داخل ہوتے ہیں۔ انسانی تاریخ اور اس کے عبرت آموز آثار کو تو قرآن بہت اہمیت دیتا ہے۔

وَ اَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا ۨالْاُوْلٰى (۵۰) وَثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ اَبْقٰى (۵۱) وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰى (۵۲) وَ الْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى (۵۳) فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى (۵۴) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى (۵۵) (۵۳ : ۵۰ تا ۵۵) "یہ کہ اسی نے عاد اولیٰ کو ہلاک کیا اور ثمود کو ایسا تباہ کیا کہ اس میں سے کسی کو نہ چھوڑا اور ان سے پہلے قوم نوح کو تباہ کیا کہ وہ تھے ہی سخت ظالم اور سرکش لوگ اور اوندھی گرنے والی بستیوں کو اٹھا کر پھینکا پھر چھا دیا ان پر وہ جو (تم جانتے ہو کہ) کیا چھا دیا۔ پس اے انسان اپنے رب کی کن کن نعمتوں میں تو شک کرے گا"

یہ ایک سرسری نظر ہے جس میں ایک ایک امت پر مختصر نگاہ ڈالی جاتی ہے اور اس کے انجام کو دکھا کر انسانی شعور کو چٹکی دی جاتی ہے کہ وہ بیدار ہو۔

عاد' ثمود اور قوم نوح کو تو قرآن کے قاری جانتے ہیں اور کئی جگہ یہ قصص مذکور ہیں۔ موتفکہ کا لفظ افک بمعنی بہتان اور ضلالت سے ہے۔ (وہ بستیاں جو الٹ دی گئیں' لوط کی قوم کی بستیاں تھیں۔) ان بستیوں کے بارے میں یہ کہ ان بستیوں پر چھا گیا جو چھا گیا اس میں عذاب کو زیادہ خوفناک اور عظیم دکھانے کے لئے نام نہیں لیا گیا یعنی بربادی' آتش فشانی کے ذریعے جو بربادی بھی آپ تصور کر سکتے ہیں وہ ان پر چھا گئی لہٰذا بیان کی ضرورت نہیں۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰی (۵۳:۵۵) "اپنے رب کی کن نعمتوں میں تو شک کرے گا" کیا یہ تباہیاں اللہ کے انعامات تھے؟ تو یہ اللہ کا فضل وکرم تھا کہ اس نے شر اور برائی کو برباد کر دیا۔ حق کو باطل پر گرایا اور اس کا بھیجا نکالا اور وہ ختم ہوگیا۔ کیا بعد میں آنے والوں کے لئے اس میں عبرت نہیں؟ وہی فضل وکرم ہے اور اس میں شک نہیں ہے اور نہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ خطاب ہر شخص کو ہے۔ ہر دل کو ہے۔ یہ اس شخص کے لئے جو اللہ کے کاموں پر غور کرتا ہے تو اسے مصیبتوں میں بھی اللہ کا فضل وکرم نظر آتا ہے۔

انفس و آفاق کے دلائل و شواہد گنوانے کے بعد اور انسانی تاریخ کے اہم عبرت آموز واقعات کی طرف سرسری اشارہ کرنے کے بعد آخری ضرب عقل و خرد کے تاروں پر' آخری مضراب لیکن ذرا سخت گویا یہ ایک سخت پکار ہے' چلا کر کہ خطرہ قریب ہے خبردار۔

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى (۵۶) اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ (۵۷) لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ (۵۸) (۵۳:۵۶ تا ۵۸) "یہ تنبیہہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے۔ آنے والی گھڑی قریب آلگی ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اس کو ہٹانے والا نہیں ہے۔" یہ رسول جس کی رسالت اور جس کے ڈراوے میں تم شک کرتے ہو۔ یہ انہیں رسولوں میں سے ہے جنہوں نے اسی طرح اپنی اقوام کو ڈرایا اور یہ سخت معیبت اور کھڑکھڑا دینے والی گھڑی ہے یا وہ اس دنیا ہی کا کوئی عذاب ہے اور جس کو ٹالنا ممکن نہیں سوائے اس کے کہ اللہ ٹال دے۔

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ (۵۳:۵۸) "اللہ کے سوا اس کو کوئی ہٹانے والا نہیں ہے۔"
تم پر تو خوفناک عذاب آنے والا ہے بہت قریب ہے۔ ڈرانے والے ناصح اور صادق و امین تمہیں ڈرا رہے ہیں۔ چیخ چیخ کر لیکن تم غفلت ہی میں آگے ہی جا رہے ہو تمہیں اندازہ نہیں کہ مشکل وقت ہے تم باز نہیں آتے ہو۔

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ (۵۹) وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ (۶۰) وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ (۶۱) (۵۳: ۵۹ تا ۶۱) "اب کیا یہی باتیں ہیں جن پر تم اظہار تعجب کرتے ہو' ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو؟ اور گا بجا کر انہیں ٹالتے ہو۔" یہ تو ایک سنجیدہ گفتگو ہے اور لوگوں پر عظیم فرائض عائد کرتی ہے اور یہ گفتگو ایک مکمل نظام حیات کی گفتگو ہے تو تمہیں اس پر تعجب کیا ہو رہا ہے اور تم ہنستے کیوں ہو۔ یہ تو دو ٹوک سنجیدہ بات ہے اور جس کے بیہ عظیم نتائج و ذمہ داریاں ہیں۔ اس زمین پر لوگوں کی جو زندگی ہے اس پر ان کو جواب دینا ہے۔ تمہیں تو اس کی فکر کرنی چاہئے۔ ہنسنے کا مقام نہیں رونے کا مقام ہے۔ ایک ہولناک اور خوفناک موقع آنے والا ہے جہاں کرب عظیم ہوگا۔ اب ایک آخری چیخ۔ ایک پوری آواز سے پکار جو دلوں کو ہلا دیتی اور کانوں کو پھاڑ دیتی ہے کہ لوگو' جہنم سے بچو' تدارک کرو اپنے آپ کو بچاؤ۔

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۵۳:۶۲) ع (السجدة) "جھک جاؤ اللہ کے آگے اور بندگی بجا

لاؤ" یوں اس انداز میں یہ بلند آواز دی جاتی ہے اور ایک طویل تمہید کے بعد یہ چیخ ہے جس سے دل دہل جاتے ہیں اور سخت سے سخت اعصاب کے اندر بھی ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کفار نے اس کو سن کر سجدہ کر لیا۔ سجدہ ریز ہوگئے حالانکہ وہ مشرک تھے۔ وہ وحی میں شک کرتے تھے۔ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہروقت وہ جھگڑتے رہتے تھے۔

انہوں نے ان حالات میں سجدہ کیا کہ وہ اس پوری سورت کے اندر خوفناک انجام کو سن چکے تھے۔ حضور اکرم ﷺ ایک پرسوز انداز میں تلاوت فرما رہے تھے۔ حرم میں مسلم اور مشرک سب بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے سجدہ کیا۔ مسلمانوں نے سجدہ کیا تو مشرکین بھی بے ساختہ گر پڑے۔ وہ اس پر تاثیر کلام الٰہی کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکے۔ شیطان بھی ان کو روک نہ سکا۔ جب ان پر سے یہ اثر ختم ہوا تو وہ اس اثر کو بھی بھول گئے اور اس بات کو بھی بھول گئے کہ انہوں نے سجدہ کیا ہے۔

روایات تواتر ہیں کہ اس سورت کو سن کر مشرکین نے سجدہ کیا۔ اس کے بعد لوگوں نے اس واقعہ کی تاویل اور تجزیہ اپنے اپنے خیال کے مطابق کیا ہے حالانکہ یہ عجیب واقعہ نہ تھا۔ یہ تو قرآن مجید کی تاثیر کا ایک نمونہ تھا جس کے سامنے ایک بار تو سخت سے سخت دل بھی گھائل ہو جاتا ہے۔

---ooo---

یہ واقعہ جس کے بارے میں روایات تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں، مشرکین مکہ کے سجدے کا واقعہ ہے۔ میں بھی سمجھتا تھا کہ اس پر تبصرہ ضروری ہے اور اس کا تجزیہ کرا چاہئے لیکن اس کے بعد مجھے اس واقعہ کا ایک شعوری تجربہ بھی ہوا اور میں نے اپنے دل میں اس پر غور کیا اور مجھے معلوم ہوا کہ اس کا اصل سبب کیا تھا۔

اور میں نے اس سے قبل، یہ ذیلی روایات پڑھ رکھی تھیں جو "حدیث غرانیق" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ حدیث ابن سعد نے طبقات میں، ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں اور بعض مفسرین نے آیت ۲۲ : ۵۲ کی تفسیر میں نقل کی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۲ : ۵۲) "اے نبیؐ تم سے پہلے ہم نے نہ کوئی رسول بھیجا ہے نہ نبی کہ جب اس نے تمنا کی، شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح شیطان جو کچھ خلل اندازیاں کرتا ہے اللہ انکو مٹا دیتا ہے اور انہی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔ اللہ علیم ہے اور حکیم ہے۔" ان روایات کے بارے میں علامہ ابن کثیر نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی روایت بھی سند صحیح کے ساتھ روایت نہیں ہوئی۔ ان میں سے مفصل ترین، رسول اللہ پر افترا میں کثیر اور خرافات میں کم سے کم آلودہ روایت ابن ابو حاتم کی روایت ہے۔ کہتے ہیں روایت بیان کی موسیٰ ابن الاموسیٰ کوفی نے، محمد ابن اسحاق شیبی سے، انہوں نے محمد ابن فلیح سے، انہوں نے موسیٰ ابن عقبہ سے، انہوں نے ابن شہاب سے، وہ کہتے ہیں سورت النجم نازل ہوئی۔ مشرکین ان دنوں کہتے تھے کہ اگر یہ شخص ہمارے الہوں کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کر دے تو ہم اسے اور اس کے ساتھیوں کو تسلیم کرلیں لیکن یہ شخص اپنے دین کے دوسرے مخالفوں کا مثلاً یہود و نصاریٰ کا ذکر ان الفاظ میں نہیں کرتا جن میں یہ ہمارے الہوں کا ذکر

کرتا ہے۔ ہمیں تو یہ سب دشنام کرتا ہے۔ یہ وہ دور تھا کہ حضور اکرم اور آپ کے ساتھیوں کو سخت اذیتیں دی جارہی تھیں اور آپ ان کی گمراہی کی وجہ سے نہایت ہی پریشان رہتے تھے۔تو آپ یہ تمنا کرتے تھے کہ یہ لوگ ہدایت پر آجائیں۔ جب اللہ نے سورت النجم نازل کی اور اس میں یہ آیت آئی۔

اَفَرَاَیْتَ الَّذِیْ تَوَلّٰی (۳۳:۵۳) وَاَعْطٰی قَلِیْلًا وَّاَکْدٰی (۳۴:۵۳) تو شیطان نے ان آیات سے متصلا بعد اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کردیئے۔

انہن الغرانیق العلٰی و ان شفاعتہن لترتجی ”اور بے شک یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی سفارش کی توقع کی جاتی ہے“۔

یہ شیطان نے اپنی جانب سے بیچ ملایا تھا۔یہ الفاظ مکہ میں ہر مشرک نے سن لئے اور ان کے دل میں بیٹھ گئے اور اس کی وجہ سے ان کی زبانیں خاموش ہوگئیں اور انہوں نے ان الفاظ کے آنے پر ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور یہ کہنا شروع کردیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رجوع کرکے اپنے سابق دین پر آگیا ہے۔جب رسول اللہ سورت کے آخر تک پہنچے تو آپ نے سجدہ کیا اور محفل میں جو مسلم اور مشرک بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے سجدہ کرلیا۔ولید ابن مغیرہ بوڑھا آدمی تھا۔اس نے زمین سے مٹی اٹھائی اور اس پر سجدہ کردیا۔دونوں فریقوں نے تعجب کیا کہ حضور کے ساتھ تمام لوگ کس طرح سجدہ ریز ہوگئے۔ مسلمانوں کو تعجب یوں ہوا کہ مشرکین نے سجدہ کرلیا حالانکہ وہ ایمان نہیں لائے تھے۔بغیر ایمان و تصدیق کے سجدہ کرلیا۔مسلمانوں نے وہ الفاظ نہ سنے تھے جو شیطان نے ادا کردیئے تھے اور جن کو مشرکین نے سن لیا تھا۔تو مشرکین مطمئن ہوگئے کہ شیطان حضور کی تمنامیں یہ بات ڈال دی اور مشرکین کے کانوں میں یہ بات ڈال دی کہ یہ الفاظ حضورؐ نے پڑھے ہیں تو انہوں نے اپنے الہٰوں کی تعظیم میں سجدہ کیا۔یہ بات لوگوں کے اندر بہت ہی مشہور ہوگئی اور شیطان نے اسے یوں پھیلا دیا کہ حبشہ تک پہنچ گئی۔جہاں بعض مومنین آباد تھے یعنی عثمان ابن مظعون اور ان کے ساتھی۔ان کو بتایا گیا کہ اہل مکہ مسلمان ہوگئے ہیں اور انہوں نے رسول اللہ کے ساتھ نماز پڑھی ہے اور ان کو یہ بات بھی پہنچی کہ ولید ابن مغیرہ نے ہاتھ میں مٹی لے کر اس پر سجدہ کیا۔ان کو بتایا گیا کہ اب مکہ میں مسلمان پرامن ہیں چنانچہ حبشی مہاجرین جلدی سے لوٹے۔اس دوران اللہ نے اس شیطانی حرکت کے (اثرات) کو منسوخ کردیا تھا اور اپنی آیات کو محکم کردیا تھا اور افترا سے بچالیا تھا اور اللہ نے فرمایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ ..... جب اللہ نے اپنا فیصلہ دے دیا اور شیطانی بیچ کو منسوخ کردیا تو مشرکین بھی اپنی گمراہی اور دشمنی کی طرف لوٹ گئے اور انہوں نے پھر از سر نو مسلمانوں پر تشدد شروع کردیا۔

بعض روایات ایسی ہیں جن میں مذکورہ بالا عبارت (غرانیق) کو حضور اکرم کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ وجہ بیان کی ہے کہ (نعوذ باللہ) حضور چاہتے تھے کہ کسی طرح لوگ مسلمان ہوجائیں اور قریش کے ساتھ کسی طرح مصالحت ہوجائے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے پڑھتے ہی ان روایات کا انکار کیا ہے کیونکہ ان کو تسلیم کرنے کے بعد عصمت انبیاء اور وحی کی حفاظت پر یقین نہیں رہ سکتا اور یہ روایات نہایت لغو ہیں اور قرآن مجید میں تحریف کے امکان کی راہ کھولتی ہیں

لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود سورت کی عبارت بھی ان الفاظ کے متحمل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے ان الفاظ کو شیطان کے الفاظ قرار دیا ہے وہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اس سورت کے الفاظ کے ساتھ ادا ہوئے ہوں اور مشرکین نے اس سے وہ تاثر لیا ہو جس کا ان روایات میں ذکر ہے کیونکہ مشرکین عرب تھے۔ وہ عربی زبان خوب سمجھتے تھے۔ جب انہوں نے (غرانیق) والی عبارت سنی اور اس کے بعد پھر متصلاً انہوں نے یہ آیت سنی۔ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى (۲۱) تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (۲۲) اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (۵۳ : ۲۳) "کیا بیٹے تمہارے لئے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لئے؟ یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئے۔ دراصل یہ کچھ نہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔" کیا وہ اس عبارت کا مفہوم بھی نہ سمجھے اور اس کے بعد انہوں نے سنا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى (۲۷) وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا (۵۳ : ۲۸) "مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ اس معاملہ کا کوئی علم انہیں حاصل نہیں ہے۔ وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان حق کی جگہ کچھ کام نہیں دے سکتا۔" اور اس سے قبل وہ یہ بھی سنتے ہیں۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (۵۳ : ۲۶) "آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں ان کی شفاعت کچھ کام نہیں آسکتی جب تک کہ اللہ کسی ایسے شخص کے حق میں اس کی اجازت نہ دیدے جس کے لئے وہ کوئی عرضداشت سننا چاہے اور اس کو پسند کرے۔" یہ مشرکین جو عرب تھے اور کلام کو اچھی طرح سمجھتے تھے وہ کس طرح رسول اللہ کے ساتھ سجدہ کر سکتے تھے کیونکہ اس سورت میں تو یہ کلام درست ہی نہیں رہتا۔ ان کے بتوں کی تعریف اور یہ کہ ان کی شفاعت قبول ہوگی۔ یہ تو تسلیم شدہ ہی نہیں رہتی۔ وہ اس قدر غبی تو تھے نہیں جس طرح یہ لوگ غبی تھے جنہوں نے یہ روایات نقل کی ہیں یا تصنیف کی ہیں جن کو آج کل مستشرقین ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں یا جہالت کی وجہ سے مطلب براری کے لئے۔

جہاں تک مشرکین کے سجدے کی بات ہے تو یہ درست ہے اور یہ کسی اور وجہ سے ہوا ہوگا۔ اس طرح مہاجرین بھی حبشہ سے کسی اور وجہ سے لوٹے ہوں گے۔ یہاں ہم مہاجرین کی واپسی کی تحقیق تو نہیں کر سکتے کہ وہ واپس آئے اور پھر دوبارہ حبشہ کو چلے گئے۔ ہاں یہاں مشرکین کے سجدے کی بات ضروری ہے۔

میں ایک عرصہ تک غور کرتا رہا کہ مشرکین نے یہ بے ساختہ سجدہ کیوں کیا۔ میرے ذہن میں ایک احتمال یہ آتا ہے کہ

ایسا ہوا ہو گا۔ روایات میں آتا ہے کہ مہاجرین حبشہ دو یا تین ماہ کے بعد حبشہ سے واپس آگئے تھے ۔ یہ بھی محتاج توجیہ نقل ہے ۔ بہرحال میں اس نکتے پر غور ہی کر رہا تھا کہ مجھے ایک شعور اور عملی تجربے سے گزرنا پڑا جس کی طرف اس سے قبل میں نے اشارہ بھی کیا ہے ۔

ایک دفعہ ہم بعض دوستوں کے ساتھ رات کو گھوم رہے تھے کہ ہم نے قریب ہی ایک قاری کی قرات سنی ۔ یہ سورت نجم پڑھ رہا تھا۔ ہم خاموش ہوگئے اور قرآن مجید سننے لگے ۔ قاری کی آواز بھی بہت ہی خوبصورت تھی اور اس کی قرات بھی بہت ہی اچھی تھی ۔

میں اس قاری کے ساتھ چلتا رہا۔ میرا تصور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عالم بالا کی سیر کرتا رہا۔ پھر جبرائیل علیہ السلام کی ملاقات جو ان سے فرشتوں کی اصل صورت میں تھی ۔ یہ تجربہ بھی حضور اکرم کے لئے عجیب ہو گا۔ پھر ہم سدرۃ المنتہیٰ اور جنت الماوی کی طرف گئے میں اور اپنے خیال اور تخیل کے ساتھ جا رہا ہوں اور قاری صاحب تلاوت کر رہے ہیں ۔ یہ میرا سفر جاری ہے جہاں تک میرا تصور ' میرا خیال اور میرا شعور میرا ساتھ دے رہا ہے ۔

اس کے بعد میرے احساسات ان تصورات پر مرکوز ہوگئے جو مشرکین فرشتوں کے بارے میں رکھتے تھے ۔ ان کی بندگی ' ان کا خدا کی اولاد ہونا ' ان کی مونث ہونا پھر نطفے سے انسان کی تخلیق کا منظر ' ماؤں کے پیٹوں میں جنین کے مناظر اور اللہ کے علم کا احاطہ کا تصور جس قدر میرے لئے ممکن تھا۔

پھر آخری پیراگراف پڑھا گیا اور مجھ پر اثرات پے در پے تھے کہ وہ جہاں جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے ایک وسیع کائنات ہے ' پھر حساب و کتاب کے مناظر ' پھر یہ منظر کہ انسان جو راہ بھی لے اس کی انتہا پر اللہ سے ملاقات ہوگی ۔ اس کے بعد اس جہاں میں ہر طرف رونے والے روتے ہیں اور ساتھ ہی ہنسنے والے ہنستے ہیں ۔ اربوں مخلوق زندہ ہوتی ہے تو اربوں فنا ہوتی ہے اور نطفہ یعنی مائیکروسکوپی نقطہ کہاں سے چلتا ہے اور سفر کرتے کرتے کس طرح مذکر اور مونث کی شکل اختیار کر کے ایک قوی ہیکل انسان بن جاتا ہے پھر میرا خیال ان بستیوں میں جاتا ہے جو ہلاک کر دی گئیں جو الٹا دی گئیں اور ان پر ویرانی چھا جاتی ہے یا جو کچھ چھا جاتا ہے ۔

اور پھر قاری آخری پکار تلاوت کرتا ہے ۔

هٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولَىٰ (٥٦) أَزِفَتِ الْآزِفَةُ (٥٧) لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ (٥٣ : ٥٨) "یہ ایک تنبیہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے ۔ آنے والی گھڑی قریب آگئی ہے ۔ اللہ کے سوا کوئی اس کا ہٹانے والا نہیں ہے ۔"

اور اس کے بعد آخری آواز آتی ہے اور میرا پورا بدن کانپ اٹھتا ہے اس خوفناک لاجوابی کے بعد

أَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ (٥٩) وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ (٦٠) وَأَنتُمْ سَامِدُونَ (٥٣ : ٦١) "کیا یہ وہ باتیں ہیں جن پر تم اظہار تعجب کرتے ہو؟ ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو اور گا بجا

کر انہیں ٹالتے ہو۔"

اور آخر میں جب میں نے قاری صاحب سے سنا۔

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۵۳: ۶۲) (السجدۃ تلاوت) "جھک جاؤ اللہ کے آگے اور بندگی بجالاؤ" تو میرا دل کانپ اٹھا۔ میرے اعصاب جواب دے گئے اور میری حالت ایسی ہوگئی کہ میں جسمانی اعتبار سے نڈھال ہوگیا اور میرے اوپر کپکپی طاری ہوگئی اور میرے لئے کھڑا ہونا مشکل ہوگیا۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور باوجود کوشش کے میں آنسو روک نہ سکا۔

اس وقت مجھے یقین ہوگیا کہ مشرکین مکہ نے جو بے ساختہ سجدہ کیا وہ مجبور تھے کہ ایسا کریں۔ اور اس کا سبب قرآن مجید کا وہ اثر ہے جو ہر شخص پر ہوتا ہے اور کوئی شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس سورت کے اندر جو لفظی ترنم ہے اور جو معنوی سحر آفرینی ہے وہ جسم کے اندر زلزلہ پیدا کر دیتی ہے۔

یہ پہلی بار نہ تھا کہ میں نے سورت نجم سنی ہو یا پڑھی ہو لیکن اس بار مجھ پر اس کا یہ اثر ہوا میرے اندر اس قدر رد عمل پیدا ہوا یہ ہے قرآن مجید کا راز۔ اس کے رد عمل میں کچھ لمحات ہوتے ہیں کہ ایک آیت یا سورت انسان سنتا ہے تو وہ فوراً لبیک کہتا ہے۔ یہ لمحات انتظار کرنے سے نہیں ملتے۔ کچھ لمحات ہوتے ہیں جن میں انسان قوت کے اصل سرچشمے سے مل جاتا ہے اور اس وقت اس پر اثر ہوتا ہے اور وہ کیا سے کیا بن جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس دن سامعین قرآن کو اس قسم کے لمحات نصیب ہوگئے تھے۔ پھر پڑھنے والے حضرت محمد ﷺ تھے۔ آپ نہایت گہرے خلوص سے پڑھتے تھے۔ آپ کی ذات ان حالات کے اندر خود شریک تھی جو اس سورت میں بیان ہوئیں۔ آپ کی ذات، آپ کی تلاوت اور آپ کا خلوص اس کے اندر گھل مل گیا تھا۔ ان سب چیزوں کے اثر میں سامعین کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ سجدہ ریز ہوگئے اور جب آپ نے پڑھا۔

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۵۳: ۶۲) (السجدۃ تلاوت) تو بے ساختہ سب سجدے میں گر گئے۔ آپ بھی گر گئے، مسلمان بھی گر گئے اور کفار بھی گر گئے۔

یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ تم اپنا تجربہ اور اپنی واردات کو بیان کر رہے اور تم تو مسلمان ہو۔ تم اس قرآن پر ایمان رکھتے ہو اور تمہارے دل میں قرآن کا ایک مقام و اثر ہے۔ یہ مشرکین تو سرے سے مومن ہی نہ تھے اور قرآن کے منکر تھے تو انہوں نے کس طرح سجدہ کر لیا۔

لیکن دو باتیں ایسی ہیں جن سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے ایک تو یہ کہ سورت کی تلاوت حضرت محمد ﷺ خود فرما رہے تھے جنہوں نے اس قرآن کو براہ راست اس کے سرچشمے سے لیا تھا اور آپ کی زندگی قرآن سے عبارت تھی اور آپ کو قرآن کے ساتھ اس قدر لگاؤ تھا کہ اگر آپ کسی گھر سے قرآن کی آواز سنتے تو آپ کے قدم بوجھل ہو جاتے اور آپ سننے لگتے۔ اپنے گھر میں بھی اگر وہ سنتے تو دروازے میں کھڑے ہو جاتے اور اندر تب جاتے جب تلاوت ختم ہوتی اور پھر اس سورت میں تو آپ کے وہ لمحات ذکر ہوئے جو آپ نے عالم بالا میں گزارے۔ روح الامین کے ساتھ گزارے اور آپ نے انہیں اپنی اصلی صورت میں دیکھا جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں ایک قاری سے سن رہا تھا۔ اس لئے دونوں میں بہت

بڑا فرق ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مشرکین کے دل قرآن کے عظیم تاثیرات سے کس طرح بچ سکتے تھے جبکہ وہ براہ راست حضرت محمد ﷺ سے سن رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ خدا کا کلام ہے البتہ وہ محض عناد میں مبتلا تھے اور یہ ضد اور عناد بھی مصنوعی تھے۔ آنے والے دو واقعات یہ بتائیں گے کہ وہ حضرت محمد ﷺ سے بہت ہی متاثر تھے۔ آپ کی روحانی اور اخلاقی قوتوں کے معترف تھے اس لئے ان کا متاثر ہو کر سجدے میں گر جانا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔

ابن عساکر نے عتبہ ابن ابولہب کے حالات زندگی میں لکھا ہے محمد ابن اسحاق سے، انہوں نے عثمان ابن عروہ سے، انہوں نے ابن الزبیر سے، انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے ہبار بن الاسود سے وہ کہتے ہیں ابولہب اور اس کے بیٹے عتبہ شام جانے کے لئے تیار ہوئے۔ میں نے بھی ان کے ساتھ تیاری کی۔ ان کے بیٹے عتبہ نے کہا خدا کی قسم میں محمد ﷺ کے پاس جاؤں گا اور اس کو اس کے رب کے بارے میں اذیت دوں گا۔ یہ نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہا اے محمد ﷺ "میں اس شخص کو تسلیم نہیں کرتا جو قریب ہوا اور لٹکا یہاں تک وہ دو کمانوں کے برابر تھا یا قریب تھا۔" تو نبی ﷺ نے فرمایا "اے اللہ اس پر اپنے کتوں میں سے کسی کتے کو مسلط فرما دے" عتبہ واپس ہوا۔ باپ نے پوچھا کہ بیٹے تم نے اسے کیا کہا۔ اس نے واقعہ دہرایا تو اس نے پھر پوچھا کہ اس نے تمہیں کیا جواب دیا۔ تو اس نے بتایا کہ انہوں نے یہ بد دعا کی کہ اے اللہ اس پر اپنے کتوں میں سے کسی کتے کو مسلط کر دے تو ابولہب نے کہا بیٹا خدا کی قسم میں اس کی بد دعا کے بارے میں تم سے بے فکر نہیں۔ بہرحال ہم چلے یہاں تک کہ ہم ابراہ میں اترے۔ یہ سدہ میں ہے۔ ہم ایک راہب کے گرجے میں جا کر اترے۔ اس نے کہا اہل عرب تم اس راستے سے کیوں آگئے ہو یہاں تو شیر اس طرح پھرتے ہیں جس طرح بھیڑ بکریاں پھرتی ہیں۔ ابولہب نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ دیکھو میں بوڑھا ہوں اور میرا تم پر حق ہے اور اس شخص نے میرے بیٹے کے بارے میں اللہ کے ہاں بد دعا کی ہے۔ میں اس سے بہت ڈرتا ہوں لہٰذا اپنے سامان کو اس گرجے میں جمع کرو اور میرے بیٹے کو سامان کے اوپر سلا دو اور اس کے بعد سامان کے ارد گرد تم سو جاؤ۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ رات کو ایک شیر آیا۔ اس نے ہمارے منہ سونگھے۔ اس کو ایک شکار نہ ملا۔ یہ شیر چھلانگ لگا کر سامان کے اوپر چڑھ گیا۔ عتبہ کا منہ سونگھا اس کے بعد اسے خوب دبوچا۔ خوب دبوچا اور اس کے بعد اس کا سر پھوڑ دیا۔ ابولہب نے کہا میں نے بھی کہا تھا کہ یہ محمد ﷺ کی بد دعا سے بچ نہیں سکتا۔

یہ واقعہ تو ابولہب کے ساتھ ہوا۔ جو آپ کے شدید ترین مخالفین میں سے تھا اور مخالف ہی نہیں بلکہ مخالفین کا سرخیل تھا۔ آپ کے خلاف لوگوں کو جمع کرتا تھا۔ اور قرآن کریم میں بھی اس کے خلاف بد دعا قیامت تک ثبت کر دی گئی ہے۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (۱) مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ (۲) سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۳) وَّ امْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۴) فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۵) (۱۱۱: ۱ تا ۵) "ٹوٹ گئے ہاتھ ابولہب کے اور نامراد ہو گیا وہ۔ اس کا مال اور جو کچھ اس

نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔ ضرور وہ شعلہ بار آگ میں ڈالا جائے گا اور اس کی جورو بھی لگائی بجھائی کرنے والی' اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی" اور یہ تھا اس کا حقیقی شعور محمد ﷺ کے بارے میں اور حضرت محمد ﷺ کی بددعا سے وہ کس قدر کانپ گیا تھا اور اسے اپنے بیٹے کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔

دوسرا واقعہ عتبہ ابن ابو ربیعہ کا ہے اس کو قریش نے حضرت محمد ﷺ کے ہاں بھیجا کہ آپؐ سے بات کرے کہ اس تحریک سے باز آجائیں جس نے قریش کے اندر تفریق ڈال دی ہے اور آپ ان کے الہوں پر تنقید کرتے ہیں۔ قریش اس کے لئے تیار ہیں کہ اگر آپ سربراہی چاہیں' مال چاہیں' عورتیں چاہیں' آپ کو دے دیں۔ جب عتبہ ابن ابو ربیعہ نے بات ختم کر دی تو حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہاری بات ختم ہوگئی تو اس نے کہا ہاں ختم ہوگئی تو حضورؐ نے کہا پھر میری بات سنو' تو اس نے کہا اچھا کرو تو آپ نے سورت تلاوت کی:۔

حٰمٓ (۱) تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲) كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۳) بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۴۱ : ۴) "یہ خدائے رحمان و رحیم کی طرف سے نازل کردہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ عربی زبان کا قرآن ان لوگوں کے جو علم رکھتے ہیں بشارت دینے والی اور ڈرانے والی مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے" آپ پڑھتے گئے یہاں تک کہ آپ نے پڑھا۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۴۱ : ۱۳) "اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اس طرح کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد و ثمود پر نازل ہوا۔" اس مقام پر عتبہ اٹھا اور حضور کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بہت خوفزدہ ہوگیا اور حضرت نبی ﷺ سے درخواست کی کہ اپنے بھائیوں پر رحم کرو۔ یہ قریش کے پاس واپس ہوا اور ان کے سامنے یہ پورا واقعہ بیان کیا اور ان سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ محمد ﷺ جو بات کہتا ہے وہ جھوٹ نہیں ہوتا۔ اس لئے میں ڈر گیا تھا کہ تم پر عذاب نہ آجائے۔

یہ اس شخص کا حال تھا جس نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ اس کا خوف اور تاثر ظاہر ہے باوجود اس کے کہ یہ لوگ سخت ہٹ دھرمی اور ضد میں انکار پر تلے ہوئے تھے۔

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب ان لوگوں نے حضرت محمد ﷺ کے منہ مبارک سے جب سورت نجم سنی تو وہ اس قدر متاثر ہوئے اور ایسے حال میں مبتلا ہوئے کہ وہ رک نہ سکے اور حضور ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ سجدہ ریز ہوگئے کیونکہ بعض لمحات ایسے ہوتے ہیں کہ قرآن کا انسان پر زبردست اثر ہوتا ہے تو انہوں نے بے ساختہ سجدہ کر لیا۔ اس میں نہ کوئی غرانیق کی بات تھی اور نہ کوئی اور بات تھی مثلاً شیطان کی دخل اندازی کی اور جو روایات بھی اس سلسلے میں ہیں وہ سب خود ساختہ ہیں۔

---ں ں ں---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ۔۔ ۲۷

سورۃ القمر ۔ ۵۴

۱۔۔ تا ۔۔ ۵۵

سورۃ القمر ایک نظر میں

یہ سورت آغاز سے اختتام تک ایک خوفناک اور سخت حملہ ہے اور اس میں مکذبین کے لئے انجام بد سے سخت ڈراوا ہے کہ تمہارا انجام بہت ہی برا ہونے والا ہے جبکہ مومنین اور تصدیق کرنے والوں کے لئے نہایت پختہ اطمینان کا سامان ہے اور یہ سورت کئی مسلسل حلقوں میں منقسم ہے۔ ہر حلقہ جھٹلانے والوں کی سزا کا ایک منظر ہے۔ ہر حلقے کے آخر میں انسانی احساس کو خوب جھنجوڑا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ (٥٤: ١٦) "دیکھ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات" اور اس دباؤ اور جھنجوڑنے کے بعد احساس کو ذرا آزاد چھوڑ کر کہہ دیا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (٥٤: ١٧) "ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا۔"

اس سورت کے موضوعات وہی ہیں جو تمام کی سورتوں میں وارد ہیں۔ آغاز میں قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر ہے اور آخر میں بھی مناظر قیامت میں سے ایک منظر ہے اور ان کے درمیان کے حصے میں قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، فرعون اور اس کے سرداروں کی ہلاکتیں ہیں۔ یہ سب موضوعات ہیں جن سے کی سورتیں بھری ہوئی ہیں اور مختلف شکل و صورت میں یہ واقعات بیان ہوئے ہیں۔

لیکن اس سورت میں انہی موضوعات کو ایک بالکل نئے انداز میں لیا گیا ہے۔ اس طرح کہ یہاں یہ پوری طرح جدید نظر آتی ہے۔ البتہ یہ سورت ذرا درشت لہجے میں نہایت فیصلہ کن انداز میں ان موضوعات کو لیتی ہے۔ انسان پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور انسان کو اپنے اردگرد تباہی ہلاکت، قرع و نزع اور توڑ و پھوڑ اور خوف و ہراس کی فضا نظر آتی ہے۔ انسان کو یہ خوف طاری ہو جاتا ہے کہ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

اس سورت کا مخصوص ترین حصہ یہ ہے کہ اس کا ہر حلقہ ایک دردناک، دہشت ناک عذاب پر مشتمل ہے اور جسے تکذیب کرنے والے دیکھ رہے ہیں۔ وہ بذات خود ان مناظر میں موجود ہیں۔ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ اللہ کے عذاب کے کوڑے برس رہے ہیں جونہی یہ مکذبین ایک عذاب سے نکلتے ہیں ابھی ان کا سانس پھولا ہوا ہوتا ہے کہ وہ عذاب کے دوسرے حلقے کے سامنے کھڑے ہیں اور پہلے منظر سے پھر یہ دوسرا منظر زیادہ ہولناک اور خوفناک ہے یہاں تک کہ اس سورت کے یہ ساتوں حلقے ایسی ہی خوفناک فضا میں ختم ہوتے ہیں اور مکذبین کا گلا گھٹنے لگتا ہے۔ ایسے ہی حالات میں سورت کا آخری منظر آجاتا ہے۔ اس کا رنگ ڈھنگ مختلف ہے۔ یہاں امن اطمینان اور سکون ہے۔ یہ منظر متقین اور خدا

خوفی رکھنے والوں کا منظر ہے ۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ (٥٤) فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (٥٤: ٥٥) ”نافرمانی سے پرہیز کرنے والے یقیناً باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے سچی عزت کی جگہ بڑے ذی اقتدار بادشاہ کے قریب“ اور یہ پرسکون منظر ان مناظر کے بعد آتا ہے جن میں ہولناکیاں موجوں کی طرح اڑتی چلی آتی ہیں ۔ ہلا مارنے والے خوف و ہراس میں اور نہایت ہی توہین آمیز عذاب میں ۔

يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ (٥٤: ٤٨) ”جس روز یہ منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے ۔ اس روز ان سے کہا جائے گا کہ چکھو جہنم کی لپٹ کا مزہ ۔“

ذرا دیکھئے ' دونوں مناظر کا فرق ' دونوں کے مقام و مرتبہ کا فرق ' دونوں گروہوں کے رنگ ڈھنگ کا فرق اور دونوں کے انجام کا فرق ۔

---()---

درس نمبر ۲۵۳ تشریح آیات

۱ ـ ـ تا ـ ـ ۵۵

سُوْرَةُ الْقَمَرِ مَكِّيَّةٌ (۵۴) (۳۷) ـ اٰيَاتُهَا ۵۵ ـ رُكُوْعَاتُهَا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ ﴿۱﴾ وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ﴿۲﴾ وَ كَذَّبُوْا وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ وَ كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳﴾ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ﴿۴﴾ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ﴿۵﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ﴿۶﴾ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ﴿۷﴾ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ﴿۸﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں منہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو چلتا ہوا جادو ہے ۔ انہوں نے (اس کو بھی) جھٹلا دیا اور اپنی خواہشات نفس ہی کی پیروی کی ۔ ہر معاملہ کو آخر کار ایک انجام پر پہنچ کر رہنا ہے ۔ ان لوگوں کے سامنے (پچھلی قوموں کے) وہ حالات آچکے ہیں جن میں سرکشی سے باز رکھنے کے لئے کافی سامان عبرت ہے اور ایسی حکمت جو نصیحت کے مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے مگر تنبیہات ان پر کارگر نہیں ہوتیں ۔ پس اے نبی ؐ ان سے رخ پھیر لو جس روز پکارنے والا سخت ناگوار چیز کی طرف پکارے گا لوگ سہمی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اپنی قبروں سے اس طرح نکلیں گے گویا وہ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں ۔ پکارنے والے کی طرف دوڑے جا رہے ہوں گے اور وہی منکرین (جو دنیا میں اس کا انکار کرتے تھے) اس وقت کہیں گے کہ یہ دن تو بڑا کٹھن ہے"۔

یہ ایک خوبصورت اور آنکھیں چندھیا دینے والا منظر ہے جس میں ایک عظیم کائناتی حادثہ دکھایا گیا ہے اور یہ اس سے بھی عظیم تر حادثہ کی تمہید ہے۔

اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (۵۴ : ۱) "قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا" یہ عظیم خبر ہے اور زبردست تمہید ہے ان لوگوں نے پہلا حادثہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اب بس دوسرے عظیم حادثہ ہی کے منتظر تھے۔

واقعہ شق قمر اور اس کے عام طور پر دیکھے جانے کے بارے میں روایات تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ تمام روایات اس پر متفق ہیں کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ البتہ اس وقت اس کی شکل کس طرح تھی اس کے اجمال اور تفصیل کا فرق روایات میں موجود ہے۔

حضرت انس ابن مالک کی روایت۔امام احمد نے روایت کی' معمر سے انہوں نے قتادہ سے انہوں نے انس ابن مالک سے وہ کہتے ہیں کہ اہل مکہ نے نبی ﷺ سے معجزہ طلب کیا تو مکہ میں دوبار چاند پھٹ پڑا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (۵۴ : ۱) "قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند ٹکڑے ہو گیا"
امام بخاری نے روایت کی عبداللہ ابن عبدالوہاب سے انہوں نے بشر ابن مفضل سعید ابن ابوعروہ سے انہوں نے قتادہ سے 'انہوں نے انس ابن مالک سے وہ کہتے ہیں "اہل مکہ نے رسول ﷺ سے مطالبہ کیا کہ آپ کوئی معجزہ دکھائیں۔ تو آپ نے ان کو دکھایا کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور دونوں کے درمیان حرا تھا۔" اس روایت کو بخاری اور مسلم نے دوسری اسناد سے بھی قتادہ اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے حضرت جبیر بن مطعم کی روایت امام احمد نے **محمد ابن کثیر سے کی ہے۔** انہوں نے سلیمان ابن کثیر سے انہوں نے حصین ابن عبدالرحمٰن سے 'انہوں نے محمد ابن جبیر ابن مطعم سے 'انہوں نے اپنے والد حضرت جبیر بن مطعم سے۔وہ کہتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا ایک پہاڑ پر نظر آتا تھا اور دوسرا اس پہاڑ پر تو کفار نے کہا محمد ﷺ نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔ اگر اس نے ہم پر جادو کیا ہے تو یہ دنیا کے سب انسانوں پر تو جادو نہیں کر سکتا۔ یہ روایت اس طریقے سے صرف امام احمد ہی نے کی ہے۔امام بیہقی نے اپنی کتاب الدلائل میں بواسطہ محمد ابن کثیر' اس کے بھائی سلیمان ابن کثیر سے 'اور انہوں نے حصین ابن عبدالرحمان سے روایت کی ہے اور ابن جریر اور بیہقی نے دوسرے طریقوں اور سندوں کے ساتھ حضرت جبیر ابن مطعم ﷺ سے نقل کی ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس ﷺ کی روایت۔امام بخاری نے روایت کی۔ یحییٰ ابن کثیر سے انہوں نے بکر سے 'انہوں نے جعفر سے 'انہوں نے عراک ابن مالک سے 'انہوں نے عبید اللہ ابن عبداللہ ابن عتبہ سے 'انہوں نے حضرت ابن عباس سے وہ کہتے ہیں حضور اکرم کے زمانے میں چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا واقعہ پیش آیا۔" امام بخاری نے اور امام مسلم نے ایک سابقہ سند کے ذریعہ بواسطہ عراک ابن عباس سے روایت کی اور امام ابن جریر نے ایک دوسری سند سے بواسطہ علی ابن ابو طلحہ' حضرت ابن عباس سے روایت کی۔ یہ اس طرح ہوا کہ ہجرت سے قبل چاند پھٹ گیا یہاں تک کہ لوگوں نے دیکھا کہ وہ دو ٹکڑے ہے۔ عوفی نے بھی حضرت ابن عباس سے اسی طرح نقل کیا۔ طبرانی نے ایک دوسری سند سے بواسطہ

عکرمہ ' حضرت ابن عباس روایت کی ۔ انہوں نے فرمایا رسول اللہ کے زمانے میں چاند تاریک ہوگیا تھا ۔" تو اہل مکہ نے کہا .... محمد ﷺ نے چاند پر بھی جادو کر دیا ہے ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔

اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (۱) وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (۵۴ : ۲) حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ۔ حافظ ابوبکر بیہقی کہتے ہیں ابو عبداللہ الحافظ اور احمد ابن الحسن قاضی نے جرری سے روایت کی دونوں نے ' ابو العباس اصم سے ' انہوں نے عباس ابن محمد دوری سے ' انہوں نے وھب ابن جریر سے انہوں نے شعبہ سے ' انہوں نے امش سے ' انہوں نے مجاہد سے ' اور انہوں نے عبداللہ ابن عمر ؓ سے ' اس آیت کی تفسیر میں ۔

اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (۵۴ : ۱) کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ کے زمانے میں ہوا تھا ۔ یہ دو ٹکڑے ہوا تھا ایک پہاڑ سے پیچھے تھا اور ایک آگے تھا ۔" اس پر نبی ﷺ نے فرمایا ۔

اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ (اے اللہ .... گواہ رہنا) اس طرح اس روایت کو مسلم اور ترمذی نے شعبہ سے انہوں نے اعمش سے اور انہوں نے مجاہد سے نقل کیا ہے ۔

عبداللہ ابن مسعود ؓ کی روایت ۔ امام احمد فرماتے ہیں ۔ روایت کی سفیان ابن ابو نجیح نے ' مجاہد سے ' انہوں نے ابو معمر سے ' انہوں نے حضرت ابن مسعود سے ' وہ فرماتے ہیں ' رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں چاند دو ٹکڑے ہوگیا ۔ کفار نے اچھی طرح اسے دیکھا ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اشہدوا (گواہ رہو) امام بخاری اور امام مسلم نے سفیان ابن عینیہ سے یہی روایت کی ہے اور انہوں نے امش سے انہوں نے ابراہیم سے ' انہوں نے ابو معمر عبداللہ ابن صخبرہ سے ' انہوں نے حضرت ابن مسعود سے ' امام بخاری کہتے ہیں کہ امام ابو داؤد طیالسی نے یہ روایت کی ' ابو عوانہ سے انہوں نے مغیرہ سے انہوں نے ابو الضحیٰ سے ' انہوں نے مسروق سے انہوں نے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے انہوں نے فرمایا رسول اللہ کے زمانے میں چاند دو ٹکڑے ہوگیا ۔ قریش نے کہا یہ ابن ابو کبشہ کا جادو ہے ۔ کہتے ہیں کہ لوگوں نے کہا دیکھو جو لوگ سفر پر ہیں وہ آجائیں کیونکہ محمد ﷺ پوری دنیا کے لوگوں پر تو جادو نہیں کر سکتا چنانچہ اس کے بعد جو سفر پر تھے وہ آئے اور انہوں نے بھی اس کی تصدیق کی ۔ امام بیہقی نے دوسرے طریقوں سے بھی اسے روایت کیا ہے مسروق سے ' انہوں نے عبداللہ ابن مسعود سے ' مفہوم اسی سے ملتا جلتا ہے ۔

یہ ہیں متواتر روایات مختلف اسناد اور طرق سے کہ یہ واقعہ ہوا اور مکہ میں اس کی جگہ بھی بتا دی گئی ۔ ماسوائے ایک روایت کے جس میں منیٰ کا ذکر ہے باقی روایات مکہ کے بارے میں ہیں ۔ حضور کے زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اور ہجرت سے قبل پیش آیا ۔ اکثر روایات میں آتا ہے کہ یہ دو ٹکڑے ہوگیا اور یہ ایک روایت میں آتا ہے کہ یہ چاند گرہن ہوگیا تھا ۔ بہرحال واقعہ جو بھی ہو روایات سے ثابت ہے اور روایات زمان و مکان کی تحدید بھی کرتی ہیں اور شق قمر کی ہیئت کا تعین بھی کرتی ہیں ۔

یہ ایسا واقعہ تھا کہ قرآن کریم نے اسے بطور دلیل قیامت مشرکین کے سامنے پیش کیا۔ کوئی ایسی روایت مشرکین سے منقول نہیں ہے کہ انہوں نے نفس واقعہ کا انکار کیا ہو۔ لہٰذا یہ واقعہ اسی طرح ہوا ہو گا اور اس قدر لوگوں نے دیکھا ہو گا کہ ان کے لئے نفس واقعہ کو جھٹلانا ممکن نہ رہا ہو گا۔ اگر چہ بطور کبر اور غرور ہو۔ اگر ان کے لئے اس کی تکذیب کی کوئی بھی صورت وہتی تو وہ ضرور کرتے۔ کفار سے جو روایات اور تبصرے منقول ہیں وہ یہ ہیں کہ محمد ﷺ نے جادو کر دیا ہے لیکن خود ان میں سے دانشمند لوگوں نے کہا۔ ذرا تحقیق کرو اور مسافروں سے تحقیق کرنے کے بعد ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ جھوٹ نہیں ہے کیونکہ اگر اہل مکہ کو محمد ﷺ مسحور کر سکتے تو وہ پوری دنیا کو تو مسحور نہیں کر سکتے اور جب انہوں ان سے مسافروں سے پوچھا جو مکہ کے باہر سے آئے تھے تو انہوں نے بھی تصدیق کی۔

اب بات یہ رہ گئی کہ آیا مشرکین نے رسول اللہ ﷺ سے کسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے جواب میں شق قمر کا معجزہ رونما ہو گیا۔ یہ روایت دراصل قرآن کی نص صریح سے متصادم ہے۔ مدلول یہ ہے کہ نبی ﷺ کو ویسے معجزات نہیں دیئے گئے جس طرح انبیائے سابق کو دیئے گئے تھے اور اس کا ایک متعین اور خاص سبب تھا۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ”اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ ان سے پہلے کے لوگ انہیں جھٹلا چکے ہیں“ مطلب یہ ہے کہ اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ حضور کو وہ معجزات نہیں دیئے گئے جن کا مطالبہ ہوا تھا۔

کفار نے جب بھی حضور سے معجزات کا مطالبہ کیا ہے تو جواب یہی دیا گیا کہ معجزات پیش کرنا آپ کے فرائض میں شامل نہیں ہے اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک بشر اور رسول ہیں اور ہر جگہ صرف قرآن کریم ہی کو آپ کے لئے معجزہ قرار دیا گیا اور اسی جیسی کوئی سورت یا کتاب لانے کا چیلنج دیا گیا۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۸۸) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (۸۹) وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (۹۰) اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (۹۱) اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (۹۲) اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۳)(۱۷: ۸۸ تا ۹۳) ”کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے چاہے وہ سب ایک

دوسرے کے مدد گار ہی کیوں نہ ہوں ۔ ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اکثر لوگ انکار ہی پر جمے رہے اور انہوں نے کہا ''ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک تو ہمارے لئے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ نہ جاری کر دے یا تیرے لئے کھجوروں اور انگوروں کا باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے یا تو آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا خدا اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لئے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں ۔'' اے نبی ان سے کہو ''پاک ہے میرا پروردگار کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں'' لہٰذا یہ کہنا کہ شق قمر کا معجزہ کفار کے مطالبہ کے جواب میں آیا تھا ' قرآن مجید کی متعدد نصوص کے بھی خلاف ہے اور اس رجحان کے بھی خلاف ہے کہ اس دنیا میں آخری رسالت انسانیت کے سامنے صرف قرآن پیش کرے اور یہ کہ قرآن کا اعجاز ہی اس کا معجزہ ہو اور قرآن کے ذریعہ انسان کے دل و دماغ کو ان آیات و معجزات کی طرف متوجہ کیا جائے جو انفس میں موجود ہیں جو آفاق میں بکثرت موجود ہیں اور جو انسانی تاریخ میں بکثرت ہیں اور سخت عبرت آموز بھی ہیں ۔ باقی نبی ﷺ کے ہاتھ پر جو معجزات صادر ہوئے اور جن کی تصدیق صحیح روایات نے کی ہے تو وہ بطور اعزاز نبی ﷺ کو دیئے گئے بطور دلائل نبوت نہیں دیئے گئے تھے ۔

یہی وجہ ہے کہ معجزہ شق قمر صادر ہوا ۔ نص قرآنی نے اس کی تصدیق کی ہے ۔ روایات متواترہ میں اس کی تصدیق ہوئی اور جس جگہ اور جس زمانے میں صادر ہوا اس کا بھی تعین ہو گیا اور جس انداز میں ہوا اس کی تفصیلات بھی موجود ہیں لیکن جن روایات میں اس کی علت بیان کی گئی ہے اس کے بارے میں ہم خاموشی اختیار کرتے ہیں ۔ بس یہی کہتے ہیں کہ شق قمر دلالت کرتا ہے قرب قیامت پر اور اسی میں ہمارے لئے عبرت ہے کہ ہم چوکنے ہو جائیں ۔ جاگیں اور اس کی تیاری کریں اس عظیم گھڑی کی ۔ لہٰذا شق قمر ایک کائناتی معجزہ تھا اور قرآن نے انسانوں کو اس کی طرف متوجہ کیا ہے جس طرح قرآن مجید دوسرے تکوینی معجزات کی طرف متوجہ کرتا ہے اور جس طرح دوسرے معجزات کے مقابلے میں ان کا رویہ قابل تعجب ہے ۔ اسی طرح اس معجزے سے بھی انہوں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا ۔

خارق عادت معجزات ' انسانیت کے ابتدائی دور ہیں ۔ بے شک انسانوں کو متاثر کرتے تھے جس دور میں انسانیت نے اس قدر علمی ترقی نہ کی تھی کہ وہ اس کائنات میں قائم اور بکھرے ہوئے معجزات کو سمجھ سکیں اور ان سے متاثر ہوں ۔ گزرے ہوئے نبیوں کے ہاتھوں جن معجزات کا صدور ہوا اور انسانیت ان سے متاثر ہوئی تو یہ اس دور کی بات ہے جب انسانیت عقلی بلوغ کے درجے کو نہ پہنچی تھی لیکن آج اس کائنات میں ایسے ایسے معجزات انسانیت کو معلوم ہو چکے ہیں جو ان معجزات سے بڑے معجزات ہیں ۔ اگرچہ ان لوگوں کو وہ متاثر نہیں کرتے جو وہی ابتدائی احساسات رکھتے ہیں اور جو عقلی بلوغ کے درجے تک نہیں پہنچے ۔

فرض کیجئے کہ چاند کا دو ٹکڑے ہونا معجزہ تھا تو چاند بذات خود بھی تو ایک معجزہ ہے ۔ یہ سیارہ اپنے اس حجم ' موجودہ وضع ' شکل ' طبیعت ' گردش کی منازل ' دورے ' اس کے آثار ' زمین کی زندگی پر اس کے اثرات اور فضا میں اس کا اس طرح سے تابغیر کسی سہارے کے کیا یہ ایک عظیم معجزہ نہیں ہے جو ہر وقت قائم اور دائم اور ہمارے مشاہدے میں ہے اور ہم اس کے بارے میں ہر وقت سوچ سکتے ہیں ۔ اس سے اثر لیتے ہیں ۔ کیا قدرت الٰہیہ پر اس سے بڑی اور کوئی دلیل چاہئے ۔

کون ہے جو نفس چاند کے معجزے سے انکار کر سکتا ہے۔ ماسوائے اس شخص کے جو ہٹ دھرم اور ضدی ہو۔

قرآن نے تو انسان کو اس کائنات کے سامنے کھڑا کر دیا اور یہ مشاہدہ کرایا کہ اس کائنات کے اندر عظیم معجزات ہر وقت قائم اور دائم ہیں۔ قرآن انسان کو ان معجزات کے ساتھ دائماً جوڑنا چاہتا ہے۔ یہ نہیں کہ شق قمر کی طرح کوئی چیز ہزار ہا سال میں ایک بار دکھا دی جائے اور اس کو بھی ایک ہی زمانے کے لوگ دیکھ لیں۔ قرآن کہتا ہے کہ دیکھو اس کائنات کو اگر دیدہ عبرت نگاہ رکھتے ہو۔

یہ پوری کائنات معجزات کا ایک منظر نامہ ہے۔ جو آنکھوں کے سامنے رہتا ہے غائب نہیں ہوتا اور یہ سب معجزے دیکھو اور دیکھتے چلے جاؤ۔ اس میں چھوٹے معجزات بھی ہیں اور بڑے بھی اور یہ معجزات شہادت دے رہے ہیں۔ ان کی شہادت سنو۔ یہ عجیب شہادت ہے اسے ریکارڈ کرو۔ یہ نہایت ہی خوبصورت شہادت ہے اس میں جمال بھی ہے اور کمال بھی ہے اور یہ تو انسان کو نہ صرف یہ کہ فیصلے پر پہنچاتی ہے بلکہ دہشت زدہ اور ششدر کر دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں بہت ہی پختہ ایمان پیدا ہوتا ہے۔ نہایت گہرا اور سنجیدہ۔

اس سورت کے آغاز میں یہ اشارہ آتا ہے کہ قیامت قریب آگئی ہے اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہے جس سے انسان پر گہرا اثر پڑتا ہے کیونکہ قیام قیامت اور چاند کا ٹکڑے ہونا بہت ہی بڑے واقعات ہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ تم نے یہ ایک عظیم حادثہ تو دیکھ ہی لیا ہے اسی طرح قیام قیامت بھی ہوگا۔

شق قمر کے بعد صرف قیامت کے بارے میں امام احمد نے روایت کی ہے حسین سے' انہوں نے محمد ابن مطرف سے' انہوں نے ابو حازم سے' اور انہوں نے حضرت سہیل ابن سعد سے وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا "میں اور قیامت اس طرح ساتھ ساتھ بھیجے گئے ہیں۔" آپ نے درمیان انگلی اور سبابہ کو جوڑ کر اشارہ کیا (متفق علیہ)

باوجود اس حقیقت کہ قیامت کی گھڑی قریب آگئی ہے اور نہایت ہی اثر انگیز واقعہ بھی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور مختلف شکلوں میں انہوں نے اللہ کی نشانیاں بھی دیکھ لی ہیں لیکن ان لوگوں کے دلوں میں عناد کوٹ کوٹ بھرا ہوا تھا۔ وہ گمراہی کی راہ پر اصرار کر رہے تھے۔ وہ ڈراوے سے متاثر ہوتے تھے اور نہ اس کائنات میں بکھری ہوئی نشانیوں سے متاثر ہوتے تھے جو نصیحت کے لئے کافی ہیں اور انسان کو جھٹلانے سے روک سکتی ہیں لیکن ان لوگوں نے ان سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔

وَإِن يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (٢) وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ وَكُلُّ أَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ (٣) وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّنَ الْأَنبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ (٤) حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (٥٤ : ٥) "مگر ان کا حال یہ ہے کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں' منہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔ انہوں نے جھٹلا دیا اور اپنی خواہشات نفس کی پیروی کی۔ ہر معاملے کو آخر کار ایک انجام پر پہنچ کر رہنا ہے۔ ان لوگوں کے سامنے وہ حالات آچکے ہیں جن میں سرکشی سے باز رکھنے کے لئے کافی سامان عبرت ہے اور ایسی حکمت جو نصیحت کے مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے مگر تنبیہات ان پر کارگر نہیں ہوتیں"

شق قمر کو بھی دیکھ کر انہوں نے اعراض کر لیا اور انہوں نے شق قمر کے بارے میں بھی وہی بات کہی جو قرآن کی آیات کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ نہایت ہی موثر جادو ہے۔ ایک نشانی تو وہ کہتے ہیں جادو ہے اور مسلسل نشانیوں کو کہتے ہیں کہ یہ مسلسل جادو ہے جس کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ یہ لوگ نشانات الہیہ پر غور کرنے سے منہ موڑ رہے ہیں۔ وہ نشانیوں کی دلالت اور شہادت سے بھی منہ موڑتے ہیں۔ یہ انکار وہ محض خواہش نفس سے مجبور ہو کر کرتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ان کے پاس کوئی حجت ہے یا اسلام کے حق میں حجت نہیں۔ یہ بھی نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات پر غور کر لیا ہے۔

وَكُلُّ أَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ (٥٤ : ٣) "ہر معاملہ کو آخر کار ایک انجام پر پہنچ کر رہنا ہے" اس عظیم کائنات میں ہر چیز اپنے مقام پر رکھی ہوتی ہے اور وہ اپنی جگہ پر پختہ ہے۔ نہ ہلتی ہے اور نہ اس کے اندر اضطراب ہے۔ اس کائنات کا ہر معاملہ ثبات و قرار پر مبنی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بدلتی ہوئی خواہشات کے مطابق اصول بھی بدلتے ہیں اور بادشاہوں کی نازک مزاجیوں کی طرح اصول اور قوانین بھی بدل جاتے ہیں۔ یوں بھی نہیں ہے کہ یہاں معاملات بخت واتفاق کے مطابق طے ہوتے ہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ اور اپنے زمان اور وقت پر رونما ہوتی ہے۔ انسان کو دیکھنا چاہئے کہ اس کے ماحول میں زمان و مکان میں، واقعات و حادثات میں ایک ترتیب ہے اور یہ ترتیب اور اصول ہر چیز میں نظر آتا ہے۔ آسمانوں کی گردش میں، زندگی کے طریقوں میں، حیوانات اور نباتات کے بڑھنے میں، تمام اشیاء اور مواد میں بلکہ خود ان کے جسم کے وظائف و فرائض میں ان کے اعضا کی کارکردگی میں ایک ترتیب ہے اور ان کو ان چیزوں پر کوئی کنٹرول حاصل نہیں ہے۔ یہ قیامت و قرار ان کو گھیرے ہوئے ہے اور ان کے گرد تمام اشیاء کو بھی اپنے لپیٹ میں لئے ہوئے ہے اور ان کے آگے اور پیچھے ہر طرف نظر آتا ہے، صرف یہ انسان ہیں کہ یہ مضطرب ہیں اور اپنی خواہشات کے مطابق کبھی ادھر جاتے ہیں اور کبھی ادھر۔

وَلَقَدْ جَآءَهُم مِّنَ الْأَنبَآءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ (٥٤ : ٤) "ان لوگوں کے سامنے وہ حالات آچکے ہیں جن میں سرکشی سے باز رکھنے کے لئے کافی سامان عبرت ہے۔" ان کے پاس اس کائنات کی آیات کے بارے میں قرآن نے کافی خبریں پھیر پھیر کر بیان کی ہیں۔ ان کے پاس امم سابقہ کے مکذبین کی خبریں بھی آچکی ہیں۔ ان کے پاس مناظر قیامت کی شکل میں آخرت کی خبریں بھی آچکی ہیں۔ ان سب امور میں عبرت آموزی، رکاوٹ، خطرے کی علامات موجود ہیں اور ان کے اندر ایسی حکیمانہ باتیں بھی ہیں جو سیدھی دل میں اترنے والی ہیں اور اچھی ہدایات ہیں لیکن جو دل اندھے ہو چکے ہیں وہ آیات کو نہیں دیکھ پاتے اور ان خبروں سے فائدہ نہیں اٹھائے نہ خبروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ ڈراوے سے وہ ڈرتے ہیں۔

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (٥٤ : ٥) "اور ایسی حکمت جو نصیحت کے مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے مگر تنبیہات ان پر کارگر نہیں ہوتیں۔" ایمان ہی وہ نعمت ہے جس کی وجہ سے قلب انسانی ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

ان کی روگردانی اور کفر پر اصرار کی اس قدر تصویر کشی کرنے کے بعد اور یہ بتا دینے کے بعد کہ یہ خبروں سے بھی

مستفید نہیں ہوتے ان کے لئے ڈراوے میں بھی فائدہ نہیں۔ رسول ﷺ کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ بھی ان سے روگردانی کرلیں اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ وہ دن جلدی ہی آنے والا ہے شق قمر اس دن کی علامت تھی' یہ دن بہت قریب ہے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَى شَيْءٍ نُّكُرٍ (٦) خُشَّعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ (٧) مُّهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَذَا يَوْمٌ عَسِرٌ (٥٤ : ٨) "پس اے نبیؐ ان سے رخ پھیرلو' جس روز پکارنے والا ایک سخت ناگوار چیز کی طرف پکارے گا' لوگ سہمی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اپنی قبروں سے اس طرف نکلیں گے گویا وہ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں۔ پکارنے والے کی طرف دوڑے جارہے ہوں گے اور وہی منکر بھی اس وقت کہیں گے یہ دن تو بڑا کٹھن ہے۔"

یہ اس دن کے مناظر میں سے ایک منظر ہے۔ اس کی ہولناک اور اسکی یہ شدت اس سورت کے موضوع و مضامین اور فضا کے مناسب ہے اور قیامت کے قریب آنے کی تمہید کے لئے بھی مناسب ہے پھر اس خبر کے بھی مناسب کہ چاند دو ٹکڑے ہوگیا اور سورت کے اندر پائے جانے والے ترنم سے بھی ہم آہنگ ہے۔

یہ منظر بہت تیز چلتا ہے اور فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ صاف نظر آنے والا اور حرکت سے بھرپور جس کی حرکات اور انداز بھی متوازن ہیں۔ لوگ گروہ درگروہ قبروں سے نکل رہے ہیں یوں جس طرح ٹڈی دل بکھر جاتا ہے۔ یہ منظر ٹڈی دل کی نسبت سے اور بھی واضح ہوجاتا ہے۔ یہ گروہ ڈر کے مارے سہمے ہوئے ہے۔ ذلت اور خوف کے مارے نظریں نیچی نیچی ہیں۔ پکارنے والے کی طرف دوڑ رہے ہیں کہ کیا آفت آگئی ہے۔ معلوم نہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ سخت بے اطمینانی ہے' انتہائی برے انجام سے دوچار ہونے کے لئے جانے والے بس یہی کہہ سکے۔

هَذَا يَوْمٌ عَسِرٌ (٥٤ : ٨) "یہ تو بڑا کٹھن دن ہے" اور یہ اس شخص کا قول ہے نہایت کربناک اور تھکے ہوئے شخص کی بات ہے جو گویا سولی پر چڑھنے کے لئے بوجھل قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ہے وہ دن جو آیا ہی چاہتا ہے لیکن یہ لوگ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ڈراوے سے منہ موڑ رہے ہیں۔ حق کی تکذیب کرتے ہیں۔ اے پیغمبر آپ بھی ان سے منہ موڑلیں اور چھوڑدیں انہیں ان کے انجام کے لئے جو نہایت ہی خوفناک ہے۔

سورت کا آغاز اس قدر خوفناک انداز اور زوردار لہجے میں کرنے کے بعد اور قیامت کا ایک خوفناک منظر پیش کرنے کے بعد اب انسانی تاریخ کے کچھ مناظر دیئے جاتے ہیں۔ جن لوگوں پر اس طرح کی قیامت ٹوٹی جو اوپر کے منظر میں دکھائی گئی۔ یہ اقوام بھی ایسا ہی رویہ اختیار کئے ہوئے تھیں جس طرح اہل مکہ نے اختیار کر رکھا ہے۔ آغاز قوم نوح علیہ السلام سے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ ۝ فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانتَصِرْ ۝ فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ

مُّنْهَمِرٍ ﴿١١﴾ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿١٢﴾ وَحَمَلْنٰهُ
عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴿١٣﴾ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿١٤﴾ وَلَقَدْ
تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿١٥﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿١٦﴾ وَلَقَدْ
يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿١٧﴾ كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ
نُذُرِ ﴿١٨﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿١٩﴾ تَنْزِعُ
النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿٢٠﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٢١﴾ وَلَقَدْ
۲۲ع يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٢٢﴾

۸ ”ان سے پہلے نوح کی قوم جھٹلا چکی ہے۔ انہوں نے ہمارے بندے کو جھوٹا قرار دیا اور کہا کہ یہ دیوانہ ہے اور وہ بری طرح جھڑکا گیا۔ آخر کار اس نے اپنے رب کو پکارا کہ ”میں مغلوب ہو چکا اب تو ان سے انتقام لے۔“ تب ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیئے اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا اور یہ سارا پانی اس کام کو پورا کرنے کے لئے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا اور نوح کو ہم نے ایک تختوں اور کیلوں والی پر سوار کر دیا جو ہماری نگرانی میں چل رہی تھی۔ یہ تھا بدلہ اس شخص کی خاطر جس کی ناقدری کی گئی تھی۔ اس کشتی کو ہم نے ایک نشانی بنا کر چھوڑ دیا۔ پھر کوئی ہے نصیحت قبول کرنے والا؟ دیکھ لو کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟ عاد نے جھٹلایا تو دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ ہم نے ایک پیہم نحوست کے دن سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی۔ جو لوگوں کو اٹھا اٹھا کر اس طرح پھینک رہی تھی جیسے وہ جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ہوں۔ پس دیکھ لو کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھی میری تنبیہات۔ ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا“؟

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ (٥٤ : ٩) ”ان سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا“ انہوں نے آیات الٰہی کو بھی جھٹلایا اور رسالت کو بھی۔

فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا (٥٤ : ٩) ”انہوں نے ہمارے بندے کو جھوٹا قرار دیا“ یعنی نوح کو۔

وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ (٥٤ : ٩) ”اور کہا یہ دیوانہ ہے“ جس طرح قریش نے نبی ﷺ کو کہا کہ مجنوں ہے اور انہوں نے حضرت نوح کو دھمکی دی کہ ہم تمہیں رجم کر دیں گے اور حراج کر کے اذیت دی اور انہوں نے آپ سے مطالبہ کیا کہ ہم پر تنقید کرنے سے باز آجاؤ اور آپ کو سخت دھمکیاں اور جھڑکیاں دیں۔

وَازْدُجِرَ (۵۴:۹) "اور بری طرح جھڑکا گیا" حالانکہ مناسب یہ تھا کہ وہ خود باز آتے اور ان کی اطاعت کرتے۔

اس نوبت تک پہنچ کر حضرت نوح رب تعالیٰ کی طرف دست بدعا ہوتے ہیں کیونکہ اللہ ہی نے ان کو اس مہم پر بھیجا تاکہ آپ اللہ کو وہ رپورٹ دے دیں کہ قوم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہے اور یہ کہ میں نے اس قدر جدوجہد کی ہے اور اب میری قوت نے جواب دے دیا ہے۔ حضرت نے اس وقت اللہ کو پکارا جب نہ کوئی حیلہ رہا اور نہ طاقت رہی۔ انہوں نے تمام حربے آزمائے۔

فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ (۵۴:۱۰) "آخر کار اس نے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہو چکا ہوں اب تو ان سے انتقام لے" میری طاقت ختم ہو گئی۔ میں نے اپنی پوری جدوجہد کر دی۔ قوتیں جواب دے گئیں اور یہ تیرا کام ہے اور انکار اور کفر مجھ پر غالب آ گیا۔ لہٰذا تو ہی مدد کر۔ اے اللہ اب تو ہی ان سے انتقام لے۔ اپنی دعوت کا بدلہ لے۔ سچائی کا ساتھ دے۔ اپنے نظام کی مدد تو ہی کر حکم تیرا ہے جدوجہد تیرے لئے ہے میرا کردار اب ختم ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا یہ کہنا تھا اور رسول خدا کی طرف سے معاملہ رب تعالیٰ کے سپرد کرنا تھا جو جبار و قہار ہے کہ دست قدرت نے اپنا کام شروع کر دیا اور اس زمین کو ان سے صاف کر دیا گیا۔ عذاب الٰہی کا چکر یوں چلنا شروع ہوا کہ تمام طبیعی قوتوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ (۱۱) وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (۵۴:۱۲) "تب ہم نے موسلادھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیئے اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا اور وہ سارا پانی اس کام کو پورا کرنے کے لئے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا"

یہ ایک عظیم کائناتی حرکت ہے جو بہت ہی بھرپور ہے لیکن اس عظیم کائناتی عمل اور حرکت کی تصویر چند الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔ الفاظ بڑی خوبصورتی سے چنے گئے ہیں اور اس پورے عمل کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ سب عمل قدرت الٰہیہ کا ہے۔

فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ (۵۴:۱۱) "ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیئے" قاری محسوس کرتا ہے کہ دست قدرت خود آسمانوں کے دروازے کھولتی ہے۔

بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ (۵۴:۱۱) "موسلادھار بارش سے" یعنی ایسی بارش جس میں پانی بہت برس رہا ہو۔ اسی قوت اور اسی حرکت سے۔

وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا (۵۴:۱۲) "اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا" زمین کو پھاڑنے اور چشموں کے پھوٹنے کا منظر یوں نظر آتا ہے کہ گو ہر جگہ سے فوارے چھوٹ گئے۔ ہر طرف چشمے ہی چشمے نظر آنے لگے۔

اب زور زور سے آسمانوں سے گرنے والا پانی' اور زمین سے ابلنے والا پانی آپس میں مل گئے ۔

فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (۵۴ : ۱۲) "اور وہ سارا پانی اس کام کو پورا کرنے کے لئے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا" یعنی دونوں کا کام یہ تھا کہ طے شدہ کام کو پورا کر لیا جائے ۔ دونوں پانی دست قدرت کے تحت کام کر رہے تھے ۔

اس پانی نے طوفان کی شکل اختیار کر لی ۔ زمین کو ڈھانپ لیا گیا اور زمین پر انسانوں کی شکل میں جو گندگی تھی اسے صاف کر دیا گیا ۔ اللہ کا پیغمبر تو اس تطہیر سے مایوس ہو گیا تھا ۔ اس کے خیال میں یہ لوگ لاعلاج ہو گئے تھے لیکن اللہ کا مشفقانہ دست قدرت پہنچ گیا ۔ رسول کی دعا قبول ہوئی ۔ پوری کائنات حرکت میں آگئی اور رسول اور اس کے ساتھیوں کو نجات مل گئی ۔

وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ (۱۳) تَجْرِىْ بِاَعْيُنِنَا جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ (۵۴ : ۱۴) "اور نوح کو ہم نے ایک تختوں اور کیلوں والی پر سوار کر دیا جو ہماری نگرانی میں چل رہی تھی ۔ یہ تھا بدلہ اس شخص کی خاطر جس کی ناقدری کی گئی ۔" اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑی کشتی تھی ۔ یہ تختوں اور میخوں والی تھی ۔ کشتی کی صفات بیان کی گئی ہیں اور موصوف کا نام نہیں لیا گیا ۔ اس کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے پھر یہ کہا گیا کہ یہ کشتی اللہ کی نگرانی میں چلتی ہے ۔ اس پر اللہ کی نظر ہے ۔

جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ (۵۴ : ۱۴) "اس شخص کے بدلہ کی خاطر جس کی ناقدری کی گئی" اس کی دعوت کا انکار کیا گیا بلکہ الٹا اس کو تمسخر کیاں دی گئی ۔ ان لوگوں نے نبی پر مظالم ڈھائے ۔ یہ اس کی سزا ہے ۔ انہوں نے نبی کے ساتھ مذاق کیا ۔ اللہ نے اسے یہ اعزاز دیا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے جس شخص کو اللہ کی راہ میں بے بس کر دیا جائے اس کی حمایت میں اللہ کی قوتیں کس طرح کام کرتی ہیں اور جو شخص اپنا کام پورا کر کے اور اپنی پوری قوت لگا کر جب معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہے تو پھر اللہ کس طرح بدلہ لیتا ہے ۔ اس کائنات کی پوری قوتیں اس کی نصرت میں اٹھ جاتی ہیں اور ان قوتوں کی پشت پر اللہ اپنی قدرت اور جبروت کے ساتھ موجود ہوتا ہے ۔

اس ہولناک انتقام کے منظر کے اختتام پر اور اس فیصلہ کن انجام پر ان لوگوں کو متوجہ کیا جاتا ہے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ ذرا ان واقعات سے عبرت لو' یہ اس لئے کہ شاید وہ متاثر ہو کر دعوت حق کو قبول کر لیں ۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَا اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴ : ۱۵) "اس کشتی کو ہم نے ایک نشانی بنا کر چھوڑ دیا ۔ پھر کوئی ہے نصیحت قبول کرنے والا" یہ واقعہ اپنے تمام حالات کے ساتھ ہم نے تاریخ کے ریکارڈ پر باقی رکھا تاکہ آنے والوں کے لئے ایک نشانی ہو ۔

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴ : ۱۵) "پھر ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا) جو نصیحت قبول کرے ۔ دلوں کو

ڈگانے کے لئے ایک سوال کہ کیا تھا عذاب اور کیا انجام ہوا ڈرائے جانے والوں کا۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ (٥٤: ١٦) "دیکھ لو کیا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات"
بہرحال ایسا ہی ہوا جس طرح قرآن نے تصویر کشی کی ہے۔یہ ایک سخت تباہ کن عذاب تھا جس نے تمام مجرموں کو نیست و نابود کرکے رکھ دیا اور ڈرانے والے کا ڈراوا سچا ہوگیا یہ ہے قرآن کا انداز بیان نہایت سہل ' قابل فہم ' پڑھنے والے کے لئے خوب جاذبیت کا حامل تاکہ ہرکوئی پڑھے اور تدبر کرے۔ سادہ سچائی کی جاذبیت کا حامل ' فطرت کے مطابق اور ' ہر طبیعت کے لئے پرجوش 'جس کے عجائبات ختم ہونے کا نام نہیں لیتے ۔اسے بار بار پڑھئے ہر بار نیا نظر آئے گا۔جب بھی کوئی اس پر تدبر کرے اسے ایک نیا مفہوم اور نیا نکتہ ملے گا۔جس قدر اس کے ساتھ کوئی شخص انسانی صحبت اختیار کرے اس کی محبت میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (٥٤: ١٧) "ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنایا ہے پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا"
یہ ہے وہ سبق جو ہر پیراگراف کے آخر میں دہرایا جاتا ہے۔ ہر مصور منظر کے بعد ' ہر منظر کے بعد قرآن انسان دل کے ساتھ گفتگو کرتا ہے اور اسے نصیحت قبول کرنے ' دانش حاصل کرنے 'تدبر کرنے کے لئے کہتا ہے۔ ہر تاریخی انجام بد کے بعد جس سے مکذبین دوچار ہوئے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ (١٨) اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (١٩) تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ (٢٠) فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ (٢١) وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (٥٤: ١٨ تا ٢٢) "عاد نے جھٹلایا تو دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات ۔ ہم نے ایک پیہم نحوست کے دن سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی۔جو لوگوں کو اٹھا اٹھا کر اس طرح پھینک رہی تھی جیسے وہ جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ہوں۔ پس دیکھ لو کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات ۔ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے۔پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا"؟

یہ دوسرا پیراگراف ہے اور اقوام سابقہ پر عذاب آنے کا دوسرا منظر ہے۔قوم نوح کے بعد ہلاکت کا یہ بڑا واقعہ تھا۔ سب سے پہلے قوم نوح ہلاک ہوئی اور اس کے بعد قوم عاد۔

پہلے یہ بتایا جاتا ہے عاد نے بھی تکذیب کی لیکن آیت ختم ہونے سے پہلے ہی ایک خوفناک سوال کر دیا جاتا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ (٥٤ : ١٨) ”میرا عذاب کیسا تھا اور تنبیہات کیسی تھیں“ اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ ان کا انجام یوں ہوا ' ہولناک اور خوفناک ۔

اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِىْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (٥٤ : ١٩) تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ (٥٤ : ٢٠) ”ہم نے ایک پیہم نحوست کے دن سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی ۔ جو لوگوں کو اٹھا اٹھا کر اس طرح پھینک رہی تھی جیسے جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ۔“

رِيْحًا صَرْصَرًا (٥٤ : ١٩) کے معنی ہیں سخت سرد ہوا ۔ الفاظ کا ترنم ہی نوعیت بتا رہا ہے ۔ نحس یعنی منحوس اور اس سے بڑی نحوست کس قوم کو کیا نصیب ہوگی جو عاد کو نصیب ہوئی ۔ یوں منظر تھا کہ جس طرح سخت ہوا سے کھجور کے تنے جڑوں سے اکھڑ کر زمین پر آجاتے ہیں اور درخت بری طرح گرا ہوا ہوتا ہے ۔ اس طرح یہ لوگ میدانوں میں پڑے ہوئے تھے ۔

منظر نہایت خوفناک ہے ۔ ہوا سخت ہے اور یہ ہوا جو عادیوں پر بھیجی گئی تھی یہ اللہ کے لشکروں میں ایک لشکر تھا ۔ اس کائنات کی قوتوں میں سے ایک قوت ۔ اللہ کی تخلیق کردہ قوت ' اللہ کے قانون قدرت کے عین مطابق چلنے والی قوت ' ایسی قوت جسے اللہ جس پر چاہے مسلط کر دے ۔ یہ قوت صحراؤں میں چل رہی ہے اور یہ جب عاد کی بستیوں تک پہنچتی ہے تو ان کا وہ حال بنا دیتی ہے جو اوپر لکھا گیا ۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ (٥٤ : ٢١) ”دیکھ لو میرا عذاب کیا تھا اور میری تنبیہات کیسی ہوتی ہیں“ اور آخری فقرہ بھی وہی حسب دستور ۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (٥٤ : ٢٢) ”ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا“ صلائے عام ہے ۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۝ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ۝ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ۝ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝ٞ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ۝ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ

۳۱ إِنَّآ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّٰحِدَةً فَكَانُوا۟ كَهَشِيمِ ٱلْمُحْتَظِرِ ۳۲ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا ٱلْقُرْءَانَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

”ثمود نے تنبیہات کو جھٹلایا اور کہنے لگے ۔ ایک اکیلا آدمی جو ہم ہی میں سے ہے 'کیا اب ہم اس کے پیچھے چلیں؟ اس کا اتباع ہم قبول کرلیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم بہک گئے ہیں اور ہماری عقل ماری گئی ہے ۔ کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر خدا کا ذکر نازل کیا گیا؟ نہیں بلکہ یہ پرلے درجے کا جھوٹا اور لالچی ہے ۔ (ہم نے اپنے پیغمبر سے کہا) ”کل ہی انہیں معلوم ہوا جاتا ہے کہ کون پرلے درجے کا جھوٹا اور لالچی ہے ۔ ہم اونٹنی کو ان کے لئے فتنہ بنا کر بھیج رہے ہیں ۔ اب ذرا صبر کے ساتھ دیکھ کہ ان کا کیا انجام ہوتا ہے ۔ ان کو جتا دے کہ پانی ان کے اور اونٹنی کے درمیان تقسیم ہوگا اور ہر ایک اپنی باری کے دن پانی پر آئے گا۔“ آخر کار ان لوگوں نے اپنے آدمی کو پکارا اور اس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اونٹنی کو مار ڈالا ۔ پھر دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات ۔ ہم نے ان پر بس ایک ہی دھماکہ چھوڑا اور وہ باڑے والے کی روندی ہوئی باڑھ کی طرح بھس ہو کر رہ گئے ۔ ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے ۔ اب ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا“؟

قبیلہ ثمود جزیرہ عرب میں عاد کے بعد نمودار ہوا ۔ یہ بھی عاد کی طرح قوت اور شوکت میں بے مثال تھا ۔ ہاں عادی جنوب میں تھے اور ثمود شمال میں تھے ۔ ثمود نے بھی رسول کی تکذیب اسی طرح کی جس طرح عاد نے کی تھی حالانکہ ثمود کو عاد کے انجام کا اچھی طرح علم تھا کیونکہ وہ جزیرہ عرب کے جنوب میں تھے ۔

فَقَالُوٓا۟ أَبَشَرًا مِّنَّا وَٰحِدًا نَّتَّبِعُهُۥٓ إِنَّآ إِذًا لَّفِى ضَلَٰلٍ وَسُعُرٍ (۲۴) ءَأُلْقِىَ ٱلذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ (۲۵) سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَّنِ ٱلْكَذَّابُ ٱلْأَشِرُ

(۵۴ : ۲٦) ”اور کہنے لگے ایک اکیلا آدمی جو ہم میں سے ہے کیا اب ہم اس کے پیچھے چلیں؟ اس کا اتباع ہم قبول کریں تو معنی یہ ہوں گے کہ ہم بہک گئے ہیں اور ہماری عقل ماری گئی ہے ۔ کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر خدا کا ذکر نازل کیا گیا؟ نہیں بلکہ یہ پرلے درجے کا جھوٹا اور لالچی ہے ۔“

یہ وہی شبہ ہے جو پوری تاریخ میں تمام مکذبین کے دلوں میں خلجان پیدا کرتا رہا ہے ۔

ءَأُلْقِىَ ٱلذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنۢ بَيْنِنَا (۵۴ : ۲۵) ”کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر خدا کا ذکر نازل کیا گیا“ یہ ان کی کھوکھلی اور بے حقیقت کبریائی تھی اور جس شخص کے اندر اس قسم کا کبر ہو وہ بھی حقیقت کو دیکھ ہی نہیں سکتا ۔ وہ بات کو نہیں دیکھتا ۔ اس کو دیکھتا ہے کہ کہنے والا کون ہے ۔

أَبَشَرًا مِّنَّا وَٰحِدًا نَّتَّبِعُهُۥٓ (۵۴ : ۲۴) ”ایک اکیلا آدمی جو ہم میں سے ہے کیا ہم اب اس کے پیچھے

چلیں؟"

آخر اس میں کیا قباحت ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے ایک اکیلے شخص کو چن لے ۔ اللہ تو خوب جانتا ہے کہ رسالت کی امانت کہاں رکھے اور پھر اس کے اوپر ذکر نازل کرے ۔ اس کو ہدایات دے اور نصیحت کی باتیں اس پر نازل کرے ' اللہ خالق ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے بندوں میں سے اس امانت کی استعداد اس نے کس کو دی ہے ۔ پھر ذکر نازل کرنے والا بھی اللہ ۔ یہ سوال ایک بے حقیقت سوال ہے اور واہی تباہی ہے جو نہایت گمراہ لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے ۔ ایسے لوگ جو کسی دعوت کے بارے میں یہ نہیں سوچتے کہ اس میں صدق و سچائی کس قدر ہے ۔ وہ دعوت دینے والے کو دیکھتے ہیں کہ دو بستیوں میں سے یہ کتنا بڑا آدمی ہے ۔ اگر کسی چھوٹے آدمی کی بات مانی گئی تو وہ چھوٹا بڑا بن جائے گا اور یہ چھوٹے رہ جائیں گے ۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ ہمیشہ یہ کہتے ہیں ۔

اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ اِنَّآ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ (۵۴ : ۲۴) "ایک اکیلا آدمی جو ہم میں سے ہے اس کے پیچھے چلیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم بہک گئے ہیں اور ہماری عقل ماری گئی ہے یا ہم جہنم رسید ہو گئے ۔" اگر ہم سے یہ منکر فعل واقع ہو گیا ۔ جب عقل ماری جاتی ہے تو انسان ہدایت کو ضلالت سمجھتا اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ گویا بہت زیادہ تعداد والی جہنموں میں داخل ہو گا ۔ (سعر جمع سعیر ہے) حالانکہ دعوت قبول کر کے وہ ایمان کے سایہ میں آ جاتا لیکن سمجھتا ہے کہ اگر ایمان لایا تو جہنموں میں داخل ہو گا ۔

یہی وجہ ہے کہ جس رسول کو اللہ نے ان کی رہنمائی کے لئے بھیجا تھا اس کے بارے میں انہوں نے کہا کہ وہ جھوٹا اور لالچی ہے ۔

بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ (۵۴ : ۲۵) "بلکہ وہ جھوٹا اور لالچی ہے" کذاب جھوٹا 'اشر شدید لالچی اور اس تبلیغ سے وہ اقتدار اور مرتبہ چاہتا ہے ۔ ہر داعی پر ہمیشہ یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ دعوت اسلامی کے بہانے مفادات کے حصول کے لئے جدوجہد کرتا ہے اور یہ ان اندھوں کا موقف ہوتا ہے جو نیک لوگوں کے جذبات اور ان کے قلبی محرکات سے واقف نہیں ہوتے ۔

بات ابھی تک حکایتی اور قصے کے انداز سے چلتی ہے کہ اچانک معاملہ خطاب کا آ جاتا ہے ۔ اور یوں نظر آتا ہے کہ گویا واقعات ابھی جاری ہیں ۔ اس لئے بتایا جاتا ہے کہ عنقریب کیا ہونے والا ہے اور ان کو مستقبل میں ہونے والے واقعات کی دھمکی دی جاتی ہے ۔

سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ (۵۴ : ۲۶) "کل ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ پرلے درجے کا جھوٹا اور لالچی کون ہے ۔" یہ قصص کے بیان کا ایک قرآنی طریقہ ہے ۔ یہ انداز قصے میں جان ڈال دیتا ہے کہ بجائے محض قصہ پارینہ کے تخیل کے زور سے اس قصے کو ایک منظر نامے کی شکل میں تبدیل کر دیا جاتا ہے ۔ اب یہ قصہ نہیں رہتا بلکہ حال اور مستقبل کے واقعات بن جاتا ہے ۔

سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ (٥٤ : ٢٦) "کل ہی وہ جان لیں گے کہ جھوٹا اور لاپچی کون ہے" کل یہ حقیقت کھل جائے گی اور یہ چھوٹ نہیں سکیں گے اور یہ معیبت بتادے گی کہ کون جھوٹا ہے اور جھوٹوں کی سزا کیا ہے۔

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ (٢٧) وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ (٥٤ : ٢٨) "ہم اپنی اونٹنی کو ان کے لئے فتنہ بناکر بھیج رہے ہیں۔ اب ذرا صبر کے ساتھ دیکھ کہ ان کا کیا انجام ہوتا ہے۔ ان کو جتادے کہ پانی ان کے اور اونٹنی کے درمیان تقسیم ہوگا اور ہر ایک اپنی باری کے دن پانی پر آئے گا۔" اب پڑھنے والے انتظار میں ہیں کہ ہوتا کیا ہے۔ ناقہ بھیج دی جاتی ہے۔ یہ ان کے لئے آزمائش ہے اور ان کے لئے امتحان ہے کہ کون کامیاب ہوتا ہے اور کون ناکام اور رسول وقت بھی انتظار میں ہے کہ کیا ہوتا ہے اور اللہ کے حکم کے مطابق وہ صبر کرتا ہے۔ اس وقت تک کہ امتحان کا نتیجہ سامنے آجائے۔ نبی کو یہ ہدایت دے دی جاتی ہے کہ پانی ان کے اور ناقہ کے درمیان تقسیم ہے۔ یہ ناقہ لازماً مخصوص ناقہ تھی۔ تقسیم یوں تھی کہ ایک دن کا پورا پانی ناقہ کے لئے تھا اور دوسرے دن کا ان کے لئے۔ ناقہ اپنے دن آئے گی اور یہ لوگ اپنے دن آئیں گے۔ وہ اپنے دن پئے گی اور یہ لوگ اپنے دن پانی لیں گے۔

اب سیاق کلام پھر حکایتی اور قصے کا انداز لے لیتا ہے اور اس کے بعد یہ واقعات یوں آتے ہیں۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ (٥٤ : ٢٩) "آخر کار انہوں نے اپنے آدمی کو پکارا اور اس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اونٹنی کو مار ڈالا۔" اور یہ شخص ان مفسدین میں سے ایک تھا جو اس شہر میں فساد کی جڑ تھے۔ سورت نحل میں ان کے بارے میں آیا ہے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (٢٧ : ٤٨) "اور شہر میں نو جتھے دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے تھے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔" اور سورت شمس میں کہا گیا۔

اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰهَا (٩١ : ١٢) "جب ان میں ایک بدبخت اٹھا"

بعض روایات میں آتا ہے کہ اس شخص نے شراب پی لی تاکہ وہ اس کام کو بے باکی سے کر سکے، اور اس ناقہ کو قتل کردے جو اللہ نے بطور نشانی بھیجی تھی اور رسول اللہ نے ان کو ڈرا دیا تھا اور متنبہ کر دیا تھا کہ اگر تم نے اسے گزند پہنچایا تو تم پر عذاب الٰہی آجائے گا۔ اس طرح فتعاطی کے معنی بیڑا اٹھانے کی بجائے شراب پینے کے ہوں گے۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ (٥٤ : ٢٩) "انہوں نے اپنے آدمی کو بلایا اس نے یہ ذمہ لے لیا یا شراب پی کر اسے قتل کر دیا۔" یہ امتحان ہو گیا اور ان پر عذاب نازل ہو گیا۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ (٥٤: ٣٠) "پھر دیکھ لو کہ کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات" یہ سوال تعجب انگیز اور خوف پیدا کرنے کے لئے ہے اور یہ عذاب کے ذکر سے بھی پہلے کیا جاتا ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ (٥٤: ٣١) "ہم نے ان پر بس ایک ہی دھماکہ چھوڑا اور وہ باڑے والے کی روندی ہوئی باڑھ کی طرح بھس ہو کر رہ گئے" قرآن کریم نے اس چیخ اور دھماکے کی تفصیلات نہیں دی ہیں۔ اگرچہ دوسری جگہ سورت فصلت میں تفصیل آتی ہے کہ۔

فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (٤١: ١٣) "تو کہہ دو کہ میں تمہیں اسی طرح اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا کہ عاد و ثمود پر نازل ہوا" یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صاعقہ صیحہ کی صفت ہو یعنی کڑاکے دار آواز۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صیحہ اور صاعقہ ایک ہی حقیقت کے لئے استعمال ہوں یعنی اچانک ٹوٹ پڑنے والا عذاب اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صیحہ صاعقہ کی آواز ہو یا صاعقہ آواز کا اثر ہو۔ آواز دی کس طرح اس کا ہمیں علم نہیں ہے۔

بہرحال ان پر ایک کڑاکے دار اور دھماکہ خیز آواز آئی اور ان کو ختم کر کے رکھ دیا۔ یہ اس طرح ہو گئے کھشیم المحتظر (وہ باڑ والے کی روندی ہوئی باڑ کی طرح بھس ہو کر رہ گئے) المحتظر وہ شخص جو حظیرہ یا باڑہ بناتا ہے اور یہ باڑہ وہ خشک کانٹے دار لکڑیوں سے بناتا ہے یہ لوگ اس طرح ہو گئے جس طرح خشک بوسیدہ لکڑیاں جو ٹوٹ پھوٹ کر بھس بن گئی ہوں تشبیہ یوں ہے کہ باڑے والا اپنے مویشیوں کے لئے لکڑیوں اور درختوں کی شاخیں جمع کرتا ہے کہ شاخیں مویشی کھاتے ہیں اور خشک ہو جاتی ہیں اور ان کو مویشی روندتے ہیں تو وہ بھوسے کی طرح پس جاتی ہیں تو یہ قوم اس طرح ہو گئی جس طرح باڑے والے کی جھاڑیاں کھائی ہوئی اور روندی ہوئی۔ صرف ایک ہی ربانی چیخ سے۔

یہ سخت دردناک و خوفناک منظر ہے اور یہ ان لوگوں کے جواب میں ہے جو مفسد تھے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے چنانچہ ان متکبرین کو پیس ڈالا گیا۔

اس دردناک و خوفناک منظر کے بعد لوگوں کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کی آیات سے نصیحت حاصل کریں اور تدبر کریں اور اس مقصد کے لئے قرآن بہترین گائیڈ ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (٥٤: ٣٢) "ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنایا ہے۔ اب ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا" اس پر پردہ گرتا ہے اور منظر پر روندا ہوا بھس پڑا ہے۔ آنکھوں کے لئے ایک منظر اور دل کے لئے ایک عبرت۔ یہ قرآن پکار پکار کر بلا رہا ہے نصیحت لینے والوں اور فکر و تدبر کرنے والوں کو۔

---ooo---

اب جب دوبارہ پردہ اٹھتا ہے تو تاریخ کا وہ ورق الٹا جاتا ہے جو جزیرہ عرب کے قریب ہے 'قوم لوط کا منظر:

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍۭ بِالنُّذُرِ ﴿٣٣﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ
لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿٣٤﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ﴿٣٥﴾
وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ
فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿٣٧﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ
مُّسْتَقِرٌّ ﴿٣٨﴾ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ ۲
مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٤٠﴾ ع ۱۸
۹

””لوط کی قوم نے تنبیہات کو جھٹلایا اور ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا اس پر بھیج دی ۔ صرف لوط کے گھر والے اس سے محفوظ رہے ۔ ان کو ہم نے اپنے فضل سے رات کے پچھلے پہر بچا کر نکال دیا ۔ یہ جزا دیتے ہیں ہم ہر اس شخص کو جو شکر گزار ہوتا ہے ۔ لوط نے اپنی قوم کے لوگوں کو ہماری پکڑ سے خبردار کیا مگر وہ ساری تنبیہات کو مشکوک سمجھ کر باتوں میں اڑاتے رہے ۔ پھر انہوں نے اسے اپنے مہمانوں کی حفاظت سے باز رکھنے کی کوشش کی ۔ آخر کار ہم نے ان کی آنکھیں موند دیں کہ چکھو اب میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزا ۔ صبح سویرے ایک اٹل عذاب نے ان کو آلیا ۔ چکھو مزا اب میرے عذاب کا اور میری تنبیہات کا ۔ ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے ۔ پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا“؟

قوم لوط کا قصہ دوسرے مقامات پر مفصل مذکور ہے ۔ یہاں اس قصے کی تفصیلات دینا مطلوب نہیں ہے بلکہ یہ عبرت دلانا مقصود ہے کہ تکذیب کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے ۔ یہ کہ اللہ کا سخت عذاب آتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز ہی تنبیہات الٰہیہ کی تکذیب کے ذکر سے ہوتا ہے ۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ بِالنُّذُرِ (۵۴ : ۳۳) ”قوم لوط نے تنبیہات کو جھٹلایا“ اور اس کے بعد متصلاً عذاب الٰہی کا ذکر ہوتا ہے ۔

اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ (۳۴) نِعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ (۵۴ : ۳۵) ”اور ہم نے اس پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی ۔ صرف لوط کے گھر والے اس سے محفوظ رہے ۔ ان کو ہم نے اپنے فضل سے رات کے پچھلے پہر بچا کر نکال لیا ۔ یہ جزا دیتے ہیں ہم ہر اس شخص کو جو شکر گزار ہوتا ہے ۔“

الحاصب وہ ہوا جو پتھروں کو اڑا کر پھینک دیتی ہو اور دوسری جگہ آیا ہے کہ ان پر مٹی کے پتھر پھینکے گئے تھے ۔ لفظ

حاصب کی آواز ہی ایسی ہے جس سے پتھر پھینکے جانے کی آواز آتی ہے ۔ اس میں شدت اور سختی ہے جو اس وقت منظر اور فضا کے مناسب ہے ۔ اس عذاب سے صرف لوط علیہ السلام کے خاندان کے لوگ بچے ۔ ماسوائے ان کی اہلیہ کے اور بچنے والے اس لئے بچے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرتے تھے اور اللہ شکر کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتا ہے ۔ ان کو اللہ عذاب سے نجات دیتا ہے اور وہ خوفناک حادثات کے درمیان سے بھی بچ کر نکل آتے ہیں ۔

قرآن نے یہاں تک اس قصے کے دو اطراف بیان کر دیئے ۔ ان کی طرف سے جھٹلانا اور اللہ کی طرف سے عذاب شدید' یہ یہاں اصل مقصد تھا ۔ اب قصے کے دونوں اطراف کے درمیان کی بعض ضروری تفصیلات ۔ قرآن کریم کا یہ بھی ایک خاص انداز بیان ہے ۔ اس انداز سے قرآن کریم بعض اشارات دیتا ہے اور تفصیلات یہ ہیں :

وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ (۳٦) وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ (۳۷) وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ

(٥٤ : ٣٨) "لوط نے اپنی قوم کو ہماری پکڑ سے خبردار کیا مگر وہ ساری تنبیہات کو مشکوک سمجھ کر باتوں میں اڑاتے رہے ۔ پھر انہوں نے اسے اپنے مہمانوں کی حفاظت سے باز رکھنے کی کوشش کی ۔ آخر کار ہم نے ان کی آنکھیں موند دیں کہ چکھو اب میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزہ ۔ صبح سویرے ایک اٹل عذاب نے ان کو آلیا ۔" حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کو اس منکر سے ایک طویل عرصے تک منع کیا لیکن انہوں نے یقین نہ کیا ۔ بیشہ شک میں مبتلا رہے اور ایک دوسرے کی طرف شک ہی کو منتقل کرتے رہے اور ایک دوسرے سے شک ہی اخذ کرتے رہے اور نبی کے ساتھ جھگڑتے ہی رہے اور ان کی بدتمیزی اس حد تک پہنچ گئی کہ خود لوط علیہ السلام کے ہاں جب مہمان' فرشتے آئے تو انہوں نے ان کو ان کا دفاع کرنے سے روک دیا ۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ خوش شکل لڑکے ہیں تو ان کے گندے جذبات جوش میں آگئے ۔ انہوں نے حضرت لوط کو گھیر لیا اور مقصد یہ تھا کہ اس کے مہمانوں کے ساتھ بدتمیزی کریں ۔ انہوں نے سنجیدگی اور شرم و حیا کے جامے تار تار کر دیئے اور انہوں نے اپنے نبی کی عزت کا بھی خیال نہ رکھا حالانکہ انہوں نے ان کو بار بار اس فعل بد کے انجام بد سے ڈرایا تھا ۔

اس مقام پر اب دست قدرت مداخلت کرتی ہے ۔ فرشتے اس عذاب کے برپا کرنے کے لئے حرکت میں آتے ہیں جس کے لئے انہیں بھیجا گیا تھا ۔

فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ (٥٤ : ٣٧) "ہم نے ان کی آنکھیں موند دیں" اور وہ اس طرح ہوگئے کہ نہ کسی چیز کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ انسانوں کو ۔ اب نہ وہ لوط کو گھیر سکتے ہیں نہ مہمانوں کو پکڑ سکتے ہیں ۔ یہ کہ قوم لوط کو اندھا کر دیا گیا تھا ۔ اس کا ذکر صرف یہاں آیا ہے ۔ پوری وضاحت کے ساتھ دوسری جگہ یہ ہے ۔

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ "لوط' ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں یہ لوگ تیری طرف نہیں پہنچ سکتے ۔" یہاں پر تفصیل دے دی کہ وہ فرشتوں اور لوط علیہ السلام تک اس لئے نہ پہنچ سکتے تھے کہ ان کو

اندھا کر دیا گیا تھا۔

اب تک تو بات بطور حکایت ہو رہی تھی ' اچانک آنکھوں کے سامنے ایک منظر آتا ہے اور جن پر عذاب آیا ہے ان سے مخاطب ہو رہا ہے۔

فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ (۵۴ : ۳۷) "چکھو اب میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزہ" یہ ہے وہ عذاب جس سے تمہیں ڈرایا جا رہا تھا اور یہ ہیں وہ تنبیہات جن میں تم شک کر رہے تھے۔

ان کی آنکھیں شام کو موند دی گئیں اور صبح تک وہ یونہی رہے کیونکہ اللہ نے ان کے لئے عذاب صبح کے وقت مقرر کیا ہوا تھا۔

وَلَقَدْ صَبَّحَهُم بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ (۵۴ : ۳۸) "صبح سویرے ہی ایک اٹل عذاب نے ان کو آلیا" اور یہ وہی عذاب تھا جس کا جلد سے تذکرہ اوپر کر دیا گیا۔ یہ وہ سخت ہوا تھی جس نے مٹی کے پتھروں کی بارش ان پر کر دی تھی اور اس نے زمین کو اس گندگی اور فساد سے پاک کر دیا۔

اب پھر انداز بیان میں فرق آتا ہے۔ منظر کو یوں پیش کیا جاتا ہے کہ گویا ابھی کا واقعہ ہے اور جن کو عذاب دیا گیا ان سے خطاب شروع ہے۔

فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ (۵۴ : ۳۹) "چکھو اب میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزہ" اور آخر میں وہی سبق۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (۵۴ : ۴۰) "ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا"

یہ کڑیاں اب جزیرہ عرب کے باہر سے بھی ایک منظر پیش کر کے ختم ہوتی ہیں۔ ایک مختصر اشارہ فرعون کے انجام کی طرف :۔

وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ
أَخْذَ عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾ أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾
أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ بَلِ
السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ﴿۴۶﴾ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴿۴۷﴾
يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ

خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ۝ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ۝ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ

۳ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۝ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ۝ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ۝

۱۵ع اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ۝ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ۝

۱۰ ’’اور آل فرعون کے پاس بھی تنبیہات آئی تھیں مگر انہوں نے ہماری ساری نشانیوں کو جھٹلا دیا۔ آخر کو ہم نے انہیں پکڑا جس طرح کوئی زبردست قدرت والا پکڑا کرتا ہے۔ کیا تمہارے کفار کچھ ان لوگوں سے بہتر ہیں؟ یا آسمانی کتابوں میں تمہارے لئے کوئی معافی لکھی ہوئی ہے؟ یا ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم ایک مضبوط جتھا ہیں ' اپنا بچاؤ کرلیں گے؟ عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے بلکہ ان سے نمٹنے کے لئے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور وہ بڑی آفت اور زیادہ تلخ ساعت ہے۔ یہ مجرم لوگ درحقیقت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور ان کی عقل ماری گئی ہے۔ جس روز یہ منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے ' اس روز ان سے کہا جائے گا کہ اب چکھو جہنم کی لپٹ کا مزا۔ نافرمانی سے پرہیز کرنے والے یقیناً باغوں اور نہروں میں ہوں گے۔ سچی عزت کی جگہ ' بڑے ذی اقتدار بادشاہ کے قریب‘‘۔

فرعون کے قصے کا آغاز و انجام اس قدر اختصار کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس ڈرانے والے آتے ہیں۔ وہ نشانیاں پیش کرتے ہیں۔ وہ ان تمام نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں اور اللہ نے ان کو اس طرح پکڑا جس طرح ایک حقیقی اقتدار رکھنے والا پکڑتا ہے۔ عزت اور اقتدار کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کو نہایت ہی سختی سے پکڑا گیا اور اشارہ اسی طرف ہے کہ فرعون بڑی عزت ' قوت اور اقتدار اعلیٰ کی باتیں کرتا تھا جبکہ یہ سب امور اللہ کو حاصل ہیں۔ اللہ کے سامنے اس کی باطل عزت نہ رہی ' اس کا جھوٹا اقتدار اعلیٰ گر گیا اور حقیقی مقتدر اعلیٰ نے اسے خوب پکڑا اور بڑی شدت اور عبرت آموزی سے پکڑا جس طرح انہوں نے مصر میں سختی ' ظلم اور قہاری و جباری سے غریبوں پر ظلم شروع کر رکھا تھا۔ اسی طرح اللہ نے ان کو بھی تباہ کر دیا۔ اب اس آخری منظر پر پردہ گرتا ہے۔ یہ فرعون جبار کا منظر اور اس کی ایک جھلک ہے۔

انسانی تاریخ میں منکرین کے عذاب کے مناظر میں سے یہ آخری منظر تھا۔ تمام منکرین کی یاد قارئین کے ذہنوں میں تازہ ہے اور سننے والوں اور یہ دیکھنے والوں کا احساس ابھی ان نقوش سے منقش ہے کہ اہل مکہ کو خطاب شروع ہو جاتا ہے۔ ان کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ تم بھی اسی طرح نیست و نابود ہو سکتے ہو اگر تم باز نہ آئے بلکہ تمہاری جو حرکتیں ہیں ان کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم پر اس سے بھی بھیانک عذاب آئے :۔

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ (۴۳) اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ (۴۴) سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ (۴۵) بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ (۴۶) اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (۴۷) يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ

فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ (۴۸) اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ (۴۹) وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَۃٌ کَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (۵۰) وَلَقَدْ اَھْلَکْنَآ اَشْیَاعَکُمْ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ (۵۱) وَکُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْہُ فِی الزُّبُرِ (۵۲) وَکُلُّ صَغِیْرٍ وَّکَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ (۵۳) (۵۴: ۴۳ تا ۵۵) "کیا تمہارے کفار کچھ ان لوگوں سے بہتر ہیں؟ یا آسمانی کتابوں میں تمہارے لئے کوئی معافی لکھی ہوئی ہے؟ یا ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم ایک مضبوط جتھا ہیں' اپنا بچاؤ کر لیں گے؟ عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے بلکہ ان سے نمٹنے کے لئے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور وہ بڑی آفت اور زیادہ تلخ ساعت ہے ۔ یہ مجرم لوگ درحقیقت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور ان کی عقل ماری گئی ہے ۔ جس روز یہ منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے 'اس روز ان سے کہا جائے گا کہ اب چکھو جہنم کی لپٹ کا مزہ۔

ہم نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے اور ہمارا حکم بس ایک ہی حکم ہوتا ہے اور پلک جھپکاتے وہ عمل میں آجاتا ہے ۔ تم جیسے بہت سوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں پھر ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟ جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ سب دفتروں میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی موجود ہے ۔

یہ دنیا اور آخرت دونوں کے عذابوں سے ڈراوا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ اس سے نکل بھاگنے کا کوئی راستہ اور سوراخ نہیں ہے اور نہ بھاگنے یا بچ جانے کی کوئی امید ہو سکتی ہے ۔ نہ حساب و کتاب میں کوئی چابکدستی دکھائی جا سکتی ہے اور اس طرح سزا سے بچا جا سکتا ہے ۔

تم نے دیکھ لیا امم سابقہ کے جھٹلانے والوں پہ کیا گزری ۔ آخر تمہارے پاس کیا گارنٹی ہے کہ تم اسی انجام سے دوچار نہ ہو گے ۔

اَکُفَّارُکُمْ خَیْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِکُمْ (۵۴: ۴۳) "تمہارے کفار کچھ ان لوگوں سے بہتر ہیں" امم سابقہ کے جو کفار اسی طرح نیست و نابود ہوئے تم ان سے کس پہلو میں اچھے ہو۔

اَمْ لَکُمْ بَرَآءَۃٌ فِی الزُّبُرِ (۵۴: ۴۳) "یا آسمانی کتابوں میں تمہارے لئے کوئی معافی لکھی ہوئی ہے؟" اور جس پر یہ منزل صحیفے گواہ ہیں کہ تم کفر اور تکذیب کے انجام سے بری الذمہ ہو جاؤ گے ۔ نہ یہ بات ہے اور نہ وہ ہے ۔ نہ تم ان سے اچھے ہو اور نہ ان صحیفوں میں تمہاری برات لکھی ہوئی ہے ۔ بس یہی صورت ہے کہ تم بھی اسی انجام سے دوچار ہو جاؤ جس سے وہ دوچار ہوئے جس طرح اللہ نے مقدر فرمایا ہے ۔

اب یہ خطاب عام کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس میں ان کے معاملے پر سخت تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے ۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّنْتَصِرٌ (۵۴: ۴۴) "یا ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم ایک مضبوط جتھا ہیں اور اپنا بچاؤ کر لیں گے" جب وہ دیکھتے تھے کہ کفار مکہ ایک بڑی جمعیت ہیں تو ان کے حوصلے بڑھ جاتے تھے اور اپنی قوت پر

غرور میں مبتلا ہو کر کہتے تھے کہ ہم ہی غالب رہیں گے اور نہ ہم پر کوئی غالب ہو سکتا ہے اور نہ ہمیں کوئی قوت شکست دے سکتی ہے۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (٥٤ : ٤٥) "عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے۔" لہٰذا ان کی جمعیت انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔ ان کی قوت ان کے لئے مددگار ثابت نہیں ہوگی۔ یہ اعلان چونکہ اللہ قہار و جبار کا تھا اس لئے ایسا ہی ہوا اور ایسا ہی ہونا تھا۔

مسلم و بخاری نے ابن عباس کی روایت نقل کی فرمایا کہ حضور اکرم بدر کے دن آپ کے لئے بنائے ہوئے ایک چبوترے میں تھے اور دعا کر رہے تھے 'اے اللہ میں تجھ کو تیرے وعدے اور عہد کا واسطہ دیتا ہوں۔ اگر تو چاہے تو آج کے بعد تیری بندگی اس زمین پر نہ ہوگی" حضرت ابوبکر نے آپ کو ہاتھ سے پکڑا اور کہا یا رسول اللہ آپ کے لئے یہی کافی ہے آپ نے رب تعالیٰ کے سامنے بہت زاری کر لی ہے۔ آپ نکلے اور زرہ میں ڈوبے ہوئے تھے اور آپ کہہ رہے تھے۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (٥٤ : ٤٥) "عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے۔"

ابن ابو حاتم کی روایت میں عکرمہ سے نقل ہے۔ انہوں نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (٥٤ : ٤٥) "عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے۔" تو حضرت عمر نے فرمایا کہ کونسا جتھا یعنی کونسا جتھا شکست کھائے گا۔ عمر کہتے ہیں جب بدر کا دن آیا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ زرہ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور یہی آیت پڑھ رہے ہیں۔ "عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔" تو اس وقت میری سمجھ میں بات آئی کہ اس سے کونسی جمعیت مراد ہے۔ یہ تو تھی دنیا کی ہزیمت لیکن یہ آخری ہزیمت نہ تھی اور نہ ہی یہ شدید اور تلخ عذاب ہے چنانچہ اس دنیاوی شکست کے بعد اب آخری شکست کی طرف بات پھر جاتی ہے۔

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ (٥٤ : ٤٦) "بلکہ ان سے نمٹنے کے لئے اصل وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور وہ بڑی آفت اور زیادہ تلخ ساعت ہے۔" اس عذاب سے جو انہوں نے دیکھا ہے یا اس زمین کی زندگی میں دیکھیں گے یا ان تمام عذابوں سے زیادہ تلخ جو اس سورت میں بیان ہوئے ہیں مثلاً طوفان نوح، باد صرصر، سخت آواز اور پتھروں کی بارش والی ہوا اور فرعون کی زبردست غرقابی۔

اب تفصیلاً بتایا جاتا ہے کہ قیامت کا عذاب کس طرح سخت شدید اور تلخ ہوگا اور تفصیلات قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں بتائی جاتی ہے :۔

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ (٤٧) يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ

وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ (۵۴ : ۴۸) "یہ مجرم لوگ درحقیقت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور ان کی عقل ماری گئی ہے ۔ (یا گمراہی اور آگ میں ہیں) جس روز یہ منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے ۔ اس روز ان سے کہا جائے گا کہ اب چکھو جہنم کی لپٹ کا مزا ۔" یعنی وہ گمراہی میں ہیں جہاں عقل اور روح کی سزا ہوتی ہے اور جہنم میں ہیں جہاں جسم اور جلد کو سزا ہوتی ہے ۔ یہ اس لئے کہ یہ کہتے تھے اور ان جیسے سب لوگوں نے بھی کہا ہے ۔

اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ (۵۴ : ۲۴) "کیا ہم میں سے ایک اکیلے شخص کی ہم تابعداری شروع کر دیں ۔ اگر ایسا کریں تو گویا ہم بہک گئے اور گئی آگوں میں پڑ گئے ۔" اب ان کو معلوم ہو گا کہ گمراہی اس اتباع میں ہے یا انکار میں ہے اور آگ اتباع رسول میں ہے یا مخالفت رسول میں ہے ۔

نہایت ہی سختی ' حقارت سے منہ کے بل آگ میں گرا دیا جائے گا ۔ یہ اس لئے کہ دنیا میں وہ استکبار اور غرور کے ساتھ کام کرتے تھے اور قوت کے بل بوتے پر فیصلے کرتے تھے ۔ اب یہاں جسمانی عذاب کے ساتھ ساتھ ان کو روحانی اور نفسیاتی عذاب بھی دیا جائے گا ۔ یوں سرزنش کر کے ۔

ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ (۵۴ : ۴۸) "چکھو جہنم کی آگ کی لپٹ"

اس خوفناک اور کپکپا دینے والے منظر کے سایہ میں اب روئے سخن تمام لوگوں کی طرف پھر جاتا ہے ۔ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کی طرف تاکہ ان کے دلوں میں اللہ کی حکمت و تدبیر اور اللہ کی تقدیر اور فیصلوں کی حقیقت بیٹھ جائے ۔

یہ دنیا ہو یا آخرت ہو ' اس دنیا کا عذاب ہو یا آخرت کا عذاب ہو ' اس سے قبل کی رسالتیں اور تنبیہات ہوں یا قرآن اور نبی آخر الزمان ہوں ' یہ پوری کائنات یا اس کا انتظام و انصرام ہو یا یہ چھوٹی چیز ہو یا بڑی چیز ہو ' یہ سب کی سب ایک اندازے اور ایک سکیم کے مطابق اللہ کی حکمت کے مطابق پیدا کئے گئے ہیں ۔ کوئی چیز بھی بے مقصد ' اتفاقاً ' عبث اور بے سوچے سمجھے پیدا نہیں کی گئی ۔

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۵۴ : ۴۹) "ہم نے ہر چیز تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے ۔" ہر چیز ' چھوٹی ہو یا بڑی ہو ' بولنے والی ہو یا خاموش ' متحرک ہو یا ساکن ' گزری چیز یا حاضر ' معلوم چیز یا مجہول ' اللہ نے ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کیا ہے ۔

یہ تقدیر اس کی حقیقت طے کرتی ہے ۔ اس کی صفت طے کرتی ہے ۔ اس کی مقدار طے کرتی ہے ۔ اس کا زمانہ طے کرتی ہے ۔ اس کا مکان طے کرتی ہے ۔ اس کے ماحول کے ساتھ اس کے روابط طے کرتی ہے ۔ اس کائنات میں اس کے اثرات طے کرتی ہے ۔

یہ قرآنی آیت چند مختصر الفاظ پر مشتمل ہے لیکن یہ آیت ایک عظیم اور محیر العقول حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے ۔ اس آیت کے مفہوم میں یہ پوری کائنات شامل ہے ۔ اس حقیقت کو انسان کا دل تب ہی پا سکتا ہے جب وہ اس پوری کائنات کو ذہن میں رکھے ۔ وہ اس کائنات کے ساتھ ہمقدم ہو ۔ اس سے حقائق اخذ کرے اور یہ محسوس کرے کہ یہ کائنات باہم تناسب اور نہایت ہی دقت کے ساتھ باہم مربوط مخلوق ہے ۔ اس کی ہر چیز ایک مقدار کے مطابق پیدا کی گئی

ہے ۔ تب اس حقیقت کا ایک سایہ اور ایک خاکہ ذہن میں بیٹھ جائے گا۔ صرف ایک چیز کو ذہن میں رکھنے سے یہ تصور نہیں آسکتا۔

جدید سائنس نے اس حقیقت کے بعض نہایت ہی معمولی شعبوں کا احاطہ کیا ہے ۔ یہ علم جدید سائنس نے اپنے محدود وسائل کے مطابق فراہم کیا ہے ۔ سائنس نے معلوم کر لیا ہے کہ ستاروں کے درمیان فاصلے ایک متعین مقدار کے مطابق ہیں ۔ سیارے اور ان کے حجم اور ستاروں اور سیاروں کے گروپ یعنی کہکشاں اور ان کی ایک دوسرے کے ساتھ کشش ' یہ مقداریں اور فاصلے اس قدر متعین ہوگئے ہیں کہ سائنس دانوں نے ایسے ستاروں کے فاصلے بھی متعین کر دیئے ہیں جن کو انہوں نے دیکھا نہیں ہے کیونکہ کشش اور ہم آہنگی کا تقاضا یہ تھا کہ ان ستاروں کو اس قدر دور ہونا چاہئے کیونکہ جس نظام کو جس تدبیر و تقدیر کے ساتھ انہوں نے دیکھا ہے' اس نظام کے مطابق ان کا فاصلہ اس قدر دور ہونا چاہئے ۔ اس کے بعد جب انہوں نے تیز دور بینوں سے مشاہدہ کیا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے تقدیر کے مطابق یعنی اندازہ کے مطابق جو فاصلے طے کئے تھے وہ درست نکلے ۔ غرض ان اجرام فلکی کو اس عظیم فضا میں ایسے متعین فاصلوں سے رکھنا جن کے اندر کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہو رہا ہے اور کوئی اضطراب نہیں ۔ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے ہر چیز کو ایک مقررہ قدر یا مقدار یا تقدیر کے ساتھ بنایا ہے ۔

یہ زمین جس کے اوپر ہم رہتے ہیں' اس کے اندر پائے جانے والے رزق اور تقدیر کا علم تو اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس کی موجودہ حالت اور ہیئت اور نسبت کے اندر اگر ذرا بھی تبدیلی کی جائے تو اس زمین پر جس قدر متنوع زندگی پائی جاتی ہے اس کے اندر زبردست خلل واقع ہو جائے یا سرے سے زندگی ہی ختم ہو جائے ۔ اس زمین کا حجم اور اس کا ڈھیر اور اس کی سورج سے دوری اور اس کا حجم اس کا درجہ حرارت اور اپنے محور پر زمین کا جھکاؤ' اس کی گردش محوری کی رفتار' چاند کا زمین سے فاصلہ ' چاند کا حجم اور اس کا مواد اور زمین کی تقسیم پانی اور خشکی میں اور اس کی نسبت غرض یہ اور اسی قسم کی دوسری ہزاروں نسبتیں لگی ہیں جن کو دست قدرت نے برابر مقدر کیا ہے ۔ ان میں اگر ذرا بھی تبدیلی ہو جائے تو تمام موجودہ نظام بدل جائے اور زمین پر سے زندگی فوراً ختم ہو جائے اور وہ ضوابط جو زندگی کو کنٹرول کرتے ہیں ان کے درمیان توازن کا ادراک اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ زندہ اشیاء اور ان کے ماحول کے درمیان توازن اور تمام اشیاء کا ایک دوسرے کے ساتھ توازن اس حد تک پہنچا ہوا ہے اور انسانوں کو معلوم ہو گیا جس طرح اس آیت کے اندر پائی جانے والی حقیقت کی طرف اشارات اچھی طرح ملتے ہیں ۔ چنانچہ عوامل حیات اور بقائے حیات کے عوامل اور موت اور فنا کے عوامل کے درمیان نسبت بھی معاشرے میں متعین ہے اور جب کوئی زندہ مخلوق اپنے حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو زندگی کو کنٹرول کرنے والے قدرتی ضوابط خود اسے چیک کرتے ہیں تاکہ جس قدر زندہ مخلوق ہو' ان کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے ۔

یہاں اس طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ بعض زندہ اشیاء کا بعض دوسری زندہ اشیاء کے ساتھ بھی تعلق اور توازن ہے ۔ زمین کے اندر موجود توازن کی طرف ہم اس سے قبل اشارہ کر چکے ہیں ۔ (سورت فرقان)

وہ پرندے جو چھوٹے پرندوں کا شکار کرکے غذا حاصل کرتے ہیں' وہ قلیل التعداد ہیں ۔ اس لئے کہ یہ بہت کم انڈے دیتے ہیں ۔ پھر بہت کم بچے دیتے ہیں اور پھر یہ محدود اور متعین علاقوں میں زندہ رہتے ہیں اور دوسرے پرندوں

کے مقابلے میں ان کی عمر طویل ہوتی ہے۔ اگر طویل عمر کے ساتھ ساتھ ان کے بچے بھی زیادہ ہوتے اور یہ ہر علاقے میں زندہ رہ سکتے تو وہ دنیا سے تمام چھوٹے پرندوں کو ختم کر دیتے اور چھوٹے پرندوں کی نسلیں ختم ہو جاتیں یا ان کی تعداد اس قدر قلیل ہو جاتی کہ جس مقصد کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا تھا یعنی لوگوں کا شکار اور کھانا اور دوسرے بے شمار مقاصد جو زمین پر وہ سرانجام دیتے ہیں' کسی نے کیا خوب کہا ہے '

بغاث	الطیر	اکثرھا	فراخا
وام	الصقر	مقلاۃ	نزور

(بغاث آبی پرندہ' کے بچے بہت ہوتے ہیں لیکن شاہین کی ماں بہت کم اور تھوڑے بچے دیتی ہے۔) یہ بھی اللہ کی حکمت اور تقدیر ہے جیسا کہ ہم نے دیکھا تاکہ قدرتی نظام بگڑ نہ جائے تاکہ پرندوں کی پیدائش اور ان کی بقا اور گوشت خور پرندوں کے ذریعہ ان کے فنا میں توازن پیدا ہو۔

مکھی کئی ملین انڈے دیتی ہے لیکن اس کی عمر صرف دو ہفتے ہوتی ہے۔ اگر یہ کئی سال تک زندہ ہوتی اور انڈے اسی نسبت سے دیتی تو مکھیاں تھوڑے ہی عرصہ میں سطح زمین کو ڈھانپ لیتیں اور کئی دوسرے زندہ جانور بلکہ انسانی بھی محروم ہو جاتے یا ان کی زندگی سطح ارض پر مشکل ہو جاتی لیکن قدرت کا نظام توازن کام کر رہا ہے اور یہ توازن اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کسی چیز کی نسل زیادہ ہے تو عمر کم رکھی گئی ہے اور اگر نسل کم ہے تو عمر زیادہ دی گئی ہے اور یہ چیز ہم حیات کے تفصیلی مکالمے میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

وہ حیوانات جو مائیکروسکوپ سے نظر آتے ہیں' تمام زندہ چیزوں سے تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں اور پھیلاؤ میں بڑی کثرت سے پھیلتے ہیں اور بہت زیادہ نقصان دہ ہوتے ہیں لیکن یہ زندگی کو قائم رکھنے میں بہت کمزور اور عمر کے لحاظ سے بہت کم ہوتے ہیں۔ یہ ملین اور بلین کے حساب سے تو سردی سے مرجاتے ہیں۔ گرمی سے مرجاتے ہیں' سورج کی شعاعوں سے مرجاتے ہیں' جراثیم کش ادویات وغیرہ سے اور دوسرے اسباب و ذرائع سے اور یہ چیزیں انسانوں اور حیوانوں کی ایک محدود تعداد کو نقصان دے سکتی ہیں۔ اگر یہ چیزیں طاقتور ہوتیں یا زیادہ عمر پاتیں تو زندہ چیزوں اور انسانوں کے لئے خطرہ بن جاتیں۔

اللہ نے ہر زندہ چیز کو اپنے دشمنوں سے بچاؤ کے لئے ہتھیار دیئے ہیں اور یہ ہتھیار حسب ضرورت ہر چیز کے لئے الگ ہے۔ مثلاً کسی کو تعداد میں کثرت کا اسلحہ دیا گیا ہے' کسی کو گرفت کی قوت دی گئی ہے اور کسی کو کیا کسی کو کیا۔

چھوٹے سانپوں کو زہر دیا گیا ہے یا بڑی سرعت سے بھاگنے کا ہتھیار۔ ناگوں کو بڑے بڑے عضلاتی ہتھیار دیئے گئے۔ اس لئے ان میں زہر شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اور گبریلا اپنے آپ کو بچانے سے عاجز ہوتا ہے۔ اس لئے ایک ایسا مادہ دیا گیا ہے جو داغ دیتا ہے اور بدبودار ہوتا ہے' جو بھی اسے چھوتا ہے اس پر وہ یہ مواد بکھیر دیتا ہے۔ اس طرح وہ دشمنوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے۔

وہ انڈہ جس میں مادہ منی کا جرثومہ داخل ہو جاتا ہے' رحم مادر کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ یہ رحم مادر کو کھانا شروع کر دیتا ہے اور اپنے اردگرد رحم مادر میں ایک گڑھا بنا دیتا ہے جو خون سے بھر جاتا ہے اور یہ اس میں زندہ رہتا ہے اور خون کو چوستا رہتا ہے اور وہ نالی جو رحم مادر سے بچے کی ناف سے ملتی ہے' وضع حمل تک خون دیتی رہتی ہے اور یہ اس مقصد

کے لئے پیدا کی جاتی ہے ۔ یہ نالی نہ لمبی ہوتی ہے اور نہ چھوٹی ہوتی ہے اور اس مقدار میں اس کی لمبائی مقدر ہے کہ مقصد کو اچھی طرح پورا کرتی ہے ۔

حمل کے آخری دنوں میں پستانوں کے اندر ایک مواد بننا شروع ہوتا ہے اور وضع حمل کے بعد زردی مائل مواد (دودھ) نکلتا ہے ۔ اللہ کی صنعت کی کاریگریوں کو دیکھو کہ اس کے اندر وہ مواد ہوتا ہے جو بچے کو متعدی امراض سے بچاتا ہے اور بچے کی پیدائش کے دوسرے دن دودھ نکلنا شروع ہوتا ہے اور قدرت کا انتظام دیکھئے کہ دودھ میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا ہے ۔ ایک سال کے بعد یہ ڈیڑھ لیٹر تک پہنچ جاتا ہے حالانکہ ابتدائی دنوں میں اس کی مقدار کم ہوتی ہے ۔ صرف یہ اعجاز نہیں ہے کہ بچے کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ دودھ بھی بڑھتا ہے بلکہ دودھ کی ترکیب میں بھی اضافہ ہوتا ہے ۔ آغاز میں یہ محض پانی اور شکر ہوتا ہے اور اس کے بعد اس میں دوسرے ضروری مادے زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور پھر اس میں تیل بھی آتا ہے بلکہ ہر دن کا دودھ دوسرے دن سے مختلف ہوتا ہے اور یہ بچے کی ضروریات نشوونما کے مطابق ۔

انسان کی نشوونما میں بے شمار مشینیں کام کرتی ہیں ۔ انسان کے فرائض ' اس کے طریقہ عمل میں بہت سے عوامل لگے ہوئے ہیں جو اس کی زندگی کو بچانے اور صحت کے محافظ اور یہ فیکٹریاں جو انسانی جسم کے اندر لگی ہوئی ہیں ' ان کے بارے میں عجیب اور حیران کن معلومات حاصل ہو چکی ہیں ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دست قدرت نے کس قدر باریک نظام وضع کیا ہے اور اس کی تدبیریں ہو رہی ہیں اور جن سے صاف صاف نظر آ رہا ہے کہ اللہ کا نظام کام کر رہا ہے ۔ ہر فرد ' ہر عضو کے لئے یہ عوامل کام کرتے ہیں بلکہ ہر خلیے کے لئے کام ہو رہا ہے اور اللہ کی نظر سے کوئی چیز غائب نہیں ہے ۔ ہم یہاں انسانی جسم کی ساخت اور اس کے پیچیدہ نظام کی تفصیلات تو نہیں دے سکتے لیکن بطور نمونہ ہم صرف ایک نظام کی طرف مختصر اشارہ کرتے ہیں ۔ یہ تحت غدودوں کا نظام ہے "یہ جسم کے اندر چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں ہیں جو جسم کو ضروری کیمیادی مواد فراہم کرتی ہیں ۔ ان کی قوت یہ ہے کہ اس کے ایک ہزار بلین اجزاء میں سے ایک جزو بھی اس قدر مواد پیدا کرتا ہے جو جسم انسان کے لئے بہت اہم ہوتا ہے اور اس کا نظام اس طرح بنایا گیا کہ ایک غدود کا مواد دوسرے غدود کے مواد کے لئے لازمی جزو ہوتا ہے اور ان کے بارے میں آج تک جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا نظام نہایت ہی پیچیدہ ہے اور اگر ان میں کسی ایک غدود میں خلل واقع ہو جائے تو انسانی جسم میں عمومی تباہی کا عمل شروع ہو جاتا ہے ۔ اگرچہ یہ خلل ایک مختصر وقت کے لئے ہو ۔

رہے حیوانات تو ان کی انواع اور اقسام کے اعتبار سے ان کے دفاعی نظام اور ہتھیار مختلف ہیں اور ان کو حسب ضرورت قوت دی گئی ہے ۔

چیتوں ' شیروں ' درندوں اور دوسرے پھاڑ کھانے والے جانوروں کو ایسے منہ دیئے گئے ہیں جو شکار کو پکڑ سکتے ہیں ۔ تمام ایسے جانور جن کا گزارہ دوسرے جانوروں کے شکار پر ہے ان کو اس مقصد کے لئے ناخن ' تیز دانت اور مضبوط جبڑے دیئے گئے ہیں اور حملہ کرنے میں چونکہ وہ اعصاب اور عضلات سے کام لیتے ہیں ' لہذا ان کے پاؤں کے عضلات بہت سخت ہوتے ہیں ۔ ہاتھ پاؤں کے ناخن بہت سخت اور مضبوط ہوتے ہیں اور ان کے معدے کے اندر اس قسم کے تیزابی لعاب ہوتے ہیں جو گوشت اور ہڈیوں کو مختصر وقت میں ہضم کر کے رکھ دیتے ہیں ۔

اسی طرح چرندوں اور پالتو جانوروں کے نظام ہاضمہ کو اس کی خوراک کے مطابق بنایا گیا ہے مثلاً وہ حیوانات جو چر کر گزارہ کرتے ہیں ان کا نظام ہضم بالکل مختلف ہے ۔ ان کے منہ نسبتاً کھلے ہیں اور یہ جانور قوی اور مضبوط ناخن نہیں رکھتے ۔ اسی طرح ان کے پھاڑ کھانے والے قوی دانت بھی نہیں ۔ اس کے مقابلے میں ان کے دانت ایسے ہیں جو گھاس کو کاٹنے والے اور پیسنے والے ہیں ۔ یہ گھاس اور نباتات کو بڑی سرعت سے کھاتے ہیں اور جلد ہی اسے نگل لیتے ہیں ۔ یوں وہ انسان کے لئے وہ خدمات سرانجام دیتے ہیں جن کے لئے ان کو پیدا کیا گیا ہے ۔ دست قدرت نے ایک عجیب نظام ہضم دیا ہے جو گھاس کھاتے ہیں وہ اوجھ میں جمع ہوتا ہے ۔ جب اس حیوان کا یومیہ کام ختم ہوتا ہے اور یہ آرام کرتا ہے تو اس کا تمام کھانا ایک خالی جگہ چلا جاتا ہے جسے "ٹوپی" کہا جاتا ہے ۔ یہاں سے یہ دوبارہ منہ میں جاتا ہے ۔ اب اسے دوبارہ خوب چبایا اور پیسا جاتا اور یہ تیسرے درجے میں جاتا ہے جسے ام تلافیف کہا جاتا ہے ۔ اس کے بعد چوتھے درجے میں جسے رنفحہ کہا جاتا ہے ۔ یہ طویل نظام ہضم صرف حیوان کے لئے بنایا گیا ہے کیونکہ جس قدر چرنے والے اور جگالی والے حیوانات ہیں ان کا شکار کیا جاتا ہے لہذا ان کو ضرورت ہوتی ہے کہ وہ جلدی سے خوراک سٹور کرلیں اور پھر آرام سے جاکر ہضم کرلیں ۔ جدید علوم نے اس بات کو دریافت کیا ہے جگالی کا عمل ان حیوانات کی زندگی کے لئے ضروری ہے کیونکہ وہ گھاس جو جلدی ہضم نہیں ہوتی اس لئے کہ نباتات کے تمام خلیوں پر سلیلوز کا پردہ ہوتا ہے اور ان کو ہضم کرنے کے لئے بہت ہی طویل وقت درکار ہوتا ہے ۔ اگر جگالی کا نظام نہ ہو اور ان کے معدے میں ایک خاص سٹور نہ ہو تو ان کو چراگاہ میں طویل وقت گزارنا پڑے ۔ ممکن ہے کہ ان کو پورا دن گھاس کے ہضم کرنے میں لگ جائے اور پھر بھی وہ خوراک پوری نہ کرسکتا اور پورا دن خوراک کھانے اور چبانے ہی میں لگا رہتا ۔ جلدی سے گھاس کھاتا اور پھر اس کا سٹور کرلیتا اور پھر جگالی کرتا ہے جبکہ سٹور میں وہ کافی نرم ہوچکا ہوتا ہے تو اس طرح حیوانات کے کئی مقاصد پورے ہو جاتے ہیں ۔ وہ اچھا کام بھی کرسکتے ہیں اور ان کی غذا بھی پوری طرح ہضم ہو جاتی ہے ۔ یہ ہیں باری تعالیٰ کی تدابیر ۔

وہ پرندے جو گوشت کھاتے ہیں مثلاً الو 'شکرہ ان کی چونچ کمان کی طرح ہوتی ہے اور تیز ہوتی ہے اور گوشت نوچنے کی صلاحیت رکھتی ہے جبکہ آبی جانور مثلاً بطخ اور مرغابی کو چوڑی چونچ دی گئی ہے تاکہ وہ پانی اور کیچڑ میں اپنی خوراک تلاش کریں اور ان کی چونچ میں ایسے چھوٹے چھوٹے ابھار ہوتے ہیں جو دانت کی طرح ہوتے ہیں اور کیڑوں وغیرہ کے کاٹنے میں مدد دیتے ہیں ۔

ایسے مرغیاں اور کبوتر اور باقی پرندے تو وہ زمین سے دانے اٹھاکر کھاتے ہیں اس لئے ان کو چھوٹی چونچ اور باریک سر دیئے گئے ہیں ۔ وہ چھوٹے سے چھوٹا دانہ بھی اٹھالیتے ہیں جبکہ بگلے کی چونچ طویل ہوتی ہے اور اس کے نیچے ایک تھیلا ہوتا ہے جو جراب کی طرح ہوتا ہے ۔ یہ شکاری کے جال کا کام کرتا ہے کیونکہ اس کی خوراک ہی مچھلی ہوتی ہے ۔

ہدہد اور ریوفران کی چونچ تیز اور لمبی ہوتی اور یہ کیڑے مکوڑے کھانے اور تلاش کرنے کے لئے موزوں ہوتی ہے کیونکہ یہ چیزیں زمین کے نیچے ہوتی ہیں ۔ سائنس نے معلوم کرلیا ہے کہ کس پرندے کی چونچ پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اس کی خوراک کیا ہے ۔

یہ بیان اب طویل ہوتا جارہا ہے ۔ ہم فی ظلال القرآن کے اختیار کردہ منہاج دائرہ سے نکل رہے ہیں ۔ اگر ہم تمام انواع و اقسام کے جانوروں اور مویشیوں پر کلام کریں تو بات بہت طویل ہو جائے ۔ صرف ایک چیز کو لے لیں "امیبا" جس

کا ایک ہی خلیہ ہوتا ہے' ذرا ملاحظہ کیجئے کہ دست قدرت نے اس کی ضروریات کو کس طرح پورا کیا ہے اور اس کے لئے بھی ضروریات کا پورا پورا انتظام کر دیا ہے۔ "ایسا ایک نہایت ہی باریک جسم والا حیوان ہے۔ یہ حوضوں' نالیوں اور پانی کی تہہ میں بیٹھے ہوئے پتھروں میں ہوتا ہے۔ یہ آنکھوں سے نہیں دیکھتا ہے۔ یہ ایک ڈھیلا ڈھالا جاندار ہے۔ حالات اور ضروریات کے مطابق یہ شکل بدل دیتا ہے۔ جب یہ حرکت کرتا ہے تو یہ اپنے جسم کے بعض اجزاء مطلوب مقام تک پہنچنے کے لئے آگے پہنچنے کے لئے آگے بڑھاتا ہے۔ یہ زائد اجزاء چھوٹے پاؤں کہلاتے ہیں۔ اگر اسے کوئی غذا ملے تو وہ ان چھوٹے ایک یا دو پاؤں سے پکڑ لیتا ہے۔ اس پر یہ ہضم کرنے والا ایک سیال پھینکتا ہے اور اس کے بعد حسب ضرورت کھا لیتا ہے۔ باقی کو دور پھینک دیتا ہے۔ یہ پانی سے آکسیجن لے کر پورے جسم کے ساتھ سانس لیتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ ایک ایسا حیوان جو سرے سے دیکھتا ہی نہیں' وہ زندہ رہتا ہے' حرکت کرتا ہے' غذا حاصل کرتا ہے' سانس لیتا ہے' اپنے فضلات نکالتا ہے اور جب وہ جوان ہوتا ہے تو دو حصوں میں بٹ جاتا ہے اور اس سے دو مختلف قسم کے حیوان بن جاتے ہیں بالکل جدید"

نباتات میں بھی زندگی محیرالعقول ہے۔ انسان اور حیوان اور پرندے کے عجائبات سے وہ بھی کسی طرح کم نہیں ہیں اور دست قدرت کی کارستانی ان حیوانات کے مقابلے میں نباتات کے اندر کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ یہ ہے مفہوم اس آیت کا۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا "اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور نہایت پورے پورے اندازہ سے پیدا کیا۔"

یہ کہ اللہ نے ہر چیز کو ایک مقدر کے مطابق پیدا کیا ہے۔ یہ ایک بہت ہی عظیم اصول ہے۔ یہ بہت ہی ہمہ گیر ہے مثلاً اس کائنات کی ہر حرکت اس کے واقعات' حادثات خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے' وہ اللہ کی تقدیر اور تدبیر کے مطابق چلتے ہیں۔ انسانی تاریخ کی ہر حرکت' نفس انسانی کی ہر حرکت' سانس لینا اور خارج کرنا' مقدر ہے۔ ہر نفس کا وقت' مقام اور ماحول مقرر و مقدر ہے اور اس کی زندگی اس کائنات کی حرکت کے ساتھ مربوط ہے اور اسی طرح حساب و کتاب کے اندر ہے جس طرح بڑے بڑے واقعات دائرہ حساب میں ہوتے ہیں۔

اور ایک صحرا میں ایک اکیلا درخت کھڑا ہے۔ یہ تقدیر نے کھڑا کیا ہے اور اس کی کوئی ضرورت ہوگی۔ یہ درخت بھی کوئی فریضہ منصبی ادا کر رہا ہوگا اور یہ بھی اس پوری کائنات کے نظام کے ساتھ مربوط ہے۔ یہ چیونٹی جو زمین پر چل رہی ہے اور یہ ذرہ جو ہوا میں اڑ رہا ہے اور یہ خلیہ جو پانی میں تیر رہا ہے یہ بھی انہیں اجرام فلکی کی طرح مقدر ہے اور کسی کے حکم سے اڑ رہا ہے۔

اللہ کی تقدیر زمان میں بھی چلتی ہے' مکان میں بھی چلتی ہے' مقدار بھی مقدر ہے صورت بھی مقدر ہے اور تمام حالات اور تمام اصول مقدر ہیں۔

اللہ کا نظام قضا و قدر کس طرح کام کرتا ہے مثلاً حضرت یعقوب ایک دوسری عورت سے نکاح کرتے ہیں اور ان سے یوسف اور بن یامین پیدا ہوتے ہیں۔ کسی نے اس کے بارے میں خیال کیا ہے کہ یہ بظاہر ایک شخصی فیصلہ تھا لیکن اس کے

پیچھے دست قدرت کام کر رہا تھا تاکہ برادران یوسف ان کے ساتھ حسد کریں' ان کو اندھے کنویں میں ڈال دیں ۔ وہاں سے ان کو قافلہ پکڑ لے ۔ مصر میں فروخت کر دے 'مصر میں عزیز مصر کا گھر ہے ۔ اس کی بیوی انہیں ورغلانے کی کوشش کرے ۔ آپ بلند اور برتر ثابت ہوں ۔ جیل میں بھیج دیئے جائیں ۔ یہ کیوں؟ تاکہ جیل میں شاہی ملازمین سے ملیں ان کے سامنے خواب کی تعبیر بیان کریں ۔ یہ کیوں؟ ابھی تک تو ان واقعات کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا ۔ سوال اٹھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ حضرت یوسف تو بے گناہ جیل میں عذاب جھیل رہے ہیں پھر یعقوب علیہ السلام کا کیا قصور ہے ۔ وہ کیوں جل رہے ہیں؟ وہ رنج و الم سے کیوں بینائی کھو بیٹھے ہیں اور یوسف علیہ السلام کو یہ تکالیف کیوں دی جا رہی ہیں ۔ جسمانی اور روحانی تکالیف ' پورے پچیس سال گزرنے کے بعد پہلا جواب آتا ہے کہ تقدیر اسے مصر کی حکومت کے لئے تیار کر رہی تھی تاکہ مصر اور اس کے ملحقہ ممالک کو قحط سے بچایا جا سکے ' پھر کس لئے؟ اس لئے کہ وہ اپنے والدین اور بھائیوں کو مصر بلا لائیں پھر اس لئے کہ ان کی نسل سے قوم بنی اسرائیل پروان چڑھے تاکہ فرعون ان پر مظالم ڈھائے اور ان کے لئے موسیٰ علیہ اسلام کو بھیجا جائے ۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ اس کرہ ارض پر وہ واقعات رونما ہوں ۔ جو حضرت یوسف کے کنویں میں ڈالنے کے بعد رونما ہوئے ۔ ان واقعات کے اثرات اس دنیا میں آج بھی موجود ہیں اور دنیا کے واقعات پر اثرانداز ہو رہے ہیں ۔

پھر ایک دوسرا واقعہ یعقوب علیہ السلام کے دادا ابو الانبیاء حضرت ابراہیم مصر جاتے ہیں ۔ مصری عورت ہاجرہ سے نکاح کرتے ہیں ۔ یہ بھی کوئی انفرادی مسئلہ نہ تھا ۔ یہ اور اس سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں جو واقعات رونما ہوئے جن کے نتیجے میں انہوں نے وطن چھوڑا' عراق سے کنعان وہاں سے مصر وہاں سے ہاجرہ کا لانا' اسماعیل علیہ السلام کا پیدا ہونا' ان کو بیت اللہ میں آباد کرنا تاکہ حضرت محمد ﷺ پیدا ہوں' ابراہیم کی نسل سے' اس جزیرہ عرب میں جو اس کرہ ارض پر بہترین مکان ہے اور دعوت اسلامی کا مرکز ہے تاکہ اس کے نتیجے میں تاریخ انسانیت میں ایک عظیم حادثہ رونما ہو ۔

یہ بھی اللہ کی تقدیر ہے اور اس کا پچھلا سرا دست قدرت کے ہاتھ میں ہے ۔ ہر حادثہ ہر واقعہ وہاں سے ہی نمودار ہوتا ہے ۔ آغاز بھی وہاں سے ' انجام بھی وہاں ' ہر قدم ' ہر تغیر میں دست قدر کا ہاتھ ہے ۔..... یہ اللہ کی تقدیر کا نظام ہے ' یہ نافذ ہے ' جامع و شامل ہے ' باریک اور گہری ۔

انسان اس کے بالکل قریبی سرے کو دیکھ رہا ہے لیکن اسے اسباب کی دراز رسی کا دوسرا سرا نظر نہیں آتا اور بعض اوقات یہ رسی بہت دراز ہو جاتی ہے ۔ زمانے گزر جاتے ہیں ' دور دراز تک ہم نکل جاتے ہیں ' ہمیں تقدیر و تدبیر کا سلسلہ نظر نہیں آتا ۔ ہمیں سمجھ نہیں آتا کہ

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ پروانے کا ناحق خون ہو گا

کس طرح ہو گا؟ اس پر لوگ جلدی مچاتے ہیں ' شور کرتے ہیں نئی نئی تجاویز لاتے ہیں ۔ یہ لوگ دراصل اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رہے ہیں ۔ نظام قضا و قدر پر دست درازی کرتے ہیں ۔

اللہ صاف فرماتا ہے کہ اس نے ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کر رکھا ہے ۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ نتائج اس پر

چھوڑ دیں جو نتائج کا مالک ہے اور آرام سے کام کریں ـ وہ اللہ کے نظام ' قضا و قدر سے ہم آہنگ ہو کر چلیں ـ نہایت انس و محبت سے اپنے حصے کا کام کریں اور نہایت ثابت قدمی اور اللہ پر بھروسے کے ساتھ قدم بڑھاتے چلے جائیں ـ

جہاں تک اللہ کے انقلاب کا تعلق ہے تو وہ پلک جھپکتے ہی نمودار ہو سکتا ہے ـ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے ـ

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (٤٥ : ٥٠) "ہمارا حکم بس ایک ہی حکم ہوتا ہے اور پلک جھپکائے وہ عمل میں آجاتا ہے ـ" صرف ایک اشارہ اور ایک ہی کلمہ تمام کام مکمل کر دیتا ہے ـ چھوٹا کام بھی اور بڑا انقلاب بھی ـ اللہ کے لئے تو کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہے ـ یہ انسانی تقدیرات ہیں جن میں بڑے اور چھوٹے کام ہیں ـ اللہ کے ہاں نہ زمان ہے نہ مکان ہے اور نہ پلک جھپکنا ہے ـ وہاں تو کن فیکون ہے ـ یہ انسانوں کو سمجھانے کے لئے بڑے اور چھوٹے اور مختصر وقت کی مثالیں دی گئی ہیں ـ زمان کیا ہے ' انسان کا ایک چھوٹا سا تصور جو وہ اس زمین کے گردش محوری اور سالانہ سے پیائش کرتا ہے ـ اللہ کے ہاں زمانے کا یہ تصور نہیں ہے ـ یہ تو بہت ہی محدود تصور ہے ـ

ایک لفظ ـ جو اس پوری کائنات کو وجود میں لاتا ہے ـ ایک لفظ ہے جو اس میں تغیرات پیدا کرتا ہے ـ ایک لفظ ہے جو اس کو نابود کر دے گا ـ ایک لفظ ہے جو ہر چیز کو وجود بخشتا ہے ـ ایک لفظ ہے جو حیات کو پھیلاتا ہے ـ ایک لفظ ہے جو موت دیتا ہے اور ایک لفظ ہو گا جو دوبارہ اٹھا دے گا ـ ایک لفظ سے حشر و نشر برپا ہو گا اور حساب و کتاب ہو گا ـ ایک لفظ ایک ارادہ ' کسی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی کسی زمان و مکان کی ضرورت نہیں پڑتی ـ بس قدرت ہے تقدیر ہے اور ہر چیز اللہ کے لئے آسان ہے ـ

اور یہی ایک لفظ تھا جس کے ذریعہ ہم زمانوں کو ہلاک کر کے لپیٹ چکے ہیں ذرا تاریخ پر نگاہ ڈالو ـ

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (٥١) وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ (٥٢) وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ (٤٥ : ٥٣) "اور تم جیسے بہت سوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں ' پھر ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟ جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ سب دفتروں میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی موجود ہے ـ" یہ ہیں مکذبین کی بربادیاں جن کی طرف اسی سورت میں اشارات موجود ہیں ـ کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟ جو نصیحت حاصل کرے اور عبرت پکڑے ـ

ان کی ان بربادیوں پر ہی ان کا حساب و کتاب ختم نہیں ہو گیا بلکہ ایک آنے والا حساب ہے جس سے کوئی ذرہ برابر فعل بھی نہیں بچ سکتا ـ

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ (٤٥ : ٥٢) "انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہے دفتروں میں درج ہے" وہ دفتروں میں سطور کی شکل میں درج ہے یوم الحساب کے لئے تیار شدہ چٹھا ہے ـ

وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ (٤٥ : ٥٣) "ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی موجود ہے ـ" کوئی چیز اس میں سے بھول کر نہیں رہتی ـ

اب روئے سخن متقین کی طرف پھر جاتا ہے ـ یہ صفحہ بالمقابل ہے مکذبین کا ـ نہایت ہی خوشحالی کی تصویر ہے ـ ان

کی امن و اطمینان میں اور کیف و سرور میں اور عزت و عظمت میں ۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ (٥٤) فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (٥٥) (٥٤: ٥٤ - ٥٥) "نافرمانی سے پرہیز کرنے والے یقیناً باغوں اور نہروں میں ہوں گے ۔ سچی عزت کی جگہ ' بڑے ذی اقتدار بادشاہ کے قریب"۔

مجرمین تو گمراہی اور آگ میں تھے ۔ تو متقین چشموں اور نہروں میں ہیں ۔ مجرموں کو منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینکا جائے گا توہین آمیز طریقے پر اور پھر سرزنش کے طور پر کہا جائے گا۔

ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ "چکھو آگ کا مساس" جبکہ مومنین جنات اور نہروں میں ہیں اور عزت کی جگہوں میں ذی اقتدار بادشاہ کے پاس ہیں ۔ پورا تقابل ہے دونوں کے درمیان ۔

الفاظ کا استعمال بھی دلچسپ ہے ۔ جنات و نہر میں ایک تو مفہوم نہایت مکمل ہے کہ باغ اور نہریں جن سے نعمتیں اور آسانیاں ظاہر ہوتی ہیں ۔ لفظ نہر لفظ سقر کے ساتھ ہم وزن ہونے کے ساتھ نہایت ہی نرم ادائیگی بھی رکھتا ہے یعنی نرم 'سہل التلفظ لفظ سے اشارہ اس طرف مطلوب ہے کہ ان کو ہر قسم کی سہولیات میسر ہیں ۔ قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ معنی کے علاوہ تلفظ سے بھی مفہوم ظاہر ہوتا ہے جس طرح سقر سے سختی ظاہر ہوتی ہے ۔

جسم اور زبان کی نعمتوں کے علاوہ وہاں قلب و روح کی غذا کا انتظام بھی ہو گا اور وہ ہو گا مقتدر اعلیٰ کا قرب ۔

فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (٥٤: ٥٥) "سچی عزت کی جگہ بڑے ذی اقتدار بادشاہ کے قریب ۔" یہ مستقل اطمینان کی جگہ ہے ۔ نہایت ہی قابل عزت قرب ہے ۔ وہ قرب کے اندر محبت محسوس کریں گے ۔ مطمئن ہوں گے ۔ یہ اس لئے کہ دنیا میں یہ لوگ اللہ سے ڈرنے والے تھے ۔ ہر وقت اللہ کی مرضی کے منتظر تھے اور اللہ کا نظام یہ ہے کہ وہ کسی دل میں دو ڈر جمع نہیں کرتا کہ کوئی دنیا میں اللہ سے ڈرے اور پھر قیامت میں بھی اللہ سے ڈرے ۔ جو یہاں ڈرے گا وہاں مطمئن اور مسرور ہو گا اور اس خوفناک اور ہولناک میدان میں امن و سکون محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ اہل ایمان اعزاز و تکریم بھی پائیں گے ۔

یہاں یہ نغمہ نہایت دھیما نغمہ ختم ہوتا ہے ۔ متقین یہاں پرامن سایہ میں ہیں اور یہ سورت جس کی تمام کڑیاں خوفناک دھماکے کی صورت میں تھیں 'پکڑ دھکڑ تھی ' اس کا یہ آخری منظر مومنین کے پرسکون حالات و مناظر پر ختم ہوتا ہے جس میں ان کا جسم اور قلب و روح سب کے سب پرسکون اور مطمئن نظر آتے ہیں ۔ یہ ہے انداز علیم و حکیم کا ۔ جو بات کی جاتی ہے وہ دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے کیونکہ اللہ لطیف و خبیر ہے اور اسی نے ہر چیز کو ایک اندازے سے بنایا ہے اور وہ ہر چیز کے ساتھ معاملہ کرنا اچھی طرح جانتا ہے ۔

---()()()---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ۔۔ ۲۷

سورۃ الرحمٰن ۔ ۵۵

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۷۸

سورۂ رحمٰن ایک نظر میں

یہ مکی سورۃ ہے اور اس کا طرز تعبیر بھی بالکل ممتاز ہے۔ اس کا موضوع پوری کائنات ہے، خصوصاً کائنات کے اندر اللہ کی پیدا کردہ نعمتیں اور سہولیات حیات۔ اللہ کی پیدا کردہ خوبصورت اشیاء، انوکھی اشیاء اور انسان کے لئے فراہم کردہ نعمتیں۔ پھر اس کائنات کا انتظام و انصرام نیز لوگوں کو ذات باری کی طرف متوجہ کرنا، اس کا اصل ہدف ہے۔ اس سورۃ میں خطاب جن و انس کو ہے اور دونوں کے خلاف اس پوری کائنات کو بطور شہادت پیش کیا گیا کہ تم اس کائنات کی کس کس شہادت کا انکار کر سکتے ہو۔ یہ موجودات تمہارے سامنے ہیں۔ بار بار چیلنج دیا جاتا ہے کہ تم اس کائنات کی کس چیز اور کس نعمت کے پہلوئے شہادت کا انکار کر دیکھتے ہو۔ یوں اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کی اہم چیزوں کو اس نمائش گاہ میں لاتا ہے اور اس سے آخرت پر استدلال فرماتا ہے۔

یہ سورۃ ایک اعلان اور فرمان ہے۔ اس اعلان کی آواز بازگشت اور اس کا نغمہ جاتی پہلو، اس کی آیات کا قافیہ، غرض ان تمام امور پر پوری سورۃ کے اندر زمزمہ سرا ہیں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، ان کی آواز بلند اور دور تک جانے والی ہے۔ سورۃ کا مطلع ایک آیت ہے اور یہ آیت ایک لفظ ہے لیکن اس پہلے لفظ کے تلفظ ہی سے آنے والی باتوں کا انتظار ہونے لگتا ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ (۵۵ : ۱) یہ ایک لفظ مبتدا ہے۔ نہایت مہربان۔ اس لفظ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اعلان اور فرمان آنے والا ہے اور مقصد اس کے بعد اللہ کی رحمتوں اور مہربانیوں کا بیان شروع ہوتا ہے۔

یہ پوری سورۃ ایک نمائش ہے۔ اللہ کی رحمتوں کی یہ نمائش تعلیم القرآن سے شروع ہوتی ہے کہ تعلیم قرآن انسان پر اللہ کے احسانات میں سے ایک بڑا احسان ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ انسان کی تخلیق اور انسان کو بیان کرنے کی صلاحیت عطا کرنا عنایات الہیہ میں سے بہت بڑی عنایت ہے۔

اس کے بعد وہ عنایات الہیہ آتی ہیں جو بزبان حال بتاتی ہیں کہ اللہ کی عنایات کیا کیا ہیں۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (۵۵ : ۵) اور وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ (۵۵ : ۶) سب عنایات ہیں۔ اونچی چھت والا آسمان اور حق و باطل کا فیصلہ کرنے والی میزان، زمین اور اس کے اندر مختلف قسم کے پھل اور حیوانات، انگور و کھجور اور دانہ بھی اور بھوسہ بھی۔ جن و انس، مشرقین و مغربین، دو دریا اور ان کے درمیان پردے اور ان کے اندر چلنے والی مخلوق اور کشتیاں اور ان سے نکلنے والے سامان اور جب یہ تمام قابل ذکر چیزیں دکھا دی گئیں تو پھر ان کے فنا کا منظر بھی دکھایا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ پوری مخلوق کو فنا کر دیا جاتا ہے اور صرف اللہ ذوالجلال و الاکرام باقی رہتا ہے کیونکہ

تمام مخلوق اس کے تصوف میں ہے اور تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔

اس فنائے مطلق اور بقائے مطلق کے سایہ میں جن و انس کو ایک زبردست چیلنج دیا جاتا ہے۔ نہایت ہی خوفناک۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ (۳۱) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۲) يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۳۳) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۴) يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ (۳۵) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۶) (۵۵: ۳۱ تا ۳۶) (اے زمین کے بوجھو، عنقریب ہم تم سے باز پرس کرنے کے لئے فارغ ہوئے جاتے ہیں تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھٹلاتے ہو۔ اے گروہ جن و انس اگر تم زمین و آسمان کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو، نہیں بھاگ سکتے۔ اس کے لئے بڑا زور چاہئے۔ اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے؟ تم پر آگ کا شعلہ چھوڑ دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے۔ اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کا انکار کرو گے؟)

اس وجہ سے پھر انجام بھی بتا دیا جاتا ہے کہ جب تم بھاگ نہیں سکتے تو پھر انجام کے لئے تیار ہو جاؤ کہ جب قیامت برپا ہوگی تو آسمان سرخ ہو جائے گا۔ مجرموں کو عذاب دیا جائے گا اور متقین کا بہترین انجام ہوگا اور اس اچھے انجام کی پوری تفصیلات اور اس نمائش گاہ عالم کا انجام اس فقرے پر۔

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (۵۵: ۷۸) (بڑی برکت والا ہے تیرے رب جلیل و کریم کا نام) آکر ختم ہوتا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۵۴ تشریح آیات

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۷۸

سورۃ کا آغاز ہوتا ہے ۔

الرَّحْمٰنُ (۵۵ : ۱) یہ مطلع ہے اس کا لفظ اور معنی دونوں مقصود ہیں ۔ اس لفظ کا ترنم اور اس کی موسیقی سب مطلوب ہیں ۔

الرَّحْمٰنُ (۵۵ : ۱) یہ گنگناتی 'ترنم' بے قید آواز اطراف کائنات میں گونج اٹھی ہے !! پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے ۔

الرَّحْمٰنُ (۵۵ : ۱) دور تک چلے جانے والی یہ نہایت ہی بلند آواز ! اس کائنات کے اطراف و اکناف میں ایک گونج پیدا کر دیتی ہے ۔ یہ تمام موجودات سے مخاطب ہے ۔ ہر موجود کے کانوں سے ٹکراتی ہے ۔ زمین و آسمان کی فضاؤں کو گونج سے بھر دیتی ہے ۔ ہر کان اور ہر دل تک پہنچ جاتی ہے ۔

الرَّحْمٰنُ (۵۵ : ۱) کی آواز تھی اور پھر خاموشی ۔ بس ختم 'پوری فضا خاموش 'ہمہ تن گوش کہ کیا ہے خبر کیا ہے اگلا حکم ۔ اس عظیم گونج کے بعد کیا ہو گا فرمان شاہی !؟ اور اس کے بعد جو خبر آتی ہے تو تمام کائنات کا دل دھڑکنے لگتا ہے ۔ کس قدر عظیم فرمان ہے یہ !

سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ (۵۵) مَدَنِيَّةٌ (۹۷) اٰیَاتُهَا ۷۸ رُکُوْعَاتُهَا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلرَّحْمٰنُ ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾ اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ
بِحُسْبَانٍ ﴿۵﴾ وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ﴿۶﴾ وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِيْزَانَ ﴿۷﴾
اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِيْزَانِ ﴿۸﴾ وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴿۹﴾ وَ

الْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ﴿١٠﴾ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ ﴿١١﴾ وَالْحَبُّ
ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿١٢﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿١٣﴾ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن
صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿١٤﴾ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ ﴿١٥﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبَانِ ﴿١٦﴾

"نہایت مہربان (خدا) نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔ سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں اور تارے اور درخت سب سجدہ ریز ہیں۔ آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو' انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔ زمین کو اس نے سب مخلوقات کے لئے بنایا۔ اس میں ہر طرح کے بکثرت لذیذ پھل ہیں۔ کھجور کے درخت ہیں جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ طرح طرح کے غلے ہیں جن میں بھوسا بھی ہوتا ہے اور دانہ بھی۔ پس اے جن و انس' تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ انسان کو اس نے ٹھیکری جیسے سوکھے سڑے گارے سے بنایا اور جن کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا۔ پس اے جن و انس' تم اپنے رب کے کن کن عجائب قدرت کو جھٹلاؤ گے؟"

رحمان کے انعامات کے بیان میں یہ پہلا پیرگراف ہے اور اس اعلان عام کی یہ پہلی خبر ہے اور پہلی نعمت:

علم القرآن (اس نے قرآن کی تعلیم دی) اور قرآن کی تعلیم کی شکل میں اللہ نے اپنے بندوں پر عظیم رحمت فرمائی۔ قرآن جو نوامیس فطرت کا ترجمان ہے۔ یہ اہل زمین کے لئے آسمان کا منہاج ہے اور یہ منہاج اہالیان زمین کو ناموس فطرت سے ملاتا ہے اور یہ ان کے عقائد' ان کے تصورات' ان کے پیمانوں' ان کی قدروں' ان کے اداروں' ان کے حالات کو نہایت ہی مضبوط بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ انہی بنیادوں پر جن پر یہ پوری کائنات قائم ہے' یہ دستور ان کی سہولتیں اطمینان اور ناموس فطرت کے ساتھ مفاہمت اور ہم آہنگی عطا کرتا ہے۔

قرآن انسانوں کے حواس اور ان کے شعور کو اس پوری کائنات کے لئے کھولتا ہے کہ دیکھو کیا ہی خوبصورت ہے یہ کائنات اور قرآن ان کو اس کا مشاہدہ یوں کراتا ہے کہ گویا انسانیت نے کائنات کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ وہ دیکھتے رہے تھے لیکن یہ ایک نیا مطالعہ ہے۔ انہوں نے خود اپنی ذات کا بھی از سر نو مطالعہ کیا۔ انہوں نے اپنے اردگرد کائنات کو پڑھنا شروع کیا بلکہ قرآن نے اس پورے کائناتی ماحول کو ایک زندگی عطا کر دی اور یہ ماحول انسان کے ساتھ ساتھ چلنا شروع ہو گیا ہے۔ اب انسان اس کائنات کے مظاہر کا دوست بن گیا۔ ساتھی بن گیا اور وہ ہمقدم ہو کر چل رہے ہیں اور اس زمین پر انسان کا یہ سفر نہایت خوشگواری سے چلنے لگا۔

اس قرآن نے انسان کے ذہن نشین کرا لیا کہ انسانو! تم اس کائنات میں اللہ کے خلفاء ہو۔ رحمان کے خلفاء ہو۔ اللہ کے نزدیک تم بہت مکرم ہو۔ تمہیں اللہ نے یہ قرآن ایک عظیم امانت دی ہے۔ وہ امانت کہ زمین و آسمانوں اور پہاڑوں نے اس کے اٹھانے سے معذرت کر لی تھی۔ قرآن تمہیں جو اعلیٰ انسانیت عطا کرتا ہے اس کی قدر و قیمت کو سمجھو اور یہ فہم و ادراک صرف قرآن کے ذریعہ ممکن ہے۔ ایمان کی راہ سے ممکن ہے۔ ایمان ہی تمہاری روح میں یہ جذبہ' یہ ہدایت

پھونک سکتا ہے اور صرف قرآن کے ذریعے سے تم اللہ کی عظیم نعمت حاصل کر سکتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اور اسے وجود بخشنے کی نعمتوں سے بھی پہلے تعلیم کا ذکر کیا کیونکہ علم قرآن کے ذریعہ ہی انسان انسان بن سکتا ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ (۵۵ : ۳) عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵ : ۴) (انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا) ہم یہاں انسان کی تخلیق کی نعمت پر کلام نہیں کرتے۔ جلد ہی سورۃ میں یہ بیان آئے گا۔ یہاں اصل مقصود تعلیم بیان ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بات کرتا ہے۔ مافی الضمیر کی تعبیر کرتا ہے۔ بیان کرتا ہے ایک دوسرے کی بات سمجھتا ہے اور پھر انسان باہم تعاون کرتے ہیں۔ یہ کام چونکہ ہروقت ہمارے درمیان ہوتا رہتا ہے اس لئے اللہ کی اس نعمت عظمیٰ کو ہم نے بھلا دیا ہے ورنہ ذرا بھی غور کیا جائے تو یہ ایک عجوبہ ہے۔ قرآن ایسی کئی نعمتوں کی یاد دہانی کراتا ہے ہمیں جگاتا ہے۔

انسان کیا چیز ہے؟ اس کی اصلیت کیا ہے؟ اسے یہ بیان کس طرح سکھا دیا جاتا ہے؟ انسان کی حیثیت تو یہ ہے کہ یہ ایک خلیہ ہے جو باپ کے مادہ منویہ میں ہوتا ہے۔ یہ رحم مادر میں ایک نہایت ہی سادہ شکل میں زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ یہ بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے' کمزور ہوتا ہے۔ یہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ یہ صرف آلات کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے' نہ یہ نظر آتا ہے اور نہ یہ اظہار کر سکتا ہے۔

یہ خلیہ جلد ہی جنین کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس جنین میں خلیوں کی تعداد پھر کئی ملین ہو جاتی ہے۔ ہڈی کے خلیے' نرم ہڈیوں کے خلیے' عضلات کے خلیے' اعصاب کے خلیے اور جلد کے خلیے۔ پھر اعضا بنتے ہیں اور ان اعضاء کے حیران کن کام اور صلاحیتیں سننا' دیکھنا' چکھنا' سونگھنا اور چھونا اور پھر شعور اور الہام۔ یہ سب خلیے اور یہ سب خواص اس ایک خلیے سے بن گئے جو ایک سادہ خلیہ تھا' نہایت چھوٹا جو نہ نظر آتا تھا اور نہ اظہار کر سکتا تھا۔

یہ کیسے ہوا؟ کہاں سے آیا؟ یہ رحمان سے آیا ہے' یہ رحمان کی مصنوعات میں سے ایک ہے۔

ذرا غور کیجئے کہ اس مخلوق کو اللہ نے کس طرح بیان سکھایا۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ (۱۶ : ۷۸) (اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حال میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اس نے تمہیں کان دیئے' آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیئے اس لئے کہ تم شکر گزار ہو)

حقیقت یہ ہے کہ بات کرنے کے اعضا ہی وہ عجوبہ ہیں جن کے عجائبات ختم نہیں ہو سکتے۔ زبان' ہونٹ' جبڑے' دانت' ہوا کی نالی' حنجرہ اور پھیپھڑے سب اس میں شریک ہوتے ہیں ۔ یہ تمام اعضاء آواز نکالنے میں شریک ہوتے ہیں اور اعضا کا یہ فعل بیان کی بنیاد بنتا ہے۔ اس پیچیدہ عمل میں یہ اعضاء ایک میکانیکی پہلو دکھاتے ہیں۔ اس کے بعد پھر ان اعضاء کا رابطہ دماغ' قوت سماعت اور پورے اعصابی نظام سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد عقل سے اس کا تعلق ہوتا ہے اور عقل کیا چیز ہے' اس کے بارے میں ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ اس کا نام "عقل" ہے۔ اس کی ماہیت اور حقیقت کا ہمیں علم نہیں ہے بلکہ یہ عقل کس طرح کام کرتی ہے ہم اس کے بارے میں بھی نہیں جانتے۔

ایک بات کرنے والا جب ایک لفظ بولتا ہے تو کس طرح بولتا ہے؟ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے کئی مراحل کئی درجے

اور کئی آلات ہیں اور بعض چیزیں ابھی تک معلوم نہیں۔

پہلے یہ شعور سامنے آتا ہے کہ اس مقصد کے لئے یہ لفظ بولنا چاہئے۔ یہ شعور عقل 'قوت مدرکہ یا روح سے حسی آلات کی طرف آتا ہے۔ یہ کس طرح آتا ہے اس کا ہمیں علم نہیں۔ دماغ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اعصاب کے ذریعے یہ حکم دیتا ہے مذکورہ بالا آلات کو کہ اس لفظ کا تلفظ کیا جائے۔ یہ لفظ بذات خود کیا چیز ہے۔ یہ وہ آواز ہے جو اللہ نے ہر انسان کو سکھائی اور اس کے معنی سکھائے۔ اب یہاں پھیپھڑے ہوا کی ایک مقدار ایک نالی کے ذریعہ ہوائی نالی کی طرف منتقل کرتے ہیں۔ پھر یہ ہوا گلے کی طرف آتی ہے۔ یہاں تاروں کا وہ نظام ہے جو آواز پیدا کرتا ہے۔ یہ نظام انسانوں کے بنائے ہوئے صوتی آلات کے تاروں سے بہت ہی مختلف اور پیچیدہ ہے۔ نہ اس نظام کے ساتھ انسان کے بنائے ہوئے آلات مشابہت کر سکتے ہیں جو آواز پیدا کرتے ہیں۔ اس کے بعد حنجرہ میں آواز پیدا ہوتی ہے اور اس کے بعد جس طرح عقل چاہتی ہے اس آواز کی تشکیل ہوتی ہے۔ اونچی آواز' نرم آواز' دھیمی آواز' تیز آواز' موٹی آواز' سخت آواز' نرم آواز' پتلی آواز' غرض قسم قسم کی آواز بھی۔ پھر حنجرہ کے ساتھ زبان' ہونٹ' جبڑے اور دانت کام کرتے ہیں۔ مختلف اطراف کے دباؤ کے نتیجے میں پھر حروف بنتے ہیں اور جہاں سے وہ نکلتے ہیں وہ ان کا مخرج ہوتا ہے۔ زبان کے اندر یہ کمال ہے کہ وہ ہر حرف کو زبان کے ایک حصے سے نکالتی ہے جس کا خاص اثر ہوتا ہے۔ زبان دباؤ کو اس حصے پر مرکوز کر دیتی ہے۔ اسی طرح حروف کی آواز میں ایک خاص ترنم پیدا ہوتا ہے۔

یہ تمام آلات صرف ایک لفظ کی ادائیگی کا انتظام کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر عبارت موضوع' افکار' احساسات' سابقہ اور نئے' غرض یہ نظام ""نظام بیان"" بذات خود ایک معجزہ ہے۔ یہ بیان انسانی جسم کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ رحمان کی صفت ہے اور رحمان کا فضل ہے۔

اب اس کائنات کی نمائش گاہ میں دست قدرت کے بنائے ہوئے دو اور عجوبے۔

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (۵۵ : ۵) (سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں) شمس و قمر کی بناوٹ ان کی حرکت اور ہم آہنگی کو دیکھ کر انسان حیران اور ششدر رہ جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عظیم نظام ہے اور منظم کی عظمت پر دال ہے اور اس نظام کے اندر گہرے حقائق پوشیدہ ہیں اور اس سے نکلنے والے نتائج دور رس ہیں۔

سورج اجرام فلکی میں سے کوئی بہت بڑا کرہ نہیں ہے۔ اس فضائے کائنات کے اندر جس کے حدود کا تعین انسان نہیں کر سکا' کئی ملین ستارے ہیں جن میں سے بہت سے سورج سے بڑے ہیں اور زیادہ حرارت والے ہیں۔ زیادہ تیز روشنی والے ہیں۔ بعض تو بیس گنا بڑے اور زیادہ گرم ہیں اور جن کی روشنی سورج کی روشنی سے پچاس گنا تیز ہے۔

شعری یمانی سورج سے بیس گنا بھاری ہے اور اس کی روشنی سورج کی روشنی سے پچاس گنا زیادہ ہے۔ سماک رامح سورج کے حجم سے اسی گنا بڑا حجم رکھتا ہے اور اس کی روشنی آٹھ ہزار گنا زیادہ تیز ہے۔ سہیل کا حجم سورج سے دو ہزار پانچ صد مرتبہ بڑا ہے۔ اسی طرح اور ستارے اور سیارے۔

لیکن ہمارے لئے سورج ہی زیادہ اہم ہے یعنی ہم زمین کے باشندوں کے لئے کیونکہ یہ زمین اور اس کی یہ حالت اور

انسان کی زندگی سورج کی حرارت کی مرہون منت ہے اور اس میں سورج کی جاذبیت کو بھی بڑا دخل ہے۔

اس طرح چاند جو اس زمین کا ایک چھوٹا سا سیارچہ ہے لیکن اسے بھی اس زمین کی زندگی میں اہمیت حاصل ہے۔ سمندروں کے اندر مدوجزر اسی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

سورج کا حجم' اس کا درجہ حرارت' ہم سے اس کا بعد' اس کا اپنے مدار میں چکر لگانا' اس طرح چاند کا حجم' اس کی ہم سے دوری اور اپنے مدار میں گردش یہ سب امور نہایت ہی باریک حساب اور پیمانوں سے بنائے ہوئے ہیں اور زمین کی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ بمقابلہ دوسرے ستاروں اور سیاروں کے۔ شمس و قمر کے بعض حسابات ہم یہاں درج کرتے ہیں کہ زمین کے حوالے سے ان کے ان حسابات میں ذرا بھی فرق آئے تو دوررس نتائج نکلیں۔

سورج زمین سے ۵ لاکھ ۹۲ میل دور ہے۔ اگر یہ اس سے قریب تر ہوتا تو زمین جل جاتی اور تمام پانی بخارات میں بدل جاتا اور بخارات فضا میں بلند ہو جاتے اور اگر یہ ذرا اور دور ہوتا تو تمام چیزیں منجمد ہو جاتیں۔ ہم تک سورج کی جو حرارت پہنچتی ہے' وہ اس کی حرارت کے دو ملین حصوں میں سے ایک حصہ پہنچتی ہے اور ہماری موجودہ زندگی کے لئے یہی معمولی حرارت کافی ہے۔ اگر شعریٰ اپنی موجودہ ضخامت اور حرارت کے ساتھ سورج کی جگہ ہوتا تو پورا کرہ ارض جل کر راکھ ہو جاتا اور پانی بخارات بن کر فضا آسمانی میں بکھر جاتا۔

اسی طرح چاند کا حجم اور ہم سے بعد ایک حساب سے رکھا گیا ہے۔ اگر یہ اس سے ذرا بھی بڑا ہوتا تو سمندر کے اندر اس قدر طوفان آتے کہ زمین بار بار ڈوبتی رہتی۔ اسی طرح اگر یہ ہم سے قریب ہو جاتا یعنی جہاں ہے تو بھی زمین پر طوفان مچا دیتا لیکن جہاں اللہ نے اسے رکھ چھوڑا ہے اس سے بال برابر ادھر ادھر نہیں ہوتا۔

سورج اور چاند کی جاذبیت زمین کے لئے ایک مقدار کے ساتھ متعین ہے اور ان کی رفتار کو بھی ایک نہایت ہی مضبوط حساب سے رکھا گیا ہے اور ہمارا یہ پورا کہکشاں اور مجموعہ شمسی بحساب بیس ہزار میل فی گھنٹہ ایک ہی سمت میں چل رہا ہے اور اس راہ میں وہ کسی دوسرے ستارے سے نہیں ٹکرایا اور اس رفتار کے کئی ملین سال ہوگئے ہیں اور فضائے کائنات ختم نہیں ہوئی۔

اس وسیع فضائے آسمانی کے اندر کوئی ستارہ اپنے مدار سے ایک بال برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہوتا اور ان کے درمیان جو توازن اور ہم آہنگی رکھی گئی ہے' اپنے حجم کے لحاظ سے یا حرکت کے لحاظ سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ سچ فرمایا ذات باری نے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (۵۵ : ۵) (سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں)

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (۵۵ : ۶) (تارے اور درخت سب سجدہ ریز ہیں) سابقہ اشارہ یہ تھا کہ اس کائنات کی تخلیق و تشکیل میں ایک مضبوط حساب رکھا ہوا ہے اور یہ اشارہ اسی طرف ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی ذات کے ساتھ مربوط ہے۔ یہ کہ یہ باری تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق چلتی ہے اور اس کی مطیع فرمان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات پوری طرح اللہ کی مطیع فرمان ہے جس طرح بندہ اور غلام مطیع ہوتا ہے اور اس کے لئے خالق نے جو ضوابط رکھے ہیں' ان کو تسلیم کرتی ہے۔ ستارے اور درخت اس بندگی اور اطاعت کا نمونہ ہیں۔ بعض نے ستارے کا یہ مفہوم

لیا ہے کہ اس سے وہ ستارہ مراد ہے جو آسمان میں ہے جبکہ بعض نے شجر سے مراد وہ گھاس لی ہے جو تال پر کھڑی نہ ہو۔ مراد جو بھی ہو' بہرحال آیت کا مفہوم وہی ہے کہ تمام چیزوں کی اطاعت اور بندگی کا رخ اللہ کی طرف ہے۔

غرض یہ کائنات ایک ایسی مخلوق ہے جس کی ایک روح اور اسی روح کی شکلیں اور مظاہر اور درجے مختلف ہوتے ہیں - کسی چیز میں کیسی روح ہے اور کسی میں کسی دوسری نوعیت کی روح لیکن درحقیقت روح کائنات ایک ہی ہے۔

قلب بشری نے روح کائنات کا ادراک بہت پہلے کر لیا تھا اور یہ کہ یہ پوری کائنات اپنی اس روح کے اعتبار سے خالق کی طرف متوجہ ہے - ہر شخص کو بذریعہ الہام لدنی اس حقیقت کا ادراک کرایا گیا تھا لیکن جب انسان نے اس روح کو اپنے حواس سے معلوم کرنے کی سعی کی تو اس حقیقت' اس الہامی حقیقت کو غبار آلود کر دیا گیا اور یہ انسانی نظروں سے اوجھل ہو گئی - جب بھی اس حقیقت کو عقل کے پائے چوبیں سے معلوم کرنے کی سعی کی گئی یہ بھاگ گئی۔

حال ہی میں انسان نے کائنات کی تخلیق میں علامات وحدت کا ایک حصہ تلاش کر لیا ہے لیکن موجودہ مادیت زدہ انسانیت روح کائنات تک نہیں پہنچ سکی جو ایک زندہ روح ہے اور اس تک روحانی انداز ہی میں پہنچنا چاہئے اور پہنچا جا سکتا ہے۔

سائنس دان اپنے کام کا آغاز اس سے کرتے ہیں کہ ذرہ تخلیق کی پہلی اکائی ہے اور وہ صرف شعاع یا نور سے مرکب ہے اور یہ کہ حرکت اصول کائنات ہے اور کائنات کے تمام اجسام اور افراد کے درمیان مابہ الاشتراک حرکت ہے۔

سوال بلکہ سوالات یہ ہیں کہ یہ کائنات حرکت کر کے جا کہاں رہی ہے - یہ تو کائنات کی صفت ہوئی اور خاصیت ہوئی - قرآن کریم یہ اطلاع دیتا ہے کہ یہ کائنات اپنے خالق کی طرف رخ کئے ہوئے ہے اور یہی حقیقی حرکت ہے۔ ظاہری حرکت دراصل روح کائنات کی حرکت کی ایک تعبیر ہے اور قرآن کریم اس روح کائنات کی حرکت کی تعبیر ایسے الفاظ میں کرتا ہے۔

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (۵۵ : ۶) (تارے اور درخت سجدہ ریز ہیں) بعض آیات میں اس کی تعبیریوں کی گئی ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۱۷ : ۴۴) (اس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیز بھی بیان کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں - کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں -) اور دوسری جگہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيْحَهُ (۲۴ : ۴۱) (کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمان اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں - ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے -)

جب انسان اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ پوری کائنات سجدہ ریز ہے اور اللہ کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہے تو

انسانی قلب کو حق تعالیٰ تک پہنچنے کا بہت بڑا زاد راہ ملتا ہے ۔ وہ اپنے ماحول کو زندہ سمجھتا ہے ۔ اس سے محبت کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہمقدم ہو کر اللہ کی طرف فرار اختیار کرتا ہے ۔ یہ سوچ روح کائنات سے یہ ہم نشینی انسان کو اس کائنات کا دوست بنا دیتی ہے ۔

یہ نہایت ہی دور رس اشارہ ہے اور بہت ہی گہرا ہے ۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (۷) اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ (۸) وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (۵۵ : ۹) (آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی ۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو ' انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو) یہاں آسمان کی طرف اشارہ ہے ' قرآن کے دوسرے اشارات کی طرح یہ بھی غافل دلوں کو جگانے کے لئے ہے اور اس کو اس طرف متوجہ کرنا مطلوب ہے کہ آسمان کو رات اور دن تم دیکھتے ہو تم اس کی اہمیت نہ کھو دو ۔ اس پر غور کرو ' اس کی عظمت اس کے جمال اور اس کی صفت میزانیت پر غور کرو کہ اس کے مدار اور رفتار میں بال برابر فرق نہیں آتا اور اس کے ذریعہ قدرت والے کی قدرتوں کو دیکھو ۔

آسمان سے مراد جو بھی ہو ' یہاں حکم دیا جاتا ہے کہ ذرا اوپر کو دیکھو ' تمہارے اوپر ایک ہولناک فضا ہے ۔ بہت بلند بہت دور ' بلا حدود و قیود ' اس فضا کے اندر ہزار ہا ملین عظیم الجثہ اجرام فلکی تیر رہے ہیں ۔ ان میں سے کوئی دو آپس میں نہیں ملتے ۔ ان کا کوئی مجموعہ دوسرے مجموعات سے متصادم نہیں ہوتا ۔ ان مجموعات کی تعداد میں ایک ایک مجموعے کی تعداد بعض اوقات ایک ہزار ملین تاروں تک پہنچ جاتی ہے ۔ ہمارے نظام شمسی کو جس مجموعے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس میں ہمارے سورج جیسے اجرام بھی ہیں اور اس سے ہزار ہا گنا بڑے بھی ہیں ۔ فقط ہمارے سورج کا قطر ۱/۳ ۱ ملین کلو میٹر ہے اور یہ سب ستارے اور یہ سب مجموعے اس کائنات کے اندر نہایت ہی خوفناک تیزی کے ساتھ حرکت پذیر ہیں لیکن یہ سب اس عظیم اور محیر العقول وسیع فضائے کائنات میں اس طرح ہیں جس طرح زمین کی فضا میں ذرات تیر رہے ہیں جو ایک دوسرے سے دور دور چلتے ہیں اور ان کے اندر کوئی تصادم نہیں ہوتا ۔ (اور اگر ہو جائے تو؟)

اللہ نے اس آسمان کو جس طرح بلند کیا ہے اور ہولناک حد تک وسیع کیا ہے اور اس کے لئے ایک فطری میزان تجویز کیا ہے اسی طرح تمہارے لئے بھی ایک میزان حق تجویز کیا ہے ۔ یہ ثابت ' مضبوط اور جما ہوا ہے اور یہ میزان قدروں کی پیمائش اور وزن کے لئے ہے ۔ افراد کی قدر ' واقعات کی قدر ' اشیاء کی قدر تاکہ ہر کسی کا وزن اور قدر متعین ہو جائے اور ان میں خلل واقع نہ ہو اور لوگ جہالت ' عناد اور خواہشات کے مطابق اچھے برے کا فیصلہ نہ کرتے پھریں ۔ اس میزان کو فطرت کے اندر بھی رکھا ہوا ہے اور دعوت اسلامی کے اندر بھی رکھا ہوا ہے جسے تمام رسول لے کر آئے ہیں اور آخر میں یہ قرآن کی شکل میں آیا ہے

اللہ نے میزان قائم کر دیا ہے ۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ :

اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ (۵۵ : ۸) " تم میزان میں خلل نہ ڈالو کمی بیشی نہ کرو اور

وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ "اور انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو" میزان حق حقدار کو دینے اور انصاف کرنے کے لئے قائم ہوتا ہے لہذا نہ حد سے آگے جاؤ نہ پیچھے رہو۔

اس طرح زمین کے اندر موجود حق اور میزان اور انسانوں کی زندگی کے اندر موجود حقوق میں حق تجی ولد رسید کے مطابق اسلامی نظام اور کائنات کے نظام کے درمیان توازن اور ہم آہنگی پیدا ہوگی۔ یوں آسمانوں سے نزول وحی اور آسمانوں کی رفعت اور بلندی دونوں کے درمیان اللہ کا میزان کام کرتا ہے اور یوں یہ دونوں مفہوم انسانی احساس پر سایہ فگن ہوتے ہیں۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵:۱۰) فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ (۵۵:۱۱) وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ (۵۵:۱۲) (زمین کو اس نے مخلوقات کے لئے بنایا۔ اس میں ہر طرح کے بکثرت پھل ہیں' کھجور کے درخت ہیں جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ طرح طرح کے غلے ہیں جن میں بھوسا بھی ہوتا ہے اور دانہ بھی) اس زمین میں بس کر اور رہ رہ کر ہمیں یہ چیزیں نظر نہیں آتیں۔ اس زمین کے حالات و اطوار کو دیکھ کر اور اپنے حالات و احوال کو ہروقت دیکھ دیکھ کر ہم اس کی کوئی چیز انوکھی نہیں پاتے جو دراصل عجوبہ ہوتی ہے اور دست قدرت کی عجب کارستانی ہوتی ہے اور زمین پر جس طرح ہمیں سکون و قرار سے رکھا گیا ہے' اس کی ٹیکنالوجی کا ہمیں پورا شعور نہیں ہوتا اور جس طرح ہمیں یہاں قرار سے رکھا گیا ہے اس کے معنی کو ہم نے سمجھا ہی نہیں ورنہ ہم اللہ کی قدرت اور عظمت کا کچھ تصور کرتے۔ ہاں کبھی کبھی جب آتش فشانی ہوتی ہے یا کوئی شدید زلزلہ آتا ہے تو ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین کانپتی ہے۔ تب ہمیں قدرے اضطراب ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے مطیع ہونے کا مفہوم کیا ہے۔

انسانوں کا تو یہ فریضہ ہے اور ان کے لئے یہ بات شایان شان ہے کہ وہ ہروقت اس بات کو ذرا یاد رکھیں۔ یہ زمین جس کے اوپر وہ چلتے دوڑتے ہیں' اگر اس کی طرف قدرے توجہ کریں تو ان کو نظر آئے کہ یہ تو ایک ذرہ ہے جو اس ہولناک اور محیر العقول وسیع تر فضا میں تیر رہا ہے۔ یہ اس مطلق بے قید' بے حد فضا میں ہے۔ یہ ذرہ خود اپنے گرد بھی ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا ہے اور سورج کے گرد یہ ساٹھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا ہے جبکہ یہ زمین یہ سورج اور اپنے مجموعہ ستارگان جو کئی ملین میں بحساب بیس ہزار میل فی گھنٹہ کسی سمت میں جا رہے ہیں جس کا ہمیں علم نہیں۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ یہ برج جبار کی طرف جا رہے ہیں۔

ہاں اگر انسان اس بات پر غور کریں کہ وہ ایک چھوٹے سے ذرے پر سوار ہیں اور یہ ذرہ اس فضا میں اس تیزی سے دوڑ رہا ہے اور یہ اس فضا میں لٹک رہا ہے اور کوئی ستون اور سہارا نہیں ہے صرف دست قدرت نے اسے یوں رکھا ہوا ہے تو وہ ہروقت اللہ کا خوف اپنے دلوں کے اندر پائیں۔ کانپتے رہیں اور تھرتھراتے رہیں اور صرف اس ذات کی طرف متوجہ ہوں جس نے اسے ایسا رکھا ہوا ہے اور اس نہایت تیز رفتار گھوڑے پر یہ یوں چل پھر رہے ہیں۔

اللہ نے تو اس خوف کے لئے اس میں اسباب حیات مہیا کر دیئے ہیں۔ یہ اس میں کھاتے پیتے ہیں جبکہ یہ انہیں لئے ہوئے اپنے گرد بھی دوڑ رہی ہے اور سورج کے گرد بھی دوڑ رہی ہے اور نظام شمسی کے مجموعے کے ساتھ بھی دوڑ رہی ہے

اور پھر اسی زمین کے اندر اللہ نے ہمارا رزق ' میوے اور فواکہ پیدا کر رکھے ہیں اور کھجور کے اونچے اونچے درخت جن کے پھل غلافوں میں بند ہوتے ہیں ۔

کم اس تھیلے کو کہتے ہیں جن کے اندر سے کھجور کا پھل باہر آتا ہے کس قدر خوبصورت ہوتا ہے وہ اور پھر دوسرے خوشے دار فصل اور دانے جن کے اوپر بھوسہ ہوتا ہے اور اسے ہٹا کر دانے نکال کر انسانوں کے لئے اور بھوسہ مویشیوں کے لئے ہوتا ہے ۔ یہاں ریحان کا ذکر بھی کیا جاتا ہے کہ بعض نباتات خوشبودار ہوتے ہیں اور یہ زمین کے اندر مختلف قسم کے نباتات ہوتے ہیں جو خوشبودار ہوتے ہیں اور ان خوشبودار نباتات میں سے کچھ انسانوں کی خوراک ہیں اور کچھ حیوانوں کی خوراک اور بعض محض خوشبوئیں ہیں جو انسانوں کے لئے متاع حیات ہیں ۔

اللہ کے ان انعامات کے ذکر کے بعد یعنی تعلیم القرآن ' تعلیم البیان 'شمس و قمر کا منظم دوران ' آسمان کی بلندیاں اور آسمانوں کا میزان اور اہل زمین کا میزان اور زمین کا لوگوں کے لئے برقرار رکھنا اور اس کے اندر کے میوہ جات ' پھل اور خوشبوئیں ظاہر و باطن کے لحاظ سے خوبصورت ' ان انعامات و احسانات کو گنوا کر جن و انس دونوں مکلف مخلوقوں کو خطاب کیا جاتا ہے ۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵:۱۳) (پس اے جن و انس اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) یہ سوال شہادت قائم کرنے کے لئے ہے ۔ ورنہ کوئی جن اور انسان فی الواقع اللہ کی نعمتوں کی تکذیب نہیں کر سکتا ۔

---۰۰۰---

جن و انس پر اللہ نے اپنے احسانات اور انعامات اس کائنات کے حوالے سے تو گنوا دیئے ' اب خود اپنی ذات کے حوالے سے کچھ حقائق ۔ ذرا اپنی ذات ہی پر غور کرو :

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ (۵۵:۱۴) وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۵۵:۱۵)فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵:۱۶) ”انسان کو اس نے ٹھیکری جیسے سوکھے سڑے گارے سے بنایا اور جن کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا ۔ پس اے جن و انس 'تم اپنے رب کے کن کن عجائب قدرت کو جھٹلاؤ گے ؟“

پیدا کرنا اور ایجاد کرنا ' اصول نعمت میں سے ہے ۔ وجود اور عدم کے درمیان جو فاصلے ہیں ان کو ان پیمانوں میں سے کسی پیمانے کے ساتھ نہیں ناپا جا سکتا جو انسان کے ادراک میں ہیں ۔ اس لئے کہ انسانوں کی دسترس میں جو پیمانے ہیں یا جن کا ادراک ان کی عقلوں نے کر لیا ہے وہ ایسے پیمانے ہیں جو ایک موجود اور دوسرے موجود کے درمیان فرق کرنے کے پیمانے ہیں ۔ رہی یہ بات کہ موجود اور غیر موجود کے درمیان کیا فرق ہے اور کس قدر فاصلے ہیں ۔ ان کو انسان نہیں جان سکتا ۔ یہی حال جنوں کا بھی ہے ۔ ان کے پیمانے بھی مخلوقات کے پیمانے ہیں ۔

جب اللہ انسانوں اور جنوں کو یاد دلاتا ہے کہ میں تمہیں عدم سے وجود میں لایا ہوں تو یہ ایک ایسی نعمت ہے جو حد ادراک سے ماوراء ہے ۔ اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ انسان کی تخلیق کس مواد سے ہوئی اور جنوں کی تخلیق کس مواد سے ہوئی ۔ انسان کو اللہ نے ۔

صَلْصَال (۵۵ : ۱۴) سے بنایا' صَلْصَال (۵۵ : ۱۴) اس مٹی کو کہتے ہیں جو سوکھ جائے اور جب اس پر ضرب لگائی جائے تو اس سے آواز صلصلہ نکلے ۔ ہو سکتا ہے کہ جس وقت انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا اس کی پیدائش کے مراحل میں سے یہ ایک مرحلہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ انسان کے مادہ تخلیق اور مٹی کے مادہ میں کوئی فرق نہیں ہے ۔

"جدید سائنس نے تو یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جسم انسانی کے اندر وہی مواد ہے جو مٹی کے اندر ہے ۔ انسان کاربن ' آکسیجن ' ہائیڈروجن ' فاسفورس 'گندھک 'کیلشیم ' پوٹاشیم 'سوڈیم کلورائیڈ ' میگنیشیم 'آئرن 'مینگنیز 'تانبے 'لیڈ ' فلورین 'کوبالٹ ' زنک ' سلیکان اور المونیم سے مرکب ہے اور یہی وہ عناصر ہیں جن سے زمین بنی ہوئی ہے ۔ اگرچہ ایک انسان اور انسان کے اندر ان کی نسبت مختلف ہوتی ہے اور انسان اور مٹی کے اندر بھی نسبت کا اختلاف ہے ۔ البتہ عناصر و اصناف ایک ہی ہیں ۔" (اللہ اور سائنس' صفحہ ۲۸۰)

لیکن سائنس نے جو بات کی ہے یہ لازی نہیں ہے کہ آیت کی تفسیر بھی وہی ہو ۔ ہو سکتا ہے کہ قرآن کی مراد یہی ہو جو سائنس نے ثابت کیا ہے یا وہ ہو جو سائنس دانوں کو بھی معلوم نہ ہو اور کچھ اور ہو ۔ یا اس سے دوسرے معنوں میں انسان کو خالی مخلوق کہا گیا ہو اور طین اور صلصال کے کچھ اور ہی معانی مراد ہوں ۔

ہم نے جس چیز کا بڑی شدت سے انتباہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی آیت کو ان مفہومات تک محدود نہیں کرنا چاہئے جو جدید سائنس نے دریافت کئے ہیں کیونکہ انسانی انکشافات صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی ہو سکتے ہیں اور تغیر اور تبدل قبول کرتے ہیں ۔ جوں جوں انسان کے وسائل علم بڑھتے ہیں انسانی نظریات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے ۔ بعض مخلص لوگ قرآنی آیات کو بہت جلد سائنسی مفہومات کے مطابق بنانے کی سعی کرتے ہیں' خواہ یہ مفاہیم تجرباتی ہوں یا فرضی ہوں اور ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ قرآن کا اعجاز ثابت کیا جائے ۔ اس لئے کہ قرآن سائنس کے خلاف ہو یا موافق ہو وہ اپنی جگہ معجزہ ہے ۔ قرآن کے نصوص کا مفہوم بہت ہی وسیع ہے اور اس کو کسی ایک وقت کے انکشافات تک محدود نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ انکشافات ہر وقت اپنے اندر غلطی کا احتمال رکھتے ہیں بلکہ بعض اوقات سرے سے نظریات باطل ہو جاتے ہیں ۔ جدید سائنسی معلومات سے ہم صرف اس قدر استفادہ کر سکتے ہیں کہ ہم ان کے ذریعہ آیات کے مفہوم و مدلول کو اپنے تصور میں وسیع کر دیتے ہیں بشرطیکہ وہ ان مفہومات کی طرف اشارہ کر رہی ہوں جن کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے لیکن کبھی ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ قرآن کا مفہوم وہی ہے جس تک ہمارے انکشافات پہنچ گئے ہیں ۔ جواز اس قدر ضرور ہے کہ ہم کہیں کہ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف قرآن نے بھی اشارہ کیا ہے ۔

رہی یہ بات کہ جنوں کو آگ کی لپٹ سے تخلیق کیا گیا ہے تو یہ مسئلہ انسانوں کے حدود علم سے باہر ہے ۔ جنوں کے صرف وجود کی اطلاع قرآن نے دی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ آگ سے پیدا کئے گئے ہیں ۔ مارج کے معنی آگ کے

شعلوں کی وہ لپٹ ہے جو زبان کی طرح ہوتی ہے اور یہ ہوا سے بنتی ہے اور جن اسی زمین پر انسانوں کے ساتھ رہتے ہیں جن اور ان کی نسل کس طرح رہتی ہے اس کا ہمیں علم نہیں ۔ یقینی بات یہی ہے کہ ان پر لازم ہے کہ وہ قرآن اور شریعت پر عمل کریں جیسا کہ اس سے قبل ہم نے ۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ (اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تیری طرف جنوں کے کچھ افراد کو پھیر دیا اور وہ قرآن سننے لگے) کی تفسیر میں کہا ہے اور جنوں اور انسانوں دونوں کو اس آیت میں خطاب کیا گیا ہے کہ اللہ کی کن کن انعامات کی تم تکذیب کرو گے ۔ دونوں کی اللہ نے تخلیق کی اور تخلیق کرنا اور وجود بخشنا وہ نعمت ہے جس پر تمام نعمتوں کا دارومدار ہے ۔ چنانچہ اس پورے پیراگراف پر یہ شہادت قائم کی جاتی ہے ۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۵ : ۱۶) (پس اے جن و انس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کی تکذیب کرو گے) ان شہادتوں کے قلم بند ہو جانے کے بعد اب تکذیب کا کونسا مقام ہے !

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾
مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾ وَ
لَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾ كُلُّ ع ۲۵ ع
مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾

” دونوں مشرق اور دونوں مغرب ' سب کا مالک و پروردگار وہی ہے ۔ پس اے جن و انس ' تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے ؟ دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے ۔ پس اے جن و انس ' تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے ؟ ان سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں ۔ پس اے جن و انس ' تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے ؟ اور یہ جہاز اسی کے ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے اٹھے ہوئے ہیں ' پس اے جن و انس ' تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھٹلاؤ گے ؟ ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے ۔ پس اے جن و انس ' تم اپنے رب کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے ؟ “

یہ اشارہ انسان کو اللہ کے شعور کے فیض میں غرق کر دیتا ہے جس طرف بھی کوئی توجہ کرے جس طرف بھی التفات

کرے۔ اور جس قدر بھی ہمارا مشاہدہ اس کائنات میں دور تک جاتا ہے جہاں بھی ہم جائیں وہاں مشرق ہیں اور مغرب ہیں۔ اللہ کی ربوبیت ہے۔ اس کی مشیت ہے اور اس کا اقتدار اعلیٰ ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ تیرا نور ہے۔ تیری ہدایت ہے۔

مشرقین اور مغربین یعنی ''مشرق اور مغرب'' ان سے مراد سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے مقامات بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ شمس و قمر کی حیثیت انعام الٰہی پہلے آچکی ہے اور اس سے مراد سورج کے مختلف مقامات طلوع اور غروب بھی ہو سکتے ہیں یعنی جو گرمیوں اور سردیوں میں چلتے رہتے ہیں۔

یہ اشارہ قلب و نظر پر جس طرح سایہ فگن ہے وہ قابل التفات ہے۔ مشرق و مغرب کی طرف متوجہ ہونا' ان مظاہر طلوع اور غروب سے اللہ کی شان پانا' یہ سوچنا کہ دست قدرت ان افلاک کو کس طرح گھما رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نور ربی ان آفاق میں جگہ جگہ موجود ہے۔ مشرق و مغرب کے اس تدبر اور تامل کے بعد قلب و نظر جو سبق ' جو عبرت لے کر لوٹیں گے جو شعور لے کر آئیں گے اس کے فیوض سے ہمارے جسم و روح بھر جائیں گے۔

مشرقین کی ربوبیت اور مغربین کی ربوبیت ' اللہ کے احسانات میں سے ایک اہم احسان ہے۔ مشرقین اور مغربین اللہ کی نشانیاں بھی ہیں اور نعمتیں بھی ہیں کیونکہ طلوع و غروب ہی سے اس زمین پر انسانوں اور جنوں کی زندگی ممکن ہے۔ اگر طلوع و غروب نہ ہوں اور یہ نظام خلل پذیر ہو جائے تو انسان اور جنات کا زندہ رہنا محال ہو جائے۔ اس لئے کہا گیا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۱۸) (تم اپنے رب کے کن کن عجائبات قدرت کو جھٹلاؤ گے)

---()()()---

بالائی کائنات کی وسعتوں سے اب زمین اور اس کے اندر کی انعامات اور احسانات کی طرف ' زمین کے اندر اللہ تعالیٰ نے خشکی اور تری کو ایک اندازے کے مطابق بنایا ہے اور خشکی اور تری میں اللہ نے انسان کے لئے بہت کچھ پیدا کیا ہے۔ ایک مقدار کے مطابق۔

مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ (۱۹) بَیْنَھُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ (۲۰) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۲۱) یَخْرُجُ مِنْھُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (۲۲) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۲۳) وَلَہُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ (۲۴) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۲۵) ع

''دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔ پس اے جن و انس ' تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے؟ ان سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔ پس اے جن و انس ' تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟ اور یہ جہاز اسی کے ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے اٹھے ہوئے ہیں 'پس اے جن و انس ' تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھٹلاؤ گے؟''

یہاں جن دو دریاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ میٹھا سمندر اور کھارا سمندر ہیں ۔ کھارے دریا سے مراد سمندر اور بڑے اور گہرے پانی ہیں اور میٹھے سے مراد چھوٹے دریا ہیں ۔ یہ باہم ملتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے حدود مقررہ سے آگے نہیں بڑھتا ۔ ہر ایک اپنے حدود سے تجاوز نہیں کرتا اور ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے ۔

زمین کے اس کرہ پر پانیوں کی یہ تقسیم اتفاقاً نہیں ہوگئی ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر نے گہرے اور باریک اندازے سے کی رکھی ہے ۔ کڑوا پانی سطح زمین کے ۳/۴ حصہ پر پھیلا ہوا ہے ۔ صرف ۱/۴ خشکی ہے اور یہ خطے ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہیں ۔ اس قدر وسیع نمکین پانی سطح زمین کے لئے بہت ہی ضروری ہے تاکہ وہ زمین کو صاف رکھے اور زندگی کے نشوونما کے لئے وہ قابل رہے ۔

"زمین سے مسلسل گیسیں نکل رہی ہیں ۔ زمانوں سے نکل رہی ہیں اور ان میں سے اکثر زہریلی ہیں لیکن ہوا ان گیسوں سے ملوث نہیں ہوتی ۔ تیز ہوا کے اندر پائے جانے والی وہ نسبت بھی نہیں بدلتی جو انسان کے وجود کے لئے ضروری ہے ۔ اس توازن کو برقرار رکھنے کا ضامن پانی کا وہ عظیم ذخیرہ ہے یعنی سمندر" (۱)

اس عظیم ذخیرہ آب پر جب سورج چمکتا ہے تو اس سے بخارات اٹھتے ہیں اور انہی بخارات سے بادل اور بارشیں بن کر خشکی پر میٹھے پانی کے دریا بہتے ہیں ۔ سمندر ' حرارت شمسی اور اعلیٰ فضا کی سردی اور دوسرے فلکیاتی عوامل مل کر بارش بناتے ہیں اور ان سے میٹھا سمندر بنتا ہے ۔

اس میٹھے پانی ہی پر انسانوں ' حیوانوں اور نباتات کی زندگی موقوف ہے ۔ تمام دریا جاکر سمندروں میں گرتے ہیں اور زمین کا نمک بہاکر یہ سمندر میں لے جاتے ہیں لیکن یہ سمندر کے پانیوں کو خراب نہیں کر سکتے ۔ جتنے بھی دریا ہیں ان کی سطح سمندر کی سطح سے بلند ہوتی ہے ۔ اس لئے سمندر بھی ان دریاؤں پر کوئی دست درازی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ دریا سمندر ہی میں گرتے ہیں ۔ ان دریاؤں کے چلنے کے جو راستے ہیں ان پر نمکین پانی دست درازی نہیں کرتا نہ نمکین پانی ان صاف پانیوں کو اپنے کام سے روک سکتا ہے ۔ دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے لہٰذا دو سمندروں کا ذکر اور ان کے درمیان پردے کا ذکر کوئی قابل تعجب بات نہیں ہے ۔ "پس اے جن و انس تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے ۔"

اس کے بعد سمندروں میں موجود اللہ کے احسانات کا ذکر ' خصوصاً وہ چیزیں جو ان کی عملی زندگی کے قریب تھیں ۔

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (۵۵ : ۲۲) (ان سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں)

موتی (لولو) دراصل حیوان ہے ۔ "سمندر کے اندر جو موتی ہیں وہ سمندروں کی عجیب ترین چیزوں میں سے ہیں ۔ یہ حیوان سیپی میں ہوتا ہے اور یہ سیپی چونے کے مواد سے بنی ہوتی ہے اور یہ سمندروں کی گہری تہوں میں اتر جاتی ہے ۔ یہ سیپی اسے خطرات سے بچاتی ہے ۔ یہ حیوان دوسرے زندہ حیوانوں سے اپنی ساخت اور طریقہ حیات کے لحاظ سے بالکل مختلف ہے ۔ اس کے پاس ایک باریک جال ہوتا ہے جس طرح شکاری کا جال ہوتا ہے ۔ یہ جال نہایت ہی عجیب انداز سے

---

(۱) "انسان اکیلا نہیں ہے" از اے کریسی موریسون ' صدر سائنس اکیڈمی ' نیویارک

بنا ہوا ہوتا ہے ۔ یہ دراصل ایک فلٹر کا کام کرتا ہے جو پانی' ہوا اور غذا کو تو اندر جانے دیتا ہے لیکن ریت 'کنکریوں وغیرہ کو صاف کرتا جاتا ہے ۔ اس جال کے نیچے اس حیوان کے منہ ہوتے ہیں ۔ ہر منہ کے چار ہونٹ ہوتے ہیں ۔ جب کبھی ریت کا کوئی ذرہ یا کوئی کنکر اس کے منہ میں داخل ہو جائے یا کوئی مضر حیوان اس سیپی میں داخل ہو جائے تو یہ حیوان فوراً اس پر ایک مادہ پھینکتا ہے جس سے یہ ریت کنکری یا حیوان ڈھانپ لیا جاتا ہے ۔ اس طرح یہ چیز ایک موتی بن جاتی ہے ۔ ریت کا ذرہ یا کنکر کی مقدار جس قدر بڑی ہوگی اس قدر موتی بڑا ہو گا ۔(۱)

" مرجان (مونگا) بھی اللہ کی مخلوقات میں سے ایک عجیب مخلوق ہے ۔ یہ سمندروں کے اندر تقریباً ۵ ء ۲ میٹر کی گہرائی تک میں رہتا ہے ۔ اس کا نچلا حصہ کسی پتھر یا لکڑی سے چسپاں ہوتا ہے اور اس کا منہ اس کے جسم کے بالائی حصے میں ہوتا ہے ۔ اس کے جسم کے ساتھ کچھ زائد حصے بھی ہوتے ہیں جن کو وہ اپنے شکار اور خوراک میں استعمال کرتا ہے ۔ جب یہ زوائد کسی شکار کو پکڑتے ہیں (یہ شکار اکثر باریک حیوانات پر مشتمل ہوتا ہے ۔ مثلاً پانی کے مچھر) تو شکار فوراً شل ہو جاتا ہے اور یہ مرجان کے ساتھ چمٹ جاتا ہے ۔ یہ زوائد یعنی ہاتھ پاؤں سکڑتے ہیں اور اس شکار کو منہ کی طرف قریب کرتے ہیں اور یہاں سے یہ شکار مرجان کے منہ میں داخل ہوتا ہے ۔ ایک باریک نالی کے ذریعے جس طرح انسان کی خوراک کی نالی کی طرح ہوتی ہے ۔"

" یہ حیوان نسل کشی کے ذریعے بڑھتا ہے ۔ یہ انڈے دیتا ہے ۔ ان انڈوں سے جنین پیدا ہوتے ہیں اور یہ جنین پر پتھروں اور جھاڑیوں سے چپک کر مستقل حیوان کے طور پر بڑھتے ہیں اور یہ گویا ایک مستقل حیوان بن جاتے ہیں ۔"

" خالق کائنات کی قدرتوں کے نشانات میں سے ایک یہ ہے کہ مرجان کا حیوان ایک دوسرے طریقے سے بھی پھیلتا ہے یعنی ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے ذریعہ اور اس کے جو اجزاء اصل سے جدا ہوتے ہیں وہ اصل کے ساتھ ہی مل کر رہتے ہیں ۔ یوں مرجان کا درخت بن جاتا ہے جس کی لمبی لمبی شاخیں ہوتی ہیں اور جوں جوں یہ شاخوں کی شکل اختیار کرتے ہیں یہ شاخیں باریک ہو جاتی ہیں ۔ مرجان جب درخت کی شکل اختیار کرتے ہیں تو اس کی لمبائی ۳۰ سینٹی میٹر تک ہوتی ہے ۔ زندہ مرجانی جانور کئی رنگوں کے ہوتے ہیں ۔ سمندر میں زرد' نارنگی' سرخ' ازرق' بھورے 'لونگ کے رنگ کے ۔"

" سرخ مرجان وہ گول اور مضبوط حصہ ہوتا ہے جو جانور کے مرجانے کے بعد رہتا ہے اور بڑی بڑی چٹانیں ان کی نوآبادیات ہوتی ہیں ۔"

" ان نوآبادیات میں سے مشہور ترین مرجانی پتھروں کا وہ سلسلہ ہے جو عظیم مرجانی پردے کے نام سے مشہور ہے جو شمال مشرقی آسٹریلیا میں واقع ہے اور اس چٹانی سلسلے کی لمبائی ایک ہزار تین سو پچاس میل ہے اور اس کی چوڑائی پچاس میل ہے اور یہ پردہ انہی باریک مرجانی جانوروں کا مرکب ہے ۔(۲)

ان موتیوں اور مونگوں سے وہ زیورات بنائے جاتے ہیں جو نہایت شاندار اور قیمتی ہوتے ہیں ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر احسان رکھتا ہے کہ تم پر میرے یہ یہ احسانات ہیں اور ان کے ذکر کے بعد پھر یاددہانی کا فقرہ دہرایا جاتا ہے ۔

---

(۱) "اللہ اور جدید سائنس" ص ۱۰۵ (۲) "اللہ اور جدید سائنس" ص ۱۰۵

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۲۳) (اے گروہ جن و انس تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

اس کے بعد بات کشتی کی طرف آتی ہے جو سمندروں میں چلتی ہے ۔ یہ کشتی بعض اوقات اتنی بڑی ہوتی ہے جیسے سمندر میں کوئی پہاڑ ہو ۔

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ (۵۵ : ۲۴) (اور یہ جہاز اسی کے ہیں جو سمندروں میں پہاڑوں کی طرح اونچے اٹھے ہوئے ہیں)

اور یہ اونچے اٹھے ہوئے جہاز اللہ سبحانہ تعالیٰ کی قدرت کے نمونے ہیں کیونکہ سمندروں میں یہ اللہ کی قدرت سے چلتے ہیں ۔ کہ سمندروں اور امواج کے تھپیڑوں میں انہیں صرف اللہ ہی حفاظت دیتا ہے ۔ یہ اللہ ہی کی نگرانی اور نگہبانی ہے کہ یہ پانیوں کے اوپر تیرتے رہتے ہیں ۔ یہ جہاز اس وقت بھی اور آج بھی اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے تھے اور ہیں ۔ ان جہازوں نے لوگوں کی ضروریات نقل و حمل میں 'سفر میں' سہولیات کی منتقلی میں اور تجارت اور کمائی میں اس قدر اہم کردار ادا کیا ہے کہ اس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۲۵) ع (پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن احسانات کی تکذیب کرو گے)

اب یہاں اس دکھائی دینے والی کائنات کے صفحات کو لپیٹ دیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے تمام فنا ہونے والی مخلوقات کے صفحات لپیٹ لئے جائیں گے ۔ یہ تمام انسان اور ان کی شکلیں ختم کر دی جائیں گی ۔ صفحہ ہستی کو تمام زندہ مخلوق سے صاف کر دیا جائے گا اور صرف اللہ ذوالجلال و ذوالاکرام کی ذات رہ جائے گی ۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (۲۶) وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (۲۷) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۲۸) "ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے ۔ پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟"

اس آیت کے سایہ میں انسان کی سانس رک جاتی ہے ۔ آواز دھیمی ہو جاتی ہے اور انسان کے اعضا رک جاتے ہیں ۔ پوری کائنات کی ہر زندہ چیز پر سایہ چھا جاتا ہے ۔ ہر قسم کی حرکت بند ہو جاتی ہے ۔ زمین و آسمان کی وسعتوں پر نور ربی چھا جاتا ہے ۔ انسانی نفوس اور انسانی اعضاء پر جلال ربی کا انعکاس ہو جاتا ہے ۔ زمان و مکان میں اللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا اور پوری کائنات پر اللہ کا جلال و وقار چھا جاتا ہے ۔

انسانی تعبیر اس صورت حال کے بیان سے عاجز ہے ۔ قرآن نے جو کچھ کہہ دیا اس پر اضافہ ممکن نہیں ہے ۔ یہ بات فضا پر ایسی خاموشی طاری کر دیتی ہے جس میں خشوع اور ذات باری تعالیٰ کا خوف ہو ' اللہ کی جلالت کا سایہ ہو اور پوری فضا سہمی سہمی ہو ۔ ایسی فضا جس پر فنا طاری ہو ۔ موت کا سکوت ہو ۔ کسی طرف کوئی حرکت نہ ہو ۔ کوئی شور و شغب نہ ہو ۔

حالانکہ ابھی ابھی یہ کائنات زندہ اور متحرک تھی - یہ آیت دائمی بقا کی تصویر کشی ہی کرتی ہے - یہ دائمی بقا کی ایک تصویر انسان کو دیتی ہے حالانکہ انسان دائمی بقا کے تجربے سے واقف نہیں ہے لیکن اس آیت میں اسے نہایت ہی گہری بقا جتائی جاتی ہے - یعنی بقائے ذوالجلال والاکرام -

بقاو دوام اور فنا و سکون کی اس تصویر کشی کے بعد وہی تبصرہ -

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۲۸) "پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن صفات حمیدہ کو جھٹلاؤ گے"

یہ بھی ایک نعمت ہے بلکہ نعمتوں کی اساس ہے کیونکہ تمام نعمتوں کا سرچشمہ ذات باری ہے - تمام مخلوقات اس سے اپنا وجود اور اسباب حیات پاتی ہیں اور یہ اسباب ' ناموس کائنات اور خصائص کائنات کی فراہم کردہ ہیں اور اس طرح انسانی زندگی کے مشن اور قدریں بھی اسی ذات باری کی وضع کردہ ہیں - وہ حی ہے اور باقی ہے اور تمام مخلوقات کا خالق ہے - وہ محافظ ہے لہذا وجود اور نعمات زندگی سب کی سب اس سرچشمہ سے ماخوذ ہیں - اس دنیا کا نظام درست نہیں ہو سکتا جب فنائے دنیا اور بقائے ذوالجلال کی حقیقت کو تسلیم نہ کر لیا جائے -

اللہ کے بقائے دوام اور مخلوق کے فنائے لازم کے تصور سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ تمام مخلوق اللہ کے در پر سوالی ہے اور وہ ذوالجلال دائم اور باقی کسی کا محتاج نہیں ہے - وہ صمد ہے -

یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۰﴾ سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا
تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا
تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾ یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ فَبِاَیِّ
اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾

"زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں سب اپنی حاجتیں اسی سے مانگ رہے ہیں - ہر آن وہ نئی شان میں ہے - پس اے جن و انس ' تم اپنے رب کی کن کن صفات حمیدہ کو جھٹلاؤ گے ؟ اے زمین کے بوجھو ' عنقریب ہم تم سے بازپرس کرنے کے لئے فارغ ہوئے جاتے ہیں - (پھر دیکھ لیں گے کہ) تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھٹلاتے ہو - اے گروہ جن و انس اگر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو - نہیں بھاگ سکتے - اس کے لئے بڑا زور چاہئے - اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے ؟ (بھاگنے کی کوشش کرو گے تو) تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ

دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے - اے جن و انس 'تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کا انکار کرو گے ؟"

زمین اور آسمانوں میں جو مخلوقات ہیں وہ اس بقائے دوام کے سوالی ہیں کیونکہ سوال کی جگہ ہی وہ ہے - اس کے سوا دوسری کوئی درگاہ نہیں ہے اور اس کے سوا کسی سے کوئی سوال اس لئے عبث ہے کہ غیر خود محتاج ہے محتاج محتاج کی کیا مدد کر سکتا ہے - ...

اللہ تعالیٰ کی ہر آن کئی شان ہے - یہ وجود جو لا محدود ہے - سب کا سب اس کی مشیت 'اس کی تصویر اور اس کی تدبیر سے چل رہا ہے - یہ تدبیر پوری کائنات میں رواں دواں ہے اور ہر فرد علیحدہ علیحدہ بھی اس تقدیر اور مشیت میں پر دیا ہوا ہے - پھر انسانی فرد کے اندر اس کا ایک ایک رواں بھی اس تقدیر کے دائرہ میں مقدر ہے - ہر چیز کو اللہ تخلیق عطا کرتا ہے - اسے اس کا مقصد تخلیق دیتا ہے اور پھر وہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنا فریضہ ادا کر رہی ہے یا نہیں -

یہ تقدیر ہر آنے والے پودے اور گرنے والے پتے کا پیچھا کرتی ہے - زمین کی تاریکیوں میں دور کہیں کوئی دانہ پڑا ہے تو وہ بھی مقدر ہے - خشک و یابس 'سمندر اور ان کی مچھلیاں 'کیڑے اور ان کے سوراخ 'حشرات اور ان کے ٹھکانے یہ تمام جانور ان کے مقامات رہائش غاروں میں 'گھونسلوں میں ' ہر انڈا اور ہر چوزہ اور ہر پر اور ہر پر کا ایک ایک ریشہ اور ہر جسم کا ہر خلیہ مقدر ہے -

اور صاحب تدبیر کسی ایک ہی کے اندر مصروف نہیں ہوتا اور نہ ایک کی تدبیر دوسرے سے غافل کر لیتی ہے - وہ بیک وقت سب کا مدبر ہے اور ان ہی حالات میں زمین کے معاملات جس میں جن و انس بھی ہیں کہ ہر وقت اس کی تم پر نظر ہے اور یہ بہت بڑی نعمت ہے - تقدیر بھی ایک نعمت ہے -

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۳۲) "پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"

فنا کے بعد بقا اور تمام مخلوقات کا واحد باقی کی طرف رخ کرنا 'تمام انسانوں کے معاملات کا اس کے نظام قضا و قدر کے اندر منضبط ہونے کے مسائل طے کرنے کے ساتھ ہی اس کائنات کی نعمتوں کا بیان ختم ہوتا ہے اور جن و انس کے سامنے اللہ کے انعامات و احسانات رکھنے اور گنوانے اور ثابت کرنے کے بعد اب ان کو ایک شدید دھمکی دی جاتی ہے - یہ نہایت ہی ہولناک اور خوفناک دھمکی اور ڈراوا ہے - یہ خوفناک دھمکی بطور تمہید دی گئی - اس کے بعد قیامت کے جو مناظر آرہے ہیں وہ بہت زیادہ ہولناک ہیں -

سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ (۳۱) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۳۲) یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۳۳) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۳۴) یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ (۳۵) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵ : ۳۶) (۵۵ : ۳۱ تا ۳۶) "اے زمین کے بوجھو 'عنقریب ہم تم سے باز پرس

کرنے کے لئے فارغ ہوئے جاتے ہیں۔ (پھر دیکھ لیں گے کہ) تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھٹلاتے ہو۔اے گروہ جن و انس اگر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔ نہیں بھاگ سکتے۔اس کے لئے بڑا زور چاہئے۔اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے؟ (بھاگنے کی کوشش کرو گے تو) تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے۔اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کا انکار کرو گے؟"

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ (۵۵: ۳۱) (اے زمین کے بوجھو، عنقریب ہم تم سے باز پرس کرنے کے لئے فارغ ہو جائیں گے) یہ کس قدر ہولناک دھمکی ہے! کوئی انس اور جن اس کے مقابلے میں کیا ٹھہرے گا۔ اس دھمکی کے مقابلے میں تو پہاڑ اور چٹانیں بھی نہیں ٹھہر سکتیں۔نہ ستارے اور افلاک ٹھہر سکتے ہیں!

اللہ جل جلالہ، القوی القادر، القہار والجبار، بزرگ و برتر، دھمکی دے رہا ہے کہ میں تم سے حساب و کتاب لینے والا ہوں اور یہ کس کو انسان اور جن جیسی ضعیف و ناتواں مخلوق کو اور دھمکی نہایت ہی غضب اور انتقام کے انداز میں ہے۔

یہ ایک بہت بڑا معاملہ ہے۔یہ تصور اور احتمالات سے بھی زیادہ خوفناک ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے مشغول نہیں۔ انسانی محاورے میں بات ہو رہی ہے۔اس دھمکی کو اس طرح مزید خوفناک بنا دیا گیا ہے۔ صرف تصور ہی سے وجود نابود ہو جاتا ہے کیونکہ انسانی وجود تو اس ہی کلمہ سے پردۂ عدم سے وجود میں آیا کن فیکون ہو گیا اور ہلاک و برباد اور نیست و نابود کرنا تو پلک جھپکنے سے بھی کم وقت لگتا ہے۔اگر احساس ہو تو جن و انس کی حالت کیا ہوگی۔جب ذوالجلال والاکرام ان کو یہ دھمکی دے رہا ہے غضب و انتقام کی دھمکی!

اس ہولناک دھمکی میں بھی سوال وہی ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۵: ۳۲) (پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن احسانات کا انکار کرو گے؟)

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۵۵: ۳۳) (اے گروہ جن و انس، اگر تم زمین اور آسمان کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو، نہیں بھاگ سکتے۔اس لئے کہ اس کے لئے بڑا زور چاہئے) کس طرح تم نکل سکتے ہو؟ کہاں سے تم بھاگ سکتے ہو؟ اس کے لئے تو بڑی قوت چاہئے اور قوت اللہ کے پاس ہے اور پھر وہی سوال۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۵: ۳۴) "پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"

آخر ان کے پاس کیا چیز رہ گئی ہے کہ وہ جھٹلائیں! محض زبانی کلامی بات سے کیا بنتا ہے؟

لیکن تباہ کن حملہ جاری ہے۔مزید دھمکی آرہی ہے اور تباہی والا انجام ان کے سامنے ہے۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ (۵۵ : ۳۵) ”تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے“ اگر تم نے نکلنے کی کوشش کی بھی تو تمہاری کوشش ناکام ہوگی۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۵ : ۳۶) ”پس اے جن و انس تم اپنے رب کے کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“ یہ خوف و ہراس کا وہ منظر ہے جس کا تصور انسان کر ہی نہیں سکتا۔ ہر مخلوق کے لئے یہ ناقابل برداشت ہے۔ خوف و ہراس کی ایسی چند ہی مثالیں ہیں جو صرف قرآن نے دی ہیں۔ یہ انسانی تصور سے بالا ہیں۔ اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم۔

قرآن نے ایک جگہ کہا۔ فَذَرْنِيْ وَ الْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ (چھوڑ دو مجھے اور ان کھاتے پیتے جھٹلانے والوں کو) دوسری جگہ ذَرْنِيْ وَ مَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ”چھوڑ دو مجھے اور جسے میں نے اکیلا پیدا کیا تھا“ اور یہ آیت۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ (۵۵ : ۳۱) ”اے جن و انس، تم زمین کا بوجھ بن چکے ہو، ذرا مجھے فارغ ہو لینے دو“ اس قسم کی خوفناک دھمکیاں انسانی تصور سے بالا ہیں۔

اب یہاں سے سورۃ کے آخر تک قیامت کے مناظر ہیں کہ قیامت سے پہلے اس کائناتی نظام میں کیا کیا انقلاب آ جائے گا۔ پھر حساب و کتاب کس طرح ہو گا اور پھر جزاء و سزا کیسی ہوگی۔

ان مناظر کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس سورۃ کے آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور ان باتوں سے جو کائنات کے بارے میں اس سورۃ میں کی گئی ہیں۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَ
الْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا
۲ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾ ع ۲۰
۱۲

”پھر (کیا بنے گا اس وقت) جب آسمان پھٹے گا اور اے جن و انس (اس وقت) تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے؟ اس روز کسی انسان اور کسی جن سے اس کا گناہ پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی، پھر (دیکھ لیا جائے گا کہ) تم دونوں گروہ اپنے رب کے کن کن احسانات کا انکار کرتے ہو۔ مجرم وہاں اپنے چہروں سے پہچان لئے جائیں گے اور انہیں پیشانی کے بال اور پاؤں پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔ اس وقت تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔ اس وقت کہا جائے گا یہ وہی جہنم ہے جس کو مجرمین جھوٹ قرار دیا کرتے تھے۔ اسی جہنم اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان وہ گردش کرتے رہیں

گے ۔ پھر اپنے رب کے کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے ؟"

وَرْدَةً یعنی سرخ تیل کی طرح یعنی بہہ جائے گا ۔ قیامت کے دن سے قبل کائنات میں ہونے والے تغیر کے بارے میں جس قدر آیات آئی ہیں ان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ افلاک کے موجودہ نظام میں مکمل ابتری آجائے گی اور نظام سماوات پر تمام کرے موجودہ نظام کی گرفت سے چھوٹ جائیں گے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور مثلاً ۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (٤) وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (٥) فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا

(٦) (٥٦: ٤ تا ٦) (زمین اس وقت یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار رہ جائیں گے) اور انہی آیات میں سے یہ بھی ہے ۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (٧) وَخَسَفَ الْقَمَرُ (٨) وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (٩)

(٧٥: ٧ تا ٩) (پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند اور سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے) اور انہی میں سے ۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (١) وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (٢) وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (٣) وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (٤) وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (٥) وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (٦) وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (٧) وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ (٨)

(٨١: ١ تا ٨) "جب سورج لپیٹ لیا جائے گا' جب تارے بکھر جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے" اور اسی طرح ہے ۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (١) وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (٢) وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ (٣)

(٨٢: ١ تا ٣) "جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے ۔"

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (١) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (٢) وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ (٣) وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ (٤) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ (٥) (٨٤: ١ تا ٥) (جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور اس کے لئے حق یہی ہے اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور

جو کچھ اس کے اندر ہے اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی) یہ اور دوسری سب آیات اس عظیم حادثے کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جو اس کائنات میں واقع ہو گا اور اس کی حقیقت صرف اللہ ہی جانتا ہے اور اس آیت کی مراد بھی یہی ہے۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (۵۵:۳۷) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۵:۳۸) "پھر جب آسمان پھٹے گا اور سرخ ہو گا اور تیل کی طرح بہہ نکلے گا تو اے جن وانس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔

---ooo---

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ (۳۹) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۴۰) (۵۵: ۳۹ — ۴۰) "اس روز کسی انسان اور کسی جن سے اس کا گناہ پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی' پھر (دیکھ لیا جائے گا کہ) تم دونوں گروہ اپنے رب کے کن کن احسانات کا انکار کرتے ہو۔"

قیامت کے مقامات میں سے یہ بھی ایک مقام ہو گا اور اس میں مختلف مقامات ہوں گے۔ بعض جگہ بندوں سے ان کے کام کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔ بعض مقامات میں کسی سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہوگی۔ بعض جگہ مجرم اپنے بارے میں جھگڑ رہے ہوں گے اور اپنے کرتوتوں کی ذمہ داری شرکاء پر ڈالیں گے۔ بعض مقامات ایسے ہوں گے کہ وہاں بولنے کی کوئی اجازت نہ ہوگی۔ نہ جھگڑنے کی اجازت ہوگی۔ قیامت کا دن طویل ہو گا اور اس میں طرح طرح کے موقف ہوں گے۔

ایک موقف یہ ہو گا کہ اس میں کسی سے کچھ بات نہ پوچھی جائے گی جبکہ لوگوں کی صفات اور اعمال بالکل واضح ہوں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہوں گے اور طے ہو گا کہ جہنمی ہے اور بعض کے چہرے سفید ہوں گے اور طے ہو گا کہ گرین چینل والا ہے اور یہ صفات ان کے چہروں اور حالات سے عیاں ہوں گی۔ کیا اس وقف کا کوئی انکار کر سکتا ہے۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَ الْاَقْدَامِ (۴۱) فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۴۲) (۵۵: ۴۱ — ۴۲) "مجرم وہاں اپنے چہروں سے پہچان لئے جائیں گے اور انہیں پیشانی کے بال اور پاؤں پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔ اس وقت تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے"۔

یہ ایک سخت منظر ہے اور توہین آمیز بھی کہ جب ماتھوں اور پیشانی کے بالوں سے اور پاؤں سے پکڑ کر کھینچے جائیں گے یعنی ماتھے اور پاؤں اکٹھے ہوں گے اور اس حالت میں جہنم رسید۔ کیا ایسے حالات میں تکذیب ہوگی۔

یہ منظر پیش نظر ہے۔ لوگوں کو پاؤں اور سر کے بالوں سے پکڑ پکڑ کر جہنم میں پھینکا جا رہا ہے اور جو لوگ اس منظر کو دیکھ رہے ہیں وہ بھی گویا جہنم کے کنارے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔ ان سے بھی کہا جاتا ہے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ (۵۵ : ۴۳) ”اس وقت کہا جائے گا یہ وہی جہنم ہے جس کو مجرمین جھوٹ قرار دیا کرتے تھے۔“ یہ سب تمہاری نظروں کے سامنے ’تم دیکھ رہے ہو۔

یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ (۵۵ : ۴۴) ”اسی جہنم اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان وہ گردش کرتے رہیں گے۔“ اب یہ مجرم جہنم اور انتہائی کھولتے گرم پانی کے درمیان گردش کر رہے ہیں دیکھ لو ان کو۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۵ : ۴۵) ”پھر اپنے رب کے کن کن قدرتوں کو تم جھٹلاؤ گے؟“
یہ تو تھی صورت عذاب جہنم کی اور اب ذرا جنتیوں کا ذکر بھی ہو جائے۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾ ذَوَاتَاۤ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِیْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّكِـِٕیْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَ جَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾

”اور ہر اس شخص کے لئے جو اپنے رب کے حضور پیش ہونے کا خوف رکھتا ہو’ دو باغ ہیں ’اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور’ اپنے رب کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں دو چشمے رواں ’اپنے رب کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں ’اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ جنتی لوگ ایسے فرشوں پر تکئے لگا کے بیٹھیں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے اور باغوں کی ڈالیں پھلوں سے جھکی پڑ رہی ہوں گی۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ان نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جنہیں ان جنتیوں سے پہلے کبھی کسی انسان یا جن نے نہ چھوا ہو گا۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ایسی خوبصورت جیسے ہیرے اور موتی ’اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟“

قرآن کی جس قدر سورتیں اب تک گزری ہیں ان میں پہلی بار دو باغوں کا ذکر ہے اور یہ دو باغ بھی جنت کے اندر ہی ہوں گے جو بہت ہی وسیع اور بڑی جگہ ہو گی لیکن یہاں دو باغوں کا خصوصی ذکر محض ان کے عالیشان ہونے کے ناطے سے

ہے ۔ سورۃ واقعہ میں یہ بات آنے والی ہے کہ اہل جنت کے دو فریق ہوں گے ۔ پہلے السابقون المقربون ہوں گے اور اصحاب الیمین ہوں گے ۔ دونوں فریقوں کے لئے نعمتیں ہوں گی ۔ یہ دو باغ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو اعلیٰ مرتبے کے لوگوں کے لئے ہوں گے اور یہ وہی لوگ ہیں جن کو السابقون الاولون کہا گیا ہے اور ان دو باغات سے کم درجے کے بھی دو اور باغ ہوں گے اور یہ باغ شاید السابقون اولون کے بعد کے لوگوں کے لئے ہوں گے اور یہ شاید اصحاب الیمین میں سے ہوں گے ۔ بہرحال ہمیں ان دو باغوں کی طرف دیکھنا چاہئے اور ان میں کچھ دیر کے لئے رہنا چاہئے ۔

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ (۴۸) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۴۹) فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ (۵۰) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۱) فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ (۵۲) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۳) مُتَّکِـِٕیْنَ عَلٰی فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ (۵۴) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵) (۵۵: ۴۸ تا ۵۵)

”ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور ' اپنے رب کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے ؟ دونوں باغوں میں دو چشمے رواں ' اپنے رب کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے ؟ دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں ' اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے ؟ جنتی لوگ ایسے فرشوں پر تکئے لگا کے بیٹھیں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے اور باغوں کی ڈالیں پھلوں سے جھکی پڑ رہی ہوں گی ۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے ؟“

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ (۵۵: ۴۸) (ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور) افنان ' افنان ' چھوٹی ڈالیاں ' تازہ ' نرم اور سرسبز و شاداب 'عینان تجریان (دو باغوں میں دو چشمے رواں) پانی بہت زیادہ اور بڑی سہولت سے لیا جا سکتا ہے ۔

فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ (۵۵: ۵۲) (دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں) یعنی متنوع اور بدل اقسام کے پھل ' وافر مقدار میں ۔ اہل جنت کس حال میں ہوں گے ۔

مُتَّکِـِٕیْنَ عَلٰی فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ (۵۵: ۵۴) ”جنتی لوگ ایسے فرشوں پر تکئے لگائے بیٹھے ہوں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے“ استبرق ریشمی مخمل جو دبیز ہو گا ۔ اگر ان کے استر ایسے ہوں گے تو ان کے ظاہری غلاف تو نہایت ہی خوبصورت ہوں گے ۔

وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ (۵۵: ۵۴) ”اور باغوں کی ڈالیں پھلوں سے جھکی پڑ رہی ہوں گی“ یعنی اگر کوئی پھل توڑنا چاہے تو اسے کسی مشقت کا سامنا کرنا نہ ہو گا ۔

لیکن انہی باتوں پر جنت کی نعمتیں ختم نہیں ہوتیں بلکہ اس سے بھی لطیف تر انعامات ہوں گے :

فِیهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ (۵۶) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۷) كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ (۵۸) فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۹) (۵۵: ۵۶ تا ۵۹) "ان نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جنہیں ان جنتیوں سے پہلے کبھی کسی انسان یا جن نے نہ چھوا ہو گا۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ایسی خوبصورت جیسے ہیرے اور موتی، اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟"

قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ (۵۵: ۵۶) "شرمیلی نگاہوں والیاں" پاکیزہ شعور رکھنے والیاں ہوں گی۔ ان کی نظریں جھکی ہوں گی اور وہ اپنے مالکوں کے سوا کسی اور کی طرف دیکھنے والیاں نہ ہوں گی۔

لَمْ یَطْمِثْهُنَّ (۵۵: ۵۶) "ان کو چھوا نہ ہو گا" نہ انسان نے نہ جن نے۔

كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَ الْمَرْجَانُ (۵۵: ۵۸) "ہیرے اور موتی کی طرح خوبصورت" چمکدار اور نرم و نازک۔

یہ ہے جزاء ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب کے مقام اور مرتبے سے ڈرتے تھے اور جنہوں نے اس کی عبادت اس طرح کی جیسا کہ گویا رب کو دیکھ رہے ہوں اور اس شعور کے ساتھ کہ وہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ یوں وہ مرتبہ احسان تک پہنچ گئے جس طرح رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس طرح وہ اپنی جزا از جانب رحمان پا گئے۔

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿٦٠﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿٦١﴾ وَ مِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿٦٢﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٣﴾ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿٦٤﴾
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٥﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿٦٦﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٧﴾ فِیْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ﴿٦٨﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٩﴾
فِیْهِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿٧٠﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧١﴾ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی
الْخِیَامِ ﴿٧٢﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٣﴾ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿٧٤﴾
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٥﴾ مُتَّكِـِٔیْنَ عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِیٍّ حِسَانٍ ﴿٧٦﴾

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾ تَبٰرَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ﴿۷۸﴾ ع ۱۳

"نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ پھر اے جن و انس اپنے رب کے کن کن اوصاف حمیدہ کا تم انکار کرو گے؟ اور ان دو باغوں کے علاوہ دو باغ اور ہوں گے۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ گھنے سرسبز و شاداب باغ۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں دو چشمے فواروں کی طرح ابلتے ہوئے، اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ان میں بکثرت پھل اور کھجوریں اور انار، اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ان نعمتوں کے درمیان خوب سیرت اور خوبصورت بیویاں، اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ خیموں میں ٹھیرائی ہوئی حوریں، اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ ان جنتیوں سے پہلے کبھی کسی انسان یا جن نے ان کو نہ چھوا ہو گا۔ اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟ وہ جنتی سبز قالینوں اور نفیس و نادر فرشوں پر تکیے لگا کے بیٹھیں گے، اپنے رب کے کن کن انعامات کو تم جھٹلاؤ گے؟"

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (۵۵ : ۶۰) "نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے" انعام اور احسان کی اس نمائش گاہ کے ہر فقرے کے بعد یہ تعقیب آتی تھی "اے جن و انس اللہ کے کن کن احسانات کا تم انکار کرو گے" یہ احسان کا بدلہ احسان سے تھا۔

اب دوسرا فریق جس کو دو باغ ملیں گے۔

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ (۵۵ : ۶۲) "اور ان دو باغوں کے علاوہ دو باغ اور ہوں گے" اور ان کے اوصاف سابقہ باغوں سے ذرا کم ہوں گے۔ یہ دو باغ۔

مُدْهَآمَّتٰنِ (۵۵ : ۶۴) "گھنے، سرسبز اور شاداب باغ" یعنی ایسے سبز جو سیاہی مائل ہوں گے کیونکہ وہ گھنے ہوں گے۔

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ (۵۵ : ۶۶) "ان میں دو چشمے فواروں کی طرح ابلتے ہوں گے" یعنی پانی کو اوپر کی طرف پھینک رہے ہوں گے۔ چشمے سے پانی ابلنا جاری پانی سے ذرا کم درجے کا ہوتا ہے۔

فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ (۵۵ : ۶۸) "ان میں بکثرت پھل اور کھجوریں اور انار ہوں گے" اور مزید

فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ (۵۵ : ۵۲) "ہر پھل کا جوڑا ہو گا" جس طرح پہلے کہا گیا۔

فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ (۵۵ : ۷۰) "ان میں خوب سیرت اور خوبصورت پریاں ہوں گی"۔

خیرت اور خیرات دونوں سے مراد اچھی سیرت ہے۔

حُوۡرٌ مَّقۡصُوۡرٰتٌ فِی الۡخِیَامِ (۵۵ : ۷۲) "خیموں میں ٹھہرائی ہوئی حوریں ہوں گی۔" خیموں میں رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بدوی لوگوں کو ان کے ذوق بداوت کے مطابق سہولتیں ہوں گی۔ مقصورات کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ شرمیلی اور نظریں جھکانے والیاں ہوں گی یا وہاں ٹھہرائی ہوئی ہوں گی۔

لَمۡ یَطۡمِثۡہُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَہُمۡ وَ لَا جَآنٌّ (۵۵ : ۷۴) "ان جنتیوں سے پہلے بھی کسی انسان یا جن نے ان کو نہ چھوا ہو گا۔"

اور ان جنتوں کے لوگ تو ان کے حالات یوں ہوں گے۔

مُتَّکِـِٕیۡنَ عَلٰی رَفۡرَفٍ خُضۡرٍ وَّ عَبۡقَرِیٍّ حِسَانٍ (۵۵ : ۷۶) "وہ جنتی سبز قالینوں اور نفیس اور نادر فرشوں پر تکئے لگائے بیٹھیں گے۔"

رَفۡرَف فرش عبقری عبقر کے بنے ہوئے، مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو خصوصاً عربوں کے قریب الفہم کرنے کے لئے۔ عبقر جنوں کی وادی کو کہتے ہیں اور ہر عجیب چیز کو وہ عبقری کہتے تھے لیکن پہلے باغ والوں کے تکیوں کا استر استبرق کے بنے ہوئے تھے۔ لہٰذا پہلے دو باغوں والوں دوسرے دو باغوں والوں کے رتبے میں فرق ہو گا اور ان تمام صفات و کمالات کے بعد یہ فقرے "اے انس و جن تم اپنے رب کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے؟"

---ooo---

اس کائنات میں اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ اور مخلوقات میں اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ اور آخرت میں اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ اس سورۃ کا موضوع تھا۔ اب اس کے آخر میں آخری سبق اور آخری نتیجہ کہ اللہ کی تسبیح کرو، اللہ کی برکتوں کا اعتراف کرو کہ وہی ہے جو ہر زندہ کو موت دیتا ہے اور وہی اکیلا قائم رہے گا۔

تَبٰرَکَ اسۡمُ رَبِّکَ ذِی الۡجَلٰلِ وَ الۡاِکۡرَامِ (۵۵ : ۷۸) "بڑی برکت والا ہے تیرے رب جلیل و کریم کا نام۔"

سورۃ رحمٰن کا یہ بہترین خاتمہ ہے۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ۔۔ ۲۷

سورۃ الواقعۃ ۔ ۵٦

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۹٦

سورۃ الواقعہ ایک نظر میں

واقعہ سورۃ کا نام بھی ہے اور اس سورۃ کا موضوع بھی ہے ۔ اس مکی سورۃ کا مرکزی مضمون اور محور ہی بعث بعد الموت ہے ۔ قرآن کی تکذیب کرنے والے اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے اس میں شک کرتے ہوئے یہ کہتے تھے ۔

اَءِ ذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (٤٧:٥٦) اَوَ اٰبَآءُ نَا الْاَوَّلُوْنَ (٤٨:٥٦) "کیا جب ہم مرگئے اور مٹی ہوگئے اور ہڈیاں ہوگئے کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور ہمارے پہلے اباء بھی ۔"

یہی وجہ ہے کہ سورۃ کا آغاز ہی صفت قیامت سے ہوتا ہے اور اس کی صفت ایسے لفظ سے بیان کی گئی ہے جو ہر قسم کی بات کو ختم کر دیتا ہے اور ہر قسم کے شک کو ختم کر دیتا ہے اور اس کے اندر مستحکم یقین پیدا کر دیتا ہے ۔ قرآن اسے (الواقعہ) کہتا ہے ۔

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (١:٥٦) لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (٢:٥٦) "جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آئے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہوگا ۔"

پھر اس دن کے واقعات ایسے بیان کئے جاتے ہیں جو اسے تمام دوسرے دنوں سے ممتاز کر دیتے ہیں ۔ جہاں لوگوں کی قدریں بدل جائیں گی ۔ حالات زمین بدل جائیں گے اور ہولناکیاں اس زمین کی شکل ہی بدل دیں گی ۔ جس طرح قدریں بدل جائیں گی اسی طرح زمین بھی بدل جائے گی ۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (٣:٥٦) اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (٤:٥٦) وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (٥:٥٦) فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا (٦:٥٦) وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً (٧:٥٦) "وہ تہ و بالا کر دینے والی آفت ہوگی ۔ زمین اس وقت یکبارگی ہلا ماری جائے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے ۔ تم لوگ اس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے ۔"

اس کے بعد ان تین گروہوں کی تفصیلات ہیں یعنی السابقون الاولون 'اصحاب المیمنہ اور اصحاب المشئمہ ۔ اور ان تینوں کا جو انجام ہوگا وہ بڑی تفصیل سے دیا گیا ہے ۔ احساس میں یہ بات اس طرح بیٹھ جاتی ہے کہ گویا یہ واقعہ ہوگیا ہے ۔ اس میں اب شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور یہ ہیں اس واقعہ کی تفصیلات جو تمہارے سامنے بیان ہو رہی ہیں ۔

مکذبین جس چیز کی تکذیب کر رہے تھے اسے انہوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا اور اپنا انجام بھی اور اہل ایمان کا انجام

وہاں عذاب الیم کی تفصیلات دینے کے بعد ان کے بارے میں یہ اعلان ہو گا۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ(٤٥)وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ(٤٦)وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اَىِٕذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ(٤٧)اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ(٤٨) (٥٦: ٤٥ تا ٤٨) "یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس انجام کو پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔ کہتے تھے "کیا جب ہم مرکر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائے گا تو پھر اٹھا کھڑے کئے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں۔" اس وقت تو عذاب حاضر ہو گا اور یہ دنیا قصہ پارینہ ہوگی۔ وہاں ان کی یہ تلخ یادیں ان کو زیادہ ذلیل کرنے کے لئے یاد کرائی جائیں گی اور یہ بتایا جائے گا کہ تم نے دنیا میں یہ ذلت اختیار کر رکھی تھی کہ تم محض خوشحالی کی وجہ سے تکذیب پر اصرار کر رہے تھے۔

اس کے ساتھ ہی سورۃ کا پہلا دور ختم ہوتا ہے اور دوسرا دور اسلامی نظریہ حیات کے متعلق ہے اور اس میں زیادہ زور عقیدہ حشر و نشر پر ہے کیونکہ اس سورۃ کا اصل موضوع ہی قیامت ہے۔ یہ دوسرا موضوع نہایت ہی موثر انداز میں ہے اور اس دوسرے دور کا مواد بھی ایسی چیزوں سے لیا گیا ہے جو لوگوں کے زیر مشاہدہ تھیں۔ ایسے مشاہدات اور تجربات جن سے ہر انسان گزرتا ہے۔ چاہے وہ جس سوسائٹی اور جس سطح کا ہے اور علمی اعتبار سے اس کا جو درجہ بھی ہے' مثلاً ان کی پیدائش کا نظام ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ منی کے ایک ایسے قطرے کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں جو رحم مادر میں گرتا ہے پھر ان کی موت اور ان کی جگہ دوسروں کی پیدائش اور اس سے یہ استدلال کہ اسی طرح تمہیں دوسری بار پیدا کیا جائے گا اور یہ دوسری پیدائش بھی اسی طرح ہوگی جس طرح پہلی پیدائش ہوتی ہے۔

پھر ان کے مشاہدے کے لئے کھیتی باڑی کے مشاہدات پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی زندگی کی ایک تصویر ہے اور نباتات کی تخلیق' اللہ کی قدرتوں میں سے ایک اہم نمونہ ہے۔ اگر اللہ نہ چاہتا تو نہ یہ نباتات پیدا ہوتے اور نہ ان کے اندر دانے پیدا ہوتے۔

پھر وہ میٹھا پانی جس کے ذریعے پوری زندگی انسانوں' حیوانوں اور نباتات کی پروان چڑھتی ہے۔ یہ پانی اللہ کے حکم اور اللہ کی قدرت پر موقوف ہے۔ اگر اللہ نہ چاہے تو بادلوں سے یہ پانی برسے ہی نہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو اسے کھاری بنا دیتا' نہ اس سے نباتات اگتے اور نہ یہ زندگی کے لئے مفید ہوتا۔

پھر ذرا آگ کو دیکھو' جسے تم جلاتے ہو' اس کی ذرا اصلیت پر نگاہ ڈالو۔ یہ درختوں کے ذریعے جلتی ہے اور اس آگ کو دیکھ لو یہی ہے نمونہ نار جہنم۔

یہ تمام مشاہدات انسانوں کے روز مرہ مشاہدات ہیں لیکن انسان ان پر غور نہیں کرتا۔ قرآن کریم ان کے بارے میں انسان کے احساسات جگاتا ہے۔

اس دور میں مسئلہ قرآن اور کلام الہٰی بھی زیر بحث لایا جاتا ہے۔ جو اس واقعہ کا بیان کر رہا ہے اور ڈرا رہا ہے۔

چنانچہ مقامات ستارہ گان کی قسم کھا کر کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم ایک عظیم امر ہے' یہ ایک نہایت بلند پایہ کتاب ہے اور اس کو وہی لوگ چھو سکتے ہیں جو پاک ہوں اور یہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے۔

اس کے بعد ایک نہایت ہی حساس مشاہدہ ان کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ یہ نہایت ہی جذباتی مشاہدہ ہوتا ہے۔ انسانی روح حلق تک آپہنچتی ہے اور تمہارا کوئی محبوب اس دنیا کے اس کنارے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے تمام محبان ہاتھ بندھے ہوئے بے بس اس کے اردگرد کھڑے ہوتے ہیں۔ کچھ کرنے سے لاچار ہوتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ اس کے جسم میں کیا ہو رہا ہے اور تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اس کی جان کنی ہوتی ہے اور وہ اگلے سفر کے بارے میں دیکھ رہا ہوتا ہے لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اشارہ بھی نہیں کر سکتا۔

سورۃ کا خاتمہ ایک سچی خبر سے ہوتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی تسبیح کرو۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ (۹۵) فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (۵۶ : ۹۶) "یہ سب کچھ قطعی حق ہے' پس اے نبی' اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔" یوں سورۃ کا آغاز اور انجام ایک ہو جاتا ہے۔

---○○○---

درس نمبر ۲۵۵ تشریح آیات

۱ ـــ تا ـــ ۹٦

سُورَةُ الْوَاقِعَةِ مَكِّيَّةٌ (۵٦) آيَاتُهَا ۹٦ رُكُوعَاتُهَا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿١﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿٢﴾ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ﴿٣﴾ إِذَا رُجَّتِ
الْأَرْضُ رَجًّا ﴿٤﴾ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴿٥﴾ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا ﴿٦﴾ وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا
ثَلٰثَةً ﴿٧﴾ فَأَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ مَا أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿٨﴾ وَأَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ مَا
أَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿٩﴾ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴿١٠﴾ أُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿١١﴾ فِيْ جَنّٰتِ
النَّعِيْمِ ﴿١٢﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِيْنَ ﴿١٣﴾ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٤﴾ عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ﴿١٥﴾
مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿١٦﴾ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿١٧﴾ بِأَكْوَابٍ وَّ
أَبَارِيْقَ وَكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿١٨﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴿١٩﴾ وَفَاكِهَةٍ
مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٢١﴾ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴿٢٢﴾ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ
الْمَكْنُوْنِ ﴿٢٣﴾ جَزَاءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٤﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيْمًا ﴿٢٥﴾
إِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿٢٦﴾

”جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آ جائے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہوگا۔ وہ تہ و بالا کر دینے والی آفت ہوگی ۔ زمین اس وقت یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے ۔ تم لوگ اس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے ' دائیں بازو والے ' سو دائیں بازو والوں (کی خوش

کا کیا کہنا اور بائیں بازو والے ' تو بائیں بازو والوں (کی بد نصیبی) کا کیا ٹھکانا اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں ۔ وہی تو مقرب لوگ ہیں ۔ نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے ۔ اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے کم ۔ مرصع تختوں پر تکئے لگائے آمنے سامنے بیٹھیں گے ۔ ان کی مجلسوں میں ابدی لڑکے شراب چشمہ جاری سے لبریز پیالے اور کنٹر اور ساغر لئے دوڑتے پھرتے ہوں گے ۔ نہ ان کو اس سے جدا کیا جائے گا اور نہ وہ ختم ہو گا اور وہ ان کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چن لیں اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں اور ان کے لئے خوبصورت آنکھوں والی حوریں ہوں گی ' ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی ۔ یہ سب کچھ ان اعمال کی جزا کے طور پر انہیں ملے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے ۔ وہاں وہ کوئی بے ہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سنیں گے ۔ جو بات بھی ہو گی ٹھیک ٹھیک ہو گی ۔"

اس پیراگراف میں ایک نہایت ہی اہم بات ایک خوفناک انداز میں بیان کی گئی ہے اور یہ اسلوب ارادۃً اختیار کیا گیا ہے ۔ عبارت کے الفاظ اور مفہوم کے درمیان پوری طرح ہم آہنگی اور یکجہتی ہے ۔ دو بار بات کا آغاز اذا شرطیہ سے ہوتا ہے دونوں بار شرط ہے اور جواب شرط نہیں ہے ۔ مثلاً ۔

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (١) لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (٢) خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (٣) (٥٦ : ١ تا ٣) "جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہو گا ' وہ تہہ و بالا کر دینے والی آفت ہو گی ۔" یہاں یہ نہیں بتایا جاتا کہ جب یہ واقعہ ہو گا جو سچا ہو گا اور تہہ و بالا کر دینے والا ہو گا لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ پھر اس وقت کیا ہو گا ۔ ایک دوسری بات شروع کر دی جاتی ہے کہ ۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (٤) وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (٥) فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا (٦) (٥٦ : ٤ تا ٦) "اور جب زمین یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے ۔" اور دوبارہ یہ نہیں بتایا جاتا کہ جب یہ ہولناک واقعہ پیش ہو گا تو پھر کیا ہو گا ۔ یہ خوفناک صورتحال ایک مقدمہ ہے ۔ آغاز ہے اور انجام کا ذکر ہی نہیں کیا جاتا کیونکہ نتائج اس قدر ہولناک ہوں گے کہ الفاظ میں اس کا بیان ممکن نہیں ہے ۔

پھر اس وقوعہ اور اس بوجھ کا پریشر ہو گا تو انسانی احساس کے اندر ارتعاش اور تزلزل پیدا ہونا متوقع ہو گا اور سیاق کلام میں اس توقع کو عملی شکل عطا کرتا ہے ۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (٥٦ : ٣) "یہ واقعہ تہہ و بالا کرنے والا ہو گا" یہ بعض ان قدروں کو بلند کر دے گا جو دنیا میں گری ہوئی سمجھی جاتی تھیں اور ان کو نیست کر دے گا جو یہاں بلند تھیں کیونکہ یہ زمین تو دارالفناء تھی ۔ جہاں اقدار اور پیمانوں کا اصل حقیقی نظام و مقام کو خلل پذیر ہو جاتا ہے اور پھر اللہ کے پیمانوں کے مطابق وہاں درست ہو گا ۔

اس کے بعد اس زمین کے اندر ایک خوفناک بھونچال ہو گا ۔ زمین کو لوگ زمین مساکن اور رکی ہوئی سمجھتے ہیں یہ زمین

پوری کی پوری ہلا دی جائے گی۔ اس عظیم واقعہ کو ایسے انداز میں بیان کیا گیا کہ احساسات میں اس کی جو شکل ہے تعبیر بھی ویسی ہے۔ زمین کی اس بھرپور حرکت کے بعد اب مضبوط اور اونچے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر اڑ رہے ہیں اور یہ ریزے اور ذرے فضائے کائنات میں بکھر رہے ہیں۔

وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (۵) فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا (۶) (۵۶: ۵ تا ۶) "اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے۔"

اس خوف کا کیا عالم ہو گا کہ زمین مسلسل ہل رہی ہوگی اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور غبار کے ذرات کی طرح فضائے آسمان میں بکھر جائیں گے۔ کتنے ہی جاہل ہیں وہ لوگ جو اپنے آپ کو اس خطرے سے دوچار کرتے ہیں۔ اس طرح کہ وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ زمین اور پہاڑوں کا یہ حشر ہو گا تو انسان کیا کر سکیں گے۔

---ooo---

سورۃ کا آغاز اس خوفناک فضا میں ہوتا ہے۔ انسانی احساس و شعور پر ڈر چھا جاتا ہے۔ یہ ہو گا وہ عظیم واقعہ جس کا کافر انکار کرتے ہیں۔ مشرکین اسے جھٹلاتے ہیں۔ یہ ہے اس سورۃ کا پہلا منظر جس میں زمین متزلزل، پہاڑ ریزہ ریزہ اور تمام چیزوں کو زیر و زبر کر دیا جائے گا۔

وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً (۷) فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ (۸) وَاَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ (۹) وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (۱۰) (۵۶: ۷ تا ۱۰)

"تم لوگ اس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے ' دائیں بازو والے ' سو دائیں بازو والوں (کی خوش نصیبی) کا کیا کہنا اور بائیں بازو والے ' تو بائیں بازو والوں (کی بد نصیبی) کا کیا ٹھکانا اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں۔"

قیامت میں لوگوں کے تین گروہ ہوں گے۔ قرآن مجید کے دوسرے مشاہد میں لوگوں کے دو ہی اقسام اور گروہ بتائے گئے ہیں لیکن یہاں تین درجے بتائے گئے ہیں۔ پہلے دائیں بازو والے ان کو اصحاب المیمنہ کہا گیا ہے اور ان کے بارے میں محض سوال کر دیا گیا۔ یہ محض ان کی گرانقدری کے لئے۔

فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ (۵۶: ۸) "دائیں بازو والے 'کیا عظیم ہیں وہ دائیں بازو والے"۔ اسی انداز میں دوسرے گروہ بائیں بازو والوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد تیسرے فریق السابقون کا ذکر ہے اور ان السابقون کو ان کی صفات سے ذکر کیا جاتا ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (۵۶: ۱۰) "آگے والے تو پھر آگے ہی والے ہیں۔" جس طرح کہا جاتا کہ وہ تو وہ 'فلاں تو فلاں ہیں' بس ان کا نام لینا ہی ان کے مرتبہ و مقام کا اظہار کر دیتا ہے۔

اس کے بعد پھر ان کی جی بھر کر تعریف کی جاتی ہے کہ ان کے لئے عالم بالا میں کیا کیا تیاریاں کی گئی ہیں۔ اگرچہ جنت

کی تیاریوں کا تصور بھی نہیں ہو سکتا لیکن اہل زمین کے تجربے کے مطابق کچھ یوں ہیں۔

أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ (١١) فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ (١٢) ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ (١٣) وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ (١٤) عَلَىٰ سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ (١٥) مُّتَّكِئِينَ عَلَيْهَا مُتَقَابِلِينَ (١٦) يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ (١٧) بِأَكْوَابٍ وَأَبَارِيقَ وَكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ (١٨) لَّا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنزِفُونَ (١٩) وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ (٢٠) وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ (٢١) وَحُورٌ عِينٌ (٢٢) كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ (٢٣) جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (٢٤) لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا (٢٥) إِلَّا قِيلًا سَلَامًا

سَلَامًا (٢٦) (٥٦: ١١ تا ٢٦) "وہی تو مقرب لوگ ہیں۔ نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے۔ اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے کم۔ مرصع تختوں پر تکئے لگائے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ ان کی مجلسوں میں ابدی لڑکے شراب چشمہ جاری سے لبریز پیالے اور کنٹر اور ساغر لئے دوڑتے پھرتے ہوں گے۔ نہ ان کو اس سے جدا کیا جائے گا اور نہ وہ ختم ہو گا اور وہ ان کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چن لیں اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں اور ان کے لئے خوبصورت آنکھوں والی حوریں ہوں گی' ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔ یہ سب کچھ ان اعمال کی جزا کے طور پر انہیں ملے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ وہاں وہ کوئی بے ہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سنیں گے۔ جو بات بھی ہوگی ٹھیک ہوگی۔"

ان پر جو انعامات الہیہ ہوں گی ان میں سے بڑی نعمت کے ذکر سے آغاز ہوتا ہے جو سب سے زیادہ نمایاں اور بلند ہے۔ رب تعالیٰ کے قرب کی نعمت۔

أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ (٥٦: ١١) فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ (٥٦: ١٢) "وہی تو مقرب لوگ' نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے۔" اور اللہ کا قرب تو وہ اعزاز ہے جس کے مقابلے میں تمام جنتیں ہیچ ہیں۔ یہ تو بہت ہی قیمتی نصیبہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ ہیں کون۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ (٥٦: ١٣) وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ (٥٦: ١٤) "اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے کم۔" یہ محدود تعداد کے لوگ ہوں گے۔ نہایت پاک لوگ' اگلوں میں سے یہ زیادہ ہوں گے۔ روایات میں اختلاف ہے کہ یہ لوگ کون ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ وہ ایمان کی طرف پہلے لپکنے والے عالی مقام لوگ ہیں جو

اسلام سے پہلے کی امتوں میں سے کسی نبی کی دعوت پر پہلے آئے اور آخرین وہ ہوں گے جو اسلام کی طرف پہلے لپکے اور جنہوں نے اسلام کی راہ میں آزمائش برداشت کیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اولین اور آخرین امت محمدیہ میں سے ہیں۔ پس اولین صدر اول کے لوگ ہیں اور آخرین بعد کے ادوار میں آنے والے لوگ ہیں۔ اس قول کو علامہ ابن کثیر نے ترجیح دی ہے۔ حسن اور ابن سیرین سے بھی اس کی ترجیح کے سلسلے میں روایات نقل کی ہیں۔ ابو حاتم نے روایت کی ہے 'حسن ابن محمد ابن صباح سے انہوں نے عفان سے انہوں نے عبداللہ ابن بکر المزنی سے 'کہ میں نے سنا کہ حسن جب اس آیت۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (۱۰) اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ (۵۶ : ۱۱) "اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں وہی تو مقرب لوگ ہیں" تلاوت کی تو انہوں نے کہا کہ سابقون تو اس جہاں سے چلے گئے 'اے اللہ ہمیں اصحاب الیمین سے بنا دے۔ اس کے بعد انہوں نے روایت کی 'اپنے والد سے 'انہوں نے ابوالولید سے 'انہوں نے السری ابن یحیٰ سے 'کہ حسن نے پڑھا۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (۱۰) اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ (۱۱) ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ (۵۶ : ۱۳) تو انہوں نے فرمایا زیادہ تر وہ لوگ جو اس دنیا سے چلے گئے ہیں اور روایت کی میرے سامنے میرے والد نے 'عبدالعزیز سے 'انہوں نے ابن مغیرہ المنقری سے 'انہوں نے ابوہلال سے 'انہوں نے محمد ابن سیرین سے کہ انہوں نے آیت۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ (۱۳) وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ (۵۶ : ۱۴) "اگلوں سے بہت اور پچھلوں سے قلیل" وہ کہتے تھے (یا یہ امید رکھتے تھے) کہ وہ سب اس امت سے ہوں گے۔

یہ تفصیلات دینے کے بعد کہ یہ لوگ کون ہوں گے 'اب ان نعمتوں کی تفصیلات دی جا رہی ہیں جو جنتوں میں ان کے لئے تیار ہیں اور اللہ نے ان کو اس شکل میں دیا ہے جس میں یہ سوچ بھی سکیں اور سمجھ بھی سکیں اور لطف اندوز بھی ہو سکیں اور ان نعمتوں کے علاوہ وہاں اور نعمتیں بھی ہوں گی جن کے ادراک اور استعمال کے لئے اس وقت وہ تیار ہوں گے اور وہ ایسی نعمتیں ہیں جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھیں 'کسی کان نے نہیں سنیں اور کسی انسان کے دل میں ان کا تصور ہی نہیں آیا۔

عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ (۵۶ : ۱۵) "مرصع تختوں پر" جن کے اندر نہایت ہی قیمتی موتی اور دھاتیں لگی ہوں گی۔

مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ (۵۶ : ۱۶) "تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔" نہایت آرام سے اور بے فکری سے۔ کوئی غم نہیں 'کوئی مشکل نہیں 'نعمتوں میں ڈوبے ہوئے نہایت اطمینان سے۔ ان نعمتوں کے چلے جانے اور ختم ہو جانے کا تو کوئی خوف نہیں اور ایک دوسرے کے آمنے سامنے محو گفتگو ہوں گے۔

یَطُوْفُ عَلَیْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (۵٦:۱۷) "ان کی مجلس میں "ابدی لڑکے" دوڑتے پھریں گے ۔" زمانہ ان کی صحت پر اثر انداز نہ ہوگا' ان کی جوانی اور نہ ان کی تروتازگی پر اثر انداز ہوگا جبکہ زمین پر مرور زمانہ کے ساتھ لڑکپن چلا جاتا تھا۔ اور یہ کیا لئے ہوئے پھریں گے؟

بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِیْقَ وَ كَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ (۵٦:۱۸) "شراب چشمہ جاری سے لبریز پیالے اور کنڑ اور ساغر لئے" اور یہ صاف شراب ہوگی۔

لَّا یُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا یُنْزِفُوْنَ (۵٦:۱۹) "جسے نہ ان سے جدا کیا جائے گا اور نہ وہ ختم ہوگی۔" یعنی نہ ان کو اس سے جدا کیا جائے گا اور نہ وہ ان کے سامنے ختم ہوگی کیونکہ وہاں تو ہر چیز دوام کے لئے ہے اور کسی چیز کے ختم ہونے کا خطرہ نہیں ہے۔

وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوْنَ (۲۰) وَلَحْمِ طَیْرٍ مِّمَّا یَشْتَهُوْنَ (۵٦:۲۱) "اور وہ ان کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے جسے چاہیں چن لیں اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے جس پرندے کا چاہیں۔" وہاں تو کوئی چیز نہ ممنوع ہوگی اور نہ کوئی ایسی چیز وہاں ہوگی جسے اہل جنت پسند نہ کریں۔

وَحُوْرٌ عِیْنٌ (۲۲) كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ (۵٦:۲۳) "اور ان کے لئے خوبصورت آنکھوں والی حوریں ہوں گی' ایسی حسین جیسے چھپاکر رکھے ہوئے موتی۔" چھپے ہوئے موتی جن کو سنبھال کر رکھا جاتا ہے بوجہ قیمتی ہونے کے نہ ان کو چھوا جاتا ہے اور نہ ان پر نظر لگتی ہے۔ اس لئے نہ کسی ہاتھ نے ان کو استعمال کیا اور نہ آنکھ نے دیکھا اور ان کھلی آنکھوں والی حوروں کی اس تعریف میں حسی اور معنوی اشارات ہیں اور یہ سب انعامات کیوں دیئے جارہے ہیں۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۵٦:۲۴) "یہ سب کچھ ان اعمال کی جزا کے طور پر انہیں ملے گا جو دنیا میں کرتے رہے تھے۔" یہ بدلہ ہے اس عمل کا جو انہوں نے دارالعمل میں کیا۔ ایسا بدلہ جو نہایت ہی پورا ہے۔ کمال درجے کا ہے اور اس میں وہ تمام کمیاں پوری کردی گئی ہیں جو دارالفنا میں تھیں اور اس کے بعد وہ نہایت آرام اور سکون سے وہاں رہیں گے۔ نہایت بلندی اور پاکیزگی میں۔ کوئی لغو بات وہاں نہ ہوگی۔ کوئی بدل اور مواخذہ نہ ہوگا۔

لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا (۵٦:۲۵) "وہاں کوئی بے ہودہ کلام یا گناہ کی بات وہ نہ سنیں گے جو بات بھی ہوگی ٹھیک ٹھیک ہوگی۔" ان کی پوری زندگی سلامتی ہوگی۔ ہر طرف سے ان پر سلام کی شبنم آئے گی۔ سلام ہی سلام ہوگا۔ اس خوبصورت ماحول میں ملائکہ کی طرف سے سلامت مبارک ہوگی اور پھر رحمان کی طرف سے سلام ہوگا۔ لہذا پوری فضا سلام ہی سلام ہوگی۔

اس برگزیدہ فریق کی بات یہاں ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد اصحاب الیمین۔

وَ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿۲۷﴾ فِيْ سِدْرٍ
مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۲۹﴾ وَّ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿۳۰﴾ وَّ مَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿۳۱﴾ وَّ فَاكِهَةٍ
كَثِيْرَةٍ ﴿۳۲﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿۳۳﴾ وَّ فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿۳۴﴾ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ ۱
اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿۳۶﴾ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿۳۷﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۳۸﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ ع ۲۸
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ ۱۴
فِيْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِيْمٍ ﴿۴۲﴾ وَّ ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿۴۳﴾ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا كَرِيْمٍ ﴿۴۴﴾ اِنَّهُمْ
كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَ كَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴿۴۶﴾ وَ كَانُوْا
يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۴۷﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۴۸﴾
قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ
اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾ فَمَالِـُٔوْنَ
مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿۵۴﴾ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿۵۵﴾
هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۵۶﴾

"اور دائیں بازو والے ' دائیں بازو والوں (کی خوش نصیبی) کا کیا کہنا۔ وہ بے خار بیریوں اور تہ بر تہ چڑھے ہوئے کیلوں اور دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور ہر دم رواں پانی اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں اور اونچی نشست گاہوں میں ہوں گے۔ ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دیں گے ' اپنے شوہروں کی عاشق اور عمر میں ہم سن ' یہ کچھ دائیں بازو والوں کے لئے ہے۔ وہ اگلوں میں سے بھی بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے بھی بہت۔ اور بائیں بازو والے ' بائیں بازو والوں (کی بد نصیبی) کا کیا پوچھنا ' وہ لو کی لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے دھوئیں کے سائے میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہو گا نہ آرام دہ۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس انجام کو پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔ کہتے تھے "کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کئے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے

جو پہلے گزر چکے ہیں؟" اے نبیؐ ان لوگوں سے کہو' یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کئے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے۔ پھر اے گمراہو اور جھٹلانے والو' تم زقوم کے درخت کی غذا کھانے والے ہو۔ اسی سے تم پیٹ بھرو گے اور اوپر سے کھولتا ہوا پانی تونس لگے ہوئے اونٹ کی طرح پیو گے۔ یہ ہے (ان بائیں بازو والوں) کی ضیافت کا سامان روز جزا میں"۔

اور دائیں بازو والے وہ ہیں جن کی طرف سورۃ کے آغاز میں اشارہ ہوا تھا۔ میمنہ والے۔ ان کی تواضعات کی تفصیلات ذرا موخر کر دی گئیں کیونکہ پہلے سابقین اولین کی مراعات کا ذکر مطلوب تھا۔ ان کے بارے میں وہی مبالغہ اور اظہار عظمت بذریعہ اجمال ما اصحاب الیمین (کیا ہی لوگ ہیں وہ)

ان لوگوں کے لئے بھی مادی اور محسوس انعامات' یہ وہ چیزیں ہیں جو کسی بدوی معاشرے میں اہم ہوتی ہیں اور ان کے لئے قابل فہم ہوتی ہیں۔ جن کو وہ سمجھتے اور برتتے ہیں۔

یہ لوگ فی سدر مخضود (بے خار بیریوں میں ہوں گے) السدر بیری کے درخت کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کانٹے ہوں گے لیکن وہاں اس کو کانٹوں سے صاف کر دیا گیا ہو گا یعنی مخضود ہوں گے وہ درخت۔

وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ (٥٦ : ٢٩) "تہ بر تہ چڑھے ہوئے کیلوں" طلح حجاز کے درختوں میں سے ایک درخت ہے۔ [1]

کانٹے دار اور بڑا لیکن یہ درخت یہاں منضود ہے یعنی مرتب ہے یا کھانے کے لئے تیار ہے بغیر مشقت کے کھایا جا سکتا ہے۔

وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (٣٠) وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ (٥٦ : ٣١) "اور دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور ہر دم رواں پانی۔" بدوی لوگوں کے لئے یہ اہم سہولیات ہیں۔ ایک دیہاتی کے خواہشات کی دوڑ یہی تھی۔

وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ (٥٦ : ٣٢) لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ (٥٦ : ٣٣) "اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک پھل۔" ان کو مجمل چھوڑ دیا گیا اور سابقہ انواع کی طرح متعین نہیں کیا گیا۔ جو اہل بادیہ کے ہاں مرغوب تھیں۔

وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ (٥٦ : ٣٤) "اونچی نشست گاہیں۔" یہاں ان کی نرمی اور ان کی ترتیب کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ یہاں صرف یہ ہے کہ اونچی نشست گاہیں۔

اونچے کے دو معنی ہوتے ہیں' مادی اور معنوی' دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم ہیں۔ اونچا مکان ہو تو وہ پاک

---

(۱) طلح کے معنی ببول' کیکر اور کیلا تینوں آتے ہیں۔ مولانا مودودی" کا ترجمہ منضود کے ساتھ زیادہ مناسب ہے جس کے معنی تہ بر تہ اور ترتیب کئے ہوئے ہیں یا ڈھیر کے ہوتے ہیں۔

بھی ہوگا اور وہاں گندگی نہ جمع ہوگی اور معنوی رفعت بھی ناپاکی سے دوری ہے ۔ اونچی نشست گاہوں میں پھر بیٹھا ہوا کون ہے؟ اس لئے یہاں بیویوں کا ذکر ہوتا ہے ۔

اِنَّآ اَنْشَاْنٰھُنَّ اِنْشَآءً (۵۶ : ۳۵) "ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر پیدا کریں گے ۔" اگر ابتداء انہیں پیدا کیا گیا تو وہ حوریں ہیں اور اگر انہیں نئے سرے سے پیدا کیا گیا ہے تو یہ وہ بیویاں ہیں جو دنیا میں تھیں اور اب جوان بنا کر اٹھائی گئی ہیں ۔

فَجَعَلْنٰھُنَّ اَبْكَارًا (۵۶ : ۳۶) "اور ان کو باکرہ بنا دیں گے ۔" یعنی ان کو کسی انسان نے چھوا تک نہ ہوگا ۔ عربا (شوہروں پر عاشق) شوہروں کے ساتھ محبت کرنے والیاں ۔ اترابا (عمر میں ہم سن) برابر درجے کی ۔ بحساب ماہ و سال اور بحساب شباب اور قوت 'لاصحاب الیمین (یہ کچھ دائیں بازو والوں کے لئے ہے) یعنی یہ تمام چیزیں ان کے لئے مخصوص ہیں تاکہ وہ ان کے اونچے فرشوں کے ساتھ مناسب ہوں اور یہ اصحاب الیمین کون ہیں ۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ (۳۹) وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ (۵۶ : ۴۰) "وہ اگلوں میں سے بھی بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے بھی بہت ہوں گے ۔" ان کی تعداد السابقین للاولین سے زیادہ ہوگی جو مقربین ہوں گے اور یہ اس اعتبار سے جو ہم نے اولین اور آخرین کا بیان کیا ہے ۔

---ooo---

اب یہاں بات اصحاب الشمال تک آجاتی ہے ۔ اس سے پہلے سورۃ کے آغاز میں ان کو اصحاب المشئمۃ کہا گیا ہے ۔

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ (۴۱) فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ (۴۲) وَّ
ظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ (۴۳) لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِیْمٍ (۴۴) اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِیْنَ
(۴۵) وَكَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِیْمِ (۴۶) وَكَانُوْا یَقُوْلُوْنَ اَئِذَا مِتْنَا
وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (۴۷) اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (۴۸) قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ
وَالْاٰخِرِیْنَ (۴۹) لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۵۰) ثُمَّ اِنَّكُمْ اَیُّهَا
الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ (۵۱) لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ (۵۲) فَمَالِــُٔوْنَ مِنْهَا
الْبُطُوْنَ (۵۳) فَشٰرِبُوْنَ عَلَیْهِ مِنَ الْحَمِیْمِ (۵۴) فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِیْمِ (۵۵)
هٰذَا نُزُلُهُمْ یَوْمَ الدِّیْنِ (۵۶) (۵۶ : ۴۱ تا ۵۶) "اور بائیں بازو والے ' بائیں بازو والوں (کی

کا کیا پوچھنا' وہ لو کی لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے دھوئیں کے سائے میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہو گا نہ آرام دہ۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس انجام کو پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔ کہتے تھے "کیا جب ہم مرکر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کئے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں؟" اے نبی' ان لوگوں سے کہو' یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کئے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے پھر اے گمراہو اور جھٹلانے والو' تم زقوم کے درخت کی غذا کھانے والے ہو۔ اسی سے تم پیٹ بھرو گے اور اوپر سے کھولتا ہوا پانی تونس لگے ہوئے اونٹ کی طرح پیو گے۔ یہ ہے (ان بائیں بازو والوں) کی ضیافت کا سامان روز جزا میں۔"

وَاَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ (۵۶ : ۲۷) لمبی چھاؤں میں اور بہتے ہوئے پانیوں کے پاس تھے... وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ (۴۱) فِیْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِیْمٍ (۴۲) وَّ ظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ (۴۳) لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ (۴۴) (۵۶ : ۴۱ تا ۴۴) وہ لو کی لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے دھوئیں کے سائے میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہو گا اور نہ آرام دہ۔ ہوا ایسی گرم ہوگی جس طرح آگ کے شعلے۔ وہ مساموں میں پہنچ کر جسم کو بھون ڈالے گی اور پانی اس قدر گرم ہو گا کہ وہ ٹھنڈک نہیں پہنچائے گا اور نہ پیاس بجھائیگا سایہ ہو گا مگر وہ دھویں کا سایہ ہو گا جس سے گلا گھٹ جائے گا اور اسے سایہ محض بطور مزاح کیا گیا ہے۔ سایہ نہ ٹھنڈا ہو گا اور نہ آرام دہ ہو گا۔ یہ تو گرم سایہ ہو گا اس میں آرام اور ٹھنڈک نہ ہوگی۔ وہ اس قدر سخت ہو گا کہ اس سے گلا گھٹ جائے گا۔ آرام تو دور کی بات ہے اور یہ تان جو ہیں ان کے لئے ٹھیک سزا ہے کیونکہ۔

اِنَّھُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُتْرَفِیْنَ (۵۶ : ۴۵) "یہ لوگ اس انجام کے پہنچنے سے پہلے سخت خوشحال تھے۔" مترفین کے لئے یہ خشک روٹی کس قدر تکلیف دہ ہوگی۔

وَکَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلَی الْحِنْثِ الْعَظِیْمِ (۵۶ : ۴۶) "اور یہ گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔" الحنث کے معنی ہیں الذنب یہاں مراد شرک ہے۔ اس میں اشارہ ہے اس حلف کی طرف جو اللہ نے انسانی فطرت سے لیا تھا کہ وہ اللہ وحدہ پر ایمان لائیں گے اب انہوں نے اس عہد کو توڑ لیا اور حانث ہو گئے۔

وَکَانُوْا یَقُوْلُوْنَ اَئِذَا مِتْنَا وَکُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (۴۷) اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (۵۶ : ۴۸) "اور کہتے تھے کیا جب ہم مرکر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائے گا تو پھر اٹھا کھڑے کئے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے جو گزر چکے ہیں۔" یہ لوگ یوں تھے۔ گویا یہ دنیا اب نہیں ہے۔ یہ لوگ میدان حشر میں کھڑے ہیں۔ دنیا ماضی پارینہ ہے اور یہ اب وہاں عذاب کے سامنے کھڑے ہیں۔

یہ اس لئے کہ دنیا کا تو ایک مختصر وقت ہے ۔ اتنا ہی جتنا پلک جھپکنے کا وقت لگتا ہے ۔ اصل وقت ' حاضر وقت تو آخرت کا وقت ہے جہاں دوام ہے ۔

سیاق کلام اب پھر ہمیں دنیا میں لاتا ہے کہ ان کے سوال کا جواب دیا جائے ۔

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ (۴۹) لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۵۶ : ۵۰) "اے نبی ان سے کہو یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع ہونے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے ۔"

اس کے بعد اب سیاق کلام دوبارہ ان کی طرف مڑ جاتا ہے جو مکذبین تھے اور بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے عذاب کی تصویر کیا ہے ۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ (۵۱) لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ (۵۶ : ۵۲) "پھر اے گمراہو اور جھٹلانے والو ' تم زقوم کے درخت کی غذا کھانے والے ہو ۔" اور زقوم کے درخت کے بارے میں انسان صرف اسی قدر جانتے ہیں جس قدر اللہ نے قرآن میں بتایا ہے کہ اس کا پھل اس طرح ہے جس طرح شیطان کا سر اور شیطان کا سر تو کسی نے دیکھا نہیں ہے لیکن احساس کے اندر جو بری صورت کی سری ہو سکتی ہے وہ شیطان کا سر ہے اور اس طرح یہ پھل بھی ۔ لفظ زقوم کا تلفظ بھی یہ بتاتا ہے کہ وہ کرخت کانٹے دار قسم کی کوئی بدصورت اور بدذائقہ چیز ہو کہ ہاتھوں میں لیتے ہی کانٹے چبھ جائیں گے ۔ حلق کو زخمی کر دے گا اور یہ ہے بمقابلہ ان بیریوں کے جن کے کانٹے صاف ہیں اور ان کیلوں کے جو تہ بر تہ میزوں پر رکھے ہوئے ہیں ۔ اور باوجود اس کے کہ وہ رؤس شیاطین کی طرح ہوں گے ۔ یہ اس کو کھائیں گے ۔

فَمَالِئُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ (۵۶ : ۵۳) "اسی سے تم پیٹ بھرو گے ۔" اس لئے کہ بھوک سخت مجبور کرنے والی چیز ہے اور مجبوری سب کچھ کراتی ہے اور یہ کرخت کانٹے دار خوراک پھر مجبور کرتی ہے کہ پانی استعمال کرو کہ نیچے اترے اور پیٹوں کو بھرے اور پانی ۔

فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ (۵۶ : ۵۴) "اوپر سے کھولتا ہوا پانی ۔" ایسا گرم جو پیاس نہ بجھائے اور ٹھنڈک اس میں نہ ہو ۔

فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ (۵۶ : ۵۵) "تونس لگے ہوئے اونٹ کی طرح پیو گے ۔" اونٹ کو جب تونس بیماری لگ جاتی ہے تو وہ پانی پیتا رہتا ہے اور سیر نہیں ہوتا ۔

هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ (۵۶ : ۵۶) "یہ ہے ان کا سامان ضیافت روز جزا میں ۔" حالانکہ قیام و نزول

راحت اور آرام کے لئے ہوتا ہے لیکن اصحاب الشمال کا نزول اجلال جنہم میں ایسا ہو گا جس میں نہ راحت ہو گی اور نہ قرار ہو گا۔ یہ ہے ان کی ضیافت اس دن کی جس کے بارے میں وہ شک میں پڑے ہوئے تھے۔ اس کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے اور قرآن کی تصدیق کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ دوسری طرف شرک بھی کرتے تھے اور اس دن کے ڈراوے سے بھی نہ ڈرتے تھے۔

یہاں آکر سب فریقوں کا انجام ختم ہو جاتا ہے جبکہ یہ عظیم واقعہ ہو گا جو اوپر نیچے کر دینے والا ہو گا اور اس پر اس سورۃ کا پہلا دور ختم ہوتا ہے۔

رہا دوسرا دور تو اس میں اسلامی نظریہ حیات کو مکمل طور پر لیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں واضح پہلو قضیہ حشر و نشر ہی ہے۔ اس دوسرے دور سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نسانی فطرت کو کس خوبصورتی کے ساتھ خطاب کرتا ہے۔ دلائل کس طرح بیان کرتا ہے اور کس قدر سادگی کے ساتھ لوگوں کی نفسیات کے اندر اتر جاتا ہے حالانکہ موضوع سخن نظریات و فلاسفی کے اعلیٰ مضامین ہوتے ہیں۔

قرآن کا کمال یہ ہے کہ وہ آسمانوں کے ان امور سے جو روٹین میں چلتے رہتے ہیں' ایسے نکات اخذ کرتا ہے جو کائنات کا عظیم مسئلہ قرار پاتے ہیں۔ وہ پا افتادہ حقائق و مناظر سے نوامیس فطرت اخذ کرتا ہے۔ ان سے ایک نظریہ حیات تشکیل کرتا ہے اور ان واقعات کو مرکز فکر و نظر بنا دیتا ہے جن سے روحانی زندگی میں ترقی و شعور کی بیداری' حواس کی تیزی پیدا ہوتی ہے اور جن مظاہر کو انسان رات اور دن دیکھتے ہیں اور ان پر سے غافلوں کی طرح گزر جاتے ہیں' ان کے بارے میں انسانی شعور کو بیدار کرتا ہے اور انسان کو بتاتا ہے کہ تم تو معجزات کے اندر ڈوبے ہوئے ہو جو تمہارے ارد گرد رات دن ہوتے رہتے ہیں۔

قرآن لوگوں کو چند محدود معجزات کے حوالے نہیں کرتا جو کسی محدود زمان و مکان کے اندر پائے گئے ہوں بلکہ وہ خود ان کے نفس میں معجزات ان کو دکھاتا ہے۔ ان کے ماحول میں پائے جانے والے معمول کے واقعات میں سے معجزات تلاش کر لیتا ہے۔ ان کے قریب جو کائناتی مظاہر ہیں' ان سے دور ان کو نہیں لے جاتا کہ وہ انہیں پیچیدہ فلاسفی میں الجھاتا ہے یا محض عقلی فرائض پر کلام کرتا ہے یا ان سے سائنسی تجربات کا مطالبہ کرتا ہے جو ہر شخص نہیں کر سکتا۔ اسلام کوئی ایسا فلسفہ الٰہیات لوگوں کے لئے نہیں تجویز کرتا۔ قرآن کا انداز مختلف ہے۔

لوگوں کے نفوس اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ لوگوں کے ارد گرد جو مظاہر فطرت ہیں وہ بھی اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ اللہ نے اس جہان میں جو جو چیز پیدا کی ہے' وہ معجزہ ہے۔ یہ اللہ کا قرآن ہے۔ اس لئے وہ انہیں انہی معجزات کی طرف لے جاتا ہے جو ان کی ذات میں ہیں۔ جو ان کے ماحول میں ہیں۔ وہ ایسے معجزات ان کو سمجھاتا ہے جن کو وہ رات دن دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ ان کو دیکھتے ہیں لیکن ان مظاہر کا اعجازی پہلو ان کی نظروں سے اوجھل ہے کیونکہ رات دن انہوں نے اس عمل کو دیکھتے دیکھتے اسے ایک معمول کا عمل سمجھ لیا ہے۔ قرآن انہی واقعات کے بارے میں ان کی آنکھیں کھولتا ہے۔ بتاتا ہے ان سب قدرت الٰہیہ کا راز کیا ہے۔ ان کے اندر کس قدر وحدت پائی جاتی ہے اور کس طرح یہ قدرت الٰہیہ تمہارے نفسوں میں کام کر رہی ہے جس طرح اس کائنات کے اندر کام کر رہی ہے جو ان کے ماحول میں ہے جس کے اندر دلائل ایمان' براہین حقیقت موجود ہیں۔ اس طرح اسلام ان چیزوں کو انسان کی فطرت کے سامنے کھولتا ہے اور ان کی فطرت کو جگاتا ہے۔

قرآن کریم اس سبق میں یہی انداز اختیار کرتا ہے ۔ سب سے پہلے ان کے سامنے وہ دلائل اعجاز پیش کئے جاتے ہیں جو خود ان کی تخلیق میں ہیں ۔ پھر وہ جو ان کے فصلوں میں ہیں جن کو وہ رات دن بوتے ہیں جو پانی وہ پیتے ہیں کیا یہ کم اعجاز ہے ۔ یہ آگ جو وہ جلاتے ہیں ۔ یہ آگ تو صبح و شام تمہارے چولہوں میں جلتی ہے پھر تمہارے سامنے تمہارے رشتہ داروں کی اموات ہوتی ہیں ۔ یہ عالم آخرت کے سفر پر جاتے ہیں ۔ ہر شخص کو یہ وقت پیش آتا ہے اور ہر زندہ کو قدرت قادرہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے جس سے کوئی فرار ممکن نہیں ہے ۔ تمام حیلے اور تمام بہانے ختم ہو جاتے ہیں ۔

قرآن نے جس انداز سے فطرت سے خطاب کیا ہے یہ انداز بذات خود دلائل اعجاز میں سے ہے کہ قرآن خالق کی طرف سے ہے ۔ قرآن کا سرچشمہ وہی ہے جس سے یہ کائنات صادر ہوئی چنانچہ قرآن دنیا کی زندگی کے سادہ مظاہر اور اشکال سے عظیم حقائق نکال کر فطری آواز میں انسان کے سامنے رکھ دیتا ہے ۔ ایک ذرہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پوری کائنات کی پہلی اکائی ہے اور خلیہ جو زندگی کا پہلا مادہ ہوتا ہے ۔ ذرہ بذات خود معجزہ ہے اور خلیہ حیات بذات خود معجزہ ہے ۔ یہاں قرآن کریم نہایت ہی سادہ مظاہر سے دینی عقائد اخذ کرتا ہے ۔ ایسے مظاہر سے جو ہر انسان کے تجربے میں ہوتے ہیں ۔ نسل انسانی ' زراعت ' پانی ' آگ ' موت ہر انسان ان اشیاء کے ساتھ عملی معاملہ رکھتا ہے ۔ غار کے رہنے والے بھی جنین کی زندگی سے واقف ہیں اور تھے ۔ نباتات کے اگنے سے واقف تھے ۔ بارش سے واقف تھے ۔ آگ جلاتے تھے اور موت کی گھڑی ان پر آتی تھی ۔ ان مشاہد کے میٹریل سے قرآن ایک عظیم الشان عقیدہ اور نظریہ اور فلسفہ تشکیل دیتا ہے ۔ اس لئے کہ قرآن ہر انسان کی کتاب ہے اور یہ مشاہدات وہ ہیں جن سے ہر انسان دوچار ہوتا ہے ۔ یہ عظیم کائناتی حقائق ہیں لیکن پیش پا افتادہ یہ اعلیٰ اسرار ہیں لیکن ہر شخص کے سامنے کھلے ' اس پوری بحث میں ایک اشارہ دوررس بھی ہے وہ ہے ستارے کے محل وقوع کی طرف جو مطالعہ فطرت کا موضوع ہے اور ایک عام انسان اور ایک بہت بڑے سائنس داں مواقع النجوم کا مشاہدہ کرتے ہیں ۔

مواقع النجوم سے مراد کائنات کی انجینئرنگ ہے اور یہ بہت بڑا راز بھی ہے اور پیش پا افتادہ بھی ہے ۔ پھر حیاتیات و نباتات دونوں معجزات ہیں ۔ پھر پانی تو اصل حیات ہے اور آگ اور اب بجلی تو تہذیب کی پہلی علامت ہے ۔

موجود اور منظور چیزوں کو اس انداز سے دیکھنا مطالعہ کرنا اور ان سے فکر و عقیدہ اور نظریہ و نظام اخذ کرنا انسان کا طریقہ علم و تعلیم نہیں رہا ہے ۔ انسانوں نے جب بھی ان مسائل پر بحث کی ہے انہوں نے ان کائناتی مواد اور مظاہر کو سامنے بھی نہیں رکھا ہے اور جب انہوں نے کبھی اسے دیکھنے کی کوشش بھی کی ہے تو اسے پیچیدہ بنا دیا ہے اور اس قدر سادگی سے نہیں لیا جس طرح قرآن نے لیا ہے بلکہ انسان نے ان سادہ مظاہر کو بھی ایک پیچیدہ فلسفیانہ مسئلہ بنا کر اسے چیستان بنا دیا ہے اور دنیا کے عوام کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا ۔

لیکن اللہ نے اپنی کتاب میں ایک فطری انداز اختیار کیا ہے یعنی اونچے مسائل کے لئے بھی ایسا میٹریل استعمال کیا جو عوام کے لئے قابل فہم ہو جس سے جو نتائج بھی اخذ کئے گئے وہ لوگوں کے لئے قریب الفہم ہو گئے جس طرح اللہ نے اس کائنات کی تخلیق کے اندر حیاتیاتی تسلسل نہایت سہولت سے قائم کیا ہے اسی طرح اس کائنات سے سادہ انداز میں اللہ العلمین کو ثابت کیا ہے ' ذرا ملاحظہ فرمائیں ۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيْتُمْ
مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ
الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا
تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَوْ نَشَاۗءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا
فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَاۗءَ
الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَوْ
نَشَاۗءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنْتُمْ
اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿۷۲﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا
لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۷۳﴾

"ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے؟ کبھی تم نے غور کیا' یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو' اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں؟ ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تم جیسے اور لوگ لے آئیں اور کسی ایسے جہان میں تمہیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔ اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو' پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟ کبھی تم نے سوچا' یہ بیج جو تم بوتے ہو' ان سے کھیتیاں تم اگاتے ہو یا ان کے اگانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو ان کھیتوں کو بھس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو الٹی چٹی پڑ گئی بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے ہوئے ہیں۔ کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا' یہ پانی جو تم پیتے ہو' اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں' پھر کیوں تم شکرگزار نہیں ہوتے؟ کبھی تم نے خیال کیا یہ آگ جو تم سلگاتے ہو' اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو یاد دہانی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کے لئے سامان زیست بنایا ہے۔ پس اے نبیؐ اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔"

پیدائش اور موت اور انتہا' حیات اور موت' ایک ایسا واقعہ ہے جس کے تجربے سے ہر شخص خود بھی گزرتا ہے اور لوگوں کی زندگی میں بھی مشاہدہ کرتا ہے۔ آخر وہ کیا وجہ ہے کہ وہ تصدیق نہ کریں کہ اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اس

حقیقت کا انسان پر اس قدر دباؤ ہے کہ انسان کے لئے خدا پر ایمان لانے کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ (٥٦: ٥٧) "ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے ہو"

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ (٥٨) ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ (٥٦: ٥٩) "کبھی تم نے غور کیا' یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو' اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں۔" تخلیق یا تناسل میں انسان کا کردار یہی ہے کہ وہ نطفہ رحم زوجہ میں ڈال دے۔ پھر دونوں کا کردار ختم ہو جاتا ہے۔ (ٹیوب بے بی نے یہ بھی ختم کر دیا ہے) اب یہ کمزور پانی رب تعالیٰ کے زیر نگرانی کام کرتا ہے۔ صرف دست قدرت اس کی تخلیق اور تربیت اور بڑھوتری میں کام کرتا ہے۔ اس کو شکل دیتا ہے۔ روح دیتا ہے اور پہلے لحظہ سے لے کر تمام مراحل معجزات ہی معجزات ہیں۔ ہر مرحلے میں ایسا خارق العادت معجزہ رونما ہوتا ہے جس میں اللہ کے سوا کسی کا کوئی کردار نہیں۔ بشر تو آج تک اسی طریقہ تخلیق و تناسل کی حقیقت تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ معجزہ کیسے ہوتا ہے۔ اس میں ان کی شرکت کا تو تصور بھی نہیں؟

اس قدر سوچ تو ہر انسان کو حاصل ہوتی ہے اور اس معجزے کو سمجھنے اور اس سے متاثر ہونے کے لئے اسی قدر کافی ہے لیکن اس خلیے کا اس قدر قصہ کہ جب یہ نطفہ رحم مادر میں رکھا گیا اور اس سے ایک مکمل انسان بن گیا۔ یہ کہانی تخیلات سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ اگر یہ قصہ عملاً وقوع پذیر نہ ہوتا رہتا اور یہ انسان اسے شب و روز دیکھتا نہ رہتا تو عقل انسانی کبھی اس کی تصدیق نہ کرتی۔

یہ خلیہ پھر تقسیم ہونا شروع ہوتا ہے۔ پھر بڑھتا رہتا ہے اور تھوڑا ہی عرصہ گزرتا ہے کہ اس ایک خلیے کی جگہ کئی ملین خلیے نمودار ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک خلیہ دوسرے خلیوں سے ممتاز خصوصیات رکھتا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک خلیہ ایک خاص پہلو تخلیق کرتا ہے۔ بعض ہڈیوں کے خلیے ہوتے ہیں۔ بعض عضلات کے خلیے ہوتے ہیں۔ بعض جلدی خلیات ہوتے ہیں۔ ان خلیوں سے آنکھیں بنتی ہیں۔ ان خلیوں سے زبان بنتی ہے اور ان خلیوں سے غدود بنتے ہیں۔ غدودوں کے خلیے زیادہ مخصوص نوعیت رکھتے ہیں۔ ہر خلیہ جانتا ہے کہ اس نے کہاں جا کر کام کرنا ہے۔ مثلاً آنکھ کے خلیے غلطی سے پیٹ میں یا پاؤں میں نہیں چلے جاتے لیکن اگر ان کو مصنوعی طور پر پشت کے اوپر لے جایا جائے تو یہ وہاں آنکھ بنا دیں گے لیکن ان کو اللہ کی طرف سے جو حکم اور الہام ہوتا ہے وہ آنکھ ہی کی جگہ مجتمع ہوتے ہیں اور وہیں آنکھ بناتے ہیں۔ اسی طرح کان کے خلیے پاؤں میں نہیں جاتے تاکہ وہاں جا کر وہ کان بنا دیں۔ یہ سب خلیے اللہ کے حکم اور الہام کے مطابق اس انسان کو بہترین تقدیم اور نقشے کے مطابق بناتے ہیں۔ ان کی نظروں کے پیچھے اور اس تشکیل میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

یہ ہے انسان کی ابتداء' رہی انسان کی انتہا تو وہ بھی اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ اگرچہ انسان اسے روز دیکھتے دیکھتے اس سے اثر نہیں لیتا۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ (٦٠) عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ

وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ (٥٦: ٦١) "ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تم جیسے اور لوگ لے آئیں اور کسی ایسے جہاں میں تمہیں دوبارہ پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے ۔"

یہ موت جس تک تمام زندہ مخلوق سفر کر کے پہنچتی ہے یہ کیا ہے؟ کس طرح واقع ہوتی ہے؟ اس کی کس قدر طاقت ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اللہ کی تقدیر ہے ۔ اس لئے اس سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔ اس سے کوئی آگے نہیں جاسکتا۔ یہ ایک حلقہ اور کڑی ہے اس تخلیق کے سلسلے میں جس نے پورا ہونا ہے ۔

اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تمہیں اس زمین سے نابود کر کے اس کی تعمیر و ترقی کے لئے دوسرے لوگوں کو وہ لا سکتا ہے کیونکہ جس نے موت مقرر کی زندگی کے بارے میں بھی اسی نے طے کیا ہے ۔ اس نے جن لوگوں کی موت کا فیصلہ کیا اتنے ہی لوگ اور وہ لاتا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے تاکہ قیامت تک جنہوں نے آنا ہے آئیں اور جب وقت مقرر آجائے گا تو پھر قیامت برپا ہوگی ۔

وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ (٥٦: ٦١) "اور تمہیں اس میں پیدا کریں جسے تم نہیں جانتے ۔" ایک ایسے عالم میں جس کو تم نہیں جانتے اور اس کے بارے میں تمہاری معلومات صرف ان معلومات تک محدود ہیں جو تم کو اللہ دیتا ہے اور جب تمہیں اس نامعلوم جہاں (آخرت) میں پیدا کر دیا جائے گا تو تب قافلہ انسانیت اپنے منزل مقصود تک پہنچ جائے گا ۔ ـــــ یہ تو ہے دوسری پیدائش اور ۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ (٥٦: ٦٢) "اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟" اور یہ دوسری پیدائش بہت ہی قریب ہے اور اس میں کوئی بات قابل تعجب نہیں ہے ۔

اس سادگی اور اس سہل انداز میں قرآن کریم پہلی پیدائش اور دوبارہ پیدائش کے مسئلہ کو پیش کرتا ہے ۔ ہمیں ایک ایسے طریقہ استدلال سے دوچار کرتا ہے جسے ہم جانتے ہیں اور جس کا ہم کوئی انکار بھی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ منطق بدیہیات پر مبنی ہے اور انسانوں کے مشاہدات پر مبنی ہے اور جس میں کوئی پیچیدگی اور کوئی تجرید نہیں ہے ' نہ فلسفہ ہے اور نہ ذہنی تھکاوٹ ہے اور کوئی ایسی بحث نہیں جو وجدان تک پہنچتی ہو ۔

یہ ایک بالکل جدید طریقہ ہے جو بدیع السموت اور قرآن کے نازل کرنے والے نے اختیار کیا ہے ۔

---()()()---

ایک بار پھر نہایت سادہ اور سہل الفہم انداز میں ' ان کے سامنے ان کے روزمرہ کی چیزیں پیش کی جاتی ہیں اور ان میں سے ان کو ایک معجزانہ پہلو دکھایا جاتا ہے ۔ وہ دیکھ رہے ہوتے ہیں اور اس سے غافل ہوتے ہیں ۔

أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ (٦٣) أَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ (٦٤) لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ

حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ (٦٥) إِنَّا لَمُغْرَمُونَ (٦٦) بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ (٦٧) (٥٦: ٦٤ تا

"کبھی تم نے سوچا' یہ بیج جو تم بوتے ہو' ان سے کھیتیاں تم اگاتے ہو یا ان کے اگانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو ان کھیتوں کو بھس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو الٹی چٹی پڑ گئی بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹے ہوئے ہیں۔"

یہ زرعی پودے ان کے سامنے اگتے ہیں اور اپنی فصل دیتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس میں ان کا کردار کیا ہے۔ یہ لوگ ہل چلا کر اس میں دانے یا بیج ڈال دیتے ہیں۔ جسے اللہ نے پیدا کیا۔ اس کے بعد ان کا کردار ختم ہو جاتا ہے اور دست قدرت ان پر عمل پیرا ہوتی ہے اور معجزانہ انداز میں یہ پودا تکمیل کے مراحل طے کرتا ہے۔

یہ بیج یا یہ دانہ اپنی نوع کو دہرانے کا عمل شروع کرتا ہے اور یہ اپنی راہ اس طرح طے کرتا ہے کہ گویا یہ عقلمند اور خبردار چیز ہے اور اپنی راہ پر سیدھا سیدھا گامزن ہے اور مراحل طے کر رہا ہے۔ انسان تو اپنے کام میں غلطی کر سکتا ہے لیکن یہ بیج کوئی غلطی نہیں کرتا۔ یہ اس طریق کار کے مطابق کام کرتا ہے جو اللہ نے اس کے لئے وضع کیا ہے۔ وہ بھی اپنے مقررہ ہدف کو خطا نہیں کرتا کیونکہ اسے دست قدرت چلا رہی ہوتی ہے اور یہ ایک عجیب سفر ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا سفر ہے کہ اگر روز و شب ہمارے سامنے دہرایا نہ جاتا تو عقل اس کی تصدیق نہ کرتی اور جہان اس کا تصور نہ کر سکتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کون سی عقل یہ باور کر سکتی ہے کہ گندم کے اس چھوٹے سے دانہ میں ڈالی پتے اور دانے سب کچھ موجود ہیں یا کھجور کی گٹھلی میں اس قدر بلند درخت موجود ہے۔

اگر یہ چیزیں ہمارے سامنے رات دن دہرائی نہ جاتیں تو عقل انہیں تسلیم نہ کرتی اور کوئی خیال ان چیزوں کی طرف جاتا ہی نہیں لیکن چونکہ سب لوگوں کے سامنے یہ قصہ دہرایا جاتا ہے اور یہ سفر صبح و شام طے ہوتا رہتا ہے اس لئے لوگ اسے مانتے ہیں اور کون ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہو کہ ماسوائے دانہ بونے کے اس کا اس عمل میں کوئی اور کردار ہے۔

لوگ کہتے ہیں ہم نے فصل اگائی اور ہم نے اتنی پروڈکشن دی حالانکہ ان سب امور میں ان کا کردار بہت ہی محدود ہے۔ رہا وہ پورا عمل جو بیج یا دانہ طے کرتا ہے اور وہ معجزہ کہ ایک چھوٹے سے بیج کے قلب سے ایک عظیم درخت وجود میں آتا ہے تو یہ تو سب کچھ خالق کی صفت ہے۔ اگر ایسا اللہ نہ چاہتا تو کوئی دانہ یہ معجزہ نہ دکھاتا۔ یہ قصہ یوں سرے تک نہ پہنچتا اور اگر اللہ چاہتا تو قبل اس کے کہ دانہ دے اسے بھس بنا دیتا۔ یہ تو اللہ کی مشیت ہے۔

اگر ایسا ہوتا تو لوگ اس پر عبرتناک تبصرے کرتے۔ انا لمغرمون (ہم پر تو چٹی چڑھ گئی) نقصان ہو گیا بلکہ یہ کہیں بل نحن محرومون (بلکہ ہم تو محروم اور بد نصیب ہیں) لیکن یہ اللہ کا فضل کہ وہ ان کو پھل دیتا ہے اور یہ دانے دورہ مکمل کرتے ہیں۔ انسانی زندگی بھی ایسی ہی ہے۔ انسانی خلیہ بھی یہی کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی قدرت انسان پیدا کرتی ہے۔ کیا مشکل ہے کہ دوبارہ اللہ اسی زمین سے انسان کو برآمد نہیں کر سکتا... آخرت کی دوبارہ پیدائش میں آخر کیا چیز تمہیں انوکھی لگتی ہے۔

أَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ (٦٨) ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ (٥٩) لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنَٰهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ (٧٠) (٥٦: ٦٨ تا

"کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا' یہ پانی جو تم پیتے ہو' اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بناکر رکھ دیں' پھر کیوں تم شکرگزار نہیں ہوتے؟"

یہ پانی تو زندگی کی اصل بنیاد ہے اور پانی کے سوا زندگی نشوونما ہی نہیں پا سکتی۔ اس طرح اللہ نے اسے مقدر کیا ہے۔ اس پانی کی تخلیق میں انسان کا کردار کیا ہے۔ اس کا کردار بس یہ ہے کہ انسان اسے حلق سے اتار دے۔ یہ کہ اس کے عناصر کس نے بنائے' اسے بادلوں سے کس نے اتارا۔ اسے ندیوں میں کس نے بہایا۔ اسے میٹھا کس نے بنایا۔

لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا (۵۶ : ۷۰) "اگر ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بناکر رکھ دیں۔" بس ہوا کو یہ حکم دینا ہے کہ بادلوں میں پانی کے ساتھ نمکیات بھی لاؤ۔ پھر وہ نہ آدمیوں کے کام آئے نہ فصلوں کے۔ کوئی پروڈکشن نہ دے۔ آخر وہ کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے۔

قرآن کے ابتدائی مخاطبین کے لئے پانی صرف بادلوں سے آتا تھا۔ براہ راست' یہ ان کے لئے زندگی کا بڑا مواد تھا۔ وہ اس کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اور اس کے متعلق بات سے ان کے دل کانپ اٹھتے تھے۔ بارش کے بارے میں ان کے قصائد و اشعار نے ان کے اس شعور کو لازوال بنا دیا ہے۔ لیکن انسان کی تمام تر مادی ترقیات نے پانی کی قیمت میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ وہ جس قدر علمی تحقیقات اور تجربہ کرنے میں اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور سائنس دان محسوس کرتے ہیں کہ حیات اور اس کی نشوونما میں پانی کا بڑا کردار ہے۔ لہٰذا پانی اہم ہے چرواہے کے لئے بھی اور ایک عظیم جدید صنعت کار کے لئے بھی اور ایک سائنس دان کے نزدیک بھی۔

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ (۷۱) ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ (۷۲) نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (۷۳) (۵۶ : ۷۱ تا ۷۳) "کبھی تم نے خیال کیا یہ آگ جو تم سلگاتے ہو' اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو یاددہانی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کے لئے سامان زیست بنایا ہے۔"

انسان کی زندگی میں آگ کا وجود انسان کے لئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی اور انسان نے اپنی تمدنی زندگی کا آغاز ہی آگ سے کیا ہے لیکن صبح و شام آگ جلانا اس کے لئے تو ایک معمول کی بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں انسان کا کردار کتنا ہے۔ بس انسان آگ جلاتا ہے لیکن جلنے کا عمل کس نے پیدا کیا اور جلنے کے عمل میں استعمال ہونے والا ایندھن کس نے بنایا۔ درخت کس نے پیدا کئے۔ اس کے بارے میں اس سے قبل تفصیلی بات ہم کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے درخت" میں ایک اشارہ ہے کہ عرب ایک درخت کی شاخ کو دوسری سے رگڑ کر آگ پیدا کرتے تھے اور یہ وہ طریقہ ہے جو شاید آج بھی پسماندہ علاقوں میں رائج ہے۔ یہ انداز ان کے تجربات میں تھا اس لئے قرآن نے اس طرف اشارہ کر دیا۔ رہا آگ کا معجزہ اور سائنس دانوں کے نزدیک اس کا راز تو یہ ایک دوسری اہم بحث ہے اور اس آگ کی مناسبت سے

آخرت کی آگ ۔

نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً (٥٦ : ٧٣) "ہم نے اس کو یاددہانی کا ذریعہ بنایا۔" یعنی آخرت کی آگ کی یاددہانی کا اور ہم نے اس کو۔

وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (٥٦ : ٧٣) "حاجت مندوں مسافروں کے لئے سامان زیست بنایا ہے۔" مقوین کے معنی مسافر ہیں۔ مخاطبین کے نفوس پر اس کا بہت اثر تھا کیونکہ ان کے سامنے ان کا ایک زندہ تجربہ پیش کیا گیا۔

جب اس حد تک اسرار و رموز فاش کر دیئے گئے جن سے دلائل ایمان روز روشن کی طرح سامنے آگئے ۔اور لوگوں کے لئے قابل فہم' تو اب اشارہ کرنا لازم ہوگیا کہ یہ سب کچھ فراہم کرنے والا کون ہے؟ کیا ایک عظیم خالق اور رب کی موجودگی کا سوال تمہارے ذہنوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کی طرف فطرت متوجہ ہوتی ہے اور فطرت انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اللہ کی تسبیح کریں اور اس حقیقت کو زندہ کریں اور دلوں کو اس سے متاثر کریں۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (٥٦ : ٧٤) "پس اے نبی اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔" اب روئے سخن مکذبین کی طرف پھیر کر سخت انداز میں قرآن کو اس کائنات سے مربوط کیا جاتا ہے۔

۲

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَ ع ۲۳ الثلثۃ
۱۵ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا
يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ
مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَوْلَاۤ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾
وَ اَنْتُمْ حِيْنَىِٕذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾
فَلَوْلَاۤ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاَمَّاۤ اِنْ
كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۸۸﴾ فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ ۙ۬ وَّ جَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾ وَ اَمَّاۤ اِنْ كَانَ
مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۰﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۱﴾ وَ اَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ

الْمُكَذِّبِينَ الضَّالِّينَ ﴿٩٢﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ ﴿٩٣﴾ وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ ﴿٩٤﴾ إِنَّ هَٰذَا ۳
لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ﴿٩٥﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٩٦﴾ ع ۲۱
۱۶

"پس میں قسم نہیں کھاتا تاروں کے مواقع کی اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں ثبت جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو اور تم نے تکذیب کو اپنا رزق بنا لیا ہے۔ اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنے اس خیال میں سچے ہو تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے۔ پھر وہ مرنے والا اگر مقربین میں سے ہو تو اس کے لئے راحت اور عمدہ رزق اور نعمت بھری جنت ہے اور اگر وہ اصحاب یمین میں سے ہو تو اس کا استقبال یوں ہوتا ہے کہ سلام ہے تجھے تو اصحاب الیمین میں سے ہے اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہ لوگوں میں سے ہو تو اس کی تواضع کے لئے کھولتا ہوا پانی ہے اور جہنم میں جھونکا جانا ہے۔ یہ سب کچھ قطعی حق ہے ۔پس اے نبی" اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔"

اس دور میں مخاطبین ستاروں کے مواقع اور محل وقوع کے بارے میں زیادہ نہ جانتے تھے۔ صرف اس قدر جو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس پر قسم اٹھائی۔

وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ (٥٦ : ٧٦) "اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔" لیکن آج ہم کسی قدر جانتے ہیں کہ یہ کس قدر عظیم قسم ہے۔ ہمارا علم مخاطبین اول کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اگرچہ ہمارا موجودہ علم بھی بہت قلیل ہے اور ہم مواقع النجوم کی عظمت کا پورا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ستاروں کے مواقع کے بارے میں جو قلیل علم حاصل ہوا ہے یہ ہماری نہایت ہی چھوٹی چھوٹی رصد گاہوں کے ذریعہ حاصل ہوا ہے۔ جن کی نظری حدود بہت ہی محدود ہیں۔ ان رصد گاہوں کے ذریعے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ یہ ہیں کہ ستاروں کے مختلف مجموعوں میں سے یہ مجموعہ ایک ہے جس کو نظام شمسی کہتے ہیں۔ اس میں ایک ارب ستارے ہیں اور ستاروں کے دوسرے مجموعے کتنے ہیں ان کی تعداد معلوم نہیں ہے اور ان کی حدود کا تعین نہیں ہے۔

"سائنس دان کہتے ہیں کہ ستارے اور سیارے جن کی تعداد ان بلین ستاروں سے زیادہ ہے' ان کو صرف سادہ نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان کو صرف دوربینوں اور رصد گاہوں کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے اور ان کو دیکھے بغیر یہ مشینیں اور آلات بھی ان کو محسوس نہیں کر سکتے۔ یہ سب اس تاریک اور نامعلوم فضائے آسمانی میں تیر رہے ہیں اور کوئی احتمال اس بات کا نہیں ہے کہ کسی ایک ستارے کے مقناطیسی دائرے کے اندر دوسرا ستارہ آ جائے یا کسی دوسرے ستارے کے ساتھ متصادم ہو جائے جس طرح اس بات کا احتمال نہیں ہے کہ بحر متوسط میں چلنے والی کشتی بحر مردار میں چلنے والی کشتی کے ساتھ متصادم ہو جائے جبکہ وہ دونوں ایک ہی سمت میں ایک ہی سرعت کے ساتھ چل رہی ہوں۔ جس طرح یہ احتمال بعید

ہے اسی طرح دو ستاروں کا ٹکرانا محال ہے۔[۱]

ہر ستارے کو اپنے قریبی ستارے سے اس فاصلے پر رکھا گیا ہے اور اس حکمت اور تدبیر سے رکھا گیا ہے اور ان تمام ستاروں کی کشش کو اس طرح متوازن رکھا گیا ہے کہ وہ اس لامتناہی فضا میں پھرنے اور تیرنے والے کھربوں ستاروں کے ساتھ متوازن ہے۔ یہ تو ہے ایک پہلو عظمت محل وقوع ستارگان کا۔ لیکن اگر چہ عظمت کا ہمارا تصور اس وقت کے مخاطبین قرآن سے بہت زیادہ ہے لیکن اگلی نسلوں کا جو تصور ہوگا وہ ہمارے اس وسیع تصور کو بھی محدود سمجھیں گی۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ (۵۶:۷۵) "پس میں قسم نہیں کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی۔" یہ بات تو بہت واضح ہے اور روشن ہے اور قسم کی محتاج نہیں ہے۔

وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ (۵۶:۷۶) "اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔" قسم کی طرف یہ اشارہ اور پھر قسم نہ کھانا ایک اسلوب ہے۔ ایک زیادہ موثر اور دل نشین انداز اور اس سے بات زیادہ پختگی سے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے کیونکہ اس پر قسم کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ (۷۷) فِىْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (۷۸) لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۷۹) تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۵۶:۸۰) "یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں ثبت جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔"

فِىْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (۵۶:۷۸) "کتاب محفوظ میں۔" اور اس کی تفسیر بعد کی آیت کر رہی ہے۔

لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶:۷۹) "جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔" مشرکین کا الزام تھا کہ اسے شیاطین نے نازل کیا ہے۔ یہ ان کے الزام کی تردید ہے کیونکہ شیطان اس کتاب کو مس نہیں کر سکتا جو اللہ کے علم میں ہے اور اس کی حفاظت میں ہے۔ اسے پاک فرشتے لے کر نازل ہوتے ہیں۔

اس آیت کی یہ سب سے اچھی تفسیر ہے کیونکہ (لا) نافیہ ہے یعنی یہ فعل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ناہیہ نہیں ہے کہ تم ایسا نہ کرو کیونکہ اس دنیا میں پاک اور نجس دونوں قرآن کو چھوتے رہتے ہیں۔ مومن اور کافر بھی چھوتے ہیں لہٰذا اس لحاظ سے نفی متحقق ہی نہیں ہے بلکہ یہ معنی زیادہ قریب ہے اور کفار کے الزام کے جواب میں یہی معنی درست ہے کہ مطہر سے مراد فرشتے ہوں کیونکہ کتب سماوی شیطان کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں۔

اور اس کے بعد کی آیت۔

---

(۱) اللہ اور سائنس ۔ ص ۳۳

تَنْزِيلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۵۶ : ۸۰) "یہ رب العالمین کی نازل کردہ ہے۔" شیاطین کی نازل کردہ نہیں ہے۔ اس کی تائید کرتی ہے۔

اگر مروی احادیث اس کا دوسرا مفہوم بتاتی ہیں کہ قرآن کو کوئی نہ چھوئے مگر پاک شخص لیکن علامہ ابن کثیر نے کہا ہے "یہ قیمتی نکتہ ہے الزہری نے اس طرح پڑھا ہے لیکن اس تفسیر کو نہیں لینا چاہئے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے عمر ابن حزم عبداللہ ابن عمر اور عثمان ابن ابوالعاص سے مسند طور پر روایت کیا ہے لیکن اس کی سب سندوں میں کلام کی گنجائش ہے۔"

اس کے بعد اس سورۃ کا آخری پیرا آتا ہے۔ یہ عقل و خرد کے تاروں پر آخری مضراب ہے۔ اس میں اس لمحے کا تذکرہ ہے جس کے بارے میں سوچ کر انسان کے اعضاء کانپ جاتے ہیں۔ یہ ہے لمحہ موت جس میں کوئی کلام نہیں ہے اور پھر انسان واپس نہیں آتا ہے نہ اس لمحے سے کوئی بچ سکتا ہے۔

اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ (۸۱) وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (۸۲) فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ (۸۳) وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ (۸۴) وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (۸۵) فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ (۸۶) تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۸۷) (۵۶ : ۸۱ تا ۸۷) "پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو اور تم نے تکذیب کو اپنا رزق بنا لیا ہے۔ اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنے اس خیال میں سچے ہو تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے۔"

کیا تم اس کتاب کی باتوں میں شک کرتے ہو اور اس لئے کہ یہ تمہیں یہ کہتی ہے کہ تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ تم قرآن اور اس کے بیان کردہ قصص آخرت کی تکذیب کرتے ہو اور قرآنی عقائد و تصورات کی تکذیب کرتے ہو۔

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (۵۶ : ۸۲) "کہ تم تکذیب کو اپنا رزق بنا رہے ہو" اور اس کو توشہ آخرت بنا رہے ہو اور زندگی بھی تم اس تکذیب پر بسر کرتے ہو یا یہ تمہاری خوراک بن گئی ہے۔ کس قدر گندی خوراک ہے یہ۔

جب تمہاری روح حلقوم تک آجاتی ہے اور تم دنیا اور آخرت کے کنارے اور دوراہے پر کھڑے ہوئے ہو تو تم کیا کرنے والے ہوتے ہو' تم کر ہی کیا سکتے ہو .... پھر قرآن کا انداز تصویر کشی آتا ہے اور اس موقع کی بہترین تصویر کشی کی جاتی ہے۔ یہ تصویری جھلکیوں کے انداز میں ہے اور مختصر جھلکیوں میں سب کچھ دکھا دیا جاتا ہے۔

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ (۸۳) وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ (۸٤) وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (۸۵) (٥٦: ۸۳ تا ۸۵) "تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے۔ اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے" یہ ایسی تصویر کشی ہے کہ ان الفاظ۔

بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ (٥٦: ۸۳) کے اندر سے سکرات الموت کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ہمیں نظر آتا ہے چہرے کے نیچے کھچے جا رہے ہیں 'سختی اور شدت نظر آرہی ہے۔ پھر۔

وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ (٥٦: ۸٤) سے نظر آتا ہے کہ اس کے اردگرد بھی اقرباء عاجز و لاچار کھڑے ہیں۔

اب روح اس دنیا سے پرواز کر گئی ہے اور میت نے سب کچھ پیچھے دنیا میں چھوڑ دیا ہے۔ یہ جدید اور نئی دنیا میں قدم رکھ رہا ہے۔ اب اس کے پاس صرف وہی کچھ ہے جو کمایا ہے۔ باقی خیر و شر پر اب اسے کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ وہاں اس جدید دنیا میں یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے لیکن پیچھے مڑ کر کسی کو کچھ بتا نہیں سکتا۔ وہ اپنے ماحول سے جدا ہو چکا ہے۔ ایک جسم پڑا ہے نے ناظرین دیکھ رہے ہیں لیکن انہیں بھی نہیں پتہ کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ یہاں آکر انسان کی قدرت اور انسان کے علم کے حدود ختم ہو جاتے ہیں۔ اس مقام پر آکر انسان اعتراف کرتے ہیں کہ وہ عاجز و لاچار ہیں۔ وہ بہت ہی محدود قوت کے مالک ہیں۔ اب کوئی جدال نہیں رہتا۔ ... یہاں آکر اس منظر پر پردہ گر جاتا ہے 'کچھ نظر نہیں آتا' کچھ معلوم نہیں اور منظر پر کوئی حرکت نظر نہیں آتی۔

اب صرف قدرت الہیہ ہی ہوتی ہے۔ علم الہی ہی ہوتا ہے۔ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور اس امر میں اب کوئی شبہ نہیں رہتا بلکہ شبہ کا شائبہ تک نہیں رہتا نہ جدل ہے اور نہ حیلہ۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (٥٦: ۸۵) "اس وقت تمہاری بہ نسبت ہم اس کے قریب ہوتے ہیں لیکن تم نہیں دیکھ سکتے۔" یہاں اب منظر پر شان باری ہے۔ اللہ کا خوف چھا جاتا ہے۔ اللہ تو ہر وقت حاضر و ناظر ہے لیکن قرآن کا یہ کمال ہے کہ وہ انسان کے خوابیدہ شعور کو جگا دیتا ہے چنانچہ مجلس موت پر اللہ کے شعوری حضور سے فضا زیادہ ہولناک ہو جاتی ہے جبکہ تمام لوگ ڈرے ہوئے سہمے ہوئے اور عاجز ہیں اور الوداع الوداع کا ماحول ہے۔

ایسی فضا میں ایک چیلنج آتا ہے نہایت ہی کپکپانے والی 'پر تاسف 'پرفغاں محفل میں اور سخت حسرتناک ماحول میں اللہ کی طرف سے ایک چیلنج آتا ہے۔

فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ (۸٦) تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۸۷) (٥٦: ۸٦ – ۸۷) "اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنے خیال میں سچے ہو تو اس

وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لاتے۔" اگر بات اس طرح ہے جس طرح تم کہتے ہو کہ کوئی جزا و سزا نہیں ہے اور تم آزاد ہو تو روح جب حلقوم کو آجائے تو وہاں سے لوٹا دو کیونکہ وہ تو حساب و کتاب دینے جارہی ہے اور تمہارے ہوتے ہوئے جارہی ہے تم بے بس کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہو وہ تو ایک بڑی ذمہ داری کا جواب دینے جارہی ہے اور تم خاموش اور بے بس کھڑے ہو۔

اب تمام حجتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ہر دلیل رد ہو جاتی ہے۔ ہر حیلہ اور ہر بہانہ ختم ہوتا ہے اور اس حقیقت کا دباؤ انسانی جسم اور عقل پر اور زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ دفاع کی قوت نہیں رکھتا۔ اسے تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا الا یہ کہ وہ ہٹ دھرمی پر اتر آئے۔

اب تھوڑا سا تبصرہ اس روح پر ہوتا ہے جو پرواز کر گئی ہے۔ یہ حلقوم تک آئی' اس نے اس فانی زندگی پر آخری نظر ڈالی اور باقی رہنے والی دنیا پر نظر لگا دی اور اس میدان کی طرف سفر کر گئی۔ جس میں ہر شخص سے بازپرس ہوگی جس کی یہ مکذبین تکذیب کر رہے ہیں :-

فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۸۸) فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ وَّ جَنَّتُ نَعِيْمٍ (۸۹) وَ اَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ (۹۰) فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ (۹۱) وَ اَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ (۹۲) فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ (۹۳) وَّ تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ (۹۴) (۵۶: ۸۸ تا ۹۴) "پھر وہ مرنے والا اگر مقربین میں سے ہو تو اس کے لئے راحت اور عمدہ رزق اور نعمت بھری جنت ہے اور اگر وہ اصحاب یمین میں سے ہو تو اس کا استقبال یوں ہوتا ہے کہ سلام ہے تجھے تو اصحاب الیمین میں سے ہے اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہ لوگوں میں سے ہو تو اس کی تواضع کے لئے کھولتا ہوا پانی ہے اور جہنم میں جھونکا جاتا۔"

سورۃ کے آغاز میں مقربین کے انعامات کا ذکر ہوگیا ہے ان کے لئے روح اور راحت ہے۔ راحت' رزق حسن اور نعمتوں والی جنت۔ ان الفاظ ہی سے ان نعمتوں کی لطافت ظاہر ہے۔ میٹھی راحت' نرم اور نازک سہولیات اور محبت و اعزاز۔

وَ اَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ (۵۶: ۹۰) "اگر وہ اصحاب یمین میں سے ہو۔" تو ان کی طرف روئے سخن براہ راست ہوتا ہے۔ اصحاب الیمین اسے خوش آمدید کہتے ہیں اور اس وقت یہ سلام کس قدر خوبصورت ہوگا۔ اس کی روح ابھی نکلی ہی نہیں کہ سلام سنائی دیتا ہے۔ ایسا جانیوالا مطمئن ہو کر جاتا ہے اور آنے والے زمانہ کی طرف مشتاق ہوتا ہے۔

وَ اَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ (۹۲) فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ (۹۳) وَّ تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ (۵۶: ۹۴) "اگر وہ جھٹلانے والے گمراہ لوگوں سے ہو تو اس کی تواضع کے لئے کھولتا ہوا پانی ہے اور جہنم

میں جھونکا جاتا ہے ۔" کیا ہی بری تواضع ہے ۔ گرم پانی اور عذاب جہنم ۔ وہ دور سے دیکھ رہا ہے کہ اسے اس جہنم میں جانا ہے ۔ روح قبض ہونے کے ساتھ ہی ۔

---O---

اب بات انتہا کو پہنچ گئی ہے ۔ خاتمہ نہایت ہی نرم دھیمے آواز میں ۔ نہایت نچلے سروں میں ۔

إِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ (۹۵) فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (۹۶) (۵۶ : ۹۵ تا ۹۶) "یہ سب کچھ قطعی حق ہے پس اے نبی" اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو ۔"

یہ آخری پرسوز تلقین ہے ۔ سچائی کے پلڑے میں وزن ڈالا جاتا ہے ۔ قلب مومن نے حق الیقین کر لیا ہے کہ واقعہ حق ہے اور ہونے والا ہے ۔ سورۃ ختم ہوتی ہے اور حکم دیا جاتا ہے ۔ "رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو" اور اسی سے نماز میں سبحان ربی العظیم جاری ہوا۔

---O---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ۔۔ ۲۷

سورۃ الحدید ۔ ۵۷

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۲۹

سورۃ الحدید ایک نظر میں

یہ پوری سورۃ ایک اسلامی جماعت کو دعوت ہے کہ وہ اپنے اندر حقیقت ایمان پیدا کرے۔ وہ حقیقت جس کے ساتھ وہ جماعت مسلم کے نفوس کو دعوت دین کے لئے خالص کر دے۔ اس طرح کہ وہ اس دعوت پر سب کچھ قربان کریں اور اس کی راہ میں کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ نہ جانی قربانی سے اور نہ مالی قربانی سے۔ تحریک کے کارکن اپنے دلوں کو تمام خلجانات اور تمام وسوسوں سے پاک کریں۔ یہ وہ مقام ہے جس پر پہنچ کر انسانی نفوس زمین پر رہتے ہوئے بھی ربانی بن جاتے ہیں۔ ان کے پیمانے اللہ کے پیمانے ہو جاتے ہیں اور ان کی وہ قدریں جن کو وہ اہم سمجھتے ہیں اور جن کے حصول کے لئے وہ ایک دوسرے سے آگے ہوتے ہیں وہ قدریں قرار پائیں جو اللہ کے ترازو میں وزن دار ہوں۔ پھر یہی وہ حقیقت ہے جو ذات باری کا شعور عطا کرتی ہے چنانچہ ذات باری کی یاد سے دل خضوع و خشوع اختیار کر لیتے ہیں اور وہ ہر اس رکاوٹ اور ہر اس جاذب نظر چیز کو دیکھ کر کانپ جاتے ہیں جو انہیں فرار الی اللہ سے روکنے والی ہو۔

اسی حقیقت کی اساس پر یہ سورۃ جماعت مسلمہ کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں مالی قربانی دے یعنی اللہ کی راہ میں جانی اور مالی قربانی دو۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ (۷) وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸) هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۹) وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۱۰) (۵۷: ۷ تا ۱۰) "ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن میں اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ رسول

تمہیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور وہ تم سے عہد لے چکا ہے۔ اگر تم واقعی ماننے والے ہو۔ وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق و مہربان ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ حالانکہ زمین و آسمان کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے۔ تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا۔ ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔"

اس عظیم حقیقت کی اساس پر ایک اسلامی جماعت کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ خضوع اور خشوع کے ساتھ اللہ کو یاد کرے۔ اور اس سچائی کا پاس رکھے اور اس کی اطاعت کرے اور انفاق فی سبیل اللہ بھی اس خدا خوفی کے نتیجے میں ہو اور اس کا داعیہ ایمانی حقیقت کے نتیجے میں پیدا ہو جو اس راہ میں ایمان کی پہلی حقیقت ہے۔ سب اعمال اسی سے پھوٹیں۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۵۷ : ۱۶) "کیا ایمان لانے والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں۔"

سچائی کے ترازو میں دنیا اور آخرت دونوں کی قدر اور وزن دکھا دیا جاتا ہے اور جماعت اسلامی کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس پلڑے میں اپنا وزن ڈالے جو قابل ترجیح ہو اور ان قدروں کو اختیار کرے جو باقی رہنے والی ہوں۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۷) اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (۱۸) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ڰ وَالشُّهَدَاۗءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۱۹) اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ

وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۲۰) سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۲۱) (۵۷: ۱۷ تا ۲۱) ”خوب جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ ہم نے نشانیاں تم کو صاف دکھا دی ہیں۔ شاید کہ تم عقل سے کام لو۔ مردوں اور عورتوں میں سے جو لوگ صدقات دینے والے ہیں اور جنہوں نے اللہ کو قرض حسن دیا ہے، ان کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لئے بہترین اجر ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ ان کے لئے ان کا اجر اور ان کا نور ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے وہ دوزخی ہیں۔ خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک کھیل اور دل لگی ہے اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال اور اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی۔ اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہوگئے۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔ دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف س کی وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے جو مہیا کی گئی ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔“

اس سورت کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم حقیقت کی طرف عمومی دعوت کے علاوہ یہ سورۃ اس وقت کے ایک عملی مسئلے کو بھی حل کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور یہ عملی مسئلہ اس وقت ۴ ھ سے لے کر فتح مکہ کے بعد کے زمانے تک مدینہ کی اسلامی سوسائٹی میں موجود تھا۔

اس دور میں اسلامی سوسائٹی میں ایک طرف تو سابق مہاجرین و انصار تھے جنہوں نے سچائی کی راہ میں جانی و مالی انفاق کی ایسی مثال پیش کی جس کو پوری انسانی تاریخ دہرا نہ سکی۔ انہوں نے اپنے نفوس کے اندر ایمان کی حقیقت پیدا کی۔ انہوں نے جان و مال کی قربانی کی لازوال مثالیں پیش کیں۔ نہایت خلوص کے ساتھ اور کامل للہیت کے ساتھ۔ انہوں نے راستے کی تمام رکاوٹوں کو اور تمام پرکشش مواقع کو اپنے راہ سے ہٹایا اور اللہ تک پہنچ گئے۔

اس ممتاز اور یگانہ روزگروہ کے ساتھ ساتھ اسلامی جماعت میں ایسے لوگ بھی تھے جو ایمان کے ان مدارج تک پہنچے ہی نہ تھے۔ جن پر یہ گروہ پہنچ چکا تھا۔ خصوصاً فتح مکہ اور اسلامی غلبہ کے بعد لوگ اسلام میں فوج در فوج داخل ہوگئے تھے اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے ایمان کی حقیقت کا پوری طرح ادراک نہ کیا تھا اور نہ انہوں نے طویل ایمانی زندگی گزاری تھی اور نہ ہی ایمان کے لئے انہوں نے قربانیاں دی تھیں جس طرح یہ مذکورہ بالا خالص اور مخلص لوگ تھے۔

یہ نئے مسلمان ایسے تھے جن کے لئے انفاق فی سبیل اللہ ایک مشکل کام تھا اور اسلامی نظریہ کی طرف سے جان و مال کا انفاق کے جو تقاضے تھے ان کے لئے ان کا پورا کرنا مشکل تھا اور دنیاوی زندگی اور مال و متاع ان کی آنکھوں کو ذرا چوند

کر رہا تھا۔ اس لئے وہ دنیا کی زندگی کے دھوکے اور جاہلیت سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔

اس سورت میں زیادہ تر خطاب ایسے ہی لوگوں کو ہے جیسا کہ ہم نے اس سے قبل اس کے نمونے پیش کئے تاکہ اپنے لوگوں کو روحانی طور پر صاف کر کے ان کو ان گراوٹوں اور ان پرکشش چیزوں کی کشش کے دائرے سے نکالا جائے اور ان کو ان لوگوں کی سطح تک بلند کیا جائے جو ایمان کے درجہ کمال تک پہنچے ہوئے تھے۔ وہ درجہ جس میں اگر کوئی پہنچ جائے تو اس کے نزدیک زمین کی قدریں بے وزن ہو جاتی ہیں اور یہ ایمانی جذبہ ایمانی حرارت سے تمام رکاوٹوں کو پگھلا کر رکھ دیتا ہے۔

اس دور میں ایک دوسرا طبقہ بھی تھا۔ یہ ان دونوں گروہوں سے جدا تھا۔ یہ لوگ منافقین تھے۔ یہ اسلامی معاشرے میں گھل مل گئے تھے۔ ان کا ظاہری وجود تو نہ تھا بالخصوص اس وقت کے بعد جب اسلام جزیرہ عرب میں غالب ہو گیا اور منافقین سب زیر زمین چلے گئے اور اپنے بلوں میں گھس گئے۔ البتہ اسلام ظاہر کرنے کے باوجود ان کے دل نفاق سے آلودہ تھے۔ یہ مسلمانوں کے خلاف کسی بھی فتنے کے اٹھنے کے انتظار میں تھے۔ فتنے ان کو بہا کر لے گئے تھے۔ یہ سورۃ ان کی تصویر کشی کرتی ہے جبکہ قیامت کے دن ان کو مومنین سے جدا کر دیا جائے گا۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَٰتِ يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَٰنِهِم بُشْرَىٰكُمُ الْيَوْمَ جَنَّٰتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۱۲) يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَٰفِقُونَ وَالْمُنَٰفِقَٰتُ لِلَّذِينَ ءَامَنُوا انظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِن نُّورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَٰهِرُهُ مِن قِبَلِهِ الْعَذَابُ (۱۳) يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنَّكُمْ فَتَنتُمْ أَنفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ (۱۴) فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مَأْوَىٰكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلَىٰكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۱۵) (۵۷: ۱۲ تا ۱۵) "اور اس دن جب تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔ (ان سے کہا جائے گا) "آج بشارت ہے تمہارے لئے" جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے "ذرا ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں" مگر ان سے کہا جائے گا "پیچھے ہٹ جاؤ اپنا نور کہیں اور تلاش کرو" پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اس دروازے کے اندر رحمت ہوگی اور باہر عذاب۔ وہ مومنوں سے پکار پکار کر کہیں گے "کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟" مومن جواب دیں گے "ہاں مگر تم نے اپنے آپ کو خو

فتنے میں ڈالا 'موقع پرستی کی' شک میں پڑے رہے اور جھوٹی توقعات تمہیں فریب دیتی رہیں 'یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آگیا اور آخر وقت تک وہ بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملہ میں دھوکہ دیتا رہا۔ لہذا آج تم سے نہ کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنہوں نے کھلا کھلا کفر کیا۔ تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔ وہی تمہاری خبرگیری کرنے والی ہے اور یہ بدترین انجام ہے۔"

اور ان لوگوں کے علاوہ جزیرہ عرب میں بعض یہودی و نصاری بھی موجود تھے۔ یہ سورت ان کے سابقہ کرتوتوں اور موجودہ حالات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسوقت جو صورت حال تھی اس کے مطابق جس طرح بعض مسلمانوں کو اس سے ڈرایا گیا تھا کہ وہ اہل کتاب کی طرح سنگ دل نہ ہو جائیں۔

كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ (۵۷ : ۱٦)

"اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہوگئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں۔" اور یہ اشارہ خصوصاً یہودیوں کی طرف تھا جبکہ نصاری کی طرف سورۃ کے خاتمہ کے قریب اشارہ ہے۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۵۷ : ۲۷)

"ان کے بعد ہم نے پے در پے رسول بھیجے اور ان کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو مبعوث کیا اور ان کو انجیل عطا کی اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کرلی۔ ہم نے اسے ان پر فرض نہ کیا تھا مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں نہوں نے آپ ہی بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے ان کا اجر ہم نے ان کو عطا کیا مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔"

اس سورۃ کا مقصد یہ تھا کہ دلوں کے اندر حقیقت ایمانی پیدا کی جائے اور اس حقیقت کے نتیجے میں انسانی شخصیت میں جو خضوع و خشوع اور خدا خوفی 'خلوص و تجرد' جذبہ جہاد اور جذبہ قربانی پیدا ہوتا ہے یہ اس سورۃ کا اصل محور اور ہدف تھا۔ تو اس سورۃ میں آغاز سے انتہا تک نہایت ہی موثر انداز میں نفوس کے اندر یہی حقیقت بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ ابتدائی اسلامی معاشرے میں اس حقیقت کو دلوں میں بٹھانے کی اشد ضرورت تھی جس طرح ہر اسلامی معاشرے میں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔

سورۃ کا پہلا پیراگراف ان موثرات کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے اندر انسان کے دلوں کے سامنے اللہ کی یہ صفات پیش کی گئی ہیں کہ اللہ وحدہ اس کائنات کا اللہ ہے لہذا اسی کی تسبیح کرو' وہ اس کائنات کا مقتدر اعلیٰ ہے اور آخر کار تمام

چیزوں نے اسی کی طرف لوٹنا ہے اور اللہ تمام لوگوں کے دلوں کی باتوں سے واقف ہے اور تمام چیزیں اس کی عبادت کرتی ہیں۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (١) لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٢) هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (٣) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (٤) لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (٥) يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (٦) (٥٧ : ١ تا ٦) "اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو زمین و آسمانوں میں ہے اور وہی زبردست و دانا ہے۔ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک وہی ہے۔ زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہی اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ اس کے علم میں ہے جو زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمانوں سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے۔ وہی زمین و آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات' فیصلے کے لئے اس کی طرف رجوع کئے جاتے ہیں۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔"

سورۃ کا یہ پہلا پیراگراف ہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ اسے پڑھ کر دل دہل جائیں اور ان کے اندر خوف خدا تقوی اور ارتعاش پیدا ہو جائے جس طرح یہ اس بات کے لئے کافی ہے کہ دلوں کے اندر اللہ کے لئے خلوص کی رغبت پیدا ہو جائے۔ اللہ سے التجا کی جائے اور اللہ کے راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے اور تمام بوجھ اتار پھینکے جائیں جو اس دعوت کے قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور انسان اللہ کی راہ میں قربانی دینے کے لئے جانی اور مالی کنجوسی سے نجات پالے لیکن اس مطلع کے علاوہ پوری سورۃ کے اندر بھی جگہ جگہ ایسی موثر آوازیں ہیں جو اسی غرض کی نوید ہیں۔ مثلاً مومنین اور مومنات کی ایک نہایت ہی روشن تصویر کھینچی گئی ہے۔

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (٥٧ : ١٢) "ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف چل رہا ہو گا۔" اور وہ تصویر جس میں اس دنیا کے مال و متاع کو نہایت ہی حقیر بتلایا گیا ہے اور آخرت کی قدروں کو

اہمیت دی گئی ہے اس طرح دلوں کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ اس دنیا کے تمام امور اللہ کی مشا سے طے پاتے ہیں اور اس پوری کائنات کو اللہ گھیرے ہوئے ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۲۲) لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۲۳) الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۲۴) (۵۷: ۲۲ تا ۲۴) "کوئی مصیبت ایسی نہیں جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پہ نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب (یعنی نوشتہ تقدیر) میں لکھ نہ رکھا ہو۔ ایسا کرنا اللہ کے لئے بہت آسان کام ہے (یہ سب کچھ اس لئے ہے) تاکہ جو کچھ نقصان بھی تمہیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ بھی اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل پر اکساتے ہیں۔ اب اگر کوئی روگردانی کرتا ہے تو اللہ بے نیاز ہے اور ستودہ صفات ہے۔" تاکہ نفس انسانی قرار پکڑے اور اس کو جو خیر و شر پیش ہو اس پر مطمئن ہو۔ یہی اللہ کا راستہ ہے لہٰذا غم پر جزع فزع نہ ہو اور خوشی پر تکبر نہ ہو۔ یوں ایک مسلم خوشی اور غم دونوں کے مقابلے میں سنجیدہ ردعمل ظاہر کرتا رہے اور وہ اللہ کے ساتھ کسی سبب کو کسی حال کو اور کسی حادثہ کو شریک نہ کرے کہ ان کی وجہ سے یوں ہوا اور ووں ہوا۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور تقدیر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔

اس سورۃ میں، جیسا کہ ہم نے آغاز بحث میں کہا دو پیراگراف ہیں۔ دونوں اپنے موضوع اور محور کے گرد گھومتے ہیں۔ اب تفصیل آیات اور تشریحات :-

---○○○---

درس نمبر ۲۵۶ تشریح آیات

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۵

آیاتها ۲۹　سُورَةُ الْحَدِيدِ (۵۷)　مَدَنِيَّةٌ (۹۴)　رکوعاتها ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱﴾ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲﴾ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ
وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ
وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۚ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ
مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۴﴾ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى
اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۵﴾ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۚ وَهُوَ
عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۶﴾

”اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو زمین اور آسمانوں میں ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے ۔ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک وہی ہے ' زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔ وہی اول بھی ہے اور آخر بھی ' اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے ۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا ۔ اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے ۔ وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے ۔

وہی زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات فیصلے کے لئے اس کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں - وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ۔"

یہ ایک طے شدہ اور نہایت ہی اشاراتی مطلع اور آغاز کلام ہے جو براہ راست دلوں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور ہمیں خوب جھنجھوڑتا ہے' خوب دباتا ہے اور ان کو لے کر ہر طرف گھماتا ہے ۔ اس کائنات کی سیر کراتا ہے ۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ہر طرف اللہ ہی اللہ ہے ۔ یہ دل اللہ ہی کو محسوس کرتے ہیں ۔ اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ ان کو نظر نہیں آتی ۔ اللہ کے سوا کوئی جائے فرار نظر نہیں آتی ۔ اللہ کے دائرہ علم سے وہ نہیں نکل سکتے ۔ اللہ کی طرف رجوع کے سوا کوئی جائے قرار نہیں ہے اور جہاں بھی وہ جاتے ہیں اللہ کا وجہ کریم نظر آتا ہے ۔

اس مطلع میں خصائص ربوبیت پر بحث کی گئی ہے جو اس کائنات میں فعال' موثر اور اس کی خالق ہے ۔ ہر چیز کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے ۔ ہر چیز پر وہ محیط ہے ۔ ہر چیز کی علیم ہے ۔ یہ ذات اس پوری کائنات کی پیدا کرنے والی ہے ۔ انسان کے دلوں کے رازوں کو جاننے والی ہے ۔ دلوں کے خفیہ رازوں کو جانتی ہے اور وہ اس پوری کائنات اور پوری انسانیت کی نگران ہے ۔

اس سورۃ کا آغاز یوں تعریف ذات باری سے ہوتا ہے اور یہ پوری کائنات اللہ کی تسبیح کرنے لگتی ہے ۔ زمین و آسمان کی ہر چیز گنگنا رہی ہے اور ہر دل جو ہدایت کے لئے کھلا ہے' وہ اسے خود سن رہا ہے ۔ اگر اس پر حجاب پڑا ہوا نہ ہو ۔ اس آیت کو اپنے ظاہر مفہوم سے بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اللہ کا فرمان ایسا ہی ہے اور ہم اس کائنات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے ' اس لئے اللہ جو کچھ فرماتا ہے اس کائنات کے خصائص بعینہ ویسے ہیں جس طرح ہمیں اللہ نے بتائے ہیں ۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۷ : ۱) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ "اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو زمین اور آسمانوں میں ہے ۔" اس لئے اس میں کوئی تبدیلی اور تغیر نہیں ہے ۔ لہذا ہمیں یقین کر لینا چاہئے کہ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اس کی ایک روح ہے اور یہ روح کائنات اپنے خالق کی تسبیح کرتی ہے اور یہی وہ مفہوم ہے جس کی تصدیق صحیح آثار و احادیث میں بیان کی گئی ہے ۔ جیسا کہ بعض اہل دل کے تجربات بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں جس وقت یہ دل اپنی صفائی اور اشراق کی حالت میں ہوتے ہیں اور وہ اس حقیقت سے متصل اور مربوط ہو جاتے ہیں جو اشیاء میں چھپی ہوتی ہے جو ان تمام چیزوں اور ان کی شکلوں کے پیچھے ہے یعنی روح کائنات ۔

قرآن کریم میں ہے ۔

يَا جِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرُ لہذا پہاڑ اور پرندے حضرت داؤد کے لئے یکساں تھے اور حدیث میں آیا ہے امام مسلم نے جابر ابن سمرہ کی روایت نقل فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان بمکه حجرا کان لیسلم علی لیالی بعثت و انی لاعرفه الان "مکہ میں ایک پتھر ہے جو مجھ پر ان دنوں سلام کہتا تھا جب مجھے نبی بنا کر بھیجا گیا تھا اور وہ مجھے اب بھی معلوم ہے ۔"

امام ترمذی نے اپنی سند سے 'حضرت علی ابن ابو طالب سے روایت کی ہے "میں رسول اللہ کے ساتھ مکہ میں تھا' ہم مکہ کے اطراف میں سے ایک طرف میں نکل گئے۔ رسول اللہ کے سامنے جو درخت اور پتھر پہاڑ بھی آیا اس نے کہا السلام علیک یا رسول اللہ" کہا اور امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت انس ابن مالک سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ایک کھجور کے تنے کے پہلو میں خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب انہوں نے حضور کے لئے منبر بنا لیا اور حضور نے اس پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا تو کھجور کے تنے نے اس طرح فریاد کی جس طرح اونٹنی فریاد کرتی ہے۔ رسول اللہ منبر سے اترے اور اس پر ہاتھ پھیرا تو وہ خاموش ہو گیا۔

اس حقیقت کے اظہار میں خود قرآن کی آیات صریح ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِیْحَهٗ (٢٤ : ٤١) "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں' اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں؟ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے۔" اور دوسری جگہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ (٢٢ : ١٨) "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سر بسجود ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں' سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان۔"

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ "کوئی چیز ایسی نہیں ہے اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔" لہٰذا اس قسم کی نصوص کی تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خصوصاً اس مقصد کے لئے کہ ہم ان آیات کو ایسے اصول موضوعہ کے ساتھ موافق کر دیں جو قرآن سے ماخوذ نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس دنیا کے تمام موضوعات کو اس قرآن کے ساتھ مطابق ہونا چاہئے جو یقیناً خالق کی طرف سے نازل ہوا ہے اور ہمارے بنائے ہوئے اصول شکی ہیں اور ہمارے بنائے ہوئے ہیں۔

وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (٥٧ : ١) (اور وہ زبردست اور دانا ہے) زمین و آسمان کی مخلوقات اس کی تسبیح اس لئے کرتی ہے کہ وہ زبردست اور دانا ہے اور اس کی حکمت انتہائی حکمت ہے قائل ہے وہ اپنی قوت قاہرہ کے ذریعہ تمام اشیاء پر حاوی ہے اور اس نے ہر چیز کو اپنی حکمت کے مطابق تخلیق کیا ہے۔

ابھی اس افتتاحی آیت کا فیض عام جاری تھا اور ہم پوری کائنات کے ساتھ جشن تسبیح میں مصروف تھے کہ سیاق کلام میں کائنات بالا کا ایک نیا سفر شروع ہو گیا۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵۷ : ۲)

"زمین اور آسمان کی سلطنت کا مالک وہی ہے ' زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

آسمان اور زمین کی ہر چیز نے تسبیح کی ہے اللہ کی ' جو مالک سموت والارض ہے اور اس کی ملکیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ پس یہ تسبیح ہے از جانب غلام بحق آقا۔ یہ مالک کوئی دنیاوی مالک نہیں ہے۔ یہ تو موت و حیات کا بھی مالک ہے۔ وہ موت و حیات کا بھی خالق ہے۔ اس نے ہر زندہ کے لئے حیات اور ہر مرنے والے کے لئے موت مقدر کر دی ہے۔ لہذا حیات و ممات اس کی تقدیر کے مطابق ہوتے ہیں۔

حیات ابھی تک تو راز ہے اس کا سرچشمہ بھی اللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ آج تک کوئی اللہ کے سوا اور کوئی سرچشمہ حیات نہیں بتا سکا نہ کوئی اس کی کیفیت آمد بتا سکا ہے اور یہ تو بڑی باتیں ہیں آج تک انسان حیات و ممات کی حقیقت بھی نہیں سمجھ سکے کہ یہ کیا ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ ہی حیات دیتا ہے۔ ہر زندہ چیز کو حیات اللہ ہی دیتا ہے۔ کوئی شخص آج تک اس کا انکار نہیں کر سکا اور نہ اس کی ضد کو ثابت کر سکا ہے۔ اس طرح موت بھی ایک راز ہے جس کے اوپر پردے ہیں۔ کوئی شخص موت کی طبیعت اور ماہیت کو بھی نہیں جانتا۔ کوئی شخص موت کو پیدا نہیں کرتا کیونکہ جو حیات نہیں دے سکتا وہ اسے سلب بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سب چیزیں اللہ کی ملکیت مطلقہ ہیں۔ اس لئے زمین و آسمان میں جو چیزیں بھی ہیں ان کو حیات بھی وہی دیتا ہے اور ان کو ممات بھی وہی دیتا ہے۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵۷ : ۲) "اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے بغیر حدود و قیود کے۔ اس کی مشیت مطلق ہے کسی حدوقید کے اندر محدود و مقید نہیں ہے۔ اس کی مشیت کا رابطہ ہر چیز سے ہوتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے ' ہوتا ہے۔ انسانی عقل اللہ کی قدرت پر اگر کوئی بندش لگاتی ہے خواہ جس رنگ میں ہو اور جس قسم کی ہو' جس انداز کی ہو وہ باطل ہے۔ وہ عقل بشری کی پیداکردہ سوچ ہے جو بذات خود محدود ہے۔ اور اللہ کی مشیت نے اس کائنات کے لیے جو قوانین قدرت اور نوامیس فطرت مقرر کیے ہیں۔ وہ اللہ کی مشیت مطلقہ میں داخل ہیں کہ وہ بلاحدود و قیود کام کر رہی ہے۔ کیونکہ اللہ کی مشیت ان نوامیس فطرت کو آزادی سے اختیار کرتی ہے۔ اور ان قوانین قدرت کو اللہ کبھی کبھی توڑتا بھی ہے۔

قرآن کریم نے اس نکتے کو بہت اہمیت دی ہے۔ بار بار اس بات کی تصریح کی جاتی ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہاں تک کہ وہ خود اپنے بنائے ہوئے قوانین قدرت کے اجراء کو بھی روک سکتا ہے۔ تاکہ یہ حقیقت واضح ہو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اس میں کسی شے کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اللہ نے اہل جنت کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور اہل جہنم کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ وہ جہنم میں رہیں گے اور یہ وعدہ اللہ کی مشیت کے نتیجے میں صادر ہوا ہے لیکن اللہ نے اپنی آزادی کو اس عہد کے دائرے سے ہی خارج رکھا ہے اور مستثنیٰ کیا ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ "وہ اس میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے"۔ جہاں بھی اس قسم کی بات آئی وہاں الا ماشاء اللہ کے الفاظ آئے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ خود اپنے فیصلوں کا پابند نہیں ہے۔ اس سلسلے میں عقلی گھوڑے

دو ڑانا جائز نہیں ہے ۔ قرآن ہی اصل سرچشمہ ہے ۔

اس آیت کے ذریعہ اس پوری کائنات پر اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور مطلق مشیت کو ثابت کیا گیا ہے چونکہ وہ قادر مطلق ہے اس لیے اس کی تسبیح بھی ہر چیز کرتی ہے ۔

اللہ کے اقتدار بے قید کے ثبوت اور اس کے فیضان عام سے اس کائنات کے جام جام کو لبالب کر دینے کے بعد اب ایک دوسری عظیم حقیقت سامنے لائی جاتی ہے ۔ یہ کہ اللہ کے سوا باقی چیزوں کا وجود ہی اصلی نہیں ہے ۔ موجود حقیقی اور واجب الوجود صرف اللہ تعالیٰ ہے ۔ وہی تمام عالم کو محیط ہے اور وہی ہرچیز کا علیم ہے ۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۵۷ : ۳) "وہی اول ہے اور آخر بھی ہے اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی ہے اور وہ ہرچیز کا علم رکھتا ہے" وہ اول یوں ہے کہ اس سے ماقبل کوئی چیز نہیں ہے ۔ آخر یوں ہے کہ اس کے بعد کوئی چیز نہ ہوگی وہ ظاہر ہے یعنی اس کے اوپر کوئی چیز نہیں ہے اور وہ باطن ہے یعنی اس سے نیچے کوئی شیئی نہیں ہے ۔

اول اور آخر کے الفاظ حقیقت زمانیہ کا استیعاب کرتے ہیں اور ظاہر اور باطن حقیقت مکانیہ کا استیعاب کرتے ہیں ۔ مطلقاً ہر زمانے میں وہ موجود ہے اور مطلقاً ہر مکان میں وہ موجود ہے ۔ اور کسی زمان و مکان میں قید نہیں ہے ۔ اس تصور کے مطابق صرف وہی ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں ہے اور ہمارا قلب اور ہمارا تصور بھی اسی سے وجود اخذ کرتا ہے ۔ لہٰذا وجود الٰہی ہی حقیقی وجود ہے اور اللہ ہی حق ہے اور اللہ ہی حقیقت ہے اور کوئی حقیقت ہے تو وہ اللہ سے مستفاد ہے ۔ نہ کسی اور کے پاس ذاتی حقیقت ہے اور نہ ذاتی وجود ہے' اس پوری کائنات میں ۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۵۷ : ۳) "اور وہ ہرچیز کا علم رکھتا ہے"۔ وہ حقیقی اور کامل علم رکھتا ہے ۔ اس لیے کہ تمام اشیاء کی حقیقت تو ادھر ہی سے آئی ہوئی ہے لہٰذا اللہ کے ذاتی علم میں ہے ۔ اور اللہ کا علم ایسا ہے کہ اس کی حقیقت' اس کی نوعیت اور اس کی صفات میں کوئی بھی شریک نہیں ۔ کسی اور کے پاس ایسا علم نہیں ہے ۔ چاہے مخلوق کو جس قدر ظاہری معلومات بھی ہوں ۔

جب کسی دل میں یہ حقیقت بیٹھ جاتی ہے تو اسے پھر اللہ کی ذات کے سوا کسی اور چیز کی پرواہ ہی نہیں رہتی ۔ کوئی چیز یہاں تک کہ انسانی قلب و عقل کوئی حقیقت اور کوئی وجود نہیں رکھتے مگر وہی جو اس حقیقت کبریٰ نے عطا کیا ہوتا ہے ۔ ہر چیز وہم ہے' جانے والی ہے ۔ صرف اللہ ہی باقی رہنے والا ہے ۔ اور وہی ایک حقیقی وجود ہے ۔

جب کوئی دل اس حقیقت کو اپنے اندر بٹھالے تو وہ اس حقیقت تک رسائی حاصل کر لیتا ہے ۔ وہ ایک نہایت ہی بلند مرتبہ سکون و قرار تک پہنچ جاتا ہے ۔ لیکن جب تک وہ اس رتبہ حصول الی الحقیقت پر فائز نہیں ہو جاتا اسے چاہئے کہ وہ اس آیت پر تدبر کرتا رہے اور یہ کوشش کرتا رہے کہ وہ اس کے مدلول اور حقیقت تک پہنچ جائے' اس آیت کا مفہوم ہی بڑی حقیقت ہے ۔

اہل تصوف نے اسی حقیقت' عظیم حقیقت کو پکڑ لیا ۔ انہوں نے اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا اور اس میں انہوں نے کئی کئی راستے نکالے ۔ بعض نے کہا کہ وہ اس کائنات کی ہرچیز میں اللہ کو دیکھتے ہیں ۔ بعض نے کہا انہوں نے دیکھا کہ ہرچیز

کے پیچھے اللہ کھڑا ہے ۔ بعض نے کہا کہ اس نے اللہ کو دیکھا ہے اور اس کائنات میں تو اسے اللہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر ہم الفاظ کی کمی بیشی اور الفاظ کی تنگ دامانی کو نظرانداز کر دیں تو یہ سب اقوال اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ' لیکن متصوفین پر جو تنقید کی جا سکتی ہے ۔وہ صرف یہ ہے انہوں نے اس تصور کو اپنے اوپر اس قدر طاری کر دیا ہے کہ عملی زندگی کو معمل کر دیا۔ جبکہ اسلام کا متوازن انداز یہ تھا کہ انسان کے دل و دماغ اس حقیقت کو اخذ کریں' اس کے اندر رہیں اور بسیں لیکن وہ اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت بھی ادا کریں جس کے لیے اللہ نے ان کی تخلیق کی ہے ۔اور اس کے تمام تقاضے پورے کریں جن میں سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ اس کائنات میں وہ نظام زندگی قائم کریں جو اللہ نے اس قرآن میں نازل فرمایا ہے ۔اس خیال سے کہ اس عظیم حقیقت کے تصور ہی کے مطابق اس دنیا میں انسان کو اپنی زندگی بسر کرنی ہے ۔یہ نظام فطرت انسانی کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس طرح اللہ نے اسے پیدا کیا ہے اور جس طرح اس نے قرآن کو بطور ہدایت نامہ بھیجا ہے ۔

---ooo---

اس عظیم حقیقت کو قلب میں بٹھانے کے بعد اب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس حقیقت کبریٰ کا ظہور اس کائنات میں کیونکر ہوا؟

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (٤) لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (٥) یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَهُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (٦) (۵۷: ۴ تا ۶) "وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا۔اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو' جو کام بھی تم کرتے ہو' اسے وہ دیکھ رہا ہے ۔ وہی زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات فیصلے کے لیے اسی کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں ۔وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے"۔

زمین و آسمان کی تخلیق کی حقیقت 'عرش پر استوا کی حقیقت اور پوری مخلوقات کا احاطہ اور کنٹرول اور ان تمام اشیاء کا علم اور یہ حقیقت کہ اللہ ہر چیز کے ساتھ موجود ہے جہاں بھی وہ ہو ۔اور یہ کہ تمام امور کا مرجع اللہ کی طرف ہے ' اور یہ کہ وہ اس پوری کائنات میں متصرف ہے ۔ اور یہ کہ وہ دلوں کے رازوں اور سوچوں کو بھی جاننے والا ہے ۔یہ سب حقائق اسی بڑی حقیقت سے نکلے ہوئے ہیں جس کا اوپر ذکر ہوا۔ لیکن ان چیزوں کو دوبارہ اس کائناتی جزئیات کے ساتھ متعلق کر کے ذکر کرنے کا قلب پر اثر ہوتا ہے اور اس پر قدرت الٰہیہ کا پرتو پڑتا ہے ۔ یہ آسمان اور یہ زمین اور یہ عظیم

کائنات جب انسانی سوچ کا مرکز بنتے ہیں تو اپنی عظمت اور جلالت کے باعث 'اپنی خوبصورتی اور نظام کے باعث 'اپنے پیچیدہ نظم و نسق کے باعث 'اپنی منظم حرکات کے باعث 'اپنے تسلسل کی وجہ سے یہ انسانی قلب و نظر کو بے حد متاثر کرتے ہیں - پھر یہ مخلوقات بھی انسانوں جیسی مخلوق ہیں لہٰذا انسانی دل ان کے ساتھ ایک قسم کا انس اور محبت رکھتا ہے 'جب انسان کا دل و دماغ اس عظیم کائنات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں تو فکر و نظر کی تاروں پہ ضربات پڑتی ہیں اور ان سے نئے نئے فکری زمزمے نکلتے ہیں - انسان ان کی طرف کان دھرتا ہے 'بڑے غور سے سنتا ہے 'مسحور ہو جاتا ہے - یہ نغمے اسے کیا پیغام دیتے ہیں کہ اللہ جس نے ان کو پیدا کیا ہے 'اس نے اس کو بھی پیدا کیا ہے - یہ سب چیزیں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور انسان بھی اللہ کی تسبیح کرتا ہے - یہ چیزیں بتاتی ہیں کہ ہم نے بھی اپنا وجود خالق کائنات سے لیا ہے اور تم نے بھی - لہٰذا اس کائنات میں صرف وہی ایک حقیقت ہے جو اہم ہے -

یہ چھ دن کیا ہیں؟ ان کی حقیقت بھی صرف اللہ ہی جانتا ہے - ہمارے دنوں کی حقیقت ہی کیا ہے؟ یہ تو سورج کے سامنے زمین کی گردش محوری کا نتیجہ ہیں - اور یہ سورج اور یہ زمین تو اللہ کے ایام کے بعد وجود میں آئے ہیں - لہٰذا یہ وہ ایام نہیں ہیں جن میں اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا - لہٰذا اس کو بھی اللہ پر چھوڑ دیں جب چاہے گا ہمیں بتا دے گا -

اور یہ عرش الٰہی 'ہم اس پر اس طرح ایمان لاتے ہیں جس طرح اللہ نے اس کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں - رہی یہ بات کہ اللہ نے عرش پر استوا حاصل کیا تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس سے مراد اس کائنات پر مکمل کنٹرول ہے - کیونکہ قرآن مجید نے یہ بات واضح طور پر کہہ دی ہے کہ اللہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل نہیں ہوتا - اس لیے کبھی ایسا نہ تھا کہ وہ کسی وقت عرش پر نہ ہو اور بعد میں متمکن ہوا ہو - اور یہ بات کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہمیں اس کی کیفیت معلوم نہیں ہے 'یہ ایک ایسی بات ہے جو -

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (۵۷ : ۴) "پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا" کی تشریح نہیں کرتا - لہٰذا اسے اس کائنات کے اقتدار اعلیٰ اور کنٹرول سے کنایہ کہنا چاہئے اور اس قسم کی تفسیر سے اس اصول کی خلاف ورزی نہیں ہوتی جو ہم نے ابھی بیان کیا ہے - کیونکہ اس کنایہ میں ہم نے اپنا کوئی خیال پیش نہیں کیا بلکہ قرآن کی ایک طے شدہ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ مہیمن ہے - اور اس تصور کی طرف اشارہ کیا ہے جو ذات باری خود دیتا ہے -

تخلیق اور کنٹرول اور مکمل علم کے ساتھ 'یہ آیت اس حقیقت کو ایک ایسی تصویری انداز میں پیش کرتی ہے کہ قلب و نظر اس میں گم ہو جاتے ہیں 'یہ تصویر بہت وسیع ہے 'بلکہ یہ تصویر مسلسل حرکت میں ہے 'یہ حرکت کسی بھی وقت رکتی نہیں ہے - یہ محض تصوراتی تصویر نہیں ہے اور نہ شعلہ خیال ہے بلکہ ایک موثر اشاراتی رنگ ہے جو انسانی دل و دماغ کے ہر پہلو کو بھر دیتا ہے 'اس سے انسان کے دل دھڑکتے ہیں 'خیال کی لہریں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور فکر کے سوتے پھوٹتے رہتے ہیں - ذرا غور سے پڑھئے :

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا

(۵۷ : ۴) "اس کے علم میں ہے جو زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے '

اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے"۔ ہر لمحہ زمین کے اندر جاندار اور بے جان چیزوں کی بے شمار تعداد داخل ہوتی ہے۔ اور اسی طرح ہر لحظہ زمین سے ۔لاتعد ولاتحصی زندہ اور غیر زندہ اشیاء نکلتی ہیں۔ آسمان سے جو بارشیں برستی ہیں جو شعاعیں یہاں مختلف ستاروں سے پہنچتی ہیں' شہاب ثاقب جو گرتے ہیں' فرشتے جو اترتے ہیں راز اور اقدار جو اترتی ہیں اور جو چیزیں آسمانوں میں چڑھتی ہیں' جو نظر آتی ہیں اور جو نظر نہیں آتیں جن کی تعداد کا علم صرف اللہ کو ہے۔ غرض یہ مختصر سی آیت ایک مسلسل حرکت کی طرف خیال کو پھیرتی ہے جو کبھی منقطع نہیں ہے اور ان بڑے بڑے واقعات کی طرف اشارہ کرتی ہے جن کی تعداد معلوم نہیں ہے۔ اور انسان کا خیال مسلسل اس حرکت کے ساتھ چپک جاتا ہے کیونکہ زمین میں ہر وقت چیزیں داخل ہو رہی ہیں۔ اور آسمان کی طرف ہر وقت چیزیں چڑھ رہی ہیں۔ اس طرح انسان اللہ کے علم کی وسعت سے متاثر رہتا ہے۔ جب انسان ان لاتعداد چیزوں کو دیکھتا ہے اور شمار نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی دل اس حقیقت کی طرف دائما التفات رکھے تو وہ اللہ کی معیت میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔ وہ اس کی مملکت میں سیر کر سکتا ہے' جبکہ اس کا جسم اپنی جگہ برقرار ہو گا' وہ اس کائنات کی وادیوں کی سیر کر سکتا ہے اور وہ نہایت حساسیت اور صاف و شفاف سوچ کے ساتھ نہایت خوف و تقویٰ کی حالت میں ملکوت سماوات میں گھوم پھر سکتا ہے۔

ابھی پڑھنے والا ان خیالات کے ساتھ زمین و آسمان کی وادیوں میں گھوم رہا تھا کہ قرآن نے اس کا دامن پکڑ لیا کہ ذرا اپنی ذات کی وادی میں بھی سیر کرو' جب وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ اپنی ذات کی وادیوں میں گھومتا ہے تو باری تعالیٰ کو وہاں بھی موجود پاتا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے وہ جانتا ہے اور وہ بہت قریب ہے شہ رگ سے بھی زیادہ!

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۵۷ : ۴) "وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے"۔ یہ کوئی مجاز نہیں ہے' یہ ایک حقیقت ہے۔ اللہ ہر کسی کے ساتھ موجود ہے۔ ہر چیز کے ساتھ موجود ہے۔ ہر وقت موجود ہے۔ ہر مکان میں موجود ہے۔ وہ بندوں کے ہر عمل سے خبردار ہے اور دیکھتا ہے اگر کوئی صرف اس حقیقت کو دل میں بٹھا لے تو یہ ایک عظیم حقیقت ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ ایک پہلو سے انسان کو سراسیمہ کر دیتی ہے اور ایک پہلو سے انسان کو امید اور محبت عطا کرتی ہے۔ بس یہی ایک حقیقت اگر کسی انسان کے قلب میں بیٹھ جائے تو اسے بلند کرنے اور پاک و صاف کرنے کے لیے یہ کافی ہے۔ انسان اس دنیا کی تمام دلچسپیوں اور مطلب پرستیوں سے دامن چھڑا کر اللہ کا ہو جاتا ہے اور پھر وہ ہر معاملے میں بہت محتاط' خشیت اور خوف خدا سے سرشار اور ہر گندگی میں پڑنے سے رک جاتا ہے کیونکہ اس کو اللہ سے حیا آتی ہے۔ اب وادی ملکوت السموات والارض کی سیر ایک دوسرے زاویہ سے۔ یہ سیر ذرا اس سیر سے مختلف قسم کی ہے جو پہلے مذکور ہوئی۔

لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ (۵۷ : ۵) "وہی زمین و آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات فیصلے کے لیے اس کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں"۔ سماوات اور ارض کا ذکر پہلے تخلیق کے سلسلے میں ہوا اور حیات و ممات کے نقطہ نظر سے ہوا۔ اور قضا و قدر کے زاویہ سے ہوا۔ یہاں اس زاویہ سے کہ ان کے فیصلے اللہ بادشاہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ جب اللہ ہی مالک ہے تو فیصلے کرنا بھی اس کے اختیار میں ہے۔

جب انسان میں یہ شعور پختہ ہو جائے تو پھر وہ ہر معاملے میں اللہ کی رضا دیکھتا ہے۔ اپنے کاموں کے آغاز میں بھی اور انتہا میں بھی وہ دیکھتا ہے کہ اللہ کی مرضی کیا ہے۔ یہ شعور انسان کو غیر اللہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور ہر معاملے میں اللہ کا نیاز مند کر دیتا ہے اور اسے تنہائی میں اور سوسائٹی میں ہر جگہ اللہ کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے۔ اس کی حرکت اور سکون' اس کا مشورہ اور اس کی سوچ سب اللہ کی نگرانی میں ہوتی ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ اسے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں اور اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

اس سورہ کا یہ پہلا پیراگراف ایک ایسی حرکت پر ختم ہوتا ہے جو اس کائنات میں دست قدرت کا مظہر ہے' جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں تک اترتی ہے۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَ هُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۵۷ : ۶) "وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے"۔ رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں داخل ہونا ایک مسلسل حرکت ہے' لیکن یہ نہایت ہی لطیف حرکت ہے' بظاہر پر سکون نظر آتی ہے۔ اس کے معنی چاہے یہ ہوں کہ رات اور دن چھوٹے بڑے ہوتے رہتے ہیں' رات کا ایک حصہ دن کو دیا جاتا ہے یا دن کا ایک حصہ چھوٹا کر کے رات کو دیا جاتا ہے' یا طلوع و غروب کے وقت ان کا باہم تداخل مراد ہو' لیکن یہ ایک مسلسل لطیف حرکت ہے۔ اور دلوں کے اندر ایک حرکت ہے۔ اور یہ خیال کی حرکت ہے۔ اور یہ ہر وقت دل میں ہوتی ہے۔ دلوں والی ہے' یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔ یہ انسانی شعور کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے' جو رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے' نہایت ہی لطیف شعور ہے۔ اور یہ شعور کہ اللہ دلوں کے لطیف ترین اور مخفی تصورات کو بھی جانتا ہے' ایک عظیم چیز ہے!

---ΟΟΟ---

اس سورت کا یہ پہلا پیراگراف انسانی احساس کو اس قدر تیز کر دیتا ہے کہ اب وہ ہدایات لینے کے لیے تیار ہے۔ لہٰذا اب اسلامی جماعت کو حکم دیا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اور مناسب وقت میں انفاق فی سبیل اللہ کا مظاہرہ کرو۔ یہ ہدایت ایسے حالات میں دی جاتی ہے کہ انسان کا اندرونی اور اس کے قلب کی طرف جانے والے تمام راستوں کے دروازے کھلے ہیں' اس کا شعور بیدار ہے' وہ سننے کے لیے بے تاب ہے۔ چنانچہ اسی حالت میں یہ پکار آتی ہے۔ لیکن یہ بھی اپنے اندر نہایت اثر انداز ہونے والے دلائل' اور جھنجھوڑنے والی تنبیہات کے ساتھ آتی ہے۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝ وَ مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

مُّؤْمِنِیْنَ ۝ هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَی النُّوْرِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝۹ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ
الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ
وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝۱۰ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ ع ۱۰
اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَ لَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۝۱۱ یَوْمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَ ۱۷
الْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰی نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ
تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝۱۲ یَوْمَ
یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِیْلَ
ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِیْهِ
الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝۱۳ یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا
بَلٰی وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰی
جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۱۴ فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْیَةٌ وَّ لَا
مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِیَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝۱۵

"ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ رسول تمہیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور وہ تم سے عہد لے چکا ہے۔ اگر تم واقعی ماننے والے ہو۔ وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔ تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد

کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے - جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے - ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے - اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں - جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے - کون ہے جو اللہ کو قرض دے ؟ اچھا قرض ' تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے اور اس کے لیے بہترین اجر ہے - اس دن جب کہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا - (ان سے کہا جائے گا کہ) آج بشارت ہے تمہارے لیے جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی ' جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے - یہی ہے بڑی کامیابی - اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہو گا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے ذرا ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں - مگر ان سے کہا جائے گا " پیچھے ہٹ جاؤ ' اپنا نور کہیں اور تلاش کرو - " پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا - اس دروازے کے اندر رحمت ہوگی اور باہر عذاب - وہ مومنوں سے پکار پکار کر کہیں گے " کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے " ؟ مومن جواب دیں گے - " ہاں ' مگر تم نے اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالا ' موقع پرستی کی شک میں پڑے رہے ' اور جھوٹی توقعات تمہیں فریب دیتی رہیں ' یہانتک کہ اللہ کا فیصلہ آگیا ' اور آخر وقت تک وہ بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملہ میں دھوکا دیتا رہا - لہذا آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنہوں نے کھلا کھلا کفر کیا تھا - تمہارا ٹھکانا جہنم ہے ' وہی تمہاری خبرگیری کرنے والی ہے اور یہ بدترین انجام ہے - "

یہاں اللہ تعالیٰ اب ان دلوں سے مخاطب ہے جن کو خود اس نے پیدا کیا ہے - اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ان دلوں میں بات داخل کرنے کی راہیں کیا ہیں - کیونکہ ان کے حالات سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے - خفیہ ترین خیالوں سے بھی اللہ باخبر ہے - اللہ کو معلوم ہے کہ دلوں میں ایمان کس طرح بیٹھتا ہے - دل غیر ایمانی شوائب سے کس طرح پاک ہوتا ہے اور یہ ایمان پھر کس طرح عملی زندگی میں ایک بڑے درخت کی طرح اگتا ہے ' اور انسان انفاق فی سبیل اللہ اور اللہ کے راستے میں کس طرح بڑھ کر جان تک قربان کر دیتا ہے - یہ وہ مقام ہے جو انسانی قوت سے بہت بڑا ہے ' اور اس کے حصول کے لیے بہت بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے - یہی وجہ ہے کہ اللہ اپنی مخلوق کو تربیت دینے کے لیے اس قسم کے دلائل اور موثرات اور ہدایات دیتا ہے - پوری کائنات کے حقائق اس کے سامنے پیش کرتا ہے کہ حضرت انسان ان سے متاثر ہو ' اور دنیا کی تمام چیزوں کو اللہ کے ترازو سے تولے اور ناپے - اللہ بار بار اور قدم قدم پر انسان کی تربیت کے لیے یہ انتظام فرماتا ہے - اور صرف یہ نہیں کہ سیدھا سادا حکم دے دیا جائے کہ اہل ایمان درج ذیل باتوں پر عمل کریں - قرآن نہ اس قسم کا خشک سرکلر جاری کرتا ہے نہ خشک قانون بناتا ہے بلکہ وہ ہر جگہ اطمینان بخش دلائل دیتا ہے - ہر وقت انسانی سوچ کی تاروں کو چھیڑتا ہے - انسانوں کی تربیت کے لیے قرآنی انداز اور منہاج اس قابل ہے کہ اسلامی انقلاب کے داعی اس پر بہت غور کریں - اسے سمجھیں اور اس پر عمل کریں - اس سورت کے آغاز میں جو موثر دلائل اور اشارات دیئے گئے تھے وہ دلوں پر گہرے اثرات چھوڑنے والے تھے - ان کو پڑھ کر سخت سے سخت دل موم ہو جاتے ہیں اور نہایت ہی خوابیدہ اور مدہوش شعور بھی جاگ اٹھتا ہے - لیکن قرآن کریم انہیں دوسرے پیرے میں بھی ان کو مسلسل جھنجھوڑتا ہے اور ایما اور تلقین جاری ہے - ہدایات اور ارشادات بھی جاری ہیں اور ساتھ ساتھ دلائل و اشارات بھی جاری ہیں -

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ (۵۷ : ۷) "ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے"۔

یہاں اس آیت کے مخاطب مسلم ہیں بلکہ نہایت قدیم اور دور اول کے مومن ہیں۔ لیکن ان کو بھی کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور رسول اللہ پر۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے دلوں کے اندر حقیقت ایمانیہ پیدا کرو' یہ ایک گہری ہدایت ہے اور گہرا نکتہ ہے کیونکہ بلایا تو اس طرف جا رہا ہے کہ اللہ کی راہ میں انفاق کرو' لیکن اس سے پہلے ہی یہ اشارہ دے دیا کہ اپنے دلوں کے اندر حقیقت ایمانی پیدا کرو' اور اس انفاق کے حکم کے بعد بھی ایک اشارہ اور ہدایت کہ تم جو کچھ خرچ کر رہے ہو وہ اپنے مال سے نہیں خرچ کر رہے' یہ تو اللہ کا مال ہے اور اس نے تمہاری نگرانی اور خلافت میں دے دیا ہے۔ کیونکہ ابھی تمہیں یہ سمجھایا گیا ہے کہ۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ "زمین و آسمانوں کی بادشاہت اور ملکیت اسی کی ہے"۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے انسانوں کو اس زمین پر ایک محدود خلافت اور نیابت دی ہے۔ زندہ کرنے اور مارنے والا تو وہ ہے۔ یوں اس نے تمہیں زمین میں نسلا بعد نسل خلیفہ بنایا ہے۔

سورت کے آغاز میں جو اصولی باتیں بیان کی گئی تھیں' یہ ہدایات ان کے ساتھ مربوط ہو جاتی ہیں۔ اور یہ سب تصورات اب مل کر اہل ایمان کو قائل کرتے ہیں کہ وہ مالک جس نے تمہیں اس زمین پر' اس کے خزانوں پر خلیفہ بنایا ہے' تمہیں اس نے سب کچھ دیا ہے' بتاؤ وہ اپنی ہی دولت کا ایک حصہ تم سے مانگ رہا ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا' دو گے اللہ کو کچھ' دیکھو اللہ ہی دینے والا ہے' اس کے خزانوں میں کمی نہیں ہے۔ تم کیوں ہاتھ کھینچے ہوئے ہو' یہ تو اسی کا ہے؟

فقط اس پر بھی بات ختم نہیں ہے کہ دلائل دیئے' قائل کیا اور نہایت فہمائش اور محض امید پر' بلکہ اس کے بعد ایک اور موثر خطاب آتا ہے کہ اس انفاق کا ایک نہایت ہی بڑا معاوضہ بھی تمہیں ملے گا۔ اس کا فضل و کرم بھی تم پر ہوگا۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ (۵۷ : ۷) "جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لیے بڑا اجر ہے"۔ اب کون ہے جو ایمان کا دامن چھوڑ کر پیچھے رہ سکتا ہے۔ کون ہے جو انفاق سے پیچھے رہ سکتا ہے' اور کون ہے جو اپنے آپ کو اس فضل و کرم سے محروم کر سکتا ہے؟

لیکن ابھی بات یہاں بھی ختم نہیں ہے اب ان چٹکیوں اور دلائل' ہدایات و اشارات کے بعد ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وقت کو بھی دیکھو' حالات کی نزاکت کا احساس بھی کرو' اس وقت کے حالات پیش کر کے کہا جاتا ہے کہ وقت کا تقاضا کیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸) هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۹) (۵۷ : ۸ - ۹) "تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ

پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ رسول تمہیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور وہ تم سے عہد لے چکا ہے ۔ اگر تم واقعی ماننے والے ہو ۔ وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے 'اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے "۔

آخر ایمان کی راہ میں رکاوٹ کیا ہے ؟ ایمان تو وہ لا چکے ہیں ایمان لانے کا حق یہاں مطلوب ہے ۔ پھر دعوت ذات رسول کی طرف سے ہے 'جن کے ہاتھ پر تم بیعت کر چکے ہو' پختہ وعدہ کر چکے ہو ۔ اور پھر آسمانوں سے آیات بینات کی پے درپے موسلا دھار بارش ہو رہی ہے ۔ یہ آیات تمہیں اندھیروں 'شک اور حیرانی سے نکال رہی ہیں ۔ ہدایت و یقین اور اطمینان کی روشنی تمہیں دی جا رہی ہے ۔ ایسے حالات میں جن میں تم پر رحمتوں کی بارشیں ہو رہی ہیں ۔

نبی آخر الزمان کا کسی قوم میں موجود ہونا' ان کا اللہ کی زبان و کلام میں گفتگو فرمانا کلام اللہ پڑھ پڑھ کر سنانا تو تمہارے اور اللہ کے درمیان خود تمہارے مخصوص معاملات کے بارے میں نہایت ہی براہ راست رابطہ پیدا کر دیتا ہے ۔ اور یہ اس قدر عظیم نعمت ہے جس کا تصور نہ پہلے کسی نے کیا اور نہ بعد میں ہو سکے گا ۔ آج ہم چودہ سو سال کی دوری سے جب اسے سوچتے ہیں 'تو یہ دور' وحی کا دور' حیات رسول کا دور فی الواقع عظیم نعمتوں کا دور تھا' خوشیوں کا دور تھا' نیک بختیوں کا دور تھا' کیا ہی دور تھا' اللہ جل جلالہ' بذات خود رسول اللہ کی زبانی اپنے بندوں کو بتا رہا ہے ۔ نہایت رحمت' محبت اور کرم کے ساتھ 'لو یہ کام کرو' دیکھو اس سے بچو' یہ ہے راہ اس پر چلو' یہ دیکھو تم غلط ہو گئے ہو' یہ ہے میری رسی اسے پکڑو اور نکل آؤ گڑھوں سے 'کنوؤں سے 'توبہ کرو' توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے ۔

این درگہ ما درگہ نا امیدی نیست

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

آؤ دور تک نہ چلے جاؤ غلط راہوں پر' میری رحمت سے مایوس نہ ہو' وہ تو اس قدر وسیع ہے کہ سب کائنات اس میں ڈوب جاتی ہے ۔ اے فلاں تو نے یہ کہا ہے' یہ غلط ہے ۔ اے فلاں تو نے یہ سوچا ہے' یہ غلط ہے ۔ یہ تو گناہ ہے ۔ فلاں فلاں کاموں کا تو نے ارتکاب کیا ہے یہ غلط ہے ۔ آؤ' توبہ کرو اور میری رحمت میں داخل ہو جاؤ ۔ اے فلاں وہ فلاں فلاں چیزیں تمہیں روک رہی ہیں ان کو اتار پھینکو' فلاں تو نے یہ سوال کیا ہے یہ ہے جواب اس کا ۔ اور یہ کام جو تو نے کیا ہے اس کا یہ وزن ہے ۔

یہ لوگ جو اللہ کے ساتھ رہتے ہیں' جو اس کی مخلوق ہیں' جن کو اللہ تلقین فرماتا ہے جن کے ساتھ یوں ہمکلام ہوتا ہے ۔ یہ اپنے اندر تیز احساس رکھتے ہیں کہ اللہ ان کے ساتھ ہے اور وہ اللہ کے ساتھ ہیں ۔ یہ حقیقت ہے اور یہ واقعہ ہے رات کی تاریکیوں میں بھی اللہ ان کی فریادیں سن رہا ہے ۔ اور ان کو قبول کرتا ہے ۔ قدم قدم پر ان کی رہنمائی کرتا ہے اور ان کی طرف متوجہ ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات اس شخص کی سوچ سے بھی بلند ہے جو اس کے اندر نہ رہا ہو ۔ اس لیے آج ہم بھی کہہ سکتے کہ وہ یوں تھے ۔ لیکن ان آیات میں سب سے پہلے جن لوگوں کو خطاب کیا گیا وہ ایسے ہی حالات میں زندہ رہ رہے تھے ۔ اور ان لوگوں کو اس قسم کی تربیت یاد دہانی اور اکساہٹ کی ضرورت تھی ۔ لیکن اب اگر کوئی اس قسم کے تصور کو اپنے ذہنوں میں جمائے اور بسائے ہوئے ہے ہمارے اس گئے گزرے دور میں تو یہ اس فضل سے بھی بڑا فضل ہے ۔ یہ

بات زیادہ قابل قدر ہے کہ دور صحابہ سے دور پندرہویں صدی میں یہ تصور کرتا ہو۔

بخاری شریف کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے صحابہ سے کہا کہ تمہارے نزدیک کون سا مومن قابل تعجب اور صاحب فضل و کرم ہے' تو صحابہ کرام نے فرمایا فرشتے؟ تو حضورؐ نے فرمایا"وہ کیونکر ایمان نہ لائیں گے وہ ہیں ہی اپنے رب کے پاس"۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ پھر"انبیاء"۔ تو آپ نے فرمایا:"وہ کس طرح ایمان نہ لائیں جبکہ وحی ان پر نازل ہو رہی ہے"۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ پھر"ہم لوگ"۔ تو حضورؐ نے فرمایا: "تم کیوں ایمان نہ لاؤ' جبکہ میں تمہارے درمیان ہوں؟ بلکہ ایمان کے لحاظ سے افضل ترین لوگ وہ ہیں جو تمہارے بعد ہوں گے' ان کے پاس صحیفے ہوں گے اور وہ ان کے اندر پائی جانے والی تعلیمات پر ایمان لائیں گے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا کہ صورت حال میں بہت فرق ہے۔ ان لوگوں کے ہاں ایمان کے اشارات' اسباب اور دلائل بہت زیادہ تھے۔ عجیب و غریب تھے۔ بلکہ اگر وہ ایمان نہ لاتے تو قابل تعجب بات ہوتی۔ اس کے باوجود ان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ایمان کو اپنے نفوس کے اندر حقیقت بناؤ' اگر مومن ہو تو۔

اب موجبات ایمان اور دلائل ایمان سے آگے' دلائل انفاق اور موجبات انفاق کی طرف' مگر قدرے تاکید کے ساتھ اور تکرار کے ساتھ۔

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ

(۱۰:۵۷) "آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے"۔ اس میں اسی حقیقت کو دہرایا گیا ہے جو پہلے بیان ہوئی۔

لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ "اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور تمام امور فیصلے کے لیے اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں"۔ اللہ کی میراث' اس کا اقتدار اعلیٰ اور بادشاہت ہے اور جس کا اقتدار اعلیٰ ہے فیصلے بھی اسی کے ہیں اور جو اختیارات اللہ نے ان کے لیے دیئے ہیں وہ سب جلدی اسی کی طرف واپس ہو جائیں گے۔ اس لیے جب اللہ تمہیں دعوت انفاق دے رہا ہے اور یہ مال تو اسی کا ہے' اور اسی نے اس میں تصرف کے اختیارات تمہیں دیئے ہیں۔ اور یہ اسی کی طرف لوٹنے والا ہے لہٰذا بخل اور کنجوسی کے لیے کوئی جواز نہیں رہتا' اس خطاب میں بس یہی حقیقت ہے۔

منهم السابقون الاولون نے اللہ کی راہ میں جو کچھ ان کے بس میں تھا' خرچ کیا۔ یہ مہاجرین و انصار کے پاکیزہ لوگ تھے اور انہوں نے نہایت ہی مشکل دور میں یہ خرچ کیا۔ نہایت ہی شدید مشکلات کے دور میں انہوں نے مالی قربانی دی اور اس زمانے میں خرچ کیا جبکہ اسلام ہر طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ فتح مکہ یا حدیبیہ سے قبل کے زمانے میں اسلام کے دوست اور معاون قلیل تھے۔ دشمن زیادہ تھے۔ اور اس دور میں ان لوگوں نے جو خرچ کیا اس پر ان کو کوئی دنیاوی امید اور لالچ بھی نہ تھی۔ نہ وہ خرچ کسی کو دکھانے کے لیے کرتے تھے۔ یہ سب خرچ جذبہ خیر پر مبنی تھا۔ جس خیر کو انہوں نے اختیار کر لیا تھا۔ یہ خرچ وہ اپنے اس نظریہ کے لیے کر رہے تھے جسے انہوں نے تمام دنیاوی مفادات کو چھوڑ

چھاؤ کر اختیار کر لیا تھا۔ انہوں نے زبیر سا مال خرچ کیا۔ بعض نے اس مقدار میں مال خرچ کیا جو السابقون الاولون نے فتح سے قبل کیا تھا۔ اس پر قرآن کی آیات نازل ہوئیں ان میں تصریح کی گئی ۔ مقدار کے اعتبار سے تمہارا خرچ ان کے خرچ کے برابر ہو سکتا ہے یا زیادہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اللہ کے ترازو میں سابقون کا خرچ قابل ترجیح ہے ۔ اس لیے کہ انہوں نے جس ایمانی جذبہ سے خرچ کیا اس میں فرق ہے ۔

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا (۵۷ : ۱۰) "تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے ۔ جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے ۔ ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے"۔ ایک شخص وہ ہے جو اس وقت خرچ کرتا ہے اور جہاد کرتا ہے 'جب ہر طرف سے نظریہ پر حملے ہوتے ہیں 'اس نظریہ کے ماننے والے اور دوست قلیل ہیں ۔ اور کسی منفعت کا کوئی نشان تک نہیں ہے ۔ نہ اقتدار ہے اور نہ سہولیات ہیں 'اور ایک شخص اس وقت خرچ کرتا ہے اور جہاد کرتا ہے جب نظریہ حیات پر امن ہے 'اس کے انصار بہت ہیں اور نصرت 'غلبہ اور فتح اور مفادات متوقع ہیں تو دونوں کے درمیان بہت فرق ہے ۔ پہلا شخص صرف اللہ سے لو لگائے ہوئے ہوتا ہے 'وہ مخلص ہے اور اس کے اخلاص میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ اسے اللہ پر گہرا بھروسہ ہے اور صرف اللہ پر اطمینان ہے ۔ یہ شخص اسباب ظاہری اور دنیاوی مفادات سے دور ہے ۔ اس کو اس خیر اور بھلائی پر صرف اس کا عقیدہ آمادہ کر رہا ہے اور یہ دوسرا شخص جو بھلائی کرتا ہے اس کے لیے اس کے نظریہ کے سوا دوسرے دواعی بھی اس نیکی پر آمادہ کرنے کے لیے ہیں ۔ یہاں تک کہ اس کی نیت صاف بھی ہو پھر بھی دوسرے عوامل ملحوظ ہیں ۔

امام احمد نے روایت کی ہے ۔ احمد ابن عبد الملک سے انہوں نے زہیر سے 'انہوں نے حمید الطویل سے 'انہوں نے انس سے کہتے ہیں کہ حضرت خالد ابن ولید اور عبد الرحمٰن ابن عوف کے درمیاں کچھ باتوں کا تبادلہ ہو گیا ۔ خالد نے عبد الرحمٰن سے کہا: "تم لوگوں پر اس لیے دست درازی کرتے ہو کہ کچھ دن تم ان سے پہلے اسلام لے آئے ہو 'ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ اس بات کا تذکرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا "میرے ان ساتھیوں کو چھوڑ دو ' اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے 'کہ اگر تم احد کے برابر سونا خرچ کرو (یا کہا کہ پہاڑوں کے برابر سونا خرچ کرو) تو بھی تم ان کے اعمال تک نہیں پہنچ سکتے ۔۔۔ صحیح میں ہے ۔

لا تسبوا اصحابي فو الذي نفسي بيده لو انفق احدكم مثل احد ذهبا ما بلغ مد احدهم او نصيفه (۱)"میرے ساتھیوں کو گالیاں نہ دو ۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے 'اگر تم میں کوئی احد

---

(۱) معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں اصحابی کا خاص مفہوم ہے ۔ ان کے بارے میں حضورؐ نے سخت تنبیہ فرمائی ہے ۔ یہ لوگ دراصل سابقون اولون ہیں ۔ حضور اکرمؐ اپنے اور دیگر صحابہ اور مومنین سے کہتے تھے ۔ دعوا لي اصحابي " میرے ساتھیوں کو میرے ہی لیے چھوڑ دو" اس سے صحبت خاصہ مراد ہے ۔ ایک بار حضرت ابوبکر صدیق کے بارے میں کہا دعوا لي صاحبي "میرے اس ساتھی کو میرے لیے چھوڑ دو ۔"

جیسا سونا خرچ کرے تو نہ ان کی مد کو پہنچ سکتا اور نہ نصف مد کو (مد پیمانہ تقریباً دو کلو)

لیکن بعد میں آنے والوں کو بھی مایوس نہیں کیا گیا۔ سب کے لیے اونچا مقام ہے ۔ اچھا وعدہ ہے ۔

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (۵۷ : ۱۰) "اور اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔"

اگرچہ ان کے درمیان درجات کے اعتبار سے تفاوت تھا لیکن وہ سب اچھے اور عدل تھے ۔

لیکن یہ تفاوت ' اور سب کے لیے جزائے حسن کے وعدے سب کے سب اللہ کے علم سے مشروط ہیں سب کے احوال سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے ۔ یہ اللہ ہی ہے کہ وہ جانتا ہے کہ ان کے ان اعمال کے پیچھے کیا داعیہ تھا۔ حقیقی علم تو اللہ ہی رکھتا ہے ۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۵۷ : ۱۰) "جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔"

یہ ایک ایسا ٹچ اور ایک ایسی چٹکی ہے جس سے دل بیدار ہو جاتے ہیں کہ ظاہری اعمال اپنی جگہ پر ہیں اور دنیا کے فیصلے تو اپنی جگہ پر ہیں لیکن اللہ کے فیصلے اللہ کے علم پر ہوں گے ۔ خبردار وہاں وزن اللہ کے پیمانوں سے ہو گا۔

ایمان اور انفاق فی سبیل اللہ کے لیے ایک دوسرا مرحلہ ' ایک دوسرا محرک اور نیا ولولہ :

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (۱۱) يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۲) يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ (۱۳) يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۱۴) فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَاْوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰىكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۵) (۵۷ : ۱۱ تا ۱۵) "کون ہے جو اللہ کو قرض دے ؟ اچھا قرض ' تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے اور اس کے لیے بہترین اجر ہے ۔ اس دن جب کہ تم مومن مردوں اور عورتوں

کو دیکھوگے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔ (ان سے کہا جائے گا کہ) آج بشارت ہے تمہارے لیے جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔ اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے ذرا ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں۔ مگر ان سے کہا جائے گا" پیچھے ہٹ جاؤ ' اپنا نور کہیں اور تلاش کرو۔" پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اس دروازے کے اندر رحمت ہوگی اور باہر عذاب۔ وہ مومنوں سے پکار پکار کہیں گے "کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے"؟ مومن جواب دیں گے۔" ہاں مگر تم نے اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالا ' موقع پرستی کی ' شک میں پڑے رہے ' اور جھوٹی توقعات تمہیں فریب دیتی رہیں ' یہانتک کہ اللہ کا فیصلہ آگیا ' اور آخر وقت تک وہ بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملہ میں دھوکا دیتا رہا۔ لہٰذا آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنہوں نے کھلا کھلا کفر کیا تھا۔ تمہارا ٹھکانا جہنم ہے ' وہی تمہاری خبرگیری کرنے والی ہے اور یہ بدترین انجام ہے۔"

یہ رب ذوالجلال کی طرف سے ایک زبردست پکار ' ایک زبردست موثر اشارہ اللہ اپنے فقیر اور محتاج بندوں سے کرتا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا (۵۷ : ۱۱) "کون ہے جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض"

تاکہ صرف یہ تصور کہ ایک مسلم فقیر ہے اور اللہ کی طرف ہروقت محتاج ہے اور رب ذوالجلال اس سے قرض مانگ رہا ہے ' اس بات کے لئے کافی ہے کہ وہ ازکر اللہ کی راہ میں خرچ کرے ' کیونکہ لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ نفع بخش کار وبار میں سرمایہ لگاتے ہیں۔ لوگ چونکہ فقیر ہیں اور اللہ کو دیا ہوا قرضہ محفوظ ہے ' اس کی واپسی یقینی ہے ' پھر یہ ان کے لئے ایک باعث عزت بات بھی ہے کہ وہ اللہ کو قرض دے رہے ہیں۔ عموماً لوگ نفع بخش کاروبار میں رقم لگاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تو کئی گنا بڑھا کر اسے واپس کرتا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ لوگ اس کاروبار میں سرمایہ نہ لگائیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو صرف اچھے جذبات تک ہی نہیں لے جاتا بلکہ وعدہ فرماتا ہے کہ اس قرض حسن پر تمہیں کئی گنا اضافہ کر کے دے گا۔ بشرطیکہ وہ قرض حسن ہو اور صرف اللہ کے لئے دیا ہو اور کئی گنا اضافے کے ساتھ پھر اللہ کے ہاں مزید اجر بھی ملے گا۔

فَيُضَٰعِفَهُۥ لَهُۥ وَلَهُۥٓ أَجْرٌ كَرِيمٌ (۵۷ : ۱۱) "تاکہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے اور اس کے لئے بہترین اجر ہے"۔ اور اس اجر کا نقشہ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کر کے بتایا جاتا ہے۔ قیامت کے دن یہ اجر دیا جائے گا اور یہ بہت ہی قابل قدر اجر ہوگا۔

یہ منظر قرآن کریم کے مناظر میں سے بالکل ایک نیا منظر ہے۔ اس منظر کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے کہ اسے حرکت اور مکالمات سے بھرپور انداز میں بالکل ایک زندہ منظر بنا دیا گیا ہے۔ آج جب ہم قرآن کریم کو پڑھتے ہیں تو ہماری نظروں کے سامنے پوری تصویر آجاتی ہے۔ مومنین اور مومنات ہمیں سخت تاریکی میں چلتے نظر آتے ہیں لیکن ان کے سامنے اور ان کے دائیں جانب ہمیں ایک لطیف نور اور چمک نظر آتی ہے۔ یہ نور خود ان اہل ایمان کا نور ایمانی ہے اور یہ ان کے چہروں سے پھوٹ رہا ہے۔ ان مومنین اور مومنات کے اجسام سے یہ نور پھوٹ رہا ہے اور اس نور کی روشنی میں

یہ اس دن کی تاریکی میں آگے بڑھ رہے ہیں' یہ وہی نور ہے جو جاہلیت کے اندھیروں میں اللہ نے ان کو دیا تھا اور اس کی روشنی میں وہ چلتے تھے' اب یہ نور ان کی ارواح کے ذریعہ ان کی خاکی جسم پر غالب آگیا ہے ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے اجسام کے خاکی اجزاء سے یہ نور چمک رہا ہو کہ جدید سائنس کی تحقیقات بھی اسی طرف جاری ہیں کہ مادہ ایٹم سے بنا ہے اور ایٹم دراصل نور اور "شعاعیں" ہے ۔ یوں گویا یہ نور پھر حقیقی نور ہو گا ۔

اب اس منظر میں مومنین اور مومنات کو مبارک سلامت دی جاتی ہے ۔

بُشْرٰكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۵۷ : ۱۲) "آج ہے خوش خبری تمہارے لئے" جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔ یہی ہے بڑی کامیابی ۔

لیکن مبارک سلامت کے اس منظر پر ابھی یہ ختم نہیں ہے ۔ ادھر سے منافقین اور منافقات کا گروہ بھی گرتا پڑتا چلا آرہا ہے ۔ یہ حیران و پریشان اور کس مپرسی کی حالت میں ہے' یہ لوگ مومنین اور مومنات کے ساتھ لپٹ جاتے ہیں اور کہتے ہیں ۔

یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ (۵۷ : ۱۳) "اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہو گا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے ذرا ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں" ۔ مومنین اور مومنات کا گروہ جدھر بھی دیکھتا ہے ادھر نور ہی نور ہے' جو لطیف و شفاف ہے' لیکن اس نور سے منافق مرد اور منافق عورتوں کا گروہ کس طرح استفادہ کر سکتا ہے' انہوں نے تو پوری زندگی جہالت کی تاریکی میں بسر کی ہے ۔ ایک نامعلوم آواز اس موقعہ پر پکارتی ہے ۔

قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا (۵۷ : ۱۳) "مگر ان سے کہا جائے گا پیچھے ہٹ جاؤ ایک نور کہیں اور تلاش کرو" ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آواز ان کی تذلیل اور ان کے ساتھ مزاح کے لئے بلند ہو گی ۔ اور ان کو یہ یاد دہانی مطلوب ہو گی کہ دنیا میں تم کیا کرتے تھے رات کے اندھیروں میں اپنی منافقانہ پالیسی پر کرتے رہتے تھے ۔ کہ واپس جاؤ دنیا میں اور وہاں اپنا نور تلاش کرو ۔ واپس جاؤ کیونکہ یہ نور تو دنیا سے آیا ہے ۔ دنیا کے عمل سے یہ نور حاصل ہوتا ہے ۔ آج تو تم دارالجزاء میں ہو یہاں کیا تلاش کرتے ہو ۔

اس مرحلے میں اچانک مومنین اور مومنات کے گروہ اور منافقین اور منافقات کے گروہ کی درمیان جدائی کر دی جاتی ہے ۔ کیونکہ یہ جدائی کا دن ہے ۔ دنیا میں تو یہ لوگ اسلامی صفوں میں گھس گئے تھے ۔

فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ (۵۷ : ۱۳) "پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا' اس

دروازے کے اندر رحمت ہوگی اور باہر عذاب"۔ یہ ایک ایسی دیوار ہوگی جس کے اس پار نظر تو نہ آئے گا لیکن آواز سنائی دے گی۔ اب منافقین کا گروہ مومنین کو پکارے گا۔

يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ (۵۷ : ۱۴) "وہ انہیں پکار کر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے"۔ اب ہم کیوں جدا ہو رہے ہیں۔ دنیا میں تو ہم تمہارے ساتھ ایک ہی جگہ زندہ رہے تھے۔ ایک ہی سطح پر اور یہاں بھی ہم ایک ہی جگہ تمہارے ساتھ اٹھائے گئے ہیں۔

قَالُوا بَلَى (۵۷ : ۱۴) "وہ کہیں گے ہاں" معاملہ تو ایسا ہی ہے۔

وَلَكِنَّكُمْ فَتَنتُمْ أَنفُسَكُمْ (۵۷ : ۱۴) "مگر تم نے اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالا"۔ تم نے اپنے آپ کو ہدایت سے توڑ لیا۔

وَتَرَبَّصْتُمْ (۵۷ : ۱۴) "موقع پرستی کی"۔ تم نے عزم کر کے فیصلہ کن انداز میں حق کا راستہ اختیار نہ کیا۔

وَارْتَبْتُمْ (۵۷ : ۱۴) "شک میں پڑے رہے"۔ تمہیں یقین کی وہ دولت نہ دی گئی جس کے ذریعے تم آتش نمرود میں کود جاتے۔

وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ (۵۷ : ۱۴) "اور جھوٹی توقعات تمہیں دھوکہ دیتی رہیں"۔ تم نے یہ سوچا کہ اسی طرح تذبذب منافقت اور لالچ کو دونوں جانب سے پکڑنے میں کامیابی ہے۔

حَتَّى جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ (۵۷ : ۱۴) "یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا"۔

وَغَرَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ (۵۷ : ۱۴) "اور آخر تک وہ بڑا دھوکہ باز تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکہ دیتا رہا"۔ یہ شیطان تھا۔ تمہیں نئی نئی لالچیں دیتا اور تمناؤں کی دنیا میں بساتا۔ اب مومنین ان کو مزید یاد دلاتے ہیں اور فیصلہ سناتے ہیں گویا آج فیصلہ ان کے ہاتھ میں۔

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مَأْوَاكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلَاكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۵۷ : ۱۵) "لہٰذا آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا۔ نہ ان لوگوں سے جنہوں نے کھلا کھلا کفر کیا۔ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے۔ وہی تمہاری خبرگیری کرنے والی ہے اور یہ بدترین انجام ہے"۔

یہ شاید دربار مقتدر اعلیٰ سے اعلان ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جواب ہو گا۔

اس منظر کی فنی ہم آہنگی کو دیکھا جائے تو اس کے لئے نور کے انتخاب میں ایک خاص حکمت ہے۔ کیونکہ یہ بات منافقین اور منافقات کے گروہ کے بارے میں ہے اور منافقین اور منافقات کے گروہ کا اصل کردار ہی یہ ہوتا ہے کہ اپنے باطن کو چھپاتے ہیں اور ان کے ضمیروں میں جو بات چھپی ہوتی ہے اس کے مقابلے میں کچھ اور ظاہر کرتے ہیں۔ وہ نفاق کی کارروائیاں ہمیشہ اندھیروں میں کرتے ہیں۔ اندھیرا چھپاتا ہے اور روشنی دکھاتی ہے۔ گویا دو کردار بھی متضاد ہیں ایمان اور نفاق اور دو رنگ بھی متضاد ہیں نور اور ظلمت۔ اور ان دونوں چیزوں سے منظر نہایت خوب بنتا ہے۔ ایمان کو روشن دکھایا گیا ہے اور نفاق کو تاریک۔ مومن نور میں سفر کر رہے ہیں اور منافق اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ معانی کو منظر کی روشنیوں کے ذریعہ بھی ظاہر کر دیا گیا۔"[1]

کون ہے جو اس دن نور کا طلب گار نہ ہوگا اور اس کا مشتاق نہ ہوگا۔ کون ہے جو اس کے بعد بھی انفاق فی سبیل اللہ سے گریز کرے گا۔ اس قدر موثر دلائل' مفادات اور اچھے انجام کے باوجود.... یہ ہے قرآن کا انداز تعلیم و تربیت' قرآن نہایت تسلسل اور مستقل مزاجی سے مومنین کی تربیت کر رہا ہے۔ اور ایک ماہر کی طرح اور علیم و خبیر استاد کی طرح بڑی حکمت سے ہدایات اور سبق طلبہ کے ذہن میں یوں اتارتا ہے کہ وہ فوراً عمل کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد دوسرا سیشن آتا ہے اس میں بھی مسلسل پکار ہے اور اسی انداز میں اور اسی طرز پر جماعت مسلمہ کو عمل پر ابھارا جاتا ہے۔

---()---

(1) مشاہد القیامہ

درس نمبر ۲۵۷ ایک نظر میں

اس سبق میں بھی اس سورت کے ہر موضوع اور محور ہی کو لیا گیا ہے ' یعنی نفس کے اندر حقیقت ایمان اگر ناکہ اس کے نتیجے میں اللہ کی راہ میں مخلصانہ انفاق پر نفس آمادہ ہو جائے اور اس میں تقریباً ویسے ہی دلائل ایمان اور موثرات اور تنبیہات ہیں جیساکہ پہلے حصے میں تھے البتہ وہاں سورت کا آغاز نہایت زور دار تھا۔

یہ سبق مومنین کو ایک نرم سے عتاب کے ساتھ شروع ہوتا ہے وہ مومنین جو ابھی تک اس مقام تک انہیں پہنچے جس تک انہیں پہنچانا مطلوب ہے ' یہاں ہمیں کہا جاتا ہے کہ انہیں ان اہل کتاب کی طرح نہیں ہونا چاہئے جو سنگ دل تھے اور فاسق تھے ۔ ان کو ڈرایا جاتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم بھی کہیں ان کی طرح نہ ہو جاؤ ۔ البتہ دلوں کو زندہ کرنے والا اللہ ہی ہے جس طرح وہ زمین کو زندہ کرتا ہے ۔

اس آسابٹ کے بعد اب دوبارہ دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اسی طرح ہے جس طرح کوئی کسی نفع بخش کاروبار میں رقم لگاتا ہے ۔ اللہ آخرت میں کئی گنا کر کے دیتا ہے اور اجر کریم بھی دیتا ہے جیساکہ پہلے سبق میں کہا گیا تھا ۔ لہذا اس نفع بخش روبار کے ذریعہ جنت کماؤ جو بہت وسیع ہے ۔

اگلی آیات میں دنیاوی اقدار اور اخروی اقدار کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ دنیا تو ایک کھیل کود ہے صحیح زندگی آخرت کی ہے لہذا اہل ایمان کو چاہئے کہ آخرت کی طرف دوڑیں ۔

اب دوبارہ ان کو آخرت سے دنیا میں لایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ دنیا کے معاملات اللہ کے حکم سے چلتے ہیں لہذا برے حالات یا اچھے حالات اللہ کے حکم سے آتے ہیں انفاق سے کوئی غریب نہیں ہوتا لہذا کہا جاتا ہے کہ تمہیں دنیا کی کوئی چیز انفاق سے روک نہ دے ۔ اس کے بعد ان کے سامنے دعوت اسلامی کی ایک تاریخ پیش کی جاتی ہے ' بتایا جاتا ہے کہ یہ ایک ہی دعوت ہے ' ایک ہی پیغام ہے ' ایک ہی صراط مستقیم ہے ' ہر عہد میں جو لوگ اس سے منہ موڑتے ہیں وہ فاسق ہیں ۔ اہل کتاب نے یہی کام کیا جس طرح پہلے سبق میں بھی یہی کہا گیا ۔ اس کے بعد ان کو پکارا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو ایمان لاؤ تاکہ وہ تمہیں دوگنا اجر اور رحمت دے اور تمہارے چہروں پر نور پیدا کر دے ۔ اور تم پر فضل و کرم کر دے ۔ لہذا اللہ کا فضل و کرم اہل کتاب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے ۔ اللہ بڑے فضل والا ہے ۔

یوں یہ سورت اپنے آغاز و انجام دونوں سے باہم مربوط اور متناسب ہو جاتی ہے اور اس کی سب کڑیاں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں ۔ عقل و خرد کے تاروں پر مسلسل ضربات لگتی ہیں اور ان میں تنوع بھی ہے اور تکرار بھی ہے تاکہ اس کا دلوں پر گہرا اثر ہو ۔ اور دل مومن ایک ضرب کے بعد دوسری ضرب سے گرماتا رہے ۔

---()()()---

درس نمبر ۲۵۷ تشریح آیات

۱۶ ۔۔ تا ۔۔ ۲۹

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿١٦﴾ اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٧﴾

"کیا ایمان لانے والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور ان کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی' پھر ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں؟ خوب جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے' ہم نے نشانیاں تم کو صاف دکھا دی ہیں' شاید کہ تم عقل سے کام لو"۔

یہ مولائے کریم و رحیم کی طرف نہایت ہی موثر پکار ہے کہ اب تک تو تمہارے دل اللہ کے خوف اور خشوع و خضوع سے بھر جانا چاہئے تھا۔ تم پر تو اللہ کا بہت بڑا فضل ہو چکا ہے۔ تمہارے اندر ایک رسول موجود ہے' جو تمہیں ایمان کی طرف بلا رہا ہے۔ اس رسول پر آیات بینات نازل دی گئی ہیں تاکہ تمہیں تاریکیوں سے روشنیوں کی طرف لائیں۔ اور تمہیں اس نے اس کائنات میں اور تمہاری تخلیق میں آیات بھی بتا دی ہیں۔

یہ ایک ایسا عتاب ہے جس میں محبت ہے۔ ہمدردانہ عنایت ہے۔ جوش دلایا جاتا ہے اور شعور دیا جاتا ہے کہ اللہ بڑا جلیل القدر رب ہے۔ اس کا ذکر خضوع و خشوع کے ساتھ کرو' اور اللہ کی جانب سے جو سچائی آرہی اسے نہایت عزت و احترام اور اطاعت اور سپردگی کے ساتھ لو' البتہ سوال میں یہ تاثر نمایاں ہے کہ تمہاری رفتار سست ہے۔

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ

(۵۷ : ۱۶) "کیا ایمان لانے والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل ذکر سے پگھلیں۔ اور ان کے

نازل کردہ حق کے آگے جھکیں"۔ اس طرح ابھارنے اور سست روی پر عتاب کرنے کے ساتھ ان کو لبیک نہ کہنے اور سست روی اختیار کرنے کے برے انجام سے بھی ڈرایا جاتا ہے کہ جب دلوں کو ساتھ ساتھ صاف نہ کیا جاتا رہے تو وہ زنگ آلود ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر سنگدلی پیدا ہو جاتی ہے' یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ذکر الٰہی سے غافل ہو جائیں اور جب وہ حق کے سامنے جھکنا بھول جائیں:

وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ (۵۷ : ۱۶) "اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی' پھر ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں"۔ جب دل سخت ہو جائیں تو پھر اگلا مرحلہ فسق اور فجور کا ہوتا ہے۔

انسانی دل بہت جلد بدل جاتا ہے۔ انسان بہت جلد بھول جاتا ہے۔ جب وہ صاف شفاف اور روشن ہوتا ہے تو اس سے نور کی لہریں اٹھتی ہیں۔ اور موتی کی طرح چمکتا ہے۔ اور جب اس پر زیادہ وقت گزر جائے یاد دہانی اور تربیت ختم ہو جائے تو وہ سخت ہو جاتا ہے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسے مسلسل یاد دہانی اور تربیت کی ضرورت پڑتی ہے کہ اس کے اندر خضوع و خشوع پیدا ہو۔ اسے بار بار کھٹکھٹانا چاہئے تاکہ وہ نرم اور صاف ہوتا رہے اور ہر وقت بیدار رہنا چاہئے کہ وہ سنگدل اور گندہ نہ ہو جائے۔

لیکن اگر کوئی دل بجھ گیا' پتھر بن گیا' سخت ہو گیا' گندہ ہو گیا تو مایوسی کی ضرورت نہیں ہے' وہ از سر نو زندہ ہو سکتا ہے' اس میں از سر نو حیات داخل ہو سکتی ہے' وہ از سر نو اللہ کے سامنے جھک سکتا ہے' اللہ تو قدرتوں والا ہے' وہ تو مردہ زمین کو از سر نو زندہ کر دیتا ہے۔ ایک مردہ زمین دیکھتے دیکھتے زندگی سے بھرپور اور تروتازہ ہو جاتی ہے۔ سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے میوہ جات اور پھل دینے لگتی ہے یہی حال دلوں کا ہے۔

اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۵۷ : ۱۷) "خوب جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے"۔ اور قرآن کے اندر وہ چیز ہے جو دلوں کو موت کے بعد پھر زندہ کرتی ہے۔ اس کے اندر وہ مواد موجود ہے جو غذا دیتا ہے' جو سیراب کرتا ہے اور جو گرماتا ہے۔

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۵۷ : ۱۷) "ہم نے نشانیاں تم کو صاف صاف دکھا دی ہیں' شاید کہ تم عقل سے کام لو"۔

اس زندہ کر دینے والی چٹکی کے بعد' اور اس بالواسطہ عتاب کے بعد' اور اس ڈراوے کے بعد دوبارہ انفاق فی سبیل اللہ پر ابھارا جاتا ہے۔

إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ
قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ ﴿١٨﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ
أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ ۖ ۲
وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١٩﴾ اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ ع ۹
الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ۖ ۱۸
كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ
حُطَامًا ۖ وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۚ وَمَا
الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿٢٠﴾ سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ
عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ ذَٰلِكَ
فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٢١﴾ مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ
فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ
يَسِيرٌ ﴿٢٢﴾ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ
فَخُورٍ ﴿٢٣﴾ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۗ وَمَن يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ
الْحَمِيدُ ﴿٢٤﴾

" مردوں اور عورتوں میں سے جو لوگ صدقات دینے والے ہیں اور جنہوں نے اللہ کو قرض حسن دیا ہے ان کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لئے بہترین اجر ہے ۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں ' ان کے لئے ان کا اجر اور ان کا نور ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے وہ دوزخی ہیں ۔ خوب جان لو یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے ۔

پھروہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی ۔ پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے ۔ اس کی برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے ۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں ۔ دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے 'جو مہیا کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں ۔ یہ اللہ کا فضل ہے 'جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے ' اور اللہ بڑے فضل والا ہے ۔ کوئی مصیبت ایسی نہیں جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب "یعنی نوشتہ تقدیر" میں لکھ نہ رکھا ہو ۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان کام ہے ۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمہیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ ۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں 'جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کرنے پر اکساتے ہیں ۔ اب اگر کوئی روگردانی کرتا ہے تو اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے "۔

صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں صدقہ لینے والوں پر اپنی برتری نہیں جتلاتے اور اس سودے میں یہ لوگ فریق ہی نہیں ہوتے ۔ ان کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے ۔ اس سے بلند اور برتر شعور اور کیا ہو سکتی ہے کہ صدقہ دینے والا یہ سمجھے کہ وہ غنی اور حمید ذات کو قرض دے رہا ہے ۔ اور وہ اس کائنات کے مالک کے ساتھ سودا کر رہا ہے ۔ اور یہ کہ وہ جو کچھ خرچ کر رہا ہے وہ دوگنا تگنا ہو کر ملے گا ۔ اور کئی گنا لوٹانے کے بعد اجر کریم بھی دیا جائے گا ۔

صدیقین کا مقام بہت ہی بلند مقام ہے احادیث نبوی میں اس کی خوب تشریح کی گئی ہے ۔ اگرچہ یہ مقام بہت بلند ہے لیکن اس کے حصول کے مواقع ہر کسی کے لئے کھلے ہیں 'یہ چند افراد یا کسی طبقے تک محدود نہیں ہے 'جو بھی اللہ اور رسول پر صحیح ایمان پیدا کرے اور اس مقام بلند کا طلب گار ہو وہ اسے پا سکتا ہے 'اللہ کے فضل پر کوئی حد بندی نہیں ہے ۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ (۵۷ : ۱۹) "اور جو لوگ اللہ اور رسولوں پر ایمان لائے ہیں وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق ہیں" ۔ یہ اس دین کی خاصیت اور امتیازی بات ہے کہ یہ سب انسانوں کے لئے ایک کھلا راستہ ہے ۔ یہ ایک بلند افق ہے جس کی طرف سب کی نظریں لگی رہتی چاہئیں ۔ یہاں کسی کا ٹھیکہ نہیں ہے اور نہ یہ مقامات کچھ مخصوص لوگوں کو ملتے ہیں ۔ اسلام میں ہر شخص عمل کر کے اعلیٰ درجات تک پہنچ سکتا ہے ۔ یہ ایک ایسا دین ہے جس میں کسی ایسے طبقے کی گنجائش نہیں ہے ۔ جسے کوئی پیدائشی برتری حاصل ہو ۔

امام مالک اپنی کتاب موطا میں روایت کرتے ہیں صفوان ابن سلیم سے 'انہوں نے عطا ابن یسار سے 'انہوں نے ابو سعید خدری سے 'کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت دیکھیں گے کہ بلند بالا خانوں والوں کو 'یہ اونچے ہوں گے 'جیسا کہ تم روشن ستارے کو دور مشرقی اور مغربی افق میں دیکھتے ہو 'اس لئے کہ بلندی درجات میں بہت فرق ہو گا ۔ صحابہ کرام نے پوچھا رسول خدا یہ انبیاء کے منازل ہوں گے جن تک کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکے گا ۔ تو فرمایا ہاں "خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ کچھ لوگ ہوں گے جو اللہ پر ایمان لائے اور جنہوں نے مرسلین کی تصدیق کی" ...... یہ ہے ایمان کی پختگی اور اللہ کے دین پر فدا ہونے کا مقام ؟ وہ بعد میں آتا ہے ۔

وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَ نُوْرُهُمْ (۱۹:۵۷) "اور شہدا ہیں ان کے لئے ان کا اجر اور ان کا نور ہے" ۔ شہدا کی بات تو قرآن میں بار بار آئی ہے ۔ احادیث نبوی بھی ان کے بارے میں متواتر ہیں ۔ یہ اس دین کے چوکیدار ہوتے ہیں اور کوئی دین چوکیداری کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا ۔ اور کسی جگہ جہاد کے بغیر دین کبھی قائم نہیں ہو سکتا ۔ جہاد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عقیدہ محفوظ ہو ' دعوت اسلامی کے لئے راہ آزاد ہو ' اہل ... در اہل شریعت کو فساد سے محفوظ رکھا جائے ' یہی وجہ ہے کہ صرف شہدا فی سبیل اللہ ہی اس اونچے مقام کے شہداء ہیں ' وہ رب کے قریب ہوں گے ۔ اور وہ رب کے پاس ہوں گے ۔ عند ربھم ان کا اعزاز ہے ۔

"صحیحین میں روایت ہے کہ شہدا کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں جنت میں ہوتی ہیں اور وہ جہاں چاہتی ہیں چگتی ہیں ۔ اس کے بعد وہ ان طاقوں میں آکر ٹھہرتے ہیں ۔ اللہ ان پر ظاہر ہو گا اور فرمائے گا تم کیا چاہتے ہو ' ... یں گے ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں دوبارہ دنیا کی طرف لوٹایا جائے اور ہم پھر تیری راہ میں جنگ کریں جس طرح پہلی مرتبہ جنگ کی ۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ دنیا کی طرف نہ لوٹیں گے ۔" اور شیخین اور دوسروں نے انس ؓ سے روایت کی ہے فرماتے ہیں فرمایا رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے "جو کوئی جنت میں داخل ہو جائے وہ دنیا کی طرف لوٹنا پسند نہ کرے گا اگرچہ یہاں اس کے لئے بہت کچھ ہو ' ماسوائے شہید کے ' وہ یہ چاہے گا کہ دنیا کی طرف لوٹایا جائے اور دسیوں مرتبہ اللہ کی راہ میں قتل ہوتا رہے کیونکہ وہ شہیدوں کی عزت دیکھ چکا ہو گا ۔"

یہ باتیں سن کر دور اول کے مسلمانوں کے لئے جان کی کوئی اہمیت نہ رہتی تھی ۔ وہ مسلمان جن کو مقام شہادت کا پتہ لگ جاتا تھا ۔

امام مالک نے یحییٰ ابن سعید سے روایت کی ہے کہ ایک بار رسول اللہ جہاد کے لئے لوگوں کو آمادہ فرما رہے تھے ۔ اور آپ جنت کا ذکر فرما رہے تھے ۔ انصار کا ایک آدمی سن رہا اور اس کے ہاتھ میں کھجوروں کے کچھ دانے تھے جنہیں وہ کھا رہا تھا ۔ تو اس نے کہا "میں تو دنیا کا لالچی ہوں گا ' اگر میں بیٹھ گیا اور یہ کھجوریں کھاتا رہا یہاں تک کہ میں ان سے فارغ ہو جاؤں ۔ اس نے یہ کھجوریں پھینک دیں اور تلوار اٹھائی اور کفار پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ وہ قتل ہو گیا ۔ اس شخص کے نام کے بارے میں روایت ہے کہ وہ عمیر ابن الحمام ؓ تھا ۔"

جب صدیقوں کا یہ مقام ہے اور شہدا کا یہ مقام ہے تو کافرین اور مکذبین کا مقام بھی بتا دیا جاتا ہے ۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۱۹:۵۷) "اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ دوزخی ہیں" ۔ کون ہے جو اس اعزاز اور اس مرتبے کو چھوڑ سکتا ہے اور یہ پسند کر سکتا ہے کہ وہ جہنم والوں میں سے ہو جائے ۔ اب ایک تیسری چٹکی بھری جاتی ہے ۔ یہ دعوت ایمان اور دعوت انفاق اور دعوت شہادت کے بعد ہے ۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ ان مقامات بلند سے اگر کوئی چیز روک سکتی ہے تو وہ حب الدنیا ہے جبکہ دنیا نہایت حقیر ' نہایت معمولی اور نہایت ہلکی چیز ہے ۔ اور اس کے مقابلے میں آخرت بہت قیمتی ہے ۔ ایک بہترین تمثیل !

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وَ فِى الْاٰخِرَةِ

عذابٌ شدیدٌ وّ مغفرۃٌ مّن اللّٰہ ورضوانٌ و ماالحیوۃُ الدُّنیا الّا متاعُ الغُرُور (۵۷ : ۲۰)
”خوب جان لو یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسری سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہوگئے۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی۔ پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کی برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں“۔

اس دنیا کی زندگی کو اگر دنیا کے پیمانوں سے ناپا تولا جائے ' تو ظاہری نظروں میں وہ ایک عظیم امر نظر آتا ہے۔ اور بہت ہی بڑا مسئلہ ہے لیکن اس دنیا کو اگر پوری کائنات کے زاویہ سے دیکھا جائے اور آخرت کے میزان کے مطابق اسے تولا جائے تو وہ ایک بہت ہی معمولی چیز ہے۔ یہاں قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ دنیا آخرت کے مقابلہ بازیچۂ اطفال ہے۔ کیونکہ اصل جہاں تو آخرت ہے جہاں انسانوں کو اس دنیا کے انجام پر جانا ہے۔

کھیل ' تماشا ' زینت ' برتری جتانا ' اور ہر چیز میں کثرت حاصل کرنا دنیا کی تمام بھرپور جدوجہد اور تمام مصروفیات کے پیچھے بس یہی کچھ ہے اس دنیا کے اس تمام کھیل کو قرآن اپنے مخصوص انداز میں ایک منظر کی شکل میں پیش کرتا ہے۔

کمثل غیثٍ اعجبَ الکُفّارَ نباتُہ (۵۷ : ۲۰) ”اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشتکار خوش ہوگئے“۔ کفار سے مراد یہاں کاشتکار ہیں۔ کفر کا لغوی معنی چھپانا ہے۔ اور لغوی اعتبار سے کاشتکار کو کفار کہا جاتا ہے کہ وہ بیج کو زمین میں چھپاتا ہے لیکن یہاں اشارہ کفر کی طرف بھی ہے کہ وہ دنیاوی زندگی پر خوش ہوتا ہے۔

ثُمّ یھیجُ فترٰہُ مُصفرًا (۵۷ : ۲۰) ”پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ زرد ہوگئی“۔ اور کٹنے کے لئے تیار ہوگئی۔ کیونکہ اس سرسبزی کے لئے ایک وقت مقرر ہے اور بہت جلدی وہ کٹنے کے وقت کو پہنچ جاتی ہے۔

ثُمّ یکُونُ حُطامًا (۵۷ : ۲۰) ”پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے“۔ اب اسکرین پر یہ حرکت اور دوڑ دھوپ ختم ہوجاتی ہے۔ فصل کٹنے کے منظر کے ساتھ حیات دنیا کا منظر بھی ختم ہوجاتا ہے۔

رہی آخرت تو اس کی شان ہی الگ ہے۔ آخرت کی شان یہ ہے کہ اس کا خیال رکھا جائے اور اسے اہمیت دی جائے۔ اور اس کو پیش نظر رکھ کر تیاری کی جائے۔

وفی الاٰخرۃ عذابٌ شدیدٌ وّ مغفرۃٌ مّن اللّٰہ ورضوانٌ (۵۷ : ۲۰) ”اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے“۔ آخرت اس طرح چند لمحات میں گزرنے والی نہیں ہے جس طرح یہ دنیا چند لمحات میں گزر جاتی ہے۔ یہ دنیا کی طرح نہیں ہے کہ ایک دانہ ہے۔ وہ اگا اور پھر بھس بن گیا۔ اور ختم بلکہ آخرت میں تو حساب و کتاب ہے اور پھر دوام ہے۔ لہٰذا اس کا انجام یہ ہونا چاہئے۔

وَ مَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۵۷ : ۲۰) "اور دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں"۔ اس سامان زندگی کی کوئی ذاتی حقیقت نہیں ہے۔ یہ دھوکہ ہے۔ یہ انسان کو لہو و لعب میں مشغول رکھتا ہے۔ اور اس کی زندگی بالآخر دھوکے کا شکار ہوتی ہے۔

انسان اگر سنجیدگی سے تلاش حقیقت کرنے نکلے تو یہ زندگی ایک دھوکہ ہی ہے۔ لیکن زندگی کو اسلام اور قرآن نے جس معنی میں متاع غرور کہا ہے اسے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قرآن کا منشا یہ نہیں ہے کہ دنیا کے معاملات سے انسان لاتعلق ہو جائے اور ترک دنیا کر لے۔ نہ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ دنیا کی تعمیر و ترقی میں دلچسپی نہ لی جائے۔ اور یہاں انسان نے اللہ کے نائب ہونے کے حوالے جو ذمہ داری ادا کرنی ہے اسے ادا نہ کرے۔ بلکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ دنیا کی قدر و قیمت اور اس کی حقیقت کے بارے میں انسانی شعور کو درست کیا جائے۔ اور انسان کو بتایا جائے کہ اس دنیا کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے۔ وہ یہ کہ دنیا ایک زائل ہونے والی اور ہر انسان سے رہ جانے والی ایک عارضی جگہ ہے۔ اس کی جاذبیت اور اس کی اہمیت بھی اسی قدر ہونا چاہئے۔ جن لوگوں سے یہ سورت مخاطب تھی وہ پہلے مومن تھے اور ان کے ذمہ کچھ ایمانی تقاضے تھے اور دنیا کے بارے میں ان کا تصور اور شعور درست کرنا ضروری تھا تاکہ وہ ایمانی فرائض سرانجام پاسکیں۔ ہر مومن اپنے عقیدے اور نظریہ کے حوالے سے اس تصور کا محتاج ہے۔ اگر مومن نے اپنے عقیدے اور نظریہ حیات کو یہاں قائم کرنا ہے تو اسے اپنے دل کو اس دنیا سے متعلق صاف کرنا ہو گا۔

چنانچہ اسلام ان کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا ایک نیا میدان دیتا ہے۔ وہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا حقیقی میدان ہے۔ وہ مقصد جس کا تعلق ان کے انجام سے متعلق ہے۔ اور جس کا تعلق عالم بقا اور دار آخرت سے ہے۔

سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ جَنَّۃٍ عَرْضُهَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (۵۷ : ۲۱) "دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے، جو مہیا کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے"۔

یہ مقابلہ سامان لہو و لعب جمع کرنے میں نہیں ہے، یہ بہت سا مال جمع کرنے کا بھی نہیں ہے یہ ان لوگوں کا مقابلہ ہے جنہوں نے اپنی گردن سے دنیا کی غلامی کا طوق اتار پھینکا ہے، اور انہوں نے لہو و لعب کا میدان بچوں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اور ان کی نظریں کسی اونچے افق پر ہیں۔ اور ان کا ہدف اس دنیا سے بھی ذرا آگے ہے۔

وَ جَنَّۃٍ عَرْضُهَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ (۵۷ : ۲۱) "اس جنت کی طرف جس کا عرض اور وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے"۔

بعض مفسرین نے، اس زمانے میں جب اس کائنات کی وسعتوں کے بارے میں ہماری معلومات محدود تھیں یہ رائے

اختیار کی تھی کہ اس آیت سے مراد مجازاً بہت زیادہ وسعت ہے ' اسی طرح ان لوگوں نے بعض احادیث نبوی کو بھی مجازاً محمول کیا تھا - اسی طرح وہ حدیث جس میں کہا گیا ہے کہ جنت میں بالا خانوں والوں کو اہل جنت اس قدر بلند دیکھیں گے جس طرح ایک چمکدار تارا افق پر نظر آتا ہے 'مشرق میں یا مغرب میں ' اس سے مراد بھی اہل تفسیر زیادہ بلندی لیتے تھے لیکن آج انسانوں کی بنائی ہوئی نہایت ہی چھوٹی دور بینیں اس کائنات کی جو وسعت ہمیں بتاتی ہیں وہ محیرالعقول اور سر چکرا دینے والی ہے 'جنت کی وسعت کے بارے میں احادیث ' اور وہ احادیث جن میں بالا خانے افق کے ستاروں جیسے بلند نظر آئیں ' ایسے حقائق نظر آتے ہیں جو عقل کے بہت قریب بلکہ مشاہدے کے بہت ہی قریب ہیں اور اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ قرآنی آیات یا احادیث جو جنت کی وسعت کے بارے میں ہیں ان کو مجاز پر محمول کیا جائے -

جنت میں اس طویل و عریض مملکت میں ہر وہ شخص پہنچ سکتا ہے جو اس کا ارادہ کرے - ہر شخص اسے آگے بڑھ کر حاصل کر سکتا ہے لیکن اس کا بیعانہ اللہ اور رسولوں پر ایمان لانا ہے -

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۵۷ : ۲۱) "یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے"-

اللہ کا فضل بے حد و حساب اور اس پر کوئی پابندی نہیں ہے - یہ فضل ان تمام لوگوں کے لئے کھلا ہے جو اس میں دلچسپی رکھتے ہوں - لہٰذا لوگوں کو چاہئے کہ اللہ کے اس فضل کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے بڑھیں - اس محدود الاطراف زمین ہی میں نہیں بلکہ اللہ کی لامحدود کائنات میں -

ایک نظریاتی شخص کا فریضہ ہے کہ وہ اس عظیم کائنات کے ساتھ معاملہ کرے اور اپنے نفس ' اپنے نقطہ نظر ' اپنے تصور ' اپنی ترجیحات اور اپنے شعور کو اس تنگ اور محدود دنیا کے اندر محدود نہ کرے ' جب تک نظریاتی لوگ اپنے نقطہ نظر کو وسیع نہ کریں گے وہ اسلامی نظریہ حیات کی کوئی قابل قدر خدمت نہ کر سکیں گے - اس لئے کہ اسلامی نظریہ حیات لوگوں کی حقارتوں ' ذلتوں اور خود غرضیوں سے متصادم ہوتا ہے - اور وہ لوگوں کی گمراہی اور کج روی کے ساتھ بھی متصادم ہوتا ہے -

پھر باطل قوت ہر وقت ایک نظریاتی شخص کا مقابلہ کرتی ہے اور وہ چونکہ زمین کے ایک حصے پر قابض ہوتی ہے اس لیے اس کے مقابلے میں وہی شخص کھڑا ہو سکتا ہے جس کا معاملہ ایک عظیم کائنات سے ہو اور اس زمین سے زیادہ وسیع تر نقطہ نظر رکھتا ہو - اور وہ اس فانی دنیا سے آگے باقی دنیا میں کچھ مقاصد و اہداف رکھتا ہو یعنی رضائے الٰہی -

اس زمین کے مقاصد اور معیار کبھی بھی ایک نظریاتی شخص کے لیے اعلیٰ مقاصد اور نصب العین نہیں ہو سکتے ان کی اہمیت ایک مومن کے لیے اسی قدر ہوتی ہے ' جس قدر زمین کی حیثیت بمقابلہ کائنات ہوتی ہے - یہ پوری زمین نہ ازلی ہے اور نہ ابدی ہے - زمین اور اللہ کی کائنات کے درمیان کوئی نسبت ہی نہیں ہے ' زمین چھوٹی اور اس کے مقاصد بہت چھوٹے ہیں -

چنانچہ ایک مومن کا نقطہ نظر بہت ہی وسیع اور بہت ہی بلند ہوتا ہے - اگرچہ زمین بہت خوب صورت طویل و عریض نظر آئے - اس لیے نظریاتی شخص اس حقیقت سے معاملہ کرتا ہے جو لامحدود ہوتی ہے اور زمین پر حدود و قیود وارد ہوتی

ہے، وہ اس حقیقت سے مقابلہ کرتا ہے جو ازلی اور ابدی موجود ہے۔ اور یہ عظیم حقیقت عالم آخرت کے وسیع میدان میں ہوتی ہے۔ اس دنیا کی بعض حقیر قدروں میں اگر کمی بیشی ہو بھی جائے تو ایمانی قدروں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جن لوگوں کے پیش نظر ان اعلیٰ قدروں کا حصول ہوتا ہے وہ اللہ کے مختار بندے ہوتے ہیں اور اس دنیا کی محدود قدروں سے آزاد ہوتے ہیں۔

اب چوتھی چٹکی آتی ہے۔ یہ ایک گہرا احساس دلاتی ہے، اس بات کا اس دنیا میں جو کچھ بھی پیش آتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (٢٢) لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ (٢٣) الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ

مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (٢٤) (٥٧: ٢٢ تا ٢٤) "کوئی مصیبت ایسی نہیں جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب "یعنی نوشتہ تقدیر" میں لکھ نہ رکھا ہو۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان کام ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمہیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں، جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کرنے پر اکساتے ہیں۔ اب اگر کوئی روگردانی کرتا ہے تو اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے"۔

اس کائنات میں جو واقعہ بھی پیش آتا ہے، وہ اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ اللہ نے پہلے سے قلم بند کر لیا ہے۔ اور اس کائنات کے منصوبے اور نقشے میں متعین اور محسوب ہے۔ اس میں محض بخت و اتفاق کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس پوری کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے کامل اور شامل علم کے ذریعے ایسا کر لیا ہے۔ اور بہت ہی تفصیل کے ساتھ سب کچھ قلم بند کر دیا ہے، یہ اللہ کے علم میں تھا۔ اللہ کے علم میں کوئی ماضی حال اور مستقبل نہیں ہے۔ یہ زمان و مکان کے فاصلے اور حدیں اللہ کے علم پر حاوی نہیں ہیں، یہ تو ہم اپنے محدود علم کے ذریعے ان چیزوں کو اس طرح زمان و مکان کے قید میں دیکھتے ہیں۔ ہم تو ان حدود و قیود کے بغیر نہیں دیکھ سکتے۔ پھر ہم حقیقت مطلقہ کا ادراک ہی نہیں کر سکتے، ہاں بعض اوقات انسانوں کی قوت مدرکہ کو ایک ایسی چمک حاصل ہو جاتی ہے جس وقت ہماری سطح حقیقت مطلقہ سے جڑ جائے، ہم اشیاء کی حقیقت کو اس عادی طریقے سے جان سکتے ہیں جن ذریعہ حواس، رہا اللہ تعالیٰ جو حقیقت مطلقہ ہے اور وہ اس کائنات کی ہر چیز کو بلا حدود و قیود جانتا ہے۔ یہ کائنات اور اس کے اندر واقعات اپنی آغاز سے انتہا تک اللہ کے علم میں ہیں۔ یہ علم مطلق ہے اور بلا حدود و قیود ہے۔ اور اللہ کے نقشے میں ہر ایک چیز اور واقعہ کا ایک مقام ہے جو اللہ کے علم میں ہے، لہٰذا ہر واقعہ جسے انسان خیر سمجھتا ہے یا شر سمجھتا ہے، زمین پر وہ واقع ہوتا ہے۔ اور انسانوں کی زندگیوں میں

وہ پیش آتا ہے یہ اللہ کی کتاب میں ثبت ہے ۔

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۵۷ : ۲۲) ”ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے“ ۔

اس کا فائدہ کیا ہے ؟ اس حقیقت کا فائدہ یہ ہے کہ ایک انسان جسے اس دنیا کے واقعات پر خوشی بھی ہوتی ہے اور پریشانی بھی ہوتی ہے وہ اسے منجانب اللہ سمجھیں اور اس دنیا میں سکون اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں ۔ اگر کوئی ناگوار چیزیں دیکھیں تو حسرتوں سے اپنے آپ کو فنا نہ کر دیں اور اگر کوئی فرحت بخش واقعات دیکھیں تو آپے سے باہر نہ ہو جائیں اور جس طرح حقیقت ہے یہ سمجھیں کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے ۔

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ (۵۷ : ۲۳) ”تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمہیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو ' اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ“ ۔

لہذا نظر کا آفاقی ہو جانا اور اپنا معاملہ عظیم کائنات سے کرنا ' ازل اور ابد سوچنا ' اور جو کچھ پیش آتا ہے اسے کتاب تقدیر کا فیصلہ سمجھنا ' ان سب چیزوں سے نفس انسانی وسعت اختیار کر لیتی ہے انسان بڑا ہوتا ہے ' ثابت قدم ہوتا ہے ' اور واقعات وحادثات کا ڈٹ کر فیصلہ کرتا ہے اور حرکت کائنات کے دوران اسے جو کچھ پیش آتا ہے نفس انسانی اس سے کامیابی سے گزرتا ہے ۔

جب انسان اپنے آپ کو اس عظیم کائنات سے علیحدہ کر لیتا ہے تو اسے پیش آنے والے واقعات کے نتیجے میں جزع وفزع لاحق ہوتی ہے ۔ وہ نہایت ہلکے پن کا مظاہرہ کرتا ہے ۔ لیکن جب کوئی انسان یہ عقیدہ رکھتا ہے اور یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ اور یہ واقعات اور تصادم ' اسی طرح ہیں ۔ جس طرح ایک عظیم کائنات میں ذرات باہم ٹکراتے بھی ہیں اور وہ اپنی مقصد بھی پورا کرتے ہیں اور ایک وسیع نقشے کے مطابق کام بھی کرتے ہیں ' اور یہ نقشہ ازل سے تیار ہے اور یہ سب افراد ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں ۔ تو پھر اسے یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ جو برا ہونے والے ہونا ہی تھا اس لیے نہ وہ محرومی پر پریشان ہوتا ہے اور نہ وہ کچھ ملنے پر آپے سے باہر آتا ہے ۔

لیکن یہ مقام کہ کوئی بندہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے چند ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے ۔ رہے تمام مسلمان تو ان کو یہ عقیدہ آلام ومصائب کی تلخیوں سے نکال دیتا ہے اور اس طرح ان کو خوشحالی میں اترانے سے روکتا ہے ۔ اور دونوں حالات میں ایک مومن متوازن الطبع ہوتا ہے ' حضرت عکرمہ نے کیا خوب کہا ۔

”ہر آدمی خوش بھی ہوتا ہے اور مغموم بھی ' خوشی کو شکر میں بدل دو اور غم کو صبر میں“ ۔

یہ ہے اسلام کا معتدل نقطہ نظر ۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ (۵۷ : ۲۳) الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (۵۷ : ۲۴) ”اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑے لوگ سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل پر اکساتے ہیں“

مسئلہ تقدیر' فخر و مباہات اور بخل کے مضامین کے درمیان ربط کیا ہے؟ یہ کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے جو کچھ پیش آتا ہے وہ اللہ کی طرف سے آتا ہے' وہ ہرگز کبر و غرور اور فخر و مباہات پیش نہیں کرتا۔ اور نہ داد و دہش میں کمی کرتا ہے اور نہ بخل کرتا ہے اور نہ بخل کی دعوت دیتا ہے۔ اور جو لوگ اس حقیقت کا شعور نہیں رکھتے اور نہ اس پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ان کا اپنا کمال ہے' اس لئے وہ فخر و غرور کرتے ہیں اس کے بعد وہ نیکی کی راہوں میں خرچ نہیں کرتے کیونکہ ایسا شخص یہ سوچ لیتا ہے کہ اگر یہ غریب لوگ اہل ہوتے تو وہ بھی کما لیتے۔

وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (۵۷ : ۲۴) "اور اگر کوئی روگردانی کرتا ہے تو اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے" جو خرچ کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی توشہ آخرت تیار کرتا ہے اور جو اللہ کی بات مانے گا بھلا اس کا ہو گا۔ اللہ کہتا ہے' وہ اپنے محتاج بندوں کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں محمود ہے اور بے نیاز ہے اسے نہ لوگوں کی تعریف کی ضرورت ہے اور نہ تائید کی۔

---ooo---

اب آخر میں سورت کا آخری پیراگراف آتا ہے۔ یہ مختصراً اس دنیا میں رسولوں کی لیک لائن کا ذکر کرتا ہے۔ اسلامی نظریہ حیات کی تاریخ حضرت نوح علیہ السلام سے ادھر کہ اس دنیا میں اس کی غرض و غایت کیا تھی اور آخر میں حضرت عیسیٰ' انجیل کا نزول اور امت عیسیٰ کے خدو خال:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ
٣ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۖ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ
ع ٦ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٢٥﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا
19 فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ ۖ فَمِنْهُمْ مُهْتَدٍ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ
قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ ۙ
وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً ۚ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا
كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۖ فَآتَيْنَا الَّذِينَ
آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿٢٧﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ
آمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيَجْعَلْ لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَ

يَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۲۸﴾ لِّئَلَّا يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتٰبِ أَلَّا يَقْدِرُونَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ ۲
فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَأَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۲۹﴾ ع ۲
۲۰

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا' اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں' اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں - یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے - یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے - ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان دونوں کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی - پھر ان کی اولاد میں سے کسی نے ہدایت اختیار کی اور بہت سے فاسق ہو گئے - ان کے بعد ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے اور ان سب کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو مبعوث کیا اور اس کو انجیل عطا کی' اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا - اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کر لی' ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا' مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا - ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے ان کا اجر ہم نے ان کو عطا کیا' مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں - اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ' اللہ تمہیں رحمت کا دوہرا حصہ عطا فرمائے گا اور تمہیں وہ نور بخشے گا جس کی روشنی میں تم چلو گے' اور تمہارے قصور معاف کر دے گا' اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے - (تم کو یہ روش اختیار کرنی چاہیے) تاکہ اہل کتاب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے فضل پر ان کا کوئی اجارہ نہیں ہے - اور یہ کہ اللہ کا فضل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے' جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے' اور وہ بڑے فضل والا ہے"-

رسالت کی حقیقت ایک ہی ہے' تمام رسالتوں کا پیغام ایک تھا - رسول مختلف ادوار میں لیکر آئے - اکثر رسولوں کو معجزات دیئے گئے - بعض رسولوں کو کتابیں بھی دی گئیں قرآن کہتا ہے -

وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (۵۷ : ۲۵) "ان کے ساتھ کتاب نازل کی" رسول بھی ایک تھے اور کتاب بھی ایک تھی - اور دعوت بھی ایک تھی لہذا رسالت کی نوعیت ایک ہی ہے -

یہ کتاب کے ساتھ المیزان کیا ہے؟ ہر نبی اس لئے آیا ہے کہ انسانوں کو ایک میزان دے جس پر وہ اپنے حسن و قبح کو تولیں - اور اپنے اعمال کو اس میزان کے مطابق درست کریں اعمال' واقعات اور انسانوں کا وزن اس میزان پر ہو - اس کے مطابق لوگوں کی زندگی درست ہو' مختلف خواہشات کا سمت درست ہو' اور مختلف مزاجوں کے درمیان اعتدال پیدا ہو - اور باہم ٹکراؤ والی مصلحتوں کا فیصلہ ہو - ایک ایسا میزان ہو جو کسی کا طرفدار نہ ہو' یہ میزان حق ہو' کسی کے ساتھ ظلم نہ کرتا ہو' یہ اللہ کا میزان ہو جو سب کا رب ہے -

یہ میزان جو اللہ نے رسولوں پر اتارا یہ انسانیت کے لئے ان تمام بے اعتدالیوں کے خلاف ایک ضمانت ہے جن میں انسانیت مبتلا ہوتی رہتی ہے' تمام اضطرابات' تمام انتشار اور تمام طوفان جس سے انسانیت دوچار ہوتی رہتی ہے - جہاں

خواہشات کے تصادم برپا ہوتے ہیں۔ جہاں جذبات کے طوفان اٹھتے ہیں جہاں ضد و عناد کے غبار آندھیوں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ جہاں انسان فرعون بن جاتے ہیں۔ یہ میزان ضروری تھا کہ سب اس کے سامنے جھکیں۔ اور اس میزان کے سائے ہر کسی کو انصاف ملے۔ عدل ملے۔

لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۲۵:۵۷) "تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں" غرض اس میزان کے بغیر جو اللہ کے تجویز کردہ نظام زندگی اور نظام قانون کے مطابق ہوتا ہے 'لوگ کبھی عدل و انصاف نہیں پا سکتے۔ اگر کبھی لوگ عدل پا بھی لیں وہ عدل کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ ان کی خواہشات کی وجہ سے اور ان کی جہالتوں کی وجہ سے جلدی عدل کا میزان ان کے ہاتھوں سے گر جاتا ہے۔

وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۲۵:۵۷) "اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں۔ یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔" لوہے کو آسمانوں سے اتارنے کی تعبیر لی ہے جیسے دوسرے مقامات پر آیا ہے۔

وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ "اور اس نے جو مویشیوں کے آٹھ جوڑے تمہارے لئے اتارے" دونوں جگہ مقصد یہ ہے کہ اللہ نے اشیاء کی تخلیق اس مقصد کے لئے کی ہے گویا ان کی تخلیق تقدیر الٰہی کے مطابق ہے۔ پھر یہاں آیت کی فضا کی مناسبت اور ہم آہنگی کے قیام کی وجہ سے بھی نزول کا مادہ استعمال کیا گیا کیونکہ پہلے نزول کتاب اور نزول میزان کا ذکر تھا۔ اس طرح یہاں فرمایا کہ نزول حدید بھی اس کائنات کے لئے اہم ہے۔
لوہا اتار آسمان سے۔

فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (۲۵:۵۷) "جس میں بڑا زور ہے" مثلاً لوہے کے اندر ہی جنگ اور سلامتی مضمر ہے۔

وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۲۵:۵۷) "لوگوں کے لئے منافع ہیں" آج تک انسانی تہذیب و تمدن لوہے کی برکت سے ہے۔ اور پھر۔

وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ (۲۵:۵۷) "یہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے" یہ اشارہ جہاد و قتال کی طرف ہے۔ یہ یہاں اس لئے لایا گیا ہے کہ جہاد بالمال اور جہاد بالنفس اسلحہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔
یہاں جو کہا گیا کہ اللہ اپنے لوگوں کو ظاہر کرنا چاہتا ہے جو کہ اللہ اور اس کی رسولوں کی غائبانہ مدد کرتے ہیں۔ تو بتایا

جاتا ہے کہ اللہ اور رسول اللہ کی نصرت کے معنی کیا ہیں۔تو اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی دعوت اور نظام کی مدد کرتے ہیں جہاں تک ذات باری تعالیٰ کا تعلق ہے تو وہ تو۔

اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۵۷: ۲۵) "اللہ بہت ہی قوی اور غالب ہے" یہاں کہا گیا کہ رسالت اپنی حقیقت ' اپنی کتاب اور اپنی دعوت کے اعتبار سے ایک ہی ہے ' اور یہ رسالتوں کا میزان اور شریعت بھی ایک ہے۔اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ رسول بھی ایک ہیں یہ نوح ابراہیم کی اولاد سے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ

(۵۷: ۲۶) "اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان دونوں کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی" رسولوں کا ایک ہی شجرہ نسب ہے جس کی شاخیں ایک ہی جڑ کے ساتھ پیوستہ ہیں۔انسانیت کے آغاز ہی سے یہ شجرہ چلا ہے۔نوح علیہ السلام سے 'پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ' اور ان کے بعد پھر انسانون کے پھیلنے کے ساتھ رسالتیں بھی پھیل گئیں۔

لیکن جن نسلوں میں یہ نبوت اور کتاب چلتی رہی وہ نسلیں ایک جیسی نہ تھیں۔

فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۵۷: ۲۶) "پھر ان کی اولاد میں کسی نے ہدایت اختیار کی اور بہت سے فاسق ہوگئے" یہ نہایت ہی مختصر تبصرہ طویل انسانی تاریخ پر۔

اور اس طویل تاریخ کی آخری کڑی نبوت محمدی سے پہلے یہ رہی۔

ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّیْنَا بِعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ (۵۷: ۲۷) "اس کے بعد ہم نے پے درپے رسول بھیجے اور ان سب کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو مبعوث کیا" یعنی نوح اور ابراہیم کی اولاد میں پے درپے رسول بھیجے اور ان میں سے آخری کڑی عیسیٰ ابن مریم کی تھی۔یہاں حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں کی ممتاز صفت بھی بیان کر دی جاتی ہے۔

وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً (۵۷: ۲۷) "اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا" یہ ترس اور رحم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا نتیجہ تھا۔کیونکہ آپ نے لوگوں کی روحانی تربیت پر زور دیا۔اور ظاہر ہے کہ روحانی تربیت اور روحانی صفائی کے نتیجے میں ترس اور رحم بیدار ہوجاتا ہے۔جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا صحیح اتباع کیا وہ رحم دل ہوتے تھے۔قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی عیسائیوں کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے۔ابتدائی دور کے عیسائیوں نجاشی اور وفد نجران کے لوگوں کا رویہ بھی اسلام کے ساتھ ہمدردانہ رہا۔اور اسی طرح دوسرے متفرق افراد بھی ان میں دار الاسلام آئے اور اسلام قبول کیا۔جب تک وہ عیسیٰ علیہ السلام کے صحیح متبعین میں سے رہے۔

قرآن کریم یہاں مسیح علیہ السلام کے متبعین کی ایک دوسری صفت کو بھی بیان کرتا ہے لیکن اس پر ایک خوبصورت

تنقید بھی کرتا ہے۔

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ (۵۷:۲۷) ''اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کرلی ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔ مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی تھی'' راجح تفسیر یہ ہے کہ تاریخ مسیحیت میں جو رہبانیت نظر آتی ہے وہ مسیح کے بعض پیروکاروں نے اختیار کرلی تھی۔ اور یہ انہوں نے اللہ کی رضا جوئی کے لئے اختیار کرلی تھی۔ یہ انہوں نے زندگی کی آلودگیوں سے دوری کے لئے اختیار کرلی تھی اللہ نے اسے ان پر فرض نہ کیا تھا۔ لیکن جب انہوں نے اسے اختیار کرلیا۔ اپنے اوپر واجب کرلیا تو پھر ان کا فرض تھا کہ وہ اس کا حق ادا کرتے۔ اور پاکیزگی' بلندی' عفت' قناعت اور ذکر و فکر کے جو تقاضے وہ رکھتی تھی اسے یہ پورا کرتے۔ کیونکہ انہوں نے رضائے الٰہی کے لئے اسے ایجاد کیا تھا۔

لیکن ہوا یوں کہ یہ رہبانیت محض رسم ہو کر رہ گئی اسم سے خالی ہوگئی۔ لوگوں نے اسے پیشہ بنالیا اور حقیقی روح سے خالی ہوگئی۔ چند رہبان کے سوا کسی نے اس کا جو حق ادا نہ کیا۔

فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۵۷:۲۷) ''اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے ان کا اجر ہم نے ان کو عطا کیا۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔'' اللہ کا قانون یہ نہیں ہے کہ لوگوں کی ظاہری شکلوں کو دیکھ کر فیصلہ کرے۔ نہ رسم و رواج کو دیکھے۔ اللہ لوگوں کی نیت کو دیکھتا ہے لوگوں کے اعمال کو دیکھتا ہے۔ وہ نیت اور عمل پر فیصلے کرتا ہے۔ اور کسی کی نیت اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ تو دلوں کی بات جانتا ہے۔

---○○○---

اب آخری پکار ان لوگوں کے نام ہے جو ایمان لائے ہیں۔ اور دین اور رسالت کی تاریخ اور امم اسلامیہ کی کڑیوں میں سے آخری کڑی ہے اور جنہوں نے اب قیامت تک انبیا کی دعوت کا بوجھ اٹھانا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۸) لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۲۹) (۵۷:۲۸ - ۲۹) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ' اللہ تمہیں رحمت کا دہرا حصہ عطا فرمائے گا اور تمہیں وہ نور بخشے گا جس کی روشنی میں تم چلو گے' اور تمہارے قصور معاف کر دے گا' اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔ (تم کو یہ روش

اختیار کرنی چاہئے) تاکہ اہل کتاب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے فضل پر ان کا کوئی اجارہ نہیں ہے - اور یہ کہ اللہ کا فضل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے ' جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے ' اور وہ بڑے فضل والا ہے "۔

یہ ایمان والوں کو آواز دی جا رہی ہے - ان کے محبوب نام سے دی جا رہی ہے -

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۵۷ : ۲۸) "اے ایمان لانے والے لوگو!" یہ ان کے دل کی آواز ہے ' دل پر چسپاں ہونے والی آواز ہے - ایمان کو زندہ کرنے والی آواز ہے - یہ یاد دہانی ہے کہ ایمان کا حق ادا کرو ' اور تمہارا رب جو تمہیں پکار رہا ہے اس کے ساتھ تمہارا تعلق ایمانی تعلق ہے - اس لئے تمہیں اس نام سے پکار رہا ہے - ایمان کے حوالے سے اللہ دعوت دیتا ہے کہ اس سے ڈرو اور رسول پر ایمان لاؤ - معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایمان کا حق کوئی خاص مفہوم مراد ہے - یعنی حقیقت ایمان اور آثار خود اپنے اندر پیدا کرو -

اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ (۵۷ : ۲۸) "اللہ سے ڈرو ' اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ ' اللہ تمہیں اپنی رحمت کا دہرا حصہ عطا فرمائے گا" یہ بھی عجیب انداز ہے - اللہ کی رحمت کا تجزیہ تو نہیں ہو سکتا جس کو پہنچ گئی پوری پوری پہنچ گئی - اس کے حصے بخرے کہاں ہوتے ہیں - دراصل یہاں محدود انسانی ذہن کے مطابق بات ہو رہی ہے کہ تمہیں دو حصے ملیں گے -

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ (۵۷ : ۲۸) "تمہیں وہ نور بخشے گا جس کی روشنی میں تم چلو گے" یہ وہ ربانی تحفہ ہوتا ہے جو ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں - اور رسول پر بھی ایمان لاتے ہیں - اس بخشش سے دل نرم ہو جاتے ہیں - اور پردوں کے پیچھے سے اصل حقیقت کو دیکھ لیتے ہیں - اس لئے وہ اپنی راہ پر سیدھے جاتے ہیں - گمراہ نہیں ہوتے -

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۷ : ۲۸) "اور تمہارے قصور معاف کر دے گا - اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے" بہرحال انسان تو انسان ہے ' جس قدر بھی نور اسے حاصل ہو اس سے غلطی سرزد ہو سکتی ہے - اس کو مغفرت کی بروقت ضرورت ہے اور اللہ غفور الرحیم ہے -

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ تاکہ اللہ کی رحمت کا دہرا حصہ تمہیں ملے - یہ کہ یہ نور تمہیں ملے جس کی روشنی میں تم سفر زندگی طے کرو ' اور اللہ کی رحمت اور مغفرت تمہارے شامل حال ہو جائے اور تمہاری خطائیں معاف ہوں -

لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ (۵۷ : ۲۹) "تاکہ اہل کتاب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے فضل پر ان کا اجارہ نہیں ہے اور یہ کہ اللہ کا فضل اس کی اپنے ہاتھ میں ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے" اہل کتاب یہ گھمنڈ رکھتے تھے کہ وہ اللہ کی برگزیدہ

قوم ہیں اور وہ اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا "وہ کہتے ہیں کہ یہودی بن جاؤ یا نصاریٰ بن جاؤ تمہیں ہدایت مل جائے گی" تو اللہ تعالیٰ مومنین کو دعوت دیتا ہے کہ اللہ کی رحمت' اس کی جنت' اس کی مغفرت اور اس کی انعامات کے مستحق ہو جاؤ اور میں تم پر ان چیزوں کی بارش کروں گا تب اہل کتاب کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ تو زعم باطل میں مبتلا ہیں۔ اور ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ مسلمانوں پر ہو گیا ہے۔ یہ کسی کے اجارے میں نہیں دے دیا گیا اور نہ محدود کر دیا گیا ہے۔

وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (۵۷: ۲۹) "اور اللہ بڑے فضل والا ہے"۔

غرض یہ ایک ایسی دعوت ہے جس میں مسلمانوں کو مقابلے کی دعوت دی گئی۔ کہ تم تقویٰ اور طہارت اور نیکی کی راہ میں آگے بڑھ جاؤ۔ اس پر یہ سورت ختم ہوتی ہے اور سورت کا خاتمہ اور آغاز باہم مل جاتے ہیں۔ کیونکہ اس پوری سورت میں یایها الذین امنو اکی پکار ہے۔ کہ رب کے سامنے خضوع و خشوع اختیار کرو' رب کے احکام بجالاؤ' مالی' بدنی اور روحانی فرائض پورے کرو۔

قرآن کریم جس انداز میں قلب انسانی کو خطاب کرتا ہے یہ سورت اس کا بہترین نمونہ ہے۔ پر اثر انداز میں انسانوں کو نیکیوں پر ابھارا جاتا ہے' اس سورت کا آغاز انجام اور سیاق کلام سب انسانوں کو عمل صالح پر آمادہ کرنے والے ہیں۔ اس کی تصاویر' ماحول اور اثر آفرینیاں قابل دید ہیں' دعوت اسلامی کا کام کرنے والوں کے لئے اس میں دروس عبرت ہیں۔ اس میں اشارات ہیں کہ لوگوں کو کس اسلوب میں خطاب کیا جائے اور کس انداز میں جوش دلایا جائے'........ یہ اللہ کا درس ہے۔ جس نے ہماری دل بنائے ہیں اور جو ہر چیز کا خالق ہے۔ داعیوں کو چاہئے کہ وہ اس ربانی درسگاہ سے سیکھ کر نکلیں تاکہ ان کی دعوت کامیاب ہو۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ــ ۲۸

سورۃ المجادلۃ ـ ۵۸

۱ ــ تا ــ ۲۲

سورۃ المجادلہ ایک نظر میں

اس سورت میں بلکہ اس پورے پارے میں مدنی دور کی تاریخ اسلام اور سیرۃ النبی کے واقعات و موضوعات پر بحث ہے ۔ مدینہ میں اٹھنے والی اسلامی جماعت اور اسلامی سوسائٹی کی تربیت اور اصلاح اور اس مقصد کے لیے تیاری جس کے لیے اسے برپا کیا گیا ہے ۔ یہ اس سورت کے موضوعات ہیں ۔ تحریک کے سامنے جو ہدف تھا وہ ایک عالمی بلکہ کائناتی ہدف تھا ۔ اور یہ ہدف اس تحریک کے لیے اللہ نے اپنی کائناتی اسکیم میں ازل سے مقرر کر رکھا تھا ۔ مختصر الفاظ میں وہ ہدف یہ تھا کہ ان لوگوں کے سامنے اس زندگی کا کامل اور شامل ' جامع اور مانع تصور حیات پیش کیا جائے ۔ پہلے اس تصور کو جماعت مسلمہ کے ذہنوں میں بٹھایا جائے اور پھر اس تصور کی بنیاد پر ایک عملی نظام قائم کیا جائے ۔ اس کے بعد یہ جماعت اس نظام کو لے کر اٹھے اور پوری دنیا پر چھا جائے اور اس نظام کو غالب کر دے ۔ یہ چونکہ ایک عظیم مقصد تھا اس لیے اس کے لیے ایک عظیم تیاری کی ضرورت تھی ۔

وہ ابتدائی مسلمان جن کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جا رہا تھا ' وہ عظیم لوگ تھے ۔ ان میں انصار اور مہاجرین کے سابقون اولون تھے جن کا ایمان پختہ تھا ' جدید نظریہ کے بارے میں جن کا تصور مکمل ہو گیا تھا ' ان کے نفوس اس کے لیے مخلص ہو گئے تھے ' وہ اس بات کو پا گئے تھے کہ ان کے وجود کی حقیقت کیا ہے اور اس عظیم کائنات کی حقیقت کیا ہے ۔ ان کا وجود اس کائنات کی حقیقت میں مکمل حل ہو گیا تھا ۔ یوں وہ اس کائنات میں اللہ کی تقدیر بن گئے تھے ۔ ان کے اندر کوئی ٹیڑھ پن باقی نہ رہی تھی ۔ وہ اس کائنات کے ساتھ چلتے تھے اور اس کائنات کی رفتار سے ایک قدم بھی پیچھے نہ رہتے تھے ۔ ان کے دلوں کے اندر اللہ کے سوا کوئی آرزو نہ تھی ۔ وہ ایسے تھے جیسا کہ اس سورت میں ان کے بارے میں کہا گیا ہے ۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸ : ۲۲) " تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں ' وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے ' خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے

ہوں یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان ـ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخش دی ہے ـ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ـ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے ـ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ـ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں ـ خبردار رہو اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں"ـ

لیکن یہ السابقون الاولون جماعت اسلامی کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر کم تھے ـ خصوصاً ان ادوار میں جب اسلام ایک پر شوکت قوت تھی اور لوگ اس سے ڈرتے تھے ـ یہاں تک کہ فتح مکہ سے پہلے بھی اس میں ایسے لوگ آگئے تھے جن کی تربیت مکمل نہ تھی ـ اور جنہوں نے اسلامی فضا میں کوئی زیادہ وقت نہ گزارا تھا ـ جس طرح اس میں منافقین بھی داخل ہو گئے تھے' محض مفادات کی خاطر جبکہ ان کے دلوں میں بیماری تھی' وہ موقع کی تلاش میں تھے اور وہ اسلامی بلاک اور اسلام کے بالمقابل قوی تر بلاکوں کے درمیان مذبذب تھے ـ ان مخالف محاذوں میں مشرکین کا محاذ بھی تھا اور یہودیوں کا محاذ بھی تھا ـ

اس عظیم کردار کے لیے مسلمانوں کو تیار کرنے کی خاطر ایک عظیم تربیت کی ضرورت تھی ـ اس کے لیے بڑی محنت اور پتہ مار کام کرنے کی ضرورت تھی' اور یہ کام نہایت تدریج کے ساتھ کیا جانا ضروری تھا ـ یہ تربیتی کام چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی ضروری تھا اور بڑے بڑے معاملات میں بھی ضروری تھا ـ اسلام نے جو تحریک شروع کی تھی وہ ایک ہمہ گیر تعمیری تحریک تھی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس تحریک کے سربراہ تھے ـ پہلے ان نفوس کی تعمیر کی جاتی تھی جن سے اسلامی سوسائٹی کی عمارت بنی تھی ـ اس سوسائٹی کو اسلامی نظام حیات کے نظریہ اور اصولوں پر استوار ہونا تھا' اس طرح کہ یہ نفوس اس نظام کو پہلے سمجھیں اور پھر اسے ٹھوس عملی شکل دیں اور پھر اسے زندہ اور متحرک شکل میں زمین کے کونے کونے میں منتقل کر دیں ـ وہ محض نعرہ یا محض کتاب نہ ہو بلکہ ایک عملی حقیقت ہو ـ

اس سورت اور اس پارے میں اس ہمہ گیر تربیت اور تعمیر کا خوب مشاہدہ ہو گا اور حیات نو کی تعمیر کے لیے جدوجہد کے نمونے بھی ملیں گے اور تعمیر اخلاق کے لیے اسلامی منہاج بھی ملے گا ـ جذبات' واقعات اور لوگوں کی عادات کا مطالعہ بھی ہو گا' اور اسلام اور اسلام کے دشمنوں' مشرکین' منافقین اور یہودیوں کے درمیان مسلسل کشمکش کی جھلکیاں بھی نظر آئیں گی ـ

اس سورت میں ہم مشاہدہ کریں گے کہ اس جماعت پر کس طرح اللہ کی طرف سے مسلسل مہربانیاں ہو رہی ہیں ـ اللہ اپنی نگرانی میں اس جماعت کو بنا رہا ہے ـ اپنے ٹھوس منہاج کے مطابق اس کی تربیت فرما رہا ہے ـ اسے یہ شعور اور احساس بھی دیا جا رہا ہے کہ اللہ کا فضل تمہارے شامل حال ہے ـ اس جماعت کے دل میں یہ یقین پیدا کیا جا رہا ہے کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے ـ اور وہ مشکل ترین حالات میں تمہارا مددگار ہے ـ تمہارے چھوٹے چھوٹے معاملات کو بھی وہ دیکھ رہا ہے ـ تمہاری خفیہ نیتوں کو بھی وہ دیکھ رہا ہے ـ اور تمہارے سب معاملات میں وہ تمہیں تمہارے دشمنوں کی سازشوں سے بچا رہا ہے' خواہ خفیہ سازشیں ہوں' خواہ ظاہری ہوں ـ تم اس کی نگرانی اور حفاظت میں ہو اور اس نے تمہیں اپنے جھنڈے تلے لے لیا ہے' اپنے سایہ میں لے لیا ہے ـ وہ تمہارے اخلاق' تمہاری عادات' تمہارے رسم و رواج کی اصلاح و تربیت کر رہا ہے ـ ایسی تربیت جو کہ اللہ والی جماعت کے اور حزب اللہ کے لائق ہو' جو اللہ کی نگرانی میں ہو ـ اور جو اللہ

کے جھنڈے بلند کیے ہوئے ہو اور اسی نام سے معروف ہو۔

چنانچہ اس سورت کا آغاز اس عجیب دور کی ایک تصویر سے ہوتا ہے' اس تصویر میں آسمان اور زمین کے درمیان' عالم بالا اور انسانوں کے درمیان براہ راست رابطہ نظر آتا ہے۔ یہ رابطہ بالکل ظاہر اور محسوس ہے۔ عالم بالا اسلامی سوسائٹی کے روز مرہ کے معاملات میں شریک ہے۔ اور یہ شرکت بالکل عیاں ہے۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ‌ۖ وَ اللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ (۵۸ : ۱) "اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملہ میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے۔ وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے"۔ یوں نظر آتا ہے کہ ایک چھوٹے سے خاندان کے روز مرہ کے معاملات میں سے ایک معاملہ میں عالم بالا سے مداخلت ہوگئی۔ اس خاندان کے لیے بڑی مشکل صورت حالات پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے معاملے میں اللہ کا فیصلہ آ جاتا ہے۔ اللہ نے اس عورت کی گفتگو سن لی تھی' جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تکرار کر رہی تھی۔ حضرت عائشہ نے بھی یہ باتیں نہ سنی تھیں حالانکہ وہ آپ سے قریب تھیں۔ یہ ایک ایسی تصویر ہے جس سے اللہ کا وجود' اللہ کا قرب' اللہ کی مہربانی اور اللہ کی نگرانی اس پوری فضا پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس کے بعد ایک نہایت ہی تاکیدی ہدایت اور تبصرہ آتا ہے۔ جو لوگ اللہ کے دشمن ہیں' اور یہ جماعت مسلمہ کے دشمن ہیں اور وہ اس کے اندر اس کی صفوں میں شامل ہیں' ان کے لیے عذاب الیم ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں میں ان لوگوں سے مواخذہ اس ریکارڈ کے مطابق کیا جائے گا' جو اللہ نے ان کے اعمال کے متعلق تیار کیا ہے۔ یہ خود یہ سب کچھ کر کے اسے بھول جائیں گے۔

وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (۵۸ : ۶) "اللہ ہر چیز پر گواہ ہے"۔ اس کے بعد تاکید مزید یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ ہر قسم کے نجویٰ کو سن رہا ہے۔ تمام وہ لوگ جو نجویٰ کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اکیلے ہیں' اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۵۸ : ۷) "پھر قیامت کے روز وہ ان کو بتا دے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔ یہ بھی ایک تصویر ہے جو دکھاتی ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے اور اسے سب کچھ معلوم ہے۔

یہ تمہید تھی ان لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لیے جو چھپ چھپ کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ اس سے ان کو پریشان' غمگین اور خوفزدہ کرنا مطلوب ہے۔ اور ان کو یہ دھمکی دینا مطلوب ہے کہ ان کی تمام کارستانیاں اللہ کو معلوم ہیں۔ اللہ دیکھ رہا ہے کہ تمہارے مشورے گناہ' دست درازی اور رسول اللہ کی نافرمانی میں ہیں' اور اللہ اس پر تمہیں پکڑنے والا ہے اور عذاب دینے والا ہے۔ اس مناسبت سے مسلمانوں کو بھی ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ صرف نیک

کاموں میں نجویٰ کر سکتے ہیں ۔جن کا تعلق تربیت نفوس اور اپنے معاملات کی بھلائی ہو۔

تربیت اور تہذیب کے کچھ مزید اصول دیتے ہوئے مسلمانوں کو آداب مجلس رسول سکھائے جاتے ہیں 'کہ رسول کی مجلس میں رسول کی اطاعت کریں اور اچھا رویہ اختیار کریں ۔ اسی طرح مجالس علم اور ذکر میں بھی یہی رویہ اختیار کریں ۔ رسول اللہ سے سوال کرنے کے آداب اور ایسے معاملات میں بہت ہی سنجیدگی اختیار کرنے کے آداب ۔

باقی سورۃ میں ان منافقین کے رویوں پر تبصرہ ہے جو یہودیوں کے ساتھ محبت رکھتے ہیں ۔ان کے ساتھ مل کر اسلامی تحریک کے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور مسلمانوں اور رسول اللہ کے سامنے جھوٹی قسمیں کھاکر اپنی صفائی کرتے ہیں ۔یہ قسمیں کھانے والے جھوٹے ہیں ۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔یہ لوگ اپنی قسموں کی آڑ میں اللہ کے عذاب سے بچنا چاہتے ہیں 'جس طرح دنیا میں قسموں کے ذریعہ رسول اللہ اور مسلمانوں کی ناراضگی سے بچنا چاہتے ہیں ۔ فیصلہ سنا دیا جاتا ہے کہ جو اللہ اور رسول اللہ سے دشمنی کرتا ہے اللہ نے لکھ دیا ہے کہ وہ ذلیل لوگوں میں سے ہو گا۔ اور ایسے لوگ آخرکار سخت خسارے میں رہیں گے ۔جس طرح اللہ نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ اور اس کے رسول غالب رہیں گے ۔یہ بات اللہ نے ان کی حیثیت کو کم کرنے کے لیے بیان کی ہے کیونکہ بعض نادان مسلمان اب بھی ان لوگوں کو اہمیت دیتے تھے ۔ اس لیے وہ ایسے منافقوں کے ساتھ تعلقات قائم رکھے ہوئے تھے ۔ مقصد یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے تعلق کا مرکز اور محور اسلامی سوسائٹی ہو جائے ۔ اور اس طرح اسلامی صفیں مکمل طور پر ان منافقین سے ممتاز ہو جائیں ۔ وہ صرف اللہ کی مہربانی پر بھروسہ کریں اور صرف اس بات پر اطمینان کریں کہ اس جماعت اور امت کو اللہ نے کسی عظیم مقصد کے لیے اٹھایا ہے اور اس کی تربیت اللہ انہی اہداف کو پیش نظر رکھ کر کر رہا ہے اور ان کو نہ صرف اس دنیا میں بلکہ پوری کائنات میں ایک مقصد کے لیے تیار کر رہا ہے ۔

اس سورت کے آخر میں حزب اللہ کی خوبصورت تصویر 'یہ تصویر السابقون الاولون کی تھی جو مدینہ کی گلیوں میں چلتی پھرتی تھی 'مہاجرین میں بھی تھی اور انصار میں سے بھی ۔ اور اس دور میں مسلمانوں کی اکثریت کو یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ وہ اس مقام بلند تک پہنچنے کی کوشش کریں جس تک ابھی وہ نہیں پہنچے ۔ان کو بتانا مقصود تھا کہ تمہارا آئیڈیل منافق نہیں بلکہ یہ لوگ ہیں ۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (۵۸ : ۲۲) "تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں 'وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہو ..."۔

---o0o---

درس نمبر ۲۵۸ تشریح آیات

ا ـ ـ تا ـ ـ ۲۲

سُورَةُ الْمُجَادَلَةِ (۵۸) مَدَنِيَّةٌ (۱۰۵)
آیاتها ۲۲ ركوعاتها ۳
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖ
وَ اللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝١ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ
مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۗ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـئِيْ وَلَدْنَهُمْ ۗ وَ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ
مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا ۗ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝٢ وَ الَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ
نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۗ
ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۗ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝٣ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ
شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ
مِسْكِيْنًا ۗ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۗ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۗ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۝٤

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملہ میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے ۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے' وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے ۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار

کرتے ہیں ان کی بیویاں ان کی مائیں بنیں ہیں' ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے ۔ یہ لوگ ایک سخت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں' اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے ۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی اس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی تھی' تو قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں' ایک غلام آزاد کرنا ہو گا ۔ اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے' اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے ۔ اور جو شخص غلام نہ پائے وہ دو مہینے کے پے درپے روزے رکھے قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں ۔ اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے ۔ یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ ۔ یہ اللہ کی مقرر کی گئی ہوئی حدیں ہیں' اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

جاہلیت کا یہ قانون تھا کہ مرد کسی وجہ سے بیوی سے ناراض ہو جاتا تو اسے یہ کہہ دیتا "تو میرے لیے اس طرح ہے جس طرح میری ماں کی پیٹھ"۔ اس فقرے سے نہ عورت طلاق ہوتی تھی اور نہ وہ اس کے ساتھ تعلق زناشوئی قائم کر سکتا تھا ۔ یوں یہ عورت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معلق رہ جاتی تھی ۔ یہ دوسرے مظالم کے علاوہ ایک ظلم تھا جس میں کوئی عورت زمانہ جاہلیت میں مبتلا ہو جاتی تھی ۔

جب اسلام ظہور پذیر ہوا تو اسلامی سوسائٹی میں ظہار کا یہ پہلا واقعہ پیش آیا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے ۔ ابھی تک اسلامی قانون ظہار نافذ نہ ہوا تھا ۔ امام احمد روایت کرتے ہیں ۔ سعد ابن ابراہیم اور یعقوب سے' یہ دونوں لپی سے' وہ محمد ابن اسحاق سے' وہ معمر ابن عبداللہ ابن حنظلہ سے' وہ یوسف ابن عبداللہ ابن سلام سے' وہ خولہ بنت ثعلب رضی اللہ عنہا سے وہ کہتی ہیں : "خدا کی قسم سورہ مجادلہ کی ابتدائی آیات میرے اور اوس ابن الصامت کے بارے میں نازل ہوئیں ۔ میں ان کی بیوی تھی ۔ یہ بہت بوڑھے اور سخت مزاج تھے ۔ ایک دن وہ آئے میں نے کسی معاملے میں ان کے ساتھ تکرار کر لیا ۔ انہیں بہت غصہ آیا تو انہوں نے مجھے کہا تو مجھ پر ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ ۔ اس کے بعد وہ چلے گئے ۔ اور لوگوں کی محفل میں کچھ دیر تک رہے ۔ پھر واپس آگئے ۔ تو کیا دیکھتی ہوں کہ یہ میرے ساتھ تعلق زناشوئی کرنا چاہتے ہیں ۔ میں نے کہا خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں خولہ کی جان ہے' تم میرے قریب نہیں آ سکتے ۔ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ تو کہہ دیا ہے ۔ اب یہ معاملہ رسول اللہ کے پاس جائے گا ۔ اور جب تک اللہ اور رسول اللہ کا کوئی حکم نہیں آ جاتا تم میرے قریب نہیں آ سکتے ۔ تو انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا اور میں نے انہیں روکا جس طرح ایک عورت بوڑھے شخص کو روک لیتی ہے ۔ غرض میں انہیں اپنے سے پرے پھینک دیا ۔ اس کے بعد میں اپنی بعض پڑوسنوں کے پاس گئی اور ان سے کپڑے عاریتاً مانگے ۔ پھر میں رسول اللہ کے پاس پہنچ گئی ۔ میں آپ کے سامنے بیٹھ گئی ۔ تو میں نے آپ کے سامنے پورا ماجرہ سنایا اور میں نے شوہر کی بداخلاقی کی شکایت بھی کی ۔ تو رسول اللہ کہنے لگے "وہ تمہارا چچازاد بوڑھا ہے ۔ اس کے بارے میں اللہ سے ڈرو"۔ خدا کی قسم میں اصرار کرتی ہی رہی یہاں تک کہ قرآن مجید نازل ہو گیا ۔ رسول اللہ پر فوراً ایک حالت طاری ہو گئی ۔ جو عموماً آپ پر نہ ہوتی تھی ۔ اس کے بعد آپ سے یہ حالت دور ہو گئی تو مجھے آپ نے فرمایا "خولہ' اللہ نے تمہارے اور تمہارے خاوند کے بارے میں قرآن نازل کر دیا ہے"۔ اس کے بعد آپؐ نے مجھے یہ آیات سنائیں ۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَ اللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ (١) اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ وَ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (٢) وَ الَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (٣) فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (٤) (٥٨ : ١ تا ٤) ”اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملہ میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے ' وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں ' ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے۔ یہ لوگ ایک سخت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں ' اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی اس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی تھی ' تو قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں ' ایک غلام آزاد کرنا ہو گا۔ اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے ' اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ اور جو شخص غلام نہ پائے وہ دو مہینے کے پے درپے روزے رکھے قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ یہ اللہ کی مقرر کی گئی ہوئی حدیں ہیں ' اور کافروں کے لیے دردناک سزا ہے“۔

کہتی ہیں مجھے رسول اللہ نے بتایا کہ اس کو حکم دیں کہ وہ ایک غلام آزاد کر دے۔ تو میں نے حضور سے عرض کی ”اس کے پاس کیا ہے کہ وہ غلام آزاد کرے“ تو آپ نے فرمایا ”پھر وہ مسلسل دو ماہ تک روزے رکھے“۔ تو میں نے کہا کہ : ”خدا کی قسم وہ تو بوڑھا آدمی ہے۔ وہ دو ماہ کے مسلسل روزے نہیں رکھ سکتا“۔ تو آپ ؐ نے فرمایا ”پھر وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے فی مسکین ایک وسق کھجوریں دے۔“ کہتی ہیں میں نے کہا رسول خدا ' خدا کی قسم اس کے پاس یہ بھی نہیں ہے۔ تو رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ ”میں اسے کھجور کی ایک ”عرق“ (ساٹھ صاع) دے دوں گا“۔ تو میں نے کہا ”حضور ﷺ ایک عرق میں دے دوں گی“۔ تو اس پر حضور ﷺ نے فرمایا ”تو نے ٹھیک رویہ اختیار کیا اور احسان کیا ' لہذا جاؤ اور اس کی طرف سے صدقہ کرو ' اور اس کے بعد اپنے چچازاد کے ساتھ اچھا رویہ اختیار کرو“۔ کہتی ہیں ”میں نے ایسا ہی کیا“۔ (اس روایت کو امام ابو داؤد نے کتاب الطلاق میں نقل کیا ہے)۔

یہ حالات تھے جن میں حضور اکرم اور ایک عورت کے درمیان گفتگو ہوئی اور اس بارے میں پھر سات آسمانوں کے اوپر سے حکم آیا تاکہ اس عورت کو اس کا حق دیا جائے اور اس کے اور اس کے خاوند کے دلوں کو سکون دیا جائے اور اس قسم کے معاملات 'روز مرہ معاملات میں مسلمانوں کے لیے ضابطہ وضع کر دیا جائے۔

یہ وہ حالات ہیں 'جن سے قرآن کی ایک سورت کا آغاز ہو رہا ہے۔ قرآن اللہ کی ایک دائمی اور لازوال کتاب ہے اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کے ساتھ پوری کائنات ہم رکاب ہو جاتی ہے۔ سورت کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا (۵۸ : ۱) "اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی تھی"۔ تو اللہ مسلمانوں کی ایک عام عورت کے معاملات کی طرف بھی متوجہ ہے۔ اس عظیم کائنات' ناپید اکنار کائنات کے انتظام و انصرام نے اللہ کو ان معاملات سے مشغول نہ کر دیا تھا' نہ کسی اہم معاملے نے اللہ کو اس سے باز رکھا۔

یہ بہت ہی اہم معاملہ ہے کہ اس طرح کے ایک چھوٹے سے روز مرہ کے معاملے میں اللہ کی مداخلت ہو جائے اور پوری جماعت مسلمہ یہ شعور لے کہ اللہ ان کے ساتھ ہے' ان کے حالات میں' ان کے معاملات میں کسی بڑے معاملے میں یا چھوٹے معاملے میں' روز مرہ کے معاملے میں یا دائمی اور بڑے مسئلے اور مسائل میں۔ حالانکہ اللہ بہت ہی بڑا' برتر' جلیل القدر' جبار اور متکبر ہے۔ تمام آسمان اور زمین اسی کے ہیں اور وہ غنی ہے اور اپنی ذات میں محمود ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں 'تعریفیں ہیں اس ذات کے لیے جو تمام آوازوں کو سنتا ہے' رسول اللہ سے تکرار کرنے والی کا نام خولہ تھا' وہ آئی گھر کے ایک کونے میں وہ رسول اللہ سے بات کر رہی تھی اور میں اس کی باتیں نہ سن سکتی تھی' اللہ نے یہ آیت نازل کی۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْ اِلَی اللّٰهِ (۵۸ : ۱) "اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی تھی اور اللہ سے فریاد کیے جاتی تھی"۔ (بخاری)

خولہ کی روایت میں' جسے خویلہ تصغیر اور تذلیل کے لیے کہا گیا ہے' یہ بات ہے کہ یہ حادثہ' اس میں اس عورت کی کارروائی' رسول اللہ تک پہنچنا' تکرار کرنا' قرآن کا نازل ہونا' ان سب باتوں سے اس زندگی کا ایک نقشہ سامنے آجاتا ہے جو انسانی تاریخ کی یہ منفرد سوسائٹی گزار رہی تھی۔ یہ عجیب دور تھا' لوگوں کا رابطہ براہ راست عالم بالا سے قائم تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی ہدایات کے منتظر رہتے تھے۔ گویا سب لوگ عیال اللہ تھے۔ لوگوں کی نظریں عالم بالا پر اس طرح لگی ہوئی تھیں جس طرح ایک بچہ ہر وقت ماں باپ کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔

قرآن کے اندر اس واقعہ کی جو روایت ہے اس سے جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ عالم بالا کی طرف سے مسلسل ہدایت اور تربیت بھی ہو رہی ہے اور ساتھ ساتھ قانون سازی بھی۔ قرآن اپنے اسلوب کے مطابق قانون بنا رہا تھا۔ یہ بصورت لکٹ خشک قانون سازی نہیں ہے۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اللّٰهُ

یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ (۵۸ : ۱) "اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی تھی اور اللہ سے فریاد کیے جاتی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے اور وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے"۔ یہ نہایت ہی موثر آغاز ہے۔ دیکھو تم دونوں جو باتیں کر رہے ہو' اکیلے نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ اللہ موجود ہے۔ وہ سن رہا ہے۔ اس نے عورت کی بات سن لی۔ اپنے خاوند کے بارے میں تکرار اور اللہ سے شکایت۔ اللہ کو تو سب کچھ معلوم ہے' وہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ یہ تھے حالات اس حادثہ کے جس میں دونوں کے ساتھ ثالث اللہ تھا ـــ یہ سب باتیں چٹکیاں اور دل کے تاروں پر مضراب ہیں۔

اور اس کے بعد اصل مسئلے کو لیا جاتا ہے:

اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ

وَ اِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (۵۸ : ۲) "تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں' ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے۔ یہ لوگ ایک سخت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں' اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے"۔

مسئلے کا حل نہایت ہی گہرائی سے کر دیا گیا۔ ایام جاہلیت میں ظہار کا جو قانون مروج تھا وہ تھا ہی بے بنیاد' بیوی ماں تو ہوتی نہیں کہ وہ ماں کی طرح حرام ہو جائے۔ ماں تو صرف وہ ہوتی ہے جس نے جنا۔ ایک لفظ کہنے سے نہ بیوی ماں بن جاتی ہے نہ حرام ہو جاتی ہے۔ یہ نہایت ہی ناپسندیدہ کلمہ ہے۔ حقیقت اس کی منکر ہے۔ سچائی اس کی منکر ہے' لہذا معاشرے کے اندر سوشل معاملات حقیقت پسندانہ اور حق اور حقائق پر قائم ہونا مناسب ہیں۔ آئندہ مناسب یہ ہے کہ سوشل معاملات واضح اور متعین ہوں۔ مجمل' مضطرب اور پیچیدہ نہ ہوں اور سابقہ معاملات اور حادثات اللہ نے معاف کر دیئے۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (۵۸ : ۲) اصل مسئلے کے سلسلے میں فیصلہ دینے کے بعد اب قانون سازی یوں کی جاتی ہے:

وَ الَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ

یَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (۵۸ : ۳) "جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی اس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی تھی' تو قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں' ایک غلام آزاد کرنا ہو گا۔ اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے' اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے کئی کفاروں میں غلام کی آزادی کی تجویز رکھی ہے۔ یہ اسلام نے دنیا سے غلامی کو ختم کرنے کے لیے

ایک تدبیر کی تھی ۔ کیونکہ اس دور میں جنگ کے بین الاقوامی قوانین میں غلامی کو جائز رکھا گیا تھا۔ اسلام نے بہرحال اس کے ختم کرنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں ۔ یہاں آیت ۔

ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا (۵۸ : ۳) "پھر وہ اس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی تھی" کے مفہوم میں بہت سے اقوال وارد ہیں ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دوبارہ مجامعت کا ارادہ کرلیں جسے انہوں نے بذریعہ ظہار اپنے اوپر حرام کر دیا ہے ۔ یہ مفہوم سیاق کلام کے زیادہ قریب ہے ۔ لہٰذا غلام کا آزاد کرنا 'اس مجامعت سے قبل ہوگا ۔ اس پر نصیحت

ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ (۵۸ : ۳) "اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے" ۔ کفارہ ایک قسم کی یاد دہانی اور تازیانہ عبرت ہے کہ دوبارہ یہ حرکت نہ کرو 'کیونکہ یہ رسم نہ حق ہے اور نہ معروف طریقہ ہے ۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۵۸ : ۳) "اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے" ۔ اللہ کو اس کی حقیقت معلوم ہے ۔ واقعات سے بھی وہ خبردار ہے اور تمہاری معاشرت سے بھی وہ خبردار ہے ۔

یہ نصیحت اور عبرت آموزی قانون ظہار کی تکمیل سے پہلے آگئی ۔ نفوس کی تربیت کے لیے اور اس لیے کہ اللہ جو قانون بنا رہا ہے وہ اپنے علم اور اپنی حکمت کے مطابق بنا رہا ہے ۔ وہ ظاہر سے بھی خبردار ہے اور باطن سے بھی ۔ اب اس کے بعد حکم کو مکمل کیا جاتا ہے ۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا (۵۸ : ۴) "اور جو شخص غلام نہ پائے وہ دو مہینے کے پے درپے روزے رکھے قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں ۔ اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے" ۔

اب اس قانون کے توضیحی بیان اور مسلمانوں کو ہدایت کے لیے یہ تبصرہ آتا ہے ۔

ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۵۸ : ۴) "یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ" ۔ وہ تو پہلے سے مومن ہیں؟ لیکن یہ بیان کہ یہ کفارات اور جرمانے اور ان کے حالات کو اللہ کے احکام و قوانین سے مربوط کرنے سے ایمان میں قوت اور اضافہ ہوتا ہے ۔ عملی زندگی ایمان کے ساتھ مربوط ہوتی ہے اور عملی زندگی پر ایمان کا کنٹرول قائم ہوتا ہے ۔

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۵۸ : ۴) "یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں" ۔ یہ حدیں اللہ نے اس لیے قائم کی ہیں کہ لوگ ان حدوں سے آگے نہ بڑھ جائیں ۔ اور جو شخص ان کا خیال نہیں رکھتا اور ان سے ادھر ہی رک کر نہیں رہتا اس کے غضب کا مستحق ہوتا ہے ۔

وَ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۵۸ : ۴) "اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ کیونکہ وہ ظلم کرتے ہیں' اللہ کو چیلنج کرتے ہیں' ایمان نہیں لاتے۔ اللہ کی حدود پر نہیں رکتے' جس طرح اہل ایمان رکتے ہیں۔

یہ آخری عبارت وَ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۵۸ : ۴) "اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ سابقہ آیت کے خاتمے کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور آنے والی آیت کا سابق آیت کے ساتھ رابطہ بھی قائم کر دیتی ہے۔ جس کا موضوع یہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل ہو کر رہیں گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ وَ قَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۚ﴿۵﴾ یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ
اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ ا
شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۶﴾ ع ۶

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ اسی طرح ذلیل و خوار کر دیئے جائیں گے جس طرح ان ا
سے پہلے کے لوگ ذلیل و خوار کیے جا چکے ہیں۔ ہم نے صاف صاف آیات نازل کر دی ہیں' اور کافروں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ اس دن (یہ ذلت کا عذاب ہونا ہے) جب اللہ ان سب کو پھر سے زندہ کر کے اٹھائے گا۔ اور انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ وہ بھول گئے ہیں مگر اللہ نے ان کا سب کیا دھرا گن گن کر محفوظ کر رکھا ہے اور اللہ ایک ایک چیز پر شاہد ہے"۔

پہلے پیراگراف میں یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ اہل اسلام کے ساتھ کس قدر مہربانی کرنے والا ہے اور جماعت مسلمہ کے مسائل حل کرنے کے لیے وہ ہر وقت تیار ہے۔ یہ دوسرا پیراگراف کافروں کی سرکوبی کے لیے ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور رسول اللہ کی دشمنی پر اتر آئے ہیں یعنی وہ مسلمانوں کی حدود پر متضاد اور مخالفانہ موقف اختیار کرتے ہیں اور محاذ آرائی کرتے ہیں۔ پہلے چونکہ حدود اللہ کا ذکر ہے اور حدود پر جو جھگڑتا ہے وہ دشمن ہوتا ہے یعنی سرحدوں پر جو لڑتا ہے اس لیے یہاں ایسے دشمنان اسلام کا ذکر کر دیا گیا۔ جو رسول اللہ کے مقابلے میں حد پر کھڑے ہیں اور مقابلے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس سے دو متقابل فریقوں کی ایک تصویر دی گئی جو حدود پر لڑتے ہیں۔ اس سے کافروں کے اس فعل کی قباحت اور گھناؤنے پن کا اظہار مقصود ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنے خالق اور رازق سے لڑنے نکل آئے ہیں اور انہوں نے اللہ کی حدوں پر اپنی شیطانی افواج جمع کر رکھی ہیں۔

یہ لڑنے والے محاذ آرائی کرنے والے۔

كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۵۸ : ۵) "اسی طرح ذلیل و خوار کر دیئے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے کے لوگ ذلیل و خوار کیے جا چکے ہیں"۔ راجح بات یہ ہے کہ یہ ایسے لوگوں کے لیے بد دعا ہے اور اللہ

کی طرف سے بد دعا دراصل حکم الہٰی ہی ہوتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تو فعال لما یرید ہے۔ کبت کے معنی قہر نازل ہونے اور ذلیل کرنے کے ہیں۔ پہلے لوگوں سے مراد یا تو وہ ہیں جو گزر چکے 'انبیائے سابقہ کی امتیں۔ جن کو اللہ نے اسی جرم میں پکڑ لیا ان سے مراد وہ مشرکین اور یہود نہیں جن کو مسلمانوں کے ذریعہ اللہ نے ذلیل کر دیا تھا' ان آیات کے نزول سے پہلے' مثلاً غزوۂ بدر میں۔

وَ قَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ (۵۸ : ۵) "ہم نے تو صاف صاف آیات نازل کر دی ہیں"۔ اس آیت میں ان لوگوں کے انجام کو مفصل اور جدا کر کے بیان کیا ہے جو اللہ اور رسول سے دشمنی کرتے ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہ اس لیے کہ یہ انجام جو ان آیات میں بیان ہوا ہے وہ لوگ اس انجام تک کسی جہالت کی وجہ سے نہیں پہنچ رہے یا اس لیے اس انجام تک نہیں پہنچ گئے کہ ان کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ بلکہ ان کو بات بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھا دی گئی تھی۔ اس کے بعد ان کا اخروی انجام نہایت ہی سبق آموز انداز میں لایا جاتا ہے تاکہ اہل ایمان کی اصلاح اور تربیت ہو۔

وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ (۵) یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (۵۸ : ٦) "اور کافروں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ اس دن (یہ ذلت کا عذاب ہوتا ہے) جب اللہ ان سب کو پھر سے زندہ کر کے اٹھائے گا۔ اور انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ وہ بھول گئے ہیں مگر اللہ نے ان کا سب کیا دھرا گن گن کر محفوظ کر رکھا ہے اور اللہ ایک ایک چیز پر شاہد ہے"۔

یہاں یہ توہین آمیز عذاب' ان کے تکبر کے بدلے' ان کو دیا جائے گا۔ جب لوگوں کو اللہ اٹھائے گا تو ان نام نہاد بڑوں کو اللہ عوام کے سامنے توہین آمیز عذاب دے گا۔ یہ وہ عذاب ہو گا جو حق پر دیا جائے گا۔ اور ان کا مفصل اعمال نامہ اس کی پشت پر ہو گا جسے یہ اس دن بڑی بے پرواہی سے بھول جائیں گے۔ حالانکہ اللہ نے اسے یوں تیار کیا ہو گا کہ اس میں سے کوئی چیز بھی باقی نہ رہی ہو گی کیونکہ اللہ تو سب کچھ جانتا ہے۔

وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (۵۸ : ٦) "اور اللہ ہر ایک چیز پر گواہ ہے"۔

یہاں رعایت اور فضل و کرم' اور جنگ اور انتقام کی دونوں تصاویر آمنے سامنے ہیں۔ اللہ کا علم اور موجودگی ہر جگہ ہے۔ وہ رعایت امداد اور مہربانی کے لیے بھی حاضر ہے اور وہ جنگ اور انتقام اور دشمنوں کو عذاب دینے کے لیے بھی حاضر ہے۔ لہٰذا اللہ کے حضوری اور موجودگی پر اہل ایمان مطمئن ہو جائیں اور کافر اور دشمن خوفزدہ ہو جائیں۔

یہ کہ اللہ ہر چیز پر شاہد ہے۔ اب یہاں اس کی ایک زندہ تصویر پیش کی جاتی ہے۔ یہ اس قدر موثر ہے کہ قلب و شعور کی تاروں میں اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَا

يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَ
لَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا
عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٧﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا
عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ
وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۡ وَاِذَا جَاۗءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَ
يَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ
يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٨﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا
بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۭ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٩﴾ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَاۗرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠﴾

"کیا تم کو خبر نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا اللہ کو علم ہے؟ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چوتھا اللہ نہ ہو' یا پانچ آدمیوں میں سرگوشی ہو اور ان کے اندر چھٹا اللہ نہ ہو۔ خفیہ بات کرنے والے خواہ اس سے کم ہوں یا زیادہ' جہاں کہیں بھی وہ ہوں' اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر قیامت کے روز وہ ان کو بتا دے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہیں سرگوشیاں کرنے سے منع کر دیا گیا تھا پھر بھی وہ وہی حرکت کیے جاتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا؟ یہ لوگ چھپ چھپ کر آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں کرتے ہیں' اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو تمہیں اس طریقے سے سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے تم پر سلام نہیں کیا ہے اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہماری ان باتوں پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا؟ ان کے لیے جہنم ہی کافی ہے۔ اسی کا وہ ایندھن بنیں گے۔ بڑا ہی برا انجام ہے ان کا۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی باتیں نہیں بلکہ نیکی اور تقویٰ کی باتیں کرو اور اس خدا سے ڈرتے رہو جس کے حضور تمہیں حشر میں پیش ہونا ہے۔ کانا پھوسی تو ایک شیطانی کام ہے' اور وہ اس لیے کی جاتی ہے کہ ایمان لانے والے لوگ اس سے رنجیدہ ہوں' حالانکہ بے اذن خدا وہ انہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی' اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے"۔

آیت کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ اللہ کا علم اس کائنات کے بارے میں جامع و مانع ہے اور ہر چیز کو شامل ہے۔ انسانی فکر اس پوری کائنات کے اندر' آسمان کی دوریوں میں اور زمین کے اطراف میں ہر چیز تک چھوٹی ہو یا بڑی ظاہر ہو یا خفیہ معلوم ہو یا مجہول ہو' نہیں پہنچ سکتی جبکہ ہر چیز اللہ کے علم میں ہوتی ہے۔ یہ آیت انسانی فکر کو یوں دور تک لے جاتی ہے۔

اس کے بعد پھر ہماری فکر خود مخاطبین کے قلوب تک جا پہنچتی ہے۔ ہر شخص کا قلب خزانہ خیالات ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے خفیہ ترین مشورے دو' تین' چار یا پانچ یا کم و بیش آدمی جہاں اور جس محفل میں ہوں' وہاں تک لے جائی جاتی ہے۔

مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ ثَلَٰثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ أَدْنَىٰ

مِن ذَٰلِكَ وَلَآ أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا (۵۸ : ۷) "کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چوتھا اللہ نہ ہو' یا پانچ آدمیوں میں سرگوشی ہو اور ان کے اندر چھٹا اللہ نہ ہو۔ خفیہ بات کرنے والے خواہ اس سے کم ہوں یا زیادہ' جہاں کہیں بھی وہ ہوں' اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے"۔

یہ بذات خود حقیقت ہے لیکن جن خوبصورت الفاظ میں اسے بیان کیا گیا ہے ان کی وجہ سے وہ بہت زیادہ موثر ہو جاتی ہے۔ ایسے انداز میں کہ کبھی تو انسان کا دل کانپ اٹھتا ہے اور کبھی اسے نہایت اطمینان ہوتا ہے کہ اللہ جل جلالہ بھی ہمارے ساتھ موجود ہے۔ جب بھی کوئی تین افراد الگ ہوئے کہ کوئی بات کریں تو فوراً یہ شعور ان کے اندر زندہ ہو جائے گا کہ ہمارے اندر اللہ چہارم ہے اور جب بھی کوئی پانچ جمع ہوں گے تو وہ محسوس کریں گے چھٹا اللہ ہے۔ غرض دو ہوں یا اور زیادہ' اللہ موجود ہوتا ہے۔

یہ ایک ایسی صورت حال ہے کہ انسان کا دل اس کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہو سکتا' کانپ اٹھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اہل ایمان کے لیے یہ ایک مانوس بات ہے' یہ ان کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں کیونکہ اہل ایمان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے لیکن یہ منظر نہایت خوفناک بھی ہے۔

هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا (۵۸ : ۷) "اللہ ان کے ساتھ ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں"۔

ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيَٰمَةِ (۵۸ : ۷) "پھر قیامت کے روز ان کو بتا دے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے"۔ یہ ایک دوسری متزلزل کرنے والی چٹکی ہے' محض اللہ کا موجود ہونا اور تمام باتوں کو سننا بھی ایک خوفناک بات ہے لیکن یہ کہ ان باتوں کا بعد میں حساب و کتاب بھی دینا ہے' یہ اور زیادہ ہولناک بات ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ نجویٰ کرنے والوں کا مقصد یہ ہو کہ ان کا نجویٰ خفیہ رہ جائے۔ قیامت میں اس نجویٰ کی کارروائی کھلی عدالت میں پیش ہوگی اور سب لوگ وہاں حاضر ہوں گے کیونکہ وہ تو یوم المشہود ہے۔

اب خاتمہ بھی اسی بات پر ہوتا ہے' جس سے آغاز ہوا تھا۔

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۵۸ : ۷) "اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔ یوں علم الٰہی کی حقیقت اور جامعیت دلوں میں بٹھائی جاتی ہے۔ ایک ہی آیت میں مختلف اسالیب سے یہ کام ہوتا ہے اور یہ اسالیب اس حقیقت کو دلوں میں بہت گہرا کر دیتے ہیں اور اسی بات کو دل کے اندر مختلف راہوں اور دروازوں سے بٹھاتے ہیں۔

---ooo---

یہ حقیقت کہ اللہ حاضر و ناظر ہے اور مذکور بالا آیات میں اس کو دلوں میں نہایت ہی خوفناک طریقے سے بٹھایا گیا۔ یہ دراصل منافقین کو ایک سخت دھمکی دینے کے لیے بطور تمہید لائی گئی ہے۔ یہ منافقین رسول اللہ اور جماعت مسلمہ کے خلاف رات دن نجویٰ کرتے رہتے تھے' سازشیں تیار کرتے تھے۔ مدینہ میں ان کی کثرت تھی' دھمکی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ان کا موقف بہت عجیب ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۵۸ : ۸) "کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہیں سرگوشیاں کرنے سے منع کر دیا گیا تھا پھر بھی وہ وہی حرکت کیے جاتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا؟ یہ لوگ چھپ چھپ کر آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں کرتے ہیں' اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو تمہیں اس طریقے سے سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے تم پر سلام نہیں کیا ہے اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہماری ان باتوں پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا؟ ان کے لیے جہنم ہی کافی ہے۔ اسی کا وہ ایندھن بنیں گے۔ بڑا ہی برا انجام ہے ان کا"۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں منافقین کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منصوبہ نہایت رواداراانہ اور ان کے ساتھ آپ کا رویہ نہایت ہی ہمدردانہ تھا۔ آپ ان کو یہی نصیحت فرماتے ہیں کہ اخلاص کے ساتھ اسلام کو قبول کر لیں۔ اور آپ ان کو بار بار نجویٰ' سازشوں اور خفیہ تدابیر سے روکتے تھے۔ اور منافقین یہ کام یہودیوں کے ساتھ مل کر کرتے تھے۔ بلکہ یہ تمام کام مشرکین اور منافقین یہودیوں کے اشاروں پر کرتے تھے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلصانہ رویہ کے باوجود انہوں نے اپنی ان سازشون اور خفیہ تدابیر اور نجویٰ کے کام کو اور تیز کر دیا۔ اور اس کے لیے انہوں نے ایسے ذرائع اور تدابیر بھی شروع کر دیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی نافرمانی کی جائے۔ اور مسلمانوں کے معاملات اور اسلامی نظام میں فساد برپا کر کے خلل ڈالا جائے۔

یہ لوگ اپنے کام میں اس قدر تیز اور جری ہو گئے تھے کہ انہوں نے اسلامی حکومت کے احکامات میں فساد ڈالنے کے ساتھ ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ علیک سلیک کے اندر بھی فساد پیدا کر دیا تھا۔ اور السلام علیکم کے معنی میں بھی تبدیلی کر دی تھی۔

وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ (۵۸ : ۸) "اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو تمہیں اس طریقے سے سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے تم پر سلام نہیں کیا ہے"۔ یہ منافقین اور یہودی السلام علیکم کی جگہ السام علیکم کہتے تھے۔ یعنی یہ کہ تم پر موت آجائے۔ اسی طرح انہوں نے کچھ دوسرے الفاظ بھی گھڑ لیے تھے جن کا ظاہر تو اچھا تھا مگر باطن میں وہ ان سے غلط مراد لیتے تھے اور پھر وہ کہتے تھے کہ اگر یہ نبی برحق ہوتا تو اسے ہماری ان باتوں کا علم ہوتا یا ان مجالس کا علم ہوتا جن میں ہم اس کے خلاف تدابیر اور سازشیں کرتے ہیں۔

اس سورت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ بھی جو یہ اپنے دلوں میں سوچتے تھے اور وہ بھی جو سازشیں وہ اپنی مجلسوں میں کرتے تھے۔ کیونکہ سورت کے آغاز میں بتا دیا گیا کہ جو عورت اپنے خاوند کے بارے میں تکرار کر رہی تھی اس کی باتیں اللہ نے سن لیں۔ اور یہ کہ اگر تین آدمی نجویٰ کریں تو چوتھا اللہ ہوتا ہے' اگر چار کریں تو پانچواں اللہ ہوتا ہے نیز ان کے نفوس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی اللہ کو معلوم ہے۔ اور اس کے بعد ان کی باتوں کی یہ تردید کر دی گئی۔

حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۵۸ : ۸) "ان کے لیے جہنم ہی کافی ہے۔ اسی کا وہ ایندھن بنیں گے۔ بڑا ہی برا انجام ہے ان کا"۔

ان کی خفیہ سازشوں کا انکشاف' ان کے نجویٰ کا انکشاف خصوصاً جبکہ حضور کی جانب سے ممانعت کے باوجود انہوں نے کیا' پھر وہ جو دلوں میں کہتے تھے کہ اگر یہ سچا نبی ہے تو اسے ہماری یہ کارروائیاں معلوم ہونی چاہئیں۔ ان باتوں کا انکشاف' غرض یہ سب انکشافات اس بات کی دلیل ہیں کہ زمین و آسمان کی ہر بات کا اللہ کو علم ہے اور اللہ ہر نجویٰ میں موجود ہیں' وہ خفیہ اجتماع کا شاہد ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں منافقین کے لیے تو خوفناک تھیں کہ ان کے تمام امور طشت از بام ہو چکے ہیں جبکہ اہل ایمان کے لیے اطمینان اور بھروسے کا باعث بنیں۔

---ooo---

اب خطاب اہل ایمان کو ہو رہا ہے "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' کہ تم منافقین کی طرح نجویٰ نہ کرو' گناہ کی باتوں میں' دشمنی کی باتوں میں' رسول کی نافرمانی میں' بلکہ جو بات بھی کرو خدا خوفی کے ساتھ کرو' اس قسم کا نجویٰ دراصل شیطان کے اشارے سے ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ شیطان مومنین کو پریشان کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس قسم کا نجویٰ مومنین کے لائق نہیں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۹) اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۰) (۵۸ : ۹ – ۱۰) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو

تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں نہیں بلکہ نیکی اور تقویٰ کی باتیں کرو اور اس خدا سے ڈرتے رہو جس کے حضور تمہیں حشر میں پیش ہونا ہے ۔ کانا پھوسی تو ایک شیطانی کام ہے' اور وہ اس لیے کی جاتی ہے کہ ایمان لانے والے لوگ اس سے رنجیدہ ہوں' حالانکہ بے اذن خداوہ انہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی' اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے''۔

معلوم ہوتا ہے ابتدائی زمانے میں جب کہ لوگوں میں ابھی تک اسلامی جماعت کا صحیح شعور اور احساسات پیدا نہ ہوئے تھے' بعض مسلمان اجتماعی معاملات میں اپنی قیادت کے ساتھ مشورہ کیے بغیر ہی' باہم اجتماعی مشورہ شروع کر دیتے تھے ۔ یہ لوگ ابھی اسلامی تنظیم کی روح سے واقف نہ تھے' جس کے مطابق سب سے پہلے ہر مشورہ بصورت تجویز پہلے قیادت کے سامنے آنا چاہئے اور اسلامی قیادت کے علاوہ کوئی نجویٰ نہیں ہونا چاہئے ۔ معلوم ہوتا ہے اس دور میں بعض مسلمان اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے' جب ایسے مشورے کرتے تھے تو اس سے پیچیدگیاں پیدا ہوتی تھیں اور اس سے جماعت مسلمہ کو تکلیف پہنچتی تھی اگرچہ مشورہ کرنے والوں کی ایسی نیت نہ ہوتی تھی ۔ لیکن ان لوگوں کی طرف سے محض ایسے مسائل اٹھا دینا ہی جماعت کے لیے ایذا کا باعث بن جاتا اور اس سے اجتماعی پالیسی کی نافرمانی ہو جاتی ۔

یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان کو لقب ایمان سے پکارا جاتا ہے' جو ان کی جدید اجتماعیت کی بنیاد فراہم کرتا ہے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (۵۸ : ۹) ''اے لوگو' جو ایمان لائے ہو''۔ ایسے مشورے نہ کرو جو گناہ ہوں' اور حدود سے متجاوز ہوں' اور جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معصیت لازم آتی ہو ۔ اور یہ بھی بیان کر دیا جاتا ہے کہ اہل ایمان کن امور پر مشورہ کر سکتے ہیں ۔

وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (۵۸ : ۹) ''بلکہ نیکی اور تقویٰ کی باتوں پر مشورے کرو''۔ نیکی اور تقویٰ کے بارے میں وسائل وتدابیر اختیار کرنے کے لیے بے شک تم مشورے کرو' البر: یعنی عام بھلائی' التقویٰ :بیداری اور اللہ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوئے ڈرنا ۔ اس قسم کا تقویٰ صرف بھلائی ہی سکھاتا ہے ۔ پھر صراحت کے ساتھ ان کو کہا جاتا ہے کہ ' اس اللہ سے ڈرو جس کی طرف تم نے پلٹ کر جانا ہے ۔ وہ وہاں تمہارے سب کیے پر تم سے حساب لے گا ۔ وہ اس پورے ریکارڈ کو تیار کرنے والا اور اس پر گواہ بھی ہو گا ۔ چاہے جس قدر بھی تم چھپاؤ اور خفیہ رکھو ۔

امام احمد نے روایت کی ہے بہز اور عفان سے' ان دونوں نے ہمام سے' انہوں نے قتادہ سے' انہوں نے صفوان ابن محرز سے' یہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمر کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا' کہ ایک شخص نے ان سے پوچھا: ''تم نے نجویٰ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا سنا کہ قیامت میں اس کے بارے میں کیا ہو گا؟ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ کہتے سنا کہ :''اللہ ایک مومن کے قریب ہو گا ۔ اس پر اپنے دونوں ہاتھ یوں رکھے گا کہ وہ لوگوں سے چھپ جائے گا ۔ اور اس کے گناہوں کا اس سے اقرار لے گا اور کہے گا تمہیں فلاں فلاں گناہ معلوم ہیں' تمہیں فلاں فلاں گناہ معلوم ہیں' تمہیں فلاں فلاں گناہ معلوم ہیں ۔ یہاں تک کہ جب اس کے پورے گناہ اسے یاد دلا دیئے اور اقرار لے لیا' اور اس شخص نے یہ سوچ لیا کہ اب تو وہ مارا گیا تو اس کے بعد اللہ فرمائے گا اچھا' دنیا میں تو میں نے ان گناہوں کو چھپا دیا تھا اور آج میں تمہارے لیے ان سب کو معاف کرتا ہوں ۔ اس کے بعد اللہ اس کو اس کی نیکیوں کا اعمال نامہ

دے گا۔ رہے کفار اور منافقین تو ان کے خلاف پیش ہونے والے گواہ کہیں گے 'اے رب یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا' لعنت ہے ظالموں پر۔ (بخاری)

اس کے بعد مومنین کو نجویٰ' افواہیں پھیلانے اور خفیہ سازشوں سے منع کیا جاتا ہے۔ جماعت سے الگ خفیہ طور پر کوئی مشورہ نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اہل ایمان اس جماعت کا حصہ ہیں' ان کی مصلحت اور جماعت کی مصلحت ایک ہے۔ ان کو کسی معاملے میں جماعت سے جدا نہیں ہونا چاہئے۔ اور ان سے کہا جاتا ہے کہ مومنین جب دیکھیں کہ کچھ لوگ الگ کانا پھوسی کر رہے ہیں' اور الگ مشورے ہو رہے ہیں تو اس طرح اہل ایمان کو شک' پریشانی اور حزن و ملال ہو گا اور بداعتمادی کی فضا پیدا ہو گی۔ شیطانی کاوش ہی یہ ہے کہ وہ اس قسم کے نجویٰ کرنے والوں کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے تا کہ وہ نجویٰ کر کے جماعت مسلمہ کو پریشان کریں حالانکہ وہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۵۸: ۱۰) "کانا پھوسی تو ایک شیطانی کام ہے' اور وہ اس لیے کی جاتی ہے کہ ایمان لانے والے لوگ اس سے رنجیدہ ہوں' حالانکہ بے اذن خدا وہ انہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی' اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے"۔ کوئی مومن اللہ کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اللہ کے سوا کسی پر بھروسہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور نہ کوئی ایسی ہستی ہے۔

احادیث میں آتا ہے کہ ایسے حالات میں کانا پھوسی نہیں کرنا چاہئے جس کی وجہ سے شکوک و شبہات پیدا ہوں اور مسلمانوں کا باہم اعتماد مجروح ہو اور دلوں کے اندر اندیشے پیدا ہوں۔

اعمش حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت کرتے ہیں: "اگر تم تین ہو تو پھر تم سے کوئی دو تیسرے کے سوا الگ ہو کر مشورہ نہ کرے 'کیونکہ اس بات سے وہ دل گیر ہو گا"۔ یہ اسلامی جماعت کے بہترین آداب ہیں۔ اور اگر ایسے آداب کو ملحوظ رکھا جائے تو شکوک و شبہات کی گنجائش ہی نہ رہے گی۔ ہاں اگر راز رکھنے کی مصلحت درپیش ہو' یا کسی کی پردہ داری مطلوب ہو' یا کسی مخصوص شخص کے معاملات میں بات ہو رہی ہو یا کسی عمومی بحث میں پردہ داری مطلوب ہو تو پھر بند کمرے میں بات کرنے کی کوئی ممانعت بھی نہیں ہے۔ اور ایسی صورت مشورہ جماعت کے قائدین کے درمیان ہوا کرتی ہے۔ لیکن کوئی اکٹھ ایسا نہ ہو کہ جسے جماعت اندر جماعت کہا جا سکے یا جو جماعت کے علم کے بغیر ہو۔ اس قسم کے نجویٰ سے قرآن اور سنت نے منع کیا ہے اور اس قسم کے نجویٰ سے جماعتوں کے اندر افتراق اور ان کی صفوں میں شکوک پیدا ہوتے ہیں اور یہ وہ بیماری ہے جس کو شیطان بڑے اہتمام سے پھیلاتا ہے تاکہ ایمان والوں کے درمیان عدم اطمینان پھیلا دے۔ اور اللہ نے یہاں فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ جماعت مسلمہ کو کبھی نقصان نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ مومنین کی جماعت کا نگران' نگہبان اور چوکیدار اللہ بذات خود ہے اور اللہ ہر نجویٰ میں حاضر و موجود ہوتا ہے۔ اور ایسے مشوروں میں جو سازشیں ہوتی ہیں اللہ ان کو مومنین کے لیے بے ضرر بنا دیتا ہے۔

إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (۵۸: ۱۰) "اللہ کے اذن کے سوا"۔ جہاں بھی کوئی حتمی اور جزمی وعدہ اور فیصلہ ہو

وہاں اس قسم کی استثنا ہوتی ہے' اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اللہ خود اپنے فیصلوں کا پابند نہیں ہے لہٰذا اللہ جو چاہے کرے' اگر اللہ چاہے کہ مسلمانوں کو تکلیف پہنچے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۵۸ : ۱۰) "اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے"۔
اللہ ہی بچانے والا اور حامی ہے ـ وہی قوی اور عزیز ہے' وہی علیم و خبیر ہے' وہی شاہد اور حاضر ہے' اور اس کائنات میں وہی کچھ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے ـ اور اللہ نے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ وہ مومنوں کو بچائے گا تو اس کے بعد مومنوں کے لیے کیا فکر رہ جاتا ہے اس لیے وہ بے فکر ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد اہل ایمان کو ایک دوسرا اجتماعی ادب سکھایا جاتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ
لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا
نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ
اَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا
بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا
۲
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۳ ع۷
۲

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم سے کہا جائے کہ اپنی مجلس میں کشادگی پیدا کرو تو جگہ کشادہ کر دیا کرو' اللہ تمہیں کشادگی بخشے گا اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔ تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے' اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا' اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ کو اس کی خبر ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم رسول سے تخلیہ میں بات کرو تو بات کرنے سے پہلے کچھ صدقہ دو' یہ تمہارے لیے بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ البتہ اگر تم صدقہ دینے کے لیے کچھ نہ پاؤ تو اللہ غفور و رحیم ہے۔ کیا تم ڈر گئے اس بات سے کہ تخلیہ میں گفتگو کرنے سے پہلے تمہیں صدقات دینے ہوں گے؟ اچھا' اگر تم ایسا نہ کرو ـــ اور اللہ نے تم کو اس سے معاف کر دیا ـــ تو نماز قائم کرتے رہو' زکوۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان آیات کے نزول کا بھی منافقین کے ساتھ تعلق ہے۔ ان سے پھر ان آیات اور ماقبل کی آیات کے درمیان ربط واضح ہو جاتا ہے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ یہ آیات مجالس ذکر کے بارے نازل ہوئی ہیں۔ منافقین کا رویہ یہ تھا کہ جب یہ کسی شخص کو مجلس رسول میں آتا دیکھتے تو اپنی جگہ جم کر بیٹھ جاتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے

یہ حکم دیا کہ نئے آنے والوں کو مجلس میں جگہ دیا کرو۔

مقاتل ابن حبان نے کہا کہ یہ جمعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم صفہ میں تھے' جگہ تنگ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین اور انصار میں سے اہل بدر کا بہت اکرام کرتے تھے۔ اہل بدر میں سے کچھ لوگ آئے اور ان سے پہلے جگہ بھر چکی تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد کھڑے ہو گئے اور کہا۔

السلام علیکم ایھا النبي و رحمۃ اللہ و برکاتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد انہوں نے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کیا۔ انہوں نے بھی سلام کا جواب دیا۔ یہ لوگ کھڑے رہے کہ شاید یہ لوگ ان کے لیے مجلس میں وسعت پیدا کریں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم کر لیا کہ وہ کیوں کھڑے ہیں؟ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ناگوار گزری۔ تو آپ کے ارد گرد مہاجرین و انصار میں سے جو غیر بدری لوگ تھے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا فلاں تم اٹھ جاؤ' فلاں تم اٹھ جاؤ' یوں ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اٹھاتے رہے جب تک تمام بدریوں کے بیٹھنے کی جگہ نہیں ہو گئی۔ یہ بات ان لوگوں پر بہت ہی گراں گزری جو اٹھائے گئے تھے۔ ان کے چہروں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کراہت دیکھ لی۔ اس پر منافقین نے کہا کہ کیا تم کو یہ یقین نہیں ہے کہ تمہارے "صاحب" لوگوں کے درمیان انصاف کرتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا ہمیں تو اس طرح کا اٹھانا منصفانہ معلوم نہیں ہوتا۔ کچھ لوگوں نے نبی کا قرب چاہا اور قریب بیٹھ گئے۔ اور آپؐ نے ان کو اٹھا دیا اور پھر دیر تک بیٹھے رہے۔ ہم تک یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے اس شخص پر رحم کیا جس نے اپنے بھائی کے لیے مجلس میں جگہ بنائی۔ اس کے بعد اگر کوئی آتا تو وہ لوگ جگہ دینے کے لیے جلدی سے اٹھ جاتے۔ اور لوگ ایک دوسرے کے لیے مجالس میں جگہ بناتے اور یہ آیت جمعہ کے دن نازل ہوئی۔

اگر یہ روایت درست ہے تو یہ ان احادیث کے منافی نہیں ہے جن میں یہ آیا ہے کہ مجلس سے کسی شخص کو اٹھا کر دوسرے کو نہ بٹھایا جائے۔ جیسا کہ صحیحین کی روایت میں ہے "کوئی شخص کسی شخص کو مجلس سے اس لیے نہ اٹھائے کہ اس کی جگہ خود بیٹھ جائے لیکن طریقہ یہ ہے کہ مجالس کے اندر وسعت اور کشادگی پیدا کرو" اور اسی طرح دوسری احادیث کے بھی یہ خلاف نہیں ہے جن کا مضمون یہ ہے کہ بعد میں آنے والا وہاں بیٹھ جائے جہاں مجلس ختم ہوتی ہے اور لوگوں کی گردنوں کے اوپر چڑھ کر آگے نہ بڑھے تاکہ وہ ممتاز جگہ بیٹھ جائے۔

آیت کا مضمون یہ ہے کہ پہلے بیٹھے ہوئے لوگ آنے والے کے لیے جگہ بنائیں۔ جس طرح آیت میں یہ بھی ہے کہ اگر منتظمین کسی کو کہیں کہ وہ اپنی نشست چھوڑ دے تو اسے چاہئے کہ وہ چھوڑ دے۔ لیکن یہ حکم منتظم اور قیادت سے صادر ہونا چاہئے' باہر سے آنے والے کی جانب سے نہیں۔

غرض یہاں یہ ہے کہ انسانی نفوس کے اندر وسعت پیدا کی جائے' قبل اس کے کہ مجالس کے اندر وسعت پیدا کی جائے۔ اگر دل کے اندر وسعت پیدا ہو جائے تو پھر وہ برداشت کرے گا اور مجلس میں آنے والے بھائیوں کو نہایت ہی محبت اور نہایت ہی خوش اخلاقی کے ساتھ بٹھائے گا اور ان کا استقبال کرے گا اور نہایت خوشی اور رضامندی سے ان کے لیے جگہ بنائے گا۔

لیکن اگر قیادت یہ سمجھتی ہو کہ کسی خصوصیت یا مخصوص حالات کی وجہ سے جگہ خالی کرنا ضروری ہے تو طیب نفس اور

خوشی خوشی سے جگہ خالی کر دینا چاہئے۔ لیکن اصول اپنی جگہ وہی رہے گا کہ پیچھے آنے والا پیچھے رہے' گردنوں پر سوار ہو کر آگے نہ بڑھے۔ یا کسی دوسرے کو اٹھا کر اس کی جگہ خود نہ بیٹھے۔ یہ تو رواداری ہے اور انتظامی حکم ہے جو فیصلہ کن ہے اور اسلام بہرحال بہترین آداب سکھاتا ہے۔

ہر حکم دینے کے بعد اسلامی نظام تربیت کا یہ اصول ہے کہ وہ لوگوں کے شعور کی اصلاح کرتا ہے۔ یہاں بھی کہا جاتا ہے کہ اگر تم مجالس میں اور دلوں میں وسعت پیدا کرو گے تو اللہ تمہارے لیے وسعت پیدا کر دے گا۔

فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ (۵۸ : ۱۱) "تو جگہ کشادہ کر دیا کرو' اللہ تمہیں کشادگی بخشے گا"۔ اور وہ لوگ جو اپنی سوڑ دیتے ہیں اور رسول اللہ یا قیادت کی اطاعت کرتے ہیں تو اللہ ان کو رفعت مقام عطا کرے گا۔

وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

(۵۸ : ۱۱) "اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ' تو اٹھ جایا کرو' تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے' اللہ ان کو بلند درجہ عطا فرمائے گا"۔ یہ ہو گی ان کی تواضع کی جزاء اور تعمیل حکم اور ڈسپلن کا اجر۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں قریب مقام حاصل کرنا بھی دراصل حصول علم کے لیے ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ یہ آیت ان کو سکھاتی ہے کہ جو ایمان وسعت قلبی سکھائے' اطاعت امر سکھائے' اور وہ علم جو دل کی تہذیب عطا کرے' اور وہ دل وسیع ہو جائے اور مطیع فرمان ہو جائے تو ایسے علم اور متعلم کے درجات اللہ کے ہاں بلند ہو جاتے ہیں اور یہ جو درجہ عطا ہوا یہ اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے رسول کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے مجلس میں اپنا درجہ چھوڑ دیا۔ لہٰذا اللہ نے اپنے ہاں درجہ دے دیا۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۵۸ : ۱۱) "اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ کو اس کی خبر ہے"۔ لہٰذا اللہ علم اور معرفت کی بنا پر ہر کام پر مناسب جزا دے گا اور اللہ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے کاموں کے پیچھے کیا داعیہ رکھا ہے۔

یوں قرآن کریم انسانی نفوس کی تہذیب اور اخلاقی تربیت کرتا ہے اور انسانوں کو وسعت قلبی' رواداری' اطاعت امر سکھاتا ہے۔ اس طرح کہ وہ ناگوار کام کو بھی ذوق و شوق سے کریں۔ دین اسلام محض خشک دفعات پر مشتمل کوئی قانون نہیں ہے۔ یہ تو ایک شعور' ایک نظریہ' ایک احساس اور ضمیر کے اندر ایک ملکہ ہے جو عمل پر ابھارتا ہے۔

اب قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے ایک دوسرا ادب اہل ایمان کو سکھاتا ہے۔

---ooo---

معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی میں گفتگو کرنے والوں کی بہت کثرت ہو گئی تھی اور ہر فرد اپنے انفرادی معاملات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو چاہتا تھا۔ اور اس کے ذاتی معاملات میں ہدایات اور مشورے چاہتا تھا۔ اور اس دور میں رسول اللہ کی اجتماعی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں اور آپ کا وقت بہت ہی قیمتی تھا۔ اور آپ کے ساتھ تنہائی میں گفتگو ایک بہت ہی اہم اور سنجیدہ مسئلہ بن گیا تھا۔ یہ تو کسی نہایت ہی اہم مسئلے ہی میں ہو سکتا تھا' لیکن لوگ تھے کہ اس اعزاز کے لیے ٹوٹ پڑے تھے۔ چنانچہ اللہ نے تنہائی میں وقت کا مطالبہ کرنے والوں کو کنٹرول

کرنے کے لیے مالی تاوان عائد کر دیا۔ اور یہ مالی تاوان جماعت کے اجتماعی کاموں کے لیے تھا۔ یوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وقت کا ایک حصہ ایسے لوگوں کو دے دیتے کیونکہ آپ کا پورا وقت اجتماعی معاملات کے لیے وقف تھا۔ یہ تاوان یوں تھا کہ جو شخص تنہائی میں وقت چاہتا وہ پہلے صدقہ کرے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۸ : ۱۲) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم رسول سے تخلیہ میں بات کرو تو بات کرنے سے پہلے کچھ صدقہ دو، یہ تمہارے لیے بہتر اور پاکیزہ تر ہے۔ البتہ اگر تم صدقہ دینے کے لیے کچھ نہ پاؤ تو اللہ غفور و رحیم ہے"۔

اس آیت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمل کیا۔ آپ کے پاس ایک دینار تھا۔ آپ نے اسے روپوں میں تبدیل کیا۔ آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس وقت الگ کوئی مشورہ کرتے تو ایک درہم کا صدقہ کر دیتے لیکن مسلمانوں پر یہ امر بہت ہی شاق گزرا۔ اللہ کو تو پہلے سے معلوم تھا۔ جو مقصد اس امر سے تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوقات کس قدر قیمتی ہیں۔ اس لیے اللہ نے یہ حکم واپس لے لیا۔ دوسری آیت آگئی۔

---ooo---

اور ان کو متوجہ کر دیا کہ عبادات اور اللہ کی فرمان برداری کرو۔

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

(۵۸ : ۱۳) "کیا تم ڈر گئے اس بات سے کہ تخلیہ میں گفتگو کرنے سے پہلے تمہیں صدقات دینے ہوں گے؟ اچھا، اگر تم ایسا نہ کرو --- اور اللہ نے تم کو اس سے معاف کر دیا --- تو نماز قائم کرتے رہو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔

ان دونوں آیات اور ان کے شان نزول میں وارد احادیث کے فلسفے سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بڑے معاملات میں مسلمانوں کی تربیت کے لیے اور اسلامی جماعت کو تیار کرنے کے لیے کس قدر جدوجہد کی گئی۔

اب سیاق کلام منافقین کی طرف پھرتا ہے۔ یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ گہری دوستی اور راہ و رسم رکھتے تھے۔ ان کے بعض حالات کھولے جاتے ہیں اور ان کو دھمکی دی جاتی ہے کہ تمہارے سب کرتوت اب چھپے نہیں رہے اور تمہارا انجام بہت ہی برا ہونے والا ہے۔ دعوت اسلامی تمہاری تمام سازشوں کے باوجود اب کامیابی کی راہ پر گامزن ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ
وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ اِنَّهُمْ
سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۶﴾ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ
شَيْـــًٔا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا
فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰي شَيْءٍ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ
هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ
حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
يُحَاۗدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰۗىِٕكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ
رُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۱﴾ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
يُوَاۗدُّوْنَ مَنْ حَاۗدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ اَوْ اَبْنَاۗءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ
اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَ
يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ ۳
وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾ ع ۹

کیا تم نے دیکھا ان لوگوں کو جنھوں نے دوست بنایا ہے ایک ایسے گروہ کو جو اللہ کا مغضوب ہے؟ وہ نہ تمہارے ۳
ہیں نہ ان کے' اور وہ جان بوجھ کر جھوٹی بات پر قسمیں کھاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے'
بڑے ہی برے کرتوت ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے جس کی آڑ میں وہ اللہ کی راہ
سے لوگوں کو روکتے ہیں' اس پر ان کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ اللہ سے بچانے کے لیے نہ ان کے مال کچھ کام آئیں
گے نہ ان کی اولاد۔ وہ دوزخ کے یار ہیں' اسی میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ جس روز اللہ ان سب کو اٹھائے گا' وہ اس کے
سامنے بھی اسی طرح قسمیں کھائیں گے جس طرح تمہارے سامنے کھاتے ہیں اور اپنے نزدیک یہ سمجھیں گے کہ اس سے ان

کا کچھ کام بن جائے گا۔ خوب جان لو' وہ پرلے درجے کے جھوٹے ہیں۔ شیطان ان پر مسلط ہو چکا ہے اور اس نے خدا کی یاد ان کے دل سے بھلا دی ہے۔ وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو' شیطان کی پارٹی والے ہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔ یقیناً ذلیل ترین مخلوقات میں سے ہیں وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ فی الواقع اللہ زبردست اور زور آور ہے۔ تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے' خواہ وہ ان کے باپ ہوں' یا ان کے بیٹے' یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو' اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں"۔

یہ منافقین پر ایک تنقیدی حملہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ایک ایسی قوم سے دوستی کر رہے ہیں جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین مسلمانوں کے خلاف نہایت گہری چالیں چلتے تھے اور مسلمانوں کے شدید ترین دشمنوں یعنی یہودیوں کے ساتھ مل کر یہ سازشیں تیار کرتے تھے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اقتدار مستحکم ہو گیا تھا۔ کیونکہ جب ان پر رسول اللہ اور مسلمان تنقید کرتے تھے اور ان سے باز پرس کرتے تھے تو یہ لوگ جھوٹی قسمیں کھاتے تھے۔ حالانکہ رسول اللہ اور مسلمان جو بات کرتے تھے وہ اللہ کی طرف سے فراہم کردہ انکشافات پر مبنی ہوتی تھی۔ جب وہ حلف اٹھاتے تھے تو وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ وہ اپنی قسموں کی آڑ میں اپنے آپ کو اس مواخذے سے بچاتے تھے۔ کیونکہ ان کی تمام سازشیں اسلامی حکومت کی طرف سے قابل مواخذہ تھیں۔

اتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً (۵۸ : ۱۶) "انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے"۔ اس طرح وہ اپنی سازشیں جاری رکھے ہوئے ہیں اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

ان آیات کے درمیان اللہ نے ان کو بار بار دھمکی دی۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۵۸ : ۱۵) "اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے' بڑے ہی برے کرتوت ہیں جو یہ کر رہے ہیں"۔ اور آگے ہے :

فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۵۸ : ۱۶) "اس پر ان کے لیے ذلت کا عذاب ہے"۔ آگے ہے :

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۵۸ : ۱۷) "اللہ سے بچانے کے لیے نہ ان کے مال کچھ کام آئیں گے نہ ان کی اولاد۔ وہ دوزخ کے یار ہیں اسی میں ہمیشہ رہیں گے"۔

اور ان آیات میں روز قیامت ان کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ بہت ہی بھدی اور توہین آمیز ہے۔ وہ جس طرح دنیا

میں جھوٹی قسمیں اٹھاتے ہیں اسی طرح وہ اللہ کے ہاں بھی قسمیں اٹھاتے نظر آتے ہیں۔

یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا یَحْلِفُوْنَ لَكُمْ (۵۸ : ۱۸) "جس روز اللہ ان کو اٹھائے گا، وہ اس کے سامنے بھی اسی طرح قسمیں کھائیں گے جس طرح تمہارے سامنے کھاتے ہیں"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفاق ان کی گھٹی میں پڑ گیا ہے۔ قیامت میں بھی یہ ان کے ساتھ رہے گا۔ اور اللہ ذوالجلال کے سامنے بھی یہ جھوٹی قسمیں اٹھانے کی جرات کریں گے۔ حالانکہ اس وقت ان کو معلوم ہو گا کہ اللہ تو دل کی باتیں بھی جانتا ہے۔

وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰی شَیْءٍ (۵۸ : ۱۸) "اور اپنے نزدیک یہ سمجھیں گے کہ اس سے ان کا کچھ کام بن جائے گا"۔ حالانکہ وہ ہوا میں لٹک رہے ہیں ان کے پاؤں تلے تو زمین نہیں ہے۔۔۔۔ حقیقی جھوٹے ہیں یہ لوگ۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۵۸ : ۱۸) "وہ پرلے درجے کے جھوٹے ہیں"۔

ان کی ان حرکات کا سبب یہ ہے کہ شیطان ان پر پوری طرح چھا گیا ہے۔

فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ (۵۸ : ۱۹) "اس نے اللہ کی یاد ان کے دل سے بھلا دی ہے"۔ اور جو دل اللہ کو بھلا دیتا ہے وہ بگڑ جاتا ہے اور شر کے لیے خالص ہو جاتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ (۵۸ : ۱۹) "یہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں"۔ اور شیطان کی پارٹی خالص اس کے لیے کام کرتی ہے، اس کے جھنڈے تلے چلتی ہے۔ اس کے نام سے کام کرتی ہے۔ اس کے مقاصد پورے کرتی ہے۔ یہ پارٹی خالص شر ہے اور خالص خسارے میں پڑے گی۔

اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۵۸ : ۱۹) "خبردار! شیطان کی پارٹی والے خسارے میں رہنے والے ہیں"۔ یہ بہت ہی شدید اور سخت تنقیدی حملہ ہے جو ان منافقین پر کیا گیا۔ یہ طویل تنقیدی حملہ اس لیے کیا گیا کہ وہ رات دن نہایت ہی خطرناک سازشوں میں مصروف تھے۔ رات دن یہودیوں سے مل کر مسلمانوں کے خلاف تدابیر سوچتے تھے۔ اس تنقیدی حملے سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو خوب اطمینان ہوا ہو گا اور آئندہ بھی ہو گا کہ ان کی جانب سے اللہ خود تدابیر کرتا ہے۔

---()()()---

یہ منافقین یہودیوں کے ہاں پناہ لیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہودی ایک قابل لحاظ قوت ہیں، ان سے لوگ ڈرتے ہیں اور امیدیں بھی انہی سے وابستہ ہیں۔ اور یہ لوگ اسی غرض سے ان سے مشورہ اور معاونت طلب کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ ان کو یہودیوں سے مایوس فرماتا ہے اور کہتا ہے کہ ان یہودیوں پر تو ذلت اور شکست لکھ دی گئی ہے۔ اور اللہ بھی غالب ہے اور اس کا رسول بھی غالب رہے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِی الْاَذَلِّیْنَ (۲۰) كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۲۱) (۵۸ : ۲۰ – ۲۱) "یقیناً ذلیل ترین مخلوقات میں سے ہیں وہ لوگ

جو اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے ۔ فی الواقع اللہ زبردست اور زور آور ہے"۔

یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے جو سچا ہو کر رہا ہے ۔ اور آئندہ بھی سچا ہو کر رہے گا ۔ اگرچہ بظاہر اس سچے وعدے کے حالات مخالف نظر آئیں ۔

عملاً جو جزیرۃ العرب میں جو ہوا' وہ یہی تھا کہ ایمان اور توحید غالب آ گئے ۔ کفر اور شرک مغلوب ہوئے اور جزیرۃ العرب میں اسلامی نظریہ حیات غالب ہو گیا ۔ اور کفر اور شرک کے ساتھ ایک طویل کشمکش کے بعد اور رکاوٹوں کو دور کرنے کے بعد پوری انسانیت عقیدۂ توحید کے سامنے سرنگوں ہوئی ۔ اگرچہ دنیا کے بعض علاقوں میں شرک اور کفر نے ایک عارضی وقت کے لیے غلبہ حاصل کر لیا ۔ جس طرح آج ملحد اور بت پرست حکومتوں میں شرکیہ عقائد کا کسی نہ کسی جگہ غلبہ ہے لیکن عقیدۂ توحید پوری دنیا میں غالب رہا ہے ۔ نیز الحاد اور شرک مسلسل زوال پذیر ہیں ۔ اس لیے کہ شرک اپنے مختلف مظاہر کے ساتھ اس قابل ہی نہیں ہے کہ وہ دنیا میں باقی رہے ۔ اور جدید سائنس نے انسانیت کو عقیدۂ توحید پر بہت سے جدید دلائل بھی فراہم کر دیئے ہیں لہٰذا ایمان اور توحید مسلسل ترقی میں ہے ۔ اور شرکیہ عقائد و نظریات سکڑ رہے ہیں ۔

ایک مومن تو اللہ کے وعدے کو ایک حقیقت سمجھتا ہے ۔ اگر کسی زمانے میں ایک محدود نسل یا محدود قطعہ زمین اس کے خلاف نظر آئے تو اسے یقین کرنا چاہئے کہ وہ صورت حال عارضی ہے اور بدلنے والی ہے ۔ اور یہ عارضی غلبہ کفر بھی کسی حکمت کے تحت ہو گا ۔ اور شاید اس لیے کہ اہل ایمان اسے اپنی ایمانی غیرت کے لیے ایک چیلنج سمجھیں اور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تاکہ وہ اللہ کے وعدے کے مطابق مغلوب ہو ۔

آج ہمارے دور میں ایمان کے دشمن' ہر طرف سے اہل ایمان کے خلاف جنگ آزما ہیں اور ہر طرف سے حملہ آور ہیں اور انہوں نے ایمان کے خلاف ایک نہ ختم ہونے والی جنگ شروع کر رکھی ہے ۔ ہر طرف سے پکڑ دھکڑ' سازشیں اور مسلسل اور متنوع سازشیں اسلام اور ایمان کے خلاف ہو رہی ہیں ۔ اس طرح کہ مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے' ملک بدر کیا جا رہا ہے' ان کو قسم قسم کی اذیتیں دی جا رہی ہیں' ان کے ذرائع رزق بند کیے جا رہے ہیں' اور ان پر ہر قسم کی ذلت مسلط کر رکھی ہے ۔ اس کے باوجود اہل ایمان کے دل ایمان سے بھرے ہوئے ہیں ۔ ان کو گرنے سے بچایا جاتا ہے اور وہ غالب اقوام کے اندر پگھل کر ختم نہیں ہوتے ۔ اور وہ یہ مشکلات برداشت کر کے بھی ایسے مواقع کے انتظار میں ہیں کہ کفر پر حملہ آور ہوں اور اسے پاش پاش کر کے رکھ دیں ۔ ایک طویل عرصے سے مسلمان اس صورت حال سے دوچار ہیں لیکن ان کا ایمان مضبوط ہے اور وہ جدوجہد میں مصروف ہیں تو اس سے نظر آتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول غالب ہو کر رہیں گے اور اس سلسلے میں ان کو کوئی طویل انتظار بھی نہ کرنا پڑے گا ۔

لہٰذا مومن کو اپنے دل میں یہ شک نہیں لانا چاہئے کہ ایمان غالب رہے گا ۔ اللہ کا وعدہ ایک حقیقت ہے اور اس نے جلد یا بدیر حقیقت کا روپ اختیار کرنا ہے اور جو لوگ اللہ و رسول اللہ اور اسلام کے دشمن ہیں وہ ذلیل ہو کر رہیں گے اور اللہ اور رسول ہی غالب رہیں گے ۔ یہ بات ہوتی ہے اور ہو کر رہے گی ۔ لیکن بظاہر حالات ایسے ہوا کرتے ہیں' جو اس کے خلاف نظر آتے ہیں ۔

اور آخر میں وہ اصول جس پر مسلمانوں کو جم کر رہنا چاہئے ۔ یہ اٹل اصول ہے اور یہ ایمان کے سچے ہونے اور

جھوٹے دعوائے ایمان کے لیے ایک ترازو ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸ : ۲۲) "تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے' خواہ وہ ان کے باپ ہوں' یا ان کے بیٹے' یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو' اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں"۔

یہ حزب اللہ اور حزب الشیطان کے درمیان مکمل جدائی ہے۔ تمام تعلقات اور تمام کششوں کو چھوڑ کر جماعت مسلمہ کے لیے یکسو ہو جانا چاہیے۔ اور ایک ہی رسی' ایمانی رسی کو پکڑ کر باہم مضبوط ہو جانا چاہیے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۵۸ : ۲۲) "تم کبھی نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے"۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے دل میں دو دل نہیں رکھے۔ کوئی انسان اپنے دل میں دو محبتیں نہیں رکھ سکتا۔ یعنی اللہ اور رسول کی محبت بھی ہو اور اللہ اور رسول کے دشمنوں کی محبت بھی ہو۔ یا تو ایمان ہو گا یا "لا ایمان" ہو گا۔ یہ دونوں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ (۵۸ : ۲۲) "خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے ہوں یا ان کے بھائی ہوں' یا ان کے اہل خاندان ہوں"۔ جب ایمان کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں تو پھر خون اور رشتہ داری کے روابط کٹ جاتے ہیں۔ اگر دو جھنڈوں کے درمیان کشمکش نہ ہو تو پھر خون اور رشتہ داری کے روابط رکھے جا سکتے ہیں اور دو جھنڈوں سے مراد اللہ کا جھنڈا اور شیطان کا جھنڈا ہیں۔ اگر حزب اللہ اور حزب الشیطان کے درمیان جنگ برپا نہ ہو اور حالت جنگ میں والدین اور رشتہ دار حزب الشیطان کے طرفدار نہ ہوں تو شریعت والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھے روابط رکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن اگر جنگ دشمنی اور مقابلہ اور مخاصمت

جاری ہو تو پھر اسلام حکم دیتا ہے کہ تمام رشتے کاٹ دو۔ اور صرف ایک ہی رسی اور مضبوط رسی کو تھام لو یعنی ایمان کی رسی۔ ابو عبیدہ نے بدر کے دن اپنے باپ کو قتل کر دیا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبدالرحمن کے قتل کا ارادہ کر لیا تھا۔ مصعب ابن عمیر نے اپنے بھائی عبید ابن عمر کو قتل کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ 'حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ 'حضرت علی رضی اللہ عنہ 'حضرت عبیدہ اور حارث نے اپنے قریبی رشتہ داروں اور خاندان کے لوگوں کو قتل کر دیا۔ انہوں نے خون اور رشتہ داری کا کوئی خیال نہ رکھا۔ اور دین اور نظریہ کو اہمیت دی۔ یہ وہ اعلیٰ معیار تھا جس تک اسلام نے نظریاتی روابط کو پہنچایا۔

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ (۵۸ : ۲۲) "یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا"۔ یہ ان کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو مضبوط کر دیا۔ رحمان نے اپنے ہاتھ سے ان کے دلوں میں لکھ دیا' لہٰذا اب یہ ان کے دلوں سے نہ مٹ سکتا ہے اور نہ اسے زوال ہو سکتا ہے۔ نہ بجھ سکتا ہے اور نہ اس کے اندر کوئی پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔

وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (۵۸ : ۲۲) "اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی"۔ انہوں نے راہ ایمان اور اسلامی انقلاب لانے کا جو عزم کر رکھا ہے وہ اسی روحانی قوت سے ہی کیا اور ان کی روح جس طرح منور ہوئی وہ اسی قوت اشراق اور تائید ایزدی سے منور ہوئی۔ یہی روح ان کو اس نور اور اشراق کے اصل سرچشمے سے جوڑتی ہے۔

وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (۵۸ : ۲۲) "وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا' جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔ اور یہ ہے جزاء اس بات کی کہ وہ اللہ کے لیے خالص ہو گئے اور اپنے روابط انہوں نے صرف ایمان کے تعلق پر قائم کیے اور انہوں نے اس فانی دنیا کے تمام اغراض اور تمام دشمنیوں کو پس پشت ڈال دیا۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (۵۸ : ۲۲) "اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے"۔ یہ نہایت ہی روشن' خوبصورت' راضی اور مطمئن تصویر ہے' جس کی ذریعہ ایک سچے مومن کو 'ایک نہایت ہی بلند مقام پر رکھا گیا ہے' وہ نہایت ہی پسندیدہ اور محبت آمیز تصویر کہ ان کا رب ان سے راضی ہے' وہ رب سے راضی ہیں۔ تمام دنیا سے کٹ کر وہ اللہ کے ساتھ ہو گئے ہیں' اللہ نے انہیں اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ ان کے لیے وسیع باغات تیار کر لیے ہیں' ان کو بتا دیا ہے کہ وہ ان سے راضی ہے' اس لیے اس قرب کی وجہ سے ان کو بھی انس و اطمینان حاصل ہو گیا ہے۔

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ (۵۸ : ۲۲) "وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں"۔ یہ اللہ کی پارٹی ہیں۔ یہ اللہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے ہیں' یہ اللہ کی قیادت میں جمع شدہ ہیں۔ اللہ کی ہدایات کے مطابق گامزن ہیں۔ اس کے نظام کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ کا دست قدرت ان کے ذریعہ کام کرتا ہے' اور یہ اللہ کی تقدیر ہیں۔

اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸ : ۲۲) "خبردار رہو' اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے

والے ہیں"۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کا مددگار فلاح نہیں پائے گا تو اور کون ہے جو فلاح پائے گا۔ یوں پوری انسانیت دو پارٹیوں میں تقسیم ہے ۔ایک حزب اللہ اور دوسری حزب الشیطان ۔ دو ہی جھنڈے ہیں ۔ اللہ کا جھنڈا' شیطان کا جھنڈا۔ اگر کوئی اللہ کی پارٹی میں ہو گا تو اللہ کے جھنڈے کے نیچے ہو گا اور اگر شیطان کے جھنڈے کے نیچے ہو گا تو وہ شیطان کی پارٹی میں ہو گا۔ اور باطل پرست ہو گا۔ یہ دو متضاد صفات اور متضاد پارٹیاں ہیں۔

کوئی نسب نہیں ہے 'کوئی رشتہ دار نہیں ہے 'کوئی رشتہ دار اور قرابت دار نہیں ہے 'کوئی وطن اور نسل نہیں ہے ۔کوئی عصبیت اور قومیت نہیں ہے ۔بس صرف عقیدہ' عقیدہ اور ایمان ہے ۔ جو شخص حزب اللہ کی طرف مائل ہو گیا' اور حق کے جھنڈوں کے نیچے کھڑا ہو گیا' وہ اور تمام لوگ جو اس جھنڈے کے نیچے کھڑے ہیں اللہ کی راہ میں بھائی بھائی ہیں ۔ وہ مختلف اوطان میں ہیں ۔ مختلف اقوام و قبائل میں ہیں ۔ مختلف نسلوں اور قبیلوں میں ہیں لیکن وہ بھائی بھائی ہیں کیونکہ وہ اللہ کی پارٹی ہیں ۔ اور حزب اللہ ایک ایسا رابطہ ہے جس کے تحت تمام امتیازات پگھل جاتے ہیں ۔ اور جس پر شیطان مسلط ہوا اور وہ باطل کے جھنڈے تلے کھڑا ہو گیا تو وہ حزب اللہ کے افراد میں سے کسی کا بھائی اور رشتہ دار نہیں ہے ۔ نہ کسی زمین میں' نہ کسی نسل میں' نہ کسی قوم میں' نہ کسی رنگ میں' نہ کسی رشتہ داری میں ۔کیونکہ اہل حق کے درمیان پہلا رابطہ قائم ہو گیا ہو عقیدے کا رابطہ ہے' یہ دوسرے رابطے تو اس کے بعد پیدا ہوتے ہیں ۔

۔۔ 000 ۔

اس آیت کے اشارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں ایسے لوگ تھے جو خون' قرابت داری' مفادات اور دوستی کے رشتوں کو اہمیت دیتے تھے ۔ اس آیت میں ایسے ہی لوگوں کی تربیت کی کوشش کی گئی ہے ۔ چنانچہ اس آیت میں فیصلہ کن اور دو ٹوک اسلامی رشتوں کے استوار کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ جبکہ یہی آیت یہ بتاتی ہے کہ اسلامی جماعت کے اندر ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے پہلے ہی ان دنیاوی رشتوں کو کاٹ دیا تھا ۔ وہ اسلامی رابطوں ہی کے قائل تھے اور اسلام کے ہدف کو انہوں نے پورا کر لیا تھا۔

اور یہ اس سورت کا مناسب خاتمہ ہے 'جس کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ اللہ اپنی اس جماعت کے افراد کی ایک ایک ضرورت کو پورا کر رہا ہے ۔ یہاں تک کہ ایک نہایت ہی غریب اور فقیر گھرانے کے مسائل بھی وہ حل کرتا ہے ۔ ایک غریب عورت جو حضور اکرم کے ساتھ تکرار کر رہی تھی اور اپنے بارے میں اور اپنے خاوند کے بارے میں شکایات کر رہی تھی ۔ اللہ نے اس کے مسائل حل کیے ۔

لہذا اس جماعت کا تمام روابط سے کٹ کر اللہ کا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے جو ان کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کو پوری کرتا ہے 'ایک قدرتی اور مناسب بات ہے ۔ نیز ایک ایسی جماعت جسے اللہ اپنی حزب کہتا ہے' اور جسے اس کائنات میں اللہ نے ایک نہایت ہی اہم کردار کے لیے اٹھایا ہے اس کا یوں اللہ کے لیے کٹ جانا ایک طبعی امر ہے ۔

--- 000 ---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ۲۸

سورۃ الحشر ۔۔ ۵۹

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۲۴

سورۃ الحشر ایک نظر میں

یہ سورت واقعہ بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے ـ بنی نضیر یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا اور یہ واقعہ سن چار ہجری میں پیش آیا ـ اس سورت میں اس واقعہ کی کیفیت اور اسباب پر تبصرہ کیا گیا ہے ـ اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس واقعہ کے بعد جماعت مسلمہ کے اندر کیا کیا تبدیلیاں اور انتظامات کیے گئے ـ ان باتوں کو قرآن کے خاص انداز بیان کے مطابق لیا گیا ہے اور ان واقعات پر سبق آموز تبصرہ کیا گیا ہے اور جماعت مسلمہ کو عملی واقعات سے دوچار کر کے اس کی زندہ تربیت کی گئی ہے ـ اور واقعات پر تبصرے کے دوران مناسب ہدایات بھی دی گئی ہیں ـ

قبل اس کے کہ ہم قرآنی آیات کی تفسیر پیش کریں ' مناسب ہے کہ وہ ہدایات یہاں دے دیں جو اس واقعہ کے بارے میں وارد ہیں ـ تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ قرآن کے بیان کا انداز روایات کے انداز سے کس قدر مختلف ہے ـ قرآن کریم کس طرح واقعات کے پس منظر کو لیتا ہے اور دور تک ان کے اسباب اور محرکات پر بحث کرتا ہے ـ چنانچہ واقعات بھی بیان ہو جاتے ہیں اور ان کے ماحول میں ان کے جو اسباب ہوتے تھے وہ بھی بیان ہوتے ہیں اور جو اسباب ان واقعات کے مقابلہ میں زیادہ اصولی ہوں انہیں بھی لیتا ہے ـ ایک واقعہ تو ایک متعین زمان و مکان میں ہوتا ہے ـ قرآن کریم اس کی تہ میں پائے جانے والے اصول بھی لیتا ہے ـ

یہ سن چار ہجری کے ابتدائی دنوں کی بات ہے ' زمانہ غزوۂ احد کے بعد اور غزوۂ احزاب سے پہلے کا ہے ـ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دس بڑے رفقاء کے ساتھ دیار بنی نضیر میں گئے ـ ان میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ' حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے ـ مسلمانوں کے ہاتھوں سے دو افراد ناحق قتل ہو گئے تھے ـ میثاق مدینہ کے مطابق اس کی دیت میں بنی نضیر نے بھی حصہ دینا تھا ـ بنی نضیر نے حضور کا بے حد گرم جوشی سے استقبال کیا ـ اور وعدہ کیا کہ وہ اپنا حصہ ادا کریں گے ـ لیکن اندر اندر سے وہ اپنے ہاں یہ مشورے کرنے لگے کہ یہ بہترین موقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیا جائے ـ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محلے کی ایک دیوار کے سائے میں تشریف فرما تھے ـ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا جس پوزیشن میں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بیٹھے ہیں اس میں تم ان کو کبھی نہ پاؤ گے ـ کون ہے جو گھر کے اوپر چڑھ کر ایک بہت بڑا پتھر ان کے سر پر دے مارے اور ہمیں ہمیشہ کے لیے ان سے نجات دے دے ـ عمر ابن حجاش ابن کعب اس کام کے لیے تیار ہو گیا ـ اس نے کہا میں یہ کام کرتا ہوں ـ یہ اوپر چڑھا ' پتھر پھینکنے کے لیے ' اور اللہ نے رسول اللہ کو بذریعہ الہام بتا دیا کہ یہودی تو اس قسم کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں ـ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے ' گویا قضائے حاجت کے لیے جا رہے ہیں ـ جب حضور دیر تک غائب ہو گئے تو آپ کے ساتھیوں نے محسوس کیا کہ آپ نے بہت دیر لگا دی ہے ـ چنانچہ وہ اس محلے سے نکلے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھنے لگے ـ تو معلوم ہوا کہ آپ تو مدینہ تشریف لے گئے ہیں اور مدینہ میں پہنچ چکے ہیں ـ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ بنو نضیر کے ساتھ جنگ کی تیاری کی جائے ' کیونکہ ان کی جانب سے خیانت ظاہر ہو گئی تھی اور وہ معاہدۂ امن میثاق انہوں نے توڑ دیا تھا۔ اس سے قبل بنی نضیر کے کعب ابن اشرف نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کی تھی اور دشمنوں پر چڑھانے کی سعی کی تھی اور کعب اور بنی نضیر کے کچھ لوگوں نے کفار قریش کے ساتھ رابطے کیے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف معاہدے کیے تھے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور بنی نضیر کے درمیان عہد قائم تھا۔ اس کے نتیجے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محمد ابن مسلمہ کو اجازت دی کہ وہ کعب ابن الاشرف کو قتل کر دیں۔

جب انہوں نے محلہ بنی نضیر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی تو پھر ان کے ساتھ معاہدے کے قیام کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور اسلامی اصول کے مطابق۔

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ

(۸ : ۵۸) ''اگر تمہیں کسی قوم سے عہد میں خیانت کرنے کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو اعلانیہ اس کے آگے پھینک دو''۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری کی اور محلہ بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا۔ اور ان کو تین دن کی مہلت دے دی۔ بعض روایات میں دس دن کی مہلت کا ذکر ہے کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑوس چھوڑ دیں اور محلے سے نکل جائیں۔ ان کو یہ اجازت ہوگی کہ وہ اپنے مال ساتھ لے جائیں اور اپنے کھیتوں پر اور باغوں پر اپنے جانشین یا مختار کار مقرر کریں لیکن منافقین مدینہ جن کا سرخیل عبداللہ ابن ابی ابن سلول تھا' ان کو پیغام بھیجا کہ یہ شرائط قبول نہ کرو' مقابلہ کرو اور ان کو یقین دلایا کہ ڈٹ جاؤ اور روکے رکھو' ہم تمہیں ان کے سپرد نہ کریں گے۔ اگر تمہارے ساتھ لڑائی ہوئی تو ہم تمہارے ساتھ لڑیں گے' اور اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے۔

اسی بارے میں یہ آیات۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّ اِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۱) لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ (۱۲) لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۱۳) (۵۹ : ۱۱ تا ۱۳) ''تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہوں نے منافقت کی روش اختیار کی' یہ اپنے کافر اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں ''اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے اور تمہارے بارے میں ہم کسی کی بات نہ مانیں گے۔ اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری

مدد کریں گے" ۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ قطعی جھوٹے ہیں ۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ ہرگز نہ نکلیں گے ۔ اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی ہرگز مدد نہ کریں گے ۔ اور اگر یہ ان کی مدد کریں بھی تو پیٹھ پھیر جائیں گے اور پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے ۔ ان کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر تمہارا خوف ہے ۔ اس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ نہیں رکھتے" ۔

چنانچہ یہودی قلعہ بند ہو گئے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کے باغات کو کاٹنا شروع کر دو ' اور ان کو آگ لگا دو ' تو انہوں نے پکارا محمد تم تو فساد سے روکتے تھے اور اب جو لوگ فساد کرتے ہیں تم ان کی معاونت کرتے ہو ۔ آخر تم باغات کو کیوں جلاتے ہو اور باغات کو کٹواتے کیوں ہو ۔ ان کی اس بات کی تردید میں یہ آیات ۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ (۵۹ : ۵) " تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا ' یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا تاکہ فاسقوں کو ذلیل و خوار کرے ۔

جب یہ محاصرہ ۲۶ شب و روز تک طول کھینچ گیا تو یہودیوں کو منافقین کے وعدوں کی سچائی میں شک ہونے لگا ۔ ان کے دلوں کے اندر سخت خوف پیدا ہو گیا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان کو جلاوطن کر دیں اور ان کو قتل نہ کریں ' جیسا کہ اس سے قبل بنی قینقاع کو جلاوطن کیا گیا تھا (اس کی تفصیلات ہم نے سورہ احزاب گیارھویں پارے میں بیان کر دی ہیں) اس شرط پر کہ وہ اونٹوں پر جو سامان لے جا سکتے ہیں لے جائیں ماسوائے اسلحہ کے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس شرط کو قبول کر لیا ۔ انہوں نے اپنے وہ اموال لے لیے جو لوٹ لے جا سکتے تھے ۔ چنانچہ وہ لوگ خود اپنے گھر کو گراتے تھے اور دروازوں کی لکڑیوں کو بھی اونٹوں پر لاد کر منتقل کرتے تھے ۔ یا اپنی لکڑیوں اور گھروں کو خراب کر دیتے کہ مسلمانوں کے ہاتھ نہ لگیں ۔ مسلمانوں نے صرف بعض دیواروں کو گرا دیا جن کے اندرون وہ قلعہ بند ہو گئے تھے ۔ اس بارے میں اس سورت کی یہ آیات وارد ہیں ۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ (۲) وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ (۳) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۴) (۵۹ : ۲ تا ۴) " وہی ہے جس نے اہل کتاب کافروں کو پہلے حشر کے لئے

ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ تمہیں ہرگز گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور وہ بھی یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ان کی گڑھیاں انہیں اللہ سے بچالیں گی مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ گیا تھا۔ اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے۔ بس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو' اگر اللہ نے ان کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں انہیں عذاب دے ڈالتا۔ اور آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا اور جو اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔

ان میں سے بعض لوگ تو خیبر کو چلے گئے' بعض لوگ شام کو چلے گئے اور ان کے سرداروں میں سے جو خیبر کو گئے تھے ان میں سے سلام ابن ابو الحقیق تھا اور کنانہ ابن الربیع ابن ابو الحقیق تھا اور حی ابن اخطب جن کا ذکر غزوۂ احزاب کے محرکین میں آتا ہے اور بنی قریظہ کے حالات میں بھی۔ جن کی تفصیلات سورہ احزاب میں ہیں۔ بعض کا ذکر فتح خیبر میں بھی آتا ہے۔ سورہ فتح۔

بنی نضیر کا جو مال رہ گیا تھا' اسے فے قرار دیا گیا تھا اور یہ خالص اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تصرف فنڈ تھا کیونکہ یہ اموال مسلمانوں کے گھوڑے یا اونٹ دوڑانے سے حاصل نہ ہوئے تھے۔ ان اموال کو رسول اللہ نے مہاجرین میں تقسیم کر دیا اور انصار میں سے کسی کو بھی حصہ نہ دیا' ماسوائے دو افراد کے جو غریب تھے۔ سہل ابن حنیف اور ابو دجانہ سماک ابن خرشہ۔ یہ اس لیے کہ مہاجرین مکہ میں سب کچھ چھوڑ آئے تھے' اور خالص اسلام کی خاطر مدینہ آگئے تھے۔ اور انصار نے ان کو اپنے گھر میں اور مالوں میں شریک کر لیا تھا۔ نہایت حسن سلوک اور سچی برادری کے طور پر' اور نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے ایثار کے طور پر۔ جب بنی نضیر جلاوطن ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے اندر ان کا علاقہ تقسیم کر کے حالات کو فطری انداز کی طرف لوٹا دیا تاکہ فقراء کے لیے بھی ایک فنڈ قائم ہو جائے۔ اور دولت صرف اغنیاء کے اندر ہی تقسیم نہ ہوتی رہے۔ اس دولت میں سے انصار کے صرف ان دو فقیروں کو حصہ دیا گیا۔

بنی نضیر کے اموال کی تقسیم کے بارے میں بعض لوگوں نے اعتراضات کیے اور یہ اعتراضات منافقین کی طرف سے تھے۔ اس لیے ان کا یہ جواب دیا گیا:

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۹ ۵ : ۶) "اور جو مال اللہ نے ان کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیئے وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے گھوڑے اور اونٹ دوڑا دیئے ہیں بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے' تسلط عطا فرما دیتا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے کہا' اگر تم چاہتے ہو تو میں مہاجرین کو تمہارے ساتھ شریک کر کے تمہارے اموال میں ان کو شریک کر دوں اور تمہیں اس غنیمت میں شریک کر دوں اور اگر تم چاہو تو تمہارے مال اور تمہارے مکانات مہاجرین تمہارے لیے خالی کر دیں اور تمہیں غنیمت سے کچھ نہ ملے۔ اس پر انصار نے کہا "ہم اپنے مال اور شہر بھی ان کے ساتھ تقسیم کرتے ہیں اور غنیمت بھی ان کو دیتے ہیں۔ اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ

اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۸) وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ

الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ

حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ

نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۹) (۵۹ : ۸ ـ ۹) "ان غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں ۔ یہی راست باز لوگ ہیں جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لاکر دارالہجرت میں مقیم تھے ۔ یہ لوگ ان سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں"۔

یہ ہے وہ واقعہ جس کے بارے میں یہ سورت نازل ہوئی ۔ اس سورت کی آیات اسی سے متعلق ہیں جن میں اس سورت کا خاتمہ بھی ہے جس میں خطاب ان لوگوں کو ہے جو ایمان لائے ' جنہوں نے اس واقعہ کو دیکھا اور جو ان کے بعد آئے ۔ یہ قرآن کریم کا ایک خاص انداز ہے کہ وہ کسی جزئی واقعہ پر ایک کلی اور اصولی انداز میں تبصرہ کرتا ہے ۔ پھر اس واقعہ سے سبق آموز اصول اخذ کرتا ہے اور اس کو بڑے اصولوں سے جوڑ دیتا ہے ۔ پھر پوری سورت کے آخر میں اللہ کی صفات کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ اور یہ وہ صفات ہیں جو اس کائنات میں نہایت ہی فعال ہیں اور اس کائنات کا واقعات انہی کے زیر اثر رونما ہوتے ہیں ۔ اور ان صفات کی حقیقت کے ادراک کی وجہ سے ایک ایسا ایمان وجود میں آتا ہے جو حقائق کو سمجھتا ہے اور جو اس کائنات پر بصیرت افروز نظر رکھتا ہے ۔

سورت کا آغاز بھی اس سے ہوتا ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور خاتمہ بھی اس حقیقت پر ہوتا ہے ۔ یوں آغاز و اختتام میں توافق اور تناسب پیدا ہوتا ہے ۔ یہ آغاز و اختتام سورت کے موضوع ' دعوت تقویٰ اور خضوع و خشوع اور اللہ کی تدبیر میں غور و فکر کے موضوعات کے لیے موزوں ہے ۔

اب ذرا نصوص پر تفصیلی گفتگو کہ ان نصوص نے واقعہ کی تصویر کشی کس طرح کی اور اس حادثہ سے نفوس کو کیا تربیت دی گئی ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۵۹ تشریح آیات

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۲۴

سُوْرَةُ الْحَشْرِ (٥٩) مَدَنِيَّةٌ (١٠١)
اٰيَاتُهَا ٢٤ رُكُوْعَاتُهَا ٣

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝١ هُوَ
الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۗ
مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ
اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ
بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝٢ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ
اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاۗءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝٣
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ۝٤

اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

”اللہ ہی کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے ‘ اور وہی غالب اور حکیم ہے ۔ وہی ہے جس نے اہل کتاب کافروں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ تمہیں ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے ‘ اور وہ بھی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کی گڑھیاں انہیں اللہ سے بچالیں گی ۔ مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ گیا تھا ۔ اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور

مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے ۔پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو! اگر اللہ نے ان کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں وہ انہیں عذاب دے ڈالتا' اور آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کا مقابلہ کیا' اور جو بھی اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔

سورت کا آغاز اس حقیقت سے ہوتا ہے اور یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور یہ اللہ کی پاکی اور بڑائی بیان کرتے ہوئے اس ایک اللہ کی طرف توجہ ہے ۔یہ ان لوگوں کے افراد کی کہانی جنہوں نے اہل کتاب ہونے کے باوجود کفر کیا۔ نقض عہد کیا۔ ذرا دیکھو کس طرح ان کے گھروں سے اس ذات نے ان کو نکالا۔ اور جو لوگ رات اور دن اللہ کی تمہید کرتے ہیں وہ سب کچھ ان کو عطا کر دیا۔ اور فی الواقعہ ۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۵۹ : ۱) "وہی غالب و حکیم ہے"۔ وہ اس قسم کے اسباب فراہم کرتا ہے جن سے اس کے دوستوں کی امداد ہوتی ہے اور ایسے اسباب پیدا کرتا ہے کہ دشمن اپنے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ وہ تقدیر و تدبیر کرنے میں بہت بڑا حکیم ہے ۔

---○○○---

اس کے بعد اس حادثہ کا بیان یوں ہوتا ہے :

هُوَ الَّذِيٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ (۲) وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ (۳) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۴) (۵۹ : ۲ تا ۴) "وہی ہے جس نے اہل کتاب کافروں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ تمہیں ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے' اور وہ بھی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کی گڑھیاں انہیں اللہ سے بچالیں گی۔ مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ گیا تھا۔ اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے ۔پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو!

اگر اللہ نے ان کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں وہ انہیں عذاب دے ڈالتا' اور آخرت میں تو ان

کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کا مقابلہ کیا' اور جو بھی اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ ہی تھا جس نے پہلے حشر یا ہلے میں اہل کتاب کے کافروں کو ان کے گھروں سے نکال دیا۔ درحقیقت ہر چیز کا فاعل اللہ ہی ہوتا ہے لیکن اس آیت میں براہ راست نسبت بھی اللہ ہی کی طرف کی گئی ہے۔ اور پردۂ احساس پر یہ بات آئی ہے کہ اس مہم کی قیادت ہی اللہ کر رہا تھا۔ اور گویا اس مہم میں دست قدرت کسی پردے میں نہ تھا۔ اور ان نکالے ہوئے لوگوں کو ایسی سرزمین کے لیے نکالا کہ جہاں سے ان کو اٹھایا جائے گا۔ لہذا یہ لوگ مدینہ کی طرف اب کبھی واپس نہ ہوں گے اور ان کا حشر ہی اب جلاوطنی کی سرزمین سے ہو گا۔

اللہ کا براہ راست ان کو نکالنا اور ان کو دوسری سرزمین کی طرف پھیلانا درج ذیل آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ (۵۹ : ۲) "تمہیں ہرگز گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور وہ بھی یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ان کی گڑھیاں انہیں اللہ سے بچالیں گی"۔ نہ تم ان کی جلاوطنی کی توقع رکھتے تھے اور نہ وہ جلاوطنی کے وقوع کو تسلیم کرتے تھے۔ وہ اپنے قلعوں میں اور فوجی قوت کے لحاظ سے اس قدر مضبوط تھے کہ تم ان کے نکلنے کی توقع ہی نہ کرتے تھے اور وہ اس قدر مغرور ہو گئے تھے کہ اس قوت کی وجہ سے وہ خدا کو بھی بھول گئے۔

فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (۵۹ : ۲) "مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ گیا تھا۔ اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا"۔ اللہ ان پر ان کے دلوں کے اندر سے حملہ آور ہوا۔ ان کے قلعے جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ ان کے دلوں میں اللہ نے خوف ڈال دیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے قلعوں کے دروازے کھول دیئے۔ اللہ کی قدرت نے دکھایا کہ وہ اپنے آپ پر بھی کنٹرول نہیں رکھتے۔ ان کے دل بھی ان کے کنٹرول میں نہیں اور وہ اپنے ارادوں اور اپنے منصوبوں کے بھی مالک نہیں رہے۔ ارادوں اور منصوبوں پر بھی قائم نہ رہ سکے۔ چہ جائیکہ وہ قلعوں میں بند رہیں۔ انہوں نے باقی تو ہر قسم کے دفاعی انتظامات کر رکھے تھے' البتہ ایک انتظام رہ گیا تھا کہ ان کے دل بھی مضبوط ہوں۔ اس طرف سے وہ غافل تھے۔ اللہ نے ان کی ہمتوں کو پاش پاش کر دیا۔ یہی ہوتا ہے کہ جب اللہ کسی کام کو کرتا ہے۔ اللہ کو معلوم تھا کہ کہاں سے حملہ کیا جائے۔ وہ ہر چیز کا عالم ہے اور وہ ہر چیز پر خبردار ہے۔ لہذا نہ کسی سبب کی ضرورت پیش آئی اور نہ کسی ظاہری وسیلے کی ضرورت پیش آئی جو عوام الناس کے ذہنوں میں ہوتے ہیں۔ اسباب و وسائل بھی تو اللہ کے [illegible] کردہ ہوتے ہیں۔ جب اللہ کوئی چیز چاہتا ہے تو اس کے اسباب چشم زدن میں سامنے آجاتے ہیں۔ جس طرح نتائج اور انجام اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اسی طرح اسباب و وسائل بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ کے لیے نہ اسباب و وسائل مشکل ہیں اور نہ نتائج اور انجام۔ وہ تو عزیز و حکیم ہے۔

اہل کتاب کے کافر اپنے قلعوں میں خود قلعہ بند ہوئے لیکن اللہ نے ایسے زاویہ سے حملہ کیا جس کی وہ توقع ہی نہ کرتے تھے اور نہ اس نوبت کی۔ انہوں نے قلعہ بندی کی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے گھروں اور قلعوں کے دفاع کا انتظام کیا تھا مگر ہوا یوں کہ وہ اپنے ہاتھوں سے گھروں اور قلعوں کو خراب کرتے رہے اور مومنین کو بھی وہ موقعہ دیتے تھے کہ

ان کو خراب کریں۔

يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَ اَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۹ : ۲) "وہ اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو خراب کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کر رہے تھے"۔ اس آیت پر ان اہل کتاب کافروں کی کہانی ختم ہو گئی۔ کس قدر عبرت آموز انداز میں اور کس قدر تصویر کشی کے انداز میں اور منظر بھی ایسا کہ حرکت سے بھرپور۔ اللہ ان پر ان کے قلعوں کے پیچھے سے حملہ آور ہوتا ہے اور وہ خود اپنے قلعوں کو گرانا شروع کر دیتے ہیں اور مومنین بھی خراب کرتے ہیں اور وہ بھی خراب کرتے ہیں۔

اب اس منظر نامے پر پہلا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں :

فَاعْتَبِرُوْا يٰاُولِي الْاَبْصَارِ (۵۹ : ۲) "پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو"۔ یہ تبصرہ نہایت ہی برمحل ہے 'اس کے لیے دل بالکل تیار ہیں اور ہر پڑھنے والا بھی حیران ہے کہ اس قدر منصوبے اور یہ دفاع!

اگلی آیت میں یہ بات بتائی جاتی ہے کہ اللہ نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آخرت سے پہلے 'اس دنیا ہی میں' ان کو ذلیل و خوار کیا جائے گا۔ ان کی بچنے کی کوئی صورت تھی ہی نہیں۔

وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ (۵۹ : ۳) "اگر اللہ نے ان کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں وہ انہیں عذاب دے ڈالتا۔ اور آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی"۔ لہٰذا اللہ کا عذاب ان پر آنا ہی تھا۔ جس طرح کہ ان پر آگیا اگر یہ صورت اللہ نے لکھ نہ دی ہوتی تو دوسری صورت میں آتا۔ یہ عذاب دنیا بھی ان کے لیے طے تھا اور قیامت کا عذاب تو بہرحال مقدر ہے 'کیوں؟

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ مَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵۹ : ۴) "یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا اور جو بھی اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔ المشاقہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کی طرف اور اس کی سائیڈ لینے کی بجائے جانب مخالف میں چلے گئے ہیں۔ اللہ کی جانب یہ تھی کہ وہ رسول اللہ کی طرف ہو جاتے۔ کیونکہ یہی اللہ کی طرف تھی۔ آیت کے آخر میں یہ کہا کہ جو اللہ کا مقابلہ کرتا ہے تو اس میں ضمناً رسول کا مقابلہ بھی آ جاتا ہے۔ یہ عجیب اور مضحکہ خیز منظر ہے کہ کمزور بندے رب ذوالجلال کے مقابلے پر اتر آئیں اور اللہ کے مقابلے میں قلعہ بند ہوں۔ یہ نہایت ہی خوفناک منظر ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانوں میں کمزور مخلوق اللہ کے غضب کو دعوت دے۔ اللہ تو شدید غضب والا ہے۔

یہاں ایک اہم بات ہے بنی نضیر کے بارے میں۔

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ (۵۹ : ۲) "وہ لوگ جو اہل کتاب میں سے کافر ہوتے ہیں"۔ اور اس سورت میں اس کی بار بار تکرار آئی ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے دین کا انکار کر دیا ہے جو اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا تھا۔ یہودی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ یہاں ان کے لیے کفر کی صفت کا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ یہی کفر ان کی اس سزا کا سبب تھا اور یہ بھی بتانا مقصود تھا کہ مسلمان ان کے خلاف جو ایکشن لے رہے ہیں اس کا اخلاقی جواز موجود ہے کہ یہ بھی دوسرے کافروں کی طرح کافر ہیں۔ اور اس وجہ سے ان پر یہ عذاب آیا۔ لہذا۔

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ (۵۹ : ۲) کا فقرہ بہت ہی با مقصد ہے۔

اس کے بعد اہل ایمان کو بعض واقعات پر مطمئن کیا جاتا ہے 'کہ ایک تو یہ کفر کرنے والے تھے' دوسرے یہ رسول اور اللہ سے دشمنی کرنے والے تھے' اس لیے جنگی ایکشن کے دوران ان کے جو باغات کاٹے گئے یا جلائے گئے' یا چھوڑے گئے' تو اس کے بارے میں اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ اللہ کے حکم سے ایسا ہوا۔ اور یہودی اس سلسلے میں جو پروپیگنڈہ کرتے ہیں مومنین کو اس سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ۝ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۝ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۗ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ

فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ
خَصَاصَةٌ ۫ۗ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۹ وَالَّذِیْنَ
جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا
بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ ۱
رَّحِیْمٌ ۱۰ الربع ع ۱۰

۴

"تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا' یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا۔ اور (اللہ نے یہ اذن اس لیے دیا) تاکہ فاسقوں کو ذلیل و خوار کرے۔ اور جو مال اللہ نے ان کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیئے' وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے ہوں' بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے' تسلط عطا فرما دیتا ہے' اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول ؐ کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسول ؐ اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ جو کچھ رسول ؐ تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ۔ اللہ سے ڈرو' اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ (نیز وہ مال) ان غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ یہی راست باز لوگ ہیں (اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لاکر دارالہجرت میں مقیم تھے۔ یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان (مہاجرین) کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں' جو کہتے ہیں کہ "اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی بغض نہ رکھ' اے ہمارے رب' تو بڑا مہربان اور رحیم ہے"۔

لِيْنَة (۵۹ : ۵) کھجور کے بہترین درختوں کو کہتے ہیں۔ یہ اس وقت کی بہترین قسم تھے جسے سب جانتے تھے۔ مسلمانوں نے یہودیوں کے باغات میں سے بعض کو کاٹا تھا۔ بعض کو چھوڑ دیا تھا۔ ان کے دلوں میں ایک خلجان تھا' یعنی کاٹنے پر' اور چھوڑنے پر۔ جبکہ اس سے قبل اور اس کے بعد مسلمانوں کے لیے جنگی ضابطہ یہی رہا کہ تحریق اور بربادی سے گریز کیا جائے۔ اس لیے اس واقعہ میں جو کچھ ہوا اس کی استثنائی حالت کے لیے یہ آیت آئی تاکہ مسلمانوں کے دل مطمئن ہو جائیں۔ آیت نے کہہ دیا کہ اگر باغات جلانے کو تم نے چھوڑا ہے اور اس سے اجتناب کیا ہے تو یہ بھی اللہ کا

اذن تھا اور اگر کاٹ کر جلایا ہے تو یہ بھی اذن الٰہی تھا۔ کیونکہ اس مہم کی نگرانی اللہ براہ راست کر رہا تھا۔ اس لیے اللہ نے مسلمان لشکریوں سے ایسا کروایا۔ ان کے ہاتھوں تقدیر کو ظاہر کیا۔ لہٰذا یہ سب کارروائیاں اس کی مرضی سے ہوئیں۔ ان سے اللہ ان فاسقوں کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے پیارے باغات گر رہے تھے اور جل رہے تھے اور جو چھوڑے گئے تھے وہ بھی ان کے لیے باعث حسرت تھے کہ چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اللہ کی مشا تھی کہ دونوں طرح ان کو حسرت سے دوچار کرے۔

جن مومنین کے دل میں خلجان تھا کہ یہ تخریب و تحریق کیوں ہوئی' ان کو اطمینان ہوا' ان کو تسلی ہوگئی کہ یہ تو اللہ کی مشا تھی۔ اللہ جو چاہتا ہے' کرتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ تو دست قدرت کے آلات محض تھے۔

---ooo---

اس سورہ کا یہ دوسرا پیراگراف بھی ایک نہایت ہی اہم مسئلے کو لیتا ہے کہ اس واقعہ میں جو اموال ہاتھ لگے اور حضور کی طرف پلٹے یا ایسے ہی واقعات بعد کے زمانے میں پیش آئیں تو ان کا حکم کیا ہے۔ یعنی وہ اموال جو جنگ اور قتال کے بغیر ہاتھ آجائیں۔ یا ایسے واقعات جن میں قدرت الٰہیہ نے مسلمانوں کے لیے اموال فراہم کیے۔ اور مسلمانوں نے اس میں کوئی زیادہ جنگی کارروائی نہ کی ہو۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٦) مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (٧) لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (٨) وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (٩) وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (١٠) (٥٩: ٦ تا ١٠) "اور جو مال اللہ نے ان کے قبضے سے نکال

کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیئے' وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے ہوں' بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے' تسلط عطا فرما دیتا ہے' اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسولؐ کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسولؐ اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے ۔ جو کچھ رسولؐ تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ ۔ اللہ سے ڈرو' اللہ سخت سزا دینے والا ہے ۔ (نیز وہ مال) ان غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں ۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں ۔ یہی راست باز لوگ ہیں (اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دارالہجرت میں مقیم تھے ۔ یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان (مہاجرین) کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں ۔ خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں ۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں ۔ (اور وہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے) جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں' جو کہتے ہیں کہ "اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی بغض نہ رکھ' اے ہمارے رب' تو بڑا مہربان اور رحیم ہے"۔

ان آیات میں فے کا حکم بیان ہوا یا فے جیسے دوسرے اموال کا ۔ نیز ان آیات میں امت مسلمہ اور اسلامی سوسائٹی کی ایک نہایت ہی اہم صفت اور اس کی دائمی حالت کو بیان کیا گیا ہے جو امت مسمہ کی امتیازی صفت رہی ہے اور امت کی پوری تاریخ میں اس کی امتیازی شان رہی ہے ۔ یہ امت کی وہ خصوصیت رہی ہے جس کو اس نے مضبوطی سے پکڑے رکھا ہے ۔ کسی دور میں بھی خدا کے فضل سے امت سے یہ صفت جدا نہیں ہوئی ہے ۔ یہ صفت امت مسلمہ کی کسی نسل' کسی قوم' کسی شخص مسلم سے ایک طویل اسلامی تاریخ میں کبھی جدا نہیں ہوئی ہے ۔ پھر اس دنیا میں جن جن علاقوں میں مسلمان ہیں ان میں سے کسی علاقے میں بھی مسلمانوں سے یہ صفت الگ نہیں ہوئی ہے اور یہ وہ عظیم حقیقت ہے اور اس پر گہرا غور کرنا چاہئے ۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰی مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ (۵۹ : ۶) "اور جو مال اللہ نے ان کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیئے' وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے ہوں' بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے' تسلط عطا فرما دیتا ہے' اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

اَوْجَفْتُمْ (۵۹ : ۶) ایجاف سے ہے ۔ ایجاف کے معنی ہیں گھوڑے کو تیزی سے دوڑانا ۔ رکاب کے معنی اونٹ کے ہیں ۔ مسلمانوں کو بتایا جاتا ہے کہ بنو نضیر نے اپنے پیچھے جو مال چھوڑے ہیں انہوں نے اس پر گھوڑے نہیں دوڑائے اور نہ اونٹوں پر تیز سفر کر کے انہوں نے اسے حاصل کیا ہے ۔ لہٰذا ان اموال کا حکم مال غنیمت کا نہیں ہے ۔ مال

غنیمت میں تو مجاہدین کا ۵/ ۴ حصہ ہوتا ہے۔اور ۵/ ا حصہ اللہ ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور رشتہ داروں ' یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کا ہوتا ہے۔جب کہ جنگ بدر کے اموال غنائم کے بارے میں اللہ نے فیصلہ کیا۔اس فے کا حکم یہ ہے کہ یہ سب کا سب اللہ رسول اللہ ' رشتہ داروں ' یتیموں ' مساکین اور مسافروں کا ہے۔اور اس میں تصرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے اور آیت میں جن رشتہ داروں کا ذکر ہے ' ان سے مراد رسول اللہ کے قرابت دار ہیں۔اس لیے کہ صدقات ان کے لیے جائز نہ تھے اور زکوٰۃ میں ان کا حصہ نہ تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی دولت نہ تھی جسے ورثاء پالیتے اور ان میں فقراء بھی تھے ' جن کی کوئی آمدن نہ تھی۔اس لیے ان کے لیے غنائم کے خمس میں حصہ رکھا گیا تھا جیسا کہ فے اور فے کی قسم کے اموال میں ان کا حصہ رکھا گیا تھا۔رہے دوسرے لوگ تو ان کے احکام معروف و معلوم ہیں اور یہ فنڈز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف خاص میں تھے۔

یہ تو تھا فے کا حکم جو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے۔لیکن ان آیات میں اس حکم اور ان حالات پر اکتفا نہیں کیا گیا جن میں یہ حکم جاری ہوا بلکہ یہاں ایک دوسری حقیقت کا بھی اظہار کر دیا گیا ہے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ (۵۹ : ۶) "بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط عطا کرتا ہے"۔لہٰذا یہ اللہ کی تقدیر کا ایک حصہ ہے۔جس کا ظہور ہو گیا۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵۹ : ۶) "اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

یوں رسولوں کا معاملہ تقدیر الٰہی کا اظہار قرار پاتا ہے اور اللہ کی تقدیر کے چکروں میں رسولوں کا مقام بھی متعین کیا جاتا ہے کہ رسولوں کا ظہور اور غلبہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہوتی۔دست قدرت یہ کام کرتا ہے۔اگرچہ رسول بشر ہیں لیکن وہ اللہ کے ساتھ براہ راست مربوط ہوتے ہیں۔اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اپنے نظام قضاو قدر کا ظہور کرتا ہے اور رسول جو کام کرتے ہیں وہ اذن الٰہی سے کرتے ہیں اور اللہ کے ہاں وہ مقدر ہوتا ہے۔وہ اپنی خواہش کے مطابق حرکت بھی نہیں کرتے۔وہ کوئی کام اپنی مرضی یا اپنے مفادات سے نہیں کرتے۔وہ جنگ ' جہاد یا امن ' مصالحت یا مخاصمت صرف اللہ کے حکم سے کرتے ہیں اور وہ اللہ کی تقدیر کا ظہور ہوتا ہے اور اللہ کی تقدیر ان کے تصرفات اور ان کی حرکات سے ظاہر ہوتی ہے۔اور وہ جو کچھ کرتے ہیں وہ اللہ کا فعل ہوتا ہے اور اللہ ہر کام پر قدرت رکھتا ہے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵۹ : ۷) "جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسولؐ کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسولؐ اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔جو کچھ رسولؐ تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ۔اللہ سے ڈرو ' اللہ سخت سزا دینے والا

ہے"۔

یہ آیت اس حکم کو بتا رہی جس کا ذکر ہم نے پہلے کر دیا ہے۔ اس حکم کی علت بیان کرتے ہوئے اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کی وجہ دراصل اسلام کے نظام اقتصادی کا ایک عظیم اصول ہے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (۵۹ : ۷) "تاکہ وہ تمہارے مالداروں کے درمیان میں گردش نہ کرتا رہے"۔ اور اس کی علت کے بیان میں اسلام کے دستوری نظام کا ایک دوسرا اعلیٰ ترین اصول بیان کر دیا۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا (۵۹ : ۷) "جو کچھ رسول تمہیں دے، وہ لے لو، اور جس چیز سے وہ تمہیں روک دے اس سے رک جاؤ"۔ اگرچہ یہ دو اصول فے کی تقسیم کے ضمن میں وارد ہیں لیکن اسلام کے اقتصادی نظام اور اسلام کے دستوری نظام میں یہ بہت اہم اصول ہیں اور ان دونوں ہی پر دراصل اسلام کا اقتصادی اور دستوری نظام قائم ہے۔

پہلا قاعدہ اسلام کا اقتصادی اصل الاصول ہے اور اسلام کے اقتصادی نظریات اس پر مبنی ہیں۔ اسلام انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن انفرادی ملکیت پر یہ ایک پابندی اور چیک ہے۔ یعنی اسلام انفرادی ملکیت کو اس قدر وسیع آزادی نہیں دیتا کہ کچھ محدود مالدار لوگ ہی دراصل تمام دولت اور مفادات کو اپنی طرف سرمایہ کے زور سے کھینچ لیں۔ اور مال چند چوٹی کے لوگوں کے درمیان گردش کرے۔ اس لیے ہر وہ صورت حال جس کے اندر دولت صرف امراء کے درمیان گردش کرتی وہ اسلام کے نظریہ اقتصاد کے خلاف ہے۔ اور یہ اجتماعی عدل کے بھی خلاف ہے۔ اسلامی سوسائٹی کے اندر اجتماعی اور معاشی روابط اس طرح تشکیل پاتے ہیں کہ اس میں دولت چند محدود لوگوں ہی کے اندر گردش نہیں کرتی۔

اسلام نے اپنا اقتصادی نظام ان اصولوں کی بنیاد پر قائم کیا۔ اس نے زکوٰۃ فرض کی' یہ اڑھائی فیصد اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ اور ۱۰/ ۱یا ۲۰/ اتمام زرعی پیداواروں پر عائد ہوتا ہے۔ اسی طرح مویشیوں میں اور ان خزانوں میں جو زمین سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ شرح دراصل بہت ہی بڑی شرح ہے۔ پھر مجاہدین کے لیے ۵/ ۴ حصہ رکھا ہے. خواہ فقیر ہوں یا غنی ہوں' جبکہ فے صرف فقراء کے لیے رکھا ہے۔ اسی طرح اسلام نے زمین کی پیداوار کے اندر مالک اور مضارع کو شریک قرار دیا ہے اور امام کو یہ اختیار دیا کہ وہ لوگوں کی ضرورت سے زائد اموال ان سے لے کر فقراء میں تقسیم کر دے۔ اور اگر بیت المال کو ضرورت ہو تو لوگوں کے اموال میں بیت المال کا حصہ مقرر کر دے۔ پھر اسلام نے ذخیرہ اندوزی کو حرام قرار دیا' ربا کو حرام قرار دیا اور ربا اور ذخیرہ اندوزی دونوں ہی اصل ذرائع ارتکاز دولت ہیں۔ غرض اسلام کا اقتصادی نظام اسی عظیم قاعدے پر قائم ہے کہ دولت چند اغنیاء کے اندر ہی گردش نہ کرے بلکہ تمام فقراء تک اس کا پھیلاؤ ہو۔ اور یہ قاعدہ انفرادی ملکیت پر حاوی ہے۔

اس طرح اسلام انفرادی ملکیت کی اجازت دیتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ سرمایہ دارانہ نظام نہیں ہے۔ نہ سرمایہ دارانہ نظام اسلامی نظام سے ماخوذ ہے کیونکہ ربا اور ذخیرہ اندوزی کے سوا کوئی سرمایہ دارانہ نظام نہیں ہوتا۔ اسلامی نظام ایک خاص نظام ہے جو اللہ علیم و خبیر کی طرف سے ہے۔ یہ الگ پیدا ہوا' الگ چلا' اور آج بھی وہ تمام دوسرے اقتصادی نظاموں سے الگ تھلگ ہے۔ یہ ایک منفرد' متوازن' عادلانہ اور تمام حقوق و واجبات کا خیال رکھنے والا نظام ہے۔ اور یہ

نظام اس کائنات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے ۔ اس لیے کہ اس کائنات کا خالق اللہ ہے ' انسان کا خالق اللہ ہے اور اس اقتصادی نظام کا خالق بھی اللہ ہے ۔

دوسرا اصول اسلام کے دستوری نظام کا ہے کہ شریعت کا ماخذ خدا اور رسول اور قرآن اور سنت ہیں ۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹ : ۷) "جو کچھ رسول تمہیں دے ' وہ لے لو ' اور جس چیز سے وہ تمہیں روکے اس سے رک جاؤ"۔ اسلامی دستور اور قوانین کا یہ اصل الاصول ہے ۔ اسلام کا قانونی نظام اس سے لیا گیا ہے کہ شریعت من جانب اللہ ہے اور اللہ کی جانب سے رسول لے کر آیا ہے ۔ اور یہ قرآن اور سنت سے عبارت ہے ۔ پوری امت مسلمہ مع امام وقت مل کر بھی ان تعلیمات کی خلاف ورزی کے مجاز نہیں جو قرآن و سنت میں ہیں ۔ اگر کوئی خلاف قرآن اور سنت قانون بنائے گا تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہ ہوگی کیونکہ اس قسم کا قانون اپنے پہلے جواز ہی کو کھو بیٹھتا ہے ۔ یہ نظریہ تمام انسانی وساتیر اور قانون سازی کے نظریات سے یکسر مختلف ہے ۔ کیونکہ ان نظریات کے مطابق قوم قانون سازی کا سرچشمہ ہوتی ہے ۔ یوں کہ کوئی قوم جو قانون چاہے ' اپنے لیے بنا سکتی ہے ۔ اور جو قوم جو چاہے دستور و قانون بنا دے ۔ لہٰذا اسلامی دستور نظام اقتدار کا سرچشمہ قرآن و سنت ہیں ۔ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا ہے ۔ امام امت کا نائب ہے ۔ نہ امام اور نہ قوم رسول اللہ کی لائی ہوئی شریعت محمدی کی مخالفت کے مجاز ہیں ۔

اب اگر کوئی مسئلہ قرآن و سنت میں نہ ہو تو اسے قرآن و سنت کے دوسرے اصولوں کی روشنی میں یوں حل کیا جائے گا کہ اس سے قرآن و سنت میں موجود کسی اصول کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو ۔ یہ اصول شریعت کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ بھی ایک شرعی اصول ہے ۔ لہٰذا ہر صورت میں سرچشمہ قانون قرآن اور سنت ہیں ۔ اور دوسرے قوانین و قواعد اسی وقت معتبر ہوں گے جب وہ قرآن اور سنت کے کسی مسلمہ قاعدے کے خلاف نہ ہوں ۔ امت کا اقتدار اس قاعدے کے اندر محدود ہے ۔ یاد رہے کہ امام امت بھی اسی قاعدے کا پابند ہے ۔ یہ ایک منفرد نظام قانون ہے اور کسی انسانی سوسائٹی کے ہاں اس قسم کا کوئی قانونی نظام نہیں ہے ۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں قانونی نظام بھی نظام کائنات کی طرح ایک فطری نظام ہوتا ہے ۔ جس طرح کائنات کے لیے اللہ نے نظام فطرت وضع کیا ہے ۔ اسی طرح انسانوں کے لیے اللہ نے نظام شریعت وضع کیا ہے تاکہ انسان کا بنایا ہوا قانون نظام فطرت سے ٹکرا نہ جائے اور جو قانون بھی آج تک انسانوں کے بنائے ہیں وہ نظام فطرت سے ٹکرائے ہیں ۔

ان دونوں اصولوں کو اس آیت میں اللہ سے مربوط کیا گیا ہے اور لوگوں کو دعوت دی ہے کہ ان کی اطاعت میں وہ اللہ سے ڈریں ۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵۹ : ۷) "اللہ سے ڈرو ' اللہ سخت سزا دینے والا ہے"۔ یہ وہ بڑی ضمانت ہے جو اسلامی قانون کو حاصل ہے ' اس لیے اسے توڑنے کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا ۔ نہ اس سے بھاگنے کی کوئی گنجائش ہے ۔ کیونکہ مومنین کو علم ہے کہ اللہ تو دیکھتا ہے ۔ اعمال سے خبردار ہے ۔ تمام لوگوں کو اسی طرف لوٹنا ہے ' اور اگر خلاف ورزی کی گئی تو وہ سخت عذاب دینے والا ہے ۔ ان کو معلوم ہے کہ مال کو پھیلانا ہے اور اسے

دولتمندوں کے درمیان ہی گردش نہیں دینا ہے ۔ اور شریعت کے جو احکام خدا اور رسولؐ نے دیئے ہیں انہوں نے انہیں لینا ہے اور جس چیز سے منع کیا ہے اس سے منع ہوتا ہے اور اس سلسلے میں کوئی سستی اور کوئی تساہل نہیں کرتا ہے کیونکہ انہوں نے اللہ کے سامنے جانا ہے ۔

اب رسول اللہ نے اس فے کو مہاجرین میں تقسیم کیا اور صرف دو غریب انصاریوں کو اس میں شریک فرمایا ۔ یہ ایک خاص اقدام تھا اور اس کا مقصد یہی تھا کہ دولت صرف دولت مندوں میں جمع نہ ہو جائے ۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (۵۹ : ۷) "تاکہ وہ مالداروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے"۔ حکم تو عام تھا کہ وہ فقراء کے لیے ہے خواہ مہاجر ہوں یا انصار یا بعد میں آنے والے ہوں ' چنانچہ اگلی آیات میں اس پر بات ہوتی ہے ۔

قرآن کریم احکام محض ایک خشک لکٹ کی طرح بیان نہیں کرتا ۔ وہ اسے زندہ اور عام بیان کے انداز میں دیتا ہے ۔ وہ ایک زندہ حکم ہوتا ہے زندہ انسانوں پر نافذ ہوتا ہے اور حکم کے اندر ہی اس کے اخلاقی پہلو اور اسباب بھی دیئے جاتے ہیں ۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۵۹ : ۸) "ان غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں ۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں ۔ یہی راست باز لوگ ہیں"۔

یہ ایک ایسی تصویر ہے جس میں مہاجرین کے خدوخال اچھی طرح ثبت کر دیئے گئے ہیں وہ اپنے گھروں اور مال سے محروم کر دیئے گئے ہیں ۔ ان کو مشرکین کی اذیت اور ان کی سختی نیز رشتہ داروں اور اہل خاندان کی طرف سے سرد مہری کی وجہ سے گھر بار چھوڑنا پڑا اور ان کا کوئی قصور اس کے سوا نہ تھا کہ وہ کلمہ طیبہ کے قائل تھے اور صرف اللہ کو رب جانتے تھے ۔

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا (۵۹ : ۸) "یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں"۔ ان کا اعتماد صرف اللہ پر ہے ۔ صرف اس کے بھروسے پر جی رہے ہیں اور ان کو یقین ہے کہ اس کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں ہے ۔ اور اس کے باوجود وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں لگے ہوئے ہیں ۔

وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (۵۹ : ۸) "اللہ اور اس کے رسول کی حمایت پر کمربستہ ہیں"۔ اپنے دلوں کے ساتھ ' اپنی تلواروں کے ساتھ ۔ اور پھر نہایت ہی مشکل حالات میں انہوں نے یہ فریضہ سرانجام دیا ۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۵۹ : ۸) "یہی راست باز لوگ ہیں"۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے زبان سے کلمہ ایمان ادا کیا اور پھر اپنے عمل سے اس کی تصدیق کی ۔ وہ اللہ کے ساتھ سچے تھے کہ انہوں نے اللہ کو اختیار کیا ۔ رسول اللہ کے ساتھ سچے تھے کہ انہوں نے ان کی اطاعت کی ۔ اور وہ سچائی کے ساتھ بھی مخلص تھے کیونکہ ان کی صورت میں

سچائی چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُ و الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۹ : ۹) "جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لاکر دارالہجرت میں مقیم تھے۔ یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان (مہاجرین) کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں"۔

یہ ہے انصار کی ایک خوبصورت تصویر جس کے اندر ان کے اہم خدوخال نہایت ہی نمایاں کر کے دکھائے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ صفات اگر عملاً مدینہ میں واقع نہ ہوا تھا اور عملاً اپنے انتہاؤں تک نہ گیا ہوتا تو لوگ اسے افسانہ سمجھتے اور لوگ کہتے یہ بہترین تخیل ہے۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُ و الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۵۹ : ۹) "جو لوگ ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ایمان لاکر دارالہجرت میں مقیم تھے"۔ یعنی مدینۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ میں یہ انصار تھے جو ایمان لاکر یہاں مقیم تھے۔ اسی طرح انہوں نے ایمان کو بھی یہاں مقیم کر دیا تھا۔ گویا مدینہ منزل ایمان و یقین تھا۔ یہ ایک نہایت ہی خوبصورت اشاراتی تعبیر ہے۔ انصار نے ایمان کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا یہ اس کی بہترین تصویر ہے۔ یہ ایمان کا گھر تھا' یہ ایمان کا وطن تھا' یہاں مومنین کے دل لٹکے ہوئے تھے اور یہاں ان کے قلوب اور روح کو سکون ملتا تھا۔ یہاں لوٹ کر وہ مطمئن ہوتے تھے جس طرح ایک شخص گھر آکر مطمئن ہوتا ہے لہٰذا مدینہ دار الایمان تھا۔

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا

(۵۹ : ۹) "یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے"۔ تاریخ انسانی میں کوئی ایسا اجتماعی واقعہ نہیں ہے کہ کسی قوم نے مہاجرین کا اس طرح استقبال کیا ہو جس طرح انصار نے مدینہ میں مہاجرین کا کیا۔ نہایت محبت' ایثار' سخاوت' مروت کے ساتھ۔ انہوں نے ان کو اپنے مال میں شریک کیا۔ مکانوں میں ٹھہرایا اور ان کی تمام ذمہ داریاں قبول کیں۔ روایات میں آتا ہے کہ کوئی مہاجر کسی انصاری کے گھر بذریعہ نامزدگی نہیں ٹھہرا بلکہ ہر شخص پر قرعہ اندازی ہوئی۔ کیونکہ جب کوئی مہاجر آتا تو کئی لوگ آجاتے کہ ہمارے ہاں ٹھہرے گا۔

وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا (۵۹ : ۹) "جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے"۔ یعنی جن صورتوں کے اندر مہاجرین کو زیادہ دیا گیا۔ یہاں نے سب کا سب ان کے لیے مخصوص کر دیا گیا تو اس کی وجہ سے وہ اپنے دلوں میں حاجت محسوس نہیں کرتے۔ یہاں تنگی یا حسد کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس سے ان کے دلوں کی پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے دلوں کے اندر کوئی ضرورت 'حاجت یا کوئی چیز بھی وہ نہیں محسوس کرتے۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹ : ۹) "اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں"۔ ایک آدمی خود محتاج ہو پھر بھی دوسروں کو ترجیح دے تو یہ بہت بلند مقام ہے اور انصار اس میدان میں اس قدر آگے بڑھے کہ ان کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ہے۔ اور تاریخ کے ہر دور اور ہر واقعہ میں انہوں نے نہایت ہی بلند کرداری کا مظاہرہ کیا۔ اس قدر بلند کرداری کا جس کی نظیر کوئی پیش نہ کر سکا۔

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۹ : ۹) "حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں"۔ دل کی تنگی ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ یہ ہر بھلائی کے دروازے کو بند کر دیتی ہے کیونکہ کسی نہ کسی صورت میں مالی تاوان کا مطالبہ کرتی ہے۔ جذبات کو دبانے کا مطالبہ کرتی ہے اور محنت صرف کرنے کا مطالبہ کرتی ہے اور بعض اوقات بھلائی کے راستے میں جان تک دینے کا مطالبہ ہوا کرتا ہے۔ کوئی بخیل کبھی نیکی کا کام نہیں کر سکتا' وہ تو ہر وقت لینے کی فکر میں ہوتا ہے۔ دنیا کچھ بھی نہیں ہے اور جو شخص دل کی تنگی سے بچ گیا' اس کے سامنے سے گویا ایک بڑی رکاوٹ دور کر دی گئی اور وہ نیکی کے کاموں میں خرچ کرتے ہوئے۔ داد و دہش کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا

بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۵۹ : ۱۰)

"جو ان اگلوں کے بعد آئے ہیں' جو کہتے ہیں کہ "اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی بغض نہ رکھ' اے ہمارے رب' تو بڑا مہربان اور رحیم ہے"۔

یہ تیسری تصویر ہے جو نہایت پاکیزہ' راضی برضا اور سمجھنے والے لوگوں کی تصویر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مہاجرین و انصار کے بعد آئے۔ اس آیت کے نزول کے وقت وہ تو مدینہ میں موجود نہ تھے؟ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ازلی علم میں آ چکے تھے جو زمان و مکان کے حدود سے وراء ہے اور یہ دنیا میں بعد میں آنے والے تھے۔ اللہ نے پیشگی ان کی صفات بیان کر دی کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ سلف صالحین کے لئے طلب مغفرت کرتے ہیں اور وہ تمام مومنین کے لیے اپنے دل صاف رکھنے والے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کے دل

صاف ہوں۔کیونکہ دونوں کے درمیان ایمانی رشتہ موجود ہے۔دونوں پر اللہ کی رحمت ہوئی ہے کہ ان کو مومن بنایا ہے۔ اور اللہ تو رؤف رحیم ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کا چہرہ کس قدر روشن ہے اور وہ اس کائنات میں کس قدر روشنی بکھیرنے والی امت ہے۔اس کا رشتہ ایمانی اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا آغاز اس کے انجام سے منسلک ہے اور بندھا ہوا ہے۔ اور اس کا آخری حصہ اول حصے سے بندھا ہوا ہے۔وہ ایک دوسرے کے ضامن 'کفیل' محب اور رحم کرنے والے ہیں۔ اور بلالحاظ قوم و نسب' اور بلالحاظ دوری زمان و مکان وہ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں۔ یہ امت مسلہ مسلمانوں کے شعور پر مسلسل چھائی رہی۔یوں اہل ایمان قیامت تک گزشتہ لوگوں۔

اَلَّذِیۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِیۡمَانِ (۵۹ : ۱۰) کو یاد کرتے رہیں اور اس امت کو مسلمان اس طرح یاد کرتے ہیں جس طرح کوئی اپنے بھائیوں کو یاد کرتا ہے' نہایت اعزاز' عزت اور محبت میں 'قدماء نے آنے والوں کا خیال رکھا اور آنے والے اگلوں کو یاد کرتے ہیں۔یہ سب ایک صف ہیں' ایک ہی رجمنٹ ہیں' اور زمانے گزر گئے ہیں۔ ایک ہی جھنڈا ہے۔ایک ہی ہدف ہے۔ایک ہی افق ہے۔اور ان کا ایک ہی رب ہے جو رؤف و رحیم ہے۔

یہ ایسی روشن تصویر ہے جس سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔لیکن وہ ایک زندہ حقیقت کی طرح کھڑی ہے۔اور یہ امت انسانیت کے لیے ایک بہترین مثال ہے۔ایک نہایت شریفانہ کریمانہ مثال پوری انسانیت کے لیے۔ایسی خوبصورت مثال جس حد تک کوئی تصور کر سکتا ہے۔یہ تصویر اس وقت بہت ہی خوبصورت لگتی ہے جب ہم اپنے دور کی ایک امت کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ کریں۔ہمارے دور کی یہ امت کارل مارکس کی انجیل "کیپٹل" کی اساس پر وجود میں آئی ہے۔یہ ایک ایسی امت ہے جس کے دلوں میں بغض و عداوت جوش مارتی ہے۔ طبقات ایک دوسرے کے خلاف لڑتے اور کشت و خون کرتے نظر آتے ہیں اس امت کے تصور کے مطابق انسانی تاریخ جنگ اور کشمکش اور نفرت کی تصویر ہے اور پھر اس امت کو تمام اہل دین کے ساتھ نفرت ہے۔

زرا دوبارہ امت محمدیہ اور امت کارل مارکس کے درمیان تقابل کیجئے۔امت محمدیہ انسانیت کو اس کے اعلیٰ مراتب تک بلند کرتی ہے۔ جبکہ یہ دوسری امت انسانیت کو ذلت کی انتہائی پستیوں تک گراتی ہے۔امت محمدیہ کی تصویر یہ ہے کہ زمان و مکان کی حدود سے ماوراء 'نسل اور وطن کی حد بندیوں سے آزاد نسب اور خاندان کے محدود دائروں سے باہر' تمام انسانوں کو ایک دوسرے کا ضامن 'کفیل' دوست اور واقف کار بناتی ہے اور سب کو ایک اونچے ہدف کی طرف بلند کرتی ہے اور ہدف ہے اللہ کی بندگی۔--- ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز--- جن کے دل صاف ہیں اور اگلوں پچھلوں کے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہے ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں اور ایک دوسرے کے حوالے سے دل صاف ہیں۔

جبکہ دوسری تصویر یہ ہے کہ اس میں لوگ ایک دوسرے کو ذبح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں' بعض دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں' ان کا استحصال کرتے' سازشیں کرتے ہیں اس کے مقابلے میں دوسرے ان سے بغض 'حسد اور نفرت کرتے ہیں۔ پوری انسانی تاریخ عبارت ہے' اظہار نفرت سے۔یہاں تک کہ عبادت گاہوں میں بھی نفرت ہے۔ ان کے نزدیک نماز بھی دراصل ایک جال ہے۔اور مذہب ایک دھوکہ ہے جس کے ذریعہ مالدار لوگ غریبوں کا استحصال کرتے

ہیں ۔ اور ان دو تصاویر کو دیکھتے ہوئے اس آیت کو پھر پڑھئے :

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ

اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۵۹ : ۱۰) "اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی بغض نہ رکھ 'اے ہمارے رب ' تو بڑا مہربان اور رحیم ہے"۔ یہ ہے قافلہ ایمان اور یہ ہے دعائے اہل ایمان ۔ یہ نہایت ہی معزز قافلہ ہے اور یہ نہایت ہی کشادہ آدمی کی دعا ہے ۔

اس خوبصورت تصویر کشی اور اسے نہایت ہی بلند مقام پر نور کے فریم میں نصب کرنے کے بعد 'اب مضمون اس موضوع پر آتا ہے جس کے بارے میں یہ سورت نازل ہوئی ہے ۔ اب یہاں ایک دوسرے گروہ کی کریہہ تصویر سامنے آتی ہے ۔ یہ ہے گروہ منافقین :

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ نَافَقُوْا یَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا
مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَىٕنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِیْعُ فِیْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ
وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۱ لَىٕنْ اُخْرِجُوْا لَا
یَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَىٕنْ قُوْتِلُوْا لَا یَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَىٕنْ نَّصَرُوْهُمْ لَیُوَلُّنَّ
الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ ۝۱۲ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ۝۱۳ لَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِیْعًا اِلَّا فِیْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ
وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُهُمْ بَیْنَهُمْ شَدِیْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِیْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ ۝۱۴ كَمَثَلِ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِیْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ
اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۱۵ كَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا
كَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۱۶ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ ٢
اَنَّهُمَا فِی النَّارِ خَالِدَیْنِ فِیْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ۝۱۷ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ع ٧

اتَّقُوا اللّٰہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ۭ اِنَّ اللّٰہَ خَبِيْرٌۢ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ
الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ
الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴿۲۰﴾

"تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہوں نے منافقت کی روش اختیار کی ہے؟ یہ اپنے کافر اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں "اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے' اور تمہارے معاملہ میں ہم کسی کی بات ہرگز نہ مانیں گے' اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے"۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ قطعی جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ ہرگز نہ نکلیں گے' اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی ہرگز مدد نہ کریں گے اور اگر یہ ان کی مدد کریں بھی تو پیٹھ پھیر جائیں گے اور پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے۔ ان کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر تمہارا خوف ہے' اس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ یہ کبھی اکٹھے ہو کر (کھلے میدان میں) تمہارا مقابلہ نہ کریں گے' لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر۔ یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں۔ تم انہیں اکٹھا سمجھتے ہو مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ حال اس لیے ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں یہ انہی لوگوں کے مانند ہیں جو ان سے تھوڑی ہی مدت پہلے اپنے کیے کا مزا چکھ چکے ہیں۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ان کی مثال شیطان کی سی ہے کہ پہلے وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر' اور جب انسان کفر کر بیٹھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری الذمہ ہوں' مجھے تو اللہ رب العالمین سے ڈر لگتا ہے۔ پھر دونوں کا انجام یہ ہونا ہے کہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائیں' اور ظالموں کی یہی جزا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو' اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو' اللہ یقیناً تمہارے ان سب اعمال سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں خود اپنا نفس بھلا دیا' یہی لوگ فاسق ہیں۔ دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں"۔

یہاں ان باتوں کا ایک ریکارڈ پیش کر دیا جاتا ہے جو اس واقعہ کے بارے میں یہودیوں اور منافقین مدینہ کے درمیان ہوتی رہیں۔ منافقین نے ان کے ساتھ جو جو معاہدے کیے وہ پورے نہ کیے اور یہودیوں کو اس طرح ذلیل کر کے رکھ دیا۔ اللہ ان پر حملہ آور ہوا اور ان کو اس قدر مرعوب کر دیا کہ انہوں نے وہ کام اپنے ہاتھوں سے کیا جو مومنین نے کرنا تھا۔ لیکن قرآن کریم اس ریکارڈ کو پیش کرتے وقت ہر آیت میں ایک عظیم حقیقت سے بھی مسلمانوں کو آگاہ کرتا ہے۔ جو ان کے دل میں بیٹھ جاتی ہے' جو ان کے دلوں کے اندر ایک گہرا تاثر پیدا کرتی ہے' اور ان کے دل و دماغ میں ایمان گہرا ہو جاتا ہے۔ ان کے علم میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کی اخلاقی تربیت پختہ ہو جاتی ہے۔

پہلی حقیقت یہ قلم بند کی گئی کہ یہودی اور منافقین بھائی بھائی ہیں ۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ

(۵۹ : ۱۱) "تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنھوں نے منافقت کی روش اختیار کی ہے ۔ یہ اپنے کافر اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں"۔ تو یہ اہل کتاب کافر تھے اور منافقین ان کے بھائی تھے ۔ اگرچہ انہوں نے اسلام کی چادر اوڑھ رکھی تھی ۔

پھر منافقین کی یہ تاکید شدید جو انہوں نے اپنے بھائیوں سے کی ۔

لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ

(۵۹ : ۱۱) "اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے ، اور تمہارے معاملہ میں ہم کسی کی بات ہرگز نہ مانیں گے ، اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے"۔ لیکن اللہ ان کی حقیقت کو خوب جانتا ہے ۔ وہ ان کی قرارداد سے بالکل مختلف قرار دیتا ہے اور ان کی تاکیدات کے برعکس موکد حقیقت بتاتا ہے ۔

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۱) لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا
لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ (۱۲) (۵۹ : ۱۱ -
۱۲) "مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ قطعی جھوٹے ہیں ۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ ہرگز نہ نکلیں گے ، اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی ہرگز مدد نہ کریں گے اور اگر یہ ان کی مدد کریں بھی تو پیٹھ پھیر جائیں گے اور پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جس کی شہادت اللہ نے دی تھی ۔ انہوں نے جو فیصلے کیے تھے اور جن کا اعلان کیا تھا ان میں سے ایک پر بھی عمل نہ کیا ۔

اس کے بعد اللہ مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے جو ان منافقین اور ان اہل کتاب کافروں کے دلوں میں خوب بیٹھی ہوئی ہے ۔

لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۵۹ : ۱۳)

"ان کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر تمہارا خوف ہے ، اس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ نہیں رکھتے"۔ ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اللہ کے مقابلے میں مومنین سے زیادہ ڈرتے ہیں ۔ اگر یہ اللہ سے ڈرتے تو پھر اللہ کے کسی بندے سے نہ ڈرتے کیونکہ خوف اور خشیت تو ایک ہوتی ہے ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی اللہ سے بھی ڈرے اور لوگوں سے بھی ڈرے ۔ عزت صرف اللہ کی ہے ۔ اور تمام دوسری مخلوق اللہ کے مقابلے میں کوئی عزت اور غلبہ نہیں رکھتی ۔ تمام دوسری مخلوقات اللہ کے احکام کے تابع ہے ۔ قرآن کہتا ہے ۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا "زمین میں جو چیز بھی چلنے والی ہے اس کی چوٹی اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔ اس لیے جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ کسی اور سے نہیں ڈرتا۔ لیکن جو لوگ اس حقیقت کو نہیں پاتے وہ ماسوائے اللہ سے ڈرتے ہیں اور وہ دوسری قوتوں سے اللہ کی نسبت زیادہ ڈرتے ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۵۹ : ۱۳) "یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے"۔ اس کے بعد ان کے دلوں میں قائم ایک دوسری حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے جو سابقہ حقیقت ہی کا نتیجہ ہے یعنی مسلمانوں کے خوف کا۔ یہ حقیقت بھی ان منافقین اور کافرین کے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے۔

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (۵۹ : ۱۴) "یہ کبھی اکٹھے ہو کر (کھلے میدان میں) تمہارا مقابلہ نہ کریں گے' لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر۔ یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں۔ تم انہیں اکٹھا سمجھتے ہو مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ حال اس لیے ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں"۔

یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ منافقین اور اہل کتاب کی جو تصویر قرآن کریم نے کھینچی ہے وہ ابھی تک سچی ہے۔ منافقین اور کافر اہل کتاب جب بھی جہاں بھی ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے ہیں تو یہ صورت سامنے ہو کر آگئی۔ حال ہی میں اخوان اہل ایمان اور یہودیوں کے درمیان فلسطین کی سرزمین پر جو جھڑپیں ہوئیں ان میں یہودی کسی جگہ بھی کھل کر میدان میں نہ آئے اور وہ اپنی آبادیوں اور حلقوں میں چھپ کر ہی لڑتے رہے اور جب کبھی وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر آئے تو وہ چوہوں کی طرح پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔ یوں نظر آتا تھا کہ شاید یہ آیت انہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَلِيْمِ الْخَبِيْرِ ان حقائق کے علاوہ ان کی نفسیاتی جھلکیاں بھی عجیب ہیں۔

بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ (۵۹ : ۱۴) "یہ آپس کی مخالفت میں شدید ہیں"۔

تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى (۵۹ : ۱۴) "تم انہیں اکٹھا سمجھتے ہو اور ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں"۔ جبکہ اس کے مقابلے میں مومنین کی حالت یہ ہے کہ وہ صدیوں کے آنے والے اپنے سابقہ لوگوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ زمان و مکان کی دوریوں کے باوجود وہ ایمان کی رسی میں بندھے ہوئے ہیں۔ اور اس راہ میں جنس وطن اور خاندان رکاوٹ نہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (۵۹ : ۱۴) "ان کا یہ حال اس لیے ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں"۔ بعض اوقات ظاہری حالات دھوکہ دیتے ہیں۔ اہل کتاب آپس میں نہایت متحد و متفق نظر آتے ہیں اور ایک دوسرے کے کفیل و مددگار نظر آتے ہیں اور حمایت بھی کرتے ہیں جس طرح منافقین ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے

ہیں۔ لیکن آسمان سے یہ سچی خبر آتی ہے کہ یہ کو اب ایسے نہیں ہیں جیسے نظر آتے ہیں۔ یہ محض ان کا خارجی منظر ہے۔ کبھی کبھی ان کا یہ پردہ اتر جاتا ہے اور ان کی حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ اندر سے کس قدر پھٹے ہوئے ہیں۔ اور قرآن کریم کی سچائی ثابت ہوتی ہے۔ ایک ہی محاذ اور ایک ہی بلاک کے اندر وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہیں۔ دراصل یہ اپنی اپنی مصلحتوں کے لیے جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں۔ متضاد خواہشات رکھتے ہیں' ان کی پالیسیاں باہم متصادم ہوتی ہیں۔ جب بھی مومنین نے صداقت سے کام کیا ہے اور جب بھی ان کے دل اللہ کی ذات پر جمع ہوئے ہیں' ان کے مقابلے میں کفار اور منافقین کے محاذ میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور ان کے دل باہم بکھر گئے ہیں۔ اور بظاہر ان کا اتحاد خواب پریشاں بن گیا ہے اور جب بھی مومنین نے صبر کیا ہے اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا تو انہوں نے دیکھا کہ کافروں کے درمیان جو ظاہری اتحاد اور بندش نظر آتی ہے وہ کھل گئی ہے اور ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ہے اور نظر آ گیا ہے کہ ان کے درمیان شدید اختلافات ہیں' شدید دشمنی ہے اور وہ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں اور دشمنیاں کر رہے ہیں۔ اور ان کے دل ایک دوسرے سے بالکل جدا (شتی) ہیں۔

کفار اور منافقین کو مسلمانوں پر اس وقت غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ نقصان بھی پہنچا دیتے ہیں جب مسلمانوں کے دل ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اس وقت پھر وہ مسلمانوں کی تمثیل نہیں پیش کرتے جو سابقہ آیت میں ذکر ہوتی ہے بلکہ وہ نام کے مسلمان ہوتے ہیں ورنہ مومنین کے مقابلے میں منافقین کے بارے میں قرآن نے کہا۔

بَأْسُهُم بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ (۵۹ : ۱۴) "آپس میں ان کی مخالفت شدید ہے"۔

تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتَّى (۵۹ : ۱۴) "تم انہیں اکٹھے سمجھتے ہو مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں"۔ قرآن کریم مومنین کے دلوں میں یہ حقیقت اچھی طرح بٹھاتا ہے تاکہ ان کے دلوں میں سے کافروں کا رعب نکل جائے۔ اور وہ ان سے نہ ڈریں کیونکہ ان کی حقیقت واقعی یہی ہے اور ایسی ہی ہے۔ اس لیے یہ مسلمانوں کی تربیت ہے اور یہ ایک ثابت حقیقت پر مبنی ہے۔ اگر مسلمان قرآنی تعلیمات کو سنجیدگی سے لیں تو ان کے دشمنوں کے معاملات ان کے لیے آسان ہو جائیں اور ان کے دل متحد ہو جائیں۔ اور ان کے مقابلے میں دنیا کی کوئی قوت ہی نہ ٹھہر سکے۔

جو لوگ اللہ پر صحیح طرح ایمان لا چکے ہیں ان کو چاہئے کہ اپنی حقیقت اور اپنے دشمنوں کی طبیعت کو اچھی طرح سمجھیں۔ اور اگر انہوں نے اپنی حقیقت کو پا لیا تو نصف معرکہ سر ہو گیا۔ اور اس حقیقت کی طرف قرآن کریم ایک واقعہ کی شکل میں اشارہ کرتا ہے اور یہ حقیقت قرآن نے بطور تمثیل اور سبق ذکر کی ہے۔ اور اس کے بعد پھر اس واقعہ کا تجزیہ کیا اور دلائل دیئے تاکہ وہ لوگ جنہوں نے وہ واقعہ دیکھا تھا وہ عبرت پکڑیں۔ اور بعد کے آنے والوں کے لیے بھی وہ ایک عبرت آموز واقعہ بن جائے۔ قرآن نے یہ اشارہ ان لوگوں کے سامنے کیا ہے جو اس حقیقت سے باخبر تھے۔ واقعہ بنی نضیر پہلا واقعہ نہ تھا۔ اس سے قبل بنی قینقاع کا واقعہ ہو گیا تھا۔ اسی کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے :

كَمَثَلِ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۵۹ : ۱۵)

"یہ انہی لوگوں کے مانند ہیں جو ان سے تھوڑی ہی مدت پہلے اپنے کیے کا مزا چکھ چکے ہیں۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ واقعہ بنی قینقاع غزوۂ بدر کے بعد اور غزوۂ احد سے قبل ہوا تھا۔ ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان عہد تھا۔ جب مسلمانوں نے بدر میں مشرکین پر غلبہ پا لیا تو یہودیوں کو یہ بات بہت ہی بری لگی۔ اور انہوں نے مسلمانوں کی اس عظیم فتح کو دل سے قبول نہ کیا اور جل بھن گئے۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ مدینہ میں مسلمان جس قدر قوت پکڑتے ہیں اس قدر ان کی اہمیت گھٹتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ جو باتیں کرتے تھے رسول اللہ کو ان کی رپورٹیں ملتی رہتی تھیں کہ یہ کسی شر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بارہا نصیحت کی اور غداری کے انجام سے ڈرایا۔ تو انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کا بدتر جواب دیا جس کے اندر ایک دھمکی مضمر تھی۔ انہوں نے کہا "محمد، تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم تمہاری قوم قریش کی طرح ہیں۔ تم اس بات پر مغرور نہ ہو کہ تم نے ایک ایسی قوم سے جنگ کی جن کو جنگ کا تجربہ نہ تھا اور تم نے ان کو مار لیا۔ ہم ایسے ہیں کہ اگر خدا کی قسم تم نے ہم سے لڑائی کی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیسے لوگ ہیں"۔

اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک عرب خاتون کچھ سامان لے کر آئی اور اسے فروخت کیا۔ یہ سامان اس نے بازار بنی قینقاع میں فروخت کیا۔ اس کے بعد وہ ایک سنار کے پاس بیٹھ گئی تو انہوں نے اس کے ساتھ برائی کا ارادہ کر لیا اور کہا کہ وہ چہرہ کھولے، اس نے انکار کر دیا۔ سنار نے شرارت کر کے اس کی چادر کا پچھلا حصہ اس کی پیٹھ کے ساتھ باندھ دیا۔ جب وہ اٹھی تو اس کی شرمگاہ ننگی ہو گئی۔ یہ اس کے ساتھ ہنسے۔ اس نے فریاد کی۔ ایک مسلمان شخص اٹھا اور اس نے سنار کو قتل کر دیا۔ تمام یہودی جمع ہوئے۔ اور انہوں نے مسلمان کو قتل کر دیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے مسلمانوں کو پکارا۔ اس پر مسلمانوں کو بہت ہی غصہ آیا۔ چنانچہ ان کے اور بنی قینقاع کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔

رسول اللہ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے رسول اللہ کے فیصلے پر ہتھیار ڈال دیے کہ آپ جو فیصلہ کریں، اس پر رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ابن سلول ان کی طرفداری میں کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ بنی قینقاع اور خزرج کے درمیان ایک معاہدہ تھا۔ لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ یہ منافقین دراصل کفار اہل کتاب کے بھائی تھے۔ بڑی کشمکش کے بعد رسول اللہ راضی ہو گئے کہ ان کو قتل کرنے کے بجائے جلاوطن کر دیا جائے اور یہ کہ وہ اپنے ساتھ اموال اور سامان لے جائیں ماسوائے اسلحہ کے۔ اور یہ لوگ شام کو چلے گئے۔

یہ واقعہ تھا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے کہ یہ بنی نضیر بھی بنی قینقاع کی طرح ہیں اور منافقین ان کے بھائی ہیں اور ان کے بھی بھائی تھے۔ منافقین نے اپنے بھائی کافر اہل کتاب کو دھوکہ دیا کہ وہ مقابلہ کریں، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ لیکن ان کا یہ انجام ہوا اور انہوں نے کوئی ساتھ بھی نہ دیا۔ یہاں ان کی ایک دائمی تمثیل دی جاتی ہے کہ منافقین جو کچھ کرتے ہیں بعینہ وہی شیطان کرتا ہے اور جو لوگ شیطان کی سنتے ہیں ان کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّي بَرِيْءٌ مِّنْكَ اِنِّيْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (١٦) فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ

(۱۷) "ان کی مثال شیطان کی سی ہے کہ پہلے وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر' اور جب انسان کفر کر بیٹھتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری الذمہ ہوں' مجھے تو اللہ رب العالمین سے ڈر لگتا ہے۔ پھر دونوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائیں' اور ظالموں کی یہی جزا ہے"۔

شیطان انسانوں کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے وہی سلوک منافقین اہل کتاب کافروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن انسان ہیں کہ پھر اس کے کہے پر چلتے ہیں۔ یہ ایک دائمی حقیقت ہے اور قرآن کریم اس عارضی واقعہ کے حوالے سے اسے یہاں بیان کر دیتا ہے کہ اس طرح اس جزئی واقعہ سے بھی ایک دائمی اور کلی نصیحت و حکمت اخذ کی جائے اور یوں بات کا دائرہ وسیع ہو جائے۔ اور بات صرف ایک جزئی واقعہ تک محدود نہ رہے۔ قرآن کا یہ انداز ہے کہ قرآن دائمی' اور اعلیٰ حقائق کو بھی ایک جزء کے حوالے سے بیان کرتا ہے۔ کیونکہ محض کلی اور اصولی باتیں خشک فلسفہ بن جاتی ہیں۔ اور انسانی شعور اور دل و دماغ پر ان کا وہ اثر نہیں ہوتا جس طرح ایک مثال اور واقعہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ ہے فرق قرآن کے اندازِ بیان کا اور فلاسفہ اور مدرسین کے اندازِ بیان کا۔ فلاسفہ صرف فارمولوں کی شکل میں بات کرتے ہیں۔

اس مثال پر بنی نضیر کا قصہ ختم ہوتا ہے اور اس قصے کے درمیان قرآن نے اس قدر حقائق ہدایات اور تصاویر بیان کیں اور ان کی وجہ سے اس جزوی قصے کو آفاقی بنا دیا گیا یا اعلیٰ حقائق کو اس قصے کی شکل میں پیش کیا گیا۔ اور یہ واقعہ ادھر زمین پر چلتا رہا اور ادھر انسانی ضمیر کے اصلاح کا کام کرتا رہا۔ یوں یہ واقعہ ایک واقعہ سے زیادہ درس حکمت اور موجب ہدایت اور عبرت بن گیا۔ اندازِ بیان اس واقعہ اور ان حقائق کا اللہ کی کتاب میں کچھ اور ہے اور انسان اسے جس طرح بیان کرتے ہیں وہ کچھ اور ہے۔

بنی نظیر کے واقعہ کا یہ بیان' اس پر تبصرے اور اس کے ضمن میں عظیم حقائق کا بیان اور ہدایات کے بعد اب روئے سخن اہل ایمان کی طرف پھر جاتا ہے اور خطاب اس پیارے لفظ اور پیاری صفت سے کیا جاتا ہے "اے اہل ایمان" تاکہ وہ اسے جلدی سے قبول کر لیں۔ سہولت سے عمل پیرا ہوں۔ ان سے کہا جاتا ہے تقویٰ کی راہ اختیار کرو' یہ دیکھو کہ کل یوم الحشر کے لیے تم نے کیا تیاری کی ہے' اللہ کو بھول نہ جاؤ جس طرح پہلے لوگوں نے بھلا دیا' تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا۔ اور ان کا برا انجام ہوا اور وہ جہنمی ہو گئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۸) وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۱۹) لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۲۰) (۵۹: ۱۸ تا ۲۰) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو' اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو' اللہ یقیناً تمہارے ان سب اعمال سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں خود اپنا نفس بھلا دیا' یہی لوگ فاسق ہیں۔ دوزخ میں

جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے ۔ جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں"۔

تقویٰ کیا چیز ہے؟ یہ ایک قلبی حالت ہے جس کی طرف اس لفظ کا پرتو ہی اشارہ کر رہا ہے ۔ لیکن الفاظ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ تقویٰ کی حالت کی تصویر کشی کر سکیں ۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس میں دل بیدار اور حساس ہوتا ہے ' اور اللہ کا تیز شعور رکھتا ہے ' اور یہ شعور ہر حالت میں ہوتا ہے ۔ انسان اللہ سے خائف 'بہت محتاط اور اس بات سے حیا کرنے والا ہوتا ہے کہ اللہ اسے ایسے حال میں پائے جو اللہ کو پسند نہیں ہے کیونکہ اللہ تو ہر لمحہ دیکھ رہا ہوتا ہے اس لیے اللہ سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (۵۹ : ۱۸) "ہر شخص دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے"۔ یہ ایسی تعبیر ہے جس کا مفہوم اس کے الفاظ سے بہت زیادہ وسیع ہے اور ان الفاظ کو سن کر ہی انسانی تصور کے سامنے ایک کتاب کے صفحات کھلنے لگتے ہیں ۔ جس کے اندر اس کے پورے اعمال درج ہیں ' ان میں تمام اعمال چھوٹے بڑے درج ہیں تو انسان سوچتا ہے کہ اس نے اس کتاب کے صفحات میں اندراج کے لیے کیا تیاریاں کی ہیں ۔ بس یہ تصور ہی اس کے سامنے اپنی کمزوریاں لے آتا ہے اور کئی تقصیرات اور معاصی اس کے سامنے آجاتے ہیں 'اگرچہ اس نے نیکیاں ہی کی ہوں ' اور راہ حق میں جدوجہد بھی کی ہے ۔ لیکن اگر اس کی نیکیاں کم ہو گئیں تو کیا ہو گا ۔ بہرحال یہ چند الفاظ اگر انسان کے پیش نظر رہیں تو وہ کبھی بھی غافل نہیں ہو سکتا ۔ وہ ہر وقت اپنے اعمال پر نظر رکھے گا۔

یہ شعور دینے کے بعد مومنین کو مزید بیدار کیا جاتا ہے ۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۵۹ : ۱۸) "اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ یقیناً تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے"۔ اسی طرح قلب مومن کا احساس تیز ہو جاتا ہے ۔ وہ ڈرتا ہے اور معصیت کرتے ہوئے اللہ سے حیا کرتا ہے کیونکہ اللہ تو انسان کے تمام اعمال سے خبردار ہے"۔

اس آیت میں جس یاد دہانی اور بیداری کی دعوت دی گئی ' اس کی مناسبت سے اگلی آیت میں ان کو ڈرایا جاتا ہے کہ وہ اس طرح نہ ہوں ۔

كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ (۵۹ : ۱۹) "ان لوگوں کی طرح نہ ہوں جو اللہ کو بھول گئے تھے تو اللہ نے انہیں اپنا نفس بھلا دیا تھا"۔ یہ عجیب حالت ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بھلا دے لیکن یہ ہے حقیقت ۔ اس لیے کہ جو شخص اللہ کو بھلا دیتا ہے ' وہ اس دنیا میں اس طرح ہوتا ہے جس طرح حیوان چرتے پھرتے ہیں ۔ یوں وہ اپنی حیثیت انسانی کو بھلا دیتا ہے ' اور اس حقیقت سے پھر ایک دوسری حقیقت لازم آتی ہے ۔ وہ یوں کہ وہ اپنے آپ کو بھلا کر اپنی طویل زندگی کے لیے کوئی سامان نہیں تیار کرتا ۔ اور کل کے لیے اس کی کوئی تیاری نہیں ہوتی ۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵۹ : ۱۹) "یہی لوگ فاسق ہیں"۔ یہ جادۂ حق سے منحرف اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں ۔ اس لیے اگلی آیت میں آتا ہے کہ ایسے لوگ جہنمی ہیں ۔ اور مومنین چونکہ اہل جنت ہیں اس لیے ان کو

چاہئے کہ وہ ان لوگوں کے راستے کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کریں کیونکہ دونوں کے راستے ہی جدا ہیں ۔

لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ

"دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے ۔ جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں" (۵۹ : ۲۰) ۔ نہ دونوں کے حالات برابر ہوں گے نہ مزاج برابر ہو گا ۔ نہ راستہ اور نہ راستے پر چلنے کا طریقہ ۔ نہ جنت اور نہ منزل ۔ غرض ان کی کوئی چیز یکساں نہیں ہو سکتی ۔ ان کے راستے ہی جدا ہیں اور یہ راستے اس طرح جدا ہیں کہ کسی مقام پر باہم نہیں ملتے ۔ ان کی سمت جدا ہے' اس کا خط جدا ہے' نہ سیاست میں' نہ صف میں اور نہ دنیا اور نہ آخرت میں ۔

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ (۵۹ : ۲۰) "جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں" ۔ یہاں اہل جنت کا انجام بتا دیا جاتا ہے اور اہل جہنم کو بھلا دیا جاتا ہے کہ ان کا انجام تو معلوم ہے گویا وہ بھلا دیئے گئے گم ہو گئے ۔

اب قلب و نظر کی تاروں پر آخری اور شدید ضرب جس سے انسان کپکپا جاتا ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ اے دل مومن اگر پہاڑوں پر یہ قرآن اتارا جاتا تو وہ بھی پاش پاش ہو جاتے ۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ
خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱ هُوَ اللّٰهُ
الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝۲۲ هُوَ
اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ
الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۲۳ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ ۳
لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲۴ ع ۲۷
۶

"اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے ۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ (اپنی حالت) پر غور کریں ۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں' غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا' وہی رحمٰن اور رحیم ہے ۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس' سراسر سلامتی' امن دینے والا' نگہبان' سب پر غالب' اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا' اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا ۔ پاک ہے' اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو

نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے' اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

یہ ایک تمثیل ہے لیکن ایک حقیقت کو بطول مثال پیش کیا گیا ہے۔ یہ قرآن ایک عظیم وزن رکھتا ہے۔ اس کے اندر بہت بڑی قوت ہے' بے پناہ اثر کا مالک ہے' اور اس کے مقابلے میں کوئی چیز ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔ جس پر اس کا وزن پڑے تو متزلزل ہو جاتا ہے' پاش پاش ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب پہلی مرتبہ اسے پڑھا تو وہ پاش پاش ہو گئے اور جب وہ ایک رات سننے والے سے سن رہے تھے۔

وَالطُّوْرِ (١) وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ (٢) فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (٣) وَّالْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ (٤) وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ (٥) وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (٦) اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ (٧) (٥٢ : ١ تا ٧) "قسم ہے طور کی اور ایک ایسی کھلی کتاب کی جو رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے اور آباد گھر کی' اور اونچی چھت کی' اور موجزن سمندر کی' کہ تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں"۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد وہ گھر کو واپس آئے اور اس قدر غم زدہ ہو گئے کہ لوگ ایک ماہ تک ان کی عیادت کرتے رہے۔

بعض ایسے لمحات آتے ہیں کہ انسان کا دل قرآنی معارف کے لیے کھل جاتا ہے تو قرآن کا اثر اس قدر تیز ہوتا ہے کہ انسان ہلا مارا جاتا ہے اور اس پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور انسان کے اندر اس قدر تغیرات اور تبدیلیاں آ جاتی ہیں جس طرح مقناطیس اور بجلی کا اثر لوہے اور جسم پر ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی شدید اثر ہوتا ہے۔

اللہ خالق الجبال بھی ہے اور منزل القرآن بھی۔ اللہ کا فرمان ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ

(۵۹ : ۲۱) "اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے"۔ جن لوگوں نے قرآن کریم کی اس نوعیت کے اثرات کو اپنے جسم میں محسوس کیا ہے وہی اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں لیکن ان کا ذوق اور ان کا احساس الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اور اس سورت کے آخر میں خدائے رحمن و رحیم کی تعریف اور تسبیح آتی ہے' جب انسان کی ذات پر قرآن کریم کا کسی قدر اثر ہو جاتا ہے تو وہ تسبیح کرنے لگتا ہے اور یہ اسمائے حسنیٰ ایسے ہیں جن کے آثار کائنات میں واضح نظر آتے ہیں کیونکہ اللہ کے اسمائے صفات کائنات کے مظاہر اور اس کی حرکت میں نظر آتے ہیں:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (٢٢) هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ

الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۲۳) هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲۴) (۵۹: ۲۲ تا ۲۴) "وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں' غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا' وہی رحمٰن اور رحیم ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے نہایت مقدس ' سراسر سلامتی' امن دینے والا' نگہبان' سب پر غالب' اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا' اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا۔ پاک ہے' اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے' اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

اللہ کی اس تسبیح کے تین ٹکڑے ہیں اور ہر ایک کا آغاز عقیدۂ توحید سے ہوتا ہے۔

هُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یا هُوَ اللّٰهُ سے ہوتا ہے۔ اللہ کے اسماء میں سے ہر اسم کا اثر اس کائنات میں صاف نظر آتا ہے یا انسانی زندگی میں نظر آتا ہے۔ دکھانا یہ ہے کہ اللہ کی ذات فعال ہے۔ اور اللہ کی فعالیت کا تعلق اس کائنات اور انسانوں کی زندگیوں سے ہے۔ یہ کوئی منفی صفات نہیں اور نہ اس زندگی کے عملی پہلو سے جدا ہیں۔ یہ صفات ہمارے ماحول' ہمارے احوال اور ہمارے مظاہر میں ہمارے ساتھ ہیں۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (۵۹: ۲۲) "اللہ وہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے"۔ لہٰذا اسی کے الٰہ ہونے کا عقیدہ رکھو' اسی کی عبادت کرو' اور اسی کی طرف رخ کر کے پکارو۔ تخلیق سے لے کر موت تک تمہاری زندگی کے اندر وہی موثر اور فعال ہے اور اسی عقیدے پر مکمل اسلامی نظام فکر اور نظام عمل قائم ہے۔ لوگوں کے آپس کے تعلقات' لوگوں کے عام زندہ مخلوق کے ساتھ تعلق اور لوگوں کے اس کائنات کے ساتھ تعلق کو عقیدۂ توحید کی اساس پر استوار کیا گیا ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (۵۹: ۲۲) "غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔ اس سے یہ شعور پیدا کرنا مطلوب ہے کہ اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ ظاہر اور خفیہ سب اس پر ظاہر ہے۔ تو انسان کو یہ شعور تازہ رکھنا چاہئے کہ وہ دیکھ رہا ہے اس کے بعد جو کچھ بھی کرنا چاہے' کرے۔ کیونکہ انسان یہاں اکیلا زندہ نہیں رہ رہا ہے۔ اگرچہ انسان تنہائی میں ہو۔ اگر انسان اپنے اندر یہ کیفیت پیدا کرے تو اس کا قلب نہ غافل ہو سکتا ہے نہ سو سکتا ہے۔

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۵۹: ۲۲) "وہی رحمٰن و رحیم ہے"۔ ان صفات کے تصور سے انسان مطمئن اور خوش ہوتا ہے اور خوف کے ساتھ امید بھی ہوتی ہے۔ ہیبت کے ساتھ طمانیت بھی آتی ہے۔ مومنین کے تصورات کے مطابق اللہ ہر وقت انسانوں کا پیچھا ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ نگرانی بھی کر رہا ہے۔ وہ ہر وقت لوگوں کو سزا اور عذاب ہی نہیں دے رہا بلکہ ان کو ہدایت بھی دے رہا ہے۔ ان کو شتر بے مہار نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اللہ ان کی رہنمائی کرتا ہے اور

معاونت بھی کرتا ہے ۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (۵۹ : ۲۳) "وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں"۔ اس دوسری تسبیح میں بھی اس عقیدے یا کلمہ شہادت کو دہرایا گیا کیونکہ یہ اصل الاصول ہے ۔

اَلْمَلِكُ (۵۹ : ۲۳) "وہ بادشاہ ہے"۔ یہی معبود جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے یہی بادشاہ بھی ہے ۔ جب بادشاہ بھی وہی ہے تو پھر لازم ہے کہ سارے معاملات میں صرف اسی کی طرف رجوع ہو۔ کوئی اور بادشاہ پھر نہ ہو گا۔ لہذا کوئی شخص دو بادشاہوں کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اللہ نے کسی آدمی کے اندر بیک وقت دو دل پیدا نہیں کیے ۔

اَلْقُدُّوْسُ (۵۹ : ۲۳) "نہایت مقدس"۔ یہ لفظ انتہائی پاکی کو ظاہر کرتا ہے ۔ طہارت مطلقہ۔ اللہ قدوس ہے تو اللہ کے بندوں کا دل بھی پاک ہونا چاہئے تاکہ اس کے اندر اللہ کی پاک تعلیمات بیٹھ سکیں اور وہ فیوض و برکات کے نزول کے اہل ہو سکے ۔ اور وہ اللہ کی پاکی بیان کر سکے ۔

اَلسَّلٰمُ (۵۹ : ۲۳) "سراسر سلامتی"۔ السلام سے امن ' سلامتی ' اور اطمینان کا نزول ہوتا ہے اور یہ پوری کائنات سلامتی سے بھر جاتی ہے ۔ قلب مومن اپنے رب کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے ۔ ایک اللہ کے جوار رحمت میں امن سے ہوتا ہے ۔ پھر اس کائنات میں وہ آفات و بلیات سے بھی اپنے آپ کو امن میں پاتا ہے ۔ اس کی بے اطمینانیاں ' بے چینیاں اور تمام تھکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور وہ اس کائنات کی ہر چیز کا دوست بن جاتا ہے ۔

اَلْمُؤْمِنُ (۵۹ : ۲۳) "امن دینے والا"۔ امن و سلامتی دیتا ہے ۔ اس صفت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی اہمیت کیا ہے ' مومن ہو کر انسان اللہ کی صفات میں سے ایک صفت میں شریک ہو جاتا ہے ' یوں صفت ایمان کے بعد وہ زمین کی مخلوق نہیں رہتا بلکہ عالم بالا کی طرف بلند ہو جاتا ہے ۔

اَلْمُهَیْمِنُ (۵۹ : ۲۳) "نگہبان"۔ اللہ کی صفات کے تصور کا یہ نیا زاویہ ہے ۔ سابقہ صفات القدوس السلام المومن ایسی صفات ہیں جو ذات سے متعلق ہیں لیکن مہیمن کی صفت پوری کائنات سے متعلق ہے اور اس سے اللہ کی نگرانی اور بادشاہت کا اظہار ہوتا ہے ۔

اسی طرح اگلی صفات ۔

اَلْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (۵۹ : ۲۳) "سب پر غالب ' اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا ' بڑا ہو کر رہنے والا"۔ یہ ایسی صفات ہیں جس سے اللہ کی گرفت ' غلبے اور جبر کا اظہار ہوتا ہے ۔ جس سے ایسی برتری ' قوت ' غلو کا اظہار ہوتا ہے جس کے اور کوئی شریک نہ ہو۔ اور در حقیقت اللہ کی ذات و صفات میں کوئی شریک بھی نہیں ہے ۔ صرف وہی عزیز ہے ' صرف وہی جبار ہے ' صرف وہی متکبر ہے ۔ ان صفات کا اطلاق اس کے سوا کسی پر نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ سورت کا اختتام یوں ہے :

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ (۵۹ : ۲۳) "پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں"۔
اور آخری تسبیح جو بہت ہی طویل ہے :

هُوَ اللّٰهُ (۵۹ : ۲٤) "وہی ہے معبود" اور اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔

اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ (۵۹ : ۲٤) "تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اسے نافذ کرنے والا"۔ خلق کا مفہوم ہے : منصوبہ بنانا اور پورا نظام تقدیر تیار کرنا۔ اور باری کے معنی پھر اس منصوبے کو مسلسل نافذ کرتے چلے جانا۔ یہ دونوں صفات باہم متصل ہیں۔ ان میں فرق بھی لطیف ہے۔

اَلْمُصَوِّرُ (۵۹ : ۲٤) "صورت گری کرنے والا"۔ یہ صفت بھی سابقہ دونوں صفات سے مربوط ہے۔ یعنی منصوبہ ' پھر تخلیق اور پھر تصویر اور خدو خال کا تعین۔ ہر چیز کی صورت اور سیرت کا تعین۔ ہر چیز کو اس کے خواص عطا کرنا۔
یہاں ان صفات کا 'مسلسل لانا' جن کے اندر بہت کم فرق ہے اور جو تخلیق ہی کے مختلف مراحل ہیں ' یہ اشارہ دیتا ہے کہ کسی بھی تخلیق کے کام میں یہی تدریج کار فرما ہوتی ہے۔ یہ اشارہ انسانوں کو دیا جا رہا ہے۔ انسانی تصورات کے مطابق پہلے نقشہ تخلیق ' پھر تخلیق اور پھر تصویر ہوتی ہے ورنہ اللہ کے ہاں تو نہ درجات ہیں اور نہ مراحل ہیں۔ وہاں تو کُنْ فَیَكُوْنَ ہے۔ ہم انسان ان امور کو اپنے دائرۂ ضرورت میں لاکر سمجھتے ہیں اور ہماری قدرت اور طاقت بہت چھوٹی ہے۔

لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (۵۹ : ۲٤) "اس کے بہترین نام ہیں"۔ یہ نام بذات خود اچھے ہیں۔ ان کو اچھا کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی اچھا کہے تو اچھے ہوں۔ یہ اسمائے حسنیٰ انسانوں کے دلوں پر حسن کے فیوض کرتے ہیں۔ ان پر غور وتدبر کر کے اور ان صفات کو اپنے اندر پیدا اور ان سے ہدایت لے کر انسان کمال حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اللہ ان صفات کے ساتھ متصف ہونا پسند کرتا ہے تو یہ پسندیدہ صفات ہیں ' اوصاف حمیدہ ہیں۔ لہٰذا انسان کو ان درجات میں بلند ہوتے رہنا چاہئے۔

اسمائے حسنیٰ کے ساتھ اللہ کی تسبیح ' پاکی اور یاد کا یہ طویل سلسلہ اب اس پوری کائنات کی وسعتوں میں پھیل جاتا ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز یہ فیوض لے رہی ہے لہٰذا تم بھی ان تسبیحات سے اشارات لو اور فیوض حاصل کرو۔

یُسَبِّحُ لَهُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۵۹ : ۲٤) "ہر چیز جو آسمان اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔ یہ ہے وہ منظر جو ان صفات کے ذکر کے بعد ایک متوقع منظر ہے۔ تمام اشیاء اس میں شریک ہیں۔ سورت کا آغاز و اختتام بھی باہم مل جاتا ہے اور آغاز میں بھی اللہ کی پاکی اور انجام میں اس کی تسبیح سبحان اللہ وبحمدہ۔

---○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ۔۔ ۲۸

سورۃ الممتحنۃ ۔ ۶۰

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۳

سورۃ الممتحنۃ ایک نظر میں

یہ سورت بھی اس تربیتی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو مدینہ میں اسلامی سوسائٹی کی تنظیم اور اسلامی حکومت کی تشکیل اور تربیت کے لیے ہو رہی تھی۔ اس سلسلہ تربیت اور اس اسلامی منہاج کی یہ ایک کڑی ہے' جس کے ذریعہ اللہ اپنا ایک پسندیدہ نظام زندگی' اس دنیا میں پوری انسانیت کے لیے بطور نمونہ قائم کر کے دکھانا چاہتا تھا۔ ایسا نمونہ جو عملاً کسی سوسائٹی میں نافذ ہو' اور اس کے مخصوص فیچر ہوں' الگ شخصیت ہو اور الگ خد و خال ہوں۔ جہاں تک انسانیت کی عملی صورت حال ہے تو وہ کبھی کبھار اس تک پہنچ جاتی ہے۔ کبھی اس سے پیچھے رہتی ہے' لیکن یہ معیار اس کے سامنے ہو' اس کا ہدف ہو اور وہ اس ٹارگٹ کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہے کہ ایک دن ایسا نظام بھی قائم رہا۔ ہم بھی ایسا کر کے رہیں گے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا' اس قسم کے نظام کے قیام کے لیے ایک مرحلہ وار تیاری اور جدوجہد کی ضرورت تھی۔ وہ واقعات جو جماعت کے اندر واقع ہوتے تھے' یا جماعت کے ساتھ متعلق ہوتے تھے وہ اس تیاری کے لیے بنیادی عنصر کا کام دیتے تھے۔ یہ مواد علم الٰہی میں طے شدہ تھا اور ان واقعات کی بنیاد پر تبصرہ' توضیح اور تشریح اور تجزیہ ان پر مزید وضاحت کے لیے ہوتا اور یوں جماعت کی تربیت کا کام جاری تھا۔

مدینہ کی عملی زندگی کی پے درپے امواج اور واقعات و حادثات کے اضطراب میں یہ تربیت پایہ تکمیل کو پہنچی اور یہ جماعت تیار ہوئی جس نے اسلامی نظام حیات کو عملاً دنیا میں رائج کرنا تھا۔ یہ جماعت عملی زندگی سے کہیں الگ تھلگ نہ تھی۔ یہ اس معاشرے کے اندر رہ کر تربیت پا رہی تھی۔ البتہ اپنے عقیدے اور تصور کے اعتبار سے اور اپنی نفسیاتی تشکیل کے اعتبار سے' اور اپنے افکار اور تصورات کے لحاظ سے اس وقت کی پوری دنیا سے خصوصاً جزیرۃ العرب کے پہلی تصورات سے' بالکل الگ ہوگئی تھی اور اس مسلسل تربیت کے ذریعے اس کو اپنے اس ممتاز نظریہ حیات میں عمداً الگ کیا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی فکری دنیا میں کوئی ایسی بات نہ ہوئی جو جدید اسلامی اور ایمانی فکر سے اجنبی ہو۔ لیکن یہ لوگ جو دینی اور فکری اعتبار سے معاشرہ سے الگ تھلگ تھے' وہ عملی لحاظ سے اسی معاشرے کے اندر رہتے تھے۔ بلکہ ان کو ہر روز نئے نئے حادثات اور واقعات کی بھٹی میں تپاکر اور بار بار آزمائشوں سے گزار کر اور دھات کی طرح بار بار گرم کر کے صاف کیا جا رہا تھا۔ ان پر مختلف اطراف سے اثر انداز ہونے والے عوامل کے اثرات ڈال کر آزمایا جاتا تھا۔ کیونکہ اللہ جس نے ان نفوس کو پیدا کیا تھا وہ جانتا تھا کہ صرف ایک بار کی کیفیت' ایک بار کا تسلیم کر لینا اور جوش میں کسی بات کو اپنا لینا مکمل تربیت کے لیے کافی نہ تھا۔ اللہ کو علم تھا کہ ماضی کے جمع شدہ افکار' ماضی کی دلچسپیاں اور میلانات' پھر انسان کی فطری کمزوریاں' پھر انسان پر اثر انداز ہونے والے حالات' انسان کی عادت کی مجبوریاں ایسی رکاوٹیں ہیں کہ جنہیں صرف ایک ہی نشست میں دور نہیں کیا جا سکتا' انہیں بار بار آزمانے اور تپانے کی ضرورت ہے۔ بار بار کی نصیحت اور یاد دہانی کی

ضرورت ہے۔ چنانچہ اللہ کے نظام تقدیر کے مطابق ایک ایک واقعہ پردۂ تقدیر کے پیچھے سے نمودار ہوتا رہا اور اس کی روشنی میں ان کی آزمائش، نصیحت اور عبرت آموزی ہوتی رہی اور بار بار ہدایات دی جاتی رہیں۔

رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہروقت بیدار رہتے تھے اور بصیرت افروز الہام بھی ان کی مدد کر رہا تھا اور ہروقت، واقعات و حادثات پیش آتے رہتے تھے اور ان کی روشنی میں آپ اس جماعت کو ہدایات دیتے رہتے تھے۔ وحی و الہام بھی اپنا کام کر رہے تھے۔ اس طرح اللہ کی عین نگرانی میں اس جماعت کو بنایا جارہا تھا۔

لِتُصْنَعَ عَلَى عَيْنِي یہ سورت بھی اس تیاری کا ایک حصہ ہے۔ اس کا اور اس جیسی تمام دوسری سورتوں کا مقصد یہ ہے کہ قلب مومن کے اندر ایک ربانی دنیا کی تخلیق کی جائے۔ اس دنیا کا محور صرف ایمان ہو۔ مسلمان اس ایمان کے محور کے گرد گھوم رہے ہوں۔ ان سب کے ہاتھ میں ایک ہی رسی مضبوط تھامی ہوئی ہو' ان کے نفوس عصبیت جاہلیہ سے پاک ہوں۔ ہر قسم کی عصبیت سے جو قوم نسل' خاندان اور زمین کے تصورات پر بنی ہو تاکہ ان تمام تصورات اور تعلقات کو ختم کر کے اس کی جگہ ایک ہی رابطہ قائم کر دیا جائے' یعنی ایمانی تعلق' ایک ہی پارٹی ہو یعنی حزب اللہ اور ایک ہی جھنڈا ہو یعنی اسلامی جھنڈا۔

اسلام جس قسم کی دنیا وجود میں لانا چاہتا ہے وہ ربانی اور انسانی دنیا ہے۔ اس معنی میں ربانی کہ وہ اپنی تمام ہدایات اللہ کے احکام' اللہ کی ہدایات اور شریعت سے اخذ کرے اور اپنے شعور اور عمل میں وہ اللہ کی سمت کی طرف متوجہ ہو۔ اور انسان اس مفہوم میں کہ اس کی لپیٹ میں تمام جنس انسانی آجائے۔ ایمانی عقائد و نظریات کی حدود میں اور اس ربانی اور انسانی دنیا سے اسلام نسلی' وطنی اور لسانی عصبیت کو یکسر ختم کرنا چاہتا ہے۔ اور ان کے علاوہ وہ تمام چیزوں کو مٹانا چاہتا ہے جس کے ذریعہ انسان اور انسان کے درمیان فرق کیا جاسکے۔ یہی وہ بلند دنیا ہے جس میں کوئی انسان صحیح انسانی زندگی بسر کر سکتا ہے جس میں شرافت اور روحانیت کا اجتماع ہو سکتا ہے۔

اس دنیا کے قیام کی راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں قائم ہیں۔ عربی معاشرے میں یہ رکاوٹیں تھیں اور آج کے اس مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے میں بھی گھرانے کے تعصبات' خاندانی تعصبات' قوم کے تعصبات' نسل کے تعصبات اور زمین و وطن کے تعصبات سب ان میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بعض دوسری رکاوٹیں بھی ہیں۔ انسان کے ذاتی مرغوبات' انسان کی خواہشات' حرص' لالچ' کنجوسی' دولت کی بھوک' پھر ذاتی برتری اور نفسیاتی الجھنیں اور اسی قسم کی دوسری رکاوٹیں۔ اس لیے اسلام کے یہ پیش نظر تھا کہ وہ ان تمام رکاوٹوں کو عبور کرے۔ اور علاج کے سلسلے میں' یہ سورت بھی ایک علاج ہے' اور ان تربیتی کڑیوں میں سے یہ بھی ایک کڑی ہے' جو پہلے جماعت مسلمہ کی تربیت کے لیے اختیار کی گئیں۔

مسلمانوں میں ابھی بعض لوگ ایسے تھے' جنہوں نے اگرچہ اپنا علاقہ' اپنا گھر' اپنا مال اور اپنے اہل و عیال اور اپنا خاندان مکہ میں چھوڑ دیا تھا لیکن ان کے دل ابھی تک مکہ کے ان لوگوں اور چیزوں کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے قریش کے ہاتھوں نہایت دکھ اور درد سے تھے لیکن ابھی تک بعض لوگوں کی یہ خواہش تھی کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان صلح ہو جائے اور یہ جھگڑا ختم ہو جائے' جس میں دونوں طرف سے لوگ اپنے بھائیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ اس

لیے ایسے لوگ موجود تھے جو چاہتے تھے کہ یہ خصومت ختم ہو جائے۔

اللہ کا منشا یہ تھا کہ اس قسم کے دلوں سے اس قسم کے تعلقات اور ہمدردیوں کا صفایا ہو جائے۔ اور وہ اپنے دین ' عقیدے ' نظریات اور نظام کے لیے یکسو ہو جائیں۔ اللہ جانتا تھا کہ ان تعلقات اور میلانات میں سے بعض انسانی فطرت کے بہت قریب تھے ' پھر ان میں سے بعض جاہلیت کے تہ بہ تہ افکار کی وجہ سے ابھی باقی تھے جو دلوں کے اندر بیٹھے ہوئے تھے پھر یہ لوگ عرب تھے ' جن کے اندر قبیلے کی عصبیت ' خاندان کی عصبیت گھرانے کی عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم ہرروز کسی نہ کسی واقعہ کے ضمن میں ان کے دلوں کو صاف کرنے میں لگا ہوا تھا جو بھی واقعہ ہوتا کوئی سورت اس کا تجزیہ کرتی اور اس سے سبق نکالتی تاکہ یہ تربیت اور یہ علاج قابل فہم ہو جائے۔ اور محض نظریاتی تربیت کے بجائے عملی تربیت ہو۔

روایات میں ایک متعین واقعہ بھی نقل ہوا ہے جس کے بارے میں اس سورت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ ممکن ہے کہ یہ آیات اسی واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہوں لیکن نصوص کا مفہوم اور مراد ایک اصول کی شکل میں ہوتا ہے اور ان کا اطلاق عام ہوتا ہے ' زمان و مکان کا پابند نہیں ہوتا ' نالہ پابند نے نہیں ہے۔

اس حادثہ کے بارے میں روایت ہے۔ حضرت حاطب ابن ابوبلتعہ مہاجرین میں سے تھے ' اور اہل بدر سے تھے ' مکہ میں ان کی اولاد اور مال تھا۔ یہ اہل قریش میں سے نہ تھے بلکہ عثمان کے حلفا میں سے تھے۔ جب رسول اللہ نے عزم کیا کہ مکہ پر حملہ کیا جائے۔ کیونکہ اہل مکہ نے معاہدۂ حدیبیہ کو توڑ دیا تھا ' تو حضورؐ نے مسلمانوں کو اس جنگ کے لیے تیاری کا حکم دے دیا۔ حضورؐ نے دعا کی اے اللہ اہل مکہ کو ہماری تیاریوں کی خبر نہ ہو۔

اللھم عم علیھم خبرنا حضورؐ نے اپنے صحابہ میں سے ایک جماعت کے سامنے اپنے ارادے کا اظہار کر دیا۔ ان میں سے حاطب بھی تھے۔ حاطب نے ایک خط لکھا اور ایک مشرک عورت کے ہاتھ اسے اہل مکہ کے لیے بھیجا کہ رسول اللہ ؐ کا یہ ارادہ ہے۔ یہ عورت مزینہ قبیلہ کی تھی اور مدینہ میں مانگنے کے لیے آئی تھی۔ اس اطلاع سے حضرت حاطب کی غرض یہ تھی کہ ان کے ہاں ان کا تعلق ہو جائے۔ چنانچہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کر دی کہ آپ کی دعا منظور ہے اور اس خط کی اطلاع دے دی۔ حضورؐ نے اس عورت کے پیچھے آدمی روانہ کیے اور اس سے خط لے آئے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے حصین ابن عبدالرحمٰن سے انہوں نے سعد ابن عبدہ سے ' انہوں نے عبدالرحمٰن سلمی سے انہوں نے حضرت علی سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ' ابو مرثد اور زبیر ابن العوام کو تیز رفتار گھوڑوں پر بھیجا۔ تم جاؤ اور مقام روضہ خاخ میں مشرکین کی ایک عورت جا رہی ہے ' اس کے پاس حاطب ابن ابو بلتعہ کا ایک خط ہے جو مشرکین مکہ کے نام ہے۔ ہم نے اس عورت کو اسی مقام پر پایا۔ جہاں رسول اللہ نے فرمایا تھا۔ یہ اپنے اونٹ پر سوار تھی۔ ہم نے اسے کہا نکالو خط۔ تو اس نے کہا میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ ہم نے اونٹ کو بٹھایا اور خوب ڈھونڈا ' خط نہ تھا۔ ہم نے کہا کہ رسول اللہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے ' خط نکالو ورنہ ہم تجھے ننگا کر دیں گے۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ لوگ سنجیدہ ہیں تو وہ ازار باندھنے کی جگہ کی طرف جھکی اور اس نے ایک کپڑے سے خط نکالا۔ اس نے ازار بند کی جگہ اسے باندھ رکھا تھا۔ ہم خط لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ' اللہ کے رسول ؐ اس نے اللہ اور اللہ کے رسول ؐ کے ساتھ خیانت کی ہے ' براہ کرم مجھے

چھوڑیں کہ اس کی گردن تن سے جدا کر دوں ۔ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا' تم نے جو کچھ کیا اس پر تمہیں کس چیز نے مجبور کیا ہے ۔ حضرت حاطب نے کہا' خدا کی قسم مجھے کچھ بھی نہیں ہے' میں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والا ہوں' میں چاہتا تھا کہ اہل قریش کے ہاں میرا ایک احسان ہو' جس کے ذریعہ اللہ میرے بچوں اور مال کی حفاظت کا بندوبست کر دے ۔ اور اے پیغمبر .... آپ کے سب ساتھیوں کا مکہ میں کوئی نہ کوئی رشتہ دار ایسا ہے جو ان کے مال اور بچوں کی جان کی حفاظت کرتا ہے ۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ شخص سچ کہتا ہے' اس کے بارے میں کوئی بری بات نہ کرو' حضرت عمرنے فرمایا اس نے اللہ' رسول اللہ .... اور مومنین کے ساتھ خیانت کا ارتکاب کیا ہے ۔ تو حضورؐ مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی گردن اڑا دوں ۔ حضورؐ نے فرمایا : کیا یہ بدری نہیں ہے؟ حضورؐ نے مزید کہا شاید اللہ اہل بدر کے پاس آیا اور ان کو کہہ دیا کہ جو چاہو کرو' تمہارے لیے تو جنت واجب ہو گئی ہے ۔ یا یہ فرمایا کہ تم معاف کر دیئے گئے ہو ۔ اس پر حضرت عمرکی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور فرمایا اللہ اور رسول اللہ ...... زیادہ جانتے ہیں ۔ امام بخاری کی کتاب المغازی میں اس روایت پر یہ اضافہ کیا ہے ۔ تو اللہ نے یہ سورت نازل کی :

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاۤءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ (۶۰ : ۱) "اے لوگ جو ایمان لائے ہو' میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ' تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو" ۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ جو لوگ بھیجے گئے تھے وہ علی' زبیر اور مقداد تھے ۔

یہاں ہم قرآن کے سایہ کی حدود سے آگے نہ نکلیں گے' اگر ہم قدرے کھڑے ہو کر اس واقعہ پر غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ مربی اعظم حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس طرح کے واقعات اور حادثات میں جماعت کو کس طرح تربیت دیتے تھے اور کیسے فیصلے فرماتے تھے ۔ لہٰذا اس واقعہ پر قدرے غور کی ضرورت ہے ۔

۱۔ سب سے پہلے یہ کہ حضرت حاطب کا فعل قابل غور ہے ۔ آپ مسلم اور مہاجر تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جن کے سامنے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ راز کھول دیا تھا ۔ اس فعل پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نفس انسانی کے اندر بھی نشیب و فراز ہوتے ہیں ۔ مختلف چیزیں انسانوں پر اثر انداز ہوتی ہیں' نفس انسانی جس قدر ترقی مراحل سے گزرے' جس قدر کمال و جمال کا حامل ہو' اس کے اندر کمزور اور ضعیف مقامات ہوتے ہیں ۔ یہ اللہ ہی ہے جو انسانوں کو لغزشوں سے بچاتا ہے ۔

۲۔ اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور تحمل بھی نظر آتا ہے ۔ آپ نہایت ہی دھیمے انداز میں پوچھتے ہیں کہ یہ کام کرنے پر تم کیوں مجبور ہو گئے' آپ کی تفتیش نہایت کھلے دل سے ہے اور آپ نہایت ہی مہربانی سے پوچھتے ہیں ۔ حالانکہ ان سے غلطی سرزد ہو چکی ہے ۔ آپ الہامی ذریعہ سے معلوم کر لیتے ہیں کہ اُن کا جواب درست ہے' اور صحابہ کرام کو روک دیتے ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ نہ کہا جائے ۔

صدق لا تقولوا الا خیرا پس یہ فیصلہ ہو گیا ۔ یوں آپ نے ان کی مدد کی اور انہیں اس غلطی سے نکلنے کے

لیے ہمت دی ۔ آپ نے ان کا پیچھا نہ کیا اور نہ دوسروں سے کہا ہے کہ ان کا پیچھا کرو ۔ جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اسلام کی ننگی تلوار ہیں ۔ سچے اور دو ٹوک فیصلہ کرنے والے ۔ "اس نے اللہ ' رسول اللہ .... اور مومنین کے ساتھ خیانت کی ہے ' اجازت دیجئے کہ اس کی گردن اڑا دوں"۔ حضرت عمر صرف گناہ کو دیکھ رہے ہیں اور اپنے جوش ایمانی سے مغلوب ہیں ۔ لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے ایک وسیع فریم ورک میں دیکھتے ہیں ۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنے وسیع علم ' نفس انسانی کی مجموعی حقیقت ' اور ہر پہلو سے حالات پر نظر رکھتے ہیں اور ان وسیع معلومات کے ساتھ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رؤف ورحیم ہونا بھی اپنی جگہ ہے ۔ اور آپ ایسے مربی ہیں کہ ہر پہلو آپ کی نظر میں ہے ' اس لیے آپ کا رویہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مختلف ہے ۔

۳۔ پھر حضرت حاطب کے الفاظ ' وہ نہایت کمزور پوزیشن میں ہیں ' لیکن اس زمین کے اسباب اور اللہ کی تقدیر کے بارے میں ان کا تصور مومنانہ ہے ۔ وہ کہتے ہیں ۔

اردت ان تکون لی عند القوم ید "یعنی میں نے یہ ارادہ کیا کہ اس قوم میں یا کوئی ہاتھ ہو جو میرے مال اور اولاد کو بچائے"۔ اصل میں بچانے والا تو اللہ ہے ۔ یہ ذریعہ یا ہاتھ کو بچانے والا نہیں ہوتا ۔ اس کے ذریعہ اللہ بچاتا ہے ۔ اس تصور کو وہ اپنی باقی بات میں بیان کرتا ہے ۔

ولیس احد من اصحابك الا له هناك من عشیرته من یدفع الله به عن اهله وماله "آپ کے ساتھیوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کے وہاں کوئی رشتہ دار نہ ہوں ' جن کے ذریعہ اللہ اس کے مال اور اہل و عیال کو بچاتا ہے"۔ اللہ ان کے تصور میں موجود ہے کہ بچاتا اللہ ہی ہے ' چاہے وہ جس کے ذریعے بچائے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے کلام میں گہری سچائی کو پایا ۔ اس لیے آپ نے حکم دیا کہ یہ سچ کہتے ہیں ' ان کے بارے میں ماسوائے کلمہ خیر کے اور کچھ نہ کہو ۔

۴۔ اس حادثے میں اللہ کی تقدیر اپنی جگہ کام کر رہی ہے کہ حاطب ان چند محدود افراد میں سے تھے جن کو حملے کا راز بتایا گیا تھا ۔ یہ چند گنے چنے لوگوں میں سے تھے مگر ان سے کمزوری سرزد ہو گئی ۔ دست قدرت اس نقصان سے مسلمانوں کو بچاتا ہے ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مقصود یہ تھا کہ یہ بات کھل جائے اور اس کا بندوبست کر دیا جائے ۔ پھر دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی اس واقعہ کو کوئی مسئلہ نہیں بنایا گیا ۔ کہ یہ کیوں ایسے ہوا ۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ دیکھیے جی ایسے لوگوں کو راز بتایا جاتا ہے جو چھپاتے ہی نہیں ' بلکہ خیانت کرتے ہیں اور ہمیں نہیں بتایا جاتا ۔ اگر ہمیں بتایا جاتا تو ہم حفاظت کرتے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان اپنی قیادت کا کس قدر احترام کرتا ہے ۔ وہ حسن ظن میں کس قدر متواضع ہوتا ہے اور جس بھائی سے غلطی ہو جائے اس کے ساتھ رویہ کیا رکھتا ہے ۔

یہ واقعہ متواتر احادیث میں آتا ہے ۔ البتہ یہ کہ یہ آیات اس واقعہ کے بارے میں نازل ہوئیں ۔ یہ صرف بخاری شریف کی ایک ہی روایت میں ہے اور بخاری کی روایت بھی درست ہے ' لیکن قرآن کی نص کا مضمون عام ہے ' اور نہایت وسیع ہے ۔ اور ایک وسیع دائرہ عمل کو اپنے اندر لیتا ہے ۔ حضرت حاطب کے واقعہ نے بھی بہت وسیع ۔

یہ قرآن کا انداز ہے کہ قرآن ایک جزئی واقعہ کے نتیجے میں ایک اصول وضع کر دیتا ہے۔

اس دور میں لوگوں کے باہم تعلقات کی نوعیت بدل رہی تھی۔رشتہ داری' چھوٹی چھوٹی عصبیتیں' لوگوں کی موروثی عادات اور محدود مقامی وابستگیاں ٹوٹ رہی تھیں اور ان کی جگہ عالمی انسانی تصورات لے رہے تھے۔

نفوس انسانی کے سامنے نئی تصاویر بن رہی تھیں۔جدید قدریں پروان چڑھ رہی تھیں' جدید پیمانے اور ترازو لگ رہے تھے۔زندگی' کائنات' اور انسان کے بارے میں جدید تصورات آرہے تھے۔زمین کے اوپر انسان کے نئے مقاصد ترجیح پارہے تھے اور وجود انسانی اور مقاصد انسانی اور اہداف و منازل از سرنو متعین ہو رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ اس نئی جماعت کو ایک فصل کی طرح بو رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے پودوں کی شکل میں یہ فصل اگ رہی تھی۔ اور یہ کام اللہ اور رسول اللہ کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔اللہ اس جماعت کو سکھا رہا تھا کہ تمہاری تخلیق کا مقصد کیا ہے۔ان کو بتایا جا رہا تھا کہ تمہارے اردگرد کے لوگ تمہیں مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ان کو بتا رہا تھا کہ تم میری پارٹی ہو' تمہارے ذریعہ سے میں نے یہاں بہت بڑا انقلاب برپا کرنا ہے۔دنیا کی تقدیر بدلنی ہے۔اس لیے تمہیں خاص خصوصیات اور صفات اور علامات دی جارہی ہیں۔تم اللہ کے جھنڈے بلند کرو گے اور ان علامات' خصوصیات اور جھنڈوں سے تمہاری پہچان ہوگی۔دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔لہٰذا تم اللہ کے لیے خالص ہو جاؤ۔اس کے دل بن جاؤ' صرف اللہ اور اللہ کے حوالے سے تعلقات رکھو۔رابطے کے تمام دوسرے طریقوں کو کاٹ دو۔عمل میں بھی اور فکر و شعور میں بھی۔

یہ پوری سورت اسی رخ پر چل رہی ہے۔یہاں تک کہ اس کے آخر میں مومنات و مہاجرات کے بارے میں جو قانون آیا ہے' وہ بھی صرف تعلق ایمانی کے رخ ہی پر ہے۔ان سے بیعت ایمان لی جاتی ہے۔اور ان کے اور ان کے خاوندوں کے درمیان جدائی کر دی جاتی ہے۔اسی طرح مومنین اور ان کی کافر بیویوں کے درمیان بھی جدائی کر دی جاتی ہے۔یہ دراصل نظریاتی اور جدید روابط ہی کی ایک شکل ہے' جو اس سورت کا موضوع ہے۔

سورت کا خاتمہ بھی اسی پر ہے' جس پر آغاز ہوا کہ اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی مت کرو۔جب کہ ان پر اللہ کا غضب ہے۔خواہ وہ مشرک ہوں یا یہودی ہوں۔یوں اسلامی رابطے کے سوا تمام روابط کو ختم کر دیا جاتا ہے۔مسلمانوں کے درمیان صرف ایمان کا رابطہ رہ جاتا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۶۰ تشریح آیات

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۳

آیاتھا ۱۳ سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ (۶۰) مَدَنِيَّةٌ (۹۱) رکوعاتھا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ
بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ
تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۤ
تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ڰ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ
مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝۱ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا
اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْۗءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝۲ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ
وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ڔ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ڔ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۳

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو' حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں اور ان کی روش یہ ہے کہ رسول کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب' اللہ پر ایمان لائے ہو' تم چھپا کر ان کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو' حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو' ہر چیز کو میں خوب جانتا ہوں۔ جو شخص بھی تم میں سے ایسا کرے وہ یقیناً راہ راست سے بھٹک گیا۔ ان کا رویہ تو یہ ہے کہ اگر تم پر قابو پا جائیں تو تمہارے ساتھ دشمنی کریں اور ہاتھ اور زبان سے

تمہیں آزار دیں ۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ ۔ قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں کسی کام آئیں گی نہ تمہاری اولاد ۔ اس روز اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور وہی تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے " ۔

سورت کا آغاز نہایت ہی محبوب آواز سے ہوتا ہے جہاں بھی اس آواز سے مسلمانوں کو خطاب کیا جاتا ہے اس کے اندر گہرے اشارات ہوتے ہیں ۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۶۰ : ۱) " اے لوگو جو ایمان لائے ہو " ۔ یہ آواز اس رب کی جانب سے ہے جس پر وہ ایمان لا چکے ہیں ۔ ان کو اہل ایمان کے نام سے پکارا جاتا ہے ' کہ تمہارے ایمان کے کچھ تقاضے ہیں ۔ تم نہایت ہی خطرناک موڑ پر کھڑے ہو ' تمہارے اردگرد دشمن سازشوں کے جال بن رہے ہیں ۔ اور تم پر بہت بڑی ذمہ داری ڈالی گئی ہے　 اپنائیت کے انداز میں ۔ اللہ اپنے دشمنوں کو ان کا دشمن اور ان کے دشمنوں کو اپنے دشمن سے تعبیر کرتا ہے ' تاکہ مسلمانوں کے اندر یہ شعور ہو کہ وہ اللہ کے سپاہی ہیں ۔ اسی کی طرف ہی ان کو جانا ہے ۔ اللہ کا دشمن ان کا دشمن ہے ۔

لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ (۶۰ : ۱) " میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ ' کہ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو " ۔ یہاں مومنین کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ وہ میرے ہیں اور میری طرف آنے والے ہیں ۔ اس لیے میں تمہارے دشمنوں کا دشمن ہوں ۔ لہٰذا وہ ایسے لوگ ہیں جو اللہ کی طرف منسوب ہیں ' جو اس زمین پر اللہ کے جھنڈے بلند کرنے والے ہیں ۔ وہ اللہ کے محبوب اور دوست ہیں ۔ لہٰذا ان کے شایان شان یہ بات نہیں ہے کہ وہ اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کریں ۔ یہاں ان کو یاد دلایا کہ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ دشمن تمہارے خلاف کیا کچھ کرتے رہے ہیں ۔ تمہارے دین اور تمہارے رسول کے بارے میں ان کا رویہ کیا رہا ہے ۔ یہ جنون کی حد تک تم پر مظالم کرتے رہے ۔

وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِیَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ (۶۰ : ۱) " حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں اور ان کی روش یہ ہے کہ رسول کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب ' اللہ پر ایمان لائے ہو " ۔ آخر ان جرائم کے بعد ان کے ساتھ دوستی اور محبت کی کیا بنیاد رہ گئی ہے ۔ انہوں نے سچائی سے کفر کیا ۔ رسول اللہ کو اپنے گھر اور شہر سے نکالا ۔ مومنین کو نکالا اور ان کا اس کے سوا کوئی جرم نہ تھا کہ وہ اللہ رب العالمین پر ایمان لائے تھے ۔ مسلمانوں کو وہ باتیں یاد دلائی جا رہی ہیں جن کا تعلق ان کے عقیدے سے ہے ۔ اس عقیدے ہی کی وجہ سے ان کے ساتھ مشرکین نے جنگ کی تھی اور اس عقیدے کے سوا اس مسلسل جنگ کی اور کوئی وجہ نہ تھی ۔ بتایا جاتا ہے کہ مسئلہ ہی ایمان کا تھا ۔ جس پر اس قدر جنگیں اور دشمنیاں ہوئیں ۔ یہ عقائد کی جنگ ہے ' نظریات کی جنگ ہے ۔ صرف یہ مسئلہ ہے کہ انہوں نے سچائی سے انکار کیا ' انہوں نے رسول کو اور ایمان کی وجہ سے مسلمانوں کو نکالا ۔

جب یہ مسئلہ واضح ہے اور ظاہر ہے تو ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ اب تو ان کے ساتھ مروت و محبت کا کوئی جواز ہی

نہیں ہے۔ بشرطیکہ تم صرف اس مقصد کے لیے آئے ہو' اگر کسی کا کوئی اور مقصد ہے تو وہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۶۰ : ۱) سے مخاطب نہیں ہے۔

اِنْ کُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِھَادًا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِیْ (۶۰ : ۱) "اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضاجوئی کی خاطر نکلے ہو"۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک شخص جہاد کے لیے آیا ہو اور اللہ کی رضا کی خاطر مہاجر ہوا ہو اور پھر اسے اس کے ایمان کی وجہ سے نکالا گیا ہو اور وہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جنہوں نے اسے نکالا ہو اور وہ اس کے اور اللہ کے دشمن ہوں۔

اس کے بعد ان کو اس بات سے ڈرایا جاتا ہے جو ان کے دلوں میں خفیہ طور پر بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ کہ وہ اللہ کے دشمنوں کی محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں' حالانکہ اللہ سے تو کوئی امر پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ تو خفیہ اور علانیہ سب چیزوں کو جانتا ہے۔

تُسِرُّوْنَ اِلَیْھِمْ بِالْمَوَدَّۃِ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَیْتُمْ وَ مَآ اَعْلَنْتُمْ (۶۰ : ۱) "تم چھپا کر ان کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو حالانکہ جو تم چھپا کر کرتے ہو' اور جو علانیہ کرتے ہو ہر چیز کو میں خوب جانتا ہوں"۔

اس کے بعد ان کو ذرا شدید انداز میں دھمکی دی جاتی ہے۔ اس قدر شدید کہ ایک مومن کا دل دہل جاتا ہے۔

وَ مَنْ یَّفْعَلْہُ مِنْکُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (۶۰ : ۱) "جو شخص بھی تم میں سے ایسا کرے گا وہ یقیناً راہ راست سے بھٹک گیا"۔ مومن نے سب قربانیاں تو ایمان کی خاطر دی ہیں۔ اگر ایمان ہی کو خطرہ لاحق ہو گیا تو اس کے سوا اس کے لیے کیا اور خطرہ ہو سکتا ہے؟

ان دونوں تنقیحات اور تنبیہات کے بعد دوبارہ اہل ایمان کو بتایا جاتا ہے کہ یہ کفار تمہارے بارے میں کیا کچھ سوچتے ہیں اور منصوبے بناتے ہیں۔

اِنْ یَّثْقَفُوْکُمْ یَکُوْنُوْا لَکُمْ اَعْدَآءً وَّ یَبْسُطُوْٓا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَھُمْ وَ اَلْسِنَتَھُمْ بِالسُّوْٓءِ (۶۰ : ۲) "ان کا رویہ تو یہ ہے کہ اگر تم پر قابو پا جائیں تو تمہارے ساتھ دشمنی کریں اور ہاتھ اور زبان سے تمہیں آزار دیں"۔ وہ جب بھی مسلمانوں کے خلاف کوئی موقعہ پاتے ہیں' اپنے کینے اور دشمنی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ جس قدر اذیت مومنین کو دے سکتے ہیں' دیتے ہیں۔ یہ ہاتھوں سے اذیت ہو' یا زبانوں سے اذیت ہو' ہر طریقے اور ہر سبیل سے وہ اس کام کے لیے تیار ہیں --- اور سب سے بڑی بات اور سب سے خوفناک بات یہ ہے:

وَ وَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ (۶۰ : ۲) "اور وہ تو چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ"۔ صحیح مومنین کے لیے یہ تمام اذیتوں سے بڑی اذیت ہے۔ ہر جسمانی' لسانی اور روحانی اذیت سے ان کے لیے یہ بڑی اذیت ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ ان کے ہاتھ سے نہایت ہی قیمتی خزانہ چلا جائے گا۔ ایمان کا خزانہ اور وہ مرتد ہو جائیں گے اور یہ ان کے

ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہوگی۔

اس خزانے کی قدر و قیمت اسی شخص کو معلوم ہے 'جو کفر کے بعد مومن ہوا ہے' جس نے گمراہی کے بعد نور ہدایت دیکھا ہو۔ اور اب وہ اپنے تصورات 'اپنے افکار' اپنے شعور کے ساتھ ایمانی زندگی بسر کر رہا ہو' نہایت اطمینان کے ساتھ۔ ایسا شخص کسی صورت میں بھی اپنی سابقہ حالت کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔ ایسا شخص کفر کو اس طرح ناپسند کرتا ہے جس طرح وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے۔ پس مومنین کا دشمن وہ ہے جو انہیں دوبارہ کفر کی جہنم میں ڈال دینا چاہتا ہے جبکہ اللہ نے ان کو توفیق دے دی ہے کہ وہ جنت ایمانی میں زندگی بسر کریں۔ یہ ایمانی زندگی کو بھرپور اور بامعنی بنا دیتا ہے جبکہ کفر کی زندگی خالی اور بے معنی ہوتی ہے۔ یوں قرآن کریم تدریج کے ساتھ بتاتا ہے کہ مسلمانوں اور اللہ کے دشمن اہل ایمان کو دوبارہ کافر بنانا چاہتے ہیں' یہ ان کی اصولی اسکیم ہے' اور اسی لیے تو تم مکہ سے بھاگ نکلے ہو۔ یاد رکھو۔

وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ (٦٠ : ٢) "اور وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح دوبارہ کافر ہو جاؤ"۔

---ooo---

یہ تھا پہلا دور' جس کے اندر متعدد حقائق ہدایات اور بیداری کے لیے تیز چٹکیاں تھیں۔ اس کے بعد ایک دور جس کے اندر ایک ہی تیز احساس دے دیا گیا ہے کہ یہ قرابت داریاں' جو انسان کو خفیہ دوستی پر مجبور کرتی ہیں' اور دو ٹوک نظریاتی موقف کو بھلا دیتی ہیں یہ بالکل مفید نہیں ہیں۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (٦٠ : ٣) "قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں کسی کام آئیں گی نہ تمہاری اولاد۔ اس روز اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور وہی تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے"۔

مومن نیکی کرتا ہے اور آخرت کا اجر چاہتا ہے۔ وہ دنیا میں بوتا ہے اور آخرت میں کاٹے گا۔ اور اس پر یہ بات اثرانداز ہوتی ہے کہ جب آخرت میں ایمان اور عقیدے کا تعلق نہ ہو گا تو رشتہ داری کا تعلق بھی کٹ جائے گا' تو اس طرح اس دنیا کی مختصر زندگی میں اس کے دل سے اس رشتہ داری اور قرابت داری کے تعلقات کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ اور وہ ایسے تعلق کو اہمیت دینے لگتا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں مفید ہوتا ہے اور قائم رہتا ہے' اور وہ نظریاتی اور ایمانی تعلق ہوتا ہے۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ (٦٠ : ٣) "قیامت کے دن تمہاری رشتہ داریاں اور اولاد تمہارے کسی کام نہ آئے گی"۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی طرف تم لپکتے ہو اور تمہارے دل ان سے متعلق ہیں اور یہ تعلقات تمہیں مجبور کرتے ہیں کہ تم اپنے دشمنوں کے ساتھ دوستی کرو' تاکہ تم ان تعلقات کو بچا سکو۔ جب کہ حضرت حاطب نے اپنی اولاد اور مال کی خاطر یہ کیا۔ جس طرح دوسروں کے دل اپنی اولاد اور مال کے لیے جوش مارتے ہیں' تو

یہ چیزیں بھی تمہیں کوئی نفع نہ دیں گی ۔ قیامت کے دن تو یَفْصِلُ بَیْنَکُمْ ''اس روز اللہ تمہارے درمیان جدائی کر دے گا'' ۔ کیونکہ رشتہ داری اور قرابت داری کی رسی اس دن ٹوٹ جائے گی' اس دن صرف اللہ کی رسی کام کرے گی ۔

وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۶۰:۳) ''اور وہی تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے'' ۔ وہ ظاہر' باطن اور نیت تک سے واقف ہے ۔

اب تیسرا پیراگراف آتا ہے ۔ اس میں امت مسلمہ کو اس امت کے سرچشمے' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف لے جایا جاتا ہے ۔ کیونکہ حضرت ابراہیم سے ادھر ایک ہی قافلہ ہے' اور ایک ہی امت ہے' تاریخ کی طویل وادیوں میں یہ قافلہ چلا آ رہا ہے ۔ اس قافلے کا سامان' سامان ایمان ہے ۔ یہ قافلہ ہر قسم کے تعلقات سے برات کرتا ہے' ماسوائے تعلقات عقیدہ کے ۔ یہی امت ہے جو حضرت ابراہیم سے چلی ۔ یہ ابو الانبیاء تھے اور دین حنیف کے داعی ۔ وہ قابل تقلید ہیں' نہ صرف عقیدے میں' بلکہ سیرت اور انداز تبلیغ میں بھی ۔ ان کو بھی یہی قرابت داری اور رشتہ داری کا مسئلہ درپیش تھا ۔ چنانچہ حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھی مومنین ان رشتہ داریوں اور علاقوں کو چھوڑ کر چلے گئے اور انہوں نے صرف اپنا عقیدہ اپنا لیا ۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ
اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَ
بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ
لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ
تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ
۱ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ
ع ۶ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

''تم لوگوں کے لیے ابراہیم ؑ اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا'' ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو' قطعی بیزار ہیں ۔ ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا ۔ جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ'' ۔ مگر ابراہیم ؑ کا اپنے باپ سے یہ کہنا (اس سے مستثنیٰ ہے) کہ ''میں آپ کے لیے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا'

اور اللہ سے آپ کے لیے کچھ حاصل کر لینا میرے بس میں نہیں ہے" (اور ابراہیم ﷺ و اصحاب ابراہیم ﷺ کی دعا یہ تھی کہ) "اے ہمارے رب' تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کر لیا اور تیرے ہی حضور ہمیں پلٹنا ہے۔ اے ہمارے رب ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا دے۔ اور اے ہمارے رب' ہمارے قصوروں سے درگزر فرما' بے شک تو ہی زبردست اور دانا ہے"۔

انہی لوگوں کے طرز عمل میں تمہارے لیے اور ہر اس شخص کے لیے اچھا نمونہ ہے جو اللہ اور روز آخر کا امیدوار ہو۔ اس سے کوئی منحرف ہو تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے"۔

ایک مسلم جب تاریخ پر نظر ڈالتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی ایک طویل تاریخی نسب نامہ اور شجرۂ ایمان ہے۔ یہ ماضی کی تاریخ میں بہت دور تک پھیلا ہوا ہے' دور حضرت ابراہیم علیہ السلام تک۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنے عقائد و نظریات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیروکار ہے بلکہ اہل ایمان اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دعوتی تجربات بھی ایک ہی جیسے ہیں اس لیے ایک مومن یہ شعور رکھتا ہے کہ اس کے پاس تجربات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ نہ صرف وہ تجربات جن سے وہ گزر رہا ہے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تجربات بھی اس میں شامل ہیں۔ قافلہ ایمان جو اب مکہ میں ہے' یہ تو ماضی کی تاریخ زمان و مکان میں بہت دور تک چلا ہے۔ کئی وادیاں اس نے طے کی ہیں۔ یہ صرف اسی جھنڈے تلے چلتا رہا ہے اور ایسے ہی حالات سے گزرا ہے جن سے وہ گزر رہے ہیں' یہ کوئی نیا معاملہ نہیں ہے کہ گویا صرف تم ان مشقتوں سے دوچار ہو گئے ہو۔ آج اگر مومنین کا تعلق اپنے دشمنوں سے کٹ گیا تو کیا بات ہے۔ وہ ایک ایسے نظریہ کی ایک شاخ ہے جس کی نہایت ہی سایہ دار شاخیں تاریخ کی فضا میں' دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ وہ درخت ہے جس کا پودا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لگایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس تجربے سے گزرے تھے' جس سے مدینہ میں مسلمان گزر رہے تھے اور حضرت ابراہیم میں اہل ایمان کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔

اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (۶۰ : ۴) "تم لوگوں کے لیے ابراہیم ؑ اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا "ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو' قطعی بیزار ہیں۔ ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا۔ جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ""۔ اس میں انہوں نے اپنی قوم' ان کے معبودوں' اور ان کی عبادت سے بیزاری کا اظہار کر دیا۔ دوسرے الفاظ میں ان کا کفر کیا اور اللہ پر ایمان لائے اور یہ عداوت اور بغض اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک وہ قوم اللہ وحدہ پر ایمان نہ لائے۔ یہ دوٹوک' فیصلہ کن اور پختہ قطع تعلق تھا' جس کے بعد فریقین کے درمیان سے ہر قسم کے روابط کٹ گئے' ماسوائے تعلق ایمان کے۔ یہی فیصلہ اہل ایمان کا فیصلہ ہے اور یہی قرارداد ان اہل ایمان کی ہے جو مدینہ میں ہیں۔ اور ایسا ہی ہونا چاہئے جس طرح امت ابراہیمی نے فیصلہ کیا۔

بعض مومنین یہ دیکھتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام نے باوجود قطع تعلق کے اپنے والد کے لیے استغفار کیا حالانکہ وہ مشرک تھے ۔اس میں بعض مسلمانوں کے لیے دبے ہوئے جذبات ابھرانے کی راہ تھی ۔ جو وہ اپنے مشرک بھائیوں کے لیے رکھتے تھے ۔ چنانچہ قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس استغفار کی توضیح کر دی ۔کیونکہ انہوں نے باپ سے کہا تھا ۔

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ (٦٠ : ٤) "میں تمہارے لیے ضرور استغفار کروں گا" ۔ یہ بات انہوں نے اس وقت کہہ دی 'جب ان کے والد نے شرک پر اصرار نہ کیا تھا ۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت اپنے والد کے ایمان کے بارے میں توقع رکھتے تھے ۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ اَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ "جب یہ بات کھل گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے بیزاری کا اعلان کر دیا" ۔ جیساکہ دوسری سورت میں آیا ہے ۔

یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سارا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تھا اور توکل اور یکسوئی کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے ۔

وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ

الْمَصِيْرُ (٦٠ : ٤) "اور اللہ سے آپ کے لیے کچھ حاصل کر لینا میرے بس میں نہیں ہے" (اور ابراہیم ؑ و اصحاب ابراہیم ؑ کی دعا یہ تھی کہ) "اے ہمارے رب 'تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کر لیا اور تیرے ہی حضور ہمیں پلٹنا ہے" ۔ یوں اللہ کے سامنے مطلق سپردگی کا اعلان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت کا خاصہ ہے ۔ اور اس کی طرف یہاں اہل ایمان کے دلوں کو متوجہ کیا جاتا ہے کیونکہ قرآن کا یہ انداز ہے کہ وہ کسی بھی قصے کی ایک ہی کڑی کو لے کر اس کا تجزیہ کرتا ہے اور اہل ایمان کو اس طرف متوجہ کرتا ہے ۔ اور اس کڑی کے اندر مسلمانوں کے لیے جو سبق 'نصیحت 'حکمت اور دانائی کی قابل تقلید مثال ہوتی ہے 'اسے واضح کر دیتا ہے ۔

اس قصے کے دوران حضرت ابراہیم کی دعا کا یہ حصہ بھی اہم ہے ۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا (٦٠ : ٥) "اے ہمارے رب ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا دے" ۔ ان کافروں کو ہم پر مسلط نہ کر 'کہ یہ تسلط ان کافروں کے لیے فتنہ ہو جائے 'وہ یہ کہیں کہ اگر مسلمان حق پر ہوتے اور ان کا ایمان ان کو بچا سکتا 'تو ہم ان پر کس طرح غالب ہو جاتے ۔ اور یہی شبہات ہر دور میں اہل ایمان کے دلوں میں بھی پیدا ہوتے ہیں 'جب اہل باطل اور اہل کفر اہل ایمان پر غالب ہو جاتے ہیں ۔ اور باغی اور سرکش اہل ایمان پر غالب ہوتے ہیں اور اس میں بھی اللہ کی حکمت ہوتی ہے ۔ اور یہ غلبہ ایک وقت کے لیے ہوتا ہے ۔ مومن ان ابتلاؤں پر صبر کرتا ہے ۔ لیکن ایسے حالات میں بھی اہل ایمان کو دعا کرنا چاہئے کہ وہ ان کو ایسی آزمائشوں میں نہ ڈالے ۔

وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا (٦٠ : ٥) "اور اے ہمارے رب ہمارے قصوروں سے درگزر فرما" ۔ یہ دعا حضرت

ابراہیم خلیل اللہ کر رہے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ کی بندگی کا جو اعلیٰ مقام ہے۔ اس تک پہنچنا مشکل ہے اور اللہ کی نعمتوں اور احسانات کے برابر اللہ کی بندگی کوئی بشر نہیں کر سکتا جو اللہ کی پاکی اور جلالت شان کے برابر ہو۔ اس لیے آپ یہ دعا کرتے ہیں کہ آپ کے بعد آنے والوں کے لیے یہ نمونہ ہو۔

آپ کی دعا، آپ کا رجوع الی اللہ، آپ کے استغفار، آپ کی تعریف رب کا خاتمہ یوں ہے:

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۶۰: ۵) "بے شک تو ہی زبردست اور دانا ہے"۔ تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور تیرے سب کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کے اس طرز عمل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں تمہارے لیے ایک بہترین نمونہ ہے جنہوں نے مشکل ترین حالات میں رجوع الی اللہ کیا اور اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۶۰: ۶) "انہی لوگوں کے طرز عمل میں تمہارے لیے اور ہر اس شخص کے لیے اچھا نمونہ ہے جو اللہ اور روز آخر کا امیدوار ہو۔ اس سے کوئی منحرف ہو تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے"۔

لہٰذا ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھی صرف اس شخص کے لیے نمونہ ہیں جو اللہ سے امیدوار ہو اور آخرت کی جوابدہی کے لئے فکرمند ہو۔ صرف ایسے ہی لوگوں کے دلوں میں حضرت ابراہیم کے تجربات کی قدر ہو سکتی ہے۔ اور وہ ان کے لیے نمونہ اور اسوہ ہو سکتے ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر کوئی رہنمائی پا سکتا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کے مقاصد اللہ اور آخرت ہوں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نمونے کو دیکھیں۔ یہ اشارہ ہے اہل ایمان کو۔

لیکن جو اسلامی نظام کی پرواہ نہیں کرتے اور جو قافلہ ابراہیمی کے راستے سے ادھر ادھر جانا چاہتے ہیں۔ جو شخص اس شجرۂ نسب سے دور جانا چاہتا ہے، تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۶۰: ۶) "اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے"۔ اس سفر سے اب ہم واپس ہو رہے ہیں، اہل ایمان نے اپنی تاریخ کا مطالعہ کر لیا۔ اب وہ زمین پر اپنی یادیں لے کر واپس ہو گئے۔ امم سابقہ میں ان کے لیے جو سبق آموز تجربات تھے وہ انہوں نے جمع کر لیے اور امم سابقہ میں سے جو لوگ ایسے ہی حالات سے گزرے تھے انہوں نے کیا فیصلے کیے تھے اور انہوں نے پا لیا کہ جس راہ پر وہ چل رہے تھے یہ تو ایسی راہ ہے جس پر پہلے بھی لوگ چلتے رہے ہیں۔ وہ پہلے لوگ نہیں ہیں جنہوں نے یہ کام کیا۔

قرآن کریم اس تصور کو قافلہ اہل اسلام کے دلوں میں خوب بٹھا رہا ہے تاکہ یہ قافلہ چلتا رہے۔ اور وہ یہ محسوس نہ کرے کہ وہ اکیلا ہے یا انوکھا ہے۔ اگرچہ موجودہ نسل میں وہ اکیلا ہے۔ یوں اسے سہارا ملتا ہے اور اس راہ پر چلنے میں مشقت کم ہو جاتی ہے۔ یوں کہ راہ اگرچہ دشوار گزار ہے۔ لیکن کئی لوگ پہلے بھی چلتے رہے ہیں اور انہی گھاٹیوں سے ہو کر گزرے ہیں۔

---ooo---

مکہ و مدینہ کے درمیان جو جنگی صورت حالات جاری تھی اور جس کے اندر بھائی بھائی سے کٹ گیا تھا اور لوگ اس صورت حال کو بہت ہی بھاری سمجھتے تھے ۔ اب ان کو امید کی ایک کرن دکھائی جاتی ہے کہ یہ صورت حالات اہل مکہ کی ضد کی وجہ سے ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ بالآخر یہ لوگ بھی اسی قافلہ میں شریک ہو جائیں گے ۔ اسی جھنڈے کو اٹھالیں ۔ یوں ممکن ہو گا کہ بھائی بھائی کا باہم تعلق بھی بحال ہو جائے گا اور اب مزید تخفیف کی جاتی ہے اور ایک بین الاقوامی قانون کا مستقل قاعدہ بیان کر دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان مقاطعت اور عداوت اور دشمنی ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اسلام کے دشمن ہیں ۔ اور اگر کوئی اسلام کی دشمنی ترک کر دے تو پھر ہر مسلمان کو اجازت ہے کہ جس کے ساتھ نیکی کرنا چاہے اور وہ مستحق ہے اس کے ساتھ نیکی کرے ۔ اور باہم منصفانہ اور عادلانہ روابط قائم کیے جائیں ۔

عَسَى اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُمْ مِنْهُمْ مَوَدَّةً ۚ وَاللَّهُ قَدِيرٌ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٧﴾ لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿٨﴾ إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٩﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ ۖ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ ۖ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۖ وَآتُوهُمْ مَا أَنْفَقُوا ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْأَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوا مَا أَنْفَقُوا ۚ ذَٰلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٠﴾ وَإِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَآتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَزْوَاجُهُمْ مِثْلَ مَا أَنْفَقُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿١١﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ

عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ
وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ
مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَىِٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا ۲
النصف يَىِٕسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾ ع ۷

۸ "بعید نہیں کہ اللہ کبھی تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان محبت ڈال دے جن سے آج تم نے دشمنی مول لی ہے۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور وہ غفور و رحیم ہے۔ اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے۔ اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے۔ اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں"۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو (ان کے مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو' اور ان کے ایمان کی حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو۔ نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لیے حلال۔ ان کے کافر شوہروں نے جو مہر ان کو دیئے تھے وہ انہیں پھیر دو۔ اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تم ان کے مہر ان کو ادا کر دو۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو۔ جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیئے تھے وہ تم واپس مانگ لو۔ اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیئے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں۔ یہ اللہ کا حکم ہے' وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اور اگر تمہاری کافر بیویوں کے مہروں میں سے کچھ تمہیں کفار سے واپس نہ ملے اور پھر تمہاری نوبت آئے تو جن لوگوں کی بیویاں ادھر رہ گئی ہیں ان کو اتنی رقم ادا کر دو جو ان کے دیئے ہوئے مہروں کے برابر ہو۔ اور اس خدا سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔ اے نبیؐ' جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی' چوری نہ کریں گی' زنا نہ کریں گی' اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی' اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی' اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی' تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو' یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ' جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے' جو آخرت سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کافر مایوس ہیں"۔

اسلام سلامتی کا دین ہے' محبت کا عقیدہ ہے۔ وہ ایک ایسا نظام ہے جو پوری دنیا کو اپنے سایہ عاطفت میں لینا چاہتا

ہے ۔ اور پوری دنیا میں اپنا منہاج قائم کرنا چاہتا ہے ۔ وہ لوگوں کو اللہ کے جھنڈوں کے نیچے جمع کرتا ہے اور ان کو باہم متعارف بھائی بناتا ہے ۔ اس سلسلے میں اگر کوئی رکاوٹ ہے تو وہ یہ ہے کہ اسلام کے دشمن اپنی معاندانہ کارروائیاں کرتے ہیں ۔ وہ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں ۔ اگر مخالفین اسلام ' اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ دشمنی ترک کر دیں تو اسلام کو کسی کے ساتھ دشمنی میں دلچسپی نہیں ہے ۔ اسلام از خود کوئی دشمنی پیدا نہیں کرتا ۔ وہ دشمنی اور جنگی حالت میں بھی انسانی نفوس کے اندر انس و محبت کے اسباب قطع نہیں کرتا ۔ وہ منصفانہ معاملہ کرتا ہے اور ہروقت اس امید میں رہتا ہے کہ تمام لوگ اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں ۔ اسلام کبھی بھی کسی کو ہدایت اور راہ راست پر آ جانے سے مایوس نہیں کرتا ۔

اس قطعے کی پہلی آیت میں اس امید کا ذکر ہے ' جو کبھی بھی ناامیدی سے مغلوب نہیں ہوتی ۔ یہ آیت ان لوگوں کے دلوں کے لیے مرہم ہے جن پر اسلام اور کفر کی اس جنگ کو مسلط کیا گیا تھا اور مجبوراً ان کو اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ بائیکاٹ کرنا پڑ رہا تھا ۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً (۶۰ : ۷) "بعید نہیں کہ اللہ کبھی تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان محبت ڈال دے جن سے آج تم نے دشمنی مول لی ہے "۔ اللہ کی طرف سے امید کا اظہار گویا قطعی اشارہ ہے کہ جلد ہی یہ دشمنی ختم ہو جائے گی ۔ جن مومنین نے اسے سنا ہو گا ان کو یقین ہو گیا ہو گا ۔ اس کے بعد جلد ہی مکہ فتح ہو گیا تھا اور سب اہل مکہ مسلمان ہو گئے تھے اور سب ایک جھنڈے کے نیچے آ گئے تھے ۔ اور ان تمام دشمنیوں اور عنادوں کے دفاتر لپیٹ لیے گئے تھے اور اہل مکہ اور اہل مدینہ بھائی بھائی بن گئے تھے ۔

وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ (۶۰ : ۷) "اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے "۔ جو چاہتا ہے ' کرتا ہے ۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۶۰ : ۷) "اور اللہ غفور و رحیم ہے "۔ جو سابقہ زمانے میں اور حالت کفر میں کسی سے شرک ہو گیا ' اس کو بخشنے والا ہے ۔ سابقہ زمانے کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے ۔

جب تک اللہ کا وعدہ پورا نہیں ہو جاتا ' جس کے بارے میں اوپر کی آیت میں امید دلائی گئی تھی ' اللہ نے ان لوگوں کے ساتھ تعلقات مودت قائم کرنے کی اجازت دے دی ' جو دین کے معاملے میں مسلمانوں سے برسرجنگ نہیں تھے ' جنہوں نے مسلمانوں کو اپنے گھروں سے نہیں نکالا تھا ایسے لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے پر جو پابندی سمجھی جاتی تھی اسے رفع کر دیا گیا کہ ایسے کفار کے ساتھ بھی عدل کرو اور ان کا کوئی حق اگر تمہارے دائرہ اختیار میں ہے تو اسے ادا کرو ' لیکن جو لوگ دین کے معاملے میں تم سے لڑ رہے ہیں ' انہوں نے تمہیں گھروں سے نکالا ہے ' یا تمہارے نکالنے میں معاونت کی ہے ' تو ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی موالات نہیں ہے ' اور جو لوگ ایسے لوگوں سے موالات کرتے ہیں وہ ظالم ہیں ۔ ظلم کے معانی میں سے ایک معنی شرک بھی ہے ۔ آیت ۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ پیش نظر ہونی چاہئے ۔ مومنین کے لیے یہ شدید تہدید ہے ۔ اس لیے انہیں اس

قسم کے تعلقات قائم کرتے ہوئے بہت محتاط رہنا چاہیے کہ کہیں سب کچھ نہ گنوا دیں۔

یہ اصول جو غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں وضع کیا گیا ہے' یہ اس دین کے مزاج کے مطابق ہے اور نہایت ہی منصفانہ بین الاقوامی قانون ہے۔ یہ خالص انسانی نقطہ نظر سے ہے بلکہ اس کو اس پوری کائنات کے نظام کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔ کیونکہ یہ پوری کائنات ایک ہی الٰہ واحد کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ پوری کائنات رب واحد کی طرف متوجہ ہے اور پوری کائنات اللہ کے منصوبے اور نظام اور نقشے کے مطابق چل رہی ہے۔ اگرچہ اس میں لوگوں کے درمیان اختلافات ہیں اور وہ باہم منقسم ہیں۔

یہ اصول اسلام کے بین الاقوامی قانون کا اساسی اصول ہے جس کے مطابق لوگوں کے درمیان امن و سلامتی کی حالت اصلی اور مستقل حالت ہے' اور اس حالت کے اندر تغیر جارحیت اور دفاع جارحیت کی وجہ سے آجاتا ہے۔ یا اس وجہ سے آتا ہے کہ دو اقوام کے درمیان معاہدہ ہو' اور ان میں سے ایک معاہدے کو توڑ دے یا خیانت کے امکانات پیدا ہو جائیں یا کوئی قوت آزادی اعتقاد یا آزادی اظہار رائے اور دعوت اسلامی کی راہ میں مزاحم ہو جائے۔ اور یہ بھی دراصل ایک جارحیت ہے۔ ان حالات کے علاوہ اسلام امن و سلامتی' محبت' نیکی اور عدل کے احکام دیتا ہے۔

یہ قاعدہ اسلامی نظریہ حیات کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ اسلام انسان اور انسان کے درمیان فرق و امتیاز صرف عقیدے کی بنیاد پر کرتا ہے۔ ایک مومن اگر کسی دوسری قوم کے ساتھ جنگ کرتا ہے تو محض اپنے عقیدے کی وجہ سے کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جنگ کی کوئی اور وجہ نہیں ہے۔ اسلام صرف دعوت کی آزادی اور رائے کی آزادی کے لیے لڑتا ہے۔ اس کے علاوہ فقط وہ اسلامی نظام کے قیام اور اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے لڑتا ہے۔

یہ توجیہہ اور تفسیر اس پوری سورت کے رخ کے ساتھ بھی موافق ہے جس کے اندر عقائد و نظریات کی اہمیت سے بحث ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان صرف نظریاتی جھنڈے کے نیچے لڑ سکتے ہیں۔ اس لیے جو شخص اس محاذ میں ان کے ساتھ کھڑا ہوا تو وہ ان میں سے ہے۔ اور جس نے اس نکتے پر ان سے جنگ کی تو وہ ان کا دشمن ہے۔ جس شخص نے ان کے ساتھ امن کی حالت کو برقرار رکھا اور ان کو ان کے عقائد پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے عقائد کی طرف لوگوں کو بلائیں اور ان کی راہ روکنے کی کوشش نہ کی اور لوگوں کو زبردستی اسلامی عقائد قبول کرنے سے روکا تو وہ مسالم ہے اور اسلام ان کے ساتھ نیکی اور سماجی تعلق قائم کرنے سے نہیں روکتا۔

اصل بات یہ ہے کہ ایک مسلم اس کرۂ ارض پر اپنے عقیدے کی خاطر زندہ ہوتا ہے۔ اس کا مسئلہ اس کا نظریہ اور اس کے ماحول کے ساتھ اس کا مسئلہ بھی یہی نظریہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے مصلحت اور مفادات پر کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ وہ کسی عصبیت کے لیے جہاد نہیں کرتا مثلاً رنگ' نسل' زبان اور علاقے کی عصبیت۔ اسلام میں جنگ اگر ہے تو صرف نظریات کے لیے ہے۔ اس لیے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو' اور اسلامی نظام کے لیے جنگ ہے۔

اس کے بعد سورہ توبہ نازل ہوئی۔ جس میں ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۹ : ۱) "اللہ اور رسول کی طرف سے مشرکین سے بیزاری کا اعلان ہوتا ہے"۔ اس کے ذریعہ جزیرۃ العرب میں مشرکین کے ساتھ معاہدات ختم کر

دیئے گئے ۔جن لوگوں کے معاہدے میں میعاد مقرر نہ تھی ان کو چار ماہ کی مہلت دے دی گئی اور جن کے ساتھ میعاد مقرر تھی ان کے ساتھ معاہدے کی مدت طے کی گئی ۔ لیکن امن کے وہ معاہدات جو جزیرۃ العرب کے مشرکین کے ساتھ تھے اور جنہیں منسوخ کیا گیا وہ اس لیے کہ مشرکین عرب بار بار معاہدے توڑ رہے تھے ۔جب انہیں فائدہ ہوتا تو معاہدے پر عمل کرتے 'اور جب نقصان ہوتا تو توڑ دیتے ۔اس لیے ایسے لوگوں کے لیے اسلام نے ایک دوسرا بین الاقوامی قاعدہ بنایا۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ

"اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت کا خطرہ ہو تو علانیہ ان کا معاہدہ ان کے سامنے پھینک دو' بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتا" ۔اور یہ ضرورت اس وقت اس لیے بھی پیش آئی تھی تاکہ اسلام کے پایہ تخت اور مرکز کو محفوظ کر دیا جائے ۔اس وقت مرکز اسلام جزیرۃ العرب تھا۔ اور اس کو ان لوگوں سے پاک کرنا ضروری تھا' جو مسلمانوں کے بارے میں ہروقت انتظار میں رہتے تھے 'کہ کوئی موقعہ ملے اور وہ حملہ آور ہوں ۔مشرکین اور اہل کتاب معاہدین بار بار عہد توڑ رہے تھے ۔اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ چونکہ دشمنی کی حالت ہوا کرتی ہے' اس لیے ایسے حالات میں اگر فریقین حالت جنگ پر ہوں تو دونوں کے لیے مفید ہے ۔ خصوصا ایسے حالات میں جبکہ قیصر اور کسریٰ کی عظیم مملکتوں نے اسلامی مملکت کے خلاف افواج جمع کرنا شروع کر دی تھیں ۔اور دونوں نے اسلام کو اپنے لیے خطرہ سمجھ لیا تھا ۔دونوں نے جزیرۃ العرب کے ساتھ ساتھ عربی ریاستوں کا رخ جزیرۃ العرب کی طرف پھیر دیا تھا ۔ لہٰذا اسلامی بلاک کی اندرونی تطہیر ضروری ہو گئی تھی تاکہ متوقع بیرونی جارحیت کا موثر مقابلہ کیا جا سکے ۔

---ooo---

یہ نوٹ یہاں کافی ہے ۔اب سیاق سورت کی طرف آتے ہیں ۔اب مومنات مہاجرات کی بات ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۶۰:۱۰) وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (۶۰:۱۱) (۶۰: ۱۰ — ۱۱) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو (ان کے مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو' اور ان کے ایمان کی

حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے ۔ پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو ۔ نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لیے حلال ۔ ان کے کافر شوہروں نے جو مہر ان کو دیئے تھے وہ انہیں پھیر دو ۔ اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تم ان کے مہر ان کو ادا کر دو ۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو ۔ جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیئے تھے وہ تم واپس مانگ لو ۔ اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیئے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں ۔ یہ اللہ کا حکم ہے' وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے ۔ اور اگر تمہاری کافر بیویوں کے مہروں میں سے کچھ تمہیں کفار سے واپس نہ ملے اور پھر تمہاری نوبت آئے تو جن لوگوں کی بیویاں ادھر رہ گئی ہیں ان کو اتنی رقم ادا کر دو جو ان کے دیئے ہوئے مہروں کے برابر ہو ۔ اور اس خدا سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو" ۔

ان آیات کے شان نزول کے بارے میں آیا ہے کہ صلح حدیبیہ کی عبارت یوں تھی : "یہ کہ نہیں آئے گا ہم سے کوئی شخص تمہاری طرف جو تمہارے دین پہ ہو' تو تم اسے ہماری طرف لوٹاؤ گے" ۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان ابھی حدیبیہ کے نشیبی علاقے میں تھے کہ کچھ مومن عورتیں آئیں' یہ ہجرت کا مطالبہ کر رہی تھیں اور دارالاسلام آنا چاہتی تھیں ۔ قریش آگئے' کہ ان کو مطابق معاہدہ واپس کریں ۔ معاہدہ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاہدے میں عورتوں کے بارے میں کچھ بھی نہ تھا ۔ یہ تو آیات نازل ہوئیں' جنہوں نے مہاجر عورتوں کو لوٹانے سے منع کر دیا ۔ کیونکہ عورتیں کمزور تھیں اور ان کو ان کے دین کے بارے میں فتنے میں مبتلا کیا جا سکتا تھا ۔

ان کی ہجرت کے ساتھ ہی اس سلسلے کے بین الاقوامی احکام بھی نافذ ہو گئے ۔ یہ قانون سازی بھی نہایت ہی منصفانہ انداز پر کی گئی اور اس میں فریق مخالف کی زیادتیوں کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ۔ کیونکہ اسلام داخلی اور خارجی معاملات میں کوئی قانون انتقامی جذبات پر نہیں بناتا ۔

اس سلسلے میں اسلام نے پہلے اقدام یہ کیا کہ ان عورتوں کے حالات کو دیکھا جائے کہ آیا وہ کس مقصد کے لیے ہجرت کر رہی ہیں؟ یہ نہ ہو کہ وہ اپنے سابق خاوندوں سے جان چھڑانا چاہتی ہوں' یا کسی منفعت کی طلب گار ہوں' یا یہ نہ ہو کہ وہ دارالاسلام میں کسی محبوب کے پیچھے تو نہیں جا رہی ہیں ۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ان سے حلف لیا جاتا تھا کہ وہ خاوند کی دشمنی میں تو نہیں نکل آئیں ۔ یہ بھی حلف لیا جاتا تھا کہ مکہ سے تنگ آکر مدینہ کی زمین کی طرف تو نکل آنا نہیں چاہتیں ۔ یہ حلف لیا جاتا تھا کہ دنیا کے کسی اور مفاد کے لیے تو نہیں آگئیں ۔ اور یہ حلف لیا جاتا تھا کہ وہ اللہ اور رسول کی محبت کے سوا کسی اور جذبہ کے تحت تو نہیں آگئیں؟ حضرت عکرمہ کہتے ہیں کہ حلف میں یہ بھی تھا کہ تم صرف اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں آ رہی ہو' مسلمانوں میں سے کسی شخص کے ساتھ تمہیں محبت تو نہیں ہے' یا تم اپنے خاوند سے بھاگنا تو نہیں چاہتی ہو؟

یہ ہوتا تھا ان کا امتحان ۔ ان کے ظاہری حالات پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے حلفیہ بیان پر اکتفا کیا جاتا تھا ۔ رہا یہ معاملہ کہ ان کے دلوں میں کیا ہے تو اس سے صرف اللہ خبردار ہے ۔ انسان کے لیے کوئی راہ نہیں ہے کہ وہ دلوں کے راز جان سکے ۔

اَللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاِیۡمَانِہِنَّ (۶۰ : ۱۰) "ان کی حقیقت ایمان تو اللہ ہی جانتا ہے" ۔ پھر اگر وہ اس مضمون کا

اقرار بذریعہ بیان حلفی کر دیں تو پھر۔

فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ (٦٠: ١٠) "تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو' نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں نہ کفار ان کے لیے حلال ہیں"۔

اصل میں اعلیٰ تعلق آ گیا ہے۔ ایمانی تعلق اور اس نے تمام دوسرے تعلقات کاٹ دیئے ہیں۔ اس لیے اب کوئی ایسا تعلق باقی نہیں رہا ہے کہ اس جدائی کو جوڑ سکے۔ میاں بیوی کا تعلق تو ایسا تعلق ہے کہ اس میں دو افراد ایک دوسرے کے ساتھ مکمل مل جاتے ہیں' جڑ جاتے ہیں اور ایک مستقل اور دائمی تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ جب زوجین کے درمیان ایمانی اتحاد نہ ہو تو زوجیت کے حقوق پورے کرنا ممکن نہیں ہے۔ ایمان دل کی اعلیٰ زندگی کا نام ہے اور اس کی جگہ کوئی جذبہ قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ اگر ایمان کا تعلق نہ ہو تو میاں بیوی کے درمیان اتحاد اور ہم آہنگی ممکن نہیں ہے۔ نہ فریقین کے درمیان انس پیدا ہو سکتا ہے نہ یگانگت۔ جبکہ میاں بیوی کے درمیان محبت' باہم شفقت اور انس و سکون ضروری ہے۔

ابتدائی زمانہ ہجرت میں یہ حکم نہ آیا تھا۔ مومنہ عورت اور کافر مرد کے درمیان تفریق نہ کی جاتی تھی۔ نہ مومن مرد اور کافرہ عورت کے درمیان تفریق کی جاتی تھی۔ اس لیے کہ اس دور میں اسلامی نظام معاشرت اور اسلامی سوسائٹی ابھی مستحکم نہ تھی۔ لیکن صلح حدیبیہ یا فتح حدیبیہ کے بعد' زیادہ تر روایات کے مطابق یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ اب مومن اور کافر کے درمیان ازدواجی تعلق قائم نہ رہے۔ ازدواجی تعلق صرف مومن اور مومنات کے درمیان ہو۔ جیسا کہ عملی صورت یہ ہو گئی تھی کہ صرف ایمان کا رابطہ رہ گیا تھا اور مدینہ طیبہ میں صرف ایمانی تعلق تھا۔ اللہ اور رسول کا تعلق رہ گیا تھا' باقی تمام قسم کے تعلقات کاٹ دیئے گئے تھے۔ بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیئے گئے تھے۔

لیکن اس تفریق کے بعد پھر نقصان رسیدہ فریق کے لیے منصفانہ قانون سازی کی گئی۔ اگر کسی کافر خاوند کی بیوی کی جدائی کا حکم صادر ہوتا ہے تو اس نے بیوی کو جو مہر دیا تھا' یا دوسرے اخراجات اٹھائے تھے وہ واپس کرنے ہوتے تھے۔ اسی طرح اگر کسی کافر عورت کو مسلم مرد سے جدا کیا تو مسلم مرد نے جو مہر دیا اور نفقہ دیا وہ اسے واپس کر دیا جاتا تھا۔

اب مومنات مہاجرات کے ساتھ مومنین کا نکاح جائز قرار دیا گیا بشرطیکہ وہ ان کو مہر ادا کر دیں۔ اس میں ایک فقہی اختلاف ہے کہ آیا ان عورتوں کو عدت گزارنی تھی یا نہیں۔ صرف حاملہ عورتوں کو عدت گزارنی تھی یعنی جب تک وضع حمل نہ ہو جائے۔ اگر عدت ہے تو کیا یہ مطلقہ عورت کی عدت ہے یعنی تین طہر یا حیض۔ یا یہ کہ ایک حیض آنے کے ساتھ اور رحم پاک ہونے کا یقین کافی ہے۔ (کتب فقہ دیکھیں)

وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ

وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا (٦٠: ١٠)

"ان کے کافر شوہروں نے جو مہر ان کو دیئے تھے وہ انہیں پھیر دو۔ اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تم ان کے مہر ان کو ادا کر دو۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو۔ جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیئے تھے وہ تم واپس مانگ لو۔ اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیئے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں"۔ اس کے بعد اللہ

تعالیٰ ان تمام احکام پر عمل کا ضامن اور چوکیدار مقرر کرتا ہے جو ہر مسلم کے دل میں ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے' اللہ سے ڈرو۔

ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (٦٠ : ١٠) "یہ اللہ کا حکم ہے' وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے"۔ یہ واحد ضمانت ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ کوئی دھوکہ' حیلہ یا نقض عہد نہ کرے گا کیونکہ اللہ کے احکام تو علیم و خبیر کے احکام ہیں۔ اور یہ اس حاکم کے احکام ہیں جو دلوں کے بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔ یہ احکام نہایت قوی اور قدرتوں والے حاکم کے ہیں۔ ایک مسلمان کے ضمیر میں بس یہی رابطہ کافی ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ حکم کہاں سے آیا ہے اس لیے وہ ان احکام پر چلتا ہے اور ان کا خیال رکھتا ہے۔ کیونکہ مومن کو یقین ہوتا ہے کہ اس نے اللہ کے سامنے جانا ہے۔

اب اگر مسلمانوں نے اپنی بیویوں کو مہر وغیرہ دیا ہو اور وہ بیویاں دارالکفر میں رہ گئی ہوں جہاں وہ اس قانون کے مطابق جدا ہوگئی ہوں اور ان کے اہل خانہ یا اولیاء نے مومن مسلمانوں کے حق کو واپس نہ کیا ہو' جیسا کہ بعض حالات میں عملاً ایسا ہوا۔ تو امام وقت ان کے نقصان کی تلافی اس فنڈ سے کر دے گا جو ان کافروں کی ملکیت ہو گا جن کی بیویاں دارالاسلام کو آگئی ہوں یا ان رقومات سے ادائیگی کر دی جائے گی جو کفار کے ہاں سے مال غنیمت مسلمانوں کو ملا۔

وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا (٦٠ : ١١) "اور اگر تمہاری کافر بیویوں کے مہروں میں سے کچھ تمہیں کفار سے واپس نہ ملے اور پھر تمہاری نوبت آئے تو جن لوگوں کی بیویاں ادھر رہ گئی ہیں ان کو اتنی رقم ادا کر دو جو ان کے دیئے ہوئے مہروں کے برابر ہو"۔

اور اس حکم اور اس پر عمل کرنے کو بھی ایمان سے جوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ اسلام میں ہر حکم اللہ سے مربوط ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (٦٠ : ١١) "اور اس خدا سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو"۔ اللہ پر ایمان لانے والوں کے لیے یہ بہت ہی موثر یاد دہانی ہے۔

یوں یہ احکام زوجین کے درمیان ایک حقیقت پسندانہ فسخ نکاح کرتے ہیں۔ اور یہ جدائی اسلامی تصور حیات کے مطابق ہے۔ اسلام ازدواجی رشتوں کے لیے ایک الگ تصور رکھتا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اسلامی صفیں دوسری صفوف سے مکمل طور پر جدا اور ممتاز ہوں۔ اور اسلام کی پوری زندگی اسلامی نظریہ حیات پر استوار ہو۔ اور ایمان کے محور کے ساتھ وہ مربوط ہو۔ اور ایک ایسی انسانی سوسائٹی تشکیل پائے جس کے اندر نسل' رنگ' زبان' نسب اور زمین اور علاقوں کی بنیادوں پر کوئی اجتماعی نظام نہ ہو۔ اور صرف ایک ہی جھنڈا ہو جس کے مطابق لوگوں کے درمیان تفریق ہو۔ یعنی وہ پارٹی جو اللہ والوں کی ہے ۔ وہ حزب اللہ ہے اور وہ پارٹی جو شیطان کی ہے جسے حزب الشیطان کہا جاتا ہے۔

---ooo---

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بتایا جاتا ہے کہ یہ عورتیں جو مہاجر ہوگئی ہیں ان سے کن باتوں پر

بیعت لی جائے گی۔ یہ عورتیں یا وہ عورتیں جو اسلام میں داخل ہونا چاہتی ہیں ان کی بیعت یہ ہوگی :

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۲:۶۰) "اے نبیؐ' جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی' چوری نہ کریں گی' زنا نہ کریں گی' اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی' اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی' اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی' تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو' یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔

یہ باتیں جن پر عورتوں سے بیعت لی گئی ہے' یہ اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی عناصر ہیں اور اجتماعی زندگی کے بھی یہ اساسی اصول ہیں۔

۱۔ یہ کہ وہ اللہ کے ساتھ مطلقاً کسی کو شریک نہ کریں گی۔ ۲۔ سرقہ نہ کریں گی۔ ۳۔ زنا سے اجتناب کریں گی۔ ۴۔ اولاد کو قتل نہ کریں گی۔

جاہلیت میں رواج تھا کہ عورتوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ نیز اس میں جنین کو قتل کرنا بھی شامل ہے۔ جس کا سبب کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جنین کی امین ہیں۔

وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ (۱۲:۶۰) "اور اپنے ہاتھوں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی"۔ اس کا مفہوم حضرت ابن عباس نے یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کے علاوہ کسی اور کی اولاد کو ان خاوندوں کے ساتھ نہ ملائیں گی۔ یہی رائے مقاتل کی ہے۔

یہ تحفظ زنا سے ارتکاب سے بچنے کی بیعت کے بعد ایک لازمی ہدایت ہے۔ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ عورتیں کئی مردوں سے تعلقات زناشوئی قائم کرتی تھیں۔ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا وہ اسے اس شخص کا قرار دے دیتیں جس کے ساتھ وہ مشابہت رکھتا۔ بعض اوقات یہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ بچے کا الحاق کرا دیتیں حالانکہ ان کو اس کا باپ معلوم ہوتا تھا۔

لیکن آیت کے عمومی الفاظ میں تمام ایسے حالات آتے ہیں جن میں بہتان تراشی ہوتی ہو۔ ابن عباس اور مقاتل نے اسے جو مخصوص کیا ہے تو اس لیے کہ اس وقت ایسے حالات موجود تھے جو حرمت زنا کے حکم سے ختم ہو رہے تھے لیکن موجود حاملہ عورتوں کو تو بچوں کے الحاق کا فیصلہ بہرحال کرنا ہی تھا)۔

وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ (۱۲:۶۰) "اور کسی معروف امر میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی"۔

اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہے ۔ ہر اس معاملے میں جو آپ ان سے کہیں اور ظاہر ہے کہ حضورؐ تو معروف کا حکم ہی دیں گے ۔ لیکن یہاں معروف کے لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ اس لیے کہ یہ ایک دستوری دفعہ ہے ۔ اسلامی دستور میں یہ بنیادی قاعدہ ہے کہ حکمرانوں کی اطاعت معروف کے دائرے کے اندر محدود ہے ۔ صرف ان کاموں میں حکمرانوں کی اطاعت لازمی ہے جو شریعت اسلامیہ کے مطابق ہوں ۔ اسلام میں مطلق اطاعت کا کوئی اصول نہیں ہے ۔ اسلامی دستور کے مطابق قانون سازی اور حکمرانی کے اختیارات کا سرچشمہ اسلامی شریعت ہے ۔ امام وقت کا ارادہ نہیں ہے نہ قوم کا ارادہ نہ اکثریتی یا اجتماعی کسی اصول کو قانون کا درجہ دے سکتا ہے جو شریعت کے خلاف ہو ۔ لہذا قوم اور قوم کا امام دونوں اسلامی شریعت کے پابند ہیں ۔

جب ان عورتوں نے یہ بیعت کر لی تو تب وہ مومنات ہوں گی ۔ اور تب ان کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغفرت کی دعا کریں گے کہ اللہ ان کے سابقہ گناہوں کو معاف کرے ۔

اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۶۰ : ۱۲) "بے شک اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے" ۔ وہ کوتاہیوں کو معاف کرنے والا ہے ۔

---ooo---

آخر میں یہ اثر انگیز تبصرہ :

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ قَدْ یَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَۃِ کَمَا یَئِسَ الْکُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ (۶۰ : ۱۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ ' جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے ' جو آخرت سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کافر مایوس ہیں" ۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ اس قوم سے مراد یہودی ہیں ' جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے ۔ اور اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ قرآن کریم میں کئی جگہ اس قوم کے لیے یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں ' لیکن یہ آیت عام بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے مفہوم میں وہ لوگ بھی آ جائیں جو مشرکین ہیں اور جن کا تذکرہ اس پوری سورت میں ہوا ہے اور اللہ کی تمام دشمن اس سے مراد ہوں ۔ کیونکہ اللہ کے سب دشمن آخرت سے مایوس ہیں اور وہ آخرت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ۔ اور ان کو تشبیہ ان کفار سے دی گئی ہے جو قبروں میں ہیں ۔ ان کو تو معلوم ہو چکا ہے کہ انہوں نے کفر اور شرک کا ارتکاب کیا ۔ اب وہ دائمی جہنمی ہیں ۔ دنیا کی مہلت ختم ہے ۔ اب حشر میں صرف حساب ہونا ہے اور انہوں نے جہنم میں گرنا ہے ۔

یہ آخری پکار پوری سورت کی پکاروں کو اور پوری سورت کی دعوتوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے ۔ اس طرح سورت کا خاتمہ اور آغاز ایک ہی مضمون سے ہوا کہ مَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کو دوست نہ بناؤ اور اس خاتمے کے اندر سورت کی تمام آواز کو جمع کر دیا گیا ۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ۔۔ ۲۸

سورۃ الصّف ۔ ۶۱

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۴

سورۃ الصّف ایک نظر میں

اس سورت کے پیش نظر دو باتیں ہیں۔ یہ نہایت اساسی باتیں اور پوری سورت میں بہت ہی واضح طور پر کہی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بعض اشارات ہیں لیکن یہ سب اشارات بھی انہی دو امور کے ساتھ ملحق ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ تمام اہل ایمان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ دین اسلام دراصل اللہ کا آخری دین ہے' یہی دین مختلف شکلوں میں' انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں اس وقت کے حالات کے مطابق جاری اور نافذ رہا ہے۔ رسولوں اور ان کے ساتھ اٹھنے والی جماعتوں کی زندگیوں میں اس کے تجربے ہوتے رہے ہیں۔ اس دین کی تمام سابقہ شکلیں دراصل اس آخری دین اور نظام کے لیے تمہید اور تیاری تھیں۔ کیونکہ اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت آخری رسالت ہو' اور آپ کا دین آخری دین ہو۔ اور اسے تمام دینوں پر غالب کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ ؑ کو جن لوگوں کی طرف بھیجا گیا تھا انہوں نے ان کو اذیت دی' رسالت کا انکار کیا' گمراہ ہو گئے اور یہ لوگ اللہ کے دین کے امین اور محافظ نہ بنے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۶۱ : ۵) ”اور یاد کرو موسیٰ کی وہ بات جو اس نے اپنی قوم سے کہی تھی کہ ”اے میری قوم کے لوگو' تم کیوں مجھے اذیت دیتے ہو' حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں“۔ پھر جب انہوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے' اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا“۔ یوں حضرت موسیٰ کی قوم بھی اس دین کی قیم نہ رہی' اور اس امانت کو سنبھالنے سے انہوں نے انکار کر دیا' ان کے دل ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے بھی ان کو مزید ٹیڑھا کر دیا۔ چونکہ انہوں نے بالارادہ گمراہی اختیار کر لی' اس لیے اللہ نے بھی ان کو گمراہ کر دیا اور اللہ فاسقین کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا تذکرہ ہوتا ہے اور یہ رسالت بھی دراصل حضرت موسیٰ ؑ ہی کی رسالت کی وسیع شکل تھی۔ حضرت موسیٰ ؑ نے بھی تورات کی تصدیق کی۔ اور آپ نے آخری نبی کے آنے کے لیے راہ ہموار کی۔ اور آخری رسول کے آنے کی بشارت دی۔ آپ نے پہلے کتابی دین' دین موسیٰ اور آخری کتابی دین' دین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپس میں ملا دیا۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (۶۱ : ۶) ”اور یاد کرو عیسیٰ ابن مریم کی وہ بات

جو اس نے کہی تھی کہ "اے بنی اسرائیل' میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں' تصدیق کرنے والا ہوں اس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہو گا"۔ گویا عیسیٰ علیہ السلام اس لیے تشریف لائے تھے کہ دین الہیٰ کی امانت جو تورات کی شکل میں تھی' اسے نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سپرد کر دیں اور آپ ؐ کے بارے میں خوشخبری بھی دیں۔

اور اللہ کے علم اور تقدیر میں یہ بات مقرر تھی کہ ان تمام مراحل اور مدارج سے گزر کر' اس کا دین ایک مستقل اور مکمل شکل میں زمین پر غالب آ جائے اور یہ رسول آخر الزمان ﷺ کے ہاتھوں۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۶۱ : ۹) "اللہ وہی تو ہے' جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے' خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

یہ اس سورت کا پہلا ہدف ہے اور اسی کے اوپر دو سرا ہدف بنی ہے۔ وہ یہ کہ جب ایک مومن کے اندر یہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ دین اس کے ہاتھ میں ایک امانت ہے اور اس امانت کے بارے میں اللہ کا حکم یہ ہے کہ اسے تمام ادیان پر غالب کرنا ہے' تو ایک مسلم کا یہ شعور پھر اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اٹھے اور اس کو غالب کرنے کے لیے' اس دین کی راہ میں جدوجہد کرے۔ جیسا کہ اللہ کا ارادہ ہے کہ اسے غالب کیا جائے۔ اور اس سلسلے میں پھر ایک مومن کے قول اور فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ بڑی بری بات ہے کہ پہلے تو تم جہاد کی خواہش کرتے تھے اور جب جہاد فرض ہو گیا تو تم منہ موڑ رہے ہو۔ جیسا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں پر یہ حالت طاری ہو گئی تھی اور اس سلسلے میں بعض روایات بھی ہیں۔ چنانچہ سورت کے آغاز میں پوری کائنات کی طرف سے تسبیح کے ذکر کے بعد یہ آتا ہے کہ اللہ یہ چاہتا ہے :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۲) كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۳) اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۴) (۶۱ : ۲ تا ۴) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔ اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔

اس کے بعد سورت کے وسط میں ان کو کہا جاتا ہے۔ دنیا و آخرت میں نفع بخش تجارت کیا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ (۱۰) تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۱) يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۲) وَ اُخْرٰى
تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۳) (٦١ : ۱۰ تا ۱۳)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذاب الیم سے بچائے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو' وہ بھی تمہیں دے گا' اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبی اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو"۔

سورت کا خاتمہ ایک پکار پر ہوتا ہے جو اہل ایمان کو ہے کہ وہ اللہ کے مددگار بن جائیں' جس طرح عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں کو پکارا تھا کہ کون ہے تم میں سے میرا مددگار' باوجود اس کے کہ بنی اسرائیل نے تکذیب کر دی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دشمنی پر اتر آئے تھے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ
اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
وَ كَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ (٦١ : ۱٤)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کے مددگار بنو' جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں کو خطاب کر کے کہا تھا: "کون ہے اللہ کی طرف دعوت میں میرا مددگار؟" حواریوں نے جواب دیا "ہم ہیں اللہ کے مددگار"۔ اس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے"۔

یہ دونوں لائنیں اس سورت میں بالکل واضح ہیں۔ اور تمام آیات کا مقصد یہی ہے۔ اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ رسالت کی تکذیب کرنے والوں پر تنقید اور تنبیہہ آ جائے اور اس قسم کی تنبیہات ہمیشہ قرآن میں آتی رہتی ہیں۔ یہاں کہا جاتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کے بعد بھی ان لوگوں نے تکذیب کی' حالانکہ رسول کے مقصد' رسالت کی تاریخ اور طریقہ کار سب کی وضاحت کر دی گئی۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (٦) وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى
اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (٧) يُرِيْدُوْنَ

لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (٨) (٦١: ٦ تا ٨)

"مگر جب وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انہوں نے کہا یہ تو صریح دھوکہ ہے' اب بھلا اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹے بہتان باندھے حالانکہ اسے اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔ یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا یہ دین اس کرۂ ارض پر اللہ کا آخری دین ہے۔ اور انسانوں کو درست عقیدہ عطا کرنا' اور درست فکر و نظر دینا اب دین اسلام کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ جب کسی مسلم کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ وہ اس فریضے کا مکلف ہے۔ اس کا فرض ہے کہ دعوت و جہاد کے ذریعہ لوگوں تک اس آخری دین کو پہنچائے۔ اور اسی بات کو اللہ پسند کرتا ہے۔ پھر مسلم کا یہ بھی فرض ہے کہ اس کے دین میں اس کا راستہ بالکل واضح ہو اور اپنے دین اور اس کے قیام کے لیے جہاد کے معاملے میں اس کے افکار گنجلک نہ ہوں اور وہ شف نہ کرتا ہو۔ نہ وہ اس سیدھے راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے اختیار کرتا ہو۔ کیونکہ اللہ نے یہی راستہ اختیار کیا ہے کہ اللہ کے دین کے قیام کے لیے صف بستہ ہو جاؤ اور جہاد کرو۔

اسی دوران مسلمانوں کے اخلاق' ان کے مزاج اور ان کے ضمیر اور سوسائٹی میں ان کے طرز عمل کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسے ہرگز وہ بات نہیں کہنا چاہئے جو وہ کر نہیں سکتا۔ اور نہ اس کے قول اور عمل میں تضاد ہو' نہ ان کے ظاہر و باطن میں فرق ہو' اس کی گھر کے اندر اور باہر کی زندگی یکساں ہو' اور اپنے ہر حال میں اسے اللہ کے لیے خالص ہونا چاہئے۔ اپنے قول اور فعل میں سچا ہو' اس کے قدم اور اس کا راستہ صاف ہو۔ وہ اپنے دوسرے بھائیوں کا ہمدرد ہو اور سب لوگ اس طرح ہوں جس طرح بنیان مرصوص۔

---ooo---

درس نمبر۲۶۱ تشریح آیات

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۴

سُوْرَةُ الصَّفِّ مَدَنِيَّةٌ
آيَاتُهَا ۱۴ رُكُوْعَاتُهَا ۲
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے' اور وہ غالب اور حکیم ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔ اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔

اللہ عزیز و حکیم کی تسبیح پوری کائنات کر رہی ہے۔ سورت کے آغاز میں یہ بات لا کر اہل ایمان کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ تمہارا دین اس پوری کائنات کا دین ہے۔ اور یہ دین توحید ہے۔ اور تم اس کے امین ہو۔ اور کافرین اور مشرکین کا موقف غلط ہے اور وہ اس دین کی روشنی کو بجھانا چاہتے ہیں۔ اللہ تمہیں دعوت دے رہا ہے کہ اس دین اور اس رسول کی نصرت کرو اور اللہ نے اس دین کا غلبہ مقرر کر رکھا ہے۔ اگرچہ کافر اور مشرک تو اس کو ختم کرنا چاہتے ہیں' لیکن اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کے علی الرغم اسے غالب کرنا چاہتا ہے۔ اس آغاز کا مفہوم یہ ہے کہ یہ پوری کائنات کا دین ہے اور پوری کائنات کی امانت ہے۔ اور جس نظریہ کے لیے تم نے جہاد کرنا ہے وہ پوری کائنات کا نظریہ ہے اور اس دین کا ظہور اور غلبہ دراصل اک قدرتی امر ہے' اور اللہ عزیز و حکیم کی منشا اور تقدیر ہے۔

اس کے بعد بعض مومنین کی جانب سے کمزوری کے اظہار پر عتاب کیا جاتا ہے' کہ دین کے معاملے میں جہاد سے جو شخص منہ موڑے گا' اسے اللہ بہت ہی ناپسند کرتا ہے اور اسے قابل شرم قرار دیتا ہے' خصوصاً ان لوگوں کی جانب سے جو ایمان لائے ہیں جب کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو اللہ بہت پسند کرتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۲) كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۳) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (٤) (٦١ : ٢ تا ٤) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔ اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔

علی ابن طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ مسلمانوں میں سے بعض لوگ ایسے تھے کہ فرضیت جہاد سے پہلے کہتے تھے کہ اللہ ہمیں کوئی ایسا عمل بتا دے' جو اسے بہت ہی محبوب ہو' ہم اس پر عمل کریں۔ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی کہ اللہ کے نزدیک محبوب ترین عمل تو بے شک ایمان لانا ہے لیکن اس کے بعد ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنا اللہ کو محبوب ہے جو ایمان نہیں لاتے اور اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور ایمان کا اقرار نہیں کرتے۔ جب جہاد کا یہ حکم نازل ہوا تو بعض مسلمانوں نے اسے پسند نہ کیا اور اسے انہوں نے ایک بھاری حکم سمجھا' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۲) كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۳) (٦١ : ٢ - ٣) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں"۔ امام ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اس قول کو اختیار کیا ہے۔

لیکن امام ابن کثیر نے کہا ہے: "جمہور نے کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مسلمانوں نے یہ تمنا کی کہ جہاد فرض ہو جائے' جب جہاد فرض ہو گیا تو بعض لوگوں نے اسے پسند نہ کیا اور دوسری جگہ بھی اس کے بارے میں آیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (٧٧) اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ

وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (٧٨)(٤ : ٧٧ - ٧٨) "تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو' اور زکوۃ دو' اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسے ڈر رہے ہیں جیسا کہ خدا سے ڈرنا چاہئے' یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر' کہتے ہیں خدایا' یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو' دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔ رہی موت تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال تمہیں آکر رہے گی' خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو"۔

قتادہ اور ضحاک نے کہا کہ یہ ان لوگوں کی سرزنش کے لیے نازل ہوئی ہے جو کہتے تھے کہ ہم نے قتل کیا' تیر مارا' تلوار چلائی' اور یہ یہ کیا اور دراصل انہوں نے ایسا نہ کیا تھا۔

آیت کے سیاق کلام اور اس میں قتال کے ذکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جمہور مفسرین کی بات درست ہے۔ یہی رائے ابن جریر نے بھی اختیار کی ہے۔ لیکن قرآنی آیات کا مفہوم بالعموم شان نزول کے واقعات سے وسیع ہوتا ہے۔ بلکہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم عمومی مفہوم لیتے ہیں۔ خصوصی واقعہ نزول کا لحاظ نہیں رکھتے۔ ہاں جس واقعہ میں آیت نازل ہوئی اس کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔۔۔ آغاز یوں ہوتا ہے کہ کسی واقعہ یا واقعات پر عتاب ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (٦١ : ٢) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں"۔ اور اس کی انتہا اس پر ہوتی ہے کہ اللہ کے نزدیک یہ فعل بہت ہی برا ہے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (٦١ : ٣) "اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں"۔

المقت وہ ناپسندیدہ بات جو اللہ کے نزدیک بہت ہی ناپسندیدہ ہے۔ وہ اس کو بہت برا سمجھتا ہے اور یہ اللہ کہتا ہے جو تمہارا رب ہے۔

اور تیسری آیت میں وہ بات واضح طور پر بتا دی جس کے بارے میں انہوں نے کہا کہ ہم کریں گے مگر پھر بھی انہوں نے اس سلسلے میں کوتاہی کی۔ اور وہ ہے جہاد و قتال۔ اور قرار دیا جاتا ہے کہ جو لوگ صف بستہ قتال کرتے ہیں وہ بہت ہی محبوب لوگ ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (٦١ : ٤)

"اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔ صرف قتال ہی نہیں' بلکہ قتال اللہ کی راہ میں ہو' اور یہ قتال منظم ہو' سوسائٹی کی صفوں کے اندر تنظیم کے بعد ہو' اور یہ قتال ہو بھی نہایت ہی جم کر لڑنے کی صورت میں۔

---ooo---

جیسا کہ ہم نے اس پارے کی متعدد سورتوں میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ قرآن کریم کے پیش نظر یہ بات تھی کہ

ایک ایسی امت کی تعمیر کی جائے جو اس زمین پر قرآن کی امانت کی حامل ہو۔ قرآنی منہاج زندگی قائم کرنا اس کا منشا ہو' اور قرآنی شریعت کو ایک مکمل نظام کی شکل میں پیش کرے۔ اس مقصد کے لیے ایک جماعت اور ایک سوسائٹی بنانا ضروری تھا۔ اور اسی جماعت کو ایک عملی جماعت بنانا ضروری تھا' اور یہ سب کام ایک ساتھ کرنے ضروری تھے۔ یاد رہے کہ اسلامی نظام کا مزاج یہ ہے کہ اس میں فرد کی قیمت جماعت میں ہے' تنہا کچھ نہیں۔ اسلام اپنے وجود کو ایک باہم مربوط اور منظم جماعت کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے' جس کا ایک نظام ہو' جس کا ایک ہدف ہو' اور اس ہدف کے ارد گرد اس کے تمام افراد گھومتے ہوں۔ یوں کہ یہ نظام ہر ایک کے ضمیر میں' ہر ایک کے عمل میں' پھر اس کرۂ ارض پر کسی امت کی عملی شکل میں نافذ ہو اور زمین کے اوپر اس عملی سوسائٹی کی شکل میں' ایک ایسی سوسائٹی ایک ایسی امت جو عملاً متحرک ہو اور اپنے تمام کام اس نظام کے حدود اور فریم ورک میں کرتی ہو۔

اسلام' اگرچہ فرد کی اصلاح اور ایک فرد کی نیت کی اصلاح اور ضمیر کی اصلاح پر بہت زور دیتا ہے اور انفرادی ذمہ داری کا اصول بھی اسلام ہی نے عطا کیا ہے' لیکن اسلام افراد کا دین نہیں ہے' کہ ایک ایک فرد عبادت خانے میں جا کر اپنی اپنی عبادت کرے۔ اس طرح اسلام کسی ایک فرد کی ذات میں حقیقت نہیں بن سکتا' نہ کسی ایک منفرد شخص کی ذات میں بھی حقیقت نہیں بن سکتا۔ نہ اسلام اس صورت میں آیا ہے کہ وہ ایک شخص کی زندگی میں گوشہ نشین ہو کر رہے' بلکہ اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کی زندگی پر حکمران ہو' زندگی کے اندر تصرف کرے' اس پر کنٹرول کرے' اور لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اور سرگرمیوں پر حاوی ہو۔ اس لیے کہ انسان انفرادی طور پر زندہ نہیں رہتے بلکہ اجتماعی طور پر زندہ رہتے ہیں اور اسلام چونکہ انسانوں پر حکمرانی کے لیے آیا ہے اس لیے وہ ایک اجتماعی نظام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے آداب' اس کے قواعد' اس کے ارادے' یہاں تک کہ اس کی عبادات بھی اجتماعی ہیں۔ اگر اسلام کا کوئی حکم کسی فرد کے لیے ہے تو بھی وہ ایک ایسے انسان کے لیے ہے جو سوشل ہے اور ایک جماعت کے اندر رہتا ہے' اس میں اٹھتا بیٹھتا ہے اور اس جماعت میں اپنے دین کا امین ہے' ایک نظام کا حامل ہے' اور اس کا فرض ہے کہ اس نظام کو لوگوں کے اندر نافذ کرے۔

جب سے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دعوت کا آغاز کیا' اسلامی معاشرہ قائم ہونا شروع ہو گیا۔ اسلامی جماعت کی تشکیل شروع ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ اس جماعت کے قائد قرار پائے۔ یہ جماعت ایسی تھی جس کی جماعتی ذمہ داریاں تھیں' جو اپنے ماحول سے بالکل ممتاز تھی۔ اس کو ایسے آداب سکھائے جاتے تھے کہ ان کا ایک سرا اگر ایک فرد انسان کے ضمیر میں ہوتا تھا تو دوسرا سرا ایک جماعت سے متعلق ہوتا تھا اور یہ اسلامی اجتماعی سوسائٹی اس وقت بھی تھی جب ابھی مدینہ میں اسلامی حکومت قائم نہ ہوئی تھی بلکہ مدینہ کی اسلامی حکومت قائم بھی مکہ کی اسلامی جماعت کے ذریعہ سے ہوئی تھی۔

ہم جب ان آیات پر غور کرتے ہیں تو دینی عقائد کے اوپر جو اخلاقی نظام ان میں استوار کیا جاتا ہے وہ ایک اجتماعی ضرورت بھی ہے اور یہ اخلاق ایک اجتماعی نظام ہی کی شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں اور یہ نظام ایسا ہے کہ اسے نافذ کرنے کے لیے ایک انتظامیہ کی ضرورت ہے۔

پہلی دو آیات میں اس بات پر گرفت کی گئی ہے کہ یہ بات ایک مسلمان اور مومن کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ ایک بات کہے اور پھر اس پر عمل نہ کرے۔ یہ ایک مسلمان اور مومن کی شخصیت کی بنیادی صفت ہے۔ سچائی اور

استقامت اور راست بازی - اس کا باطن اور ظاہر ایک ہو - اس کا قول اور فعل یکساں ہوں اور یہ بات صرف مسئلہ جہاد تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک مومن کو ہر معاملے میں ایسا ہونا چاہئے -

یہ کہ مسلم کا ظاہر و باطن ایک ہونا چاہئے اور قول و فعل یکساں ہونا چاہئے - ایک ایسی بات ہے جس پر قرآن نے بہت ہی تاکید کی ہے اور اس مضمون کو بار بار بیان کیا ہے - یہودیوں کے بارے میں کہا گیا -

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲ :

۴۴) "تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو - کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے" - اور منافقین پر تنقید کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲۰۴) وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲۰۵) (۲ : ۲۰۴) "انسانوں میں سے کوئی تو ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے ' مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے - جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے ' تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے ' کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے - حالانکہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا" - اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "منافق کی علامتیں تین ہیں ' جب بات کرے تو جھوٹ بولے ' جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے ' اور جب اس پر امانت کا اعتماد کیا جائے تو خیانت کرے" - (متفق علیہ)

اس مضمون کی احادیث بہت ہیں ' آگے جو حدیث ہم ذکر کر رہے ہیں ' وہ اس سلسلے میں شدید ترین اور سخت ترین ہدایت ہے - امام احمد نے عبداللہ ابن عامر ابن ربیعہ سے روایت کی - فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے گھر آئے - اس وقت میں بچہ تھا - میں گھر سے باہر جانے لگا کہ کھیلوں - میری ماں نے مجھے کہا عبداللہ! ادھر آؤ میں تمہیں کچھ دیتی ہوں - میری ماں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم نے اسے کیا دینے کا ارادہ کیا ہے؟ تو اس نے کہا کھجور کا دانہ - تو حضورؐ نے فرمایا اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارے خلاف ایک جھوٹ لکھ دیا جائے گا - اور یہی وجہ ہے کہ امام احمد ابن عقیل سفر کر کے ایک شخص کے پاس ایک حدیث نقل کرنے گئے اور یہ سفر کافی طویل تھا تو آپ نے اس شخص کو دیکھا کہ وہ تھیلی پکڑے ہوئے ہے اور اپنے خچر کو یہ باور کرا رہا ہے کہ اس میں خوراک ہے ' حالانکہ وہ خالی تھی تو امام احمد نے اس شخص سے روایت کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس نے اپنے خچر کے ساتھ جھوٹ بولا -

یہ تھی اسلام کی اخلاقی تعمیر - اور یہ تھا ایک مسلمان کے لیے اخلاقی معیار - اور یہ تھے وہ لوگ جن کو اسلامی نظام حیات کا امین بنایا گیا تھا - یہی معیار ہے جسے قائم کرنا اس سورت کا مقصد و محور ہے اور یہ اسلامی جماعت کی تربیت کا ایک اہم نکتہ ہے جسے اللہ اسلامی منہاج کو درست کرنے کے لیے اٹھاتا ہے -

جب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں جو اس سورت کا محور اور موضوع ہے یعنی جہاد فی سبیل اللہ ۔ تو اس سے پہلے ہم کئی موضوعات اپنے سامنے پاتے ہیں تاکہ ہم ان پر غور کریں اور اس سے عبرت لیں ۔

سب سے پہلے تو ہمارے سامنے حضرت انسان کا نفس آتا ہے اور اس نفس پر ضعف کے لمحات آتے ہیں ۔ صرف اللہ ہی اسے اس ضعف سے بچا سکتا ہے اور دائمی یاد دہانی اور دائمی تربیت کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ روایات میں آتا ہے کہ یہ نہایت ہی ابتدائی مہاجرین میں سے کچھ لوگ تھے جن کی خواہش تھی کہ ان کو قتال کی اجازت دی جائے ۔ یہ لوگ اہل مکہ میں تھے اور ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ مکہ ہی میں لڑنا چاہتے تھے لیکن اس وقت ان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ہاتھوں کو روکے رکھیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں ۔ لیکن جب ان پر جہاد فرض کیا گیا اور وہ بھی مدینہ میں اور مناسب وقت پر ' تو ان میں سے بعض لوگ ایسے تھے کہ وہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہئے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ڈرنے لگے ۔ اور انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ۔

وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (٤ : ٧٧) "اے اللہ تو نے ہم پر قتال کیوں فرض کر دیا ۔ ذرا اور ہمیں مہلت دی ہوتی" ۔ یا یہ مدینہ ہی کی ایک جماعت تھی اور محبوب ترین اعمال کے بارے میں پوچھتی تھی اور جب بتایا گیا کہ محبوب ترین عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے تو انہوں نے اس کو ناپسند کیا ۔

یہی ایک واقعہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے کہ نفس انسانی بہت کمزور ہے اور اسے رات دن مسلسل تربیت و تذکیر اور یاد دہانی کی ضرورت ہے ۔ خصوصا جبکہ اس کو مشکل ترین ٹارگٹ دیا جا رہا ہو ۔ یہ تربیت اس لیے ضروری ہے کہ یہ اپنی راہ پر درست چلتی رہے ' اپنی کمزوریوں پر قابو پائے اور دور افق بلند پر اس کی نظریں ہوں ۔ نیز اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کبھی بھی کوئی مشکل ٹارگٹ لینے کے لیے ایک مسلم کو بے تاب نہیں ہونا چاہئے ۔ جبکہ چاہت دین ہو تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے ۔ اگر ہم اللہ کے سامنے تجاویز پیش کریں اور اللہ وہ حالات پیش کر دے تو شاید ہم ثابت قدم نہ رہ سکیں ۔ دیکھئے یہ مسلمانوں کی پہلی جماعت ہے اور اس میں بھی ایسے لوگ ہیں جن پر گرفت ہو رہی ہے کہ کیوں تم ایسی باتیں کرتے ہو جن پر عمل نہیں کرتے ۔ یہ سخت عتاب ہے اور خوفناک گرفت ہے ۔

دوسری بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے ' جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں ' اس طرح جس طرح وہ بنیان مرصوص ہیں ۔ اللہ اپنے راستے میں لڑنے کے لیے کس قدر زوردار انداز سے مسلمانوں کو آمادہ کرتا ہے لیکن ریکارڈ یہ بتاتا ہے کہ یہ تاکید بعض لوگوں کی اس نفسیاتی حالت کو دور کرنے کے لیے کی گئی جو جنگ کو پسند نہ کرتے تھے اور اسے اور موخر کرنا چاہتے تھے ۔ اور جنگ سے پسپائی اختیار کر رہے تھے ۔ اس لیے یہاں ان کو سختی سے آمادہ کیا گیا ۔ لیکن اس مخصوص سبب نزول کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ آیت مخصوص حالات کے لیے ہے بلکہ اسلام کی یہ عام پالیسی ہے کہ لوگوں کو بروقت جنگی حالات کے لیے آمادہ رکھا جائے ۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ اسلام خواہ مخواہ جنگی جنون پیدا کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی وہ جنگ کو ایک محبوب چیز سمجھتا ہے ۔ اسلام جنگ کو اس لیے فرض قرار دیتا ہے کہ حالات اسے مجبور کر دیتے ہیں ۔ پھر اسلام جن مقاصد کے لیے جنگ کرتا ہے

وہ بلند مقاصد ہیں ۔ اسلامی جنگ اس لیے ہوتی ہے کہ اسلامی ممالک کے اندر اللہ کے آخری منہاج زندگی کو نافذ اور قائم کیا جائے ۔ یہ اسلامی منہاج زندگی اگرچہ ایک فطری منہاج ہے لیکن اسلام انسانی نفوس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس منہاج کے معیار تک بلند کریں تاکہ اس اعلیٰ معیار پر یہ نظام قائم رہ سکے ۔ لیکن یہ بھی ایک عملی حقیقت ہے کہ ہمیشہ اس کرۂ ارض پر ایسی قوتیں رہی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی اس دنیا میں قدم نہ جما سکے ۔ اس لیے کہ دنیا کے جس قدر غیر اسلامی نظام ہیں ان کے کچھ مفادات و امتیازات ہوتے ہیں' یہ نظام بعض کھوٹی اور جھوٹی قدروں پر قائم ہوتے ہیں' جب بھی دنیا میں اسلامی نظام قائم ہوا ہے ایسی قوتوں کے مفادات ختم ہو گئے ہیں ۔ یہ باطل نظامہائے زندگی انسانی نفوس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور انسانوں کو انسانی سطح سے نیچے گرا کر اور ان کے اندر اخلاقی بگاڑ پیدا کر کے' اور ان کو حقیقت سے جاہل رکھ کر اسلامی نظام کی مخالفت میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں ۔ اور یوں عوام الناس اپنی جہالت کی وجہ سے اسلام کی راہ روکنے لگتے ہیں ۔ شر کا زور ہوتا ہے اور باطل پھولا ہو دکھائی دیتا ہے ۔ اور شیطان کی چالیں بہت گہری ہوتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حاملین ایمان اور اسلامی منہاج حیات کے محافظین اور پاسداروں کے لیے اعلیٰ اخلاقی معیار تجویز کرتا ہے تاکہ وہ شر اور شیطان کے ایجنٹوں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں ۔ ان کی اخلاقی حالت مضبوط ہو' وہ دشمنوں کے خلاف لڑ سکیں ۔ اور وہ ہر وقت ایسی جنگ کے لیے تیار ہوں جو ان پر اسلام کے دشمن مسلط کر دیں ۔ یہی ایک ضمانت ہے جس کی وجہ سے دعوت اسلامی کی راہ نہیں رکتی ۔ جس کے ذریعہ سے اسلامی نظام قائم رہتا ہے ۔ لوگوں کو اظہار رائے کی آزادی ملتی ہے ۔ اور وہ اپنی مرضی کا نظام قائم کر سکتے ہیں ۔

پھر یہ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کرتے ہیں نہ اپنی ذات کے لیے لڑتے ہیں اور نہ ہی کسی رنگ کی عصبیت کے لیے لڑتے ہیں ۔ نہ نسلی' نہ لسانی' نہ علاقائی اور نہ خاندانی عصبیت کے لیے ۔ صرف اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں ۔ اس لیے لڑتے ہیں کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وہ جو صرف اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو وہ اللہ کے راستے میں لڑتا ہے" ۔

کلمتہ اللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے احکام و مقاصد کے لیے اور اللہ کا ارادہ بھی یہی ہے کہ جس طرح یہ پوری کائنات اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور اللہ کے قانون قدرت کے مطابق چلتی ہے اسی طرح انسان بھی اللہ کے بھیجے ہوئے آخری اور مکمل نظام زندگی اور شریعت الٰہیہ کے مطابق چلے ۔ اور یوں یہ پوری کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والے سب انسان اللہ کے قانون کے مطابق چلیں ۔ اور اللہ کے سوا کسی کا قانون اور شریعت نہ چلے ۔

یہ ضروری تھا کہ بعض افراد نظام شریعت کی راہ روکیں' بعض طبقات اسلامی نظام کو قائم ہونے نہ دیں ۔ بعض حکومتیں اسے اپنے لیے خطرہ سمجھیں اور اس کے سوا بھی چارہ نہ تھا کہ اسلام ان رکاوٹوں کو عبور کرے اور ان کا مقابلہ کرے ۔ اور یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں پر جہاد و قتال فرض کیا گیا تاکہ اسلامی نظام کو قائم کیا جا سکے اور اسے قائم رکھا جا سکے ۔ اور زمین کے اوپر اللہ کا کلمہ بلند ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ ان لوگوں کو محبوب سمجھتا ہے' جو اس کے راستے میں صف بندی سے لڑتے ہیں گویا وہ بنیان مرصوص ہیں ۔

یہ ہے وہ حالت جس پر ہمیں بہت زیادہ غور کرنا چاہیے ۔

الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۶۱ : ۴) "جو اللہ کی راہ میں صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔ اگر مجاہدین اس حالت میں نہ ہوں تو شاید محبوب نہ ہوں۔ یہ ہر فرد کو بھی حکم ہے اور اجتماعی لحاظ سے بھی حکم ہے۔ یعنی ان کو اس طرح ہونا چاہئے کہ ان کی ایک مضبوط نظام والی جماعت ہو۔ اس لیے کہ جو قوتیں اسلام کی راہ میں روکتی ہیں وہ جماعتی اور اجتماعی قوت کی شکل میں ہوتی ہیں۔ اور اس کے خلاف پوری قوتوں کو جمع کرتی ہیں۔ لہٰذا اسلامی قوتوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں جمع ہو کر نکلیں اور ملت واحد کی شکل میں آئیں۔ ایک پختہ دیوار کی شکل میں اور نہایت ہی منظم شکل میں نکلیں۔ ہم آہنگی سے نکلیں۔ لہٰذا یہ صورت کہ ایک انسان اکیلا اللہ کی بندگی کرے ' اکیلا جہاد کرے ' اکیلا زندگی بسر کرے ' یہ ایسی صورت ہے ' جو اس دین کے مزاج ہی کے خلاف ہے ' حالت جہاد کے جو تقاضے ہوتے ہیں ان کے خلاف ہے اور اس کے بعد پوری زندگی کو کنٹرول کرنے کی جو صورت ہوتی ہے ' اس کے خلاف ہے۔

یہ تصویر جو مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ یہاں پیش فرماتا ہے یہ دراصل مسلمانوں کے دین کی تصویر ہے۔ یہ تصویر دکھاتی ہے کہ مسلمانوں کے نشانات راہ کیا ہیں اور قرآن کریم ان کے لیے اجتماعی نظام کفالت و حمایت کس طرح تجویز کرتا ہے۔

صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۶۱ : ۴) "ایک صف کی شکل میں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔ ایک ایسی دیوار جس کی اینٹیں ملی ہوئی ہیں ' باہم پیوست ہیں اور ہر اینٹ اپنا فریضہ ادا کر رہی ہے اور ہر اینٹ اپنے مقام پر کھڑی ہے اور اپنا فریضہ ادا کر رہی ہے۔ اگر ایک اینٹ بھی نکال لی جائے تو پوری عمارت گر سکتی ہے۔ اسی طرح اگر اینٹ آگے ہو جائے ' پیچھے ہو جائے یا اوپر والی اینٹ نیچے والی اینٹ سے جدا ہو جائے تو دیوار میں سوراخ ہو سکتا ہے۔ یہ سب باتیں جماعت کے افراد کے باہمی ربط کو متعین کرتی ہیں۔ جو ایک ہی سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ یعنی وہ شعوری طور پر بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوں ' فکر و نظر میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہمقدم ہوں ' نظام میں بھی منظم ہوں جس طرح تسبیح کے دانے اور ہدف بھی ایک ہو۔

---ooo---

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ اسلامی انقلاب کا منہاج تمام دعوتوں میں ایک ہی رہا ہے۔ آدم علیہ السلام سے ادھر:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۭ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ

يَأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۶﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ
وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷﴾ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ
وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى ا
وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ ع ۹
اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۹
وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾
وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ
اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ ۲
فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴿۱۴﴾ ع ۵
۱۰

”اور یاد کرو موسیٰ ...... کی وہ بات جو اس نے اپنی قوم سے کہی تھی کہ ”اے میری قوم کے لوگو‘ تم کیوں مجھے اذیت دیتے ہو‘ حالاں کہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں؟““ پھر جب انہوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے‘ اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ اور یاد کرو عیسیٰ ابن مریم کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ ”اے بنی اسرائیل‘ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں‘ تصدیق کرنے والا اس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے‘ اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہو گا۔ مگر جب وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انہوں نے کہا یہ تو صریح دھوکا ہے۔ اب بھلا اس شخص سے بڑا

ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹے بہتان باندھے' حالانکہ اسے اسلام (اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینے) کی دعوت دی جا رہی ہو؟ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں' اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذاب الیم سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا' اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو' وہ بھی تمہیں دے گا' اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبی اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کے مددگار بنو' جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں کو خطاب کر کے کہا تھا: "کون ہے اللہ کی طرف (بلانے) میں میرا مددگار؟" اور حواریوں نے جواب دیا تھا: "ہم ہیں اللہ کے مددگار"۔ اس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے"۔

بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ کو ایذا دینا' جبکہ آپ ان کو اور اس ملت کو فرعون کے مظالم سے چھڑانے والے تھے' آپ ان کے رسول اور قائد تھے اور معلم تھے' ایک ایسی داستان کی طرف اشارہ ہے جو مسلسل ان کو دی جانے والی ایذا پر مشتمل ہے۔ آپ نے اس قوم کو درست کرنے کے لیے جو مشقتیں اٹھائیں اور دشوارگزار مراحل سے گزرے' وہ انتھک جدوجہد ہے۔ اور قرآن کریم نے اس کی خوب تفصیلات دی ہیں' جن کو پڑھ کر ایک شخص تسلیم کر لیتا ہے کہ یہ ان تھک جدوجہد تھی اور آپ اولوالعزم رسولوں میں سے تھے۔

ان کی حالت یہ تھی یہ حضرت موسیٰ ﷺ ان کو ذلت سے نجات دینے کی جدوجہد کر رہے تھے اور فرعون کی گرفت اور جباری و قہاری کا مقابلہ کر رہے تھے لیکن یہ لوگ اس ذلت میں بھی امن و چین سے رہنا پسند نہیں کرتے تھے اور اس حالت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تنقید کرتے تھے۔ وہ اس ان تھک جدوجہد پر یہ تبصرہ کرتے تھے۔

أُوذِينَا مِن قَبْلِ أَن تَأْتِيَنَا وَمِن بَعْدِ مَا جِئْتَنَا (۷: ۱۲۹) "ہمیں اذیت دی گئی قبل اس کے کہ آپ ہمارے پاس آئیں اور اس کے بعد بھی جبکہ آپ آگئے"۔ گویا وہ آپ کی رسالت میں اپنے لیے کوئی خیر نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ وہ اپنی اذیت کی وجہ اس رسالت کو سمجھتے تھے۔

لیکن جونہی اللہ نے فرعون کو غرق کیا اور بنی اسرائیل کو نجات دی اور یہ سب منظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا' نجات پاتے ہی انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت توحید کو ترک کرنے کا ارادہ کر لیا اور قوم فرعون کی طرح' شرک کرنے کا ارادہ کیا۔

فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰ أَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوا يَا مُوسَى اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ

اٰلِهَةٌ (۷: ۱۳۸) "پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پر ان کا گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگے "اے موسیٰ ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے ان کے لیے معبود ہیں"۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی ملاقات کے لیے پہاڑ پر گئے جہاں سے انہیں تورات کی تختیاں دی گئیں' ان کے جاتے ہی سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى

فَنَسِيَ (۲۰: ۸۸) "اور ان کے لیے سامری نے ایک بچھڑے کی مورت بنا کر نکال لایا جس سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ لوگ پکار اٹھے یہی ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا۔ موسیٰ اسے بھول گیا"۔

پھر انہوں نے اس طعام پر اعتراضات شروع کر دیے جو انہیں صحرا میں من اور سلویٰ کی شکل میں ملتا تھا اور کہا

يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ

مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا (۲: ۶۱) "اے موسیٰ ۰۰۰۰۰ ہم ایک ہی کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کر کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار ساگ' ترکاری' گیہوں' لہسن پیاز اور دال وغیرہ پیدا کرے"۔

اس کے بعد جب ان کو گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو وہ بہانہ سازی اور گستاخی کرنے لگے۔ یہ گستاخی نبی کے حق میں بھی تھی اور رب تعالیٰ کے حق میں بھی۔ کہنے لگے: اپنے رب کو پکارو کہ وہ کیسی ہو' اس کا رنگ کیسا ہو۔

فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ (۲: ۷۱) "پھر انہوں نے اسے ذبح کیا ورنہ وہ ایسا کرتے نہ معلوم ہوتے تھے"۔

اس کے بعد انہوں نے سبت کو بطور یوم تعطیل خود مطالبہ کیا اور پھر اس کی خلاف ورزی کی۔ پھر ان کو حکم دیا گیا کہ اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔ تو انہوں نے ذلیل و خوار ہو کر ارض مقدس میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ

يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (۵: ۲۲) "انہوں نے کہا اے موسیٰ وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں۔ ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے' جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں' ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لیے تیار ہیں اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اصرار کیا تو ان کا جواب یہ تھا:

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ

فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۵ : ۲۴) "اے موسیٰ، ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں"۔

اس کے علاوہ بار بار کی نافرمانیوں، سوالات، سرکشی اور ذاتی تہمتوں کے ذریعہ ان لوگوں نے بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اذیت دی۔ جن کی تفصیلات احادیث میں آتی ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل کرتا ہے جو محبت بھرے لہجے میں ان سے ایک گلہ ہے۔

يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (۶۱ : ۵) "اے میری قوم کے لوگو، تم کیوں مجھے اذیت دیتے ہو حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں"۔ اور ان کو اس بارے میں شک نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن ان کی یہ بات گلہ ہے جس میں عتاب بھی ہے اور نصیحت بھی ہے۔

لیکن جب انہوں نے اصلاح و استقامت کی تمام کوششوں کو نظرانداز کر دیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو مزید ٹیڑھا کر دیا۔ اور ان کے یہ دل ہدایت کے لیے قابل ہی نہ رہے۔ یہ گمراہ ہوگئے اور اللہ نے بھی ان کے لیے ضلالت لکھ دی۔

---ooo---

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۶۱ : ۵) "اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا"۔ یوں دین پر ان کی استقامت ختم ہوگئی اور ان سے محافظین دین کا منصب چلا گیا اور وہ اسی طرح ٹیڑھی راہ اور گمراہی پر رہے۔

اس کے بعد عیسیٰ ابن مریم تشریف لائے اور انہوں نے بنی اسرائیل سے کہا:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (۶۱ : ۶) "اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں"۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میں اللہ ہوں، اور نہ یہ کہا کہ میں اللہ کا بیٹا ہوں، نہ یہ کہا کہ وہ اللہ کے اقانیم میں سے ایک اقنوم ہیں۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (۶۱ : ۶) "تصدیق کرنے والا ہوں اس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے۔ اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا"۔ یوں صریح الفاظ میں رسالت کی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ سلسلہ رسالت ایک ہی ہے اور ہر رسول کے بعد جو دوسرا رسول آتا ہے وہ سابقہ رسول کی رسالت کی تصدیق کرتا ہے۔ یوں اس ایک ہی رسالت کے حلقے زمین و آسمان کے درمیان اور زمین کی طویل تاریخ کے اوپر پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور یہی تصویر اللہ کے منہاج حق کے لائق ہے۔ یہ ایک ہی دین اور ایک ہی منہاج ہے۔ اور اس شکل و صورت مختلف لوگوں کے لیے مختلف رہی ہے کیونکہ انسان مختلف ادوار میں علم، تجربات اور استعداد کے لحاظ سے مختلف رہا، اس لیے شریعت کی شکل بھی مختلف رہی ہے، لیکن نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو عقلی

اعتبار سے ایک بالغ امت دی گئی' اس لیے آپ کو ایک آخری اور مکمل شریعت دی گئی۔ ایک پختہ عقل امت کو مکمل شریعت دی گئی۔ اس دین نے انسانی عقل سے اپیل کی۔ اور عقل کے کام کے لیے ایک وسیع دائرہ عمل چھوڑ دیا تاکہ اس کے اندر وہ کام کرے' لیکن پوری انسانیت کے لیے ایک دائرہ کار بہرحال متعین کر دیا گیا تاکہ اس کے اندر وہ کام کرے اور اس دائرے کا تعین انسان کی قوت اور استعداد کو دیکھتے ہوئے خالق کائنات نے خود کیا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے انجیل میں احمد کی پیش گوئی موجود تھی۔ آج جو اناجیل رائج ہیں ان میں ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ موجودہ اناجیل 'بعد کے ادوار میں لکھی گئی ہیں' اور جن حالات میں لکھی گئی ہیں وہ بھی معلوم ہیں۔

قرآن کریم جب جزیرۃ العرب میں نازل ہوا اور یہود و نصاریٰ نے بھی پڑھا۔ جس میں تھا۔

اَلنَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ "نبی ای جسے وہ اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں"۔ تو ان میں سے بعض مخلص علماء نے اس کا اقرار بھی کیا جیسا کہ عبداللہ ابن سلام نے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اس آیت کے چھپانے کا سخت اہتمام کرتے تھے۔

پھر تاریخی روایات متواتر ہیں کہ یہودی اس نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتظار کرتے تھے اور وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اس کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ اسی طرح نصاریٰ میں سے بعض اہل توحید جو جزیرۃ العرب میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے موجود تھے' انہوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ لیکن یہودی یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ یہ نبی آخر الزمان ان میں سے ہو گا جب اللہ نے اسے حضرت ابراہیم کی اولاد کی دوسری شاخ بنی اسماعیل سے بھیج دیا' انہوں نے اس کو بہت ناپسند کیا۔ اور اس کے ساتھ جنگ شروع کر دی۔

بہرحال نص قرآنی بذات خود اس معاملے میں قطعی ہے۔ اور قرآن ہی ایک معتمد علیہ ذریعہ ہے' جس کے اندر کوئی تحریف نہیں ہوتی' جبکہ تورات اور انجیل کا حال تو سب کو معلوم ہے۔

---○○---

چنانچہ اکثر تفسیری اقوال کے مطابق درج ذیل آیات اس بارے میں ہیں کہ یہود و نصاریٰ نے اس پیغمبر کا استقبال کس طرح کیا جس کی بشارت خود ان کی کتابوں میں دی گئی تھی۔ ان آیات میں ان کے رویے کی سخت مذمت کی گئی' کہ انہوں نے اس دین کا استقبال کرنے کے بجائے' اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں حالانکہ اللہ کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ دین تمام ادیان پر غالب ہو گا اور یہی آخری دین ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۶) وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُوَ یُدْعٰۤى اِلَى الْاِسْلَامِ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۷) یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۸) هُوَ الَّذِیْ

أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ

(۹) (٦١ : ٦ تا ۹) "مگر جب وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انہوں نے کہا یہ تو صریح دھوکا ہے ۔ اب بھلا اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹے بہتان باندھے ' حالانکہ اسے اسلام (اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینے) کی دعوت دی جا رہی ہو؟ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں ' اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو ۔ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

بنی اسرائیل اس دین جدید کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے ۔ دشمنی ' سازشیں اور گمراہ کن پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اور ہر قسم کے اوچھے ہتھیار اس کے مقابلے میں لے کر آگئے اور اس دین کے خلاف انہوں نے جو جنگ شروع کی وہ آج تک ختم نہیں ہوئی ۔ انہوں نے سب سے پہلے اس پر یہ الزام لگایا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنَٰتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ (٦١ : ٦) "جب وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انہوں نے کہا یہ تو صریح جادو ہے"۔ جس طرح ان لوگوں نے کہا جو کتابوں کو نہ جانتے تھے ' نہ بشارتوں کو جانتے تھے ۔ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کا رویہ ایک ہی جیسا رہا۔ بلکہ اہل کتاب اسلامی محاذ کے اندر بھی سازشیں شروع کر دیں ۔ مہاجرین اور انصار کو لڑانے کی کوشش کی ۔ اور انصار کے دو قبائل اوس اور خزرج کو لڑانے کی کوشش کی ۔ کبھی انہوں نے مشرکین مکہ سے ایکا کر کے اس نئے دین کے خلاف جنگ کی اور کبھی انہوں نے منافقین مدینہ کے ساتھ اتحاد کر کے اس کے خلاف لڑنے کی سعی کی ۔ اور انہوں نے مدینہ اور عالم اسلام پر ہر حملہ آور کی مدد کی ۔ مثلاً غزوہ احزاب میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے جھوٹے الزامات لگا کر بھی اس میں حصہ لیا۔ جبکہ افک کے واقعہ کو انہوں نے عبداللہ ابن ابی ابن سلول کے ذریعہ خوب اچھالا اور فتنہ عثمان میں بھی انہوں نے عبداللہ ابن سبا کے ذریعہ کام کیا۔ پھر سیرت کی کتابوں میں انہوں نے منظم سازش کے ذریعہ اسرائیلیات کو داخل کیا۔ جب وہ قرآن کے اندر جعلی آیات داخل ہونے سے عاجز ہو گئے تو انہوں نے تفسیر ' سیرت اور احادیث کے اندر وضعی احادیث داخل کرنے کی سعی کی۔

یہ جنگ ' اسلام کے خلاف ' آج تک ختم نہیں ہوئی ۔ آج تک عالمی یہودیت ' عالمی عیسائیت اور صیہونیت اسلام کے خلاف رات دن سازشوں میں مصروف ہے ۔ یہ ہر طرف سے اسلام پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور لوگوں کو بھی اسلام کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتے ہیں ۔ اس جنگ میں چودہ سو سال سے نہ جنگ بندی ہوئی ہے ' نہ صلح ہوئی ہے 'کسی دور میں بھی نہیں ۔ مشرق میں جا کر انہوں نے صلیبی جنگیں لڑیں ۔ مغرب میں اندلس میں انہوں نے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیا۔ اور شرق اوسط میں انہوں نے ہمیشہ اسلامی خلافت کے خلاف جنگ کی ۔ یہاں تک کہ ترکی کی خلافت کو انہوں نے تباہ کیا اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ اس کے بعد بھی ان کی یہ جنگ ختم نہ ہوئی اور انہوں نے جعلی "ہیرو" اسلام اور عالم اسلام کے لیے پیدا کیے اور ان کے ذریعہ انہوں نے اسلام کے خلاف اپنی انتقامی پیاس کو بجھایا۔ جب انہوں نے اسلام کی آخری نشانی خلافت اسلامیہ ترکیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہا تو انہوں نے ترکی میں ایک عظیم ہیرو پیدا کیا اور اس

کے اندر اس قدر ہوا بھری کہ وہ بہت بڑا زعیم بن گیا۔ اس کے بعد اس کے مقابلے میں اتحادیوں کی فوجوں نے پسپائی اختیار کی ' جنہوں نے آستانہ کو فتح کر لیا تھا تاکہ اس شخص کو بہت بڑا فاتح بنا کر پیش کیا جا سکے۔ ایک ایسا فاتح جو خلافت اسلامیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکے۔ اس نے ترکی کو عالم اسلام سے جدا کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ ترکی لادینی ریاست ہے۔ اس کا دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب بھی یہودی اسلام پر ضرب لگانا چاہیں وہ عالم اسلام کے لیے اس قسم کے لیڈر پیدا کرتے ہیں۔ جب بھی وہ صحیح اسلامی تحریکات پر ضرب لگاتے ہیں ' وہ مسلمان ممالک میں اس قسم کے لیڈر پیدا کرتے ہیں ان کے ذریعہ یہ ان ممالک میں اسلامی حمیت اور اسلامی عصبیت کے علاوہ ہر عصبیت پیدا کرتے ہیں ' اسلامی جھنڈوں کے علاوہ ہر جھنڈا بلند کرتے ہیں۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۶۱ : ۸) "یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں ' اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔ قرآن کی یہ آیت ایک عظیم حقیقت کا اظہار کر رہی ہے۔ اور اس حقیقت کو ایک ایسی تصویری انداز میں پیش کیا گیا جس سے انسان کو ان لوگوں کی حالت پر بے اختیار ہنسی آتی ہے وہ اپنے منہ سے یہ الزام لگاتے تھے کہ یہ کھلا جادو ہے ' اور اس کے خلاف یہ سازشیں کرتے تھے اور خفیہ منصوبے بنا کر اسے ختم کرنا چاہتے تھے اور اس جدید دین کا قصہ ہی تمام کرنا چاہتے تھے ' اس لیے اللہ نے ان کے منصوبوں کے مقابلے میں ان کی یہ مایوس کن تصویر کھینچی کہ وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں۔ اللہ کا نور اور یہ ضعیف اور حقیر!!

وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۶۱ : ۸) "اور اللہ اپنے نور کو پوری طرح پھیلا کر رہے گا ' اگرچہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے"۔ اللہ کا وعدہ سچا ہوا۔ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اپنے نور کو پوری طرح پھیلا دیا۔ اس نے ایک اسلامی جماعت ' نہایت ہی زندہ و تابندہ اسلامی جماعت کھڑی کر دی۔ اور اسے اسلامی نظام زندگی نہایت ہی واضح نشانات کے ساتھ دیا۔ اور اس کے حدود و قیود متعین کیے۔ نسلوں تک یہ نظریہ لوگوں کی عملی زندگی میں زندہ اور متحرک رہا ' صرف کتابوں میں نہیں ' اللہ نے اسے عالم واقعہ میں غالب کیا۔ اللہ پاک نے اس نور کو مکمل کیا ' مسلمانوں کا دین مکمل ہوا ' مسلمانوں پر اپنی نعمتوں کو تمام کیا۔ اور ان کے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔ ان کے لیے اس دین کو محبوب بنا دیا ' وہ اس کے لیے لڑتے رہے ' حالت یوں ہو گئی کہ اگر کسی مسلمان کو آگ میں ڈال دیا جائے تو وہ اسے پسند کرے گا مگر کفر کی طرف لوٹنا پسند نہ کرتا تھا۔ چنانچہ دین کی صورت لوگوں کے دلوں میں مکمل ہو گئی۔ اور آپ کے بعد بھی یہ صورت حال کبھی کبھی پیدا ہوتی رہی ہے اور قائم رہتی ہے۔ باوجود کہ اس کے کہ ہر طرف سے مسلمانوں کے خلاف سازشیں ' ستم اور پکڑ دھکڑ شروع ہے۔ باوجود ہر طرف کے حملوں کے اسلام ہر کربلا کے بعد زندہ ہوتا ہے اس لیے کہ اسلام اللہ کا نور ہے اور اللہ کے نور کو انسانی کوششیں ختم نہیں کر سکتیں۔ نہ آگ اور لوہا اس کو ختم کر سکتا ہے۔ اگرچہ عالم اسلام کے مصنوعی لیڈر جو یہودیوں اور نصرانیوں کے خود ساختہ لیڈر ہیں۔ بعض اوقات یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اسلام کو ختم کر دیا ہے اور اس کا

نور بجھا دیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا اللہ کا فیصلہ یہ تھا کہ نور خدا پھیل جائے اور دین غالب ہو۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (٦١ : ٩) "وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اسلامی نظام زندگی ہدایت ہے اور دین حق ہے۔ یہ ایک فیصلہ کن بات ہے اور اس پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ کا ارادہ پورا ہو گیا اور یہ دین تمام ادیان پر غالب ہو گیا ہے۔ یہ دین اپنی ذات اور اپنی تشکیل کے لحاظ سے واحد دین ہے' اس کے مقابل کا کوئی دین نہیں ہے۔ مثلاً دنیا کے بت پرستانہ ادیان کے اندر تو مقابلے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ رہے کتابی دین تو یہ اسی سلسلے کا آخری اور مکمل دین ہے' اور اللہ کے نظام کا یہ آخری ایڈیشن ہے۔ یہ اپنی مکمل اور اعلیٰ صورت میں ہے۔

سابقہ کتب سماوی کے اندر بے شمار تحریفات کر دی گئی ہیں' ان کی شکل بدل گئی ہے اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں اور ان میں وہ اضافے ہو گئے ہیں جو ان میں نہ تھے۔ ان کے اندر کانٹ چھانٹ کر دی گئی ہے۔ پھر وہ اس حالت تک پہنچ گئی ہیں کہ وہ آج جدید دور کی زندگی کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ان کے اندر تحریف نہیں ہوئی تو بھی وہ سابقہ ایڈیشن ہیں جبکہ دین اسلام اللہ کے نظام کا آخری اور تازہ ترین نسخہ ہے جس کے اندر جدید ترقی یافتہ زندگی کے تمام مسائل حل کر دیئے گئے ہیں۔ سابقہ ادیان اللہ کی اسکیم کے مطابق ایک محدود وقت کے لیے آئے تھے۔

اللہ کا یہ وعدہ نفس دین اور اس کی نوعیت اور اس کے احکام و مواد کے اعتبار سے تو پورا ہوا کہ دین اسلام کے مقابلے کا کوئی دین نہیں ہے لیکن یہ نظام عملی زندگی میں بھی ایک غالب نظام رہا ہے۔ ایک بار تو یہ دین غالب ہو کر رہا ہے۔ یہ اس کرۂ ارض پر اس قدر غالب ہوا کہ تمام ادیان' تمام اقوام تقریباً ایک سو سال تک اس کے زیر نگیں رہے۔ اس کے بعد بھی یہ دین وسط ایشیا اور وسط افریقہ میں سیلاب کی طرح پھیل گیا۔ یہاں تک کہ ابتدائی جہادی جدوجہد کے ذریعہ اس کے اندر جس قدر لوگ داخل ہوئے اس کے بعد محض تبلیغی جدوجہد کے ذریعہ اپنی ذاتی قوت سے یہ دین پانچ گنا علاقے اور آبادی میں پھیل گیا۔ آج بھی یہ دین بغیر حکومتی قوتوں کے پھیل رہا ہے۔ حالانکہ یہودی اور صیہونی سازش نے اہل دین کے سیاسی نظام' نظام خلافت کو ختم کر دیا ہے۔ یہ نظام ان لوگوں نے ترکی میں اس ہیرو کے ہاتھوں ختم کرایا جسے اس مقصد کے لیے انہوں نے خود گھڑا تھا۔ اور باوجود اس کے کہ پورے عالم اسلام میں اس دین کے خلاف رات دن سازشیں ہو رہی ہیں اور پورے عالم اسلام میں یہودیوں کے ہاتھوں نصب کردہ "ہیرو" عالم اسلام میں اٹھنے والی اسلامی تحریکات کچل رہے ہیں لیکن یہ اللہ کا چراغ ہے اور پھونکوں سے اسے بجھایا نہیں جا سکتا۔

غرض باوجود اپنوں اور غیروں کی سازشوں کے یہ دین انسانی تاریخ میں اب بھی اہم کردار سرانجام دے رہا ہے اور پہلے بھی اس نے ادا کیا ہے۔ اور انسانی سازشیں اس کی راہ نہیں روک سکتیں۔ کیونکہ اللہ کے مقابلے میں انسان کی قوت کوئی قوت نہیں ہے۔ اگرچہ وہ بہت گہری چال چلیں کیونکہ اللہ بھی گہری چال چلتا ہے۔

یہ آیات اس وقت اہل ایمان کے حوصلے بڑھا رہی تھیں جب قرآن کے ابتدائی سامعین یہود و نصاریٰ کی کوششوں اور سازشوں کے علی الرغم غلبہ دین کی جدوجہد کر رہے تھے اس وقت بھی دین کو تو اللہ غالب کر رہا تھا' مسلمان تو دست

قدرت کے لیے ایک پردہ اور بہانہ تھے ۔ اور آج بھی یہ آیات ان لوگوں کے لیے ایک حوصلہ پیدا کر رہی ہیں جو غلبہ دین کا کام کر رہے ہیں اور آئندہ بھی غلبہ دین کے لیے اٹھنے والی تحریکات کے لیے یہ آیات مشعل راہ ہوں گی اور وہ دن دور نہیں ہے کہ ایک بار پھر یہ دین غالب ہو کر رہے گا ۔

---ooo---

اسلامی نظریہ حیات کے تسلسل کے بیان کے بعد ' اور اس وعدے کے بعد کہ اس دین کو غالب ہو کر رہنا ہے ۔ اگرچہ کافر اس کے خلاف سازشیں کریں ' اب روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے ۔ اس وقت کے مسلمانوں کو بھی خطاب ہے ۔ اور اس کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو بھی یہ خطاب ہے کہ مسلمانو ' اس دین کی رو سے ایک بہترین تجارت تمہیں بتائی جا رہی ہے ' یہ تجارت جہاد فی سبیل اللہ ہے ۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ (۱۰) تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۱) یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَیُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۱۲) وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۳) (۶۱ : ۱۰ تا ۱۳)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذاب الیم سے بچا دے ؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر ' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے ۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو ۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا ' اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ' اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا ۔ یہ ہے بڑی کامیابی ۔ اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو ' وہ بھی تمہیں دے گا ' اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح ۔ اے نبی اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو “ ۔

ذرا انداز تعبیر پر غور فرمائیں ۔ بعض چیزوں کو باہم ملایا گیا ' بعض کو اپنی جگہ سے دور رکھا گیا ہے ۔ استفہام اور جواب استفہام کے درمیان ایک فاصلہ رکھا گیا ہے ۔ بعض چیزوں کو مقدم کیا گیا ہے اور بعض کو موخر کر دیا گیا ہے ' ان سب امور کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ پکار اور یہ آواز اچھی طرح لوگوں کے دلوں کے اندر اتر جائے اور اسالیب تعبیر کے تمام ذرائع استعمال کر کے بات کو دلوں تک بلکہ دلوں کی تہوں تک اتارا جائے ۔

دیکھیے پکار کا آغاز ۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۶۱ : ۱۰) سے ہے ' اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' اور اس کے بعد اللہ ان سے

پوچھتا ہے کہ بتاؤں تمہیں ایسی تجارت؟ اس سے سامعین کے دلوں میں بھرپور شوق پیدا کیا جاتا ہے۔

هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۶۱ : ۱۰) "میں بتاؤں تمہیں وہ تجارت جو تمہیں عذاب الیم سے نجات دے دے؟"

اب کون ہے جو اس قسم کی تجارت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بے تاب نہ ہوگا۔ لیکن یہاں آیت ختم ہو جاتی ہے اور درمیان میں فصل آ جاتی ہے۔ استفہام اور جواب استفہام کے درمیان آیت ختم ہو کر وقف آ جاتا ہے اور سامع کے دل میں اگلی آیت سننے کے لیے بے تابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جواب آتا ہے جبکہ سامعین بے تاب تھے۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۶۱ : ۱۱) "ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر"۔ وہ تو اللہ اور رسول پر ایمان لا چکے تھے۔ اور وہ جب جواب سنتے ہیں تو ان کے دل روشن ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ جواب شرط تو پہلے سے ان کے اندر موجود ہے۔

وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (۶۱ : ۱۱) "اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے"۔ اور یہی اس سورت کا مضمون اور محور ہے۔ اس انداز میں یہ آ رہا ہے' بار بار تکرار کے ساتھ' اس طرح اسے مضمون کے اندر بار بار دہرایا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ انسان کو تربیت دینے کے لیے بار بار کی یاد دہانی کی ضرورت ہے۔ مختلف انواع و دلائل اور مختلف قسم کی تائید و تاکید کے ساتھ تاکہ اس قدر پر مشقت فرائض کی ادائیگی کے لئے نفس انسانی تیار ہو جائے۔ کیونکہ اس قسم کے پر مشقت فرائض کی ادائیگی کے بغیر نہ اسلامی منہاج یہاں زندہ رہ سکتا ہے اور نہ اس کو بچایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اس تجارت پر مزید تبصرہ کیا جاتا ہے اور اس تجارت کی تعریف و تحسین کی جاتی ہے۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۶۱ : ۱۱) "یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو"۔ اس لیے کہ انسان کسی بھلائی کی طرف تب ہی لپکتا ہے جب اسے علم ہو کہ بھلائی یہ ہے۔ اس کے بعد اگلی آیات میں اس بھلائی اور تجارت کی مزید تفصیلات دی جاتی ہیں۔ کیونکہ اجمال کے بعد تفصیلات کا اثر بہت ہوتا ہے۔ اس طرح بات احساس میں مستقلاً بیٹھ جاتی ہے۔

يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (۶۱ : ۱۲) "اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا"۔ اس تجارت اور بھلائی کی یہ ایک بات ہی کافی ہے۔ اگر اس کے بعد کوئی اور کیا چاہے گا کہ اس کے گناہ معاف ہو جائیں یا اپنے لیے اور کیا ذخیرہ کرے گا۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم کی حدود نہیں ہوتیں اس لیے۔

وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ

"اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا"۔ اس سے بڑی تجارت اور کیا ہے کہ ایک مجاہد اپنی اس مختصر زندگی میں جہاد کرے' وہ اپنی جان دے دے اور اس کے عوض اسے یہ باغات اور ابدی زندگی ملے اور بہترین مکانات اور نعیم مقیم میں رہے ۔ اور یہ عظیم حقیقت ہے کہ کیسی بڑی کامیابی ہے ۔

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۶۱ : ۱۲) "یہ ہے عظیم کامرانی" یہاں آکر اس نہایت ہی نفع بخش تجارت کا سودا ختم ہو گیا ۔ فی الواقعہ یہ تو بہت بڑا نفع ہے ۔ کہ ایک مومن مختصر دنیا دے کر ابدی آخرت لے لے ۔ اگر کوئی ایک روپے کی تجارت کرکے دس کما لے تو بازار میں اس کا چرچا ہو جاتا ہے' لیکن اس شخص کا حال کیا ہو گا کہ وہ اس دنیا کی محدود زندگی میں جہاد کرے اور دنیا کا محدود متاع دے دے اور آخرت کا لامحدود زمانہ مزے کرے اور آخرت کا متاع و عیش حاصل کرے' جو لامحدود اور لامقطوع ہے ۔

یہ سودا حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور حضرت عبداللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ہوا تھا ۔ یہ عقبہ کی رات کو ہوا تھا ۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کہا کہ آپ ﷺ اپنے لیے جو چاہیں' شرائط رکھ لیں ۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ رب کے لیے میں یہ شرائط عائد کرتا ہوں کہ تم اس کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو ۔ اور اپنے لیے میں یہ شرط عائد کرتا ہوں کہ تم میرا دفاع اس طرح کرو گے جس طرح تم اپنے مال اور جان کا دفاع کرتے ہو"۔ تو انہوں نے کہا کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمیں کیا ملے گا ۔ تو آپ نے فرمایا ۔

(الجنۃ) تو انہوں نے کہا اس سودے میں بہت بڑا فائدہ ہو گیا ہمیں' نہ ہم اس سودے کو منسوخ کرتے ہیں اور نہ فریق دوئم کی درخواست اس سلسلے میں مانتے ہیں ۔

لیکن اللہ کا فضل تو بہت عظیم ہے ۔ اللہ جانتا ہے کہ انسانی نفوس اس جہاں میں بھی کچھ چاہتے ہیں ۔ انسان کی محدود ساخت چاہتی ہے کہ اس جہاں میں بھی کچھ مزا ملے تو اللہ تعالیٰ ان کو خوشخبری دیتا ہے کہ اس جہاں میں بھی تمہیں فتح مبین اور غلبہ دین حاصل ہو گا ۔ اور اسلامی نظام زندگی قائم ہو کر رہے گا ۔ اور تمہاری نسل کے اندر ہو کر رہے گا ۔

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۶۱ : ۱۳) "اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو' وہ بھی تمہیں دے گا ۔ اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح ۔ اے نبی' اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو"۔

یہ سودا یہاں شرح منافع کی انتہاؤں کو چھو لیتا ہے ۔ اور یہ منافع اللہ ہی دے سکتا ہے ۔ وہ اللہ جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے' وہ اللہ جس کی رحمت کو روکنے والا کوئی نہیں ہے ۔ یہ رحمتیں کیا ہیں' مغفرت گناہ' باغات' بہترین مکانات' جن کے اندر نہ ختم ہونے والی نعمتیں ہوں گی اور اس سودے کا منافع صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ ان کی ایک قسط یہاں دنیا میں بھی دی جائے گی ۔ اللہ کی نصرت اور غلبہ دین اور فتح مبین ۔ کون ہے جو ایسی تجارت نہ کرے گا یا اس میں تامل کرے گا ۔ یا اس سے پہلوتہی کرے گا ۔

اس ترغیب اور تلقین کے بعد نفس انسانی کے تصور کا منظر آتا ہے۔ یہ تصور انسان کے لیے بہت اہم ہے۔ جو شخص اس کائنات اور اس کی اندر اس زندگی کا ایمانی تصور رکھتا ہو' اور وہ اپنے دل میں یہ تصور رکھتے ہوئے زندگی بسر کر رہا ہو' اس تصور کے وسیع آفاق اور حدود بھی رکھتا ہو' اس کے بعد یہ شخص اگر ایسی زندگی کے بارے میں سوچے جو ایمان سے خالی ہے۔ جو نہایت ہی محدود تنگ اور چھوٹی زندگی ہے' جس کی سطح بہت گری ہوئی ہے۔ جس کی اہم ترین باتیں نہایت ہی حقیر ہیں۔ تو اس قسم کا دل جس نے ایمان کی یہ وسعتیں دیکھی ہوئی ہیں وہ اس قدر محدود اور حقیر زندگی میں ایک منٹ کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ ایک منٹ بھی اس جہاد اور جدوجہد میں شرکت سے تاخیر نہ کرے گا' جس کا مقصد اس طرح کی وسعت والی زندگی کو اس کرۂ ارض پر قائم کرنا ہے' تاکہ اس میں وہ بھی زندہ رہے' اور لوگ بھی زندہ رہیں۔ اور پھر صورت یہ ہے کہ وہ اس جہاد اور جدوجہد پر کوئی اجر بھی طلب نہ کرتا ہو۔ کیونکہ یہ زندگی اور یہ نظام بذات خود ہی ایک مقصد اور اجر ہے۔ یہ نظریہ جہاد جو دل کو خوشی اور فرحت سے بھر دیتا ہے' اسے کون ترک کر سکتا ہے اور اس کے سوا کون زندہ رہ سکتا ہے۔ ایسا شخص دوڑ کر اس جہاد میں کود پڑتا ہے۔ آتش نمرود ہو تو بھی کود پڑتا ہے' جو بھی نتیجہ ہو' کود پڑتا ہے۔

لیکن دیکھئے اللہ کو معلوم ہے کہ نفس انسانی بہت ضعیف ہے' کسی وقت بھی اس کے جوش و خروش میں کمی آ سکتی ہے۔ اور یہ کہ جہاد میں تیزی کسی بھی وقت کند ہو سکتی ہے اور امن کوشی اور سلامت پسندی انسان کو کبھی گری ہوئی زندگی گزارنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔ اس لیے قرآن کریم ایک ہی اسلوب پر بات کر کے ختم نہیں کر دیتا۔ وہ نفس انسانی کو تیار کرنے کے لیے ہر پہلو سے سعی کرتا ہے۔ ہر قسم کے موثرات' دلائل' شواہد اور مثالیں دیتا ہے۔ بار بار پکارتا ہے اور انسان کو صرف ایمان اور افراد کے حوالے نہیں کر دیتا' نہ ہی صرف ایک بار حکم دے دیتا ہے جس طرح ایک سرکاری افسر سرکلر جاری کر دیتا ہے۔

---ooo---

چنانچہ سورت کا خاتمہ ایک نئی پکار سے ہوتا ہے۔ اس پکار کا نیا رنگ ہے۔ ایک جدید دلیل' ایک موثر مثال اور ایک نئے پہلو سے آمادگی اور اکساتا۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُونُوٓا۟ أَنصَارَ ٱللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ٱبْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّـۧنَ مَنْ أَنصَارِىٓ إِلَى ٱللَّهِ ۖ قَالَ ٱلْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ ٱللَّهِ ۖ فَـَٔامَنَت طَّآئِفَةٌ مِّنۢ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ وَكَفَرَت طَّآئِفَةٌ ۖ فَأَيَّدْنَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا۟ ظَٰهِرِينَ (۶۱:۱۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کے مددگار بنو' جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں کو خطاب کر کے کہا تھا: "کون ہے اللہ کی طرف (بلانے) میں میرا مددگار؟" اور حواریوں نے جواب دیا تھا: "ہم ہیں اللہ کے مددگار"۔ اس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے"۔

حواری کون تھے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد۔ یہ تعداد میں ۱۲ تھے۔ یہ ہروقت آپ کے ساتھ ہوتے تھے اور آپ سے تعلیمات لیتے تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے آپ کے اٹھائے جانے کے بعد آپ کی وصیتوں اور آپ کی تعلیمات کو پھیلایا۔

آیت کا مقصد ان کے حالات زندگی بیان کرنا نہیں ہے بلکہ انہوں نے دعوت کے حوالے سے جو موقف اختیار کیا' اسے پیش کرنا ہے' لہٰذا ہم بھی یہاں اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ (۱۴:۶۱) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کے مددگار بنو"۔ کس قدر بلند مقام تک اللہ اپنے مجاہد بندوں کو لے جاتا ہے۔ انسان کے لیے اس سے بڑا مقام اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کا معاون ہو جائے۔ اس صفت میں اتنی بڑی عزت افزائی ہے جو جنت اور اس کی نعمتوں سے بھی بڑی ہے۔ اللہ کے انصار بن جاؤ!

كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ (۱۴:۶۱) "جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں کو خطاب کر کے کہا تھا: "کون ہے اللہ کی طرف (بلانے) میں میرا مددگار؟" اور حواریوں نے جواب دیا تھا: "ہم ہیں اللہ کے مددگار"۔ تو انہوں نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر دیا اور یہ مقام عزت پایا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کے فرائض منصبی میں یہ بات شامل تھی کہ آپ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں بشارت دیں اور دین آخیر کے بارے میں خوشخبری دیں۔ لہٰذا حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے متبعین اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اس کام کے لیے آگے بڑھیں۔ جس طرح حواریوں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ یہی اس حوالے میں آمادہ کرنے اور اکسانے والی بات ہے۔ اور پھر کیا ہوا انجام؟

فَآمَنَت طَّائِفَةٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَت طَّائِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ (۱۴:۶۱) "اس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے"۔

اس آیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ حضرت مسیح کی نفس رسالت پر ایمان لائے تھے یعنی مسیحی چاہے ان کے عقائد درست ہوں یا بعد میں مشرک ہو گئے ہوں اور ان کے عقائد میں شدید انحرافات آ گئے ہوں' ان کو اللہ نے ان لوگوں پر غالب کر دیا جو حضرت عیسیٰ کی رسالت ہی کو نہ مانتے تھے۔ یعنی یہودیوں پر جس طرح تاریخ شاہد ہے اور دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ لوگ جو ان کی رسالت پر ایمان لائے اور عقیدۂ توحید اور بشریت رسول پر بھی قائم رہے تو اللہ نے ان اہل توحید کی حجت اور برہان کے لحاظ سے تائید کی بمقابلہ ان لوگوں کے جو مشرک ہو گئے اور جنہوں نے حضرت مسیح کو الٰہ مانا' ان کی والدہ کو الٰہ مانا یا روح القدس کو الٰہ مانا' اور پھر ان اہل توحید کی تائید دین اسلام کے عقیدۂ توحید سے بھی ہوئی اور دین مسیح' دین اسلام کی شکل میں غالب ہو گیا' تو یہ دوسری تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

اس اشارہ اور اس واقعہ سے مراد عبرت یہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ۔ یہ کہ مومنین کو جہاد فی سبیل للہ کے لیے تیار کرنا جو اس سورت کا محور ہے ۔ کیونکہ مومنین ہی اللہ کے دین کے قیام کے ذمہ دار ہیں ۔ یہی وارث ہیں رسالت آخرہ کے ۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اس عظیم مقصد کے لیے نکالا گیا ہے ۔ ان کو چاہئے کہ وہ اٹھیں اور اپنا فریضہ حیات پورا کریں ۔ ”جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: کون ہے اللہ کی طرف بلانے میں میرا مددگار ۔ اور حواریون نے جواب دیا تھا: ”ہم ہیں للہ کے مددگار“ ۔ اور آخرت کی نصرت اور فتح انہی لوگوں کی ہوتی ہے جو للہ کے مددگار اور اس کے دین کے خادم ہوتے ہیں ۔

یہ اس سورت کی آخری پکار ہے ۔ آخری چٹکی اور آخری اکساہٹ ہے ۔ اس کا اپنا رنگ اور الگ ذائقہ ہے ۔ اور یہ مثال اس سورت کے مضمون کے ساتھ نہایت ہی مناسب ہے ۔ ایک تاریخی مثال اور تاریخی رنگ ۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ــ ٢٨

سورۃ الجمعة ـ ٦٢

١ ــ تا ــ ١١

سورۃ الجمعۃ ایک نظر میں

یہ سورت 'سورہ الصف کے بعد نازل ہوئی ۔ موضوع اور محور وہی ہے جو سورہ صف کا ہے ۔ البتہ یہ اس موضوع کو ایک نئے پہلو اور ایک نئے انداز میں لے رہی ہے ۔ اور اس میں بالکل جدید دلائل دیئے گئے ۔ یہ سورت مدینہ کی جماعت مسلمہ کے ذہن میں یہ بات بٹھاتی ہے کہ دعوت اسلامی کو پھیلانے کے لیے 'اللہ نے جس جماعت کا انتخاب کیا ہے' یہ آخری جماعت ہے ۔ اور یہ اس کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے ۔ اور اس پر خدا کا بہت بڑا فضل ہے کہ خاتم الانبیاء کو یہ خاتم الامم امت دی گئی ۔ پھر نبی آخرالزمان' خاتم الانبیاء کا' ایک امی امت عربوں کے اندر بھیجا جانا' اللہ کا بہت بڑا کرم ہے اور اس کی قدر کرنی چاہئے ۔ پھر جب لوگوں کو اللہ نے یہ توفیق دی کہ وہ رسول کریم کی دعوت کو قبول کریں 'تو ان کو چاہئے کہ وہ اس امانت کو اٹھائیں اور اس کی ذمہ داریاں پوری کریں ۔ اور یہ احساس بھی کرنا چاہئے کہ ان کی ایک تاریخ ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی منشا یہ ہے کہ یہ بیج جو یہاں بویا گیا ہے 'یہ بڑھ جائے اور دور تک پھیل جائے ۔ جبکہ بنی اسرائیل جو اہل کتاب اور تعلیم یافتہ تھے' انہوں نے اس امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا ہے اور انہوں نے ایک طویل عرصہ تک عالم بالا سے تعلق رکھنے کے باوجود' اب اس تعلق کو توڑ دیا ہے ۔ اور ان کی مثال یوں ہے کہ تورات کو اٹھائے پھرتے ہیں لیکن اس طرح جس طرح گدھے پر کتابیں لاد دی جائیں ۔ وہ تورات کی تعلیمات کو سمجھتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں ۔

یہ ہے وہ اصل موضوع اور محور جو اس سورت میں لیا گیا ہے ۔ اور یہ ہیں وہ باتیں جو اس سورت کے ذریعہ' مسلمانوں کے دلوں میں بٹھانے کی سعی کی گئی ہے ۔ خصوصاً وہ لوگ جو اس وقت مدینہ طیبہ میں موجود تھے ۔ اور یہ وہ لوگ تھے جن کو یہ ڈیوٹی دی گئی تھی کہ تم نے اسلامی نظام حیات کو مدینہ میں عملاً برپا کرنا ہے اور ان تحریکات کی طرف بھی اس میں اشارہ کیا گیا جو مدینہ کی جماعت کے بعد یہ ذمہ داری قبول کریں گی' وہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہوں گی ۔

اس سورت میں مدینہ کی جماعت مسلمہ کے بعض عملی حالات کو بھی لیا گیا ہے اور عملی ہدایات دی گئی ہیں ۔ خصوصاً جماعت کی نفسیاتی تربیت کے سلسلے میں' اس سے بعض دینی اور اخلاقی کمزوریاں دور کرنا بھی مطلوب تھیں ۔ کسی جماعت کی ذہنی اور نفسیاتی تطہیر کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ جذبات' میلانات' رکاوٹیں' لالچ' دنیاوی مفادات' عرب کلچر کی موروثی عادات' اور رسم و رواج' خصوصاً دولت سمیٹنے کی عادات اور وہ تمام باتیں جو اس عظیم مشن اور عظیم بار امانت اٹھانے کی راہ میں حائل تھیں ۔ ان کو دور کرنا ایک مشکل کام تھا ۔ اس سلسلے میں ایک متعین واقعہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ ایک دن خطبہ جمعہ دے رہے تھے کہ تجارتی قافلوں میں سے ایک قافلہ پہنچ گیا ۔ جونہی اعلان ہوا کہ قافلہ آگیا ہے' لوگ خطبہ جمع چھوڑ کر قافلے پر ٹوٹ پڑے' اور خریداری کے کام میں لگ گئے ۔ خصوصاً قافلوں میں جو لہو و لعب ہوتے ہیں' ایام جاہلیت کے رواج کے مطابق کہ قافلوں کے ساتھ دف بجانے والے اور دوسرے گانے بجانے والے بھی ہوتے تھے' سب لوگ چلے گئے اور رسول اللہ کو کھڑا چھوڑ دیا ۔ صرف ۱۲ آدمی رہ گئے' جن میں حضرت ابوبکر

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما موجود تھے۔ اور آپ کی باتیں سنتے رہے' جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لوگوں کی تعداد پوری طرح منضبط نہ کی جا سکی ہو۔ بہرحال لوگوں نے یہ حرکت بہرحال کی' جس پر قرآن کریم میں تنبیہہ کی گئی۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں لوگوں کی تربیت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور قرآن کو کس قدر محنت کرنی پڑی اور ان محنتوں کے بعد ہی جا کر وہ لوگ اس مقام تک پہنچے جس تک پہنچے۔ ایک، تو یہ حال کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر چلے جائیں اور ایک یہ کہ پھر وہ تاریخ اسلام کو کیا بلکہ پوری انسانی تاریخ میں ایک منفرد جماعت بن جائیں۔ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ اس قسم کی جماعت کی تعمیر و تشکیل کا کام کس قدر دشوار ہے' جس پر عظیم امانت کے اٹھانے کا دباؤ ڈالنا مطلوب ہو' آئندہ بھی کوئی ایسی جماعت تیار کرنا چاہے' اور اسلامی نظام زندگی کو عملاً برپا کرنے کا مقصد اس کے پیش نظر ہو تو اسے انہی خطوط پر تربیتی جدوجہد کرنی ہوگی۔

اس سورت میں یہودیوں کو ایک چیلنج بھی دیا گیا ہے' کہ آؤ موت کی تمنا کریں اس شخص کے لیے یا اس گروہ کے لیے جو باطل پر ہو۔ یہ اس لیے کہ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام لوگوں کے مقابلے میں اللہ کے زیادہ محبوب اور دوست ہیں' اور یہ کہ وہ اللہ کی برگزیدہ قوم ہیں' اور یہ کہ ان کے علاوہ کسی قوم میں کوئی رسول کس طرح آ سکتا ہے۔ یہ اس قسم کے لمبے چوڑے دعوے کرتے تھے' قرآن کریم نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ ان کو اچھی طرح یقین ہے کہ وہ بر سر باطل ہیں' اس لیے وہ ہرگز اس چیلنج کو قبول کرنے کی ہمت نہ کریں گے' اور بتایا جاتا ہے کہ یہ موت سے بہت بھاگتے ہیں' لیکن یہ جہاں بھی ہوں' موت ان تک رسائی حاصل کرے گی اور ان کو میدان حشر میں اٹھایا جائے گا اور وہاں ان کو پورا پورا اعمال نامہ بتا دیا جائے گا کہ یہ کیا کرتے رہے ہیں۔ یہ بات اگرچہ یہودیوں کو خطاب کر کے کہی گئی ہے لیکن اشارۃً مومنین کے لیے بھی یہی ہے کہ وہ بھی ایسے نہ بن جائیں' جو لوگ اس دنیا میں دعوت دین کی امانت کے حامل بنا دیئے گئے ہیں' ان کو چاہئے کہ وہ اس سلسلے میں اپنے فرائض ادا کریں' اگرچہ ان کی جان بھی اس راہ میں چلی جائے۔

یہ ہے اصل تجارت کہ کوئی اس منزل کی راہ و رسم سے واقف ہو۔ اور تجارت کا یہ مضمون سورہ صف کے مضمون سے ملتا ہے۔ وہاں تجارت بتا دی گئی ہے جو ایک مسلمان نے کرنی ہے' اور یہاں وہ تجارت بتائی گئی ہے' جس سے دور بھاگنا ہے۔ دونوں جگہ تجارت کے الگ الگ پہلو ہیں۔ قرآن کا اسلوب دونوں جگہ ایک ہے جو تاثرات دینے میں دونوں جگہ الگ ہیں۔ اگرچہ مقصد ایک ہے۔ دونوں سورتیں ایک ہی سمت میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ ذرا تفصیلات دیکھئے!

---ooo---

درس نمبر ۲۶۲ تشریح آیات

۱ ــ تا ــ ۱۱

سورۃ الجمعۃ (۶۲) مدنیۃ (۱۱۰) آیاتها ۱۱ رکوعاتها ۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ الۡمَلِکِ الۡقُدُّوۡسِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے --- بادشاہ ہے نہایت مقدس ' زبردست اور حکیم"۔

اس آغاز میں بتایا جاتا ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ لیکن یہ کائنات جو تسبیح کر رہی ہے اس میں سے جن چیزوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ اس سورت کے موضوع اور محور کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اور اس کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہیں۔ سورت کا نام جمعہ ہے۔ اس میں یہ تعلیم ہے کہ جمعہ کی اہمیت کیا ہے ' اس دن تمام امور سے فارغ ہو کر اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور جمعہ کی نماز کے وقت لہو و لعب اور محنت و تجارت چھوڑ کر ' اللہ کے ذکر کی طرف آنا چاہئے۔ لوگ جمعہ کو چھوڑ کر اور خطبہ جمعہ چھوڑ کر جس مال تجارت کی طرف بھاگے ہیں ' اس کا مالک تو اللہ ہے ' جو بادشاہ مطلق ہے۔ دنیا کا یہ مال اس کے اختیار میں ہے اور وہ "القدوس" ہے۔ وہ مقدس ہے اور پاک ہے اور پوری کائنات اس کی پاکی اور تقدیس بیان کر رہی ہے۔ جبکہ یہ لوگ اس کی تقدیس چھوڑ کر لہو و لعب اور تجارت کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ وہ "العزیز" ہے ' یہودیوں کو جو دعوت مباہلہ دے رہا ہے ' وہی غالب ہے ' وہ سب لوگوں کو اٹھا کر ان سے حساب و کتاب کا انتظام کرتا ہے۔ اور وہ "الحکیم" ہے۔ جس نے عربوں جیسی ناخواندہ قوم سے ایک رسول اٹھایا جو آیات پڑھ کر سناتا ہے ' علم و دانش سکھاتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم خطبہ جمعہ کا مقصود ہے۔ غرض جو صفات یہاں آغاز میں لائی گئی ہیں ' سورت کا مضمون بھی انہی کی سمت پر ہے۔

ہُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۲﴾ وَّ
اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳﴾ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ
يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۴﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ
ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا
اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَاۗءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۶﴾ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۷﴾
قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ ۱
الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾ ع ۸
۱۱

"وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا' جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے' ان کی زندگی سنوارتا ہے' اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے اور (اس رسول کی بعثت) ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی ان سے نہیں ملے ہیں ۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے ۔ یہ اس کا فضل ہے' جسے چاہتا ہے دیتا ہے' اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے ۔ جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا' ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہیں ۔ اس بھی زیادہ بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا ہے ۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا ۔ ان سے کہو "اے لوگو جو یہودی بن گئے ہو' اگر تمہیں یہ گھمنڈ ہے کہ باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر بس تم ہی اللہ کے چہیتے ہو تو موت کی تمنا کرو۔ اگر تم اپنے اس زعم میں سچے ہو"۔ لیکن یہ ہرگز اس کی تمنا نہ کریں گے اپنے ان کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں' اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے ۔ ان سے کہو "وہ جس موت سے تم بھاگتے ہو' وہ تو تمہیں آکر رہے گی ۔ پھر تم اس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے' اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

کہا گیا ہے کہ عربوں کو امی اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ لوگ بالعموم لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے ۔ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مہینہ تو یوں ہے' یوں ہے اور یوں ہے اور دس انگلیوں کے ساتھ تین بار اشارہ کیا اور فرمایا ہم ایک امی امت ہیں' ہم حساب اور کتاب نہیں کرتے"۔ (جصاص) یہ بھی کہا گیا ہے جو لکھا پڑھا نہیں ہے اسے امی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اس حال میں ہے جس طرح ماں سے پیدا ہوا ہے ۔ کیونکہ لکھنا پڑھنا تو بعد میں سیکھنے

سے ہوتا ہے۔

اور ممکن ہے اسی اس لیے کہا گیا ہو کہ یہودی دوسری اقوام کو "گویم" کہتے تھے۔ عبرانی زبان میں گویم اقوام کو کہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم تو اللہ کی پسندیدہ قوم ہیں اور دوسرے لوگ عام اقوام یعنی امم ہیں۔ یوں وہ عربوں کو امی کہتے تھے۔ امی کا یہ مفہوم کہ وہ امہ کی طرف منسوب ہے زیادہ موزوں نظر آتا ہے بجائے اس کے کہ وہ ام کی طرف منسوب ہیں۔

یہودیوں کا یہ پختہ خیال تھا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے مبعوث ہو گا اور ان کے اندر جو اختلافات ہیں' ان کو وہ ختم کر دے گا۔ اور دنیا میں جو دوسری اقوام کے مقابلے میں شکست کھا گئے ہیں ان کو فتح نصیب ہو گی اور ذلت کے مقابلے میں ان کو عزت حاصل ہوگی اور وہ اس نبی کی برکت سے عربوں پر فتح کی دعا کیا کرتے تھے۔

حکمت ربانی کا تقاضا یہ ہوا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عربوں سے پیدا ہو۔ یعنی امیین غیر الیہود میں سے' (گویم) میں سے۔ اس لیے کہ یہ بات اللہ کے علم میں تھی کہ یہودیوں میں سے وہ صلاحیت ختم ہو چکی ہے' جو پوری انسانی قیادت کے لیے درکار تھی' جیسا کہ اس سورت کے دوسرے پیراگراف میں آرہا ہے۔ اور جس طرح سورہ صف میں گزرا کہ یہ لوگ گمراہ ہوگئے ہیں۔ اور انہوں نے فکر و نظر کی کوتاہی اور ٹیڑھ پن کو اپنا لیا تھا۔ اور انہوں نے اپنی طویل تاریخ میں اللہ کی امانت کے حوالے سے جو کچھ کیا اس کے پیش نظر اب وہ اس قابل نہیں ہے کہ آخری امانت ان کے سپرد کی جائے۔

اس علاقے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی ایک مرکز دعوت بنایا تھا اور دعوت کا آغاز بیت اللہ کے سایہ میں حضرت خلیل اللہ اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۲۷) رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۱۲۸) رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۲۹) (۲ : ۱۲۷ - ۱۲۹) "اور یاد کرو' ابراہیم اور اسماعیل کو جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے' تو دعا کرتے جاتے تھے۔ اے ہمارے رب' ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے۔ تو سب کچھ سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو' ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے رب ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو! جو انہیں تیری آیات سنائے' ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوار دے تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے"۔

غیب کے پردوں کے پیچھے یہ دعا موجود تھی' صدیاں پیچھے' اللہ کے ہاں محفوظ تھی' یہ درخواست ضائع نہیں ہوئی تھی

اور یہ اس لیے رکھی گئی تھی کہ اللہ نے اس کے لیے اپنی حکمت کے مطابق جو وقت مقرر کیا تھا' وہ ابھی نہ آیا تھا۔ جب اس کی حکمت کے مطابق مقرر کردہ وقت آگیا تو اللہ نے دعا منظور فرمائی اور رسول بھی آیا اور دعا کی منظوری بھی ہو گئی کیونکہ اللہ کے نظام قضا و قدر میں ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے' نہ آگے ہوتا ہے اور نہ پیچھے ہوتا ہے۔

غرض یہ درخواست اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق حقیقت بن گئی۔ یہ درخواست انہی الفاظ میں یہاں منظور کی جاتی ہے جن میں حضرت ابراہیم نے کی تھی۔ حضرت ابراہیم کے الفاظ تھے :

رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲ : ۲)

یہاں تک کہ حضرت ابراہیم نے اللہ کی حمد اور صفت میں یہ فرمایا تھا۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ یہی الفاظ یہاں بھی دہرائے گئے۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۶۲ : ۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے خود ان کے بارے میں جب پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا: "میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔ حضرت عیسیٰ کی بشارت ہوں۔ اور جب میری ماں کو حمل ٹھہرا تو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان سے ایک نور نکلا ہے' جس کی وجہ سے شام کے علاقہ بصری کے محلات روشن ہو گئے"۔ (روایت ابن اسحاق جس کی سند کو ابن کثیر نے جید کہا ہے۔)

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۶۲ : ۲) "وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا' جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے' ان کی زندگی سنوارتا ہے' اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے"۔ اور یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے امیوں میں خود انہی میں سے ایک رسول اٹھایا اور اسے کتاب دے کر انہیں بھی اہل کتاب بنا دیا۔ پ ان میں ایک رسول بنایا اور اس کی وجہ سے ان کا مقام و مرتبہ بھی بلند ہو گیا۔ انہیں امیت اور اہمیت سے نکالا۔ یعنی ان پڑھ ہونے کے بجائے تعلیم یافتہ بنا دیا اور عوامی قوم (گویم) ہونے کے بجائے ممتاز قوم بنا دیا۔ ان کے حالات بدل دیئے اور وہ پوری دنیا کے ممتاز لوگ بن گئے۔

وَيُزَكِّيْهِمْ (۶۲ : ۲) "ان کی زندگیوں کو پاک کرتا ہے"۔ اسلام جو کچھ انہیں سکھاتا تھا وہ تزکیہ اور تطہیر ہی تھی۔ ضمیر و شعور کی تطہیر' عمل اور طرز عمل کی تطہیر' خاندانی زندگی کی تطہیر' اجتماعی زندگی کی تطہیر' اور نظریات کی ایسی تطہیر کہ تمام شرکیہ عقائد نکال کر صرف ایک عقیدہ توحید دے دیا۔ تمام باطل تصورات ختم کر کے صرف صحیح اور برحق عقیدہ توحید عطا کر دیا۔ افسانوی افکار و عقائد کے بجائے واضح اور یقینی عقائد دے دیئے۔ اسی طرح اخلاقی طوائف الملوکی سے نجات دے کر ایمانی اخلاق کی سطح پر ان کو پہنچا دیا۔ معیشت سے ناپاک سودی نظام کی جگہ عادلانہ رزق حلال کا طریقہ

بتایا۔ غرض ایک ہمہ گیر تطہیر کا انتظام کیا۔ اور ایک فرد' ایک جماعت اور ظاہر و باطن سب کی تطہیر کر دی۔ انسان کو اس زمینی زندگی اور زمینی تصورات سے بلند کر کے ایک ایسے نورانی مقام تک بلند کر دیا جو ربانی مقام ہے۔ اس مقام پر انسان کا معاملہ اللہ سے ہو گیا۔ یوں انسان اپنے آپ کو زمین کی ایک عاجز مخلوق سمجھنے کے بجائے ایک علوی مخلوق بن گیا۔

وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (۶۲ : ۲) "اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔ یہ رسول ان کو کتاب کی تعلیم دیتا ہے جس کی وجہ سے یہ امی بھی اہل کتاب ہو گئے۔ انہیں حکمت سکھاتا ہے اور اس پوری دنیا کے حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام اشیا کی قیمت متعین کرنے میں صحیح اندازہ کرتے ہیں' ان کی روح صحیح فیصلے کرتی ہے۔ وہ صحیح عمل اختیار کرتے ہیں اور اس سے بڑی دانائی اور نہیں ہے۔

وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۶۲ : ۲) "حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے"۔ یہی جاہلیت جس کی تعریف حضرت جعفرؓ ابن ابو طالب نے حبشہ کے نجاشی کو بتایا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب قریش مکہ نے نجاشی کے پاس ایک سفارت بھیجی' جو عمر ابن العاص اور عبداللہ ابن ابو ربیعہ پر مشتمل تھی۔ تاکہ وہ اس کے سامنے مہاجرین مسلمانوں کی بھیانک تصویر کھینچیں اور اس کے ہاں اس کے موقف کو غلط رنگ میں پیش کریں تاکہ وہ ان کو اپنی مہمانی اور اپنے ہاں امان سے نکال دے' تو اس موقعہ پر حضرت جعفر نے فرمایا:

"بادشاہ وقت' ہم ایک جاہل قوم تھے' بتوں کو پوجتے تھے' مردار کھاتے تھے' فحاشی کرتے تھے' صلہ رحمی نہ کرتے تھے' پڑوسیوں کا کوئی خیال نہ رکھتے تھے' ہم میں سے زور آور کمزور کو کھا جاتا تھا' ایسے حالات میں تھے کہ اللہ نے ہم میں ایک رسول بھیج دیا۔ اس نے دعوت دی کہ ہم ایک ہی خدا کو پکاریں اور اس کی بندگی کریں' ہم اس کے نسب کو جانتے ہیں' اس کی صداقت سے واقف ہیں' اس کی امانت اور عفت کے معترف ہیں۔ اس نے دعوت دی کہ ہم صرف اللہ وحدہ کو پکاریں اور اس کے علاوہ ہم جو پتھروں' بتوں کی بندگی کرتے تھے' انہیں ترک کر دیں۔ وہ کہتا ہے تم سچ کہو' امانت ادا کرو' صلہ رحمی کرو' پڑوسی کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرو' اور حرام چیزوں اور خون ریزی سے بچو' اس نے ہمیں ہر قسم کے فواحش سے روک دیا ہے' جھوٹ سے روک دیا ہے۔ یتیم کا مال کھانے سے روک دیا ہے۔ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے روک دیا ہے۔ حکم دیا ہے کہ اللہ کی بندگی کریں اور کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں۔ وہ ہمیں نماز' روزہ اور زکوۃ کا حکم دیتا ہے"۔

باوجود اس کے کہ وہ جاہلیت اور گمراہی میں کانوں تک ڈوبے ہوئے تھے اللہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اس نظریہ کے اٹھانے کے قابل ہیں۔ اس کے امین ہوں گے اور ان کے اندر صلاحیتیں موجود ہیں اور جدید دعوت کے لیے ضروری صلاحیت وہ رکھتے ہیں۔ جبکہ یہودیوں کی فطرت میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے اور مصری غلامی نے ان کو ناقابل اصلاح بنا دیا ہے۔ ان کی نفسیات میں الجھن' کجی اور انحراف پیدا ہو گیا ہے۔ اس لیے اب ان کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ نہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں درست ہوئے اور نہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ لوگ درست ہوئے' یہاں تک کہ اللہ نے ان پر لعنت اور غضب لکھ دیا اور وہ اس دنیا میں اللہ کے دین کے حامل نہ رہے اور قیامت تک ان سے یہ اعزاز چھن گیا۔

پھر اللہ کو اس بات کا بھی علم تھا کہ اس زمانے میں جزیرۃ العرب ہی دعوت اسلامی کے لیے بہترین مرکز کا کام کر سکتا

تھا۔ اور پوری انسانیت کو جاہلیت کی گمراہی سے نجات دے سکتا تھا۔ کیونکہ دونوں بڑی شہنشاہیتوں نے تہذیب و تمدن کو بگاڑ دیا تھا۔ ان کی حکومت کو گھن لگ گیا تھا اور اندر سے ان کو کھوکھلا کر دیا تھا اور حالت یہ تھی جس پر ڈینسن یہ تبصرہ کرتا ہے۔

"پانچویں اور چھٹی صدی میں دین دار دنیا ہلاکت اور بربادی کے قریب جا پہنچی تھی کیونکہ وہ عقائد و نظریات جو کسی تہذیب و تمدن کو جنم دیا کرتے ہیں وہ گر گئے تھے' اور ان گرے ہوئے نظریات کی جگہ لینے کے لیے کوئی دینی نظریہ موجود نہ تھا۔ یوں نظر آتا تھا کہ جس تہذیب و تمدن کی تعمیر میں 'انسانیت کو چار ہزار سال تک محنت کرنی پڑی' وہ ٹوٹنے والا ہے اور اس کا شیرازہ بکھرنے ہی والا ہے۔ اور انسانیت ایک بار پھر جہالت کے دور میں واپس جانے والی ہے۔ کیونکہ پوری دنیا میں قبائل ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے نظر آتے تھے۔ پوری دنیا میں کوئی قانون اور کوئی نظام نہ تھا۔ انسانی تمدن ایک وسیع درخت کی طرح تھا جس کی وسیع شاخیں پوری دنیا پر سایہ فگن تھیں لیکن یہ درخت جھک گیا تھا اور گھن نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ ایسے ہی ہمہ گیر فساد کے اندر ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے تمام انسانیت کو پھر سے مجتمع کر دیا"۔ یہ شخص تھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم' اور یہ صورت حال انسانیت کی' تو ایک یورپین مصنف کے نقطہ نظر سے تھی' لیکن اسلامی زاویہ نگاہ سے وقت اس سے تاریک تر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے شبہ جزیرۃ العرب سے اس بدوی امت کو اٹھایا۔ وہ قرآن و سنت لے کر اٹھی' اس کے اندر صلاحیت موجود تھی۔ سب سے پہلے اس نے اپنی اصلاح کی' اور پھر پوری دنیا کی تقدیر بدل دی۔ اللہ نے اس بدوی قوم کو رسول دیا۔ کتاب دی' رسول اور کتاب نے ان کو پاک کر دیا اور ان کو حکمت اور دانائی دی' اگرچہ پہلے وہ گمراہ تھے۔

وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۶۲ : ۳) "اور ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی ان سے نہیں ملے ہیں' اللہ زبردست اور حکیم ہے"۔ یہ آخرون کون ہیں ان کے بارے میں متعدد روایات آئی ہیں۔

امام بخاری نے روایت کی ہے' عبدالعزیز ابن عبداللہ سے' انہوں نے سلیمان ابن بلال سے' انہوں نے ثور سے' انہوں نے ابو الغیث سے' انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے یہ فرماتے ہیں "ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ پر سورہ جمعہ نازل ہوئی۔

وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ (۶۲ : ۳) "اور ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ان سے نہیں ملے"۔ تو صحابہ کرام ﷺ نے پوچھا اللہ کے رسول وہ کون ہیں تو حضورؐ نے ان کے سوال کا جواب نہ دیا' یہاں تک کہ تین بار آپ سے پوچھا گیا۔ ہم میں سلمان فارسی بھی موجود تھے۔ تو حضورؐ نے اپنا دست مبارک سلمان فارسی پر رکھا اور پھر کہا "اگر ایمان ثریا کے اندر بھی ہو تو ان لوگوں سے بعض لوگ یا ایک شخص اسے پالے گا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں اہل ایران شامل ہیں۔ اس لیے مجاہد کہتے ہیں اس سے مراد عجمی لوگوں میں وہ سب ہیں' جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تصدیق کی۔

ابن ابو حاتم نے روایت کی' اپنے والد سے' انہوں نے ابراہیم ابن علاء زبیری سے' انہوں نے ولید ابن مسلم سے' انہوں نے ابو محمد عیسیٰ ابن موسیٰ سے' انہوں نے ابو حازم سے' انہوں نے سہل ابن سعد ساعدی سے' وہ کہتے ہیں رسول اللہ نے

فرمایا میری امت کے بعض لوگوں کی پشتوں میں ایسے مرد اور عورتیں ہوں گی جو جنت میں بغیر حساب داخل ہوں گے اور اس کے بعد آپ نے پڑھا۔

وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ (۶۲ : ۳) یعنی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد آئندہ آنے والے لوگ ۔ دونوں اقوال کی گنجائش ہے یعنی وہ لوگ جو عرب کے علاوہ ہیں اور وہ لوگ جو مسلمان ہو گئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دور میں اور ان کی اولاد جو بعد میں پیدا ہو گی ۔ ان آیات اور روایات میں اشارہ ہے کہ یہ امت آئندہ زمانوں اور زمین کے تمام حصوں میں مسلسل رہنے والی امت ہے، اور اس نے اس ذمہ داری کو قیامت تک پورا کرنا ہے ۔ اس آخری دین کی حامل یہ امت آخر زمانے تک رہے گی ۔

وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۶۲ : ۳) "اور اللہ زبردست اور حکیم ہے"۔ وہ قوی ہے، اور کسی امت کو مختار بنانے کی قدرت رکھتا ہے اور وہ حکیم ہے اور اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کس منصب کے لیے چنے گئے ۔ اور متقدمین اور متاخرین میں سے لوگوں کو درجے دینا بھی اس کا فضل و کرم ہے ۔

---ooo---

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (۶۲ : ۴) "یہ اس کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے"۔

اللہ کی جانب سے کسی امت، کسی جماعت، کسی فرد کو اس کام کے لیے چن لینا کہ وہ اس عظیم امانت کا حامل ہو، اور اللہ کے نور اور فیض کا سرچشمہ ہو، اور ایسا مرکز ہو، جس پر زمین و آسمان ملتے ہوں، یہ اختیار و انتخاب اللہ کا بہت بڑا فضل و کرم ہوتا ہے ۔ اس سے بڑا فضل کہ اگر مومن اپنی جان اور مال اور اس دنیا کا سب کچھ بھی دے دے تو وہ اس سے زیادہ قیمتی ہے ۔ اس راہ میں جدوجہد، مشکلات، جہاد غرض سب مشقتوں سے زیادہ قیمتی اور اہم ۔

اللہ تعالیٰ مدینہ کی اسلامی جماعت اور ان کے بعد آنے والے لوگوں، اور اسی راہ پر چلنے والوں کو یاد دلاتا ہے کہ یہ بہت بڑا فضل و کرم ہے تم پر، کہ اس نے تمہیں اس عظیم مقصد کے لیے منتخب کیا ہے ۔ تمہارے اندر رسول بھیجا ہے، جو تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور علم و حکمت کا یہ سرمایہ آنے والی نسلوں کے لیے جمع کرتا ہے، اور پہلی جماعت اسلامی کے کارہائے نمایاں بطور نمونہ اور مثال قائم کرتا ہے ۔ اللہ مسلمانوں کو یاد دلاتا ہے کہ یہ ہے عظیم فضل الہی جس کے مقابلے میں تمام دنیاوی و اخروی انعامات ہیچ ہیں، جبکہ اس کے فرائض کی ادائیگی کے دوران ہر قسم کی مالی اور جانی قربانیاں بھی ہیچ ہیں بمقابلہ اس اعزاز اور فضل کبیر کے ۔

اس کے بعد اللہ ان کو یہ یقین دہانی کراتا ہے کہ یہودیوں کا دور اس کرۂ ارض پر سے ختم ہو گیا ہے ۔ اب وہ حاملین امانت الٰہیہ نہیں رہے ۔ نہ ان کے دلوں میں یہ بات ہے اور نہ ان کے کردار میں یہ بات ہے کیونکہ اس امانت کو اٹھانے والے دل فقیہ، صاحب ادراک، مخلص اور باعمل دل ہوتے ہیں ۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۶۲ : ۵) "جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا' ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہیں ۔ اس بھی زیادہ بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا ہے ۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا"۔

بنی اسرائیل کو توریت دی گئی اور وہ نظریہ اور شریعت کی امانت کے حامل بنے ۔ لیکن انہوں نے ۔

لَمْ يَحْمِلُوْهَا (۶۲ : ۵) "انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا" ۔ کیونکہ اس امانت کو ادراک تفقہ اور فہم و فراست اور حکمت و دانائی کے ساتھ اٹھایا جا سکتا ہے ۔ انہوں نے ضمیر کی دنیا میں اور عمل کی دنیا میں اس ذمہ داری کو قبول کرنا چھوڑ دیا تھا اور قرآن نے جس طرح بنی اسرائیل کی سیرت کا ریکارڈ پیش کیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس امانت کی کوئی قدر نہ کی ۔ وہ صرف ایک بوجھ اٹھا رہے تھے ۔ اس امانت اور دین کے مقاصد پورے نہ کر رہے تھے ۔

یہ نہایت ہی حقیر تصویر ہے' ان کو جو یہاں قرآن کریم نے کھینچی ہے' لیکن یہ تصویر ان کی حقیقت کا اظہار نہایت ہی عمدہ طریقے سے کرتی ہے ۔

بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۶۲ : ۵) "اس سے بھی زیادہ بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا' ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیتا"۔

اور جن لوگوں کو یہ آخری امانت دی گئی ہے' وہ اگر یہی رویہ اختیار کرتے ہیں تو ان کی مثال بھی ایسی ہی ہے وہ سب لوگ جن کو دینی امانت دی گئی اور وہ اس کا حق ادا نہیں کرتے ۔ ان کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ مسلمان جن پر صدیاں گزر گئیں اور وہ مسلمانوں کے صرف نام اٹھائے ہوئے ہیں' ان کے اندر مسلمانوں کے اعمال نہیں ہیں' خصوصاً وہ لوگ جو قرآن اور کتب اسلامی کو پڑھتے ہیں اور وہ فرائض ادا نہیں کرتے جو ان میں ہیں ۔ یہ سب لوگ ایسے ہی ہیں جس طرح گدھے پر کتابیں لدی ہوئی ہوں ۔ ہمارے دور میں ایسے لوگ بہت ہیں ۔ مسئلہ کتابوں اور تدریس و تعلیم کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ عمل اور ذمہ داریاں اٹھانے کا ہے ۔

یہودیوں کا زعم یہ تھا اور اب بھی ان کے اندر یہ زعم موجود ہے کہ وہ اللہ کی مختار قوم ہیں' پسندیدہ اور برگزیدہ! اور یہ کہ وہ اللہ کے محبوب ہیں بمقابلہ تمام دوسری اقوام کے ۔ جبکہ دوسری اقوام گوئیم ہیں یا امی ہیں یا امی ہیں ۔ لہذا ان پر اپنے دین کے احکام پر عمل کرنا لازمی نہیں ہے ۔ یہ گوئیم کے لیے ہے ۔

وَقَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ اگر ہم دوسری اقوام کے لوگوں پر کوئی زیادتی کریں تو ہم پر مواخذے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے دعوے وہ کرتے تھے ۔ جن پر کوئی دلیل نہ تھی ۔ یہاں اللہ ان کو دعوت مباہلہ دیتا ہے ۔ دعوت مباہلہ ان کو بھی دی گئی اور نصاریٰ کو بھی ۔

---○○○---

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ(٦) وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ(٧)قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ(٨) (٦٢: ٦ تا ٨) "ان سے کہو"اے لوگو جو یہودی بن گئے ہو' اگر تمہیں یہ گھمنڈ ہے کہ باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر بس تم ہی اللہ کے چہیتے ہو تو موت کی تمنا کرو۔ اگر تم اپنے اس زعم میں سچے ہو"۔ لیکن یہ ہرگز اس کی تمنا نہ کریں گے اپنے ان کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں' اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ان سے کہو "جس موت سے تم بھاگتے ہو' وہ تو تمہیں آکر رہے گی۔ پھر تم اس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے' اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

مباہلہ کے معنی یہ ہیں کہ فریقین آمنے سامنے کھڑے ہو جائیں اور دونوں مل کر دعا کریں کہ اے اللہ ہم دونوں میں سے جو بر سرباطل ہے' اسے ہلاک کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن جن لوگوں کو مباہلہ کے لیے دعوت دی وہ ڈر کر سامنے نہیں آئے۔ کسی نے بھی حضور اکرم کی دعوت مباہلہ قبول نہیں کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے دل ہی دل میں اسلام کی حقانیت کے قائل تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رسول اللہ سچے ہیں اور یہ دین حقیقی دین ہے۔

امام احمد نے روایت کی ہے اسماعیل ابن یزید زرقی سے' انہوں نے ابو یزید سے' انہوں نے فرات سے' انہوں نے عبدالکریم ابن مالک جزری سے' انہوں نے عکرمہ سے' انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ ابوجہل ملعون نے یہ کہا کہ اگر میں نے محمد کو خانہ کعبہ میں دیکھا تو میں اس پر حملہ کر دوں گا یہاں تک کہ میں اس کی گردن دبا دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر اس نے ایسا کیا ہوتا تو فرشتے اسے علانیہ پکڑ لیتے اور اگر یہودی موت کی تمنا کرتے تو وہ مرجاتے۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ جہنم میں ان کے مقامات کیا ہیں اور جن لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت مباہلہ دی تھی اگر وہ نکلتے تو جب واپس آتے تو نہ ان کا مال ہوتا اور نہ ان کے اہل و عیال موجود ہوتے۔ (بخاری' ترمذی)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت ان کے لیے مباہلے کا چیلنج نہ ہو' محض چیلنج ہو۔ کیونکہ ان کا زعم تھا کہ وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اللہ کے محبوب اور دوست ہیں تو کیوں نہیں جلدی کرتے کہ اللہ کے ہاں انعامات پائیں۔ دوست تو دوست کی ملاقات کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان کے اس دعوے پر تبصرہ کیا گیا کہ یہ جھوٹے ہیں اور جو دعویٰ کر رہے ہیں ان میں وہ سچے نہیں ہیں۔ ان کو یہ یقین نہیں ہے کہ انہوں نے دنیا میں آخرت کے لیے کوئی اچھا عمل کیا ہے' جس پر ان کو اجر و ثواب ملنے والا ہے۔ انہوں نے تو برے کام ہی آگے بھیجے ہیں' جن کی وجہ سے وہ موت سے بہت ڈرتے ہیں۔ اور جس شخص کے پاس

زادِ راہ نہ ہو' وہ سفر پر نہیں نکلتا۔

وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّٰلِمِينَ (۶۲ : ۷) "لیکن یہ ہرگز اس کی تمنا نہ کریں گے اپنے ان کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے"۔

اب آخری دور میں موت کی حقیقت اِن کو بتا دی جاتی ہے۔ یہ جو موت سے ڈرتے ہیں اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ موت تو ایک قطعی امر ہے اور اس سے کوئی فرار نہیں ہے۔ کوئی مفر نہیں ہے' موت کے بعد تو اللہ کی طرف جانا ہے' اور پھر اللہ کے ہاں حساب و کتاب دینا ہے' جس میں کوئی شک نہیں ہے۔

قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۶۲ : ۸) "ان سے کہو" جس موت سے تم بھاگتے ہو' وہ تو تمہیں آکر رہے گی۔ پھر تم اس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے' اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

یہ ایک توجہ دلاؤ نوٹس ہے' مسلمانوں کو' اور غیر مسلموں سب کو کہ ایک حقیقت کو اپنے دل و دماغ میں تازہ کر لو۔ اور لوگ اس اٹل حقیقت کو بھول جاتے ہیں' یا بھلانے کی کوشش کرتے ہیں' موت تو آنے والی ہے۔ یہ زندگی ختم ہونے والی ہے۔ اس دنیا میں تم جس قدر اس سے بھاگو' تم موت کے منہ میں پہنچ جاؤ گے۔ لہٰذا کوئی جائے پناہ اللہ کے سوا نہیں ہے' وہاں حساب و کتاب دینے سے کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

طبری نے اپنی معجم میں معاذ ابن محمد ہذلی کی حدیث روایت کی ہے۔ یونس سے' انہوں نے حسن سے' انہوں نے حضرت سمرۃ سے' مرفوع صورت میں کہ "جو شخص موت سے بھاگتا ہے' اس کی مثال لومڑی جیسی ہے جس سے زمین اپنا قرضہ مانگ رہی تھی' تو وہ بھاگنے لگی یہاں تک کہ بھاگتے بھاگتے تھک گئی اور اس کے لیے بھاگنا ممکن نہ رہا تو وہ اپنے سوراخ میں جا گھسی تو وہاں زمین نے اس سے کہا: "اے لومڑی میرا قرضہ؟"

اب اس سورت کا آخری مقطع آتا ہے اور یہ جمعہ کی نماز کے بارے میں ہے' یہ اس موقعہ کی نسبت سے جو واقعہ ہوا شاید ایسا واقعہ ایک سے زائد مرتبہ ہوتا ہو گا کیونکہ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا بتوار رہتا تھا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ
فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٩﴾
فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ
وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٠﴾ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا

انفَضُّوٓا اِلَيۡهَا وَ تَرَكُوۡكَ قَآئِمًا‌ ؕ قُلۡ مَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ مِّنَ اللَّهۡوِ وَمِنَ ۲
ع۳ التِّجَارَةِ‌ ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ ۞
۱۲

""اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو' یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو' شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔ اور جب انہوں نے تجارت اور کھیل تماشا ہوتے دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے اور تمہیں کھڑا چھوڑ دیا۔ ان سے کہو' جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے۔ اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے""۔

جمعہ کی نماز بغیر جماعت کے نہیں ہو سکتی' اس میں یہ بات لازمی ہے کہ مسلمان اس میں جمع ہوں اور خطبہ جمعہ سنیں اور اس خطبے میں مسلمانوں کو دینی تعلیم دی جائے۔ یہ مسلمانوں کا ایک دینی اور تنظیمی اجتماع ہے' جس میں دین اور دنیا اور آخرت سب کو ایک ہی سلسلہ اجتماع میں جمع کر دیا گیا ہے اور یہ سب امور عبادت کا حصہ ہیں۔ نماز جمعہ سے اسلام کا اجتماعی نظریہ اور نظام بڑی خوبی سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں بے شمار احادیث وارد ہیں جن میں جمعہ کی فضیلت' اس کی تیاری' غسل' کپڑوں کی صفائی اور خوشبو لگانے کی ہدایات دی گئی ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

اذا جاء احدکم الجمعۃ فلیغتسل ""جب تم میں سے کوئی جمعہ کو آئے تو اسے چاہئے کہ وہ غسل کرے""۔

اصحاب سنن اربعہ نے اوس ابن اوس ثقفی کی حدیث نقل کی ہے۔ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سنا اور جس نے جمعہ کے دن غسل کیا اور خوشبو لگائی' اگر اس کو دستیاب ہو' اور اچھے کپڑے پہنے' پھر وہ مسجد کی طرف نکلا اور اگر نماز (نفل) پڑھنا چاہا' پڑھے اور مسجد میں کسی کو اذیت نہ دی۔ اس کے بعد وہ مسجد میں بیٹھا' یہاں تک کہ امام نکلا اور اس نے نماز پڑھائی تو یہ جمعہ اگلے جمعے تک کے گناہوں کا کفارہ ہو گا""۔

اس پیراگراف کی پہلی آیت میں کہا گیا ہے کہ اذان سنتے ہی تمام معاشی سرگرمیاں موقوف کر دو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ (۶۲ : ۹) ""اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو""۔ یعنی زندگی کی تمام سرگرمیاں بند کر دو' اور ذکر الٰہی میں مصروف ہو جاؤ۔

ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۶۲ : ۹) ""یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے' اگر تم جانو""۔

اس میں یہ اشارہ ہے کہ زندگی کی تمام دلچسپیوں کو ترک کر کے ذکر الٰہی میں تھوڑا سا وقت گزارو' یہاں معاشی سرگرمیاں چھوڑ کر۔

وَ اسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (۶۲:۹) "اللہ کے ذکر کی طرف سعی کرو" کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ سے پہلے ذکر و فکر میں مشغول ہو جاؤ۔ خالص ذکر الٰہی ۔ اور اپنا تعلق اس وقت میں عالم بالا کے ساتھ جوڑ دو۔ اس طرح تمہیں قلبی تطہیر نصیب ہو گی اور اس ذکر کے نتیجے میں دل پر عالم بالا کی معطر خوشبو اور معطر باد نسیم کے جھونکے اثر چھوڑیں گے ۔ اور پھر تلاش معاش میں بھی ذکر الٰہی اور فضل الٰہی :

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَ اذْکُرُوا

اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۶۲:۱۰) "پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو' شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے"۔

یہ ہے اسلامی نظام کا توازن ۔ یعنی زمین پر ضروریات زندگی کا توازن ۔ مثلاً کام کاج اور تلاش معاش اور روح کو ذکر الٰہی میں مشغول کرنا اور ایک وقت کے لیے تلاش معاش کی سرگرمیوں سے نکل کر عزلت نشیں ہو کر ذکر و فکر میں مشغول ہونا' قلبی زندگی کے لیے یہ ضروری ہے اور اس قلبی اور روحانی بالیدگی کے بغیر کوئی شخص اس عظیم امانت کا حق ادا نہیں کر سکتا جو ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے اور ذکر الٰہی تلاش معاش کے دوران بھی ضروری ہے ۔ اور تلاش معاش کے اندر بھی اگر ذکر و فکر ہو تو یہ تلاش معاش عبادت بن جاتا ہے لیکن تلاش معاش کے دوران ذکر و فکر کے علاوہ ایک وقت صرف ذکر و فکر کے لیے خالص بھی ضروری ہے ۔ جس میں اور کوئی کام نہ ہو جس طرح ان دو آیات میں اشارہ ہے ۔

حضرت عراک ابن مالک رضی اللہ عنہ جب جمعہ کی نماز پڑھتے تھے تو مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ فرماتے ہیں ۔ اے اللہ میں نے آپ کی پکار کی تعمیل کر دی اور فرض نماز ادا کر دیا اور اب میں مسجد سے نکل رہا ہوں جس طرح تو نے حکم دیا ہے' اے اللہ مجھے اپنا فضل نصیب کر ۔ آپ خیر الرازقین ہیں (ابن ابو حاتم) ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ حکم الٰہی کو کس سنجیدگی سے لیا کرتے تھے ۔ کس قدر سادگی سے' کیونکہ ان کے دل میں شعور تھا کہ ' قرآن اللہ کے احکام پر مشتمل ہے اور مسلمانوں نے اس کی تعمیل کرنی ہے ۔

صحابہ کرام کا یہ سادہ ادراک ' سنجیدہ طرز عمل اور نہایت ہی سادگی سے رب تعالیٰ سے ہمکلامی ہی وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے وہ اس قدر بلند مقام تک پرواز کر گئے ' حالانکہ وہ جاہلیت سے نکل کر آئے تھے ' اور جاہلیت کی عادات اور میلانات ان کو ہر وقت اپنی طرف کھینچتے تھے ۔ اور جاہلیت کی ایک عادت کا نمونہ اس سورت کی آخری آیات میں پیش کیا جاتا ہے ۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَۃً اَوْ لَھْوَا اِنْفَضُّوْا اِلَیْھَا وَتَرَکُوْکَ قَآئِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ

مِّنَ اللَّھْوِ وَمِنَ التِّجَارَۃِ وَ اللّٰہُ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ (۶۲:۱۱) "اور جب انہوں نے تجارت اور کھیل تماشا ہوتے دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے اور تمہیں کھڑا چھوڑ دیا ۔ ان سے کہو' جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے ۔ اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے"۔ حضرت جابر سے روایت ہے کہ ایک بار جب ہم نبی

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک قافلہ آگیا' جس میں کھانے کا سامان تھا۔ لوگ قافلے کی طرف لپک گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دو آدمی رہ گئے۔ ان میں حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما تھے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا (۶۲: ۱۱) "اور جب انہوں نے تجارت اور کھیل تماشا ہوتے دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے اور تمہیں کھڑا چھوڑ دیا"۔

آیت میں اشارہ ہے کہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے' وہ اس لہو اور تجارت سے بہتر ہے اور یہ بھی یہاں صراحت کے ساتھ بتایا کہ اللہ بہترین رزق دینے والوں میں سے ہے۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۶۲: ۱۱) "اللہ بہتر رزق دینے والا ہے"۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بدوی عربی معاشرے کی تعلیم و تربیت کے لیے اسلام نے کس قدر جدوجہد کی' اور کس طرح ان لوگوں سے صحابہ کی وہ جماعت تیار کر دی جس نے انسانی تاریخ میں ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ پوری انسانی تاریخ میں جس کی مثال نہیں ہے اور ان کی زندگیوں میں ان لوگوں کے لیے ایک نمونہ ہے جو زمانہ ملاحدہ میں دعوت اسلامی کا کام کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے کس قدر صبر و مصابرت سے کام لیا' اور اسلامی انقلاب کی راہ میں پیش آنے والی کمزوریوں' نقائص' واماندگیوں اور لغزشوں پر کس طرح صبر کیا اور ان کو دور کیا۔ آج ہم بھی اسی طرح اپنی اصلاح کر سکتے ہیں۔ یہ نفس انسانی اپنے اندر خیر کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور شر کی بھی۔ اس کے اندر یہ صلاحیت بھی ہے کہ روحانی قوت اور روحانی اور قلبی صفائی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچ جائے جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ لیکن اس کے لیے صبر و ثبات' فہم و ادراک' ثابت قدمی اور استقامت اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ گھبرا کر انسان نصف راستے سے واپس ہو جائے۔ واللہ المستعان

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ـــ ۲۸

سورۃ المنافقون ـ ۶۳

۱ ـــ تا ـــ ۱۱

سورۃ المنافقون ایک نظر میں

اس سورت کا جو نام رکھا گیا ہے وہی اس کا موضوع ہے۔ منافقین کا ذکر صرف اس سورت میں نہیں ہوا اور نہ ان کے حالات اور ان کی سازشیں صرف اس ایک سورت تک محدود ہیں۔ مدینہ میں نازل ہونے والی ہر سورت میں ان کا ذکر صراحۃ یا اشارۃ موجود ہے۔ لیکن اس سورت کا بڑا حصہ انہی کے بارے میں ہے۔ اس میں ان سے متعلق بعض واقعات اور ان کے اقوال پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

اس میں ان کے اخلاق' ان کے جھوٹ' ان کی سازشوں اور ان کے داؤ پیچ پر تنقید کی گئی ہے جو وہ اسلام کے خلاف کرتے تھے۔ ان کے دل مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت اور سازشوں سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ نہایت بزدل' اندھے' اور بے بصیرت تھے۔

اس سورت میں انہی کی بحث ہے۔ صرف آخر میں مسلمانوں کو متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندر ان منافقین جیسی صفات پیدا نہ ہونے دیں۔ اگرچہ ان صفات کا سبب نفاق سے بہت دور کا تعلق ہے اور نفاق کی کم از کم صفت یہ ہے کہ انسان اللہ کے لیے مخلص نہ ہو' اور اپنے مال اور اولاد کی وجہ سے انسان اللہ کی یاد سے غافل ہو جائے۔ اور پھر اس پر مزید یہ کہ اللہ کی راہ میں انفاق نہ کرے' یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آئے جس میں انفاق فی سبیل اللہ مفید ہی نہ رہے۔

تحریک نفاق کا آغاز اس وقت ہوا جب اسلام مدینہ میں داخل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے قریب تک یہ جاری رہی اور کسی وقت بھی مدینہ منافقین سے خالی نہ تھا۔ اگرچہ ان کے مظاہر اور وسائل بدلتے رہے۔ جس دور میں یہ سورت نازل ہوئی ہے اس میں' معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریک زوروں پر تھی۔ اس نے مسلمانوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا' مسلمانوں کی قوت اور طاقت اور توجہ اس عرصہ میں زیادہ تر منافقین ہی کی طرف رہی۔ اور قرآن کریم اور احادیث نبوی میں بڑی کثرت سے ان کا ذکر آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفاق کی تحریک مدینہ میں ایک بااثر تحریک تھی اور بعض اوقات تو اس کا اثر واضح طور پر محسوس ہوتا تھا۔

اس تحریک کے بارے میں استاذ محمد عزہ دروزہ کی کتاب "سیرت رسول قرآن کی روشنی میں" سے یہاں چند پیراگراف نقل کرنا مناسب ہو گا۔

"مدینہ میں اس تحریک کے ظہور کا سبب واضح ہے۔ کیونکہ مسلمان اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں اس قدر قوی نہ تھے کہ ان سے کچھ لوگ ڈرتے اور ان سے کسی کو خیر کی توقع ہوتی یا شر کی توقع ہوتی۔ اس لیے کسی کو ضرورت نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی چاپلوسی کرے اور بظاہر ان کے ساتھ شریک ہو جائے اور درپردہ ان کے خلاف سازش کرے اور عیاری و مکاری سے مخالفت کرے۔ کیونکہ مکہ کے اکثر کبرا اور بالاتر لوگ اسلام کے خلاف تھے' ان میں سے جو چاہتا' کہہ سکتا۔ مسلمانوں کو اذیت بھی دیتا اور تحریک اسلامی کے خلاف کھلے طور پر تمام وسائل استعمال کرتا۔ بغیر کسی جھجک کے اور مکہ میں

قوت بھی کفار کے ہاتھوں میں تھی' اور اسی وجہ سے مسلمانوں کو ہجرت کر کے ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ پہلے وہ حبشہ گئے پھر یثرب کی طرف ہجرت کر گئے ۔ اور بعض کو اہل مکہ نے پکڑے رکھا' یا دبا کر اور خوفزدہ کر کے ہجرت سے بھی روکے رکھا۔ اور بعض مسلمان ایسے بھی ہوں گے جن کو مکہ میں اسلام چھپانا پڑا ہو گا اور بعض ایسے بھی تھے جن کو اہل مکہ نے تشدد کر کے شہید بھی کر دیا تھا۔ لہٰذا مکہ میں کسی کو نفاق کی ضرورت نہ تھی"۔

گویا مدینہ میں حالات مکہ سے بالکل مختلف تھے ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینہ کو ہجرت کرنے سے پہلے ہی اوس اور خزرج کے نہایت ہی بااثر لوگوں کی حمایت اور نصرت حاصل کر چکے تھے ۔اور آپ نے تب ہجرت فرمائی جب آپ کو تسلی ہوگئی کہ وہاں آپ کی پوزیشن مضبوط ہوگی ۔مدینہ میں کوئی عرب گھرانا ایسا نہ رہ گیا تھا' جس میں اسلام داخل نہ ہوگیا ہو۔ اس لیے ایسے حالات میں یہ بات ممکن ہی نہ تھی کہ جو لوگ ایمان نہ لائے تھے' وہ جہالت یا نادانی کی وجہ سے یا غصے' کینہ' اور عناد کی وجہ سے رسول اللہ کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوں' کیونکہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کا لوگوں نے جس طرح استقبال کیا تو اس سے ان کو معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی قوت کیا ہے اور اثر کیا ہے ۔ اس لیے ایسے حالات میں مدینہ میں کوئی مسلمانوں اور مہاجرین و انصار کے بالمقابل علانیہ کھڑا نہ ہو سکتا تھا ۔ اوس اور خزرج کی بڑی تعداد انصار نبی بن گئی تھی اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ وفائی معاہدے کر لیے تھے ۔ اور ان کی اکثریت بہترین مسلم بن گئی تھی اور وہ یہ یقین کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نصرت اور اطاعت فرض ہے۔

آپ ان کے لیڈر' مرشد اور واجب الاطاعت نبی تھے ۔ اس لیے جن لوگوں نے ابھی تک عقیدۂ توحید کو قبول نہ کیا تھا اور دل کے بیمار تھے اور ہٹ دھرمی اور کینہ میں مبتلا تھے اور نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور دعوت اسلامی کے مخالف اور دشمن تھے ۔ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی مخالفت علانیہ کریں ۔ وہ مجبور تھے کہ بظاہر وہ بھی اپنے اسلام کا اعلان کر دیں' نمازیں پڑھیں' اسلام کے ارکان پورے کریں اور اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ امن و امان پائیں ۔ اور ان کی برادری بھی قائم رہے' ان کی مکاری' سازشیں اور چالیں اس طرح گہری تھیں جس طرح پہلوانی کے داؤ ہوتے ہیں' اور یہ کام وہ چھپ کر کرتے تھے ۔ اور اگر ان کو کوئی علانیہ کام بھی کرنا پڑتا تب بھی وہ اسے نفاق کے رنگ میں چھپا کر کرتے ۔ لیکن نظر بہرحال یہ آتا کہ یہ ان کی منافقانہ چال ہے ۔ لیکن وہ اس کے لیے بظاہر کوئی حیلہ بہانہ' مصلحت یا دلیل اور منطق کا کوئی پردہ ضرور اختیار کرتے اور یہ لوگ کسی حال میں بھی اپنے کفر اور نفاق کو ظاہر نہ کرتے تھے ۔ لیکن باوجود ان کی ان احتیاطوں کے اور ان کی ان تمام پردہ داریوں کے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور مخلص مہاجرین و انصار پر' ان کی یہ منافقت پوشیدہ نہ تھی ۔ البتہ اسلامی مہمات اور بحرانوں کے اندر ان کا منافقانہ رویہ صاف صاف ظاہر ہو جاتا اور یہ لوگ سخت شرمندہ ہوتے ۔ اور قرآن کریم ان کی حالت پر جو تبصرہ کرتا اس سے بھی وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے ۔ قرآن مجید گویا ان کے کفر نفاق اور شرپسندیوں اور سازشوں کو ان پر کھول دیتا اور وقتاً فوقتاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے بارے میں متنبہ کر دیتا"۔

"قرآن کریم کی مدنی آیات نے ان پر جو تبصرے کیے ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سازشوں کے دور رس اثرات تھے ۔ اور یہ ایک قومی کشمکش تھی ۔ ایسی ہی کشمکش جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور زعماء مکہ کے درمیان تھی ۔

اگرچہ دونوں کے زمانے اور نتائج مختلف تھے ۔کیونکہ مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پوزیشن روز بروز مضبوط ہوتی جاتی تھی ۔ آپ کی قوت میں اضافہ ہو رہا تھا' اسلام کا دائرہ وسیع تر ہو رہا تھا۔ اور یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اب حکمران بھی تھے ۔ آپ کے احکام نافذ ہوتے تھے ۔ اور آپ کے اردگرد ایک قوت جمع تھی ۔ پھر آپ کے مقابلے میں منافقین ایک بلاک کی صورت میں منظم نہ تھے جن کی کوئی عیاں شخصیت ہو۔ ان کی کمزوری' ان کی تعداد کی کمی' اور ان کی حیثیت کی کمی' ان کو زوال کی طرف لے جا رہی تھیں۔ جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت بڑھ رہی تھی ۔ اسلام وسیع ہو رہا تھا اور اس کی عزت اور قوت میں اضافہ ہو رہا تھا"۔

"مدینہ کے ابتدائی دور میں منافقین اسلامی حکومت کے لیے جس طرح عظیم خطرہ بنے ہوئے تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں ان کے قبائل کی عصبیت تازہ تھی اور ابھی اوس اور خزرج کے قبائلی تصورات ختم نہ ہوئے تھے جبکہ یہ منافق بھی ابھی تک زیادہ ترچھپے ہوئے تھے اور اسلام کمزور تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چاروں طرف سے مشرک قبائل کے گھیرے میں تھے اور اہل مکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن تھے' اور پورے جزیرۃ العرب کے قبلہ و کعبہ تھے ۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں موقع کی تلاش میں تھے ۔ اور ہروقت اس انتظار میں تھے کہ ان کو کوئی موقعہ ملے اور وہ فیصلہ کن وار کریں ۔ اور ابتدائی ادوار میں مدینہ کے اردگرد یہودی بھی رہ رہے تھے ۔ ان یہودیوں نے آغاز میں تو صرف حضور ؐ کو ناپسند کیا' لیکن بعد میں انہوں نے بھی کفر اور دشمنی شروع کر دی اور سازشیں کرنے لگے ۔ جلد ہی ان کے اور منافقین کے درمیان غیر تحریری اتفاق ہو گیا کہ اسلام کی بیخ کنی کرنی ہے ۔ اور مسلمانوں کے خلاف مل کر کام کرنا ہے ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ منافقین نہ قوی تھے اور نہ کوئی کارروائی کر سکتے تھے ۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ یہودیوں کی شہ پر ان کی سازشوں اور درپردہ ریشہ دوانیوں اور یقین دہانیوں کی وجہ سے کیا۔ اور محض اس لیے کیا کہ ان کے اور یہودیوں کے درمیان ایکا ہو گیا تھا اور ان کا یہ شر اور یہ بلاک تب ختم ہوا کہ اللہ نے احسان فرمایا اور اسلام اور نبی اسلام کو غلبہ عطا فرمایا" ۔ (دیکھئے کتاب مذکور کا ص ۲۰۷ تا ۲۱۶)

---)(---

درس نمبر ۲۶۳ تشریح آیات

۱ ـ ـ تا ـ ـ ۱۱

آياتها ۱۱ سورة المنفقون (۶۳) مدنية (۱۰۴) ركوعاتها ۲

بسم الله الرحمن الرحيم

اذا جاءك المنفقون قالوا نشهد انك لرسول الله والله يعلم انك
لرسوله والله يشهد ان المنفقين لكذبون ۝۱ اتخذوا ايمانهم جنة
فصدوا عن سبيل الله انهم ساء ما كانوا يعملون ۝۲ ذلك بانهم امنوا
ثم كفروا فطبع على قلوبهم فهم لا يفقهون ۝۳ واذا رايتهم تعجبك
اجسامهم وان يقولوا تسمع لقولهم كانهم خشب مسندة يحسبون
كل صيحة عليهم هم العدو فاحذرهم قتلهم الله انى يؤفكون ۝۴

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”اے نبیؐ ‘ جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ”ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسولؐ ہیں“۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اس کے رسولؐ ہو‘ مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں“۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور اس طرح یہ اللہ کے راستے سے خود رکتے اور دنیا کو روکتے ہیں۔ کیسی بری حرکتیں ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے ایمان لا کر پھر کفر کیا‘ اس لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی‘ اب یہ کچھ نہیں سمجھتے۔ انہیں دیکھو تو ان کے جثے تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں۔ بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے ہو مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دیئے گئے ہوں۔ ہر زور کی آواز کو یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہ پکے دشمن ہیں‘ ان سے بچ کر رہو‘ اللہ کی مار ان پر‘ یہ کدھر الٹے پھرائے جا رہے ہیں“۔

یہ رسول اللہ کے پاس آتے تھے۔ آپ کے سامنے یہ لوگ آپ کی رسالت پر ایمان کی شہادت دیتے تھے‘ لیکن دل

سے یہ شہادت نہ ہوتی ۔ بطور تقیہ یہ شہادت دیتے 'تاکہ ان کی حقیقت مسلمانوں سے چھپ جائے' لیکن درحقیقت یہ جھوٹی شہادت دے رہے تھے ۔ محض دھوکے کے لیے آتے ۔ یہ اس کے ذریعہ اپنے آپ کو چھپاتے ۔ چنانچہ اللہ فرماتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں ۔ لیکن اس موقعہ پر اللہ حضورؐ کی رسالت کی تصدیق خود فرماتا ہے اور منافقین کی جھوٹ کی شہادت دیتا ہے ۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ (۶۳ : ۱) "اللہ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں"۔ اور وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (۶۳ : ۱) "اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں"۔

یہاں انداز تعبیر میں نہایت احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے ۔ منافقین کے قول کی تکذیب سے پہلے اللہ رسالت محمدی کی تصدیق فرماتا ہے ۔ اگر یوں نہ ہوتا تو صرف یہ بات آتی کہ منافقین کی شہادت جھوٹی ہے ۔ اور شہادت تو رسالت سے متعلق ہے ۔ اور قرآن کا مقصد یہ نہ تھا ۔ "ان کی شہادت سچی ہے لیکن وہ اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں"۔ مطلب یہ ہے کہ شہادت سچی ہے لیکن وہ اقرار رسالت میں جھوٹے ہیں ۔ ضمیر کے مطابق شہادت نہیں دے رہے ۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً (۶۳ : ۲) "انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایمان کے بارے میں جب ذرا بھی شبہ پیدا ہوتا تو وہ قسمیں اٹھانا شروع کر دیتے ۔ یہ اس وقت ہوتا جب معلوم ہوتا کہ انہوں نے فلاں فلاں سازش میں حصہ لیا ۔ یا جب ان کی کوئی تنقید مسلمانوں تک پہنچ جاتی ۔ جب بھی ان کی کوئی ایسی بات کھلتی وہ قسمیں شروع کر دیتے ۔ یوں وہ اپنی صفائی بیان کر دیتے ۔ اور اس ڈھال کے پیچھے اپنے آپ کو بچا لیتے 'تاکہ آئندہ وہ اپنی سازشیں اور خفیہ تدابیر جاری رکھ سکیں اور ان میں جو بے وقوف تھے ان کو مزید دھوکہ دے سکیں ۔

فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۶۳ : ۲) "اس طرح وہ اللہ کے راستے سے رکتے اور روکتے ہیں"۔ یعنی خود اپنے نفوس کو بھی روکتے ہیں اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں ۔ اور سچائی کے ساتھ یقین نہیں کرتے ۔ اور اس سلسلے میں جھوٹی قسموں کا سہارا لیتے ہیں ۔

اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶۳ : ۲) "یعنی بری حرکتیں ہیں جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔ آخر جھوٹ 'فریب اور گمراہ کرنے سے بڑھ کر اور کیا برائی ہوگی ۔

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ یہ کام کیوں کرتے ہیں؟ جھوٹی شہادت 'جھوٹی قسمیں اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنے کا عمل نامشکور کیوں کرتے ہیں؟ یہ اس لیے کہ انہوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا ہے ۔ یعنی اسلام کو اچھی طرح جاننے اور دیکھنے کے بعد انہوں نے کفر پر چلنے کا ارادہ کر لیا ہے ۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۶۳ : ۳) "یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے ایمان لا کر پھر کفر کیا' اس لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ' اب یہ کچھ نہیں سمجھتے"۔

انہوں نے اسلام کو اچھی طرح پہچان لیا ہے ۔ لیکن اعلان ایمان کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ کفر کی طرف لوٹنے کا فیصلہ کر لیا ہے ۔ کوئی سمجھ دار' باذوق اور زندہ دل انسان یہ نہیں کر سکتا کہ ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف لوٹ

جائے ۔ کون ایسا ہو سکتا ہے جو ذوق رکھتا ہو' معرفت رکھتا ہو ۔ جو اس کائنات کے ایمانی تصور سے واقف ہو' جس نے ایمانی زندگی کا مزہ چکھا ہو' اور ایمان کی پاکیزہ فضا میں زندگی بسر کی ہو' ایمان کی روشنی میں سیدھی راہ پر چلا ہو' جو ایمان کے سایوں میں رہا ہو' اور پھر وہ کفر کی سیاہ رات اور کفر کی گرم اور جھلسا دینے والی فضاؤں میں جانا پسند کرے ۔ یہ حرکت وہی شخص کر سکتا ہے جس کا ذوق نہ ہو' جس کا دل حسد سے بھرا ہوا ہو ۔ جس کے اندر کوئی احساس و شعور نہ ہو اور جو سیاہ و سفید میں تمیز نہ کر سکتا ہو ۔

فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۶۳ : ۳) "اس لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے' اب یہ کچھ نہیں سمجھتے" ۔

اس کے بعد ان کی ایک نہایت منفرد تصویر پیش کی جاتی ہے ۔ اس تصویر کو دیکھ کر حقارت' نفرت پر بے اختیار ہنسی آتی ہے کہ یہ عجیب کندۂ ناتراش ہیں ۔ اندھے اور بہرے ہیں ۔ بے عقل' خالی الدماغ' اندھے' بزدل' سخت بخیل اور حاسد بلکہ وہ کندۂ ناتراش کی طرح ایک دیوار کے ساتھ چنے ہوئے ہیں ۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۶۳ : ۴) "انہیں دیکھو تو ان کے جثے تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں ۔ بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دیئے گئے ہوں ۔ ہر زور کی آواز کو یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں ۔ یہ پکے دشمن ہیں' ان سے بچ کر رہو' اللہ کی مار ان پر' یہ کدھر الٹے پھرائے جا رہے ہیں" ۔

یہ اس طرح ہیں جس طرح مضحکہ خیز بت ہوتے ہیں ۔ انسان معلوم ہی نہیں ہوتے ۔ جب یہ خاموش ہوتے ہیں تو کندۂ ناتراش نظر آتے ہیں اور جب یہ بولتے ہیں تو ان کے الفاظ ہر قسم کے مفہوم' احساس' اثر یا حقیقت سے خالی ہوتے ہیں' تم ان کی بات سنتے ہو' یوں نظر آتے ہیں کہ گویا لکڑیاں ہیں جن کو دیوار کے سہارے سے کھڑا کر دیا گیا ہے (یعنی یہ بے جان ہیں اور ماسوائے آواز کے ان میں زندگی کی کوئی علامت نہیں) ۔

ایک طرف تو وہ ایسے جامد' نافہم اور بے روح ہیں اور دوسری طرف سے یہ اس قدر چوکنے ہیں اور ڈرپوک ہیں اور ہر وقت کانپتے ہی رہتے ہیں اور انہیں ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے ۔

يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (۶۳ : ۴) "ہر زور کی آواز یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں" ۔ ان کو تو علم ہے کہ وہ منافق ہیں ۔ اور ان کے اوپر نفاق کا مہین پردہ پڑا ہوا ہے' جو چالاکی' قسموں اور احتیاطوں کی وجہ سے ابھی تک فاش نہیں ہوا ۔ ہر وقت وہ سہمے رہتے ہیں کہ یہ پردہ چاک ہی نہ ہو جائے اور راز فاش ہی نہ ہو جائے ۔ تصویر ایسی کھینچی گئی ہے کہ ہر وقت ادھر ادھر دیکھتے رہتے ہیں ۔ ہر حرکت' ہر آواز اپنے خلاف سمجھتے ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر حرکت ان پر وار ہے' اور ہر آواز ان کی پکار ہے ۔ یہ عجیب تصویر ہے ان کی اگر معاملہ فہم و ادراک کا ہو' تو وہ لکڑی کے بت ہیں ۔ کوئی سمجھ' کوئی روح' کوئی شعور اور ایمان کا اثر ان پر نہیں ہے ۔ اور اگر معاملہ ثابت قدمی اور خوف کا ہو تو وہ اس باریک شئی

کی طرح ہیں جو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ جھکتی رہتی ہے۔ ہر وقت کپکپاتی رہتی ہے۔ اور اپنی ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ وہ رسول اللہ کے دشمن نمبر ایک ہیں۔

هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ (۶۳ : ۴) "یہ پکے دشمن ہیں ان سے بچ کر رہو"۔ یہ اسلامی محاذ کے اندر چھپے ہوئے خفیہ دشمن ہیں۔ اسلامی صفوں کے اندر ہیں' اس لیے یہ خارجی دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔

فَاحْذَرْهُمْ (۶۳ : ۴) "ان سے بچ کر رہو"۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم نہیں دیا گیا کہ ان کو قتل کر دو' ان کو دوسرے انداز سے پکڑنا مطلوب تھا۔ اور اس میں حکمت' یقین' رواداری کے ساتھ ان کی سازشوں سے بچنا مطلوب تھا۔ (اس کا ایک نمونہ ابھی آرہا ہے)

قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۶۳ : ۴) "اللہ کی مار ان پر یہ کدھر الٹے پھرائے جا رہے ہیں"۔ یہ جہاں بھی جائیں اللہ ہی ان کے ساتھ جنگ کرنے والا ہے۔ اور اللہ جس کے خلاف دعا کرے' تو یہ حکم تصور ہوتا ہے کہ گویا فیصلہ ہو گیا کہ یہ ختم ہو گئے' قتل ہو گئے۔ اور یہی ہوا۔ پہلے مدینہ اور پھر جزیرۃ العرب میں۔

مزید بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی اندرونی حالت کیا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خلاف خفیہ طور پر کیا سازشیں کرتے ہیں اور آپ کے سامنے کس طرح جھوٹ بولتے ہیں ان کی اہم صفات یہ ہیں:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۭ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۭ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ
الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ع ۸

۱۳ "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرے تو سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے رکتے ہیں۔ اے نبیؐ' تم چاہے ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو' ان کے لیے یکساں ہے' اللہ ہرگز انہیں معاف نہ کرے گا' اللہ فاسق لوگوں کو ہرگز ہدایت نہیں دیتا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول کے ساتھیوں پر خرچ کرنا بند کر دو تاکہ یہ منتشر ہو جائیں۔ حالانکہ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کا مالک اللہ ہے'

مگر یہ منافق سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔ حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں"۔

سلف صالحین میں سے بے شمار لوگوں کی رائے یہ ہے کہ یہ آیات عبداللہ ابن ابی ابن سلول کے بارے میں ہیں۔ علامہ ابن اسحاق نے غزوۂ بنی المصطلق کے ذیل میں اس کی تفصیلات دی ہیں۔ یہ واقعہ بنی المصطلق کے پانی کے چشمے المریسیع پر سن ۶ ہجری میں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پانی پر نزول فرمایا تھا' غزوۂ کے واقعات کے بعد' واقعہ یوں ہوا کہ لوگ پانی بھرنے کے لیے اس پانی پر جمع ہوگئے۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ ایک شخص ملازم تھا جو بنی غفار قبیلے کا تھا اور اس کا نام جہجاہ ابن مسعود تھا۔ یہ آپ کے گھوڑے کو چلاتا تھا۔ یہ جہجاہ اور ایک دوسرے شخص سنان ابن وبر الجہنی بنی عوف ابن الخزرج کا حلیف ایک دوسرے سے آگے ہونے کی وجہ سے پانی پر لڑ پڑے۔ جہنی نے آواز دی "اے قوم انصار"۔ اور جہجاہ نے آواز دی "اے مہاجرین"۔ اس پر عبداللہ ابن ابی ابن سلول سخت غصے میں آگیا۔ اس وقت اس کی قوم کے کچھ لوگ اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں حضرت زید بن ارقم ایک نوجوان لڑکے بھی تھے۔ عبداللہ ابن ابی ابن سلول نے کہا اچھا' یہاں تک بات پہنچ گئی' اب یہ لوگ ہمارے علاقے میں زیادہ ہو کر ہمیں یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ خدا کی قسم قریش کے ان گرے پڑے لوگوں اور ہماری مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کہا: کتے کو پالو کہ وہ تمہیں کاٹے' خدا کی قسم اگر ہم مدینہ گئے تو ہم میں سے جو زیادہ عزت دار ہو گا وہ ذلیل کو نکال دے گا۔ اس کے بعد اس نے حاضرین مجلس سے خطاب کر کے کہا۔ یہ تو کام تو تم نے اپنے ساتھ خود کیا ہے۔ تم نے ان کو اپنے علاقے میں آنے دیا۔ تم نے ان کے ساتھ اپنے مال تقسیم کیے۔ خدا کی قسم اگر تم نے ان سے اپنے ہاتھ کھینچ لئے ہوتے تو وہ دوسرے علاقوں کا رخ کرتے۔

یہ باتیں زید ابن ارقم نے سن لیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور یہ پوری باتیں آپ کو سنائیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ رسول اللہ اپنے دشمنوں سے فارغ ہوگئے تھے۔ جب حضورؐ کے سامنے یہ بات کی گئی تو حضرت عمر موجود تھے۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا حضور عباد ابن بشر کو حکم دیں کہ اسے قتل کر دے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا "عمر اس پر تو لوگ یہ کہیں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرنے لگا ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا البتہ فوراً کوچ کا اعلان کر دو"۔ یہ ایسا وقت تھا کہ اس میں رسول اللہ کبھی سفر نہ فرماتے تھے۔ لوگ نکل پڑے۔ عبداللہ ابن ابی ابن سلول حضور اکرم کے پاس گیا۔ یہ اس وقت جب اسے معلوم ہوگیا کہ زید ابن ارقم نے پوری بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دی ہے۔ اس نے قسم اٹھائی کہ نہ میں نے یہ بات کی ہے اور نہ اس بارے میں کوئی لفظ کہا ہے۔ یہ عبداللہ ابن ابی اپنی قوم میں بڑا معزز اور ذی مرتبہ تھا۔ اس کی ساتھ جو صحابہ کرام انصار سے آئے تھے۔ انہوں نے کہا رسول خدا ممکن ہے یہ لڑکا بات کو پوری طرح نہ سمجھا ہو' یا وہم سے اس نے ایک بات سے کچھ اور سمجھا ہو۔ اور بات اسے پوری طرح یاد نہ رہی ہو۔ یہ لوگ عبداللہ ابن ابی ابن سلول پہ مہربان تھے اور اس کے طرفدار تھے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب حضورؐ نے کوچ کیا اور چل پڑے تو اسید ابن حضیر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کا سلام کیا' اور پھر کہا اللہ کے نبی آپ تو ایک ایسے وقت میں کوچ کر رہے ہیں جو ایک نیا وقت ہے۔ ایسے اوقات میں آپ نے کبھی کوچ کا حکم نہیں دیا۔ رسول اللہ نے فرمایا کیا تم نے سنا نہیں کہ تمہارے ساتھی نے کیا کہا۔ تو انہوں نے کہا "حضورؐ وہ کون ساتھی ہے تو آپ نے فرمایا (عبداللہ ابن ابی)۔ تو انہوں نے کہا اس نے کیا کہا ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا

کہ "اس کا خیال ہے کہ جب ہم مدینہ پہنچیں گے تو ہم میں سے عزت والا آدمی ذلیل لوگوں کو نکال دے"۔ تو انہوں نے کہا رسول اللہ تو پھر آپ اسے مدینہ سے نکال دیں گے۔ اگر آپ چاہیں گے۔ خدا کی قسم وہ ذلیل ہے اور آپ معزز ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ رسول اللہ اس کے ساتھ نرمی فرمائیں' خدا کی قسم اللہ نے آپ کو ہمارے پاس بھیجا ہے اور اس کی قوم اس کے لیے موتی تلاش کر رہی تھی کہ ان سے تاج بنا کر اسے پہنا دے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ آپ نے اس سے ایک مملکت چھین لی ہے۔

اس کے بعد حضورؐ اس دن پورا دن لوگوں کو لے کر چلے' شام ہو گئی' پھر ساری رات چلے کہ صبح ہو گئی' اور دوسرے دن بھی سورج نکل آیا اور وہ ان کو ازیت دینے لگا۔ اس کے بعد حضورؐ نے حکم دیا کہ پڑاؤ کرو۔ جونہی لوگ اتر کر زمین پر پڑے سو گئے اور حضورؐ نے یہ کام اس لیے کیا کہ لوگوں کو کل کی بات پر کوئی چہ میگوئی کرنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں اس وقت سورہ منافقون نازل ہوئی۔ یہ ابن ابی کے بارے میں نازل ہوئی اور ان لوگوں کے بارے میں جو اس جیسے تھے۔ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضورؐ نے زید ابن ارقم کو کان سے پکڑا۔ "یہ شخص ہے جس نے اللہ کے لیے اپنے کانوں سے کام کیا"۔ اور عبداللہ ابن عبداللہ ابن ابی ابن سلول کو پتہ چل گیا کہ اس کے والد نے کیا کیا ہے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے عاصم ابن عمر ابن قتادہ نے بتایا کہ یہ عبداللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے۔ اور کہا کہ یا رسول اللہ .... مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے والد عبداللہ ابن ابی کو قتل کرنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ لازماً یہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ مجھے حکم دیں میں اس کا سر لا کر حاضر کر دوں گا۔ کیونکہ خزرج کو معلوم ہے کہ اپنے والد کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے والا میرے مقابلے میں کوئی نہیں ہے۔ مجھے یہ خطرہ ہے کہ آپ کسی اور کو حکم دیں کہ وہ میرے والد کو قتل کر دے۔ میرا نفس مجھے اجازت نہ دے گا کہ عبداللہ ابن ابی کا قاتل مدینہ میں لوگوں کے اندر پھرے اور میں مجبور ہو جاؤں کہ ایک کافر کے بدلے مومن کو قتل کر دوں اور ہمیشہ کے لیے جہنمی ہو جاؤں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "نہیں ہم اس کے ساتھ نرمی کریں گے اور اس کی ملاقات بھی اچھے طریقے سے کریں گے جب تک وہ ہمارے اندر زندہ ہے"۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کے بعد جب بھی وہ کوئی ایسی حرکت کرتا' اس کی قوم اس پر اس کی سخت گرفت کرتی۔ اسے پکڑتے اور اس کے ساتھ لوگ سختی کرتے۔ اس پر رسول اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ اس کی قوم اس سے نفرت کرنے لگی ہے۔ "عمر تمہاری اب کیا رائے ہے؟ کہ جس دن تم نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں اسے قتل کر دوں' اگر میں اسے اس دن قتل کر دیتا تو اس کی وجہ سے شورش پیدا ہو جاتی اور آج اگر میں خود اس کے قبیلے کو حکم دوں تو وہ اسے قتل کر دیں" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا' خدا کی قسم مجھے اب معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے میری رائے سے بہت زیادہ برکت والی ہے۔

عکرمہ اور ابن زید وغیرہ نے ذکر فرمایا ہے کہ لوگ جب واپس مدینہ پہنچے تو حضرت عبداللہ ابن عبداللہ ابن ابی ابن السلول رضی اللہ عنہ مدینہ کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے تلوار نکال لی' لوگ اس کے پاس سے گزرتے رہے' جب اس کے والد رئیس المنافقین آئے تو انہوں نے باپ سے کہا: "پیچھے کھڑے ہو جاؤ"۔ خدا کی قسم' تم اس جگہ

سے ادھر نہیں آ سکتے ۔ جب تک رسول اللہ اجازت نہ دے دیں ۔ اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ معزز ہیں ۔ اور تم ذلیل ہو' جب رسول اللہ تشریف لائے تو آپ اس وقت قافلے کے "ساقہ" کے طور پر آ رہے تھے (ساقہ قافلے کے پیچھے چلنے والا افسر جو دیکھے کہ کسی نے راہ گم کر دیا ہو یا کوئی ضرورت مند ہو گیا ہو) تو رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی ابن سلول نے حضورؐ سے اپنے بیٹے کی شکایت کی تو عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا حضور یہ اس وقت تک شہر کے اندر نہیں جا سکتا جب تک آپ اجازت نہ دیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اجازت دی ۔ اور بیٹے سے کہا : اب جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی ہے تو آپ جا سکتے ہیں"۔

یہاں آ کر ہم کبھی ان واقعات کو دیکھتے ہیں' کبھی صحابہ کرام کو دیکھتے ہیں اور کبھی نصوص قرآنی کو دیکھتے ہیں' یوں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت' اللہ تعالیٰ کے نظام تربیت اور اللہ کے دست قدرت اور نظام قضا و قدر کو دیکھتے ہیں ۔ تو حیران رہ جاتے ہیں --- مسلمانوں کی صفوں کے اندر منافقین نہایت دور تک گھسے ہوئے ہیں ۔ یہ منافق تقریباً دس سال سے یہاں رہ رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو چن کر اپنی صفوں سے نکالتے نہیں ہیں اور ان منافقین کے ناموں اور اشخاص کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صرف اپنی وفات سے چند ایام قبل ہی اطلاع دیتا ہے ۔ اگرچہ حضورؐ ان کی چاپلوسی' چالاکی اور عیاری کی وجہ سے انہیں خوب جانتے تھے ۔ اسی طرح دوسری علامات کی وجہ سے بھی کہ جب کوئی بات ہوتی ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا ۔ اور اللہ نے یہ حکم اس لیے دیا کہ اللہ کسی شخص کے دل کو کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں دیتا ۔ دلوں کا مالک صرف اللہ ہے ۔ یہ اللہ ہی ہے جو دلوں کے بھیدوں پر محاسبہ کر سکتا ہے ۔ لوگوں کا تعلق لوگوں کے ساتھ ظاہری اقرار اور حالات پر ہو گا ۔ اور محض شک کی بنا پر کسی کو پکڑا نہ جائے گا بلکہ شک کی بنا پر چھوڑا جائے گا ۔ محض عقل کی بنیاد پر کسی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ۔ یہاں تک کہ جب اللہ نے رسول کو اطلاع دے دی کہ آخر تک بعض لوگ نفاق پر قائم ہیں اور نام بھی بتا دیئے تب بھی حضور نے ان کو جماعت سے نہ نکالا ۔ جب تک کہ وہ اسلام کا اقرار کرتے اور اسلامی فرائض و واجبات ادا کرتے رہے اور حضورؐ نے صرف حذیفہ ابن الیمان رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی تھی اور انہوں نے مسلمانوں کے اندر اس راز کو نہیں پھیلایا ۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ کے پاس آتے تھے اور اپنے بارے میں ان سے اطمینان حاصل کرتے کہ بتاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تو منافقین میں شمار نہیں کیا ۔ تو حضرت حذیفہ فرماتے' عمر رضی اللہ عنہ تم ان میں سے نہیں ہو اور اس سے زیادہ کچھ نہ کہتے اور رسول اللہ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ ان میں سے اگر کوئی مر جائے تو اس کا نماز جنازہ نہ پڑھائیں ۔ جب ان میں سے کوئی مر جاتا تو رسول اللہ اس کی نماز جنازہ نہ پڑھاتے ۔ یوں معلوم ہو جاتا کہ یہ منافق ہے ۔ جب رسول اللہ فوت ہو گئے تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ان لوگوں کی نماز جنازہ میں شریک نہ ہوتے تھے ۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی نماز جنازہ میں نہ جاتے تھے' جن میں حضرت حذیفہ نہ گئے ہوں ۔ جب وہ دیکھتے کہ حضرت حذیفہ موجود ہیں تو معلوم کر لیتے کہ منافقین میں سے نہیں ہے ۔ اور اگر حذیفہ نہ ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز نہ پڑھتے لیکن منہ سے کچھ نہ کہتے ۔

اس طرح یہ واقعات آگے بڑھتے رہے' اللہ کی تقدیر اور حکمت کے مطابق ۔ اللہ کی مقرر کردہ حکمتوں اور مقاصد کے حصول کے لیے تربیت' عبرت اور اخلاقی اور تنظیمی تربیت کی خاطر --- یہ واقعہ جس کے بارے میں یہ آیات نازل

ہوئیں' اس کے اندر کس قدر عبرتیں ہیں؟

ذرا عبداللہ ابن ابی ابن سلول کو دیکھیں ۔ یہ مسلمانوں کے اندر رہ رہا ہے ۔ رسول اللہ کے قریب رہتا ہے ۔ اس دین کی حقانیت کے واقعات و احادیث اور نشانات و علامات اس کے ماحول میں' اس کے سامنے پے درپے ظاہر ہو رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اسے توفیق ایمان نہیں دے رہا ہے ۔ کیونکہ اللہ کے نظام قضا و قدر میں اس طرح لکھا ہی نہ گیا تھا ۔ اثر آفرینی اور ضوپاشی کا یہ سیلاب اس تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوا' اس لیے کہ اس کے دل میں اس دین کی دشمنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ یوں کہ وہ اوس اور خزرج کا بادشاہ نہ بن سکا ۔ اس نے یہ کھیل تیار کر لیا تھا' مگر اسلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں داخل ہوئے تو یہ کھیل خراب ہو گیا ۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ہدایت قبول نہ کی ۔ حالانکہ ہدایت کے دلائل ہر طرف سے آ رہے تھے ۔ اور اسلام میں ہر طرف وسعت ہو رہی تھی ۔

لیکن دوسری طرف ان کے بیٹے ہیں' ان کا نام بھی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ہے ۔ یہ ایک مسلم اور مخلص مسلم کا بلند ترین نمونہ ہیں ۔ یہ باپ ان کے لیے مصیبت ہے' یہ باپ کے کارناموں سے تنگ آ چکے ہیں ۔ باپ جو موقف اختیار کرتا ہے' وہ ان کے لیے شرمندگی کا سبب ہے ۔ لیکن باپ جو بھی کرے وہ اس کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے سعادت مند بیٹے ہیں ۔ یہ سنتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو شاید اس شخص کو اب قتل ہی کرا دیں ۔ ان کے دل میں جذبات اور ردعمل کا واضح طوفان اٹھتا ہے ۔ اور وہ رسول اللہ کے سامنے ان کا اظہار صاف صاف کر دیتے ہیں ۔ وہ اسلام سے محبت کرتے ہیں ۔ رسول اللہ کے مطیع فرمان بھی ہیں ۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ اگر رسول اللہ مجھے اپنے باپ ہی کے خلاف حکم دیں تو میں تعمیل کروں گا ۔ لیکن وہ اس بات کو برداشت نہیں کرتے کہ کوئی اور آگے بڑھے اور ان کے باپ کی گردن اڑا دے ۔ وہ زمین کے اوپر زندہ پھرے اور لوگ انہیں دیکھیں ۔ وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ شاید میرا نفس اس منظر کو برداشت نہ کر سکے ۔ شیطان مجھے بدلہ لینے پر مجبور کر دے ۔ تو وہ حضورؐ کے سامنے اپنے یہ خلجانات پیش کر کے مسئلے کے حل کی درخواست کرتے ہیں ۔ اور خود ہی تجویز پیش کرتے ہیں کہ اگر آپ نے لازماً یہ کام کرنا ہی ہے تو مجھے حکم دیں ۔ میں اس کا سر آپ کے سامنے پیش کر دوں گا تاکہ کوئی غیر اس کام کو نہ کرے اور میں اپنے کافر والد کے بدلے ایک مسلمان کو قتل کر دوں اور جہنم رسید ہو جاؤں ۔

انسانی فکر و خیال کو جس میدان میں بھی جولانی دی جائے' اور جس پہلو سے بھی اس واقعہ پر نظر دوڑائی جائے' اس میں حسن و جمال ہی نظر آتا ہے ۔ ایک مومن کے دل میں ایمان کس قدر خوبصورت نظر آتا ہے کہ وہ رسول اللہ کے سامنے یہ تجویز رکھتا ہے کہ دنیا کا مشکل ترین کام یعنی خود اپنے باپ کے قتل کا حکم مجھے دیجئے ۔ اور یہ ڈیوٹی وہ صداقت سے لے رہا ہے ۔ اور نور ایمان اور حکمت ایمانی کا جمال دیکھئے کہ اس پیشکش کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو کس حکمت سے اس سے بھی بڑی مصیبت سے بچاتا ہے ۔ یہ کہ وہ انسانی جذبات سے مغلوب ہو کر ایک کافر باپ کے بدلے مومن کو قتل کر دے اور وہ مومن کو جنت میں پائے اور اپنے آپ کو دوزخ میں ۔ اور اسی مومن کی صداقت اور سچائی دیکھئے کہ وہ اپنی کمزوری کا بھی صاف صاف اظہار کرتا ہے اور وہ کہتا ہے "خدا کی قسم خزرج کو معلوم ہے کہ میرے مقابلے میں والد کے بارے میں احسان کرنے والا جوان نہیں ہے"۔ چنانچہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کرتے ہیں کہ انہیں اس مشکل سے نکالا جائے ۔ یہ مومن اپنے کیس کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ نہ حکم عدولی ہوتی ہے اور نہ آپ کی دل شکنی

ہوتی ہے۔کیونکہ حکم رسول کو ماننے کے لیے وہ تیار ہیں۔اشارے کی ضرورت ہے۔بشرطیکہ حضور حکم دیں اور وہ والد کا سرپیش کر دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ سچا مومن کس قدر مشکل صورت حال میں پھنس گیا ہے۔ حضورؐ نہایت ہی شریفانہ انداز میں ان کی ہر مشکل دور فرما دیتے ہیں۔بلکہ حضورؐ فرماتے ہیں "ہم اس کے ساتھ نرمی کریں گے اور اس کے ساتھ محفل میں اچھا سلوک کریں گے جب تک کہ وہ زندہ ہے"۔اور اس سے قبل جب حضرت عمر نے اس کے قتل کی تجویز پیش کی تو آپ نے ان کی تجویز یہ کہہ کر رد کر دی کہ لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

پھر اس واقعہ میں حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو تصرفات و اقدامات ہیں وہ بھی قابل ملاحظہ اور قابل تقلید ہیں۔ آپ ایک ایسے قائد کی طرح کام کرتے نظر آتے جو الہام کی روشنی میں کام کرتا ہے۔آپ نے لشکر کو حکم دیا کہ کوچ کرو، حالانکہ آپ کی ایسے اوقات میں کوچ کرنے کی عادت نہ تھی۔اور آپ نے اس سفر کو اس قدر طویل وقت کے لیے جاری رکھا کہ لوگ تھک کر چور ہو گئے تاکہ لوگوں کے اندر عصبیت جاہلیہ کے جذبات پھیلائے جانے کا کوئی موقعہ ہی کسی کو نہ ملے۔کیونکہ دو افراد نے اپنی جنگ میں عصبیت کا سہارا لیا تھا۔ایک نے کہا اے انصاریو! دوسرے نے کہا اے مہاجرو! اور پھر اس موقعہ پر رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی ابن سلول جو فتنہ انگیزی کرنا چاہتا تھا اسے بھی حضورؐ نے دبا دیا۔اس کی اسکیم یہ تھی کہ مہاجرین اور انصار کے درمیان جو اخوت اور محبت ہے، اس کو جلا کر رکھ دے۔ حالانکہ یہ اخوت و محبت کا وہ نادر نمونہ تھا جس کی مثال انسان کی ہزاروں سالوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔اس کے بعد اسید ابن حضیر کے ساتھ حضورؐ کی گفتگو اور اس کے اندر پائی جانے والی روحانی تیاری، جو اس فتنے کے مقابلے میں حضور فرما رہے تھے اور پھر اس فتنے کے سرغنے کو پکڑنے کا جوش جبکہ وہ اپنی قوم میں اب تک بھی بااثر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سب سے آخر میں رجل مومن عبداللہ ابن عبداللہ کا کردار نہایت ہی روشن اور خوبصورت ہے کہ وہ مدینہ کے باہر تلوار لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے باپ کو شہر کے اندر داخل نہیں ہونے دیتے، جب تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیں۔اور یہ ہے مظاہرہ اس بات کا کہ۔

لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ (۶۳ : ۸) "اس سے معزز شخص ذلیل شخص کو نکال باہر کرے گا"۔ اور اس پر بھی رجل مومن نے یہ کام اس لیے کیا کہ لوگ جان لیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عزت دار ہیں اور ان کا باپ ذلیل ہے۔آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں اور اس ذلیل شخص کو داخلے کی اجازت ہوتی ہے۔اور سائنسی تجربہ بتا دیتا ہے کہ عزیز کون ہے اور ذلیل کون؟ اسی واقعہ میں اور اسی وقت میں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بلند ترین چوٹی ہے جہاں تک یہ مومنین پہنچ چکے تھے۔ ایمان نے ان کو ان مقامات بلند اور مراتب بلند تک پہنچا دیا تھا لیکن وہ تھے انسان۔ان میں بشری کمزوریاں تھیں، ان میں جذبات تھے، ان کے دلوں میں خلجانات آتے تھے، یہ ہے اس دین کا نہایت ہی نمایاں وصف، بشرطیکہ لوگ اسے اس کی حقیقت کے مطابق سمجھیں۔اور لوگ ان لوگوں کو ایک انسان کی طرح رکھ کر سمجھیں کہ یہ لوگ مکہ اور مدینہ کی سرزمین پر بطور انسان رہے، کھانا کھاتا رہے اور بازاروں میں پھرتے رہے اور پھر بھی اس مقام تک پہنچ گئے۔

اب وہ آیات جو ان واقعات کے بارے میں نازل ہوئیں، مناسب ہے کہ قدرے ان کے ساتھ بھی رہیں :

وَ اِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَ رَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (۶۳ : ۵) "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرے تو سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے رکتے ہیں"۔ یہ لوگ یہ فعل کرتے ہیں، اور اس قسم کی باتیں منہ سے نکالتے ہیں، جب ان کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ باتیں پہنچ گئی ہیں تو پھر یہ فوراً ڈر جاتے ہیں۔ ذلیل ہو کر جھوٹی قسمیں اٹھاتے ہیں اور ان جھوٹی قسموں کے سہارے زندہ رہ رہا ہے اور اگر وہ امن کی حالت میں ہوں، کوئی ان سے کہے کہ آؤ رسول اللہ سے درخواست کرو کہ تمہاری بخشش کے لیے رسول اللہ دعا کریں تو سر جھٹکتے ہیں اور نہایت ہی تکبر میں حضورؐ کے پاس آنے سے رک جاتے ہیں۔ یہ منافقین کی دونوں باہم متضاد صفات ہیں۔ اگرچہ یہ اپنی قوم میں 'باعزت اور باتمام لوگ ہوں۔ یہ دل میں اپنے اندر سے اس قدر کھوکھلے اور ڈرپوک ہوتے ہیں کہ یہ تکبر کرتے ہیں' اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ سر جھٹک کر پھیر دیتے ہیں' جب ان کو خوف نہ ہو' لیکن جب یہ خوف ہو کہ رسول اللہ کے سامنے جانا ہے تو پھر قسمیں اٹھاتے ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ نے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا ہے' لہٰذا اب آپ ان کے بارے میں استغفار کریں یا نہ کریں' استغفار کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۶۳ : ۶) "اے نبیؐ' تم چاہے ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو' ان کے لیے یکساں ہے' اللہ ہرگز انہیں معاف نہ کرے گا' اللہ فاسق لوگوں کو ہرگز ہدایت نہیں دیتا"۔

ان کے فسق و فجور کی ایک جھلک ملاحظہ ہو' جس کی وجہ سے اللہ نے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا ہے کہ انہیں ہدایت نصیب نہ ہو گی۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا (۶۳ : ۷) "یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے ساتھیوں پر خرچ کرنا بند کر دو' تاکہ یہ منتشر ہو جائیں"۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کے کہنے والے کا خبث باطن عیاں ہے اور یہ شخص نہایت ہی ذلیل انسان ہے۔ یہ وہ منصوبہ ہے جو اہل باطل روز اول سے اہل ایمان کے خلاف آزماتے ہیں۔ زمان و مکان کی قید کے سوا ہر جگہ اور ہر دور میں اہل باطل نے یہ نسخہ آزمایا ہے جیسا کہ اگلوں پچھلوں نے مشورہ کر کے یہ طے کر دیا ہے کہ اہل دین اور اہل نظریہ لوگوں پر رزق کے دروازے بند کر دو۔ یہ اس لیے کہ یہ لوگ اس قدر ذلیل ہوتے ہیں کہ یہ لوگ ہر بات ہر فیصلہ پیٹ کے نقطہ نظر سے کرتے ہیں۔ چنانچہ اہل ایمان کے خلاف شیطان نے یہی نسخہ آزمانے کی تجویز کی۔

یہی نسخہ قریش نے بنی ہاشم کے خلاف آزمایا اور ان کو شعب بن طالب میں محصور کر دیا اور راشن اور ضروریات زندگی ان پر بند کر دیں تاکہ بنو ہاشم رسول اللہ کی حمایت چھوڑ دیں اور رسول اللہ کو مشرکین کے سپرد کر دیں۔

... یہی منصوبہ منافقین مدینہ کے رئیس نے پیش کیا کہ تم ان لوگوں پر انفاق بند کر دو' یہ سب بھاگ کر چلے جائیں گے ۔ تنگی حالات اور بھوک و افلاس سے مجبور ہو کر ۔

اور یہی نسخہ کمیونسٹوں نے اپنے علاقے میں ان اہل دین کے خلاف استعمال کیا کہ ان پر ضروریات زندگی بند کر دیں تا کہ بھوک سے مر جائیں یا دین اور خدا کا انکار کر دیں ۔ اور نماز و روزہ چھوڑ دیں ۔

آج ہمارے دور میں پوری دنیا میں احیاء اسلام کی جو تحاریک چل رہی ہیں ان کے ساتھ بھی ان کے مخالفین یہی سلوک کر رہے ہیں ۔ ان کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں انہیں افلاس سے مار رہے ہیں اور ان پر ملازمتوں کے دروازے بند کر رہے ہیں ۔

غرض تمام دشمنان اسلام نے بالاتفاق اس ذلیل ذریعہ کو اہل ایمان کے خلاف آزمایا ہے ۔ اور یہ طریقہ قدیم زمانوں سے آج تک یونہی چلا آ رہا ہے ۔ لیکن ان دشمنان اسلام نے اس حقیقت کو بھلایا ہے ۔

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ (۶۳ : ۷) "حالانکہ زمین و آسمان کے خزانوں کا مالک اللہ ہے مگر یہ منافق سمجھتے نہیں ہیں" ۔ حالانکہ زمین و آسمان کے خزانوں ہی سے اللہ ان لوگوں کو رزق دے رہا ہے جو مسلمانوں کا رزق بند کر رہے ہیں ۔ کیونکہ نہ یہ لوگ خود اپنا رزق پیدا کر رہے ہیں اور نہ مومنین کا رزق بند کر سکتے ہیں لیکن یہ لوگ غبی ہیں اور یہ اس واضح حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ وہ خود اپنی روزی کے مالک نہیں اور بند کرنا چاہتے ہیں دوسروں کا رزق ۔

یوں اللہ تعالیٰ مومنین کو ثابت قدم اور ان کی دلوں کو مضبوط فرماتے ہیں تاکہ وہ دشمنان اسلام کے اس ذلیل منصوبے کا مقابلہ کریں ۔ کیونکہ اللہ کے دشمنوں کے پاس اب اور کوئی ہتھیار نہیں رہا ہے ۔ اس لیے وہ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے ہیں ۔ اللہ ان کو مطمئن کرتا ہے کہ زمین و آسمان کے خزانوں کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں ہیں ۔ لہذا اگرچہ دشمنوں کو بھی دیتا ہے لیکن دوستوں کو بھی نہیں بھلاتا ۔ اللہ کی رحمت کا قانون یہ ہے کہ وہ دشمنوں کو بھی رزق دیتا ہے ۔ کسی کو بھی بھوک سے نہیں مارتا ۔ ان لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر اللہ ان کا رزق کاٹ دے تو یہ لوگ کچھ بھی نہ پائیں گے ۔ اس لیے اللہ اپنے بندوں کو ایسے حالات کے سپرد نہیں کرتا کہ وہ روزی سے محروم ہو جائیں ۔ وہ تو بہت بڑ کریم ہے ۔ کیونکہ کسی پر رزق کے دروازے بند کرنے کا کام وہ شخص ہی کر سکتا ہے جو بہت ذلیل اور پرلے درجے کا خسیس ہو ۔ اور اس کے بعد ان کا یہ قول :

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ (۶۳ : ۸) "یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل" کو وہاں سے نکال باہر کرے گا" ۔ اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ اس حقیقت کو عبداللہ ابن عبداللہ ابن ابی نے کس طرح حقیقت کر کے پیش کیا اور کس طرح ذلیل آدمی عزت دار آدمی کی اجازت سے شہر میں داخل ہوا ۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۶۳ : ۸) "حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے مگر یہ منافق جانتے نہیں" ۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ اور مومنین

کو اپنے ساتھ ایک صف میں شامل کر کے ان کو بھی معزز بنایا اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے کہ اللہ اپنے رسول اور مومنین کو اپنے پہلو میں کھڑا کر دے ۔ اور کہے ”ہم ہیں معزز اور یہ ہیں ذلیل ۔ اللہ نے بالکل سچ کہا‘ کہ اس نے قلب مومن میں ایمان کو عزت کے مساوی قرار دیا اور مومن کو عزت حاصل ہوئی اللہ کی عزت سے ‘ایسی جو نہ ہلکی ہوتی ہے ‘ نہ اس میں سستی آتی ہے ‘ نہ جھلتی ہے ‘ اور نہ نرم ہوتی ہے ۔ اور یہ عزت نفس انسان مومن کو بہت ہی متزلزل حالات میں بھی ‘ ایمان کے حوالے سے کمزور ہونے نہیں دیتی ۔ اس طرح جب کسی کے دل میں ایمان اچھی طرح قرار پکڑ لیتا ہے اور پختہ ہو جاتا ہے تو اس شخص کے دل میں عزت بھی نہایت مضبوط اور جڑ پکڑ لیتی ہے ۔

وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۸:۶۳) ”مگر منافق جانتے نہیں“ ۔ وہ کیا جانیں ‘ انہوں نے نہ تو عزت نفس کا ذوق پایا اور نہ ان کے پاس اس کا سرچشمہ ہے ۔

اب اللہ تعالیٰ ان مومنین کو آخری بار پکارتا ہے ‘ وہ مومنین جن کے رسول کو اور خود ان کو اللہ نے اپنی عزت سے معزز بنایا‘ اللہ کی طرف سے ان کی طرف اب اس سورت میں آخری ندا آتی ہے کہ وہ عزت اور شرف کے اس مقام تک بلند ہو جائیں اور منافقین کی تمام صفات اپنے اندر سے نکال دیں ۔ اور مال اور اولاد سے بلند ہو کر شرف کا یہ مقام حاصل کریں ‘ دیکھو دنیا کا کوئی مفاد‘ چاہے مال ہو یا اولاد ہو ‘تمہیں روک نہ دے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ
عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَاَنْفِقُوْا مِنْ
مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ
۲ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ
ع ۲ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

۱۴ ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو ‘ تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں ۔ جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں ۔ جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اس وقت وہ کہے کہ ”اے میرے رب ‘کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا“ ۔ حالانکہ جب کسی کی مہلت عمل پوری ہونے کا وقت آ جاتا ہے تو اللہ کسی شخص کو ہرگز مزید مہلت نہیں دیتا‘ اور جو کچھ تم کرتے ہو ‘ اللہ اس سے باخبر ہے“ ۔

اگر انسان کا قلب زندہ نہ ہو تو مال اور اولاد انسان کو غافل کر دینے والے بن جاتے ہیں ۔ یہ سامان لہو و لعب ہیں ۔ قلب زندہ ہو گا تو معلوم ہو گا کہ انسان کا مقصد وجود کیا ہے ۔ اسے معلوم ہو گا کہ اللہ نے اسے پیدا کیا ہے اور اس کے اندر اپنی روح پھونکی ہے ۔ اس کی روح کے اندر ایک ایسا روحانی شوق پیدا کیا جو انسان کو ‘ انسانی طاقت کی حدود کے اندر ‘

صفات الہیہ کا عکس دیتا ہے ۔ یہ مال و اولاد تو دنیا کے عارضی انتظام اور دنیا میں رہنے کی حد تک محدود ذمہ داریاں ہیں' جو انسان پر ڈالی گئی ہیں ۔ اس لیے نہیں کہ یہ انسان کو آخرت کی اصل باقی اور دائمی زندگی سے غافل کر دیں اور انسان اللہ اور اللہ تک پہنچنے کے اعلیٰ مقصد کو بھلا ہی دے اور انسان وہ سبق بھلا دے جو عالم بالا سے اسے ملتا ہے ۔ یوں وہ غافل ہو کر خسارے میں پڑ جائے ۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۶۳ : ۹) "جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں" ۔ یوں ان کو پہلا خسارہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ انسانی صفات بھلا دیتے ہیں ۔ کیونکہ انسان مکمل انسان تب ہی بنتا ہے کہ اسے عالم بالا سے اتصال حاصل ہو اور جو شخص انسانیت ہی گنوا دے' اس نے گویا سب کچھ گنوا دیا ۔ اس نے گویا اصول و اولاد کو بھی گنوا دیا ۔

ایک ہی آیت میں انفاق کے لیے بے شمار موثر اشارات

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ (۶۳ : ۱۰) "جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو" ۔ یہ سمجھایا جاتا ہے کہ تمہارے ہاں رزق اور وسائل رزق جو آتے ہیں وہ کہاں سے آتے ہیں؟ یہ اس اللہ کے ہاں سے آتے ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو' اور جو تمہیں انفاق کا حکم دیتا ہے ۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ (۶۳ : ۱۰) "قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے" ۔ بس اس سے سب کچھ رہ جائے اور یہ اس کی اولاد یا دوسروں کے پاس چلا جائے ۔ اور اگلے جہاں میں جب وہ تلاش کرے تو اسے آگے بھیجا ہوا کچھ نظر نہ آئے ۔ یہ سب سے بڑی حماقت اور سب سے بڑا خسارہ ہے ۔ پھر وہاں یہ تمنائیں کرے گا کہ اسے دوبارہ مہلت دی جائے اور وہ دوبارہ صالحین میں سے بن جائے گا ۔ لیکن یہ تو محض تمنا ہی ہوگی ۔

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا (۶۳ : ۱۱) "حالانکہ جب کسی کی مہلت عمل پوری ہونے کا وقت آ جاتا ہے تو اللہ کسی کو مزید مہلت نہیں دیتا" ۔ مزید مہلت ممکن نہ ہوگی ۔

وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۶۳ : ۱۱) "اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے؟"

غرض ایک ہی آیت میں یہ مختلف قسم کی یاد دہانیاں ہیں ۔ اور منافقین کی خصوصیات اور مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشوں کو بیان کرنے کے بعد یہ ہدایات برمحل تھیں ۔ اب جبکہ مسلمان اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صف میں اہل عزت کے ساتھ یکجا کھڑے ہیں ۔ لہٰذا ان کا فرض ہے کہ وہ ایمان کے تقاضے پورے کریں ۔ اللہ کو یاد کریں اللہ کی قوت امن کا سرچشمہ ہے ۔ یوں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو قرآن کے ذریعہ تربیت دیتا ہے ۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ۔۔ ۲۸

سورۃ التغابن ۔ ۶۴

ا ۔۔ تا ۔۔ ۱۸

سورۃ التغابن ایک نظر میں

اس سورت کے موضوع ' محور ' انداز گفتگو ' ماحول اور اشارات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت مکی سورتوں کی طرح ہے ۔ خصوصاً اس کے ابتدائی پیراگراف اور آیات ۔ صرف آخری پیراگرافوں اور آیات میں مدنی فضا کا پتہ چلتا ہے ۔

اس کے ابتدائی پیراگراف یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ (آیت ۱۴) تک اسلامی عقائد و نظریات سے متعلق ہیں اور اسلوب بھی مکی سورتوں کی طرح ہے جن میں خطاب مشرکین مکہ کو ہوا کرتا تھا ۔ اور خطاب کا انداز اور مضامین و تصورات بھی ایسے ہیں کہ جس طرح دعوت کا آغاز بالکل نئے مخاطبین سے ہو رہا ہے گویا مخاطب کے سامنے پہلے یہ تصورات پیش نہیں ہوئے ۔ پھر ان میں اس کائنات کی نشانیاں پیش کی گئی ہیں ۔ سابق امم کے واقعات کی طرف اشارہ ہے اور بعث بعد الموت اور قیامت کے مشاہد ہیں جن کو نہایت ہی تاکید کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔ اس طرح کہ گویا مخاطبین ان عقائد کے منکر ہیں ۔

آخری فقرات بے شک مدنی مزاج و انداز کے ہیں ۔ جس طرح اکثر مدنی سورتوں کا انداز ہوتا ہے ۔ یہ کہ انفاق فی سبیل اللہ بہت اہم ہے ' یہ کہ مال و اولاد اسلامی انقلاب کی راہ میں رکاوٹ ہیں ۔ یہ مضامین اکثر مدنی دور کے ہیں اور بار بار آتے ہیں کیونکہ مدینہ ہی میں نئی اٹھنے والی امت مسلمہ کو ان باتوں کی ضرورت تھی ۔ پھر ان آیات میں ان ذمہ داریوں کا بھی ذکر ہے جو مومنین کے کاندھوں پر پڑ گئے ہیں ۔ معاملات کو اللہ کے بھروسے پر چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے اور مسئلہ تقدیر کو ذہنوں میں بٹھانے کی سعی کی گئی ہے ۔ یہ مضامین جہاد کے راستے میں رکاوٹوں کے حوالے سے مدنی سورتوں میں بکثرت آتے ہیں ۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور بعض میں آتا ہے کہ یہ مدنی ہے اور اس کے مدنی ہونے کو ترجیح بھی دی گئی ہے ۔ قریب تھا کہ میں اس کے مکی ہونے کی طرف مائل ہو جاتا کیونکہ اس کے ابتدائی پیراگراف خالص مکی انداز کے ہیں ۔ لیکن آخر کار میری رائے یہی بنی کہ یہ مدنی سورت ہے ۔ اور یہی راجح رائے ہے ۔ کیونکہ ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی مکہ ہی جیسے حالات تھے ۔ اور مدینہ سے لئل مکہ کو بھی خطاب ہو رہا تھا ۔ اور مدینہ کے ارد گرد جو مشرک قبائل تھے ' ان سے بھی خطاب ہو رہا تھا ۔ نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ مدینہ میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں کوئی ایسی بحث نہ تھی جس میں خالص نظریاتی اور دعوتی پہلو ہو ۔ مدینہ میں بھی ایسے لوگ تھے جن کے سامنے خالص مکی انداز میں دعوت اسلامی کے پیش کرنے کی ضرورت تھی ۔

اس سورت کے پہلے پیراگراف میں ایمانی تصورات کے آفاقی پہلو کو لیا گیا ہے یہ کہ یہ پوری کائنات اللہ کی تخلیق ہے اور اس میں اسی کی بادشاہت ہے اور وہ اس کے ساتھ ہر وقت رابطہ رکھتا ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ کے بعض اسماء حسنیٰ اور بعض صفات کا اس کائنات میں موثر ظہور ہوتا ہے ۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (١) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (٢) خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (٣) يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (٤) (٦٤: ١ تا ٤) "اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور پھر تم سے کوئی کافر ہوئے اور کوئی مومن ہوئے اور اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ اس نے زمین و آسمان کو برحق پیدا کیا اور تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی ہے اور اسی کی طرف آخر کار تمہیں پلٹنا ہے۔ زمین و آسمان کی ہر چیز کا اسے علم ہے' جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو' سب اس کو معلوم ہے۔ اور وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے"۔

ایمان کا یہ کائناتی اور آفاقی تصور اس قدر دقیق اور اس قدر وسیع اور جامع و مانع ہے کہ ایمان کی تاریخ میں اسلام جیسا جامع تصور نہیں دیکھا گیا۔ اسلام کا تصور یہ ہے کہ تمام رسالتوں کا عقیدہ یہی عقیدۂ توحید رہا ہے۔ اور یہ عقیدہ ہر امت کے ہاں رہا ہے۔ کہ اس کائنات کو اللہ نے پیدا کیا اور تمام مخلوق کو اللہ ہی نے پیدا کیا اور اللہ اس پوری مخلوقات کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے اور قرآن نے تمام رسولوں کا یہی عقیدہ نقل کیا ہے اور ان باتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جو تحریف شدہ کتب سماوی میں پائی جاتی ہیں' یا وہ لوگ جو ان ادیان کے بارے میں کتابیں لکھتے ہیں اور ان کا قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ نہ پورے قرآن پر اور نہ قرآن کے بعض حصوں پر۔ کتب سماوی میں ایمانی عقائد میں جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ بعد کے ادوار میں ان کتب کے ماننے والوں نے ان میں پیدا کیں۔ بعد کے ادوار کی تحریفات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں میں خالص توحید نہ تھی یا یہ کہ تخلیق کائنات کے بعد اللہ اس کائنات میں متصرف اور اس کا مدبر نہیں رہا ہے۔ تو یہ بعد کے ادوار کی تحریفات ہیں۔ کیونکہ اللہ کا دین آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزمان تک ایک رہا ہے۔ اس لیے کہ تمام ادیان اللہ کی طرف سے ہیں تو پھر ان تحریف شدہ کتابوں میں جو تصورات ہیں یا ان پر لکھے جانے والے تبصروں میں جو تصورات ہیں' ان کا تعلق خدا تعالیٰ کے دین سے نہیں ہو سکتا اور نہ ایسے متضاد تصورات اللہ کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں۔

یہ اس حقیقت کے باوجود کہ تمام رسالتوں کے اندر ذات باری کے بارے میں بنیادی تصور ایک ہی رہا ہے لیکن اس کے باوجود یہ کہنا کوئی غلط بات نہ ہو گی کہ اسلام نے ذات الٰہی کا جو تصور پیش کیا اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں جو عقائد وضع کیے ہیں' وہ تمام سابق امتوں کے تصور سے زیادہ لطیف' زیادہ وسیع' زیادہ شامل زیادہ کامل اور جامع و مانع ہیں۔ یہ ایسا تصور ہے جس میں ذات باری اپنی مخلوق اور کائنات کے ساتھ زندہ اور فعال تعلق رکھتی ہے۔ اور اس

کی صفات اس پوری کائنات میں کام کرتی ہیں اور یہ بات اس حقیقت سے بھی موافق ہے کہ اسلامی رسالت آخری رسالت ہے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا دین آخری دین ہے اور یہ امت آخری امت ہے اور عقلی اعتبار سے ' سن رشد کو پہنچنے والی امت ہے ۔ لہذا اس اعتبار سے اسے کامل 'شامل اور لطیف تصور دیا گیا ہے 'جس کے اندر الہیات کے بارے میں ہر سوال کا جواب موجود ہے ۔ اور عقیدہ توحید کے تمام تقاضوں کی وضاحت بھی موجود ہے اور اس عقیدے کے پورے آثار و نتائج بھی بتائے گئے ہیں ۔

اس تصور کا خلاصہ یہ ہے کہ قلب بشری اپنے ظرف کے مطابق الوہیت کی حقیقت سمجھ لے 'اس کی عظمت اپنے دل میں بٹھالے ۔ اس کو قدرت الہیہ کا شعور ہو اور اس کائنات میں قدرت الہیہ کے آثار کو وہ پالے ۔ اور خود اپنے نفوس کے اندر بھی وہ قدرت کے آثار کو شاہد و مشہود پائے اور وہ ان دیکھے جانے والے 'اور محسوس کیے جانے والے ' آثار قدرت کے درمیان زندگی بسر کرے ۔ اور کسی وقت بھی وہ اس کے احساس سے دور نہ ہوں اور وہ اس بات کو محسوس کرتا ہو اور دیکھتا ہو کہ یہ قدرت اور اس کے آثار ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہیں ۔ ہر چیز کے محافظ ہیں ۔ ہر چیز کے مدبر ہیں ۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے ۔ خواہ وہ حقیر اور عظیم ہو یا بڑی اور چھوٹی ہو ۔

اس تصور کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ انسانی قلب کے اندر تیز احساس پیدا کر دیا جائے 'دائمی خوف 'احتیاط 'خشیت ' طمع اور امید پیدا ہو جائے اور انسان اپنی زندگی میں اللہ کے ساتھ متعلق ہو کر چلے ۔ ہروقت اس کے دل میں قدرت الہیہ کا شعور زندہ ہو 'اللہ کے علم اور اس کی نگرانی کا شعور اسے ہروقت ہو 'اللہ کی قہاری و جباری کا ہروقت احساس ہو 'اللہ کی رحمت و فضل کا وہ ہروقت طلبگار ہو ۔ اور ہر حال اور ہروقت وہ یہ شعور رکھتا ہو کہ وہ شہ رگ سے بھی قریب ہے ۔

اور پھر اس تصور ایمان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ اس کے مطابق انسان یہ احساس رکھتا ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی مطیع فرمان ہے ۔ اس کے آگے سجدہ ریز ہے ۔ اور اس کے ساتھ یہ مومن بھی اللہ کی طرف متوجہ ہے ۔ دونوں اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں ۔ دونوں اس کے زیر تدبیر چلتے ہیں ۔ یہ کائنات قانون قدرت کے مطابق اور ہر انسان قانون شریعت کے مطابق ۔ اس معنی میں اسلام کا تصور ایمانی ایک آفاقی اور کائناتی تصور ہے ۔ اسی طرح بعض دوسرے پہلو بھی ہیں کہ اسلام کا تصور ایمان جامع ہے اور قرآن میں جگہ جگہ اس کے بارے میں اشارات ملتے ہیں ۔ اور اس کی بہترین مثال وہ ہے جو سورہ حشر کے آخر میں گزری ہے ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۶۴ تشریح آیات

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۸

آیاتها ۱۸ — سُورَةُ التَّغَابُنِ ۶۴ — مَدَنِيَّةٌ ۱۰۸ — رکوعاتها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ ۫ وَ هُوَ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَ
اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ
صُوَرَكُمْ ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۳﴾ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ
وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴﴾ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْ قَبْلُ ۡ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ
تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّ اسْتَغْنَى
اللّٰهُ ۭ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۶﴾

”اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے ۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا اسے علم ہے ' جو کچھ تم چھپاتے ہو ' اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو ' سب اس کو معلوم ہے ' اور وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے ۔ کیا تمہیں ان لوگوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے اس سے پہلے کفر کیا اور پھر اپنی شامت اعمال کا مزہ چکھ لیا؟ اور آگے ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے ۔ اس انجام کے مستحق وہ اس لیے ہوئے کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی دلیلیں اور نشانیاں لے کر آتے رہے ' مگر

انہوں نے کہا "کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے ؟" اس طرح انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا' تب اللہ بھی ان سے بے پرواہ ہو گیا اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود"۔

زمین اور آسمانوں میں 'جو مخلوق بھی ہے' وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہے ۔ اس کی تسبیح اور تعریف کر رہی ہے ۔ گویا اس پوری کائنات کی روح مومن ہے ۔ اور اس پوری کائنات کا دل مومن ہے ۔ اللہ اس پوری کائنات کا مالک ہے ۔ اور اس کائنات کی ہر چیز میں اس کا شعور بھی ہے ۔ اللہ اپنی ذات میں بھی ستودہ صفات ہے اور اس مخلوقات کے اندر بھی اس کی تعریف اور تمجید ہوتی ہے ۔ اب اگر اس وسیع کائنات کے سمندر میں ایک اکیلا انسان کافر بن جائے اور اس کی روح اور اس کا قلب غافل اور منکر ہو' وہ سرکش اور نافرمان ہو' اللہ کی تسبیح نہ کرے' اس کی طرف متوجہ نہ ہو تو یہ بالکل شاذ ہو گا' اور انوکھا ہو گا' اور عجیب ہو گا اور نمایاں طور پر الگ ہو گا ۔ اس طرح جس طرح کسی کو یہ پوری کائنات دھتکار دے ۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶۴ : ۱) "اور وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ اللہ کی قدرت بے قید اور لامحدود ہے ۔ قلب مومن میں قرآن اس حقیقت کو طبع کرتا ہے ۔ یوں انسان اس حقیقت کو جانتا ہے اور اس کے مدلول سے متاثر ہوتا ہے ۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ قدرت جو چاہے اس کے ساتھ کرے ۔ وہ اپنے آپ کو قدرت کے سپرد کر دیتا ہے کہ قدرت اس معاملات کے اندر جو چاہے تصرف کرے ۔

قدرت الٰہیہ کا یہ جامع تصور کہ یہ ہر شے اس کی تسبیح کرتی ہے' اس کی تعریف کرتی ہے اور اس کی طرف متوجہ ہے' یہ اسلام کے اس عظیم جامع تصور کا ایک اہم پہلو ہے ۔

دوسری چٹکی خود قلب انسانی کے اندر ۔ انسان کا یہ چھوٹا سا دل اس عظیم کائنات کے سمندر کے اندر ہے ۔ یہ پوری کائنات تسبیح الٰہی اور حمد الٰہی میں رطب اللسان ہے ۔ یہ چھوٹا سا دل کبھی مومن بن جاتا ہے اور کبھی کافر ۔ اس چھوٹے انسان کا چھوٹا قلب ہی اس کائنات میں ایسا موقف اختیار کرتا ہے ۔ کائنات کی کوئی شے اس کفر میں اس کا ساتھ نہیں دیتی ۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴ : ۲) "وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا' پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن"۔ یہ انسان اللہ کی قدرت اور اللہ کے ارادے سے وجود میں آیا ہے ۔ اور یہ اللہ ہی ہے جس نے انسان کے اندر کفر کے رجحان کے امکانیات اور ایمان کے رجحان کے امکانیات رکھے ۔ اس حضرت انسان کے اندر مختلف الجہات استعدادیں بیک وقت ودیعت کر دیں اور پھر اللہ نے اسے نیک و بد کی تمیز بھی عطا کی ۔ اور اسی استعداد کے مطابق اس انسان کے اندر ایمان پیدا ہوا ۔ ایمان اللہ کی طرف سے ایک بڑی امانت ہے اور اس کی بڑی ذمہ داریاں ہیں ۔ اس کے بعد اللہ نے اسے دین و شریعت بھی عطا کی جس کے مطابق وہ اپنے ایمان اور عمل کو وزن کرتا ہے ۔ یہ دین اس نے رسولوں پر نازل فرمایا اور یوں اللہ تعالیٰ نے انسان کی معاونت کی کہ وہ اس امانت کو اٹھائے اور دوسرے انسانوں کی اس میں داخل ہونے کے لیے مدد دے ۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۶۴ : ۲) "اور اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو"۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ انسان کر کیا رہا ہے ؟ وہ انسانوں کی نیت اور رجحان سے واقف ہے لہٰذا انسان کو عمل بھی کرنا چاہئے اور ڈرنا بھی

چاہئے کیونکہ نگران علیم و بصیر ہے، کہیں سویا ہوا نہیں ہے۔

انسان کی حقیقت اور اس جہاں میں اس کے مقام و موقف کے بارے میں یہ تصور، اس کائنات کے بارے میں اسلام کے واضح سیدھے تصور کا ایک حصہ ہے کہ انسان کو یہاں استعداد و اختیار دیا گیا ہے اور وہ اپنے خالق کے سامنے اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور خالق علیم و بصیر ہے۔

اب تیرا نشتر، یہ اشارہ کر رہا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ حق روح کائنات ہے، حق ہی کی وجہ سے یہ کائنات قائم ہے ورنہ یہ ختم ہو جائے اور یہ کائنات اللہ کی ایک بالکل حیران کن تخلیق ہے۔ اور آخر کار سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (٦٤ : ٣) "اس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے، اور تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی ہے، اور اسی کی طرف آخر کار تمہیں پلٹنا ہے"۔

آیت کا پہلا حصہ یہ ہے کہ "اس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا"۔ اس سے ایک مومن کو یہ شعور ملتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اور تدبیر میں حق ایک بنیادی عنصر ہے۔ یہ کوئی عارضی یا غیر ضروری چیز نہیں ہے۔ اس کائنات کی تشکیل ہی حق پر ہے اور جو ذات یہ حقیقت بیان کر رہی ہے وہ وہی ہے جس نے زمین و آسمان اور اس کائنات کو پیدا کیا ہے اور اسے معلوم ہے کہ یہ کائنات کس بنیاد پر قائم ہے۔ کسی شخص کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے تو جب اس کا سچائی پر اعتماد بحال ہوتا ہے تو اس کا اپنے دین پر بھی اعتماد بحال ہوتا ہے۔ کیونکہ دین اسلام بھی حق پر قائم ہے اور دین حق ہے۔ اور یہ کائنات بھی حق پر قائم ہے جو انسان کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہے۔ لہذا حق غالب ہو گا۔ حق باقی رہے گا اور جب باطل کی جھاگ بیٹھ جائے گی تو حق نمودار ہوتا ہے۔

اور آیت کے آخری حصہ میں ایک دوسری حقیقت بیان کی گئی ہے۔

وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (٦٤ : ٣) "اور اس نے تمہاری صورت بنائی اور بہت عمدہ بنائی"۔ انسان کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک تم مکرم ہو اور اللہ نے تمہیں بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔ تمہاری اخلاقی تصویر بھی اچھی ہے اور تمہاری شعوری تصویر بھی اچھی ہے اور پیدائشی تصویر بھی بہت حسین ہے۔ انسان اپنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے بھی زندہ اشیاء سے زیادہ مکمل جسم کا مالک ہے۔ اور روحانی، و شعوری اور قابلیتوں کے لحاظ سے بھی وہ مکمل ہے، یہی وجہ ہے کہ زمین پر خلافت کا منصب انسان کو دیا گیا ہے اور انسان کے لحاظ سے اس وسیع جگہ یعنی زمین پر اسے بسایا گیا ہے۔

اگر انسان کی جسمانی ساخت اور اس کے نقشے پر ذرا گہری نظر ڈالی جائے یا انسانی جسم کے نظام کے کسی بھی حصے پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔

وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (٦٤ : ٣) "اس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی"۔

یہ ایک ایسا نقشہ ہے جس کے اندر کمال و جمال دونوں پائے جاتے ہیں اور پھر ہر انسان کے اندر خوبصورتی میں تفاوت ہے لیکن جہاں تک مجموعی نقشے کا تعلق ہے وہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ اور کامل ہے اور انسانی ضروریات تمام زندہ چیزوں کی ضروریات کے مقابلے میں بطریق احسن پوری کرتا ہے۔

وَ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ (۶۴ : ۳) "اور اسی کی طرف آخر کار تمہیں پلٹنا ہے"۔ ہر چیز کا انجام ' ہر مخلوق کا مرجع اور ہر معاملے کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس پوری کائنات کا مرجع بھی وہ ہے۔ اس انسان کے لوٹنے کی جگہ بھی وہ ہے۔ اللہ کے ارادے ہی سے ان چیزوں نے وجود پایا۔ اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ پیدائش بھی اس سے حاصل کی اور فنا اور انجام بھی اسی کی طرف ہے۔ وہی اول ہے اور وہی آخر ہے ' ہر چیز پر محیط ہے۔ آغاز بھی وہ اور انجام بھی وہ اور وہ لامحدود ہے۔

---ooo---

اور چوتھا تیز احساس جو اس آیت میں دیا گیا ہے ' وہ ہے اللہ کے جامع اور شامل اور محیط علم کی ایک ایسی تصویر ' جو انسان کے خفیہ رازوں کو جاننے والا ہے ' راز سے بھی خفیہ چیز ' جو دل میں آتی ہے ' جسے "ذات الصدور" کہتے ہیں ' جن کی گرفت میں دل ہوتا ہے ' انہیں بھی جانتا ہے۔

یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ یَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۶۴ : ۴) "زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا اسے علم ہے ' جو کچھ تم چھپاتے ہو ' اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو ' سب اس کو معلوم ہے ' اور وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے"۔

اس حقیقت کا ایک مومن کے دل میں بیٹھنا ' اسے معرفت رب عطا کرتا ہے۔ اس طرح اپنے رب کی معرفت حاصل ہونے کے بعد اس کے آفاقی اور کائناتی ایمان کا یہ پہلو بہت مضبوط ہو جاتا ہے۔ وہ یہ شعور رکھتا ہے کہ وہ اللہ کی نظروں میں ہے۔ کوئی ایسا راز نہیں ہے جو اس پر مخفی ہو۔ اس کے ضمیر میں کوئی گہری سوچ بھی ایسی نہیں ہے جس سے اللہ باخبر نہ ہو۔

یہ تین آیات ہی انسان کے لیے اس قدر رہنمائی فراہم کر دیتی ہیں کہ انسان اپنی حقیقت کو سمجھے ' اس کائنات کو سمجھے اور اس کائنات اور اپنے خالق کی ساتھ اپنا تعلق جوڑے۔ اللہ سے ڈرے۔ ہر حرکت اور ہر رخ میں۔

اب ہم آتے ہیں اس سورت کے دوسرے پیراگراف کی طرف۔ اس میں ان اقوام ماضیہ کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔ جن کا بڑا اعتراض یہ تھا کہ ایک بشر کو کس طرح رسول بنایا گیا؟ مشرکین مکہ بھی یہی سوال دہراتے تھے اور اسی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیمات کی تکذیب کرتے تھے۔

اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَ بَالَ اَمْرِهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۶۴ : ۵) ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِیْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالُوْۤا اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّ اسْتَغْنَى اللّٰهُ وَ اللّٰهُ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (۶۴ : ۶) (۶۴ : ۵ – ۶) "کیا تمہیں ان لوگوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی

جنہوں نے اس سے پہلے کفر کیا اور پھر اپنی شامت اعمال کا مزہ چکھ لیا؟ اور آگے ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اس انجام کے مستحق وہ اس لیے ہوئے کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی دلیلیں اور نشانیاں لے کر آتے رہے' مگر انہوں نے کہا "کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟" اس طرح انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا' تب اللہ بھی ان سے بے پرواہ ہوگیا اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود"۔

یہ خطاب تمام مشرکین کو ہے کہ اس سے قبل جن لوگوں نے تکذیب کی ان کا جو انجام ہوا' اس پر ذرا غور کر لو۔ استفہام تو کبھی اس لیے ہوتا ہے کہ اقوام سابقہ کے حالات ان مشرکین کو بتا دیئے جانے کے بعد بھی یہ کفر کرتے ہیں تو ان کا یہ رویہ قابل مذمت ہے اور کبھی اس لیے ہوتا ہے کہ دیکھو اور اس طرح توجہ کرو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کا انجام یوں بھی ہوتا ہے (یعنی مذمت اور توجہ مبذول کرانے کے لیے) یہ لوگ تو امم سابقہ کے احوال سے واقف تھے' قصے ان کے ہاں مشہور تھے۔ مثلاً عاد' ثمود اور لوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں تو عرب واقف تھے۔ ان کھنڈرات پر سے وہ گزرتے تھے جب وہ شمال اور جنوب کے سفروں پر جاتے تھے۔

دنیا میں ان کا جو انجام ہوا وہ تو زبان زد عام ہے' قرآن اس پر یہ اضافہ کرتا ہے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (٦٤ : ٥) "اور آگے ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے"۔ یہ آخرت کا عذاب ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا (٦٤ : ٦) "اس انجام کے مستحق وہ اس لیے ہوئے کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی دلیلیں اور نشانیاں لے کر آتے رہے' مگر انہوں نے کہا "کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟" اور یہ وہی اعتراض تھا جو مشرکین مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے۔ یہ بہت ہی گرا پڑا اعتراض ہے اور خالص جہالت پر مبنی ہے۔ یہ لوگ منصب رسالت کو سمجھے ہی نہیں اور اس بات کو سمجھے ہی نہیں کہ رسول اور رسالت نے انسانوں کے سامنے اللہ کی شریعت اور نظام پیش کرنا ہوتا ہے' لہٰذا ضروری ہے کہ اس نظام کو ایک بشر اپنے اوپر نافذ کر کے لوگوں کو دکھائے۔ یوں رسول کا بشر ہونا انوکھا نہیں بلکہ ضروری تھا۔ یہ رسول ہی ہوتا ہے جو اسلامی شریعت اور قانون پر عمل کر کے دکھاتا ہے' اگر رسول اور لوگوں کی جنس ہی الگ ہو تو لوگ رسالت کی ایک عملی صورت سے محروم ہو جائیں گے اور ان کے لیے یہ ممکن ہی نہ ہوگا کہ اس کی اطاعت کریں۔ اپنی ذات' اپنے اخلاق اور اپنی انداز معیشت میں۔ پھر ان کی یہ رائے خود انسان کی حقیقت سے جہالت پر مبنی ہے کہ اللہ نے انسان کو یہ صلاحیت عطا کی کہ وہ عالم علوی سے ہدایت اخذ کرنے کے قابل ہو' اور اس کے لئے کسی فرشتے کو رسول بنانے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ انسان کے اندر تو اللہ کی روح پھونکی ہوئی ہے اور انسان کی اسی روحانیت کی وجہ سے وہ اللہ سے براہ راست رسالت اخذ کرتا ہے۔ اور اس کے فرائض اللہ کی منشا کے مطابق ادا کرتا ہے۔ یہ انسانوں کے لیے ایک ایسا اعزاز ہے جس سے انکار کوئی جاہل ہی کر سکتا ہے جس کو انسان کے مقام و مرتبہ کا علم نہ ہو۔ اگر کوئی جاہل نہیں ہے تو پھر وہ متکبر اور مغرور ہے۔ اور اپنے کبر و غرور کی وجہ سے رسول اللہ کی اطاعت نہیں کرتا۔ گویا یہ اعتراض کرنے والے یا جاہل ہیں یا متکبر ہیں اور نظرانداز کرنے کے قابل ہیں۔ ان کے نزدیک یہ تو جائز ہے کہ جنس انسان کے علاوہ کوئی جنس فرشتے وغیرہ آئیں تو ان کی

رسالت کو تو یہ ماننے کے لیے تیار ہیں مگر اپنے میں سے ایک انسان کو یہ رسول ماننے کے لیے تیار نہیں۔

صرف یہی وجہ ہے جس کی بنا پر تاریخ میں لوگوں نے رسولوں کا انکار کیا' حالانکہ ان کے ساتھ دلائل و معجزات تھے' اور اعلیٰ تعلیمات تھیں۔ اس جہالت اور کبر کی وجہ سے لوگوں نے کفر و شرک تو اختیار کیا مگر رسالتوں کا انکار کرتے رہے۔

وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (٦٤: ٦) "تب اللہ بھی ان سے بے پرواہ ہو گیا اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود"۔ اللہ ان کے ایمان اور ان کی اطاعت سے مستغنی ہو گیا۔ اللہ کو ان چیزوں کی ضرورت کیا ہے۔ اللہ تو ان چیزوں کا اصلا محتاج ہی نہیں ہے' وہ غنی ہے اور اپنی ذات ہی میں محمود ہے۔ یہ تو تھے وہ لوگ جنہوں نے کفر و شرک کیا اور اپنے اس فعل کے انجام تک پہنچ گئے اور سبب صرف جہل اور کبر تھا۔ اب مشرکین مکہ اور مدینہ کس وجہ سے کفر اور شرک پر اصرار کر رہے ہیں۔ کیا یہ بھی اسی انجام کو پہنچنے کے خواہش مند ہیں۔

تیسرا پیراگراف دوسرے پیراگراف کا تتمہ ہے کہ رسالت پر اعتراض کے ساتھ یہ لوگ بعث بعد الموت کے بھی منکر ہیں۔ یہ لوگ مکہ اور مدینہ کے مشرک تھے' جن کے سامنے رسول اللہ کی دعوت پیش کی جا رہی تھی۔ اس پیراگراف میں رسول اللہ کو ہدایت فرمائی جاتی ہے کہ آپ بطور تاکید مزید ان تک یہ بات پہنچا دیں کہ مزاح نہ سمجھو تم نے ایک دن اٹھنا ہے۔ پھر اس دن کا ایک منظر بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں مکذبین اور مصدقین کا انجام بتایا جاتا ہے۔ آخر میں ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ ایمان لاؤ اور ہر معاملے میں رسول کی اطاعت کرو اور ہر معاملے کو اللہ کے سپرد کر دو۔

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ
لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝٧ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ
رَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝٨ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ
لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ
عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝٩ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ
ع ۱۰ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝١٠ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَ
15 مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝١١ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا
الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝١٢ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝١٣

"منکرین نے بڑے دعوے سے کہا ہے کہ وہ مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے ۔ ان سے کہو "نہیں ' میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے ' پھر ضرور تمہیں بتایا جائے گا کہ تم نے (دنیا میں) کیا کچھ کیا ہے ' اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے ۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر ' اور اس کے رسول ؐ پر ' اور اس روشنی پر جو ہم نے نازل کی ہے ۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے ۔ (اس کا پتہ تمہیں اس روز چل جائے گا) جب اجتماع کے دن وہ تم سب کو اکٹھا کرے گا ۔ وہ دن ہو گا ایک دوسرے کے مقابلے میں لوگوں کی ہار جیت کا ' جو اللہ پر ایمان لایا ہے اور نیک عمل کرتا ہے ' اللہ اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ۔ یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے ۔ یہی بڑی کامیابی ہے ۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے ۔ وہ دوزخ کے باشندے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گی اور وہ بدترین ٹھکانا ہے ۔ کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن ہی سے آتی ہے ۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو ' اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے ' اللہ کو ہر چیز کا علم ہے ۔ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ؐ کی اطاعت کرو لیکن اگر تم اطاعت سے منہ موڑتے ہو تو ہمارے رسول پر صاف صاف حق پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے ۔ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ' لہٰذا ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے ۔"

مشرکین اور کافرین کے اس قول کو کہ ہمیں دوبارہ نہ اٹھایا جائے گا ' آغاز ہی سے زعم باطل کہا اور یہ بتا دیا کہ یہ سفید جھوٹ ہے ۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا جاتا کہ آپ ان سے سخت ترین الفاظ میں کہہ دیں کہ تمہیں اٹھایا جائے گا ۔ اور اس تاکید کو اپنے رب کے نام سے حلف اٹھا کر مزید موکد کر دیں ۔ آخر رسول جب اپنے رب کے نام کی قسم اٹھا کر کوئی بات کرے تو اس سے مزید تاکید اور کیا ہو سکتی ہے ۔

قُلْ بَلٰی وَ رَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ (۶۴ : ۷) "ان سے کہو میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے" ۔ اور نہ صرف یہ کہ اٹھائے جاؤ گے بلکہ ۔

ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ (۶۴ : ۷) "پھر تمہیں بتایا جائے گا کہ تم نے کیا کچھ کیا ہے" ۔ اس میں سے کوئی چیز بھی چھوٹی ہوئی نہ ہو گی ۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہو گا ' اس لیے وہ قیامت کے دن بتا دے گا ۔

وَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ (۶۴ : ۷) "اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے" ۔ وہ زمین و آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے ' وہ ظاہری اور خفیہ سب چیزوں کو جانتا ہے ۔ وہ ان رازوں سے واقف ہے جو دلوں کے راز ہیں ۔ اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے جیسا کہ سورت کے آغاز میں بطور تمہید یہ فقرہ آیا ۔

ان تاکیدوں کی روشنی میں ان کو دعوت دی جاتی ہے ' کہ اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ نے رسول پر جو تعلیمات اتاری ہیں ان کو تسلیم کرو ' وہ تو نری روشنی ہے ۔ یہ قرآن دراصل علم کی روشنی ہے ' اور قرآن جو دین و شریعت پیش کرتا ہے ' وہ بھی روشنی ہے ۔ یہ تعلیم اپنی حقیقت میں نور ہیں ' کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ نور السموات والارض ہے ۔ پھر یہ تعلیمات اپنے آثار کے اعتبار سے بھی نور ہیں ۔ اور اپنی ذات کے لحاظ سے بھی نور ہیں ۔ اس روشنی میں انسان اپنی حقیقت پا لیتا ہے اور اس جہاں کے حقائق کو اس کائنات کے حقائق سے دیکھتا ہے ۔

دعوت ایمان دینے کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کا سب کچھ اللہ پر ظاہر ہے ۔ اس سے کوئی شے مخفی نہیں رہی ۔

بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (۶۴ : ۸) "اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔
اس کے بتایا جاتا ہے کہ ذرا دیکھو جس بعث بعد الموت کی تیاری کی تمہیں دعوت دی جاتی ہے ۔ وہ کیسی ہوگی؟

یَوْمَ یَجْمَعُکُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ (۶۴ : ۹) "جب اجتماع کے دن وہ تمہیں اکٹھا کرے گا ۔ وہ دن ہوگا ایک دوسرے کے مقابلے میں لوگوں کی ہار جیت کا"۔ یوم الجمع تو اس لیے ہوگا کہ تمام اگلے پچھلے انسانوں کو اس دن جمع کیا جائے گا ۔ اور تمام ملائکہ کو بھی اس دن حاضر کیا جائے گا ۔ اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گی ۔ انسانی تصور کے قریب کرنے کے لیے حدیث میں آتا ہے ۔ حضرت ابوذر سے روایت ہے ۔ فرماتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :"میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو کچھ تم نہیں دیکھ رہے ۔ اور میں وہ کچھ سن رہا ہوں جو تم نہیں سن سکتے ۔ آسمان بوجھ کی وجہ سے چرچرایا اور اس کا حق ہے کہ وہ چرچرائے ۔ کیونکہ آسمان میں چار انگلیوں کی جگہ بھی نہ ہوگی جہاں ایک فرشتہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز نہ ہو ۔ خدا کی قسم اگر تم وہ کچھ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم بہت کم ہنستے اور روتے ہی رہتے ۔ اور تم اپنے بستروں پر اپنی بیویوں سے لذت اندوز نہ ہوتے اور تم اونچے مقامات پر چڑھ کر ' اللہ کے سامنے روتے کہ اے اللہ ' کاش میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ لیا جاتا"۔ (ترمذی)

آسمان جہاں چار انگلیوں کی جگہ پر بھی ایک فرشتہ سجدہ ریز ہوگا ' کس قدر وسیع ہے؟ یہ ناقابل تصور وسیع فضا ہے ۔ انسان نے ابھی تک اس کی حدود کو معلوم نہیں کیا؟ اور اس میں ہمارے سورج جیسے کئی سورج اس طرح ہیں جس طرح ایک ذرہ فضا میں اڑ رہا ہے ۔ تو کیا اس سے یہ بات انسانی تصور کے قریب ہوگئی کہ یوم الجمع یعنی قیامت کے دن کس قدر فرشتے جمع ہوں گے؟

اس عظیم اجتماع میں تغابن ہوگا ۔ یہ غبن سے باب مغالطہ سے ہے ۔ یہ ایک تصویر ہے کہ مومنین کس قدر کامیاب ہوں گے اور کافرین کس قدر محروم ہوں گے ۔ یہ جہنم میں جاکر ہر چیز سے محروم ہو جائیں گے اور مومنین جنت میں جاکر سب کچھ پالیں گے ۔ دونوں کا نصیب بہت ہی مختلف ہے ۔ یوں کہ گویا کامیابی کا ایک مقابلہ منعقد ہے اور ایک طرف ہر قسم کی کامیابی ہے اور دوسری طرف ہر قسم کی ناکامی ہے اور ہر فریق اپنے مقابل کو غبن کر رہا ہے ۔ اس مقابلے میں مومن کامیاب ہوئے اور انہوں نے سب کچھ جیت لیا اور کافر ہار گئے اور سب کچھ ہار گئے ۔ اس معنی میں یہ یوم التغابن ہے اور اس کی تفسیر یہ آیات کر رہی ہیں :

وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّکَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَیُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۹) وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ (۱۰) (۶۴ : ۹ — ۱۰) "جو اللہ پر ایمان لایا ہے اور نیک عمل کرتا ہے ' اللہ اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے

نیچے نہریں بہتی ہوں گی ۔ یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے ۔ یہی بڑی کامیابی ہے ۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے ۔ وہ دوزخ کے باشندے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گی اور وہ بدترین ٹھکانا ہے"۔

اس سے قبل کہ ان کو ایمان کی طرف بلایا جائے ۔ ایمان کا ایک بنیادی قاعدہ یہاں متعین کر دیا جاتا ہے یعنی ایمان اللہ اور بالرسالت کے بعد۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَه وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ

عَلِيْمٌ (۶۴ : ۱۱) کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن ہی سے آتی ہے ۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو ' اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے ' اللہ کو ہر چیز کا علم ہے"۔ اس پیراگراف میں چونکہ لوگوں کو ایمان کی طرف بلایا گیا تھا ' اس لیے اس کے ساتھ اس حقیقت کا ذکر بھی مناسب سمجھا گیا کیونکہ یہ ایمان کے متعلق امور میں سے ہے کہ انسان ہر چیز کو اللہ کی طرف لوٹا دے ۔ اور یہ عقیدہ رکھے کہ خیر و شر اللہ کی طرف سے ہے ۔ یہ ایمان کی تفصیلات ہیں اور ان کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ عملی زندگی میں اس عقیدے کے سوا ایمانی شعور کا تصور نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آیات کے نزول کے وقت کوئی ایسی صورت حال بھی ہو جس میں لوگوں کو یہ تسلی دی گئی کہ خیر و شر اللہ کی طرف سے ہے مثلاً مومنین اور مشرکین کے درمیان کوئی خاص واقعہ اس سورت اور اس واقعہ کے نزول کے وقت ہو۔

بہرحال یہ بات کہ نفع و نقصان اللہ ہی کی طرف سے ہے ۔ ایمان کا بہت ہی اہم پہلو ہے ۔ اس طرح اللہ پر ایمان لانے والے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جو کچھ پیش آتا ہے اللہ کی طرف سے ہے ۔ ہر حرکت اور حادثہ سے بھی اللہ کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ اور مومن کو جو خوشی یا غم پیش آتا ہے وہ اس پر مطمئن ہوتا ہے ۔ غم پر صبر کرتا ہے اور خوشی کا شکر ادا کرتا ہے اور کبھی کبھار تو بعض مومنین اس سے بھی اوپر چلے جاتے ہیں ۔ وہ خوشی اور غم دونوں میں شکر ادا کرتے ہیں اور ہر حال کو ' وہ اللہ کا فضل سمجھتے ہیں ' یوں کہ غم میں ان کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور حسنات میں اضافہ ہوتا ہے ۔

متفق علیہ حدیث ہے ۔ مومنین کے مزے ہیں کہ اللہ جو فیصلہ کرتا ہے ان کے لیے اس میں خیر ہی ہوتی ہے ۔ اگر مصیبت آئے تو وہ صبر کرتے ہیں تو ان کو ثواب ملتا ہے ۔ اور اگر ان کو خوشی ملے تو شکر کرتے ہیں تو بھی اس کے لیے خیر ہوتی ہے اور یہ صرف مومنین کے لیے ہے"۔

وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۶۴ : ۱۱) "اللہ کو ہر چیز کا علم ہے"۔ یہ تعقیب اسی لیے آئی کہ اللہ کا علم کلی ہے اور اس شخص کو بھی اس قسم کی کلی ہدایت مل جاتی ہے ۔ اور یہ علم ' اللہ اس کو دیتا ہے جس کو وہ ہدایت کرنا چاہے ۔ جب کسی کا ایمان صحیح ہوتا ہے تو اس کے سامنے سے کئی پردے اٹھ جاتے ہیں اور کئی اسرار اس پر وا شگاف ہو جاتے ہیں ۔ ایک مقدار کے مطابق ۔

آگے دعوت ایمان کے سلسلے میں ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو ۔

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۶۴ : ۱۲)

"اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو' لیکن اگر تم اطاعت سے منہ موڑتے ہو' تو ہمارے رسول پر صاف صاف حق پہنچا دینے کی ذمہ داری کے سوا کچھ ذمہ داری نہیں ہے"۔ اس سے قبل ان کو لوگوں کا انجام بتایا جا چکا ہے جو منہ موڑتے ہیں۔ یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ رسول کا کام تبلیغ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے بات پہنچا دی تو وہ اپنے فریضے سے سبکدوش ہو گیا۔ اور اس طرح لوگوں پر حجت تمام ہو گئی اور اب لوگ اس معصیت اور منہ موڑنے کے انجام کا انتظار کریں جو انہیں ابھی ابھی سنا دیا گیا ہے۔

اس کے بعد یہ پیراگراف عقیدہ توحید کی قرار داد پر ختم ہوتا ہے جس کا وہ انکار کرتے تھے اور تکذیب کرتے تھے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے مومنین کا تعلق اللہ کے ساتھ کیسا ہوتا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (٦٤ : ١٣) "اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں اور ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے"۔

توحید کی حقیقت ہی ایمان کی اساس ہے۔ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کو صرف اللہ پر بھروسہ ہو' صرف اللہ پر بھروسہ کرنا صحیح عقیدہ توحید کے اثرات میں سے ایک اثر ہے جو دل میں موجود ہوتا ہے۔ اس دعوت ایمان سے آگے پھر اہل ایمان کو خطاب شروع ہوتا ہے۔ گویا یہ آیت پچھلے پیراگراف اور آنے والے کے درمیان پل کا کام دے رہی ہے۔

---○○○---

اب مومنین کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ بیویاں' اولاد اور مال ایک بہت بڑا فتنہ اور آزمائش ہوتے ہیں۔ اور اس آزمائش میں کامیاب وہی ہو سکتا ہے جو خدا کا خوف رکھتا ہو۔ سمع' طاعت اور انفاق ہی کے ذریعہ انسان ان فتنوں پر قابو پا سکتا ہے اور مومنین کو نفسیاتی کنجوسی سے بھی متنبہ کیا جاتا ہے اور سخاوت اور انفاق کے بدلے میں اجر' مغفرت اور فلاح اخروی کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے۔ اس کی قدرت غالب ہے۔ اور وہ زبردست حکیم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ
عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَ اِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۞ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۞ فَاتَّقُوا اللّٰهَ
مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ
نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَ يَغْفِرْ ٢
لَكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۞ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞ ع ٨
١٦

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' ان سے ہوشیار

رہو۔ اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و رحیم ہے۔ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں' اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے۔ لہٰذا جہاں تک تمہارے بس میں ہو' اللہ سے ڈرتے رہو' اور سنو اور اطاعت کرو' اور اپنے مال خرچ کرو' یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے۔ جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اگر تم اللہ کو قرض حسن دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا' اللہ بڑا قدر دان اور بردبار ہے' حاضر اور غائب ہر چیز کو جانتا ہے' زبردست اور دانا ہے"۔

ان آیات کے بارے میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ پہلی آیت کے بارے میں ان سے کسی نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ مکہ کے کچھ لوگ تھے جو اسلام لے آئے تھے۔ انہوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ ہجرت کر کے رسول اللہ کے پاس آ جائیں' لیکن ان کی بیویوں اور ان کی اولاد نے' اس سے انکار کر دیا۔ اور ان کو نہ چھوڑا۔ پھر بعد میں جب وہ رسول اللہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ لوگ تعلیم دین کے میدان میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ تو انہوں نے ارادہ کر لیا کہ ان بیویوں اور اولاد کو سزا دیں۔ اللہ نے یہ آیت نازل کی :

وَ اِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٦٤:١٤) "اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و رحیم ہے"۔ امام ترمذی نے اسے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اسناد حسن صحیح ہے۔ یہی عکرمہ مولی ابن عباس کی رائے ہے۔ لیکن آیت کی عبارت اور نص عام ہے۔ اور اس جزئی واقعہ تک اس کے مفہوم کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تنبیہ بھی اس طرح ہے جس طرح اگلی آیت میں مال اور اولاد سے متنبہ کیا گیا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (٦٤:١٥) "تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں"۔ تنبیہ یہ ہے کہ بعض اوقات مال اور اولاد دشمن بن جاتے ہیں۔ یہ بات انسانی زندگی کی ایک نہایت ہی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ زندگی کے اندر بعض اوقات روابط اور تعلقات اس قدر متنوع اور مختلف سمتوں سے دامن کش ہوتے ہیں کہ انسان آزمائش میں پڑ جاتا ہے۔ ازواج اور اولاد بھی انسان کو ذکر الٰہی سے غافل کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ ایمان کے مشکل ترین تقاضے پورے کرنے کی راہ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً فریضہ جہاد فی سبیل اللہ میں دنیاوی نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ انسان اور اس کی اولاد اور اہل خاندان تشدد کا شکار ہوتے ہیں۔ بعض اوقات انسان اپنی ذات پر سختی برداشت کر سکتا ہے لیکن بیوی بچوں پر سختیاں اور تشدد برداشت نہیں کر سکتا۔ یوں انسان جدوجہد اور جہاد میں بزدلی اختیار کرتا ہے کہ بچوں اور بیوی کے آرام اور آسائشوں میں خلل نہ ہو۔ اور وہ اس کے دشمن نہ ہو جائیں اور یوں دراصل وہ دشمن ہو جاتے ہیں اور اسے راہ راست سے روک دیتے ہیں۔ یوں ایک مومن اعلیٰ مقاصد اور بلند مراتب کے حصول سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ بعض اوقات تو ازواج و اولاد ٹھیک کھڑے ہو کر راہ روک دیتے ہیں اور مومن اپنے فرائض سرانجام دینے سے رک جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ مومن کے نظریاتی مخالف ہوتے ہیں۔ اور مومن کے لیے ان سے صاف صاف قطع تعلق بھی ممکن نہیں ہوتا۔ غرض یہ اور بے شمار دوسری صورتیں اس دشمنی اور آزمائش کی پیش آ سکتی ہیں۔

اس لیے اللہ نے اولاد' بیوی اور مال کے فتنوں اور آزمائشوں کے بارے میں یہاں سختی کے ساتھ متنبہ کیا کہ ان کے

بارے میں مومن کے دل میں ایک احتیاط اور ایک شعور موجود ہو اور اس کا دل بیدار ہو اور برداشت کرنے کی تیاری میں اگر کوئی دباؤ آئے تو وہ مقابلہ کرے۔

اس کے بعد مال اور اولاد کی دشمنی کو ایک دوسرے رنگ میں تکرار کر کے پیش کیا کہ یہ فتنہ بھی ہوتے ہیں۔لفظ فتنہ کے دو معنی ہوتے ہیں :ایک یہ کہ اللہ تمہیں مال اور اولاد کے ذریعہ آزماتا ہے' لہٰذا چوکنے رہو' احتیاط کرو کہ تم اس آزمائش میں پاس ہو جاؤ۔اور خلوص اور تجرد اختیار کرو۔ فتنے کے معنی یہ ہیں کہ سنار سونے کو آگ میں ڈال کر پگھلاتا ہے تاکہ اس سے کھوٹ نکال دے۔یہ عمل فتنہ کہلاتا ہے۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ مال و اولاد خود فتنہ ہیں اور یہ شیطان کے ہتھیار ہیں۔یہ تمہیں دین کی مخالفت اور معصیت میں ڈالتے ہیں۔لہٰذا اس معنی میں دشمن ہیں ان سے بچو کہ وہ تمہیں نقصان نہ پہنچادیں۔یہ دونوں معنی قریب قریب ہیں۔

امام احمد نے روایت کی ہے۔عبداللہ ابن بریدہ سے' انہوں نے ابوبردہ سے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔حسن اور حسین آئے۔انہوں نے سرخ قمیض پہن رکھے تھے۔یہ چلتے تھے اور گرتے پڑتے آ رہے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم منبر سے اترے' ان کو اٹھایا۔اپنے سامنے بٹھایا۔اور پھر فرمایا :"اللہ اور اللہ کے رسول نے سچ کہا کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش ہے۔میں نے دونوں بچوں کو دیکھا کہ چل رہے ہیں اور گرتے پڑتے آرہے ہیں۔مجھ سے نہ رہا گیا' میں نے خطبہ چھوڑ کر ان کو اٹھالیا"۔اصل سنت نے واقعہ سے اسے روایت کیا ہے۔یہ ہیں رسول اور یہ ہیں آپ کے نواسے۔لہٰذا اولاد کا معاملہ بہت ہی نازک اور اہم ہے اور خطرہ ہے اور ان کے بارے میں تنبیہہ ضروری تھی۔اللہ نے اسے ضروری سمجھا اور یہ تنبیہہ کی۔اللہ تعالیٰ' جو لوگوں کا خالق ہے' ان کے جذبات اور شعور کا بھی خالق ہے۔اور یہ جذبات اور میلانات اولاد کے بارے میں اسی نے حضرت انسان میں رکھے ہیں۔اللہ نے ضروری سمجھا کہ لوگ افراط وتفریط سے بچیں اور کہیں ان کی اولاد ان کی ہلاکت کا باعث نہ بن جائے۔اللہ جانتا تھا کہ یہ محبتیں بعض اوقات دشمن سے بھی زیادہ نقصان دے سکتی ہیں۔اور بعض اوقات یہ ایسی سازش کر سکتی ہیں جس طرح ایک گمراہ دشمن چال چلتا ہے۔

انسان کو مال و اولاد کے فتنے سے ڈرا کر' اور ان کی جانب سے نہایت ہی گہری دشمنی سے خبردار کر کے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فتنہ ہیں۔

وَ اللّٰہُ عِنْدَہٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ (۶۴ : ۱۵) "اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے"۔

اب اہل ایمان کو ان کی طاقت اور استطاعت کے مطابق' اللہ سے ڈرنے اور سمع و اطاعت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِیْعُوْا (۶۴ : ۱۶) "لہٰذا جہاں تک تمہارے بس میں ہو' اللہ سے ڈرتے رہو اور سنو اور اطاعت کرو"۔یہ شرط کہ "جہاں تک تمہارے بس میں ہو"۔یہ اللہ کی طرف سے اپنے بندوں پر بہت بڑا رحم وکرم ہے۔اللہ کو علم ہے کہ بندے کے اندر کتنی طاقت ہے۔کس قدر تقویٰ اور اطاعت وہ کر سکتا تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا :"جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو اس کی تعمیل اس حد تک کرو جس حد تک تمہارے بس میں ہو۔لیکن میں جس بات سے منع کر دوں تو پوری طرح رک جاؤ"۔اطاعت امر کی تو حدود نہیں اس

لیے اس میں حکم بقدر استطاعت ہے ۔رہی نہی تو اس پر پورا پورا عمل کرنا ہو گا' بغیر نقصان کے اور بغیر کمی کے ۔

اس کے بعد ان کو انفاق فی سبیل اللہ پر آمادہ کیا جاتا ہے ۔

وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ (٦٤ : ١٦) "اور اپنے مال خرچ کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے"۔ یہ جو کوئی خرچ کرتا ہے تو یہ دراصل اپنے لیے کرتا ہے ۔وہ حکم دیتا ہے کہ اس کام کو اپنے لیے کرو 'گویا وہ خود اپنے اوپر خرچ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا تمہیں اجر ملے گا۔ گویا یہ بھی تم اپنے اوپر خرچ کرتے ہو۔

اب اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو بتاتا ہے کہ انفاق کی راہ میں رکاوٹ بخیلی اور دل کی تنگی ہے اور یہ ایک ایسی مصیبت ہے جو انسان کے ساتھ لگی رہتی ہے ۔سعادت مند وہ ہے جو اس بخل سے نجات پا گیا۔اور جو اس سے بچا لیا گیا وہ سمجھ جائے کہ اس پر فضل و کرم ہو گیا ہے اور وہ کامیاب ہو گیا ہے۔ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (٦٤ : ١٦) "اور جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں"۔

اس کے بعد ان کو انفاق اور اللہ کی راہ میں مزید خرچ کرنے پر آمادہ کیا جاتا ہے اور ان کے دلوں میں انفاق کو محبوب بنانے کے لیے' انفاق کو قرض حسن سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔اور قرض حسن بھی ایک غلام سے اس کا آقا مانگ رہا ہے۔ قرض لے کر وہ کئی گنا کر کے دیتا ہے ۔اور قرض دینے والے کا شکر بھی ادا کرتا ہے اور تمہاری کوتاہیوں کو بھی معاف کرتا ہے ۔اور اللہ انسان کی کوتاہیوں کو دیکھ کر بہت ہی حلم سے کام لیتا ہے ۔اس لیے کہ وہ اللہ ہی تو ہے ۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ (٦٤ : ١٧) "اگر تم اللہ کو قرض حسن دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا۔ اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔ اللہ بڑا قدر دان اور بردبار ہے"۔ اللہ بہت ہی برکت والا اور عظیم ہے ۔کتنا بڑا کریم ہے 'کتنا بڑا ہے ۔ وہ بندے کو پیدا کرتا ہے 'اسے رزق دیتا ہے' پھر اس سے قرضہ مانگتا ہے قرض حسن ۔پھر صرف قرض ہی نہیں لوٹاتا بلکہ اسے کئی گنا کر کے لوٹاتا ہے ۔پھر اللہ اپنے بندے کا شکریہ ادا کرتا ہے ۔اور اس کے ساتھ نہایت ہی حلم سے معاملہ کرتا ہے ۔اللہ اور اپنے غلام کا شکر ' یا اللہ یہ تیرا ہی کام ہے !اور ایک عظیم انعام ہے !

اللہ ہمیں اپنی صفات سے آگاہ کرتا ہے کہ ہم اپنے نقائص اور اپنی کمزوریوں پر کس طرح قابو پائیں اور ہم ہمیشہ اللہ کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھیں اور ہم اللہ جل شانہ کی تقلید زمین پر کریں ۔اپنی محدود طاقت کے مطابق ۔اللہ نے فرمایا ہے کہ میں نے انسان کے اندر اپنی روح پھونکی ہے ۔اس روح کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اللہ کی صفات کی تقلید کریں ۔اپنی طاقت کے مطابق کریں ۔انسان کے سامنے یہ بلند آفاق ہر وقت کھلے ہیں کہ یہ جس قدر ان میں بلندیوں تک جا سکتا ہے ' جا سکے ۔ان بلندیوں تک وہ درجہ بدرجہ بلند ہو ۔یہاں تک کہ وہ اللہ تک جب پہنچے تو ایسی حالت میں ہو کہ اللہ اسے پسند کرے ۔اور اس سے راضی ہو۔

اب اس سورت کا خاتمہ ایک ایسی صفت الہی پر ہوتا ہے کہ جس سے ہمارے دلوں کے اندر خوف و تقویٰ پیدا ہوتا ہے ۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (٦٤ : ١٨) "اللہ حاضر اور غائب ہر چیز کو جانتا ہے ' زبردست اور دانا ہے"۔ اس کے علم کے سامنے سب کچھ کھلا ہے ۔ اس کی سلطنت کے سامنے سب کچھ جھکا ہوا ہے ۔ وہ اپنی حکمت سے اس پوری کائنات کی تدبیر کر رہا ہے ۔ یوں کہ لوگ زندہ ہیں اور یوں رہیں کہ اللہ انہیں دیکھ رہا ہے ۔ اس کی مکمل حکومت ان پر نافذ ہے ۔ ہر حاضر اور غائب کو اس کا دست قدرت چلا رہا ہے ۔ جب یہ تصور قلب مومن میں بیٹھ جاتا ہے تو وہ اللہ کے سامنے خلوص اور اطاعت کرتے جاتا ہے ۔ اور اللہ کے احکام کی اطاعت نہایت آمادگی سے کرتا ہے ۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ـــ ۲۸

سورۃ الطلاق ـ ۶۵

۱ ـــ تا ـــ ۱۲

سورۃ الطلاق ایک نظر میں

اس سورت کا نام الطلاق ہے ' اس لیے کہ اس میں طلاق کے احکام ہیں ۔ اس سورت میں طلاق کے احکام کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ۔ سورہ بقرہ میں بھی طلاق کے احکام گزرے ہیں ۔ لیکن یہاں تفصیلات ہیں کہ طلاق کی صورت میں کیا خاندانی احکام ہیں ۔ اس سورت میں وہ وقت بتایا گیا ہے جس میں طلاق واقع ہوتی ہے ' جسے اللہ قبول کرتا ہے اور جو اللہ کے طریقے کے مطابق ہے ۔

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ (۶۵ : ۱) "اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو ان کی عدت کے لیے طلاق دیا کرو"۔

مطلقہ کا یہ حق ہے اور اس پر واجب ہے کہ وہ گھر میں رہے ۔ یعنی جس نے اسے طلاق دی ہے اسی کے گھر میں ' یعنی وہ خود بھی گھر سے نہ نکلے اور اسے نکالا بھی نہ جائے ' الا یہ کہ وہ کھلی فاشی کا ارتکاب کرے ۔

لَا تُخْرِجُوْھُنَّ مِنْ بُیُوْتِھِنَّ وَلَا یَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ (۶۵ : ۱) "نہ تم ان کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ نہ وہ خود نکلیں الا یہ کہ وہ کسی صریح برائی کی مرتکب ہوں"۔

عدت پوری کرنے کے بعد اس کا حق ہے کہ وہ گھر سے چلی جائے اور پھر اپنے بارے میں جو فیصلہ چاہے ' کرے ۔ ہاں اگر خاوند نے دوران عدت رجوع کر لیا ہو اور اسے روک لیا ہو تو پھر وہ حسب سابق بیوی رہے گی لیکن یہ رجوع اس لیے نہ ہو گا کہ اسے ضرر پہنچائے یا اسے اذیت دے اور اسے معلقہ کی طرح رکھے اور بیوی بنا کے نہ رکھے ۔ صرف اس صورت میں رجعت ہو سکتی ہے ' جب وہ معروف طریقے سے اسے رکھنا چاہے ۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَھُنَّ فَاَمْسِکُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (۶۵ : ۲) "پھر جب وہ اپنی عدت کے خاتمہ پر پہنچیں تو یا انہیں بھلے طریقے سے روک رکھو یا بھلے طریقے پر ان سے جدا ہو جاؤ"۔

جو بھی فیصلہ کرو رکھنے کا یا جدا کرنے ' اس پر گواہ ٹھہرالو ۔

وَّاَشْھِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْکُمْ (۶۵ : ۲) "اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنا لو جو تم میں سے صاحب عدل ہوں"۔

سورہ بقرہ میں ہے کہ جن عورتوں کو حیض آتا ہے ان کی عدت تین قروء ہے جس کے معنی فقہی اختلافات کے مطابق تین حیض ہیں یا تین طہر ہیں ۔ یہاں ان عورتوں کی عدت کے احکام ہیں ' جن کو حیض نہیں آتا ۔ یا چھوٹی ہیں ابھی حیض

شروع ہی نہیں ہوا۔

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ (٦٥ : ٤) "اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں یا ان کے معاملہ میں اگر تم لوگوں کو کوئی شک لاحق ہے تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ یہی حکم ان کا ہے جنہیں ابھی حیض نہ آیا ہو"۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (٦٥ : ٤) "اور حاملہ عورتوں کی عدت کی حد یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے"۔

پھر یہ حکم ہے کہ عدت گزارنے والی کہاں عدت گزارے اور جو عورت وضع حمل کا انتظار کر رہی ہے اس کا نفقہ کس کے ذمہ ہے۔

اَسْکِنُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ سَکَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِکُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَیِّقُوْا عَلَیْهِنَّ وَاِنْ کُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَیْهِنَّ حَتّٰی یَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (٦٥ : ٦) "اور ان کو زمانہ عدت میں اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو، جیسی کچھ بھی جگہ تمہیں میسر ہو اور انہیں تنگ کرنے کے لیے ان کو نہ ستاؤ۔ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک ان کا وضع حمل نہ ہو جائے۔

اگر وضع حمل کے بعد بچے کو دودھ پلانا ہے، اور زوجین کے درمیان اتفاق ہو جائے کہ یہی والدہ دودھ پلائے، بچے کی مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے تو اس کا نفقہ یا اتفاق نہ ہو تو کوئی دوسری پلائے۔

فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَکُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَاْتَمِرُوْا بَیْنَکُمْ بِمَعْرُوْفٍ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰی (٦٥ : ٦) "پھر اگر وہ تمہارے لیے دودھ پلائیں تو ان کی اجرت انہیں دو، اور بھلے طریقے سے، باہمی گفت و شنید سے طے کر لو، لیکن اگر تم نے ایک دوسرے کو تنگ کیا تو بچے کو کوئی اور عورت دودھ پلالے گی"۔

اجرت کا معیار کیا ہونا چاہئے۔ تمام حالات میں اجرت خاوند کی مالی استطاعت کے مطابق طے ہونا چاہئے۔

لِیُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَیْهِ رِزْقُهٗ فَلْیُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰهَا (٦٥ : ٧) "خوشحال آدمی اپنی خوشحالی کے مطابق نفقہ دے اور جس کو رزق کم دیا گیا ہو وہ اسی مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اس سے زیادہ کا وہ اسے مکلف نہیں کرتا"۔

یوں ان نصوص کے اندر تمام حالات طلاق کے لیے مفصل احکام دے دیئے۔ طلاق کی وجہ سے ٹوٹنے والے خاندان کے تمام بنیادی مسائل یہاں حل کر دیئے گئے اور ان احکام کی حکمت بھی بتا دی گئی۔ نہایت نرمی' نہایت بارکی اور نہایت وضاحت کے ساتھ۔

جب انسان اس سورت پر غور کرتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے' اس چھوٹی سی سورت میں وہ تمام احکام دے دیئے گئے ہیں جو کسی ایسے خاندان کو درپیش ہوتے ہیں جس میں بدقسمتی سے طلاق ہو جاتی ہے۔ اس سورت میں تمام متعلقہ احکام و قوانین مفصل بتلائے ہیں لیکن ان احکام کے اندر ہی ترغیب' ترہیب' ڈراوا اور ہر حکم پر حکیمانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اللہ نے یہ ہدایت کی ہے کہ تحلیل شدہ خاندان یہ سمجھے کہ اللہ کی تقدیر اور فیصلہ ہی ایسا ہو گا' اصل فیصلے زمین و آسمانوں کا مالک آسمان پر کرتا ہے اور پھر یہ بھی اسی سورت میں بتا دیا گیا کہ جو لوگ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں' اللہ انہیں ہلاک کرتا ہے۔ اور ان لوگوں کے لیے بڑی وسعت ہوتی ہے جو اس سے ڈرتے ہیں۔ تمام احکام کے درمیان بھی یہی تلقین ہے کہ معروف طریقے سے' باہم رضامندی سے' باہم احسان کے ساتھ اور ایثار کے ساتھ' اور اجر اخروی کا لحاظ رکھتے ہوئے' معاملات کو طے کرو' یہ بھی تلقین کی گئی ہے کہ تخلیق اور رزق کے معاملات میں اور رزق کی تنگی اور کشادگی کے معاملات میں اللہ کی تقدیر چلتی ہے۔

سورت کا موضوع ہے معاملہ طلاق لیکن اس کے اندر جابجا بکثرت عظیم کائناتی حقائق بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اور پھر طلاق کے موضوع پر قانون سازی اور ہدایات کو اس قدر اہم سمجھا گیا ہے کہ احکام کے بیان میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کیا گیا ہے' خاص آپ کی ذات کو۔ حالانکہ احکام و ہدایات سب مومنین کے لیے عام ہیں۔ یہ اس لیے کہ دیکھو یہ کوئی بہت اہم معاملہ ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ (۶۵ : ۱) سے خطاب شروع ہو رہا ہے۔ پھر احکام کی تفصیلات دی گئی ہیں' ایک ایک حالت کا حکم ہوا۔ ہر حکم تو نہایت سخت تاکیدی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ان احکامات پر سختی سے عمل کرو' ان کے نفاذ میں خدا سے ڈرو' ان کو اخذ کرنے میں اللہ کو حاضر و ناظر سمجھو' درمیان میں ترغیب' ترہیب' تبصروں اور احکام کی علت کے بیان میں تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ اس قدر تفصیل سے کہ انسان سمجھتا ہے کہ شاید اسلام کا مرکزی مضمون ہی قانون طلاق ہے۔ بس یہی دین ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ عالم بالا خود فیصلہ کرنے بیٹھا ہے۔ خود اس کی نگرانی کر رہا ہے کہ احکام نافذ ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اور ان احکام کے نفاذ میں جو لوگ تقویٰ اور خدا خوفی کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کو اعلیٰ درجے کا مومن کہا جاتا ہے۔ اور جو لوگ ان احکامات میں چالیں چلتے ہیں' تامل کرتے یا تعمیل میں ہچکچاہٹ کا اظہار کرتے ہیں' زوجین میں سے کسی کو مضرت پہنچاتے ہیں ان کو سخت ترین سزا کی دھمکی دی جاتی ہے۔ اور اگر زوجین ایک دوسرے کے ساتھ حسن اخلاق کا برتاؤ کریں' بھلائی اور آسانی پیدا کریں اور رواداری پیدا کریں اور معروف طریقے سے معاملات طے کریں' تو اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ جدائی بھی فریقین کے لیے باعث خیر بن سکتی ہے' اللہ کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔

پھر قارئین ان احکامات کے درمیان آیات کے درج ذیل ٹکڑے پڑھتے ہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰہَ رَبَّکُمْ (۶۵ : ۱) "اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے"۔

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (۶۵ : ۱) "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا"۔

لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (۶۵ : ۱) "تم نہیں جانتے کہ شاید اس کے بعد اللہ کوئی صورت پیدا کر دے"۔

وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (۶۵ : ۲) "اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنالو جو تم میں سے صاحب عدل ہوں اور گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو"۔

ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (۶۵ : ۲) "یہ باتیں ہیں جن کی لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے' ہر اس شخص کو جو اللہ اور آخرت دونوں پر ایمان رکھتا ہو"۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا (۲) وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (۶۵ : ۳) "جو اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ جو اللہ پر بھروسہ کرے وہ اس کے لیے کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے"۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا (۶۵ : ۲) "اور جو شخص اللہ سے ڈرے اس کے معاملے میں وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے"۔

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗ اِلَيْكُمْ (۶۵ : ۵) "یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے"۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗ اَجْرًا (۶۵ : ۵) "اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا"۔

سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا (۶۵ : ۷) "بعید نہیں کہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرما دے"۔

پھر اسی سورت میں ایک قاری 'ایک شدید ڈراوا بھی پڑھتا ہے جو بہت طویل ہے :

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا

وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا (٨) فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَ كَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا (٩) اَعَدَّ

اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا --- (٦٥ : ١٠) "کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی۔ انہوں نے اپنے کیے کا مزہ چکھ لیا اور ان کا انجام کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔

اور اس کے بعد اس قسم کے انجام سے ڈرایا جاتا ہے اور اللہ کی نعمتیں یاد دلائی جاتی ہیں، خصوصاً اللہ کا رسول تم میں اٹھایا جانا اور اسے ایک ایسا دین عطا کرنا جو نور ہی نور ہے یہ بھی ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ اور پھر قیامت کا اجر کبیر جو تیار پڑا ہے۔

--- فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا (١٠)

رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ

الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا (١١) "پس اللہ سے ڈرو اے صاحب عقل لوگو، جو ایمان لائے ہو۔ اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کر دی ہے۔ ایسا رسول جو تم کو اللہ کی صاف صاف ہدایت دینے والی آیات سناتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی یہ لوگ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اللہ نے ایسے شخص کے لیے بہترین رزق رکھا ہے"۔

اور اس کے بعد عظیم کائنات میں انسانی فکر کو گھمایا جاتا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا

اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (٦٥ : ١٢) "اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند، ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے"۔

ایک انسان ان سب باتوں کو احکام طلاق کے ضمن میں اور ان پر تبصروں کے ضمن میں پڑھتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ قرآن کی ایک پوری سورت صرف خانگی امور سے متعلق وقف ہے، عائلی مسائل، طلاق اور طلاق کے بعد کے حالات اور ان معاملات کو اس کائنات، اور اس کے بارے میں نظریات اور انسانی نفسیات سے منسلک کیا جاتا ہے حالانکہ موضوع زیر بحث تغیر کے لیے نہیں تخریب کے لیے ہے۔ اور اس میں ایک خاندان کی صرف تحلیل ہو رہی ہے۔ نہ کوئی خاندان وجود میں آ رہا ہے اور نہ کسی حکومت کی تشکیل کا کوئی مسئلہ ہے۔ جب کہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ شاید کسی حکومت کی تشکیل سے

بھی بڑا کوئی معاملہ درپیش ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس عائلی مسئلہ کو اس قدر اہمیت کیوں دی گئی ہے؟

اس سے کئی امور معلوم ہوتے ہیں' ان میں اہم امر یہ ہے کہ دین اسلام ایک بلند مرتبہ اور سنجیدہ دین ہے اور اس کا سرچشمہ قطعاً انسان نہیں ہے۔ اگر دوسرے شواہد کو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو صرف یہی ایک سورت ہی اس حقیقت پر کافی شہادت رکھتی ہے۔

پھر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں خاندان کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام دراصل ہے ہی ایک خاندانی نظام۔ اسلامی نظام کے زاویہ سے خاندان ہی ذریعہ سکون ہے اور اس کے ذریعہ لوگ باہم محبت اور شفقت کے مظاہر دیکھتے ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی' ایک دوسرے کے رازدار' ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک' کردار کی طہارت کے باعث اور ایک دوسرے کے لیے کفیل ہوتے ہیں۔ اس خاندان کے ماحول میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے' آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہے' اور افراد خاندان کے باہم محبت اور باہم کفالت کا انتظام ہوتا ہے۔

قرآن کریم گھریلو زندگی کی نہایت ہی خوبصورت تصویر کھینچتا ہے' جس کے اندر ہر طرف شفقت کے سائے چھائے ہوئے ہیں۔ ہر طرف رحمت اور شفقت کی خوشبو ہی خوشبو ہے اور نہایت ہی لطیف تعلق کی تروتازگی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً "اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے نفسوں سے تمہارے لیے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی"۔ اور دوسری جگہ ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ "وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو"۔

ایک نفس دوسرے نفس کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے اور دونوں کے لیے یہ تعلق سکون و قرار ہے۔ محبت اور رحمت ہے۔ ایک دوسرے کے لیے پردے اور ایک دوسرے کی زینت ہیں۔ انسان خود ان الفاظ کے اندر نہایت مٹھاس اور محبت محسوس کرتا ہے۔ الفاظ کے اندر ہی ایک اچھی فضا اور تروتازگی نظر آتی ہے۔

ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس رابطے اور تعلق کے لیے اسلام کیا حقیقی اساس تجویز کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی پختہ تعلق اور نہایت ہی نرم تعلق ہے۔ اور اس تعلق سے وہ اصل مقاصد بھی معلوم ہوتے ہیں جن کے لیے یہ تعلق قائم کیا گیا ہے۔ یہ کہ نسل انسانی کا تسلسل قائم رہے۔ یہ تمام فطری اغراض و مقاصد ایک بڑے مقصد کو پورے کرنے کے لیے ہیں۔ وہ یہ کہ

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ "کہ تمہاری بیویاں تمہارا کھیت ہیں"۔ اس تعلق سے بڑا مقصد یہ ہے کہ نسل انسانی کے بڑھانے کا انتظام ہو۔ لیکن یہ مقصد اور اس سے متعلق تمام دوسرے مقاصد نہایت پاکیزگی' طہارت کے رنگ میں ہوں' یہ تعلق ایک بامقصد اور سنجیدہ تعلق ہو' اور تمام آلودگیوں سے پاک ہو۔

اس ابتدائی یونٹ یا خلئے یا نرسری کی اسلامی نظام پوری حفاظت کرتا ہے۔ اور اسے بقا کی پوری پوری ضمانتیں عطا

کرتا ہے۔ اسلام اس خلیے کو، محض اخلاقی اور روحانی اشراق کے ذریعہ نشو ونما نہیں دیتا بلکہ وہ اس کو مکمل دستوری اور قانونی تحفظات بھی دیتا ہے۔

جو شخص اسلام کے عائلی قانون پر ایک سرسری نگاہ ڈالے اور اس سلسلے میں قرآن و سنت کی ہدایات کو غور سے پڑھے، کہ قرآن و سنت نے مختلف حالات میں کیا کیا ہدایات دی ہیں اور پھر ان قانونی، اخلاقی ہدایات کے ساتھ ساتھ، ان پر کس قدر دلائل اور حکمتیں اور تبصرے اور سبق آموز نتائج دیئے ہیں۔ اور جس طرح ان تمام حالات کو اللہ کی ذات سے جوڑا گیا ہے، جیسا کہ اس سورت میں آپ نے بطور نمونہ دیکھ لیا۔ تو وہ بڑی سہولت سے پوری طرح اس حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے کہ اسلامی نظام میں معاشرتی نظام کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور اللہ کے نزدیک اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سورہ نساء کے آغاز ہی میں اللہ نے فرمایا کہ مجھ سے ڈرو اور رحم کے حقوق سے ڈرو۔ ذرا پیچھے چلئے اس آیت کو دوبارہ پڑھیں۔

يٰأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (٤ : ١) "اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلائے۔ اسی خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے"۔

اور سورہ اسراء میں اللہ کی عبادت اور والدین کے ساتھ احسان کو ایک سطح پر رکھا گیا۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (١٧ : ٢٣) "تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر اس کی اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو"۔ پھر سورہ لقمان میں اللہ کے شکر اور والدین کے شکر کو ایک ساتھ لایا گیا۔

اَنِ اشْكُرْ لِىْ وَلِوَالِدَيْكَ "شکر کرو میرا اور اپنے والدین کا"۔

اسلامی نظام میں خاندان کی نگہداشت اور حفاظت پر اس لیے زور دیا گیا ہے کہ خالق کے نظام تخلیق میں انسانی زندگی کو ایک خاندان کی صورت میں تسلسل دیا گیا ہے۔ اللہ نے انسانیت کا پہلا خلیہ آدم اور حوا کو قرار دیا۔ لوگ بعد میں اسی خاندان سے زیادہ ہو کر پھیلے۔ اللہ اس پر قادر تھا کہ وہ لوگوں کو کئی ملین کی تعداد میں ایک ہی بار پیدا کر دیتا۔ لیکن اللہ نے ماں اور باپ پر مشتمل ایک خاندان کو حیات انسانی کے لیے گہوارہ بنا کر اس منہاج پر نسل کو چلایا۔ کیونکہ ایک خاندان ہی بچے کی فطری ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔ اس کے ماحول ہی میں اس کی استعداد بڑھ سکتی ہے اور خاندان ہی میں اس کی شخصیت اور اس کی قابلیت پروان چڑھ سکتی ہے۔ خاندان ہی میں وہ گہرے اثرات لے سکتا ہے۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے اسلامی نظام زندگی بھی اپنی تخلیق کے نظام کے مطابق بناتے ہوئے اس کی انہی خطوط پر شیرازہ بندی کی، جس

طرح انسانیت کی تخلیق ایک خاندانی نظام کے مطابق ہے' جس طرح اسلامی نظام قانون میں خاندان کی اہمیت ہے اسی طرح اسلامی نظام اور اسلامی قانون بھی نظام فطرت کے مطابق ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اسلامی نظام حیات اور قرآن و سنت نے عائلی زندگی اور خاندانی نظام کو جو بے حد اہمیت دی گئی ہے اس کا مقصد اس نظام کو خدا کے ساتھ پیوست کر کے ایک مقدس رنگ دینا ہے۔ یہ نظام اور معاہدۂ زوجیت صرف ایک سول معاہدہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک مقدس بندھن ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مومنین کے اندر ایک روحانی پاکی اور شعوری صفائی فرماتا ہے۔ جبکہ بت پرستانہ اور دوسرے تحریف شدہ اور گمراہانہ ادیان میں اس کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام فطرت کے تقاضوں کے ساتھ جنگ نہیں کرتا۔ نہ فطری تقاضوں کو ایک گندا عمل قرار دیتا ہے بلکہ اسلام فطری خواہشات کو منظم کر کے اور پاکیزہ راہوں سے اسے بلند کرتا ہے۔ اور ان تقاضوں کو اسلام خالص حیوانی سطح سے اٹھا کر اس بلند مقام تک لے جاتا ہے کہ بے شمار نفسیاتی' اجتماعی اور سماجی آداب کے لیے یہ تقاضے محور کا کام دیتے ہیں۔ اس کے بعد پھر جنسی تعلقات نہایت اعلیٰ درجے کے انسانی شعور پر مبنی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کہ جب دو جسم آپس میں ملتے ہیں تو اس کے نتیجے میں دو دل بھی مل جاتے ہیں' دو روحیں بھی مل جاتی ہیں بلکہ دو انسان آپس میں ایک ہو جاتے ہیں۔ مشترکہ زندگی ان کو باہم مربوط کرتی ہے۔ ان کی امیدیں مشترکہ ہوتی ہیں۔ ان کے درد اور دکھ ایک ہوتے ہیں' ان کا مستقبل ایک ہوتا ہے اور اولاد کی صورت میں تو ان کے جسم بھی ایک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ اولاد اک گھر میں پیدا ہوتی ہے اور یہ اولاد پھر والدین کے اندر ان کے ازدواجی رشتے کو اور مربوط اور مستحکم کر دیتی ہے۔

اسلام ازدواجی زندگی کو پاکیزگی اور بلندی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اس لیے اسلام حکم دیتا ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان شادی کا انتظام کرو۔

وَ انْكِحُوْا الْاَيَامٰى وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَائِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (٢٤ : ٣٢) وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَايَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ "تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی' غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو' اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا' اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے۔ اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں انہیں چاہئے کہ عفت مآبی اختیار کریں۔ یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے"۔

اسلامی قانون نے شادی شدہ مرد اور عورت کو محصن اور محصنات کہا ہے' یعنی بچے ہوئے لوگ۔ مقصد یہ ہے کہ بغیر شادی کے رہنا اگرچہ ایک نہایت ہی معمولی عرصہ ہو' اللہ اس سے راضی نہیں ہوتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "مجھے یہ ڈر لگا کہ میں اللہ سے ملوں اور رنڈوا ہوں"۔ یہ بات انہوں نے اس وقت کہی جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد جلد انہوں نے شادی کر لی۔ یوں نکاح کرنا اسلامی نظام اور دین اسلام میں عبادات میں شمار ہوتا ہے اور اس کا درجہ اسی طرح ہے جس طرح دوسری عبادات ہوتی ہیں۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اسلام کے عائلی قوانین پر نظر ڈالی جائے تو یہ نہایت ہی فطری لیکن حقیقت پسندانہ قوانین ہیں ۔ یہ عائلی تعلقات اور ان کے ضابطے انسانوں کو انسان سمجھ کر بنائے گئے ہیں ۔فطری انداز کے عائلی روابط کو پھر اٹھاکر بلند اور مقدس مقام تک لے جایا گیا ہے ۔ زندگی کے حقیقی حالات اور انسان کی حقیقی سطح اور اس کی صلاحیت کو سامنے رکھتے ہوئے ۔ یہ چونکہ دو دلوں کے اندر جوڑ پیدا کرتا ہوتا ہے 'اس لیے اسلام نے ان روابط کی شیرازہ بندی میں صرف قانونی اقدامات پر ہی اکتفاء نہیں کیا' نہ صرف اخلاقی وعظ پر فریقین کو چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ قانونی ضوابط بھی وضع کیے گئے ہیں ۔ اخلاقی ہدایات بھی دی گئی ہیں ۔ خدا کے خوف سے بھی ڈرایا گیا ہے ' لیکن ان کے ساتھ ساتھ انسان کے حقیقی نفسیاتی حالات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے ۔

اسلام نے عائلی تعلقات کے اندر سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی ہے کہ یہ تعلقات دائمی ہوں اور چلتے رہیں ۔ اور ان تعلقات کو جاری رکھنے کے لیے اسلام نے کافی ضمانتیں فراہم کی ہیں ۔ اسلام نے زوجین کو کہا ہے کہ رشتہ ازدواج دراصل ایک مقدس رشتہ اور عبادت ہے ۔ اس کے قیام کے لیے سرکاری بجٹ میں مد رکھی گئی ہے ۔فقراء کے لیے اور فقیرات کے نکاح کے لیے معاونت رکھی ہے ۔ پھر زینت کی نمائش کو ممنوع قرار دیا ہے کہ محروم لوگوں کے اندر جنسی اشتعال نہ ہو ۔ یہ نہ ہو کہ بازاروں میں حسن پھرے اور اس کے پیچھے دیوانے لگے ہوئے ہوں ۔ اسلام نے حد زنا 'اور حد قذف کا قانون جاری کیا ۔گھروں کے اندر داخلے کے لیے استیذان کا قانون جاری کیا ۔ اور خود ایک گھر میں رہنے والے لوگوں سے بھی کہا گیا کہ جب وہ گھر میں داخل ہوں تو اجازت لے کر آئیں ۔

اسلام نے ازدواجی تعلقات کے لیے ایک متعین قانون بنایا' پھر گھر کا انتظام مرد کے ہاتھ میں دیا اور اسے گھر کا منتظم اعلیٰ مقرر کیا ۔کیونکہ جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ قوی تر ہے تاکہ خاندان کے انتظام میں انتشار نہ ہو' غرض خاندانی نظام کے بچانے کے لیے اسلام نے ہر ذریعہ استعمال کیا ۔ جذباتی ہدایات نیز تعلقات کو اللہ کی نگرانی میں دینا اور ان کے سلسلے میں خدا خوفی پیدا کرنا بھی خاندانی نظام کے استحکام کے لیے ہیں ۔ غرض اسلام نے ان تعلقات کو صرف جذبات کے حوالے نہیں کیا ۔

لیکن ان تمام قانونی' اخلاقی اور دینی انتظامات کے باوجود بعض اوقات ایسے عملی حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ کوئی خاندانی یونٹ قائم نہیں رہ سکتا ۔ یہ حالات چونکہ عملی اور حقیقی ہوتے ہیں' اس لیے اسلام نے ایسے حالات کے لیے بھی ایک عملی ضابطہ اختیار کیا ہے 'کہ اگر زوجین کے درمیان اس قدر تلخی ہوگئی ہو کہ ان کا یکجا رہنا ممکن نہ ہو تو اسلام اس قسم کی کوئی عبث کوشش نہیں کرتا کہ فریقین کو زبردستی جوڑے رکھا جائے اور اگر تحلیل کی ضرورت ہو تو اس کے لیے راہ چھوڑتا ہے لیکن :

اسلام یہ اجازت نہیں دیتا کہ اس ابتدائی یونٹ میں معمولی خرابی ہوتے ہی اسے تحلیل کر دیا جائے بس معمولی اختلاف ہو اور فوراً طلاق واقع ہو جائے ۔ اسلام اس یونٹ کو بچانے کی پوری پوری سعی کرتا ہے اور تحلیل کی اجازت اس وقت دیتا ہے جب بچنے کی کوئی صورت نہ رہے ۔ مکمل مایوسی ہو جائے ۔

چنانچہ اسلام کا حکم یہ ہے خصوصاً مردوں سے کہا جاتا ہے :

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ

فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (٤ : ١٩) "اور ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو' اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو' مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو"۔ اگر کوئی خاوند بیوی کو ناپسند بھی کرتا ہو' پھر بھی قرآن اسے آمادہ کرتا ہے کہ ذرا صبر سے کام لو' طلاق کے فیصلے میں جلدی نہ کرو اور ان کو امید دلاتا ہے کہ "ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو"۔ کیا پتہ ہے کہ ان مکروہ عورتوں ہی میں تمہارے لیے بھلائی ہو۔ اور یہ خیر ان کے ذریعے آنے والی ہو۔ لہٰذا ان کو چاہئے کہ اس خیر سے اپنے آپ کو محروم نہ کریں۔ یہ ایک نہایت ہی بلیغ انداز ہے جس کے ذریعہ قرآن کریم محبت اور حسن سلوک کے جذبات کو زندہ کرتا ہے اور نیز اس بلیغ انداز سے کراہت اور ناپسندیدگی کی سختی کو نرمی سے بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جب یہ نفاق اس قدر بڑھ گیا کہ محض ناپسندیدگی نہیں رہی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر عورت کی طرف سے نافرمانی اور نشوز پیدا ہو گیا ہے پھر بھی طلاق آخری حل نہیں ہے بلکہ فریقین کے درمیان اس تنازعہ کو رفع کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ

اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا (٤ : ٣٥) "اگر تم لوگوں کو کہیں میاں بیوی کے درمیان تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو' وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا' اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے:

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا

بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (٤ : ١٢٨) اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو' تو کوئی مضائقہ نہیں کہ میاں بیوی آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہرحال بہتر ہے"۔

اگر جرگہ سے بھی مصالحت نہ ہو' اور کوئی صورت نہیں ہے کہ یہ یونٹ بچ سکے اور اس سلسلے میں کی جانے والی تمام کوششیں رائیگاں گئی ہیں اور جس قدر دباؤ پڑتا ہے' حالات اور خراب ہوتے ہیں تو حکمت اور دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ واقعات کو تسلیم کر لیا جائے۔ پھر اس قسم کی باہم جکڑی ہوئی زندگی کو اسلام بھی پسند نہیں کرتا تو آخری حل سامنے آتا ہے اور یہ جائز قرار پاتا ہے لیکن جائز ہونے کے باوجود۔ "ابغض الحلال عند اللہ الطلاق"

(اللہ کے نزدیک طلاق ناپسندیدہ ترین حلال امر ہے) اب اگر خاوند طلاق کا آخری فیصلہ کر لے تو پھر اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ فوراً ہی تعلقات کاٹ دے۔ سنت طریقہ طلاق یہ ہے کہ طلاق یوں دی جائے کہ جب عورت ایام ماہواری سے فارغ ہو تو قبل اس کے کہ خاوند اس کے ساتھ ہم بستری کرے اسے ایک طلاق دے دے۔ اس کے بعد

دوسری بار عورت اس طرح فارغ ہو تو دوسری طلاق دے ۔ تیسرے مہینے وہ اسی طرح فارغ ہو تو تیسری بار طلاق دے ۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خاوند غصے میں آکر یکلخت تعلقات کاٹ نہ دے ۔ اس طریقہ طلاق کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طلاق رجعی ہوتی ہے ۔ اس دوران اگر کوئی صورت پیدا ہو جائے تو خاوند رجوع کر سکتا ہے ۔ اسی طرح دوسری طلاق بھی رجعی ہوگی پھر بھی وہ رجوع کر سکتا ہے ۔ اگر دو ماہ میں بھی ان کے درمیان کوئی صلح نہ ہو سکے تو پھر آخری بار طلاق فائنل ہوگی ۔

اس کے بعد پھر عدت کا دور آتا ہے ۔ اگر کسی عورت کو ایام ہوتے ہیں تو تین بار ایام سے پاکی سے عدت گزر جائے گی ۔ اور جس عورت کا حمل ہو تو وضع حمل سے اس کی عدت گزر جائے گی اور جس کا حمل بھی نہ ہو اور حیض بھی نہ آتا ہو اس کی عدت تین ماہ ہوگی ۔ اسی طرح نابالغ کی عدت بھی تین ماہ ہوگی ۔ اگر عدت جاری ہو تو دوران عدت خاوند رجوع کر کے تعلقات کو پھر سے بحال کر سکتا ہے ۔ (اگر تین طلاق بیک وقت دے دی ہوں اور عدت گزر رہی ہو تو احناف کے نزدیک رجوع کا اختیار نہ ہو گا) ۔

لیکن اسلام کی یہ تمام کوششیں اس بات کی نفی نہیں کرتیں کہ قطعی جدائی نہیں ہو سکتی ۔ اسلام حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے حالات کو تسلیم کرتا ہے اور ایسے حالات کے لیے قانونی اقدامات بھی کرتا ہے ۔ جدائی کی صورت میں ذمہ داریوں کا تعین بھی کرتا ہے ۔ اس سورت میں ایسے ہی حالات کے لیے مفصل قانون سازی کی گئی ہے ۔ ان قانونی اقدامات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کس قدر فطری اور واقعیت پسند دین ہے ۔ اور اس نے انسان کی زندگی کے مسائل کو کس قدر خوبصورتی کے ساتھ حل کیا ہے اور انسان کو آگے بڑھایا ہے بلکہ اسے آسمانوں تک بلند کر کے معرفت الٰہیہ سے نوازا ہے ۔

اس سورت سے چوتھا نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اسلامی سوسائٹی میں جاہلیت سے ورثے میں ملے ہوئے بعض عملی مسائل موجود تھے ۔ یہ مسائل اور رسم و رواج پہلے سے عملاً اسلامی سوسائٹی میں چلے آ رہے تھے ۔ اس لیے اسلامی سوسائٹی کو خاندانی نظام کی تشکیل جدید کے لیے ترغیب ' ترہیب 'تبصرے ' حکمتوں اور احکامات پر عمل کرنے کی شدید تاکید کی ضرورت پیش آئی ۔ ان مسائل کی وجہ سے عورت ظلم کی چکی میں پس رہی تھی ۔ اور ہر معاملے میں اس پر مظالم ہوتے تھے جس کی وجہ سے ان احکامات کے نفاذ میں اس قدر تشدید کی ضرورت پیش آئی ۔ اس لیے نفسیاتی دلائل 'نہایت باریک قانونی تفصیلات اور خدا خوفی کی بار بار اپیلیں کرنی پڑیں تاکہ لوگوں کو ان جدید احکام میں تاویل کرنے ' اور پہلوتہی کرنے کا موقعہ ہی نہ ملے ۔ کیونکہ اسلام سے پہلے مرد و عورت کے تعلقات کسی ضابطے کے پابند نہ تھے اور مرد جس وقت چاہتا تھا ' خاندان کا شیرازہ بکھیر دیتا تھا ۔

عورت پر مظالم کے یہ حالات صرف جزیرۃ العرب تک محدود نہ تھے ۔ اس وقت کی پوری دنیا میں عورتوں پر مظالم ہو رہے تھے ۔ پوری دنیا میں عورت ' غلاموں سے بھی بدتر حالات میں زندگی بسر کر رہی تھی بلکہ دوسری جگہوں میں تو عورت کے ساتھ تعلق کو ایک گندہ تعلق سمجھا جاتا تھا ۔ اور عورت کو شیطان کا ہتھیار سمجھا جاتا تھا ۔

جب اسلام آیا تو اس نے عورت کو اس گرے ہوئے مقام سے اوپر بلند کیا اور مرد و عورت کے تعلقات کو بالکل مساوی سطح پر لا کر اسے وہ تقدس بخشا جس کی طرف ہم نے گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا ہے ۔ قدر و قیمت 'حقوق ' تحفظات کے اعتبار سے عورت کو بالکل ایک جدید زندگی بخشی ۔ اب وہ ایک لڑکی نہیں ہے جسے زندہ درگور کر دیا جائے ' جس کی

توہین کی جائے ۔اب وہ ایک ایسی خود مختار ہستی ہے ۔کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہو سکتا' خواہ وہ باکرہ ہو یا شادی شدہ ہو' وہ اگر کسی کی عورت ہے تو اس کے لیے حقوق اور تحفظات ہیں ۔اور یہ حقوق قانونی حقوق ہیں' محض رسم و رواج نہیں ہیں ۔ مطلقہ ہے تو اس کو وہ حقوق حاصل ہیں جو اس سورت میں مفصل ہیں ۔

اسلام نے عورت کو یہ حقوق اس وقت دیئے جبکہ جزیرۃ العرب یا دنیا کے کسی خطے میں 'کسی عورت کے اندر یہ شعور نہ تھا کہ معاشرہ نے ان کو جو مقام دیا ہوا ہے وہ ان کے استحقاق سے فرو تر ہے ۔اور یہ حقوق اسلام نے عورت کو اس لیے بھی نہ دیئے تھے کہ خود مردوں کے اندر یہ شعور بیدار ہو گیا تھا کہ عورت پر ظلم ہو رہا ہے' نہ یہ حقوق اس لیے دئے گئے تھے کہ عربی عورتوں کی کوئی انجمن تھی' وہ مطالبہ کر رہی تھی یا زمین کے اوپر دوسرے علاقوں میں عورتوں کی کوئی انجمن تھی' اور وہ مطالبہ کر رہی تھی ۔یا اس لیے بھی وہ حقوق اسلام نے نہیں دیئے کہ کچھ عورتیں مکہ کے دارالندوہ کی ممبر بن گئی تھیں یا مجلس شوریٰ اور پارلیمنٹ کی ممبر بن گئی تھیں ۔یا اس لیے کہ اس کرۂ ارض کے اوپر کہیں سے کوئی آواز ان کے حقوق کے لیے اٹھ گئی تھی ۔یہ تو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے از خود یہ شریعت بھیجی' اللہ بادشاہ سماوات نے اہل زمین پر رحم کیا ۔اور حکم دیا کہ عائلی زندگی کو اس گراوٹ سے بلند کیا جائے ۔اور عائلی تعلقات کو شرعی اصولوں پر استوار کیا جائے ۔یہ کہ زوجین نفس واحدہ ہیں اور ان کے حقوق بھی بحیثیت انسان برابر ہیں ۔

یہ ہے ایک بلند اور ارفع دین ۔اس سے وہی شخص منہ موڑ سکتا ہے جو اندھا ہے اور اس میں عیب وہی تلاش کرتا ہے جو پسماندہ ذہنیت رکھتا ہے ۔اور اس کے ساتھ وہی جنگ کرتا ہے جو منحوس اور کینہ ہو' اس لیے کہ اللہ کی شریعت کو ترک کر کے انسانوں کی شریعت وہی شخص اختیار کرتا ہے جو ہوائے نفس کا غلام ہو ۔

میں سمجھتا ہوں اس سورت پر اس قدر تبصرہ کافی ہے اور اب مناسب ہے کہ ہم اس کی آیات پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں ۔یہ تبصرہ بھی سورت کی فضا سے کچھ زیادہ بعید نہیں ہے' نہ غیر متعلق ہے ۔نہ اس پارے کی فضا سے دور ہے ۔جس میں اسلامی جماعت کی تشکیل اور تنظیم پر زور دیا گیا ہے ۔ہاں البتہ تفصیلی احکام اس مجمل تبصرے سے قدرے مختلف ہوں گے ۔تفصیل سے معلوم ہو گا کہ وہ زندہ' متحرک' باشعور' ہدایت پذیر سوسائٹی کی عملی باتیں ہیں ۔اور یہی فرق ہے قرآن و سنت کے احکام اور کتب فقہ کے احکام کا ۔فقہ اور اصول فقہ کے احکام کا وہ رنگ نہیں ہوتا جو قرآن میں بیان احکام کے وقت ہوتا ہے کیونکہ قرآن میں احکام کے ساتھ ہدایات اثر اندازی اور اثر پذیری بھی ساتھ ساتھ نمایاں نظر آتی ہے جبکہ فقہ و قانون میں خشک احکام ہی ہوتے ہیں ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۶۵ تشریح آیات

۱ ــ تا ــ ۱۲

آیاتها ۱۲ سُورَةُ الطَّلَاقِ (۶۵) مَدَنِيَّةٌ (۹۹) رکوعاتها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ
مُّبَيِّنَةٍ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ لَا
تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝۱ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ
بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ
لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ
لَّهٗ مَخْرَجًا ۝۲ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ
حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝۳ وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ
مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ
يَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ
يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝۴ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ
يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ۝۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اے نبیؐ' جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے لیے طلاق دیا کرو اور عدت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو' اور اللہ سے ڈرو' جو تمہارا رب ہے۔ (زمانہ عدت میں) نہ تم انہیں ان کے گھروں سے نکالو' اور نہ وہ خود نکلیں' الا یہ کہ وہ کسی صریح برائی کی مرتکب ہوں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں' اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اوپر خود ظلم کرے گا۔ تم نہیں جانتے' شاید اس کے بعد اللہ (موافقت) کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ پھر جب وہ اپنی (عدت کی) مدت کے خاتمہ پر پہنچیں تو یا انہیں بھلے طریقے سے (اپنے نکاح میں) روک رکھو' یا بھلے طریقے پر ان سے جدا ہو جاؤ اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنالو جو تم میں سے صاحب عدل ہوں اور (اے گواہ بننے والو) گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو۔ یہ باتیں ہیں جن کی تم لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے' ہر اس شخص کو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۔ جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لیے وہ کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔ اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں ان کے معاملہ میں اگر تم لوگوں کو کوئی شک لاحق ہے تو (تمہیں معلوم ہو کہ) ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اور یہی حکم ان کا ہے جنہیں ابھی حیض نہ آیا ہو۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت کی حد یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔ جو شخص اللہ سے ڈرے اس کے معاملہ میں وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے یہ اللہ کا حکم ہے۔ جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا"۔

یہ پہلا مرحلہ ہے اور یہ پہلا حکم ہے کہ خطاب تو صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن حکم تمام مومنین کے لیے ہے۔ کیونکہ خطاب۔

يٰأَيُّهَا النَّبِيُّ (۶۵ : ۱) سے ہے اور حکم یوں شروع ہوتا ہے :

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (۶۵ : ۱) "جب تم لوگ طلاق دو"۔ معلوم ہوا کہ اس حکم کی خدا کے نزدیک بہت بڑی اہمیت ہے اور اس لیے یہ تاثر دیا گیا کہ اسے نہایت سنجیدگی سے لیا جائے۔ یہ اہم حکم ہے۔ اللہ اپنے نبی کو خصوصی طور پر خطاب فرماتا ہے کہ یہ حکم لیجئے اور اسے لوگوں تک پہنچائیے۔ یہ ایک نفسیاتی انداز ہے اور نہایت ہی اونچے درجے کے اہتمام کا۔

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (۶۵ : ۱) "جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں عدت کے لیے طلاق دو"۔ اس آیت کے مفہوم کے تعین میں بخاری شریف کی ایک صحیح حدیث وارد ہے۔ یحییٰ ابن بکیر سے' لیث سے' انہوں نے عقیل سے' انہوں نے ابن شہاب سے' انہوں نے سالم سے' انہوں نے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے وہ کہتے ہیں کہ میری ایک بیوی تھی جسے میں نے طلاق دے دی۔ اس وقت وہ حائضہ تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ کو بہت غصہ آیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: "اسے چاہئے کہ اس سے رجوع کرے۔ پھر اسے بیوی بنا

کر رہے ... وہ حیض سے پاک نہ ہو جائے اور اس کے بعد وہ دوبارہ حائضہ ہو جائے اور پھر حیض کی مدت ختم ہونے پر پاک ہو جائے ۔ اب اگر وہ اسے طلاق دینا چاہتا ہے تو دے دے ۔ ایسی حالت میں کہ وہ پاک ہو اور قبل اس کے کہ اس نے ہاتھ لگایا ہو ۔ یہ ہے وہ عدت جس کا حکم اللہ نے دیا ہے "۔ مسلم نے بھی اس کو روایت کیا ہے ۔ البتہ ان کے الفاظ یہ ہیں : "یہ ہے وہ عدت جس کے لیے اللہ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے "۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاق واقع ہونے کا ایک متعین وقت ہے ۔ لہٰذا مرد کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جس وقت چاہے عورت کو طلاق دے دے الا یہ کہ اس کی بیوی پہلے سے حالت طہر میں ہو اور اس طہر میں اس نے اپنی بیوی کو ہاتھ نہ لگایا ہو ۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک دوسری صورت بھی ہے جس میں طلاق دی جا سکتی ہے ۔ وہ یہ کہ عورت واضح طور پر حاملہ ہو ۔ اس میں حکمت الٰہیہ یہ ہے کہ طلاق اس طرح ایک متعین وقت کے لیے موخر ہو جائے گی ۔ اور جس وقت مرد طلاق دینے کے لیے آمادہ ہوتا ہے 'فوراً نہ دی جا سکے گی ۔ عملاً طلاق موخر ہو جائے گی ۔ اور فائدہ یہ ہو گا کہ اگر کوئی فوری غیض و غضب کا معاملہ ہو تو وہ ٹھنڈا ہو جائے ۔ اور اس دوران فریقین کے درمیان تعلقات درست ہو جائیں ۔ نیز اگر حاملہ ہے تو حمل کی تفتیش میں بھی وقت گزر سکتا ہے ۔ بعض اوقات ہو سکتا ہے کہ ایک شخص حمل ہی کی وجہ سے طلاق سے رک جائے ۔ جب حمل معلوم ہو جائے 'اس صورت میں اگر وہ طلاق دے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ سوچ سمجھ کر طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا ہے ۔ "یہ کہ طہر میں طلاق دی جائے جس میں عورت کے پاس نہ گیا ہو "۔ یہ اس لیے کہ اس صورت میں حمل کا امکان کم ہوتا ہے ۔ اور یہ شرط کہ "وہ پہلے یہ تفتیش کرائے کہ حمل نہیں ہے "۔ یہ اس لیے کہ اسے معلوم ہو کہ بیوی حاملہ ہے ۔

یہ پہلی کوشش ہے کہ خاندان کے خلیے پر وار کرنے سے خاوند کو روکا جاتا ہے اور اس عمارت کو گرانے کے لیے مارے جانے والے کدال کو روک دیا جاتا ہے یا روکنے کی سعی کی جاتی ہے ۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر کوئی شخص ان شرعی ہدایات کی پرواہ کیے بغیر طلاق دیتا ہے تو واقع نہیں ہوتی ۔ جس وقت بھی کوئی طلاق دے طلاق واقع ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس طرح طلاق دینا مکروہ ہے ۔ اللہ اور رسول سے ایسے شخص پر غضب کا نزول ہو گا ۔ (اور اسے طلاق بدعی) کہتے ہیں اور ایک سچے مومن کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اس سے بچے اور اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرے ۔

وَ اَحۡصُوا الۡعِدَّۃَ (۶۵ : ۱) "عدت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو "۔ تاکہ اس کے عدم شمار میں عدت گزارنے والی عورت پر مدت زیادہ نہ ہو جائے اور عدت گزارنے کے بعد اگر وہ دوسرا خاوند کرنا چاہتی ہے تو اسے بلاضرورت دیر نہ کرنا پڑے ۔ یا اگر مدت کم شمار ہو تو اس سے مدت کے جو مقاصد ہیں وہ پورے نہ ہوں ۔ یعنی نسب کی حفاظت کے لیے رحم مادر کی پاکی کا یقین ہونا ۔ اس کے بعد عدت گزارنے کے بارے میں مفصل احکام ۔ اور معاملے کو اللہ کی نگرانی اور خدا خوفی کے حوالے کیا جاتا ہے ۔

وَ اتَّقُوا اللّٰہَ رَبَّکُمۡ ۚ لَا تُخۡرِجُوۡہُنَّ مِنۡۢ بُیُوۡتِہِنَّ وَ لَا یَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ (۶۵ : ۱) "اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے 'نہ تم انہیں گھروں سے نکالو 'نہ وہ خود نکلیں الا یہ کہ وہ کسی

صریح برائی کے مرتکب ہوں"۔ یہ پہلی پکار کے بعد پہلی تنبیہ ہے۔ اور عورتوں کو گھروں سے نکالنے یا ان کے خود نکلنے کو خدا خوفی کے حوالے کیا گیا ہے کہ اس معاملے میں خدا سے ڈرو۔ یہ کہا گیا ہے کہ "ان کو ان کے گھروں" سے نہ نکالو حالانکہ گھر تو خاوند کے ہیں' لیکن چونکہ ان کو وہاں رہنے کا استحقاق ہے اور ان کا وہاں رہنا اللہ نے فرض قرار دیا ہے' اس لیے ان خاوندوں کے گھروں کو ان کے گھر کہا گیا ہے۔ ہاں صرف ایک صورت میں وہ گھروں سے نکل سکتی ہیں' یا نکالی جا سکتی ہے کہ ان سے کسی کھلی فحاشی کا ارتکاب ہو' اگر وہ زنا کا ارتکاب کریں تو حد کے لیے نکالا جائے گا۔ یا یہ کہ خاوند کے رشتہ داروں کے لیے وہ ایذا کا سبب ہوں۔ یا بعض اوقات خاوند کے ساتھ نافرمانی اور بدکلامی بھی ہو سکتی ہے' کیونکہ عورت کو خاوند کے گھر رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے لیے ایسے مواقع فراہم ہوں کہ وہ رجوع کے لیے آمادہ ہو سکیں۔ اور محبت کے جذبات کو کام کرنے کے مواقع فراہم ہوں۔ مشترکہ زندگی کی یادیں اپنا کام کر سکیں' یوں کہ عورت جسمانی لحاظ سے خاوند سے دور ہو گی اور اس کی نظروں کے سامنے ہو گی۔ اس حالت میں دونوں کے درمیان معاملات کی درستگی کے امکانات موجود ہوں گے۔ اگر وہ خاوند کے گھر رہتے ہوئے' زنا کا ارتکاب کرتی ہے' یا فحاشی اور بدکلامی کرتی ہے' یا اس کو اور اس کے اہل خانہ کو ایذا دیتی ہے' تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ٹھہرانے سے جو مقاصد پیش نظر تھے ان کے حصول کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لہذا اب اس کا یہاں رہنا مزید بدمزگی کا باعث ہو گا۔ فریقین میں مزید کشیدگی ہو گی۔

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (۶۵: ۱) "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور جو کوئی اللہ کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا"۔ یہ دوسرا ڈراوا ہے جو اسلام کے قانون طلاق پر عمل نہ کرنے والوں کو دیا گیا ہے۔ کیونکہ اپنے احکام کی تعمیل کروانے اور ان پر عمل کی نگرانی کرنے والا اللہ بذات خود ہے۔ اگر کوئی مومن ہے تو وہ حدوں کو ہرگز عبور نہیں کر سکتا جن کا نگران اللہ ہے۔ یہ تو کھلی ہلاکت اور تباہی ہے۔ "جو اللہ کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا"۔ اس لیے کہ اللہ کی حدود پر اللہ کی فوجیں کھڑی ہیں' پھر یہ شخص اپنی بیوی پر ظلم کر کے خود اپنے ساتھ ظلم کر رہا ہے کہ دونوں ایک ہی نفس سے پیدا کردہ ہیں۔

لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (۶۵: ۱) "تم نہیں جانتے کہ شاید اللہ اس کے بعد کوئی صورت پیدا کر دے"۔ یہ نہایت موثر احساس دلاتا ہے۔ کوئی ہے جو مستقبل کے پردے کے پیچھے پوشیدہ امور کو جانتا ہو۔ یا کون ہے جو اللہ کی تقدیر کو جانتا ہے اور اس حکمت کو جانتا ہے کہ عدت کیوں مقرر کی گئی ہے اور یہ کیوں مقرر کیا ہے کہ وہ گھروں میں رہیں۔ یہ ان کو امید اور اچھی امید کی یقین دہانی ہے۔ بعض اوقات اس سے بہت بڑی خیر نکل آتی ہے۔ بعض اوقات اچانک حالات تبدیل ہو جاتے ہیں' غلط فہمی دور ہو کر رضامندی پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ کی تقدیر تو ہر وقت حرکت میں رہتی ہے۔ اس کے اندر ہر وقت تغیر ہوتا رہتا ہے۔ نئے نئے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں لہذا اللہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی بہتر طریقہ ہے اور اللہ سے ڈرنے ہی میں خیر ہے۔

نفس انسانی پر بعض اوقات وقتی حالات چھا جاتے ہیں۔ اور موجودہ حالات کے ہاتھوں وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ اور مستقبل کی راہیں اس پر مسدود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ وہ موجودہ حالات کی گندگی میں مجبوراً پڑا رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اب یونہی رہنا ہے۔ یہی صورت باقی رہے گی۔ اور موجودہ حالات ہمیشہ اس کے رفیق رہیں گے اور موجودہ سائے اس کا

پیچھا کرتے ہی رہیں گے ۔ یہ ایک نفسیاتی جیل خانہ ہوتا ہے جس میں کوئی شخص خود اپنے ہاتھوں قید ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اعصاب شکن ہوتا ہے ۔

لیکن حقیقت یوں نہیں ہوتی ۔ اللہ کی تقدیر تو حالات پر خندہ زن ہوتی ہے ۔ حالات تو بدلتے رہتے ہیں ۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں ۔ بعض اوقات مشکلات کے بعد ایسے حالات پیش آ جاتے ہیں کہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے ۔ مشکل کے بعد ہمیشہ آسانیاں ہوتی ہیں ۔ تنگی کے بعد کشادگی ہوتی ہے اور اللہ کی ہر روز نئی شان ہوتی ہے ۔ تمام تخلیق اس کے ہاتھ میں ہے ۔

اللہ یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کے شعور میں یہ فکر مستقلاً بیٹھی ہو' تاکہ وہ پرامید رہیں اور اللہ کی طرف نظریں لگائے ہوئے ہوں' کہ وہ کسی بھی وقت مشکلات کو دور کر دے گا ۔ اور حالات کے بدلنے میں کوئی دیر نہیں لگتی' لہٰذا انسانی ذہن کو بھی اپنے دروازے اس کے لیے کھلے رکھنے چاہئیں اور مایوس ہو کر وہ ذہن کو بند نہ کر دے ۔ آنے والی گھڑی میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے ۔

لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (۶۵ : ۱) "تم نہیں جانتے کہ اللہ اس کے بعد کوئی صورت مصالحت پیدا کر دے"۔

---ooo---

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ذٰلِكُمْ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا (۶۵ : ۲) وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (۶۵ : ۳) (۶۵ : ۲ ـ ۳) "پھر جب وہ اپنی (عدت کی) مدت کے خاتمہ پر پہنچیں تو یا انہیں بھلے طریقے سے (اپنے نکاح میں) روک رکھو' یا بھلے طریقے پر ان سے جدا ہو جاؤ اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنا لو جو تم میں سے صاحب عدل ہوں اور (اے گواہ بننے والو) گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو ۔ یہ باتیں ہیں جن کی تم لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے' ہر اس شخص کو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو ۔ جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو ۔ وہ جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لیے وہ کافی ہے ۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے ۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے"۔

یہ دوسرا مرحلہ اور اس کا حکم ہے ۔ عدت پوری ہو جاتی ہے 'اور جب تک عورت عدت سے خارج نہیں ہو جاتی' خاوند کو رجوع کا حق رہتا ہے اور محض رجوع کرنے سے وہ اس کی بیوی بن جاتی ہے ۔ یاد رہے کہ عدت کی مختلف میعادیں ہم نے پہلے بتا دی ہیں ۔ یہ ہے امساک یعنی روک لینا ۔ یا اگر وہ (دوسری یا تیسری) طلاق نہیں دیتا اور عورت بائن ہو جاتی ہی یعنی عورت ایک یا دو طلاقوں ہی سے جدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ آزاد ہو جاتی ہے ۔ اس کے بعد اگر خاوند چاہے تو اس کی مرضی سے جدید نکاح کر سکتا ہے لیکن اگر وہ رجوع کرتا ہے یا عورت کو جدا کرتا ہے 'حکم یہ ہے کہ اس کے ساتھ معروف طریقے کے مطابق برتاؤ کرے ۔ یہ بھی منع ہے کہ کہ اسے محض تنگ کرنے کے لیے رجوع کرے ۔ مثلاً یہ کہ عورت کو ایک طلاق دے ۔ پھر وہ پوری عدت گزارنے سے قبل رجوع کرے 'پھر اس کو طلاق دے اور پھر وہ تین مہینے کی عدت شروع کرے اور ختم ہونے سے قبل پھر رجوع کرے اور پھر طلاق دے دے ۔ یوں اس کی عدت نو ماہ تک چلی جائے ۔ یہ ہے عورت کو محض اذیت دینا ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر رکھنا ہے تو رجوع کرے ۔ اور اس طرح بھی نہ ہو کہ رجوع کر کے اسے معلق رکھ دے کہ وہ بے چاری مالی تاوان دینے پر مجبور ہو جائے ۔ جب یہ سورت نازل ہوئی تو اس وقت عرب معاشرہ میں ایسی صورتیں ہو رہی تھیں اور ہمیشہ ایسا ہوتا ہے جب انسانی دلوں سے اللہ کا خوف نکل جاتا ہے ۔ معاشرت اور جدائی دونوں حالتوں میں خوف خدا ہی بہترین ضامن ہوتا ہے ۔ نیز عورت کو جدا کرتے وقت سب و شتم 'سختی' سخت کلامی یا مارپیٹ معروف طریقہ نہیں ہے ۔ معروف طریقہ یہ ہے کہ شرافت سے رخصت کیا جائے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کو پھر ایک جگہ رہنا پڑے ۔ اور اس صورت میں بری یادیں بیچ میں حائل نہ ہوں ۔ اس طرح بری اور ناخوش گوار یادیں 'یہ برے الفاظ یا طنز و تشنیع دوبارہ تعلقات قائم ہونے کی راہ میں حائل نہ ہوں ۔ یہ اسلام کا عظیم تادیبی سبق ہے کہ ایسے مشکل اور تلخ حالات میں بھی انسان کو شریفانہ طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے ۔

ہاں اب جدائی ہو یا رجوع دونوں حالات میں شہادت کا قیام ضروری ہے ۔ دو عادل گواہ اس پر قائم ہوں تاکہ شک کسی معاملے میں نہ ہو کہ لوگوں کو طلاق کے بارے میں تو معلوم ہو اور رجوع کرنے کے بارے میں معلوم نہ ہو ۔ لوگوں میں شکوک پھیل جائیں اور لوگ باتیں بنائیں کہ فلاں کی بیوی تو مطلقہ ہے ۔ جبکہ اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ میاں بیوی کے متعلق لوگوں کے دل بھی صاف ہوں اور ان کی زبانیں بھی صاف ہوں ۔ فقہاء کی اکثریت کا خیال ہے کہ رجوع یا فراق کے لیے شہادت کا قیام ضروری نہیں ۔ بعض فقہاء اسے ضروری خیال کرتے ہیں لیکن دونوں کا خیال یہی ہے کہ شہادت ضرور قائم کی جائے تاکہ بوقت ضرورت کام آئے ۔ اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقعہ نہ ملے ۔ چنانچہ اس بیان کے بعد متعدد ہدایات دی جاتی ہیں اور یاد دہانیاں کرائی جاتی ہیں :

وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (۶۵ : ۲) "اور شہادت قائم کرو اللہ کے لیے" ۔ کیونکہ یہ ایک اہم معاملہ ہے ۔ اور اس میں اللہ کے لیے شہادت دینا گواہ پر لازم ہے ۔ اللہ اس کے قیام کا حکم دیتا ہے ۔ وہی اس کی ادائیگی کا بھی حکم دیتا ہے ۔ اور اس پر اجر بھی وہ دے گا ۔ اس میں معاملہ خدا کے ساتھ ہے 'نہ خاوند کے ساتھ 'نہ بیوی کے ساتھ' اور نہ لوگوں کے ساتھ ہے ۔

ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (۶۵ : ۲) "یہ باتیں ہیں جن کی تم کو

نصیحت کی جاتی ہے ' ہراس شخص کو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو"۔ ان آیات کے مخاطب مومنین تھے اور وہ سب کے سب اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے تھے ۔ اللہ ان کو کہتا ہے کہ یہ بہت ہی اہم معاملات ہیں ۔ اگر انہوں نے سچے دل سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا ہے تو پھر انہیں ان احکام الٰہی کا احترام کرنا چاہئے ۔ یہ ان کے ایمان کے لیے معیار تصور ہو گا اور دعوائے ایمان کا یہ پیمانہ ہو گا۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّه مَخْرَجًا (۲) وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (۶۵ : ۳)

"اور جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر کا اسے گمان بھی نہ جاتا ہو"۔ وہ دنیا اور آخرت کی تنگیوں سے انہیں نکال دے گا۔ اور رزق ایسے ذرائع سے اسے دے گا جدھر کا اسے گمان بھی نہ ہو گا۔ یہ ایک عام فیصلہ اور دائمی حقیقت ہے ۔ لیکن یہاں ان اصولوں کو احکام طلاق پر منطبق کیا جاتا ہے ۔ اشارہ یہ ہے کہ ان احکام پر پورا پورا عمل کرو۔ خدا خوفی ایک ایسا ضابطہ ہے جو ایسے معاملات میں سب سے زیادہ کارگر ہے ۔ خوف خدا ہی انسان کے لیے ایک اچھا نگراں ہے ورنہ قانونی ضوابط میں سے لوگ اپنے لیے راہیں نکال لیتے ہیں صرف تقویٰ ہی انسان کو صحیح عمل پر گامزن کر سکتا ہے ۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُه اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِه (۶۵ : ۳) "جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لیے وہ کافی ہے اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے"۔ اس معاملے میں سازشوں کی بڑی گنجائش ہوتی ہے ' اور بعض اوقات سازش کا مقابلہ کرنے کے لیے سازش کرنی پڑتی ہے ' یہاں کہا جاتا ہے کہ ایسی سازشیں نہ کرو ' اللہ پر بھروسہ کرو ' اور جو لوگ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں وہ ان کے لیے کافی ہوتا ہے ۔ اللہ اپنے کام کر کے رہتا ہے ' وہ جو فیصلے کر چکا ہے وہ واقع ہو کر رہتے ہیں ۔ لہٰذا اللہ اور اس کے فیصلوں پر بھروسہ کرنا ' جبکہ وہ بڑی قوت ہے اور جو چاہتا ہے ' کرتا ہے ۔ کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے ۔

یہ آیت عام ہے ۔ مقصد یہ ہے کہ دلوں کے اندر ایمان اور بھروسے کی صحیح کیفیت پیدا کی جائے ۔ اللہ کے ارادے اور اللہ کی تقدیر کے حوالے سے ۔ لیکن یہاں چونکہ یہ عام بات طلاق کے حوالے سے آئی ہے تو اس کا یہاں خاص طلاق کی طرف بھی اشارہ ہے ' کیونکہ یہ بھی اللہ کے فیصلوں میں سے ایک فیصلہ ہے ۔

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۶۵ : ۳) "اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے"۔ ہر چیز اس کی مقدر ہے ' اس کے زیر نگین ہے ' ہر واقعہ کی ایک جگہ ' ایک مقام ہے ۔ اس کے حالات ' اس کے اسباب اور نتائج اس کے پیدا کردہ ہوتے ہیں ۔ کوئی چیز از خود وجود میں نہیں آتی ۔ نہ یہ معاملات یونہی چلتے ہیں جس طرح کوئی چلائے ۔ یہ پوری کائنات ' نفس انسانی اور اس کی زندگی کے تمام واقعات ' اسی عظیم حقیقت کے نتیجے میں نمودار ہوتے ہیں یعنی مطابق تقدیر الٰہی ۔ (اس پر ہم نے آیت

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَه تَقْدِيرًا کے ضمن میں تفصیل سے بات کی ہے دیکھئے سورہ الفرقان:۲) یہاں مقصد

یہ ہے کہ یہ طلاق اور یہ رجوع، عدت، شہادت، ادائیگی شہادت وغیرہ سب احکام اللہ کے ہاں مقدر ہیں۔ اور یہ اس طرح ہوتے چلے جاتے ہیں جس طرح کائنات میں سنت الہیہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح انسان ان معاملات کو یوں سمجھتا ہے جس طرح اللہ کے ہاں فیصلے ہوتے ہیں۔

---ooo---

وَالّٰٓـِٔیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔیْ لَمْ یَحِضْنَ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا (۴) ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗ اِلَیْكُمْ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یُكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَ یُعْظِمْ لَهٗ اَجْرًا (۵) (۶۵ : ۴ تا ۵) "اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں ان کے معاملہ میں اگر تم لوگوں کو کوئی شک لاحق ہے تو (تمہیں معلوم ہو کہ) ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اور یہی حکم ان کا ہے جنہیں ابھی حیض نہ آیا ہو۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت کی حد یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔ جو شخص اللہ سے ڈرے اس کے معاملہ میں وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے یہ اللہ کا حکم ہے۔ جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا"۔

ان آیات میں ان عورتوں کی مدت عدت کی تحدید کی گئی ہے جن کو حیض نہیں آتا اور وہ حاملہ بھی نہیں ہیں۔ یعنی وہ عورتیں جن کو حیض آنا بند ہو گیا ہو، یا ان کو ایام بیماری کی وجہ سے یا صغر سنی کی وجہ سے آتے ہی نہ ہوں۔ کیونکہ اس سے قبل سورہ بقرہ میں عدت کی جو مدت بتائی گئی تھی وہ ان عورتوں کے لیے تھی جن کو حیض آتا ہو۔ چاہے لفظ قروء سے مراد تین ایام ماہواری لیے جائیں یا تین ایام فراغت لی جائے۔ یہ فقہی اختلاف ہے۔ رہی وہ عورتیں جن کے ایام آنا بند ہو گئے ہوں یا آتے ہی نہ ہوں یا شروع ہی نہ ہوئے ہوں تو ان کا معاملہ مجمل تھا کہ وہ کس طرح عدت گزاریں۔ چنانچہ یہ آیات نازل ہوئیں کہ شک کو دور کر کے حکم کو منفصل کر دیں۔ ان کے لیے تین مہینے کی مدت مقرر ہے تاکہ ان کی مدت ایام ماہواری کے ساتھ ایک جیسی ہو جائے۔ رہی وہ عورتیں جو حاملہ ہیں تو ان کی مدت وضع حمل ہے۔ طلاق کے بعد یہ مدت طویل ہو یا مختصر، اگرچہ نفاس سے طہارت کے لیے چالیس ایام کی مدت ہے۔ لیکن عدت کو اس لیے مقرر کیا گیا تھا کہ یہ دیکھا جائے کہ عورت کے ہاں بچہ تو نہیں ہے۔ اب حاملہ مطلقہ تو وضع حمل کے ساتھ ہی خاوند سے جدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس کے بعد انتظار کی ضرورت نہیں ہے اور وضع حمل کے بعد اس کے ساتھ رجوع نہیں ہو سکتا، صرف نیا نکاح ہی ہو سکتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک میزان مقرر کر دیا ہے لہٰذا ہر حکم کے پیچھے حکمت ہے۔

یہ تو تھا حکم، اب نصیحت، عبرت اور حکمتیں۔

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا (۶۵ : ۴) "جو شخص اللہ سے ڈرے اس کے معاملہ میں

وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے"۔ انسان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ معاملات میں اس کے ساتھ نرمی ہو۔ اور یہ بہت بڑا انعام ہے کہ اللہ اپنے امور میں سے کچھ میں لوگوں کے لیے سہولت پیدا کر دے۔ یوں ان کو کوئی مشکل 'کوئی عذاب' اذیت اور تنگی اور مشقت نہ ہو۔ اور وہ اپنے اندازے اور اپنے شعور کے مطابق سہولت محسوس کرے۔ حرکت و عمل میں معاملات کو آسان پاتا ہو۔ کام کرنے اور اس کے نتائج حاصل کرنے میں وہ اس کو آسان پائے اور وہ ایسی ہی حالت میں رہے اور اللہ کے ساتھ اس کی ملاقات ہو جائے۔ اور یہ طلاق بھی ان معاملات میں سے ہے جن میں اللہ نے سہولت پیدا کی ہے۔ (عیسائیت اور ہندو مذہب میں طلاق تھی ہی نہیں)۔

ذٰلِكَ أَمْرُ اللَّهِ أَنزَلَهُ إِلَيْكُمْ (٦٥ : ٥) "یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے"۔ یہ ایک دوسرا احساس ہے۔ متنبہ کیا جاتا ہے کہ ذرا سنجیدہ ہو جاؤ۔ یہ حکم اللہ کا ہے۔ یہ اللہ نے اتارا ہے ان لوگوں پر جو مومن ہیں۔ لہٰذا اس کی تعمیل تقاضائے ایمان ہے۔ اور اس حکم کی تعمیل کا تعلق اللہ سے ہے۔

دوبارہ لوگوں کو خدا خوفی کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جس پر اس سورت میں بہت زور دیا گیا ہے حالانکہ یہ احکام کی سورت ہے۔

وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُعْظِمْ لَهُ أَجْرًا (٦٥ : ٥) "اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کی برائیوں کو اس سے دور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا"۔ پہلی بات یہ تھی کہ اللہ سہولیات پیدا کر دے گا اور اب یہ کہ اس کے گناہ معاف ہوں گے اور اجر زیادہ ہو گا۔ چنانچہ یہ دو طرفہ فیض ہے اور انسان پر اثر انداز ہونے والا فائدہ ہے۔ یہ عام حکم ہے اور طلاق اور تمام دوسری امور پر منطبق ہونے والا امر ہے لیکن یہاں اس کا سایہ طلاق کے معاملات پر ڈالنا مقصود ہے تاکہ لوگ اللہ کی نگرانی کے شعور سے سرشار ہوں اور اللہ کے فضل کا احساس کریں کہ اگر کوئی کام انہیں مشکل بھی نظر آئے تو اللہ اس کو آسان بنا دے گا اور اس میں اگر کوئی کوتاہی ہو گئی تو مغفرت کر دے گا۔

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ
وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ ۚ وَإِن كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنفِقُوا
عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۖ وَأْتَمِرُوا
بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ ۖ وَإِن تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ ﴿٦﴾ لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن
سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا
إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ﴿٧﴾ وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ عَتَتْ ع ۷
١٧

عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸﴾ فَذَاقَتْ
وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ﴿۹﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚۛ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚۛ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ﴿۱۰﴾ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴿۱۱﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ
خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا ۲
اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾ ع ۵
۱۸

”ان کو (زمانہ عدت میں) اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو‘ جیسی کچھ بھی جگہ تمہیں میسر ہو اور انہیں تنگ کرنے کے لیے ان کو نہ ستاؤ۔ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک ان کا وضع حمل نہ ہو جائے۔ پھر اگر وہ تمہارے لیے (بچے کو) دودھ پلائیں تو ان کی اجرت انہیں دو‘ اور بھلے طریقے سے (اجرت کا معاملہ) باہمی گفت و شنید سے طے کر لو۔ لیکن اگر تم نے (اجرت طے کرنے میں) ایک دوسرے کو تنگ کیا تو بچے کو کوئی اور عورت دودھ پلالے گی۔ خوشحال آدمی اپنی خوشحالی کے مطابق نفقہ دے‘ اور جس کو رزق کم دیا گیا ہو وہ اسی مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اس سے زیادہ کا وہ اسے مکلف نہیں کرتا۔ بعید نہیں کہ اللہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرما دے۔ کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی۔ انہوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور ان کا انجام کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے‘ اللہ نے (آخرت میں) ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ پس اللہ سے ڈرو۔ اے صاحب عقل لوگو‘ جو ایمان لائے ہو۔ اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کر دی ہے‘ ایک ایسا رسول جو تم کو اللہ کی صاف صاف ہدایت دینے والی آیات سناتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے‘ اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ لوگ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ نے ایسے شخص کے لیے بہترین رزق رکھا ہے۔ اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے۔ (یہ بات

تمہیں اس لیے بتائی جا رہی ہے) تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے 'اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے"۔

یہ آخری بیان ہے جس میں گھروں میں رہائش کے مسئلے کو لیا گیا ہے اور عدت کے دوران نفقہ کے مسئلہ کو لیا گیا ہے جو بھی عدت کی مدت قرار پائے ۔ مسئلہ یہ ہے کہ جس قسم کی رہائش بھی ہو' خاوند کو چاہئے کہ وہ بیوی کو فراہم کرے ۔جس طرح کی رہائش میں وہ خود رہتا ہے اور جس قدر وہ اپنی مالی پوزیشن کے مطابق فراہم کر سکتا ہے ۔ باہم برتاؤ میں نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ ہو۔ نہ مکان میں تنگی کی جائے ' نہ عزت میں کمی کی جائے ' اور نہ دوسرے معاملات میں مثلاً گفتگو وغیرہ میں ۔حاملہ عورتوں کے نفقے کو مخصوص طور پر ذکر کیا گیا حالانکہ ہر قسم کی عدت گزارنے والی عورتوں کے لیے نفقہ واجب ہے ۔کیونکہ حمل کی مدت بعض اوقات طویل ہو جاتی ہے اور یہ خیال ہو سکتا ہے کہ تین مہینے ہی نفقہ واجب ہے یا حمل اگر طلاق کے بعد صرف مختصر ترین وقت وضع ہو جائے تو پھر یہ وہم ہو سکتا ہے کہ شاید زیادہ مدت کے لیے نفقہ دینا ہو گا۔ لہٰذا اس کا تعین کر دیا گیا یعنی جب تک قانونی مدت عدت ختم نہیں ہو جاتی خواہ مختصر ہو یا طویل ۔

اس کے بعد دودھ پلانے کے مسئلہ کی تفصیلات دی گئیں ۔دودھ پلانا بغیر معاوضہ کے ماں کی ذمہ داری نہیں قرار دی گئی ۔ جب تک وہ دونوں کے مشترکہ بچے کو دودھ پلا رہی ہے تو اس کا حق ہے کہ اسے اس خدمت کا معاوضہ ملے کہ وہ زندہ رہ سکے اور بچے کے لیے دودھ بھی جاری ہو۔ یہ ہیں اسلامی نظام قانون کی وہ رعائتیں جو ماں کو دی گئیں ۔ ان رعایتوں کے ساتھ دونوں کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ وہ اس بچے کے معاملات کو باہم مشورہ سے طے کریں ۔اور بچے کی مصلحت کو پیش نظر رکھیں کہ وہ دونوں کے درمیان ایک امانت ہے ۔ یہ نہ ہو کہ ان دونوں کی مشترکہ زندگی کی ناکامی اس بچے کے لیے مصیبت بن جائے ۔جس کا کوئی قصور نہیں ہے ۔

یہ ہے وہ حسن سلوک جس کی طرف دونوں کو دعوت دی جاتی ہے ۔ اگر انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا اور رضاعت اور اس کے اجر کے بارے میں ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق نہ ہو سکا تو بچے کو تو بہرحال دودھ پلانا ہے 'کوئی اور پلائے گی ۔

فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ (٦٥ : ٦) "تو بچے کو کوئی اور عورت دودھ پلائے گی"۔ نہ ماں کا اعتراض ہو گا اور نہ بچے کو دودھ سے محروم کر کے مار دیا جائے گا کیونکہ ان کی مشترکہ زندگی تحلیل ہوئی اور پھر انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ سختی کی ' بچے کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔

اس کے بعد نفقہ کے اصول کا تعین کر دیا جاتا ہے ۔ اس میں ایک دوسرے کو سہولت دینا ہے ' تعاون اور عدل و احسان سے کام لینا ہے ۔ اس میں سختی اور ہٹ دھرمی جائز نہیں ہے ۔ اگر کسی شخص کو اللہ نے وسعت دی ہے تو وہ وسعت کے مطابق خرچ کرے 'سکونت اور معیشت دونوں میں اور رضاعت کی اجرت میں اور جس کی مالی حالت اچھی نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے کہ اس سے محدود اجرت لی جائے ۔کیونکہ اللہ کسی سے اسی قدر مطالبہ کرتا ہے جس قدر اسے اللہ نے دیا ہے اور کوئی شخص بھی اپنے مال وسائل سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتا۔کیونکہ دولت تو وہی ہے جو اللہ کسی کو دیتا ہے ۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا (٦٥ : ٧) "اللہ نے جس کو جتنا دیا ہے اس سے زیادہ کا وہ اسے مکلف نہیں کرتا"۔

رضاعت کے دوران دونوں کو یہ امید دلائی جاتی ہے 'کہ اللہ ہی سے اچھے حالات کی امید اور خواہش رکھیں :

سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا (٦٥ : ٧) "بعید نہیں کہ اللہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرما دے"۔ تنگی کے بعد آسانی اور مشکلات کے بعد فراخی یہ سب اللہ کا کام ہے۔ اس لیے ان دونوں کو چاہئے کہ وہ اللہ ہی کی طرف متوجہ ہوں۔ اللہ ہی سے امیدیں وابستہ کریں' وہی داتا ہے' وہی کشادگی عطا کرنے والا ہے اور تنگی و کشادگی' مشکلات اور سہولیات 'سختی اور نرمی سب اسی کے اختیار میں ہے۔

یہاں تک طلاق کے تمام احکام اور طلاق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اثرات کے قانونی انتظامات بیان کیے اور تمام آثار کے بارے میں واضح حل بتایا گیا۔ اور اس منہدم گھرانے کا تمام ملبہ' اس کے غبار تک کو ٹھکانے لگا دیا گیا تاکہ دل غبار آلود نہ ہوں' دلوں پ [illegible] کدورتیں دور ہو جائیں' اور زوجین ماضی کو بھلا کر از سرنو نئی زندگی شروع کر دیں' سابقہ عداوت کو پوری طرح مٹا دیا جائے' دلوں کے اندر جو قلق تھا' اسے ختم کر دیا تاکہ کوئی اضطراب از سرنو پیدا نہ ہو۔ دلوں سے وسوسے اور گراوٹیں دور کر دیں۔ اور فریقین کو اس قابل بنا دیا کہ ایک دوسرے کے ساتھ از سرنو سماجی تعلقات قائم کر سکیں۔ خاوند اگر اپنی مطلقہ بیوی یا خود اپنے بچے پر کچھ فراخدلانہ خرچ کرتا ہے تو اسے بتا دیا گیا کہ اس خرچ کی وجہ سے وہ فقیر نہ ہو گا اور بیوی کو بھی کہا گیا کہ وہ پھر اگر بچے کو دودھ پلانے کا کوئی کم معاوضہ لے تو اس سے وہ زیادہ امیر نہ ہو گی' لہٰذا اسے بھی چاہئے کہ اپنے سابق شوہر اور خود اپنے بچے کے معاملے میں کوئی سخت رویہ اختیار نہ کرے۔ اللہ ہی ہے جو مشکلات کے بعد کشادگی دینے والا ہے۔ دنیا کے رزق سے آخرت کا رزق زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

طلاق کے نتیجے میں جو کدورتیں اور بدمزگیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان کے بارے یہ حکم دیا گیا کہ ان کو بھلا دیا جائے اور اللہ سے بہتر مستقبل کی امید رکھی جائے جو کچھ ہو چکا وہ مقدر تھا۔ اب آئندہ ایک دوسرے کے ساتھ معروف انداز میں معاملہ کیا جائے اور خدا کا خوف رکھا جائے۔

یہ مکمل علاج ہے' یہ موثر نصائح' یہ مکرر' سہ کرر تاکیدات کہ معروف کے ساتھ معاملہ کرو سب کی سب اس ناخوشگوار واقعہ کے اثرات کو دور کرنے کی بہترین ضمانت ہیں۔ ضمیر کے احساس اور خدا خوفی کے سوا کوئی اور چیز مسلمانوں کے درمیان اصلاح ذات البین کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ اگر خدا خوفی کو ہٹا کر فریقین کے درمیان صرف قانونی جنگ چھڑ جائے تو اس کا انجام تلخی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ بعض احکام اس قدر نرم ہیں کہ خود ان سے تلخیاں دور ہو جاتی ہیں۔ جن کو کسی قانون کے ذریعہ گنوایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اس اخلاقی حکم کے ذریعہ بتایا گیا کہ عورتوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے۔ اس سلسلے میں خدا کا خوف اختیار کیا جائے۔ اللہ ہی ہے جو ہر خفیہ اور ظاہری چیز کو جاننے والا ہے۔ اور متقین کو دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ اجر دینے والا ہے۔ خصوصاً رزق کا معاملہ تو ہے ہی اللہ کے ہاتھ میں جس کا اس سورت میں بار بار تذکرہ ہوا۔ کیونکہ رزق اور مفاد ہی وہ اصل بات ہے جس پر تنازعہ ہوتا ہے' اور طلاق کے بعد زیادہ تر جھگڑا مالی معاملات و مفادات پر ہوتا ہے۔

---ooo---

طلاق کے معاملات کے اختتام کے بعد اب پورے دین کے معاملہ میں ایک تاریخی رویہ کو ذکر کیا جاتا ہے 'کہ اگر تم

طلاق کے قوانین کی خلاف ورزی کرو گے تو تاریخ میں کئی اقوام نے 'رسولوں کی رسالت اور ان کے پیش کردہ دین سے منہ موڑا لیکن ان کا انجام اچھا نہ ہوا۔اب بھی یہ دین اور یہ شریعت اس صورت کی شکل میں تمہیں دیا جا رہا ہے جو ایک نعمت ہے 'اس کی قدر کرو۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا (٨) فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا (٩) اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا (١٠) رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا (١١) (٦٥: ٨ تا ١١) "کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی۔انہوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور ان کا انجام کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے' اللہ نے (آخرت میں) ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔پس اللہ سے ڈرو۔اے صاحب عقل لوگو' جو ایمان لائے ہو۔اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کر دی ہے' ایک ایسا رسول جو تم کو اللہ کی صاف صاف ہدایت دینے والی آیات سناتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے' اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔یہ لوگ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔اللہ نے ایسے شخص کے لیے بہترین رزق رکھا ہے"۔

یہ ایک طویل ڈراوا ہے' جس کے تفصیلی مناظر ہیں۔پھر جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کو ایمان کی روشنی نصیب ہوئی ہے ان کو بتایا گیا کہ یہ تم پر اللہ کا بہت بڑا کرم ہے اور اس کا بدلہ تمہیں قیامت میں ملے گا اور قیامت کا بدلہ ہی دراصل رزق حسن ہے۔

تاریخ میں جن لوگوں نے رسالت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا اور نافرمانی کی ہے تو اللہ کی یہ سنت رہی ہے کہ نافرمانوں کو اس نے پکڑا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا (٦٥: ٨) "کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی"۔ان کے پکڑ کی تفصیل اور سخت حساب اور سخت عذاب اور برے انجام کی تصویر یہ تھی۔

فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا (۶۵ : ۹) "انہوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور ان کا انجام کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے" اللہ نے (آخرت میں) ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور اس عذاب کی تصویر یہ تھی۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا (۶۵ : ۱۰) "اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔ اس عذاب اور برے انجام کی یہ تفصیلات اس لیے دی ہیں کہ اللہ کے احکام کی نافرمانی کی سزا کا خوف دیر تک انسانی اعصاب پر رہے۔ یہ قرآن کا انداز ہے کہ وہ عذاب الہی کے مناظر کو نہایت ہی مفصل اور طوالت سے بیان کرتا ہے۔

اس ڈراوے پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ باری باری نافرمان اقوام کو پکڑا گیا اور اس پکڑ کا ذکر یہاں احکام و قوانین کی نافرمانی کے ضمن میں آرہا ہے۔ گویا طلاق کے احکام قوانین کا تعلق بھی سنت الہیہ سے ہے۔ اس سے یہ تاثر دینا مطلوب ہے کہ قوانین طلاق محض ایک سول لاء ہی نہیں بلکہ ان کا تعلق امت مسلمہ کے اجتماعی نظام سے ہے۔ اس سلسلے میں پوری امت بھی مسئول ہوگی اور اگر ان قوانین کی خلاف ورزی ہوئی تو پوری امت پر عذاب الہی آئے گا۔ احکام طلاق اور اسلامی نظام کے دوسرے احکام کی مخالفت کے انجام سے پوری امت مسئول ہے۔ کیونکہ اسلامی نظام اور اسلامی منہاج کے چلانے کی ذمہ داری اجتماعی ہے۔ صرف وہ لوگ ہی عذاب الہی کے مستحق نہ ہوں گے جو خلاف ورزی کرتے ہیں بلکہ پورا گاؤں اور پوری امت مسئول ہوگی، جو اپنے نظام زندگی کی تنظیم میں خلاف ورزی کو برداشت کرتی ہے۔ یہ دین اسی لیے آیا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اسے نافذ کیا جائے۔ یہ پوری زندگی پر حاوی ہو۔ اس طرح یہاں پوری امت نافرمان قرار دی گئی، اگر اسلامی نظام کے قیام کی مسئولیت شخصی ہوتی تو پوری امت کو ہلاک نہ کیا جاتا۔

یہ بستیاں نافرمان قرار دی گئیں اور انہوں نے وبال کو چکھا۔ اور آخر کار خسارے میں مبتلا ہوئیں۔ اور یہ سزا ان کو اسی دنیا میں دی گئی۔ بستیوں، اقوام اور ملل کو یہ سزا دی گئی جنہوں نے اسلامی منہاج سے انکار کیا ہے۔ ہم بھی شہادت دیتے ہیں اور ہمارے اسلاف بھی شہادت دیتے ہیں کہ احکام نکاح و طلاق کی نافرمانی کرنے والی اقوام کو عذاب دیا گیا۔ وہ فساد، انتشار، غربت، قحط، ظلم، بے چینی اور نہایت ہی بدامنی اور ڈر کی زندگی گزارتی رہیں جس میں کوئی اطمینان اور سکون نہ تھا اور آج بھی ہم اس کرۂ ارض پر ایسی کئی اقوام کو دیکھ رہے ہیں۔

یہ سزا اس کے علاوہ ہے جو ان نافرمانوں کے انتظار میں ہے جنہوں نے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کی اور جنہوں نے اسلامی نظام سے بغاوت کی۔ اللہ فرماتا ہے:

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا (۶۵ : ۱۰) "اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے"۔ اور اللہ بہت ہی سچا ہے۔

یہ دین ایک منہاج حیات ہے اور اس کا ایک اجتماعی نظام زندگی ہے، جس کی تفصیلات ہم نے سورہ صف میں دی ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ ایک ایسی جماعت تشکیل دے جس کا ایک نظام ہو۔ اس جماعت اور سوسائٹی کی زندگی کو بدل کر رکھ دے لہٰذا یہ پوری جماعت اس دین کے بارے میں مسئول ہوگی۔ اور یہ جماعت ان احکام کی خلاف ورزی نہ کرے گی کہ اس پر یہ دھمکی صادق آجائے، جو امم سابقہ کو دی گئی، جنہوں نے امر الٰہی سے نافرمانی کی۔

اس ڈراوے اور اس کے طویل مناظر میں عقلمند لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے 'جو ایمان لاتے ہیں' اور ان کی عقلمندی کا ثبوت ہی یہ ہے کہ وہ ایمان لے آئے کہ اس اللہ سے ڈرو جس نے تم پر یہ یاددہانی نازل کی ہے۔

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا (۶۵ : ۱۰) "اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کی ہے"۔ اور یہ ذکر مشخص تمہارے پاس موجود ہے۔ رسول مجسمہ ذکر ہیں۔ پوری ذات رسول کو نحوی اعتبار سے الذکر کا بدل کر کے لایا گیا ہے۔

رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ (۶۵ : ۱۱) "ایک رسول جو تم کو اللہ کی صاف صاف ہدایت دینے والی آیات سناتا ہے"۔

یہ نہایت ہی گہرا قابل توجہ نکتہ ہے اور اس کے اوپر کئی دلائل ہیں۔ یہ ذکر جو رسول لوگوں تک پہنچانے کے لیے لائے ہیں وہ رسول اللہ کی شخصیت کے اندر سے ہو کر ان تک پہنچا ہے۔ آپ صادق و امین تھے اور آپ نے پورا ذکر ان تک پہنچا دیا گویا یہ ذکر خدا سے براہ راست ان تک پہنچ گیا۔ اور رسول کی ذات نے اس کا کوئی حصہ چھپایا نہیں تھا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ آیت ذات رسول کو ذکر بتاتی ہے کہ رسول کی ذات پوری کی پوری ذکر ہو گی۔ رسول گویا مجسمہ ذکر ہیں اور وہ زندہ قرآن ہیں۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ۔

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ "آپ کے اخلاق قرآن تھے"۔ آپ کے دل میں قرآن تھا اور آپ عملی زندگی میں قرآن کو پیش کرتے تھے۔

ذکر کے علاوہ اہل ایمان کو نور' ہدایت' صالحیت اور جنتوں کی نعمتوں کا وعدہ بھی کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ جنتوں میں جو رزق ملیں گے۔ وہ دنیا کے ارزاق کے مقابلے میں بہت ہی مکرم رزق ہیں 'بہت ہی احسن ہیں۔

ایک بار پھر رزق کی بات ہوتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ دنیا کا رزق تو ہر کسی کو ملتا ہے۔ اصل رزق تو رزق آخرت ہے' جبکہ مومنین کے لیے دنیا میں بھی رزق حسن کا وعدہ ہے۔

---ооо---

اور آخر میں پھر پوری کائنات کا زمزمہ جو بہت ہی محیر العقول حد تک وسیع ہے۔ یوں اس پوری سورت کے موضوع کو یعنی قوانین طلاق کو' اللہ کے نظام قضا و قدر اور اس وسیع کائنات میں اللہ کے قانون قدرت کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْا

اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (۶۵ : ۱۲) "اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے۔ (یہ بات تمہیں اس لیے بتائی جا رہی ہے) تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے 'اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے"۔

سات آسمانوں کے بارے میں ہمیں ابھی تک پورا علم حاصل نہیں ہوا ہے کہ ان کی دوریاں اور فاصلے کتنے ہیں۔ اسی طرح سات زمینوں کا بھی ہمیں علم نہیں ہے۔ یہ زمین جس کے اوپر ہم رہتے ہیں ان میں سے ایک ہو گی اور باقی اللہ

کے علم میں ہوں گی اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ یہ زمین آسمانوں ہی کے جنس سے ہے ۔ اپنی ترکیب اور اپنے خصائص کے اعتبار سی 'ان آیات کو ابھی ہم اپنے سائنسی معلومات پر منطبق کرنا نہیں چاہتے ۔ ہمارے علم نے ابھی تک اس کائنات کے بہت ہی تھوڑے حصے کا احاطہ کیا ہے ۔ اس لیے یہ تحقیق کے طور پر نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کا مفہوم یہ ہے اور انسان یہ بات اس وقت تک نہیں کہہ سکتا جب تک اسے اس کائنات کا تمام علم حاصل نہ ہو جائے ۔ لہٰذا ہم اس آیت کے نفسیاتی پہلو ہی پر اکتفاء کرتے ہیں کہ اللہ کے احکام پوری کائنات پر حاوی ہیں ۔

اس پوری کائنات کی طرف یہ اشارہ ۔

سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (۶۵ : ۱۲) "سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند" ۔ جب انسان اس پر غور کرتا ہے تو اس کے سامنے اس کائنات کا ہولناک اور محیرالعقول وسیع منظر آ جاتا ہے ۔ اللہ کی مملکت کی وسعت 'اللہ کی قدرت کے عظیم مشاہد 'جن کے مقابلے میں یہ زمین ' رائی کے دانے جیسی حقیر نظر آتی ہے 'اور اس کے اندر جو مخلوق ہے ۔ ظاہر ہے کہ وہ اس سے حقیر تر ہے ۔ اور اس کے حادثات پھر مزید حقیر تر ہیں ' اللہ کی کائنات میں اگر پوری زمین ایک حقیر سی گیند ہے تو اس کے اندر چند ٹکوں کی کیا حقیقت ہے جو ایک خاوند خرچ کرتا ہے اور ایک بیوی وصول کرتی ہے ؟

اس ہولناک طور پر وسیع اور محیرالعقول طور پر عظیم کائنات کے اندر اللہ کے احکام و اوامر چلتے ہیں نکاح و طلاق تو اللہ کے اوامر کا ایک حصہ ہیں ۔ خود انسانی علم کے زاویہ سے بھی اللہ کے احکام جو اس کائنات میں نازل ہوتے ہیں ' خود انسانی تصورات کے پیمانوں سے بھی بہت عظیم ہیں ۔ اللہ کے کسی حکم کی مخالفت گویا پوری کائنات کی مخالفت کو دعوت دینا ہے ۔ زمین و آسمان کی مخالفت کو دعوت دینا اور یہ مخالفت بہت ہی جسارت ہے ۔ کوئی عقلمند آدمی اس جسارت کا ارتکاب نہیں کر سکتا ۔ جبکہ رسول آ گیا ہے 'وہ کھلی آیات سنا رہا ہے اور لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لا رہا ہے ۔

زمین اور آسمان میں اللہ کے احکام کے نزول کا مطلب یہ ہے کہ قلب مومن میں یہ تصور بٹھایا جائے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔ لہٰذا وہ جو چاہتا ہے اسے کوئی چیز اس سے عاجز نہیں کر سکتی ۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے ۔ اس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں ۔ ہر چیز اس کی بادشاہت میں ہے اور وہ دلوں کے راز بھی جانتا ہے ۔

اس بات کے یہاں دو پہلو ہیں : ایک یہ کہ جو اللہ یہاں عائلی احکام دے رہا ہے ' وہ وسیع علم رکھتا ہے ۔ اللہ تمام حالات ' تمام مصلحتوں اور انسان کی استعداد کی حدود سے واقف ہے ' لہٰذا لوگوں کو اللہ کے احکام سے سرمو سرتابی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ وہ علیم و محیط کا بنایا ہوا قانون ہے ۔

دوسرا یہ کہ یہ احکام اور ان پر تعمیل تمہارے دلوں اور تمہارے ضمیر پر چھوڑ دی گئی ہے اور تمہارے ضمیر اور شعور کا بھی اللہ کو علم ہے ۔ لہٰذا اپنے دل کی گہرائیوں سے ان احکام پر صدق دل کے ساتھ عمل کرو ' اللہ دنیا کے قوانین کے مقننین کی طرح نہیں ہے کہ جو جانتے نہیں ۔ وہ تو علیم بذات الصدور ہے ۔

اس آخری زمزمے اور وسعت علم الہی کے زمزمے پر اس سورت کا خاتمہ ہوتا ہے ۔ انسان سوچ کر ہی خائف ہو جاتا ہے اور اس کے سامنے سر جھکانے ' اطاعت کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہتا ۔ سبحان اللہ ' اللہ ہی تو دلوں کا خالق ہے ' وہ ان دلوں کی وادیوں کے نشیب و فراز سے ہی واقف ہے ۔

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ۔۔ ۲۸

سورۃ التحریم ۔ ٦٦

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۲

سورۃ التحریم ایک نظر میں

جب تقدیر الٰہی نے یہ فیصلہ کیا کہ رسالت محمدی کو آخری رسالت قرار دے اور نظام مصطفیٰ کو آخری نظام زندگی قرار دے ۔ اور اس نظام کے مطابق دنیا میں مسلمانوں کی زندگیوں کو چلا کر دکھا دے ۔ اور یہ کہ اس دین کو پوری انسانی زندگی کی سرگرمیوں پر حاوی کر دے اور ہر میدان تک وسیع کر دے ۔

جب تقدیر الٰہی نے یہ فیصلہ کر دیا تو اس نے اسلامی نظام زندگی کو یہ رنگ دیا ۔ اسے کامل ' جامع اور مکمل بنایا ' جسے انسان کی تمام ضروریات کے لیے کفیل بنایا ۔ اس نظام کو اللہ نے اس طرح بنایا ہے کہ یہ انسان کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا کر انہیں ہر پہلو سے گرمی دیتا ہے اور انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض کے طور پر اپنے فرائض اچھی طرح ادا کر سکے ۔ اور اپنے آپ کو ایک ایسی مخلوق ثابت کرے جسے اللہ نے مکرم بنایا اور اس کی تخلیق کے بعد اللہ نے اس کے اندر اپنی روح پھونکی ۔

چونکہ یہ آخری نظام تھا تو اللہ نے اس کی تشکیل یوں کی کہ وہ زندگی کی گاڑی کو آگے کی طرف بڑھاتا چلا جائے ' وہ پیداوار میں اضافہ کرے ' پاکیزگی کے ساتھ آگے کی طرف بڑھے ' اور یہ سب کام نہایت خوش اسلوبی سے بیک وقت ہوں ۔ اس نے یعنی اسی نظام نے انسان کی کسی بھی تعمیری صلاحیت کو معطل نہیں کیا ۔ اس نے کسی مفید صلاحیت کو دبانے کی سعی نہیں کی ۔ بلکہ اس نے صلاحیتوں کو نشاط بخشا ' خفیہ قوتوں کو جگایا ۔ لیکن اس نے آگے بڑھنے کی حرکت کو نہایت توازن کے ساتھ منظم کیا ۔ تاکہ وہ نہایت ہی باوقار افق تک بلند ہو ' یوں کہ اس دنیا میں انسان کو آخرت کی زندگی کے لیے تیار کرے اور اس فانی مخلوق کو باقی رہنے والے جہاں کے لیے تیار کرے ۔

یہ انتظام اللہ نے یوں کیا کہ اس نظام کے مظاہرے کے لیے اللہ نے ایک انسان رسول کریم کو بھیجا اور اس نے اس نظام پر عمل کر کے لوگوں کو سمجھایا ۔ چنانچہ اسلامی نظریہ حیات ' اپنے تمام خصائص کے ساتھ آپ کی زندگی میں مجسم کر کے چلتا پھرتا سمجھایا گیا ۔ اور رسول کریم کی زندگی کو اسلام کا ظہور ' مظاہرہ اور مشاہدہ قرار دیا گیا ۔ آپ ایک بشر تھے جس کی تمام قوتوں کو مکمل کر دیا گیا تھا ۔ آپ جسمانی لحاظ سے مکمل ' آپ کا جسمانی ڈھانچہ ' آپ کے حواس ' آپ کا شعور ' آپ کا ذوق نہایت کامل اور سلیم تھے ۔ آپ کے جذبات ' آپ کی طبیعت ' آپ کے احساسات ' آپ کا ذوق جمال ' سب کے سب کامل اور مکمل تھے ۔ آپ کی عقل بہت برتر تھی ۔ آپ کی فکر بہت ہی وسیع تھی ' آپ کے ادراک کے آفاق بہت وسیع تھے ۔ آپ کی قوت ارادی ایسی تھی کہ آپ کو حالات پر مکمل کنٹرول ہوتا تھا ۔ ان صلاحیتوں سے برتر بات یہ تھی کہ آپ کی روح کو اشراق کلی حاصل تھا ۔ آپ کی ذات معراج کی صلاحیت رکھتی تھی ۔ آپ عالم بالا کی آواز سنتے تھے ' نور ربی کو دیکھ سکتے تھے ' اور اشکال و مظاہر سے صرف نظر کرتے ہوئے آپ کی روح کو روح کائنات سے اتصال حاصل تھا ۔ یہاں تک کہ شجر و حجر آپ پر سلام بھیجتے تھے ۔ ستون آپ کے لیے روتا تھا اور کانپ اٹھتا تھا اور یہ سب قوتیں آپ کی شخصیت

میں متوازن تھیں' جس طرح یہ کائنات متوازن ہے۔ اسی طرح آپ کی شخصیت متوازن تھی اور پھر یہ نظام جو آپ کو دیا گیا اور آپ نے مومنین کو دیا وہ بھی متوازن ہے۔

چونکہ اسلامی نظام زندگی کو آپ کی زندگی کی صورت میں عملی شکل دینا مقصود تھا تو آپ کی زندگی کو ایک کتاب مفتوح قرار دیا گیا تاکہ اسے تمام انسان پڑھ سکیں۔ اس میں یہ عقائد بھی موجود ہوں' ان کی واقعی اور عملی شکل بھی موجود ہو' چنانچہ آپ کی زندگی کا کوئی حصہ چھپا ہوا نہ تھا۔ نہ اس کا کوئی حصہ لپٹا ہوا دفتر تھا بلکہ آپ کی زندگی کے بعض واقعات کو قرآن نے پیش کیا اور ایسے واقعات کو بھی کھول کر پیش کیا جو بالعموم عام انسان بھی ان کو عوام کے سامنے پیش کرنا پسند نہیں کرتے۔ انسان کی وہ کمزوریاں جن پر انسان کو کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ ان کو بھی نہیں چھپایا گیا۔ یوں نظر آتا ہے کہ رسول اللہ کی زندگی کے بعض نہایت ہی خفیہ گوشوں کو بھی دست قدرت نے لوگوں پر ظاہر کر دیا۔

اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ کی زندگی میں پرائیویٹ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ آپ کی ساری زندگی دعوت کی زندگی تھی اور پبلک زندگی تھی۔ اس لیے اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ اسے چھپایا جائے' آپ کی زندگی ایک تربیتی منظر تھا۔ قابل عمل اور قابل تقلید زندگی تھی۔ اور اسلامی عقیدۂ حیات پر مبنی تھی تاکہ لوگ اسلام کو آپ کی شخصیت میں زندہ دیکھ سکیں۔ جس طرح آپ کی زبان سے اسلام کو سنتے تھے' اسلام کو آپ کے عمل میں دیکھتے بھی تھے۔ یہی تھی آپ کی غرض تخلیق اور یہی تھا آپ کا مقصد بعثت۔

آپ کے رفقاء نے آپ کی باتیں یاد کیں اور بعد کے لوگوں کے لیے نقل کیں۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔ ان لوگوں نے نہایت باریک ترین تفصیلات قلم بند کیں۔ یہاں تک کہ آپ کی زندگی کا کوئی چھوٹا بڑا واقعہ ان سے رہ نہ گیا۔ یہاں تک کہ آپ کی روز مرہ کی باتیں بھی جو انہوں نے یاد کیں ان کو بھی قلم بند کیا۔ اور یہ بھی اللہ کے نظام تقدیر میں لکھا ہوا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے تمام واقعات قلم بند ہوں۔ اور اسلامی نظریہ حیات کی ایک ایک بات عملی شکل میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پائی جاتی ہو۔ رسول اللہ کی زندگی کا یہ پہلو اس کے علاوہ تھے' جو قرآن نے قلم بند کیے۔

اس سورت کے آغاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کا ایک صفحہ قلم بند کیا گیا ہے۔ اس میں آپ کی ازواج مطہرات کے بعض انسانی تاثرات اور ان پر ردعمل کو بیان کیا گیا ہے۔ ان ازواج کے آپس کے تعلقات اور پھر آپ کے ساتھ ان کے تعلقات کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر ان واقعات اور ان کے اثرات ازواج مطہرات پر اور پھر امت پر بیان کیے گئے ہیں اور اس کے بعد وہ ہدایات اور رہنمائی امت کو دی گئی ہے جو واقعات کی شکل میں ہے۔

جن حالات میں یہ واقعات ہوئے' جس زمانے میں ہوئے' اس کی طرف اس سورت میں کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جو روایات آئی ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات زینب بنت جحش ؓ کے نکاح کے بعد پیش آئے۔

یہاں مناسب ہے کہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات اور آپ کی گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ باتیں بتا دیں۔ جن کی روشنی میں وہ واقعات اچھی طرح سمجھ میں آ جائیں' جو اس سورت میں لیے گئے ہیں۔ یہ واقعات ہم نے امام ابن جریر کی کتاب جوامع السیرۃ سے لیے ہیں۔ نیز سیرۃ ابن ہشام میں بھی یہ روایات موجود ہیں۔

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی زوجہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا تھیں۔ آپ کے ساتھ حضور ﷺ

کا نکاح اس وقت ہوا جب کی عمر ۲۵ سال تھی ۔ بعض روایات میں ۲۳ سال بھی آئی ہے ' جبکہ حضرت خدیجہ کی عمر چالیس یا اس سے بھی زیادہ تھی ۔ آپ ہجرت سے تین سال قبل فوت ہوگئیں ۔ حضور ﷺ نے ان کی زندگی میں کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کی ۔ جب وہ فوت ہوئیں تو ان کی عمر ۵۰ سال سے زیادہ تھی ۔

۲۔ حضرت خدیجہ ؓ کی وفات کے بعد آپ نے حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی کی ۔ کوئی ایسی روایت نہیں ہے کہ آپ بہت خوبصورت یا جوان تھیں ۔ یہ سکران ابن عمرو ابن عبدالشمس کی بیوہ تھیں ۔ یہ شخص قدماء مسلمین میں سے تھے ۔ یہ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گئے تھے ۔ جب یہ فوت ہوگئے تو ان کی بیوہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے نکاح کر لیا ۔

۳۔ اس کے بعد آپ ؐ نے حضرت عائشہ بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا سے شادی کی ۔ یہ چھوٹی تھیں ۔ اور ہجرت کے بعد آپ کی رخصتی ہوئی ۔ ان کے سوا آپ نے کسی کنواری عورت کے ساتھ شادی نہیں فرمائی ۔ ان کے ساتھ حضور ؐ کو بہت محبت تھی ۔ کہتے تھے : کہ رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی اور آپ کے نکاح میں وہ ۹ سال اور پانچ ماہ رہیں ۔ اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے ۔

۴۔ اس کے بعد آپ نے حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی کی ۔ یہ شادی بھی ہجرت کے بعد دو سال اور کچھ مہینوں کے بعد ہوئی ۔ یہ بیوہ تھیں ۔ حضرت عمر ؓ نے ان کے رشتے کے لیے حضرت ابوبکر ؓ ' حضرت علی ؓ اور حضرت عثمان ؓ سے کہا مگر کسی نے قبول نہ کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان سے اچھا رشتہ اسے مل جائے گا اور پھر خود ان کے ساتھ نکاح کر لیا ۔

۵۔ اس کے بعد آپ نے زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا ۔ ان کے پہلے خاوند عبیدہ ابن الحارث ابن عبدالمطلب تھے ۔ یہ بدر کے دن مارے گئے تھے ۔ یہ زینب رضی اللہ عنہا حضور اکرم ﷺ کی زندگی ہی میں فوت ہوگئی تھیں ۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ان کے پہلے خاوند عبداللہ ابن جحش اسدی تھے جو احد کی جنگ میں شہید ہوئے ۔ یہ روایات زیادہ قریب صحت نظر آتی ہے ۔

٦۔ اس کے بعد آپ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا ۔ آپ سے پہلے یہ ابو سلمہ کی بیوی تھیں ۔ یہ احد کی جنگ میں زخمی ہوگئے تھے اور یہ زخم بگڑتا گیا یہاں تک کہ وہ فوت ہوگئے ۔ حضور نے ان کی بیوہ کے ساتھ نکاح کر لیا اور ان کے تمام بچوں کو بھی اپنی پرورش میں لے لیا ۔

۷۔ آپ نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا ۔ پہلے آپ نے ان کا نکاح اپنے غلام اور متبنیٰ زید بن حارثہ سے کرایا ۔ ان دونوں کی باہم نہ بن سکی ۔ زید نے ان کو طلاق دے دی ۔ سورہ احزاب پارہ ۲۲ میں ہم نے ان کا قصہ بیان کر دیا ہے ۔ یہ بہت حسین و جمیل تھیں ۔ انہی کے بارے میں حضرت عائشہ ؓ یہ سوچتی تھیں کہ یہ میرے مقابلے میں زیادہ اہمیت اختیار کرلیں گی کیونکہ یہ حضور ﷺ کی پھوپھی زاد تھیں اور بہت ہی خوبصورت تھیں ۔

۸۔ اس کے بعد آپ نے حضرت جویریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا ۔ یہ شخص بنی مصطلق کے سردار تھے ۔ اور یہ نکاح ٦ ہجری کے وسط میں ہوا ۔ ابن اسحاق روایت کرتے ہیں : محمد ابن جعفر ابن زبیر سے ' وہ عروہ ابن زبیر سے ' وہ حضرت عائشہ سے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے بنی المصطلق کی قیدی عورتوں کو تقسیم کیا تو جویریہ بنت

الحارث ثابت ابن قیس ابن شماس کے حصے میں آئیں یا ان کے ایک چچا زاد کے حصے میں ۔ اس نے اس عورت کے ساتھ معاہدہ آزادی کر لیا ۔ یہ اس قدر میٹھی اور خوبصورت عورت تھی کہ اسے جو بھی دیکھتا فریفتہ ہو جاتا ۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور آپ سے اپنی آزادی کے سلسلے میں مالی اعانت طلب کی ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جونہی میں نے اسے اپنے کمرے کے دروازے کے پاس دیکھا میں نے اسے بہت ناپسند کیا ۔ میں نے معلوم کیا کہ حضور ﷺ اسے پسند کریں گے ۔ یہ آئی اور اس نے کہا رسول خدا کہ میں جویریہ بنت حارث ابن ابو ضرار ہوں جو قوم کا سردار ہے ' مجھ پر جو مصیبت آئی ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہے ۔ میں ثابت ابن قیس ابن شماس کے حصے میں آئی ہوں یا اس کے چچازاد کے حصے میں ۔ میں نے اس کے ساتھ مکاتبت کر لی ہے ۔ میں اس سلسلے میں آپ سے مالی لداد چاہتی ہوں ۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم اس سے بھی زیادہ اچھی بات پسند کرو گی ؟ تو اس نے کہا کہ رسول خدا وہ کیا چیز ہے ؟ کہا کہ "میں تمہاری مکاتبت کی پوری رقم ادا کر دوں اور تمہارے ساتھ نکاح کر لوں" ۔ تو اس نے کہا ہاں رسول خدا ﷺ میں نے یہ تجویز منظور کر لی ۔

۹ ۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا ۔ یہ ابو سفیان کی بیٹی تھیں اور حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی ۔ ان کے خاوند عبداللہ ابن جحش عیسائی ہو کر مرتد ہو گئے ۔ اور انھوں نے ام حبیبہ کو چھوڑ دیا ۔ حضور ﷺ نے ان کو پیغام نکاح دیا اور نجاشی نے حضور ﷺ کی طرف سے ان کو مہر دیا اور یہ حبشہ سے مدینہ کو آئی ۔

۱۰ ۔ فتح خیبر کے بعد آپ نے حضرت صفیہ ... ... بنت حی ابن اخطب رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا ۔ یہ بنو نضیر کا سردار تھا ۔ یہ کنانہ ابن ابو الحقیق کی بیوی تھیں اور یہ بھی یہودیوں کا ایک سردار تھا ۔ ابن اسحاق ان کے ساتھ نکاح کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اسے لایا گیا اور اس کے ساتھ ایک اور عورت بھی تھی ۔ حضرت بلال ان کو لے کر مقتولین یہود کے پاس سے گزرے ۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو دوسری عورت تھی ۔ اس نے دور سے آواز میں چیخ لگائی ' اپنے منہ کو پیٹا ' اور اپنے سر پر مٹی ڈالی ۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا دور کرو میرے پاس سے اس شیطانہ کو ۔ صفیہ کے بارے میں آپ نے حکم دیا کہ آپ کے پیچھے بیٹھا دیا جائے اور اس کے اوپر چادر ڈال دی ۔ مسلمانوں نے جان لیا کہ حضور اکرم ﷺ نے اسے اپنے لیے چن لیا ہے ۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال ﷺ سے کہا : (جس طرح مجھ تک اطلاع پہنچی ہے) "بلال تمہارے دل سے رحم کا جذبہ نکال دیا گیا تھا جب تم ان دو عورتوں کو لے کر ان کے مقتولین پر پھرا رہے تھے" ۔

۱۱ ۔ اس کے بعد آپ نے میمونہ بنت حارث ابن حزن رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا یہ خالد ابن ولید اور عبداللہ ابن عباس کی خالہ تھیں ۔ حضور اکرم ﷺ سے قبل یہ ابو رہم ابن عبدالعزی کی بیوی تھیں ۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ خویطب ابن عبدالعزی کی بیوی تھیں ۔ یہ آخری عورت تھیں جن نے حضور ﷺ نے نکاح کیا ۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر عورت کے ساتھ نکاح کرنے کی اپنی ایک کہانی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نکاح کا ایک خاص سبب تھا اور اس میں حکمت تھی ' ماسوائے زینب بنت جحش اور جویریہ بنت حارث کے ان میں سے اور کوئی بھی نوجوان نہ تھی ۔ یا ایسی نہ تھیں کہ ان کی خوبصورتی کی وجہ سے کوئی ان میں دلچسپی لیتا ہو ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

حضورﷺ کو زیادہ محبوب تھیں۔ یہاں تک کہ مذکورہ بالا دونوں جو خوبصورت تھیں' ان کے نکاح کی بھی ان کے جمال کے علاوہ ایک نفسیاتی وجہ بھی تھی۔ میں اس بات کی نفی نہیں کرتا کہ ان کے نکاح میں خوبصورتی کو دخل نہ تھا جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں اندازہ کیا اور وہ درست نکلا۔ نہ میں زینب کے جمال کی نفی کرتا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی سے ہم اس قسم کے انسانی اور بشری میلان کی نفی نہیں کر سکتے۔ نہ اس قسم کا ذوق ہونا کوئی کمزوری ہے کہ انصار نبی اس کی مدافعت کریں۔ یا آپ کے دشمنان اس کے بارے میں آپ پر الزام لگائیں کیونکہ حضورﷺ ایک انسان تھے۔ ایک بلند پایہ انسان لیکن بیویوں کے سلسلے میں آپ کے جذبات مختلف اور نکاح کے سلسلے میں اسباب بھی مختلف تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ازواج کے ساتھ ایک بشر اور رسول کی طرح زندہ رہے' جس طرح اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ اس بات کا اعلان کر دیں۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا "کہ دو پاک ہے میرا رب' میں تو فقط ایک بشر رسول ہوں"۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازواج کے ساتھ حسن معاشرت فرمائی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: "حضور اکرم صلعم جب اپنی ازواج کے ساتھ تنہا ہوتے تو بہت ہی نرم مزاج اور بہت ہی شریف انسان ہوتے۔ نہایت ہی زیادہ ہنسنے والے اور مسکرانے والے"۔ لیکن آپ کی ذات' آپ کے روحانی فیوض اور آپ کے قلبی جذبات' آپ کے حسن ادب اور حسن معاملہ سے بھی وہ فیضیاب ہوتیں۔ رہا یہ کہ ان ازواج کی مادی زندگی کیسی تھی تو وہ بقدر کفاف تھی۔ یہاں تک کہ فتوحات کے بعد جب کہ مسلمان اموال غنیمت کی وجہ سے مالدار ہو گئے تھے۔ آپ اس سے قبل سورہ احزاب میں حضور اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات اور وسعت نفقہ کے مطالبات کے بارے میں پڑھ آئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ایک بحران پیدا ہو گیا اور آخر کار اللہ نے ان کو اختیار دے دیا کہ وہ یا حضور اکرم ﷺ کا انتخاب کر لیں یا آزادی کو اختیار کر لیں۔ لیکن سب نے اللہ اور رسول اور دار آخرت کو اختیار کیا۔ (دیکھئے پارہ ۲۲)

لیکن حضور اکرم ﷺ کے گھر میں زندگی بسر کرنے کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ انسانی جذبات بالکل ختم ہو گئے تھے۔ آپ کی ازواج مطہرات بہرحال بشر تھیں۔ اور بشری جذبات وہاں بھی موجود تھے۔ بعض اوقات ان کے درمیان تنازعہ بھی ہو جاتا جو بالعموم ایسے گھرانوں میں ہو جاتا ہے۔ اس سے قبل ابن اسحاق کی روایت میں گزرا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کو دیکھتے ہی اسے ناپسند کیا اور سمجھ لیا کہ یہ حضور اکرم ﷺ کے دل میں گھر کرے گی۔ جب بھی حضورﷺ نے اسے دیکھا اور عملاً ایسا ہی ہوا۔ پھر صفیہ کے ساتھ جو ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کے کسی قصور کے بارے میں تذکرہ کیا کہ صفیہ کی تو یہ بات آپ کے لیے کافی ہے تو حضورﷺ نے فرمایا کہ تم نے اتنی بڑی بات کی ہے کہ اگر اسے سمندر کے اندر ملایا جائے تو اس کا رنگ بدل جائے"۔ اور اپنے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جب تخییر کی آیت نازل ہوئی تو میں نے اللہ' رسول اور دار آخرت کو چنا' لیکن رسول اللہ سے درخواست کی کہ اپنی دوسری ازواج کو میرے فیصلے کی اطلاع نہ دیں تو حضورﷺ نے فرمایا "اللہ نے مجھے سخت گیر

بنا کر نہیں بھیجا' مجھے تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے ۔ مجھ سے جس نے بھی پوچھا میں اسے بتاؤں گا کہ عائشہ نے کیا فیصلہ کیا ہے کہ اس نے اللہ' رسول اور دار آخرت کو اپنایا ہے"۔

یہ واقعات جو حضرت عائشہ نے اپنے بارے میں خود نقل کیے ہیں ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر سچی تھیں کیونکہ وہ اسلام کی تربیت یافتہ تھیں ۔

ان مثالوں میں معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے گھر کے اندر کی فضا کیسی تھی اور آپ جس طرح پوری امت کی تربیت فرما رہے تھے اسی طرح اپنے گھر کے اندر بھی لوگوں کی تربیت کر رہے تھے ۔

یہ واقعہ جس کے بارے میں اس سورت کی ابتدائی آیت نازل ہوئی ۔ ایسے ہی واقعات میں سے ایک واقعہ تھا جو آپ اور آپ کے ازواج مطہرات کے درمیان پیش آیا ۔ اس کے بارے میں متعدد روایات ہیں اور ان کے درمیان اختلاف بھی ہے ۔ قرآن کی نصوص کی تشریح کے وقت ہم ان کی تفصیلات دیں گے ۔

اس واقعے کے حوالے سے جو ہدایات دی گئیں خصوصاً آپ کی دو بیویوں کو جو یہ حکم دیا گیا کہ توبہ کریں اور اس کے بعد پھر تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ اپنے گھرانوں کی تربیت کر کے انہیں دوزخ کی آگ سے بچائیں اور اپنے آپ کو آگ سے بچائیں اور پھر کافروں کا ایک منظر بھی پیش کیا کہ جہنم میں ان کی حالت کیا ہو گی اور پھر سورت کے آخر میں حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی کافر بیویوں کی ایک مسلمان گھرانے میں ہونے کی مثال دی گئی اور پھر فرعون کی بیوی ایک کافر کے گھر میں اور پھر مریم بنت عمران کی مثال کہ وہ ایک اعلیٰ خاتون تھیں جس کے رحم میں کلمہ الٰہیہ پھونکا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور وہ نہایت ہی عبادت گزار خاتون تھیں ۔

ان آیات کے نزول کے بارے میں (آیت ۱ تا ۵) متعدد روایات وارد ہیں ۔ امام بخاری نے ان آیات کی تفسیر کے ضمن میں روایت کیا ہے' ابراہیم ابن موسیٰ سے' انہوں نے ہشام ابن یوسف سے' انہوں نے ابن جریج سے' انہوں نے عطا سے' انہوں نے عبید ابن عمر سے' انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہ "نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم زینب بنت جحش کے ہاں شہد پیا کرتے تھے ۔ اور آپ کے ہاں قدرے ٹھہرتے تھے ۔ میں نے اور حفصہ نے یہ طے کیا کہ ہم میں سے جس کے ہاں بھی حضور آئیں گے تو وہ کہے گی کہ حضور آپ نے مغافیر کھایا ہے (یہ ایک پھل ہے جس کا ذائقہ میٹھا ہوتا ہے' لیکن بدبودار ہوتا ہے) ۔ تو آپ نے فرمایا نہیں لیکن میں نے زینب بنت جحش کے ہاں شہد پیا ہے ۔ میں دوبارہ نہیں پیوں گا ۔ میں نے حلف اٹھا لیا ہے ۔ لیکن یہ بات کسی سے نہ کہنا" ۔ یہ تھی وہ بات کہ آپ نے اپنے اوپر شہد حرام کر دیا حالانکہ وہ حلال تھا ۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ (٦٦ : ١) "اے نبی تم کیوں اس چیز کو حرام قرار دیتے ہو' جو اللہ نے تمہارے لیے حلال قرار دی ہے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ جس عورت نے یہ مکالمہ حضورؐ کے ساتھ کیا' اس نے اپنی دوسری ہم مشورہ کو بتا دیا' حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے اسے حکم دیا تھا کہ کسی سے نہ کہنا ۔ اللہ نے حضور ﷺ کو بذریعہ وحی سب کچھ بتا دیا ۔ اس پر حضور ﷺ نے مکالمہ کرنے والی بیوی کو اور پھر اپنی ہم مشورہ بیوی کو بتانے والی کو بتا دیا کہ تم نے تو اس بات کو پھیلا دیا

ہے ۔ لیکن حضورﷺ نے اسے اپنے حسن خلق کی بنا پر پورا واقعہ نہ بتایا۔ایک مختصر سی بات کی اس حد تک کہ وہ مکالمہ کرنے والی جان لے کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تو اصل بات معلوم ہوگئی ۔ یہ پریشان ہوئی اور پوچھا۔

مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا (٦٦ : ٣) "آپ کو اس کی کس نے خبر دی؟" شاید اس کے دل میں یہ بات آئی ہو کہ شریک مشورہ نے راز کھول دیا ہے ۔تو حضورﷺ نے بتا دیا :

نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ (٦٦ : ٣) "مجھے تو علیم و خبیر نے یہ واقعہ بتایا ہے" ۔ مطلب یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بذریعہ الہام سب کچھ بتا دیا گیا۔

اس واقعہ کے بعد 'اور پھر اللہ کی جانب سے دو بیویوں کے اس مشورہ کے انکشاف کے بعد اور رسول اللہ ﷺ کے گھر میں ایسا واقعہ ہو جانے کے بعد حضور اکرم ﷺ اپنی ازواج سے بہت ناراض ہو گئے اور آپ نے بلا کر کہا' کہ ایک ماہ ان کے قریب نہ جائیں گے ۔ یہ باتیں مشہور ہو گئیں کہ آپ نے ازواج مطہرات کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا ہے ۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا غصہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب یہ آیات نازل ہوئیں ۔ اور آپ دوبارہ اپنی ازواج کے پاس گئے ۔

دوسری روایت امام نسائی نے نقل کیا ہے ۔ یہ حضرت انس ﷺ کی حدیث ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی ایک لونڈی تھی اور حضورﷺ اس کے ساتھ مجامعت فرماتے تھے ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ آپ کے پیچھے پڑ گئیں اور آپ نے اس کو اپنے اوپر حرام کر دیا۔ اس پر اللہ نے یہ آیات نازل کی :

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ (٦٦ : ١) "اے نبی تم کیوں حرام قرار دیتے ہو اس چیز کو' جو اللہ نے تمہارے لیے حلال قرار دی ہے' تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو" ۔

اور ابن جریر اور ابن اسحاق کی ایک روایت میں یہ ہے' ماریہ جو آپ کے بیٹے ابراہیم کی ماں تھیں اور ام ولد لونڈی تھیں ۔ ان کے ساتھ آپ نے حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں مجامعت کی ۔ اس پر حفصہ رضی اللہ عنہا کو غصہ آیا اور انہوں نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ حضورؐ نے ان کے ساتھ وعدہ کر لیا کہ وہ ماریہ کو اپنے اوپر حرام کرتے ہیں اور قسم اٹھا لی ۔ اور حکم دیا کہ اس بات کو خفیہ رکھیں۔ حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتا دیا' یہ تھا اصل واقعہ ۔

دونوں روایات میں سے ایک ان آیات کے نزول کا سبب ہو سکتی ہے ۔ یہ دوسری روایت زیادہ قریب ہے ۔ اس حادثہ کی فضا کے مجموعی تاثر کے ساتھ خصوصاً اس کے بعد جب حضورﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔ اس لحاظ سے کہ یہ موضوع زیادہ حساس ہے ۔ لیکن پہلی روایت زیادہ قوی ہے بلحاظ سند ۔ یہ پہلی روایت ممکن الوقوع بھی ہے اور اس پر جو اثرات مرتب ہوئے وہ بھی ممکن الوقوع ہیں ۔

رہا معاملہ ایلا کا تو اس کی تصویر کشی امام احمد کی روایت میں بہت اچھی طرح کی گئی ہے ۔ اس روایت میں اس وقت کے اسلامی معاشرے کی تصویر کشی بھی ہوتی ہے ۔ امام احمد نے روایت کیا' عبدالرزاق سے 'انہوں نے معمر سے' انہوں نے زہری سے' انہوں نے عبید اللہ ابن عبداللہ ابن ابوثور سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے وہ فرماتے ہیں مجھے شوق تھا کہ میں حضرت عمرﷺ سے ان دو عورتوں کے بارے میں پوچھوں' جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے :

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (٦٦ : ٤) ”اگر تم اللہ سے توبہ کرتی ہو‘ (تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں“۔ کہ یہ کون تھیں۔

ایک بار حضرت عمرؓ ایک طرف ہوئے اور میں ان کے ساتھ کوزہ لے کر ایک طرف ہوا۔ آپ قضائے حاجت کے لیے گئے اور میرے پاس آئے۔ میں نے ان کے ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ اسی موقعہ پر میں نے ان سے پوچھا لیا کہ وہ دو عورتیں کون تھیں‘ جن کے بارے میں یہ آیا ہے :

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (٦٦ : ٤) تو حضرت عمرؓ نے فرمایا ابن عباس تم عجیب آدمی ہو (زہری کہتے ہیں حضرت عمرؓ نے سوال کو اچھا نہ سمجھا لیکن چھپایا نہیں) فرمایا یہ کہ عائشہ .... اور حفصہ .... تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا۔ ہم لوگ قریش ایسے لوگ تھے کہ ہم نے عورتوں کو خوب کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ لیکن جب ہم مدینہ آئے تو وہاں ہم نے دیکھا کہ عورتیں لوگوں پر غالب ہیں۔ تو ہماری عورتوں نے بھی ان سے سیکھنا شروع کر دیا۔ میری رہائش دار السید ابن زید‘ محلہ عوالی میں تھی۔ میں ایک دن اپنی بیوی پر غصہ ہوا تو اس نے آگے سے جواب دیا۔ میں نے اس بات کو بہت برا سمجھا کہ عورت آگے سے بات کا جواب دیتی ہے۔ اس نے کہا میرا جواب دینا آپ کو اس قدر برا لگا ہے‘ خدا کی قسم رسول اللہ کی عورتیں آپ کے ساتھ تیز باتیں کرتی ہیں اور بعض اوقات ان میں سے ایک صبح سے شام تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روٹھ جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں : میں اٹھا اور حفصہ کے پاس گیا اس کے گھر میں۔ میں نے اسے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ باتیں پلٹا کر کرتی ہو اور سنا ہے کہ تم میں بعض صبح سے شام تک آپ سے روٹھ جایا کرتی ہے۔ تو اس نے کہا ہاں ایسا تو ہوتا ہے۔ تم میں سے جس نے ایسا کیا وہ تو تباہ و برباد ہوا۔ کیا تمہیں ڈر نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے تم پر اللہ کا غضب آ جائے اور تم ہلاک ہو جاؤ۔ تم کبھی رسول کی بات کو پلٹا کر جواب نہ دیا کرو۔ تم رسول اللہ سے کچھ بھی نہ مانگا کرو۔ اور میرے مال سے تمہیں جو درکار ہو مجھ سے مانگا کرو۔ تمہیں یہ بات کہیں غرے میں نہ ڈال دے کہ تمہاری سوکن تم سے زیادہ خوبصورت بھی ہے اور رسول اللہ کو محبوب بھی ہے یعنی (عائشہ) فرماتے ہیں کہ میرا ایک انصاری پڑوسی تھا۔ ہم رسول اللہ ﷺ کی محفل میں باری باری جاتے تھے۔ ایک دن وہ جاتا اور دوسرے دن میں جاتا اور وہ مجھے وحی کے بارے میں اطلاع دیتا‘ اسی طرح اپنی باری پر میں اسے اطلاع دیتا۔ ان دنوں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ غسانی ہمارے خلاف حملے کے لیے گھوڑے تیار کر رہے ہیں۔ میرا ساتھی ایک دن گیا۔ واپسی پر اس نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر اس نے آواز دی۔ میں نکلا تو اس نے کہا بہت بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کیا غسانی آ گئے ہیں؟ تو اس نے کہا نہیں اس سے بھی بڑا اور طویل حادثہ ہو گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ میں نے کہا کہ ”حفصہ تباہ و برباد ہو گئی“۔ میرا خیال تھا کہ ایک دن یہ بات ضرور ہو گی۔ میں نے صبح کی نماز پڑھی اور اپنے اوپر کپڑے باندھے اور اترا اور سب سے پہلے حفصہ کے پاس گیا۔ وہ رو رہی تھی۔ میں نے کہا کیا رسول اللہ ﷺ نے تمہیں طلاق دے دی ہے؟ اس نے کہا مجھے علم نہیں ہے۔ وہ یہ ہیں الگ مشربہ (پانی پینے کی جگہ) میں۔ میں ایک سیاہ غلام کے پاس آیا اور اسے کہا کہ حضور اکرم ﷺ سے عمر کے لیے اجازت طلب کریں۔ غلام اندر گیا اور پھر باہر آیا اور کہا میں نے تمہارا تذکرہ کیا‘ حضور ﷺ خاموش

رہے۔ میں گیا اور منبر رسول ﷺ کے پاس آیا وہاں کچھ لوگ بیٹھے رو رہے تھے۔ میں منبر کے پاس قدرے بیٹھا۔ اس کے بعد میں جو محسوس کر رہا تھا اس نے مجھے بیٹھنے نہ دیا۔ میں پھر غلام کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ عمر کے لیے اجازت طلب کرو' وہ اندر گیا اور پھر واپس آیا اور کہا کہ میں نے آپ کا تذکرہ کیا مگر حضور ﷺ خاموش رہے۔ میں پھر نکلا اور منبر کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ اس کے قدرے وقفے کے بعد پھر میرے احساس نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں پھر غلام کے پاس آیا اور وہ اندر گیا اور پھر واپس ہوا۔ اور یہی کہا کہ میں نے آپ کا نام لیا کہ عمر ہیں۔ حضور ﷺ خاموش رہے۔ میں واپس چلا گیا۔ اچانک دیکھا کہ وہ غلام مجھے پکار رہا ہے۔ اس نے کہا آپ کو اجازت مل گئی ہے' اندر جائیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا۔ آپ باریک بنی ہوئی چٹائی پر تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ جس نے آپ کے پہلو پر دھاریاں ڈال دی تھیں۔ میں نے حضور ﷺ سے دریافت کیا حضور کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟ تو آپ نے فرمایا: "نہیں"۔ میں نے کہا اللہ اکبر۔ حضور آپ غور فرمائیں قریشی عورتوں پر غالب ہوا کرتے تھے۔ جب ہم مدینہ میں آئے تو یہاں کے لوگوں پر عورتیں غالب تھیں' ہماری عورتوں نے آہستہ آہستہ ان سے سیکھنا شروع کر دیا۔ ایک دن میں اپنی بیوی پر غصہ ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ آگے سے بات لوٹا رہی ہے۔ میں نے اس بات کو بہت ہی برا سمجھا۔ میری بیوی نے کہا تمہیں یہ بات کیوں اتنی بری لگ گئی' رسول اللہ ﷺ کی بیویاں تو آپ کے جواب میں بات بھی کرتی ہیں اور ان میں سے ایک صبح سے شام تک آپ سے روٹھ بھی جاتی ہیں تو میں نے کہا جو ایسا کرتی ہے وہ تو برباد ہوئی۔ کیا جو ایسا کرتی ہے وہ اللہ کے غضب سے نہیں ڈرتی۔ کہ اگر اپنے رسول کی وجہ سے اللہ غضب میں آجائے' اور وہ ہلاک ہو جائے۔ اس پر آپ مسکرائے۔ تو میں نے کہا حضور میں حفصہ کے پاس گیا تھا اور میں نے کہا تم کہیں اپنی پڑوسن کی وجہ سے غرے میں نہ پڑ جاؤ۔ وہ تم سے خوبصورت بھی ہے اور رسول اللہ اس سے تمہارے مقابلے میں زیادہ محبت بھی کرتے ہیں۔ تو رسول اللہ دوسری بار مسکرائے۔ تو میں نے کہا حضور میں بیٹھ سکتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا "ہاں"۔ میں بیٹھ گیا۔ میں نے گھر پر ایک نظر ڈالی۔ خدا کی قسم گھر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی' جس پر میری نظر جمتی!۔

میں نے کہا رسول اللہ آپ دعا فرمائیں کہ آپ کی امت پر اللہ کشادگی کر دے۔ اللہ نے فارسیوں' رومیوں پر کشادگی کر دی ہے' جبکہ وہ اللہ کی بندگی نہیں کرتے۔ اس پر حضور ﷺ بیٹھ گئے اور فرمایا "ابن خطاب تم شک میں ہو کہ وہ ایک ایسی قوم ہیں جن کو اس دنیا کے مزے اللہ نے یہاں ہی جمع کر دیئے ہیں"۔ میں نے کہا رسول اللہ ﷺ میرے لیے معافی طلب فرمائیں اور رسول اللہ ﷺ نے قسم اٹھائی کہ ایک ماہ تک ان کے پاس نہ جائیں گے کیونکہ آپ ان پر بہت ناراض ہو گئے تھے۔ اس پر اللہ نے رسول اللہ ﷺ پر عتاب فرمایا اور یہ آیات نازل ہوئیں": (بخاری' مسلم' ترمذی' نسائی' سب نے زہری سے)

---OOO---

درس نمبر ۲٦٦ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۱۲

آیاتها ۱۲ — سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ ٦٦ — مَدَنِيَّةٌ (١٠٧) — رکوعاتها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ
الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۲ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا
نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا
نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝۳ اِنْ تَتُوْبَاۤ
اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ
جِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝۴ عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ
طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ
عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”اے نبی، تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے؟ (کیا اس لیے کہ) تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو؟--- اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اللہ نے تم لوگوں کے لیے اپنی قسموں کی پابندی

سے نکلنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے ۔ اللہ تمہارا مولیٰ ہے ' اور وہی علیم و حکیم ہے ۔ پھر جب اس بیوی نے (کسی اور پر) وہ راز ظاہر کر دیا ' اور اللہ نے نبی کو اس (افشائے راز) کی اطلاع دے دی ' تو نبیؐ نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا ۔ پھر جب نبیؐ نے اسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا آپ کو اس کی کس نے خبر دی؟ نبیؐ نے کہا " مجھے اس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا ہے اور خوب باخبر ہے ۔ اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں ۔ اور اگر نبیؐ کے مقابلے میں تم نے جتھہ بندی کی تو جان رکھو کہ اللہ اس کا مولیٰ ہے اور اس کے بعد جبریل اور تمام صالح اہل ایمان اور سب ملائکہ اس کے ساتھی اور مددگار ہیں ۔ بعید نہیں کہ اگر نبی تم سب بیویوں کو طلاق دے دے تو اللہ اسے ایسی بیویاں تمہارے بدلے میں عطا فرما دے جو تم سے بہتر ہوں ۔ سچی مسلمان ' باایمان ' اطاعت گزار ' توبہ گزار ' عبادت گزار اور روزہ دار ' خواہ شوہر دیدہ ہوں یا باکرہ "۔

یہ دراصل ایک عتاب ہے کیونکہ کوئی مومن اپنے اوپر اس چیز کو حرام نہیں کر سکتا جو اللہ نے حلال کی ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے "شہد" یا "ماریہ" کے پاس جانے کو ازروئے قانون اور شریعت تو حرام نہ کیا تھا ۔ صرف اپنے بارے میں فیصلہ کیا تھا کہ میں اس کام کو دوبارہ نہیں کروں گا ۔ اس پر یہ جھڑکی آئی کہ جن چیزوں کو اللہ نے حلال کیا ہے ' کسی کو خوش کرنے کے لیے ان سے اپنے آپ کو محروم کرنا بھی جائز نہیں ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا ۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٦٦ : ١) "اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ فعل قابل مواخذہ ہے ۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ اللہ کی مغفرت طلب کی جائے اور اللہ کی رحمت شامل حال ہو جائے ۔ یہ نہایت ہی لطیف اشارہ ہے ۔

قرآن جس حلف کی طرف اشارہ کر رہا ہے ' جو رسول اللہ نے کر لیا تھا کہ دوبارہ ایسا نہیں کروں گا تو اللہ نے فرمایا کہ اس قسم سے نکل آؤ ' یعنی کفارہ ادا کر کے اور قسم اگر کسی اچھے کام سے رکنے کے لیے ہو تو اس کا توڑنا اور کفارہ دینا فرض ہے ۔

وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ (٦٦ : ٢) "اللہ تمہارا مولیٰ ہے"۔ اللہ تمہاری کمزوریوں پر تمہاری معاونت کرتا ہے ۔ اور اس معاملے میں بھی تمہاری معاونت کرتا ہے جو تمہارے لیے گراں گزرے ۔ اور یہ قسموں کو حلال کرنا اور ان سے کفارہ ادا کر کے نکل آنے کا طریقہ اسی لیے تو اللہ نے فرض کیا ہے ۔

وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (٦٦ : ٢) "وہی علیم و حکیم ہے"۔ وہ تمہارے لیے جو قوانین بناتا ہے ' وہ علم و حکمت سے بناتا ہے ۔ اور تمہارے لئے جو احکام دیتا ہے وہ ایسے ہوتے ہیں کہ تم ان پر عمل کر سکتے ہو اور وہ تمہارے لیے مفید ہوتے ہیں ۔ لہٰذا انہی چیزوں کو حرام کرو جو اللہ نے حرام کیں ۔ اور جو اللہ نے حلال کی ہیں ان کو حرام نہ کرو ۔ یہ مناسب نتیجہ ہے ۔

اس کے بعد روئے سخن اس بات کی طرف ہے جو آپ نے فرمائی تھی لیکن اس کی تفصیل نہیں بتائی گئی ۔ کیونکہ نفس بات اس قدر اہم نہ تھی ۔ اور نہ کوئی ایسی بات تھی جس کا قیامت تک تاریخی ریکارڈ پہ لانا ضروری تھا ۔ بس جس چیز کو

باقی رکھنا مطلوب تھا' وہ پاس بات کے آثار و نتائج تھے ۔

وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِه حَدِیْثًا (٦٦ : ٣) "(اور یہ معاملہ بھی قابل توجہ ہے کہ) نبیؐ نے ایک بات اپنی ایک بیوی سے راز میں کی تھی"۔

عجیب زمانہ تھا یہ کہ لوگوں کی روز مرہ کی زندگی میں بھی عالم بالا سے بر ملا مداخلت ہو رہی تھی ۔ معلوم یہ ہوا کہ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بتا دیا کہ جو راز ایک بیوی کے حوالے کیا گیا تھا' اس تاکید کے ساتھ کہ کسی اور کو پتہ نہ چلے' وہ اس نے دوسری کو بتا دیا ہے ۔ اور نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب اس راز دار بیوی سے بات کی تو صرف اشارہ کر دیا گیا کہ تم نے راز کو راز نہیں رکھا ۔ پوری تفصیل نہ بتائی کہ تم نے یہ یہ باتیں دوسری بیوی سے کیں اور یہ آپ کے مکارم اخلاق کا تقاضا تھا کہ کسی کو زیادہ شرمندہ نہ کیا جائے ۔ آپ نے یہ بتا دیا کہ مجھے عالم بالا سے خبر آگئی ہے ۔

وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِه حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِه وَ اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِه قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ (٦٦ : ٣) "پھر جب اس بیوی نے (کسی اور پر) وہ راز ظاہر کر دیا' اور اللہ نے نبیؐ کو اس (افشائے راز) کی اطلاع دے دی' تو نبیؐ نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا ۔ پھر جب نبیؐ نے اسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا آپ کو اس کی کس نے خبر دی؟ نبیؐ نے کہا "مجھے اس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا ہے اور خوب باخبر ہے"۔

یہ خبر چونکہ دو بیویوں کے درمیان ان کی جتھہ بندی کی وجہ سے پھیلی ہوئی تھی' تو خبر پھیلانے والی بیوی کو شرمندہ کرنے کے لیے بس اشارہ ہی کافی تھا ۔ ایسے مواقع میں اللہ کے علم اور اللہ کی خبر دادی کی طرف اشارہ بہت ضروری ہے کیونکہ ایسی غلطی تب ہی سرزد ہوتی ہے کہ انسان اللہ کے علم و خبرداری سے غافل ہو جائے یا اسے بھول جائے ۔ اس لیے قرآن مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے ۔ کہ تمہاری نادانیاں اللہ کے علم میں بہرحال ہیں ۔

اب یہاں انداز کلام حکایت سے خطاب کی طرف آ جاتا ہے' اور جن دو ازواج نے یہ کام کیا تھا' ان سے خطاب کیا جاتا ہے ۔ گویا بات ان کے سامنے ہو رہی ہے ۔

اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَی اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَ اِنْ تَظٰهَرَا عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ جِبْرِیْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ (٦٦ : ٤) "اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں ۔ اور اگر نبیؐ کے مقابلے میں تم نے جتھہ بندی کی تو جان رکھو کہ اللہ اس کا مولیٰ ہے اور اس کے بعد جبریل اور تمام صالح اہل ایمان اور سب ملائکہ اس کے ساتھی اور مددگار ہیں"۔

آغاز خطاب میں ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ توبہ کریں تاکہ ان کے دل اللہ کی طرف مائل ہو جائیں کیونکہ ان کے دل اللہ سے دور ہو گئے تھے ۔ جب یہ دعوت دے دی جاتی ہے تو پھر ان پر ایک خوفناک تنقید کی جاتی ہے ۔ نہایت رعب دار آواز میں :

اس زبردست تنقید سے معلوم ہوتا ہے کہ حادثہ اور واقعہ جو بھی تھا مگر رسول اللہ کے قلب مبارک پر اس کا گہرا اثر تھا ۔ چنانچہ اللہ کو اعلان کرنا پڑا کہ اللہ ' ملائکہ اور صالح مومنین اس کے لیے کافی طرفدار ہیں ۔ اس اعلان سے ' حضور اکرم ﷺ کا غبار خاطر دور ہو جاتا ہے اور آپ مطمئن ہو جاتے ہیں ۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ واقعہ جو بھی ہو ' لیکن حضور ﷺ پر اس واقعہ کا گہرا اثر تھا ۔ حضور اپنے گھروں میں اس قسم کے ماحول کی توقع نہ کرتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر ﷺ کے پڑوسی انصاری نے ' اس واقعہ کی جو رپورٹ دی ' وہ اس قدر خوفناک تھی کہ اس کے قول کے مطابق غسانیوں کے حملے سے بھی بڑی بات ہو گئی ہے ۔ غسانیوں کی اس وقت شام پر حکومت تھی ۔ اور وہ سلطنت روم کے موالی تھے ۔ ان کے ان کے ساتھ دوستی کے معاہدے تھے ۔ اس دور میں مدینہ پر غسانیوں کا حملہ آور ہونا بہت ہی خطرناک بات تھی ۔ لیکن مسلمانوں کے لیے رسول اللہ کا پریشان اور بے قرار ہونا غسانیوں کے حملے سے بھی بڑی بات تھی ۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانے کی سلامتی سب سے بڑی بات تھی ۔ اور آپ ؑ کا اضطراب لوگوں کے لیے ناقابل برداشت تھا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خیرالقرون کے یہ لوگ معاملات کو کس زاویہ سے دیکھتے تھے ۔ جس طرح اس انصاری نے اس واقعہ کو ایک عظیم واقعہ سمجھا ۔ اسی طرح اللہ نے بھی اسے سمجھا ان حضرات کی سوچ خدا اور رسول ؑ کی سوچ کی سمت اختیار کر چکی تھی ۔

پھر اگلی آیت میں ان کو نہایت ہی صراحت کے ساتھ بتایا گیا کہ نبی کریم ﷺ کے لیے اور آپ کے گھرانے کے لائق کیسی خواتین درکار ہیں ۔ اگر تمہیں طلاق دے دی گئی تو تم سے بہتر اور ان صفات والی خواتین تمہاری جگہ لیں گی :

عَسٰی رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا (٦٦ : ٥) "بعید نہیں کہ اگر نبی تم سب بیویوں کو طلاق دے دے تو اللہ اسے ایسی بیویاں تمہارے بدلے میں عطا فرما دے جو تم سے بہتر ہوں ۔ سچی مسلمان ' باایمان ' اطاعت گزار ' توبہ گزار ' عبادت گزار اور روزہ دار ' خواہ شوہر دیدہ ہوں یا باکرہ "۔

اشارتاً ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہیں تو ایسا ہونا چاہئے ' یعنی تمہیں ایسا مسلمان ہونا چاہئے کہ تم اطاعت شعار ہو اور دین کے احکام کو قائم کرو ' تمہارا ایمان ایسا ہو جو کاسہ دل کو ایمان و یقین سے لبالب کر دے اور تم دل سے خدا و رسول کی اطاعت کرو ۔ اور توبہ کرو جس کے معنی یہ ہیں کہ جو ہو چکا اس پر نادم ہو جاؤ اور آئندہ کے لیے اطاعت شعار ہو جاؤ ' بروقت عبادت میں مشغول رہو ' سیاحت اور سائحات کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت اللہ کی بڑائی اور کبریائی میں غور کیا جائے ۔ اور ان صفات کے ساتھ ساتھ وہ شوہر دیدہ بھی ہوں گی اور باکرہ بھی ہوں گی ۔ جس طرح کہ موجودہ ازواج مطہرات میں دونوں قسم کی خواتین ہیں ۔

یہ ان کے لیے ایک زبردست تادیبی سرزنش تھی کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف جتھہ بندی کی ۔ یاد رہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم معمولی باتوں پر غصہ نہ فرماتے تھے۔

ان آیات کے نزول سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تسلی ہو گئی۔ خود رب تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے اہل بیت کو خطاب فرمایا۔ اور اس زلزلہ کے بعد تو اہل بیت کے اندر بھی سخت پشیمانی ہو گئی اور اللہ کی ہدایات کے بعد سب کچھ درست ہو گیا اور یہ اس گھرانے کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ اللہ تعالیٰ خود اس کو مخاطب کرے' کیونکہ یہ کوئی معمولی گھرانا تو تھا نہیں' اس کی تو ہربات بعد میں آنے والوں کے لیے منہاج حیات تھی۔ ضابطہ اخلاق اور قانون تھی۔

یہ اس ذات کے گھریلو حالات تھے جو ایک امت کی تربیت کر رہا تھا۔ ایک مملکت کی بنیاد رکھ رہا تھا اور یہ ایسی مملکت تھی جس کی کوئی مثال گزری ہوئی تاریخ میں نہ تھی۔ اس جیسا نظام امم سابقہ میں نہ تھا۔ ایک ایسی امت تشکیل پا رہی تھی۔ جو الٰہی نظریہ حیات کو آخری شکل میں پیش کر رہی تھی۔ ایک ربانی معاشرہ وجود میں لایا جا رہا تھا اور ایسا معاشرہ جو قیامت تک کے لیے اسوہ بن رہا تھا۔

پھر ان آیات میں ایک عظیم' جلیل القدر' بلند کردار اور کریم انسان کی تصویر ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ اپنا انسانی کردار بھی ادا کر رہا ہے اور نبوی کردار بھی ادا کر رہا ہے۔ دونوں کے اندر کوئی بارڈر لائن متعین نہیں کر سکتا۔ کیونکہ تقدیر الٰہی کا فیصلہ یہ تھا کہ تمام رسول بشر ہوں گے۔ اور اس بشر رسول نے انسانیت کو آخری نظام زندگی عطا کرنا تھا' جو قیامت تک کے لیے انسانیت کا منہاج قرار پاتا تھا۔

یہ ایک کامل رسالت تھی' جسے ایک کامل رسول لے کر آیا تھا۔ اور اس کا کمال یہ تھا کہ یہ رسالت انسان کو انسان بنا رہی تھی۔ وہ انسانی قوتوں میں سے کسی قوت کو دبا نہیں رہی تھی۔ نہ انسان کی تعمیری قوتوں میں سے کسی قوت کو نظرانداز کر رہی تھی۔ انسانی صلاحیتوں میں سے کسی صلاحیت کی بیخ کنی کرنا' اس رسالت کا منشا نہ تھا بلکہ یہ انسانی قوتوں کو زیادہ مہذب' زیادہ تربیت یافتہ اور زیادہ بلند کرتی تھی۔ یہ تھی آخری رسالت۔

اسلام کو جن لوگوں نے سمجھا اور اپنے آپ کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا' اسلام نے ان کو اسی طرح چار چاند لگا دیئے کہ یہ لوگ اسلام کا صحیح ایڈیشن بن گئے۔ اور اسی طرح ان کے نبی کی سیرت اور اس کی عملی زندگی جس میں' انسانی تجربات بھی تھے' انسانی سعی بھی تھی' انسانی ناتوانیاں بھی تھیں' انسانی قوتیں بھی تھیں۔ قرآنی دعوت اور ہدایات کے ساتھ مل کر ان لوگوں کو قدم بقدم آگے بڑھایا جس طرح آپ کے اہل خانہ اور ان لوگوں کی زندگیون سے ظاہر ہوتا ہے' جو آپ کے قریب رہتے تھے' اور اس طرح یہ جدوجہد کامیاب کوشش بن گئی۔ اور ان زندگیوں میں قیامت تک آنے والوں کے لیے نمونہ لیکن صرف ایسے لوگوں کے لیے' جو اسے دیکھنا چاہیں' اور جو عملی دنیا میں رہنے والے ہوں' صرف اپنے خول اور اپنے خیالات کے محدود دائروں کے اندر بند نہ ہوں' جنہوں نے اپنی آنکھیں بند نہ کی ہوں۔

اس آخری رسالت کو کامل اور مکمل شکل میں نازل کر کے قدرت الٰہیہ نے اسے ایک ایسے رسول کی زندگی میں عملی شکل دی' جو اس رسالت کو آسمان سے اخذ کرتا تھا' اور زندہ صورت میں اس کا ترجمہ کرتا تھا۔ یوں قدرت الٰہیہ نے اس رسول آخر الزمان کی زندگی کو' ایک کتاب مفتوح بنایا کہ آپ کی زندگی سے آنے والی نسلیں بہترین نمونہ اور اسوہ اخذ کریں۔

اس واقعہ کی روشنی میں' جس کے سبب مسلمانوں کی زندگی پر گہری اثرات مرتب ہو گئے تھے' اب قرآن کریم مسلمانوں کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و اولاد کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ چنانچہ قیامت کا

ایک نہایت ہی موثر منظر بھی ان کے سامنے پیش کیا جاتا کہ وہاں کفار کی حالت کیا ہوگی ۔ جس طرح اس واقعہ میں ازواج کو دعوت دی تھی کہ توبہ کرو اسی طرح یہاں اہل ایمان کو دعوت دی جاتی ہے کہ توبہ کرو اور توبہ کرنے والوں کے لیے اللہ نے جو باغات تیار کر رکھے ہیں وہ بھی بتا دیئے جاتے ہیں ۔ اور جھلک دکھا دی جاتی ہے ۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ کفار اور منافقین سے جہاد کرو ۔ یہ ہے اس سورت کا دوسرا پیراگراف :

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا
النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ
اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ
اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً ع
نَّصُوْحًا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ ١٩
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى
بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۸﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ
وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۹﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے ' جس پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں ۔ (اس وقت کہا جائے گا کہ) اے کافرو' آج معذرتیں پیش نہ کرو' تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے ۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے توبہ کرو' خالص توبہ' بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی ۔ یہ وہ دن ہو گا جب اللہ اپنے نبی ؐ کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں ' رسوا نہ کرے گا ۔ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما' تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔ اے نبی ؐ' کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ ۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے"۔

اپنے نفس اور اپنے اہل و عیال کے بارے میں مومن پر عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے ۔ قیامت کے دن کی آگ

موجود ہے ۔ اور اس نے اس سے اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو بچانا ہے ۔ یہ ایسی دہکتی ہوئی آگ ہے ۔

وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (۶۶ : ۶) "جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے"۔ لوگ اس میں اس طرح ہوں گے جس طرح پتھر پڑے ہوتے ہیں 'سنگ راہ کی طرح کوئی ان کی طرف توجہ نہ کرے گا۔ کس قدر سخت آگ ہوگی کہ اس میں پتھر جلیں گے اور کس قدر سخت عذاب ہو گا اور اہل جہنم کس قدر بے وقعت ہوں گے ۔ جہنم کا سب ماحول نہایت شدید اور خوفناک ہو گا۔

عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ (۶۶ : ۶) "جس پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے ہوں گے"۔ ان کا مزاج اس عذاب کی سختی کی طرح سخت ہو گا۔

لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۶۶ : ۶) "جو کبھی اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور 'جو حکم بھی دیا جاتا ہے وہ بجالاتے ہیں"۔ ان کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرتے ہیں ' اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ جو بھی حکم ان کو دیا جاتا ہے وہ اسے کرگزرتے ہیں ' اور وہ اپنی اس قوت اور مضبوطی کی وجہ سے اس آگ پر متعین ہوئے ہیں ۔ لہٰذا ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس آگ سے اپنے نفس اور دین کو بچائے اور قبل اس کے کہ فرصت کی گھڑیاں ختم ہوں وہ اپنے اور اپنے اہل و عیال اور آگ کے درمیان پردے حائل کر دے ۔

دیکھو وہاں اہل کفر جب اس کے دہانے پر پہنچیں گے 'تو وہ عذرات پیش کریں گے ' اور کوئی عذر نہ سنا جائے گا' بلکہ ان کو وہاں سخت مایوسی ہوگی 'جب سب عذرات رد کر دیئے جائیں گے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۶۶ : ۷)
"اے کافرو' آج معذرتیں پیش نہ کرو 'تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جارہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے"۔ آج عذرات پیش نہ کرو 'کیونکہ آج عذرات کا دن نہیں ہے ۔ آج تو ہر کسی کو اپنے کیے کا پھل مل رہا ہے ۔ اور تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ آج تمہیں کس چیز کا پھل مل رہا ہے ؟

سوال یہ ہے کہ مومنین اپنے نفس کو اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے کس طرح بچائیں ۔ ان کو راستہ بتایا جاتا ہے اور امید دلائی جاتی ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶۶ : ۸) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے توبہ کرو' خالص

بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یہ وہ دن ہو گا جب اللہ اپنے نبیؐ کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں' رسوا نہ کرے گا۔ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما' تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

یہ ہے طریقہ 'خالص توبہ کا۔ توبہ' جو قلب کو پاک و صاف کر دے' اور اس کے بعد کوئی دھوکہ نہ ہو۔ گناہوں سے توبہ یوں ہوتا ہے کہ آدمی نے جو گناہ کیے ہیں' ان پر نادم ہو جائے اور اس کے بعد ان کی جگہ ندامت لے لے۔ یہ توبہ قلب کو پاک کر دیتی ہے اور اس پر معاصی کا جو رنگ ہوتا ہے یا میل ہوتی ہے' وہ دور ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد پھر یہ دل انسان کو عمل صالح پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ ہوتا ہے توبۃ النصوح۔ یعنی ایسی توبہ جو قلب کو یاد دہانی کراتی رہتی ہے اور دوبارہ اسے معاصی کا ارتکاب کرنے نہیں دیتی۔ (مسلسل نصیحت کرنے والی)۔

اگر کوئی اس قسم کی توبہ کر لے تو اس کے بعد اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ اس توبہ کی وجہ سے سابقہ معاصی بھی معاف ہو جائیں گے' اور توبہ کرنے والا جنتوں میں داخل ہو جائے گا۔ اس دن جب کہ کفار سخت شرمندہ ہوں گے اور اس دن نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اہل ایمان شرمندہ نہ ہوں گے۔

یہاں اللہ نے مومنین کو نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ ضم کیا ہے۔ یہ اس لیے کہ ان کو توبہ پر آمادہ کیا جائے کہ "دیکھو اس دن تمہارے لیے اس قدر حوصلہ افزائی ہوگی کہ تم حضرت نبی کریم ﷺ کی صف میں کھڑے ہوگے اور تمہاری عزت ہوگی اور تمہیں شرمندہ نہ کیا جائے گا۔ اور اس دن تمہارے آگے آگے ایک نور جا رہا ہو گا"۔

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (۶۶:۸) "ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا" اس دن وہ اس نور کے ساتھ پہچانے جائیں گے یہ دن تو بہت ہی خوفناک' طوفانی اور دل دہلا دینے والا ہو گا۔ جس میں ہر طرف اژدحام ہی اژدحام ہو گا اور ان کو یہ اعزاز ہو گا کہ جنت میں داخلے کے وقت ان کے آگے آگے اور دائیں جانب ایک نور جا رہا ہو گا۔ اس نور کے ساتھ وہ جنت میں جائیں گے' جہاں نور علی نور ہو گا۔

اہل ایمان اگرچہ اس شدید اور خوفناک مقام میں ہوں گے' لیکن ان کو وہاں یہ دعا اور عرضداشت اللہ کے سامنے پیش کرنے کی ہمت ہوگی۔

يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶۶:۸) "اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے' اور ہم سے درگزر فرما تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ اس وقت جب زبانیں گنگ ہوں گی اور دل بیٹھ رہے ہوں گے' اس خوفناک موقف میں ایسی دعا اہل ایمان کو سکھانا ہی اس بات کی علامت ہے کہ یہ منظور ہوگی۔ یہ تو سکھائی ہی اس لیے گئی کہ منظور ہو۔ کیونکہ یہ دعاء بھی اللہ ان کو بطور احسان سکھا رہا ہے' جس طرح نور اس کی عزت افزائی کے لیے دوڑ رہا ہو گا۔

یہ عذاب اور یہ ثواب دراصل ایک مومن کی ذمہ داری کا تعین کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو اور خاندان کو بچانے کے سلسلے میں مومن پر کس قدر عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ ہدایات اس واقعہ کے ضمن میں دی جا رہی ہیں

جونہی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پیش آیا کہ ایک مومن اپنے خاندان کی ہدایت اور تربیت کا ذمہ دار ہے ۔ جس طرح وہ اپنی اصلاح کا مکلف ہے اپنے اہل و عیال کی اصلاح کا بھی مکلف ہے ۔

یاد رہے کہ اسلام ایک خاندانی نظام ہے ' جیسا کہ ہم نے سورہ طلاق میں کہا' مومن پر اس کے گھرانے کی اصلاح کی ذمہ داری ہے ۔ کیونکہ ایک مومن گھرانہ اسلامی جماعت کا پہلا خلیہ ہے ۔ اور اسی خلیے سے پھر اسلامی جماعت میں دوسرے زندہ خلیے پیدا ہوتے ہیں ۔ ہر ایک گھر اسلامی نظریہ حیات کا حلقہ یا مورچہ ہے ۔ یہ حلقہ اپنی بناوٹ میں بہت ہی مضبوط ہونا چاہئے ۔ اس حلقے کا ہر فرد سرحدوں پر دفاع میں مصروف ہونا چاہئے ۔ اگر یہ مورچہ مضبوط نہ ہو گا تو دشمن اندر گھس آئے گا اور کوئی دفاع ممکن نہ ہو گا ۔

مومن داعی کا فرض ہے کہ وہ اپنی دعوت پہلے اپنے گھر سے شروع کرے ۔ اور اندر سے یہ قلعہ مضبوط ہو' اور اس قلعے سے باہر نکلنے سے پہلے وہ گھر کے اندر کے قلعے کے تمام سوراخ بند کر دے ۔ ایک گھرانے کی حفاظت تب ہی ہو سکتی ہے جب کسی گھر میں ماں بھی مسلمہ ہو' صرف باپ اس قلعے کی حفاظت نہیں کر سکتا ۔ ماں اور باپ دونوں مل کر لڑکے لڑکیوں کو درست کر سکتے ہیں ۔ اس لیے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ میں صرف مردوں سے اسلامی سوسائٹی تشکیل دینا چاہتا ہوں تو یہ ممکن نہیں ہے ۔ اسلامی انقلاب کے لیے مومن عورتوں کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ آنے والی نسل کی تربیت اسلامی خطوط پر کر سکیں ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن جس طرح مردوں کے لیے نازل ہوا' اسی طرح عورتوں کے لیے نازل ہوا ۔ وہ مردوں کی تنظیم کے ساتھ گھرانوں کی تنظیم بھی کر رہا تھا ۔ گھرانوں کو اسلامی مناہج پر استوار کر رہا تھا ۔ اس لیے اس نے ایک مسلمان پر اس کی دینی ہدایت اور اہل و عیال کی ہدایت کی ذمہ داری عائد کی ۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا (٦٦ : ٦) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے نفس اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ" ۔

یہ وہ نکتہ ہے کہ اس کو وہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں جو لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں ۔ اصلاح کے کام کا آغاز اپنی بیوی سے شروع کرنا چاہئے ۔ ماں سے' اس کے بعد اولاد کی طرف بڑھنا چاہئے اور پھر اپنے تمام رشتہ داروں تک ۔ نہایت کوشش کرنی چاہئے کہ ہم ایک مسلم خاتون پیدا کر لیں' جس سے مسلمان پیدا ہوں' جو شخص ایک مسلم گھرانا تعمیر کرنا چاہتا ہے' اس کا فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک مسلم خاتون کی تلاش کرے' اگر ہم گھر کی مالکہ مسلم پیدا نہ کر سکے' تو یاد رہے کہ اسلامی جماعت اور اسلامی سوسائٹی کی تشکیل میں بہت دیر لگے گی ۔ اور ہماری جماعت کی اساسوں اور بنیادوں کے اندر کمزوریاں ہوں گی ۔

پہلی جماعت اسلامی کے اندر تو یہ کام بہت ہی آسان تھا کیونکہ مدینہ میں ایک ایسا اسلامی معاشرہ وجود میں آ گیا تھا' سوسائٹی پر پاکیزہ خیالات غالب تھے ۔ اسلامی شریعت کا ساتھ ساتھ نفاذ ہو رہا تھا ۔ اور مرد اور عورتیں سب کے سب اللہ اور رسول کی طرف اپنے مسائل لے کر رجوع کرتے تھے ۔ اور اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حکم پر کان دھرتے تھے ۔ اور جب کوئی حکم نازل ہوتا تھا تو وہ آخری فیصلہ ہوتا تھا ۔ اس وقت اسلامی سوسائٹی موجود تھی پھر غالب تھی اور ان حالات میں عورت کے لیے بھی یہ بات آسان تھی کہ وہ اپنے آپ کو اسلامی خطوط پر ڈھال لے ۔ خاوندوں کے

لیے بھی آسان تھا کہ وہ ان کو نصیحت کریں اور بچوں کی تربیت کریں۔

لیکن ہم تو نہایت ہی بدلے ہوئے حالات میں ہیں۔ ہم ایک مکمل جاہلی معاشرے میں زندہ رہ رہے ہیں۔ قانون جاہلی کا غالب ہے۔ اخلاق جاہلیت' علم و ثقافت جاہلی ہیں۔ اور آج عورت بھی اس جاہلی معاشرے میں کام کر رہی ہے۔ آج جب عورت اسلام کی دعوت پر لبیک کہنے کا ارادہ بھی کر لے تو وہ اس میں بہت بڑا بوجھ محسوس کرتی ہے' چاہے وہ خود اسلام کی طرف بڑھنا چاہے یا اس کا خاوند اور باپ اسے اسلام کی طرف بڑھانے کی ہدایت کریں۔

قرن اول میں مرد عورت اور معاشرے ایک ہی تصور کے زیر نگیں تھے۔ ان پر اسلام کی حکمرانی تھی' شکل ایک تھی اور اسلام عمل میں موجود اور نافذ تھا۔ آج مرد مومن کی حالت یہ ہے وہ ایک ایسے ایمانی تصور کی حکمرانی چاہتا ہے جو عملاً موجود نہیں ہے۔ اور معاشرہ عملاً جاہلیت کا معاشرہ ہے۔ اس معاشرے کا دباؤ مرد کے مقابلے میں عورت پر زیادہ ہے۔ جدید معاشرہ عورت کو بڑی تیزی سے گمراہ کر رہا ہے۔

اس نکتے پر آکر پھر مرد کی ذمہ داری بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے اسے خود اپنے آپ کو بھی بچانا ہے اور اپنے اہل و عیال کو بھی بچانا ہے' پھر ایسے حالات میں کہ بیوی اور بچے ایسے ماحول میں گھرے ہوئے ہیں کہ ان پر ہر طرف سے جاہلیت کا حملہ ہے۔

اس لیے آج کے مسلمان کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس کو اصلاح کے لیے قرن اول کی جماعت مسلمہ کے مقابلے میں ہزار ہا گنا زیادہ جدوجہد کرنی ہوگی' اس لیے جو شخص آج کے دور میں کوئی اسلامی قلعہ تعمیر کرنا چاہتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ ایک ایسا گھر تعمیر کرنے کے ارادے سے پہلے اپنے لیے اس قلعے کا ایسا چوکیدار تلاش کرے' جس کے تصورات اور نظریات ویسے ہی ہوں جیسے اس کے اپنے تصورات ہوں۔ اس سلسلے میں ایک انقلابی خاوند کو پھر کچھ قربانیاں دینی ہوں گی۔ پہلی قربانی یہ ہوگی کہ وہ خوبصورت کی تلاش نہ کرے' مالدار کی تلاش نہ کرے' جھوٹی ملمع کاری پر خوش نہ ہو۔ اسے چاہئے کہ وہ دین دار عورت کی تلاش کرے جو اس کے ساتھ مل کر' ایک مسلم گھرانے کی تشکیل کرے اور ایک مسلم قلعے کی تعمیر کرے۔ اور بچوں کے جو باپ ہیں ان کا بھی فرض ہے کہ وہ جو قلعے بناتے ہیں وہ بھی اپنی اولاد اور اہل و عیال کی طرف متوجہ ہوں۔ کسی دوسرے کو دعوت دینے سے پہلے اپنے بچوں' بیٹوں' بیٹیوں اور پوتیوں کی طرف توجہ کریں۔ اور اللہ جو پکار کر کہہ رہا ہے' اس پر عمل کریں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا (٦٦ : ٦) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے نفس اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ"۔

ایک بار پھر میں اس بات کی طرف آتا ہوں کہ اسلام ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنا چاہتا ہے جس کے اوپر اسلام کی حکمرانی ہو' جس کے اندر اسلام کا واقعی وجود ہو۔ اس کا طریق کار اسلام نے یہ اختیار کیا ہے کہ ایک ایسی جماعت ہو جس کا عقیدہ اسلام ہو' جس کا نظام اسلام ہو' جس کا قانون اسلامی ہو' جس کا منہاج زندگی اسلامی ہو' اور وہ اپنے تمام تصورات تعلیمات اسلام سے اخذ کرے۔

اسلامی تصور حیات کی کا خزانہ یہ جماعت ہوتی ہے۔ یہ اس کی محافظ ہوتی ہے اور یہ اسے دوسروں تک منتقل کرتی ہے۔ اور ہر قسم کے جاہلی دباؤ کے مقابلے میں یہ اس کا دفاع کرتی ہے اور اس جماعت کو اس اذیت سے بچاتی ہے۔

لہٰذا ایک اسلامی جماعت یا اسلامی سوسائٹی کا قیام ضروری ہے 'جس کے اندر ایک مسلمہ زندہ رہے اور اس پر اس کے ماحول کی جاہلیت کا اثر نہ ہو' دباؤ نہ ہو 'اس طرح یہ عورت اسلامی تقاضوں اور جاہلیت کے مطالبات کی کشمکش سے باہر نکل آئے گی ۔ ایسے حالات میں اگر ایک مسلم مرد نوجوان اور یہ مسلمہ مل کر ایک اسلامی قلعہ تعمیر کریں تو ایسے قلعوں سے اسلامی بلاک اور اسلامی محاذ تشکیل پا سکتا ہے ۔

یہ ایک ضرورت ہے 'فرض ہے' محض نفل نہیں ہے کہ ایک ایسی اسلامی سوسائٹی قائم ہو' جو باہم ایک دوسرے کو حق اور اسلام کی نصیحت کرے 'اپنی فکر کو نشو و نما دے 'اپنے اخلاق و آداب کو عملاً جاری کرے اور اس سوسائٹی کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ اسلامی رنگ میں زندہ رہیں ۔ اسلام کے لیے زندہ ہوں' اسلام کے محافظ ہوں' اسلام کے داعی ہوں ۔ اور اہل جاہلیت میں سے جن کو وہ اپنی سوسائٹی کی طرف بلائیں ان کو نظر آئے کہ ان لوگوں کی جماعت اور ان کی سوسائٹی کے اندر ایک زندہ اسلام ہے تاکہ وہ اندھیروں سے اللہ کے حکم سے نور کی طرف نکل آئیں اور یہ سوسائٹی اسی طرح بڑھتی رہے کہ اللہ اسلامی انقلاب برپا کر دے اور پھر آئندہ اسلامی انقلاب کے رنگ میں اس جماعت اور اس کے زیر تربیت آئندہ نسلیں تیار ہوں ۔

مدینہ میں مسلمانوں نے ایسی ہی جماعت بنائی تھی 'اور ایسا ہی انقلاب برپا کر دیا تھا' اس لیے یہاں اس کے بچانے کی ہدایت کی جاتی ہے 'کیونکہ کفار اور منافقین اس کو ختم کرنا چاہتے تھے ۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ (٦٦ : ٩) "اے نبی 'کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ ۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے" ۔ پہلے یہ حکم دیا گیا کہ مسلمان اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم سے بچائیں ' خالص توبہ کریں جس کی وجہ سے ان کے گناہ معاف ہوں گے ۔ اور وہ جنتوں میں داخل ہوں گے 'جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں ۔ اب حکم یہ ہے کہ کفار و منافقین کے ساتھ جنگ کرو ' اس لیے کہ وہ اس قسم کی اسلامی سوسائٹی کے قیام سے خائف ہیں 'جس میں اسلام کے شیدائی تیار ہوں ۔ وہ اس قسم کی سوسائٹی پر حملہ آور ہوتے ہیں ۔ جیسا کہ مدینہ میں بھی کفار اور منافقین کا یہی ہدف تھا اور آج بھی یہی ہے اور آئندہ بھی یہی ہو گا ۔

یہاں کفار اور منافقین دونوں کے ساتھ جہاد اور سختی کا حکم دیا گیا ہے ۔ کیونکہ دونوں اسلامی سوسائٹی کے انہدام کے لیے ایک ہی جیسے مقاصد رکھتے ہیں ۔ لہٰذا دونوں پر سختی کی ضرورت ہے ۔

وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ (٦٦ : ٩) ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے" ۔ یوں ان دونوں باتوں کے درمیان ربط ہو جاتا ہے ۔

اس کے بعد اب تیسرا دور آتا ہے ۔ اس سورت کا یہ آخری دور ہے ۔ اور یہ تیسرا دور بھی پہلے دور کا تکمیلی دور ہے ۔ یہ انبیاء کے گھروں میں کافر عورتوں اور کفار کے گھروں میں مومن عورتوں کی بات کرتا ہے ۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ

امْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا
فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ﴿۱۰﴾
وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ
عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۱﴾ وَ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ ۱
رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴿۱۲﴾ ع
۲۰

"اللہ کافروں کے معاملہ میں نوح ؑ .... اور لوط ؑ .... کی بیویوں کو بطور مثال پیش کرتا ہے۔ وہ ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں، مگر انہوں نے اپنے ان شوہروں سے خیانت کی اور وہ اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ بھی نہ کام آ سکے۔ دونوں سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی چلی جاؤ اور اہل ایمان کے معاملہ میں اللہ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے۔ جب کہ اس نے دعا کی "اے میرے رب، میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچا لے اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات دے"۔ اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال دیتا ہے جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی، پھر ہم نے اس کے اندر اپنی طرف سے روح پھونک دی، اور اس نے اپنے رب کے ارشادات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں سے تھی"۔

حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویوں کے بارے میں جو یہ آیا ہے کہ انہوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے خاوندوں کی دعوت کے خلاف کام کیا۔ یہ نہ تھا کہ وہ کسی فحاشی کی مرتکب ہوئی تھیں۔ نوح علیہ السلام کی بیوی بھی دوسرے مزاح کرنے والوں کے ساتھ اپنے شوہر کے ساتھ مزاح کرتی تھی۔ اور لوط علیہ السلام کی بیوی نے ان کے مہمانوں کی اطلاع اوباشوں کو دی، حالانکہ اس کو معلوم تھا کہ حضرت لوط علیہ السلام اس بدفعلی کے خلاف ہیں۔

فرعون کی عورت کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ یہ مومنہ تھی۔ شاید یہ ایشیائی ہوگی اور دین موسیٰ کو ماننے والی ہوگی۔ تاریخ میں آتا ہے کہ بادشاہ مصر امنحوتب چہارم کی والدہ ایشیائی تھیں اور یہ مصریوں کے دین پر نہ تھیں۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس نے مصریوں کے لیے ایک خدا تجویز کیا اور سورج کی ٹکیہ کو اس کے لیے رمز بنایا اور اس نے اپنے آپ کو اخناتون کا لقب دیا۔ بہرحال یہ عورت مراد ہے، یا موسیٰ علیہ السلام کا جو فرعون تھا اس کی بیوی مراد ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون امنحوتب نہ تھا۔

یہاں ہمیں فرعون کی عورت کی تاریخی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کریم نے جو اشارہ کر دیا ہے وہ کافی ہے۔ نام یا اشخاص تو اصولوں کے لیے مثال ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نام اور اشخاص اکثر ترک کرتا ہے۔ یہ حکم دینے کے بعد کہ

اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو بچانے کی سعی کرو' یہ اصول بہرحال دہرایا جاتا ہے کہ ہر شخص اپنے کیے کا ذمہ دار خود ہے۔ ازواج مطہرات اور ازواج مومنین سے کہا جاتا ہے' اپنے انجام کی فکر کرو' محض اس لیے کسی کو نہ چھوڑا جائے گا کہ وہ نبی کا بیٹا ہے یا وہ نبی کی بیوی ہے یا کسی صالح شخص کا بیٹا ہے یا بیوی ہے۔

ذرا دیکھو نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویوں کو۔

كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ (٦٦ : ١٠) "وہ ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں' مگر انہوں نے اپنے ان شوہروں سے خیانت کی اور وہ اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ بھی نہ کام آسکے۔ دونوں سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی چلی جاؤ"۔ کفر کے معاملے میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہے اور نہ کفر و ایمان میں کوئی سفارش چلتی ہے۔ اگر اسلامی نظریہ حیات کے ساتھ کوئی خیانت کرے گا تو وہ نبی کی بیوی کیوں نہ ہو' جہنم رسید ہو گی۔

دیکھیے فرعون کی بیوی کو' کفر کا طوفان متاثر نہ کر سکا حالانکہ وہ اس طوفان میں زندگی بسر کر رہی تھی' فرعون کے محل میں۔ وہ اس سے نجات طلب کرتی تھی اور حقیر فرعون کے مقابلے میں جنت میں محل چاہتی تھی۔ اور وہ فرعون کے کفر کے ساتھ نہ تھی' اس سے نجات طلب کر رہی تھی' اور اس کی خواہشات یہ تھیں:

اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (٦٦ : ١١) "جب اس نے کہا اے میرے رب' میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچالے اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات دے"۔

فرعون کی مومنہ بیوی کی دعا ایک مثال ہے اس بات کی کہ جب ایمان راسخ ہو جاتا ہے تو ایک مومنہ دنیا کی اعلیٰ ترین زندگی پر لات مار دیتی ہے۔ فرعون مصر اپنے دور میں دنیا کے بڑے بادشاہوں میں شمار ہوا کرتا تھا۔ اور قصر فرعون میں ایک عورت سب سے اونچا ساز و سامان پاتی ہے۔ لیکن ایمان کی وجہ سے وہ اس سے بھی اونچی پرواز کرتی ہے۔ وہ اسے عیش و عشرت نہیں سمجھتی بلکہ ایک گندگی سمجھتی ہے۔ اور اس زندگی سے پناہ مانگتی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ اس سے نجات پائے۔

یہ ایک نہایت ہی عظیم مملکت کی خاتون اول ہے۔ اور یہ اس کی عظیم امتیازی خصوصیت ہے' کیونکہ عورت ہمیشہ معاشرتی دباؤ اور اثر کو قبول کرتی ہے لیکن یہ اکیلی عورت اس عظیم دباؤ کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑی ہے۔ اس پر معاشرے کا دباؤ ہے' اس پر محل کا دباؤ ہے' اس پر مملکت کا دباؤ ہے' اس پر بادشاہ کے وزراء اور حاشیہ نشینوں کا دباؤ ہے' اور اس پر بادشاہ کی ملکہ ہونے کے منصب کا دباؤ ہے' لیکن اس ہمہ جہت دباؤ کے مقابلے میں' یہ عظیم عورت اپنا سر آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے ہے' اور کفر کے اس عظیم سمندر کے اندر ایک چھوٹے سے تختے پر بیٹھی ہے اور اس کا دامن ان تمام آلودگیوں سے تر نہیں ہو رہا ہے۔ کس قدر عظیم ہے وہ!!

اللہ کے لیے خالص ہو جانے کی یہ ایک نہایت ہی اعلیٰ مثال ہے' کہ وہ تمام موثرات کا مقابلہ کر رہی ہے۔ تمام

تعلقات کا مقابلہ کر رہی ہے' تمام رکاوٹوں کو عبور کر رہی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی لازوال کتاب میں وہ اپنا نام لکھوا گئی ۔ اور جب اس کتاب کے نزول کے وقت اس عورت کا نام پکارا جارہا ہو گا کہ اس عظیم کائنات کی لامحدود وادیوں میں اس کی گونج مچی ہو گی ۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ (۶۶ : ۱۲) "عمران کی بیٹی مریم" یہ بھی آغاز ہی سے پارسا خاتون تھیں ۔ قرآن کریم نے دوسری سورتوں میں ان کی تعریف کی ہے ۔ یہاں ان کی پاکیزگی سیرت کی بات ہے ۔

الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (۶۶ : ۱۲) "جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی" ۔ یہودی آپ پر الزامات عائد کرتے تھے' قرآن کریم آپ کی برأت کا اعلان کرتا ہے ۔

فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (۶۶ : ۱۲) "پھر ہم نے اس کے اندر اپنی طرف سے روح پھونکی" ۔ اور اس روح کے نتیجے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے' جیسا کہ سورہ مریم میں اس کی تفصیلات گزر گئی ہیں ۔ یہاں ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ۔ کیونکہ یہاں مقصد صرف آپ کی طہارت اور آپ کے ایمان کامل کو ثابت کرنا ہے ۔

وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ (۶۶ : ۱۲) "اور اس نے اپنے رب کے ارشادات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں سے تھی" ۔

یہاں امراۃ فرعون کا علیحدہ ذکر کرنا' پھر اس کو حضرت مریم علیہ السلام کے ساتھ برابری کی سطح پر ذکر کرنا' اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کے نزدیک فرعون کی بیوی کا مرتبہ بھی بہت بلند تھا' کیونکہ وہ نہایت ہی مشکل حالات میں راہ ایمان پر جمی ہوئی تھی ۔ بہرحال نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات کے سامنے یہ دو نمونے رکھے جاتے ہیں کہ آپ لوگوں کا کردار اس قدر بلند ہونا چاہئے اور اہل ایمان کو قیامت تک یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلامی سوسائٹی کو قائم کرنا ہے تو اس کے لیے باکردار اور مسلم خواتین پیدا کرو ۔

بہرحال آخر میں ہم دوبارہ اس طرف قارئین کی توجہ مبذول کراتے ہیں کہ یہ سورت اور یہ پورا پارہ بہترین اور زندہ مثال ہے نبی کریم کی سیرت کی ۔ اور ان سورتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام اور صحابیات کی جو جماعت تیار کی' تاریخ انسانی میں اس کی مثال نہیں ہے ۔ پھر قرآن کریم نے سیرت النبی کے واقعات کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ قرآن کا منفرد انداز ہے ۔ ایک جزوی واقعہ کو مخصوص حالات سے نکال کر اور زمان و مکان کا رنگ اڑا کر قرآن اس کو ایک ابدی اصول کے طور پر پیش کرتا ہے ۔ یہ کام قرآن ہی کر سکتا ہے ۔ پڑھنے والا اسے ایک واقعہ کے پس منظر میں پڑھ کر سمجھتا ہے' لیکن قرآن اس سے جو نتائج اخذ کرتا ہے' وہ کلی ہوتے ہیں ۔

صدق اللہ العظیم

---○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۲۹

سورہ الملک - ٦٧

۱ ــ تا ــ ۳۰

سورۃ الملک ایک نظر میں

یہ پورا پارہ ہی مکی سورتوں پر مشتمل ہے جیسا کہ اس سے پہلے کا مکمل پارہ مدنی سورتوں پر مشتمل تھا۔ مکی اور مدنی سورتوں کا اپنا اپنا ذوق اور اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس پارے کی بعض سورتوں کے ابتدائی حصے ایسے ہیں جو ابتدائی حصے کے ٹکڑے ہیں مثلاً سورہ المزمل اور سورہ المدثر کی ابتدائی آیات۔ ان میں سے بعض سورتیں ایسی ہیں جو بعثت کے تین سال بعد نازل ہوئی ہیں' مثلاً سورہ القلم بعض بعثت کے دس سال بعد نازل ہوئی ہیں' جیسا کہ سورہ جن' جس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ یہ سفر طائف سے واپسی پر نازل ہوئی' جہاں آپ کو بنو ثقیف نے بہت ہی اذیت دی۔ اللہ نے جنوں کا ایک طائفہ آپ کی طرف موڑ دیا' اس وقت آپ نہایت دل سوز انداز میں قرآن پڑھ رہے تھے۔ سورہ الجن میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے' جو اسی پارے میں ہے۔ طائف کا سفر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد ہوا' یعنی ہجرت سے ایک سال قبل یا دو سال قبل' اگرچہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ سورت آغاز بعثت میں نازل ہوئی ہے اور یہی راجح ہے۔

مکی قرآن کا موضوع اور محور بالعموم اسلامی عقیدۂ توحید' وحی الٰہی پر یقین اور آخرت کے حساب و کتاب پر یقین ہوتا ہے۔ اس تصور کے مطابق پھر اس کائنات کے بارے جو نظریہ بنتا ہے اور اس پوری کائنات اور خالق کائنات کا باہم تعلق اور خالق کائنات کی ایسی تعریف کی۔ خالق کائنات کا شعور انسانی تصور اور عقائد میں زندہ' موثر اور فعال ہو اور یہ تصور انسان اور خدا کے درمیان عبد و معبود کا تعلق قائم کرتا ہو۔ پھر اس تصور کے مطابق ایک بندہ اس دنیا کی تمام اشیاء کی قدر و قیمت متعین کرتا ہو۔ اس سے قبل کی مکی سورتوں میں اس قسم کے افکار ہم نے مطالعہ کیے ہیں۔ اس پارے میں بھی "آفاقی ایمان" کے نمونے موجود ہیں۔

یہ تو تھا موضوع اور حال مکی قرآن کا۔ رہا مدنی قرآن تو اس کا موضوع' ان عقائد تصورات اور پیمانوں کے مطابق عملی زندگی اور نظام کی تشکیل ہے۔ مدینہ میں اہل ایمان کو زندگی کی عملی کشمکش میں ڈال کر دین اور شریعت کی امانت اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ مدنی قرآن ایک کشمکش پیہم ہے جو ایمان و ضمیر کے میدان میں بھی ہے اور زندگی کے عملی مظاہر میں بھی ہے۔ اس عملی کشمکش کا مطالعہ ہم نے اس سے قبل مدنی سورتوں میں کیا ہے اور خصوصاً گزشتہ پارے میں اس کی بڑی تفصیلات مطالعہ کیں۔

یہ سورت اس کائنات کے بارے میں انسان کو بالکل ایک نیا تصور دیتی ہے اور یہ متعین کرتی ہے کہ اس کا خالق کائنات سے تعلق کس نوعیت کا ہے۔ یہ تصور نہایت وسیع اور جامع اور مانع ہے۔ یہ اس زمین کے چھوٹے سے کرے سے بہت زیادہ متجاوز اور وسیع ہے۔ اور اس دنیا کی مختصر زندگی سے بھی متجاوز اور وسیع ہے۔ اسی سلسلے میں انسان کو بتایا جاتا ہے کہ آسمانوں میں بڑے بڑے جہاں آباد ہیں اور اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے اور انسانوں اور پرندوں کے علاوہ اور مخلوقات بھی ہیں مثلاً جن' اور اس جہاں کے بعد دوسرا جہاں بھی ہے' جہاں جنتیں اور ان کے خدم و حشم اور نوکر

جاکر اور دوزخ اور اس کے داروغے اور چوکیدار و حوالدار اور عالم شہادت جس کے ساتھ لوگوں کے دل معلق ہیں' کے علاوہ عالم غیب کے کئی جہاں ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے اور جن کے ساتھ صرف مومنین کے دل معلق ہوتے ہیں ۔ پھر اس جہاں میں پائے جانے والے معجزات اور انسانوں کے نفوس کے اندر پائے جانے والے معجزات جن کے اوپر سے انسان نہایت ہی غفلت کے ساتھ گزر جاتا ہے ۔ یہ سب اس سورت کے موضوعات و مضامین ہیں ۔

اس سورت کا اہم کام اور ہدف یہ ہے کہ یہ انسانی قلب و نظر سے 'وہ تمام تصاویر 'نقوش اور وہ تمام تصورات کھرچ کر دور کرتی ہے' جو جاہلیت کے پسماندہ' جامد' غیر معقول افکار کی وجہ سے قلب و نظر پر تہ بہ تہ جمع ہوئے تھے ۔ یہ سورت ان افکار میں نقب لگاتی ہے 'فکر و نظر سے ان کے غبار کو صاف کرتی ہے اور انسانی حواس ' انسانی عقل اور انسانی بصیرت کو جلا دیتی ہے ۔ انسان کو اس کائنات میں پھراتی ہے' اسے نفس انسانی کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے' فضائے کائنات کا سفر کراتی ہے' آسمانوں کے طبقات و مقامات اور ابعاد دکھاتی ہے ۔ زمین کے اوپر پانیوں کی روانی' اور اس میں پھر عالم الغیب کے جو حقائق کی تصویر کشی اور اللہ کا دست قدرت کام کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ اس میں قدرت کی قوت سے ہر چیز متحرک اور دوڑتی نظر آتی ہے ۔ انسان جب اس سورت کے اندر سفر کرتے ہوئے اس کے آخر سے نکلتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بہت ہی بڑا ہے ۔ یہ کائنات بہت وسیع ہے ۔ اس زمین کے اوپر آسمان ہیں اور آسمانوں کے اوپر اور جہاں ہیں ۔ مظاہر قدرت کے پیچھے حقائق قدرت ہیں اور یہ کہ یہ کائنات جامد نہیں ہے' متحرک ہے اور یہ حرکت اللہ کی قدرت کی وجہ سے ہے ۔ زندگی کی حرکت اور زندوں کی حرکت عبارت ہے اس کائنات سے ۔

زندگی اور موت کیا ہے ؟ رات اور دن باہم موت و حیات کو دیکھ رہے ہیں' لیکن یہ سورت ہمیں موت و حیات کے پردے کے پیچھے لے جاتی ہے کہ حیات اور موت کے پیچھے تقدیر الہٰی اور اللہ کا نظام قضا و قدر کار فرما ہے ۔ وہ تمہیں اس زمین پر آزما رہا ہے ۔ وہ حیات و کائنات کا مدبر ہے ۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ (۶۷ : ۲) "جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی ہے" ۔

اور آسمان ایک عظیم مخلوق ہے' جو ہماری جاہل آنکھوں کے سامنے ہے' یہ جاہل آنکھیں اس سے آگے بڑھ کر اس دست قدرت کو دیکھ نہیں پاتیں 'جس نے آسمان اور زمین ایجاد کیا ہے ۔ ہماری ان جاہل آنکھوں کو اس آسمان کے اندر کوئی کمال نظر نہیں آتا ہے ۔ لیکن یہ سورت انسانی فکر میں ارتعاش پیدا کر کے اس پر غور و فکر اور تامل کی دعوت دیتی ہے ۔ اور یاد دہانی کراتی ہے کہ اس آسمان کے کمال و جمال پر ذرا غور کرو' اور اس کی حرکات کیسی ہیں اور ان کے مقاصد کیا ہیں ۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ (۳) ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا

وَّهُوَ حَسِيْرٌ (٤) وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ

(٥) (٦٧: ٣ تا ٥) ”جس نے تہ بہ تہ آسمان بنائے۔ تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔ ہم نے تمہارے قریب کے آسمان کو عظیم الشان چراغوں سے آراستہ کیا ہے اور انہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ بنا دیا ہے“۔

افکار جاہلیت میں یہ دنیا ہی اس کائنات کے وجود کا مقصد ہے اور بس یہی آخری چیز ہے۔ لیکن یہ سورت ایک دوسرے جہاں سے نہایت موثر انداز میں پردہ اٹھاتی ہے، جو شیاطین اور کافرین کے لیے تیار کردہ ہے۔ یہ ایک زبردست خوفناک جہاں ہے۔ جہنم کا ایک منظر آتا ہے جو حرکت، انتظار اور بھاگ دوڑ سے بھرپور ہے۔

وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ (٥) وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (٦) اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ (٧) تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ (٨) قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ (٩) وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (١٠) فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ

السَّعِيْرِ (١١) (٦٧: ٥ تا ١١) ”ان شیطانوں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہم نے مہیا کر رکھی ہے اور جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ جب وہ اس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دہاڑنے کی ہولناک آواز سنیں گے اور وہ جوش کھا رہی ہوگی، شدت غضب سے پھٹی جاتی ہوگی۔ ہر بار جب کوئی انبوہ اس میں ڈالا جائے گا تو اس کے کارندے ان لوگوں سے پوچھیں گے ”کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟“ وہ جواب دیں گے ”ہاں، خبردار کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اسے جھٹلا دیا اور کہا اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا ہے، تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو“۔ اور وہ کہیں گے ”کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے“۔ اس طرح وہ اپنے قصور کا خود اعتراف کرلیں گے، لعنت ہے ان دوزخیوں پر“۔

فکر جاہلیت کے اندر انسانوں کی سوچ صرف اس زندگی تک محدود ہوتی ہے، اور وہ عالم غیب کی طرف اپنی سوچ کا رخ پلٹاتے ہی نہیں کہ عالم غیب کے اندر کیا کیا مستور ہے۔ جاہلیت کی فکر اس دنیا میں قید ہوتی ہے، اور یہ زمین جو اس فکر کے نزدیک ثابت ہے اور برقرار ہے، یہ یونہی ہے، یہ سورت انسانی فکر و نظر کو کھینچ کھینچ کر عالم غیب اور عالم سموات کی طرف لے جاتی ہے اور قدرت الٰہیہ کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اگرچہ ذات باری کو کسی نے دیکھا نہیں ہے، لیکن وہ ذات قادر مطلق ہے، جو چاہے کرے، جہاں چاہے کرے، اور جب چاہے کرے۔ یہ سورت اس زمین کو بھی حرکت دیتی ہے جسے وہ ساکن اور جامد سمجھتے ہیں، اور اس پر مطمئن چلتے پھرتے ہیں اور اس کی سرگرمیوں میں غرق ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ (١٢) وَ اَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (١٣) اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (١٤) ع هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَ اِلَيْهِ النُّشُوْرُ (١٥) ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ (١٦) اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ (١٧) (٦٧: ١٢ تا ١٧) "جو لوگ بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں' یقیناً ان کے لیے مغفرت ہے اور بڑا اجر۔ تم خواہ چپکے سے بات کرو یا اونچی آواز سے (اللہ کے لیے یکساں ہے) وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔ کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ باریک بین اور باخبر ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے' چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق' اسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔ کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے' تمہیں زمین میں دھنسا دے اور یکایک یہ زمین جھکولے کھانے لگے؟ کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے؟ پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میری تنبیہہ کیسی ہوتی ہے"۔

پرندے' رنگ برنگ کے پرندے اللہ کی مخلوقات ہیں اور انسان ان کو دیکھتے ہیں اور رات دن دیکھتے ہیں۔ لیکن ان پرندوں کی حقیقت اور تخلیق پر بالکل غور نہیں کرتے۔ یہ سورت ان کے دامن کو پکڑ پکڑ کر ان کو کہتی ہے کہ ذرا ان پرندوں پر غور تو کرو' اور اللہ کی قدرت کو دیکھو کہ اس نے ان کی صورتیں کیسی پیاری بنائی ہیں۔ اور ان کو قوتیں کیسی دی ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ يَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ (٦٧: ١٩) "کیا یہ لوگ اپنے اوپر اڑنے والے پرندوں کو پر پھیلاتے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے۔ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو؟ وہی ہر چیز کا نگہبان ہے"۔

یہ لوگ اپنے گھروں میں بے فکر بیٹھے ہوئے ہیں' اللہ کی قدرت اور اللہ کے نظام قضا و قدر سے غافل پڑے ہیں۔ لیکن یہ سورت ان کو اس جمود اور بے حسی کی نفسیاتی حالت سے نکالتی ہے' جبکہ وہ ان کے پاؤں کے نیچے زمین کو بھی ہلا مارتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ تم ہر طرف سے اللہ کے قہر اور اللہ کے جبروت میں گھرے ہوئے ہو۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ (٦٧: ٢٠) "بتاؤ' آخر وہ کون سا لشکر تمہارے پاس ہے جو رحمٰن کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں"۔

یہ رزق جو یہ رات دن کھاتے ہیں' ان کے خیال میں بھی یہ ان کی زندگی کا قریبی سبب ہے۔ اور اس دنیا میں ان کے سارے تنازعے اس رزق ہی پر ہیں۔ یہ سورت ان کی توجہ بہت دور ان ظاہری اسباب سے پیچھے حقیقی اسباب کی طرف مبذول کراتی ہے۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ (۶۷: ۲۱)

"یا پھر بتاؤ' کون ہے جو تمہیں رزق دے سکتا ہے' اگر رحمٰن اپنا رزق روک لے؟ دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز کرنے پر اڑے ہوئے ہیں"۔

یہ اپنی گمراہی میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں جبکہ در حقیقت وہ گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ سورت ان کی تصویر اور لئل ہدایت کی تصویر کھینچتی ہے۔ نہایت موثر اور اشاراتی انداز میں۔

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ

(۶۷: ۲۲) "بھلا سوچو' جو شخص منہ اوندھائے چل رہا ہو' وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ جو سر اٹھائے سیدھا ایک ہموار سڑک پر چل رہا ہو"۔

اللہ نے ان کو سوچنے سمجھنے کی استعداد دی ہے لیکن یہ اس سے استفادہ نہیں کرتے اور وہ جن چیزوں کو حواس سے دیکھتے ہیں ان کے ظاہری قالب اور صورت کے پیچھے وہ اصل حقائق دیکھنے کے لئل نہیں۔ یہ سورت ان کو یاد دہانی کراتی ہے' کہ اللہ نے تم کو کیسی کیسی نعمتیں دی ہیں' کیسی کیسی قوتیں دی ہیں' اور حکم دیا ہے کہ اپنی ان قوتوں کو کام میں لاؤ اور مستقبل کے لیے ان کو کام میں لاؤ' اور اس کائنات کی اصل غرض و غایت کو معلوم کرو۔

قُلْ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۶۷: ۲۳) "ان سے کہو' اللہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا' تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیئے مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو"۔ ان سے کہو وہ اللہ ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا ہے اور اسی کی طرف سمیٹے جاؤ گے۔

یہ لوگ بعث بعد الموت اور حشر و نشر کو جھٹلاتے ہیں اور چڑ کر حشر کا وقت پوچھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے سامنے حشر و نشر کی ایک تصویر کھینچ دی جاتی ہے۔

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲۵) قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۲۶) فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِیْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَقِیْلَ هٰذَا الَّذِیْ

كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ (۲۷) (۶۷: ۲۵ تا ۲۷) "یہ کہتے ہیں "اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پورا ہو گا"۔ کہہ دیجئے "اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے 'میں تو بس صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں"۔ پھر جب یہ اس چیز کو قریب سے دیکھ لیں گے تو ان سب لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے جنہوں نے انکار کیا ہے اور اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم تقاضے کر رہے تھے"۔

یہ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہلاک ہو جائیں ' آپ ؐ کے ساتھی مسلمان بھی ختم ہو جائیں اور یہ آواز جس نے ان کی نیندیں حرام کر دی ہیں 'یہ ختم ہو جائے حالانکہ یہ تو نصیحت ہے 'جمود کو توڑنے والی آواز ہے ۔سوئے ہوؤں کو جگانے والی آواز ہے ۔یہ سورت بتاتی ہے کہ اگر پیغمبر ہلاک ہو جائے اور آپ کے سب رفقاء ہلاک ہو جائیں تو کفر اور تکذیب پر جو تمہیں عذاب ملنے والا ہے اس سے تمہیں کون بچائے گا۔ لہٰذا ان کے لیے مناسب ہے کہ وہ قیامت کے آنے سے قبل ہی اپنے معاملات پر غور کر لیں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۲۸) قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۲۹) (۶۷: ۲۸ تا ۲۹) "ان سے کہو' وہ بڑا رحیم ہے 'اسی پر ہم ایمان لائے ہیں 'اور اسی پر ہمارا بھروسہ ہے 'عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ صریح گمراہی میں پڑا ہوا کون ہے"۔

آخر میں ان کو دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر اللہ صرف ایک پانی کو بند کر دے جس پر تمہاری زندگی موقوف ہے اور یہ اللہ کا جاری کردہ ہے تو تمہارا کیا بنے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ (۶۷: ۳۰) "ان سے کہو 'کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمہارے کنوؤں کا پانی زمین میں اتر جائے تو کون ہے جو اس پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمہیں نکال کر لا دے گا؟"

غرض پوری سورت حرکت ہے 'حس کی حرکت 'احساس کی حرکت 'فکر کی حرکت اور شعور کی حرکت ۔اس سورت کا محور اور کنجی اس کا پہلا فقرہ ہے ۔جو نہایت جامع اور معنی خیز ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ (۶۷: ۱) "نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں سلطنت ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ تمام صورتیں اور تمام مناظر جو اس سورت میں پیش کیے گئے ہیں یہ اسی دست قدرت کی کارستانیاں ہیں۔ تمام ظاہر اور غائب حرکات جن سے انسان کا قلب متاثر ہوتا ہے ان کا محرک وہی قدرتوں والا ہے۔

اللہ کی بادشاہت اور قدرت کا سب سے بڑا کارنامہ موت و حیات کی تخلیق ہے۔ پھر انسانوں کو اس جہاں میں آزمانے کے لیے بھیجا ہے۔ پھر اللہ کی قدرت کی بڑی نشانی آسمانوں کے اندر خوبصورت چراغ پیدا کرنا اور شیطانی قوتوں

کے اوپر شہاب ثاقب چھوڑتا ہے ۔ اور پھر اللہ کی قدرتوں کا ایک نمونہ جہنم کی تیاری ہے اور جہنم کے اوپر زبردست داروغوں کا تقرر ہے ۔ پھر اللہ کی قدرت کا مظہر سب کچھ جاننا اور زمین کو انسانوں کے لیے مسخر کرنا ہے ۔ پھر انسانی تاریخ میں مکذبین پر آنے والے عذاب خسف اور پتھروں کی بارش' پھر پرندوں کا ہوا کے اوپر سوار ہونا ۔ پھر اللہ کی قہاری و جباری اور تمام کائنات پر حاوی ہونا ۔ لوگوں کی تخلیق' ان کے لیے رزق کی تخلیق' انسانوں کی شخصیت میں سننے' دیکھنے اور سوچنے کی قوتیں پیدا کرنا' زمین میں لوگوں کو دفن کرنا اور پھر اٹھانا ۔ آخرت کا علم صرف اس کے لیے محفوظ ہونا اور کافروں کو عذاب دینا اور لوگوں کے لیے زمین میں پانی کے چشمے جاری کرنا اور انہیں خشک کر دینا' یہ سب کچھ اللہ کی قدرت اور بادشاہت کے کارنامے ہیں ۔

غرض یہ پوری سورت اور اس کے موضوعات اور اس کی تمام تصویریں اور تمام اشارات اسی پہلے فقرے کی تشریح ہیں اور اللہ کے نظام اور مملکت اور بادشاہت کے مختلف پہلو ہیں ۔

تَبٰرَكَ الَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرُ (۶۷ : ۱) "نہایت بزرگ اور برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

اس سورت میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں اور جو ارشادات دیئے گئے ہیں' وہ اس میں مسلسل جوش و خروش سے اٹھتے ہیں' موجوں پر موجیں حقائق لے کر اٹھ رہی ہیں ۔ اور اس پہلے فقرے کی تشریح کر رہی ہیں ۔ اس لیے اس سورت کو ہم مختلف اسباق میں تقسیم نہیں کر سکتے ۔ اب ذرا آیات کی تفصیل!

---○○○---

درس نمبر ۲۶۷ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۳۰

سُورَةُ الْمُلْكِ مَكِّيَّةٌ
آیاتہا ۳۰　رکوعاتہا ۲
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

سورت کے آغاز میں اللہ کی برکات پر مشتمل یہ سپاس نامہ اس بات پر دال ہے کہ اللہ کی برکتیں اور اللہ کے کرم اور اللہ کے فیوض کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اللہ کی برکتیں اللہ کی سلطنت میں ہیں اور اس کی بادشاہت میں کوئی کمی نہیں۔ اللہ کی ذات اور اللہ کی صفات کی برکات کا فیض عام اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے اور یہ پوری کائنات اس کا حمد گا رہی ہے اور اس لا انتہا وجود کی وادیوں میں اس کی گونج ہے۔ قلب مومن ان برکتوں سے لبالب ہے اور یہ کائنات اس کتاب الٰہی کے ذریعہ قلب مومن پر نازل ہوتی ہے اور اس پوری کائنات میں ان کا ظہور ہے۔

بِيَدِهِ الْمُلْكُ (۶۷ : ۱) "جس کے ہاتھ میں سلطنت ہے"۔ وہ اس کائنات کا مالک ہے' اس کا اس نے احاطہ کر رکھا ہے۔ اس کی چوٹی کے بال اس کے ہاتھ میں ہیں' وہ اس میں متصرف ہے۔ یہ ہے اصل حقیقت کہ اس پوری کائنات کا بادشاہ وہی ہے جب یہ حقیقت انسانی ضمیر میں بیٹھ جاتی ہے تو یہ اپنی راہ خود بخود متعین کر دیتی ہے اور اس کے بعد پھر کوئی بھی اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کے لیے فارغ نہیں ہوتا۔ پھر وہ ایک ہی آقا' ایک معبود اور ایک ہی بادشاہ کا قائل ہوتا ہے۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶۷ : ۱) "اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ کوئی چیز اس پر غالب نہیں ہے' کوئی چیز اس کے ارادے کے سامنے رکاوٹ نہیں بن سکتی' اس مشیت کی حدود و قیود سے باہر' جو چاہتا ہے' تخلیق کرتا ہے' جو چاہتا ہے کرتا ہے' جو چاہے کر سکتا ہے' جو حکم دے اس کی تعمیل کروا سکتا ہے۔ اس کی قدرت بے حد و بے قید ہے۔ جب یہ حقیقت ذہن میں بیٹھ جائے تو ہمارے احساسات' تصورات اور عقل میں کسی قوت کے لیے کوئی سوچ

جاتی ہے تو اس کی نفی ہو جاتی ہے۔ انسان جو کچھ بھی سوچ سکتا ہے اس کی قدرت اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ انسان کا تصور بہت ہی محدود ہے کیونکہ انسان کی ذات اور اس کی فکری کائنات محدود ہے۔ انسان اپنے ماحولیات اور معلومات کے محدود دائرے میں سوچنے کا عادی ہے جو بہت ہی محدود ہوتا ہے۔ یہ حقیقت کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ انسان کو اس محدود دائرے سے نکالتی ہے۔ انسان یقین کرتا ہے کہ اللہ کی قدرت لامحدود ہے تو انسان اپنے آپ کو اس کے حوالے کرتا ہے اور یوں وہ اس محدود سوچ سے لامحدود سوچ کی طرف نکل جاتا ہے ورنہ انسان حاضر و موجود کے محدود تصور ہی کا غلام ہوتا ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ ھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ﴿۲﴾

”جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے' اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی“۔

یہ کہ وہ قادر مطلق ہے اور اپنی مملکت میں ہر قسم کے تصرفات کرتا ہے' تو اس کے آثار قدرت اور نمونہ تصرفات ملاحظہ فرمائیں کہ اس نے موت و حیات کی تخلیق کی۔ موت میں وہ حالت بھی شامل ہے جو کسی زندہ چیز کو حیات دینے سے پہلے ہوتی ہے۔ اور وہ حالت بھی شامل ہے' جو حیات واپس لینے کے بعد طاری ہوتی ہے۔ اور حیات میں بھی پہلی زندگی شامل ہے اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے والی زندگی بھی شامل ہے۔ یہ سب حالات اللہ کی تخلیقات میں آتے ہیں۔ ذہن انسانی میں یہ حقیقت بٹھانے کا مقصد یہ ہے کہ اے انسان تجھے بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا تو ایک ذمہ دار مخلوق ہے۔ یہ نہیں ہے کہ بس یونہی اتفاقاً تو آ گیا ہے اور بس یونہی ایک دن مر کر مٹی ہو جائے گا۔ اور یہ کام اور یہ عظیم تخلیقی عمل بے مقصد نہیں ہے بلکہ یہ انسانوں کو آزمانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ اللہ کے علم میں جن انسانوں کو جو مظاہرہ کرنا تھا وہ سامنے آ جائے' جس کا اللہ کو پہلے سے علم تھا۔ اور وہ اپنے اعمال پر مناسب جزاء و سزا کے حقدار ہو جائیں۔

لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (٦٧ : ٢) ”تاکہ تم لوگوں کو آزما دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے“۔ جب یہ عقیدہ ذہن میں بیٹھ جائے تو انسان بیدار' محتاط' چوکنا اور سمجھدار ہو جاتا ہے۔ وہ دل میں چھوٹے بڑے کاموں کے بارے میں سوچتا ہے اور پوشیدہ اور ظاہری باتوں کے بارے میں غور کرتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو غفلت میں نہیں چھوڑتا۔ نہ مطمئن اور بے فکر چھوڑتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

وَ ھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ (٦٧ : ٢) ”اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی ہے“۔ اس اختتامیہ سے یہ اطمینان دلانا مطلوب ہے کہ بے شک اللہ قدیر ہے اور زبردست ہے لیکن وہ غفور بھی ہے۔ وہ بندوں پر سختی نہیں کرتا۔ جب انسان کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ میرا امتحان ہے تو وہ ہر وقت خائف رہتا ہے کہ کیا نتیجہ نکلے گا لیکن جب وہ یہ سوچے گا کہ اللہ تو غفور و رحیم ہے تو اسے امید بندھ جائے گی اور وہ ثبات و قرار کے ساتھ صراط مستقیم پر چلے گا۔

اسلام نے انسانوں کے سامنے خدا کا جو تصور پیش کیا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ جو ہروقت انسانوں کا پیچھا کرتا ہے' نہ ایسا ہے کہ اسے عذاب دینے میں مزا آتا ہے' نہ وہ عذاب دینے کو پسند کرتا ہے بلکہ اللہ ہروقت یہ یاد دہانی کراتا ہے کہ تمہارا ایک مقصد وجود ہے' اس کو نظروں سے اوجھل ہونے نہ دو' اپنی حقیقت کے مقام تک اپنے آپ کو بلند کرو' اور جس طرح اللہ نے اپنی روح تم میں پھونک کر تمہیں ایک بلند مرتبہ دیا۔ اس پر فائز ہو کر اللہ کی مخلوقات تمام مخلوقات سے اپنے آپ کو افضل ثابت کرو' جب لوگ اس مقصد کو پالیں تو پھر ان پر اللہ کی رحمتوں کی بارش ہوتی ہے۔ قدم قدم پر ان کی معاونت کی جاتی ہے اور حساب و کتاب میں عفو و درگزر سے کام لیا جاتا ہے۔

یہ کہ اللہ ہرچیز پر قادر ہے اور اسی نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ لوگوں کو آزمائے تو اس حقیقت کا مطالعہ ایک طرف اس پوری کائنات کے میدان میں کرایا جاتا ہے اور دوسری طرف حشر کے میدان میں اسکے مظاہر دکھائے جاتے ہیں۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ ﴿۴﴾ وَ لَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِیْرِ ﴿۵﴾ وَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۭ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۶﴾ اِذَاۤ اُلْقُوْا فِیْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِیْقًا وَّ هِیَ تَفُوْرُ ﴿۷﴾ تَكَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ ۭ كُلَّمَاۤ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَذِیْرٌ ﴿۸﴾ قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ ۙ۬ فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۚۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ ﴿۹﴾ وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْۤ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ﴿۱۰﴾ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ﴿۱۱﴾

"جس نے تہہ بہ تہہ آسمان بنائے۔ تم رحمن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو' کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔ ہم نے تمہارے قریب کے آسمان کو عظیم الشان چراغوں سے آراستہ کیا ہے اور انہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ بنا دیا ہے"۔

"ان شیطانوں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہم نے مہیا کر رکھی ہے۔ جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے

لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ جب وہ اس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دھاڑنے کی ہولناک آواز سنیں گے اور وہ جوش کھا رہی ہوگی' شدت غضب سے پھٹی جاتی ہوگی۔ ہر بار جب کوئی انبوہ اس میں ڈالا جائے گا' اس کے کارندے ان لوگوں سے پوچھیں گے "کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟" وہ جواب دیں گے "ہاں' خبردار کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اسے جھٹلا دیا اور کہا اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا ہے' تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو"۔ اور وہ کہیں گے "کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے"۔ اس طرح وہ اپنے قصور کا خود اعتراف کرلیں گے' لعنت ہے ان دوزخیوں پر"۔

ان آیات میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ پہلی آیت کا مفہوم ہیں اور اس کی مثالیں ہیں۔ اللہ اپنی بادشاہت کو جس طرح چلاتا ہے اس کے مظاہر ہیں اور اللہ کی بے قید قدرت کے آثار ہیں۔ اور پھر تفصیلات میں انسان کی آزمائش اور جزاو سزا کی۔ تہ بہ تہ سات آسمانوں کا مطلب ہم موجودہ فلکی نظریات سے اخذ نہیں کر سکتے کیونکہ فلکی نظریات' جوں جوں ہمارے آلات مشاہدہ آگے بڑھتے ہیں' بدلتے رہتے ہیں۔ آیت سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ فقط اس قدر ہے کہ اوپر کی کائنات کے سات ایسے طبقے ہیں جو ایک دوسرے سے ایک فاصلے پر ہیں' اس لیے انہیں طبقات کہا گیا ہے۔

قرآن مجید ہماری نظر کو زمین و آسمان کی تخلیق کی طرف مبذول کرتا ہے اور انسانوں کو یہ چیلنج کرتا ہے کہ ذرا زمین و آسمان کے اس نظام کو دیکھو' اس میں کوئی نقص بھی ہے۔ تمہارا مشاہدہ تھک تھکا کر عاجز رہ جائے گا اور اسے کوئی نقص نظر نہ آئے گا۔

مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷ : ۳) "تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے"۔ اللہ کی مخلوقات میں نہ کہیں خلل ہے' نہ نقص ہے اور نہ اضطراب ہے۔

فَارْجِعِ الْبَصَرَ (۶۷ : ۳) فارجع "پھر پلٹ کر دیکھو"۔ دوبارہ کوشش کرو' اچھی طرح معلوم کرنے کی کوشش کرو۔

هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (۶۷ : ۳) "کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے"۔ کیا تمہاری نظروں نے کوئی شگاف دیکھا' کوئی نقص اور کوئی خلل دیکھا؟

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ (۶۷ : ۴) "بار بار نگاہ دوڑاؤ"۔ شاید کوئی چیز دیکھنے سے رہ گئی ہو' اور تم معلوم نہ کر سکے ہو' لہذا پھر بھی نگاہ ڈالو۔

يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (۶۷ : ۴) "تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی"۔ یہاں چیلنج یہ ہے کہ ان آسمانوں اور اللہ تمام کی تمام مخلوقات کو ذرا گہری نظر سے دیکھو' اس کائنات کا سنجیدہ مطالعہ کرو' اور اس میں تامل و تدبر کرو' اور اس چیز اور اس صفت ہی کو دراصل قرآن کریم انسانوں میں عام کرنا چاہتا ہے کہ تم اس کائنات کا گہرا مشاہدہ کرو۔ یہ کائنات دراصل بہت عجیب و غریب اور نہایت ہی خوبصورت ہے اور اس کے اندر

معجزات و کمالات موجود ہیں لیکن ہم اس کے اندر اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ اس کا انوکھا پن ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے ۔ اور اس کی عظیم خوبصورتی ہمیں کوئی خوبصورتی نظر نہیں آتی ۔ حالانکہ یہ اس قدر خوبصورت ہے کہ نظر اس کی خوبصورتی کو دیکھ دیکھ سیر ہی نہ ہو اور اس کے اندر جو سبق اور اشارات ہیں ہمارے قلب ونظر کو اس سے سیر ہی نہ ہو ۔ اور عقل تدبر کرتی ہی رہ جائے اور اس کے نظام کی بوقلمونیاں ختم ہی نہ ہوں ۔ اس نقطہ نظر سے اگر انسان اس کائنات کا مطالعہ کرے تو اسے یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی تیار کردہ اور سجائی ہوئی حسین و جمیل نمائش گاہ نظر آئے 'جس کا انوکھا پن اور جس کی خوبصورتی کبھی پرانی نہ ہو کیونکہ اس طرح عقل ونظر کے لیے اس کی خوبصورتی روز نئی ہوگی ۔

جو لوگ اس کائنات کی حقیقت سے قدرے واقف ہیں اور وہ جدید سائنسی علوم کے مطابق اس کے بعض پہلوؤں کے حالات اور اس کے نظام کو کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں وہ تو حیران رہ جاتے ہیں اور ان کی عقل چکرانے لگتی ہے ۔ لیکن اس کائنات کی خوبصورتی کے مشاہدے کے لیے کسی بڑی مقدار علم کی ضرورت نہیں ہے ۔ انسان پر اللہ کا یہ کرم ہے کہ اس کو اللہ نے ایسی صلاحیت دی ہے کہ وہ معمولی مشاہدے اور غور و فکر کے ساتھ اس کائنات کے ہمقدم اس طرح چل سکتا ہے جس طرح ایک زندہ آدمی دوسرے زندہ آدمی کے ساتھ چلتا ہے ۔ انسان کا قلب براہ راست اس کائنات کے پیغام کو پاتا ہے اور اس کی خوبصورتی کو دیکھتا ہے 'بشرطیکہ وہ آنکھیں اوپر کر کے دیکھے اور دل کھول کر کچھ اخذ کرے ۔ اور وہ اس کائنات کو ایک زندہ مخلوق سمجھ کر اس کا رفیق بن جائے 'قبل اس کے کہ وہ اپنے نور فکر اور اپنی رصد گاہوں سے اس عظیم اور عجیب کائنات کے رازوں کو افشا کرے ۔

چنانچہ قرآن مجید لوگوں کو اس کائنات کے حوالے کرتا ہے ۔ ان کے ہاتھ میں کائنات کی کھلی کتاب پکڑاتا ہے 'کہ اس کائنات کی آواز سنو' اس کے مناظر اور عجائبات کی سیر کرو' اس لیے کہ قرآن مجید کے مخاطب صرف سائنس دان نہیں ہیں' بلکہ ہر دور اور ہر سطح کے انسان ہیں ۔ قرآن کو ایک جنگلی اور صحراوی بھی پڑھتا ہے اور شہر میں بسنے والا اور سمندروں میں سفر کرنے والا بھی پڑھتا ہے ۔ وہ ایک ان پڑھ سے بھی مخاطب ہے 'جس نے ایک حرف بھی نہیں پڑھا ۔ اور اسی طرح وہ ماہر علم نجوم و فلکیات سے بھی مخاطب ہے ۔ وہ ماہر طبیعیات سے بھی ہمکلام ہے اور ماہر فلسفی سے بھی ۔ ہر ایک کو قرآن میں عجائبات ملتے ہیں 'جن میں وہ تامل کرتا ہے اور قرآن ان سب کے غور و فکر کی قوتوں کو بیدار کرتا ہے ۔

کمال کی طرح اس کائنات کی ہر چیز میں جمال بھی مقصود بالذات ہے بلکہ کمال اور جمال ایک ہی حقیقت کے دو نام یا دو پہلو ہیں 'کسی چیز میں کمال ہی اس کی خوبصورتی کا اعلیٰ درجہ ہوتا ہے ۔ چنانچہ قرآن نے پہلے آسمانوں کی خوبصورتی کی طرف متوجہ کیا اور اس کے بعد کمال کی طرف ۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ (۶۷ : ۵) ''اور ہم نے تمہارے قریب کے آسمان عظیم الشان کو چراغوں سے آراستہ کیا''۔ یہ سمائے دنیا کہلاتا ہے ۔ شاید یہ وہ بلندی ہے جو زمین کے سکان اور قرآن کے مخاطب انسانوں کے فہم کے قریب ہے ۔ مصابیح اور چراغوں سے مراد ستارے اور سیارے ہیں جو ہمیں نظر آتے ہیں 'جن انسانوں سے قرآن مخاطب تھا وہ آسمانوں کو دیکھ کر یہی سمجھتے تھے کیونکہ ان کے پاس رصد گاہیں نہیں تھیں اور اس وقت بھی اور آج بھی کوئی آنکھوں سے آسمان کو دیکھے تو اس میں ستارے روشن چراغ نظر آتے ہیں ۔

یہ منظر کس قدر خوبصورت ہے ۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ۔ اس قدر خوبصورت کہ انسان کے دل کو کھینچ لیتا ہے ۔ اس منظر کے کئی رنگ ہیں ۔ صبح و شام اس کا الگ الگ نظارہ ۔ طلوع اور غروب کا الگ نظارہ ہے ۔ تاریک رات اور چاندنی رات کا الگ منظر ہوتا ہے ۔ مطلع صاف ہو تو اور منظر ہے ۔ مطلع غبار آلود ہو اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس کا الگ منظر ہے ۔ گھڑی بھر میں مناظر بدلتے رہتے ہیں ۔ جگہ کی تبدیلی سے مناظر بدلتے ہیں ۔ زاویہ کی تبدیلی سے بدلتے ہیں لیکن جو منظر بھی سامنے آئے ذہن کو گرفت میں لے لیتا ہے ۔

یہ اکیلا ستارہ جو دور افق پر چمک رہا ہے گویا وہ خوبصورت آنکھ ہے 'نہایت محبت سے پکارتی ہے ۔ پھر وہ دو ستارے جو الگ نظر آتے ہیں 'یہ اژدحام سے دور محو گفتگو ہیں ۔ اور وہ ستاروں کا جھرمٹ جو جگہ جگہ نظر آتا ہے وہ کائنات کے میلے کا ایک حلقہ یاراں ہے جو کبھی یہاں جمع ہوتا ہے تو کبھی وہاں!

یہ باریک چاند جو ایک رات ایک شاخ کی طرح ہوتا ہے اور ایک رات اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے اور پھر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر معدوم ہو جاتا ہی اور دوبارہ وہ ولادت پاتا ہے ۔ ہر رات کو اس کا نیا روپ ہوتا ہے ۔

یہ وسیع فضائے کائنات جس کی لمبائیوں اور دوریوں تک بینائی ساتھ نہیں دیتی ۔ اور خوبصورتی اس قدر کہ آنکھیں دیکھتی رہ جائیں ۔ یہ ہے حقیقی خوبصورتی 'جس کا تصور بھی انسان نہیں کر سکتا' لیکن انسان اگر ان خوبصورتیوں کو الفاظ کا جامہ پہنانا چاہے تو ممکن نہیں ۔ انسانی عبارات اس سے قاصر ہیں ۔

قرآن کریم انسانوں کو اس آسمان اور اس پوری کائنات کے جمال کی طرف متوجہ کرتا ہے ۔ کیونکہ جمال کائنات کا ادراک ہی ایک ذریعہ ہے جس کی وساطت سے انسان خالق کائنات کے جمال کا تصور کر سکتا ہے ۔ اور یہی ادراک انسان کو اس بلند مقام تک پہنچاتا ہے 'جس تک انسان کبھی پہنچنے کی تمنا کر سکتا ہے کیونکہ اس پوٹ تک پہنچ جاتا ہے جہاں سے آگے وہ ابدی حیات پا سکتا ہے ۔ اب وہ ایک خوبصورت آزاد اور لازوال دنیا میں پہنچ جاتا ہے ۔ یہ زندگی اس دنیا کی آلودگیوں سے پاک ہوتی ہے اور انسانی زندگی کے وہ لمحات لازوال لمحات ہوتے ہیں جن میں کوئی انسان اس کائنات کے لازوال حسن کا ادراک کر لے 'ایسے ہی حالت میں وہ ذات باری کے قریب تر ہو جاتا ہے اور ذات باری کے کمالات کا تصور کر سکتا ہے ۔

اور اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ انسان کے یہ خوبصورت ستارے ایک دوسرا کام بھی کرتے ہیں ۔ یہ شہاب ثاقب بن کر شیطانوں پر بمباری بھی کرتے ہیں ۔

وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ (۶۷:۵) ''اور انہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا''۔ ہم نے ''فی ظلال القرآن'' میں یہ رویہ اختیار کیا ہے کہ غیبی امور کے بارے میں بات کو اسی حد میں رکھیں جس حد تک قرآن کریم نے کہہ دی ہے ۔ اس معاملے میں قرآن نے جو پہلو بتایا ہے اسی تک محدود رہیں ۔ جس قدر قرآن نے کہہ دیا ہے وہ ایک مکمل بات ہے ۔

ہمارا ایمان ہے کہ ایک مخلوق ہے 'جس کا نام شیطان اور شیاطین ہے ' قرآن میں ان شیطانوں کی بعض صفات وارد ہیں ۔ ظلال القرآن میں اس موضوع پر پہلے بات ہو چکی ہے ۔ اس پر مزید اضافے کی ضرورت نہیں ہے 'اور ہمارا یہ ایمان

ہے کہ یہ شیاطین جب عالم بالا میں جانے کی کوششیں کرتے ہیں تو ان کو شہاب ثاقب بھگاتے ہیں' دوسری جگہ آیا ہے۔

وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (٧) ------- اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (٣٧ : ١٠) "اور ہر شیطان سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا..... تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے"۔

یہ شہاب ثاقب کس طرح پیچھا کرتا ہے۔ یہ شہاب کس قدر بڑا ہے۔ اس کی شکل کیا ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں اللہ نے تفصیلات ہمیں نہیں بتائیں اور کوئی دوسرا ذریعہ علم انسانوں کے پاس نہیں ہے' جس سے کوئی بات پوچھی جا سکے۔ بس جس قدر قرآن نے کہہ دیا اس پر اکتفا کرنا چاہئے۔ اور یہی یہاں مقصود ہے۔ اگر اس سے زیادہ بتانا مقصود ہوتا تو اللہ بتا دیتا۔ اس لیے جس چیز کو اللہ نے ہمارے لیے موجب خیر و برکت نہیں سمجھا' اس کے پیچھے نہیں پڑنا چاہئے۔ شیاطین کا رجم بھی ایسے ہی معاملات میں سے ہے' جس کا تفصیلی علم ہمیں نہیں دیا گیا۔ اور دنیا میں شہاب ثاقب کی سزا کے علاوہ آخرت میں ان کے لیے اور سزا ہے۔

وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ (٦٧ : ٥) "اور ان شیطانوں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہم نے مہیا کر رکھی ہے"۔ یہ بمباری دنیا میں اور آگ کا عذاب آخرت میں۔

شیاطین اور کافرین کے درمیان چونکہ واضح تعلق ہے اس لیے ساتھ ہی ان کا ذکر بھی کیا گیا ان کے لیے بھی عذاب جہنم ہے۔

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (٦٧ : ٦) "اور جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے"۔ اس کے بعد جہنم کے ایک منظر کی تفصیلات دی جاتی ہیں جس میں جہنم نہایت ہی غیظ و غضب اور نہایت انتقامی حالت میں نظر آتی ہے۔

اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ (٧) تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (٦٧ : ٨) "جب وہ اس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دھاڑنے کی ہولناک آواز سنیں گے اور وہ جوش کھا رہی ہو گی۔ شدت غضب سے پھٹی جاتی ہو گی"۔ ذرا جہنم کو دیکھو' یہ زندہ مخلوق کی طرح ہے۔ اسے غصہ آ رہا ہے اور وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے اور اس کی سانس پھول رہی ہے اور اس طرح اس کی سانس شدت غضب سے پھنکار کی شکل اختیار کر رہی ہے۔ اس پر اس کے غصے' کراہت اور نفرت کی وجہ سے اس قدر دباؤ ہے کہ قریب ہے کہ وہ پھٹ پڑے۔

بظاہر تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ انداز بیان ایک مجازی تصویر کشی کا انداز ہے لیکن ہم اس کائنات کا جس قدر گہرا مطالعہ کریں گے' معلوم ہو گا کہ اللہ کی مخلوقات میں سے ہر مخلوق زندہ ہے اور اس کی ایک مخصوص روح ہے۔ اور ہر مخلوق

اپنے رب کو جانتی ہے۔ اور اس کی حمد وثنا کرتی ہے اور اللہ کی ہر مخلوق جب دیکھتی ہے کہ انسان رب تعالیٰ کا کفر کرتا ہے تو تمام مخلوقات خوفزدہ ہو جاتی ہیں کیونکہ ہر چیز کو اپنے خالق کی معرفت حاصل ہے اور ہر چیز مطیع فرمان ہے' لہٰذا ہر چیز کو نافرمان مخلوق پر غصہ آتا ہے اور مخلوقات کی روح تمام منکرین سے نفرت کرتی ہے۔

قرآن کریم میں آتا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ

وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۱۷ : ۴۴) "اس کی پاکی کو ساتوں آسمان و زمین اور وہ ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان اور زمین میں ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو' مگر تم اس کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو"۔ اور اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ہے۔

يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَ الطَّيْرَ (۳۴ : ۱۰) "(ہم نے حکم دیا) اے پہاڑو' اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو اور یہی حکم ہم نے پرندوں کو دیا"۔

اور دوسری جگہ بھی صراحت کے ساتھ وارد ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا

قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (۴۱ : ۱۱) "پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا' اس نے آسمان اور زمین سے کہا وجود میں آ جاؤ تم چاہو یا نہ چاہو' دونوں نے کہا: ہم آگئے فرماں برداروں کی طرح"۔

یہ تمام چیزیں' جس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں وہ یہ ہے کہ ہر چیز رب تعالیٰ پر ایمان لاتی ہے' اس کی تسبیح کرتی ہے' تعریف کرتی ہے اور جب یہ چیزیں دیکھتی ہیں کہ انسان خالق کائنات کی نافرمانی کرتا ہے تو یہ دہشت زدہ ہو جاتی ہیں۔ جب انسان ایک مختلف رویہ اختیار کرتا ہے تو یہ چیزیں غضب الٰہی کے خوف سے کانپ اٹھتی ہیں۔ اور ان کو اس قدر غصہ آتا ہے کہ شدت غضب کی وجہ سے قریب ہے کہ یہ ایک دھماکے کے ساتھ انسان پر حملہ آور ہو جائیں۔ جس طرح کوئی کسی شریف اور عزت نفس رکھنے والے شخص کو برا بھلا کہے۔ غضب کے مارے اس کا گلا گھٹ جاتا ہے اور سانس پھول جاتی ہے اور وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتا ہے اور اسی طرح کی حالت جہنم کی بتائی گئی۔

وَ هِيَ تَفُوْرُ (۷) تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (۶۷ : ۸) "وہ جوش کھا رہی ہوگی اور شدت غضب سے پھٹی جا رہی ہوگی"۔

اور جہنم کے نگرانوں کی حالت بھی یہی ہوگی۔

كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ (۶۷ : ۸) "ہر بار جب کوئی انبوہ

اس میں ڈالا جائے گا' اس کے کارندے ان لوگوں سے پوچھیں گے "کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا"۔ یہ بات واضح ہے کہ جنم میں ان سے یہ سوال محض معلومات حاصل کرنے کے لیے نہ ہو گا' یہ ان کی سرزنش کرنے اور ان کو ذلیل کرنے کے لیے ہو گا' گویا جنم کے کارندے بھی جنم کے ساتھ اس غیظ و غضب میں شریک ہوں گے۔ جس طرح وہ دونوں ان کو عذاب دینے میں شریک ہیں اور کسی مصیبت زدہ اور پریشان شخص پر اگر سرزنش اور دھتکار کے کوڑے بھی لگیں تو اس کی تلخی کی تو حد ہی نہ ہو گی لیکن ذرا ان لوگوں کا جواب سنیں کہ یہ لوگ کس قدر ذلیل و خوار ہو گئے ہیں۔ اب وہ برخورداروں کی طرح اپنی غفلت اور حماقت کا اقرار کرتے ہیں' جبکہ وہ پہلے بڑے غرور کے ساتھ رسولوں کو گمراہ کہتے تھے۔

قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ فَکَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ (۹) وَقَالُوْا لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (۱۰) فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (۶۷: ۱۱) "وہ جواب دیں گے "ہاں' خبردار کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اسے جھٹلا دیا اور کہا اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا ہے' تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو"۔ اور وہ کہیں گے "کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے"۔ اس طرح وہ اپنے قصور کا خود اعتراف کر لیں گے' لعنت ہے ان دوزخیوں پر"۔

جو سنتا ہے اور عقل سے بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے آپ کو اس پوزیشن میں نہیں ڈالتا۔ اور اس طرح انکار نہیں کرتا جو ان بدبختوں نے کیا۔ اور وہ رسولان برحق کو جھٹلانے کی جسارت نہیں کرتا اور نہ اس قدر بھونڈے انداز کی ساتھ ان پر گمراہی کا الزام لگاتا ہے' بغیر کسی معقول وجہ کے' الٹا یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اللہ نے تو کچھ نازل نہیں کیا' تم جھوٹ بول رہے ہو' جیسا کہ گویا وہ ابھی اللہ کے پاس سے آیا ہے۔

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (۶۷: ۱۱) "اس طرح وہ اپنے قصور کا خود اعتراف کر لیں گے' لعنت ہے ان دوزخیوں پر"۔ سحق کے معنی بعد کے ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کے لئے بددعا ہے۔ جب انہوں نے اعتراف کر لیا اور یہ اعتراف' اس وقت کیا جب وہ منظر ان کے سامنے آگیا' جس کے وقوع کا وہ انکار کر رہے تھے۔ اور اللہ جس کے لئے بددعا کر دے تو گویا ان کی بربادی کا فیصلہ ہو گیا۔ یہ لوگ رحمت خداوندی سے دور ہو گئے' اب ان کو اللہ کی مغفرت کی کوئی امید نہیں رہی ہے۔ نہ عذاب سے چھوٹنے کی کوئی امید ہے۔ اب تو وہ دوزخ کے ساتھی ہیں۔ کیا ہی بری صحبت ہے اور کیا ہی بری ہم نشینی ہے ان کی اور کیا ہی برا انجام!

یہ عذاب' جنم کا عذاب' جو پھنکاریں مار رہی ہے' ایک شدید عذاب ہے۔ خوفناک عذاب ہے۔ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر نفس کے اندر اللہ نے ایمان کی حقیقت اور ایمان کے دلائل رکھ دیئے ہیں اس کے باوجود بھی اگر کوئی نفس اللہ کا انکار کرتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر کوئی بھلائی نہیں اور وہ ہر قسم کی بھلائی سے محروم

ہے ۔ اسی طرح وہ اپنے وجود اور شخصیت کی تمام بنیادی صفات کا بھی وزن کھو بیٹھتی ہے ۔ وہ اسی طرح ہے جس طرح جہنم میں پتھروں کو جلایا جائے ۔ اس کی شخصیت نے اپنے آپ کو اپنے مکان سے گرا کر اس آگ میں ڈالا ہے حالانکہ اس کا فرض یہ تھا کہ وہ اس سے بھاگتی ۔

جو شخص اللہ کا انکار کرتا ہے وہ آگے بڑھنے کے بجائے الٹے پاؤں پھرتا ہے اور اوندھے منہ گرتا ہے اور وہ زندگی کے ہر دوڑ میں گرتا ہی چلا جاتا ہے ' یہاں تک کہ وہ انتہائی بری ' پسماندہ اور قابل نفرت شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ آخر کار وہ ایک مکروہ جہنمی کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ وہ اس قدر بدشکل ہو جاتا ہے کہ اس جہاں کی کوئی چیز بھی اس قدر کریہہ المنظر نہیں ہوتی ۔ جس طرح کوئی چیز مسخ ہو جائے ۔ تو ایسے شخص کے سوا تمام جہان ایک طرف ہوتی ہے ۔ ہر چیز مومن ہے ۔ اللہ کی ثنا خواں ہے ' اور ہر چیز میں خیر موجود ہے اور تمام اشیاء کے اندر ایمان ایک رابطہ ہے ۔ ماسوائے ان نفوس انسانی و شیطانی کے جو کفر اختیار کرتے ہیں ۔ ان منکر اور بھٹکے ہوئے افراد کا ہر قسم کا تعلق جہاں بھی وہ ہوں ' ہر چیز سے کٹ جاتا ہے ' ماسوائے جہنم کے وہ کسی کام کے نہیں ہوتے ۔ ان کے اندر کوئی معنی کوئی حقانیت اور کوئی عزت نہیں ہوتی ۔ اس لیے یہ نفوس جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں ۔

قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ صفات بالمقابل پیش کرتا ہے ۔ جس طرح جہنم والوں کے مناظر دکھائے گئے ۔ اس کے بالمقابل مومنین کے حالات بھی دکھائے جاتے ہیں ۔ اور یہ پورے قرآن کریم کا انداز ہے ۔ چنانچہ یہاں بھی آیات لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (٦٧ : ٢) ''تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون اچھے اعمال کرتا ہے'' ۔ کے مضمون کے مطابق آزمائش کے بعد جو کامیاب ہوئے ان کی جزاء کا ذکر ہے ۔

إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿١٢﴾

''جو لوگ بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں ' یقیناً ان کے لیے مغفرت ہے اور بڑا اجر'' ۔

غیب سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے رب کو دیکھا نہیں اور اس سے ڈرتے ہیں ' اور یہ مراد بھی ہے کہ اس حالت میں بھی رب سے ڈرتے ہیں جب انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا ہوتا ۔ ایک انسان جب چھپے ہوئے بھی برائی نہیں کرتا تو اس کا ضمیر زندہ ہوتا ہے اور وہ خدا کا صحیح طرح مومن ہوتا ہے ۔ حافظ ابوبکر بزار نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے ' طالوت ابن عباد سے ' انہوں نے حارث ابن عبید سے ' انہوں نے ثابت سے ' انہوں نے انس سے وہ کہتے ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا ۔ رسول خدا ..... ہم آپ کے پاس ایک حال میں ہوتے ہیں لیکن جب ہم آپ سے جدا ہوتے ہیں تو ہمارا حال اور ہوتا ہے ۔ تو آپ ؐ نے فرمایا تم اور تمہارے رب کے ساتھ تعلق کیسا ہے ؟ تو انہوں نے فرمایا کہ رب تو تنہائی میں اور محفل میں ہر جگہ ہمارا رب ہے ۔ تو آپ ؐ نے فرمایا کہ یہ ''نفاق نہیں ہے'' ۔ لہٰذا اللہ کے ساتھ رابطہ حقیقی رابطہ ہے ۔ جب اللہ پر یقین ہو تو ایسا شخص مومن ہے ۔

یہ مذکورہ بالا آیت مضمون ماقبل اور مضمون مابعد دونوں کو آپس میں ملاتی ہے ۔ یہ کہ اللہ کو ہر حالت کا علم ہے خواہ کوئی ظاہر ہو یا خفیہ ' تنہائیوں میں ہو ۔ اللہ تعالیٰ پکار کر لوگوں کو کہتا ہے کہ میں نے تمہیں پیدا کیا اور میں تمہارے ظاہر و باطن دونوں سے واقف ہوں مجھے اپنی مخلوق کی تمام صلاحیتوں کا علم ہے ۔

وَ اَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ ۱
خَلَقَ ؕ وَ هُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ﴿۱۴﴾ ۱۴ع

"تم خواہ چپکے سے بات کرو یا اونچی آواز سے (اللہ کے لیے یکساں ہے) وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے ۔ کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ باریک بیں اور باخبر ہے"۔

تم کوئی بات خفیہ کرو یا جہراً کرو ' اللہ کو تو علم ہے ۔ وہ جہر' خفی اور دل کی باتوں کو بھی جانتا ہے ۔

اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (٦٧ : ١٣) "وہ دلوں کا حال جانتا ہے"۔ وہ بات جو ابھی دل کو چھوڑ کر منہ پر نہیں آئی ۔ کیونکہ ان باتوں کو دلوں کے اندر اس نے تو پیدا کیا ہے جس طرح دلوں کو اس نے پیدا کیا ہے ۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (٦٧ : ١٤) "کیا وہی نہ جانے جس نے پیدا کیا"۔

وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (٦٧ : ١٤) "حالانکہ وہ باریک بین اور باخبر ہے" اس کا علم بہت ہی باریکی اور تاریکی تک پہنچا ہوا ہوتا ہے ۔ ہر خفی و مستور بھی اس کے علم میں ہے ۔

جو لوگ اپنی کوئی حرکت اللہ سے چھپاتے ہیں ' یا باتیں اللہ سے چھپاتے ہیں ' یا دل کی نیت کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تو نیت ہے ' وہ ایک مضحکہ خیز سوچ رکھتے ہیں ۔ جس ضمیر میں وہ بات چھپاتے ہیں وہ کس کے ہاتھ میں ہے؟ وہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ اور اس کے اندر ابھرنے والی سوچ کی تمام لہروں کو وہ جانتا ہے ۔ نیت و ارادہ بھی اللہ کی مخلوقات کا حصہ ہے ۔ اور اس کو بھی وہ جانتا ہے کہ کون کیا ارادہ رکھتا ہے ۔ لوگ کیا چھپاتے ہیں اور کیا نہیں چھپاتے ۔

قرآن انسانی قلوب میں یہ حقیقت بٹھانا چاہتا ہے ' اس لیے کہ اس طرح وہ حقیقت کبریٰ کا صحیح ادراک کر سکتے ہیں ۔ مزید یہ کہ ان کے اندر بیداری اور تقویٰ کا احساس بڑھتا ہے ' جس کا تعلق اس عظیم ذمہ داری کے ساتھ ہے ' جو انہوں نے اس جہاں میں اٹھائی ہے یعنی دنیا میں صحیح نظریہ حیات پھیلانا ' عدالت کا قیام ' اور نیت اور عمل میں خلوص کا حصول اور یہ مقام کوئی انسان اس وقت تک نہیں پا سکتا جب تک وہ ظاہر و باطن میں خدا سے نہ ڈرتا ہو ' اور اللہ بہت ہی لطیف و خبیر ہے ۔

جب ایک مومن اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ خفیہ نیت میں بھی اللہ سے ڈرتا ہے اور دل میں پوشیدہ وسوسہ کے بارے میں بھی ڈرتا ہے اور ظاہری قول اور فعل سے بھی ڈرتا ہے اگر وہ اللہ کی مرضی کے خلاف ہو ' کیونکہ اللہ تو وسوسہ سے خبردار ہے ۔

اس کے بعد اب روئے سخن انسان کے نفوس اور ان کی نگرانی کے موضوع سے ' زمین کی طرف پھرتا ہے کہ اس کی تخلیق انسان کے لیے ہوئی ہے اور اس زمین کو تمہارے زیر نگیں بنایا گیا ہے اور سب چیزیں تمہارے لیے پیدا کی ہیں ۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا

مِنْ رِّزْقِهٖ ۭ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ۝

"وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے ' چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق 'اسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے"۔

لوگوں کی حالت یہ ہے کہ اس زمین پر رہتے رہتے اور اس زمین پر ان کو ہر قسم کی رہائشی سہولتیں ہونے کی وجہ سے ' اس میں چلنے پھرنے کی قدرت اور اس کی مٹی ' پانی ' ہوا اور دوسرے خزانوں پر دسترس کی وجہ سے اور اس کی تمام پیداوار استعمال کرنے کی وجہ سے ' لوگ یہاں کی زندگی کے عادی ہو گئے ہیں اور یہ بات تک بھول گئے ہیں کہ اللہ نے اس کو ان کے لیے مسخر کر دیا ہے اور ان کی دسترس میں دے دیا ہے۔ قرآن کریم بار بار ان کو یہ سبق یاد دلاتا ہے کہ ذرا اس پر غور کرو اور دیکھو۔ چنانچہ ہر دور میں لوگوں نے اپنے اپنے علم کے مطابق تسخیر کائنات کے مفہوم کو سمجھا۔

ایک مسخر زمین ' ابتدائی دور کے سننے والوں کے ذہن میں صرف یہ مفہوم رکھتی تھی کہ اس زمین کے اوپر ہم چل سکتے ہیں۔ پیدل یا گھوڑوں پر سوار ہو کر ' یا کشتی پر سوار ہو کر جو سمندر کے سینے کو چیرتی چلی جاتی ہے۔ اور اس میں زراعت کر سکتے ہیں اور اس کے اندر جو کچھ زندہ و مردہ مخلوقات ہے ' اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ پانی ' ہوا اور زمین اور ہر قسم کے نباتات وغیرہ۔

یہی مجمل مفہومات تھے جن کو اب سائنس نے ذرا مزید مفصل بنا دیا ہے ' جہاں تک آج ہمارا علم آگے بڑھا ہے۔ اور ہمارے اس علم کی وجہ سے اس نص قرآنی کا مفہوم بھی مزید وسیع ہو گیا ہے آئندہ نسلیں اس سے زیادہ سمجھیں گی۔

اب جدید علوم کے مطابق اس کا مفہوم کس قدر وسیع ہے۔ یہ لفظ ذلول بالعموم ایک جانور کے لیے استعمال ہوتا ہے جو سدھایا ہوا ہو۔ یعنی جو سواری کے لیے اچھا ہو ' مطیع ہو ' زمین پر اس لفظ کا اطلاق اب ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ زمین بھی دراصل ایک سواری ہے ' اگرچہ یہ ٹھہری ہوئی ' پرسکون اور جمی ہوئی ہے ' لیکن دراصل یہ متحرک سواری ہے بلکہ نہایت ہی تیز رفتار سواری ہے۔ اللہ نے اسے ایسا تابع جانور بنایا ہے کہ سوار کو اٹھا کر پھینک نہیں دیتی اور نہ اسے ہوا میں اڑا دیتی ہے۔ نہ اس کے اوپر انسان کے قدم ڈگمگاتے ہیں اور نہ یہ انسان کو گھوڑے یا اونٹ پر سوار ہونے والے کی طرح ہلاتی ہے ' جھٹکے دیتی ہے ' اچھالتی ہے ' جس طرح ایک غیر "ذلول" جانور ایسا کرتا ہے۔ پھر یہ ایک ایسا جانور ہے کہ تابع جانور کی طرح دودھ دینے والی بھی ہے۔

یہ جانور یا یہ گولا جس کے اوپر ہم سوار ہیں ' یہ اپنے ارد گرد ایک ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے چکر لگا رہی ہے اور اس محوری رفتار کے ساتھ ساتھ یہ سورج کے گرد ۶۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی دوڑ رہی ہے۔ پھر یہ زمین ' یہ سورج اور سورج کی پوری کہکشاں ۲۰ ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے آسمان کے برج جبار (VAST ORBTTA) کی سمت چلتے ہیں جس کا ایک چکر ۲۶ کروڑ سال میں پورا ہوتا ہے۔ ان تمام رفتاروں کے باوجود ' ان تمام دوڑوں کے باوجود ہم بڑے آرام سے اس گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ گھوڑا بہت بڑا "ذلول" ہے۔ اس قدر سکون سے جا رہا ہے کہ رفتار کا احساس بھی نہیں ہو رہا ہے۔ بڑے سکون سے بیٹھا ہے۔ اس کے اعصاب پر کوئی دباؤ نہیں ہے اور یہ نہیں ہو رہا کہ اس سے گر کر اس کی بوٹی بوٹی اس کائنات میں بکھر جائے۔ اور اس گھوڑے کے اوپر سے انسان کبھی بھی

نہیں کرتا۔

پھر یہ تین مختلف الاطراف حرکتوں میں یہ گھوڑا جتا ہوا ہے۔ ان میں دو حرکتوں' یعنی حرکت محوری اور حرکت شمسی کے اثرات کو تو ہم جانتے ہیں۔ انسانوں پر بھی ان کا اثر ہے' زمین پر بھی ان کا اثر ہے اور اس زمین پر پائی جانے والی زندگی پر بھی ان کا اثر ہوتا ہے۔ زمین کی گردش محوری کی وجہ سے لیل و نہار پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ہمیشہ رات ہوتی تو سردی کی وجہ سے تمام چیزیں جم جاتیں' اور سورج کے گرد اس کا جو دورہ ہے اس سے موسم اور مختلف فصلوں کے اوقات کا تعین ہوتا ہے۔ اور اگر ایک ہی موسم رہتا تو زمین کی موجودہ شکل نہ ہوتی۔ رہی تیسری حرکت تو ابھی ہمیں اس کی حکمت کا علم نہیں ہو سکا اور یہ ضروری ہے کہ اس عظیم کائنات کے کسی عظیم تر نظام سے اس کا کوئی تعلق ہو۔ واللہ اعلم!

یہ گھوڑا جو بیک وقت ان مختلف اطراف میں یہ حرکات کر رہا ہے اپنی اس حرکت کے دوران اپنی جگہ جما ہوا ہے یا جما ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہ اپنے محور پر 23.5 ڈگری جھکا ہوا ہے۔ اور اس جھکاؤ کے نتیجے ہی میں چار مختلف موسم پیدا ہوتے ہیں۔ یہ موسم زمین کی گردش شمسی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اس حرکت میں ذرا بھی خلل آ جائے تو ہمارا تمام موسمی نظام' بارشوں کا نظام اور فصلیں اگنے کا نظام اور ماہ و سال کا نظام ختم ہو جائے' بلکہ ممکن ہے کہ زمین پر سے زندگی ہی ناپید ہو جائے۔

اللہ نے زمین کو اس طرح انسان کے لیے سدھایا ہوا ہے کہ اس کے اندر جاذبیت کی ایسی مقدار رکھی ہے کہ زمین انسان کو اپنے اوپر چپکائے رکھتی ہے اور تمام حرکات کے دوران انسان اس کے اوپر اودھر ادھر نہیں لڑھکتے۔ اسی طرح اس کے اوپر فضا کے دباؤ کا نظام قائم کیا گیا ہے جس کی وجہ سے انسان بسہولت اس کے اوپر چل سکتا ہے۔ اگرچہ موجودہ فضائی دباؤ ذرا بھی زیادہ ہوتا تو انسان کے لیے زمین کے اوپر چلنا ممکن ہی نہ رہتا یا چلنا بہت ہی مشکل ہوتا۔ زیادہ دباؤ کی وجہ سے انسان چپک جاتا یا چلنے کے قابل نہ ہوتا۔ اور اگر موجود دباؤ سے بھی اسے قدرے کم کر دیا جاتا تو انسان فضا میں چھلانگیں لگاتا پھرتا اور اس کے قدم مضطرب ہو جاتے۔ یا اس کا پیٹ اندرونی دباؤ سے پھٹ جاتا۔ کانوں کے پردے پھٹ جاتے۔ جس طرح ان لوگوں کو پیش آتا ہے جو بالائی فضا میں چلے جاتے ہیں اور ان کو موجودہ فضائی دباؤ مصنوعی طور پر فراہم نہیں کیا جاتا۔

پھر اللہ نے موجودہ زمین کو مسخر کر دیا۔ اس نے زمین کی سطح کو ہموار کر دیا ہے اور اوپر سے اس پر نرم مٹی فراہم کر دی ہے۔ اگر یہ زمین ایک مضبوط صحرا کی طرح ہوتی جس طرح سائنس دانوں نے یہ مفروضہ کیا ہے کہ یہ ٹھنڈی ہو کر ایک چٹان بن گئی تھی۔ تو اس پر چلنا بھی مشکل ہوتا اور اس کے اندر کوئی روئیدگی بھی نہ ہوتی' لیکن فضائی عوامل' ہوا' گرمی' سردی اور بارشوں نے ان سخت پتھروں کو توڑا پھوڑا اور اس طرح زمین پر یہ مٹی پیدا ہوئی' جس کے اندر ہر قسم کی پیداوار ممکن ہوتی ہے (اور اسی سے انسان بھی بنایا گیا) یوں اس سواری کے سوار اس کا دودھ بھی پیتے ہیں۔

اور اللہ نے زمین کو اس طرح مسخر بنایا کہ اس کے اوپر جو ہوا جمع کی اس کے اندر انسان اور دوسری زندگی کی تمام ضروریات جمع کر دیں۔ اور یہ ضروریات اس طرح باریک بینی کے ساتھ اس ہوا کے اندر رکھ دیں کہ اگر ان عناصر میں سے کوئی چیز ذرا بھی کم و بیش کر دی جائے تو کرۂ ارض کے اوپر سے تمام زندگی ختم ہو جائے۔ ہوا میں آکسیجن کی نسبت ۲۱ جز ہے اور نائٹروجن ۷۸ جز ہے اور باقی کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے اور دوسری گیسیں ہیں۔ اور یہ نسبت زمین پر زندگی کے

قیام کے لیے لازمی ہے۔

پھر اللہ نے زمین کو انسانی زندگی کی ہزار ہا ضروریات کے لیے موزوں قرار دیا۔ ان میں زمین کا موجودہ حجم' سورج کا موجودہ حجم اور چاند کا موجودہ حجم سب کے سب سازگار ہیں۔ پھر شمس و قمر سے زمین کی موجودہ دوری' سورج کا درجہ حرارت' اور زمین کے چھلکے کا موجودہ موٹاپا اور زمین کی موجودہ رفتار' زمین کا اپنے محور پر ایک طرف جھکا ہوا ہونا اور پھر خشکی اور تری کی موجودہ نسبت اور ہوا کی موجودہ کثافت اور یہ اس قسم کی دوسری چیزیں سب مل کر زمین کو انسان کے لیے مسخر کرتی ہے اور ذلول بناتی ہیں اور انہی چیزوں کی وجہ سے انسانوں کا رزق فراہم ہوا ہے اور ان سے مختلف حیوانات اور پھر انسان کو زندگی ملی ہے۔

یہ قرآنی آیت ان امور کی طرف اشارہ کر رہی ہے تاکہ اسے ہر دور کا آدمی اپنی علمی استطاعت کے مطابق سمجھ سکے۔ جس قدر انسانی مشاہدہ آگے بڑھے گا۔ آیت کا مفہوم وسیع ہوتا جائے گا اور انسان یہ شعور تازہ کرتا رہے گا کہ سب بادشاہی اللہ کے ہاتھ ہی میں ہے۔ وہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔ انسان کے پورے ماحول میں ہر چیز کا بھی نگہبان ہے۔ یہ زمین انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ انسان کی حفاظت بھی اللہ کر رہا ہے اور اگر کسی وقت اس کی نگہبانی اٹھ جائے تو یہ پورے کا پورا نظام یکلخت بگڑ جائے۔

جب انسانی ضمیر میں یہ بات بیٹھ گئی' تو اللہ رحمٰن اور رحیم نے حکم دیا کہ اس زمین کی چھاتی پر گھومو پھرو اور اس کے اندر جو ارزاق رکھے ہوئے ہیں ان کو استعمال کرو۔

فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ (٦٧ : ١٥) "چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق"۔ مناکب کے معنی ہیں اس کی بلندیاں یا اس کی پہلو۔ جب اللہ نے زمین کی بلندیوں اور پہلوؤں پر پھرنے کی اجازت دے دی تو اس کے میدان اور اس کی وادیوں میں پھرنے کی اجازت بھی اس میں آگئی اور اس کے اندر جو بھی رزق ہے وہ اللہ کا پیدا کردہ ہے۔ وہ کسی کا مال نہیں ہے' جو کسی کے ہاتھ میں ہو' یہ سب اس کی ملکیت میں ہے۔ اور اس کا مفہوم بہت ہی وسیع ہے' اس سے جو بالعموم لوگوں کے ذہن میں آتا ہے' لفظ رزق سے۔ اس سے صرف وہ مال مراد نہیں ہے جو کسی کے قبضے میں ہو تاکہ وہ اس سے اپنی ضروریات پوری کرے۔ اس رزق سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کے لیے رزق کے اسباب ہیں اور جو اس زمین کے اندر ودیعت کی ہوئی ہیں۔ وہ تمام عناصر جن سے یہ زمین بنائی گئی ہے اور وہ تمام عناصر جن کے استعمال کے لیے اللہ نے نباتات' حیوانات اور انسانوں کو اہل بنایا۔ اس رزق کی تشریح جدید علوم نے خوب کر دی ہے مختصراً اس کی نوعیت یوں ہے:

"ہر پودے کی زندگی ہوا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ کے چھوٹے ذرات مالیکیولز لزوزا ت پر موقوف ہے جو ہوا میں ہوتے ہیں۔ جن کو یہ پودا سانس لے کر جذب کرتا ہے۔ یہ ایک کیمیاوی عمل ہے جو سورج کی روشنی میں مکمل ہوتا ہے' یوں سمجھنا چاہئے کہ درختوں کے پتے دراصل درختوں کے پھیپھڑے ہیں۔ سورج کی روشنی میں پودے اس قابل ہوتے ہیں کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کریں اور کاربن کو آکسیجن سے علیحدہ کر دیں اور آکسیجن کو واپس کر دیں اور کاربن کو ہائیڈروجن کے ساتھ ملاکر' جسے جڑوں کے ذریعہ پودا پانی کی شکل میں اخذ کرتا ہے' (جہاں پانی کی آکسیجن اور

ہائیڈروجن کی علیحدگی ہو جاتی ہے) اور پھر نہایت ہی حیران کن انداز سے قدرت ان عناصر سے شکر اور نامیاتی ریشے اور متعدد دوسرے کیمیاوی مواد تیار کرتی ہے 'جس سے پھل اور پھول تیار ہوتے ہیں اور جس مواد سے پودا اپنی غذا بھی لیتا ہے اور روئے زمین کے تمام دوسرے حیوانات کے لیے غذا تیار بھی کرتا ہے 'اور اس دوران یہ پودا جو آکسیجن سانس کے ذریعہ کھینچتا ہے اسے نکال دیتا ہے 'جس کے بغیر پانچ سیکنڈ کے اندر اندر زندگی ختم ہو جاتی ہے"۔

"اس طرح معلوم ہوتا ہے تمام نباتات ' تمام جنگلات ' تمام جھاڑیاں پانی پر پائی جانے والی کائی ' تمام فصلیں دراصل کاربن اور پانی سے تشکیل پاتی ہیں ۔ حیوانات اور انسان کاربن ڈائی آکسائیڈ نکالتے ہیں اور نباتات آکسیجن نکالتے ہیں ۔ اگر یہ تبادلہ نہ ہوتا تو انسانی زندگی اور حیوانی زندگی سب آکسیجن اور سب کاربن ڈائی آکسائیڈ کو آخر کار ختم کر دیتے اور جب یہ توازن ختم ہو جاتا تو پودے جھلس جاتے اور انسان مرجاتے ۔ حال ہی میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی ایک قلیل مقدار حیوانات کی زندگی کے لیے ضروری ہے جبکہ نباتات کو بھی آکسیجن کی قلیل مقدار کی ضرورت ہوتی ہے"۔

"اگرچہ ہم ہائیڈروجن کو سانس کے ذریعے نہیں جذب کرتے ۔ لیکن اس کا وجود بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر پانی موجود نہیں ہوتا اور پانی انسانی اور حیوانی زندگی کے لیے نباتات کے لیے اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسانوں اور حیوانوں کی زندگی ممکن ہی نہیں"۔ (۱)

اسی طرح نائٹروجن کا بھی زمین کے رزق کے ساتھ گہرا تعلق ہے ۔

"نائٹروجن کے بغیر کوئی غذائی پودا نشوونما ہی نہیں پا سکتا ۔ اسے کسی نہ کسی طرح نائٹروجن ملنا چاہئے ۔ زرعی زمین میں نائٹروجن کے داخل ہونے کے دو طریقے ہیں ۔ یہ کہ ایک خاص قسم کا بیکٹریا یعنی (جراثیم) سبزی نما نباتات کی جڑوں میں رہتے ہیں ۔ شفتل 'چنا' لوبیا وغیرہ کی جڑوں میں ۔ یہ جراثیم خالص نائٹروجن حاصل کرتے ہیں مثلاً ہوا سے اور ان کو مرکب شکل میں زمین میں چھوڑتے ہیں اور پھر پودا اس کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے ۔ جب یہ پودا مر جاتا ہے تو یہ مرکب نائٹروجن زمین کے اندر ہی رہ جاتا ہے"۔

"ایک طریقہ دوسرا بھی ہے 'جس کے ذریعہ نائٹروجن زمین میں داخل ہو جاتی ہے ۔ اور وہ یہ ہے کہ جب لمبی ہوائیں چلتی ہیں جن میں بجلی چمکتی ہے ۔ ہواؤں کے اندر جب بھی چمکتی ہے تو کسی قدر آکسیجن اور نائٹروجن کو متحد کر دیتی ہے ۔ اور بارش اسے زمین پر ایک مرکب نائٹروجن کے طور پر پھینک دیتی ہے ۔ اس صورت میں کہ پودے ان کو جذب کر سکیں"۔

کیونکہ پودے خالص نائٹروجن کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے ۔ اس لئے کہ ہوا میں اس کی نسبت ۷۸٪ ہوتی ہے"۔ (۲)

اور زمین کے اندر جو جامد اور سیال رزق موجود ہے یہ سب زمین اور اس کے حالات رزق کے ساتھ متعلق ہے ۔

---

(۱) "سائنس ایمان کی دعوت دیتی ہے" ترجمہ محمود صالح فلکی ص ۲۰ '۲۱۔
(۲) "سائنس ایمان کی دعوت دیتی ہے" ترجمہ محمود صالح فلکی ص ۲۰ '۲۱۔

یہاں اندر کے ارزاق کی تشریحات کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ لفظ رزق کا مفہوم یہاں بہت ہی وسیع ہے اور بہت ہی گہرا ہے۔ اور جب اللہ ہمیں اجازت دیتا ہے کہ تم زمین میں پھرو اور رزق تلاش کرو کہ تمہارے لیے زمین کو مسخر کیا گیا ہے تو یہ سب اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں اور ہمیں اجازت ہے۔ جس قدر انسان اس سے استفادہ کر سکے۔

فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ (۶۷: ۱۵) "چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق"۔

لیکن یہ اجازت ایک متعین وقت تک کے لیے ہے اور وقت کا تعین کر دیا گیا ہے جو اللہ کے علم میں ہے۔ اللہ کی تدبیر کائنات کے مطابق ہے۔ زندگی اور موت کے عرصہ ابتلا تک کھاؤ لیکن اس کے بعد۔

وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ (۶۷: ۱۵) "اسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے"۔ اسی کی طرف جانا ہے اور اگر تم نہیں مانتے تو بتاؤ کس کی طرف جانا ہے؟ اس کے سوا جائے پناہ تو کہیں بھی نہیں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ابھی انسان اس زمین کی پشت پر اور اس کے اندر اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہی ہو رہا تھا اور اللہ کے حکم سے زمین پر چل کر نعمتیں سمیٹ رہا تھا کہ اچانک اس سدھائی ہوئی تابعدار زمین کے اندر ایک جنبش پیدا ہوتی ہے اور اس کا یہ توازن اور رفتار یکدم ختم ہو جاتی ہے۔ اب یہی پرسکون زمین ان پر بمباری کر رہی ہے اور پہاڑ گرا رہی ہے۔ ان کے احساس اور تصورات میں ایک زلزلہ برپا کر دیا جاتا ہے تاکہ یہ لوگ زمین کے قرار و سکون اور نعمتوں سے لطف اندوز ہونے میں ہی مگن نہ ہو جائیں اور ذرا اس بادشاہ کی طرف بھی دیکھیں جس نے اس نظام کو قائم کر رکھا ہے' اپنے دلوں اور سوچوں کو اللہ کے ساتھ مربوط رکھیں۔

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرِ ﴿۱۷﴾ وَ لَقَدْ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ ﴿۱۸﴾

"کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے' تمہیں زمین میں دھنسا دے اور یکایک یہ زمین جھکولے کھانے لگے؟ کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے' تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے؟ پھر تمہیں معلوم ہو جائے کہ میری تنبیہ کیسی ہوتی ہے۔ ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں۔ پھر دیکھ لو کہ میری گرفت کیسی سخت تھی"۔

یہ انسان جو اس سدھائی ہوئی مطیع فرمان سواری پر سوار ہو کر مزے لوٹ رہا ہے اور اس سواری کے اندر ہی اپنا رزق دودھ کی شکل میں حاصل کرتا ہے' اسے معلوم ہے کہ یہ مطیع فرمان سواری ایک دن بگڑ جائے گی اور جب اللہ کا حکم ہو گا تو یہ ذلیل نہ رہے گی۔ یہ ذرا سا جھٹکا ہی دے گی کہ اس کے اوپر کی تمام چیزیں ادھر ادھر بکھر جائیں گی اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح لرز جائیں گے اور یہ اس قدر تیز جھکولے کھانے لگے گی اور ایسے حالات بڑے زلزلوں اور بڑی بڑی

آتش فشانیوں کے وقت بھی ہوتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رکی ہوئی اور تابع زمین کے اندر کس قدر سرکشی ہے جو ناقابل کنٹرول ہے۔ اس کی زمام تو اللہ نے پکڑ رکھی ہے۔ اس لیے یہ جھٹکے نہیں کھاتی ہے اور جب یہ چند سیکنڈ یا ایک منٹ کے لیے بھی جھٹکے دے تو زمین کے اوپر انسانوں نے جس قدر پختہ سے پختہ قلعے تعمیر کیے ہوئے ہیں 'سب مسمار ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بستیوں کی بستیاں اس کے پیٹ کے اندر دھنس جاتی ہیں اور جب انسان اس کے اندر جا رہے ہوں تو کوئی چیز بھی انہیں بچا نہ سکے۔

زلزلوں ' آتش فشانی اور دھنسنے کے وقت یہ فرعون انسان پھر چوہوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتے ہیں۔ جس طرح چوہے پنجرے میں بند ہوں اور وہ نکلنے کے لیے ادھر ادھر بھاگتے ہیں۔ ایک منٹ پہلے تو یہ غافل 'مست ' سرکش اور اس ذات عالی مقام سے غافل تھے جس نے اس سرکش سواری کی زمام کو تھام رکھا تھا اور اب ہر طرف بھگدڑ ہے۔

انسان اس دنیا میں ایسی آندھیاں بھی دیکھتے ہیں جو باد و باراں کے ساتھ پتھر بھی برسا رہی ہوتی ہیں اور جس جس بستی سے گزرتی ہیں ' درختوں ' خیموں اور مکانات کو اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ جنگلات کو جلا کر بھسم کر دیتی ہیں اور لوگ دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ بے بس دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا علم اور ان کی قوت اور ٹیکنالوجی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ یہ طوفان ہزاروں میل کی رفتار سے چلتے ہیں اور پتھر اڑاتے اور سمندروں کو خشکیوں پر چڑھاتے چلے جاتے ہیں تو انسان ان کے سامنے ایک مچھر اور چیونٹی کے برابر رہ جاتا ہے ' لیکن یہ اللہ کی قوت ہی ہوتی ہے جو اپنی افواج کو روکتی ہے اور پھر یہ زمین اور یہ سواری قرار پکڑتی ہے۔

قرآن کریم انسانوں کو یاد دلاتا ہے کہ یہ سواری جو تمہارے لیے سدھائی ہے اور بڑی سلامتی سے چل رہی ہے 'تم کہیں دھوکہ نہ کھا جاؤ ' یہ تو خالق کائنات کے کنٹرول میں ہے اور اسی نے اسے تمہارے لیے سدھایا ہے 'اس کی سرکشیاں جب شروع ہوں گی تو تم پھر اپنے آپ کو کسی صورت میں بچا نہ سکو گے۔ یہ زمین جھکولے کھا سکتی ہے اور تیز رفتاری اختیار کر سکتی ہے۔ یہ اپنے اندر سے گرم گرم لاوا بھی اگل سکتی ہے 'یہ تمہیں زمین کے اندر بھی دھنسا سکتی ہے ' پتھروں کی بارش بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی انسانی طاقت اس کو نہیں روک سکتی۔ اور نہ کوئی انسانی طاقت اسے تباہی و بربادی سے دور کر سکتی ہے۔ اللہ اس قدر ڈراتا ہے کہ دل دہل جاتے ہیں اور اعصاب شل ہو جاتے ہیں اور اعضا تھر تھرانے لگتے ہیں۔

فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ (۶۷ : ۱۷) "پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میری تنبیہ کیسی ہوتی ہے"۔ اب ان کے سامنے تاریخی واقعات کی طرف ایک مجمل اشارہ پیش کیا جاتا ہے کہ ازمنہ ماضیہ میں بعض منکرین کا عبرتناک انجام تمہارے سامنے ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (۶۷ : ۱۸) "ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں پھر دیکھ لو میری گرفت کیسی سخت تھی"۔ نکیر کا مفہوم ہے غصہ اور سرزنش اور اس کے نتیجے میں آنے والی سزا۔ ان کو وہ واقعات معلوم ہیں کہ اللہ نے امم سابقہ کو پکڑا۔ انہی سے پوچھا جاتا ہے کہ تم ہی بتاؤ کہ پکڑ کیسی رہی۔

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (٦٧ : ١٨) کیونکہ آثار ان کے سامنے تھے ۔ لہٰذا وہ جانتے کہ عذاب کیسا رہا۔

یہاں اللہ ان کی جس بے خوفی پر تنبیہ فرماتا ہے وہ ایسی بے خوفی ہے جس میں انسان اللہ سے غافل ہو جائے ۔ ایسا امان ہے جس کے نتیجے میں انسان کے دل سے اللہ کی قدرت کا ڈر نکل جائے اور اللہ کی عظمت کا خیال نہ رہے ۔ اس بے خوفی سے مراد وہ امن و اطمینان کی حالت نہیں ہے جو ذکر الٰہی کے نتیجے میں انسان کو حاصل ہوتی ہے ۔ جو اللہ کی رحمت اور اس کی نگہبانی کے یقین سے نصیب ہوتا ہے ۔ مومن اللہ کی رحمت اور فضل کا امیدوار ہوتا ہے ۔ لیکن غافل نہیں ہوتا۔ اللہ کو یاد کرنے والا مومن تو ہر وقت اس کی طرف نظریں اٹھائے ہوئے ہوتا ہے ۔ اس سے حیا کرتا ہے' اس کے غضب سے ڈرتا ہے ۔ اور وہ ہر وقت دعا کرتا ہے کہ اے اللہ تیری تقدیر میں میرے لیے جو مشکل لکھی ہے اس سے بچا لو ۔ عافیت نصیب کر ۔ وہ ہر وقت ڈرتا ہے ۔

امام احمد نے اپنی اسناد کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا "میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی بے فکری کی حالت میں یوں ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ آپ کی حلق کا کوا نظر آتا ہو ۔ آپ صرف تبسم فرماتے ۔ اور رسول اللہ ﷺ یوں تھے کہ جب کوئی بادل دیکھتے یا تند ہوا دیکھتے تو آپ کے چہرے پر اثر ہو جاتا ۔ تو میں نے کہا کہ اے رسول خدا لوگ جب بادل دیکھتے ہیں یا ہوا دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اس امید پر کہ اس میں بارش ہو گی ۔ اور میں دیکھتی ہوں کہ آپ جب ان چیزوں کو دیکھتے ہیں تو آپ کے چہرے پر کراہیت کے آثار نظر آتے ہیں ۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے عائشہ .... اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اس میں عذاب ہی نہ ہو' بعض اقوام کو ہوا سے عذاب دیا گیا" "ایک قوم نے عذاب دیکھا اور کہا یہ ہے بادل جو ہم پر بارش کرے گا"۔ صحیحین

یہ ہے دائمی جاگتا احساس' اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے نظام قضا و قدر کے بارے میں ۔ اس احادیث میں آپ کی سیرت سے بھی نقل ہوا ہے' یہ احساس اللہ کی رحمت پر اطمینان اور اللہ کے فضل کی امیدواری کے خلاف نہیں ہے ۔

یوں آیات میں بتایا جاتا ہے کہ تمام ظاہر اسباب کا ایک مسبب الاسباب ہے ۔ تمام سبب کو سبب اول کی طرف لوٹایا جاتا ہے ۔ اور وہ ذات باری ہے' جس کے ہاتھ میں پوری بادشاہت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ لہٰذا کسی گاؤں کو زمین میں دھنسا دینا' کسی کو آتش فشاں کی زد میں لانا' کسی بستی کو زلزلے سے تباہ کر دینا' اور کسی بستی کو تیز ہواؤں کی زد میں لانا صرف اللہ کی قدرت میں ہے ۔ اور ان کے علاوہ یہ تمام کائناتی قوتیں اور یہ تمام طبیعیاتی قوتیں کیا کسی انسان کے ہاتھ میں ہیں ۔ ان کا معاملہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ ان کے بارے میں جو اسباب گنواتے ہیں ۔ وہ تو محض مفروضے ہیں جن کے ذریعہ انسان ان واقعات کی کوئی معقول تشریح کرنا چاہتے ہیں ۔ لیکن ان واقعات میں ان کا دخل و عمل کوئی نہیں ہوتا ۔ اور نہ اپنے آپ کو ان واقعات سے بچا سکتے ہیں ۔ اور انسان اس زمین کی پشت پر جو تبدیلیاں لاتے ہیں وہ ایک ہی جھٹکے سے نیست و نابود ہو جاتی ہیں ۔ ایک آندھی اٹھتی ہے جس میں آگ ہوتی ہے تو وہ بھسم کر کے رکھ دیتی ہے ۔ گویا کہ یہ کاغذی کھیل تھا ۔ لہٰذا لوگوں کو چاہئے کہ وہ ہر معاملے کو صرف خالق کائنات کی طرف لوٹائیں اور اسے ہی تمام حادثات کا سبب اول سمجھیں' اسے ہی ان قوانین قدرت کا جاری کرنے والا سمجھیں جن کے مطابق کائنات چلائی جاتی ہے ۔ اور وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ آسمان ہی علامت بلندی ہے ۔ اور یوں اللہ کو یاد کریں جس کے ہاتھ میں سب بادشاہیاں ہیں اور وہ سب چیزوں پر قادر ہے ۔

انسان کے اندر جو قوت ہے وہ وہی ہے جو اسے خالق نے بخشی ہے۔اس کے پاس وہی علم ہے جو خالق نے اسے دیا ہے۔ لیکن اس پوری کائنات کی زمام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کائنات کے قوانین اس اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ اور اس کے اندر جو قوتیں ہیں وہ اللہ کی مدد کی وجہ سے ہیں۔ اور یہ قوتیں اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق چلتی ہیں ان سے جو تکلیف انسان کو پہنچتی ہے' ان سے جو نعمتیں انسان کو پہنچتی ہیں اور وقتاً فوقتاً جو واقعات و حادثات اس کائنات میں انسان کو پیش آتے رہتے ہیں یہ سب اللہ کی طرف سے ہیں اور جو بڑے بڑے حادثات انسان کو اس دنیا میں پیش آتے ہیں اور جن کے سامنے انسان بے بس کھڑا ہوتا ہے اور نہایت ہی بڑا نقصان اٹھاتا ہے ان کے جواب میں انسان صرف یہ کر سکتا ہے کہ وہ اللہ خالق کائنات کو یاد کرے اور اس کے سامنے دست بدعا ہو۔جس نے ان قوتوں کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور صرف اللہ سے معاونت طلب کرے کہ وہ ان قوتوں کو انسان کے لیے مسخر کر دے۔

اور انسان جب اس حقیقت کو بھول جاتا ہے اور غرے میں مبتلا ہو کر دھوکہ کھا جاتا ہے اور اکڑتا ہے کہ اس نے تو اس کائنات کی بعض قوتوں کو مسخر کر لیا ہے' تو ایسا شخص دراصل حقیقی علم سے دور ہو جاتا ہے اور اس کا رابطہ اب حقیقی علم سے کٹ جاتا ہے حالانکہ یہ حقیقی علم اسے اعلیٰ سرچشمے تک بلند کرتا ہے۔اس طرح وہ مسخ ہو کر زمین پر گر جاتا ہے جبکہ حقیقی علم رکھنے ولا شخص جو سچا مومن ہوتا ہے' وہ سرنگوں ہوتا ہے لیکن وہ اس کائنات کے وسیع میلے تک رسائی حاصل کر لیتا ہے' اس کا رابطہ باری تعالیٰ تک ہو جاتا ہے۔یہ ہے وہ رحمت خداوندی جس کا مزا وہی شخص لے سکتا ہے جس پر یہ رحمت ہوئی ہو اور یہ رحمت خداوندی اس شخص پر ہوتی ہے جس کے لیے اللہ لکھ دے۔

لیکن انسان جس قدر چاہے غرور کرے' اس کائنات کی قوتیں اسے مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ عجز و انکسار کے ساتھ اپنی بے بسی کا اعتراف کر لے' چاہے وہ حقیقی علم سے لذت آشنا ہو یا نہ ہو۔وہ نئے نئے انکشافات کرتا ہے اور نئی نئی طبیعی قوتوں کی تسخیر کرتا ہے' اس کے بعد جب وہ کائناتی سرکش قوتوں کا بھی سامنا کرتا ہے تو وہ اپنی عاجزی تسلیم کر لیتا ہے اور نہایت ذلت کے ساتھ تسلیم کرتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ کبھی وہ تند طوفان سے کسی پناہ گاہ میں چھپ جاتا ہے لیکن یہ طوفان نہایت سرکشی سے اس کے اوپر سے گزرتا ہے اور یہ اس کی راہ نہیں روک سکتا۔زیادہ سے زیادہ وہ جو کر سکتا ہے' وہ یہ ہے کہ طوفان کی زد سے بچ سکتا ہے۔لیکن یہ بھی کبھی کبھار۔ بعض اوقات یہ قوتیں اس قدر سرکش ہوتی ہیں کہ دیواروں سے پیچھے اور تہ خانوں کے اندر اسے ہلاک کر دیتی ہیں اور کبھی جب اس کو سمندر کی سرکشی سے واسطہ پڑتا ہے تو اس کے بڑے بڑے جہاز موجوں اور بگولوں کے اندر آکر غرق ہو جاتے ہیں اور یوں نظر آتے ہیں جس طرح بچوں کا کوئی کھیل تھا۔ رہے زلزلے اور آتش فشاں تو وہ تو اول روز سے آج تک ناقابل کنٹرول ہیں۔یہ صرف عقل کا اندھاپن ہے جو کسی انسان کو یہ باور کرا سکتا ہے کہ وہ اللہ کے سوا اکیلا بھی یہاں رہ سکتا ہے یا یہ کہ وہ اس کائنات کا مالک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اس زمین میں خدا کا نائب اور خلیفہ ہے۔اور اسے علم' قوت اور قدرت اسی قدر دی گئی جس قدر اللہ نے چاہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں اس کا محافظ اور نگہبان اللہ ہی ہے۔وہ رازق بھی ہے اور معطی بھی ہے۔اگر اللہ کا دست قدرت ایک لحظہ کے لیے بھی اس کی نگہبانی چھوڑ دے تو اس دنیا کی طبیعی قوتیں اسے ایک سیکنڈ کے اندر پیس کر رکھ دیں۔ بلکہ صرف مکھیاں اور چیونٹیاں ہی اسے کھا جائیں۔ لیکن وہ اللہ کے حکم سے یہاں محفوظ ہے اور معزز ہے۔ لہٰذا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ یہ شرف و کرم کہاں سے اخذ کرتا ہے' یہ تو اللہ کا فضل ہے جو اسے دیا گیا ہے۔

اب ڈراوے اور تنبیہ کے بعد اسے دوبارہ غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے اور یہ ایک ایسے منظر میں جسے وہ بہت دیکھتا رہتا ہے ' ہر وقت دیکھتا رہتا ہے لیکن یہ انسان اس پر کم ہی غور کرتا ہے ۔ حالانکہ وہ منظر قدرت الہی کا ایک بہت بڑا منظر ہے اور اگر وہ اس پر غور کرے تو بہت کچھ اس سے سیکھ سکتا ہے ۔ کیونکہ یہ اللہ کی قدرت کے آثار میں سے ایک عجیب اثر ہے ۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَٰفَّٰتٍ وَيَقْبِضْنَ ۚ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيرٌ ﴿١٩﴾

"کیا یہ لوگ اپنے اوپر اڑنے والے پرندوں کو پر پھیلائے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟ رحمن کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو؟ وہی ہر چیز کا نگہبان ہے"۔

یہ خارق العادت معجزہ جو ہر وقت واقع ہوتا رہتا ہے ۔ یہ چونکہ بار بار واقع ہوتا ہے اس لیے ہم اسے اہم نہیں سمجھتے ۔ اور اس کے اندر اللہ کی جو قدرت کام کر رہی ہے اسے بھی ہم بھول جاتے ہیں ۔ خصوصاً جبکہ وہ صف بندی میں اڑتے ہیں اور پروں کو پھیلاتے ہیں اور سکیڑ لیتے ہیں ۔ دونوں صورتوں میں وہ صف بستہ اڑتے ہیں اور ہوا میں وہ پروں کو بند کر کے بھی اللہ کی قدرت سے اڑتے ہیں اور پروں کو پھیلا کر بھی اللہ کی قدرت سے اڑتے ہیں ۔ اور یہ پرندے بعض اوقات ایسے کرتب دکھاتے ہیں ' جن سے ان کی تخلیق کی خوبصورتی ظاہر ہوتی ہے ۔ انسان دیکھتا ہی رہ جاتا ہے ۔ اللہ کی عجیب و غریب مخلوقات کا یہ ایک عجیب تماشا ہے ۔ جس کے اندر کمال اور جمال باہم یکجا نظر آتے ہیں ۔ اس منظر کی طرف قرآن کا اشارہ یہ ہے !

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَٰفَّٰتٍ وَيَقْبِضْنَ (۶۷ : ۱۹) "کیا یہ لوگ اپنے اوپر اڑنے والے پرندوں کو پر پھیلائے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟" اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ ان کو کس نے ڈیزائن کیا ہے ؟ ۔

مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ (۶۷ : ۱۹) "رحمن کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو"۔ اور رحمن نے ان کو ہوا میں ان قوانین قدرت کے مطابق رکھا ہوا ہے جو ہوا کے بارے میں اللہ نے یہاں رکھے ہوئے ہیں اور ان قوانین کے اندر ایک عجیب ترتیب ہے اور ان قوانین کے مطابق اللہ ان پرندوں کی تخلیق کی ہے جس میں ایک ایک خلیے اور ایک ایک ذرے کا حساب ملحوظ ہے ۔ یہ وہ قوانین ہیں جن کے مطابق فضا کے اندر ہزاروں مساواتی فارمولے چلتے ہیں تاکہ ہوا میں پرندوں کی اڑان کا عمل مکمل ہو ۔ اور یونہی انتظام کے ساتھ چلتا رہے ۔

اور رحمن نے ان پرندوں کو اس حالت میں اپنی قدرت قادرہ کے ذریعے یوں رکھا ہوا ہے اور ان پر اس کی نظر اور نگرانی ہر وقت حاضر ہے اور کسی بھی وقت دور نہیں ہوتی ۔ یہ اللہ ہی ہے کہ جو ان قوانین اور فارمولوں کو اس جہاں میں ہر وقت قائم ' متوازن اور منظم رکھتا ہے ۔ یہ اصول کسی بھی وقت ٹوٹتے نہیں ۔ ان میں کبھی خلل نہیں آتا ۔ کبھی ان میں اضطراب نہیں آتا ۔ ایک پلک جھپکنے کے لیے بھی ' ہر وقت ۔

مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ (۶۷ : ۱۹) "صرف رحمٰن ہی انہیں اس طرح تھامے ہوئے ہے" کہ ہر پرندے اور ہر پر کو اللہ نے تھام رکھا ہے۔ اور یہ پرندہ جب ہوا میں پروں کو سکیڑ لیتا ہے تو پھر فضا میں معلق ہوتا ہے' اللہ اسے وہاں رکھ رہا ہوتا ہے۔

اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍۭ بَصِيْرٌ (۶۷ : ۱۹) "وہی ہے جو ہر چیز کا نگہبان ہے"۔ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے' ہر چیز کی خبر رکھتا ہے۔ اس کے لئے حالات زندگی تیار رکھتا ہے' اسے قوت دیتا ہے اور ہر لمحہ اس کی ضروریات' روز مرہ کی ضروریات مہیا رکھتا ہے۔ جس طرح کوئی خبیر و بصیر رکھتا ہے۔ پرندوں کو فضا میں اسی طرح رکھتا ہے جس طرح تمام حیوانات کو زمین پر رکھتا ہے' جو فضا میں نہیں اڑتے ہیں۔ جس طرح اس فضائے کائنات میں اس نے بڑے بڑے اجرام فلکی روک رکھے ہیں۔ جنہیں یوں روکنے والا اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن قرآن کریم لوگوں کو پکڑ کر ان کی آنکھوں اور دلوں کو ان تمام مناظر کی طرف کھینچ کر لاتا ہے جن کو وہ دیکھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ اور ان کے دلوں پر ان مناظر کے اشارات اور اثرات بٹھاتا ہے۔ ورنہ اللہ کی ہر صنعت میں اعجاز ہے اور اللہ کی ہر مخلوق میں اس کے آثار ہیں۔ اور ہر تن اور ہر نسل اس سے اپنی عقل کے مطابق دیکھ سکتی ہے۔ ایک بدوی کہتا تھا:

البعرة تدل على البعير "اونٹ کی مینگنی دلالت کرتی ہے کہ اونٹ گزرا ہے"۔ اور آج کا انسان اپنے مشاہدات کے ذریعہ توفیق الٰہی سے سب کچھ جانتا ہے یا بہت کچھ جانتا ہے۔

اب قرآن دوبارہ ان کو ان کے ان حالات کی طرف لاتا ہے جن میں وہ بے بس ہوتا ہے' طوفانوں' زلزلوں' آتش فشانی میں اور سنگ باری میں۔ فضا میں تیرنے والے پرندے کو دیکھ لیں کہ وہ تو فضائے کائنات میں اللہ کی توفیق سے امن میں ہیں تو دوبارہ ان کو ان کے مشکل لمحات یاد دلائے جاتے ہیں اور اس تکرار کا بہت اثر ہوتا ہے۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ۚ﴿۲۰﴾

"بتاؤ' آخر وہ کون سا لشکر تمہارے پاس ہے جو رحمٰن کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں"۔

اللہ نے اس سے پہلے انسانوں کو خسف سے ڈرایا' جبکہ اس سے قبل کئی مکذبین کو یہ سزا دی گئی' پھر سنگباری سے ڈرایا جبکہ کئی پر سنگباری کی گئی۔ اور اسی طرح دوسرے مکذبین کی مختلف ہلاکتوں سے ڈرایا تھا۔ یہاں دوبارہ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کون ہے جو ان کی امداد کرتا ہے اور اس قسم کی مختلف ہلاکتوں سے تمہیں بچاتا ہے؟ اللہ کی پکڑ کو رحمٰن کے سوا کون روکے ہوئے ہے؟۔

اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ (۶۷ : ۲۰) "حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین دھوکے میں پڑے ہوئے

ہیں"۔ یہ دھوکہ ان کو اس بات پر مطمئن کر دیتا ہے کہ وہ امن میں ہیں۔ کسی کی ضمانت اور اطمینان میں ہیں' حالانکہ وہ اللہ کے غضب اور عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں۔ کیونکہ وہ نہ ایمان لائے ہیں اور نہ عمل صالح کر رہے ہیں' جن کی وجہ سے اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے اور اللہ کا عذاب واقع نہیں ہوتا ہے۔

اور ایک چٹکی پھر دوبارہ' ان کو احساس دلایا جاتا ہے کہ یہ رزق الٰہی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اگر اللہ کی طرف سے بند کر دیا جائے تو پھر کون ہے جو اس قدر عظیم انتظام کر سکتا ہے۔

أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ﴿٢١﴾

"یا پھر بتاؤ' کون ہے جو تمہیں رزق دے سکتا ہے۔ اگر رحمٰن اپنا رزق روک لے؟ دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز پر اڑے ہوئے ہیں"۔

جیسا کہ اوپر گزر گیا۔ ہر انسان اللہ کے پیدا کردہ اسباب کا مرہون منت ہے۔ اللہ ان اسباب میں سے کسی ایک سبب کو کھینچ لے تو بھوک سے لوگ مر جائیں۔ اور یہ رزق اللہ نے اس کائنات کی اسکیم میں بطور سلسلہ اسباب رکھا ہوا ہے۔ یہ اسباب سب کے سب ایسے ہیں جو انسان کی قدرت میں نہیں ہیں۔ اور یہ تمام انسانوں کی دسترس میں ہیں۔ یہ سب اسباب انسان کے وجود سے بھی پہلے پیدا کر دیئے گئے تھے۔ اور یہ اسباب اپنی طبیعی قوت اور طاقت کے اعتبار سے انسان سے بہت ہی بڑے ہیں اور ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک سبب بھی دست قدرت کی طرف سے محو کر دیا جائے تو انسان سب کے سب صفحہ ہستی سے مٹ جائیں۔

اگر اللہ پانی ختم کر دے' ہوا کو بند کر دے یا وہ عناصر ختم کر دے جن سے اشیاء بنی ہیں' تو کون ہے جو لا سکتا ہے۔ زمین سے ہزار گنا بڑے ستارے موجود ہیں لیکن حیات اور اسباب حیات سے خالی ہیں۔

اس گہرے وسیع اور عظیم مفہوم کے اندر لفظ رزق کے تمام مفہوم سما جاتے ہیں۔ جس رزق کے بارے میں انسان یہ زعم رکھتا ہے کہ اسے وہ کماتا ہے' مثلاً محنت کر کے ایجاد کر کے' پیداوار حاصل کر کے' جبکہ یہ تمام کام بعض اسباب و عناصر پر موقوف ہیں اور دوسری جانب سے اللہ نے جن اقوام کو وہ اسباب دیئے ہیں ان پر بھی موقوف ہیں۔ کیونکہ ایک کام کرنے والا جو سانس بھی لیتا ہے اور جو حرکت بھی کرتا ہے' وہ اللہ کے رزق ہی کی وجہ سے کرتا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے اس عامل کو پیدا کیا۔ اسے قدرت اور طاقت بخشی۔ اسے ایک نفس دیا' جو اس دنیا میں سانس لیتا ہے' پھر اس کے جسم کے اندر جو مواد چلتا ہے' اس کے ذریعہ اسے قوت حاصل ہوتی ہے اور وہ حرکت کرتا ہے' اور جو عقلی کام وہ کرتا ہے وہ بھی اس عقلی قوت کی وجہ سے کر پاتا ہے جو اللہ نے اس کے دماغ میں رکھی ہے اور صانع اور موجد جو بھی ایجاد کرتا ہے اس میں اللہ ہی کا پیدا کردہ میٹریل استعمال کرتا ہے۔ اور اس عمل میں بھی انسانی اور کائناتی اسباب استعمال کرتا ہے جو اللہ کا رزق اور عطیہ ہیں۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ (٦٧ : ٢١) "پھر بتاؤ' کون ہے جو تمہیں رزق دے اگر رحمٰن اپنا رزق روک لے"۔

بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ (٦٧ : ٢١) "دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز پر اڑے ہوئے ہیں"۔ یہ طے کرنے کے بعد کہ رزق صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے' یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ روگردانی اور سرکشی کرتے ہیں اور نہایت ہی تکبر میں دعوت اسلامی سے نفرت کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ اللہ کے رزق پر پل رہے ہیں لہٰذا اللہ کا رزق کھا کر سرکشی کرنا اور غرور میں دین سے گریز کرنا نہایت قبیح اور گھٹیا فعل ہے کیونکہ ان کی تمام ضروریات اللہ کی طرف سے فضل و کرم پر مشتمل ہے۔ اور پھر بھی یہ روگردانی اور تکبر کرتے ہیں۔

یہ ان لوگوں کی تصویر ہے جو اللہ کی دعوت کا انکار کرتے ہیں' کبرو سرکشی کی حالت میں اور سخت تکبرانہ نفرت کے ساتھ' یہ بھولے ہوئے ہیں کہ وہ اللہ کی مخلوق ہیں اور اللہ کے فضل و کرم پر زندہ رہ رہے ہیں اور وہ اپنے وجود' اپنی زندگی کی ضروریات کے مالک بھی نہیں ہیں۔

اپنے ان حالات کے باوجود اشادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے تھے کہ یہ گمراہ لوگ ہیں۔ اور اپنے آپ کو ہدایت پر سمجھتے تھے۔ اور ہر دور میں خدا کی طرف بلانے والوں کے بارے میں یہی سمجھا جاتا ہے' چنانچہ ایسے مدعیان اور اہل ایمان کی اصل حقیقت کو ایک تمثیل یا ایک منظر کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۲﴾

"بھلا سوچو' جو شخص منہ اوندھائے چل رہا ہو' وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ جو سر اٹھائے سیدھا ایک ہموار سڑک پر چل رہا ہو؟" جو شخص اوندھا چلتا ہے وہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ پاؤں پر سیدھا نہیں چلتا بلکہ منہ کے بل چلتا ہے' حالانکہ اللہ نے چلنے کے لیے پاؤں پیدا کیے ہیں' یا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ راہ میں گرتا پڑتا ہے اور پھر اٹھ کر چلتا ہے۔ اور پھر منہ کے بل گرتا ہے' اور اسے سیدھی چال نصیب نہیں ہے۔ یہ اس بدبخت شخص کی حالت ہے جو مشقت برداشت کرتا ہے' تکلیفیں اٹھاتا ہے' گرتا پڑتا جاتا اور منزل مقصود سے بھی محروم رہتا ہے' اس کے مقابلے میں ایک مومن سیدھا شاہراہ پر ایک متوازن رفتار سے جا رہا ہے' راستہ بھی واضح ہے' جاری راستہ ہے اور یقیناً منزل تک پہنچانے والا راستہ ہے۔

پہلا حال ایک بدبخت' گمراہ اور سرکش انسان کا ہے۔ یہ اللہ کی راہ سے محروم ہے' اللہ کی ہدایت سے محروم ہے۔ یہ اللہ کے قوانین قدرت سے محروم ہے' یہ فطرت کے اصولوں سے ٹکراتا ہے' مخلوق خدا سے متصادم ہے۔ اس لیے کہ یہ غلط راہ پر چلتا ہے اور سیدھی راہ نہیں لیتا۔ یہ غلط پگڈنڈیوں پر جا رہا ہے جن میں نشیب و فراز اور پتھریلی راہ ہے۔ یہ گرتا پڑتا ہے اور سخت مشقت میں راہ طے کر رہا ہے اور دائمی گمراہی میں ہے۔

اور دوسرا وہ شخص ہے جو نیک بخت ' سنجیدہ ' راہ خدا سے واقف ' اس پر چلنے والا ' اللہ کے قوانین قدرت کے مطابق صحیح رفتار رکھتا ہے ' سیدھی جاری راہ پر ہے جس پر قافلہ ایمان اپنے لاؤ لشکر اور سازوسامان کے ساتھ رواں دواں ہے جس پر اس پوری کائنات کا قافلہ مخلوقات رواں دواں ہے ۔ خواہ زندہ مخلوق ہے یا غیر زندہ!

ایمان کی زندگی دراصل یسر ہے ' آسانی ہے ' استقامت ہے ' سیدھی راہوں پر چلنا ہے ' اور کفر کی زندگی سختی ہے ' گرنا پڑنا ہے ' اوندھا چلنا ہے اور غلط راہوں پر چلنا ہے ۔

پھر ہر شخص غور کرے کہ ان دونوں میں سے کون سی راہ درست ہے ' کیا اس کے جواب کی ضرورت ہے ۔ نہیں اس سوال کے اندر جواب موجود ہے ۔ یہ تصدیقی اور تقریری سوال ہے کہ بات یہی ہے ۔

یہ سوال و جواب یوں ختم ہوتا ہے جب ہمارا تخیل ان دو افراد کی تصویر اور تمثیل کے پیچھے دوڑتا ہے ۔ ایک گروہ ہے کہ اپنے منہ کے بل چلتا ہے ' گرتا ہے ' اٹھتا ہے ' پھر گرتا ہے ' پتھریلی راہ ہے ۔ ٹیڑھی راہ ' خاردار راہ ہے ۔ منزل مقصود معلوم نہیں ہے ' صرف گرتا ' اٹھتا ہے ۔ ہر کوئی اپنے طور پر بھاگ رہا ہے جبکہ دوسری ایک جماعت ہے جو ایک قافلے کی شکل میں ہمقدم چل رہی ہے ۔ جس کے قدم سیدھے نہیں ' راہ سیدھی ہے ' جاری رہا ہے بلکہ شاہراہ ' اور منزل مقصود یعنی کہ سب لوگ ادھر جارہے ہیں ۔

یہ ہے قرآنی انداز گفتگو کہ معنوی اور فلسفیانہ حقائق کو نہایت ہی مجسم اور مشخص انداز میں ہماری نظروں کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ معانی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ۔

مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤى (۶۷ : ۲۲) ہدایت و ضلالت کے ذکر کے بعد ' اب ان کو وہ وسائل دکھائے جاتے ہیں جو اللہ نے ہدایت و ضلالت کے سلسلے میں ان کو دے رکھے ہیں ' یعنی وہ قدرتی قوتیں جن کے ذریعے وہ حقائق کا ادراک کر سکتے ہیں ۔ جن سے وہ فائدہ نہ اٹھاتے تھے اور جن کا وہ شکر بھی ادا نہ کرتے تھے ۔

قُلْ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾

"ان سے کہو ' اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ' تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیئے ' مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو" ۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ ہی نے انسان کو پیدا کیا ' اور اسے دیکھنے سننے اور سوچنے کی قوتیں بھی اللہ ہی نے دیں اور یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اللہ کی مخلوقات میں سے انسان اعلیٰ و ارفع مخلوق ہے ۔ اور وہ اس جہان میں موجود ہے ۔ اس نے خود اپنے آپ کو نہیں پیدا کیا ' لہٰذا اس سے اعلیٰ و ارفع اور زیادہ علم والا موجود ہو گا ۔ اور وہی خالق ہے کوئی شخص خالق کے اعتراف سے نہیں بھاگ سکتا ' کیونکہ خود انسان کا محض وجود ہی تقاضا کرتا ہے کہ کوئی ارفع قوت موجود ہے اور اس میں بحث و جدال کرنا اور شک کرنا محض ہٹ دھرمی ہے ۔ قرآن کریم اس حقیقت کو یہاں اس لیے لاتا ہے کہ

وہ بتائے کہ اللہ نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی قوتیں دی ہیں۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (٦٧ : ٢٣) "تم کو سننے، دیکھنے اور سوچنے کی طاقتیں دیں" اور انسان نے اللہ کے یہ انعامات پاکر کیا کیا؟ یہ سمع، یہ بصارت اور یہ عقل کی قوت؟ اور انسان کا طرز عمل دیکھیے!

قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (٦٧ : ٢٣) "مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو"۔

سننے کی قوت اور دیکھنے کی قوت انسان کے نفس کے اندر دو عجیب معجزے ہیں۔ انسان نے ان کے بعض پہلو معلوم کر لیے ہیں۔ اور وَالْأَفْئِدَةَ سے قرآن سوچنے کی قوت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ تو اعجب العجائب ہے۔ انسان کی عقلی قوت کے بارے میں ابھی تک انسان پوری معلومات نہیں حاصل کر سکا۔ عقل انسان کے اندر اللہ کا ایک منفرد معجزہ ہے۔

جدید علوم نے سننے کی قوت کے بارے میں بعض حیران کن باتوں کو دریافت کر لیا ہے، مناسب ہے ان میں سے بعض چیزوں کا یہاں ذکر کر دیا جائے۔

"ہمارے سننے کی حس بیرونی کان سے کام شروع کرتی ہے اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ اس کی انتہا کہاں ہوتی ہے؟ سائنس دان کہتے ہیں کہ آواز ہوا کے اندر جو لہریں پیدا کرتی ہے یہ لہریں کان تک جاتی ہیں۔ یہ کان ان کو اندر داخل کرنے کے لیے منظم کرتا ہے، تاکہ یہ کان کے پردے کے اوپر پڑیں اور یوں یہ آواز کان کے پردے کی دوسری طرف گہرائی تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ گہرائی ایسی ہے کہ اس میں اسپرنگ کی طرح گول نالیاں ہیں اور یہ نصف دائرے کی شکل میں ہیں۔ اس گول نالیوں کے حصے میں چار ہزار قوس ہیں، جو سر کے آلہ سماعت کے ساتھ پیوست ہیں"۔

"سوال یہ ہے کہ ہر ایک قوس کا طول کیا ہے اور اس کا حجم کیا ہے اور یہ قوس کس طرح بنائے گئے ہیں، جن کی تعداد ہزاروں میں ہے اور یہ کس قدر چھوٹی جگہ میں رکھ دیئے گئے ہیں جبکہ ان کے علاوہ اور کئی ہڈیاں ہیں جو موجوں کی طرح متحرک ہوتی ہیں۔ اور یہ تمام سامان کان کے پردے کے پیچھے ایک چھوٹی سی کھلی جگہ میں ہے! کان میں ایک سو ہزار (ایک لاکھ) سماعتی خلیات ہیں! اور سماعت کے اعصاب کے آخر میں باریک ترین ریشے ہیں، ان کی باریکی ہی محیرالعقول ہے اور اس کے تصور ہی سے سر چکرانے لگتا ہے"۔ (۱)

"انسانی حاسہ بصارت کو ذرا دیکھیے، اس کے مرکز میں روشنی کا استقبال کرنے والوں کی ۱۳۰ ملین (۱۳ لاکھ) سیل ہیں۔ یہ استقبال کرنے والی آنکھیں اعصاب کے سرے ہیں اور آنکھ کے اہم حصے صلب قرنیہ (Carnea) جھلی (Placenta) جالی (Ratina) یہ اہم اعضا، ہزارہا اعصاب اور مراکز کے علاوہ ہیں"۔ (۲)

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کر کے یہ خصوصیات اسے عبث نہیں دیں۔ اور نہ بغیر کسی ارادے منصوبے کے یونہی اتفاقاً یہ کام ہو گیا ہے۔ بلکہ یہ اس لیے دی گئی ہیں کہ انسان اس زمین پر زندگی بسر کر سکے۔ اور یوم

(۱) اللہ اور جدید علوم، عبدالرزاق نوفل، ص ۵۷۔
(۲) حوالہ بالا ص ۵۸

الجزاء میں پھر اس سے زندگی کا حساب لے کر اسے جزاء و سزا دی جائے ۔

قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾

"ان سے کہو 'اللہ ہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے"۔

الذ رء کا عربی میں مفہوم ہے کہ کسی چیز کا بڑھانا۔اور بڑھانے کے ساتھ ساتھ پھیلانا بھی اس کے مفہوم میں آ جاتا ہے اور الحشر کے معنی جمع کرنا' یعنی پھیلانے کے بعد جمع کرنا۔"تصوراتی اعتبار سے یہ دونوں مخالف یا مختلف حرکتیں ہیں اور معنوی اعتبار سے باہم متقابل ہیں۔ایک کے مفہوم میں بڑھانا' زمین میں پھیلانا اور بکھیرنا اور دوسرے مفہوم کا منظر ہے جمع کرنا اور اٹھانا' ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ دونوں مناظر کو جمع فرما دیتا ہے تاکہ انسانی احساس میں دونوں مناظر آ جائیں۔یہ قرآن کا تصور ہے۔انسان جو زمین کے اندر منتشر ہوتے اور پھیلتے جاتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ ایک دن تمہارے جمع کا بھی ہے۔جہاں جمع کر کے تمہیں ایک ہی میدان میں اٹھایا جائے گا اور اس حیات اور اس موت کے بعد یہ بہت ہی بڑا معاملہ ہے۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اس بڑے معاملے میں تم شک میں پڑے ہو؟ اور سوالات کرتے ہو؟

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٥﴾

"یہ کہتے ہیں "اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پورا ہو گا؟"

یہ ایک خلجان آلودہ سوال ہے اور اس کے اندر ہٹ دھرمی اور تکبر کی بو بھی۔

اس وعدے اور قیام قیامت کے وقت کا علم ہمیں اس قدر ہے کہ وہ اپنے وقت سے مقدم و موخر نہیں ہو سکتا۔ اس کا وقت ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ یہ یوم الجزاء ہے۔ہمارے لیے اس میں کیا فرق ہے کہ وہ کل آ جائے یا کئی ملین سال بعد آ جائے' ہماری زندگی تو مختصر سی زندگی ہے۔اصل بات یہ ہے کہ یہ آنے والی ہے اور اس کے لئے تیاری کرنا ضروری ہے۔تمہیں اس میں بہرحال اٹھایا جائے گا اور جزاء و سزا ہو گی۔

اس لیے اللہ نے اس کے وقت کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔کیونکہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم ہو جانے میں کوئی فائدہ ہی کیا ہے۔انسان کی عملی زندگی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ان احکامات کے ساتھ اس کا تعلق ہے' جو انسان کو دیئے گئے ہیں۔بلکہ مصلحت تو اس میں ہے کہ عام لوگوں کو اس کے وقوع کے وقت کا پتہ نہ ہو' صرف اللہ کو پتہ ہو۔

قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٢٦﴾

"کہو "اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے' میں تو بس صاف صاف خبر کر دینے والا ہوں"۔

یہاں خالق اور مخلوق کے درمیان پورا فرق ہو جاتا ہے۔اللہ کی ذات علیحدہ اور ممتاز ہو جاتی ہے' نہ اس کا کوئی شبیہ رہتا ہے اور نہ شریک۔اور علم خالص اسی کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے اور تمام مخلوق رسول' ملائکہ اللہ کے سامنے باادب کھڑے رہ جاتے ہیں۔"کہو اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے۔میں تو بس صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں"۔جس

طرح حدیث جبریل میں آتا ہے۔

ما المسئول عنہا باعلم من السائل "کہ مسئول عنہ سائل سے زیادہ علم نہیں رکھتا"۔ یہ علم نہ رسولوں کے پاس ہے اور نہ فرشتوں کے پاس ہے' رسول کا کام فقط ڈرانا ہے۔

یہ لوگ شک کے انداز میں قیامت کے بارے میں سوالات کرتے تھے اور اللہ کی طرف سے ان کو نہایت قطعی انداز میں جواب دیا جا رہا تھا' قرآن کریم اپنے مخصوص انداز میں یہ تخیل دیتا ہے کہ گویا یہ دن آ ہی گیا ہے اور یہ لوگ حشر کے میدان میں ہیں اور قیامت درپیش ہے اور اب وہاں یہ ہو رہا ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـئَتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ۝۲۷

"پھر جب یہ اس چیز کو قریب دیکھ لیں گے تو ان سب لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے' جنہوں نے انکار کیا ہے' اور اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم تقاضا کر رہے تھے"۔

جب انہوں نے اسے دیکھ لیا اور وہ ان کے سامنے ہے۔ ان کو توقع ہی نہ تھی کہ ان کے سامنے کھڑی ہو گی۔ اب تو ان کے چہروں کی شکل بگڑ رہی ہے۔ غم کے بادل ہیں ان چہروں پر۔ اب ان کو یوں سرزنش کی جاتی ہے۔

هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ (٦٧: ٢٧) "یہی ہے وہ چیز جس کے لیے تم تقاضے کرتے تھے"۔

یہ ہے حاضر اور قریب۔ اور دعویٰ تمہارا یہ تھا کہ قیامت کہاں ہے؟

یہ انداز کہ ہونے والے واقعات کو قرآن اس طرح پیش کرتا ہے کہ گویا ہو گئے' یہ ان کے شکوک و شبہات کے جواب میں کیا ہی خوب انداز ہے۔ ان کو ایک شعوری جھٹکا دیا جاتا ہے کہ وہ دیکھو قیامت تو برپا ہے۔ اور تکذیب کرنے والا اور شک کرنے والا کلام ربانی کے سامنے مبہوت رہ جاتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ منکر ہے بلکہ منظر کے سامنے کھڑا رہتا ہے۔

اور یہ تصویر کشی اثر انداز اس لیے ہوئی ہے کہ اللہ کے علم میں ہیں وہ ہونے والے مناظر' گویا فی الواقعہ وہ مناظر قائم ہیں' کیونکہ اللہ کا علم زمان و مکان کے قید کے اندر محدود نہیں۔ یہ ماضی' حال اور مستقبل تو انسان کے لیے ہیں۔ آج اگر اللہ حکم دے تو یہ شاید ہم اسی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح اچانک منکرین مخاطبین کو دنیا سے آخرت میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اور شک و شبہ کی بجائے ان کا سامنا کرا دیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کے سامنے ان کو لایا جاتا ہے جو اللہ کے علم میں قائم ہے' اگر پردہ اٹھا دے تو ہم بھی دیکھ لیں' لیکن اللہ یہاں صرف اس کی تصویر دکھاتا ہے۔

مشرکین مکہ اس قدر احمق' خوش فہم اور معاند تھے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور مٹھی بھر مومنین کے بارے میں یہ تمنائیں کرتے تھے کہ وہ ہلاک ہو جائیں اور یہ مومنین سے بے غم ہو جائیں۔ اور وہ ایک دوسرے کو یہی نصیحت کیا کرتے تھے کہ بھائی صبر کرو' چند لوگ ہیں مرکھپ جائیں گے۔ اس لیے یہ انتشار خود بخود ختم ہو جائے گا جو قریش کی صفوں میں انہوں نے برپا کر دیا ہے اور بعض اوقات تو وہ اس زعم میں مبتلا ہو جاتے تھے کہ اللہ عنقریب محمد ﷺ اور

اس کے ساتھیوں کو ہلاک کر دے گا۔ اس لئے کہ وہ صابی اور گمراہ ہیں کیونکہ یہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔اب حشر و نشر کے اس میدان کے بعد ان کو کہا جاتا ہے تمہاری یہ تمنائیں تو اپنی جگہ 'لیکن اگر محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ان کے ساتھی ہلاک کر دیئے گئے تو تم عذاب الیم سے کس طرح بچ جاؤ گے۔تم اپنے رویہ اور اپنے عقائد اور اپنے اعمال پر غور کرو۔اگر یہ پیغمبر اور اس کے مٹھی بھر ساتھی ہلاک ہوگئے تو اس سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾

"ان سے کہو 'کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اللہ خواہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کرے' کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچالے گا"۔

یہ ایسا سوال ہے' جو انہیں سنجیدہ غوروفکر کی دعوت دیتا ہے اور یہ دعوت ہے کہ اپنے معاملات پر ذرا غور کرو' تمہارے لیے بہتر یہ ہے۔اگر نبی اور اس کے مٹھی بھر ساتھی ہلاک بھی ہو جائیں تو تمہیں کیا فائدہ ہو گا۔اللہ تو باقی ہے۔نبی اور اس کے ساتھی اللہ کے دائرہ رحم میں ہیں' لیکن تمہیں تو اس کے سامنے جانا ہے۔اس نے تمہیں پیدا کیا اور اسی کی طرف جانا ہے۔تمہاری تیاری کیا ہے؟

یہ سیاق کلام میں۔

مَنْ يُّجِيْرُكُمْ نہیں کہا جاتا' بلکہ يُجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ (٦٧ : ٢٨) کہا جاتا ہے۔یہ نہیں کہا جاتا کہ تم کافر ہو' بلکہ یہ کہ جو کافر ہوں گے ان کو کون بچائے گا۔اشارہ یہ ہے کہ عذاب کافروں کے لیے ہے۔

فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (٦٧ : ٢٨) "کافروں کو دردناک عذاب سے کون بچائے گا"۔ یہ دعوت کا حکیمانہ اسلوب ہے۔ایک طرف انہیں ڈرایا جاتا ہے دوسری جانب اشارہ دیا جاتا ہے کہ واپس ہو جاؤ اس راہ سے۔اگر یہ کہا جاتا کہ تم تو کافر ہو اور تمہارے لیے عذاب الٰہی سے کوئی بچاؤ کی راہ نہیں ہے تو وہ شاید جہالت و حماقت کا راستہ اختیار کر کے منہ آتے۔اور براہ راست اقدام کی وجہ سے عناد میں مبتلا ہو جاتے۔

بعض اوقات اشاراتی انداز صریح انداز سے زیادہ اثر کرتا ہے۔"نہ ہم سمجھے کہ تم آئے کہیں سے"۔ایسا انداز بہت موثر ہوتا ہے۔

اب اس اشارہ کے بعد دونوں موقف برابر نہیں ہیں۔مومنین کو اپنے رب پر بھروسہ ہے۔وہ توکل علی اللہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں' اور اپنے ایمان پر وہ مطمئن ہیں' وہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ راہ ہدایت پر ہیں اور دراصل کھلی گمراہی میں تو ان کا فریق مخالف مبتلا ہے۔

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ

ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ۝

"ان سے کہو' وہ بڑا رحیم ہے' اسی پر ہم ایمان لائے ہیں' اور اسی پر ہمارا بھروسہ ہے' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ صریح گمراہی میں پڑا ہوا کون ہے"۔

یہاں اللہ کی جگہ رحمن کی صفت اس لیے لائی گئی ہے کہ اللہ نبی اور اس کے مٹھی بھر ساتھیوں کو ہلاک نہیں کرتا بلکہ وہ ان پر رحیم وکریم ہے' جس طرح کہ تمہاری تمنائیں ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ساتھیوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے موجودہ تعلق کو مضبوط کرو' اعلان کردو۔

اٰمَنَّا بِه (٦٧ : ٢٩) "ہم اس پر ایمان لائے ہیں" صرف اللہ پر۔ انداز کلام اس کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ مسلمانوں کے بہت ہی قریب ہے۔ ان کے درمیان اعتماد کا تعلق ہے۔

وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا (٦٧ : ٢٩) "اور اس پر ہمارا بھروسہ ہے" صرف اس پر۔ اللہ تعالیٰ نبی کو حکم دیتا ہے کہ اس فضل وکرم کا اعلان کردیں۔ آپ کو گویا کہا جاتا ہے کہ ان کفار کی تمناؤں اور اقوال سے نہ ڈریں۔ میں تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ساتھ ہوں۔ لہٰذا یہ اعلان کردیں اور یہ اللہ کی جانب سے نبی اور دوستان نبی کے ساتھ دوستی کا اعلان ہے۔ جس میں ان کے لیے اعزاز ہے۔

اور فریق مخالف کو بالواسطہ دھمکی دی جاتی ہے۔

فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (٦٧ : ٢٩) "عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ صریح گمراہی میں پڑا ہوا کون ہے"۔

یہ بھی ایک انداز ہے جو ہٹ دھرمی اور اصرار کے قلعوں میں دراڑیں ڈال دیتا ہے اور مخاطب کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی پوزیشن پر غور کرے کہ کہیں وہ خود تو گمراہ نہیں ہے۔ کہیں وہ خود تو عذاب کا مستحق نہیں ہو رہا ہے۔

فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (٦٧ : ٢٨) "کون ہوگا جو کافروں کو عذاب الیم سے پناہ دے گا" لیکن اس پوری گفتگو میں اللہ ان کو یہ نہیں کہتا کہ تم کافر ہو تاکہ وہ ضد میں نہ آجائیں۔ یہ دعوت کا اسلوب ہے جو زیادہ تر حالات میں مفید رہتا ہے۔

اور اب عقل وخرد کی تاروں پر آخری شدید ضرب جن سے زمزمہ اٹھتا ہے۔ یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ خبردار یہ تو ہے اخروی عذاب۔ لیکن اللہ نافرمانوں کو اس دنیا میں بھی عذاب دیا کرتا ہے۔ آج ہی اگر اللہ پانی بند کردے تو سوچو

۲ تمہاری حالت کیا ہو جائے۔

۱۶ ع ۲ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ۝

۲

”ان سے کہو ' کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر تمہارے کنوؤں کا پانی زمین میں اتر جائے تو کون ہے جو اس پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمہیں نکال کر لا دے گا؟“

مَآؤُكُمْ غَوْرًا (۶۷: ۳۰) کے معنی اس پانی کے ہیں جو زمین کی رگوں میں دور تک چلا جائے اور اسے واپس لانے کی کوئی سبیل نہ ہو۔

مَّعِيْنٍ (۶۷: ۳۰) وہ چشمہ جو زمین سے ابل کر پانی لا رہا ہو۔ یہ مناظر وہ دیکھتے رہتے تھے۔ اگرچہ وہ اس دن اس میں شک کرتے تھے۔ لیکن زمین و آسمان کی بادشاہت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے 'وہ جس وقت چاہے ان چشموں کو خشک کر دے۔ اگر اللہ ان کی زندگی کے اس سبب کو ہی کشید کر لے تو نتائج کیا ہوں۔ اس کے بعد ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے ذرا اس پر بھی غور کر لو۔

یوں اس سورت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ دلائل 'تاثرات' ملکوت سماوات اور ارض کی سیر' ہر آیت ایسی کہ بذات خود فکر انگیز 'قلب و نظر اور فکر و خیال کی جولانی۔

یہ بہت ہی زیادہ فکر انگیز سورت ہے۔ حجم اگرچہ کم ہے لیکن تصورات 'ہدایات آفاق کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ اشاراتی تیر ہیں جو بہت ہی دور تک فکر و خیال کو لے جاتے ہیں اور کائنات کی سیر کراتے ہیں۔

یہ سورت اسلامی تصور حیات کی بنیادیں رکھ دیتی ہے۔ یہ ضمیر کے اندر بٹھاتی ہے کہ تمام فیصلے ازل میں ہو چکے ہیں۔ تمام کائنات پر اللہ کا مکمل کنٹرول ہے 'انسانوں کو یہاں آزمائش اور امتحان کے لیے بھیجا گیا جس کا نتیجہ حشر و نشر کے دن نکلے گا۔ اللہ کی مخلوقات میں کمال و جمال انتہاؤں پر ہے۔ اللہ کا علم ظاہر و باطن پر محیط ہے 'رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ مخلوقات کا محافظ ہے 'وہ مخلوقات کے ساتھ ہے 'ایک مسلم کا تصور اب کیا ہے 'پھر اس کائنات کا اللہ کے ساتھ کیا تعلق ہے 'یہ وہ مجموعہ تصورات ہے جس کے اوپر اسلامی نظام حیات کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ مومن کا تعلق اپنے رب کے ساتھ 'مومن کا تعلق اپنے نفس کے ساتھ 'مومن کا تعلق اپنے بھائیوں اور انسانوں کے ساتھ 'مومن کا تعلق تمام زندہ مخلوقات کے ساتھ 'مومن کا تعلق روئے زمین کی اشیاء کے ساتھ۔ یہ تصورات انسان کے ضمیر میں ان تعلقات کو اس تفصیلی کیفیات عطا کرتے ہیں۔ اس سے ایک مسلم کی زندگی کی اقدار اور پیمانے وضع ہوتے ہیں۔

---○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ــ ۲۹

سورۃ القلم ـ ۶۸

۱ ــ تا ــ ۵۲

سورۃ القلم ایک نظر میں

یہ ممکن نہیں ہے کہ اس سورت کے نزول کی تاریخ کا تعین کیا جا سکے ۔ چاہے اس کا آغاز ہو یا دوسرے پیراگراف ہوں۔ نیز یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ابتدائی آیات پہلے نازل ہوئیں اور دوسری آیات بعد میں نازل ہوئیں ۔ ان احتمالات میں سے کسی کو ترجیح بھی نہیں دی جا سکتی۔

روایات میں آتا ہے کہ سورت علق کے بعد نازل ہونے والی یہ دوسری سورت ہے ' اور مختلف مصاحف کی ترتیب میں بھی یہ دوسری سورت ہے ۔ لیکن سورت کا سیاق کلام 'اس کے موضوعات و مضامین اور اس کا اسلوب اس موقف کے خلاف ہیں ۔ بلکہ نظر یوں آتا ہے کہ یہ سورت انفرادی دعوت کے سہ سالہ دور کے بعد نازل ہوئی ہے ' جبکہ دعوت عام شروع ہوگئی تھی اور قریش نے علی الاعلان دعوت اسلامی کی مخالفت شروع کر دی تھی ۔ قریش نے رسول اللہ کے بارے میں اپنا یہ شرمناک الزام لگانا شروع کر دیا تھا ۔ اور قرآن نے اسے نقل کر کے اس کی تردید شروع کر دی تھی ۔ اور اس کے ساتھ قرآن کریم نے دعوت اسلامی کی راہ روکنے والوں کو دھمکی دینا بھی شروع کر دی تھی ۔ یہ دھمکی اس سورت میں موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلقات تلخی تک پہنچ گئے تھے ۔

اور یہ احتمال کہ اس سورت کی پہلی آیات بھی سورہ علق کی ابتدائی آیات کی طرح نہایت ہی ابتدائی دور کی ہیں اور یہ کہ یہاں جس جنون کی نفی کی گئی ہے 'اس سے مراد وہ خیال ہے جو حضورﷺ کو آغاز وحی کے دور میں لاحق تھا کہ شاید آپ کو کوئی جنون لاحق ہو گیا ہے تو یہ نہایت ہی غلط بات ہے ۔ کیونکہ ایک تو اس بارے میں کوئی صحیح ثابت شدہ روایت نہیں ہے ' دوسرے یہ کہ سورت کا انداز بیان مسلسل ہے اور اس سورت کے آغاز میں جس جنون کا ذکر ہے ۔

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (۶۸ : ۲) "تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو" اس سے مراد حضورﷺ کا اپنا تاثر نہیں ہے بلکہ مراد وہ جنون ہے ' جو سورت کے آخر میں مخالفین آپ پر الزام لگاتے کیونکہ سورت کے آخر میں آیا ہے ۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ (۶۸ : ۵۱) "اور یہ کافر لوگ کلام نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو کہیں ایسی نظروں سے دیکھتے کہ گویا تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے" ۔ یہی وہ بات ہے کہ جس کا جواب سورت کے آغاز میں بھی دیا گیا ہے ۔ نیز سورت کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تمام کڑیاں باہم ملی ہوئی ہیں ۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ اس سورت کی آیات ۱۷ سے لے کر ۳۳ تک مدنی ہیں ۔ ان آیات میں باغ والوں کا

ذکر آیا ہے 'ان کی آزمائش کا ذکر ہے ۔ نیز آیات ۴۲ سے آیات ۵۰ تک بھی مدنی ہیں جن میں صاحب الحوت یعنی مچھلی والے کے قصے کی طرف اشارہ ہے ۔ ہم سمجھتے ہیں یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں ۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ پوری سورت مکی ہے ۔ کیونکہ پوری سورت کا انداز مکی ہے اور اس پر گہری مکی چھاپ ہے ۔ اور سورت کا سیاق اور انداز سورت کے مکی اور مدنی ہونے میں زیادہ فیصلہ کن ہوتا ہے ۔ یہ پوری سورت اپنے موضوع کے ارد گرد نہایت ربط اور ترتیب کے ساتھ چل رہی ہے ۔

ہماری رائے یہ ہے کہ یہ سورت ترتیب نزولی کے اعتبار سے دوسری سورت تو نہیں ہے 'لیکن یہ بات درست ہے کہ یہ سورت اس وقت نازل ہوئی جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام دعوت شروع کر دی تھی ۔ اور یہ سورت اس حکم کے بعد نازل ہوئی ہے ۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ "اور اے پیغمبر اپنے خاندان کے قریبی لوگوں کو ڈرائیں"۔ اس وقت تک قرآن کریم کا ایک حصہ نازل ہو گیا تھا ۔ جس میں انبیائے سابقین کے احوال اور قصص بھی آگئے تھے جن کے بارے میں اہل مکہ نے کہا ۔

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۶۸ : ۱۵) "پرانی کہانیاں ہیں"۔ اور قریش کو پورے اسلام کی دعوت دے دی گئی تھی ۔ اور اہل قریش غلط اور باطل الزامات عائد کر کے دعوت اسلامی کے مقابلے پر اتر آئے تھے ۔ اور انہوں نے تحریک کے خلاف شدید حملے کر کے اس کو آنکھیں دکھانا شروع کر دی تھیں ۔ سورت کی آخری آیت ۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ (۶۸ : ۵۱) "اور یہ کافر لوگ کلام نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو کہیں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ گویا تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے"۔ اس سے نظر آتا ہے کہ آپ نے عام لوگوں کو دعوت دینا شروع کر دی تھی ۔ آغاز دعوت میں یہ منظر نہ تھا ۔ آغاز میں تو افراد کو دعوت دی جاتی تھی اور انفرادی ذرائع سے دی جاتی تھی ۔ اور کفار کے جلسہ ہائے عام میں بات نہ کی جاتی تھی اور دعوت کا یہ منظر نامہ نبوت کے تیسرے سال کے بعد کی بات ہو سکتی ہے ۔

پھر اس سورت میں یہ بھی ہے کہ مشرکین نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے مصالحت کی تجاویز بھی پیش کرنا شروع کر دی تھیں تاکہ کچھ لو اور کچھ دو کے معاملے پر یہ مسئلہ طے ہو جائے اور نظریاتی معاملات میں مصالحت ہو جائے ۔ لیکن قرآن نے صاف صاف جواب دیا ۔

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۶۸ : ۹) "یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں"۔ ظاہر ہے کہ اگر دعوت ایک ایک فرد کو دی جا رہی ہے تو اس اجتماعی فیصلے کا مطالبہ کس طرح ہو سکتا ہے ۔ کیونکہ انفرادی دعوت سے کوئی معاشرتی خطرہ پیدا نہیں ہوتا ۔ اور اس قسم کا خطرہ تو تب ہوتا ہے جب دعوت ظاہر ہو اور زور پکڑ لے ۔ یوں بے شمار دلائل و شواہد خود سورت کے اندر ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت ابتدائی دور کی نہیں

ہے اور یہ سورت کم از کم نبوت کے تین سال بعد نازل ہوئی ہے ۔ اور اس کا عرصہ اس سے بھی متاخر ہو سکتا ہے ۔ یعنی دعوت کے آغاز اور نزول کے درمیان تین سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو سکتا ہے ۔ یہ بات بھی معقول نظر نہیں آتی کہ تین سال گزر گئے ہوں اور ان میں قرآن کریم نازل نہ ہوا ہو ۔ معقول بات یہی ہے کہ اس تین سال کے عرصے میں کئی سورتیں اور ان کے اجزاء نازل ہوئے ہوں گے ۔ جن کے اندر صرف عقیدے اور نظریہ کی بات ہو گی اور ان میں مخالفتوں پر تنقید زیادہ نہ ہو گی جس طرح اس سورت میں سخت تنقید وارد ہے ۔ اول سے آخر تک تنقیدی جملے ہیں ۔

لیکن اس سے اس کی نفی بھی نہیں ہوتی کہ سورہ المزمل اور المدثر اور یہ سورت دعوت کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئی ہیں ۔ اگرچہ بہت ابتدائی نہ بھی ہوں 'جس طرح مصاحف میں آیا ہے ۔ اور اسباب و دلائل وہی ہیں جن کی طرف اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں ۔ یہ بحث و استدلال سورہ المزمل اور المدثر پر بھی صادق آتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پودا 'یعنی اسلامی نظریہ حیات کا صاف و ستھرا پودا اس زمین میں سب سے پہلے لگایا جا رہا تھا ۔ نظریہ نہایت بلند اور صاف ستھری شکل میں اور عربوں کے اندر جو جہالت اور جاہلیت چھائی ہوئی تھی 'اس کی آب و ہوا اس پودے کے لیے بے حد ناموافق تھی ۔ نہ صرف عربوں میں بلکہ پورے کرۂ ارض پر سے صحیح عقیدہ توحید اٹھ چکا تھا ۔

قریش کے ہاں ملت ابراہیم کے کچھ مدھم سے خطوط تھے ۔ اور جن کو انہوں نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا 'لیکن ان کے اندر انہوں نے مشرکانہ خرافات ' افسانوں اور قصے کہانیوں اور اوہام اور سنی سنائی باتوں کو ملا دیا تھا ۔ اس کے مقابلے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ملت ابراہیمی کو جس صاف اور ستھری صورت میں پیش کیا 'جس قدر سیدھے اور سادہ طریقے سے بیان کیا 'اور جس قدر جامع اور مانع عقیدہ توحید کی شکل میں ان کے سامنے رکھا 'ان کو یہ بالکل نئی چیز نظر آئی ۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقائد اس سرچشمے سے تھے جس سے ابراہیم علیہ السلام کا دین حنیف اول آیا تھا ۔ پھر اس کو اللہ نے اس جدید دور کے لیے مزید مکمل نظریہ و عمل کی شکل دے دی تھی کیونکہ اس دین کو اب قیامت تک کے لوگوں کی رہنمائی کرنی تھی اس لئے کہ اب انسان وہ انسان نہ رہا تھا جو ابراہیم علیہ السلام کے دور کا پسماندہ انسان تھا 'اب تو انسانیت عقلی اعتبار سے رشد و بلوغ کے دور میں داخل ہو گئی تھی ۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیش کردہ عقیدۂ توحید اور عربوں میں مروجہ بے شمار الہوں کے عقیدے کے درمیان ایک بہت بڑا انقلابی اور بنیادی فرق تھا ۔ ان ارباب متفرقون کے علاوہ یہ لوگ اب جنوں کی بھی پوجا کرتے تھے ۔ ملائکہ کی پرستش بھی کرتے تھے ۔ نیز دوسری اقوام سے بھی انہوں نے ادھر ادھر کے عقائد 'ٹکڑیوں کی شکل میں لے رکھے تھے جبکہ قرآن میں یکلخت تمام الہوں کی نفی کر کے صرف ایک اللہ کو الہ مانا گیا تھا 'واحد الہ عظیم الہ ۔ ہر چیز پر قادر الہ ' اور ایسا الہ جو ہر وقت اپنی پوری کائنات اور پوری مخلوقات کا نگہبان ہے اور جس کا ارادہ براہ راست ان کے ساتھ متعلق ہے ۔

پھر اس وقت اہل عرب کے اندر جو طبقات تھے ' طاقتور قبائل کے سردار 'کاہن اور خانہ کعبہ کے مجاور اور خادم اور عام لوگ 'ان کے درمیان مختلف قسم کے امتیازات قائم تھے جبکہ اسلام کا نظریہ حیات ان تمام امتیازات کو ختم کر رہا تھا ' تمام انسانوں اور انسانوں میں سے محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کر رہا تھا جیسا کہ قرآن کریم کی عام تعلیمات تھیں ۔

اسی طرح قرآن کریم ایک اخلاقی انقلاب کا داعی تھا ۔ عربوں میں رائج اخلاقیات کو ختم کر کے ایک نیا اخلاقی نظام قائم

کر رہا تھا' جس پر محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عمل پیرا تھے ۔

صرف اخلاقی انقلاب ہی اس بات کے لیے کافی تھا کہ قریش اس دین جدید کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں' لیکن ان کو صرف جدید اخلاقیات ہی پر اعتراض نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ دوسرے اعتبارات بھی تھے اور قریش کے نزدیک سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بتوں کو برا بھلا کہتے تھے ۔

بعض لوگوں کے نزدیک یہ بات بھی قابل اعتراض تھی کہ مکہ اور طائف کے دو شہروں میں بعض نہایت ممتاز لوگ بھی تھے ۔ چاہئے تو یہ تھا کہ یہ قرآن کسی ممتاز شخص پر نازل کیا جاتا ۔

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ "یہ قرآن ان دو شہروں کے کسی عظیم آدمی پر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟" دو شہروں سے مراد مکہ اور طائف ہیں ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ قریش کی ایک اعلیٰ شاخ کے چشم و چراغ تھے لیکن بعثت سے پہلے آپ سردار نہ تھے ۔ جبکہ اہل مکہ میں سرداری کا نظام تھا' نیز بنوثقیف میں بھی سرداری کا نظام تھا جبکہ اس وقت کی عرب سوسائٹی میں اقتدار قبائل کے سرداروں کے پاس ہوا کرتا تھا ۔ اور ان سرداروں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی سرداری چھوڑ کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اطاعت شروع کر دیں ۔ یہ بہت ہی بڑا انقلاب تھا ۔ (حضور ﷺ سرداری نظام کو ختم کر کے مرکزی انتظامیہ قائم کرنا چاہتے تھے) ۔

پھر خود قریش کے اندرونی خاندانی رقابتیں بھی زوروں پر تھیں ۔ مثلاً ابوجہل جیسا ضدی آدمی اس بات پر تلا ہوا تھا کہ دین اسلام میں داخل ہو کر وہ کس طرح بنو عبد مناف کی سیادت کو قبول کرے ۔ اخنس ابن شریق اور ابو سفیان کے ساتھ اس کی جو گفتگو تاریخ کی کتابوں میں نقل ہوئی کہ یہ تینوں ایک دوسرے سے چھپ کر تین راتیں قرآن سنتے رہے اور ہر رات یہ وعدہ کرتے رہے کہ یہ دوبارہ نہ آئیں گے مگر آتے ہی رہے ۔ بعد میں انہوں نے آخر کار حلف اٹھایا کہ آئندہ نہ آئیں کہ اگر عوام نے انہیں دیکھ لیا تو ان پر اثر ہو جائے گا' جب اخنس ابن شریق نے ابوجہل سے' اس کی رائے دریافت کی تو اس کا جواب یہ تھا :"تم نے کیا سنا؟ ہم اور بنو عبد مناف ایک دوسرے سے عزت اور شرف کے حصول کے لیے لڑتے رہے ۔ انہوں نے لوگوں کو کھانے کھلائے تو ہم نے بھی کھلائے ۔ انہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں تو ہم بھی سواریاں دیں یہاں تک کہ گھٹنے سے گھٹنا ملا کر ہم نے گھوڑوں پر مقابلہ کیا ۔ اور ہم یوں تھے جیسے مقابلہ کرنے والے سوار ۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں سے ایک نبی پیدا ہو گیا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے تو ہم نبی کہاں سے لائیں ۔ خدا کی قسم! ہم اس پر کبھی ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے" ۔

ان وجوہات کے علاوہ بھی بعض اسباب تھے اور بعض ایسے حالات تھے کہ لوگوں کے مفادات' ان کے طبقات' اور ان کے نفسیاتی تصورات اور عزت نفس پر زد پڑتی تھی ۔ یہ تصورات اور برتری کا یہ شعور ایام جاہلیت سے ان کے دل و دماغ میں بیٹھا ہوا تھا ۔ اس لیے یہ تمام قوتیں اس سعی میں لگی ہوئی تھیں کہ اس نظریاتی پودے کو کسی طرح اکھاڑ پھینکیں' قبل اس کے کہ اس کی جڑیں مضبوط ہو جائیں اور گہری زمین کے اندر چلی جائیں ۔ اور قبل اس کے کہ یہ درخت تومند ہو کر پھیل جائے ۔ خصوصاً اس وقت جب یہ انفرادی خفیہ دعوت کے دور سے گزر کر تحریک آگے بڑھ گئی ۔ اللہ نے اپنے نبی کو حکم دے دیا کہ اب علانیہ اجتماعی دعوت شروع کر دیں اور دعوت کے خدوخال واضح ہونے لگے اور قرآن کریم مسلسل نازل ہونے لگا اور شرکیہ عقائد اور غلط رسومات کو اس نے جڑ سے اکھاڑنا شروع کر دیا ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اگرچہ نبی تھے ۔ آپ پر رب تعالیٰ کی طرف سے وحی آرہی تھی ' عالم بالا سے آپ کا رابطہ تھا لیکن بہرحال آپ بشر تھے ' انسانوں کے جذبات اور خلجانات آپ کی ذات کا حصہ تھے ' آپ کو سخت مخالفت کا سامنا تھا ۔ مشرکین نے اب ہر طرف سے مخالفت شروع کر دی تھی ۔ آپ اور آپ کے مٹھی بھر ساتھی یہ تمام مشکلات جھیل رہے تھے ۔

آپ بھی مشرکین کی باتیں سنتے تھے اور آپ کے مٹھی بھر ساتھی بھی مشرکین کی باتیں سنتے تھے ۔ یہ لوگ آپ پر ذاتی حملے کرتے تھے ۔

وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ (٦٨ : ٥١) "وہ کہتے تھے کہ ضرور یہ دیوانہ ہے" ۔ آپ کے ساتھ وہ جو مزاح کرتے تھے یہ اس کا ایک نمونہ ہے ۔ جو قرآن نے نقل کر دیا ہے ۔ یہ تو تھا ان کا حملہ آپ کی ذات کے بارے میں ۔ اس کے علاوہ جو لوگ مسلمان ہوگئے ان کے اقربا ان پر اپنے گھروں میں مظالم ڈھا رہے تھے ۔ مسلمان قلیل تھے ' ضعیف تھے اس پر ان کا مزاح اور ٹھٹھے ' ان کے لیے شدید اذیت کا باعث ہوا کرتے تھے ۔ اگرچہ یہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کے متعلق تھے ۔

چنانچہ اس پارے میں اور اس دور کی تمام سورتوں میں یہ نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو اور مسلمانوں کو بہت زیادہ تسلی دیتا ہے ۔ اور ان کو اپنی نگہداشت میں رکھے ہوئے ہے ' وہ ان کا ولی اور نگہبان ہے ۔ اللہ ان کو تسلی دیتا ہے ۔ ان کی تعریف کرتا ہے اور اس دعوت کا جو اخلاقی پہلو ہے ' اسے نمایاں کیا جاتا ہے جو نبی کریم کی ذات اور مسلمانوں کے نفوس کے اندر نمایاں ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ الزامات کی تردید فرماتا ہے اور ضعیف مسلمانوں کے دلوں کو مطمئن فرماتا ہے اور یہ تسلی دیتا ہے کہ دشمنوں کے ساتھ لڑنے کے لیے وہ کافی ہے اور ان کا بندوبست وہ خود کر دے گا ۔ تم فکر نہ کرو ' اگرچہ تمہارے دشمن قوی اور مضبوط ہیں ۔

سورہ القلم میں اس قسم کی بے شمار تسلیاں ہیں ۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (١) مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (٢) وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (٣) وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (٤) (٦٨ : ١ تا ٤) "قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں ' تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو ' اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو" ۔

اور دوسری جگہ ہے :

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (٣٤) اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ (٣٥) مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (٣٦) (٦٨ : ٣٤ تا ٣٦) "یقیناً خدا ترس لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں نعمت بھری جنتیں ہیں ۔ کیا ہم فرمان برداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں ؟ تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے تم کیسے حکم لگاتے ہو" ۔

اور نبی کے ایک کھلے اور ممتاز دشمن کے بارے میں اللہ فرماتا ہے :

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (١٠) هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ (١١) مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ (١٢) عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ (١٣) أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ (١٤) إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (١٥) سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ (١٦) (٦٨: ١٠ تا ١٦)

"ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا ہے' بے وقعت آدمی ہے' طعنے دیتا ہے' چغلیاں کھاتا پھرتا ہے' بھلائی سے روکتا ہے' ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے' سخت بد اعمال ہے' جفاکار ہے' اور ان سب عیوب کے ساتھ بداصل ہے۔ اس بنا پر کہ وہ بہت مال اور اولاد رکھتا ہے۔ جب ہماری آیات اس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔ عنقریب ہم اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے"۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ مکذبین کے ساتھ نمٹ لینے کا اعلان کرتا ہے۔

فَذَرْنِي وَمَن يُكَذِّبُ بِهَٰذَا الْحَدِيثِ سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ (٤٤) وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ (٤٥) (٦٨: ٤٤ تا ٤٥) "پس اے نبی تم اس کلام کے جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم ایسے طریقے سے ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ میں ان کی رسی دراز کر رہا ہوں۔ میری چال بڑی زبردست ہے"۔

اور اس دنیا کے عذاب کے سوا ان کو آخرت کا عذاب بھی دیا جائے گا' جو بہت ہی سخت ہے۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَن سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ (٤٢) خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ (٤٣)

(٦٨: ٤٢ تا ٤٣) "جس روز سخت وقت آپڑے گا اور لوگوں کو سجدہ کرنے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے' ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی' ذلت ان پر چھائی ہوگی' یہ جب صحیح سالم تھے' اس وقت انہیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ (اور یہ انکار کرتے تھے)

ان کے سامنے باغ والوں کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ یہ اس دنیا کا قصہ ہے' اس سے عرب واقف تھے' سخت اترانے والے مالک تھے اس باغ کے۔ یہ تہدید ہے کبراء قریش کو جو اپنے مال و اولاد پر اترا رہے تھے' جس طرح اس سے قبل کہا گیا کہ ان کا سخت رویہ اس وجہ سے ہے کہ یہ صاحب مال و اولاد ہیں۔

سورت کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ صبر جمیل اختیار کریں۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ (٦٨: ٤٨) "اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ"۔

ان تسلیوں سے' ان تعریفوں سے' ان حوصلہ افزائیوں سے 'مکذبین کو ان شدید دھمکیوں سے' جو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جا رہی ہیں' اور خدا کی طرف سے ان کے خلاف اس اعلان جنگ سے' ان سب امور سے کیا معلوم ہوتا ہے؟ یہ کہ یہ دور مسلمانوں پر بہت سخت تھا' تعداد بہت کم تھی' مخالفین طاقتور تھے' غریب اور نادار لوگوں پر تشدد ہو رہا تھا' اور نہایت ہی مشکل حالات میں ناموافق زمین پر تحریک اسلامی کا پودا لگایا جا رہا تھا۔ یہ نظریاتی پودا جبکہ اسے اکھاڑنے کی سعی ہر طرف سے ہو رہی تھی۔

اس سورت کے اسلوب بیان سے' اس کے انداز تعبیر سے' اس کے موضوعات سخن سے بھی وہ حالات اچھی طرح عیاں ہیں' جو تحریک اسلامی کو اس وقت درپیش تھے۔ مخالفین اپنے خیالات' تصورات اور اعتراضات کے حوالے سے نہایت ہی سادہ' بدوی نظر آتے ہیں اور ان کی ترجیحات اور اجتماعات نہایت فروتر قسم کے ہیں جیسا کہ کسی بھی پرلے درجے کی پسماندہ سوسائٹی میں ہوتا ہے۔

جس انداز سے اللہ تعالیٰ ان کی افتراء پردازیوں کا رد فرماتا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی سوسائٹی کیسی تھی۔

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (۲) وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (۳) وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (٤) فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ (٥) بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ (٦) (٦٨ : ۲ تا ٦) "تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو' اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے' جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔ عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون جنون میں مبتلا ہے"۔ اور اس طرح اللہ کی جانب سے شدید دھمکی کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ حالات کس قدر سخت تھے اور یہ لوگ کس قدر اجڈ تھے۔

فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (٤٤) وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (٦٨ : ٤٥) "پس اے نبی تم اس کلام کے جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم ایسے طریقے سے ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ میں ان کی رسی دراز کر رہا ہوں۔ میری چال بڑی زبردست ہے"۔

اور حالات کی سنگینی اور ان لوگوں کی بدویت ان سخت الفاظ سے بھی معلوم ہوتی ہے' جو ان سے ایک شخص کے بارے میں استعمال ہوئے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (١٠) هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ (١١) مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (١٢) عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (١٣) (٦٨ : ١٠ تا ١٣) "ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا ہے' بے وقعت آدمی ہے' طعنے دیتا ہے' چغلیاں کھاتا پھرتا ہے' بھلائی سے روکتا ہے' ظلم و زیادتی

میں حد سے گزر جانے والا ہے 'سخت بد اعمال ہے 'جفاکار ہے 'اور ان سب عیوب کے ساتھ بد اصل ہے۔

ان کے لیے اللہ نے جس قصے کا انتخاب کیا ہے 'وہ بھی بعض سادہ لوح لوگوں کا قصہ ہے 'جن کی فکر 'جن کا تصور' جن کی سرکشی اور حرکات کا انعکاس اس سے خوب ہوتا ہے۔ ذرا اس قصے کے کرداروں کے اقوال دیکھیں۔

وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ (۲۳) اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ (۶۸: ۲۴) "اور وہ آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمہارے ساتھ باغ میں نہ آنے پائے"۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف ان لوگوں کو جس انداز میں خطاب کیا جاتا ہے 'اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہت سادہ تھے۔

اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ (۳۷) اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ (۳۸) اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ (۳۹) سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ (۴۰) (۶۸: ۳۷ تا ۴۰) "کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ یا پھر کیا تمہارے لیے روز قیامت تک ہم پر کوئی عہد و پیمان ثابت ہے کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ؟ ان سے پوچھو تم میں سے کون اس کا ضامن ہے؟"

یہ وہ صفات ہیں جو ان قرآنی تعبیرات سے 'واضح طور پر سامنے آتی ہیں 'جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی ایام میں دعوت اسلامی کو کس قدر سادہ لوح لوگوں سے واسطہ تھا۔ اور دعوت اسلامی کو کن حالات سے گزرنا پڑا۔ اور ان سادہ لوح بدوی لوگوں کو دعوت اسلامی اور قرآن نے حضور اکرم ﷺ کے آخری عہد میں کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا اور ان کی سادگی 'ان کی فکر 'ان کے تصورات اور ان کے شعور اور ان کی ترجیحات میں کس قدر عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ چنانچہ قرآن کے آخری دور یعنی ۲۲ سال بعد کے اسالیب کلام 'طرز خطاب 'انہی لوگوں کے شعور 'افکار اور ترجیحات میں کیا انقلاب برپا ہوا؟ حالانکہ بیس بائیس سال کا عرصہ اقوام کے عروج و زوال کی تاریخ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ اس طرح تھوڑا ہوتا ہے جس طرح پلک جھپکنے کا وقت۔ ۲۲ سال کا عرصہ اور ایک بدوی قوم کے اندر ایک عظیم انقلاب۔ یہ سوسائٹی اس قلیل وقت میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور اس نے دنیا سے علمی 'فکری اور سیاسی قیادت چھین لی اور پھر دنیا کو اس مقام تک پہنچایا جس تک وہ کبھی نہ پہنچی تھی۔ نہ نظریاتی اعتبار سے 'نہ اس زاویہ سے کہ کسی نظریہ نے لوگوں کی زندگیوں کو اس قدر بدل کر رکھ دیا ہو 'نہ اس اعتبار سے کہ کسی نظریہ نے اس قدر وسیع آبادی کو مختصر وقت میں اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو اور اسے رواداری 'محبت اور فکری غذا فراہم کی ہو 'اور شعوری ضروریات پوری کی ہوں 'ایک اجتماعی نظام دیا ہو 'تنظیمی ادارے دیئے ہوں 'اور تمام پہلوؤں سے انسانیت کو بلند کیا ہو؟

اس سورت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے سادہ ترین بدویت کے اندر کس قدر عظیم انقلاب برپا کیا 'جو گہرا بھی تھا 'جامع و مانع بھی تھا اور وسیع بھی تھا۔ غرض یہ ایک ہمہ گیر انقلاب تھا جس نے ضعف کو قوت میں بدل دیا۔ قلت کو کثرت میں بدل دیا۔ اور فکر کی کایا پلٹ دی۔ یاد رہے کہ انسانوں کی ظاہری صف بندی کے مقابلے میں فکری اصلاح مشکل ترین کام ہوتا ہے۔

درس نمبر ۲۶۸ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۵۲

سُوْرَةُ الْقَلَمِ (۶۸) مَكِّيَّةٌ (۲)
اٰيَاتُهَا ۵۲ رُكُوْعَاتُهَا ۲
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْنَ ﴿۱﴾ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲﴾ وَ اِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ﴿۳﴾ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿۴﴾ فَسَتُبْصِرُ وَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۵﴾ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ﴿۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۷﴾ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴿۹﴾ وَ لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ﴿۱۰﴾ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ﴿۱۱﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ﴿۱۳﴾ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۱۴﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۵﴾ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ﴿۱۶﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

"ن ۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں ' تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو ۔ اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ۔ اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو ۔ عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون گمراہی میں مبتلا ہے ۔ تمہارا رب ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں ' اور وہی ان کو بھی اچھی طرح جانتا ہے جو راہ راست پر ہیں ۔ لہٰذا تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ ۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں ۔ ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے ' طعنے دیتا ہے ' چغلیاں کھاتا پھرتا ہے ' بھلائی سے روکتا ہے '

ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے' سخت بداعمال ہے' جفاکار ہے اور ان سب عیوب کے ساتھ بداصل ہے' اس بنا پر کہ وہ بہت مال اور اولاد رکھتا ہے۔ جب ہماری آیات اس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔ عنقریب ہم اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے"۔

اللہ یہاں ن 'قلم اور کتابت کی قسم اٹھاتا ہے اور حرف نون ایک منفرد حرف ہے۔ اس میں اور قلم و کتابت میں تعلق واضح ہے۔ ان چیزوں کی قسم کیوں اٹھائی ہے؟ اس لیے کہ اسلام میں لکھنے پڑھنے کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اس سے یہ ہدایت مقصود ہے کہ اس کام کی طرف توجہ کرو کیونکہ عرب امی تھے اور وہ لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ نہ تھے۔ بہت ہی کم لوگ عربوں میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے جبکہ امت محمدیہ نے آئندہ انسانوں میں جو اہم کردار ادا کرنا تھا' اس کے لیے لکھنا پڑھنا بہت ہی ضروری تھا۔ اور قرات اور کتابت کا پھیلانا اسلامی پالیسی کا بنیادی نکتہ تھا تاکہ یہ نظریہ اور اس کے اوپر جو نظام برپا کیا جانا تھا' اسے پوری دنیا میں پھیلایا جا سکے اور یہ امت انسانیت کی قیادت کر سکے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اس مقصد کے لیے لکھنا پڑھنا ایک بنیادی ضرورت تھی۔

اس بات کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ وحی کا آغاز یوں ہوا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ (١) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (٢) اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ (٣) الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (٤) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (٥) (٩٦ : ١ تا ٥)

"پڑھو اے نبی اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا' جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا"۔ اور پھر یہ حکم دیا نبی امی کو جس کے بارے میں اللہ نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ امی ہیں اور اس کی خاص حکمت تھی۔ لیکن جب وحی آئی تو اس ہدایت کے ساتھ کہ پڑھو اور لکھو۔ یہاں نون کے ذریعہ اس کی مزید تاکید کی۔ اور قلم اور سطروں کی قسم اٹھائی۔ یہ ایک انداز تھا اس امت کی تربیت کا۔ جس نے اس کائنات میں ایک عظیم کردار ادا کرنا تھا۔

غرض یہاں قسم ہے حرف تہجی نون کی اور پھر قلم کی اور پھر سطروں کی۔ ایک اس بات کے لیے کہ قرات اور کتابت اسلام کی بنیادی پالیسی اور بہت اہم ہے۔ دوسرے اس بات کی تردید کے لیے جو کفار الزام لگاتے تھے کہ حضور اکرم مجنون ہیں تو اللہ تعالیٰ یہاں تردید کرتا ہے کہ رب کے فضل و کرم سے آپ مجنون نہیں ہیں۔

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (٦٨ : ٢) "تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو"۔ ایک مختصر سی آیت میں ایک بات کو ثابت کیا جاتا ہے اور ایک کی نفی کر دی جاتی ہے۔ ثابت یہ کیا جاتا ہے کہ آپ پر اللہ کا فضل و کرم ہے۔ اور نفی اس بات کی کی جاتی ہے کہ آپ مجنون نہیں ہیں۔ اور اثبات رحمت نہایت ہی اپنائیت کے ساتھ ہے۔

رَبِّكَ یعنی تمہارے رب کے فضل و کرم سے۔

جب انسان قبل نبوت کی سیرت کے واقعات پڑھتا ہے تو وہ متعجب ہوتا ہے کہ اس شخص پر یہ لوگ ایسا الزام لگاتے

ہیں جس کے بارے میں وہ جانتے تھے کہ وہ بہت بڑا دانا شخص ہے۔ نبوت سے کئی سال پہلے جب ان کے درمیان حجر اسود کے نصب کرنے پر اختلاف ہوگیا تو آپ نے بڑی عقلمندی سے مسئلہ کو حل کر دیا۔ پھر انہوں نے آپؐ کو امین کا لقب دیا۔ اور آپؐ کے پاس وہ اپنی امانتیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ہجرت کے وقت تک امانتیں آپؐ ہی کے پاس رکھی جاتی تھیں۔ سخت دشمنی کی حالت میں بھی ان کا اعتماد تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ ہجرت کے بعد ایک زمانہ تک مکہ میں رہے تاکہ لوگوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیں جو آپ کے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ پھر یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے کبھی جھوٹ نہ سنا تھا۔ جب ہرقل نے ابو سفیان سے پوچھا کیا نبوت سے پہلے تم نے کبھی اس پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا؟ ابو سفیان اگر چہ آپ کا سخت دشمن تھا مگر اس نے کہا کہ "نہیں"۔ تو اس پر ہرقل نے کہا کہ جو شخص تم میں سے کسی پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ خدا پر کس طرح جھوٹ باندھ سکتا ہے کہ لوگوں سے سچ کرے اور خدا سے جھوٹ۔

انسان حیران رہ جاتا ہے کہ مکہ کے لوگوں نے حضور اکرم ﷺ کے بارے میں یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں کرنے کی جرات کی۔ حالانکہ آپ بہت بلند اخلاق، مہربان، سچے اور ان کے درمیان نہایت ہی عقلمند مشہور تھے۔ لیکن محبت و نفرت انسان کو اندھا اور بہرہ کر دیتی ہیں۔ اور انسان اپنے مقاصد کے لیے جھوٹ بولنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ کہنے والا کذاب ہے۔

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (۶۸ : ۲) "تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو"۔ یوں نہایت محبت اور ہمدردی کے ساتھ آپ پر سے اس الزام کی نفی کی جاتی ہے۔ اور آپ کو اس سے باعزت طور پر بری قرار دیا جاتا ہے۔ اور ان کے کافرانہ عناد اور مذموم الزام کو رد کر دیا جاتا ہے۔

وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (۶۸ : ۳) "اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے"۔ یعنی آپ کے لیے دائمی اور مسلسل اجر کا انتظام ہے۔ یہ سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا، نہ انتہا کو پہنچے گا۔ تمہارے رب نے تجھے نبوت عطا کی ہے اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ یہ ایک نہایت بڑی اور حقیقی تسلی ہے اور نہایت ہی بھرپور ہے۔ اس کے بعد انسان کوئی محرومی، کوئی ظلم، کسی بہتان کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ جب رب تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ تمہارے لیے ایسا مسلسل اجر ہے، جس کا سلسلہ منقطع ہونے والا نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ پھر انسان اس راہ میں آنے والی کسی مشکل کی کوئی پرواہ نہیں کرتا خصوصاً جبکہ رب تعالیٰ کی طرف سے اپنائیت اور اعزاز و تکریم کے ساتھ یہ یقین دہانی ہو۔

اس کے بعد ایک عظیم شہادت آپ کے حق میں آتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸ : ۴) "اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس تعریف و ثنا میں پوری کائنات شریک ہو جاتی ہے اور اس پوری کائنات کی روح کے اندر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آپ خلق عظیم کے مالک تھے۔

کسی قلم میں یہ قوت نہیں ہے کہ وہ آپ کے مناقب بیان کر سکے، کسی شخص میں یہ قوت نہیں ہے کہ وہ آپ کے اخلاق کا تصور کر سکے۔ اور اس عظیم سرٹیفکیٹ کی تشریح کر سکے۔ یہ عظیم کلمات رب عظیم کی طرف سے ہیں۔ اور رب

تعالیٰ ہی اپنی اس عظیم شہادت کی تشریح کر سکتا ہے ۔ اللہ کے ہاں عظمت کے کیا پیمانے ہیں ' اس کا بندہ کس قدر عظیم ہے ' یہ وہی جانتا ہے ۔ جس نے کہا ۔

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ (٦٨ : ٤) "اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو" ۔ یہ خلق عظیم وہ ہے جس کا تصور کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی محدود عقل و ادراک سے اس کا تصور کر سکے ۔ لیکن مختلف پہلوؤں سے آپ کے اخلاق "عظیم" تھے ۔

سب سے پہلا پہلو تو یہ ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ رہی ہے ۔ رب تعالیٰ آپ کو خلق عظیم کا لقب عطا فرما رہا ہے ۔ اس میں اللہ کی مخلوق اور اس کی ناپیدا کنار کائنات بھی شامل ہے ۔ اور ملاء اعلیٰ کی تمام مخلوقات جو رب تعالیٰ کی کائنات کے کارندے ہیں ' سب اس میں شامل ہیں ۔

آپ کے خلق عظیم کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ نے یہ ربانی شہادت حاصل کی ۔ اپنے رب کی طرف سے حاصل کی ۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس عظیم کائنات کا عظیم باری تعالیٰ یہ کہہ رہا ہے "یہ ایک بہت اعزاز ہے" ۔ ان کلمات کا ایک عظیم مفہوم ہے ' ان کی ایک وسعت ہے ' ان کی ایک بلند گونج ہے ۔ آپ جانتے تھے کہ کس عظیم ذات کی ہے یہ شہادت اور یہ شہادت کس قدر عظیم ہے ۔

یہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی کا ظرف تھا جو اس عظیم شہادت کو قبول کرنے کی طاقت رکھتا تھا ۔ صرف آپ ہی کا حوصلہ تھا کہ اس عظیم مصدر سے یہ شہادت پائے اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی جگہ اور مقام پر قائم رہے ۔ اور اس عظیم شہادت کے دباؤ اور اثر کو برداشت کر سکے ۔ یہ ایک تعریف تھی لیکن آپ کی ذات کے اندر کوئی حرکت 'کوئی اضطراب پیدا نہ ہوا ۔ نہایت اطمینان ' نہایت توازن اور سنجیدگی کے ساتھ آپ نے یہ اعزاز لیا ۔ اور آپ کی عظمت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ نے اس عظیم خطاب کے بوجھ کو اٹھا لیا ۔

آپ کے خلق عظیم کی روایات سے سیرت کی کتب بھری ہیں ۔ آپ کے صحابی اس مضمون پر رطب اللسان ہیں اور خود آپ کا برتاؤ ہی ایک بڑی شہادت ہے ' اس بات کی ۔ لیکن رب تعالیٰ کی طرف سے یہ عظیم اعزاز عظیم تر ہے ۔ یہ علی کبیر اور رب متعال کی طرف سے ہے ۔ اور پھر اس سے بھی عظیم تر یہ بات ہے کہ خالق کائنات کی طرف سے یہ عظیم شہادت پاکر آپ سنجیدہ ' مطمئن ' مضبوط اور اپنے مقام پر جمے رہے ۔ آپ نے انسانوں پر اپنی برتری نہیں جتائی ' آپ نے علو اختیار نہیں کیا ' بڑائی اختیار نہیں کی اور آپ نے اسے ہضم کر لیا اور آپ کا انکسار وہی رہا ۔ حالانکہ یہ بہت ہی عظیم اعزاز تھا ۔

اللہ جانتا ہے کہ وہ کس کو رسول بنا رہا ہے ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی اس عظمت کے باوجود .... رسول تھے اور اپنی اس کائناتی عظمت کے باوجود رسالت کی ذمہ داریاں اٹھا رہے تھے اور لوگوں کے سامنے ایک انسان کی طرح عظمت اخلاق کا نمونہ پیش فرماتے تھے ۔

یہ آخری رسالت جس قدر کامل اور جمیل ہے ' جس قدر عظیم اور جامع ہے ' جس قدر حق اور سچی ہے ' اس کا حامل وہی شخص ہو سکتا تھا ' جس کو خالق کائنات یہ لقب دے کہ تم خلق عظیم پر ہو ۔ اور پھر آپ کی شخصیت کو بھی یہ قوت دی

گئی کہ وہ اس عظمت کو وصول کر سکے ۔ اور متوازن اور سنجیدہ رہے ۔ ایک عظیم انسان کی طرح مطمئن رہے ۔ ایک عظیم شخص ہی اس عظمت کو اٹھا سکتا ہے جو ان الفاظ میں دی گئی ہے ۔ اس عظیم ثنا اور تعریف کے بعد قرآن میں بعض اوقات آپؐ پر عتاب بھی آیا ہے' لیکن آپؐ نے اسے بھی نہایت ہی عظمت کے ساتھ سنا ہے ۔ نہایت توازن اور اطمینان کے ساتھ ۔ جس طرح آپ کی اس عظمت کا اعلان ہوا ۔ اسی طرح آپ کو تنبیہہ کرنے والی آیات کو بھی اس لازوال کتاب میں جگہ دی گئی ہے ۔ اللہ نے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھی ۔ اور دونوں حالات میں نبی آخر الزمان عظیم رہے ۔ آپؐ نے دونوں باتوں کو عظمت کے ساتھ لیا ۔

نفس محمدی کی حقیقت دراصل رسالت محمدی کے اندر پوشیدہ ہے' اور عظمت محمد ﷺ کا پیمانہ رسالت محمدیہ کی عظمت ہے ۔ اور حقیقت محمدیہ حقیقت دین اسلام کی طرح انسان کے ادراک سے اور انسان کے مشاہدے سے اس طرح دور ہے جس طرح اس کائنات میں کوئی کہکشاں دور ہے ۔ ایک شخص رصد گاہ میں بیٹھ کر دور سے اس کی طرف اشارہ تو کر سکتا ہے لیکن کسی کے لیے حقیقت محمدیہ کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے ۔ کیونکہ یہ حقیقت انسان کے مشاہدے اور ادراک سے بہت دور ہے ۔ انسان ایک کہکشاں کی طرح دور سے اس کی طرف اشارہ تو کر سکتا ہے لیکن وہ اس کے بارے میں پوری بات نہیں کر سکتا ۔

میں ایک بار پھر یہ نکتہ اٹھاتا ہوں اور اس سوچ میں پڑا ہوں کہ حقیقت محمدیہ نے کس قدر عظیم اعزاز پایا اور اسے اپنایا اور آپ کی شخصیت متوازن' ثابت قدم اور مطمئن رہی ۔ آپ بہرحال انسان تو تھے ۔ کبھی جب آپؐ اپنے کسی رفیق کی تعریف فرماتے تو آپ کا وہ رفیق اور اس کے دوست یار خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے ۔ اس کا ان پر اس قدر اثر ہوتا کہ قریب تھا کہ ان کو شادی مرگ سے دوچار ہونا پڑے ۔ باوجود اس کے کہ آپ بشر تھے ۔ آپؐ کے ساتھی جانتے تھے کہ آپؐ بشر ہیں ۔ اور آپؐ نبی ہیں اور نبوت کا ایک معلوم دائرہ ہوتا ہے ۔ نبی بشر ہوتا ہے لیکن حضور اکرم ﷺ کا معاملہ اور ہے ۔ آپؐ کے حق میں تو شہادت رب کائنات دے رہا ہے ۔ آپؐ جانتے ہیں کہ رب کائنات کس قدر عظیم ہے ۔ اور اگر کوئی نہیں جانتا تو حقیقت محمدیہ تو رب کائنات کی عظمت کو خوب جانتی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود آپ اس عظیم شہادت کو نہایت سنجیدگی سے ہی لیتے ہیں اور اپنی روش میں کوئی فرق آنے نہیں دیتے ۔ یہ ہے اصل عظمت اور یہ ہے وہ بات' جو ہر اندازے سے بلند ہے ۔

حضرت محمد ﷺ وحدہ اس مقام تک پہنچے ہیں' اس عظمت کے مقام تک ۔ یہ عظمت و کمال کی بلند چوٹی ہے جس کو آپؐ نے صرف آپؐ نے سر کیا ہے ۔ اس مقام تک کوئی اور انسان نہیں پہنچ سکا اور یہ حقیقت محمدیہ تھی جو اس رسالت کے اٹھانے کے اہل ہوئی جو کائناتی رسالت ہے' ابدی رسالت ہے' اور عالمی انسانی رسالت ہے ۔ یہ رسالت آپ کی شخصیت میں مشخص ہوئی اور عملی شکل میں انسانیت کو ملی ۔ یہ آخری رسالت اسی طرح آئی کہ مکہ اور مدینہ میں انسانی شکل میں پھرتی رہی ۔ یہ تھے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔ اس مقام کے لائق اور اللہ ہی جانتا تھا کہ اس مقام کا اہل اس کی مخلوق میں سے کون ہے؟ اس لیے اس نے اعلان فرمایا کہ

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸ : ۴) اللہ نے بذات خود یہ اعلان کیا اور اعلان فرمایا کہ اللہ خود حضرت

محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر صلوۃ و سلام بھیجتا ہے ۔ اور یہ اللہ ہی کی بخشش ہے جو کسی انسان کو عطا کرتا ہے ۔ یہ رتبہ بلند ہے جس کو مل گیا ۔

پھر اس شہادت کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے ' اور وہ یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے انسانی نظام کے اندر اخلاق کی اہمیت کیا ہے ۔ اسلامی نظام حیات میں حسن اخلاق ہر معاملے میں ایک بنیادی عنصر ہے ۔

اسلامی نظریہ حیات کا مطالعہ کریں یا نبی آخر الزمان کی سیرت کا مطالعہ کریں ' نظر آئے گا کہ ان میں بنیادی عنصر اسلامی اخلاق کا ہے ۔ اسی اخلاقی عنصر پر اسلام کا تہذیبی اور قانونی نظام قائم ہے ۔ اس نظام میں طہارت ' نظافت ' امانت ' سچائی ' عدل ' رحم دلی ' نیکی ' وعدہ وفائی ' قول و فعل کے درمیان مطابقت ' نیت اور ضمیر کے درمیان مطابقت ' ظلم اور زیادتی کی مخالفت ' ظلم اور دھوکہ بازی کی ممانعت ' لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانے کی ممانعت ' لوگوں کی عزت پر حملے کی ممانعت ' فحاشی کے ارتکاب اور فحاشی کی اشاعت کی ممانعت ' خواہ وہ جس شکل میں بھی ہو ۔ اور اس نظام میں جس قدر قانون سازی بھی کی گئی ہے وہ ان اخلاقیات میں سے کسی نہ کسی اخلاق کی حفاظت کے لیے کی گئی ہے اور اس قانون سازی کے ذریعہ لوگوں کے سلوک ' ان کے شعور اور طرز عمل میں اخلاقی قدریں پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے ۔ اور یہ اخلاقیات بیک وقت انفرادی ' اجتماعی اور بین الاقوامی طرز عمل میں ملحوظ رکھے گئے ہیں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فرمان ہے :'' مجھے اس لیے بھیجا گیا کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کر دوں'' ۔ آپ نے اپنی بعثت کا مقصد اخلاقی تطہیر کے اندر محدود کر دیا ۔ اور احادیث کا ایک زمزمہ بہہ رہا ہے کہ خلق حسن اختیار کرو ' کریمانہ انداز اپناؤ ' آپ کی سیرت طیبہ اس کی ایک مثال ہے اور ایک صاف صفحہ ہے ۔ اور ایک اعلیٰ تصویر ہے مکارم اخلاق کی ۔ اور فی الواقعہ آپ اس بات کے مستحق تھے کہ خالق کائنات یہ شہادت دے کہ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (٦٨ : ٤) جس طرح حضور اکرم ﷺ خلق عظیم کے اعلیٰ درجے پر ہیں اسی طرح آپ کا پیش کردہ اسلامی نظام حیات بھی اعلیٰ اخلاقی قدروں کا حامل ہے ۔ اس اخلاق کے ذریعہ زمین کی بستیوں کو آسمانوں سے ملا دیا گیا اور لوگوں کے دلوں کو خدا سے جوڑ دیا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ اللہ کن کن باتوں پر راضی ہوتا ہے ۔

یہ پہلو اسلام کے اخلاقی نظام میں ایک ممتاز پہلو ہے ۔ کیونکہ اسلامی اخلاقیات کسی سوسائٹی کی پیداوار نہیں ہیں ' یہ زمینی اور مادی اصولوں سے ماخوذ نہیں ہیں ' نہ یہ کسی رسم و رواج ' عرف ' مصلحت اور باہمی روابط و تعلقات سے ماخوذ ہیں ۔ ان اخلاقیات کا دارومدار رضائے الٰہی پر ہے ۔ اس دعوت پر ہے کہ لوگو ' اللہ کی طرف بلند ہو جاؤ ' اللہ کی صفات حمیدہ کو اپنے اندر پیدا کرو ' تاکہ تمہاری انسانیت کے آفاق آسمانوں سے مل جائیں ' تاکہ تم اخروی زندگی کو بہتر کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پاؤ ۔ اور تم اللہ کے ہاں ۔

فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُقْتَدِرٍ (٥٤ : ٥٥) ''ایک مقتدر بادشاہ کے ہاں سچی مجلس میں'' بیٹھنے کے قابل ہو جاؤ ۔ اس لیے اسلامی اخلاقیات کسی مادی تصور کے اندر محدود نہیں ہیں ۔ یہ لامحدود اخلاقیات ہیں ۔ اور یہ ان انتہائی بلندیوں پر ہیں جہاں تک کوئی انسان پہنچنے کا تصور نہیں کر سکتا ہے ۔ کیونکہ یہ اخلاقیات اللہ کی صفات کی پیروی پر مبنی ہیں ' گرے ہوئے مادی اصولوں سے ماخوذ نہیں ہیں ۔

پھر اسلامی اخلاقیات 'مفرد اخلاقیات' نہیں ہیں ۔ صدق 'امانت' عدل 'رحم' نیکی' یہ سب ایسی اخلاقیات ہیں 'جن میں ایک سے زیادہ انسانوں کا باہم تعلق پیش نظر ہوتا ہے ۔ یہ ایک نظام کے ساتھ متعلق اخلاقیات ہیں ۔ باہم تعاون' باہم معاملہ' تقسیم کار اور تقسیم حقوق اور اجتماعی تنظیم سے متعلق امور ہیں ۔ ان کا تعلق زندگی کے ایک تصور سے ہے اور ان کا ماخذ ذات باری ہے ۔ اس لیے یہ رہبانیت یا ذاتی اذن پر مبنی بھی نہیں ہیں اور مادی مفادات اور زمین کے اعتبارات ان کا ماخذ نہیں ہے بلکہ اللہ کی رضا ان کا اصل ماخذ ہے ۔

یہ اخلاقیات اپنے کمال 'جمال' توازن 'سیدھے پن' تسلسل اور ثبات کے پہلو سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں مکمل طور پر منعکس ہوئیں اور اس وجہ سے حضور ﷺ سے کہا گیا ۔

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸ : ۴) "اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو" ۔ اس تعریف عظیم کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ آپ کا مستقبل نہایت تابناک ہے ۔ مشرکین سے کہہ دیں کہ تم اپنے برے انجام کا انتظار کرو' تم خلق عظیم کے مالک پر ایسے الزامات عائد کرتے ہو ۔ تنبیہہ کی جاتی ہے کہ تمہارے دعووں کی حقیقت تم پر جلد ہی کھل جائے گی کہ مجنون کون ہے ؟

فَسَتُبْصِرُ وَ يُبْصِرُوْنَ (۵) بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ (۶) اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۷) (۶۸ : ۵ تا ۷) "عنقریب تم بھی دیکھ لو گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون گمراہی میں مبتلا ہے ۔ تمہارا رب ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں' اور وہی ان کو بھی اچھی طرح جانتا ہے جو راہ راست پر ہیں" ۔

اَلْمَفْتُوْنُ (۶۸ : ۶) سے مراد ہے گمراہ ۔ اللہ فرماتا ہے کہ اللہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی جانتا ہے اور گمراہوں کو بھی ۔ یا اس کے معنی ہیں وہ شخص جو آزمائش میں ڈال دیا گیا ہے اور جس کا نتیجہ نکلنے والا ہے ۔ دونوں مفہوم قریب قریب ہیں ۔ اس وعدے میں رسول اللہ اور مومنین کے لیے اطمینان ہے جبکہ مخالفین کے لیے دھمکی ہے ۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر جنون کا الزام لگایا تھا ۔ اس جنون سے ان کی مراد یہ نہ تھی کہ آپ کی عقل چلی گئی ہے کیونکہ واقع صورت حال اس کی تکذیب کر رہی تھی بلکہ اس سے وہ مراد لیتے تھے کہ آپ پر جنون کا اثر ہو گیا ہے اور اس میں ان کا اشارہ اس طرف تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے' جو اس پر شعر وحی کرتا ہے ۔ اشارتاً وہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف اس بات کو منسوب کرتے تھے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو تعلیمات پیش کرتے' ان کا تعلق نہ شعر سے تھا اور جنوں کی باتوں سے ۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ تسلی دیتا ہے کہ مستقبل نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حقیقت کو بھی ظاہر کر دے گا اور آپ کی تکذیب کرنے والوں کی حقیقت کو بھی ۔ اور معلوم ہو جائے گا کہ دونوں میں سے کون گمراہ ہے ؟ اور مزید اطمینان کے لیے کہا جاتا ہے کہ رب تعالیٰ تو جانتا ہے کہ کون گمراہ ہے اور کون راہ راست پر ہے ۔ یہ کلام تو وہی وحی کر رہا ہے ۔ لہٰذا

اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے - یہ ایسی بات ہے جس کی وجہ سے آپ دشمنوں کی ہر زیادتی کو برداشت کر لیتے تھے اور اس کے نتیجے میں آپ کے دشمن پریشان ہو جاتے تھے اور آپ کی ثابت قدمی کی وجہ سے ان کے اندر قلق اور تزلزل پیدا ہو جاتا تھا' جیسا کہ اگلی آیات میں آتا ہے -

اگلی آیت میں آپ کو بتایا جاتا ہے کہ اندر سے ان لوگوں کا حال بہت پتلا ہے - ان کی سوچ اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے - بظاہر تو وہ مخاصمت کرتے ہیں' جھگڑتے ہیں' حق کا انکار کرتے ہیں' آپ پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں' لیکن اندر سے ان کے اندر تزلزل پیدا ہو گیا ہے - وہ ہل گئے ہیں اور جن عقائد پر وہ ڈٹے ہوئے نظر آتے ہیں' درحقیقت ان کے ایک بڑے حصے پر خود ان کو اعتماد نہیں ہے - یہ سودا بازی کے لیے تیار ہیں' یہ چاہتے ہیں کہ کچھ آپ نرم ہوں اور کچھ یہ نرم ہوں لیکن جن لوگوں نے نظریاتی انقلاب لانا ہوتا ہے وہ تب ہی لا سکتے ہیں جب وہ اپنے اخلاقی نظریات پر جم جائیں - ان لوگوں کے جو عقائد ہیں یہ ان کے بارے میں کچھ زیادہ سنجیدہ نہیں ہیں - انہوں نے چند ظاہری رسوم کو پکڑا ہوا ہے جن کے ساتھ ان کے مفادات وابستہ ہیں - لہذا ان کی کوئی بات نہ مانو -

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (٨) وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (٦٨ : ٩) ''تم جھٹلانے والوں کے دباؤ میں نہ آؤ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں'' - دراصل اندر سے یہ لوگ سودا بازی کے لیے تیار ہیں - چاہتے ہیں کہ نصف نصف سودا طے ہو جائے جس طرح تاجر لوگ مول تول کر لیتے ہیں - لیکن ان کو معلوم ہے کہ نظریات اور تجارت میں فرق ہوتا ہے - ایک نظریاتی شخص اپنے عقائد اور نظریات میں بھی سودا بازی کے لیے تیار نہیں ہوا کرتا - کیونکہ نظریات میں چھوٹی بات بھی بڑی بات کی طرح قیمتی ہوتی ہے بلکہ نظریات میں چھوٹی اور بڑی بات ہوتی ہی نہیں ہے - نظریہ ایک مکمل اکائی ہوتا ہے - اس میں کوئی کسی کی نہ اطاعت کرتا ہے اور نہ اپنے نظریات کے کسی حصے سے دستبردار ہوتا ہے -

اس بارے میں بے شمار روایات وارد ہیں کہ وہ کیا معاملات تھے جن پر مشرکین مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سودا بازی کے لیے تیار تھے کہ آپ نرمی کریں تو وہ بھی کریں یہ کہ حضور ﷺ ان کے الہوں کو برا بھلا کہنا ترک کر دیں اور یہ بھی نہ کہیں کہ ان بتوں کی عبادت کرنا ایک احمقانہ فعل ہے - یا یہ کہ حضور اکرم کچھ باتیں ان کے دین کی مان لیں اور کچھ باتیں وہ مان لیں گے - یوں جمہور عرب کے سامنے ان کی لاج رہ جائے گی - جس طرح ہمیشہ مصالحت کرنے والوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ نصف نصف پر فیصلہ کر لیتے ہیں - لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رویہ تو دو ٹوک تھا - آپؐ اس میں نہ مداہنت کرتے تھے اور نہ نرمی فرماتے تھے لیکن دین اسلام کے اصولوں کے علاوہ آپ تمام معاملات میں' نہایت ہی نرم رویہ اختیار فرماتے تھے - معاملات میں نہایت ہی اچھے تھے' معاشرت میں نہایت ہی خوش اخلاق تھے اور لوگوں کے ساتھ نہایت ہی اچھا رویہ رکھتے تھے - رہا دین کا معاملہ تو وہ خدا سے متعلق تھا - اور خدا کی ہدایت یہ تھی -

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (٦٨ : ٨) ''لہذا تم ان جھٹلانے والوں کی کوئی بات نہ مانو'' - چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں ایسے حالات میں بھی دین کے معاملے میں کوئی سودا بازی نہیں کی جبکہ آپ نہایت ہی مشکل حالات میں تھے - آپ کی تحریک محاصرے میں تھی - آپ کے ساتھ چند ساتھی تھے - ہر طرف سے ان پر مظالم ہو رہے

تھے ۔ اچک لیے جاتے تھے ۔ شدید ترین اذیتیں دی جاتی تھیں لیکن وہ صبر کرتے تھے ۔ البتہ وہ بڑے سے بڑے جبار کے سامنے کلمہ توحید پڑھنے سے کبھی باز نہ آتے تھے ۔ نہ وہ ان کے تالیف قلب کے لیے اور نہ ان کی اذیت سے جان چھڑانے کے لیے ۔ نہ وہ کسی ایسی حقیقت کی وضاحت سے چوکتے تھے جس کا ان کے ایمان سے کوئی دور کا بھی تعلق ہوتا تھا ۔

ابن ہشام نے اپنی سیرت میں ابن اسحاق سے روایت کی ہے :"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قوم کے سامنے اسلام کا اظہار اور علانیہ دعوت شروع کر دی تو انہوں نے آپ کے دین کا کوئی رد یا جواب نہ دیا ۔ یہاں تک کہ آپ نے ان کے الہوں کا ذکر شروع کر دیا اور ان کی عبادت کو احمقانہ فعل بنایا ۔ جب حضور ﷺ نے یہ کہا تو انہوں نے اسے ایک عظیم جرم سمجھا اور اس پر بہت برا منایا ۔ یہ لوگ آپ کے خلاف جمع ہو گئے اور دشمنی شروع کر دی ۔ ماسوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ اسلام میں لے آیا تھا ۔ لیکن یہ بہت ہی قلیل اور کمزور تھے ۔ رسول اللہ کے چچا ابو طالب نے آپ کی حمایت کی اور آپ کا دفاع کیا' اور آپ کے محافظ کے طور پر آپ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور رسول اللہ اپنا کام کرتے رہے ۔ خوب اظہار خیال کرتے رہے اور کوئی آپ کو اپنی باتوں سے روک نہ سکتا تھا ۔

جب قریش کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں سے باز نہیں آتے جن کو وہ برا سمجھتے ہیں اور یہ کہ ان کی صفوں میں تفرقہ پڑ گیا ہے اور وہ بدستور ان کے الہوں پر تنقید کرتے ہیں ۔ پھر انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ان کے چچا ان کی حمایت پر تلے ہوئے ہیں اور وہ ان کو قریش کے سپرد نہیں کرتے ۔ تو قریش کے اشراف کا ایک وفد ابو طالب کے پاس گیا ۔ ان میں عتبہ اور شیبہ پسران ربیعہ' ابو سفیان ابن حرب ابن امیہ' ابو البختری العاص ابن ہشام' اسود ابن مطلب ابن اسد' ابوجہل (اس کا نام ابو الحکم عمر ابن ہشام تھا)' ولید ابن مغیرہ' نبیہ اور منبہ پسران حجاج ابن عامر اور دوسرے لوگ جو ان کے ساتھ گئے تھے ۔ انہوں نے کہا ابو طالب "یہ کہ تمہارے بھتیجے نے ہمارے الہوں کو گالیاں دیں اور ہمارے دین میں عیب نکالے اور ہمارے خیالات کو احمقانہ کہا ۔ ہمارے آباؤاجداد کو گمراہ کہا' اب تمہارے سامنے دو راستے ہیں یا تو اسے ان باتوں سے روک دو یا ہمارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جاؤ' کیونکہ جس طرح ہم اس کے دین کو نہیں مانتے تم بھی نہیں مانتے ۔ ہم اس کا علاج کر دیں گے"۔ ابو طالب نے ان کے ساتھ نہایت ہی نرم باتیں کیں اور انہیں اچھے طریقے سے رخصت کر دیا ۔ یہ لوگ واپس ہو گئے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا کام جاری رکھا ۔ آپ اپنے دین کا اظہار فرماتے اور لوگوں کو اس کی طرف بلاتے ۔ لیکن اس کے بعد آپ کے اور قریش کے درمیان اختلافات شدید ہو گئے ۔ دشمنی میں دور تک چلے گئے اور لوگوں کی آتش عناد تیز ہو گئی اور جگہ جگہ آپ کے خلاف باتیں ہونے لگیں ۔ اور لوگ آپ کے خلاف ایک دوسرے کو اکسانے لگے ۔ انہوں نے کہا کہ اٹھو' اس شخص کے خلاف ۔ یہ لوگ دوبارہ ابو طالب کے پاس گئے اور کہا ابو طالب تم ہم میں سب سے معمر ہو' عزت دار ہو' اور شریف ہو ۔ ہم نے تم سے درخواست کی تھی کہ اپنے بھتیجے کو اس کام سے روکو مگر تم نے اسے نہ روکا ۔ خدا کی قسم! ہم اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے آباؤاجداد کو گالیاں دے' ہمارے عقائد کو احمقانہ بتلائے اور ہمارے الہوں کی عیب جوئی کرے ۔ یا تو آپ اسے روکیں یا پھر اس کی حمایت سے ہاتھ اٹھالیں ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ ہو گی جو فریق بھی ہلاک ہو گیا ۔ یا اس طرح کی سخت باتیں انہوں نے کہیں اور چلے گئے ۔ ابو طالب پر قوم کے درمیان یہ جھگڑا ذرا گراں گزرا ۔ اور انہوں نے پوری قوم کی عداوت کو بھاری سمجھا ۔

اور یہ بھی وہ نہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے حوالے کر دیں اور شرمندگی اٹھائیں ۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے یعقوب ابن عتبہ ابن مغیرہ ابن اخنس نے بتایا کہ جب قریش نے ابوطالب سے یہ باتیں کیں تو انہوں نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلایا۔ ان سے کہا بھتیجے! تمہاری قوم میرے پاس آئی اور انہوں نے یہ کہا اور یہ کہا۔ اس لیے تم مجھ پر اور اپنے آپ پر ذرا رحم کرو اور مجھ پر اس قدر بوجھ نہ ڈالو جس کے اٹھانے کی مجھے طاقت نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سمجھا کہ شاید ابوطالب کی رائے اس معاملے میں بدل گئی ہے ۔ اور یہ کہ آپ بھی اب ساتھ چھوڑنے والے ہیں اور مجھے قریش کے حوالے کرنے والے ہیں اور یہ کہ ابوطالب بھی اب حمایت اور نصرت سے دستکش ہو رہے ہیں ۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا "چچا! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں اور یہ مطالبہ کریں کہ یہ کام چھوڑ دو تو یہ نہیں ہو سکتا' میں یہ کام کرتا رہوں گا جب تک یہ دین غالب نہیں ہو جاتا یا میں ہلاک نہیں ہو جاتا۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ کی آواز روندھ گئی اور آپ روپڑے اور اٹھ کر چلے گئے ۔ جب آپ چلے گئے تو ابوطالب نے آواز دی : بھتیجے! ادھر آؤ' رسول اللہ واپس ہوئے تو انہوں نے کہا "جاؤ جو چاہو کرو' خدا کی قسم میں تمہیں کسی قیمت پر ان کے حوالے کبھی بھی نہ کروں گا"۔

یہ ہے تصویر حضور اکرم ﷺ کی کہ آپ اس وقت بھی اپنی دعوت پر جمے ہوئے تھے جبکہ آپ کے چچا محترم بھی دستکش ہونے کے بارے میں سوچ رہے تھے ۔ جو آپ کے حامی اور محافظ تھے اور یہ آخری قلعہ تھے' جس میں آپ اس کرۂ ارض پر اپنے دشمنوں کے مقابلے میں پناہ لے سکتے تھے ۔

یہ تو تھی ایک نہایت ہی روشن اور قوی تصویر ۔ یہ اپنی نوعیت اور حقیقت کے اعتبار سے بالکل ایک انوکھی تصویر تھی ۔ اس کا رنگ اور پرتو سب ہی انوکھے تھے ۔ اس کی عبارت اور مکالمات بھی اپنی نوعیت کے تھے ۔ نہایت نئے اور سنجیدہ موقف کی ایک تصویر اس طرح روشن' جس طرح یہ عقیدہ روشن ہے ۔ اور اس میں سرٹیفکیٹ اور شہادت کا مصادق اور مفہوم موجود ۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸ : ۴) "اور بے شک آپ عظیم اخلاق کے نہایت ہی بلند مرتبے پر ہیں"۔ اور ان اخلاق عالیہ کی ایک دوسری تصویر بھی خود ابن اسحاق نے نقل کی ہے ۔ کہتے ہیں روایت بیان کی یزید ابن اسحاق نے' محمد ابن کعب قرظی سے' انہوں نے کہا مجھے یہ بتایا گیا کہ عتبہ ابن ربیعہ ایک سردار تھا۔ یہ ایک دن قریش کی ایک محفل میں بیٹھا ہوا تھا' اس نے تجویز پیش کی' جبکہ حضور اکرم مسجد نبوی میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے 'کیا مناسب نہیں ہے کہ میں محمد ﷺ سے بات کروں اور ان کے سامنے کچھ باتیں رکھوں شاید وہ اسے قبول کر لیں ۔ اس طرح کہ ان کے جو مطالبات ہوں ہم انہیں دے دیں اور وہ ہمارے خداؤں سے باز آجائیں ۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت حمزہ اسلام قبول کر چکے تھے اور قریش نے دیکھ لیا تھا کہ حضور ﷺ کے حامیوں میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ انہوں نے کہا : ابوالولید جاؤ اور ان سے بات کرو' عتبہ اٹھا اور آیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے کہا بھتیجے! ہمارے اندر تمہاری جو حیثیت ہے' وہ تم جانتے ہو۔ تمہارا بہت اونچا درجہ ہے اور تمہارا نسب بھی بہت اونچا ہے اور تم نے اپنی قوم کو ایک بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے ۔ جماعت کے اندر تفریق پیدا ہو گئی ہے ۔ تم نے ہمارے نظریات کا مذاق اڑایا ہے' ہمارے دین

اور الہوں پر تنقید کی ہے اور تم نے ہمارے آباؤ اجداد کو کافر کہا۔ تم میری بات سنو۔ میں تمہارے سامنے کچھ تجاویز پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم ان پر غور کرو گے۔ شاید ان میں سے بعض کو تم منظور کر لو۔ کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "ابوالولید کہو۔ میں سنتا ہوں"۔ اس نے کہا: "بھتیجے! تم جو دین پیش کرتے ہو اگر اس سے تمہارا مقصد بہت زیادہ مال جمع کرنا ہے' تو ہم تمہارے لیے اس قدر مال جمع کرتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے۔ اور اگر تم اونچا مقام چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا سردار بناتے ہیں' ہم تمہارے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں گے۔ اگر تم بادشاہت چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں۔ اور اگر تم پر کوئی دورہ پڑتا ہے جس کا دفعیہ تم نہیں کر سکتے تو ہم تمہارے علاج کا انتظام کرتے ہیں۔ اس پر ہم سے جو ہو سکا' خرچ کریں گے یہاں تک کہ تم تندرست ہو جاؤ۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ انسان کے ساتھ کوئی چیز لگ جاتی ہے اور اس کو اس کا علاج کرنا پڑتا ہے" یہ اور ایسی اور باتیں جو اس نے کیں۔ عتبہ ان باتوں سے فارغ ہوا اور رسول اللہ یہ باتیں سنتے رہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا ابوالولید تم کہہ چکے؟ اس نے کہا: "ہاں"۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا اب میری بات سنو۔ اس نے کہا: ہاں "کہو"۔ اس پر حضور ﷺ نے پڑھنا شروع کیا:

حٰمٓ (۱) تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲) كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۳) بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (٤) وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَيْنِنَا وَ بَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ (٥) قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَ اسْتَغْفِرُوْهُ وَ وَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ (٦) (٤١ : ١ تا ٦) "ح م۔ یہ خدائے رحمن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے' ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ عربی زبان کا قرآن' ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں' بشارت دینے والا اور ڈرانے والا مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں "جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں' ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے تو اپنا کام کر ہم اپنا کام کیے جائیں گے"۔۔۔ اے نبی ان سے کہو' میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا۔ مجھے وحی کے ذریعہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے' لہٰذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو۔ اور اس سے معافی چاہو۔ تباہی ہے مشرکوں کے لیے۔۔۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد بھی سورہ حم سجدہ پڑھتے رہے۔ جب عتبہ نے اسے سنا تو خاموش ہو گیا اور اپنے ہاتھ پشت کے پیچھے زمین پر لگا کر ٹیک لی اور سنتا رہا۔ اب رسول اللہ ﷺ سجدہ تک پہنچ گئے اور آپ نے سجدہ کیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا ابوالولید تم نے سنا جو سنا بس یہ ہے جواب تم جانو اور تمہارا کام"۔ عتبہ اپنے ساتھیوں کے پاس گیا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: ہم خدا کی قسم اٹھا کر کہتے ہیں کہ یہ شخص جو چہرہ لے کر گیا تھا اس کے ساتھ واپس نہیں

آیا۔ جب یہ جا کر ان کی محفل میں بیٹھا تو انہوں نے پوچھا ابوالولید کیا خبر لائے ہو؟ تو اس نے کہا خبر یہ ہے کہ میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے خدا کی قسم میں نے ایسا کوئی کلام کبھی نہیں سنا۔ یہ نہ تو شعر ہے نہ جادو ہے ' نہ کہانت ہے ۔ اے اہل قریش میری بات مانو اور میں اس کا ذمہ دار ہوں ' یہ شخص جو کچھ کرنا چاہتا ہے اسے کرنے دو اور اس کی راہ نہ روکو ۔ اس کو الگ چھوڑ دو ' خدا کی قسم اس کی جو بات میں نے سنی ہے اس کی شہ سرخی لگنے والی ہے ۔ اگر اس کو عربوں نے ختم کر دیا تو تمہارا کام وہ کر دیں گے اور تمہیں اسے مارنے کی ضرورت نہ ہوگی اور اگر یہ عربوں پر غالب آگیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہوگی اور اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی ۔ اور تم اس کی وجہ سے نہایت ہی نیک بخت ہو گئے ' انہوں نے کہا ابوالولید خدا کی قسم اس نے اپنی زبان سے تمہیں مسحور کر دیا ۔ اس نے کہا : اس کے بارے میں یہ میری حقیقی رائے ہے ۔ اب تمہاری مرضی ہے جو چاہو کرتے رہو ۔

دوسری روایات میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ عتبہ کو کلام الٰہی سناتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے ۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۴۱ : ۱۳) ” اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اس طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا کہ عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا “ تو ابوالولید خوفزدہ ہو کر اٹھا اور آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگا : ” محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں تمہیں خدا کا اور رحم کا واسطہ دیتا ہوں “ ۔ یہ اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں فی الواقع یہ عذاب نازل نہ ہو جائے ۔ اس کے بعد وہ قوم کے پاس گیا اور ان سے وہ بات کہی جس کا اوپر تذکرہ ہوا ۔

بہرحال یہ قریش کی طرف سے سودے بازی کی دوسری کوشش تھی ۔ یہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خلق عظیم کی ایک تصویر ہے ۔ اس سے آپ کے آداب اچھی طرح معلوم ہوتے ہیں کہ آپ عتبہ کی بات نہایت تحمل سے سنتے ہیں ۔ یہاں تک کہ وہ فارغ ہو جاتا ہے حالانکہ اس کی باتیں نہایت بے معنی ہیں ۔ ان باتوں کا تعلق صرف اس زمین سے ہے ۔ لیکن آپ کے اخلاق کریمانہ تھے کہ آپ نہ اس کی بات کاٹتے ہیں نہ جلدی کرتے ہیں اور نہ غصے میں آتے ہیں اور نہ اس کو جھڑکتے ہیں ۔ یہاں تک کہ یہ شخص اپنی بیہودہ باتوں سے فارغ ہو جاتا ہے اور آپ پوری توجہ سے سنتے ہیں ۔ اس کے بعد آپ نہایت نرمی سے پوچھتے ہیں ۔ ابوالولید آپ کی بات ختم ہوئی ' اور یہ تاکید مزید کے لیے کہ وہ یہ نہ کہے کہ میری بات رہتی ہے ۔ یہ ہے سچا اطمینان ' اور حقیقی ادب کہ آپ پوری پوری بات سنتے ہیں ۔ یہ بھی آپ کے خلق عظیم کا ایک پہلو ہے ۔ بیہودہ باتیں بھی تحمل سے سنتے ہیں ۔

اور ایک تیسری سودا بازی بھی مروی ہے ۔ ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ اسود ابن المطلب ابن اسد ابن عبدالعزیٰ ' ولید ابن مغیرہ ' امیہ ابن خلف اور عاص ابن وائل سہمی نے آپ کو روکا اور یہ لوگ اپنے قبائل میں نہایت ہی معتبر لوگ تھے ۔ انہوں نے کہا : ” محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم اس کی عبادت کرتے ہیں جس کی تم کرتے ہو ' اور تم ان الہوں کی عبادت کرو جن کی ہم کرتے ہیں ۔ ہم اور تم شریک ہو جائیں گے ۔ اگر جس خدا کی تم عبادت کرتے ہو وہ اچھا ہوا تو ہمارا بھی اس میں حصہ ہوگا اور ہم جن کی عبادت کرتے ہیں اگر وہ اچھے ہوئے تو تم نے بھی اپنا حصہ اس بھلائی سے لیا ہوگا ۔ ان کے بارے میں اللہ نے یہ سورت نازل کی ۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (١) لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (١٠٩ : ١ ـ ٢) "اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم کرتے ہو"۔ اس سودا بازی کو دو ٹوک انداز میں ختم کر دیا گیا۔ اور رسول اللہ نے ان کو یہ سورت سنا دی جس طرح اللہ کا حکم تھا۔

اب رسول اللہ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک متعین شخص بڑا چرب زبان ہے' اس کی کسی بات کو تسلیم نہ کریں۔ یہاں قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں اس کا نام نہیں لیا' لیکن اس کی تمام گھٹیا صفات کو گنوا دیا گیا' جو اس شخص کے اندر پائی جاتی تھیں۔ اس شخص کو نہایت ذلت اور حقارت کے ساتھ دھمکی دی جاتی ہے :

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (١٠) هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ (١١) مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (١٢) عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (١٣) اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ (١٤) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (١٥) سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ (١٦) (٦٨ : ١٠ تا ١٦) "ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے' طعنے دیتا ہے' چغلیں کھاتا پھرتا ہے' بھلائی سے روکتا ہے' ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے' سخت بداعمال ہے' جفاکار ہے اور ان سب عیوب کے ساتھ بداصل بھی ہے' اس بنا پر کہ وہ بہت مال اور اولاد رکھتا ہے۔ جب ہماری آیات اس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔ عنقریب ہم اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے"۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ ولید ابن مغیرہ ہے' اور اسی کے بارے میں سورہ مدثر کی یہ آیات بھی نازل ہوئیں :

ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا (١١) وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا (١٢) وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا (١٣) وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا (١٤) ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ (١٥) كَلَّا ۭ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا (١٦) سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا (١٧) اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ (١٨) فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (١٩) ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (٢٠) ثُمَّ نَظَرَ (٢١) ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (٢٢) ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ (٢٣) فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ (٢٤) اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (٢٥) سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ (٢٦) (٧٤ : ١١ تا ٢٦) "چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا' بہت سا مال اس کو دیا' اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے اس کو دیئے' اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی' پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ ہرگز نہیں' وہ ہماری آیات سے عناد رکھتا ہے۔ میں تو اسے عنقریب ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی تو خدا کی مار اس پر' کیسی بات بنانے

کی کوشش کی ۔ ہاں ' خدا کی مار اس پر ' کیسی بات بتانے کی کوشش کی ۔ پھر لوگوں کی طرف دیکھا ۔ پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا ۔ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا ۔ آخر کار بولا یہ کچھ نہیں 'مگر ایک جادو ' جو پہلے سے چلا آ رہا ہے ۔ یہ تو ایک انسانی کلام ہے ۔ عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا"۔

اس شخص کے بارے میں بہت سی روایات میں آتا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خلاف ہروقت سازشوں میں لگا رہتا تھا ۔ آپ کے ساتھیوں کو ڈراتا تھا ۔ دعوت اسلامی کی راہ روکتا تھا ۔ اور رات دن لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتا تھا ۔ نیز بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ **سورہ القلم کی آیات اخنس ابن شریق اور ولید بن مغیرہ کے بارے میں ہیں**۔ یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے سخت مخالف تھے ۔ یہ ہروقت آپ ؐ سے برسرپیکار رہتے تھے ۔ اور لوگوں کو آپ کے خلاف اکساتے تھے ۔

یہ سخت تہدیدی جملہ اس سورت میں اور دوسری سورتوں میں جو اس دور میں نازل ہوئیں ' اس بات کا ثبوت ہے کہ اس دور میں حالات بہت شدید تھے اور یہ شخص جو مسلمانوں اور تحریک اسلامی کے خلاف سرگرم تھا ' خواہ ولید تھا یا اخنس تھا (پہلا قول راجح ہے) تحریک اسلامی کی راہ روکنے میں اس کا بہت بڑا دخل تھا ۔ نیز ان تنقیدی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بہت بدفطرت شخص تھا اور اس کے نفس میں بھلائی کی کوئی رمق نہ تھی ۔

یہ کس قسم کا آدمی تھا ' قرآن نے اس کی ۹ صفات بیان کی ہیں اور سب کی سب مذموم صفات ہیں :

۱۔ حلّاف (۶۸ : ۱۰) (بہت قسمیں کھانے والا) زیادہ قسمیں وہی اٹھاتا ہے جو سچا نہیں ہوتا ' اس کے شعور میں یہ بات ہوتی ہے کہ لوگ اس پر اعتماد نہیں کرتے اور اسے جھوٹا سمجھتے ہیں ۔ یہ شخص قسمیں اٹھاتا ہے اور بہت زیادہ قسمیں اٹھا کر اپنے جھوٹ کو چھپاتا ہے اور اس طرح لوگوں کا اعتماد حاصل کرتا ہے ۔

۲۔ مَّهِينٍ (۶۸ : ۱۰) (بے وقعت) اپنی نظروں میں خود ہلکا ' لوگوں کی نظروں میں ناقابل اعتبار ۔ زیادہ قسمیں اٹھانے کی ضرورت ہی اسے اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ ہلکا ہے ۔ خود اسے اپنے اوپر اعتماد نہیں ۔ نہ لوگوں کو ہے ۔ اگرچہ بظاہر وہ دولتمند ہے ' جتھے دار ہے ۔ لہذا ایک بادشاہ ' ایک مالدار اور ایک قوی اور جبار شخص بھی ہلکا ہو سکتا ہے ۔ اس لیے کہ اہانت اور عزت دونوں نفسیاتی صفات ہیں ۔ یہ کبھی انسانی شخصیت سے دور نہیں ہوتیں ۔ ایک شریف انسان باوزن ہوتا ہے ۔ اگرچہ دنیا کے دوسرے پہلوؤں سے وہ کوئی بڑا آدمی نہ ہو ۔

۳۔ هَمَّازٍ (۶۸ : ۱۱) (طعنے دینے والا) یہ شخص اقوال و اشارات سے لوگوں کے عیب بیان کرتا ہے ' ان کے سامنے بھی اور ان کے پس پشت بھی ۔ ایسے شخص کو اسلام بہت برا خیال کرتا ہے جو لوگوں کے عیب نکالتا ہے ۔ یہ بات مروت کے خلاف ہے ۔ اعلیٰ آداب کے بھی خلاف ہے ' نیز لوگوں کے ساتھ برتاؤ ' لوگوں کے اکرام کے خلاف ہے ' خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں ۔ اس صفت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات میں لیا ہے ۔ اور اس کی سخت ممانعت کی ہے ۔

ایک جگہ کہا گیا ۔ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ (۱۰۴ : ۱) "تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو لوگوں پر طعن کرے اور برائیاں کرنے کا خوگر ہو"۔ اور دوسری جگہ ہے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا

نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰی اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا

بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ (۴۹ : ۱۱) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو' ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے"۔ یہ سب بدخوئی اور چغل خوری کی اقسام ہیں۔

۴۔ مَّشَّآءٍ بِنَمِیْمٍ (۶۸ : ۱۱) (چغلیاں کھاتا پھرتا ہے) وہ لوگوں کے درمیان ایسی باتیں پھیلاتا ہے جن سے ان کے دل میلے ہوں' تعلقات ختم ہوں' محبت ختم ہو' یہ ایک ذلیل حرکت ہے اور ہلکے لوگ ایسا کام کیا کرتے ہیں۔ کوئی خوددار شخص اس قسم کی حرکت کا ارتکاب نہیں کیا کرتا جو یہ توقع کرتا ہو کہ لوگ اسے اچھی نظروں سے دیکھیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ اس قسم کے شخص کی باتیں سنتے ہیں وہ بھی اسے اچھا نہیں سمجھتے۔ دل سے یہ لوگ بھی اسے برا سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ کاش یہ شخص یہ بری بات انہیں نہ بتاتا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس بات کو پسند نہ فرماتے تھے کہ آپ کو ایسی بات بتائی جائے جس سے آپ کا دل اپنے کسی صحابی سے خفا ہو۔ آپ فرماتے "کوئی شخص مجھے میرے ساتھی کی ایسی بات نہ بتائے کیونکہ میں پسند کرتا ہوں کہ میں تمہارے پاس نکلوں اور میرا دل تمہارے بارے میں صاف ہو"۔ (ابوداؤد وغیرہ)

صحیحین میں ہے "رسول اللہ ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے اور فرمایا یہ دونوں عذاب میں مبتلا ہیں' اور یہ کسی بڑے جرم میں سزاوار نہیں ہیں۔ ایک تو اس لیے کہ یہ پیشاب سے اپنے آپ کو بچاتا نہ تھا اور دوسرا چغل خور تھا"۔

امام احمد نے حضرت حذیفہ کی یہ حدیث نقل کی ہے "جنت میں چغلی کھانے والا داخل نہ ہو گا"۔ (ابن ماجہ)

امام احمد نے بریدہ ابن الحکم کی روایت نقل کی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا بتاؤں میں کہ تم میں سے اچھا کون ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ! "وہ لوگ جب ان کو دیکھا جائے تو خدا یاد آ جائے"۔ پھر فرمایا کہ بتاؤں کہ برے لوگ کون ہیں؟ "وہ جو چغلی کھاتے ہیں' جو دوستوں کے درمیان دشمنی پیدا کرتے ہیں جو پاک دامن لوگوں میں 'عیب تلاش کرتے ہیں"۔

اسلام کے لیے اس قسم کی بری خصلت کی مذمت بہت ضروری تھی' کیونکہ یہ خصلت نہایت مذموم' گری ہوئی اور سوسائٹی میں فساد ڈالنے والی ہے' جس طرح دوستوں میں فساد پیدا کرتی ہے اور اس قسم کے شخص کو ننگا کرنا ضروری تھا' قبل اس کے کہ وہ اسلامی سوسائٹی کے اندر فساد پیدا کر دے' لوگوں کے دلوں کو ایک دوسرے سے بھر دے' اور قبل اس سے کہ وہ سوسائٹی کی سلامتی کو نقصان پہنچائے۔ ایسے لوگ اکثر اوقات بے گناہ لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

۵ـ مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ (۶۸:۱۲) (بھلائی سے روکنے والا) یعنی وہ بھلائی سے اپنے آپ کو بھی محروم کرتا ہے اور دوسروں کو بھی ـ یہ شخص لوگوں کو ایمان سے روکتا تھا' حالانکہ ایمان بھلائی کا سرچشمہ ہوتا ہے ـ اس شخص کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ شخص اپنی اولاد اور اہل خاندان سے کہا کرتا تھا: ''اگر تم میں سے کسی نے دین محمد کو قبول کیا تو میں اسے کبھی بھی کوئی نفع نہ پہنچاؤں گا'' ـ جس کے بارے میں اسے شک ہوتا کہ وہ دین اسلام کی طرف مائل ہے ـ یوں ان کو وہ اس طرح دھمکی دے کر ڈراتا تھا ـ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کی اس حرکت کو بھی ریکارڈ کر دیا کہ وہ بھلائی سے روکنے والا ہے ـ

۶ـ مُعْتَدٍ (۶۸:۱۲) (ظلم و زیادتی میں حد سے گزرنے والا ہے) حق اور عدل سے آگے بڑھ جاتا ہے ـ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر یہ شخص تعدی کرتا' مسلمانوں پر ظلم کرتا' اپنے خاندان والوں پر ظلم کرتا' اور ان کو ہدایت اور دین حق سے روکتا ـ کسی پر ظلم کرنا بہت ہی بری حرکت ہے اور قرآن و سنت میں اس کی سخت ممانعت کی گئی ہے ـ اسلام ظلم کی ہر صورت کی بیخ کنی چاہتا ہے ـ یہاں تک کہ کھانے اور پینے میں بھی ـ

كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا ''جو رزق ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور حد سے نہ گزرو'' ـ عدل اور اعتدال اسلام کا بنیادی اصول اور اسلام کی نشانی ہے ـ

۷ـ اَثِیْمٍ (۶۸:۱۲) (بداعمال ہے) وہ برے اعمال کا ارتکاب کرتا ہے گویا اثم کی صفت اس کے ساتھ لازم ہوگئی ہے ـ پس یہ گناہگار ہے' اور ہر قسم کے معاصی کا ارتکاب کرتا ہے ـ یہ صفت اس کے ساتھ لازم ہے ـ گویا اس کا مزاج ہی ایسا ہے کہ ہر برائی کا ارتکاب کرے ـ

۸ـ عُتُلٍّ (۶۸:۱۳) (جفاکار) یہ ایک لفظ ہے جو اپنے تلفظ اور مفہوم کی رنگارنگی کی وجہ سے کئی معانی دیتا ہے' یہ ایک ایسا جامع مفہوم دیتا ہے کہ کئی الفاظ اس کو ادا نہیں کر سکتے ـ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عتل کے معنی سخت اور خشک کے ہیں' یعنی ظالم ـ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ بہت کھانے اور پینے والا ہے ـ اور سخت وحشی اور روکنے والا ہے' اپنی مذموم طبیعت میں بیگانہ ہے ـ معاملات میں برا ہے ـ

حضرت ابوالدرداء سے روایت ہے ''عتل' بڑے پیٹ والا' کج خلق' بہت کھانے والا' بہت پینے والا' دولت جمع کرنے والا' اور بخیل و کنجوس ہوتا ہے'' ـ لیکن لفظ عتل میں یہ سب مفہوم اس کی کرخت آواز ہی سے ظاہر ہوتے ہیں ـ یعنی وہ شخص جو مکارم اخلاق کے ہر پہلو سے کریہہ المنظر ہو ـ

۹ـ زَنِیْمٍ (۶۸:۱۳) ''بے اصل'' یہ اخلاق ذمیمہ کا خاتمہ ہے ـ یہ اسلام کے دشمنوں میں سے ایک دشمن کی صفات ہیں ـ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے دشمن ایسے ہی مکروہ لوگ ہو سکتے ہیں ـ زنیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی قوم کے ساتھ لاحق ہو گیا ہو اور وہ دراصل ان میں سے نہ ہو' یا یہ کہ ان میں اس کی نسب مشکوک ہو اور اس کے مفاہیم میں یہ بھی ہے کہ جو شخص لوگوں میں خباثت' ذلت اور شرارتوں میں بہت ہی مشہور ہو' اسے بھی زنیم کہا جاتا

ہے۔ دوسرا مفہوم زیادہ قریب ہے اور ولید ابن مغیرہ پر زیادہ فٹ آتا ہے۔ اگرچہ اس لفظ کا اطلاق اس پر ایسی صفت چسپاں کرتا ہے کہ قوم میں وہ ہلکا ہو جبکہ وہ زیادہ فخر کرنے والا اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والا ہو۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ ان ذاتی صفات کے علاوہ اس نے دین اسلام کے خلاف یہ موقف جو اختیار کر رکھا ہے یہ اس لیے ہے کہ اللہ نے اس کو مال و دولت اور اولاد دی ہے۔

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ(١٤) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ(١٥)(٦٨: ١٤ ــ ١٥) ”اس بنا پر کہ وہ بہت مال اور اولاد رکھتا ہے“۔ جب ہماری آیات اس کو سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔ کیا ہی بری بات ہے کہ ایک انسان کو اللہ مال و دولت دے اور وہ اس کے بدلے میں 'اللہ کی آیات کے ساتھ استہزا کرے۔ اور اللہ کے رسول کے ساتھ مذاق کرے۔ اور اللہ کے دین پر دست درازی کرے۔ صرف یہی ایک صفت مذکورہ بالا تو صفات سے زیادہ بھاری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سخت توہین آمیز تہدید آتی ہے۔ یہ جبار و قہار کی تہدید ہے۔ یہ اپنے آپ کو بڑا اور طاقتور سمجھتا ہے۔ مال اور اولاد پر فخر کرتا ہے۔ اپنے مقام' مرتبے اور نسب اور شرارتوں پر فخر کرتا ہے۔ اگر یہ طاقتور ہے تو۔

سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ(٦٨: ١٦) ”ہم اس کی اس سونڈ پر داغ لگائیں گے“۔ خرطوم کے معانی میں سے ایک یہ ہے کہ خرطوم خنزیر کی ناک کے کنارے کو کہتے ہیں۔ شاید یہی یہاں مراد ہے اور عربی میں انف عزت کو کہا جاتا ہے۔ اونچی ناک والا۔ اور رغم الانف ناک کا خاک آلود ہونا ذلت کے معنی میں آتا ہے۔ کہا جاتا ہے ورم انفہ' حمی انفہ' یعنی غضبناک ہوا اس سے الانفہ(عزت نفس) ہے۔ خرطوم پر داغ لگانے کے معنی ہیں اسے ذلیل کیا جائے گا۔ ایک تو اس پر داغ لگا دیا جائے گا جس طرح غلاموں پر داغ لگائے جاتے تھے اور دوسرے یوں کہ اس کی ناک کو خنزیر کی ناک کی طرح بنایا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ولید پر یہ آیات بم کی طرح آکر گریں ہوں گی کیونکہ وہ ایک ایسی قوم سے تھا جس میں شاعروں کی ہجو سے بھی' شریف لوگ بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن یہاں تو خالق سموات نے اس پر ایسی سنگباری کی اور اس انداز سے کی جس کی مثال نہیں ہے۔ اور پھر اس ہجو کو ایک ایسے نوشتے میں ریکارڈ کر دیا گیا' جس کے ایک ایک لفظ کو اس پوری کائنات میں پڑھا اور تلاوت کیا جاتا ہے اور یہ اس پوری کائنات میں قرار پکڑتا ہے اور اسے دوام نصیب ہوتا ہے۔

یہ تھی رب ذوالجلال کی طرف سے سنگباری' اس ذلیل شخص پر جو اس کے دین کا دشمن تھا' جو رسول کریم کا دشمن تھا۔ وہ رسول کریم جو خلق عظیم کے مالک تھے اور یہ دشمن اسلام جو بھی ہو' وہ اس کا مستحق تھا۔

مال اور اولاد کے اشارے کی مناسبت سے اور تکذیب کرنے والوں کی سرکشی اور دست درازیوں کے حوالے سے ایک ایسی کہانی کی طرف یہاں اشارہ کیا جاتا ہے جو ان کے ہاں معروف تھی۔ اور عوام کے اندر اس کا بہت چرچا تھا۔ نعمت خداوندی پر ناشکری کی سزا سے اللہ خبردار کرتا ہے۔ جو لوگ دوسروں کے حقوق ادا نہیں کرتے' بھلائی سے منع کرتے ہیں۔

مَنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ (۶۸: ۱۲) میں ان کو خبردار کیا جاتا ہے کہ یہ مال و اولاد تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بھی ایک آزمائش ہے' جس طرح باغ والے آزمائش میں تھے۔ ہر چیز کا ایک انجام ہے اور ہر کوئی ایک حالت میں نہیں ہوتا۔

اِنَّا بَلَوۡنٰهُمۡ كَمَا بَلَوۡنَاۤ اَصۡحٰبَ الۡجَـنَّةِ‌ ۚ اِذۡ اَقۡسَمُوۡا لَيَصۡرِمُنَّهَا
مُصۡبِحِيۡنَ ۙ‏ ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسۡتَثۡنُوۡنَ‏ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ عَلَيۡهَا طَآئِفٌ مِّنۡ رَّبِّكَ وَهُمۡ
نَآئِمُوۡنَ‏ ﴿۱۹﴾ فَاَصۡبَحَتۡ كَالصَّرِيۡمِ ۙ‏ ﴿۲۰﴾ فَتَنَادَوۡا مُصۡبِحِيۡنَ ۙ‏ ﴿۲۱﴾ اَنِ اغۡدُوۡا عَلٰى
حَرۡثِكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰرِمِيۡنَ‏ ﴿۲۲﴾ فَانۡطَلَقُوۡا وَهُمۡ يَتَخَافَتُوۡنَ ۙ‏ ﴿۲۳﴾ اَنۡ لَّا
يَدۡخُلَنَّهَا الۡيَوۡمَ عَلَيۡكُمۡ مِّسۡكِيۡنٌ ۙ‏ ﴿۲۴﴾ وَّغَدَوۡا عَلٰى حَرۡدٍ قٰدِرِيۡنَ‏ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا
رَاَوۡهَا قَالُوۡۤا اِنَّا لَـضَآلُّوۡنَ ۙ‏ ﴿۲۶﴾ بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ‏ ﴿۲۷﴾ قَالَ اَوۡسَطُهُمۡ
اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ لَوۡلَا تُسَبِّحُوۡنَ‏ ﴿۲۸﴾ قَالُوۡا سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ‏ ﴿۲۹﴾ فَاَقۡبَلَ
بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَلَاوَمُوۡنَ‏ ﴿۳۰﴾ قَالُوۡا يٰوَيۡلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِيۡنَ‏ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَاۤ
۱ اَنۡ يُّبۡدِلَـنَا خَيۡرًا مِّنۡهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوۡنَ‏ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الۡعَذَابُ‌ؕ وَلَعَذَابُ
۳۳ ع الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ‌ۘ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ‏ ﴿۳۳﴾

۳ "ہم نے ان (اہل مکہ) کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمائش میں ڈالا تھا' جب انہوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے اور وہ کوئی استثناء نہیں کر رہے تھے۔ رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھر گئی اور اس کا ایسا حال ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔ صبح ان لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر پھل توڑنے ہیں تو سویرے سویرے اپنی کھیتی کی طرف نکل چلو۔ چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس باغ میں نہ آنے پائے۔ وہ کچھ نہ دینے کا فیصلہ کیے ہوئے صبح سویرے جلدی جلدی اس طرح وہاں گئے جیسے کہ وہ (پھل منع کرنے پر) قادر ہیں۔ مگر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے "ہم راستہ بھول گئے ہیں'۔۔۔۔ نہیں' بلکہ ہم محروم رہ گئے"۔ ان میں جو سب سے بہتر تھا اس نے کہا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟" وہ پکار اٹھے "پاک ہے ہمارا رب' واقعی ہم گناہ گار تھے"۔ پھر ان میں سے ہر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا۔ آخر کار انہوں نے کہا "افسوس ہمارے حال پر' بے شک ہم سرکش ہو گئے تھے۔ بعید نہیں کہ ہمارا رب ہمیں بدلے میں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے' ہم اپنے رب کی طرف رجوع

کرتے ہیں"۔ ایسا ہوتا ہے عذاب ۔ اور آخرت کا عذاب اس سے بڑا ہے 'کاش یہ لوگ اس کو جانتے"۔

ہو سکتا ہے کہ یہ قصہ اہل مکہ کے درمیان معروف ہو۔ لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ اس دنیا کے تمام کام دست قدرت میں ہیں ۔ اور یہاں کوئی خوشحال ہے یا بدحال ہے' وہ اللہ کی آزمائش میں ہے ۔ اور یہی اس قصے سے یہاں مقصود و مطلوب ہے۔

اس قصے کے کرداروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی پسماندہ قسم کے سادہ لوح لوگ ہیں ۔ جس طرح دیہات کے سادہ لوح باشندے ہوتے ہیں ۔ زیادہ گہرے افکار سے بہرہ ور نہیں ہوتے ۔ اور سیدھی سیدھی بات کرتے ہیں ۔ اس دور میں جب یہ آیات اتر رہی تھیں تو قرآن کے مخاطب اکثر ایسے ہی سادہ لوگ تھے ۔ جو اسلام سے دشمنی رکھتے تھے اور اسلام کا انکار کرتے تھے 'لیکن ان کے دماغ زیادہ پیچیدہ نہ تھے اور نہ فلسفیانہ افکار وہ رکھتے تھے ۔ اکثر لوگ سادہ لوح اور سیدھے تھے ۔

جہاں تک اس قصے کی طرز ادا کا تعلق ہے تو یہ قرآن کے انداز بیان کا ایک نمونہ ہے ۔ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو کسی قصے میں اچانک نمودار ہوتی ہیں اور پڑھنے اور معلوم کرنے کا شوق بڑھاتی ہیں اور اس میں انسانی تدابیر اور ان کے فیل ہونے کے مناظر بھی ہیں کہ انسان کس طرح اپنی طرف سے کوشش کرتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے ۔ اور یہ قصہ یوں بیان ہوتا ہے کہ گویا کردار ہمارے سامنے یہ سب کچھ کر رہے ہیں ۔ ذرا اسے دیکھئے خود قرآن کے الفاظ میں ۔

اب ہم باغ والوں کے سامنے ہیں ۔ یہ دنیا کی جنت ہے' آخرت کی جنت نہیں ہے ۔ یہ اس باغ کے بارے میں رات فیصلہ کرتے ہیں' بالعموم جب باغ توڑا جاتا ہے تو ہر معاشرہ میں مساکین بھی اس دن حاضر ہوتے ہیں اور وہ بھی پیداوار میں سے اپنا حصہ پاتے ہیں ۔ اور اس باغ کے سلسلے میں بھی یہی معمول تھا ۔ لیکن اس باغ کے وراثت میں پانے والے موجودہ مالکان نے' یہ اسکیم بنائی ہے کہ مساکین کو محروم کر دیا جائے ۔ واقعات یوں آگے بڑھتے ہیں ۔

إِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ (۱۷) وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ (۱۸) (۶۸ : ۱۷ ـ ۱۸) "ہم نے ان (اہل مکہ) کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمائش میں ڈالا تھا' جب انہوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے اور وہ کوئی استثناء نہیں کر رہے تھے"۔ انہوں نے یہ طے کیا کہ صبح تڑکے باغ کا پھل توڑلائیں لیکن اس قرارداد کے بعد انہوں نے انشاء اللہ نہ کہا۔ یا یہ نہ طے کیا کہ مساکین کے لیے بھی کچھ چھوڑیں گے اور اس پر انہوں نے قسم بھی اٹھائی کہ ایسا ضرور کریں گے اور اس امر کا فیصلہ کر لیا۔ اور رات کو انہوں نے یہ شریر فیصلہ کیا۔ انہوں نے جو سازش کی یہ انہی کے دلوں میں رہی اور ان کو پتہ ہی نہ چلا کہ رات کی تاریکی میں باغ کے ساتھ کیا ہوتا ہے ۔ اس کا انہیں تصور بھی نہ تھا۔ یہ تو سوگئے لیکن اللہ تو نہیں سوتا۔ اللہ نے وہ کام کیا جو ان کی تدبیر کے برعکس تھا۔ اور یہ بطور سزا ہوا کہ انہوں نے نعمت کا شکر ادا کرنے کے بجائے سرکشی کی اور مساکین اور فقراء کا حصہ کاٹنے کا فیصلہ کیا حالانکہ وہ پہلے سے چلا آرہا تھا۔ یہ اک اچانک آفت ہے جو اس مرحلے پر سامنے آتی ہے ۔ رات کی تاریکی میں دست قدرت کے بھیجے ہوئے کچھ سائے حرکت میں آتے ہیں ۔ لوگ سوئے ہوئے ہیں ۔

فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ (۱۹) فَاَصْبَحَتْ

كَالصَّرِيْمِ (۲۰) (۶۸: ۱۹ — ۲۰) "رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھر گئی اور اس کا ایسا حال ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو"۔ یعنی اس بلا نے رات کو اس کے تمام پھل ختم کر دیئے۔ لیکن اس باغ کا منظر اب نظروں سے ہٹا لیجئے ۔۔۔ اب ان لوگوں کا منظر سامنے آتا ہے جنھوں نے رات کو تدبیر کی تھی اور خفیہ فیصلہ کیا تھا۔ یہ لوگ صبح سویرے ایک دوسرے پر آوازیں بھی دے رہے ہیں تاکہ وہ اپنے منصوبے پر عمل کریں۔

فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ (۲۱:۶۸) اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

صٰرِمِيْنَ (۶۸: ۲۲) (۶۸: ۲۱ — ۲۲) "صبح سویرے انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر پھل توڑنے ہیں تو سویرے سویرے اپنی کھیتی کی طرف نکل چلو"۔ صبح وہ ایک دوسرے کو اٹھاتے جگاتے ہیں اور رات کے فیصلے کو یاد دلاتے ہیں اور چپکے چپکے یہ عمل ہو رہا ہے۔ اس کے بعد سیاق کلام میں ان کے ساتھ ایک مذاق بھی ہوتا ہے۔ ان کے اٹھنے اٹھانے، چلنے اور باہم گفتگو کی تصویر خوب کھینچی جاتی ہے۔ یہ نہایت دھیمی آواز سے بات کرتے ہیں تاکہ ان کی تدبیر پوری طرح کامیاب ہو، تاکہ پورا پھل توڑ لیں اور مساکین کو پوری طرح محروم کر دیں۔

فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ (۲۳) اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ (۲۴)

(۶۸: ۲۳ — ۲۴) "چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس باغ میں نہ آنے پائے"۔ اب حالت یہ ہے کہ ہم جو قرآن پڑھ رہے ہیں ہمیں تو معلوم ہے کہ آگے کیا آ رہا ہے لیکن ان بیچاروں کو تو پتہ نہیں ہے کہ آگے وہ کیا دیکھنے جا رہے ہیں۔ ہم نے تو یہ منظر دیکھ لیا ہے کہ رات کو دست قدرت اپنا کام کر گیا ہے۔ باغ میں تو اب کچھ نہیں توڑنے کے لیے۔ باغ یوں ہے کہ گویا کسی نے اس کے تمام پھل توڑ لیے ہوں اور وہاں کچھ بھی باقی نہ ہو۔ اور خفیہ ہاتھ نے یہ کام کر دیا۔ اب ہماری سانس رک رہی ہے کہ یہ لوگ کس صورت حال سے دوچار ہونے والے ہیں۔ ان کی تمام تدابیر ان پر الٹ گئی ہیں۔

سیاق کلام مزید مذاق کر رہا ہے ان لوگوں کے ساتھ۔

وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ (۶۸: ۲۵) "وہ کچھ نہ دینے کا فیصلہ کیے ہوئے صبح سویرے جلدی جلدی اس طرح وہاں گئے جیسے وہ پھل کو منع کرنے پر قادر ہیں"۔ وہ اس ارادے سے چلے کہ وہ مساکین سے پھل روکنے اور انہیں منع کرنے پر قادر ہیں۔ اب پہلی مرتبہ وہ ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں جس کی توقع وہ نہ کرتے تھے۔ اب مزاح کی جگہ سنجیدگی آ جاتی ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ (۶۸: ۲۶) "مگر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے "ہم راستہ بھول

گئے ہیں"۔ یہ تو ہمارا باغ ہی نظر نہیں آتا۔ ہمارا باغ تو پھل سے لدا تھا۔ شاید ہم راستہ بھول کر کسی دوسری جگہ آ گئے ہیں۔ لیکن جب معلوم ہوتا ہے کہ راستہ تو نہیں بھولے وہی معروف راستہ ہے جس سے آئے۔

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ (۶۸:۲۷) "نہیں بلکہ ہم محروم رہ گئے"۔ اور یہ ہے اصل حقیقت۔ اب سازش اور مکاری کے انجام نے انہیں گھیر لیا تھا۔ سرکشی اور دوسروں کے حقوق مارنے کا انجام انہوں نے دیکھا۔ اب ان میں سے معتدل، عقلمند اور صالح آدمی یہ تبصرہ کرتا ہے:

معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ لوگ اس حرکت کا فیصلہ کر رہے تھے تو اس نے ان کو غریبوں کی اس حق تلفی سے منع کیا تھا۔ اس نے چونکہ اپنی رائے پر اصرار نہ کیا تھا اس لیے اسے بھی دوسروں کے ساتھ نقصان میں شریک ہونا پڑا۔ لیکن وہ انہیں یاد دلاتا ہے کہ تم نے میری بات نہ سنی۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ (۶۸:۳۰) "پھر ان میں سے ہر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا"۔ لیکن آخر کار وہ جان لیتے ہیں کہ سب کی غلطی ہے، اب نادم ہوتے ہیں۔ اور توبہ کے بعد امید کرتے ہیں کہ شاید اللہ ان کو یہ باغ دوبارہ عطا کر دے۔ دوبارہ اسے باردار کر دے کیونکہ اب وہ مساکین کے خلاف سازش اور بخل سے باز آنے کا عزم کر چکے ہیں۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ (۳۱) عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ (۳۲) (۶۸:۳۱ - ۳۲) "آخر کار انہوں نے کہا "افسوس ہمارے حال پر، بے شک ہم سرکش ہو گئے تھے۔ بعید نہیں کہ ہمارا رب ہمیں بدلے میں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے، ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں"۔ اور قبل اس کے کہ اس منظر پر سے پردہ گر جائے، ہم یہ نصیحت سنتے ہیں:

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۶۸:۳۳) "ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب اس سے بڑا ہے۔ کاش یہ لوگ اس کو جانتے"۔ یوں ہوتی ہے نعمتوں میں بھی آزمائش۔ اس لیے اہل مکہ کو معلوم ہونا چاہئے۔

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ (۶۸:۱۷) "ہم نے ان کو اسی طرح آزمائش میں ڈال دیا ہے جس طرح باغ والوں کو آزمایا تھا"۔ لہٰذا ان کو دیکھنا چاہئے کہ ان کی بھلائی کس میں ہے۔ اور یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ دنیا کی آزمائش اور عذاب تو مختصر ہوتا ہے۔ اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۶۸:۳۳) "لیکن آخرت کا عذاب اس سے بہت بڑا ہے، کاش یہ لوگ جانتے"۔

یوں قریش کے سامنے خود ان کے بدوی معاشرے کا ایک مشہور واقعہ رکھا جاتا ہے ۔ چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ یہ پرانا واقعہ پھر دہرایا جا سکتا ہے ۔ ان کو چاہئے کہ اپنی دولت کو دین اسلام پر ظلم کے لیے استعمال نہ کریں ۔ ورنہ اللہ اس کو ضائع کر سکتا ہے ۔ اور اہل ایمان کو یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ کبراء قریش کو جو مال و دولت اور جاہ و مرتبہ دیا گیا ہے اور وہ اسے غلط استعمال کر رہے ہیں' یہ سخت آزمائش میں ہیں ۔ بہت جلد نتائج سامنے آجائیں گے ۔ اور اگر یہ باز آجائیں تو ان کے لیے بہتر ہے' کاش کہ وہ ہوش کے ناخن لیتے ۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۶۸ : ۳۳) "لیکن آخرت کا عذاب اس سے بہت بڑا ہے' کاش یہ لوگ جانتے" ۔ رہے وہ لوگ جو ڈرنے والے ہیں اور چوکنے ہیں تو ان کے لیے درجات ہیں ۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾

"یقیناً خدا ترس لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں نعمت بھری جنتیں ہیں" ۔

یہ ہے دونوں کے انجام کا فرق ۔ اور یہ ہے دونوں کے طرز عمل اور حقیقت کا فرق ۔ دونوں کی راہ الگ ہے تو یقیناً دونوں کا انجام بھی الگ الگ ہو گا ۔

اب اس کے بعد قرآن کریم ان کے ساتھ ایک ایسا مکالمہ کرتا ہے جو بالکل قابل فہم ہے اور سورت کے ماقبل کے مضامین نے اسے واضح کر دیا ہے ۔ اور ان پر اب سوال پر سوال کیا جاتا ہے ۔ ایسا سوال جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے ۔ اس لیے وہ جواب نہیں دے سکتے ۔ کیونکہ ان سوالات کا واحد جواب ہے جو کڑوا ہے ۔ اس کے سوا یہ کوئی جواب نہیں دے سکتے اور آخرت میں ان کے لیے ایک خوفناک منظر ہے ۔ اور دنیا میں ان کے ساتھ رب تعالیٰ کا اعلان جنگ ہے ۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۹﴾ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۴۱﴾ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ

الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿٤٧﴾

"فرمانبرداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے ' تم کیسے حکم لگاتے ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ یا پھر کیا تمہارے لیے روز قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ؟ ان سے پوچھو تم میں سے کون اس کا ضامن ہے؟ یا پھر ان کے ٹھہرائے ہوئے کچھ شریک ہیں (جنہوں نے اس کا ذمہ لیا ہو)؟ یہ بات ہے تو لائیں اپنے ان شریکوں کو اگر یہ سچے ہیں۔

جس روز سخت وقت آ پڑے گا اور لوگوں کو سجدہ کرنے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے ' ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی ' ذلت ان پر چھا رہی ہو گی۔ یہ جب صحیح و سالم تھے ' اس وقت انہیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا (اور یہ انکار کرتے تھے)۔

پس اے نبیؐ ' تم اس کلام کے جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم ایسے طریقہ سے ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہو گی۔ میں ان کی رسی دراز کر رہا ہوں ' میری چال بڑی زبردست ہے۔ کیا تم ان سے کوئی اجر طلب کر رہے ہو کہ یہ اس چٹی کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں؟ کیا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہوں؟"

اس مکالے اور تحدیات کے درمیان یہ دھمکی بھی آتی ہے کہ آخرت میں تو ان کے لیے عذاب ہے ہی لیکن دنیا میں بھی ان کے خلاف جنگ ہو گی۔ یوں مکالے میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور چیلنج زوردار ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اہل مکہ کو چیلنج کے انداز میں کہا جاتا ہے۔

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ (۶۸ : ۳۵) "کیا ہم فرمانبرداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟" یہ سوال آیات سابقہ میں پائے جانے والے لوگوں کے حوالے سے ہے جو مجرم تھے اور اس کا جواب صرف ایک ہے کہ مسلمین مجرمین کی طرح نہیں ہو سکتے۔ مسلمین رب کے سامنے جھکنے والے ہیں۔ یہ کبھی بھی ان لوگوں کی طرح نہیں ہوا کرتے جو جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں ' جن کی اوصاف آیات سابقہ میں بیان کر دی گئی ہیں اور جو اہل مکہ پر چسپاں ہوتی ہیں۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مجرموں اور مسلموں کا انجام ایک طرح کا نہ ہو۔ چنانچہ دوسرا سوال کیا جاتا ہے۔ یہ بھی سرزنش کا سوال ہے۔

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ (۶۸ : ۳۶) "تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے ' تم کیسے حکم لگاتے ہو"۔ یعنی آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے ' تمہاری عقل کیوں کام نہیں کر رہی ہے۔ تم فیصلے کن دلائل پر کرتے ہو؟ آخر حسن و قبح کے پیمانے تمہارے ہاں کیا ہیں؟ کہ تمہارے میزان کے مطابق ایک مسلم اور مجرم برابر ہے --- اس سرزنش اور استنکاری سوالات کے بعد اب قرآن ان کے ساتھ مزاحیہ انداز اختیار کرتا ہے کہ یہ کسی سنجیدہ گفتگو کے قابل ہی نہیں۔

اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ (۳۷) اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ (۳۸) (۶۸: ۳۷ – ۳۸) ''کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ تمھارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟'' یہ ان کے ساتھ ایک مذاق ہے کہ کس کتاب سے یہ علم لے کر آئے ہو' کیونکہ عقل و عدل کا کوئی معیار تمھارے اس فیصلے کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ تمھارے فیصلے کا خلاصہ تو یہ ہے کہ مسلموں اور مجرموں کا ایک ہی انجام ہے ۔پھر یہ عجیب مضحکہ خیز کتاب ہوگی جو تمھاری خواہشات اور تمھاری مرغوبات کے مطابق فیصلے کرتی ہے کہ جو تم چاہتے ہو' وہی فیصلے اس میں درج ہیں ـ حق اور عدل پر مبنی نہیں ہیں ـ نہ معقول و معروف کے کسی اصول پر مبنی ہیں ـ

اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ (۶۸: ۳۹) ''یا پھر کیا تمھارے لیے روز قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمھیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ''۔ اگر کتاب نہیں ہے تو پھر اللہ کا کوئی عہد تمھارے ساتھ ہو گا پھر؟ اور یہ عہد قیامت تک کے لیے ہو گا۔ اور اس کے مطابق تمھارا یہ حق تسلیم کر لیا گیا ہو گا' کہ تمھارے نفس کے بارے میں تمھارا اپنا اختیار ہے تم جو چاہو' کرو لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے' اللہ کے ہاں ایسا عہد کسی کے ساتھ نہیں ہے ـ آخر وہ کس بنیاد پر ایسی باتیں کرتے ہیں اور ان کی دلیل کیا ہے؟

سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ (۶۸: ۴۰) ''ان سے پوچھو تم میں سے کون ہے اس کا ضامن''۔ یعنی اس معاہدے کے اوپر کوئی ہے دستخط کرنے والا اور اس پر عمل کروانے کی ضمانت دینے والا کہ اللہ کے ساتھ ایسا کوئی معاہدہ ہوا ہے اور جو قیامت تک کے لیے قابل عمل اور قابل نفاذ ہے ـ یہ اس قسم کا مزاح ہے' اس قدر فصیح و بلیغ مزاح ہے کہ اسے سن کر ایک معقول آدمی تو پانی پانی ہوکر رہ جاتا ہے کیونکہ اسے ایک نہایت ہی کھلی اور روشن حقیقت کا سامنا ہوتا ہے ـ

اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (۶۸: ۴۱) ''یا پھر ان کے ٹھہرائے ہوئے کچھ شریک ہیں (جنھوں نے ذمہ اٹھایا ہے) تو لائیں اپنے ان شریکوں کو اگر یہ سچے ہیں''۔ یہ لوگ اللہ کے ساتھ کئی الہوں کو شریک ٹھہراتے تھے' لیکن قرآن مجید ان کو اپنا شریک نہیں کہتا' ان کا شریک کہتا ہے ـ قرآن یہ بتاتا ہے کہ اللہ کا شریک تو اللہ کو معلوم نہیں ہے ـ اور چیلنج دیتا ہے کہ یہ جو کچھتے ہیں کہ ہیں تو لے آئیں تاکہ ان کو دیکھا جائے' لیکن کہاں سے لائیں؟

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (۴۲) خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ (۴۳)

(۶۸: ۴۲ – ۴۳) ''جس روز سخت وقت آپڑے گا اور لوگوں کو سجدہ کرنے کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ

سجدہ نہ کر سکیں گے' ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی' ذلت ان پر چھا رہی ہوگی ۔ یہ جب صحیح و سالم تھے' اس وقت انہیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا (اور یہ انکار کرتے تھے)"۔ یوں یہ لوگ قیامت کے اس منظر کے سامنے ہیں ۔ گویا قیامت برپا ہے ۔ اور ان کو بلایا جا رہا ہے' کہ لاؤ شریکوں کو جن کا تم دعویٰ کرتے تھے ۔ اور اللہ کے علم میں تو یہ دن حقیقتاً حاضر ہے ۔ کیونکہ اللہ کے علم میں ماضی' حال اور مستقبل نہیں ہے ۔ یوں اللہ کے علم کو پیش کرنا' نہایت گہرا اثر ڈالتا ہے اور قرآن مجید کا مخصوص انداز بیان ہے ۔

يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ "جب پنڈلی کھل جائے گی"۔ یہ عربی محاورے میں سختی اور کرب کے لیے آتا ہے ۔ یعنی مشکل وقت میں انسان آستین چڑھاتا ہے اور پائینچے اٹھاتا ہے اور پنڈلی کھل جاتی ہے ۔ بالعموم مشکل وقت میں انسان ایسا کرتا ہے' اور اس وقت ان کو دعوت دی جائے گی کہ اللہ کے سامنے سجدہ کرو' یہ نہ کر سکیں گی' کیونکہ وقت چلا گیا ہو گا اور یا اس لیے کہ اس وقت جس طرح دوسری جگہ کہا گیا :

مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ "سر اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہوں گے"۔ حالت یہ ہوگی کہ ان کے اعصاب اور اجسام خوف کے مارے اکڑے ہوئے ہوں اور وہ غیر ارادی طور پر سجدہ نہ کر سکیں گے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت ہی خوفزدہ پریشان ہوں گے ۔ مزید ہیئت کذائی یہ ہوگی ۔

خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ (٦٨ : ٤٣) "ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی' ذلت ان پر چھائی ہوئی ہوگی"۔ یہ متکبر اور اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھنے والے اس دن یوں ہوں گے ۔ نیچی نظر اور ذلیل حالت یہ دو حالتیں ان کی بداعمالیوں کا بدلہ ہیں ۔ سورت کے آغاز میں جو ڈراوا آیا تھا کہ اس کی سونڈ پر ہم داغ لگائیں گے یہاں اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گہری ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوں گے اور ذلیل و خوار ہوں گے ۔

یہ ایسے حالات میں ہیں شکستہ و ریختہ کہ ان کو ڈرایا ڈلایا جاتا ہے کہ اس حالت تک وہ کس وجہ سے پہنچے' کیونکہ یہ لوگ حق سے منہ موڑتے تھے اور تکبر کرتے تھے ۔ اور جب صحیح سالم تھے اور ان کو سجدوں کے لیے بلایا جاتا تھا' تو یہ تکبر کرتے تھے ۔ اب اس وجہ سے یہ لوگ اس ذلیل موقف میں ہیں اور اس مختصر دنیا کو تو یہ پیچھے چھوڑ آئے ہیں ۔ آج انہیں بلایا جاتا ہے مگر ان کے اندر سکت ہی نہیں ہے ۔

وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ (٦٨ : ٤٣) "جب صحیح و سالم تھے اس وقت انہیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا" مگر یہ انکار کرتے تھے ۔ اور آج بلایا جاتا ہے' کرنا چاہتے ہیں' مگر طاقت نہیں ہے یا موقعہ نہیں ۔ ایسی ہی حالت میں ایک دوسری تہدید دلوں کو ہلا مارنے والی جبکہ وہ پہلے سے کرب اور بے چینی میں ہیں اور حواس باختہ ہیں ۔

فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهَذَا الْحَدِيثِ (٦٨ : ٤٤) "پس اے نبی' تم اس کلام کو جھلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو"۔ مارے گئے ۔ یہ خوفناک دھمکی ہے اللہ جبار و قہار کی طرف سے' جو قوی اور مضبوط ہے ۔

حضور اکرم ﷺ سے کہا جاتا ہے کہ چھوڑ دیجئے ان ٹٹ پونجیوں کو جو اس عظیم کلام کی تکذیب کرتے ہیں۔ میں ان سے لڑوں گا۔ یہ کون تھا جو تکذیب کرتا تھا؟ یہ وہی انسان ہے جس کی قوت ایک چیونٹی سے بھی کم ہے۔ بلکہ اس پوری کائنات کی نسبت سے یہ تو ایک ذرے کے برابر بھی نہیں ہے جو ہوا میں اڑ رہا ہے۔ اللہ قہار و جبار کی قوت کے مقابلے میں' اس کی عظمت کے مقابلے میں انسان بیچارہ ہے کیا؟

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان کو میرے لیے چھوڑ دو' آپ اور اہل ایمان آرام و اطمینان سے بیٹھیں' یہ جنگ میرے ساتھ ہے' میرے دین کی وجہ سے ہے۔ یہ لوگ میرے دشمن ہیں۔ میں ان کے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے رہا ہوں' ان کو معلوم ہو جائے گا۔ آپ لوگ آرام و اطمینان سے بیٹھ جائیں۔ کس قدر خوفناک دھمکی ہے۔ اور کس قدر باوثوق یقین دہانی ہے' ان لوگوں کو جو اس وقت نہایت ہی کمزور پوزیشن میں ہیں۔ اور یہ محض یقین دہانی ہی نہیں ہے۔ اللہ جبار و قہار بتلا دیتا ہے کہ ان کے خلاف کیا سٹریٹجی اختیار کی جائے گی۔ یہ تو بہت ہی کمزور ہیں اور ضعیف ہیں۔

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (٤٤) وَ اُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (٤٥) (٦٨:٤٤ — ٤٥) ''ہم ایسے طریقے سے بتدریج ان کو تباہی کی طرف لے جائیں گے' کہ ان کو خبر ہی نہ ہوگی میں ان کی رسی دراز کر رہا ہوں۔ میری چال بڑا زبردست ہے''۔ ان مکذبین اور تمام روئے زمین کے باشندے اس سے فروتر ہیں کہ اللہ ان کے بارے میں کوئی تدبیر کرے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کو اپنی قوتوں سے ڈراتا ہے کہ وہ اللہ کے غضب کو دعوت نہ دیں۔ اور وقت کے چلے جانے سے پہلے ہی' اپنے آپ کو درست کر لیں' اور یہ جان لیں کہ یہ ظاہری عافیت جس میں وہ ہیں' یہ بھی ان کے لیے بڑی فتح ہے جس پر وہ غرور کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ ان کو جو ظلم کرنے' سرکشی کرنے' دین اسلام سے منہ موڑنے' اور گمراہی اختیار کرنے کی جو مہلت دے دی گئی ہے' یہ دراصل مزید برے انجام کی تدبیر ہے۔ یہ اللہ کی تدبیر ہے کہ یہ لوگ اپنے بوجھ پورے کے پورے اٹھائیں اور قیامت میں جب آئیں تو گناہوں سے لدے ہوئے ہوں اور شرمندگی' سرزنش اور عذاب میں ڈالے جانے کے مستحق ہو چکے ہوں۔

اللہ نے جو تدبیر کی ہوئی ہے' اس میں بھی اللہ نہایت ہی عادلانہ اور رحیمانہ انداز اپناتا ہے کہ ان کو پہلے سے بتا دیتا ہے' حالانکہ وہ اس کے دین کے دشمن ہیں' رسول اللہ ﷺ کے دشمن ہیں تاکہ وہ غور کر لیں اور اگر چاہیں تو راہ راست پر آ جائیں۔

اللہ تعالیٰ مہلت تو دیتا ہے لیکن یونہی شتر بے مہار نہیں چھوڑتا۔ جب وہ ظالموں کو پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ سے پھر کوئی بچ نہیں سکتا۔ یہاں اللہ اپنے طریقے' اپنی سنت اور اپنی مشیت بتاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتاتا ہے کہ جو لوگ اس کلام کا انکار کرتے ہیں ان کو ذرا چھوڑیں کہ میں کس طرح انجام تک پہنچاتا ہوں۔ یہ لوگ مال' اولاد اور مرتبہ و مقام پر اتراتے ہیں۔ میں ان کو مہلت دیتا ہوں۔ یہ نعمتیں ہی ان کے لیے باعث عذاب ہوں گی۔ یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطمئن کر دیا جاتا ہے اور ان کو عذاب کے منہ میں جانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اس خوفناک منظر اور اس خوفناک تہدید کی فضا میں اب یہ مکالمہ یوں اختتام پذیر ہوتا ہے' ان کے موقف پر تعجب کیا جاتا ہے اور چیلنج دیا جاتا ہے۔

أَمْ تَسْئَلُهُمْ أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ (٦٨: ٤٦) "کیا تم ان سے کوئی اجر طلب کر رہے ہو کہ یہ اس چٹی کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں"۔ کیا اسلام میں داخل کرنے کی کوئی بڑی فیس ہے جس سے یہ لوگ ڈر رہے ہیں اور بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اور منہ موڑ رہے ہیں۔ اور اس لیے مجبور ہیں کہ یہ برا انجام ہی اختیار کریں۔ محض اس لیے کہ ادائیگی مشکل ہے۔

أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ (٦٨: ٤٧) "یا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہیں"۔ ان کو یقین ہے کہ وہ سچی راہ پر ہیں۔ اور وہ ڈرتے نہیں۔ ان کو یہ غیبی تائید حاصل ہے اور یہ علم انہوں نے لکھ رکھا ہے اور ان کو یقین ہے یا انہوں نے خود اسے لکھ لیا ہے اور ان کو یقین ہے کہ یہ درست ہے۔ کچھ بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کو کوئی یقین حاصل ہے اور نہ ہی آپ کوئی فیس طلب کرتے ہیں۔

---000---

یہ انداز تعبیر نہایت معنی خیز' خوفناک اور عجیب ہے۔

فَذَرْنِي وَمَن يُكَذِّبُ بِهَٰذَا الْحَدِيثِ (٦٨: ٤٤) "چھوڑ دو مجھے اور ان لوگوں کو جو اس کلام کی تکذیب کرتے ہیں"۔ میرے اور ان احمقوں کے درمیان اب گویا جنگ شروع ہو گئی ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ اللہ کی جنگ رہی ہے۔ اس اعلان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ معرکہ ایمان و کفر' معرکہ حق و باطل میں' دراصل تم فریق نہیں ہو۔ ایک فریق یہ احمق ہیں اور دوسرا اللہ ہے۔ اس جنگ کی کمان اللہ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

اور یہ بات دراصل ہے بھی حقیقت' اگرچہ بظاہر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ معرکہ حق و باطل میں اہم کردار نظر آتے ہیں' ان کا جو کردار ہے وہ بھی سنت الٰہیہ اور تقدیر الٰہی کی تدبیر کا ایک حصہ ہے۔ رسول اللہ اور مسلمان تو دست قدرت کے آلات کار تھے' یہ اللہ ہی تھا جو انہیں استعمال کرتا تھا۔ وہ فعال لما یرید ہے جو چاہتا ہے' کرتا ہے اور کراتا ہے۔ کام اللہ خود کرتا ہے۔

جب یہ آیات نازل ہوئیں' تو حضور ﷺ مکہ میں تھے اور مکہ کے بھی ابتدائی ایام تھے۔ مسلمان نہایت ہی قلیل تعداد میں تھے' ضعیف تھے۔ یوں اللہ نے ان کے کاسہ دل کو اطمینان سے بھر دیا اور یوں ان لوگوں کو خوفزدہ کر دیا جو قوت' مال' مرتبے اور اولاد کی وجہ سے غرے میں مبتلا تھے۔ اس کے بعد جب حضور ﷺ مدینہ گئے تو وہاں ظاہری حالات بدل گئے۔ اللہ نے یہ چاہا کہ رسول اللہ اور مسلمانوں کا اس معرکہ میں ایک ظاہری کردار بھی ہو۔ لیکن اصل حقیقت اللہ نے ہمیشہ دو ٹوک الفاظ میں بتائی جہاں وہ مکہ میں ضعیف تھے' تب بھی اور مدینہ میں وہ بظاہر کامیاب اور طاقتور تھے تب بھی۔ بدر میں کہا۔

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (٨: ١٧) "پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں

قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا اور اے نبی تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کیے گئے) تو یہ اس لیے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے ' یقیناً اللہ سننے اور جاننے والا ہے"۔ تاکہ ان کے دلوں میں یہ حقیقت بیٹھ جائے کہ جنگ کا فریق دراصل اللہ ہے ۔ اور یہ جنگ اس کی جنگ ہے 'تاکہ اس آزمائش میں اللہ کے لیے اجر لکھ دے ۔ رہی اصل جنگ تو وہ اللہ کی ہے اور رہی فتح تو وہ بھی اللہ عطا کرتا ہے 'مسلمانوں کے بغیر بھی یہ فتح اللہ عطا کر سکتا ہے ۔ رہے یہ لوگ جو اس میں شریک ہوتے ہیں تو یہ دست قدرت کے آلات ہوتے ہیں ۔ اور اللہ کی افواج صرف مومنین تک محدود نہیں ہیں ۔

بہرحال قرآنی آیات میں اس حقیقت کو بالکل واضح کر کے بیان کیا ہے ' خواہ بظاہر مسلمان کمزور ہوں یا مضبوط ' نیز اللہ کے نظام قضا و قدر کے ساتھ بھی یہی بات متفق ہے ۔ اللہ کی سنت اور اللہ کی مشیت کا بھی یہی تقاضا ہے ۔ رہے مسلمان اور اسلامی افواج تو وہ محض آلات اور اسباب ہیں ۔

یہ وہ حقیقت ہے جو مومن کو حالت قوت اور ضعف دونوں میں مطمئن کر دیتی ہے بشرطیکہ قلب مومن مخلص ہو' اور جہاد میں وہ اللہ پر بھروسہ کرتا ہو' کیونکہ کفر و اسلام کے معرکوں میں مسلمانوں کی قوت فیصلہ کن نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی نصرت فیصلہ کن ہوتی ہے ۔ اللہ نصرت کا ضامن بن جاتا ہے ۔ اگر مسلمان ضعیف بھی ہوں تو بھی فتح پاتے ہیں کیونکہ ان کو اللہ کی تائید حاصل ہوتی ہے ۔ ہاں اللہ دشمنوں کو مہلت دیتا ہے ۔ ان کی رسی دراز کرتا ہے ۔ اور اپنی مشیت ' حکمت ' اور عدل اور رحمت کے مطابق اپنے مناسب وقت پر اپنے دشمنوں کو شکست دیتا ہے ۔

نیز یہ ایک ایسی حقیقت بھی ہے جس سے اللہ کے دشمنوں کے دل بھی تھرتھر کانپتے ہیں ۔ چاہے مسلمان حالت ضعف میں ہوں یا حالت قوت میں ہوں ۔ اس لیے کہ دشمن اسلام بھی جانتا ہے کہ ہمارا مقابلہ مسلمانوں سے نہیں بلکہ خدا سے ہے ۔ اس خدا سے جو اپنے نبی سے کہہ رہا ہے ۔

فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهَٰذَا الْحَدِيثِ (٦٨ : ٤٤) "چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جو اس کلام کی تکذیب کرتا ہے"۔ تم الگ ہو جاؤ اور اس بدبخت کو میرے لیے چھوڑ دو لیکن اللہ کی چال زبردست اور اس کا جال نظر فریب ہوتا ہے ۔ یہ اس میں اس طرح پھنس جائیں گے کہ پتہ بھی نہ چلے گا ۔ اگرچہ یہ طاقتور ہوں ۔ یہ ان لوگوں کی قوت جس کی وجہ سے یہ غرے میں مبتلا ہیں یہی ان کے لیے موجب شکست ہوگی ۔

وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ (٦٨ : ٤٥) "میں ان کی رسی دراز کر رہا ہوں میری چال زبردست ہے"۔ رہی یہ بات کہ فتح کب ہوگی' تو اس کا علم اللہ کو ہے ۔ کوئی اللہ کی چال اور جال سے بچ کر نہیں نکل سکتا ۔ اس سے وہی لوگ غافل ہوتے ہیں جو فسق و فجور میں بہت دور چلے جاتے ہیں ۔

ایسے حالات میں آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صرف یہی کہنے کی ضرورت ہے کہ آپ وقت آنے تک صبر کریں ۔ مشکلات برداشت کریں ' رسالت اور دعوت کی ذمہ داریاں پوری کریں 'نفس کی خواہشات پر صبر کریں ۔ ان کی ایذا رسانیوں پر صبر کریں ۔ یہاں تک کہ اللہ کے مقابلے کا وقت آ جائے ۔ یہاں دعوت اسلامی کی تاریخ سے ایک واقعہ بتایا جاتا ہے کہ جلد بازی نہ کریں اللہ نظام کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور حضرت یونس علیہ السلام نے بے صبری کی تھی تو

اللہ کے فضل ہی نے ان کی مدد کی۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ؕ﴿۴۸﴾ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾ فَاجْتَبٰىهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾

''اچھا' اپنے رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو اور مچھلی والے (یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جاؤ' جب اس نے پکارا تھا اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ اگر اس کے رب کی مہربانی اس کے شامل حال نہ ہو جاتی تو وہ مذموم ہو کر چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا۔ آخر کار اس کے رب نے اسے برگزیدہ فرما لیا اور اسے صالح بندوں میں شامل کر دیا''۔

مچھلی والے حضرت یونس علیہ السلام ہیں۔ ان کے واقعہ کی تفصیلات سورہ صافات میں گزر گئی ہیں۔ ان کے تجربہ کا خلاصہ یہ ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے' کہ حضرت یونس علیہ السلام کو اللہ نے ایک گاؤں کی طرف بھیجا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ موصل کے قریب نینوئ نامی گاؤں تھا۔ ان لوگوں نے ایمان لانے میں دیر کر دی۔ آپ کو ان کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ غصے میں آپ نے ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ اپنے دل میں کہا کہ اللہ نے مجھ پر یہ لازم نہیں کیا کہ ان ہٹ دھرموں اور معاندین کے درمیان میں بیٹھا رہوں جبکہ یہ نہیں مان رہے ہیں' تو میں کسی دوسری قوم میں کام کر سکتا ہوں یا اللہ مجھے دوسری جگہ بھیج سکتا ہے۔ اس غصے کی حالت میں آپ ساحل کے کنارے تک چلے گئے۔ ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ جب یہ سمندر کے درمیان گئے تو کشتی بھاری ہو گئی اور غرق ہونے لگی۔ انہوں نے قرعہ پھینکا کہ کشتی کو ہلکا کرنے کے لیے ایک آدمی کو کم کیا جائے۔ قرعہ آپ کا نکلا۔ لوگوں نے آپ کو سمندر میں پھینک دیا۔ مچھلی نے نگل لیا۔ اس وقت حضرت یونس علیہ السلام نے اللہ کو پکارا جب کہ وہ سخت مشکل میں تھے اور قریب المرگ تھے۔ سمندر کے اندر مچھلی کے پیٹ میں تھے۔ تاریکیوں پر تاریکیاں تھیں۔ اور موجوں پر موجیں تھیں۔ یہاں انہوں نے پکارا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ''نہیں ہے کوئی الٰہ مگر تو' تو پاک ہے اور میں ظالموں میں سے تھا''۔ اس وقت اللہ کا فضل و کرم آپہنچا' مچھلی نے انہیں حکم الٰہی کے مطابق ساحل پر اگل دیا۔ اور اس وقت ان کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ گوشت کا لوتھڑا رہ گئے تھے۔ مچھلی کے معدے کے کیمیاوی عمل نے ان کی جلد کو رقیق بنا دیا تھا جبکہ ابھی تک اللہ نے ان کو زندہ رکھا۔ معجزانہ انداز میں اور اللہ خود اپنے بنائے ہوئے قوانین حیات کا پابند نہیں ہے۔

یہاں اللہ فرماتا ہے کہ اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو مچھلی انہیں اس حالت میں پھینکتی کہ وہ مذموم ہوتے۔ یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے مذموم ہوتے۔ کہ وہ اپنے مقام دعوت سے ذرا جلدی چلے گئے۔ اللہ نے ان کی اس تسبیح کو قبول کیا اور ان کے اعتراف اور عذر کو قبول کر لیا اور ان پر رحم و کرم کر دیا۔

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۶۸ : ۵۰) ''آخر اس کے رب نے اسے برگزیدہ فرما لیا اور

اسے صالح بندوں میں شامل کر لیا"۔

یہ تجربہ خاتم النبیین کے لیے پیش کیا گیا تاکہ آپؐ اپنے فرائض رسالت کی ادائیگی میں اس سے استفادہ کریں۔ کیونکہ آپ نے آخری رسالت کا کام تمام سابقہ تجربات کی روشنی میں کرنا تھا۔ تمام نصیحتیں، تمام عبرتیں اور تمام تجربات کی فصل آپ نے کاٹنی تھی تاکہ آپ کے لیے اپنے کام میں فیصلے کرنے میں آسانی ہو۔ اور آپ یہ بوجھ اچھی طرح اٹھا سکیں۔ تاکہ آنے والے زمانے میں، جدید سے جدید تر حالات میں بھی زندگی کی گاڑی ان اصولوں کے مطابق چلائی جا سکے اور جب مستقبل کوئی نیا مسئلہ لے کر آئے تو اس دعوت اور رسالت کے اصولوں میں اس کا حل موجود ہو۔

یہ تجربہ جس سے حضرت یونس علیہ السلام گزرے، یہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں کہ انہی کی طرح لوگ ہٹ دھرمی، تکذیب اور سرکشی پر اترے ہوئے ہیں اور یہ نصیحت آپ کو اس وقت کی گئی جب حق و باطل کے معرکے کی ذمہ داری سے آپ کو سبکدوش کر دیا گیا۔ یہ ذمہ داری اللہ نے لے لی۔ جس طرح چاہے گا، جنگ کرے گا، جس وقت چاہے گا، کرے گا۔ آپ کو یہ حکم دے دیا کہ آپ صبر اور ثابت قدمی سے اپنا کام یعنی ابلاغ کرتے رہیں، چاہے اس راہ میں جو مشکلات بھی آئیں، تمام فیصلے وقت پر ہوں گے۔ مقام دعوت نہ چھوڑیں نہ جلدی کریں۔

دعوت اسلامی کی مشکلات اور مشقتوں میں سے سب سے بڑی مشقت صبر کرنا ہے۔ اور اس وقت کا انتظار کرنا ہے کہ جب اللہ اپنا آخری فیصلہ صادر کر دے کیونکہ دعوت کی کامیابی کے وقت کا فیصلہ اللہ کے پاس ہے اور یہ فیصلہ اللہ اپنی حکمت کے مطابق صادر فرماتا ہے۔ اس فیصلے کی گھڑی کے آنے سے پہلے اس راہ میں بڑی مشقتیں آتی رہتی ہیں، لوگ جھٹلاتے ہیں، پھر تشدد کرتے ہیں۔ چالیں چلتے ہیں اور سخت عناد رکھتے ہیں۔ باطل اپنی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے اور وہ اسے اس طرح بڑھا کر پیش کرتا ہے جس طرح غبارے میں ہوا بھر دی جاتی ہے۔ اور وہ خوفناک نظر آتا ہے، لوگ ظاہری کامیابی اور باطل کی چلت پھرت سے مرعوب ہو کر اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں، پھر مشکل ترین مشقت یہ ہوتی ہے کہ داعی نہایت ثابت قدمی، استقلال، سنجیدگی کے ساتھ جم کر کام کرتا رہے اور وعدہ حق کی آمد کا انتظار کرے۔ کوئی شک نہ کرے، کوئی تردد اسے نہ ہو، سیدھی راہ پر جا رہا ہو، اگرچہ راہ میں رکاوٹیں آئیں تو گویا وقت کے آنے کا انتظار بڑی مشقت ہے۔ رہا اصل معرکہ تو یہ اللہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ وہی اس معرکے میں فریق ہے، وہی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ ظالموں کی رسی دراز کر رہا ہے۔ اور اس میں حکمت پوشیدہ ہے۔ یہی وعدہ ان مشکل حالات میں نبی کریم ﷺ سے ہوا اور بعد کے حالات نے اس کی تصدیق کی۔

آخر میں کافروں کے ایک دوسرے منظر کو یہاں لایا جاتا ہے۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی دعوت اور تبلیغ سن کر سخت غصے میں آتے تھے اور جل بھن جاتے تھے اور ان کے دل مین سخت عناد اور حسد پیدا ہوتا ہے، جس کا اظہار ان کی نظروں سے ہوتا۔ زہر آلود اور قہر آمیز نظروں سے یہ لوگ آپ کو گھورتے ہیں۔ قرآن کریم ان کو نہایت ہی خوبصورتی سے بیان کرتا ہے جس پر اضافہ ممکن نہیں۔

وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا

۲

الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ﴿۵۱﴾ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿۵۲﴾ الربع ۱۹ ع ۲

"جب یہ کافر لوگ کلام نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو تمہیں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ گویا تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے 'اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے' حالانکہ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے"۔

یہ ممکن تھا کہ یہ خشمگیں نظریں حضور اکرم ﷺ کے قدم ہلا دیں اور آپ پھسل جائیں۔ اور آپ ڈگمگانے لگیں۔ ان کی نظروں میں جس قدر قہر' غضب' شرارت' جوش انتقام اور حسد اور گرمی تھی' قرآن کریم نے اسے بہت ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اور ان نظروں کے ساتھ وہ سب وشتم اور اتہام و الزام بھی لگاتے اور کہتے۔

إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ (۶۸ : ۵۱) "یہ تو ایک مجنون ہے"۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جسے دست قدرت کا قلم ہی رقم کر سکتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دعوت اسلامی اس ابتدائی دور میں کس قدر مشکل حالات سے گزر رہی تھی۔ اس وقت مکہ کے مخالفین کا حلقہ بااثر مجرمین کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ ان کے دل جل رہے تھے اور آنکھیں مارے غصب کے پھٹ رہی تھیں۔ لیکن اللہ فرماتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر احمق ہیں کہ مکہ کے اس چھوٹے سے شہر میں جل بھن رہے ہیں یہ تو ایک عالمی پروگرام ہے۔

وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (۶۸ : ۵۲) "حالانکہ یہ تو جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے"۔ صرف مکہ والوں کے لیے نہیں ہے اور پھر یہ جو الزام لگاتے ہیں وہ کس قدر احمقانہ ہے کہ کیا دیوانے عالمی اصلاح کا کوئی پروگرام پیش کرتے ہیں۔ صدق اللہ العظیم!

یہاں مناسب ہے کہ لفظ العالمین پر بات ہو جائے۔ ابھی یہ دعوت مکہ میں ہے' چند ماننے والے ہیں اور رسول کو خشمگیں نظروں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اور مشرکین مکہ اس کے خلاف جنگ میں اپنے پورے وسائل استعمال کر رہے ہیں۔ اس ابتدائی دور میں' اس مشکل وقت میں بھی اعلان کر دیا جاتا ہے کہ یہ عالمی تحریک ہے۔ جس طرح کہ اس کی حقیقت تھی۔ لہٰذا مدینہ میں جب اس تحریک نے عالمی انداز اختیار کیا تو یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ جس طرح آج کل مغربی افتراء پرداز یہ الزام لگاتے ہیں کہ دعوت اسلامی نے عالمی رنگ صرف مدینہ کی کامیابی کے بعد اختیار کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پہلے دن سے ایک عالمی دعوت تھی۔ یہی اللہ کا ارادہ تھا اور یونہی یہ دعوت زمانہ آخر تک رہے گی۔ یہ اللہ کا ارادہ ہے۔ یہ دعوت اللہ کی ہے اور وہی اس کا محافظ ہے۔ وہ اس کا حامی اور ناصر ہے۔ وہی اس کی جانب سے لڑنے والا ہے۔ اور اس کے حاملین کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اس پر جم جائیں۔ وہ سب سے اچھے فیصلے کرنے والا ہے۔

--- ○○○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۲۹

سورۃ الحاقۃ ۔ ۲۹

۱ -- تا -- ۵۲

سورۃ الحاقہ ایک نظر میں

یہ نہایت ہی ہولناک ' خوفناک اور پر شوکت سورت ہے ـ آپ جب چاہیں اسے پڑھیں ـ آپ کے احساسات میں ایک زلزلہ برپا ہو گا ـ اول سے لے کر آخر تک احساسات کے دروازے پر دستک دے رہی ہے ـ خوفناک ضربات لگاتی ہے ' دو ٹوک بات کرتی ہے ' اور اس کی اسکرین پر منظر کے بعد منظر آتا ہے اور ہر منظر میں یہ اصرار ہے کہ احساس کرو 'کبھی خوفناک انداز میں 'کبھی پر شوکت انداز میں 'کبھی عذاب آخرت دکھا کر اور کبھی اچھی طرح جھنجھوڑ کر ـ

لطف یہ ہے کہ پوری سورت پردہ احساس پر ایک ہی مفہوم اور ایک ہی حرکت پیدا کرنا چاہتی ہے ـ خبردار یہ معاملہ یعنی دین و ایمان کا معاملہ ایک سنجیدہ اور اہم اور فیصلہ کن معاملہ ہے 'اس میں کوئی بات برائے وزن بیت نہیں ہے ـ اور نہ مزاح ہے ـ دنیا میں بھی اہم ہے ' آخرت میں بھی اہم ہے ـ اللہ کے حساب و کتاب میں بھی اہم ہے ـ نہ دنیا میں اس پر سودابازی ہو سکتی ہے اور نہ قیامت میں اس میں سے کسی جز کو ترک کیا جا سکتا ہے ـ اس میں ذرا سی چوک بھی غضب الٰہی کو دعوت دینا ہے ـ اپنے آپ کو اللہ کی پکڑ کا مستوجب بنانا ہے ـ اگرچہ وہ رسول خدا کیوں نہ ہوں ' لہٰذا تمام انسان کو یہاں تک کہ رسول اللہ خیرالبشر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں 'یہ حق ہے ـ حق الیقین اور عین الیقین ہے اور رب العالمین کی طرف سے ہے ـ

یہ مفہوم اس لفظ سے بھی ظاہر ہے 'جو اس سورت میں قیامت کے لیے استعمال ہوا ہے ـ اَلْحَاۤقَّةُ (۶۹ : ۱) الحاقہ 'اس لفظ کا صوتی ترنم اور اس کا مفہوم 'یعنی وہ امر جس کا وقوع ہونا ہے 'ہونی شدنی ہے ' سنجیدہ ' دو ٹوک سچائی اور طے شدہ ہونے کا مفہوم پردۂ احساس پر چھوڑتا ہے ـ لفظ کے تلفظ ہی میں ایک قاری بوجھ محسوس کرتا ہے اور پھر یہ مفہوم مضبوطی سے شعور میں بیٹھ جاتا ہے ـ نہایت قرار و سکون کے ساتھ ـ اس میں حرف حا کا مد ہے اور یہ مد بالالف ہے اور بعدہ قاف مشدد ہے اور آخر میں تائے تانیث ہے جو وقف کی صورت میں ہا کا آواز دیتی ہے گویا ایک بھاری بوجھ اٹھا کر آرام سے رکھ دیا جاتا ہے ـ

اس کے بعد قیامت کے منکرین ایک ایک کر کے اسکرین پر آتے ہیں ـ ان کو سخت عذاب میں جتلا کر کے دکھایا جاتا ہے ـ ہر ایک کی تباہی فیصلہ کن ہے ـ یہ احساس دلایا جائے کہ قیامت فیصلہ کن ہے لہٰذا تمام دارومدار ایمان پر ہے ـ

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ (۴) فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ (۵) وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ (۶) سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (۷) فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ (۸) وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ (۹) فَعَصَوْا رَسُوْلَ

رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً (١٠) اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِى الْجَارِيَةِ (١١)

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّ تَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ (١٢) (٦٩: ٤ تا ١٢) "اور عاد نے اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کو جھٹلایا تو ثمود ایک حادثہ سے ہلاک کیے گئے اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلسل سات رات اور آٹھ دن ان پر مسلط رکھا' تم دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں گویا وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔ اب کیا ان میں سے کوئی باقی بچا نظر آتا ہے؟ اور اسی خطائے عظیم کا ارتکاب فرعون اور اس سے پہلے کے لوگوں نے اور تلپٹ ہونے والی بستیوں نے کیا۔ ان سب نے اپنے رسول کی بات نہ مانی تو اس نے ان کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑا۔ جب پانی کا طوفان حد سے گزر گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں سوار کر دیا تھا' تاکہ اس واقعہ کو تمہارے لیے سبق آموز یادگار بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اس کی یاد محفوظ رکھیں"۔ یوں جس نے بھی دین و ایمان اور حساب و کتاب اور قیامت کو نظرانداز کیا اللہ تعالیٰ کی خوفناک پکڑ سے دوچار ہوا۔ اور اسے اللہ نے پیس کر رکھ دیا۔ یہ سب مناظر بتاتے ہیں کہ ایمان اور قیامت کا معاملہ خصوصاً نہایت ہی سنجیدہ' فیصلہ کن' دوٹوک اور قطعی ہے۔ یہ مزاح کی باتیں نہیں ہیں۔ یہ کھیل تماشا نہیں کہ ان پر نظر ڈال کر نظرانداز کر دیا جائے۔

یہ سنجیدگی اور قیامت کے خوفناک مناظر۔ ان سے یہ بات جھلکتی ہے کہ ایک دن یہ پوری کائنات ختم کر دی جائے گی اور جلال ربانی کا ظہور ہو گا۔ اور نہایت ہی خوفناک دن ہو گا۔ جس میں بڑے بڑے اجرام فلکی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔

فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ (١٣) وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (١٤) فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (١٥) وَ انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِىَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (١٦) وَّ الْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ

(١٧) (٦٩: ١٣ تا ١٧) "پھر جب ایک دفعہ صور میں پھونک مار دی جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا' اس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آ جائے گا۔ اس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی' فرشتے ان کے اطراف و جوانب میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے"۔

قیامت کے ایک منظر میں بھی اس خوف اور سنجیدگی کی تلقین کی جاتی ہے۔ جب حساب و کتاب ہو گا' حساب و کتاب کے یہ مناظر فیصلہ سنائے جانے کے بعد بھی خوفناک ہیں اور اس سورت کے اشارات اور احساس دلانے کے موثر طریقوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اس دن جو کامیاب ہو جاتا ہے اور جس کو نتیجہ بھی مل جاتا ہے وہ بھی اس قدر خائف ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ (١٩) اِنِّىْ

ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ (٢٠) (٦٩ : ١٩ – ٢٠) "اس وقت جس کا اعمال نامہ اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا' وہ کہے گا "لو دیکھو' پڑھو میرا نامہ اعمال میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے"۔ یہ نجات پا چکا ہے لیکن پھر بھی مارے خوف کے اسے یقین نہیں آ رہا ہے۔

وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَهْ (٢٥) وَ لَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ (٢٦) یٰلَیْتَهَا کَانَتِ الْقَاضِیَةَ (٢٧) مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ (٢٨) هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ (٢٩) (٦٩ : ٢٥ تا ٢٩) "اور جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا "کاش' میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی۔ آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ میرا سارا اقتدار ختم ہو گیا"۔ کس قدر فریاد و فغاں ہے۔ اور یہ کس طرح پردۂ احساس پر بیٹھ جاتی ہے۔ یہ ہے رنگ اس سورت کا۔

اور اس سورت کی ہولناکی اور سنجیدگی اور قطعیت اس وقت بھی سامنے آتی ہے جب مجرمین کو نہایت ہی سخت الفاظ میں فیصلہ سنایا جاتا ہے۔ فضائے عدالت خوفناک ہے۔ ہر طرف خاموشی اور آواز آتی ہے :

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ (٣٠) ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ (٣١) ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُکُوْهُ (٣٢) (٦٩ : ٣٠ تا ٣٢) "پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو' پھر اسے جہنم میں جھونک دو' پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو"۔ اس حکم کا ایک ایک فقرہ اس قدر بھاری ہے کہ زمین و آسمان کے بوجھ سے زیادہ ہے اور وادی شعور میں اس کے گولے اس قدر دھماکے سے گرتے ہیں کہ انسان حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ دل و دماغ پر ایک سنجیدگی طاری ہو جاتی ہے۔ اس عدالتی فیصلے کے دلائل بھی گنوائے جاتے ہیں۔ اور جن سے اس جرم کا انجام منصفانہ ثابت ہو جاتا ہے۔

اِنَّهٗ کَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ (٣٣) وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (٣٤) فَلَیْسَ لَهُ الْیَوْمَ هٰهُنَا حَمِیْمٌ (٣٥) وَّ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ (٣٦) لَّا یَاْکُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ (٣٧) (٦٩ : ٣٣ تا ٣٧) "یہ نہ بزرگ و برتر اللہ پر ایمان لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔ لہٰذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یار غم خوار ہے اور نہ زخموں کے دھوون کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا' جسے خطاکاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا"۔

پھر اسی مفہوم کو ایک ہولناک قسم کھا کر کتاب میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس دین کی حقیقت کیا ہے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس پر غور کریں :

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ (٣٨) وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ (٣٩) اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (٤٠) وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ (٤١) وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (٤٢) تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٤٣) (٦٩: ٣٨ تا ٤٣) "پس' میں قسم نہیں کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے' یہ ایک رسول کریم کا قول ہے' کسی شاعر کا قول نہیں ہے' تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے' تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے"۔

اور آخر میں آخری ضرب لگائی جاتی ہے۔ دو ٹوک دھمکی دی جاتی ہے اور جو بھی اس دین سے کھیلتا ہے' یا اس میں تبدیلی کرتا ہے اسے سخت گرفت کی دھمکی دی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ کام کرنے والے محمد رسول اللہ ہی کیوں نہ ہوں۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ (٤٤) لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ (٤٥) ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ (٤٦) فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ (٤٧) (٦٩: ٤٤ تا ٤٧) "اور اگر اس (نبیؐ) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے' پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا"۔ اس معاملہ میں نہ نرمی کی جا سکتی ہے' نہ خواہشات کی پیروی۔

اور سورت کا خاتمہ اس قرارداد پر ہوتا ہے' جو بالکل فیصلہ کن دو ٹوک ہے اور جس سے معاملے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (٤٨) وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ (٤٩) وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (٥٠) وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ (٥١) فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (٥٢)

(٦٩: ٤٨ تا ٥٢) "درحقیقت یہ پرہیزگار لوگوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں۔ ایسے کافروں کے لیے یقیناً یہ موجب حسرت ہے اور یہ بالکل یقینی حق ہے' پس اے نبی اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کر"۔ یہ ایسا خاتمہ ہے کہ بات کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ فیصلہ کن قرارداد آ جاتی ہے اور ہر قسم کی لغو سے دامن جھاڑ لیا جاتا ہے اور پس رب عظیم کے نام کی تسبیح اور حسن انجام کا انتظار۔

یہ مفہوم اور معنی جو یہ سورت انسانی احساس و شعور میں بٹھانا چاہتی ہے' اس کا اسلوب' اس کے اثرات' اس کے مناظر' اس کی تصاویر اور اس کے سائے نہایت ہی خوبصورتی سے' نہایت موثر انداز میں قاری اور سامع کے ذہن نشین کراتے ہیں۔

سورت کا انداز ایسا ہے کہ اپنے زندہ و تابندہ اور متحرک مناظر کے ذریعے انسانی احساس کو ہر طرف سے گھیر لیا جاتا

ہے' اس طرح کہ انسان اس تاثر سے نکل کر کہیں بھاگ نہیں سکتا۔ وہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ معانی' مضامین اور واقعات زندہ ہیں اور ابھی وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔

اقوام عاد و ثمود کی تباہیاں یوں بیان ہوئیں کہ گویا ابھی یہ واقعات ہو رہے ہیں۔ فرعون اور قوم لوط کی بستیاں جو الٹ دی گئی تھیں' یوں نظر آتی ہیں کہ گویا نظر آ رہی ہیں اور انسان اشارہ کر سکتا ہے کہ وہ رہیں۔ طوفان نوح گویا برپا ہے اور وہ ہے کشتی بھری ہوئی پردۂ خیال پر۔ اور نہایت ہی مختصر الفاظ ایک دو آیات میں' معانی کے سمندر اور تصاویر پیش کر دی جاتی ہیں۔ ذرا پڑھئے :

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ (٦) سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (٧) فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ (٨) (٦٩ : ٦ تا ٨) "اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلسل سات رات اور آٹھ دن ان پر مسلط رکھا۔ (تم وہاں ہوتے تو) دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں جیسے وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔ اب کیا ان میں سے کوئی تمہیں باقی بچا نظر آتا ہے؟"

کون ہے جو ان آیات کو سمجھ کر پڑھے اور اس کے پردۂ احساس پر تیز طوفانی ہوا کا منظر نکھر نہ جائے' جو ہر طرف سے دھاڑتی چنگھاڑتی آ رہی ہو اور توڑ پھوڑ کر ہر چیز کو نیست و نابود کر رہی ہو۔ پوری سات راتیں چل رہی ہو اور آٹھ دن چل رہی ہو اور لوگوں کی لاشوں کا منظر اس میں یوں ہو کہ جیسے کھجور کے درخت جڑ سے اکھاڑ پھینکے گئے ہوں۔

كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (٦٩ : ٧) "جیسا کہ کھجور کے بوسیدہ تنے گرے پڑے ہوں"۔ یہ ایسا منظر ہے جو زندہ' آنکھوں کے سامنے متمثل ہوتا ہے۔ بادل میں تخیل کی شکل میں زندہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی پکڑ کے دوسرے سب مناظر جو اس میں بیان ہوئے۔

پھر ہمارے سامنے اس دنیا کے خاتمہ کے مناظر آتے ہیں۔ یہ نہایت ہی خوفناک اور ہولناک مناظر ہیں۔ یہ مناظر ہمارے تخیل کے اندر وہ زلزلہ برپا کرتے ہیں کہ پورے ماحول کو خوف' رعب اور درماندگی سے بھر دیتے ہیں۔

وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (٦٩ : ١٤) "زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا"۔ جو بھی اسے پڑھے گا اس کے پردۂ تخیل پر زمین اپنے پہاڑوں سمیت اٹھتی ہے اور یکبارگی دے ماری جاتی ہے اور ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے اور۔

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (١٦) وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا (٦٩ : ١٧) "اس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی' فرشتے ان کے اطراف و

جوانب میں ہوں گے"۔ جو بھی اسے پڑھتا ہے اس کے ذہن میں زمین و آسمان کے اس نظام کا انجام بیٹھ جاتا ہے کہ اس خوبصورت آسمان کا یہ انجام ہو گا۔ اور پھر۔

وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ (۱۷) يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ (۱۸) (۶۹: ۱۷ – ۱۸) "فرشتے اس کے اطراف میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے"۔ اس سے انسان کے ذہن میں بادشاہ کے جلال کا تصور آ جاتا ہے۔

اب ذرا اس شخص کی خوشی کو دیکھیں جو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں پاتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے۔ لوگوں کو خوشی کے مارے دکھاتا پھرتا ہے اور پھولا نہیں سماتا۔

هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ (۱۹) اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ (۶۹: ۲۰) "لو دیکھو' پڑھو میرا نامہ اعمال میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے"۔

اور پھر تباہ ہونے والے کا منظر جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جاتا ہے اس کے الفاظ' کلمات اور تاثرات سے حسرت اور مایوسی ٹپکتی پڑتی ہے۔

يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ (۲۵) وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ (۲۶) يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ (۲۷) مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ (۲۸) هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ (۲۹) (۶۹: ۲۵ تا ۲۹)

"کاش میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی۔ آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ میرا سارا اقتدار ختم ہو گیا"۔

اور جب انسان اللہ کا آخری فیصلہ سنتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ (۳۰) ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ (۳۱) ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (۳۲) (۶۹: ۳۰ تا ۳۲) "پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو' پھر اسے جہنم میں جھونک دو' پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو"۔ اور اللہ کے کارندے ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر ان سب امور کی تعمیل کرتے ہیں۔ اور یہ بدبخت مارا جاتا ہے۔ اور یوں ہو جاتی ہے اس کی حالت:

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ (۳۵) وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ (۳۶) لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ (۳۷) (۶۹: ۳۵ تا ۳۷) "لہذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یار غم خوار ہے اور نہ زخموں کے

دھوون کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا' جسے خطاکاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا"۔

اور آخر میں وہ عظیم دھمکی آتی ہے جس میں تمام انسانوں کے ساتھ رسول کریم بھی شامل ہیں ۔کوئی نہیں ہے جو اسے سن کر کانپ نہ جاتا ہو۔ اور ہیبت میں جتلا نہ ہو جاتا ہو۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ (٤٤) لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ (٤٥) ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ (٤٦) فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ (٤٧) (٦٩: ٤٤ تا ٤٧) "اور اگر اس (نبیؐ) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے' پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا"۔

غرض پوری سورت میں پرشوکت' زندہ' متحرک مناظر ہیں اور انسانی احساس اس پوری سورت میں ان کی شدید گرفت میں رہتا ہے ۔ پوری سورت میں انسانی شعور بڑے اضطراب' الحاح اور دباؤ میں رہتا ہے اور اس پر مثبت اور حقیقی اثرات مرتب ہوتے ہیں ۔

اس سورت میں آیات کے قافیے اور مقاطع نہایت نغمہ بار اور متنوع ہیں ۔ مناظر اور ماحول کے لحاظ سے اثر آفرینی کی جاتی ہے ۔ بعض جگہ مد طویل ہے' بعض جگہ تشدید ہے' اور بعض جگہ سکتہ ہے ۔ مثلاً

اَلْحَآقَّةُ (١) مَا الْحَآقَّةُ (٢) وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْحَآقَّةُ (٣) (٦٩: ١ تا ٣) میں مد اور تشدید کے بعد یا ہائے ساکت آتی ہے یا اس سے قبل یاء ہے ۔ ان تمام مناظر میں جن میں تباہی کے مناظر ہیں' دنیا میں یا آخرت میں یا خوشی اور غم کے مناظر ہیں' ان میں یہی قافیہ ہے ۔ اس کے بعد جب حکم بادشاہی یا عدالت عالیہ کا فیصلہ آتا ہے تو یہ قافیہ ایک خوفناک انداز بادشاہی اختیار کر لیتا ہے ۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ (٣٠) ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ (٦٩: ٣١) اس کے بعد جب اس فیصلے کے دلائل دیئے جاتے ہیں تو یہ قافیہ میم و نون سے بدل جاتا ہے اور انداز فیصلہ کن اور دو ٹوک ہو جاتا ہے ۔

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ (٣٣) وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (٣٤) فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ (٣٥) وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ (٣٦) (٦٩: ٣٣ تا ٣٦) اور فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (٦٩: ٥٢) حروف قافیہ میں تغیر اور مد کی نوعیت میں تبدیلی مناظر اور موقف اور انداز کلام کی مناسبت سے ہے ۔ ہر موقعہ کے محل اور ماحول کے مطابق الفاظ اور قافیوں کا انتخاب ہے ۔ اور ہر جگہ احساس پر ایک نیا اثر ہوتا ہے ۔ الغرض یہ ایک نہایت پرتاثیر سورت ہے' پرشوکت کلام ربانی ہے ۔ اثر کا عالم وہی جانے جو اسالیب کلام عرب سے ذرا بھی واقف ہو ۔ انداز کلام بہترین بیانیہ کلام ہے' بہترین نمونہ ہے' بہترین تبصرہ ہے اور بہترین دلائل ہیں ۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۲۶۹ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۵۲

سُوْرَةُ الْحَاقَّةِ مَكِّيَّةٌ (۶۹) (۷۸)
آيَاتُهَا ۵۲ رُكُوعَاتُهَا ۲
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَاۗقَّةُ ۝ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝

"ہونی شدنی! کیا ہے وہ ہونی شدنی؟ اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے ہونی شدنی؟"

اس سورت کا موضوع اور محور ہولناک مشاہد قیامت ہیں۔ آغاز بھی قیامت کے ایک نام سے ہے اور نام بھی اس سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ نام قیامت کے واقعات کا اظہار اپنے تلفظ اور مفہوم دونوں سے کرتا ہے۔ الحاقہ اس آفت کو کہا جاتا ہے جس کا آنا ٹھہر گیا ہو۔ وہ حق ہو چکی ہو اور اس کا نزول لازمی ہو گیا ہو اور جس نے ہونا ہو اور اٹل ہو۔ یہ سب مفہوم ایسے ہیں کہ جن کے اندر قطعیت 'جزم' شدنی کا مفہوم ہے۔ لہٰذا قیامت کے لیے اس لفظ کا استعمال سورت کے موضوع اور مضمون کے ساتھ نہایت ہی مناسب ہے۔ پھر اس لفظ کے تلفظ کے اندر بھی وہ اشارہ موجود ہے' جو بات اس کے مفہوم میں ہے اور آگے سورت میں جو فضا بیان ہوئی ہے اس کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ نیز تکذیب کرنے والوں کا دنیا و آخرت میں' جو انجام ہونے والا ہے اس کے لیے یہ لفظ الحاقہ حق ہے اور برحق ہے۔

پوری سورت کی فضا نہایت سنجیدہ اور قطعیت کی فضا ہے اور خوفناک حقیقی فضا ہے۔ ایک طرف تو اس میں قدرت الٰہیہ کی ہیبت ناکیاں ہیں۔ اور دوسری جانب اس میں اس انسان کی' اس قدرت الٰہیہ کے سامنے بے بسیاں ہیں اور پھر ان کے ساتھ اس کی خرمستیاں ہیں اور جب وہ اللہ کی شدید گرفت میں آتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت کے مناظر میں بھی' اس دنیا میں اس وقت جب یہ اسلامی نظام کو رد کر کے رسولوں کی تکذیب کرتا ہے' تو اللہ کی شدید پکڑ میں آتا ہے اور اس گرفت اور پکڑ کے پھر کئی رنگ ہیں اور ہر رنگ دوسرے سے خوفناک ہے۔ اس لیے کہ یہ اس دنیا میں شتر بے مہار نہیں چھوڑا گیا تھا۔ نہ اس لیے کہ یہاں یہ کچھ اور بن جائے۔ بلکہ اس کا فریضہ یہ تھا کہ رسولوں کا احترام کرے اور ان کی اطاعت کرے۔

اس پوری سورت کے الفاظ 'اپنے تلفظ' ترنم 'اپنے مفہوم' اپنے اجتماع اور ترکیب کے لحاظ سے یہ فضا بنانے میں

شریک ہیں۔سورت کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک مفرد کلمہ لایا جاتا ہے۔یہ مبتدا ہے اور اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔

اَلْحَاۤقَّةُ (۶۹ : ۱) اس کے بعد اس عظیم حادثہ کے بارے میں ایک بھرپور خوفناک اور ہولناک سوال اور استفہام ہے۔

مَا الْحَاۤقَّةُ (۶۹ : ۲) "کیا ہے 'یہ واقعہ" تمہیں اس کا کیا پتہ ہے کہ یہ کس قدر ہولناک ہو گا۔اس کے بعد خود ہی بتا دیا جاتا ہے کہ تمہیں کچھ پتہ نہیں ہے کہ یہ کس قدر ہیبت ناک واقعہ ہو گا؟ مخاطب کو لاعلم اور جاہل بنا کر اور بتا کر اس کے ہول اور خوف کو دوچند کر دیا گیا اور اس کے بعد مزید خوفناک بات یہ ہے کہ کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔کوئی وضاحت ابھی نہیں کی جاتی تاکہ خوف اور ہراس کی یہ فضا ذرا دیر تک قائم رہے۔انسان سوچے کہ کوئی بہت بڑا واقعہ ہے جس کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ہے اور نہ بتایا جا رہا ہے۔کیا ہی محیرالعقول انداز ہے!

اس سوال کو یہاں چھوڑ کر مکذبین کو لیا جاتا ہے۔جن پر اس دنیا میں قیامت گزر گئی جو پیس کر رکھ دیے گئے۔بہت ہی ناقابل انکار' سنجیدہ واقعات' کوئی شخص ان واقعات کی تکذیب پر اصرار نہیں کر سکتا۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝۴ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝۵
وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝۶ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ
ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ
خَاوِيَةٍ ۝۷ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝۸

ثمود اور عاد نے اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کو جھٹلایا۔تو ثمود ایک سخت حادثہ سے ہلاک کیے گئے۔اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیے گئے۔اللہ تعالیٰ نے مسلسل سات رات اور آٹھ دن ان پر مسلط رکھا' تم دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں گویا وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔اب کیا ان میں سے کوئی باقی بچا نظر آتا ہے؟"

اَلْحَاۤقَّةُ (۶۹ : ۱) کے بعد قیامت کا دوسرا نام آتا ہے اَلْقَارِعَة ۔یہ نام اَلْحَاۤقَّةُ (۶۹ : ۱) سے بھی سخت۔الحاقہ تو وہ واقعہ جو ہونی شدنی ہے اور القرع کے معنی ہیں۔ایک سخت چیز کو دوسری اسی قسم کی سخت چیز پر مارنا اور قیامت کے قیام کو اَلْقَارِعَة اسی لیے کہا گیا ہے' اس کی وجہ سے دلوں پر ہولناک اور خوفناک ضربات پڑیں گی اور یہ پوری کائنات توڑ پھوڑ کا شکار ہو جائے گی۔لفظ اَلْقَارِعَة بھی اپنے تلفظ' اپنی سخت آواز کی وجہ سے ٹکراتا' مارتا اور دلوں کے اندر جزع و فزع پیدا کرتا ہے۔عاد اور ثمود نے اس ہونی شدنی کا انکار کیا' اس کھڑکھڑا کر ٹوٹ پڑنے والی آفت یعنی قیامت کا انکار کیا۔

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ (۶۹ : ۵) "ثمود ایک بڑے حادثہ سے ہلاک کیے گئے"۔جیسا کہ

دوسری سورتوں میں آیا ہے۔ثمود شمالی حجاز کے علاقہ حجر میں رہتے تھے' حجاز اور شام کے درمیان۔یہ ایک سخت دھماکے کی آواز سے ہلاک کیے گئے۔دوسری جگہوں پر اس کے لیے الصیحہ کا لفظ آیا ہے' لیکن یہاں اسے الطاغیہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔کیونکہ الطاغیہ کے معنی ہیں ایک ایسا حادثہ جس پر کنٹرول نہ کیا جا سکتا ہو' اور یہاں اس سورت کی فضا میں ہولناکی اور خوفناکی کے اظہار کے لیے بھی لفظ الطاغیہ موزوں تھا اور جو قافیہ سابقہ آیات کا چلا آرہا تھا اس کے لیے بھی یہ تبدیلی ضروری تھی' اس لیے الصیحہ کی جگہ الطاغیہ کا لفظ آیا۔ثمود کا قصہ صرف اس ایک آیت سے تمام کر دیا گیا۔دفتر لپیٹ لیا گیا' وہ ڈوب گئے اور ہوا نے ان کی خاک بھی اڑا دی اور الطاغیہ نے انہیں یوں روندا کہ ان کا سایہ تک باقی نہ رہا۔

لیکن عاد کی تباہی کو ذرا تفصیل اور طوالت سے لیا جاتا ہے۔یہ اس لیے کہ ان کا عذاب بھی سات راتیں اور آٹھ دنوں تک مسلسل جاری رکھا گیا تھا۔جبکہ ثمود ایک چیخ' ایک کڑک کے ساتھ چشم زدن میں تباہ ہو گئے تھے۔

وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ (۶۹ : ۶) "عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیئے گئے"۔الریح الصرصر کے معنی ہیں' سخت ٹھنڈی ہوا۔لفظ صرصر سے ہوا کی آواز بھی ظاہر ہو رہی ہے۔اور اس ہوا کی زیادہ شدت ایک دوسرے لفظ عَاتِيَة سے ظاہر کی گئی تاکہ عاد کی سرکشی کا علاج اس سرکش ہوا سے کیا جائے۔مناسب عمل کی مناسب سزا۔یہ عاد سخت جبار اور سرکش تھے۔قرآن نے دوسری جگہ تفصیلات دی ہیں۔یہ لوگ یمن اور حضرموت کے درمیان احقاف میں رہتے تھے۔یہ نہایت سخت گیر اور جبار تھے۔یہ ہوا جو صرصر تھی اور "عاتی" تھی "شدید سرد اور سرکش"۔

سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ حُسُومًا (۶۹ : ۷) "اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن ان پر مسلط کیا"۔الحسوم کے معنی ہیں مسلسل کاٹ دینے والی۔یہ شدید چلنے والی' دھاڑتی چنگھاڑتی اور تباہی مچاتی ہوئی' اس طویل عرصے کے لیے مسلسل جاری تھی۔جس کا وقت قرآن تعین کے ساتھ کر رہا ہے۔

فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَىٰ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (۶۹ : ۷) "تم دیکھتے کہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں جیسا کہ کھجور کے بوسیدہ تنے"۔گویا یہ منظر اسکرین پر پیش ہو رہا ہے یا سامنے ہے۔انداز تعبیر ایسا ہے کہ پردۂ احساس پر منظر نمودار ہو جاتا ہے۔صرعیٰ۔وہ گرے پڑے اور بکھرے ہوئے۔گویا وہ ایسے ہیں جیسے اعجاز نخل۔(کھجور کے تنے جڑوں اور تنوں کے ساتھ) خاویہ یعنی بوسیدہ جو اندر سے خالی ہوں اور بوسیدگی کی وجہ سے جگہ جگہ گرے ہوئے ہوں۔یہ ایک ایسا منظر ہے کہ چند الفاظ میں اس کا نقشہ قرآن ہی کھینچ سکتا ہے۔اب نہایت ہی ٹھہراؤ ہے اور وہ منظر کہ جب ہوا چنگھاڑتی ہوئی گزر گئی ہے۔

فَهَلْ تَرَىٰ لَهُم مِّن بَاقِيَةٍ (۶۹ : ۸) "پھر کیا اب ان میں سے کوئی باقی بچا ہوا نظر آتا ہے"۔نہیں کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ویرانی ہی ویرانی ہے۔

یہ تو ہے عاد و ثمود کا قصہ' یہی حال ہے دوسرے مکذبین کا۔اب فقط دو آیات میں کئی واقعات۔

وَ جَآءَ فِرْعَوْنُ وَ مَنْ قَبْلَهٗ وَ الْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ﴿۹﴾ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴿۱۰﴾

"اور اسی خطائے عظیم کا ارتکاب فرعون اور اس سے پہلے کے لوگوں نے اور تلپٹ ہو جانے والی بستیوں نے کیا۔ ان سب نے اپنے رب کے رسول کی بات نہ مانی تو اس نے ان کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑا"۔

فرعون مصر میں تھا۔ یہ حضرت موسیٰ کے دور کا فرعون تھا۔ اس سے قبل اس کی تفصیلات نہیں آئیں۔ المؤتفکت سے وہ بستیاں مراد ہیں جو ہلاک ہوئیں ' تباہ ہوئیں ' تلپٹ ہوئیں۔ یہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں تھیں ' جن کو ہلاک کیا گیا اور یوں کہ انہیں الٹ دیا گیا۔ لفظ مؤتفکت کے مفہوم میں یہ دونوں باتیں آتی ہیں۔ ان سب لوگوں کے کام اور بدعملی کو الخاطئہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی انہوں نے غلط فعل کا ارتکاب کیا۔ یہ الخطیئۃ سے ماخوذ ہے یعنی عظیم غلطی۔ یہاں فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ (۶۹ : ۱۰) "ان سب نے اپنے رب کے رسول کی بات نہ مانی"۔ حالانکہ انہوں نے کئی رسولوں کی بات نہ مانی تھی۔ ایک رسول نہ تھا لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے رسول اور رسالت ایک ہی چیز ہے۔ گویا تمام رسول ایک ہی رسول ہیں۔ قرآن کریم کے یہ انوکھے اشارات میں سے ایک اشارہ ہے۔ اور اس سورت کی فضا کے مطابق ان سب کا ایک ہی ہولناک انجام ذکر کر دیا جاتا ہے۔ جو فیصلہ کن انجام ہے۔

فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً (۶۹ : ۱۰) "تو اس نے ان کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑا"۔ رابیہ کے معنی ہیں : اعلیٰ ' ڈھانپنے والی ' دفن کرنے والی۔ یہ لفظ یہاں اس لیے لایا گیا ہے کہ لفظ طاغیہ کے ساتھ مناسبت پیدا ہو جائے جو ثمود پر آئی ہے۔ اور عاتیہ کے ساتھ یکساں ہو جائے جو عاد پر پڑی۔ اور اس سورت کی فضا اور ماحول سے مناسب لفظ بھی فراہم ہو جائے لیکن تفصیل اور طوالت بھی نہ ہو کیونکہ اس سورت میں انحصار بھی ملحوظ ہے۔

اب اس کے بعد سفینہ جاریہ کا منظر۔ اس میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کے منظر کی طرف اشارہ ہے۔ انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کی۔ حضرت نوح کا یہ امتیاز ہے کہ ان کے ساتھیوں کی نسل ہی سے موجودہ آبادی چلی ہے۔ لیکن انسانوں نے اس عظیم معجزے سے نہ عبرت پکڑی اور نہ خدا کا شکر ادا کیا ' کہ اس واقعہ میں اللہ نے ہمارے اجداد کو بچایا۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴿۱۱﴾ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّ تَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾

"جب پانی کا طوفان حد سے گزر گیا تو ہم نے تم کو کشتی میں سوار کر دیا تھا تاکہ اس واقعہ کو تمہارے لیے ایک سبق آموز یادگار بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اس کی یاد محفوظ رکھیں"۔

یہ پانی کی پہاڑوں کی طرح موجیں اور ان پر چلنے والی کشتی کا منظر' دونوں اس سورت کی خوفناک فضا کی خوفناکیوں میں اضافہ کرنے والے ہیں ـ اور سورت کے مناظر کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہیں اور جاریہ اور واعیہ کے الفاظ قافیہ کو یکساں کرتے ہیں ـ اور پھر یہ نصیحت آموز تبصرہ ـ

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ (۶۹: ۱۲) "تاکہ اس واقعہ کو تمہارے لیے ایک سبق آموز یادگار بنا دیں اور یاد رکھنے والے کان اس کی یاد محفوظ رکھیں" ـ یہ نصیحت جامد اور پتھر دل پر بھی اثر کرتی ہے ـ اور یہ آواز ایسے کانوں سے بھی پار ہو جاتی ہے 'جن پر کوئی آواز اثر نہیں کرتی ـ جو ہر چیز کو سننے سے انکار کرتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں ـ رسولوں کا انکار اور امم سابقہ کی ہلاکتوں سے چشم پوشی سے تمام نشانات 'معجزات اور تذکروں کا انکار ـ اللہ کی نعمتوں اور ان کے آباؤ اجداد پر ہونے والی نعمتوں کا انکار ـ

اب ایک عظیم ہولناک منظر آتا ہے اور اس کے سامنے یہ سب چھوٹے چھوٹے مناظر نہایت ہی چھوٹے نظر آتے ہیں ـ یہ ہے ہولناک منظر الحاقہ کا ـ القارعہ کا جس کی یہ لوگ اس کے باوجود تکذیب کرتے ہیں کہ انہوں نے ان امم سابقہ کا انجام ابھی دیکھ لیا جنہوں نے تکذیب کی تھی ـ

اقوام سابقہ کی ہلاکتوں کا خوف محدود ہے ـ باوجود اس کے کہ وہ بھی بہت بڑا خوف ہے 'کیونکہ قیامت سے قبل ہونے والی تباہی کے مقابلے میں یہ سب تباہیاں بہرحال محدود اور معمولی ہیں ـ اس مختصر تمہید کے بعد اب پردہ اٹھایا جاتا ہے ـ اس عظیم 'ہمہ گیر تباہی اور ہولناکی کے مناظر سے ـ یہ بڑا منظر سابقہ چھوٹے مناظر کا تکملہ ہے ـ

فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾ وَ انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِىَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾ وَّ الْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾

"پھر جب ایک دفعہ صور پھونک مار دی جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا 'اس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا ـ اس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی 'فرشتے ان کے اطراف و جوانب میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے" ـ

ہمارا ایمان ہے کہ ایک دن صور پھونکا جائے گا اور اس کے بعد پھر علی الترتیب یہ واقعات ہوں گے ـ ان واقعات کی تفصیلات اور ان کی کیفیات کو ہم یہاں قلم بند نہیں کر سکتے ـ کیونکہ یہ واقعات عالم غیب میں ہونے والے ہیں ـ اور ہمارے پاس چونکہ یہ آیات ہی ہیں جو مجمل ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس میں تفصیلات دی گئی ہوں ـ اور ان نصوص میں اگر تفصیلات دے بھی دی جاتیں تو اصل مقصد جو یہاں دینا مقصود تھا 'اس میں کوئی اضافہ نہ ہوتا تھا ـ لہٰذا ان تفصیلات کے پیچھے پڑنا ایک عبث بات ہے ـ محض ظنوں اور قیاسات سے شریعت نے منع کیا ہے ـ

جب صور پہلی بار پھونکا جائے گا اور اس کے بعد یہ ہولناک حرکات و تغیرات ہوں گے ۔

وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (۶۹ : ۱۴) "اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھاکر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا" ۔ زمین اور پہاڑوں کو یکبارگی اٹھاکر پٹخ دینا جو سب اونچ نیچ کو برابر کر دے اور یہ نہایت ہی خوفناک منظر ہو گا ۔ یہ زمین جس کے اندر انسان پرامن طور پر چلتا پھرتا ہے اور اطمینان سے زندگی بسر کرتا ہے ۔ اور یہ زمین انسان کے نیچے نہایت ہی سکون سے رکی ہوئی ہے ۔ اور یہ اونچے گہرے اور مضبوط پہاڑ جن کے ثبات و قرار سے انسان کو خوف ہوتا ہے ۔ اپنی اس اونچائی اور عظمت کے باوجود اٹھاکر پٹخ دیئے جائیں گے ۔ جس طرح بال کو اٹھاکر مار دیا جاتا ہے ۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جو انسان کو قدرت خداوندی کے مقابلے میں اس کی اور اس کرۂ ارض کی کمزوری 'چھوٹائی اور نہایت ہی بے وزنی کا اظہار کرتا ہے ۔

جب صور میں ایک بار پھونک ماردی گئی اور یہ سب ہولناک واقعات ہوگئے زمین اور پہاڑوں کو اٹھاکر ریزہ ریزہ کر دیا گیا ۔ تو یہ سورت جس ہولناک امر کا اظہار کر رہی ہے یہ امر اس دن وقوع پذیر ہو گا ۔

فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (۶۹ : ۱۵) اور واقع بھی قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے ۔ جس طرح الحاقہ اور القارعہ ایک نام ہے ۔ واقعہ اس لیے کہ اس نے واقع ہونا ہے ۔ اس کی اصل حقیقت ایک واقعہ ہی کی ہے ۔ یہ اس قسم کا نام ہے جس میں ایک خاص اشارہ ہے ۔ ان لوگوں کے لیے جو اس میں شک کرتے رہیں ۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ تو واقعہ ہے ۔

اور معاملہ یہیں تک محدود نہیں ہے کہ زمین اور پہاڑوں کو ایک گیند کی طرح اٹھاکر زمین پر مار دیا جائے گا اور یہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے بلکہ آسمان میں بھی تغیرات رونما ہوں گے ۔ آسمان صحیح سلامت نہ رہے گا ۔

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (۶۹ : ۱۶) "اس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی" ۔ اور ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اس آسمان سے کون سا آسمان مراد ہے ۔ جس کے شق کا یہاں ذکر ہے ۔ لیکن یہ آیات اور دوسری آیات اشارہ اس طرف کر رہی ہیں کہ قیامت کے دن ہولناک فلکی تغیرات اور تضادات ہوں گے ۔ مقصد یہ ہے کہ کرات فلکی کی چولیں کھل جائیں گی اور جس چیز نے اس نظام کو ایک منظم طریقے سے تھا رکھا ہے 'اس کا نظم کھل جائے گا ۔ اور جب یہ نظام کھل گیا تو اس کا انتشار دیدنی ہو گا ۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج کل علمائے فلک نے آخر کار موجود نظام کے خاتمے کی جو صورت اپنے مشاہدات سے تجویز کی ہے وہ بعینہ وہی ہے 'جو قرآن تجویز کرتا ہے ۔ حالانکہ انہوں نے یہ اندازے محض سائنسی مشاہدات سے لگائے ہیں ۔ انہوں نے بہرحال اس کائنات کے بارے میں بہت قلیل مشاہدہ کیا ہے اور اس قلیل مشاہدے پر یہ مفروضے قائم کیے ہیں ۔

لیکن ہم مومنین وہ مفروضے ان قرآنی آیات کے اندر نہایت مفصل انداز میں مشاہدہ کرتے ہیں ۔ یہ نہایت مجمل آیات ہیں اور یہ متعین واقعات نہیں بلکہ اصولی اور کلی واقعات بیان کرتی ہیں ۔ ہم بس صرف ان اصولی واقعات پر اکتفا کرتے ہیں 'جو قرآن نے بیان کیے ۔ یہ ہمارے لیے سچی خبریں ہیں ۔ کیونکہ یہ آیات اس ذات نے بیان کی ہیں جس نے

قرآن بھی نازل کیا ہے اور کائنات کو بھی بنایا ہے ۔ اور جو اپنی مخلوقات کو ہمارے محدود مشاہدات سے بڑھ کر بہت ہی اچھی طرح جانتا ہے ۔ کیونکہ اللہ کی کائنات میں ' یہ زمین اور یہ پہاڑ اور زمین اور سورج کے ساتھ تمام کہکشاں اور ستارے ایسے ہی ہیں جیسے زمین کے اوپر غبار کے چھوٹے چھوٹے ذرات اڑتے ہیں ۔ لہٰذا ہم میں سے ایک انسان جس طرح دو ذرات کو اٹھا کر پھینک سکتا ہے ' اللہ کے نزدیک زمین کو اٹھا کر پھینکنا ایسا ہی ہے تو قیامت میں جب آسمانوں کی بندش کھلے گی تو زمین و آسمان ذرات کی طرح اڑتے پھریں گے اور یہ باتیں بھی قرآن کی زندہ آیات سے معلوم ہوتی ہیں ۔

اب رب ذوالجلال کا جلال منظر پہ چھا جاتا ہے ' اور صور پھونکے جانے اور زمین اور پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے اور بھونچال و انتشار کے بعد اس پوری کائنات میں ایک ٹھہراؤ آ جاتا ہے ۔ اور رب ذوالجلال اور قہار کی بزرگی اور عظمت چھا جاتی ہے ۔

وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ (۶۹:۱۷)

"فرشتے اس کے اطراف و جوانب میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے"۔ فرشتے اس کائنات و سماوات کے اطراف و جوانب میں ہوں گے اور اس کائنات کے اوپر عرش الٰہی ہو گا اور اس کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے ۔ یہ آٹھ فرشتے ہوں گے یا آٹھ صفیں ہوں گی یا ان کے آٹھ طبقات ہوں گے یا یہ آٹھ اللہ کے علم میں ہوں گے کہ وہ کیا ہوں گے ؟ یہ آٹھ کون ہیں اور کیا ہیں ؟ اس کی تفصیلات کا بھی ہمیں علم نہیں ہے ۔ نہ ہمیں عرش کی کیفیت کا علم ہے نہ اٹھانے کی کیفیت کا علم ہے ۔ ہم ان تمام امور کو ایک طرف چھوڑ دیتے ہیں ' اس لیے کہ ان کا تعلق غیبی معاملات سے ہے جن کا تفصیلی علم ہمیں نہیں دیا گیا اور ہمیں اللہ نے ان چیزوں کے تفصیلی علم کے حصول کا نہ مکلف بنایا ہے ' نہ حصول کا حکم دیا ہے ۔ ہم ان تفصیلات کو بھی اللہ کے غیبی علم پر چھوڑ دیتے ہیں ۔ بس اب اللہ ہی اللہ ہو گا ' سب کچھ فنا ہو گا اور یہی شعور ہے جو قرآن اور یہ سورت ہمیں دینا چاہتی ہے کہ ہم اللہ سے ڈریں ' قیامت کی جوابدہی سے ڈریں اور اللہ کی قدرت اور جلالت سے ڈریں ۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾

"وہ دن ہو گا جب تم لوگ پیش کیے جاؤ گے ' تمہارا کوئی راز بھی چھپا نہ رہ جائے گا"۔ سب کے سب کھلے اور ننگے ہوں گے ۔ جسم بھی ' ضمیر بھی ' عمل بھی اور انجام بھی ۔ وہ تمام راز جو پردوں کے نیچے تھے ' کھل کر سامنے آ جائیں گے ۔ انسانی نفس ننگا ہو گا ' انسانی جسم ننگا ہو گا ' انسانی عیوب سامنے آ جائیں گے ۔ گواہ سامنے آ جائیں گے ۔ انسان کی مکاریاں اور فن کاریاں کافور ہو جائیں گی ۔ سب حیلے تدبیریں بے اثر ہوں گی ۔ اور وہ باتیں بھی کھل جائیں گی جن کو وہ اپنے آپ سے چھپاتا تھا ۔ یہ کس قدر شرمندگی ہوگی کہ وہ راز طشت ازبام ہوں گے ۔ لوگوں کی نظروں میں انسان کس قدر شرمندہ ہوں گے ۔ رہے اللہ تو اس کے سامنے تو پہلے بھی سب کچھ کھلا تھا ۔ اب بھی کھلا ہے لیکن انسان کے ذہن میں یہ بات شعوری طور پر بیٹھی نہیں ہے ۔ اس لیے کہ اس کے شعور میں زمین کے اندر ایک انسان اور انسان کے درمیان پردہ داری کا شعور ہے جبکہ قیامت کے دن فرق صرف یہ ہو گا کہ اس بیچارے انسان کے شعور میں پردے کا جو شعور تھا وہ اٹھ جائے

گا۔ اور وہ سمجھے گا کہ سب پردے گر گئے ہیں۔ اس کائنات میں سب چیز کھلی ہے۔ اب جبکہ زمین اٹھا کر پٹخ دی گئی ہے تو تمام اوٹ ختم ہو گئے ہیں۔ یہ ہموار ہے' میدان ہے۔ آسمان کی بندشیں بھی کھل گئی ہیں اور آسمانوں کے پیچھے بھی کوئی شے چھپی نہیں ہے۔ اجسام بھی ننگے ہیں' انسانی نفسیات بھی کھلی ہیں' نہ راز ہے اور نہ نیاز ہے۔

مگر یہ ایک نہایت پریشان کن کام ہے اور یہ اس پوری زمین اور تمام پہاڑوں سے بھی بڑا کام ہے۔ اور اس سے بھی شدید ہے کہ آسمان پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوکر نیچے گر جائیں کہ انسان بالکل ننگا کھڑا ہو' اس کی نفسیاتی کیفیات لوگوں پر کھل جائیں' اس کا شعور بھی عیاں ہو جائے' اس کی پوری ہسٹری سامنے آجائے' اس کے تمام کرتوت فلم میں بند ہو جائیں اور اس کی تمام چھپی ہوئی باتیں کھل جائیں اور یہ سب امور پوری انسانیت کے بھی سامنے آجائیں۔ فرشتوں کے سامنے' جنوں کے سامنے' انسانوں کے سامنے اور وہ اللہ کے عرش وجلال بادشاہی کے نیچے ہوں گے اور سخت خوفزدہ ہوں گے۔

انسانی مزاج اور نفسیات نہایت پیچیدہ ہوتی ہیں۔ انسانی نفسیات کے اندر بے شمار نشیب و فراز ہوتے ہیں جس کے اندر اس کا نفس' جس کے اندر اس کے مشاعر' اور جس کے اندر اس کے جذبات اور میلانات ہوتے ہیں' اچھے یا برے۔ اس کی صلاحیتیں اور اس کے پوشیدہ راز ہوتے ہیں۔ (توقعہ ہاامیہ ص ۸۱) سیپی کے سمندری جانور کی طرح کہ جب اسے ایک سوئی یا کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ بڑی جلدی سے سکڑ کر اپنی سیپی کے خول مین چھپ جاتا ہے۔ اور مکمل طور پر اندر داخل ہو جاتا ہے۔ اور اپنے آپ کو پوری طرح بند کر دیتا ہے۔ انسان بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ جب اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی آنکھ اسے دیکھ رہی ہے اور اس کی تمام حرکات نوٹ رہی ہیں اور وہ جن چیزوں کو چھپا رہا ہے وہ تو ظاہر ہو گئی ہیں۔ تو انسان نہایت شدید تکلیف محسوس کرتا ہے کہ اس کے نہایت ہی خفیہ معاملات بھی کھل گئے ہیں۔

اب دیکھئے کہ اس قسم کا انسان اس دن ننگا ہو گا اور ہر طرح سے ننگا ہو گا' جسم اور قلب کے لحاظ سے ننگا ہو گا۔ شعور' نیت اور ضمیر کے لحاظ سے ننگا ہو گا۔ ہر پردے سے محروم ہو گا۔ اور وہ اللہ جبار و قہار کے تحت الحکم ہو گا اور تمام روئے زمین کے انسانوں اولین و آخرین کے سامنے ہو گا۔ یہ بہرحال ایک کڑوی صورت حال ہو گی ہر چیز سے زیادہ کڑوی اور تلخ۔ اس کے بعد نجات پانے والوں اور جہنم میں بھیجے جانے والوں کا منظر پیش کیا جاتا ہے۔ یوں جیسا کہ یہ منظر آنکھوں کے سامنے ہے۔

فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَٰبَهُۥ بِيَمِينِهِۦ فَيَقُولُ هَآؤُمُ ٱقْرَءُوا۟ كِتَٰبِيَهْ ﴿١٩﴾ إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي
مُلَٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿٢٠﴾ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٢١﴾ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿٢٢﴾ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ﴿٢٣﴾
كُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ هَنِيٓـًٔۢا بِمَآ أَسْلَفْتُمْ فِي ٱلْأَيَّامِ ٱلْخَالِيَةِ ﴿٢٤﴾

"اس وقت جس کا نامہ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا "لو دیکھو' پڑھو میرا نامہ اعمال' میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے"۔ پس وہ دل پسند عیش میں ہو گا' عالی مقام جنت میں' جس کے پھلوں کے گچھے جھکے پڑ رہے ہوں گے۔ (ایسے لوگوں سے کہا جائے گا) مزے سے کھاؤ اور پیو اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے

گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں"۔

یہ کہ اعمال نامہ دائیں ہاتھ اور بائیں ہاتھ میں دیئے جانے اور آگے سے اور پیچھے سے دیئے جانے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ عملاً ایسا ہو گا اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ عربی زبان کے یہ محاورے میں 'اچھے سلوک کی تعبیر دائیں ہاتھ سے اور برے سلوک کی تعبیر بائیں سے کی گئی ہے یا برے سلوک کی صورت میں اعمال نامہ پیچھے سے دیا جانا تعبیر کیا گیا ہے جو بھی مفہوم ہو۔ اس لیے ہم اس بحث میں نہیں پڑتے 'اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ ناکام لوگوں کے ساتھ وہاں اچھا سلوک نہ ہو گا۔

جو منظر یہاں پیش کیا گیا ہے' وہ اس شخص کا ہے جو کامیاب ہو گیا وہ دن نہایت ہی خوفناک ہو گا' اس لیے اس منظر میں یہ شخص نہایت ہی فرحاں و شاداں ادھر ادھر دوڑ رہا ہے۔ دیکھو صفیں چیرتا ہوا دوستوں کو تلاش کر رہا ہے۔ اس کے جسم کے روئیں روئیں سے خوشی ٹپک رہی ہے اور وہ خوشی کے مارے چلا اٹھتا ہے۔

هَآءُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ (٦٩: ١٩) "دیکھو' یہ ہے پڑھو میرا اعمال نامہ"۔ اس کے بعد وہ مزید خوشی کا اظہار یوں کرتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ مجھے یقین نہ تھا کہ میں نجات پا جاؤں گا بلکہ مجھے ڈر یہ تھا کہ مجھ سے حساب لیا جائے گا۔ اور حدیث میں ہے۔

من نوقش الحساب عذب "جس کا حساب کتاب مناقشہ کے ساتھ کیا گیا' بس وہ عذاب دیا گیا"۔ حدیث میں آتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے ساتھ حساب و کتاب میں جھگڑا کیا گیا بس وہ عذاب میں مبتلا ہوا۔ میں نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا وَّیَنْقَلِبُ اِلٰۤی اَهْلِهٖ

مَسْرُوْرًا "تو حضور ﷺ نے جواب دیا۔ اس میں تو یہ ہے کہ ہر کسی کے سامنے اس کا حساب پیش کیا جائے گا۔ قیامت کے دن عملاً آڑ نہ ہو گا۔ اگر کسی کے ساتھ ہوا تو مارا گیا"۔ (بخاری' مسلم' ابو داؤد)

ابن ابو حاتم نے روایت کی' بسر ابن بکر واسطی سے' انہوں نے زید ابن ہارون سے' انہوں نے عاصم ' احول سے' انہوں نے ابو عثمان سے وہ کہتے ہیں: مومن کو اس کے دائیں ہاتھ میں اس کا اعمال نامہ دیا جائے گا۔ نہایت خفیہ انداز میں' وہ اپنی کوتاہیاں اس میں پڑھے گا۔ جوں جوں وہ اپنے گناہ پڑھتا جائے گا۔ اس کا رنگ بدلتا جائے گا۔ پھر یہ اپنی نیکیاں پڑھے گا تو اس کی حالت بحال ہو گی۔ پھر وہ اچانک دیکھے گا کہ اس کی تمام بداعمالیاں نیکیوں میں بدل جائیں گی۔ اس وقت پھر یہ لوگوں سے خوش ہو کر کہے گا۔

هَآءُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ (٦٩: ١٩) "یہ ہے پڑھو' میرا اعمال نامہ"۔

حضرت عبداللہ ابن حنظلہ سے روایت ہے' جن کا لقب غسیل ملائکہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اللہ اپنے بندے کو قیامت میں کھڑا کرے گا تو اس کی برائیاں اس کے اعمال نامے کی پشت یعنی پہلے ہی صفحے پر درج ہوں گی۔ اور اسے کہے گا تم نے یہ کیا ہے تو وہ کہے گا ہاں اے رب' تو اللہ تعالیٰ اسے کہے گا میں نے تجھے دنیا میں شرمندہ نہیں کیا اور میں نے تمہیں بخش دیا

ہے۔اس وقت یہ بندہ یہ کہے گا۔

هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ (٦٩ : ١٩) ”یہ ہے پڑھو' میرا اعمال نامہ“۔

اور صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے جب ان سے نجویٰ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا ”میں نے رسول اللہ سے سنا:“اللہ قیامت کے دن اپنے بندے کے قریب ہو گا۔اس سے اس کے تمام گناہوں کا اقرار لیا جائے گا۔جب وہ بندہ یہ یقین کر لے گا کہ بس وہ مارا گیا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔میں نے یہ باتیں دنیا میں چھپا رکھی تھیں اور اب یہاں میں انہیں معاف کرتا ہوں۔اس کے بعد اس کی اچھائیوں کی کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں دی جائے گی۔رہے کافر اور منافق' تو گواہ کہیں گے یہ وہ لوگ ہیں' جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا۔خبردار اللہ کی لعنت ہو کافروں پر“۔

اس کے بعد علی الاعلان بتا دیا جائے گا کہ ان لوگوں کے لیے اللہ نے یہ یہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں۔یہاں اس کے سامنے ایسی حسی اور مادی نعمتیں گنوائی جا رہی ہیں۔جن کو عرب اچھی طرح مادی ترقی کا کمال سمجھتے تھے۔اس وقت کے لوگ چونکہ دور جاہلیت سے ابھی ابھی ایک بدوی معاشرہ سے نکل کر آئے تھے' اس لیے ان کے مزاج کے مطابق بعض پسندیدہ باتیں یہاں گنوائی جاتی ہیں۔کیونکہ نہ تو وہ زیادہ ترقی یافتہ تھے اور نہ جنت کی نعمتوں کا کوئی تصور کر سکتا ہے۔

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (٢١) فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ (٢٢) قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ (٢٣) كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْٓــًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ (٢٤) (٦٩ : ٢١ تا ٢٤) پس وہ دل پسند عیش میں ہو گا' عالی مقام جنت میں 'جس کے پھلوں کے گچھے جھکے پڑ رہے ہوں گے۔(ایسے لوگوں سے کہا جائے گا) مزے سے کھاؤ اور پیو اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں“۔یہ نعمتیں اور پھر ان کے ساتھ ساتھ یہ اعزاز و اکرام اور یہ تواضع اور پھر باری تعالیٰ کی طرف سے یہ مکالمہ ”کھاؤ اور پیو' اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں“۔یہ وہ سادہ رنگ ہے جہاں تک عہد اول کے مسلمانوں کا تعلق باللہ پہنچ گیا تھا' حالانکہ اللہ کے قرب میں اس سے بھی زیادہ انعامات ہیں۔نیز تعلق باللہ اور جنتوں کے ان انعامات میں بعض لوگوں کے لیے قیامت تک کشش رہے گی۔لوگوں کے بھی رنگ اور اقسام ہیں اور نعمتوں کے بھی رنگ و اقسام ہیں۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ﴿٢٥﴾
وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ﴿٢٦﴾ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ﴿٢٧﴾ مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ
مَالِيَهْ ﴿٢٨﴾ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ﴿٢٩﴾

"اور جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا "کاش میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے ۔ کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی ۔ آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا ۔ میرا سارا اقتدار ختم ہو گیا" ۔

اب یہ شخص جان چکا ہے کہ اس کے خلاف فیصلہ ہو چکا ہے ۔ اور اس کا انجام کار آخر کار جہنم رسیدگی ہے ۔ یہ اس میدان میں نہایت ہی حسرتناک انجام لیے کھڑا ہے ۔ نہایت درجے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے ۔ اور درج بالا تبصرہ وہ کرتا ہے ۔

نہایت طویل منظر ہے اس شخص کا ۔ اس کی حسرت کو ذرا طوالت سے بیان کیا گیا ہے ۔ اس قدر کہ ایک قاری یہی سمجھتا ہے کہ یہ بیان ختم ہی نہ ہو گا ۔ لہجہ بھی مایوس کن ہے لیکن یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز کہ وہ بعض مناظر و مواقف کو طوالت دیتا ہے اور بعض کو چند جملوں میں بیان کر دیتا ہے ۔ اور اس طرح نفس انسانی پر نہایت ہی مفید اثرات چھوڑ دیتا ہے ۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ حسرت اور پشیمانی کی سوچوں کو ذرا طوالت دی جائے تاکہ لوگ ابھی سے سوچ لیں کہ وہاں کس قدر حسرت اور شرمندگی کا سامنا ہو گا ۔ عذاب تو بہت بڑی چیز ہے ۔ چنانچہ اس منظر کو ذرا طویل کر دیا گیا کیونکہ سیاق کلام میں اصل مقصود یہی تھا ۔ اس میں عبارت بھی بڑی نغمہ بارے ۔ یہ بدبخت شخص تمنائیں کرتا ہے کہ اے کاش یہ وقت نہ آتا ۔ اسے کتاب اعمال ہی نہ دی جاتی' اسے علم ہی نہ ہوتا کہ کیا ہوا ۔ اور یہ کہ یہ قیامت کا وقت یا اس لیے جو موت آئی تھی' وہ دائمی ہو جاتی ۔ میرے وجود کے عناصر ترکیبی ہی ختم کر دیئے جاتے ۔ مزید افسوس اس پر کہ دنیا میں جن چیزوں پر وہ فخر کرتا تھا وہ اس کے لیے بالکل نافع نہیں ہے ۔

مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ (۶۹ : ۲۸) "آج یہاں میرا مال میرے کچھ کام نہیں آیا" ۔ بلکہ میرا سب کا سب اقتدار جاتا رہا ہے' نہ مال مفید ہے اور نہ میرا اقتدار مفید رہا ہے ۔ بات کی ٹون نہایت ہی حسرت اور یاس سے بھری ہوئی ہے ۔ اور قرآن کریم نے اس کے لیے جو قافیے چنے ہیں وہ اسے نہایت طویل کر دیتے ہیں (جس طرح کوئی میت پر روتا ہے) یوں کہ آخر میں ہا ۔ اور اس سے قبل یا ۔ اور اس سے قبل الف ۔ کتابیہ' حسابیہ' قاضیہ' مالیہ اور سلطانیہ ۔ الفاظ بھی ایک قسم کا مد ہے اور حسرت آمیز ہے ۔ اور نہایت ہی فصیح و بلیغ انداز میں ۔

یہ نہایت ہی حسرتناک ٹون اس وقت ختم ہوتی ہے' جب عدالت خداوندی سے ایک زوردار ڈگری کے ساتھ تعمیل کے احکام بھی صادر ہوتے ہیں ۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾

"(حکم ہو گا) پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو' پھر اسے جہنم میں جھونک دو' پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو" ۔

کس قدر ہولناک احکام ہیں' کس قدر قاتل دہشت ہے اور جلال ربی کس قدر نمایاں ہے !!

خُذُوْهُ (۶۹ : ۳۰) "پکڑو اسے" یہ حکم اللہ العلی العظیم کی طرف سے صادر ہو رہا ہے۔اس کمزور و نحیف اور عاجز و مسکین پر پوری کائنات ٹوٹ پڑتی ہے۔ ہر طرف سے مامورین لپکتے ہیں۔ ابن ابو حاتمؒ منہال ابن عمر سے روایت کرتے ہیں "جب اللہ یہ حکم دے گا کہ "پکڑو اسے" تو ستر ہزار فرشتے لپکیں گے۔ ہر ایک اس کیڑے پر لپکے گا، جبکہ یہ کافر نہایت ہی حقیر اور کرب زدہ ہے۔

فَغُلُّوْهُ (۶۹ : ۳۰) "گردن میں طوق ڈالو اس کے" جو بھی ان ستر ہزار میں سے پہنچے گا طوق ڈال دے گا اس کی گردن میں؟

ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ (۶۹ : ۳۱) "پھر اسے جہنم میں جھونک دو"۔ قریب ہے کہ جہنم میں اس کے بھن جلنے کی آواز ہم سن لیں۔

ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (۶۹ : ۳۲) "پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو"۔ آگ کی زنجیروں میں سے ایک گز زنجیر بھی اس کیڑے کے لیے کافی ہے، لیکن مزید لمبی زنجیر اسے ذلیل کرنے کے لیے اور لفظ سبعین کے استعمال کے لیے ہے۔یوں انسانوں کو ڈرانا مقصود ہے۔اب یہ حکم اور ڈگری صادر ہوگئی ہے۔اس کا اجراء ہوگیا ہے اور مجرم جہنم رسید ہوگیا ہے، تو اب اس حکم پر دلائل دیئے جاتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔اس قدر سخت سزا کا یہ مستوجب کیوں ہوا؟

إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ﴿٣٣﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴿٣٤﴾

"یہ نہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا"۔

اس کا دل ایمان باللہ سے خالی تھا۔یہ محض انسانی لحاظ سے بھی کوئی اچھا انسان نہ تھا۔لوگوں پر رحم نہ کرتا تھا۔لہذا اس آگ کے سوا اس کے لیے کوئی اور مناسب جگہ ہی نہ تھی۔

جس آدمی کا دل ایمان سے خالی ہو، وہ مرجاتا ہے۔اس کا دل کھنڈر بن جاتا ہے، برباد ہو جاتا ہے۔اس کے اندر کوئی روشنی نہیں ہوتی، وہ مسخ ہوگیا ہے۔وہ حیوانوں سے کم تر مخلوق جمادات سے بھی کم تر ہوگیا ہے۔کیونکہ ہر چیز مومن ہے۔ ہر چیز تسبیح کرتی ہے۔ ہر چیز اپنے وجود کے اصل مصدر سے پیوستہ ہوتی ہے۔رہا یہ عقلمند انسان تو اپنے اصل اور سرچشمے سے یہ اپنے آپ کو کاٹ دیتا ہے۔

پھر اس کا دل انسانوں پر ترس نہیں کھاتا۔اللہ کے بندوں میں سے مساکین تو اللہ کی رحمت کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں۔ان کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہئے۔ان کے قیام اور طعام اور لباس کا خیال رکھنا ہم انسانوں ہی کا فرض ہے۔اس طرح معلوم ہوا کہ انسانوں کی اجتماعی معاشی ضروریات سوسائٹی کے ذمہ ہیں اور ان کا تعلق ایمانیات کے ساتھ ہے۔

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ ﴿٣٥﴾ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ﴿٣٦﴾

ا

لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ﴿۳۷﴾ ع

۵

"لہذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یار غم خوار ہے اور نہ زخموں کے دھوون کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا' جسے خطاکاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا"۔

اس بدبخت شخص کے انجام بد کا یہ تکمیلی بیان ہے۔ یہ اللہ عظیم پر ایمان نہ لاتا تھا۔ مساکین کی ضروریات بھی فراہم نہ کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب قیامت میں اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ (۶۹ : ۳۵) "لہذا آج یہاں اس کا کوئی غم خوار نہیں ہے"۔ اور اس کے وہاں کھانے کا انتظام مساکین سے بھی بدتر ہے۔

وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ (۶۹ : ۳۶) "زخموں کے دھوون کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا نہیں ہے"۔ غسلین سے مراد اہل جہنم کی پیپ اور زخموں کے پانی اور اس پانی کو کہتے ہیں جو زخموں کے دھونے سے نکلتا ہے۔ ایسے گندے لوگوں کے لیے 'اب ایسی ہی گندی خوراک موزوں ہے۔ کیونکہ اس شخص کا دل مساکین پر رحم سے خالی تھا۔

لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ (۶۹ : ۳۷) "جسے خطاکاروں کے سوا اور کوئی نہیں کھاتا"۔ گناہگار' جن کی فطرت میں یہ گناہ رچے بسے ہوں۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی وجہ سے یہ شخص پکڑے جانے' طوق پہنائے جانے' آگ میں جلائے جانے کا مستحق ہوا اور اسے اس قدر طویل بیڑیاں پہنائی گئیں۔ جہنم اور اس کے اندر بیڑیاں' یہ جہنم کے عذاب کے درجات میں سے شدید درجہ ہے۔ یہ تو اس شخص کی حالت ہے جو مساکین کے طعام پر لوگوں کو ابھارتا نہیں' لیکن اس "شخص" کا عذاب تم خود سوچو جو بچوں' عورتوں اور بوڑھوں کو زندہ رکھتا ہے اور ان کے سرپرستوں کو ناحق سرکشوں اور جباروں کی طرح پکڑتا ہے اور جو ان کے ہاتھ سے لقمے اور کپڑے بھی چھین لیتا ہے اور وہ سخت سردیوں کے اندر ننگے آسمان کے نیچے ہوتے ہیں۔ ایسے "ڈکٹیٹر" کہاں جائیں گے جبکہ وہ زمین میں جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ ذرا سوچ لو' کہ ان کے لیے اللہ نے کیا تیار کیا ہوگا جبکہ صرف مسکینوں کے کھانے پر لوگوں کو نہ ابھارنے پر یہ سخت سزا رکھی گئی ہے۔

یہ سخت' اور پرتاثیر منظر اس شدید سورت میں اس لیے لایا گیا کہ یہ ابتدائی ایام کی سورت ہے اور اس وقت عرب سوسائٹی نہایت اجڈ اور سخت تھی۔ اور ان کو اسی طرح کے سخت مناظر دکھانے کی ضرورت تھی تاکہ اس سے ذرا خائف ہو جائیں اور اپنی روش میں قدرے نرمی اختیار کریں اور اس شرمندگی سے اپنے آپ کو بچانے کی سعی کریں اور جب بھی انسانیت اس قسم کے مختلف النوع معاشرتی سطح پر ہوتی ہے' جس میں ایک طرف اس قسم کے سخت اور اجڈ لوگ ہوتے ہیں دوسری طرف ایسے لوگوں کے مقابلے میں نرم خو اور اثر لینے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ یعنی جن میں لوگوں کی نفسیاتی حالت مختلف درجات پر ہوتی ہے اس لئے قرآن مجید کے انداز خطاب میں یہ سب لوگ پیش نظر ہوتے ہیں اور دعوت کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے مختلف سطح کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔ آج بھی بعض علاقوں میں سنگدل لوگ رہتے ہیں۔ ایسے مزاج کے لوگ بھی ہیں جو نہایت ہی سخت اور ان پر ایسے ہی الفاظ اثرانداز ہو سکتی ہے جو شعلہ بار ہوں' جس

طرح اس سورت میں ہیں ۔ وہ ایسے ہی مناظر سے ڈر سکتے ہیں جو اس سورت میں بیان ہوئے ہیں ۔

اس قسم کے سخت الفاظ اور سخت مناظر کے زیر سایہ' جو اس سورت میں مسلسل چلے آرہے ہیں جن میں وہ مناظر بھی ہیں کہ لوگوں کو اس دنیا میں عذاب الہی میں گرفتار بتایا گیا ہے اور وہ مناظر بھی ہیں جن میں یہ پوری کائنات اڑتی دکھائی گئی ہے ۔ پھر قیامت کے مناظر جہاں تمام انسانوں کو ننگا دکھایا گیا ہے اور وہ مناظر جن میں لوگ خوشی کے مارے اڑتے بھی دکھائے گئے ہیں ۔ ان تمام مناظر کے بعد اب ایک نہایت ہی سنجیدہ' فیصلہ کن اور دو ٹوک بات آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بات کر رہے ہیں' اس کی حقیقت کیا ہے ۔ جبکہ یہ لوگ اس میں شک کرتے ہیں ۔ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں ۔

فَلَآ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ۝ وَ مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ ۝ اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ۝ وَّ مَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ۝ وَ لَا بِقَوۡلِ کَاهِنٍ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ۝ تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝

پس 'میں قسم نہیں کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے' یہ ایک رسول کریم کا قول ہے 'کسی شاعر کا قول نہیں ہے' تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو ۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے' تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو ۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے"۔

یہ معاملہ بہت ہی واضح ہے اور اس پر کسی قسم کی ضرورت نہیں ہے اور عقلی لحاظ سے ثابت ہے اور ایک واقعہ ہے اور اس پر کوئی قسم اٹھانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے ۔ یہ حق ہے' حق کی طرف سے نازل شدہ ہے' نہ شعروشاعری ہے نہ کسی کاہن کی کہانت اور بڑ ہے نہ کسی افتراء پرداز کی افتراء ہے ۔ لہٰذا قسم کی ضرورت نہیں ۔

فَلَآ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ (۶۹ : ۳۸) وَمَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ (۶۹ : ۳۹) "پس 'میں قسم نہیں کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو' اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے"۔

یہ قسم بہت عظیم ہے ۔ اس کائنات 'عظیم کائنات کی قسم ہے جو تم دیکھتے ہو اور اس عظیم کائنات کی قسم ہے جو نظر نہیں آتی ۔ یہ کائنات انسان کے مشاہدے سے بہت زیادہ عظیم ہے بلکہ یہ اس سے بھی بہت بڑی ہے جس قدر انسان ادراک کر سکتا ہے ۔ انسان اس کائنات کے نہایت ہی تھوڑے حصے کا ادراک کر سکتا ہے اور بہت ہی تھوڑے حصے کا مشاہدہ کر سکتا ہے ۔ اللہ نے انسان کو اسی قدر طاقت دی ہے جس قدر انسان کو ضرورت ہے ۔ اس زمین میں رہنے' اس کو ترقی دینے اور یہاں اللہ کا نائب اور خلیفہ ہونے کے لیے جس قدر ضرورت ہے ورنہ اگر پوری زمین کا مقابلہ پوری کائنات سے کیا جائے تو یہ ایک چھوٹا سا ذرہ ہے جو اس قابل بھی نہیں ہے کہ اس کائنات کے دوسرے سرے سے نظر آئے ۔ اس عظیم کائنات الہیہ میں سے انسانوں کو نہایت ہی محدود حصے کی بصیرت و بصارت کی قدرت دی گئی ہے ۔ انسان اس کے اسرار و رموز اور حالات اور قوانین قدرت کا بہت ہی تھوڑا سا حصہ ابھی تک معلوم کر سکا ہے ۔ ایک بہت بڑا

حصہ ہے جسے انسان نہیں دیکھ پا رہا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ (٦٩ : ٣٨) وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ (٦٩ : ٣٩) "پس' میں قسم نہیں کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو' اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے"۔

یہ اشارہ انسانی دل و دماغ کو بہت کھول دینے والا ہے۔ جب انسان یہ پاتا ہے کہ انسانی فکر و نظر کے موجودہ دائرے سے وراء بھی کچھ پہلو ہیں۔ کچھ جہاں اور بھی ہیں' کچھ اسرار و رموز پوشیدہ بھی ہیں' جو ابھی انسان کو نظر نہیں آ رہے' تو اس طرح انسانی تصور اور انسانی ادراک کے دائرے کو وسعت ملتی ہے۔ اس کائنات کے آفاق وسیع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس قرآن میں رہنے اور بسنے والا انسان اس محدود جگہ (Space) کا پابند نہیں ہوتا جس میں وہ رہتا ہے۔ نہ وہ اپنی آنکھوں کے محدود مشاہدے کا قیدی بنتا ہے' نہ اپنی موجودہ محدود ادراک پر اکتفاء کرتا ہے۔ یہ کائنات ہمارے مشاہدے سے زیادہ وسیع اور یہ حقیقت ہماری قوت ادراک سے بڑی ہے۔ کیونکہ اس محدود انسان کو جو محدود مشاہدہ اور قوت مدرکہ دی گئی ہے' وہ اس دنیا پر اس کی محدود ضروریات کے لیے دی گئی ہے۔ ہاں وہ اپنے مشاہدے اور قوت مدرکہ کو وسعت دے سکتا ہے۔ اور اپنی ان محدود قوتوں کو بھی وسعت دے سکتا ہے لیکن وہ یہ بھی اس وقت کر سکتا ہے کہ جب اس کو احساس ہو کہ کچھ حقائق اور جہاں اور بھی ہیں' جن تک ابھی ہماری رسائی نہیں ہوئی ہے۔ اور پس پردہ ان جہانوں سے زیادہ وسیع جہاں ہیں جن تک ہماری رسائی ہو گئی ہے۔ یہاں آکر انسان کا رابطہ اس ذات مطلق سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جو انسان کو نور بخشتی ہے اور اس سے براہ راست تعلق پاکر انسان پھر دوسرے جہانوں کی سیر کرتا ہے' جو بظاہر مستور ہیں۔

وہ لوگ جو اپنے آپ کو ان حقائق کے اندر محدود کرتے ہیں جن کو آنکھ دیکھ سکتی ہے' یا جن کو ہماری قوت مدرکہ پا سکتی ہے' یہ لوگ دراصل مساکین ہیں۔ درحقیقت اس قسم کے لوگ اپنے نہایت محدود محسوسات اور مدرکات کے قیدی ہیں۔ یہ لوگ اس وسیع دنیا میں رہتے تو ہیں مگر انہوں نے اپنے آپ کو کنویں کا مینڈک بنا دیا ہے جب کہ انسان کو ایک عظیم کائنات کے اندر بھیجا گیا ہے تاکہ اسے دیکھے اور عبرت لے۔

اس کائنات کے اندر اور اس زمین کے اوپر رہنے والے' اس انسان کی تاریخ میں' بارہا ایسا ہوا ہے کہ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو' اس طرح کنویں کا مینڈک بنایا ہے۔ انہوں نے اپنے اوپر معرفت اور روشنی کے دروازے بند کیے ہیں۔ اور ایمان اور شعور کے راستے سے حقیقت کبریٰ تک پہنچنے سے اپنے آپ کو محروم کیا ہے۔ پھر وہ یہ کوشش بھی کرنے لگتے ہیں کہ روشنی کے یہ دروازے' جس طرح انہوں نے اپنے اوپر بند کیے' دوسروں پر بھی بند کر دیں۔ کبھی وہ جاہلیت کے نام سے ایسا کرتے رہے ہیں اور کبھی وہ لادینیت کے نام سے ایسا کرتے رہے ہیں۔ جاہلیت اور جدید علمی جاہلیت دونوں دراصل ایک بڑے قید خانے ہیں جن کے اندر ان لوگوں نے اپنے آپ کو محصور کر لیا ہے اور معرفت اور روشنی کے حقیقی سرچشموں سے اپنے آپ کو محروم کر دیا ہے۔

گزشتہ دو سو سالوں کے اندر' مغربی سائنس نے اپنے غرور اور حماقت کی وجہ سے' اپنے آپ کو' ان مضبوط سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا تھا۔ لیکن اس صدی میں' خود مغربی سائنس نے آہستہ آہستہ ان مضبوط سلاخوں کو توڑنا شروع کر دیا ہے اور خود اپنے تجربات کو نور کے سرچشموں سے جوڑنا شروع کر دیا۔ یہ اس وقت ممکن ہوا جب سائنس کا جوش و غرور

ٹھنڈا ہوا اور وہ کلیسا کی حماقتوں اور اس کے خلاف جوش انتقام کی مدہوشی سے باہر نکل آئی ہے۔ (۱)

اور سائنس نے معلوم کر لیا کہ اس کائنات کے اندر اس کے حدود کار ہی محدود ہیں اور اس نے تجربہ کر لیا کہ یہ محدود آلات جن کے ذریعے وہ اس کائنات کا مشاہدہ کر رہی ہے' وہ تو اسے کسی لامحدود کائنات کی طرف لے جا رہے ہیں ۔چنانچہ سائنس نے ایمان کی دعوت دینا شروع کر دی۔ (۲) ۔

نہایت عاجزانہ انداز میں سائنس نے خوشخبری دی اور اعلان کیا کہ اب وہ اس قید خانے سے رہا ہو گئی ہے۔جب بھی انسانیت نے اپنے آپ کو مادیت کی سلاخوں کے پیچھے بند کیا۔اس کے ساتھ یہی سلوک ہوا۔

ڈاکٹر الیکس کاریل' جنہوں نے خلیہ پر تحقیقات میں تخصص حاصل کیا۔اور جنہوں نے خون کی گردش کے نظام پر کام کیا اور عملاً پریکٹس بھی کرتے رہے۔اور انہوں نے کئی اداروں کی سرجری اور مختلف طریقہ ہائے علاج پر کام کیا۔اور جن کو ۱۹۱۲میں نوبل انعام ملا اور دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں انسٹی ٹیوٹ آف ہیومنزم فرانس کے ڈائریکٹر رہے' وہ لکھتے ہیں :

"یہ کائنات بہت وسیع ہے' اور اس کے اندر ہمارے انسانی عقول کے علاوہ بھی کئی فعال عقل کام کرتی ہیں۔ ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کی وادیوں کے' نشیب و فراز میں انسانی عقل جب چاہے' ان عقول سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ نماز ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے جس کے ذریعہ ہم ان عقول تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔اسی طرح ہم اس ابدی عقل سے جا ملتے ہیں جس کا کنٹرول اس کائنات کی تمام تقدیروں پر ہے۔ چاہے یہ تقدیرات ہمیں نظر آ رہی ہوں یا ہماری نظروں سے اوجھل ہوں۔ (۳)

"تقدس کا یہ شعور اور دوسری روحانی سرگرمیاں انسانی زندگی پر گہرے اثرات ڈالتی ہیں۔تقدس کے اس شعور اور روحانی سرگرمیوں کی وجہ سے ہم' اس عظیم روحانی دنیا سے متصل رہتے ہیں جس کے آفاق بہت ہی وسیع ہیں اور جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے"۔ (۴)

ایک دوسرے ڈاکٹر ڈی نوئے ہیں۔انہوں نے استاد کوری اور ان کی بیوی کے ساتھ مل کر تشریح الابدان اور طبیعیات کے میدان میں کام کیا۔اور راکفیلر انسٹی ٹیوٹ نے ان کو اپنے ادارے کے دوسرے ممبران کے ساتھ سرجری اور اس کی خصوصیات کے موضوع پر تحقیقات کے لیے بلایا۔وہ فرماتے ہیں :

"کئی ذہین اور نیک نیت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ اللہ پر ایمان نہیں لا سکتے۔اس لیے کہ وہ اللہ کا تصور یا ادراک نہیں کر سکتے۔حالانکہ ایک دیانت دار انسان جو اپنے نفس کو علمی تحقیقات میں لگائے رکھتا ہے' اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اللہ کا تصور بھی کر سکے' جس طرح ایک ماہر طبیعیات پر لازم نہیں ہے کہ وہ بجلی کا تصور کر سکے۔جس طرح خدا کا تصور

(۱) انسان' مادیت اور اسلام کے درمیان۔ محمد قطب
(۲) سائنس کی طرف سے دعوت ایمان۔ ترجمہ محمود فلکی۔ تصنیف اے۔کریسی مور
(۳) بیسویں صدی کے مفکرین کے عقائد ۔ استاد عناد
(۴) بیسویں صدی کے مفکرین کے عقائد ۔ استاد عناد

انسان ناقص ہو گا' اسی طرح بجلی کا تصور بھی ناقص ہو گا اور باطل ہو گا۔ اس لیے کہ بجلی کا مادی تصور ممکن ہی نہیں ہے۔ بجلی ناقابل تصور ہونے کے باوجود ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور یہ لکڑی کے ایک ٹکڑے سے زیادہ ثابت شدہ ہے جس کا تصور کیا جا سکتا ہے"۔ (۱)

سر آرتھر ٹامسن' اسکاٹ لینڈ کے مشہور مصنف ہیں' کہتے ہیں: "ہم ایک ایسے زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں کہ اس میں یہ حقیقت ٹھوس اور شفاف بن گئی ہے۔ ایتھر نے اپنا مادی وجود کھو دیا ہے۔ مادی تاویلات میں غلو کرنے کی صلاحیت کے معاملے میں وہ حدیث العہد ہے۔

ایک مجموعہ مضامین بعنوان "سائنس اور مذہب" میں کہتے ہیں :

" دینیات کے اہل علم کو اس بات پر تاسف نہیں کرنا چاہئے کہ ایک ماہر طبیعیات' طبیعیات کے دائرے سے نکل کر رب طبیعیات تک کیوں نہیں پہنچ پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنسی تحقیقات کا رخ الہیاتی نہیں ہے۔ لیکن اگر علمائے طبیعیات' طبیعیات کے دائرے سے نکل کر مافوق الطبیعیات میں داخل ہو گئے تو اس کے نتائج نہایت ہی عظیم ہوں گے۔ آج تک کی تحقیقات کے بعد ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ ہم اس پر خوشی کا اظہار کریں کہ سائنس دانوں نے اس سمت کام کرنے کی راہ فراہم کر دی ہے کہ اب دینی جذبات سائنس میں سانس لے سکیں۔ جبکہ ہمارے آباؤاجداد کے زمانے میں' یہ ممکن نہ تھا کہ سائنس کے مضامین میں مذہب کی بات کی جا سکے۔ جس طرح مسٹر لانچڑوں ڈیفنس نے اپنی کتاب میں' جو یہ غلط دعویٰ کیا تھا' اس کے بالمقابل اب ہم یہ بات نہایت زور اور اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ سائنس نے اللہ تعالیٰ کے نہایت ہی اعلیٰ اور نہایت بلند مرتبہ تصور کے لیے راہ ہموار کر دی ہے۔ اور اب ہم اس قول کا لفظی مفہوم درست سمجھتے ہیں کہ سائنس نے انسانوں کے لیے جدید آسمان اور جدید زمین' پیدا کر دیئے ہیں اور انسان کو عقلی جدوجہد میں اس قدر آگے بڑھا دیا کہ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان کو امن و سلامتی صرف اس صورت میں ملے گی کہ وہ اللہ کی ذات پر یقین کر لے"۔ (۲)

اس سے قبل ہم اے۔ کریسی موریسن' صدر سائنس اکیڈمی نیویارک اور امریکہ میں قومی تحقیقات کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر کی کتاب سے یہ اقتباس نقل کر چکے ہیں۔ کتاب کا نام ہے "انسان اکیلا نہیں کھڑا"۔

"ہم عملاً ایک وسیع عالم مجہول کے قریب جا پہنچے ہیں۔ کیونکہ یہ بات سائنسی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ مادہ دراصل عالمی دور کا ایک مظہر ہے۔ اور یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے قوت ہے۔ لیکن اس بات میں شک نہیں ہے کہ اس کائنات کو وجود میں لانے میں کسی بخت و اتفاق کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ محیرالعقول عظیم کائنات ایک ضابطے کی پابند ہے"۔

"یہ کہ یہ انسان ایک حیوان تھا جو ایک ایسے "موجود" کی شکل اختیار کر گیا جو باشعور' مفکر' اپنے وجود کو جاننے والا بن گیا' یہ بات درست نہیں کہ یہ انسان محض مادی عوامل کی وجہ سے ایسا بن گیا اور اس کے پیچھے کسی تخلیق کرنے والے کا قصد و ارادہ نہ تھا' یہ کوئی ممکن بات نہیں ہے"۔

---

(۱) بیسویں صدی کے مفکرین کے عقائد ۔ استاد عناد
(۲) دور جدید کے مفکرین کے عقائد ۔ استاد عناد

"اگر قصد و ارادے کو تسلیم کیا جائے تو اس کے مطابق پھر انسان ایک مشین ہو گا تو سوال یہ ہو گا کہ اس مشین کو کون چلا رہا ہے 'کیونکہ چلانے کے بغیر اس سے کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ سائنس یہ بتانے سے قاصر ہے کہ انسانی مشین کا مدیر کون ہے اور پھر سائنس یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتی کہ ارادہ کوئی مادی چیز ہے"۔

"ہم اس مقام تک پہنچ چکے ہیں کہ ہم کہیں کہ اللہ نے اپنے نور کا ایک حصہ انسان کو عطا کیا ہے"۔

یوں نظر آتا ہے کہ سائنس اب مادیت کے قید خانے سے اس کی سلاخیں توڑ کر اور دیواریں گرا کر باہر نکل آئی ہے۔ اور وہ اب کھلی فضا میں آزادانہ غور و فکر کرتی ہے۔ جس طرح قرآن نے فرمایا:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ (۶۹: ۳۸) وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ (۶۹: ۳۹) "پس میں قسم نہیں کھاتا ہوں ان چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی جو تم نہیں دیکھتے ہو"۔

یہ اور اس قسم کی متعدد آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ بعض "کیڑے" سوچنے والے "کیڑے" ابھی تک سائنس کے نام پر اپنے اوپر رب تعالیٰ کے نور کے دروازے بند کیے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ دراصل نہ سائنس دان ہیں اور نہ مومن۔ یہ جس طرح سائنس کے میدان میں پسماندہ ہیں 'اسی طرح دین کے میدان میں پسماندہ ہیں۔ اور لاشعوری طور پر یہ مادیت کے قید خانے میں مبتلا ہیں۔ اور اس مقام اور مرتبے سے پیچھے رہ گئے ہیں جو انسان جیسے مکرم مخلوق کے لائق ہے۔

ذرا دوبارہ غور کریں:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ (۳۸) وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ (۳۹) اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۴۰) وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ (۴۱) وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۴۲) تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۳) (۶۹: ۳۸ تا ۴۳) "پس میں قسم نہیں کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے 'یہ ایک رسول کریم کا قول ہے 'کسی شاعر کا قول نہیں ہے 'تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے 'تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے"۔

رسول اللہ پر اور قرآن پر جو الزامات مشرکین مکہ نے لگائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپؐ شاعر ہیں۔ دوسرا یہ تھا کہ آپ کاہن ہیں اور یہ ان کا ایک سطحی شبہ تھا۔ اور یہ اس لیے ان کو لاحق ہو گیا تھا کہ یہ قرآن ایک لاجواب کلام تھا۔ اور عام لوگوں کے کلام سے اس کا معیار بہت بلند تھا۔ اور شاعر اس لیے کہتے تھے کہ ان کا یہ وہم تھا کہ شاعروں پر جن آتے ہیں اور وہ ان سے اس قسم کا کلام سنا کرتے ہیں۔ اسی طرح کاہنوں کو بھی وہ جنوں کے ساتھ تعلقات رکھنے والے سمجھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ باتیں ان کو یہ جنات بتاتے ہیں۔ یہ شبہ بہت ہی سطحی تھا اور قرآن اور رسالت اور ذات رسول پر تدبر کرنے سے یہ جلدی ہی زائل ہو سکتا تھا۔

یہ درست ہے کہ شعر میں بعض اوقات اچھی موسیقی ہوتی ہے 'اعلیٰ خیالات ہوتے ہیں 'خوبصورتی ہوتی ہے لیکن قرآن

اور شاعری بالکل جدا چیزیں ہیں۔ دونوں کے درمیان بنیادی فرق ہے۔ قرآن کریم ایک مکمل نظام زندگی عطا کرتا ہے اور یہ نظام سچائی پر مبنی ہے۔ اس کی بنیاد نظریہ توحید پر مبنی ہے۔ یہ اس کائنات کے ایک خالق پر ایمان کو ضروری سمجھتا ہے۔ وہ انسانوں کی طرح اس کائنات کو بھی زندہ اور مطیع رب سمجھتا ہے۔ جبکہ شعر چند تاثرات' جذبات' متفرق واقعات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا نظام زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نہ ایک نظریہ پر مبنی ہوتا ہے' جو خوشی اور غم' آزادی اور قید اور محبت اور نفرت میں ایک ہو' جبکہ شعر ان حالات میں یکسر بدل جاتا ہے اور مختلف حالات میں مختلف ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہ قرآن کریم نے جو تصور حیات پیش کیا ہے اس کی پہلی لینٹ بھی اسلام اور قرآن نے رکھی ہے۔ اس کے جزئیات' اس کے اصول بھی' سب کے سب قرآن نے دیئے اور اس عقیدے کے ساتھ دیئے کہ یہ سب من جانب اللہ ہے۔ اس تصور حیات کا منہاج ہی ایسا ہوتا ہے جو انسانی نہیں ہو سکتا۔ انسان کوئی ایسا جامع نظام اور تصور تجویز نہیں کر سکتا' جس کی نہ پہلے کوئی مثال ہے اور نہ بعد میں۔ اس کے مقابلے میں انسانوں نے اس کائنات' اس کی قوت خالقہ اور قوت مدبرہ کے بارے میں جو فلسفے گھڑے ہیں' وہ بھی ہمارے سامنے موجود ہیں جو علم فلسفہ' علم شعر' دوسرے فکری اور نظریاتی مکاتب میں تفصیل سے کتابوں میں موجود ہیں۔ جب ان کا تقابلی مطالعہ قرآن سے کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن بالکل کسی علیحدہ سرچشمے کا فیض ہے۔ یہ منفرد مزاج اور منفرد خصوصیات رکھتا ہے اور اس کے مقابلے میں انسانی تصورات پائے چوبیں کی طرح ہیں۔

اس طرح کہانت اور کاہنوں سے جو باتیں صادر ہوتی رہتی ہیں' آج تک انسانی تاریخ میں کوئی کاہن ایسا نہیں گزرا جس نے ایک نظام زندگی' فلسفہ زندگی اور نظام آخرت دیا ہو اور وہ اسی طرح کامل' مکمل اور معقول ہو' جس طرح قرآن کا پیش کردہ نظام معقول ہے۔ کاہنوں سے جو کچھ نقل ہوا ہے' وہ یہ ہے کہ چند مہمل کلمات' چند سجع اور قافیے جن میں تیر تکے لڑائے گئے ہیں اور ایک آدھ کہیں' کوئی سنی سنائی حکمت کی بات بھی ہوتی ہوگی۔

لیکن قرآن کے اندر بعض ایسی جھلکیاں بھی ہیں جن پر غور کرنے سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کبھی اس طرح سوچ ہی نہیں سکتا۔ ہم نے فی ظلال القرآن میں ایسی بعض جھلکیاں دکھائی ہیں کہ نہ قرآن سے پہلے اور نہ بعد میں انسانوں کا ذہن کبھی اس طرف گیا ہے۔ بعض آیات یہاں بھی غور کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِى ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِى كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ

”اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے' سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں ہوگا جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں ہے جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے“۔ (۶:۵۹)

مثلاً یہ تصور:

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۵۷ : ۴) "اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے' اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے' اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے' اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہے' جہاں بھی تم ہو اور جو کام بھی تم کرتے ہو وہ اسے دیکھ رہا ہے"۔ یا مثلاً اس قسم کے خیال کی طرف۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَى وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُعَمَّرٍ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ (۳۵ : ۱۱) "کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ بچہ جنتی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔ کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوتا ہے۔ اللہ کے لیے یہ بہت کچھ آسان کام ہے"۔

نیز نہ پہلے کسی انسان کو اس بات کا دھیان ہوا' اور نہ بعد میں ہوگا کہ اللہ نے اس کائنات کو کس طرح تھام رکھا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ (۳۵ : ۴۱) "حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے۔ اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے سوا کوئی دوسرا تھامنے والا نہیں ہے"۔

یا پھر یہ منظر کہ اس کائنات میں زندگی کس طرح پھوٹتی ہے اور خالق کائنات میں یہاں زندگی کے قیام کے لیے کس قدر انتظامات کیے ہیں اور موافق حالات بنائے ہیں :

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذَلِكُمُ اللَّهُ فَأَنَّى تُؤْفَكُونَ (۹۵) فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۹۶) وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۹۷) وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ (۹۸) وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ

وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ

اِذَآ اَثْمَرَ وَ يَنْعِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۹۹) (۶ : ۹۵ تا ۹۹) ’’دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے ۔ وہی زندہ کو مردے سے نکالتا ہے، اور وہی مردہ کو زندہ سے خارج کرنے والا ہے ۔ یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے ۔ پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو؟ پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے ۔ اسی نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے ۔ اسی نے چاند اور سورج کے طلوع اور غروب کا حساب مقرر کیا ہے ۔ یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھہرائے ہوئے اندازے ہیں ۔ اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا ۔ دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں ۔ اور وہی ہے جس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا، پھر ہر ایک کے لیے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ ہے ۔ یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی نباتات اگائی ۔ پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کیے ۔ پھر ان سے تہ بہ تہ جڑے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کیے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں ۔ اور انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو ۔ ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں‘‘ ۔

اس قسم کی جھلکیاں قرآن میں بہت زیادہ ہیں، اور انسانی خیالات اور اسالیب کلام میں اس قسم کی باتیں نہیں ہوتیں ۔ قرآن کے صرف یہی پہلو، اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ یہ قرآن منجانب اللہ ہے ۔ دوسرے دلائل سے اگر صرف نظر کر دیا جائے جو خود اس کتاب کے اندر بھی ہیں اور ان حالات کے اندر بھی جن میں یہ کتاب نازل ہوئی تو اس کتاب کے اندر بعض ایسی باتیں ہیں جن کی طرف انسانی خیال جاتا ہی نہیں ۔ لہٰذا ان لوگوں کے یہ شبہات سطحی ہیں اور ان کا اظہار انہوں نے اس وقت کیا، جس وقت قرآن کی چند سورتیں نازل ہوئی تھیں ۔ پورا قرآن ابھی مکمل نہ ہوا تھا ۔ اس وقت بھی قرآن کریم کے اندر یہ خصوصیت موجود تھی ۔ اس کے اندر واضح اشارات تھے کہ اس کا سرچشمہ زمین پر نہیں ہے، آسمان پر ہے ۔

کبراء قریش اپنے دلوں میں یہ بات محسوس بھی کرتے تھے اور کبھی کبھار اپنے درمیان اس کا اعتراف بھی کرتے تھے ۔ لیکن مفادات انسان کو اندھا کر دیتے ہیں، جن کے پیش نظر انسان ہدایت کی راہ پر آنے کا فیصلہ نہیں کر سکتا ۔ ایسے حالات کے بارے میں قرآن نے پیشگی کہہ دیا تھا کہ اب وہ اس قسم کے الزامات لگائیں گے کہ یہ ایک قدیم جھوٹ ہے ۔

کتب سیرت میں متعدد واقعات نقل ہوئے ہیں کہ زعمائے قریش جب اپنے ہاں اس شبہے کے بارے میں باتیں کرتے تھے تو وہ خود تسلیم کرتے تھے کہ ان کی یہ بات غلط ہے ۔

ابن اسحاق نے ولید ابن مغیرہ اور نضر ابن الحارث اور عتبہ ابن ربیعہ کے متعلق یہ روایت نقل کی ہے ۔ ان میں سے پہلے شخص کے بارے میں اس نے نقل کیا ہے ۔

"پھر یہ ہوا کہ ولید ابن مغیرہ کے پاس قریش کے کچھ لوگ جمع ہوئے ۔ یہ ان میں معمر آدمی تھا' اور موسم حج آنے ہی والا تھا۔ اس نے ان سے کہا اے اہل قریش! تم جانتے ہو کہ حج کا موسم آنے والا ہے ۔ اور اس میں تمام عالم عرب سے وفود تمہارے پاس آئیں گے اور تمام عربوں نے تمہارے اس شخص کے بارے میں خبریں سن رکھی ہیں ۔ لہٰذا اس کے بارے میں اپنی آراء مجتمع کر لو اور ایک ہی بات کرو' اور اس کے بارے میں باہم متضاد باتیں نہ کرو کہ خود تمہاری باتیں ایک دوسرے کو جھٹلا دیں ۔ اور تم خود اپنی تردید کرو۔ انہوں نے کہا ابو عبدالشمس سب سے پہلے تم ہی بتاؤ اور ہمارے لیے ایک بات طے کر دو ہم وہی کریں گے ۔ اس نے کہا پہلے تم بتاؤ کہ تمہاری آراء کیا ہیں؟ بعض نے کہا کہ ہم کہیں گے کہ یہ کاہن ہے ۔ اس نے کہا یہ تو نہیں' خدا کی قسم! یہ کاہن نہیں ہے ۔ ہم نے کہان کو دیکھا ہے ۔ اس کا کلام کاہنوں کی گنگناہٹ سے مختلف ہے ۔ نہ کاہنوں جیسا سجع ہے' اس میں ۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ ہم یہ کہیں گے کہ یہ مجنون ہے ۔ تو اس نے کہا مجنون بھی تو وہ نہیں ہے ۔ ہم نے پاگلوں کو دیکھا ہے اور پاگلوں کو جانتے ہیں ۔ نہ اس پر دورے پڑتے ہیں' نہ اسے کوئی وہم ہوا ہے' نہ وسوسہ میں گرفتار ہے وہ ۔ تو بعض نے کہا تو پھر اسے شاعر کہا جائے ۔ تو اس نے کہا کہ وہ شاعر نہیں ۔ ہم سب لوگ شعراء کو جانتے ہیں ۔ اقسام شعر میں رجز' ھزج' قریض' مقبوضہ' مبسوطہ' لہٰذا قرآن تو ان میں سے نہیں ہے ۔ تو اس کے بعد کہا کہ پھر اسے ساحر اور جادوگر کہا جائے ۔ تو اس نے کہا کہ یہ تو جادوگر بھی نہیں ہے ۔ جادوگروں کو ہم نے دیکھا ہوا ہے نہ یہ جادوگروں کی طرح پھونکتا ہے اور نہ یہ گانٹھیں باندھتا ہے ۔ اس کے بعد انہوں نے کہا: عبدالشمس تم ہی بتاؤ کہ پھر ہم اسے کیا کہیں؟ اس نے کہا "خدا کی قسم اس کے کلام میں زبردست مٹھاس ہے' اس کی جڑیں نہایت گہری ہیں اور شاخیں پھیلی ہوئی ہیں ۔ اور اس کی شاخوں میں پھل ہیں ۔ تم ان باتوں میں سے جو بھی کہو گے عام آدمی کو معلوم ہو گا کہ یہ جھوٹ ہے ۔ اور قریب ترین بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ ایک جادوگر ہے ۔ ایسا جادو لایا ہے کہ بیٹے کو باپ سے جدا کر دیا ہے' بہن کو بھائی سے الگ کر دیا ہے' خاوند کو بیوی سے جدا کر دیا ہے ۔ ایک شخص کو خاندان سے جدا کر دیا ہے ۔ وہ اس سے یہ باتیں لے کر نکلے اور مکہ کی راہوں میں بیٹھ گئے ۔ جب موسم حج میں لوگ آنے لگے تو جو بھی آتا وہ اس سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کرتے اور لوگوں کو ان سے ڈراتے ۔

اور نضر ابن الحارث کے بارے میں مروی ہے کہ اس نے کہا "اے قوم قریش! خدا کی قسم تم پر ایک ایسی مصیبت آ پڑی ہے جس کا کوئی علاج تمہارے پاس نہیں ہے ۔ محمد تم میں ایک چھوٹا سا نو عمر بچہ تھا' وہ تم میں سب کا محبوب تھا' وہ تم میں سب سے سچا تھا' وہ تم میں سب سے زیادہ امین تھا' جب تم نے اس کے چہرے پر بڑھاپا دیکھا اور وہ بات تمہارے پاس لے کر آیا جو وہ لے کر آیا تو تم نے کہا یہ جادوگر ہے ۔ نہیں خدا کی قسم! ایسا نہیں ہے' وہ جادوگر نہیں ہے ۔ ہم نے جادوگروں کو دیکھا ہے ۔ ان کی پھونک اور ان کی گانٹھوں کو بھی دیکھا ۔ تم نے کہا کہ وہ کاہن ہے ۔ نہیں' خدا کی قسم! وہ کاہن نہیں ہے ۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے ۔ ان کے خلجانات کو بھی دیکھا ہے ۔ ان کا سجع کلام بھی سنا ہے تم کہتے ہو وہ شاعر ہے ۔ نہیں' خدا کی قسم! ایسا نہیں' وہ شاعر نہیں ہے ۔ ہم نے شعراء دیکھے ہیں اور شعراء کے اصناف شعر سے بھی ہم واقف ہیں ۔ رجز' ھزج وغیرہ ۔ تم کہتے ہو کہ وہ مجنون ہے ۔ ہم نے مجنونوں کو دیکھا ہے' نہ اس پر دورے پڑتے ہیں' نہ وہ وسوسوں کا شکار ہے اور نہ اس کی باتیں غلط سلط ہیں ۔ اے گروہ قریش! اپنے اس معاملے میں غور کرو' خدا کی قسم! میں

سمجھتا ہوں تم پر ایک عظیم مصیبت آگئی ہے.....“

اس کی باتوں میں اور عتبہ کی باتوں میں پوری طرح یکسانیت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ہو' جو کبھی عتبہ کی طرف منسوب ہو گیا ہو اور کبھی نضر کی طرف۔ لیکن' یہ بات بعید نہیں ہے کہ دونوں نے ایک ہی طرح کی بات کی ہو۔ کیونکہ دونوں قریش کے اکابر میں سے تھے۔ اور ان کے تاثرات قرآن کے بارے میں ایک ہی جیسے تھے۔

عتبہ کا جو موقف تھا اس کا قصہ اس سے قبل ہم نے سورہ قلم کے ابتدائیہ میں بیان کر دیا ہے۔ یہ موقف بھی حضور اکرم اور قرآن کے بارے میں ولید اور نضر کے قریب قریب تھا۔

غرض یہ لوگ جو الزام لگاتے تھے کہ آپؐ ساحر ہیں یا کاہن ہیں' کبھی تو یہ بطور عیاری و مکاری یوں کہتے تھے اور کبھی وہ محض مغالطہ انگیزی کے لیے کر رہے تھے۔ اور اس میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ قرآن مجید بذات خود اس قدر واضح تھا کہ سنتے ہی لوگ اسے سمجھ لیتے تھے۔ اس لیے وہ قسم کا محتاج ہی نہ تھا کہ خدا ان چیزوں کی قسم اٹھائے جو معلوم ہیں اور جو معلوم نہیں ہیں۔ (1)

بے شک یہ رسول کریم ﷺ کا قول ہے یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ اور نہ کاہن کا کلام ہے۔ یہ تو رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے۔

یہاں جو یہ کہا گیا کہ یہ رسول کریم کا قول ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رسول کریم ﷺ نے یہ کلام تخلیق کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے طرز کا کلام ہے۔ شاعر اور کاہن ایسا کلام پیش نہیں کر سکتے۔ ایسا کلام ایک رسول ہی پیش کر سکتا ہے۔ اللہ نے بھیجا اور اس کی طرف یہ نازل کیا اسی لیے بعد متصلاً کہہ دیا گیا۔

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶۹ : ۴۳) ”یہ رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے“۔

اور یہ تعقیبات۔

قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ (۶۹ : ۴۲) ”تم کم ایمان لاتے ہو“۔

قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۶۹ : ۴۲) ”تم کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو“۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ تم ایمان نہیں لاتے' اور تم نصیحت نہیں حاصل کرتے۔ یہ انداز تعبیر مکمل نفی کے لیے عربی زبان میں عام تھا کہ مکمل نفی کو قلیل کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ حدیث شریف میں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم (قلیل اللغو) تھے یعنی بالکل لغویات نہ کرتے تھے۔ یہاں مراد مکمل نفی ہے۔ ورنہ اگر کسی کا قلیل ایمان بھی ہو' اور کوئی قلیل نصیحت بھی قرآن سے لیتا ہو' وہ رسول اللہ کو شاعر' کاہن نہیں کہہ سکتا بلکہ ایک کافر اور غافل ہی حضور ﷺ کے بارے میں ایسی بات کر سکتا ہے۔

اور آخر میں یہ خوفناک ڈراوا آتا ہے کہ جو بھی عقیدے کے بارے میں اللہ پر افتراء باندھے گا وہ اللہ کی گرفت میں آ

(1) سید قطب کے نزدیک آیات کے معنی یہ ہوں گے میں قسم نہیں اٹھاتا۔ لیکن ہندوستانی علماء کا ترجمہ درست ہے کہ (پس نہیں' میں قسم اٹھاتا ہوں)

جائے گا۔ اور یہ تہدید اس ایک احتمال کی نفی بھی کر دیتی ہے جو رہ جاتا ہے کہ حضورﷺ نے یہ اپنی طرف سے بنایا ہو۔ تو اللہ فرماتا ہے کہ آپ سچے ہیں اگر ہم پر وہ کوئی افتراء باندھتے تو ہم اسے سختی سے پکڑتے ہیں۔ اسلامی عقائد میں جو قلیل تحریف بھی کرتا ہے ' وہ پکڑا جاتا ہے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿٤٤﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿٤٥﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿٤٦﴾ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿٤٧﴾

"اور اگر اس (نبیؐ) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے ' پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا"۔

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرمﷺ خود تمہارے اقوال کے مطابق بھی صادق و امین ہیں۔ اور اگر انہوں نے اس کلام سے کوئی بات اپنی طرف سے بنائی ہوتی تو ہم اس کو اپنی گرفت میں لے لیتے اور چونکہ آپ پر خدا کی پکڑ نہیں آئی ' اس لیے لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ آپ سچے ہیں۔ یہ تو تھا ایک مثبت استدلالی نظریہ اور ثبوت ' لیکن جس انداز میں یہ بات کی گئی ہے وہ ایک مکمل اور متحرک منظر کا انداز ہے۔ مثلاً یوں نظر آتا ہے کہ جس طرح ایک قوی تر انسان باز پرس کے لیے کسی کو پکڑ لے اپنے دائیں ہاتھ سے ' اور پھر اس کی رگ جان کاٹ دے۔ یہ بھی نہایت ہی سخت اور متاثر کر دینے والا منظر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی قدرت کس قدر عظیم ہے اور اس کے سامنے انسان کس قدر عاجز ہے۔ سب کے سب انسان اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات ' اسلامی عقائد ' دین سے استدلال اور تمام دینی مباحث ' نہایت ذمہ داری کا کام ہے۔ اور اس میں ہر شخص کو ذمہ داری سے اقدام و کلام کرنا چاہئے ' جبکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ دھمکی دی گئی ہے تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا ' جو اسلام کے بارے میں لاپرواہ ہو کر کلام کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ نہایت خوف ' ڈر اور احتیاط اور خضوع و خشوع کا مقام ہے اور محتاط رہنے کا کام ہے۔

اب آخری اختتامیہ آتا ہے۔ اس میں فیصلہ کن بات بیان کر دی جاتی ہے اس دین کی حقیقت کیا ہے؟

وَإِنَّهُ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٤٨﴾ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنكُم مُّكَذِّبِينَ ﴿٤٩﴾ وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٥٠﴾ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿٥١﴾

"درحقیقت یہ پرہیزگار لوگوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں۔ ایسے کافروں کے لیے یقیناً یہ موجب حسرت ہے اور یہ بالکل یقینی حق ہے"۔

یہ قرآن صرف ان دلوں کو نصیحت دے سکتا ہے جن کے اندر جوابدہی کا کسی قدر خوف ہو یعنی جس حقیقت کو قرآن لے کر آیا ہے ' وہ ان کے دلوں کے اندر موجود ہو۔ اور قرآن ان کو یاد دلائے کہ اسے بھی یاد کرو ' اور دلوں کو اس پر

ابھارے ۔ رہے وہ لوگ جو سرے سے ڈرتے ہی نہیں تو ان کے دل غافل اور اندھے ہیں مسخ شدہ ہیں ۔ وہ نور معرفت اور نصیحت سے محروم ہیں اور نہ قرآن ان کے لیے مفید ہے ۔

وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ (۶۹ : ۴۹) "اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں کچھ لوگ جھلانے والے ہیں" ۔ لیکن بعض لوگوں کے جھلانے سے حقیقت نہیں بدل جاتی ۔ اس طرح تمہارا یہ فعل حقائق کو نہیں بدل سکتا ۔

وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۶۹ : ۵۰) "ایسے کافروں کے لیے یہ یقیناً موجب حسرت ہے" ۔ اس لیے کہ یہ قرآن اہل ایمان کی تو شان بلند کرتا ہے جبکہ تکذیب کرنے والوں کی حیثیت کو گراتا ہے اور آخر کار تو حق نے غالب ہونا ہے ۔ اور مکذبین نے ذلیل ہونا ہے ۔ عنقریب ایسا ہو گا اور پھر ان کے لیے یہ موجب حسرت ہو گا اور قیامت کے دن بھی ان پر یہ حجت ہو گا اور موجب حسرت ہو گا کیونکہ تکذیب کی وجہ سے ان کو سخت عذاب دیا جائے گا ۔ لہذا دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے لیے موجب حسرت ہو گا ۔

وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ (۶۹ : ۵۱) "اور یہ بالکل یقینی حق ہے" ۔ جھلانے والوں کے جھلانے کے باوجود یہ حق ہے ۔ یقینی ہے ۔ صرف یقینی نہیں بلکہ حق الیقین ہے ۔ حق الیقین ایک خاص انداز کی تاکید ہے جو لفظاً بھی زوردار ہے اور معناً بھی تاکید ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ سچائی میں یہ گہرا ہے ۔ یقین میں نہایت گہرا ہے اور جو کچھ اس میں بیان ہوا ہے یہ حق اور سچائی ہے ۔ ایک ایک آیت میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا سرچشمہ خدا تعالیٰ ہے ۔

یہ ہے اس دین کا مزاج اور طبیعت اور یقینی نتیجہ ۔ نہ یہ شاعری ہے نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے ۔ نہ یہ اللہ پر افتراء ہے ۔ بلکہ یہ اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے اور یہ متقی لوگوں کے لیے تذکرہ اور یاد دہانی ہے ۔ اور حق الیقین ہے ۔

اب آخر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو آخری ہدایات دی جاتی ہیں ۔ گزشتہ مباحث کے بعد اس قسم کی تلقین کا بہترین اور مناسب وقت ہے ۔ لہذا یہ نہایت ہی بروقت ہدایت ہے ۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾ ع ۱۵

"پس اے نبیؐ اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو" ۔ ایسی تسبیح جس میں اللہ کی پاکی بھی ہو اور اللہ کی بڑائی بھی ۔ جس میں اعتراف حق بھی ہو اور تحقیق حق بھی ہو ۔ جس میں عبودیت بھی ہو اور خضوع و خشوع بھی ہو ۔ اس طویل بحث و مباحثہ کے بعد جس میں اللہ کی عظیم قدرتوں کا بیان ہوا اور رب کریم کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے ۔ دلوں کے اندر یہ شعور پیدا کیا جاتا ہے کہ اللہ رب عظیم ہے ۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۲۹

سورۃ المعارج - ۷۰

۱ -- تا -- ۴۴

سورۃ المعارج ایک نظر میں

یہ سورت طویل اور سست رفتار نفسیاتی علاج کی ایک کڑی ہے۔ مشرکین کے ذہنوں میں دور جاہلیت کی جو گہری اور پیچیدہ بیماریاں تھیں اور قرآن کریم ان کا علاج کر رہا تھا' یہ اس کی ایک کڑی ہے۔ اور اس میں جاہلیت کی بقایا تاریکیوں اور بیماریوں کی صفائی کی گئی ہے۔ جس طرح یہ مہم اس وقت قرآن کو درپیش تھی' اسی طرح آئندہ بھی تحریک اسلامی کو ایسی ہی مہم درپیش ہو سکتی ہے۔ ہر دور کی جاہلیت کی سطح میں اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن اس کے ظاہری اور پوشیدہ حقائق میں اختلاف نہیں ہوتا۔

غرض یہ ایک نفسیاتی مہم ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسانی نفس کے نشیب و فراز میں جہاں جہاں بھی جاہلیت کے اس قسم کے آثار ہوں اور تہہ بہ تہہ تاریکیاں جمی ہوئی ہوں' ان کی صفائی کر دی جائے اور یہ اس قدر مشکل مہم تھی' جو ان جنگی مہمات' سے زیادہ مشکل تھی' جن میں' بعد کے ادوار میں' مسلمانوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ یہ ذہنی اور نفسیاتی تاریکیاں اور بیماریاں ان سیاسی قوتوں سے زیادہ سخت اور زیادہ دفاع کرنے والی تھیں بلکہ حملہ آور ہونے والی تھیں' جو تحریک اسلامی کی پوری تاریخ میں اس کے خلاف حملہ آور رہیں۔ قدیم زمانے میں بھی اور آج کی جدید تاریخ میں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کو نفسیات اور عقائد و نظریات کے میدان میں جنگ کرنی پڑی۔

اس سورت کا بنیادی موضوع اور اس کا محور عقیدۂ قیامت ہے۔ قیامت کا ثبوت اسے لوگوں کے دل و دماغ میں بٹھانا کہ وہ دن آئے گا' جس میں جزاء و سزا کا عمل ہو گا۔ اور کافروں کو وہ سزا دی جائے گی جس سے قرآن ان کو ڈراتا ہے۔ اس سورت کا ہدف صرف یہی ہے کہ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیا جائے اور نفس انسانی اگر مومن ہو تو وہ بہت مختلف ہوتا ہے اس سے جب وہ کافر ہو۔ چنانچہ یہ سورت نفس مومنہ کی صفات اور علامات بھی بتاتی ہے۔ اور اس کے شعور اور طرز عمل کو بھی بتاتی ہے اور اللہ کے ہاں اس کے استحقاق کو بھی ظاہر کرتی ہے اور نفس امارہ کفارہ کے بارے میں بھی بتاتی ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ اس کے لیے کیا عذاب ہے اور کس قدر ذلت و اہانت ہے۔ اور یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان کی طے کردہ قدریں کیا ہوتی ہیں؟ اور خالق کائنات کی طے شدہ قدریں کیا ہیں؟

یوں یہ سورت انسان کی نفسیاتی بیماریوں کا طویل المدت علاج کرتی ہے۔ نفس انسانی کی دنیا کے نشیب و فراز میں اترتی ہے' اور اس کی کمزوریوں اور بیماریوں کو لیتی ہے اور ان کا علاج کرتی ہے۔ یہ تھا وہ نفسیاتی معرکہ جو اس کتاب نے ایک طویل عرصے تک لڑا اور اس میں یہ کتاب کامیاب رہی' بعد کے ادوار میں مسلمانوں کے لیے پھر میدان معرکہ مشکل نہ تھا کیونکہ قرآن نے اس جنگی میدان میں معرکے سے قبل کفار کو نفسیاتی' دینی اور نظریاتی میدان میں شکست دے دی تھی۔ اور یہ بہت مشکل کام ہوتا ہے' خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ کسی نظریاتی قوت کی پشت پر کوئی مادی قوت نہ ہو۔

جو لوگ قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کے ذہن میں واقعات سیرت بھی مستحضر ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مکہ کے

اندر قرآن کریم کس قوت کے ساتھ عربوں کی نفسیاتی دنیا پر لشکر کشی کر رہا تھا اور کس طرح نفوس کو فتح کر کے ان کو برضا و رغبت اسلامی قیادت کی حلقہ بگوشی تسلیم کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ مکہ مکرمہ میں جب انسان قرآن کی فتوحات پر نظر ڈالتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن انسانی نفسیات پر عجیب عجیب زاویوں سے حملے کرتا تھا اور ان کو فتح کر لیتا تھا۔ کبھی تو قرآن کا انداز یوں ہوتا کہ کسی سورت میں طوفان اور سیلاب کی طرح دلائل اور موثرات آتے ہیں۔ اور جاہلیت کے افکار باطلہ کے خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتے ہیں اور بعض اوقات اندازبیان یوں ہوتا ہے جس طرح ایک غضبناک قوم حملہ آور ہوتی ہے اور جو بھی اس کے سامنے آتا ہے اسے مٹا کر رکھ دیتی ہے۔ یوں قرآن کریم جاہلیت کے آثار اور تصورات کو مٹا دیتا ہے اور بعض اوقات وہ یوں حملہ آور ہوتا ہے کہ گویا وہ کوڑے برسا رہا ہے' جس سے انسانی احساس جل اٹھتا ہے۔ اور انسان ان کی مار کو اور درد کو برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ اور بعض اوقات قرآن کریم کا انداز بہت ہی خوشگوار' محبت آمیز مکالمات سے بھرپور ہوتا ہے اور یہ مکالمات محبت اور ہمدردی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور انسانی شعور اور دل کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات قرآن کی پکار نہایت ہی ہولناک ہوتی ہے۔ سننے والوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ اس چیخ اور زوردار پکار کو سن کر انسان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ محسوس کرتا ہے کہ بہت ہی خطرہ درپیش ہے۔ اور بعض اوقات قرآن کا انداز نہایت سادہ اور صاف ہوتا ہے۔ اور کوئی عقلمند انسان اسے نظرانداز نہیں کر سکتا۔ اور نہ اس میں کوئی جدل و جدال کر سکتا ہے۔ کبھی اس کا انداز نہایت پرامیدی کا ہوتا ہے اور قرآن قاری کو امید کی ایک کرن عطا کرتا ہے' جس سے انسانی شعور میں روشنی اور صبح نو اور تروتازہ فضا کی امید پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی انداز یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسانی مغیبات کی پیچیدہ وادیوں اور اس کے اندرونی نشیب و فراز میں اتر جاتا ہے اور انسان کی داخلی کیفیات کو ایک منظر کی شکل عطا کر دیتا ہے اس طرح کہ انسان اس منظر کو دیکھ کر شرمندگی محسوس کرتا ہے کہ یہ تو میرا راز افشا ہو گیا۔ یوں انسان خود اپنے تاثرات اور اپنے میلانات اور انفعالات سے واقف ہوتا ہے جبکہ اس سے قبل وہ خود اپنے میلانات سے غافل تھا۔ غرض قرآن کریم میں سینکڑوں نیچ' سینکڑوں تنبیہات' سینکڑوں پکاریں' سینکڑوں دلائل ہیں' جو تلاوت قرآن کے دوران سامنے آتے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ قرآن اس فکری اور شعوری میدان جنگ میں کشمکش برپا کیے ہوئے ہے۔ غرض یہ طویل' مسلسل اور پیہم جدوجہد قرآن نے جاری رکھی اور عربوں جیسے معاند دلوں کو شکست دے دی۔

یہ پوری سورت ان کوششوں کا ایک نمونہ ہے جس میں ثبوت آخرت پر بحث ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے متعلقہ موضوعات بھی اس میں لیے گئے ہیں۔

سورہ الحاقہ بھی دراصل ثبوت آخرت ہی کے موضوع پر تھی۔ لیکن سورہ الحاقہ اور اس سورت کے انداز میں بہت فرق ہے۔ اس سورت میں قیام قیامت کے موضوع کو بالکل ایک نئے زاویہ سے لیا گیا ہے۔ اور بالکل جدید رنگ اور جدید انداز اور جدید سائے اور عکس میں!

پچھلی سورہ الحاقہ میں قیامت کے ہولناک اور خوفناک مناظر لیے گئے تھے جنہیں پڑھ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے اور جو مناظر اور حرکات دکھائی گئی تھیں وہ بھی شدید اور خوفناک تھیں۔ مثلاً :

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ (۱۳) وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا

دَكَّةً وَّاحِدَةً (١٤) فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (١٥) وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (١٦) (٦٩ : ١٣ – ١٦) "پھر جب ایک دفعہ صور میں پھونک مار دی جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا' اس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آ جائے گا۔ اس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی۔

اور اسی سورت میں اللہ کی شان کبریائی اور جلالت کو یوں خوفناک انداز میں بیان کیا گیا ہے :

وَّالْمَلَكُ عَلٰى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ (٦٩ : ١٧)

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ (٦٩ : ١٨) (٦٩ : ١٧ – ١٨) "فرشتے اس کے اطراف و جوانب میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ وہ دن ہوگا جب تم لوگ پیش کیے جاؤ گے تمہارا کوئی راز بھی چھپا نہ رہ جائے گا"۔

اسی طرح سورہ الحاقہ میں جو عذاب کے مناظر تھے' وہ بھی نہایت ہولناک تھے۔ یہاں تک کہ عدالت کبریائی کی طرف سے عذاب کے جو احکامات صادر ہوئے' ان کے الفاظ میں بھی شدت صاف صاف نظر آتی ہے۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ (٣٠) ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ (٣١) ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (٣٢) (٦٩ : ٣٠ تا ٣٢) "پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو' پھر اسے جہنم میں جھونک دو' پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو"۔ اور جن لوگوں کو عذاب دیا گیا ان کی چیخ و پکار اور آہ و فغاں میں بھی یہ شدت اور سختی عیاں ہے' زور زور سے آہ و زاری کر رہے ہیں وہ۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ (٢٥) وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ (٢٦) يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ (٢٧) (٦٩ : ٢٥ تا ٢٧) "کاش میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی"۔

رہی یہ سورت تو اس کے تمام مناظر اس کائنات کے بجائے نفس انسانی کے اندر ہیں۔ انسانی نفس کے خدوخال' اس کی علامات' اس کے خلجان' اس کے اقدامات وغیرہ۔ اگر اس میں اس کائنات کا کوئی منظر ہے بھی تو اس کا خوف بھی نفسیاتی دنیا میں ہے۔ ظاہری مناظر میں نہیں ہے۔ یعنی نفس انسانی کے اندر جو ڈر' زلزلہ' خلجان' بھوک اور خوف کی حالت ہوتی ہے' یہاں یوں اس کے اندر محدود ہے۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ (٨) وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (٩) وَلَا يَسْئَلُ

حَمِيْمٌ حَمِيْمًا (۱۰) يُبَصَّرُوْنَهُمْ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ (۱۱) وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ (۱۲) وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُئْوِيْهِ (۱۳) وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ (۱٤) (۷۰: ۸ تا ۱٤) "جس روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون جیسے ہو جائیں گے۔ اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو' اپنی بیوی کو' اپنے بھائی کو' اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا' اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے"۔ یہ سب نفسیاتی اتار چڑھاؤ ہیں۔

اس سورت میں جہنم بھی ایک زندہ نفس کی شکل میں آتی ہے۔ اور وہ تمام زندوں کے احساسات میں شریک ہے۔

كَلَّا اِنَّهَا لَظٰى (۱۵) نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى (۱٦) تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى (۱۷) وَ جَمَعَ فَاَوْعٰى (۱۸) (۷۰: ۱۵ تا ۱۸) "وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہو گی جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی' پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی ہر اس شخص کو' جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا"۔

اس سورت میں جو عذاب مذکور ہے اس کی نوعیت بھی حسی سے زیادہ نفسیاتی ہے۔

يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ (٤۳) خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ (٤٤) (۷۰: ٤۳ – ٤٤) "جب یہ اپنی قبروں سے نکل کر اس طرح دوڑے جا رہے ہوں گے جیسے اپنے بتوں کے استھانوں کی طرف دوڑ رہے ہوں' ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی' ذلت ان پر چھا رہی ہوگی یہ وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے"۔

لہٰذا اس سورت کے مناظر' تصاویر اور سائے سورہ الحاقہ سے اس طرح مختلف ہیں جس طرح دونوں سورتوں کا ماحول اور انداز مختلف ہے۔ لیکن دونوں سورتیں ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہی ہیں۔ یعنی عقیدۂ آخرت اور آخرت کے مناظر۔

یہی وجہ ہے کہ سورہ معارج میں انسانی نفس کے وہ حالات بھی بیان کیے گئے ہیں جو خوشی کی حالت میں ہوتے ہیں اور وہ حالات بھی جو مشکلات میں ہوتے ہیں۔ ایمان کی حالت اور کفر کی حالت۔ اور یہ اس سورت کے نفسیاتی رنگ کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انسان کے نفسیاتی حالات کے بارے میں ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۱۹) اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا (۲۰) وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (۲۱)

الَّا الْمُصَلِّیْنَ (۲۲) الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (۲۳) (۷۰: ۱۹ تا ۲۳) ’’انسان تھڑ دلا پیدا کیا گیا ہے‘ جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں‘ جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں‘‘۔ اور اہل ایمان کی نفسیاتی اور عملی حالت یہ ہے:

الَّا الْمُصَلِّیْنَ (۲۲) الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (۲۳) وَالَّذِیْنَ فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ (۲۴) لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۲۵) وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ (۲۶) وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ (۲۷) اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ (۲۸) وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۹) اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ (۳۰) فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۳۱) وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۳۲) وَالَّذِیْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ (۳۳) وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ (۳۴) اُولٰٓئِكَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّکْرَمُوْنَ (۳۵) (۷۰: ۲۲ تا ۳۵) جو نماز پڑھنے والے ہیں‘ جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں‘ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے‘ جو روز جزا کو برحق مانتے ہیں‘ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو‘ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ـــــ بجز اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے‘ جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں‘ البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں ـــــ‘ جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں‘ جو اپنی گواہیوں میں راست بازی پر قائم رہتے ہیں اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ عزت کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہیں گے‘‘۔

سورہ الحاقہ کا محور اور مضمون یہ تھا کہ اسلامی عقیدہ اور نظریہ کے متعلق فیصلہ کن انداز اختیار کیا جائے اور عقیدۂ آخرت چونکہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقیدے کے ایک جزکی حیثیت سے زیربحث تھا۔ باقی مضامین بھی تھے مثلاً زمین میں مکذبین پر عذاب کا نزول۔ اور سخت گرفت اور یہ کہ اسلامی نظریہ میں اگر کوئی تبدیلی کرتا ہے تو ان کی گرفت۔ لیکن سورہ المعارج کا زیادہ تر مضمون صرف قیامت کے بارے میں ہے۔ وہاں کی جزاء و سزا گویا وہاں آخرت کا مضمون ضمنی اور یہاں اصل محور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو دوسرے مضامین یہاں لائے گئے ہیں‘ وہ براہ راست آخرت سے متعلق ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ اللہ

کے ہاں ایام للہ کا حساب و کتاب کیا ہے اور آخرت کے بارے میں لوگوں کے کیا اندازے ہیں اور للہ کے ہاں اس کی حقیقت کیا ہے؟

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (٤) فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا (٥) اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا (٦) وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا (٧) (٧٠: ٥ تا ٧)

"ملائکہ اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔پس اے نبی ﷺ صبر کرو' شائستہ صبر۔یہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں"۔یہ بھی آخرت سے متعلق حقیقت ہے۔

اسی طرح یہ بات کہ انسانی نفس اگر ایمان رکھتا ہو یا ایمان سے خالی ہو' ان دونوں حالتوں میں فرق کیا ہوتا ہے۔دونوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟

پھر یہ بات کہ کافر دھوکہ کھاتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ جنت میں داخل ہوں گے' حالانکہ للہ کے ہاں ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے اور وہ للہ سے آگے ہوکر کوئی کام نہیں کر سکتے اور نہ للہ کے عذاب سے بچ سکتے ہیں اور یہ بات بھی سورت کے اصلی محور سے متعلق ہے۔

یوں یہ سورت قریب قریب قیامت کے موضوع تک محدود ہے۔اور اسی حقیقت کو لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتی ہے' باوجود اس کے کہ اس کے بیچ متنوع ہیں اور بعض ایسے موضوعات بھی اس میں ہیں جو اصل موضوع کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

اب ہم اس طرف آتے ہیں کہ اس سورت کا ایک خاص انداز تعبیر ہے اور ایک خاص موسیقی اس میں ملحوظ ہے۔سورہ الحاقہ میں تنوع یہ تھا کہ قافیہ ایک ایک پیراگراف میں بدل جاتا تھا۔اور یہ تبدیلی معنوی تبدیلی کے ساتھ ہوتی تھی' لیکن اس سورہ المعارج میں قافیہ اور موسیقی کا تنوع ذرا مزید گہرا ہے۔اس میں جملوں میں موسیقی کے لحاظ سے بھی تنوع ہے اور قافیہ کے لحاظ سے بھی۔اور اس میں جملوں کی ترکیب موسیقی کے زاویہ سے ذرا گہری اور سورت کے پہلے حصے میں خاص طور پر نمایاں ہے۔

آغاز میں تین جملے موسیقی اور قافیہ کے اعتبار سے یکساں ہیں۔جملوں کی طوالت بھی یکساں ہے مثلاً :

سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (١) لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ (٢) مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ (٣) تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (٤) فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا (٥) (٧٠: ١ تا ٥) یہاں پانچویں آیت اور قافیہ میں اس پیراگراف کو جمیلاً کی الف پر ختم کیا گیا ہے۔

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا (٦) وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا (٧٠: ٧) صرف دو فقرے اور خاتمہ الف پر دونوں مرتبہ

اور دوسرے فقرے پر پیراختم ہے۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ (۸) وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (۹) وَ لَا يُسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا (۱۰) (۷۰:۸ تا ۱۰) اس میں داخلی قافیے مختلف ہیں' لیکن تیسرے فقرے پر الف پر پیراختم۔

يُبَصَّرُوْنَهُمْ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ (۱۱) وَصَاحِبَتِهِ وَاَخِيْهِ (۱۲) وَ فَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُئْوِيْهِ (۱۳) وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ (۱۴) كَلَّا اِنَّهَا لَظٰى (۱۵) نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى (۱۶) تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى (۱۷) وَ جَمَعَ فَاَوْعٰى (۱۸) اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۱۹) اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا (۲۰) وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (۲۱) (۷۰:۱۱ تا ۲۱) اس پیرے میں جو چھ مرتبہ الف پر وقف ہے' تین آخری الف کا انداز پہلے تین سے مختلف ہے۔اور اس کے بعد پھر آیات کا خاتمہ میم اور نون پر یا یاء اور نون پر ہوتا ہے۔

سورت کے آغاز میں موسیقی کی متنوع ٹون ہے' یہ ٹون نہایت گہری اور پیچیدہ ہے۔ اور اس کی یہ پیچیدگی' اور اس کا یہ تنوع' موسیقی کا ذوق رکھنے والے کانوں کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔کیونکہ اس کے اندر موسیقی کا وہ حسن ہے جو عربی معاشرے کے ذوق موسیقی کے لیے انوکھا ہے۔اور اس کا ٹون عربی موسیقی کے ٹون سے مختلف ہے لیکن قرآن اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ اسے سہل بناکر عربی ذوق کے سامنے رکھتا ہے اور یہ عربی ذوق اسے قبول کر لیتا ہے۔اگرچہ یہ ٹون اپنی تشکیل کے اعتبار سے بالکل ایک جدید اور گہرا فن ہے اور عربوں کے عادی ذوق موسیقی سے مختلف ہے۔ان گزارشات کو وہ لوگ تو بسہولت سمجھ سکتے ہیں جو کسی قدر اصول موسیقی سے واقف ہیں اور وہ ان باتوں کو سمجھنے میں زیادہ وقت محسوس نہ کریں گے۔ عام لوگوں کے لیے مناسب ہے کہ وہ میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن کی فصل ''التناسق'' کا مطالعہ کریں۔

اب آیات کی تفصیلات اور تفسیر۔

--- ○○○---

درس نمبر ۲۷۰ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۴۴

سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ (۷۰) مَكِّيَّةٌ (۷۹) اٰيَاتُهَا ۴۴ رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ ذِي
الْمَعَارِجِ ﴿۳﴾ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ
اَلْفَ سَنَةٍ ﴿۴﴾ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ﴿۵﴾ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ﴿۶﴾ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ﴿۷﴾
يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ﴿۸﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴿۹﴾ وَلَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ
حَمِيْمًا ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ﴿۱۱﴾
وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ﴿۱۲﴾ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ
ثُمَّ يُنْجِيْهِ ﴿۱۴﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ﴿۱۵﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴿۱۶﴾ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۷﴾
وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے' (وہ عذاب) جو ضرور واقع ہونے والا ہے' کافروں کے لیے ہے' کوئی اسے دفع کرنے والا نہیں' اس خدا کی طرف سے ہے جو عروج کے زینوں کا مالک ہے۔ ملائکہ اور روح اس کے حضور ﷺ چڑھ کر جاتے ہیں۔ ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ پس اے نبی ؐ صبر کرو' شائستہ صبر۔ یہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں"۔ (وہ عذاب اس روز ہو گا) جس روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو

جائے گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون جیسے ہو جائیں گے۔ اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو' اپنی بیوی کو' اپنے بھائی کو' اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا' اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیرات نجات دلا دے۔ وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی' پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی ہر اس شخص کو' جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا"۔

مشرکین عرب کے نزدیک حقیقت آخرت کو سمجھنا نہایت ہی مشکل کام تھا۔ جب حضور اکرم ﷺ نے ان کے سامنے یہ حقیقت پیش فرمائی تو انہوں نے اس کے مقابلے میں سخت نفسیاتی ردعمل کا اظہار کیا۔ یہ لوگ اسے نہایت تعجب انگیز' عجیب و غریب اور ایک خوفناک قسم کا نظریہ سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے بڑی سختی سے اس کا انکار کیا۔ اور مختلف انداز میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو چیلنج کہ آپؐ یہ دن لا کر دکھائیں۔ کبھی کہا اس کا وقت ہی بتا دیں۔

حضرت ابن عباس کی ایک روایت میں آتا ہے کہ جس شخص نے عذاب قیامت لانے کے بارے میں سوال کیا تھا' وہ نضر ابن حارث تھا اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ کفار کی طرف سے سوال تھا کہ لاؤ عذاب اور اللہ نے فرمایا مانگنے کی ضرورت نہیں ہے وہ تو کفار پر آنے ہی والا ہے۔

بہرحال کوئی تھا جس نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ آجائے قیامت اور ہو جائے ان کو عذاب۔ تو اللہ نے فرمایا کہ یہ بہت جلد آنے والا ہے۔ کیونکہ اللہ نے اسے مقدر کر دیا ہے تم اسے بعید سمجھتے ہو' لیکن ہے یہ قریب' اور کوئی اسے دفع نہیں کر سکتا اور نہ روک سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے بارے میں مطالبہ کرنا جبکہ وہ واقع ہونے ہی والا ہے' سوال کرنے والے کی بدنصیبی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ سوال کرنے والا ایک ہو یا بہت سے سوال کرنے والے ہوں' بہرحال سوال کیا گیا تھا۔

کافرین مطلقاً عذاب کے مستحق ہیں' چاہے وہ قیامت کے بارے میں سوال کریں یا نہ کریں اور یہ عذاب وقوع پذیر ہونے والا ہے' اس اللہ کی طرف سے' جو عروج کے زینوں کا مالک ہے' جو ہر قسم کی برتری کا مستحق ہے اور جو بڑے درجوں والا اور صاحب عرش عظیم ہے۔

اس افتتاحی فقرے کے بعد' جس میں عذاب کے موضوع پر فیصلہ کن بات کر دی گئی کہ یہ واقع ہو گا' فلاں فلاں اس کے مستحق ہوں گے' یہ عذاب اللہ کی طرف سے ہو گا' جو نہایت ہی بلند اور قوتوں والا ہے' اور اس کے بارے میں جو فیصلہ ہے وہ نافذ ہونے والا ہے' کوئی قوت اسے رد کرنے والی نہیں ہے۔ یہ فیصلہ عالم بالا کا ہے' اب اس یوم العذاب کی تفصیلات اور اس دن کے واقعات پائے جاتے ہیں' جس کے بارے میں یہ لوگ جلدی مچا رہے ہیں۔ یہ قریب ہے لیکن اللہ کے ہاں زمانوں کا حساب انسانوں کے زمانوں کے حساب سے بہت ہی مختلف ہے۔ اللہ کے اندازوں اور انسانوں کے اندازوں کے درمیان بہت فرق ہے۔ اللہ کے معیار اور انسان کے معیار مختلف ہیں۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (٤)
فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا (٥) اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا (٦) وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا (٧) (٧٠: ٤ تا ٧)

اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے ۔پس اے نبیؐ صبر کرو ' شائستہ صبر ۔یہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں"۔ راجح بات یہ ہے کہ جس دن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ' وہ قیامت کا دن ہے کیونکہ سیاق کلام میں یہ معنی متعین نہیں ہیں ۔اس دن ملائکہ اور روح اللہ کی طرف چڑھتے ہیں اور روح سے مراد راجح روایت کے مطابق حضرت جبرئیل ہیں ۔جیسا کہ دوسرے مقامات پر ان کو اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔ملائکہ کے بعد خصوصاً ان کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اہم مرتبہ ہے اور اس دن کے حوالے سے یہ ذکر کہ ملائکہ اور روح الامین اس دن اوپر جائیں گے ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت ہی اہم دن ہو گا ۔اور اس کی یہ خصوصیت ہوگی ۔ اور وہ اس دن اس کے انتظامات اور معاملات کے بارے میں اوپر جائیں گے اور ہمیں یہ معلوم نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں اللہ نے اس کا مکلف بنایا ہے کہ ہم جانیں کہ ان کی یہ دوڑ دھوپ کن معاملات کے لیے ہوگی اور نہ یہ کہ یہ فرشتے کس طرح چڑھیں گے اور کہاں جائیں گے چڑھ کر؟ یہ عالم غیب سے متعلق امور ہیں اور اس آیت کے مفہوم میں ان سے کوئی اضافہ نہیں ہو گا ۔اور کوئی دلیل بھی ہمارے پاس نہیں ہے ۔بس یہ کہ وہ بہت ہی اہم دن ہو گا ' جس میں اس قدر اہم لوگ بہت ہی زیادہ مشغول ہوں گے ۔

رہی یہ تعبیر۔

كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (۷۰ : ۴) تو اس سے مراد طویل زمانہ بھی ہو سکتا ہے اور عربی اسالیب میں یہ استعمال عام ہے ' اور اس سے مراد کوئی متعین وقت بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فی الواقعہ دنیا کے سالوں کی طرح یہ پچاس ہزار سال کا ایک طویل دن ہو ۔ہمارے زمانے میں یہ حقیقت قریب الفہم ہو گئی ہے کیونکہ ہمارا دن تو زمین کی گردش محوری سے بنتا ہے اور یہ گردش چوبیس گھنٹوں میں مکمل ہو جاتی ہے اور ایسے ستارے بھی ہیں جن کی گردش محوری ہمارے اس ستارے زمین کی گردش سے کئی ہزار گنا زیادہ وقت میں مکمل ہوتی ہے ۔اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ گویا ستر ہزار سالوں یا پچاس ہزار سالوں سے مراد کوئی متعین زمانہ ہے بلکہ اس سے مراد ایک معیار ہے اللہ کے معیاروں میں سے ۔

اور اللہ کے ایام میں سے ایک دن اگر پچاس ہزار سال کے برابر ہے تو قیامت کے عذاب کو یہ لوگ جو دور دیکھتے ہیں ' وہ اللہ کے نزدیک قریب ہے ۔یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ آپ صبر جمیل سے کام لیں اور ان کی تکذیب اور عذاب آخرت کے بارے میں شتابی سے پریشان نہ ہوں ۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا (۵) إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا (۶) وَنَرَاهُ قَرِيبًا (۷) (۷۰ : ۵ تا ۷)

"پس صبر کرو شائستہ صبر ' یہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں"۔ صبر کی ہدایت پر دعوت ہر داعی کو دی جاتی رہی ہے ۔ ہر رسول کو یہی ہدایت کی گئی کہ صبر کریں اور رسولوں کے متبعین مومنین کو بھی صبر جمیل کی ہدایت کی گئی ۔ یہ راہ جس قدر دشوار گزار ہے اور یہ دعوت جس قدر بھاری ہے ' اور اس میں کمزور نفس انسانی کو لغزشوں سے بچانے کی جس قدر ضرورت ہے ' اس کی اہمیت عیاں ہے کیونکہ اسلامی انقلاب کا ہدف دور نظر آتا ہے اور مقصد اور منزل

افق میں بہت دور اور بلندی پر ہوتی ہے۔

صبر جمیل سے مراد وہ صبر ہے جس سے صبر کرنے والا مطمئن ہو' اس کے دوران صبر کرنے والا مصیبت' بے چینی اور شک کا احساس نہ رکھتا ہو۔ اسے یقین ہو کہ اس کے ساتھ جو وعدہ کیا گیا ہے وہ سچا ہے۔ صبر کرنے والے کی کیفیت یہ ہو کہ اس کا انجام بہتر ہونے والا ہے' جو اللہ کی تقدیر پر راضی ہو اور جو ابتلاء آرہی ہے' وہ یقین رکھتا ہو کہ اس میں حکمت الٰہی مضمر ہے۔ اور صبر کرنے والا یہ سمجھتا ہو کہ جو مصیبت بھی اس پر آتی ہے وہ اللہ کی طرف سے آرہی ہے۔ اور اسے اس کا اجر دیا جائے گا۔

یہی وہ صبر ہے جسے صبر جمیل کہا گیا ہے۔ اور یہی صبر ایک داعی کو زیب دیتا ہے کیونکہ وہ اللہ کی طرف بلاتا ہے' اللہ کی دعوت دیتا ہے۔ اس میں اس کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس دعوت کے ساتھ اس کے ذاتی مفادات وابستہ نہیں۔ اس لیے اس پر جو مصائب آرہے ہیں وہ اللہ کی راہ میں ہیں اور اس کے بارے میں جو فیصلے ہوتے ہیں وہ اللہ کے فیصلے ہیں۔ اس لیے صبر جمیل وہ ہے جو حقیقت پسندانہ اور شائستہ ہو۔ اور اس صبر کرنے والے کو ان امور کا گہرا شعور ہو۔

یہ دعوت جس کے مقابلے میں مکذبین کھڑے ہو جاتے ہیں' اور اس کی راہ روکتے ہیں' یہ اللہ کی دعوت ہے اور قیامت جس کی وہ تکذیب کرتے ہیں اور اس کے برپا ہونے کے لیے جلدی مچاتے ہیں۔ یہ بھی اس کی دعوت ہے اور وہی ہے جو اپنی تدبیر اور حکمت کے مطابق اس کے قیام کے وقت کا تعین کرتا ہے۔ لیکن لوگ اس تدبیر اور تقدیر کو سمجھ نہیں پاتے۔ اور جلدی مچاتے ہیں۔ اور جب وقت زیادہ گزر جائے تو وہ اس میں شک کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو خود داعی سخت بے چینی محسوس کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں بھی یہ رغبت اور خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ اللہ کا وعدہ جلدی ہی سامنے آجائے اور ایسے ہی اوقات میں داعی کو ایسی ہدایت کی جاتی ہے۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا (۷۰ : ۵) "صبر کرو' شائستہ صبر"۔

یہاں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے' تاکہ آپ کا قلب مبارک مخالفت اور تکذیب کے دکھ کو برداشت کرلے۔ اور اس کے ساتھ دوسری حقیقت کو سمجھ لے کہ واقعات و معاملات کے پیمانے اللہ کے ہاں اور ہوتے ہیں اور لوگوں کے ہاں اور۔

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا وَّنَرٰهُ قَرِيبًا (۷۰ : ۷) "یہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں"۔ اس کے بعد اس دن کے مناظر پیش کیے جاتے ہیں' جس میں واقع ہونے والا عذاب آئے گا' جسے وہ بعید سمجھتے ہیں اور اللہ اسے قریب سمجھتا ہے یہ مناظر اس کائنات میں ہیں اور انسان کی نفسیاتی دنیا کے اندر بھی۔ یہ اس قدر ہولناک ہوں گے کہ انسان کے اوسان خطا ہو جائیں گے اور اس کائنات اور نفس انسانی کے اندر زلزلہ برپا ہو گا۔

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ (۸) وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (۷۰ : ۹) "جس روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون جیسے ہو جائیں گے"۔ مہل کے معنی ہیں خام معدنیات کو پگھلانا مثلاً تیل کی تلچھٹ' اور العہن کے معنی ہیں اون کا منقش کپڑا۔ قرآن کریم مختلف مقامات میں یہ

اطلاع دیتا ہے کہ اس دن عظیم واقعات رونما ہوں گے ۔ ان کی وجہ سے اس دنیا کے اجرام فلکی کی موجودہ حالت نہیں رہے گی ۔ ان کے اوصاف ' حالات اور شکل بدل جائے گی اور ان میں سے ایک یہ آسمان یوں ہو جائے گا جس طرح پگھلی ہوئی معدنیات ۔ اور جو لوگ علوم طبعیہ پر تحقیقات کرتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ ان آیات پر غور کریں ۔ ان کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ تمام فلکی اجرام دراصل پگھلے ہوئے مادے سے منجمد ہوئے ہیں ' یہاں تک کہ یہ مادہ گیس کی شکل میں تھا اور گیس کا درجہ پگھلنے اور سیال ہونے کی حالت کے بھی بعد آتا ہے ۔ شاید یہ تمام مادہ قیامت کے دن بجھ جائے گا ۔ جس طرح کہا گیا ۔

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ "اور جب ستارے تاریک ہو جائیں گے " ۔ اور ٹھنڈے ہو کر سیال ہو جائیں گے ' یوں ان کی گیس کی طبیعت میں تبدیلی ہو جائے گی ۔

بہرحال یہ تو ایک احتمال ہے اور اس زاویہ سے تحقیقات کرنے والوں کی دلچسپی اس میں ہو سکتی ہے ۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تو اس بات پر ایمان رکھتے ہیں جو آیت کا مفہوم ہے ۔ اور جس میں یہ خوفناک نقشہ کھینچا گیا ہے کہ آسمان پگھلے ہوئے مواد کی طرح ہوں گے ۔ اور پہاڑ دھنکے ہوئے متلون اون کی طرح ہوں گے ۔ اور نہایت ہی خوفناک منظر ہو گا جس کی تعبیر قرآن اس خوفناک الفاظ میں کر رہا ہے ۔

وَلَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا (۱۰) يُبَصَّرُوْنَهُمْ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ (۱۱) وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ (۱۲) وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُئْوِيْهِ (۱۳) وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ (۱٤) (۷۰: ۱۰ تا ۱٤) کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے ۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو ' اپنی بیوی کو ' اپنے بھائی کو ' اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا ' اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے " ۔

لوگ اس دن نہایت پریشان ہوں گے اور ہر ایک کو اپنی پڑی ہو گی ۔ کوئی شخص اپنے سوا کسی دوسرے کی طرف ملتفت ہونے کا موقعہ نہ پائے گا ۔ اور اس کے شعور میں کسی غیر کے لیے کوئی وسعت نہ ہو گی ' جگری دوست بھی جگری دوست کو نہ پوچھے گا ' ایک مدہوش کر دینے والا خوف ہو گا اور اس کی وجہ سے لوگوں کے تمام روابط منقطع ہوں گے اور ہر شخص اپنے مسائل اور اپنی پریشانی میں گھرا ہو گا ۔ وہ ایک دوسرے پر پیش کیے جائیں گے اور ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے اور عمداً ایسا کیا جائے گا لیکن ہر کسی کو اپنی پڑی ہو گی ۔ ہر ضمیر کا اپنا شغل ہو گا ۔ لہٰذا دوست دوست کو نہ پوچھے گا ' نہ کوئی کسی سے مدد طلب کر سکے گا ۔

اور مجرم کا حال کیا ہو گا ؟ اس کی جان خوف کے ہاتھ میں ہو گی ۔ اس کا احساس ہی جاتا رہے گا اور وہ اس دن کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنی عزیز ترین متاع دینے کے لیے تیار ہو گا ۔ جبکہ اس زندگی میں وہ اس متاع پر

جان چھڑ کتا تھا' اور اس کی پوری زندگی ان کے لیے تھی - مثلاً اولاد' بیوی' بھائی' خاندان جو حامی و مددگار ہوتا ہے - بلکہ اس دن اپنی جان کو بچانے کے لیے تو وہ اس پوری دنیا کے اموال و اقتدار کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گا' کہ کسی طرح نجات پا جائے - رنج و الم کی یہ کس قدر بھیانک تصویر ہے - یہ شخص نیم مدہوش ہے اور پوری کائنات بخشنے کے لیے تیار ہے - یہ انداز تعبیر قرآن کے ساتھ مخصوص ہے -

یہ ہے مجرم کی حالت' یہ ہیں اس کی تمنائیں کہ اس حالت میں وہ ایسے حالات دیکھتا ہے کہ امید کی آخری چنگاری بھی بجھ جاتی ہے' جھوٹی تمنائیں ختم ہو جاتی ہیں اور اصل اور حقیقی صورت حالات سامنے آتی ہے -

كَلَّا اِنَّهَا لَظٰى (۱۵) نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى (۱٦) تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى (۱۷) وَ جَمَعَ فَاَوْعٰى (۱۸) (۷۰: ۱۵ تا ۱۸) "ہرگز نہیں' وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہو گی جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی' پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی ہر اس شخص کو' جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا" - یہ ایک منظر ہے کہ جسے دیکھ کر انسان کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں جبکہ اس منظر سے قبل رنج و الم کی وجہ سے یہ مدہوش تھا - کلا' یہ نہایت سختی سے تردید اور جھڑکی کا لفظ ہے - ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا - یہ باطل خواہشات ہیں کہ کوئی بیٹوں' بیوی' خاوند' بھائی' بہن اور خاندان اور روئے زمین کی جائیداد کا فدیہ دے سکے گا' ہرگز نہیں -

اِنَّهَا لَظٰى (۷۰: ۱۵) "وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہو گی" -

نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى (۷۰: ۱٦) "جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی" - چہرے اور سر کے گوشت کو' اور پھر یہ بلا کی شکل میں ہو گی - زندہ چلتی ہوئی - اور اس خوفناکی میں وہ قصداً اضافہ کر رہی ہو گی -

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى (۱۷) وَ جَمَعَ فَاَوْعٰى (۷۰: ۱۸) "پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی ہر اس شخص کو جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا" - یہ اس کو اسی طرح بلائے گی جس طرح اسے اس سے قبل دنیا میں راہ ہدایت کی طرف بلایا جاتا تھا - اور یہ پیٹھ پھیر کر چلا جاتا تھا - لیکن آج جبکہ اسے یہ بلا رہی ہے تو اس قابل نہیں ہے کہ پیٹھ پھیر کر چلا جائے - اس سے قبل یہ دعوت اسلامی کے مقابلے میں مال جمع کرنے میں لگا ہوا تھا اور اس مال کو وہ برتنوں اور تجوریوں میں محفوظ کر کے رکھتا تھا - اور آج یہ دعوت بلائے جہنم کی طرف سے ہے - نہ یہ اسے رد کر سکتا ہے نہ مال دے کر جان کو چھڑا سکتا ہے -

اس سورت' اس سے پہلی سورت اور سورہ قلم میں بھی تاکید اس بات کی تھی کہ ان کے جرم میں یہ بات بھی شامل تھی یہ لوگ مال جمع کرتے تھے اور مساکین کے کھانے پر لوگوں کو نہ ابھارتے تھے - یعنی کفر' شرک اور تکذیب کے ساتھ ساتھ ان کا یہ جرم بھی تھا - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر' گمراہی اور تکذیب کے ساتھ ساتھ مکہ میں تحریک کو یہ مشکل بھی درپیش تھی کہ لوگ بخیل تھے اور دولت پرست تھے اور غریبوں کا خیال نہ رکھتے تھے - اس لیے بار بار ان امور کی طرف بھی اشارہ کیا کہ فقیروں' مسکینوں کو نظر انداز کرنا اور بہت زیادہ دولت پرست و مادہ پرست ہونا موجب عذاب ہے -

اس سورت میں دوسرے اشارات بھی ہیں جن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت دعوت اسلامی کا آغاز جس کی معاشرے میں ہوا تھا' اس کے خدوخال کیا تھے ۔ یہ ایک ایسا معاشرہ تھا جس میں لوگ مال و دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے ۔ تجارت اور سود خواری ہر طرف پھیلی ہوئی تھی ۔ قریش کے سردار تجارتی کوٹھیوں کے مالک تھے اور ہر ایک کے اپنے اپنے قافلے ہوتے تھے ۔ جو یہ گرمیوں اور سردیوں میں چلاتے تھے ۔ دولت پر لوگ ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے تھے ۔ ہر شخص بے حد بخیل تھا ۔ فقراء اور مساکین محروم تھے ۔ یتیم اور لاچار بھوکے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاشی ناہمواری کو دور کرنے کے لیے قرآن کریم نے بار بار تکرار احکامات صادر کیے' بار بار حرص کی مذمت کی ۔ انسانی نفوس کے اندر اتر کر بخل اور حرص کو جڑوں سے نکالا ۔ اور یہ کام اسلام نے فتح سے قبل نظریاتی طور پر کیا اور فتح کے بعد عملی طور پر کیا ۔ مثلاً ربا کی ممانعت کی گئی ۔ لوگوں کے اموال باطل طریقوں سے کھانے کی ممانعت کی گئی ۔ یتیموں کے مال کے کھانے کو آگ کھانا بتایا گیا' اور یتیموں کے مال میں اسراف سے اور ظلم سے روکا گیا ۔ یتیموں کے نکاح کو اس لیے روکنے کی ممانعت کی گئی کہ ان کا مال کھاتے رہیں یا یتیم لڑکیوں کے ساتھ نکاح کرنے کی رغبت اس لیے رکھی جائے کہ ان کا مال ہڑپ کر لیں ۔ غرض جو اقدامات' ہدایات اور تنبیہات کی گئیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لوگوں کی معاشی صورت حالات کیا تھی اور یہ کہ اسلام کی ابدی معاشی پالیسی کیا ہے ۔ کسی اسلامی معاشرے کے لیے دائمی ہدایات یہی ہیں کہ بخل' حسد اور حرص سے بچو اور مادیت اور دولت کے بندھنوں سے اپنے آپ کو آزاد کرو اور یہ پالیسی پورے قرآن میں جاری رکھی گئی ۔

--- ! ! ! ---

اس سے قبل قیامت کے ہولناک مناظر دکھائے جا چکے' خوف اور عذاب کی صورت میں ۔ اب بتایا جاتا ہے کہ خوشی اور غم کے مختلف مواقع پر نفس انسانی کا ردعمل کیسا ہوتا ہے ۔ ایمان کی حالت میں انسان مختلف حالات کے مقابلے میں کیا ردعمل کرتا ہے اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ایمان کی حالت میں ردعمل کیا ہوتا ہے ۔ اور ایمان نہ ہونے کی صورت میں کیا ہوتا ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ مومنین کا انجام کیا ہے اور کافرین کا انجام کیا ہے؟

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿١٩﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿٢٠﴾ وَّ اِذَا
مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿٢١﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿٢٢﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿٢٣﴾
وَ الَّذِيْنَ فِيْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ﴿٢٥﴾ وَ الَّذِيْنَ
يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٢٦﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿٢٧﴾
اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿٢٨﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿٢٩﴾ اِلَّا
عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى

وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ
رٰعُوْنَ ﴿٣٢﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ
٣٥ ع يُحَافِظُوْنَ ﴿٣٤﴾ اُولٰٓئِكَ فِىْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٣٥﴾

"انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے 'جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں' جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے' جو روز جزا کو برحق مانتے ہیں' جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو' جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں بجز اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے 'جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں' البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں ' جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں' جو اپنی گواہیوں میں راست بازی پر قائم رہتے ہیں اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ عزت کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہیں گے"۔

"اس" انسان کی تصویر ذرا دیکھئے' یہ ایمان سے محروم انسان ہے۔ قرآن کریم اس کی کس قدر سچی تصویر کھینچتا ہے۔ اور اس تصویر میں ایک غیر مومن انسان کے خدوخال اور فیچرز کس قدر نمایاں ہیں۔ ان تمام خدوخال سے انسان تب ہی محفوظ ہوتا ہے' جب وہ مومن ہوتا ہی۔ ایک مومن پر اگر کوئی مصیبت آ جائے تو وہ صبر جمیل کا پیکر ہوتا ہے اور مطمئن ہوتا ہے۔ جزع وفزع سے دور' اور اگر اسے خوشحالی نصیب ہو تو وہ نہ بخل کرتا ہے نہ اتراتا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (١٩) اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا (٢٠) وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (٢١) (٧٠: ١٩ تا ٢١) "انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے' جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے"۔ یوں نظر آتا ہے کہ ایک ایک لفظ مصور قدرت کا ایک رنگ ہے اور وہ انسان کے چہرے اور اس کی خصوصیات کو صاف بتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ جب انسان یہ نہایت ہی مختصر سی تین آیات پڑھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان میں چند ہی کلمات استعمال ہوئے ہیں' تو اسے ایمان سے خالی انسان کی **ایک** نہایت چمکدار اور واضح تصویر نظر آتی ہے۔ اس کے تمام فیچرز نمایاں ہیں۔ ھلوع' جزوع اور منوع اس انسان کو اگر کوئی مصیبت پیش آ جائے یا حقائق حیات کا کوئی ڈنک لگ جائے تو یہ آہ و فغاں کرنے لگتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ بس وہ اب اسی حالت میں رہے گا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اب تو وہ ہمیشہ کے لئے اس مصیبت میں پھنس گیا ہے' اور کوئی نہیں ہے جو اس کو اس مصیبت سے نکال دے۔ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ گویا مصیبت کی یہ گھڑی دائمی ہے۔ اس وقت یہ شخص اوہام میں بندھ جاتا ہے اور مصیبت اور مشقت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس کے تصور میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ اس مشکل کے بعد کوئی آسانی بھی آ سکتی ہے۔ وہ اللہ سے کسی قسم کی رحمت اور مہربانی کا امیدوار نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ جزع فزع اس کو کھا جاتی ہے۔ اس کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور اس صورت کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک قوی ذات کی

پناہ میں نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی مضبوط سہارا نہیں ہوتا' جس سے اس کو کوئی امید ہے۔ اور اس کے برعکس اگر وہ خوشحال ہو' عافیت میں ہو' تو وہ نیکی کا کوئی کام کرنے سے رکنے والا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ سہولیات اس کو اس کی محنت اور مشقت کی وجہ سے حاصل ہیں' اس لیے یہ ان کو اپنے لیے مخصوص کر لیتا ہے' اپنی ذات کے لیے چھپا لیتا ہے اور بلکہ یہ اپنی مملوکات کا غلام ہو جاتا ہے۔ اور اپنی جائیداد اور مال پر مرمٹنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اسے معلوم نہیں ہے کہ رزق کی حقیقت کیا ہے اور یہ کہ رزق کے ملنے میں خود انسان کا کردار کیا ہے۔ یہ شخص یہ امید نہیں رکھتا کہ اگر دنیا میں وہ خرچ کر دے تو اللہ کے ہاں اسے اس سے بھی زیادہ بہتر رزق ملے گا۔ تو یہ شخص جس کا دل ایمان سے خالی ہے' دونوں حالتوں میں تھڑدلا ہے۔ حالت خیر میں بھی اور حالت شر میں بھی۔ یہ ایک انسان کی بہت ہی بری تصویر ہے۔ لیکن اس انسان کی جس کا دل نور ایمانی سے خالی ہو۔

لہٰذا اللہ پر ایمان لانا دراصل بڑا اہم مسئلہ ہے۔ یہ محض ایک لفظ نہیں ہے جو زبان سے ادا کر دیا جائے۔ اور نہ ہی یہ چند مذہبی رسومات عبادات سے متعلق ہے۔

یہ دراصل ایک نفسیاتی حالت ہے اور یہ ایک مکمل نظام حیات ہے اور حالات و واقعات کے لیے یہ ایک معیار ہے۔ اور انسان کا دل اگر ایمان سے خالی ہو جائے تو وہ اس قدر ہلکا ہو جاتا ہے جس طرح پرندوں کا ایک پر جسے ہوا کے جھونکے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر اڑا کر گھماتے ہیں اس کا کوئی وزن اور پیمانہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کا انسان ہمیشہ قلق اور خوف کا شکار رہتا ہے۔ اگر اسے کسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑے تو وہ جزع فزع کرتا ہے۔ اگر اسے کوئی بھلائی نصیب ہو تو بخیل ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس کا ظرف ایمان سے بھرا ہوا ہو' تو وہ نہایت اطمینان' عافیت میں ہوتا ہے' اس لیے کہ اس کا ربط ایک حقیقی سرچشمے سے ہوتا ہے۔ جہاں سے تمام واقعات و حالات کنٹرول ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی تقدیر پر مطمئن ہوتا ہے' چاہے خیر ہو یا شر ہو۔ اگر خیر ہو تو وہ مطمئن ہوتا ہے۔ اللہ کی رحمت کا شعور رکھتا ہے۔ اللہ کی آزمائشوں میں وہ ہمیشہ شمع امید روشن رکھتا ہے۔ کہ مشکل کے بعد آسانی آتی ہے۔ وہ امید رکھتا ہے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی آتی ہے۔ اسے اگر خیر ملتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کچھ فرائض ہیں۔ اس کے لیے خرچ کرتا ہے اور اسے اس کی جزاء آخرت میں ملے گی۔ بلکہ دنیا و آخرت دونوں میں اسے جزاء ملے گی۔ لہٰذا ایمان دنیا میں ایک ایسی کمائی ہے جس کی جزاء آخرت میں ملے گی اور اس کی وجہ سے انسان کو راحت' اطمینان اور ثبات و قرار ملتا ہے۔ اور پوری زندگی میں وہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اہل ایمان کو اس صورت حال سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ پھر ان کی صفات کیا ہیں۔ انسان کی ان عام صفات سے جن کا اوپر ذکر ہوا' ایک مومن کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔ مثلاً :

إِلَّا الْمُصَلِّينَ (٢٢) الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ (٢٣) (٧٠ : ٢٢ تا ٢٣)

"مگر وہ لوگ جو نماز پڑھنے والے ہیں' جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں"۔ نماز بنیادی طور پر رکن اسلام اور علامت ایمان ہے' لیکن اس کی حکمت یہ ہے کہ یہ درحقیقت للہ کے ساتھ ذریعہ اتصال ہے۔ اور یہ ایک ایسے تعلق کا مظہر ہے جس میں صرف بندہ اور اس کا رب آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ بندہ مقام بندگی کے اعلیٰ مرتبے پر اور رب تعالیٰ مقام ربوبیت اور معبودیت کے اعلیٰ مرتبے پر ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ ایمان کی صفت دائمہ صلوٰۃ ہے۔

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (۷۰: ۲۳) "جو اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں"۔ نماز کے ساتھ تسلسل اور دوام ایک لازمی صفت ہے۔ گذے دار قسم کی نماز 'سستی سے پڑھی جانے والی نماز مکمل نماز نہیں ہے۔ نماز کے بارے میں سستی 'ست روی اور غفلت سخت معیوب ہے۔ نماز چونکہ بندے اور رب کے درمیان رابطہ ہے اس لیے اس میں دوام لابدی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کوئی عبادت کرتے تو آپ اس پر دوام اختیار فرماتے۔ حدیث شریف میں ہے "اللہ کے نزدیک اعمال میں سے محبوب ترین عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے۔ اگرچہ وہ قلیل ہو" لہٰذا اللہ کے ساتھ تعلق کا یہ مقدس رابطہ دائمی ہونا چاہئے۔ اسے مزاج نہ ہونا چاہئے کہ کبھی ہو اور کبھی نہ ہو۔ جس طرح جی نے چاہا کر لیا۔

وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ (۲۴) لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۲۵) (۷۰: ۲۴ ۔ ۲۵) "جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے"۔ یہ خصوصاً زکوٰۃ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ صدقات جو معلوم اور متعین ہیں 'وہ مومنین کے اموال میں غرباء کا حق ہیں اور "حق معلوم" کا اس سے بھی زیادہ جامع مفہوم یہ ہے کہ وہ خود اپنے اموال میں ایک متعین حق سائلین کے لیے مقرر کرتے ہیں اور وہ اپنے جذبے سے کہتے ہیں کہ یہ ان کا حق ہے۔ اس طرح وہ بخل اور کنجوسی کے جذبہ پر قابو پاتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ شعور ابھرتا ہے کہ اہل معاشرہ پر ناداروں کے حوالے سے ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ خصوصاً اسلامی امت تو باہم متکافل امت ہے۔ سائل وہ ہے جو سوال کرتا ہے اور محرم وہ نادار جو سوال نہیں کرتا۔ اور اپنی ضرورت کا اظہار کسی کے سامنے نہیں کرتا 'یوں وہ محروم رہتا ہے۔ یا محروم وہ شخص ہے جس پر کوئی مصیبت آئی ہو اور اسے نعمتوں سے محروم کر دیا گیا ہو اور اس نے سوال کرنے سے اجتناب کیا ہو۔ یہ شعور کہ محتاجوں اور محروم لوگوں کا بھی دولت میں حصہ ہے ایک زاویہ سے تو اللہ کے فضل کا شعور ہے اور دوسری جانب سے انسانی اخوت کا شعور ہے جبکہ نفسیاتی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بخل اور کنجوسی کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور یہ ایک اجتماعی ضمانت میں بھی ہے۔ لہٰذا معاشرے کے مالی حقوق ادا کرنے میں بہت فائدے ہیں۔ غرض زکوٰۃ و صدقات میں نفسانی 'ذاتی اور معاشرتی فائدے ہیں۔ اور یہاں اس کا ذکر انسان کے نفسیاتی علاج کے حوالے سے ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۷۰: ۲۶) "جو روز جزاء کو برحق مانتے ہیں"۔ یہ صفت تو اس سورت کے محور سے براہ راست متعلق ہے 'کیونکہ سورت کا محور اور موضوع قیامت ہے۔ لیکن یہاں ان آیات میں ایک مومن کی نفسیاتی حالت سے بحث ہے۔ قیامت کی تصدیق ایمانیات کا اہم حصہ ہے اور کسی نظام زندگی کی تشکیل میں اس کا شعوری اور عملی اثر ہوتا ہے کیونکہ جو شخص قیامت کی تصدیق کرتا ہے اس کی قدریں اور پیمانے اور ہوتے ہیں اور جو قیامت کی تصدیق نہیں کرتا یا اس کے بارے میں شک میں ہوتا ہے 'اس کی قدریں بالکل جدا ہوتی ہیں 'چاہے ان کا تعلق نظریات سے ہو یا اعمال سے ہو یا زندگی کے اہم حادثات سے ہو۔

قیامت پر یقین رکھنے والا آسمانوں (خدا) کے میزان اور نظام کے مطابق کام کرتا ہے۔ وہ آخرت کے حساب و کتاب کے لیے تیاری کرتا ہے۔ صرف دنیا پر نظریں مرکوز نہیں کرتا۔ اور اسے زندگی میں جن حادثات اور جن واقعات

سے دوچار ہونا پڑے خواہ اچھے ہوں یا برے 'اس کے بارے میں اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ یہ تو دنیا کے عارضی حالات ہیں ' اصل جہان تو اور ہے ۔ لہٰذا وہ اپنی قیامت کو درست کرتا ہے اور جو آخرت کی تکذیب کرتا ہے اس کا سب کچھ اسی دنیا کے لئے ہوتا ہے ۔

اگر وہ یہاں کسی چیز سے محروم ہو گیا تو اس کے نزدیک گویا وہ سب چیزوں سے محروم ہو گیا ۔کیونکہ اس کی تمام سرگرمیاں اس جہاں کے لیے ہوتی ہیں ۔ چنانچہ اس کے حساب و کتاب کے پیمانے مختلف ہوتے ہیں اور وہ ہر معاملے میں ایک غلط نتیجے تک پہنچتا ہے ۔اور وہ اپنے آپ کو اس محدود دنیا کے مختصر وقت کے اندر محدود کر دیتا ہے ۔چنانچہ یہ بدبخت ' مسکین ' ہروقت عذاب میں مبتلا اور قلق میں گرفتار ہوتا ہے ۔کیونکہ اس دنیا کے بارے میں اس کے تمام اندازے غلط ہوتے ہیں ۔وہ کبھی مطمئن اور خوش نہیں ہوتا ۔کبھی عادلانہ اور منصفانہ فیصلے نہیں کرتا ۔اس لیے کہ اس کے فیصلے دنیا کے محدود دائرے میں محدود ہوتے ہیں ' لہٰذا یہ خود بھی پریشان ہوتا ہے اور اپنے ماحول کو بھی پریشان کرتا ہے ۔ آزردہ دل آزردہ کند انجمنے را..... غرض وہ اس دنیا میں بھی کوئی اعلیٰ اقدار پر مشتمل زندگی نہیں پاتا ۔یہی وجہ ہے کہ اسلام میں یوم الاخرت پر یقین کو اسلامی نظریہ حیات کا جز بنایا گیا ہے ۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ (۲۷) اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ (۲۸) (۷۰:۲۷ - ۲۸) "جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو" ۔مجرد تصدیق قیامت سے یہ ایک آگے کا درجہ ہے ۔یہ قیامت کے بارے میں زیادہ حساسیت اور اللہ کی نگہبانی کا تازہ احساس اور اللہ کے دربار میں تقصیر کا شعور ہے اور زیادہ عبادت گزاری ہے ۔ اور یہ خوف ہے کہ کسی وقت بھی اللہ کا عذاب آسکتا ہے ۔اس لیے ایسے لوگوں کے سامنے ہروقت غضب الٰہی کا خوف رہتا ہے اور وہ اللہ کی حمایت اور بچاؤ کے طلبگار رہتے ہیں ۔

حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے عذاب سے خوف کھاتے تھے ۔ حالانکہ اللہ کے نزدیک آپ کا جو مرتبہ تھا ' وہ معلوم ہے اور آپ کو اچھی طرح معلوم بھی تھا کہ آپ برگزیدہ ہیں اور اللہ کی آپ پر مہربانیاں ہیں ۔چنانچہ آپ کو یہ یقین تھا کہ صرف اللہ کا فضل ہی آپ کو جنت میں داخل کر سکتا ہے ۔اس لیے آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا "کسی کا عمل اسے ہرگز جنت میں داخل نہیں کر سکتا" ۔اس پر صحابہ کرام ﷺ نے پوچھا رسول اللہ کیا آپ پر بھی اسی اصول کا اطلاق ہے ؟" آپ نے فرمایا :"اور میں بھی !الا یہ کہ اللہ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے" ۔(بخاری ومسلم)

اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ (۷۰:۲۸) "کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو" ۔اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ اللہ کے عذاب سے ہروقت ڈرتے رہنا چاہئے ۔اور اس سے کسی لحظ بھی غافل نہیں ہونا چاہئے ۔بعض اوقات غفلت کے اوقات میں ایسے امور سرزد ہو جاتے ہیں جو سبب عذاب ہوتے ہیں ۔ لہٰذا غفلت بہت ہی خطرناک ہے ۔اور اللہ کی غرض بھی یہ ہے کہ لوگ ہروقت حساس رہیں اور بیدار رہیں ۔اور اس کے باوجود اگر ان سے کوئی کمزوری سرزد ہوگئی ہو تو اللہ کی رحمت وسیع ہے اور اس کی مغفرت حاضر ہے ۔اور توبہ کا دروازہ

کھلا ہے وہ بند نہیں ہے ۔ یہ ہے اسلام کا سیدھا موقف ' جو غفلت اور قلق کے درمیان درمیان ہے کہ انسان کا دل اللہ سے مربوط بھی رہے اور وہ ڈرتا بھی رہے اور اس کی رحمت کا امیدوار بھی رہے ۔ اور اس کی رحمت پر مطمئن بھی رہے ۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۹) اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ (۳۰) فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ

(۳۱) (۷۰ : ۲۹ تا ۳۱) "جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔۔۔ بجز اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے ' جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں ' البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں "۔ اس سے غرض نفس انسانی اور انسانی سوسائٹی کی طہارت ہے ۔ اسلام ایک پاک و صاف سوسائٹی کی تشکیل چاہتا ہے ۔ ایک ایسی سوسائٹی جس کی ہر بات کھلی ہو یا صریح ہو ۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں تمام فرائض حیات ادا کیے جاتے ہوں ' جس میں فطری میلانات کی تشفی ہوتی ہو ' لیکن اس طرح نہ ہوں کہ فطری حاجات پورا کرنے کے لیے کوئی بے حیائی کا ارتکاب کرے اور یا پیچیدہ اور خفیہ طریقوں سے غلطیوں کا ارتکاب کیا جائے ۔ اسلام ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرتا ہے جو قانونی اصولوں پر ایک جائز خاندان کی تشکیل سے اٹھتا ہے ' جس میں میاں بیوی کا تعلق علانیہ ہوتا ہے اور جس کے واضح حدود و قیود ہوتے ہیں ۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں ہر بچے کو پتہ ہو کہ اس کا باپ کون ہے ' جس میں کسی بچے کی ولادت کسی کے لیے شرمندگی کا باعث نہ ہو ۔ ایک ایسا معاشرہ جس کے افراد کے چہروں پر شرم و حیاء کا پردہ ہو ' لیکن اس میں جنسی تعلقات نہایت پاک ہوں ۔ مستقل اساسوں پر ہوں ' بامقصد ہوں اور یہ تعلقات اس لیے ہوں کہ فریقین ایک انسانی فریضہ بھی پورا کرتے ہوں ۔ محض شہوت رانی مقصد نہ ہو ' یعنی آنے والی نسلوں کے حوالے سے فریقین اپنے فرائض بھی پورے کرتے ہوں ۔

قرآن کریم مومنین کی صفات میں یہ ذکر فرماتا ہے کہ ۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۹) اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ (۳۰) فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۳۱)

(۷۰ : ۲۹ تا ۳۱) "جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔۔۔ بجز اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے ' جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں ' البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں "۔

لہٰذا وہ اپنی بیویوں اور اپنی مملوکہ لونڈیوں کے ساتھ پاکیزہ تعلق قائم کر سکتے ہیں اور یہ تعلق پاکیزہ بھی ہو اور قانونی بھی ہو ۔ اور اسلام لونڈیوں کا واحد قانون راستہ اس طرح تجویز کرتا ہے کہ جو عورتیں جنگی قیدی کے طور پر آئیں اور ان کو فدیہ اور احسان کے طور پر چھوڑنے کا فیصلہ اسلامی حکومت نے نہ کیا ہو ۔ اس سلسلے میں سورہ محمد کی یہ

آیت اصول طے کرتی ہے :

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰی اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا "پس جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو' اس کے بعد احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کرو تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے"۔

لیکن بعض اوقات کسی قیدی کا تبادلہ نہیں ہوتا' فدیہ بھی نہیں ملتا' اور حکومت اسلامی بطور احسان چھوڑنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی تو اس صورت میں قیدی مرد یا عورت غلام ہوں گے جب تک دوسرا فریق مسلمان قیدیوں کو غلام بناتا ہے۔ اگرچہ دشمن قوم غلامی کا کوئی اور نام رکھ دے۔ یوں اس ناگزیر صورت میں اسلام نے لونڈیوں کے ساتھ صرف ان کے مالکوں کو معاشرت کی اجازت دی ہے اور ان غلاموں کی آزادی کا بندوبست اسلام نے پھر ان صورتوں میں کسی ایک کے ذریعے کیا جو اس نے غلاموں کی آزادی کے لیے تجویز کیں۔ غلاموں کی آزادی کا بندوبست قرآن نے متعدد ذرائع سے کیا۔ اس طرح اسلام نے قیدی عورتوں کو معاشرے میں کھپانے کا ایک واضح بندوبست کیا تاکہ وہ معاشرے کے اندر شتر بے مہار کی طرح پھر کر گندگی نہ پھیلائیں' یوں ان کو معاشرے میں آزاد کر دیا جائے کہ جو چاہیں کریں۔

فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۷۰: ۳۱) "البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں"۔ یوں اسلام ہر قسم کی جنسی گندگی کے سامنے یہ بند باندھ دیتا ہے۔ ان دو واضح صورتوں کے علاوہ جنسی تعلق حرام ہے۔ اسلام نفس جنسی تعلق میں کوئی گندگی محسوس نہیں کرتا لیکن ان دو جائز صورتوں کے علاوہ سب تعلقات کو حرام قرار دیتا ہے۔ اسلام ایک صاف ستھرا اور واضح اور کھلا معاشرتی نظام چاہتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۷۰: ۳۲) "جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں"۔ یہ وہ اخلاقی قدریں ہیں جن پر اسلام اپنے معاشرے کی بنیاد اٹھاتا ہے۔ معاشرے میں امانتوں کی رعایت و حفاظت اور عہد کی حفاظت کا تصور اس امانت کبریٰ کی رعایت اور حفاظت سے اٹھتا ہے جو اللہ نے زمین اور پہاڑوں پر پیش کی۔ اور انہوں نے اس امانت کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا اور یہ انکار اس خوف کی وجہ سے ہوا کہ یہ بہت بڑا بھاری بوجھ ہے' لیکن انسان نے اسے اٹھا لیا۔ یہ تھی' اسلامی نظریہ حیات کی امانت۔ عقیدۂ توحید کی امانت اور یہ انسان نے اختیاراً قبول کی' مجبوراً نہیں۔ یہ امانت جو انسانوں نے قبول کی جب وہ اپنے والد کی پشت میں تھے اور اس پر وہ گواہ ہوئے اور ان کی پیدائش اس پر گواہ ہوئی' اسی امانت و دیانت سے یہ لازم آیا کہ دنیا میں تمام عہد پورے کرو' چنانچہ اسلام نے عہد پورا کرنے میں بہت سختی سے کام لیا اور اس کی تاکیدات کی گئیں تاکہ اسلامی معاشرہ نہایت ہی پختہ اصولوں پر قائم ہو۔ اور امانت و دیانت اور رعایت عہد کو نفس مومنہ کی خصوصیت قرار دیا اور خیانت اور وعدہ خلافی کفار کی صفت قرار دیا۔ اور اس کو قرآن کریم میں بار بار دہرایا اور تاکیدات فرمائیں تاکہ اس میں شک نہ رہے کہ امانت اور وفائے عہد

اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔

وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ (۷۰ : ۳۳) "جو اپنی گواہیوں میں راست بازی پر قائم رہتے ہیں"۔ اللہ نے ادائے شہادت کے ساتھ بے شمار حقوق وابستہ کیے ہیں۔ بلکہ شہادت پر اللہ کی حدود کا قیام موقوف ہے۔ اگر شہادت قائم نہ ہو تو حدود قائم نہیں ہو سکتیں۔ یہ کہ کسی کو شہادت ادا نہ کرنے کا گناہ نہ کرنا چاہئے اور جب کسی سے شہادت مانگی جائے تو وہ اسے کبھی بھی نہ چھپائے۔ اور شہادت کو صحیح طرح ادا کرنا چاہیے اس میں ادھر ادھر کی بات نہیں کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شہادت کو اس شخص کی شہادت قرار دیا ہے تاکہ اسے اللہ کی اطاعت کے ساتھ واسطہ کیا جائے۔ دوسری جگہ ہے:

وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ "اور شہادت اللہ کے لیے قائم کرو"۔ اور یہاں اسے صفات مومنین میں سے ایک صفت قرار دیا۔ اور یہ شہادت بھی امانات میں سے ایک امانت ہے یہاں اسے علیحدہ بھی ذکر کیا کیونکہ یہ بہت اہم فریضہ ہے۔

اور صفات مومنین کا آغاز بھی نماز سے اور خاتمہ بھی نماز سے۔

وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۷۰ : ۳۴) "جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں"۔ صفات مومنین کے آغاز میں جو صفت بیان کی گئی تھی' وہاں کہا تھا کہ وہ نماز پر دوام اختیار کرتے ہیں اور یہاں ذکر ہے کہ وہ نماز کی حفاظت کرتے ہیں یعنی نماز کے فرائض' اس کے اوقات' اس کے سنن' اس کی ہیئت اور اس کی روح کی حفاظت کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ اسے مکمل طور پر اور سستی کر کے نہیں ادا کرتے۔ اور اسے یوں ضائع نہیں کرتے کہ صحیح طرح نہ پڑھیں اور آغاز و انجام دونوں جگہ نماز کا ذکر کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام میں نماز کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ اسی پر مومنین کی صفات ختم ہوتی ہیں۔

اب یہاں ان کا انجام بھی دیا جاتا ہے جبکہ دوسرے فریق کا انجام اس سے قبل بتا دیا گیا تھا۔

اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ (۷۰ : ۳۵) "یہ لوگ عزت کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہیں گے"۔ یہ مختصر ترین آیت حسی مزے اور معنوی مزے دونوں کو ایک جگہ جمع کر دیتی ہے۔ یہ باغات میں ہوں گے اور باعزت طور پر ہوں گے۔ یوں لذت بھی پائیں گے اور عزت بھی پائیں گے۔ اور یہ ان کے ایمان ایقان اور نیکی کی وجہ سے' ان کا امتیاز ہو گا۔

اب آخر میں دعوت اسلامی کا ایک منظر۔ یہ مکی منظر ہے۔ ایک جگہ رسول کریم ﷺ کھڑے دعوت دے رہے ہیں۔ قرآن پڑھ رہے ہیں اور مشرکین ہر طرف سے امنڈتے چلے آ رہے ہیں:

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿٣٦﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿٣٧﴾

"پس اے نبیؐ کیا بات ہے کہ یہ منکرین دائیں اور بائیں سے گروہ در گروہ تمہاری طرف دوڑے چلے آرہے ہیں؟"

مُھْطِعٖ اس شخص کو کہتے ہیں جو گردن لمبی کرتے ہوئے تیز تیز چلتا ہے ۔ گویا رسی گلے میں ڈال کر کھینچا جا رہا ہو' اور عزین جمع عزہ کی اور اس کا وزن اور معنی دونوں لفظ ۔

فئة کی طرح ہے 'یعنی گروہ ۔ اس میں ان کی اس مشکوک حرکت پر ایک مزاح بھی ہے اور اس ہیئت اور حرکت کی ایک تصویر بھی ۔ ان پر تعجب کیا جاتا ہے اور ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف اس لیے نہیں بھاگ رہے کہ آپ کی باتیں سنیں یا آپ سے ہدایات لیں ۔ بلکہ وہ نہایت حواس باختہ انداز میں معلوم کرنے کے لیے دوڑتے ہیں کہ آپ ؐ کیا کہتے ہیں اور پھر واپس بھاگتے ہیں ۔ اور اپنے اپنے ہاں جا کر حلقوں میں بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ .... آپؐ کے خلاف کیا سازشیں کریں؟

أَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ ﴿٣٨﴾

"کیا ان میں سے ہر ایک یہ لالچ رکھتا ہے کہ وہ نعمت بھری جنت میں داخل کر دیا جائے گا"۔ اور وہ اپنے موجودہ حال میں ہوتے ہوئے بھی جنتی ہوں گے بلکہ ایسے مجرمین تو آگ کی لپیٹ میں ہوں گے ۔ شاید یہ لوگ اپنے آپ کو اللہ کے نزدیک کوئی بڑی چیز سمجھتے ہیں ۔ اس لیے یہ کفر کرتے ہی ۔ رسول اللہ ﷺ کو اذیت بھی دیتے ہیں ۔ قرآن سنتے ہیں اور پھر خفیہ سازشیں کرتے ہیں اور پھر بھی یہ توقع کرتے ہیں کہ جنت نعیم میں داخل ہوں گے اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے نزدیک بڑی چیز سمجھتے ہیں ۔

كَلَّا ۖ إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّمَّا يَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾

"ہرگز نہیں' ہم نے جس چیز سے ان کو پیدا کیا ہے اسے یہ خود جانتے ہیں"۔ یعنی ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ان کی اس تمنا اور خوش فہمی کو نہایت حقارت کے ساتھ رد کیا جاتا ہے ۔ ان کو معلوم ہے کہ ہم نے ان کو ایک حقیر پانی کی بوند سے پیدا کیا ہے ۔ قرآن کریم ان کو اپنی اصل حقیقت سے آگاہ کرتا ہے ۔ یوں ان کے اندر جو کبر و غرور اور تکبر و علو تھا اسے ملیامیٹ کر دیا جاتا ہے اور ان کے غرور کی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے ۔ اور یہ صرف ایک لفظ کے ذریعہ ۔ ایک اشارہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم نے ان کو کس چیز سے پیدا کیا ہے ۔ انسان کی کمزوری' ناتوانی اور بے وزنی کی بہترین تصویر ہے ۔ تعجب کیا جاتا ہے کہ یہ کس طرح یہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں جبکہ ان کے افعال ایسے ہیں ۔ پھر وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں ۔ ان کو دیکھنا چاہئے کہ ان کے مدارج تخلیق کیا ہیں ۔ اللہ کے ہاں ان کی اہمیت' ان کے اس کفر کی وجہ سے' مچھر کے برابر بھی نہیں ہے ان کو تو ان کے کفر کی وجہ سے جہنم کی آگ کی لپیٹ میں جانا ہے ۔ یہ کس طرح اللہ کی نعمتوں کی توقع کرتے ہیں ۔

ان کے معاملے کو غیر اہم سمجھتے ہوئے اور ان کی اہمیت کو کم دکھاتے ہوئے اور ان کی بڑائی کے بت توڑتے ہوئے اللہ اپنے اس فیصلے کا اعلان کرتا ہے کہ اگر یہ ہدایت نہیں حاصل کرتے تو اللہ ان کے مقابلے میں اچھے لوگوں کو پیدا کر دے گا ۔ یہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ اپنے اسی انجام تک جا پہنچیں گے جس کے وہ مستحق ہیں ۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾

"پس میں قسم نہیں کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی' ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور کوئی ہم سے بازی لے جانے والا نہیں ہے"۔

اس معاملے پر قسم اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ مشرقوں اور مغربوں کے رب کی طرف اشارہ کر کے اللہ کی عظمت کو بتایا گیا۔ مشارق و مغارب سے کبھی تو ستاروں کے مقامات طلوع مراد ہوتے ہیں جو بہت زیادہ ہیں جو اس طویل و عریض کائنات میں بہت زیادہ ہیں اور اس سے یہ مفہوم بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ وہ مشرق جو مختلف علاقوں میں مسلسل آتے رہتے ہیں اور یہ مشرق بروقت رہتے ہیں کیونکہ جب زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے تو دنیا کی کوئی نہ کوئی جگہ مشرق ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی جگہ مغرب ہوتی ہے۔

بہرحال مشارق و مغارب کا جو مفہوم بھی ہو' اس سے اس کائنات کی ضخامت معلوم ہوتی ہے۔ اور خالق کائنات کی عظمت کا تصور ابھرتا ہے۔ کیا ان بے وقعت و بے قیمت لوگوں کا معاملہ' جن کو ہم نے جس چیز سے پیدا کیا ہے اسے یہ جانتے ہیں' اس بات کا محتاج ہے کہ رب المشارق اور رب المغارب کے نام کی قسم اٹھائی جائے۔ جبکہ وہ ان جیسے دوسرے لوگ اٹھانے پر قادر ہے۔ اور وہ اس کے مقابلے میں نہیں آ سکتے' اس سے بچ نہیں سکتے۔ اس سے کہیں بھاگ نہیں سکتے۔

--- ○○○ ---

جب سیاق کلام اس مقطع تک پہنچتا ہے اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ قیامت کا عذاب کس قدر ہولناک ہے اور اس دن کافروں کی کیا ذلت ہوگی اور مومنین کی کیا عزت ہوگی' تو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف روئے سخن پھر جاتی ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں اور ان لوگوں کو چھوڑ دیں کہ وہ اسی دن کے عذاب کے لیے آگے بڑھیں۔ اس موقعہ پر پھر اس عذاب کے منظر کو یہاں بیان کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ کس قدر کربناک منظر ہے یہ۔

فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِىْ
۲ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾
۹ ع خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِىْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾
۸

"لہذا انہیں اپنی بیہودہ باتوں اور اپنے کھیل میں پڑا رہنے دو یہاں تک کہ یہ اپنے اس دن کو پہنچ جائیں جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے' جب یہ اپنی قبروں سے نکل کر اس طرح دوڑے جا رہے ہوں گے جیسے اپنے بتوں کے استھانوں کی طرف دوڑ رہے ہیں' ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی' ذلت ان پر چھا رہی ہوگی۔ وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے"۔

آپ ؑ کو کہا جاتا ہے کہ یہ نہایت بے وقعت لوگ ہیں اور ان کا انجام نہایت ہی خوفناک ہے ۔ چنانچہ قیامت کے دن ان کے حال اور کسمپری کا جو نقشہ کھینچا جاتا ہے وہ اپنی جگہ بہت ہی خوفناک ہے جبکہ اسی نقشہ کشی اور تصویر سازی میں حقارت آمیزی اور مضحکہ خیزی کے رنگ بھرے ہوئے ہیں اور یہ اس حال کے جواب میں ہے جس میں یہاں دنیا میں یہ لوگ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے تھے ۔

یہ لوگ جب قبروں سے نکلیں گے ' تو گھبراہٹ میں اس تیزی سے بھاگیں گے جیسے یہ اپنے آستانوں کی طرف بھاگ رہے ہوں ۔ دنیا میں جس طرح ان کی چال ہوتی تھی اس کی طرف تہکمانہ اور توہین آمیز اشارہ ہے ۔ یہ اپنے میلوں ٹھیلوں میں استھانوں کی طرف بھاگا کرتے تھے ۔ اور ان بتوں کے گرد جمع ہوتے تھے ۔ یہ لوگ آج بھی تیزی سے بھاگ رہے ہیں لیکن اس بھگدڑ اور اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔

اس کے بعد ان کی حالت کی تصویر یوں کھینچی جاتی ہے :

خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ (۷۰ : ۴۴) "ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی ' ذلت ان پر چھا رہی ہو گی" ۔ ان الفاظ سے ان کی ہیئت کذائی کی خوب تصویر کھینچی گئی ہے ۔ اور وہ نہایت تھکے ماندے اور ذلیل و خوار نظر آتے ہیں ۔ اس سے قبل دنیا میں ان کی دوڑ دھوپ 'سستی اور کھیل کو دکی تھی اور اب یہ ذلیل و خوار ہو کر ادھرادھر بھاگ رہے ہیں ۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِىْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ (۷۰ : ۴۴) "یہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا تھا" ۔ اور یہ اس میں شک کرتے تھے ' تکذیب کرتے تھے اور جلدی مچاتے تھے ۔

یوں سورت کا آغاز اور انجام ایک ہو جاتا ہے ۔ اور بعث بعد الموت کے مسئلہ کا یہ حلقہ بھی اپنے اختتام کو پہنچتا ہے ۔ اور یوں زندگی کے جاہلی تصور اور اسلامی تصور کے مابین یہ معرکہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے ۔

--- ००० ---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۲۹

سورہ نوح - ۷۱

۱ -- تا -- ۲۸

سورۂ نوح ایک نظر میں

یہ پوری سورت حضرت نوح علیہ السلام کے قصے پر مشتمل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ آپ کے ساتھ آپ کی قوم نے کیا سلوک کیا۔ یہ قصہ دعوت دین کا کام کرنے والوں کے لیے ایک تجربہ ہے کہ دیکھو کبھی یوں بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی انسانیت پر ایسا دور بھی آتا ہے اور خیر و شر' ہدایت و ضلالت اور حق و باطل کی دائمی کشمکش کے اندر بھی خیر' ہدایت اور حق کو ایسے حالات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

اس سورت میں ایک ایسی انسانی سوسائٹی کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو حد درجہ ہٹ دھرم' گمراہ اور باطل پرست ہے۔ لوگ پوری طرح گمراہ قیادت کی گرفت میں ہیں اور یہ قیادت حد درجہ متکبر' حق سے منہ موڑنے والی' دلائل ایمان اور معجزات حق پر توجہ نہ کرنے والی ہے۔ حالانکہ یہ معجزات ان کے نفوس اور آفاق کائنات کے اندر جابجا بکھرے پڑے تھے۔ یہ نشانات و معجزات اس کائنات کی کھلی کتاب میں موجود تھے اور نفس انسانی کی خفیہ کتاب کے اوراق کے اندر بکھرے پڑے تھے۔

یہ سورت رحمت الہیہ کے مختلف نمونوں میں سے ایک واضح نمونہ بھی ہے' جس سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس انسان پر کس قدر مہربان ہے کہ وہ محض اپنے فضل و کرم کی وجہ سے اس انسان کو راہ ہدایت دکھانے کے لیے پے درپے رسولان کرام کو بھیجتا رہا ہے۔ جبکہ یہ انسان ہمیشہ گمراہ قیادت کی اطاعت کو پسند کرتا رہا ہے۔ ایک ایسی قیادت کا گرویدہ ہوتا رہا ہے۔ جو گمراہ کرتی ہے' گمراہ کنندہ ہوتی ہے اور ہدایت و سچائی کو قبول کرنا اپنی توہین سمجھتی ہے۔

یہ سورت تھکا دینے والی جدوجہد' ناقابل برداشت بوجھ' صبر جمیل اور جہد مسلسل اور اپنے نظریہ پر اصرار کا ایک بہترین نمونہ بھی پیش کرتی ہے کہ انبیائے کرام نے اس گم کشتہ راہ' ضدی اور معاند انسانیت کو راہ راست پر لانے کے لیے کس قدر ان تھک جدوجہد کی جبکہ اس جدوجہد کے نتیجے میں وہ اپنے لیے کچھ نہ چاہتے تھے۔ نہ وہ ان لوگوں سے کوئی اجر طلب کرتے تھے جو ہدایت پاتے تھے' وہ نہ کوئی انعام چاہتے تھے اور نہ کوئی شکرانہ وصول کرتے تھے۔ نہ وہ کوئی فیس یا تنخواہ وصول کرتے تھے جو بالعموم معلمین وصول کرتے ہیں' یا جس طرح مدارس' جامعات اور اداروں کے کارکن وصول کرتے ہیں۔ جس طرح دور جدید کا رواج ہے اور قدیم زمانوں میں بھی یہ معاوضہ کسی نہ کسی صورت میں ہوا کرتا تھا۔

حضرت نوح علیہ السلام رب تعالیٰ کے سامنے اپنی ساڑھے نو سو سال کی جدوجہد کی جو رپورٹ پیش کرتے ہیں وہ اس تھکا دینے والی جدوجہد اور اعصاب شکن محنت کی اچھی تصویر ہے۔ نیز وہ اس میں ان کی قوم کی ہٹ دھرمی' عناد' ضال و مضل قیادت کی اطاعت اور اقتدار پرستی کی بھی اچھی تصویر کشی کرتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں :

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا (۵) فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا

(٦) وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا (٧) ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا (٨) ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا (٩) فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا (١٠) یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا (١١) وَّیُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَیَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّیَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (١٢) مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (١٣) وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (١٤) اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (١٥) وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (١٦) وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (١٧) ثُمَّ یُعِیْدُكُمْ فِیْهَا وَیُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا (١٨) وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا (١٩) لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا (٢٠) (٧١: ٥ تا ٢٠) اس نے عرض کیا ”اے میرے رب' میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انھیں معاف کر دے' انھوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔ میں نے کہا ”اپنے رب سے معافی مانگو' بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا' تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا' تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کر دے گا۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے؟ حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمھیں بنایا ہے۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟ اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا' پھر وہ تمھیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکایک تم کو نکال کھڑا کرے گا۔ اور اللہ نے زمین کو تمھارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو“۔

اس جہد مسلسل' اس بے مثال اصرار اور دعوت' اس ثابت قدمی کے ساتھ طویل تبلیغ کے بعد' انھوں نے فرمایا:

رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا (٢١) وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا (٢٢) وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا (٢٣) وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا (٢٤) (٧١: ٢١ تا ٢٤) ”میرے

رب' انہوں نے میری بات رد کر دی اور ان (رئیسوں) کی پیروی کی جو مال اور اولاد پاکر اور زیادہ نامراد ہو گئے ہیں ۔ ان لوگوں نے بڑا بھاری مکر کا جال پھیلا رکھا ہے ۔ انہوں نے کہا ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو' اور نہ چھوڑو ود اور سواع کو' اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو ۔ انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے"۔ بے شک یہ نہایت ہی تلخ حاصل تھا اور نہایت ہی کڑوا پھل تھا' مگر وہ یہ محنت ساڑھے نو سو سال تک کرتے رہے ۔ یہ کیونکہ ایک رسول کا فریضہ تھا ۔ یہ انہیں ادا کرنا تو تھا ہی ۔

حضرت نوح علیہ السلام کے اس تلخ تجربہ کی روئیداد نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے پیش کی جا رہی ہے کیونکہ دعوت اسلامی کا فریضہ اب قیامت تک آپ کے سپرد کر دیا گیا ہے اور پورے کرۂ ارض کے حوالے سے یہ فریضہ آپ کے حوالے کیا گیا ہے ۔ یہ سب سے بڑا فریضہ ہے جو کبھی کسی رسول کے حوالے کیا گیا ۔ حضور ﷺ دیکھ رہے تھے کہ آپ کے ایک بھائی نے کس قدر طویل جدوجہد کی اور اس کرۂ ارض پر ایمان کا دیا روشن کرنے کے لیے کس قدر جدوجہد کی اور لوگوں نے اس دعوت کے مقابلے میں کس قدر اندھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا ۔ کس طرح دنیا کی گمراہ لیڈر شپ نے ہدایت یافتہ لیڈر شپ کو مغلوب کر دیا ۔ اور لوگوں کے عناد اور گمراہی کے باوجود کس طرح اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے مسلسل رسول بھیجے ۔ اور نوح علیہ السلام کے بعد' جو آدم ثانی ہیں' یہ سلسلہ چلتا ہی رہا ۔

اور یہ روئیداد مکہ میں اٹھنے والی جماعت مسلمہ کے سامنے بھی پیش کی جا رہی ہے کہ اب قیامت تک یہ امت اس دعوت کی وارث ہو گی ۔ اس دعوت کے خطوط پر جو منہاج زندگی قائم ہو گا اور جس طرح یہ نظام اس وقت کی جاہلیت کے بالمقابل پیش ہو رہا ہے' اسی طرح آئندہ بھی ہر جاہلیت کے مقابلے میں قائم کرنا ہو گا تاکہ امت مسلمہ دیکھے اور سمجھے کہ اس نے اس راہ میں کس قدر جدوجہد کرنی ہے ۔ اس نے اپنی اس دعوت پر کس طرح اصرار کرنا ہے' کس قدر ثابت قدمی دکھانی ہے' اس طرح جس طرح آدم ثانی حضرت نوح علیہ السلام نے دکھائی ۔ نیز وہ یہ سبق بھی لے کہ مومنین کی قلیل تعداد پر اللہ ہمیشہ نظر کرم رکھتا ہے اور کس طرح ان کو ایک مکمل تباہی کے طوفان سے بچانے کا انتظام کرتا ہے ۔

نیز مشرکین مکہ کو بھی یہ بتانا مقصود ہے کہ ذرا غور کریں کہ ان کے اسلاف مکذبین کا انجام کیا ہوا اور اللہ کی اس عظیم نعمت پر غور کریں کہ اللہ نے تمہارے لیے ایک نہایت ہی رؤف و رحیم رسول بھیجا' جو حضرت نوح علیہ السلام کی طرح تمہاری ہلاکت اور بربادی کی دعا نہیں کرتا' اس لیے کہ اللہ کے نظام قضا و قدر نے تمہیں ایک وقت تک مہلت دے دی ہے اور یہ تم پر بہت بڑی رحمت ہے کہ تمہارے نبی نوح علیہ السلام کی طرح تمہارے خلاف بددعا نہیں کرتے اور جس طرح اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام کو دعا سکھائی تھی ایسی کوئی ہدایت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو نہیں کی گئی ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے تو یہ بددعا فرمائی ۔

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا (۷۱ : ۲۴) "اور تو ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے"۔ اور مزید فرمایا :

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا (۲۶) اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (۲۷) (۷۱ : ۲۶ - ۲۷) "اور نوح نے کہا ـــــ "" میرے رب' ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ ۔ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ

تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا' بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا"۔

انسانی تاریخ میں دعوت اسلامی کی اس کڑی کی روئیداد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعوت اسلامی کے اصول اور فروع اور جڑیں ایک رہی ہیں۔ ایک ہی بنیاد پر یہ نظریہ مبنی رہا ہے۔ اور اس کی جڑیں انسانی تاریخ میں گہری ہیں اور یہ عمارت ایک مستقل اور نہایت متعین بنیادوں پر استوار رہا ہے۔ پھر یہ نظریہ اس پوری کائنات کے نظام' اس پوری کائنات میں جاری اللہ کے نظام قضا و قدر اور اللہ کے ارادے اور مشیت سے مربوط ہے۔ یہ باتیں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت سے صاف ظاہر ہوتی ہیں۔ حضرت نوح ؑ فرماتے ہیں :

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۲) اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ (۳) يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۴) (۷۱ : ۲ تا ۴) "اس نے کہا' اے میری قوم کے لوگو' میں تمہارے لیے ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا (پیغمبر) ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو' اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آ جاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا' کاش تمہیں اس کا علم ہو"۔

اور حضرت نوح علیہ السلام کی ایک دوسری تقریر کو یوں نقل کیا گیا ہے :

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (۱۳) وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (۱۴) اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (۱۵) وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (۱۶) وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (۱۷) ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا (۱۸) وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا (۱۹) لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا (۲۰) (۷۱ : ۱۳ تا ۲۰) "تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے؟ حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟ اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا' پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکایک تم کو نکال کھڑا کرے گا۔ اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو"۔

یہ باتیں مسلمانوں کے شعور میں بٹھانے کی اہمیت یہ ہے کہ وہ اپنی دعوت کی نوعیت کو سمجھ جائیں' ان کو اپنا نظریاتی شجرۂ نسب معلوم ہو جائے اور وہ یہ جان لیں کہ تاریخ انسانیت میں ان کے قافلے کی اہمیت کیا ہے۔ اور انہوں نے اس دعوت اور

اس دعوت پر مبنی نظام کے قیام کے لیے کیا کچھ کرتا ہے اور یہ کہ یہ دعوت اللہ کا منہاج قدیم ہے جس کے لیے تمام پیغمبروں نے کام کیا ہے ۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے ۔

جب انسان تمام رسولوں کی جدوجہد ' اس انتھک جدوجہد کی روئیداد پر غور کرتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے ' اور وہ کانپ اٹھتا ہے کہ رسولان کرام کی طویل جدوجہد کے نتیجے میں کیا تبدیلی آئی؟ نظر تو یہی آتا ہے کہ انسانیت نے بے راہ روی ہی اختیار کی اور رسولوں کے ساتھ سخت عناد کیا ۔ اور مان کر نہ دیا لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا اور ایک کے بعد ایک رسول آتا رہا ' یہ کیوں؟

ایک انسان یہ سوال کر سکتا ہے کہ آیا اس طویل جدوجہد اور اس کے نتائج کے درمیان کوئی نسبت ہے؟ جو حضرت نوح علیہ السلام سے چلی اور چلتے چلتے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جاری رہی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ ؐ کی امت کے مختلف لوگ بھی یہ جدوجہد کرتے رہے اور اس سلسلے میں ناقابل تصور قربانیاں دی جاتی رہیں ' تو کیا اس عظیم جدوجہد اور اس کے نتائج کے درمیان کوئی توازن اور نسبت ہے؟

اوروں کو تو چھوڑیے ' کیا خود حضرت نوح علیہ السلام کی جدوجہد جس کی تفصیلات اس سورت میں دی گئی ہیں اور دوسری سورتوں میں بھی اس کی روئیداد موجود ہے کہ آپ نے نہایت ہی طویل عرصہ تک یہ جدوجہد فرمائی اور اس میں قوم نوح نے کفر اور نافرمانی ہی پر اکتفاء نہ کیا بلکہ وہ آپ کا مذاق بھی اڑاتے رہے ' بلکہ مذاق کے علاوہ بہتان تراشی بھی کرتے رہے اور آپ تھے کہ صبر اور نیکی اور اعلیٰ شائستہ آداب اور نہایت ہی دلسوز انداز بیان کے ذریعہ اپنا کام رکھتے رہے ۔

ازمنہ قدیمہ سے ' یہ جہد مسلسل ' یہ ناقابل تصور قربانیاں جاری ہیں ۔ ایک کے بعد ایک رسول آتا ہے ۔ اس کا انکار ہوتا ہے ' مذاق اڑایا جاتا ہے ' بعض کو آگ میں جلایا جاتا ہے ' بعض کو آروں کے ساتھ چیرا جاتا ہے ' بعض کو اپنے گھروں سے اور اپنے ملک سے نکالا جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ آخری رسالت آجاتی ہے ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی طرح جدوجہد کرتے رہے ہیں ' جس کا مفصل ریکارڈ قرآن و سنت و سیرت میں موجود ہے ۔ اس کے بعد امت میں مصلحین اور مجددین آتے ہیں ۔ اور وہ بے حد جدوجہد کرتے ہیں ' ہر ملک اور ہر سرزمین تک پہنچتے ہیں ۔ ہر دور اور ہر زمانے میں جہد مسلسل اور دعوت جاری رہتی ہے ۔

کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس جہاد اور سعی اور ان تھک محنتوں اور کاوشوں کے مطابق نتائج نکلے ہیں؟ اور کیا انسانیت جس نے ان عظیم مساعی کی ناقدری کی اور اب بھی کر رہی ہے ' یہ انسانیت اس بات کی مستحق تھی کہ اللہ اس پر اس قدر کرم کرتا؟ یا کیا اب بھی لوگ اس کے مستحق ہیں کہ یہ جدوجہد جاری رکھی جائے ' لوگوں کے انکار ' ناقدری اور مسلسل روگردانی کے باوجود کیا یہ مناسب ہے کہ اللہ ان پر اسی طرح رحمتیں کرتا چلا جائے ' اس ناشکرے ' حقیر ' چھوٹے کیڑے پر ' جسے انسان کہا جاتا ہے؟

ہاں یقیناً ان سب سوالات کا جواب اثبات میں ہے اور بلاجدل و جدال اور بغیر کسی شک و شبہ کے اثبات میں ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ زمین کے اوپر ایمان کی حقیقت کا قائم ہو جانا ' اس پوری جدوجہد ' اس مسلسل صبر ' اس ان تھک محنت اور ان بے مثال قربانیوں کے برابر ہے ۔ تمام انبیاء اور ان کے متبعین نے اس سلسلے میں جو مساعی کیں ' خواہ جس زمان و مکان میں بھی کیں ' حقیقت ایمان کا قیام ان کا مناسب حاصل ہے ۔ بلکہ حقیقت ایمان کا قیام ان تمام مساعی سے زیادہ قیمتی ہے ' بلکہ اس کی قدروقیمت اس پوری کائنات سے زیادہ ہے ۔ یہ پوری کائنات جس کے اندر اس زمین کی وہی حیثیت ہے جو

ہماری اس زمین کی فضا میں اڑنے والے ایک ذرے کی بمقابلہ اس زمین کے ہے۔ایسا ذرہ جسے کوئی محسوس ہی نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ اس انسانی مخلوق کو متعین خصائص عطا کیے جائیں اور اس نظام کو اس کے ضمیر میں بٹھا دیا جائے اور اس کی زندگی میں قائم کر دیا جائے اور یہ قیام خود اسی کے ہاتھوں سے ہو۔اور اللہ انسان کو ایسا کرنے کی توفیق دے اور اس کی مدد کرے۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ اللہ نے اس مخلوق کو یہ خصوصیات کیوں عطا کیں۔اور کیوں اللہ نے انسان کو یہ خصوصیت دی کہ وہ اپنی جدوجہد اور اپنے ارادے سے اپنی ذات میں بھی حقیقت ایمان پیدا کرے اور دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے وہ جو نظام زندگی اختیار کرے 'اس میں بھی اس حقیقت کو قائم کرے اور اللہ نے انسان کو اس طرح نہیں پیدا کیا جس طرح فرشتے ہوتے ہیں کہ وہ ازروئے تخلیق مومن 'مطیع اور نیکوکار ہیں اور ان کے اندر شر اور معصیت کی قدرت ہی نہیں ہے 'جس طرح ابلیس کے اندر ہے۔

ہمیں اس کا راز نہیں معلوم کیونکہ اللہ نے بتایا نہیں ہے 'البتہ اس طرح تخلیق کرنے میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہو گی۔اس کائنات کے لیے اس قسم کی مخلوق کو کیوں پیدا کیا گیا ہے؟

لہٰذا انسانی دنیا میں حقیقت ایمان کے قیام کے لیے انسانی جدوجہد کی ضرورت ہے اور اسی جدوجہد کے لیے اللہ نے انبیائے کرام کا برگزیدہ گروہ بھیجا اور انبیاء کے بعد ان کے متبعین میں سے ایک برگزیدہ گروہ کو چنا 'جو سچی طرح حقیقت ایمان پر عمل پیرا تھا اور انبیاء کے سچے متبعین کو بھی اللہ نے اس مقصد کے لیے چنا اور انہوں نے بھی حقیقت ایمان کے قیام کے لیے انتھک سعی کیں۔نہایت ہی جامع اور نہایت پر مشقت جہاد کیا۔

اس حقیقت کا دل میں بیٹھنے کا مفہوم یہ ہے کہ دل کے اندر اللہ کے نور کی ایک چنگاری بیٹھ جائے اور قلب انسانی کے اندر اللہ کے اسرار پوشیدہ ہوں اور مومن کا یہ دل اللہ کی تقدیر کا آلہ بن جائے اور یہ ایمان ایک عظیم حقیقت ہو 'مجرد تصور ہی نہ ہو اور پھر یہ عظیم حقیقت خود انسان اور انسان کے ماحول میں پائے جانے والے 'زمین و آسمان سے بھی عظیم تر ہو بلکہ یہ حقیقت پوری کائنات سے بھی بڑی ہو۔

جب حقیقت ایمان انسانوں کی زندگی میں ٹھوس شکل اختیار کرے یا انسانوں میں سے ایک جماعت کی زندگی میں ٹھوس شکل اختیار کرے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس زمین کی زندگی عالم بالا کی زندگی سے مربوط ہو جاتی ہے۔اور پھر انسان اس حقیقت کی وجہ سے عالم بالا کی زندگی سے رابطہ پیدا کرنے کے لئل ہو جاتا ہے۔ایک فانی ایک باقی کے ساتھ رابطہ قائم کر لیتا ہے۔ایک جزء ایک کل کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے۔ایک ناقص ایک کامل کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔

یہ وہ حاصل ہے جو ہر قسم کی انسانی جدوجہد اور محنت سے بھاری ہے۔ہر قربانی سے زیادہ قیمتی ہے۔اگرچہ یہ مقام کسی کو اس زمین پر ایک دن یا اس سے بھی کم وقت کے لیے حاصل ہو۔کیونکہ جب انسانیت اس مقام تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کی نظریں بلند افق پر ہوتی ہیں اور اس کے سامنے ایک عملی روشنی اور نور آ جاتا ہے۔اور اس نور کی روشنی میں پھر وہ صدیوں تک جدوجہد کرتی رہتی ہے۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ انسانوں نے جب کبھی ترقی و کمال کے اعلیٰ مدارج حاصل کیے وہ ایمان ہی کی روشنی میں حاصل کیے۔اور ایمان ہی کی وجہ سے حاصل کیے۔صرف ایمان ہی کے ذریعہ انسانیت کو وسعتیں حاصل ہوئیں۔انسانی تاریخ میں جن ادوار میں انسانیت کو عروج حاصل ہوا وہ ایمان ہی کے ادوار رہے ہیں۔ان ادوار میں ایمان کو زمین پر عروج حاصل ہوا اور

ایمان نے انسانیت کی قیادت سنبھالی ۔ یہ ادوار زمانہ مابعد کے لوگوں کو محض خیالی اور تصوراتی ہی نظر آتے ہیں لیکن دراصل وہ حقیقت ہوتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی فلسفہ 'کسی علم 'کسی فن 'کسی مذہب اور کسی نظام کے ذریعہ انسانیت اس قدر ترقی نہیں کر سکتی ' جس قدر اس ذریعہ سے کر سکتی ہے کہ "حقیقت ایمان" زمین پر ایک حقیقت کا روپ اختیار کر لے 'یوں کہ لوگوں کے عقیدے ' ان کی عملی زندگی ' ان کے اخلاق ' ان کے تصورات اور ان کی اقدار میں "حقیقت ایمان" ایک حقیقت بن جائے ۔ اور اس حقیقت کے نتیجے میں انسان ایک مکمل نظام زندگی اختیار کر لیں 'جس طرح ہر رسالت کے دور میں ایسا ہی ہوا کہ رسولوں نے ایمان کی حقیقت کو لوگوں کی زندگی میں جاگزیں کیا اور اس کے نتیجے میں ایک مکمل نظام زندگی وجود میں آیا ۔

اور یہ کہ "اسلامی نظریہ حیات اللہ کی جانب سے ہے" ۔ یہ امر واقعہ قطعی دلیل ہے کہ جب بھی انسانیت نے ایمان باللہ کو اس زمین پر حقیقت کا روپ دیا ہے 'انسانیت نے بے پناہ ترقی کی ہے اور اس کے سوا کوئی اور ذریعہ سے کبھی بھی انسانیت کو ترقی اور عروج نصیب نہیں ہوا ۔ نہ سائنس کے ذریعہ ' نہ فلسفہ کے ذریعہ ' نہ علوم و فنون کے ذریعہ اور نہ کسی نظام زندگی کے ذریعہ ۔ جب انسانیت کے اندر حقیقی مومنین کی قیادت ناپید ہوئی ' اسے ایمان کے سوا کوئی اور حقیقت فائدہ نہیں دے سکی بلکہ ایمان کے بغیر انسانیت کی اقدار ' اس کے پیمانے اور اس کی انسانی سطح گر گئی اور اس پر نفسیاتی مصیبت ' فکری انتشار اور اعصابی امراض کا بدترین دور آ گیا ۔ اور باوجودیکہ مادی ترقی کے ' انسانیت مصائب کا شکار ہوئی ۔ باوجود مادی ترقی ' جسمانی آرام اور عقلی ترقی اور مادی سہولیات کے انسانیت ' اطمینان ' راحت اور سکون سے محروم رہی ۔ اور اس کا تصور حیات اس قدر بلند نہ ہو سکا ۔ جس طرح ایمان کی روشنی میں بلند ہوا ۔ نیز اس کائنات کے ساتھ اس کا ربط اس قدر مضبوط نہ ہوا جس طرح ایمان کے زیر سایہ انسان اس پوری کائنات سے مربوط ہو جاتا ہے اور نہ حقیقت ایمان گم کر دینے سے انسانیت کو انسانی شرف حاصل ہوا ۔ پوری انسانی تاریخ میں اگر ایمان تصورات کا گہرا مطالعہ ہو تو انسان اسی نتیجے پر پہنچتا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ہمیشہ اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ وہ حقیقت ایمان کو دنیا پر غالب کرنے کے لیے قربانیاں دیں اور حقیقت ایمانی کے استقرار کے لیے اس قدر عظیم قربانیاں دیں 'جس قدر ان کی قوت و استطاعت ہو ۔ ایک ایسا گروہ تیار کریں جن کا دل ' نور الہی سے بھرا ہوا ہو ' اور اس گروہ کے دل اللہ کی روح سے متصل ہوں ۔ ان لوگوں کی زندگیاں اس طرح بسر ہوں کہ وہ اسلامی نظام زندگی کا زندہ نمونہ ہوں ۔ جو اعلیٰ انسانی تصورات اور اعلیٰ انسانی اخلاق کا نمونہ ہوں ۔ اور ان کی عمومی زندگی بھی ایک اعلیٰ معیاری زندگی ہو ۔ اس طرح جس طرح حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں "اعلیٰ زندگی" عملاً برپا ہوئی تھی ۔

انسانیت پھر بھی دعوت اسلامی سے اس طرح منہ موڑے گی جس طرح اس نے حضرت نوح ' حضرت ابراہیم ' حضرت موسیٰ ' حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد علیہم السلام اور ان کے بھائی دوسرے انبیاء کی دعوت سے منہ موڑا ۔ اور آئندہ بھی بشریت انہی گمراہ قیادتوں کے پیچھے بھاگے گی جس طرح اس سے پہلے انسانی تاریخ میں ہوتا ہے ۔ لوگوں نے انہی لوگوں کی اطاعت کی جو گمراہی میں دور تک ڈوبے ہوئے تھے اور آئندہ بھی سچائی کی طرف بلانے والوں کو قسم قسم کی سزائیں دی جائیں گی ۔ اور ان سے قسم قسم کے انتقام لیے جائیں گے 'جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا گیا 'جس طرح بعض پیغمبروں کو آرے کے ساتھ چیرا گیا 'جس طرح تمام رسولوں کے ساتھ مذاق کیا گیا ۔ اور پوری انسانی تاریخ میں ایسا ہوتا رہا ۔

لیکن اللہ کی طرف دعوت کا کام یونہی جاری رہا، جس طرح اللہ نے چاہا کیونکہ یہ وہ نتیجہ ہے جس کی راہ میں ہمیشہ بڑی بڑی قربانیاں دی جاتی رہی ہیں اور یہ اس قدر قیمتی مقصد ہے کہ اس کے لیے عظیم قربانیاں دی جاتی رہی ہیں۔ اگرچہ حاصل صرف یہ نکلے کہ ایک یا چند افراد کے دلوں میں نور ایمان کا چراغ روشن ہو جائے۔ اور صرف ایک ہی دل اللہ سے مربوط ہو جائے۔

حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک نبوت اور دعوت کا یہ طویل فاصلہ اس بات کا مظہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنے ذمہ لگائی ہے کہ دعوت ایمانی کا سلسلہ جاری رہے گا اور ہر دور اور ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی انسان ایمان کی دعوت لے کر اٹھتا رہے گا۔ اس طویل اور مسلسل جدوجہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اس دعوت کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اس جدوجہد سے کم از کم مطلوبہ نتائج نہ ملیں کہ ایک داعی بذات خود سچا مومن بن جائے، وہ دعوت کی راہ میں اپنی جان تک دینے کے لیے تیار ہو جائے اور کسی صورت بھی دعوت اسلامی کی جدوجہد سے منہ نہ موڑے۔ یہی وہ اعلیٰ نصب العین ہوتا ہے جس کی وجہ سے داعی اس پوری زندگی کے دائرہ کشش سے بلند ہوتا ہے۔ اس پر اس زمین کی کشش اور جاذبیت اثرانداز نہیں ہوتی۔ اور وہ اس زمین اور زمینی میلانات کے دائرہ کشش سے باہر نکل جاتا ہے۔ یہ ایک عظیم حاصل ہے۔ یہی عظیم کمائی ہے۔ اور یہ اس قدر قیمتی ہے کہ اس کے مقابلے میں تلخ ترین جدوجہد بھی کم نظر آتی ہے۔

یہ داعیان الی اللہ کی کمائی ہے۔ یہ انسانیت کی کمائی ہے جس کی وجہ سے یہ انسانیت شرف اور بلندی حاصل کرتی ہے اور اس شرف اور کمائی کی وجہ ہی سے فرشتے انسانوں کو سجدے کرتے ہیں حالانکہ انسان زمین پر فساد برپا کرنے والا اور خونریزی کرنے والا ہے۔ لیکن ان کمزوریوں کے باوجود انسان اپنی جدوجہد سے ایمان کی روشنی بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اور ایمان کی راہ میں قربانیاں بھی دیتا ہے اور اپنی جدوجہد کے ذریعہ ہی وہ دست قدرت کی تقدیر بن جاتا ہے اور پھر زمین پر اللہ کا مقرر کردہ نظام زندگی قائم کرتا ہے۔ اور وہ اس قدر روحانی آزادی حاصل کر لیتا ہے کہ اس راستے میں اپنی جان تک دے دیتا ہے۔ اور وہ اس قدر عظیم مشقتیں برداشت کرتا ہے جو زندگی سے بھی بھاری ہوتی ہیں تاکہ وہ اپنے عقیدے کو سینے سے لگا کر نجات حاصل کرے۔ اور اس زمین پر اس عقیدے اور ایمان کو ثبات و قرار عطا کر دے۔ اور دوسرے لوگ اس عقیدے اور ایمان سے مستفید ہوں۔ اور اس طرح ایک مومن کی قربانیوں کی وجہ سے دوسرے لوگ مستفید ہوتے ہیں اور ان کو کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ جب کسی روح کو اس قدر آزادی نصیب ہوتی ہے تو اس کے لیے ہر قسم کی جدوجہد اور مشقت آسان ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ہر قسم کی قربانیاں دیتا ہے۔ اور یہ ان تھک جدوجہد اور عظیم قربانیاں پس پردہ چلی جاتی ہیں اور وہ "حاصل" نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے جو اللہ کے ترازو میں زمین و آسمانوں اور پوری کائنات سے بھاری ہے۔

اب اس تبصرے کے بعد سورہ نوح کی آیات کی تشریح جس میں اول سے آخر تک یہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

---○○○---

درس نمبر ۲۷۱ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۲۸

آیاتها ۲۸ — سُوْرَةُ نُوْحٍ (۷۱) مَكِّيَّةٌ (۷۱) — رکوعاتها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲﴾ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوْهُ وَ
اَطِيْعُوْنِ ﴿۳﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ اَجَلَ
اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ہم نے نوح ۴ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس ہدایت کے ساتھ) کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کر دے قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے۔

اس نے کہا ”اے میری قوم کے لوگو' میں تمہارے لیے ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا (پیغمبر) ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو' اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا' کاش تمہیں اس کا علم ہو“۔

سورت کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ رسالت اور نبوت کا سرچشمہ کیا ہے اور یہ نظریہ اور عقیدہ کہاں سے آرہا ہے۔

اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِه (۷۱ : ۱) ”ہم نے نوح ۴ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا“ گویا' سرچشمہ ہدایت و رسالت ذات باری تعالیٰ ہے۔ تمام انبیاء اپنے عقائد اور ہدایات اللہ سے لیتے ہیں' اللہ انسانوں کا بھی خالق ہے۔ اس کائنات کا بھی خالق ہے اور اللہ ہی ہے جس نے انسانوں کی فطرت کے اندر معرفت رب کی استعداد

رکھی ۔ اور جب بھی انسانوں نے راہ فطرت اور اللہ کی ہدایت سے منہ موڑا' اللہ نے کوئی نہ کوئی رسول بھیج دیا۔ اور تمام رسول ہمیشہ گم کردہ راہ انسانیت کو راہ راست کی طرف موڑتے رہے ۔ حضرت نوح علیہ السلام سلسلہ رسل کی پہلی کڑی تھے ۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ۔ قرآن کریم نے حضرت آدم کی رسالت کا ذکر نہیں فرمایا کہ انہوں نے انسانوں کی ہدایت کے لیے یہ یہ کام کیا' اس لیے کہ حضرت آدم صرف اپنے بیٹوں اور پوتوں کی ہدایت پر مامور تھے ۔ اور حضرت آدم کے پوتے اور اولاد آپ کی وفات کے بعد ایک عرصے کے بعد گمراہ ہوئی اور اپنے لیے بت گھڑ لیے ۔ اور ان کی پوجا کرنے لگی ۔ پہلے تو وہ ان کو مقدس قوتوں کے لیے بطور رمز و اشارہ استعمال کرتے تھے بعد میں انہوں نے ان بتوں ہی کی پوجا اختیار کر لی ۔ اور ان بتوں میں سے مشہور وہ پانچ بت تھے 'جن کا ذکر اس سورت میں آ رہا ہے ۔ چنانچہ جب یہ لوگ گمراہ ہو گئے تو اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو ارسال فرمایا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ان کو عقیدۂ توحید کی طرف واپس لانے کی طویل جدوجہد کی ۔ اور ان کے عقائد کو درست کرنے کی سعی کی ۔ کتب سابقہ میں حضرت ادریس علیہ السلام کو سب سے پہلے نبی کے طور پر ذکر کیا گیا۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام سے بھی پہلے ۔ لیکن کتب سابقہ کے مندرجات ہمارے لیے حجت نہیں ہیں ' اس لیے کہ ان کے اندر بار بار تحریف ہوتی رہی ہے اور ان میں بار بار حذف و اضافہ ہوتا رہا ہے ۔

قرآن کریم کے قصص کے مطالعے سے یہی تاثر ملتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سب سے پہلے نبی ہیں اور ان کو بالکل انسانیت کے ابتدائی دور میں بھیجا گیا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک تبلیغ کی ۔ اس دور کے لوگوں کی یہ طویل عمر بھی یہ بتاتی ہے کہ یہ لوگ بہت ہی ابتدائی دور کے لوگ تھے اور پھر اس دور میں انسانوں کی تعداد بھی بہت کم تھی اور انسانوں کی نسل ابھی تک اس طرح نہ پھیلی تھی جس طرح زمانہ مابعد میں پھیل گئی ۔ حیاتیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اشیاء کی تعداد کم ہو تو عمر زیادہ ہوتی ہے ۔ اللہ ہی حقیقت سے واقف ہے ۔ یہ سنن الٰہی کے مطالعہ پر مبنی ہمارا قیاس ہے ۔

اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت کے مشن اور ہدف کی طرف مختصر اشارہ آتا ہے ۔ یہ کہ اے نوح علیہ السلام تم اپنی قوم کو ڈراؤ :

اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۷۱ : ۱) "کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کر دو قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے"۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم جس حالت تک پہنچ چکی تھی اور جس طرح وہ آپ کی ہدایات اور تبلیغ سے منہ موڑ رہی تھی ' تکبر کر رہی تھی اور نہایت ہی ہٹ دھرمی اور عناد میں مبتلا تھی ' اس کے لیے یہاں یہ کہنا نہایت مناسب ہے کہ بس تم ان کو انجام بد سے ڈراؤ ' چنانچہ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز یوں کیا کہ لوگو ' دنیا و آخرت کے عذاب سے ڈرو ' تم اپنے آپ کو اس عذاب کا مستحق بنا رہے ہو۔

فریضہ رسالت کے تعین کے بعد فوراً یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام تبلیغ شروع کر چکے ہیں ۔ آپ کا خطاب یوں ہے کہ لوگو تم اگرچہ نہایت گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کر چکے ہو لیکن باز آ جاؤ ' توبہ کرو ' تمہارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور تمہارا احساب قیامت تک کے لیے ملتوی کر دیا جائے گا۔ ورنہ تم تو فوری ہلاکت اور پکڑ کے مستحق

ہو۔ساتھ ساتھ اصول دعوت کا ذکر بھی کر دیا گیا کہ اللہ وحدہ کی بندگی کرو' تمام معاملات میں میری سنت کی پیروی کرو۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (٢) اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ (٣) يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (٤) (٧١: ٢ تا ٤) "اس نے کہا"اے میری قوم کے لوگو' میں تمہارے لیے ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا (پیغمبر) ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو' اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آ جاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا' کاش تمہیں اس کا علم ہو"۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (٧١: ٢) "اے میری قوم کے لوگو' میں تمہارے لیے صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں"۔ آپ اپنی دعوت میں جس بات کی وضاحت کرتے ہیں وہ ڈراوا ہے۔اور اس ڈراوے کو آپ نہایت ہی وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔مجمل بات نہیں کرتے نہ پیچیدہ کر کے اور لپیٹ کر محض اشارات و کنایات سے بات کرتے ہیں نہ آپ اپنی دعوت کے سلسلے میں شش و پنج کرتے ہیں۔اور قوم نوح جس انجام سے دوچار ہونے والی تھی وہ بھی آپ نے صاف صاف بتا دیا کہ اگر تم باز آ جاؤ تو دنیا کا عذاب موخر ہو سکتا ہے۔

حضرت نوح ؑ جو دعوت پیش کر رہے تھے' وہ بھی سادہ اور سیدھی ہے۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ (٧١: ٣) "کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"۔یعنی اللہ وحدہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرو' تمہارے شعور و سلوک پر یہ بات چھائی ہوئی ہو' اور رسول اللہ کی اطاعت وہ بات ہے جس سے نظام زندگی پھوٹتا ہے اور زندگی کے تفصیلی قواعد وضع ہوتے ہیں جس کی تعبیر سنت رسول ؐ سے کی جاتی ہے۔

بس تمام ادیان سماوی کے یہی خطوط ہیں۔اللہ کا حکم اور رسول اللہ کی اطاعت۔انہی خطوط پر دین استوار ہوتا ہے۔ تفصیلات ہر دور کے حالات کے مطابق ہوتی ہیں۔انسانیت کے تفصیلی سوالات' اس کا تصور وجود اور اس کائنات کے اندر پائے جانے والے مختلف سوالات جو مختلف ادوار میں ہوتے ہیں ان کے جوابات کے نتیجے میں ادیان کی تفصیلات اور فروعات میں اختلاف ہوتا ہے۔

اللہ کی پوری بندگی کرنا ہی دراصل ایک مکمل نظام ہوتا ہے۔اللہ کی بندگی میں تصور الٰہ' اس کی اطاعت کی تفصیلات' خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی نوعیت' اس کائنات میں حسن و قبح کے اصول۔لوگوں کی زندگیوں میں حسن و قبح کے اصول۔اس طرح اللہ کی بندگی کے اصول سے ایک مکمل نظام زندگی قائم ہو جاتا ہے۔زندگی گزارنے کا ایک منہاج سامنے آ جاتا ہے۔یہ ایک ربانی منہاج حیات ہوتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندگی اور خدائی کا باہم تعلق کیا ہوتا ہے؟ اور وہ کیا قدریں ہیں' جو زندہ اور غیر زندہ اشیاء کے متعلق اللہ نے تجویز فرمائی ہیں۔

اور "خدا کا خوف" وہ ضامن ہے جو اس نظام زندگی اور منہاج حیات کو قائم رکھتا ہے۔ جس قوم کے دل میں خدا کا خوف ہو وہ اس منہاج سے ادھر ادھر نہیں جاتی۔ نہ اس میں حیلے اور بہانے تلاش کرتی ہے۔ نیز تقویٰ کے بدولت انسان کے اندر اخلاق فاضلہ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ انسان کا طرز عمل حقیقی ہوتا ہے' بغیر کسی ظاہرداری اور دکھاوے کے۔

اطاعت رسول سے دراصل راستے کی حدود کا تعین ہوتا ہے اور انسان اس سیدھی راہ پر چلنے کے لیے تفصیلی ہدایات اخذ کرتا ہے اور براہ راست رب تعالیٰ اور عالم بالا سے مربوط رہتا ہے۔

یہ تھے وہ خطوط جن پر حضرت نوح علیہ السلام نے آغاز انسانیت سے لوگوں کے لیے راہ ہدایت اور منہاج حیات استوار کیا۔ اور ازمنہ مابعد کی تمام دعوتیں انہی خطوط پر استوار ہوتی رہیں اور حضرت نوح علیہ السلام نے قوم سے وعدہ کیا کہ اگر تم نے توبہ کر لی اور لوٹ آئے تو اللہ معاف کر دے گا۔

يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۷۱ : ۴) "اور تمہارے گناہوں سے درگزر کرے گا اور تمہیں وقت مقررہ تک باقی رکھے گا"۔ اور یہ باقی رکھنا' اس بات کے عوض میں ہو گا کہ تم اللہ کی بندگی کرو گے' اللہ سے ڈرو گے اور رسول خدا کی اطاعت کرو گے' اور اس کے بدلے اللہ مزید یہ کرے گا کہ تمہارے سابقہ گناہ بھی معاف کر دے گا اور تمہارا احساب وکتاب اس وقت تک موخر ہو جائے گا جو اللہ نے مقرر کر رکھا ہے یعنی یوم الاخرت تک۔ اور اس طرح دنیا میں تم پر جو تباہ کن عذاب آنے والا ہے' وہ موخر ہو جائے گا۔ (عنقریب حضرت نوح علیہ السلام پیش کریں گے کہ اللہ نے ان لوگوں کے ساتھ اور بھی وعدے فرمائے تھے)۔

اس کے بعد یہ فرمایا گیا کہ قیام قیامت حتمی ہے اور وہ اپنے وقت پر ضرور آئے گی۔ اس میں کوئی تاخیر نہیں ہو سکتی۔ جس طرح دنیا کے عذاب میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قیامت کے بارے میں عقیدے کو یوں درست کر دیا جاتا ہے۔

اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۷۱ : ۴) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آ جاتا ہے تو ٹالا نہیں جاتا' کاش تمہیں اس کا علم ہوتا"۔ اس سے مراد قیامت بھی ہو سکتی ہے اور ہر وہ دوسرا وقت بھی ہو سکتا ہے جو اللہ کسی واقعہ کے وقوع کے لیے مقرر کر دے۔ بہرحال یہاں یہ عام عقیدہ ذہنوں میں بٹھانا مقصود ہے کہ اللہ کا مقرر کردہ وقت ٹالا نہیں جا سکتا۔ ہاں اگر یہ لوگ اطاعت کر لیں اور توبہ کر لیں تو اللہ دنیا میں تباہ کر دینے کے بجائے' قیام قیامت تک کے لیے ان کا عذاب ٹال دے گا۔

---ooo---

حضرت نوح علیہ السلام اپنی مساعی جاری رکھے ہوئے ہیں' اور اپنی قوم کی ہدایت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ کسی مصلحت کی پرواہ نہیں کرتے' کسی مفاد کا لحاظ نہیں کر رہے۔ وہ اس عظیم مقصد کے لیے وہ سب کچھ برداشت کر رہے ہیں۔ لوگ اعتراض کر رہے ہیں' منہ موڑ رہے ہیں اور مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن آپ ہیں کہ کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ساڑھے نو سو سال اس جدوجہد میں گزر جاتے ہیں۔ چند لوگ ہی دعوت قبول کرتے ہیں جبکہ قوم کی طرف سے منہ موڑنے' گمراہی پر اصرار کرنے اور مذاق کرنے میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ٹھیک ساڑھے نو سو سال کے بعد حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے دربار میں اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرتے ہیں۔ اس طویل عرصے میں جو کچھ پیش آیا' وہ عرض

کر دیتے ہیں ' جبکہ رب تعالیٰ کو تو پہلے سے معلوم ہے ۔ اور حضرت نوح علیہ السلام بھی جانتے ہیں کہ رب کو معلوم ہے ' لیکن شکوہ شکایت یونہی دہرائی جاتی ہے اور انبیائے کرام کا شکوہ تو اللہ ہی سے ہو سکتا ہے ۔ وہ اللہ کے ہاں ہی اپنی فریاد پیش کر سکتے ہیں ۔ اور وہ مومنین جن کو حقیقت ایمان تک رسائی حاصل ہوتی ہے وہ بھی صرف اللہ ہی سے شکایات کرتے ہیں ۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا ﴿۵﴾ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ
اِلَّا فِرَارًا ﴿۶﴾ وَ اِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ
وَ اسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَ اسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ﴿۷﴾ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ
جِهَارًا ﴿۸﴾ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ﴿۹﴾ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا
رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿۱۰﴾ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿۱۱﴾ وَّ یُمْدِدْكُمْ
بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِیْنَ وَ یَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ یَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾ مَا لَكُمْ لَا
تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾ اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ
سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ وَ اللّٰهُ
اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ ثُمَّ یُعِیْدُكُمْ فِیْهَا وَ یُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾ ۱
وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ﴿۱۹﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾ ع ۲۰

اس نے عرض کیا "اے میرے رب ' میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا مگر میری پکار نے ان کے فرار 9
ہی میں اضافہ کیا ۔ اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے ' انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا ۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی ۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا ۔ میں نے کہا " اپنے رب سے معافی مانگو ' بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے ۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا ' تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا ' تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے لیے تم کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے ؟ حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے ۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا ؟ اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا ' پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکایک تم کو نکال کھڑا کرے گا ۔ اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ تم اس

کے اندر کھلے راستوں میں چلو"۔

یہ تھی حضرت نوح علیہ السلام کی کارکردگی اور یہ رہی ان کی رپورٹ۔ اس طویل عرصہ کارکردگی میں وہ اپنے رب کے سامنے اپنا حساب پیش فرماتے ہیں۔ آپ کی رپورٹ میں جو چیز نمایاں ہے' وہ آپ کی جہد مسلسل ہے۔

اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا (۷۱ : ۵) "میرے رب' میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا"۔ انہوں نے ہمت نہ ہاری' وقفہ نہیں کیا' اور وہ لوگوں کے مسلسل اعراض اور اصرار کے باوجود مایوس نہیں ہوئے لیکن

فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا (۷۱ : ۶) "لیکن میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا"۔ یعنی وہ داعی الی اللہ سے بھاگتے رہے اور شیطان کے پیچھے پڑے رہے۔ حالانکہ اللہ ان کا خالق تھا' جن انعامات میں وہ مزے سے رہ رہے تھے' وہ اللہ کی تخلیق کردہ تھیں۔ یہ ہدایت بھی اللہ ہی کی طرف سے آ رہی تھی' اور داعی نہ اجر کا طلبگار تھا اور نہ فیس عائد کر رہا تھا۔ اور جس ذات سے وہ بھاگ رہے تھے وہ ان کو اس لیے بلا رہی تھی کہ آؤ تمہیں بخش دیا جائے' آؤ تمہیں ان گناہوں کے انجام سے بچایا جائے اور معصیت اور ضلال سے بچایا جائے۔

وہ تو بھاگتے رہے لیکن داعی حق ان کو گھیرتے رہے اور ہر طرح ان کے کانوں تک کلمہ حق پہنچاتے رہے لیکن انہوں نے نہ اس بات کو برداشت کیا کہ ان کے کانوں میں کلمہ حق پڑے اور نہ اس بات کو پسند کیا کہ پیغمبر پر ان کی نظریں پڑیں' اس لیے انہوں نے گمراہی پر بے حد اصرار اور کلمہ حق کے قبول کرنے سے بڑا تکبر کیا۔

وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا (۷۱ : ۷) "اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے' انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا"۔ یہ ہے انداز داعی حق کا کہ وہ اپنی دعوت پر اصرار کرتا ہے اور جونہی اور جب بھی اسے موقعہ ملے وہ کلمہ حق کہہ دیتا ہے جبکہ اہل کفر کے اصرار کی بھی یہ ایک مثال ہے کہ جب وہ ہٹ دھرمی پر اتر آئیں تو منہ بھی چھپا لیتے ہیں۔ اس دعوت اور اس انکار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی ایام میں جبکہ بشریت عہد طفولیت میں تھی۔ دعوت کے شب و روز کیا تھے کہ لوگ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے اور سروں کو چادروں میں چھپا لیتے تھے۔ انداز تعبیر سے لوگوں کا کافرانہ طرز عمل ظاہر ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یہ انگلیوں کو کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ پوری انگلیاں تو کانوں میں نہیں ٹھونسی جاتیں مگر یہ مبالغہ کے لیے کہا گیا کہ وہ کانوں کو یوں بند کر رہے ہیں کہ آواز کسی طرح بھی ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ گویا یہ کوشش کر رہے تھے کہ پوری انگلی کو کانوں میں ٹھونس لیں۔ یہ سخت اصرار اور ہٹ دھرمی کی شکل ہے اور ابتدائی ادوار میں یہی صورت حالات تھی۔

مسلسل دعوت دیتے چلے جانے' ہر موقعہ سے فائدہ اٹھانے اور ان تھک جدوجہد کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت نوح

علیہ السلام نے دعوت اسلامی کے لیے ہر انداز بھی اختیار کیا۔ کبھی انہوں نے ببانگ دہل دعوت دی۔ کبھی انہوں نے خفیہ تحریک چلائی۔

ثُمَّ اِنِّیْ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا (۷۱ : ۹) "پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا"۔

اس دعوت کے دوران حضرت نوح علیہ السلام نے ان کو یہ بھی بتایا کہ اگر تم میری دعوت قبول کر لو تو تمہیں دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کی کامیابی نصیب ہوگی۔ اور یہ بھی بتایا کہ اگر تم لوگ اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرو تو وہ تمہیں بخش دے گا کیونکہ وہ تو بہت بخشنے والا ہے۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا (۷۱ : ۱۰) "میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگو وہ بہت بڑا معاف کرنے والا ہے"۔ اور ان کو یہ لالچ بھی دیا کہ اللہ تمہیں وافر رزق بھی دے گا' بارشوں کے ذریعہ نہریں بہا دے گا' اولاد دے گا' اموال دے گا' جو تمہیں بہت عزیز ہیں۔

يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا (۷۱ : ۱۱) وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (۷۱ : ۱۲) "وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا' تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا' تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا"۔

حضرت نوح علیہ السلام نے استغفار اور عطائے رزق جہاں کو باہم یکجا کر دیا اور قرآن میں بے شمار مواقع پر ایمان' ہدایت اور صلاح اور تقویٰ اور خوشحالی اور وافر رزق کو ایک دوسرے کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے :

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۷ : ۹۶) "اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم آسمان و زمین سے ان پر نعمتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کو ان کے اعمال کے بدلے پکڑا"۔

اور دوسری جگہ ہے :

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (۶۵) وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (۶۶) (۵ : ۶۵ - ۶۶) "اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور

ڈرتے تو ہم ان سے ان کی برائیاں دور کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کر دیتے' اگر وہ توریت' انجیل اور جو ان کی طرف نازل کیا گیا ان کے رب کی طرف سے' ان کو قائم کرتے' تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے"۔
اور دوسری جگہ ہے :

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنَّنِي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ (۲) وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ (۳) (۱۱ : ۲ – ۳) "یہ کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی میں تم کو اس کی طرف سے ڈر اور خوشخبری سناتا ہوں اور یہ کہ گناہ بخشواؤ اپنے رب سے اور اس کی طرف رجوع کرو' وہ تم کو بہت اچھا فائدہ پہنچائے گا۔ ایک مقرر وقت تک اور دے دے گا ہر صاحب فضل کو اس کا فضل"۔

یہ اصول جس کا ذکر قرآن کریم متفرق مقامات پر کرتا ہے ایک صحیح اصول ہے اور یہ اللہ اپنے وعدے پر قائم ہے اور ان سنن حیات پر قائم ہے جو اللہ نے اس کائنات میں جاری کیے ہیں اور انسانوں کی عملی تاریخ اس پر شاہد عادل ہے۔ یہ قاعدہ اقوام کے لیے ہے افراد کے لیے نہیں ہے۔ اس جہاں میں جب بھی کسی قوم نے شریعت پر اپنا نظام استوار کیا ہے اور عمل صالح اختیار کر کے خدا خوفی کا رویہ اپنایا ہے اور اللہ سے ڈر کر اپنی کوتاہیوں سے معافی طلب کی ہے' اللہ نے اسے مادی ترقی بھی دی ہے۔ غرض جب بھی کسی قوم نے تقویٰ اختیار کر کے اللہ کی بندگی اختیار کی ہے اور شریعت کو نافذ کیا ہے' اور لوگوں کے درمیان عدل کا نظام رائج کیا ہے تو اس کائنات کی قدرتی قوتوں نے اس کے ساتھ تعاون کیا ہے اور اللہ نے اسے زمین پر تمکین عطا کی ہے اور وہ دنیاوی ترقی کے اعتبار سے بھی عروج تک پہنچی ہے۔

بعض اوقات ہم اس کرۂ ارض پر ایسی اقوام دیکھتے ہیں جو اللہ سے نہیں ڈرتیں اور جو اللہ کی شریعت کے مطابق عمل پیرا نہیں ہوتیں' لیکن اس کے باوجود ان کو وافر رزق ملتا ہے۔ اور اس زمین کے اوپر ان کو اقتدار اعلیٰ بھی ملا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہوتی ہے۔

وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً "اور ہم تمہیں خیر و شر کے ذریعہ سے آزماتے ہیں"۔ پھر یہ خوشحالی ایک سڑی ہوئی خوشحالی ہوتی ہے اور اسے اجتماعی بیماریاں' اخلاقی گراوٹ' ظلم اور زیادتی' انسانی شرافت کا فقدان جیسی خرابیاں لاحق ہوتی ہیں اور ان کا مزہ کرکرا ہوتا ہے۔ آج ہمارے سامنے دو بڑی حکومتیں ہیں جن کو اللہ نے رزق میں وہ وسعت دی ہے۔ زمین کے ایک بڑے حصے پر ان کو اقتدار ملا ہوا ہے۔ ایک سرمایہ دار ہے اور ایک اشتراکی ہے۔ (سید قطب' آپ کو اللہ نے اطلاع دے دی ہوگی کہ یہ نابود ہو چکی ہے) جہاں تک پہلی کا تعلق ہے اس کی اخلاقی حالت حیوانوں سے بھی زیادہ گری ہوئی ہے۔ اور ان کی زندگی کی مجموعی حالت یہ ہے کہ یہ صرف ڈالر پر قائم ہے اور ڈالر کے سوا وہاں کوئی اخلاقی قدر نہیں ہے۔ اور دوسری سمت میں انسان ایک غلام سے بھی گرا ہوا ہے اور اس کا جاسوسی نظام اس قدر خوفناک ہے کہ ہر شخص ایک دائمی خوف میں زندگی بسر کرتا ہے۔ کوئی شخص رات کو اس حال میں نہیں سوتا کہ اسے صبح

گرفتاری کا ڈر نہ ہو۔ یہ دونوں ممالک انسانی معیاروں کے لحاظ سے گرے ہوئے ہیں۔ (صرف سٹالن نے ۲ کروڑ انسان تہ تیغ کیے۔ مترجم)

اب ذرا دیکھئے کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی طویل جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اپنی قوم کو انفس و آفاق میں پائے جانے والے دلائل ایمان کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ آپ حیران رہ جاتے ہیں کہ اس کے جواب میں قوم ان کو کس طرح رد کرتی ہے 'نہایت گستاخانہ رویہ اپناتی ہے۔ آپ اس رویہ پر ان کی سرزنش کرتے ہیں۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (۷۱:۱۳) وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (۸۱:۱۴)

"تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے لیے تم وقار کی توقع نہیں رکھتے۔ حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے"۔ یہ اطوار کیا تھے؟ قوم نوح علیہ السلام ان کو اچھی طرح سمجھتی تھی یا اس کا کوئی ایسا مفہوم تھا جو وہ لوگ اس وقت اچھی طرح سمجھتے تھے اور یہ طور اور تفریق کا ان کے ذہنوں پر بہت ہی اچھا اثر تھا۔ اس پر غور کرنے سے وہ راہ راست پر آ سکتے تھے۔ اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ مراد جنین کے مختلف اطوار ہیں۔ نطفہ' علقه، مضغه اور موجودہ ہیکل انسانی۔ اور اس حقیقت کو وہ لوگ بھی سمجھتے تھے اور ہم بھی۔ کیونکہ وہ جو جنین کامل ہونے سے قبل ہی گر جاتے ہوں گے' ان کے مشاہدے سے وہ انسانی اطوار کو سمجھتے ہوں گے۔ بہرحال اس آیت کے ممکنہ معنوں میں سے یہ ایک مفہوم ہے۔ یہ بھی ممکن ہے اس سے مراد جنین کے اطوار ہوں کہ آغاز میں وہ ایک خلیے کا حیوان ہوجاتا ہے۔ پھر متعدد خلیوں والا بن جاتا ہے' پھر پانی کے حیوانات کی طرح' پھر پستانوں والے حیوانات کی طرح اور آخر کار موجودہ شکل انسانی کی طرح۔ لیکن یہ اطوار قوم نوح علیہ السلام کے لیے قریب الفہم نہ تھے کیونکہ یہ اطوار حال ہی میں مشاہدے میں آئے ہیں۔ اور اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے جو دوسری آیات کا ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ "پھر اٹھا کھڑا کیا اس کو ایک نئی صورت میں' تو اللہ برکتوں والا ہے سب سے بہتر بنانے والا"۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں آیات کا اس کے سوا بھی کوئی اور مفہوم ہو۔ جسے ابھی تک ہم نہ سمجھ سکے ہوں اور آئندہ کسی وقت سمجھ لیں۔

بہرحال نوح علیہ السلام نے ان کو مطالعہ ذات کی طرف متوجہ کیا اور اس بات پر سخت گرفت کی کہ دیکھو تو سہی کہ اللہ نے تم کو کس طریقے سے پیدا کیا ہے اور پھر بھی لوگ خالق کو نہیں پہچانتے حالانکہ وہ دیکھتے ہیں کہ تمام مخلوقات میں سے انسان محیر العقول مخلوق ہے۔ اور اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام ان کو کائنات کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (۱۵) وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (۷۱:۱۶) "کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟" سات آسمانوں کے مفہوم کا تعین ہم ان سائنسی نظریات کے مطابق نہیں کر سکتے' جو سائنس دان اس کائنات کے بارے میں گھڑتے رہتے ہیں۔ کیونکہ سائنسی نظریات تو مفروضات ہوتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے لوگوں کو سات آسمانوں کی طرف متوجہ کیا اور اللہ نے ان کو بتایا کہ یہ سات ہیں ۔ اور ان آسمانوں میں شمس و قمر اس طرح ہیں کہ ایک نور ہے اور دو سراچراغ ہے ۔ لوگ آسمانوں کو بھی دیکھ رہے تھے 'اور شمس و قمر کو بھی دیکھ رہے تھے ۔ آسمان اس فضا سے عبارت ہے جو نیلگوں ہے ۔ یہ ہے کیا؟ اس کی حقیقت نہ وہ معلوم کر سکتے تھے اور نہ ان سے مطلوب تھا۔ نہ آج تک ان کی حقیقت معلوم ہو سکی ہے ۔ اس حد تک وضاحت اس بات کے لیے کافی ہے کہ انسان اس ہولناک کائنات پر غورو فکر کرے اور دیکھے کہ قدرت الٰہیہ نے کس قدر عجیب تخلیق کی ہے اور یہی مقصد تھا حضرت نوح علیہ السلام کا ۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ اللہ نے تمہیں کس طرح زمین سے پیدا کیا اور کس طرح دوبارہ زمین کی طرف لوٹایا ۔ اور پھر اس سے تمہیں نکالے گا ۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (۱۷) ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا (۷۱ : ۱۸) "اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور پھر یکایک اس سے نکال کھڑا کرے گا"۔

انسان کی تخلیق کے عمل کو یہاں "اگانے" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ ایک عجیب انداز تعبیر ہے ۔ قرآن کریم میں کئی جگہ یہ انداز اختیار کیا گیا ہے ۔ مثلاً ۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا "ایک پاکیزہ زمین اپنے نباتات اپنے رب کے اذن سے نکالتی ہے اور جو خبیث ہے وہ صرف کم پیداوار نکالتی ہے"۔ اس آیت میں انسانوں کی پیدائش کی طرف اشارہ ہے ۔ اور انسان کی پیدائش کے ساتھ نباتات کی پیدائش کا ذکر تو کئی جگہ آتا ہے ۔ سورہ حج میں بعث بعد الموت پر دلیل دیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے :

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ (۲۲ : ۵) "اے لوگو، تمہیں قیامت میں زندہ ہو کر اٹھنے میں شبہ ہے تو ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفہ سے 'پھر گوشت کی بوٹی سے' جو مختلف تھی بنی ہوئی اور غیر بنی ہوئی' تاکہ تم کو بتا دیں اور ارحام میں ہم ٹھہراتے ہیں جو چاہتے ہیں ایک مقرر وقت تک 'پھر تمہیں طفل کی شکل میں نکالتے ہیں تاکہ تم جوانی تک پہنچو' پھر تم میں سے بعض کو موت آلیتی ہے اور بعض ذلیل عمر تک لوٹ جاتے ہیں' تا

کہ اس طرح وہ علم کے بعد کچھ نہ جانیں اور تم دیکھتے ہو کہ زمین خراب پڑی ہے ۔ جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ تازہ ہو جاتی ہے ۔ اور ابھرتی ہے ۔ اور وہ ہر قسم کی پر رونق چیز اگاتی ہے"۔ اور سورہ مومنون میں پیدائش کے مختلف مدارج بتلانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے ۔

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ "پھر ہم اس کے ذریعے تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغات اگاتے ہیں"۔ اور اسی طرح دوسرے مقامات پر بھی ۔

یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو قابل نظر ہے ' یہ بتاتی ہے کہ روئے زمین پر اللہ نے حیات و نبات کے لیے تقریباً ایک ہی جیسے اصول رکھے ہیں ۔ انسان کی تخلیق بھی اسی طرح ہے جس طرح نباتات کی تخلیق ہے ۔ جن عناصر سے انسان پیدا ہوتا ہے انہی سے حیوانات و نباتات بھی پیدا ہوتے ہیں ۔ دونوں انہی عناصر سے غذا اخذ کرتے ہیں ۔ انسان حیوان بھی زمین کے نباتات میں سے ایک نبات ہیں ۔ جس طرح اللہ نے نباتات کو رنگا رنگی دی ہے ' اسی طرح حیوانات اور انسانوں کو بھی تنوع اور رنگا رنگی دی ہے ۔ دونوں زمین سے ہیں ' دونوں زمین سے غذا لیتے ہیں اور دونوں زمین میں فنا ہوتے ہیں ۔

یوں ایمان کے ذریعہ ایک مومن کے شعور میں اس زمین کی زندہ اگنے والی مخلوق کے بارے میں صحیح تصور پیدا ہوتا ہے ۔ یہ ایک زندہ اور علمی شعور ہے کیونکہ اس کی اساس شعوری ایمان پر ہے اور یہ قرآنی علوم کا مخصوص امتیاز ہے ۔

جو لوگ زمین سے پیدا کیے گئے ہیں وہ دوبارہ اس زمین کے پیٹ میں جاتے ہیں ۔ جس طرح اللہ نے ان کو زمین سے نکالا ' دوبارہ زمین کی طرف لوٹائے گا ۔ چنانچہ اس طرح ان کی ہڈیاں اور بوسیدہ اجزائے وجود زمین کے ذرات کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں ۔ جس طرح یہ ذرات پیدائش سے پہلے زمین کے اندر تھے ۔ اور اللہ دوبارہ ان ذرات کو زمین سے نکالے گا ۔ اور یہ اسی طرح ہو گا جس طرح پہلی مرتبہ ہوا ۔ یہ نہایت ہی سہل کام ہے اللہ کے لیے ۔ یہ کام اللہ ایک لمحہ اور ایک لحظہ میں کر دے گا ۔ یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے ۔ بشرطیکہ لوگ قرآنی زاویہ سے اس حقیقت پر غور کریں ۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس حقیقت کی طرف متوجہ فرمایا تاکہ ان کو معلوم ہو کہ اللہ قدرتوں والا ہے کہ اس نے تمہیں اس زمین سے اگایا ہے اور دوبارہ بھی وہ تمہیں اسی طرح اگائے گا ۔ جب یہ شعور انسان کے اندر بیٹھ گیا تو پھر انسان خوف آخرت کرنے لگتا ہے ۔ اور اس کی تیاری کرتا ہے کیونکہ یہ قیامت تو اسی طرح آسانی سے قائم ہو جائے گی جس طرح اس زمین پر نباتات اگتے ہیں ۔ نہایت آسانی اور سہولت کے ساتھ ۔ جس کے اندر کوئی معقول انسان ' کوئی قیل و قال نہیں کر سکتا ۔

آخر میں حضرت نوح علیہ السلام لوگوں کو اس طرف متوجہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے زمین کے اندر تمہارے لیے کیا کیا سہولیات پیدا کی ہیں ۔ اس زمین کو تمہارے لیے مسخر کیا ' سدھایا ۔ اس میں تمہارے زندہ رہنے کے لیے تمام سہولیات رکھ دیں ۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا (۱۹) لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا

(۷۱ : ۲۰) "اور اللہ نے زمین کو فرش کی طرح تمہارے لیے بچھایا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو"۔

یہ حقیقت جو حضرت نوح علیہ السلام نے لوگوں کے سامنے پیش کی اور ان کے سامنے موجود تھی' حضرت نوح علیہ السلام کی باتوں سے وہ تو بھاگتے تھے لیکن ان میں جو حقائق تھے' ان سے ان کے لیے فرار مشکل تھا۔ یہ زمین ان کے سامنے بچھی ہوئی تھی ۔ یہ پہاڑ موجود تھے' یہ وادیاں موجود تھیں اور ان وادیوں کی راہوں پر ہی وہ چلتے تھے ۔ پیدل بھی چلتے' سوار ہو کر بھی چلتے اور تیر کر بھی چلتے ۔ اور اس کے اندر اللہ کے جو فضل و کرم بکھرے ہوئے تھے ان سے وہ استفادہ کرتے تھے اور نہایت ہی آسانی سے وہ استفادہ کرتے تھے ۔

یہ حقائق وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے' اس سلسلے میں کسی گہری علمی تحقیق کی ضرورت نہ تھی ۔ یہ اصول فطرت تھے اور ان کے مشاہدے اور تجربے میں تھے ۔ اور ان حقائق کے اندر وہ زندہ رہ رہے تھے ۔ ہاں جوں جوں انسان نے علمی ترقی کی اس نے ان حقائق کے مزید پہلو معلوم کر لیے ۔ جس کے بارے میں قرآن کی ہدایت بھی ہے کہ تم زمین میں پھرو اور نصیحت حاصل کرو ۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ (سورۂ ملک) یوں حضرت نوح علیہ السلام نے کوشش کی کہ اپنی قوم کے کانوں میں کسی نہ کسی طرح کلمہ حکمت ڈال دیں' مختلف طریقوں اور مختلف اسالیب کے ذریعہ اور اس کے لیے انہوں نے مختلف انداز اختیار کیے اور طویل عرصہ اس کام میں لگایا۔ صبر جمیل کے ساتھ اور ان تھک جدوجہد کے ساتھ' ساڑھے نو سو سال مسلسل! اس کے بعد اب حضرت نوح علیہ السلام رب تعالیٰ کی طرف لوٹتے ہیں' جس رب تعالیٰ نے ان کو یہ مشن دیا تھا ۔ رپورٹ پیش کرتے ہیں نہایت تفصیلی رپورٹ ہے یہ ۔ یہ رپورٹ نہایت ہی دردناک لہجے میں ہے اور نہایت موثر الفاظ میں ہے ۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کس قدر جدوجہد کی ۔ انہوں نے گم کردہ راہ انسانیت کو راہ ہدایت پر لانے کے لیے کیا کچھ کیا ۔ لیکن یہ تو سلسلہ رسالت کی ایک ہی کڑی ہے ۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَ اتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ۬ وَّ لَا یَغُوْثَ وَ یَعُوْقَ وَ نَسْرًا ﴿۲۳﴾ وَ قَدْ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا ۚ۬ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾

نوح نے کہا "میرے رب' انہوں نے میری بات رد کر دی اور ان (رئیسوں) کی پیروی کی جو مال اور اولاد پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے ہیں ۔ ان لوگوں نے بڑا بھاری مکر کا جال پھیلا رکھا ہے ۔ انہوں نے کہا ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو' اور نہ چھوڑو ود اور سواع کو' اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو ۔ انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے' اور تو

بھی ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے"۔

حضرت نوح علیہ السلام کی فریاد کا خلاصہ یہ ہے کہ قوم نے اس طویل جدوجہد و مسلسل جہاد کے باوجود ان کو پوری طرح مسترد کر دیا۔ حقیقت کو اچھی طرح پیش کرنے اور حقائق پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کے باوجود لوگوں نے منہ موڑ لیا۔ ان کو ڈرایا بھی گیا' مال دولت اور اقتدار و اولاد کے وعدے بھی ان کے ساتھ کیے گئے۔ ترقی اور خوشحالی کا لالچ بھی دیا گیا۔ یہ لوگ چونکہ گمراہ قیادتوں کے پیچھے چلتے تھے' اور گمراہ قیادتیں ہمیشہ اپنے عوام کو دھوکہ دیتی ہیں' اس لیے کہ گمراہ قیادتوں کے ہاتھ میں مالی وسائل اور جاہ و اقتدار ہوتا ہے' تو لوگ انہی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

وَ اتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗ اِلَّا خَسَارًا (۷۱ : ۲۱) "اور ان (رئیسوں) کی پیروی کی جو مال اور اولاد پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے"۔ اس مال اور اولاد نے انہیں دھوکہ دے کر مزید گمراہ کر دیا۔ لہٰذا مال و اولاد کے نتیجے میں انہیں بدبختی اور خسارہ ہی ملا۔

ان لوگوں نے صرف گمراہی پر اکتفا نہ کیا' بلکہ۔

وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا (۷۱ : ۲۲) "ان لوگوں نے بڑے بھاری مکر کا جال پھیلا کر رکھ دیا"۔ یعنی اس قدر عظیم سازش کی کہ اس سے آگے کوئی بڑی سازش نہ ہو۔ انہوں نے دعوت اسلامی کے تمام راستے بند کرنے کے لیے مکاری کی۔ لوگوں کے دلوں کو دوسرے کاموں میں مشغول کر دیا اور ان کے دلوں کے اندر دعوت اترنے کے مواقع ہی ختم کر دیئے۔ کفر' گمراہی اور جاہلیت کو ان کے لیے حسین بنا دیا۔ اور لوگ جاہلیت ہی میں بھٹکتے رہے۔ ان کی بڑی مکاری یہ تھی کہ یہ لوگوں کو ان الہوں کی عبادت میں لگائے رکھتے تھے جن کو انہوں نے الٰہ کہہ رکھا تھا۔ عوام الناس کے دلوں میں ان بتوں کی حمیت اور غیرت پیدا کر دی تھی۔

وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ (۷۱ : ۲۳) "انہوں نے کہا' ہرگز نہ چھوڑو اپنے الہوں کو"۔ ان الہوں کو انہوں نے "تمہارے الٰہ" کہہ کر پکارا تاکہ ان کو جوش آئے۔ جھوٹی حمیت اور گناہ پر آمادہ کرنے والی غیرت جاگے۔ پھر انہوں نے ان بتوں میں سے جو زیادہ معزز اور مشہور تھے' ان کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا تاکہ عوام ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔

وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا وَّ لَا يَغُوْثَ وَ يَعُوْقَ وَ نَسْرًا (۷۱ : ۲۳) "نہ چھوڑو' ود' سواع' یغوث اور یعوق اور نسر کو"۔ یہ نسر تو ان کا بڑا بت تھا جو حضور ﷺ کے دور کی جاہلیت میں بھی پوجا جاتا تھا۔

ہمیشہ گمراہ قیادتیں عوام الناس کی پوجا کے لیے بت گھڑتی ہیں' ان کے نام اور شکلیں ہی مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہیں' لیکن عوام الناس کو ان کے ارد گرد گھمایا جاتا ہے۔ عوام کے دلوں میں ان بتوں کی جاہلانہ محبت پیدا ہو جاتی ہے تاکہ وہ عوام کو ہلاکت کے جس گڑھے میں چاہیں' لے جا کر گرا دیں۔ اور ان کو اس گمراہی پر قائم رکھیں اور اس گمراہ قیادت کی قید میں رہیں۔

وَ قَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا (۲۴:۷۱) ''انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا''۔ ہر گمراہ قیادت اسی قسم کے بتوں کے سامنے عوام کو جمع کرتی ہے' یہ بت پتھروں کی شکل میں بھی ہوتے ہیں' افراد کی شکل میں بھی ہوتے ہیں اور افکار کی شکل میں بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ سب کے سب بت ہوتے ہیں' سب کے سب دعوت اسلامی کی راہ روکتے ہیں۔ عوام کو داعیان حق سے دور رکھتے ہیں۔ بڑی بڑی سازشیں کرتے ہیں اور ان سازشوں پر اصرار کرتے ہیں۔

اس مقام پر اس نبی کریم کے دل سے ان گمراہوں' مکاروں' گمراہ کرنے والوں اور ان کے متبعین کے لیے یہ بد دعا نکلتی ہے۔

وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا (۲۴:۷۱) ''اے اللہ تو بھی ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے''۔ یہ ایک ایسے دل کی بد دعا ہے جس نے ایک طویل عرصہ تک جدوجہد کی۔ ایک طویل عرصہ تک مشقتیں برداشت کیں۔ یہ بد دعا تب نکلی کہ تمام ذرائع ختم ہو گئے اور معلوم ہو گیا کہ ان ظالم باغی اور سرکش دلوں میں اب بھلائی کا رمق بھی باقی نہیں ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ دل رب کی ہدایت اور نجات کے مستحق ہی نہیں رہے۔

قبل اس کے حضرت نوح علیہ السلام کی پوری بد دعا یہاں نقل کی جائے' ظالموں اور خطاکاروں کا انجام نقل کیا جاتا ہے۔ ان کا وہ انجام بھی جو یہاں ہوا اور وہ بھی جو آخرت میں ہوا۔ کیونکہ اللہ کے علم کے نقطہ نظر سے آخرت بھی حاضر و موجود ہے اور اس زاویہ سے بھی کہ اس کا وقوع اس قدر یقینی ہے کہ گویا واقع ہو گیا۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾

''اپنی خطاؤں کی بنا پر ہی وہ غرق کیے گئے اور آگ میں جھونک دیئے گئے' پھر انہوں نے اپنے لیے اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ پایا''۔

ان کی خطاکاریوں' ان کے گناہوں اور ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے وہ جہنم میں داخل ہوئے۔ یہاں فائے تعقیب بالارادہ لائی گئی ہے۔ کیونکہ ان کے غرق ہوتے ہی ان کو جہنم رسید بھی کر دیا گیا اور ان کے غرق ہونے اور جہنم کے داخل ہونے کے درمیان جو زمانی فاصلہ ہے وہ گویا ہے ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کے میزان اور معیار میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ گویا اس دنیا میں ان کا غرق کیا جانا اور آخرت میں ان کا دوزخ میں داخل کیا جانا گویا باہم قریب و متصل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد عذاب قبر کا عرصہ ہو جو نہایت ہی مختصر ہے۔

فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا (۲۵:۷۱) ''پھر انہوں نے اپنے لیے اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ پایا''۔ نہ اولاد' نہ مال' نہ مرتبہ' نہ دوست اور نہ ان کے نام نہاد الٰہ۔

ان دو چھوٹی سی آیات میں ان سرکشوں کا قصہ تمام ہو گیا اور ان کا قصہ حیات ختم ہوا۔ لیکن ابھی حضرت نوح علیہ السلام کی دعا ختم نہیں ہوئی کہ اے اللہ ان کو فنا کر دے۔ یوں کہ ان کا وجود تک نہ رہے۔ یہاں ان کی غرقابی اور طوفان

کے قصے کی تفصیلات نہیں دی گئیں' اس لیے کہ اس مقام پر نہایت شتابی کے ساتھ ان کا قصہ تمام کر کے دکھانا مطلوب تھا۔ یہاں تک کہ غرقابی اور داخلہ جہنم کے درمیان کے طویل فاصلے کو صرف فائے تعقب کے ذریعہ لپیٹ لیا گیا۔

اب حضرت نوح علیہ السلام کی مکمل دعا آتی ہے :

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ
الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا
كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ ۲
وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾ النصف ع ۸

"اور نوح ؑ نے کہا" "میرے رب' ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔ اگر تو نے ان کو ۱۰
چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا' بدکار اور سخت کافر ہی ہو گا۔ میرے رب' مجھے اور میرے والدین کو' اور ہر اس شخص کو جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہوا ہے' اور سب مومن مردوں اور عورتوں کو معاف فرما دے' اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کر"۔

حضرت نوح علیہ السلام کے قلب مبارک پر یہ الہام آگیا تھا کہ اس ناپاک زمین کو غسل دینا مقصود ہے اور ظالموں اور سرکشوں نے اس کو شر و فساد سے بھر دیا ہے۔ یہ شر اس قدر غالب ہو گیا ہے اور اس قدر جم گیا ہے کہ اس نے دعوت دین کو جامد کر کے رکھ دیا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کے لوگ اب ناقابل اصلاح ہو گئے ہیں اور بارہا ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی وقت اہل زمین ناقابل اصلاح ہو جائیں تو ان پر عام تباہی آتی ہے اور اس طرح اللہ زمین کی تطہیر فرما دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تک حضرت نوح علیہ السلام پہنچ چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے دعا فرمائی کہ اے اللہ' ان لوگوں کو ختم کر دے' ظالموں کو بیخ و بن سے اکھاڑ دے' کوئی زندہ وجود باقی نہ رہے' اور انہوں نے دلیل بھی دے دی۔

اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ (۷۱ : ۲۷) "اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے"۔ عبادک سے مراد یہاں اہل ایمان ہیں یعنی لوگ تو ایمان لائیں گے لیکن یہ بااثر اور سرکش مقتدر لوگ اپنے اقتدار اور قوت کے بل بوتے پر ان کو گمراہ کر دیں گے۔ اور اس سے مراد عام انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ پھر معنی یہ ہو گا کہ یہ عوام الناس کو اپنے مرتبے اور بلند مقام کی وجہ سے متاثر کریں گے اور اللہ سے دور کر دیں گے۔

پھر ان لوگوں نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے' جس میں سے صرف کفار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جو بچے بھی پیدا ہوتے ہیں' ان کی پیدائش کے نتیجے میں کفار نسل تیار ہوتی ہے۔ کیونکہ ظالموں نے جو فضا تیار کر رکھی ہے اس میں ظالم اور گمراہ نسل ہی تیار ہوتی ہے۔ جو نور ایمان سے محروم ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حضرت نوح علیہ السلام نے اشارہ فرمایا اور قرآن کریم نے آپ کی زبانی نقل کیا۔

وَ لَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (۷۱ : ۲۷) "اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا' بدکار اور سخت کافر ہو گا"۔ کیونکہ وہ اپنی سوسائٹی میں برے اور گمراہ کن حالات' طریقے اور افکار شائع کرتے ہیں۔ اور انہوں نے اپنی سوسائٹی اور نظام کو ایسا بنا دیا ہے کہ اس کے اندر فاسق و فاجر ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ آپ نے دوبارہ ان کی بیخ کنی کے لیے دعا کی۔ اللہ نے ان کی دعا کو قبول کر لیا اور روئے زمین کو ان کی گندگی سے صاف کر دیا۔ ان پر ایسا سیلاب آیا جو سب کچھ بہا کر لے گیا۔ اور اس قسم کا تباہ کن سیلاب اللہ جبار و قہار ہی لا سکتا ہے۔

ایک طرف حضرت نوح علیہ السلام نے کفار کے بارے میں دعا فرمائی کہ ان کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا (۷۱ : ۲۸) "اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کر"۔ اور دوسری جانب انہوں نے اپنے لیے دعا فرمائی :

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ (۷۱ : ۲۸) "میرے رب' مجھے اور میرے والدین کو' اور ہر اس شخص کو جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہوا ہے' اور سب مومن مردوں اور مومن عورتوں کو معاف فرما دے"۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ کو اپنی مغفرت کے لیے بھی پکارا۔ اور یہ ہیں انبیاء کے آداب بارگاہ رب تعالیٰ میں۔ اللہ کے سامنے بندے کو اس طرح عاجزی سے بات کرنا چاہئے جس طرح نوح علیہ السلام کر رہے ہیں۔ وہ اس طرح دعا کر رہے ہیں جس طرح ایک انسان دعا کرتا ہے۔ انسان سے غلطی بھی ہوتی ہے' تقصیرات بھی ہوتی ہیں۔ اگرچہ ایک نبی غایت درجہ مطیع رب ہوتا ہے' جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں بھی جنت میں رب کریم کے فضل کے سوا داخل نہیں ہو سکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام نبی ہیں۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ اعصاب شکن جدوجہد کی' پھر بھی وہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ' جو تقصیرات ہوئی ہیں معاف کر دی جائیں۔

پھر وہ اپنے والدین کے لیے دعا کرتے ہیں۔ ایک نبی اپنے والدین کا احترام کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مومن ہوں گے۔ اگر مومن نہ ہوتے تو اللہ آپ کو اس کی اجازت نہ دیتا جس طرح اللہ نے آپ کی بات اپنے بیٹے کے بارے میں نہ سنی جو کافر تھا۔

پھر آپ کی دعا ان لوگوں کے بارے میں ہے جو آپ کے گھرانے میں اور آپ کی سوسائٹی میں بطور مومن بیٹھیں۔ یہ ایک مومن کی دوسرے مومن کے ساتھ نیکی ہے۔ ایک مومن اپنے لیے جو چیز پسند کرتا ہے وہی دوسرے مومن کے لیے بھی پسند کرتا ہے۔ گھر کا ذکر یہاں اس لیے ہوا کہ اس طوفان میں تمام مومنین کے لیے احکام تھے کہ وہ آپ کے گھر میں داخل ہو جائیں اور آپ ان کو سفینہ میں لے کر نکلیں گے۔

اس کے بعد عام مومنین اور مومنات کے لیے دعا ہے۔ یہ بھی ایک نبی کا رویہ ہے کہ وہ تمام اہل ایمان کے لیے نیک خواہشات رکھتا ہے۔ چاہے یہ مومنین اس کے دور کے ہوں' اس سے پہلے گزرے ہوں یا بعد کے ادوار میں آنے والے ہوں۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کا ایک راز ہے کہ اس نظریہ کے ساتھ منسلک ہونے والے لوگوں کا آپس میں بہت

ہی گہرا رابطہ ' تعلق اور محبت اور برادرانہ جذبات ہوتے ہیں ـ اور یہ خصوصیت صرف اسلامی نظریہ حیات ہی کو حاصل ہے ـ اس محبت کے مقابلے میں پھر کافروں کے ساتھ دشمنی اور کراہیت ـ

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا (۷۱ : ۲۸) "اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کر"ـ یہاں یہ سورت ختم ہوتی ہے جس میں ایک طرف ایک شریف نبی کی ان تھک جدوجہد کی تصویر کشی ہے اور دوسری طرف سرکشوں اور معاندین کی تصویر ہے ـ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعیان حق کو کس قدر عظیم جدوجہد کرنی چاہئے اور یہ کہ اس راہ میں کس قدر مشکلات ہوا کرتی ہیں ـ اور کس قدر عظیم قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے 'تحریک دعوت اسلامی؟ اور یہ عظیم جدوجہد اس لیے ضروری ہے کہ کوئی انسانی سوسائٹی دعوت اسلامی اور اسلامی نظام کے سوا' نہ ہی دنیا میں اور نہ آخرت میں ترقی اور کامیابی حاصل کر سکتی ہے ـ غرض ترقی کا راز اور انسانیت کے عروج کا ذریعہ دعوت اسلامی اور اسلامی نظام کے قیام میں ہے ـ

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۲۹

سورۃ الجن - ۷۲

۱ -- تا -- ۲۸

سورۃ الجن ایک نظر میں

اس سورت کے معانی اور مفاہیم پر غور کرنے سے پہلے ہر احساس پر جو نمایاں چیز نمودار ہوتی ہے اور جو بہت واضح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک موسیقی کا قطعہ ہے' جس کی آواز کانوں میں مسلسل آرہی ہے ۔جس کا نغمہ نہایت قوی ہے اور جو ترنم سے بھرپور ہے ۔یہ پوری سورت گنگناہٹ سے بھرپور ہے ۔اس کی آواز میں حزن و ملال اور تاسف اور شکایت و غم نمایاں ہے ۔بلکہ اس پوری سورت کے اندر رنج و الم اور درد و کرب واضح نظر آتا ہے ۔یہ خصوصیت اس سورت کے مناظر' اس کی فضا اور اس کی روح میں نمایاں ہے ۔خصوصاً سورت کے آخری حصے میں جہاں جنوں کے قول کے اختتام پر حضور اکرم ﷺ کو خطاب ہوتا ہے ۔اس خطاب کو سن کر ہر شخص کے دل میں حضور ﷺ کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے ۔اور اس ہمدردی میں محبت کے جذبات بھرے نظر آتے ہیں ۔اس خطاب میں حضور ﷺ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جاتا ہے ۔کہ آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تبلیغ کریں اور یہ کہ اللہ آپ کا نگران و نگہبان ہے ۔

قُلْ اِنَّمَا اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَا اُشْرِكُ بِهٖۤ اَحَدًا (۲۰) قُلْ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (۲۱) قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (۲۲) اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا (۲۳) حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا (۲۴) قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا (۲۵) عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖۤ اَحَدًا (۲۶) اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (۲۷) لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا (۲۸) (۷۲ : ۲۰ تا ۲۸) ''اے نبیؐ 'کہو کہ ''میں تو اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا''۔کہو ''میں تم لوگوں کے لیے کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ کسی بھلائی کا''۔کہو' ''مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی بچا نہیں سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں ۔میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں ۔اب جو بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات

نہ مانے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔ (یہ لوگ اپنی اس روش سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کا جتھا تعداد میں کم ہے۔ کہو "میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہے' اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا' سوائے اس رسول کے جسے اس نے (غیب کا علم دینے کے لیے) پسند کر لیا ہو' تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے' اور وہ ان کے پورے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے"۔

جنات نے جو حقائق پیش کیے ان کا نفسیاتی اثر اس کے علاوہ ہے۔ اس سورت میں جنات کی ایک طویل تقریر پیش کی گئی ہے۔ اور اس تقریر میں جنات نے بہت ہی وزن دار حقائق بیان کیے ہیں۔ جن کا انسانی احساس اور انسانی ادراک پر بہت بھاری اثر ہوتا ہے۔ اور انسان غوروفکر پر مجبور ہوتا ہے کہ جس دعوت کو جنات اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں ان کو انسان کیونکر نظرانداز کر سکتے ہیں۔ یہ غوروفکر جب اس سورت کے عمومی مغموم لہجے اور مغموم اور درد بھری موسیقی سے ملتے ہیں تو یہ باہم نہایت ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور پردۂ احساس پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔

پھر جو لوگ اس سورت کو' ترتیل کے ساتھ اور اس پس منظر کے ساتھ سمجھتے ہوئے پڑھتے ہیں تو یہ احساسات واضح ہو کر سامنے آتے جاتے ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا۔

یہ تو تھا اس سورت کا ایک ممتاز پہلو' اب اس سے آگے بڑھ کر جب ہم اس کے محور' موضوع اور اس رخ کلام پر غور کرتے ہیں تو اس میں علم و حکمت کے بے شمار معانی و اشارات پائے جاتے ہیں۔

یہ سورت ایک دوسرے جہاں سے اسلامی نظریہ حیات پر شہادت ہے' جس کے بارے میں مشرکین جھگڑتے تھے۔ جدل و جدال کرتے تھے اور محض تیر تکے چلاتے تھے اور بعض اوقات سرے سے اس کے منکر ہو جاتے تھے۔ وہ کبھی یہ کہتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اسلامی نظریہ حیات کے بارے میں جو باتیں کرتے ہیں وہ ان پر جن القا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سورت میں جنوں کی طرف سے اس نظریہ کی تصدیق آتی ہے اور وہ اس کی سچائی کی شہادت دیتے ہیں۔ اور اس بات کی تکذیب کرتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جنوں سے امداد لیتے ہیں حالانکہ خود جنوں کا حال یہ تھا کہ انہیں اس قرآن کا تب پتہ چلا جب انہوں نے خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اسے سنا اور قرآن سن کر یہ جن دم بخود رہ گئے' مرعوب ہو گئے اور ان پر اس قرآن کے گہرے اثرات پڑے۔ ان کے دل اللہ کے فیوض و برکات سے اس قدر بھر گئے کہ اب وہ خاموش نہیں رہ سکے۔ نہ انہوں نے اس سلسلے میں کوئی مجمل اور سرسری بات کی' نہ مختصر بات کی بلکہ نکلے اور اس پیغام کو پوری تفصیل کے ساتھ اپنی قوم تک پہنچا دیا۔ جس طرح کسی کو اچانک عظیم خبر مل جاتی ہے اور وہ ہر کسی سے کہتا پھرتا ہے کیونکہ نزول قرآن دراصل ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس سے زمین و آسمان' کواکب و سیارے' جن و انس' ملائکہ اور پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا' اور اس واقعہ نے تمام عالم کو متاثر کر لیا تھا۔ یہ جنوں کی طرف سے اسلام کے حق میں ایک نہایت موثر نفسیاتی شہادت تھی۔

اس کے بعد اس سورت نے جنوں کے بارے میں وہ تمام اوہام و خرافات ختم کر دیئے جو ان کے بارے میں لوگوں کے

عقائد میں رچے بسے تھے' نیز قرآن کے مخاطبین سے پہلے اور بعد کے زمانوں میں جنوں کے بارے میں لوگوں کے جو اوہام تھے' ان کی تصحیح بھی کر دی ۔ اور اس چھپی ہوئی مخلوق کی پوری حقیقت بتا دی کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے' بغیر افراط و تفریط کے ۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے پہلے مخاطبین کے عقائد میں یہ بات اچھی طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ جنات کو اس کرۂ ارض پر اقتدار حاصل ہے ۔ اس لیے اہل عرب جب کسی بھی وادی اور نشیبی جگہ میں داخل ہوتے تھے یہ لوگ جنوں سے ان کے سردار کے ہاں پناہ لینے کا اعلان کرتے ۔ اور کہتے کہ میں اس وادی کے سردار کے ہاں اس وادی کے احمقوں کی حماقتوں سے پناہ مانگتا ہوں ۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو امن میں سمجھتے تھے ۔ نیز ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ جنات غیب بھی جانتے ہیں اور یہ غیب کی خبریں کاہنوں کو دیتے ہیں اور یہ کاہن پھر پیش گوئیاں کرتے تھے ۔ بعض عرب جنوں کی عبادت بھی کرتے تھے اور بعض نے اپنا نسب نامہ جنوں کے ساتھ ملا دیا تھا ۔ اور بعض یہ کہتے تھے کہ اللہ کی ایک بیوی جنوں میں سے ہے جس سے فرشتے پیدا ہوتے ہیں ۔

جنوں کے بارے میں یہ اور اس قسم کے دوسرے عقائد و تصورات جاہلیت میں عام تھے اور بعض حلقوں اور علاقوں میں یہ اوہام و خرافات آج تک موجود ہیں ۔ ایک طرف تو یہ اوہام و خرافات تھے جو ایام جاہلیت میں لوگوں کے تصورات پر چھائے ہوئے تھے ۔ اور جن کے آثار آج بھی باقی ہیں ۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی تھے اور ہیں جو سرے سے جنوں کے وجود سے انکار کرتے ہیں اور یہ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جنات کے بارے میں جو بات بھی ہو وہ خرافات ہے ۔ چنانچہ بعض لوگ تو وہم کے سمندر میں غرق تھے اور بعض انکار کے اندھیرے میں غرق تھے ۔ ان کے دو انتہاؤں کے درمیان اسلام نے جنوں کی اصل حقیقت بیان کر دی ۔ اور ان کے بارے میں لوگوں کے افکار درست کر دیئے ۔ لوگوں کے دل و دماغ سے خرافات بھی نکال دیئے' ان کے دلوں سے ان کا خوف بھی نکال دیا' اور لوگوں کو اس بات سے نجات دے دی کہ لوگ خواہ مخواہ ان کی سلطنت کے تابع ہوں ۔

جن ایک حقیقی مخلوق ہیں ۔ وہ یہاں خود اپنے بارے میں یہ معلومات دیتے ہیں :

وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا (۷۲ : ۱۱) "اور ہم میں سے کوئی صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں ہم مختلف طریقوں میں بٹے ہوئے ہیں" ۔ بعض گمراہ اور گمراہ کنندہ ہیں اور بعض سادہ اور بے گناہ ہیں ۔ یہ سادہ لوگ دھوکہ بھی کھا جاتے ہیں ۔

وَ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا (۴) وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (۷۲ : ۵) "اور یہ کہ ہمارے نادان لوگ اللہ کے بارے میں بہت خلاف حق باتیں کہتے رہتے ہیں" اور یہ کہ "ہم نے سمجھا تھا کہ انسان اور جن کبھی خدا کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتے" ۔ اور یہ کہ جنات ہدایت کے قابل ہیں ۔ اسی طرح وہ گمراہ بھی ہوتے ہیں اور قرآن کریم کو سن کر وہ سمجھتے ہیں اور گہرا تاثر لیتے ہیں ۔

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْۤا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۱) يَّهْدِيْۤ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَ لَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا (۷۲ : ۲) "اے نبی کہو' میری طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے غور سے سنا اور پھر جا کر اپنی قوم کے لوگوں سے کہا : "ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے جو راہ

راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے"۔ اور یہ کہ وہ ازروئے تخلیق انسانوں کی طرح ایک ذمہ دار مخلوق ہیں اور ان پر جزاء و سزا کا اصول جاری ہوتا ہے۔ اور ایمان اور کفر کے بارے میں وہ مکلف ہیں۔

وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا(۱۳) وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا(۱۴) وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا(۱۵) (۷۲: ۱۳ تا ۱۵) "اور یہ کہ جب ہم نے ہدایت کی تعلیم سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اب جو کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لائے گا اسے کسی حق تلفی یا ظلم کا خوف نہ ہو گا اور یہ کہ ہم میں سے کچھ مسلم ہیں اور کچھ حق سے منحرف تو جنہوں نے اسلام اختیار کر لیا انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈلی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں"۔ یہ انسانوں کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے جب یہ لوگ ان کی پناہ مانگتے ہیں بلکہ اس پناہ مانگنے کی وجہ سے جن اور مغرور ہو جاتے۔

وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (۷۲: ۶) "اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جن میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے' اس طرح انہوں نے جنوں کا غرور اور بڑھا دیا"۔ اور یہ کہ وہ نہ علم غیب جانتے ہیں اور نہ عالم بالا میں انہیں کوئی رسائی حاصل ہے۔

وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّ شُهُبًا(۸) وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ یَّسْتَمِعِ الْاٰنَ یَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا(۹) وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْۤ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا(۱۰) (۷۲: ۸ تا ۱۰) "اور یہ کہ "ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہریداروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے"۔ اور یہ کہ "پہلے ہم سن گن لینے کے لیے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تھے' مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے گھات میں ایک شہاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے"۔ اور یہ کہ "ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا زمین والوں کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کا رب انہیں راہ راست دکھانا چاہتا ہے"۔ اور یہ کہ ان کے اور خدا کے درمیان کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔

وَّ اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّ لَا وَلَدًا (۷۲: ۳) "اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے اس نے کسی کو بیوی یا بیٹا نہیں بنایا ہے"۔ اور اللہ کی قوت کے مقابلے میں جنوں کی کوئی قوت نہیں ہے نہ وہ اللہ کے کاموں کے مقابلے میں کوئی حیلہ رکھتے ہیں۔

وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا (۷۲:۱۲) "اور یہ کہ ہم سمجھتے تھے نہ زمین میں ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں"۔

یہ صفات جو یہاں ذکر ہوئیں اور ان کے علاوہ قرآن کریم میں ان کی جو صفات مذکور ہیں یا جو حالات بیان ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جن علم غیب نہیں جانتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں آتا ہے کہ آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے لیے مسخر شدہ جن 'ایک عرصہ تک کام کرتے رہے اور انہیں معلوم نہ تھا کہ حضرت سلیمان فوت ہو چکے ہیں۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ

(۳۴:۱۴) "پھر جب اس کی موت کا فیصلہ کر دیا تو اس کی موت کی اطلاع ان کو گھن سے لگی جس نے اس کا عصا کھا لیا۔ پھر جب وہ گر پڑا تو جنوں کو علم ہوا کہ اگر وہ غیب کا علم جانتے تو اس ذلت کی تکلیف میں نہ رہتے"۔

ابلیس جو جنوں میں سے ہے 'اس کے بارے میں قرآن خصوصیت سے یہ کہتا ہے۔

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (۷:۲۷) "وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے جبکہ تم انہیں نہیں دیکھ سکتے"۔ یعنی ان کا وجود ایسا ہے کہ انسان اس کو نہیں دیکھ سکتے جبکہ جن انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں۔

اور سورہ رحمان میں جنوں کے مادۂ تخلیق اور انسانوں کے مادۂ تخلیق کی تفصیلات دی گئی ہیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (۱۴) وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۱۵) (۵۵:۱۵) "آدمی کو کھنکھارتی مٹی سے بنایا' جیسے ٹھیکری ہوتی ہے 'اور جن کو آگ کی لپٹ سے"۔

ان تمام آیات سے اس مخلوق کے وجود اور اس کی نوعیت کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں اور اس کی بیشتر خصوصیات بھی معلوم ہوتی ہیں۔ اور وہ تمام اوہام اور قصے کہانیاں اور خرافات کی تردید بھی ہو جاتی ہے ' جو جاہلیت کے دور میں جنوں کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ یوں جنات کے بارے میں ایک مسلم کا تصور بالکل صاف ستھرا اور واضح ہو جاتا ہے اور اس میں اوہام و خرافات کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اور اس سے ان لوگوں کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو جنات کے سرے سے وجود کے منکر ہیں۔

اس سورت نے مشرکین عرب کے ان خیالات کی پوری پوری تردید بھی کر دی جو وہ اس کائنات میں جنوں کے کردار کے بارے میں رکھتے تھے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے جنوں کے وجود ہی کا انکار کیا ہے تو ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ وہ اپنے اس انکار کو کس دلیل پر مبنی کرتے ہیں؟ اور پھر اس قدر قطعی اور جزمی بات کرتے ہیں اور جو لوگ جنات کو تسلیم کرتے ہیں ان کے ساتھ ہنسی مزاح کرتے ہیں اور اسے خرافات قرار دیتے ہیں۔ یہ ان کا کام ہے کہ وہ بتائیں کہ ان کا دعویٰ کس دلیل پر مبنی ہے؟

ان لوگوں کا دعویٰ صرف اس صورت میں درست ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس پوری کائنات کو چھان مارا ہو اور ان کو اس میں جن نہ ملے ہوں۔ آج تک کسی سائنس دان نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے پوری کائنات کو چھان

مارا ہے۔ جبکہ خود اس زمین کے اندر بے شمار زندہ مخلوق ہے جس تک ابھی ہمارا علم رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ روزانہ کسی نہ کسی مخلوق کا انکشاف ہوتا رہتا ہے۔ اور آئندہ بھی کئی زندہ اشیاء معلوم ہوں گی جو ابھی تک معلوم نہیں ہیں۔

کیا انہوں نے اس کائنات کی تمام قوتوں کو معلوم کر لیا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان میں سے جن نام کی کوئی قوت نہیں ہے۔ کوئی معقول شخص اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس جہاں میں کئی پوشیدہ قوتیں ہیں اور آئے دن ان کے انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔ اور کل وہ قوتیں معلوم نہ تھیں اور اہل علم بڑی سنجیدگی سے مزید قوتوں کے انکشاف میں لگے ہوئے ہیں۔ اور جو انکشاف ہوئے وہ لوگ نہایت عاجزی سے اپنی کم مائیگی کا اعلان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو جہالت کی چوکھٹ پر کھڑے ہیں اور ابھی تک انہوں نے کسی علمی کام کا آغاز ہی نہیں کیا ہے۔

کیا ان سائنس دانوں نے پوری کائناتی قوتوں کے انکشاف کر دیئے ہیں اور ان میں سے جنات اور بجلی کو یہ لوگ ایک علمی حقیقت قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے بجلی کو دیکھا تک نہیں ہے۔ اور نہ ان کی تجربہ گاہوں میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں یہ اس بجلی کو جمع کر سکیں جس کے بارے میں یہ لوگ رات دن بحث کرتے ہیں۔

لہٰذا جو لوگ اس قدر قطعیت اور جزم کے ساتھ جنات کا انکار کرتے ہیں آخر ان کے پاس کیا علمی دلیل ہے' اس دعویٰ پر؟ اصل بات یہ ہے کہ اس کائنات اور اس کی قوتوں کے بارے میں انسان کا علم اس قدر کم ہے کہ کوئی معقول انسان کسی بات پر کوئی دعویٰ قطعیت کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ بات حقیقت ہے کہ جنات کے ساتھ لوگوں نے بے شمار خرافات وابستہ کر لی ہیں۔ اور ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم ان تمام خرافات کا انکار کرتے ہیں جس طرح قرآن کریم نے کئی خرافاتی کہانیوں کا انکار کیا بلکہ ان کی تردید کر دی۔ اس طرح نہیں کہ ہم سرے سے اس مخلوق کے وجود ہی کا انکار کر دیں اور بلاحجت اور دلیل انکار کر دیں۔ یہ ایک غائب مخلوق ہے اور اس قسم کے غیبی امور کے بارے میں ہمیں چاہئے کہ ہم کسی ایسے سرچشمہ علم کی طرف رجوع کریں جو یقینی ہو اور سائنسی تصورات کے نتیجے میں اس یقینی سرچشمے کی مخالفت سے باز رہیں کیونکہ قرآن وسنت ایک یقینی ذریعہ علم ہے اور اس نے جو کچھ جنات کے بارے میں کہہ دیا' وہ حرف آخر ہے۔

مذکورہ بالا امور کے ساتھ ساتھ یہ سورت' اسلامی تصور حیات کی حقیقت الوہیت اور حقیقت عبودیت کی وضاحت بھی کرتی ہے۔ اس کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والی مخلوق کی حقیقت بھی واضح کرتی ہے۔ پھر اس مخلوق کے باہمی ربط و تعلق کو بھی واضح کرتی ہے۔

جنات کی تقریر میں عقیدۂ توحید کی بہت ہی خوبصورت وضاحت کی گئی ہے۔ اس بات کی تردید کی گئی ہے کہ اللہ کی کوئی بیوی ہے یا اس کی کوئی اولاد ہے۔ اور اس بات کی تشریح بھی کی گئی ہے کہ آخرت میں سب نے حساب دینا ہے اور یہ کہ زمین میں کوئی ایسی قوت نہیں ہے کہ وہ اللہ پر غالب ہو سکے یا اللہ سے چھوٹ سکے یا رہ سکے۔ اور اسے منصفانہ جزاء و سزا نہ ملے۔ اور اس سورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطاب کیا گیا ہے اس میں ان حقائق میں سے بعض حقائق بھی لیے گئے ہیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا (۲۰) قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (۲۱) قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (۲۲)

(۷۲: ۲۰ تا ۲۲) "اے نبیؐ کہو کہ "میں تو اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا"۔ کہو "میں تم لوگوں کے لیے کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ کسی بھلائی کا"۔ کہو "مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی بچا نہیں سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں"۔ اور یہ اس واقعہ کے بعد ہوا جب جنات نے اس حقیقت پر صریح شہادت دے دی۔

اس سورت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ وحدہ حاکم مطلق ہے اور انسانوں کے لیے اعلیٰ و ارفع مقام یہ ہے کہ وہ بندگی کے برتر مقام پر پہنچ جائیں۔

وَّ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا (۷۲: ۱۹) "یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے"۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے تو اس مضمون کی پھر تاکید کی گئی ہے۔

قُلْ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا (۷۲: ۲۱) "کہو' میں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا"۔

یہ کہ غیب جاننے والا صرف اللہ وحدہ ہے' جنات غیب نہیں جانتے۔

وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْۤ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا (۷۲: ۱۰) "اور یہ کہ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا زمین والوں کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کا رب انہیں راہ راست دکھانا چاہتا ہے"۔ اسی طرح رسولوں کو بھی علم غیب نہیں ہے' ان کو اسی قدر علم ہوتا ہے جس قدر اللہ بتا دے۔

قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا (۲۵) عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖۤ اَحَدًا (۲۶) اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (۲۷) (۷۲: ۲۵ تا ۲۷) "کہو "میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہے' اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا' سوائے اس رسول کے جسے اس نے (غیب کا علم دینے کے لیے) پسند کر لیا ہو' تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے"۔

رہے اللہ کے بندے اور مخلوقات جو اس کائنات میں موجود ہیں' تو اس بارے میں سورت بتاتی ہے کہ ان میں سے بعض اور بعض کے درمیان کچھ مشترکہ امور ہیں اور باہم ملنے کی کچھ راہیں ہیں۔ اگرچہ ان کی ساخت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ مثلاً جنوں اور انسانوں کے درمیان بعض امور بہت ہی مشترک ہیں' جس طرح اس سورت اور دوسری سورتوں میں بتایا گیا ہے۔ انسان اس زمین پر بھی دوسری مخلوقات سے علیحدہ اور دور نہیں ہے۔ انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان باہم اتصال اور باہم اشتراک ہے۔ اور یہ انسان جو محسوس کرتا ہے کہ اس کی جنس' اس کی

اس کی قبائلی اور قومی حیثیت الگ اور ممتاز ہے۔تو یہ بے حقیقت سوچ ہے۔اس کائنات کی ساخت اور مزاج میں نہ ان چیزوں کا وجود ہے اور نہ کوئی حقیقت ہے۔انسان کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ اس کائنات کے حوالے سے اپنے تصور اور شعور کو ذرا کھول دے کیونکہ اس کائنات میں انسان کے علاوہ کئی دوسری مخلوقات بھی ہیں' ارواح ہیں اور خفیہ قوتیں ہیں' انسان کو ان کے بارے میں علم نہیں ہے' لیکن اس کائنات میں وہ موجود ہیں۔انسان کے اردگرد موجود ہیں' انسان اس کائنات میں وحدہ مالک نہیں ہے جس طرح بعض اوقات وہ محسوس کرتا ہے۔

پھر یہ دینی اور نظریاتی حقیقت کہ لوگ اگر اسلامی نظام پر قائم ہو جائیں اور یہ کائنات اس کے نتیجے میں اپنی حرکت اور رفتار بدل دے تو یہ بھی ایک معلوم حقیقت ہے' جب انسان بدلتے ہیں تو اس کائنات کی قوتیں ان کے حق میں بدل جاتی ہیں۔

وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا (۱۶) لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَ مَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا (۷۲ : ۱۷) "اور لوگ راہ راست پر ثابت قدمی سے چلتے تو ہم انہیں خوب سیراب کرتے تاکہ اس نعمت سے ان کی آزمائش کریں اور جو اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑے گا اس کا رب اسے سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا"۔یہ وہ حقیقت ہے جو اسلامی تصور حیات کا ایک اہم پہلو ہے کہ انسانی قوتوں اور اعمال اور کائناتی قوتوں اور ان کے افعال کے درمیاں ایک ربط ہے۔یوں یہ سورت نہایت وسیع طول و عرض میں اشارات اور ہدایات کو پھیلاتی ہے' اگرچہ اس کی آیات صرف ۲۸ ہیں اور اس کا نزول ایک متعین واقعہ کے بعد ہوا ہے۔

رہا وہ واقعہ جس کی طرف اس سورت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ بعض جنوں نے قرآن کریم سنا تو اس کے بارے میں روایات میں اختلاف ہے۔

حافظ ابوبکر بیہقی اپنی کتاب دلائل النبوت میں یہ روایت کرتے ہیں' ابوالحسن علی ابن احمد ابن عبدان سے' انہوں نے احمد ابن عبید الصفار سے' انہوں نے اسماعیل قاضی سے' وہ مسدد سے' وہ ابوعوانہ سے' وہ ابوبشر سے' وہ سعید ابن جبیر سے' وہ ابن عباس سے (رضی اللہ عنہم) وہ کہتے ہیں :"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نہ تو جنوں کے سامنے تلاوت کی اور نہ ہی جنات کو دیکھا۔رسول اللہ ﷺ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ عکاظ کے بازار کی طرف چل پڑے۔اس دور میں شیاطین پر پابندی لگ گئی تھی کہ وہ اب آسمانوں کی خبروں کی سن گن نہیں لے سکتے۔جب بھی شیاطین آسمانوں میں چڑھتے' ان پر شہاب ثاقب کی بارش ہو جاتی۔شیاطین اپنی قوم کے پاس آئے۔انہوں نے رپورٹ دی کہ صورت حال کیا ہے؟ تو سب نے کہا کہ ہمارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ پیدا کر دی گئی ہے۔اور جب بھی ہم اوپر جانے کی کوشش کرتے ہیں شہاب ثاقب ہمارا پیچھا کرتے ہیں۔سب نے یہ کہا کہ یہ پابندی جو لگ گئی ہے تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس کائنات میں کوئی بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔لہٰذا اس زمین کے اطراف میں مشرق و مغرب کی طرف نکلو اور دیکھو کہ کیا بڑا واقعہ ہو گیا ہے اور یہ رکاوٹ کیوں ڈال دی گئی ہے۔چنانچہ شیاطین مشرق و مغرب کی طرف نکل گئے اور معلوم کرنے لگے کہ کیا بڑا واقعہ ہو گیا ہے کہ ہم پر آسمانوں کی خبریں لینے کی پابندی لگ گئی ہے۔جو لوگ تہامہ کی طرف نکلے تھے' وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔اس وقت آپ نخلہ کے مقام پر تھے اور آپ عکاظ کی طرف جا رہے تھے۔

آپ اس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ جب انہوں نے قرآن مجید کو سنا تو اس کو کان لگا کر سنا۔ قرآن سننے کے بعد انہوں نے کہا کہ یہ ہے وہ بڑا واقعہ جس کی وجہ سے ہمارے اور آسمان کے درمیان رکاوٹ ہو گئی ہے۔ یہاں سے جب یہ جن اپنی قوم کی طرف لوٹے تو انہوں نے یہ کہا "اے ہماری قوم :

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۱) یَّهْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَ لَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (۷۲ : ۲) اور اللہ نے نبی صلی للہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیات نازل کیں۔

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ ---- اللہ دراصل نبی ﷺ کی طرف جنوں کے اقوال وحی فرمائے۔ (امام بخاری نے مسدد سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے اور امام مسلم نے شیبان ابن فروح سے بھی یہی روایت نقل کی ہے"۔

یہ تو ہے ایک روایت اور صحیح مسلم میں اور روایات بھی ہیں۔ وہ روایت کرتے ہیں 'محمد ابن مثنیٰ سے' وہ عبدالاعلیٰ سے' وہ داؤد سے (یہ ابن ابوہند ہیں) وہ عامر سے' یہ کہتے ہیں : کہ میں نے علقمہ سے پوچھا کہ جنوں والی رات میں ابن مسعود موجود تھے؟ تو علقمہ نے کہا میں نے خود ابن مسعود سے یہ پوچھا تھا کہ جنوں کی رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تم میں سے بھی کوئی تھا؟ تو انہوں نے فرمایا :"نہیں" لیکن رسول اللہ ﷺ ایک رات غائب ہو گئے' ہم نے آپ کو وادیوں اور پہاڑیوں اور جھاڑیوں میں تلاش کیا۔ کسی نے کہا کوئی آپ کو لے اڑا' یا کسی نے اچانک قتل کر دیا۔ اس رات ہم پر بہت مصیبت گزری۔ یہ اس قدر بری رات تھی جو کسی پر آ سکتی ہے۔ جب صبح ہوئی تو کیا دیکھتے ہیں حضور ﷺ حرا کی طرف سے آ رہے ہیں۔ ہم نے کہا حضور ہم نے آپ کو نہ پایا اور بہت تلاش کیا۔ آپ نہ ملے۔ اور ہم پر یہ رات اس قدر بری گزری جو کسی پر گزر سکتی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا :"میرے پاس جنوں کی طرف سے بلانے والا آیا تھا' میں ان کے ساتھ چلا گیا اور ان پر قرآن کریم پڑھا"۔ کہتے ہیں حضور ﷺ ہمارے ساتھ اس مقام تک تشریف لے گئے اور آپ ﷺ نے ہمیں جنوں کے آثار اور ان کی آگ جلانے کے مقامات بتلائے"۔ لوگوں نے آپ سے جنوں کی خوراک کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا"وہ سب ہڈیاں جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہو' وہ تمہارے ہاتھ لگ جاتی ہیں اور جن پر بہت گوشت ہوتا ہے اور ہر وہ مینگنی جو تمہارے جانوروں کی ہو' وہ جنوں کی خوراک ہے۔ لہٰذا تم ہڈیوں اور مینگنیوں کے ساتھ استنجا نہ کرو' کیونکہ یہ تمہارے بھائی جنوں کی خوراک ہے"۔

حضرت ابن مسعود سے ایک اور روایت بھی ہے کہ وہ اس رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ لیکن پہلی روایت کی سند زیادہ قوی ہے۔ لیکن ایسی روایات کو ہم نظرانداز کرتے ہیں۔ صحیحین کی دونوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو معلوم نہ تھا کہ جنات موجود ہیں اور قرآن سنتے ہیں۔ اور حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ جنوں نے خود دعوت دی تھی۔ امام بیہقی دونوں روایات کو علیحدہ علیحدہ واقعات قرار دیتے ہیں۔

ابن اسحاق نے ایک تیسری روایت بھی نقل کی ہے۔"جب ابو طالب فوت ہو گئے تو قریش حضور اکرم ﷺ سے زیادہ اذیت محسوس کرنے لگے' جو وہ ابو طالب کی موجودگی میں نہ کرتے تھے' تو حضور ﷺ طائف کی طرف نکل گئے کہ بنوثقیف کی حمایت حاصل کر لیں' اور اس طرح ثقیف قریش کے مقابلے میں آپ کو بچانے میں تعاون کریں اور شاید وہ دعوت

اسلامی کو قبول کرلیں۔ حضور اکرم ﷺ اکیلے ان کی طرف گئے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں' برید 'بن زیاد نے روایت کی' محمد ابن کعب قرظی سے 'یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب طائف پہنچے تو آپ بنوثقیف کے چند لوگوں سے ملے جو ان کے اشراف اور سردار تھے۔ یہ تین بھائی تھے 'یالیل ابن عمرابن عمیر' مسعود ابن عمرابن عمیر اور حبیب ابن عمرابن عمیر۔ ان میں سے ایک کی بیوی قریشی تھی یعنی بنی جمح میں سے۔ ان کے پاس حضور ﷺ بیٹھے 'ان کو اللہ کی طرف بلایا۔ اور ان کے ساتھ اسلام کی نصرت کرنے کے موضوع پر بات کی اور یہ درخواست کی کہ قریش کے مخالفین کے مقابلے میں میری امداد کرو۔ ان میں سے ایک نے کہا 'کہ اگر اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے تو میں کعبہ ہی کو نہیں مانتا (یہ شخص کعبہ کا کپڑا اکھاڑنے لگا) دوسرے بھائی نے کہا کیا اللہ کو تیرے سوا کوئی اور نہ ملا تھا اور تیسرے نے کہا خدا کی قسم میں تجھ سے بات ہی نہ کروں گا۔ اگر تو رسول ہے 'جس طرح تیرا دعویٰ ہے تو میں مناسب نہیں سمجھتا کہ تیری بات کے خلاف کروں اور اگر تو جھوٹا ہے تو جھوٹے شخص کے ساتھ بات کرنا ہی مناسب نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ اٹھے اور ثقیف کے بارے میں ہر قسم کی بھلائی سے مایوس ہوگئے۔ حضور ﷺ نے ان سے یہ کہا "تم نے مجھے جو جواب دیا سو دیا لیکن اب تم یہ مہربانی کرو کہ اس بات کو یہاں تک ہی رہنے دو"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس بات کو پسند نہ کیا کہ آپ کی قوم کو آپ کے بارے میں یہ اطلاع ملے۔ اور وہ آپ کے خلاف مزید جری ہو جائیں۔

چنانچہ انہوں نے ایسا نہ کیا اور اپنے اوباشوں 'غلاموں کو آپ کے پیچھے لگا دیا' وہ آپ ﷺ کو گالیاں دیتے رہے۔ آپ ﷺ پر آوازے کستے رہے یہاں تک کہ لوگ جمع ہوگئے اور آپ ﷺ مجبوراً ایک باغ کے اندر چلے گئے۔ یہ باغ عتبہ اور شیبہ پسران ربیعہ کا تھا۔ یہ دونوں باغ میں موجود تھے۔ جب ثقیف کے اوباش چلے گئے جو آپ کا پیچھا کر رہے تھے تو آپ نے انگور کی ایک بیل کے نیچے آرام کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ انگور کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ ربیعہ کے بیٹے دور سے دیکھ رہے تھے کہ ثقیف کے لوگوں نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جب رسول اللہ ﷺ مطمئن ہوگئے تو آپ نے یہ دعا فرمائی "اللہ 'میں تیرے سامنے اپنی ناتوانی کی شکایت کرتا ہوں' اپنی بے تدبیری کی کا اعتراف کرتا ہوں 'اور اس بات کا بھی شکوہ کرتا ہوں کہ لوگوں کے دل میں میرا احترام نہیں رہا۔ اے ارحم الراحمین تو کمزوروں کا رب ہے اور میرا بھی رب ہے۔ تو مجھے کن لوگوں کے سپرد کر رہا ہے 'تو کیا مجھے کسی غیر کے حوالے کر رہا ہے جو مجھ سے ترش روی سے پیش آئے یا میرا معاملہ تو نے کسی دشمن کے حوالے کر دیا ہے 'اگر تو مجھ پر ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے لیکن تیری عافیت میرے لیے بہت ہی وسیع ہے۔ میں تیرے چہرے کے نور کی پناہ مانگتا ہوں جس سے پوری دنیا روشن ہے اور جس کی وجہ سے دنیا اور آخرت کی بھلائی ملتی ہے۔ میں تیرے غضب سے پناہ مانگتا ہوں۔ اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو جائے 'تو میری سرزنش کر سکتا ہے کہ تو راضی ہو اور تیرے سوا نہ جائے پناہ ہے اور نہ قوت کا سرچشمہ ہے۔"

کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ کو عتبہ کے لڑکوں نے اس حال میں دیکھا تو ان کو آپ پر رحم آگیا۔ ان کا ایک عیسائی غلام تھا' جس کا نام عداس تھا۔ تو انہوں نے اسے حکم دیا کہ انگور کا ایک گچھا لو 'اسے تھالی میں رکھو' اس شخص کے پاس لے جاؤ' اور اس سے کہو یہ کھائیں۔ عداس نے ایسا ہی کیا۔ حضور ﷺ کے سامنے انگور رکھے اور کہا آپ تناول فرمائیں۔ جب حضور اکرم ﷺ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو فرمایا "بسم اللہ" 'اس کے بعد کھایا۔ عداس نے آپ کی طرف دیکھا اور کہا یہ بات تو اس علاقے کے لوگ نہیں کہتے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے کہا عداس تم کہاں کے رہنے والے ہو' اور تمہارا دین کیا ہے؟ تو

اس نے کہا میں نصرانی ہوں اور میں "نینوی" کا رہنے والا ہوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ "یونس ابن متی کے گاؤں کے ہو جو ایک صالح شخص تھا"۔ تو عداس نے کہا آپ کو کیا پتہ ہے کہ یونس ابن متی کون تھا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا "وہ میرا بھائی ہے۔ میں بھی نبی ہوں اور وہ بھی نبی تھا"۔ عداس رسول اللہ ﷺ پر جھک پڑا۔ آپ کا سر' ہاتھ اور پاؤں چومنے لگا۔ اس پر ربیعہ کے لڑکوں میں سے ایک نے دوسرے کو کہا کہ تمہارے غلام کو اس نے بگاڑ ہی دیا۔ جب عداس آیا تو دونوں نے اس سے پوچھا: عداس تم ہلاک ہو تم اس شخص کے سر اور پاؤں اور ہاتھ کو کیوں چوم رہے تھے۔ تو اس نے کہا: آقا! اس سے زیادہ اچھی چیز اس روئے زمین پر نہیں ہے۔ اس نے مجھے ایسی بات بتائی ہے جو ایک نبی ہی بتا سکتا ہے وہ کہنے لگے عداس تم پر ہلاکت ہو تمہیں وہ اپنے دین سے نہ پھیر دے' تمہارا دین اس سے بہتر ہے۔

اس کے بعد حضور اکرم ﷺ طائف سے مکہ کی طرف آئے۔ آپ ثقیف کی جانب سے مایوس ہو گئے۔ نخلہ کے مقام پر آپ رات کو رہے اور وہاں آپ نے نصف رات کو نماز میں تلاوت شروع کی۔ اس موقعہ پر جنات کے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے قرآن سنا جس کا تذکرہ قرآن مجید میں کیا گیا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے یہ لوگ سات افراد تھے' دو حصوں میں۔ انہوں نے غور سے قرآن کو سنا۔ جب حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو وہ پلٹ کر اپنی قوم کی طرف چلے گئے۔ یہ ایمان لے آئے اور انہوں نے دعوت اسلامی کو قبول کر لیا جس کی حکایت اللہ نے کی۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ..... تا ..... يُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ اور دوسری جگہ فرمایا

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ ---- یعنی سورہ جن کی پوری آیات۔

ابن کثیر نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے یہ صحیح ہے لیکن یہ کہ جنوں نے اس رات کو حضور ﷺ کا کلام سنا' یہ محل نظر ہے۔ بلکہ جنوں نے کلام الہی آغاز وحی کے دور میں سنا تھا جس طرح حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما میں مذکور ہے۔ اور حضور ﷺ طائف کو اس وقت گئے جب آپ کے چچا فوت ہو گئے تھے۔ اور یہ واقعہ ہجرت سے ایک سال قبل یا دو سال قبل کا ہے۔ واللہ اعلم!

اگر یہ حدیث صحیح ہو کہ حضور طائف سے دل شکستہ واپس ہوئے تھے کیونکہ طائف کے ذلیل کبراء نے حضور ﷺ کے ساتھ نہایت ہی توہین آمیز سلوک کیا تھا۔ اور اس کے بعد آپؐ نے رب تعالیٰ کے سامنے وہ دعا فرمائی تھی جس کے ایک ایک لفظ سے دل شکستگی ٹپکی پڑتی ہے تو اللہ کی جانب سے یہ نہایت ہی حوصلہ افزا کارروائی ہے کہ حضور ﷺ کی طرف جنات کا رخ پھیر دیا جائے تاکہ آپ ان کو تبلیغ کریں اور وہ اپنی قوم تک اس پیغام کو پہنچائیں۔ اس میں نہایت ہی لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ اگر انسان نہ مانیں تو اس دعوت کو کائنات کی دوسری قوتیں تسلیم کریں گی۔

غرض واقعہ وہ ہو یا یہ' بہرحال یہ ایک عظیم واقعہ ہے۔ اس کا مفہوم بھی عظیم ہے اور حکمت بھی عظیم ہے۔ اور قرآن کے بارے میں جنوں کا جو تبصرہ ہے وہ بھی نہایت ہی معنی خیز ہے۔ اسلام کے بارے میں انسان کے ریمارکس اور جنوں کی پوری تقریر کا قرآن میں نقل ہونا بھی معنی خیز ہے۔ اب آیات کی تفصیلات!

---O O O---

درس نمبر ۲۷۲ تشریح آیات

۱-- تا-- ۲۸

آیاتہا ۲۸ سُورَةُ الجِنِّ (۷۲) مَكِّيَّةٌ (۴۰) رکوعاتہا ۲

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

قُلۡ اُوۡحِىَ اِلَىَّ اَنَّهُ اسۡتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الۡجِنِّ فَقَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿۱﴾
يَّهۡدِىۡۤ اِلَى الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنۡ نُّشۡرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۙ﴿۲﴾ وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ
رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۙ﴿۳﴾ وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوۡلُ سَفِيۡهُنَا عَلَى اللّٰهِ
شَطَطًا ۙ﴿۴﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنۡ لَّنۡ تَقُوۡلَ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۙ﴿۵﴾ وَّاَنَّهٗ
كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الۡاِنۡسِ يَعُوۡذُوۡنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الۡجِنِّ فَزَادُوۡهُمۡ رَهَقًا ۙ﴿۶﴾ وَّ
اَنَّهُمۡ ظَنُّوۡا كَمَا ظَنَنۡتُمۡ اَنۡ لَّنۡ يَّبۡعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۙ﴿۷﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”اے نبی کہو، میری طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے غور سے سنا اور پھر جاکر اپنی قوم کے لوگوں سے کہا: ”ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست کی طرف راہنمائی کرتا ہے اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے“۔ ”اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے اس نے کسی کو بیوی یا بیٹا نہیں بنایا ہے“۔ ”اور یہ کہ ہمارے نادان لوگ اللہ کے بارے میں بہت خلاف حق باتیں کہتے رہتے ہیں“ اور یہ کہ ”ہم نے سمجھا تھا کہ انسان اور جن کبھی خدا کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتے“۔ اور یہ کہ ”انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے، اس طرح انہوں نے انسانوں کی بے چینی کو اور زیادہ بڑھا دیا“۔ اور یہ کہ ”انسانوں نے بھی وہی گمان کیا جیسا تمہارا گمان تھا کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا“۔

نفر اور رھط کا اطلاق تین سے نو تک ہوتا ہے جبکہ جنوں کے بارے میں روایت ہے کہ یہ نو تھے۔ جس انداز سے

یہاں اس واقعہ کا آغاز کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ یوں تھا کہ حضور ﷺ نے قرآن کی تلاوت فرمائی اور جنوں نے قرآن کو سنا اور پھر اپنی قوم کے پاس جاکر انہوں نے تبلیغ کی اور اس کا علم حضور اکرم ﷺ کو نہ تھا' اس تمام واقعہ کی اطلاع اللہ نے حضور ﷺ کو بذریعہ وحی دی اور یہ پہلا واقعہ تھا اور اس کے بعد بھی کئی واقعات ہوئے ہوں گے کہ حضور ﷺ نے قرآن پڑھا اور جنوں نے سنا ہو گا۔ اور اس بات کا اظہار حضور ﷺ کی قرات کے بارے میں وارد احادیث سے بھی ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ جانتے ہوئے اسے پڑھا کہ جن بھی سنتے ہیں۔ امام ترمذی نے حضرت جابر ابن عبداللہ سے روایت کی ہے :"حضور اکرم ﷺ نکلے اور اپنے ساتھیوں کے سامنے سورہ رحمان کی تلاوت فرمائی' اول سے آخر تک' سب لوگ خاموش ہوگئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ سورت میں نے جنوں پر تلاوت کی ہے' وہ اس کا تم سے اچھا جواب دینے والے تھے۔ جب بھی میں پڑھتا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ تو وہ جواب میں کہتے۔

لا بشئی من نعمتك ربنا نكذب فلك الحمد "اے ہمارے رب' ہم تیری نعمتوں میں سے کسی چیز کی تکذیب نہیں کرتے لہٰذا سب تعریفیں تیرے لیے ہیں"۔ اس روایت سے ابن مسعود کی روایت کی تائید ہوتی ہے' جس کو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔

یہ پہلا موقعہ ہے جس میں جنوں کے ساعت قرآن کی بات کی گئی ہے۔ اسی موقعہ کے بارے میں سورہ احقاف کی آیات میں بھی بات کی گئی ہے۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ (۲۹) قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۳۰) یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَیُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ (۳۱) وَمَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ وَلَیْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءُ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۲) (۴۶ : ۲۹ تا ۳۲) "جس وقت متوجہ کیا ہم نے آپ کی طرف جنوں میں سے کچھ لوگ' جو سننے لگے قرآن مجید کو' پھر وہ جب وہاں پہنچ گئے' بولے' چپ رہو' پھر جب تلاوت ختم ہوئی تو واپس ہوئے اپنی قوم کی طرف ان کو ڈراتے ہوئے' کہنے لگے اے ہماری قوم کے لوگو' ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد اتری ہے' یہ اگلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ سچائی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ایک سیدھے راستے کی طرف' اے ہماری قوم کے لوگو' اللہ کی طرف بلانے والے کو مان لو' ایمان لاؤ اس پر' اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں عذاب

الیم سے نجات دے گا۔اور جو کوئی للہ کی طرف بلانے والے کی بات نہ مانے گا تو وہ اس بات کو زمین میں روک نہ سکے گا اور للہ کے سوا اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا اور ایسے لوگ کھلی گمراہی میں ہوں گے"۔

یہ آیات اور یہ سورت دونوں یہ بتاتے ہیں کہ قرآن مجید جنات کے کانوں میں اچانک پڑ گیا تھا۔اور اس کا ان پر اس قدر اثر ہوا کہ ان کے قدم اکھڑ گئے۔ان کے دلوں میں ایک زلزلہ سا برپا ہوگیا۔اور ان کے وجود کے اندر ایک سخت جھٹکا سا پیدا ہوا اور حالت یہ ہوگئی کہ ان کا پورا وجود ایمان اور فیوض الہیہ سے بھرا ہوا تھا۔اس لیے وہ فوراً اپنی قوم کی طرف لوٹے اور اس حال میں لوٹے کہ ان کے قلوب کا جام نور ایمان سے جھلک رہا تھا اور وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی توقف نہ کر سکتے تھے۔چنانچہ انہوں نے نور ایمان کو فوراً دوسروں کی طرف منتقل کرنا شروع کر دیا۔وہ نہایت ہی گرمی اور جوش سے اس نور کو دوسروں کی طرف منتقل کرنے لگے تھے۔نہایت گرم جوشی سے' نہایت سنجیدگی اور نہایت اہتمام سے۔یہ ایک ایسی حالت ہے کہ جب کسی پر یہ پہلی مرتبہ طاری ہوتی ہے تو انسان کی شخصیت کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔اور وہ پھر فوراً اپنے احساسات' جذبات اور تاثرات کو دوسروں تک منتقل کرنے کی سعی کرنے لگتا ہے۔بہت ہی جوش و خروش کے ساتھ۔

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۷۲ : ۱) "ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے"۔ قرآن کریم کی جو پہلی خصوصیت ان کو واضح نظر آئی وہ یہ تھی کہ یہ عجیب اور غیر مالوف ہے اور اس کو سن کر دلوں کے اندر خوف پیدا ہو جاتا ہے۔جو شخص بھی قرآن مجید کو تیز احساس اور کھلے دل کے ساتھ پڑھے گا' دل کی کشادگی اور معتدل ذوق کے ساتھ پڑھے گا یا سنے گا' وہ اس سے مرعوب ہو جائے گا۔اور اسے نظر آئے گا کہ یہ ایک عجیب چیز ہے۔اس کے اندر قوت استدلال ہے۔اس کے اندر بے پناہ جاذبیت ہے۔اور اس کے اثرات اس قدر شدید ہیں کہ قلب و ضمیر کے تاروں کے اندر ایک زبردست ارتعاش اور نغمہ پیدا کر دیتا ہے۔یہ عملاً بھی عجیب ہے۔اس پر جنات کا ردعمل شاہد ہے کہ انہوں نے اسے ایسا پایا اور فوراً عمل کے لیے تیار ہوگئے۔

يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ (۷۲ : ۲) "جو راہ راست کی رہنمائی کرتا ہے"۔ یہ قرآن مجید کی دوسری ممتاز بدیہی صفت ہے' جنوں کے اس گروہ نے بادی النظر میں اسے محسوس کر لیا۔اور انہوں نے جب قرآن کی حقیقت کو اپنے دلوں کے اندر پا لیا تو انہوں نے معلوم کر لیا کہ یہ کتاب کتاب ہدایت ہے۔پھر ہدایت کے بجائے انہوں نے ارشاد کا لفظ استعمال کیا جو ہدایت سے زیادہ وسیع المفہوم ہے۔یعنی یہ کتاب ہدایت کرتی ہے اور حق و صواب کی راہ دکھاتی ہے۔اور رشد کے لفظ میں ایک اور مفہوم بھی ہے یعنی سنجیدگی' اعتدال اور علم و معرفت تو گویا یہ کتاب علم و معرفت' سنجیدگی اور اعتدال کے ساتھ راہ صواب کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔اور اس کا انداز عالمانہ ہے۔اور اس مطالعے سے ان حقائق تک پہنچنے کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔گویا یہ نتائج اس کتاب کے ذاتی اثرات و نتائج ہیں۔

قرآن رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔یوں کہ یہ دلوں کے اندر احساس اور کشادگی پیدا کر دیتا ہے' ادراک اور معرفت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔اللہ کے ساتھ رابطہ پیدا کرتا ہے' جو نور ہدایت کا سرچشمہ ہے۔پھر یہ کتاب اس پوری کائنات کے اندر جاری قوانین فطرت کے ساتھ انسان کو جوڑ دیتی ہے اور پھر عملی زندگی میں یہ کتاب زندگی کا ایک عملی نظام تجویز کرتی ہے۔اور اس نظام کے نتیجے میں انسانیت کو وہ عروج نصیب ہوتا ہے جو اس کے سوا بھی کسی اور نظام میں نصیب

نہیں ہوتا۔ اور یہ کتاب پھر ایک ممتاز تہذیب و تمدن کو وجود میں لاتی ہے۔ جس کے اندر زندگی بسر کرنے والے لوگ فکری 'تصوراتی' اخلاقی 'قانونی اور عملی اعتبار سے نہایت ہی ممتاز اور ترقی یافتہ لوگ ہوتے ہیں۔

فَاٰمَنَّا بِهٖ (۷۲ : ۲) "ہم اس پر ایمان لائے ہیں"۔ قرآن سننے کے بعد یہ ایک قدرتی اور فطری ردعمل ہے کہ انسان اسے تسلیم کرلے 'اس کو سمجھ لے۔ اور اس سے حقیقی تاثر حاصل کرلے۔ اللہ تعالیٰ جنات کا یہ تبصرہ مشرکین مکہ کی غیر آموزی کے لیے نقل کرتے ہیں کہ تم عرصے سے قرآن سن رہے ہو اور مان کر نہیں دیتے۔ اور تم اس کتاب کو جنات کی طرف منسوب کرتے ہو۔ اس طرح کبھی کہتے ہو کاہن ہے 'کبھی کہتے ہو شاعر ہے اور کبھی کہتے ہو مجنون ہے۔ اور ان تینوں کا جنات سے تعلق ہوتا تھا۔ لیکن ذرا جنوں کی حالت دیکھو کہ وہ قرآن سن کر مدہوش ہوگئے 'انہوں نے اسے سمجھ لیا اور اس دعوت کو لے کر اپنی قوم میں پھیل گئے۔ ایک منٹ بھی انہوں نے دیر نہ کی۔ نہ اپنے آپ کو روک سکے 'فوراً اس دعوت اور تاثر کو لے کر نکل گئے۔ انہوں نے حق کو پہچان لیا اسے قبول کرلیا' یقین کرلیا اور اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ اور کوئی مکر و فریب نہ کیا اور کوئی بغض و عناد نہ کیا جس طرح مشرکین مکہ کر رہے تھے۔

وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (۷۲ : ۲) "اور ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے"۔ یہ خالص 'صریح اور صحیح ایمان ہے 'اس میں نہ شرک شامل ہے 'نہ وہم کا دخل ہے۔ اور نہ خرافات کے لیے کوئی راہ ہے۔ یہ ایمان حقیقت قرآن کے ادراک کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے اور اس حقیقت کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے جس کی طرف قرآن داعی ہے۔ یعنی خالص توحید بغیر شائبہ شرک

وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا (۷۲ : ۳) "اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس نے کسی کو بیوی یا بیٹا نہیں بنایا"۔ الجد کے معنی حصہ اور نصیب کے ہوتے ہیں۔ یعنی قدر اور مقام' عظمت اور اقتدار۔ یہ سب امور لفظ "جد" میں شامل ہیں اور اس کے پرتو ہیں۔ لیکن اجمالی مفہوم یہ ہے کہ اللہ بہت ہی بلند مرتبے والا ہے۔ وہ بہت عظیم اور جلیل القدر ہے۔ اس لیے اس نے نہ کسی کو بیوی بنایا ہے اور نہ بیٹا بنایا ہے۔

عربوں میں یہ غلط خیال تھا کہ ملائکہ اللہ کی لڑکیاں ہیں اور یہ لڑکیاں اس طرح پیدا ہوئیں کہ اللہ کی بیوی جن تھی۔ خود جنوں کی زبانی اس کہانی اور افسانے کی تردید کر دی گئی کہ اللہ ان چیزوں سے پاک و صاف ہے۔ اور انہوں نے بڑی کراہت کے ساتھ اس کی طرف اس غلط نسبت کی نفی کر دی کہ نہ اس قسم کی کوئی رشتہ داری ہے اور نہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ گویا یہ اللہ کی بہت بڑی توہین ہے۔ اس قسم کے تمام تصورات اور اس سے ملتے جلتے تمام تصورات غلط اور مشرکانہ ہیں' چاہے وہ کسی شکل و صورت میں ہوں۔ مشرکانہ کہانیاں ہوں' یا اقانیم کے افسانے ہوں یا کوئی اور صورت ہو۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا (۴) وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ

وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (۷۲ : ۵) "اور یہ کہ ہمارے نادان لوگ اللہ کے بارے میں بہت خلاف حق باتیں کہتے رہے ہیں اور یہ کہ ہم نے سمجھا تھا کہ انسان اور جن کبھی خدا کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتے"۔ جن اس بات کو

دہرا رہے کہ ہمارے بعض بے وقوف خدا کے بارے میں خلاف حق تصورات رکھتے تھے اور اللہ کے لیے بیوی اور اولاد کا اعتقاد رکھتے تھے۔ اور قرآن کریم سننے کے بعد ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ان کے یہ عقائد درست نہ تھے اور جنوں میں سے جو لوگ اس بات کے قائل تھے وہ بڑے جاہل اور احمق تھے۔ اس قدر جاہل کہ وہ یہ تصور کرتے تھے کہ انسانوں اور جنوں میں سے کوئی شخص اللہ پر جھوٹ کیسے باندھ سکتا ہے؟ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی جھوٹ نہیں باندھ سکتا تھا۔ اس لیے جب بعض احمقوں نے یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ اللہ کی بیوی اور اولاد ہے تو انہوں نے بھی اس بات کو مان لیا' کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے اللہ پر کوئی افتراء کیسے باندھ سکتا ہے۔ لیکن یہی شعور ان کے لیے موجب ایمان بن گیا کیونکہ ان کے دل میں یہ پاک خیال تھا۔ ادھر کسی نے اللہ پر جھوٹ باندھا نہیں ادھر اللہ نے اس کی گردن دبوچی نہیں۔ ان جنوں پر گمراہی کا یہ غبار ان کی جہالت کی وجہ سے آگیا تھا۔ جونہی ان کو حق ملا انہوں نے گمراہی کے غبار کو جھاڑ دیا۔ حقیقت کو پا لیا۔ اصل حقیقت کو چکھ لیا اور وہ بول اٹھے :

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (١) یَّهْدِیْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (٢) وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا (٣) (۷۲: ۱ تا ۳) "ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے' اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے' اس نے کسی کو بیوی اور بیٹا نہیں بنایا"۔

اور یہ جھاڑ اور صفائی اس وجہ سے ان کو نصیب ہوئی کہ وہ حق تک پہنچ گئے اور یہ حقیقت اس قابل تھی جس پر کبرائے قریش کے اکثر بر خود غلط دماغ اس پر غور کرتے' جو یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ کی بیوی ہے اور بیٹیاں ہیں اور اس حقیقت سے ان کے دلوں میں خدا خوفی اور احتیاط پیدا ہو جاتی اور وہ اس پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرتے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ اور کبرائے قریش کے جو احمقانہ عقائد تھے' ان کی صداقت میں شک و شبہ پیدا ہو جاتا' لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ اس قصے کو یہاں لانے کا مقصد بھی یہ تھا کہ کبرائے قریش کے عقائد کی تردید کی جائے۔ قرآن کریم اور کبرائے قریش کے درمیان جو نظریاتی جنگ برپا تھی' یہ سورت اس کی ایک جھڑپ کا نمونہ تھی۔ اور یہ سورت دراصل ان بیماریوں کا ایک دیرپا علاج کر رہی تھی جو زمانہ جاہلیت سے باقی رہ گئی تھیں۔ اور ابھی تک لوگوں کے دلوں پر چھا رہی تھیں۔ لوگ سادہ لوح تھے اور وہ ان عقائد سے بری الذمہ تھے' لیکن گمراہ اور بر خود غلط قیادت کی طرف سے ان کو اسی راہ پر چلایا جا رہا تھا اور زمانہ جاہلیت کے خرافات کو دین بنا کر ان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (۷۲: ۶) "اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ اس طرح جنوں نے ان کی بے چینی کو اور زیادہ بڑھا دیا"۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف جو ایام جاہلیت میں متعارف تھا اور آج بھی کئی

معاشروں میں یہ بات متعارف ہے کہ جنوں کو زمین اور انسانوں پر اقتدار حاصل ہے اور یہ کہ وہ انسانوں کو نفع نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔ اور یہ کہ بعض اراضی اور سمندروں اور فضا میں یہ جن محکوم ہیں ' اور ان کے سردار ان پر حکمران ہیں۔ چنانچہ جب یہ لوگ کسی ' غیر آباد جگہ جاتے یا کسی جنگل اور پہاڑ میں ہوتے تو یہ اس علاقے کے سردار جن کی پناہ مانگ لیتے کہ اس کے زیر دست جن کہیں اسے نقصان نہ پہنچا دیں۔ یہ پناہ مانگنے کے بعد ' وہاں شب باشی کرتے۔

شیطان کو یہ طاقت دے دی گئی ہے کہ وہ انسانوں کے قلوب پر اثر انداز ہو ' (ماسوائے ان لوگوں کے جو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑیں ' ایسے لوگ اس کی دسترس سے بچے رہتے ہیں) لیکن انسانوں میں سے جو شخص شیطان کی طرف جھکتا ہے تو وہ اسے کوئی نفع نہیں دیتا۔ اس لیے کہ شیطان انسانوں کا دشمن ہے۔ یہ دراصل انسان کو گمراہ کرتا ہے ' اور اسے اذیت دیتا ہے۔ چنانچہ یہ گروہ جن اس حقیقت واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (۷۲ : ۶) "اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ اس طرح انہوں نے انسانوں کی بے چینی کو اور زیادہ کر دیا"۔ اور یہاں رہق کے معنی گمراہی ' قلق ' حیرت کے ہیں اور یہ ان دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے جو شخص اپنے دشمن کے سامنے جھک جاتا ہے اور اس پر بھروسہ کرتا ہے۔ اور جو اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا اور نہ اللہ سے پناہ مانگتا ہے۔ اہل قریش ایسا ہی کرتے تھے حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام سے ادھر تمام انسانوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے۔

انسانی قلب جب غیر اللہ کے ہاں نفع کی امید سے پناہ مانگتا ہے یا اس امید سے کہ غیر اللہ ضرر رفع کر دے گا۔ ایسا شخص قلق ' حیرت اور بے ثباتی اور بے اطمینانی کے سوا کچھ نہیں پاتا۔ اور یہ رہق کی بدترین صورت ہے۔ یعنی ایسی بے چینی جس کے اندر قلب کوئی آرام اور امن محسوس نہ کرے۔

اللہ کے سوا ہر چیز بدلنے والی ' ہر چیز زائل ہونے والی ہے اور ہر چیز فنا ہونے والی ہے ' جب کوئی دل اللہ کے سوا کسی اور چیز سے متعلق ہو جائے تو وہ ڈگمگاتا رہتا ہے ' وہ حیران و پریشان رہتا ہے۔ اور اس لیے کہ وہ جس چیز کے ساتھ متعلق ہے ' اس کا رخ جدھر ہو گا ' اس کا رخ بھی ادھر ہو گا۔ اللہ وحدہ باقی ہے۔ زوال پذیر نہیں ہے ' زندہ ہے ' مرنے والی ذات نہیں ہے۔ دائم ہے متغیر نہیں ہے۔ اس لیے جو شخص اللہ کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرے گا وہ گویا ایک مستقل محور کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر دے گا اور اس کے اندر بھی ایک قسم کا استقلال پیدا ہو جائے گا۔

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا (۷۲ : ۷) "اور یہ کہ انسانوں نے بھی وہی گمان کیا جیسا تمہارا گمان تھا کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا"۔ جن اپنی قوم سے گفتگو کرتے ہیں کہ جس طرح بعض انسان جنوں کی پناہ مانگتے تھے اسی طرح وہ بھی یہ گمان رکھتے تھے جس طرح تم گمان رکھتے ہو کہ اللہ رسول نہ بھیجے گا۔ لیکن دیکھ لو اللہ نے تو رسول بھیج دیا ہے اور رسول کو یہ قرآن بھی دے دیا ہے جو رشد و ہدایت کا سامان فراہم کر رہا ہے یا مفہوم یہ ہے کہ ان کے عقائد یہ تھے جس طرح تمہارے ہیں کہ اللہ قیامت میں کسی کو نہ اٹھائے گا لہٰذا انہوں نے قیامت

کے لیے کوئی تیاری نہ کی اور رسول خدا نے جس انجام سے ڈرایا تھا اس کی پرواہ نہ کی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اللہ کسی کو نہیں اٹھائے گا۔

یہ دونوں ظن وگمان حقیقت کے مطابق نہ تھے۔ یہ جاہلانہ خیالات پر مبنی تھے۔ اور اس پوری کائنات کی حکمت و تخلیق سے بے خبری پر مبنی تھے۔ اللہ نے تمام مخلوق کو یوں پیدا کیا ہے کہ اس کے اندر خیر کی صلاحیت بھی تھی اور شر کی صلاحیت بھی تھی۔ (جس طرح اس سورت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کو بھی دو ہری صلاحیت دی گئی ہے۔ خیر کی بھی اور شر کی بھی' ہاں ان میں سے بعض نے اپنے آپ کو شر مجسم کر لیا مثلاً ابلیس' جس نے اپنے آپ کو رحمت خداوندی سے محروم کر لیا اور خالص شر بن گیا) اور اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھیج کر خیر کی معاونت کی۔ رسولوں کا مشن یہ قرار پایا کہ وہ انسانوں کے اندر پائی جانے والی خیر کی صلاحیت کو ابھاریں اور ان کی فطرت میں جو خیر کی استعداد ہے اسے جلا دیں' لہٰذا یہ عقیدہ بالکل غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کو نہ بھیجے گا۔

یہ تو اس صورت میں ہے جب ہم آیت میں بعث سے مراد ''رسولوں کا بھیجنا'' لیں۔ اگر بعث سے مراد آخرت میں اٹھانا ہے تو پھر بھی یہ بات حکمت تخلیق کے خلاف ہے کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی نیکی اور بدی کا حساب و کتاب اس دنیا میں پورا نہیں ہو جاتا۔ لہٰذا اللہ کی حکمت تخلیق اور عدل کے تقاضے کے مطابق بھی ضروری ہے کہ ایک ایسا جہاں ہو جہاں مظلوموں کے ساتھ انصاف کیا جائے' نیکو کاروں کو انعام اور بدکاروں کو سزا دی جائے اور حساب و کتاب بے باک ہو۔ اور جو جس مقام کا حیات دنیا کے مطابق 'اہل بنتا ہو' اس میں جائے۔ لہٰذا اس بات کا کوئی موقعہ و مقام نہیں ہے کہ اللہ کسی کو دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔ یہ اعتقاد حکمت الٰہیہ کے خلاف ہے۔ عدل و انصاف کے اصولوں کے خلاف ہے۔

چنانچہ اس انداز میں جنوں نے اپنی قوم کے غلط خیالات کو درست کرنے کی سعی کی اور قرآن نے یہ بات مشرکین عرب کے غور کے لیے نقل کی کہ جن تو خود اپنے خیالات پر نظر ثانی کر رہے ہیں تم کیا کر رہے ہو۔

--- ○○○ ---

اس آخری رسالت کے اثرات اس پوری کائنات پر مرتب ہوگئے ہیں' کائنات کے اطراف میں قوائے طبیعیہ بھی بدل گئی ہیں۔ زمین و آسمان میں انتظامی تبدیلیاں آگئی ہیں تاکہ وہ اپنی وہ تمام کاروائیاں ترک کر دیں جو اس آخری رسالت کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔ ہر قسم کی غیب دانی کا دعویٰ ترک کر دیں اور یہ کہ وہ اعلان کر دیں کہ اس کائنات میں وہ کچھ قوت بھی نہیں رکھتے۔

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ﴿۸﴾ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ﴿۹﴾ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴿۱۰﴾

"اور یہ کہ "ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہریداروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے"۔ اور یہ کہ "پہلے ہم سن گن لینے کے لیے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تھے' مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے گھات میں ایک شہاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے"۔ اور یہ کہ "ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا زمین والوں کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کا رب انہیں راہ راست دکھانا چاہتا ہے"۔

یہ واقعات جو جنوں کے ذریعہ قرآن نے نقل کیے ہیں' بتاتے ہیں کہ اس آخری رسالت سے قبل کے زمانے میں' جس میں رسول نہ تھا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کے دور میں' جنوں کا یہ مشغلہ تھا کہ وہ عالم بالا کی طرف جاتے تھے اور عالم بالا میں اس زمین اور کائنات کے بارے میں جو احکام صادر ہوئے تھے یا فرشتوں کے درمیان زیر بحث آتے تھے' مثلاً اللہ تعالیٰ فرشتوں کو جو احکام برائے نفاذ صادر کرتا تھا' یہ جن عالم بالا میں بعض مقامات تک پہنچ کر گن سن لے لیتے تھے اور پھر ان سچی معلومات کے ساتھ بہت سی غلط معلومات جمع کر کے' یہ جن دنیا میں کاہنوں' قیافہ دانوں اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کو دیتے اور یہ لوگ ان حقیقی معلومات کو شیطانوں کے آمیزے کے ساتھ مزید اپنے مفاد کی چیزیں ملا کر لوگوں میں پھیلاتے' ان کو گمراہ کرتے اور اس طرح شیطانی منصوبہ چلتا رہتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اور حضور ﷺ سے قبل یہ نظام کس طرح چلتا تھا' اس کی تفصیلات قرآن نے نہیں دی ہیں اور نہ یہ تفصیلات جاننے کی کوئی ضرورت ہے۔

چنانچہ جنوں کا یہ گروہ کہتا ہے کہ اب عالم بالا سے یہ گن سن ممکن نہیں رہی ہے۔ اب جب وہ یہ کوشش کرتے ہیں جسے وہ "لمس سماء" سے تعبیر کرتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ ہر طرف سے شدید پہرے لگے ہوئے ہیں اور جو جن بھی ایک حد سے اوپر جاتا ہے آگے سے شہاب ثاقب کی بمباری ہوتی ہے۔ جو بھی ایسی کوشش کرتا ہے شہاب گر کر اسے ختم کر دیتا ہے۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم تو غیب نہیں جانتے کہ ان نئے انتظامات کے مقاصد کیا ہیں اور اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے :

وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا (۷۲ : ۱۰)

"اور یہ کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آیا زمین والوں کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کا رب انہیں راہ راست دکھانا چاہتا ہے"۔ یہ تمام غیبی امور صرف اللہ کے علم کے حوالے ہیں' جن کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ پس پردۂ تقدیر سے کیا چیز نمودار ہوتی ہے۔ آیا انسانوں پر کوئی مصیبت آ رہی ہے اور وہ گمراہی میں مزید آگے جائیں گے یا ان کے لیے ہدایت اور رحمت کے دروازے کھل گئے ہیں۔ انہوں نے ہدایت کو شر کے مقابلے میں ذکر کیا گویا حقیقی خیر ہے ہی ہدایت۔

جب وہ ذریعہ ہی اس بات کی تردید کر دے' جس کی طرف کاہن اپنا یہ دعویٰ منسوب کرتے تھے کہ وہ اپنے مزعومہ افکار وہاں سے لیتے ہیں' تو پھر کاہنوں کے مزعومہ دعوؤں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ جنوں نے یہ کہہ دیا کہ وہ تو علم غیب نہیں جانتے۔ لہٰذا بات ختم ہوگئی' ہر قسم کے زعم باطل قرار پائے اور کاہنوں اور عرافوں کے دعوؤں کا اعتبار جاتا رہا۔ یہ بات ثابت ہوگئی کہ غیب صرف اللہ جانتا ہے۔ لہٰذا نہ کوئی غیب کا دعویٰ کر سکتا ہے اور نہ پیش گوئی کر سکتا ہے۔ یوں قرآن کریم نے انسانی عقل کو ہر قسم کے اوہام و خرافات سے پاک کر دیا اور ان تمام مزعومات کے دروازے بند کر

دیئے ' جو کیے جا سکتے تھے اور اعلان کر دیا کہ اب انسانی عقل سن رشد کو پہنچ گئی ہے اور انسانی افکار کے اندر اوہام و خرافات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آسمانوں کے یہ پہریدار کس طرح کھڑے ہیں ' یہ شیاطین کو کس طرح روکتے ہیں؟ شہاب ثاقب کس طرح فائر کرتے ہیں۔ تو اس بارے میں نہ قرآن نے ہمیں کچھ بتایا ہے اور نہ صحیح احادیث میں اس کی تفصیلات ہیں اگر قرآن و سنت اس کی ضرورت محسوس کرتے کہ اس میں انسانوں کے لیے کوئی خیر ہے تو ضرور بتلا دیتے۔ جب اللہ نے کچھ نہیں بتایا تو یہ کوشش ہی عبث ہے۔ اس سے ہماری زندگی اور ہمارے علم میں کوئی تعمیری اضافہ نہیں ہو سکتا۔

شہابوں کے بارے میں بھی کسی جدل و مباحثے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ شہاب دراصل اس کائنات کے نظام کے مطابق حرکت کرتے ہیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ایسے تھے۔ اور بعد میں بھی اور ان کا ضابطہ عمل وہی ہے جس کو سائنس دان اب معلوم کرنے کی سعی کر رہے ہیں جن کی سوچ کبھی درست نکلتی ہے اور کبھی غلط ہو کر ترمیم پذیر ہو جاتی ہے۔ اگر سائنس دانوں کے موجودہ نظریات درست بھی ہوں تو اس سے قرآن کے فرمان کی نفی نہیں ہوتی۔ یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ اور ممکن ہے کہ یہ شہاب شیطانوں کے لیے رجم ہوں اور یہ کام اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہو جس کا ابھی تک ہمیں پورا علم نہیں ہے۔

جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ ایک تمثیل ہے ' جس میں بتایا گیا ہے کہ کلام الٰہی میں کوئی التباس نہیں ہو سکتا اور اس میں باطل کی آمیزش کرنے والے نہیں کر سکتے اور یہ کہ اس آیت کو اپنے ظاہری مفہوم میں نہیں لیا جا سکتا ' تو ان بیچاروں کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگ پہلے سائنسی نظریات پر قطعی ایمان لا کر قرآن کے پاس آتے ہیں اور ان کے ذہنوں میں یہ نظریات جدید سائنسی نظریات سے آتے ہیں۔ پھر یہ قرآن کی تفسیر ان مزعومہ نظریات کے مطابق کرنے بیٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ ملائکہ کو قوائے خیر اور قوائے مطیعہ کی تفسیر و تمثیل قرار دیتے ہیں ' شیاطین کو قوائے شر اور قوائے مفسدہ کی تمثیل کہتے ہیں اور رجوم شیاطین کو تمثیل حفظ قرآن قرار دیتے ہیں اس لیے کہ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی موجود ہو اور مشاہدے سے باہر ہو ' وہ ملائکہ ' جنات اور شیاطین کے وجود کو اس طرح مشاہدہ کر سکیں کہ جس طرح وہ انسانوں اور دوسرے طبیعی اجسام کو دیکھتے ہیں۔ اس لیے وہ ان غیر مرئی اجسام اور موجودات کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن اگر انہی سے پوچھا جائے کہ تمہارے ان مزعومات کی حقیقت کیا ہے ' جن کے اوپر تم قرآن و سنت کو پرکھتے ہو تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر اور اسلامی تصور کی تشکیل اور تشریح کا صحیح طریقہ ہی یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن سے پہلے تمام افکار و تصورات نکال دے اور قرآن کو کسی سابقہ تحفظ کے بغیر مطالعہ کرے۔ یہ سابقہ تصورات ' عقلی ہوں ' شعوری ہوں یا نفسیاتی ہوں اور قرآن کا مطالعہ کر کے اپنے تصورات اور افکار کی تشکیل قرآن کے مطابق کرے۔ اور اس کائنات کے حقائق کی روشنی میں ' سنت نبوی کے حدود کے اندر کرے۔ یہ نہ ہو کہ قرآن اور سنت کو بیرونی افکار و نظریات کے کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیا جائے اور ان پر محاکمہ کیا جائے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ہرگز کسی ایسی چیز کا انکار نہ کریں جسے قرآن ثابت کرتا ہے۔ نہ ان میں تاویلات کریں۔ نہ ایسے امور کو قطعی سمجھیں جن کا قرآن انکار کرتا ہے۔ ہاں قرآن و سنت کی منفیات اور ثابت شدہ حقائق کے دائرے سے باہر انسان آزاد ہے کہ اپنی عقلی اور سائنسی جدوجہد کے ذریعہ جو چاہے

نظریات قائم کرے۔

یہ بات ہم قرآن کے بارے میں 'اہل ایمان کی عمومی روش کے پیش نظر کہہ رہے ہیں' جو قرآن کی نصوص کی تاویلات اپنے ذہنی افکار کے مطابق کرتے ہیں کیونکہ وہ اس دنیا کو اپنے افکار کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں' میں خود اپنے آپ کو اس روش سے بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا' ظلال القرآن کے ابتدائی حصوں میں' میں خود بھی غیر شعوری طور پر اس طرف جھک گیا ہوں گا' لیکن اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی تو آئندہ ایڈیشنوں میں اس قسم کے رجحان کی اصلاح کر دوں گا۔ یہاں میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یہی حق ہے' اور یہ اللہ کی طرف سے میرے لیے خاص عنایت اور ہدایت ہے۔

رہے وہ لوگ جو سرے سے قرآن پر ایمان ہی نہیں لاتے' اور ان حقائق کے انکار میں ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں اور محض اس لیے ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ ابھی تک انہوں نے ان کا ادراک نہیں کیا ہے' تو ایسے لوگوں کا طرز عمل مضحکہ خیز ہے۔کیونکہ سائنس ابھی تک ان حقائق کا بھی پوری طرح ادراک نہیں کر سکی۔ جو اس کے سامنے موجود ہیں۔ ان حقائق پر ابھی سائنس تجربہ کر رہی ہے۔ للذا ان حقائق کے عدم ادراک سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ موجود نہیں۔ نیز حقیقی سائنس دانوں نے اہل دین کی طرح رب عالم مجہول کو تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے' اگر وہ کتب سماوی کے طریقے پر کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے تو کسی چیز کا انکار بھی نہیں کرتے۔کیوں کہ انہوں نے سائنسی تجربات کے ذریعے معلوم کر لیا ہے کہ انسان دراصل عالم الغیب کی ایک وسیع دنیا کے دروازے پر کھڑا ہے۔ جبکہ کچھ عرصہ پہلے وہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے تمام حقائق دریافت کر لیے ہیں۔ چنانچہ اب سائنس دانوں نے بھی اپنی علمی کم مائیگی کا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور ان کا انداز اب ان مدعیان علوم سائنس کا سا نہیں ہے جو سماوی حقائق' نامعلوم حقائق کا انکار بطور فیشن کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی اس وسیع و عریض کائنات میں نامعلوم حقائق اور اسرار کے انبار لگے ہوئے ہیں اس کائنات کے اندر بے پناہ قوتیں ہیں اور یہ سورت ہمیں اس کائنات کا ایک حصہ بتاتی ہے۔ چنانچہ ان نامعلوم حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے اس کائنات کے بارے میں ہم صحیح اور متوازن تصورات ذہنوں میں رکھ سکتے ہیں۔ اس طرح اس جہاں کی مادی قوتوں' روحانی موجودات' ارواح' حیوانات' ہمارے ماحول طبیعی کے حقائق' ہماری زندگی' ہماری ذات اور ہمارے افعال کے بارے میں ہماری سوچ درست ہو جاتی ہے۔ یہ متوازن سوچ ہی ایک مسلم کو دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اچھی طرح نکھار کر ممتاز کر دیتی ہے۔ نہ وہ اوہام و خرافات کو تسلیم کرتا ہے' اور نہ وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اس کائنات کے تمام حقائق پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ اور اس متوازن سوچ کا ماخذ' قرآن اور سنت ہیں۔ چنانچہ ایک مسلم اپنی سوچ کو قرآن اور سنت کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور تمام حقائق کو قرآن و سنت کے مطابق جانچتا ہے۔ خواہ وہ اخلاقی حقائق ہوں یا طبیعی۔

عالم نامعلوم کے میدانوں میں اترنے کے لیے اور عقل انسانی کی ترک تازیوں کے لیے متعین راستے موجود ہیں۔ اسلام عقل انسانی کو ان میدانوں میں اترنے کے لیے آگے بڑھاتا ہے۔ لیکن ان متعین راستوں اور میدانوں سے آگے کچھ ایسے جہاں بھی ہیں جہاں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے عقل کے اندر کوئی قوت نہیں ہے۔ یہ میدان عقل سے ماوراء ہیں۔ پھر عقل انسانی کو ان جہانوں تک پہنچنے کی ضرورت بھی نہیں ہے' کیونکہ اس زمین پر قدرت نے انسانوں کے لیے جو فریضہ منصبی متعین کیا ہے اور جس کے لیے انسان کی تخلیق ہوئی ہے' یعنی انسان بطور خلیفۃ اللہ فی الارض' تو اس

زاویہ سے انسانوں کو ان نامعلوم جہانوں کے بارے میں جاننے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔کیونکہ جس قدر علم کی اسے ضرورت تھی اللہ نے قرآن و سنت کے ذریعہ اسے یہ علم دے دیا ہے' تاکہ انسان اس جہاں میں' اس زمین پر اپنے مقام اور حیثیت اور اپنے ماحول کو جان سکے' کیونکہ یہ علوم حاصل کرنا انسان کی قدرت ہی میں نہیں ہے اور غیوبات یعنی ملائکہ' فرشتوں' جنات اور شیاطین سب اس زمرہ میں آتے ہیں۔ اسی طرح روح انسان' انسان کی تخلیق اور اس کا انجام اسی دائرے میں آتے ہیں۔یہ ایسے میدان ہیں جہاں عقل انسانی صرف وحی پر بھروسہ کر سکتی ہے۔

رہے وہ لوگ جو سنت الہیہ کی ہدایت کی روشنی میں چلتے ہیں۔وہ ان میدانوں کے حدود پر جاکر رک جاتے ہیں جو خدا اور رسول نے انسان کو بتا دیئے ہیں۔ اللہ اور رسول ﷺ نے ان غائب جہانوں کے بارے میں انسان کو یہ شعور دیا ہے کہ یقین کر لو کہ اللہ بہت ہی عظیم ہے اور وہ بہت بڑا حکیم ہے اور یہ کہ اس جہاں میں انسان کا منصب کیا ہے؟ اور اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں انسان کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی پہنچ کے دائرے میں' اپنے ماحول کے اندر ہی غور و فکر کرے' اور جس قدر اس کی طاقت میں ہے وہ کام کرے۔اور اپنی طاقت کے حدود کے اندر جس قدر ٹیکنالوجی وہ دریافت کرلے' اسے اس جہاں میں پیداوار کے اضافے اور سہولیات حیات کی فراہمی کے لیے استعمال کرے اور یہاں اللہ کے نائب ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے۔اللہ کی ہدایات کے مطابق کام کرے' اللہ کی طرف اپنا رخ کرتے ہوئے چلے' اور اس قدر بلندی اختیار کرتے ہوئے آگے بڑھے' جس قدر اللہ نے اس کے لیے پسند کیا ہے۔

رہے وہ لوگ جو اللہ کی ہدایات کو تسلیم نہیں کرتے تو وہ دو بڑے گروہوں کی شکل میں موجود ہیں۔ایک گروہ تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے صرف اپنی عقل کے ہتھیار کو کام میں لاتا ہے۔حالانکہ عقل انسانی محدود ہے اور ذات باری لامحدود ہے۔یہ گروہ غیبی حقائق کو کتب منزلہ کی روشنی میں نہیں بلکہ اپنی عقل کے زور پر معلوم کرنا چاہتا ہے۔یہ گروہ فلاسفہ ہے' جنہوں نے اس کائنات اور اس کے رابطوں کی عقلی توجیہ کی ہے۔ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ بچے ایک ایسے عظیم پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کے لیے نکلیں جس کی بلندی کا علم ہی نہ ہو اور وہ گرتے پڑتے آگے بڑھ رہے ہیں یا چند بچے ہوں جنہوں نے ابھی تک حروف تہجی بھی نہ سیکھے ہوں' لیکن وہ اس کائنات کے وجود کو دریافت کرنے کی سعی کر رہے ہوں۔انہی لوگوں میں یونان کے بڑے بڑے فلسفی شمار ہوتے ہیں اور خود مسلمانوں میں سے وہ فلسفی اور منطقی بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔جو یونانی فلاسفہ کی لائن پر سوچتے رہے ہیں۔اور اسی زمرے میں وہ جدید فلاسفہ بھی آتے ہیں جو اسلامی لائن پر نہیں سوچتے۔یہ تو رہا' ایک گروہ۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو اس انداز فکر سے مایوس ہوگیا۔اس گروہ نے اپنے اپ کو تجربے پر مبنی علم تک محدود کر دیا۔اور یہ طبقہ تمام مجہولات سے صرف نظر کرتا ہے۔اس کی علمی دنیا میں' ان میدانوں تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔اور اس سلسلے میں یہ طبقہ بھی قرآن و سنت سے کوئی ہدایت لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔یہ طبقہ خدا اور رسول کی ہدایت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار اس لیے نہیں ہوتا کہ یہ سمجھتا ہے کہ انسان کے لیے خدا کا تجرباتی ادراک ممکن نہیں ہے۔اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی علمی دنیا پر یہ طبقہ چھایا رہا۔لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے اس طبقے نے معلوم کر لیا کہ اس کا یہ علمی غرور بھی لاعلمی پر مبنی ہے۔اس لیے کہ اس طبقے کے لوگ اس مادے پر تجرباتی کام کرتے کرتے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ مادہ بھی دراصل ایک نور اور چمک سے قریب ہے اور نور اور چمک کا بھی وہ ابھی تک حقیقی ادراک نہیں کر سکے۔اور نور کا قانون اور

اس کی حقیقت بھی دراصل انسان کے دائرۂ ادراک سے ماوراء ہے۔اس لیے بیسویں صدی کے طبیعی سائنس دانوں کو بھی اپنی تنگ دامانی کا اچھی طرح ادراک ہو گیا ہے۔

اس کے بعد یہ جنات اللہ کی ہدایت کے حوالے سے 'اپنا حال اور موقف بیان کرتے ہیں۔یہ کہ وہ بھی بعینہٖ انسانوں کی طرح 'ہدایت و ضلالت کی استعداد رکھتے ہیں اور انسانوں کی طرح ذمہ دار مخلوق ہیں۔یہاں وہ رب تعالیٰ کے بارے میں اپنا عقیدہ بتاتے ہیں کہ ہم جو ایمان لائے ہیں وہ یہ ہے اور وہ اپنا نظریہ ہدایت و ضلالت واضح طور پر پیش کرتے ہیں۔

وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾ وَّ اَنَّا
ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾ وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا
الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾
وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَ
اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾

"اور یہ کہ "ہم میں سے کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں 'ہم مختلف طریقوں میں بٹے ہوئے ہیں"۔ اور یہ کہ "ہم سمجھتے تھے کہ نہ زمین میں ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں"۔اور یہ کہ "ہم نے جب ہدایت کی تعلیم سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔اب جب کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لے آئے گا اسے کسی حق تلفی یا ظلم کا خوف نہ ہو گا"۔ اور یہ کہ "ہم میں سے کچھ مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) ہیں اور کچھ حق سے منحرف۔تو جنہوں نے اسلام (اطاعت کا راستہ) اختیار کر لیا"انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں"۔

یہ توضیحات کہ جنوں میں سے بعض لوگ اچھے ہیں اور بعض برے ہیں 'بعض مسلم ہیں اور بعض منکر حق ہیں۔یہ بتاتی ہیں کہ جن بھی دوہری شخصیت کے مالک ہیں 'جس طرح انسان دوہری شخصیت کا مالک ہے' جو نیکی اور بدی دونوں کی استعداد رکھتا ہے' ہاں جنوں میں سے بعض لوگ خالص شر اور خالص بدی کے مجسم ہو گئے' مثلاً ابلیس اور اس کے قبیلے کے لوگ' ان توضیحات کی بڑی اہمیت ہے اور ان کی وجہ سے اس مخلوق کے بارے میں ہمارے خیالات درست ہو جاتے ہیں 'کیونکہ اکثر لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جن صرف شرارت کی فطرت رکھتے ہیں اور صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جس کے اندر خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں۔اور انسانوں کے یہ خیالات اس لیے تھے کہ ان کو قرآن کی فکری اصلاح پر غور کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا لیکن قرآن کی ان توضیحات کے بعد تو انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے خیالات کو درست کر لیں۔

جنوں کے اس گروہ کا قول ہے :

وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ (۷۲ : ۱۱) "اور یہ کہ ہم میں کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ اس سے فروتر ہیں"۔ اور اپنا عمومی حال وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا (۷۲ : ۱۱) "ہم مختلف طریقوں میں بٹے ہوئے ہیں"۔ یعنی ہر شخص نے اپنے لیے ایسا طریقہ اپنا لیا ہے جو دوسرے سے مختلف ہے اور کٹا ہوا ہے اور وہ ایمان لانے سے پہلے کے اپنے عقائد یوں بیان کرتے ہیں۔

وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا (۷۲ : ۱۲) "اور یہ کہ ہم سمجھتے تھے کہ نہ زمین میں ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں"۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ کو اس زمین میں ان پر پوری پوری قدرت حاصل ہے۔ یہ بھی وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ اللہ سے بھاگ بھی نہیں سکتے۔ یعنی بندہ رب کے سامنے بہت ضعیف ہے۔ اور تمام مخلوق خالق کا مقابلہ نہیں کر سکتی یعنی اسلام لانے سے پہلے بھی یہ گروہ اللہ کی قدرت اقتدار اور غلبے کا شعور اٹھاتا تھا۔

یہ تھے وہ جن 'جن کے ہاں بعض انسان دور جاہلیت میں پناہ لیتے تھے۔ اور مشرکین عرب تو اپنی حاجات میں جنوں کو پکارتے تھے اور انہوں نے ان جنوں اور رب تعالیٰ کے درمیان رشتہ داری کا عقیدہ بھی تصنیف کر لیا تھا۔ جبکہ یہ جنات اپنی عاجزی' اور اللہ کی قدرت کا اقرار کرتے ہیں۔ یہ اپنی ضعیفی اور اللہ کے اقتدار کی بات کرتے ہیں۔ یہ اپنی عاجزی اور اللہ کی قہاری و جباری کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ بات وہ صرف اپنی قوم سے ہی نہیں کہتے بلکہ مشرکین مکہ سے بھی کہتے تھے کہ حقیقی قوت صرف اللہ کے پاس ہے جو اس کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔

اور اب وہ ہدایت کا پیغام سننے اور سمجھنے کے بعد یہ کہتے ہیں :

وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ (۷۲ : ۱۳) "اور یہ کہ ہم نے جب ہدایت کی تعلیم سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے"۔ اور ہدایت کا پیغام سننے والے ہر شخص کا فریضہ یہی ہے۔ یہ لوگ قرآن کو یہاں ہدایت کا نام دیتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کی اصل ماہیت ہدایت ہی ہے اور اس کا نتیجہ بھی ہدایت ہے۔۔۔ اور ان کو اپنے رب پر پورا اعتماد بھی ہے۔ جس طرح ہر ایمان لانے والے کو اپنے آقا پر ہونا چاہئے۔

فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا (۷۲ : ۱۳) "اب جو کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لائے گا' اسے کسی حق تلفی یا ظلم (یعنی طاقت سے زیادہ کام دینے) کا خوف نہ ہوگا"۔ ایک مومن ایمان کے بعد اللہ پر پورا پورا بھروسہ کرنے لگتا ہے۔ اور اسے اللہ کے عدل پر پورا بھروسہ ہوتا ہے اور یہی ہے ایمان کی حقیقت کہ اللہ عادل ہے۔ وہ کسی مومن کا حق نہیں مارتا۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ نہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ ذیوٹی دیتا ہے۔ اللہ مومن بندے کو اس کے استحقاق سے ذرہ بھر بھی محروم نہیں کرتا۔ اور اللہ اپنے بندے کو رھق سے بھی بچاتا ہے۔ رھق کے معنی ہیں طاقت سے زیادہ جہد و مشقت میں ڈالنا۔ لہٰذا کوئی اور شخص بھی ایک مومن پر ظلم کرنے کی جرأت نہ کر سکے گا کیونکہ مومن اللہ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک مومن بعض اوقات اس دنیا کی سہولیات سے محروم

رہتا ہے لیکن یہ محرومیاں "بخس" کے مفہوم میں نہیں آتیں ۔ بعض اوقات ایک مومن کو اذیتیں بھی دی جاتی ہیں اور یہ اس زمین کی بعض چھوٹی قوتوں کی طرف سے ہوتی ہیں ۔ لیکن یہ اذیتیں رھق کے مفہوم میں داخل نہیں ہیں کیونکہ اللہ کو معلوم ہے کہ کون کس قدر مشقت برداشت کرنے کا اہل ہے اور کون کس قدر سہولیات کا اہل ہے ۔ اور اللہ بعض بندوں کو مشقتوں میں ڈال کر ان کو اپنے قریب کرتا ہے ۔ اور یہ ان کے لیے مفید ہوتی ہیں ۔

لہذا ایک مومن نفسیاتی لحاظ سے حق تلفی اور قوت برداشت سے زیادہ مشقت اٹھانے سے محفوظ ہوتا ہے ۔ اس لیے اسے ۔ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَھَقًا (۷۲:۱۳) کسی حق تلفی سے بھی نہیں ڈرنا چاہئے اور یہ خیال بھی نہیں کرنا چاہئے کہ اس پر اس کی قوت برداشت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا گیا ہے ۔ یہ تصور انسان کے اندر اطمینان، آرام اور سکون پیدا کر دیتا ہے ۔ انسان قلق، چبھن اور بے چینی محسوس نہیں کرتا ۔ یہاں تک کہ وہ اگر مشقت میں ہو پھر بھی جزع فزع نہیں کرتا، نہ ڈرتا ہے، نہ اپنے اوپر دروازے بند کرتا ہے ۔ وہ مشقت کو آزمائش سمجھتا ہے ۔ صبر کرتا ہے اور اللہ سے فراخی کی امید رکھتا ہے ۔ اور اس پر بھی اسے اجر ملتا ہے ۔ لہذا امارت و غربت اور ضعف و قوت دونوں حالتوں میں وہ فائدے میں رہتا ہے ۔ اور اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا ۔ اور جنوں کے اس گروہ نے اس حقیقت کو بہت ہی اچھے انداز سے ذہن نشین کرایا اس کے بعد یہ لوگ اب ہدایت و ضلالت کی حقیقت ذہن نشین کراتے ہیں اور ہدایت و ضلالت پر جزاء و سزا کا ذکر کرتے ہیں:

وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (۱۴) وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (۷۲:۱۵) "اور یہ کہ "ہم میں سے کچھ مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) ہیں اور کچھ حق سے منحرف ۔ تو جنہوں نے اسلام (اطاعت کا راستہ) اختیار کر لیا انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں" ۔ قاسط کے معنی ظالم اور حق سے ایک طرف ہونے والے عدل و نیکی سے منحرف ہونے والے کے ہیں ۔ جنوں نے ان کو مسلمانوں کے مقابل لا کر ذکر کیا ہے اور اس کے اندر ایک لطیف اشارہ ہے، کہ ایک مسلمان عادل اور مصلح ہوتا ہے اور اس کا فریق مقابل ظالم اور مفسد ہوتا ہے ۔

فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (۷۲:۱۴) "جس نے اسلام کی راہ لی اس نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی" ۔ یہاں ان کے اس فعل کو لفظ "تحروا" سے تعبیر کیا ۔ نہایت گہری سوچ سے راہ ہدایت تلاش کرنا ۔ اور اس کے بالمقابل ہے گمراہی اور ضلالت ۔ "تحری" کے معنی ہوتے ہیں نہایت دقت سے راہ صواب کو اختیار کرنا اچھی طرح سوچ کر اور اچھی چھان بین کر کے ۔ یہ نہیں کہ جدھر منہ ہوا ادھر چل دیا ۔ بغیر سوچ سمجھ کے، یعنی اسلام قبول کرتے ہی وہ راہ صواب تک پہنچ گئے ۔ اشارہ اس طرف ہے کہ اسلام عین راہ نجات ہے اور یہ بہت ہی خوبصورت اشارہ ہے ۔

وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (۷۲:۱۵) "اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں" ۔ یعنی ان کے جہنمی ہونے کا فیصلہ ہو گیا ہے اور جب یہ جہنم میں پھینکے جائیں گے تو جہنم کی آگ

ان کی وجہ سے اس طرح تیز ہو گی جس طرح خشک ایندھن کی وجہ سے آگ زیادہ مشتعل ہو جاتی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنات کو بھی جہنم کا عذاب ہو گا۔ اور یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ نیک جن جنت کے بھی مستحق ہوں گے۔ یہی حقیقت ہے 'کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے سوا کسی اور چیز کا عقیدہ اختیار کرے۔ اگر کوئی کرتا ہے تو وہ باطل ہو گا اور جو کچھ قرآن کہتا ہے بلاجدال درست ہو گا۔ لہٰذا جو بات جنوں پر صادق ہے وہی انسانوں کا انجام بھی ہو گا۔

یہاں تک تو قرآن نے جنوں کی باتیں ان کے اپنے الفاظ میں نقل کیں۔ لیکن اب باری تعالیٰ کی طرف سے ان کے مقالات کا خلاصہ پیش ہوتا ہے کہ وہ یوں بھی کہتے ہیں کہ جو مخلوق بھی راہ استقامت اختیار کرے گی اللہ کا اس کے ساتھ یہی سلوک ہو گا۔

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۚ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾

"اور لوگ اگر راہ راست پر ثابت قدمی سے چلتے تو ہم انہیں خوب سیراب کرتے تاکہ اس نعمت سے ان کی آزمائش کریں اور جو اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑے گا اس کا رب اسے سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا"۔

اللہ فرماتا ہے کہ جن ہمارے متعلق یہ کہتے تھے کہ اگر لوگ یا ظالم اور کافر لوگ راہ راست پر آجائیں تو ہم ان کو خوب سیراب کریں۔ اور یوں ان کے رزق میں اضافہ ہو 'تاکہ "ہم" ان کو آزمائیں کہ شکر ادا کرتے ہیں یا ناشکری کرتے ہیں۔

طرز ادا میں یہ تبدیلی کہ جنوں کے قول کو نقل کرنے کے بجائے جنوں کے قول کا مفہوم قرآنی الفاظ میں ادا کیا گیا اور جنوں کی بات تو اس طرح قرآن کریم میں کئی جگہ آتی ہے اور اس سے کلام میں تاکید مزید پیدا کرنا مطلوب ہوتا ہے اور قاری اس طرف زیادہ متوجہ ہوتا ہے۔

توجہ مبذول کرانے کے اس نوٹ میں کئی حقائق ہیں 'جن کے مطابق ایک مومن کا ایمان تشکیل پاتا ہے اور ان کے مطابق وہ معاملات کے فیصلے کرتا ہے اور واقعات کے باہم روابط متعین کرتا ہے۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ اقوام اور سوسائٹیاں اور معاشرے کس طرح صراط مستقیم پر قائم رہ کر اللہ تک پہنچ سکتی ہیں۔ اور پھر وصول الی اللہ اور پیداوار میں اضافہ اور خوشحالی کے حصول کے درمیان ربط کیا ہے جبکہ خوشحالی کا سبب اول آبپاشی کا انتظام اور کثرت ہے جہاں تک زندگی کا تعلق ہے وہ تو پانی سے تشکیل پاتی ہے۔ آج ہمارے صنعتی دور میں بھی خوشحالی کا دارومدار بہرحال پانی اور سیرابی پر ہے۔ اگرچہ صرف زراعت پر زندگی موقوف نہیں رہی ہے۔ لیکن پھر بھی تعمیر و ترقی کا مدار پانی ہی پر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ راہ راست پر قائم رہے تو نہ صرف وہ ترقی یافتہ اور خوش حال ہو جاتا ہے بلکہ ایسے لوگوں کو زمین پر اقتدار اعلیٰ بھی حاصل ہوتا ہے 'امت عربیہ۔

اس کی واضح مثال ہے کہ ایام جاہلیت میں جزیرۃ العرب کے درمیان یہ نہایت پسماندہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ لیکن جب وہ راہ راست پر چل پڑے تو ان کے لیے ایسی زمینوں کے دروازے کھل گئے جہاں پانی بڑی مقدار میں سیا تھا اور جب یہی عرب بدعمل ہوگئے اور انہوں نے راہ راست سے انحراف اختیار کیا تو وہ دوبارہ پسماندہ ہو گئے اور اس لیے وہ اس وقت بدحال ہیں ۔ اور یہ اس وقت تک بدحال رہیں گے جب تک یہ دوبارہ راہ راست پر نہیں آجاتے ۔ اور جب بھی یہ آئے ان پر خوشحالی آجائے گی اور ان کو زمین میں تمکن حاصل ہو گا۔

اگر ایسی اقوام کہیں موجود ہوں جو راہ راست پر نہ ہوں اور پھر بھی وہ باوسائل ہوں ' تو اللہ ان پر دوسرے عذاب مسلط کر دے گا اور وہ کئی آفات و بلیات سے دوچار ہوں گی ۔ ایسی اقوام انسانیت ' اقدار ' انسانی شرف اور کرامت کے اعتبار سے گر جائیں گی ۔ یوں ان کی یہ خوشحالی اور مادی ترقی بے معنی ہو کر رہ جائے گی ۔ اور ان کی زندگی تلخ ' اور پر مشقت ہوگی ۔ ایسی اقوام انسانی شرف سے محروم ہوں گی ۔ اور ان کو زندگی میں کوئی اطمینان نہ ہو گا۔ اس مضمون کی تشریحات ہم سورہ نوح میں کر آئے ہیں ۔

اور اس نوٹ سے جو دوسری حقیقت ظاہرہوتی ہے وہ یہ ہے کہ خوشحالی اور تمکین فی الارض بھی دراصل ایک ابتلا ہے ' ایک آزمائش ہے ۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو اچھے اور برے حالات کے ذریعہ آزماتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ خوشحالی میں اللہ کا شکر ادا کرنا بہت مشکل کام ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی بدحالی پر صبر کرے ' جبکہ بادی النظر میں انسان کی توجہ ایک طرف ہو جاتی ہے ' اس کی مدافعانہ قوتیں مجتمع ہو جاتی ہیں ۔ اور وہ اپنی پوری قوتوں کو صورت حالات کی مدافعت میں لگا دیتا ہے ۔ مثلاً وہ اللہ کو یاد کرتا ہے ' اللہ سے دعا کرتا ہے ' اور اللہ سے ان مشکل حالات میں مدد طلب کرتا ہے جبکہ تمام دنیاوی سہارے ختم ہوتے ہیں تو انسان اللہ کا سہارا لیتا ہے ۔ رہی خوشحالی تو وہ انسان کو غافل کر دیتی ہے ' انسان فضولیات میں مشغول ہو جاتا ہے ۔ انسانی احساسات ہو جاتے ہیں ' قوت مدافعت سو جاتی ہے اور انسان کے لیے غفلت اور بے راہ روی کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں ۔ اور انسان بڑی سہولت سے شیطان کے پھندے میں پھنس جاتا ہے ۔

جب انسان پر خوشحالی اور نعمتوں کی کثرت کی آزمائش آجائے تو اسے ہروقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ مال و دولت بسااوقات انسان کو سرکشی میں مبتلا کر دیتے ہیں ۔ انسان اللہ کا شکر نہیں کرتا ' اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بخیل ہو جاتا ہے اور دنیاوی اخراجات میں اسراف کرنے لگتا ہے ۔ یہ دونوں چیزیں زندگی کے توازن کے لیے عذاب بن جاتی ہیں ۔ اسی طرح اقتدار کی قوت بھی اکثراوقات انسان کو اندھاکر دیتی ہے ' وہ ظالم اور سرکش ہو جاتا ہے ' وہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے ' اور حدود سے آگے بڑھتا ہے ۔ لوگوں پر دست درازی کے بعد ایسا شخص پھر اللہ کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے ۔ اسی طرح مال و جمال کے فتنے انسان کو کبر و غرور اور بے راہ روی اور بدعملی اور بدکرداری اور فسق و فجور میں مبتلا کرتے ہیں ۔ اسی طرح اگر کوئی ذکی اور ذہین ہے تو وہ دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے اور بر خود غلط ہو جاتا ہے اور وہ اعلیٰ قدروں کو پامال کرتا ہے ۔ غرض ہر نعمت آزمائش ہے الا یہ کہ کوئی بروقت اللہ کو یاد کرے اور اللہ کی پناہ طلب کرے ۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ ذکر الہٰی سے اعراض کے نتیجے میں ایک طرف انسان خوشحالی میں آزمایا جاتا ہے تو دوسری طرف وہ عذاب اخروی میں بھی مبتلا ہو گا۔ قرآن کریم اس کی تصریح کرتا ہے ۔

يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا (٧٢ : ١٧) "اس کا رب اسے سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا"۔ یعنی یہ عذاب بہت شدید ہو گا' جس طرح ایک آدمی چڑھائی چڑھ رہا ہو تو وہ مشکل محسوس کرتا ہے۔ جوں جوں چڑھتا ہے اس کے لیے رفتار مشکل ہوتی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے کئی جگہ شدت عذاب کی تعبیر چڑھائی چڑھنے کے ساتھ کی ہے۔ ایک دوسری جگہ ہے۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ (٦ – ١٢٥) "پس جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے۔ اور ایسا بھینچتا ہے کہ اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا وہ آسمانوں کی طرف چڑھ رہا ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا (المدثر – ١٧) "میں عنقریب اسے ایک کٹھن چڑھائی چڑھاؤں گا"۔
یہ تیسری آیت ہو سکتی ہے کہ یہ جنوں کے قول کی حکایت ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ کا کلام ہو۔

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿١٨﴾

"اور یہ کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں' لہٰذا ان میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سجدہ بھی صرف اللہ کے لیے ہے اور مقامات سجود' مساجد بھی اللہ کی ملکیت ہیں۔ لہٰذا اسلام مکمل توحید کا قائل ہے۔ اللہ کے سوا کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کسی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اور اللہ کی توحید کے سوا تمام اعتبارات اور تمام حیثیات ہیچ ہیں۔ لہٰذا کسی کے ہاں کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ اور نہ کسی سے طلب کرنا چاہئے اور نہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنے قلب میں استحضار دینا جائز ہے۔ اگر یہ آیت جنوں کا مقولہ ہے تو پھر یہ جنوں کی اس بات کی تاکید ہے۔

وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (٧٢ : ٢) "اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے"۔ خصوصاً عبادت اور ذکر و فکر کے مقام میں بالخصوص سجدہ ریزی میں۔ اور اگر یہ ابتداء ہی سے کلام الٰہی ہے تو پھر موقعہ کی مناسبت
١ سے اللہ کی طرف سے ہدایت ہے اور یہ قرآن کا انداز ہے کہ وہ برمحل ہدایت دے دیتا ہے اور اسی طرح اگلی آیت :

وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿١٩﴾ ١٩ ع

١١ "اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے"۔

یعنی سب جمع ہو کر اور جتھا بنا کر اس وقت اس پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہو گئے جب وہ اللہ کو پکارنے کے لیے یعنی اللہ کے سامنے نماز ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوا۔ نماز یعنی صلوٰۃ کے معنی دعا کے ہیں۔ صلوٰۃ کے اصلی معنی ہی دعا کے ہیں۔ اگر یہ آیت جنوں کا قول ہو تو اللہ کی جانب سے ان کی بات کی حکایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوتے اور تلاوت کرتے تو مشرکین مکہ آپ کے ارد گرد جمع ہو جاتے جیسا کہ سورۃ المعارج میں ہے۔

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ (٣٦) عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ

عِزِيْنَ (٣٧) (٧٠: ٣٦ - ٣٧) "پس اے نبی کیا بات ہے' کہ یہ منکر دائیں اور بائیں سے گروہ در گروہ تمہاری طرف دوڑے چلے آتے ہیں" - اور نہایت حیرانی سے قرآن سنتے ہیں اور قبول نہیں کرتے - یا وہ ادھرادھر سے آپ پر حملہ آور ہونے کے لیے جمع ہوتے ہیں - لیکن اللہ آپ کو ان سے بچاتا ہے اور ایسے مواقع بارہا پیش آئے - اگر یہ جنوں کا قول ہے تو وہ اپنی قوم کے سامنے مشرکین مکہ کے رویہ پر تعجب کا اظہار کر رہے ہیں اور اگر ابتداء ہی سے کلام الٰہی ہے تو یہ حکایت جنوں کی حالت کی بھی ہو سکتی ہے کہ وہ نہایت حیرانی اور دہشت کی حالت میں آپ کے ارد گرد جمع ہوتے ہیں' کلام سنتے ہیں' تعجب کرتے ہیں اور یہ رسول اللہ کے ارد گرد اس طرح جمع ہوتے ہیں جس طرح اونی کپڑے کے بنے ہوئے بال ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ مفہوم اس تعجب' حیرانی اور دہشت کے زیادہ مناسب ہے جو جنات کے پورے کلام کے دوران موجود رہی ہے - کیونکہ جنات کا پورا کلام درحقیقت اظہار تعجب اور اچھنبے کا نمونہ ہے - واللہ اعلم!

اسلامی دعوت اور قرآن کے کلام کے بارے میں جب جنوں کا کلام یہاں آکر ختم ہوتا ہے' جس میں جنوں نے اپنے تعجب کا اظہار کیا' جس میں ان کے شعور اور ان کی سوچ میں ارتعاش پیدا ہوا اور انہوں نے دیکھا کہ ارض و سما اور جنات و فرشتے اور ستارے اور سیارے سب کے سب اس عظیم دعوت اور اس عظیم کلام کے حوالے سے متحرک ہیں - کائنات کا یہ عظیم نظام بھی اس کی وجہ سے متاثر ہو گیا ہے اور یہ ایک نہایت اہم اور سنجیدہ تحریک ہے - تو اس کے ساتھ ہی روئے سخن اب نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے - حضور اکرم ﷺ کو نہایت ہی دو ٹوک' فیصلہ کن اور اٹل ہدایات دی جاتی ہیں کہ آپ تبلیغ کے لیے خالص ہو جائیں اور یہ کہہ دیں کہ میں کسی کے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں - نہ میں غیب دانی کا مدعی ہوں' نہ میں لوگوں کی تقدیر بدل سکتا ہوں - یہ بات نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ اور شکایت کے انداز میں کی جاتی ہے - نہایت سختی اور فیصلہ کن انداز میں :

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٠﴾ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿٢١﴾
قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٢﴾ اِلَّا
بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴿٢٣﴾ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا
وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿٢٤﴾ قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ﴿٢٥﴾
عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰي غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٦﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ
يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿٢٧﴾ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ

٢

٩ع رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿٢٨﴾

١٢ "اے نبیؐ کہو کہ "میں تو اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا"۔ کہو "میں تم لوگوں کے لیے کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ کسی بھلائی کا"۔ کہو "مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی بچا نہیں سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔ میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں۔ اب جو بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات نہ مانے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔ (یہ لوگ اپنی اس روش سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کا جتھا تعداد میں کم ہے۔ کہو "میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہے' اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا' سوائے اس رسول کے جسے اس نے (غیب کا علم دینے کے لیے) پسند کر لیا ہو' تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے' اور وہ ان کے پورے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے"۔

اے محمدؐ آپ یہ اعلان کر دیں۔

اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا (٧٢ : ٢٠) "میں تو اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا"۔ یہ اعلان اس وقت آتا ہے جب جنات بھی اپنی قوم کے سامنے یہ اعلان کرتے ہیں۔

وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (٧٢ : ٢) "اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے"۔ یوں اس اعلان کا بہت اثر ہو گا۔ اور یہ اعلان بیک وقت جن و انس کا اعلان ہو جائے گا۔ اور یہ اعلان دونوں کی شناخت ہو گا۔ اور جو شخص اس اعلان سے برات کرے گا وہ گویا جن و انس دونوں سے اپنے آپ کو علیحدہ کر دے گا۔ وہ دونوں جہانوں اور دونوں آبادیوں سے دور ہو گا۔

قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (٧٢ : ٢١) "کہو' میں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں نہ کسی بھلائی کا"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ خالص اللہ کے لیے ہو جائیں اور ہر قسم کے دعوے سے دستبردار ہو جائیں اور صاف صاف اعلان کر دیں کہ اللہ کی خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت بھی مجھے حاصل نہیں ہے بلکہ یہ کہ میں بندہ ہوں اور اللہ کے لیے کوئی شریک نہیں ٹھہراتا۔ یہ صرف اللہ ہے جو انسانوں کے نفع و نقصان کا مالک ہے۔ یہاں قرآن مجید ضرر اور مضرت کے مقابل رشد و ہدایت کو لایا اور یہی بات جنات نے بھی کہی تھی۔

وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا (٧٢ : ١٠) "اور یہ

کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ زمین والوں کے ساتھ کوئی بڑا معاملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کا رب انہیں راہ راست دکھانا چاہتا ہے؟" یوں دونوں آیات اور دونوں اقوال کے درمیان مناسبت پیدا ہو گئی۔ الفاظ میں بھی اور مفہوم میں بھی اور یہ مناسبت قصے اور اس پر تبصرے دونوں میں مقصود ہے۔

یہاں قرآن کریم جنات سے بھی اس بات کی نفی کر دیتا ہے کہ وہ کسی کو نفع یا نقصان دے سکتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں بھی یہ تردید کر دی جاتی ہے کہ آپ کسی کو نفع یا نقصان دے سکتے ہیں اور نفع و نقصان دینا اللہ کی خصوصیت قرار پاتا ہے۔ یوں اسلامی عقیدہ اور اسلامی تصور حیات صاف ستھرا ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔

قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (۲۲) اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ (۷۲: ۲۳) "کہو "مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی بچا نہیں سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔ میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں"۔ یہ ایک نہایت ہی خوفناک دھمکی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالت کا معاملہ کس قدر نازک اور سنجیدہ ہے۔ رسالت اور دعوت اسلامی نہایت حساس امور ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کر دیں کہ مجھے اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ اور اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں، بچنے کی صورت صرف یہ ہے کہ میں تبلیغ کروں میرے پاس اللہ کی جو امانت ہے اسے پہنچا دوں۔ یہی ایک معاملہ ہے جس کی گارنٹی دے دی گئی ہے۔ اس معاملے میں میرے اختیارات نہیں۔ میں تو صرف تبلیغ پر مامور ہوں اور اس کے سوا میرے لیے کوئی اور صورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تو لازمی سروس ہے۔ اور میں اس سے کہیں بھاگ نہیں سکتا۔ نہ کوئی جائے پناہ ہے۔ ایسی پناہ گاہ جہاں میں بچ سکوں۔ میرے لیے صرف یہ صورت ہے کہ میں اپنا فریضہ ادا کرتا رہوں۔

ذرا غور کیجئے کس قدر نازک، سنجیدہ اور خوفناک معاملہ ہے رسالت اور دعوت کا۔ یہ کوئی رضاکارانہ معاملہ نہیں ہے کہ کوئی چاہے تو دعوت پیش کرے اور کوئی نہ چاہے تو چھوڑ دے۔ یہ ایک لازمی سروس کی ڈیوٹی ہے۔ نہایت حساس ڈیوٹی ہے۔ اللہ دیکھ رہا ہے اور اللہ سے کوئی کہیں بھاگ نہیں سکتا۔ یہ کوئی ذاتی شغل اور ہابی (Hobby) بھی نہیں ہے کہ کوئی ذاتی خوشی اور حصول لذت کے لیے یہ کام کرے تو یہ حاکم مطلق کا حکم ہے۔ اور اس سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ نہ اس میں کوئی تردد کر سکتا ہے، یوں دعوت اسلامی کی نوعیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ رسول کے بعد کے انسانوں میں آنے والے داعی بھی از سر نو اس کی حیثیت کو سمجھیں کہ یہ ایک لازمی فریضہ ہے اور نہایت حساس، سنجیدہ معاملہ ہے اور اللہ جو کبیر اور متعال ہے، خود اس کا نگران ہے۔

وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا (۲۳) حَتّٰۤی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا (۷۲: ۲۴) "اب جو بھی اللہ اور اس کے رسول(ﷺ) کی بات نہ مانے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

(یہ لوگ اپنی اس روش سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کا جتھا تعداد میں کم ہے"۔

یہ ظاہری اور درپردہ دونوں انداز میں ایک خوفناک تہدید اور ڈراوا ہے' ان لوگوں کے لیے جن کے پاس یہ پیغام پہنچ جائے اور وہ اس سے روگردانی کریں جبکہ اس سے قبل ان لوگوں کو سخت تنبیہہ کر دی گئی کہ جو قبول کر لیں پھر وہ دوسروں تک نہ پہنچائیں۔

اگر مشرکین کو یہ ناز ہے کہ وہ قوت رکھتے ہیں اور ان کی تعداد زیادہ ہے اور وہ اس کا مقابلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی کمزور قوت اور قلت تعداد سے کرتے ہیں تو ان کو جلد ہی اپنی قوت کا اندازہ ہو جائے گا' جب وہ اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے۔ یا تو دنیا ہی میں دیکھ لیں گے اور یا آخرت میں دیکھ لیں گے کہ۔

مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا (۷۲: ۲۴) "کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کا جتھا تعداد میں کم ہے"۔ کون ضعیف' ناتواں اور بے وقار ہے۔ اور کون زور آور ہے۔

اب ذرا پیچھے لوٹیے کہ جنات نے کیا کہا تھا:

وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا (۷۲: ۱۲) "اور یہ کہ ہم سمجھتے تھے کہ نہ زمین میں ہم اللہ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں"۔ یوں اس قصے پر تبصرہ کے الفاظ قصے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ گویا اس پورے قصے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس پر یہ تبصرہ کیا جائے کہ اللہ کو کوئی ہرا نہیں سکتا۔

اب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ طاقت کے علاوہ اپنے بارے میں علم غیب کی بھی نفی کر دیں۔

قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا (۷۲: ۲۵) "کہو' میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے"۔ دعوت کے معاملات میں آپؐ کا کوئی اختیار نہیں اور نہ اس میں آپ کا کوئی ذاتی حق ہے۔ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ تبلیغ کریں۔ اور اپنے آپ کو اس طرح محفوظ خطے میں داخل کر دیں اور محفوظ خطے میں وہی شخص داخل ہو سکتا ہے جو تبلیغ کا حق ادا کر دے۔ اور تکذیب اور نافرمانی پر اللہ جس برے انجام سے ڈراتا ہے وہ بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ آپؐ کو اس میں بھی کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ نہ آپؐ کو اس کا کوئی وقت وقوع معلوم ہے کہ وہ قریب ہے یا دور ہے؟ یہ سب غیبی امور ہیں اور ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ان امور کا علم اللہ کے لیے مخصوص ہے۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا (۷۲: ۲۶) "وہ عالم الغیب ہے' اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا"۔ یوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے الوہیت کی تمام صفات کی نفی کر دی جاتی ہے اور آپؐ صرف بندہ مختار

رہ جاتے ہیں اور کسی انسان کے لیے بندگی سے بڑا کوئی وصف اور اعزاز نہیں ہو سکتا۔ بندگی اور عبودیت انسان کے مراتب و درجات میں سے اعلیٰ مرتبہ اور درجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو الوہیت کی تمام صفات سے مبرا کر دیا جاتا ہے اور حکم دے دیا جاتا ہے کہ آپؐ تبلیغ کریں۔ "کہو' میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے' وہ قریب ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی لمبی مدت مقرر فرماتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا"۔

اس سے فقط ایک استثناء ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کسی غیب کے بارے میں اجازت دے دے اور اس سے کسی رسول کو مطلع کر دیا جائے۔ اور یہ بھی ان معاملات کے بارے میں جن کا تعلق آپ کی دعوت کے فرائض سے ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف جن باتوں کا پیغام آتا تھا تو وہ بھی غیبی امور ہی تھے۔ اپنے وقت میں حضورؐ پر ایک مقدار کے مطابق احکام آتے تھے اور پھر رسولوں کی بھی آگے پیچھے سے نگرانی کی جاتی تھی کہ ان پر جو غیب آیا ہے انہوں نے اس کی تبلیغ کر دی ہے یا نہیں۔ حضور اکرمؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اس بات کا اعلان بھی کر دیں اور نہایت صراحت اور سنجیدگی کے ساتھ اور نہایت ہی خشوع کے ساتھ کر دیں۔

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (۲۷) لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَ اَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا (۷۲ : ۲۸) "سوائے اس رسول کے جسے اس نے (غیب کا علم دینے کے لیے) پسند کر لیا ہو' تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے' اور وہ ان کے پورے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے"۔ پس وہ رسول جن کو وہ اپنی دعوت کے پہنچانے کے لیے چن لیتا ہے ان کو اللہ اپنے عالم غیب میں سے کچھ بتا دیتا ہے اور وہ پہلو وہی ہے جو وحی پر مشتمل ہے۔ یعنی وحی کے موضوعات' اس کا طریقہ یعنی وہ فرشتے' جو وحی اٹھا کر لاتے ہیں اور وہ سرچشمہ جس سے وہ لاتے ہیں یعنی لوح محفوظ اور اس کا نظام حفاظت جس کا ذکر ہوا اور وہ دوسرے امور جن کا تعلق رسول کی رسالت اور دعوت کے ساتھ ہے۔ یہ تمام امور غیبی امور ہیں اور انسانوں میں سے کوئی ان کے بارے میں نہیں جانتا۔ (لہٰذا رسول کو جو غیب دیا جاتا ہے وہ وحی الٰہی سے متعلق ہوتا ہے)

اور اس کے ساتھ ساتھ رسولوں کے اردگرد اللہ کے نگران مقرر کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ نگران ان کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور ان کے کام کی نگرانی بھی کرتے ہیں۔ یہ نگران ان کو شیطان کے وسوسوں سے بھی بچاتے ہیں' شیطانوں کی مداخلت سے بھی بچاتے ہیں' اور شیطان کی خواہشات اور تمناؤں سے بھی بچاتے ہیں۔ یہ ان کو ان بشری کمزوریوں سے بھی بچاتے ہیں کہ وہ رسالت و دعوت میں کوئی سستی نہ کریں' کسی بات کو بھلا نہ دیں' راہ راست سے منحرف نہ ہو جائیں اور ان کو دوسرے بشری نقائص اور ناتوانیوں سے بچاتے ہیں۔

لیکن انبیاء کے اس حفاظتی نظام میں ایک قسم کا خوف اور حساسیت پائی جاتی ہے۔ ذرا انداز بیان پر غور کریں۔

فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (۷۲ : ۲۷) "تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے"۔ تو ہر رسول کی مسلسل نگرانی ہوا کرتی ہے کہ آیا وہ اپنا فریضہ ادا کر رہا ہے یا نہیں۔

لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (۷۲ : ۲۸) "تاکہ وہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچادیئے"۔ اللہ تو پہلے سے جانتا ہے لیکن اللہ چاہتا ہے کہ ان سے عمل تبلیغ عملاً صادر ہو جائے اور وہ نظر آجائے اور اللہ کا علم اس سے متعلق ہو۔

وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ (۷۲ : ۲۸) "اور وہ ان کے پورے ماحول کو احاطہ کیے ہوئے ہے"۔ ان کے نفوس' ان کی زندگی جو کچھ بھی ہے اور ان کے ماحول میں جو کچھ بھی ہے اسے اللہ جانتا ہے۔ اللہ کے علم سے کوئی چیز غائب نہیں ہوتی۔

وَ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (۷۲ : ۲۸) "اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے"۔ نہ صرف یہ کہ جو رسولوں سے متعلق ہے' بلکہ اس کا احاطہ اور اس کا شمار ہر چیز کو شامل ہے۔ ذرے ذرے کو بھی شامل ہے۔

ذرا اس حالت کا تصور کیجئے! ایک رسول تبلیغ کر رہا ہے اور اس کے آگے پیچھے نگراں لگے ہوئے ہیں۔ یہ محافظ بھی ہیں اور رقیب بھی ہیں اور اللہ رسولوں کے پورے ماحول سے براہ راست رابطہ رکھتا ہے۔ لہذا رسول کا فریضہ اور آپ کی سروس ایک لازمی فوجی سروس ہے۔ اور آپ کو یہ فریضہ ادا کرنا ہے۔ رسول اپنا کام کر رہا ہے۔ خود مختار نہیں ہے' نہ وہ کمزوری دکھا سکتا ہے' نہ اپنی خواہش کی پیروی کر سکتا ہے۔ نہ اپنی پسند کے پیچھے جا سکتا ہے بلکہ ایک نہایت ہی حساس' سنجیدہ اور سخت ڈیوٹی ہے جس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ ہر رسول اس بات کو جانتا ہے اور اس طرح اپنا فریضہ ادا کرتا چلا جاتا ہے۔ اور ادھر ادھر دیکھتا بھی نہیں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی سخت نگرانی ہو رہی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا ہر فعل اللہ کے علم میں ہے اور برملا ہے۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص کے دل میں رسول سے نہایت گہری ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور ہمدردی کے ساتھ ایک خوف اور دہشت بھی اس کے دامن گیر ہو جاتی ہے کہ دعوت دین کا معاملہ کس قدر حساس ہے۔

---()()()---

اس خوفناک اور مرعوب کن ہدایت پر یہ سورت ختم ہو جاتی ہے' جس کا آغاز بھی اسی قسم کے ماحول سے ہوا تھا' جسے جنوں کے طویل اقتباس سے شروع کیا گیا تھا اور جس میں جنوں کے کپکپا دینے والے واقعات بیان ہوئے تھے۔

یہ سورت جس کی کل آیات ۲۸ سے زیادہ نہیں ہیں' اسلامی نظریہ حیات سے متعلق بے شمار حقائق کو طے کرتی ہے۔ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد کا ایک نہایت ہی متوازن اور سیدھا راستہ تجویز کرتی ہے جس کے اندر کوئی غلو نہیں ہے اور نہ افراط و تفریط ہے۔ یہ سورت عالم کے بارے میں بھی نہایت معتدل لائن دیتی ہے۔ انسانوں کے سامنے عالم غیب کے دروازے بھی بند نہیں کرتی اور نہ انسانوں کو عالم غیب کے بارے میں افسانے اور خرافات گھڑنے کی اجازت دیتی ہے۔ اور جنوں کا یہ تبصرہ اس سورت میں نہایت ہی قیمتی ہے۔

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۷۲ : ۱) يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ (۷۲ : ۲) "ہم نے قرآن سنا جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے"۔

---()()()---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۲۹

سورۃ المزمل- ۷۳

۱-- تا -- ۲۰

سورۃ المزمل ایک نظر میں

اس سورت کے اسباب نزول میں یہ روایت بھی ہے کہ اہل قریش دارالندوہ میں جمع ہوئے اور یہ سوچنا شروع کیا کہ دعوت اسلامی کو روکنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کریں اور رسول اللہ کے خلاف کیا سازشیں کریں۔ یہ اطلاعات رسول اللہ ﷺ تک پہنچیں تو آپ بے حد پریشان ہوئے۔ آپ ﷺ نے اپنا کمبل اوڑھ لیا اور نہایت فکرمندی کی حالت میں سو گئے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس سورت کی ابتدائی آیات لے کر تشریف لائے۔

یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ (۱) قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا (۷۳ : ۲) ---- اور سورت کا دوسرا حصہ جو

اِنَّ رَبَّكَ یَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ -------- آخر تک' اس پورے ایک سال بعد نازل ہوا جبکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے کچھ ساتھی رات کو طویل وقت تک عبادت کرتے رہتے تھے اور ان کے پاؤں پھول گئے تھے۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے یہ تخفیفی احکامات نازل ہوئے۔ سورت کا دوسرا حصہ گویا پورے بارہ ماہ بعد نازل ہوا۔

ایک دوسری روایت بھی اس مضمون کو دہراتی ہے۔ ہم ان شاء اللہ سورہ مدثر کے مقدمے میں نقل کریں گے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ غار حرامیں ذکر الہی کے لیے جایا کرتے تھے تاکہ روحانی پاکیزگی اختیار کریں۔ یہ واقعہ بعثت سے تین سال پہلے کا ہے۔ آپؐ غار حراء میں سال کا ایک مہینہ گزارتے۔ یہ رمضان کا مہینہ ہوتا۔ یہ غار مکہ سے تقریباً دو میل دور ہے۔ آپؐ اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے جاتے' جو آپؐ کے قریب ہی ہوتیں۔ مساکین میں سے جو بھی آتا' اسے کھانا کھلاتے' آپؐ پورا مہینہ عبادت اور ذکر و فکر میں گزارتے۔ آپ پوری کائنات پر غور فرماتے اور دیکھتے کہ اس کائنات کی پشت پر ایک عظیم قوت کارفرما ہے۔ پھر آپ اپنی پاکیزہ فطرت کی بنا پر اس صورت حال کو پسند نہ کرتے تھے جو اس وقت موجود تھی یعنی اہل عرب کے عقائد' افسانوی تصورات اور اوہام و خرافات جن میں یہ لوگ بندھے ہوئے تھے۔ لیکن آپؐ پریشان تھے کہ اگر ان طور طریقوں کو ختم کر دیا جائے تو پھر کیسا نظام رائج ہو۔ آپؐ کے سامنے کوئی واضح راستہ نہ تھا جو آپؐ لوگوں کے لیے تجویز کرتے۔

حضور اکرم ﷺ کو اس طرح غار حرا کی تنہائیوں میں بھجوانا بھی اللہ کی ایک تدبیر تھی تاکہ آپؐ آنے والے منصب کی ذمہ داریوں کے لیے ذہنا تیار ہو جائیں اور یہ ایک عظیم حکمت تھی۔ اس تنہائی میں آپؐ اپنے آپ کو دنیا کی مصروفیات سے علیحدہ کر دیتے تھے۔ اور ان میں آپؐ اپنی فطرت صافی سے ہدایات لیتے تھے۔ اس کائنات اور اس کی تخلیق کے مناظر پر غور کرتے تھے۔ آپ کی روح کائنات کے ساتھ تسبیح الہی میں مصروف ہوتی تھی۔ اور آپ اس کائنات کے جمال و کمال کو اپناتے تھے۔

اور اس پوری کائنات کے ساتھ آپ کی سوچ مصروف تھی۔ آپؐ اس نظام قدرت کو سمجھنے کی سعی فرماتے تھے۔

ایسی روحانی شخصیات کو' جنہوں نے زندگی کے دھارے کو بدل ڈالنا ہوتا ہے اور جنہوں نے زندگی کی اداؤں کو بدلنا ہوتا ہے' اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ کچھ وقت کے لیے عزلت نشینی اختیار کریں اور ایک عرصہ کے لیے اس دنیا کے مشاغل سے دور ہو جائیں اور اس حقیر دنیا کے چھوٹے موٹے غموں سے اپنے آپ کو دور کر دیں۔

ایسے افراد کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایک طویل وقت صرف غور و فکر میں گزاریں اور ان کا معاملہ اور موضوع فکر یہ پوری کائنات ہو۔ جب انسان اس دنیائے دنی کے مشاغل اور شور و شغب میں مصروف ہوتا ہے تو وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ اس میں گم ہو جاتا ہے اور مگن ہو جاتا ہے کہ اس کے ذہن سے اس دنیا کے بدل دینے کا داعیہ ہی جاتا رہتا ہے۔ لیکن جب انسان کچھ دیر کے لیے اس دنیا سے ایک طرف ہو جائے' اس سے دوری اختیار کرلے' تو پھر ایسے انسان کے لیے ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ کسی بڑی بات کے بارے میں سوچ سکے' جو اس دنیائے دنی کی نہایت ہی حقیر اور معتبر چیزوں اور قدروں سے بڑی ہو۔ اس طرح اس کی روح اور اس کی سوچ مروج رسوم و رواج اور مروجہ اقدار سے ذرا آزاد ہو کر کسی اعلیٰ اور برتر مصدر سے حقائق اخذ کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایسا ہی چاہا۔ چونکہ آپ کو ایک عظیم ذمہ داری کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ آپ کے ذمہ یہ فریضہ عائد کیا جا رہا تھا کہ آپؐ نے زمین کے چہرے کو بدل کر کے رکھ دینا ہے۔ تاریخ کا دھارا بدل دینا ہے تو آپ کی ذات کی تربیت کے لیے اللہ نے آپ کو یہ ترغیب دی۔ اور آپ پورے تین سال تک ایک ماہ کے لیے غار حرا میں عزلت نشینی اختیار کرتے رہے۔ اس عرصہ میں آپ اپنی روح کو اس دنیا کی آلودگیوں سے جدا کر دیتے اور اس کائنات کے پردوں کے پیچھے جو خفیہ غیبی راز اور حکمتیں تھیں' ان پر غور کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آ پہنچا جس کے لیے آپ کو تیار کیا جا رہا تھا۔ اللہ کا حکم ہوا کہ آپ اٹھیں اور لوگوں کو ڈرائیں۔

غرض جب وقت آ گیا۔ اللہ کا حکم صادر ہو گیا کہ اب اس فیض اور رحمت کے دروازے اہل جہاں کے لیے کھول دیئے جائیں' تو جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے۔ اس وقت آپ غار حراء میں تھے۔ یہ کہانی ابن اسحاق نے وھب ابن کیسان سے' انہوں نے عبید سے یوں روایت کی ہے:

جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے' میں سو رہا تھا۔ ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا' جس میں ایک کتاب تھی' تو انہوں نے کہا پڑھو۔ میں نے کہا میں نہیں پڑھتا' (بعض روایات میں آتا ہے میں پڑھنے والا نہیں ہوں) فرمایا: "انہوں نے مجھے خوب دبایا' یہاں تک کہ میں نے یہ گمان کر لیا کہ میری موت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اس کے بعد مجھے چھوڑ دیا۔ اور کہا: پڑھو' میں نے پھر کہا: میں نہیں پڑھا کرتا' آپ نے فرمایا انہوں نے دوبارہ مجھے دونوں بازوؤں میں پکڑ کر دبایا۔ یہاں تک کہ میں گمان کرنے لگا کہ شاید میں مر جاؤں گا۔ اس کے بعد مجھے چھوڑا اور کہا: پڑھو' آپؐ نے فرمایا: "میں نے کہا میں کیا پڑھوں؟" آپ فرماتے ہیں کہ یہ سوال میں نے اس لیے کیا کہ وہ مجھے دوبارہ اس طرح نہ دبائیں جس طرح پہلے انہوں نے مجھے دبایا۔ اس پر انہوں نے کہا

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۱) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۲) اِقْرَاْ وَ

رَبُّكَ الْاَكْرَمُ (۳) الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (٤) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (٥) (۹۶ : ۱ تا ۵) "پڑھو اے نبی' اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا' جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے 'انسان کی تخلیق کی - پڑھو' اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا' انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا"۔ آپ ؐ نے فرمایا تو میں نے اسے پڑھا - پھر یہ ختم ہوا اور وہ مجھ سے چلے گئے - اور میں اس خواب سے اٹھا اور میری حالت یہ تھی کہ گویا میرے دل کے اوپر ایک تحریر لکھ دی گئی تھی - میں غار حرا سے نکلا یہاں تک کہ میں پہاڑ کے درمیان تھا کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سنی جو کہہ رہی تھی "اے محمد' تم رسول اللہ ہو اور میں جبرائیل ہوں"۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا - کیا دیکھتا ہوں کہ جبریل ایک مرد کی شکل میں ہیں' پاؤں آسمان کے افق پر ہیں' کہتے ہیں اے محمد تم رسول اللہ ہو اور میں جبریل ہوں - میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا - نہ آگے جاتا ہوں' نہ پیچھے - میں افق پر ان سے چہرہ پھیرتا ہوں' میں افق پر جس طرف دیکھتا ہوں آگے جبریل نظر آتے ہیں - میں اسی طرح کھڑا ہوں نہ آگے جاتا ہوں' نہ پیچھے - یہاں تک کہ خدیجہ نے میری تلاش میں آدمی بھیجے' یہ لوگ مکہ کے بالائی حصے تک گئے اور واپس ہو گئے اور میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا - پھر وہ چلے گئے اور میں بھی اپنے گھر کو لوٹ آیا - میں خدیجہ ...... کے پاس آیا - میں ان کے پہلو میں ان کی ران کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا - حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا "ابو القاسم تم کہاں تھے؟ میں نے تمہاری تلاش میں لوگ دوڑائے' وہ اعلیٰ مکہ تک گئے اور واپس آگئے"۔ اس کے بعد میں نے ان کے سامنے یہ واقعہ دہرایا - تو انہوں نے کہا کہ اے میرے چچازاد تمہیں مبارک ہو تم ثابت قدم رہو - اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے مجھے امید ہے کہ تم اس امت کے نبی ہو گے"۔

اس کے بعد ایک مدت کے لیے وحی بند ہو گئی - ایک بار پھر آپ ؐ پہاڑ پر تھے تو آپ ؐ نے دیکھا کہ جبریل پھر موجود ہیں - حضور ﷺ پر ان کے رعب کی وجہ سے کپکپی طاری ہو گئی - حضور ﷺ آہستہ آہستہ چل کر اور زمین کی طرف جھکتے ہوئے اور کانپتے ہوئے اپنے اہل و عیال کے پاس گئے - آپ یہ کہہ رہے تھے مجھے کپڑا اڑھاؤ' مجھ پر لحاف ڈالو"۔ گھر والوں نے ایسا ہی کیا اور آپ ؐ اس طرح کانپ رہے تھے جس طرح سخت سردی لگی ہو' چنانچہ حضرت جبریل نے آواز دی۔

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (۷۳ : ۱) (بعض روایات میں آیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (۷٤ : ۱) خدا کو علم ہے کہ اس وقت کون سی آیت تھی۔

اس سورت کی ابتدائی آیات کے نزول کے بارے میں پہلی روایت صحیح ہو یا دوسری' بہرحال رسول اللہ ﷺ یہ جان گئے کہ اب سونے کا وقت چلا گیا ہے' اب تو مجھ پر بھاری ذمہ داری آن پڑی ہے - اب مجھے ایک طویل جدوجہد کرنی پڑے گی' اب جاگنا ہے' بیداری ہے' جدوجہد ہے اور پکار ہے اور یہ پکار مجھے کبھی سونے نہ دے گی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کہا گیا "اٹھو"۔ آپ ؐ اٹھ کھڑے ہوئے اور کھڑے رہے - اور تئیس سال تک کھڑے رہے - آپ ؐ کھڑے ہو گئے اور کھڑے رہے اور ہمیشہ دعوت دیتے رہے - یہ بوجھ آپ ؐ نے اٹھا لیا - یہ تو بہت ہی بھاری بوجھ تھا - یہ امانت کبریٰ کا بوجھ تھا - پوری انسانیت کا بوجھ تھا - اسلامی نظریہ حیات کا بوجھ تھا اور مختلف

میدانوں میں جدوجہد کا بوجھ تھا۔

یہ بوجھ انسانی ضمیر کی صفائی کا بوجھ تھا۔ انسانی ضمیر جاہلیت کے اوہام اور خرافات میں غرق تھا' انسانی نفس پر زمین کے رجحانات اور میلانات چھائے ہوئے تھے ۔ انسانی شہوات نفسانیہ کے ہاتھوں میں قید تھا' اور اس کے گلے میں دنیا پرستی کے طوق پڑے ہوئے تھے ۔ جب حضور اکرم ﷺ اپنے ساتھیوں کی تطہیر سے فارغ ہوئے تو دوسرے معرکے شروع ہو گئے' اسلام کے دشمن ہر طرف سے اس تحریک پر حملہ آور ہو گئے اور حضور اکرم ؐ نے جو گروہ تیار کیا تھا اور جن کا ضمیر صاف ہو گیا تھا یہ دشمن اس گروہ کو نیست و نابود کرنے کے لیے تیار ہو گئے ۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے ۔ قبل اس کے کہ وہ تناور درخت ہو جائے اور دوسرے علاقوں کو اپنے سائے میں لے لے ۔ ابھی حضور اکرم ﷺ جزیرۃ العرب کے معرکوں سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ رومی حملہ آور ہو گئے اور شمال کی جانب سے انہوں نے سخت گرفت کی سعی کی جس کا حضور ﷺ اور مسلمانوں نے مقابلہ کیا۔

لیکن ان تمام معرکوں اور تمام میدانوں کے اندر لڑنے کے باوجود ایمان و خیر کا معرکہ بہرحال جاری رہا۔ کیونکہ نفس و ضمیر کے معرکے کا فریق مخالف شیطان ہوتا ہے اور شیطان انسانی نفس اور انسانی ضمیر کے میدان میں ہروقت بر سرپیکار رہتا ہے ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی موجود تھے ۔ آپ ؐ بھی ہر میدان میں بر سرجنگ تھے اور یہ چونکہ لڑائی آپ نہایت غربت اور تنگدستی کی حالت میں لڑ رہے تھے حالانکہ دنیا کے وسائل آپ کے پاس ہر طرف سے اڈتے چلے آ رہے تھے ۔ آپ ؐ اس حال میں بھی جہد مسلسل میں اور مشقت میں رہے جبکہ آپ کے اردگرد اہل ایمان نہایت خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے ۔ آپ یہ ان تھک جدوجہد کر رہے تھے' مسلسل صبر کر رہے تھے' راتوں کو جاگ رہے تھے' رب کی عبادت کر رہے تھے' قرآن مجید نہایت درد سے سنا رہے تھے' اللہ کے ہو گئے تھے' جس طرح اللہ نے آپ ؐ کو یہ احکام دیئے تھے :

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (١) قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا (٢) نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا (٣) اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (٤) اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (٥) اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا (٦) اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (٧) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (٨) رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا (٩) وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (١٠) (٧٣: ١ تا ١٠) "اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو ۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں ۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے ۔ دن کے اوقات میں تو تمہارے لیے بہت مصروفیات ہیں ۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو ۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' لہٰذا اسی کو اپنا وکیل بنا لو اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ ان سے

الگ ہو جاؤ"۔

یوں حضور ﷺ کھڑے ہو گئے اور اس طرح آپؐ نے اس جہد مسلسل کا مظاہرہ کیا اور یہ مسلسل جنگ لڑی۔ بیس سال سے زیادہ عرصہ تک آپؐ میدان جنگ میں رہے۔ اس دوران کوئی بات آپؐ کو اس معرکے سے غافل نہ کر سکی۔ جب سے آپؐ نے عالم بالا سے یہ نداء سنی کہ قُمْ تو آپ کھڑے رہے اور انسانیت کے ساتھ آپؐ نے جو بھلائی کی اس پر اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

سورت کا یہ پہلا حصہ یکساں ترنم کا انداز رکھتا ہے۔ ایک ہی ٹون ہے۔ لام ممدود پر آیات ختم ہوتی ہیں' یہ لہجہ نہایت ہی نرم' سنجیدہ اور رعب دار ہے۔ جس طرح ایک عظیم ذمہ داری کے احکامات دیئے جا رہے ہیں اس طرح انداز بھی ذمہ دارانہ ہے۔ سیاق کلام میں بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ معاملہ کس قدر ذمہ داری کا ہے اور کس قدر نازک' حساس اور بھاری ہے۔ ایک بھاری ذمہ داری عائد کی جا رہی ہے اور اس میں مخالفین کے لیے بھی سخت تہدید ہے۔

وَ ذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَۃِ وَ مَہِّلْہُمْ قَلِیْلًا (١١) اِنَّ لَدَیْنَآ اَنْکَالًا وَّ جَحِیْمًا (١٢) وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّۃٍ وَّ عَذَابًا اَلِیْمًا (١٣) (٧٣: ١١ تا ١٣) "ان جھٹلانے والے خوشحال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو اور انہیں ذرا کچھ دیر اسی حالت پر رہنے دو۔ ہمارے پاس (ان کے لیے) بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے"۔ اس کائنات کے ہولناک مشاہد اور نفس انسانی کی گہرائیوں میں ایک زلزلہ برپا ہوتا ہے۔

یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَکَانَتِ الْجِبَالُ کَثِیْبًا مَّہِیْلًا (٧٣: ١٤) "یہ اس دن ہو گا جب زمین و پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑوں کا حال ایسا ہو جائے گا جیسے ریت کے ڈھیر بکھرے جا رہے ہیں"۔ اور

فَکَیْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ کَفَرْتُمْ یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا (١٧) اِلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِہٖ کَانَ وَعْدُہٗ مَفْعُوْلًا (٧٣: ١٨) "اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہو گا؟ اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہتا ہے"۔

اب ہمارے سامنے سورت کی ایک طویل آیت ہے' سورت کا دوسرا حصہ بھی آیت ہے۔ یہ قیام اللیل کے سال کے بعد نازل ہوئی جبکہ حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ کے پاؤں سوج گئے تھے۔ اس قیام کے ذریعہ اللہ ان لوگوں کو جس عظیم کام کے لیے تیار کر رہا تھا' وہ واضح ہے۔ اس آیت کے ذریعہ یہ تخفیف نازل ہوئی اور آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو یہ تسلی دی گئی کہ یہ انداز تربیت اللہ نے اپنے علم و حکمت کے ذریعہ تمہارے لیے تجویز کیا تھا۔ اور یہ فرائض اللہ کے علم اور حکمت کے مطابق ضروری تھے۔ اس آیت کا اسلوب بھی خاص ہے اور مضمون اور معانی کے اعتبار سے طرز ادا بھی طویل جملوں والی ہے۔ اور انداز بیان میں ٹھہراؤ اور وضاحت کا انداز ہے۔ اور الفاظ اور قافیہ

بھی انہی کے مناسبت سے ہے۔

غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ یعنی میم اور اس سے قبل پائے مدود۔

یہ سورت اپنے دونوں حصوں کے ساتھ دعوت اسلامی کی تاریخ کی ایک اہم کڑی پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز عالم بالا کی ایک پکار سے ہوتا ہے جس میں آپ کے کاندھوں پر عظیم ذمہ داری عائد کی جاتی ہے' اور حکم دیا جاتا ہے کہ اس عظیم ڈیوٹی کے لیے تربیت کی ضرورت ہے 'قیام اللیل' نماز' ترتیل قرآن' ذکر و فکر اور خضوع و خشوع اور اللہ کے لیے کٹ کر علیحدہ ہو جانا' صرف اللہ پر بھروسہ کرنا' اس راہ کی مشکلات پر صبر کرنا۔ اور اگر کسی سے قطع تعلق کرنا ہی پڑے تو اچھے انداز سے قطع تعلق کرنا۔ منکرین کے معاملے کو جبار و قہار کے سپرد کر دینا کیونکہ یہ دعوت اور یہ دین تو اسی کا ہے۔ وہ جانے اور اس کی دعوت کے معاندین جانیں۔

اس کے بعد پھر ٹریننگ اور تربیت کے کورس میں قدرے تخفیف کی جاتی ہے' اور سہولت پیدا کی جاتی ہے۔ ہدایت کی جاتی ہے کہ اللہ کی بندگی کرو' اللہ کے راستے میں خرچ کرو' اور اللہ کی رحمت طلب کرو' اللہ غفور رحیم ہے۔ غرض یہ سورت دراصل اس جدوجہد کا آغاز ہے جو تاریخ انسانیت کے بہترین لوگوں نے پوری انسانیت کی خاطر شروع کی تاکہ اس گم گشتہ راہ انسانیت کو واپس رب کی طرف لایا جائے۔ اس گروہ کو ہدایت کی گئی کہ اس جدوجہد کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں۔ ان پر صبر کریں اور خود اپنے ضمیر کے اندر آنے والے خیالات کے ساتھ بھی مجاہدہ کریں۔ تمام دنیاوی اغراض سے اپنے آپ کو بالا کرلیں' تمام فوائد سے دستکش ہو جائیں اور ان تمام راحتوں کو خیرباد کہہ دیں جن سے بے کار لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور نیند کو بھی کم کر دیں جس سے فارغ البال لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ یہ تھے اس سورت کے مضامین' اب ذرا تفصیلات کے ساتھ۔

--- ○○○---

درس نمبر ۲۷۳ تشریح آیات

۱ ـــ تا ـــ ۲۰

سُورَۃُ الْمُزَّمِّلِ مَکِّیَّۃٌ (۳) آیَاتُهَا ۲۰ رُکُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿۱﴾ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ﴿۴﴾ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ﴿۵﴾ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِیْلًا ﴿۶﴾ اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ﴿۷﴾ وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ﴿۸﴾ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِیْلًا ﴿۹﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ دن کے اوقات میں تو تمہارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' لہٰذا اسی کو اپنا وکیل بنا لو"۔

یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ (۷۳ : ۱) قُمِ ـــــ (۷۳ : ۲) "اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے کھڑے ہو جاؤ....." آسمانوں کی پکار' اللہ اور کبیر اور متعال کا حکم "قم" کھڑے ہو جاؤ۔ اس عظیم کام کے لیے کھڑے ہو جاؤ جو ایک عرصہ سے تمہارے انتظار میں ہے۔ یہ ایک بھاری ذمہ داری ہے اور یہ تمہارے لیے ہے۔ اٹھو اور اس راہ میں جدوجہد کرو۔ ان تھک جدوجہد کرو' اٹھو نیند اور آرام کا وقت اب گیا۔ تیاریاں کرو اس عظیم جدوجہد اور اس چوکھی

لڑائی کے لیے۔

یہ ایک عظیم حکم ہے' ایک خوفناک حکم ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ گرم و نرم بستر کو چھوڑ دو۔ آرام دہ اور پرسکون گھر کو چھوڑ دو۔ غرض اس حکم کے ذریعہ آپ کو ایک عظیم کشکش اور عظیم جدوجہد کے سمندر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور پھر یہ کشکش خشکیوں میں' سمندروں میں اور انسان کی عملی زندگی میں اور انسانی ضمیر میں ہر جگہ برپا ہوتی ہے۔

جو شخص صرف اپنے لیے زندگی بسر کرتا ہے بعض اوقات وہ بڑی خوشگوار زندگی بسر کرتا ہے' لیکن وہ نہایت صغیرو حقیر زندگی بسر کرتا ہے اور ایک معمولی انسان کی طرح مرتا ہے۔ بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جو بڑی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ لہذا ایسے بڑے آدمی کے لیے سونا ممکن ہی نہیں رہتا' اسے آرام نصیب ہی نہیں ہوتا' اسے گرم بستر کم ہی نصیب ہوتے ہیں' اسے عیش و عشرت سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہتا۔ اسے سازوسامان فراہم کرنے کی فرصت ہی نہیں رہتی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حقیقت کو پالیا تھا' اس لیے آپ ؐ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا جبکہ وہ آپ ﷺ کو مطمئن کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ سو جائیں۔ "خدیجہ ...... سونے کا زمانہ تو گیا"۔ ہاں وہ دور چلا گیا۔ اب تو جاگنے کا دور ہے' مسلسل بیدار رہنے کا زمانہ ہے۔ اب تو جدوجہد ہے یا جہاد ہے۔ اور طویل مشقتیں ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (١) قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا (٢) نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا (٣) اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (٤) (٧٣: ١ تا ٤) "اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو"۔

یہ ایک عظیم مہم کے لیے منجانب اللہ تربیت تھی اور اس تربیت میں ایسے ذرائع استعمال کیے گئے جن کی کامیابی کی ضمانت من جانب اللہ دی گئی تھی۔ قیام اللیل' جس کی زیادہ سے زیادہ حد نصف رات یا دو تہائی رات سے کم یا ایک تہائی ہے۔ اس میں صرف ترتیل قرآن اور نماز ہوتی ہے۔ ترتیل قرآن کا مطلب ہے قرآن کو تجوید کے ساتھ قرآن کے اصولوں کے مطابق پڑھنا' جلدی جلدی بھی نہ ہو اور محض گانے بجانے کا انداز بھی نہ ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایات وارد ہیں کہ آپ نے قیام اللیل کے دوران گیارہ رکعات سے زیادہ نہ پڑھا تھا لیکن ان گیارہ رکعات میں رات کے دو تہائی حصے سے قدرے کم وقت گزارتے تھے اور آپ قرآن مجید کو خوب رک رک تجوید کے ساتھ پڑھتے تھے۔

امام احمد نے اپنی سند میں روایت کی ہے' یحییٰ ابن سعید سے (یہ ابن عروبہ ہیں) انہوں نے قتادہ سے' انہوں نے زرارہ ابن اوفی سے' انہوں نے سعید ابن ہشام سے کہ وہ حضرت ابن عباس کے پاس آئے اور ان سے وتروں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسے شخص کے بارے میں نہ بتاؤں جو تمام اہل زمین سے حضور ﷺ کے وتروں کے بارے میں زیادہ جانتا ہے؟ فرمایا عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو۔ اور پوچھ کر ان کا جو جواب ہو' وہ مجھے بھی بتا دو۔ سعید ابن ہشام کہتے ہیں۔ میں نے پوچھا: اے ام المومنین۔ مجھے بتایئے کہ

حضور ﷺ کے اخلاق کیسے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ میں نے کہا پڑھتا ہوں۔ انہوں نے کہا بس رسول اللہ کا اخلاق قرآن تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اٹھ کھڑا ہوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ حضور ﷺ کے قیام اللیل کے بارے میں پوچھوں تو میں نے کہا ام المومنین رسول اللہ قیام اللیل کس طرح فرماتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ کیا تم سورہ المزمل نہیں پڑھتے؟ میں نے کہا ہاں پڑھتا ہوں۔ اللہ نے اس سورت کے پہلے حصے میں قیام اللیل فرض فرمایا تھا۔ تو رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھی ایک سال تک قیام اللیل پر عمل پیرا رہے۔ یہاں تک کہ ان کے پاؤں پھول گئے اور اللہ نے اس کا اختتام آسمانوں میں بارہ مہینے روکے رکھا۔ اس کے بعد اس سورت کے آخری حصے میں تخفیف نازل فرمائی' اس کے بعد قیام اللیل نفلی ہو گیا جبکہ پہلے فرض تھا۔ میں نے پھر ارادہ کر لیا کہ اٹھ کر چلا جاؤں تو مجھے حضور ﷺ کے وتر کے بارے میں خیال آ گیا۔ میں نے پوچھا ام المومنین مجھے حضور ﷺ کے وتر کے بارے میں بتائیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہم آپ کے لیے مسواک اور وضو کا پانی تیار کرتے تھے۔ تو اللہ رات کو آپ کو اٹھاتا تھا' جس وقت اللہ اٹھانا چاہتا۔ آپ پہلے مسواک کرتے' پھر وضو فرماتے' پھر آپ آٹھ رکعات پڑھتے اور ان میں نہ بیٹھتے' صرف آٹھویں رکعت کے بعد بیٹھتے۔ آپ بیٹھ کر اللہ کو یاد کرتے' دعا کرتے' پھر آپ سلام پھیرے بغیر آٹھویں رکعت کے بعد اٹھتے تاکہ نویں رکعت پڑھیں۔ پھر بیٹھتے اور اللہ وحدہ کو یاد کرتے' پھر دعا کرتے اور پھر سلام پھیرتے اور ہم سلام پھیرنے کی آواز سنتے۔ اس کے بعد آپ بیٹھ کر دو رکعات پڑھتے۔ یہ سلام پھیرنے کے بعد پڑھتے بیٹھتے۔ یہ گیارہ رکعات ہو گئے۔ جب حضور ﷺ معمر ہو گئے اور آپؐ کا جسم مبارک بھاری ہو گیا تو ساتویں رکعت وتر ہوتی۔ پھر ساتویں کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھتے۔ اس طرح نو رکعتیں ہوتی ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ آپ جو نماز پڑھتے تو اس بات کو پسند کرتے تھے کہ اس پر مداومت کریں اور جب کبھی حضور ﷺ جاگ نہ سکتے' یا کسی درد یا بیماری کی وجہ سے رات کو نہ اٹھتے تو دن کو بارہ رکعات ادا فرماتے۔ اور مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ رسول خدا نے ایک ہی رات میں تمام قرآن مجید کو پڑھ کر ختم کیا ہو اور یہ بھی میرے علم میں نہیں ہے کہ ماسوائے رمضان کے آپؐ نے کبھی پورے مہینے کے روزے رکھے ہوں۔ (امام مسلم نے بھی اسے قتادہ سے روایت کیا ہے' دیکھئے زاد المعاد' ابن قیم مفصلا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ تربیت اس لیے کی جا رہی تھی کہ ایک بھاری ذمہ داری آپ ؐ کے سپرد کی جانے والی تھی۔

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (۷۳:۵) "ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں"۔ اس سے مراد یہ قرآن ہے' اور قرآن مجید سے آگے پھر مزید احکامات ہیں۔ قرآن مجید کلامی اعتبار سے ثقیل نہیں ہے' یہ تو آسان ہے۔ اور اس سے نصیحت حاصل کرنا بھی بہت سہل ہے لیکن سچائی کے ترازو میں یہ بہت ہی وزن دار ہے اور اس کے اثرات بہت دور رس ہیں اور اس نظام کے قیام کی ذمہ داریاں بھاری ہیں۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ

(۵۹:۲۱) "اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ جھک جاتے اور اللہ کے ڈر سے ریزہ ریزہ ہو جاتے"۔ اس لیے اللہ نے اس قرآن کو ایک ایسے دل پر نازل فرمایا جو پہاڑ سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ اس لیے اس نے

اس کو اخذ کر لیا۔

پھر قرآن کی روشنی کو اخذ کرنا' اس کی حقیقت کو جاننا اور اس کا استیعاب حاصل کرنا بہت بھاری ہے اور اس کے لیے بہت طویل تیاری اور تربیت کی ضرورت ہے۔ عالم بالا سے رابطہ قائم کرنا' اس کائنات کی روح تک پہنچ جانا' اور اس کائنات کے زندہ اور جامد ارواح تک پہنچ جانا' جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس تک رسائی حاصل ہوئی' ایک طویل اور ثقیل ذمہ داری ہے اور اس کے لیے طویل جہد و تربیت کی ضرورت ہے۔

پھر اسلام کے جادۂ مستقیم پر بلا تردد اور بلا شک قائم ہو جانا اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اور دنیا کے میلانات و جاذبیتوں سے متاثر نہ ہونا اور اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں' ان کو عبور کرتے چلے جانا اور جو مشکلات آئیں ان کو برداشت کرنا' بہت ہی بھاری ذمہ داری ہے اور اس کے لیے بھی طویل تیاری اور جہد کی ضرورت ہے۔

راتوں کو جاگنا جب کہ لوگ سو رہے ہیں' اور روز مرہ کی زندگی کی کدورتوں سے دور ہونا اور دنیاوی جھمیلوں سے ہاتھ جھاڑ کر اللہ کا ہو جانا اور اللہ کی روشنی اور اللہ کے فیوض وصول کرنا اور وحدت مطلقہ سے مانوس ہونا اور اس کے لیے خالص ہو جانا اور رات کے سکون اور ٹھہراؤ کے ماحول میں ترتیل قرآن' ایسی ترتیل کہ گویا یہ قرآن ابھی نازل ہو رہا ہے اور یہ پوری کائنات اس قرآن کے ساتھ رواں دواں ہے۔ انسانی الفاظ اور عبارات کے سوا ہی یہ پوری کائنات قرآن کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ قیام اللیل میں انسان قرآن کے نور کی شعاعیں' اس کے اشارات' نہایت پر سکون ماحول میں حاصل کرتا ہے اور یہ سب اس دشوار گزار راستے کا ساز و سامان ہے۔ کیونکہ اس کٹھن راستے کی مشکلات رسول اللہ ﷺ کے انتظار میں تھیں اور یہ ہر اس شخص کا انتظار کرتی ہیں' جو بھی اس دعوت کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ جو شخص بھی جس دور میں دعوت اسلامی کا کام کرتا ہے' شیطانی وساوس اور اس راہ کے تاریک ترین لمحات میں یہی زاد راہ کسی داعی کے کام آتا ہے اور اس سے اس کی راہ روشن ہوتی ہے۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا (۷۳ : ۶) "درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے زیادہ موزوں ہے"۔ اور قرآن کو ٹھیک ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ اس سے مراد عشاء کے بعد اٹھنا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ رات کے وقت اٹھنا جسم کے لیے باعث مشقت ہے اور۔

اَقْوَمُ قِيْلًا (۷۳ : ۶) یعنی بھلائی میں مضبوط طریقہ ہے (مجاہد) کیونکہ دن کی جدوجہد کے بعد تھکاوٹ کا غلبہ ہوتا ہے اور نرم بستر بہت جاذبیت رکھتا ہے۔ یہ جسم کو روندنے کے لیے بہت ہی موثر ہے۔ لیکن جو شخص یہ عمل کرتا ہے' وہ گویا اعلان کرتا ہے کہ اس پر روحانیت غالب ہے' اور اس نے اللہ کی دعوت پر لبیک کہہ دیا ہے۔ اور وہ دعوت پر سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رات کو قرآن کریم بھی اچھی طرح پڑھا جا سکتا ہے' رات کے وقت اللہ کے ذکر میں مٹھاس ہوتی ہے اور نماز تو نہایت ہی خضوع و خشوع کے ساتھ پڑھی جا سکتی ہے اور رات کے وقت اللہ کے سامنے عرض و معذرت اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ انسان کے دل میں محبت الٰہی پیدا ہوتی ہے۔ انسان کو آرام ملتا ہے اور انس و محبت حاصل ہوتی ہے' دل میں سکون' خوشی اور نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ دن کی نمازوں میں یہ مقام حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جس نے یہ دل پیدا کیا ہے' وہ اس دل کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے۔ اللہ کو معلوم ہے اس

میں کیا چیز اثر سکتی ہے اور کس چیز کا اس پر اثر ہوتا ہے۔ اور کن اوقات میں دل زیادہ اثر لیتا ہے اور اچھے اثرات لینے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اور کیا اسباب ہیں جو اس پر زیادہ اثرانداز ہوتے ہیں۔

اللہ اپنے بندے اور رسول کو ایک عظیم جدوجہد کے لیے تیار کر رہا تھا اور ان پر عظیم فرائض نازل ہونے والے تھے۔ اس لیے اللہ نے ان پر قیام اللیل فرض کیا کیونکہ نفس کو قابو کرنے کے لیے یہ موزوں ترین طریقہ ہے۔ اس سے نفس اچھی طرح روند ڈالا جاتا ہے اور پھر اس سے قرآن کی تلاوت اور اس کی حکمت سمجھنے میں زیادہ مدد ملتی ہے۔ تیز دن کے وقت ہر شخص کی بے شمار مصروفیات ہوتی ہیں اور یہ مصروفیات بہت سا وقت لیتی ہیں اور مختلف اطراف میں انسانی توجہ مبذول رہتی ہے۔ اور اس میں انسانی قوت کا ایک بڑا حصہ صرف ہو جاتا ہے۔

اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (۷۳ : ۷) "دن کے اوقات میں تو تمہارے لیے بہت مصروفیات ہیں"۔ لہٰذا دن کو ان مصروفیات میں گزرنا چاہئے اور رات کو اللہ کے لیے مختص کرنا چاہئے اور نماز اور ذکر میں مصروف رہنا چاہئے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (۷۳ : ۸) "اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو"۔ اللہ کے نام کے ذکر سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ کوئی صرف اللہ کا نام ہی جپتا رہے۔ اور سو دانوں یا ہزار دانوں کی تسبیح رولتا رہے' بلکہ اس سے یہ ذکر مراد ہے کہ زبان پر اللہ کا نام ہو اور دل میں اللہ کی شان حاضر ہو۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ نماز پڑھو جس میں اللہ کا ذکر ہی ذکر ہے اور تلاوت قرآن ہے اور تبتل کے معنی ہیں اللہ کے سوا ہر چیز سے کٹ جانا اور پوری طرح عبادت اور ذکر میں مشغول ہو جانا اور ہر شغل اور ہر تصور سے ایک طرف ہو جانا' اور اپنے مشاعر اور تصورات کے ساتھ اللہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے۔

جب تبتل کا ذکر ہوا جس کا مفہوم ہے اللہ کے سوا ہر چیز سے کٹ جانا' تو اس کے ساتھ اس بات کی تصریح ضروری ہو گئی کہ یہ بیہ واضح کر دیا جائے کہ اللہ کے سوا کوئی اس کا اہل ہی نہیں ہے۔ اللہ ہی فقط اس بات کا مستحق ہے کہ انسان اس کی طرف متوجہ ہو۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا (۷۳ : ۹) "وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' لہٰذا اسی کو اپنا وکیل بنالو"۔ وہ ہر متوجہ ہونے والے کا رب ہے۔ مشرق و مغرب کا رب ہے' وہ واحد اللہ ہے اور اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اور جو شخص اللہ کا ہو جائے' وہ دراصل اس کائنات کی واحد حقیقت تک پہنچ گیا اور اللہ پر توکل کرنا دراصل اس کائنات کی واحد حقیقت پر عمل کرنا ہے۔ اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اس کے ذہن میں یہ عقیدہ خود بخود آجاتا ہے کہ اللہ اس کائنات کے شرق و غرب اور پوری کائنات پر قادر مطلق ہے۔ اور رسول اکرم ﷺ جن سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اٹھو کہ تم نے اس جہاں میں ایک بھاری ذمہ داری اٹھائی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اللہ کے ہو جاؤ اور پوری کائنات کی طرف پشت کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ کیونکہ اس کام کے لیے قوت' طاقت' سازو سامان اسی سرچشمے سے ملتا ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ کی قوم کی طرف سے آپ کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا جا رہا ہے 'لوگ منہ موڑ رہے ہیں' الزامات لگاتے ہیں اور دوسروں کو راہ راست سے دور کرتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں۔ ان مکذبین کو مجھ پر چھوڑیں' میں ان سے نمٹ لوں گا کیونکہ میں نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے اور ان سے میں سخت انتقام لوں گا۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿۱۰﴾ وَذَرْنِيْ وَ
الْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿۱۱﴾ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ﴿۱۲﴾ وَّ
طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ
الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿۱۴﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ
اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾
فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴿۱۷﴾ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ۚ كَانَ
وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾

"اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔ ان جھٹلانے والے خوشحال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو اور انہیں ذرا کچھ دیر اسی حالت پر رہنے دو۔ ہمارے پاس (ان کے لیے) بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب"۔ یہ اس دن ہو گا جب زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑوں کا حال ایسا ہو جائے گا جیسے ریت کے ڈھیر ہیں جو بکھرے جا رہے ہیں۔

تم لوگوں کے پاس ہم نے اسی طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔ (پھر دیکھ لو جب) فرعون نے اس رسول کی بات نہ مانی تو ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہو گا؟ اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہتا ہے"۔

اگر یہ روایت صحیح ہو کہ اس سورت کی ابتدائی آیات آغاز بعثت میں نازل ہوئیں تو پھر یہ دوسرا حصہ یقیناً قدرے بعد کے زمانے میں نازل ہوا' جبکہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علانیہ دعوت کا آغاز کر دیا تھا اور مکذبین اور تحریک کے کارکنوں پر دست درازیاں کرنے والے میدان میں آگئے تھے اور یہ لوگ رسول اللہ اور اہل اسلام کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ اور اگر دوسری روایت درست ہو تو پھر پہلا حصہ بھی اس وقت نازل ہوا جب حضور اکرم ﷺ کو

مشرکین اور مکذبین نے دکھ دینا شروع کر دیا اور یہ لوگ دعوت اسلامی کا راستہ روکنے کے لیے سرگرم تھے۔

بہرحال جو صورت بھی ہو' قیام اللیل اور ذکر و فکر کے ساتھ صبر کی تلقین کرنا (اور یہ دونوں باتیں بالعموم جمع ہوتی ہیں) تحریک اسلامی کے لیے ایک بہترین زادراہ ہے۔ اور اس راہ کی مشکلات کو صرف انہی ہتھیاروں اور تدابیر کے ذریعے برداشت کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ راہ بہت طویل اور صبر آزما ہے۔ خواہ انسانی افکار کے میدان کی کشمکش ہو یا میدان جنگ کی ضرب و حرب ہو۔ دونوں مشکل کام ہیں۔ دونوں میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (۷۳:۱۰) "جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو"۔ کیونکہ یہ لوگ اشتعال انگیز کارروائیاں کرتے تھے اور ناقابل برداشت حد تک ہٹ دھرمی کرتے تھے۔

وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا (۷۳:۱۰) "اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ"۔ نہ کوئی عتاب ہو اور نہ آپ ان پر غصہ ہوں' نہ بائیکاٹ ہو اور نہ دشمنی ہو۔ یہ تھا منصوبہ دعوت اسلامی کا پوری مکی زندگی میں۔ خصوصاً مکہ کے ابتدائی زمانے میں۔ محض قلب و ضمیر اور دل و دماغ کو اپیل کی جاتی تھی۔ نہایت نرمی سے تبلیغ کی جاتی تھی اور صرف کھول کھول کر حقائق بیان کیے جاتے تھے۔

اور ان لوگوں کی دست درازیوں اور تکذیب کا دفاع ذکر الٰہی کے بعد صبر جمیل ہی سے کیا جا سکتا تھا' اللہ نے ہر رسول کو صبر کا حکم دیا ہے' اور بار بار دیا ہے۔ پھر اللہ نے ہر رسول کے ساتھیوں اور بعد میں آنے والے مومنین کو بھی صبر کا حکم دیا ہے۔ رسولوں کے زمانوں کے بعد میں بھی جس شخص نے دعوت اسلامی کا بیڑا اٹھایا ہے' اس کا زاد راہ صبر ہی رہا ہے۔ اس کا اسلحہ اور سازوسامان صبر ہی رہا ہے۔ صبر بہترین ڈھال اور بہترین اسلحہ ہے۔ صبر ہی بہترین قلعہ اور پناہ گاہ ہے۔ یہ نفس اور اس کی خواہشات کے ساتھ جہاد ہے۔ یہ نفس کی بے راہ رویوں اور خواہشات کے خلاف جہاد ہے۔ یہ نفس کی سرکشی' جلد بازی اور مایوسی کے خلاف بھی ایک جدوجہد ہے۔ اور دعوت اسلامی کے دشمنوں' ان کی ریشہ دوانیوں اور اذیتوں کے خلاف بہترین دفاع اور ہتھیار ہے۔ اور یہ بالعموم نفس انسانی کے خلاف بھی ہتھیار ہے۔ یہ نفس بالعموم دعوت اسلامی کی تکالیف اور ذمہ داریوں سے جان چھڑانے کی تدابیر کرتا ہے۔ نفس انسانی مختلف رنگوں اور لباسوں میں اس دعوت کی ذمہ داریوں سے جان چھڑانا چاہتا ہے اور سیدھی راہ پر چلنا نہیں چاہتا۔ اور داعی کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ ان تمام باتوں پر صبر کرے۔ اور ذکر و صبر دونوں ایک ساتھ چلتے ہیں۔ ہر موقعہ پر جہاں صبر کرنا ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی یاد کے ساتھ ہی ممکن ہے۔

اور اے پیغمبر یہ لوگ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں اس پر صبر جمیل اختیار کرو اور ان کو نہایت ہی شریفانہ انداز میں چھوڑ دو' ان مکذبین کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں ان کا انتظام خود کر لوں گا۔

وَذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِیْلًا (۷۳:۱۱) "ان جھٹلانے والے خوشحال لوگوں سے نمٹنے کے لیے تم مجھے چھوڑ دو اور انہیں ذرا کچھ دیر اسی حالت میں رہنے دو"۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ہمیشہ جبار و قہار اور مضبوط قوت والے کہا کرتے ہیں۔ یہ جھٹلانے والے تو ابن آدم میں سے ہیں اور دھمکی دینے والی ذات وہ

ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور جس ذات نے اس عظیم اور وسیع کائنات کو پیدا کیا ہے اس نے اس تمام جہاں کو صرف لفظ کن کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

مجھے ذرا چھوڑ دو کہ میں ان مکذبین کے کام سے نمٹ لوں' یہ دعوت تو میری دعوت ہے' تمہارے ذمہ تو صرف تبلیغ ہے۔ انہیں جھٹلانے دو اور تم ان کو شریفانہ انداز میں چھوڑ دو۔ ان کے ساتھ جنگ میں خود کروں گا۔ تم اس کے بارے میں پریشان نہ ہو۔

اور یہ تو پیس کر رکھ دینے والی ایک تباہی ہوگی' جب اللہ جبار و قہار کی ذات ان کی طرف متوجہ ہو جائے گی تو ان کی قوت کو ہلا کر رکھ دے گی اور یہ پاش پاش ہو جائیں گے اور یہ لوگ جو اپنے آپ کو "صاحبان نعمت" سمجھتے ہیں نیست و نابود ہوں گے۔

وَ مَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا (۷۳: ۱۱) اگر پوری دنیا کی زندگی کی مہلت بھی ان کو دے دی جائے تو بھی یہ ایک وقت قلیل ہے۔ اللہ کے حساب میں تو یہ ایک دن کا بھی ایک حصہ ہے۔ اور خود ان لوگوں کے اندازے کے مطابق بھی پوری زندگی ساعت قلیل ہے۔ قیامت میں یہ خود بھی یہی اندازہ کریں گے کہ ہم ایک دن یا دن کا کوئی حصہ ہی دنیا میں رہے ہیں۔ بہرحال بظاہر کفار کو مہلت جس قدر لمبی دے دی جائے وہ قلیل ہی ہے۔ اگر اس دنیا میں ان پر اللہ کی گرفت نہ آئی تو قیامت بہت ہی قریب ہے۔

اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّ جَحِيْمًا (۱۲) وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّ عَذَابًا اَلِيْمًا (۷۳: ۱۳)

"ہمارے پاس بھاری بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ' اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے"۔

انکال کے معنی بیڑیاں ہیں۔ جحیم جہنم ہے اور طعام ذاغصہ' وہ جو اس قدر پھنسنے والا ہے جو حلق کو توڑ دے اور یہ صاحبان نعمت کے لیے مناسب جزاء ہے۔ جنہوں نے نعمتوں کی کوئی رعایت نہیں کی اور نہ نعمتوں کا شکر ادا کیا۔ اے محمد ﷺ صبر کرو' صبر جمیل کرو' اور ان سے نمٹنے کا کام ہمارے ذمہ چھوڑ دو۔ ہمارے پاس ان کے لیے بہت کچھ سامان ہے۔ پہلے بڑی بڑی بیڑیاں ہیں جو ان کے لیے باعث اذیت ہوں گی' اور پھر جہنم ہے جو انہیں خوب تپائے گی اور گرمائے گی۔ پھر ان کے لیے ایک ایسا کھانا ہے جو حلق میں پھنس کر اسے زخمی کر دے گا۔ اور پھر مزید یہ کہ سخت عذاب ہو گا اور یہ عذاب ان کو ایک خوفناک دن میں دیا جائے گا۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ وَ كَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا (۷۳: ۱۴) "یہ اس دن ہو گا جب زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑوں کا حال ایسا ہو جائے گا جیسے ریت کے ڈھیر بکھرے جا رہے ہیں"۔

یہ ہے اس دن کی ہولناکی' اس کی زد میں یہ وسیع زمین بھی آرہی ہے۔ یہ زمین لرز رہی ہے' ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے' یہ انسان تو نہایت ہی کمزور اور حقیر ہیں۔ بڑے بڑے کرات ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

اب رخ ذرا ان صاحبان نعمت کی طرف ہوتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ فرعون بڑا جبار تھا' لیکن اس کا جو انجام ہوا وہ تمہارے سامنے ہے۔ قیامت کا ہول تو تم نے دیکھ لیا ذرا فرعون کے اس دنیاوی انجام کو بھی دیکھ لو۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (۱۵)

فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا (۷۳:۱۶) ”ہم نے تمہارے پاس اسی طرح ایک رسول بھیجا ہے' جس طرح ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا' فرعون نے اس رسول کی بات نہ مانی تو ہم نے اسے بڑی سختی سے پکڑ لیا“۔ یوں اختصار کے ساتھ ان کے دلوں کے اندر زلزلہ پیدا کیا جاتا ہے اور ان کو اپنے سخت موقف سے اکھارنے کی سعی کی جاتی ہے جبکہ اس سے قبل پہاڑ کے زلزلہ اور ریزہ ریزہ کر دینے کا منظر گزر گیا ہے۔ وہ ہے آخرت کا عذاب اور پکڑ اور یہ ہے دنیاوی پکڑ۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں جو پکڑ بھی ہو تم اس سے کیسے بچ سکتے ہو؟ خصوصاً قیامت کی پکڑ تو اس قدر شدید ہوگی :

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا (۷۳:۱۷) ۨالسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ

بِهٖ (۷۳:۱۸) ”اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہو گا؟“ یہ اس قدر ہولناک صورت حالات ہوگی کہ آسمان پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گا' اس سے قبل زمین پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہوگی اور پھر جب اس دن جو بچے بھی ہوں گے وہ غم کے مارے بوڑھے ہو جائیں گے۔ یہ ہولناکی اب انسانی ذات کے اندر آ جاتی ہے۔ زندہ انسانوں کی حالت کیا ہوگی؟ یہ لڑکے بھی بوڑھے ہو جائیں گے اور لوگوں کے احساس کو اس طرف پھیرا جاتا ہے اور پھر بطور تاکید کہا جاتا ہے کہ ایسا ضرور ہو گا۔

كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا (۷۳:۱۸) ”اللہ کا وعدہ پورا ہو کر ہی رہتا ہے“۔ یہ ایک واقعہ ہو گا' کیونکہ یہ اللہ کی مشیت ہوگی اور اللہ کی مشیت کے مطابق واقعات رونما ہوتے ہیں۔

یہ ہولناکی جو زمین کے لرزہ' قیام قیامت اور نفس انسانی کی خوفزدگی کی شکل میں سامنے آئی' اس کے بعد اب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟ ۱

۱۹ ع اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۟ؒ

۱۳ ”یہ ایک نصیحت ہے' اب جس کا جی چاہے' اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے“۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی طرف جانے کا راستہ بہت ہی آسان ہے۔ ان راستوں کے مقابلے میں جو مشکوک ہیں' جو ہولناک اور خوفناک ہیں کیونکہ وہ راہ مستقیم ہے۔

یہاں ایک طرف تو اسلام کے ہٹ دھرم مکذبین کے دلوں کے اندر خوف اور زلزلہ پیدا کیا گیا' دوسری جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک اور ضعیف اور قلیل اہل ایمان کی ڈھارس بندھائی گئی ہے کہ اطمینان رکھو اور یقین کرو' تمہارا رب تمہارے ساتھ ہے' وہ تمہارے اعدا سے خود نمٹ لے گا۔ بس ان کے لیے ایک قلیل مہلت مقرر ہے' یہ ایک معلوم وقت ہے۔ اس کے بعد حق و باطل کا فیصلہ ہو گا' جب اس فیصلے کا وقت آ جائے گا چاہے

اس دنیا میں ہو یا آخرت میں اور اللہ پھر اپنے دشمنوں سے انتقام لے گا۔ ان کو فرعون کی طرح غرق کر دے گا یا قیامت میں بیڑیاں پہنا کر عذاب جہنم میں تپائے گا اور سخت عذاب ہو گا۔ یاد رکھو کہ اللہ اپنے دوستوں کو بے یارومددگار نہیں چھوڑتا اور اگر دشمنوں کو مہلت دیتا ہے تو وہ بھی ایک وقت تک دیتا ہے۔

اب سورت کا دوسرا حصہ آتا ہے اور یہ پورا حصہ ایک طویل آیت کی صورت میں ہے۔ روایات کے مطابق سورت کے پہلے حصے کے پورے ایک سال بعد نازل ہوا ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ
مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ ۙ وَآخَرُونَ
يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ
قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَ ٢
أَعْظَمَ أَجْرًا ۚ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٠﴾ اع

١٣

"اے نبی، تمہارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو، اور تمہارے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ یہ عمل کرتا ہے۔ اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے، اسے معلوم ہے کہ تم لوگ اوقات کا ٹھیک شمار نہیں کر سکتے، لہٰذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو، پڑھ لیا کرو۔ اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں، اور کچھ اور لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس جتنا قرآن بآسانی پڑھا جا سکے، پڑھ لیا کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو۔ جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے، وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔ اللہ سے مغفرت مانگتے رہو، بے شک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔"

یہ ایک خوبصورت رعایت ہے۔ اس پر مشقت، واماندہ اور تھکے ہارے شخص کے لیے خوشخبری کہ چلو چھٹی مل گئی۔ اللہ کی طرف سے نبی اور مومنین کے لیے نہایت ہی مناسب تخفیف اور چھوٹ کا اعلان ہے۔ اللہ کو معلوم تھا کہ وہ مخلص ہیں اور وہ نہایت تندہی سے احکام بجا لا رہے ہیں۔ رات کے طویل قیام کی وجہ سے ان کے پاؤں پھول گئے ہیں اور رات کا بڑا حصہ تلاوت قرآن اور نماز میں بسر ہو رہا ہے۔ اللہ کا مقصد یہ نہ تھا کہ قرآن کے ذریعہ لوگوں کو مشقت میں ڈال دیا

جائے بلکہ مقصد یہ تھا کہ جو عظیم ذمہ داری نبی اور مسلمانوں پر عائد ہو رہی ہے' اس کے لیے ان کو تیار کیا جائے ۔ اور یہ ذمہ داری چونکہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں اداکرنی تھی اس لیے ان کے لیے اس ٹریننگ کا انتظام ضروری تھا۔

یہاں جس انداز میں بات کی گئی ہے' وہ نہایت ہی اطمینان بخش ہے ۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ (۷۳: ۲۰) "اے نبی تمہارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو اور تمہارے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ بھی"۔ اللہ نے تمہارا قیام اللیل دیکھ لیا۔ اور تمہارے ساتھیوں کو بھی دیکھ لیا۔ اور اللہ نے تمہاری اس عبادت کو قبول کر لیا ہے ۔ اللہ نے جان لیا کہ تمہارے اور ان کے پہلو گرم و نرم بستروں سے علیحدہ ہوتے ہیں ۔ تم لوگوں نے ان نرم بستروں کی پکار کو نہ سنا اور اللہ کی پکار کو سنا ۔ اب اللہ تم پر مہربانی فرماتا ہے ۔ اور تم پر اور تمہارے ساتھیوں پر قدرے تخفیف فرماتا ہے ۔

وَ اللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ (۷۳: ۲۰) "اور اللہ رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے"۔ یوں کہ کبھی رات زیادہ لمبی ہوتی ہے اور کبھی دن ۔ اور تم اور تمہارے ساتھی رات کی ایک تہائی 'نصف رات یا دو تہائی رات عبادت کرتے رہتے ہو ۔ پھر اللہ تمہاری طاقت کی حدود سے بھی واقف ہے ۔ اور اللہ کا مقصد تمہیں تھکانا اور عذاب دینا نہیں ہے ۔ اللہ تو تمہیں ایک مقصد کے لیے تیار کر رہا ہے ۔ جب تم تیار ہو گئے تو پھر تخفیف کر دی تو تم بھی اپنے نفوس پر تخفیف کرو' اور اب اس کام پر اس قدر سختی نہ کرو۔

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (۷۳: ۲۰) "اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو' پڑھ لیا کرو"۔ یعنی رات کے وقت نماز میں ۔ لیکن اپنے آپ کو مشقت اور تنگی میں نہ ڈالو۔ اور یہاں بعض امور ایسے بھی بتا دیئے جاتے ہیں جن میں مستقبل میں اہل اسلام نے مشغول ہونا تھا اور ان ڈیوٹیوں کے ساتھ قیام اللیل ذرا زیادہ مشکل تھا۔

عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى (۷۳: ۲۰) "اسے معلوم تھا کہ تم میں سے کچھ مریض ہوں گے"۔ ان پر قیام اللیل کا فریضہ پر مشقت ہو گا۔

وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (۷۳: ۲۰) "کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کے تلاش میں سفر کرتے ہیں"۔ یعنی تلاش معاش میں سفر اور سفر کی مشقتیں ۔ کیوں کہ معاشی جدوجہد بھی ضروریات زندگی میں سے ہے ۔ اللہ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم دنیا کی زندگی کی ضروریات کے لیے جدوجہد ترک کرو اور رھبان بن جاؤ۔

وَ اٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (۷۳: ۲۰) "کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے"۔ اللہ کو علم تھا کہ عنقریب وہ ظلم کے مقابلے میں جہاد کی اجازت دے دے گا' اسلام کے جھنڈے بلند ہوں گے اور باغیوں کا مقابلہ کیا جائے گا۔ لہٰذا اس مقابلے کے لیے اب یہ تخفیف کی جاتی ہے۔ اب بغیر مشقت کے جس قدر ممکن ہو پڑھو۔

فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْہُ (۷۳: ۲۰) "لہٰذا قرآن سے جس قدر تم آسانی سے پڑھ سکتے ہو' پڑھ لو"۔ بغیر مشقت اور تنگی کے۔ اور باقی دینی فرائض پر پوری طرح جم جاؤ۔

وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (۷۳: ۲۰) "اور نماز پڑھو اور زکوۃ دو"۔ اور اس کے بعد قرض حسن بھی دو۔

وَ اَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ عِنْدَ اللّٰہِ ھُوَ خَیْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا (۷۳: ۲۰) "اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو۔ جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے' وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے"۔ اور اللہ کی طرف اس طرح متوجہ ہوتے جاؤ کہ استغفار کرتے رہو' اپنی تقصیرات کی معافی چاہو' انسان سے قصور سرزد ہوتے ہیں' وہ خطا کا ارتکاب کرتا ہے۔ اگرچہ وہ کوشش کرے اور درست افعال کرنے کی سعی کرے۔

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۷۳: ۲۰) "اور اللہ سے مغفرت مانگو اللہ غفور و رحیم ہے"۔ یہ رحمت' شفقت اور تیسیر کی ایک چٹکی ہے اور ایک سال قیام کے بعد اب یہ سہولت نازل ہوتی ہے۔ اللہ نے مسلمانوں پر یہ تخفیف فرمائی ہے۔ اب قیام اللیل نفلی ہو گیا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر بھی اپنی روش ہی پر قائم رہے۔ ثلث اللیل سے آپ کا قیام اللیل کبھی کم نہ ہوا۔ یہ اللہ کے ساتھ مناجات تھی۔ رات کی تنہائیوں میں' دنیا کے شور و شغب سے دور۔ یوں آپ اس مناجات سے زاد راہ لیتے رہے۔ اور پوری زندگی میں یہ جدوجہد جاری رہی۔ لیکن سوتے میں بھی آپ کی آنکھیں بند ہو جاتیں تو آپ کا دل بیدار ہی رہتا تھا۔ آپ کا قلب مبارک ہر وقت اللہ کو یاد کرتا رہتا تھا۔ آپ ہر وقت سوتے یا جاگتے اللہ کے ساتھ جڑے رہتے تھے۔ غرض آپ دنیا کی تمام آلودگیوں سے علیحدہ ہو کر رب کے ہو گئے تھے۔ اور اس راہ میں جس قدر بوجھ آپ برداشت کر سکتے تھے۔ آپ نے برداشت کیا۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۲۹

سورۃ المدثر۔ ۷۴

۱ -- تا -- ۵۶

سورۃ المدثر ایک نظر میں

سورۃ مزمل کے مقدمہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس سورت کے سبب نزول اور وقت نزول کو بھی متعین کرتا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ سورت بھی علق کے بعد نازل ہونے والی پہلی سورت ہے اور بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ علانیہ دعوت شروع ہونے کے بعد نازل ہوئی۔ اس وقت جب مشرکین نے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ایذائیں دینا شروع کر دی تھیں۔

امام بخاری نے روایت کی 'یحییٰ ابن کثیر سے 'انہوں نے وکیع سے 'انہوں نے علی ابن مبارک سے 'انہوں نے یحییٰ ابن ابوکثیر سے 'انہوں نے فرمایا: میں نے ابوسلمہ ابن عبدالرحمن سے پوچھا کہ قرآن مجید میں سب سے پہلے کیا نازل ہوا تو انہوں نے کہا

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (٧٤ : ١) میں نے کہا لوگ کہتے ہیں۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (٩٦ : ١) پہلے نازل ہوئی تو ابوسلمہ نے کہا: میں نے یہ سوال جابر بن عبداللہ سے کیا تھا اور میں نے ان سے یہی کہا جو تم نے مجھے کہا۔ تو جابرؓ نے فرمایا میں تمہیں صرف وہی بات بتاؤں گا جو مجھے رسول اللہ ﷺ نے بتائی۔ آپ نے فرمایا: "میں نے حرا میں تنہائی اختیار کی جب میں نے اپنا وقت پورا کر دیا 'تو نیچے اترا' تو مجھے ایک آواز دی گئی تو میں نے اپنے دائیں طرف دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا' میں نے شمال کی طرف دیکھا تو بھی کچھ نظر نہ آیا' آگے کو دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا' پیچھے کو دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا تو ایک چیز دیکھ لی۔ اس کے بعد میں خدیجہ رضی کے پاس آیا اور کہا "مجھے کچھ اوڑھا دو اور مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈالو"۔ آپ نے فرمایا: چنانچہ انہوں نے مجھ پر کچھ ڈالا اور مجھ پر ٹھنڈا پانی بھی ڈالا اور اس کے بعد مجھ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (٧٤ : ١) قُمْ فَاَنْذِرْ (٧٤ : ٢) وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ (٧٤ : ٣) (٧٤ : ١ تا ٣) اس روایت کو امام مسلم نے عقیل سے 'انہوں نے ابن شہاب سے 'انہوں نے ابوسلمہ سے نقل کیا ہے۔ ابوسلمہ نے کہا مجھے جابر ابن عبداللہ نے بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو 'وحی رک جانے کے واقعہ کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا۔ (آپؐ نے اپنی بات میں فرمایا) کہ میں جا رہا تھا کہ میں نے آسمان سے آواز سنی۔ میں نے اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو حرا میں میرے پاس آیا تھا' زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ میں اس سے اس قدر گھبرایا کہ میں زمین کی طرف جھک گیا۔ میں گھر والوں کے پاس آیا۔ میں نے کہا مجھے کچھ اوڑھاؤ' تو انہوں نے مجھے اوڑھایا۔ اس کے بعد اللہ نے یہ آیات نازل کیں۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (١) قُمْ فَاَنْذِرْ (٢) وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ (٣) وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (٤)

وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ (٥) (٧٤ : ١ تا ٥) تک۔ ابو سلمہ کہتے ہیں رجز سے مراد بت ہیں۔ یہاں تک کہ وحی کے نزول میں گرمی آگئی اور پے در پے نازل ہونے لگی۔

اس حدیث پر ابن کثیر نے یہ تبصرہ کیا کہ اس کا سیاق محفوظ ہے اور اس حدیث کے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے قبل وحی نازل ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس حدیث میں ہے "پس کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو میرے پاس حرا میں آیا تھا"۔ یہ جبریل امین تھے اور غار حرا میں آیات۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ (١) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (٢) اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ

الْاَكْرَمُ (٣) الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (٤) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (٥) (٩٦ : ١ تا ٥)

لے کر آئے تھے اور اس کے بعد کچھ عرصہ کے لیے وحی رک گئی تھی اور اس وقفے کے بعد یہ فرشتہ دوبارہ آیا تھا۔ اور دونوں احادیث کے درمیان تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ فترۃ الوحی کے بعد یہ سورت نازل ہوئی۔

یہ ہے ایک روایت 'لیکن ایک دوسری روایت بھی ہے۔ طبرانی نے روایت کی ہے' محمد ابن علی ابن شعیب السمار سے' انہوں نے حسن ابن بشر بجلی سے 'انہوں نے معافی ابن عمران سے 'انہوں نے ابراہیم ابن زید سے 'وہ کہتے ہیں میں نے ابوملیکہ کو یہ کہتے سنا کہ میں نے ابن عباس ﷺ سے یہ سنا کہ ولید ابن مغیرہ نے قریش کے لیے ایک دعوت ترتیب دی۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو ولید نے کہا تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو تو بعض نے کہا جادوگر ہے۔ بعض نے کہا جادوگر نہیں ہے۔ بعض نے کہا کاہن ہے اور بعض نے کہا کاہن نہیں ہے۔ بعض نے کہا شاعر ہے اور بعض نے کہا نہیں۔ بعض نے کہا یہ ایسا پرانا جادوگر یا موثر جادوگر ہے تو ان کی رائے اس پر بیٹھ گئی کہ یہ پرانا جادو ہے۔ ان لوگوں کا یہ تبصرہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا تو آپ بہت ہی متفکر ہوئے۔ آپ نے اپنا سر جھکایا اور اپنے اوپر کپڑا اوڑھ لیا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (١) قُمْ فَاَنْذِرْ (٢) وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ (٣) وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (٤)

وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ (٥) وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (٦) وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (٧) (٧٤ : ١ تا ٥) یہ وہی روایت معلوم ہوتی ہے جو سورہ مزمل کے بارے میں نقل ہوئی۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دونوں میں سے کون سی سورت پہلے نازل ہوئی اور یہ روایت کس سورت کے بارے میں ہے۔

ہاں سورت کے نفس مضمون اور داخلی شہادت کا تقاضا یہ ہے کہ سورت کی ابتدائی آیات۔ وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (٧٤ : ٧) تک 'ممکن ہے کہ دعوت اسلامی کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوں جس طرح سورہ مزمل کی ابتدائی آیات۔

وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (٨) رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا (٧٣ : ٩) اور یہ دونوں ہدایات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس عظیم بوجھ کے اٹھانے کے لیے

تیار کرنے کے لیے دی گئی ہوں اور اس مرحلے کی تیاری کے لیے دی گئی ہوں کہ اب حضور ﷺ نے علانیہ دعوت کے مرحلے میں داخل ہونا تھا اور قریش کے سامنے پوری دعوت پیش کرنا تھی جس کے نتیجے میں آپ کو کئی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا تھا۔ اور آنے والی مشکلات کے لیے نفسیاتی اور نظریاتی تیاری کی ضرورت تھی۔ اور ان دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات کے بعد والی آیات ایک مناسب وقفے کے بعد اس وقت نازل ہوئی ہوں جب قوم نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھٹلا دیا تھا' اور آپ کی دشمنی میں کھل کر آ گئے تھے اور مسلمانوں اور آپ کو ہر قسم کی ایذا دینے لگے تھے۔ آپ کے خلاف جھوٹے الزامات کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ اور نہایت ہی گھٹیا ہتھیار استعمال کر رہے تھے۔

بہرحال یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات سورتوں کے آخری حصوں کے ساتھ ہی اس وقت نازل ہوئی ہوں۔ جب کفار مکہ نے آپ کی تکذیب کر دی تھی اور وہ سازشیں' تبصرے اور پروپیگنڈے شروع کر دیئے تھے جن کا ذکر ہوا اور ان سے حضور مغموم ہو کر اور کچھ اوڑھ کر لیٹ گئے ہوں اور یہی صورت سورہ قلم کی بھی ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا۔

بہرحال اس سورت کا شان نزول اور وقت نزول جو بھی ہو' اس کے آغاز میں عالم بالا نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ وہ بھاری ذمہ داری عائد کی ہے جس نے آپ کی نیند حرام کر دی' آپ کے آرام اور بے فکری کے دن جاتے رہے۔ اور آپ نے اس مسلسل جدوجہد اور جہاد فی سبیل للہ کا آغاز کر دیا جو آپ نے اپنی پوری زندگی میں جاری رکھا۔

يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (١) قُمْ فَاَنْذِرْ (٧٤ : ٢) "اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے' اٹھو اور خبردار کرو"۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت دی کہ اس عظیم امر کے لیے تیاری کرو' اور اس کام میں درج ذیل امور سے مدد حاصل کریں۔

وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ (٣) وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (٤) وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (٥) وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (٦) وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (٧) (٧٤ : ٣ تا ٧) "اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو' اور اپنے کپڑے پاک رکھو' اور گندگی سے دور رہو۔ اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو"۔ یہاں ہدایات کا خاتمہ صبر پر ہوتا ہے جس طرح سورت المزمل میں کہا گیا تھا۔

اس کے بعد اس سورہ میں قیامت کے منکرین کو سخت تہدید کی جاتی ہے کہ ان کے ساتھ جنگ صرف اللہ ہی کی ہے۔ جس طرح سورہ المزمل میں بھی یہی مضمون آیا تھا۔

فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ (٨) فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ (٩) عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ (١٠) ذَرْنِيْ وَ مَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا (١١) وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا (١٢) وَّ بَنِيْنَ شُهُوْدًا (١٣) وَّ مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا (١٤) ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ (١٥) كَلَّا اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا (١٦) سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا (١٧) (٧٤ : ٨ تا ١٧) "اچھا' جب صور میں پھونک ماری جائے گی' وہ دن بڑا ہی سخت دن ہو گا'

کافروں کے لیے ہلکا نہ ہو گا۔ چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا' بہت سا مال اس کو دیا' اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیئے' اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی' پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ ہرگز نہیں' وہ ہماری آیات سے عناد رکھتا ہے۔ میں تو اسے عنقریب ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا"۔

سورہ مدثر میں ایک خاص شخص کے اوصاف نمایاں کر کے بیان کیے گئے ہیں' اور اس کی سازشوں میں سے ایک سازش کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ اسی طرح سورہ قلم میں وارد ہوا ہے۔ شاید یہ دونوں نقشے ایک ہی شخص کے بارے میں ہوں۔ جس طرح بعض روایات میں کہا گیا کہ یہ شخص ولید ابن مغیرہ تھا۔ (روایات تشریح آیات میں آ رہی ہیں) یہاں اس کے ساتھ للہ کی جنگ کی وجوہات بھی بیان کی جاتی ہیں۔

إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ (۱۸) فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (۱۹) ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (۲۰) ثُمَّ نَظَرَ (۲۱) ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (۲۲) ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ (۲۳) فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ (۲۴) إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۲۵) (۷۴: ۱۸ تا ۲۵) "اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی تو خدا کی مار اس پر' کیسی بنات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں' خدا کی مار اس پر' کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا۔ پھر پیشانی سیکڑی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آ رہا ہے' یہ تو ایک انسانی کلام ہے"۔ اس کے بعد اسی شخص کے انجام کا ذکر ہے۔

سَأُصْلِيهِ سَقَرَ (۲۶) وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ (۲۷) لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ (۲۸) لَوَّاحَةٌ لِلْبَشَرِ (۲۹) عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (۳۰) (۷۴: ۲۶ تا ۳۰) "عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ؟ نہ باقی رکھے نہ چھوڑے۔ کھال جھلس دینے والی۔ انیس کارکن اس پر مقرر ہیں"۔

جہنم کے منظر اور اس کے انیس داروغوں کے ذکر پر مکہ میں ایک شور سا مچ گیا۔ ہر طرف سے شک کا اظہار ہونے لگا اور سوالات اٹھائے گئے اور مزاح ہونے لگا۔ اس سے ضعیف الایمان لوگ بھی متاثر ہوئے اور مشرکین کے اندر چرچا بھی ہوا۔ چنانچہ یہاں انیس کے عدد کی تفسیر اور توجیہہ بھی کر دی گئی کہ انیس فرشتے کیوں مقرر ہیں۔ اس کے بعد عالم غیب کی جانب ایک دریچہ کھولا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ غیب للہ کا خاصہ ہے۔ اس دریچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تصور حیات میں للہ کے خفیہ جہانوں اور غیبوں کے بارے میں کیا احکام ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ

اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا

هُوَ وَ مَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ (۷۴: ۳۱) "ہم نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے بنائے ہیں' اور ان کی تعداد کو کافروں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے' تاکہ اہل کتاب کو یقین آجائے اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے' اور اہل کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں' اور دل کے بیمار اور کفار یہ کہیں کہ بھلا اللہ کا اس عجیب بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اس طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے' ہدایت بخش دیتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اس کے سوا کوئی نہیں جانتا --- اور اس دوزخ کا ذکر اس کے سوا کسی غرض کے لیے نہیں کیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو"۔

آخرت اور دوزخ اور اس کے کارکن فرشتوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ کچھ مناظر قدرت بھی دیئے جاتے ہیں' جو ہماری نظروں کے ہر وقت سامنے ہیں تاکہ یاد دہانی اور ڈراوے کے موقعہ پر دلوں پر اچھا اثر ہو۔

كَلَّا وَ الْقَمَرِ (۳۲) وَ الَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ (۳۳) وَ الصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ (۳۴) اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ (۳۵) نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ (۳۶) لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ

يَتَاَخَّرَ (۳۷) (۷۴: ۳۲ تا ۳۷) "ہرگز نہیں' قسم ہے چاند کی' اور رات کی جبکہ وہ پلٹتی ہے اور صبح کی جبکہ وہ روشن ہوتی ہے' یہ دوزخ بھی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے' انسانوں کے لیے ڈراوا۔ تم میں سے ہر اس شخص کے لیے ڈراوا جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے"۔

اس کے بعد پھر مجرموں اور نیکوں کا مقام بھی بتایا جاتا ہے۔ یعنی دائیں بازو والوں اور بائیں بازو والوں کا۔ جہاں مکذبین صاف صاف اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اس قدر قید و بند اور سزا کے مستحق ہیں جس کا فیصلہ ان کے حق میں ہوا ہے' اور اس کے بعد فیصلہ کن انداز میں بتا دیا جاتا ہے کہ اب کسی سفارش کرنے والے کی سفارش ان کو کوئی فائدہ نہ دے گی۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (۳۸) اِلَّا اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ (۳۹) فِيْ جَنّٰتٍ يَتَسَآءَلُوْنَ (۴۰) عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ (۴۱) مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ (۴۲) قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (۴۳) وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ (۴۴) وَ كُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ (۴۵) وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۴۶) حَتّٰى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ (۴۷) فَمَا

تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (۴۸) (۷۴: ۳۸ تا ۴۸) "ہر شخص اپنے کسب کے بدلے رہن ہے۔ دائیں بازو والوں کے سوا' جو جنتوں میں ہوں گی' وہ مجرموں سے پوچھیں گے "تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟" وہ کہیں گے "ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے' اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے' اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل

کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے' اور روز جزاء کو جھوٹ قرار دیتے تھے' یہاں تک کہ ہمیں اس یقینی چیز سے سابقہ پیش آگیا۔ اس وقت سفارش کرنے والوں کی کوئی سفارش ان کے کسی کام نہ آئے گی۔

اس شرمسار کنندہ موقف اور اس توہین آمیز اقرار کی فضا میں سرزنش کے انداز میں پوچھا جاتا ہے کہ دعوت اسلامی کے خلاف انہوں نے یہ موقف کیوں اختیار کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہ دعوت نصیحت اور نجات کی دعوت ہے' جس کو قبول کر کے وہ برے انجام سے بچ سکتے ہیں۔

چنانچہ ان کی تصویر کشی ایک نہایت ہی مضحکہ خیز انداز میں پیش کی جاتی ہے کہ یہ اس قدر نفرت کرتے ہیں جس طرح جانور شیروں سے نفرت کرتے ہیں۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ (٤٩) كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ (٥٠) فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (٥١) (٧٤: ٤٩ تا ٥١) آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں' گویا یہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں"۔

اب بتایا جاتا ہے کہ وہ کس غرور میں مبتلا ہیں' جو ان کو اس نصیحت آموز دعوت کے قبول کرنے سے روکتا ہے۔

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (٧٤: ٥٢) "بلکہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کے نام کھلے خط بھیجے جائیں"۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ ہر ایک کے نام الگ خط اور صحیفہ آئے۔ اور اس سے بھی گہرا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کے اندر خدا خوفی نہیں ہے۔

كَلَّا بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ (٧٤: ٥٢) "ہرگز نہیں اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے"۔

آخر میں ایک فیصلہ کن قرارداد۔

كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ (٥٤) فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (٧٤: ٥٥) "ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے' اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کرے"۔ اور نصیحت حاصل کرنے یا نہ کرنے کا معاملہ بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ (٧٤: ٥٦)

"اور یہ کوئی سبق حاصل نہ کریں گے الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ وہ اس کا حقدار ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے اور وہ اس کا اہل ہے کہ (تقویٰ کرنے والوں کو) بخش دے"۔

یوں قرآن مجید نے قریش کے ذہنوں سے جاہلیت کے عقائد و تصورات نکالنے کے لیے یہ سخت جدوجہد کی اور قریش کے بغض و عناد کا مقابلہ کیا۔ جو انہوں نے عمداً اسلامی تحریک کے خلاف روا رکھا ہوا تھا اور وہ مختلف طریقوں سے قصداً ایسا کر رہے تھے۔ اس سورت اور سورہ مزمل کے درمیان کئی یکسانیاں بھی ہیں اور سورہ قلم بھی انہی جیسی ہے۔ چونکہ ان تینوں سورتوں کا رخ ایک ہی طرف ہے اس لیے ممکن ہے کہ یہ تھوڑے تھوڑے وقفے کی بعد نازل ہوئی ہوں اور ایک جیسے

حالات میں نازل ہوئی ہوں۔ ہاں سورہ مزمل کا دوسرا حصہ جو حضور اکرم ﷺ اور آپ کے بعض ساتھیوں کی جسمانی اور روحانی ریاضت اور عبادت کے بارے میں نازل ہوا' وہ بعد میں نازل ہوا۔

اس سورت کی آیات مختصر' تیز رفتار اور مختلف القافیہ ہیں۔ کبھی اس میں ٹھہراؤ ہے اور کبھی تیز رفتار بہاؤ ہے۔ خصوصاً ایک مکذب کی تصویر کشی کے وقت' خصوصاً جبکہ وہ سوچتا ہے اور بات کا اندازہ کرتا ہے۔ تیوری چڑھاتا ہے اور منہ بناتا ہے۔ اور دوزخ کا منظر۔

لَا تُبْقِىْ وَلَا تَذَرُ (٢٨) لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (٧٤: ٢٩) اور ان کے بھاگنے کا منظر حمر' مستنفرہ' فرت' قسورۃ' قافیے اور زیروبم کے اس تنوع کی وجہ سے اور مناظر اور سایوں کی بوقلمونی کی وجہ سے اس سورت کے اندر ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض قافیوں کو ختم کر کے دوبارہ شروع کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً راء ساکنہ 'المدثر' انذر' فکبر اور اس کا ترک اور دوبارہ آجانا' قدر' بسر' استکبر' سقر' نیز ایک قافیہ سے دوسرے قافیہ کی طرف چلا جانا اور ایک ہی فقرے میں' خصوصی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے' مثلاً۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ (٤٩) كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ (٥٠) فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (٥١) (٧٤: ٤٩ تا ٥١) پہلی آیت میں سوال ہے اور یہ سوال استنکاری ہے۔ دوسری اور تیسری آیت میں تصویر کشی اور مزاح ہے۔ اب آیات پر تفصیلی بحث۔

--- ○○○---

درس نمبر ۲۷۴ تشریح آیات

۱۔۔تا۔۔۵۶

سُورَةُ الْمُدَّثِّرِ مَكِّيَّةٌ آیاتها ۵۶ رکوعاتها ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو، اور اپنے کپڑے پاک رکھو، اور گندگی سے دور رہو۔ اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو"۔

یہ عالم بالا کی بہت ہی اہم آواز ہے۔ اور اس نہایت ہی اہم معاملے کے بارے میں ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ انسانوں کو ڈرانا ہے، ان کو جگانا اور بیدار کرنا ہے اور دنیا میں ان کو شر و فساد سے بچانا ہے اور آخرت میں آگ سے بچانا ہے۔ اور وقت ختم ہونے سے قبل ہی نجات کا طریقہ اور امتحان میں کامیابی کی حکمت بتانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت ہی بڑی ذمہ داری ہے خصوصاً جبکہ یہ ذمہ داری ایک فرد بشر کے کاندھوں پر ڈال دی جائے۔ اگرچہ یہ فرد و بشر نبی اور رسول ہو کیونکہ انسان اس قدر گمراہ، سرکش، باغی، نافرمان، معاند، کج رو اور اپنے رویہ پر اصرار کرنے والا ہے کہ کسی انسان کے لیے اس کی اصلاح کا کام بہت ہی مشکل کام ہے۔ دنیا کے مشکل سے مشکل کام کے مقابلے میں بھی یہ زیادہ مشکل تر کام ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (۱) قُمْ فَاَنْذِرْ (۷۴ : ۲) "اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو"۔ رسالت کے فرائض میں سب سے بڑا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو برے انجام سے ڈرایا جائے۔ اور ان کو متنبہ کیا جائے کہ خطرہ بہت قریب ہے۔ اور عذاب ان لوگوں کے لیے گھات میں بیٹھا ہوا ہے جو غافل ہیں اور جو بری راہوں پر سرپٹ دوڑ رہے ہیں اور ان کو خطرے کا کوئی شعور اور احساس نہیں ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کو اپنے بندوں سے کس قدر زیادہ ہمدردی ہے اور وہ کس قدر رحیم ہے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ اگر سب کے سب انسان گمراہ ہو جائیں تو وہ اللہ کی بادشاہت میں ذرہ برابر کمی نہیں کر سکتے اور اگر یہ سب کے سب ہدایت پر آ جائیں تو اللہ کی بادشاہت میں کوئی اضافہ نہیں کر

سکتے۔ لیکن یہ اللہ کا رحم و کرم ہے کہ وہ ان کو آخرت کے دردناک عذاب سے بچانے کے لیے اس قدر انتظامات کرتا ہے۔ دنیا میں لوگوں کو شر سے بچاتا ہے۔ اور رسولوں کو بھیجتا ہے کہ آؤ میں تمہیں بخش دوں اور اپنے فضل و کرم سے جنت میں داخل کر دوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ عظیم ڈیوٹی سپرد کرنے کے بعد اب آپ کی ذات کے بارے میں خصوصی ہدایات دی جاتی ہیں۔

(۱) پہلے یہ کہ اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔

وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴ : ۳) "اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو"۔ یعنی صرف اللہ وحدہ کی بڑائی کا اعلان کر دو۔ کیونکہ در حقیقت بڑا صرف اللہ ہے۔ اور صرف وہی مستحق ہے کہ اس کا نعرۂ تکبیر بلند کیا جائے۔ اس ہدایت میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات میں اللہ 'اور توحید کے مفہوم کے اندر یہ بات شامل ہے کہ اللہ وحدہ بڑا ہے۔

ہر فرد' ہر شے' ہر قدر' اور ہر حقیقت اللہ کے مقابلے میں صغیر و حقیر ہے۔ اور اللہ وحدہ کبیر اور متعال ہے۔ اللہ کے جلال کبریائی میں تمام اجرام فلکی' تمام حجم' تمام قوتیں' تمام قدریں' تمام واقعات' تمام حالات' تمام معانی اور تمام صورتیں ناپید اور غائب ہو جاتی ہیں۔ اور اللہ عظیم اور بلند اور بلند تر ہو جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ اس بلندی تصور اور علو عقیدہ کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر' دنیا کو ڈرانے اور متنبہ کرنے اور ہوشیار و خبردار کرنے کا فریضہ اپنے ذمہ لیں اور حالات اور مشکلات کا مقابلہ کریں اور اس کی سختیاں اور بوجھ برداشت کریں۔ لہٰذا اس تصور کے مقابلے میں مخالفین کی تمام سازشیں جھوٹی ہوں گی' تمام قوتیں ہیچ ہوں گی' تمام رکاوٹیں دور ہوں گی۔ اگر داعی یہ سچا تصور رکھتا ہو کہ وہ جس رب کی دعوت لے کر اٹھا ہے' وہ سب سے بڑا ہے تو اس کے سامنے کوئی مشکل کھڑی نہیں ہو سکتی۔ دعوت اسلامی کی سختیاں اور مشکلیں یہ تقاضا کرتی ہیں کہ انسان کے ذہن میں اللہ کی کبریائی اور کبریائی کا عقیدہ مستحضر ہو۔

(۲) دوسری ہدایت یہ دی جاتی ہے۔

وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (۷۴ : ۴) "اور اپنے کپڑے پاک رکھو"۔ یہ کنایہ ہے' قلبی' اخلاقی اور عملی پاکیزگی سے۔ شخصیت کی پاکیزگی' جس میں ظاہری طہارت بھی شامل ہے اور وہ تمام معاملات بھی شامل ہیں جن کا کسی نہ کسی طریقے سے ذات نبیؐ سے تعلق ہے اور روحانی اور اخلاقی پاکیزگی ہی میں انسان عالم بالا سے اشارات اخذ کر سکتا ہے۔ اور رسالت کے مزاج ہی میں پاکیزگی ہوتی ہے' اس لیے یہاں پاکیزگی کا حکم دیا گیا۔ پھر فریضہ رسالت اور لوگوں تک پیغام پہنچانے اور ان کو ڈرانے اور مختلف قسم کے لوگوں' مختلف قسم کی خواہشات اور مختلف قسم کے نشیب و فراز میں دعوت اسلامی کے کام کے لیے یہ ضروری تھا کہ آپ کا دامن ہر داغ اور دھبے سے پاک ہو۔ نیز فریضہ رسالت سپرد ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ہر قسم کے لوگوں میں جانا تھا۔ جن میں گندے لوگ بھی تھے اور غلیظ بھی۔ جو گندگی اور غلاظتوں میں ڈوبے ہوئے تھے اور آپ کو حکم یہ تھا کہ ان کی گندگیوں اور غلاظتوں میں ملوث ہوئے بغیر دعوت اسلامی کا فریضہ آپ نے سرانجام دینا ہے۔ یہ نہایت ہی اہم اور گہرا اشارہ ہے' ان تمام لوگوں کے لیے جو

دعوت اسلامی کا کام لے کر اٹھتے ہیں 'اور جو وارثین انبیاء کے مقام پر ہوتے ہیں اور جنہوں نے ہر قسم کے لوگوں کے اندر رہ کر کام کرنا ہوتا ہے۔ ہر قسم کے حالات میں کام کرنا ہوتا ہے ' ہر قسم کے معاشروں اور سوسائٹیوں میں کام کرنا ہوتا ہے۔

(۲) آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ شرک ترک کر دیں اور تمام وہ افعال ترک کر دیں جو آخرت میں عذاب کا موجب ہوں گے۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۷۴ : ۵) "اور گندگی سے دور ہو جاؤ"۔ حضور اکرم ﷺ تو پہلے سے ہر قسم کے شرک اور ان باتوں سے اجتناب کر رہے تھے جو آخرت میں عذاب کے موجب تھے اور منصب نبوت پر فائز ہونے سے پہلے ہی آپ اس ہدایت پر عمل پیرا تھے 'کیونکہ آپ نے اللہ کے حکم سے پہلے اپنی فطرت سلیمہ کے تقاضے کے مطابق ان برائیوں کو ترک کر دیا تھا۔ تمام نظریاتی 'اخلاقی ' رواجی اور عملی جاہلیت سے آپ پہلے سے مجتنب تھے۔ کسی روایت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ آپ نے کسی جاہلی رسم اور شرکیہ عمل میں شرکت کی ہو۔ پس یہ ہدایت دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ آپ ان سے دور رہیں اور یہ چیزیں اسلام سے لگا نہیں کھاتیں۔ کوئی اسلامی روش ان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے آپ کو بطور تاکید ہدایت کی گئی ہے کہ آپ ان چیزوں سے دور رہیں۔ "رجز" کے معنی عذاب کے ہوتے ہیں 'اس کے بعد اس کا اطلاق ان باتوں پر بھی ہوا جو عذاب کے اسباب تھے یعنی ان چیزوں کو چھوئیں بھی نہیں۔

(۳) یہ ہدایت بھی آپ کو دی جاتی ہے کہ نبوت کے کام سے اپنے ذاتی مفادات کو دور رکھیں اور آپ جو عظیم کام کر رہے ہیں اس پر احسان نہ جتلائیں۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۷۴ : ٦) "اور احسان نہ کرو' زیادہ حاصل کرنے کے لیے"۔ حضور اکرم ﷺ نے دعوت کی زندگی میں بہت کچھ صرف کرنا تھا 'اپنی پوری مادی اور اخلاقی اور جسمانی قوت اس راہ میں صرف کرنی تھی اور قربانیاں دینی تھیں لیکن رب تعالیٰ کا مطالبہ آپ سے یہ تھا کہ اس عظیم جدوجہد کو عظیم نہ سمجھیں اور کسی پر احسان نہ جتلائیں۔ دعوت اسلامی کی راہ میں اگر کسی کے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ میں نے بہت کچھ کیا ہے تو وہ ہرگز داعی نہیں رہ سکتا۔ اس راہ میں جدوجہد اس وقت عظمت کا رنگ لیتی ہے 'جب اسے بھلا دیا جائے ' بلکہ نفس انسانی کے اندر یہ شعور اچھی طرح بیٹھ جائے کہ اس راہ میں جو کچھ صرف ہو رہا ہے وہ اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔ اور یہ اللہ ہی ہے جس نے ہمیں اس مقصد کے لیے چنا' توفیق دی اور وسائل دیئے اور ہم اس کے اہل ہوئے۔ بس یہ اللہ کا کرم 'اس کا چناؤ اور اس کی تکریم ہے اور عزت افزائی ہے جو اس نے ہمیں اس کام کے لیے توفیق دی۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اللہ کے اس دین پر اس کا شکر ادا کریں نہ یہ کہ 'کسی پر احسان جتلائیں۔

(۵) آخر میں حضور اکرم ﷺ کو یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ جو بھی پیش آئے ' آپ صبر کریں۔

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (۷۴ : ۷) "اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو"۔ قرآن کریم میں دعوت اسلامی کے سلسلے

میں اللہ بار بار صبر کی تلقین فرماتا ہے' اور حقیقت بھی یہ ہے کہ دعوت اسلامی کی راہ میں صبر ہی اصل سازوسامان ہے۔ یہ ایک چومکھی لڑائی ہوتی ہے' ایک طرف خود اپنی خواہشات اور میلانات کے خلاف جنگ کرنا ہوتی ہے' دوسری جانب دعوت اسلامی کے دشمنوں کے خلاف جنگ کرنا ہوتی ہے۔ یہ دشمن شیطانوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور مفادات و خواہشات کے لیے لڑ رہے ہوتے ہیں۔ پھر طویل جدوجہد اور قلت وسائل اور اجر سب کا سب اخروی ہوتا ہے۔ اس دنیا کا کوئی مفاد اس جہد سے وابستہ نہیں ہوتا۔ ان حالات کے ساتھ بھی لڑنا پڑتا ہے۔ خالص رضائے الٰہی کے لیے۔

جب نبی کریم ﷺ کو یہ اہم ہدایات دے دی گئیں تو اب بتایا جاتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس سے آپ نے لوگوں کو ڈرانا ہے۔ ایک چٹکی میں اس بات کو سامنے لایا جاتا ہے۔ وہ خوفناک دن ان کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے جس سے آپؐ نے لوگوں کو ڈرانا ہے۔

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ﴿٨﴾ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ﴿٩﴾ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ﴿١٠﴾

"اچھا' جب صور میں پھونک ماری جائے گی' وہ دن بڑا ہی سخت دن ہو گا' کافروں کے لیے ہلکا نہ ہو گا"۔

فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ (٤ ٧ : ٨) کے معنی بھی بگل میں پھونکنے کے ہیں لیکن نقر کے معنی میں آواز کی سختی بھی ہے اور آواز کی اس سختی سے اشارہ مقصود ہے' اس دن کی سختی کی طرف۔ گویا ناقور میں آواز ٹھونکی جاتی ہے اور اس سے سخت آواز نکلتی ہے اور یہ آواز کانوں پر فائر کی طرح لگتی ہے۔ اس لیے یہ دن کافروں پر بہت ہی سخت ہو گا اور اس میں ان کے لیے کوئی سہولت نہ ہوگی۔

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ (٤ ٧ : ١٠) "کافروں کے لیے ہلکا نہ ہو گا"۔ یہ دن سب کا سب سخت ہو گا۔ اس قدر سخت کہ اس میں کوئی نرمی نہ ہوگی' لہٰذا یہ سمجھو کہ اس دن بے حد کرب ہو گا' سخت تنگی ہوگی' لہٰذا اس کے بارے میں محتاط ہو جاؤ۔ اور صور سے بچنے سے پہلے ہی تیاریاں کر لو۔ یوں ان کے سامنے اس دن کا منظر پیش کیا جاتا ہے۔

اب روئے سخن ایک مخصوص مکذب اور جھٹلانے والے معاند کی طرف پھر جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص دعوت اسلامی کا ایک خاص معاند تھا اور دعوت کے خلاف تمام تدابیر یہ کرتا تھا۔ چنانچہ اسے سخت دھمکی دی جاتی ہے اور اس کی ایسی تصویر کھینچی جاتی ہے کہ سننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کون ہے؟ اس شخص کے پورے خدوخال اس قلمی تصویر میں دے دیئے گئے ہیں اور یہ شخصیت صاف صاف الفاظ کے اندر متحرک نظر آتی ہے۔ ذرا ملاحظہ کریں:

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ﴿١١﴾ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ﴿١٢﴾ وَبَنِينَ شُهُودًا ﴿١٣﴾ وَمَهَّدْتُ لَهُ تَمْهِيدًا ﴿١٤﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ﴿١٥﴾ كَلَّا ۖ إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ﴿١٦﴾ سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا ﴿١٧﴾ إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿١٨﴾

فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿١٩﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ﴿٢٤﴾ إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿٢٥﴾ سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ﴿٢٦﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ ﴿٢٧﴾ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ﴿٢٨﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿٢٩﴾ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿٣٠﴾

"چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا' بہت سا مال اس کو دیا' اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیئے' اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی' پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ ہرگز نہیں' وہ ہماری آیات سے عناد رکھتا ہے۔ میں تو اسے عنقریب ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی تو خدا کی مار اس پر' کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں' خدا کی مار اس پر' کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا۔ پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آرہا ہے' یہ تو ایک انسانی کلام ہے۔ عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ؟ نہ باقی رکھے نہ چھوڑے۔ کھال جھلس دینے والی۔ انیس کارکن اس پر مقرر ہیں"۔

متعدد روایات میں یہ بات وارد ہے کہ ان آیات سے مراد ولید ابن مغیرہ مخزومی ہے۔ علامہ ابن جریر روایت کرتے ہیں' ابن عبد الاعلیٰ سے' وہ محمد ابن ثورہ سے' وہ معمر سے' وہ عبادہ ابن منصور سے' وہ عکرمہ سے' کہ ولید ابن مغیرہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا۔ آپؐ نے اس کے سامنے قرآن کریم پڑھا۔ اس کا دل نرم ہو گیا۔ یہ بات ابوجہل ابن ہشام کو پہنچی۔ یہ اس کے پاس آیا اور کہا "تمہاری قوم چاہتی ہے کہ تمہارے لیے مال جمع کرے"۔ اس نے کہا: کس لیے؟ اس نے کہا کہ یہ مال وہ تمہیں دینا چاہتے ہیں کیونکہ تم محمدؐ کے پاس گئے اور تم پر اس کا اثر ہو گیا ہے۔ (ابوجہل نے اس کی عزت نفس کے احساس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ ایک غیرت مند شخص ہے) ولید نے کہا قریش کو معلوم ہے کہ میں ان کا مالدار شخص ہوں۔ ابوجہل نے کہا' لہٰذا تم اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کہہ دو تاکہ لوگ سمجھیں کہ تم اس کے اقوال کو ناپسند کرتے ہو اور محمدؐ کی باتوں کے منکر ہو۔ تو ولید نے کہا کہ میں اس کے بارے میں کیا کہوں "خدا کی قسم تم میں سے کوئی شخص محمدؐ جیسا ادب اور شعر میں ماہر نہیں ہے۔ میں اشعار کی تمام اقسام سے واقف ہوں' رجز' قصیدہ اور اشعار تک جانتا ہوں۔ اس کا کلام ان میں سے کسی کے مماثل نہیں ہے بلکہ اس کے کلام میں ایک مٹھاس ہے' اس کے سامنے جو آتا ہے' پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اور اس سے جو بلند ہونا چاہے یہ اس سے بلند ہوتا ہے۔ تو ابوجہل نے کہا خدا کی قسم تمہاری قوم ہرگز اس وقت تک تم سے راضی نہ ہوگی جب تک تم اس کے بارے میں کچھ نہ کہو۔ تو اس پر اس نے کہا ذرا مجھے سوچنے دو' جب اس نے سوچا تو اس نے کہا' یہ کلام ایک ایسا جادو ہے جو اگلے وقتوں سے چلا آرہا ہے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں:

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا (۷۴: ۱۱) ---- عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (۷۴: ۳۰) تک۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضورﷺ کے ساتھ ولید کی ملاقات کے بعد قریش نے کہا کہ اگر ولید بے دین ہو گیا تو تمام قبیلہ قریش بے دین ہو جائے گا۔ تو ابوجہل نے کہا کہ ولید کو میں ٹھیک کر دوں گا۔ اس کے بعد ابوجہل ولید کے پاس آیا۔ اور طویل غور و فکر کے بعد اس نے کہا۔ "یہ پرانا جادو ہے' کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ ایک آدمی اور اس کے گھرانے کے درمیان جدائی کر دیتا ہے۔ باپ کو بیٹے سے جدا کر دیتا ہے اور مالک اور غلام کے درمیان جدائی پیدا کرتا ہے"۔

یہ ہے واقعہ جس طرح روایات میں آتا ہے۔ لیکن قرآن اس کو نہایت ہی زندہ و تابندہ الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ انداز نہایت ہی موثر ہے۔ اس طرح آغاز ہوتا ہے۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا (٧٤: ١١) "چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا"۔ یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جسے میں نے اکیلا پیدا کیا تھا اور اس وقت اس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی نہ تھی جن پر اہل دنیا فخر کرتے ہیں۔ مال و دولت اور اولاد اور دوسری اشیاء مثلاً معاشرے میں عزت و احترام' یہ چیزیں میں نے اسے دیں' اور اب یہ ان پر اترا کر تحریک اسلامی کے خلاف جنگ کرتا ہے' سازشیں کرتا ہے' اس کو میرے ذمہ چھوڑ دو۔ میں اس سے نمٹ لوں گا۔ اس مقام پر جب انسان قدرے غور کرتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اس بدبخت کے خلاف علیم و خبیر کی بے پناہ قدرت اور قوت نے کام شروع کر دیا ہے۔ اللہ جبار و قہار کی قوت ہے۔ یہ قوت اس حقیر و ناتواں کو توپیس کر رکھ دے گی اور اس کا کیا حال ہو گا۔

اس آیت نے اس شخص کے خدوخال ذرا نہایت ہی طوالت سے بیان کیے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی وہ تفصیلات بھی دی ہیں' جو اللہ نے اس شخص کو دی تھیں۔ یہ تفصیلات اس کے اعراض اور اس کی سازشوں کے ذکر سے بھی پہلے دی گئی ہیں کہ میں نے اسے اکیلا پیدا کیا' اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا' یہاں تک کہ بدن پر کپڑے بھی نہ تھے۔ اس کے بعد اللہ نے اسے بہت وسیع دولت دی۔ اور اس کو ڈھیر سے بیٹے دیئے جو اس کے ارد گرد ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اور ان کی وجہ سے وہ نہایت ہی معتبر سمجھا جاتا تھا۔ اور اللہ نے اس کے لیے زندگی کا ہر سامان فراہم کیا اور ہر موڑ کو آسان کیا۔

ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ (٧٤: ١٥) "پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں"۔ یعنی موجود دولت پر قانع نہیں ہے۔ مزید بھی چاہتا ہے لیکن نہ قناعت کرتا ہے' اور نہ شکر بجالاتا ہے۔ یا وہ یہ طمع کرتا ہے کہ اس پر بھی وحی نازل ہو اور اسے کتاب دی جائے جس طرح سورت کے آخر میں آتا ہے۔

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِءٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُؤْتَى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (٧٤: ٥٢) "بلکہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کے نام کھلے خط بھیجے جائیں"۔ یہ شخص ان لوگوں میں سے تھا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے حسد کرتے تھے کہ آپ کیوں نبی ہو گئے۔

یہاں اس کی سرزنش کی جاتی ہے اور اس پر سخت عتاب آتا ہے۔

إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا (٧٤: ١٦) "یہ ہماری آیات سے عناد رکھتا تھا"۔ اس نے عناد کی وجہ سے حق

کے دلائل کو رد کر دیا اور ان اشارات کو قبول نہ کیا جو ایمان کی طرف لے جاتے تھے۔ یہ دعوت اسلامی کے مقابلے میں آکھڑا ہوا۔ رسول اسلام سے جنگ شروع کر دی' لوگوں کو اسلام سے روکا اور اس کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا کیا۔

اس کے بعد' اس سخت ترین سرزنش کے بعد اب اسے دھمکی دی جاتی ہے' جس کی وجہ سے اب اس کو حاصل سہولیات مشکلات میں بدل جاتی ہیں۔ اور آسانیوں کی جگہ دشواریاں لیتی ہیں۔

سَأُرْهِقُهُ صَعُوْدًا (۷۴:۱۷) "عنقریب اسے میں کٹھن چڑھائی چڑھاؤں گا"۔ مشقت اور دشواری کی یہ بہترین تمثیل و تصویر ہے۔ چڑھائی چڑھنا نہایت مشقت کا عمل ہوتا ہے اور انسان کے لیے سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ کام کسی سے زبردستی لیا جائے اور چڑھنے والے کی کوئی ذاتی دلچسپی نہ ہو تو یہ عمل پھر مزید دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ تمثیل اور تصویر ایک حقیقی تعبیر بھی ہے۔ کیونکہ جو شخص ایمان کے سیدھے' ہموار اور خوشگوار راہ سے منحرف ہو جاتا ہے تو اسے انحراف کی راہ میں مشکلات پیش آتی۔ بے شمار ناہمواریاں اور مشکلات۔ ایسے شخص کی زندگی قلق اور بے چینی میں گزرتی ہے۔ وہ ہمیشہ حیران و پریشان رہتا ہے' گویا اسے زبردستی آسمان پر اور سولی پر چڑھایا جا رہا ہو' اس کی زندگی میں نہ تروتازگی ہوتی ہے' نہ راحت' نہ خوشی' اور نہ سکون اور نہ یہ امید کہ اس پر مشقت سفر کے نتیجے میں وہ منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔

اب اس شخص کی ذہنی کیفیت اور اندرونی نفسیات کی وہ بھدی تصویر کھینچی جاتی ہے جس میں ہر شخص خود اپنے تاثرات اور احساسات کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ اپنے اعصاب پر دباؤ ڈالتا ہے' ماتھے پر شکن آتی ہے اور منہ بناتا ہے۔ اور یہ تمام ذہنی اور فکری زور اس بات کے لیے لگاتا ہے کہ قرآن اور صاحب قرآن کے اندر کوئی عیب نکال لائے۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ (۱۸) فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (۱۹) ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (۲۰) ثُمَّ نَظَرَ (۲۱) ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (۲۲) ثُمَّ اَدْبَرَ وَ اسْتَكْبَرَ (۲۳) فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ (۲۴) اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۲۵) (۷۴:۱۸ تا ۲۵) "اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی تو خدا کی مار اس پر' کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں' خدا کی مار اس پر' کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا۔ پھر پیشانی سیکڑی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آ رہا ہے' یہ تو ایک انسانی کلام ہے"۔

انداز تعبیر ایسا ہے کہ ایک ایک لمحے' ایک ایک سوچ اور ایک ایک حرکت کی تصویر کشی کی جا رہی ہے۔ گویا ایک ماہر عکاس کی قلم ہے جو تصویر بناتی جاتی ہے' الفاظ نہیں بلکہ رنگ بھرے جا رہے ہیں۔ نہیں گویا ایک ریل چل رہی ہے اور ایک ایک منظر نظروں کے سامنے آ رہا ہے۔ جو لمحہ بہ لمحہ بدل رہا ہے۔

ایک تصویر میں یوں نظر آتا ہے کہ یہ شخص سخت غور و فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس منظر میں اسے ایک بد دعا بھی دی جاتی ہے۔

فَقُتِلَ (۷۴:۱۹) "یہ مارا جائے" پھر ایک شدید استہزاء ہے۔

كَيْفَ قَدَّرَ (۷۴:۱۹) "کیسی بات بنانے کی کوشش کی اس نے"۔ اس کے بعد دوبارہ بددعا دی جاتی۔

ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (۷۴:۲۰) "پھر خدا کی مار اس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی"۔

پھر اگلی تصویر میں وہ ' ادھر ادھر دیکھتا ہے ' منہ بناتا ہے ' پیشانی سیکڑتا ہے اور مضحکہ خیز صورت بناتا ہے۔ جس کے اندر نہایت درجہ مصنوعیت ہے۔

اس کی یہ تمام بناوٹ اور سوچ اسے کوئی معقول نتیجہ نہیں دیتی۔ پس وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ روز روشن کو رات کہے اور حق کو باطل کہے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ (۲٤) اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۷۴:۲۵) "یہ کچھ نہیں مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آرہا ہے ' یہ تو ایک انسانی کلام ہے"۔

یہ زندہ لمحات ہیں جن کو قرآن مجید الفاظ کی شکل دیتا ہے۔ یہ اس قدر قوی اور واضح تخیل دیتے ہیں کہ تصویر سے زیادہ واضح ہے ' اور متحرک قلم سے زیادہ اثر انگیز اور سحر آفریں ہے۔ جس شخص کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اسے قیامت تک انوکھ اور قابل نفرت اور نہایت ہی بدنما تصویر دے دی جاتی ہے۔ جسے نسلوں تک لوگوں نے دیکھا پڑھا اور دیکھیں گے اور پڑھیں گے۔ اس تصویر کشی کے بعد اب اس شخص کو ایک خوفناک دھمکی دی جاتی ہے۔

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ (۷۴:۲٦) "عنقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا"۔ لیکن اس دوزخ کو ایک خوفناک نامعلوم بلا بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سَقَرُ (۷۴:۲۷) "اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ؟" یہ بہت ہی خوفناک چیز ہے۔ ہماری قوت مدرکہ سے وراء ہے۔ اور اس اجمال اور عدم علم کے بعد دوزخ کی بعض شدید خصوصیات بتائی جاتی ہیں۔

لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ (۷۴:۲۸) "نہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے"۔ یہ جھاڑو دے کر سب کچھ نگل جانے والی ہے اور سب کچھ مٹا دینے والی ہے۔ کوئی چیز بھی اس کے سامنے کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اور نہ اس سے کوئی چیز رہتی ہے۔ اور نہ اس سے کوئی چیز زیادہ ہوتی ہے ' وہ سب کچھ فنا کر دیتی ہے۔

اب انسان کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہے۔

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (۷۴:۲۹) "کھال جھلس دینے والی ہے"۔ جس طرح سورہ معارج میں کہا گیا۔

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى (۷۰:۱۷) "یہ ہر اس شخص کو بلاتی ہے جو پیٹھ پھیر کر جائے اور منہ موڑے"۔ وہ سب کو اپنی طرف بلانے والی ہے اور اس کا منظر بہت ہی خوفناک ہے۔۔ پھر اس کے اوپر چوکیدار اور نگران کھڑے ہیں :

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (٧٤ : ٣٠) "اس کے اوپر انیس کارکن مقرر ہیں"۔ یہ نگران ملائکہ ہیں۔ جو نہایت ہی شدید القوت ہیں یا ملائکہ کی صفت کی کوئی اور مخلوق ہے۔ یا ملائکہ کی ایک نوع ہے۔ بہرحال 'اللہ نے یہ بتایا کہ انیس ہیں۔ ہمارا اس پر ایمان ہے۔

جہاں تک اہل ایمان کا تعلق ہے وہ چونکہ ذات باری تعالیٰ پر پختہ یقین رکھتے تھے تو انہوں نے کلام الٰہی سنتے ہی یقین کر لیا۔ اور ایسا رویہ اختیار کیا جس طرح بندے کو رب تعالیٰ کے ساتھ اختیار کرنا چاہئے۔ اس لیے انہوں نے کوئی شک نہ کیا۔ رہے مشرک تو انہوں نے فرشتوں کی اس تعداد کو ایک فتنہ بنا دیا۔ کیونکہ ان کے دل ایمان سے خالی تھے۔ ان کے دلوں میں ذات باری تعالیٰ کا مناسب احترام نہ تھا۔ وہ اس عظیم معاملے میں سنجیدہ ہی نہ تھے۔ اس لیے یہ سنتے ہی وہ طنز و مذاق کرنے لگے اور انہوں نے اسے عجیب شے سمجھ کر مذاق شروع کر دیا۔ بعض نے کہا کیا تم میں سے دس آدمی ان انیس میں سے ایک کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بعض نے کہا صرف دو کا مقابلہ تم کر لو باقی کو میرے ذمہ چھوڑ دو۔ میں ان کا بندوبست کر لوں گا۔ اس قسم کی اندھی 'تنگ نظر اور ہٹ دھرم روح کے ساتھ انہوں نے اس کتاب عظیم کو لیا۔

آنے والی آیات اس بارے میں نازل ہوئیں۔ ان میں اس بات کی تشریح کی گئی ہے کہ اللہ کے غیب کے خفیہ خزانوں میں سے ایک نکتے کا علم کیوں ظاہر کیا گیا۔ اور یہ کہ انیس کی تعداد کیوں مقرر کی گئی ہے اور اس معاملے کو اللہ کے علم غیب کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ جہنم اور اس کے فرشتوں اور کارکنوں کی تعداد کے ذکر سے کیا مطلب اور مقصود ہے۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۪ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ
اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ
مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى ۱
لِلْبَشَرِ (٣١) ع ۳۱
۱۵

"ہم نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے بنائے ہیں' اور ان کی تعداد کو کافروں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے' تاکہ اہل کتاب کو یقین آجائے اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے' اور اہل کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں' اور دل کے بیمار اور کفار یہ کہیں کہ بھلا اللہ کا اس عجیب بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اس طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے' ہدایت بخش دیتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ۔۔۔ اور اس دوزخ کا ذکر اس کے سوا کسی غرض کے لیے نہیں کیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو"۔

آیت کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ یہ فرشتے انیس ہیں اور مشرکین اس تعداد میں شک کرتے ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً (۷۴ : ۳۱) "ہم نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے بنائے ہیں"۔ تو یہ کارکن ان فرشتوں میں سے ہیں جو نہایت ہی قوت والے ہیں اور ان کی طبیعت اور مزاج کو اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ نہایت ہی قوی ہیں اور ان کے بارے اللہ نے فرمایا ہے۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ "وہ ان احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور ان کو جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ اسے کر گزرتے ہیں"۔ یعنی وہ اللہ کے احکامات کی پیروی کرتے ہیں۔ اور ان کے اندر اس بات کی طاقت ہے کہ اللہ جو حکم دے وہ اس کی تعمیل کریں۔ اللہ نے ان کو ایسی قوت دے رکھی ہے کہ وہ ان کو جو حکم دے 'اس کی تعمیل وہ فوراً کر دیں۔ اگر اللہ نے ان کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ آگ کے اندر اللہ کے احکام کی تعمیل کریں تو اللہ نے ان کو قدرت دی ہے کہ وہ ایسے حالات میں کام کر سکیں۔ جس طرح اللہ نے ان کو سکھایا۔ لہٰذا ان فرشتوں کے ساتھ یہ بیچارے کب پنجہ آزمائی کر سکتے ہیں 'ان لوگوں نے جو یہ کہا کہ ان فرشتوں کو وہ قابو کر لیں گے تو یہ محض جہالت کی وجہ سے کہا 'ان لوگوں کو دراصل اللہ کی قوتوں اور اللہ کی فوجوں کی طاقت کا کوئی پتہ ہی نہیں۔ اور یہ معلوم ہی نہیں کہ اللہ اپنے معاملات کو کس طرح چلاتا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۷۴ : ۳۱) "اور ہم نے ان کی تعداد کو کافروں کے لیے فتنہ بنایا ہے"۔ یہ کافر دراصل ان فرشتوں کی تعداد پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ مقامات کیا ہیں جہاں تسلیم کے بغیر بات نہیں بنتی اور وہ مقامات کیا ہیں جہاں جدل و جدال اور بحث و مباحثے کی گنجائش ہوتی ہے۔ یہ معاملہ غیبیات کا ہے۔ اور اس میں تسلیم و رضا کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان غیبی شعبوں اور موضوعات پر انسان کے پاس نہ قلیل علم ہے اور نہ کثیر علم ہے۔ جب اللہ نے اپنے نبی کے ذریعہ یہ اطلاع کر دی اور نبی سچا ہے اور اللہ سچا ہے تو پھر بحث و مباحثہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ انسان کا مقام یہ ہے کہ بس نبی کی بات کو تسلیم کرے اور یہ اطمینان رکھے کہ جس قدر خبر اللہ نے بتا دی اسی قدر بتانے میں خیر ہے اور اس میں مباحثے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ انسان مناقشہ اس موضوع پر کر سکتا ہے جس کے بارے میں اس کے پاس کوئی سابقہ علم ہو اور جدید علم کے بارے میں وہ اعتراض کرتا ہو۔ تو فرشتوں کی تعداد کے بارے میں انسان کے پاس سرے سے کوئی سابق علم ہی نہیں ہے اور یہ کہ "وہ" انیس ہیں تو اس کا علم اللہ ہی کو ہے کہ وہ کیا ہیں اور انیس کیوں ہیں؟ تو اعتراض کرنے والے بیس پر بھی اعتراض کر سکتے ہیں۔ آخر آسمان سات کیوں بنائے ہیں 'اس پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے اور انسان کو موجودہ شکل میں کیوں بنایا اور سوکھی مٹی سے کیوں بنایا اور جنوں کو آگ کے شعلے سے کیوں بنایا؟ اور انسان کیوں ماں کے پیٹ میں ۹ ماہ رہتا ہے اور کچھوے کیوں ہزار ہا سال زندہ رہتے ہیں اور یہ کیوں؟ اور یہ کیوں؟ جواب صرف یہی ہے کہ یہ اللہ کی مرضی ہے اور یہی حقیقی جواب ہے ایسے معاملات کا۔

لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۷۴ : ۳۱) "تاکہ اہل کتاب کو یقین آ جائے اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے 'اور اہل کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں"۔ اور یہ دونوں فریق دوزخ کے نگرانوں کی تعداد میں یقین کا مواد

پائیں گے اور اہل ایمان کا تو ایمان زیادہ ہو گا۔ رہے اہل کتاب' تو ان کے پاس اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی علم ضرور ہو گا۔ اور جب وہ سنیں گے کہ قرآن کریم بھی اس بات کی تصدیق کر رہا ہے تو وہ بات درست ہے کیونکہ قرآن کریم کتب سابقہ کی تصدیق کرنے والا ہے۔ رہے اہل ایمان' تو ان کا ایمان تو ہر نئی آیت کے بعد زیادہ ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے دل کھلے ہیں اور عالم بالا سے ان کا بذریعہ رسول ہروقت رابطہ رہتا ہے۔ اور جو حقائق بھی وارد ہوتے ان کے ایمان میں اضافے کا موجب بنتے ہیں۔ ان کے دلوں میں عنقریب یہ حکمت بیٹھ جائے گی کہ کیوں اللہ نے انیس فرشتے مقرر کیے ہیں' کیونکہ اللہ کے نظام تخلیق و تدبیر میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے اور ان دونوں کے ذہن میں جب یہ حقیقت بیٹھ جائے گی تو یہ دونوں فریق شک نہ کریں گے کیونکہ یہ بات اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

وَ لِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْكٰفِرُوْنَ مَا ذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا (۷۴: ۳۱) "اور دل کے بیمار اور کفار یہ کہیں کہ بھلا اللہ کا اس عجیب بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے؟" یوں اس ایک ہی حقیقت کا اثر مختلف دلوں میں مختلف ہوتا ہے' جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ یقین کرتے ہیں اور جو مومن ہیں ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور جن لوگوں کے دل میں بیماری ہے اور جو ضعیف الایمان اور منافق ہیں وہ حسرت استعجاب میں پوچھتے ہیں :

مَا ذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا (۷۴: ۳۱) "اللہ کا اس بات سے مطلب کیا ہے؟" کیونکہ اس تعداد حکمت وہ نہیں سمجھتے۔ اور نہ وہ اصولاً اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ خالق کائنات کی تمام باتوں میں کوئی نہ کوئی حکمت ہو ہے۔ وہ خدا اور رسول اللہ ﷺ کی خبروں کی تصدیق پیش کرتے ہیں اور نہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کے ہر کام میں خیر حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (۷۴: ۳۱) "اس طرح اللہ جسے چاہتا گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے' ہدایت بخشتا ہے"۔ "اسی طرح" یعنی حقائق کے بیان کے ذریعہ اور آیات قرآنیہ کے بیان ذریعہ اللہ تعالیٰ مختلف دلوں کو مختلف انداز میں متاثر کرتا ہے۔ ایک گروہ اللہ کی مشیت کے مطابق ان سے ہدایت لیتا ہے دوسرا گروہ اللہ کے نظام مشیت کے تحت گمراہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر امر کا آخری سبب اللہ کا ارادۂ مطلقہ ہوتا ہے۔ ان انسانو قدرت الہیہ نے دونوں طرز کی صلاحیتیں دی ہیں۔ ان کے اندر ہدایت کی صلاحیت بھی ہے اور گمراہی کی صلاحیت بھی ہے۔ یہ صلاحیت اللہ کے نظام مشیت کے اندر ہے۔ پس جو گمراہ ہو' وہ بھی مشیت کے اندر ہے اور جو ہدایت پائے وہ بھی دائرے کے اندر ہے' کیونکہ ان کی تخلیق کے اندر دونوں قسم کی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں۔ دونوں راستے ان کے لیے آ کر دیئے گئے ہیں' جو کوئی جس راستہ کو اختیار کرتا ہے' اللہ کے دائرہ مشیت کے اندر ہی ہوتا ہے اور یہ دائرہ اللہ کی گہری حک پر مبنی ہے۔

یہ تصور کہ اللہ کی مشیت مطلق اور بے قید ہے اور اس کائنات میں جو امر واقع ہوتا ہے وہ اس مشیت کے دائر اندر ہوتا ہے۔ یہ ایک وسیع تصور ہے اور یہ متکلمین کی ان محدود بحثوں سے وسیع تر ہے جو وہ انسان کی جبریت اور اختیا

بارے میں کرتے رہے ہیں ۔ یہ ایک ایسی بحث ہے جس کا کسی فیصلہ کن انجام تک پہنچنا ہی ممکن نہیں ہے ۔ کیونکہ جبر و اختیار کی مباحث نہایت ہی تنگ زاویہ سے کی جاتی ہیں ۔

یہ بحثیں انسان کی محدود سوچ ' محدود طرز استدلال کے انداز میں اور انسان کے محدود تصورات کے اندر کی جاتی ہیں جبکہ اللہ کے نظام مشیت کا تعلق اللہ کی غیر محدود الوہیت کے نظام سے ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ہدایت اور ضلالت کا راستہ بتا دیا اور وہ منہاج بھی بتا دیا جس پر چل کر ہم سعادت اور کامیابی حاصل کر سکتے ہیں ۔ اور وہ طریقے بھی بتا دیئے جن کے ذریعہ انسان گمراہ ہوتے ہیں اور برے انجام تک پہنچ جاتے ہیں ۔ اس کے بعد اللہ نے ہمیں مکلف نہیں بنایا کہ اس سے زیادہ بھی ہم جان لیں ' نہ اللہ نے اس سے زیادہ ہمیں قدرت اور طاقت دی ہے ۔ اللہ کا کہنا یہ ہے کہ میرا ارادہ بے قید ہے اور میں جو کچھ چاہتا ہوں وہی ہوتا ہے ۔ لہذا ہمیں اپنے فہم اور ادراک کے مطابق اللہ کی بے قید مشیت اور ارادۂ مطلق کو سمجھنا چاہئے اور اس کے مطابق چلنا چاہئے ۔ ہمیں اس منہاج پر چلنا چاہئے جس کے نتیجے میں ہدایت ملتی ہے اور اس منہاج سے بچنا چاہئے جس سے ہم گمراہ ہوتے ہیں اور ان مسائل پر ہمیں فضول اور لاحاصل بحث نہیں کرنا چاہئے جن تک انسانی قوائے مدرکہ کی رسائی ممکن ہی نہیں ہے ۔ اس اصول کے مطابق متکلمین مسئلہ قدر و اختیار کے موضوعات پر جو مباحث کیے ہیں وہ لاحاصل ہیں ۔

ہم اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے کہ اللہ کی مشیت ہمارے بارے میں کیا کرتی ہے ۔ البتہ ہم اس حقیقت کو پا سکتے ہیں کہ انسان اللہ کے فضل و کرم کے مستحق کس طرح ہوتے ہیں لہذا ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی قوتیں ان کاموں میں صرف کریں جن کا ہمیں مکلف بنایا گیا ہے اور اللہ کے پوشیدہ اور مشتبہ امور کو اللہ پر چھوڑ دیں ۔ جب اللہ کی مشیت ظاہر ہو جاتی ہے تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کی مشیت تھی اور ایسا ہو گیا ۔ مشیت کے ظہور سے قبل ہم سمجھ ہی نہیں سکتے ۔ ہر مشیت کے پیچھے ایک حکمت پوشیدہ ہوتی ہے اور یہ حکمت بھی اللہ جانتا ہے ' صرف اللہ وحدہ ۔ یہ تو ہے ایک سچے مومن کا طریقہ کار ۔

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (۷۴: ۳۱) ''اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اس کے سوا کوئی نہیں جانتا'' ۔ اس لیے اللہ کی افواج ' ان کی حقیقت ' ان کے وظائف اور ان کی قوت کا ہمیں علم نہیں ہے 'کیونکہ یہ اللہ کے غیبی امور میں سے ہیں ۔ یہ اللہ کی مرضی ہے کہ وہ ان امور میں سے کسی چیز کا انکشاف کر دے ۔ اور اللہ جو بات کر دے وہ فیصلہ کن اور اٹل ہوتی ہے ۔ اللہ کے قول کے بعد کوئی مجادلہ نہیں کر سکتا' کسی کو کوئی بات کرنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ کسی بات کے معلوم کرنے کی اجازت ہے ۔ کیونکہ یہ کام کوئی کر ہی نہیں سکتا ۔

وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ (۷۴: ۳۱) ''اور اس دوزخ کا ذکر اس کے سوا کسی غرض کے لیے نہیں کیا گیا کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو'' ۔ ھی کی ضمیر یا تو اللہ کے ''جنود'' کی طرف راجع ہے یا جہنم کی طرف ۔ اور اس پر جو فرشتے ہیں ان کی طرف ۔ اور یہ بھی اللہ کی افواج میں سے ہیں ۔ اور ان کا ذکر لوگوں کو متنبہ کرنے اور ڈرانے کے لیے کیا گیا ہے ۔ محض جدل و جدال کے لیے نہیں ۔ اللہ کے کلام سے صرف اہل ایمان ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں ' رہے گمراہ دل ' تو وہ ان چیزوں کو محض جدل و جدال کا ذریعہ بناتے ہیں ۔

اس غیبی حقیقت کی وضاحت اور ہدایت لینے اور گمراہ ہونے کے طریقے اور اسباب بتانے کے بعد اب حقیقت آخرت '

حقیقت جہنم اور رب تعالیٰ کی خفیہ قوتوں کو اس کائنات کے ظاہری مشاہد اور نشانیوں کے ساتھ جوڑا جاتا ہے ۔ ان ظاہری نشانیوں کو تو انسان دیکھتے ہوئے بھی غفلت اور لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہیں جبکہ غیبی حقائق معلوم کرنے کے لیے تیر تکے چلاتے ہیں' حالانکہ ان ظاہری امور اور نشانات سے اللہ کے ارادے اور قوتیں اچھی طرح ظاہر ہوتی ہیں اور ان ظاہری نشانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے بڑا مقصد اور ایک طاقتور ارادہ ہے ۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ﴿٣٣﴾ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ﴿٣٤﴾ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾ نَذِيرًا لِلْبَشَرِ ﴿٣٦﴾

"ہرگز نہیں' قسم ہے چاند کی' اور رات کی جبکہ وہ پلٹتی ہے' اور صبح کی جبکہ وہ روشن ہوتی ہے' یہ دوزخ بھی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے' انسانوں کے لیے ڈراوا"۔

چاند کے مناظر' رات کے مناظر جب وہ ختم ہوتی ہے اور صبح نمودار ہوتی ہے' یہ زبردست مشاہد اور مناظر ہوتے ہیں ۔ یہ آنکھیں کھول دینے والے مناظر ہیں اور انسانی دل و دماغ پر ان کے بے شمار اثرات مرتب ہوتے ہیں ۔ اور انسان ان پر اگر غور کرے تو اس پر کئی راز کھلتے ہیں ۔ کئی گہرے تصورات انسان کے پردۂ خیال پر آتے ہیں اور اسے پختہ شعور ملتا ہے ۔ قرآن کریم انسان کو ان مظاہر کی طرف متوجہ کر کے انسان کے دل میں ان تصورات کو بٹھاتا ہے ۔ اور ان احساسات کو اچھی طرح جانتا ہے ۔

جب چاند طلوع ہوتا ہے' فضائے کائنات میں چلتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے ۔ اگر انسان اس پر غور کرے تو وہ انسان کے کان میں اس کائنات کے کچھ نہ کچھ راز ضرور ڈال دیتا ہے اور بعض اوقات تو چاند کی روشنی میں کھڑے ہو کر غور و فکر کرنے سے انسان پر یہ اثر ہوتا ہے کہ گویا اس نے نور کا غسل کر لیا ہے ۔

اور رات کے جانے کا منظر بھی عجیب ہوتا ہے' صبح کی نموداری کے وقت اور سورج کے طلوع سے پہلے کے ان پر سکون لمحات میں' اگر انسان چشم بینا سے دیکھے تو اس کو نظر آتا ہے کہ ایک شعوری ارادہ اور دست قدرت ایک صورت حال کو ہٹا کر دوسری حالت کو بڑھا رہا ہے ۔ اس منظر میں جس طرح دنیا آہستہ آہستہ منور ہوتی ہے' قلب بینا بھی منور ہوتا چلا جاتا ہے ۔ غرض صرف چشم بینا کی ضرورت ہے اور احساس و شعور کی ۔

اللہ تعالیٰ انسانی قلب و نظر کا خالق ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ مناظر انسانی احساسات پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں ۔ اور بعض اوقات تو یہ اثرات اس قدر گہرے ہوتے ہیں کہ انسان یہ سمجھتا کہ وہ از سرنو پیدا کر دیا گیا ہے اور پہلی مرتبہ یہ دیکھ رہا ہے ۔

اور ان موثرات' اشراقات اور تاثرات کے استقبال کے پیچھے' شمس و قمر اور لیل و نہار اور نموداری صبح میں ایک دوسری عظیم حقیقت بھی پوشیدہ ہے جس کی طرف قرآن انسان کو متوجہ کر رہا ہے ۔ انسانی قلب و نظر کو آمادہ کر رہا ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرے کہ ان مظاہر میں اللہ کی قدرت تخلیق' اللہ کی حکمت تدبیر اور اس کائنات کے زبردست نظم و نسق کے نشانات ہیں اور یہ کہ یہ کائنات اس قدر دقیق اور پیچیدہ نظم کے ساتھ چل رہی ہے کہ اسے دیکھ کر انسانی عقل

حیرت زدہ ہو جاتی ہے۔

ان عظیم کائناتی حقائق کے ساتھ قسم اٹھا کر اللہ تعالیٰ غفلت میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو جگاتا ہے کہ اللہ کی عظیم قدروں کو ذرا سمجھنے کی کوشش کرو' اور ان کے اندر جو آثار و نشانات ہیں ان سے عبرت لو۔ یہ کہ جہنم اور اس کے اوپر متعین افواج الہیہ اور آخرت اور اس کی ہولناکیاں دراصل ان عظیم امور میں سے ہیں جو عجیب بھی ہیں اور خوفناک بھی ہیں اور یہ واقعات نہایت ہی پرخطر ہیں۔ انہیں سنجیدگی سے لو۔

اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ (٣٥) نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ (٧٤ : ٣٦) "یہ دوزخ بھی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے' انسانوں کے لیے ڈراوا"۔ یہ قسم اور اس کے مشمولات اور وہ بات جس پر اس انداز میں قسم اٹھائی جارہی ہے' یہ سب باتیں انسانی قلب ونظر کو جھنجھوڑنے والی ہیں اور انسان کو بڑی شدت سے جھٹکے دینے والی ہیں اور یہ بات اپنے مضمون اور صوتی ہم آہنگی کے اعتبار سے 'صور میں پھونکے جانے (النقر في الناقور) کے تیز سورت کے آغاز میں مدثر کے نام سے پکارنے اور نہایت ہی سخت حکم بلکہ کاش۔

قُمْ فَاَنْذِرْ (٧٤ : ٢) کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ گویا حالات خطرناک ہیں' فضا پر خوف طاری ہے اور ہنگامی حالت کا ہائے وہو برپا ہے۔

اب ان شدید جھٹکوں اور تنبیہات اور نہایت ہی اثرانگیز نداؤں کی روشنی میں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہر نفس اپنے کیے کا حق دار اور ذمہ دار ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہئے کہ جو راہ وہ اختیار کرتا ہے' پوری پوری ذمہ داری کے ساتھ اختیار کرے۔ یہ کہ ہر نفس خود مختار ہے اور وہ اپنے لیے جو انجام چاہے اختیار کر لے۔ وہ اپنے اعمال اور کسب کا ذمہ دار ہے۔ ہر شخص اپنے حق کا حقدار ہو گا اور اپنے گناہوں کا بوجھ خود اٹھائے گا۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿٣٧﴾ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿٣٨﴾

"تم میں سے ہراس شخص کے لیے ڈراوا جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے۔ ہر شخص اپنے کسب کے بدلے رہن ہے"۔

' ہر شخص اپنے نفس کا ذمہ دار ہے' جس حالت میں اسے چاہے' رکھ دے' جو بوجھ چاہے اٹھالے' جو قدم چاہے اٹھائے۔ اچھائی کی طرف آگے بڑھے' یا پیچھے رہ جائے۔ اپنے آپ کو عزت دے یا ذلیل کرے۔ ہر نفس اپنی کمائی کے ہاتھ رہن ہے اور اپنے اعمال کے ہاں قید ہے۔ اللہ نے ہر شخص کو راہ ہدایت بھی بتا دی ہے اور راہ ضلالت بھی دکھا دی ہے اور اس کائنات کے ان مناظر کی روشنی میں اور جہنم کی منظرکشی کے بعد وہ ہراس چیز کو فنا کر دینے والی ہے' جو اس کے دائرے کے اندر آجائے۔

اس منظر کے بعد کہ ہر نفس اپنے کیے کا ذمہ دار ہے اور جو کچھ اس کیا اس کا مرہون ہے۔ یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اصحاب الیمین ان جکڑبندیوں اور ان پابندیوں سے آزاد ہوں گے اور وہ حساب و کتاب کے بعد رہائی پالیں گے۔ اور اس کامیابی کے بعد اب وہ مجرمین سے پوچھیں گے کہ وہ کیا وجوہات تھیں جن کی وجہ سے وہ اس انجام سے دوچار ہوئے۔

إِلَّآ أَصْحَٰبَ ٱلْيَمِينِ ﴿٣٩﴾ فِى جَنَّٰتٍ يَتَسَآءَلُونَ ﴿٤٠﴾ عَنِ ٱلْمُجْرِمِينَ ﴿٤١﴾
مَا سَلَكَكُمْ فِى سَقَرَ ﴿٤٢﴾ قَالُوا۟ لَمْ نَكُ مِنَ ٱلْمُصَلِّينَ ﴿٤٣﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ ٱلْمِسْكِينَ ﴿٤٤﴾
وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ ٱلْخَآئِضِينَ ﴿٤٥﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ ٱلدِّينِ ﴿٤٦﴾ حَتَّىٰٓ أَتَىٰنَا
ٱلْيَقِينُ ﴿٤٧﴾

"دائیں بازو والوں کے سوا' جو جنتوں میں ہوں گی' وہ مجرموں سے پوچھیں گے "تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟" وہ کہیں گے "ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے' اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے' اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے' اور روز جزاء کو جھوٹ قرار دیتے تھے' یہاں تک کہ ہمیں اس یقینی چیز سے سابقہ پیش آگیا"۔

اصحاب الیمین کی رہائی اور قیدو بند سے ان کے چھوٹ جانے کا واقعہ کیونکر پیش آیا کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ان کی نیکیوں کو دوگنا کر دیا اور ایسے مشکل حالات میں ان کی رہائی اور کامیابی کا اعلان دلوں کو گرما دیتا ہے اور انسان اللہ کی رحمتوں کے یقین سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس بات کا اثر مجرموں اور تکذیب کرنے والوں پر بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سخت ترین حالات میں محصور پاتے ہیں۔ نہایت ہی اہانت آمیزی کے ساتھ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور ایک طویل بیان ریکارڈ کراتے ہیں' جبکہ وہ اہل ایمان جن کو وہ اس دنیا میں کچھ چیز ہی نہ سمجھتے تھے اور ان کو ذرہ برابر اہمیت بھی نہ دیتے تھے' وہ اب عزت و تکریم کی بلندیوں پر ہیں۔ اور وہ ان سے اس انداز میں سوال کرتے ہیں جس طرح کوئی نہایت ہی شکست خوردہ شخص سے کرتا ہے۔ ذرا سوال دیکھیں :

مَا سَلَكَكُمْ فِى سَقَرَ (٤٢:٧٤) "تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟" اور اس صورت حال کا اہل ایمان کے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے' جو ان مجرمین کے ہاتھوں اس جہاں میں سخت اذیتیں جھیل رہے تھے۔ آج وہ عالم آخرت میں اپنے آپ کو نہایت ہی اعلیٰ مقام میں پاتے ہیں' جبکہ ان کو دق کرنے والے اس توہین آمیز پوزیشن میں ہیں' یہ منظر اس قدر دلکش اور پرتاثیر ہے کہ فریقین اپنے آپ کو قیامت کے دن حاضر و موجود پاتے ہیں۔ گویا اس دنیا کا صفحہ لپیٹ لیا گیا ہے اور ہم قیامت کے میدان میں حاضر و موجود ہیں۔

اور اب ذرا اس طویل اعتراف جرم کو پڑھیں جو ان مکذبین اور متکبرین نے اللہ اور مومنین کی موجودگی میں کیا' اور نہایت ہی ذلت اور خواری کے ساتھ کیا۔

قَالُوا۟ لَمْ نَكُ مِنَ ٱلْمُصَلِّينَ (٤٣:٧٤) "وہ کہیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے"۔

اشارہ یہ ہے کہ ہم ایمان لاکر اس گروہ میں شامل نہ ہوئے جو نمازیوں کا گروہ تھا' اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں نماز کی اہمیت کیا ہے۔ یہ گویا ایمان اور فلاح کی دلیل ہے اور نماز کا انکار دراصل کفر ہے اور جو شخص نماز نہیں پڑھتا۔ وہ

صفت ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔

وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ (٤٤:٧٤) "اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے"۔ یہ دوسری صفت ہے۔ نماز للہ کی بندگی کی صفات میں سے ہے جس کا تعلق ذات باری سے ہے جبکہ اطعام مساکین وہ عبادت ہے جس کا تعلق انسانوں کی ذوات سے ہے۔ قرآن کریم میں انسانوں کے رزق کے انتظام کو ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے اور اس پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ عرب معاشرہ' جہاں فخر و مباہات پر وہ سب کچھ لٹا دیتے تھے۔ وہاں غرباء اور مساکین بھوک سے مرتے تھے اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ قرآن اس مسئلہ کی طرف خالص انسانی بنیادوں پر متوجہ کرتا ہے اور صرف رضائے الہی کے لیے اطعام مساکین کو عبادت قرار دیتا ہے۔

وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ (٤٥:٧٤) "اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے"۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ وہ لوگ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقیدہ کے بارے میں کس قدر بے باک تھے اور وہ اسلامی عقیدے کو محض گپ شپ سمجھتے تھے۔ اور ایمان ان کے لیے طنز و مزاح کا موضوع تھا۔ حالانکہ ایمان اور عقیدہ ایک نہایت ہی سنجیدہ' خطرناک اور خوفناک نتائج کا حامل معاملہ تھا۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس میں ان کو چاہئے تھا کہ نہایت غور و خوض کے بعد کوئی فیصلہ کرتے۔ زندگی کے تمام معاملات سے قبل اس بارے میں فیصلہ ضروری تھا۔ اس کا تصور' اس کا شعور' اس کی قدر و قیمت اور اس کی حقیقت کے تعین پر تمام حقائق حیات کا تعین موقوف ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر سنجیدگی اور غور و فکر کے ساتھ فیصلہ نہ کرنا ایک احمقانہ قدم تھا اور ہم سے اس حماقت کا صدور ہو چکا ہے کہ ہم اس قدر اہم معاملے کو گپ شپ سمجھتے رہے۔

وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (٤٦:٧٤) "اور روز جزاء کو جھوٹ قرار دیتے تھے"۔ یہ ہے اس مصیبت کی اصل بنیاد' جو شخص قیام قیامت کا منکر ہوتا ہے اس کی زندگی کی تمام قدریں اور پیمانے خلل پذیر ہو جاتے ہیں اور اس کی تمام اقدار مضطرب ہوتی ہیں۔ اس کے احساسات میں زندگی کا دائرہ بہت ہی محدود اور تنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی پوری سوچ اس زمین کی مختصر عمر تک محدود ہو جاتی ہے اور وہ انہی نتائج کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ جو اس مختصر زندگی میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ان نتائج پر کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور آخرت کا کوئی حساب و کتاب اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تمام معیارات اور تمام قیاسات فساد پذیر ہوتے ہیں۔ اس کے دنیاوی امور میں بھی فساد برپا ہوتا ہے اور اس کے تمام امور شر پر منتج ہوتے ہیں۔

مجرم یہ کہتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارے احوال کچھ یوں تھے کہ ہم نماز نہ پڑھتے تھے' مساکین کو کھانا نہ کھلاتے تھے اور محض گپ شپ اور غیر سنجیدہ گفتگو میں لگے رہتے تھے اور قیامت کی تکذیب کرتے تھے۔

حَتّٰىٓ اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ (٤٧:٧٤) "یہاں تک کہ اس یقینی چیز سے سابقہ پیش آ گیا"۔ یعنی ہم موت سے دو چار ہو گئے' جو تمام شکوک و شبہات کو ختم کر دیتی ہے۔ اور معاملے کا فیصلہ کر دیتی ہے اور یہ فیصلہ اس قدر یقینی ہوتا ہے کہ

کوئی اسے رد نہیں کر سکتا۔ اب نہ ندامت مفید ہوتی ہے اور نہ توبہ قبول ہوتی ہے۔ اور نہ عمل صالح کا وقت رہتا ہے۔ اور اب یقینی صورت حالات پیش آتی ہے۔

یہاں اس برے موقف پر ایک تبصرہ ہوتا ہے کہ اب تو تمام امیدیں کٹ گئی ہیں اور یہ لوگ اس انجام تک آپہنچے ہیں۔

فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴿٤٨﴾

"اس وقت سفارش کرنے والوں کی کوئی سفارش ان کے کسی کام نہ آئے گی"۔ اب تو فیصلہ ہو چکا اور بات بچ ہو گئی۔ سب کا فیصلہ ہو گیا' اور یہ فیصلہ اور یہ انجام مجرمین کا حقیقی انجام تھا۔ اب ان مجرموں کو کسی کی کوئی سفارش فائدہ نہ دے گی اور اگر فرض کر لیا جائے کہ کوئی سفارش ہو گی تو بھی یہ سفارش کام نہ آئے گی۔

اس توہین آمیز اور مایوس کن صورت حالات کی تصویر دکھا کر اب پھر ان لوگوں کو' متوجہ کیا جاتا ہے کہ اس دنیا میں ان کے لیے جو مواقع فراہم کر دیئے گئے ہیں' ان کو چاہئے کہ وہ ان مواقع سے فائدہ اٹھائیں لیکن وہ اس ہدایت سے منہ موڑ رہے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے روکتے ہیں بلکہ وہ ہدایت اور خیر سے دور بھاگتے ہیں۔ اور ان وسائل سے دور بھاگتے ہیں جو زندگی' ابدی زندگی کے حقیقی وسائل ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ جس صورت حال میں ڈوبے ہوئے ہیں اس کی ایک مضحکہ خیز جھلک دکھائی جاتی ہے۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿٤٩﴾ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾

"آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں 'گویا یہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں"۔

جنگلی گدھے بہت ہی ڈرپوک ہوتے ہیں 'جب یہ شیر کی دھاڑ کی آواز سنتے ہیں تو یہ جدھر منہ ہوتا ہے ادھر بھاگ جاتے ہیں۔ عرب اس قسم کے مناظر سے واقف تھے۔ جب انسانوں کو ان خوفزدہ گدھوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ تو یہ منظر نہایت ہی مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تذکرہ اور نصیحت سے ان کی نفرت اور فرار انہیں انسانوں کی بجائے گدھے بنا دیتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ انہیں کوئی خوف درپیش ہے بلکہ اس لیے کہ ایک یاددہانی کرانے والا ان کو اپنے رب کی طرف بلا رہا ہے اور انہیں یہ موقعہ فراہم کر رہا ہے کہ یہ لوگ اس خوفناک انجام سے دوچار ہونے سے بچ جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دست قدرت کی محیر العقول عکاسی ہے 'جس نے اسی تشبیہ کو یوں ریکارڈ کیا تاکہ قیامت تک لوگ اسے پڑھتے رہیں اور ان لوگوں کا رویہ قابل نفرت نظر آتا رہے اور لوگ ایسے رویئے سے بچتے رہیں اور جن لوگوں نے یہ رویہ اختیار کیا وہ شرمساری سے منہ چھپاتے پھریں۔

یہ تو تھی ان لوگوں کی بیرونی تصویر کہ "وہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر کے ڈر سے بھاگ پڑے ہیں"۔ لیکن ان کی داخلی نفسیاتی تصویر کیا ہے اور ان کا شعوری خلجان کیا ہے

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾

"بلکہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کے نام کھلے خط بھیجے جائیں"۔

یہ شعور وہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ حسد کی وجہ سے رکھتے تھے کہ حضور ﷺ کو یہ منصب کیوں عطا ہوا؟ ہر کوئی یہ چاہتا تھا کہ یہ منصب اسے دیا جائے اور ہر شخص کے اوپر کھلے صحیفے اترتے نظر آئیں۔ یہ اشارہ ہے ان کبرائے قریش کی طرف جو اس بات پر جل بھن گئے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ابن عبداللہ پر یہ کلام کیوں نازل ہوا:

لَوْ لَا اُنْزِلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ "یہ قرآن دو شہروں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں ہوا؟" لیکن اللہ نے فرمایا کہ وہ جانتا ہے کہ منصب رسالت کا اہل کون ہے اور اس عظیم کام کے لیے اس نے کس کا انتخاب کرنا ہے۔ یہی بات تھی جس کی وجہ سے یہ لوگ اسلامی نظریہ حیات سے نفرت کرتے تھے اور قبولیت پر آمادہ نہ تھے۔

ان لوگوں کے نفوس کی اندرونی تصویر کشی جاری ہے' چنانچہ اس طمع اور لالچ اور حسد سے بھرپور ایک دوسرا سبب بھی سامنے رکھ دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس بے جا حسد اور لالچ میں کیوں مبتلا ہوگئے ہیں تو اس سے بھی دور رس سبب یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ اس وجہ سے اللہ کے اس فضل و کرم سے محروم ہوگئے ہیں۔

كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝۵۳

"ہرگز نہیں' اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے"۔

ان کی یہ بے خوفی اور لاابالی پن ہی ہے جو انہیں اس نصیحت و حکمت سے دور کر رہا ہے اور دعوت اسلامی سے یہ دور بھاگ رہے ہیں۔ اگر ان کے دلوں میں آخرت کا شعور ہوتا تو ان کی صورت حال یہ نہ ہوتی کہ یہ ہر معاملے میں شک میں گرفتار ہیں۔

اس کے بعد ایک بار پھر ان کو تنبیہ کی جاتی ہے۔ اب آخری بات کہہ دی جاتی ہے اور ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اب جو چاہیں کریں اور جو انجام چاہیں' قبول کریں۔

كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۝۵۴ۚ فَمَنْ شَاۗءَ ذَكَرَهٗ ۝۵۵ۭ

"ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے' اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کرلے"۔

یہ قرآن جس کے سننے سے یہ لوگ منہ موڑ رہے ہیں اور اس طرح بھاگ رہے ہیں جس طرح جنگلی گدھے بھاگتے ہیں۔ جبکہ ان کے دل حسد اور لالچ سے بھرے ہیں۔ اور آخرت کے بارے میں یہ لوگ لاپرواہ ہیں۔ یہ تو ایک تذکرہ اور تنبیہ اور نصیحت ہے۔ جو چاہے یہ نصیحت حاصل کرے۔ جو نہ چاہے نہ کرے۔ نفع نقصان ہر کسی کا اپنا ہے۔ جو چاہے عزت اور جنت حاصل کرے اور جو چاہے ذلت اور جہنم حاصل کرے۔

یہ بات کہنے کے بعد کہ لوگ نیک و بد کے اختیار کرنے میں آزاد و مختار ہیں۔ یہ حقیقت بھی سامنے لائی جاتی ہے کہ ان کی یہ آزادی اور اختیار دائرہ مشیت الٰہیہ کے اندر ہے اور اللہ کی مشیت بے قید ہے۔ اور انجام کار تمام امور اللہ کے

دائرہ اختیار ہی میں ہیں ۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن ہر موقعہ و مناسبت میں واضح کرتا ہے تاکہ انسان یہ نہ سمجھ لے کہ اللہ کی مشیت محدود ہے ۔ مطلب یہ کہ انسانی اختیار بھی دائرہ مشیت کے اندر ہی ہوتا ہے اور تمام واقعات اللہ کے حکم و مشیت سے وقوع پذیر ہوتے ہیں ۔ ۲

وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۝ ۵۶ ع
۱۶

”اور یہ کوئی سبق حاصل نہ کریں گے الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے ۔ وہ اس کا حقدار ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے اور وہ اس کا اہل ہے کہ (تقویٰ کرنے والوں کو) بخش دے“۔

اس کائنات میں جو چیز بھی واقع ہوتی ہے اللہ کے عظیم تر نظام مشیت میں بندھی ہوتی ہے ۔ اللہ کے ارادے اور مشیت ہی کے رخ پر اور اس کے وسیع دائرے کے اندر واقعات چلتے ہیں ۔ لہٰذا کسی انسان سے کوئی فعل اللہ کی مشیت کے بغیر سرزد نہیں ہو سکتا ۔ زمین کی تمام قدروں کو مشیت الٰہیہ اپنے دائرے کے اندر لیے ہوئے ہوتی ہے ۔ کیونکہ تمام قدریں اللہ کی مشیت کی پیدا کردہ ہیں اور انسان اور نوامیس فطرت اللہ کے پیدا کردہ ہیں ۔ اس کائنات میں جو واقعات چلتے ہیں وہ مشیت الٰہیہ کی ریل کے اندر ہی چلتے ہیں جس پر کوئی حد اور قید نہیں ہے ۔ اس ریل کے اندر ہر انسان آزاد بھی ہے اور بند بھی ۔

تذکر اور نصیحت آموزی تو اللہ کی توفیق کے مطابق ہوتی ہے ۔ اللہ جانتا ہے کہ کون اس کا مستحق ہے ۔ دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتے ہیں ۔ اللہ جس طرف چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے ۔ اگر اللہ جان لے کہ یہ شخص اچھی نیت کا مالک ہے تو اللہ اسے اچھائی کی طرف پھیر دیتا ہے ۔

لیکن انسان کو کوئی پتہ نہیں ہے کہ اللہ کیا چاہتا ہے؟ اللہ کی چاہت تو پردۂ غیب میں ہے ۔ البتہ اس کو یہ معلوم ہے کہ اللہ کی رضا کیا ہے؟ کس میں ہے؟ اور یہ بات اللہ نے قرآن میں بتا دی ہے کہ اللہ کی رضا کس میں ہے؟ جب انسان اللہ کی مرضی کے راستے کی طرف بڑھتا ہے تو اللہ اسے مزید آگے بڑھنے کی توفیق دیتا ہے ۔

لیکن اللہ تعالیٰ ایک مومن کے احساس کے اندر جس چیز کو اچھی طرح بٹھانا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی مشیت بے قید ہے ۔ اور یہ کہ اللہ کی مشیت اسے گھیرے ہوئے ہے' تاکہ ایک مخلص بندے کی تمام تر توجہ اللہ کی ذات پر مرکوز رہے ۔ اور ایک مسلم پوری طرح اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کیے رکھے ۔ یہ ہے وہ بنیادی حقیقت جسے ذہن نشین کیے بغیر اسلام کسی انسان کے دل میں جاگزیں نہیں ہو سکتا ۔ اور جب یہ کیفیت ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جائے اور انسانی قلب و نظر اس میں سرشار ہو جائیں اور انسان زندگی کے تمام واقعات اور حادثات کی تعبیر اس تصور کے مطابق کرنے لگے تو وہ صحیح طرح مسلم ہوتا ہے ۔ یہی مقصد ہے اللہ کی مشیت کے بے قید ہونے کا اور اللہ کی مشیت کا یہ اطلاق قرآن میں ہر فیصلے کے ساتھ لایا جاتا ہے ۔ چاہے جنت اور دوزخ کا فیصلہ ہو' چاہے کسی شخص کی ہدایت و ضلالت کا فیصلہ ہو ۔

رہا وہ تاریخی اور کلامی مجادلہ و مباحثہ جو انسان کے جبر و اختیار کے بارے میں چلا' تو وہ پوری حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا' وہ دراصل کلی حقیقت کے ایک جزء کو لیتا ہے اور اس کی وجہ سے فکر انسانی کبھی تشفی بخش قول تک کبھی نہیں پہنچ سکا ۔ کیونکہ یہ مباحثہ و مجادلہ قرآن کے صحیح اور سادہ راہوں سے ہٹ کر نہایت ہی پیچیدہ راہوں پر جا نکلا اور جس قدر یہ مباحثہ آگے بڑھا' فکر انسانی کی تگ و تازی کی راہیں تنگ ہوتی رہیں ۔

وَ مَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۷۴ : ۵۶) "اور یہ کوئی سبق حاصل نہ کریں گے ۔ الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے"۔ کیونکہ وہ اللہ کی مشیت کے نظام سے متصادم نہیں ہو سکتے ۔ اور نہ وہ کسی حیثیت میں کوئی مخالفانہ حرکت کرتے ہیں ۔ انسان کی حرکت اور انسان کا ارادہ بھی وسیع تر دائرہ مشیت کے اندر ہی ہوتا ہے ۔

هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى (۷۴ : ۵۶) "وہ اس کا حقدار ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے"۔ اللہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کے بندے اس سے ڈریں' اس لیے ان سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں ۔

وَ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ (۷۴ : ۵۶) "اور وہ اس بات کا اہل ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو بخش دے"۔
اور یہ کرم وہ جن بندوں پر چاہتا ہے' کرتا ہے اور اللہ کا کرم اس کے نظام مشیت کے مطابق ہوا کرتا ہے ۔ تقویٰ ہی انسان کو مغفرت کا اہل بناتا ہے ۔ اور اللہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے ۔

هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ (۷۴ : ۵۶) "وہ اس بات کا حق دار ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے اور وہ اس کا اہل ہے تقویٰ کرنے والوں کو بخش دے"۔

---000---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۲۹

سورۃ القیامۃ ۔ ۷۵

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۴۰

سورۃ القیامۃ ایک نظر میں

یہ ایک چھوٹی سی سورت ہے ' لیکن انسان کے دل و دماغ پر یہ اس قدر حقائق و دلائل ' تصاویر اور مناظر اور اثرات و اشارات کا القا کرتی ہے جن کا کوئی انسان نہ دفاع کر سکتا ہے اور نہ ان سے صرف نظر کر سکتا ہے ۔ ان مناظر اور تاثرات کو یہ سورت نہایت ہی قوت کے ساتھ ' اپنے خاص قرآنی اسلوب میں ' نہایت بھرپور انداز میں اور بڑی کثرت سے پیش کرتی ہے ۔ انداز تعبیر بھی نہایت پرشوکت ' نہایت ہی مترنم اور نہایت ہی معنی خیز ہے ۔ اگر کوئی اسے کھلے دل اور شعور کے ساتھ پڑھے تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔

پہلی دو آیات میں قیام قیامت اور نفس لوامہ کی قسم کی طرف اشارہ ہے ۔

لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (۱) وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۷۵ : ۲) "میں قسم نہیں کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور میں قسم نہیں کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی" ۔ اس کے بعد قیامت اور نفس لوامہ دونوں کے متعلق مباحث آتے ہیں اور سورت کے اختتام تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ قیامت اور ملامت کرنے والے نفس کے موضوعات ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ گویا قسم نہ کھانے کا اعلان قسم کی طرف اشارہ ہے ۔ اور دونوں نکات موضوع سورت ہیں ۔ گویا دونوں واقعات کے درمیاں ایک خوبصورت اور گہرا ربط ہے ۔

ان بڑے حقائق میں سے جو اس سورت میں لائے گئے ' اور جن کے ذریعہ قلب انسانی کے گرد ایسا حصار ڈالا گیا ہے کہ اس سے اس کے بھاگنے کا کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا گیا ۔ ایک حقیقت یہ ہے کہ موت ایک ایسا حادثہ ہے جس سے ہر انسان کو دوچار ہونا ہے ۔ کوئی اسے روک نہیں سکتا ۔ نہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے ۔ اس کا وقوع ہر لمحہ ہوتا رہتا ہے ۔ بڑے ' چھوٹے ' بڑے امیر و فقیر ' قوی اور ضعیف سب اس سے دوچار رہتے ہیں ۔ اس کے مقابلے میں کسی کے پاس نہ کوئی حیلہ ہے اور نہ وسیلہ ' نہ قوت مدافعت ہے اور نہ سفارش ۔ نہ تقدیم ہے اور نہ تاخیر ۔ یہ فیصلہ ایک ایسے پلیٹ فارم سے آتا ہے جہاں کسی کا کوئی زور نہیں چلتا اور ماسوائے سر تسلیم خم کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا ۔ اس بارگاہ کا ارادہ اٹل ہے ۔ یہ بہت ہی بلند ارادہ اور اونچی بارگاہ ہے ۔ غرض یہ سورت انسانی دلوں کی یوں چٹکیاں بھرتی ہے :

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ (۲۶) وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ (۲۷) وَّ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ (۲۸) وَ الْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (۲۹) اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ (۳۰) (۷۵ : ۲۶ تا ۳۰) "ہرگز نہیں ' جب جان حلق تک پہنچ جائے گی ' اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ' اور آدمی سمجھ

لے گا کہ یہ دنیا سے جدائی کا وقت ہے اور پنڈلی سے پنڈلی جڑ جائے گی ۔ وہ دن ہو گا تیرے رب کی طرف روانگی کا"۔

یہ سورت جو حقائق پیش کرتی ہے ' ان میں سے ایک انسان کی پہلی پیدائش ہے اور یہ پہلی تخلیق دراصل دوسری تخلیق پر دلیل ہے ۔ اور یہ کہ انسان کی تخلیق کے پیچھے تدبیر بھی ہے اور تقدیر بھی ہے ۔ یہ ایک ایسی نمایاں حقیقت ہے جس کے مراحل کو اللہ تعالیٰ نہایت تفصیل کے ساتھ بتاتا ہے ۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخلیق کس قدر پیچیدہ ہوتی ہے اور اس پر ہر وقت ذات باری کو قدرت حاصل ہے ۔ اور جو لوگ آخرت کی تکذیب کرتے ہیں وہ بھی تخلیق انسان کا دعویٰ نہیں کر سکتے ۔ یہ تخلیق اس بات کو قطعیت کے ساتھ طے کرتی ہے کہ ایک الٰہ ہے جو ان امور کی تدبیر کرتا ہے اور یہ سب امور اس کی تقدیر اور اندازے کے مطابق ہیں ۔ لہٰذا دوبارہ تخلیق اس دنیا کے معاملات کا حتمی اور لازمی نتیجہ ہے کیونکہ اللہ نے انسان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا اور نہ اللہ کے نزدیک انسانوں کی زندگی اور ان کے اعمال بلاوزن ہیں ۔ اور نہ حساب و کتاب سے آزاد ہیں ۔ یہ ہیں وہ موثرات جن کے ذریعہ یہ سورت انسان کے احساسات کو جگاتی ہے ۔

چنانچہ اس بحث کے آغاز ہی میں کہا جاتا ہے :

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (٣٦) اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى (٣٧) ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى (٣٨) فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى (٣٩) اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى (٤٠) (٧٥: ٣٦ تا ٤٠) "کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا' پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے' پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں ۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے"۔

اس سورت کے موثر ترین مناظر میں سے 'قیام قیامت کا منظر ہے ۔ اس منظر کا قلب انسانی پر بے حد گہرا اثر ہوتا ہے ۔ اس منظر میں قیام قیامت کے وقت کے کائناتی انقلابات 'نفسیاتی تغیرات' اور خوف و ہراس کی فضا کا بیان ہے 'جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف و ہراس کائنات کی روح پر چھا گیا ہے اور نفس انسانی کی گہرائیوں تک جا پہنچا ہے ۔ نفس انسانی کی حالت یوں ہے کہ وہ یوں اچھل کود رہا ہے جس طرح پنجرے میں بند چوہا اچھل کود رہا ہوتا ہے اور ادھر ادھر سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے ۔ یہ منظر انسانوں کے اس قول کے جواب میں پیش کیا گیا ہے کہ قیامت ممکن نہیں ہے اور یہ پردۂ غیب میں مستور ایک چیز ہے ۔ انسان اسے اہم نہیں سمجھتا اور اس کے بارے میں شک کا اظہار کرتا ہے اور اس کے بارے نہایت فاسقانہ تبصرہ کرتا ہے ۔ چنانچہ نہایت ہی سرعت سے قیامت کی چند تیز رفتار جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں ۔

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ (٥) يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ (٦) فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (٧) وَخَسَفَ الْقَمَرُ (٨) وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (٩) يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ

اَیْنَ الْمَفَرُّ (۱۰) کَلَّا لَا وَزَرَ (۱۱) اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ (۱۲) یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ (۱۳) بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ (۱۴) وَّ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (۱۵) (۷۵: ۵ تا ۱۵) "میں قسم نہیں کھاتا ہوں قیامت کے دن کی' اور میں قسم نہیں کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی 'کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں ۔ مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے ۔ پوچھتا ہے "آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن؟" پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے ۔ اس وقت یہی انسان کہے گا "کہاں بھاگ کر جاؤں؟" ہرگز نہیں' وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہو گی' اس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہو گا ۔ اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے"۔

ان مناظر میں سے ایک منظر مومنین کا بھی ہے جو اپنے رب کے سامنے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ کھڑے ہیں ۔ وہ مشتاقان دید ہیں' حالانکہ یہ دن ایسا ہے کہ جس کے اندر ہر طرف خوف و ہراس کی فضا ہے اور مومنین کے بالمقابل ایسے لوگوں کا منظر ہے جو اللہ سے ڈرے ہوئے ہیں' ناامید ہیں اور انہوں نے جو کفر اور معصیت کی ہے اس کے انجام کی توقع وہ رکھتے ہیں ۔ یہ منظر اس قدر پرشوکت ہے کہ گویا وہ آنکھوں کے سامنے نظر آتا ہے ۔ یہ منظر ان لوگوں کی تردید میں ہے جو آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دیتے ہیں ۔ یہ منظر یوں ہے :

کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ (۲۰) وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (۲۱) وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ (۲۲) اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (۲۳) وَ وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌ (۲۴) تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ (۲۵) (۷۵: ۲۰ تا ۲۵) "ہرگز نہیں' اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو ۔ اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے' اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے اور کچھ چہرے اداس ہوں گے اور سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ برتاؤ ہونے والا ہے"۔

اس سورت کے ان مشاہد' تاثرات اور دلائل کے درمیان چار آیات کا ایک نکتہ معترضہ ہے ۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ایک خاص ہدایت کی گئی ہے ۔ یہ ہدایت اس قرآن کے بارے میں ہے اور یہ نکتہ بھی اس سورت کے اندر موجود ایک مناسبت کی وجہ سے آیا ہے 'کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس بات کا خوف کیا کرتے تھے کہ کہیں آپ وحی کی کوئی چیز بھول نہ جائیں ۔ چنانچہ آپ وحی وصول کرتے وقت فقرہ فقرہ دہراتے تھے ۔ اور زبان کو حرکت میں لاتے تھے تاکہ اسے یاد کرلیں ۔ چنانچہ یہ ہدایت دی گئی :

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ (۷۵: ۱۶) اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ (۷۵: ۱۷) فَاِذَا

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۷۵: ۱۹) (۷۵: ۱۶ تا ۱۹) "اے نبی ﷺ اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو' اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے' لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں' اس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو' پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے"۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (۷۵: ۱۸)

یہ یقین دہانی اس لیے کرائی گئی کہ یہ وحی' اس کا نزول اور اس کی حفاظت' اس کا جمع کرنا اور اس کا سمجھانا اور بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ یہ اللہ کا کام ہے۔ آپ کا کام صرف اخذ کرنا اور تبلیغ کرنا ہے۔ لہٰذا آپ مطمئن رہیں اور آپ کے دل میں بھول جانے کے بارے میں جو خدشات ہیں ان کو نکال دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قرآن کی تعلیم بھی آج تک ویسی ہی موجود ہے کیونکہ یہ اللہ کا فرمان تھا اور اللہ کا فرمان اسی طرح حقیقت بنتا ہے جس طرح فرمان ہوتا ہے۔ اسے کوئی رد نہیں کر سکتا۔ یہ اللہ کا فرمان ہے اور کتاب اللہ کا حصہ ہے۔ لہٰذا کلام الٰہی کے حفظ میں شک کرنا کفر ہے۔ قرآن نے یہ ہدایت اس سورت میں اس مقام پر اس لیے دی ہے کہ قرآن بھی اللہ کے دوسرے کلمات کی طرح ایک کلمہ ہے اور اللہ کے کلمات اور جہالت میں تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے۔ جس طرح اللہ کے کائناتی قوانین میں تغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح قرآن کے کلمات میں بھی تغیر ممکن نہیں اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے اس لیے قرآن کا کوئی ایک حرف بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ حق ہے' سچ ہے' نہایت اہم اور قابل قدر ہے۔

اس سورت کو پڑھتے ہوئے قلب انسانی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ گھیر لیا گیا ہے' اور اب اس کے سامنے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ اس سورت کی عملیات میں گھر گیا ہے۔ اب اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ ہے' اور نہ کوئی بچانے والا ہے۔ اس کی پیدائش' اس کی تربیت اور قدم بقدم اس کا آگے بڑھنا اللہ کے علم کے مطابق ہے۔ چاہے یہ بڑھنا پہلی پیدائش میں ہو یا دوسری میں۔ حالانکہ اس کی حالت یہ ہے کہ وہ لہو و لعب میں گرفتار ہے اور اس دنیا سے دھوکہ کھائے ہوئے ہے اور اپنے آپ کو کوئی چیز سمجھتا ہے۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى (۳۱) وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (۳۲) ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى (۳۳) (۷۵: ۳۱ تا ۳۳) "مگر اس نے نہ سچ مانا اور نہ نماز پڑھی' بلکہ جھٹلایا اور پلٹ گیا' پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔

لیکن ان حقائق' دلائل' اشارات اور احساسات کے اندر بالواسطہ تہدید اور ڈراوا بھی لپٹا ہوا ہے۔

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى (۳۴) ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى (۷۵: ۳۵) "یہ روش تیرے لیے سزاوار ہے' اور تجھے زیب دیتی ہے' ہاں یہ روش تیرے لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے"۔ یوں اس ڈراوے کا خوب اثر ہوتا ہے اور وہ خوب بامعنی ہوتا ہے۔

یوں یہ سورت قلب انسان کی غفلت' اس کے اعراض اور ہٹ دھرمی اور غفلت کا علاج کرتی ہے اور اسے ایک صحیح تصور دیتی ہے۔ پھر یہ سورت اس قرآن کریم کے بارے میں بھی ایک دو ٹوک بات کرتی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ عظیم اور جلیل کا کلام اور حکم ہے۔ کیونکہ یہ پوری کائنات اللہ کے کلمات کے ہمقدم ہے۔ اور

اللہ کے کلمات اس پوری کائنات کی عملی کتاب میں ثبت ہیں ۔ جن کے مطابق یہ کائنات رواں دواں ہے اور دوسری جانب یہ کلمات اس کتاب میں ثبت ہیں جو نہایت ہی مکرم کتاب ہے ۔

ہم نے یہ حقائق اور مناظر الگ سے محض تبصرے کے لیے بیان کیے ہیں لیکن جب ان کو اس سورت کے اندر پڑھا جائے تو یہ پھر ایک دوسری چیز معلوم ہوتے ہیں ۔ کیونکہ سیاق کے اندر جب یہ حقائق پے درپے آتے ہیں اور ان کے ساتھ دوسرے عوامل ملتے ہیں تو یہ ایک باشعور دل کو جگہ جگہ چٹکیاں بھرتے ہیں ۔ کبھی ایک پہلو سامنے آتا ہے تو کبھی نگینے کا دوسرا رخ چمکتا ہے ۔ یہ قرآن کریم کا خاص اسلوب ہے کہ جب وہ قلب بشر سے مخاطب ہوتا ہے تو وہ اس کے اندر وہ اثرات چھوڑتا ہے جو کسی دوسرے اسلوب کلام میں نہیں ہوتے ۔ آج تک کوئی دوسرا طریقہ تکلم اور تحریر اس اسلوب کا سا اثر نہیں دکھا سکا ۔

اب ذرا سورت کا سامنا کیجئے ۔ خود سیاق سورۃ میں اس کا مخصوص مزہ لیجئے ۔

---○○○---

درس نمبر ۲۷۵ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۴۰

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ مَكِّيَّةٌ (۳۱) — آيَاتُهَا ۴۰ — رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (۱) وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۲) أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ
أَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهُ (۳) بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى أَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ (۴) بَلْ يُرِيْدُ الْإِنْسَانُ
لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ (۵) يَسْـَٔلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ (۶) فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (۷) وَخَسَفَ الْقَمَرُ (۸)
وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (۹) يَقُوْلُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ (۱۰) كَلَّا لَا وَزَرَ (۱۱) إِلٰى
رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ (۱۲) يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ (۱۳) بَلِ الْإِنْسَانُ
عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ (۱۴) وَّلَوْ أَلْقٰى مَعَاذِيْرَهُ (۱۵)

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"میں قسم نہیں کھاتا ہوں قیامت کے دن کی' اور میں قسم نہیں کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی' کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے۔ پوچھتا ہے "آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن؟" پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت یہی انسان کہے گا "کہاں بھاگ کر جاؤں؟" ہرگز نہیں' وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہو گی' اس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہو گا۔ اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے"۔

قسم کی طرف اشارہ کرنا اور قسم نہ کھانا زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے اور یہی اثر آفرینی یہاں مقصود ہے۔ اور اس انداز سے یہ مقصد اچھی طرح حاصل ہوتا ہے اور یہ انداز قرآن کریم میں بار بار دہرایا جاتا ہے اور اس کے بعد پھر حقیقت قیامت اور ملامت کرنے والے نفس کی حقیقت بیان کی جاتی ہے۔

قیامت کی حقیقت کے بارے میں اس سورت میں مکرر بات کی گئی ہے۔ لیکن نفس لوامہ کیا ہے؟ اس کے بارے میں تفاسیر ماثورہ میں کئی اقوال مذکور ہیں۔ حضرت حسن بصری سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ تم جب بھی دیکھو ایک سچا آدمی ہمیشہ اپنے آپ کو ملامت کرے گا کہ میری بات کا کیا مطلب تھا؟ میرے کھانے کا مقصد کیا ہے؟ اور میری بات کا فائدہ کیا ہے؟ رہا فاجر تو اپنی راہ پر آگے ہی بڑھتا ہے اور اپنے آپ کو کسی مرحلے پر بھی ملامت نہیں کرتا۔ اور حضرت حسن سے روایت ہے کہ زمین و آسمان کے باشندوں میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا' جو اپنے آپ کو قیامت کے دن ملامت نہ کرے گا۔ حضرت عکرمہ سے روایت ہے کہ تم خیر اور شر دونوں پر ایک دوسرے کو ملامت کرو گے کہ لے کاش کہ میں ایسا ایسا کرتا۔ اور یہی روایت سعید ابن جبیر سے ہے اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ اس سے نفس لوّم مراد ہے۔ اور ان ہی سے روایت ہے کہ وہ ملامت زدہ نفس جو کسی مذموم بات پر ملامت کیا جائے اور مجاہد سے روایت ہے کہ وہ نفس جو ان امور پر نادم ہو جو فوت ہو گئے ہوں اور اپنے آپ کو ملامت کرے۔ قتادہ کہتے ہیں لوامہ وہ نفس ہے' جو فجور کا ارتکاب کرے۔ ابن جریر کہتے ہیں یہ سب اقوال قریب المعنی ہیں اور زیادہ قریب یہ مفہوم ہے کہ نفس لوامہ سے وہ نفس مراد ہے جو اپنے آپ کو خیر اور شر پر ملامت کرے اور جو خیر رہ جائے اس پر نادم ہو۔

ہمارے خیال میں حسن بصری کا قول زیادہ بہتر ہے کہ نفس لوامہ وہ ہے جو ملامت کرتا ہے کہ ”خدا کی قسم ایک مومن کو جب بھی تم دیکھو وہ اپنے آپ کو ملامت ہی کرتا ہے کہ میں نے جو بات کی اس کا کیا مقصد ہے؟ میں نے جو کھایا اس کا کیا مقصد ہے' اور میں نے جو کچھ سوچا اس کا کیا مقصد ہے۔ اور فاسق و فاجر بس آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ اپنی کسی بات پر اپنے آپ کو ملامت نہیں کرتا“۔

تو نفس لوامہ وہ ہے جو بیدار ہے' خدا کا خوف رکھنے والا ہے' ہر وقت محتاط اور اپنا حساب رکھنے والا' جو اپنے ماحول پر نظر رکھتا ہو' وہ اپنی خواہشات پر نظر رکھتا ہو اور ہر وقت اس بات سے محتاط ہو کہ کہیں دھوکہ نہ کھا جائے۔ یہ نفس اللہ کے ہاں قابل قدر ہے۔ اور اس کا ذکر قیامت کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور یہ نفس فاجرہ کے بالمقابل ہوتا ہے۔ نفس فاجرہ وہ ہوتا ہے جو آگے بڑھتا رہتا ہے۔ فسق و فجور میں گم ہوتا ہے' جس کی صفات یہ ہوتی ہیں کہ وہ جھوٹ بولتا ہے' روگردانی کرتا ہے' اور نہایت غرور سے اپنے اہالی و موالی کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنا محاسبہ نہیں کرتا۔

لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (١) وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (٢) (٧٥ : ١ – ٢) ”میں قسم نہیں کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور میں قسم نہیں کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی“۔ یعنی وقوع قیامت پر قسم نہیں اٹھاتا' یہاں اللہ نے قسم اٹھانے کی بھی نفی کی اور اس بات کو بھی حذف کر دیا کہ کس بات پر قسم نہیں اٹھائی جارہی لیکن جس بات کی قسم اٹھائی جارہی ہے اس کا ذکر ایک دوسرے انداز میں کر دیا گیا۔ گویا یہ نئی بات ہے اور قسم کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ (۳) بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰی اَنْ نُّسَوِّیَ

بَنَانَهٗ (٤) (۷۵: ۳ – ٤) کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں"۔ مشرکین مکہ اس شعوری خلجان میں مبتلا تھے کہ پرانی ہڈیوں کو کس طرح یکجا کر کے انسان بنا دیا جائے گا جبکہ یہ ریزہ ریزہ ہو کر مٹی میں مل گئی ہوں اور زمین میں بکھر گئی ہوں' کس طرح انسان کو بعینہٖ اسی طرح دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ اور یہ خلجان آج تک بعض دلوں میں موجود ہے۔ قرآن کریم اس کی تردید نہایت تاکید کے ساتھ کرتا ہے کہ ہاں ایسا ہی ہو گا اور لازماً ہو گا۔

بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ (۷۵: ٤) "کیوں نہیں ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں"۔ بنان انگلیوں کے اگلے سرے کو کہتے ہیں۔ مفہوم کے اندر تاکید یوں پیدا کی جاتی ہے کہ ہڈیوں کو ہم تو پورے پورے تک بنا دیں گے اور جب کوئی ایک ایک پور ابنا سکتا ہے اس کے لیے ہڈیاں جمع کرنا کیا مشکل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان کے ایک ایک جزء کو دوبارہ جمع کر دیا جائے گا اور کوئی جز نہ رہ جائے گا۔ پورے کا پورا آموجود ہو گا' خواہ چھوٹا حصہ ہو یا بڑا۔

یہاں تو یہ کہہ دیا' لیکن سورت کے آخر میں دوبارہ تخلیق پر ایک دوسری دلیل بھی لائی گئی ہے۔ یہاں تو صرف ان کے خلجان اور اس کے ظاہری سبب کا اظہار کر دیا گیا کہ یہ لوگ ہڈیوں کے جمع ہونے کی توقع نہیں رکھتے۔ انسان دراصل فسق و فجور کی خواہش رکھتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اس فسق و فجور میں آگے ہی جاتا رہے۔ اور کوئی چیز اسے روکنے والی نہ ہو اور نہ اس کو حساب و کتاب کا سامنا کرنا پڑے اور نہ جزاء و سزا کا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وقوع قیامت کو مستبعد سمجھتا ہے اور قیامت کے وقوع سے فرار کی راہ ڈھونڈتا ہے۔

بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ (۵) یَسْئَلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ (٦) (۷۵: ۵ – ٦)

"مگر انسان چاہتا یہ ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے۔ پوچھتا ہے "آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن؟" یہاں سوال لفظ "ایان" سے لیا گیا ہے۔ یہ لفظ مشدد اور مترنم ہے۔ اور اس شد اور ترنم سے دراصل اشارہ ہے۔ اس طرف کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی اور یہ سوچ ان لوگوں کو اس لیے کہ یہ فسق و فجور میں آگے ہی بڑھتے رہیں اور بعث بعد الموت اور جواب دہی کا تصور انہیں نہ روک سکے۔ اور نہ ان کی زندگی کو مکدر کر سکے۔ درحقیقت تصور آخرت ہی وہ چیز ہے جو اس قسم کے احساس کو لگام دے سکتا ہے۔ اور محبان فسق و فجور کو روک سکتا ہے۔ ایسے لوگ اس قسم کی رکاوٹوں اور فسق و فجور کی بندشوں کو بلا روک و ٹوک جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

قیامت کے وقوع کے بارے میں ہٹ دھرمی اور اسے مستبعد سمجھنے کا جواب یہاں نہایت شتابی کے ساتھ' فیصلہ کن انداز میں دیا گیا اور یوں دیا گیا کہ اس میں شک ہی نہ رہے۔ اس جواب میں انسانی حواس' انسانی شعور اور کائناتی مشاہد پیش کیے گئے۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (۷) وَخَسَفَ الْقَمَرُ (۸) وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (۹) یَقُوْلُ

الْاِنسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ (۱۰)(۷۵:۷ تا ۱۰) "پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے ۔ اس وقت یہی انسان کہے گا "کہاں بھاگ کر جاؤں؟" جب بجلی چمکتی ہے تو نظر چندھیا جاتی ہے اور جلدی لوٹ آتی ہے ۔ اور جب سورج خسف کا شکار ہوتا ہے تو بے نور ہو جاتا ہے اور سورج اور چاند دور ہیں لیکن یہ باہم مل جائیں گے اور اس طرح تمام فلکی انتظام مختل ہو جائے گا اور ایک خوفناک اور انقلابی صورت حالات ہو گی اس وقت ہر انسان باہم ایک دوسرے سے سوال کریں گے ۔

اَیْنَ الْمَفَرُّ (۷۵:۱۰) "بھاگنے کی جگہ کہاں ہے"۔ اور انسان اس جزع فزع میں پھر ہر طرف بھاگتا پھرے گا۔ جس طرح چوہا پنجرے میں بند ہو جاتا ہے اور ہر طرف بھاگتا رہتا ہے ۔ اب نہ جائے فرار ہے' نہ جائے پناہ ہے' نہ آگے جا سکتے ہیں اور نہ پیچھے۔

کَلَّا لَا وَزَرَ (۱۱) اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ (۷۵:۱۲) "ہرگز نہیں وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہو گی اس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہو گا"۔

اس دن یہ صورت حالات نہ ہو گی جو انسان چاہتا ہے کہ بلا حساب و کتاب وہ فسق و فجور کے راستے پر آگے بڑھے اور کوئی پوچھنے والا نہ ہو' بلکہ اس دن تو پورا پورا محاسبہ ہو گا اور اس نے اپنے جو اعمال بھولے ہوں گے ان کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا۔ اور جب وہ یاد کرے گا تو پھر جزاء و سزا ہو گی ۔

یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ (۷۵:۱۳) "اس روز انسان کو اس کا اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا"۔ یعنی وہ اعمال جو اس نے اپنی وفات سے پہلے کیے اور وہ آثار جو اس نے مرنے کے بعد چھوڑے ۔ خواہ اچھے آثار ہوں یا برے آثار ہوں کیونکہ انسان کے بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں جن کے آثار باقی رہتے ہیں اور وہ اس کے اعمال میں اضافہ کرتے رہتے ہیں ۔

پھر وہاں انسان جو عذرات بھی پیش کرے گا' اس کا کوئی عذر بھی قبول نہ ہو گا کیونکہ وہ اپنے کیے کا ذمہ دار ہو گا۔ نفس انسانی کو اللہ نے خیر و شر کی ہدایت کر دی ہے ۔ اگر نفس انسان کو خیر تک لے جائے تو اچھا انجام ہو گا اور اگر شر تک لے جائے تو اس کا محاسبہ ہو گا۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ (۷۵:۱۴) وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (۷۵:۱۵) "بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے ۔ چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے"۔ یہاں یہ بات نوٹ کیے جانے کے قابل ہے کہ اس سورۃ میں ہر چیز نہایت تیز رفتاری سے چل رہی ہے ۔ فقرے' قافلے' موسیقی اور ترنم' مناظر اور چمک دمک' اسی طرح حساب و کتاب بھی سرعت سے ہو گا۔ مقدم اور موخر سب کچھ سامنے ہو گا اور یہ اس لیے کہ وہ ایان سے سوال کر کے قیامت کو بہت دور اور بہت ناممکن سمجھتے تھے ۔

اب چار آیات آتی ہیں جو قرآن مجید کے بارے میں آپ کو ہدایات دے دی ہیں اور یہ جملہ معترضہ ہیں ۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖؕ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗۚۖ ﴿۱۷﴾
فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗۚ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗؕ ﴿۱۹﴾

"اے نبی ؐ 'اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو 'اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے 'لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں 'اس وقت تم اس کی قرات کو غور سے سنتے رہو 'پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے"۔

ان آیات کے بارے میں ہم نے سورت کے مقدمہ میں جو کچھ کہہ دیا ہے اس پر اس قدر اضافہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کے حفظ و حفاظت کا کام اللہ نے مطلقاً اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اللہ اس بات کا ضامن ہے کہ قرآن زندہ رہے گا 'محفوظ رہے گا 'جمع وتدوین مکمل ہوگی اور اس کی تشریح بھی اللہ کرے گا۔ مکمل ذمہ داری اللہ پر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذمہ داری فقط یہ ہے کہ آپ اسے اٹھائیں اور لوگوں تک پہنچا دیں۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ حضور اکرم ﷺ اخذ وحی کے لیے بیتاب ہو جاتے تھے اور آپ جلدی سے سب کے سب قرآن کا اخذ اور حفظ چاہتے تھے۔ اور اس بارے میں بے حد سنجیدہ تھے کہ اس کا کوئی کلمہ رہ نہ جائے۔ اس لیے آپ جلدی جلدی دہراتے تھے 'تو آپ کو یہ ہدایت کی گئی کہ آپ زبان سے دہرانے کی کوشش نہ کریں 'حفاظت اللہ کی ذمہ داری ہے۔

یہ بات قرآن کے اندر کئی جگہ ریکارڈ کی گئی ہے 'اس لیے کہ خدا تعالیٰ یہ بات مسلمانوں کے ذہن میں بٹھانا چاہتا تھا کہ قرآن کا حفظ اور جمع بہت اہم ہے۔ جس کی طرف ہم نے سورت کے مقدمہ میں اشارات کیے ہیں۔

اس جملہ معترضہ کے بعد اب سورت میں قیامت کے مناظر آتے ہیں کہ نفس لوامہ کا اس میں کیا حال ہو گا۔ ان مناظر میں یہ بات یاد دلائی جاتی ہے کہ اس دنیا کے بارے میں تمہارے نفوس کے اندر کیا کیا امنگیں آتی ہیں 'کس طرح تم دنیا کے اندر مگن ہو اور آخرت کو بھولے ہوئے ہو۔ اور آخرت کی پرواہ ہی نہیں کرتے ہو۔ ذرا دیکھو تو سہی کہ وہاں تمہاری کیا گت بننے والی ہے۔ ایک نہایت ہی زندہ اور متحرک منظر میں اس حالت کو انسانوں کے سامنے رکھا جاتا ہے جو نہایت ہی موثر اور اشاراتی ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَۙ ﴿۲۰﴾ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَؕ ﴿۲۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌۙ ﴿۲۲﴾
اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌۚ ﴿۲۳﴾ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌۙ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌؕ ﴿۲۵﴾

"ہرگز نہیں 'اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔ اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے 'اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے اور کچھ چہرے اداس ہوں گے اور سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمرتوڑ برتاؤ ہونے والا ہے"۔

انداز بیان میں جو پہلی بات نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں دنیا کے لیے عاجلہ کا لفظ استعمال کیا ہے 'اس لفظ

کے مفہوم میں ایک بات تو یہ ملحوظ ہے کہ یہ دنیا جلدی ختم ہونے والی چیز ہے۔ اور اصل مقصود یہی بتانا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ لفظ اس لیے بھی لایا ہے کہ اس سے قبل قرآن کے بارے میں جملہ معترضہ میں بھی یہ بات کہی گئی تھی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ (۷۵:۱۶) "وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو"۔ اس دنیا اور اس کے ہر کام میں عجلت دراصل اس دنیا کی خصوصیت ہے۔ اور دنیا میں مفادات کے لیے شتابی اور قرآن کو جلد یاد کرنے کے لیے عجلت دونوں اس دنیا کے رنگ ہیں۔ یہ قرآن کریم کا نہایت ہی لطیف اور گہرا اشاراتی ہم آہنگی ہے اور یہ قرآنی انداز کلام ہے۔

اب قرآن کریم کا پیش کردہ مصور منظر جو قرآن کا منفرد اسلوب ہے۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ (۲۲) إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (۷۵:۲۳) "اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے"۔ یہ آیت ایک ایسی حالت کی طرف ایک جھلک کی شکل میں تیز اشارہ کر رہی ہے کہ الفاظ کے اندر کسی انسان کے لیے ایسا اشارہ ممکن نہیں ہے۔ نہ انسان اس حالت کا حقیقی ادراک ہی کر سکتا ہے۔ کامیاب اور نیک بخت لوگوں کی حالت کی یہ ایسی تصویر ہے جس کی حالاتی تصویر کشی ممکن ہی نہیں ہے بلکہ اس حالت کے مقابلے میں جنت کی بھی کوئی حقیقت نہیں رہی۔ حالانکہ وہ نعمتوں کی انواع و اقسام سے بھری ہوئی ہے۔ یہ حالت کہ یہ چہرے تروتازہ ہوں گے، اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ رب کی طرف دیکھ رہے ہوں اور خوش اور مطمئن ہوں۔ یہ ہے بلند ترین مقام سعادت مندی!

اس جہاں میں انسان بعض اوقات اس کائنات اور نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے حسن و جمال سے بے حد لطف اندوز ہوتا ہے۔ انسان مثلاً چاندنی رات میں گم ہوتا ہے۔ اگر چاندنی نہ ہو تو اندھیری رات کا بھی ایک لطف ہوتا ہے۔ پھر نمود سپیدۂ صبح کیا خوبصورتی دکھاتا ہے۔ درختوں کے طویل اور گہرے سائے، سمندر کی پے درپے موجیں، صحراؤں کی دوریاں، باغات کی سرسبزیاں، خوبصورت پھل اور پھول فرحاں و شاداں دل، پختہ ایمانی لمحات، مشکلات کو انگیز کرنا اور دوسری خوبصورتیاں جن سے یہ جہاں پر ہے اور انسان ان سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے اور تصور اور نور کے پروں کے ساتھ اس جہاں میں دوڑتا اور اڑتا پھرتا ہے۔ اور اس قدر خوشی اور سرور پاتا ہے کہ زندگی کے درد اور دکھ بھول جاتا ہے اور مادی اور جسمانی خوشیوں کو بھول جاتا ہے۔ خواہشات نفس اور مادی شوق اور لذت ایک لمحے کے لیے ذہن سے دور ہو جاتے ہیں

لیکن اس کی خوشیوں کا عالم ہی کیا ہو گا جب وہ اللہ کے تخلیق کردہ کمال و جمال کے بھی آگے بڑھ کر ذات باری کے کمالات کو دیکھ رہا ہو اور اللہ کی طرف اس کی نظریں ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مقام تب حاصل ہوتا ہے جب اللہ کی خاص مدد شامل حال ہو، پھر یہ تب حاصل ہوتا ہے کہ جب کسی کو اللہ کی جانب سے ثابت قدمی حاصل ہو۔ انسانوں کو اپنے اوپر کنٹرول حاصل ہو، وہ استقامت کا مالک ہو اور اخروی سعادت مندی سے لطف اندوز ہو رہا ہو، وہ سعادت مندی جس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اور جس کی حقیقت کو پوری طرح سمجھنا ہی مشکل ہے۔

وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ (۲۲) اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ (۷۵: ۲۳) ”بعض چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے“۔ وہ تروتازہ کیوں نہ ہوں جبکہ وہ رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

انسان اس دنیا میں اللہ کی تخلیقات کا نظارہ کرتا ہے' خوبصورت پھل' عجیب و غریب پھول' خوش رنگ اور خوبصورت پرندے اور ان کے بال و پر' خوبصورت روحیں اور اچھے کام اور ان چیزوں کو دیکھ کر اس کا رواں رواں خوش ہوتا ہے۔ اور اس کے چہرے سے خوشی ٹپک رہی ہوتی ہے اور چہرہ تروتازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر انسان اللہ کے کمال اور جمال اور نور ذات کی طرف دیکھ رہا ہو تو اس کی خوشی اور خوش بختی کے کیا کہنے۔ انسان اس مقام تک تب ہی پہنچ سکتا ہے جب وہ ان تمام رکاوٹوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ دور پھینک دے جو اس مقام بلند تک پہنچنے سے روک رہی ہوتی ہیں۔ یہ مقام تب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی ذات اور اپنے ماحول سے تمام نقائص دور کر دے۔ اور وہ اللہ کے سوا کسی چیز کی طرف دیکھ ہی نہ رہا ہو۔

انسان اللہ کی طرف کس طرح دیکھے گا؟ کس عضو سے دیکھے گا؟ کیا آلہ بینائی اسے حاصل ہو گا؟ کیا ذریعہ ہو گا اللہ کے دیکھنے کا؟ تو یہ وہ بات ہے جو ہمارے تصور سے ماوراء ہے۔ یہ ایک تصور ہے جو قلب مومن کو دیا جا رہا ہے۔ ایک فیض ہے جس سے روح مومن فیض یاب ہوگی۔ یہ دنیا کی آلودگیوں سے پاک اور شفاف فیض سعادت ہے' جو مومن کو حاصل ہو گا۔

رہے عقلیت پسند تو وہ اس سے خوشی اور سرور حاصل کرنے کے بجائے ایسی آیات میں مجادلہ شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا' جس طرح وہ خوشی اور اطمینان سے محروم ہوتے ہیں۔ اسی طرح فہم وادراک سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اس جہاں کی باتیں دنیا کی مالوف عقل سے نہیں' ایمان کی قوت مدرکہ سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

انسانی شخصیت کا ارتقاء اور اس کو محدود زمینی شخصیت سے علیحدہ اور بلند کرنا ہی اسے قیامت کے روز لامحدود شخصیت اور ذات برتروبالا سے ملا سکتا ہے۔ اس کے بغیر انسان کے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ وہ لامحدود کے ساتھ کیسے مل سکتا ہے۔ لہٰذا معتزلہ اور اہل سنت کے درمیان رویت باری کے بارے میں جو طویل بحثیں چلیں وہ بالکل لاحاصل تھیں' کیونکہ انسان کی اس زمینی شخصیت اور اخروی شخصیت کے درمیان فرق ہو گا۔

کلمات الٰہیہ کا ہم وہی مفہوم سمجھ سکتے ہیں جو ہماری محدود ذات کے اندر سماتا ہے' جب ہماری شخصیت ہی بدل جائے اور ان محدود تصورات سے بالا ہو جائے تو پھر ان کلمات کا مزاج اور مفہوم ہی بدل جائے گا۔ کلمات تو دراصل رمز ہوتے ہیں ان مفہومات کے لیے جو انسانی تصور میں ہوتے ہیں۔ جب انسانی تصورت کے حدود و قیود بدل جائیں تو کلمات کے مفہوم بھی بدل جائیں گے۔ جب انسانی شخصیت بدل گئی' اس کی قوت مدرکہ کی طاقت بدل گئی تو اس کے ساتھ ساتھ کلمات اور تصورات دونوں بدل جائیں گے۔ اس دنیا میں ان کلمات کا ہم وہ مفہوم سمجھتے ہیں جو ہمارے حسب حال ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں ایسے مفاہیم میں نہیں الجھنا چاہئے جو ہم ان کلمات سے اخذ نہیں کر سکتے۔

بس ہمیں اس سعادت مندی اور اس مقدس خوشی اور سرور کی امید رکھنا چاہئے جس کا ہم اس دنیا کے مفاہیم کے اعتبار سے تصور کر سکتے ہیں۔ اور ہمیں چاہئے کہ ہم اس قسم کے فیوض کے لیے اپنی نظریں عالم بالا کی طرف بلند رکھیں۔ اور اس سے بڑا سرور اور کوئی نہیں ہے۔

وَ وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍۭ بَاسِرَۃٌ (۲۴) تَظُنُّ اَنۡ یُّفۡعَلَ بِہَا فَاقِرَۃٌ (۷۵: ۲۵) ”اور کچھ چہرے

اس دن اداس ہوں گے اور سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ برتاؤ ہونے والا ہے"۔ یہ کون ۔ ۔ چہرے ہوں گے ' جو پریشان 'بدبخت اور سیاہ رو ہوں گے ۔ یہ اللہ کی نظر کرم سے محروم اور نا امید ہوں گے ۔ اور یہ محرومی خود ان کی اپنی غلطیوں اور پسماندگیوں کی وجہ سے ہوگی ۔ ان کی مادیت اور بے بصیرتی کی وجہ سے ہوگی ۔ ان کے چہروں پر رنج و الم اور حزن و ملال چھایا ہوا ہوگا اور رنج و ملال کی وجہ سے چہروں پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی ۔ کیونکہ ان کو یہ شدید خطرہ لاحق ہوگا کہ وہ بہت جلد ایسے حادثے سے دوچار ہونے والے ہیں جو ان کی کمر توڑ کر رکھ دے گا ۔ فاقرہ ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں ۔ یہاں مراد خوف ' ڈر ' بے چینی ' چہرے کی سیاہی ' پریشانی اور رنج و الم ہے ۔

یہ ہے نقشہ آخرت کا جسے یہ لوگ پس پشت ڈال رہے ہیں اور مہمل چھوڑ رہے ہیں ' اور دنیا کی اس مختصر زندگی کے پیچھے دوڑ رہے ہیں ' جسے وہ بہت اہمیت دیتے ہیں ۔ حالانکہ جو دن آرہا ہے وہ بہت اہم ہے ۔ اصل انجام کا وہاں فیصلہ ہوگا اور اس دنیا اور آخرت کی اہمیت میں بہت بڑا فرق ہے ۔ قیامت میں بعض چہرے تروتازہ ہوں گے اور رب تعالیٰ کی طرف دیکھ رہے ہوں گے جب کہ کچھ چہرے پژمردہ ہوں گے ا ر انہیں یہ شدید خطرہ لاحق ہوگا کہ ان کو کمر توڑ حادثہ پیش آنے والا ہے ۔

مشاہد قیامت یوں تھے کہ وہاں دیدے پتھرا جائیں گے ' چاند بے نور ہوگا اور شمس و قمر اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور انسان بے اختیار پکار اٹھے گا کہ کہاں جاؤں اور پھر وہاں لوگوں کے انجام بہت مختلف ہوں گے ' اور جنتیوں اور دوزخیوں کے انجام کے درمیان طویل فاصلے ہوں گے ۔ جنتیوں کے چہرے تروتازہ ہوں گے ' وہ رب کی طرف نظریں جمائے ہوں گے ' جبکہ دوزخیوں کے چہرے سیاہ ہوں گے اور وہ شدید خطرے سے دوچار ہونے والے ہوں گے ۔

یہ وہ مناظر ہیں جو بے حد قوی الاثر ہیں اور ان کی اثر آفرینی کی اصل قوت قرآن کے اسلوب بیان میں ہے ۔ جو اک مشخص اور مصور اور زندہ اسلوب ہے ' تو ان مناظر اور مشاہد کو آگے بڑھاتے ہوئے ' اب ایک ایسا منظر سامنے لایا جاتا ہے جو روز مرہ کا منظر ہے اور جسے ہم روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ۔ یہ ایک بھاری اور ناگوار منظر ہوتا ہے مگر یہ ہونی شدنی ہے اور ہر جگہ اور ہر گھر میں واقع ہو جاتا ہے ۔

یہ منظر موت کا منظر ہے ۔ وہ موت جس سے ہر زندہ کو دوچار ہونا ہوتا ہے ۔ جس کو کوئی شخص نہ اپنے آپ سے دور رکھ سکتا ہے اور نہ کسی اور کو اس سے بچایا جا سکتا ہے ۔ یہ موت دو جگری دوستوں کو جدا کر دیتی ہے ۔ یہ اپنے راستے پر جاتی ہے اور جاری و ساری ہے ۔ کسی بھی وقت اس کے وقوع میں وقفہ نہیں ہوتا ۔ کسی کا رونا اور کسی کی چیخ و پکار کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ نہ جدا ہونے والوں کی حسرتوں کا اس پر اثر ہوتا ہے ۔ نہ کسی کی چاہت کا اس پر اثر ہوتا ہے اور نہ کسی کے ڈر کا اس پر اثر ہوتا ہے ۔ یہ موت جباروں اور قہاروں کو بھی اسی طرح دبوچ لیتی ہے جس طرح ایک کیڑے کو دبوچ لیتی ہے ۔ امراء و غرباء ' غلاموں اور ڈکٹیٹروں سب کو نابود کر دیتی ہے ۔ یہ موت جس کے مقابلے میں انسان کے لیے کوئی حیلہ اور چارہ نہیں ہے لیکن اے افسوس کہ لوگ اس کے بارے میں کم ہی سوچتے ہیں کہ موت کس قدر عظیم قوت قاہرہ رکھتی ہے ۔

كَلَّآ إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾
ع ۲۰ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾
۱۷

"ہرگز نہیں' جب جان حلق تک پہنچ جائے گی' اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا' اور آدمی سمجھ لے گا کہ یہ دنیا سے جدائی کا وقت ہے اور پنڈلی سے پنڈلی جڑ جائے گی۔ وہ دن ہو گا تیرے رب کی طرف روانگی کا"۔

یہ موت کا منظر ہے اور یہ نص قرآنی اسے یوں پیش کر رہا ہے گویا وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ منظر آنکھوں کی سامنے یوں آ رہا ہے جس طرح مصور کے قلم سے رنگ نکلتے ہی تصویر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ (۷۵: ۲۶) "ہرگز نہیں' جب جان حلق تک پہنچ جائے"۔ جب روح حلق تک آ جائے تو اس وقت انسان کی زندگی کے آخری لمحات ہوتے ہیں۔ ان لمحات میں انسان پر ذہول اور مدہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ انسان پر شدت کی ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے کہ نظریں ٹکٹکی باندھ لیتی ہیں اور جس کی موت واقع ہو رہی ہوتی ہے' اس کے ارد گرد دوست و رشتہ دار جمع ہو جاتے ہیں اور مرنے والے کو بچانے کے لیے ہر حیلہ اور ہر وسیلہ اختیار کرتے ہیں۔

وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ (۷۵: ۲۷) "کہا جائے کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا"۔ شاید بطور آخری چارۂ کار یہ دم درود اور جھاڑ پھونک ہی مفید ہو جائے اور جس شخص پر موت کی حالت طاری ہے شاید یہ اس سے واپس آ جائے اور آخری حالت۔

وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (۷۵: ۲۹) "اور پنڈلی سے پنڈلی جڑ جائے"۔ ہر حیلہ اور ہر وسیلہ فیل ہو جائے اور یہ بات طے ہو جائے کہ آپ بیمار نے جانا ہی ہے جس طرح ہر زندہ نے آخر کار جانا ہوتا ہے۔

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ (۷۵: ۳۰) "وہ دن ہو گا تیرے رب کی طرف روانگی کا"۔ یہ منظر اس قدر زندہ اور متحرک ہے کہ انسان کو ریل پر چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور ہر لفظ ایک حرکت کو مصور کر رہا ہے۔ ہر لمحہ اور ہر فقرہ دوڑ دھوپ اور حرکت کو ظاہر کرتا ہے۔ جوں جوں موت قریب آتی ہے لوگوں کی حرکت اور جزع فزع میں تیزی آتی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس کی طرف پورا مجمع بڑھ رہا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تمام علاج ناکام ہو گئے ہیں۔ اور آخری منظر آتا ہے۔

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ (۷۵: ۳۰) "یہ تو تیرے رب کی طرف چلنے کا دن ہے"۔ اب پردہ گرتا ہے' لیکن ہمارے تخیل کے پردے پر تصویر جمی ہوئی ہے۔ ہمارے احساسات پر انمٹ نقوش بیٹھے ہیں۔ اب فضا پر مہیب خاموشی ہے۔ کہیں کہیں رونے کی آواز آ رہی ہے۔

اس زندہ' حقیقی اور ناقابل دفاع منظر کے سامنے اب جھٹلانے والوں اور مدہوش اور غافل لوگوں کا بھی ایک نقشہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عمل اور اطاعت نہ کرنے کی وجہ سے سعادت سے محروم ہیں۔ ان کے دامن میں معاصی اور نافرمانیاں ہی ہیں اور یہ لوگ لہو و لعب میں مصروف ہیں اور اپنے اس حال میں مگن ہیں۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾

"مگر اس نے نہ سچ مانا اور نہ نماز پڑھی بلکہ جھٹلایا اور پلٹ گیا' پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا"۔

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات ایک مخصوص ص کے حق میں نازل ہوئیں' بعض روایات میں اس شخص کا نام بھی لیا گیا کہ یہ عمرو ابن ہشام ابوجہل تھا۔ یہ شخص بعض اوقات رسول اللہ کے پاس آتا تھا اور قرآن کریم سنتا تھا۔ لیکن پھر چلا جاتا تھا اور ایمان نہ لاتا تھا۔ اور نہ آپ کی اطاعت کرتا تھا۔ نہ اللہ سے ڈرتا تھا۔ اور نہ مودبانہ رویہ اختیار کرتا تھا۔ بلکہ یہ حضور اکرم ﷺ کو مزید اذیت دینے لگتا تھا۔ آپ کو برا بھلا کہتا اور لوگوں کو دین اسلام میں آنے سے روکتا۔ پھر یہ اپنی ان کارروائیوں پر اتراتا' اور اپنے کارناموں پر فخر کرتا جیسا کہ اس آیت میں کہا گیا۔

قرآن کریم یہاں اس شخص کے ساتھ مزاح کرتا ہے اور نہایت ہی حقارت آمیز تبصرہ کرتا ہے۔ قرآن کریم اس شخص کے غرور کی حرکت کو لفظ یَتَمَطّٰی (۷۵ : ۳۳) کے ساتھ تعبیر کرتا ہے۔ یعنی اپنی پیٹھ کو اکڑاتا ہوا۔ اور نہایت ہی بوجھل قسم کے تعجب کا اظہار کرتا ہوا جس میں کراہیت کے آثار نمایاں ہیں۔

کسی مخصوص شخص کی بات چھوڑیئے' ہر دور میں حق کے مقابلے میں ایک ابوجہل ہوتا ہے جو سنتا ہے 'سمجھتا ہے' لیکن منہ موڑ لیتا ہے اور اللہ کے راستے سے لوگوں کو ہٹانے میں بڑی بڑی فن کاریوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور داعیان حق کو اذیت دیتا ہے۔ اور بڑی بڑی مکاریاں کرتا ہے۔ وہ منہ موڑتا ہے اور اپنی شرانگیزیوں پر فخر کرتا ہے حالانکہ دراصل یہ شخص زمین میں فساد پھیلاتا ہے اور حق' سچائی اور اصلاح کی راہ روکتا ہے۔

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾

"یہ روش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے۔ ہاں یہ روش تیرے ہی لیے سزاوار ہے اور تجھی کو زیب دیتی ہے"۔

یہ ایک عام اصطلاحی انداز تعبیر ہے' عربی روز مرہ کے مطابق' مگر اس کے اندر تہدید اور ڈراوا بھی ہوتا ہے۔ ایک بار حضور اکرم ﷺ نے ابوجہل کو گلے سے پکڑا اور کہا۔

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى (۳۴) ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى (۷۵ : ۳۵) تو اللہ کے اس دشمن نے کہا "محمد کیا تم مجھے دھمکی دیتے ہو؟ خدا کی قسم نہ تم اور نہ تمہارا رب میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو اور میں ان تمام لوگوں سے زیادہ معزز ہوں جو مکہ کے دونوں پہاڑوں کے درمیان بھی چلے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن اسے پکڑا اور یوں حضرت محمد ﷺ اور رب محمد ﷺ نے اس کا سب کھیل بگاڑ دیا۔ اور ابوجہل سے قبل فرعون نے بھی اپنی قوم سے کہا تھا۔

مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ "میں تمہارے لیے اپنے مقابلے میں کوئی دوسرا حاکم نہیں پاتا"۔ اور کہا۔

اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ "کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے ماتحت نہیں چل رہی ہیں"۔ کئی ابوجہل گزرے ہیں جنہوں نے اسلامی دعوتوں کے مقابلے میں اپنے قبائل' اپنی قوت اور اپنی قوم کے بل بوتے پر جرائم کا ارتکاب کیا اور اپنے آپ کو کچھ چیز سمجھتے تھے' اور انہوں نے اللہ کو بھلا

دیا تھا لیکن اللہ نے ان کو مچھروں اور مکھیوں کے ذریعہ ہلاک اور برباد کر دیا۔ بہرحال ہر فرعون کی تباہی کی ایک میعاد ہوتی ہے جس میں کوئی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

آخر میں لوگوں کی زندگی سے ایک اور اہم حقیقت کو سامنے لایا جاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی حیات بعد موت پر دلالت کرتی ہے۔ جس کا وہ شدت سے انکار کرتے تھے۔ اور اس سے خود ان کی اس زندگی کی نشوونما کی تدبیر اور تقدیر اور تعجب خیز اور عبرت آموز ٹیکنالوجی بھی معلوم ہوتی ہے جو خدا کی پیدا کردہ ہے اور یہ تقاضا کرتی ہے کہ قیامت ضرور واقع ہو گی اور خود مطالعہ حیات وقوع حشر و نشر کو لابدی قرار دیتا ہے بشرطیکہ کوئی اسے چشم بینا سے مطالعہ کرے۔

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ۝ أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن
۲ مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ
۱۰ع وَالْأُنثَىٰ ۝ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۝
۱۸

"کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا' پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے' پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے"۔

یہ آخری مقطع ہے جو نہایت اثر آفریں ہے اور اس میں گہرے حقائق کی طرف اشارے ہیں۔ ان حقائق کے بارے میں اس وقت کے سامعین نے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ ان حقائق میں سے زیادہ انسان کی تخلیق اور اس دنیا میں اس کی حیات کے نشوونما کے لیے تدابیر کی طرف اشارات ہیں۔

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى (۷۵:۳۶) "کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسے یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟" اہل عرب کے نزدیک زندگی ایک ایسی حرکت تھی جس کا نہ کوئی سبب تھا اور نہ کوئی علت تھی۔ نہ کوئی مقصد اور نہ غایت تھی۔ لوگ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے تھے اور قبروں میں جاتے تھے۔ اور پیدائش اور موت کے درمیان کا عرصہ لہو و لعب کے لیے مخصوص تھا۔ زندگی زینت اور زیبائش اور باہم فخر و مباہات سے عبارت تھی۔ لوگ زندگی اسی طرح گزارتے تھے جس طرح حیوانات گزارتے ہیں یہ کہ اس کائنات میں کوئی ناموس فطرت ہے اور زندگی کا کوئی مقصد ہے اور وہ ایک حکمت کے تحت وجود میں لائی گئی ہے۔ یہ باتیں ان کی سمجھ سے دور تھیں۔ وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ انسان ایک متعین تقدیر کے مطابق پیدا کیا گیا ہے اور یہ کہ وہ کوئی ذمہ دار مخلوق ہے اور اس کی تخلیق کے پیچھے کوئی جزاء و سزا کا نظام بھی موجود ہے۔ اور زندگی کا یہ سفر ایک آزمائش ہے۔ رہا یہ تصور کہ یہ زندگی ایک بامقصد زندگی ہے اور اس کی پشت پر ایک قادر مطلق ذات ہے جو اللہ العالمین ہے' اور اس نے ہر چیز کو ایک اندازے اور ایک حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے اور ہر چیز ایک انجام کو پہنچنے والی ہے تو یہ تصورات ان کی سوچ میں نہ تھے' بلکہ یہ لوگ ان تصورات سے کوسوں دور تھے۔ اسلام

سے قبل کے زمانے میں عربوں کی ایسی ہی حالت تھی۔

حالانکہ انسان اور حیوان کے درمیان فرق ہی اس شعور کی وجہ سے ہے کہ واقعات ایک مقصد کے تحت وقوع پذیر ہوتے ہیں' ان کے اہداف اور مقاصد متعین ہیں۔جس طرح یہ پوری کائنات با مقصد ہے اسی طرح اس کے اندر حضرت انسان بھی با مقصد ہے۔جوں جوں انسان کا یہ شعور ترقی کرتا رہا ہے 'انسانیت نے ترقی کی ہے ' اس شعور کے تحت انسان کی زندگی باہم مربوط ہوتی ہے۔اس تصور کے تحت انسان اپنی زندگی کے لمحات کا حساب کرتا ہے۔تمام حادثات و واقعات پر غور کرتا ہے۔حال اور مستقبل کو ماضی سے مربوط رکھتا ہے۔پھر اس پوری زندگی کو اس کائنات کے نظام کے ساتھ مربوط رکھتا ہے۔اور پھر انسان اور پوری کائنات کو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ جوڑتا ہے کہ یہ انسان اور اس کی زندگی اور یہ جہاں عبث نہیں پیدا کیے گئے۔

یہ ہے وہ عظیم تصور حیات جس کی طرف قرآن نے لوگوں کو پہنچایا۔یہ ایک عظیم انقلابی تصور تھا۔اس وقت انسانوں کے اندر جو سوچ بالعموم موجود تھی اس پر اگر غور کیا جائے تو اس کے مقابلہ میں یہ بہت ہی انقلابی سوچ تھی۔نیز اس وقت دنیا میں جو فلسفے اور خیالات رائج اور مشاہد تھے ان کے مقابلے میں یہ تصور اور عقیدہ ایک انقلابی تصور اور سوچ تھی۔(دیکھئے میری کتاب اسلام کائنات اور زندگی اور انسان)۔

یہ چٹکی کہ۔

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًى (۷۵: ۳۶) "کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسے یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟" یہ دراصل ان چند قرآنی اشارات میں سے ہے جو انسان کو اس کائنات کے ساتھ روابط اور تعلقات قائم کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔اس جہاں اور انسان دونوں کے لیے غرض و غایت اور ایک مقصد متعین کرتے ہیں۔واقعات کے لیے علل و اسباب متعین کرتے ہیں اور کچھ چیزوں کو کچھ کے نتائج قرار دیتے ہیں۔یوں یہ پوری کائنات اور اس کے اندر انسان بامقصد اور باہم مربوط ہو جاتے ہیں۔

یہاں اس تصور پر نہایت ہی سادہ اور سیدھے دلائل لائے جاتے ہیں'جن کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔خلاصہ یہ کہ انسان شتر بے مہار اور بے مقصد نہیں ہے۔

اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰى (۳۷) ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى (۳۸) فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى (۳۹) (۷۵: ۳۷ تا ۳۹) "کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا' پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے' پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں"۔

یہ انسان کیا ہے؟ یہ کس سے بنایا گیا ہے؟ کس طرح تھا اور کس طرح ہو گیا۔اور زندگی کا یہ سفر اس نے کہاں سے شروع کیا اور کہاں تک پہنچا۔اس کرۂ ارض پر وہ کیسے پہنچا جو ایک چھوٹا سا ستارہ ہے۔

کیا وہ پانی کا چھوٹا سا نطفہ نہیں تھا' پانی کی ایک بوند جو ٹپکتی ہے۔کیا انسان ایک نہایت ہی خوردبینی نکتہ نہ تھا۔پھر وہ ایک

خلیہ بن گیا۔ پھر وہ خون کا ایک مخصوص لوتھڑا بن گیا۔ یہ لوتھڑا رحم مادر میں بڑھتا رہا۔ پہلے یہ رحم کی دیواروں کے ساتھ معلق رہا اور اس کے خون سے اپنی غذا اخذ کرتا رہا۔ یہ تمام مراحل سفر اسے کس نے سکھائے؟ اور یہ طاقت اسے کس نے دی اور یہ راستہ اسے کس نے بتایا؟

اس کے بعد کس نے اسے ایک جنین کی شکل دی۔ جس کی قوتوں کے اندر اعتدال اور جس کے اعضا باہم ہم آہنگ اور متناسب بن گئے۔ پھر کس طرح یہ ایک خلیہ اب کئی ملین خلیوں کی شکل اختیار کر گیا۔ حالانکہ پہلے یہ ایک خلیہ تھا اور ایک خوردبینی انڈا تھا۔ وہ سفر اور تغیر پذیری جو اس خلیے نے ایک جنین تک طے کی' یہ پیدائش سے موت تک کے مراحل سے طویل تھی۔ سوال یہ ہے کہ کون ہے جو اسے ان طویل تغیرات کے لیے تیار کر رہا ہے۔ حالانکہ آغاز میں وہ ایک نہایت ہی چھوٹی مخلوق تھی۔ نہ عقل اور نہ قوائے ادراک اس کے اندر تھیں۔ اور نہ دنیاوی تجربات اسے حاصل تھے۔

پھر ایک ہی مخلوق سے اللہ نے کس طرح مرد اور عورت پیدا کیے۔ کیا یہ مخلوق خود اپنے آپ کو مرد اور عورت کی شکل میں ڈھالتی ہے۔ کیا یہ مخلوق خود مذکر مونث ہونے کا فیصلہ کرتی ہے یا یہ کوئی دوسری قوت ہے جو ان تاریکیوں میں اسے مذکر و مونث بناتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی ذات کے تصور کے سوا اس جہاں کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا جو قادر مطلق ہے۔ جو مدبر ہے' جو تمام واقعات اور حادثات کا سبب اول ہے۔ جو قدرت مطلقہ رکھتی ہے۔ یہ وہی ذات ہے جو انسان کو ایک خوردبینی ذرے سے یہاں تک لاتی ہے۔

فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى (۷۵: ۳۹) "پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں"۔

یہ حقیقت جو انسانی شعور کے ساتھ چپک جاتی ہے پھر پوری سورت کی تلخیص یوں کی جاتی ہے اور ان تمام حقائق سے نتیجہ یوں اخذ کیا جاتا ہے۔

اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى (۷۵: ۴۰) "کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے"۔ ہاں بے شک اللہ قادر ہے کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کر دے۔ ہاں اللہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ حشر و نشر کے دن سب کو اٹھائے۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ انسان مجبور ہے کہ عقیدۂ آخرت پر ایمان لائے۔ کیونکہ یہ پوری کائنات اس پر شاہد ہے۔

یوں یہ سورت ایک زوردار فقرے پر ختم ہوتی ہے۔ جس کا اثر فکر و احساس کے پردوں پر نہایت گہرا اور فیصلہ کن ہوتا ہے اور انسان اس کائنات' اس کی حقیقت اور اس کی پشت پر کام کرنے والی ذات مدبرہ کے قریب چلا جاتا ہے۔

---OOO---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ٢٩

سورۃ الدھر۔ ٧٦

١ -- تا -- ٣١

سورۃ الدھر ایک نظر میں

بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور اس کا مکی ہونا بالکل ظاہر ہے۔ اس کے موضوع سخن' طرز ادا اور تمام معنوی و کلامی خصوصیات بتاتی ہیں کہ یہ مکی ہے۔ اس لیے ہم ان روایات پر اعتماد کرتے ہیں جن میں ہے کہ یہ مکی ہے۔ بلکہ اس کی بعض باتیں تو یہ بتاتی ہیں کہ یہ مکی دور کی بھی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے۔ کیونکہ جنات کے انعامات کی تفصیلات مکہ کی ابتدائی سورتوں کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے۔ اسی طرح قیامت کے سخت عذاب کی تصویر کشی بھی۔ نیز اس سورت میں حضور اکرم ﷺ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کے فیصلوں پر صبر کریں۔ یعنی مشکلات کو برداشت کریں۔ اور کسی آثم اور ناشکرے کی اطاعت نہ کریں۔ یہ اشارہ ان مظالم کی طرف ہے جب مکہ کے ابتدائی دور میں لوگ تحریک اسلامی کے کارکنوں پر کیا کرتے تھے۔ اس لیے اہل ایمان کو ہدایت ہوئی کہ ان ظالموں کو ذرا مہلت دیجئے اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیجئے اور جو سچائی آپ پر نازل ہوئی ہے اس پر جم جائیں اور کفار کی طرف ہرگز نہ جھکیں اور نہ ان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کریں۔ جیسا کہ سورہ قلم' سورہ مزمل اور سورہ مدثر کے مضامین ہیں۔ لہٰذا یہ سورت اسی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کہ یہ سورت مدنی ہے' نہایت ضعیف بات ہے۔ جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

سورت کا انداز نہایت نرم' تر و تازہ اور دعوت الی اللہ کی التجا ہے۔ اللہ کے سامنے گڑگڑانا اور اس کی رضامندی کی طلب۔ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرنا اور اللہ کے فضل کا احساس' اللہ کے عذاب سے بچنا' راہ خدا میں ابتلاؤں کو سمجھنے کی کوشش کرنا' اور انعام و اکرام اور ابتلا و آزمائش میں اس کی حکمتوں کو سمجھنا' اس سورت کے مضامین ہیں۔

اس سورت کا آغاز ایک نہایت موثر اور قلب پر رقت طاری کر دینے والے سوال سے ہوتا ہے کہ ذرا بھی سوچا ہے تو اے انسان' کہ تخلیق سے پہلے تو کہاں تھا؟ کس نے تمہاری تخلیق کی؟ اور کس نے تمہیں ایک قابل ذکر مخلوق بنایا؟ جبکہ اس سے قبل تو اس کائنات کی کوئی قابل ذکر مخلوق نہ تھا۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (۷۶ : ۱) "کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا"۔

اس کے بعد اس کی اصلیت اور حقیقت کے بارے میں ایک اشارہ ہے کہ اس کی تخلیق کس قدر حکیمانہ ہے اور اس کی تخلیق کے اندر کس قدر گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ اور اس کے اندر احساس و ادراک کی کیا کیا عجیب قوتیں ودیعت کر دی گئی ہیں۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (۷۶ : ۲) "ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا"۔

پھر ایک تیسرا اشارہ کہ ہم نے انسان کو نیک و بد کی تمیز دی اور راہ ہدایت تک لانے میں اس کی مدد کی اور اس کے بعد اسے چھوڑ دیا کہ وہ راہ راست اختیار کرتا ہے یا بد۔

اِنَّا ھَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (۷٦: ۳) ''ہم نے اسے راستہ دکھایا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا''۔

ان تین اشارتی چٹکیوں کے بعد' اور دل مومن کے اندر گہری سوچ پیدا کرنے کے بعد' اسے آگے اور پیچھے کی بصیرت عطا کرنے کے بعد' اور راہ کے انتخاب میں احتیاط اور تدبر کی تعلیم دینے کے بعد' انسانوں کو ببانگ دہل پکارا جاتا ہے کہ تمہارے آگے جنت بھی ہے اور دوزخ بھی ہے۔ اور جنت میں تمام انعام و اکرام ہوں گے اور عیش و آرام کی زندگی ہو گی جبکہ جہنم میں آگ اور زنجیریں ہوں گی۔

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَا وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِیْرًا (٤) اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا (٥) عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُاللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا (٦) (۷٦: ٤ تا ٦) ''کفر کرنے والوں کے لیے ہم نے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ نیک لوگ (جنت میں) شراب کے ایسے ساغر پیئں گے جن میں آب کافور کی آمیزش ہو گی۔ یہ ایک بہتا چشمہ ہو گا جس کے پانی کے ساتھ اللہ کے بندے شراب پیئں گے اور جہاں چاہیں گے بسہولت اس کی شاخیں نکال لیں گے''۔

اس سے قبل کہ عیش و عشرت کی تصویر کشی کی جائے' ان ابرار اور نیک لوگوں کی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں' لیکن یہ خصوصیات نہایت محبت آمیز' ان کے جمال اور خوبصورتی کے ساتھ بیان کی گئیں جو ان نعمتوں کے حسب حال ہیں اور ان کے ساتھ مناسب ہیں۔

یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ یَخَافُوْنَ یَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا (۷) وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا (۸) اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۹) اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا (۱۰) (۷٦: ۷ تا ۱۰)

''یہ وہ لوگ ہوں گے جو (دنیا میں) نذر پوری کرتے ہیں' اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہو گی' اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ''ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں' ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ' ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہو گا''۔

اس کے بعد پھر ان لوگوں کی جزائے اخروی کی تفصیلات دی جاتی ہیں جو اس مصیبت کے طویل دن سے ڈرتے رہے

اور اللہ کے احکام بجالاتے رہے۔ جو نیک رہے' اور اپنی محتاجی کے باوجود اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہے۔ محض اللہ کی رضاجوئی کے لیے' جو کسی سے نہ بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ بلکہ وہ محض قیامت کے دن کے خوف سے یہ عبادات سرانجام دیتے ہیں۔

یہ لوگ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ خضوع وخشوع کرنے والے ہیں' اللہ کے لیے کھانا کھلانے والے ہیں اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دینے والے ہیں' ان کے لیے کیا انعام ہے؟ اس کی تفصیلات دی جارہی ہیں۔ ان کے لیے امن و آرام اور عیش و عشرت ہیں۔

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا (۱۱) وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا (۱۲) مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا (۱۳) وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا (۱۴) وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا (۱۵) قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا (۱۶) وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا (۱۷) عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا (۱۸) وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا (۱۹) وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا (۲۰) عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (۲۱) اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا (۲۲) (۷۶: ۱۱ تا ۲۲) "پس اللہ تعالیٰ انہیں اس دن کے شر سے بچالے گا اور انہیں تازگی اور سرور بخشے گا۔ اور ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔ وہاں وہ اونچی مسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ نہ انہیں دھوپ کی گرمی ستائے گی نہ جاڑے کی ٹھر۔ جنت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کر رہی ہوگی' اور اس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے (کہ جس طرح چاہیں انہیں توڑ لیں) ان کے آگے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش کرائے جا رہے ہوں گے' شیشے بھی وہ چاندی کی قسم کے ہوں گے' اور ان کو (منتظمین جنت نے) ٹھیک اندازے کے مطابق بھرا ہوگا۔ ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی' یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔ ان کی خدمت کے لیے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیئے گئے ہیں۔ وہاں جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے نعمتیں ہی نعمتیں اور

ایک بڑی سلطنت کا سروسامان تمہیں نظر آئے گا۔ان کی اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے' ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے' اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔یہ ہے تمہاری جزا اور تمہاری کارگزاری قابل قدر ٹھیری ہے"۔

جب نعمتوں اور عشرتوں کی یہ نمائش گاہ ختم ہوگئی اور خوشگوار زندگی اور جنتوں کے مزے کا بیان ہوگیا تو اب روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے تاکہ اس کفر' اعراض اور تکذیب کے مقابلے میں آپ جم جائیں اور صبر کریں اور قدرے انتظار کریں کہ اللہ کا فیصلہ آجائے۔اور اپنے رب کے ساتھ رابطہ کریں۔اور جب بھی راستہ طویل ہو' رب ہی سے مدد حاصل کریں۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا (۲۳) فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (۲٤) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (۲٥) وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَ سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا (۲٦) (۷٦: ۲۳ تا ۲٦) "اے نبیؐ' ہم نے ہی تم پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے' لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو' اور ان میں سے کسی بدعمل یا منکر حق کی بات نہ مانو۔اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو' رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو"۔

اس کے بعد لوگوں کو اس بھاری دن سے ڈرایا جاتا ہے جس کے لیے لوگ کچھ تیاری نہیں کر رہے ہیں اور نہ اس کو اہمیت دیتے ہیں اور نیک اور متقی لوگ اس سے بہت ڈرتے ہیں۔بتایا جاتا ہے کہ تمہارا معاملہ اللہ پر بہت ہی ہلکا ہے' جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تمہیں قوت دی ہے اور جس طرح اس نے تمہیں پیدا کیا' تمہیں لے جا بھی سکتا ہے اور تمہاری جگہ دوسری اقوام بھی کھڑی کر سکتا ہے۔اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو تمہیں کبھی کا مٹا دیا ہوتا' اور یاد رکھو یہاں تمہیں بطور آزمائش بھیجا گیا ہے۔

اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا (۲۷) نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَاۤ اَسْرَهُمْ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَاۤ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا (۲۸) اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۲۹) وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۳۰) يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۳۱) (۷٦: ۲۷ تا ۳۱) "یہ لوگ تو جلدی حاصل کرنے والی چیز (دنیا) سے محبت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ہم نے ہی ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں' اور ہم جب چاہیں ان کو بدل کر رکھ دیں۔یہ ایک نصیحت ہے' اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرلے۔اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے۔یقیناً اللہ بڑا علیم و حکیم ہے۔اپنی

رحمت میں جس کو چاہتا ہے ' داخل کرتا ہے اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

اس سورت کا آغاز انسان کی تخلیق کے مضمون سے ہوتا ہے۔ اور یہ کہ یہ تخلیق اللہ کے نظام تقدیر کے مطابق ہے۔ اور انسان کو اللہ نے اس جہاں میں آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور سورت کا خاتمہ آخرت کی ابتلا اور آزمائش پر ہوتا ہے۔ چنانچہ زندگی کے آغاز اور خاتمہ کے درمیان پوری زندگی آتی ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ انسان کو یہ زندگی عبث ضائع نہیں کرنا چاہئے اور نہ غفلت اور لاپرواہی سے گزارنا چاہئے کہ نہ وہ اس کا کوئی مقصد سمجھے اور نہ رازہائے حیات کو سمجھے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ وہ آزمائش کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اللہ نے اسے قوت مدرکہ دی ہے تاکہ وہ آزمایا جائے۔

آغاز اور انجام کے درمیان جنتوں کی نعمتوں اور عیش و عشرت کی ایک طویل ترین تصویر کشی کی گئی ہے۔ یا یہ قرآن کی طویل ترین تصویر یا تصاویر میں سے ہے۔ اگر ہم سورہ واقعہ کی تصویر کشی کو پیش نظر رکھیں۔ اس میں جنت کے انعامات کی طویل تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ تصویر کشی بالجملہ حسی نعمتوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ان نعمتوں کے ساتھ اعزاز و اکرام بھی ہے ' لیکن اس کا حسی انداز یہ بتاتا ہے کہ یہ چھ آیات مکی دور میں نازل ہوئیں۔ کیونکہ مکی دور میں لوگ زمانہ جاہلیت میں ڈوبے ہوئے تھے اور حسی سوچ کے زیادہ قریب تھے اور حسی لطف اندوزی کے زیادہ دلدادہ تھے۔ وہ چیزیں جن کا یہاں ذکر ہوا۔ ان کو زیادہ متاثر کرتی تھیں اور ان کی طرف وہ بالعموم زیادہ راغب ہوتے تھے اور یہ ان کے لیے پرکشش تھیں۔ اور آج جدید ترقی یافتہ دور میں بھی اس قسم کے حسی لذات پر لوگ مرمٹتے ہیں۔ لہٰذا یہ رنگ اور یہ تصاویر ان کی خواہشات کے عین مطابق تھیں۔ اور اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے تخلیق کردہ دل چاہے کیا ہیں؟ اور ان کی ساخت اور ان کے شعور کے حسب حال کیا چیز ہے اور بعض انعامات ان حسی انعامات سے زیادہ ارفع بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً سورہ قیامت میں ہے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ (۲۲) اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (۷۵: ۲۳) "بعض چہرے آج تروتازہ ہوں گے ' اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے"۔ بہرحال اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کے بندوں کی اصلاح کے لیے کیا بہتر ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۷٦ تشریح آیات

۱-- تا-- ۳۱

سُوْرَةُ الدَّهْرِ (٧٦) مَدَنِيَّةٌ (٩٨) اٰيَاتُهَا ٣١ رُكُوْعَاتُهَا ٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ﴿١﴾ اِنَّا خَلَقْنَا
الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿٢﴾ اِنَّا هَدَيْنٰهُ
السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ﴿٣﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا' خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا"۔

یہ استفہام تقریری ہے' یعنی کسی چیز کے بارے میں دریافت کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت کی اطلاع دینا مقصود ہے کہ ایسا ضرور تھا۔ لیکن سوالیہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا کہ انسان کو خود اس حقیقت کے بارے میں سوال کرنا چاہئے' اور سوچنا چاہئے کہ وہ کسی وقت کوئی قابل ذکر شے نہ تھا اور جب وہ اب ایک قابل ذکر شے ہے تو اسے دست قدرت کا کسی قدر تو شعور ہونا چاہئے جو اسے عدم سے وجود میں لائی اور تاریکیوں سے روشنی کی طرف لائی۔ جہاں یہ اس دنیا کے اسٹیج پر اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

بہرحال استفہامیہ اور سوالیہ انداز میں' اس مقام پر چند حقائق کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ یہ نہایت ہی اونچے رجے کے اشارات ہیں۔ گہرے حقائق ہیں اور ان کو پیش نظر رکھ کر قابل غور نکات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

ایک نکتہ یہ ہے کہ ذرا اپنے وجود میں آنے سے قبل اور آغاز وجود کے زمانے اور حالات پر غور کرو' کہ یہ دنیا ایسی تھی اور اس پر انسان آباد نہ تھا۔ ذرا غور کرو کہ اس وقت یہ دنیا کیسی لگ رہی ہوگی؟ انسان اللہ کی ایک مخلوق ہے'

لیکن اپنے آپ کو ایک بڑی چیز سمجھتا ہے اور مغرور ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ دنیا اس کے وجود میں آنے سے بھی پہلے زمانوں سے ایسی ہی تھی۔ بلکہ اس کائنات کی مخلوق انسان کی تخلیق کی توقع ہی نہ رکھتی تھی۔ لیکن اللہ کا ارادہ ہوا اور اس نے انسان کی تخلیق فرمائی۔

ایک نکتہ یہ ہے کہ ذرا ان لمحات پر غور کرو جن میں یہ مخلوق انسانی وجود میں آئی۔ ان لمحات کے بارے میں انسان تو ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے جبکہ تخلیق انسان کے آغاز کا علم تو خالق کائنات ہی کو ہو سکتا ہے۔ یہ تو خالق ہی جانتا ہے کہ اس کائنات اور دنیا میں حضرت انسان کا اضافہ کس طرح ہوا۔ اس کائنات کی طویل تاریخ میں اللہ ہی نے انسان کے لیے مخصوص کردار متعین کیا ہے۔

ایک نکتہ یہ ہے اس ذات انسان کو 'کائنات کے اس اسٹیج پر' دست قدرت نے کس طرح لاکر کھڑا کیا اور ایک ذمہ داری اور ایک کردار اس کے سپرد کیا؟ اس کے لیے اسے تیار کیا۔ اس کے کردار کا تانا بانا اس پوری کائنات کے خطوط کے ساتھ ملایا۔ اور وہ حالات اس کے لیے مہیا کیے جن کے اندر اس کے لیے وہ کردار اداکر نا ممکن اور آسان ہوا۔ جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد قدم قدم پر اس کے لیے سہولیات فراہم کیں۔ یوں یہ حضرت انسان اس کائنات کی ہر چیز کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہو گیا۔

بہت سے اشارات ہیں اور بہت سے قابل غور نکات ہیں جو یہ آیات قلب انسانی کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ جن سے انسانی سوچ اور انسانی فکر 'انسان کے مقصد وجود' اس کے ارادوں اور آغاز سے انجام تک ہر مرحلے پر اس کے نظام تقدیر کے نکات اخذ کرتی ہے۔

یہ تو تھے نکات انسان کے آغاز تخلیق کے متعلق۔ رہا وہ نظام جو نسل انسانی کے بقائے دوام کے لیے اور تاقیامت تسلسل کے لیے وضع کیا گیا تو وہ نظام بالکل مختلف ہے اور اس کا ایک اپنا قصہ ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا (۷۶ : ۲) "ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا"۔

امشاج کے معنی ہیں مخلوط۔ یہ اشارہ ہے اس حالت کی طرف جب مرد کا خلیہ عورت کے بیضے میں داخل ہو کر اس کے ساتھ خلط ہو جاتا ہے اور اس میں مرد اور عورت کی موروثی خصوصیات کی طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے' جن کو علمائے حیاتیات "جینز" کہتے ہیں۔ یہ وہ خصائص ہیں جو جنس انسانی کو دوسرے زندہ اجناس سے ممیز کرتے ہیں' پھر اس کے ذریعہ خاندانی موروثی خصائص بھی بچے میں منتقل ہوتے ہیں۔ اور انسانی نطفہ انسانی جنین کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اور دوسرے حیوانات سے مختلف شکل اختیار کرتا ہے اور یہی مخلوط نطفہ ہے جس کی طرف مرد اور عورت کی وراثتی خصوصیات منسوب کی جاتی ہیں بلکہ یہ مخلوط نطفہ کئی مختلف وراثتی خصوصیات کا مخزن ہوتا ہے۔

یوں اللہ نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔ یہ نہ اتفاقاً پیدا ہوا ہے۔ اور نہ اس کی تخلیق ایک بے مقصد اور عبث کام ہے۔ نہ اسے کھیل کے طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ بلکہ انسان کو ایک ذمہ دار مخلوق کے طور پر امتحان اور آزمائش کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ آزمائش کیا ہے؟ کیا امتحان ہے؟ اور اس امتحان کا نتیجہ کیا ہو گا؟ البتہ انسان دنیا کے

اسٹیج پر جو ڈرامہ کرتا ہے' یہ محض نتیجے کے اظہار کے لیے ہے تاکہ یہ نتیجہ کھلی عدالت میں پیش ہو اور اس کے اوپر جزاء و سزا مرتب ہوں۔ اور لوگ اپنے اچھے اور برے انجام تک پہنچیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انسان کو سمیع و بصیر بنایا ہے۔ یعنی اسے ادراک کے وسائل دیئے ہیں کہ وہ نیک و بد کو سمجھ سکے اور جان سکے۔ اور اس دنیا کے افعال و اشیاء کی حقیقت کو اچھی طرح پاسکے اور اس امتحان کو اچھی طرح پاس کر سکے۔

پس اللہ تعالیٰ نے انسان کے سلسلہ توالد و تناسل کو چلانے کا جو ارادہ کیا اور اس کے لیے جو نظام متعین فرمایا وہ نطفہ مخلوط سے اس کی تخلیق کا نظام ہے۔ اور اس میں گہری حکمت اور گہری مقصدیت ہے۔ یہ کوئی اتفاق اور بے سوچے سمجھے کا سلسلہ نہیں ہے۔ اور یہ حکمت اور مقصد اس انسان کو آزمانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس ذات کے اندر ہدایت کے اخذ کرنے اور حق کی قبولیت کی استعداد رکھی۔ اور پھر اسے علم و معرفت اور قدرت واختیار عطا کیا گیا اور یہ تمام صلاحیتیں' علم وادراک اور اخذ ہدایت اور تربیت کی اللہ نے ایک نہایت ہی متعین وزن اور مقدار کے ساتھ اسے عطا کیں۔

پھر علم و معرفت اور فہم وادراک کے ساتھ ساتھ اسے یہ قدرت اور احتیاط بھی دیا کہ وہ راہ حق کو اختیار کرے۔ چنانچہ اسے حق و باطل کی تمیز دے کر چھوڑ دیا کہ جو راہ چاہے اختیار کرے۔ خواہ اللہ کی راہ اختیار کرے یا اس کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (۷۶ : ۳) "اور ہم نے اسے راستہ دکھایا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا"۔ یہاں اللہ نے راہ ہدایت کی تعبیر شکر نعمت سے کی ہے۔ کیونکہ جب کسی کو ہدایت عطا کر دی جاتی ہے تو اس کے پردۂ شعور پر سب سے پہلے شکر کا احساس نمودار ہوتا ہے' وہ جانتا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا' تو اللہ تعالیٰ نے اسے انسانیت عطا کر کے ایک قابل ذکر چیز بنایا۔ پھر اسے سمع و بصر عطا کر کے دوسرے حیوانات سے ممتاز کیا اور یوں وہ علم و معرفت پر قادر ہوا' پھر اسے ازروئے فطرت اور بذریعہ انبیاء ہدایت عطا فرمائی اور آزاد چھوڑ دیا کہ وہ راہ ہدایت اختیار کر کے مشکور بنے یا راہ ضلالت اختیار کر کے کفور اور ناشکرا بنے۔ لفظ کفور کے مفہوم میں ہے کہ ناشکری میں وہ غلو کرے۔

ان تین توجہ مبذول کرنے والی چٹکیوں اور تنبیہات کے بعد اب انسان محسوس کر لیتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار اور بامقصد مخلوق ہے اور وہ آزاد نہیں ہے بلکہ ایک محور کے گرد بندھا ہوا ہے۔ اور گھوم رہا ہے۔ اور اسے جو صلاحیتیں دی گئی ہیں ان پر اس سے حساب کیا جا رہا ہے اور یہ جہاں اس کے لیے دارالامتحان ہے۔ یہاں اسے آزمائشی طور پر رکھا گیا ہے۔ یہاں اسے کھیل کے میدان میں نہیں اتارا گیا بلکہ امتحان کے کمرہ میں بٹھایا گیا ہے۔ غرض ان مختصر تین آیات سے فکر و نظر کا بے بہا خزانہ ملتا ہے اور بلند افکار اور تصورات اور گہری حکمت کے جو ہر ظاہر ہوتے ہیں جبکہ ان تمام نکات کے نتیجے میں انسان پر ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور شعور کی پختگی اور طرز عمل میں سنجیدگی اور وقار حاصل ہوتا ہے۔ یہ مختصر آیات انسان کا نظریہ حیات متعین کر دیتی ہیں۔ اس کے وجود کا مقصد بتاتی ہیں اور زندگی کا شعور عطا کرتی ہیں۔ اور ان کی روشنی میں انسان اپنی زندگی اور اس کی قدروں کا تعین کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان آیات کے بعد متصلاً یہ بتا دیا جاتا ہے کہ اس آزمائش اور ابتلا کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے۔ اور انسان اگر شکر کی راہ لے گا تو نتیجہ کیا ہوگا اور اگر انسان کفر اور کفران کی راہ لے گا تو انجام کیا ہوگا؟

جو کفر اور ناشکری کی راہ لیں گے' ان کا انجام نہایت ہی اختصار کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ پوری سورت کی فضا اور اس کا انداز نرم و نازک اور سہولتوں اور خوشیوں اور جنتوں کی دائمی نعمتوں کا ہے۔ لہٰذا اللہ میاں عذاب جہنم کی تفصیلات دے کر اس سورت کی فضا کو مکدر کرنا نہیں چاہتے۔ نہایت اختصار کے ساتھ فرماتے ہیں :

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِيْرًا۝۴

"کفر کرنے والوں کے لیے ہم نے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے"۔ زنجیریں ان کے پاؤں میں ہوں گی' طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے' یہ لوگ زنجیروں میں بندھے ہوئے اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے جہنم میں گرائے جائیں گے۔ لیکن اس مختصر ذکر کے بعد اب جنت کی نعمتوں کی طرف روئے سخن پھر جاتا ہے اور نہایت ہی سرعت کے ساتھ اور قدرے تفصیل کے ساتھ۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا۝۵ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا۝۶

"نیک لوگ (جنت میں) شراب کے ایسے ساغر پئیں گے جن میں آب کافور کی آمیزش ہوگی۔ یہ ایک بہتا چشمہ ہوگا جس کے پانی کے ساتھ اللہ کے بندے شراب پئیں گے اور جہاں چاہیں گے بسہولت اس کی شاخیں نکال لیں گے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک لوگوں کا مشروب ایسا ہوگا کہ اس میں کافور کی ملاوٹ ہوگی' یہ مشروب ایک ایسے چشمے سے بھر کر دیا جائے گا' جو ان کے لیے خصوصی طور پر بہایا گیا ہوگا۔ یعنی وہ نہر کی طرح وافر اور کثیر مقدار میں ہوگا۔ عربوں کی یہ عادت تھی کہ شراب میں کبھی کافور اور کبھی زنجبیل (سونٹھ) کا آمیزہ کرتے تھے۔ اور اس طرح شراب کو زیادہ لذیذ بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں انہیں بتایا جاتا ہے کہ جنت میں بھی پاک اور صاف مشروب ہوگا' جس میں کافور کا آمیزہ ہوگا اور یہ شراب بڑی وافر مقدار میں ہوگی۔ اس کا معیار کیا ہوگا' یہ دنیا کی شراب کے مقابلے میں بہت خوش ذائقہ ہوگی اور اس کی لذت اس قدر زیادہ ہوگی کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ تو درحقیقت قریب الفہم بنانے کے لیے ان اصطلاحات کے اندر کہا جا رہا تھا تاکہ لوگ سمجھ سکیں ورنہ جنت کی نعمتیں عالم غیب میں ہیں۔ ان کا صحیح تصور اور ان کی صحیح تعبیر ہم نہیں کر سکتے۔

اہل جنت کو پہلی آیت میں الابرار کہا گیا ہے اور دوسری میں عباداللہ کہا گیا ہے۔ یہ محض قرب و محبت کے اظہار کے لیے اور فضل و کرم کے اعلان کے لیے ہے کہ اللہ کے یہ بندے اللہ کے قریب ہوں گے۔ اور ان کے اوصاف اور خدوخال یہ ہوں گے :

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ يَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا۝۷ وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا۝۸ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا﴿۹﴾ إِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا﴿۱۰﴾

"یہ وہ لوگ ہوں گے جو (دنیا میں) نذر پوری کرتے ہیں' اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی' اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) "ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں' ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ' ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا"۔

یہ نہایت روشن اور شفاف تصویر ہے اور یہ ان مخلصین اور سچے لوگوں کی شکل ہے جو اللہ کے احکام اور اسلامی نظریہ حیات کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہوتے ہیں۔ اور اپنے مقابلے میں دوسرے بندگان خدا کو ترجیح دیتے ہیں اور اللہ کا ڈر اور خوف ان پر طاری رہتا ہے' وہ اللہ کی رضامندی کے متلاشی ہوتے ہیں۔ اور ان پر اسلام کے حوالے جو بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے وہ اللہ کے عذاب سے ہر وقت ڈرتے ہیں۔

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ (۷۶:۷) "وہ نذر پوری کرتے ہیں"۔ یعنی جو عبادات اور نیک کام خود اپنے اوپر لازم کرتے ہیں' ان کی وفا کرتے ہیں یعنی وہ دین اسلام کے معاملے کو بڑی سنجیدگی سے لیتے ہیں اور اس کی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہیں۔ وہ ان ذمہ داریوں سے پہلوتہی کرنے کی سعی نہیں کرتے اور نہ ذمہ داری قبول کر کے اور اس کا حلف اٹھانے کے بعد اسے نظرانداز کرتے ہیں۔ یہی ہے معنی اس بات کا کہ وہ نذر پوری کرتے ہیں۔ یہ ہے مفہوم یوفون بالنذر کا۔ اس کا مفہوم فقہی اور معروف نذر و نیاز سے زیادہ وسیع ہے۔ جس میں اجتماعی اور دینی ذمہ داریاں بھی داخل ہیں۔

وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا (۷۶:۷) "اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی"۔ وہ اس دن کی حالت اور صفت کا نقشہ ان کے ذہن میں بڑی خوبی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوتا ہے' جس کی مصیبت عام ہوگی اور تمام قصورواروں اور بدکاروں تک اس دن کی مصیبت پہنچے گی۔ لہٰذا وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اس دن کے عام اور وسیع شر کے زد میں کہیں وہ نہ آ جائیں۔ یہ ہے حالت ان کے موقف اور تقویٰ کی۔ وہ اس بھاری ذمہ داری اور دین کے عظیم فرائض کا شدید احساس رکھتے ہیں اور کوتاہیوں اور قصوروں سے ڈرتے ہیں۔ اگرچہ وہ عبادت گزار اور اطاعت شعار ہوں۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (۷۶:۸) "اور اس کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں"۔ یہ ان کی نیکی' مہربانی اور بھلائی کا شعور ہے لیکن اس کا اظہار مساکین وغیرہ کو کھانا کھلانے کی شکل میں کیا گیا ہے۔ باوجود اس کے کہ ان کو اس کھانے کی خود اشد ضرورت ہے' کیونکہ ایسے لوگوں کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ اس کھانے سے محبت کرتے ہیں' الا یہ کہ وہ خود اس کی طرف محتاج ہوں' لیکن اس

احتیاج کے باوجود وہ ایثار کرتے ہیں اور یہ کھانا دوسروں پر خرچ کرتے ہیں۔

اس صفت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے اندر موجود مشرک معاشرے میں معاشی صورت حال کیا تھی' یہاں غرباء اور محتاجوں پر انفاق کا کوئی رواج نہ تھا۔ فخر و مباہات اور نمائش کے لیے تو وہ بہت کچھ لٹا دیتے تھے لیکن غریبوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس خود غرضی اور کنجوسی کے میدان میں اسلام کے پروردہ یہ نیک لوگ ہی غرباء کے لیے سایہ دار درخت تھے۔ وہ اپنی ذاتی محتاجی کے باوجود لوگوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ خلوص اور محبت کے جذبات کے ساتھ اور اللہ کی رضامندی کی خاطر وہ یہ نیکی کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی نیت اور ان کے مقصد کو بھی یہاں ظاہر کیا جاتا ہے کہ وہ کس طرح اور کیونکر خرچ کرتے تھے۔

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (٩) إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا (١٠) (٧٦: ٩ – ١٠) "ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں' ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ' ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہو گا"۔ یہ گویا بلند پایہ قلوب کے اندر رحمت اور محبت کی موجیں ہیں۔ اور یہ محض اللہ کی رضامندی کے حصول کے لیے ہیں۔ ان مہربانیوں سے وہ کوئی جزاء اور کوئی معاوضہ بلکہ شکریہ تک نہیں چاہتے۔ نہ کبر و غرور کا اظہار کرتے ہیں اور نہ غرباء پر اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بس وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس فعل کی وجہ سے سخت مصیبت کے دن کی تکالیف سے بچ جائیں' کیونکہ صدقہ کی وجہ سے مصیبت ٹلتی ہے اور اہل ایمان کو حضور اکرم ﷺ نے بتایا ہے۔

اتق النار ولو بشق تمرہ "آگ سے بچو اگرچہ کھجور کے دانے کی ایک پھاڑی کے ساتھ"۔

اطعام مساکین دراصل اس اعلیٰ جذبے کا اظہار تھا جو یہ لوگ اپنے اندر رکھتے تھے۔ یوں وہ محتاجوں کی بنیادی ضروریات کا انتظام کرتے تھے' لیکن غریبوں اور محتاجوں کی امداد کی شکل و صورت مختلف معاشروں میں مختلف ہو سکتی ہے' لہذا ضروری نہیں ہے کہ غریبوں اور محتاجوں کے طعام کی شکل و صورت وہی ہو جو ابتدائی دور میں مروج تھی۔ اصل بات وہ جذبہ ہے جو اطعام المساکین کی تہ میں کام کر رہا ہوتا ہے۔ ہر معاشرے میں اہل ثروت کو اسے زندہ رکھنا چاہئے اور اس معاملے میں ان کے دلوں کو حساس ہونا چاہئے۔ جذبات زندہ ہوں اور دلوں کے اندر جذبہ خیر موجزن ہو' اور بھلائی کے اس جذبے کے تحت ماسوائے رضائے الہیٰ کے اور کوئی دنیاوی مقصد نہ ہو کہ کوئی دنیاوی نفع مقصود ہو یہاں تک کہ شکریہ کی توقع تک پیش نظر نہ ہو۔

دور جدید میں منظم ٹیکس نافذ کیے جاتے ہیں۔ لوگوں کے ذمہ فرائض عائد کیے جاتے ہیں اور حکومتیں اجتماعی کفالت کے لیے بجٹ عائد کرتی ہیں۔ اور محتاجوں کی امداد بھی کی جاتی ہے لیکن ان آیات میں اسلامی نظام نے جو ہدایات دی ہیں' ان اقدامات کے ذریعہ ان کا ایک پہلو ہی پورا ہوتا ہے اور جسے فریضہ زکوۃ کے ذریعہ پورا کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ایک پہلو ہے یعنی محتاجوں کی ضروریات کو پورا کرنا' جبکہ اسلامی نظام کے پیش نظر یہ بھی ہے کہ دہندگان کو بھی روحانی پاکیزگی حاصل ہو اور وہ بھی اعلیٰ سطح تک بلند ہوں' محتاجوں کی مدد کرنے والوں کی تہذیب اور تربیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ بعض لوگ غرباء کی امداد کو ایک برا فعل تصور کرتے ہیں کہ اس طرح غرباء ذلیل ہوتے ہیں اور دینے والوں کا بھی مزاج بگڑ جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام دلوں کا عقیدہ ہے' وہ ایک نظام تربیت ہے' اگر جذبہ انفاق درست ہو تو اس کے ذریعہ انفاق کرنے والے کی بھی اصلاح ہوتی ہے اور غرباء کو بھی نفع ہوتا ہے۔ یوں انفاق سے دو فائدے ہوتے ہیں' جو اس دین کے پیش

نظر ہیں۔

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا ﴿۱۱﴾

"پس اللہ تعالیٰ انہیں اس دن کے شر سے بچالے گا اور انہیں تازگی اور سرور بخشے گا"۔

یہاں نہایت تیزی کے ساتھ یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس دن کے شر سے بچالیے جائیں گے جس سے وہ بہت ڈرتے ہیں تاکہ دنیا میں بھی یہ لوگ مطمئن ہو جائیں کیونکہ یہاں وہ قرآن کریم کی ہدایات اخذ کرتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں' اس لیے وہاں ان کو اللہ کی جانب سے تروتازگی اور مسرت حاصل ہوگی۔ ان کو سخت مصیبت والے دن کا وہاں احساس ہی نہ ہوگا کیونکہ یہاں وہ خوف کھاتے تھے اور اللہ کے سامنے جانے سے ڈرتے تھے۔ چنانچہ قیامت میں ان کے دل تروتازہ اور ان کا شعور مسرت آمیز ہوگا۔

اس کے بعد جنت کی نعمتوں کا مزید ذکر اور تفصیلات :

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ﴿۱۲﴾

"اور ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا"۔ اس جنت میں ان کی مستقل رہائش ہوگی اور ریشمی لباس ہوگا جسے وہ پہنیں گے۔

مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ﴿۱۳﴾

"وہاں وہ اونچی مسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ نہ انہیں دھوپ کی گرمی ستائے گی' نہ جاڑے کی ٹھر"۔

گویا وہاں ان کی محفلیں منعقد ہوتی رہیں گی جن میں وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھیں گے اور سب کے سب خوشحال اور نعمتوں اور آسائشوں میں ڈوبے ہوئے' خوشگوار موسموں میں ہوں گے جہاں نہ گرمی کی شدت ہوگی اور نہ سردیوں کی منجمد کرنے والی سردی ہوگی۔ بہرحال وہ ایک دوسرا جہاں ہوگا۔ جس میں ہمارے جہاں والے شمس و قمر نہ ہوں گے۔ ایک نئی دنیا ہوگی یہی ہم کہہ سکتے ہیں۔

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿۱۴﴾

"جنت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کر رہی ہوگی' اور اس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے (کہ جس طرح چاہیں انہیں توڑ لیں)"۔ یہ کہ چھاؤں بس قریب ہوگی اور جنت کے درختوں کے پھل بھی ان پر جھکے ہوں گے' تو اس سے زیادہ خوشی اور مسرت اور عیش و عشرت کیا ہو سکتی ہے۔ یہ اعلیٰ ترین تصور ہے' خوشحالی اور فارغ البالی کا۔

یہ تو ہے اس جنت کی عمومی صورت حال جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے تیار کیا ہے' جن کے لیے یہ صورت بیان کی گئی ہے' جو نہایت ہی خوبصورت ہے اور روشن ہے تاکہ دنیا میں کتاب الٰہی میں پڑھ کر وہ خوش ہوں۔ ان نعمتوں اور سہولیات کی مزید تفصیلات :

وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ﴿۱۵﴾ قَوَارِيرَ مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ﴿۱۶﴾ وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ﴿۱۷﴾ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ﴿۱۸﴾

"ان کے آگے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش کرائے جا رہے ہوں گے' شیشے بھی وہ چاندی کی قسم کے ہوں گے' اور ان کو (منتظمین جنت نے) ٹھیک اندازے کے مطابق بھرا ہو گا۔ ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی' یہ جنت کا ایک چشمہ ہو گا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے"۔

یہ لوگ نہایت ہی آسائش اور عیش و عشرت میں ہوں گے۔ سایوں میں تختوں پر بیٹھے ہوں گے' سائے نہایت ہی گہرے اور خوشگوار ہوں گے' نہایت ہی اچھی فضا میں پھل درختوں کے ساتھ اس طرح لٹک رہے ہوں گے کہ وہ جب چاہیں توڑ سکیں گے۔ پھر ان پر جو مشروبات تقسیم ہوں گے' وہ چاندی کے خوبصورت برتنوں میں ہوں گے۔ اور شیشوں کے جام چل رہے ہوں گے اور یہ شیشے بھی چاندی کی قسم کے سفید ہوں گے۔ یعنی چاندی کو اس طرح شفاف بنایا جائے گا کہ وہ شیشہ نظر آئے گا۔ جس کی مثال اس جہاں میں نہ ہوگی۔ پھر جو مشروب ان کے سامنے پیش ہو گا' وہ نہایت مناسب' ہر شخص کی ضرورت کے مطابق ہو گا اور یہ مشروب اک ایسے جاری چشمے سے بھر کر لایا جائے گا جسے سلسبیل کہا جائے گا اور یہ نہایت ہی میٹھا اور خوشگوار ہو گا۔

اب خوشی میں مزید اضافے کے طور پر جو لوگ یہ چاندی کے برتنوں میں شراب طہور پیش کر رہے ہوں گے وہ نہایت ہی خوبصورت لڑکے ہوں گے جو ہمیشہ ایسے لڑکے رہیں گے اور روشن چہرے والے ہوں گے۔ یہ وقت گزر جانے کے ساتھ بوڑھے نہ ہوں گے۔ یہ لوگ ہمیشہ لڑکوں کی طرح تروتازہ اور خوبصورت چہروں والے ہوں گے۔ وہ یوں نظر آئیں گے جیسے موتی جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ﴿۱۹﴾

"ان کی خدمت کے لیے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیئے گئے ہیں"۔

اس کے بعد قرآن مجید ایک نگاہ میں پورے لفظ کو نہایت مختصر الفاظ میں پیش کرتا ہے اور دعوت نظارہ دیتا ہے۔

وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ﴿۲۰﴾

"وہاں جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک بڑی سلطنت کا سروسامان تمہیں نظر آئے گا"۔

ہر طرف نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک عظیم مملکت کا سازوسامان ہو گا' جس میں ابرار عیش کریں گے جو اللہ کے مقرب

بندے ہوں گے اور یہ تو تھی جنت کی اجمالی حالت۔

یہاں بعض چیزوں کا خصوصی ذکر بھی کیا جاتا ہے جو اس عظیم حکومتی انتظام کا مظہر ہیں گویا یہ حکومتی نظام کا نمونہ ہیں۔

عٰلِیَهُمْ ثِیَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّحُلُّوْۤا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾

"ان کی اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے' ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے' اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا"۔

سندس نہایت باریک ریشم کو کہتے ہیں اور استبرق موٹے ریشم کے کپڑوں کو کہتے ہیں۔ ایسے حالات میں جب وہ زیب زینت کیے ہوئے ہوں اور خوب عیش و عشرت کر رہے ہوں' ان کا رب ان کے لیے یہ انتظام فرما رہا ہو گا' جو نہایت ہی کریم عطا کنندہ ہے۔ اور اس سے ان انتظامات کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ انتظام رب تعالیٰ کی طرف سے ہو گا۔ اور ان بہترین انتظامات کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اعزاز میں یہ کلمات بھی کہے جائیں گے۔

۲۲ ع اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾

۱۹

"یہ ہے تمہاری جزا اور تمہاری کارگزاری قابل قدر ٹھہری ہے"۔

عالم بالا سے یہ تقریر ان کے اعزاز میں ہوگی' چنانچہ ان کلمات کی وجہ سے ان انعامات کی قدر و قیمت دوچند ہو جاتی ہے۔ ان الفاظ پر انعامات جنت کی یہ تفصیلات ختم ہوتی ہیں۔ اور یوں لوگوں کو پکارا جاتا ہے کہ قید و بند اور آگ و سلاسل سے بھاگو اور ان نعمتوں میں داخل ہو جاؤ۔ ابھی وقت ہے اور دونوں راستے تمہارے لیے کھلے ہیں۔

جنت کی طرف اس پکار کی انتہا پر اور جنت کی خوشگوار نعمتوں کے ذکر کے بعد' اب ان مشرکین کے حالات کو لیا جاتا ہے' جو عناد میں مبتلا ہیں اور تکذیب پر اصرار کر رہے ہیں' جو دعوت اسلامی کی حقیقت کو ابھی تک نہیں سمجھ سکے۔ اور وہ دعوت اسلامی کے معاملے میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ سودا بازی کرنا چاہتے ہیں۔ یا وہ چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی بعض ایسی باتوں کو ترک کر دیں جن سے ان کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ایک طرف یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سودا بازی کرتے ہیں اور دوسری طرف اہل ایمان پر تشدد کرتے ہیں۔ ان کو ایذائیں دیتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور خود بھلائی' جنت اور نعیم مقیم سے منہ موڑتے ہیں۔ ان حالات میں اس سورت کا یہ آخری حصہ آتا ہے اور ان مسائل پر قرآن کے مخصوص انداز میں تبصرہ کیا جاتا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾

وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَ سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾

"اے نبیؐ ' ہم نے ہی تم پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے ' لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو ' اور ان میں سے کسی بدعمل یا منکر حق کی بات نہ مانو۔ اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو ' رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو"۔

ان چار آیات میں دعوت اسلامی کے حوالے سے ایک عظیم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو داعیان حق کی زندگی میں اچھی طرح رچ اور بس جائے اور وہ ایک طویل عرصہ تک اس حالت میں رہیں اور اس میں غوروفکر کریں اور اس کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے حقیقی مفہوم ' اس کی عملی شکل اور اس کے ایمانی اور نفسیاتی تقاضوں کو پورا کریں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا بنیادی نکتہ عقیدۂ توحید تھا اور آپ ایک عرصہ تک مشرکین مکہ کے سامنے اسے پیش کرتے رہے تھے۔ آپ عقیدۂ توحید کو محض ایک عقیدے کے طور پر ان کے سامنے نہ پیش کرتے تھے۔ اگر آپ صرف ایک عقیدے کا اظہار کرتے تو اس کا برداشت کرنا ان کے لیے آسان ہوتا' کیونکہ عقیدۂ شرک جس کے اوپر وہ لوگ جمے ہوئے تھے ' وہ کوئی ٹھوس قوت اور ثبات والا عقیدہ نہ تھا کہ وہ اس کے ذریعہ عقیدۂ توحید کا مقابلہ کر سکتے ' کیونکہ اسلامی کا عقیدۂ توحید نہایت قوی ' سادہ اور ٹھوس عقیدہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلامی دعوت اور اسلامی عقیدۂ توحید کے ساتھ کچھ حالات ایسے تھے جن کی وجہ سے یہ لوگ عناد اور دشمنی پر اتر آئے۔ اور وہ تاریخی کشمکش برپا ہوئی جس کا ذکر قرآن نے بھی جابجا کیا ہے۔ شرک کے عقیدے کی وجہ سے دراصل قریش کو ایک اجتماعی قیادت کا مقام حاصل تھا۔ اور اس عقیدے کے اردگرد اعلیٰ خداؤں کا جو تانا بانا بنا گیا تھا ' اور پھر ان خداؤں کے ساتھ ان کے جو اجتماعی مفادات وابستہ ہوگئے تھے یہی وہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے قریش دعوت اسلامی کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان کا موقف بظاہر بالکل باطل تھا۔ اور اس باطل عقیدے کو یہ لوگ لے کر اسلام کے ظاہر ' سادہ اور قوی عقیدے کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مزید یہ کہ جاہلی زندگی کی عیاشی ' لذت کوشی اور شہوت رانی اور اباحیت ان کو مجبور کر رہی تھی کہ اس نئے عقیدہ اور نظام کا مقابلہ کیا جائے۔ کیونکہ اس نظام میں قانونی ' اخلاقی پابندیاں ہیں اور اعلیٰ انسانی قدروں پر زور دیا گیا ہے اور جس میں فحاشی اور آزاد شہوت رانی پر پابندیاں تھیں ' جبکہ وہ ایسی زندگی گزار رہے تھے جو اخلاقی بندھنوں سے آزاد تھی۔

یہ اسباب خواہ ان کا تعلق اجتماعی قیادت و سیادت سے ہو یا اقتدار اور مصالح سے ہو یا عادات ' عرف عام ' رسم و رواج اور موروثی تقالید سے ہو ' یا جن کا تعلق اخلاقی حدود و قیود کی آزادی سے ہو۔ جو پہلی دعوت اسلامی کے مقابلے میں اس وقت کے لوگوں کو اٹھا لائے تھے۔ یہی اسباب آج بھی قائم ہیں اور آج بھی ہر ملک اور ہر سرزمین کی دعوت اسلامی کا مقابلہ انہی اسباب و وجوہات سے کیا جا رہا ہے۔ یہ نظریاتی دعوت کا مقابلہ انہی اسباب کی وجہ سے کیا جاتا ہے ' جس کی وجہ دعوت اسلامی کا کام پر مشقت ' مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔

لہٰذا داعیان حق کو چاہئے کہ وہ اس حقیقت پر طویل وقت تک غوروفکر کریں اور ان حقائق میں زندہ رہیں جو ان

آیات میں بیان ہوئے ہیں' چاہے یہ داعیان جس زمان و مکان میں ہوں کیونکہ دعوت اسلامی خواہ جس زمان و مکان میں ہو' اسے انہی حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو پیش آئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اللہ کی جانب سے یہ پیغام ملا کہ آپ لوگوں کو برے انجام سے ڈرائیں اور آپ سے کہا گیا۔

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (۷۴ : ۱)قُمْ فَاَنْذِرْ (۷۴ : ۲) "اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے اٹھو اور ڈراؤ"۔

جب آپ نے دعوت کا آغاز کیا تو یہ اسباب آپ کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوگئے۔ قوم پوری کی پوری دعوت جدید کی راہ روکنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ جن حالت پر وہ قائم ہیں ان کو جوں کا توں رکھیں' باوجود اس کے کہ وہ جانتے تھے کہ ان کا عقیدہ کمزور اور ناقابل قیام ہے۔ پہلے ان کے اندر عناد کا جذبہ پیدا ہوا' پھر انہوں نے اپنے ان کمزور اور بودے عقائد کا دفاع شروع کر دیا۔ اور ان کی جو اجتماعی حالت تھی۔ زندگی کے جو رسم و رواج تھے' جو آزادی اور بے قیدی تھی اور جو عریانی اور فحاشی رائج تھی اس کے دفاع میں یہ لوگ دعوت اسلامی کی راہ روکنے لگے کیونکہ یہ جدید دعوت ان کے لیے خطرہ تھی۔

دعوت اسلامی کا مقابلہ یوں شروع ہوتا ہے کہ ابتدائیں دعوت پر چند سعید روحیں لبیک کہتی ہیں۔ ان کو اذیت دی جاتی ہے اور دھمکیوں اور اذیتوں کے ذریعہ اس کو اس دین سے پھیرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے بعد دعوت کے خلاف ایسا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں دعوت کی غلط تصور بیٹھ جائے۔ مختلف قسم کے بے بنیاد الزامات عائد کیے جاتے ہیں تاکہ جو لوگ داخل ہو گئے ہوں وہ اگر باز نہیں آئے تو اور لوگ داخل نہ ہوں۔ کیونکہ جو لوگ دعوت اسلامی کو سمجھ چکے ہوتے ہیں ان کو دعوت سے روکنے اور واپس لانے کے مقابلے میں نئے لوگوں کو روکنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔

یہ وسائل اختیار کرنے کے بعد انہوں نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر دھمکیوں اور تشدد کے علاوہ دوسرے تمام دباؤ بھی ڈالنا شروع کیے کہ آپ ان کے ساتھ کچھ لو اور کچھ دو کا طریقہ اختیار کرلیں۔ اور آپ ان کے عقائد' ان کے رسم و رواج اور بتوں کے خلاف باتیں بند کریں وہ بھی آپ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے۔ یہ سودابازی بعینہ ایسی تھی جیسا کہ دنیاوی معاملات کے بارے میں لوگ مصالحت کے لیے درمیانی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یہی وہ مراحل ہیں جو ہر اس شخص کو پیش آتے جو بھی زمان و مکان میں منہاج النبوۃ پر دعوت اسلامی کا کام کرتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تو اللہ کے رسول تھے۔ اللہ نے ان کو فتنوں اور دشمنوں سے بچالیا۔ لیکن آپ بہرحال انسان تھے اور آپ کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا جو قلیل گروہ تھا' وہ بھی تھوڑی سی تعداد پر مشتمل تھا۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ آپ بشر ہیں اور آپ کے ساتھی ضعیف ہیں اس لیے اللہ نے ان کو دشمنوں کے حوالے نہیں فرمایا اور ان کی مدد فرمائی۔ اور قدم قدم پر نشانات راہ بتلائے گئے .... چنانچہ ان آیات میں اسی امداد کا ذکر ہے اور اس رہنمائی کا ذکر ہے جو اس مشکل مرحلے میں کی گئی۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا (۷۶ : ۲۳) "اے نبی' ہم نے تم ہی پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا"۔

یہ پہلا نکتہ توجہ طلب ہے' بتایا جاتا ہے کہ اس دعوت کا سرچشمہ اور ماخذ کیا ہے۔ یہ دعوت اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کی طرف ہے۔ اور اللہ ہی اس کا سرچشمہ ہے۔ اسی نے قرآن نازل کیا ہے۔ اللہ کے سوا اس کے اندر کسی اور کا کوئی دخل نہیں ہے اور نہ اللہ کی دعوت کی سوا کسی اور کی دعوت اس کے ساتھ مل سکتی ہے۔ اس کی ہدایات صرف اللہ سے لی جاتی ہیں۔ اس کی کوئی فکر کسی اور ذریعہ سے نہیں پیش جاتی۔ اللہ ہی نے قرآن کریم نازل فرمایا ہے' اللہ ہی حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا ہے لہذا یہ دعوت اللہ کی ہدایت کے مطابق چل رہی ہے اور اس کے بتائے ہوئے نشانات پر جاری ہے۔ کیونکہ اس دعوت کا ماخذ قرآن ہے جو نازل ہی اللہ نے کیا ہے۔

لیکن باطل نہایت مغرور اور سرکش ہوتا ہے اور شر بظاہر پھولا ہوا نظر آتا ہے' اس لیے مومنین کو اذیت دی جاتی ہے۔ ہر قسم کا شر اور فتنہ ان کی راہ میں ہے۔ دعوت اسلامی کے دشمن صرف یہ کر سکتے ہیں کہ وہ لوگوں کو دعوت اسلامی کو قبول کرنے سے روکیں اور اس پر وہ اصرار کرتے رہیں۔ اس پر مزید یہ کہ وہ اپنے عقائد' رسم و رواج اور فتنہ انگیزیوں پر جمے ہوتے ہیں۔ شر و فساد اور فتنہ انگیزی کے اس دور میں یہ لوگ مصالحت اور میانہ روی کی پیش کش کرتے ہیں' معاملات کو نصف نصف تقسیم کرتے ہیں۔ یہ ان مشکل حالات میں ایک پرکشش پیشکش ہے۔ اور ایسے حالات میں اس قسم کی پیشکش کو رد کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن ایسے حالات میں ایک دوسری تنبیہ آتی ہے اور اس اہم معاملے کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (۷۶:۲۴) "لہذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو اور اس میں کسی اور بدعمل یا منکر حق کی بات نہ مانو"۔ کیونکہ تمہارے اور ان کے درمیان کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ نہ تمہارے درمیان کوئی پل ہے' جس کے اوپر سے خیالات' نظریات ادھر ادھر جا سکیں۔ کیونکہ تمہارے مناہج اور جاہلیت کے مناہج کے درمیان وسیع خلا ہے۔ اس کائنات کے بارے میں تمہارا تصور ان کے تصورات سے جدا ہے۔ تم حق پر ہو اور وہ کفر پر ہیں۔ تم ایمان پر ہو اور وہ باطل پر ہیں۔ تم نور پر ہو اور وہ اندھیرے میں ہیں۔ تم علم و معرفت پر ہو اور وہ جاہلیت پر ہیں۔

پھر معاملات تمام اللہ کے احکام کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اللہ کا حکم اور نظام یہ ہے کہ وہ باطل کو بھی موقعہ اور مہلت دیتا ہے۔ شر کو بھی موقعہ دیتا ہے اور بعض اوقات اہل ایمان کو دیر تک آزمائشوں میں ڈال کر ان کو پاک اور خالص کرتا ہے۔ یہ تمام احکام اللہ کی حکمت کے مطابق صادر ہوتے ہیں' اللہ کی تقدیر اور حکمت دنیا کو چلاتی ہے۔ لہذا۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ (۷۶:۲۴) "رب کے حکم پر صبر کرو"۔ اس وقت تک جب وقت آ جائے۔ اذیت پر بھی صبر کرو' مشکلات پر بھی صبر کرو' باطل اگر غالب ہو تو بھی صبر کرو۔ شہ رگ پھولی ہوئی ہو تو صبر کرو' آپ حق کے حامل ہیں۔ اور قرآن آپ کے پاس ہے جو حق پر مشتمل ہے اس لیے آپ حق پر جم جائیں' صبر کریں اور ان کی پیش کشوں کو نظر انداز کر دیں۔ یہ لوگ کچھ دو اور کچھ لو کی پالیسی کے مطابق فیصلہ چاہتے ہیں۔ کچھ اپنی باتیں منوانا چاہتے ہیں۔

وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (۷۶:۲۴) "اور ان میں کسی بدعمل یا منکر حق کی بات نہ مانو"۔ کیونکہ یہ لوگ آپ کو اللہ کی عبادت' اللہ کی اطاعت اور حق پر چلنے نہیں دینا چاہتے۔ کیونکہ یہ لوگ بدکردار اور کفار ہیں۔ یہ

چاہتے ہیں کہ آپ بھی کسی قدر کفر اور شرک کا ارتکاب کریں تاکہ معاملے کا فیصلہ نصف نصف پر ہو جائے۔ کچھ اچھی باتیں وہ مانیں 'کچھ بری باتیں آپ مان لیں۔ اس طرح وہ آپ کو دھوکہ دے کر راضی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی جسمانی خواہشات پوری کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ آپ کو سربراہی کا منصب پیش کرتے ہیں۔ اور آپ کو دولت کی پیشکش بھی کرتے ہیں۔

عتبہ ابن ربیعہ آپؐ سے کہتا ہے "اس کام کو چھوڑ دیجئے' میں اپنی بیٹی آپ کے نکاح میں دیتا ہوں۔ میری بیٹیاں قریش خوبصورت ترین لڑکیاں ہیں"۔ غرض ہر دور اور ہر زمان و مکان میں داعیان حق کو انہی ذرائع سے ورغلایا گیا ہے۔

صبر کریں اگرچہ طویل عرصہ تک آپ کو جدوجہد کرنی پڑے۔ اگرچہ قریش کا تشدد سخت ہو جائے اور راستہ طویل ہو ئے لیکن صبر تو بہت ہی مشکل کام ہے۔ اور اس کے لیے سخت تیاری اور ریاضت کی ضرورت ہے اور وہ تیاری یہ ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (٢٥) وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَه وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا (٢٦) (٧٦: ٢٥ - ٢٦) "اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو' رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو"۔ یہ ہے زاد راہ۔ صبح و شام اللہ کا نام لینا اور طویل راتوں میں اللہ کی پاکی بیان کرنا' اس سرچشمے سے رابطہ بحال رکھنا جہاں سے قرآن کریم کا نزول ہو رہا ہے۔ جہاں سے دعوت اسلامی اور تحریک اسلامی برپا کرنے کا حکم صادر ہوا ہے۔ یہی سرچشمہ قوت کا بھی سرچشمہ ہے۔ یہی اس راہ کے سازو سامان کا بھی ماخذ ہے۔ اور اس کے ساتھ رابطے کا طریقہ ذکر و فکر' تسبیح و تہلیل اور دعاء و عبادت ہے۔ خصوصاً طویل راتوں کے اوقات میں۔ اس لیے کہ یہ راہ طویل ہے۔ اور یہ بوجھ بھاری ہے۔ لہٰذا اس راہ کے لیے بہت ہی بڑی مقدار میں زاد راہ کی ضرورت ہے۔ اور طویل راتوں کی تنہائیوں میں صرف بندے اور رب کی ملاقات تنہائی میں رہتی ہے۔ نہایت پرامیدی اور محبت کی فضا میں۔ اس ملاقات سے تمام تھکاوٹیں اور تمام الجھنیں حل ہو جاتی ہیں۔ اور ضعیفی اور قلت وسائل کی کمی دور ہو جاتی ہے۔ اور تمام تھکاوٹیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور انسان دیکھ لیتا ہے کہ جس مقصد کے لیے وہ کام کر رہا ہے وہ ایک عظیم مقصد ہے اور پھر اس کے مقابلے میں جدوجہد اور قربانیاں اور راہ کی مشکلات اور قربانیاں بہت کم نظر آتی ہیں۔

اللہ رحیم و کریم ہے' اس نے اپنے بندوں کو دعوت کا ذمہ دار بنایا' اس پر قرآن نازل فرمایا' انہیں بتایا گیا کہ ان ذمہ داریوں کا بوجھ کیا ہے' اور راہ کی مشکلات کیا ہیں۔ لہٰذا اللہ نے اپنے نبی کو بے سہارا نہیں چھوڑا۔ اس کی نصرت فرمائی اور یہ تربیت اور راہ کی ان مشکلات کے مقابلے کے لیے تیاری کروانا بھی دراصل اللہ کی مدد اور نصرت ہے۔ اصحاب دعوت اور احیائے اسلام کے لیے کام کرنے والوں کا یہی زاد راہ ہے۔ ہر دور میں اور ہر جگہ..... یہ دعوت ایک ہے۔ اس کا طریق کار ں ایک ہے اور حالات اور واقعات بھی ایک ہیں۔ اہل باطل نے ہمیشہ اس کے خلاف ایک ہی راستہ اختیار کیا ہے۔ جو وسائل ﷺ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برخلاف باطل نے اختیار کیے وہی ہر باطل ہر حق کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ ہمیشہ باطل ایک قسم کے اسباب و وسائل لے کر حق کے مقابلے میں آتا ہے۔ لہٰذا حق کے اسباب اور وسائل بھی وہی ہونے چاہئیں۔ جو نے اختیار کیے ہیں۔

وہ حقائق کیا ہیں جن کے اندر داعیان حق کو رہنا چاہئے؟ یہ وہی ہیں جو داعی اول نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سکھائے ۔۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ دعوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہ کام اللہ کا ہے۔' دوسری بات یہ کہ یہ حق جو

اللہ کی طرف سے آیا ہے۔اس کے ساتھ باطل کا آمیزہ نہیں ہو سکتا۔ نہ اہل حق اور اہل باطل کے درمیان باہم تعاون ہو سکتا ہے۔یا کچھ لو اور کچھ دو پر سودا بازی ہو سکتی ہے۔اس لیے کہ دونوں کے منہاج باہم مختلف ہیں' دونوں کے راستے جدا ہیں۔ اگر کسی وقت باطل اپنی قوت اور دبدبے کی وجہ سے غالب ہوتا ہے تو اس میں بھی اللہ کی رضا اور حکمت ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں اہل ایمان کے لیے صبر ضروری ہوتا ہے اور اس میں اللہ کی حکمت ہوتی ہے۔اور اہل حق کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ صبر' نماز اور تسبیح اور تہلیل اور ذکر و فکر کے ذریعہ مشکلات پر قابو پائیں۔...... یہ ہے وہ عظیم حقیقت جس کا ادراک ان تمام لوگوں کو اچھی طرح کر لینا چاہئے جو دعوت دین لے کر اٹھتے ہیں۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کے منہاج اور طریق کار کے درمیان جو جاہلیت کا منہاج ہے۔اور اسلامی منہاج اور طریق کار کے درمیان جو خدائی منہاج ہے۔ مکمل جدائی اور فرق ہے۔یہ لوگ اپنا بھلا نہیں چاہتے' ان کے اغراض و مقاصد نہایت گرے پڑے ہیں اور ان کی سوچ بہت ہی چھوٹی ہے۔کیا فرق ہے دونوں میں؟

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا ﴿٢٧﴾

"یہ لوگ تو جلدی حاصل ہونے والی چیز (دنیا) سے محبت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں"۔ یہ لوگ جن کی امیدیں نہایت ہی قریبی ہیں' جو نہایت ہی چھوٹی چیزوں کو بڑی اور اہم سمجھتے ہیں' جن کی سوچ اور جن کے مطالبے بہت ہی چھوٹے ہیں۔یہ چھوٹے لوگ ہیں اور یہ اس دنیا ہی میں گم ہیں' دنیا کے شب و روز ہی ان کے لیے اہم ہیں۔اور وہ عظیم اور ثقیل دن اور بھاری ذمہ داریوں کا دن ان کی نظروں سے اوجھل ہے۔ حالانکہ وہ بہت ہی بھاری دن ہو گا۔یہ ایسے لوگ ہیں جن کی اطاعت کسی چیز میں نہیں کی جا سکتی۔جن کا اتباع کسی راہ پر نہیں کیا جا سکتا۔یہ مومنین کے ساتھ کسی دوراہے پر ملتے ہی نہیں' کسی نکتے پر ہم مقصد نہیں۔ان کی نظریں دنیا پر ہیں' دنیا کے اقتدار اور مال و اسباب پر ہیں' جو نہایت ہی حقیر و قلیل قدر و قیمت کی حامل ہیں۔

بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اصل چیز سے غافل ہیں۔یہ لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز کو حاصل کرتے ہیں اور وہ بھاری نتائج کا دن جب یہ زنجیروں اور طوق و سلاسل میں جکڑے ہوں گے اور سخت حساب و کتاب ہو گا۔اسے یہ بھولے ہوئے ہیں۔

اس آیت میں روئے سخن تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کی طرف ہے کہ یہ لوگ ایسے ہیں اور ان کے ساتھ سلوک ایسا ہونا چاہئے لیکن بالواسطہ یہ ان لوگوں کو ایک قسم کی دھمکی ہے جو دنیا پرست ہیں اور دنیا کے اہتمامات میں لگے ہوئے ہیں۔اور ایسے دنیا پرست لوگ درحقیقت اسلامی تحریک کے کام کے نہیں۔

اب یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ ہی نے ان کو یہ حالات دیئے ہیں' یہ قوت' یہ مقام' یہ شوکت' ان کو اللہ ہی نے دی ہے۔اور اللہ اس پر قادر ہے کہ ان لوگوں کو ضعیف و ناتواں بنا دے اور ان سے ان کی یہ حالت چھین لے لیکن اللہ کے کام گہری حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اور وہ اس دنیا کو ایک طویل عرصے سے اپنی حکمتوں کے مطابق چلاتا آ رہا ہے۔

نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا ﴿٢٨﴾

”ہم نے ہی ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں' اور ہم جب چاہیں ان کو بدل کر رکھ دیں“۔

یہ ذرا ان لوگوں کو تنبیہ اور تذکیر ہے جو اپنی قوتوں پر مغرور ہیں کہ تمہاری قوت بلکہ تمہارے وجود کا سرچشمہ بھی درحقیقت ہم ہیں۔ اور اس کے بعد مومنین کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ اگرچہ تم قلیل و ضعیف ہو لیکن تم جس ذات کی دعوت لے کر اٹھے ہو وہ نہایت ہی قوت والی ذات ہے۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمام واقعات اللہ کی قدرت سے وجود میں آتے ہیں اور ان کی پشت پر اللہ کی قدرت کارفرما ہوتی ہے۔ اور تمام امور اس کی حکمت کے مطابق سرانجام پاتے ہیں اور وہ احکم الحاکمین ہے۔

وَ اِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا (٦ ٧ : ٨ ٢) ”اور جب ہم چاہیں ان کو بدل کر رکھ دیں“۔ اللہ کے مقابلے میں یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اللہ نے ہی ان کو پیدا کیا ہے۔ یہ قوت اللہ ہی نے ان کو دی ہے۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ ان کے مقابلے میں ایک دوسری قوم اٹھا دے جو ان کی جگہ لے لے۔ اللہ نے جو ابھی تک ان کو مہلت دی ہے اور ان کی جگہ دوسری قوت نہیں اٹھائی تو یہ اللہ کا فضل و کرم ہے اور اس کا فیصلہ اور حکمت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اور آپ ؐ کے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ اہل ایمان کے موقف اور دوسروں کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو اس دنیا کے معاملات میں غرق ہیں' جو اپنی قوت پر مغرور ہیں کہ وہ اللہ کی نعمتوں کی قدر کریں' یہ نہ کریں کہ شکر ادا کرنے کی بجائے وہ اللہ کی نعمتوں کو ذریعہ غرور بنائیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ نعمتیں اور یہ مہلت دراصل آزمائش ہے۔ جس طرح سورت کے آغاز میں تصریح کی گئی تھی۔

اس کے بعد ان کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم کو جو مہلت دی گئی ہے اس کی ایک ایک گھڑی تمہارے لیے بہت قیمتی ہے' قرآن کریم اللہ کی رحمت ہے۔ یہ مسلسل نازل ہو رہا ہے اور یہ سورت بھی ایک تذکرہ ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿٢٩﴾

”یہ ایک نصیحت ہے' اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے“۔

اور اس کی بعد یہ تصریح بھی کر دی جاتی ہے کہ اللہ کی مشیت بے قید ہے۔ اور ہر چیز اللہ کی مشیت کے مطابق ظہور پذیر ہوتی ہے۔ تاکہ لوگوں کی آخری توجہ اللہ کی طرف ہو۔ اور آخر کار سب لوگ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ انسان اپنی قوت پر مغرور ہونے کی بجائے اللہ کی قوت پر بھروسہ کرے۔ اور یہ عقیدہ رکھے کہ حقیقی قوت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے یعنی پوری طرح اللہ کے آگے جھک جائے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿٣٠﴾

”اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے' یقیناً اللہ بڑا علیم و حکیم ہے“۔

یہ اس لیے تاکہ انسانوں کے دل یہ جان لیں کہ فاعل مختار دراصل اللہ ہے۔ وہی متصرف اور زبردستی کنٹرول کرنے

والا ہے تاکہ سب دل اللہ ہی کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ یہ ہے وہ حقیقت جو ان آیات میں بیان کی گئی ہے کہ اصل فاعل مختار اللہ ہے لیکن اللہ نے انسان کو یہ طاقت دی ہے کہ وہ حق و باطل کو سمجھ سکے اور اللہ کی مشیت کے مطابق سچائی یا باطل کی طرف اپنا رخ کر سکے۔ اس کے لیے اللہ نے انسان کو علم و معرفت بھی عطا کیا۔ اور رسول بھیج کر انسانوں کو حق و باطل کا راستہ بھی اچھی طرح سمجھایا۔ اور قرآن اور دوسری کتابیں اتار کر راستے کی نشاندہی بھی کر دی۔ لیکن یہ سب امور اللہ کی قدرت اور مشیت کے دائرے کے اندر ہوتے ہیں۔ پس جو شخص اللہ کی طرف اپنا رخ کرتا ہے۔ اللہ اسے راہ راست کی طرف آنے کی توفیق دیتا ہے۔ جب وہ اپنا رخ اللہ کی طرف نہ کرے اور اللہ کے سامنے دست بدعا نہ ہو تو وہ ہدایت و فلاح سے محروم ہو جاتا ہے اور ایسے شخص کو توفیق نہیں ہوتی۔

۲
يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۳۱﴾ ۹ع

۲۰ "اپنی رحمت میں جس کو چاہتا ہے داخل کرتا ہے' اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

غرض اللہ کی مشیت بے قید ہے' جس طرح چاہے فیصلہ کر دے۔ اگر اللہ چاہے تو کسی کو بھی اپنی رحمت میں داخل کر دے۔ انسانوں مین سے ہو' جو بھی اس کی رحمت میں داخل ہونے کی التجا کرے۔ اس کی اطاعت پر اللہ کی مدد طلب کریں۔ ہدایت کی توفیق کے طلبگار ہوں جبکہ ظالموں کے لیے اس نے عذاب تیار کر رکھا ہے' جو بہت دردناک ہے اور اللہ نے ان کو اس جہاں میں مہلت دے رکھی ہے تاکہ وہ عذاب الیم تک جا پہنچیں۔

سورت کا یہ خاتمہ اس کے آغاز سے ہم آہنگ ہے۔ اس میں آزمائش کا آخری انجام بتلایا گیا ہے۔ جس کے لیے اللہ نے انسان کو نطفہ امشاج (مخلوط نطفے) سے پیدا کیا ہے جس کے لیے اللہ نے انسان کو سمع و بصر عطا کیا۔ اور جنت اور دوزخ کا راستہ بتلایا ہے۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۲۹

سورۃ المرسلٰت ۔ ۷۷

۱ -- تا -- ۵۰

سورۃ المرسلٰت ایک نظر میں

اس سورت کے خدوخال تیز' اس کے مناظر شدید اور اس کے اثرات گہرے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ گویا تیز اور کاٹنے والے کوڑے ہیں' جو آگ برسا رہے ہیں۔ گویا ایک انسان اور اس کا قلب ایک عدالت میں کھڑے ہیں اور ان کا مقدمہ زیر سماعت ہے۔ سوالات پر سوالات ہو رہے ہیں۔ دھمکی آمیز سوالات اور تیر کی طرح تیز اور چبھتی ہوئی دھمکیاں آ رہی ہیں۔

اس سورت میں دنیا و آخرت کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ کائنات اور نفس انسانی کے حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ خوفناک عذاب الٰہی کے مشاہد ہیں اور ہر منظر اور مشہد کے بعد ایک چبھتا ہوا تیر مجرمین کے دلوں پر آکر گرتا ہے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۷۷ : ۱۵) "تباہی ہے' اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔ یہ چبھتا ہوا فقرہ دس مرتبہ دہرایا جاتا ہے جو ان مجرموں کے دلوں پر چرکے لگاتا جاتا ہے۔ یہ فقرہ اس سورت کے تیز خدوخال اور شدید مناظر اور گہرے اثرات کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

یہ ویسا ہی مکرر فقرہ ہے اور بار بار کی ضرب ہے جیسا کہ سورہ رحمٰن میں ایک ایک نعمت کے گننے کے بعد یاد دہانی کا مکرر سوالیہ فقرہ دہرایا گیا تھا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ "اے جن و انس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔ اسی طرح ایک لازمی نتیجہ سورۃ قمر میں ہر واقعہ عذاب کے بعد لایا جاتا رہا۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ "پس کیسا رہا میرا عذاب اور میری تنبیہہ"۔ یہاں اس فقرے کا بار بار دہرانا سورت کو ایک خاص ذائقہ اور تیز و طرار خصوصیات عطا کرتا ہے۔

سورت کے مقطعے اور فقلے چھوٹے چھوٹے ہیں اور پے درپے آ رہے ہیں۔ سرعت اور سختی کے ساتھ' قوافی میں تعدد ہے' ہر مقطع الگ قافیہ رکھتا ہے' بعض قافیے دہرائے بھی جاتے ہیں۔ پردۂ احساس پر ان فواصل' قوافی اور مقطعوں کا ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ انداز کلام سخت ہے۔ ایک ایک ضرب کے بعد گویا نئی ضرب لگائی جاتی ہے۔ بلکہ یہ پوری سورت ہی عقل و خرد کے پردے پر مسلسل ضربات پر مشتمل ہے۔ اور ہر ضرب شدید سے شدید تر ہے۔

سورت کا آغاز ہی طوفانی فضا سے ہوتا ہے' شدید ہواؤں کا ذکر ہے' یا تیز رفتار فرشتوں کا ذکر ہے جو دوڑے پھرتے ہیں "قسم ہے ان ہواؤں کی جو پے درپے بھیجی جاتی ہیں' پھر طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں' پھر ان کو پھاڑ کر جدا کرتی ہیں' پھر دلوں میں خدا کی یاد ڈالتی ہیں' عذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر"۔ یہ ہے اس سورت کا آغاز جو اس کی فضا اور اس کے انداز کے عین مطابق ہے۔

قرآن کریم کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ سورت کے مضامین اور مناظر کے لیے ایک مخصوص ملائم فضا تیار کرتا ہے۔ یہ

سورت بھی اسی قسم کے مضامین' مناظر اور مخصوص فضا کی ایک مثال ہے۔ مثلاً اس کے علاوہ ذرا سورہ الضحیٰ کو پڑھیے۔ مضمون یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رب کی مہربانیوں کا ذکر کیا جائے۔اس لیے صبح اور شام کا ذکر ہوا اور رات کے چھانے کا ذکر' جس کے اندر انسان پناہ لیتا ہے اور آرام کرتا ہے۔ حفاظت' مہربانیوں اور رعایتوں کے لیے یہ مناظر مناسب تھے۔ سورہ عادیات کا مضمون تھا لوگوں کو قبروں سے اٹھانا' جبکہ وہ مرمٹ کر مٹی اور غبار ہوں گے۔ تو وہاں ایسے تیز رفتار گھوڑوں کا ذکر کیا گیا جو پھنکارتے ہوئے گرد و غبار اڑاتے ہیں۔ مناظر کے پس منظر کے اندر ہم آہنگی کی مثالیں قرآن کریم میں بے شمار ہیں۔ (دیکھیے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن)

اس آغاز کے بعد سورت کے دس مقطعوں میں سے ہر مقطع گویا ایک مشاہداتی سفر ہے۔ ہر مقطعہ اس وسیع و عریض کائنات میں ایک سفر پر مشتمل ہے' جس سے مسافر کو گہرا شعور' بلند خیالات اور پاکیزہ تاثرات حاصل ہوتے ہیں اور یہ اس کی زندگی کو تبدیل کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ مشاہداتی اور تصوراتی بحران ان کلمات سے زیادہ وسیع ہے۔ ہر مقطع کے چند الفاظ گویا نشانات راہ ہیں۔ جگہ جگہ تیر کے نشان کی طرح ہیں جو ایک وسیع وادی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ دس مقطعے گویا دس جہانوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اور ہر جہاں اور ہر میدان دوسرے سے مختلف اور وسیع تر ہے۔

پہلا سفر وقوع قیامت کے مناظر پر مشتمل ہے۔ اس میں وہ عظیم کائناتی انقلابات دکھائے گئے ہیں جو اس وقت وقوع پذیر ہوں گے نہ یہ آسمان رہے گا اور نہ یہ زمین اور اللہ کے نمائندے بندوں کے حسابات کے دفاتر اور فائلیں لے کر حاضر ہوں گے۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ(۸) وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ(۹) وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ(۱۰) وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ(۱۱) لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ(۱۲) لِیَوْمِ الْفَصْلِ(۱۳) وَمَآ اَدْرٰكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ(۱۴) وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ(۱۵) (۷۷:۸ تا ۱۵) "پھر جب ستارے ماند پڑ جائیں گے' اور آسمان پھاڑ دیا جائے گا' اور پہاڑ دھنک ڈالے جائیں گے' اور رسولوں کی حاضری کا وقت آ پہنچے گا (اس روز وہ چیز واقع ہو جائے گی) کس روز کے لیے یہ کام اٹھا رکھا گیا ہے؟ فیصلے کے روز کے لیے۔ اور تمہیں کیا خبر کہ وہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔

دوسرا مطالعاتی سفر امم سابقہ کے بارے میں ہے۔ یعنی ان اقوام کے بارے میں جو اللہ کے نبیوں کو جھٹلاتے ہیں۔

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِیْنَ(۱۶) ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِیْنَ(۱۷) كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ(۱۸) وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ(۱۹) (۷۷:۱۶ تا ۱۹) "کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر انہی کے پیچھے ہم بعد والوں کو چلتا کریں گے۔ مجرموں کے ساتھ ہم یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔

تیسرا مطالعاتی سفر وادی تخلیق انسان میں ہے۔ انسان کی تخلیق کا نظام ایک وسیع ترجہاں ہے۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (٢٠) فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ (٢١) اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (٢٢) فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ (٢٣) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٢٤) (٧٧: ٢٠ تا ٢٤) "کیا ہم نے ایک حقیر پانی سے تمہیں پیدا نہیں کیا اور ایک مقررہ مدت تک اسے ایک محفوظ جگہ ٹھیرائے رکھا؟ تو دیکھو، ہم اس پر قادر تھے، پس ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

اور چوتھا سفر اس زمین کا ہے جو اپنے زندہ اور مردہ بچوں کو اپنے سینے کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ اس زمین میں ان کا سامان حیات و ممات تیار رکھا ہے۔ اور اللہ نے اسے ایسا بنایا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا (٢٥) اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا (٢٦) وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا (٢٧) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٢٨) (٧٧: ٢٥ تا ٢٨) "کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا، زندوں کے لیے بھی اور مردوں کے لیے بھی اور اس میں بلند و بالا پہاڑ جمائے اور تمہیں میٹھا پانی پلایا؟ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

پانچواں سفر ان لوگوں کی دنیا کا ہے جو آواز حق کو جھٹلانے والے ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے فیصلے کے دن ان کے حالات کیا ہوں گے، کس قدر سرزنش ہوگی اور کس قدر سخت عذاب ہوگا۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (٢٩) اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (٣٠) لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ (٣١) اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (٣٢) كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ (٣٣) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٣٤) (٧٧: ٢٩ تا ٣٤) "چلو اب اسی چیز کی طرف جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ چلو اس سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے۔ نہ ٹھنڈک پہنچانے والا اور نہ آگ کی لپٹ سے بچانے والا۔ وہ آگ محل جیسی بڑی بڑی چنگاریاں پھینکے گی (جو اچھلتی ہوئی یوں محسوس ہوں گی) گویا کہ وہ زرد اونٹ ہیں۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

چھٹا اور ساتواں سفر بھی انہی مکذبین کے ساتھ ہے۔ مزید سرزنش اور تذلیل ہے ان لوگوں کی۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ (٣٥) وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ (٣٦) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٣٧) هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ (٣٨) فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ (٣٩) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٤٠) (٧٧: ٣٥ تا ٤٠) "یہ وہ دن ہے جس میں وہ نہ کچھ بولیں گے اور نہ انہیں موقع دیا جائے گا کہ کوئی عذر پیش کریں۔ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے

لیے ۔ یہ فیصلے کا دن ہے ۔ ہم نے تمہیں اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو جمع کر دیا ہے ۔ اب اگر کوئی چال تم چل سکتے ہو تو میرے مقابلہ میں چل دیکھو ۔ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔

اور آٹھواں سفر متقین کے ساتھ ۔ یہ دکھایا گیا ہے کہ ان کے لیے کیا کیا انعامات ہیں ۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ (٤١) وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ (٤٢) كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (٤٣) اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (٤٤) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٤٥) (٧٧: ٤١ تا ٤٥) "متقی لوگ آج سایوں اور چشموں میں ہیں اور جو پھل وہ چاہیں (ان کے لیے حاضر ہیں) کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو ۔ ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں ۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

نواں سفر بھی مکذبین کے ساتھ ایک جھلک ہے ۔ سخت سرزنش کرتے ہوئے ۔

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ (٤٦) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٧٧: ٤٧)

"کھا لو اور مزے کر لو تھوڑے دن ۔ حقیقت میں تم لوگ مجرم ہو ۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

اور دسواں سفر بھی مکذبین کے موقف کے بارے میں ہے کہ یہ لوگ کس طرح ہٹ دھرمی کر رہے ہیں ۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ (٤٧) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٧٧: ٤٩)

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اللہ کے آگے) جھکو تو نہیں جھکتے تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔۔۔ ان سفروں' ان مناظر' ان موثرات و اشارات کے بعد یہ خاتمہ کلام ۔

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (٧٧: ٥٠) (اب اس قرآن کے بعد کون سا کلام ایسا ہو سکتا ہے جس پر یہ ایمان لائیں گے"۔

غرض قاری کا فکر و ذکر اس تیز رفتار سورت کے ساتھ' اس کے مشاہد و مناظر میں بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے ۔ رہے سورت کے موضوعات کلام تو وہ وہی ہیں جو قرآن کی دوسری سورتوں میں ہیں' خصوصاً مکی سورتوں میں ۔ لیکن وہی حقائق اس سورت میں بالکل ایک نئے زاویہ سے بیان کیے گئے ہیں ۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ وہی موضوع اور مضمون ہر بار نئے ذوق و شوق' نئے منظر و پس منظر کے ساتھ' نئی فکری اور نفسیاتی زاویوں کے ساتھ بیان ہوتا ہے ۔ ہر موقعہ و محل کی ضرورت کے مطابق ۔ چنانچہ وہی بات ہر بار جدید نظر آتی ہے اور اس کے اندر جدید نفسیاتی اشارات و دلائل ہوتے ہیں جو نفس انسانی کا حصہ بن جاتے ہیں ۔ اور انسان ہر بار ایک نئے انداز سے لبیک کہتا ہے ۔

اس سورت میں جہنم کے مناظر بھی جدید ہیں اور مکذبین کے سامنے یہ مناظر نئے انداز سے پیش کیے جاتے ہیں ۔ یوں نظر آتا ہے کہ مضمون کا انداز بیان اور مخاطبین سب نئے ہیں ۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ہر سورت ایک نئی شخصیت بن کر سامنے آتی ہے ۔ جس کے اپنے فیچر اور خدوخال ہوتے ہیں اور وہ گہرے اثرات کی حامل ہوتی ہے ۔

درس نمبر ۲۷۷ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۵۰

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّيَّةٌ (۳۳) (۷۷)
اٰيَاتُهَا ۵۰ رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ﴿۵﴾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴿۶﴾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے ان ہواؤں کی جو پے درپے بھیجی جاتی ہیں' پھر طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور بادلوں کو اٹھاکر پھیلاتی ہیں' پھر ان کو پھاڑ کر جدا کرتی ہیں' پھر دلوں میں خدا کی یاد ڈالتی ہیں' عذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر' جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے"۔

مسئلہ دراصل وقوع قیامت کا ہے۔ مشرکین مکہ کے لیے اس کا سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ آیا یہ کس طرح واقع ہوگی۔ قرآن کریم نے اس مسئلہ کو مختلف اسالیب میں' مختلف دلائل و شواہد کے ساتھ بیان فرمایا۔ یہ مسئلہ ان لوگوں کے ذہن میں بٹھانا بہت ہی ضروری تھا' اس لیے کہ اس کے سوا اسلامی نظریہ حیات ان کے ذہن میں بیٹھ ہی نہ سکتا تھا۔ اور نہ ان کی زندگی کی قدریں صحیح طرح متعین ہو سکتی تھیں۔ اور نہ زندگی کے اصول اور فروغ وضع ہو سکتے تھے۔ تمام آسمانی کتب اور عقائد میں وقوع قیامت کا عقیدہ پہلا زینہ رہا ہے۔ دراصل انسانی زندگی کی اصلاح اور صحیح تعمیر اس کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ انسان کی زندگی اور اس کے اعمال کا دارومدار اسی عقیدے پر ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو صرف اس عقیدے کے ذریعہ ہی درست کیا جا سکتا ہے۔ اور انسان کے لیے صحیح اعلیٰ قدریں قیامت کی جوابدہی کے تصور ہی سے کی جا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس عقیدے کو عربوں کے ذہن میں بٹھانے کے لیے اس قدر طویل جدوجہد کی تاکہ وہ اس پر اچھی طرح یقین پیدا کرلیں۔

سورت کے آغاز میں اللہ قسم اٹھاتا ہے کہ آخرت کا وعدہ پورا ہونے والا ہے۔ اور قسم کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن امور پر اللہ نے قسم اٹھائی ہے وہ بھی غیبی حقائق ہیں۔ ایسی قوتیں جو پوشیدہ ہیں اور اس کائنات کے نظام میں وہ

بہت ہی موثر ہیں جس طرح انسانی زندگی کے اندر بھی موثر ہیں۔سلف صالحین نے ان کے مفہوم کے تعین میں اختلاف کیا ہے۔بعض نے یہ کہا ہے کہ ان تمام الفاظ سے مراد ہوائیں ہیں' بعض نے کہا کہ ان سے مراد ملائکہ ہیں۔بعض نے کہا کہ بعض الفاظ سے مراد ہوائیں ہیں اور بعض سے مراد ملائکہ ہیں۔ان تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مفہوم اور مدلول بہرحال مجمل اور پوشیدہ ہے۔اور یہ اجمال' غموض اور عدم وضاحت اس حقیقت کے زیادہ مناسب ہے۔جس پر قسم اٹھائی جارہی ہے کیونکہ وہ بھی غیبی حقیقت ہے اور جس طرح وہ چیزیں جن کی قسم اٹھائی جارہی ہے' خواہ فرشتے ہوں یا ہوائیں ہوں' انسانی زندگی میں موثر ہیں۔اسی طرح قیامت بھی انسانی زندگی میں موثر ہوگی۔

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا (۷۷ : ۱) "قسم ہے ان کی جو پے درپے بھیجے جاتے ہیں"۔حضرت ابوہریرہ ﷛ سے روایت ہے کہ ان سے مراد ملائکہ ہیں۔مسروق' ابوالضحیٰ' مجاہد سے ایک روایت کے مطابق' سدی' ربیع ابن انس ابو صالح (ایک روایت کے مطابق) سے بھی ایسی ہی روایت ہے۔اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ قسم ہے ان فرشتوں کی جن کو احکامات الہیہ کے ساتھ پے درپے بھیجا جاتا ہے۔جس طرح گھوڑے کی گردن کے بال (ایال) لمبے اور مسلسل ہوتے ہیں۔لیکن لائن میں اسی طرح یہ فرشتے پے درپے آتے ہیں۔یہی بات انہوں نے عاصفات' ناشرات' فارقات اور ملقیات کے بارے میں کہی ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہیں۔

اور حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ المرسلات عرفا سے مراد ہوائیں ہیں' اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ مسلسل اور پے درپے چلتی ہیں جس طرح گھوڑے کے ایال چلتے ہیں۔یہی رائے ان کی عاصفات اور ناشرات کے بارے میں ہے۔حضرت ابن عباس' مجاہد' قتادہ اور ابوصالح نے (ایک روایت کے مطابق) بھی اس کی تائید کی۔

ابن جریر نے المرسلات کے بارے میں توقف کیا ہے کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں یا ہوائیں اللہ ہی جانتا ہے۔لیکن عاصفات سے انہوں نے قطعاً مراد ہوائیں لی ہیں۔یہی بات انہوں نے ناشرات کے بارے میں کہی کہ یہ ہوائیں ہیں جو بادلوں کو بکھیرتی ہیں۔

اور حضرت ابن مسعود سے روایت ہے (الفارقات فرقا، الملقیات ذکرا، عذرا او نذرا) سے مراد فرشتے ہیں۔یہی رائے حضرت ابن عباس' مسروق' مجاہد' قتادہ' ربیع ابن انس' سدی اور ثوری سے منقول ہے۔اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔یہ فرشتے اللہ کے احکام لے کر رسولوں پر آتے ہیں اور حق و باطل کے درمیان فرق کرتے ہیں۔رسولوں پر وحی کا القا کرتے ہیں' جس کے اندر لوگوں کے لیے ڈراوا اور اتمام حجت ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ ان الفاظ یا ان کے اس مفہوم کو ارادتاً مجہول رکھا گیا ہے جس کی قسم اٹھائی گئی ہے مثلاً (الذاریات ذروا) اور (النازعات غرقا) کے مفہوم کو ارادتاً مجمل رکھا گیا ہے۔نیز متقدمین نے ان کے مفہوم میں جو اختلاف کیا ہے یہ بھی دلیل ہے اس امر پر کہ ان الفاظ کے مفہوم مقسم بہ کو مبہم رکھا گیا ہے اور ان مقامات پر ابہام اصل مقصود تھا۔لہٰذا اشاراتی انداز ہی اس مقام پر زیادہ موزوں ہے۔یہ الفاظ اور ان کی مبہم اشارات اور ان کا تسلسل اور ترنم اور ان کی پیدا کردہ فضا انسانی شعور کے اندر ایک ارتعاش پیدا کرتی ہے۔اور یہ ارتعاش اور کام پر ابھارنا اس سورت کے موضوع اور سورت کے رخ کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہیں۔اس سورت کا ہر مقطع دراصل انسان کو ایک شدید جھٹکا دیتا اور جھنجھوڑتا

ہے کہ باز آجاؤ ان بداعمالیوں سے اور اللہ کی ظاہر اور باہر اور حقیقی آیات و نشانات کا انکار نہ کرو۔ اور اگر تم باز نہیں آتے تو پھر تکذیب پر اصرار کرنے والوں کے متعین انجام کے لیے تیار ہو جاؤ۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ "اس دن انکار کرنے والوں کے لیے ہلاکت ہے"۔

اس کے بعد انسانی فکر و نظر اور شعور کو ایک شدید جھٹکا دیا جاتا ہے کہ جب وہ دن آئے گا جس کا تمام رسولوں کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے۔ جس دن تمام رسول اپنی کارکردگی پیش کریں گے اور جس دن لوگوں کی اعمال کے فیصلے ہوں گے تو وہ کیسا دن ہو گا۔

فَإِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ﴿٨﴾ وَإِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ﴿٩﴾ وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ﴿١٠﴾ وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتْ ﴿١١﴾ لِأَيِّ يَوْمٍ أُجِّلَتْ ﴿١٢﴾ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ﴿١٣﴾ وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ﴿١٤﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٥﴾

"پھر جب ستارے ماند پڑ جائیں گے' اور آسمان پھاڑ دیا جائے گا' اور پہاڑ دھنک ڈالے جائیں گے' اور رسولوں کی حاضری کا وقت آ پہنچے گا (اس روز وہ چیز واقع ہو جائے گی) کس روز کے لیے یہ کام اٹھا رکھا گیا ہے؟ فیصلے کے روز کے لیے۔ اور تمہیں کیا خبر کہ وہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔

جب ستارے ماند پڑ جائیں گے اور ان کی روشنی چلی جائے گی۔ اور جب آسمان میں دراڑیں پڑ جائیں گی اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑا دیئے جائیں گے۔ اس قسم کے مناظر اور مشاہد کو قرآن کی مختلف سورتوں میں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ سب کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ نظر آنے والی کائنات ایسی نہ رہے گی اور اس کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ یہ کرات سماوی ریزہ ریزہ ہوں گے۔ بہت عظیم دھماکے ہوں گے' یہ عظیم دھماکے ایسے ہی ہوں گے جس طرح کے دھماکے معمولی پیمانے کے' وہ زلزلوں اور آتش فشانی کی شکل میں دیکھتے رہتے ہیں۔ گویا قیامت کے دن یہ زلزلے' دھماکے' آتش فشانی کے واقعات بہت بڑے پیمانے پر ہوں گے۔ جس طرح عید اور شب قدر کے موقعہ پر بچے آتش فشانی کرتے ہیں یا مثلاً ایٹمی دھماکے اور ہائیڈروجن کے دھماکے۔ لیکن پوری کائنات کے کرات کے باہم ٹکرانے سے جو ہولناکیاں پیدا ہوں گی وہ بہت عظیم ہوں گے۔ وہ انسانی تصور سے بالا ہیں اور ان دھماکوں کے بعد پھر انسانوں کا زندہ موجود رہنا اور تماشے دیکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔

ان دھماکوں اور ہولناکیوں کے بعد پھر یہ سورت بتاتی ہے کہ ایک دوسرا عظیم واقعہ ہو گا اور وہ یہ کہ رسولوں سے کہا جائے گا کہ وہ اپنے فریضہ رسالت کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کریں۔ آدم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک رسولوں کی حاضری کا وقت آجائے گا۔ اور یہ حساب و کتاب اس قدر عظیم ہو گا جس کے لیے اس پوری کائنات کے اندر زلزلہ برپا کر کے میدان ہموار کیا گیا۔ زمینی زندگی کے تمام فیصلے اب ہوں گے۔ اور ہر فیصلے اللہ کے احکام

کے تحت ہوں گے ۔ اور تمام نسلوں کے انجام کا آخری فیصلہ کر دیا جائے گا۔

قرآن کریم نے اس مسئلے کو نہایت ہی ہولناک انداز میں پیش کیا ہے ۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت ہی عظیم حقیقت ہے ۔اس قدر عظیم کہ انسان اچھی طرح اس کا ادراک بھی نہیں کر سکتا۔

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ (۱۱) لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ (۱۲) لِیَوْمِ الْفَصْلِ (۱۳) وَمَآ اَدْرٰكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ (۱۴) (۷۷ : ۱۱ تا ۱۴) "اور رسولوں کی حاضری کا وقت آپہنچے گا (اس روز وہ چیز واقع ہو جائے گی) کس روز کے لیے یہ کام اٹھا رکھا گیا ہے؟ فیصلے کے روز کے لیے ۔اور تمہیں کیا خبر کہ وہ فیصلے کا دن کیا ہے؟"

اس انداز تعبیر ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عظیم بات کا ذکر ہو رہا ہے ۔جب انسانی شعور کے پردے پر اس قدر ہولناکی اور خوف طاری ہو گیا کیونکہ رسول جوابدہی کے لیے طلب ہو گئے اور ستارے بے نور ہو گئے اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑ گئے تو اس خوف و ہراس کی حالت میں یہ ڈراوا آتا ہے ۔

وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ (۷۷ : ۱۵) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔ اور یہ ڈراوا اللہ عزیز اور جبار کی طرف سے ہے اور ان حالات کے بعد ہے جو اس کائنات پر طاری کر دیئے گئے ۔اور رسول حاضر ہو گئے اور ان سے بھی کارکردگی کی رپورٹ طلب ہونے لگی ۔اور وہ ایک ایک کر کے حساب پیش کرنے لگے' تو ایسے حالات میں یہ ڈراوا بہرحال بے حد موثر ہوتا ہے ۔اور واقعی ایک حساس انسان پر مارے خوف کے غشی آنے لگتی ہے ۔

اب یوم الفصل اور یوم الحساب کی ان خوفناکیوں سے کھینچ کر انسان کو خود اس دنیا کی انسانی تاریخ کی طرف لایا جاتا ہے کہ اے مبہوت انسان ذرا اپنی تاریخ پر غور کرو۔

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۸﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۱۹﴾

"کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر انہی کے پیچھے ہم بعد والوں کو چلتا کریں گے ۔ مجرموں کے ساتھ ہم یہی کچھ کیا کرتے ہیں ۔ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔

یوں ایک ہی چوٹ میں اقوام و ملل سابقین کی ہلاکتوں کی ایک جھلک دکھا دی جاتی ہے ۔اور بعد میں آنے والی اقوام کی جھلک دکھائی جاتی ہے ۔حالانکہ تاریخ بعید اور تاریخ قریب میں ہلاک شدہ اقوام کی مثالیں بے شمار ہیں ۔ دور دور تک اور قریب قریب کے زمانوں میں اقوام کی لاشیں ہی لاشیں نظر آتی ہیں ۔اور زبان حال سے سنت الٰہی کی گونج نظر آتی ہے اور سنائی دیتی ہے ۔

كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ (۷۷ : ۱۸) "مجرموں کے ساتھ ہم یہی کچھ کیا کرتے ہیں"۔ یہ تو اللہ کی سنت جاریہ ہے ۔کبھی رکتی نہیں' کبھی اپنا راستہ بدلتی نہیں ۔ جب مجرمین جان لیتے ہیں کہ ان کا انجام ان دور کے مجرمین اور

قریب کے مجرمین والا ہونے والا ہے تو ان پر ہلاکت کی بددعا آتی ہے اور اللہ کی طرف سے بددعا تو حکم ہلاکت ہوتی ہے۔

وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ (۷۷: ۱۹) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔
اب ہمارا سفر پھر ایک موڑ لیتا ہے۔ بربادیوں اور ہلاکتوں اور لاشوں کے مشاہدے سے بالکل مختلف تخلیق اور تعمیر کا سفر کہ اللہ کا نظام تخلیق اور نظام ربوبیت اور نظام تدبیر کس طرح کام کرتا ہے۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾
اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾

"کیا ہم نے ایک حقیر پانی سے تمہیں پیدا نہیں کیا اور ایک مقررہ مدت تک اسے ایک محفوظ جگہ ٹھیرائے رکھا؟ تو دیکھو، ہم اس پر قادر تھے، پس ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔
اس سے مراد جنین کا طویل اور عجیب سفر ہے۔ اس طویل نامیاتی سفر کو قرآن کریم چند جھلکیوں کے اندر بیان کر دیتا ہے۔ ایک حقیر پانی کی بوند، پھر قرار مکین اور محفوظ جگہ میں رکھنا، ایک متعین وقت تک ایک واضح نظام اور اندازے کے مطابق، اور اس نظام اور اندازے کے بارے میں یہ تبصرہ۔

فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ (۷۷: ۲۳) "ہم قادر تھے پس ہم بہت اچھی قدرت رکھنے والے ہیں"۔
یہ قدرت اور یہ اندازہ اس قدر دقیق ہے کہ اس کا کوئی مرحلہ اور کوئی اندازہ غلط نہیں ہوتا۔ اور اس پر آخری تبصرہ۔

وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ (۷۷: ۲۴) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔
اس کے بعد اس زمین کا مطالعاتی سفر، یہ سفر انسانی زندگی کے بارے میں ہے۔ اور زمین کے اندر اس زندگی کے لیے تمام ضروریات کا مقرر کرنا اور اس کا مطالعہ۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾ وَّ جَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ
شٰمِخٰتٍ وَّ اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾

"کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا، زندوں کے لیے بھی اور مردوں کے لیے بھی اور اس میں بلند و بالا پہاڑ جمائے اور تمہیں میٹھا پانی پلایا؟ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔
یعنی زمین کو ہم نے ایسا بنایا ہے کہ یہ اپنے دامن میں زندہ اور مردہ سب چیزوں کو لپیٹ کر رکھتی ہے اور اس میں ہم نے بلند، بالا پہاڑ جما دیئے ہیں جو بہت اونچے اور جمے ہوئے ہیں۔ اور ان کے اوپر ہروقت بادل چھائے رہتے ہیں اور ان سے میٹھا پانی بہتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کی عظیم قدرت اور ٹھیک ٹھیک اندازوں کا مظہر ہے۔ اور گہری حکمت پر دلالت

کرتا ہے 'لہٰذا مکذبین کے لیے کوئی جواز نہیں ہے کہ وہ جھلائیں ۔

اب ان مشاہد قدرت اور گہرے حکیمانہ قوانین فطرت کے پیش کرنے اور انسانی شعور کو تاثرات اور احساسات سے بھر دینے کے بعد اب روئے سخن حساب و کتاب اور روز جزاء کی طرف پھر جاتا ہے ۔ایک نہایت ہی مرعوب کرنے والا حکم ہم سنتے ہیں جس میں مکذبین سے کہا جاتا ہے کہ اٹھو اور راستہ لو اس عذاب کا جس کا تم انکار کرتے تھے ۔ یہ حکم نہایت ہی سرزنش اور تکلیف دہ انداز میں دیا جاتا ہے ۔

انْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝۲۹ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِىْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝۳۰ لَّا ظَلِيْلٍ وَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ۝۳۱ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝۳۲ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۝۳۳ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۳۴

"چلو اب اسی چیز کی طرف جسے تم جھلایا کرتے تھے ۔ چلو اس سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے ۔ نہ ٹھنڈک پہنچانے والا اور نہ آگ کی لپٹ سے بچانے والا ۔ وہ آگ محل جیسی بڑی بڑی چنگاریاں پھینکے گی (جو اچھلتی ہوئی یوں محسوس ہوں گی) گویا کہ وہ زرد اونٹ ہیں ۔ تباہی ہے اس روز جھلانے والوں کے لیے"۔

یعنی جاؤ' اب تم آزاد ہو 'قیامت کے طویل دن کے فیصلے اب ہو چکے 'لیکن یہ آزادی اب دائمی قید ہے 'جہنم کے اندر ۔

انْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۷۷ : ۲۹) "چلو اب اسی چیز کی طرف جسے تم جھلایا کرتے تھے"۔ یہ چیز اب تمہارے سامنے حاضر و موجود ہے ۔ وہ کیا ہے ۔

انْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِىْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (۷۷ : ۳۰) "چلو اس سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے"۔ یہ جہنم کا دھواں ہے ۔جس کی شاخیں اور بڑھ کر تین حصوں میں پھیل گئی ہیں ۔ لیکن یہ بہرحال آگ کے شعلے سے زیادہ بہتر ہے لیکن

لَّا ظَلِيْلٍ وَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ (۷۷ : ۳۱) "نہ ٹھنڈک پہنچانے والا نہ آگ کے شعلے سے بچانے والا"۔ یہ بظاہر سایہ ہے لیکن اس میں دم گھٹتا ہے 'سخت گرم ہے اور آگ کے شعلے کی طرح ہے اور اس کو سایہ محض مزاح کے طور پر کہا گیا ہے ۔ بلکہ یوں ان کے دلوں کے اندر تمنا پیدا کی گئی ہے کہ کاش کوئی سایہ ہو جس میں وہ پناہ لے سکیں ۔

چلو' لیکن تم جانتے ہو کہ تمہیں اب کہاں چلنا ہے اور جو فیصلہ ہوا ہے اس کی روشنی میں تم اپنی منزل کو جانتے ہو ۔ لہٰذا تصریح و تشریح کی ضرورت نہیں ہے ۔ اور جہاں تم جاؤ گے "وہ" کیا کر رہی ہے ۔

اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (٣٢) كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ (٧٧: ٣٣) "وہ محل جیسی بڑی چنگاریاں پھینکے گی گویا کہ وہ زرد اونٹ ہیں"۔ شرارے یوں نکل رہے ہوں گے کہ گویا بڑے بڑے پتھروں کے محلات آگے پیچھے آکر گر رہے ہیں۔ (عرب پتھروں کے بنے ہوئے مکانات کو محلات کہتے تھے۔ ضروری نہیں ہے کہ مراد آج کے دیو ہیکل محلات ہوں) اور یہ شرارے آگے پیچھے یوں لگ رہے ہوں گے جیسے زرد اونٹ۔ یہ تو ہوں گے اس آگ کے شرارے۔ اب آگ کیسی ہوگی، اللہ ہی اس سے بچائے۔ اس خوفناک حالت میں مکرر تبصرہ آرہا ہے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٧٧: ٣٤) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔
اس مادی ہولناکی کے بعد اب ذرا نفسیاتی خوف و ہراس جس میں مکذبین ڈوبے ہوئے ہوں گے اور وہ نہایت ہی دباؤ میں ہوں گے لیکن کچھ کہہ نہ سکیں گے۔ یہ سب کچھ اب تو انہیں برداشت ہی کرنا ہے۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٧﴾

"یہ وہ دن ہے جس میں وہ نہ کچھ بولیں گے اور نہ انہیں موقع دیا جائے گا کہ کوئی عذر پیش کریں۔ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔
یہ خوفناک خاموشی بتارہی ہوگی کہ کس قدر خوف میں یہ لوگ مبتلا ہیں۔ کس قدر دباؤ ہے ان پر کس قدر ہیبت ناک عاجزی ہے، نہ بات کرسکتے ہیں اور نہ عذرات پیش کرسکتے ہیں۔ کیونکہ بات اور عذرات کا وقت ہی گزر گیا۔ آج تو۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (٧٧: ٣٧) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔ بعض دوسرے مناظر میں یہ ذکر ہوا ہے کہ وہ حسرت اور افسوس کریں گے، قسمیں اٹھائیں گے، معذرتیں پیش کریں گے لیکن اب ان پر تو طویل دن آپڑا ہے۔ اس میں کبھی وہ مہیب سکوت میں ہوں گے اور کبھی چلاتے بھی رہیں گے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ البتہ اس سورت کی فضا کی مناسبت سے ان کی حالت سکوت اور حالت دباؤ کو لایا گیا ہے۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٨﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ
فَكِيْدُوْنِ ﴿٣٩﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٠﴾ ع ۴۰
۲۱

"یہ فیصلے کا دن ہے۔ ہم نے تمہیں اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو جمع کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی چال تم چل سکتے ہو تو میرے مقابلہ میں چل دیکھو۔ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔
آج تو فیصلے کا دن ہے۔ عذرات پیش کرنے کا دن نہیں ہے۔ آج تو اولین اور آخرین جمع ہیں۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے۔ اگر کوئی تدبیر خلاصی کی ہے تو چلو آزمالو۔ اگر تم کوئی تدبیر یا کوئی طاقت و قدرت رکھتے ہو؟ لیکن اللہ کے مقابلے

میں تدبیر کہاں اور طاقت کہاں؟ بس خاموشی ہی خاموشی ہے۔اور دردناک سرزنش ۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۷۷ : ٤٠) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔

مجرمین کے مناظر سرزنش کے بعد اب متقین کی بات بھی ہو جائے ۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّ فَوَاكِهَ مِمَّا
يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾

"متقی لوگ آج سایوں اور چشموں میں ہیں اور جو پھل وہ چاہیں (ان کے لیے حاضر ہیں) کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔

یہ لوگ چھاؤں میں ہوں گے 'اب یہ حقیقی چھاؤں ہے' یہ دھوئیں کی چھاؤں نہیں ہے۔جس کے تین شعبے ہیں ۔نہ ٹھنڈی ہے اور نہ آگ کے شعلوں سے بچانے والی ہے ۔یہ لوگ چشموں میں ہوں گے 'گلا گھونٹنے والے دھوئیں میں نہیں۔

وَّ فَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ (۷۷ : ٤٢) "ایسے پھلوں میں جو وہ چاہیں گے"۔ان مادی انعامات اور سہولیات کے علاوہ ان کو روحانی انعام بھی دیا جائے گا کہ علی رؤس الاشہاد کہا جائے گا۔نہایت ہی اعزاز کے ساتھ۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (٤٣) اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۷۷ : ٤٤) "کھاؤ اور پیو مزے سے اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں"۔

یہ ایک عظیم اعزاز ہے کہ ان کے بارے میں شاہی نوٹیفیکیشن جاری ہو گا۔ اور آخری تبصرہ۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۷۷ : ٤٥) "تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے"۔اور یہ تبصرہ ان انعامات کے بالمقابل ہے۔

یہاں' سیاق کلام اب سرسری اشارہ بلکہ ایک جھلک دکھائی جاتی ہے ۔اس دنیا کی زندگی کے حالات کی جسے اب قیامت کے دن لپیٹ لیا گیا ہے۔ہم اسکرین پر اس کا نقشہ اور ایک جھلک پھر دیکھتے ہیں 'جس میں مکذبین کی ذلت اور خواری دکھائی جاتی ہے۔

كُلُوْا وَ تَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾

"کھا لو اور مزے لے کر لو تھوڑے دن ۔ حقیقت میں تم لوگ مجرم ہو۔ تباہی ہے اس روز جھلانے والوں کے لیے"۔ یوں گویا ہم آخرت کے میدان میں دنیا کی فلم دیکھ رہے ہیں اور یہ جھلک ہمیں صرف دو فقروں میں دکھائی جاتی ہے ۔گویا ہم اپنی آنکھوں سے یہ جھلکیاں دیکھ رہے ہیں ۔اگرچہ دنیا و آخرت میں طویل عرصے ہیں' آخرت میں یہ خطاب متقین کو تھا' جبکہ دنیا میں یہ مجرمین کے لیے ہے اور زبان حال سے یہ کہا جا رہا ہے کہ دیکھو کس قدر فرق ہو گا دونوں کے حالات میں ۔کہ ایک گروہ اس مختصر زمانے میں خوب کھا پی رہا ہے اور طویل زمانوں کے لیے پھر محروم ہو گا۔

وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ (۷۷: ٤۷) "آج قیامت میں جھلانے والوں کے لیے تباہی ہے"۔ اور قیامت کے بعد زمانے ختم نہ ہوں گے ۔

اب تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے مخاطبین قرآن پر کہ انہیں ایسی دعوت دی جا رہی ہے اور یہ قبول نہیں کرتے ۔

وَإِذَا قِيۡلَ لَهُمُ ارۡكَعُوۡا لَا يَرۡكَعُوۡنَ ﴿٤٨﴾ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿٤٩﴾ ۲

فَبِأَيِّ حَدِيۡثٍۭ بَعۡدَهٗ يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿٥٠﴾ ۱۰ع

۲۲

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اللہ کے آگے) جھکو تو نہیں جھکتے ۔ تباہی ہے اس روز جھلانے والوں کے لیے ۔ اب اس (قرآن) کے بعد اور کون سا کلام ایسا ہو سکتا ہے جس پر یہ ایمان لائیں"۔

حالانکہ وہ دیکھ رہے ہیں اور انہیں اس خوبصورتی کے ساتھ سمجھایا اور ڈرایا جا رہا ہے ۔اگر یہ اس انداز کلام سے متاثر نہیں ہوتے جس سے پہاڑ بھی ہل جاتے ہیں اور جمادات کے اندر بھونچال برپا ہو جاتا ہے ۔تو اس کے بعد ان پر کوئی کلام کارگر نہیں ہو سکتا۔ گویا یہ لوگ نہایت شقی' بدبخت اور برے انجام تک پہنچنے والے ہیں ۔اور ان کی قسمت میں ہلاکت لکھی ہوئی ہے ۔اور ان پر کلام نرم و نازک بے اثر ہے ۔

یہ پوری سورت اپنے مضامین' اپنے انداز تعبیر' اپنے الفاظ کے ترنم' اپنے خوفناک مشاہد و مناظر اور اپنے چبھنے والے تیز اشارات کی وجہ سے اس قدر موثر ہے کہ کوئی دل اس کے مقابلے میں اپنی جگہ ٹھہر نہیں سکتا۔ کوئی وجود متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سخت سے سخت دل بھی پگھل جاتا ہے ۔ لیکن ان لوگوں پر اگر یہ سورت بھی کارگر نہیں تو پھر ان کا خدا ہی حافظ!

سبحان اللہ 'کیا کلام ہے یہ قرآن! کس قدر مضبوط گرفت ہے اس کی ۔کس قدر قوت ہے اس میں!!

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ۔۔ ۳۰

سورۃ الضحیٰ ۔ ۹۳	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۱
سورۃ الم نشرح ۔ ۹۴	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸
سورۃ التین ۔ ۹۵	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸
سورۃ العلق ۔ ۹۶	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۹
سورۃ القدر ۔ ۹۷	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵
سورۃ البینۃ ۔ ۹۸	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸
سورۃ الزلزال ۔ ۹۹	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸
سورۃ العادیات ۔ ۱۰۰	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۱
سورۃ القارعۃ ۔ ۱۰۱	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۱
سورۃ التکاثر ۔ ۱۰۲	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸
سورۃ العصر ۔ ۱۰۳	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۳
سورۃ الھمزۃ ۔ ۱۰۴	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۹
سورۃ الفیل ۔ ۱۰۵	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵
سورۃ القریش ۔ ۱۰۶	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۴
سورۃ الماعون ۔ ۱۰۷	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۷
سورۃ الکوثر ۔ ۱۰۸	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۳
سورۃ الکافرون ۔ ۱۰۹	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۶
سورۃ النصر ۔ ۱۱۰	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۳
سورۃ اللھب ۔ ۱۱۱	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵
سورۃ الاخلاص ۔ ۱۱۲	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۴
سورۃ الفلق ۔ ۱۱۳	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵
سورۃ الناس ۔ ۱۱۴	۱ ۔۔ تا ۔۔ ۶

پارہ ۳۰ اور سورۃ النباء ایک نظر میں

سورۃ نباء کا بلکہ اس پورے پارے کا ایک خاص مزاج ہے۔ سورہ بینہ اور سورہ نصر کے سوا اس کی تمام سورتیں کی ہیں۔ بیشتر سورتیں چھوٹی اور بعض لمبی ہیں۔ لیکن ان تمام سورتوں کا رنگ اور انداز ایک ہے۔ اور یہ رنگ پورے پارے کی خصوصیت ہے۔ موضوع، گفتگو کے رخ، انداز گفتگو، الفاظ، لہجہ اور تمام اسلوب کلام کے اعتبار اس پورے پارے میں یکسانیت ہے۔ گو انسانی احساسات پر شدید ضربات لگائی گئی ہیں تاکہ انسانی احساس جاگے۔ یوں نظر آتا ہے کہ شدید خطرے کے وقت کوئی کسی سوئے ہوئے غافل کو چیخیں لگا کر جگا رہا ہے یا کچھ لوگ غفلت اور نشے کی حالت میں ہیں۔ لہو و لعب اور دنیا کی خرمستیوں میں بے ہوش ہیں اور اس دنیا کی دلچسپیوں میں مست ہیں اور کوئی ہمدرد داعی انہیں جگا رہا ہے اور زور زور سے پکار رہا ہے کہ ہوش میں آؤ، خطرہ ہے۔ غور کرو، فکر تو کرو، آخر اس کائنات کا ایک مالک اور خالق ہے۔ یہ کائنات اپنا ایک نظم رکھتی ہے۔ ایک منصوبے کے مطابق چلتی ہے، یہ بے مقصد نہیں ہے، اسے ایک مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہ مقصد انسان کی آزمائش ہے۔ کہ ایک دن انسان نے اپنا اعمال نامہ لینا ہوگا، حساب و کتاب دینا ہوگا۔ جزا و سزا ہوگی۔ ایک طرف عظیم سزا ہے اور دوسری جانب انعامات و اکرامات ہیں۔ ذرا سوچو، ہوش کرو، اور غور و فکر کرو کہ کون سا انجام بہتر ہے تمہارے لیے۔ یہ ضربات و تنبیہات ہیں، پہلی ضرب دوسری ضرب، تیسری ضرب، دسویں ضرب۔ ان ضربات اور ان چیخوں کے ساتھ ساتھ ایک طاقتور ہاتھ ان غافل سوئے ہوئے لوگوں کو ہلا رہا ہے جو عیش و عشرت کے نشے میں مدہوش ہیں۔ وہ ایک گہرے مدہوش شخص کی طرح آنکھیں کھولتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔ یہ زبردست ہاتھ انہیں دوبارہ جگاتا ہے، حرکت دیتا ہے اور پورے زور سے چیختا ہے۔ یہ لوگ اگر جاگ بھی اٹھتے ہیں تو سخت ہٹ دھرمی، نفرت اور عناد کے انداز میں کہتے ہیں۔ جاؤ بابا کام کرو، جب یہ لوگ تنگ آتے ہیں تو اس ڈرانے والے پر سنگ باری شروع کر دیتے ہیں اور دوبارہ دنیا کی اس عیش و عشرت اور خرمستیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔

یہ تھے میرے احساسات اس پارے کو پڑھتے ہوئے، اگرچہ یہ چند مخصوص اور متعین حقائق پر مشتمل ہے لیکن ان کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ نیز اس پورے پارے میں مخصوص انداز بیان بھی ہے جو دل میں اترنے والا ہے۔ اس کائنات کے بعض مناظر اور نفس انسانی کے بعض حالات کو بھی لیا گیا ہے اور قیامت کے دن کے بعض واقعات بھی لیے گئے ہیں۔ ان کا تکرار بھی ہے اور ان میں تنوع بھی ہے اور یہ تکرار قصداً کیا گیا ہے۔ یوں مختلف زاویوں سے قلب و نظر کے تاروں کو چھیڑا گیا ہے۔

ہر پڑھنے والا یہی محسوس کرتا ہے، جب وہ پڑھتا ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِه (۸۰:۲۴) "انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی خوراک پر غور کرے"۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ (٥:٨٦) ''انسان کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس سے پیدا کیا گیا ہے''۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (١٧) وَ اِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ (١٨) وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ (١٩) وَ اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (٢٠) (٨٨: ١٧ تا ٢٠) ''کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے' آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھائے گئے اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی''۔

نیز یہ آیات پڑھتے ہوئے بھی یہی احساسات پیدا ہوتے ہیں۔

ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا (٢٧) رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا (٢٨) وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا (٢٩) وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (٣٠) اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا (٣١) وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا (٣٢) مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (٣٣) (٧٩: ٢٧ تا ٣٣) ''کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے اس کو بنایا' اس کی چھت خوب اونچی اٹھائی۔ پھر اس کا توازن قائم کیا اور اس کی رات ڈھانکی اور اس کا دن نکالا۔ اس کے بعد زمین کو اس نے بچھایا۔ اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑ دیے سامان زیست کے طور پر' تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے''۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا (٦) وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا (٧) وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا (٨) وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (٩) وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا (١٠) وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (١١) وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (١٢) وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (١٣) وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا (١٤) لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا (١٥) وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا (١٦) (٧٨: ٦ تا ١٦) ''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا' اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔ اور تمہیں جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا' اور تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا' اور رات کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا وقت بنایا اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کیے اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا' اور بادلوں سے لگاتار بارش برسائی تاکہ اس کے ذریعے سے غلہ سبزی اور گھنے باغ اگائیں''۔ اور

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ (٢٤) اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا (٢٥) ثُمَّ شَقَقْنَا

الْاَرْضَ شَقًّا(٢٦)فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا(٢٧) وَّعِنَبًا وَّ قَضْبًا(٢٨) وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا(٢٩) وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا(٣٠) وَّ فَاكِهَةً وَّاَبًّا(٣١) مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (٣٢) (٨٠: ٢٤ تا ٣٢) "پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے۔ ہم نے خوب پانی لنڈھایا۔ پھر زمین کو عجیب پھاڑا۔ پھر اس کے اندر اگائے غلے' اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجور اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست کے طور پر"۔

اور یہ آیت۔

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ(٦) الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ(٧) فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ(٨) (٨٢: ٦ تا ٨) "اے انسان' کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا ہے جس نے تجھے پیدا کیا' تجھے نک سک سے درست کیا' تجھے متناسب بنایا' اور جس صورت میں چاہا' تجھے جوڑ کر تیار کیا"۔ اور پھر یہ آیات

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى(١) الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى(٢) وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى(٣) وَالَّذِيْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى(٤) فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى(٥) (٨٧: ١ تا ٥) "اے نبی اپنے رب کے برتر نام کی تسبیح کرو' جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا' جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی۔ جس نے نباتات اگائیں پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا"۔ اور پھر

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ(٤) ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ(٥) اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ(٦) فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ(٧) اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ(٨) (٩٥: ٤ تا ٨) "ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا' پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا۔ سوائے ان لوگوں کے' جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ بس اس کے بعد کون جزا و سزا کے معاملہ میں تم کو جھٹلا سکتا ہے۔ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟"

یہی احساسات ہوتے ہیں جب پڑھنے والا سورہ تکویر کی ان آیات کو پڑھتا ہے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ(١) وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ(٢) وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ(٣)

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ(٤) وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ(٥) وَاِذَا الْبِحَارُ
سُجِّرَتْ(٦) وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ(٧) وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ(٨) بِاَيِّ ذَنْبٍ
قُتِلَتْ(٩) وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ(١٠) وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ(١١) وَاِذَا
الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ(١٢) وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ(١٣) عَلِمَتْ نَفْسٌ
مَّآ اَحْضَرَتْ(١٤) (٨١: ١ تا ١٤) "جب سورج لپیٹ دیا جائے گا' اور جب تارے بکھر جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے' اور جب دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی۔ اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے' اور جب جانیں جوڑ دی جائیں گی اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا اور جب جہنم دہکائی جائے گی اور جب جنت قریب لے آئی جائے گی' اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے"۔

اور سورہ انفطار کی یہ آیات

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (١) وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (٢) وَاِذَا
الْبِحَارُ فُجِّرَتْ (٣) وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (٤) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ

(٥) (٨٢: ١ تا ٥) "جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے اور جب قبریں کھول دی جائیں گی' اس وقت ہر شخص کو اس کا اگلا پچھلا سب کیا دھرا معلوم ہو جائے گا"۔

اور سورہ انشقاق کی یہ آیات

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ(١) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ(٢) وَاِذَا الْاَرْضُ
مُدَّتْ(٣) وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ(٤) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ(٥) (٨٤: ١ تا

٥) "جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے حق یہی ہے۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی' اور جو کچھ اس کے اندر ہے' اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی۔ اور وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کے لیے حق یہی ہے"۔

اور سورہ زلزال کی یہ آیات

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۱) وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (۲) وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا(۳) يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا(٤) بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا(٥)

(۹۹: ۱ تا ۵) "جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے؟ اس روز وہ اپنے حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے حکم دیا ہو گا"۔

ان آیات کے علاوہ جب پڑھنے والا سورتوں کے آغاز میں اور درمیان چند لمحات پاتا ہے اور اس کائنات کے دلائل و شواہد کی پکار کو سنتا ہے تو اس کے احساسات نور سے بھر جاتے ہیں۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ(۱٥) الْجَوَارِ الْكُنَّسِ(۱٦) وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ(۱۷) وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ(۱۸)(۸۱: ۱٥ تا ۱۸) "پس نہیں میں قسم کھاتا ہوں' پلٹنے والے اور چھپ جانے والے تاروں کی' اور رات کی جب وہ رخصت ہوئی اور صبح کی جب اس نے سانس لیا"۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ(۱٦) وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ(۱۷) وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ(۱۸)(۸٤: ۱٦ تا ۱۸) "پس نہیں' میں قسم کھاتا ہوں شفق کی' اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے' اور چاند کی جب وہ ماہ کامل بن جاتا ہے"۔

وَالْفَجْرِ(۱) وَلَيَالٍ عَشْرٍ(۲) وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ(۳) وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ(٤)(۸۹: ۱ تا ٤) "قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی' اور رات کی جب وہ رخصت ہو"۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا(۱) وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا(۲) وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا(۳) وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا(٤) وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا(٥) وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا(٦) وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا(۷) فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا(۸)(۹۱: ۱ تا ۸) "سورج اور اس کی دھوپ کی قسم اور چاند کی قسم جب کہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے اور دن کی جب وہ اسے نمایاں کر دیتا ہے اور رات کی قسم جب وہ سورج کو ڈھانپ لیتی ہے اور آسمان کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے قائم کیا اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بچھایا' اور نفس کی اور اس ذات کی جس نے اسے سنوارا پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی"۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى (۱) وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى (۲) وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى

(۳)(۹۲: ۱ تا ۳) "قسم ہے رات کی جبکہ وہ چھا جائے اور دن کی جبکہ وہ روشن ہو' اور اس ذات کی جس نے نر اور مادہ پیدا کیا"۔

وَالضُّحٰى (۱) وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى (۲) (۹۳ : ۱ ـ ۲) "قسم ہے روز روشن کی اور رات کی جبکہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے"۔ یہ اور اس قسم کی دوسری آیات۔

الحاصل اس پورے پارے میں اس بات کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے کہ اللہ نے جس طرح انسانوں اور حیوانوں اور نباتات کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے' وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ نیز اس کائنات کے دوسرے مظاہر قدرت کو بطور شہادت پیش کیا گیا جو اس کائنات کی کھلی کتاب میں جابجا موجود ہیں۔ نیز اس پارے میں قیامت کے سخت' خوفناک اور کھڑکھڑانے اور کپکپانے والے مظاہر پیش کر کے انسان کو ڈرایا گیا ہے۔ حساب و کتاب کے مناظر' جہنم کے عذاب کے خوفناک مناظر' جنت کی بے حد و حساب انعامات کو ترغیب اور ترہیب کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ قیامت کے مناظر کو اسی طرح خوفناک مناظر کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جس طرح اس دنیا کے خوفناک مناظر ہوتے ہیں۔ ان تمام امور کو اللہ کے نظام تخلیق' قدرت تخلیق' تدبیر کائنات اور کائنات کے اندر جاری قوانین قدرت اور نوامیس فطرت پر دلیل کے طور پر لایا گیا ہے۔ اور ان سے انسان کو ڈرایا گیا ہے۔ کبھی کبھار ان مناظر کے اندر ان اقوام کے انجام کی طرف اشارات بھی کیے گئے ہیں جن کو انسانی تاریخ میں ان کی بدکرداریوں کی وجہ سے ہلاک کیا گیا۔ اس پورے پارے میں ان موضوعات پر بے شمار آیات ہیں لیکن ہم چند کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

یہ سورت یعنی سورہ نباء بھی مذکورہ بالا حقائق اور مناظر کے پیش کرنے کا ایک نمونہ ہے۔ اسی طرح سورہ النازعات' سورہ عبس' آغاز کی چند آیات کو چھوڑ کر باقی سورت میں یہی حقائق و مشاہد ہیں۔ پہلی آیات میں دعوت اسلامی کے ایک مخصوص واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ باقی پوری سورت میں انسانی پیدائش اور نباتاتی زندگی کے حقائق پیش کرنے کے بعد قیامت کے کڑاکے دار قیام کا ذکر ہے۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ (۳٤) وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ (۳۵) وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ (۳٦) لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (۳۷) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ (۳۸) ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (۳۸) وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ (٤۰) تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (٤۱) (۸۰ : ۳٤ تا ٤۱) "اس روز آدمی اپنے بھائی' اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہو گا' کچھ چہرے' اس دن دمک رہے ہوں گے۔ ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے اور کچھ چہروں پر اس دن خاک اڑ رہی ہو گی۔ کلونس چھائی ہوئی ہو گی"۔

سورہ التکویر میں اس کائنات میں ہونے والے عظیم انقلابات کا ذکر ہے' جبکہ بعض کائناتی مناظر کی قسم اٹھاکر وحی کی سچائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو ثابت کیا گیا ہے۔ سورہ انفطار میں قیامت کے دن سے قبل ہونے والے کائناتی انقلابات بیان کیے گئے ہیں اور جنت کے انعامات کو نہایت ہی دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یوں کہ انسان ان کے حصول کے لیے میدان میں نکل آئے۔

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (۸۲:۶) "اے انسان تیرے رب کریم کے بارے میں تجھے کس چیز نے غرے میں ڈال دیا ہے"۔ سورہ انشقاق میں قیامت کے روز ہونے والے عظیم کائناتی انقلابات' جنت کی نعمتوں کے مناظر اور دوزخ کے عذاب کے مناظر بیان کیے گئے ہیں اور سورہ بروج میں یوم قیامت کے مناظر' امم ماضیہ میں سے اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والے لوگوں کی تعذیب کے ایک مخصوص واقعہ کی جھلکیاں اور چونکہ ان لوگوں نے مومنین کو آگ میں جلایا تھا اس لیے یہ سورت ان لوگوں کے لیے سزائے اخروی کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت کا عذاب بہت ہی شدید ہو گا۔

سورہ الطارق میں انسان کی تخلیق اور نباتات کی تخلیق کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ (۱۳) وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۱٤) (۸٦: ۱۳ - ۱٤) "بے شک یہ ایک جچی تلی بات ہے' ہنسی مذاق نہیں ہے"۔ سورہ اعلیٰ تخلیق' تسویہ اور تقدیر اور ہدایت کا ذکر کرتی ہے۔ اور اس کے بعد اس میں مختلف قسم کے نباتات کے اگانے اور پھر کو ڈاکرکٹ بنا دینے کا ذکر ہے۔ اور اس سے یہ اشارہ دینا مقصود ہے کہ اللہ ایک دن اسی طرح پھر عام انسانوں کو اٹھائے گا۔ اور حساب و کتاب ہو گا اور جزاء و سزا ہوگی اور سورہ غاشیہ میں جنت کی نعمتوں اور جہنم کے عذاب کے مناظر ہیں۔ اور اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ اگر غور کریں تو اونٹ کی تخلیق آسمانوں کی رفعتوں اور دوریوں' اور زمین اور پہاڑوں کے اندر بہت کچھ سامان عبرت ہے۔ غرض اسی طرح تمام سورتوں میں یہ مناظر و مشاہد بیان کیے گئے ہیں۔ چند ہی سورتیں ایسی ہیں جن میں ایمان اور اسلامی نظام کی بات کی گئی ہے۔ مثلاً سورہ اخلاص' سورہ الکافرون' سورہ الماعون' سورہ النصر' سورہ القدر' سورہ العصر وغیرہ یا پھر چند سورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کا ذکر ہے۔ اور آپؐ کو مشورہ دیا گیا ہے کہ آپؐ ہر شر سے اللہ کی پناہ طلب کریں۔ مثلاً الضحیٰ' الانشراح' الکوثر' الفلق' الناس وغیرہ اور یہ بھی چند ہی ہیں۔

اس پورے پارے کا ایک مخصوص انداز بیان بھی ہے۔ نہایت صاف ستھرا انداز' جس میں اس کائنات سے حسن و جمال کے خاص پوئنٹ لیے گئے ہیں۔ نفس انسانی سے بھی حسن و جمال کے پہلو لیے گئے ہیں۔ اعلیٰ درجے کے [illegible] مناظر و تصاویر' دلکش فضا میں' اور نہایت ہی مسحور کن مترنم قافیے اور آیات کے خاتمے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ تمام چیزیں' سوئے ہوئے غافل انسانوں اور بری راہوں پر سرپٹ دوڑنے والوں کو خطاب کرنے میں موزوں تر ہیں۔ ایسے لوگوں کے جگانے' ان کو راہ راست کی طرف کھینچنے اور ان کے احساسات کو بیدار کرنے کی خاطر قسم قسم کے [illegible] اور موثرات پیش کرنے کی خاطر یہ اسلوب نہایت ہی مفید ہے۔ یہ موثر انداز بعض مثالوں کے مطالعہ سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے۔ مثلاً ستاروں کی قسم کھاکر کہا جاتا ہے کہ وہ یوں ہیں جس طرح زندہ چیزیں ہوتی ہیں اور وہ شیروں اور [illegible]

طرح نمودار ہوتے ہیں اور چھپ جاتے ہیں ۔ اور رات کو "چھپ جانے والی اور صبح کو "سانس لینے والی" کہہ کر ان کو زندگی بخشی گئی ہے لیکن سانس کے ذریعہ وہ گویا روشنی کی آکسیجن لیتی ہے ۔ سورہ تکویر میں ہے :

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ (۱۵) الْجَوَارِ الْكُنَّسِ (۱٦) وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ (۱۷)

وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (۱۸)(۸۱: ۱۵ تا ۱۸) "پس نہیں' میں قسم کھاتا ہوں پلٹنے والے اور پیچھے چلنے والے اور پھر چھپ جانے والے تاروں کی اور رات کی جب وہ اندھیروں میں گھس جاتی ہے اور صبح کی جب وہ روشنی کا سانس لیتی ہے" ۔ اور سورج کے غروب ہونے کے مناظر' رات کی تاریکیاں اور چاندنی رات کی خوشگوار روشنی

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (۱٦) وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (۱۷) وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ

(۱۸)(۸٤: ۱٦ تا ۱۸) "پس نہیں میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور ان چیزوں کی جنہیں رات جمع کرتی ہے ۔ چاند کی جب وہ ماہ کامل بن جاتا ہے ۔ اور پھر نمود صبح کے مناظر' رات کا آہستہ آہستہ غائب ہوتے جانا کیا ہی خوبصورت منظر ہوتا ہے اور کس قدر خوبصورت انداز میں پیش ہوتا ہے ۔ سورہ فجر سے

وَالْفَجْرِ (۱) وَلَيَالٍ عَشْرٍ (۲) وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۳) وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ

(٤)(۸۹: ۱ تا ٤) "قسم ہے صبح کی' اور قسم ہے دس راتوں کی اور قسم ہے جفت اور طاق کی اور قسم ہے رات کی جب وہ جا رہی ہو" ۔ اور

وَالضُّحٰى (۱) وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى (۲)(۹۳: ۱ تا ۲) "قسم ہے دن کی اور قسم ہے رات کی جب چھا جائے" ۔ اور سورت میں قلب و نظر کو متاثر کر دینے والی یہ آیات

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (٦) الَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (۷)

فِىْۤ اَىِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (۸)(۸۲: ٦ تا ۸) "اے انسان' تجھے کس چیز نے رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے' جس نے تجھے پیدا کیا' پھر موزوں بنایا ۔ اور پھر جس شکل و صورت میں چاہا' جوڑا" ۔ اور جہنم کے بارے میں یہ الفاظ

فَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (۸) فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (۹) وَمَآ اَدْرٰكَ مَا هِيَهْ (۱۰) نَارٌ

حَامِيَةٌ (۱۱)(۱۰۱: ۸ تا ۱۱) "اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے' اس کی جائے قرار گہری کھائی ہو گی اور تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے ؟ بھڑکتی ہوئی آگ" ۔

بعض تعبیرات میں براہ راست بات کرنے کی بجائے اشارے کنایے کا انداز اپنایا گیا اور براہ راست لفظ کی بجائے

اس کے دور کے مشتقات کو لیا گیا ہے تاکہ نغمہ اور ترنم کے اعتبار سے موزوں تر لفظ کو استعمال کیا جائے۔ اس پورے سپارے میں انداز تعبیر کا یہ پہلو نمایاں اور مکرر ہے۔

یہ سورت اس پورے پارے کے انداز کا ایک نمونہ ہے۔ اس کے موضوعات' بیان کردہ حقائق' مناظر اور تصویر کشیل' اس کی فضا' اس کے اثرات اور رنگ' اس کے الفاظ اور عبارات' اس کائنات کے تاثرات سب کے سب ایسے ہیں کہ انسان کے پردۂ احساس پر ارتعاش پیدا کرتے ہیں اور انسانی ضمیر پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں کے زاویہ سے انسان کی اصلاح کرتے ہیں۔

سورت کا آغاز ایک سوال سے ہوتا ہے' جو اس حقیقت کی عظمت' خوفناک اور اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ جس سے وہ اختلاف کرتے تھے۔ حالانکہ وہ ایک عظیم معاملہ ہے اور بالکل ظاہر ہے اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے۔ اس سوال کا جواب صرف یہ دے دیا جاتا ہے کہ اچھا عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

عَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ (١) عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيْمِ (٢) الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (٣) كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (٤) ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (٥) (٧٨: ١ تا ٥) "یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟ کیا اس بڑی چیز کے بارے میں جس کے متعلق یہ مختلف چہ میگوئیاں کرنے میں لگے ہوئے ہیں؟ ہرگز نہیں' انہیں معلوم ہو جائے گا' ہاں ہرگز نہیں' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔

اس مختصر سوال اور جواب کے بعد اس موضوع پر بات ختم ہو جاتی ہے اور ان کو اس نظری موضوع کے بجائے ایسے حقائق کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو ان کے سامنے' ان کے ماحول میں' ان کے نفوس میں' ان کی دنیا میں موجود ہیں اور اگر ان پر غور کیا جائے تو وہ عظیم حقائق و شواہد ہیں اور وہ اس بات پر دلیل ہیں کہ جس معاملے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ تو آنے والا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا (٦) وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا (٧) وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا (٨) وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (٩) وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا (١٠) وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (١١) وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (١٢) وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (١٣) وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا (١٤) لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا (١٥) وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا (٧٨: ١٦) (٧٨: ٦ تا ١٦) "کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا' اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا اور تمہیں جوڑے کی شکل میں پیدا کیا اور تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا' اور رات کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا وقت بنایا اور تمہارے اوپر سات آسمان قائم کیے۔ اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا' اور بادلوں سے

لگاتار بارش برسائی تاکہ اس کے ذریعے سے غلہ اور سبزی اور گھنے باغ اگائیں"۔

حقائق و مناظر اور نہایت ہی موثر تصاویر دکھانے کے بعد انہیں پھر اس عظیم خبر' اس خوفناک موضوع کی طرف لایا جاتا ہے' جس میں ان کو اختلاف تھا' جس کے بارے میں وہ پوچھتے رہتے تھے اور آغاز سورت میں مفصل جواب کی بجائے تہدید آمیز انتظار ہی پر اکتفاء کیا گیا تھا کہ وہ کیسے ہو گا۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ چنانچہ اس کے بڑے بڑے واقعات ہوں گے۔

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا (۱۷) يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا (۱۸)

وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا (۱۹) وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (۲۰)

(۷۸ : ۱۷ تا ۲۰) "بے شک فیصلے کا دن ایک مقررہ وقت ہے' جس روز صور میں پھونک ماری جائے گی تو تم فوج در فوج آؤ گے اور آسمان کھول دیا جائے گا کہ وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا اور پہاڑ چلائے جائیں گے یہاں تک کہ وہ سراب ہو جائیں گے"۔

پھر عذاب جہنم کی ایک خوفناک اور شدید جھلک دکھائی جاتی ہے۔

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا (۲۱) لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا (۲۲) لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا (۲۳) لَا

يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا (۲۴) اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا (۲۵) جَزَآءً وِّفَاقًا (۲۶)

اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا (۲۷) وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا (۲۸) وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ

كِتٰبًا (۲۹) فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا (۳۰) (۷۸ : ۲۱ تا ۳۰) "درحقیقت جہنم ایک گھات ہے' سرکش کا ٹھکانا' جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے' اس کے اندر کسی ٹھنڈک اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزہ وہ نہ دیکھیں گے' کچھ ملے گا تو بس گرم پانی' اور زخموں کا دھوون' بھرپور بدلہ۔ وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور ہماری آیات کو بالکل جھٹلا دیا تھا' اور حال یہ تھا کہ ہم نے ہر چیز گن گن کر لکھ رکھی تھی۔ اب چکھو مزہ' ہم تمہارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کریں گے"۔

اور جنتوں میں اللہ کی نعمتوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر یوں ہو گا۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا (۳۱) حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا (۳۲) وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا (۳۳) وَّ

كَاْسًا دِهَاقًا (۳۴) لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا (۳۵) جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً

حِسَابًا (۳۶) (۷۸ : ۳۱ تا ۳۶) "یقیناً متقیوں کے لیے کامرانی کا ایک مقام ہے' باغ اور انگور' اور نوخیز ہم سن لڑکیاں اور چھلکتے ہوئے جام۔ وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سنیں گے۔ جزاء اور کافی انعام تمہارے رب

کی طرف سے 'اس نہایت مہربان خدا کی طرف سے"۔

اب سورت کا خاتمہ ہے جو ایک عظیم حقیقت کا منظر ہے اور یہ فکر و نظر کے تاروں پر ایک عظیم چوٹ ہے۔ اس عظیم حقیقت کو ایک خوفناک منظر کی صورت میں پیش کر کے لوگوں کو اس سے ڈرایا جاتا ہے۔

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا (۳۷) يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا (۳۸) ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا (۳۹) اِنَّا اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا (۴۰) (۷۸:۳۷ تا ۴۰)

"تمہارے رب کی طرف سے 'اس نہایت مہربان خدا کی طرف سے جو زمین اور آسمان کا اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا مالک ہے جس کے سامنے کسی کو بولنے کا یارا نہیں۔ جس روز روح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے 'کوئی نہ بولے گا سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے۔ وہ دن برحق ہے 'اب جس کا جی چاہے 'اپنے رب کی طرف پلٹنے کا راستہ اختیار کرے۔ ہم نے تم لوگوں کو اس عذاب سے ڈرا دیا ہے جو قریب آ لگا ہے۔ جس روز آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اور کافر پکار اٹھے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا۔

یہ ہے وہ عظیم شہ سرخی 'جس کے بارے میں یہ لوگ باہم سوال کرتے ہیں اور یوں ہو گا وہ دن جب ان لوگوں کے سامنے یہ حقیقت ایک واقعہ کی شکل میں نمودار ہو گی۔

--- ooo---

درس نمبر ۲۷۸ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۴۰

سُورَةُ النَّبَإِ　مَكِّيَّةٌ (٨٠)　آیَاتُهَا ٤٠　رُكُوعَاتُهَا ٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ﴿١﴾ عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ ﴿٢﴾ الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ ﴿٣﴾

كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ﴿٤﴾ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ﴿٥﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟ کیا اس بڑی خبر کے بارے میں جس کے متعلق یہ مختلف چہ میگوئیاں کرنے میں لگے ہوئے ہیں؟ ہرگز نہیں' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا' ہاں' ہرگز نہیں' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔

آغاز کلام ہی ان نام نہاد سوال کرنے والوں کے سوالات پر سرزنش سے ہوتا ہے۔ تعجب اس پر کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس قدر ظاہرو باہر بات کے بارے میں قیل و قال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے سوالات دراصل قیام قیامت کے بارے میں تھے اور یہی موضوع تھا جس کے بارے میں وہ نہایت ہی شک اور خلجان میں مبتلا تھے اور سخت مجادلہ اور مباحثہ کرتے تھے۔ ان لوگوں کے تصور میں یہ بات آتی تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے' حالانکہ ایسا لازمی ہونا چاہئے اور قیام قیامت بالکل ایک منطقی امر ہے۔

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ (٧٨ : ١) "یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں"۔ اور کس چیز کے بارے میں یہ مباحثے کر رہے ہیں اور اس کے بعد خود اس کا جواب دے دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سوال برائے استفہام نہ تھا۔ نہ کچھ معلومات مطلوب تھیں۔ سوال محض ان کے حال پر تعجب کرنے کے لیے کیا گیا ہے اور مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کی حالت قابل تعجب ہے کیونکہ ان کے سوالات ایک نہایت ہی عظیم معاملے کے بارے میں ہیں' جس کے بارے میں یہ شک میں ہیں اور اس کی حقیقت یہ ہے۔

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ (۲) الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (۷۸ : ۳) "کیا اس بڑی خبر کے بارے میں جس کے متعلق یہ مختلف چہ میگوئیاں کرنے میں لگے ہوئے ہیں"۔ یہاں اس عظیم حقیقت کا نام نہیں لیا گیا' صرف اسے نباء عظیم کہا گیا' جو اس کی صفت ہے ۔ اس لیے کہ تعجب اور مبالغے کے انداز کو جاری رکھا جائے ۔ اس دن کے بارے ں' اختلافات اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان تھے ۔ ان لوگوں کے درمیان جو اس پر ایمان لائے تھے اور ایسے لوگوں کے درمیان جو اس کا انکار کرتے تھے' سوالات دراصل انکار کرنے والوں ہی کی طرف سے تھے ۔

پھر اس سوال اور قیل و قال کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا ہے اور نہ اس بات کی تصریح کی جاتی ہے کہ یہ سوال و داب کس امر کے بارے میں ہے ۔ یہاں صرف اس امر عظیم کی صفت عظیم کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور ایک ملفوف اور بالواسطہ دھمکی دینے پر ہی اکتفاء کر دیا جاتا ہے اور یہ بالواسطہ دھمکی ڈائریکٹ جواب سے زیادہ موثر ہے ۔ اور زیادہ خوفزدہ کر دینے والی ہے ۔

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (٤) ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (۷۸ : ۵) "ہرگز نہیں' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا' ہاں ہرگز نہیں' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔ لفظ کلا زجر آمیز اور سخت توبیخ کے ساتھ انکار کرنے کے معنی میں آتا ہے ۔ یہاں جس قسم کی فضا پیدا کرنا مطلوب ہے' اس کے لیے یہ لفظ نہایت موزوں ہے ۔ لفظ کلا کے تکرار اور لفظ سیعلمون دونوں کے تکرار میں سخت تہدید اور ڈراوا ہے ۔

اب بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ روئے سخن اس عظیم خبر سے پھر کر کسی دوسرے موضوع کی طرف منتقل ہو گیا ہے تاکہ تھوڑے وقفے کے بعد اسے براہ راست لیا جائے' روئے سخن دراصل ہمارے پیش پا افتادہ کائنات کے اندر موجود بعض حقائق' مظاہر' مناظر اور شواہد کی طرف پھر جاتا ہے ۔ جن کو اگر چشم بینا سے دیکھا جائے اور ان پر غور کیا جائے تو وہ انسانی فکر و نظر میں ایک بھونچال پیدا کر دیتے ہیں اور فکر انگیز ہیں ۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ﴿۶﴾ وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ﴿۷﴾ وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ﴿۸﴾ وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ﴿۹﴾ وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ﴿۱۰﴾ وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۪﴿۱۱﴾ وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ﴿۱۲﴾ وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۪﴿۱۳﴾ وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۙ﴿۱۴﴾ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا ۙ﴿۱۵﴾ وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا ؕ﴿۱۶﴾

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا' اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا ۔ اور تمہیں جوڑوں کی شکل ں پیدا کیا' اور تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا' اور رات کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا وقت بنایا اور تمہارے اوپر

سات مضبوط آسمان قائم کیے اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا' اور بادلوں سے لگاتار بارش برسائی تاکہ اس کے ذریعے سے غلہ سبزی اور گھنے باغ اگائیں"۔

یہ سفر اس عظیم اور طویل و عریض کائنات کے اطراف و جوانب میں ہے' اس سفر میں ہم بے شمار مناظر دیکھتے ہیں' اور مشاہدے کرتے ہیں۔ یہ طویل مناظر اور بے شمار تخلیقاتی تصاویر ہمارے سامنے نہایت ہی محدود اور مختصر الفاظ کے ذریعہ پیش کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہایت ہی محدود وقت میں' محدود الفاظ کے ذریعہ جب یہ مناظر پردۂ تخیل پر گزرتے ہیں تو فکر و نظر پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ عقل و خرد کی تاروں پر مضراب اپنا کام نہایت تیزی اور تسلسل کے ساتھ کر رہا ہے۔ یہ سب تصورات ایک اثباتی استفہام کے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ایک طاقتور ہاتھ' نہایت ہی غفلت میں سوئے ہوئے لوگوں کو جگا رہا ہے۔ جو ان کے قلب و نظر کو اللہ کی اس گوناگوں مخلوقات کے مشاہدے کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ اور یہ دعوت دے رہا ہے کہ اس نظام کے پیچھے کام کرنے والی قوت مدبرہ پر ذرا غور کرو کہ کس طرح ہر چیز کو اس نے ایک مقدار کے مطابق رکھا ہوا ہے۔ کس طرح یہ کائنات پیدا کی گئی ہے' پیدا ہو رہی ہے۔ کیا کوئی عقل یہ سوچ سکتی ہے کہ یہ مخلوقات یونہی چھوڑ دی جائے گی اور کوئی حساب و کتاب نہ ہو گا بلکہ حساب و کتاب ہو گا اور یہ جب واقعہ ہو گا تو یہ وقت کی عظیم خبر ہو گی اور اس کی شہ سرخی لگے گی۔ مگر افسوس کہ اس عظیم حقیقت کے بارے میں یہ لوگ اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ اس سفر کے کئی مراحل ہیں' پہلا مرحلہ اس زمین کے مطالعے کا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا (٦) وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا (٧٨ : ٧) "کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا' اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا"۔ مہاد کے معنی ہیں سیر و سیاحت کے لیے تیار کردہ۔ نیز گہوارے کی طرح نرم۔ دونوں مفہوم لفظ مہاد سے نکلتے ہیں اور باہم قریب ہیں۔ انسان علم و معرفت کے جس مقام پر بھی ہو اور تہذیب و تمدن کے جس مرحلے میں بھی ہو' وہ اس حقیقت کو سمجھتا ہے کہ زمین اس کے لیے گہوارہ ہے بطور حقیقت واقعہ اس چیز کو سمجھنے کے لیے کسی بڑی مقدار علم کی ضرورت نہیں۔ پہاڑوں کا میخ کی طرح مضبوطی سے جما ہوا ہونا بھی انسان کو ہمیشہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ وہ پتھر کے دور میں ہو یا زمانہ حال کی علمی ترقی کے دور کا ہو' یہ حقائق محسوسات ہیں۔ معمولی توجہ سے دریافت ہو سکتے ہیں۔

البتہ جس حقیقت کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے وہ پتھر کے دور کے انسان کے ابتدائی احساسات سے ذرا گہری ہے۔ انسان نے جوں جوں علم و معرفت میں ترقی کی' وہ اس کائنات کے حقائق کی گہرائیوں تک جا پہنچا۔ اور یہ حقائق انسان کی نفسیات پر چھاتے رہے۔ اور انسان نے اس بات کا ادراک کر لیا کہ اس کائنات کی پشت پر ایک گہری حکمت اور تدبیر کام کر رہی ہے۔ اور اس کے اندر ایک پیچیدہ ٹیکنالوجی رکھ دی گئی ہے اور تمام مخلوقات اور موجودات باہم مربوط اور معاون ہیں۔ اور ایک دوسرے کی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ اس زمین کو خصوصاً انسانی زندگی کے لیے ممد و معاون اور گہوارہ بنایا گیا ہے۔ اور یہ انسان اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور اس کے اور ان کائناتی قوتوں کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہے۔

زمین کو خصوصیت کے ساتھ انسانی حیات کے لیے گوارہ بنایا گیا ہے' اور یہ ایک ایسا ثبوت ہے جس کی حقانیت میں شک نہیں کیا جا سکتا ہے' بشرطیکہ دیکھنے والا عقل و خرد سے بے بہرہ نہ ہو اور وہ اس ظاہری کائنات کی پشت پر بھی جھانک کر دیکھ سکتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اس زمین میں جو قوتیں پیدا کی ہیں' اگر ان کی نسبت ترکیب کے اندر معمولی ردو بدل بھی کر دیا جائے' اور زمین کے ظروف و احوال وہ نہ رہیں جو ہیں' یا اگر زمین کی تخلیق کے اندر ملحوظ عناصر کے درمیان میں سے کسی ایک عنصر ہی کو غائب کر کے اس مرکب کی نسبتوں کے اندر ذرا سا بھی اختلال واقع ہو جائے تو زمین جس کو انسان کے لیے گوارہ بنایا گیا ہے' انسان کے لیے موت کا کنواں بن جائے اور اس کے اندر سے وہ صفت مفقود ہو جائے جس کی طرف قرآن یہاں اشارہ کر رہا ہے۔ قرآن نے تو اس بات کی طرف یہاں مجمل اشارہ فرمایا ہے۔ تفصیلات انسان پر چھوڑ دی ہیں تاکہ انسان اپنی عقل و خرد اور علم و تجربہ کے مطابق تفصیلات کا مطالعہ کرے۔

اور اللہ نے پہاڑوں کو زمین کے اندر میخوں کی طرح گاڑ دیا۔ ہر انسان ایک سرسری نظر سے اس بات کو ظاہراً پاتا ہے کہ پہاڑ زمین کے اندر میخوں کی طرح گاڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح جس طرح خیمے کی میخیں ہوتی ہیں' اور پہاڑ خیموں کی طرح نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت کیا ہے' تو قرآن سے ہم یہ پاتے ہیں اور اس بات کا ادراک کرتے ہیں کہ یہ زمین کو مضبوط کرنے اور اس کا توازن قائم کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے ازحد ضروری ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ پہاڑ اس لیے قائم کیے گئے ہوں تاکہ زمین پر سمندروں کی گہرائیوں اور پہاڑوں کی بلندیوں کی وجہ سے ایک توازن قائم ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی وجہ سے زمین کے اندرونی سکیڑ اور سطحی سکیڑ کے درمیان توازن قائم کیا گیا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان پہاڑوں کی وجہ سے زمین کے بعض حساس مقامات پر زلزلوں اور آتش فشانیوں کو روکا گیا ہو' اور ان وجوہات کے علاوہ بعض دوسری نامعلوم وجوہات کے ناطے پہاڑوں کو میخیں کہا گیا ہو۔ جن کا ابھی تک انسان کو علم ہی نہ ہوا ہو' کیونکہ قرآن نے کئی نامعلوم حقائق کی طرف اشارات اور واضح اشارات کیے تھے اور انسانوں نے ان کا ایک نہایت ہی محدود حصہ صدیوں بعد معلوم کیا ہے۔

دوسرا سفر دراصل انسانی نفسیات کی وادیوں میں ہے۔ نفس انسانی کے بعض پہلوؤں کو لیا گیا ہے۔

وَّ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا (۷۸: ۸) "اور ہم نے تمہیں مرد و عورت کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا"۔ یہ بھی اس دنیا کی ایک نہایت کھلی حقیقت ہے' جسے انسان نہایت ہی سادگی کے ساتھ پاتا ہے کہ انسانوں کو مرد اور عورت کی شکل میں پیدا کیا گیا ہے۔ پھر ان کو جوڑا بنایا گیا اور ان کے ملاپ سے سلسلہ حیات کو جاری رکھا گیا۔ ہر انسان اس حقیقت اور اس نظارے کو دیکھتا ہے اور پھر وہ دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اس نظام کے اندر کس قدر لطف' مزہ' خوشی اور آرام رکھا گیا ہے اور ان امور کو سمجھنے کے لیے کسی وسیع علم کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے اللہ نے انسانوں کے سامنے یہ حقیقت رکھی' ہر تہذیب و تمدن کا بیٹا بھی اسے سمجھتا ہے اور ہر بدوی اور پہاڑی بھی اس کو محسوس کر کے اس کو برتتا ہے اور اس کے مطابق زندگی کو منظم کرتا ہے۔

اس گہری حقیقت کے اس اجمالی شعور سے آگے کچھ مزید قابل غور باتیں بھی ہیں' ان تک صرف ان لوگوں کو رسائی حاصل ہوتی ہے جو علم و معرفت میں ذرا گہرائی تک چلے جاتے ہیں' مثلاً انسانی جرثومے اور نطفے سے مذکر اور مونث

بنا دینا حالانکہ اس جرثومے کے اندر مذکر و مونث کی کوئی شناخت نہیں ہوتی۔ یہ اللہ ہی ہے جو کسی نطفے کو تذکیر کی طرف لے جاتا ہے اور کسی نطفے کو تانیث کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ صرف دست قدرت کے کارنامے ہیں۔ اللہ کی تخلیق اور اللہ کی ہدایت جس نطفے میں جو خصائص چاہے ڈال دے تاکہ انسان ایک جوڑے کی شکل میں پیدا ہوں اور زندگی کی گاڑی آگے بڑھے۔

وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا(۹) وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا(۱۰) وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ

مَعَاشًا(۱۱)(۷۸: ۹ تا ۱۱) ”اور تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا اور رات کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا وقت بنایا“۔ اللہ کی مہربانیوں پر ذرا غور کریں کہ اس نے انسانوں کو سکون اور تازگی عطا کرنے کے لیے نیند کی تخلیق کی۔ یہ نیند جب انسان پر طاری ہوتی ہے تو ایک وقت کے لیے اس کی قوت مدرکہ اور قوت عمل کو موقوف کر دیتی ہے۔ اس وقفے میں انسان ایک ایسی حالت میں چلا جاتا ہے کہ جسے نہ حالت موت کہا جا سکتا ہے اور نہ حالت حیات۔ اس حالت میں جانے سے انسانی جسم اور اعصاب کی تمام تھکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ اور وہ تازہ دم ہو کر اور از سرنو پیدا ہو کر زندگی کی جدوجہد اور مشغولیات اپنا لیتا ہے۔ حالت نوم کس طرح طاری ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں ایک انسان کس طرح تازہ دم ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کو صرف اللہ ہی جانتا ہے اور اس کام میں انسانی ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ نہ انسان اس بات کو جانتا ہے کہ یہ تازگی اس کے جسم میں کس طرح سرایت کر جاتی ہے۔ کیونکہ جب وہ جاگ اٹھتا ہے تو وہ نیند کے حالات کا تصور نہیں کر سکتا۔ اور نیند کی حالت میں بھی اس کی قوت مدرکہ معطل ہوتی ہے۔ یہ ہے ہر زندہ چیز سے متعلق ایک کھلے راز کی بات جسے صرف وہ ذات جانتی ہے جس نے ان زندہ مخلوقات کو پیدا کیا اور انسانی زندگی اور اس کی سرگرمیوں کو سونے اور نیند پر موقوف کیا۔ کیونکہ ہر زندہ مخلوق ایک محدود وقت تک ہی نیند کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے' اور اگر اسے مجبوراً دیر تک مصنوعی طریقے سے بیدار رکھا جائے تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

لیکن نیند میں جسمانی اور اعصابی ضروریات کے علاوہ بھی کچھ راز ہیں۔ یہ روح کے لیے بھی سکون کا ذریعہ ہے۔ روح کو بھی زندگی کی سخت کشمکش سے ہٹا کر اس کے لیے سکون کا ذریعہ ہے۔ یوں جس طرح ایک فوجی اسلحہ اتار کر قدرے ستاتا ہے اور امن و سکون کی حالت میں چلا جاتا ہے لیکن نیند کی حالت میں اسے جانا پڑتا ہے۔ وہ چاہے یا نہ چاہے کیونکہ نیند انسان کی ایک ایسی ضرورت ہے جس طرح کھانا پینا' اس کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات نیند کے نتیجے میں ایسی تبدیلی آتی ہے جو معجزات سے کم نہیں ہوتی۔ انسان روحانی تھکاوٹ میں مبتلا ہوتا ہے' اعصاب چور چور ہوتے ہیں' روح متزلزل ہوتی ہے' اور دل پریشانی سے بھرا ہوتا ہے۔ اچانک ایک اونگھ سی طاری ہوتی ہے' اور بعض اوقات یہ اونگھ چند لمحات سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن ایک فرد کے جسم اور روح پر تازگی طاری ہو جاتی ہے اور اس کی حالت میں ایک انقلاب آ جاتا ہے اور چند لمحات کے اندر انسان اپنے آپ کو تروتازہ بلکہ ایک نیا انسان محسوس کرتا ہے۔ غزوۂ بدر اور غزوۂ احد میں تھکے ہارے مسلمانوں پر اللہ نے ایسی ہی اونگھ طاری کر دی تھی جسے نعاس امنۃ کہا گیا۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً (۸: ۱۱) ”اس وقت کو یاد کرو جب تمہیں ایک ایسی اونگھ نے ڈھانپ لیا'

سکون طاری کرنے کے لیے صرف اللہ کی طرف سے"۔اور سورہ آل عمران میں

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ (۳: ۱۵۴) "اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے"۔اور بعض اوقات بعض دوسرے لوگوں پر بھی ایسے حالات طاری کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ "سبات" یعنی زندگی کی سرگرمیوں اور عقل و روح کی تمام سرگرمیوں سے رک جانا' ہر زندہ مخلوق کی ضرورت ہے' اور دست قدرت اور خالق کائنات کے رازوں میں سے ایک راز ہے' اور ایک ایسی نعمت ہے جو خالص اللہ کی داد و دہش اور عطا اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ قرآن کریم انسان کے عقل و ادراک کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ اے انسان ذرا اپنی ذاتی خواص پر بھی غور کرو' اور جس دست قدرت نے یہ خواص رکھے ہیں اس پر بھی قدرے تامل اور تدبر کرو اور اس کی معرفت حاصل کرو۔

اور ذات باری کی قدرتوں میں سے ایک اہم قدرت اور تدبیر یہ ہے کہ اس نے اس کائنات کی حرکت کو بھی زندہ مخلوق کی حرکت کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔جس طرح انسان کے اندر نیند رکھکر اسے سکون دیا گیا ہے کہ زندگی کی کشمکش کے بعد وہ قدرے سکون میں رہے۔تو کائنات کے اندر اللہ نے رات کا ماحول پیدا کر کے انسان کے لیے نیند اور سکون کا سازگار ماحول پیدا کر دیا ہے۔یوں اللہ کی مخلوق کے اندر باہم سازگار ماحول پیدا ہوا۔اور یہ پوری دنیا زندہ مخلوقات کا ایک خاندان بن گئی۔زندہ اشیاء کی یہ فیلی ان خصائص کے مطالبات پر لبیک کہتی ہے' جو اس کائنات کے اندر رکھ دیئے گئے ہیں' اور ان زندہ مخلوقات کی تمام اقسام کے اندر ایسی حرکت اور ایسی ضروریات رکھ دی گئی ہیں جو بعینہ اس پوری کائنات کے اندر رکھی گئی ہیں' اور یہ تمام امور دست قدرت نے سرانجام دیئے ہیں اور یوں اس کائنات اور اس پوری زندہ مخلوق کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور موافقت پیدا کر دی گئی ہے۔

اور ان آیات میں تیسرا رنگ یہ دکھایا گیا ہے' دور کے آسمانوں اور بلندیوں کا قریب کی زمین کے ساتھ رابطہ ہے۔

وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (۱۲) وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (۱۳) وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا (۱۴) لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا (۱۵) وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا (۱۶) (۷۸: ۱۲ تا ۱۶) "اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کیے اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا' اور بادلوں سے لگاتار بارش برسائی تاکہ اس کے ذریعے سے غلہ سبزی اور گھنے باغ اگائیں"۔

اور وہ سبع شداد جو انسان کے اوپر کھڑے کیے گئے وہ سات آسمان ہیں۔اور دوسری جگہ ان کو سات راستے کہا گیا ہے۔ان سے حقیقی طور پر مقصود کیا ہے۔یہ اللہ ہی جانتا ہے۔یہ سات کہکشانی مجموعے بھی ہو سکتے ہیں' یہ کہکشانی مجموعے اس قدر بڑے ہیں کہ ان میں سے ایک ہی کہکشانی گروپ میں ستاروں کی تعداد ایک سو ملین کے لگ بھگ ہے۔اور ان سات مجموعوں کا ہماری زمین اور ہمارے مجموعہ شمسی سے تعلق ہے اور ان "سبع شداد" کا کوئی اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے۔

اور اس بات کو اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ اس کائنات کے بارے میں ہمارا موجودہ علم بہت زیادہ دکھائی دینے کے باوجود بہت ہی قلیل ہے۔

اس آیت میں جو کچھ بتایا گیا وہ یہ ہے کہ یہ سات آسمان نہایت مضبوط ہیں۔ ان کی عمارت نہایت پختہ ہے۔ اور اس قدر مضبوطی کے ساتھ باہم دگر پیوست کر دیئے گئے ہیں کہ ان کے ڈھانچے میں کسی جگہ ٹوٹ پھوٹ اور انفکاک ممکن نہیں ہے۔ اور یہ وہی ہیں جن کو ہم اس فضائے کائناتی میں مشاہدہ کرتے ہیں اور جن پر آسمانوں کا لفظ بولا جاتا ہے اور لوگ سمجھ لیتے ہیں اور دوسری چیز یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ سات مضبوط آسمان زمین سے بھی مربوط ہیں اور انسان اور تمام دوسری زندہ مخلوقات سے بھی مربوط ہیں۔ اس لیے ان سات مضبوط چیزوں کا ذکر انسان کی زندگی اور اس کے قیام و انصرام کی تدابیر کے ضمن میں کیا گیا۔

وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (۷۸ : ۱۳) "اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ بنایا"۔ اور یہ روشن اور گرم چراغ سورج ہے جس کی روشنی تیز ہے اور اس کے اندر بے پناہ گرمی ہے۔ جس کی وجہ سے زمین اور اس کے اوپر زندگی ممکن ہوتی ہے جو سمندر کے پانیوں کو گرم کر کے ان سے اس وسیع زمین پر آبپاشی کا بندوبست کرتا ہے۔ وہ بادلوں کو اٹھاتا ہے۔ ان کو بلندی کی اعلیٰ سطح تک لے جاتا ہے اور پھر ان بادلوں کو نچوڑ کر بارش برسائی جاتی ہے۔

وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا (۷۸ : ۱۴) "اور بادلوں سے لگاتار بارش برسائی"۔ یعنی قوانین قدرت ان بادلوں کو نچوڑتے ہیں اور ان کا پانی زمین پر گرتا ہے۔ یہ پانی کس طرح نچوڑا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہواؤں کے ذریعہ بادلوں سے پانی نچوڑا جاتا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بادلوں کے باہم ٹکرانے سے بجلی کی پیدائش کے عمل سے پانی نکل آتا ہو، لیکن ان تمام اسباب کے پیچھے اصل تو مسبب الاسباب ہے جو ان تمام اسباب اور اثرات ڈالنے والی چیزوں کا خالق ہے۔ اس سورج کو چراغ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں جلنے کا عمل اور روشنی ہوتی ہے اور یہی کام سورج کے اندر ہو رہا ہے کہ اس میں جلنے کا عمل اور روشنی بکھیرنے کا عمل ہو رہا ہے۔ لہٰذا سورج اور چراغ پوری طرح ایک ہی عمل کر رہے ہیں۔

اللہ کے روشن چراغ سے ہم پر گرم شعاعوں اور روشنی کی بارش ہوتی ہے اور بادلوں سے لگاتار بارش نچوڑی جاتی ہے۔ اور یہ بجلی کی کڑک کے عمل سے بار بار برستی ہے اور اس بارش اور اس گرمی ہی سے اس کرۂ ارض پر ہر قسم کے نباتات پیدا ہوتے ہیں اور ان نباتات سے وہ تمام حیوانات پیدا ہوتے جن کو انسان استعمال کرتے ہیں اور وہ تمام گھنے باغات پیدا ہوتے ہیں۔ الفاف سے مراد ہے وہ گھنے درخت جو ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے ہوئے ہوں اور ایک درخت کی ٹہنی دوسرے میں گھسی ہوئی ہو۔

اس کائنات کی تخلیق میں یہ ہم آہنگی، اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے ایک حکیمانہ ہاتھ کام کر رہا ہے۔ نہایت حکمت کے ساتھ اس کی ہر چیز اندازے کے ساتھ بنائی گئی ہے۔ اور یہی ارادہ اس کو چلا رہا ہے اور اس حقیقت کو ہر انسان پاتا ہے، اگر وہ اپنی عقل اور اپنے شعور کو اس طرف متوجہ کرے، لیکن دور جدید میں جب انسان نے علم و معرفت میں ترقی کر لی، تو اس نے معلوم کیا کہ اس کائنات کی تخلیق میں کیا کیا تدابیر اختیار کی گئی ہیں اور اس کی ہر ہر چیز کو

کس طرح ایک فارمولے کے مطابق بنایا گیا ہے ۔ یہ فارمولے اس قدر عجیب اور حیران کن ہیں کہ ان کو دیکھ کر عقل چکرانے لگتی ہے ۔ اور علم و معرفت رکھنے والا جدید انسان اور سائنس دان اس بات کو احمقانہ تصور کرتا ہے کہ یہ کائنات یونہی بخت و اتفاق سے پیدا ہو گئی ہے اور جو لوگ اس کائنات کے کسی مدبر اور خالق کے تسلیم کرنے سے فرار اختیار کرتے ہیں ۔ وہ لوگ دراصل محض ہٹ دھرمی اور ضد میں مبتلا ہیں ۔ اور ان کے اس رویے کو اب احترام کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے ۔ اور اس کائنات کے پیچھے ایک قوت مدبرہ کام کر رہی ہے جس نے ہر چیز کو نہایت ہی حساس سکیل کے ساتھ پیدا کیا ہے اور کائنات کی تمام قوتیں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ اور پیوست ہیں ۔ اور قرآن کریم نے اس آیت میں اسی تنظیم 'ہم آہنگی اور تقدیر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ زمین کو گہوارہ بنایا ہے اور پہاڑوں کو میخوں کی شکل دی ہے اور لوگوں کو جوڑے جوڑے بنایا' نیند کو باعث سکون بنایا' اور رات کو سب کے لیے چھپنے اور آرام کرنے کا ذریعہ بنایا' اور سورج کے ذریعہ گرمی اور روشنی کا انتظام کیا ۔ اور ہواؤں اور بادلوں کے ذریعہ بارشوں کا انتظام کیا' جن کے نتیجے میں سبزیاں' حیوانات اور پھل نکالے گئے ۔ یہ تمام حقائق جس انداز سے بیان کیے گئے ہیں ۔ سائنسی زاویہ سے بھی یہ باہم متوافق اور ہم آہنگ ہیں اور ان کے اندر گہرا تعلق سبب اور مسبب کا ہے ۔ اور یہ تعلق ہی بتاتا ہے کہ اس کائنات کا ایک ایسا خالق ہے جو اس کے نظام کو نہایت ہی خوبصورتی اور حکمت سے ملا رہا ہے اور وہ حکیم و قدیر ہے ۔ ان سائنسی اور مشاہداتی حقائق کو اگر کھلی آنکھوں سے پڑھا جائے تو اس سے انسان کو حکمت و دانش کا ایک بہت بڑا پیغام ملتا ہے اور اس کے بعد پھر وہ ایک عظیم پیغام پاتا ہے اور اس کی یہ شہ سرخی لگتی ہے کہ ایک فیصلے کا دن آنے والا ہے ۔

یہ تمام مخلوقات یہاں تمہارے استفادے کے لیے ہیں 'کھاؤ اور پیو اور عیش کرو' مگر ایک دن بھی آنے والا ہے' یہ دن یوم الفصل ہے' یہ دن فیصلوں کا دن ہے ۔

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ﴿١٧﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ﴿١٨﴾ وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴿١٩﴾ وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿٢٠﴾

''بے شک فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے جس روز صور میں پھونک مار دی جائے گی' تم فوج در فوج نکل آؤ گے ۔ اور آسمان کھول دیا جائے گا' حتیٰ کہ وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا اور پہاڑ چلائے جائیں گے یہاں تک کہ وہ سراب ہو جائیں گے'' ۔

لوگ عبث پیدا نہیں کیے گئے اور نہ ہی وہ شتر بے مہار ہیں ۔ ان کی زندگی کے اندازے اور نظام 'جس کا ذکر آیات ماقبل میں کیا گیا ہے' اور پھر اس کائنات کا نظام جس میں وہ رہ رہے ہیں' دونوں نظام پوری طرح ایک دوسرے کے

ساتھ ہم آہنگ ہیں ' ان پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد ہر دانش مند آدمی اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ انسان مہمل اور غیر ذمہ دار نہیں ہیں کہ زمین پر اچھے کام کریں یا برے کام کریں اور پھر مر کر مٹی ہو جائیں ۔ راہ ہدایت پر ہوں یا راہ ضلالت پر ہوں ' ان سے پوچھنے والا کوئی نہ ہو ' زمین پر عدل کر لیا ' یا ظلم ' کوئی پوچھنے والا نہ ہو ۔

بہرحال ایک دن فیصلے کا ضرور ہے ' جس دن تمام گزرے ہوئے معاملات کے فیصلے ہوں گے ۔ یہ طے شدہ ' متعین دن ہے ' جس کے رسم اور قواعد طے شدہ ہیں اور اس کا وقت بھی اللہ کے ہاں طے شدہ ہے ۔ اور مقرر و متعین ہے ۔

اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کَانَ مِیْقَاتًا (۷۸ : ۱۷) "بے شک فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے" ۔ اس دن اس کائنات کا نظام بدل جائے گا اور اس نظام کی بندش کھل جائے گی

یَّوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا (۱۸) وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَکَانَتْ اَبْوَابًا (۱۹) وَّ سُیِّرَتِ الْجِبَالُ فَکَانَتْ سَرَابًا (۲۰) (۷۸ : ۱۸ تا ۲۰) "جس روز پھونک ماری جائے گی تو تم فوج در فوج نکل آؤ گے ۔ اور آسمان کھول دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا اور پہاڑ چلائے جائیں گے ' یہاں تک کہ وہ سراب بن جائیں گے" ۔

صور سے مراد بگل ہے ۔ ہم صرف اس کے نام سے واقف ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ اس میں پھونک ماری جائے گی ۔ اس کی کیفیت کیا ہوگی تو اس میں ہمیں نہیں پڑنا چاہئے ۔ اگر ہم اس کی تفصیلی کیفیت معلوم بھی کر لیں تو اس سے ہمارے ایمان میں کوئی فرق نہیں پڑے گا ۔ اللہ نے ہماری قوت فہم و ادراک کو ایسے لاحاصل موضوعات پر کھپانے سے بچایا ہے اور جس قدر علم کی ضرورت تھی وہ ہمیں بتا دیا ہے ۔ پس ہم یہی سوچتے ہیں کہ ایک آواز ہوگی اور اس کے نتیجے میں سب انسان قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے ۔ ہمارے ذہنوں میں یہ منظر آتا ہے کہ انسانی نسلیں فوج در فوج چلی آ رہی ہوں گی ۔ حالانکہ دنیا میں اللہ نے ایسا نظام قائم کیا تھا کہ اگلی نسلیں جاتی رہتی تھیں اور نئی نسلیں ان کی جگہ لیتی تھیں تا کہ یہ نہ ہو کہ زمین پر لوگوں کے رہنے کی جگہ ہی نہ رہے ' بہرحال ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ فوج در فوج ہر نشیب و فراز سے چلے آ رہے ہوں گے ۔ ایک ہی میدان میں ہوں گے ۔ یہ چیونٹیوں کی طرح قبروں سے نکل رہے ہوں گے اور یہ اس قدر لوگ ہوں گے کہ نہ ان کا پہلا سرا معلوم ہو گا اور نہ آخری ۔ اور یہ عظیم اجتماع دلوں کے اندر ایک خوف پیدا کر رہا ہو گا کیونکہ کسی نے بھی اس قدر عظیم اجتماع نہ دیکھا ہو گا اور نہ سوچا ہو گا اس لیے کہ یہ اجتماع قیامت کے دن ہی ہو گا ۔ یہ کہاں ہو گا اس کا ہمیں علم نہیں ہے ۔ کیونکہ کائنات کا یہ نظام تو تباہ کر دیا جائے گا ۔ عظیم حادثات اور انقلابات ہو چکے ہوں گے ۔

وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَکَانَتْ اَبْوَابًا (۱۹) وَّ سُیِّرَتِ الْجِبَالُ فَکَانَتْ سَرَابًا (۷۸ : ۲۰) "اور آسمان کھول دیا جائے گا ' حتیٰ کہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا اور پہاڑ چلائے جائیں گے یہاں تک کہ وہ سراب ہو جائیں گے" ۔

یہ مضبوط آسمان کھول دیا جائے گا۔ یہ دروازے ہی دروازے ہو گا یعنی پھٹ کر اس میں دراڑیں پڑ جائیں گی جیسا کہ دوسری سورتوں میں آیا ہے۔ یہ ایسی صورت حال ہوگی جس کا ہم پوری طرح تصور نہیں کر سکتے۔ بڑے بڑے پہاڑ چل پڑیں گے اور سراب بن جائیں گے۔ یعنی باہم ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور ہوا میں بکھر جائیں گے۔ اور یوں نظر آئے گا جس طرح سراب۔ جیسا کہ دوسری سورتوں میں آیا ہے۔ جس طرح سراب کا وجود نہیں ہو گا۔ اسی طرح پہاڑ غبار بن کر معدوم ہو جائیں گے اور یہ ذرات اس طرح روشنی کو منعکس کریں گے جس طرح سراب میں روشنی منعکس ہوتی ہے اور پانی نظر آتا ہے۔ غرض اس کائنات میں ہولناک تبدیلیاں ہوں گی۔ اور یہ انقلاب نفخ صور کے بعد ہو گا۔ یہ ہے فیصلے کا دن۔ یہ مقدر ہے اور اللہ کی حکمت و تدبیر سے اس میں سب واقعات ہوں گے۔

اب نفخ صور کے متصلاً رونما ہونے والے واقعات سے قدرے بعد میں آنے والے کچھ واقعات، نیکوکاروں اور بدکاروں کے فیصلے کی ایک جھلک۔ لیکن پہلے ان لوگوں کا فیصلہ سنایا جاتا ہے جو بدکار ہیں۔

إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿٢١﴾ لِّلطَّاغِينَ مَآبًا ﴿٢٢﴾ لَّابِثِينَ فِيهَآ
أَحْقَابًا ﴿٢٣﴾ لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ﴿٢٤﴾ إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا ﴿٢٥﴾
جَزَآءً وِفَاقًا ﴿٢٦﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ﴿٢٧﴾ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۱
كِذَّابًا ﴿٢٨﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ﴿٢٩﴾ فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ﴿٣٠﴾ ع۳۰

"درحقیقت جہنم ایک گھات ہے، سرکشوں کا ٹھکانا، جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔ اس کے اندر کسی ٹھنڈک ۱
اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزہ نہ چکھیں گے، کچھ ملے گا تو بس گرم پانی اور زخموں کا دھوون، (ان کے کرتوتوں) کا بھرپور بدلہ۔ وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور ہماری آیات کو انہوں نے بالکل جھٹلا دیا تھا، اور حال یہ تھا کہ ہم نے ہر چیز گن گن کر لکھ رکھی تھی۔ اب چکھو مزہ، ہم تمہارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں ہرگز اضافہ نہ کریں گے"۔

جہنم کو پیدا کر دیا گیا ہے، یہ موجود اور تیار ہے اور ایک انسان کی طرح گھات میں بیٹھی انتظار کر رہی ہے اور یہ لوگ آتے ہیں اور اس میں گرتے ہیں اور وہ برابر ان کا استقبال کر رہی ہے گویا زمین پر ان کی زندگی ایک سفر ہے اور یہ لوگ لوٹ رہے ہیں، اپنی اصلی جائے رہائش کی طرف، اور اس مرجع اور ماوی میں انہوں نے اب ابدالآباد تک رہنا ہے۔ یہ ایک طویل زندگی ہوگی اور زمانوں پر زمانے گزرتے چلے جائیں گے اور ان کی حالت یہ ہوگی۔

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا (۷۸ : ۲۴) "اس کے اندر وہ کسی ٹھنڈے پانی کا مزہ نہ چکھیں گے"۔ ہاں پینے کے لیے انہیں کچھ ملے گا ضرور۔ وہ کیا ہو گا؟ بہت ہی تلخ اور مکروہ۔

إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا (۷۸ : ۲۵) "کچھ ملے گا تو بس گرم پانی اور زخموں کا دھوون"۔ سخت گرم پانی جس سے ان کے حلق اور پیٹ جل بھن جائیں گے۔ یہ ان کے لیے "ٹھنڈک" ہے اور غساق وہ پانی جو جلے ہوئے

لوگوں کے زخموں سے بہتا ہے یہ ہے ان کا مشروب ۔

جَزَآءً وِّفَاقًا (۲۶:۷۸) "بھرپور بدلہ"۔ انہوں نے جو کچھ کمایا اور جو کچھ قیامت کے لیے ذخیرہ کر کے بھیجا اس کا پورا پورا بدلہ ۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا (۲۷:۷۸) "وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے"۔ اور نہ نیک و بد کے انجام کے واقع ہونے میں یقین رکھتے تھے ۔

وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا (۲۸:۷۸) "اور ہماری آیات کو انہوں نے جھٹلا دیا تھا"۔ ان الفاظ کے ترنم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تکذیب میں شدید تھے اور تکذیب پر مصر تھے ۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا ریکارڈ تیار کر رہا تھا ۔ اور یہ اس قدر کامل و شامل ریکارڈ تھا کہ اس سے کوئی بڑی چھوٹی چیز چوک نہ سکتی تھی ۔

وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا (۲۹:۷۸) "اور حال یہ تھا کہ ہم ہر چیز گن گن کر لکھ رہے تھے"۔ اس لیے اب یہاں ان کو سخت ملامت کی جاتی ہے ۔

فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا (۳۰:۷۸) "اب چکھو مزہ، ہم تمہارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کریں گے"۔

اب مقابل کا منظر پیش ہوتا ہے ۔ یہ اہل تقویٰ اور ان نعمتوں کا منظر ہے جس میں وہ مزے سے رہ رہے ہیں ۔ باغیوں اور نافرمانوں کے بعد یہ بھی ضروری تھا کہ ایک جھلک ان کی بھی دکھا دی جائے ۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾
وَّ كَاْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ
عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾

"یقیناً متقیوں کے لیے کامرانی کا ایک مقام ہے ' باغ اور انگور ' اور نوخیز ہم سن لڑکیاں اور چھلکتے ہوئے جام ۔ وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سنیں گے ۔ جزاء اور کافی انعام تمہارے رب کی طرف سے"۔

پہلے منظر میں جہنم آراستہ و پیراستہ تھی ۔ کفار کے ٹھکانے کے طور پر اور وہ یوں گھات میں تیار بیٹھی تھی جس طرح ایک شکاری گھات میں بیٹھتا ہے ۔ اور ایک ایک کو شکار کرتا ہے ۔ اسی طرح جہنم سے بھی کوئی بچ کر نہ نکل سکتا تھا ۔ اس منظر میں یوں نظر آتا ہے کہ اہل جنت نجات اور کامیابی کے مقام پر فائز ہو چکے ہیں ۔ اور یہ نجات اور کامیابی کی جگہ ۔

حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا (۷۸ : ۳۲) "باغ اور انگور"۔ کی صورت میں ہے۔ اور انگور کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے لیا گیا ہے کہ قرآن کریم کے مخاطب اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ کواعب کے معنی ہیں ایسی نوخیز نوجوان لڑکیاں جن کے پستان گول ہوں اور اتراب کے معنی ہیں حسن و جمال اور ماہ و سال کے لحاظ سے ہم سن۔

وَّكَاْسًا دِهَاقًا (۷۸ : ۳۴) "اور جھلکتے ہوئے جام" یعنی لبریز۔

ان انعامات کی ظاہری شکل و صورت حسی ہے اور ان کا ذکر جن چیزوں کا نام لے کر کیا گیا ہے وہ اس لیے تاکہ مفہوم لوگوں کے فہم کے قریب آجائے۔ رہی ان کی حقیقت تو اہل زمین کے لیے اس کا ادراک ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کی فہم و ادراک زمین کے تصورات کے اندر مقید ہے اور ان کے عمومی اور معنوی حالات اسلامی ذوق و ضمیر کے مطابق ہوں گے۔ ایک مسلمان ان کا شعور رکھتا ہے کہ۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا (۷۸ : ۳۵) "وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سنیں گے"۔ یعنی وہ ایسی زندگی بسر کر رہے ہوں گے کہ اس میں کوئی لغو بات نہ ہوگی۔ اور اس میں کوئی جھوٹ نہ ہوگا کیونکہ جھوٹ پر بالعموم جنگ و جدال کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے وہاں حقائق کھلے ہوں گے اور کسی کو بحث و مباحثہ کا موقعہ نہ ہوگا۔ نہ ایسی باتیں وہاں ہوں گی جو بے فائدہ ہوں اور ان میں کوئی بھلائی نہ ہو۔ یہ صورت حالات اس جہان کے لیے مناسب ہے جو دارالخلد ہے۔

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا (۷۸ : ۳۶) "جزاء اور کافی انعام تمہارے رب کی طرف سے"۔ یہاں انداز تعبیر کی رعنائی اور پر ترنم آواز اور جزاء اور عطا کی تقسیم قابل ملاحظہ ہے۔ اور فواصل اور قوافی میں شدت اور صوتی ہم آہنگی اس پورے پارے میں ایک مخصوص انداز ہے اور بہت ہی خوبصورت۔

اس دن کے مناظر جس کے بارے میں سوال کرنے والے سوال کرتے ہیں جس کے بارے میں اختلاف کرنے والے اختلاف کرتے ہیں اب ختم ہوتے ہیں اور ان کے خاتمے پر لفظی اور معنوی اعتبار سے خوبصورت منظر ملاحظہ کیجئے' جس میں جبرئیل علیہ السلام اور دوسرے فرشتے صف بستہ کھڑے ہیں۔ یہ سب رحمن کے سامنے کھڑے ہیں' ان میں سے صرف وہی بات کر سکتا ہے جسے اجازت ہو۔ ایک ہیبت ناک اور خوفناک موقف ہے۔

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ۝ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۚ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝

"اس نہایت مہربان خدا کی طرف سے جو زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا مالک ہے' جس کے

سامنے کسی کو بولنے کا یارا نہیں۔ جس روز روح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے' کوئی نہ بولے گا سوائے اس کے جسے رحمن اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے"۔

یہ جزاء و سزا جو اہل تقویٰ اور اہل ضلالت کے لیے' اس سے قبل مفصل طور پر بیان ہوئی' یہ تیرے رب کی طرف سے ہے۔ اور

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ (۷۸:۳۷) ہے (اس نہایت مہربان خدا کی طرف سے جو زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا مالک ہے) اس آخری ٹچ اور اس عظیم حقیقت کے بیان کے لیے اب یہ مناسب وقت ہے' یعنی یہ کہ اللہ کی ربوبیت زمین و آسمانوں پر حاوی ہے' اس کے اندر یہ دنیا بھی ہے اور آخرت بھی ہے۔ یہ اہل تقویٰ کو جزاء دیتی ہے اور اہل ضلالت اور بدکاروں کو سزا دیتی ہے اور دنیا و آخرت کے تمام فیصلے اللہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ پھر یہ ربوبیت نہایت رحیمانہ ہے۔ یہ جزاء بھی اس کی رحمت کا نتیجہ ہے اور سزا بھی اس کی رحمت کا تقاضا ہے۔ یہ اس کی رحمت ہی کا تقاضا ہے کہ سرکشوں کو جہنم میں جلایا جائے۔ کیونکہ یہ عین رحمت ہے کہ شر کو سزا ملے اور خیر و شر برابر نہ ہوں ورنہ یہ تو ظلم ہو گا۔

پھر یہ رحمت اپنے اندر جلال لیے ہوئے ہے۔ اس خوفناک دن میں اس دربار رحمت میں کوئی بات نہ کر سکے گا۔ جبرئیل علیہ السلام اور دوسرے سربرآوردہ فرشتے بھی صف بستہ خاموش کھڑے ہوں گے۔ صرف اجازت سے کچھ عرض کرنا ہو گا اور بات ہو گی۔ لیکن بات بھی درست ہو گی ورنہ رحمٰن تو دل کی بات جانتا ہے' بری بات کہنے کی اجازت ہی نہ ہو گی۔

یہ منظر کہ بے گناہ لوگ اور سرکردہ فرشتے بھی اس بارگاہ میں خاموش کھڑے ہیں' کوئی شخص بات بھی نہیں کرتا' سما ہوا کھڑا ہے' فضا پر رعب' خوف' جلالت اور وقار کے گہرے بادل پھیلا دیتا ہے۔ ایسے حالات میں جبکہ خوف کے بادل چھائے ہوئے ہوں' دنیا کے غافلوں اور بری راہوں پر سرپٹ بھاگنے والوں کو ایک بار پھر ڈرایا جاتا ہے' ایک زبردست چیخ آتی ہے اور مدہوش لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ
عَذَابًا قَرِيْبًا ۚۖ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ ۲
كُنْتُ تُرٰبًا ۝ ع۱۰
۲

"وہ دن برحق ہے' اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف پلٹنے کا راستہ اختیار کر لے۔ ہم نے تم لوگوں کو اس عذاب سے ڈرا دیا ہے جو قریب آ لگا ہے۔ جس روز آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے' اور کافر پکار اٹھے گا کہ کاش وہ خاک ہوتا"۔

یہ ایک شدید جھٹکا ہے' ان لوگوں کو نہایت شدت سے جھنجھوڑا جاتا ہے جو اس حق دن کے بارے میں شک میں مبتلا

تھے اور تشکیک پر مشتمل سوالات کرتے تھے ۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ (۷۸ : ۳۹) ”وہ دن برحق ہے“۔ لہٰذا اس کے بارے میں شکی سوالات کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ لوگو ! ابھی فرصت کے اوقات موجود ہیں ' مہلت ملی ہوئی ہے ۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ ۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا (۷۸ : ۳۹) ”جس کا جی چاہے وہ رب کی طرف راستہ لے“۔ قبل اس کے کہ جہنم گھات لگا کر بیٹھے اور تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لے ۔

یہ سخت ڈراوا ہے ۔ اگر کوئی خواب خرگوش میں بھی ہو ' وہ بھی بیدار ہو سکتا ہے ۔

اِنَّاۤ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا (۷۸ : ۴۰) ”ہم نے تم لوگوں کو اس عذاب سے ڈرایا جو قریب آ لگا ہے“۔ وہ دور نہیں ہے ۔ یہ جہنم کا عذاب ہے جو تمہارے انتظار میں ہے ۔ جیسا کہ اس منظر میں تم نے دیکھ لیا ۔ یہ دنیا تو ایک مختصر سفر ہے اور عمر کی کشتی ساحل پر لگنے ہی والی ہے ۔

یہ اس قدر شدید عذاب ہو گا کہ کافر اپنے وجود ہی سے بیزار ہو گا اور اس بات کو پسند کرے گا کہ اے کاش اسے معدوم ہی کر دیا جائے ۔

يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِىْ كُنْتُ تُرٰبًا (۷۸ : ۴۰)
”جس روز آدمی وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور کافر پکار اٹھے گا کہ اے کاش میں خاک ہوتا“۔ یہ وہ نہایت تنگ دل اور مایوسی سے کہے گا ۔

اب فضا پر خوف اور ندامت کے بادل چھا جاتے ہیں کہ زندہ انسان یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ معدوم ہو جائے اور خاک و غبار بن جائے ۔ وہ اپنے معدوم ہونے ہی کی صورت میں اپنے آپ کو اس خوفناک عذاب سے بچا سکتا ہے ۔ یہ ہو گا ان لوگوں کا موقف جو آج اس عظیم حقیقت اور سرخیوں والی حقیقت کے بارے میں تشکیک پر مشتمل سوالات کرتے ہیں اور شبہات اٹھاتے ہیں ۔

---OOO---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ -- ۳۰

سورۃ النّٰزعٰت ۔ ۷۹

۱ -- تا -- ۴۶

سورۃ النٰزعٰت ایک نظر میں

یہ سورت بھی اس پارے کا ایک ممتاز نمونہ ہے ۔ اس کا مرکزی مضمون قیامت کے شعور کو پختہ اور بیدار کرتا ہے ۔ قیام کے عظیم واقعات ' اس کی سنجیدگی ' اس کی ضخامت اور اس کی ہولناکیاں بتائی گئی ہیں اور یہ بھی ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ اس زمین کے اوپر انسانوں کی تخلیق اور انسانوں کے مراحل حیات کی تدبیر اور زمین کے اندر اور باہر زندگی کی نشو و نما اور مراحل سب اس بات پر شاہد ہیں کہ قیام قیامت ایک حقیقت ہے اور اللہ کے ہاں اصل مقصود ہے ۔ یہ اس کائنات کا انجام ہے اور تمام تخلیقات اس لیے ہوئی ہیں کہ وہ اس انجام تک جاکر پہنچیں ۔

اس عظیم حقیقت اور ہولناک واقعہ کو ذہن میں بٹھانے اور اس کے متعلق انسانی شعور کو بیدار کرنے کی خاطر ایک ایسا اسلوب بیان اختیار کیا گیا جس میں قلب و نظر کی تاروں کو خوب چھیڑا گیا ہے اور انسانی ادراک اور شعور پر اس قدر اثرات ڈالے گئے ہیں کہ انسانی احساس اور شعور اسے قبول کرنے کے لیے بخوبی تیار ہو جاتا ہے وہ قیامت کے حوالے سے حساس اور بیدار ہو جاتا ہے اور اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے ۔

بات کی ابتداء ایک زوردار مگر مجمل اور غامض پیراگراف سے ہوتی ہے ' جسے پڑھ کر انسان پر خوف اور تجسس کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ انسان نہایت ہی موثر مترنم اور کپکپا دینے والے انداز کلام میں بہتا چلا جاتا ہے ۔ یہ آغاز اس قدر رعب دار ' اس قدر اچانک ' اس قدر خوبصورت ہے کہ ایک لمحے کے لیے تو سانس رک جاتی ہے ۔ نظریں خیرہ ہو جاتی ہیں ۔ ذرا ملاحظہ کیجئے ۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا (١) وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا (٢) وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا (٣) فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا (٤) فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (٥) (٧٩ : ١ تا ٥) " قسم ہے ان کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں اور جو تیزی سے تیرتے پھرتے ہیں ' پھر سبقت کرتے ہیں ' پھر حالات کا انتظام چلاتے ہیں ۔

اس غامض ' مجمل اور لرزہ براندام کرنے والے خوفناک آغاز کلام کے بعد اصل موضوع یعنی قیامت کا پہلا منظر پیش کیا جاتا ہے ۔ اس منظر کی فضا اور ماحول بھی وہی انداز رکھتا ہے جو اس مطلع کی ہے ۔ گویا آغاز کلام اور مطلع اس منظر کا فریم اور کور ہے ۔

یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ (٦) تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ (٧) قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ (٨) اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ (٩) یَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ (١٠) ءَاِذَا كُنَّا

عِظَامًا نَّخِرَةً (۱۱) قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ (۱۲) فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ

(۱۳) فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ (۱٤) (۷۹: ٦ تا ۱٤) "جس روز ہلا مارے گا زلزلے کا جھٹکا اور اس کے پیچھے اور جھٹکا پڑے گا' کچھ دل ہوں گے' جو اس روز خوف سے کانپ رہے ہوں گے' نگاہیں ان کی سہمی ہوئی ہوں گی ۔ یہ لوگ کہیں گے "کیا واقعی ہم پلٹا کر پھر واپس لائے گئے ہیں؟ جب کہ ہم کھوکھلی بوسیدہ ہڈیاں بن چکے تھے؟" کہیں گے "یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہے" ۔ حالانکہ یہ بس اتنا کام ہے کہ ایک زور کی ڈانٹ پڑے گی اور یکایک یہ کھلے میدان میں موجود ہوں گے" ۔

اس لرزا دینے والے اور دہشت زدہ کر دینے والے خوفناک منظر کے بعد اب انسانی تاریخ میں گزرے ہوئے مکذبین کے انجام بد کا ایک منظر ۔ یہ قصہ فرعون و کلیم کا نہایت ہی موثر مترنم منظر ہے اور اس میں فضا کی خوفناکی اور دہشت کو ذرا کم کیا گیا ہے تاکہ انداز بیان حکایتی اور بیانیہ شکل و صورت اختیار کر لے ۔

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى (۱٥) اِذْ نَادٰهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۱٦)

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۱۷) فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى (۱۸) وَ اَهْدِيَكَ

اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (۱۹) فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى (۲۰) فَكَذَّبَ وَعَصٰى (۲۱) ثُمَّ

اَدْبَرَ يَسْعٰى (۲۲) فَحَشَرَ فَنَادٰى (۲۳) فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۲٤) فَاَخَذَهُ

اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (۲٥) اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (۲٦)

(۷۹: ۱٥ تا ۲٦) "کیا تمہیں موسیٰ کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اس کے رب نے اسے طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا تھا کہ "فرعون کے پاس جا' وہ سرکش ہو گیا ہے' اور اس سے کہہ کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اس کا) خوف تیرے اندر پیدا ہو؟" پھر موسیٰ نے (فرعون کے پاس جاکر) اس کو بڑی نشانی دکھائی' مگر اس نے جھٹلا دیا اور نہ مانا' پھر چال بازیاں کرنے کے لیے پلٹا اور لوگوں کو جمع کر کے اس نے پکار کر کہا "میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں" ۔ آخر کار اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا ۔ درحقیقت اس میں بڑی عبرت ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے" ۔ یوں اس عظیم حقیقت کے لیے یہ قصہ بھی تمہید قرار پاتا ہے ۔

اب وادی تاریخ سے نکل کر ہم اس کائنات کے وسیع میدان میں داخل ہوتے ہیں ۔ ہمارے سامنے اس کائنات کے ہولناک مناظر ہیں ۔ یہ مناظر اس بات کے لیے شاہد عادل ہیں کہ اس کے پیچھے ایک دست قدرت اور گہری قوت مدبرہ کام کر رہی ہے اور ایک عظیم اللہ العالمین ہے جس نے اس ناپید کنار کائنات کو پیدا کیا ۔ جو اس کے انجام کو کنٹرول کرنے والا ہے ۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔ ان مناظر کو نہایت ہی موثر مناظر کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور انداز بیان

نہایت ہی زور دار ہے اور سورت کا آغاز اور اس کا انجام پرتاثیر انداز گفتگو کے عین مطابق :

ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا (۲۷) رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا (۲۸) وَ اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا (۲۹) وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (۳۰) اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰهَا (۳۱) وَ الْجِبَالَ اَرْسٰهَا (۳۲) مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ (۳۳)

(۷۹: ۲۷ تا ۳۳) "کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے اس کو بنایا' اس کی چھت خوب اونچی اٹھائی پھر اس کا توازن قائم کیا' اور اس کی رات ڈھانکی اور اس کا دن نکالا۔ اس کے بعد زمین کو اس نے بچھایا' اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑ دیئے۔ سامان زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے"۔

بات کو ذہن کے قریب کرنے کے لیے یہ تمہیدی باتیں کی گئیں اور یہ دل پر اثرانداز ہونے والے دلائل و اشارات دیئے گئے۔ اب وہ مقصد' ہنگامہ عظیم کا منظر پیش کیا جاتا ہے جو موضوع سورت ہے اور بتایا جاتا ہے کہ لوگوں نے دنیا میں جو رویہ اختیار کیا' اس کا انجام کیا ہو گا۔ یہ جزاء و سزا تو آخرت میں عملی شکل اختیار کریں گے لیکن ان کی تصویر کشی ایسے انداز میں کی گئی ہے جو قیامت کے ہنگامہ عظیم سے مماثلت رکھتی ہے۔

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى (۳۵) وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (۳۶) فَاَمَّا مَنْ طَغٰى (۳۷) وَ اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۳۸) فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى (۳۹) وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (۴۰) فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (۴۱)

(۷۹: ۳۴ تا ۴۱) پھر جب وہ ہنگامہ عظیم برپا ہو گا' جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا' اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی' تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی' دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہو گی۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا' جنت اس کا ٹھکانا ہو گی"۔

اس ہنگامہ عظیم کے مناظر پیش کرنے سے ذہن انسانی میں جو شعور اور جو وجدان جاگزیں ہوتا ہے' جہنم دیکھنے والوں کو صاف نظر آتی ہے۔ ان لوگوں کا انجام بھی صاف نظر آتا ہے جنھوں نے دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔ اپنے رب سے ڈرے اور نفس کو خواہشات سے روکا' ان سب امور کے بعد اب ان لوگوں کو شدید دھمکی دی جاتی ہے جو اس عظیم ہنگامہ خیز حقیقت کی تکذیب کرتے ہیں' جس کے وقت کے بارے میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار سوالات کرتے ہیں' یہ دھمکی ایسے انداز میں ہے کہ اس سے اس عظیم حادثہ کی ضخامت اور عظمت اور خوفناکی ذہن میں

اچھی طرح بیٹھ جاتی ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا (٤٢) فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا (٤٣) اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا (٤٤) اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا (٤٥) كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا (٤٦) (٧٩: ٤٢ تا ٤٦) "یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ "آخر وہ گھڑی کب آکر ٹھہرے گی؟" تمہارا کیا کام کہ اس کا وقت بتاؤ۔ اس کا علم تو اللہ پر ختم ہے۔ تم صرف خبردار کرنے والے ہو۔ ہر اس شخص کو جو اس کا خوف کرے۔ جس روز یہ لوگ اسے دیکھ لیں گے تو انہیں یوں محسوس ہوگا کہ (دنیا میں یا حالت موت میں) یہ بس ایک دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک ٹھہرے ہیں"۔

ان آیات میں ہائے ممدودہ بطور قافیہ لائی گئی ہے یہ انسان کے شعور پر طویل و وسیع اثرات چھوڑتی ہے۔ جس سے ایک طرف اس ہنگامہ خیز واقعہ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس واقعہ سے انسان اچھی طرح ڈر جاتا ہے۔

---OOO---

درس نمبر ۲۷۹ تشریح آیات

۱۔۔ تا۔۔ ۴۶

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ (۷۹) مَكِّيَّةٌ (۸۱) اٰيَاتُهَا ۴۶ رُكُوْعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ﴿۳﴾ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ﴿۴﴾ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے ان کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں' اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں' اور تیزی سے تیرتے پھرتے ہیں' پھر سبقت کرتے ہیں' پھر معاملات کا انتظام چلاتے ہیں"۔

ان کلمات کی تفسیر میں یہ کہا گیا ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہیں' یعنی وہ جو انسانوں کی ارواح کو نہایت شدت سے کھینچتے ہے۔ ناشطات کے معنی ہیں چست اور کام کے لیے تیار ہیں۔ اور اس کائنات کے اطراف و اکناف میں تیرتے پھرتے ہیں۔ اور جو رب تعالیٰ کی اطاعت اور احکام کی بجا آوری میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں اور اس کائنات کے تمام امور کے انتظام اور انصرام میں لگے ہوئے ہیں۔

دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ ان سے مراد ستارے ہیں جو اپنے مداروں اور کائنات کی فضاؤں میں ڈوب جاتے ہیں اور پھر نکلتے ہیں۔ بڑی تیزی سے گردش کرتے ہیں۔ ایک منزل سے دوسری میں داخل ہوتے ہیں۔ اس فضائے کائنات میں وہ معلق ہیں۔ اور رفتار میں بعض تیز ہیں اور بعض ست۔ لہٰذا ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں اور دست قدرت نے ازروئے فطرت ان کو جو احکامات دیئے ہیں وہ سرانجام دیتے ہیں' اور زمین اور اس کے باشندوں کو متاثر کرتے ہیں' یوں وہ اس زمین کا انتظام و انصرام کرتے ہیں۔

بعض تفاسیر کے مطابق نازعات' ناشطات' سابحات اور سابقات سے مراد ستارے ہیں اور مدبرات سے مراد فرشتے

ہیں اور بعض حضرات نے یہ تفسیر بیان کی ہے کہ نازعات ' ناشطات اور سابحات سے مراد ستارے ہیں اور سابقات اور مدبرات سے مراد ملائکہ ہیں ۔

ان آیات و کلمات کا مفہوم جو بھی ہو ' لیکن قرآنی فضا میں زندگی بسر کرتے ہوئے میرا احساس یہ ہے کہ اس پیرائے میں گفتگو اور ان الفاظ کے لانے سے مراد انسانی احساس کو بیدار کرنا ' انسانی شعور کے اندر تجسس اور آنے والے پر خطر اور ہنگامہ خیز حالات کے بارے میں خبردار اور بیدار کرنا ہے ۔ یہ الفاظ اور یہ مفہوم ہمیں اس بات کے لیے تیار کرتے ہیں کہ آگے جو بات آرہی ہے وہ ایک عظیم واقعہ ہے ' جسے الطامۃ الکبریٰ راجفہ اور رادفہ کے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ۔ اگر ہم ان الفاظ کے تفصیلی معانی میں نہ الجھیں کہ ان سے حقیقی مراد کیا ہے ؟ تو اس طرح ہم قرآن کریم کے فطری انداز پر اکتفا کر کے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ قرآن کریم کا حقیقی ہدف یہ ہے کہ وہ دلوں کو ہلائے اور گرمائے اور اس مقصد کے لیے قرآن کریم موثر سے موثر اسلوب اختیار کرتا ہے ۔ ہمارے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کا انداز مطالعہ بھی ہے ۔ آپ سورہ عبس و تولی پڑھ رہے تھے جب

وَّ فَاكِهَةً وَّاَبًّا (۸۰ : ۳۱) تک پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ "فاکہہ" تو ہمیں معلوم ہے لیکن "ابا" کیا ہے ۔ اور اس کے بعد کہا ' اے عمر تیری جان کی قسم ' یہ محض تکلف ہو گا ۔ اگر تم اللہ کی کتاب کے مفہوم میں سے کسی بات کو نہ سمجھو تو کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی ۔ اور ایک دوسری روایت میں انہوں نے فرمایا کہ یہ سب کچھ ہم جانتے ہیں ۔ اگر ہم "اب" کا مفہوم نہ جانیں تو کیا ہے ؟ اس کے بعد انہوں نے اس عصا کو توڑ دیا جو ان کے ہاتھ میں تھا ' اور پھر کہا عمر یہ تو محض تکلف ہے عمر کی ماں کے بیٹے کیا ہو جائے گا اگر تو "اب" کے مفہوم کو نہ جانے ۔ "لوگو ' قرآن میں سے جو تم جانتے ہو ' اس پر عمل کرو اور جو نہیں جانتے اسے چھوڑ دو" ۔ یہ ایسی بات ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام قرآن کریم کے سامنے کس قدر سہمے رہتے تھے اور کس قدر احترام کرتے تھے ۔ جس طرح ایک بندہ اپنے مالک کے احکام کا احترام کرتا ہے اور فوراً تعمیل کرتا ہے ۔ قرآن کریم کے کچھ کلمات اگر مغلق اور غامض ہوں تو بھی ان کا ایک مقصد ہوتا ہے ۔

مطلع میں جن باتوں پر قسم اٹھائی گئی ہے اس کا جواب درج ذیل آیات ہے یعنی جواب قسم کی ان الفاظ میں تصویر کشی کی گئی ہے ۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝۶ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝۷ قُلُوْبٌ يَّوْمَىِٕذٍ
وَّاجِفَةٌ ۝۸ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝۹ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي
الْحَافِرَةِ ۝۱۰ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝۱۱ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝۱۲
فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝۱۴

"جس روز ہلا مارے گا ' زلزلے کا جھٹکا اور اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا پڑے گا ' کچھ دل ہوں گے جو اس روز خوف

سے کانپ رہے ہوں گے ' نگاہیں ان کی سہمی ہوئی ہوں گی ۔ یہ لوگ کہیں گے "کیا واقعی ہم پلٹا کر پھر واپس لائے گئے ہیں؟ جب کہ ہم کھوکھلی بوسیدہ ہڈیاں بن چکے تھے؟" کہیں گے "یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہے" ۔ حالانکہ یہ بس اتنا کام ہے کہ ایک زور کی ڈانٹ پڑے گی اور یکایک یہ کھلے میدان میں موجود ہوں گے"۔

پہلے جھٹکے سے مراد زمین پر طاری ہونے والا جھٹکا ہے کیونکہ دوسری جگہ رجف کی نسبت صراحتہ زمین کی طرف کی گئی ہے ۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ "جب زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے"۔ رادفہ سے مراد ' مطابق روایات آسمان کا لرزنا ہے ۔ یعنی زمین کے لرز اٹھنے کے بعد آسمان بھی لرز اٹھے گا۔ یہ پھٹ جائے گا ' اور اس کے ستارے بکھر جائیں گے ۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ راجفہ سے مراد پہلا صور ہے ۔ پہلا صور جب سخت آواز نکالے گا تو زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے ' زمین کے اوپر درندے چرندے انسان سب لرز اٹھیں گے اور اس کے بعد زمین و آسمان کی تمام مخلوق بیہوش ہو جائے گی ۔ اور رادفہ سے مراد دوسرا صور ہے 'جس کے نتیجے میں تمام مخلوق زندہ ہو کر زمین سے اگ پڑے گی اور میدان حشر برپا ہو جائے گا جس طرح سورہ زمر آیت ۶۸ میں آیا ہے ۔

بہرحال جو مفہوم بھی ہو' انسانی شعور کے پردہ پر ایک زلزلہ برپا ہوتا ہے اور انسان پر اس تصویر کشی سے ایک خوف اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور مارے خوف کے انسان تھرتھر کانپنے لگتا ہے ۔ یوں انسانی شعور اس دن کے خوف و ہراس کو سمجھنے کے قریب ہو جاتا ہے کہ اس دن اس قدر خوف اور اضطراب ہو گا کہ مضبوط سے مضبوط شخص کے قدم اکھڑ جائیں گے اور وہ بے قرار ہو جائے گا۔ انسان اس بات کو پالیتا ہے کہ اس آیت کا مفہوم کیا ہے ۔

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ (٨) اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ (٧٩ : ٩) "کچھ دل ہوں گے جو اس روز خوف کے مارے کانپ رہے ہوں گے ' نگاہیں ان کی سہمی ہوئی ہوں گی"۔ کیونکہ یہ دل شدید اضطراب میں مبتلا ہوں گے ' ان پر ذلت چھائی ہوئی ہو گی ۔ خوف ' دہشت اور ٹوٹ پھوٹ کے آثار ان پر نمایاں ہوں گے ۔ زلزلہ ہو گا اور تباہی کا سماں ہر طرف نمایاں ہو گا۔ اور ایسا ہی ٹوٹ پھوٹ اس دن زمین اور آسمان کے نظام میں ہو گا۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ (٦) تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ (٧٩ : ٧) اور یہی سماں اور یہی منظر ان الفاظ و کلمات سے بھی ظاہر ہوتا ہے جن کے ساتھ قسم کھائی گئی ۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا (١) وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا (٢) وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا (٣) فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا (٤) فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (٥) (٧٩ : ١ تا ٥) یہ تمام مناظر (دل کی دنیا کے 'اس زمین و آسمان کے اور ان قسمیہ کلمات کے) سب کی فضا' سائے اور اثرات ہم رنگ اور ہم آہنگ ہیں ۔ غرض یہ پوری سورت ایک ہنگامہ عظیم کے انداز میں ہے ۔

اب اس منظر کے بارے میں خود ان کے تاثرات یہاں نقل کیے جاتے ہیں کہ جب دوسرا صور پھونکے جانے کے بعد یہ ناگہاں اٹھیں گے اور سخت حیران ہو جائیں گے۔

يَقُولُونَ ءَ إِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ (١٠) ءَ إِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً

(۷۹ : ۱۱) "یہ لوگ کہیں گے' کیا ہم واقعی پلٹا کر واپس لائے جا چکے ہیں؟ جبکہ ہم کھوکھلی بوسیدہ ہڈیاں ہو چکے تھے"۔ یہ گفتگو وہ اس وقت کر رہے ہوں گے' جب پہلے پہل حشر کے میدان میں اٹھیں گے۔ کہا جاتا ہے۔

رَجَعَ فِي حَافِرَتِهِ "یعنی اس راستے سے گیا جس سے آیا تھا"۔ یہ گفتگو وہ مدہوشی اور حیرانی میں کریں گے کہ آیا وہ دوبارہ اسی زندگی میں آگئے ہیں۔ وہ حیران ہوں گے کہ ہم بوسیدہ ہڈیاں ہونے کے باوجود کس طرح زندہ انسان بن گئے۔

نَّخِرَةً (۷۹ : ۱۱) ان ہڈیوں کو کہتے ہیں جو اندر سے خالی ہو گئی ہوں اور ان کے اندر جب ہوا چلتی ہے تو سرسر کی آواز آرہی ہو۔ لیکن جب وہ ذرا ہوش میں آئیں گے اور ان کے حواس بحال ہوں گے تو انہیں معلوم ہو گا کہ وہ تو فی الواقعہ زندہ کر دیے گئے ہیں لیکن یہ تو اخروی زندگی ہے۔ اب ان کو اپنے خسارے اور نقصان کا اندازہ ہو جائے گا۔ اب ان کا تبصرہ یہ ہو گا۔

قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ (۷۹ : ۱۲) "کہیں گے' یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہے"۔ یہ ایک ایسی زندگی ہے جس کو انہوں نے کوئی اہمیت نہ دی۔ اس کے لیے کوئی توشہ انہوں نے جمع کر کے نہ بھیجا اور اب تو کمائی کی جگہ نہیں ہے لہٰذا خسارہ ہی خسارہ ان کا مقدر ہے۔
ایسے حالات میں قرآن کریم بتاتا ہے کہ قیام قیامت کا یہ ہنگامہ عظیم بسہولت برپا کر دیا جائے گا اور اس کی حقیقت تو بس اتنی ہی ہے۔

فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ (١٣) فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ (۷۹ : ۱٤) "حالانکہ یہ بس اتنا کام ہے کہ ایک زور کی ڈانٹ پڑے گی اور یکایک یہ کھلے میدان میں موجود ہوں گے"۔ الزجر کے معنی ہیں تیز آواز۔ یعنی الصیحہ۔ لیکن یہاں الصیحہ کی بجائے الزجرۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ یہ لفظ اس سورت کی فضا اور ماحول کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔ یہاں ماحول شدت اور سختی کا ہے۔ ساہرہ سفید اور چمکدار زمین کو کہتے ہیں۔ مراد میدان حشر ہے۔ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ یہ میدان کہاں ہو گا۔ اس کے بارے میں ہماری معلومات مخبر صادق کی فراہم کردہ معلومات تک محدود ہیں۔ لہٰذا اس کے بارے میں ہم اس سے زیادہ کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتے کیونکہ مخبر صادق کے علاوہ کوئی بات وثوق اور محفوظ طریقے سے نہیں کی جا سکتی۔
اس ڈانٹ سے مراد' مطابق نصوص قرآن و سنت' دوسرا نفخ صور ہے' جس کے ہوتے ہی تمام لوگ اپنی اپنی جگہ

اور اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے' جو الفاظ اس کے لیے چنے گئے ہیں' ان سے اس عمل کی سرعت معلوم ہوتی ہے کہ یہ عمل نہایت تیزی سے ہو گا۔ اس پوری سورت کے بیان کردہ واقعات سرعت اور خوف کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی سرعت اور خوف کی وجہ سے دلوں پر کپکپی اور جسموں پر لرزہ طاری ہو گا۔ اس سورت کی ہر حرکت' ہر لمحہ اور ہر منظر اور فضا میں ہم آہنگی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

اب اگلے مرحلے میں تیزی' حرکت اور خوف کی یہ فضا قدرے تھم جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں قصہ موسیٰ و فرعون کی طرف مختصراً اشارات ہیں۔ اس میں اس سرکشی کا انجام دکھایا گیا ہے' اس لیے بیان میں قدرے سکون اور نرمی آجاتی ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ مُوْسٰی ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ
طُوًى ﴿۱۶﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾
وَ اَهْدِیَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰیَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَ
عَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ ا
فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰى ﴿۲۶﴾ ع ۲۶

"کیا تمہیں موسیٰ کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اس کے رب نے اسے طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا تھا کہ ۳
"فرعون کے پاس جا وہ سرکش ہو گیا ہے' اور اس سے کہہ کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اس کا) خوف تیرے اندر پیدا ہو؟" پھر موسیٰ نے (فرعون کے پاس جا کر) اس کو بڑی نشانی دکھائی' مگر اس نے جھٹلا دیا اور نہ مانا؟ پھر چال بازیاں کرنے کے لیے پلٹا اور لوگوں کو جمع کر کے اس نے پکار کر کہا "میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں"۔ آخر کار اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔ در حقیقت اس میں بڑی عبرت ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن کریم میں بار بار آیا ہے۔ اور اس کی بہت تفصیلات دی گئی ہیں۔ اس سے قبل کی سورتوں میں اس کی تفصیلات گزر چکی ہیں۔ ہر جگہ اس قصے کا حصہ آیا ہے۔ مختلف انداز اور مختلف اسلوب بیان میں آیا ہے۔ ہر جگہ قصے کا وہ حصہ اور اس انداز میں آیا ہے' جس کی ضرورت ہو اور جو موضوع و محل کے مناسب ہو۔ اس قصے کے بیان میں قرآن کریم کا اسلوب بیان اپنے عروج پر ہوتا ہے اور یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز ہے کہ وہ قصے کو نہایت برمحل اور مناسب انداز میں پیش کرتا ہے۔

یہاں یہ قصہ نہایت اختصار کے ساتھ آیا ہے' اس کے مناظر جھلکیوں کی شکل میں بڑی تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ کوہ طور کی وادی مقدس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پکارا جاتا ہے۔ اور انہیں فرعون کی طرف تبلیغی مشن پر جانے کے احکامات دیے جاتے ہیں اس کی سرکشی اور پھر دنیا و آخرت میں اس کے انجام بد اور اللہ کی گرفت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یوں اس کا انجام اس سورت کے موضوع اور مضمون کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو جاتا ہے کیونکہ سورت کا بنیادی موضوع ہے

حشر و نشر اور حساب و کتاب ہے۔ چند مختصر آیات میں 'الف کے ساتھ طویل مد کے ترنم کے ساتھ اس قصے کی جھلکیاں بڑی تیزی کے ساتھ گزر جاتی ہیں۔ یوں اس کا انداز اور اس کا اثر اس سورت کے مزاج کے مطابق ہو جاتا ہے۔

ان مختصر آیات میں نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ اس قصے کے کئی پہلو دکھائے گئے ہیں۔

اس کا آغاز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کیا جاتا ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى (۱۵:۷۹) "کیا تمہیں موسیٰ کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟" یہ سوالیہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا ہے تاکہ مخاطب پوری توجہ سے قصے کو سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو جائے اور پوری طرح اخذ کرلے۔

اس کے بعد پھر واقعات کی تفصیلات آتی ہیں۔ اس قصے کو لفظ حدیث (بات) سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ قصہ دراصل ہے ہی موسیٰ اور رب کا مکالمہ۔ اس لیے لفظ حدیث لانا نہایت واقعیت پسندی ہے۔ چنانچہ سوال و جواب اور رب کے ساتھ مناجات۔

اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (۱٦:۷۹) "جب اس کے رب نے اسے طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا تھا"۔ راجح قول یہ ہے کہ طویٰ وادی کا نام ہے 'جو شخص شمالی حجاز میں مدین کی طرف سے آئے ' یہ وادی طور کے دائیں جانب پڑتی ہے۔

یہ وقت جس میں اللہ کی جانب سے پکار آئی ' یہ ایک عظیم اور خوفزدہ کرنے والے لمحات ہیں اور عجیب کیفیات کا وقت ہو گا کہ اللہ جل شانہ بذات خود اپنے ایک بندے کو پکار رہا ہو گا اور سوچا جائے تو یہ ایک عظیم بات ہے۔ ان لمحات کی خوفناکیوں کے بیان سے انسانی الفاظ قاصر ہیں۔ اللہ کی عظیم بادشاہت اور حکومت کا یہ ایک راز ہے۔ نیز نفس انسانی کے رازوں میں سے بھی یہ ایک سربستہ راز ہے کہ اللہ نے انسانی نفس میں یہ قوت ودیعت کی اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ ندائے جلیل کو سن سکے اور اس سے مفہوم اخذ کر سکے۔ یہ وہ آخری بات ہے جو اس مقام کی نسبت سے ہم کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ مکالمہ الٰہی کے اس مقام اور اس کی کیفیت اور ماہیت کو سمجھنا انسان کے لیے نہایت ہی مشکل ہے۔ انسان کے لیے مناسب ہے کہ اس مقام کے کنارے پر ہی کھڑا رہے۔ اس وقت جب خود باری تعالیٰ انسان کو یہ قوت نہیں دے دیتا کہ وہ اس مقام کی کیفیات و تجلیات اور سوال و جواب کو سمجھ سکے اور اس کا شعور اور اس کی قوت مدرکہ اسے چکھ سکے۔

دوسرے مقامات پر اللہ اور کلیم اللہ کے درمیان ' اس مقام پر ہونے والے مکالموں کی تفصیلات بھی دی گئی ہیں ' لیکن اس سورت میں چونکہ موضوع کے ارد گرد مختصر باتیں رکھنی مقصود ہیں اس لیے یہاں زوردار باتیں نہایت موثر انداز میں اور ایک جھلک کی صورت میں کی گئی ہیں۔ اس لیے یہاں بس چند کلمات کے بعد ہی ذکر کر دیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ عظیم مشن سپرد کر دیا گیا۔ پس آواز آئی اور حکم دے دیا گیا۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۱۷) فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى (۱۸) وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (۱۹:۷۹) "فرعون کے پاس جا ' وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہا کہ

کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں تو خوف تیرے اندر پیدا ہو"۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۷۹ : ۱۷) "فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے"۔ سرکشی ایسا گناہ ہے کہ اسے واقع ہی نہیں ہونا چاہئے اور اگر یہ سرزد ہو جائے تو اسے باقی نہیں رہنا چاہئے۔ یہ ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔ اس سے زمین میں فساد پھیلتا ہے۔ اللہ سرکشی کو پسند نہیں کرتا' سرکشی کے نتیجے میں بے شمار مکروہات جنم لیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بلند ترین انبیاء میں سے ایک ممتاز نبی کو صرف اس لیے بھیجا کہ فرعون کی سرکشی کو مٹا دے اور یہ ڈیوٹی اللہ نے ان کے ساتھ خود ہمکلام ہو کر لگائی۔ براہ راست یہ حکم دیا گیا اور یہ مشن ان کے سپرد کیا گیا تاکہ یہ ممتاز نمایندہ اس شر کو ختم کرے۔ اور دنیا سے اس فساد کو دور کرے' یہ ایک نہایت ہی کریہہ فعل ہے کہ حکمرانوں میں سے کوئی سرکش اور ظالم ہو۔ اسی لیے اللہ نے بذات خود براہ راست یہ مشن اپنے ایک بندے کے سپرد کیا۔ اور حکم دیا کہ اس شخص کو اس حالت سے نکال کر انصاف کی راہوں پر لے آؤ' اگر وہ نہ آئے تو اس پر دنیا و آخرت کی سزا اور عذاب نازل کرنے کا جواز پیدا ہو۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۷۹ : ۱۷) "فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ ظالم و سرکش ہو گیا ہے"۔ اس کے بعد اللہ اپنے بندے کو یہ بھی سکھاتا ہے کہ اس سرکش اور ظالم کے دربار میں انہوں نے اپنا پیغام اور دعوت کس اسلوب میں پیش کرنی ہے۔ نہایت نرم' پرکشش اور محبت بھرے انداز میں۔ شاید کہ وہ باز آ جائے اور اس کے دل میں بات اتر جائے۔ اور اللہ کے غضب اور عذاب سے بچ نکلے۔

فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى (۷۹ : ۱۸) "کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے"۔ کیا تو اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ اس سرکشی اور ظلم کی گندگی سے نکل آئے۔ اور اللہ کی نافرمانیوں کو ترک کر دے۔ کیا تو نماز' دعا اور برکت کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔

وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (۷۹ : ۱۹) "اور میں تیری رہنمائی تیرے رب کی طرف کروں کہ تیرے اندر خوف پیدا ہو"۔ کیا تیرے اندر یہ خواہش ہے کہ تو اپنے رب کے راستے کے نشیب و فراز سے واقفیت حاصل کرے۔ اگر تو رب کی راہوں پر چلے گا تو تیرے دل میں رب کا خوف پیدا ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ظالم اور سرکش تب ہی بنتا ہے جب اپنے رب سے دور چلا جائے۔ راہ حق بھلا دے اور سنگدل ہو کر فساد اختیار کرے۔ اس طرح وہ آخر کار سرکشی اور ظلم کو اپنا وطیرہ بنا لیتا ہے۔

یہ بات تو اس وقت کی گئی ہے جب اللہ کی جانب سے آواز آئی اور یہ عظیم مشن حضرت موسیٰ کے سپرد کیا گیا اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں پہنچے۔ تو انہوں نے یہی بات دہرائی جو اللہ نے سکھائی کہ ایسا کہو' لیکن تبلیغ کے وقت کی جو منظر کشی کی گئی اس میں اس کا تذکرہ نہیں ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ویسا ہی کہا ہو گا جس طرح اللہ نے فرمایا کہ یوں کہو۔ لہٰذا سپردگی مشن کے وقت جو بات کہی گئی اسے یہاں حذف کر دیا اور بات مختصر کر دی

اب یہاں آکر یہ منظر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور آخری بات کہی جاتی ہے ۔

فَاَرٰهُ الْاٰیَةَ الْكُبْرٰی (۲۰) فَكَذَّبَ وَعَصٰی (۷۹ : ۲۱) ”پھر موسیٰ نے اس کو بڑی نشانی دکھائی مگر اس نے جھٹلایا دیا' اور نہ مانا“۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ بات پہنچا دی جو پہنچانی تھی ۔ اور اسی انداز میں اور اسی اسلوب میں پہنچا دی جس میں ان کے رب نے ان کو حکم دیا تھا لیکن اس قسی القلب اور سرکش آدمی کے ہاں یہ اسلوب' کامیاب نہ ہوا کیونکہ مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر ہوا کرتا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ عظیم معجزات پیش کیے 'عصا پیش کیا اور ید بیضا پیش کیا' جیسا کہ دوسری سورتوں میں تفصیلات آتی ہیں ۔ تو اس نے ”جھٹلایا اور نہ مانا“ یوں اختصار کے ساتھ یہ منظر تکذیب اور معصیت پر ختم ہوتا ہے ۔

اب اسی اختصار کے ساتھ ایک دوسرا منظر سامنے آتا ہے ۔ فرعون موسیٰ علیہ السلام کو اپنی جگہ ہی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جادوگروں کو جمع کرتا ہے ۔ اور سحر اور سچائی کا مقابلہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ اس کا کبرو غرور یہ کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ وہ راہ ہدایت پر آجائے اور حق کو قبول کرے ۔

ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰی (۲۲) فَحَشَرَ فَنَادٰی (۲۳) فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی

(۷۹ : ۲۴) ”پھر چال بازیاں کرنے کے لیے پلٹا اور لوگوں کو جمع کر کے اس نے پکار کر کہا ”میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں“۔ سیاق کلام میں یہاں اس سرکش کافر کی بات کو نہایت سرعت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور اس کی مساعی کی تفصیلات 'جادوگروں کا جمع کیا جانا' اور مقابلہ آرائی کی تفصیلات کو یہاں حذف کر دیا جاتا ہے ۔ پس اتنا ہی کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کو چھوڑ کر چلا گیا ۔ اپنی سعی اور تدبیریں کرتا رہا اور عوام کو بھی جمع کیا اور جادوگروں کو بھی جمع کر لایا ۔ اور پس یہاں اس کی ایک ہی مکروہ اور گندی بات کو نقل کر دی' جو جہالت اور غرور اور سرکشی سے اٹی پڑی ہے کہ ”میں ہوں تمہارا رب اعلیٰ“ نعوذ باللہ ۔

یہ بات اس سرکش نے اس بل بوتے پر کی کہ اسے یقین تھا کہ عوام تو جاہل ہیں اور انہوں نے اس بات پر لبیک کہنا ہے جو وہ کہہ دے ۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کو عوام کی جہالت ' عوام کی ذلت اور عوام کی غیر مشروط اطاعت سخت دھوکے میں ڈال دیتی ہے ۔ حالانکہ ہر سرکش اور ڈکٹیٹر تو دراصل ایک شخص ہوتا ہے ۔ اس کے پاس نہ قوت ہوتی ہے اور نہ دلیل ۔ بلکہ اس کی قوت اور دلیل یہی ہوتی ہے کہ ذلیل اور جاہل عوام اس کے سامنے بچھ جاتے ہیں وہ اپنے کاندھوں کو اس کے سامنے جھکاتے ہیں اور وہ ان پر سوار ہو جاتا ہے اور ان کی گردنیں لمبی ہوتی جاتی ہیں اور وہ ان میں رسی ڈال کر مزید کھینچتا رہتا ہے ۔ لوگ اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور وہ مزید سربلند کرتا ہے ۔ لوگ اس کے مقابلے میں اپنے حقوق اور اپنی عزت سے دست بردار ہوتے اور وہ مزید سرکش ہوتا رہتا ہے ۔

عوام الناس یہ کام کیوں کرتے ہیں' ایک طرف سے وہ دھوکے میں ہوتے رہیں اور دوسری جانب سے وہ ڈرتے ہیں ۔ رہا ان کا خوف تو وہ محض وہم و گمان پر مبنی ہوتا ہے ۔ اس لیے کہ ہر ڈکٹیٹر اور سرکش تو ایک فرد ہوتا ہے' وہ ہزاروں اور لاکھوں عوام کا کیا بگاڑ سکتا ہے ۔ اگر لوگوں کے اندر اپنی انسانیت' اپنی کرامت' عزت نفس' اپنی آزادیوں کا احساس ہو

تو پھر ان ہزاروں اور لاکھوں عوام میں سے ایک شخص اس ڈکٹیٹر کے مقابلے کے لیے کافی ہوتا ہے لیکن یہ ڈکٹیٹر اور سرکش ان کو دھوکہ دیتا ہے' وہ کہتا ہے کہ وہ اختیارات کا سرچشمہ ہے۔ حالانکہ کسی قوم میں سے ایک فرد اٹھ کر کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں تمہارا رب اعلیٰ اور ڈکٹیٹر اور سرکش ہوں۔ اگر قوم بیدار ہو اور اسے نیک و بد کا علم ہو تو اس میں سے کبھی بھی سرکش ڈکٹیٹر پیدا نہیں ہو سکتا' پھر جو امت اپنے حقیقی رب اعلیٰ سے واقف ہو تو اس کے اندر کوئی اس قسم کا فرعونی ڈکٹیٹر سر نہیں اٹھا سکتا۔ نیز اگر کوئی قوم یہ فیصلہ کر لے کہ اس نے صرف رب واحد کی بندگی کرنی ہے اور اس رب کے سوا کوئی نہیں ہے کہ اسے نفع دے سکے یا نقصان۔ تو ایسی قوم میں کوئی مطلق العنان سر نہیں اٹھا سکتا۔

فرعون کو معلوم تھا کہ اس کی قوم غافل اور ذلیل ہے۔ اور اس کی رعیت کے لوگوں کے دل ذوق ایمان سے خالی ہیں۔ اس لیے اسے اس قدر جرات ہوگئی کہ وہ کہے۔

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹ : ۲۴) "میں ہی تمہارا رب اعلیٰ ہوں"۔ اگر اس کی قوم میں ایمان ہوتا' عزت نفس ہوتی۔ وہ ایک آزاد قوم ہوتی اور ذی شعور قوم ہوتی تو اسے یہ بات کہنے کی جرات نہ ہوتی۔ کیونکہ وہ تو جانتا تھا کہ وہ تو دوسروں کی طرح ایک محتاج اور ضعیف بندہ ہے۔ وہ کوئی فوق الفطرت قوت نہیں رکھتا۔ اگر مکھی اور مچھر بھی اس سے کچھ لے بھاگے تو اس کی افواج اور وہ اسے نہیں پکڑ سکتے۔

اس کفر' سرکشی اور تکذیب اور گندی بات کے بعد اب اللہ کی عظیم قوتیں حرکت میں آتی ہیں۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (۷۹ : ۲۵) "آخر کار اللہ نے اسے دنیا اور آخرت کے عذاب میں مبتلا کر دیا"۔ یہاں آخرت کے عذاب کو دنیا کے عذاب پر مقدم کر دیا گیا' اس لیے کہ عذاب اخرت تو بہت ہی سخت اور شدید ہو گا۔ نافرمانوں اور سرکشوں کے لیے حقیقی عذاب تو عذاب آخرت ہو گا اور آخرت میں ایسے لوگ بڑی سختی اور بے رحمی سے پکڑے جائیں گے۔ پھر سورت کا موضوع ہی آخرت ہے۔ اس لیے عذاب آخرت کو مقدم کرنا ضروری ہوا۔ نیز لفظی ترنم اور قافیہ کے اعتبار سے بھی "آخرت" کو پہلے اور "اولیٰ" کو بعد میں ہونا چاہئے تھا' یوں لفظی اور معنوی اعتبار سے الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (۷۹ : ۲۵) ہم آہنگ ہوگئے۔

اس دنیا میں فرعون جس عذاب سے دوچار ہوا' وہ بھی بڑا سخت تھا۔ رہا آخرت کا عذاب تو وہ بہت ہی شدید اور سخت ہو گا۔ فرعون بڑی قوت والا تھا' اور خاندانی عزت اور وقار کا مالک تھا۔ اسے اگر اس قدر شدید عذاب سے دوچار کیا گیا تو دوسرے کم درجے کے مکذبین ڈکٹیٹر اور سرکش بہرحال شدید ترین عذاب سے دوچار ہوں گے اور رہے مشرکین مکہ تو عالمی قوتوں میں تو ان کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰى (۷۹ : ۲۶) "درحقیقت اس میں بڑی عبرت ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے"۔ جو شخص اللہ کی معرفت رکھتا ہے' اللہ سے ڈرتا ہے' وہی اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ فرعون کے واقعہ میں لوگوں کے لیے کیا کیا عبرتیں ہیں۔ رہا وہ شخص جس کے دل میں تقویٰ' خوف اور خشیت ہی نہیں ہے۔ اس کے اور عبرت کے درمیان پردے حائل ہوگئے ہیں۔ اس کے اور نصیحت حاصل کرنے کے درمیان ایک دبیز پردہ حائل

ہو جاتا ہے ۔ آخر کار وہ انجام بد سے دوچار ہی نہیں ہوتا بلکہ انجام بد سے جا کر ٹکراتا ہے اور اللہ اس سے دنیا و آخرت میں انتقام لے لیتا ہے ۔ پس ہر شخص کو اللہ ہی عبرت ' راہ راست اور اچھے انجام کے لیے وسائل فراہم کرتا ہے ۔

ڈکٹیٹروں اور مادی و سیاسی قوت کے بل بوتے پر ظلم اور سرکشی کرنے والوں کے اس مطالعے اور نظارے کے بعد اب ذرا مشرکین مکہ کی طرف ' جن کو اپنی چھوٹی سی قوت پر بڑا گھمنڈ تھا ' ان کے سامنے بعض عظیم کائناتی قوتیں پیش کی جاتی ہیں ' تاکہ وہ ذرا سمجھیں کہ ان ہولناک کائناتی قوتوں کے سامنے ان کی قوت ہیچ ہے ۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾

"کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے اس کو بنایا ' اس کی چھت خوب اونچی اٹھائی پھر اس کا توازن قائم کیا ' اور اس کی رات ڈھانکی اور اس کا دن نکالا ۔ اس کے بعد زمین کو اس نے بچھایا ' اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑ دیئے ۔ سامان زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے" ۔

یہ ایسا استفہام ہے جس کا جواب ایک ہی ہے اور ناقابل انکار اور ناقابل بحث و مباحثہ ہے ۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ (۷۹ : ۲۷) "تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی" ۔ یقیناً آسمانوں کی تخلیق بہت بڑا اور مشکل کام ہے ۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے ۔ نہ بحث کی گنجائش ہے ۔ لہٰذا تمہیں جو اللہ نے مختصر سی قوت دی ہے ' اس پر تمہیں اس قدر نازکیوں ہے حالانکہ آسمان اور کائنات کی دوسری قوتیں تم سے قوی تر ہیں ۔ یہ تو ہے اس سوال کا ایک پہلو ' لیکن اس کی ایک جہت اور بھی ہے ' وہ یہ کہ تم اپنے دوبارہ اٹھائے جانے کو ایک مشکل کام تصور کرتے ہو ' جبکہ آسمانوں کی تخلیق تمہاری تخلیق سے مشکل ہے ' حالانکہ حشر میں تمہاری تخلیق ابتدائی تخلیق نہ ہوگی بلکہ محض اعادہ ہوگا اور جس ذات بابرکات نے آسمانوں اور جہانوں کی تخلیق کی ہے ' اس کے لیے تمہارا اعادہ زیادہ آسان ہے ۔

آسمانوں کی تخلیق بلاریب ایک عظیم کام ہے ۔

بَنٰىهَا (۷۹ : ۲۷) "اس نے اسے بنایا" ۔ ہر عمارت قوت اور باہم سہارا لے کر قیام کی مظہر ہوتی ہے ۔ آسمانوں کا وسیع نظام بھی ایک عمارت کی طرح باہم بندھا ہوا ہے ۔ اس کے ستارے اور سیارے ایک نظام میں بندھے ہوئے ہیں ۔ کوئی چیز بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتی ۔ نہ اپنے مدار سے نکلتی ہے ' نہ گرتی ہے اور ٹکراتی ہے ۔ گویا یہ بالائی کائنات ایک وسیع عمارت ہے ' جس کے تمام اعضاء باہم متماسک ہیں ۔

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا (۷۹ : ۲۸) "اس کی چھت خوب اونچی اٹھائی ۔ پھر اس کا توازن قائم کیا"۔ سمک بلندی اور قدو قامت کو کہتے ہیں ۔ آسمان بلند بھی ہے اور باہم جڑا ہوا بھی ہے اور اس کے اجزاء ایک دوسرے سے پیوست ہیں ۔ اسی کو

فَسَوّٰهَا (۷۹ : ۲۸) سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ آسمانوں کے نظام پر ایک سرسری نظر ڈالنے اور ایک معمولی علم رکھنے والے کو بھی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ آسمانوں کے نظام کے اندر مکمل ہم آہنگی ہے ۔ ان عظیم اجسام کو جو چیز باہم جوڑ کر رکھ رہی ہے اور ان کی حرکات و اثرات کے درمیان جو چیز تنظیم پیدا کرتی ہے ۔ اس کا اگر تفصیلی مطالعہ کیا جائے 'تو ان الفاظ کے معانی بہت گہرے اور وسیع ہو جاتے ہیں اور یہ نظام اس قدر محیرالعقول ہو جاتا ہے جس کے بارے میں انسان پہلے کچھ زیادہ نہ جانتے تھے ۔ انسان ششدر رہ جاتا ہے اور مرعوب اور مبہوت ہو جاتا ہے اور سوائے اس کے کہ اس نظام کے پیچھے کام کرنے والی ایک عظیم قوت مدبرہ کو تسلیم کیا جائے ۔ انسانوں کے لیے اس محیرالعقول عظیم اور وسیع و عریض نظام کی تشریح کے لیے کوئی اور راہ ہی نہیں ہے ۔ بہرحال کسی نہ کسی مذہب اور دین کے مطابق الہ العالمین کو تسلیم کرنا ضروری ہے ۔

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا (۷۹ : ۲۹) "اور اس کی رات ڈھانکی اور اس کا دن نکالا"۔ اس انداز تعبیر میں لفظاً اور معنیً شدت اور ترنم ہے ۔ اور یہ انداز تعبیر اس سورت کی شدت اور قوت کے عین مطابق ہے ۔

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا (۷۹ : ۲۹) کے معنی ہیں رات کو سیاہ اور تاریک بنا دیا ۔

اور اَخْرَجَ ضُحٰهَا (۷۹ : ۲۹) کے معنی ہیں 'دن کو روشن کیا ۔ تاریکی اور روشنی کی لیے یہاں قرآن نے جو الفاظ چنے ہیں وہ سیاق کلام کے لیے بہت موزوں ہیں ۔ روشنی اور تاریکی کا پے درپے آنا اور جانا 'رات کی تاریکی اور چاشت کی روشنی ہر شخص کا دیکھا ہوا منظر ہے ۔ ہر دل اس سے متاثر ہوتا ہے ۔ انسان بعض اوقات 'زیادہ مانوس ہونے کی وجہ سے گردش لیل و نہار سے وہ تاثر نہیں لیتا جو قرآن یہاں بیان کرتا ہے 'لیکن قرآن مجید کا یہ کمال ہے کہ وہ انسانی احساسات کو تیز کرتا ہے اور انسان بھولے بسرے نغمے گانے لگتا ہے اور یہ سب کچھ انسان کو بالکل جدید لگتا ہے ۔ گویا ہر دن ایک نیا دن طلوع ہوتا ہے ۔ کل وہ شعور اور وہ تاثر نہ تھا جو آج قرآن کو پڑھ کر انسان کو حاصل ہوتا ہے ۔ ان حقائق کے حوالے سے قرآن انسانی احساسات کو بیدار کرتا ہے اور جوں جوں کائنات کے ان مناظر اور حقائق کے بارے میں انسانی علم وسیع ہوتا ہے 'انسان کے تاثرات 'اس کی حیرانگی اور اس کی دہشت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (۳۰) اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا (۳۱)

وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا (۷۹ : ۳۲) "اس کے بعد زمین کو اس نے بچھایا 'اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑ دیے"۔

دحو الارض کے معنی ہیں زمین کو تیار کرنا اور اس کے چھلکے کو بچھانا ہے ۔اس طرح کہ انسان اس کے اوپر چل بھی سکیں ۔اس کے اوپر جمع ہونے والی مٹی نباتات اگانے کے قابل ہو۔ اور اس کے اوپر پہاڑوں کا جمانا' یہ سب امور اسی طرح انجام پائے کہ اللہ سطح زمین کو اس اس طرح سکون و قرار عطا کیا اور اس کے اوپر درجہ حرارت اس مقدار میں پیدا کیا کہ یہاں حیوانی اور نباتاتی زندگی ممکن ہوئی۔ اور اللہ نے زمین سے پانی نکالا' چاہے اس سے مراد وہ پانی ہو جو چشموں کی صورت میں نکلتا ہے یا آسمانوں سے برستا ہے اور ندیوں کی صورت میں بہتا ہے ۔ اور اللہ نے اس کے ذریعہ وہ تمام نباتات اگائے جس سے انسانی خوراک اور حیوانوں کی خوراک نکلی ۔ بعض جانور براہ راست اس سے کھاتے ہیں اور بعض بالواسطہ۔

یہ سب انتظام اس وقت ہوا' جب اللہ نے زمین و آسمان کا موجودہ نظام تعمیر کیا۔ رات اور دن کو پیدا کیا۔ زمین و آسمان کے بارے میں جدید نظریات اس آیت کے مفہوم کی مکمل تائید کرتے ہیں کہ زمین پر کئی ملین سال گزرے اور اسی طرح گردش لیل و نہار کا نظام جاری رہا اور بعد میں وہ جاکر انسانی زندگی اور زراعت کے قابل بنی اور اس کا چھلکا سخت ہوا اور سکڑ کر پہاڑ نمودار ہوئے ۔

قرآن کریم اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ یہ سب نظام تمہاری خاطر کیا گیا۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۷۹ : ۳۳) "سامان زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے"۔ اس سے دو باتوں کی طرف اشارہ مطلوب ہے ۔ایک یہ کہ اللہ نے اس کائنات کے نظام کو چلانے کے لیے عظیم الشان تدابیر اختیار کی ہیں اور دوسرا یہ کہ اس نظام کے اندر ہر چیز ایک طے شدہ فارمولے کے مطابق نہایت صحیح اندازے سے بنائی گئی ہے ۔ آسمانوں کو موجودہ شکل دینا' زمین کو اس شکل و صورت میں تیار کرنا' اور موجودہ نظام اتفاقاً پیدا نہیں ہو گیا۔ بلکہ پہلے سے مقدر اور مرتب تھا۔ اور اس کی ایک ایک چیز کو ایک حساب اور ایک اندازے سے پیدا کیا گیا ہے اور اسی مقصد کو سامنے رکھ کر پیدا کیا گیا ہے کہ اس زمین پر حضرت انسان نے آکر بسنا ہے ۔اس کا وجود' اس کی نشوونما' اور اس کی ترقی کے لیے یہاں بے شمار سازگار حالات پیدا کیے گئے ہیں اور ان کو اس نظام کے بنیادی ڈھانچ اور نقشے کے اندر رکھ دیا گیا ہے ۔ پورا نظام شمسی اس طرح بنایا گیا ہے اور اس زمین کے اندر تو یہ امور علی الخصوص ملحوظ ہیں۔

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ اصل حقائق کی طرف ایک مجمل اشارات کرتا ہے' جن میں اصل بات اور حقیقت بھی آجاتی ہے اور ایک عام سے عام آدمی بھی قرآنی مفہوم کو پا لیتا ہے ۔ یہاں قرآن کریم نے جن سہولیات اور سازگار چیزوں کی طرف اشارہ کیا وہ آسمانوں کی تخلیق و تعمیر' رات کا چھانا اور پرسکون ماحول' دن کا ظہور' اور دوڑ دھوپ' زمین کا بچھانا اور سازگار بنانا' پانی کا بہانا اور نباتات کا اگانا اور پہاڑوں کا جمانا اور انسانوں اور حیوانوں کے لیے سامان زیست فراہم کرنا' ان اشارات سے ایک طرف تو اللہ کی تدبیر کی حکمت اور تخلیق کا حکیمانہ نظام نظر آتا ہے اور یہ حقائق وہ مظاہر ہیں جن کو ہر شخص دیکھتا اور سمجھتا ہے ۔ ہر سطح اور ہر معاشرے کا انسان ان کو سمجھتا ہے ۔ اور ان کے سمجھنے کے لیے کسی بڑے درجہ علم کی ضرورت ہی نہیں ہے ۔ بس ایک انسان ہو' جہاں بھی ہو' جس زمانے میں ہو' وہ ان اشارات کو سمجھتا ہے ۔

لیکن اس عمومی سطح کے پس پشت اور گہرائی کے ساتھ اگر غور کیا جائے تو اس سطح کے نیچے عظیم حقائق ہوتے ہیں مثلا

یہ کہ اس کائنات کی تخلیق کے منصوبے میں گہری منصوبہ بندی ہے' اور اس کا نظام محض بخت و اتفاق پر نہیں چل رہا ہے ۔ اس کائنات کی حقیقت اس بات کی نفی کرتی ہے ۔ کیونکہ محض اتفاقاً اس قدر حکیمانہ فارمولا بن جانا ممکن ہی نہیں ہے ۔ جو عجیب و غریب ہے اور جو نہایت حکیمانہ ہے ۔

جس کہکشاں میں ہم رہتے ہیں جسے شمسی کہکشاں کہا جاتا ہے' ہماری زمین اس کہکشاں کا ایک سیارہ ہے ۔ اس کی تنظیم اور اس کا نظام گردش ایک عجیب نظام ہے جو اس جیسی کروڑوں کہکشانوں میں نہیں ہے ۔ پھر یہ زمین تو تمام سیاروں میں سے ایک منفرد انداز کا سیارہ ہے' سورج سے اس کا فاصلہ' اس کے فضائی حالات اور اس کی گردش ایسے ہیں کہ اسے انسانی زندگی کے لئل بناتے ہیں ۔ آج تک انسان نے اس وسیع و عریض کائنات میں کوئی دوسرا سیارہ معلوم نہیں کیا جس میں ایسی ہی زندگی ہو' اور جس کے اندر ہزاروں لاکھوں ایسے عوامل ہیں جو انسانی زندگی کے ممد و معاون ہوں ۔

"اس لیے کہ اسباب حیات ایک ایسے سیارے میں فراہم ہوتے ہیں جس کا حجم مناسب ہو' جو سورج سے ایک مناسب دوری پر ہو ۔ اور اس کے عناصر کی ترکیب ایسی ہو جس کے اندر زندہ حرکت میں آ سکے" ۔

"سازگار حجم کا مناسب ہونا اس لیے ضروری ہے کیونکہ کسی سیارے کے ارد گرد کی فضا کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ اس سیارے کا حجم کتنا ہے اور اس میں جاذبیت کی قوت کس قدر ہے" ۔

"اور معتدل دوری اس لیے ضروری ہے کہ جو سیارے سورج کے زیادہ قریب ہیں ۔ وہ اس قدر گرم ہوتے ہیں کہ ان میں اجسام کے اجزاء اپنی جگہ نہیں ٹھہر سکتے اور جو سیارے سورج سے بہت دور ہوتے ہیں وہ اس قدر سرد اور ٹھوس ہوتے ہیں کہ ان کے اندر کوئی جسم پھل پھول نہیں سکتا" ۔

"پھر کسی سیارے کی ترکیب ایسے عناصر سے ہونا ضروری ہے جس کے اندر زندگی ممکن ہو اور پھل پھول سکے' کیونکہ نباتات کے لیے اور حیوانات کے لیے وہ عناصر ضروری ہیں جو اس زمین میں رکھے گئے ہیں" ۔

"پھر زمین کو سورج سے اس قدر دور رکھا گیا ہے کہ اگر اس کا فاصلہ ذرا کم و بیش ہو جائے تو اس پر زندگی ممکن ہی نہ ہو ۔ اور اس کی تفصیلات ہم اب اچھی طرح جانتے ہیں ۔ آج تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس زمین کے علاوہ اور بھی کوئی سیارہ کسی سورج کے گرد ایسا ہے" ۔ (بیسویں صدی کے مفکرین کے افکار' استاد عقاد' ص ۳۶) ۔

یہ حقائق کہ یہ کائنات ایک خاص نظم' تدبیر اور منصوبے کے مطابق بنائی گئی ہے اور اس کے اندر انسان کی ایک مخصوص حیثیت ہے ۔ انسان کو اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں کہ قیام قیامت ایک حقیقت ہے اور ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ انسان سے حساب و کتاب لیا جائے گا اور اس کے اعمال پر اسے جزاء و سزا دی جائے گی ۔ اگر اس کائنات اور اس میں انسانی زندگی کی تخلیق ایک حکیمانہ انداز کے مطابق ہے تو پھر لازماً انسان اس نتیجے تک پہنچے گا کہ ایک دن اس زندگی کا خاتمہ ہو گا اور انسان اپنے اعمال کی جزاء و سزا سے دوچار ہو گا ۔ یہ بات انتہائی غیر معقول اور غیر منصفانہ ہو گی کہ اس زندگی کا خاتمہ ایسا ہی ہو کہ ظالم' بدکار سزا پانے سے بچ جائیں اور مظلوم دنیا میں مشکلات جھیلنے کے بعد یونہی ختم کر دیئے جائیں ۔ اس قسم کے عقائد و نظریات اس حکمت' اس منصوبہ بندی اور اس تدبیر کے خلاف ہیں جو اس کائنات کی تخلیق اور تعمیر میں عیاں ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ ان حقائق کے بعد اب سورت کے مرکزی مضمون یعنی قیام قیامت کو لیا جاتا ہے یعنی وہ ہنگامہ عظیم جو

برپا ہو گا اور پھر اس جہاں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس سے قبل ذہنوں کو اس عقیدے کے قبول کرنے کے لیے تیار کر لیا گیا تھا۔ ذہن قبولیت کے لیے تیار تھا۔ لہٰذا یہ ذکر نہایت ہی مناسب وقت میں ہوا۔

فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ ﴿٣٥﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ ﴿٣٦﴾ فَأَمَّا مَن طَغَىٰ ﴿٣٧﴾ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ﴿٣٩﴾ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ﴿٤٠﴾ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ﴿٤١﴾

"پھر جب وہ ہنگامہ عظیم برپا ہو گا' جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا' اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی' تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی' دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہو گی۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا' جنت اس کا ٹھکانا ہو گی"۔

دنیا کی یہ زندگی چند روزہ ہے اور اس کے لیے یہاں نہایت گہرائی اور حکمت سے نظام زندگی اور سامان حیات تیار کیا گیا ہے۔ اس کائنات کا نظام اور انسانی زندگی کے نظام کے درمیان گہرا ربط ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ چند روزہ متاع ہے اور ایک دن اسے ختم ہونا ہے۔ جب وہ ہنگامہ عظیم برپا ہو گا تو اس زندگی کا نظام معطل ہو جائے گا۔ یہ چند روزہ زندگی ختم ہو گی۔ یہ عظیم کائنات ختم ہو گی۔ یہ بلند و بالا آسمان' یہ بلند پہاڑ' اور یہ وسیع و عریض زمین' اور اس زمین کے اوپر برپا ہونے والی تمام کشمکش اور یہ سرگرمیاں سب کی سب ختم ہو جائیں گی کیونکہ یہ حادثہ بہت عظیم ہو گا اور بہت ہی عام ہو گا۔ یہ ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

اب انسان کو یاد آئے گا کہ وہ کیا کچھ کرتا رہا ہے' اب اسے اپنی تمام سرگرمیاں یاد آتی جائیں گی۔ زندگی کے واقعات یاد آتے جائیں گے۔ زندگی کی مصروفیات جنہوں نے انسان کو اس عظیم دن سے غافل کر دیا تھا' اب اسے سب کچھ یاد ہو گا۔ لیکن اب اس کی یہ یادداشت اسے حسرت اور مایوسی کے سوا کچھ نہ دے سکے گی۔ اب تو اس کے سامنے ایک دوسرا نقشہ ہو گا۔

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ (۷۹ : ۳۶) "اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی"۔ اب یہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گی۔ ہر دیکھنے والا اسے دیکھ سکے گا۔ لفظ "برزت" میں لفظی تشدید اور معنوی تشدید دونوں ملحوظ ہیں' اس لفظ کے ذریعہ ہر نظر کے سامنے منظر لایا گیا ہے اور پھر لفظ کا ترنم بھی۔

آج ہر کسی کا انجام مختلف ہو گا اور اللہ کا نظام کائنات اور نظام آزمائش اور پہلی زندگی کے مقاصد کھل کر سامنے آ جائیں گے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی (۳۷) وَ اٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا (۳۸) فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی

(۳۹:۷۹) "تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، دوزخ اس کا ٹھکانا ہوگی"۔ طغیان اور سرکشی کا مفہوم وسیع تر ہے، یہ ہر اس شخص پر صادق آتا ہے جو حق اور ہدایت کی راہ سے متجاوز ہوتا ہے۔ اس کے حدود قوت اور جبر اور اقتدار اعلیٰ کے بل بوتے پر ظلم اور تجاوز کرنے والے سرکشوں سے زیادہ وسیع ہیں۔ ہر وہ شخص جو دنیا پرست ہے اور راہ ہدایت سے ادھر ادھر متجاوز ہوتا ہے۔ وہ باغی اور طاغی ہے جس کی بڑی صفت یہ ہے کہ وہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دیتا ہے۔ آخرت کی جوابدہی کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کی فکر ہی انسان کے ضمیر اور اس کے عمل میں توازن پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی آخرت کو بھلا دے یا آخرت پر دنیا کو ترجیح دے تو اس کی قدروں اور پیمانوں کے درمیان خلل پڑ جاتا ہے اور اس کے تمام پیمانے اور قدریں بدل جاتی ہیں۔ اس کا شعور اور طرز زندگی بدل جاتا ہے۔ چنانچہ وہ باغی، طاغی اور حدود سے متجاوز ہو کر ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا انجام یہ ہوتا ہے: "دوزخ اس کا ٹھکانا ہوتی ہے"۔ وہ دوزخ جو کھلی تھی اور حاضر تھی اور عظیم دن میں اس کو نمایاں کر کے رکھ دیا گیا تھا۔

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَ نَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی (۴۰) فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی (۴۱:۷۹) "اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنت اس کا ٹھکانا ہوگی"۔ جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا ہے، وہ کبھی بھی کسی معصیت کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اگر کبھی بشری کمزوری سے اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو یہ خوف اسے ندامت اور استغفار پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ توبہ کرتا ہے اور اس طرح وہ اطاعت کے دائرے میں دوبارہ داخل ہو جاتا ہے۔

نفس کو خواہشات سے باز رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان دائرۂ اطاعت سے باہر نہ نکلے، کیونکہ خواہشات نفسانیہ ہی انسانوں کو نافرمانی، طغیانی اور سرکشی پر آمادہ کرتی ہیں۔ آزمائش اور شر کا راستہ ہی خواہشات نفسانیہ ہیں۔ شیطان انسان پر اسی راستے سے حملہ آور ہوتا ہے۔ جہالت کا علاج بہت آسان ہے۔ لیکن جانتے بوجھتے خواہشات نفسانیہ کی پیروی کرنا بہت بڑی مصیبت اور آزمائش ہوتی ہے۔ اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

خواہشات نفسانیہ کے دباؤ کا مقابلہ صرف خشیت الٰہیہ سے کیا جا سکتا ہے۔ اللہ کے ڈر کے سوا کوئی ہتھیار اس دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایک ہی آیت میں ان کو جمع کیا ہے۔ اور بات کون کر رہا ہے؟ وہ ذات جس نے نفس انسانی کو پیدا کیا ہے۔ بیماری بھی وہی بتاتا ہے اور علاج بھی۔ انسانی نفس کے نشیب و فراز سے اس کا خالق ہی باخبر ہے۔ اس ذات کو معلوم ہے کہ اس مخلوق میں کس جگہ کمزوریاں ہیں اور ان کا علاج کیا ہے؟ ان خفیہ کمزوریوں کا تعاقب کس طرح کیا جا سکتا ہے اور اس کے کیا طریقے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس بات کا مکلف نہیں بنایا کہ اس کے نفس کے اندر خواہش ہی نہ ہو، بلکہ اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ نفس کو روکے، اس کو لگام دے، اور خواہشات کو ذرا دبا کر رکھے۔ اور اس معاملے میں خدا خوفی سے استعانت حاصل کرے کہ ایک دن اس نے رب جلیل کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اور اگر وہ نفس کی خواہشات پر کنٹرول کرے گا تو

اس کا عوضانہ اسے جنت ملے گی اور یہ اس کا ٹھکانا ہوگی۔

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (۷۹ : ۴۱) "جنت اس کا ٹھکانا ہوگی"۔ کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ نفس کے ساتھ جہاد' جہاد اکبر ہے اور اس کی قیمت یہ ہے کہ یہ نفس سیدھا ہو کر بلند مقام و مرتبہ تک پہنچ جائے۔

انسان' انسان تب ہو گا کہ وہ اس نہی پر عمل کرے۔ نفس کے خلاف جہاد کرے اور اس طرح گری ہوئی سطح سے اپنے آپ کو بلند کرے۔ انسان اس طرح انسان نہیں بن جاتا کہ وہ اپنے نفس کو خواہشات نفسانیہ کے حوالے کر دے اور جہاں تک ممکن ہو سکے خواہشات نفسانیہ کی پیروی کرے' اور دلیل یہ دے کہ اللہ نے اس کی فطرت میں یہ خواہشات رکھ دی ہیں' کیونکہ جس ذات نے نفس انسانی کے اندر خواہشات نفسانیہ کا وبال رکھا ہے' اسی نے انسان کو یہ قوت بھی دی ہے کہ وہ راہوار نفس کو لگام دے۔ اور حکم بھی دیا کہ نفس کی تمام خواہشات کی پیروی نہ کرو' اس کے دائرۂ جاذبیت اور دائرہ کشش سے اپنے آپ کو نکالو۔ اور اس کا صلہ بھی دینے کا اعلان کیا کہ تمہارا مستقل ٹھکانا جنت میں ہو گا' اگر تم نفس کے خلاف جہاد کر کے فاتح ہوگئے اور بلندی اختیار کی تو جنت میں جاؤ گے۔

ایک تو ہے انسانی آزادی جس کے ذریعہ اللہ نے اس انسان کو معزز بنایا ہے' یہ ہے آزادی اس بات کی کہ انسان اپنے نفس پر فتح حاصل کرے۔ اور خواہشات نفس کی غلامی سے آزادی حاصل کرے۔ اور نفس کے ساتھ ایسا متوازن رویہ رکھے جو انسانی آزادی' اختیار اور تقدیر کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ لیکن آج کل جس چیز کو انسانی آزادی کہا جاتا ہے وہ دراصل حیوانی آزادی ہے۔ اس میں ایک انسان اپنے نفس کی خواہشات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے' غلام بن جاتا ہے۔ اور اس کی زمام اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ اس کے نفس کی خواہشات کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ایسی آزادیوں کی بات وہی لوگ کرتے ہیں جو شکست خوردہ ہوتے ہیں' غلام ہوتے ہیں' ہاں انہوں نے غلامی کے لباس پر آزادی کا عنوان درج کر لیا ہے اور جنوں کا نام خرد رکھ دیا ہے۔

پہلی آزادی سے متصف انسان ہی دراصل بلند' ترقی یافتہ اور آزاد و بلند زندگی کا اہل ہوتا ہے' جس کا مقام جنت الماویٰ میں ہے۔ دوسری آزادی سے متصف شخص دراصل گرا ہوا ہے' خواہشات نفسانیہ کا غلام ہے اور ان کے سامنے گھٹنے ٹیکے ہوئے ہے۔ اور اس کا اصل مقام جہنم کی تہہ ہے جہاں انسانیت ختم ہو جاتی ہے اور یہ شخص درختوں اور پتھروں کی طرح جہنم کا ایندھن ہو گا۔ یہ پتھر ہے' انسان نہیں ہے۔

اس دین میں گراوٹ اور پسماندگی اور بلند ہونے اور ترقی یافتہ ہونے کا یہ معیار ہے جہاں چیزوں اور افعال کو حقیقی وزن دیا جاتا ہے۔

اب اس سورت میں عقل و خرد کی تاروں پر ایک شدید چوٹ لگائی جاتی ہے جس سے ایک طویل نغمہ بلند ہوتا ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۝ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ۝ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ۝ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ۝ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا

۲
۲۰ع لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا ۝
۴ ۔ ”یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ”آخر وہ گھڑی کب آکر ٹھہرے گی؟“ تمہارا کیا کام کر کہ اس کا وقت بتاؤ۔ اس کا علم تو اللہ پر ختم ہے۔ تم صرف خبردار کرنے والے ہو۔ ہر اس شخص کو جو اس کا خوف کرے۔ جس روز یہ لوگ اسے دیکھ لیں گے تو انہیں یوں محسوس ہو گا کہ (دنیا میں یا حالت موت میں) یہ بس ایک دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک ٹھہرے ہیں“۔

ہٹ دھرمی میں ڈوبے ہوئے مشرکین جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی روز قیامت کی یہ ہولناکیاں سنتے اور قرآن میں قیامت کے برپا ہونے کے عظیم واقعات اور افراتفری اور ہنگامہ عظیم کی بات سنتے کہ وہاں حساب و کتاب ہو گا اور جزاء و سزا ہو گی تو وہ فوراً سوال کر دیتے۔

اَيَّانَ مُرْسٰهَا (۷۹ : ۴۲) ”آخر وہ گھڑی کب آکر ٹھہرے گی“۔ یہ تو تھا ان کا سوال۔

جواب یہ ہے۔

فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا (۷۹ : ۴۳) ”تمہارا کیا کام کہ تم اس کا وقت بتاؤ“۔ یہ ایسا جواب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑی عظیم بات ہو گی اور ایک عظیم حادثہ ہو گا اور ان لوگوں کا اس طرح سوال کرنا حماقت اور گھٹیا پن ہے۔ یہ بچگانہ سوال ہے اور اپنے حدود اور مقام سے آگے کی بات ہے۔ تو ان کو جواب دینے کے بجائے رسول اللہ کو جواب دیا جاتا ہے کہ ”تمہارا کیا کام کہ تم اس کا وقت بتاؤ“۔ یہ تو اس سے بڑی چیز ہے کہ تم اس کے بارے میں پوچھو یا تم سے پوچھا جائے۔ اس کا وقت بتانا یا اس کا برپا کرنا میرے رب کا کام ہے' میرا کام نہیں ہے۔

اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا (۷۹ : ۴۴) ”اس کا علم تو اللہ پر ختم ہے“۔ اس کا معاملہ اللہ پر آکر رک جاتا ہے اسی کو اس کے برپا ہونے کے وقت کا علم ہے۔ اور وہی اس کا مجاز ہے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا (۷۹ : ۴۵) ”تم تو خبردار کرنے والے ہو' ہر اس شخص کو جو اس کا خوف کرے“۔ تمہارا فریضہ بس یہی ہے۔ تمہارے حدود بھی یہاں تک ہیں کہ جو شخص قیامت سے ڈرتا ہے اس کو ڈرائیں۔ یعنی ایسے لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن ہم نے خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ یہ دن ضرور آتا ہے اور اس کے وقت کا علم صرف اللہ کو ہے۔

ہاں وقت بتانے کے بجائے اس کی ہولناکیاں اور ہنگامہ خیزیاں بتا دی جاتی ہیں۔ اور جب وہ برپا ہو گی تو اس وقت انسان کا شعور کیا ہو گا اور احساسات کیسے ہوں گے۔ اس کی عظمت کا اندازہ اسی سے لگا لو کہ اس وقت تم اس پوری دنیاوی زندگی کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار کرو گے۔

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا (۷۹ : ۴۶) ”جس روز یہ لوگ اس کو

دیکھ لیں گے تو انہیں محسوس ہو گا کہ اس دنیا میں بس یہ دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر تک ٹھہرے ہیں"۔

اس کے بارے میں تمہارے تاثرات یوں ہوں گے کہ اس کی عظمت کو دیکھ کر تم پوری دنیا کو اور اپنی پوری عمروں کو اور اپنے سازوسامان کو یوں سمجھو گے کہ شاید صبح و شام کا ایک مختصر وقت تھا جو ہم نے دنیا میں بسر کیا۔

یہ دنیا جس کے لیے لوگ باہم لڑتے اور جھگڑتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ انہوں نے ہمہ گیر کشمکش برپا کی ہے۔ اس دنیا کے لوگ مرتے ہیں اور آخرت کی لازوال اور بے پناہ انعامات کو اس کی خاطر ترک کرتے ہیں اور اس مختصر مدت کے لیے عظیم جرائم اور مظالم کا ارتکاب کرتے ہیں' نافرمانی کرتے ہیں' سرکشیاں کرتے ہیں' اور رات اور دن اس کی طلب میں غرق ہیں۔ یہ دنیا ان دنیا داروں کی نظروں میں اس قدر سمٹ اور سکڑ جائے گی کہ وہ کہیں گے کہ ہم تو صرف اتنا عرصہ رہے ہیں جس طرح صبح کے وقت کا ایک مختصر حصہ یا شام کا ایک حصہ۔

یہ ہے دنیا' مختصر' جلدی سے فنا ہونے والی' حقیر و ناپائیدار' کم قیمت اور گھٹیا۔ کیا لوگ اس دنیا کے ایک مختصر وقت کے لیے جس کے بارے میں خود ان کا تاثر یہ ہو گا کہ یہ ایک پورے دن کے برابر بھی نہیں ہے۔ بلکہ صبح و شام کے ایک پہر کے برابر ہے۔ ابدی زندگی اور اس کی نعمتوں کو ترک کر رہے ہیں حالانکہ اس دنیا کی خواہشات بھی زائل ہونے والی خواہشات ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک عظیم حماقت میں مبتلا ہے۔ کوئی ذی عقل اور چشم بینا رکھنے والا انسان تو یہ فعل نہیں کر سکتا۔

--- ooo ---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ------ ۳۰

سورۃ عبس ـ ۸۰

۱--- تا--- ۴۲

سورۃ عبس ایک نظر میں

اس سورت کے پیراگراف قوی اور واضح ہیں اور اس میں بعض اہم حقائق بیان ہوئے ہیں ' جن کے گہرے اثرات ہیں ـ اس کی فضا ' اس کے مناظر اور اشارات نہایت گہرے ہیں ' ایک طرف عقل و خرد کے تاروں کو چھیڑ کر شعور میں ارتعاش پیدا کیا گیا ہے اور دوسری جانب کانوں میں نہایت ہی میٹھا نغمہ گونجتا ہے ـ

پہلے پیرے میں سیرت النبوی کے ایک مخصوص واقعہ پر تبصرہ کیا گیا ہے ـ واقعہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے بعض اکابر کے ساتھ محو گفتگو تھے ' ان کے سامنے اسلام کی تشریح فرمارہے تھے کہ ایک غریب اور نابینا شخص آگئے جن کا نام عبداللہ ابن ام مکتوم تھا ـ ظاہر ہے کہ ان کو نابینا ہونے کی وجہ سے معلوم نہ تھا کہ آپ کی مجلس میں کون بیٹھا ہے اور آپ کس اہم کام میں مصروف ہیں ـ انہوں نے آتے ہی مطالبہ کر دیا کہ اللہ نے آپ کو جو کچھ سکھایا ہے ' اس سے کچھ ان کو تعلیم دے دیں ـ ان کی اس مداخلت کو حضورؐ نے ناپسند فرمایا ـ آپؐ کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کے آثار نمودار ہو گئے اور آپؐ نے چہرہ پھیر لیا ـ چنانچہ اس سورت کے آغاز میں وحی الٰہی کے ذریعہ آپؐ کو سخت عتاب آیا ـ اس عتاب کے ذریعہ یہ قرار دیا گیا کہ اسلامی تحریک میں فیصلہ کن قدریں کیا ہیں اور اس دعوت کی حقیقت کیا ہے اور اس دعوت کا مزاج اور اخلاقیات کیا ہیں؟

عَبَسَ وَ تَوَلّٰی (۱) اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی (۲) وَ مَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی (۳) اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی (٤) اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی (٥) فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی (٦) وَ مَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی (۷) وَ اَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی (۸) وَ ھُوَ یَخْشٰی (۹) فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَھّٰی (۱۰) کَلَّا اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ (۱۱) فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ (۱۲) فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ (۱۳) مَّرْفُوْعَۃٍ مُّطَھَّرَۃٍ (۱٤) بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ (۱٥) کِرَامٍ بَرَرَۃٍ (۱٦) (۸۰ : ۱ تا ۱٦)

"ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آگیا ـ تمہیں کیا خبر ' شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو ' جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو ' حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے ' اس سے تم بے رخی برتتے ہو ـ ہرگز نہیں ' یہ تو ایک نصیحت ہے ' جس کا جی چاہے اسے قبول کرے ـ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو

مکرم ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں 'معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں"۔

دوسرے پیراگراف میں بتایا گیا ہے کہ انسان ہمیشہ رب کا انکار کرتا ہے اور کھلے کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس پیراگراف میں اس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ وہ ذرا اپنے وجود اور مراحل حیات پر غور کرے کہ وہ کس طرح پیدا ہوا کس سے پیدا ہوا اور رب تعالیٰ نے اس کی زندگی کے لیے کیا کیا سہولیات فراہم کیں؟ اور کس طرح اس کی موت ہوتی ہے اور پھر کس طرح اسے دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ لیکن ان عبرت آموز حقیقتوں کے باوجود انسان احکام الٰہیہ میں تقصیرات کرتا ہے۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ (۱۷) مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (۱۸) مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ (۱۹) ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ (۲۰) ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ (۲۱) ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (۲۲) كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ (۲۳) (۸۰:۱۷ تا ۲۳) "قتل ہو انسان' کیسا ناشکرا ہے یہ۔ کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے؟ نطفہ کی ایک بوند سے۔ اللہ نے اسے پیدا کیا' پھر اس کی تقدیر مقرر کی' پھر اس کے لیے راہ آسان کی' پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا۔ پھر جب چاہے وہ اسے دوبارہ اٹھا کھڑا کرے۔ ہرگز نہیں' اس نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا"۔

تیسرے پیرے میں انسان کو اس اہم چیز کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جو اس دنیا میں انسان کے لیے بہت اہم ہے یعنی انسان اور اس کے مویشیوں اور دوسرے حیوانات کی خوراک' پھر اس خوراک کی فراہمی کے لیے اللہ نے جو تدابیر اور انتظامات فرمائے ہیں اور ان انتظامات کے اندر ایسے ہی متعین اندازے اور قدریں رکھی ہیں جس طرح اس کی تخلیق کے اندر متعین قدریں تھیں۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ (۲٤) اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا (۲٥) ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا (۲٦) فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا (۲۷) وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا (۲۸) وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا (۲۹) وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا (۳۰) وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا (۳۱) مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۳۲) (۸۰:۲٤ تا ۳۲) "پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے۔ ہم نے خوب پانی لنڈھایا' پھر زمین کو عجیب طرح پھاڑا' پھر اس کے اندر اگائے غلے اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست کے طور پر"۔

آخری پیرے میں شور قیامت کا ذکر ہے۔ یہ ایک ہولناک شور وشغب ہو گا۔ الصاخہ کے لفظ اور معنی دونوں خوفناک ہیں' اس قدر کہ انسان صرف اس شور وشغب کی طرف متوجہ ہو گا اور تمام دوسرے امور اس کی نظروں سے

اوجھل ہوں گے' ذہن و شعور کے علاوہ انسان کا چہرہ بھی متاثر ہو گا۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ (۳۳) يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ (۳٤) وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ (۳۵) وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ (۳٦) لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (۳۷) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ (۳۸) ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (۳۸) وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ (٤٠) تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (٤۱) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (٤۲) (۸۰:۳۳ تا ٤۲)

"آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز بلند ہوگی --- اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہو گا۔ کچھ چہرے اس روز دمک رہے ہوں گے' ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے۔ اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اڑ رہی ہوگی اور کلونس چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے"۔

اس سورت کی آیات اور پیروں کو اس طرح جھلکیوں کے انداز میں پیش کرنا بے حد اثر آفریں ہے۔ انسانی احساس پر اس کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ صرف پڑھتے ہی یہ جھلکیاں دل کا وہ حال کر دیتی ہیں کہ اس کی کایاپلٹ جاتی ہے۔ اب ہم ان پیروں کی تفسیر تفصیلات سے لیں گے اور بعض ایسے نکات بھی بیان کریں گے جو سرسری نظر میں معلوم نہیں ہوتے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۸۰ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۴۲

سُورَۃُ عَبَسَ (۸۰) مَكِّيَّةٌ (۲۴) آیاتہا ۴۲ رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤى ﴿۱﴾ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ﴿۲﴾ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى ﴿۳﴾ اَوْ يَذَّكَّرُ
فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ﴿۶﴾ وَمَا عَلَيْكَ
اَلَّا يَزَّكّٰى ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ﴿۸﴾ وَهُوَ يَخْشٰى ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ
تَلَهّٰى ﴿۱۰﴾ كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾
مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾

”ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آگیا۔ تمہیں کیا خبر' شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو' جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو' حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے' اس سے تم بے رخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے' جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں' معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں“۔

یہ ہدایات جو اس متعین واقعہ کے حوالے سے دی گئی ہیں بہت ہی اہم ہدایات ہیں' بادی النظر میں انسان ان کو پڑھ کر جو کچھ سمجھتا ہے' اس سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ یہ ایک معجزہ ہے' یہ ایک حقیقت ہے جسے اس کرۂ ارض پر ایک زندہ اور عملی حقیقت بنایا گیا ہے۔ یہ ایک عظیم معجزہ ہے۔ انسانی زندگی کو اس معجزے نے یکسر بدل دیا۔ اور یہ اسلام کا پہلا اور نمایاں معجزہ تھا۔ یہ ہدایات اگرچہ بظاہر ایک معمولی انفرادی اور جزوی واقعہ کے حوالے سے آئی ہیں لیکن اس سے ان کی

اہمیت کم نہیں ہوتی 'کیونکہ یہ قرآن کریم کا ایک ربانی انداز ہے کہ وہ ایک لامحدود اور نہایت ہی گہری اور تمام حقیقت ایک محدود اور ظاہری واقعہ کے ضمن میں بیان کر دیتا ہے۔

اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو جو حقیقت یہاں ان ہدایات میں ذہن نشین کرائی جارہی ہے اور اس کے نتیجے میں اسلامی معاشرے کے اندر جو عملی نتائج پیدا ہو رہے ہیں وہ تو عین اسلام ہے۔یہی اسلام ہے جو ہر آسمانی رسالت نے پیدا کیا' اور اس کا پودا زمین کے اندر لگایا۔

یہ گہری حقیقت جو ان ہدایات کے ضمن میں بیان کی گئی ہے۔محض یہ نہیں ہے کہ معاشرے کے افراد کے ساتھ برتاؤ کس طرح ہو' غرباء کے ساتھ کیا ہو اور امراء کے ساتھ کس طرح ہو' جیسا کہ بظاہر اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔یہ حقیقت اس سے ذرا گہری ہے 'بہت بڑی ہے۔وہ یہ ہے کہ معاملات کے وزن اور قدر کا اسلامی پیمانہ کیا ہے۔مسلمانوں نے اپنی قدریں اور پیمانے کہاں سے لینے ہیں۔

ان ہدایات کے ذریعہ جس حقیقت کو استقلال بخشا گیا ہے کہ لوگوں کو اپنی اقدار صرف آسمانی حوالوں سے اخذ کرنی ہیں۔ان کے پیمانے آسمان سے متعین ہو کر آئیں ' زمین اور اہل زمین کے ہاں کیا کچھ رائج ہے۔یہ اسلامی نظروں میں کچھ نہیں ہے' اہل دنیا کی اقدار کیا ہیں۔یہ اسلامی نگاہ میں غیر متعلق بات ہے۔

اب معلوم ہو گا کہ یہ تو ایک عظیم معاملہ ہے اور اس کرۂ ارض پر اس معیار کو قائم کرنا مشکل کام ہے۔زمین کے اوپر زمین کے لوگ وہ قدریں اور پیمانے آسمان سے اخذ کریں جن کے اوپر زمین اور اہل زمین کی کوئی چھاپ نہ ہو' اور زمین کے رواج اور حوالوں سے وہ خالی ہوں یہ فی الحقیقت ایک عظیم امر ہے۔

ان ہدایات کی عظمت اور ان کی عملی مشکلات کا اندازہ تب ہوتا ہے جب ہم انسان کی پیچیدہ عملی زندگی کا گہرا مطالعہ کریں اور یہ اندازہ کریں کہ انسانی نفس ' انسانی شعور پر ان کا دباؤ کیا ہوتا ہے۔انسان کے لیے واقعی حالات' زندگی کے دباؤ اور پریشر' لوگوں کے خاندانی اور معاشی روابط کے بندھنوں سے نکلنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔انسان کی موروثی قدریں' تاریخی روایات اور تمام دوسری قدریں جو اسے زمین کے ساتھ مضبوطی سے باندھ رہی ہوتی ہیں اور جن کا دباؤ نفس انسانی پر بہت سخت ہوتا ہے۔

اور یہ معاملہ اس وقت بھی عظیم اور مشکل نظر آتا ہے' جب ایک انسان دیکھتا ہے کہ اس مسئلے پر سرور کونین کو بھی اللہ کی طرف سے ہدایات کی ضرورت پیش آئی بلکہ یہ ہدایات سخت عتاب کی شکل میں دی گئیں اور آپ کے طرز عمل پر بارگاہ رب العزت کی طرف سے تعجب کا اظہار کیا گیا۔

کسی معاملے کی عظمت اور اس کے مشکل الحصول ہونے کے لیے صرف یہ کہنا ہی کافی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت پیش آئی اور آپ کو ہدایت دی گئی اور تنبیہہ کی گئی کہ آپ کو یہ اعلیٰ معیار قائم کرنا ہے۔یہ اس لیے کہ آپ کی عظمت ' آپ کی بلندی اور رفعت اس بات کی دلیل ہے کہ اگر آپ کو بھی اس معاملے کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے تو یہ معاملہ فی الواقع بہت عظیم اور یہ معیار مشکل الحصول ہے۔یہ ہے اس معاملے کی اہمیت اور حقیقت ' جسے اللہ تعالیٰ زمین کے اوپر ایک واقعہ اور حقیقت نفس الامری کے طور پر' اس انفرادی واقعہ کی صورت میں ' ایک مثال 'معیار اور ماڈل کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا تاکہ لوگ اس میزان اور معیار کے مطابق اپنا طرز عمل درست کریں۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ' نمونہ اور عملی زندگی سے اپنے لیے میزان اور معیار اخذ کریں ۔ یوں یہ واقعہ اور یہ ہدف ایک عظیم ہدف بن جاتا ہے ۔ قرآن وسنت دراصل وہ پیمانہ ہے جسے اللہ نے رسولوں کو عطا کیا' ان پر نازل کیا تاکہ لوگ ان کے مطابق اپنے اعمال اور طرز عمل کو درست کریں' اس سلسلے میں یہ میزان کیا ہے؟ یہ ہے ۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ "تم میں سے معزز اللہ کے نزدیک' وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے"۔ بس یہی وہ وزن ہے جس کے مطابق کسی کا پلڑا بھاری ہوگا اور کسی کا ہلکا ہوگا۔ اور یہ خالص آسمانی قدر و قیمت ہے ۔ آسمانی پیمانہ ہے اور اس کا زمین کے حالات و روایات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے ۔

لیکن لوگ تو اس زمین پر رہتے ہیں اور یہاں ان کے درمیان قسم قسم کے روابط ہیں ۔ ہر رابطے کا ایک وزن' ایک دباؤ اور ایک کشش ہے ۔ ان کی اقدار مختلف ہوتی ہیں ۔ نسب' قوت' مال اور ان تینوں کی بنیاد پر قائم ہونے والے روابط و مفادات' اقتصادی اور غیر اقتصادی روابط جن میں بعض لوگوں کے حالات دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں ۔ نسب' مال اور قوت کے لحاظ سے اس زمین پر بعض لوگوں کا وزن زیادہ اور بعض کا کم ہوتا ہے ۔

جب اسلام آتا ہے' تو اس کا اعلان یہ ہوتا ہے ۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ "تم میں سے معزز اللہ کے نزدیک' وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے"۔ تو وہ ان تمام روابط' اقدار اور تعلقات سے صرف نظر کر لیتا ہے ۔ حالانکہ ان چیزوں کا ان کی عقلیت اور شعور پر دباؤ ہوتا ہے ۔ ان میں جاذبیت ہوتی ہے ۔ انسانوں کے فہم و شعور میں اس کی گہری جڑیں ہوتی ہیں ۔ اسلام ان تمام چیزوں کو بدل کر انسانوں کو آسمانی قدریں دیتا ہے اور یہ آسمانی قدریں اور پیمانے صرف ایک معیار کو تسلیم کرتے ہیں کہ جو متقی ہے وہ مکرم ہے اور بس ۔

ایک واقعہ' جزئی اور متعین واقعہ پیش آتا ہے اور اس کے ضمن میں یہ اصول اور یہ بنیادی قدر متعین ہو جاتی ہے کہ یہ آسمان سے نازل شدہ پیمانہ اور یہ قدر و قیمت آسمانوں سے مقرر ہوئی ہے ۔ امت مسلمہ کا فریضہ یہ ہے کہ لوگ ہر اس چیز کو ترک کر دیں جو لوگوں کے ہاں عرف اور متعارف ہو' جو زمینی تصورات' زمینی اقدار اور عرف پر مبنی ہو' اور صرف ان قدروں اور پیمانوں کو اپنائیں جو آسمان سے نازل ہوں ۔

ایک فقیر اور اندھا آتا ہے ۔ نام عبداللہ ابن ام مکتوم ہے ۔ یہ رسول اللہؐ کے ہاں آتا ہے تو آپؐ قریش کے سرداروں سے محو گفتگو ہیں ۔ ان کو دعوت دین ہی دی جارہی ہے ۔ عتبہ' شیبہ' یہ دونوں سردار ربیعہ کے مشہور بیٹے ہیں ۔ ابو جہل (عمر ابن ہشام) امیہ ابن خلف' ولید ابن مغیرہ اور عباس ابن عبدالمطلب بھی ان کے ساتھ ہیں ۔ حضورؐ کو یہ امید ہے کہ ان لوگوں کا اسلام اس وقت تحریک کی مشکلات میں کمی کر دے گا ۔ کارکنوں پر مظالم ہو رہے تھے اور یہ چند افراد اپنے مالی' جانی اور سیاسی حیثیت کے تمام وسائل کو اسلام کی راہ روکنے کے کام میں جھونک رہے تھے ۔ اور لوگوں کو اسلام کی راہ سے روک رہے تھے اور وہ اسلام کے خلاف ہر سازش کر رہے تھے کہ اسے مکہ کے اندر ہی منجمد کر کے رکھ دیں جبکہ دوسری اقوام مکہ سے باہر غیر جانبدار کھڑی تھیں اور باہر کی اقوام اس دعوت کو اس لیے قبول نہیں کر رہی تھی کہ خود اہل مکہ اس کی راہ روکے کھڑے تھے ۔ سخت مخالفت کر رہے تھے' اور اس وقت کے قبائلی نظام میں اگر کوئی قبیلہ بھی کسی

سردار کی بات کو مان کر نہیں دیتا تو اس کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی ۔

یہ فقیر اندھا شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان اکابر قریش کے ساتھ مصروف ہیں ۔ اپنے کسی ذاتی معاملے میں نہیں 'کسی ذاتی مفاد میں نہیں بلکہ دعوت اسلامی کے کام اور مفاد میں مصروف گفتگو ہیں ۔ اگر یہ لوگ مسلمان ہو جاتے ہیں تو مکہ میں دعوت اسلامی کے راستے سے تمام رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں ۔ اور اس کی راہ سے تمام نوکدار کانٹے چنے جاتے ہیں اور اسلام مکہ کے اردگرد کے علاقوں میں بھی پھیل جاتا ہے ۔ کیونکہ ان اکابر کے اسلام لانے کے بعد اسلام تیزی سے پھیل جاتا۔

یہ صاحب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس حال میں آتے ہیں اور کہتے ہیں حضورؐ مجھے اس علم میں سے کچھ پڑھائیے جو اللہ نے آپؐ کو دیا ہے ۔ وہ بار بار اس بات کی تکرار کرتے ہیں اور اور جانتے بھی ہیں کہ حضورؐ مصروف ہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ان فعل اور ان کی اس بات کو پسند نہیں کرتے اور آپؐ کے چہرے پر کراہت کے آثار نمودار ہوتے ہیں اور یہ شخص ان آثار کو نہیں دیکھ پا رہے ہیں ۔ آپؐ ترش روئی اختیار کرتے ہیں اور منہ پھیر لیتے ہیں کیونکہ یہ شخص آپؐ کو ایک نہایت اہم معاملے سے روک رہے ہیں ۔ یہ معاملہ اس لیے اہم ہے کہ اگر یہ کام ہو جاتا ہے تو دعوت اسلامی کو بہت فائدہ ہو جاتا ہے ۔ اور یہ کام آپؐ دین اسلام کے فائدے اور مدد کے لیے کر رہے ہیں' خالص دینی فائدے کے لیے ۔ اسلام کی مصلحت کی خاطر اور اسلام کے پھیلانے کی چاہت کے جذبے سے ۔

لیکن آسمانوں سے مداخلت ہوتی ہے ۔ اس لیے مداخلت ہوتی ہے کہ اس موضوع پر فیصلہ کن بات کر دی جائے تاکہ دعوت اسلامی کے طریق کار میں کچھ نشانات راہ رکھ دیئے جائیں اور وہ ترازو قائم کر دیا جائے جس پر اسلامی نقطہ نظر سے اقدار کو تولا جائے گا۔ اور اس کے مقابلے میں تمام حالات اور تمام مقاصد ترک کر دیئے جائیں گے یہاں تک کہ خود اللہ کے دین کی مصلحت کو بھی نظرانداز کر دیا جائے گا۔ اگرچہ انسان اس معیار کے خلاف کسی چیز کو دعوت اسلامی کے لیے مفید سمجھتے ہوں ۔ بلکہ اگرچہ سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسی چیز کو دعوت اسلامی کے لیے مفید سمجھتے ہوں۔

چنانچہ عالم بالا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عتاب آتا ہے اور نبی کریمؐ تو خلق عظیم کے مالک ہیں اور محبوب رب العالمین ہیں لیکن یہ عتاب نہایت ہی شدید اسلوب میں آتا ہے ۔ پورے قرآن میں اس قسم کے سخت عتاب کی یہ واحد مثال ہے جس میں لفظ کلا استعمال ہوا ہے جو سختی سے تردید کے لیے آتا ہے اور جھڑکی کے موقعہ پر استعمال ہوتا ہے اور یہ اس لیے کہ یہ میزان وہ ہے جس کے اوپر پورا دین قائم ہے ۔

جس اسلوب اور انداز میں یہ عتاب فرمایا گیا ہے وہ ایک منفرد انداز ہے ۔ انسانی اسالیب اس کی نقل یا ترجمانی نہیں کر سکتے ۔ کیونکہ انسانی تحریر کی زبان کی کچھ حدود ہیں اور کچھ طریقے ہیں ۔ انسانی اسلوب تحریر میں ایسے گرم اور سخت اشارات نہیں سموئے جا سکتے جو زندہ و تابندہ ہوں ۔ یہ قرآن کریم کا اعجازی انداز گفتگو ہے جو اس قسم کے اشارے چند مختصر الفاظ میں کر دے اور عتاب کی ایک جھلک سی دکھا دے ۔ ایسے انداز میں کہ گویا وہ نہایت ہی تیز تاثرات ہیں' زندہ صورت میں ہیں' مخصوص اثر اور انداز رکھتے ہیں ۔

عَبَسَ وَ تَوَلّٰی (۱) اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی (۸۰ : ۲) ” ترش رو ہوا اور بے رخی برتی' اس بات پر

کہ وہ اندھا اس کے پاس آگیا"۔ یہ گفتگو اس انداز کی ہے کہ گویا ایک غیر موجود اور غائب شخص کے بارے میں بات ہو رہی ہے اور وہ مخاطب نہیں ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے' بات اللہ کے نزدیک بڑی ناپسندیدہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے مناسب نہ سمجھا کہ اس کا تذکرہ اپنے نبی اور محبوب کو براہ راست خطاب کر کے کرے۔ یہ اس لیے کہ آپؐ اللہ کو بہت محبوب ہیں اور اللہ آپؐ کا اکرام فرماتا ہے اور براہ راست خطاب نہیں فرمارہا کہ تم نے ایسا کیا۔ کیونکہ بات بڑی ناپسندیدہ ہے۔

اس کے بعد بات کا انداز بدلتا ہے۔ اصل بات کا تذکرہ کیے بغیر آپؐ سے خطاب شروع ہو جاتا ہے۔ اور خطاب میں بات کو یوں شروع کیا جاتا ہے۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى (٣) أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرَى (٨٠: ٤) "تمہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو؟" آپؐ کو کیا معلوم کہ یہ عظیم بھلائی وقوع پذیر ہو جائے' یہ کہ یہ اندھا فقیر پاک و صاف ہو جائے جو نہایت شوق سے آپ کے پاس آیا ہے' ہدایت چاہتا ہے اور جب آپؐ اس کو ہدایت دیں تو اس کے لیے نفع بخش ہو جائے اور اس کے دل میں نور ربانی روشن ہو جائے اور زمین پر وہ اس طرح ہو جائیں جس طرح منارہ نور ہوتا ہے۔ اگر ایک دل میں ایمان بیٹھ جائے اور پوری طرح بیٹھ جائے تو اللہ کے نزدیک یہ ایک عظیم کام ہے۔

اب اس عتاب کا لہجہ ذرا اور تیز ہوتا ہے۔ بات کے اندر میں ذرا سختی آجاتی ہے۔ اور یہ اظہار تعجب اب شدید عتاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَى (٥) فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّى (٦) وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّى (٧) وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَى (٨) وَهُوَ يَخْشَى (٩) فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّى (١٠) (٨٠: ٥ تا ١٠)

"جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو' حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے' اس سے تم بے رخی برتتے ہو"۔ یعنی جو آپؐ سے' آپؐ کے دین سے' آپؐ کے پاس موجود ہدایت' بھلائی سے' نور اور طہارت سے جو قرآن کریم کی شکل میں ہے ان سب خزانوں سے بے پروائی برتتا ہے تو ایسے شخص کو آپؐ اہمیت دیتے ہیں' اس کی ہدایت کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ آپؐ اس کے درپے ہوتے ہیں اور وہ آپؐ سے منہ موڑ رہا ہوتا ہے۔

وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّى (٨٠: ٧) "اگر وہ پاکیزگی اختیار نہیں کرتا تو اس کی ذمہ داری آپؐ پر نہیں ہے"۔ اگر وہ اپنی موجودہ گندی حالت اور ناپاکی کو جاری ہی رکھنا چاہتا ہے تو آپؐ پر کیا ذمہ داری ہے۔ اس کے کرتوتوں کی باز پرس آپؐ سے نہ ہوگی۔ آپؐ نہ اس کے ذمہ دار ہیں' نہ اس کا مواخذہ آپؐ سے ہوگا۔ اور وہ جو آپؐ کے پاس دوڑ کر آتا ہے۔

جَاءَكَ يَسْعَى (٨٠: ٨) نہایت مطیع فرمان ہو کر اور وہ اللہ کی خشیت رکھتا ہے تو

فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى (۸۰: ۱۰) "آپ اس سے بے رخی برتتے ہیں"۔ یہ نہایت ہی شدید عتاب ہے۔ تلہی کے معنی کسی شخص کو چھوڑ کر دوسری طرف مشغول ہونا۔

اب اس عتاب کا لہجہ ذرا اور سخت ہو جاتا ہے اور جھڑکی اور سختی سے تردید کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔

كَلَّآ ہرگز نہیں' یہ ممکن نہیں' یہ ایک ایسا انداز خطاب ہے جس پر غور کرنا چاہئے' ایسا ہرگز نہ ہو گا۔

اس کے بعد دعوت اسلامی کی حقیقت' اس کی عظمت اور اس کی بلندی کو بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسی دعوت ہے جو کسی کی محتاج نہیں ہے۔ اس کو کسی کی سند اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے اور اس دعوت کی نظر میں وہی شخص قابل لحاظ ہے جو دعوت اسلامی کو صرف دعوت کی خاطر قبول کرتا ہے' دنیا میں اس کے حالات اور اس کی حیثیت جو بھی ہو۔

اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (۱۱) فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (۱۲) فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ (۱۳) مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ (۱٤) بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ (۱٥) كِرَامٍ بَرَرَةٍ (۱٦) (۸۰: ۱۱ تا ۱٦) "یہ تو ایک نصیحت ہے' جس کا جی چاہے' اسے قبول کرے۔ یہ صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں۔ معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں"۔ گویا یہ دعوت ہر لحاظ سے ایک قابل قدر دعوت ہے۔ اس کے صحیفے بھی مکرم ہیں۔ بلند مرتبہ اور پاکیزہ ہیں اور عالم بالا میں ان کا انتظام اور ان کی تبلیغ ایسے ہاتھوں میں دیا گیا ہے جو نیک اور معزز ہیں۔ لہٰذا دعوت اسلامی کے ساتھ جو بھی منسلک ہے' دور سے یا نزدیک سے' وہ مکرم اور نیک ہے اور اس دعوت کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے' جو اس سے منہ موڑتے ہوں اور بے پروائی برتتے ہوں۔ یہ تو صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو اس کی برتری اور اس کی پاکیزگی کے قائل ہیں اور جو اس سے پاکیزگی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ہے معیار' اللہ کا مقرر کردہ معیار۔ اسی میزان کے مطابق میں ہمیں لوگوں کے اور اپنے اعمال اور اپنی حیثیات کو وزن کرنا ہو گا۔ یہ اللہ کا حکم ہے' اللہ کا کلام ہے۔ اور اس کے مقابلے میں کسی بات کا کوئی وزن ہی نہیں رہتا' ہر فعل اور ہر حکم اس سے فروتر ہے۔

یہ حکم کہاں دیا گیا اور یہ واقعہ کہاں پیش آیا؟ مکہ میں' جبکہ دعوت اسلامی کا ہر طرف سے پیچھا کیا جا رہا تھا' مسلمان بہت ہی کم تعداد میں تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان بااثر لوگوں کی طرف کسی ذاتی مقصد کے لیے بھی متوجہ نہ تھے۔ اور اس اندھے سے لاپروائی کسی ذاتی غرض کے لیے نہ تھی۔ حضورؐ کے پیش نظر بھی صرف اور صرف دعوت اسلامی کا مفاد تھا لیکن اس دعوت کا ترازو یہ تھا۔ اس کی قدریں دوسری تھیں اس نے تو لوگوں کے لیے قدروں کا تعین کرنا تھا' روایات کی تخلیق کرنی تھی۔ یہ دعوت تب ہی کامیاب' باوقار اور مضبوط ہو سکتی جب وہ ایسے پیمانے قائم کر دیتی۔

یہ فقط ایک انفرادی واقعہ نہ تھا' یہ ایک عظیم اصول تھا۔ نہ ایک معمولی اخلاقی برتاؤ کا معاملہ تھا' معاملہ یہ تھا کہ ایک اصولی اور دستوری مسئلہ درپیش تھا کہ لوگ نیک و بد کے پیمانے کہاں سے اخذ کریں۔ کیا زمین کے رسم و رواج سے یا

آسمانی ہدایات سے ' زمینی اور عوامی زاویوں سے یا بارگاہ رب العزت سے ' جہاں سے یہ اصول وضع ہوا ہے ۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ "تم میں سے اللہ کے نزدیک معزز وہ ہے جو تم میں سے متقی ہے"۔

اس دعوت اور اس تحریک میں وہی قابل لحاظ ہے جو اللہ کے نزدیک قابل لحاظ ہے ۔ اگرچہ دنیاوی اعتبار سے وہ ان عناصر سے محروم ہو جو لوگوں کے نزدیک وزن دار ہیں ۔ جن مناظر کا لوگوں پر دباؤ ہے اور جن کو دنیا والوں کے نزدیک اہم سمجھا جاتا ہے ' مثلاً نسب وحسب ' افرادی اور مالی قوت ' اور دوسری قابل لحاظ باتیں ۔ اگر یہ چیزیں ایمان سے خالی ہوں اور ان کے ساتھ تقویٰ کا رنگ نہ ہو ' تو اس دعوت میں ان کا کوئی وزن نہیں ہے ۔ اس تحریک کے زاویہ سے اہم بات اور سب سے مقدم بات یہ ہے کہ ایک شخص اپنے حالات ایمان اور تقویٰ کے اعتبار سے درست کام کرے ۔

اس واقعہ ' انفرادی اور جزوی واقعہ کے حوالے سے ' اللہ تعالیٰ اس عظیم حقیقت اور اس عظیم اصول کو ذہن نشین کرانا چاہتا تھا اور قرآنی انداز اصلاح اور تربیت کے عین مطابق ' جس میں ایک انفرادی واقعہ سے ایک عظیم اصول نکال کر لوگوں کے ذہن نشین کرایا جاتا ہے ۔ یہ اصول پھر دستوری قاعدہ بن جاتا ہے ۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ان ہدایات اور اس عتاب سے بے حد متاثر ہوئی ۔ آپؐ نے نہایت جوش و خروش سے ان ہدایات کو قبول کیا اور ان پر عمل کر کے اس اصول اور دستور کو اسلامی معاشرے میں نافذ کیا ۔ اس نئی جماعت کی عمارت اس اصول پر استوار ہوئی کہ یہ اسلامی معاشرے کی خشت اول تھی ۔

آپ کا پہلا فرض یہ قرار پایا کہ آپ اس واقعہ کو قرآن کی ایک سورت کے طور پر خود بیان کریں ۔ یہ ایک عظیم بات تھی ۔ یہ خدا کا رسول ہی کر سکتا تھا ۔ جس پہلو سے بھی ہم اس پر غور کریں ۔ انسان اپنی کمزوریوں کو چھپاتا ہے ۔ یہ رسول خدا ہی تھے جنہوں نے اس عتاب الٰہی کا برملا اعلان فرمایا اور یہ اعلان بھی اس منفرد انداز میں فرمایا ۔ اگر نبی کے سوا کوئی اور لیڈر ہوتا تو وہ اپنی غلطی کا احساس کر لیتا ' آئندہ احتیاط کرتا ' لیکن اللہ کے نبی کا مقام تو کچھ اور ہوتا ہے ۔ منصب نبوت کے آفاق تو کچھ اور ہوتے ہیں ' بہت بلند اور بہت دور رس ۔

یہ نبی ہی تھا جو نہایت ہی مشکل اور نازک حالات میں ' قریش کے ایک بااثر اور مقدر لوگوں کے سامنے اس اصول کا اعلان کر دیں ۔ جبکہ اس نئی دعوت کے مقابلے میں یہ بااثر لوگ اپنے مالی افرادی اور خاندانی عزت و جاہ کے سب وسائل لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور ایک ایسے معاشرے میں جس میں حسب ونسب اور عزت و جاہ کے سوا کوئی اور قدر رائج نہ تھی ' اس میں بات صرف یہ ہوتی تھی ۔ محمد ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب ' ابن ہاشم اور لوگ کہتے تھے ۔

لَوْلَا نُزِّلَ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ "یہ قرآن دو گاؤں کے کسی عظیم شخص پر کیوں نہیں اترا؟" ۔ حضورؐ تو ان کے اندر صاحب نسب تھے ' لیکن رئیس نہ تھے اور وہ تو صرف جاہ و اقتدار کے پجاری تھے ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے معاشرے میں ایک نبی اور وحی الٰہی ہی اس قسم کا عظیم انقلاب برپا کر سکتی ہے ۔ زمین پر رہنے والا کوئی شخص اور دنیاوی ذہن سے سوچنے والا کوئی فرد ایسا انقلابی اقدام نہیں کر سکتا اور خصوصاً ایسے حالات اور ایسے وقت میں جن میں حضور اکرمؐ دعوت اسلامی کا کام کر رہے تھے ۔

یہ آسمانی قوت اور آسمانی ہدایت ہی تھی جس نے اس معاملے کو اس انداز پر چلایا ' یہ اصول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

ذات کے ذریعہ ان مشکل حالات میں نافذ کیا گیا۔ حضور اکرمؐ نے اسے نافذ کیا' نہایت جوش و خروش' نہایت قوت اور مضبوطی کے ساتھ اس دستور کو اس نئی سوسائٹی کی بنیادوں کے اندر رکھ دیا اور یہ امت مسلمہ کی زندگی میں ایک طویل عرصہ تک قائم و دائم رہا۔

یہ دراصل انسانیت کے لیے ایک دوسرا جنم تھا۔ جس طرح ایک انسان فطرتاً پیدا ہوتا ہے' بلکہ انسانیت کا یہ جنم دراصل زیادہ قیمتی تھا۔ اس طرح کہ انسانی سوسائٹی' کسی سرزمین میں متعارف جاری و ساری قدروں کو خیرباد کہہ دے اور ایسی قدروں کو اپنالے جو بالکل نئی ہوں۔ آسمانوں سے نازل شدہ ہوں۔ نئے تصورات' نئے نظریات آجائیں' ان کے نتیجے میں نئے حالات اور نئے اعمال اور نئے روابط اور ایک نیا شعور پیدا ہو جائے اور زمین پر عملاً پائے جانے والے تصورات' نظریات' حالات اور عملی روابط اور رسم و رواج کو اکھاڑ پھینکا جائے۔ اور لوگ ان سابقہ تصورات اور روابط کے دباؤ سے یکلخت آزاد ہو جائیں اور ان کے اندر جدید تصورات اور جدید قدریں رچ بس جائیں۔ وہ ان کو خوب سمجھ لیں۔ سب کے سب ان کو تسلیم کریں۔ اور یہ عظیم انقلاب برپا ہو جائے۔ یہ جدید قدریں مسلم سوسائٹی کے ضمیر میں نمایاں ہوں۔ اس کے قوانین میں واضح ہوں' تو فی الواقعہ یہ انسانوں کے لیے ایک نیا جنم تھا۔ یہ عظیم انقلاب تھا جس کے برپا کرنے کے لیے ذات محمدی کو بھی تنبیہہ اور ہدایت کی ضرورت پیش آئی اور یہ انقلاب ابتدائی دور کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک طویل عرصے تک نمایاں رہا۔

ہم جدید دور کے لوگ دراصل اس عظیم انقلاب اور انسانیت کے اس جدید جنم کو کماحقہ سمجھ نہیں پارہے' اس لیے کہ ہم نے اس دنیا اور اس زمین کی قدروں' زمین کے روابط اور اس دنیا کی حیثیات اور نظریات کو ترک کر کے اپنے آپ کو اسلام کے مطابق نہیں ڈھالا۔ ہم پر مادیت اور مادی قدروں اور دنیاوی تصورات کا اس قدر غلبہ ہے کہ ہمارے دور کے بعض جاہل جو تاریخ کا مادی فلسفہ پیش کرتے ہیں۔ یہ سمجھنے لگے ہیں' کہ عقائد و تصورات اور اعلیٰ قدریں اور علوم و فنون دراصل مادی حالات اور مادی اور معاشی قدروں کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح تمام رسوم و رواجات اور اصول و قوانین جو اصل معاشی قدروں کی پیداوار ہوتے ہیں' یہ لوگ بے حد جاہل ہیں اور یہ نفس انسانی کے نشیب و فراز سے بالکل ناواقف ہیں۔ بہرحال اسلام نے جو انقلاب رونما کیا وہ ایک معجزہ تھا اور انسانوں کے لیے ایک نیا جنم تھا۔

انسانیت کے اس نئے جنم کے بعد اور اس عظیم انقلاب کے بعد' دنیا کی فضا پر یہ قدریں حاوی رہیں' لیکن ایک عربی معاشرے میں ان کا حاوی ہونا اس قدر آسان نہ تھا' نہ مسلمانوں کے نفوس پر ان کا حاوی ہونا کوئی سہل الحصول ٹارگٹ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے ذاتی کمالات' پھر ارادۂ الٰہی' پھر خدا کی طرف سے ہدایات و تصرفات اور پھر قرآن کریم کی ہدایات پر گرمجوشی سے عمل پیرا ہونے کے شوق کی وجہ سے' ان عظیم اصولوں اور قدروں کو لوگوں کے شعور اور ضمیر میں بٹھایا' ایک پودے کی طرح ان کے دلوں میں یہ نئی اخلاقیات اور قدریں کاشت کی گئیں' پھر ان کی سخت نگہداشت کی گئی تاکہ ان کی جڑیں مضبوط ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی پر صدیاں گزر گئیں لیکن یہ قدریں اپنی جگہ جمی ہوئی ہیں حالانکہ ان صدیوں میں باد مخالف کے بڑے بڑے طوفان گزر گئے اور بے شمار عوامل ان قدروں کے خلاف کام کرتے رہے۔

اس واقعہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جب بھی ابن ام مکتوم کی ملاقات ہوئی' آپؐ ان کو ان کلمات کے

ساتھ خوش آمدید کہتے۔ "آیئے صاحب تمہاری وجہ سے مجھے اللہ جل شانہ نے سختی سے ٹوکا"۔ حضور اکرمؐ نے اس اندھے فقیر کو دو بار اپنی زندگی میں مدینے کا گورنر بنایا۔

عربی معاشرے میں کسی کو رشتہ دینا' ایک بڑا حساس مسئلہ تھا۔ اس معاملے میں جہاں لڑکی دی جاتی تھی' ان لوگوں کے لیے سخت معیار تھا' آپؐ نے اپنی پھوپھی زاد زینب بنت جحش اسدیہ کو اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے نکاح میں دلوایا تاکہ ان جاہلی قدروں پر ضرب لگائی جا سکے۔

اس سے قبل جب آپؐ کے مدینہ میں مواخات کا نظام قائم کیا تو اپنے چچا حمزہ کا بھائی اپنے اسی آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کو بنا دیا۔ اور حضرت بلال ابن رباح کو حضرت خالد ابن رویحہ الخثعمی کا بھائی بنا دیا۔

حضرت زید کو غزوۂ موتہ میں امیر بنایا۔ یہ اس غزوہ کے پہلے امیر تھے۔ اس کے بعد جعفر ابن ابوطالب کا نمبر تھا' پھر عبداللہ ابن رواحہ انصاری کا۔ اس لشکر میں تین ہزار انصار اور مہاجرین تھے جن میں خالد ابن ولید بھی تھے۔ اس لشکر کو رخصت کرنے کے لیے حضورؐ خود نکلے۔ اس جنگ میں یہ تینوں شہید ہو گئے تھے۔ اللہ ان سے راضی ہو۔ اور آپؐ کے آخری احکامات میں سے یہ حکم تھا کہ آپؐ نے حضرت اسامہ ابن زید کو رومیوں کے ساتھ جنگ کے لیے کمانڈر مقرر کیا۔ اس لشکر میں بے شمار انصار اور مہاجرین شامل تھے۔ ان میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ جیسے لوگ بھی تھے جو آپؐ کے ساتھی اور وزیر و مشیر تھے اور جو آپؐ کے بعد خلیفہ تھے۔ نیز حضرت سعد ابن وقاص بھی تھے جو آپؐ کے قریبی بھی تھے اور قریش میں سے قدیم الاسلام تھے۔

بعض لوگوں نے حضرت اسامہ کی امارت پر تعجب کا اظہار بھی کیا' کیونکہ وہ بالکل کم عمر نوجوان تھے۔ حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں "حضورؐ نے ایک لشکر روانہ فرمایا اور اس پر اسامہ ابن زید کو امیر مقرر فرمایا' بعض لوگوں نے ان کی امارت پر اعتراض کیا تو آپؐ نے کہا اگر تم اسامہ ابن زید کی امارت میں طعن کرتے ہو تو تم نے اس سے قبل ان کے والد کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا' خدا کی قسم' وہ امارت کے اہل تھا اور مجھے سب لوگوں میں نہایت محبوب تھا اور یہ بھی مجھے تمام لوگوں سے محبوب ہے"۔ (شیخین اور ترمذی)

اور جب سلمان فارسیؓ کے بارے میں بعض لوگوں نے نازیبا الفاظ کہے اور عربی اور فارسی کے حوالے سے بات کی۔ اور ان باتوں سے محدود عربی قومیت کی بو آتی تھی' تو حضور اکرمؐ نے اس تصور پر بھی ایک فیصلہ کن ضرب لگائی اور فرمایا: "سلمان ہم اہل بیت میں سے ہے"۔ اور حضرت مسلمانوں کو آسمانی قدروں نے تمام گری ہوئی دنیاوی قدروں سے آگے بڑھا دیا اور وہ ایک لمحے میں آفاق سے بھی آگے بڑھ گئے اور محدود قومیت کی لکیریں مٹا دی گئیں جو عربوں کے نزدیک بہت اہم تھیں اور سلمان کو اہل بیت کا فرد قرار دیا (طبرانی و حاکم)۔

جب حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت بلالؓ کے درمیان تکرار ہو گئی اور حضرت ابوذرؓ کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا "اے سیاہ فام عورت کے لڑکے"' تو اس پر حضور اکرمؐ شدید طور پر غضب ناک ہو گئے اور اس بات کو حضرت ابوذرؓ کے منہ پر مار دیا اور فرمایا "ابوذر پیمانے کو درست رکھو' اسلام میں سفید عورت کے بیٹے کو سیاہ عورت کے بیٹے کے اوپر کوئی فضیلت نہیں ہے"۔ چنانچہ آپؐ نے بات کو نہایت ہی ابتدائی جڑوں سے علیحدہ کر دیا۔ اسلام' اسلام ہے اور آسمانی قدروں پر مشتمل ہے اور جاہلیت' جاہلیت ہے۔ اس کی قدریں زمینی ہیں۔ (ابن مبارک)

حضرت ابوذرؓ کے حساس دل پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات کا سخت اثر ہوا' انہوں نے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی اور قسم اٹھائی کہ وہ اس وقت تک اپنی پیشانی کو اوپر نہ اٹھائیں گے جب تک بلالؓ اسے روند نہ ڈالیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس بری بات کا کفارہ یہی تھا۔

جس ترازو کے مطابق حضرت بلالؓ کو اس قدر وزن حاصل ہوا تھا' وہ آسمانی ترازو تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں' رسول اللہ نے فرمایا! "بلالؓ مجھے بتاؤ کہ تم نے کون سا ایسا عمل کیا ہے جس پر تمہیں خدا کے ہاں بہت زیادہ اجر کی توقع ہے؟" اس لیے کہ میں نے معراج کی رات' جنت میں تمہارے جوتوں کی آواز سنی ہے"۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد میں نے جب بھی مکمل پاکی اختیار کی ہے (وضو' غسل) رات کو یا دن کو تو میں نے اس کے بعد نماز پڑھی ہے' جس قدر اللہ نے میرے لیے مقدر کیے تھے' بس یہی وہ بات ہے جس سے میں امید کرتا ہوں کہ مجھے زیادہ ثواب ملے گا۔ (شیخین)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمار ابن یاسر کے بارے میں فرمایا کرتے تھے' جب بھی انہوں نے حضورؐ سے ملاقات کی اجازت چاہی' "اسے اجازت دو' یہ پاک اور پاکباز ہے"۔ (نسائی) اور دوسری جگہ آپؐ نے فرمایا "عمار سر سے پاؤں تک ایمان سے پر ہے"۔ اور حضرت حذیفہؓ کے بارے میں فرمایا "مجھے معلوم نہیں ہے کہ میں تمہارے اندر اب کتنا عرصہ رہوں گا' لہٰذا ان دونوں کی پیروی کرو"۔ (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کیا) اور عمار کے طریقے پر چلو اور تمہیں جو بات ابن مسعود نے بتائی' اس کی تصدیق کرنا"۔ (ترمذی)

حضرت ابن مسعود کی حالت تو یہ تھی کہ جو لوگ مدینہ کے رہنے والے نہ تھے' وہ آتے تو حضرت ابن مسعود کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کا آدمی سمجھتے .... کیونکہ یہ اکثر آتے جاتے تھے اور بروقت حضورؐ کے ساتھ رہتے تھے۔ (شیخین و ترمذی)

ایک آزاد کردہ غلام جلیبیبؓ تھے' ان کے لیے حضورؐ خود ہی رشتہ تلاش فرماتے تھے۔ حضورؐ چاہتے تھے کہ انصار میں سے کوئی عورت ان کے لیے مل جائے۔ ایک لڑکی کے بارے میں حضورؐ نے پیغام دیا' اس کے والدین نے انکار کر دیا تو اس لڑکی نے کہا' کیا تم رسول اللہؐ کی بات کو رد کر رہے ہو؟ اگر رسول اللہؐ اس پر راضی ہیں تو مجھے اس شخص کے نکاح میں دے دو۔ اس پر والدین راضی ہوگئے اور انہوں نے وہ لڑکی اسے نکاح کر کے دے دی۔ (احمد)

یہ شخص اپنی اس شادی کے بعد جلدی پیش آنے والی کسی جنگ میں گم ہوگئے۔ حضرت ابو برزہ اسلمی روایت فرماتے ہیں کہ حضور ایک غزوہ میں شریک ہوئے۔ اللہ نے آپؐ کو فتح دی اور مال غنیمت بھی ملا۔ جنگ کے بعد حضورؐ نے فرمایا کیا تم کسی کو گم پاتے ہو' تو لوگوں نے کہا ہاں فلاں فلاں اور فلاں نہیں ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے دوبارہ دریافت فرمایا کیا تم کسی کو گم پاتے ہو؟ تو لوگوں نے کہا' فلاں' فلاں اور فلاں نہیں ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کیا کوئی اور شخص گم پا رہے ہو تو انہوں نے کہا نہیں اور تو کوئی گم نہیں ہے تو آپؐ نے فرمایا ہاں میں جلیبیب کو گم پاتا ہوں۔ لوگوں نے انہیں تلاش کیا' یہ سات مقتولین کفار کے پاس پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان سات کو قتل کر دیا تھا' جس کے بعد انہوں نے اسے شہید کر دیا تھا۔ آپؐ ان کی لاش کے پاس کھڑے ہوئے اور فرمایا اس نے سات کو قتل کر دیا۔ بعد میں انہوں نے اسے شہید کر دیا۔ یہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ اس کے بعد آپؐ نے اپنے

دونوں بازوؤں میں انہیں اٹھایا۔ حضورؐ کے بازوؤں کے سوا ان کے لیے کوئی چارپائی نہ تھی۔ ان کے لیے قبر کھودی گئی اور انہیں قبر میں رکھ دیا گیا۔ راوی نے غسل کا ذکر نہیں کیا۔ (مسلم)

اللہ کی ان ہدایات کے ذریعہ سے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ کی وجہ سے انسانیت کو ایک نیا جنم ملا۔ اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں حسن و قبح کے اصول آسمان سے لیے جاتے تھے۔ یہ معاشرہ اسی زمین پر ہوتے ہوئے بھی زمین کی گری پڑی اقدار سے آزاد تھا۔ یہ تھا اسلام کا عظیم معجزہ۔ یہ ایک عظیم معجزہ تھا اور کوئی معجزہ خدا اور رسولؐ کے احکام کے بغیر صادر نہیں ہو سکتا۔ اس معجزے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ دین اللہ کا دین تھا اور جس ذات بابرکات نے یہ دین پیش کیا وہ اللہ کا رسولؐ تھا۔

اور اللہ کی ایک خاص تدبیر تھی کہ رسول اللہ کے بعد آپؐ کے پہلے ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ اس کے والی اور خلیفۃ المسلمین بنے۔ اس کے بعد آپ کے دوسرے ساتھی حضرت عمرؓ اس دین کے سربراہ بنے۔ یہ دوسرے خلیفہ دونوں میں سے اس نظام کو زیادہ سمجھنے والے تھے، یہ زیادہ حضور اکرم کی سنت پر چلنے والے تھے اور رسول سے محبت کرنے والے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اطاعت کے میدان میں ان کے نقش قدم پر چلنے والے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہ کے بارے میں حضورؐ کے اصرار کو سمجھ لیا تھا۔ اس لیے انہوں نے منصب امارت سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے یہی کام کیا۔ یہ لشکر حضور اکرمؐ نے تیار کیا تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ کے باہر خود اسے الوداع کہا۔ اسامہ سوار تھے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفۃ المسلمین ان کی سواری کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ حضرت اسامہ کو حیا آ گئی کہ وہ سوار ہوں اور بوڑھے خلیفہ پیدل ساتھ ساتھ جا رہے ہوں۔ انہوں نے کہا "خلیفۃ المسلمین، یا تو آپ سوار ہوں یا میں اترتا ہوں"۔ خلیفۃ المسلمین قسم اٹھاتے ہیں "خدا کی قسم تم نہ اترو گے اور خدا کی قسم میں سوار بھی نہ ہوں گا، کیا ہو جائے گا اگر میرے پاؤں بھی اللہ کے راستہ میں غبار آلود ہو جائیں"۔

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے سوچا کہ آپ کو حضرت عمرؓ کی ضرورت ہے کیونکہ آپ کے کاندھوں پر خلافت کا بوجھ پڑ چکا ہے لیکن عمر تو جیش اسامہ کے ایک سپاہی ہیں۔ اسامہ امیر ہیں۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ اسامہ سے اجازت طلب کی جائے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں "اگر تم عمرؓ کو ترک کر کے میری مدد کر سکتے ہو تو مناسب ہو گا"۔ ذرا الفاظ کو دیکھو "اگر تم مناسب سمجھو تو حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر میری مدد کرو"۔ یہ ہیں وہ بلندیاں جن تک اسلام نے انسانوں کو پہنچا دیا۔ یہ معجزہ صرف اللہ کی مرضی سے ہو سکتا ہے اور ایک رسول ہی اسے سرانجام دے سکتے ہیں۔

زمانے کا پہیہ گھومتا ہے اور ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ حضرت عمرؓ خلیفہ ہیں اور وہ حضرت عمار ابن یاسر کو کوفہ کا حاکم مقرر کرتے ہیں۔

ایک وقت یوں بھی آتا ہے کہ حضرت عمر کے دفتر کے سامنے سہیل ابن عمرو ابن الحارث ابن ہشام اور ابوسفیان کھڑے ہیں اور ان کے ساتھ قریش کے سرداروں کی ایک جماعت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے اور طلقاء کہلائے۔ حضرت عمرؓ ان سے پہلے صہیب اور بلال کو اندر بلاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ اسلام کے سابقون الاولون اور اہل بدر میں سے تھے۔ ابوسفیان کے نتھنے مارے غصے کے پھول جاتے ہیں اور سخت جذباتی انداز میں کہتے ہیں "میں اپنی پوری زندگی میں ایسا دن نہیں دیکھا کہ ان غلاموں کو تو اندر بلایا جاتا ہے اور ہم دروازے پر چھوڑے جاتے ہیں"۔ اس

کے ایک ساتھی جنھوں نے حقیقت اسلام کو سمجھ لیا تھا اور ان کے شعور پر اسلام چھا گیا تھا' ان سے کہا "اے قوم تمہارے چہروں پر جو آثار نمودار ہیں' میں دیکھ رہا ہوں۔ اگر تمہیں غصہ آ رہا ہے تو یہ غصہ اپنے نفس سے اتارو' ان لوگوں کو بھی اسلام کی طرف بلایا گیا اور تمہیں بھی بلایا گیا۔ انہوں نے فوراً لبیک کہا اور تم نے دیر لگا دی۔ تم ذرا اس وقت کا خیال کرو کہ قیامت میں ان کو بلایا جائے اور تم وہاں بھی کھڑے کے کھڑے رہو۔ (اسلام کا اجتماعی عدل)

حضرت عمرؓ اسامہ ابن زید کے لیے عبداللہ ابن عمر سے زیادہ الاؤنس مقرر فرماتے ہیں۔ حضرت عبداللہ اس کا راز پوچھتے ہیں حضرت عمر جواب دیتے ہیں "بیٹے' زید رسول اللہ کو تمہارے باپ سے زیادہ محبوب تھے اور اسامہ رسول اللہ کے ہاں تم سے زیادہ محبوب تھے۔ اس لیے میں نے رسول اللہؐ کی محبت کو اپنی محبت پر ترجیح دے دی"۔ حضرت عمرؓ کو معلوم تھا کہ رسول اللہؐ کی محبت آسمانی پیمانوں سے ناپی جاتی ہے۔

--- ○○○---

حضرت عمرؓ حضرت عمارؓ ابن یاسر کو بھیجتے ہیں کہ وہ اسلام کے عظیم کمانڈر' فاتح اور اعلیٰ خاندان کے فرد حضرت خالد بن ولید کے خلاف بعض شکایات کی تفتیش کریں۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمارؓ نے ان کو ان کی چادر سے باندھا اور بعض روایات میں آتا ہے کہ ان کو خود ان کے عمامے سے باندھا گیا۔ یہاں تک کہ تفتیش ختم ہوگئی اور اس کے نتیجے وہ بے گناہ ثابت ہوگئے۔ اس کے بعد وہ انہیں کھولتے ہیں اور خود اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر عمامہ باندھتے ہیں اور حضرت خالدؓ کو اس پر کوئی غصہ نہیں آتا۔ اس لیے کہ حضرت عمارؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ہیں اور ان سے پہلے اسلام لانے والے ہیں اور ان کے بارے میں رسول اللہؐ نے جو کچھ فرمایا وہ ان کو معلوم تھا۔

حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں فرماتے تھے۔ یہ ہمارے سردار ہیں جنھوں نے ہمارے دوسرے سردار کو غلامی سے آزاد کرایا یعنی حضرت بلال کو جو امیہ ابن خلف کے مملوک تھے اور امیہ انہیں سخت اذیت دیتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے انہیں خریدا اور آزاد کر دیا۔ ان کے بارے میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ بلالؓ ہمارے سردار ہیں۔

یہ حضرت عمرؓ ہی تھے کہ انہوں نے فرمایا اگر ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم موجود ہوتے تو میں انہیں خلیفہ بنا دیتا۔ حضرت عمرؓ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں اور دوسری جانب انہوں نے حضرت عثمانؓ' حضرت علیؓ' حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ جیسے لوگوں کو بھی خلیفہ نہ بنایا۔ بلکہ چھ آدمیوں کی شوریٰ مقرر کی کہ ان میں سے کسی ایک کو مقرر کیا جائے۔

حضرت علیؓ حضرت عمار اور حسن ابن علی کو اہل کوفہ کی طرف بھیجتے ہیں۔ وہ ان سے درخواست کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ان کا جو نزاع ہوگیا ہے اس میں وہ ان کا ساتھ دیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں "مجھے اچھی طرح علم ہے کہ حضرت عائشہؓ تمہارے نبیؐ کی بیوی ہیں' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' لیکن اللہ نے تمہیں اس امتحان میں ڈال دیا ہے کہ تم میری اطاعت کرتے ہو یا ان کی"۔ (بخاری) اس طرح حضرت عائشہؓ کے بارے میں لوگ ان کی بات سنتے ہیں۔

حضرت بلالؓ یمن کے گورنر تھے۔ ابورویحہ خثعمی یمن کے ایک قبیلے میں شادی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان کی سفارش کریں۔ حضرت بلالؓ فرماتے ہیں میں بلال ابن رباح ہوں اور یہ میرے بھائی ابورویحہ ہیں۔ یہ ایک ایسا شخص ہے کہ نہ اس کے اخلاق اچھے ہیں اور نہ یہ زیادہ دیندار ہے۔ تم چاہو تو اپنی لڑکی ان کے عقد میں دے دو اور نہ چاہو تو نہ دو"۔ حضرت بلالؓ انہیں دھوکہ نہیں دیتے اور نہ اس کے معاملے میں کوئی بات چھپاتے ہیں'

اور نہ وہ اس بارے میں یہ کہتے ہیں کہ میں سفارشی ہوں۔ وہ صرف یہ بات پیش نظر رکھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہیں گے اللہ کے ہاں جوابدہ ہیں۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کس قدر سچے ہیں اور وہ یہ رشتہ دے دیتے ہیں۔ بس وہ یہ بات کافی سمجھتے ہیں کہ وہ ایک صاحب نسب عرب ہیں اور ان کی پچی سفارش حضرت بلالؓ حبشی کر رہے ہیں۔

غرض یہ عظیم حقیقت اسلامی معاشرے میں عملاً قائم ہوگئی اور اس کے بعد ایک طویل زمانے تک قائم رہی۔ باوجود اس کے بعد کے زمانوں میں مسلمانوں کے اندر زوال اور تنزل کے بے شمار عوامل پیدا ہو گئے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کا جب بھی ذکر ہوتا ہے تو ان کے ساتھ ان کے آزاد کردہ غلام عکرمہ کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ جب عبداللہ ابن عمر کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے ساتھ ان کے غلام نافع کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ انس ابن مالک کے ساتھ ابن سیرین کا ذکر ہوتا ہے' اور ابو ہریرہ کے ساتھ ان کے غلام عبدالرحمٰن ابن ہرمز کا ذکر ہوتا ہے 'بصرہ میں حسن بصری 'مکہ میں مجاہد' عطا ابن ابی رباح اور طاؤس ابن کیسان جیسے لوگ مشہور فقہاء تھے۔ عمر ابن عبدالعزیز کے زمانے میں 'مصر میں یزید ابن ابی حبیب مفتی اعظم مقرر ہوئے۔ یہ علقمہ کے سیاہ فام آزاد کردہ غلام تھے۔

یہ تھیں آسمانی اور اسلامی قدریں جنھوں نے انسانیت کو تقویٰ کی بنیاد پر اس قدر بلند کر دیا' اگرچہ دنیا کے اندر مقبول ترین اقدار میں سے کوئی خصوصیت ان کے اندر نہ تھی۔ نہ اپنی ذات کے اعتبار سے اور نہ ان کے ماحول کے اعتبار سے۔ یہ میزان اور یہ پیمانے دنیا میں ماضی قریب تک قائم رہے۔ ماضی قریب میں پوری دنیا پر دوبارہ جاہلیت چھا گئی۔ دنیا کا ایک حصہ امریکی جاہلیت کے زیر اثر آگیا جس میں انسانوں کی قیمت ڈالر کی شکل میں متعین ہونے لگی اور نصف مشرقی دنیا کی قیادت روسی جاہلیت کو حاصل ہوگئی اور اس میں انسان کی وقعت ایک پیداواری مشین کے سوا کچھ نہ تھی۔ رہی اسلامی دنیا تو اس پر وہی جاہلیت عربی قومیت کی جاہلیت چھا گئی جس کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے اسلام دنیا میں آیا تھا اور عملاً اسلام نے اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ آج عالم اسلام سے اس اعلیٰ معیار اور اعلیٰ قدر کو مٹا دیا گیا ہے اور عالم اسلام ایک ایسی جاہلیت کی تاریکیوں میں ڈوب گیا ہے 'جس کے اندر ایمان اور تقویٰ اعلیٰ قدر ہی نہیں ہے۔

ہاں عالم اسلام میں دعوت اسلامی اور احیائے اسلام کی تحریک جاری ہے۔ صرف اس تحریک پر امید ہے کہ یہ پوری دنیا کو جاہلیت سے نکال کر از سرنو آسمانی قدریں عطا کرے گی اور شاید ایک بار پھر انسانیت ایک نیا جنم لے جیسا کہ انسانیت کو آغاز اسلام کے دور میں نصیب ہوا۔ جس کی ایک جھلک اس سورت کی ابتدائی آیات میں دکھائی گئی ہے۔ یہ چند آیات ہیں لیکن نہایت ہی اہم اور سنگ میل اور فیصلہ کن ہیں۔

ایک مخصوص واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے سورت کے پہلے حصے میں اس عظیم حقیقت کو بیان کیا گیا' اب دوسرے حصے میں' اس انسان کے رویہ پر سخت تعجب کا اظہار کیا گیا ہے جو ایسے حقائق اور ایمان اور تقویٰ کی اس دعوت سے منہ موڑتا ہے' اور دعوت اسلامی سے اپنے آپ کو برتر اور بالا سمجھتا ہے۔ یہ انسان اپنے اصل اور اپنی تخلیق کے حالات پر اگر غور کرتا تو ہرگز اعراض نہ کرتا۔ انسان یہ نہیں دیکھتا کہ اس پر اللہ کی کیا کیا عنایات ہیں۔ اس کی زندگی قدم قدم پر اللہ کے کنٹرول میں ہے' دنیا اور آخرت میں یہ انسان دراصل ہر مرحلہ حیات میں اللہ کے اختیار میں ہے' لیکن یہ اپنے خالق' اپنے کفیل اور اپنے محاسب کے حقوق ادا نہیں کرتا اور نہ اس سے ڈرتا ہے۔

قُتِلَ الۡاِنۡسَانُ مَاۤ اَكۡفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنۡ اَىِّ شَىۡءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِيۡلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقۡبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنۡشَرَهٗ ﴿۲۲﴾ كَلَّا لَمَّا يَقۡضِ مَاۤ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾

"قتل ہو انسان 'کیسا ناشکرا ہے یہ ۔کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے' نطفہ کی ایک بوند سے ۔اللہ نے اسے پیدا کیا 'پھر اس کی تقدیر مقرر کی 'پھر اس کے لیے زندگی کی راہ آسان کی 'پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا ۔پھر جب چاہے وہ اسے دوبارہ کھڑا کر دے ۔ہرگز نہیں 'اس نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا"۔

قُتِلَ الۡاِنۡسَانُ (۸۰:۱۷) "انسان قتل ہو"۔کیونکہ وہ اپنے ان قابل تعجب اعمال کی وجہ سے اس بات کا مستحق ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے ۔یہ سرزنش اور طعن و تشنیع کا ایک انداز ہے ۔مطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ کر رہا ہے وہ اس قدر برا ہے کہ اگر اس پر اسے سزائے موت دے دی جائے تو قابل تعجب نہ ہوگی ۔

مَاۤ اَكۡفَرَهٗ (۸۰:۱۷) "کس قدر ناشکرا ہے"۔وہ کفر' انکار میں بہت شدید ہے 'اگر وہ اپنی تخلیق پر غور کرتا تو اپنے خالق کا شکر ادا کرتا ۔دنیا میں تواضع اختیار کرتا اور آخرت کا خیال رکھتا ۔یہ انسان کس بات پر مست ہے ۔اپنے آپ کو بے پرواہ سمجھتا ہے 'اور ہدایت سے منہ موڑتا ہے ۔ذرا اپنی اصلیت اور آغاز وجود کے حالات پر تو غور کرے ۔

مِنۡ اَىِّ شَىۡءٍ خَلَقَهٗ (۸۰:۱۸) "کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے"۔اس کی اصلیت تو نہایت معمولی 'متواضع اور حقیر ہے ۔اور یہ اللہ کا فضل و کرم ہی ہے جس نے اپنی تقدیر اور تدبیر سے اس جرثومے سے انسان بنایا ہے ۔

مِنۡ نُّطۡفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ (۸۰:۱۹) "نطفہ کی ایک بوند سے اللہ نے اسے پیدا کیا ۔پھر اس کی تقدیر مقرر کی"۔یعنی ایک ایسے نطفے سے جس کی کوئی قیمت نہیں ہے اور اس اصل جرثومے سے جس کے اندر کوئی قوت نہیں' وہ خود نہ آ سکتا تھا' یہ تو خالق تھا جس نے اس کا آنا مقدر کیا ۔پھر اس کی صنعت اور تخلیق میں مضبوطی پیدا کی ۔پھر اسے ایک تندرست و توانا مخلوق بنایا اور اسے تمام مخلوقات پر ترجیح دی اور مکرم بنایا' اور اس حقیر جرثومے کو اس زمین پر مختار ٹھہرایا ۔

ثُمَّ السَّبِيۡلَ يَسَّرَهٗ (۸۰:۲۰) "پھر اس کے لیے راہ میسر کی"۔زندگی کی راہ یا ہدایت کی راہ ۔زندگی کی راہ یا ہدایت کی راہوں پر چلنے کے لیے اس کے اندر استعداد اور صلاحیتیں ودیعت فرمائیں ۔اور جب زندگی کا یہ سفر ختم ہوا تو یہ انسان بھی اس انجام تک جا پہنچا جس تک تمام زندہ مخلوق کو پہنچنا ہے ۔اس انجام تک پہنچنے سے رکنا اس کے

اختیار میں نہیں ہے اور اس انجام سے کوئی راہ فرار نہیں ہے۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ (۸۰:۲۱) "پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا"۔ لہٰذا جس طرح اس کا آنا اللہ کے امر سے ہے' اس کا یہ انجام بھی اللہ کے امر سے ہے۔ اللہ نے جب چاہا اسے زندگی میں لے آیا اور جب چاہا زندگی کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اور قبر کے پیٹ میں رکھوا دیا۔ یہ قبر بھی اس کے لیے اس کی شرافت کی خاطر اور اس پر مہربانی کرتے ہوئے مقرر کی۔ یوں نہ چھوڑا کہ جہاں مر جائے' وہیں چھوڑ دیا جائے اور جانور اسے نوچتے رہیں۔ انسان کی فطرت میں یہ بات رکھ دی کہ مردہ انسانوں کی لاش کو قبر میں چھپایا جائے۔ یہ بھی اللہ کی تدبیر اور تقدیر اور احکام کا ایک حصہ ہے کہ مردوں کو دفن کیا جائے۔ اور جب اللہ کی مشیت کے مطابق باز پرس کا وقت آپہنچے گا تو اسے دوبارہ زمین سے اٹھا دیا جائے گا اور یہ بھی اللہ کے حکم سے ہو گا۔

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (۸۰:۲۲) "اور پھر جب چاہے اسے دوبارہ اٹھا کر کھڑا کر دے"۔ کیونکہ وہ یونہی بے کار چھوڑا جانے والا نہیں ہے اور نہ بغیر حساب و کتاب کے اسے یونہی زمین کا حصہ بنا دیا جائے گا۔ لہٰذا ذرا غور کرو کہ یہ انسان اسی حساب و کتاب کے لیے کچھ تیاری کر رہا ہے دیکھو کہ یہ انسان اسی حساب و کتاب کے لیے کچھ تیاری کر رہا ہے یا نہیں۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ (۸۰:۲۳) "ہرگز نہیں' اس نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا"۔ بات مطلق انسان کی ہو رہی ہے' تمام افراد انسان کی بہر دور کے انسان اللہ کے احکام بجا لانے میں کوتاہی کرتے ہیں' اپنی پوری زندگی میں ان کی روش یہی ہوتی ہے۔ "لما" سے اس مفہوم کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ ہرگز نہیں' انسان ہر صورت میں قصوروار ہے' یہ اپنے فرائض ادا نہیں کرتا' وہ اپنی اصلیت اور حقیقت کو بھی پیش نظر نہیں رکھتا' حالانکہ یہ بات ہروقت اس کے پیش نظر ہونی چاہئے۔ نیز وہ اپنے خالق' اپنے ہادی اور اپنے کفیل کا حق شکر بھی ادا نہیں کرتا۔ اور اس زندگی کا مختصر سا سفر اس طرح نہیں طے کرتا کہ اس کے اقدامات آخرت کو پیش نظر رکھ کر ہوں۔ مجموعی طور پر انسان کی حالت ایسی ہی ہے کہ اکثریت نافرمان' ناشکری' ہدایت سے بے نیاز اور متکبر ہے۔

اب جدید پیراگراف آتا ہے۔ سابقہ پیراگراف میں انسان کی پیدائش کی بات رکھی گئی تھی' اب کہا جاتا ہے کہ یہ انسان ذرا اپنی اور اپنے مویشیوں کی خوراک پر تو غور کرے۔ اس دنیا کی زندگی اور سفر میں اللہ نے انسان اور اس کے مویشیوں کے لیے کیا انتظام فرمایا۔ انسان کے غور کے لیے یہ ایک ہی چیز کافی ہے جو اللہ نے اس کے لیے فراہم کی ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ
شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّ
زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ

وَلِاَنۡعَامِكُمۡ ۝

"پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے۔ ہم نے خوب پانی لنڈھایا' پھر زمین کو عجیب طرح پھاڑا' پھر اس کے اندر اگائے غلے اور انگور اور ترکاریاں۔ اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست کے طور پر"۔

یہ ہے قصہ انسان اور اس کے مویشیوں کی خوراک کا' جس کی تیاری کے تمام مراحل مختصر' یہاں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ انسان کو چاہئے کہ وہ ان پر غور کرے۔ کیا ان انتظامات میں خود اس کا اپنا بھی کوئی دخل ہے۔ کیا یہ سب کچھ اس کی تدبیر سے ہو رہا ہے۔ جس ذات باری نے اسے پیدا کیا اور اس دنیا اور زمین پر لا کر کھڑا کر دیا۔ یہ وہی ذات ہے جس نے یہ تمام انتظامات کیے۔

فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ (۸۰ : ۲۴) "پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے"۔ یہ نظام خوراک براہ راست اس کے ساتھ متعلق ہے' اس کے قریب ہے' اس کے ساتھ لازم و ملزوم ہے' اسے چاہئے کہ وہ اس حاضر و موجود اور لازم و مکرر نظام پر غور کرے۔ اس کا قصہ اور اس کی کہانی کس قدر عجیب ہے اور کس قدر آسان ہے۔ یہ کام چونکہ بسہولت ہوتا رہتا ہے اس لیے اس کے اندر جو عجائب و کمالات ہیں وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت یہ نظام رزق بھی ایسا ہی معجزہ ہے جس طرح انسان کی تخلیق ایک معجزہ ہے۔ جس طرح تخلیق میں ہر مرحلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح اس نظام رزق کا ہر مرحلہ بھی اللہ کے دست قدرت میں ہے۔

اَنَّا صَبَبۡنَا الۡمَآءَ صَبًّا (۸۰ : ۲۵) "ہم نے خوب پانی لنڈھایا"۔ پانی کا بارش کی صورت میں گرایا جانا ایک ایسا عمل ہے' جس سے ہر دور کا انسان واقف تھا۔ علم و تجربہ کے ابتدائی اور انتہائی مراحل کے انسان اس سے واقف تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے جو انسان' ہر انسان کے سامنے پیش کی جاتی ہے لیکن جب انسان نے ترقی کر لی تو اسے معلوم ہوا کہ اس آیت کے مفہوم میں کیا کیا وسعتیں ہیں۔ آج کل کے ماہرین ماحولیات اس زمین کے اوپر پانی کے اس اجتماع کے بارے میں جو مفروضے پیش کرتے ہیں' ان میں سے قریب ترین یہ ہے کہ یہ پانی ہمارے اوپر فضا میں تھا اور یہ بارش کی شکل میں زمین پر گرا اور سمندروں کی شکل اختیار کر گیا۔

دور حاضر کے سائنس دانوں میں سے ایک شخص یہ کہتا ہے: "اگر اس بات کو درست مان لیا جائے کہ سورج سے جدا ہونے کے وقت زمین کا درجہ حرارت یا زمین کی سطح کا درجہ حرارت تقریباً ۱۲۰۰۰ ڈگری تھا تو یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ اس وقت تمام عناصر ایک دوسرے سے الگ تھے اور کسی کیمیاوی ترکیب کا امکان ہی نہ تھا۔ پھر کرۂ ارض اور اس کے اجزائے ترکیبی بتدریج ٹھنڈے ہوگئے اور اس طرح مختلف کیمیاوی مرکبات وجود میں آئے۔ اور اس دنیا کا ملبہ وجود میں آیا جسے ہم جانتے ہیں۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن اس وقت تک مل نہیں سکتے جب درجہ حرارت ۴۰۰۰ ہزار فارن ہیٹ تک نہ آ جائے۔ یوں جب درجہ حرارت ۴۰۰۰ ہزار فارن ہیٹ تک آیا تو یہ اجزاء مرکب ہوگئے اور پانی وجود میں آیا جس کے بارے میں جدید سائنس نے معلوم کر لیا ہے کہ وہ کرۂ ہوائی کی شکل میں تھا اور سمندر کا پانی زمین پر نہ تھا بلکہ ہوا کی

شکل میں تھا۔ اور تمام دوسرے عناصر بھی منفرد تھے۔ ان کی ترکیب عمل میں نہ آئی تھی۔ یہ عناصر گیسوں کی شکل میں تھے۔ جب کرۂ ہوائی میں پانی تیار ہوا تو وہ زمین پر گرنے لگا لیکن یہ بارش جوں جوں زمین کے قریب آتی' زیادہ حرارت کی وجہ سے پھر گیس بن کر فضا میں اٹھ جاتی۔ کیونکہ زمین کا درجہ حرارت اس سے بھی زیادہ تھا جتنا ہزار ہا میل بالائی فضاؤں میں تھا۔ بالآخر جب زمین بتدریج ٹھنڈی ہوتی گئی تو بارشوں کا یہ طوفان زمین کے قریب پہنچ گیا اور گرمی کی وجہ سے دوبارہ بھاپ بن کر اٹھتا رہا۔ آخرکار اس عظیم طوفان نے زمین کی سطح کو ٹھنڈا کر کے' یہ عظیم سمندر جو فضاؤں میں تھے' زمین پر اتار دیئے۔ یہ طوفان کس قدر عظیم تھے ان کا تصور بھی مشکل ہے"۔ (علم ایمان کی طرح ہوتا ہے' ترجمہ ڈاکٹر محمود صالح فلکی)

ہم ان مفروضوں اور نظریات کو مفروضے ہی مانتے ہیں اور قرآن کو ان کے ساتھ محدود نہیں کرتے لیکن یہ نظریات قرآن کے مفہوم کو وسیع کر دیتے ہیں اور اسے ہمارے فہم و ادراک کے قریب لے آتے ہیں۔ یہ دراصل پانی انڈیلنے کی سائنسی تاریخ ہے۔ یہ نظریات بہرحال نظریات ہیں' درست بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ پانی کے زمین پر آنے کے کچھ دوسرے نظریات بھی وجود میں آ جائیں کیونکہ قرآن ہر دور اور ہر معیار علم کے انسانوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ اور یہی قرآن کا اعجاز ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے میں نے ہی سمجھا ہے۔

یہ تھا طعام کا ابتدائی حصہ۔

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا (۸۰: ۲۵) "ہم نے خوب پانی لنڈھایا"۔ کیا انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ اس پانی کی تخلیق میں اس کا کوئی بھی دخل ہے۔ یا اس کی پیدائش کی ہسٹری میں اس کا دخل ہے یا انسانوں نے کسی تدبیر سے یہ سمندر زمین پر انڈیل دیئے تاکہ وہ اپنے طعام کا انتظام کریں۔

ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا (۸۰: ۲۶) "پھر ہم نے زمین کو عجیب طرح پھاڑا"۔ پانی کے انڈیلنے کے بعد یہ تیسرا مرحلہ ہے۔ یہ بات بالکل ابتدائی اور پتھر کے دور کے انسان کی سمجھ میں بھی آتی تھی جو دیکھتا تھا کہ پانی آسمانوں سے برس رہا ہے اور یہ خدا کی قدرت سے برس رہا ہے اور اس میں انسان کی تدبیر اور تقدیر کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ زمین کو پھاڑ کر اس کی مٹی میں جذب ہوتا تھا' یا وہ دیکھتا تھا کہ زمین کی مٹی اللہ کی قدرت سے شق ہوتا ہوتی ہے۔ اس سے نباتات نکلتے ہیں اور فضا میں بلند ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ نباتات نرم و نازک ہوتے ہیں اور زمین نہایت بھاری اور مضبوط ہوتی ہے لیکن یہ دست قدرت ہی ہے جو اس مضبوط زمین کو شق کر کے اس کے اندر سے نرم و نازک پودے کو نکالنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ بھی ایک معجزہ ہے جسے ہر انسان دیکھتا ہے جو پودے اور مٹی کا مشاہدہ رکھتا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کے اندر ایک خفیہ قوت کام کر رہی ہے اور یہ نہایت ہی مہربان قوت ہے۔

لیکن اس ابتدائی مفہوم کے بعد جو علوم آگے بڑھتے ہیں تو آیت کے مفہوم و مدلول کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اور زمین کے شق ہونے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ پودوں کی پرورش کے لیے سازگار بنا دی گئی ہے۔ جیسا کہ سابقہ نظریہ میں ہم نے بتایا کہ زمین کے اوپر پانی کے ہولناک طوفان آئے۔ جن کے نتیجے میں زمین کے چھلکے کی چٹانیں ٹوٹ

پھوٹ کر بہہ نکلیں اور ہموار میدان وجود میں آئے' جس کے اندر ایسی مٹی جمع ہو گئی جو قابل زراعت ہے ۔ یہ مفہوم بھی اس آیت میں داخل ہے ۔

ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا (۸۰ : ۲۶) "پھر ہم نے زمین کو پھاڑا" کی آیت ۔

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا (۸۰ : ۲۵) "ہم نے پانی لنڈھایا" کے بعد آتی ہے ۔ اس سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے کہ زمین کا شق ہونا پانی کے بعد ہوا ۔

بہرحال ان آیات کا یہ مفہوم ہو یا کوئی تیسرا مفہوم ہو' بہرحال تخلیق کے تیسرے مرحلے میں نباتات کی تخلیق کا ذکر ہے اور بظاہر ان نباتات کی طرف اشارہ کیا گیا جو انسانوں اور انسانوں کے کام آنے والے مویشیوں کے لئے چارہ کا کام کرتے ہیں اور جن کو ابتدائی انسان بھی اچھی طرح سمجھتا تھا ۔

فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا (۸۰ : ۲۷) "پھر اس میں غلے اگائے" ۔ اس سے تمام حیوانات مراد ہیں ۔ جن کو انسان کسی نہ کسی صورت میں استعمال کرتے ہیں اور جن کو مویشی کسی نہ کسی صورت میں اپنی غذا بناتے ہیں ۔

وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا (۸۰ : ۲۸) "انگور اور ترکاریاں" ۔ انگور تو مشہور ہیں ۔ قضب ان سبزیوں کو کہا جاتا ہے جو سبزی کے طور پر کھائی جاتی ہیں ۔ اور ان کو بار بار کاٹا اور چنا جاتا ہے ۔

وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا (۲۹) وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا (۳۰) وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا (۸۰ : ۳۱) "اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے" ۔ زیتون اور کھجور کے درخت مشہور ہیں اور حدائق حدیقہ کی جمع ہے' یہ اس ثمردار باغ کو کہا جاتا ہے جو دیواروں کے اندر گھرا ہوا ہو اور غلبا غلباء کی جمع ہے' یعنی ایسے باغات جن کے درخت گھنے ہوں اور جن کی شاخیں ایک دوسرے کے اندر گھس گئی ہوں ۔

فَاكِهَةً وہ میوہ جو باغات سے حاصل ہو ۔

اَبًّا (۸۰ : ۳۱) کا مفہوم غالباً وہ جسے انسان چارے کے لیے کاشت و نگہداشت کریں ۔ اس کے مفہوم کے بارے میں حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا ۔ انہوں نے اس کے بارے میں اپنے آپ کو ملامت کیا تھا جیسا کہ سورہ نازعات میں گزر گیا ہے ۔

یہ تو تھا انسان کے طعام کا قصہ' اور انسانی طعام کی تمام ضروریات صرف اللہ فراہم کرتا ہے اور اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہے ۔ اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں بلکہ انسان دخیل ہونے کا مدعی ہی نہیں ہے کہ وہ اس کے مختلف مراحل میں سے کسی مرحلے میں دخیل ہے ۔ یہاں تک کہ زمین کے اندر وہ جو بیج بوتا ہے اس کی نشوونما میں بھی وہ دخیل نہیں ہے ۔ نہ انسان نے بیج پیدا کیا ہے اور نہ ایجاد کیا ہے ۔ ابتدائی طور پر یہ حیوانات کس طرح ایجاد ہوئے' یہ ایک معجزہ

ہے ۔ اور انسانی تصور اور ادراک سے وراء ہے ۔ یہ مٹی انسان کے سامنے ہے اور ایک ہے ' اور ہر دانہ ایک ہی زمین میں اور باہم متصل قطعات میں اپنے اپنے پھل اور پھول لاتا ہے جبکہ ایک ہی پانی اور دوسرے عناصر اسے غذا دیتے ہیں لیکن یہ درست قدرت ہی کا کام ہے کہ پودے اور پھل مختلف ہوتے ہیں ۔ اور ان پودوں اور پھلوں سے آگے جو بیج پیدا ہوتے ہیں ان میں "ماں بیج" کے تمام خصائص موجود ہوتے ہیں ۔ یہ باتیں اور یہ ٹیکنالوجی انسان سے مخفی ہے ۔ اس کا راز کوئی نہیں جانتا ' نہ اس میں کوئی فیصلہ کر سکتا ہے ' اور نہ اس سے کوئی مشورہ لیا جاتا ہے ۔ بہرحال دست قدرت نے جو کچھ کیا وہ یہ ہے اور

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (۸۰: ۳۲) "تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست کے طور پر" ۔ ایک مقررہ وقت تک ۔ اور جب یہ دنیا ختم ہوگی تو یہ سامان زیست بھی ختم ہو گا کیونکہ اللہ نے اسے متاع حیات کے طور پر بنایا ہے ۔ اس کے بعد پھر ایک دوسرا عظیم واقع ہو گا ۔ وہ کیا ہو گا؟ انسان کو چاہئے کہ اس کے واقع ہونے سے قبل ہی اس کے بارے میں غور کرے ۔

فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ ﴿٣٣﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿٣٤﴾ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ﴿٣٥﴾ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ﴿٣٦﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ﴿٣٧﴾ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ ا
وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾ ع ۴۲
۵

"آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز بلند ہوگی ۔ ۔ اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا ۔ ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہو گا ۔ کچھ چہرے اس روز دمک رہے ہوں گے ' ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اڑ رہی ہوگی اور کلونس چھائی ہوئی ہوگی ۔ یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے"۔

یہ دنیا کے ساز و سامان کا خاتمہ ہے ۔ یہ اللہ کی طویل اسکیم ' اور ایک کلی اور جامع تدبیر کے ساتھ موافق ہے ' جس کے مطابق اللہ نے انسان کو مرحلہ وار پیدا کیا اور اس اسکیم کے مطابق آگے بڑھایا اور یوں آغاز کے عین مطابق اس کا خاتمہ ہوا ۔ یہ آخری منظر ابتدائی منظر کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس میں ایک شخص دوڑتا ہوا آیا ' اس کا پیمانہ خوف خدا سے لبریز تھا اور اس کے مقابلے میں ایک شخص تھا جو لاپرواہ اور ہدایت سے منہ موڑنے والا تھا ۔ یہ دونوں کردار اللہ کے پیمانوں میں جو مقام رکھتے تھے اور یہ دونوں کا انجام ہے سورت کے آخر میں :

الصَّاخَّةُ ایک ایسا لفظ ہے جو معنی کے ساتھ ساتھ آواز بھی سخت و کرخت رکھتا ہے ۔ قریب ہے کہ کان کے پردے ہی پھٹ جائیں ۔ یہ لفظ اپنے زور تلفظ سے ہوا کو پھاڑتا ہے ۔ اور کانوں میں آکر پیوست ہو جاتا ہے ۔

یہ لفظ اپنے اس کرخت تلفظ کے ذریعہ اگلے منظر کی راہ ہموار کرتا ہے ' اگلا منظر کیا ہے ۔ یہ منظر ایسا ہے جس میں انسان اپنے عزیز ترین تعلق داروں کو چھوڑ کر بھاگتے نظر آتے ہیں ۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ (٣٤) وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ (٣٥) وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ (٣٦)

(۸۰ : ۳۴ تا ۳۶) "اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں ' اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا"۔ یہی لوگ تھے کہ دنیا میں ان کے یہ روابط کسی حال میں بھی نہ ٹوٹتے تھے لیکن بس ایک سخت و کرخت چیخ ہوگی اور یہ تمام روابط ٹوٹ پھوٹ جائیں گے اور یہ تمام تعلقات کٹ جائیں گے ۔

اس منظر میں خوف محض نفسیاتی خوف ہے ۔ نفس انسانی پر جزع فزع کی حالت طاری ہوگی اور یہ انسان اپنے مقام اور ماحول سے جدا ہو جائے گا ۔ بس وہ اپنی ہی سوچے گا ۔ اس کے سامنے پریشانیوں اور خود اپنے مسائل کا انبار ہو گا ۔ وہ اپنے سوا کسی کے لیے کچھ کرنے کے لائق نہ ہو گا نہ وقت اور قوت ہو گی ۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (۸۰ : ۳۷) "ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہو گا"۔

ان عبارات و کلمات کی تہہ میں غم و اندوہ کے گہرے سائے ہیں ۔ پریشانیوں کی اس سے زیادہ بہتر تعبیر ممکن ہی نہیں ہے ۔ احساس و ضمیر دونوں کے بوجھ کو یہ عبارت کیا خوب ظاہر کرتی ہے ۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (۸۰ : ۳۷) "ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہو گا"۔ (اقتباسات ازمشاهد القیامه)

یہ ہوگی حالت اس دن تمام لوگوں کی جب یہ آواز برپا ہوگی اور یہ ایسی سخت اور کرخت آواز ہوگی کہ کان بہرے ہو جائیں گے ۔ اس روز مومنین کا کیا حال ہو گا اور کافروں کا کیا حال ہو گا؟ اس روز تو سب کو اللہ کے پیمانوں سے ناپا جائے گا اور اللہ کے ترازو سے تولا جائے گا ۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ (٣٨) ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (٣٩) "کچھ چہرے اس روز دمک رہے ہوں گے ' ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے"۔ یہ چہرے روشن چہرے ہوں گے ' ان سے نور برس رہا ہو گا ' خوش ہوں گے ' ہنس رہے ہوں گے ' اپنے رب سے امیدیں وابستہ کیے ہوں گے ' وہ مطمئن ہوں گے کہ ان کا رب ان سے راضی ہے ' یہ اس سخت ہولناک آواز کے خوف سے نجات پا چکے ہوں گے ۔ یہ آواز تو ایسی ہوگی کہ سنتے ہی سب خوشیاں کافور ہو جائیں گی لیکن ان کو چونکہ ان کا انجام بتا دیا جائے گا اس لیے وہ ان ہولناکیوں کے باوجود خوش و خرم اور مطمئن ہوں گے ۔

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ (٤٠) تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (٤١) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (٤٢) (۸۰ : ۴۰ تا ۴۲) "اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اڑ رہی ہوگی اور سیاہی چھائی ہوئی

ہو گی - یہی کافر اور فاجر لوگ ہوں گے"- یہ غبار حزن و ملال کا غبار ہو گا' اور حسرت و یاس کا غبار ہو گا- اور ذلت اور پریشانی کی وجہ سے چہروں پر سیاہی ہو گی - ان کو معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے کیا کمایا ہے' لہٰذا ان کو یقین ہو جائے گا کہ ان کا انجام کیا ہے -

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (۸۰ : ۴۲) "یہ کافر اور فاجر لوگ ہوں گے"- جو اللہ اور اس کی رسالتوں پر ایمان نہیں لائے - جنہوں نے اللہ کی حدود کو توڑا-

یہ دو قسم کے چہرے ہوں گے اور دونوں چہروں کے اندر دو قسم کے لوگوں کا انجام اس طرح دکھایا گیا ہے جس طرح کوئی شیشے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہے - چہروں کے خدوخال الفاظ و عبارات میں اس طرح قلم بند کیے گئے ہیں کہ گویا ریل پر چلتے ہوئے چہرے صاف صاف نظر آتے ہیں - یہ ہے قرآن کا زور دار انداز بیان اور ادبی مچ-

اس انجام سے سورت کا آغاز اور انجام بھی باہم ہم آہنگ ہو جاتے ہیں - آغاز میں اسلامی قدروں کا ذکر تھا' اور انجام میں اسلامی پیمانوں اور اسلامی ترازو کے مطابق لوگوں کا انجام بتایا گیا ہے - چنانچہ اس نہایت ہی مختصر سی سورت میں عظیم حقائق لائے گئے ہیں - بہترین مناظر پیش کیے گئے اور بہترین ہدایات و اشارات دیے گئے ہیں اور یہ سورت اپنے خوبصورت انداز بیان کے ساتھ' اپنے مقاصد کو نہایت خوبصورتی سے ادا کرتی ہے -

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ------ ۳۰

سورۃ التکویر ۔ ۸۱

۱ -- تا -- ۲۹

سورۃ التکویر ایک نظر میں

یہ سورت صرف دو پیروں پر مشتمل ہے ۔ دونوں میں اسلامی نظریہ حیات کے عظیم اور بنیادی حقائق بیان کیے گئے ہیں ۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ جب قیامت برپا ہو گی تو اس سے قبل اس کائنات میں کیا کیا ہولناک تبدیلیاں ہوں گی ۔ یہ تبدیلیاں شمس و قمر' سیاروں اور ستاروں' سمندروں اور پہاڑوں' زمین و آسمان اور چرندوں و پرندوں میں آئیں گی اور انسان تو بہرحال ان عظیم انقلابات سے 'سب سے زیادہ متاثر ہو گا ۔

دوسرے پیرے میں جو عظیم حقیقت بیان کی گئی ہے وہ حقیقت وحی اور اس کے متعلقہ امور ہیں' وہ فرشتے کیسے ہیں جو وحی لاتے ہیں' اس نبی ؐ کا کیا مقام ہے جس پر یہ وحی آرہی ہے اور جن لوگوں کے سامنے یہ پیغام پیش کیا جارہا ہے ان کا ردعمل کیا ہے لیکن یہ اللہ کی مشیت ہے' جس نے ان کو پیدا کیا اور ان کے لیے نزول وحی کا انتظام فرمایا ۔

اس سورت کا عمومی اثر ایسا ہے کہ گویا ایک تباہ کن مصیبت پھوٹ پڑی ہے' جو ہر چیز کو تہ و بالا کر رہی ہے ۔ ہر چیز کو بکھیرتی چلی جاتی ہے' ہر پرسکون چیز میں تلاطم پیدا کر دیتی ہے' ہر پرامن چیز کو خوفزدہ کر دیتی ہے ۔ ہر معمولی اور مروج کام میں گڑبڑ اور تبدیلی پیدا کر دیتی ہے اور نفس انسانی کو اس شدت سے جھنجھوڑ دیتی ہے کہ انسان سخت پریشان ہو جاتا ہے اور اس کا وہ سکون تباہ ہو جاتا ہے جس کا وہ عادی تھا ۔ اس ہولناک اور خوفناک فضا میں اور تیز و تند طوفاں میں نفس انسانی اس طرح ادھر ادھر اڑتا پھرتا ہے جس طرح ایک پر ہوا میں اڑ رہا ہے جس کا کوئی وزن نہیں ہے' نہ ایک جگہ ٹھہر سکتا ہے' نہ کوئی جائے فرار ہے اور نہ پناہ گاہ و قرار ہے ۔ صرف اللہ واحد اور قہار کی پناہ ہے جو وحدہ باقی اور دائم ہے ۔ اور آخری جائے قرار و اطمینان ہے ۔

اس سورت میں ایسا اثر ہے کہ انسان دنیا کے تمام ذرائع سکون و اطمینان کو بھلا دیتا ہے ۔ اور مارے خوف کے صرف اللہ کی پناہ حاصل کرتا ہے اور بھاگ کر اللہ کے ہاں سکون و قرار طلب کرنے لگتا ہے' اسے یقین ہو جاتا ہے اس ذات کبریا کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں ۔

اس کے باوجود یہ سورت حسین و جمیل مناظر کا مرقع ہے ۔ ان مناظر کا تعلق ہماری نظروں کے سامنے موجود کائنات سے بھی ہے ۔ اور عالم آخرت سے بھی ۔ جب اس جہاں کے تمام طور طریقے اور انداز بدل جائیں گے ۔ پوری سورت خوبصورت انداز تعبیر کا بھی نمونہ ہے ۔ جس میں رنگا رنگ مناظر اور سحر آفرینیاں پائی جاتی ہیں' لیکن یہ سب امور اس نہایت ہی مختصر سورت میں سمو دیئے گئے ہیں گویا دریا بحباب اندر ۔ چنانچہ یہ مختلف فیکٹر مردہ احساس کو پار کر کے شعور میں بیٹھ جاتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سورت میں بعض الفاظ ایسے ہیں کہ آج کے عرب قارئین کے لیے بھی مشکل ہیں اور بعض تعبیرات ایسی ہیں جو مالوف نہیں ہیں' ورنہ میں اس سورت کی سرے سے تفسیر ہی بیان نہ کرتا' اور قارئین کو دعوت دیتا کہ

وہ اس سورت کے اثرات ' اس کی تصویر کشی ' اس کی فضا اور مناظر و حقائق سے براہ راست استفادہ کریں ۔ کیونکہ ان چیزوں کی تشریح کسی انسانی زبان میں نہیں کی جا سکتی ۔ اگر کوئی براہ راست سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو یہ سورت دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور خود اپنی تفسیر کرتی ہے لیکن آج کی دور میں قرآن کی سادہ زبان کی تشریح بھی ضروری ہو گئی ہے ہمارے زمانے میں عرب بھی قرآن کی مالوف زبان سے بہت دور ہو گئے ہیں ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۸۱ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۲۹

سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ (٨١) مَكِّيَّةٌ (٧) اٰيَاتُهَا ٢٩ رُكُوْعُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝١ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝٢ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝٣ وَاِذَا
الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝٤ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝٥ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝٦ وَاِذَا
النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝٧ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝٨ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝٩ وَاِذَا
الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝١٠ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝١١ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝١٢ وَاِذَا
الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝١٣ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ۝١٤

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا' اور جب تارے بکھر جائیں گے' اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے' اور جب دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی' اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیئے جائیں گے' اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے' اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑ دی جائیں گی' اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟ اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے' اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا' اور جب جہنم دہکائی جائے گی' اور جب جنت قریب لے آئی جائے گی' اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے"۔

یہ ایک منظر ہے جس میں اس پوری کائنات میں مکمل انقلاب کے نظارے کی عکاسی کی گئی ہے۔ تمام موجودات کے اندر انقلاب برپا ہے' یہ انقلاب اجرام سماوی اور اس کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ وحشی جانور اور خانگی

جانور بھی اس سے متاثر ہیں 'نفس انسانی اور اس کی حرکات بدل چکی ہیں ' ہر نامعلوم حقیقت آنکھوں کے سامنے ہے اور ہر راز طشت از بام ہو چکا ہے ۔ اور انسان اپنی کمائی اور اپنے اس زاد راہ کے سامنے کھڑا ہے اور حساب و کتاب شروع ہے اور حیران و پریشان ہے کہ اس کے ارد گرد ہر چیز اس عظیم طوفان کی زد میں آچکی ہے 'اور کائنات کا تمام نظام اتھل پتھل ہو چکا ہے ۔

یہ عظیم کائناتی واقعات اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ حسین و جمیل اور یہ عظیم کائنات اور اس کا نظام 'جس کی تمام حرکات موزوں اور مرتب ہیں 'جس کی ساخت نہایت ہی مستحکم ہے ۔ اور جس کے اندر قائم کشش نہایت موزوں ہے اور جسے نہایت علیم و حکیم ہاتھوں نے بنایا ہے 'یہ پوری کائنات بکھر بکھر جائے گی 'اس کے اس مستحکم نظام کی بندش کھل جائے گی ۔ جن قوتوں اور جن صفات کی وجہ سے یہ اس طرح چل رہی ہے 'یہ سب جاتی رہیں گی ' غرض یہ پورا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر یہ کائنات اور اس کی مخلوقات ایک نئی زندگی پائیں گے ۔ یہ نئی کائنات اور یہ نئی زندگی موجودہ خصوصیات سے مختلف ہو گی ۔

یہی تصور ہے جو یہ سورت قلب و نظر میں بٹھانا چاہتی ہے تاکہ انسان سوچ لے اور انسانی شعور ان ظاہری اور عارضی مناظر سے ہٹ جائے ۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ بہت ہی مضبوط نظر آئیں اور ان حقائق کو اپنے اندر سمو لے جو باقی رہنے والے ہیں ۔ انسان اس ذات باری کا تصور کرے جو باقی اور لازوال ہے اور وہ ذات اس وقت بھی باقی ہو گی جبکہ یہ پوری کائنات زائل ہو جائے گی اور عظیم حوادث اس کی شکل ہی بدل دیں گے ۔ اس سورت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس ظاہری اور عادی اور صرف نظر آنے والی کائنات کے دائرے سے نکل کر اس مطلق حقیقت اور ذات باری کے ساتھ جڑ جائے جو زمان و مکاں سے وراء ہے جو انسانی احساس اور تصور سے آگے ہے 'جو کسی دائرے اور حد کے اندر محدود نہیں ہے ۔

یہ ہے وہ حقیقی شعور جو ہمارے اندر پیدا ہوتا ہے ۔ جب انسان ان عظیم انقلابی مناظر کو اس سورت میں دیکھتا ہے ۔ اس مشاہدے سے گویا انسان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور اللہ کی عظمت کا شعور ذہن میں بیٹھ جاتا ہے ۔

لیکن عملاً کیا ہو گا؟ تو اس کا علم صرف اللہ کو ہے ۔ ہمارا شعور اور ہمارا تصور بہت محدود ہے ۔ آج ہم ان عظیم انقلابات کا پورا تصور نہیں کر سکتے ۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ سوچ سکتے ہیں کہ اس زمین پر ایک عظیم زلزلہ برپا ہو گا ۔ اور یہ زلزلہ ہر طرف تباہی مچا دے گا اور زمین کے اندر سے ایک ایسا ناقابل کنٹرول آتش فشانی کا عمل ہو گا اور زمین کے اوپر سیارے اور ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں گے اور سمندروں کا پانی طوفانی شکل اختیار کر لے گا اور یہ کہ سورج کے اندر بھی آتش فشانی کا عمل ہو گا اور اس کے شعلے لاکھوں میلوں تک اٹھیں گے اور یہ شاہدات انسان دیکھ بھی سکے گا ۔

لیکن قیامت کے برپا ہونے کے وقت جو کائناتی انقلابات ہوں گے ' ہماری یہ سوچ یہ باتیں اور یہ مشاہدات ان کے مقابلے میں طفل تسلیاں ہیں ۔ اگر ہمارے لیے ان کا سمجھنا ضروری ہے تو ہم صرف ایسی عبارات میں لا سکتے جو ان واقعات کا مجمل سا تصور پیش کریں کیونکہ اس کے سوا ہم اور کچھ بھی نہیں کر سکتے ۔

اِذَ الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (۸۱ : ۱) "جب سورج لپیٹ دیا جائے گا"۔ اس کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور اس کے اندر برپا اشتعال ختم ہو جائے گا ۔ اس وقت سورج کے اندر جلن کا عمل شروع ہے اور اس

سے جو شعلے اٹھ رہے ہیں' وہ اس کے اردگرد ہزاروں میل تک بلند ہوتے ہیں۔ جب سورج گرہن ہوتا ہے تو اس وقت رصد گاہوں سے یہ عمل صاف نظر آتا ہے۔ اس کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ سورج کے اس جلنے کے عمل سے سورج پر موجود تمام مواد ایک اڑتے ہوئے گیس کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور یہ گیس جلتی ہوئی سورج کی فضا میں بلند ہوتی ہے۔ یہ حالت اس طرح نہ رہے گی اور سورج اسی طرح ٹھنڈا ہو جائے گا۔ جس طرح ہماری یہ زمین ٹھنڈی ہو گئی ہے اور اس کے اوپر کوئی التہابی عمل نہیں ہے۔ اس کے سوا سورت کا اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے جو ابھی تک ہمارے علم میں نہیں ہے۔ یہ عوامل کس طرح وجود میں آئیں گے' ان کا علم اللہ ہی کو ہے۔

وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (۸۱: ۲) "اور جب تارے بکھر جائیں گے"۔ یعنی اس بندش کے نظام سے باہر نکل آئیں گے جو اس کائنات کے نظام میں موجود ہے اور جس نے سب کو باہم باندھا ہوا ہے۔ اور یہ کہ ان کی روشنی ختم ہو جائے گی اور وہ تاریک ہو جائیں گے۔ یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کن ستاروں کے ساتھ یہ حادثہ ہو گا۔ یہ تمام ستارے ہوں گے یا ستاروں کا ایک گروہ ہو گا جو ہمارے قریب ہے۔ مثلاً سورج کے قریبی ستاروں میں یہ عمل ہو گا یا ہماری پوری کہکشاں میں یہ عمل ہو گا' جس میں کروڑوں ستارے ہیں۔ یا تمام ستاروں میں **ہو گا** جن کے مقامات و مدارات کا علم بھی اللہ کو ہے اور تعداد کا علم بھی اللہ کو ہے کیونکہ جہاں تک ہماری رصد گاہیں ہمارے مشاہدے کو پہنچاتی ہیں ان سے آگے بھی بے شمار جہاں ہیں۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ ستارے بے نور ہو جائیں گے یا بکھر جائیں گے اور پوری حقیقت کا علم صرف اللہ کو ہے۔

وَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (۸۱: ۳) "جب پہاڑ چلائے جائیں گے"۔ پہاڑوں کے چلائے جانے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے' پیس کر ہوا میں بکھیر دیا جائے گا جیسا کہ دوسری سورت میں ہے۔

وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا (۲۰ : ۱۰۵) "تم سے یہ لوگ پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں تو کہہ دیں کہ تمہارا رب انہیں دھول بنا کر اڑا دے گا"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

وَّ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (۵) فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا (۶) (۵۶ : ۵، ۶) "اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے"۔

وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (۷۸: ۲۰) "اور پہاڑ چلائے جائیں گے یہاں تک کہ وہ سراب ہو جائیں گے"۔

ان سب آیات میں اس طرف اشارہ ہے کہ پہاڑوں کو ایک ایسا حادثہ پیش آئے گا' جس سے ان کی مضبوطی' ان کا باہم پیوست ہونا' اور اپنی جگہ پر برقرار رہنا جاتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس پورے عمل کا آغاز عملی زلزلہ سے ہو۔ اور اس زلزلہ کے بارے میں خود قرآن کریم تصریح کرتا ہے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۱) وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (۲) (۹۹ : ۱ ، ۲) "جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی"۔ یہ سب واقعات قیامت کے طویل دن میں رونما ہوں گے۔

وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۸۱ : ۴) "اور جب دس مہینے کی حاملہ اونٹنیاں اپنے حال پر چھوڑ دی جائیں گی"۔ العشار ' ان اونٹنیوں کو کہتے ہیں جو حاملہ ہوں اور حمل کے دس مہینے ہو چکے ہیں۔ عربوں کے نزدیک اس سے بہتر اور کوئی ملکیت نہ تھی۔ اس کی وہ بہت زیادہ دیکھ بھال کرتے تھے کیونکہ وہ قریب زمانے میں بچہ دینے والی ہوا کرتی تھی اور پھر دودھ دیتی اور اس کی افادیت قریب ہوتی۔ جس دن یہ عظیم انقلابات ہوں گے لوگ گھبراہٹ کی وجہ سے ایسے قیمتی مال کو بھی چھوڑ کر بھاگ نکلیں گے۔ کوئی بھی ایسے قیمتی مال کی طرف متوجہ نہ ہو گا۔ جس دور کے لوگوں سے قرآن مخاطب تھا ' خصوصاً عرب ' وہ ایسے مال کو ہرگز نہ چھوڑتے تھے الا یہ کہ ان پر کوئی عظیم مصیبت آ جائے۔

وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (۸۱ : ۵) "اور جب جنگل کے جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیئے جائیں گے"۔ یہ وحوش جو انسانوں سے اور خود ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں۔ ایسے خوفزدہ ہوں گے اور اس طرح ایک جگہ جمع ہو جائیں کہ بجائے پہاڑوں میں بکھرنے کے اور اپنے اپنے سوراخوں ' غاروں اور بلوں میں گھسنے کے ' جو ان کا معمول ہوتا ہے ' ایک جگہ جمع ہوں گے ' نہ ان کو انسانوں سے خوف ہو گا اور نہ ایک دوسرے سے۔ درندے اپنے شکار کو بھول جائیں گے ' ادھر ادھر بھاگتے پھریں گے اور اپنے غاروں میں پناہ نہ لیں گے جیسا کہ بالعموم وہ ایسے بلوں میں گھس جانے کے عادی ہوتے ہیں۔ نہ شکاری درندہ شکار کے پیچھے بھاگے گا اور یہ حالت اس لیے ہوگی کہ یہ سب درندے اور پرندے خوفزدہ ہوں گے اور یوں اپنی حاجت ہی چھوڑ دیں گے۔ اگر حیوانوں کی یہ حالت ہوگی تو انسانوں کا کیا کہنا ہے۔

وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۸۱ : ۶) "اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے"۔ سجرت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ سمندروں کو پانی سے بھر دیا جائے گا۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ سمندروں میں یہ پانی اس طرح آئے گا جس طرح بادلوں اور بارشوں کے طوفان زمین پر حملہ آور ہوئے ' جبکہ زمین سرد ہوئی اور اس کا چھلکا سخت ہوا۔ جس کا ذکر ہم نے سورہ نازعات میں کیا یا یوں کہ زمین میں جب زلزلے پیدا ہوں گے اور آتش فشانی کا عمل ہو گا تو سمندر کے درمیان سے خشکی ختم ہو جائے گی اور سمندر ایک دوسرے کے اوپر چڑھ دوڑیں گے۔ یا اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان میں آگ لگ جائے گی اور وہ پھٹ پڑیں گے جیسا کہ دوسری جگہ میں ہے۔

وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ (۸۲ : ۳) "اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے"۔ سمندروں کے پھٹنے کی عملی شکل یوں ہو سکتی ہے کہ پانی کے اجزاء ہائیڈروجن اور آکسیجن ایک جگہ جمع ہو جائیں یا ان کے اجزاء اس طرح پھٹ جائیں جس طرح ذرات اور ایٹم پھٹ جاتے ہیں۔ اور یہ شکل نہایت ہی ہولناک ہو گی ' جب یہ صورت ہو گی تو ایک ناقابل تصور آگ ان سمندروں میں شعلہ زن ہو جائے گی۔ ایک محدود تعداد میں اگر ایٹمی یا ہائیڈروجن کا دھماکہ ہو جائے

تو اس سے بھی ایک ہولناک دھماکہ ہوتا ہے' لیکن اگر تمام سمندروں کے ذرات پھٹ جائیں تو انسان اس ہولناک دھماکے کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اس سے کس قدر عظیم جہنم برپا ہو جائے گا۔

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (۷:۸۱) "اور جب جانیں جوڑ دی جائیں گی"۔ اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ تمام روحیں' اجسام کے ساتھ ملا دی جائیں گی' اور ان کو دوبارہ ملا کر از سرنو زندہ کر دیا جائے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ معنی یہ ہو کہ لوگوں کے باہم متجانس گروپ بنا دیئے جائیں گے جیسا کہ دوسری جگہ آتا ہے۔

وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً (۵٦ : ۷) "اور تم تین گروپ ہو گے"۔ یعنی مقربین الٰہی کا گروپ' دائیں بازو والے اور بائیں بازو والے یا کسی اور اصول تقسیم کے مطابق لوگوں کو ملا دیا جائے گا۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ (۸) بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (۸۱: ۹) "اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی"۔ دور جاہلیت میں انسانیت کی تذلیل اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ لوگوں میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا عام رواج تھا۔ یہ حرکت وہ دو وجوہات سے کرتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اس بات کو عار سمجھتے تھے کہ ان کی لڑکیاں کسی کی بیوی یا لونڈیاں بنیں۔ دوسری وجہ یہ تھی وہ فقر اور غربت سے ڈرتے تھے۔ قرآن کریم نے اس عادت بد کو قلم بند کر کے دور جاہلیت کی اس برائی کو ہمیشہ کے لیے ریکارڈ کر دیا۔ کیونکہ اسلام آیا ہی اس لیے تھا کہ عربوں اور پوری انسانیت کو اس پستی سے نکال دے۔ اور انسانیت کو ترقی اور رفعت عطا کرے۔ قرآن کہتا ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۵۸) يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۵۹)(١٦: ۵۸ - ۵۹) "اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے۔ دیکھو کتنے برے حکم ہیں جو یہ خدا کے بارے میں لگاتے ہیں"۔ اور دوسری جگہ ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۱۷) اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ (۱۸)(۴۳: ۱۷ - ۱۸) "اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کی یہ لوگ اس خدائے رحمٰن کی طرف نسبت کرتے ہیں' اس کی ولادت کا مژدہ اگر

جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے ' اور وہ غم سے بھر جاتا ہے ۔کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے ۔ اور بحث اور حجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح بھی نہیں کر سکتی"۔ اور تیسری جگہ یہ فرمایا۔

وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (۱۷ : ۳۱) "اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو' ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی ۔ در حقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے"۔

یہ رسم عملاً نہایت سنگدلی سے پوری کی جاتی تھی ۔ بیٹی کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ ایک صورت یہ ہوتی کہ جب بچی چھ سال کی ہو جاتی تو باپ ماں سے کہتا کہ لڑکی کو تیار کرو' میں اسے ماموں کے گھر لے جاتا ہوں ۔ اس سے قبل وہ کسی خالی جگہ اس کے لیے کنواں کھود چکا ہوتا تھا۔ جب لڑکی کو لے جا کر کنویں پر پہنچا تو کہتا کہ کنویں میں دیکھو اور اسے کنویں میں گرا دیتا اور اوپر سے مٹی گرا دیتا۔ بعض اقوام میں رواج یہ ہوتا کہ جب کسی عورت کی ولادت کا وقت آتا تو اسے ایک گڑھے کے کنارے بٹھایا جاتا۔ اگر ولادت بیٹی کی ہوتی تو اسے گڑھے میں گرا دیتی ۔ اور اگر بیٹا ہوتا تو لے کر گھر آ جاتی۔ اگر کوئی خاندان بیٹی کو زندہ درگور کرنے کا ارادہ نہ کرتا تو اسے نہایت ہی بری حالت میں رکھا جاتا اور جب وہ اونٹ چرانے کے قابل ہوتی تو اسے اون یا بالوں سے بنا ہوا ایک جبہ پہنا دیا جاتا اور دیہات میں بھیج دیا جاتا کہ اونٹ چرائے ۔

جو لوگ بیٹیوں کو زندہ درگور نہ کرتے اور ان سے اونٹ بھی نہ چرواتے تو وہ دوسرے ذرائع سے ان کو زندہ درگور رکھتے ۔ جب بیچاری کسی کے نکاح میں آتی اور خاوند مرجاتا تو خاندان کا سرپرست آتا اور اس کے سر پر کپڑا ڈال دیتا۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس عورت کے ساتھ کوئی شخص نکاح نہیں کر سکتا۔ اگر اسے خود پسند آتی تو اس کے ساتھ شادی کر لیتا چاہے وہ اس شادی کو پسند کرتی یا نہ کرتی ۔ اگر یہ اسے پسند نہ ہوتی تو بھی وہ اسے روکے رکھتا یہاں تک کہ مرجاتی اور یہ اس کی وراثت پاتا۔ الا یہ کہ اپنا مال دے کر یہ عورت اپنے آپ کو آزاد کرالیتی ۔ بعض لوگ ایسے تھے کہ عورت کو اس شرط پر طلاق کرتے تھے کہ وہ صرف اس جگہ نکاح کرے گی جہاں ان کی مرضی ہوگی الا یہ کہ وہ فدیہ دے کر اس شرط کو ساقط کروا دیتی ۔ بعض اوقات یوں ہوتا کہ اگر خاوند مرجاتا تو بیوی کو خاندان کے چھوٹے بیٹوں کے لیے روک رکھتے ۔ لڑکا بالغ ہوتا اور نکاح کرتا۔ اگر کسی کی سرپرستی میں یتیم لڑکی ہوتی تو وہ اسے نکاح کرنے نہ دیتا تاکہ اس کی سرپرستی ختم نہ ہو جائے اور اس لیے کہ اگر اس کی بیوی مرجائے تو یہ اس کے ساتھ نکاح کرلے ۔ یا اپنی چھوٹی اولاد کے ساتھ نکاح کرلے ۔ یہ کام وہ محض مالی لالچ میں کرتے ۔ یا اگر لڑکی اچھی ہوتی تو اسے خوبصورتی کی وجہ سے روک لیتے۔

بہرحال جاہلیت کے زمانے میں عورت بیچاری کے یہ شب و روز تھے ۔ جب اسلام آیا تو اس نے ان تمام عادات و رسومات کی سخت مذمت کی ۔ اس نے لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی مذمت میں بہت مبالغہ کیا۔ اور یہ بتایا کہ قیامت کے میدان میں اٹھنے والے سوالات میں سے یہ ایک اہم سوال ہو گا۔ اور اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان ہولناک مناظر میں کیا ہے جن سے اس کائنات کا پورا نظام درہم برہم ہو گا' گویا یہ بھی ایک ایسا حادثہ تھا جس سے عمرانی نظام درہم برہم ہوتا ہے ۔ اگر زندہ درگور کی جانے والی لڑکی سے بھی باز پرس ہوگی کہ اس کے ساتھ یہ فعل کیوں ہوا؟ تو جس شخص نے اس فعل شنیع کا ارتکاب کیا اس سے تو لازماً سوال ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی جاہلی نظام میں عورت عزت کا مقام حاصل نہیں کر سکتی تھی ۔ اگر اسلامی شریعت نے اور اسلامی نظام زندگی نے جنس بشر کو کرامت اور عزت عطا نہ کی ہوتی ۔ اور اس تکریم اور اعزاز میں مرد اور عورت کو برابر نہ کیا ہوتا' اور یہ نہ کہا ہوتا کہ انسان کے اندر اللہ نے اپنی روح پھونکی تو عورت کو یہ اعزاز کبھی نصیب نہ ہوتا جو اسلام نے اسے عطا کیا ہے ۔ عورت عزت و شرف کی زندگی صرف اسلامی نظام سے حاصل کر سکتی ہے ۔ اس کے سوا کسی اور عائلی اور زندگی سے اسے عزت و شرف نہیں مل سکتا ۔ نہ کسی معاشرے سے مل سکتا ہے ۔

اس طرح انسانیت کو جو ایک نیا جنم ملا وہ ان اقدار کی بدولت ممکن ہوا جو آسمانوں سے طے ہو کر آئی تھیں' اس کے نتیجے کے طور پر اس دنیا میں عورت کو بھی اپنا مقام ملا ۔ چنانچہ عورت کے فطری ضعف کی وجہ سے' اس کی مادی زندگی کی ضروریات' اس کے خاوند پر رکھی گئی ہیں' اس کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت اور اس کے وزن اور مقام میں کوئی کمی نہیں آتی ۔ اس لیے کہ اسلامی نظام میں مادی زندگی کی اس قدر اہمیت نہیں ہے ۔ اسلامی نظام میں اصل وزن روحانی اقدار کا ہے جن کا تعلق اللہ سے ہے اور روحانی اقدار کے اعتبار سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے ۔

جب وہ دلائل گنے جائیں کہ یہ دین اللہ کی طرف سے ہے اور جس ذات بابرکات نے یہ دین پیش کیا ہے وہ اللہ کے رسول ہیں' تو اسلام نے عورت کو جو مقام دیا ہے' وہ ان دلائل میں سرفہرست ہو گا ۔ اس لیے کہ جس دور میں اسلام نے عورت کو یہ مقام دیا اس میں ایسی کوئی علامت' کوئی تحریک یا کوئی سماجی مطالبہ اور ایسا نہ تھا کہ عورت کو یہ مقام دیا جانا چاہئے ۔ نہ کوئی معاشی تحریک تھی اور نہ کوئی معاشرتی دباؤ تھا کہ عورت کو یہ مقام دیا جائے' یہ خالص اسلامی نظام تھا جس نے خالص وحی الٰہی کے تحت یہ کارنامہ سرانجام دیا ۔ اسلام نے محض ربانی ہدایات کے مطابق عورت کو جاہلیت کی اس پستی سے نکال کر مقام بلند دیا اور اس کی زندگی کے حالات ہی بدل کر رکھ دیئے ۔

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (۸۱ : ۱۰) "اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے"۔ صحف سے مراد نامہ اعمال ہے ۔ نشر ہونے سے مراد یہ ہے کہ جب سب لوگوں کے اعمال نامے خفیہ نہ رہیں گے کھل کر سب لوگوں کے سامنے آ جائیں گے اور نہ ناقابل فہم رہیں گے ۔ اور ان کا یہ انکشاف ہی بدکاروں کے لیے سوہان روح ہو گا ۔ کیونکہ کئی ایسی خفیہ برائیاں ہوں گی کہ اگر ان کا انکشاف ہو تو بدکار کے لیے سخت شرمندگی کا باعث ہو گا اور وہ پگھل کر رہ جائے لیکن اس کا کیا حال ہو گا کہ جب اس وقت اس کے تمام اعمال لوگوں کے سامنے ہوں گے ۔

اعمال ناموں کا نشر ہونا اور رازوں کا کھل جانا بھی اس دن کی ہولناکی میں اضافہ کر دے گا اور یہ دنیا کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب ہو گا کہ راز کھل جائیں گے اور لوگوں کے وہ پوشیدہ راز بھی ظاہر ہوں گے جو سینوں میں ہوں گے ۔

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ (۸۱ : ۱۱) "اور جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا"۔ اعمال نامے تو زمین کے حالات پر مشتمل ہوں گے' ان کے مقابلے میں آسمانوں کے حالات بھی کھل کر سامنے آ جائیں گے ۔ لفظ آسمان کا پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ ہمارے سروں پر جو نیلگوں پردہ ہے' یہ ہٹ جائے گا ۔ یہ کس طرح ہٹ جائے گا تو اس کی کیفیت کا علم اللہ ہی کو ہے ۔ بہرحال ہمارے سروں پر جو نیلا گنبد نظر آتا ہے یہ نظر نہ آئے گا اور کوئی اور ہی منظر ہو گا ۔

اور اب آخری منظر' اس دن کے مناظر میں سے آخری منظر یوں ہو گا ۔

وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ (۱۲) وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ (۸۱: ۱۳) "اور جب جہنم دہکائی جائے گی اور جب جنت قریب لائی جائے گی"۔ یعنی جب جہنم میں آگ جلے گی اور اسے خوب دھکایا جائے گا اور اس کے شعلے زیادہ ہوں گے اور اس کا جوش و خروش اور حرارت زیادہ ہو جائے گی۔ یہ جہنم کہاں ہے اور کس طرح دھکائی جائے گی؟ کیا ایندھن استعمال ہو گا' ہمارے پاس اس سلسلے میں صرف ایک آیت ہے۔

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ "اس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے"۔ یہ حالت تو اس وقت کی ہو گی جب اہل جہنم کو اس کے اندر پھینک دیا جائے گا۔ اور جب جنت قریب کر دی جائے گی' اور جن لوگوں کو جنت میں داخل ہونا ہے' یہ ان کے سامنے آ جائے گی' اور ان پر واضح ہو جائے گا کہ اب تو وہ بسہولت اس میں داخل ہوں گے تو ایسی صورت میں اسے "مزلفہ" کہا جاتا ہے یعنی قریبہ اور اس حال میں کہ وہ تیار اور آراستہ ہے اور اب چند قدم لینے کی دیر ہے' چند بے ترتیب قدم بھی پہنچا سکتے ہیں۔

جب اس کائنات میں' جب عالم اشیاء میں' خواہ زندہ ہوں یا جمادات ہوں یا نباتات' میں اس قدر انقلاب آ جائے گا' تو اب کسی کو کیا شک رہے گا کہ یہ مرحلہ آنے ہی والا ہے' ہر شخص کو یقیناً اپنے اعمال یاد آ جائیں گے' وہ اعمال جو کسی نے اس دن کے لیے تیار کیے' جو وہ لے کر آیا یا پیش کرنے کے لیے' جو تیار کیے حساب اور جواب حساب کے لیے۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ (۸۱: ۱۴) "اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے"۔ اس خوفناک دن کے اندر ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کے پاس کیا ہے اور اس کے ذمہ کیا ہے' اس روز اس کو معلوم ہو جائے گا اور اس کی حالت یہ ہو گی کہ وہ کانپ رہا ہو گا اور اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اب وہ اپنے اعمال نامے میں کچھ بھی تغیر و تبدل نہیں کر سکے گا۔ نہ اس میں کوئی زیادتی ہو گی اور نہ کمی ہو گی' اسے یہ بات ایسے حالات میں معلوم ہو گی کہ وہ دنیا سے کٹ چکا ہو گا' مستقبل کے بارے میں ان کے جو تصورات تھے' وہ نہ رہے۔ وہ دنیا سے کٹ گئے اور دنیا ان سے دور ہو گئی۔ ہر شے متغیر ہو گئی اور ہر شے بدل سی گئی ہے۔ آج تو صرف ذات باری ہی قائم و دائم ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ لوگ اس دنیا ہی میں رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے تاکہ قیامت میں بدلتے ہوئے حالات میں بھی اللہ ان کے سامنے موجود ہوتا۔

ان موثر اشارات پر یہ پہلا پیراگراف ختم ہوتا ہے اور انسانی احساس کو گہرے شعور سے بھر دیتا ہے اور قیامت کے مناظر انسان کے ذہن میں بیٹھ جاتے ہیں اور انقلاب مکمل ہوتا ہے۔

اب دوسرا پیراگراف آتا ہے' اس میں اس کائنات کے خوبصورت ترین مناظر کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ اس کے لیے نہایت ہی خوبصورت تصورات چنے گئے ہیں۔ وحی کیا ہے' اس پر قسم ہے' منصب رسالت اور وہ فرشتے کیسے ہیں جو اس کو لے کر آ رہے ہیں اور اس قرآن کے مقابلے میں لوگوں کا جو ردعمل ہے وہ بھی دائرۂ مشیت الٰہیہ میں ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِيْ

قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿٢٠﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِيْنٍ ﴿٢١﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ
بِمَجْنُوْنٍ ﴿٢٢﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿٢٣﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿٢٤﴾
وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿٢٥﴾ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿٢٦﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ
ا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٧﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿٢٨﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ
ع۲۹ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٩﴾

٦ "پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پلٹنے والے اور چھپ جانے والے تاروں کی، اور رات کی جبکہ وہ تاریک ہوئی اور صبح کی جبکہ اس نے سانس لیا، یہ فی الواقع ایک بزرگ پیغام بر کا قول ہے، جو بڑی توانائی رکھتا ہے، عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے، وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے، وہ بااعتماد ہے، اور (اے اہل مکہ) تمہارا رفیق مجنون نہیں ہے، اس نے اس پیغامبر کو روشن افق پر دیکھا ہے۔ اور وہ غیب (کے اس علم کو لوگوں تک پہنچانے) کے معاملہ میں بخیل نہیں ہے۔ اور یہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے۔ پھر تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو؟ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے، تم میں سے ہر اس شخص کے لیے جو راہ راست پر چلنا چاہتا ہو اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے"۔

الْخُنَّسِ – الْجَوَارِ – الْكُنَّسِ تینوں سے مراد ستارے ہیں۔ الخنس وہ ستارے جو اپنے دورۂ فلکی میں پلٹتے ہیں، الجوار جو چلتے ہیں اور الکنس، جو چھپتے ہیں۔ انداز بیان کے استعارات ان ستاروں کو ہرنوں کی طرح زندگی کی خصوصیات بخش دیتے ہیں، جو پلٹتی ہیں، دوڑتی ہیں اور اپنے غار میں گھس جاتی ہیں۔ ایک طرف سے دوسری طرف لوٹ جاتی ہیں، یہ ستارے گویا زندہ ہرنوں کی طرح دوڑتے گھومتے اور زندہ نظر آتے ہیں۔ انداز تعبیر ان ستاروں کی حرکت کو ایک حسن رفتار عطا کر دیتا ہے۔ اور ان کے ظہور میں بھی جمال نظر آتا ہے۔ اور فضا میں بھی اس کا جمال ہے۔ چھپنا بھی خوبصورت اور نمودار ہونا بھی خوبصورت۔ دوڑنا بھی اچھا اور مڑنا بھی اچھا۔ پھر الفاظ بھی خوبصورت اور ان کا تلفظ بھی پر نغمہ اور پر ترنم اور خوبصورت۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔

وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ (۸۱:۱۷) "رات کی جب وہ تاریک ہوئی"۔ لیکن لفظ عسعس میں بھی مفہوم کی طرف اشارے ہیں۔ عس کے معنی اندھیرے میں ہاتھ پاؤں کے ساتھ چلنے کے ہیں جبکہ آنکھوں سے کچھ نظر نہ آتا ہو گویا رات تاریکی میں چل رہی ہے۔ یہ نہایت ہی خوبصورت انداز گفتگو ہے۔

وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (۸۱:۱۸) "اور صبح جب اس نے سانس لیا" بھی ایک زندہ بلکہ تابندہ انداز تعبیر ہے اور اس میں زیادہ اشاریت ہے۔ سپیدہ صبح گویا زندہ ہے اور سانس لے کر نمودار ہوتا ہے۔ روشنی گو صبح کی سانس ہے اور صبح کے وقت وحوش و طیور اور انسانوں کی حرکت اس کی علامت زندگی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں

عربی زبان کے خوبصورت ترین اسالیب اظہار کے اندر سپیدۂ صبح کی نمو داری کے لیے کوئی ایسا خوبصورت فقرہ نہیں ہے۔ زندہ حساس دل صبح کو دیکھ کر یہ شعور اچھی طرح پا لیتا ہے کہ یہ صبح سانس لے رہی ہے اور جب ایسا حساس دل پھر قرآن کی اس آیت کو پڑھتا ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ یہ بھی میرے دل میں تھی۔

جو شخص اسالیب کلام کو سمجھنے کا ذوق رکھتا ہے اور وہ اچھی منظر کشی اور تصویر کشی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے' وہ جب یہ آیت پڑھتا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ (۱۵) الْجَوَارِ الْكُنَّسِ (۱۶) وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ (۱۷)

وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (۱۸) (۸۱: ۱۵ تا ۱۸) "پس نہیں' میں قسم کھاتا ہوں پلٹنے والے اور چھپ جانے والے تاروں کی' اور رات کی جبکہ وہ تاریک ہوئی اور صبح کی جبکہ اس نے سانس لیا"۔ تو اسے معلوم ہوگا کہ یہ عبارت شعور و معانی اور انداز تعبیر کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے اندر رکھتی ہے اور جن کائناتی حقائق کی طرف اس میں اشارہ ہے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کائناتی حقائق کو ایک تیز احساس اور شعور کے ساتھ لیا گیا ہے۔

یہ کائناتی مناظر جن کو زندگی کا لباس پہنایا گیا ہے۔ اور ایک زندہ اور خوبصورت اسلوب بیان کے ذریعہ ان کی روح انسانی روح کے ساتھ ملا دی گئی ہے۔ یہ مناظر انسان کی روح پر اس کے حقیقی اسرار و رموز کھولتے ہیں' اور اس قوت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ان سب چیزوں کے پیچھے کار فرما ہے۔ اور جس ایمانی حقیقت کی طرف بلایا جا رہا ہے' یہ مناظر اس کے زمزمہ خواں ہیں۔ اس کے بعد اس حقیقت کو نہایت ہی بہترین حالات میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ اسے یاد رکھا جائے اور انسانی فطرت اس کا استقبال کرے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۱۹) ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ (۲۰) مُّطَاعٍ

ثَمَّ اَمِيْنٍ (۲۱) (۸۱: ۱۹ تا ۲۱) "یہ فی الواقعہ ایک بزرگ پیغام بر کا قول ہے' جو بڑی توانائی رکھتا ہے' عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے' وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے' وہ بااعتماد ہے"۔ یعنی یہ قرآن مجید جو آپ لوگوں کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے' خصوصاً یہ قیامت کی ہولناکیاں جو بیان کی جا رہی ہیں' یہ رسول مکرم کا قول ہے' یعنی جبرئیل علیہ السلام کا جو خدا کے فرستادہ ہیں اور جنہوں نے اس بات کو بحفاظت پہنچایا ہے اور گویا قرآن پہلے خدا کا قول ہے اور پھر جبرئیل کا قول ہے کہ انہوں نے بطور پیغام الہی دہرایا ہے۔

اور یہ پیغام لانے والا' جس کے ذمہ اس اہم پیغام کو آسمانوں سے نیچے پہنچانے کی ذمہ داری لگائی گئی وہ کیسی شخصیت ہے؟ یہ اللہ کے ہاں نہایت مکرم ہے اور اللہ کا یہ کہنا ہے کہ وہ نہایت ہی پختہ صلاحیتوں والا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے پیغام کو پہنچانے کے لیے جس فرشتے کی ذمہ داری تھی اسے اس بات کی ضرورت تھی کہ اسے اس کام کے لیے توفیق عطا ہو۔ اس کا اللہ کے ہاں مقام و مرتبہ بلند ہو اور عرش عظیم کے مالک کے ہاں وہ مکرم ہو اور مقرب ہو اور امین اور قابل اعتماد ہو' جو بات اسے دی گئی اسے پوری طرح پہنچاتا بھی ہو اور پہنچا بھی سکتا ہو۔

ان کی صفات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام نہایت مہتم بالشان ہے۔ بلند مرتبہ اور اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر کس قدر مہربانی فرمائی ہے کہ انسان کی ہدایت کے لیے قرآن نازل کرنے کے لیے اس قسم کا پیغامبر مقرر کیا ہے جو نبی مختار تک یہ پیغام پہنچاتا ہے۔ یہ اس قدر عظیم مہربانی اور عنایت ہے کہ اگر انسان اس پر غور کرے تو وہ پانی پانی ہو جائے کہ رب کائنات انسان پر اس قدر کرم فرماتا ہے کہ اللہ کی مخلوقات میں انسان مکرم' اس پر آنے والا پیغام مکرم اور لانے والا فرشتہ مکرم' اور جس نبی پر وہ آیا وہ نبی مختار مکرم ہے۔

یہ صفت تو اس پیغام لانے والے کی ہے جو اللہ کا کلام لایا اور نبی مختار کے حوالے کیا۔ اور اس رسول کا مقام کیا ہے جو لوگوں کے پاس یہ پیغام لے کر آیا ہے تو وہ تو تمہارے ساتھی اور بھائی ہے۔ ایک طویل عرصہ تک تمہارے اندر رہا ہے لہٰذا یہ بات قابل تعجب ہے کہ جب وہ تمہارے پاس یہ کلام عالیشان لے کر آیا تو تم نے اس پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ اور اس کے بارے میں تم نے مختلف روپے اختیار کر لیے حالانکہ وہ تمہارے ساتھی ہیں' جس کے بارے میں تمہیں پوری پوری معلومات ہیں' وہ تمہیں جو غیب کی باتیں بتاتے ہیں ان کے سلسلے میں وہ نہایت امین ہیں۔

وَ مَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ(٢٢) وَ لَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ(٢٣) وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ(٢٤) وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ(٢٥) فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ(٢٦) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ(٢٧) لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ(٢٨) وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ(٢٩) (٨١: ٢٢ تا ٢٩) "یہ تمہارا رفیق مجنوں نہیں ہے' اس نے اس پیغامبر کو روشن افق پر دیکھا ہے' اور وہ غیب کے معاملے میں بخیل نہیں ہے اور یہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے' پھر تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو' یہ تو سارے جہاں والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ تم میں سے ہر اس شخص کے لئے جو راہ راست پر چلنا چاہتا ہو اور تمہارے چاہے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے"۔ یہ لوگ نبی کریمؐ کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے' یہ بھی جانتے تھے کہ آپ انتہائی عقلمند آدمی ہیں' سچے اور امین ہیں اور ثابت قدم اور راہ راست پر ہیں' لیکن اس کے باوجود وہ کہتے تھے کہ آپ پاگل ہیں اور یہ کہ آپ جو باتیں فرماتے ہیں۔ آپ پر یہ شیطان القاء کرتا ہے۔ اور یہ باتیں وہ لوگ نبی کریمؐ کے خلاف بطور سازش کرتے تھے جس کی تفصیلات کتب احادیث میں موجود ہیں اور بعض لوگ قرآن کریم کے کلام عالی سے مرعوب ہو کر ایسا کرتے تھے کہ کوئی انسان ایسا کلام پیش نہیں کر سکتا۔ نہ انہوں نے کسی انسان سے ایسا کلام سنا تھا۔ پھر ان کے اندر یہ تصور بھی تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان لگا ہوتا ہے اور وہ شاعروں پر یہ کلام القاء کرتا ہے اور ان کا یہ تصور بھی تھا کہ کاہنوں کے ساتھ بھی شیاطین لگتے ہوتے ہیں' ان پر بھی وہ غیب کی باتیں القاء کرتے ہیں۔ اور یہ بات بھی ان میں عام تھی کہ بعض اوقات شیطان بعض لوگوں کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ اور ان کی زبان پر وہ اپنی بات کرتا ہے۔ لیکن اس کلام عالی شان کی سچی تاویل اور تعبیر کرنے کے لیے وہ بہرحال تیار نہ تھے کہ یہ کلام رب العالمین کی طرف سے ہے۔

چنانچہ اس پیراگراف میں قرآن نے ان کو اس کائنات کی خوبصورتی کی طرف متوجہ کیا' اس کائنات کے زندہ اور تابندہ مناظر پر غور کرنے کی دعوت دی اور اس کے ذریعہ ان کے ذہن میں یہ تصور بٹھایا کہ یہ قرآن بھی اس کائنات کی طرح ایک بدیع اور بے مثال کلام ہے۔ اور اس ذات کی طرف سے ہے جو اس کائنات کی خالق ہے۔ جس نے جس طرح اس کائنات میں جمال رکھا ہے اسی طرح قرآن میں بھی جمال رکھا ہے۔ جس کی کوئی مثال نہیں۔ چنانچہ قرآن نے قرآن کے حامل فرشتے' قرآن کے مبلغ رسول کی صفات بیان کیں کہ یہ رسول تو تمہارا ساتھی ہے' تم اسے جانتے ہو۔ اس میں مجنون ہونے کی کوئی صفت نہیں ہے اور اس نے اپنی آنکھوں سے اس فرشتے کو دیکھا ہے' جو اس پر کلام لایا ہے۔ اس وقت وہ فرشتہ افق پر چھایا ہوا تھا اور رسول کو حق الیقین تھا کہ یہ فرشتہ ہے' فرستادۂ رب العالمین ہے اور جو غیب کے علوم حضورؐ پر آتے ہیں آپ نہایت امانت سے پہنچاتے ہیں۔ ان باتوں میں کوئی مشکوک بات نہیں ہے۔ خود تم نے بھی رسول اللہ سے کبھی کوئی غلط بات نہیں سنی۔

وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (۸۱: ۲۵) "اور یہ شیطان مردود کا قول نہیں ہے"۔ اس لیے کہ شیطان اس قسم کا سیدھا راستہ لوگوں کو نہیں بتلایا کرتا۔ اللہ تعالیٰ نہایت تنبیہہ کے انداز میں پوچھتے ہیں کہ تم کدھر جا رہے ہو؟

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ (۸۱: ۲۶) "پھر تم کدھر چلے جا رہے ہو؟" تم کس قدر غلط فیصلہ کرتے ہو' کس قدر بودی بات کرتے ہو؟ حق سے منہ موڑ کر کدھر جا رہے ہو؟ حالانکہ حق اور سیدھا راستہ تمہارے سامنے ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۸۱: ۲۷) "یہ تو سارے جہاں والوں کے لیے ایک نصیحت ہے"۔ یہ ایک یاد دہانی ہے اور ان کو بتاتی ہے کہ تمہارے وجود کی حقیقت کیا ہے؟ تمہاری پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ تمہارے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کا مقصد کیا ہے؟ یہ دعوت تو ایک عالمی دعوت ہے۔ اگرچہ یہ دعوت اس وقت دشمنوں کے نرغے میں ہے لیکن یہ دراصل ایک عالمی تحریک ہے۔ یہ آیت اس بات پر شہادت ہے کہ دعوت اسلامی اپنے آغاز ہی سے ایک عالمی دعوت تھی۔

اس کے بعد ان کو بتایا جاتا ہے کہ ہدایت اور نصیحت ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اس کی طرف آگے بڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ چونکہ اللہ نے تمہیں یہ سہولیات فراہم کر دی ہیں' اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تم ارادہ کر لو اور اس راستے پر چل نکلو۔ اگر تم نہ چلوگے تو تم سے بازپرس ہوگی۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (۸۱: ۲۸) "تم میں سے ہر اس شخص کے لیے جو سیدھے راستے پر چلنا چاہے"۔ یعنی جو راہ ہدایت لینے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اللہ کی طرف چلنا چاہتا ہو۔ کیونکہ اس کلام کے بعد تو اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ اللہ کا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے۔ اس کلام اور تذکرہ کے بعد تو تمام عذرات ساقط ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ کلام ایک صحیح اور سلیم دل پر راہ راست آشکارا کر دیتا ہے۔ لہٰذا اب جو راہ راست سے انحراف کرے گا اس

سے باز پرس ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ انفس و آفاق میں اشارات ایمان اور دلائل ہدایت اس قدر کثرت سے ہیں کہ ہر انسان بمشکل ان کے دائرہ اثر سے اپنے آپ کو نکالتا ہے اور اس کے لیے اسے عمداً سعی کرنی پڑتی ہے۔ ہر انسان پر ان دلائل کا زبردست اثر ہر وقت قائم رہتا ہے۔ خصوصاً جو شخص قرآن پر غور وتدبر کرے اور قرآن کے نہایت موثر اسلوب کلام کو سمجھتا ہو' اور جو لوگ بھی قرآن کو سنیں اور سمجھیں۔ وہ راہ حق سے انحراف عمداً کریں گے اور ان کے پاس کبھی بھی کوئی معقول عذر اور وجہ جواز نہ ہوگا۔

جب یہ بتا دیا گیا کہ تمام لوگوں کا راہ ہدایت پر آنا ممکن ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ اللہ نے ہر کسی کے لیے راہ حق پر چلنا آسان کر دیا ہے' تو اس مقام پر مناسب سمجھا گیا کہ لوگوں کی خواہش کے پس پردہ جو عظیم حقیقت کارفرما ہے' وہ بھی انہیں صاف صاف بتا دی جائے۔ وہ یہ کہ اگر وہ چاہیں بھی تو' توفیق الہی کے بغیر راہ راست پر نہیں آسکتے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۱: ۲۹) "اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا الا یہ کہ اللہ رب العالمین چاہے"۔ یہ اس لیے کہ وہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ان کی مشیت اللہ کی وسیع تر مشیت سے آزاد اور جدا ہے' جس کی طرف تمام امور لوٹتے ہیں' اللہ کی طرف سے اختیار دیا جانا اور راہ ہدایت پانے کے لیے سہولت فراہم کرنا بھی اللہ کی عظیم مشیت کے اندر محدود ہے' جس کے دائرے کے اندر وہ تمام امور محدود ہیں جو ہو چکے ہیں اور جو ہونے والے ہیں۔

یہ آیت اور اس قسم کی تمام دوسری آیات جن میں لوگوں کی مشیت کے متصلا بعد یہ کہا جاتا ہے کہ ہوتا وہی کچھ ہے جو اللہ چاہے۔ یہ اس لیے لائی جاتی ہیں کہ اللہ کی مشیت کی عمومیت اور ہمہ گیری کے بارے میں لوگوں کے تصورات کو درست کیا جائے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام امور اللہ کی مشیت کے دائرے میں ہیں۔ اور اللہ نے لوگوں کو جو آزادانہ اختیارات دیئے ہیں وہ اس کی وسیع تر مشیت کے دائرے کے اندر ہیں۔ مثلاً یوں کہ اللہ نے فرشتوں کو یہ توفیق دے دی ہے کہ وہ اللہ کے احکام کی تعمیل کریں۔ ان کو یہ اجازت بھی دے دی ہے کہ وہ ایسا کریں' اور استطاعت بھی دے دی ہے کہ وہ ایسا کر سکیں تو یہ بھی اللہ کی مشیت کا ایک پہلو ہے کہ وہ دو راستوں میں سے جو راستہ چاہیں اختیار کریں اور یہ اختیار وہ تعلیم اور بیان کے بعد استعمال کریں۔

مومنین کو چاہئے کہ وہ اپنے عقیدے اور اپنے تصورات میں اس حقیقت کا اقرار کریں تاکہ ان کو معلوم ہو کہ اصل حقیقت کیا ہے' وہ اللہ کی مشیت کبریٰ کو دیکھتے ہوئے اللہ ہی پر بھروسہ کریں' اللہ کی توفیق کے طالب ہوں اور جو راہ اختیار کریں اور جو راہ ترک کریں اس میں قدرت الٰہیہ اور مشیت الٰہیہ ان کے سامنے ہو۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الانفطار ۔ ۸۲

۱-- تا-- ۱۹

سورۃ الانفطار ایک نظر میں

اس مختصر سورت میں اسی کائناتی انقلاب کا تذکرہ ہے جو سورہ تکویر میں ہوا تھا' لیکن یہ سورت اس انقلاب کو ایک نیا رخ اور شخصیت عطا کرتی ہے۔ اس کے مخصوص خدوخال ہیں' یہ سورت قلب انسانی کو اپنی مخصوص وادیوں میں گھماتی ہے اور بالکل نئے اثرات سے سرشار کر دیتی ہے۔ اس کا انداز سنجیدہ 'گہرا اور رکا ہوا ہے اور اس کا لہجہ سرزنش کا ہے اور دھمکی آمیز ہے۔

چنانچہ کائناتی انقلاب کے مناظر مختصر لیے گئے ہیں' پوری سورت پر حاوی ہیں جس طرح سورہ تکویر میں تھے کیونکہ عتاب کی فضا یہاں سنجیدہ ہے اور اس کے اثرات بھی تدریجی ہیں۔ سورت کا ترنم اور نغمگی بھی سنجیدہ ہے۔ یوں ترنم' اثرات اور انداز بیان تینوں باہم مناسب اور موافق و متوازن ہیں۔

اس سورت کے پہلے پیراگراف میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب آسمان پھٹ جائے گا اور کواکب بکھر جائیں گے اور سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے اور قبریں کھل جائیں گی اور دوسرے ایسے حالات نمودار ہوں گے جن کے ذریعہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ اس سخت دن کے لیے کیا کچھ کمایا ہے اور کیا کچھ کوتاہی اس سے ہو گئی ہے۔

سورت کے دوسرے حصے میں سخت تنبیہہ میں لپٹا ہوا عتاب اور سرزنش کا احساس ہے اور یہ عتاب اس انسان کو کیا گیا ہے کہ تمہاری ذات اور تمہاری تخلیق کے اندر اللہ کے کیا کیا فیوض اور رحمتیں موجود ہیں لیکن تم ان فیوض اور رحمتوں کا حق ادا نہیں کر رہے ہو اور نہ اللہ کی ایسی قدر کرتے ہو جیسی اس کی کرنی چاہئے اور اللہ کے اس فضل و کرم کا وہ شکر ہی ادا نہیں کر رہے۔

يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (٦) الَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (٧)

فِىْٓ اَىِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (٨) (٨٢: ٦ تا ٨) "اے انسان 'کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا' جس نے تجھے پیدا کیا' تجھے نک سک سے درست کیا' تجھے متناسب بنایا' اور جس صورت میں چاہا' تجھ کو جوڑ کر تیار کیا"۔

تیسرے پیراگراف میں بتایا گیا ہے کہ اس نافرمانی اور انکار کی علت کیا ہے' یہ کہ یہ لوگ روز قیامت اور اس کے حساب و کتاب اور جوابدہی کے منکر ہیں اور قیامت کا انکار ہی ہر برائی کا سرچشمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے حساب و کتاب کی سخت تاکید کی جاتی ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ہو گا اور پھر تمہارا انجام یوں ہو گا۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ (٩) وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ (١٠) كِرَامًا كَاتِبِيْنَ

(١١) يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (١٢) اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ (١٣) وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ
جَحِيْمٍ (١٤) يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ (١٥) وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَ (١٦) (٨٢: ٩ تا
١٦) "ہرگز نہیں' بلکہ تم لوگ جزاء و سزا کو جھٹلاتے ہو' حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں' ایسے معزز کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔ بے شک نیک لوگ مزے میں ہوں گے' بے شک بدکار لوگ جہنم میں جائیں گے۔ جزاء کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے اور اس سے ہرگز غائب نہ ہوں گے"۔

آخری پیراگراف میں اس دن کی عظمت کی تصویرکشی کی گئی ہے' اور اس کی ہولناکیاں دکھائی گئی ہیں' اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس دن کسی کو کسی کام کا یارانہ ہوگا اور صرف اللہ جل شانہ کا حکم چلے گا۔

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (١٧) ثُمَّ مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (١٨) يَوْمَ لَا تَمْلِكُ
نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (١٩) (٨٢: ١٧ تا ١٩) "اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ ہاں' تمہیں کیا خبر کہ جزاء کا دن کیا ہے؟ یہ وہ دن ہے جب کسی کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا' فیصلہ اس دن اللہ کے اختیار میں ہوگا"۔

تیسویں پارے میں جو تنبیہات اور موثرات عموماً بیان ہوئے ہیں' یہ سورت بھی انہی کا ایک نمونہ اور ایک کڑی ہے اور اس میں وہی حقائق اور مضامین مختلف اسالیب بیان کے مطابق بیان کیے گئے ہیں۔

--- ooo---

درس نمبر ۲۸۲ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۱۹

سُورَۃُ الانفطار (۸۲) مَکّیۃ — آیاتہا ۱۹ — رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

إِذَا السَّمَآءُ انفَطَرَتْ ﴿١﴾ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انتَثَرَتْ ﴿٢﴾ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿٣﴾ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ﴿٤﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ﴿٥﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"جب آسمان پھٹ جائے گا' اور جب تارے بکھر جائیں گے' اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے' اور جب قبریں کھول دی جائیں گی' اس وقت ہر شخص کو اس کا اگلا پچھلا سب کیا دھرا معلوم ہو جائے گا"۔

گزشتہ سورت میں ہم نے ان آثار کی بات کی تھی جو ان مظاہر کو دیکھ کر انسانی احساس پر نمودار ہوتے تھے' یہ مناظر اس عظیم انقلاب سے متعلق تھے جو دست قدرت اس کائنات میں برپا کر دے گا' اس کائنات کو اس طرح ہلا مارا جائے گا کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر قائم نہ رہے گی اور اس عظیم کائنات کو تہ و بالا کر دیا جائے گا۔ ہم نے وہاں یہ بھی بتایا تھا کہ ان آثار میں سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کا دل اس پوری کائنات سے اٹھ جاتا ہے اور انسان اپنا تعلق اس خالق حقیقی کے ساتھ جوڑ لیتا ہے جو باقی اور لازوال ہے۔ جو اس وقت بھی باقی رہے گا جب یہ پوری کائنات ہلا ماری جائے گی۔ ان تمام انقلابات' زلزلوں اور توڑ پھوڑ کے عظیم عمل میں انسان کے لیے واحد جائے پناہ اس ذات کبریا کی درگاہ ہے جو ثابت' برقرار اور اس قدر منظم ہے جسے خلود اور دوام حاصل ہے۔ اور یہ خلود اور دوام صرف اسی ذات کا خاصہ ہے۔

یہ اس عظیم کائناتی انقلاب کے جو پہلو لائے گئے ہیں' ان میں سے ایک پہلو آسمان کا پھٹنا ہے۔ آسمان کے پھٹنے اور شق ہونے کا ذکر اور منظر قرآن مجید کے کئی مقامات پر پیش کیا گیا ہے۔ سورہ رحمٰن میں ہے۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (۵۵ : ۳۷) "جب آسمان پھٹ جائے گا تو وہ اس طرح سرخ ہو گا جس طرح چمڑا سرخ ہوتا ہے"۔ اور سورہ الحاقہ میں ہے۔

وَ انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (۶۹ : ۱۶) "اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس کی

بندش کھل جائے گی"۔ اور سورہ انشقاق میں ہے ۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (۸۴ : ۱) "جب آسمان پھٹ جائے گا"۔ اس مصیبت کے دن کی مشکلات اور حقائق میں سے ایک بڑی حقیقت یہ ہوگی کہ اس دن آسمان پھٹ جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ آسمان کے پھٹنے کی تفصیلی کیفیت کیا ہوگی؟ تو حقیقت یہ ہے کہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ نہ اس کی اصل حقیقت سے ہم خبردار ہیں ۔ جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ اس کائنات کی شکل و صورت میں ایک عظیم تغیر رونما ہو گا جو ہمیں نظر آتی ہے اور اس کا یہ موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور اس کی موجودہ بندش کھل جائے گی جس نے اس کے تمام کرات کو اس وقت اپنی جگہ باندھ کر رکھا ہے ۔

یہاں اس عظیم فضا میں ستاروں کے بکھر جانے کا منظر بھی فضا کی ہولناکی میں شریک ہو جاتا ہے ۔ اس وقت یہ ستارے اپنے اپنے مدار میں ایک خوفناک سرعت اور تیزی کے ساتھ گردش کر رہے ہیں ۔ لیکن اپنے اپنے مدار میں جکڑے ہوئے ہیں ' اور ایسا نہیں ہے کہ اس محیر العقول وسیع فضا میں جدھر منہ ہو' ادھر دوڑتے رہیں ' اور اگر یہ اس طرح بکھر جائیں جس طرح اس وقت ہو گا جب قیامت برپا ہوگی تو وہ اس نہایت مضبوط غیر مرئی نظام کی بندش سے چھوٹ جائیں ' جس نے ان کو جوڑ رکھا ہے 'تو یہ فضا میں اسی طرح پھرتے رہیں جس طرح ایک ذرہ فضا میں اڑتا رہتا ہے ۔

سمندروں کی "تفجیر" کا ایک مفہوم تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ بھر جائیں اور خشکی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں اور ایک عظیم طغیانی آ جائے ' نیز اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ پانی پھٹ جائے اور جن عناصر سے وہ مرکب ہے ' ان عناصر کی صورت اختیار کر لے ۔ یعنی آکسیجن اور ہائیڈروجن ۔ جس طرح پانی کی تشکیل سے قبل یہ ہائیڈروجن اور آکسیجن گیس کی شکل میں تھا۔ اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں عناصر بھی ایٹم اور ہائیڈروجن بم کی طرح پھٹ جائیں ۔ اس کا تصور اب اچھی طرح کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایٹم اور ہائیڈروجن پھٹ جائیں تو اس کائنات کے اندر کیا کچھ ہو جائے گا جبکہ موجو ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اس دھماکے کے مقابلے میں محض کھلونے ہیں یا "تفجیر" کے کوئی اور معنی ہیں جو ابھی تک ہماری سمجھ سے باہر ہیں ۔ غرض ایک عظیم ہولناک اور خوفناک صورت حالات ہوگی ۔

قبروں کا کھلنا بھی ان حالات کی وجہ سے ہو گا یا مفہوم یہ ہو گا کہ اس طویل تبدیلی کے دوران حقیقتاً قبریں پھٹ پڑیں گی اور ان میں سے لوگوں کے جسم اٹھ کھڑے ہوں گے تاکہ یہ میدان حشر میں حساب و کتاب کے لیے چل پڑیں ۔ اس آخری مفہوم کی تائید فقرۂ مابعد سے بھی ہوتی ہے ۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ (۸۲ : ۵) "اس وقت ہر شخص کو اس کا اگلا پچھلا سب کیا دھرا معلوم ہو جائے گا"۔ یعنی جو پہلے کیا اور جو بعد میں کیا' یا یہ کہ جو اس نے دنیا میں کیا اور جو اچھے اور برے آثار دنیا میں چھوڑے یا جو دنیا میں عیش کیا اور جو آخرت کے لیے ذخیرہ کیا۔ مطلب یہ ہے کہ ان عظیم حادثات اور انقلابات کے بعد ہر شخص اگلا پچھلا جان لے گا۔ یہ حادثات میں ہر حادثہ ہی خوفناک ہو گا۔

قرآن کریم کا مخصوص انداز کلام ملاحظہ کیجئے۔ کہا جاتا ہے ۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ "نفس یہ جان لے گا"۔ نفس سے یہاں مراد ہر نفس ہے لیکن "ہر" کو حذف کرنا بات کو

نہایت نفیس اور خوبصورت بنا دیتا ہے ۔ بات یہاں آکر ختم نہیں ہو جاتی کہ ہر ایک شخص اپنے تمام اعمال کا پورا پورا علم حاصل کر لے گا ۔ بلکہ اس علم کے انسان پر شدید اثرات ہوں گے ۔ جس طرح کہا جاتا ہے اچھا تمہیں معلوم ہو جائے گا ۔ اگرچہ آیت میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ کیا اثرات ہوں گے نفس پر ۔ لیکن یہ ان عظیم کائناتی حادثات سے بھی سخت ہوں گے ۔ انداز کلام سے اس مفہوم کا انعکاس ہوتا ہے ۔

یہ تھا ایک ایسا مطلع جس نے انسانی احساس و شعور اور عقل و خرد کو یوں بیدار کر دیا ۔ اب اگلے پیرے میں انسان کی موجودہ حالت پر ایک تبصرہ آتا ہے کہ یہ انسان کس قدر غافل اور لاپرواہ ہے ' یہاں انداز عتاب نہایت ہمدردانہ ہے اور اس عتاب میں سرزنش اور جھڑکی کا پہلو درپردہ ہے ۔ اور بظاہر بات اللہ کی عنایات پر تدبر کی گئی ہے ۔ خصوصاً انسان کی موجودہ ' متوازن اور خوبصورت اور معتدل شکل و صورت میں پیدائش کو مدنظر رکھتے ہوئے ۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ بات تھی کہ انسان کو موجودہ معتدل اور متوازن شکل و صورت اور جسم کے اعضاء سے فروتر شکل دے دیتا لیکن اللہ نے اسے ایسی صورت دی کہ جو تکنیکی اور خوبصورتی دونوں اعتبار سے بے مثال ہے ۔ کیا انسان پر لازم نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں پر غور کرے اور شکر ادا کرے ۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡإِنسَٰنُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ ٱلۡكَرِيمِ ۝٦ ٱلَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّىٰكَ فَعَدَلَكَ ۝٧ فِيٓ أَيِّ صُورَةٖ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝٨

"اے انسان 'کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا ' جس نے تجھے پیدا کیا ' تجھے نک سک سے درست کیا ' تجھے متناسب بنایا ' اور جس صورت میں چاہا ' تجھ کو جوڑ کر تیار کیا " ۔

یہاں انسان کو خطاب اس کی انسانیت کے حوالے سے کیا گیا ہے ۔ انسان میں صفت انسانیت ہی وہ صفت ہے جو اسے ممتاز اور مکرم بناتی ہے ۔ اور اپنی اس صفت کی وجہ سے انسان کو تمام دوسرے حیوانات اور زندہ مخلوقات پر برتری اور فضیلت حاصل ہے ۔ اور جس کی وجہ سے انسان مقام بلند تک پہنچا ہے ۔ اور اس پر اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے ۔

اس کے بعد نہایت ہی ہمدردانہ اور خوبصورت تنبیہہ اور عتاب آتا ہے ۔ ذرا الفاظ دیکھئے :۔

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (۸۲ : ۶) "کس چیز نے تجھے رب کریم سے دھوکے میں ڈال دیا ہے " ۔ اے انسان ' ذرا غور کر ' تمہارا مربی ' تمہارا نگہبان تمہاری کس قدر عزت افزائی کرتا ہے ۔ جس نے تمہیں انسانیت بخشی جس کی وجہ سے تم غور و فکر کرتے ہو ' بات کو سمجھتے ہو ' حیوانیت سے بلند ہوتے ہو ' آخر کیا چیز ہے جس نے تمہیں اپنے رب کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے اور تم رب کے احکام میں تقصیرات اور کوتاہیاں کرتے ہو اور سستی کرتے ہو ' اللہ کے بارے میں گستاخیاں کرتے ہو ' جبکہ وہ نہایت ہی مہربان مربی ہے ' جس نے قدم قدم پر تم پر فضل و کرم کر رکھا ہے ' جس کے کرموں اور انعامات میں سے بڑی نعمت اور کرم تمہاری یہ انسانیت ہے ' اور انسانیت کا خلاصہ یہ ہے کہ تم نیک و بد کی تمیز رکھتے ہو ۔

اس کے بعد اس ربانی تکریم اور عزت افزائی کی تفصیلات دی جاتی ہیں ۔ پہلے نہایت ہی موثر اشاراتی اور گہرے

معانی پر مشتمل ایک مجمل پکار تھی اور عزت و تکریم کے خفیہ اشارے تھے اور پوشیدہ معانی تھے جو ایک آسمانی پکار اور محبت آمیز ندا میں مضمر تھے ـ اب تفصیلات ـ تفصیلات میں انسان کی تخلیق' اس کی موزونیت اور اس کے غایت درجہ اعتدال کے حقائق لائے جاتے ہیں ـ اگر اللہ چاہتا تو انسان کو کسی اور صورت میں بنا سکتا تھا' لیکن یہ محض اس کا فضل و کرم ہے کہ اس نے انسان کے لیے اس قدر خوبصورت شکل تجویز کی ـ اگر انسان صرف اپنی شکل و صورت اور جسمانی ساخت کے تکنیکی کمالات پر ہی غور کرے تو وہ اللہ کا شکر کرے' مگر انسان نہ صرف یہ کہ شکر نہیں کرتا بلکہ وہ نہایت غرے کے ساتھ راہ غفلت پر سرپٹ دوڑ رہا ہے ـ

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (٦) اَلَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (۸۲ : ۷) "اے انسان' کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا' جس نے تجھے پیدا کیا' تجھے نک سک سے درست کیا' تجھے متناسب بنایا" ـ یہ ایک ایسا اشارہ ہے کہ اگر انسان کی انسانیت بیدار ہو' اور اس کا قلب و نظر پاک ہو' تو اس سے اس کی انسانیت کا ذرہ ذرہ جاگ اٹھے اور اس کا پورا وجود کانپ اٹھے اس لیے کہ انسان کا خالق اس کی سرزنش کر رہا ہے ـ اپنے احسانات بتلا کر سرزنش کرتا ہے جبکہ انسان خواب غفلت میں مدہوش ہے' پر از تقصیرات زندگی بسر کر رہا ہے' بلکہ وہ اپنے آقا اور مولا کے بارے میں سخت گستاخ ہے حالانکہ اس آقا نے اسے اس قدر پیاری' متناسب اور معتدل شکل و صورت اور شخصیت دی ہے ـ

حقیقت یہ ہے کہ انسان کو موجودہ خوبصورت' معتدل اور متناسب شکل پر پیدا کرنا اور اس اہتمام اعضا کا اچھی طرح اپنے وظائف کو پورا کرتے چلے جانا ایک ایسی حقیقت ہے جس پر طویل تدبر اور جدوجہد کی ضرورت ہے' اور اس غور و فکر کے بعد پھر شکر بجالانا فرض ہے ـ اور اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان ایسے خالق کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے محبت رکھے اور اس کا احترام کرے ـ جس نے اس تخلیق کے ذریعے انسان کو مکرم بنایا' اور یہ تکریم اور تفضیل اللہ کا محض فضل و کرم تھا' اس لیے کہ اللہ اس بات پر قادر تھا کہ وہ انسان کو کسی بھی نئی شکل و صورت میں پیدا کرتا' جس طرح چاہتا' لیکن اللہ نے موجودہ خوبصورت پیاری اور معتدل اور متناسب شکل انسان کو عطا کی ـ

حقیقت یہ کہ اپنی ساخت کے اعتبار سے انسان بے مثال ہے ـ اس کی شکل و صورت نہایت ہی موزوں و معتدل ہے اور اس کی ساخت کے نقشے میں بے شمار عجائبات ہیں ـ خود انسان کو اللہ نے فہم و ادراک کی جو قوت دی ہے اس کے جسم کے اندر موجود تکنیکی کمالات اور عجائبات اس کی قوت ادراک سے وراء ہیں ـ یہ تخلیق اس کائنات میں موجود دوسری تخلیقات سے بھی زیادہ عجیب ہے ـ

خوبصورتی' تناسب اور اعتدال انسان کے جسم سے بالکل عیاں ہیں' خود انسان کی قوائے مدرکہ بھی اپنی جگہ عجائبات ہیں ـ انسانی نفسیات اور اس کی روحانی دنیا بھی عجیب تر ہے ـ اور نفسیاتی اور روحانی دنیا بھی اس کے جسمانی اعتدال اور تناسب کے ساتھ ہم آہنگ ہیں ـ

دور جدید میں لوگوں نے صرف انسان کی جسمانی ساخت پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں اور ان میں تفصیلات کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ انسانی ساخت کے اندر کیا کیا تکنیکی عجائبات ہیں ـ پورا مطالعہ پیش کرنا تو ممکن نہیں ہے بعض اشارات پر ہم یہاں اکتفا کریں گے ـ

انسانی جسم کے اندر جو بڑے بڑے نظام ہیں' مثلاً ہڈیوں کا نظام' عضلات کا نظام' جلد کا نظام' ہاضمے کا نظام' دوران خون کا نظام' سانس کا نظام' تناسل کا نظام' شریانوں کا نظام' اعصاب کا نظام' پیشاب کا نظام' اس کی قوت ذائقہ' قوت شامہ اور سمع و بصر کی قوتیں یہ تمام نظام اگر دقت نظر سے دیکھے جائیں تو اپنی اپنی جگہ پر سب عجائبات ہیں۔ انسان نے آج تک جس قدر پیچیدہ سے پیچیدہ تکنیکی آلات ایجاد کیے ہیں وہ ان نظاموں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ انسان جب ان نظاموں پر غور کرتا ہے تو اس پر دہشت طاری ہو جاتی ہے اور وہ سکتے میں آ جاتا ہے لیکن انسان ہے کہ اپنی ذات کے ان عظیم عجائبات سے صرف نظر کر لیتا ہے۔

سائنس کا ایک انگریزی جریدہ لکھتا ہے:''ہاتھ قدرت کے عجائبات میں سے ایک منفرد عجوبہ ہے۔ انسان کے لیے ایسا آلہ ایجاد کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ کسی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ہاتھ کی طرح سادہ آلہ ایجاد کرے جس کے اندر وہ کمالات ہوں جو ہاتھ میں ہیں۔ انسان پڑھنے کے وقت کتاب کو ہاتھ سے پکڑتا ہے اور ہاتھ اسے آنکھ سے موزوں کر کے فاصلے پر لے جاتے ہیں۔ یہ پوزیشن خودکار طریقے سے ہاتھ فوراً طے کر دیتے ہیں۔ اگر آپ کتاب کا ورق الٹنا چاہیں تو ہاتھ کی انگلی نہایت تکنیکی طریقے سے ورق پر رکھی جاتی ہے۔ اور تھوڑے سے دباؤ سے ورق الٹ جاتا ہے۔ پھر قلم پکڑتے ہیں اور ہاتھ کے اعصاب خود بخود قلم کو چلاتے ہیں' پھر یہ ہاتھ عجیب انداز سے انسانی ضرورت کے تمام ہتھیاروں اور اوزاروں کو استعمال کرتا ہے۔ چمچ' چھری' قلم اور دوسرے آلات خود بخود جس طرح ہم چاہیں' ہاتھ کی گرفت میں آتے ہیں۔ یہ قدرتی آلہ ۲۷ ہڈیوں اور ۱۵ عضلات پر مشتمل ہے اور محیر العقول ہے''۔ (اللہ اور جدید علم' استاد عبدالرزاق)

انسان کا کان اور اس کا جوف دراصل چار ہزار کے لگ بھگ نصف قوس کی کمانوں پر مشتمل ہے' یہ کمانیں نہایت عمدگی سے بنائی گئی ہیں اور باہم دگر نہایت تکنیکی اعتبار سے مربوط ہیں۔ یہ موسیقی کے آلات کے مشابہ ہیں۔ اور یہ کمانیں ہر قسم کی آواز کو ایک عجیب انداز سے عقل اور دماغ کی طرف منتقل کرتی ہیں۔ بجلی کی کڑک کی سخت آواز ہو یا درختوں کی نہایت خوشگوار سرسراہٹ ہو' کرخت آواز ہو یا آلات موسیقی کی خوشگوار آواز ہو' یہ نصف قوس کے بے شمار نشیب و فراز جو کان کے اندر بنے ہوئے ہیں' اس آواز کو من و عن دماغ تک پہنچاتے ہیں''۔

''آنکھ بھی ایک عجیب آلہ ہے' روشنی کو اخذ کرنے والے تین کروڑ سے اوپر اعصاب کے سرے اس کے اندر موجود ہیں۔ پھر آنکھ کی حفاظت کے لیے پپوٹے اور اس کے اوپر پلکوں کا جنگلہ ہے۔ یہ نہایت خوبصورتی سے کسی بھی بیرونی چیز کو اندر آنے نہیں دیتے۔ اور خودکار طریقے سے حرکت میں رہتے ہیں۔ اور اجنبی چیزوں کو روکتے اور موڑتے ہیں۔ پلکوں کا سایہ دھوپ کی شدت کو بھی کم کرتا ہے اور پپوٹے خودکار طریقے سے آنکھ کو تر رکھتے ہیں۔ آنکھ کی صفائی کا نظام کس خوبصورتی سے کیا گیا ہے' یہ سیال مادہ جسے آنسو کا نام دیا جاتا ہے یہ آنکھ کو ہروقت صاف رکھتا ہے اور بہترین صفائی کرنے والا سیال ہے''۔ (علم ایمان کی دعوت دیتا ہے)

''چکھنے کا نظام انسان کی زبان میں رکھا گیا ہے۔ زبان کے لعاب دار پردے میں بے شمار چکھنے والے خلیے ہیں۔ یہ خلیے گھنڈیوں کی شکل میں ہیں۔ ان گھنڈیوں کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ کچھ ریشہ دار ہوتی ہیں' بعض محدب ہوتی ہیں اور بعض پھٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور یہ خلیے زبان کے نگلنے اور چکھنے والے پٹھوں سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ جب انسان

کوئی چیز کھاتا ہے تو اس عمل سے چکھنے والے اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور یہ اثرات دماغ تک جاتے ہیں اور یہ پورا نظام انسانی منہ کے ابتدائی حصہ میں تخلیق کیا گیا ہے تاکہ اگر انسان کسی چیز کو ناپسند کرتا ہے تو اسے تھوک سکے ۔یوں منہ کے اندر ہی انسان معلوم کر لیتا ہے کہ جو چیز کھائی جا رہی ہے وہ تلخ ہے' شیریں ہے 'گرم ہے' سرد ہے 'نمکین ہے یا جلانے والی ہے ۔ زبان کے اندر چکھنے کی نو ہزار گھنڈیاں ہوتی ہیں اور یہ پٹھوں کے ذریعہ دماغ کے ساتھ مربوط ہوتی ہیں ۔ان کا حجم کیا ہے اور یہ کس طرح عمل کرتی ہیں؟ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے"۔ (اللہ اور جدید سائنس)

"اور پھر اعصاب کا نظام جو پورے جسم میں پھیلا ہوا ہے' یہ ایسے باریک ریشوں کا مرکب ہے جو جسم کے ہر طرف پہنچے ہوئے ہیں ۔جسم کے کونے کونے سے آگے یہ بڑے اعصاب سے جڑتے جاتے ہیں ۔اور اعصاب کے مرکزی نظام سے مربوط ہوتے ہیں ۔اگر جسم کا کوئی حصہ بھی کسی طرح متاثر ہو تو یہ نظام مرکزی نظام کو اطلاع دیتا ہے' چاہے موسم کی معمولی سی تبدیلی کیوں نہ ہو ۔یہ نظام پورے جسم سے احساسات دماغ تک پہنچاتا ہے اور دماغ اس تاثر کے بعد حکم صادر کرتا ہے اور یہ نظام نہایت ہی تیزی سے پیغام رسانی کا کام کرتا ہے ۔اس پیغام رسانی کی رفتار سو میٹر فی سیکنڈ ہے"۔

"نظام ہضم ایسا ہے جس طرح کوئی کیمیاوی لیبارٹری ہوتی ہے ۔کوئی چیز کھاتے ہی اس لیبارٹری میں ایک عجیب عمل شروع ہوتا ہے اور یہ فیکٹری ماسوائے معدے کے اس تھیلے کا سب کچھ چاٹ لیتی ہے ۔اور یہ عمل نہایت ہی حیرت انگیز طریقہ سے ہوتا ہے"۔

"اس لیبارٹری میں ہم انواع و اقسام کے کھانے داخل کرتے ہیں' ہمارے سامنے یہ بات نہیں ہوتی کہ ان کے ساتھ یہ لیبارٹری کیا کرے گی اور نہ ہم سوچتے ہیں کہ یہ کھانے کس طرح ہضم ہوں گے ۔گوشت 'تلی ہوئی مچھلی اور دوسری خوراکیں کچھ پانی کے ساتھ اس لیبارٹری میں داخل کر دیتے ہیں"۔ (اللہ اور جدید سائنس)

"کھانوں کے اس مجموعے سے یہ لیبارٹری نفع بخش چیزیں لے لیتی ہے کہ تنور میں یہ مختلف کھانے اس طرح ٹوٹتے پھوٹتے ہیں کہ ان کے تمام اجزاء تحلیل ہو جاتے ہیں ۔وہ فضلات کو نکال کر باقی چیزوں کو پروٹین کی شکل دیتی ہے تاکہ وہ جسم کے مختلف خلیات کے لیے غذا کا کام دیں ۔یہ نظام ہضم اس ملغوبے سے ضروری اجزاء کیلشیم 'گندھک' آیوڈین 'لوہا اور بے شمار دوسرے اجزاء اخذ کر لیتا ہے اور اس بات کا پورا خیال رکھتا ہے کہ کوئی کار آمد جز ضائع نہ ہو' تاکہ ان سے ہرمون پیدا ہوں اور انسانی زندگی کے لیے تمام ضروری مواد بقدر ضرورت مہیا ہوتا رہے اور نہایت منظم طریقے سے ہوتا رہے ۔معدہ چربی اور دوسرے بعض اجزاء کا ذخیرہ بھی کرتا ہے تاکہ ہنگامی ضروریات کے وقت یہ مواد کام آسکے ۔اور یہ لیبارٹری یہ سب کام خود کار طریقے سے کرتی ہے اور انسان کو نہ اس کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے اور نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے ۔نہ انسان کو اس کے اسباب و علل معلوم ہوتے ہیں ۔ہم بس اس کے اندر بے شمار چیزیں ڈال دیتے ہیں اور پھر یقین ہوتا ہے کہ ہماری زندگی کو جاری رکھنے کے لیے معدہ خود بخود ضروری اشیاء اخذ کرے گا ۔اور سارے کام خود کرے گا۔

جب خوراک 'نظام ہضم کے ذریعے نئی شکل اختیار کرتی ہے تو معدہ ان کو جسم کے کھربوں خلیات تک ان کی خوراک کے طور پر پہنچاتا ہے ۔اس کرۂ ارض پر پوری آبادی سے زیادہ خلیات خود ایک انسان کے جسم میں ہیں ۔اور ہر خلیہ الگ خوراک مانگتا ہے جسے فراہم کیا جاتا ہے ۔ ہر خلیہ تک صرف اس کی ضرورت کی غذا پہنچتی ہے ۔اور یہ خلیات پھر اعضاء کی شکل اختیار کرتے ہیں مثلاً ہڈیاں' ناخن 'کان' آنکھیں' دانت اور دوسرے اعضاء"۔

"پس معدہ ایک ایسی لیبارٹری ہے جو کسی بھی انسانی تخلیق کردہ لیبارٹری سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اور اس کے ساتھ ترسیل کا ایک عجیب نظام ہے جو کسی بھی انسانی نظام ترسیل اور انفذ سے زیادہ ٹیکنیکل ہے۔ اور آج تک انسان نے ایسا پیچیدہ نظام نہ دیکھا ہے نہ ایجاد کیا ہے اور اس لیبارٹری کا نظام نہایت ضبط اور منصوبہ بندی سے کام کرتا ہے۔ (یہ تمام اقتباسات کتاب "سائنس ایمان کی دعوت دیتی ہے" سے لیے گئے ہیں)۔

انسانی جسم کے اندر کام کرنے والے نظاموں کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ لیکن ان تمام نظاموں میں انسان کے ساتھ حیونات بھی کسی نہ کسی طرح شریک ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر نظام خواہ انسانوں میں ہو یا حیوانات میں، اپنی جگہ معجز ہے۔ لیکن انسان کی عقلی، فکری اور روحانی خصوصیات وہ ہیں جس میں یہ منفرد ہے اور یہ وہی خصوصیات ہیں جن کے بارے میں اللہ انسان کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ یہ اس پر اس کا احسان عظیم ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (۸۲ : ۷) "جس نے تمہیں پیدا کیا، تمہیں نک سک سے درست کیا اور متناسب بنایا"۔ اور یہ خطاب یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ سے شروع کیا۔

مثلاً انسان کی قوت مدرکہ جو عقل میں ہے، ہم اس کی حقیقت کو نہیں جانتے، اس قدر جانتے کہ یہ ادراک قوت عقلیہ کے ذریعے ہوتا ہے اور قوت عقلیہ ہی آلہ ادراک ہے۔ جہاں تک عقل کا تعلق ہے، ہم نہ اسے جانتے ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ اس قوت کا عمل ادراک کس طرح کام کرتا ہے۔

ہماری معلومات اور مدرکات کس طرح دماغ میں رہتی ہیں، ہم بس اس قدر فرض کر لیتے ہیں کہ نہایت ہی لطیف دماغی اور اعصابی ریشوں کے ذریعہ یہ معلومات اور مدرکات ذہن اور عقل میں منتقل ہوتی ہیں۔ لیکن عقل اسے کہاں سٹور کرتی ہے؟ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ دماغ کے اندر ریکارڈ کرنے کا کوئی فیتہ ہے تو پھر ساٹھ (۶۰) سال کے لیے کئی ملین میٹر طویل فیتہ ہونا چاہئے کہ وہ ساٹھ سالہ زندگی میں انسانی مشاہدات کو ریکارڈ کرے۔ ساٹھ سال کا ذکر ہم اس لیے کرتے ہیں کہ بالعموم اوسط عمر ساٹھ سال ہوتی ہے۔ ان ساٹھ سالوں میں انسان الفاظ و معانی، تاثرات اور شعور اور مناظر و مشاہد کے لاتعداد چیزیں اپنے دماغ میں ریکارڈ کرتا ہے۔

انفرادی الفاظ و معانی پھر کس طرح مرکب ہو کر نتائج پیدا کرتے ہیں۔ انفرادی حادثات اور انفرادی تصاویر کس طرح کمپوز ہو کر علم اور کلچر پیدا کرتی ہیں۔ یہ ایک الگ دنیا ہے اور معلومات علوم اور اصول میں بدل جاتی ہیں۔ مدرکات اور ادراک کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور تجربات سے علم و سائنس وجود میں آتے ہیں۔ یہ اپنی جگہ دنیا کے عجائبات ہیں۔

یہ تو ہوئی انسان کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت، جو اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اس کی وجہ سے انسان ممتاز ہے۔ لیکن انسان کی خصوصیات میں سے یہ کوئی بڑی خصوصیت نہیں ہے بلکہ انسان کے اندر اللہ کی روح سے جلا ہوا ایک چراغ بھی ہے جسے انسانی روح کہا جاتا ہے۔ انسان کی یہ روح انسان کو جمال کائنات کے ساتھ جوڑتی ہے اور یہی روح ہر انسان کو خالق کی روح سے مربوط کرتی ہے۔ اور انسان کو وہ لمحات نصیب کرتی ہے جن میں انسان حقیقت کبریٰ کے ساتھ جڑ جاتا ہے، جو اپنی جگہ لامحدود ہے اور اس اتصال میں پھر انسان جمال حقیقت کبریٰ کی کچھ جھلکیاں پا لیتا ہے۔

انسان اس روح کی حقیقت سے بھی بے خبر ہے۔ روح تو ایک بڑی چیز ہے، انسان جن محسوسات کا ادراک کرتا ہے، وہ تو ان کی حقیقت سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ روح ہی ہے جو اسے خوشی اور سعادت مندی کے وہ لمحات اور وہ

جھلکیاں عطا کرتی ہے جن کی وجہ سے وہ اس زمین پر ہوتے ہوئے بھی عالم بالا سے مربوط ہو جاتا ہے ۔ اور یوں وہ جنت کی ابدی زندگی کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ حقیقت کبریٰ کے جمال کو دیکھ سکے ۔

یہ روح 'انسان کے لیے اللہ کا مخصوص تحفہ ہے ۔ اور اس روح ہی کی وجہ سے انسان 'انسان قرار پایا ہے ۔ اور اسی وجہ سے اللہ نے اسے یوں مخاطب کیا ۔

یَاۤیُّهَا الْاِنْسَانُ اور پھر اسے اس قدر محبت آمیز سرزنش کی ۔

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (۸۲ : ۶) "تجھے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے غرے میں ڈال دیا ہے"۔ یہ اللہ کی طرف سے انسان کے لیے براہ راست سرزنش ہے ۔ اللہ بذات خود انسان کو پکارتا ہے اور انسان جب نظریں اٹھاتا ہے تو وہ اللہ کے سامنے ایک گناہگار' غافل' اللہ کے فضل و کرم کی قدر نہ کرنے والا' بلکہ اللہ کے ہاں ایک گستاخ شخصیت کی صورت میں کھڑا نظر آتا ہے ۔ اب اللہ تعالیٰ اسے اپنی عظیم نعمت اور اپنے فضل و کرم سے آگاہ فرماتا ہے ۔ اور اس کو اس کی ناقدری' اور اس کی تقصیرات اور گستاخیوں سے مطلع فرماتا ہے ۔

یہ ایک انسانی سرزنش ہے کہ اگر انسان میں احساس ہو تو وہ پانی پانی ہو جائے ۔ اگر انسان اپنی انسانیت کے سرچشمے کو تلاش کرے' اور اللہ کی اس اطلاع اور اللہ کی ذات پر غور کرے اور یہ دیکھے کہ وہ کس بادشاہ کے سامنے کھڑا ہے ۔ اسے کس قدر عظیم ذات پکار رہی ہے' اور اس کی سرزنش کر رہی ہے اور اس پر یہ عتاب ہو رہا ہے' تو حقیقت یہ ہے کہ انسان پگھل کر رہ جائے ۔ ذرا غور کرو ۔

یَاۤیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (۶) الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ (۷) فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (۸) (۸۲ : ۶ تا ۸) "اے انسان' کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا' جس نے تجھے پیدا کیا' تجھے نک سک سے درست کیا' تجھے متناسب بنایا' اور جس صورت میں چاہا' تجھ کو جوڑ کر تیار کیا"۔

اب اگلے پیرے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان کیوں غافل ہو جاتا ہے اور اس سے تقصیرات کیوں سرزد ہوتی ہیں ۔ ان کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے دن کا یقین نہیں رکھتا ۔ بتایا جاتا ہے کہ حساب و کتاب ایک حقیقت ہے اور اس کی کیفیات اور مناظر یوں ہوں گے ۔ اور یہ کہ لوگوں کا انجام یکساں نہ ہو گا اور اس حقیقت کو نہایت تاکید کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے ۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ﴿۹﴾ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴿۱۰﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿۱۱﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۱۳﴾ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴿۱۴﴾ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿۱۶﴾

"ہرگز نہیں' بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) تم لوگ جزاو سزاکو جھٹلاتے ہو' حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں' ایسے معزز کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔ یقیناً نیک لوگ مزے میں ہوں گے اور بے شک بدکار لوگ جہنم میں جائیں گے۔ جزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے اور اس سے ہرگز غائب نہ ہو سکیں گے"۔

لفظ کلا بھی زجر و توبیخ کا لفظ ہے' اس کے ذریعہ سرزنش کی جاتی ہے کہ تم جس حال میں ہو' یہ درست نہیں ہے۔ تمہاری سوچ غلط ہے۔ اس کے ذریعے سابقہ موضوع سے بات کو دوسرے موضوع اور نکتے کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔ ایک نئی بات سامنے لائی جاتی ہے اور یہ تاکید اور زوردار بات کرنے کا ایک انداز ہے۔ یہ انداز عتاب اور یاد دہانی اور تصویر کشی سے الگ ہے۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ (۸۲ : ۹) "ہرگز نہیں' اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جزاء و سزا کو جھٹلاتے ہو"۔ تمہیں یہ یقین نہیں ہے کہ اس زندگی کا جواب بھی دینا ہے اور یہی ہے تمہاری غفلت کا حقیقی سبب۔ جس کی وجہ سے تم سے تقصیرات ہوتی ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص زندگی کی جوابدہی اور حساب و کتاب پر یقین نہ رکھتا ہو اور پھر وہ سیدھے راستے پر بھی چلتا ہو' بھلائی بھی کرتا ہو' اور اللہ کی اطاعت بھی کرتا ہو۔ بعض اوقات' بعض لوگوں کے دل اس قدر صاف و شفاف ہو جاتے ہیں کہ وہ رب کی اطاعت صرف رب کی محبت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کرتے کہ اللہ ان کو سزا دے گا یا جزاء دے گا' اور ان کو کسی انعام کا کوئی لالچ ہی نہیں رہتا۔ لیکن ایسے لوگ بھی قیامت پر یقین رکھتے ہیں' اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے ساتھ ملاقات کے شائق ہوتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ جس رب کے ساتھ انہیں محبت ہے اس کو دیکھیں۔ لیکن جب کوئی قیامت کی تکذیب کرتا ہے تو وہ آداب زندگی' اطاعت رب اور نورانیت اور روحانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم کے اندر زندہ دل نہیں ہوتا' اور اس کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔

تم لوگ روز جزاء کی تکذیب کرتے ہو لیکن تم دراصل قیامت کے دن کی طرف کشاں کشاں جا رہے ہو' تمہاری زندگی کا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے۔ کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا اور نہ ضبط کیے جانے سے چھوٹ سکتا ہے۔ نہ فرشتے بھولتے ہیں۔

وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ (۱۰) كِرَامًا كَاتِبِيْنَ (۱۱) يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (۱۲) (۸۲ : ۱۰ تا ۱۲) "حالانکہ تم پر نگراں مقرر ہیں' یہ ایسے معزز کاتب ہیں جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں"۔ یہ محافظ وہ روحانی مخلوقات ہیں جو فرشتوں سے ہیں۔ یہ ہروقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں' اس کی نگرانی کرتے ہیں' اور جو اعمال وہ کرتا ہے اسے لکھتے ہیں' ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کس طرح ریکارڈ تیار کرتے ہیں' اللہ کی طرف سے ہم پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی کہ ہم اس کی تفصیلی کیفیات بھی جانیں۔ اللہ کو معلوم ہے کہ ہمارے اندر ان غیبی امور کے ادراک کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اور نہ اس میں ہمارا کوئی فائدہ ہے کہ ہم ریکارڈ کیے جانے کی کیفیت بھی جانیں۔ کیونکہ یہ علم ہمارے فرائض میں سے نہیں ہے اور نہ اس سے انسان کے مقصد تخلیق کا تعلق ہے۔ لہٰذا اس میں مشغول ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق ان غیبی امور سے ہے جن کا انکشاف اللہ نے ہمارے سامنے نہیں کیا۔ ہمارے لیے صرف یہی شعور اور یقین دہانی ہے کہ انسان شتر بے مہار نہیں ہے۔ اور اللہ نے ایسے کارندے اس

کے اوپر نگران مقرر کر دیئے ہیں ـ جو اس کی ہر بات کو ریکارڈ کرتے ہیں ـ یہ اس لیے کہ وہ جاگ اٹھے اور خوف کے مارے کانپ جائے اور اپنے مقصد زندگی کو پورا کرتے ہوئے آداب زندگی کو ملحوظ رکھے ـ

اس سورت کی فضا اللہ کے انعامات اور اللہ کے فضل و کرم کی تھی 'اس لیے ان فرشتوں کی یہ صفت یہاں لائی گئی کہ وہ "کرام" ہیں قابل قدر اور صاحب منزلت ہیں ـ یہ اس لیے کہ انسان کو یہ خوف لاحق ہو کہ اس پر معزز لوگ نگران ہیں ـ لہٰذا اسے ارتکاب جرائم و قبائح کے وقت شرم آنی چاہیے کیونکہ یہ بات انسان کی فطرت کا حصہ ہے کہ جب وہ شرفاء اور معزز لوگوں کے اندر بیٹھا ہو تو وہ قبیح حرکات نہیں کرتا' مبتذل الفاظ کا استعمال نہیں کرتا اور اپنی روش درست رکھتا ہے لیکن اگر انسان کو یہ شعور مل جائے کہ اللہ کے معزز فرستادہ اس کی باتوں کو نوٹ کر رہے ہیں تو انسان بے شمار قباحتوں سے بچ سکتا ہے جو شرفاء کے ساتھ لاحق نہیں ـ قرآن کا یہ کمال ہے کہ وہ انسانی شعور کو زندہ و بیدار رکھتا ہے اور تصور قیامت اور عقیدۂ کاتبان الٰہی کے ذریعہ انسان کو اعلیٰ خیالات اور اعمال کے لیے پرجوش بناتا ہے ـ

اس کے بعد نیک لوگوں کے انجام اور برے لوگوں کے انجام کا ذکر کیا جاتا ہے کہ فرشتے اور اللہ کے معزز نمایندے جو ریکارڈ تیار کرتے ہیں' وہ بہت اہم ہے اور اس کی بناء پر دائمی سعادت یا دائمی شقاوت نصیب ہوگی ـ

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ (١٣) وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ (١٤) يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ (١٥) وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ (١٦) (٨٢: ١٣ تا ١٦) "یقیناً نیک لوگ مزے میں ہوں گے اور بے شک بدکار لوگ جہنم میں جائیں گے ـ جزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے اور اس سے ہرگز غائب نہ ہو سکیں گے" ـ

لہٰذا یقین کرو کہ یہ انجام لازمی ہونے والا ہے ـ یہ طے شدہ انجام ہے کہ نیک لوگ جنت میں اور برے لوگ جہنم میں داخل ہوں گے ـ بر' ابرار کا واحد ہے ـ وہ شخص کہ نیکی اس کی عادت ثانیہ بن جائے ـ نیک کاموں میں وہ تمام کام شامل ہیں جو اچھے کام ہیں ـ اور نیکی کی یہ صفت انسانی شرافت کے ساتھ متناسب ہے ـ اس کے مقابلے کا لفظ بھی ایسا ہی ہے ـ فجار' وہ گستاخ' بے ادب جو اثم و معصیت کے کاموں میں بے دھڑک کود پڑتے ہیں ـ جہنم ان کے فسق و فجور کے لیے موزوں جگہ ہے ـ مناسب جائے مقام ہے ـ ان کا حال کیا ہوگا؟

يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ (٨٢: ١٥) "جزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے" ـ تو بطور تاکید مزید یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں مجرم مفرور نہ ہو سکیں گے ـ

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ (٨٢: ١٦) "اور وہ اس سے ہرگز غائب نہ ہو سکیں گے" ـ نہ آغاز فیصلہ میں یہ غائب ہوں گے اور نہ معافی کے ذریعہ جہنم سے نکل سکیں گے ـ یوں ابرار اور فجار کی حالت ایک دوسرے کے عین بالمقابل اور متضاد ہوگی ـ جنت اور جہنم کے حالات بھی باہم متضاد اور بالمقابل ہوں گے ـ جبکہ اہل جہنم کے حالات اور ورود جہنم کو ذرا تفصیل سے بتایا گیا ہے ـ

اصل موضوع یہ تھا کہ یہ لوگ قیامت کے حساب و کتاب کے منکر تھے اور تکذیب کرتے تھے ـ لہٰذا اس دن کے

واقعات بیان کرنے کے بعد اس دن کی ہولناکیوں اور خوفناکیوں کو دوبارہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس دن کو وہ مکمل طور پر بے بس ہوں گے ۔ کسی کے لیے کوئی چارہ نہ ہو گا اور کسی جانب سے کوئی امداد و معاونت نہ ملے گی اور یہ دن اس قدر خوفناک ہو گا کہ تمہیں اس کا کوئی علم ہی نہیں ہے ۔ یہ بتا کر کہ تم اس دن کے ہول سے مکمل طور پر بے خبر ہو' اس خوف کو زیادہ کر دیا جاتا ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ عظیم مصیبت آنے والی ہے ۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿١٧﴾ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿١٨﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ﴿١٩﴾ ع الربع ۱۹ ع ۷

"اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ ہاں' تمہیں کیا خبر کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ یہ وہ دن ہے جب کسی شخص کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہو گا' فیصلہ اس دن بالکل اللہ کے اختیار میں ہو گا" ۔

قرآن کے انداز تعبیر میں کسی مصیبت کو مجہول اور نامعلوم کر کے بیان کرنا' ایک عمومی انداز ہے ۔ اس انداز سے اس کی خوفناکیوں میں خوب اضافہ ہو جاتا ہے ۔ یعنی یہ کہ انسانی تصور سے قیامت کی مصیبت ماوراء ہے ۔ مصیبت اور خوف کا ہم جو بھی بھیانک تصور کر سکتے ہیں' اس سے بھی وہ بڑھ کر ہے ۔ پھر سوال کو دہرا کر اس خوفناکی میں مزید اضافہ کیا جاتا ہے ۔

سوال دہرانے کے بعد اس کے ایسے خدوخال بیان کر دیئے جاتے ہیں جو اس کی خوفناکیوں کے ساتھ متناسب ہیں ۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا (۸۲ : ۱۹) "یہ وہ دن ہے جس میں کسی نفس کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہو گا" ۔ یعنی انسان مکمل طور پر عاجز' لاچار اور بے بس ہوں گے ۔ ہر شخص کو اپنی پڑی ہو گی' وہ سب سے کٹ چکا ہو گا' کوئی دوست و یار یاد نہ ہو گا ۔

وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ (۸۲ : ۱۹) "فیصلہ اس دن صرف اللہ کے اختیار میں ہو گا" ۔ یہ صرف اللہ کی منفرد ذات ہو گی اور دنیا و آخرت کے فیصلے اسی کے اختیار میں ہوتے ہیں' لیکن اس دن یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی ۔ اگرچہ دنیا میں بعض لوگ اس حقیقت کے تصور سے غافل ہوتے ہیں اور غرے میں ہوتے ہیں ۔ لیکن قیامت میں یہ امر پوشیدہ نہ رہے گا ۔ ہر کسی پر عیاں ہو گا ۔ غافل' متکبر اور ہر خود غلط سب ہی اسے دیکھ لیں گے ۔

یہ سورت کا خوفناک اختتام ہے اور یہ اختتام سورت کے آغاز کے خوفناک انقلابات کائنات کے ساتھ مل کر' انسانی سوچ' انسانی احساسات کو گھیر لیتا ہے ۔ یہ دونوں خوف اور ہلا مارنے والے حالات انسان کو دہشت زدہ کر دیتے ہیں ۔ ان دونوں ہولناک حالات یعنی آغاز و انجام کے درمیان ایک پر محبت' ہمدردانہ ملامت ہے جس سے ایک خاص انسان پانی پانی ہو جاتا ہے ۔ یہ ہے سورت کا خاتمہ ۔

--- ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ المطففین ـ ۸۳

۱-- تا-- ۳۶

سورۃ المطففین ایک نظر میں

مکہ مکرمہ میں دعوت اسلامی جن عملی حالات و مراحل سے گزر رہی تھی یہ سورت اس کے ایک مرحلے کا نمونہ ہے۔ اس کا مقصد خفتہ دلوں کو جگانا اور غافل قلوب کو متوجہ کرنا ہے' انسانی شعور کو جھنجوڑنا ہے اور لوگوں کو عالم عرب اور اس کرۂ ارض پر اٹھنے والے اس عظیم انقلاب کی طرف متوجہ کرنا ہے جو عرب سوسائٹی اور انسانی کلچر کو بدل رہا تھا۔ یہ ایک آسمانی پیغام تھا اور زندگی کا بالکل ایک جدید تصور پیش کر رہا تھا۔

مکہ مکرمہ میں موجود سوسائٹی کے ایک عملی پہلو کو اس سورت کے آغاز میں لیا گیا ہے اور یہ صورت حالات مکہ میں عملاً موجود تھی کہ لوگ دیتے وقت کم دیتے تھے اور لیتے وقت زیادہ لیتے تھے۔ آغاز میں ایسے لوگوں (مطففین) کو دھمکی دی گئی ہے کہ وہ جب رب العالمین کے سامنے حشر کے میدان میں کھڑے ہوں گے تو کیا جواب دیں گے۔

يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۳ : ٦) "اس دن جبکہ لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے"۔ اور سورت کے آخر میں ان خیالات کی تصویر کشی ہے جو اس وقت کی سوسائٹی ان انقلابیوں کے بارے میں رکھتی تھی۔ یہ لوگ ان اہل ایمان پر اشاروں کنایوں میں اعتراض کرتے تھے' ان کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے تھے اور ان کے بارے میں کہتے تھے۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ (۸۳ : ۳۲) "کہ یہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں"۔ اس کے علاوہ اس سورت میں نیکوکاروں اور بدکاروں کے آخری انجام کی جھلک بھی دکھائی گئی ہے کہ اس یوم عظیم میں دونوں کے مآل و احوال کیسے ہوں گے۔

یہ سورت چار پیروں پر مشتمل ہے۔ پہلے پیرے میں مطففین کے خلاف اعلان جنگ کیا گیا ہے۔ یہ لوگ کون ہیں ان کی تعریف خود قرآن کرتا ہے :

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ (۱) الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ (۲) وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (۳) اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ (٤) لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ (٥) يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٦) (۸۳ : ۱ تا ٦) "تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو اپنے زور سے پورا پورا لیتے ہیں' اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس

دن جبکہ سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے"۔

اور دوسرے پیراگراف میں فجار کو سخت سرزنش کی گئی۔ان کو ہلاکت اور بربادی کی دھمکی دی گئی ہے اور ان پر الزام لگایا گیا ہے کہ وہ سخت تجاوز کرنے والے گناہگار ہیں۔اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے اس اندھے پن اور پسماندگی کی اصل علت کیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن وہ کس انجام بد سے دوچار ہونے والے ہیں اور ان کے لیے سب سے بڑا عذاب یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کے دیدار سے محروم ہوں گے کیونکہ اس دنیا میں بدکاری نے ان کے قلوب کو ڈھانپ رکھا ہے اور ان لوگوں کو جہنم میں نہایت ذلت اور سرکوبی کی حالت میں رکھا جائے گا۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ (٧) وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ (٨) كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (٩) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (١٠) الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (١١) وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (١٢) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (١٣) كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (١٤) كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (١٥) ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ (١٦) ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (١٧) (۸۳:۷ تا ۱۷) "ہرگز نہیں' یقیناً بدکاروں کا نامہ اعمال قید خانے کے دفتر میں ہے۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ کیا ہے وہ قید خانے کا دفتر؟ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں اور اسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بدعمل ہے۔اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے "یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں"۔ ہرگز نہیں' بلکہ دراصل ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ہرگز نہیں' بالیقین اس روز یہ اپنے رب کی دید سے محروم رکھے جائیں گے' پھر یہ جہنم میں جا پڑیں گے' پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

اور تیسرے پیرے میں اسی کا صفحہ بالمقابل ہے۔تصویر کا دوسرا رخ ہے اور یہ تصویر برابر اور نیکوکاروں کی ہے۔ اور ان انعامات کی تصویر کشی ہے جو ان کے لیے طے شدہ ہیں۔اور پھر قیامت کے دن ان کے چہروں پر جو تروتازگی ہوگی اس کی تصویر کشی بھی ہے۔اور ان چشموں کی بات ہے جس سے وہ صاف وشفاف شراب پی رہے ہوں گے۔ان تختوں کی تصویر کشی ہے' جن پر وہ ایک دوسرے کے بالمقابل بیٹھے ہوں گے۔یہ نہایت ہی تروتازہ' نرم اور روشن تصویر ہے۔

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا عِلِّيُّوْنَ (١٩) كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (٢٠) يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (٢١) اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ (٢٢) عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ (٢٣) تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ (٢٤) يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ (٢٥) خِتٰمُهٗ مِسْكٌ وَفِيْ ذٰلِكَ

فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۲۶) وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ (۲۷) عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (۲۸) (۸۳:۱۸ تا ۲۸) "ہرگز نہیں' بے شک نیک آدمیوں کا نامہ اعمال بلند پایہ لوگوں کے دفتر میں ہے۔ اور تمہیں کیا خبر کہ کیا ہے وہ بلند پایہ لوگوں کا دفتر؟ ایک لکھی ہوئی کتاب' جس کی نگہداشت مقرب فرشتے کرتے ہیں۔ بے شک نیک لوگ بڑے مزے میں ہوں گے' اونچی مسندوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے' ان کے چہروں پر تم خوشحالی کی رونق محسوس کرو گے۔ ان کو نفیس ترین سربند شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہو گی۔ جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔ اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی' یہ ایک چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ شراب پییں گے"۔

اب آخری پیرے میں ان مشکلات کو ریکارڈ کیا جاتا ہے جو اس باطل اور غفلت کی دنیا میں فساق و فجار کے ہاتھوں اہل حق برداشت کر رہے تھے۔ یہ فجار اہل حق کو ایذائیں دیتے تھے' ان کے ساتھ مذاق کرتے تھے' اور نہایت گستاخی سے پیش آتے تھے تاکہ بطور تقابل فساق اور فجار کے انجام لوگوں کے سامنے ہو اور حقیقی اور ابدی اور طویل زندگی پیش کی جاسکے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ (۲۹) وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ (۳۰) وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ (۳۱) وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ (۳۲) وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ (۳۳) فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ (۳۴) عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ (۳۵) هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۳۶) (۸۳:۲۹ تا ۳۶) "مجرم لوگ دنیا میں ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارے کرتے تھے' اپنے گھر والوں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے' اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے تھے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں' حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں' مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں' مل گیا نا کافروں کو ان حرکتوں کا ثواب جو وہ کیا کرتے تھے"۔

بہرحال یہ سورت ایک طرف دعوتی ماحول بتاتی ہے اور دوسری طرف یہ بتاتی ہے کہ ایک عملی معاشرے اور ماحول میں دعوت اسلامی کا اسلوب کیا ہوتا ہے اور کسی معاشرے کے نفسیاتی حالات کا مقابلہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ سورت کی تفصیلی تشریح کے وقت ان باتوں پر تفصیل سے بحث ہوگی' ان شاء اللہ!

--- ○○○ ---

درس نمبر ۲۸۳ تشریح آیات

۱-- تا-- ۳۶

سُورَةُ الْمُطَفِّفِينَ مَكِّيَّةٌ
آیاتھا ۳۶ رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝١ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝٢ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝٣ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝٤ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝٥ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٦

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو اپنے زور سے پورا پورا لیتے ہیں' اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس دن جبکہ سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے"۔

سورت کا آغاز ناپ تول میں ڈنڈی مارنے والوں پر تنقیدی حملے سے ہوتا ہے کہ ان ڈنڈی مارنے والوں (مطففین) کے لیے تباہی اور ہلاکت ہے۔ یہاں بطور فیصلہ یہ بات جتائی جا رہی ہے کہ ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا ہو یا یہ ان کے حق میں بد دعا ہو' مطلب دونوں کا ایک ہی ہے کیونکہ اللہ کی جانب سے بد دعا بھی ایک فیصلہ ہوتا ہے۔

اگلی دو آیات میں مطففین کی تعریف کی گئی ہے کہ مطفف' ڈنڈی مارنے والا کون ہوتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ (۲) وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (۳) (۸۳ : ۲ - ۳) "یہ وہ لوگ ہیں جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو گھاٹا دیتے ہیں"۔ جب وہ مشتری ہوں تو بہت ہشیاری سے پورا پورا لیتے ہیں اور اگر بیچنے والے ہوں تو کم دیتے ہیں۔

اس مکی سورت میں اس اہمیت کے ساتھ ناپ تول میں کمی کے مسئلہ پر بحث تعجب خیز ہے اور ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ مکی سورتوں میں بالعموم کلی اور اصولی عقائد اور نظریات سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً توحید کا ثبوت' اللہ کی بے قید مشیت' عام مخلوق اور پوری کائنات پر اللہ کا کنٹرول' وحی کی حقیقت اور نبوت کا منصب' آخرت کی حقیقت اور حساب و کتاب اور عمومی انداز میں اخلاقی احساسات پیدا کرنا' خصوصاً ایسے احساسات جن کا ان بنیادی عقائد و نظریات کے ساتھ خاص ربط اور تعلق ہو۔ رہی یہ بات کہ کسی اخلاقی مسئلہ پر خاص طور پر بحث کرنا تو یہ بات مکی سورتوں میں نہیں ہے مثلاً کم ناپنے اور کم تولنے کا مسئلہ' اور دوسری معاملاتی بے قاعدگیاں۔ یہ تمام امور مدنی سورتوں میں آئے جبکہ اسلامی نظام حکومت قائم ہو گیا تھا اور اس نے معاشی' معاشرتی اور سماجی مسائل کو حل کرنا شروع کیا تھا کیونکہ یہی انداز اسلامی منہاج کا عمومی انداز تھا۔

لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ بتایا جائے کہ اس عمومی قاعدے سے ہٹ کر قرآن نے اس مسئلے کو کیوں لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان چند اور مختصر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بعض وجوہات تھیں۔

ان آیات سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب اسلام آیا تو مکہ میں ناپ تول میں کمی کا ایک ظالمانہ نظام ایک خوفناک شکل میں موجود تھا۔ مکہ کے کبراء یہ کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کا پورے عرب بلکہ شرق و غرب کی تجارت پر قبضہ تھا۔ اور یہ اکابر وسیع کاروبار کے مالک تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ذخیرہ اندوزی کا جال پھیلا رکھا تھا۔ یہ لوگ گرمیوں اور سردیوں کے سفر شام اور یمن کے ساحل کی طرف کرتے تھے اور انہوں نے مختلف مواقع پر تجارتی میلے بھی منظم کر رکھے تھے۔ مثلاً حج کے موقعہ پر عکاظ کا بازار لگتا تھا جس میں وسیع تجارتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ادبی اور تاریخی سرگرمیاں بھی زوروں پر ہوتی تھیں۔ لوگ مفاخر اور اشعار بھی پڑھتے۔

آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں ان اکابر مجرمین کو سخت دھمکی دیتا ہے کہ تباہی تمہارے سر پر ہے۔ اسی طرح ان کے خلاف اعلان جنگ کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برا کام کرنے والے لوگ اونچے طبقات کے لوگ تھے۔ اور ان کو ایسا معاشرتی مقام حاصل تھا کہ یہ لوگوں کو اس پر مجبور کرتے تھے کہ ان کو کم دیں۔ قرآن نے لفظ (یکتالو ن علی الناس) استعمال کیا جس میں لفظ "علی" برتری کے مفہوم میں ہے یعنی اپنی اونچی پوزیشن کی وجہ سے لوگوں پر کم ناپ و تول ٹھونستے تھے اور جب ان سے وہ کچھ لیتے تھے تو جبراً زیادہ لیتے تھے۔ اگر وہ پورا لیتے تو یہ بات قابل اعتراض نہ ہوتی اور اس کا ذکر ہی نہ کیا جاتا۔ یعنی وہ جو چاہتے 'جبراً لے لیتے۔ اور جب لوگوں کو دیتے تو اپنی سیاسی اور سماجی پوزیشن کی وجہ سے کم دیتے۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے حقوق پورے حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے اس لئے کہ ان کبراء کو سیاسی اور قبائلی برتری حاصل تھی اور معاشی برتری کی وجہ سے لوگ مجبور ہوتے تھے کہ ان کے اس ظلم پر راضی ہوں۔ یہ ذخیرہ اندوزی کرتے تھے اور پھر لوگوں کو مہنگا فروخت کر کے ان کو کم دیتے تھے۔ جیسا کہ آج کل کے تجارتی نظام کی خصوصیت ہے۔ غرض ایک واضح ظالمانہ نظام تطفیف مکہ میں کام کر رہا تھا' اس لیے اسے چیلنج کیا گیا۔

اس مکی معاشرہ میں دعوت اسلامی کے نہایت ہی ابتدائی ایام میں اس مسئلے کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کا مزاج کیا ہے' نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین ایک مکمل نظام زندگی ہے اور زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے خواہ نظریاتی ہو یا عملی۔ اور اس نظام کی اٹھان گہرے اخلاقی اصولوں پر ہے جو اس نظام کے اندر نہایت ہی گہرائی

میں رکھے گئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ان ابتدائی ایام ہی میں اس غلط روش کو ناپسند کیا کیونکہ باہم معاملات میں یہ کھلی بداخلاقی تھی۔حالانکہ اس دور میں اسلام کو اجتماعی قیادت اور اختیارات حاصل نہ تھے' نہ حکومت تھی اور نہ اسلامی شریعت نافذ تھی۔لیکن اسلام نے اپنے مزاج کے عین مطابق اس برائی کے خلاف یہ آواز بلند کی۔اور اعلان کر دیا کہ ناپ تول میں ڈنڈی مارنے والوں کے لیے ہلاکت اور بربادی ہے۔جو لوگ یہ کام کرتے تھے وہ مکہ کے سردار' برسر اقتدار اور بااختیار تھے۔ان کو لوگوں پر روحانی سیادت حاصل تھی۔اور یہ عقیدۂ شرک کے محافظ تھے اور ان کو مکہ میں معاشی برتری بھی حاصل تھی۔اسلام نے ان لوگوں کی قیادت وسیادت کے باوجود ان کے اس ظلم اور دھاندلی کے خلاف آواز بلند کی۔اور غریب عوام کے حق میں آواز بلند کی جن کا استحصال کیا جارہا تھا اور یہ استحصال وہ ان مذہبی خیالات کی بنا پر کر رہے تھے جو انہوں نے ان عوام کے ذہنوں پر بٹھا دیئے تھے۔اسلام نے جو آواز اٹھائی وہ اسلام کی فطری آواز تھی۔اسلامی نظام کے مزاج کے عین مطابق تھی' اور یہ ایک ایسی آواز تھی جو سوئے ہوئے عوام کو جگا رہی تھی اور تحریک اسلامی نے یہ آواز اس وقت اٹھائی جب اس کے ماننے والے اس وقت مکہ میں مقہور و محصور تھے اور جن لوگوں کے خلاف یہ اٹھائی گئی وہ معاشرے پر چھائے ہوئے تھے اور ان کو معاشی' دینی اور مالی برتری حاصل تھی۔

اس سے ہمیں ایک نہایت ہی حقیقت پسندانہ سبب ملتا ہے۔اس بات کا کہ مشرکین مکہ اسلام اور دعوت اسلامی کے معاملے میں کیوں ایک ناقابل عبور رکاوٹ بن کر کھڑے ہوگئے تھے۔اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ نیا نظریہ جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرمارہے ہیں۔یہ فقط عقیدہ اور زبانی اقرار ہی نہیں ہے کہ اللہ ایک ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔اور بتوں اور مورتیوں کو چھوڑ کر فقط ایک خدا کی عبادت اور بندگی کرنا ہے۔ایسا نہ تھا بلکہ وہ جانتے تھے کہ یہ عقیدہ اور نظریہ جاہلیت کی تمام بنیادوں کو اکھاڑ کر پھینک رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے تمام مفادات بھی ختم ہو رہے ہیں اور اس عقیدے سے ان کی عزت' مقام اور اقتدار کو سخت خطرہ لاحق ہے۔اس نظام کا مزاج ہی دوئی قبول نہیں کرتا۔یہ نظام ایسے سیکولر عناصر سے بھی نہیں ملتا جن کا ربط آسمانی ہدایات وتصورات سے نہ ہو' اور یہ نظام اس تمام زمینی مواد کو ختم کرتا ہے جس کے اوپر جاہلیت کا نظام قائم ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اہل مکہ نے اس نئے نظام کے خلاف جو کبھی لڑائی شروع کر دی اور یہ لڑائی نہ ہجرت سے قبل کے زمانے میں کبھی رکی اور نہ بعد کے زمانوں میں' یہ کبھی ختم نہیں ہوئی۔یہ جنگ دراصل کلچر کی جنگ تھی۔یہ لوگ' اسلامی کلچر کے خلاف برسرپیکار تھے۔یہ محض دینی نظریاتی جنگ نہ تھی۔

جو لوگ اسلامی نظام کے اقتدار کی راہ روک رہے ہیں۔ان لوگوں نے ہر دور اور ہر مقام پر اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھا ہے۔انہوں نے اسلامی نظام کے غلبے کے نتائج کو اچھی طرح جانا ہے تب ہی تو انہوں نے اسلامی نظام کے غلبے کو روکنے کی کوشش کی۔یہ لوگ جانتے تھے اور ہیں کہ ان کے باطل طور طریقے اور ان کے جابرانہ مفادات اور خود ان کی کھوئی قوت اور ان کی بے راہ روی' غرض یہ سب چیزیں اسلامی نظام کے غلبے کے نتیجے میں ختم ہونے والی ہیں کیونکہ یہ تو ایک سیدھا اور نہایت ہی شریفانہ نظام ہے۔

دوسرے لوگوں کے مقابلے میں یہ باغی اور سرکش اور ڈنڈی مارنے والے' خواہ اس ڈنڈی مارنے اور ظلم کی جو صورت بھی ہو' مالی ظلم ہو یا دوسرے حقوق و فرائض میں ظلم ہو' یہ باغی اور سرکش دوسرے لوگوں کے مقابلے میں

اسلامی نظام سے زیادہ خائف رہتے ہیں کیونکہ یہ نہایت منصفانہ اور پاک و صاف نظام ہے۔یہ نظام انسانی حقوق پر کوئی سودابازی اور کوئی مداہنت قبول نہیں کرتا اور نہ نصفانصف اور کچھ لو اور کچھ دو کا فیصلہ کرتا ہے۔

ہجرت سے قبل جن لوگوں نے عقبہ ثانیہ کی بیعت کی تھی۔انہوں نے اسی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ابن اسحاق کہتے ہیں :"اور مجھے عاصم ابن عمرابن قتادہ نے بتایا کہ جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کے لیے جمع ہوئے تو اس موقعہ پر عباس ابن عبادہ ابن نضلہ انصاری 'بنی سالم ابن عوف کے فرد نے کہا :"اے اہل خزرج 'کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم اس شخص کے ساتھ کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟" تو انہوں نے کہا "ہاں ہم جانتے ہیں"۔تو اس نے کہا "حقیقت یہ ہے کہ تم اور ہم اسود و احمر کے ساتھ لڑنے جارہے ہیں۔اگر تمہاری رائے یہ ہے کہ جب ہمیں مالی تاوان لاحق ہو گا' اور ہمارے شرفاء قتل ہوں گے اور ہم پھر اس کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں گے تو ابھی سے اسے چھوڑ دو 'اگر بعد میں تم اسے چھوڑو گے تو دنیا و آخرت میں تباہ ہو جاؤ گے اور اگر تم اس بات پر تل گئے ہو کہ مال لٹانا اور اشراف کا قتل ہونا ہمیں منظور ہے تو بیعت کر لو۔خدا کی قسم 'یہ دنیا و آخرت سے بہتر ہیں" تو بیعت کرنے والوں نے کہا کہ "ہم مال لٹانے اور اشراف کے قتل پر بھی اسے ہی قبول کرتے ہیں"۔اس پر اس شخص نے کہا :"رسول خدا اس پر ہمیں کیا اجر ملے گا۔اگر ہم نے یہ عہد پورا کر دیا" تو آپ نے فرمایا "جنت"۔تو انہوں نے کہا "لائیے ہاتھ" آپ نے بھی ہاتھ بڑھایا اور لوگوں نے بیعت کی۔

غرض بیعت عقبہ کرنے والوں نے بھی اس دین کے مزاج کو سمجھ لیا تھا اور کبرائے قریش نے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ دین تلوار کی دھار کی طرح عدل و انصاف کے اصولوں پر سیدھا قائم ہے۔یہ زیادتی اور سرکشی کسی طرح بھی برداشت نہیں کرتا۔نہ حد سے تجاوز اور بغاوت کو برداشت کرتا ہے اور نہ کبر و غرور کو اور نہ یہ دین کے نام پر ظلم' زیادتی اور دھوکہ بازی اور استحصال کو برداشت کرتا ہے۔لہٰذا ہر وہ شخص جو سرکش ہو' باغی ہو' متکبر ہو' استحصالی ہو' وہ اس دین' اس کی دعوت اور اس کے داعیوں کا دشمن ہوتا ہے۔

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ (٤) لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ (٥) يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ

الْعٰلَمِيْنَ (٦) (٨٣ : ٤ تا ٦) "کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں۔اس دن جبکہ سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے"۔ان لوگوں کا معاملہ بہت عجیب ہے۔صرف یہ یقین کہ ہم نے ایک دن رب العالمین کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اس دن رب العالمین کے سوا اور کوئی مختار نہ ہو گا' اس کے سوا کوئی آقا نہ ہو گا۔اور اس دن صرف اللہ کے فیصلے کا انتظار ہو گا۔اور اللہ کے سوا کوئی ولی اور مددگار نہ ہو گا۔غرض صرف یہ ایک عقیدہ ہی اس بات کے لیے کافی تھا کہ وہ ڈنڈی مارنے کی اس گھناؤنی حرکت سے باز آجاتے اور لوگوں کے مال باطل طریقے سے نہ کھاتے اور اپنے اقتدار کو بذریعہ ظلم نہ بناتے اور لوگوں کے حقوق پر ڈاکے نہ ڈالتے۔لیکن وہ ڈنڈی مارنے کے عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں گویا کہ ان کو یقین ہی نہیں ہے کہ انہوں نے ایک دن اللہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور یہ ایک عجیب طرز عمل ہے۔

اس سورت کے پہلے پیراگراف میں ان لوگوں کو مطففین کہا گیا یعنی ڈنڈی مارنے والے جبکہ دوسرے پیرے میں

ان کو فجار کہا گیا ہے یعنی بد کار۔ یہاں ان کو بد کاروں کی صف میں شامل کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ان کے شب و روز کیا ہیں 'اللہ کے نزدیک ان کا مقام کیا ہے؟ اس زندگی میں یہ کیسے ہیں اور آخرت میں وہ کیسے ہوں گے اور کس قسم کے حالات ان کے انتظار میں ہیں۔

كَلَّآ إِنَّ كِتَٰبَ ٱلْفُجَّارِ لَفِى سِجِّينٍ ﴿٧﴾ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا سِجِّينٌ ﴿٨﴾
كِتَٰبٌ مَّرْقُومٌ ﴿٩﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿١٠﴾ ٱلَّذِينَ يُكَذِّبُونَ بِيَوْمِ
ٱلدِّينِ ﴿١١﴾ وَمَا يُكَذِّبُ بِهِۦٓ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ﴿١٢﴾ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ءَايَٰتُنَا
قَالَ أَسَٰطِيرُ ٱلْأَوَّلِينَ ﴿١٣﴾ كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ ﴿١٤﴾
كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ﴿١٥﴾ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا۟
ٱلْجَحِيمِ ﴿١٦﴾ ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا ٱلَّذِى كُنتُم بِهِۦ تُكَذِّبُونَ ﴿١٧﴾

"ہرگز نہیں' یقیناً بدکاروں کا نامہ اعمال قید خانے کے دفتر میں ہے۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ کیا ہے وہ قید خانے کا دفتر؟ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔ تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں اور اسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بدعمل ہے۔ اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے "یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں"۔ ہرگز نہیں' بلکہ دراصل ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ہرگز نہیں' بالیقین اس روز یہ اپنے رب کی دید سے محروم رکھے جائیں گے 'پھر یہ جہنم میں جا پڑیں گے 'پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

ان لوگوں کو یہ یقین نہیں ہے کہ یہ لوگ قیامت کے یوم عظیم میں اٹھائے جائیں گے۔ اسی لیے قرآن کریم نہایت سرزنش اور زجر و توبیخ کے انداز میں اس سے روکتا ہے اور نہایت تاکید کے ساتھ بتاتا ہے کہ ایک کتاب میں ان کے تمام اعمال ثبت کیے جا رہے ہیں۔ اور اس بات کو زیادہ تاکیدی بنانے کے لیے یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ کتاب کہاں رکھی ہوئی ہے اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ جب ان فساق و فجار کے سامنے 'اس عظیم دن میں ان کی کتاب پیش کی جائے گی تو ان پر بڑی بربادی واقع ہوگی۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ (۷) وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ (۸) كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۹) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۱۰) (۸۳: ۷ تا ۱۰) "ہرگز نہیں' یقیناً بدکاروں کا نامہ اعمال قید خانے کے دفتر میں ہے۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ کیا ہے وہ قید خانے کا دفتر؟ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔

تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے"۔ فجار ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اثم و معصیت میں حدوں سے گزر جائیں ' خود لفظ فجار کی صوتی لہروں میں یہ مفہوم پوشیدہ ہے۔ ان کی کتاب سے مراد ان کا اعمال نامہ ہے۔ اس کی ماہیت اور کیفیت کا علم انسانوں کو نہیں ہے۔ یہ غیبی امور میں سے ہے اور اس کے بارے میں ہم صرف اتنی بات کر سکتے ہیں جو مخبر صادق نے ہمیں اطلاع دی ہو۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ بدکاروں کے اعمال کا ایک دفتر ہے اور یہ سجین میں ہے۔ قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ کسی بات کو خوفناک بنانے کے لیے ایک سوال کر دیتا ہے۔

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ (۸۳: ۸) "تمہیں کیا معلوم کہ سجین کیا ہے؟" مقصد یہ تاثر دینا ہے کہ یہ معاملہ تمہارے حد ادراک سے آگے اور دور ہے اور بہت عظیم ہے اور تمہارے دائرہ ادراک سے بڑا ہے۔ لیکن قرآن بہرحال اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ

اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ (۸۳: ۷) "فجار کا اعمال نامہ سجین میں ہے"۔ جو ایک متعین جگہ ہے۔ اگرچہ انسان کو معلوم نہیں ہے۔ اس طرح قارئین کو ایک یقینی اطلاع دی جا رہی ہے کہ یہ اعمال نامہ تیار اور موجود ہے اور یہی یہاں مقصود ہے۔

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۸۳: ۹) "وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی"۔ اعمال نامہ کی تفصیلات کہ فجار کا یہ اعمال نامہ تیار شدہ ہے۔ اور اس میں کوئی کمی بیشی اب نہیں ہو سکتی۔ بس اس عظیم دن میں اسے کھولا جائے گا۔ اس لیے خیال کرو۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۸۳: ۱۰) "اس دن مکذبین کے لیے بربادی ہے"۔ اور مکذبین کی تعریف بھی کر دی جاتی ہے۔

الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۱۱) وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (۱۲) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۳) (۸۳: ۱۱ تا ۱۳) "اور اسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بدعمل ہے۔ اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں"۔ یہ الزام وہ اس لیے دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں امم سابقہ کے قصے اور حالات برائے عبرت لائے گئے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ اس کائنات میں چلنے والی سنت الٰہیہ کی نشاندہی کی گئی ہے اور یہ سنت ایک اٹل قانون کی طرح لوگوں کو گرفت میں لیتی ہے۔

اس دست درازی اور تکذیب کے بعد اب ایک سرزنش اور تنبیہہ آتی ہے اور یہ کلا سے شروع ہوتی ہے اور اس میں ان کی اس روش کی اصلی علت اور سبب بتایا جاتا ہے کہ وہ کیوں ظلم کرتے ہیں اور حق کو کیوں جھٹلاتے ہیں؟ یہ کہ وہ غافل ہو گئے ہیں اور ان کے دل مسخ ہو کر زنگ آلود ہو گئے ہیں۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۳: ۱۴) "ہرگز نہیں، دراصل ان لوگوں کے دلوں پر، ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے"۔ یعنی وہ جن گناہوں اور نافرمانیوں کا ارتکاب کرتے ہیں انہوں نے ان کے دلوں کو ڈھانپ لیا ہے۔ اور جب کوئی شخص معصیت کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا دل زنگ پکڑ کر سیاہ ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح اس پر ایک دبیز پردہ پڑ جاتا ہے اور یہ دل نور سے چھپ جاتا ہے اور اس کا احساس دھیرے دھیرے ختم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ احساس ہی ختم ہو جاتا ہے۔

امام ترمذی اور نسائی نے محمد ابن عملان سے انہوں نے قعقاع سے انہوں نے ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اس سے اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اب اگر وہ توبہ کرے تو وہ نقطہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ پھر گناہ کرے تو یہ سیاہی بڑھ جاتی ہے" امام ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ اور امام نسائی کے الفاظ یہ ہیں: "جب انسان کسی غلطی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اگر اس نے برائی سے ہاتھ کھینچ لیا، استغفار کیا اور توبہ کر لیا تو اس کا دل صیقل ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے دوبارہ اس برائی کا ارتکاب کیا تو اس نقطے میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ سیاہی اس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے۔ یہ ہے وہ زنگ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۳: ۱۴) "ہرگز نہیں بلکہ ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے"۔

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں "یہ گناہ پر گناہ ہے، یہاں تک کہ دل اندھا ہو جاتا ہے اور پھر مرجاتا ہے"۔

یہ ہے تکذیب کرنے والوں کا حال اور یہ ہے ان کی تکذیب اور ان کے فسق و فجور کی علت۔ اب اس عظیم دن میں ان کے ہونے والے انجام کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ان کا اس عظیم دن میں جو انجام ہو رہا ہے وہ ان کے فسق و فجور اور ان کی تکذیب کے حسب حال ہے۔

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۱۵) ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ (۱۶) ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۱۷) (۸۳: ۱۵ تا ۱۷) "ہرگز نہیں، بالیقین اس روز یہ اپنے رب کی دید سے محروم رکھے جائیں گے، پھر یہ جہنم میں جا پڑیں گے، پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

فسق و فجور اور گناہوں نے ان کے دلوں کو ڈھانپ لیا تھا۔ دنیا میں ان کے دل رب تعالیٰ کے احساس سے دور ہو گئے تھے اور گناہوں نے ان کی زندگی کو بے نور اور تاریک کر دیا تھا، وہ زندگی میں ایسی روش رکھتے تھے جس طرح اندھے ہوں۔ اب آخرت میں ان کا انجام بھی طبعی ہے اور ان کے حسب حال ہے۔ آخرت میں وہ دیدار رب کی عظیم نعمت سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ایک عظیم محرومی ہوگی۔ قیامت میں یہ نعمت صرف اس شخص کو نصیب ہوگی جس کی روح صاف اور شفاف ہو چکی ہو اور اسکی اس صفائی کی وجہ سے اس کے اور رب کے درمیان سب پردے دور ہو جائیں گے۔

سورہ قیامت میں انہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَة "کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے"۔قیامت میں رب تعالیٰ سے حجاب ان کے لیے عذاب قیامت سے بھی بڑا عذاب ہو گا۔ تمام محرومیوں سے یہ بڑی محرومی ہو گی اور یہ کسی انسان کی انسانیت کا بدترین انجام ہو گا کہ اس کی انسانیت رب کریم کے ساتھ جا ملنے اور اس تک پہنچ جانے سے محروم رہے۔کیونکہ جب کوئی رب کریم تک پہنچنے سے محروم ہو جائے تو وہ اپنے انسانی خصائص کھو بیٹھتا ہے۔اور اس حد تک گر جاتا ہے کہ وہ اب جہنم کے لائق اور مستحق ہو جاتا ہے۔

ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ (۸۳:۱۶) "پھر یہ جہنم میں پڑ جائیں گے"۔ لیکن اس جہنم رسیدگی کے ساتھ ساتھ وہاں ان کی سرزنش بھی ہو گی اور یہ اس عذاب سے بھی زیادہ کڑوی ہو گی۔

ثُمَّ يُقَالُ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ (۸۳:۱۷) "پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

اب اس کے بعد صفحہ بالمقابل پیش کیا جاتا ہے۔قرآن کریم کا یہ مستقل انداز بیان ہے کہ وہ بالعموم اچھائی اور برائی دونوں کی تصویر کے دونوں رخ پیش کرتا ہے تاکہ حسن وقبح کے تقابل سے لوگ بات کو اچھی طرح سمجھیں اور حقیقت ان کے ذہن نشین ہو جائے اور اچھوں اور بروں دونوں کا انجام بھی سامنے آ جائے۔

كَلَّا إِنَّ كِتَٰبَ ٱلْأَبْرَارِ لَفِى عِلِّيِّينَ ﴿١٨﴾ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا عِلِّيُّونَ ﴿١٩﴾ كِتَٰبٌ مَّرْقُومٌ ﴿٢٠﴾ يَشْهَدُهُ ٱلْمُقَرَّبُونَ ﴿٢١﴾ إِنَّ ٱلْأَبْرَارَ لَفِى نَعِيمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى ٱلْأَرَآئِكِ يَنظُرُونَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِى وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ ٱلنَّعِيمِ ﴿٢٤﴾ يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ﴿٢٥﴾ خِتَٰمُهُۥ مِسْكٌ ۚ وَفِى ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ ٱلْمُتَنَٰفِسُونَ ﴿٢٦﴾ وَمِزَاجُهُۥ مِن تَسْنِيمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا ٱلْمُقَرَّبُونَ ﴿٢٨﴾

"ہرگز نہیں، بے شک نیک آدمیوں کا نامہ اعمال بلند پایہ لوگوں کے دفتر میں ہے۔اور تمہیں کیا خبر کہ کیا ہے وہ بلند پایہ لوگوں کا دفتر؟ ایک لکھی ہوئی کتاب، جس کی نگہداشت مقرب فرشتے کرتے ہیں۔بے شک نیک لوگ بڑے مزے میں ہوں گے، اونچی مسندوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے، ان کے چہروں پر تم خوشحالی کی رونق محسوس کرو گے۔ان کو نفیس ترین سربند شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہو گی۔جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہو گی، یہ ایک چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ شراب پئیں گے"۔

اس پیراگراف کے آغاز میں لفظ کلا "ہرگز نہیں"۔زجر و توبیخ اور سرزنش کے لیے آیا ہے اور یہ زجر اس سے ماقبل مذکور ہے۔

ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِىْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۸۳: ۱۷) "پھر ان سے کہا جائے گا یہ وہی ہے جس کی تم تکذیب کرتے تھے"۔ اس پر بطور نتیجہ کہا' ہرگز نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے بعد نیک لوگوں کا بیان شروع ہوتا ہے اور یہ مثبت اور تاکیدی انداز میں آتا ہے۔

جس طرح پہلے کہا گیا تھا کہ بدکاروں کا نامہ اعمال سجین میں ہے تو یہاں کہا جا رہا ہے کہ نیکو کاروں کا نامہ اعمال علیین میں ہے۔ اور ابرار "نیکوکار" وہ لوگ ہیں جو اطاعت کیش اور ہرنیک کام کرنے والے ہیں۔ یہ نافرمانوں اور حد سے گزرنے والوں کے بالمقابل یہاں لائے گئے ہیں۔

لفظ علیین سے علو اور بلندی کا مفہوم ذہن میں آتا ہے' اور اس سے ہم یہ بات اخذ کر سکتے ہیں کہ سجین کے اندر انحطاط' پستی اور گراوٹ کا مفہوم ہو گا۔ اور اس کے بعد سوال ایک خوفناک سوال آتا ہے جو بتاتا ہے کہ مخاطب کو معلوم نہیں ہے کہ علیون ہے کیا؟ مطلب یہ ہے کہ تم ان بلندیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ مقام تمہارے حد ادراک سے ماوراء ہے۔

اس اشاراتی فضا سے نکل کر اب روئے سخن نیکو کاروں کے اعمال نامے کی طرف مڑ جاتا ہے تو وہ کیا ہے۔

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۲۰) يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (۸۳: ۲۱) "ایک لکھی ہوئی کتاب ہے جس کی نگہداشت مقرب فرشتے کرتے ہیں"۔ لکھی ہوئی (مرقوم) کے معنی ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ یہاں اس قدر اضافہ ہے کہ مقرب فرشتے اس کتاب کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس سے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ کتاب نہایت پاکیزہ' نہایت قابل قدر' نہایت بلند مرتبہ کتاب ہے جس پر اللہ کے مقرب فرشتے حاضر رہتے ہیں اور اس کتاب میں چونکہ نہایت اعلیٰ اخلاق اور اعمال کا ذکر ہے۔ اس لیے یہ ان مقرب فرشتوں کے لیے متاع حیات ہے اور وہ ایسا لکھیں گے اس کتاب کی اس فضا کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ یہ قابل قدر کتاب ہے۔

اس قابل قدر کتاب کے ذکر کے بعد اب خود ابرار کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس اچھے اعمال نامے کے مالک ہیں اور ان انعامات و اکرامات کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں وہ رہ رہے ہوں گے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِىْ نَعِيْمٍ (۸۳: ۲۲) "بے شک نیک لوگ بڑے مزے میں ہوں گے"۔ یہ نعیم جحیم کے مقابلے میں ہے۔

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ (۸۳: ۲۳) "اونچی مسندوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے"۔ یعنی نہایت ہی مکرم مقام پر ہوں گے۔ اور اس مقام پر یہ جہاں چاہیں گے' سیر کرتے پھریں گے۔ ذلت و خواری کی وجہ سے ان کی نظریں سہمی ہوئی نہ ہوں گی۔ اور نہ تھک تھکا کر وہ آنکھیں بند کر لیں گے۔ یہ لوگ تختوں پر اور مسندوں پر بیٹھے ہوں گے اور نظارے کر رہے ہوں گے جس طرح حجلہ عروسی پہ لوگ بیٹھے ہوتے ہیں۔ عربوں کے نزدیک عیش و عشرت اور نعمت اور آرام کا یہ ارفع مقام ہوا کرتا تھا کہ کوئی حجلہ عروسی میں ہو' اور اونچی اونچی مسندوں پر آرام سے بیٹھا ہو کیونکہ بالعموم ایک عربی کی زندگی سخت مشقت کی زندگی ہوتی ہے۔ یہ تو دنیاوی زندگی کی ایک تمثیل ہے۔ آخرت میں جو صورت

ہوگی وہ ناقابل تصور حد تک ارفع و بلند ہوگی ۔ اور ان کے بلند سے بلند تصور سے بھی اعلیٰ و ارفع ہوگی ۔ اور زمین اور اس دنیا کے اونچے سے اونچے تصور اور تجربے سے بھی اونچی ہوگی ۔

ان نعمتوں میں وہ جسمانی طور پر بھی نرم و نازک ہوں گے ۔ اور ان کی اسی نزاکت اور نرمی اور خوشی اور خوشحالی کے اثرات ان کے چہرے سے ظاہر ہوں گے ۔ اور ہر آدمی اس کا مشاہدہ کر رہا ہوگا ۔

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ (۸۳:۲۴) "ان کے چہروں پر تم خوشحالی کی رونق محسوس کرو گے"۔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ (۸۳:۲۵) خِتٰمُهٗ مِسْكٌ "ان کو نفیس ترین سربند شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہوں گی"۔ رحیق ' خالص اور صاف شراب کو کہتے ہیں 'جس میں کوئی ملاوٹ نہ ہوگی اور نہ کوئی کدورت ہوگی ۔ شراب کی یہ صفت کہ وہ سربند ہوگی اور اس کی مہر مشک سے بنی ہوئی ہوگی ۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وہ برتنوں میں ہوگی اور یہ برتن سربند اور مہرزدہ ہوں گے اور پینے کے وقت ان کو کھولا جائے گا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت اہتمام اور صفائی سے اسے تیار کیا جائے گا اور مشک سے مہر کرنا ' اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ صاف اور خوش ذائقہ ہوگی ۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو ان اصطلاحات میں بتائے گئے ہیں جن کے ساتھ انسان اس دنیا میں مانوس ہے ' لیکن جب اہل ایمان جنت میں داخل ہوں گے تو ان کا ذوق اس دنیا کے ذوق سے آزاد ہوگا کیونکہ دنیا کا ذوق نہایت محدود ہے ۔

شراب کے وصف کا اختتام جو ان دو آیات میں ہوتا ہے ۔

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ (۲۷) عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (۸۳:۲۸) "اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی 'یہ چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ شراب پئیں گے"۔ اس اختتام سے پہلے ہی ' درمیان میں ایک اہم ہدایت دے دی جاتی ہے اور یہ ہدایت ہے ۔

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳:۲٦) "جو لوگ ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں"۔ یہ ایک گہرا اشارہ ہے اور اس کے اندر ایک جہان معانی پوشیدہ ہے ۔

یہ ڈنڈی مارنے والے ' جو لوگوں کے اموال باطل طریقے سے کھاتے ہیں ' اور آخرت کا کوئی خیال نہیں رکھتے ۔ قیامت کے حساب و کتاب کی تکذیب کرتے ہیں ' اور ان کی بدکاری اور معصیت اور ظلم کی وجہ سے ان کے دلوں پر سیاہی چھائی ہے ۔ یہ لوگ تو اس دنیا کے مال و متاع میں ایک دوسرے کے ساتھ تنافس کرتے ہیں ' ان میں سے ہر شخص اس دنیا کے مال و متاع میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتا ہے ' اور دنیا کو زیادہ سے زیادہ سمیٹنا چاہتا ہے ۔ اس لیے ظلم کرتا ہے اور فسق و فجور میں مبتلا ہے ۔ اور اس زوال پذیر سازوسامان کے لیے مر مٹ رہا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

اس دنیا کا مال و منال اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس کے بارے میں کوئی مقابلہ ہو' مقابلہ اور بازی لے جانا اگر کوئی چاہتا بھی ہے تو چاہئے کہ وہ قیامت اور آخرت کے سازوسامان کے لیے کرے ۔

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳:۲۶) "جو لوگ ایک دوسرے پر بازی لے جانا چاہتے ہیں' وہ اس اخروی چیز کو حاصل کرنے کے لیے بازی لے جائیں"۔ کیونکہ یہی تو مطلوب مومن ہے ۔ یہی وہ نصب العین ہے جس کی طرف وہ دوڑیں اور یہی وہ ٹارگٹ ہے جس کی طرف وہ سب سے آگے بڑھیں ۔

دنیا کا سازوسامان' جاہ و مرتبہ جس قدر عظیم کیوں نہ ہو' اعلیٰ و ارفع کیوں نہ ہو ۔ آخرت کے سازوسامان کے مقابلے میں حقیر اور بے قیمت ہے ۔ یہ پوری دنیا اللہ کے ہاں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتی ۔ آخرت اللہ کے پیمانوں میں بھاری ہے ۔ لہٰذا آخرت ہی ایک ایسی قیمتی حقیقت ہے جس کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے بازی لے جانا مناسب ہے نہ کہ دنیا ۔

یہ عجیب بات ہے کہ آخرت کے لیے مقابلہ کرنے والوں کی روحیں بہت بلند ہو جاتی ہیں جبکہ دنیا کے لیے مقابلہ کرنے والے باہم حسد و دشمنی کی وجہ سے گر جاتے ہیں ۔ ان کی روح گر جاتی ہے اور جو لوگ آخرت کے لیے سعی اور مقابلہ کرتے ہیں اس کی وجہ سے یہ پوری دنیا بھی خیر و برکت سے معمور ہو جاتی ہے اور یہ سب کے لیے پاکیزہ جائے رہائش بن جاتی ہے ۔ جبکہ مقابلہ اگر دنیاوی مقاصد کے لیے ہو تو بغض و عداوت پیدا ہو جاتی ہے ۔ لوگ ایک دوسرے کو اس طرح نوچ کھاتے ہیں جس طرح حشرات الارض ایک دوسرے کو کھاتے ہیں اور نیک لوگوں کی زندگی تو اس ماحول میں سخت دشوار ہوتی ہے ۔ ہر طرف سے ان کی ٹانگ کھینچی جاتی ہے اور ہر طرف سے ان کو نوچا جاتا ہے ۔

یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ اگر ہم آخرت ہی کے لیے باہم مقابلہ اور مسابقت کریں تو یہ دنیا خراب اور برباد ہو جائے گی' جیسا کہ بعض دنیا پرستوں کا خیال ہے ۔ اسلام کا تصور یہ ہے کہ دنیا آخرت کے لیے ایک کھیت ہے ۔ یہاں فصل کی بوائی ہوگی اور آخرت میں فصل کاٹی جائے گی ۔ اصلاح و تقویٰ کے ساتھ اسلامی نظام زندگی کے مطابق اس دنیا کو آباد کرنا اور ترقی دینا' اسلامی نظریہ خلافت ارضی کے مطابق ایک مومن کا مطلوب و مقصود ہے ۔ اسلام اس دنیا کی ترقی کی راہ ہی سے آخرت کی ترقی کا قائل ہے ۔ یہی اسلام کا نظریہ عبادت ہے کہ اس دنیا کی پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت کرنا ہی انسان کا مقصد تخلیق ہے ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (ذاریات : ۵٦) "اور میں نے جن و انس کو اس کے سوا کسی اور مقصد کے لیے نہیں پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں"۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے سورہ ذاریات' پارہ ۲۷)

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳:۲۶) "جو لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز میں باری لے جائیں"۔ یہ ایک ایسی ہدایت ہے جو اس دنیا کے لوگوں کی نظریں اس کم قیمت اور حقیر زمین سے بلند کر کے آخرت پر مرکوز کراتی ہے ۔ جبکہ عملاً وہ اسی دنیا میں انسان کے منصب خلافت کو ادا کرتے ہوئے اس زمین کی تعمیر و ترقی میں بھی مصروف ہوتے ہیں ۔ اس کی مثال یوں ہے کہ مسلمان اس دنیا میں پائی

جانے والی گندگی کی تطہیر میں بھی مصروف ہوتے ہیں اور اس گندگی سے دامن بھی بچاتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی زندگی بہت ہی مختصر ہے ۔ اور آخرت کے جہاں میں انسان کی عمر طویل ہے ۔ اور اس کی انتہا کا علم اللہ ہی کو ہے ۔ پھر اس دنیا کا سازوسامان بھی محدود ہے ۔ اور جنت کا سازوسامان اس قدر زیادہ اور لامحدود ہے کہ انسان کے حد ادراک سے ماوراء ہے ۔ اس دنیا میں سازوسامان اور عیش و آرام کی سطح بھی معلوم اور محدود ہے جبکہ آخرت کا عیش و آرام لامحدود ہے ۔ آخرت کا میدان بہت ہی وسیع اور دنیا کا میدان بہت ہی محدود ہے ۔ دونوں کے مقاصد میں بھی بہت بڑا فرق ہے ۔ دونوں کا نفع نقصان بھی بہت ہی مختلف ہے ۔ اس لیے مقابلہ بھی مختلف ہے ۔ اور حکم یہ ہے ۔ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳:۲۶) "جو لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز میں بازی لے جائیں" ۔ یہاں ابرار اور نیکوکاروں کے انعامات اخروی کی تفصیلات ذرا طویل ہوگئیں اور یہ اس لیے بیان کی گئیں کہ مکہ کی سوسائٹی میں وہ فجار اور فساق کے ہاتھوں ظلم و ستم کا شکار تھے ۔ ان کو اذیت دی جارہی تھی ' ان کے ساتھ مذاق کیا جارہا تھا ' اور ان پر زیادتیاں ہورہی تھیں ' اس لیے ان انعامات کی بھی تفصیلات دی گئیں جو ان کے لیے تیار رکھی ہیں ' اور مذاق کے بدلے پھر کافروں کے ساتھ بھی مذاق ہوگا ' اس وقت وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ ابرار کو وہ انعامات پورے کے پورے مل گئے ہیں ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
یَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَ اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا
فَكِهِیْنَ ﴿۳۱﴾ وَ اِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾ وَ مَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَیْهِمْ
حٰفِظِیْنَ ﴿۳۳﴾ فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ یَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ۱
یَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ ع ۳۶

"مجرم لوگ دنیا میں ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے ۔ جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان ۸
کی طرف اشارے کرتے تھے ' اپنے گھر والوں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے ' اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے تھے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں ' حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے ۔ آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں ' مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں ' مل گیا نا کافروں کو ان حرکتوں کا ثواب جو وہ کیا کرتے تھے" ۔

اہل ایمان کے ساتھ مجرموں کے استہزا کے مناظر ' ان کی جانب سے دست درازیوں اور زیادتیوں کے جو شاید قرآن نے یہاں قلم بند کیے ہیں خصوصاً ان کا یہ تبصرہ کہ مسلمان گمراہ لوگ ہیں ' یہ سب مناظر مکہ کی سوسائٹی کے عملی مناظر ہیں ' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقامت دین کی ہر کسی تحریک کے کارکن انہی حالات اور انہی ریمارکس سے دوچار ہوتے ہیں ۔ ہر دور اور ہر نسل میں یہی صورت حالات ہوا کرتی ہے ۔ آج ہم اپنے دور کے حالات کو جب دیکھتے ہیں تو یہ نظر آتا

ہے کہ شاید یہ آیات ابھی ہمارے حسب حال اتری ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فساق و فجار کا مزاج ایک جیسا ہوتا ہے اور اہل حق کے مقابلے میں ان کا موقف بھی ہمیشہ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔اس میں زمان و مکان کے فرق سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَكُوْنَ (۸۳: ۲۹) ''مجرم لوگ دنیا میں ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے''۔یہ ایسے ہی تھے'اس ''تھے'' نے صدیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔اب یہ آخرت کی بات ہو رہی ہے۔یہ اپنی آنکھوں سے اہل جنت کی نعمتوں کو دیکھ رہے ہیں۔یہاں آخرت میں ان کو ذرا یاد دلایا جا رہا ہے کہ تم تو یہ رویہ رکھتے تھے۔یاد ہے نا۔

یہ اہل ایمان سے بطور مذاق ہنستے تھے کہ یہ ہیں مومن۔یہ ہیں ''صالح''۔یہ ہیں ''صالحین''۔یہ کیوں ہنستے تھے۔یا تو اس لیے کہ یہ لوگ غریب اور فقیر تھے اور بات انقلاب کی کرتے تھے اور پہنے ہوئے ہوتے تھے چیتھڑے۔یا اس لیے کہ ہر طرف سے ان پر مار پڑتی ہے۔جیلوں میں ہیں'اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے۔یا اس لیے کہ یہ لوگ ان کی حماقتوں میں شریک نہ ہوتے تھے۔ان لوگوں کے ہاں یہ سب باتیں مضحکہ خیز تھیں۔چنانچہ وہ اہل ایمان پر طنز و تشنیع کے تیر برساتے تھے۔ان کو اذیت دیتے تھے۔ان پر تشدد کرتے تھے اور نہایت ہی رذالت اور گھٹیا انداز میں ان سے مذاق کرتے تھے۔اس بات کا اہل ایمان پر برا اثر ہوتا تھا۔اور ان کو تکلیف ہوتی تھی لیکن وہ صبر کرتے تھے۔بلند اخلاق اختیار کرتے تھے اور نہایت شائستگی سے بات کو ٹال دیتے تھے۔

وَ اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ (۸۳: ۳۰) ''جب ان کے پاس سے گزرتے'تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارہ کرتے تھے''۔یعنی وہ آنکھوں سے اشارے کرتے تھے یا ہاتھوں سے اشارے کرتے تھے یا کوئی ایسی حرکت کرتے تھے جو ان کے درمیان مذاق اڑانے کے لیے متعارف تھی۔یہ ایسی گری ہوئی حرکت ہوتی جس سے ان کی گستاخی اور بے ادبی کا اظہار ہوتا'یہ حرکت تہذیب کے دائرے سے نکلی ہوئی ہوتی'اور ایسی حرکات سے ان لوگوں کا مقصد یہ ہوتا کہ اہل اسلام کے دل ٹوٹ جائیں اور ان کو شرمندہ کیا جائے اور وہ اس تحریک کی کامیابی سے مایوس ہو جائیں'اس لیے یہ لوگ اس طرح کے اشارے کرتے اور چھچھوری حرکات کرتے۔

وَ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمُ (۸۳: ۳۱) ''اور جب وہ اپنے گھروں کی طرف پلٹتے''۔یعنی مومنین کو ایذائیں دے کر اور ان کا مذاق اڑا کر جب وہ تھک جاتے تو اپنے گھروں کی طرف انْقَلَبُوْا فَكِهِیْنَ (۸۳: ۳۱) ''تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے''۔وہ اپنی ان حرکات پر خوش ہوتے'اور نہایت مزے سے اتراتے ہوئے جاتے'اور اپنی ان گھٹیا حرکات اور شرارتوں پر ان کو سخت مسرت ہوتی۔حالانکہ اگر ان کا ضمیر زندہ ہوتا تو ان کو ملامت کرتا'اور ان کو اپنے ان افعال پر ندامت ہوتی'ان کو بالکل احساس نہ ہوتا کہ وہ کس قدر حقیر حرکت کر رہے اور کس قدر گندا طرز عمل ہے ان کا۔قلب و نظر کے مسخ ہونے اور ضمیر کے مرجانے کی یہ آخری حد ہے۔

وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْآ اِنَّ هٰؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ (۸۳:۳۲) "اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں"۔ اور یہ تو نہایت ہی تعجب خیز بات ہے کہ اب یہ لوگ ہدایت و ضلالت کے موضوع پر بات کرنے لگے ہیں اور بزعم خود یہ اہل حق اور اہل ہدایت کو اہل ضلالت اور گمراہ کہتے ہیں' اور نہایت وثوق اور تحقیر آمیز طریقے سے یہ تبصرہ کرتے ہیں۔

اِنَّ هٰؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ (۸۳:۳۲) "کہ یہ لوگ بہکے ہوئے ہیں"۔

فسق و فجور کا یہ مزاج ہے کہ وہ ایک حد پر نہیں رکتا' وہ کسی بات سے نہیں شرماتا' کسی فعل پر نادم نہیں ہوتا۔ ان فساق و فجار کی طرف سے اہل ایمان جیسے معیاری لوگوں پر یہ الزام لگانا کہ وہ بہکے ہوئے ہیں' اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ فساق و فجار کسی حد پر جاکر نہیں رکتے اور بے حیا ہوتے ہیں۔

قرآن کریم اہل ایمان کی جانب سے نہ مناظرہ کرتا ہے اور نہ مجادلہ۔ نہ وہ اس افترا کی تردید کرتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسی ناسقانہ گھٹیا بات ہے جس کی طرف سنجیدہ التفات کی ضرورت ہی نہیں ہے لیکن قرآن کریم ان لوگوں کے ساتھ ایک سنجیدہ مذاق ضرور کرتا ہے جو ایک ایسے معاملے مین ٹانگ اڑاتے ہیں جس کے ساتھ ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان کا ہدایت و ضلالت سے کیا کام ہے۔ اور مسلمانوں کی نگرانی پر ان کو کس نے مامور کیا۔

وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ (۸۳:۳۳) "حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے"۔ نہ مسلمانوں کے امور ان کے سپرد کیے گئے ہیں' نہ یہ ان پر قیم ہیں' نہ اہل ایمان کے حالات و کوائف ان سے پوچھے گئے ہیں' لہٰذا ان کی جانب سے مسلمانوں پر یہ تبصرہ ایک بے تکی بات ہے۔

دنیا میں مجرمین اہل ایمان کے ساتھ جو برتاؤ کرتے تھے' اس کا منظر اب یہاں اس سنجیدہ مذاق کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور اب قیامت کے دن کا حاضر منظر پیش کیا جاتا ہے کہ دیکھو اب جنت میں یہ اہل ایمان کس مزے میں ہیں۔

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ (۳٤) عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ

(۸۳:۳۵) "آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں' مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں"۔

آج کا دن ایسا ہے کہ کفار دیدار ربانی جیسی نعمت سے محروم اور محجوب ہیں۔ اور اس محرومیت کا ان کو بے حد غم ہے' اس کی وجہ سے ان کی انسانیت گرگئی اور وہ واصل جہنم ہو گئے اور اس جہنم رسیدگی پر مزید یہ کہ ان کی اہانت بھی ہوگی اور سرزنش بھی ہوگی۔

هٰذَا الَّذِىْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۸۳:۱۷) "وہ یہی ہے ناوہ چیز جس کی تم تکذیب کرتے تھے؟"

آج کا دن تو یوں ہے کہ اہل ایمان اونچی اونچی مسندوں پر بیٹھے ہیں اور کفار کے حالات کا نظارہ کر رہے ہیں اور دائمی نعمتوں میں مزے لے رہے ہیں' سربند خالص اور صاف شراب سے ان کی تواضع ہو رہی ہے اور اس سربند شراب پر مہر اور سیل مشک کی ہوگی اور اس کے اندر چشمہ تسنیم کے خوش ذائقہ پانی کا امتزاج ہو گا اور آج کفار کے حالات کو دیکھ کر

اہل ایمان مسکرائیں گے۔

ایک بار پھر قرآن نہایت سنجیدہ مزاح کرتا ہے۔

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۸۳: ۳۶) "مل گیا نا کافروں کو ان کی حرکتوں کا ثواب' جو وہ کیا کرتے تھے"۔ ہاں کیا ان کو بدلہ مل گیا؟ وہ جو کچھ کرتے تھے اس کا ثواب مل گیا؟ ان کو ثواب تو نہ ملا تھا۔ لفظ ثواب کا مفہوم تو حسن جزا ہے اور ان کو ہم ابھی جہنم میں چھوڑ کر آئے ہیں' اور انہوں نے اپنے کیے کی سزا پالی ہے۔ تو یہ سزا گویا ان کے لیے ثواب ہے۔ لفظ ثوب استعمال کر کے قرآن کریم نے ان کے ساتھ ایسا مذاق کیا جس کی چبھن وہ دل کی گہرائی میں محسوس کرتے ہیں۔

اب ہم اس منظر کے سامنے قدرے کھڑے ہوتے ہیں' جس کے مناظر حرکت سے بھرپور ہیں۔ یہ ان لوگوں کا منظر ہے جنہوں نے اس دنیا میں مسلمانوں اور تحریک اسلامی کے خلاف جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ اس سے قبل ابرار اور نیک لوگوں کی جزا کے بیان میں قرآن کریم نے قدرے طوالت سے کام لیا تھا' اور ان کی عیش و عشرت کے مناظر میں طوالت سے کام لیا تھا۔ یہ طویل بیان اور تفصیلات تاثیر کے لحاظ سے اعلیٰ خوبیوں کا مالک تھا' اور شعوری اور نفسیاتی لحاظ سے مکہ کے مشکل حالات میں کام کرنے والے مسلمانوں کے لیے بہترین تسلی تھی۔ مکہ میں یہ مٹھی بھر مسلمان سخت مشکلات سے دوچار تھے۔ ان کو اذیت دی جارہی تھی اور ان پر قسم قسم کے تشدد ہو رہے تھے اور ان باتوں کا ان پر بہرحال گہرا اثر ہوتا تھا۔ ان کو ضرورت تھی کہ ان کی ڈھارس بندھائی جائے اور ان کے حوصلوں کو بلند رکھا جائے اور ان کی مدد کی جائے۔

مشرکین کی طرف سے مسلمانوں کو جو اذیت دی جارہی تھی۔ اس کی یہ تفصیلات مسلمانوں کے لیے اہم تھی۔ ایک گونہ تسلی تھی کہ ان کا رب بہرحال دیکھ رہا ہے اور وہ ان تکالیف کو یونہی نہ چھوڑ دے گا۔ اگرچہ وقتی طور پر کافروں کو مہلت دی جارہی تھی اور یہ تصور کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ اہل ایمان کے دلوں کی تسلی کے لیے کافی تھا' اس سے اہل ایمان کے زخم مندمل ہو جاتے تھے کہ اللہ دیکھ رہا ہے کہ اہل ایمان کے ساتھ مزاح کرنے والے کس طرح مزاح کر رہے ہیں اور اہل مکہ ان کو کیا کیا اذیتیں دے رہے ہیں۔ اور ان کے آلام اور ان کی تکالیف سے کس طرح وہ لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ یہ کمینے کس طرح گھٹیا پن کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور ان کو کوئی شرم بھی نہیں آتی لیکن اہل ایمان کا رب یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور قرآن میں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ریکارڈ کر رہا ہے۔ اس لیے کہ یہ صورت حالات اللہ کے ہاں اس قابل ہے کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ریکارڈ کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اہل ایمان کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا تو ان کے تمام غم اور آلام دور ہو گئے۔ تمام رنج و الم ختم ہو گئے۔

پھر ان کا رب ان مجرموں کے ساتھ ایک سنجیدہ مذاق کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ جری مجرم اس مزاح کو محسوس نہ کریں کیونکہ ان کو فطرت مسخ ہو چکی ہے اور ان کے قلوب ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے زنگ آلود ہو چکے ہیں بلکہ سیاہ ہو چکے ہیں لیکن اہل ایمان کے حساس دل اور خوف خدا سے کانپنے والے دل' اس مزاح کو اہمیت دیتے ہیں اور اس کی قدر کرتے ہیں اور یہ ان کے دکھوں اور دردوں کے لیے سکون بخش دوا ہے اور اس سے ان کو خوشی ہوتی ہے۔

یہ مومن اس بات کو بھی اہمیت دیتے ہیں کہ ان کے رب کے ہاں ان کا ایک مقام ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ

جنتوں میں ان کے لیے نعمتیں ہیں اور عالم بالا میں ' درگاہ الٰہی میں ان کے لیے بلند مرتبہ و مقام ہے اور عزت ہے ـ پھر وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان کے دشمنوں کا آخرت میں کیا حال ہے؟ اور اللہ کے ہاں وہ ذلیل و خوار ہیں ـ بے وقعت ہیں اور ان مناظر قیامت میں ان کے لیے کیسا توہین آمیز عذاب ہے ـ یہ مناظر وہ دیکھتے ہیں اور ان سے وہ یہ یقین حاصل کرتے ہیں کہ قیامت میں ان کی حالت کیا ہوگی ـ اس وقت مسلمان قلیل تھے ' ان پر تشدد ہو رہا تھا ' وہ کمزور تھے ' ان کے ساتھ مزاح ہو رہا تھا اور وہ قلت تعداد کی وجہ سے اور کمزوری کے سبب ہر قسم کے مصائب جھیل رہے تھے ' چنانچہ ان مناظر کے تاثرات اور یقین سے ان کی یہ تمام تلخیاں کم ہو جاتی تھیں اور دکھ اور درد کم ہو جاتے تھے ـ ان حالات اور مناظر اور ان کے نتیجے میں حاصل ہونے والے یقین کی وجہ سے بعض اہل ایمان ان تلخیوں میں بھی شیرینی محسوس کرتے اور وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کو وہ دنیا ہی میں حقیقتاً دیکھ رہے ہیں ' جن کا ان آیات میں ذکر ہے ـ

لیکن سیرت صحابہؓ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ جس قدر اذیتیں جھیل رہے تھے اور جس قدر مجرمین ان پر تشدد کر رہے تھے اور ان کے ساتھ گھٹیا مزاح کرتے تھے ان سب مشکلات کو وہ صرف ایک ہی نصب العین کے لیے برداشت کر رہے تھے کہ ان کو جنت ملے گی اور ان کے مخالف کافروں کو جہنم ملے گی ـ اور اس دنیا میں ان دو گروہوں کے جو حالات ہیں وہ آخرت میں یکسر بدل جائیں گے ـ یہی وہ بات ہے جس کا اہل ایمان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ فرمایا تھا ' جنہوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور جس راہ میں وہ اپنے مال اور اپنی جان کھپا رہے تھے ـ

رہی یہ بات کہ اس دنیا میں بھی تمہیں غلبہ نصیب ہو گا ـ اور تم ملکوں کو فتح کر لوگے تو اس کا تذکرہ قرآن مجید میں مکی دور میں بہت ہی کم ملتا ہے ـ یعنی اس غرض کے لیے کہ اہل ایمان کو اس سے تسلی دی جائے اور ان کے حوصلے بڑھانے چاہئیں ـ

اصل بات یہ ہے کہ مکہ میں قرآن مجید ایسے افراد تیار کر رہا تھا جو وہ اس امانت اور اس نظریہ کی ذمہ داریوں کے اٹھانے کے قابل ہو جائیں اور یہ افراد اس قدر مضبوط ' اس قدر قوی ' اس قدر مخلص اور اس قدر باکردار ہوں کہ وہ اس دنیا کے تمام مفادات کو اس راہ میں قربان کر دیں ـ اور ان کے پیش نظر صرف آخرت کی کامیابی ہو اور صرف اللہ کی رضامندی کے وہ طالب ہوں ایسے لوگ جو اس دنیا میں گزرنے والی پوری زندگی کو مصیبت اور مشقت میں کاٹنے کے لیے تیار ہوں ـ تشدد اور ظلم برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں ' ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے آمادہ ہوں اور اس جہاں میں وہ کسی اجر کے طالب نہ ہوں یہاں تک کہ وہ اس جہاں میں اسلامی انقلاب اور اسلام کے غلبے کے طلبگار بھی نہ ہوں ' اور ان کے دلوں میں یہ خواہش بھی نہ ہو کہ وہ برسراقتدار آجائیں ' قرآن کے پیش نظر ایک ایسی مخلص جماعت کی تیاری تھی ـ

اور جب ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جس کے پیش نظر اس دنیا کے مختصر سفر کے اغراض و مقاصد میں سے کوئی مقصد نہ تھا ' الا یہ کہ کوئی بات بغیر خواہش کے مل جائے اور ان کا نصب العین صرف جزائے اخروی کا حصول تھا ' اور جن کا عقیدہ یہ تھا کہ حق و باطل کا اصل فیصلہ آخرت میں ہو گا ' جب ایسی جماعت تیار ہوگئی اور اللہ نے جان لیا کہ یہ جماعت سچی ہے اور اس کی نیت خالص ہے اور اس نے جس مقصد کے لیے بیعت کی تھی ' اسے سچ کر دکھایا تو پھر اس دنیا میں بھی اس کی نصرت کے لیے اللہ کی مدد آگئی ـ اور یہ نصرت بھی اس لیے آئی تاکہ وہ دعوت اسلامی کی امانت کا حق ادا کرے ' اسلامی نظام حیات کا حق ادا کرے ' نہ ایسی جماعت کے ساتھ دنیا کے مفادات کا کوئی وعدہ کیا گیا تھا اور نہ اس جماعت کے دل میں دنیاوی مفاد کا کوئی تقاضا تھا کہ اسے یہ دیا جائے یا وہ ' یہ جماعت اس قدر مخلص ہوگئی تھی کہ اس کے پیش نظر

رضائے الہیٰ کے سوا کوئی اور مقصد نہ تھا۔

جن آیات میں اس کرۂ ارض پر کامیابیوں کا ذکر ہے ۔یہ سب مدنی آیات ہیں اور مدنی حالات اس وقت پیدا ہوئے جب اہل ایمان کے دلوں میں ایسے حالات کی کوئی خواہش ہی نہ تھی نہ وہ ان کا انتظار کرتے تھے ۔ یہ نصرت اس وقت آئی جب اللہ کی مشیت کا یہ تقاضا ہوا کہ اسلامی نظام حیات ایک عملی شکل میں دنیا اور زمین پر قائم ہو جائے اور اس وقت کے لوگ اور آنے والے لوگ عملاً اسلام کو دیکھ لیں ۔ یہ نصرت اہل ایمان کی مشکلات ' مشقتوں اور اذیتوں اور قربانیوں پر بطور جزا نہ تھی ۔بس یہ اللہ کا ایک فیصلہ تھا اور اس کی حکمت کو اب ہم سمجھنے کی سعی کر رہے ہیں ۔ [1]

---ooo---

(۱)اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سید قطب کے سامنے سید مودودی رحمتہ اللہ علیہ کا لٹریچر تھا ' اور ان کی یہ رائے مولانا ابو الحسن علی ندوی کے تبلیغی افکار پر مبنی ہے ۔ تبلیغی حضرات یہی انداز رکھتے ہیں ۔ فی ظلال القرآن کا پہلا ایڈیشن چار جلدوں میں تھا ۔جب انہوں نے اس پر نظر ثانی کی تو آٹھ جلدوں میں مفصل ایڈیشن شائع ہوا ۔یہ ۶۷ ۔ ۱۹۶۶ ء کا ایڈیشن تھا ۔نظر ثانی شدہ ایڈیشن میں سید قطب صاحب نے سید مودودی کے افکار کو سمیٹا ہے اور مفصل حوالے بھی دیئے ہیں ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر کیا مکمل اسلامی انقلاب نظریہ تھا یا نہیں ' اس کی تفصیلات دیکھئے میری کتاب "قرآن سیرت اور انقلاب" جو قرآن مجید کا خلاصہ ہے اور ۱۱۴ سورتوں کا خلاصہ ترتیب نزولی کے مطابق ہے اور اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو بھی نہایت ہی اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ جب صرف تین افراد مسلمان تھے ' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ اور حضرت علیؓ تو اس وقت بھی حضورؐ نے قیصرو کسریٰ کو فتح کرنے کی بات کی تھی ۔ (شیرازی)

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الانشقاق ـ ۸۴

۱-- تا-- ۲۵

سورۃ الانشقاق ایک نظر میں

اس سورت کا آغاز بعض کائناتی انقلابات کے مظاہر و مناظر سے ہوتا ہے ۔ پہلے سورہ تکویر ' پھر سورہ انفطار میں ۔اور ان سے قبل سورہ النبامیں ان مشاہد کی تفصیلات دی گئی ہیں ' لیکن یہ ان مناظر کا ایک خاص انداز ہے ۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ تمام واقعات دراصل اطاعت حکم ربی میں ہو رہے ہیں ۔ یہ زمین اور یہ آسمان دراصل رب تعالٰی کے احکام کے مطیع ہیں اور نہایت خضوع و خشوع سے اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور یہ اطاعت نہایت ہی خضوع اور فرمانبرداری کے ساتھ ہوتی ہے ۔اور بڑی سہولت سے ہوتی ہے ۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ(١) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ(٢) وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ(٣) وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ(٤) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ(٥)(٨٤: ١ تا ٥) ”جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے حق یہی ہے (کہ اپنے رب کے حکم مانے)۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کے لیے حق یہی ہے (کہ اس کی تعمیل کرے)“۔

خود سپردگی سے بھرپور یہ پیراگراف دراصل تمہید تھا انسان کے خطاب کے لیے تاکہ یہ کائناتی خضوع و خشوع اس کے دل میں اتار دیا جائے اور اس کو اللہ کے احکام یاد دلائے جائیں اور یہ بتایا جائے کہ اللہ کے ہاں تمہارا انجام کیا ہو گا۔ یہ خضوع اور اطاعت انسان کے دل میں اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ آسمان و زمین اور یہ پوری کائنات اس عظیم منظر میں اللہ کی مطیع ہے ۔

يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ(٦) فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ(٧) فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا(٨) وَّيَنْقَلِبُ اِلٰى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا(٩) وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ(١٠) فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا(١١) وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا(١٢) اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا(١٣) اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ(١٤) بَلٰٓى اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا(١٥)(٨٤: ٦ تا ١٥) ”اے انسان تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا

جارہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے 'پھر جس کا نامہ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا گیا' اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا۔ رہا وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا۔ وہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ اسے کبھی پلٹنا نہیں ہے۔ پلٹنا کیسے نہ تھا' اس کا رب اس کے کرتوت دیکھ رہا تھا"۔

تیسرے پیراگراف میں اس کائنات کے ان مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے جو انسان کے مشاہدے میں ہیں اور جو یہ بات بتلاتے ہیں کہ اس کائنات کے نظام میں نہایت گہری منصوبہ بندی ہے اور انسان ایسے حالات میں زندگی کے شب و روز گزار رہے ہیں جو ایک اسکیم کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں' اور زندگی کا یہ نشیب و فراز انہوں نے دیکھنا ہے اور جو مشکلات بھی پیش آئیں انہیں برداشت کرنا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ(١٦) وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ(١٧) وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ(١٨)

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ(١٩)(٨٤: ١٦ تا ١٩) "پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی' اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے' اور چاند کی جب کہ وہ ماہ کامل ہو جاتا ہے' تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک مشکل حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے"۔

اب سورت کا آخری پیراگراف آتا ہے' اس میں ان لوگوں کے حالات پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے جو دعوت اسلامی کو قبول نہیں کرتے۔ اور یہ ہے انسانیت کی حقیقت اور یہ ہے اس کا انجام جو آغاز سورت میں بتایا گیا۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ(٢٠) وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ(٨٤: ٢١)

السجدة "پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جائے تو سجدہ نہیں کرتے"۔ اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندرون میں جو کچھ رکھتے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ لہٰذا ان کا انجام متعین اور معلوم ہے۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ(٢٢) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ(٢٣) فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ(٢٤) اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ(٢٥)

(٨٤: ٢٢ تا ٢٥) "بلکہ یہ منکرین تو الٹا جھٹلاتے ہیں' حالانکہ جو کچھ یہ (اپنے نامہ اعمال میں) جمع کر رہے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ لہٰذا ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ البتہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں' ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے"۔

اس سورت کا انداز دھیما اور اس کے معانی جلیل القدر ہیں۔ اس کائنات کے انقلاب کے مناظر بھی دھیمے انداز میں

پیش کیے گئے ہیں جبکہ اس سے قبل سورت تکویر میں ایسے ہی انقلابی مناظر کا انداز طوفانی تھا۔ غرض اس سورت کا لہجہ ایسا ہے جس طرح ایک رحیم و شفیق استاد نہایت آرام اور سہولت سے اپنے زیر تربیت افراد کو قدم بقدم پڑھاتا ہے اور نہایت نرم اور گہری تلقین کے ساتھ' ذرا دیکھئے خطاب کس قدر ہمدردانہ ہے' اے انسان! انسان کی انسانیت کو ابھارا جاتا ہے۔ اس میں نصیحت بھی ہے اور ضمیر کی بیداری بھی۔

اس سورت میں اسی دھیمے انداز میں پیراگراف مرتب کیے گئے ہیں' جو انسان کے دل و دماغ کو اس کائنات کی وسیع وادیوں' انسانیت کے مختلف میدانوں میں یکے بعد دیگرے سیر کراتے چلے جاتے ہیں' انسان ایک ایسے کائناتی منظر کی سیر کرتا ہے جس میں ہر چیز قانون قدرت کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔ پھر انسانی قلب کی وادی میں اور پھر قیامت کے منظر جزاء و سزا کے میدان میں اور پھر وہاں سے واپس کائنات کے موجود اور حاضر مناظر و مشاہد میں' اور پھر انسان کے عقل و خرد کی وادی میں پھر اس بات کا اظہار کرتے ہوئے کہ انسان کا یہ طرز عمل کس قدر عجیب ہے کہ ان مشاہد کو دیکھتے ہوئے بھی وہ ایمان نہیں لاتا۔ اور پھر یہ دھمکی کہ اگر اسی طرح انکار کرتے رہے تو عذاب الیم سے دوچار ہوں گے اور اگر ایمان لے آئے تو تمہارے لیے غیر منقطع اجر ہو گا۔

یہ سب مناظر اور مشاہد' یہ سب اشارات و تاثرات' اور یہ ملکوتی سیر ایک نہایت ہی مختصر سورت میں سمو دیے گئے ہیں' جس کا طول و عرض چند سطروں تک محدود ہے۔ یہ کام صرف قرآن کا خاصہ ہے۔ کسی دوسری کتاب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ اس قدر عظیم معانی اور مقاصد ہیں کہ ایک طویل کتاب میں بھی ان کو کماحقہ بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کو اس قدر زوردار انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ قرآن ہے اور اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگوں کے لیے آسان ترین طریقے سے ہدایت فراہم کی جائے۔ دلوں کو براہ راست خطاب کرے' ایسی راہوں سے دلوں تک ہدایات پہنچائے جو قریب ترین ہوں۔ یہ ہے انداز اور رنگ علیم و خبیر کے اسلوب بیان کا۔

---ooo---

درس نمبر ۲۸۴ تشریح آیات

۱-- تا-- ۲۵

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ (۸۴) مَكِّيَّةٌ (۸۳) آیاتہا ۲۵ رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴿۱﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ﴿۲﴾ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿۳﴾
وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ﴿۴﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے حق یہی ہے (کہ اپنے رب کے حکم مانے)۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کے لیے حق یہی ہے (کہ اس کی تعمیل کرے)"۔

گزشتہ سورت میں ہم نے آسمان کے پھٹنے کی تشریح کی ہے۔ یہاں جو بات اضافی آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کام اللہ کی اطاعت میں ہو گا۔ اور یہ کہ وہ اس بات کا ذمہ دار اور مستحق ہے کہ ایسا کرے اور اللہ کے اس حق کو ادا کرے کیونکہ اللہ کا حق ہے کہ اس کے احکام کی اطاعت کی جائے۔

وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ (۸۴ : ۲) "اور اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے حق یہی ہے"۔ کہ اپنے رب کے احکام کی تعمیل کرے۔ آسمان کی طرف سے "اذن" یعنی اعلان یا اجازت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ پھٹنے میں اللہ کے حکم کی تعمیل کرے گا اور حقت کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اوپر اللہ کا یہ حق واقع ہو گیا۔ اور اس نے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ اس پر اللہ کا یہ حق ہے اور یہ بھی ایک طرح کا اظہار ہے۔ تسلیم اور اطاعت کا کہ یہ اللہ کا مسلمہ حق ہے آسمان پر۔

وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ (۸۴ : ۳) "اور جب زمین پھیلا دی جائے گی"۔ یہ بھی ایک جدید منظر اور مفہوم ہے۔ زمین کے پھیلنے اور اس کی لمبائی کا مفہوم کیا ہے؟ یعنی وہ قوانین قدرت معطل ہو جائیں گے جو اس زمین کو

کنٹرول کرتے ہیں اور جو اسے اس کی موجودہ شکل میں قائم رکھتے ہیں ۔ یعنی موجودہ گول یا بیضوی شکل میں قائم رکھتے ہیں ۔ انداز کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے اندر یہ تبدیلی باہر کے عوامل سے پیدا ہوگی کیونکہ اس کے لیے صیغہ مجہول استعمال ہوا ہے یعنی لفظ مدت ۔

وَ اَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ (٨٤ : ٤) "اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی"۔ یہ ایک ایسی تصویر کشی ہے کہ یہ زمین گویا ایک زندہ اور صاحب ارادہ چیز ہے ' اور وہ اپنے اندر کی چیزوں کو باہر پھینک کر خالی ہو رہی ہے ۔ کیونکہ اس کے اندر بہت کچھ ہے ۔ مثلاً یہ مخلوقات جن کا گننا مشکل ہے ' جو صدیوں سے اس کے اندر دفن ہو رہی ہیں اور نہ اس کے زمانے کا علم ہے اور نہ لوگوں کی تعداد کا۔ زمین کے پیٹ کے اندر جو معدنیات ' پانی اور دوسری چیزیں ہیں جن کا علم صرف اللہ کو ہے ' سب باہر آ جائیں گی ۔ صدیوں سے یہ زمین ان چیزوں کو اٹھائے ہوئے ہے ۔ جب قیامت برپا ہوگی تو یہ سب چیزوں اور سب رازوں کو اگل دے گی ۔

وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ (٨٤ : ٥) "اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کے لیے یہی حق ہے"۔ اذن کے معنی یہاں اطاعت رب کے ہیں اور اللہ کے احکام کی تعمیل کرنے کے ہیں ۔ جس طرح یہ تعبیر آسمان کے لیے بھی تھی ۔ مطلب یہ ہے کہ زمین اعتراف کر رہی ہوگی ' اللہ کا اس پر حق ہے کہ وہ اللہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرے ۔ انداز بیان میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ گویا زمین ' آسمان ' ذی روح مخلوق ہیں ۔ یہ اللہ کا حکم سنتے ہیں اور بالارادہ تعمیل کرتے ہیں ' فوراً لبیک کہتے ہیں اور اس طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح ایک شخص اطاعت کا اقرار و اعتراف کرتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ اس پر ایسا کرنا حق ہے' اس لیے وہ سر تسلیم خم کرتا ہو اور بغیر جبر کے یہ کام کرتا ہو اور اس میں کوئی حیل و حجت نہ کرتا ہو ۔

اگرچہ قیام قیامت کے دن اس کائنات میں ایک عظیم انقلاب ہوگا اور یہ اسی کا ایک منظر ہے ' لیکن یہاں جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ پر وقار اور دھیمی ہے ۔ اور اس پر توازن اور خشوع کے گہرے سائے ہیں ۔ جو تاثرات پردۂ احساس پر قائم رہتے ہیں وہ اطاعت ' تسلیم و رضا' خضوع و خشوع اور بغیر حیل و حجت اور بغیر قیل و قال اطاعت کیشی کے ہیں ۔

چنانچہ ایسی ہی فضا میں باری تعالیٰ کی جانب سے ایک پکار آتی ہے ۔ اس میں انسان کو انسانیت کے نام سے پکارا جاتا ہے ۔ یہ دکھا کر کہ دیکھو یہ پوری کائنات اور یہ ارض و سما کس طرح سر اطاعت خم کیے ہوئے ہیں ' اور اللہ کی اطاعت کو اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں ۔

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝

"اے انسان ' تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے"۔

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ (٨٤ : ٦) جس کو رب تعالیٰ نے مہربانی کر کے اس طرح بنایا ہے ' جس کو اللہ نے پوری مخلوقات کے مقابلے میں انسانیت کی منفرد صفت دی ۔ اس کو تو یہ چاہئے کہ یہ اپنے رب کی معرفت میں سب سے آگے

ہو ' اور اس پوری کائنات اور ارض و سما کے مقابلے میں اللہ کے سامنے زیادہ سر تسلیم خم کرنے والا ہو ' اللہ نے اس کے جسم میں اپنی روح پھونکی ' اسے یہ قوت دی اور یہ فہم دیا کہ وہ رب تک رسائی حاصل کر سکے اور اپنے نور کا دیا اس کی ذات میں جلایا ' اور اس کے اندر یہ تڑپ رکھی کہ وہ اللہ کے فیوض حاصل کرے ' اور ان کے ذریعہ روحانی پاکیزگی اختیار کرے اور لامحدود بلندیوں تک عروج حاصل کرے ۔ اور اس کمال کی انتہاؤں تک جا پہنچے جن تک انسان پہنچ سکتا ہے ۔ یاد رہے کہ انسانی ترقی اور کمال کے آفاق بہت وسیع ہیں ۔

يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (٨٤ : ٦) "اے انسان ' تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے"۔ اے انسان تو اپنا سفر حیات اس جہاں میں نہایت مشقت کے ساتھ طے کر رہا ہے ۔ اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے ' جدوجہد کر رہا ہے ' سانس پھولی ہوئی ہے ۔ راستہ دشوار ہے اور اس پر مشقت راستے کو طے کر کے تو پہنچنے والا کہاں ہے ؟ رب کی طرف مرجع ہے اور جائے پناہ درگاہ الہٰی ہی ہے اور تو اس تک اس جدوجہد اور مشقت کے بعد پہنچ رہا ہے ۔

اے انسان ' تو اس جہاں میں اپنی ضروریات زندگی بھی بڑی جدوجہد سے مہیا کر رہا ہے ۔ اگر کسی کو جسمانی مشقت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تو فکر معاش اور ذہنی پریشانی ہر کسی کو ہوتی ہے ۔ خوشحال اور غریب دونوں فکرمند ضرور ہوتے ہیں ۔ دونوں ہی مشقت کرتے ہیں ۔ اگرچہ مشقت کی نوعیت مختلف ہوتی ہے ۔ ورنہ مشقت اور جدوجہد انسان کی زندگی کا جزو لاینفک ہے ۔ لیکن سرمایہ دار اور نادار دونوں آخر کار اللہ کے ہاں جا پہنچتے ہیں ۔

اے انسان ' اس زمین پر تو ہرگز حقیقی راحت نہ پا سکے گا ۔ راحت اور آرام تو آخرت میں ہوں گے لیکن ان کے لیے جو سر تسلیم خم کرتے ہوئے احکام خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں اور آخرت کے لیے کچھ کماتے ہیں ۔ اس زمین کی مشقت ایک جیسی ہے ۔ اگرچہ رنگ مختلف ہوں اور ذائقے الگ ہوں لیکن جب انسان رب تعالیٰ کے ہاں پہنچے گا تو وہاں انجام کا اختلاف حقیقی ہو گا ۔ ایک فریق تو اس قدر مشقت میں ہو گا جس سے زمین کی مشقت بہت مختلف اور کم ہے اور دوسرا فریق اس قدر انعام پائے گا کہ ان کے مقابلے میں زمین کی تمام تھکاوٹیں دور ہو جائیں گی ۔ یوں محسوس ہو گا کہ اس نے کبھی کوئی تکلیف دیکھی ہی نہیں ۔ اے انسان ' تجھے تو انسانیت کی صفت دے کر ممتاز کر دیا گیا ہے ۔ اپنے لیے وہ انجام اور وہ مقام چن لے جو تیری انسانیت کے شایان شان ہو ' جو اس صفت کے مناسب ہو جو اللہ نے تجھے دی ہے ۔ وہ آرام اور وہ خوشی اور نعمت طلب کر جو آخرت میں ہے ۔

اس پکار کے اندر ہی چونکہ انسانیت کے انجام کے لیے اشارہ تھا ' اس لیے متصلاً یہ بات بھی بتا دی گئی کہ انسانیت اس پر مشقت جدوجہد کے بعد دونوں انجاموں میں کس انجام تک پہنچے گی ۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝
وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ فَسَوْفَ
يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝ اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ اِنَّهٗ ظَنَّ

اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ﴿١٤﴾ بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿١٥﴾

"پھر جس کا نامہ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا گیا' اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا۔ رہا وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا۔ وہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ اسے کبھی پلٹنا نہیں ہے۔ پلٹنا کیسے نہ تھا' اس کا رب اس کے کرتوت دیکھ رہا تھا"۔

وہ لوگ جن کو ان کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا' ان سے اللہ راضی ہو گا' یہ نیک بخت ہوں گے' ایمان دار اور نیکوکار ہوں گے' اللہ ان سے راضی ہو جائے گا اور ان کی نجات کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ان لوگوں کے ساتھ نرمی کے ساتھ حساب ہو گا۔ اللہ کے کارندے زیادہ باز پرس نہیں کریں گے اور نہ حساب میں گہرائیوں تک جائیں گے۔ اس کی تصویر کشی احادیث رسولؐ میں کی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان احادیث کو پڑھ لیا جائے تو مزید کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے ساتھ حساب میں مناقشہ کیا گیا اسے ضرور سزا ہو گی۔ فرماتی ہیں میں نے کہا' اللہ نے نہیں کہا "اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا"۔ تو آپؐ نے فرمایا: "یہ کامیابی حساب سے نہیں ہو گی بلکہ صرف پیشی سے ہو گی' قیامت میں صورت یہ ہو گی کہ جس سے حساب لیا گیا' اس کو سزا ہو گئی"۔ (بخاری' مسلم' ترمذی' نسائی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک دوسری روایت ہے' فرماتی ہیں کہ میں ایک نماز میں حضور اکرمؐ سے سنا "اے اللہ میرے ساتھ ہلکا حساب فرمانا"۔ جب حضورؐ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے پوچھا کہ حضورؐ ہلکا حساب کیا ہوتا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ حساب کی کتاب کو دیکھ کر چشم پوشی کر دی جائے اور جانے دیا جائے۔ عائشہ اس دن جس سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی وہ تو مارا گیا"۔ (احمد بشرط مسلم از عبداللہ ابن زبیرؓ)

غرض اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دے دیا گیا' اس کے ساتھ حساب یسیر ہو گا اور وہ نجات پا جائے گا۔

وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (٨٤ : ٩) "اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش و خرم پلٹے گا"۔ یعنی ان لوگوں کی طرف جو اس سے پہلے جنت میں جا چکے ہوں گے۔ اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں بھی ہم خیال لوگ اکٹھے ہوں گے۔ اور ہر شخص اپنے صالح اہل و عیال اور دوستوں میں ہو گا۔ نجات پانے والے شخص کی تصویر کشی اسی طرح ہے کہ یہ یاروں' دوستوں اور اپنے خاندان والوں کی طرف فرحاں و شاداں جا رہا ہو گا اور اسے نجات اور ملاقات کی دوہری خوشی ہو گی اور پھر جنتوں میں۔

یہ تو تھی دائیں بازو والوں کی صورت حالات' اس کے مقابلے میں بالکل ایک مختلف صورت حالات بھی ہے ان لوگوں کی جو پکڑے جائیں گے' اپنے برے اعمال کی پاداش میں۔ یہ لوگ تو اپنا اعمال نامہ لینا بھی نہ چاہیں گے۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ (۱۰) فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا (۱۱) وَّیَصْلٰی

سَعِیْرًا (۱۲) (۸۴: ۱۰ تا ۱۲) "رہے وہ لوگ جن کا اعمال نامہ پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا"۔ ایسے مناظر کی تصویر کشی اس سے قبل قرآن کریم میں اس طرح کی گئی ہے کہ کامیاب ہونے والوں کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا گیا اور اہل جہنم کا بائیں ہاتھ میں۔ لیکن یہاں کی تصویر ذرا مختلف ہے۔ یہاں تصویر میں نظر یوں آتا ہے کہ اہل جہنم کو ان کا اعمال نامہ پیٹھ کے پیچھے سے دیا جا رہا ہے۔ لہذا تصویر میں کوئی تضاد نہیں ہے بائیں ہاتھ میں پیچھے سے دیا جا رہا ہے۔ یہ ایسے شخص کی تصویر ہے جو نامہ اعمال نہیں لینا چاہتا ہے' وہ سامنا نہیں کر سکتا' سخت پریشان و گریزاں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم لوگ اعمال نامے' دائیں ہاتھ میں دیئے جانے اور بائیں ہاتھ میں دیئے جانے کی کیفیات سے واقف نہیں ہیں۔ ہم صرف یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے لوگ نجات پانے والے ہیں اور جنت میں جائیں گے اور دوسرے لوگ ناکام و نامراد ہونے والے ہیں اور جہنم میں جائیں گے اور ہلاک ہوں گے۔ اصل مقصود یہی بات ہے نہ یہ کہ کیفیت کیسی ہو گی۔ اور قرآن کریم نے جو شکل و صورت بیان کی ہے اس سے بہرحال انسان پر گہرے اثرات پڑے ہیں۔ اور انسان خوف کے مارے کانپ اٹھتا ہے۔ حقیقت احوال اللہ ہی کے علم میں ہے کہ یہ مراحل کس طرح طے ہوں گے۔

یہ بدبخت جس نے زمین پر بھی اپنی زندگی ان تھک جدوجہد میں گزاری اور تھک تھکا کر اللہ کے سامنے پہنچا لیکن معصیت اور نافرمانی میں ڈوبا ہوا' گناہوں کے بوجھ سے لدا پھندا۔ اب یہاں آکر اپنے انجام کو جان لیتا ہے۔ انجام بد سے دوچار ہوتا ہے۔ اب جانتا ہے کہ اب تو اس کی نہ ختم ہونے والی مشقت شروع ہو گئی' تو یہ بدبخت اب موت کو پکارتا ہے' موت دائمی موت اور فنا کی استدعا کرتا ہے تاکہ وہ اس بدبختی سے بچ جائے جو اس پر آنے ہی والی ہے۔ یاد رہے کہ انسان موت کی آغوش میں پناہ اس وقت لیتا ہے جب وہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی اور راہ نجات نہیں ہے۔ نہ کوئی جائے فرار ہے تو اس وقت موت اس کی آخری تمنا ہوتی ہے' یہ مفہوم متنبی نے اس شعر میں سمو دیا ہے

کفی بك داء ان تری الموت شافیا
وحسب المنایا ان یکن امانیا

"اس سے بڑی اور کیا ہو گی کہ تم موت کو شفا سمجھنے لگو اور یہ مشقت کافی ہے کہ موت آرزو بن جائے (اور آئے نہیں)"۔

لہذا اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو گی' اور اس سے بڑی معصیت اور کیا ہو گی کہ وہ وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا (۸۴: ۱۲) "اور بھڑکتی ہوئی آگ میں جا پڑے گا"۔ اور یہ شخص اب موت کی تمنا کرے گا جو کبھی پوری نہ ہو گی..... اب ذرا ایک جھلک اس شخص کے ماضی کی یہاں دکھا دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ اس انجام تک پہنچا۔

اِنَّهٗ كَانَ فِیْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (۱۳) اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ (۸۴: ۱۴) "یہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا' اس نے سمجھا تھا کہ اس نے پلٹنا نہیں ہے"۔ یہ حالت تو اس کی دنیا میں تھی اور وہ تو چلی گئی۔ آج تو

قرآن ہمیں قیامت کے میدان میں لے گیا ہے اور دنیا تو بیت گئی ہے اور یہاں حساب و کتاب ہو رہا ہے اور قرآن کے انداز نے زمان و مکان کو لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ فِیْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (۸۴:۱۳) "یہ اپنے گھر والوں میں مگن تھا"۔ یہ حاضر و موجود کا فدائی تھا' غلام تھا' اور مستقبل سے غافل تھا۔ یہ اس بات سے لاپرواہ تھا کہ قیامت کے میدان میں اسے کیا پیش آنے والا ہے۔ یہ قیامت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا اور نہ اس کے لیے کوئی تیاری کرتا تھا۔

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ (۸۴:۱۴) "اس نے سمجھا تھا کہ اس نے پلٹنا نہیں ہے"۔ رب کی طرف پلٹ کر نہیں جانا ہے۔ اگر اس نے یہ سمجھا ہوتا کہ اللہ کے سامنے جانا ہے تو یہ اس حاضری کے لیے کچھ تو تیاری کرتا اور آخرت کو کچھ تو اہمیت دیتا لیکن اس کو یقین نہ تھا بلکہ ظن یہ تھا کہ قیامت ہی نہیں ہے۔

بَلٰىٓ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِیْرًا (۸۴:۱۵) "پلٹنا کیسے نہ تھا' اس کا رب اس کے کرتوت دیکھ رہا تھا"۔ اس کا ظن یہ تھا کہ اللہ کی طرف لوٹ کر ہی نہیں جانا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا رب تو اس کے حالات سے باخبر تھا' اس کی حقیقت کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا' اس کے تمام اقدامات' اور تمام حرکات سے واقف تھا' اللہ کو معلوم تھا کہ اس نے کس انجام تک پہنچنا ہے اور یہ کہ اللہ نے اس کو اس کے کیے کی سزا دینی تھی' چنانچہ ایسا ہی ہوا' جب اللہ کے علم کے مطابق اس نے اپنی زندگی جہنم کے مطابق گزار دی' اور اس نے ایسا ہی کرنا تھا۔

اس بدبخت کی تصویر کے بالمقابل ایک دوسرے شخص کی تصویر ہے جو نیک بخت ہے' اگرچہ یہ اپنی دنیا کی محدود زندگی میں اپنے گھر والوں کے دائرے کے اندر ہی خوش و خرم تھا لیکن اس کی زندگی مجموعی طور پر کسی نہ کسی طرح پر مشقت تھی۔ اس کے مقابلے میں یہ نیک بخت اب آخرت میں اپنے اہل و عیال کی طرف خوش و خرم لوٹ رہا ہے۔ یہ دنیا کی زندگی تو مختصر اور محدود تھی لیکن اخروی زندگی طویل اور لامحدود ہے۔ یہ زندگی اب بے قید ہے' خوشگوار ہے' طویل ہے اور ہر قسم کی مشقت اور پریشانی اور تھکاوٹ سے خالی ہے۔

اب قارئین اس طویل اور گہرے سفر سے فارغ ہوتے ہیں۔ اس میں انہوں نے بے شمار مناظر دیکھے اور تاثرات لیے' اب سیاق کلام انہیں اس کائنات کے ایسے لمحات میں لے جاتا ہے جن میں ان کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ یہاں انسانوں کو اس کائنات کے وہ مناظر دکھائے جاتے ہیں جن میں خود حضرت انسان کا منظر بھی ہے یہ چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ انسان اور اس کے گرد پھیلی ہوئی یہ کائنات ایک گہری تدبیر اور نہایت ہی باریک اندازے اور تقدیر کے مطابق چل رہی ہے اور اس دنیا کے اندر انسان کے بدلتے ہوئے لمحات و حالات اس گہری تدبیر اور تقدیر کے نتیجے میں ہیں۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾
لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾

"پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی، اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے، اور چاند کی جب کہ وہ ماہ کامل ہو جاتا ہے، تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک مشکل حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے"۔

یہ چند مناظر ہیں، قرآن کریم ان کی قسم کھاکر قلب انسانی کو ان کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ ان پر غور کرو، اس طرح انسانی دل و دماغ کو اشارات اور تاثرات سے بھر دیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے یہ لمحات ایک خاص نوعیت رکھتے ہیں، ان میں ایک طرف خشوع اور دھیما پن ہے اور دوسری طرف پر جلال ہیبت ہے۔ جس طرح سورت کا آغاز پرجلال دھیمے مناظر سے تھا، یہ لمحات اور مناظر بھی ایسے ہی ہیں۔

شفق کا وقت وہ ہوتا ہے جس میں ہر چیز سہم جاتی ہے، غروب کے بعد نفس انسانی پر بھی ایک گہری خاموشی اور خوف کے سائے پڑ جاتے ہیں۔ انسانی سوچ ان کو الوداع کہتی ہے اور الوداع میں ہمیشہ خاموشی اور دکھ کے سائے ہوتے ہیں اور پھر رات کے خوفناک لمحات آتے ہیں، جن میں اندھیروں کی وحشت ہوتی ہے۔ اور آخر کار رات کی تاریکیوں میں ہر چیز لپٹ کر خاموش ہو جاتی ہے، اور ایک مہیب سکون کی فضا ہوتی ہے۔

وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (۸۴:۱۷) "اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے"۔ رات اور اس میں جو کچھ جمع ہوتا ہے، اور جن چیزوں کو وہ اٹھا لیتی ہے۔ نام لیے بغیر ہر معلوم و نامعلوم چیز جو رات کے پردے میں آ جاتی ہے جو کچھ رات میں جمع ہوتا ہے، جن چیزوں کو وہ سینے سے لگا لیتی ہے۔ ان میں تمام چیزیں، تمام زندہ مخلوق، تمام جذبات اور تمام خفیہ جہان آ جاتے ہیں۔ وہ تمام چیزیں جو زمین پر چلتی ہیں یا جو انسانی ضمیر میں خفیہ طور پر جاری و ساری ہیں۔ غرض راہوار خیال دور تک جاکر واپس ہوتا ہے اور انسانی فکر اور سوچ ان تمام مناظر کا احاطہ نہیں کر سکتی جو قرآن کے اس مختصر سے فقرے کا مدلول ہیں۔

وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (۸۴:۱۷) "قسم ہے رات کی اور ان چیزوں کی جو وہ سمیٹ لیتی ہے"۔ جس سے انسانی شعور پر خضوع و خشوع اور خوفناک اور مہیب سکون کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور یہ حالت شفق اور رات کے چھانے کی حالت سے ہم آہنگ ہے۔

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (۸۴:۱۸) "اور قسم ہے چاند کی جبکہ وہ ماہ کامل بن جائے"۔ یہ بھی ایک دھیما اور سحر انگیز خوبصورت منظر ہے۔ چاند جن راتوں میں مکمل ہوتا ہے۔ اور زمین پر اپنا ٹھنڈا، دھیما اور فکر انگیز نور بکھیرتا ہے۔ خاموشی، ٹھنڈے ماحول میں کیا ہی خوبصورت نظارہ ہوتا ہے۔ مادی اور ظاہری بھی اور معنوی اور فکری بھی۔ یہ ایک ایسا نظارہ اور سفر ہے جو شام، شفق اور رات کے چھا جانے سے ہم آہنگ ہے، اسی نظارے کے بنیادی عناصر جمال و جلال اور خضوع و خشوع اور خاموشی اور سکون ہیں۔

یہ عظیم کائناتی مناظر، نہایت ہی خوبصورت، نہایت ہی فکر انگیز، اور نہایت مرعوب کن، تیز رفتار جھلکیوں کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور انسانی قلب و نظر سے مخاطب ہوتے ہیں، ان دلوں کو جو اس کائنات کی پکار کو نہیں سنتے۔ ان مناظر کی قسم اٹھائی جاتی ہے تاکہ انسانی قلب و ضمیر پر اثر ہو اور وہ ان کی تروتازگی، ان کی خوبصورتی اور ان کے اشارات

اور ان کے اثرات کو قبول کر سکے اور اس ہاتھ کو دیکھ سکے جس نے اس کے خطوط کو متعین کیا ہے اور جو ان مناظر اور جھلکیوں کو پے درپے سامنے لاتا ہے' ان جھلکیوں میں یہ مناظر بھی ہوتے ہیں اور لوگ بھی بدلتے ہیں اور ان کے حالات بھی بدلتے ہیں' لیکن نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ان مناظر کو دیکھتے ہوئے بھی لوگ غافل ہیں۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۱۹:۸۴) "تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک مشکل حالت سے دوسری حالت کی طرف بدلتے چلے جانا ہے"۔ یعنی ایک صورت حال کے بعد دوسری صورت حال سے تمہیں دوچار ہونا پڑے گا۔ جس طرح اللہ نے تمہارے مقدر میں لکھا ہوا ہے۔ یہاں ایک حال سے دوسرے حال کی تبدیلی کے لیے "سواری" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ عربی میں مشکلات سے دوچار ہونے کے لیے معاملات' خطرات' حالات اور مشکلات پر سوار ہونے کا محاورہ عام ہے۔ کیا جاتا ہے۔

ان المضطر یرکب الصعب من الامور وھو عالم برکوبہ "مشکلات میں گھرا ہوا شخص مشکلات پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ اس بات کو جانتا ہے کہ وہ ان پر کس طرح سوار ہو یعنی قابو پائے" تحریک اسلامی کو پیش آنے والے حالات و مشکلات ایک کے بعد ایک سخت ترین مراحل کی شکل میں آئیں گے۔ اور یہ حالات اللہ کی تقدیر اور مشیت کے مطابق آئیں گے جو اس راہ میں لوگوں کو چلاتی ہے' اور دست قدرت ان کو ایک انتہا تک پہنچاتا ہے۔ جہاں سے دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ جس طرح شفق نمودار ہوتا ہے' رات آتی ہے اور چھا جاتی ہے' چاند نمودار ہوتا ہے اور ماہ کامل بن جاتا ہے یہاں تک انسان اس سفر کو طے کر کے اللہ تک پہنچ جائیں جیسا کہ سابقہ پیراگراف میں تصریح کی گئی۔ پے درپے ہم آہنگ پیراگراف اور فقرات کا آنا' ایک مفہوم اور فکر سے دوسری سوچ اور معنی اخذ کرنے چلے جانا' اور ایک نظارے سے دوسرے نظارے تک پہنچنا' یہ قرآن کریم کا پر اعجاز اور انوکھا انداز ہے جس کی نقل اتارنا ممکن نہیں ہے۔

ان مناظر اور اشارات اور ان مشاہدات اور خوشگوار لمحات کی فضا' جو اس پوری سورت میں یکے بعد دیگرے آئے۔ ان کے ذکر کے بعد اب ایک عقلمند انسان پر تعجب کیا جاتا ہے کہ ان دلائل ایمان کے باوجود وہ ایمان نہیں لاتا حالانکہ اس کائنات میں اور خود ان کے نفوس میں وافر مقدار میں واضح دلائل موجود ہیں۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠﴾ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ﴿٢١﴾

"پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے"۔

ہاں اس بات کے لیے ان کے پاس کوئی وجہ جواز نہیں ہے' اس کائنات کے مناظر میں' اور خود انسانوں کے نفوس میں اس قدر شواہد اور آثار ہیں کہ قلب انسانی جدھر بھی متوجہ ہو' وہ اسے دعوت نظارہ دیتے ہیں جہاں بھی زندہ فکر ہو' یہ شواہد بڑھ چڑھ کر سامنے آتے ہیں۔ یہ آثار و شواہد اس قدر کثرت سے ہیں' اس قدر قوی ہیں اور اس قدر گہرے ہیں کہ اگر کسی بشر کا دل ان کی طرف ذرا بھی ملتفت ہو' متوجہ ہو تو وہ اسے گھیر لیتے ہیں۔ اگر وہ ان کی طرف کان دھرے' متوجہ ہو اور ان کی بات سنے تو یہ شواہد ہر جگہ اس کے ساتھ سرگوشیاں کرتے ہیں اور باآواز بلند بھی بات کرتے ہیں۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲۰) وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ (۸۴: ۲۱)

السجدۃ "پھر ان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے"۔ قرآن ان کے ساتھ فطری زبان میں بات کرتا ہے' اور انفس و آفاق میں جو دلائل فطرت اور اشارات ایمان پائے جاتے ہیں ان کے لیے ان کے دلوں کو کھولتا اور دلوں میں تقویٰ' اطاعت اور خضوع و خشوع کے جذبات ابھارتا ہے اور یہی انسانی قلوب کے لیے سجدہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات بہت ہی خوبصورت ہے' اس کے اندر ہر طرف اشارات قدرت ہیں' اس کے اندر ایسی تجلیات اور ایسے انوار اور ایسے مناظر موجود ہیں جو قلب انسانی کو خضوع و خشوع کے جذبات سے بھر دیتے ہیں۔

پھر یہ قرآن بھی خوبصورت اور اشاراتی ہے اور اس کے اندر بھی ایسے اشارات' ایسے مناظر اور شواہد ہیں جو قلب بشری کا تعارف اس کائنات اور رب کائنات سے کراتے ہیں۔ اور انسان کے دل و دماغ میں اس عظیم کائنات کے عظیم حقائق ڈال کر اسے اس کائنات کے بزرگ و برتر خالق کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ کیا ہی شان ہے۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲۰) وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ (۸۴: ۲۱)

السجدۃ "پھر ان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے"۔

یہ حقیقت ہے کہ یہ ایک عجیب طرز عمل ہے۔ اور اس طرز عمل کے ذریعہ اب بات کا رخ اس عجیب مخلوق کی طرف مڑ جاتا ہے' یعنی کفار کی طرف اور بتایا جاتا رہے کہ کیا ہی برا انجام ان کے انتظار میں ہے۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۴﴾

"بلکہ یہ منکرین تو الٹا جھٹلاتے ہیں' حالانکہ جو کچھ یہ (اپنے نامہ اعمال میں) جمع کر رہے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ لہٰذا ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو"۔

اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے وہ تکذیب کرنے پر تل گئے ہیں' جھٹلانا ان کا مزاج ثانی بن گیا ہے۔ تکذیب ان کی علامت ہے لیکن ان کے دلوں کے اندر جو بیماریاں ہیں اور جن کی وجہ سے انہوں نے تکذیب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔ اللہ انہیں خوب جانتا ہے۔ یہ محض شرارت ہے اور برے مقاصد ہیں جو تکذیب کا سبب بن رہے ہیں۔

اب ان کی بات یہاں ختم ہوتی ہے اور روئے سخن براہ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۸۴: ۲۴) "لہٰذا ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو"۔ کیا ہی بری خوشخبری ہے جس میں کوئی مسرت نہیں' جس کو پانے والا پسند ہی نہیں کرتا۔ نہ ایسی خوشخبری کا کوئی انتظار کرتا ہے۔ اور اہل ایمان جو تکذیب نہیں کرتے۔ ان کے لیے کیا کیا تیاریاں ہیں؟ جو عمل صالح کے ذریعہ قیامت کی تیاریاں کرتے ہیں تو

اسے تکذیب کرنے والوں کے انجام سے مستثنیٰ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

۲۵ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴿۲۵﴾

"البتہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے"۔

عربی زبان میں اسے استثنائے منقطع کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ کفار کو جو ناگوار اور سیاہ خوشخبری دی گئی ہے یا سیاہ وارنٹ دیا گیا ہے اس میں اہل ایمان کو شامل ہی نہ تھے' لیکن اس استثنائی انداز سے مقصود یہ ہے کہ جن لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا وہ بہت ہی خوش قسمت ہیں۔

اور اجر غیر ممنون کیا ہے' وہ جو ختم نہ ہو' ہمیشہ باقی رہنے والا دائمی اجر۔ اس فیصلہ کن ضرب پر یہ سورت ختم ہوتی ہے۔ یہ ایک مختصر سورت ہے' چند سطری لیکن وسیع اور فکر انگیز موضوعات بحث پیش کرتی ہے۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ البروج ۔ ۸۵

۱-- تا -- ۲۲

سورۃ البروج ایک نظر میں

یہ مختصر سورت اسلامی نظریہ حیات کے حقائق بیان کرتی ہے کہ ایمانی تصورات کے بنیادی عناصر کیا ہوتے ہیں' جو ایک عظیم موضوع ہے۔ یہ سورت دور دور تک اس موضوع پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں اسرار و رموز کا وہ ذخیرہ ہے کہ اس کی آیات بلکہ کلمات بھی دور رس حقائق و معانی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ سورت ایک محل ہے جس کے روشن دانوں نے نور کی لہریں دور دور تک پھیل رہی ہیں۔

براہ راست موضوع تو اصحاب الاخدود کا ایک انفرادی واقعہ ہے۔ اسلام سے قبل کے زمانے میں اہل ایمان کا ایک گروہ' غالباً عیسائی موحدین' دشمنوں کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے تھے۔ یہ دشمن سخت سرکش اور شرپسند تھے' اور یہ ظالم ان مومنین پر ظلم اس لیے کر رہے تھے کہ مشرکوں نے صحیح دین چھوڑ کر شرکیہ عقائد اپنا لیے تھے اور یہ لوگ اپنے اصل عقیدے پر جمے ہوئے تھے اور اس بات کے لیے تیار نہ تھے کہ نیا شرکیہ عقیدہ اپنائیں۔ پس ان سرکشوں نے زمین میں گڑھے کھدوائے' ان گڑھوں میں آگ جلائی گئی' اور اس آگ میں ان مومنین کو گرایا گیا اور وہ جل کر راکھ ہو گئے۔ اور یہ کام ایسے حالات میں ہوا کہ ان سرکشوں نے پوری آبادی کو یہ منظر دیکھنے کے لیے جمع کر رکھا تھا تاکہ وہ اہل ایمان کے اس انجام کو دیکھ کر ڈر جائیں اور یہ سرکش اس منظر کو دیکھ کر خوش ہوں۔ انسانوں کو جلا کر خوش ہوں۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۸۵ : ۸) "اور ان اہل ایمان کے ساتھ ان کی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ اس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں محمود ہے"۔

سورت کا آغاز قسم سے ہوتا ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (۱) وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ (۲) وَشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ (۳) قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ (۴) (۸۵ : ۱ تا ۴) "قسم ہے مضبوط قلعوں والے آسمان کی' اور اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے' اور دیکھنے والے اور دیکھی جانے والی چیز کی کہ مارے گئے گڑھے والے"۔

یہاں آسمانوں اور ان کے درمیان پائے جانے والے عظیم قلعوں اور قیامت کے دن کو باہم مربوط کیا جاتا ہے کہ یہ قلعے بھی عظیم ہیں اور قیامت کے واقعات بھی بہت عظیم ہوں گے۔ اور قیامت کے دن لوگوں کی عظیم تعداد حاضر ہو گی اور بڑے بڑے واقعات ہوں گے۔ ان واقعات کو پھر اس عظیم دردناک واقعہ سے مربوط کیا جاتا ہے جس کے سرکش کرداروں پر اللہ کا عذاب لازم ہے۔

اس کے بعد اس دردناک واقعہ کا سرسری بیان ہے' یہ بیان نہایت مختصر ہے لیکن پردۂ شعور پر اس واقعہ کی بربریت کو اچھی طرح نقش کر دیتا ہے۔ اور یہ اشارہ بھی دے دیا جاتا ہے کہ عقیدہ اور نظریہ کس قدر عظیم شے ہے اور عقیدے کے اندر کس قدر قوت ہوتی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے تشدد پر بھی فتح پا لیتا ہے' اور اس کی راہ میں زندگی تک قربان کر دیا جاتا ہے' اور وہ آگ کا مقابلہ کر کے اس کو ٹھنڈا کر سکتا ہے۔ اور وہ اس قدر بلندی تک پہنچ سکتا ہے کہ اس بلندی کو نسلوں تک یاد رکھا جاتا ہے۔ اس میں اسی طرف اشارہ بھی ہے کہ یہ واقعہ نہایت ہی بدترین واقعہ تھا اور یہ فعل کرنے والے شر' فساد اور ظلم و زیادتی میں مست تھے' ان کے مقابلے میں اہل ایمان سربلند' پاک اور معصوم تھے۔

النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ (٥) اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ (٦) وَّ هُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ (٧) (٨٥: ٥ تا ٧) "اس گڑھے میں بھڑکتی ہوئی آگ تھی جبکہ وہ اس گڑھے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے"۔

اس کے بعد مختصر فقروں میں اسلامی نظریہ حیات کے سلسلے میں تبصرے اور نتائج آتے ہیں جن میں اسلامی انقلاب کی تحریک کے سلسلے کی بہت ہی اہم اور اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی دعوت و منشور کے سلسلے کی نہایت ہی بنیادی باتیں بتائی گئی ہیں :

○ یہ کہ زمین و آسمان کی بادشاہت صرف اللہ کی ہے اور زمین و آسمان میں جو واقعات ہوتے ہیں' اللہ انہیں دیکھ رہا ہوتا ہے۔

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (٨٥: ٩) "اللہ' جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے' اور وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے"۔

○ یہ کہ جہنم میں جلنے کا عذاب ان سرکشوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا ہے۔ جو ظلم اور بربریت میں نہایت ہی گھٹیا مقام تک اتر گئے ہیں۔ اور پھر جنت کے مزوں کا بھی ذکر ہے جو اہل ایمان کے لیے مخصوص ہیں اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے اس لیے کہ ان لوگوں نے اپنی زندگی پر اپنے ایمان اور اپنے عقیدے کو ترجیح دی۔ اور انہوں نے آگ میں جلائے جانے کے عذاب کو برداشت کیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ (١٠) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ (١١) (٨٥: ١٠ - ١١) "جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ستم توڑا اور پھر اس سے تائب نہ ہوئے یقیناً ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلائے جانے کی سزا ہے' جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے' یقیناً ان کے لیے جنت کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی

ہوں گی' یہ ہے بڑی کامیابی"۔

ان تبصروں میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ کی پکڑ بہت شدید ہوتی ہے کیونکہ وہی خالق ہے' پہلی بار بھی اسی نے پیدا کیا' دوبارہ بھی وہی پیدا کرے گا۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (۸۵:۱۲) "درحقیقت تمہارے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے' وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے' وہی دوبارہ پیدا کرے گا"۔ اس حقیقت کا تعلق ان مظلوم جانوں سے ہے جو اس حادثے میں تلف ہوئیں لیکن اس تبصرے میں اس سزا سے آگے مزید دور تک روشنی پڑتی ہے۔

اس کے بعد اللہ کی کچھ صفات کا ذکر ہے اور ان میں سے ہر صفت ایک متعین مقصد کے لیے لائی گئی ہے۔

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ (۸۵:۱۴) "وہ اللہ بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے"۔ وہ گناہوں کو بخشنے والا ہے' اگرچہ وہ بہت بڑے گناہ ہوں بشرطیکہ کہ ان کا مرتکب تائب ہو جائے۔ اور وہ ان لوگوں سے بہت محبت کرتا ہے جو اس اللہ کو دنیا کی ہر چیز پر ترجیح دیں۔ مثلاً جن لوگوں پر اس واقعہ میں شدید تشدد ہوا یا مکہ میں جو تشدد ہو رہا تھا' ان کے زخموں کے لیے یہ محبت کی نہایت ہی کارگر مرہم ہے کہ اللہ غفور و ودود ہے۔

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ (۱۵) فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۸۵:۱۶) "عرش کا مالک ہے' بزرگ اور برتر ہے' اور جو کچھ چاہے کروانے والا ہے"۔ یہ صفات بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوقات پر مکمل کنٹرول ہے۔ وہ قادر مطلق ہے' اس کا ارادہ بے قید ہے' یہ تمام صفات اس واقعہ کے ساتھ براہ راست منسلک ہیں۔ اور اس واقعہ سے آگے بھی دور تک روشنی ڈالتی ہیں۔

آخر میں بتایا جاتا ہے کہ ان کافروں کا رویہ کیسا ہے اور یہ کہ اللہ تو انہیں گھیرے ہوئے ہے لیکن یہ جانتے نہیں ہیں۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ (۱۹) وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ (۲۰)

(۸۵:۱۹ تا ۲۰) "مگر جنہوں نے کفر کیا ہے وہ جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں' حالانکہ اللہ نے انہیں گھیرے میں لے رکھا ہے"۔ اور اس قرآن کی حقیقت اور اس کی اصلیت اور حفاظت کی بات بھی کی گئی ہے۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ (۲۱) فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۸۵:۲۲) "بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے اور لوح محفوظ میں درج ہے"۔

غرض یہ تھے اس سورت کے چند تبصرے جو دور دور تک روشنی پھیلاتے ہیں۔ اب ہم ذرا ان پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔

--- ○○○---

درس نمبر ۲۸۵ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۲۲

آیاتہا ۲۲ — سورۃ البروج (۸۵) — مکیۃ (۲۷) — رکوعہا ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ﴿١﴾ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ﴿٢﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ﴿٣﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے مضبوط قلعوں والے آسمان کی' اور اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے (یعنی قیامت)' اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز کی"۔

واقعہ اصحاب الاخدود کی طرف آنے سے قبل سورت کا آغاز اس قسم سے ہوتا ہے "قسم ہے مضبوط قلعوں والے آسمان کی"۔"بروج" سے مراد یا تو عظیم الجثہ اجرام فلکی ہیں 'گویا وہ آسمانوں کے عظیم الشان قلعے ہیں' سورہ ذاریات میں کہا گیا۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۵۱ : ۴۷) "اور آسمان کو ہم نے ہاتھوں سے بنایا اور ہم بہت وسعت دینے والے ہیں"۔ اور سورہ نازعات میں فرمایا۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا (۷۹ : ۲۷) "کیا تخلیق کے لحاظ سے تم مضبوط ہو یا آسمان جسے ہم نے بنایا"۔ اور یا بروج سے مراد وہ منزلیں ہیں جن کے اندر یہ اجرام گردش کرتے ہیں یعنی جب یہ اجرام اپنے ایک مدار کے اندر گردش کرتے ہیں اور اس سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتے اور بروج کے لفظ سے ان کی ضخامت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' یہاں اس سورت کی فضا پر ضخامت کا سایہ ڈالنا مقصود ہے۔

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ (۸۵ : ۲) "اور قسم ہے اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے"۔ یہ وہ دن ہے جس میں دنیا کے اعمال اور واقعات کے فیصلے ہوں گے۔ اس دنیا میں جس نے جو کمایا ہو گا' اس کی جزاء و سزا ہو گی۔ اور اس

دن کو الیوم الموعود اس لیے کہا گیا کہ اس کے آنے کا اللہ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اس دن حساب کے بعد جزاء و سزا ہوگی اور جن لوگوں پہ دنیا میں زیادتی ہوئی یا جنہوں نے کسی پر زیادتی کی اس دن تک اللہ نے ان کو مہلت دی اور یہ ایک عظیم دن ہو گا' جس کا لوگوں کو انتظار ہے تاکہ وہ دیکھیں کہ اس کے اندر کیا فیصلے ہوتے ہیں۔

وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ (۸۵ : ۳) "اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز کی"۔اس دن لوگوں کے اعمال بھی پیش ہوں گے 'سب لوگ بھی پیش ہوں گے' تو یہ سب مشہود ہوئے 'اور سب لوگ دیکھیں گے تو وہ شاہد بھی ہوئے 'اس دن ہر چیز پردے سے باہر آجائے گی اور ہر کسی کو نظر آئے گی۔

یہ عظیم اجرام فلکی والا آسمان 'اور یہ عظیم دن جس میں حساب و کتاب ہو گا اور سب شاہد اور مشہود جمع ہوں گے۔ ان کے ذکر سے جو فضا بنتی ہے۔وہ اپنی عظمت' اہمیت اور عظیم اجتماع کے لحاظ سے 'اس بات کے لیے مناسب ہے کہ اس میں اصحاب الاخدود کا عظیم سانحہ بیان کیا جائے۔یہ وسیع و عریض فضا گویا اس واقعہ کے بیان کے لیے اور اس حقیقت اور وزن دار بنانے کے لیے بنائی گئی یعنی قیامت کی فضا جو اس دنیا کی وسعتوں سے زیادہ وسیع ہے اور اس کی زندگی اور اس کا زمانہ اس دنیا کی محدود زندگی اور محدود زمانے سے زیادہ وسیع ہے۔

اس فضا کی تیاری کے بعد اور ایک وسیع میدان تیار کرنے کے بعد اب اس عظیم واقعہ کی طرف فقط سرسری اشارہ کیا جاتا ہے۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّ هُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝ وَ مَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

"مارے گئے گڑھے والے۔(اس گڑھے والے) جس میں خوب بھڑکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی۔ جبکہ وہ اس گڑھے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے۔اور ان اہل ایمان سے ان کی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ اس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے' جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے 'اور وہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے"۔

اس واقعہ کا آغاز اس تبصرے سے ہوتا ہے کہ اصحاب الاخدود پر اللہ کی مار ہو۔ان الفاظ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل پر اللہ بہت ناراض ہے اور جن لوگوں نے اس گھناؤنے فعل کا ارتکاب کیا وہ غضب الٰہی کے مستحق ہیں۔یہ فعل اس قدر ظالمانہ ہے کہ اللہ جو حکیم ہے 'اس کا غضب جوش میں آگیا اور اس نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ ان ظالموں سے انتقام لے گا۔

اس کے بعد اخدود (گڑھوں) کی تشریح کی جاتی ہے کہ وہ کیا ہیں؟ وہ آگ ہے بڑھکتی ہوئی' دراصل انہوں نے زمین کے اندر گڑھے بنوائے تھے ان میں آگ جلائی تھی اور ان کو آگ سے بھر دیا تھا' یوں گڑھوں کو دہکتی ہوئی آگ بتایا گیا۔ یعنی وہ گڑھے دہکتی ہوئی آگ سے بھرے ہوئے تھے۔

"گڑھوں والے قتل ہوئے" وہ قتل ہونے اور اسی طرح جلائے جانے کے مستحق ہیں کیونکہ انہوں نے جب یہ ظلم کیا تو وہ کیسے حالات میں تھے؟

اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ (٦) وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ (۸۵: ۷) "جبکہ وہ اس گڑھے کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے"۔

یہ ایک ایسی تصویر کشی ہے کہ اس سے ان کا موقف اور ان کا منظر اچھی طرح ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ لوگ آگ جلا رہے ہیں' مومنین اور مومنات کو پکڑ پکڑ کر اس میں پھینک رہے ہیں اور ان کو کنارے پر بیٹھے جلتے دیکھ رہے ہیں۔ اس سنگدلی کے فعل کو قریب سے دیکھ رہے ہیں' سزا دہی کے طریقوں کا مشاہدہ بھی کر رہے ہیں اور جوں جوں آگ ان کے اجسام کو کھاتی ہے' یہ خوش ہو رہے ہیں اور اس دردناک منظر کو اپنے مشاہدے پر ثبت کر رہے ہیں۔

اہل ایمان بے گناہ تھے۔ ان کے ذمہ ان ظالموں کا کوئی قصاص نہ تھا۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (٨) الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۸۵: ۹) "اور ان اہل ایمان کے ساتھ ان کی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ اس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں محمود ہے' جو آسمان اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے اور وہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے"۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اللہ پر ایمان لائے تھے جو زبردست اور غالب ہے اور وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے اس پر قادر ہے اور وہ الحمید ہے یعنی وہ ہر حال میں حمد و ثنا کا مستحق ہے اور بذات خود محمود ہے۔ اگرچہ جاہل اور نادان لوگ اس کی حمد و ثنا نہ کریں۔ وہ اس بات کا مستحق ہے کہ لوگ اس پر ایمان لائیں اور صرف اسی کی بندگی کریں اور زمین و آسمان کی بادشاہی اسی کی ہے۔ وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے اور حاضر و ناظر ہے۔ اور وہ اس مخصوص واقعہ کو بھی دیکھ رہا ہے جو اہل ایمان کو پیش آیا کہ ان کو گڑھے میں پھینکا گیا۔ اس ایمان مفصل کے بیان سے اور اللہ کی شہادت سے ہر اس مومن کو تسلی ہو جاتی ہے جسے محض ایمان کی وجہ سے سرکش اور جبار اذیت دیتے ہیں۔ اللہ گواہ ہے اور شہادت کے لیے وہ کافی ہے۔

غرض ان مختصر آیات میں یہ قصہ ختم کر دیا جاتا ہے' لیکن ان لوگوں کا یہ فعل اور تشدد اس قدر ظالمانہ اور سنگدلانہ ہے کہ ہر قاری کا دل ان لوگوں کے خلاف نفرت اور کراہت سے بھر جاتا ہے اور انسان سوچنے لگتا ہے کہ واقعہ کے اثرات و نتائج اللہ کے ہاں کیا ہوں گے۔ اللہ کے ہاں اس واقعہ کی اہمیت کیا ہوگی اور یہ ظالم اللہ کے ہاں کس غضب کے مستحق بن گئے ہیں۔ واقعہ تو اختصار کے ساتھ بیان ہو گیا لیکن انسانی سوچ میں یہ واقعہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ اللہ کے ہاں اس کے اثرات اور اس کا حساب و کتاب باقی و موجود ہے۔

یہ قصہ ختم ہو گیا، لیکن انسانی قلب اس عظیم کارنامے سے مرعوب ہو جاتا ہے کہ ایمان کٹھن آزمائش پر فتح پا لیتا ہے، نظریہ زندگی پر ترجیح پاتا ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو زمین کی تمام دلچسپیوں اور جسم کی تمام خواہشات کو نظرانداز کر دیتے ہیں، ان لوگوں کے لیے ایک راہ یہ بھی تھی کہ ایمان کو چھوڑ کر زندگی کا سامان لے کر نکل جائیں، لیکن ان کا یہ سودا کس قدر خسارے کا سودا ہوتا، اس طرح پوری انسانیت گویا ہار جاتی۔ وہ اعلیٰ انسانی قدروں کو قتل کر دیتے۔ اب لوگوں کو نظریہ سے خالی زندگی حقیر نظر نہ آتی، غلامی پر وہ راضی ہو جاتے اور لوگ اس قدر ذلیل ہو جاتے کہ جسمانی غلامی کے بعد وہ روحانی غلامی بھی قبول کر لیتے۔ لیکن یہ عظیم اقدار تھیں جن کو انہوں نے اس وقت بھی خریدا اور نفع بخش سودا سمجھا جب وہ زمین پر زندہ تھے، اور ان کو انہوں نے اس وقت بھی ترجیح دی جب ان کے جسم جل رہے تھے۔ یوں یہ روحانی قدریں فتح مند ہوتی ہیں اور یہ قدریں آگ کی بھٹی سے پاک ہو کر نکلتی ہیں۔ اس کے بعد رب کے ہاں ان کے لیے بھی اجر ہے اور ان کے دشمنوں کا بھی حساب ہو گا، چنانچہ کہا جاتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ﴿١٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ﴿١١﴾

"جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ستم توڑا اور پھر اس سے تائب نہ ہوئے یقیناً ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلائے جانے کی سزا ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، یقیناً ان کے لیے جنت کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ ہے بڑی کامیابی"۔

جو کچھ اس زمین پر ہوا، وہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا کہ جو ہونا تھا بس ہو چکا اور اس کے آثار بھی یہاں ختم ہو گئے۔ اس کے آثار باقی ہوتے ہیں۔ ہر کام کی سزا اور جزاء ہوتی ہے جس کے واقع ہونے پر ہی واقعہ ختم ہوتا ہے۔ اس لیے ان سرکشوں نے اہل ایمان کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا نتیجہ ابھی نکلنے والا ہے۔ اور اللہ قیامت کے دن فیصلہ کرنے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوْا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (۸۵: ۱۰) "جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم کیا" اور وہ اپنی گمراہی میں آگے ہی بڑھتے رہے۔ ان کو کوئی شرمندگی لاحق نہ ہوئی۔

ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ (۸۵: ۱۰) "اور پھر تائب نہ ہوئے یقیناً ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے، اور ان کے لیے جلائے جانے کی سزا ہے"۔ یہاں قرآن کریم نے حریق 'جلانے کی صراحت کی ہے، معنی تو وہی ہے جو عذاب جہنم کا ہے لیکن لفظ حریق کو اس لیے لایا گیا ہے تاکہ اصحاب الاخدود کو دیئے جانے والی سزا کے بالمقابل یہاں بھی جلنے کا لفظ آ جائے کیونکہ اہل ایمان کی سزا کے لیے حریق کا لفظ استعمال ہوا تھا لیکن دنیا کے جلنے اور آخرت کے جلنے میں بڑا فرق ہے۔ دونوں کے جلنے کی شدت اور مدت دونوں میں فرق ہے۔ دنیا میں

جلانے والی آگ کو انسان جلاتے ہیں ' جبکہ آخرت کی آگ کو اللہ نے تیار کیا ہے ۔ دنیا کی آگ تو چند لمحات تک جلاتی ہے اور پھر ختم ہو جاتی ہے لیکن آخرت کی آگ میں تو لا انتہا زمانوں تک جلتے رہیں گے ۔ دنیا کے جلنے میں اللہ کی رضا پنہاں ہے اور اعلیٰ قدروں کی فتح ہے لیکن جب وہ آخرت میں جلیں گے تو اللہ کے دائمی عذاب اور غضب میں ہوں گے اور پستی ' گراوٹ اور مذمت ان کے ساتھ لازم ہو گی ۔

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے وہ جنت میں ہوں گے اور وہاں اللہ کے انعامات انہیں میسر ہوں گے اور اللہ ان سے راضی ہو گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۸۵ : ۱۱) "اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے یقیناً ان کے لیے جنت کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی"۔ یہ ہے حقیقی نجات اور کامیابی۔

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ (۸۵ : ۱۱) "یہ ہے بڑی کامیابی"۔ فوز کے معنی نجات اور کامیابی کے ہیں۔ آخرت کے عذاب سے نجات پانا ہی بڑی کامیابی ہے اور باغات جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ تو کامیابی پر کامیابی ہے ۔ آخرت کے اس انجام پر اب یہ واقعہ مکمل ہوتا ہے اور یہی ہے حقیقی خاتمہ اور انجام دونوں فریقوں کے موقف کا۔ زمین میں جو واقعات ہوتے ہیں وہ حقیقی واقعات کا ایک حصہ ہوتے ہیں' یہ تمام واقعہ نہیں ہوتے ' اس واقعہ پر آگے جو تبصرے آتے ہیں ان میں سے پہلا تبصرہ اسی غرض کے لیے ہے کہ اہل ایمان کے دلوں میں یہ حقیقت بٹھا دی جائے کہ واقعات دنیا ہی میں ختم نہیں ہوتے ۔ اس دور میں ' جب یہ سورت نازل ہوئی مکہ مکرمہ میں مٹھی بھر مسلمان اس قسم کی مصیبتیں جھیل رہے تھے اسی طرح دنیا کے کسی زمان و مکان ہیں جو لوگ اسلام کے لیے کام کرتے ہیں اور ان پر تشدد ہوتا ہے تو ان کو بھی یہ بتلانا مقصود ہے کہ ان فتنہ سامانیوں کا انجام قیامت میں سامنے آئے گا۔

اس کے بعد اب تبصرے آتے ہیں ۔ پہلا تبصرہ :

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿۱۲﴾

"درحقیقت تمہارے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے"۔ یہاں اللہ کی پکڑ کو اس لیے شدید کہا گیا کہ اس زیر بحث واقعہ میں ان سرکشوں نے اہل ایمان کو جو سزا دی وہ ان کے خیال میں شدید سزا تھی ۔ لوگوں کے خیال میں بھی شدید تھی لیکن یہاں کہا جاتا ہے کہ حقیقی پکڑ کر اللہ جبار و قہار کی پکڑ ہے جو زمین و آسمان کا بادشاہ ہے ' ان لوگوں کی سزا کیا سزا ہو گی جو زمین سے ایک ٹکڑے پر ایک محدود سا اقتدار رکھتے ہوں اور جو خود بھی ضعیف اور حقیر ہیں اور ان کا اقتدار بھی محدود وقت کے لیے ہے۔

یہ بات یہاں نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قائل رب تعالیٰ اور مخاطب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تعلق کے اظہار کے لیے (ربك) کا لفظ لایا گیا ہے ۔ یہ تمہارا رب ہے جس کی ربوبیت کی طرف آپ کی نسبت ہے اور

جس کی امداد اور نصرت پر آپ کو بھروسہ ہے ۔ اور جب فساق و فجار اہل ایمان پر تشدد کر رہے ہوں تو ایسے حالات میں اللہ کے ساتھ تعلق ہی اہم سازو سامان ہوتا ہے ۔

إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ ﴿١٣﴾

"وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا"۔ اصولی طور پر ابتدا اور اعادۂ حیات کا مفہوم ابتدائے حیات اور موت کے بعد قیامت میں حیات ثانی کے ساتھ مختص ہے ۔ لیکن رات اور دن کے ہر لمحہ میں آغاز حیات اور اعادہ حیات کا عمل مسلسل جاری ہے ۔ ہر لمحہ آغاز حیات اور تخلیق حیات کا عمل جاری ہے ۔ اللہ نے ایک ایسا نظام وضع کیا ہے جس کے ذریعہ حیات کا تسلسل قائم ہے ۔ جو چیز ہوتی ہے اس کا اعادہ ہوتا رہتا ہے ۔ اور یہ کائنات مسلسل نئی زندگی پاتی رہتی ہے ۔ آغاز اور اعادہ کے اس مسلسل نظام میں اصحاب اخدود کا واقعہ بھی اپنے نتائج کے ساتھ گزر گیا ۔ اللہ نے ایسا ہی طے کیا تھا' جو ہو گیا اور ایسے ہی واقعات ہوتے رہیں گے ۔ یہ واقعہ آغاز تھا جس کا اعادہ ہو گا' یا اس قسم کے پہلے واقعات کا اعادہ تھا' بہرحال اس دنیا میں واقعات کی ابتدا بھی ہوتی ہے اور اعادہ بھی ہوتا ہے اور یہ سب اللہ کی کتاب تقدیر کے مطابق ہوتا ہے ۔

وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ﴿١٤﴾ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ﴿١٥﴾

"اور وہ بخشنے والا ہے ' محبت کرنے والا ہے ' عرش کا مالک ہے اور بزرگ و برتر ہے"۔ یہاں مغفرت کا تعلق اور ربط آیت ماقبل سے ہے ۔

ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا (۸۵ : ۱۰) "پھر اس سے تائب نہ ہوئے"۔ یہ اللہ کی بے پایاں رحمت اور اللہ کا فضل عظیم ہے ۔ اور ایک کھلا دروازہ ہے اور یہ ہر واپس آنے والے اور ہر توبہ تائب ہونے والے کے لیے کھلا ہے ۔ اگرچہ اس کا گناہ اور اس کی معصیت نہایت سخت ہو ۔ لفظ ودود (محبت کرنے والا) کا تعلق اہل ایمان سے ہے جنہوں نے ہر چیز پر اپنے رب کو ترجیح دی ۔ یہ وہ مقام محبت اور وہ مقام انس ہے جہاں تک اللہ کے خاص بندے ہی پہنچ سکتے ہیں ۔ اس مقام تک اللہ صرف ان بندوں کو ترقی دیتا ہے ' جو اللہ کے ساتھ ایسی محبت کرتے ہیں کہ ہر چیز پر ' محبوب سے محبوب چیز پر اللہ کو ترجیح دیتے ہیں ۔ ان بندوں کی صفت سے انسانی قلم قاصر ہے ' الا یہ کہ کسی قلم کو اللہ طاقت دے ۔ یہ مقام بلند جس تک ان مخصوص بندوں کو عروج نصیب ہوتا ہے ' یہ اللہ کی محبت اور سچی دوستی کا مقام ہے ۔ رب اور بندے کے درمیان دوستی ! اور اللہ کی جانب سے اپنے محبوبوں اور مقربین کے ساتھ محبت کا مقام ! لہٰذا اس مرتبہ و مقام کے مقابلے میں اس زندگی کی کوئی حیثیت نہیں ہے جو بہرحال ختم ہونے والی تھی ' اور اس مرتبہ و مقام کے مقابلے میں اس عذاب حریق کی بھی کوئی حیثیت نہیں جو بہرحال ایک محدود وقت کے لیے تھا ' یہ قربانیاں تو اللہ کی جانب سے محبت اور دوستی کے ایک لمحے کے برابر بھی نہیں ہیں ۔

اس زمین میں جو لوگ کسی ایک شخص کے غلام ہوتے ہیں ۔ اگر یہ مجازی مالک ان کی تعریف میں ایک کلمہ بھی کہہ

دے اور اگر وہ دیکھ لیں کہ ان کے کسی فعل سے مالک مجازی کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہو گئے ہیں 'یہ غلام بہرحال غلام ہے اور وہ مالک مجازی بھی اللہ کا بندہ اور غلام ہے ۔ لیکن اللہ کے خاص بندے جن کے ساتھ اللہ محبت کرتا ہے 'جن کے ساتھ محبت کرنے والا رب جلیل ہوتا ہے اور وہ عرش کا مالک ہوتا ہے 'جو بلند اور برتر ہے 'اور کریم ہوتا ہے تو ان بندے کی جان اگر جاتی ہے تو کچھ بھی نہیں 'اگر ان پر تشدد ہوتا ہے تو کچھ بھی نہیں ۔ دنیا کی پوری زندگی میں اگر تشدد ہوتا رہے تو بھی اس لمحہ محبت پر وہ قربان ہے جو رب ودود کی طرف سے محبت کا لمحہ ہے جو عرش کا مالک ہے اور عظیم ہے ۔

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ (۸۵ : ۱۵) "جو عرش کا مالک ہے اور بزرگ و برتر ہے"۔

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ﴿١٦﴾

"اور جو کچھ چاہے 'کر ڈالنے والا ہے" ۔ یہ اللہ کی وہ صفت ہے جو ہروقت سامنے آتی رہتی ہے ۔ مسلسل روبعمل رہتی ہے ۔ اللہ جو کچھ چاہے 'کر ڈالنے والا ہے ۔ اس کا ارادہ بے قید ہے 'جو چاہتا ہے اختیار کر لیتا ہے 'جو چاہتا ہے 'کرتا ہے 'اور یہ صفت دائمی اور ابدی ہے 'یہ اللہ کی صفت ہے ۔

بعض اوقات اللہ چاہتا ہے کہ اس دنیا ہی میں اہل ایمان کو فتح نصیب ہو اور اس میں کوئی حکمت ہوتی ہے 'بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایمان کو عذاب پر ترجیح ملتی ہے ۔ فانی جسم تو چلے جاتے ہیں 'لیکن ایمان باقی رہتا ہے اور اس میں بھی حکمت ہوتی ہے ۔ بعض اوقات وہ جباروں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس میں حکمت ہوتی ہے اور بعض اوقات ایسے ہی دوسرے جباروں کو مہلت دیتا ہے اور اس میں بھی حکمت ہوتی ہے ۔ اس کے سب کام اس کی تقدیر کے مطابق حکمت پر مبنی ہوتے ہیں ۔

یہ اللہ کی حکمتیں ہیں 'اخدود والوں نے اہل ایمان کو ہلاک کر دیا 'اور ان کو مہلت ملی اور فرعون اور ثمود کو اللہ نے ہلاک کیا ۔ یہ سب واقعات اللہ کے ارادۂ مطلقہ اور اس کی حکمت اور تقدیر کے مطابق ہوئے ۔ اور اللہ کا بے قید ارادہ اسی طرح اس پوری کائنات میں انہی حکمت کے مطابق کام کرتا ہے ۔ اور اللہ جو چاہتا ہے 'کرگزرتا ہے ۔ اسی کا ایک نمونہ یوں ہے ۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ﴿١٧﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ ﴿١٨﴾

"کیا تمہیں لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟ فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی! یہ دو طویل قصوں کی طرف اشارہ ہے 'اس لیے فرعون اور قوم ثمود کی باتیں مخاطبین کو معلوم تھیں ۔ قرآن کریم نے دونوں قصوں کو بار بار بیان کیا ہے ۔ یہاں ان کو جنود اس لیے کہا گیا کہ وہ بہت ہی طاقتور تھے ۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ان کا قصہ کیا ہے اور تمہارے رب نے ان کے ساتھ کیا کیا تھا؟ اللہ تو جو چاہے کرگزرتا ہے ۔

فرعون اور ثمود دونوں کے قصے اپنی نوعیت اور نتائج کے اعتبار سے مختلف تھے ۔ فرعون کو تو اللہ نے معہ اپنے لشکر کے 'غرق کیا اور بنی اسرائیل کو نجات دی ۔ ان کو ایک عرصہ تک زمین کا اقتدار سونپا گیا تاکہ ان کے ذریعہ اللہ نے اپنی تقدیر کو ظاہر کرے اور اپنے ارادے پورے کرے ۔ رہے ثمود تو اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا اور حضرت صالح علیہ السلام کی

معیت میں ایک چھوٹی سی تعداد نے نجات پائی لیکن اس کے بعد اس تعداد کو زمین کا اقتدار نہ دیا گیا تھا' صرف یہ ہوا کہ ان فاسقوں سے ان کو نجات ملی۔

یہ دونوں واقعات اللہ کے ارادۂ مطلقہ اور اللہ کی بے قید مشیت کا نمونہ تھے۔اور دعوت اسلامی کے دو نمونے تھے کہ ان کے دو نتائج میں سے کوئی نتیجہ نکلنے کا احتمال ہے۔ہاں ایک تیسرا احتمال بھی ہے جو اصحاب اخدود کو پیش آیا۔یہ واقعات مکہ میں کام کرنے والی مٹھی بھر تحریک اسلامی کو بتائے جا رہے تھے کہ دعوت الی اللہ کو ان میں سے کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے' نہ صرف مکہ میں کام کرنے والے مسلمانوں کو یہ نقشہ دکھایا جا رہا تھا بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی۔

آخر میں پردۂ احساس پر دو قوی ضربات لگائی جاتی ہیں' دونوں میں ایک فیصلہ کن بات ہے اور آخری فیصلہ ہے۔

بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ تَكْذِیْبٍ ﴿۱۹﴾ وَّ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِیْطٌ ﴿۲۰﴾

"مگر جنہوں نے کفر کیا ہے وہ جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں' حالانکہ اللہ نے ان کو گھیرے میں لے رکھا ہے"۔ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ یہ رات دن جھٹلاتے ہی رہتے ہیں' حالانکہ اللہ نے انہیں گھیر رکھا ہے اور اللہ کا قہر و غضب بھی انہیں گھیرے ہوئے رہے اور اللہ کا علم بھی۔وہ تو ایسے ہیں جیسے ایک عام سیلابی طوفان میں چوہوں کا حال ہوتا ہے۔

۱
بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ ﴿۲۱﴾ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾ ع ۲۲
۱۰

"(ان کے جھٹلانے سے اس قرآن کا کچھ نہیں بگڑتا) بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے اس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے"۔ مجید کے معنی ہیں بلند قابل قدر اور گہری اصلیت والا' اللہ کے کلام کے علاوہ یہ صفات کس پر صادق آ سکتی ہیں۔ یہ کلام لوح محفوظ میں ہے۔ہمیں معلوم نہیں کہ لوح محفوظ کی نوعیت کیسی ہو گی کیونکہ یہ ایک غیبی معاملہ ہے۔اس کی حقیقت کے بارے میں صرف اللہ جانتا ہے۔ہم تو وہ پرتو جان سکتے ہیں جو اس تعبیر سے ذہن پر پڑتا ہے یا دل جو اشارہ قبول کرتے ہیں اور وہ اشارات یہ ہیں کہ قرآن ایک محفوظ کتاب ہے۔اور ہر معاملے میں اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے۔ تمام باتیں ختم ہو سکتی ہیں لیکن یہ محفوظ ہے۔یہ بات تو واقعہ اخدود میں کہی گئی ہے لیکن تمام معاملات میں قرآن کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الطارق ۔ ۸٦

۱ -- تا -- ۱۷

سورۃ الطارق ایک نظر میں

اس پارے کے ابتدائیہ میں ہم نے بتایا تھا کہ یہ سورت دراصل انسان کے خوابیدہ احساس پر پے درپے شدید ضربات ہیں' شدید ترین ضربات اور ایسی بے ساختہ چیخ و پکار پر مشتمل ہے' جو کسی ایسے شخص کو جگانے کے لیے کی جاتی ہے جو غفلت کی نیند میں غرق ہو' یہ ضربات اور ان کے ساتھ یہ بے ساختہ آوازیں کچھ اس مضمون کی ہیں ۔اٹھو' جاگو' دیکھو' توجہ کرو' غوروفکر کرو' گہری سوچ سے کام لو۔ آخر اس کارخانہ قدرت کا ایک چلانے والا ہے ۔اس کائنات کی پشت پر ایک حکیمانہ قوت کام کر رہی ہے ۔یہ پوری کائنات ایک لگے بندھے ضابطے کے مطابق چل رہی ہے ۔دیکھو اس جہاں میں تمہارا امتحان ہو رہا ہے ۔تم اپنے اقوال و افعال کے ذمہ دار ہو' پوری زندگی کا حساب و کتاب تم نے پیش کرنا ہے ۔ ایک شدید عذاب بھی تیار ہے اور ایک عظیم نعمتوں بھری جنت بھی موجود ہے جس کا ایک عظیم مملکت کی طرح نظام ہے ۔

یہ سورت ان خصوصیات کا نمونہ ہے ۔اس کی ضربات میں اسی طرح شدت ہے جس طرح ان کے مناظر شدید ہیں ۔ موسیقی کا انداز بھی شدید ہے ۔ الفاظ کا ترنم بھی شدید ہے' اور معنوی اشارات میں بھی شدت ہے ۔ مثلاً الطارق' الثاقب' الدافق' الرجع اور الصدع کے الفاظ لفظی اور معنوی اور ترنم میں شدت رکھتے ہیں ۔

معنوی سختی کا نمونہ یہ ہے کہ ہر نفس کی نگرانی ہو رہی ہے ۔

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (٨٦ : ٤) "کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کے اوپر کوئی نگہبان نہ ہو" ۔اور قیامت کے دن ایسے شدید حالات ہوں گے کہ کسی کے پاس نہ کوئی اپنی طاقت ہوگی اور نہ کوئی مددگار ہوگا ۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (٨٦ : ٩) فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ (٨٦ : ١٠) "جس روز پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہوگی اس وقت انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا" ۔اور یہ قرآن آخری اور فیصلہ کن بات ہے ۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ (١٣) وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (٨٦ : ١٤) "یہ ایک جچی تلی بات ہے یعنی مذاق نہیں ہے" ۔ پھر اس سورہ میں جو دھمکی دی گئی اس میں شدت اور سختی کا انداز شامل ہے ۔

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا (١٥) وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا (١٦) فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (٨٦ : ١٧) "یہ لوگ کچھ چالیں چل رہے ہیں ۔میں بھی ایک چال چل رہا ہوں' پس چھوڑ دو اے نبیؐ

ان کافروں کو اک ذرا کی ذرا ان کے حال پر"۔

جس طرح ہم نے پارے کے مقدمہ میں کہا تھا اس میں وہ تمام موضوعات پائے جاتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک اللہ ہے' یہ کائنات ایک تدبیر اور تقدیر کے مطابق چل رہی ہے ۔ یہ زندگی ایک آزمائش ہے' انسان یہاں اپنے افعال و اقوال کا ذمہ دار ہے اور ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ جہاں جزاء و سزا ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

جن کائناتی مناظر کو پیش کیا گیا ہے اور جن نظریاتی مقاصد کو پیش کیا گیا ہے ان کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور مطابقت ہے ۔ اور اس کی تفصیلی فصاحت اس وقت ہوگی جب ہم قرآن کریم کی آیات بھی بحث کریں گے ۔ اپنے انداز بیان کے اعتبار سے قرآن کی آیات تو بے مثال حسن رکھتی ہیں۔

---○○○---

درس نمبر ۲۸۶ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۱۷

سُوْرَۃُ الطَّارِقِ (۸۶) مَکِّیَّۃٌ (۳۶) اٰیَاتُھَا ۱۷ رُکُوْعُھَا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ﴿۲﴾ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ﴿۳﴾ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔ اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے؟ چمکتا ہوا تارا۔ کوئی جان ایسی نہیں ہے جس کے اوپر کوئی نگہبان نہ ہو"۔

اس قسم میں ایک کائناتی منظر اور ایک ایمانی سچائی کو بیان کیا گیا ہے۔ آغاز آسمان اور طارق کے ذکر سے ہوتا ہے اور جس طرح قرآن کریم کا انداز بیان ہے 'خود ہی پوچھ لیا جاتا ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ (۸۶ : ۲) "تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا (طارق) کیا ہے"۔ گویا وہ ایک ایسی چیز ہے کہ انسانی ادراک سے ماوراء ہے۔ اس کے بعد قرآن مجید خود اس کی تعریف اور وضاحت کرتا ہے کہ وہ النَّجْمُ الثَّاقِبُ (۸۶ : ۳) "چمکتا ہوا تارا" ہے اسے ثاقب اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی شعاعوں کے ذریعہ تاریکیوں کو پھاڑ کر اپنی روشنی زمین پر پھینکتا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے ہر ستارہ نجم ثاقب ہے۔ اس آیت سے ہم معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ ستارہ کون سا ہے اور نہ اس تعین کی چنداں ضرورت ہے بلکہ اس سے مطلق ستارہ مراد لینا ہی بہتر ہے۔ اس طرح مفہوم یہ ہو گا "قسم ہے آسمان کی اور اس کے اندر موجود چمکتے ہوئے ستاروں کی جو تاریکیوں کو پھاڑ کر روشنی پہنچاتے ہیں" اور وہ اس روشنی کے ذریعہ اس پردۂ تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہو جاتے ہیں جو دوسری چیزوں کو چھپا لیتا ہے۔ اسی مفہوم سے سورت کے اندر بیان ہونے والے حقائق اور مفاہیم کی طرف بھی اشارہ ہو گا جیسا کہ آگے تشریح میں آ رہا ہے۔

جواب قسم یہ ہے کہ ہر نفس کے اوپر اللہ نے اپنے حکم سے ایک نگران مقرر کر رکھا ہے۔

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (۸۶ : ۴) "کوئی جان نہیں ہے جس کے اوپر کوئی نگہبان نہ ہو"۔
جن الفاظ اور جس ترکیب میں یہ بات کی گئی ہے وہ سخت تاکیدی اسلوب ہے۔ نفی و اثبات کہ کوئی نفس نہیں ہے مگر اس پر نگران مقرر ہے۔ جو اس کی نگرانی بھی کرتا ہے اور اس کے اعمال بھی لکھتا ہے۔ اور یہ نگران اس کی حفاظت بھی کرتا ہے اور اس کی تقرری اللہ کے حکم سے ہے۔ ان تمام باتوں کو نفس کی طرف منسوب کیا گیا ہے کیونکہ تمام انسانی راز تمام انسانی افکار' انسانی نفس کے اندر ہوتے ہیں اور یہ نفس ہی سزاو جزا کا ذمہ دار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کو یونہی نہیں چھوڑ دیا گیا کہ شتر بے مہار کی طرح جہاں چاہیں گھومیں پھریں اور ان کا کوئی محافظ اور چرواہا نہ ہو' اور ان کو زمین کی وادیوں میں بغیر نگران کے چھوڑ دیا گیا ہو' کہ جہاں چاہیں گھومیں اور جہاں چاہیں چریں اور کوئی پوچھنے والا نہ ہو' بلکہ انسانوں کے اعمال کو بڑی دقت کے ساتھ ریکارڈ کیا جارہا ہے اور یہ ریکارڈ ہر شخص کا براہ راست تیار ہو رہا ہے اور نہایت صفائی کے ساتھ ہو رہا ہے۔

یہ آیت اس بات اور خوفناک حقیقت کو سامنے لاتی ہے کہ انسان چاہے بظاہر اکیلا ہو' اکیلا کسی وقت نہیں ہوتا' جب دنیا میں کوئی بھی دیکھنے والا نہ ہو تو اللہ اور اللہ کا نمایندہ دیکھ رہا ہے اور ریکارڈ کر رہا ہے' اگر کوئی دنیاوی آنکھ اسے نہیں بھی دیکھ رہی اور کسی ستارے کی چمک بھی اس تک نہیں پہنچ رہی تو اللہ کی نظریں اس پر ہیں اور اللہ کا مقرر کردہ نگران ساتھ لگا ہوا ہے۔ اس طرح جس طرح نجم ثاقب کی روشنی تاریکیوں کو پھاڑ پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ کی نگرانی میں بھی کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔ اور اللہ کا مقرر کردہ نگران ساتھ لگا ہوا ہے۔ اس طرح جس طرح نجم ثاقب کی روشنی تاریکیوں کو پھاڑ پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ کی نگرانی میں بھی کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔ اور اللہ کے کمالات یکساں ہیں' وہ جس طرح آفاق میں کام کرتے ہیں اسی طرح انفس میں بھی کرتے ہیں۔

یہ چٹکی جس کے ذریعہ نفس انسانی کے احساس کو بیدار کر کے اسے اس کائنات سے جوڑ دیا گیا' اب ایک دوسری چٹکی کے ذریعہ اللہ کی گہری تدبیر اور اٹل تقدیر کے بارے میں اس کے احساس کو بیدار کیا جاتا ہے۔ آسمانوں اور ستاروں کی قسم اٹھا کر اس گہری تدبیر کی طرف اشارہ تھا۔ اب بتایا جاتا ہے کہ انسان اور زمین اور ستاروں کی بات تو دور کی بات ہے یہ تمہارا انفس بھی کرشمہ قدرت ہے۔ خود انسان کی تخلیق ہی بتاتی ہے کہ یہ انسان شتر بے مہار نہیں ہے اور نہ خود رو ہے۔ اور نہ بے مقصد سلسلہ وجود و عدم ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَآئِبِ ۝

"پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے"۔

انسان کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا اور پھر دیکھتے دیکھتے کیا بن گیا۔ ایک ایسے پانی سے اسے پیدا کیا جو اچھل کر جسم انسانی سے نکلتا ہے اور یہ آتا کہاں سے ہے' انسان کی پیٹھ اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔

یہ پانی مرد کی ریڑھ کی ہڈیوں سے جمع ہوتا ہے ـ اور عورت کی سینے کی بالائی ہڈیوں سے نکلتا ہے اور اس پانی کا بننا اور اس کا یوں خارج ہونا اللہ کے رازوں میں سے ایک راز تھا جسے انسان ابھی تک نہیں جانتا تھا گزشتہ نصف صدی میں سائنس نے اپنے اسلوب تحقیق کے مطابق اس کے بعض پہلوؤں سے پردہ اٹھایا اور معلوم ہوا کہ انسان کی پیٹھ کی ہڈیوں اور عورت کے سینے کی بالائی ہڈیوں کے اندر عورت کا مادۂ منویہ بنتا ہے اور یہ دونوں مواد جب ایک نہایت ہی محفوظ جگہ میں اکٹھے ہوتے ہیں تو پھر ان سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے ـ

حقیقت ہے کہ انسان کی ابتدائی پیدائش اور آخری شکل تمام کے درمیان ایک طویل اور خوفناک سفر ہے ـ وہ پانی جو ریڑھ کی ہڈیوں اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے اس کے اور پھر ایک مکمل شکل و صورت کے انسان کے درمیان ایک طویل سفر ہے ' جو عقل بھی رکھتا ہے ـ وہ عضوی ' اعصابی ' عقلی اور نفسیاتی پیچیدہ ترکیب بھی رکھتا ہے ـ یہ سفر جو اچھلتا پانی طے کر کے ایک عاقل و بالغ انسان کی شکل اختیار کر لیتا ہے ' اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان سے باہر ایک قوت ہے جو اس مائع پانی کو ایک سمت میں چلاتی ہے ' جبکہ ابتدائی حالت میں اس پانی کے اندر نہ قدرت ہے نہ کوئی ہیولا ہے ' یہ پانی یہ طویل سفر نہایت ہی عجیب و غریب انداز میں طے کرتا ہے اور اس انجام تک پہنچتا ہے ـ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس پر ایک نگران مقرر ہے کہ وہ اس باریک نکتے کی نگرانی کرتا ہے جس کے اندر نہ عقل ہے اور نہ اس کے اندر کوئی ہیولا نظر آتا ہے ـ نہ قوت ہے اور نہ ارادہ ہے اور اس نکتے کے اس طویل سفر میں مسلسل نگران رہتا ہے ـ اس نکتے کے اندر اس قدر عجائب ہیں کہ انسان اپنی شعوری زندگی کے آغاز سے انتہا تک اس قدر عجائب و غرائب نہیں دیکھ سکتا ـ

یہ ایک نکتہ نہایت ہی باریک نکتہ ہوتا ہے اور یہ نہایت طاقتور خوردبین سے بھی بمشکل نظر آتا ہے ـ یہ پانی جب ایک بار مرد کی پشت سے اچھل کر نکلتا ہے تو اس کے اندر ایسے کروڑوں نکتے ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک نکتہ اپنے مقام تک پہنچتا ہے ـ یہ حقیقت کہ اس نکتے کی کوئی شکل نہیں ہوتی اس کے اندر عقل نہیں ہوتی ' اس کے اندر کوئی قوت نہیں ہوتی ' اور کوئی ارادہ نہیں ہوتا ' اس وقت معلوم ہو جاتی ہے جب یہ نکتہ رحم مادر میں جا کر ٹھہرتا ہے اور پھر غذا کا متلاشی ہوتا ہے ـ اب دست قدرت اس کی رہنمائی یوں کرتا ہے کہ یہ نکتہ اپنے ارد گرد پائے جانے والے رحم مادر کی دیواروں کو کھانا شروع کر دیتا ہے اور یہ رحم مادر کے اندر اپنے لیے خون کا ایک حوض بنا لیتا ہے ـ یہ خون اس کے لیے غذا کا کام کرتا ہے ـ جونہی اسے اطمینان ہوتا ہے کہ اس کی خوراک کا انتظام ہو گیا ہے ـ یہ ایک نئی کارروائی شروع کرتا ہے ـ اب یہ تقسیم در تقسیم ہونا شروع کرتا ہے ـ اور مسلسل تقسیم ہوتا رہتا ہے ـ یہ سادہ ' بے عقل اور بے شکل اور ضعیف و ناتواں اور قوت و ارادے سے محروم خلیے کو معلوم ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کس طرف بڑھنا ہے ـ یہ دست قدرت ہی ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے اور اسے قوت و ارادہ سے نوازتا ہے کہ اسے کدھر جانا ہے اور کیا شکل اختیار کرنی ہے ـ دست قدرت اسے حکم دیتا ہے کہ وہ اس مسلسل تقسیم کے عمل سے پیدا ہونے والے خلیوں کو اس کام میں لگا دے جس کے لیے انہیں پیدا کیا جا رہا ہے ـ اس عمارت کے جس حصے کے لیے خلیے پیدا ہوتے ہیں وہ اس عضو کی طرف بڑھتے ہیں جبکہ جسم انسانی کی عمارت مجموعی اعتبار سے بے حد پیچیدہ عمارت ہے ـ تقسیم کے عمل سے پیدا ہونے والے یہ خلیے مسلسل چلتے ہیں اور ان اعضا کی شکل میں جمع ہوتے ہیں اور آخر کار یہ عظیم ہیکل تیار ہوتا ہے ـ یہ خلیے انسان کے جسم

کے اندر عضلاتی نظام تیار کرتے ہیں ۔ پھر ان کا ایک گروپ اعصابی نظام تیار کرتا ہے ۔ ان کا ایک گروپ شرائین کا جال بچھاتا ہے ۔ یہ اور اس عمارت کے دوسرے پیچیدہ نظام تیار ہوتے ہیں لیکن یہ تعمیر و تشکیل کا عمل اس قدر سادہ نہیں ہے جس طرح سمجھا جاتا ہے ۔ اس نظام کے اندر نہایت ہی گہری ٹیکنالوجی کام کرتی ہے ۔ ہڈیوں میں سے ہر ہڈی' عضلات میں سے ہر ایک عضلہ اور اعصاب میں سے ہر ایک پٹھا' کسی دوسری ہڈی' پٹھے کے پوری طرح مشابہ اور یکساں نہیں ہے ۔ کوئی پٹھا دوسرے اعصاب کے ساتھ یکساں نہیں ہے کیونکہ یہ عمارت بے حد پیچیدہ ہے ۔ اس کی ساخت بھی نہایت عجیب ہے ۔ ہر ایک کا فعل اور فریضہ الگ ہے ۔ اس لیے ہر خلیہ معلم قدرت سے یہ بات سیکھتا ہے اور اخذ کرتا ہے کہ وہ کس مخصوص عضو کے لیے مخصوص ہے ۔ اور اس نے اس عضو کے اندر پھر کیا ڈیوٹی سرانجام دینی ہے ۔ اس لیے جسم کے اندر جو چھوٹے سے چھوٹا خلیہ بھی حرکت کرتا ہے' معلم قدرت کی رہنمائی میں وہ اپنی راہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس نے کہاں جانا ہے اور اس کی ڈیوٹی کیا ہے اور اس نے کیا کرنا ہے ۔ کوئی ایک خلیہ یا ان کا گروپ بھی کبھی اپنی راہ غلط نہیں کرتا ۔ مثلاً جو خلیے آنکھ بناتے ہیں' ان کو معلوم ہوتا ہے کہ آنکھ سر میں ہوتی ہے ۔ یہ جائز نہیں ہے کہ وہ پیٹ یا پاؤں یا بازوؤں میں آنکھیں بنائیں ۔ حالانکہ اگر اللہ چاہے تو وہ پیٹ' ہاتھ اور پاؤں میں کسی جگہ آنکھ بنا دے ۔ اگر آنکھ بنانے والا پہلا خلیہ ان مقامات کی طرف چلا جائے اور وہاں آنکھ بنا دے تو وہ بنا سکتا ہے لیکن جب آنکھ کا خلیہ سفر کرتا ہے تو وہ اسی مقام کی طرف سفر کرتا ہے جو اس کے لیے اس انسانی پیچیدہ ہیولا کے اندر مخصوص کر دیا گیا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ اس خلیے کو یا ان خلیات کو یہ احکام کون دیتا ہے ۔ کون ہے جس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آنکھ کو اس جگہ ہونا چاہیے اور اس جگہ نہیں ہونا چاہیے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ۔ یہ اللہ ہی حافظ و برتر ہے جو ان خلیات کی نگرانی کرتا ہے' ان کو ہدایت دیتا ہے' ان کو راہ بتاتا ہے اور ایسی تاریکیوں میں راہ بتاتا ہے جہاں اللہ کے سوا کوئی اور راہ بتانے والا ہوتا ہی نہیں ہے ۔

یہ تمام خلیے' اجتماعی طور پر بھی اور انفرادی طور پر اس فریم ورک کے اندر کام کرتے ہیں جو ان کے لیے ان خلیات کا مجموعی نظم طے کرتا ہے ۔ اس مجموعی نظم میں اس عضو کی شکل بھی ہوتی ہے اور اس کے اندر وراثتی خصوصیات بھی ہوتی ہیں' مثلاً اگر انسان کی آنکھ کے خلیات ہیں تو وہ ایک تو انسانی آنکھ بنائیں گے اور دوسرے یہ کہ اس آنکھ کے اندر اس انسان کے آباء و اجداد کی مخصوص شکل و صورت بھی محفوظ ہوگی ۔ اس نقشے سے معمولی انحراف بھی اس عضو کے نظام کو خراب کر دیتا ہے ۔ تو سوال پھر یہی ہے کہ وہ ہستی کون ہے جس نے خلیات کو یہ قدرت دی اور ان کو ایسا منظم عمل کرنے کا طریقہ سکھایا ۔ حالانکہ یہ ایک سادہ خلیہ ہوتا ہے اور اس میں عقل و ادراک نہیں ہوتا ۔ نہ قوت اور ارادہ ہوتا ہے ۔ اس سوال کا سیدھا سادھا جواب یہی ہے کہ صرف اللہ کی ذات ہے ۔ یہ اللہ ہی ہے جو ان خلیات کو وہ کچھ سکھاتا ہے کہ انسان نہ اس قسم کا نقشہ بنا سکتا ہے ۔ نہ ایک عضو تیار کر سکتا ہے ۔ نہ ہاتھ' نہ آنکھ' نہ ان کا کوئی حصہ ۔ اس کے برعکس ایک سادہ خلیہ یا خلیات کا مجموعہ یہ کام کر دکھاتا ہے' جو نہایت ہی عظیم اور پیچیدہ کام ہے ۔

ایک خلیے سے انسان تک اس سفر کے اس سرسری جائزے کے اندر ایک جہاں ہے عجائبات اور انوکھی چیزوں کا' یعنی اچھلتے پانی سے انسان بننے تک کے مراحل میں ۔ اعضاء کا نظام' ان عجائب کی تفصیلات بیان کرنے سے بھی ہم عاجز ہیں ۔ اور نہ ظلال القرآن کے محدود صفحات میں یہ ممکن ہے لیکن یہ سب عجائبات اس بات پر شاہد ناطق ہیں کہ ایک خفیہ دست قدرت ہے جو ان خلیوں سے یہ کام کرواتا ہے ۔ ان حقائق سے ایک تو وہ حقیقت ثابت ہوتی ہے جس پر آسمان اور

الطارق کی قسم اٹھائی گئی ہے اور یہ قسم اور جواب قسم دوسری عظیم حقیقت کے لیے ایک تمہید ہے کہ ان تمام انسانوں نے ' اسی طرح ایک بار پھر خودکار انداز سے اپنی قبروں سے اٹھنا ہے لیکن اس دوسری حقیقت کا مشرکین مکہ انکار کرتے تھے جو قرآن کے اولین مخاطب تھے 'جن کے سامنے یہ سورت سب سے پہلے اتری تھی۔

إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ﴿٨﴾ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ﴿٩﴾ فَمَا لَهُ مِن قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ﴿١٠﴾

"یقیناً وہ (خالق) اسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔جس روز پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہوگی' اس وقت انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا"۔

یہ اللہ ہی ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کی نگہداشت کی۔ لہٰذا اس پر قادر ہے کہ موت کے بعد اسے زندگی بخشے اور مرکر مٹی میں مل جانے کے بعد اسے حیات جدید دے۔ اللہ کی پہلی تخلیق جس کا اوپر ذکر ہوا' یہ شہادت دے رہی ہے کہ وہ دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ پہلی زندگی اللہ کی تدبیر اور اللہ کی قدرت پر شاہد عادل ہے کیونکہ پہلی تخلیق میں نہایت حکیمانہ ٹیکنالوجی پوشیدہ ہے۔ اگر انسان کو دوبارہ زندہ کرنے اور حساب و کتاب لینے کو تسلیم نہ کیا جائے تو پہلی تخلیق کا پورا انظام عبث ہو جائے گا۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ (٨٦ : ٩) "جس دن پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہوگی"۔ جب چھپے ہوئے راز کھلیں گے اور وہ پردے جن کی تہوں میں راز پوشیدہ ہوں گے ہٹ جائیں گے 'ان رازوں کی جانچ ہوگی وہ ظاہر اور کھلے ہوں گے اور راز نہ رہیں گے 'جس طرح چمکتا ہوا تارہ اندھیروں سے نمودار ہوتا ہے اور جس طرح نفس انسانی پردوں کے اندر ملفوف ہوتا ہے اور اس کا حافظ اس کی ہر بات جانتا ہے تو جس دن انسان کے پاس نہ قوت ہوگی اور نہ اس کا کوئی مددگار ہوگا 'اس دن سب کچھ سامنے آجائے گا۔

فَمَا لَهُ مِن قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ (٨٦ : ١٠) "اس وقت نہ انسان کے پاس اپنا زور ہوگا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا"۔ یعنی نہ ذاتی قوت ہوگی اور نہ خارج سے کوئی امداد ملے گی۔ اور کوئی بات پوشیدہ بھی نہ رہے گی اور انسان کی تمام کمزوریاں ظاہر ہو جائیں گی تو یہ بہت ہی سخت گھڑی ہوگی۔ ایسے حالات کا احساس انسان پر گہرا اثر ڈالتا ہے 'کہ یہ کائنات 'پھر نفس انسانی 'پھر تخلیق انسانی کے مختلف مدارج اور آخرکار قیامت کے دن انسان کی بے بسی کہ جب تمام راز کھل جائیں گے 'اور تمام قوتیں اور سہارے ختم ہوں گے۔

شاید اب بھی کسی قدر شک باقی رہ گیا ہے۔ نفس انسانی کے اندر کچھ خلجان موجود ہے اور بعض اوقات نہایت ہی موثر کلام اور اٹل دلائل کے بعد بھی انسان کے شبہات رہتے ہیں۔ اس لیے پھر تاکیدی قسموں کے بعد جتایا جاتا ہے کہ یہ ایک فیصلہ کن بات ہے اور یہاں بھی اس قرآن اور کائنات کے درمیان ربط پیدا کر کے بات کی جاتی ہے جس طرح آغاز سورت میں کیا گیا۔

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ ﴿۱۱﴾ وَ الۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ﴿۱۳﴾ وَّ مَا هُوَ بِالۡهَزۡلِ ﴿۱۴﴾

"قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی اور (نباتات اگتے وقت) پھٹ جانے والی زمین کی' یہ ایک جچی تلی بات ہے' ہنسی مذاق نہیں ہے"۔

الرجع کے معنی ہیں لوٹنے کے' آسمان بار بار بارش برساتا ہے اور الصدع کے معنی پھٹنے کے ہیں اور بارش کے بعد جب زمین سے نباتات اگتے ہیں تو وہ پھٹتی ہے اور اس سے پودے پھوٹتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں زندگی کی ایک قسم کا اظہار کرتی ہیں۔ یعنی نباتات اور ان کی پہلی زندگی کہ آسمانوں سے پانی برستا ہے اور پھر نباتات اگتے ہیں۔ یہ تمثیل اس سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے کہ نطفے کا پانی اچھل کر برسے' اور آسمان کے بجائے ریڑھ اور سینے کی ہڈیوں سے نکلے اور رحم کے اندھیروں سے بچہ نمودار ہو۔ گویا ایک ہی زندگی ہے اور ایک ہی منظر ہے' ایک ہی قسم کی حرکت' ایک ہی نظام اور ایک ہی قسم کی تخلیق ہے اور دونوں سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کا صانع ایک ہے۔ اور کوئی معقول انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہے کہ وہ ایسی کوئی تخلیق کر سکتا ہے اور ان تخلیقات کے ہم شکل کوئی مخلوق بنا سکتا ہے۔

یہ منظر چمکتے ہوئے ستارے کے منظر کے بھی ہم رنگ ہے۔ ایسے ستارے کی روشنی بھی ظلمتوں کے پردے پھاڑ کر سامنے آتی ہے اور جس طرح یہ روشنی نمودار ہوتی ہے اس طرح چھپے ہوئے راز بھی نمودار ہوں گے گویا یہ مناظر بھی ہم رنگ ہیں۔ اور ان سے بھی ایک ہی صانع کی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔

یہ دو کائناتی مخلوقات ہیں جن کی قسم اٹھائی جا رہی ہے یا کائناتی حادثات ہیں جن کی قسم اٹھائی جا رہی ہے آسمان جو بار بار بارش برساتا ہے اور زمین جو نباتات کے اگنے کی وجہ سے بار بار پھٹتی ہے۔ ان دونوں واقعات یا حادثات کا منظر' اس منظر کے اندر پوشیدہ اشارات اور خود ان الفاظ صدع اور رجع کی قطعیت اور سختی اور پھر ان کے ساتھ اللہ کی قسم اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ دوبارہ زندگی اور باز پرس قطعی بات ہے۔ مذاق نہیں ہے۔ یا یہ کہ یہ پورا قرآن مجید ایک قطعی بات کرتا ہے اور اس کے اندر کوئی بات محض بات کے لیے نہیں کی گئی۔ اس میں جو تصورات بیان کیے گئے ہیں وہ فیصلہ کن خیالات اور نظریات ہیں اور وہ حق اور سچائی ہیں جن کے اندر کوئی شبہ اور شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ آخری بات ہے' اللہ کا آخری کلام ہے۔ اس کے بعد کوئی کلام نہیں ہے۔ اور اس کے حقائق میں کوئی کلام نہیں ہے۔ اور زمین و آسمان اس پر شاہد عادل ہیں خصوصاً بارش برسانے والا آسمان اور فصلیں اگانے والی زمین۔

ان حقائق کے بیان کے سایہ میں' کہ تمام انسانوں کو اٹھایا جائے گا اور ان سے باز پرس ہوگی' روئے سخن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس مٹھی بھر جماعت کی طرف پھر جاتا ہے جو مکہ مکرمہ میں نہایت ہی کٹھن حالات سے گزر رہے تھے۔ اور ان کے خلاف اور ان کی دعوت اور تحریک کے خلاف رات دن کی سازشیں ہو رہی تھیں۔ اور اس کام کے لیے یہ ہر وقت گھات میں بیٹھے رہتے تھے' اور اسلامی تحریک کے مقابلے میں مختلف تدابیر اختیار کرتے تھے اور دعوت اسلامی کے پھیلنے کے راستے بند کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ نئے نئے ہتھکنڈے استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کو تلقین کی جاتی ہے کہ آپ ثابت قدم رہیں اور ان لوگوں کی سازشوں کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ایک وقت تک یہ مخالفت ہوگی اور آخر کار کامیابی آپ کے قدم چومے گی' اس دعوت کی قیادت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔آپ ؐصبر اور اطمینان سے کام جاری رکھیں۔اللہ خود تدابیر اختیار کر رہا ہے۔

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿١٥﴾ وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا ﴿١٦﴾ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ

۱۷ع اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿١٧﴾

۱۱

"یہ لوگ (یعنی کفار مکہ) کچھ چالیں چل رہے ہیں اور میں بھی ایک چال چل رہا ہوں۔پس چھوڑ دو اے نبی ؐ ان کافروں کو اک ذرا کی ذرا ان کے حال پر چھوڑ دو"۔

ان لوگوں کی حقیقت تو ہم نے بھی بتا دی ہے' یہ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیے گئے ہیں جو والد کی پیٹھ اور والدہ کے سینے سے نکلتا ہے۔ابتدائی طور پر اس پانی میں نہ طاقت تھی 'نہ قوت اور نہ ارادہ۔نہ علم اور نہ ہدایت۔ان لوگوں کو تو دست قدرت اس طویل طریقے سے وجود میں لائی ہے اور ایک دن دوبارہ ان کو اسی طرح پیدا کیا جائے گا اور ان کے تمام راز کھل جائیں گے اور یہ پھر اسی طرح بے بس اور بے کس ہوں گے۔یہ لوگ اللہ کی تحریک کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں؟میں ان کا خالق' ہدایت دینے والا' حفاظت کرنے والا' پیدا کرنے والا' مارنے والا اور دوبارہ لوٹانے والا ہوں' ان کو میں نے اس امتحان میں ڈالا ہوا ہے۔میں قادر اور قاہر ہوں اور آسمانوں پر چمکتے ستاروں کا پیدا کرنے والا ہوں۔جس پانی سے وہ پیدا ہوئے ہیں اور اسے ایک بولنے اور سوچنے والا انسان بنایا' اللہ ہی نے یہ آسمان بنایا ہے جو بارش برساتا ہے اور اس میں نباتات پیدا کرتا ہے۔یہ کام کرنے والا میں ہوں اور میں بھی ان کی تدابیر کے مقابلے میں تدابیر کرتا ہوں۔

اب ایک طرف ان لوگوں کی سازشیں ہیں اور دوسری طرف اللہ کی تدابیر ہیں' حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے' اس جنگ کا درحقیقت ایک ہی فریق ہے' دوسرا فریق جو بظاہر نظر آتا ہے وہ محض مذاق کے لیے ہے۔

فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (۸٦:۱۷) "پس چھوڑ دو' اے نبی ؐ' ان کافروں کو' ان کو تھوڑی سی مہلت دے دو"۔جلدی نہ کرو' اس معرکے کا انجام دور نہیں ہے۔آپ ؐ نے اس معرکے کی حقیقت کو دیکھ لیا ہے' ان لوگوں کو ذرا سی مہلت بھی ایک بڑی حکمت کے تحت دی جا رہی ہے' اور یہ مہلت قلیل ہی ہے۔اگرچہ تمہاری پوری زندگی اس میں لگ جائے اس لیے انسانوں کو جو عمر اس دنیا کے لیے دی گئی ہے' وہ تو قلیل ہی ہے۔

انداز تعبیر محبت بھرا ہے' اللہ تعالیٰ رسول اللہ ؐ سے فرماتا ہے کہ آپ ان کو مہلت دے دیں۔

فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (۸٦:۱۷) "آپ ان کافروں کو مہلت دے دیں ایک تھوڑے وقت کے لیے"۔گویا اختیارات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہیں۔گویا مہلت دینا آپ ؐ کے اختیارات میں ہے حالانکہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے' یہ ایک انداز محبت ہے۔اور اس انداز

سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رحمت و شفقت کے جھونکے محسوس کرتے ہیں۔ اور آپ ؐ کی یہ خواہش کہ فوری کامیابی ہو' اس فضا میں ڈوب جاتی ہے' یوں اللہ آپ ؐ کے ارادے کو اپنے ارادے میں ملا دیتا ہے اور بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید آپ ؐ اختیارات میں شریک ہیں' یوں آپ ؐ کے سامنے سے وہ پردے ہٹ جاتے ہیں اور آپ اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں قطعی فیصلے ہوتے ہیں۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ اختیارات آپ ؐ کے ہاتھ میں ہیں لیکن آپ قدرے مہلت دے دیں۔ یہ انداز محبت ہے۔ نہایت ہی لطیف انداز انس و محبت۔ ایسے انداز گفتگو سے وہ تمام کلفتیں دور ہو جاتی ہیں جو اس راہ میں آپ ؐ کو پیش آ رہی تھیں۔ تمام تھکاوٹیں' تمام مشکلات دور ہو جاتی ہیں' مشکلات اور مشقتوں کے پہاڑ پگھل جاتے ہیں اور فضا پر انس و محبت کے سائے چھا جاتے ہیں۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الاعلیٰ ۔ ۸۷

۱-- تا -- ۱۹

سورۃ الاعلیٰ ایک نظر میں

امام احمد نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سورہ۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى (۸۷: ۱) کو بہت پسند فرماتے تھے۔ اور امام مسلم کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز میں اور جمعہ کی نماز میں یہ سورت اور سورت هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ (۸۸: ۱) پڑھتے تھے۔ کئی بار عید اور جمعہ ایک ہی دن آئے تو بھی آپؐ نے ان کو پڑھا۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق تھا کہ آپؐ اس سورت سے محبت رکھتے کیونکہ یہ سورت اس پوری کائنات کو ایک عبادت خانہ بناتی ہے جس کی تمام مخلوق رسول اللہ کے ہمرکاب ہے اور اللہ کی تسبیح اور ثنا میں مصروف ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى (۱) الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى (۲) وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى (۳) وَالَّذِيْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى (٤) فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى (٥) (۸۷: ۱ تا ۵) "(اے نبیؐ) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا' جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی' جس نے نباتات اگائیں پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا"۔ سورت کا انداز نرم ہے' اللہ کی تسبیح و ثنا کی گونج دور تک سنائی دیتی ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجا طور پر اس سورت کو پسند کیا' اس سورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خوشخبریوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ آپؐ کو تبلیغ اور یاد دہانی کرانے کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى (٦) اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى (۷) وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (۸) فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (۹) (۸۷: ٦ تا ۹) "ہم تمہیں پڑھوا دیں گے' پھر تم نہیں بھولو گے' سوائے اس کے جو اللہ چاہے' وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ پوشیدہ ہے اس کو بھی۔ اور ہم تمہیں آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں' لہٰذا تم نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو"۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ آپؐ کے قلب مبارک میں قرآن کو بٹھا دے گا اور اس طرح آپؐ حفظ کرنے کی مشقت سے بے فکر ہو جائیں گے۔ پھر اللہ وعدہ فرماتا ہے کہ ہم آسان طریقوں کی رہنمائی کریں گے۔ تمام معاملات میں' اور خصوصاً دعوت اسلامی کے معاملات میں اور یہ ایک عظیم بات ہے۔

کیوں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت سے محبت کرتے؟ اس لیے کہ اس میں اسلامی تصور حیات کے

تمام بنیادی قواعد ثبت کر دیئے گئے ہیں۔ عقیدہ توحید اس میں مذکور ہے' وحی الہٰی کی بات اس میں آگئی ہے' آخرت کی جزا و سزا کا ذکر بھی آگیا ہے' یہ سب باتیں اسلامی ایمانیات کے بنیادی اجزاء ہیں۔ پھر ان عقائد اور نظریات کو انسانی تاریخ میں دور تک پھیلا دیا گیا ہے' کہ یہی باتیں تمام نبیوں نے کی ہیں۔

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی (۱۸) صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی (۸۷: ۱۹)

"یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی' ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں"۔ اس کے علاوہ سورت اسلامی نظریہ حیات کا جو مزاج متعین کرتی ہے' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو طریقہ کار بتلاتی ہے اور امت مسلمہ کا جو رویہ دکھاتی ہے' وہ سب ایسے ہیں کہ نرمی' رواداری ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان سب امور کے بیان کے ضمن میں پھر نہایت ہی مختلف ہدایات و اشارات ہیں جن کی تشریح اپنی جگہ آئے گی۔

---ooo---

درس نمبر ۲۸۷ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۱۹

سُوْرَةُ الْاَعْلٰى مَكِّيَّةٌ (۸) اٰيَاتُهَا ۱۹ رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴿۱﴾ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۲﴾ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى ﴿۳﴾
وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ﴿۴﴾ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"(اے نبیؐ) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا، جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی، جس نے نباتات اگائیں پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا"۔

سورت کا آغاز نہایت ہی نرم اور نہایت لمبے آہنگ سے ہوتا ہے، اس لمبے ٹون کے ذریعہ فضا میں تسبیح کی خوشگوار اور خوشبودار آواز بکھیر دی گئی ہے۔ اس کے بعد پھر تسبیح کا حکم اور پھر وہ صفات جن کو تسبیح کے بعد لایا گیا ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى (۱) الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى (۲) وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى (۳)

وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى (۴) فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى (۵) (۸۷ : ۱ تا ۵) "(اے نبیؐ) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا، جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی، جس نے نباتات اگائیں پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا"۔ تاکہ اس تسبیح کے ذریعہ اس پوری کائنات کے اطراف و اکناف میں تسبیح کی یہ آواز گونج اٹھے اور پوری کائنات ایک معبد نظر آئے اور ایک عبادت گاہ کے ساتھ ساتھ یہ پوری کائنات صانع قدرت کی مصنوعات کی نمائش گاہ بھی بن جائے۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى (۲) وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى (۸۷ : ۳) "وہ جس نے پیدا کیا اور ہر چیز کو متناسب بنایا اور ہر چیز کی تقدیر بنا کر اسے ہدایت بخشی"۔

تسبیح کے کیا معنی ہیں - اللہ کی برتری ذہن میں بسانا' اللہ کو ہر عیب سے پاک سمجھنا اور ذہن میں اللہ کی صفات حسنیٰ کا استحضار اور ان چیزوں کی روشنی' چمک اور نورانیت سے اپنے ذوق و وجدان اور قلب و شعور کو روشن رکھنا' نام ہے تسبیح کا - محض زبان سے سبحان اللہ جپنے کو تسبیح نہیں کہتے -

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (۸۷ : ۱) "اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو" - یہ الفاظ انسانی وجدان اور شعور پر ایک حالت طاری کر دیتے ہیں - یہ وجدانی حالت ایسی ہوتی ہے جس کا اظہار الفاظ کے اندر ممکن نہیں ہے - یہ تو ایک وجدانی اور ذوقی چیز ہے اور ایک ایسی زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا تعلق کچھ معانی اور کچھ صفات کے استحضار سے ہے نہ کہ کچھ الفاظ رٹنے سے -

یہ معانی و صفات کیا ہیں؟ پہلی صفت 'صفت ربوبیت ہے - اور دوسری صفت اعلیٰ ہے - رب کے معنی مربی 'نگران اور پالنے والے کے ہیں - ان صفات کے سائے اور پرتو اس سورت کی فضا اور اس کے اندر بیان کی جانے والی خوشخبریوں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں 'خصوصاً اس کے نرم انداز کے ساتھ - صفت اعلیٰ پردہ شعور پر ایسی تصاویر لاتی ہے جن سے علو' برتری اور غیر متناہی اور غیر محدود آفاق کا اظہار ہوتا ہے - انسانی روح دور تک تسبیحات کرتی ہے اور اس تصور علو سے تسبیح میں پاکی اور عظمت کے ساتھ مناسبت پیدا ہوتی ہے اور تسبیح اپنے بنیادی عناصر کے اعتبار سے تصور علو رب کا نام ہے -

ابتدائی خطاب ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے' اور یہ براہ راست اللہ کی طرف سے آپؐ کو خطاب ہے - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس حکم ربی کو پڑھتے تھے -

سَبِّحِ "پاکی بیان کرو" تو اگلی آیات پڑھنے سے پہلے آپؐ اس حکم پر عمل کر لیتے اور آپؐ فرماتے -

سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى "میں اپنے رب اعلیٰ کی پاکی بیان کرتا ہوں" - یوں حکم اور جواب حکم یا تعمیل حکم ہو جاتا - امر کی اطاعت ہو جاتی اور اللہ کے ساتھ مناجات اور سوال و جواب ہو جاتا - کیونکہ حضورؐ رب کے سامنے کھڑے ہوتے - براہ راست یہ کلام رب تعالیٰ سے لے رہے ہوتے تھے اور اس اتصال اور قرب کی حالت میں جواب دے دیتے - جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ یہ تسبیح سجدے میں پڑھا کرو -

(اجعلوا في سجودكم) اور اس سے قبل جب یہ آیت نازل ہوئی تھی -

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ "اپنے رب عظیم کے نام کا تسبیح کرو" - تو آپ نے حکم دیا کہ اس کو رکوع میں پڑھو چنانچہ رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ پڑھنا شروع کیا گیا - پس رکوع و سجود کی یہ تسبیح ایک زندہ تسبیح ہے' محض مردہ کلمات نہیں' جس طرح ایک زندہ چیز کا جسم حیات اور زندگی سے گرم ہوتا ہے ایسی ہی تسبیح نماز میں مطلوب ہے تاکہ اس تسبیح سے براہ راست حکم خداوندی کی تعمیل ہو جائے یا بالفاظ دیگر اجازت خداوندی کی تعمیل ہو' کیونکہ اللہ کا اپنے بندوں کو یہ اجازت دینا کہ اس کی حمد و ثنا کرو' یہ بھی اللہ کا فضل و کرم ہے - کیونکہ اس طرح انسان کو یہ اجازت ملتی ہے کہ وہ اپنے حد تصور کے مطابق اللہ کے قریب ہو جائے - کیونکہ انسان اللہ کی ثنا اللہ کی ذات و صفات میں اپنے محدود تصور کے

مطابق ہی کر سکتا ہے ۔ اور یہ اللہ کے فضل و کرم کی ایک شکل ہے کہ اللہ اپنی ذات کی معرفت اپنے بندوں کو اپنی صفات کے ذریعہ کرواتا ہے ۔ ایسی حدود میں کہ جن کے اندر وہ اللہ کی معرفت کا تصور کر سکتے ہیں ۔ اللہ اپنی ذات تک پہنچنے کے لیے اپنے بندوں کو جس شکل و صورت میں بھی اجازت دیتا ہے ' یہ ان پر فضل و کرم کی ایک صورت ہوتی ہے ۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى (١) الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى (٢) وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى (٣) (٨٧ : ١ تا ٣) "اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو' جس نے پیدا کیا' اور تناسب قائم کیا' جس نے تقدیر بنائی ' پھر راہ دکھائی" ۔ یعنی ہرچیز کو پیدا کیا اور نہایت مناسب شکل میں پیدا کیا اور اس تخلیق کے ہر پہلو کو کامل بنایا ۔ اس حد تک کامل کہ کوئی اس میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی فلاں چیز اس کے لیے مناسب نہیں ہے ۔ اللہ نے تقدیر یوں بنائی کہ ہرچیز کے لیے اس کا فرض منصبی مقرر کر دیا اور اس کا مقصد تخلیق اور اس مقصد کو پورا کرنے کا طریقہ بھی اسے سمجھا دیا ۔ ہرچیز کو عجیب الہامی انداز میں یہ تعلیم دی گئی ۔ ہرچیز کو یہ شعور بھی بذریعہ الہام دے دیا کہ اس کی مقررہ زندگی کے لیے اس کو کس کس چیز کی ضرورت ہے ۔

یہ ایک عظیم حقیقت ہے اور اس کائنات کی جس چیز کا تجزیہ کیا جائے اس کے اندر یہ حقیقت موجود ہے ۔ اس وسیع و عریض کائنات کی ہرچیز میں ' خواہ بڑی ہو یا چھوٹی ہو ' اہم ہو یا حقیر ہو ' ہرچیز کی تخلیق میں تسویہ اور تناسب موجود ہے ۔ ہرچیز کامل الخلقت ہے اور ہرچیز کی تخلیق کا ایک مقصد ہے اور وہ مقصد اس کی تقدیر ہے ' اور ہرچیز کو اللہ نے اپنا مقصد وجود پورا کرنے کے لیے نہایت ہی آسان طریقہ کار فراہم کر دیا ہے ۔ غرض اللہ کی ہر مخلوق مکمل اور متناسب ہے ۔ اور ہر چیز اپنا انفرادی فریضہ ادا کرتی ہے ۔

مثلاً ایٹم ایک اکیلا ایٹم ' پروٹون اور الیکٹرون کی برقی رفتار کے اندر اسی قدر توازن رکھتا ہے جس طرح ایک کہکشاں اپنے سورج اور اس کے تابع ستاروں کے درمیان توازن رکھتی ہے ۔ ایک ایٹم اپنے مقصد اور فریضے کو اسی طرح پورا کرتا ہے جس طرح ایک کہکشاں پورا کرتی ہے ۔ دونوں کو اپنا مقصد اور طریقہ حصول مقصد معلوم ہوتا ہے ۔

ایک منفرد خلیہ ایک مکمل تخلیق ہے ۔ اور اس کے اندر اپنا مقصد تخلیق پورا کرنے کی پوری استعداد ہوتی ہے اور وہ اپنا مقصد اسی طرح پورا کرتا ہے جس طرح کوئی اعلیٰ مرکب اور پیچیدہ مخلوق کرتی ہے ۔

پھر ایک منفرد ایٹم اور کسی کہکشاں کے درمیانی درجات پر الگ الگ مخلوق ہے ۔ جس طرح ایک منفرد خلیہ اور پیچیدہ ترین مخلوقات کے درمیان زندہ مخلوقات کے مختلف درجے اور ان کی تنظیم ہے ۔ اور ہر درجے اور ہر تنظیم کی تخلیق میں کمال اور تسویہ ہے اور ہر ایک کے لیے انفرادی فرائض اور اجتماعی مقاصد ہیں ۔ دست قدرت الہامی طریقے سے ان سے یہ کام کراتا ہے اور اس گہری حقیقت یعنی تخلیق و تسویہ کا یہ کام پوری کائنات پر شاہد عادل ہے ۔

اس حقیقت کو انسانی قلب پا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کائنات کے اشارات اخذ کرنے کے لیے تیار ہو اور کھلے دل سے وہ اس کائنات کی موجودات پر غور کرے ۔ انسان کا اکتسابی علم جس درجے کا بھی ہو اور وہ ترقی یافتہ معاشرے کا فرد ہو یا پسماندہ معاشرے کا فرد ہو وہ کائنات کی ان اشیاء سے یہ الہامی اشارات اخذ کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے دل و دماغ کے دریچے بھی ان اشارات کو پانے کے لیے تیار ہوں اور کھلے ہوں اور کسی عقل و خرد کے تار اس قابل ہوں کہ وہ مضراب

حقیقت کے جواب میں نغمہ بار ہو سکیں۔

اس کے بعد کائنات کا مشاہدہ اور کسبی علم آتے ہیں اور انسان مطالعہ فطرت میں پہلی نظر سے جو الہام پاتا ہے' تمام مشاہدات اس کی تائید کرتے ہیں' بعض لوگوں نے مشاہدۂ کائنات کے ذریعہ ایسے اشارات جمع کیے ہیں جو اس کائنات کے اندر پوشیدہ مجموعی حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

نیویارک کی سائنسی علوم کی اکیڈمی کے صدر کریسی موریسن اپنی کتاب ''انسان اکیلا نہیں کھڑا'' میں اپنے مشاہدات یوں قلم بند کرتے ہیں۔

''پرندوں میں وطن لوٹنے کا ایک ملکہ ہوتا ہے' ایک خاص چڑیا جو دروازوں پر گھونسلے بناتی ہے' خزاں کے موسم میں جنوب کی طرف ہجرت کر جاتی ہے اور اگلے سال بہار میں اپنے اسی مقام کی طرف لوٹ آتی ہے۔ ستمبر کے مہینے میں امریکہ کے اکثر پرندے جنوب کی طرف جاتے ہیں اور وہ سمندروں اور صحراؤں پر سے پرواز کرتے ہوئے ہزاروں میل سفر کرتے ہیں اور کبھی اپنا راستہ نہیں بھولتے۔ اور پیغام رساں کبوتر پنجرے میں طویل سفر کرتے ہیں اور جب ان کو پیغام دے کر چھوڑا جاتا ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حیران ہو کر چکر لگاتے ہیں اور اس کے بعد وہ سیدھے اپنے وطن کی طرف پرواز کرتے ہیں اور کبھی راہ نہیں بھٹکتے۔ شہد کی مکھی اگر کسی طرف جائے اور اس کے پیچھے نشانات راہ کسی طوفان کی وجہ سے مٹ جائیں تو بھی وہ راہ نہیں بھولتی اور سیدھی چھتے پر آ جاتی ہے۔ البتہ انسان کے اندر یہ جبلت کمزور ہے اور انسان اس کی کو اپنے آلات اور عقل کے ذریعہ پوری کر دیتا ہے۔ باریک کیڑے مکوڑے بھی نہایت ہی چھوٹی اور خوردبینی آنکھیں رکھتے ہیں اور یہ نہایت ہی مکمل آنکھیں ہوتی ہیں۔ باز اور عقاب وغیرہ کی آنکھیں دوربین کی طرح ہوتی ہیں' انسانی آنکھ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کی کو بھی انسانی عقل و تجربہ نے پورا کیا ہے۔ چنانچہ ان دوربینوں کے ذریعہ انسان سحابیوں کو دیکھ لیتا ہے اور اس نے ان کے دیکھنے کے لیے انسانی نظر کو بیس لاکھ گنا تیز کیا۔ نیز انسان نے ایسی خوردبینیں ایجاد کیں جن کے ذریعے وہ بیکٹریا اور دوسرے نہ نظر آنے والے کیڑے مکوڑے دیکھتا ہے۔

اب ذرا تم اپنے بوڑھے گھوڑے کو راستہ پر چھوڑ دو۔ جس قدر اندھیرا بھی ہو وہ راستہ نہ بھولے گا۔ وہ سخت تاریکی میں بھی دیکھ سکتا ہے اگرچہ بہت واضح نہ سہی۔ وہ راستہ میں اور اس کے دونوں جانب درجہ حرارت کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ یہ درجہ حرات اس کی آنکھیں انفراریڈ شعاعوں کے ذریعہ معلوم کر لیتی ہیں۔ الو ایک گرم چوہے کو سرد گھاس کے نیچے چلتا پھرتا دیکھ لیتا ہے اگرچہ سخت اندھیرا ہو اور انسانوں نے تو بجلی کے قمقموں کے ذریعہ تاریک رات کو دن بنا دیا ہے''۔

''شہد کی مکھیوں کی دنیا بھی عجیب ہے۔ کارکن مکھیاں چھتے میں مختلف قسم کے کمرے بناتی ہیں۔ یہ تربیت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ چھوٹے کمرے کارکنوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور بڑے کمرے مردوں کے لیے اور ملکہ کے لیے خاص کمرے تیار ہوتے ہیں۔ یہ ملکہ مکھی جب غیر بار آور انڈہ دیتی ہے تو اسے مردوں کے کمرے میں رکھ دیتی ہے اور جب بار آور انڈہ دیتی ہے تو اسے اس کمرے میں رکھ دیتی ہے جس میں مونث کارکن مکھیاں ہوتی ہیں جو آگے جا کر ملکہ مکھی بننے والی ہوتی ہیں اور وہ کارکن مکھیاں جو مزدور ہوتی ہیں جب وہ ایک طویل عرصہ تک نسل تیار کرنے کا کام کر لیتی ہیں تو ان کو بدل دیا جاتا ہے۔ یہ کارکن مکھیاں بچوں کے لیے غذا تیار کرنے کا کام بھی کرتی ہیں۔ یہ شہد اور پھولوں کو چبا کر ہضم کے قابل بناتی ہیں' اور بچوں کے اندر نر اور مادے کا ظہور ہو جاتا ہے تو پھر یہ مذکورہ بالا طریقے سے غذا ہضم کے لیے

تیار کرنے کا عمل ترک کر دیتی ہیں ۔ اس کے بعد ان کو شہد اور پھولوں کا بور دیا جاتا ہے اور بچوں میں سے جو مونث اس طریقے سے تربیت پاتی ہیں وہ بعد میں کارکن مکھیاں بن جاتی ہیں"۔

جو مونث مکھیاں ملکہ مکھیوں کے حجروں میں ہوتی ہیں 'تو ان کو شہد اور پھولوں کے بورے کو ابتدائی طور پر قابل ہضم بنا کر غذا دینے کا سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے 'اور جن مونث مکھیوں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے بعد میں وہ ملکہ مکھی بن جاتی ہیں ۔ صرف یہ ملکہ ہی ایسے انڈے دیتی ہیں جو بار آور ہوتے ہیں ۔ اس ٹیکنالوجی کے مطابق جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان کے لیے خاص قسم کے حجروں' ایک خاص قسم کے انڈوں اور ایک خاص قسم کی غذا کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اور غذا کے اندر تبدیلی کا اثر بھی عجیب ہوتا ہے ۔ اس قسم کی ٹیکنالوجی کے لیے مکھیوں کو ایک طویل عرصہ تک انتظار کی ضرورت پڑی ہو گی جنہوں نے ان اصولوں کے اندر تمیز کر کے ان کو نافذ کیا ہو گا اور غذا کے اثرات معلوم کیے ہوں گے ۔ اور ان اثرات کو اجتماعی طور پر نافذ کیا ہو گا جو ان کے وجود کے لیے ضروری ہو گا ۔ مکھیوں نے جب اجتماعی زندگی کا آغاز کیا ہو گا تب ان کو یہ اصول معلوم ہوئے ہوں گے 'کیونکہ مکھی کے وجود اور زندگی کی بقا کے لیے ان اصولوں کی دریافت ضروری نہ تھی ۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ شہد کی مکھی نے غذا کے اثرات کے سلسلے میں انسان سے زیادہ تحقیق کی ہے"۔ (۱)

"کتے کو ایک اضافی ناک دی گئی ہے جس کے ذریعہ وہ تمام جانوروں کی بو سونگھ لیتا ہے جو کسی راستے سے گزرے ہوں' انسان کی قوت شامہ کتوں کے مقابلے میں کمزور ہے اور آج تک انسان نے کوئی ایسا آلہ بھی ایجاد نہیں کیا جو اس کی قوت شامہ کو ترقی دے' لیکن ہماری یہ کمزور قوت شامہ بھی اس قدر چھوٹے ذرات کو محسوس کر لیتی ہے جیسے مائیکرو سکوپ کے ذریعہ ہی دیکھا جا سکتا ہے ۔

اکثر حیوانات ایسی آوازیں سن لیتے ہیں جو ہمارے کانوں کے پردوں کے اندر ارتعاش پیدا نہیں کر سکتے 'کیونکہ یہ ہماری سماعت کی حد سے بہت ہی دقیق اور باریک ہوتے ہیں ۔ انسان نے ایسے آلات ایجاد کر لیے ہیں کہ وہ کئی میل دور اڑنے والی مکھی کے پروں کی آواز بھی سن لے 'اس طرح کہ گویا وہ اس کے کان کے پردے کے اوپر بیٹھی ہے ۔ ایسے ہی آلات کے ذریعہ سورج کی شعاعوں کی رفتار کی آواز بھی ریکارڈ کی جا رہی ہے"۔

"پانی کی مکڑیوں کی ایک قسم ایسی ہے جو پانی کے اندر غبارے کی طرح ایک گھونسلا تیار کرتی ہے 'یہ تار عنکبوت سے بنایا جاتا ہے اور اسے پانی کے نیچے کسی چیز سے باندھ دیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد یہ مکڑی اپنے جسم کے بالوں کے ساتھ پانی کا ایک بلبلہ باندھتی ہے اور اسے لے جا کر اس گھونسلے سے باندھ دیتی ہے یہاں تک کہ گھونسلے کے گرد ہوا کے بلبلوں کا حصار بن جاتا ہے' اس کے بعد وہ گھونسلے کے اندر بچے دیتی ہے کہ وہ ہوا کے طوفان سے محفوظ رہیں ۔ اس گھونسلے کی ساخت میں ایک تو باریک بننے کا عمل ہے 'اس کے بعد دقیق انجینئرنگ اور ہوا بازی کا گہرا ادراک ہے"۔

"سالمن مچھلی 'جو چھوٹی سی ہوتی ہے اور سمندر میں کئی سال تک گھومتی پھرتی ہے 'اس کے بعد وہ اس دریا کی طرف

---

(۱) مغربی فکر میں ڈوبا ہوا مصنف یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اللہ نے جب مکھی کو پیدا کیا تو یہ سب کچھ سکھا دیا ۔ ان کے دماغوں پر ڈارون کا فلسفہ ارتقاء ہی بیٹھا ہوا ہے حالانکہ قرآن صاف کہتا ہے وعلم آدم الاسماء کلھا "اللہ نے آدم کو تمام نام سکھا دیئے"۔ اسی طرح اللہ نے مکھی کو بھی تمام بنیادی تعلیم دے دی تھی (مترجم)

واپس ہوتی ہے جہاں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ آخر وہ کیا قوت ہے جو اسے اس کی جائے پیدائش تک رہنمائی کرتی ہے۔ یہ جب اپنی جائے پیدائش کی طرف بڑھتے ہوئے کسی غلط دریا کی طرف چلی جائے تو اسے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دریا اس کی جائے پیدائش نہیں ہے۔ چنانچہ وہ دریا میں چلتی ہے اور پانی کے بہاؤ کے بالمقابل چل کر اپنی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔

پانی کے سانپوں کا معاملہ تو بہت ہی عجیب ہے۔ ان کا قصہ سالمن مچھلی کے برعکس ہے۔ اس مخلوق خدا کی عمر جب پوری ہوتی ہے تو یہ مختلف تالابوں اور دریاؤں سے سفر کر کے گہرے سمندروں کی طرف جاتے ہیں۔ اگر یورپ میں ہوں تو یہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے جنوبی برمودا کی گہرائیوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ وہاں پھر یہ انڈے دے کر مر جاتے ہیں' اب ان کے جو بچے پیدا ہو جاتے ہیں تو وہ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ نہایت گہرے پانیوں میں ہیں' لیکن یہ بچے اسی راستے سے ساحل کی طرف جاتے ہیں جس طرح ان کی ماں ساحل سے پانی کی طرف آئی تھی اور ساحل سے پھر یہ کسی دریا' یا نہر یا حوض اور تالاب کی طرف چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ پانیوں کی ہر قسم بحری سانپوں کے لیے موزوں ہوتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے بڑی بڑی موجیں' طوفان اور سمندری تلاطم دیکھے ہوئے ہیں اور ان کا مقابلہ کیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ساحلوں پر چلتے ہیں اور جب یہ مکمل ہو جاتے ہیں تو کوئی خفیہ قانون ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ پھر واپسی کا سفر کریں اور گہرے سمندروں میں چلے جائیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ جذبہ ان کے اندر کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی شکاری یا مچھیرے نے یورپی سمندروں میں امریکی بحری سانپ پکڑا ہو' یا کسی امریکی مچھیرے کے جال میں یورپی سانپ آگیا ہو' یورپی بحری سانپ کو چونکہ گہرے سمندروں تک لمبا سفر کرنا پڑتا ہے اسی لیے قدرت نے اسے ایک سال کی لمبی عمر عطا کی۔ یا اس سے بھی زیادہ تاکہ وہ مرنے سے قبل اپنی منزل مقصود کو پہنچ سکے۔ کیونکہ یورپی بحری سانپ کو امریکی بحری سانپ سے زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی کہ کون سے ایٹم اور کیا سالمے ہیں؟ جب بحری سانپ مچھلیوں کی شکل میں جمع ہوئے تو ان کے اندر اس قسم کی قوت ارادی پیدا ہو جاتی ہے جو ایسے دور دراز سفر کراتی ہے؟

"جب مادہ پروانہ ہوا کے دباؤ میں تمہارے کسی روشن دان سے اندر آ جاتا ہے تو وہ اپنے نر کو ایک سگنل بھیجتی ہے' چاہے وہ جتنا بھی دور ہو۔ بعض اوقات وہ بہت دور ہوتا ہے۔ وہ اس اشارے کو وصول کر لیتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے۔ اس کو گمراہ کرنے کی انسان جس قدر کوشش بھی کرے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ غلطی کرے۔ کیا ان کے پاس کوئی ریڈیو اسٹیشن ہے یا اس مرد کے پاس کوئی ریڈیو یا مشین ہے جو اس سے سگنل وصول کرتا ہے۔ ایریل کا ہونا تو بڑی بات ہے کیا اس کے پاس کوئی ایتھر ہے جس کے ذریعہ وہ ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ ٹیلی فون اور ریڈیو ہمارے پاس سریع الحرکت مواصلاتی آلات ہیں لیکن یہ تاروں کے ذریعے ایک جگہ کو دوسری جگہ سے منسلک کرتے ہیں۔ اس طرح تو یہ پروانہ ہم پر فوقیت رکھتا ہے"۔

نباتات اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کئی چیزوں سے خدمت لیتے ہیں' بغیر ان کے علم و ارادہ کے۔ مثلاً حشرات پھولوں کا بور ان کے لیے منتقل کرتے ہیں' ہوا یہی کام کرتی ہے' وحوش و طیور بھی یہی کام کرتے اور ان کا بورا اور بیج بکھیرتے ہیں۔ سب سے آخر میں ان نباتات نے انسان کو بھی اپنے جال میں پھانس لیا۔ اس نے فطرت کو حسن بخشا اور فطرت نے اسے اس کا اجر دیا۔ لیکن انسان بھی تو کسی حد پر رکنے والا نہیں۔

هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کا قائل ہے۔اس نے ہل چلایا' بیج بویا' فصل کاٹی' انبار بھرے' پھراس نے فصلوں کو ترقی دی' شاخ تراشی کی اور خوراک کا بندوبست کیا۔اگر وہ یہ کام چھوڑ دے تو بھوک سے مرجائے اور دنیا سے تہذیب وتمدن کا خاتمہ ہو جائے اور انسانیت پتھر کے دور میں واپس چلی جائے"۔

پانی کے بے شمار جانور مثلاً جھینگا مچھلی کا ایک بازو اگر کٹ جائے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے جسم کا ایک حصہ ضائع ہو گیا ہے' اس کے خلیے اور جینز اس عضو کو دوبارہ بنانا شروع کر دیتے ہیں اور جب وہ عضو مکمل ہو جاتا ہے تو خلیے یہ کام بند کر دیتے ہیں اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی ڈیوٹی ختم ہے۔

پانی کے وہ کیڑے جن کے کئی پاؤں ہوتے ہیں' جب دو ٹکڑے ہو جائے تو وہ ان میں سے ایک ٹکڑے کی مدد سے اپنے آپ کو مکمل کر لیتا ہے۔اگر تم اس کیڑے کا سر کاٹ دو تو وہ دوسرا سر بنا لیتا ہے۔

ہم زخموں کو مندمل کر سکتے ہیں لیکن ہمارے سرجن ابھی تک یہ بات نہیں جانتے کہ وہ خلیوں کو متحرک کریں اور وہ ایک نیا بازو بنا ڈالیں یا گوشت پوست' ناخن اور اعصاب بنا دیں' اگر ایسا ممکن ہو۔

اور ایک عجوبہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی خلیہ ابتدائی ایام ہی میں دو مکمل حصوں میں تقسیم ہو جائے تو اس سے دو مکمل حیوان تیار ہو جاتے ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ توام ہم شکل ہوتے ہیں' اس کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ حمل کے ابتدائی مرحلہ میں خلیہ منقسم ہو گیا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلے میں خلیہ مکمل فرد ہوتا ہے۔اور اسی طرح ایک فرد بھی ہر خلیہ میں ہوتا ہے۔

ایک دوسری فصل میں یہی مصنف لکھتا ہے :

شاہ بلوط کا بھورا بیج زمین پر گرتا ہے' اس کا بھورا چھلکا اسے محفوظ رکھتا ہے' اور یہ گرتا پڑتا زمین میں کسی دراز میں اٹک جاتا ہے۔موسم بہار میں اس کے اندر کا جرثومہ جاگتا ہے۔وہ اس چھلکے کو پھاڑ دیتا ہے اور یہ اس مغز سے خوراک حاصل کرتا ہے جو اس چھلکے کے اندر جمع کر دی گئی ہوتی ہے۔جس کے اندر اس کے موروثی جینز ہوتے ہیں۔اس کی جڑیں زمین میں جاتی ہیں۔آپ دیکھتے ہیں کہ یہ پودا نمودار ہوتا ہے' چھوٹا درخت اور پھر کامل درخت بن جاتا ہے۔اس کے اندر کئی ملین جینز ہوتے ہیں۔یہاں تک کہ یہ اپنی جڑوں' چھلکے' پھل اور پتوں اور شاخوں میں بھی اس درخت کے مماثل ہوتا ہے جس سے وہ بیج نکلا۔کروڑوں سال پہلے جو بلوط کا درخت پیدا ہوا تھا' اس کے پھل آج تک اپنے ذرات کی ترتیب اس طرح رکھتے ہیں جس طرح پہلے بلوط کے پھل نے رکھا تھا۔

یہی مصنف تیسری فصل میں لکھتا ہے :" ہر خلیہ جو کسی زندہ مخلوق میں پیدا ہوتا ہے' اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح ڈھالے کہ گوشت کا حصہ ہو یا چمڑے کا حصہ ہو اور فنا ہو جائے' یا دانت کی چمک بن جائے یا آنکھ کا سیال مادہ بن جائے یا ناک اور کان بن جائے۔ہر خلیہ اپنے آپ کو ایسی شکل میں ڈھالتا ہے کہ وہ اپنا فرض منصبی پوری طرح ادا کرے۔یہ بات نہایت ہی مشکل ہے کہ کوئی تعین کرے کہ کون سا خلیہ دائیں ہاتھ ہے یا بائیں ہاتھ کا۔لیکن ازروئے فطرت یہ بات متعین ہے کہ یہ خلیہ دائیں کان کا ہے اور یہ بائیں کان کا ہے۔غرض ہزارہا خلیات چلائے جاتے ہیں کہ وہ ایک صحیح کام کریں' صحیح وقت پر کریں اور صحیح جگہ پر کریں"۔

چوتھی فصل میں یہ شخص کہتا ہے :" مختلف قسم کی مخلوقات میں بعض مخلوقات ایسے کام کرتی ہیں جو دانش مندی کے

اعلیٰ مرتبہ کے ہیں۔ جن کی کوئی تشریح ہم نہیں کر سکتے۔ مثلاً بھڑ' ٹڈے کو شکار کرتی ہے' زمین میں ایک گڑھا کھودتی ہے اور ایک مناسب جگہ اسے دفن کر دیتی ہے۔ یہ شکار کرتے وقت اس کے ایسے مخصوص مقام پر ڈنگ مارتی ہے کہ وہ بیہوش ہو جاتا ہے لیکن اس کا گوشت صحیح و سالم زندہ رہتا ہے۔ اب مادہ بھڑ اس کے قریب ایک متعین مقام پر انڈے دیتی ہے۔ اسے شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ جب اس کے بچے پیدا ہوں گے تو اس ٹڈے کا گوشت کھائیں گے۔ لیکن اسے قتل نہ کریں گے کیونکہ یہ گوشت ان کی غذا ہے اور گوشت خراب ہو کر زہریلا نہ بن جائے۔ لازماً بھڑ نے ابتداء سے یہ کام شروع کیا ہو گا اور ہمیشہ وہ اسے دہراتی ہو گی ورنہ دنیا میں سے بھڑوں کا وجود ہی ختم ہو جاتا۔ سائنس کے پاس ایسی کوئی تشریح نہیں ہے کہ وہ بھڑوں کے اس مسلسل فعل کا سبب بیان کرے اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ یہ کام بھڑیں محض اتفاق سے کرتی ہیں' کیونکہ مادہ بھڑ تو زمین کے اندر کھودے ہوئے گڑھے کو بھر کر چلی جاتی ہے اور مرجاتی ہے' نہ وہ اس کے اسلاف یہ جانتے تھے کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ نہ اسے اس کا علم اور مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس کے بچوں کو کیا پیش آتا ہے بلکہ بھڑ کو تو یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ اس کے بعد کوئی چیز آنے والی ایسی ہے جسے وہ اپنا بچہ کہتی ہو' بلکہ اسے یہ تک علم نہیں ہے کہ وہ یہ کام اپنے نوع کی حفاظت کے لیے کرتی ہے۔

چیونٹیوں میں سے بعض کی یہ ڈیوٹی ہوتی ہے کہ وہ سردیوں کے موسم میں اپنی کالونی کو خوراک مہیا کرنے کے لیے حیوانات جمع کریں۔ پھر وہ ایک سٹور قائم کرتی ہیں جہاں یہ خوراک پیس کر رکھی جاتی ہے۔ پھر بعض چیونٹیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو قدرت نے پیسنے کے جبڑے دیئے ہوتے ہیں۔ ان کا کام صرف خوراک کو پیسنا ہوتا ہے۔ جب سردیوں کا موسم آتا ہے اور تمام غلہ پیسا جا چکا ہوتا ہے تو اس کی سپلائی یوں ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد کو فائدہ پہنچایا جا سکے تاکہ سپلائی جاری رہ سکے۔ اب چونکہ اگلی نسل میں مزید پیسنے والی چیونٹیاں پیدا ہوں گی۔ اس لیے چیونٹیوں کی فوج ان پیسنے والیوں پر حملہ آور ہوتی ہے اور ان کو قتل کر دیتی ہے۔ شاید ان کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے حصے کی خوراک پیسنے کے دوران کھالی ہے کیونکہ انہوں نے اس موقعہ سے ضرور فائدہ اٹھایا ہو گا۔

بعض چیونٹیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی جبلت یا ان کی عقل ان کو کھانوں کے باغ بنانے پر آمادہ کرتی ہیں اور یہ چیونٹیاں ابتدائی کیڑوں کو اور پودوں کے چھلکوں پر پائے جانے والے کیڑوں کو گرفتار کر لیتی ہیں۔ یہ گویا ان کے لیے گائے اور بکریوں کا کام دیتے ہیں۔ ان کیڑوں سے یہ چیونٹیاں ایسا محلول لیتی ہیں جو شہد کی طرح ہوتا ہے اور یہ چیونٹیوں کی خوراک کا کام دیتا ہے۔

چیونٹیاں بعض دوسری چیونٹیوں کو غلام بھی بنا لیتی ہیں' اور جب یہ اپنے گھونسلے بناتی ہیں تو یہ پتوں کو مناسب حجم میں کاٹتی ہیں۔ جب کارکن چیونٹیاں ان پتوں کو ایک طرف سے پکڑ کر اپنے مقام پر رکھتی ہیں تو اس وقت یہ ان بچوں سے بھی کام لیتی ہیں جو ابھی ارتقائی دور میں ہوتے ہیں لیکن ان کے ریشمی مواد سے یہ پتوں کو جوڑتی ہیں' یوں یہ بچے اپنے لیے گھونسلا بنانے سے محروم رہتا ہے لیکن اپنے بنی نوع کے لیے ایک مفید کام کر چکا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جن ذروں سے چیونٹی بنتی ہے ان ذروں میں یہ کام کرنے کی صلاحیت کس طرح پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ان کا ایک خالق ہے جس نے ان کو اس طرح کرنے کی ہدایت کی"۔ (اقتباسات ختم ہوئے)

اس میں شک نہیں ہے کہ ایک خالق ہے جس نے اپنی تمام مخلوقات کو ہدایات دیں' خواہ وہ بڑی مخلوق ہو یا چھوٹی

ہو' اور یہ وہی خالق ہے جو الْاَعْلٰى (۱) الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى (۲) وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى (۳) (۸۷: ۱ تا ۳) "جو برتر ہے 'جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا 'جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی"۔

ہم نے اوپر جو اقتباسات دیئے ہیں 'یہ تو اصل حقیقت کے ایک معمولی حصے کے مشاہدات ہیں 'جو انسانوں نے نباتات ' حشرات الارض 'پرندوں اور دوسرے حیوانات کے سلسلے میں ریکارڈ کیے ہیں۔ لیکن اس سے آگے علم و مشاہدہ کے اور بھی جہاں ہیں اور جو کچھ ہمارے علم میں ہے وہ اس قول باری کے مدلول اور مفہوم کا ایک نہایت ہی مختصر حصہ ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى (۲) وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى (۳) (۸۷: ۲ تا ۳) "جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا 'جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی"۔ یہ قابل مشاہدہ کائنات جس کے ایک معمولی حصے کو ہم جانتے ہیں ' اس سے آگے عالم غیب کے جہاں پوشیدہ ہیں۔ ہمیں تو اپنی بشری قوتوں کے مطابق بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ یہ چند اشارات ہیں جو اللہ نے ہماری محدود قوت ادراک کے لیے کر دیئے ہیں۔

اس عظیم کائنات کا ایک وسیع صفحہ پیش کرنے اور اس کی وادیوں میں اللہ کی تسبیح و ثنا کی گونج پیدا کرنے کے بعد 'اللہ کی اس عظیم تسبیح کو مکمل کرنے کے لیے یہاں نباتات کی دنیا کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے اور یہاں اس اشارے کے اندر جہان معانی ہے۔

وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى (٤) فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى (۸۷: ۵) "جس نے نباتات اگائیں اور پھر ان کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا"۔ المرعیٰ ' ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو زمین سے اگتی ہے 'اس لیے کہ ہر اگنے والی چیز کسی نہ کسی مخلوق کے لیے خوراک ہے۔ لہذا مرعیٰ کا مفہوم یہاں اس سے کہیں وسیع ہے کہ کوئی چیز ہمارے مویشیوں کے چرنے کی ہے تو مرعیٰ ہے۔ کیونکہ اللہ نے زمین کو پیدا کیا اور اس زمین کے اوپر چلنے والی ہر مخلوق کے لیے اس کے اندر اس کی خوراک پیدا کی ' چاہے یہ مخلوق زمین کے اوپر چلتی ہو 'یا اندر چھپی رہتی ہو یا اس کی فضاؤں میں اڑتی ہو۔

نباتات ابتداء میں سبز ہوتے ہیں 'پھر پژمردہ ہو کر سیاہ ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ سبزی کی حالت ہی میں خوراک کے قابل ہوتے ہیں اور بعض اوقات وہ پک کر سیاہ ہوتے ہیں تو خوراک کا کام دیتے ہیں۔ درمیانی حالت میں بھی وہ کسی نہ کسی خوراک کا کام دیتے ہیں۔ بہرحال نباتات کی ہر حالت 'اللہ کی تخلیق اور تسویہ کے مطابق کسی مخلوق کے لیے خوراک بنتی ہے۔

یہاں نباتاتی زندگی کے منظر کو پیش کر کے ایک اشارہ یہ کیا گیا ہے کہ جس طرح ہر نبات کوڑا کرکٹ بن کر انجام تک پہنچتا ہے۔ اس طرح ہر زندہ مخلوق بھی اس دنیا میں اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ اور یہ اشارہ ہے اس حیات دنیا اور حیات اخروی کی طرف کہ حیات دنیا تو نباتات کی طرح ختم ہونے والی ہے اور حیات اخروی باقی اور لازوال ہے۔ بعد میں آتا ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (١٦) وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰى (۸۷: ۱۷) "مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے"۔ دنیا کی زندگی اس کھیت کی طرح ہے جو ختم ہو کر کوڑا کرکٹ بن جاتی ہے اور آخرت باقی و لازوال ہوتی ہے۔

اس مقطع کے ذریعے اس عظیم کائنات کے صفحات کو دور تک پھیلا دیا جاتا ہے اور جن امور کا ذکر ہوتا ہے وہ سورت کے آنے والے حقائق کے ساتھ مناسب ہیں۔ یہ کائنات ان سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور یہ حقائق کائنات سے پیوست ہوتے ہیں۔ ایک نہایت ہی وسیع و عریض فریم ورک ہیں۔ اگر گہرا مطالعہ کیا جائے کہ اس سیپارے کے مضامین کو وسیع کائناتی دائرے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کائناتی دائرہ اس پارے کی فضا اور اس کے اشارات اور مضامین کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔

اب وہ خوشخبری آتی ہے جو آپ ؐ کے لیے ہے اور آپ ؐ کے بعد آپ ؐ کی امت کے لیے ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۝۶ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝۷ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝۸ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝۹

”ہم تمہیں پڑھوا دیں گے ' پھر تم نہیں بھولو گے ' سوائے اس کے جو اللہ چاہے ' وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ پوشیدہ ہے اس کو بھی۔ اور ہم تمہیں آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں ' لہٰذا تم نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو“۔

اس عظیم خوشخبری کا آغاز ہوتا ہے کہ قرآن کے حفظ کرنے اور اسے باقی رکھنے کی ذمہ داری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں سے اتار دی جاتی ہے۔

سَنُقْرِءُكَ فَلَا تَنْسٰى (۸۷ : ۶) ”ہم تمہیں پڑھوا دیں گے ' پھر تم نہیں بھولو گے“۔ لہٰذا آپ اپنے رب سے یہ کلام لیں اور بس۔ اس کو یاد کرا دینا اللہ کا کام ہے۔ یہ بات فی الواقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بڑی خوشخبری تھی۔ آپ حفظ قرآن کے لیے فکر مند ہوتے تھے۔ اب تو اس کی حفاظت کی جانب سے مطمئن کر دیا گیا کیونکہ قرآن کریم ایک نہایت ہی عظیم کلام اور آپ ؐ اسے بہت ہی محبوب رکھتے تھے۔ آپ ؐ دل و جان سے قرآن پر فدا تھے۔ اور اس کی حفاظت کا بہت ہی خیال رکھتے تھے۔ اس پر حریص تھے اور اپنی عظیم اور بھاری ذمہ داری سمجھتے تھے۔ آپ ؐ ایک ایک آیت دہراتے تھے۔ جب جبرائیل علیہ السلام اسے لاتے تو آپ ؐ سننے کے ساتھ ساتھ تکرار کرتے اور زبان کو دہرانے میں لگا دیتے یہاں تک کہ یہ بشارت آگئی اور آپ ؐ کو مطمئن کر دیا گیا۔

پھر یہ آپ ؐ کے بعد آپ ؐ کی امت کے لیے بھی ایک خوشخبری ہے۔ امت بھی مطمئن ہو جاتی ہے کہ اس عقیدے کا اصل سرچشمہ ذات باری ہے اور اس کی حفاظت کا کفیل اور ذمہ دار بھی اللہ ہے۔ نبی کے دل میں بٹھانے کا ذمہ دار بھی اور بعد کے زمانے میں حفاظت کی ذمہ داری بھی۔ یہ اللہ کی بڑی مہربانی ہے اور اس دین کی عظمت ہے اور اللہ کے ہاں اس کی اہمیت کا ثبوت ہے۔

اس موقعہ پر اور ایسے تمام مواقع پر ایک اٹل بات ضرور سامنے آتی ہے۔ یہ ایک اٹل اور دائمی قانون ہے وہ یہ کہ اللہ کی مشیت بے قید ہے اور اللہ کی مشیت پر کوئی پابندی نہیں۔ آپ نہیں بھولیں گے الا یہ کہ اللہ کچھ بھلانا چاہے۔ اگرچہ یہ پابندی خود اللہ کی طرف سے ہو ' لہٰذا اللہ کی مشیت بے قید اور اس پر کوئی قانونی قید ہے نہ کوئی وعدہ اسے پابند

کرتا ہے ۔ قرآن اس اصول کو پوری طرح محفوظ رکھتا ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم ظلال القرآن میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں ۔ یہاں بھی اس اصول کو قائم رکھا گیا۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (۸۷:۷) "سوائے اس کے جو اللہ چاہے"۔ اگرچہ یہ وعدہ سچا ہے کہ حضورؐ نہ بھولیں گے مگر اللہ کی مشیت بھی بے قید ہے 'اگر اللہ چاہے تو ایسا ہو سکتا ہے تاکہ تمام معاملات اللہ کی مشیت کے دائرے میں رہیں اور لوگ اللہ کی مشیت ہی پر نگاہ رکھیں ۔ اگرچہ کسی معاملے میں سچا وعدہ کیا گیا ہو ۔ انسانی دل و دماغ کو اللہ کی مشیت کے ساتھ ہی لٹکے رہنا چاہئے۔

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى (۸۷:۷) "وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ پوشیدہ ہے اس کو بھی جانتا ہے"۔ یہ ہے اشارہ کہ اللہ پڑھائے گا' حفظ کرائے گا اور نسیان نہ ہو گا الا یہ کہ وہ کچھ اور چاہے کیونکہ یہ تمام امور اللہ کی مخفی حکمت پر مبنی ہیں جو ظاہر اور خفیہ سب کو جانتا ہے اور معاملات کو ان کے تمام پہلوؤں سے جانتا ہے اس لیے وہ تمام معاملات میں ایسے فیصلے کرتا ہے جس میں حکمت ہوتی ہے اور یہ حکمت اللہ کے بھرپور علم پر مبنی ہوتی ہے ۔ اللہ کا علم کامل علم ہوتا ہے ۔

اب دوسری خوشخبری وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (۸۷:۸) "اور ہم تمہیں آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں"۔ یہ خوشخبری بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے لیے ہے ۔ اور آپؐ کے بعد آپؐ کی امت کے لیے بھی ہے ۔ اور اس سے اس دین کا مزاج بھی معلوم ہوتا ہے ۔ دعوت اسلامی کی حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ انسانی زندگی میں کیا کردار ادا کرتی ہے اور اس کائنات میں اسلامی نظام زندگی کا مقام و مرتبہ کیا ہے ۔ بظاہر تو یہ دو لفظ ہیں۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (۸۷:۸) لیکن ان کے اندر جو حقیقت بیان کی گئی وہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام اور شریعت کی ایک عظیم حقیقت ہے ' نیز وہ اس پوری کائنات کا بھی خلاصہ اور روح ہے ۔ یہ حقیقت رسول اللہ کے مزاج کو' اس کائنات کے مزاج اور اس دین کے مزاج سے ملا دیتی ہے ۔ یہ پوری کائنات دست قدرت نے بڑی آسانی سے بنا دی ہے ۔ یہ کائنات نہایت آسانی سے چل رہی ہے 'جس رخ پر اسے ڈال دیا گیا ہے وہ نہایت آرام اور سکون اور سہولت سے اسی رخ اور سمت پر چل رہی ہے ۔ غرض یہ نور سے نکلی ہے اور ایسے حقائق کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو حدود و قیود سے ماوراء ہے ۔

جس ذات کو اللہ آسانیاں میسر کر دے وہ اپنی زندگی کی راہوں پر بہولت چلتا ہے ۔ وہ اس کائنات کے ساتھ چلتا ہے جس کا وجود اور جس کی ترتیب باہم متناسب 'جس کی حرکت متوازن اور جس کا رخ ایک طرف ہے یعنی اللہ کی طرف ۔ ایسا شخص صرف ان قوتوں سے ٹکراتا ہے 'جو اس عظیم کائنات کے خطوط سے منحرف ہوں ۔ ایسے لوگوں کا موازنہ اگر اس پوری کائنات سے کیا جائے تو ان کا کوئی وزن نہیں رہتا۔ ایسا شخص جب چلتا ہے تو اس کی حرکت آسان 'لطیف اور نرم ہوتی ہے ۔ اس کائنات کے ہم آہنگ دنیا کے واقعات سے ہم آہنگ ' دنیا کی چیزوں اور اشخاص کے ساتھ ہم آہنگ ۔ اس کے ہاتھوں میں آسانی ہوتی ہے 'اس کی زبان میں یسر ہوتا ہے 'اس کے اقدامات آسان ہوتے ہیں 'اس کا عمل یسر ہوتا

ہے ۔ اس کے خیالات آسان ہوتے ہیں ' اس کی فکر آسان ہوتی ہے جو معاملات کو آسانی سے لیتا ہے ' معاملات کو نہایت آسانی سے لیتا ہے ' اپنے نفس کے لیے بھی آسان ہوتا ہے دوسروں کے لیے بھی آسان ہوتا ہے ۔

یہ تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ' اپنے تمام امور میں یسر ہی یسر ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب دو کاموں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے تو آسان کو لیتے ۔ یہ ہے روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ۔ (بخاری و مسلم)

اور آپؓ ہی سے روایت ہے "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے گھر میں تنہا ہوتے تو آپؐ تمام لوگوں سے نرم مزاج ہوتے ' مسکراتے ہوئے اور ہنستے ہوئے" ۔ اور صحیح بخاری کی ایک روایت ہے :"ایک لونڈی بھی رسول اللہؐ کا ہاتھ پکڑ لیتی اور جہاں چاہتی آپؐ کو لے جاتی" ۔

لباس ' طعام ' بچھونے وغیرہ میں آپؐ کی جو سیرت تھی اس پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ سادگی ' آسانی اور بے تکلفی کو پسند فرماتے تھے ۔ ابو عبداللہ شمس الدین محمد ابن قیم الجوزیہ اپنی کتاب زادالمعاد میں لباس کے سلسلے میں آپؐ کی سیرت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آپؐ کی ایک پگڑی تھی جسے "السحاب" کہا جاتا تھا ۔ یہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو دے دی تھی ' آپؐ پگڑی باندھتے اور اس کے نیچے ٹوپی پہنتے ' کبھی آپؐ ٹوپی بغیر عمامہ کے پہنتے ' کبھی عمامہ بغیر ٹوپی کے بھی باندھتے ۔ آپؐ جب عمامہ باندھتے تو اس کے شملے کو دونوں کاندھوں کے درمیان لٹکا دیتے ' جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں ہے ۔ حضرت عمر ابن حریث سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر دیکھا اور آپؐ نے سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا اور آپؐ نے اس کا ایک طرف دونوں کاندھوں کے درمیان لٹکایا ہوا تھا ۔ اور مسلم میں حضرت جابر سے یہ بھی ہے ' بالوں کی لٹ کی طرح ۔

--- ○○○---

اس سے معلوم ہوا کہ شملہ کو ہمیشہ کاندھوں کے درمیان سے نہ لٹکاتے تھے ۔ کہا جاتا ہے آپؐ مکہ میں داخل ہوئے ' آپؐ نے جنگی لباس پہنا ہوا تھا اور آپؐ کے سر پر خود تھا ۔ لہٰذا ہر موقعہ کی مناسبت سے لباس پہنتے تھے ۔

ایک دوسری فصل میں وہ فرماتے ہیں کہ بہترین طریقہ رسول اللہؐ کا طریقہ ہے جو طریقہ آپؐ نے رائج فرمایا اور جس کا حکم دیا اور جس کی ترغیب دی اور اس پر مداومت کی ۔ لباس میں آپؐ کا طریقہ یہ تھا کہ جو لباس میسر ہوتا آپؐ وہ پہنتے کبھی اونی ' کبھی روئی ' کبھی کتان کا ۔ آپؐ نے یمنی چادر بھی پہنی ' سبز چادر بھی پہنی ' حلہ ' قبا اور قمیص بھی زیب تن فرمائی ۔ پاجامہ ' ازار اور چادر بھی پہنی ۔ چمڑے کے موزے اور جوتے ۔ یہ سب چیزیں آپؐ نے استعمال فرمائیں اور عمامہ کا شملہ کبھی آپؐ نے پیچھے سے لٹکایا اور کبھی نہ لٹکایا" ۔

اور کھانے کے بارے میں آپؐ کی سیرت یہ تھی کہ آپ کسی موجود کھانے کو رد نہ فرماتے اور نہ غیر موجود کے بارے میں تکلف فرماتے ' پاکیزہ چیزوں میں سے جو بھی آپؐ کو پیش کی گئی آپؐ نے اسے تناول فرمایا ۔ الا یہ کہ کسی چیز کو آپؐ کی طبیعت نہ چاہتی ہو تو آپؐ نے بغیر حرام قرار دینے کے اسے چھوڑ دیا ۔ آپؐ نے کسی کھانے میں کبھی عیب نہیں نکالا ۔ اگر چاہت ہوتی تو تناول فرماتے ورنہ چھوڑ دیتے ' جس طرح آپؐ نے گوہ کو تناول نہ فرمایا کیونکہ آپؐ اس کے کھانے کے عادی نہ تھے لیکن امت پر اسے حرام بھی قرار نہیں دیا ' بلکہ اسے آپؐ کے دسترخوان پر آپ کے دیکھتے ہوئے کھایا گیا ۔ آپؐ نے حلوی اور شہد تناول فرمایا ۔ ان کو آپؐ بہت پسند فرماتے تھے ۔ آپؐ نے تازہ اور خشک کھجوروں کو

تناول فرمایا۔ آپ ؐ نے خالص دودھ بھی پیا اور ملا ہوا بھی۔ آپ ؐ نے شہد اور ستو پانی کے ساتھ تناول فرمائے۔ آپ ؐ نے کھجوروں کا صاف پانی پیا' آپ ؐ نے حریرہ استعمال کیا۔ یہ ایک قسم کی کھیر ہے جو دودھ اور آٹے سے بنتی ہے۔ آپ ؐ نے تروتازہ کھجور کے ساتھ ککڑی کھائی' پنیر تناول فرمایا' کھجور کے ساتھ روٹی کھائی' سرکے کے ساتھ روٹی کھائی۔ آپ ؐ نے پکا ہوا کدو کھایا اور اس کو آپ بہت پسند فرماتے تھے۔ آپ ؐ نے ابالا ہوا کدو بھی کھایا' گھی کے ساتھ ثرید کھایا' پنیر کھایا۔ تیل کے ساتھ روٹی کھائی' خربوزوں کو تازہ کھجوروں کے ساتھ اور کھجوروں کو مکھن کے ساتھ کھایا اور یہ آپ ؐ کو بہت پسند تھا۔ کسی پاکیزہ چیز کو آپ ؐ رد نہ کرتے اور نہ بتکلف خواہش کرتے بلکہ آپ ؐ کا طریقہ یہ تھا جو میسر ہو وہ تناول فرماتے' اگر کوئی چیز نہ ملتی تو صبر کرتے"۔

سونے اور بیدار ہونے کے بارے میں آپ کی سنت یہ تھی۔ کبھی اپنے بستر پر سوتے' کبھی کھال پر' کبھی چٹائی پر' کبھی زمین پر' کبھی تخت پر' کبھی سیاہ کمبل پر سوتے"۔

آپ ؐ کے فرامین سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام امور میں نرمی سے کام لیا جائے' جن میں اسلامی نظریہ حیات اور اس کے تقاضے بھی آتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ ؐ کی ہدایات بہت زیادہ ہیں' سب کو یہاں لانا مشکل ہے' چند پیش خدمت ہیں: "یہ دین آسان ہے' جو شخص اس دین کے ساتھ کشتی کرے گا وہ شکست کھا جائے گا" (بخاری)۔ "اپنے نفسوں پر سختی مت کرو' تم پر سختی کی جائے گی' ایک قوم نے اپنے آپ ؐ کو سختیوں میں ڈالا تو اس پر سختی کی گئی" (ابوداؤد)۔ "جو شخص اپنی سواری پر سختی کرتا ہے' وہ نہ تو سفر طے کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی سواری زندہ رہتی ہے" (بخاری)۔ "آسانیاں کرو سختی نہ کرو" (بخاری و مسلم)۔

اور معاملات کے بارے میں آپ ؐ کی ہدایات یہ ہیں: "اللہ رحم کرے' اس شخص پر جو فروخت کرے تو نرمی اور فراخ دلی سے' خریدے تو نرمی اور فراخ دلی سے اور تقاضا کرے تو بھی نرمی اور فراخ دلی سے" (بخاری)۔ "مومن آسان اور نرم ہوتا ہے" (بیہقی)۔ "مومن لوگوں سے مانوس ہوتا ہے اور لوگ اس سے مانوس ہوتے ہیں" (دارقطنی)۔ "اللہ کے ہاں مبغوض ترین شخص وہ ہے جو جھگڑالو اور لڑنے والا ہو" (بخاری و مسلم)۔

آپ ؐ کی سیرت میں اس بات کی روشن مثالیں ملتی ہیں کہ آپ ؐ سختی اور مشکل کو پسند نہ فرماتے تھے' یہاں تک کہ نام اور چہرے کے خدوخال میں بھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؐ کا مزاج کیسا تھا' اور آپ ؐ کے ساتھ اللہ کا سلوک کیسا تھا' اور کس طرح اللہ نے آپ کو آپ کی ساخت اور مزاج کے اعتبار سے سہل پسند بنایا تھا اور اس کی طرف آپ کی رہنمائی فرمائی تھی۔ سعید ابن مسیب اپنے والد سے روایت فرماتے ہیں کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے' تو حضور ؐ نے دریافت فرمایا تمہارا نام کیا ہے۔ والد نے کہا میرا نام حزن ہے (یعنی سخت دشوار) تو آپ نے فرمایا نہیں آپ "سہل" ہیں۔ تو انہوں نے کہا میں اس نام کو نہیں بدلوں گا جو میرے باپ نے رکھا ہے۔ ابن مسیب کہتے ہیں اس کے بعد ہمارے خاندان میں برابر سختی رہی" (بخاری)۔ "حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ ؐ نے عاصیہ کا نام بدل کر جمیلہ رکھ دیا" (مسلم)۔ اور آپ کی مشہور حدیث ہے "یہ بات نیکی کا حصہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے ہنس مکھ ہو کر ملو" (ترمذی)۔

غرض آپ ؐ اس قدر حساس تھے کہ آپ ؐ کو ناموں' چہرے کے خدوخال میں بھی درشتی پسند نہ تھی اور آپ ؐ نرمی اور آسانی کی طرف مائل ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ کی پوری سیرت نرمی' یسر' سہولت' اور سہل برتاؤ پر مشتمل ہے۔ آپ ؐ

نے ہمیشہ معاملات اور لین دین میں نرمی سے کام لیا۔ایک مثال سے واضح ہوتا ہے کہ آپ اپنے برتاؤ کی وجہ سے لوگوں کی اصلاح کس طرح کرتے تھے۔

''ایک دن آپؐ کے پاس ایک دیہاتی آیا' وہ کوئی چیز مانگ رہا تھا۔آپؐ نے اسے دے دی تو آپؐ نے اس سے پوچھا: کیا میں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کیا؟ تو اس نے کہا: نہیں' تم نے اچھا سلوک نہیں کیا۔ مسلمانوں کو سخت غصہ آیا' اور وہ اس کی طرف لپکے۔آپؐ نے اشارہ فرمایا کہ کچھ نہ کہو۔آپؐ پھر گھر میں داخل ہوئے اور کچھ مزید دیا اور پھر پوچھا: کیا میں نے اچھا سلوک کیا؟ تو اس نے کہا: ''ہاں''۔ اللہ آپ کو جزا دے۔آپ اچھے خاندان کے ہیں۔اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم پہلے جو بات کی وہ تمہیں معلوم ہے جس کی وجہ سے میرے ساتھی خفا ہوئے اور ان کے دل صاف نہیں۔تو اگر تم پسند کرو تو یہ باتیں جو تم نے میرے سامنے کی ہیں ان کے سامنے بھی کرو' تاکہ ان کے دلوں میں تم پر جو غصہ ہے' وہ دور ہو جائے۔تو اس نے کہا ''اچھا''۔دوسرے دن وہ پھر آیا۔اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس دیہاتی نے کل جو کچھ کہا وہ تمہیں معلوم ہے' ہم نے اسے مزید کچھ دیا۔اب اس کا خیال ہے کہ وہ راضی ہو گیا ہے۔بتاؤ بھائی کیا یہ درست ہے؟ تو دیہاتی نے کہا: ''ہاں اللہ آپؐ کو جزائے خیر دے۔آپؐ اچھے خاندان سے ہیں''۔اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری مثال اور اس دیہاتی کی مثال اس طرح ہے کہ اس شخص کی اونٹنی بگڑ گئی۔لوگوں نے اس کا پیچھا کیا تو وہ اور بھاگنے لگی۔تو مالک نے لوگوں کو چلا کر کہا: ''میری ناقہ کو اور مجھے چھوڑ دو میں اس کے ساتھ زیادہ نرم سلوک کرتا ہوں اور اس کے مزاج کو اچھی طرح جانتا ہوں''۔چنانچہ اس کا مالک اس کے سامنے سے آیا۔اور زمین سے کچھ گھاس پھونس جمع کر کے اس کے لیے لے آیا۔اور اسے آہستہ آہستہ واپس لایا۔یہاں تک کہ وہ اپنے مقام پر آکر بیٹھ گئی۔اس نے اس پر کجاوا کسا اور سوار ہو گیا۔جب اس شخص نے جو کچھ کہا تھا اور تم اس پر لپکے تھے تو میں اگر تمہیں چھوڑ دیتا اور تم اسے قتل کر دیتے تو وہ جہنم میں چلا جاتا''۔

یہ تھا حضورؐ کا طرز عمل ان لوگوں کے ساتھ جو نہایت ہی سخت اور بدکنے والے تھے' اس قدر سادگی اور آسانی کے ساتھ اور اللہ کی ایسی توفیق کے ساتھ' آپؐ ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے۔اس قسم کے بے شمار نمونے آپ کی سیرت میں موجود ہیں۔یہی وہ بات ہے جو اس آیت میں بطور خوشخبری آپ کو کہی گئی ہے اور آپ کو اپنی پوری زندگی میں' آپ کو دعوت میں اور آپ کے معاملات میں اس کی آپؐ کو توفیق دی گئی۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (۸۷ : ۸) ''ہم آسان دین پر چلنے کو آپؐ کے لیے آسان کر دیں گے''۔

آپؐ کی ذات گرامی جو محبوب خلائق اور بلند اخلاق کی مالک تھی اور جسے ایک آسان دین کی طرف آسانی سے رہنمائی کی گئی تھی تو آپ نے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا۔اور اسی انداز سے انسانیت کو دعوت دی' آپؐ کا مزاج ہی اس طرح بن گیا' اور آپؐ کی ماہیت ہی دین سہل میں بدل گئی اور آپؐ اسی امانت کبریٰ کے اٹھانے کے قابل ہوگئے' یہ امانت تو بہت بڑی اور بھاری تھی مگر اللہ نے اس ذمہ داری کی توفیق آپؐ کو دی اور آپؐ اس بھاری ذمہ داری اٹھانے کے قابل ہوگئے۔آپؐ نے پسندیدہ طریقے سے کام کیا اور اچھے انداز سے محنت کی۔اور خوشی اور شرح صدر سے کام کیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں اور آپؐ کے کام کی نوعیت کی تشریح کے بارے میں قرآن کریم میں کئی

آیات بھی نازل ہوئی ہیں ۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء : ۱۰۷) "اور ہم نے تمہیں کل جہاں کے لیے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے"۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷: ۱۵۷) "وہ لوگ جو اس نبی امی کی پیروی کرتے ہیں ' جسے وہ اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں ' انھیں وہ معروف کا حکم دیتے ہیں ' برائی سے روکتے ہیں ' پاکیزہ چیزیں ان کے لیے حلال کرتے ہیں ' ناپاک چیزیں ان پر حرام ٹھہراتے ہیں ' اور ان کے وہ بوجھ اور طوق جو ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں ' ان سے اتارتے ہیں "۔ لہٰذا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پوری انسانیت کے لیے رحمت تھی ۔ آپ تشریف لائے اور آپ نے لوگوں کے کاندھوں سے بوجھ اتارے اور ان کے گلوں سے وہ طوق اتارے جو انہوں نے ڈال رکھے تھے اور یہ اس لیے کہ انہوں نے دین میں سختی کی تو اللہ کی طرف سے بھی ان پر سختی کی گئی ۔ آپ جو دین اور جو دعوت لے کر آئے اس کے بارے میں بھی قرآن کہتا ہے :

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴ : ۲۲) "اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنایا ہے ' تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا"۔ اور ایک دوسری جگہ ہے ۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (۲۲ : ۷۸)
"اور اللہ نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی"۔ اور سورہ بقرہ میں ہے ۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲: ۲۸۶) "اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا"۔ اور مائدہ میں ہے ۔

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ (۵ : ۶) "اللہ تعالیٰ دین کے سلسلے میں تم پر کوئی تنگی نہیں کرنا چاہتا ' وہ تو تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے"۔ غرض یہ آخری رسالت سہل ہے اور انسانی طاقت کی حدود میں ہے ۔ اللہ نے لوگوں کو تنگی میں مبتلا نہیں کیا ۔ نہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ لوگوں کی مشقت میں ڈالا جائے ' اسلام کی روح میں بھی سہولت ہے اور اسلام کے احکام میں بھی سہولت کو مدنظر رکھا گیا ہے ۔ غرض یہ ایک فطری دین ہے ۔ سورہ روم میں ہے ۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۳۰ : ۳۰) ''جس فطرت پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، یہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے''۔

اور جب انسان اس عقیدے کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہے تو وہ اس کو بہت آسان پاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس میں انسانی قوت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس میں انسان کے مختلف حالات کی رعایت بھی کی گئی ہے۔ اس میں ان حالات کا بھی خیال رکھا گیا ہے جو مختلف قسم کے معاشروں میں انسان کو پیش آتے ہیں۔ اسلامی عقیدہ بذات خود نہایت ہی سہل اور قابل فہم ہے۔ بس ایک اللہ کا عقیدہ ہے اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ تمام مخلوقات کو اسی اللہ نے بنایا ہے اور اسی اللہ نے ان کو ان کی پیدائش کا مقصد بھی بتایا ہے۔ پھر اس نے رسولؑ بھیجے ہیں اور ان رسولوں نے لوگوں کو ان کا مقصد وجود بتایا ہے۔ رسولوں نے لوگوں کو اپنے خلق کی طرف لوٹایا۔ اس کے بعد جو فرائض بھی ان پر عائد کیے گئے وہ اسی نظریہ سے نکلتے ہیں، نہایت سیدھے سادھے طریقے سے جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے۔ اور لوگوں کو یہ حکم دیا کہ وہ ان میں سے جن احکام پر بھی عمل کر سکتے ہیں بغیر تنگی اور مشقت کے عمل کریں۔ حضورؐ نے فرمایا: ''جب میں تمہیں حکم دوں تو اس حکم کی تعمیل اس قدر کرو جس قدر تمہاری طاقت ہو اور جس کام سے میں روکوں، رک جاؤ'' (بخاری و مسلم)۔ اور جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے، ان میں سے بھی حالت اضطرار مستثنیٰ ہے۔

اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ (۶ : ۱۱۹) ''الا یہ کہ تم ان کے لیے مضطر ہو جاؤ''۔

یوں رسول آخر الزمانؐ کا مزاج ان کی رسالت اور دعوت کے ساتھ گھل مل گیا ہے، اور اس دعوت اور داعی کی حقیقت ایک ہوگئی، خصوصاً اس بنیادی صفت اور اس ممتاز رنگ میں۔ اسی طرح اس امت کو بھی امت وسط اور سہل کہا گیا جس کے پاس رسول خداؐ یہ پیغام لے کر آئے تھے۔ یہ ایسی امت تھی جس پر رحمت ہوئی اور یہ رحمت اور محبت کا پیغام لے کر نہایت آسان اور سیدھا راستہ لوگوں کو بتانے کے لیے اٹھی۔ اس طرح کہ اس امت کا مزاج آفاقی اور کائناتی مزاج بن گیا۔ اور اس کے مزاج اور اس وسیع کائنات کے مزاج کے اندر گہری ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔

پھر ذرا اس کائنات کا مطالعہ کرو، اس کی حرکت کا بہاؤ کس قدر سہل، رواں دواں ہے اور اس میں کوئی ٹکراؤ اور تصادم نہیں ہے۔ اربوں کھربوں اجرام فلکی اس کائناتی فضا میں تیرتے پھرتے ہیں۔ نہایت ہم آہنگی کے ساتھ اپنے اپنے مدار میں بہتے چلے جا رہے ہیں، نہایت تناسق، خوشگوار کشش کے ساتھ جس کے اندر کوئی اضطراب نہیں۔ کوئی ایک بھی اپنے مدار سے ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ اربوں کھربوں زندہ مخلوقات اس کرۂ ارض پر زندگی بسر کر رہی ہے اور اپنے قریبی دور کے مقاصد پورے کر رہی ہے اور یہ زندگی نہایت پختگی اور زبردست انتظام کے ساتھ گزر رہی ہے۔ اور ہر چیز اپنا مقصد تخلیق نہایت ہی سہولت سے پورا کر رہی ہے، اور اپنی متعین راہ پر اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ اس کائنات میں اربوں کھربوں حرکات واقعات، اور حالات چل رہے ہیں، مجتمع بھی اور متفرق بھی۔ اور یہ سب ایک راہ پر جا رہے ہیں جس طرح سازوں کا ایک گروپ اپنے اپنے آلہ سے بالکل مختلف آواز نکال رہا ہوتا ہے اور یہ سب مختلف آوازیں ایک ہی راگ تشکیل کر کے ایک طویل نغمہ بناتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کے وجود، اسلامی نظام زندگی اور سیرت رسولؐ کے درمیان اور امت مسلمہ کے مزاج کے درمیان ایک زبردست ہم آہنگی ہے، کیونکہ یہ اللہ کی صنعت ہے، اللہ کی

بتائی ہوئی فطرت ہے 'اور اللہ کا راگ ہے 'اور وہ نہایت ہی حکیم صنعت کار ہے ۔

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (۸۷ : ۹) "لہٰذا نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو" ۔ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھایا تو ضمانت دی کہ آپ نہ بھولیں گے 'الا ماشاء اللہ ۔ پھر اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سہولت آسان طریقے پر چلنے کی سہولت فراہم کی تاکہ آپ اس عظیم امانت کا بار آسانی سے اٹھائیں اور لوگوں کو یاد دہانی کرائیں ۔ اسی لیے آپ کو تیار فرمایا اور خوشخبری دی گئی اور کہا کہ جب بھی موقعہ ملے یاد دہانی کرائیں 'جب بھی آپ دلوں کے اندر بات اتارنے کی راہ پائیں 'اور تبلیغ کے ذرائع میسر ہوں ۔ یہاں کہا گیا ہے ۔

اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (۸۷ : ۹) "اگر نصیحت فائدہ دے" ۔ جب بھی یاد دہانی کرائیں فائدہ ہی ہوتا ہے ۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا ہے کہ نصیحت سے کسی کو کم یا زیادہ فائدہ نہ ہو 'کبھی کوئی نسل استفادہ کرنے والوں سے خالی نہیں ہوئی ۔ اگرچہ زمانہ کے اندر فساد عام ہو 'دلوں پر زنگ آگیا ہو 'اور ان پر پردے پڑ گئے ہوں بہرحال تذکیر سے فائدہ ہوتا ہی ہے ۔

جب ہم ان آیات کی اس ترتیب پر غور کرتے ہیں تو ہمیں رسالت کی عظمت کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ امانت کس قدر عظیم اور اہم ہے ۔ کہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اللہ نے آسان طریقے کی رہنمائی فرمائی اور آسانیاں بہم پہنچائیں ' پہلے یاد کروایا 'پھر اس پیغام کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی تاکہ رسول خدا اطمینان سے یاد دہانی کا فریضہ سرانجام دیں اور پھر حکم دیا کہ آپ یاد دہانی کرائیں اگر مفید ہو 'یہ سب سہولیات دے کر آپ کو کام پر لگایا اور یہ دراصل عظیم زاد راہ تھا ۔

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا یہ فریضہ پورا کر دیا 'تو آپ کی ڈیوٹی ختم ہو گئی ۔ پھر لوگ جانیں اور ان کا کام ۔ تبلیغ و تذکیر کے بعد لوگوں کے مسالک 'ان کے اہداف اور انجام مختلف ہو جاتے ہیں ۔ اور یہ اللہ ہے جو کسی کو ایک انجام تک پہنچاتا ہے اور کسی کو دوسرے تک ۔ جس طرح انہوں نے رویہ اختیار کیا 'قبول کرنے کا یا رد کرنے کا ۔

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ﴿۱۰﴾ وَ يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ﴿۱۱﴾ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ﴿۱۲﴾ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ﴿۱۳﴾ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾

"جو شخص ڈرتا ہے وہ نصیحت قبول کر لے گا 'اور اس سے گریز کرے گا وہ انتہائی بدبخت جو بڑی آگ میں جائے گا 'پھر نہ اس میں مرے گا نہ جئے گا ۔ فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا 'پھر نماز پڑھی" ۔

آپ یاد دہانی کرائیں اور اس یاد دہانی سے استفادہ وہی شخص کرے گا جو ڈرتا ہو ۔

مَنْ يَّخْشٰى (۸۷ : ۱۰) جس کے دل میں خدا کا خوف ہو 'اور جو خدا کے غضب اور خدا کے عذاب سے

ڈرتا ہو' اور وہی شخص ڈرتا ہے اور محتاط رہتا ہے جو زندہ ہو۔ اور یہ شخص جانتا ہو کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے 'جس نے اس جہاں کو پیدا کر کے اسے نہایت متوازن بنایا ہے 'تقدیر مقرر کی اور لوگوں کو راہ راست کی ہدایت کی۔ اس نے لوگوں کو ویسا ہی شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیا اور نہ مہمل پیدا کیا ہے۔ لہٰذا خیر و شر کے سلسلے میں اللہ حساب لینے والا ہے اور عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے والا ہے۔ تو ایسا شخص اللہ سے ڈرتا ہے اور جب اسے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت لیتا ہے ' اسے بصیرت دی جاتی ہے تو قبول کرتا ہے اور جب اسے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ عبرت حاصل کرتا ہے۔

وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى (۸۷: ۱۱) "اور اس سے گریز کرے گا انتہائی بدبخت"۔ جو شخص بدنصیب ہو گا وہ نصیحت سے دور ہو گا۔ لہٰذا ایسا شخص نہ نصیحت کی بات سنے گا اور نہ اس سے استفادہ کرے گا وہ بدنصیب ہو گا۔ مطلق بدنصیب۔ جس کے اندر بدبختی اعلیٰ درجے پر ہو' یعنی انتہائی بدبخت۔ اپنی گری ہوئی روح کی وجہ سے بدبخت' اس کائنات کے حقائق کا احساس نہ کرنے کی وجہ سے بدبخت۔ اس کائنات کے اندر پائے جانے والے شواہد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بدبخت' اشارات کائنات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بدنصیب' جو نہایت حرص سے اس دنیا کے حقیر مفادات کے پیچھے بھاگ رہا ہو' اس کے لیے ہلکان ہو رہا ہو' اور آخرت کا بدبخت کہ وہاں اس کے نصیب میں دائمی جہنم ہوگی جس کے زمانوں کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔

الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى (۱۲) ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (۸۷: ۱۳) "جو بڑی آگ میں جائے گا اور نہ اس میں مرے گا اور نہ جیئے گا"۔ یہ بڑی آگ کیا ہے؟ جہنم کی آگ۔ جس کی شدت بڑی ہوگی' جس کے زمانے بڑے ہوں گے 'جس کی ضخامت بڑی ہوگی جس میں رہائش طویل ہوگی۔ اس میں نہ مر سکے گا کہ احساس عذاب نہ رہے اور نہ زندہ رہے گا کہ آرام سے ہو بلکہ دائمی عذاب ہو گا اور وہاں لوگ موت کو اس طرح چاہیں گے جس طرح یہاں بڑی بڑی خواہشات کے پیچھے مرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں نجات ہے 'فلاح ہے 'پاکیزگی اور نصیحت ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (۱٤) وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (۸۷: ۱۵) "فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی"۔ تزکی کے معنی ہیں ہر گندگی اور ہر گناہ سے پاکیزگی اختیار کی۔ اس آیت میں اللہ فیصلہ فرماتا ہے کہ جو پاکیزگی اختیار کرے اور اپنے دل میں رب کا جلال بسائے اور پھر نماز پڑھے یا اللہ سے ڈرے اور اطاعت کرے۔ دونوں معنوں سے اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہے اور جلال دل میں بیٹھتا ہے اور ضمیر میں اللہ کی ہیبت پیدا ہوتی ہے۔ تو فیصلہ یہ ہے کہ وہ شخص فلاح پائے گا۔ دنیا میں بھی وہ فلاح پائے گا کہ اس کا دل اللہ سے جڑا ہوا ہو گا' زندہ ہو گا' اللہ کے ذکر میں وہ مٹھاس محسوس کرے گا اور اس کو باری تعالیٰ سے انس ہو گا اور آخرت میں بھی فلاح پائے گا۔ وہاں بڑی آگ سے بچے گا اور جنتوں میں نعیم مقیم میں ہو گا۔ دونوں کا انجام دے دیا گیا اور دونوں کے انجام میں بعد المشرقین ہے

اس خوفناک منظر میں 'جس میں نار کبریٰ دکھائی گئی ہے اور اس کے بالمقابل نجات کا منظر دکھایا گیا ہے ان لوگوں کے

لیے جو پاکیزگی اختیار کرتے ہیں۔ ان مناظر کے بعد بتایا جاتا ہے لوگ بدبختی کے چنگل میں کیوں پھنس جاتے ہیں اور ان کی غفلت کا اصل سبب کیا ہے اور عبرت آموزی' تطہیر اور فلاح و نجات سے ان کو کیا چیز روکتی ہے۔ اور وہ کیا چیز ہے جو انہیں جہنم رسید کرتی ہے اور بدبخت بنا دیتی ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿16﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿17﴾

"مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو' حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا پرستی ہی ہر مصیبت کی جڑ ہے۔ اسی وجہ سے انسان نصیحت سے منہ موڑتا ہے کیونکہ آخرت کا مطالبہ یہ ہوتا ہے اس کی فکر کرو اور آخرت کو ترجیح دو۔ اور لوگ ہیں کہ دنیا کے طالب ہیں اور اس کو اولیت دیتے ہیں۔

اور اس دنیا کو دنیا ویسے نہیں کہا گیا' بلکہ یہ دنیائے دنی ہے' قریبی ہے اور جلد مٹنے والی ہے اور اس کے مقابلے میں آخرت اچھی اور بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۸۷ : ۱۷) یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے باقی رہنے والی اور اچھی اور ابدالآباد تک مسلسل ہونے والی ہے۔ لہٰذا جو لوگ آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہیں وہ بڑی حماقت کا ارتکاب کر رہے ہیں اور ان کا اندازہ غلط ہے۔ کسی عاقل اور بصیر کا یہ کام نہیں ہے۔

آخر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ دعوت اسلامی کوئی نئی دعوت نہیں ہے' اس کی طویل تاریخ ہے۔ آغاز کائنات سے اور وجود انسانیت سے یہ دعوت چل رہی ہے اور اس کے اصول زمان و مکان کے قیود سے ماوراء ہیں۔ ا

ع ۱۹ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿18﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿19﴾
۱۲

"یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی' ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں"۔ اس سورت میں جو مضامین آئے ہیں وہ اس عظیم عقیدہ کے بنیادی اصول ہیں اور یہ وہی بنیادی اصول دعوت ہیں اور اصول دین ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی کتابوں اور صحیفوں میں مذکور ہوئے تھے۔

یہ کہ سچائی ایک ہے' عقیدہ ایک ہے' اصول دین ایک ہے یہ اس بات کی شہادت ہے کہ یہ سب ادیان ایک اللہ کی طرف سے ہیں۔ وہ ایک ہی ارادہ اور مشیت ہے جس نے ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کو اور پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ارادہ کیا ہے۔ سچائی ایک ہے' تو اس کا سرچشمہ بھی ایک ہے۔ ہاں ادیان میں فروعی اختلافات ہیں لیکن وہ اس لیے کہ شریعت و قانون میں اللہ نے وقت کے حالات اور تقاضوں کے مطابق تبدیلی فرمائی۔ البتہ تمام شرائع کی اصل ایک ہے اور ایک ہی سرچشمہ سے تمام شریعتیں نکلیں یعنی اسی رب اعلیٰ کی طرف سے آئیں جس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے متناسب بنایا اور جس نے ہر چیز کو مقدر کیا' تقدیر بنائی اور ہر چیز کو ہدایت دی۔

---OOO---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ----- ۳۰

سورۃ الغاشیۃ۔ ۸۸

آیات ۱--- تا--- ۲۶

سورۃ الغاشیۃ ایک نظر میں

اس سورت کا انداز نہایت گہرا' پرسکون اور فکر انگیز ہے۔ غور و فکر کے ساتھ ساتھ اس میں ایک طرف رجائیت ہے اور انسان عالم آخرت سے امیدیں وابستہ کرتا ہے اور دوسری جانب احتیاط اور خوف اور یوم الحساب کی فکر اور تیاری پر ابھارا گیا ہے۔

یہ سورت انسانی فکر و نظر کو دو اہم اور پرخطر وادیوں کی سیر کراتی ہے۔ ایک عالم آخرت' جو بہت ہی وسیع ہے' جس کے مناظر بہت ہی موثر ہیں اور دوسری وادی اس کائنات کی ہے جو ہمارے سامنے ہے' کھلی ہے' اور اس کے اندر پھیلی ہوئی مخلوق خدا میں آیات الٰہی بکھرے پڑے ہیں۔ ان دو وادیوں میں گھما کر انسان کو دعوت فکر دی جاتی ہے کہ آخر کار اسے اللہ کے سامنے جانا ہے' جہاں تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہوں گے۔ لہٰذا آخرت کی تیاری کرو۔ یہ تمام باتیں نہایت ہی موثر انداز میں کی گئی ہیں۔ انداز دھیما لیکن دل میں اترنے والا ہے' پختہ ہے لیکن خوفناک بھی۔

---ooo---

درس نمبر۲۸۸ تشریح آیات

۱۔۔ تا۔۔ ۲۶

سُورَةُ الْغَاشِيَةِ (۸۸) مَكِّيَّةٌ (۶۸)
آیاتها ۲۶　　رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ أَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱

"کیا تمہیں اس چھا جانے والی آفت (یعنی قیامت) کی خبر پہنچی ہے؟" اس آغاز کے ذریعہ یہ سورت دلوں کو اللہ کی طرف متوجہ کرتی ہے اور اس کائنات میں جو نشانات الہیہ موجود ہیں ان کی طرف متوجہ کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ انسان نے قیامت میں حساب دینا ہے اور جزاء و سزا سے دوچار ہونا ہے۔ اور یہ یقینی امر ہے۔ استفہامی تاکیدی یا تقریری کے ذریعہ اس بات کو نہایت تاکید سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس استفہامی انداز میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اس سورت سے قبل اس امر کی بار بار تاکید اور تذکیر کی گئی ہے۔ اس لیے یہاں قیامت کو ایک نیا نام دیا گیا ہے۔ الغاشیہ (چھا جانے والی) یعنی ایک ایسی مصیبت جس کی ہولناکیاں لوگوں پر چھا جائیں گی۔ یہ ایک نیا نام ہے لیکن اس نام کے ذریعہ قیامت کی خوفناکی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس بارے میں قیامت کے لیے کئی نام آئے ہیں۔ الطامہ، الصاخہ، الغاشیہ اور القارعہ اور یہ سب نام اسی پارے کے مضامین کے ساتھ مناسب ہیں۔

یہ سوال کہ کیا غاشیہ کی کچھ خبریں آپ کو ملی ہیں، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سمجھتے تھے کہ سب سے پہلے یہ سوال ان سے کیا گیا ہے۔ جب بھی حضور اکرمؐ اس سورت کو پڑھتے یا سنتے تو یوں محسوس ہوتا کہ شاید حضور اکرمؐ نے اسے پہلی مرتبہ سنا ہے اور ابھی یہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہو رہی ہے۔ آپ اللہ کے اس خطاب کو سن کر چونکنے ہو جاتے اور یہ خیال کرتے کہ یہ اللہ کا خطاب ہے، اور آپؐ کے احساسات یہ ہوتے کہ ابھی یہ خطاب انہوں نے پایا اور سنا۔ ابن ابوحاتم روایت کرتے ہیں ابن محمد طنافسی سے، وہ ابوبکر ابن عباس سے، وہ ابو اسحاق سے، وہ عمر ابن میمون سے کہ حضور اکرمؐ ایک عورت کے پاس سے گزرے جو پڑھ رہی تھی۔

هَلْ أَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ (۸۸ : ۱) "کیا آپ تک الغاشیہ کی بات پہنچی ہے؟" تو آپ کھڑے ہو

گئے اور آپؐ نے فرمایا "ہاں میرے پاس بات آئی ہے"۔

اس کے باوجود خطاب ہر اس شخص کو ہے جو قرآن مجید سنتا ہے یا پڑھتا ہے کیونکہ الغاشیہ کی بات قرآن کی بات ہے جو بار بار قیامت کا ذکر کرتا ہے۔ قرآن کریم قیامت کی یاد دہانی کرا کے لوگوں کو ڈراتا ہے اور خوشخبری دیتا ہے اور ڈرنے والے حساس اور متقی دلوں کے اندر عمل اور احتیاط کے جذبات ابھارتا ہے۔ ڈر اور احتیاط کے ساتھ ساتھ قرآن مجید امید اور فلاح کا انتظار بھی سکھاتا ہے تاکہ انسانی ضمیر غافل ہو کر مر ہی نہ جائے۔

اور یہ کہنے کے بعد کہ "کیا تمہیں اس چھا جانے والی آفت کی خبر پہنچی؟" اس خبر کی ہیڈ لائن دی جاتی ہیں۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ خَاشِعَةٌ ﴿٢﴾ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ﴿٣﴾ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ﴿٤﴾ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴿٥﴾ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴿٦﴾ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ﴿٧﴾

"کچھ چہرے اس روز خوفزدہ ہوں گے 'سخت مشقت کر رہے ہوں گے 'تھکے جاتے ہوں گے 'شدید آگ میں جھلس رہے ہوں گے 'کھولتے ہوئے چشمے کا پانی انہیں پینے کو دیا جائے گا' خار دار سوکھی گھاس کے سوا کوئی کھانا ان کے لیے نہ ہو گا جو نہ موٹا کرے نہ بھوک مٹائے"۔

یہاں نعمتوں کے منظر سے قبل عذاب کا منظر دکھایا گیا کیونکہ سوال قیامت کی ہولناکیوں سے متعلق تھا' بتایا جاتا ہے کہ لوگ سخت خوف کی حالت میں ہوں گے' تھکے ہارے اور ڈرے سہمے ہوں گے۔ انہوں نے پوری زندگی جدوجہد میں گزاری' تھک اور ہار گئے لیکن ان کے اعمال کھوٹے نکلے اور کسی نے بھی ان کو قبول نہ کیا' عاقبت بھی خراب ہوئی اور مصیبت اور خسارے کے سوا کچھ نہ ملا۔ چنانچہ ان کی تھکاوٹ اور پریشانی اور درماندگی میں اضافہ ہی ہوا۔

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (۸۸ : ۳) "سخت مشقت کر رہے ہوں گے اور تھکے جاتے ہوں گے"۔ دنیا میں وہ صرف اپنے نفس اور اپنی اولاد کے لیے جدوجہد کر رہے ہوں گے' دنیا اور دنیا کی طمع اور آز کے لیے تھکے ہوں گے۔ پھر آج انجام ان کے سامنے ہے کہ دنیا میں ان کو مل گیا جو ملنا تھا' مگر آخرت میں تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اب یہ آخرت کا سامنا ذلیل ہو کر کر رہے ہیں' تنگ ہیں' خائب و خاسر ہیں اور مایوس ہیں۔ اور اس ذلت اور خواری کے ساتھ پھر دردناک عذاب۔

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً (۸۸ : ٤) "شدید آگ میں جھلس رہے ہوں گے"۔ یہ اس کا مزہ چکھیں گے اور مشقتیں برداشت کریں گے۔

تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ (۸۸ : ٥) "کھولتے ہوئے چشمے کا پانی انہیں پینے کو دیا جائے گا"۔ انیہ کے معنی

انتہائی گرم 'کھولتا ہوا۔

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ (٦) لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ (٨٨ : ٧) "خاردار سوکھی گھاس کے سوا کوئی کھانا ان کے لیے نہ ہوگا جو نہ موٹا کرے نہ بھوک مٹائے"۔ "ضریع" کے معنی کے بارے میں دو قول ہیں' ایک یہ کہ یہ ایک درخت ہو گا جو جہنم کے اندر ہی پیدا ہو گا جیسا کہ خود قرآن مجید میں زقوم آیا ہے کہ وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہہ میں پیدا ہو گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ایک کانٹے دار جھاڑی ہے جو زمین کے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی ہے' اور جب یہ سبز ہوتی ہے تو اسے شبرق کہتے ہیں اور جب اسے کاٹ لیا جائے اور خشک ہو تو ضریع کہتے ہیں' اسے اونٹ چرتے ہیں۔ جب یہ خشک ہو تو اونٹ بھی اسے کھا نہیں سکتے کیونکہ اس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے۔ غرض جو معنی بھی ہوں' یہ اس طرح کی خوراک ہے جس طرح پانی کے بارے میں آیا ہے کہ وہ غسلین یا غساق پئیں گے اور جو خوراک بھی وہاں ہوگی وہ نہ ان کو موٹا کرے گی اور نہ بھوک مٹائے گی۔

آخرت کا یہ عذاب کیسا ہو گا؟ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہم اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ یہاں اس کی ایسی صفات دی جاتی ہیں تاکہ ہم بدترین سزا کا تصور کر سکیں۔ جس میں ذلت 'کمزوری' نامرادی 'گرم ترین آگ کی جلن' زمہریر یعنی بہت سرد' پینے کے لیے سخت گرم پانی' اور اس قسم کا کھانا کہ اسے اونٹ بھی نہ کھا سکیں اور اگر کھائیں بھی تو ان کو کوئی نفع نہ دے۔ ان اوصاف سے ہمارے احساسات میں جو چیز بیٹھتی ہے وہ حد درجہ کا رنج و الم ہے۔ لیکن آخرت کا عذاب ہمارے تصورات سے شدید تر ہے۔ اور وہ کیا ہو گا' یہ وہی بتا سکتا ہے جو اس میں مبتلا ہو گا۔ العیاذ باللہ! اور دوسری طرف اہل ایمان :

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاعِمَةٌ ﴿٨﴾ لِسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿٩﴾ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿١٠﴾
لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ﴿١١﴾ فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿١٢﴾ فِيهَا سُرُرٌ مَرْفُوعَةٌ ﴿١٣﴾
وَأَكْوَابٌ مَوْضُوعَةٌ ﴿١٤﴾ وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ﴿١٥﴾ وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ﴿١٦﴾

"کچھ چہرے اس روز بارونق ہوں گے' اپنی کارگزاری پر خوش ہوں گے' عالی مقام جنت میں ہوں گے' کوئی بیہودہ بات وہ وہاں نہ سنیں گے' اس میں چشمے رواں ہوں گے' اس کے اندر اونچی مسندیں ہوں گی' ساغر رکھے ہوئے ہوں گے' گاؤ تکیوں کی قطاریں لگی ہوں گی اور نفیس فرش بچھے ہوئے ہوں گے"۔

اہل جنت کے چہروں سے معلوم ہو گا کہ یہ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ وہ رضائے الٰہی کی وجہ سے بے حد مطمئن ہوں گے۔ نعمتوں میں بس رہے ہوں گے۔ ان کے اعمال کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا' تعریف کی جائے گی اور انعامات پائیں گے۔ اس کے علاوہ ان کو بلند روحانی شعور حاصل ہو گا کہ اللہ ان کے اعمال سے راضی ہے۔ اور ان کو نظر آئے گا کہ اللہ راضی ہے۔ اس سے زیادہ روحانی سکون کسی کو نہیں مل سکتا کہ کوئی بھلائی کے کاموں پر مطمئن ہو جائے' اور اس

کا انجام اچھا ہو' اور پھر وہ دیکھے کہ اس کا مالک اس سے راضی ہے اور جنتوں میں داخل ہو جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم رضائے الٰہی اور روحانی خوشی کا ذکر جنتوں کی مادی نعمتوں سے پہلے کرتا ہے اور اس کے بعد جنتوں میں ان کے مقامات کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ (۸۸ : ۱۰) "عالی مقام جنت میں ہوں گے"۔ ذاتی اعتبار سے بھی یہ بلند ہوں گے 'عزت کے اعتبار سے بھی بلند ہوں گے' درجات رہائش بھی بلند ہوں گے' مقامات بھی بلندیوں پر ہوں گے ۔ غرض ان کے احساسات پر علو چھایا ہوا ہو گا۔

لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً (۸۸ : ۱۱) "کوئی بیہودہ بات وہ وہاں نہ سنیں گے"۔ اس تعبیر میں ایک فضا اور اک جہان معانی سمو دیا گیا ہے ۔ آرام ہو گا' سکون ہو گا' اطمینان اور سلامتی ہو گی' محبت اور رضامندی ہو گی' دوستوں کی محفلیں ہوں گی' آل اولاد جمع ہوں گے' طہارت و پاکیزگی ہو گی' ہر لغو بات سے وہ دور ہوں گے ۔ کوئی ایسی بات نہ ہو گی جس میں ان کے لیے خیر و عافیت نہ ہو ۔ اور ایسی فضا اپنی جگہ ایک نعمت ہوتی ہے' یہ صورت حال خود نیک بختی ہے اور سعادت مندی ہے ۔ جب انسان اس دنیا کی زندگی کی مشکلات اور تلخیوں کا تصور کرے کہ یہاں کس قدر لغو' لڑائیاں جھگڑے' تو تو میں میں' شور و شغب' مذمت و ملامت' جھوٹ اور فریب' اور فتنہ و فساد ہے اور اس کے بعد جنت کی فضا کا تصور کرے جو پر سکون' پر امن' پر محبت' ترو تازہ ہے اور پھر قرآن کی یہ تعبیر جامع تعبیر۔

لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً (۸۸ : ۱۱) "وہاں کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے"۔ یہ الفاظ ہی ایسے ہیں جن کے اندر نرمی' آسانی اور تروتازگی ہے ۔ ان کا تلفظ بھی پر ترنم ہے ۔ نرم اور آسان ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان کی زندگی اس جہاں میں' خصوصاً تحریک اسلامی کے کارکنوں کی زندگی بھی ۔ دراصل جنت کا ایک نمونہ ہوگی جو لغو' فحش باتوں سے' جدل و جدال سے دور ہوتے ہیں ۔ یہ گویا جنت کی زندگی کی تیاری ہوتی ہے ۔

یوں جنت کے حال احوال سے یہ روشن اور بلند مفہوم پیش کیا جاتا ہے اور اس کے بعد پھر جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے جو انسانی حواس کے لیے باعث تسکین ہوتی ہیں' اور یہ اس صورت میں مذکور ہیں جس کا انسان تصور کر سکتا ہے' لیکن جنت میں یہ چیزیں اس شکل میں ہوں گی جس تک اہل جنت کے نفوس ترقی کر چکے ہوں گے' اور وہ کیا صورت ہو گی؟ جس کی معرفت انہی لوگوں کو ہو گی جنہوں نے ان کو برتا۔

فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (۸۸ : ۱۲) "اس میں چشمے رواں ہوں گے"۔ چشمہ جاری وہ چشمہ ہوتا ہے جس سے پانی ابل رہا ہوتا ہے' جاری چشموں میں خوبصورتی' پانی کی روانی اور پیاس بجھانے کا سامان بہت ہی خوبصورت ہیں ۔ آب رواں' ایک قسم کی حیات کا مظہر ہوتا ہے اور وہ انسانی روح کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے ۔ جو رواں اور متحرک ہوتی ہے ۔ اس منظر اور اس کا یہ معنوی حسن دونوں انسانی احساس کی گہرائیوں تک اترتے ہیں ۔

فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ (۸۸ : ۱۳) "اس کے اندر اونچی مسندیں ہوں گی"۔ بلندی نظافت اور طہارت

دونوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

وَّ اَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ (۸۸: ۱۴) "ساغر رکھے ہوئے ہوں گے"۔ یہ لائن پر رکھے ہوں گے تاکہ ان میں شراب صافی نوش کی جائے اور اہل جنت کو طلب کی ضرورت نہ ہوگی' ہر چیز ان کے لیے تیار ہوگی۔

وَّ نَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ (۸۸: ۱۵) "گاؤ تکیوں کی قطاریں لگی ہوئی ہوں گی"۔ یعنی وہ تکیے جو نرم مواد سے بھرے ہوں گے اور جنہیں انسان آرام اور خوشی کے وقت استعمال کرتا ہے۔

وَّ زَرَابِیُّ مَبْثُوْثَةٌ (۸۸: ۱۶) "اور نفیس فرش بچھے ہوں گے"۔ وہ فرش جو پشم دار ہو' یہ جگہ جگہ زینت اور آرام کے لئے بچھے ہوں گے۔

یہ وہ سہولیات ہیں جن کی نظیر دنیا میں ہم دیکھتے ہیں اور یہاں ان اصطلاحات میں جنت کی سہولیات کا ذکر ہمارے سمجھانے کے لیے ہے لیکن وہاں سہولیات کیسی ہوں گی' اس کا تعلق وہاں استعمال کرنے سے ہے۔ یہ وہی لوگ بتا سکیں گے جن کی قسمت میں جنت لکھی ہے۔

یہ بحث فضول ہے کہ ہم یہاں جنت کی سہولیات کی نوعیت اور کیفیت کا ذکر کریں یا قیامت کے عذاب کی کیفیات کا ذکر کریں اس لیے کہ اشیاء اور مدکارت کی نوعیت کا اظہار اس طرح ہو سکتا ہے کہ ان کے بارے میں انسانی ادراک مکمل ہو' اہل زمین کی قوت مدرکہ اس زمینی حواس کے محدود دائرے میں کام کرتی ہے۔ جب یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے تو ان کی قوت مدرکہ پر سے تمام حدود و قیود اٹھ جائیں گے اور وہاں ان کی روح اور احساس اور ادراک سب بہت ترقی کریں گے۔ جس طرح وہاں قوت مدرکہ ترقی کرلے گی' اسی طرح وہاں الفاظ کے معانی بھی وسیع تر ہو جائیں گے اور وہاں ہمارے ذوق و شوق اور فہم و ادراک کا عالم ہی اور ہو گا لہٰذا اس کی کیفیت یہاں ہم قلم بند نہیں کر سکتے۔

ہم یہاں صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ذہن میں لذت' عیش کوشی اور مٹھاس اور ذوق کا اعلیٰ ترین تصور یوں گا اور یہ ہم اپنے تجربے کے مطابق ہی کہہ سکتے ہیں۔ اصل حقیقت ہمارے علم میں تب آئے گی جب اللہ جل شانہ ہمیں وہاں یہ اعزاز بخش دے گا۔

یہاں آکر عالم آخرت کا مطالعاتی سفر ختم ہوتا ہے اور ہم اسی ظاہری کائنات کی طرف لوٹتے ہیں جو ہمارے سامنے کھڑی ہے اور جس کے اندر قادر مطلق کی تدبیر ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ جس میں اللہ کی صنعت ممتاز ہے' جس میں اللہ کی بنائی ہوئی چیزیں ممتاز نظر آتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زندگی کے بعد اس سے ایک برتر زندگی ہے' اس زمین سے ایک برتر جہان ہے اور اس موت پر ہی خاتمہ نہیں ہے بلکہ لوگوں کا انجام کچھ اور ہے

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَ اِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَ اِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَ اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾

"(یہ لوگ نہیں مانتے) تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟"

یہ مختصر چار آیات ہیں لیکن ان کے اندر قرآن کریم کے پہلے مخاطب عرب سوسائٹی کے ماحول کی پوری طرح تصویر کھینچ دی گئی ہے' اور اس کے ساتھ ساتھ پوری کائنات کا نقشہ بھی۔ آسمان' زمین' پہاڑ اور زمین کے اوپر حیوانی خوبصورتی اونٹ کی صورت میں 'کیونکہ اونٹ کی تخلیق نہایت پیچیدہ ہے اور عربوں کے لیے اس کی اہمیت مسلم ہے۔ انسان جہاں بھی ہو' یہ مناظر اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ آسمان' پہاڑ' ہموار زمین اور اس کے اوپر قسم قسم کے حیوانات۔ انسان علم و معرفت کے جس مقام پر بھی ہو' یہ مناظر اس کے علم' ادراک اور دلچسپی کا مرکز ہوتے ہیں۔ اگر انسان ان چیزوں کی ساخت پر غور کرے تو اس میں اسے وہ دلائل و شواہد مل سکتے ہیں جو اس کی رہنمائی اس کائنات کی پشت پر کارفرما قوت کی طرف کر سکتے ہیں۔

ان سب مناظر کی ایک معجزانہ شان ہے۔ ان کے اندر خالق کی صنعت کاری کے ایسے پہلو نمایاں ہیں جن کی کوئی مثال انسان کی دریافت میں نہیں ہے۔ یہ چیزیں اس بات کے لیے بالکل کافی ہیں کہ انسان اپنے ذہن میں ایک ابتدائی صحیح عقیدہ اور صحیح تصور جما لے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ (۸۸: ۱۷) "کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے"۔ قرآن کے پہلے مخاطب ایک عرب کے ہاں اونٹ کی اہمیت یہ تھی کہ وہ اس کے اوپر سفر کرتا تھا' اس کا دودھ پیتا تھا' اور اس کا گوشت کھاتا تھا' اور اس کے بالوں اور چمڑے سے لباس اور بچھونا بناتا تھا گویا اس کی زندگی کے لیے سپلائی کا یہ بڑا ذریعہ تھا اور زندگی کا ایک بڑا اثاثہ تھا۔ پھر اونٹ دوسرے حیوانات کے مقابلے میں کچھ منفرد خصوصیات بھی رکھتا تھا۔ ایک خصوصیت یہ تھی کہ اپنی ضخامت' قوت اور عظیم جثہ کے باوجود اس قدر شریف جانور ہے کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی اسے چلائے تو بڑی فرماں برداری سے اطاعت کرتا ہے۔ پھر اس سے انسانوں کو جس قدر منافع زیادہ ہیں' اسی نسبت سے اس کا سنبھالنا آسان تر ہے۔ اس کے کھانے اور چرنے کی چیزیں آسان ہیں اور اس کی خوراک کے لیے انسان کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔ جس قدر خانگی جانور ہیں ان میں سے یہ سب سے زیادہ بھوک' پیاس' مشقت اور برے حالات برداشت کرتا ہے۔ پھر اللہ نے جس سیاق میں اسے یہاں پیش فرمایا ہے اس میں اس کی ساخت نہایت موزوں تھی۔ اس کی تفصیلات آرہی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنے مخاطبین سے کہا ذرا اونٹ کی تخلیق پر غور کرو' یہ تو ہر وقت تمہارے سامنے رہتا ہے۔ کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے' اس پر غور کرنے کے لیے کسی بڑے علم کی ضرورت نہیں ہے۔

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ (۸۸: ۱۷) "کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے بنائے گئے ہیں"۔ ان کی ساخت اور ان کی تخلیق پر غور نہیں کرتے۔ اور پھر غور نہیں کرتے کہ اس کی ساخت اس کے مقاصد تخلیق کے ساتھ کس قدر ہم آہنگ ہے۔ اور وہ کس طرح اچھے طریقے سے مقصد تخلیق کو پورا کرتے ہیں۔ یہ عرب معاشرے اور عرب ماحول میں اپنے فرائض کس اچھے انداز میں پورے کرتے ہیں۔ کیا اونٹوں کو کسی انسان نے بنایا ہے' کیا

اونٹ خود بخود بن گئے' اگر یہ دونوں صورتیں نہیں تو لازماً ایک خالق ہے' جب خالق ہے تو پھر وہ نہایت ہی حکیم ہے کہ اس نے ایسی عجیب اور مفید مخلوق بنائی۔

وَ اِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ (۸۸: ۱۸) "اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا"۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ آسمانوں کی طرف غور کی نگاہ سے دیکھیں اور صحرا کے باشندوں کو تو بہت زیادہ آسمان کی طرف دیکھنا چاہئے اور غور کرنا چاہئے' جہاں کے باشندے ہروقت آسمان کے ساتھ ایک پرلطف ذوق اور اشارات رکھتے ہیں گویا آسمان تو ہے ہی ان کے لیے۔ اور آسمان ہوتا ہی صحراؤں پر ہے۔ آسمان اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ صحرا کے اوپر موجود ہے۔ اس کے روشن اور کھلے دن' آسمان کا ساحرانہ خوبصورت وقت زوال آفتاب غروب آفتاب کا منفرد منظر' جس میں جہان معانی پوشیدہ ہوتا ہے' آسمان اپنی وسیع راتوں کے ساتھ' اور اپنے چمکدار ستاروں اور خوبصورت کہانیوں کے ساتھ اور پھر اس کے خوبصورت اور روشن طلوع کے مناظر کے ساتھ تمہارے سامنے موجود ہے۔

یہ آسمان اور صحراؤں کی وسعتوں کے اوپر' کیا یہ لوگ اس کی طرف نہیں دیکھتے' کہ اسے کس طرح بلند کھڑا کیا گیا ہے۔ بغیر ستونوں کے یہ رفعتیں کس طرح قائم ہیں؟ اس کے اندر اربوں کھربوں ستارے بکھیر دیئے گئے ہیں اور اس کے اندر اس قدر خوبصورتی' اس قدر حسن اور اس قدر اشارات رکھ دیئے گئے ہیں۔ نہ انسانوں نے اسے بلند کیا اور نہ یہ خود بخود بلند ہو گیا۔ لہٰذا اسے یوں بلند کھڑا کرنے والا ضرور ہے' جس نے اسے وجود بخشا۔ یہ مشاہدہ ایسا ہے اور یہ غور و فکر ایسا ہے جس کے لیے کسی وسیع اور گہرے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک بصیرت والی نظر کی ضرورت ہے۔

وَ اِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ (۸۸: ۱۹) "اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے"۔ ایک عرب کے نزدیک پہاڑ بہت اہم تھے' پہاڑوں ہی میں عرب مشکل اوقات میں پناہ لیتے تھے۔ مشکل مراحل میں پہاڑ ہی ان کے انیس اور دوست ہوا کرتے تھے۔ پہاڑوں کے مناظر جب انسان دیکھتا ہے تو ان سے اس کو گہرے نفسیاتی اشارات ملتے ہیں۔ یہ پہاڑوں کے نظام میں ایک عظمت نظر آتی ہے۔ ایک جمال نظر آتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو کم تر سمجھ کر ان کے اندر پناہ لیتا ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں سکون حاصل کرتا ہے اور اس فطری ماحول میں خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ان اونچے پہاڑوں میں انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ اللہ کے زیادہ قریب ہے۔ یوں بلند پہاڑوں کے دامن میں وہ زمین کے شور و شغب اور حقیر سرگرمیوں سے قدرے بلند ہو جاتا ہے۔ یہ بات نہ کوئی عبث بات تھی اور نہ کوئی اتفاقی فعل تھا کہ نبوت سے قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جبل ثور کے غار حرا میں علیحدگی اختیار فرماتے تھے' لہٰذا جو لوگ لافانی بالیدگی چاہتے ہیں ان کو چاہئے کہ ان کی روح ایک عرصہ کے لیے دنیاوی آلودگیوں سے دور ہو جائے۔ پہاڑوں کے بارے میں یہاں جو الفاظ غور کے لیے آئے ہیں وہ ہیں۔

كَيْفَ نُصِبَتْ (۸۸: ۱۹) یعنی وہ زمین کے اوپر کس طرح جمائے گئے ہیں' یہ الفاظ منظر کے ماحول کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہیں۔

وَ اِلَی الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (۸۸: ۲۰) "اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟" یہ بچھی ہوئی زمین تو ہمارے سامنے ہے۔ یہ زندگی گزارنے کے لیے' اس پر چلنے کے لیے' اور اس پر کام کرنے کے لیے آسان بنا دی گئی ہے۔ کیا اسے لوگوں نے بچھایا ہے' ظاہر کہ انہوں نے نہیں بچھایا' انسانوں کی پیدائش سے تو زمین پہلے تھی۔ کیا یہ اس پر غور نہیں کرتے۔ ان کے ذہنوں میں یہ سوال کیوں نہیں اٹھتا کہ کون ہے اس کو بچھانے والا؟ اور کون ہے اسے اس طرح درست کرنے والا کہ زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے۔

یہ مناظر قلب انسانی کی طرف اہم اشارات کرتے ہیں' محض تامل اور غور و فکر سے انسان یہ اشارات پاتا ہے اور یہ اشارات وجدان کے ابھارنے اور انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان اشارات سے انسان اپنے موجد' خالق اور اس پوری کائنات کے خالق کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

اس کائناتی منظر کی منظرکشی میں جس توازن اور ہم آہنگی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس پر قدرے غور کی ضرورت ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ قرآن انسانوں سے کس خوبصورت زبان میں مخاطب ہوتا ہے۔ اور اس میں فنی خوبیوں کو کس قدر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور ایک باشعور مومن کے احساسات میں یہ دونوں چیزیں کس طرح پیوست ہوتی ہیں۔

اس منظر میں بلند آسمان اور بچھائی ہوئی زمین کو دکھایا گیا ہے۔ لیکن پہاڑوں کی بلندی افقی نہیں ہے اور نہ ہی وہ زمین پر گرے ہوئے ہیں' بلکہ وہ نصب کردہ ہیں۔ اس طرح نصب ہیں جس طرح اونٹ کے اوپر کوہان ہوتی ہے۔ اس منظر میں دو افقی خط ہیں اور دو راسی خط ہیں۔ لیکن باہم متناسب ہیں اور یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز ہے جس کے مطابق وہ مناظر کو پیش کرتا ہے۔ انداز تعبیر مجمل ہوتا ہے لیکن مصور ہوتا ہے۔

پہلا سفر تو تھا عالم آخرت میں' دوسرا مشاہداتی سفر تھا۔ اس کائنات کے مناظر میں' جو ہمارے سامنے تھے' اب روئے سخن حضور اکرمؐ کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو اپنے واجبات و فرائض کے حدود کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ کے فرائض کی نوعیت کیا ہے۔ اسی طرح لوگوں کے احساسات کو آخری چٹکی دی جاتی ہے تاکہ دعوت اسلامی کے حوالے سے سوئے ہوئے دلوں کو جگایا جائے۔

فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾

١ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ﴿٢٤﴾ إِنَّ إِلَيْنَا

ع ٢٦ النصف إِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ﴿٢٦﴾

١٣

"اچھا تو (اے نبیؐ) نصیحت کیے جاؤ' تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو' کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو۔ البتہ جو شخص منہ موڑے گا' اور انکار کرے گا تو اللہ اس کو بھاری سزا دے گا۔ ان لوگوں کو پلٹنا ہماری طرف ہی ہے' پھر ان کا حساب لینا ہمارے ہی ذمہ ہے"۔

ان کو آخرت کے واقعات کی یاد دہانی کرائیں اور اس کائنات کے شواہد بھی بتائیں۔ آپ کا بڑا فریضہ یہ ہے کہ یاد

دہانی کرائیں۔ اور یہ ایک متعین اور مقدر فریضہ ہے۔ دعوت اسلامی کے معاملے میں آپ کا کردار بس اسی قدر ہے کہ آپ دعوت پہنچادیں۔ اس کے بعد نہ آپ کا حق ہے کہ کچھ مزید کریں اور نہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ کا فریضہ یہ ہے کہ آپ دعوت پہنچائیں اس سے آگے آپ کسی کو اسلام پر مجبور کرنے کے مکلف نہیں ہیں۔

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيْطِرٍ (۸۸: ۲۲) "آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں"۔ کیونکہ دلوں کا مالک تو اللہ ہے۔ آپ جبر کر کے ان کے دلوں کو نہیں پھیر سکتے۔ دل تو اللہ کی انگلیوں کے درمیان ہیں۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ جس دل کو چاہے ایمان کی طرف پھیر دے۔

بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ صرف تبلیغ تھا تو پھر جہاد کیوں فرض کیا گیا؟ جہاد اس لیے نہیں فرض ہوا کہ لوگوں کو مومن بنایا جائے بلکہ اس لیے کہ تبلیغ کے راستے میں رکاوٹیں دور کی جائیں۔ یہ نہ ہو کہ لوگوں تک دین کی بات ہی نہ پہنچے اور یہ بھی نہ ہو کہ اگر کوئی دین اسلام کو قبول کر لے تو اس پر تشدد ہو۔ جہاد کا مقصد یہ تھا کہ تبلیغ دین کے راستے میں سیاسی رکاوٹیں دور کی جائیں۔ رسولؐ کا اصل فریضہ بہرحال دعوت دین ہے۔

یہ اشارات و ہدایات کہ رسول اللہؐ کی ڈیوٹی صرف تبلیغ ہے۔ اس کو قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ تبلیغ کرنے کے بعد بھی اگر لوگ نہیں مانتے تو رسول خداؐ پریشان نہ ہوں' ان کو تسلی ہو جائے کہ انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ وہ مطمئن ہو جائیں اور لوگوں کو تقدیر الٰہی کے حوالے کر دیں کہ وہ جو چاہے کرے۔ کیونکہ انسانوں بالخصوص دعوت اسلامی کا کام کرنے والوں کے دلوں میں اس بات کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ ان کا مشن کامیاب ہو اور غالب ہو۔ تمام لوگ اس کو قبول کر لیں اس لیے اللہ نے بار بار اس کی تاکید کی کہ داعی کا کام دعوت دینا ہے اور اسے اس قدر اخلاص سے کام کرنا چاہیے کہ ذاتی خواہش اور ذاتی پسند کو دعوت کے کھاتے سے نکال دے۔ اور دعوت کا کام جاری رکھے۔ آگے انجام کیا ہوتا ہے۔ یہ اللہ پر چھوڑ دے۔ اسے کیا ہے کہ کوئی مومن بنتا ہے یا کافر بنتا ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب کسی معاشرے میں دعوت اسلامی کے لیے حالات سازگار نہ ہوں۔ لوگ دین سے دور ہوں اور دین کی راہ میں مادی و سیاسی رکاوٹیں ہوں تو داعی کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

یہ بات کہ دعوت اسلامی ایک خیر محض ہے اور ہر انسان یہ خواہش رکھتا ہے کہ لوگ اس میں داخل ہو جائیں۔ اس خواہش کی شدت کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے بار بار یہ تلقین کی جاتی ہے کہ آپؐ کا کام صرف تبلیغ ہے۔ آپؐ کسی پر جبر نہیں کر سکتے۔ حالانکہ رسول اللہؐ خدا کے پیغمبر تھے۔ آپؐ اپنی ڈیوٹی کے حدود و قیود سے اچھی طرح واقف تھے۔ اللہ کے نظام قضا و قدر سے بھی واقف اور تربیت یافتہ تھے۔ اس لیے بھی اس نکتے کو قرآن نے بار بار مکرر کر کے بیان کیا ہے۔ لیکن اگر رسول اللہؐ کا فریضہ تبلیغ پر ختم ہو جاتا ہے' تو انکار کرنے والوں کا معاملہ بہرحال ختم نہیں ہوتا۔ اور نہ تکذیب کرنے والے چھوٹ جاتے ہیں اور صحیح سالم گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ اللہ موجود ہے اور تمام امور اللہ کے سامنے پیش ہونے والے ہیں۔

اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ (۲۳) فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ (۲۴) (۸۸: ۲۳ - ۲۴)

"البتہ جو شخص منہ موڑے گا اور انکار کرے گا تو اللہ اس کو بھاری سزا دے گا"۔ اس لیے کہ وہ صرف اللہ ہی کے

سامنے لوٹنے والے ہیں اور وہ یقیناً ان کو جزا دینے والا ہے' یہ اس سورت کا آخری اعلان ہے اور حتمی اور دو ٹوک اعلان ہے۔

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ (۲۵) ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (۸۸: ۲٦) "ان لوگوں کو پلٹنا ہماری طرف ہی ہے پھر ان کا حساب لینا ہماری ہی ذمہ داری ہے"۔ یوں دعوت اسلامی میں رسولؐ کے کردار پر بھی حدود و قیود عائد کر دیئے جاتے ہیں۔ اور آپؐ کے بعد بھی ہر داعی پر صرف دعوت دینا فرض ہے۔ یہ کہ ہر داعی کا کام یہ ہے کہ وہ یاد دہانی کراتا رہے اور حسب لینا اللہ کی ذمہ داری ہے۔ اللہ سے وہ کہیں بھاگ نہیں سکتے' نہ وہ اللہ کے محاسبے سے بچ سکتے ہیں۔ ہاں داعیان حق کی یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ انہوں نے دعوت اسلامی کے راستے میں پیدا کی جانے والی رکاوٹوں کو بھی دور کرنا ہے تاکہ لوگوں تک دعوت آزادانہ پہنچ سکے۔ اور رکاوٹیں دور کرنے کا کام فریضہ جہاد سے پورا ہوتا ہے جس طرح قرآن اور سیرت الرسول کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلام کے نظریہ جہاد کو کسی کمی اور بیشی کے سوا سمجھنا چاہیے۔ یہ بھی نہ ہو کہ اسلام کی راہ میں رکاوٹ موجود ہو' اور جہاد نہ کیا جائے۔ اور یہ بھی نہ ہو کہ تبلیغ کے راستے کھلے ہوں اور لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان کیا جائے۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الفجر ۔ ۸۹

ا -- تا -- ۳۰

سورۃ الفجر ایک نظر میں

یہ سورت اپنے عمومی اعتبار سے اس پارے کا انداز ہی رکھتی ہے' جیسا کہ کہا گیا اس پارے کے اہم موضوعات اور انداز یہ ہے کہ انسانی دل و دماغ کو بلند آواز میں ایمان' تقویٰ' دینی بیداری اور غور و فکر کی طرف بلایا جائے' لیکن اس کے اندر جو مطالعاتی سفر' جو اشارات اور فضا ہے اس کے کئی رنگ ہیں۔ مضامین' مناظر اور فضا کے اختلاف کے باوجود لہجہ کے اعتبار سے یہ یک رنگ ہے۔ انداز تعبیر کے لحاظ سے اس کا ترنم اور اور آہنگ متنوع ہے۔

اس کے بعض مناظر میں نہایت سنجیدہ حسن ہے' جن کے خدوخال تروتازہ' جن کے اثرات نرم مثلاً آغاز کا منظر' جس میں کائنات کی جھلکیاں بھی ہیں' جو نرم اور خوشگوار ہیں اور جس میں عبادت اور بندگی اور سرافگندگی کے مناظر بھی ہیں۔

وَالْفَجْرِ (۱) وَلَيَالٍ عَشْرٍ (۲) وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۳) وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ (٤) (۸۹: ۱ تا ٤) "قسم ہے فجر کی' اور دس راتوں کی' اور جفت اور طاق کی' اور رات کی جب رخصت ہو رہی ہو"۔

لیکن اس کے مقابلے میں' اس میں بعض مناظر ایسے ہیں جن کے اندر شدت اور بمباری یا سنگ باری جیسی سختی ہے۔ ظاہری مناظر کے لحاظ سے بھی' تلفظ اور موسیقی کے اعتبار سے بھی' مثلاً یہ سخت اور خوفناک منظر:

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا (۲۱) وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (۲۲) وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى (۲۳) يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِىْ (۲٤) فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗ اَحَدٌ (۲۵) وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗ اَحَدٌ (۲٦) (۸۹: ۲۱ تا ۲٦) "ہرگز نہیں' جب زمین پے درپے کوٹ کوٹ کر ریگ زار بنا دی جائے گی' اور تمہارا رب جلوہ فرما ہو گا اس حال میں کہ فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے' اور جہنم اس روز سامنے لے آئی جائے گی' اس دن انسان کو سمجھ آئے گی اس وقت اس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟ وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا! پھر اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں' اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں"۔

اس کے بعض مناظر تروتازہ ہیں۔ نرمی اور خوشگوار ماحول کے چشمے پھوٹ رہے ہیں' ہر سو اطمینان کی فضا ہے'

مناظر متوازن 'ہم آہنگ اور نغمے ہم آہنگ ہیں جیسا کہ سورت کی آخری آیات ـ

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (۲۷) ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (۲۸) فَادْخُلِیْ
فِیْ عِبٰدِیْ (۲۹) وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (۳۰) (۸۹: ۲۷ تا ۳۰) "اے نفس مطمئن چل اپنے
رب کی طرف اس حال میں کہ تو خوش اور پسندیدہ ہے' شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں"۔

اس سورت میں ایک جھلک اقوام گزشتہ کے سرکشوں کی بھی دکھائی گئی ہے ـ اس کا لہجہ بھی درمیانہ ہے جیسا کہ قصص کا لہجہ ہوتا ہے 'انداز بیانیہ اور نرم اور اثرات گہرے اور قوی ـ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ (٦) اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (٧) الَّتِیْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی
الْبِلَادِ (٨) وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (٩) وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ (١٠)
الَّذِيْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ (١١) فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ (١٢) فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ
سَوْطَ عَذَابٍ (١٣) اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (١٤) (۸۹: ٦ تا ١٤) "تم نے دیکھا نہیں
کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا۔ اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟ اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؟ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ؟ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا۔ آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے"۔

اس سورت میں غیر ایمانی تصورات اور غیر ایمانی قدروں کی ایک جھلک بھی ہی ـ انداز تعبیر اور اثرات کے اعتبار سے اس سورت میں اس جھلک کا اک خاص رنگ ہے ـ

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَكْرَمَنِ (١٥) وَاَمَّاۤ
الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَهَانَنِ (۸۹: ١٦) "مگر انسان کا حال یہ
ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا"۔

اس کے بعد ان کی اصل حقیقت بیان کر کے ان کے حالات کو رد کیا جاتا ہے 'جس کی وجہ سے ان کے ذہنوں میں یہ خیالات 'تصورات اور قدریں ابھر کر سامنے آئیں ـ یہ آیات اپنی اپنی عبارت انداز بیان اور ترنم کے اعتبار سے دو رنگ رکھتی ہیں ـ

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۱۷) وَ لَا تَحٰضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۱۸)
وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۱۹) وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۲۰) (۸۹:۱۷ تا ۲۰)

"ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے' اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے' اور میراث کا سارامال سمیٹ کر کھا جاتے ہو' اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو"۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اندازبیان کا یہ آخری رنگ ان کے حالات اور ان کے انجام' جلد ہی آنے والے انجام کے درمیان پل کا کام کرتا ہے۔ اس کے بعد سورت میں یہ آیات ہیں۔

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا (۸۹:۲۱) یہ انداز گویا پہلے نرم انداز اور آخر میں آنے والے شدید منظر کے درمیان وسط درجے کا ہے۔

اس سرسری تبصرے سے معلوم ہو گا کہ سورت میں آنے والے مناظر کے رنگ مختلف ہیں۔ اس کا انداز تعبیر اور اس کے اثرات سب مختلف النوع ہیں۔ پھر اس میں قافیوں اور فواصل کا نظام بھی مختلف ہے' جس طرح معانی اور موقف اور منظر مختلف ہے۔ پس اس زاویہ سے یہ سورت قرآن کے متوازن خوبصورت اور متناسب اندازبیان کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ جبکہ اس کا انداز بھی خوبصورت اور مانوس ہے۔

رہی یہ بات کہ اس سورت کے اغراض و مقاصد کیا ہیں' جن کے لیے یہ خوبصورت اور متوازن اندازبیان اختیار کیا گیا ہے تو مناسب ہے کہ تفصیلی تشریح آیات میں مطالعہ کیا جائے۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۲۸۹ تشریح آیات

۱-- تا-- ۳۰

سورۃ الفجر (۸۹) مکیۃ (۱۰) آیاتہا ۳۰ رکوعہا ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالْفَجْرِ ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿۲﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿۳﴾ وَالَّيْلِ إِذَا يَسْرِ ﴿۴﴾ هَلْ فِي ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے فجر کی' اور دس راتوں کی' اور جفت اور طاق کی' اور رات کی جب رخصت ہو رہی ہو"۔

اس سورت کے آغاز میں قسم اٹھانے کے لیے ایسے مناظر اور مخلوقات کا انتخاب کیا گیا ہے جو انسانوں کے مانوس مناظر ہیں اور ایک لطیف روح رکھتے ہیں اور صاف و شفاف ہیں۔ "الفجر" ایک ایسا وقت ہے جس میں زندگی نہایت خوشگوار موڈ میں سانس لیتی ہے۔ نہایت خوشی' تبسم' محبت اور تروتازہ لگاؤ کے جذبات میں یہ پوری کائنات انگڑائی لیتی ہے۔ فجر کے یہ سانس گویا مناجات الہیہ کے انفاس ہیں۔ اور فجر کے وقت ہر چیز کھلی کھلی ہوتی ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ کلیاں خوشی کی وجہ سے کھل رہی ہیں۔

وَلَيَالٍ عَشْرٍ (۸۹: ۲) "دس راتوں کی قسم"۔ ان دس راتوں کو قرآن نے مطلق چھوڑا ہے' ان کی تفسیر میں اقوال و روایات وارد ہیں' بعض میں ذوالحجہ کی دس راتیں' بعض میں محرم کی دس راتیں' اور بعض میں رمضان کی دس راتوں کا ذکر آیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ان کو اسی طرح مطلق اور عام ہی رہنے دینا چاہئے اور یہی زیادہ خوشگوار ہے۔ یہ دس راتیں جن کو اللہ ہی جانتا ہے اور اللہ کے ہاں جن کی ایک منزلت و اہمیت ہے' سیاق کلام میں ان دس راتوں پر یوں روشنی پڑتی ہے کہ شاید یہ ایک شخصیت اور ایک ذی روح راتیں ہیں' جس طرح زندہ ذی روح مخلوق ہوتی ہے۔ یہ راتیں ہم سے محبت کرتی ہیں' اور ہم ان سے محبت کرتے ہیں' اس قرآنی تعبیر کے آئینے میں۔

وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۸۹: ۳) "اور جفت و طاق کی قسم"۔ اس مانوس اور محبوب فضائے صبح گاہی میں اور قابل قدر دس راتوں میں شفع و تر روح صلوٰۃ ہیں۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں: "نماز میں سے شفع بھی ہے اور وتر

(ترمذی)۔ ان آیات میں جو فضا پائی جاتی ہے اس میں یہی مفہوم زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس چھا جانے والی کائنات کی روح کے ساتھ عبادت گزار روح کا اتصال ہی موزوں مفہوم ہے' جس طرح ایک عبادت گزار روح اللہ کی پسندیدہ دس راتوں کی روح کے ساتھ وصال پاتی ہے اور پھر یہ راتیں اور یہ روشن نمود صبح سب باہم ملتے ہیں۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ (۸۹ : ۴) "اور رات کی قسم جب وہ رخصت ہو رہی ہو"۔ یہ رات ہے یا کوئی زندہ مخلوق ہے جو اس کائنات میں چلتی پھرتی ہے' گویا وہ عاشق زار ہے جو راتوں کو سرگرداں ہے' یا مسافر ہے جو دور دراز منزل کی طرف رات کو رواں دواں ہے۔ کیا ہی خوبصورت انداز بیان ہے! منظر کس قدر مانوس ہے؟ الفاظ کا ترنم کس قدر خوشگوار ہے۔ فجر' لیالی عشر اور الشفع والوتر میں الفاظ' ترنم اور معانی کی ہم آہنگی قابل دید ہے۔ الفاظ و عبارات نہیں بلکہ نمود صبح کے خوشگوار اور گرم سانس ہیں' خوشبودار آوازیں' قلب حزیں کی پر محبت مکالمات ہیں یا روح کی لطیف سرگوشیاں ہیں یا انسانی ضمیر کی بیداری کے اشارات و لمحات ہیں۔

ذرا خوبصورتی کو دیکھیں' پر محبت سرگوشیوں سے بھرپور حسن' آزاد شاعرانہ حسن اس کا پاسنگ بھی نہیں۔ یہ تو معجزانہ تخلیقی حسن ہے اور حسن و جمال کے ساتھ حقائق پر مشتمل بھی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان قسموں کے بعد متصلاً یہ کہا جاتا ہے۔

هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ (۸۹ : ۵) "کیا اس میں صاحب عقل کے لیے کوئی قسم ہے؟" یہ ایک تقریری سوال ہے جس کا جواب ہے "بے شک اس میں قسم ہے ایک عقلمند آدمی کے لیے "ہاں"۔ اس میں ہر صاحب عقل و خرد کے لیے تسلی و تشفی ہے"۔ اس اثبات کے لیے استفہام کا انداز اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ انداز نرم اور سرگوشی کے انداز کے ساتھ زیادہ مناسب ہے' جو ان قسموں میں پایا جاتا ہے۔

یہاں اس بات کو سیاق کلام میں لپیٹ کر رکھ دیا گیا ہے جس پر قسم اٹھائی گئی تاکہ تجسس قائم رہے اور بعد کا مضمون اس کی تشریح کر دے۔ بعد کا موضوع ہے سرکشی' فساد اور ظلم اور حد سے تجاوز کا۔ اور ایسے لوگوں کے ساتھ دست قدرت کے رویے کا۔ یہ کہ ایسے لوگوں سے لازماً اللہ انتقام لیتا ہے اور اسی پر اللہ قسم اٹھاتا ہے اور قسم بھی نہایت ہی نرم' اشاراتی اور اجمالی انداز میں اٹھائی گئی۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿۶﴾ اِرَمَ
ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿۷﴾ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴿۸﴾ وَ ثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا
الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴿۹﴾ وَ فِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۱﴾
فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾ اِنَّ رَبَّكَ
لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾

”تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا۔ اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟ اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؟ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ؟ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا۔ آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے“۔

اس قسم کے مطابق سیاق کلام میں استفہام کا صیغہ پرکشش ہوتا ہے اور وہ سامعین کو زیادہ متوجہ کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ ابتداً یہ خطاب تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن بعدہ ہر اس شخص کو خطاب ہے جو ان اقوام کے عبرت آموز واقعات سے سبق لینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جس زمانے میں یہ آیات اتریں ' مخاطبین کے درمیان ان اقوام کے قصے معروف و مشہور تھے۔ اس علاقے میں جو آثار قدیمہ ابھی تک باقی ہیں اور جو قصے ابھی تک زبان زدعام ہیں ' ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوام کے بارے میں عرب اچھی طرح جانتے تھے۔ یہاں فعل کا فاعل ”ربک“ کو لایا گیا ہے۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس وقت کے مٹھی بھر مسلمانوں کے لیے سامان اطمینان ہے۔ اس وقت مکہ کے مسلمان قریش کے سرکشوں کے ہاتھوں مظالم جھیل رہے تھے اور ان کے خلاف یہ لوگ ہر محاذ پر راہ روکے کھڑے تھے۔ اس پیرایہ اظہار سے ان کے دلوں میں راحت اور محبت پیدا ہوتی ہے۔

ان مختصر آیات میں اللہ نے تاریخ انسانی کے سرکردہ جباروں کی داستانوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک مشہور قوم عاد ارم ہے جسے عاد اولیٰ بھی کہا گیا ہے۔ یہ ان عربوں میں سے تھے جو ابتدائی ادوار میں خالص عرب تھے (عاربہ) یا ان عربوں میں سے تھے جن کی نسل ختم ہوگئی ہے (بائدہ) یہ لوگ احقاف میں رہتے تھے ' احقاف ریت کے ٹیلوں کو کہتے ہیں۔ جنوب عرب میں یمن اور حضرموت کے درمیان ان کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ یہ بدوی لوگ تھے اور ایسے خیموں میں رہے تھے جو ستونوں پر قائم ہوتے تھے۔ قرآن کریم میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ یہ بڑے قوی تھے اور سخت گرفت کی طاقت رکھتے تھے۔ اپنے وقت پر یہ قوی تر قوم تھی اور اقوام میں زیادہ ممتاز تھی۔

الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ (۸۹ : ۸) ”جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی“ یعنی اس وقت تک۔

وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (۸۹ : ۹) ”اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں۔ ثمود حجر میں رہتے تھے۔ یہ جزیرۃ العرب کے شمال میں ہے۔ مدینہ اور شام کے درمیان وادی حجر ہے۔ انہوں نے چٹانیں کاٹ کر بڑے بڑے محلات بنا رکھے تھے اور پہاڑوں کے اندر قلعے اور غار بنا رکھے تھے۔

وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ (۸۹ : ۱۰) ”اور میخوں والے فرعون کے ساتھ۔ راجح بات یہ ہے کہ اوتاد سے مراد اہرام ہیں جو میخوں کی طرح زمین میں نصب ہیں۔ اور نہایت پختہ بنیادوں پر ہیں۔ جس فرعون کی طرف یہاں اشارہ ہے وہ فرعون موسیٰ ہے جو بہت سرکش تھا اور جبار تھا۔

الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ (۱۱) فَاَکْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ (۸۹ : ۱۲) ”یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا“۔ سرکشی کے بعد فساد ہی ہوتا ہے کیونکہ

سرکشی' سرکش شخص کو خراب کر دیتی ہے ۔ اسی طرح جو لوگ سرکشی اور ظلم کا شکار ہوتے ہیں وہ بھی فساد میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ ان کے اندر اخلاقی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس کے بعد اجتماعی زندگی کا ہر پہلو فساد کی زد میں آ جاتا ہے اور زندگی اپنی صحت مند تعمیری اور پاکیزہ راستے سے ہٹ جاتی ہے اور ایسے راستوں پر پڑ جاتی ہے جو انسان کی خلیفہ اللہ فی الارض ہونے کی ذمہ داری کے خلاف ہوتی ہے ۔

طغیانی اور سرکشی کی وجہ سے عوام الناس غلام اور ذلیل ہو جاتے ہیں' ان کے اندر ایک خفیہ بغض اور حسد پیدا ہو جاتا ہے ۔ وہ غصہ اور حسد کو ہروقت سینوں میں دبائے رکھتے ہیں ۔ اس طرح کے لوگوں کی شخصیت سے عزت نفس اور اعلیٰ انسانی شعور مٹ جاتا ہے' اور ان میں سے تخلیقی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے ۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ تخلیقی عمل کے لیے آزاد فضا کا ہونا ضروری ہے ۔ اور جس سوسائٹی کو کوئی ڈکٹیٹر ذلیل کر کے رکھتا ہے وہ متعفن ہو جاتی ہے ۔ اور ایک سڑی ہوئی سوسائٹی ہوتی ہے ۔ اس میں لوگ اس طرح گری ہوئی زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح کیڑے مکوڑے ۔ زیادہ سے زیادہ وہ گری ہوئی عادتوں اور عیاشیوں کے رسیا ہو جاتے ہیں ۔ ان کی قوائے عقل و خرد ماند پڑ جاتی ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں ایسے لوگوں کے اندر جرائم پیدا ہو جاتے ہیں ۔ ایسے لوگوں کے اندر خودداری ہمت' بلند عزائم' بلند نگاہی جیسی اعلیٰ صفات ختم ہو جاتی ہیں اور یہ ہے بہت عظیم بگاڑ ۔

ڈکٹیٹر اور جبار ہمیشہ اعلیٰ قدروں اور سیدھی سوچ کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیتے ہیں ۔ اس لیے اعلیٰ اقدار اور سیدھی سوچ کے نتیجے میں ان کے باطل اقتدار کو خطرہ ہوتا ہے ۔ اس لیے جبار ہمیشہ لوگوں کے لیے کھوٹی قدریں وضع کرتے اور معاشروں میں فاسد پیمانے رائج کرتے ہیں اور غلط افکار و تصورات کو رائج کر کے خوشنما بناتے ہیں تاکہ لوگ ان کے عدوان اور قہاری و جباری کو قبول کریں ۔ اور اسے ایک پاپولر اور مقبول اور مروج نظریہ سمجھیں ۔ اور یہ ہے وہ بڑا فساد جس سے اور کوئی بڑا فساد نہیں ہے ۔ اور جب یہ لوگ زمین کے اندر ہمہ جہت فساد پھیلا دیتے ہیں' اس لیے زمین کی تطہیر ضروری ہو جاتی ہے ۔

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ (١٣) اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (٨٩: ١٤)

"آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے" ۔ تمہارے گھات میں ہے اور وہ ان کے اعمال کو ریکارڈ کر رہا ہے اور جب ان کا فساد حد سے زیادہ ہو گیا تو اللہ کا کوڑا بجنے لگتا ہے اور ان پر اس دنیا ہی میں عذاب الٰہی نازل ہونے کا عمل جاری ہو جاتا ہے ۔ عذاب کے کوڑے سے مراد یہاں عذاب کی شدت اور چبھن ہے ۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کا عذاب بہت عام اور ہمہ گیر ہوتا ہے اور وہ ہر طرف سے ان سرکشوں پر انڈیل دیا جاتا ہے ۔ جس کے اندر درد چبھن اور گہرائی ہوتی ہے' اور یہ ان سرکشوں کو لے ڈوبتا ہے ۔ جنہوں نے اپنی سرکشیوں کی وجہ سے زمین کو فساد سے بھر دیا تھا ۔

جباروں اور ڈکٹیٹروں کے اس انجام کو دیکھ کر ایسے اہل ایمان اور داعیان حق کے دلوں پر اطمینان کے فیوض نازل ہو جاتے ہیں' جن کو اس قسم کے ظالموں اور سرکشوں سے واسطہ ہوتا ہے' چاہے وہ جس زمان و مکان میں ہوں اور پھر قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں ۔

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (۹۸:۱٤) "حقیقت ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے"۔ یعنی تمہارا رب حاضر و ناظر ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے اور اس کی نظروں سے کوئی چیز اوجھل نہیں ہوتی۔ وہ نگرانی کر رہا ہے اور اس کی نظر سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ لہٰذا ایمان والوں کو چاہیے کہ وہ مطمئن ہوں' ان کی مصیبتیں دور ہوں گی اس لیے کہ رب دیکھ رہا ہے اور وہ شر و فساد کا دفیعہ خود کرے گا اور قیامت میں سزا بھی دے گا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں دعوت اسلامی کو نہایت ہی عجیب طریقوں سے مدد دی جاتی ہے ہر جگہ اصحاب البروج والا طریقہ پیش نہیں آتا۔ اسی طریقے کے مطابق قرآن دین کے لیے کام کرنے والوں کی اسی انداز سے تربیت کرتا ہے اور مختلف حالات اور مختلف ماحول میں مختلف انداز سے ان کی تربیت اور نصرت ہوتی رہتی ہے اور داعیان حق کے لیے اطمینان کا سامان ہوتا رہتا ہے۔ اہل ایمان دو باتوں کی توقع رکھتے ہیں اور اپنی جدوجہد کے بعد فیصلہ اور انجام اللہ کی مشیت کے حوالے کر دیتے ہیں کہ وہ دیکھ رہا ہے۔

تمہارا رب گھات لگائے بیٹھا ہے۔ حاضر و ناظر ہے' دیکھ رہا ہے' حساب و کتاب تیار ہو رہا ہے اور نہایت ہی صحیح اعمال نامے کی اساس پر وہ جزاء و سزا دے گا۔ جس میں نہ غلطی ہوگی' نہ ظلم ہوگا اور نہ وہ دنیا کے حساب کی طرح محض ظاہری حالات پر مبنی ہوگا بلکہ وہاں تو تمام امور کا فیصلہ حقائق کے مطابق ہوگا۔ رہا انسان تو دنیا میں اس کے موازنے بھی غلط ہو جاتے ہیں۔ اندازے بھی غلط ہو جاتے ہیں اور شہادتوں میں بھی وہ ظاہر پر فیصلہ کرتا ہے' الا یہ کہ وہ کوئی فیصلہ اللہ کی شریعت کے مطابق کرے اور اسلامی تصور حیات کے مطابق سوچے۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ
رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿١٥﴾ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ
اَهَانَنِ ﴿١٦﴾

"مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا"۔

یہ تو ہے' انسان کی سوچ' ان حالات کے بارے میں جن سے وہ گزرتا ہے۔ کبھی وہ امیر ہوتا ہے' کبھی غریب ہوتا ہے' کبھی فراخی نصیب ہوتی ہے اور کبھی تنگی۔ کبھی اللہ اسے نعمتوں اور عزتوں سے آزماتا ہے کبھی جاہ و مال سے اس کی آزمائش ہوتی ہے لیکن وہ سمجھ نہیں پاتا کہ یہ تو آزمائش ہو رہی ہے کہ اگر وہ کامیاب ہوا تو اسے جزاء ملے۔ لیکن اس کی سوچ یہ ہے کہ وہ مال و منال کی فراخی اور عزت و جاہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک اس مقام و مرتبہ کا مستحق ہے اور یہ دولت اور یہ عزت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے وہ آزمائش کو انعام سمجھتا ہے اور امتحان کو نتیجہ سمجھتا ہے۔ اور اللہ کے نزدیک عزت و مقام کو وہ اس دنیا کی عزت اور مقام پر

قیاس کرتا ہے ۔اسی طرح ایسا شخص اگر غریب ہو جائے تو یہ سمجھتا ہے شاید اسے سزا دے دی گئی ہے ۔اور وہ آزمائش کو سزا سمجھتا ہے ۔ اور اگر اللہ نے اس کے رزق میں کمی کر دی ہے تو یہ اسے سزا اور توہین سمجھتا ہے ۔اس کی سوچ یوں ہے کہ اگر یہ توہین آمیز سلوک نہ ہوتا تو اللہ اسے غریب نہ بناتا۔

دونوں حالتوں میں ایسا سوچنے والا شخص غلطی پر ہوتا ہے ۔جس طرح اس کی سوچ غلط ہے اسی طرح اس کا اندازہ بھی غلط ہے ۔ اصل بات یہ ہے کہ رزق کی تنگی بھی آزمائش ہے اور کشادگی بھی آزمائش ہے ۔کشادگی یوں آزمائش ہے کہ آیا اس پر وہ شکر ادا کرتا ہے یا دولت کو ظلم و سرکشی کا سبب بناتا ہے اور تنگی کی صورت میں آیا وہ صبر کرتا ہے یا ترش مزاجی کا اظہار کرتا ہے ۔ دونوں حالات میں اس کا جو ردعمل ہو گا اسی کے مطابق جزاء و سزا ہو گی ۔ دنیا کا مال اور دنیا کی غربت بذات خود نہ جزاء ہیں اور نہ سزا ہیں ۔ اللہ کے بندوں کو ان کی دولت کی بنا پر نہیں تولا جاتا۔ نہ اس دنیا میں اللہ کی طرف نعمت کا عطا ہونا یا منع کیا جانا علامت ہے اللہ کی رضامندی کی یا اللہ کی طرف سے ناراضگی کی ۔ اللہ تو نیکو کاروں کو بھی دیتا ہے اور بدکاروں کو بھی دیتا ہے 'اور نیکو کاروں سے منع بھی کرتا ہے اور عطا بھی کرتا ہے ۔

انسان کا قلب ایمان سے خالی ہوتا ہے 'تو وہ اللہ کی جانب سے دین یا محروم کرنے کی حکمت کو نہیں سمجھ پاتا۔ اور نہ وہ اللہ کے ہاں مقرر کردہ حسن و قبح کے پیمانوں کو سمجھتا ہے اور جب کسی کا دل ایمان سے بھر جاتا ہے تو وہ خدا رسیدہ ہوتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے میزان میں کیا چیز وزن دار ہے ۔اس لیے ایسے شخص کے نزدیک دنیا کی کم قیمت منافع ہلکے ہو جاتے ہیں اور وہ جانتا ہے کہ آزمائش کے نتیجے میں جزاء ملتی ہے تو وہ رزق کی کشادگی اور تنگی دونوں حالتوں میں قیامت کے لیے کام کرتا ہے اور دونوں حالتوں میں تقدیر الٰہی پر مطمئن ہوتا ہے اور دنیا کی ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کے بغیر بھی ' اللہ کے ہاں جو اقدار وزن دار ہیں ان کو سمجھتا ہے اور دنیا کی بے وزن قدریں اسے ہیچ نظر آتی ہیں ۔

قرآن کریم کے براہ راست مخاطب مکہ کے کچھ لوگ تھے ۔ایسے لوگ ہر سوسائٹی میں پائے جاتے ہیں ۔ ان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا سے وسیع تر دنیا اور بڑی دنیا کا تصور نہیں کر پاتے ۔ یہ ایسے لوگ تھے جو تنگی رزق اور کشادگی رزق کے بارے میں اور اللہ کے بارے میں یہ تصور رکھتے تھے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ وہ اپنی اس سوچ کے مطابق اس زمین پر لوگوں کی قدر و قیمت متعین کرتے تھے ۔ خلاصہ یہ کہ ان کے نزدیک مال و جاہ ہی سب کچھ تھا۔ اس سے آگے ان کے نزدیک کوئی پیمانہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دولت کے پیچھے مرتے تھے اور مال کی محبت میں حد سے گزر جاتے تھے ۔جس کی وجہ سے وہ بے حد لالچی اور ہر کسی سے فائدے کی امید اپنے دل میں لیے ہوئے تھے 'اور اس جذبہ کی وجہ سے یہ لوگ سخت لالچی ہو گئے تھے ۔ چنانچہ اللہ یہاں ان لوگوں کی دلی حالت کو ذرا کھولتا ہے اور بتاتا ہے کہ مال و دولت کی یہ لالچ جو ان کے دلوں میں رچی بسی ہے 'وہ اس وجہ سے کہ مال و دولت کے بارے میں ان کی سوچ غلط ہے ۔ یہ نہیں سمجھتے کہ مال و دولت نعمت ہی نہیں بلکہ آزمائش بھی ہے ۔ اسی طرح غربت بھی مصیبت ہی نہیں بلکہ آزمائش ہے ۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿١٧﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿١٨﴾ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾

”ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے ' اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے ' اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو ' اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو“۔

بلکہ یوں نہیں جس طرح ایمان سے خالی انسان سوچتا ہے ۔ محض یہ کہ کسی کو کشادہ رزق دیا گیا ہے ۔ یہ اللہ کے نزدیک کرامت والی بات نہیں ہے ' اور نہ تنگی رزق اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے شخص کی اللہ کے ہاں کوئی قدر نہیں ہے اور اسے اللہ نے چھوڑ دیا ہے ۔ اصل بات یہ ہے کہ تم دولت کا حق ادا نہیں کرتے اور مال سے حقوق نہیں نکالتے ۔ تم لوگ یتیم کی کفالت بھی نہیں کرتے ' جو اپنے والدین اور اولیاء اور سرپرستوں سے محروم ہو گیا ہے ۔ اسی طرح معاشرے کے اندر موجود ناداروں کی معاشی کفالت کے لیے کوئی بندوبست نہیں کرتے ۔ مسکین کے معنی ہیں وہ شخص جو ساکن ہے ' سکون سے بیٹھا ہے اور لوگوں سے مانگتا نہیں پھرتا ۔ یہاں یہ کہا گیا کہ یتیموں اور مسکینوں کے کھانے یعنی معاشی ضروریات فراہم کرنے کے لیے دوسروں کو نہیں ابھارتا ۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اسلامی نظام میں ناداروں کی کفالت کے لیے ایک عام تحریک ہوتی ہے ' عام لوگوں کی بھلائی کے لیے لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھتے اور ایک دوسرے کو آمادہ کرتے ہیں ۔ ناداروں کی کفالت اسلام کی خصوصیت ہے ۔

تم لوگ ابتلا کا مفہوم سمجھتے ہو ۔ نہ اس آزمائش میں کامیاب ہونا چاہتے ہو ' حالانکہ اس آزمائش میں کامیابی کی راہ یہ ہے کہ یتیم کی عزت کرو ' ایک دوسرے کو یہ وصیت اور تلقین کرو کہ یتیموں کو کھانا کھلایا جائے بلکہ تم اس کے برعکس صورت اختیار کرتے رہو ۔ تم لوگ نہایت لالچ کے ساتھ پوری کی پوری میراث ہڑپ کر جاتے ہو ' اور تم مال کی بھرپور محبت کرتے ہو ' جو کسی حد میں محدود نہیں ہے ۔ مال کے معاملے میں تمہارے اندر کوئی خودداری ' کوئی وضع داری نہیں ہے ۔ اور تم محتاجوں کی نہ عزت کرتے ہو اور نہ ان کی حاجت براری کرتے ہو ۔

جیسا کہ ہم نے اس سے قبل تفصیلات دی ہیں ' مکہ میں ایسی صورت حال تھی کہ لوگ بے حد لالچی اور مفادات کے پیچھے کتوں کی طرح بھاگنے والے تھے ' اور ہر طریقے سے دولت سمیٹتے تھے ' جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں بخل اور سنگدلی پیدا ہو گئی تھی ۔ یتیم چونکہ بے سہارا ہوتے تھے اس لیے ان کے مال ہڑپ کر لیے جاتے تھے ۔ خصوصاً یتیم عورت کے ۔ پھر ان کو میراث سے محروم کر دیتے تھے جیسا کہ متعدد مقامات پر ہم نے تفصیلات دی ہیں ۔ ان ہتھکنڈوں کے علاوہ سودی کاروبار کے ذریعہ بھی اہل مکہ رات دن دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے ۔ یہ بات یہاں نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ دولت کی پرستش ہر جاہلیت کی خصوصیت ہوتی ہے جہاں بھی ہو اور جب بھی ہو ۔

ان آیات میں نہ صرف یہ کہ ان کے موقف کو اچھی طرح بیان کیا گیا ہے بلکہ ان کی مذمت بھی کی گئی ہے اور اس صورت حال کو بڑی سختی سے ناقابل برداشت بنایا گیا ہے اور اس کے لیے لفظ ”کلا“ استعمال کیا گیا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ' ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے ۔ آیات کے انداز بیان اور زوردار تعبیر اور الفاظ کے زبردست لہجے سے بھی اس صورت حالات کی مذمت نکلتی ہے ۔ ذرا دوبارہ غور کریں ۔

وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۱۹) وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹ : ۲۰) ”اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو“۔

یہاں تک کہ ان کی ناپسندیدہ حالات کی تصویر کشی کر دی گئی اور امارت اور غربت کے بارے میں ان کے غلط تصور کی

تردید کر دی گئی۔ اب ان کو قیامت کی حقیقت اور اس کے مرعوب کن حالات اور آزمائش کے نتائج اور جزاء و سزا اور حساب و کتاب کے مناظر کو نہایت ہی زور دار الفاظ میں لایا جاتا ہے۔

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ وَجِایْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِىْ ﴿۲۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾

"ہرگز نہیں، جب زمین پے در پے کوٹ کوٹ کر ریگ زار بنا دی جائے گی، اور تمہارا رب جلوہ فرما ہو گا اس حال میں کہ فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے، اور جہنم اس روز سامنے لے آئی جائے گی، اس دن انسان کو سمجھ آئے گی اس وقت اس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟ وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا! پھر اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں، اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں"۔

دُكَّتِ الْاَرْضُ (۸۹ : ۲۱) "زمین کو کوٹا جائے گا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نشانات مٹا کر اسے برابر کر دیا جائے گا۔ یہ ان انقلابات میں سے ایک ہے جو قیامت کے وقوع کے وقت اس کائنات میں برپا ہوں گے۔ رہی یہ بات کہ رب تعالیٰ نزول اجلال فرمائے گا اور فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے تو یہ ایک غیبی معاملہ ہے۔ اس کی حقیقت کو اس وقت تک ہم سمجھ نہیں سکتے، کیونکہ ابھی ہم اس دنیا میں ہیں اور ہماری قوت ادراک محدود ہے۔ البتہ اس انداز تعبیر سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ بہت ہی ہیبتناک اور خوفناک صورت حال ہو گی۔ اسی طرح جہنم کو لایا جانا پوری طرح ہماری فہم سے دور ہے۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ مجرم اس کے قریب ہو جائیں گے اور وہ اہل جہنم سے قریب ہو جائے گی۔ رہی اصل کیفیت اور صورت حالات تو وہ ایک غیبی امر ہے اور یہ اسی دن اچھی طرح معلوم ہو گی جب برپا ہو گی۔

ان آیات کے ذریعہ ایک ایسی منظر کی تصویر کشی کی گئی ہے جس سے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ آنکھیں سہم کر جھک جاتی ہیں۔ الفاظ کا تلفظ اور ترنم بھی خوفناک ہے اور مناظر کی شدید گرفت ہے۔ زمین کا ریزہ ریزہ کر دیا جانا۔ رب تعالیٰ کا نزول و جلال اور فیصلے کرنا فرشتوں کا صف بستہ کھڑے ہونا اور جہنم کا تیار کر کے حاضر کر دیا جانا، ایسے مناظر ہیں جن کی وجہ سے انسان پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ (۸۹ : ۲۳) "اس دن بات انسان کی سمجھ میں آ جائے گی"۔ وہ انسان اصل حقیقت کو سمجھ جائے گا جو اس جہاں میں امیری اور غریبی کی حقیقت کو بھی سمجھ نہ پا رہا تھا۔ جو میراث کا تمام مال سمیٹ کر کھا جاتا تھا۔ اور یتیموں اور عورتوں کا حق بھی مار لیتا تھا۔ اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار تھا۔ نہ یتیم کا اکرام کرتا تھا اور نہ مساکین کی معیشت کے لیے کوئی دوڑ دھوپ کرتا تھا۔ جو سرکش تھا اور جس نے اپنی دولت اور اقتدار کے بل بوتے

پر زمین کو فساد سے بھر دیا تھا۔ ایسا شخص آج سب کچھ سمجھ لے گا اور وہ نصیحت کو اچھی طرح قبول کرلے گا لیکن اب تو وقت جا چکا ہے۔

وَ اَنّٰی لَہُ الذِّکْرٰی (۸۹: ۲۳) "لیکن اس وقت اس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟" نصیحت لینے اور عمل کرنے کا وقت تو جا چکا ہے۔ آج نصیحت کیا فائدہ دے گی۔ یہ تو دارالجزاء ہے۔ اب تو حسرت ہی حسرت ہے۔ تمہارے لیے دارالعمل تو دنیا کی زندگی تھی جہاں تم نہ سمجھے اور نہ عمل کیا۔

یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ (۸۹: ۲۴) "وہ کہے گا کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا"۔ کچھ کمائی کرکے اس جہاں کے لیے جمع کی ہوتی' حقیقی زندگی تو یہ ہے جسے زندگی کہا جا سکتا ہے۔ تیاریاں اور کمائی اور ذخیرہ تو اس زندگی کے لیے ضروری تھا' اے کاش کہ میں نے کچھ کیا ہوتا! یہ ہوگی حسرت ناک تمنا۔ اور وہاں انسان ان حسرتناک تمناؤں کے سوا اور کر کیا سکے گا۔

ان دل دوز حسرتوں اور بے کار تمناؤں کے بعد اب اس کا انجام مختصراً یہ ہوگا۔

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَہٗ اَحَدٌ (۲۵) وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَہٗ اَحَدٌ (۸۹: ۲۶) "پھر اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں"۔ اللہ قہار و جبار ہے۔ وہ اس دن ایسا عذاب دے گا جس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ اور اس دن اس کے باندھنے کا انداز بھی ایسا ہوگا جیسا انداز یہاں متصور نہیں ہے۔ اور اللہ کی پکڑ اور اس کے عذاب کے مناظر قرآن کریم نے بڑی کثرت' نہایت دلنشیں انداز میں بیان کیے ہیں۔ یہاں صرف یہ کہا گیا ہے کہ وہ عذاب بھی منفرد ہوگا اور وہ گرفتاری بھی منفرد ہوگی اور ایسی ہوگی کہ اس جہاں میں ان کی کوئی مثال نہیں ہے۔ اور یہ صورت حال ان صورتوں کے بالمقابل ہے جو اس سورت میں عاد' ثمود اور فرعون کی پکڑ' ان کے مظالم' ان کی جباری اور ان کے شر و فساد کی بتائی گئی ہیں کہ وہ لوگوں کو پکڑتے تھے اور ظلم کرتے تھے تو اے نبی اور اے اہل ایمان جو لوگ یہاں مسلمانوں پر مظالم کرتے رہے ہیں یا کر رہے ہیں اور ان پر تشدد کر رہے ہیں۔ ان کا حال قیامت میں ایسا ہوگا اور اللہ کے عذاب اور پکڑ اور مخلوق کے عذاب اور پکڑ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دنیا کے لوگ جو عذاب دیتے ہیں اور تشدد کرتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں۔ بمقابلہ اس کے جس سے یہ لوگ دوچار ہونے والے ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ جو چاہیں کریں۔ لیکن یاد رکھیں کہ ان کا حشر بہت برا ہونے والا ہے جو ہمارے تصور سے بھی بہت بڑا ہے۔

ایسے ہولناک مناظر میں' شدید پکڑ اور شدید عذاب کے مناظر میں' جس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے' ایک پکار آتی ہے۔ یہ نفس مطمئنہ کے نام ہے اور ملاء اعلیٰ سے ہے۔

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً
ع ۳۰ مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ﴿۲۹﴾ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾
۱۴

"(دوسری طرف ارشاد ہوگا) اے نفس مطمئن' چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو خوش اور پسندیدہ ہے' شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں"۔

کس قدر پر محبت' مکمل یگانگت اور قرب کا ماحول ہے! اے نفس مطمئنہ' کس قدر روحانیت اور کس قدر تکریم اور عزت افزائی ہے۔ اس پکار میں۔

یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (٨٩:٢٧) "اے نفس مطمئن" جبکہ دوسری طرف بے مثال پکڑ دھکڑ شروع ہے' بے مثال اور ناقابل تصور عذاب دیا جارہا ہے' شدید ماحول ہے' اس شدید ماحول میں' یہ نرم اور پر محبت پکار!

ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ (٨٩:٢٨) "چل اپنے رب کی طرف"۔ چل اپنے اصل سرچشمے کی طرف' اپنے اصل گہوارے کی طرف' جو زمین کے اندر دوڑ رہا ہے' لوٹ اب اپنے رب کی طرف' تمہارے اور رب کے درمیان ایک خاص تعلق ہے' ایک خاص نسبت ہے' ایک خاص شناسائی ہے۔

رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (٨٩:٢٨) "تو بھی خوش ہے اور اللہ بھی تجھ سے خوش ہے"۔ ماحول پر اس خوشگوار اعلان سے محبت و رضا کے فیوض طاری ہو جاتے ہیں"۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ (٨٩:٢٩) "میرے بندوں میں داخل ہو جا"۔ جو میرے قریب و مختار بندے ہیں اور تو بھی یہ قرب پائے۔

وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (٨٩:٣٠) "اور میری جنت میں داخل ہو جا!" میری حمایت میں اور میری رحمت میں۔

ان آیات میں جو محبت و شفقت ہے' آغاز ہی سے ان میں جنت کی باد نسیم محسوس ہوتی ہے۔

یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (٨٩:٢٧) "اے نفس مطمئن" کے الفاظ ہی سے یہ ہوا چلنا شروع ہوتی ہے۔ یہ کون سا نفس ہے جو مطمئن ہے؟ جو رب سے مطمئن ہے' جو راہ حق پر مطمئن ہے اور گامزن ہے' اس راہ پر اسے جو کچھ پیش آئے اس پر مطمئن ہے' جو امیری میں بھی مطمئن ہے اور غریبی میں بھی۔ وہ دولت یقین سے مطمئن ہے' اس لیے اپنی راہ نہیں چھوڑتا۔ نہ راستے پر تھک ہار کر رکتا ہے' جو اس دنیا میں بھی مطمئن ہے اور قیامت کی ہولناکیوں میں بھی مطمئن ہے۔

ان آیات میں جو پکار ہے ان کی فضا خوشنودی' رضا اور طمانیت اور اللہ کی برکات و فیوض سے بھرپور ہے۔ الفاظ کا ترنم' معانی کا قرب و سکینت سے بھرپور ہونا اس پکار کی فضا ہے۔ یہ جنت کی فضا ہے۔ اور یہ فضا ان آیات کے الفاظ و معانی سے چھلکتی اور ٹپکتی ہے اور اس پر خدائے رحمٰن و رحیم کی تجلیات کا پرتو ہے۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ -- ۳۰

سورۃ البلد ۔ ۹۰

۱-- تا -- ۲۰

سورۃ البلد ایک نظر میں

یہ نہایت مختصر سورت ہے ' اس میں انسان کی زندگی سے متعلق حقائق کی بہت بڑی مقدار سمیٹ لی گئی ہے جن میں گہرے اشارات ' موج در موج امنڈتے چلے آ رہے ہیں اور پردہ احساس کو حساس تر بنانے کے لیے چٹکیاں بھری جاتی ہیں - قرآن کے علاوہ کسی تحریر میں حقائق کی اس قدر تعداد اتنی مختصر عبارت میں نہ دیکھی گئی ہے اور نہ آئندہ دیکھی جائے گی - انداز بیان ایسا ہے کہ قلب و نظر کی تاروں کے اندر نہایت تیز اور گہرا ارتعاش پیدا کیا جاتا ہے - اس سورت کا آغاز ایک قسم سے ہوتا ہے اور یہ قسم ایک ایسی حقیقت پر اٹھائی گئی ہے جو حیات انسانی کی مسلم حقیقت ہے -

---()()---

درس نمبر ۲۹۰ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۲۰

سُوْرَةُ الْبَلَدِ (۹۰) مَكِّيَّةٌ (۳۵)
اٰيَاتُهَا ۲۰ — رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿۱﴾ وَ اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿۲﴾ وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ ﴿۳﴾ لَقَدْ
خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ﴿۴﴾

"نہیں ' میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی ' اور حال یہ ہے کہ تم اس شہر میں مقیم ہو ' اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اس اولاد کی جو اس سے پیدا ہوئی ' درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے"۔

شہر سے مراد مکہ ہے ' جہاں بیت الحرام واقع ہے ' یہ پہلا وہ گھر ہے ' جو صرف اللہ کی عبادت کے لیے اس زمین پر بنایا گیا ہے ' تاکہ یہاں لوگ آزادی سے آجا سکیں اور امن سے رہ سکیں۔ جہاں آکر ' یہ اسلحہ پھینک دیں ' اپنے ذاتی جھگڑے ایک طرف رکھ دیں ' عداوتوں کو بھلا دیں اور اس میں نہایت امن سے ملیں۔ جہاں کسی کا کسی پر اسلحہ اٹھانا حرام ہو ' انسان ہی نہیں بلکہ یہاں کے پرندوں اور درختوں کو چھیڑنا اور نقصان پہنچانا بھی حرام ہو۔ پھر یہ شہر ابراہیم علیہ السلام کا گھر ہے ' جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے والد محترم ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام عربوں کے والد اور مسلمانوں کے پیشوا ہیں۔

اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یوں عزت افزائی فرماتا ہے کہ اس شہر کی قسم اس حال میں اٹھاتا ہے کہ آپ اس میں مقیم ہیں ' مطلب یہ کہ آپ کی یہاں موجودگی کی وجہ سے گویا اس شہر کی عزت و احترام میں اور شرف مقام میں اور عظمت و احتشام میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ اشارہ اس مقام پر گہرے اثرات کا حامل ہے ' ان حالات میں کہ مشرکین اس گھر کی حرمت کو ان دنوں پامال کر رہے تھے ' اس شہر میں جہاں نباتات و حیوانات بھی پرامن تھے مسلمانوں کو اذیت دی جاتی تھی۔ حالانکہ یہ گھر محترم تھا اور نبی کریم کی موجودگی کی وجہ سے اور محترم ہو گیا تھا اور جب اللہ نے اس شہر اور اس میں مقیم شخصیت کی وجہ سے قسم اٹھائی تو اس کی حرمت ' عظمت اور مرتبہ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس لیے مشرکین مکہ کا یہ موقف کہ وہ اس گھر کے خدمت گار ہیں ' اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہیں ' ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں ' بالکل غلط ' متضاد اور جھوٹا موقف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگلی قسم۔

وَ وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ (۹۰ : ۳) ''اور قسم ہے باپ کی اور اس کی اولاد کی''۔میں حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کی طرف خاص اشارہ ہے اور مکہ کی قسم' اس میں مقیم نبی آخر الزماں کی قسم اور پھر مکہ کے بانیوں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قسم ایک مناسبت رکھتی ہیں 'لیکن اس اشارے اور مناسبت کے باوجود والد اور ولد سے مراد مطلق والد اور مولود بھی ہو سکتے ہیں ـ اور اس صورت میں مفہوم یہ ہو گا کہ اس آیت میں قسم انسانی پیدائش اور انسان کی نشوونما پر کھائی گئی ہے ـ اس طرح یہ قسم تمہید ہوگی ـ سورت کے اصل موضوع کے لیے جو انسان کی حقیقت ہے ـ

استاد محمد عبدہ نے اس مقام پر ایک خاص تفسیر کی ہے اور ایک لطیف نکتہ بیان کی ہے جو ظلال القرآن کی روح سے مطابقت رکھتا ہے ـ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا یہاں نقل کرنا مناسب ہو گا ـ وہ فرماتے ہیں :

اس کے بعد اللہ نے والد اور مولود کی قسم اٹھائی کہ اس کائنات کے مظاہر میں سے انسانیت کی پیدائش اور نشوونما کا مظہر بہت ہی اہم ہے یعنی نظام تولید اور اس کے اندر جو گہری حکمت پنہاں ہے اور انسان نے حضرت انسان کو کس قدر خوبصورت بنایا ـ پھر یہ کہ والد اور مولود دونوں پیدا ہونے والے کی تکمیل میں کس قدر مشقت اٹھاتے ہیں اور کتنی مشقتوں اور محنتوں سے یہ مولود اپنے مقررہ کمال تک پہنچتا ہے''۔

''یہی صورت ایک بیج کے اگنے اور نشوونما کے ساتھ تمام ادوار سے گزرنے میں بھی پیش آتی ہے ـ اس بیج اور پودے کو فضا کے عوامل کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور یہ پودا مشقت کے ساتھ اپنے ماحول سے اپنے لیے مختلف عناصر اخذ کرتا ہے' یہاں تک کہ وہ آخر کار ایک درخت بن جاتا ہے ـ جس کا ایک بڑا تنا اور ٹہنیاں ہوتی ہیں ـ اور پھر یہ درخت اور مکمل پودا مزید بیج پیدا کرتا ہے اور یہ بیج آگے اپنا کردار ادا کرتے ہیں 'اس طرح یہ زمین ان حیاتات کی وجہ سے خوبصورت بنتی ہے ـ اگر تم ان سب امور کو ذہن میں رکھو اور پھر اس سے ذرا اوپر حیوانات پر غور کرو' تو تمہیں معلوم ہو گا کہ والد اور مولود کی حیاتیات میں جو عجوبے ہیں وہ بہت بڑے ہیں' اور والد اور مولود دونوں اس نشوونما کے عمل میں جن مشقتوں سے گزرتے ہیں اور جس طرح اس ذریعہ سے بقائے نوع کا انتظام کیا جاتا ہے اور ان کے ذریعے جس طرح اس کائنات کے حسن کو دوبالا کیا جاتا ہے ـ تو اس عمل میں نہایت بلند اور اہم مظاہر قدرت ہیں''۔

اور اس قسم کا جواب کیا ہے 'کس حقیقت کے اظہار کے لیے یہ قسم اٹھائی گئی ـ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ (۹۰ : ٤) ''درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے''۔

سخت جدوجہد اور مشقت میں سخت کشمکش اور مصائب کے مقابلے کی حالت میں پیدا کیا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ (۸٤ : ٦) ''اے انسان تو سخت مشقت کرتا ہوا اپنے رب کی طرف جا رہا ہے اور آخر کار تو اس سے ملنے والا ہے''۔

رحم کے اندر جب ایک خلیہ قرار پکڑتا ہے تو وہ پہلے دن ہی سے جہد و مشقت شروع کر دیتا ہے کہ اپنے لیے غذا فراہم کرے اور آنے والی زندگی کے لیے اچھے حالات فراہم کرے ' یہ تمام کام وہ رب تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق کرتا ہے ـ رحم کے اندر یہ اسی طرح جدوجہد میں ہوتا ہے ' یہاں تک کہ اس کے نکلنے کا وقت آتا ہے تو اپنی ماں کی طرح یہ بھی درد زہ کی تکالیف سہتا ہے ' اس پر رحم مادر سے نکلتے وقت سخت دباؤ پڑتا ہے 'پھر جب نکلتا ہے اور روشنی دیکھتا ہے تو بھی اس

پر دباؤ ہوتا ہے۔

باہر آتے ہی ایک نئی جدوجہد شروع ہوتی ہے' جب یہ ہوا کھینچتا ہے اور سانس لینے کا عمل شروع کرتا ہے اور پہلی مرتبہ وہ منہ کھولتا ہے' تو اس کے پھیپھڑے کام شروع کرتے ہیں تو اسے سخت تکلیف ہوتی ہے اور وہ چلانے لگتا ہے' اس کا خون دوران شروع کرتا ہے۔ پھر اس کا نظام ہضم کام شروع کرتا ہے اور یہ سب اعمال ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا وہ عادی نہیں ہوتا' اس کی انتڑیاں فضلات خارج کرنے کی عادی نہیں ہوتیں۔ غرض اس کے بعد اس کا ہر قدم مشقت میں اٹھتا ہے' ہر حرکت مشقت ہوتی ہے۔ ذرا دیکھئے اب یہ گھٹنوں کے بل چل رہا ہے' پھر یہ پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے اور چلتا ہے' یہ سب مشقتیں ہیں اور ہر مرحلے پر جدوجہد کرتی ہیں۔

پھر جب دانت نکلتے ہیں تو مشقت' سیدھا کھڑے ہونے میں مشقت اور اور جم کر چلنے میں مشقت' تعلیم حاصل کرنے میں مشقت' غور و فکر کرنے میں مشقت' غرض جو جدید تجربہ وہ کرتا ہے' جس طرح گھٹنوں کے بل چلنے کا تجربہ اس نے کیا' یہ سب مشقت اور جدوجہد ہے۔

اب ذرا آگے بڑھئے' اب ان مشقتوں کی شاخیں نکل آتی ہیں۔ یہ دیکھو' اپنے عضلات سے مزدوری کرنے کی مشقت کرتا ہے۔ دوسرا اپنی فکر سے مشقت کرتا ہے' یہ روح کے ساتھ محنت کر رہا ہے' یہ دیکھو ایک لقمہ جو کے لیے مشقت کر رہا ہے' یہ دوسرے کپڑے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے' اور یہ دوسرا ہزار کو دو ہزار بنا رہا ہے۔ پھر دس ہزار اور آگے' یہ دیکھو ایک حکومت اور مرتبے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے' ان میں ایک دیکھو اللہ کے راستے میں جدوجہد کر رہا ہے' بعض عیاشیوں اور خواہشات کے بندے ہیں' بعض جہنم کے لیے محنت کر رہے ہیں اور ان کے مقابلے دوسرے جنت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں' ہر شخص اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے جا رہا ہے اور بڑی مشقت کے ساتھ رب کے قریب ہو رہا ہے' اور جب میدان حشر میں اللہ کے سامنے سب کھڑے ہوں گے تو پھر بدبختوں کو دائمی مشقت اور مصیبت میں گرفتار ہونا ہو گا اور نیکوکاروں اور نیک بختوں کو عظیم نعمت اور آرام سے ملے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی زندگی ایک مشقت ہی ہے' لیکن اس کی مشقت کی شکلیں مختلف ہیں' نوعیت کے اختلاف کے باوجود اصل میں یہ زندگی مشقت ہی ہے۔ لیکن عظیم خسارہ اٹھانے والا شخص وہ ہے جو اس دنیا کی پوری مشقت اور مسلسل تکلیفات اٹھا کر نہایت ہی دائمی' تلخ مشقت تک جا پہنچتا ہے اور جہنم رسید ہوتا ہے اور اس جدوجہد میں سب سے زیادہ کامیاب وہ شخص ہوتا ہے جو نہایت ہی تکلیف دہ انداز میں اپنے رب کی طرف بڑھتا ہے اور ایسی کمائی کر کے اس دنیا کی زندگی کا بوجھ اپنے کاندھوں سے اتارتا ہے اور آخر کار دائمی کامیابی حاصل کرتا ہے اور دائمی راحت پاتا ہے۔

ہاں یہ ہے کہ بعض اوقات اس دنیا کی مشقتوں کا بعض انعام اس دنیا میں بھی مل جاتا ہے' کیونکہ جو شخص کسی اعلیٰ مقصد کے لیے جدوجہد کرتا ہے' وہ اس شخص کی طرح نہیں ہوتا جو کسی حقیر سے کام کے لیے محنت کرتا ہے۔ ایک اعلیٰ مقاصد کے لیے جان و مال خرچ کرتا ہے اور دوسرا حقیر مقاصد کے لیے' دونوں کی خوشی' اطمینان اور روحانی مسرت یکساں نہیں ہو سکتی۔ جو شخص محنت اور جدوجہد کرتا ہے' اور اس کے پیش نظر کوئی مادی مقصد نہیں ہے' یا وہ اس مادیت سے نکلنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ وہ اس شخص کی طرح نہیں ہوتا جو اس مادیت کے لیے اس طرح ہلکان ہوتا جس طرح کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض پیٹ بھرنے کے لیے مشقت کرتے ہیں۔ جو شخص اقامت دین کی جدوجہد کرتا ہے۔ وہ اس شخص کی طرح نہیں ہوتا جو کسی

دنیاوی خواہش کے پیچھے مرتا ہے ' دونوں کی مشقت ' شعور احساس برابر نہیں ہوتے ۔ زندگی کی حقیقت واضح کرنے کے بعد انسان کے بعض مزعومات 'تصورات اور بعض دعوؤں اور بعض تصرفات پر ناقدانہ تبصرہ کیا جاتا ہے !

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ۝

''کیا اس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پا سکے گا؟ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا ۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا؟''

یہ انسان مشقت میں پیدا کیا گیا اور جو اپنی اس دنیا کی پوری زندگی میں اس مشقت سے چھوٹ نہیں سکتا ' یہ اپنی حقیقت کو بھول جاتا ہے اور اس کا پیدا کرنے والا اسے جو قوت ' طاقت اور وجدان اور سازوسامان دیتا ہے ' تو وہ ان قوتوں میں ایسے تصرفات کرتا ہے جیسا کہ وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہے اور اسے اس جوابدہی کی توقع نہیں ہے اور یہ خوف نہیں ہے کہ ایک بڑی قوت اور قدر والا اسے پکڑ سکتا ہے اور حساب لے سکتا ہے ۔ اس لیے یہ انسان دیتا ہے ' پکڑتا ہے ' چھینتا ہے ' لوٹتا ہے ' جمع کرتا ہے ' اضافہ کرتا ہے ' فسق و فجور کرتا ہے ' نہایت بے خوفی اور نہایت بے باکی کے ساتھ ۔ یہ خدوخال اس انسان کے ہیں جس کا دل ایمان سے خالی ہو ۔

پھر جب ایسے مواقع پر جیسے اس سورت میں مذکور ہیں ' اسے راہ خیر میں خرچ کرنے کی دعوت دی جائے تو پھر وہ کہتا ہے ۔

اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا (۹۰ : ٦) ''میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا'' ۔ اور میرے لیے بس یہ کافی ہے کہ میں نے اس قدر مال اڑا دیا ۔

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ (۹۰ : ۷) ''کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا'' ۔ یہ بھول جاتا ہے کہ اللہ تو دیکھ رہا ہے ' اللہ کا علم تو دلوں کی باتوں کو بھی گھیرے ہوئے ہے ' اللہ تو وہ سب کچھ کو دیکھ رہا ہے ، جو اس نے خرچ کیا اور اسے معلوم ہے کہ اس نے کس لیے خرچ کیا ۔ لیکن یہ انسان اس حقیقت کو بھی بھول جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ شاید وہ اللہ کی نظروں سے اوجھل ہے ۔

انسان کے اس غرور اور اس زعم کے مقابلے میں کہ وہ طاقتور ہے اور زور آور ہے اور اس کی کنجوسی اور پھر بھی دعوائے انفاق کثیر کے مقابلے میں ' قرآن خود اس کے نفس کا آئینہ اس کے سامنے رکھ کر اسے بتلاتا ہے کہ ذرا غور تو کرو کہ اللہ نے خود تمہارے نفس کے اندر اور تمہاری ساخت کے اندر تم پر کس قدر مہربانیاں کی ہیں اور کس قدر صلاحیتیں دی ہیں لیکن اے انسان تم نے تو ایک نعمت وصلاحیت کا شکر بھی ادا نہیں کیا ۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝

"کیا ہم نے اسے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے؟ اور (نیکی اور بدی کے) دونوں نمایاں راستے اسے (نہیں) دکھا دیے؟"

انسان اپنی قوت پر ہمیشہ مغرور ہو جاتا ہے' حالانکہ اس کے پاس جو چھوٹی موٹی قوت ہوتی ہے۔ وہ اسے اللہ نے دی ہوئی ہوتی ہے' پھر انسان مال کے بارے میں بڑا بخیل واقع ہوا ہے' حالانکہ یہ مال بھی اللہ ہی نے دیا ہے۔ اس کے باوجود' نہ وہ ہدایت کی راہ لیتا ہے اور نہ شکر منعم بجا لاتا ہے۔ اللہ نے اسے حواس خمسہ عطا کیے۔ ان کے ذریعہ یہ عالم محسوسات میں کام کرتا ہے' پھر اس کو آنکھیں دی گئیں اور ان کی ساخت کس قدر دقیق اور پیچیدہ ہے اور جن کے ذریعہ وہ چیزوں کو دیکھتا ہے' پھر اللہ نے اسے قوت گویائی عطا کی اور آلہ گویائی بھی عجیب ہے' زبان اور دو ہونٹ۔

وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ (۹۰: ۹) "ایک زبان اور دو ہونٹ"۔ اس کے بعد اللہ نے انسان کو خیر و شر میں تمیز کرنے کا ملکہ دیا۔ ہدایت و ضلالت میں اور حق و باطل میں فرق کرنے کے لیے قوت استدلال دی۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰: ۱۰) "اور دونوں راستے اسے دکھائے"۔ کہ نیکی و بدی میں سے وہ جس راستے کو چاہے اختیار کرے۔ اس کو ایسی طاقت دی کہ وہ نیکی اور بدی میں سے جس کو چاہے' اپنائے اور انسان کی تخلیق میں یہ دوہری قوت رکھی گئی اور یہی اللہ کی حکمت تخلیق تھی۔ پھر اللہ نے ہر چیز کو خلقت بخشی اور اس کائنات میں اس کے لیے اس کا فریضہ منصبی آسان کر دیا۔

یہ آیت اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ انسان کی فطرت کیا ہے اور سورہ شمس میں اس کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (۷) فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۸) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۱۰) (۹۱: ۷ تا ۱۰) "قسم ہے نفس انسانی کی اور اس کی ساخت کی۔ اور پھر اسے بتایا کہ فجور کیا ہے اور تقویٰ کیا ہے۔ بے شک کامیاب ہوا وہ شخص جس نے نفس کو پاک کیا اور ناکام ہوا۔ وہ شخص جس نے اسے برباد کیا"۔ ان آیات میں نفس کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیلات سورہ شمس میں بیان کریں گے۔

یہ اللہ کی نعمتیں ہیں جو اللہ نے بنی نوع انسان کو عطا کی ہیں اور ہر انسان کے نفس میں یہ نعمتیں رکھ دی گئی ہیں' ان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہدایت قبول کرے' اس کی آنکھوں کا یہ فرض ہے کہ یہ کائنات میں قدرت الہیہ کے دلائل مشاہدہ کریں اور اشارات ایمان تلاش کریں اور دلائل قدرت اور اشارات ایمان اس کائنات میں ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ پھر انسان کی زبان اور اس کے ہونٹ کلام اور بیان کے ذرائع ہیں۔ اور ان دونوں کی وجہ سے انسان اس کرۂ ارض پر بہت کچھ کرتا ہے' بعض اوقات ایک لفظ تلوار اور بم کا کام کرتا ہے اور کبھی وہ اس کے تلفظ کرنے والے کو آگ میں گرا دیا ہے۔ غرض یہ الفاظ ہی ہیں جو انسان کو اٹھاتے اور گراتے ہیں' یعنی اس آگ میں: "حضرت معاذ ابن جبلؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھا۔ ایک دن میں آپؐ کے قریب آگیا اور ساتھ

ساتھ چلنے لگا۔ تو میں نے حضور اکرمؐ سے پوچھا اے رسول خدا! مجھے ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنت میں پہنچا دے اور دوزخ سے بچائے۔ آپؐ نے فرمایا تو نے تو بہت بڑی بات پوچھی' مگر یہ بڑی بات ان لوگوں کے لیے آسان ہے جن کے لیے اللہ آسان کر دے۔ وہ یہ کہ تم اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو' رمضان شریف کے روزے رکھو' بیت اللہ کا حج کرو۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں یہ نہ بتادوں کہ خیر کے دروازے کیا ہیں؟ تو میں نے کہا ضرور۔ تو فرمایا' روزہ ڈھال ہے اور صدقہ گناہوں کو اس طرح مٹاتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے اور رات کے نصف آخر میں نماز نیک لوگوں کا شعار و علامت ہے۔ اور آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی :

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ "ان کے پہلو رات کو بستروں سے جدا ہو جاتے ہیں"۔ پھر فرمایا کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ اس معاملہ (دین) کا سرا کیا ہے؟ اس کا ستون کیا ہے؟ اور اس کی بلند ترین چوٹی کیا ہے؟ تو حضرت معاذ نے کہا اللہ کے رسول ضرور بتایئے۔ تو فرمایا اس معاملے کا سرا اسلام ہے' ستون نماز ہے' اور بلند ترین چوٹی جہاد ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ ان سب چیزوں کا دارومدار کس چیز پر ہے تو میں نے کہا اللہ کے رسول ضرور بتایئے' تو فرمایا اس پر (زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) قابو رکھو' تو میں نے کہا' اے رسول خدا! جو کچھ ہم بولتے ہیں اس پر بھی ہم سے مواخذہ ہو گا' آپؐ نے فرمایا' تمہاری ماں تمہیں روئے کہ لوگ اپنی زبان کی کاٹی ہوئی فصل کی وجہ سے منہ کے بل یا فرمایا ناک کے بل جہنم میں گرائے جاتے ہیں"۔ (احمد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)

پھر اللہ نے انسان کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ خیر و شر کو سمجھے اور یہ سمجھے کہ جنت کا راستہ کون سا ہے اور جہنم کا راستہ کون سا ہے۔ یوں یہ ہدایت کر کے اللہ نے انسان کے ساتھ یہ اعانت کی ہے کہ وہ سیدھا راستہ لے۔

ان سب ہدایات کے باوجود انسان پھر بھی اس مشکل گھاٹی کو عبور نہیں کرتا جو اس کے اور جنت کے درمیان حائل ہے اور اللہ نے اگلی آیات میں اس مشکل گھاٹی کی توضیح فرما دی ہے :

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿١١﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿١٢﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿١٣﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿١٤﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿١٥﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿١٦﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿١٧﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿١٨﴾

"مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا' یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر (اس کے ساتھ یہ کہ) آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلق خدا پر) رحم کی تلقین کی۔ یہ لوگ ہیں دائیں بازو والے"۔

یہ ہے وہ دشوار گزار گھاٹی جس کو عبور کرنے کی ہمت انسان نہیں کرتا' الا یہ کہ جو لوگ اپنے پختہ ایمان سے مدد لیں ۔ یہ گھاٹی انسان اور جنت کے درمیان حائل ہے' اگر انسان اسے عبور کر لے تو وہ سیدھا جنت میں داخل ہو جائے ۔ یہاں قرآن کریم اس کی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے کہ انسان کے دل میں اسے عبور کرنے کا جوش پیدا ہو' اور یہ تحریک ہو کہ وہ اسے عبور کر لے' ایک جست لگائے اور اس پار ہو' اس کی پوری طرح وضاحت کی گئی اور یہ یقین دلا دیا گیا کہ یہی تمہارے اور جنت کے درمیان حائل ہے ۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ (۱۱:۹۰) "مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی" ۔ لفظ اقتحام استعمال کر کے اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ آگے بڑھو' ایک جست لگا کر اسے عبور کرو' گھس جاؤ ۔

پھر اس گھاٹی کی عظمت اور بڑائی بیان کرنے کے لیے سوال

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ (۱۲:۹۰) "تم کیا جانو کہ وہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے" ۔ یہ سوال اس لیے نہیں ہے کہ وہ گھاٹی کوئی بہت ضخیم ہے اور ناقابل عبور ہے' مطلب یہ ہے کہ یہ بہت اہم ہے ۔ اللہ کے نزدیک اس کا عبور کرنا ضروری ہے تاکہ انسان جرات کر کے گھس جائے اور جست لگا دے ۔ اگرچہ اس کی راہ میں مشکلات حائل ہوں' کیونکہ محنت اور مشقت کے بغیر تو کوئی کام بھی نہیں ہوتا اور اگر کوئی یہ مشقت برداشت کرے گا تو اسے ضرور اس کا ثمرہ مل جائے گا اور اس کی تکالیف کا صلہ اس کے سامنے ہو گا' اور اس کا کوئی عمل ضائع نہ ہو گا اور یہ کام ہر حال میں ہونے والا ہے ۔

یہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے ۔ یہ وہ چیز ہے جس کی مکہ کی سوسائٹی کو بے حد ضرورت تھی' جہاں تحریک اسلامی دعوت کا کام کر رہی تھی ۔ ان غلاموں کو آزادی دلانا جو اس سوسائٹی میں نہایت ہی برے حالات کار میں کام کر رہے تھے' اس خود غرض سوسائٹی میں لوگ نہایت ہی خود غرضی سے مفادات کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور نادار لوگ بھوک سے مر رہے تھے ۔ اس میں لوگوں کے لیے ابتدائی انسانی ضروریات فراہم کرنا' یہ باتیں تو مکہ کی سوسائٹی کے پس منظر میں تھیں' باقی بعض ایسی باتیں جن کا تعلق کسی زمان و مکان سے نہیں ہے اور جن کا تعلق تمام انسانوں کے ساتھ ہے اور جو نجات کے لیے ہمیشہ دشوار گزار گھاٹی کی طرح رہے ہیں مثلاً

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (۱۷:۹۰) "پھر وہ آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلق خدا پر) رحم کی تلقین کی" ۔ روایات میں ہے کہ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانے کا مقصد یہ ہے کہ غلاموں کو آزاد کرنے میں شرکت کرنا' اور لغوی لحاظ سے عتق کے معنی ہیں کسی کو مکمل آزاد کر دینا یعنی ایک شخص کسی کو آزاد کر دے ۔ کوئی کسی کی آزادی میں شریک ہو یا کسی کو پورا آزاد کر دے' حاصل دونوں کا ایک ہی ہے ۔

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو مکہ میں لوگوں نے اسلام کو ہر طرف سے گھیر رکھا تھا ۔ اسلامی حکومت قائم نہ تھی کہ وہ آزادی غلاماں کا قانون پاس کر دیتی ۔ غلامی جزیرۃ العرب اور اس کے علاوہ پوری دنیا میں عام تھی اور پوری دنیا میں عورتوں کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا' جب بعض غلام مسلمان ہو گئے' مثلاً عمار ابن یاسر ان کا خاندان' بلال

ابن رباح 'صہیب رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ تو ان غلاموں کے مالکان نے ان پر سخت تشدد شروع کر دیا۔ اور ان پر ایسا تشدد شروع کر دیا جو ناقابل برداشت تھا' مسلمان اس نتیجے پر پہنچے کہ ماسوائے آزادی کے اور کسی طریقے سے ان کی جان نہیں چھوٹ سکتی اور آزادی کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ ان لوگوں کو' ان کے شقی القلب اور سنگدل مالکان سے خریدا جائے۔ اس میدان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ مرد اول رہے' جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ وہ اسلام کے ہر معاملے میں سب سے پہلے لبیک کہتے' اور نہایت ثابت قدمی سے اور اطمینان سے اور استقامت سے اس راہ پر آگے بڑھتے۔

ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت بلال' اس سے پہلے بنی جمح کے پیدائشی غلام تھے' یہ نہایت سچے مسلمان تھے' نہایت پاک دل تھے۔ امیہ ابن خلف ابن وہب ابن خذافہ ابن جمح تپتی دوپہر میں انہیں نکالتا' وادی مکہ میں زمین پر پیٹھ کے بل لٹاتا اور حکم دیتا کہ ان کے سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا جائے اور ان سے کہتا کہ "تم اسی طرح رہو گے جب تک تم مر نہیں جاتے یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا انکار نہیں کر دیتے اور لات و عزیٰ کی عبادت نہیں کرتے؟" اس مصیبت کی حالت میں وہ صرف یہی کہتے "احد.... احد"۔

ایک دن حضرت ابوبکر صدیقؓ پاس سے گزرے اور یہ لوگ اس وقت ان پر اس طرح تشدد کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا گھر محلہ بنی جمح میں تھا۔ آپ نے امیہ ابن خلف سے کہا: "کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے 'کب تک تم یہ ظلم کرتے رہو گے؟" اس نے جواب دیا: "تم ہی نے تو اسے برباد کیا ہے لہٰذا اس عذاب سے تمہی اسے چھڑاؤ گے"۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا "اچھا میں کرتا ہوں۔ میرے پاس ایک سیاہ فام غلام ہے اس سے زیادہ قوی اور مضبوط اور وہ تمہارے دین پر ہے۔ میں اسے اس کے بدلے تمہیں دیتا ہوں"۔ امیہ ابن خلف نے کہا: "میں نے قبول کیا"۔ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسے اپنے غلام کے بدلے خرید لیا اور آزاد کر دیا۔

"مدینہ کو ہجرت کرنے سے پہلے' ان کے ساتھ اور چھ غلام بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آزاد کرائے' بلال ساتویں تھے۔ عامر ابن فہیرہؓ جو بدر میں شریک ہوئے اور بئر معونہ میں شہید ہوئے۔ ام عبیس 'زنیرہ' جب ان کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آزاد کرایا تو ان کی بصارت چلی گئی۔ قریش نے کہا اس سے لات اور عزیٰ کے سوا کسی اور نے نظر نہیں چھین لی۔ اس پر اس نے یہ تبصرہ کیا: "وہ جھوٹ بولتے ہیں' بیت اللہ کی قسم لات اور عزیٰ نہ نقصان پہنچا سکتے اور نہ نفع"۔ اس کے بعد اللہ نے اس کی نظر کو لوٹا دیا۔ نہدیہ اور اس کی بیٹی' یہ دونوں بنی عبدالدار کی ایک عورت کی لونڈیاں تھیں۔ اس نے ان کو آٹا دے کر بھیجا اور ساتھ ہی یہ کہا خدا کی قسم میں تمہیں کبھی بھی آزاد نہ کروں گی۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ پاس ہی سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے کہا: ام فلاں' اس قسم کا کفارہ ادا کر کے اس سے نکل آؤ' اس نے جواب دیا تم اس کا کفارہ ادا کرو' تم ہی نے تو ان کو خراب کیا ہے۔ لہٰذا تم ہی انہیں آزاد کرو' تو حضرت نے فرمایا' بتاؤ قیمت' اس نے کہا یہ ہے قیمت' حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا بس میں نے خرید لیا اور یہ آزاد ہوئیں۔ اس کا آٹا اسے لوٹا دو' انہوں نے کہا' مناسب نہیں کہ ہم اس سے فارغ ہو جائیں اور پھر اسے لوٹا دیں۔ تو انہوں نے کہا جس طرح تم چاہو۔

اسی طرح ایک بار وہ ایک لونڈی کے پاس سے گزرے' یہ بنی عدی قبیلے کی شاخ بنی مومل سے تھی اور مسلمان تھی۔ عمرو ابن الخطاب اسے سخت سزا دیتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ اسلام چھوڑ دو' اس وقت حضرت عمرؓ مشرک تھے' اسے یہ مار رہے تھے۔ جب وہ تھک گئے تو کہا میں معذرت کرتا ہوں کہ میں نے تمہیں محض اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ میں تھک گیا ہوں ورنہ اور

مانا اور وہ کہتی 'اسی طرح اللہ تیرے ساتھ کرے - اسے بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خریدا اور آزاد کر دیا''۔

ابن اسحاق کہتے ہیں 'محمد ابن عبداللہ ابن ابو عتیق نے بیان کیا' عامر ابن عبداللہ سے انہوں نے ابن زبیر سے 'انہوں نے ان کے خاندان والوں سے :یہ کہ ابوقحافہ نے کہا :'' بیٹے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ضعیف غلاموں کو آزاد کر رہے ہو 'اگر تم یہ کام کرتے ہی ہو جو کر رہے ہو تو پھر تمہیں چاہیے کہ مضبوط لوگوں کو آزاد کرو' جو تمہارے حامی ہوں اور جب تم پر مصیبت آئے تو تمہارے آگے کھڑے ہوں''۔ اس پر ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا :'' اے باپ' میں جو چاہتا ہوں وہ صرف رضائے الٰہی کے لیے چاہتا ہوں''۔

یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جو اس مشکل گھاٹی کو عبور کرنے کے لیے گھس رہے تھے 'اور وہ ایسے مصیبت زدہ جن پر تشدد ہو رہا تھا' اور سوسائٹی ایسی تھی جس میں ایسا اقدام نہایت ابتدائی جست شمار ہوتا اور نہایت انقلابی اقدام ہوتا تھا۔ یوں جس طرح کوئی مشکل ترین گھاٹی کو عبور کرے۔

اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ (١٤) یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (١٥) اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (١٦) (٩٠: ١٤ تا ١٦) ''یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا''۔ مسغبہ کے معنی ہیں بھوک کے۔ قحط کے دنوں میں چونکہ کھانا مہنگا ہوتا ہے 'اس لیے ان دنوں غریبوں کو کھانا کھلانا' ایمان کے لیے معیار بن جاتا ہے۔ اس وقت کی جاہلی سوسائٹی میں یتیموں کی حالت تو یہ تھی کہ ان کے حقوق ہر طرف سے پامال ہوتے تھے' ان کے مال کو غبن کیا جاتا تھا اور اس طرح سے اڑا لیا جاتا تھا کہ گویا زمین اسے کھا گئی۔ اگرچہ یتیم قریبی رشتہ دار ہوتا۔ اس لیے کہ اس جاہلی سوسائٹی میں لوگ دولت کے پیچھے کتوں کی طرح ہلکان ہو رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کو یتیم کے مال کی حفاظت کے لیے بار بار وصیت کرنی پڑی' کیونکہ اس معاشرے میں یتیموں پر ظلم عام تھا۔ اس لیے یہ ہدایات قرآن حکیم میں جاری رہیں اور مدنی سورتوں میں یہ دی گئیں۔ مثلاً میراث' وصیت اور نکاح کے قوانین کے ضمن میں۔ ہم نے سورہ بقرہ اور نساء میں اس موضوع پر مفصل بات کی ہے۔ خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔

اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (٩٠: ١٦) اس لیے کہا گیا ہے کہ اپنی بدحالی کی وجہ سے وہ خاک آلود ہے۔ یہاں یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے سے قبل قید لگا دی۔

فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ (٩٠: ١٤) ''فاقے کے دن کسی یتیم اور مسکین کو کھانا کھلانا''۔ یہ اس لیے کہ اس گھاٹی کو مشکل گھاٹی کہا گیا ہے اور یہ گھاٹی معیار ہے ایمانی شعور' رحمدلی' ایثار اور اسلامی سوسائٹی کے نظام تکافل کے لیے۔ لوگ اللہ کے اہل و عیال ہیں اور اللہ کے عیال کا خیال رکھنا ایمانی تقاضا ہے خصوصاً قحط سالی اور فاقوں کے دنوں میں۔ اور دونوں کام 'غلاموں کو آزاد کرنا اور غریبوں کو کھلانا' مکہ کی سوسائٹی میں نہایت ہی اہم تھے۔ اگرچہ یہ دونوں کام اسلام کے عمومی مقاصد میں بھی داخل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ان کو ایمان سے بھی مقدم ذکر کیا۔ حالانکہ ایمان لانا ایک بنیادی قاعدہ ہے۔ اس کے بعد پھر عمومی اور بنیادی اصول کا ذکر کیا گیا۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (۹۰:۱۷)

"سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور رحم کی تلقین کی"۔ لفظ ثم یہاں "پھر" کے معنی میں نہیں ہے 'کہ پہلے یہ دو کام ہیں اور بعد میں اسلام ہے' بلکہ معنی یہ ہے کہ یہ دو جزوی کام بھی ضروری ہیں لیکن ان سے پہلے ایمان لانا ضروری ہے' اور یہ ضروری اور عام اصول ہے۔ اور اعلیٰ مقام و مرتبہ ہے' اگر ایمان نہیں ہے تو پھر غلاموں کو آزاد کرنا' اور لوگوں کو کھانا کھلانا مفید ہی نہیں ہے۔ ہر اچھے عمل سے قبل ایمان لانا ضروری ہے۔ اللہ کے ہاں کسی بھی عمل صالح میں وزن صرف ایمان کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ایمان ہی اعمال کو ایک منہاج 'مسلسل منہاج کی لڑی میں پرو دیتا ہے۔ ایمان کی وجہ سے عمل صالح مسلسل اور دائمی نوعیت اختیار کر لیتا ہے اور ایمان کے بغیر اگر کوئی نیکی کرتا ہے تو وہ محض ایک عارضی جوش ہوتا ہے۔ بدلتے ہوئے مزاجوں کے ساتھ بدل جاتا ہے' یا کسی مصلحت کی وجہ سے کوئی نیکی کرتا ہے یا تعریف سننے کے لیے۔

اب معنی یوں ہوا کہ مشکل گھاٹی یہ ہے کہ کسی غلام کو آزاد کر دے' یا کسی یتیم و مسکین کو فاقے کے دن کھانا کھلائے لیکن سب سے اول یہ کہ وہ اہل ایمان میں سے ہو اور ایک دوسرے کو صبر اور رحم کرنے کی نصیحت کرنے والوں میں سے ہو۔ "ثم" کا لفظ گویا یہاں "پھر" کے معنی میں نہیں بلکہ "سب سے بڑی بات یہ کہ" کا مفہوم دیتا ہے۔

صبر کی وصیت اس لیے ضروری ہے کہ ایمان کے تقاضوں میں سے بالعموم اہم تقاضا صبر ہے۔ اور دشوار گزار گھاٹی کو عبور کرنے کے لیے بالخصوص صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ایک دوسرے کو صبر کی وصیت بھی کرنا یہ صبر سے بھی ایک اونچا درجہ ہے۔ یعنی اسلامی جماعت ایسے درجے پر ہوتی ہے کہ اس کے افراد اور کارکن باہم ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں اور اس طرح وہ ایمان کے تقاضے پورے کرنے میں ایک دوسرے کے لیے ممد و معاون ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کے احساسات ایک دوسرے کے ساتھ ہم رنگ ہوتے اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہیں' اور یہ سمجھتے ہیں کہ زمین کے اوپر ایمانی نظام کے قیام کا فریضہ صبر اور مصابرت ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ اس کارگراں کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات پر ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے ثابت قدمی کا باعث بنتے ہیں۔ ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے ہیں' ایک دوسرے کو قوت دیتے ہیں۔ یہ صبر اور تواصی بالصبر انفرادی صبر سے آگے ایک بلند درجہ ہے۔ اگرچہ یہ صبر بھی انفرادی صبر ہی پر قائم ہوتا ہے لیکن تواصی بالصبر سے اشارہ اس طرف ہے کہ مومنین اجتماعی صبر ہی کریں۔ اور یہ کہ وہ ایک دوسرے کے لیے ہمت توڑنے کا باعث نہ بنیں بلکہ ہمت بندھانے کا باعث ہوں۔ ہزیمت کا باعث نہ بنیں بلکہ اقدام اور مشکلات کو انگیز کرنے کا باعث بنیں۔ جزع فزع کا باعث نہ بنیں بلکہ ایک دوسرے کے اطمینان کا باعث بنیں۔

اسی طرح خلق خدا پر رحم کرنا ایک بات ہے اور ایک دوسرے کو لوگوں پر رحم کرنے کی تلقین کرنا ایک دوسرا فعل ہے۔ جو رحم کی تلقین کرنے پر ایک زیادہ بات ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ صفت جماعت مسلمہ کی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو رحم کی وصیت کریں اور اس فعل پر ایک دوسرے کو اکسائیں اور اسے ایک انفرادی اور اجتماعی فریضہ سمجھیں کہ افراد جماعت کا یہ شعار ہو اور نکتہ تعاون ہو۔

صبر اور تواصی صبر' رحم اور تواصی رحم کے اندر سے یہ ہدایت نکلتی ہے کہ اسلام ایک اجتماعی دین ہے جس کے قیام

کے لیے جماعت ضروری ہے 'کیونکہ یہ ایک جماعت ایک سوسائٹی کا دین ہے اور اس کے قیام سے ایک امت وجود میں آتی ہے' لیکن یہ ایسا اجتماعی دین نہیں ہے کہ اس میں انفرادی ذمہ داری نہ ہو' یہ گویا انفرادی ذمہ داری کی بنا پر اجتماعی دین ہے ۔ انفرادی ذمہ داری اس میں بہت واضح ہے ۔

یہ لوگ جو اس مشکل گھاٹی کو عبور کرتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ۔

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ (۹۰ : ۱۸) "یہ لوگ دائیں بازو والے ہیں" ۔ ان کو دوسری جگہ اصحاب الیمین
کہا گیا ہے ۔ یہ دائیں بازو والے اور سعادت مندی کی صفت والے ہیں ۔ دونوں معانی ایمانی مفہوم سے پیوست ہیں ۔ ١

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ﴿١٩﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿٢٠﴾ ع ٢٠
١٥

"اور جنھوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا وہ بائیں بازو والے ہیں' ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی" ۔

بائیں بازو والے فریق کے بیان میں دوسری صفات کو ترک کر دیا گیا ہے ۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا (۹۰ : ۱۹) "اور جنھوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا" ۔ کیونکہ جب کافر ہو گئے تو بات ختم ہو گئی ۔ کفر کے ساتھ کوئی نیکی جمع ہی نہیں ہو سکتی اور نہ کسی برائی کا علیحدہ اعتبار ہوتا ہے اس لیے کہ ہر برائی کفر کے اندر ہی ہوتی ہے اور یہ کفر اسے ڈھانپ لیتا ہے' لہٰذا اب اس بات کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہ لوگ غلاموں کو آزاد نہیں کرتے' اور کھانا نہیں کھلاتے' پھر ان لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کر دیا اور کافر ہو گئے تو پھر کوئی نیکی ان کے لیے مفید ہی نہیں ہے ۔

یہ بائیں ہاتھ کے لوگ ہیں یا بدبخت لوگ' دونوں مفہوم مراد ہو سکتے ہیں' وہ بائیں ہاتھ والے بھی' اور منحوس بھی ہیں اور یہی دونوں مفہوم یعنی دائیں جانب اور نیک بخت ایمانی مفہوم میں بھی یکجا ہیں ۔ کیونکہ ان لوگوں نے جرأت کر کے دشوار گزار گھاٹی کو عبور نہ کیا ۔

عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ (۹۰ : ۲۰) "ان پر آگ چھائی ہوئی ہے" ۔ یعنی آگ کے دروازے ان پر بند ہیں یعنی حقیقی معنی میں کہ اندر کر کے ان پر جہنم کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں اور یا اس معنی میں کہ آگ کا عذاب ان پر چھایا ہوا ہے ۔ یہ لازمی معنی ہے کہ وہ اس سے خارج نہ ہو سکیں گے ۔ جب آگ کو ہٹا نہ سکیں گے تو وہ ان پر بند ہے ۔ یہ دونوں مفہوم لازم و ملزوم ہیں ۔

یہ بنیادی حقائق جو اس انسان کی زندگی کا بنیادی امور ہیں' ایمانی عقیدے کے اساسیات ہیں' سب کے سب اس چند سطری سورت میں سمو دیے گئے ہیں اور نہایت وضاحت اور زور دار انداز سے بیان کیے گئے ہیں ۔ یہ ہے ممتاز خصوصیت قرآن کے انداز بیان کی ۔

--- ○○○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الشمس ۔ ۹۱

۱-- تا-- ۱۵

سورۃ الشمس ایک نظر میں

یہ مختصر سی سورت جس کا قافیہ ایک ہے 'جس کا انداز ترنم ایک ہے۔اس میں متعدد وجدانی اشارات ہیں' یہ وجدانی اشارات 'ان مظاہر قدرت اور مناظر فطرت سے نکلتے ہیں جن کے ساتھ اس سورت میں بات کا آغاز کیا گیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مناظر اس عظیم حقیقت کا فریم ہیں' جو اس سورت میں بیان کی گئی ہے۔یہ کیا حقیقت ہے؟ یہ کہ نفس انسانی کی اصلیت کیا ہے؟ نفس انسانی کی فطری استعداد کیا ہے؟ انسان کا خود اپنے نفس کے بارے میں کیا کردار ہے اور اس نفس کے انجام کے سلسلے میں انسان کی ذمہ داری کیا ہے؟ یہ ہے وہ عظیم حقیقت جس کا ربط یہ سورت اس کائنات کے مشاہد اور دوسرے حقائق کے ساتھ قائم کرتی ہے۔یوں یہ سورت اس کائنات کے فریم میں بات کرتی ہے۔

اس سورت میں قصہ ثمود کا بھی ذکر ہے 'جس نے اپنے نبی کی صریح تنبیہات کو رد کر دیا اور نبی کی تکذیب کی۔ ناقۃ اللہ کو قتل کر دیا اور اس کے بعد اس قوم کو تباہ و برباد کر دیا گیا اور قوم ثمود کا قصہ ایک نمونہ ہے اس قوم کی ناکامی کا جو اپنے نفس کا تزکیہ نہیں کرتی۔ایسی اقوام نفس کو فسق و فجور کے لیے آزاد چھوڑ دیتی ہیں اور خدا کا خوف ان کے نفوس سے غائب ہو جاتا ہے 'اور اس بات کو سورت کے پہلے ہی پیراگراف میں بتایا گیا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱ : ۱۰) "یقیناً فلاح پا گیا جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو دبا دیا"۔

---ooo---

درس نمبر ۲۹۱ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۱۵

سُوْرَۃُ الشَّمْسِ (۹۱) مَكِّيَّةٌ (۲۶)
اٰیَاتُهَا ۱۵ رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ﴿۱﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ﴿۲﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ﴿۳﴾
وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ﴿۴﴾ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ﴿۵﴾ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ﴿۶﴾
وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ﴿۷﴾ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴿۸﴾ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ
زَكّٰىهَا ﴿۹﴾ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴿۱۰﴾

”سورج اور اس کی دھوپ کی قسم' اور چاند کی قسم جب کہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے' اور دن کی قسم جب کہ وہ (سورج کو) نمایاں کر دیتا ہے' اور رات کی قسم جبکہ وہ (سورج کو) ڈھانک لیتی ہے' اور آسمان کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے قائم کیا' اور زمین کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے بچھایا' اور نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا' پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی' یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا“۔

یہاں اللہ تعالیٰ جس طرح بعض کائناتی مخلوق اور بعض مظاہر کی قسم اٹھاتا ہے' اسی طرح نفس انسانی کی تخلیق اور متناسب بنانے اور اسے اچھی طرح ہموار کرنے اور نیک و بد کے الہام کی قسم اٹھاتا ہے۔ اور اس قسم اٹھانے کا مقصد یہ ہے کہ یہ مخلوقات خدا اہم بن جائیں' لوگ ان کو اہمیت دیں اور ان چیزوں پر غور و فکر کر کے معلوم کر لیں کہ ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کیا ہے اور ان چیزوں کے اشارات کیا ہیں' ان میں نشانات قدرت کیا ہیں تاکہ وہ یہ بات سمجھ لیں کہ کن وجوہات سے اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم کھائی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے دل اور ان مناظر فطرت کے درمیان ایک مکالمہ ہوتا ہے' ان دونوں کے درمیان ایک

خاص خفیہ زبان ہے' یہ زبان گہرے انسانی شعور اور انسانی فطرت کی گہرائیوں میں موجود ہے ۔ ان مناظر کے درمیان' خواہ وہ جیسے بھی ہوں' اور انسانی فطرت اور شعور کے درمیان ایک گہری ہم آہنگی بھی ہے' دونوں کے درمیان مکالمہ ہوتا رہتا ہے' بغیر اس کے کہ کوئی آواز نکلے یا ریکارڈ پر کوئی سوئی لگائی جائے ۔ یہ مناظر دل سے بات کرتے ہیں اور انسانی روح کی طرف ان کے اشارات ہوتے ہیں' اور ان کے اندر ایک ایسی زندگی رواں دواں ہے' جو ایک زندہ انسان کے ساتھ مانوس اور ہمکلام ہے ۔ جب بھی ایک زندہ انسان ان مناظر سے دوچار ہو' تو ان مناظر میں اپنے لیے محبت اور انس کے جذبات جانے گا اور یہ مناظر نہایت ہی ہم آہنگی کے ساتھ اس کے ہمقدم ہوں گے اور اپنا پیغام اسے اپنی مخصوص زبان میں منتقل کر دیں گے ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بڑی کثرت سے' مختلف اسالیب کے ذریعہ کائناتی مشاہد کی طرف انسان کی توجہ مبذول کراتا ہے اور اس سلسلے میں کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا' کبھی تو قرآن مجید براہ راست یہ ہدایت دیتا ہے کہ ان مناظر فطرت پر غور کرو اور کبھی ضمنی اشارات کے ذریعہ جیسا کہ یہاں بعض تعلیقات اور بعض مناظر کی قسم اٹھا کر ان کی طرف یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ مناظر بھی آنے والے حقائق کے فریم ورک کے اندر ہی ہیں اور اس آخری پارے میں ہم نے اس بات کو بار بار نوٹ کیا ہے کہ اس قسم کی ہدایات اور اشارات بہت زیادہ ہیں ۔ کوئی ایسی سورت نہیں ہے جس میں یہ ہدایت اور یہ اشارہ نہ ہو کہ ذرا کتاب کائنات کو پڑھو اور اس کائنات میں ہم آہنگی اور اشارات تلاش کرو' اور اس کائنات کے ساتھ اس کی مخصوص زبان میں مکالمہ کرو اور اس کے استدلال کو سنو ۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا (۹۱ : ۱) "سورج اور اس کی دھوپ کی قسم" ۔ یہاں سورج اور اس کے وقت ضحیٰ اور چاشت اور دھوپ نکلنے کی قسم کھائی گئی ہے ۔ جب سورج نکلتا ہے اور اس کی دھوپ مکمل پھیل جاتی ہے تو اس وقت وہ نہایت ہی خوبصورت اور نہایت ہی اچھا بلکہ خوشگوار اور میٹھا ہوتا ہے اور سردیوں میں تو لوگ اس وقت دھوپ میں گرمی حاصل کرتے ہیں اور یہ وقت نہایت خوشگواری کا ہوتا ہے' اور گرمیوں میں بھی یہ اشراق کا وقت ہوتا ہے' خوبصورت ہوتا ہے اور دوپہر کی سخت گرمی سے قبل کا وقت ہوتا ہے' غرض چاشت کے وقت سورج اپنے مکمل حسن کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا ہے ۔ بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ یہاں چاشت کے وقت سے مراد پورا دن ہے' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ "ضحیٰ" کے وقت اور لفظی مفہوم سے آگے بڑھ کر ہم کیوں پورا دن مراد لیں' کیونکہ چاشت کے وقت میں حسن اور خوش گواری کے زیادہ اشارات ہیں' جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ۔

وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (۹۱ : ۲) "اور چاند کی قسم جو اس کے پیچھے آتا ہے" ۔ یعنی یہ سورج کے بعد آتا ہے' جب سورج غروب ہو تو پھر اس کا لطیف' شفاف' خوبصورت اور صاف نور نمودار ہوتا ہے ۔ انسانی قلب اور چاند کے درمیان قدیم رشتہ محبت ہے' اور یہ رشتہ انسانیات میں دور تک گہرائیوں میں چلا گیا ہے' انسانی نفسیات و ضمیر میں' انسانی قلب و شعور میں یہ زندہ اور چمک دار نظر آتا ہے' پھر چاند انسانی قلب کے ساتھ خوشگوار اور محبت آمیز مکالمہ بھی کرتا ہے' اور محبت بھرے اشارات بھی دیتا ہے' اور اس میں خالق کی حمد و ثنا بھی ہے ۔ قریب ہے کہ ایک سننے والا انسان' روشن چاند کی حمد و ثنا کو سنے' بعض اوقات جب ایک حساس دل چاندنی رات میں سوچتا ہے تو وہ چاند کے اس گہرے نور اللہ کی

ت اور فیوض کو محسوس کرتا ہے' اور ان نورانی موجوں میں اپنے شعور کی میل دور کرتا ہے' اپنی پیاس بجھاتا ہے اور اس نور سے سینہ لگا کر وہ اللہ کے اس نور میں ڈوب جاتا ہے۔

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا (۹۱ : ۳) "اور دن کی قسم جب وہ نمایاں کر دیتا ہے"۔ اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ (ضحھا) سے مراد ایک محدود وقت ہے' پورا دن نہیں ہے اور جلا کی ضمیر شمس کی طرف راجع ہے جو اس سیاق کلام میں مذکور ہے لیکن یہاں سیاق کلام میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ مراد "زمین" ہے۔ قرآن کریم میں اس قسم کا اسلوب بارہا اختیار کیا گیا ہے کہ کوئی ضمیر کسی ایسی چیز کی طرح راجع ہو' جو اگرچہ سیاق میں مذکور نہ ہو' لیکن معہود فی الذہن ہو اور انسانی شعور میں ہروقت حاضر ہو' یہاں سیاق کلام کا تقاضا یہ ہے کہ اس ضمیر کا مرجع زمین ہو۔ چنانچہ دن اس زمین کو روشن کر دیتا ہے اور لوگ اسے اچھی طرح دیکھتے ہیں۔ انسانی زندگی میں دن کا جو کردار ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ انسان کی حالت یہ ہے کہ دن اور رات کے مزے مسلسل لے لے کر وہ اس کا ذوق ہی بھول گیا ہے۔ چنانچہ یہاں گردش لیل و نہار کی ایک جھلک دکھا کر اس کی رعنائیوں کو قلب انسانی میں تازہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ انسان کے احساسات کو زندہ کر کے اور تیز کر کے اس کو اس منظر سے لطف اندوز کیا جائے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا (۹۱ : ٤) "اور رات کی قسم جب وہ ڈھانک لیتی ہے"۔ یہاں لفظ یغشی "ڈھانک لینا" بمقابلہ جلی "نمایاں کرنا' روشن کرنا" استعمال ہوا ہے' اس لیے کہ رات تمام چیزوں کو اپنے سینے سے لگا کر ڈھانپ لیتی ہے اور چھپا لیتی ہے۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جو انسان کے دل کو بے حد متاثر کرتا ہے' اور انسانی زندگی پر جس طرح دن کے اثرات ہوتے ہیں' اسی طرح رات کے اثرات بھی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد آسمان اور آسمان کی ساخت اور اس کی تعمیر پر قسم کھائی جاتی ہے۔

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا (۹۱ : ٥) "اور آسمان کی قسم اور اس کے بنانے والے کی قسم"۔ ما یہاں عربی گرامر کے لحاظ سے اپنے مابعد آنے والے فعل کو مصدر بنا دیتی ہے۔ آسمان سے ہم جو کچھ سمجھتے وہ ایک نیلگوں قبہ ہے جو ہمارے سروں پر ہے اور اس قبے کو جب ہم دیکھتے ہیں تو اس کے اندر ستارے اور سیارے بکھرے پڑے ہیں' اور سیارے اس کی فضاؤں اور مداروں میں پھرتے ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ تو اصل حقیقت ہم نہیں جانتے' ہم اپنے سروں پر جو چیز دیکھ رہے ہیں یہ ایک ایسی چیز ہے جس طرح ایک عظیم الشان عمارت ہو' باہم پیوستہ اور نہایت مضبوط۔ یہ عظیم ہال کس طرح بنا ہوا ہے اور اس کے اجزاء کس طرح باہم پیوست ہیں اور وہ بکھر نہیں رہے۔ اور ایک ایسی فضا میں تیر رہے ہیں جس کے نہ آغاز کا ہمیں علم ہے اور نہ انجام کا ہمیں علم ہے۔ یہی وہ چیز ہے' جس کی حقیقت ہم نہیں جانتے۔ اس آسمان کے بارے میں آج تک اہل علم نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ نظریات ہی ہیں اور وہ ترمیم اور رد و قبول کرتے ہیں۔ یہ نظریات کسی دور میں بھی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں رہے اور ہمیشہ قرار و ثبات سے محروم رہے ہیں۔ ہمارا نظریہ اور ایمان سب سے مضبوط ہے کہ دست قدرت نے انہیں تھام رکھا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ

اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِہ (۳۵ : ۴۱) "وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو ڈھلکنے سے روکے رکھا ہے۔ اگر وہ ہٹ جائیں تو پھر اللہ کے سوا کوئی انہیں اپنی جگہ قائم نہ کر سکے"۔ یہی وہ علم ہے جو نہایت مستحکم ہے' اس کے سوا یقینی بات کوئی اور نہیں ہے۔

اس کے بعد زمین اور اس کے بچھائے جانے کی قسم ہے۔

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰھَا (۹۱: ۶) "اور زمین اور اس کے بچھائے جانے کی قسم"۔ طحی الطحو سے ہے جس کے معنی بچھانے کے ہیں' جس طرح الدحو کا مفہوم ہے بچھانا' اور زندگی کے لیے ہموار کرنا۔ اور یہ ایک عظیم اور نمایاں حقیقت ہے جس کے اوپر انسانوں اور تمام حیوانوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ آسمان و زمین کے اندر اللہ نے جو ہم آہنگی پیدا فرمائی ہے' یہ اسی کی برکت ہے جس کی وجہ سے یہاں زندگی ممکن ہوئی اور یہ سب کام صرف اللہ کی تدبیر اور اندازوں کی وجہ سے ہوا۔ ہمارے لیے یہی واضح اور ظاہری حقیقت کافی ہے کہ اگر ان خصائص اور ہم آہنگیوں میں سے کوئی چیز بھی خلل پذیر ہو جائے تو نہ اس زمین میں زندگی کا وجود ہوتا اور نہ یہ زندگی اس انداز پر چلتی۔ زمین کا "الطحو" جو یہاں استعمال ہوا ہے یا "الدحو" جو سورہ نازعات (۳۰'۳۱) میں استعمال ہوا ہے۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰھَا (۳۰) اَخْرَجَ مِنْھَا مَآءَھَا وَمَرْعٰھَا (۷۹: ۳۱)

"زمین کو اس کے بعد بچھایا اور اس کا پانی اور اس میں سے نباتات نکالی"۔ دونوں مفہوم بچھانا ہے اور یہ بچھانا ان خصائص اور ہم آہنگیوں میں سے بڑی ہم آہنگی ہے۔ اور یہ صرف دست قدرت کا کارنامہ ہے۔ یہاں اس بچھانے کا ذکر کر کے اشارہ قدرت الٰہیہ کی طرف ہے اور قلب انسانی کو اس بات پر اکسایا جاتا ہے کہ ذرا اس پر غور کرے اور نصیحت حاصل کرے۔

ان قسموں اور ان کے اندر پائے جانے والے مظاہر کائنات اور مناظر فطرت کے بعد اب نفس انسانی کے عظیم حقائق پیش کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کائنات کے عجائبات میں سے یہ عظیم تر عجوبہ ہے۔ جو اس زمین و آسمان کی ان ہم آہنگیوں کی وجہ سے قائم ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا (۷) فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا (۸) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰھَا (۹) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا (۱۰) (۹۱: ۷ تا ۱۰) "اور نفس انسانی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا۔ پھر اس کی بدی اور پرہیز گاری اس پر الہام کر دی۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا"۔ ان چار آیات میں اسلام کا نظریہ نفس بیان کیا گیا ہے۔ اس کی طرف سورہ ماقبل' سورہ البلد میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ (۹۰: ۱۰) "اور ہم نے اسے دو راہیں دکھا دیں"۔ نیز سورہ دھر میں بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (٧٦: ٣) "ہم نے اسے راہ دکھا دی۔ اب وہ یا تو شکرگزار بنے گا یا ناشکر"۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ نفس انسانی میں ازروئے فطرت دو صلاحیتیں ہیں جیسا کہ سورہ ص میں کہا گیا ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ (٧١) فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (٧٢) (٣٨: ٧١ ـ ٧٢) "اور اس بات کو یاد کرو کہ جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر کو مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں تو جب میں اسے مکمل بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ"۔ مذکورہ بالا آیات میں نفس انسانی کے متعلق جو کچھ کہا گیا' یہ امور اسلام کے نظریہ فردی ذمہ داری سے بھی مربوط ہے جیسا کہ سورہ المدثر میں کہا گیا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ "ہر نفس اپنی کمائی اور عمل کا ذمہ دار ہے"۔ اور یہ موضوع اس آیت سے بھی متعلق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ کا معاملہ ہرانسان کے ساتھ اس کے اعمال کے مطابق ہوتا ہے جیسا کہ سورہ الرعد میں صراحت سے کہا گیا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ "اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں"۔ ان تمام آیات میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے بارے میں اسلام اور قرآن کا نقطہ نظر کیا ہے اور انسان کے خدوخال کیا ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ مخلوق اپنے اندر دو پہلو رکھتی ہے۔ اس کی صلاحیتیں بھی دو رخ رکھتی ہیں' اس کی ذات کے اندر دو صلاحیتیں ہیں۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس کی تخلیق کا ایک رخ مادی ہے یعنی وہ خاک جس سے اسے بنایا گیا اور دوسرا رخ اس روح کا ہے جو اس کے اندر پھونکی گئی ہے اور یہ روح اللہ کی روح ہے۔ چنانچہ خاک کی صلاحیت شر کی طرف جاتی ہے اور روح کی صلاحیت اسے خیر کی طرف لے جاتی ہے۔ اپنی تخلیق کے اعتبار سے یہ خیر و شر اور ہدایت و ضلالت دونوں کی طرف جا سکتا ہے اور خیر و شر کی تمیز کا ملکہ بھی اسے دیا گیا ہے اور اسے یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ اپنے نفس کو خیر کی طرف موڑ دے یا شر کی طرف موڑ دے۔ یہ طاقت' اختیار اور صلاحیت ازروئے تخلیق اس کے اندر موجود ہے۔ اس کی طرف قرآن نے کبھی تو الہام کے لفظ سے اشارہ کیا ہے۔

وَ نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا (٧) فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا (٩١: ٨) "اور نفس انسانی کی قسم اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا' پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی"۔ اور کبھی اس کی طرف لفظ ہدایت سے اشارہ کیا گیا ہے۔

وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (٩٠: ١٠) (البلد) "ہم نے اسے دو راہوں کی ہدایت کر دی"۔ تو یہ صلاحیت

اس مخلوق کی ذات میں ازروئے تخلیق رکھ دی گئی ہے ۔ تمام رسولوں کی جدوجہد ' تمام اچھے لوگوں کی ہدایات اور تمام خارجی موثرات اور عوامل دراصل اس صلاحیت کو جگاتے ہیں ' اسے ایک رخ اور سمت دیتے ہیں ' اسے تیزیا کند کرتے ہیں ۔ خارجی عوامل اس صلاحیت کی تخلیق نہیں کرتے کیونکہ یہ صلاحیت دو رخی صلاحیت ' ازروئے فطرت تخلیق ' ازروئے طبیعت ' ازروئے الہام الٰہی بشر کے اندر موجود ہے ۔

--- ○○○---

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹) وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱ : ۱۰) "یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا" ۔ مطلب یہ ہے کہ ان فطری قوتوں اور صلاحیتوں کے علاوہ انسان کے اندر ایک قوت مدرکہ ہے اور اس قوت مدرکہ کی وجہ سے انسان ایک ذمہ دار مخلوق بنایا گیا ہے ۔ اس قوت مدرکہ کو جس شخص نے نفس کی تطہیر کے لیے اور اس کے اندر بھلائی کی استعداد کو بڑھانے کے لیے استعمال کیا اور خیر کی صلاحیت کو شر پر غالب کر دیا تو یہ شخص کامیاب ہو گیا ' اور جس شخص نے اپنی قوت عقلیہ کو تاریک کر دیا اور اس کو چھپا کر اور دبا کر کمزور کر دیا تو وہ ناکام ہوا ۔

غرض انسان کی مسئولیت اس وجہ سے ہے کہ وہ قوت عقلیہ اور قوت مدرکہ رکھتا ہے ' اور اپنی اس قوت کی وجہ سے نفس کے اندر موجود خیروشر کی صلاحیتوں کو ایک رخ دے سکتا ہے ۔ ان صلاحیتوں کو خیر کے میدان میں ڈال کر پروان چڑھا سکتا ہے اور شر کے میدان میں ڈال کر شر کو پروان چڑھا سکتا ہے ۔ اس آزادی و اختیار کے نتیجے میں انسان پر ذمہ داری عائد کی گئی ہے ۔ اس کی قوت پر فرض عائد ہوا ۔ یہ انعام تھا جس کے جواب میں اس پر فرائض عائد ہوئے ۔

لیکن اللہ نہایت رحیم ہے ۔ انسان کو محض فطری استعداد ' عقلی قوت مدرکہ اور فطری الہام و ہدایت کے حوالے ہی نہیں کر دیا گیا ' بلکہ آدم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کی ہدایت کے لیے رسول بھیجے گئے جو ان کے لیے مستقل قدریں وضع کرتے رہے ۔ انسان کو ایمان کی بنیادی باتیں بتاتے رہے ' ایمان و ہدایت کے دلائل سمجھاتے رہے ۔ نفس انسانی کے اندر موجود دلائل اور اس کائنات کے آفاق کے اندر موجود اشارات ایمان بھی سمجھاتے رہے ۔ انسان کی آنکھوں پر سے ضلالت کے پردے اتارتے رہے تاکہ اسے راہ ہدایت صحیح نظر آئے ۔ اور یہ راہ واضح ' صاف اور بغیر کسی التباس کے انسان کو معلوم ہو ' ہر طرف سنگ ہائے میل نصب کر دیئے تاکہ وہ انسان منزل مقصود تک پہنچے اور جس راہ پر اس نے جانا ہے ' علی وجہ البصیرت جائے ۔ جس کو بھی وہ اختیار کرے اس پر چلے ۔

یہ تھی مختصراً انسان کے بارے میں اللہ کی اسکیم اور مشیت جو کام بھی ہوتا ہے ۔ اس کے دائرے کے اندر ہوتا ہے ۔ وہ اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے اور اللہ کی مکمل تقدیری نظام کے دائرے میں رہتے ہوئے ہوتا ہے ۔

انسان کی حیثیت اور مقام انسانیت کے بارے میں یہ اجمالی اور مختصر تبصرہ اپنے اندر نہایت ہی قیمتی نکات رکھتا ہے جو انسان کی تہذیب اور تربیت کے لیے نہایت مفید ہیں ۔ ایک یہ کہ اس سے حضرت انسان کو نہایت معزز اور مکرم مخلوق قرار دیا جاتا ہے ۔ اس طرح کہ اسے اپنے معاملات کا خودمختار اور ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے ۔ یہ اختیار اور ذمہ داری اگرچہ اللہ کے وسیع تر نظام مشیت اور تقدیر کے اندر ہے ' کیونکہ یہ حریت اور اختیار اللہ کی مشیت ہی نے اسے عطا کیا ' لیکن اس

سے بہرحال اس مقام و مرتبہ کا تعین ہوتا ہے اور وہ آزاد اور خود مختار مخلوق قرار پاتا ہے ۔ یوں اس کائنات میں انسان ایک نہایت ہی بلند و برتر مقام رکھتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسی مخلوق ہے جسے اللہ نے نہایت اہتمام سے تیار کیا' پھر اس میں اپنی روح پھونکی اور اس جہاں کے بہت سے اور بیشتر مخلوقات پر اسے فضیلت دی ۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ان آیات میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ انسان اپنے انجام کا خود ذمہ دار ہے ۔ سارا معاملہ اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے ۔ (دائرہ مشیت الٰہیہ کے اندر اندر جیسا کہ ہم نے وضاحت کی) اس ذمہ داری سے اس کے شعور میں احتیاط اور تقویٰ کا رنگ پیدا ہوتا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ کی تقدیر اس کی ذات میں اس طرح کام کرے گی جس طرح وہ اپنے تصرفات اور سرگرمیوں کو رخ دے گا ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ "اللہ کبھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت بدلتے نہیں"۔ فی الحقیقت یہ نہایت ہی عظیم ذمہ داری ہے ۔ کوئی ذی شعور شخص اس سے غافل اور لاپرواہ نہیں رہ سکتا ۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ انسانی سوچ کے اندر یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ وہ راہ راست پر ثابت قدم رہنے کے لیے اللہ کے مستقل پیمانوں اور دائمی قدروں کی طرف رجوع کرے تاکہ وہ یقین پر ہو کہ اسے اس کی خواہشات نے کہیں غلط راہوں پر تو نہیں ڈال دیا ہے' دھوکہ تو نہیں دے دیا تاکہ خواہشات نفس اسے ہلاکت کے راستے پر نہ ڈال دیں ۔ اور یہ نہ ہو کہ تقدیر الٰہی کے نتیجے میں وہ کہیں اپنی خواہش کو الٰہ بنا چکا ہو ۔ یہی وجہ ہے' اس طرح وہ مطیع شریعت ہونے کے سبب اللہ کے راستوں سے کبھی نہ بھٹکے گا ۔ وہ اللہ کی ہدایات کے مطابق چل رہا ہو گا' اور اسی نور سے روشنی حاصل کرے گا جو دنیا کی ان تاریک راہوں پر چلنے کے لیے' اللہ نے اسے عنایت کیا ۔

چنانچہ انسان کو اللہ نے اپنی ذات تک پہنچنے کے لیے تزکیہ نفس اور تطہیر ذات کے لیے بے شمار وسائل عطا کیے ہیں' اس کے اردگرد نور کے دریا بہہ رہے ہیں' وہ ان میں ہروقت غسل کر سکتا ہے اور اس کائنات میں معرفت کردگار کے جو سرچشمے رواں دواں ہیں وہ ان میں اپنی ذات کی تطہیر ہروقت کر سکتا ہے ۔

اس کے بعد ایک زندہ تاریخی مثال سے اس بات کو واضح کیا جاتا ہے کہ کس طرح انسان اپنے نفس کو دنیا کی آلودگیوں میں دفن کر دیتا ہے ۔ اور پھر اسے راہ ہدایت سے محروم کر دیتا ہے ۔ یہ مثال قوم ثمود ہے' جو اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے اور جن پر سخت عذاب ٹوٹ پڑا اور ہلاک کر دیے گئے ۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ﴿۱۱﴾ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ﴿۱۲﴾ فَقَالَ
لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ﴿۱۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا
فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿۱۴﴾ وَلَا يَخَافُ ۱
عُقْبٰهَا ﴿۱۵﴾ ع۱۵
۱۶

"ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر جھٹلایا۔ جب اس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی بپھر کر اٹھا تو اللہ کے رسولؐ نے ان لوگوں سے کہا کہ خبردار' اللہ کی اونٹنی کو (ہاتھ نہ لگانا) اور اس کے پانی پینے (میں مانع نہ ہونا) مگر انہوں نے اس کی بات کو جھوٹا قرار دیا اور اونٹنی کو مار ڈالا۔ آخر کار ان کے گناہ کی پاداش میں ان کے رب نے ان پر ایسی آفت توڑی کہ ایک ساتھ سب کو پیوند خاک کر دیا' اور اسے (اپنے اس فعل کے) کسی برے نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے۔"

قوم ثمود اور ان کے نبی حضرت صالح علیہ السلام کی کہانی قرآن مجید میں کئی مقامات پر آتی ہے۔ ہر مقام پر ہم نے اس پر بات کی ہے اور ابھی سورہ الفجر میں' اسی پارے میں یہ کہانی گزری ہے۔ تفصیلات ان مقامات پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

یہاں صرف یہ کہا گیا ہے کہ قوم ثمود نے صرف اپنی سرکشی کی وجہ سے اپنے نبی کی تکذیب کی۔ اور اس سرکشی کے سوا کوئی اور جواز اس کے لیے نہ تھا۔ واقعہ یوں ہوا کہ ان میں سے ایک نہایت ہی شقی القلب شخص اٹھا اور اس نے ناقۃ اللہ کو قتل کر دیا۔ یہ شخص ان میں نہایت سنگدل اور سرکش تھا کہ وہ اس قدر عظیم جرم کے ارتکاب کے لیے تیار ہو گیا۔ حالانکہ ان کے نبی نے واضح الفاظ میں ان کو متنبہ کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ اس ناقہ کو کوئی گزند نہ پہنچانا' نہ اس پانی میں مداخلت کرنا جس کو اللہ نے تمہارے اور ناقہ کے درمیان تقسیم کر دیا ہے کہ ایک دن تمہارے لیے اور ایک دن اس ناقہ کے لیے ہے اور یہ تقسیم اس لیے ہوئی تھی کہ انہوں نے اللہ کے نبی سے معجزے کا مطالبہ کر دیا تھا تو اللہ نے اس ناقہ کو معجزہ قرار دیا۔ اس ناقہ کی کوئی نہ کوئی معجزانہ شان تو بہرحال ہو گی۔ یہاں ہم اس کی تفصیلات میں نہیں جاتے۔ اس لیے کہ خود اللہ نے اس کے شان اعجاز کی تفصیلات نہیں دی ہیں۔ بہرحال انہوں نے اپنی سرکشی کی وجہ سے اللہ کی جانب سے ڈرانے والے کی تکذیب کی اور ناقہ کو قتل کر دیا۔ اور جس شخص نے عملاً یہ فعل اپنے ذمہ لیا۔ وہ ان میں سے بہت زیادہ بدبخت اور شقی تھا۔ لیکن ذمہ داری سب نے لی۔ اور سب ہی ذمہ دار اس لیے قرار پائے کہ انہوں نے اس شخص کو اس برے فعل سے نہ روکا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اسلام کے اصولوں میں سے یہ بنیادی اصول ہے کہ دنیا کی اجتماعی زندگی میں ذمہ داری بھی اجتماعی ہوتی ہے اور یہ اجتماعی ذمہ داری کا قانون اسلام کے انفرادی ذمہ داری کے اصول کے خلاف نہیں ہے۔ یعنی آخرت میں کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہو گا جو اس نے کمایا' کیونکہ اسلام میں یہ بھی گناہ کبیرہ ہے کہ کوئی دوسروں کو نصیحت کرنا چھوڑ دے' دوسروں کی اصلاح' ان کی کفالت سے دستکش ہو جائے اور نیکی کرنے اور ظالم کا ہاتھ پکڑنے پر لوگوں کو نہ ابھارے۔

جب انہوں نے اس عظیم جرم کا ارتکاب کیا تو پھر دست قدرت حرکت میں آیا۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا (۹۱ : ۱۴) "آخر کار ان کے گناہ کی پاداش میں ان کے رب نے ان پر ایسی آفت توڑی کہ ایک ساتھ سب کو پیوند خاک کر دیا"۔ "دمدمہ" کے معنی غضب کے ہوتے ہیں اور غضب کے نتیجے میں جو انتقام اور عذاب آتا ہے۔ لفظ "دمدم" کا تلفظ ہی بتاتا ہے کہ وہ عذاب کس قدر سخت ہو گا۔ اس لفظ کا تلفظ اور ترنم ہی ایک خوفناک منظر کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اللہ نے ان کی زمین کو اوپر نیچے کر دیا اور برابر کر دیا۔ یہ ایک ایسی تصویر کشی ہے جس سے نہایت ہی ہمہ گیر بربادی کا اظہار ہوتا ہے۔

وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا (۹۱ : ۱۵) "اور اسے اس کے کسی برے نتیجے کا خوف نہیں ہے"۔ وہ تو ہر

کمزوری سے پاک ہے' وہ کس سے خوف کر سکتا ہے؟ کہاں خوف کھا سکتا ہے اور کب خائف ہو سکتا ہے؟''

دراصل اس انداز تعبیر سے ایک لازمی مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ کی گرفت نہایت سخت ہوتی ہے' اس لیے کہ دنیا کا جو شخص بھی اگر کسی انجام سے نہ ڈرتا ہو تو وہ سخت ترین مظالم ڈھاتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی پکڑ سخت ہو گی کیونکہ اللہ سے تو کوئی پوچھنے والا ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ''بے شک تیرے رب کی پکڑ بہت شدید ہوتی ہے''۔ اس لیے یہ کہہ کر کہ وہ اپنے کسی فعل کے برے نتیجے سے نہیں ڈرتا' یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کی پکڑ بہت شدید ہو گی۔

یوں نفس انسانی کو اس کائنات کے عظیم حقائق کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے اور اس کائنات کے مشاہد اور مناظر کے ساتھ نفس انسانی کو متعلق کیا جاتا ہے۔ پھر نفس انسانی اور مشاہد کائنات دونوں کو اللہ کی اس سنت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے جو اس نے سرکشوں اور تکذیب کرنے والوں کی گرفت کے لیے وضع کی ہے۔ یہ سب واقعات اللہ کی تقدیر کے حدود کے اندر ہوتے ہیں۔ جس کے نظام میں اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے۔ ہر حادثہ کا ایک وقت طے شدہ ہے۔ ہر واقعہ کا ایک مقصد ہوتا ہے اور اس تقدیر کے نظام میں ہر ہر قدم پر حکمت ربانی کارفرما ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اللہ نفس کا بھی رب ہے۔ اس کائنات کا بھی رب ہے اور نظام قضا و قدر کا بھی وہی منتظم ہے۔ لہٰذا یہ سب اس کی وسیع تر اسکیم مشیت کے دائرے میں ہیں۔

--- ooo ---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ اللیل ۔ ۹۲

۱-- تا-- ۲۱

سورۃ اللیل ایک نظر میں

یہ سورت مظاہر کائنات اور فطرت انسانی کے فریم ورک میں حقیقت عمل اور مکافات عمل کا تعین کرتی ہے ' دونوں چیزیں اپنے مظاہر کے اعتبار سے متنوع ہیں۔

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى (٤) فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (٥) وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى (٦)
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى (٧) وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى (٨) وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى (٩)
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (١٠) (٩٢: ٤ تا ١٠) "در حقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔ تو جس نے (راہ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا' اور بھلائی کو سچ مانا' اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھلایا' اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے"۔ چنانچہ آخرت میں بھی ہر کسی کا انجام اعمال کے مطابق ہو گا' جس نے جو رخ اختیار کیا' اسی منزل تک پہنچ جائے گا۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى (١٤) لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى (١٥) الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى
(١٦) وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى (١٧) الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (١٨) (٩٢: ١٤ تا
١٨) "پس میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔ اس میں نہیں جھلسے گا مگر وہ انتہائی بدبخت جس نے جھلایا اور منہ پھیرا۔ اور اس سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے"۔

چونکہ اس حقیقت کے نتائج و مظاہر دو قسم کے تھے' اور ان نتائج کے دو مختلف رخ تھے۔ اس لیے کائنات اور طبیعت انسانی کے جس فریم ورک میں اس حقیقت کو لایا گیا اس کے مظاہر بھی مختلف ہیں۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى (١) وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى (٢) وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى
(٣) (٩٢: ١ تا ٣) "قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے اور دن کی جب وہ روشن ہو اور اس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا"۔ قرآن کریم کا یہ انداز بیان فقید المثال ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۹۲ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۲۱

آیاتھا ۲۱ — سورۃ اللیل (۹۲) — مکیۃ (۹) — رکوعھا ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى ﴿١﴾ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى ﴿٢﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى ﴿٣﴾

"قسم ہے رات کی جبکہ وہ چھا جائے 'اور دن کی جبکہ وہ روشن ہو اور نر اور مادہ کی تخلیق کی قسم"۔

اللہ اس سورت کا آغاز دو کائناتی معجزات کی قسم اٹھا کر کرتا ہے اور ان دونوں معجزانہ مناظر کو ایسی صفت دیتا ہے جن سے ان کی خوب تصویر کشی ہوتی ہے۔

وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى (۹۲ : ۱) "قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے"۔ اور

وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى (۹۲ : ۲) "اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو"۔ رات جب اس زمین کو ڈھانپ لیتی ہے اور اسے اپنی آغوش میں لے کر چھپا دیتی ہے۔ اور دن جب وہ روشن ہو کر ظاہر ہوتا ہے اور اس کی روشنی میں ہر چیز نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ آسمانوں کے مدار میں بھی دو مختلف اوقات ہیں اور اپنی شکل و صورت میں بھی مختلف مظاہر ہیں 'اور اپنے خصائص و آثار میں بھی مختلف ہیں۔ دوسری قسم دو مختلف جنسوں کے ساتھ ہے 'نر اور مادہ کے ساتھ 'جو جنسی اعتبار سے ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں۔

وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى (۹۲ : ۳) "اور نر و مادہ کی تخلیق کی قسم"۔ اس سے اس سورت کے باہم متقابل مظاہر اور حقائق کی تکمیل ہوتی ہے۔

گردش لیل و نہار دو ایسے مظاہر ہیں جن کے اندر ایسے معانی پوشیدہ ہیں جن کے ذریعہ وہ انسانی دل و دماغ کو بعض اشارات دیتے ہیں اور اگر ان پر غور کیا جائے تو ان کے اندر مزید گہرے معانی ملتے ہیں اور ان معانی کے پیچھے مزید وسعتیں ہیں۔ گردش لیل و نہار ایک ایسا منظر ہے جس سے قلب انسانی براہ راست اثرات لیتا ہے۔ رات جب پوری طرح چھا جائے اور دن جب پوری طرح روشن ہو جائے 'ان دونوں کی مسلسل گردش دراصل گویا ہے اور اس کے اندر

کھلے اشارات ہیں ـ یہ اشارات اس کائنات کے نامعلوم اسرار و رموز کی طرف ہیں اور اس گردش کی گفتگو ان مظاہر سے متعلق ہے 'جن میں معاملات کے بارے میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے ـ اشارات اس طرف بھی ہیں کہ ان مظاہر کی پشت پر ایک قوت مدبرہ ہے جو اس کائنات کو ہر آن نئی شان عطا کرتی رہتی ہے ـ کائنات کی گاڑی رواں دواں ہے ـ اور اسے کسی وقت بھی ایک حال پر قرار و ثبات نہیں ہے ـ

گردش لیل و نہار پر غور و فکر اور تدبر و تفکر کرنے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس عظیم کشتی کو ایک قدرتی ہاتھ چلانے والا ہے اور وہی لیل و نہار کے یہ عمومی مظاہر مسلسل پیدا کرتا رہتا ہے ـ اور یہ گردش ایک عظیم نظام ایک عظیم تسلسل اور حرکت میں نہایت دقیق نظام پر مشتمل ہے ـ اور جو ذات ان افلاک کو چلا رہی ہے وہی انسانی زندگی کو بھی چلا رہی ہے ـ اور انسان شتر بے مہار نہیں چھوڑ دیا گیا اور نہ اس کی تخلیق عبث کی گئی ہے ـ

لوگوں کو گمراہ کرنے والے اور حق کا انکار کرنے والے اس حقیقت میں جس قدر رخنے ڈالنے کی سعی کریں اور لوگوں کی توجہ اس حقیقت سے ہٹانے کی جس قدر مساعی بھی کریں 'لیکن یہ ایک ایسی نمایاں حقیقت ہے کہ ایک سلیم الفطرت انسان کا دل اس کے ساتھ لگا رہتا ہے 'یہ اس حقیقت کو براہ راست پاتا ہے ـ اس کے نظارے کرتا رہتا ہے 'اس کے اشارات وصول کرتا ہے ـ اور اگر غور و فکر کرے تو اس حقیقت کو وہ پائے گا کہ اس کائنات کا ایک مدبر ہے جس کے شعور اور تصور سے کوئی انسان دامن نہیں بچا سکتا ـ اگرچہ کوئی لغو بیانی اور بکواس کرتا رہے 'اور اگرچہ کوئی نہایت ہی ناپسندیدہ انداز میں انکار پر تل جائے ـ

یہی حال ہے 'نر اور مادہ کی تخلیق کی 'انسانوں اور ان حیوانوں میں جو دودھ پلانے والے ہیں 'رحم مادر میں ایک نہایت ہی خوردبینی جرثومہ اور خلیہ قرار پکڑتا ہے ـ پھر یہ خلیہ عورت اور مادہ کے بیضہ کے ساتھ جڑ جاتا ہے ـ اس کے بعد پھر بچہ میں یہ اختلاف کیونکر ہوتا ہے؟ وہ کون ہے جو ایک بچہ کو کہتا ہے ـ تم مرد ہو جاؤ اور دوسرے کو کہتا ہے تم عورت ہو جاؤ ـ اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ فلاں عوامل کسی خلیے کو نر بنا دیتے ہیں اور فلاں عوامل اسے مادہ بنا دیتے ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا 'کیونکہ پھر بھی یہ سوال ہو گا کہ کون ہے جو نر کے لیے یہ عوامل جمع کرتا ہے اور مادہ کے لیے یہ عوامل فراہم کرتا ہے ـ اور ایک کو نر اور دوسرے کو مادہ بنا دیتا ہے ـ اور یہ وہ واقعہ ہے جو پوری ذی روح مخلوق کے ساتھ ہوتا ہے اور اس طرح تمام ذی روح اشیاء کی نسل چلتی رہتی ہے ـ

کیا یہ کام محض اتفاقاً ہو جاتا ہے؟ اتفاق کا بھی ایک قانون ہے اور اگر اس کا خیال رکھا جائے تو انسانی اور حیوانی زندگی کے اندر نر و مادہ کے اعتبار سے جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان کو محض اتفاق کا نتیجہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا ـ لہٰذا صرف یہی ایک نظریہ اور عقیدہ رہ جاتا ہے کہ ایک خالق ہے جو بعض افراد کو نر اور بعض کو مادہ بنا دیتا ہے اور اس میں اس کی حکمت پوشیدہ ہے ـ اور اس نظام سے اس کے کچھ مقاصد ہیں لہٰذا محض بخت و اتفاق پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا ـ اور نہ اس کائنات کے نظام میں خودکاری نام کی کوئی چیز ہے ـ

پھر دودھ پلانے والی ذی روح 'چیزوں کے علاوہ تمام دوسری زندہ مخلوقات میں بھی نر اور مادہ کا نظام جاری ہے بلکہ نباتات تک میں یہ نظام جاری و ساری ہے ـ یہ ایک ہی اصول ہے جو ہر چیز میں جاری ہے اور کسی جگہ اس کی نفی نہیں ہے ـ اس اصول سے صرف اللہ وحدہ کی ذات مستثنٰی ہے کہ اس کا کوئی مادہ نہیں ہے کہ اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے ـ

یہ ہیں ان مناظر قدرت کے بعض اشارات اور یہ ہے انسانیت کی وہ اصلیت جس پر اللہ قسم اٹھاتا ہے ۔اس لیے کہ یہ مشاہد اور انسانیت کی تخلیق کے اندر گہرے دلائل و اشارات ہیں اور انہی سے قرآن مجید یہ نتائج اخذ کرتا ہے کہ اس جہاں کے بعد دوسرا جہاں ہے اور اس جہاں میں جزاء و سزا ہوگی اور یہ جزاء و سزا اس جہاں کے اعمال پر ہوگی ۔

اللہ تعالیٰ اس بات پر قسم اٹھاتا ہے کہ جس طرح اس کائنات کے مظاہر مختلف ہیں اور جس طرح لوگوں کی ساخت اور تخلیق مختلف ہے اسی طرح لوگوں کا طرز عمل اور ان کی جدوجہد بھی مختلف ہے ۔ لہٰذا پھر ان کی سعی و جدوجہد کے اختلاف کی طرح ان کی جزاء و سزا اور نتائج اعمال بھی مختلف ہیں ۔ لہٰذا ''خیر'' ''شر'' کے برابر نہیں ہے' ہدایت اور ضلالت برابر نہیں ہے' ایک صالح شخص ایک مفسد کے برابر نہیں ہو سکتا ہے' یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک سخی اور مال خرچ کرنے اور تقویٰ اختیار کرنے والا بخیل اور مستغنی کے برابر نہیں ہو سکتا ۔ نہ تصدیق کرنے والا اور سننے والا اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو تکذیب کرتا ہے اور منہ موڑتا ہے ۔ ہر ایک کا ایک طریقہ ہے اور ہر ایک کا ایک انجام ہے اور ہر ایک کی ایک مکمل جزاء ہے ۔اور ایسا ہی ہونا چاہئے ۔

إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ﴿٤﴾ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ﴿٥﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ﴿٦﴾ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ﴿٧﴾ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ﴿٨﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ﴿٩﴾ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ﴿١٠﴾ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ﴿١١﴾

''درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں ۔تو جس نے (راہ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا' اور بھلائی کو سچ مانا' اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا' اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے ۔اور اس کا مال آخر اس کے کس کام آئے گا جبکہ وہ ہلاک ہو جائے؟''

تمہاری مساعی مختلف ہیں' اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی تمہاری مساعی مختلف ہیں' اپنے اسباب اور محرکات کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں' اپنے رخ اور سمت کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں اور نتائج کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں ۔اس زمین پر بسنے والے انسانوں کے مزاج بھی مختلف ہیں ۔ان کے تصورات و افکار بھی مختلف ہیں' ان کے ذوق اور مشرب بھی مختلف ہیں' اس کی ترجیحات بھی مختلف ہیں ۔اور لوگوں کی حالت یوں لگتی ہے کہ گویا ان میں سے ہر شخص شاید ایک علیحدہ سیارے کا باشندہ ہے ۔

یہ تو ہے ایک حقیقت' لیکن ایک دوسری حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے' وہ یہ کہ ان تمام افراد بشریت کے درمیان ایک قدر مشترک بھی ہے جو انہیں باہم جوڑے ہوئے ہے ۔اور ان تمام اختلافات کے درمیان مابہ الاشتراک بھی ہے ۔یہ اشتراک انہیں دو گروہوں میں رکھتا ہے ۔دو صفوں میں اور دو جھنڈوں کے تلے قائم رکھتا ہے جو ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں ۔وہ کیا ہے ۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی (۵) وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی (۹۲ : ۶) "تو جس نے دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور بھلائی کو سچ مانا" ۔ ایک تو یہ صف ہے اور دوسری صف ۔

مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰی (۹۲ : ۸) وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰی (۹۲ : ۹) "جس نے بخل کیا اور بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا" ۔

ایک گروہ ہے جو جان بھی کھپاتا ہے ' مال بھی کھپاتا ہے ۔ اللہ کے عذاب اور اللہ کے غضب سے ڈرتا ہے اور سچائی کو مانتا ہے اور سچائی کا نام کیا ہے الحسنٰی ' اس کا علم کیا ہے الحسنٰی ۔ یہ دو قسم کے لوگ ہیں جو دو صفوں میں کھڑے ہیں ' مختلف الزاج لوگ ' مختلف قسم کی مساعی ' مختلف قسم کے طریقہ ہائے کار ' مختلف قسم کے مقاصد ۔ ان دو صفوں میں صف آرا ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں ' ہر ایک کا اپنا نظام اور منہاج کار ہے اور ہر ایک کو الگ الگ توفیق بخشی گئی ہے اور طریقہ دیا گیا ہے ۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی (۵) وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی (۶) فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰی (۷)

(۹۲ : ۵ تا ۷) "تو جس نے دیا ' اور پرہیزگاری اختیار کی اور بھلائی کو سچ مانا اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے" ۔ اس لیے کہ جو شخص مال دے ' تقویٰ اختیار کرے اور سچائی کی تصدیق کر دے تو گویا اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے حاضر کر دیا اور اپنے نفس کو پاک کرنے اور راہ راست پر لگانے کے لیے حتی المقدور سعی کر لی ۔ اب وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ کی نصرت اس کی دستگیری کرے ۔ اور اس کو بھلائی کی توفیق دے کیونکہ اللہ نے اپنے اوپر لازم کر دیا ہے کہ جس شخص نے اچھا ارادہ کیا ' اسے سہولیات فراہم کرے کیونکہ اللہ کی توفیق اور مشیت کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا ۔ اور اس کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا ۔

اور جس کو اللہ نیکی کی سہولیات فراہم کر دے تو گویا وہ منزل مقصود تک پہنچ گیا ۔ نہایت آسانی اور سکون و اطمینان کے ساتھ وہ پہنچ گیا ۔ وہ زمین پر ہوتے ہوئے بھی عالم بالا تک پہنچ گیا ' وہ نہایت آسانی سے اس جہاں میں رہتا ہے ' اس کا ماحول ' اور اس کے ارد گرد رہنے والے سب اس کے لیے سازگار ہو جاتے ہیں ' ان کے قدم سہولت سے اٹھتے ہیں ' اس کی راہ آسان ہو جاتی ہے ' وہ بڑی آسانی کے ساتھ معاملات سے نمٹ لیتا ہے ' غرض تمام کلیات و جزئیات میں اسے سہولیات حاصل ہو جاتی ہیں ۔ یہ ایک ایسا مقام و مرتبہ ہے جس کے دائرے مین سب کچھ آ جاتا ہے ۔ اور اس مرتبہ و مقام کو پانے والا رسول اللہ کے ساتھ حسب وعدہ رہی بڑی سہولیات پاتا ہے ۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰی (۹۲ : ۷) "ہم اسے آسان راستے کی طرف سہولت دیں گے" ۔

وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰی (۸) وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰی (۹) فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی (۱۰) وَ مَا يُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰی (۱۱) (۹۲ : ۸ تا ۱۱) "اور جس نے

بخل اختیار کیا اور اللہ سے بے نیازی اختیار کی اور بھلائی کو جھٹلایا' اس کو ہم سخت راستے کی طرف سہولت دیں گے' اور اس کا مال آخر اس کے کس کام آئے گا جبکہ وہ ہلاک ہو جائے"۔

وہ شخص جو اپنے نفس اور مال میں بخل اختیار کرتا ہے اور اللہ کریم سے بے نیازی اختیار کرتا ہے' اور اس کی ہدایات سے غافل ہوتا ہے اور اللہ کے دین اور اس کی دعوت کی تکذیب کرتا ہے' تو وہ اپنے نفس کو انتہائی شروفساد کے لیے تیار کرتا ہے' اور پرلے درجے کے بگاڑ سے اس کو دوچار کرتا ہے' تو وہ اس بات کے مستحق ہوتا ہے کہ اللہ اس کے لیے ہر چیز مشکل کر دے اور اسے سخت راستوں کی سہولیات فراہم کی جائیں اور اسے توفیق دی جائے کہ وہ ہر قدم پر مشکلات سے دوچار ہو' اس پر آسانیوں کا دروازہ بند کر دیا جائے' اور اسے قدم قدم پر مشکلات درپیش ہوں' جو اسے راہ راست اور صراط مستقیم سے دور ہی لے جائیں۔ اور یہ شخص بدبختی کے راستے پر ہی آگے بڑھے۔ اگرچہ وہ بظاہر یہ محسوس کرے کہ وہ کامیابی کی راہ پر جا رہا ہے۔ حالانکہ وہ تو ٹھوکر کھاتا جاتا ہے اور وہ اپنی ایک ٹھوکر سے بچنے کے لیے دوسری ٹھوکر کھاتا ہے' جس کی وجہ سے وہ سیدھی راہ سے اور دور ہو جاتا ہے تاکہ وہ اللہ کی رضا سے محروم ہو جائے۔ اور جب وہ ٹھوکروں سے بھرے ہوئے اس منحرف راہ پر آگے بڑھتا ہے اور آخرکار ہلاکت کے گڑھے میں گرتا ہے تو اس وقت پھر اس کا مال اسے کوئی فائدہ نہیں دیتا' حالانکہ یہ مال ہی تھا جس نے اسے اللہ سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اب یہ مفید نہیں ہے۔

وَ مَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى (۹۲ : ۱۱) "اور اس کا مال اس کے کس کام آئے گا جبکہ وہ ہلاک ہو جائے"۔ کسی کو شر اور فساد کے لیے سہولیات فراہم کرنا اور اسے معصیت کی توفیق دینا دراصل اسے سخت کام اور سخت راستے کی طرف موڑنا ہے۔ اگرچہ ایسا شخص اس دنیا میں کامیاب نظر آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہنم سے کوئی مشکل منزل اور مشکل جائے قیام نہیں ہے اور العسریٰ سے یہاں مراد جہنم ہی ہے۔

یوں اس سورت کا پہلا پیراگراف ختم ہوتا ہے اور اس میں تمام انسانی سوسائٹیوں کے لیے دو راستے' دو طریقے اور دو نظام متعین کر دیئے جاتے ہیں اور یہ دو راستے ہر زمان و مکان کے لیے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دراصل یہ دو بادشاہ اور دو جھنڈے ہیں' اگرچہ ان کی شکل اور رنگ مختلف ہوں۔ اور یہ کہ ہر انسان مختار ہے' کہ اپنے لیے جو راستہ چاہے اختیار کرے اور جو طریقہ چاہے اپنائے۔ اللہ ہر کسی کو وہی سہولت دیتا ہے جو وہ چاہتا ہے' یا سہولت کا راستہ اور یا سختی کا راستہ۔

رہا اگلا پیراگراف تو اس میں ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کا انجام بتایا گیا ہے۔ یہ دکھایا گیا کہ وہ شخص دوڑتے بھاگتے کہاں تک پہنچ جائے گا۔ جس کو آسان راستوں کی سہولت دی گئی اور اس کی گاڑی کہاں جا کر رکے گی جس کو سخت راستوں پر چلایا گیا اور اس پیراگراف میں بتایا جاتا ہے کہ جس فریق کا جو انجام بھی ہو گا وہ حق ہو گا اور نہایت منصفانہ ہو گا اور ایسا ہی ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ نے لوگوں کو صحیح راستہ بھی بتلایا اور اگر وہ برے راستوں پر چلیں تو ان کو دہکتی ہوئی آگ سے بھی ڈرایا۔

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ﴿١٢﴾ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ﴿١٣﴾ فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ ﴿١٤﴾ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى ﴿١٥﴾ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١٦﴾ وَسَيُجَنَّبُهَا

الْاَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ﴿١٨﴾ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ
ع تُجْزَى ﴿١٩﴾ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى ﴿٢٠﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضَى ﴿٢١﴾

"بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے' اور در حقیقت آخرت اور دنیا' دونوں کے ہم ہی مالک ہیں۔پس میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔اس میں نہیں جھلسے گا مگر وہ انتہائی بدبخت جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔اور اس سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے 'جس کا بدلہ اسے دینا ہو وہ تو صرف اپنے رب برتر کی رضاجوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے اور ضرور وہ خوش ہو گا۔

اللہ نے محض اپنے فضل و کرم کی وجہ سے اپنے اوپر یہ بات فرض کر دی کہ لوگوں کی اس فطرت کے سامنے اور لوگوں کو دی ہوئی قوت مدرکہ کے سامنے ہدایت کا راستہ واضح طور پر بیان فرما دیں۔اسی طرح تمام رسولوں کا بھی یہ فرض قرار دیا گیا کہ وہ دعوت اسلامی کی تشریح کریں اور تمام دعوتی تحریکات اور تمام کتب سماوی اور معجزات بھی اس غرض کے لیے لائے گئے تاکہ کسی کے پاس کوئی بہانہ نہ رہے اور نہ کسی کے اوپر کوئی ظلم ہو۔

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى (۹۲: ۱۲) "بے شک راستہ بتانا ہماری ذمہ داری ہے"۔یہ تو تھی پہلی حقیقت۔
دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہاں ایک قوت قاہرہ ہے 'جس نے تمام لوگوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔اس قوت کے مقابلے میں لوگوں کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (۹۲: ۱۳) "بے شک آخرت اور دنیا دونوں کے ہم مالک ہیں"۔
لہٰذا جو شخص اللہ سے دور ہونا چاہتا ہے وہ کہاں جا سکتا ہے۔اس کے مقابلے میں تو کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔
ان دونوں حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ راستہ بتانا اللہ نے اپنے ذمہ فرض قرار دیا ہے اور پھر سب لوگوں کو اللہ کے سامنے آنا ہے اور اللہ کے مقابلے میں ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔آغاز و انجام کا مالک اللہ ہے' تو اللہ نے انسانوں کو خبردار کر دیا کہ تم بھڑکتی ہوئی آگ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى (۹۲: ۱۴) "تو میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے"۔اور یہ بھڑکتی ہوئی آگ ہر کسی کے لیے نہیں ہے 'بلکہ یہ تو بھڑکائی گئی ہے۔

لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى (۹۲: ۱۵) "اس میں نہیں جھلسے گا مگر انتہائی بدبخت"۔اور یہ انتہائی بدبخت وہ ہو گا جس کا نصیبہ تمام انسانوں میں برا ہو گا۔سوال یہ ہے کہ آگ میں جھلس جانے کے بعد پھر وہ کہاں جائے گا اور اس بدبخت کی مزید تشریح۔

الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (۹۲: ۱۶) "جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا"۔یعنی اس کے سامنے دعوت

اسلامی پیش کی گئی اور اس نے تکذیب بھی کی اور منہ بھی پھیرا' حالانکہ اللہ نے حسب وعدہ اسے راستہ دکھانے کے لیے اس کے سامنے دعوت پیش کی تھی اور یہ وعدہ کیا تھا کہ جو شخص بھی دلی خواہش سے اللہ کی طرف آئے گا' وہ اسے راستہ دکھائے گا۔

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى (۹۲ : ۱۷) "اور اس سے دور رکھا جائے گا وہ جو نہایت پرہیزگار ہو گا"۔ اور یہ متقی شخص ہی نیک بخت ہے بمقابلہ بدبخت (اشقی) کے۔ اور اس کی مزید تشریح۔

الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى (۹۲ : ۱۸) "جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے"۔ یعنی وہ اپنا مال خرچ کرتا ہے تاکہ اس انفاق سے وہ پاک ہو جائے' مال خرچ کرنے کا مقصد مال کی پاکیزگی ہے' دکھاوا یا بڑائی حاصل کرنا نہیں ہے۔ وہ خوشی سے خرچ کرتا ہے اور اس لیے خرچ نہیں کرتا کہ کسی کا اس پر احسان تھا اور وہ اس کا بدلہ چکانا چاہتا تھا' نہ اس لیے کہ لوگ اس کا شکر ادا کریں' یہ خالص لوجہ اللہ خرچ کرتا ہے' جو اس کا اعلیٰ رب ہے۔

وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزَى (۱۹) إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى (۹۲ : ۲۰) "اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ جس کا وہ بدلہ دیتا ہو' وہ صرف اپنے رب برتر کی رضاجوئی کے لیے یہ کام کر رہا ہے"۔

ایسے شخص کو کیا انعام ملنے والا ہے؟ جو متقی ہے' جو اپنے مال کو محض پاک کرنے کے لیے خرچ کرتا ہے' اور رب برتر کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتا ہے۔ وہ جزاء اور وہ انجام جو ان صالح ارواح کو یہاں دکھائی جاتی ہے۔ بہت عجیب جزاء و انعام ہے۔ مروج طریقے سے ہٹ کر یہاں بالکل ایک نئے انعام کا اعلان کیا جاتا ہے۔

وَلَسَوْفَ يَرْضَى (۹۲ : ۲۱) "اور ضرور وہ خوش ہو گا"۔ اس متقی کے کاسہ دل کو رضا سے بھر دیا جائے گا' اس کی روح رضا سے بھر جائے گی' اس کے تمام اعضاء راضی برضا ہو جائیں گے' اس کے وجود کے روئیں روئیں میں رضامندی سرایت کر جائے گی اور اس کی پوری زندگی تروتازہ ہو جائے گی۔ کیا ہی خوب جزاء ہے اور کیا ہی خوب اور عظیم نعمت ہے یہ!

وَلَسَوْفَ يَرْضَى (۹۲ : ۲۱) "اور ضرور وہ خوش ہو گا"۔ اپنے دین پر خوش ہو گا' اپنے رب سے راضی ہو گا' اپنی تقدیر پر راضی ہو گا' اپنے نصیبے پر راضی ہو گا۔ خوشی اور غم دونوں پر راضی ہو گا' مالداری اور ناداری دونوں پر راضی ہو گا' آسانی اور مشکل دونوں پر راضی ہو گا۔ نرمی اور سختی دونوں پر راضی ہو گا' وہ قلق و اضطراب سے دور ہو گا۔ تنگدستی' جلد بازی' بوجھل پن اور مایوسی سے دور ہو گا۔ غرض یہ رضامندی وہ انعام ہو گا جس سے بڑا انعام اور کوئی نہ ہے اور نہ ہو گا۔ یہ ایسا انعام ہے جس کے لیے کوئی مال اور جان دونوں خرچ کر سکتا ہے۔ جو اپنے مال کو خرچ کرتا ہے تاکہ اس کا رب اس سے راضی ہو۔

یہ وہ انعام ہے جو اللہ ہی دے سکتا ہے اور یہ جزاء ان دلوں میں بھر دی جاتی ہے جو خالص اللہ کے ہو جاتے ہیں ' جن کو اللہ کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

وَلَسَوْفَ يَرْضٰى (۹۲ : ۲۱) "اور وہ عنقریب راضی ہو گا"۔ وہ راضی ہو گا ' خوش ہو گا کہ اس نے معمولی قیمت دے دی اور اس کے بدلے اسے بہت کچھ دے دیا گیا۔

غرض اس مقام پر یہ اچانک خوشخبری ہے ' البتہ ان لوگوں کے دلوں میں اس کی توقع ضرور ہے جو اپنے مال کو پاک کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں ' ایسی صورت میں خرچ کرتے ہیں کہ کسی کا ان کے اوپر کوئی احسان نہیں ہے ' پھر بھی خرچ کرتے ہیں۔ محض رضائے ربانی کے لیے خرچ کرتے ہیں ' تو "ایسا شخص لازماً خوش ہو گا"۔ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى (۹۲ : ۲۱)۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الضحیٰ ۔ ۹۳

۱-- تا -- ۱۱

سورۃ الضحیٰ ایک نظر میں

اپنے موضوع 'انداز تعبیر' اپنی فضا اور اپنے اثرات کے اعتبار سے یہ سورت محبت کی ایک چٹکی ہے 'رحمت خداوندی کی باد نسیم اور محبت کا پیغام ہے ۔ یہ رنج و الم میں مبتلا ایک مریض کے لیے دست شفقت ہے ۔ اور یہ پوری سورت روح پرور 'رضامندی اور امید پر مشتمل ہے ۔ اور مخاطب کے دل کو ٹھنڈک 'اطمینان اور یقین سے بھر دیتی ہے ۔

یہ پوری سورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے 'آپ کے ساتھ رب تعالیٰ کی ہمکلامی ہے 'آپ کے لیے تسلی 'تسکین اور اطمینان ہے ۔ پوری سورت میں رحمت کے جھونکے ہیں اور محبت کی شبنم ہے ۔ اللہ کے قرب کی لطف اندوزیاں ہیں 'ایک تھکی روح 'ایک پریشان دل اور ایک رنجیدہ دل کے لیے تسلیاں اور تشفیاں ہیں ۔

کئی روایات میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضورؐ پر وحی آنا کچھ عرصہ کے لیے رک گیا اور جبرئیل علیہ السلام نہ آئے ' مشرکین نے یہ کہنا شروع کر دیا ۔ محمدؐ کو اس کے رب نے چھوڑ دیا ہے 'اس پر یہ سورت نازل ہوئی ۔

ان مشکل دنوں میں 'جب کہ ہر طرف سے مصائب اور مشکلات کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے 'آپ کے لیے وحی کا آنا' اور اللہ کے ساتھ ہمکلام ہونا ایک بڑی تسلی کا ذریعہ ہوتا تھا ۔ کفر و انکار کی تپش میں یہ آپؐ کے لیے ٹھنڈا پانی اور تکذیب کی گرمی اور شدت میں یہ آپؐ کے لیے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہوتے تھے ۔ حضور اکرمؐ اس زمانے میں یوں دن گزار رہے تھے جس طرح کوئی سخت دوپہر کی تپش میں سفر کر رہا ہو' ہر طرف سے نفرت 'عناد' نافرمانی اور دور بدکنے کی فضا تھی ۔ یہی نہیں بلکہ آپؐ کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں 'اذیت دی جا رہی تھی اور دعوت اسلامی کی راہ روکی جا رہی تھی 'مشرکین دعوت اسلامی اور ہدایت کی تحریک پر حملہ آور ہو رہے تھے ۔

ان حالات میں جب سلسلہ وحی منقطع ہوا تو حضورؐ کا زاد راہ اور سرچشمہ قوت منقطع ہو گیا اور آپؐ کو سیراب کرنے والا سرچشمہ خشک ہو گیا اور دل بے قرار کو اپنے محبوب سے جدا کر دیا گیا ۔ اب آپؐ سخت تپش میں بغیر سازوسامان اور بغیر ٹھنڈے پانی کے رہ گئے اور محبت بھری ہوا کے جھونکے آنا بند ہو گئے اور تمام مصائب کے مقابلے میں آپ کے لیے یہ بڑی مصیبت تھی ۔

ایسے حالات میں یہ سورت نازل ہوئی 'محبت کے جھونکے آنا شروع ہوئے ۔ رحمت اور محبت 'قرب اور امید اور رضا و اطمینان کا پیغام آنا شروع ہوا ۔ اور ہر طرف سے یقین کا پیغام آیا ۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى (٣) وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (٤) وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى (٥) (٩٣ : ٣ تا ٥) "تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا' اور نہ وہ ناراض

ہوا۔ اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے "۔ تمہارے رب نے ہرگز تمہیں نہیں چھوڑا اور نہ ناراض ہوا ہے اور نہ اس نے تم پر سے دست شفقت اٹھالیا ہے بلکہ اس کی رحمت اور مہربانی اب بھی تمہارے شامل حال ہے۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (٦) وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (٧) وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى (٨) (٩٣: ٦ تا ٨) "کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانہ فراہم کیا؟ اور تمہیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی اور تمہیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا"۔ ذرا اپنی گزشتہ زندگی پر غور کرو' کیا یہ حقائق اس میں نہیں پائے جاتے؟ کیا یہ باتیں تم اپنے دل میں نہیں پاتے' اور تمہارے زندگی کے واقعات میں اس قسم کے آثار نہیں پائے جاتے۔ ہرگز نہیں' ہرگز نہیں' اللہ نے تمہیں ہرگز نہیں چھوڑا۔ اور نہ وہ ناراض ہوا ہے۔ اللہ کی بھلائی تمہارے شامل حال ہے۔ نہ اس کا سلسلہ کٹا ہے اور نہ کٹے گا بلکہ آنے والا دور بہت ہی خوب ہو گا اور تم اس پر بہت ہی خوش ہو گے۔

حقیقت نفس الامری کے ان لطیف جھونکوں میں اور حقیقت پسندانہ روح کے ساتھ' حقیقی انداز بیان اور حقیقی اثرات کے ساتھ' پھر اس حقیقت کو جس کائناتی فریم کے اندر رکھا گیا ہے اور روز روشن اور چھا جانے والی رات کے ساتھ قسم اٹھاتے ہوئے جو بات کہی گئی ہے' اس انداز تعبیر نے درحقیقت فضا کو نہایت لطیف اور پر محبت بنا دیا ہے۔ ماحول پر رحمت و شفقت' مکمل رضامندی اور شفاف محبت اور رنج و الم کے شکوے چھائے ہوئے ہیں۔

وَالضُّحٰى (١) وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى (٢) مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى (٣) وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (٤) وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى (٥) اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (٦) وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (٧) وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى (٨) (٩٣: ١ تا ٨)

"کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانہ فراہم کیا؟ اور تمہیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی اور تمہیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا"۔

یہ ہے فضائے محبت' یہ ہے باران رحمت' یہ ہے مکمل رضامندی' اور یہ شکوے جو نہایت ہی فصیح و بلیغ انداز کلام میں بیان ہو رہے ہیں۔ الفاظ نرم' نہایت مترنم' موسیقی کی حرکات مرتب' قدم مضبوط' آواز بلند' اثر درد انگیز ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے' اس لطیف محبت' اس الوداعی شفقت' اس مکمل خوشنودی اور ان شفاف شکوؤں کی تصاویر کو کہ کیا خوبصورت فریم تیار کیا گیا ہے۔ روشن دن اور چھا جانے والی رات کا فریم۔

اوقات شب و روز میں سے یہ نہایت ہی صاف اور شفاف اوقات ہوتے ہیں' ان اوقات میں انسانی قلب و نظر غور و فکر کے لیے تیار ہوتا ہے اور انسان اس کائنات اور خالق کائنات کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ ان اوقات میں انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ پوری کائنات اپنے خالق کے آگے جھکی ہوئی ہے اور اپنے خالق کے سامنے تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے۔ نہایت خوشی' سرور اور مدہوشی کی حالت میں' اس فریم کو اللہ نے کیا ہی خوبصورت نقش و نگار دیئے ہیں۔ رات کیسی ہے؟

وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی (۹۳ : ۲) "قسم ہے اس رات کی جب وہ پرسکون ہو جائے"۔ صرف رات نہیں، جس میں وحشت ہوتی ہے، تاریکیاں ہوتی ہیں، یہ رات رکی ہوئی ہے، پرسکون ہے، صاف ہے، ہاں اس پر شفاف محبت اور گلے شکوے کی بدلیاں جابجا پائی جاتی ہیں، اور اس میں الوداعی تاملات کی کدورت بھی ہے جس طرح یتیموں اور غریبوں کی رات ہوتی ہے۔ جس کی فضاؤں میں کدورتیں ہوتی ہیں، اور یہ رات بھر ایک صاف وشفاف دن میں بدل جاتی ہے۔ یوں اس تصویر کے رنگ، اس کے فریم کے رنگوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور یہ تصویر خوب جچتی ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا بے مثال فصیح اور بدیع کلام اس بات پر دلیل ہے کہ یہ اللہ کی کمال درجے کی صفت ہے، جس کی صفت کی کوئی نقل نہیں کر سکتا، اور نہ کوئی اس کی تقلید میں چند قدم آگے جا سکتا ہے۔

---ooo---

(۱) یہ میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن سے ایک اقتباس ہے۔

درس نمبر ۲۹۳ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۱۱

سُوْرَۃُ الضُّحٰی مَکِّیَّۃٌ (۹۳) اٰیَاتُہَا ۱۱ رُکُوْعُہَا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالضُّحٰی ﴿۱﴾ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ﴿۳﴾ وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی ﴿۴﴾ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

"قسم ہے روز روشن کی اور رات کی جبکہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے' (اے نبیؐ) تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور پہلے سے بہتر ہے اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے"۔

اللہ تعالیٰ ان دو خوبصورت اوقات کی قسم اٹھاتا ہے جن میں غور و فکر کے بہتر اور زیادہ مواقع ہوتے ہیں ۔ یہ اوقات ہی اپنے اندر اشارات رکھتے ہیں ۔ یوں اس کائنات کے مظاہر اور نفس انسانی کے درمیان ایک ربط پیدا کر دیا جاتا ہے' اور قلب بشری کو یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ یہ خوبصورت کائنات ایک روح رکھتی ہے' جو نفس انسانی کے ساتھ ہمقدم ہو کر چلتی ہے' اور یہ روح ہر زندہ مخلوق کے ساتھ ایک گونہ محبت رکھتی ہے' اس طرح ہر زندہ دل' اس کائنات کے اندر نہایت ہی انس و محبت کے ساتھ زندہ رہتا ہے' وہ اس میں اجنبی نہیں ہوتا اور نہ پریشان ہوتا ہے ۔ اور اس سورت میں اس کائنات کے ساتھ انس و ہم آہنگی کا ایک گہرا اثر بھی ہے ۔ اس سورت میں انس و محبت کی پینگیں بڑھانا مقصود ہے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ اللہ نے تو آپؐ کے ماحول میں محبت کا نور پھیلا دیا ہے' یہ پوری کائنات انسان کے ساتھ زمزمہ خواں ہے' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ اس جہاں میں اکیلے اور پریشان حال ہوں ۔

قسم کے اس کائناتی اشارہ کے بعد اب بصراحت تاکید آتی ہے ۔

مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی (۹۳ : ۳) "تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا"۔ نہ اللہ نے آپؐ کو چھوڑ دیا ہے اور نہ آپ سے ناراض ہوا ہے ۔ ان لوگوں کو غلط فہمی ہے جو آپ کی روح کو

اذیت دیتے ہیں' جو آپ کے قلبی اطمینان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور جو آپ ؐ کے لیے غبار خاطر بنتے ہیں ۔ اللہ تو "تمہارا رب" ہے اور آپ اس کے ہیں ۔ اس کی ربوبیت میں ہیں ۔ لہٰذا وہ آپ کا نگراں اور کفیل ہے ۔

اللہ کے فضل و کرم کے سوتے خشک نہیں ہوگئے' اور اس کے فیوض و کرم رک نہیں گئے ۔ آپ ؐ کے لیے آخرت میں وہ کچھ ہے جو اس جہاں کی ہر قسم کی داد و دہش سے بہتر ہے ۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (۹۳ : ٤) "آخرت تمہارے لیے اس جہاں سے بہتر ہے" ۔ وہ تو پہلے بھی اچھی ہے اور انجام کار بھی اچھا ہے ۔

دعوت اسلامی کا مستقبل روشن ہے' تمہارے راستے سے تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی' تمہارا نظام زندگی غالب ہو گا' اور جس سچائی کے تم حامل ہو' وہ غالب ہو کر رہے گی ۔ یہی باتیں تو آپ کو پریشان کر رہی تھیں کہ لوگ آپ ؐ سے عناد رکھتے تھے' جھٹلاتے تھے' پھر اذیت دیتے تھے' پھر سازشیں کرتے تھے' پھر آپ ؐ کے ساتھ ہر وقت مذاق کرتے تھے لیکن ۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى (۹۳ : ۵) "عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے" ۔ اب اس سورت کا سیاق آگے بڑھتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دلاتا ہے کہ آپ ؐ کے ساتھ رب تعالیٰ کا سلوک تو روز اول ہی سے نہایت اچھا رہا ہے تاکہ آپ کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ رب تعالیٰ آپ ؐ پر مہربان رہا ہے ۔ آپ ؐ کے ساتھ محبت کرتا ہے اور آپ ؐ پر رحم و کرم کرتا ہے اور اس سے قبل بھی کئی مواقع پر آپ ؐ پر فضل و کرم کرتا رہا ہے' محبت اور انس کا سلوک کرتا رہا ہے اور آپ کے ساتھ اس حسن سلوک کو نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے ۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝۸

"کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانہ فراہم کیا؟ اور تمہیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی اور تمہیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا" ۔ ذرا اپنے عملی حالات پر غور کرو' ماضی قریب پر نگاہ ڈالو' کیا تمہارا ماضی یہ بتاتا ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور تم سے ناراض ہوگیا ہے' یا کچھ اور بتاتا ہے ۔ آپ ؐ پر تو نبوت سے پہلے بھی رب کا فضل رہا ہے' جب آپ ؐ یتیم تھے تو آپ ؐ کی نگرانی کون کر رہا تھا' جب آپ ؐ حیران تھے اور راستہ معلوم نہ تھا تو آپ ؐ کو کس نے راستہ بتلایا ۔ پھر آپ ؐ نادار تھے' آپ ؐ کو کس نے مالدار بنا دیا ۔۔۔ آپ ؐ یتیم پیدا ہوئے تھے' اللہ نے آپ ؐ کو پناہ دی' لوگوں کے دل آپ ؐ پر مائل ہو گئے' اور ابو طالب آپ ؐ پر مہربان ہو گئے حالانکہ انہوں نے آپ ؐ کے دین کو قبول نہ کیا تھا ۔ آپ ؐ فقیر تھے ۔ اللہ نے آپ ؐ کو یوں غنی بنایا کہ آپ ؐ کو دلی قناعت نصیب فرمائی ۔ پھر آپ ؐ نے تجارت فرمائی اور گھر والوں کی دولت آپ کے ہاتھ میں رہی تو آپ سے فقر کا احساس ہی جاتا رہا ۔ اور ماحول میں جو لوگ اہل ثروت تھے ان کی دولت کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے ۔

آپ ؐ ایک ایسی سوسائٹی میں رہتے تھے جو جاہلی سوسائٹی تھی' جس کی قدریں مضطرب تھیں' عقائد و تصورات

ڈانواڈول تھے ۔ طرز عمل اور رسم و رواج گھناؤنے تھے ۔ آپ کی روح اس سوسائٹی میں مضطرب تھی ' آپؐ مطمئن نہ تھے مگر آپؐ کو اس سے نکلنے یا اسے بدلنے کا راستہ بھی معلوم نہ تھا ' نہ اس جاہلی سوسائٹی سے آپؐ مطمئن تھے ' نہ دین موسیٰ کے ماننے والوں سے مطمئن تھے ۔ نہ دین عیسیٰ کے ماننے والوں سے مطمئن تھے ۔ پس اللہ نے آپؐ کی طرف وحی بھیجی اور ایک نظام زندگی آپؐ کو عطا کیا ۔

حقیقت یہ ہے کہ نظریاتی گمراہی بڑی گمراہی ہوتی ہے اور افکار و نظریات کے اعتبار سے درست ہونا ایک بہت بڑی نعمت ہے ۔ یہ اگر کسی پر ہو جائے تو بڑا احسان ہے ۔ یہ راحت بھی ہے اور اطمینان بھی ہے ۔ اور نظریاتی گمراہی اس قدر عظیم ذہنی قلق ہوتا ہے ۔ جس کے مقابلے میں کوئی اور قلق اور اذیت نہیں ہوتی ۔ اس سے ذہنی تھکاوٹ پیدا ہوتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی ذہنی اذیت میں مبتلا تھے کیونکہ وحی رک گئی تھی ' مشرکین ہنس رہے تھے ' اور وحی الٰہی اور مکالمہ الٰہی جیسے محبوب امر سے آپؐ جدائی محسوس کر رہے تھے ۔ ایسے مواقع پر یہ تذکرہ اور اطمینان آ گیا کہ تمہارے رب نے ہرگز تمہیں نہیں چھوڑا بلکہ آغاز وحی سے قبل بھی اللہ نے آپؐ کو تنہا نہیں چھوڑا کہ آپؐ حیران و پریشان اور سرگرداں پھریں ۔

اس حوالے سے کہ یتیمی کی حالت میں آپ کو تحفظ دیا گیا اور حیرانی کی حالت میں راستہ بتلایا گیا ' آپ کو اور آپ کے بعد اہل ایمان کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ سوسائٹی کے اندر پائے جانے والے تمام یتیموں کی کفالت کرو ' تمام سائلوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور اللہ نے آپؐ پر جو عظیم فضل کیا ہے ' اس پر تحدیث نعمت کرو ' اور لوگوں کو دین کی طرف بلاؤ ۔

ا
فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ﴿۹﴾ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿۱۰﴾ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ
اا ع رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾ ع

۱۸ " لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو ' اور سائل کو نہ جھڑکو ' اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو " ۔

یہ ہدایات کہ یتیم کا اکرام کرو ' اس پر سختی نہ کرو ' اس کی دل شکنی نہ کرو ' سائل کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو ' سائل کی عزت کرو ۔ یہ ہدایات مکہ کی نہایت ہی منکر حق اور دولت پرست ' سوسائٹی میں بہت ضروری تھیں ' جس میں ضعیف اور قوت نہ رکھنے والا شخص اپنا حق حاصل نہ کر سکتا تھا ' جہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون تھا ' لیکن جب اسلامی نظام نافذ ہوا تو اسلامی شریعت نے اس سوسائٹی کو حق پرست اور عدالت گستر سوسائٹی بنا دیا ' لوگ نہایت محتاط ہو گئے ' اللہ کے حدود پر رکنے لگے ۔ اور وہ ایک طرف حدود اللہ کو قائم کرنے لگے اور دوسری طرف حقوق العباد کے محافظ ہو گئے ' خصوصاً ایسے لوگوں کے حقوق کے محافظ ہو گئے جن کے پاس قوت نہ تھی ' جو تلوار کے ذریعہ اپنا حق نہیں لے سکتے تھے ۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ احسان کرنے سے نعمت کا شکر ادا ہوتا ہے اور اس سے نعمت پاک بھی ہوتی ہے اور عملاً شکر کی ادائیگی بھی ہوتی ہے ۔ اور خاموش گفتگو اور شریفانہ گفتگو بھی شکر الٰہی ہوتا ہے ۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ ------ ۳۰

سورۃ الم نشرح ـ ۹۴

۱-- تا -- ۸

درس نمبر ۲۹۴ تشریح آیات

۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸

یہ سورہ الضحیٰ کے بعد نازل ہوئی۔ یہ دراصل الضحیٰ کا تکملہ ہی ہے۔ اس کی فضا بھی تروتازہ محبت کی فضا ہے۔ نہایت ہی محبت بھری گفتگو کی روح پر مشتمل ہے۔ اللہ کے کرم کے مناظر اور اللہ کی عنایات کے مقامات پر مشتمل ہے اور یہ خوشخبری کہ جلد آسانیوں کا دور آنے والا ہے۔ اور اس میں یہ حکمت بھی بتا دی گئی ہے کہ جدوجہد کے بعد آسانیاں آتی ہیں۔ اور یہ کہ تعلق باللہ اللہ کی طرف راغب ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔

آیاتها ۸ — سورة الم نشرح (۹۴) مكية (۱۲) — ركوعها ۱

بسم الله الرحمن الرحيم

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴿۱﴾ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ﴿۲﴾ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ﴿۳﴾ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"(اے نبیؐ) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟ اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔ اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح میں کوئی تنگی تھی اور آپؐ دعوت اسلامی کے سلسلے میں کچھ مشکلات محسوس فرماتے تھے۔ آپؐ پریشان تھے کیونکہ آپؐ کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں اور آپؐ کے دل پر ان کے اثرات پڑ رہے تھے اور آپؐ سمجھتے تھے کہ یہ ذمہ داریاں بہت بھاری ہیں اور یہ کہ آپؐ کو اللہ کی امداد' نصرت اور خصوصی زاد راہ کی ضرورت ہے۔

چنانچہ اس موقعہ پر آپؐ کے ساتھ یہ میٹھا مکالمہ ہوا۔ انداز گفتگو ایسا ہے کہ بات محبتوں سے بھری ہے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (۹۴:۱) "(اے نبیؐ) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا"۔ آپؐ کا سینہ دعوت اسلامی کے کام کے لیے کھل گیا' اور آپ کے لیے اس ذمہ داری کا اٹھانا ہم نے آسان کر

دیا۔ یہ ذمہ داری ہم نے آپ کی لیے محبوب بنا دی اور راستہ ہم نے صاف کر دیا اور ہم نے آپ ؐ کو اسی راستے پر لگا دیا یہاں تک کہ آپ ؐ کو اس کا انجام نہایت خوبی سے نظر آنے لگا جو سعادتوں سے پر تھا۔

ذرا اپنے سینے کو ٹٹولیے 'کیا آپ اس میں کشادگی' خوشی اور ایک چمک نہیں پاتے۔ کیا اللہ کے اس دین کا ذوق واضح طور پر نہیں پاتے۔ بتایئے تو سہی کیا ہر مشکل اور مشقت میں آپ یہ بات نہیں پاتے 'کیا ہر تھکاوٹ میں آپ کو خوشی نہیں ہوتی 'کیا ہر مشکل آپ کو آسان نہیں لگتی 'کیا ہر محرومی پہ آپ راضی نہیں ہیں؟

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ (۲) الَّذِىْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (۹۴ : ۳) "اور ہم نے تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا" یعنی دعوت اسلامی کا بوجھ اس قدر بھاری ہو گیا کہ قریب تھا کہ آپ کی کمر ہی توڑ دے۔ ہم نے آپ ؐ کو شرح صدر عطا کیا اور یہ بوجھ ہلکا ہو گیا' آپ کو کام کرنے کی توفیق دی' آپ کے لیے دعوت کا کام آسان کر دیا اور یہ لوگوں کے دلوں تک پہنچنے لگی۔ وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا اور بذریعہ وحی حقائق کا انکشاف ہونے لگا۔ اور یوں یہ دعوت دلوں میں اترنے لگی۔ اور بذریعہ وحی یہ کام نہایت آسانی' نرمی اور سکون سے ہونے لگا۔ کیا آپ ؐ اس تبدیلی کو اس بوجھ میں محسوس نہیں کرتے جس نے آپ ؐ کی کمر توڑ دی اور اب یہ ہلکا ہو گیا ہے۔ شرح صدر کے بعد اب آپ ؐ پر نہ بوجھ ہے اور نہ تنگی دل۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۹۴ : ۴) "اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا"۔ آپ ؐ کا ذکر عالم بالا میں بلند ہونے لگا' پوری زمین میں آپ ؐ کی دعوت کا غلغلہ بلند ہو گیا۔ اس پوری کائنات میں آپ ؐ کا نام بلند ہو گیا اور پھر کلمہ طیبہ میں آپ ؐ کا نام اللہ کے نام کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه کہ جب بھی کوئی کلمہ پڑھے گا آپ ؐ کا نام بلند ہو گا' اس کے بعد آخر اور کیا مقام و مرتبہ ہو سکتا ہے؟ یہ تو آپ ؐ کا ایک منفرد مقام ہے اور تمام مخلوقات کے مقابلے میں آپ ؐ کے لیے مخصوص ہے۔

ہم نے آپ ؐ کا ذکر لوح محفوظ میں کر دیا کہ زمانے گزر جائیں گے 'نسلیں جائیں گی اور آئیں گی اور کروڑوں ہونٹ آپ ؐ کے اسم گرامی کو ادا کرتے رہیں گے۔ صلوٰۃ و سلام بھیجتے رہیں گے۔ گہری محبت اور عظمت و احترام کا اظہار کرتے رہیں گے۔ آپ ؐ کا ذکر یوں بھی بلند ہوا کہ آپ ؐ کا نام اسلامی نظام زندگی اور شریعت محمدی ؐ کے ساتھ منتھی ہو گیا۔ صرف آپ ؐ کا انتخاب ہی رفع ذکر کا باعث بنا۔ یہ وہ مقام تھا جو نہ کسی کو کبھی نصیب ہوا اور نہ ہو گا۔ لہٰذا اب مشقت کہاں' تھکاوٹ کہاں' یہ دین اس قدر عظیم دین ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ہر قسم کی مشقت اور تھکاوٹ کا احساس ہی جاتا رہتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود اللہ اپنے محبوب مختار کے ساتھ مزید مہربانیاں فرماتا ہے' آپ ؐ کی کلفتیں مزید دور فرماتا ہے' آپ ؐ کو خوش اور مطمئن فرماتا ہے اور یہ اطلاع دیتا ہے کہ بہت بڑی آسانیاں اور فراخیاں آپ ؐ کے انتظار میں ہیں۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿۵﴾ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿۶﴾

"پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ مشکل کے ساتھ آسانی لازمی ہے اور مشکل کے بعد آسانیاں ہوتی ہیں۔ اور اے نبی ؐ یہ آپ ؐ کے ساتھ بھی لازم رہی

ہے ۔ جب آپؐ پر دعوت کا بوجھ بھاری ہو گیا تو ہم نے آپؐ کا دل کھول دیا' یوں آپؐ کا بوجھ ہلکا ہو گیا جس نے آپؐ کی کمر توڑ دی تھی لہٰذا مشکل کے ساتھ ہی آسانی جڑی رہی اور یہ بھاری بوجھ ہلکا ہو گیا ۔

یہ اصول ایک اٹل اصول ہے' اس لیے اسے انہی الفاظ میں مکرر لایا گیا ہے ۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (۵) اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (۹۴ : ۶) "پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے ۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے" ۔ یہ تکرار اس بات کا اظہار کر رہا ہے کہ جس وقت یہ آیات نازل ہو رہی تھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بے حد مشقت اور تنگی میں تھے ۔ اس لیے اللہ نے اس مسئلہ کی طرف اس طرح توجہ فرمائی' یاد دہانی فرمائی' اللہ نے حضورؐ کی ذات کے حوالے سے اپنی سابقہ مہربانیاں گنوائیں اور اپنے فضل و کرم اور دستگیری کا ذکر کیا اور آئندہ کے لیے بھی اسی اصول کو تاکید مزید کے ساتھ بیان کیا' تاکہ آپؐ کو تسلی ہو کہ بہتر دور آنے والا ہے ۔ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضور اکرمؐ جن مشکلات میں گھرے ہوئے تھے وہ کوئی سخت مشکلات تھیں ۔

اب بتایا جاتا ہے کہ آپؐ پر جو بہتر دور آنے والا ہے وہ کس طرح آئے گا اور انشراح صدر کے حقیقی اسباب کیا ہوا
۱ کرتے ہیں اور دعوت اسلامی کی طویل راہ میں اور دشوار گزار سفر میں زاد راہ کیا ہے' سیراب ہونے کے ذرائع کیا ہیں ۔

ع ۸ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴿۷﴾ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ﴿۸﴾

۱۹ "لہٰذا جب تم فارغ ہو تو عبادت کی مشقت میں لگ جاؤ اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہو جاؤ" ۔ بے شک سختی کے بعد آسانی ہے' تنگی کے بعد فراخی ہے' اور اس کے اسباب یہ ہیں' ان پر عمل کیجئے کہ جب آپؐ لوگوں کے ساتھ اپنی مشغولیات سے فارغ ہو جائیں اور دنیا کے امور سے فارغ ہو جائیں اور زندگی کی سرگرمیاں قدرے رک جائیں' جب آپ ان امور سے فارغ ہو جائیں تو پھر اس میدان میں اتر جائیں جس میں آپ کو محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہے یعنی اللہ کی عبادت' اللہ کی طرف توجہ ۔

وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ (۹۴ : ۸) "اپنے رب کی طرف راغب ہو جاؤ" ۔ تو پھر آپ صرف رب کی طرف راغب ہو جائیں' تمام دنیاوی امور چھوڑ دیں' یہاں تک کہ دعوت اسلامی کی سرگرمیاں بھی چھوڑ دیں' یہ ہے زاد راہ ۔ ہر سفر کے لیے کوئی نہ کوئی ساز و سامان ہوتا ہے اور یہ ہے ساز و سامان اس سفر کا ۔ جہاد کے لیے تیاری کی ضرورت ہے اور یہ ہے تیاری اور اس کے نتیجے میں تنگی کی بجائے فراخی آ جائے گی ۔ مشکل میں کشادگی آ جائے گی اور یہی ہے صحیح طریق کار ۔

اس سورت کا خاتمہ بھی الضحیٰ کی طرح ہوتا ہے ۔ اختتام پر دل میں دو قسم کے احساسات جاگزیں ہوتے ہیں ۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو حضور اکرمؐ کے ساتھ نہایت ہی عظیم محبت ہے اور عالم بالا سے اس محبت کے تازہ بہ تازہ جھونکے دم بدم آ رہے ہیں' دوسری یہ بات کہ محبت کے ساتھ ساتھ ذات باری کو حضور اکرمؐ کے ساتھ بے حد شفقت اور ہمدردی ہے ۔ اور دونوں سورتوں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت حضور نہایت مشکل دور سے گزر رہے تھے ۔ لہٰذا عالم بالا کی طرف سے اس محبت اور شفقت کے اظہار کی ضرورت تھی ۔ یہ حق کی دعوت کی بھاری ذمہ داری ہے ۔ کمر توڑ دینے والا ہے لیکن جو لوگ یہ کام کرتے ہیں ان پر اللہ کا نور اور رحمت ہر وقت چوکس رہتی ہے ۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ التین ـ ۹۵

۱-- تا-- ۸

درس نمبر ۲۹۵ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۸

اس سورت میں جو بنیادی حقیقت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ فطرت کیا ہے جس پر اللہ نے حضرت انسان کو پیدا کیا ہے اور یہ کہ ایمان کی وجہ سے یہ فطرت سیدھی راہ پر قائم رہتی ہے اور اس قدر نشوونما پاتی ہے اور ترقی کرتی ہے کہ اپنے ان اعلیٰ مراتب تک جا پہنچتی ہے جو اللہ نے انسان کے لیے تجویز کیے ہیں۔ اور جب یہی فطرت ایمان سے محروم ہوتی ہے تو نچلے سے نچلے درجوں میں گر جاتی ہے۔

سُوْرَۃُ التِّیْنِ (۹۵) مَکِّیَّۃٌ (۲۸) اٰیَاتُھَا ۸ رُکُوْعُھَا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ التِّیْنِ وَ الزَّیْتُوْنِ ﴿۱﴾ وَ طُوْرِ سِیْنِیْنَ ﴿۲﴾ وَ ھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ ﴿۳﴾

"قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طور سینا اور اس پرامن شہر (مکہ) کی"۔ اللہ انسانی فطرت مستقیمہ پر انجیر' زیتون' طور سینا اور پرامن شہر مکہ کی قسم اٹھائی ہے۔ اور یہ قسم دراصل اس حقیقت یعنی فطرت انسان کے لیے ایک موزوں اور مناسب فریم کا کام دیتی ہے۔ ہم اس سے قبل ثابت کر چکے ہیں کہ جس حقیقت کی تصویر کو فریم کرنے کے لیے جن مناظر قدرت کی قسم اٹھائی جاتی ہے اس حقیقت اور مناظر قدرت کے درمیان ایک خاص مناسبت ہوتی ہے اور یہ کسی جگہ واضح اور کسی جگہ بہت دقیق و لطیف ہوتی ہے۔

طور سینین سے مراد وہ پہاڑ ہے جس کے دامن میں اللہ اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان مکالمہ ہوا تھا اور بلد امین سے مراد شہر مکہ ہے۔ ان دونوں مقامات کا دینی حقائق کے ساتھ تعلق بالکل واضح ہے۔ انجیر اور زیتون تو بظاہر ان دونوں کا تعلق واضح نہیں ہے کہ ان کا فطرت انسانی اور تخلیق انسانی یا دینی حقائق کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

تین اور زیتون کی تفسیر میں روایات اور اقوال بہت وارد ہیں۔ بعض اقوال میں آیا ہے کہ "تین" سے مراد "طوتیلہ" کا مقام ہے جو دمشق کے قریب ہے ...... بعض نے کہا ہے کہ تین سے راد وہ درخت ہے جس کے پتے حضرت آدم اور حوا علیہما السلام نے اپنے جسم پر لپیٹے تھے' جبکہ جنت میں شیطان کے ورغلانے پر ان کو لباس سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اور اس کے بعد یہ دونوں زمین پر اتارے گئے تھے اور انہوں نے یہاں زندگی کا آغاز کیا تھا۔ بعض اقوال میں یہ تفسیر کی گئی ہے کہ

اس سے مراد کشتی نوح کے رکنے اور ٹھہرنے والی پہاڑی ہے جس میں انجیر کے درخت زیادہ اگے ہوئے تھے۔

زیتون کے بارے میں بہت سے اقوال وارد ہیں' بعض کے مطابق اس سے مراد "طور زیتا" ہے جو بیت المقدس میں ہے' بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد خود بیت المقدس ہے' بعض نے کہا کہ اس سے مراد زیتون کی وہ شاخ ہے جو وہ کبوترلے کر آیا تھا جسے حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی سے چھوڑا تھا' تاکہ آپ طوفان کے حالات کا مطالعہ کریں جب یہ کبوتر زیتون کی شاخ لے کر آیا تو آپ نے معلوم کر لیا کہ زمین کے بعض حصوں سے پانی اتر گیا ہے اور وہاں درخت اگ آئے ہیں۔

بعض حضرات اس طرف گئے ہیں کہ تین اور زیتون سے وہی پھل مراد ہیں جو ہم کھاتے ہیں اور جانتے ہیں اور ان سے کوئی اشاراتی مفہوم مراد نہیں ہے۔ یا اگر کوئی ہے تو صرف وہ جگہ ہے جہاں یہ لگتے ہیں۔ یہ تو تھے اقوال۔ جہاں تک زیتون کا تعلق ہے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی اس کا ذکر آیا ہے کہ یہ طور کے پہاڑ میں لگتا ہے۔

وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ (۲۳ : ۲۰) "اور وہ درخت جو طور سینا سے نکلتا ہے تیل کی پیداوار دیتا ہے اور کھانے والوں کے لیے سالن ہے" اور سورہ عبس میں ہے۔

وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا (۸۰ : ۲۹) "اور زیتون اور کھجور کے درخت"۔ جبکہ تین کا ذکر پورے قرآن مجید میں صرف اس جگہ آیا ہے۔

لہٰذا مذکورہ بالا اقوال میں سے کسی ایک کے بارے میں ہم کوئی قطعی بات نہیں کر سکتے' البتہ پورے قرآن مجید میں قسموں کے معاملے میں قرآن کریم کے انداز کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تین اور زیتون سے اشارہ ایسے مقامات یا ایسے واقعات کی طرف ہو جن کا تعلق دین اور ایمان سے ہو' یا اس بات سے ہو جو جواب قسم کے طور پر آرہی ہے کہ انسان کو ہم نے ایک بہترین انداز پر پیدا کیا۔ شاید جنت کی وہ جگہ مراد ہو جہاں انسان نے اپنی زندگی کا آغاز کیا تاکہ ان دونوں قسموں کا یہ اشارہ بھی قرآن کریم کے عام انداز کے ساتھ ہم رنگ ہو جائے اور یہ فریم اس تصویر کے ہم آہنگ ہو جائے جو اس میں ہے۔ موضوع کے اعتبار سے سورت میں جو بات کی گئی ہے وہ یہ ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝

"ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا' پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا' سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے آغاز تخلیق ہی سے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا اور حضرت انسان پر اللہ کی نظر عنایت رہی ہے' ویسے تو اللہ نے ہر چیز کو بہترین

ساخت پر پیدا کیا ہے' لیکن اس مقام پر اور دوسرے مقامات پر انسانی ساخت کی موزونیت کا ذکر' اور انسان کے تسویہ اور اس کے اعضا کی تعدیل کا ذکر اس بات کی علامت ہے کہ اللہ کے ہاں اپنی مخلوقات میں سے انسان کی اہمیت بہت زیادہ ہے' باوجود اس کے کہ انسان میں بہت سی کمزوریاں ہیں اور یہ کہ وہ راہ راست سے بھٹک جاتا ہے اور فطری راہ کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چلتا ہے اور شر و فساد میں مبتلا ہوتا ہے۔ پھر بھی اللہ کی طرف سے اس کی طرف یہ توجہ بتاتی ہے کہ اللہ کے ہاں انسان کا ایک مقام و مرتبہ ہے اور یہ مقام و مرتبہ اس پوری کائنات کے نظام میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اور اس کی ساخت کو نہایت اعلیٰ درجے کا بتایا ہے۔ جسمانی اعتبار سے بھی یہ مخلوق نہایت مکمل اور پیچیدہ نظام رکھتی ہے اور عقلی اعتبار سے بھی یہ تمام مخلوق سے برتر ہے اور روحانی کمالات کے اعتبار سے بھی یہ بہت ممتاز اور باکمال ہے۔

یہاں زیادہ اہمیت انسان کے روحانی پہلو کو دی گئی ہے۔ کیونکہ انسان اگر روحانی پہلو سے راہ فطرت کو چھوڑ دے اور غلط راہوں پر پڑ جائے اور ایمان کے بجائے کفر کو اختیار کرے تو بہت گر جاتا ہے۔ تمام مخلوقات سے نیچے چلا جاتا ہے اس لیے کہ انسان اپنی جسمانی ساخت تو نہیں بدل سکتا' سب سے نچلی سطح پر یہ اگر گرتا ہے' تو روحانی اعتبار سے گرتا ہے۔

یہ روحانی خصوصیات ہی ہیں جن کی اساس پر انسان تمام دوسری مخلوقات پر فائق ہے۔ انسان ان خصوصیات کی بنا پر اس قابل ہے کہ ملائکہ مقربین سے بھی اونچے مقام تک چلا جائے' قصہ معراج اس بات پر دلیل ہے کہ ایک مقام تک جبرئیل علیہ السلام گئے اور پھر رک گئے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام سے آگے چلے گئے' بہت زیادہ بلندیوں اور رفعتوں تک۔ اور یہی مخلوق انسان اگر گرنے پہ آئے تو یہ اس مقام تک گرتا ہے جس تک دوسری کوئی مخلوق نہیں گرتی۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (۹۵ : ۵) "پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے نیچوں سے نیچا کر دیا"۔ اس قدر نیچے کہ بہائم بھی اس سے بلند نظر آنے لگے' وہ ایسے انسانوں کے مقابلے میں سیدھی راہ پر نظر آنے لگے کیونکہ وہ فطرت پر قائم ہوتے ہیں' ان کو اللہ کی تسبیح و تہلیل کا الہام ہوتا ہے اور وہ اس کرۂ ارض پر جس مقصد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اسے پورا کرتے رہتے ہیں حالانکہ اس انسان کو دوسرے بہائم کے مقابلے میں نہایت ہی اچھی ساخت پر پیدا کیا گیا تھا' لیکن یہ رب تعالیٰ کا انکار کرنے لگا اور ایسے گہرے گڑھے میں گرا کہ اس سے زیادہ اور کوئی گہرائی اور گراوٹ نہ رہی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۹۵ : ٤) "ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا"۔ یعنی اپنی فطرت اور اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ بہترین تھا۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (۹۵ : ۵) "پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے نیچوں سے نیچا کر دیا"۔ جب اس نے اپنی فطرت کو اس سطح سے گرا دیا جو اس کے لیے رب تعالیٰ نے مقرر کی تھی اور یہ تشریح کر دی تھی کہ اس خط سے نیچے گراوٹ ہے اور اوپر انسانیت اور فطرت ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۹۵ : ٦) "سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے"۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جو فطرت کی راہ پر سیدھے قائم رہتے ہیں اور ایمان اور عمل صالح کے ساتھ اپنی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور پھر اس کمال تک پہنچتے ہیں جو ان کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اکمل الکاملین بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے۔

فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (۹۵ : ۶) "ان کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے"۔ یعنی دائمی اور نہ رکنے اور نہ کٹنے والا۔ وہ لوگ جو اپنی فطرت کو نیچے سے نیچے گرا لیتے ہیں' تو وہ نیچے ہی گرتے چلے جاتے ہیں' یہاں تک کہ وہ جہنم کے بھی سب سے نچلے مرتبے میں ہوتے ہیں جہاں ان کی انسانیت کی آخری علامت بھی ختم ہو جاتی ہے اور وہ مجسم گراوٹ بن جاتے ہیں۔

اعلیٰ علیین اور اسفل سافلین دراصل دو انتہائی مقامات ہیں اور دونوں کا آغاز مقام فطرت کے خط مستقیم سے ہوتا ہے۔ مقام فطرت سے انسان ایمان و عمل صالح سے اٹھتا رہتا ہے اور اٹھتے اٹھتے اپنے مقام مقرر جنت نعیم تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اگر انسان فطرت سے انحراف کر لے اور نیچے کی طرف کرتا رہے اور روحانیت سے اپنا رشتہ کاٹ لے تو جہنم تک پہنچ کر اس کے بھی نچلے درجے میں جا گرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں ایمان کی قدر و قیمت کیا ہے۔ یہ وہ نور ہے جس کی روشنی میں انسان مقام بلند تک پہنچتا ہے۔ ایمان وہ رسی ہے جو انسانی فطرت اور اس کے خالق کے درمیان رابطے کا کام دیتی ہے۔ اور یہ وہ روشنی ہے جس کے نور میں یہ اس مقام تک قدم بقدم بڑھتا ہے جو نہایت مکرم لوگوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔

جب یہ رابطہ ٹوٹ جاتا ہے جب یہ چراغ بجھ جاتا ہے' تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانیت نہایت ہی گہرے گڑھے میں گر جاتی ہے اور گرتی چلی جاتی ہے' آدمیت حیوانات سے بھی نیچے چلی جاتی ہے۔ اور انسان مٹی کا ایک بت رہ جاتا ہے اور پھر یہ پتھر کی طرح جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔ اس فضا اور ماحول میں انسان کے نام ایک کال آتی ہے : ۱

ع ۸ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝

۲۰

"پس (اے نبیؐ) اس کے بعد کون جزا و سزا کے معاملہ میں تم کو جھلا سکتا ہے؟ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟" اے نبیؐ ان حقائق کے ہوتے ہوئے کیا کوئی معقول شخص عقیدۂ آخرت کے بارے میں آپؐ کو کوئی جھلا سکتا ہے' خصوصاً جب کہ انسانیت کی قدر و قیمت ایمان کا بڑا مقام ہے اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کا انجام کس قدر گھناؤنا ہے جو نور سے محروم ہوتے ہیں اور جن کے ہاتھوں سے اللہ کی مضبوط رسی چھوٹ چکی ہوتی ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (۹۵ : ۸) "کیا اللہ سب حاکموں میں سے بڑا حاکم نہیں ہے"۔ کہ وہ سب سے بڑا منصف نہیں ہے' جبکہ وہ لوگوں کے درمیان یوں انصاف کر رہا ہے۔ کیا مومنین کا انجام اور کافرین کا یہ انجام حکمت بالغہ پر مبنی نہیں ہے؟ انصاف واضح ہے' حکمت نہایت بلند ہے' یہی وجہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوع حدیث روایت ہے کہ جب تم میں سے کسی نے سورہ تین اور زیتون کو پڑھا اور وہ آخر تک پڑھ چکا اور اس نے پڑھا۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (۹۵ : ۸) تو اسے کہنا چاہئے "ہاں اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں"۔

---○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ العلق ـ ۹۶

۱-- تا-- ۱۹

درس نمبر ۲۹۶ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۱۹

سُوْرَةُ الْعَلَقِ (۹۶) مَكِّيَّةٌ (۱)　آیاتها ۱۹　رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ﴿۳﴾ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا' جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو' اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا' انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا"۔

اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیات قرآن مجید کی سب سے پہلی نازل ہونے والی آیات ہیں جن روایات میں آیا ہے کہ کچھ دوسری آیات سے وحی کا آغاز ہوا' وہ قوی روایات نہیں ہیں۔ امام احمد نے روایت کی ہے' عبدالرزاق سے' انہوں نے معمر سے' انہوں نے زہری سے' انہوں نے عروہ سے' انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہ وہ فرماتی ہیں :

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز یوں ہوا کہ سونے کی حالت میں آپؐ کو سچے خواب آتے۔ آپؐ جو خواب بھی دیکھتے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہوتے۔ اس کے بعد آپؐ خلوت نشینی پسند کرنے لگے۔ چنانچہ آپؐ غار حرا میں جاکر خلوت اختیار فرماتے۔ آپؐ وہاں تحنث یعنی عبادت فرماتے' اور یہ سلسلہ کئی شب و روز تک رہتا۔ اور اس کے بعد آپؐ گھر والوں کے پاس آتے۔ اور اس خلوت نشینی کے لیے توشہ لے جاتے۔ پھر واپس حضرت خدیجہؓ کے پاس آتے اور مزید عرصے کے لیے سامان لے جاتے۔ یہاں تک کہ آپؐ پر سچائی آگئی' اس وقت آپؐ غار حرا ہی میں تھے۔ فرشتہ آیا تو اس نے کہا "پڑھو" تو حضورؐ نے فرمایا: "میں پڑھنے والا نہیں ہوں"۔ فرماتے ہیں اس نے مجھے پکڑا اور بھینچا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ تب مجھے چھوڑا اور کہا: "پڑھو" تو میں نے وہی جواب دیا کہ "میں

پڑھنے والا نہیں ہوں"۔ اس نے دوسری مرتبہ مجھے پکڑا اور بھینچا یہاں تک کہ میری قوت جواب دینے لگی۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور پھر کہا: "پڑھو" تو میں نے کہا: "میں پڑھنے والا نہیں ہوں"۔ تو اس نے مجھے پھر پکڑا اور بھینچا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی اور پھر کہا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۱) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۲) اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ (۳) الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (٤) (٩٦: ١ تا ٤) "پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا' جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو' اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا' انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا"۔

اس وحی کو لے کر حضورؐ واپس آئے اور حال یہ تھا کہ آپؐ کانپ رہے تھے۔ آپؐ حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا "مجھے چادر اوڑھاؤ' مجھے چادر اوڑھاؤ"۔ تو انہوں نے آپؐ کو چادر اوڑھا دی۔ یہاں تک کہ آپؐ کا خوف دور ہوا۔ پھر آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے کہا مجھے کیا ہو گیا ہے اور پھر آپؐ نے ان کو پوری کہانی سنائی اور کہا میں تو ڈر گیا تھا کہ میری جان ہی نہ چلی جائے۔ تو اس پر حضرت خدیجہؓ نے کہا' ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں آپؐ کو خوشخبری دیتی ہوں' خدا کی قسم اللہ کبھی بھی آپ کو بے سہارا نہ چھوڑے گا۔ آپؐ تو صلہ رحمی کرتے ہیں' سچ بولتے ہیں' کمزوروں کی مدد کرتے ہیں' مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی مصیبتوں میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ پھر حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ ابن نوفل ابن اسد ابن عبدالعزیٰ ابن قصی کے پاس لے گئیں۔ ورقہ زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے اور عبرانی اور عربی میں انجیل لکھتے۔ جس قدر اللہ کی مشیت ہوتی۔ اس وقت وہ بہت بوڑھے اور نابینا تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سے کہا بھائی ذرا اپنے بھتیجے کا حال سنئے۔ ورقہ نے کہا بھتیجے تمہیں کیا نظر آیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ نظر آیا تھا آپؐ نے بیان فرما دیا۔ اس پر ورقہ نے کہا یہ تو وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا' کاش میں جوان ہوتا اور کاش میں اس وقت زندہ ہوتا کہ جب تمہاری قوم تمہیں وطن سے نکال دے گی تو حضورؐ نے فرمایا کیا سچ وہ مجھے میرے وطن سے نکال دیں گے۔ ورقہ نے کہا جو تعلیم تم لے کر آئے ہو' اس طرح کی تعلیم جو بھی لے کر آیا ہے لوگ اس کے دشمن ہو گئے۔ اگر میں نے تمہارا یہ دور پایا تو میں ضرور تمہاری مدد کروں گا۔ زیادہ مدت نہ گزری کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا"۔ (بخاری اور مسلم میں یہ حدیث امام زہری سے مروی ہے)

طبری نے حضرت عبداللہ ابن زبیر سے یہ روایت کی ہے "....حضرت جبرئیل میرے پاس دیبا کا ایک ٹکڑا لے کر آئے۔ جب میں سو رہا تھا۔ اس میں ایک کتاب تھی' انہوں نے مجھ سے کہا پڑھو۔ میں نے کہا میں نہیں پڑھتا تو انہوں نے مجھے بھینچا' اس قدر کہ میں سمجھا میری جان نکل گئی۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو' تو میں نے کہا میں کیا پڑھوں؟ یہ بات میں نے اس ڈر سے کہی کہ فرشتہ میرے ساتھ دوبارہ وہ کام نہ کرے جو اس نے کیا۔ تو اس نے کہا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۱) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۲) اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ (۳) الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (٤) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (٥) (٩٦: ١ تا ٥)

فرماتے ہیں اب میں نے اسے پڑھ لیا۔ میں نے آخر تک پڑھ لیا۔ اس کے بعد وہ میرے پاس سے چلا گیا اور میں نیند سے بیدار ہو گیا۔ حالت یہ تھی کہ میرے دل میں ایک کتاب لکھ دی گئی تھی۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ مخلوق خدا میں سے شاعر اور مجنون مجھے سب سے برے لگتے تھے۔ میں ان دونوں قسم کے لوگوں کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ فرماتے ہیں میں نے سوچا کہ شاعر اور مجنوں سے تو موت ہی بہتر ہے۔ تاکہ قریش میرے بارے میں شاعر اور مجنوں کا لفظ نہ استعمال کر سکیں۔ بہتر ہے کہ میں اونچے پہاڑ پر چلاؤں' اپنے آپ کو اس پر سے گراؤں اور اپنے آپ کو قتل کر کے اس صورت حالات سے نجات پاؤں۔ چنانچہ میں اس ارادے سے نکلا یہاں تک کہ میں پہاڑ کے وسط میں تھا کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سنی جو یوں تھی "اے محمدؐ تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبرئیل ہوں"۔ میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا کیا دیکھتا ہوں کہ جبرئیل ایک انسان کی صورت میں آسمان کے افق پر کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں: "اے محمدؐ تم تو رسول اللہ ہو اور میں جبرئیل ہوں"۔ فرماتے ہیں میں کھڑا ہو گیا اور انہیں دیکھتا رہا۔ اور اس منظر نے مجھے اس کام سے روک لیا جو میں کرنا چاہتا تھا۔ میں نہ ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا اور نہ پیچھے۔ میں نے کوشش کی کہ آسمان کے اطراف میں اس سے منہ پھیر لوں لیکن میں جدھر بھی دیکھتا انہیں وہاں کھڑا پاتا۔ چنانچہ میں یونہی کھڑا رہا' نہ ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا اور نہ ایک قدم پیچھے مڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ خدیجہ نے اپنے آدمی میری تلاش میں بھیجے۔ یہ لوگ مجھے دیکھ کر مکہ پہنچ گئے اور خدیجہ کی طرف لوٹ گئے۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ اس کے بعد وہ چلے گئے اور میں بھی اپنے اہل و عیال کی طرف مکہ آگیا"۔ ابن اسحاق نے اس روایت کو طویل عبارت میں وھب ابن کیسان سے بھی روایت کیا ہے۔

اس واقعہ پر میں نے بہت غور کیا' اس پہلے واقعہ کو سیرت کی کتابوں میں تو ہم نے بارہا پڑھا تھا کتب تفاسیر میں بھی دیکھا تھا' لیکن ہم پڑھ کر آگے بڑھ گئے تھے یا قدرے غور کر کے آگے بڑھ گئے تھے۔ لیکن اب غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ تو ایک عظیم واقعہ تھا' اور نہایت ہی عظیم واقعہ تھا۔ ہم اس واقعہ کی عظمت کا جو تصور بھی کریں لیکن اس کے کچھ پہلو پھر بھی ہمارے تصور سے خارج رہیں گے۔ بہرحال یہ واقعہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی عظیم ہے اور اپنے مفہوم کے اعتبار سے بھی عظیم ہے۔ انسانوں کی زندگی پر اس کے جو آثار مرتب ہوئے اس کے اعتبار سے بھی عظیم ہے اور وہ لمحات جن میں یہ واقعہ پیش آیا وہ اس زمین کے عظیم اور قیمتی لمحات تھے۔ آغاز نظام کائنات سے لے کر اس کے انجام تک۔

سوال یہ ہے کہ یہ واقعہ کیا تھا اور ان لمحات میں وہ کیا کچھ ہو گیا؟ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ جل شانہ جو بہت ہی عظیم' جبار و قہار اور متکبر ہے' اور مالک الملک ہے' اس اللہ نے اپنی بلندیوں سے اس حقیقت پر نظر کرم فرمائی جسے عرف عام میں "انسان" کہتے ہیں' جو اللہ کی اس عظیم کائنات کے ایک گمنام گوشے میں پڑا ہوا تھا' جسے عرف عام میں "زمین" کہتے ہیں۔ اللہ نے اپنی اس مخلوق انسان کو یہ اعزاز بخشا کہ وہ الہی تجلیات کا مہبط بنے' اللہ کی حکمت کا امین بنے' اللہ کے کلام کا منزل بنے اور یوں اللہ کی تقدیر اور تدابیر اس مخلوق کو جس مقام و مرتبہ تک لے جانا چاہتی تھی اس کی مثال بنے۔

یہ ایک عظیم بات ہے' اس قدر عظیم جس کی عظمتیں لا انتہا ہیں اور اس کی عظمتیں مزید واضح ہوتی ہیں۔ جب انسان اپنی قوتوں کی تنگ دامانی پر نظر ڈالے کہ ایک طرف حقیقت الوہیت ہے جو بے قید ہے' ازلی اور ابدی ہے جبکہ انسان کی جانب ایک حقیقت ہے جو بندگی کی حقیقت ہے' محدود ہے' بدلنے والی اور فنا ہونے والی حقیقت ہے۔ تب انسان کو صحیح شعور ہوتا ہے کہ اس مخلوق پر اللہ کی کس قدر عظیم عنایت تھی۔ تب پھر انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ کس قدر عظیم اور

خوشگوار حقیقت ہے اور پھر انسان نہایت عاجزی' خشوع وخضوع اور شکر اور خوشدلی کے ساتھ اسے لیتا ہے ۔ پھر وہ اس کائنات کی لاانتہا اطراف میں اللہ کے کلمات کو گونجتا ہوا پاتا ہے کہ یہ کلمات اس ناچیز انسان پر' اس ناچیز مکان میں نازل ہوتے ہیں' یہ انسان ایک ناچیز ذرہ ہے اور یہ زمین ایک حقیر ذرہ ہے ۔

پھر اس عظیم واقعہ کے معانی کس قدر دور رس ہیں؟ اللہ کی جانب سے دیکھا جائے تو یہ اس کی جانب سے ایک وسیع فضل وکرم ہے ۔ وہ فضل وکرم کرنے والا ہے' اس کی رحمت میں یہ انسان سرشار ہے' وہ بہت بڑا کریم ہے' محبت کرنے والا ہے' احسان کرنے والا ہے' وہ جس پر فضل وکرم کرتا ہے تو بغیر سبب و علت کے کرتا ہے ۔ یہ فضل وکرم تو اس کی ذاتی صفات کا ایک پہلو ہے ۔

اور اگر انسان کے زاویہ سے دیکھا جائے تو اللہ نے انسان پر اس قدر فضل وکرم کیا ہے جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا اور اب وہ اس کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ صرف اس ایک کرم کا اگر تمام انسان شکر ادا کرنے لگ جائیں تو اگر وہ رات دن رکوع و سجود میں رہیں پھر بھی اس ایک کرم کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کرم کہ اللہ بندے کو یاد کرے' اس کی طرف نظر کرم کرے' اس کے ساتھ رابطہ قائم کرے' اور انسانوں ہی میں سے ایک ذات گرامی کو رسول بنا کر بھیج دے ۔ زمین اللہ کے کلمات کا مہبط بن جائے ۔ اس رسول کا مقام رہائش بن جائے اور اس زمین کے اطراف واکناف میں ان کلمات کی گونج بلند ہو رہی ہو ۔

پوری انسانیت کی زندگی میں اس واقعہ کے نتیجے میں کیا تغیر رونما ہوا' تو بات یہ ہے کہ پہلے لمحے ہی سے انسانیت پر اس کے اثرات شروع ہوئے' تاریخ کا دھارا بدل گیا' انسانی ضمیر کے خطوط بدل گئے' وہ قبلہ متعین ہو گیا جس کی طرف انسان نے رخ کرنا تھا اور جس سے انسانوں نے اقدار کے تصورات اور پیمانے اخذ کرنے تھے ۔ یہ پیمانے زمینی اور مادی نہ تھے بلکہ یہ آسمانی اور وحی الہی کے پیمانے تھے ۔

اس وقت سے آج تک وہ لوگ جن کی روح میں یہ بات بیٹھ گئی تھی وہ اللہ کے رحم وکرم میں داخل ہو گئے' ان پر براہ راست اللہ کا رحم ہونے لگا۔ ان لوگوں کا رویہ ہو گیا کہ وہ ہر معاملے میں براہ راست اللہ کی طرف نظریں اٹھائے رکھتے تھے' خواہ کوئی چھوٹا سا معاملہ ہو یا بڑا۔ یہ لوگ اللہ کی نظروں کے نیچے حرکت کرتے تھے' وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ اللہ ان کی دستگیری کرے گا' اور ان کو اپنی منزل تک قدم بقدم چلائے گا۔ ان کو غلط راہ سے روکے گا اور سیدھی راہ کی طرف موڑ دے گا۔ اور وہ ہر وقت اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ ابھی اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے اور ان کے دلی رازوں کو کھول دیتی ہے ۔ ابھی اللہ کا حکم آتا ہے اور ان کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں کہ یہ بات کرو اور اس سے رک جاؤ ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک عجیب زمانہ تھا' یہ ۲۳ سالہ زمانہ تھا' ان زمانوں میں انسانوں اور بندوں کے درمیان براہ راست تعلق قائم رہا۔ یہ ایک ایسا زمانہ تھا کہ اس کی حقیقت کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے تھے' جو اس میں رہتے تھے ۔ جنہوں نے اس زمانے کو محسوس کیا' جنہوں نے اس کا آغاز اور انجام دیکھا' جنہوں نے اس براہ راست رابطے کی شیرینی کو دیکھا' اور انہوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ دست قدرت قدم قدم پر ان کی دستگیری کر رہی ہے' اور انہوں نے دیکھا تھا کہ وہ کہاں سے چلے اور کہاں پہنچے' یہ ایک لمبی مسافت تھی' ایسا انقلابی سفر تھا جس کی طوالت کو اس دنیا کے کسی معیار سے نہیں ناپا جا سکتا تھا یہ انسانی ضمیر کا سفر تھا' جسے کائنات کے فاصلوں کے پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ یہ دو اجرام

فلکی کے درمیان کا سفر بھی نہ تھا بلکہ یہ ایک مکمل تبدیلی اور انقلاب تھا' اب مادی اور زمینی پیمانوں کے مقابلہ میں آسمانی پیمانے آگئے تھے' خواہشات سے مدد طلب کرنے کی بجائے اب وحی سے مدد لی جارہی تھی۔ لوگ جاہلیت سے سفر کر کے اسلام میں داخل ہوگئے تھے' شرک سے چل کر لوگ ربانیت میں داخل ہوگئے تھے۔ یہ طویل سفر تھا' زمین اور آسمانوں کے درمیان کے فاصلے سے بھی طویل اور بعید۔

یہ لوگ ذوق معرفت رکھتے تھے' اور اس کی شیرینی اور مٹھاس کو پاتے تھے' اس کی قدر و قیمت کا انہیں شعور تھا' اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے تو انہوں نے اس کمی کو محسوس کیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ یہ ایک دور تھا جو بیت گیا' اگر یہ دور عملاً گزرا نہ ہوتا تو عقل اس کا تصور بھی نہ کر سکتی۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا چلو ام ایمن کے پاس چلیں' ہم ان سے اسی طرح ملاقات کریں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ملاقات کے لیے جاتے تھے۔ جب وہ اس کے قریب گئے تو وہ رونے لگیں' انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کے رونے کی وجہ کیا ہے؟ کیا آپ نہیں جانتیں کہ اللہ کے ہاں رسول اللہ کا جو مقام ہے جو آپؐ کے لیے بہتر ہے۔ انہوں نے کہا ہاں میں جانتی ہوں کہ اللہ کے ہاں رسول اللہؐ کے لیے جو کچھ ہے وہ بہت بہتر ہے' لیکن میں اس لیے رو رہی ہوں کہ آسمان سے وحی کا آنا رک گیا ہے' ان کی بات نے ان دونوں کو رلا دیا اور وہ بھی رونے لگے۔ (مسلم)

یہ ایک مبارک گھڑی تھی اور اس کے اثرات اس وقت سے آج تک انسانی زندگی کو متاثر کر رہے ہیں اور یہ اثرات اس وقت تک اپنا کام کرتے رہیں گے جب تک اللہ زمین کا وارث نہیں ہو جاتا اور قیامت برپا نہیں ہو جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس گھڑی کے واقعہ نے انسان کو از سرنو زندگی عطا کی۔ اس طرح کہ اس نے اپنی قدریں زمین سے لینے کی بجائے آسمان سے لینا شروع کر دیں اور اپنی زندگی کا نظام وحی سے اخذ کرنے لگے' خواہشات نفسانیہ سے اخذ نہیں کرتے تھے۔

اس لمحہ میں جو کچھ ہوا اس نے تاریخ کا دھارا بدل دیا۔ اس سے قبل تاریخ میں کوئی ایسا انقلاب واقع نہ ہوا تھا اور نہ آپؐ کے بعد اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا۔ یہ واقعہ دراصل تاریخ کا دوراہا تھا۔ اس نے تاریخ کا رخ پھیر دیا اور پھر تاریخ میں ایسے نشانات راہ قائم کر دیئے گئے جنہیں آج تک مٹایا نہیں جا سکا۔ نہ بعد کے واقعات نے ان نشانات کا رنگ ہلکا کیا۔ انسانی عقائد و نظریات میں اس کائنات' اس زندگی' اور اس کی اعلیٰ قدروں کا ایک تصور بٹھا دیا گیا۔ ان کو اس طرح واضح کر دیا گیا کہ اس سے قبل تاریخ میں ان اعلیٰ قدروں کو اس طرح نہ نکھارا گیا تھا۔ اعلیٰ قدروں کی یہ ایک ایسی تصویر کشی تھی جو جامع تھی' جو صاف تھی' جو نہایت ہی مجرد تھی اور دنیا کے رنگوں سے خالی اور پاک تھی' جبکہ اس کے رنگ واقعی تھے اور انسانی زندگی کے ساتھ اچھی طرح ہم آہنگ تھے۔ چنانچہ اسلامی نظام زندگی کے اصول و قواعد رکھ دیئے گئے' اور اسلامی نظام کے نشانات اور خطوط وضع کر دیئے گئے۔

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ "تاکہ جو نیست و نابود ہوتا ہے' وہ دلیل سے نیست و نابود ہو اور جو زندہ رہتا ہے وہ دلیل سے زندہ رہے"۔ ان خطوط میں کوئی اجمال اور ابہام نہ چھوڑا گیا۔ اگر کوئی نہیں مانتا تو پھر وہ جانتے بوجھتے نہ مانے گا' اب اگر کوئی راہ راست سے بھٹکتا ہے تو وہ ارادۃً ایسا کرے گا اور اگر کوئی کجی

اختیار کرتا ہے' کو وہ قصداً ایسا کرے گا۔

اس منفرد لمحے میں یہ ایک ممتاز واقعہ تھا' یہ ایسا کائناتی حادثہ تھا جس نے ایک عہد کو ختم کر دیا جو دنیا سے نابود ہو گیا اور ایک عہد کا آغاز کر دیا جو ابد الاباد تک رہے گا۔

یہ حادثہ انسانی تاریخ میں ایک فرقان بن گیا۔ یہ انسانی زندگی میں فرقان بن گیا۔ صرف کسی امت یا قوم کی زندگی میں نہیں۔ اس حادثہ کی گونج پوری کائنات میں ریکارڈ ہو گئی اور پوری کائنات اس کے ساتھ چلنے لگی۔ یہ حادثہ انسانی ضمیر میں ریکارڈ ہو گیا۔ یہ انسانی ضمیر آج بھی اسے یاد کر رہا ہے اس کی یاد میں مناتا ہے اور کبھی اسے بھولتا نہیں اور انسانی ضمیر اس بات کو پاتا ہے کہ یا واقع' یہ حادثہ دراصل انسانیت کے لیے ایک نیا جنم تھا اور انسانی قدروں میں سے یہ انقلاب تاریخ میں ایک ہی بار واقعہ ہوا' اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ہے۔

یہ تھی بات اس سورت کے پہلے پیراگراف کی۔ رہیں بعد کی آیات اور پیرے تو ظاہر ہے کہ وہ بعد میں نازل ہوئے۔ بعد کی آیات سیرت النبی کے ان واقعات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جو بہت ہی بعد کے زمانوں میں پیش آئے جبکہ رسول اللہ ؐ کو حکم دیا گیا کہ آپ علانیہ تبلیغ کریں' اور اس دور میں پھر آپ ؐ کی مخالفت شروع ہو گئی تھی جیسا کہ آتا ہے۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْہٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی "کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو اللہ کے بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے"۔ لیکن بعد میں نازل ہونے کے باوجود سورت کے اجزاء میں ایک ربط ہے اور مطلع کے بعد جو حقائق لائے گئے ہیں ان میں مکمل ترتیب ہے۔ چنانچہ پوری سورت ایک کامل وحدت اور ایک مکمل مضمون بن جاتی ہے جس کے اجزاء باہم پیوست اور منظم ہیں۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (۱) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۲) اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ (۳) الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (٤) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (٥) (۹٦ : ۱ تا ٥)

"پڑھو (اے نبی ؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا' جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو' اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا' انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا"۔ یہ قرآن کی پہلی سورت ہے' رسول خدا ؐ کو پہلا حکم کیا دیا جاتا ہے؟ پہلی ہدایت کیا دی جاتی ہے؟ ان لمحات میں جب پہلے پہل ان کا عالم بالا کے ساتھ رابطہ قائم ہوا' جب سب سے پہلے انہیں دعوت اسلامی کی ذمہ داری سپرد کی گئی' حکم یہ ہوا کہ "پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا"۔ اللہ کی صفات میں سے تخلیق کی صفت کو لیا گیا جس کے ذریعہ پوری کائنات کو عدم سے وجود میں لایا گیا۔

اس کے بعد اس کائنات میں انسان کی تخلیق اور انسانی دور کے آغاز کی حقیقت کو لیا گیا۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۹٦ : ۲) "جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی"۔ خون کے ایک نکتے سے' جو جامد تھا اور رحم کی دیواروں کے ساتھ چپک گیا تھا۔ یہ تھا انسان کی پیدائش کا نقطہ آغاز جس

کی ساخت بہت سادہ ہے' اس انداز تخلیق سے دو باتیں سامنے آتی ہیں' ایک یہ کہ اللہ بڑا کریم ہے اور دوسری یہ اس کی قدرت خود اس تخلیق سے عیاں ہے' کرم یہ ہے کہ اس نے خون کے جمے ہوئے اس نکتے' خوردبینی نکتے کو انسان کے مقام تک پہنچایا جو پڑھتا پڑھاتا ہے۔

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ (٣) الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (٤) عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (٥)

(٩٦ : ٣--٥) "پڑھو' اور تمہارا رب بڑا کریم ہے' جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا' انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا"۔ انسان کی تخلیق کے بعد' یہ اس میں بہت بڑی تبدیلی تھی لیکن اللہ یہ کر سکتا ہے' وہ بڑا کریم ہے' اس لیے اللہ نے ایک خوردبینی نکتے میں یہ تغیر رونما کر دیا کہ وہ کامل انسان کے بعد عالم انسان بن گیا' یہ اس قدر عظیم تبدیلی ہے کہ اس سے سر چکرا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ان آیات میں اسلام کا نظریہ تعلیم بھی واضح کیا گیا ہے' رب نے انسان کو تعلیم "قلم" کے ساتھ دی۔ کیونکہ اس وقت بھی اور آج بھی انسان کی زندگی میں قلم اہم اور موثر ذریعہ تعلیم ہے اور اس حقیقت کو جس طرح ہم آج سمجھتے ہیں نزول قرآن کے وقت اس طرح نہ سمجھتے تھے' لیکن اللہ تعالیٰ تعلیم اور قلم کی قدر و قیمت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ لہٰذا آخری رسولؐ کو آخری مشن سپرد کرتے وقت اللہ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا اور قرآن کی پہلی سورت میں یہ اشارہ کر دیا گیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ جس رسولؐ کو یہ ہدایت دی گئی وہ خط نہ لکھ سکتے تھے۔ لہٰذا اگر کوئی یہ کہے کہ یہ قرآن کسی انسان کی تصنیف ہے تو کوئی امی انسان یہ بات نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا یہ ایک حقیقت ہے جو وحی الٰہی نے بتائی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے' کہ قرآن کے نظریہ کے مطابق تعلیم کا سرچشمہ کیا ہے۔ یہ سرچشمہ ذات باری ہے۔ انسان نے آج تک جس قدر علم حاصل کیا ہے یا آئندہ کرے گا۔ آج تک انسان پر اس کائنات کے جو اسرار کھلے ہیں وہ اللہ ہی کے فضل و کرم سے کھلے ہیں۔ انسانی زندگی اور انسانی نفس کے بارے میں جو اسرار کھلے ہیں وہ بھی اللہ کے فضل و کرم سے کھلے ہیں۔ اللہ ہی وہ واحد مصدر اور منبع ہے' جس کے سوا کوئی اور سرچشمہ علم و حکمت نہیں ہے۔

یہ پیراگراف جو ان لمحات کے آغاز میں نازل ہوا' جن میں سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عالم بالا کے درمیان رابطہ قائم ہوا' اس ایک ہی پیراگراف کے اندر ایمانی تصور حیات کے اساسی اصول بیان کر دیے گئے ہیں کہ "ہر حکم' ہر حرکت' ہر قدم' ہر عمل اور ہر کام اللہ کے نام اور اللہ کے احکام کے مطابق ہو گا' اللہ کے نام سے اقدام ہو گا' اللہ کے نام سے چلے گا' اللہ کے رخ ہو جائے گا اور انجام کار اللہ تک پہنچے گا"۔ اس لیے کہ اللہ ہی خالق ہے' وہی جاننے والا اور جان کاری دینے والا ہے' اسی سے آغاز ہے' اسی کی جانب سے نشوونما ہے اور اسی کی طرف سے تعلیم و تربیت ہے' انسان سیکھتا ہے جو کچھ سیکھتا ہے وہ جانتا ہے جو کچھ بھی جانتا ہے لیکن سب علم و ہنر کا سرچشمہ ذات باری ہے جس نے پیدا کیا' علم کے ذرائع دیے اور

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (٩٦ : ٥) "اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو انسان نہ جانتا تھا"۔ چنانچہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک نے عالم بالا کے ابتدائی لمحات ہی میں اس حقیقت کو اخذ فرمایا اور آپ کی سوچ' آپ کے تصرفات' آپ کے کلام اور آپ کے عمل اور آپ کے رخ پر اور آپ کی پوری زندگی میں یہ شعور چھایا رہا۔ کیونکہ یہ ایمان کا پہلا اصول تھا۔

امام شمس الدین ابو عبداللہ محمد ابن قیم الجوزیہ اپنی کتاب "زاد المعاد فی ہدی خیر العباد" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے اہم خدوخال کے بارے میں یوں فرماتے ہیں :

"اللہ کی یاد اور اس کے ذکر کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نہایت ہی مکمل انسان تھے' آپ کی گفتگو کا اہم حصہ ذکر الٰہی اور ذات باری کے متعلق مسائل ہی پر مشتمل ہوتا تھا۔ آپ کے احکام آپ کے مناہی' اسلامی قوانین کی وضاحت' اور تمام دوسری ہدایات دراصل ذکر الٰہی ہی کے پہلو تھے' اللہ کے اسماء و صفات بیان کرنا' اللہ کے احکام اور شریعت کے مسائل بیان کرنا' انجام بد سے ڈرانا وغیرہ سب باتیں اللہ کا ذکر ہی تھیں' پھر اللہ کی نعمتوں پر اس کی تعریف' اس کی برتری' اس کی حمد' اس کی تسبیح اللہ کا ذکر ہی تو تھا' پھر اللہ سے مانگنا' دعا کرنا' اللہ کی طرف راغب ہونا' اللہ سے ڈرنا' یہ سب ذکر الٰہی کے مختلف انداز ہی تو تھے' جب آپ خاموش ہوتے تو بھی یاد الٰہی کرتے' ہروقت ہر حال میں آپ کے شعور میں ذات باری موجود ہوا کرتی تھی۔ ہر سانس جو اندر جاتا یا باہر آتا' آپ کھڑے ہوتے یا بیٹھے ہوتے' چلتے پھرتے یا سوار ہوتے' سفر میں ہوتے یا حضر میں' اقامت پذیر ہوتے یا کوچ کی حالت میں ہوتے' غرض ہردم اور ہر حال میں اللہ کو یاد فرماتے"۔

آپ جب نیند سے بیدار ہوتے تو فرماتے۔

الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیہ النشور "اس ذات کے لیے حمد و ثنا ہے جس نے ہمیں موت دینے (نیند) کے بعد زندگی بخشی اور اسی کی طرف دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے"۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ رات کو جب کبھی اچانک بیدار ہوتے تو دس بار "اللہ اکبر" کہتے' اور دس بار تہلیل کرتے یعنی کہتے۔

لا الہ الا اللہ "نہیں ہے کوئی حاکم مگر اللہ"۔ اور اس کے بعد دس بار یہ دعا پڑھتے۔

اللھم انی اعوذبک من ضیق الدنیا و من ضیق یوم القیمۃ "اے اللہ میں دنیا کی تنگی اور آخرت کی تنگی سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔ اس کے بعد آپ نماز شروع کرتے۔ اور انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ حضورؐ جب رات کو جاگتے تو یہ دعا پڑھتے۔

لا الہ الا انت سبحانک اللھم استغفرک لذنبی و اسئلک رحمتک اللھم زدنی علماً ولا تزغ قلبی بعد اذھدیتنی وھب لی من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب (ابوداؤد) "اے اللہ' تیرے سوا کوئی حاکم نہیں' تو پاک ہے اور برتر ہے۔ اے اللہ میں تجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں' اور تجھ سے تیری رحمت طلب کرتا ہوں۔ اے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما اور میرے دل کو ہدایت دینے کے بعد ٹیڑھا نہ کر' اور مجھے اپنی جانب سے رحمت عطا فرما۔ بے شک تو ہی بخشنے والا ہے"۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص رات کو بیدار ہو اور کہے۔

لا الٰه الا اللہ وحدہ لاشریك له - له الملك وله الحمد وهو علی كل شئی قدیر - الحمد للہ وسبحان اللہ ولا الٰه الا اللہ و اللہ اکبر ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم "نہیں کوئی حاکم مگر اللہ' صرف وہی حاکم ہے' اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں' بادشاہت اسی کی ہے' تعریف اسی کی ہے' اور وہ ہر چیز پر قادر ہے' سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں' وہی پاک ہے' ہر عیب سے - اس کے سوا کوئی حاکم نہیں - اللہ ہی بڑا ہے' کوئی تدبیر اور کوئی قوت نہیں مگر اللہ کے ذریعہ ہی ہے' جو بلند اور عظیم ہے"- اور پھر وہ یہ دعا کرے -

اللهم اغفرلي "اے اللہ' مجھے بخش دے" - یا کوئی اور دعا کرے تو یہ دعا قبول ہوگی اور اگر وہ وضو کر کے نماز بھی ادا کرے تو نماز قبول ہوگی (بخاری)-

ایک بار حضرت ابن عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رات گزاری - فرماتے ہیں کہ نیند سے بیدار ہوئے تو آپؐ نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور سورہ آل عمران کی دس آیات

انا فی خلق السمٰوٰت سے آخر تک تلاوت کیں اور پھر اللہ کی حمد یوں بیان کی -

اللهم لك الحمد انت نور السمٰوٰت والارض ومن فیهن - لك الحمد انت قیم السموات والارض ومن فیهن - ولك الحمد انت الحق وعدك الحق وقولك الحق ولقائك الحق والجنة حق والنار حق والنبیون حق، ومحمد حق، والساعة حق اللهم لك اسلمت وبك امنت وعلیك توكلت والیك انبت وبك خاصمت والیك حاكمت فاغفرلي ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت انت الهی لا الٰه الا انت ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم "اے اللہ سب تعریفیں تیرے لیے ہیں' تو ہی زمین اور آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ ہے' ان کا نور ہے' سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں' تو زمین و آسمان اور ان کے درمیان سب چیزوں کا قائم رکھنے والا ہے' حمد تیرے ہی لیے ہے - تو حق ہے تیرا وعدہ حق ہے' تیری بات حق ہے' تجھ سے ملنا حق ہے' جنت حق ہے' آگ حق ہے' نبی حق ہیں' محمدؐ حق ہیں' قیامت حق ہے - اے اللہ میں تیرا مطیع فرمان ہوں تیرے اوپر ایمان لانے والا ہوں' تجھ پر توکل کرنے والا ہوں' میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں تیری ہی خاطر لڑا' اور سب معاملات تیرے ہی سامنے پیش کیے - اس لیے مجھے معاف کر دے - میری اگلی اور پچھلی غلطیوں کو معاف کر دے' جو پوشیدہ رکھا اور جو علانیہ کیا' تو ہی میرا حاکم ہے اور تیرے سوا کوئی حاکم نہیں ہے - اور اللہ کے سوا کوئی تدبیر اور کوئی قوت نہیں ہے' جو علی و عظیم ہے"-

اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں' حضور جب رات کو قیام فرماتے تو یہ دعا پڑھتے -

اللهم رب جبرائیل ومیكائیل و اسرافیل فاطر السموات والارض عالم الغیب والشهادة انت تحكم بین عبادك فیما كانوا فیه یختلفون اهدني لما اختلف فیه من الحق باذنك انك تهدي من تشاء الی صراط مستقیم "اور اللہ' جبرائیل' میکائیل اور اسرافیل کے رب' زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کھلی اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والے' تو فیصلہ کرنے والا ہے ان چیزوں کا جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں' حق کی

جن باتوں میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے ان کے بارے میں مجھے راہ راست کی طرف ہدایت کر ' بے شک تو جسے چاہتا ہے راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے"۔ انھوں نے غالباً یہ کہا کہ حضورؐ نماز کا آغاز اسی دعا سے کرتے تھے۔

اور جب آپؐ وتر پڑھتے تھے تو وتر سے فارغ ہونے کے بعد آپ سبحان اللہ القدوس تین بار پڑھتے تھے اور تین بار باآواز بلند پڑھتے تھے۔ ذرالمبی آواز کے ساتھ۔

آپ جب اپنے گھر سے نکلتے تھے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

بسم اللہ توکلت علی اللہ اللھم انی اعوذ بک من ان اضل او اضل او ازل او اظلم او اظلم او اجھل او یجھل علی (حدیث صحیح) "اللہ کے نام سے شروع کیا' اللہ پر بھروسہ کیا' اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں گمراہ ہو جاؤں' یا گمراہ کر دیا جاؤں یا لغزش کروں یا میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے میں کسی سے جھگڑوں یا مجھ سے ناحق جھگڑا کیا جائے"۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے گھر سے نکلے وقت یہ دعا پڑھے۔

بسم اللہ توکلت علی اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ "شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے' میں نے اللہ پر بھروسہ کیا اور نہیں ہے کوئی تدبیر اور کوئی قوت مگر اللہ کے ساتھ"۔ تو اللہ کی طرف سے ایسے شخص کو کہا جاتا ہے۔

ھدیت و کفیت و وفیت "تمہیں راہ راست ملی' تمہاری حاجت پوری ہوئی اور تمہیں پورا پورا اجر ملا"۔ اور شیطان اس سے کنارہ کش ہو جائے گا (حدیث حسن)

حضرت ابن عباسؓ ایک رات آپؐ کے پاس رہے تو فرماتے ہیں کہ صبح کو جب آپؐ نماز کے لیے نکلے تو آپ نے یہ دعا پڑھی۔

اللھم اجعل فی قلبی نورا، واجعل فی لسانی نورا، واجعل فی سمعی نورا، واجعل فی بصری نورا، واجعل فی خلفی نورا، ومن امامی نورا وجعل من فوقی نورا، واجعل من تحتی نورا، اللھم اعظم لی نورا "اے اللہ' میرے دل میں تو نور دے' میری زبان کو منور کر دے' میرے کانوں میں نور ڈال دے' میری آنکھوں میں روشنی کر دے' میرے پیچھے روشنی کر دے' میرے آگے روشنی کر دے' میرے اوپر روشنی کر دے' میرے نیچے روشنی کر دے اور میرے نور کو عظیم کر دے"۔

فضل ابن مرزوق نے عطیہ عوفی سے روایت کی ہے' انھوں نے ابو سعید خدری سے' وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا جو شخص بھی اپنے گھر سے نماز کے لیے نکلے اور یہ دعا پڑھے۔

اللھم انی اسئلک بحق السائلین علیک وبحق ممشائی الیک فانی لم اخرج بطرا ولا اشرا ولا ریاء ولا سمعۃ وانما خرجت اتقاء سخطک وابتغاء مرضاتک اسئلک ان تنقذنی من النار وان تغفرلی ذنوبی فانہ لا یغفر الذنوب الا انت "اے اللہ میں تجھ سے ان سوال کرنے والوں کے حق کے ذریعہ سوال کرتا ہوں' جو تجھ پر ہے' پھر میری جانب سے تیری طرف چلنے کے حق سے سوال کرتا ہوں' کیونکہ میں نہ غرور کرتا ہوا

نکلا ہوں اور نہ اکڑتا ہوا نکلا ہوں' نہ ریاکاری سے اور شہرت کی طلب میں نکلا ہوں۔ تیرے غضب سے بچنے کے لیے نکلا ہوں اور تیری رضا کا طلبگار ہوں' میرا سوال یہ ہے کہ مجھے آگ سے بچا دے' میرے گناہوں کو بخش دے "گناہ بخشنے والا تو تو ہی ہے"۔ تو اللہ ستر ہزار فرشتے مقرر فرمائے گا جو اس کے لیے بخشش طلب کریں گے اور اللہ اس کی طرف اپنا چہرۂ مبارک کرے گا جب تک وہ نماز ادا نہیں کرتا (یہ حدیث سنداً و متناً ضعیف ہے)

امام ابو داؤد نے روایت کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی مسجد میں داخل ہوتے تو فرماتے۔

اعوذ باللہ العظیم وبوجھہ الکریم وسلطانہ القدیم من الشیطن الرجیم "میں شیطان رجیم سے اللہ عظیم کی پناہ مانگتا ہوں' اس کے مکرم چہرے کی پناہ مانگتا ہون اور اس کے قدیم اقتدار میں پناہ مانگتا ہوں"۔ جب کوئی یہ دعا پڑھتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ اس شخص نے پورے دن کے لیے اپنے آپ کو مجھ سے محفوظ کر لیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو' تو چاہئے کہ وہ مجھ پر صلوٰۃ و سلام پڑھے اور اس کے بعد یہ دعا پڑھے۔

اللھم افتح لي ابواب رحمتك "اے اللہ میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے"۔ اور جب مسجد سے نکلے تو یہ کہے۔

اللھم انی اسئلك من فضلك "اے اللہ میں تیرے فضل کا سوالی ہوں"۔ اور آپ سے یہ نقول ہے کہ جب بھی آپؐ مسجد میں داخل ہوتے تو محمدؐ اور آل محمدؐ پہ صلوٰۃ و سلام بھیجتے اور پھر کہتے۔

اللھم اغفرلي ذنوبي وافتح لي ابواب رحمتك "اے اللہ میرے گناہ بخش دے اور اپنی رحمت کے دروازے میرے لیے کھول دے اور جب آپ نکلتے تو پھر بھی حضرت محمدؐ اور آل محمدؐ پر صلوٰۃ و سلام بھیجتے اور پھر کہتے۔

اللھم اغفرلي ذنوبي وافتح لي باب فضلك "اے اللہ' میرے گناہ معاف کر دے اور میرے لیے اپنے فضل کا دروازہ کھول دے"۔

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب صبح کی نماز پڑھتے تو مصلے پر بیٹھتے اور اللہ کو یاد فرماتے یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جاتا۔ جب صبح ہوتی تو آپؐ فرماتے۔ اللھم بك اصبحنا وبك امسینا وبك نحیا وبك نموت والیك النشور (حدیث صحیح) "اللہ تیرے ہی حکم سے ہم صبح تک پہنچتے ہیں اور تیرے ہی حکم سے ہماری شام ہوتی ہے اور تیرے ہی حکم سے ہم زندہ رہتے ہیں اور تیرے ہی حکم سے ہم مرتے ہیں اور تیرے ہی طرف ہم نے زندہ ہو کر اٹھنا ہے"۔

اور آپؐ یہ کلمات بھی کہا کرتے تھے:۔

اصبحنا واصبح الملك للہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ وحدہ لاشریك لہ۔ لہ الملك ولہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر – رب اسئلك خیر ما في ھذا الیوم وخیر ما بعدہ واعوذ بك من شر ھذا الیوم وشر ما بعدہ رب اعوذ بك من الکسل وسوء الکبر رب اعوذ بك من عذاب في النار وعذاب في القبر "ہم صبح میں داخل ہوئے اور تمام اقتدار اللہ کے لیے ہے' تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں' اللہ

کے سوا کوئی حاکم نہیں ۔ وہ واحد ہے ۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے ۔ اسی کی بادشاہت ہے ' اس کی تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اے اللہ میں تجھ سے اس دن کی بھلائی مانگتا ہوں اور اس کے بعد کے دن کی بھی اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اور اس دن کے شر سے اور اس کے بعد کے دن کے شر سے اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں سستی سے بڑھاپے کی کمزوریوں سے پناہ مانگتا ہوں ۔ اے اللہ میں آگ کے عذاب اور قبر کے عذاب سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں " ۔ اور شام ہوتی تو آپ یہی دعا یوں پڑھتے :

امسینا و امسی الملک بعد "ہم شام کے وقت تک پہنچے اور بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے تا آخر (مسلم)

اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مجھے ایسے کلمات بتائیے کہ میں صبح و شام کہوں تو آپؐ نے فرمایا یہ کلمات کہا کریں :

اللھم فاطر السموات والارض عالم الغیب والشھادۃ رب کل شئی ملیکۃ ومالکہ اشھد ان لا الہ الا انت – اعوذبک من شر نفسی وشر الشیطن وشرکہ وان اقترف علی نفسی سوء او اجرہ الی مسلم "اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے ظاہر اور غیب کے جاننے والے ' ہر چیز کے رب حکمران اور مالک ' میں شہادت دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی الہ نہیں ہے ۔ میں اپنے نفس اور شیطان کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اس کے شرک سے تیری پناہ مانگتا ہوں ۔ اور اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں اپنے نفس کو نقصان پہنچاؤں یا کسی مسلمان کی طرف نقصان کا رخ کروں " ۔ اس کے بعد اس باب میں انہوں نے بہت سی احادیث نقل کیں ۔

"اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نیا کپڑا پہنتے تھے تو اس کا نام لیتے تھے یعنی پاجامہ ' قمیص اور چادر پھر یہ دعا پڑھتے تھے ۔

اللھم لک الحمد انت کسوتنیہ اسئلک خیرہ وخیر ماصنع لہ واعوذبک من شرہ وشر ما صنع لہ "اے اللہ ' سب تعریفیں تیرے لیے ہیں ۔ یہ تو نے مجھے پہنایا ہے ۔ میں تجھ ہی سے اس کی بھلائی چاہتا ہوں اور اس مقصد کی بھلائی چاہتا ہوں جس کے لئے پہنا اور تجھ ہی سے اس کے شر اور اس چیز کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جس کے لیے اسے بنایا گیا " ۔ (حدیث صحیح)

"آپؐ سے یہ بھی منقول ہے کہ جب آپؐ اپنے گھر کو لوٹتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے ۔

الحمدللہ الذی کفانی واوانی والحمدللہ الذی اطعمنی وسقانی والحمدللہ الذی من علی – اسئلک ان تجیرنی من النار "اس خدا کی تعریف جو میرے لیے کافی ہوا اور جس نے مجھے ٹھکانا دیا ۔ اس خدا کی تعریف جس نے مجھے کھلایا پلایا ' اس خدا کی تعریف جس نے مجھ پر احسان کیا ۔ اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے آگ سے بچا " ۔

اور صحیحین میں یہ روایت مروی ہے کہ آپؐ جب بیت الخلا کو جاتے تھے تو یہ فرماتے ۔

اللھم انی اعوذبک من الخبث والخبائث "اے اللہ میں گندی چیزوں اور گندی باتوں سے تیری پناہ طلب

کرتا ہوں"۔ اور جب آپ بیت الخلاء سے نکلتے تھے تو فرماتے۔

غفرانك "اے اللہ میں تیری مغفرت طلب کرتا ہوں"۔ اور یہ بھی آتا ہے کہ آپ یہ الفاظ فرماتے۔

الحمد للہ الذی اذھب عنی الاذی وعافانی "اللہ کا شکر ہے کہ جس نے مجھ سے تکلیف دہ چیز دور کر دیا اور عافیت بخشی"۔ (ابن ماجہ)

اور آپ ؐ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ؐ نے اپنا دست مبارک ایک برتن میں ڈالا جس میں پانی تھا اور پھر صحابہ ؓ سے کہا 'اللہ کے نام سے وضو کرو اور آپ ؐ سے یہ بھی منقول ہے کہ آپ ؐ چاند دیکھتے وقت یہ دعا پڑھتے تھے۔

اللھم اھله علینا بالامن و الایمان و السلامة و الاسلام ربی و ربك اللہ "اے اللہ 'اس چاند کو ہم پر امن 'ایمان 'سلامتی اور اسلام کے ساتھ نکال۔ اے چاند میرا رب تیرا رب اللہ ہے"۔ (ترمذی)

اور جب آپ ؐ کھانے میں ہاتھ ڈالتے تو بسم اللہ پڑھتے اور لوگوں کو حکم دیتے کہ بسم اللہ کہہ کے کھاؤ 'اور فرماتے جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اس پر اللہ کا نام لے 'اگر وہ بھول جائے اور آغاز میں نہ کہہ سکے تو یوں کہے۔

بسم اللہ فی اوله و اخره "اللہ کے نام سے آغاز میں بھی اور آخر میں بھی"۔ (صحیح)

یہ تھی حضور ؐ کی زندگی اور اس پوری زندگی میں آپ ؐ اس ہدایت پر عمل پیرا تھے جو آغاز وحی میں کی گئی تھی۔ اور آپ ؐ کا ایمان 'آپ ؐ کے نظریات اور آپ ؐ کے افعال و حرکات میں یہ بات رچ بس گئی تھی۔

اس حقیقت کے تقاضے تو یہ تھے کہ انسان اللہ کی معرفت حاصل کرتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا 'یعنی اس حقیقت پر کہ اللہ نے اسے پیدا کیا 'اس نے علم سکھایا 'اور اسے تمام مخلوقات میں مکرم بنایا 'لیکن انسان نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ وہ اس سے بالکل الٹا چلا اور اس کا انحراف اور اس کی خلاف توقع حرکت کا ذکر اگلے پیراگراف میں کیا جاتا ہے۔

كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ ۝٦ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰٓ ۝٧ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰٓ ۝٨

"ہرگز نہیں 'انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے"۔

انسان یہ نہیں سوچتا کہ اسے دینے والا اور غنی کرنے والا تو اللہ ہی ہے۔ اس سے قبل اسے پیدا بھی اللہ نے کیا اور تمام مخلوقات سے مکرم بھی بنایا اور اسے تعلیم بھی دی لیکن انسان کا عمومی رویہ یہ ہے کہ جب اسے دیا جاتا ہے اور غنی بنا دیا جاتا ہے تو یہ بالعموم شکر رب ادا نہیں کرتا الا یہ کہ کسی کو اس کا ایمان اس ناشکری سے بچا دے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو اس سرچشمے کا احساس بھی نہیں ہوتا جس سے یہ عطا اور غنا آرہی ہوتی ہے 'حالانکہ اس کو دینے والا اور غنی بنانے والا وہی ہوتا ہے جس نے اسے پیدا کیا 'عزت بخشی اور علم دیا۔ لیکن انسان نہ صرف یہ کہ اس منعم کا احساس مند نہیں ہوتا بلکہ وہ نہایت سرکشی اور فسق و فجور کی راہ اختیار کرتا ہے 'بغاوت کرتا ہے اور تکبر کرتا ہے جبکہ اس کا حق یہ تھا کہ وہ

اللہ کے انعامات کو جانتا اور شکر کرتا ۔

یہ ایک سرکش انسان کی تصویر کھینچ دی گئی جو اپنی تخلیق کو بھی بھول چکا ہے اور جس کو دولت مندی نے سخت بگاڑ دیا ہے' تو ایک ملفوف اور بالواسطہ انداز میں اسے دھمکی دی جاتی ہے ۔

اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی (۹۶ : ۸) "بے شک پلٹنا تیرے رب کی طرف ہی ہے"۔ آخر یہ غافل اور سرکش بھاگے گا کہاں' آخر آنا تو اللہ ہی کے سامنے ہے ۔

لیکن اس تہدید کے ساتھ ساتھ اسلامی تصور حیات کا ایک بنیادی اصول اور نظریہ بھی پیش کر دیا جاتا ہے' یہ کہ سب نے اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے ۔ سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے' ہر چیز میں ہر بات کے حوالے سے' ہر نیت و ارادہ میں اور ہر فعل و حرکت میں' کیونکہ اللہ کے سوا اور تو کوئی جائے پناہ اور مرجع ہے ہی نہیں ۔ اگر کوئی نیک ہے یا بد ہے' سب نے اللہ کے سامنے جانا ہے ۔ اگر کوئی فرمان بردار ہے یا معصیت کیش ہے' حق پر ہے یا باطل پر ہے' اچھا ہے' یا شریر ہے ۔ غنی ہے یا فقیر ہے ۔ سب نے اللہ ہی کے سامنے جانا ہے ۔ یہ شخص جس نے اپنے آپ کو غنی سمجھ کر سرکشی کی یہ بھی اپنے آپ کو اللہ کے سامنے باندھا ہوا پائے گا ۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اللہ کے سامنے پیش ہونے کے وقت کے لیے کچھ کرے ۔ کیونکہ وہی خالق ہے اور اس کی طرف لوٹنا ہے ۔ اس طرح ان دو پیراگرافوں میں اسلامی نظریات و عقائد کے دونوں سرے لے لیے جاتے ہیں' یعنی اسلام کا نظریہ آغاز حیات اور نشوونما' پھر اسلام کا نظریہ تعلیم و تربیت اور تہذیب و شائستگی اور پھر اللہ کی طرف لوٹنا اور عقیدہ حشر و نشر اور حساب و کتاب کے لئے اللہ کے سامنے جانا ہے اور وہاں سب اختیارات اللہ کے ہوں گے ۔

اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی (۹۶ : ۸) "بے شک تیرے رب ہی کی طرف پلٹنا ہے"۔

اب تیسرا پیراگراف آتا ہے' سورہ بہت ہی مختصر ہے' لیکن یہاں سرکشی کی ایک نہایت واضح اور گھناؤنی تصویر کشی کی جاتی ہے ۔ انسانی انگشت بدنداں رہ جاتا ہے اور ایسے واقعات کو سخت ناپسند کرتا ہے ۔ یہ تصویر کشی قرآن کے منفرد انداز میں ہے ۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ﴿۱۰﴾ اَرَءَیْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓی ﴿۱۱﴾ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی ﴿۱۲﴾ اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ﴿۱۳﴾ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ﴿۱۴﴾

"تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جبکہ وہ نماز پڑھتا ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر (وہ بندہ) راہ راست پر ہو یا پرہیزگاری کی تلقین کرتا ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر (یہ منع کرنے والا شخص حق کو) جھٹلاتا اور منہ موڑتا ہو؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے"۔

قرآن اس تصویر کو نہایت ہی گھناؤنی شکل میں لیکن نہایت ہی واضح انداز میں پیش کرتا ہے ۔ انداز قرآن کا اپنا ہے'

جسے کوئی ادیب تحریری انداز نہیں دے سکتا۔ یہ ایک زندہ اور تابندہ تقریری انداز ہے جس میں نہایت ہی مختصر جھلکوں کی شکل میں 'نہایت آسانی اور ہلکے پھلکے انداز میں اور نہایت ہی تیز رفتار فلم کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

اَرَءَیْتَ "کیا تم نے دیکھا ہے؟" اس قسم کا مکروہ منظر بھی کبھی نظروں سے گزرا ہے۔ کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی (۹) عَبْدًا اِذَا صَلّٰی (۹۶ : ۱۰) "کیا تم نے دیکھا ہے ایسے شخص کو جو منع کرتا ہے ایک بندے کو نماز پڑھنے سے"۔ تم دیکھتے نہیں کہ یہ کس قدر برا اور شنیع فعل ہے۔ سخت گھناؤنا فعل ہے کہ ایک شخص خدا کی عبادت کر رہا ہے اور دوسرا اسے عبادت کرنے سے روک رہا ہے۔ پھر صورت یہ ہو کہ وہ شخص راہ راست پر ہو اور لوگوں کو تقویٰ خدا خوفی اور اچھی باتوں کی ہدایت دے رہا ہو' اور روکنے والا اسے روک رہا ہو۔
پھر اس پر مزید کہ وہ یہ فعل' نہایت ہی گھناؤنا فعل بھی کر رہا ہے اور اس کے ساتھ اس سے بھی برے فعل کا ارتکاب کر رہا ہے۔

اَرَءَیْتَ اِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی (۹۶ : ۱۳) "تمہارا کیا خیال ہے اگر (یہ منع کرنے والا حق کو) جھٹلاتا بھی ہے اور حق بات سے منہ موڑتا ہو"۔ یہاں بھی ایک بالواسطہ اور درپردہ دھمکی دی جاتی ہے جس طرح سابقہ پیراگراف کے آخر میں دی گئی تھی۔

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی (۹۶ : ۱۴) "کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے"۔ اللہ دیکھ رہا ہے کہ یہ شخص ناحق تکذیب کر رہا ہے اور ناحق منہ موڑ رہا ہے اور یہ بندۂ مومن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ناحق نماز سے بھی روکتا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت پر ہیں اور تقویٰ کا حکم دیتے ہیں اور آخرت کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی (۹۶ : ۱۴) "کیا یہ نہیں سمجھتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے"۔ یہ ایک منظر ہے جس میں ایک شخص دعوت اسلامی کی راہ روکے کھڑا ہے' ایمان کی راہ روکے ہوئے ہے۔ اطاعت و تقویٰ کی راہ روکے ہوئے ہے۔ ایسے شخص کو اب آخری دھمکی دی جاتی ہے لیکن اس بات پر کھلی دھمکی ہے بغیر لاگ لپیٹ کے۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ﴿١٥﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ﴿١٧﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿١٨﴾

"ہرگز نہیں' اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے' اس پیشانی کو جو جھوٹی اور سخت خطاکار ہے۔ وہ بلا لے اپنے حامیوں کی ٹولی کو' ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلا لیں گے"۔
یہ ایک واضح اور براہ راست دھمکی ہے اور ہے بھی شدید الفاظ میں۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ (۹۶ : ۱۵) ”ہرگز نہیں اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے“ ۔یوں

لَنَسْفَعًا کا تلفظ بھی شدید اور اس کی آواز کی سختی اس کے مفہوم کی سختی پر دلالت کرتی ہے ۔سفع کے معنی سختی سے پکڑنے کے ہیں ۔ناصیہ کا مفہوم ہے پیشانی ۔ پیشانی سرکشوں اور متکبرین کے اظہار کبر کے لیے اونچا مقام ہے ۔ایسے لوگ سر کو بلند رکھتے ہیں اور سر کی بلندی کے وقت پھر پیشانی سب سے بلند ہوتی ہے ۔لہٰذا ایسی پیشانی کو پکڑ کر گرانا ہی مناسب ہے ۔کیونکہ

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ (۹۶ : ۱۶) ”یہ جھوٹی پیشانی ہے“ ۔اور یہ چونکہ پکڑ دھکڑ کا مقام ہے اور ایسے مواقع پر لوگ یاروں مددگاروں کو بلاتے ہیں تو کہہ دیا گیا ۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ (۹۶ : ۱۷) ”بلائے اپنے حامیوں کے ٹولے کو“ ۔ہم بھی انتظام کر لیں گے ۔

سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (۹۶ : ۱۸) ”ہم بھی فرشتوں کو بلالیں گے“ ۔جو بہت سخت خو اور سخت گرفت والے ہیں ۔ظاہر ہے کہ ایسے معرکے کا انجام ان کی خواری ہی ہو گا ۔

یہ سورہ ایسے متوقع اور خوفناک منظر پر ختم ہوتی ہے ۔اس منظر پر اہل ایمان کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ایمان اور اسلام پر ثابت قدم رہیں اور اللہ کے احکام کی طاعت کرتے رہیں ۔

۱۹ ع كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ (۱۹) السجدۃ

۲۱ ”ہرگز نہیں' اس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو“ ۔

یعنی یہ سرکش جو تمہیں نماز سے روکتا ہے' اس کی اطاعت نہ کرو' یہ جو دعوت اسلامی کی راہ روکتا ہے' اس کی مزاحمت کرو' رب کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اس کا قرب حاصل کرو ۔انسان صرف عبادت اور اطاعت کے ذریعہ ہی خدا کے قریب ہوتا ہے ۔ایسے سرکشوں کو نظرانداز کر دو' اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی قوتیں اس سے نمٹ لیں ۔

روایات صحیحہ میں یہ بات مذکور ہے کہ اس سورت کے پہلے پیراگراف کے علاوہ اگلا پورا حصہ ابوجہل کے بارے میں نازل ہوا ہے ۔یہ جب خانہ کعبہ میں آیا تو حضور مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے ۔تو اس نے کہا اے محمدؐ کیا میں نے تم کو اس سے روکا نہ تھا' اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھمکی دی اور حضورؐ نے بھی اس کو خوب ڈانٹا ۔اور شاید اس موقعہ پر حضورؐ نے اس کو گلے سے پکڑ کر کہا ۔

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى (باز آجاؤ ورنہ ...) اور اس نے کہا' اے محمدؐ تم مجھے کس چیز کی دھمکی دیتے ہو' خدا کی قسم اس وادی میں میرے دوست و یار سب سے زیادہ ہیں ۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ (۹۶: ۱۷) "یہ اپنے یار و مددگار بلائے"۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اگر اس وقت یہ اپنے حامیوں کو بلاتا تو عذاب کے فرشتے اسی وقت ان کو دبوچ لیتے۔

لیکن اس سورت کا مفہوم عام ہے۔ ہر مومن اور مطیع فرمان داعی الی اللہ اور ان کے مقابل آنے والے سرکش اور نافرمان پر یہ سورت صادق آتی ہے۔ ہر وہ باغی جو لوگوں کو نماز سے روکتا ہے اور اللہ کی اطاعت شعاری سے منع کرتا ہے اور نیکی کے خلاف سازشیں کرتا ہے' اس کے لیے یہ دھمکی تیار ہے۔ آخری ہدایت یہ ہے۔

كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۹۶: ۱۹) "ہرگز نہیں اس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو' اور اللہ کا قرب حاصل کرو"۔ اس تفسیر کے مطابق سورت کے تمام پیراگراف باہم مربوط ہو جاتے ہیں۔

---OOO---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ القدر ۔ ۹۷

۱-- تا -- ۵

سورۃ القدر ایک نظر میں

اس سورت میں ایک مخصوص رات کا ذکر ہے' جس میں بہت سرگرمیاں تھیں اور سب لوگ وہاں حاضر تھے۔ پوری کائنات نے ریکارڈ کیا کہ یہ تو کوئی غیر معمولی بات ہے' جو لوگ اس محفل میں تھے وہ بہت ہی خوش نصیب' خوش و خرم اور رب ذوالجلال کے سامنے ہمہ تن گوش اور نہایت ہی عاجزی سے دست بدعا تھے' یہ کس قدر اہم رات تھی؟ یہ ایسی رات تھی جس میں اس زمین یا اہل زمین کا رابطہ عالم بالا سے ہوا۔ یہ وہ رات تھی جب عالم بالا کا پیغام' قرآن' قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اترنا شروع ہوا۔ اس رات میں ایک ایسا واقعہ ہوا جو اپنی عظمت' اپنے اثرات اور اپنی معنویت کے اعتبار سے ایک ایسا واقعہ تھا' جس کی نوعیت کا کوئی واقعہ اس زمین نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ اس قدر عظیم تھا کہ انسان کی محدود قوت مدرکہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ واقعہ یہ تھا:

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۱) وَمَا اَدْرٰكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ (۲) لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ (۳) (۹۷ : ۱ تا ۳) "ہم نے اس کو لیلۃ القدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ایک ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے"۔

وہ آیات قرآنیہ' جن میں اس واقعہ کا ذکر ہے وہ اس طرح چمک رہی ہیں' اور اس طرح نور بکھیر رہی ہیں کہ اپنے پورے ماحول کو منور کر رہی ہیں' ان آیات سے ایک مسلسل' نہایت ہی خوبصورت' اور نہایت ہی پسندیدہ اور دھیمی روشنی بکھیر رہی ہے' یہ اللہ کا نور ہے جو پوری کائنات کو بقعہ نور بنا رہا ہے اور یہ نور قرآن سے پھوٹ رہا ہے۔

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷ : ۱) "ہم نے اسے قدر والی رات میں اتارا ہے"۔ یہ فرشتوں اور فرشتوں کی روح حضرت جبرئیل علیہ السلام کا لایا ہوا نور ہے جو صبح و شام زمین و آسمان کے درمیان چکر لگاتے رہتے ہے:

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ (۹۷ : ٤) "فرشتے اور روح' اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں"۔ اور صبح صادق کی روشنی اور قرآن کی روشنی کو قرآن کریم میں یکجا کر کے لایا جاتا ہے۔ جس کے ساتھ فرشتوں اور اسلام کی سلامتی کی روشنی اور روح شامل ہوتی ہے اور یہ سب روشنیاں اس جہاں میں زندہ ارواح کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہیں۔ اور ان کے اوپر چمکتی ہیں اور پھر اس پوری کائنات کی حالت یہ ہو جاتی ہے۔

سَلٰمٌ هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷ : ٥) "یہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک"۔

یہ رات جس کا یہاں تذکرہ ہوا ہے' وہی رات ہے جس کا ذکر سورہ دخان کی اسی آیت میں ہوا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ (۳) فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ (٤)
اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِیْنَ (٥) رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (٦)

(٤٤ : ٣ تا ٦) "بے شک ہم نے اس کو بابرکت رات میں اتارا ہے۔ یقیناً ہم لوگوں کو خبردار کرنے والے ہیں' اس رات میں تمام حکیمانہ امور ہمارے حکم سے طے ہوتے ہیں اور بے شک ہم رسول بھیجنے والے ہیں۔ یہ تمہارے رب کی رحمت کے باعث ہے۔ یقیناً وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اور یہ رات رمضان شریف ہی کی راتوں میں سے ایک رات ہے۔ سورہ بقرہ میں اس کی تصریح ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ (۲ : ۱۸۵) "رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا' جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور جس میں ہدایت کے واضح دلائل اور حق و باطل میں فرق کرنے والی واضح تعلیمات ہیں"۔ مطلب یہ ہے کہ رمضان شریف میں نزول قرآن کا آغاز ہوا۔ یہ رمضان شریف کے مہینے میں تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں عبادت گزاری میں مصروف تھے۔

اس رات کے تعین میں کئی احادیث اور روایات مروی ہیں۔ بعض میں تصریح کی گئی ہے کہ یہ رمضان المبارک کی ستائیسویں رات ہے۔ بعض میں ہے کہ یہ اکیسویں رات ہے اور بعض میں ہے کہ یہ آخری عشرہ کی کوئی رات ہے۔ بعض روایات میں یہ آتا ہے کہ یہ رمضان شریف کی راتوں میں سے کوئی ایک رات ہے۔ بہرحال راجح بات اور یقین بات یہی ہے کہ یہ رمضان شریف کی ایک رات ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۹۷ تشریح آیات

۱-- تا-- ۵

سُوْرَۃُ الْقَدْرِ (۹۷) مَکِّیَّۃٌ (۲۵) اٰیَاتُہَا ۵ رُکُوْعُہَا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَیْلَةُ
الْقَدْرِ ۙ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ الرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ
رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ سَلٰمٌ ۛ هِیَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ الثلثة ۵ ع ۱ ۲۲

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

"ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے ۔ اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے ۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک"۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷ : ۱) "ہم نے اسے لیلۃ القدر میں اتارا ہے"۔ لیلۃ القدر کے معنی تقدیر اور تدبیر بھی ہو سکتے ہیں' اور قابل قدر اور بلند مرتبہ کے بھی ہو سکتے ہیں ۔ یہ دونوں معانی اس عظیم الشان کائناتی واقعہ کے ساتھ مناسب ہیں' یہ واقعہ کہ اس رات میں قرآن کریم نازل ہوا' یہ آخری رسالت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہوئی اور آپؐ نے دعوت کا کام شروع کیا ۔ میں سمجھتا ہوں اس کائنات میں اس سے بڑا کوئی واقعہ نہیں ہے ۔ اور انسانوں کی زندگی میں اس سے پر معنی اور زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت والا کوئی واقعہ بھی نہیں ہے ۔ یہ رات ایک ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے ۔ مراد ہزار مہینوں کی تحدید نہیں ہے' مراد ہے کہ ہزارہا راتوں سے یہ رات زیادہ قیمتی ہے ۔ الف شہر سے مراد زیادہ راتیں ہیں ۔ مطلب ہے ہزاروں لاکھوں راتوں سے زیادہ قیمتی ہے ۔ یوں کہ ہزاروں لاکھوں کروڑوں راتیں انسانی زندگی کو اس قدر متاثر نہیں کر سکیں ۔ جس قدر اس رات نے انسانی زندگی کو متاثر کیا ۔ اس رات نے انسانی زندگی کا رخ ہی بدل دیا ۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ (۹۷ : ۳) "شب قدر ایک ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے"۔

وَمَا أَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ (۹۷ : ۲) "اور تم کیا جانو کہ لیلۃ القدر کیا ہے"۔ یہ اس قدر عظیم ہے کہ انسانی فہم و ادراک کی حدود سے ماوراء ہے۔ بس یہی ہے اس کا مفہوم اور اس سلسلے میں عامۃ الناس میں جو اوہام و خرافات مشہور ہیں۔ ان کے تذکرے کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ ایک نہایت ہی عظیم رات ہے' اور اس کی عظمت اس وجہ سے ہے کہ اس کو اللہ نے ایک عظیم کام کے لیے منتخب کیا ہے یعنی نزول قرآن کریم کے لیے اور اس لیے کہ اللہ نے اس رات کو اپنے نور سے پوری کائنات کو بھر دیا۔ اور اس رات کو اللہ نے انسانیت کو وہ چیز عطا کی تھی جس کی اسے بے حد ضرورت تھی۔ انسانی روح اور انسانی زندگی کو اس رات یہ عطیہ ملا یعنی عمومی امن و سلامتی اور امن و سلامتی کا پیغام یعنی قرآن دیا۔ جس میں صحیح عقائد و تصورات وضاحت سے بیان ہوئے۔ جس میں ایسے آداب زندگی ثبت ہوئے جن کی وجہ سے انسانی ضمیر اور انسانی ماحول یعنی پوری زمین کو سلامتی ملی۔ اور حضرت روح الامین اس رات کو پیغام لے کر فرشتوں کے جلو میں آئے۔ یہ ایک جشن کا سماں تھا' انسانیت کو تو بہار مل رہی تھی۔ اسی جشن کو قرآن نے نہایت ہی عجیب انداز میں یہاں بیان کیا ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ (۹۷ : ٤) "فرشتے اور روح الامین اس میں اپنے رب کے حکم سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں"۔ آج جب ہم صدیوں پیچھے کی طرف نظر دوڑاتے ہیں اور پھر ہماری نگاہ اس بزرگ اور عظیم رات پر پڑتی ہے۔ اور ہم اس جشن پر غور کرتے ہیں جو اس رات دیکھا گیا۔ پھر ہم ان امور کو دیکھتے ہیں جو اس رات میں فیصلہ ہوئے اور مکمل ہوئے اور دیکھتے ہیں کہ انسانی تاریخ نے کیا سفر طے کیا' کیا واقعات و حادثات رونما ہوئے' اس رات کے فیصلوں کے نتیجے میں انسانی قلب و نظر میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ ایک عظیم رات تھی اور اس میں جتایا جانے والا یہ جشن نو بہاراں بھی فی الواقعہ بجا تھا اور آج ہمیں اللہ کا یہ کلام اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔

وَمَا أَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ (۹۷ : ۲) "تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے"۔ اور یہ کہ اس رات تمام حکیمانہ امور طے ہوئے' اس رات اساس دین' دینی اقدار اور حسن و قبح کے پیمانے طے ہوئے۔ اس رات افراد کے علاوہ حکومتوں' ملتوں اور اقوام کی قسمتوں کا فیصلہ ہوا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جس اہم چیز کا فیصلہ ہوا وہ یہ ہے کہ حق کا معیار طے ہوا۔ مستقل قدریں طے ہوئیں۔ طریق زندگی اور نظام شریعت طے ہوا اور روحانی اقدار طے ہوئیں۔ سَلٰمٌ "وہ رات سراسر سلامتی ہے"۔ انسانیت نے اپنی جہالت اور بدبختی کی وجہ سے شب قدر کی قدر و قیمت کو بھلا دیا ہے۔ اور اس عظیم واقعہ کی اہمیت کو دل سے محو کر دیا ہے' حالانکہ انسانی تاریخ کا یہ ایک عظیم واقعہ تھا' اور جب سے انسانیت نے اس عظیم واقعہ کو بھلایا اور اس عظیم پیغام کے حوالے سے غفلت کا مظاہرہ کیا تو انسانیت اللہ کی عظیم ترین رحمت و سعادت سے محروم ہو گئی۔ وہ کیا تھی؟ حقیقی امن و سلامتی کی سعادت' انسانی ضمیر و نفسیات میں امن و سلامتی کی سعادت' انسانی خاندان میں امن و سلامتی کی سعادت' وہ ہمہ گیر سعادت تھی جس سے اسلام نے دنیا کو مالا مال کر دیا تھا۔ یہ درست ہے کہ انسان نے اس عرصہ میں بے پناہ مادی ترقی کی' دنیا کو خوب آباد و شاداب کیا۔ لیکن اسلام نے جو امن

و سلامتی عطا کی ہے اسے انسان نہ پا سکا۔ باوجود مادی ترقی اور بے پناہ پیداوار کے انسانیت بدبخت بن رہی۔ وہ خوبصورت نور بجھ گیا جس نے کبھی اس کی روح کو روشن کر دیا تھا۔ اور وہ روشن خوشی ختم ہو کر رہ گئی جس نے اسے زمین کے بندھنوں سے آزاد کر کے عالم بالا کے ساتھ معلق کر دیا تھا' اور وہ مجموعی سلامتی ختم ہو گئی۔ جس کے فیوض و برکات انسانی قلب اور ارواح سے سرشار ہو گئے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ کھو چکنے کے بعد انسان نے نہ روحانی خوشی پائی' نہ آسمانی روحانیت ملی اور نہ انسان کو یہ آزادی ملی کہ وہ زمینی بوجھ سے ذرا اٹھ کر آسمانوں تک پہنچے۔

هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷ : ۵) "یہ طلوع فجر تک ہے"۔ ہم اہل ایمان اس بات پر مامور ہیں کہ اس جشن نو بہاراں کو بھی نہ بھلائیں۔ یہ اچھی یادیں ہیں' اور ان یادوں کو تازہ رکھنے کے لیے ہمارے نبیؐ نے ہمارے لیے بہت ہی سہل طریقے بتائے ہیں تاکہ ہماری روحیں اس سرچشمے سے مربوط ہیں۔ اور وہ عظیم کائناتی واقعہ انہیں یاد رہے جو اس رات میں وقوع پذیر ہوا۔ وہ یوں کہ حضورؐ نے ہمیں تاکید فرمائی کہ ہر سال اس رات کو اللہ کی عبادت میں کھڑے رہو اور رمضان شریف کی آخری دس راتوں میں اسے تلاش فرو' صحیح حدیث ہے۔ تحروا لیلۃ القدر فی العشر الاواخر من رمضان "شب قدر کو رمضان کی آخری راتوں میں تلاش کرو"۔ اور صحیحین ہی کی ایک دوسری روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ من قام لیلۃ القدر ایمانا و احتسابا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ "جس شخص نے شب قدر میں اللہ کی عبادت ایمان اور حسبۃ للہ کی حالت میں کی اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے"۔

اسلام محض ظاہری رسومات اور اشکال کا نام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عبادت کے سلسلے میں فرمایا۔

ایمانا و احتسابا "یعنی ایمان اور اخلاص کے ساتھ" تاکہ یہ قیام و عبادت اعلیٰ مقاصد کے لیے ہو جو اس رات میں متعین ہوئے اور احتساب کے طور پر یعنی خالص اللہ کے لیے ان دو شرائط سے انسانی دل میں ایسے حقائق جاگزیں ہوتے ہیں۔ جو انسان کو ان معانی کے ساتھ مربوط کر دیتے ہیں جن کے لیے قرآن نازل ہوا۔

اسلامی نظام زندگی کا یہ طریقہ ہے کہ وہ ایمان و عمل' ضمیر کے اندر موجود معتقدات اور عملی عبادات کے درمیان ربط پیدا کرتا ہے اور نظام عبادات اس طرح تجویز کرتا ہے جس کے ذریعہ انسان کے ضمیر و شعور میں وہ عقائد اچھی طرح مستحکم ہو جائیں اور زندہ شکل میں موجود ہوں اور یہ نظریہ و عقائد محض افکار کی حد تک محدود نہ ہوں بلکہ ان کا عملی اور زندہ اظہار بھی ہو۔

یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلامی نظام زندگی اور نظام عبادت دراصل ایک بہترین نظام ہے جو ان حقائق کو زندہ کرتا ہے اور انسانی ضمیر و شعور میں بھی اور عمل اور طرز عمل میں بھی زندہ اور متحرک کرتا ہے' ان حقائق کا محض ذہنی ادراک' بغیر عمل و عبادت کے' ان عقائد و نظریات کو ثبات و قرار نہیں بخش سکتا۔ عبادات و عمل کے بغیر نہ فرد کی زندگی اور نہ سوسائٹی میں یہ حقائق زندہ اور متحرک ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لیلۃ القدر کی یہ یاد اور اس میں ایمان اور خلوص کے ساتھ عبادت کرنے کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ اسلامی نظام زندگی کے منہاج اور طریقہ کار کا ایک خاص پہلو ہے۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ البینۃ ـ ۹۸

۱-- تا-- ۸

سورۃ البینۃ ایک نظر میں

قرآن کریم کے اکثر نسخوں اور اکثر روایات میں اسے مدنی سورتوں میں شمار کیا گیا ہے ' جبکہ بعض روایات ایسی بھی وارد ہیں کہ یہ مکی ہے ۔ روایات کے اعتبار سے اور اسلوب بیان کے اعتبار اس کے مدنی ہونے کو زیادہ ترجیح ملتی ہے ۔ جبکہ اس کا مکی ہونا ممکن نہیں ہے ۔ صرف اس وجہ سے کہ اس میں زکوٰۃ کا ذکر ہے یا اہل کتاب کا ذکر ہے ۔ یہ اس کے مکی ہونے کے مانع نہیں ہے ' کیونکہ بعض دوسری سورتیں جو یقیناً مکی ہیں ان میں بھی اہل کتاب کا ذکر ہے ۔ مکہ میں اہل کتاب موجود تھے ' جن میں سے بعض ایمان بھی لائے تھے اور بعض ایمان نہ لائے تھے ۔ نیز نجران کے عیسائی بھی ایک وفد کی صورت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں آکر ملے تھے اور ایمان بھی لائے تھے اسی طرح زکوٰۃ کا تذکرہ بھی مکی سورتوں میں پایا جاتا ہے ۔

یہ سورت کئی تاریخی اور ایمانی حقائق ہمارے سامنے رکھتی ہے ۔ لیکن اس کا اسلوب ایک قرارداد کے اسلوب میں ہے ' اور یہ اسلوب ہی اس رائے کو ترجیح دیتا ہے کہ یہ مدنی ہے جہاں بات فیصلہ کن اور معاملات و امور طے کرنے کے انداز میں ہوتی تھی ۔

اس سورت میں پہلی حقیقت یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس لیے ضروری ہوگئی تھی کہ ان کو واپس لاکر صراط مستقیم پر قائم کیا جائے اور ان کے اندر جو تفرقے اور اختلافات پیدا ہوگئے تھے وہ اس رسالت کے بغیر درست نہ ہو سکتے تھے :

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ (۱) رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (۲) فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۳) (۹۸ : ۱ تا ۳) " اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے ' (وہ اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیل روشن نہ آجائے (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہیں " ۔

دوسری حقیقت یہ بیان ہوتی ہے کہ اہل کتاب نے اپنے دین میں اختلاف اس وجہ سے نہیں کیا کہ ان کے دین میں کچھ مشکلات تھیں ' بلکہ صحیح علم ان کے پاس آگیا تھا اور ہر مسئلے پر صحیح دلائل بھی ان کے ہاں موجود تھے ۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ (۹۸ : ۴) " پہلے جن

لوگوں کو کتاب دی گئی تھی' ان میں تفرقہ برپا نہیں ہوا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح بیان آ چکا تھا"۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ تمام ادیان اپنے اصل کے اعتبار سے ایک ہیں' ان کے بنیادی قواعد اور اصول ایک ہیں اور سادہ اور قابل فہم ہیں' ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہوا کرتی جس سے اختلاف پیدا ہوں کیونکہ دین کی بنیادیں سادہ اور قابل فہم ہوتی ہیں۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (۹۸ : ۵) "اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں' اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے' بالکل یک سو ہو کر' اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے"۔

اور چوتھی حقیقت یہ ہے کہ دلائل آ جانے کے بعد جو لوگ کفر کریں گے وہ تمام لوگوں میں سے بدترین ہیں اور جو لوگ اس آخری رسالت کو تسلیم کریں گے وہ بہترین لوگ ہیں۔ اس لیے دونوں قسم کے لوگوں کا انجام بھی مختلف ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (٦) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (٧) جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (٨) (۹۸ : ٦ تا ٨) "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے' یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک عمل کیے' وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں۔ ان کی جزا ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو"۔

یہ ہیں وہ چار بنیادی حقائق جو اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام عقائد اور آخری رسالت میں اور اسلامی نظام ایمانیات و عمل میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر۲۹۸ تشریح آیات

۱-- تا-- ۸

سُورَۃُ البَیِّنَۃِ مَدَنِیَّۃٌ (۹۸) (۱۰۰) اٰیَاتُھَا ۸ رُکُوْعُھَا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَ الْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ ۝ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً ۝ فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ۝

اللہ کے نام سے جو بے انتا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے' (وہ اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیل روشن نہ آجائے (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ زمین کو ایک جدید رسالت کی ضرورت تھی۔ اس زمین میں ہر طرف شر و فساد عام ہو گیا تھا اور مذاہب عالم کا حال تھا کہ ان کی اصلاح ممکن ہی نہ رہی تھی۔ ایک جدید دین اور جدید رسالت کی ضرورت تھی۔ ایک نئی تحریک اور نئے نظام کی ضرورت تھی۔ اہل زمین کے عقائد و نظریات میں کفر سرایت کر چکا تھا' چاہے وہ اہل کتاب ہوں جن کو صحیح سماوی دین دیئے گئے تھے مگر انہوں نے جاننے کے بعد انہیں بھلا دیا تھا اور دین میں مکمل تحریف کر دی تھی' چاہے وہ جزیرۃ العرب کے مشرک ہوں اور اس سے باہر کے مشرک ہوں۔ دونوں کفر کی حالت میں داخل ہو گئے تھے۔

یہ کفر اور تحریف کے جس مقام پر پہنچ چکے تھے' وہاں سے ان کی واپسی ممکن نہ تھی' ان کی اصلاح صرف ایک جدید دین ہی کے ذریعہ ہو سکتی تھی' صرف ایک ایسے رسولؐ کے ذریعہ جو بذات خود ایک مبین دلیل ہو' اور اس کے پاس اپنی کتاب ہو جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہو۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً (۹۸ : ۲) "یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے

پڑھ کر سنائے"۔ یہ صحیفے شرک اور کفر سے پاک ہوں۔

فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸ : ۳) "جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔"کتاب" کا لفظ موضوع اور مضمون پر بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً کتاب الطہارہ' کتاب الصلوۃ اور کتاب القدر۔ کتاب القیامہ' صحف مطہرہ سے مراد یہ قرآن ہے۔ جس میں راست اور درست کتابیں ہیں یعنی موضوعات و مسائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ رسالت اور یہ رسول نہایت وقت پر آئے۔ اور یہ صحیفے' یہ سورتیں اور یہ موضوعات سخن اور مسائل آئے تاکہ زمین کے اندر ایسی انقلابی اصلاح کریں جس کے سوا اصلاح کی کوئی اور صورت ممکن ہی نہ تھی۔ اس دور میں دنیا کو اس رسولؐ اور اس پیغام اور اس کتاب کی ضرورت کیونکر تھی؟ اس کا جواب میں ایک عظیم اسلامی مفکر سید ابو الحسن علی ندوی کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے ایک اقتباس سے دوں گا۔ یہ اقتباس نہایت مختصر اور موضوع پر واضح ہے۔ وہ باب اول کے فصل اول میں لکھتے ہیں :

چھٹی صدی عیسوی بلااختلاف تاریخ انسانی کا تاریک ترین اور پست ترین دور تھا' صدیوں سے انسانیت جس پستی اور نشیب کی طرف جارہی تھی۔ وہ اپنے آخری نقطے تک پہنچ چکی تھی اور روئے زمین پر اس وقت کوئی طاقت نہ تھی جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے اور ہلاکت کے غار میں گرنے سے اسے روک سکے۔ انسانیت کی حالت یہ تھی کہ نشیب کی طرف جاتے ہوئے روز بروز اس کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔ انسان اس صدی میں خدافراموش ہوکر' کامل طور پر خود فراموش بن چکا تھا۔ وہ اپنے انجام سے بالکل بے فکر اور بے خبر اور برے بھلے کی تمیز سے قطعاً محروم ہو چکا تھا۔ پیغمبروں کی دعوت کی آواز' عرصہ ہوا' دب چکی تھی۔ جن چراغوں کو یہ حضرات روشن کر گئے تھے وہ ہواؤں کے طوفان میں یا تو بجھ چکے تھے۔ یا گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس طرح ٹمٹمارہے تھے جن سے چند خدا شناس دل ہی روشن تھے۔ جو شہروں کو تو کیا روشن کرتے' چند گھروں کو بھی پوری طرح روشن نہ کر سکتے تھے۔ دین دار اشخاص دین کی امانت کو اپنے سینے سے لگاکر' زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہوکر دیر و کلیسا اور صحراؤں اور غاروں میں تنہائیاں اختیار کر چکے تھے اور زندگی کی کشمکش ' اس کے مطالبات' اور اس کی خشک اور تلخ حقیقتوں سے دامن بچاکر دین و سیاست اور روحانیت اور مادیت کے معرکہ میں شکست کھاکر' اپنے فرائض قیادت سے دستکش ہوگئے تھے اور جو زندگی کے اس طوفان میں رہ گئے تھے' انہوں نے بادشاہوں اور اہل دنیا سے سازباز کر لی تھی' اور ان کی ناجائز خواہشات اور ظالمانہ نظام سلطنت اور ظالمانہ نظام معیشت ان کے معاون ہوگئے تھے اور لوگوں کے مال کھانے اور ان کی قوت اور دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں ان دنیا داروں کے شریک وسہیم ہوگئے تھے"۔

"اس دور میں بڑے بڑے مذاہب بازیچہ اطفال بن گئے تھے اور منافقین کے لیے یہ مذاہب تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔ ان مذاہب کی ظاہری صورت اور معنوی حقیقتوں کو اس حد تک مسخ کر دیا گیا تھا کہ اگر ان کے بانیاں اور داعیان کے لیے اس صدی میں آنا ممکن ہوتا اور وہ دیکھ سکتے کہ ان کے مذاہب کا کیا حشر ہوا ہے تو وہ ہرگز ان مذاہب کو پہچان ہی نہ سکتے۔ تہذیب و تمدن کے گہواروں میں خود سری' بے راہ روی اور اخلاقی گراوٹ پیدا ہوگئی تھی' اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ تمام اقوام اپنے اندرونی اختلافات و مسائل میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے نہ ان کے

پاس کوئی پیغام تھا اور نہ انسانیت کے لیے کوئی دعوت تھی ' درحقیقت یہ اقوام اور مذاہب اندر سے پوری طرح کھوکھلے اور بودے ہو چکے تھے ۔ ان کی زندگی کے سوتے خشک ہو چکے تھے ۔ ان کے پاس نہ دینی ہدایات اور تعلیمات تھیں اور نہ نظام حکومت کے لیے کوئی معقول اصول تھے" ۔ (کتاب مذکور 'ص ۲۷ ' ۳۸ و ص ۲۹ ' ۳۰)

یہ تیز رفتار جھلک ' بعثت محمدیؐ سے قبل دنیا کے ادیان کی حالت کی نہایت ہی اچھی اور مختصر تصویر دکھاتی ہے ۔ اہل کتاب اور مشرکین جن نکات کی وجہ سے کفر کی سرحدوں میں داخل ہو گئے تھے ۔ قرآن کریم نے ان کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے ' مثلاً یہودیوں اور نصاریٰ کے بارے میں قرآن نے یہ تصریح کی ہے ۔

وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ (۹ : ۳۰)

"یہود نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے عیسائیوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے" ۔ اور دوسرے مقام پر ہے ۔

وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ وَ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَیْسَتِ الْیَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍ (۲ : ۱۱۲) "یہود نے کہا کہ نصاریٰ کی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ یہودیوں کی کوئی دینی بنیاد نہیں ہے" ۔

اور یہودیوں کے بارے میں سورۂ مائدہ آیت ۶۴ میں یہ ہے ۔

وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ یُنْفِقُ كَیْفَ یَشَآءُ (۵ : ۶۴) "یہود کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں ' ان کے ہاتھ بندھ جائیں اور ان کی اس بات کا سبب ان پر لعنت ہو ' بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں ۔ وہ خرچ کرتا ہے جس طرح چاہتا ہے" ۔

اور مائدہ ۷۲ میں ہے ۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ (۵ : ۷۲) "یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہے" اور

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (مائدہ : ۷۳) "یقیناً کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے کہا اللہ تین کا تیسرا ہے" ۔

اور مشرکین کے بارے سورہ الکافروں میں ہے :

قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (۱) لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (۲) وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ (۳) وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ (۴) وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ (۵) لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ (۶) (۱۰۹ : ۱ تا ۶) "کہہ دو اے کافرو ' میں ان کی عبادت نہیں کرتا ' جن کی عبادت تم کرتے ہو ' اور نہ تم

عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں' اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو' اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے"۔ یہ اور دوسری آیات جن میں مشرکین اور دوسرے کفار کی طرف اشارہ ہے۔

اور اس کفر کے نتیجے میں دنیا کے اطراف و اکناف میں شروفساد اور تخریب و زوال عام تھا۔مولانا ندوی کے الفاظ میں :"خلاصہ یہ کہ ساتویں صدی عیسوی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہ آئی تی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جا سکے اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہو' نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل اور انصاف اور رحم پر ہو' اور نہ کوئی ایسی قیادت تھی جس کے پاس کوئی علم و حکمت ہو' نہ دنیا میں کوئی ایسا دین تھا جسے صحیح دین انبیاء کہا جا سکتا ہو' اور ان کی تعلیمات اور خصوصیات کا حامل ہو"۔

یہ وہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے اللہ کی رحمت کا تقاضا ہوا کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک ایسا رسول بھیجے' جو پاکیزہ صحیفے پڑھے' جن کے اندر نہایت ہی راست اور درست تعلیمات ہوں۔ حقیقت یہ کہ مشرکین اور اہل کتاب کے کفار' ایک ایسی نئی رسالت اور ایسے دین کے سوا کسی صورت میں بھی اس شروفساد اور اس زوال وگراوٹ سے نکل نہ سکتے تھے۔

یہاں قرآن مجید اس بات کی وضاحت کر دیتا ہے کہ اہل کتاب نے جو انحراف کی راہ لی یا باہم اختلافات کیے تو یہ جہالت کی وجہ سے نہ تھے۔یا اس وجہ سے نہ تھے کہ دین سماوی کی تعلیمات میں کچھ پیچیدگی یا اجمال تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح علم ان کے پاس آ چکا تھا' حق کے دلائل ان کے پاس موجود تھے اور اس کے باوجود انہوں نے باہم اختلاف کیا :

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴿٤﴾

"پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی ان میں تفرقہ برپا نہیں ہوا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس (راہ راست) کا بیان واضح آ چکا تھا"۔

پہلا اختلاف تو یہودیوں کے درمیان ہوا' یہ اختلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے قبل ہوا۔یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور کئی فرقے اور پارٹیاں بن گئے۔ حالانکہ ان کا رسول ایک تھا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی کتاب بھی ایک تھی یعنی تورات۔ یہ پانچ فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ مثلاً صدوقی' فریسی' آسینی' غالی اور سامری۔ ان فرقوں میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے عقائد' خصائص اور اپنا اپنا رخ تھا اور جب عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو یہودی اور عیسائی تنازعہ شروع ہو گیا۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے آخری نبی تھے اور آپ نے تورات کی تصدیق فرمائی۔ یہودی اور مسیحی اختلافات اس قدر بڑھے کہ یہ دشمنی اور عداوت کی شکل اختیار کر گئے۔ اور دونوں فریقوں کے درمیان شدید نفرت پیدا ہو گئی اور اس کے نتیجے میں جو قتل عام ہوتا رہا ہے وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ یہ ایسا قتل عام تھا کہ جب انسان ان واقعات کو آج بھی پڑھتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"چھٹی صدی کے آخر میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی رقابت اور منافرت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ ان میں سے

کوئی دوسرے فریق کو ذلیل کرنے اور اس سے اپنی قوم کا انتقام لینے اور مفتوح کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے میں 'کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ ۶۱۰ء میں یہودیوں نے انطاکیہ میں عیسائیوں کے خلاف بلوہ کیا' شہنشاہ موتاس نے ان کی سرکوبی کے لیے مشہور فوجی افربنو سوس کو بھیجا۔ اس نے پوری پوری آبادی کا اس طرح خاتمہ کیا کہ ہزاروں کو تلوار سے' سینکڑوں کو دریا میں غرق کر کے آگ میں جلا کر اور درندوں کے سامنے ڈال کر ہلاک کر دیا"۔ (دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر' ص ۲۷)

"مقریزی کی کتاب خطط میں ہے 'فوقاس روم کے شہنشاہ کے زمانے میں ایران کے شہنشاہ کسریٰ نے شام اور مصر پر فوج کشی کی۔ اس فوج نے بیت المقدس' فلسطین اور شام کے گرجاؤں کو مسمار کیا اور شام کے تمام عیسائیوں کو قتل کر دیا۔ پھر وہ عیسائیوں کی تلاش میں مصر آیا' جہاں اس کی فوج نے عیسائیوں کو بہت بڑی تعداد میں قتل کیا اور بے حد و حساب افراد کو قید کر لیا۔ عیسائیوں کے خلاف اس جنگ میں اور گرجاؤں کو مسمار کرنے میں یہودیوں نے ایرانیوں کی مدد کی اور وہ طبریہ' جبل الجلیل' قریہ' ناصرہ' صور اور بلاد قدس سے ایرانیوں کے پاس آئے اور انہوں نے عیسائیوں سے خوب انتقام لیا اور انہیں اذیت رسانی' اور قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا۔ قدس میں ان کے دو گرجاؤں کو مسمار کر دیا اور تمام مکانات کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ مقدس عود صلیب کا ٹکڑا ساتھ لے گئے اور قدس کے پوپ اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو قید کر لیا"۔

یہی مصنف قدس مفتوح ہونے کا ذکر یوں کرتا ہے: "اس اثنا میں یہودیوں نے صور کے شہر میں بغاوت کر دی۔ انہوں نے اپنے نمایندوں کو دوسرے شہروں میں بھیجا۔ چنانچہ یہودیوں نے عیسائیوں پر شدید حملہ کرنے اور انہیں قتل کر ڈالنے کے عہد و پیمان کیے۔ اس کے بعد دونوں فریقوں میں جنگ چھڑ گئی۔ یہودی بیس ہزار کی تعداد میں مجتمع ہو کر حملہ آور ہوئے اور انہوں نے صور کے باہر کے گرجاؤں کو مسمار کر دیا۔ اس پر عیسائیوں نے کثیر تعداد میں جمع ہو کر یہودیوں پر حملہ کیا۔ یہودیوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کی بہت بڑی تعداد مقتول ہوئی۔ اس زمانے میں ہرقل قسطنطنیہ میں روم کا فرماں روا ہوا۔ اس نے ایک تدبیر سے جو اس نے شاہ ایران کے خلاف کی ایرانیوں کو شکست دے دی اور وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ اس فتح کے بعد ہرقل قسطنطنیہ سے روانہ ہوا تاکہ شام اور مصر کا نظم حکومت درست کرے۔ اور ایرانیوں نے جن مقامات کو تباہ و برباد کیا ہے' ان کی تعمیر نو کرے۔ یہودی طبریہ سے آکر ہرقل کے پاس حاضر ہوئے' اسے گراں قدر تحفے دیئے اور اس سے حلفیہ امان طلب کی۔ ہرقل نے انہیں حلفیہ امان دے دی۔ اس کے بعد ہرقل بیت المقدس پہنچا۔ عیسائیوں نے انجیلوں' صلیبوں' بخور اور جلتی ہوئی مشعلوں سے اس کا استقبال کیا۔ ہرقل نے شہر اور اس کے گرجاؤں کو برباد پایا' جس سے اسے شدید صدمہ ہوا۔

عیسائیوں نے ہرقل کو بتایا کہ کس طرح یہودی ایرانیوں کے ساتھ مل کر عیسائیوں کے خلاف حملہ آور ہوئے۔ انہیں قتل کیا اور ان کے گرجاؤں کو مسمار کیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ قتل و غارت گری میں وہ ایرانیوں سے بھی بدتر تھے اور انہوں نے عیسائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کمی نہ کی۔ عیسائیوں نے ہرقل کو ابھارا کہ وہ یہودیوں کی بیخ کنی کرے اور اس کے اچھے پہلو اس کے سامنے واضح کیے۔ ہرقل نے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ وہ انہیں امان دے چکا ہے اور اس نے ان سے حلفیہ وعدہ کیا ہے۔ عیسائیوں کے پادریوں' پوپوں اور مشائخ نے فتویٰ دیا کہ یہودیوں کو قتل کرنے میں کوئی

گناہ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ہرقل سے یہ امان دھوکہ دے کر حاصل کی ہے' اس لئے کہ ہرقل کو یہ نہیں بتایا گیا کہ عیسائیوں پر کیا کیا مظالم ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ہرقل کے کفارے کے طور پر یہ سال ایک جمعہ کو روزہ رکھا کریں گے۔ یہ روزہ لازمی ہو گا۔ اور تمام عیسائیوں کو اس کا پابند بنائیں گے۔ تب ہرقل نے ان کی بات مان لی اور یہودیوں پر شدید حملہ کیا اور انہیں نیست و نابود کر دیا۔ چنانچہ مصر و شام کی رومی سلطنت میں کوئی یہودی زندہ نہ بچا۔ سوائے ان کے جو بھاگ کر کہیں چھپ گئے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قومیں یہود و نصاریٰ سنگدل' انسانی خون بہانے کی ہوس اور دشمن کو تباہ کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اسی معاملے میں یہ کسی حد پر جا کر نہیں رکتے"۔ ماذا خسر العالم استاد ندوی' ص ۹ تا ۱۱' طبع اول)

اس کے بعد عیسائیوں کے درمیان اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے' حالانکہ ان کی کتاب بھی ایک تھی' نبی بھی ایک تھا' سب سے پہلے ان کے اختلافات بنیادی عقائد میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد وہ فرقے فرقے بن گئے۔ یہ فرقے ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے' ایک دوسرے کے سخت دشمن بن گئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات اور ماہیت کے بارے میں اختلافات پیدا ہوئے کہ ان کی ماہیت لاہوتی ہے یا ناسوتی۔ پھر ان کی ماں کی ماہیت کے بارے میں اختلافات رونما ہوئے۔ پھر ٹرینٹی یعنی تثلیث کے مسئلہ پر اختلافات ہوئے۔ ان کے خیال میں خداتیوں کا ایک تھا۔ قرآن کریم نے ان کے ان عقائد کو نقل کر کے واضح طور پر کہا ہے کہ یہ لوگ کافر ہو گئے ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (۵ : ۷۲) "یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تو یہی مسیح ابن مریم ہیں"۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (مائدہ : ۷۳) "یقیناً وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین کا تیسرا ہے"۔

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (مائدہ : ۱۱۶) "اور اس بات کو یاد کرو جب اللہ قیامت کے دن عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا' کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا خدا بنا لو"۔

ان اختلافات کے نتیجے میں وہ شدید ترین تنازعہ پیدا ہوا جو شام کے عیسائیوں اور روم اور مصر کے عیسائیوں کے درمیان پیدا ہوا۔ اس کا ایک فریق روم اور شام کے ملکانی عیسائی تھے اور دوسرا فریق مصر کا منوفیثی فرقہ تھا۔ ملکانی عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت مسیح کی فطرت کے دو اجزاء ہیں ایک ملکوتی اور دوسرا ناسوتی جبکہ مصر کے منوفیثی عیسائی کہتے تھے کہ ان کی ایک ہی فطرت ہے جو اس طرح فنا ہو گئی جس طرح سرکے کا ایک قطرہ سمندر میں گر کر فنا ہو جاتا ہے۔ چھٹی اور ساتویں صدی میں یہ اختلاف ان دو فرقوں کے درمیان بہت شدت اختیار کر گیا"۔ اور یوں نظر آنے لگا کہ یہ دو

فرقے نہیں بلکہ دو الگ الگ دین و مذہب ہیں۔ جس طرح یہودی اور عیسائی دو الگ الگ اہل مذہب ہیں اور ہر ایک دوسرے کے بارے میں یہ تصور کرتا ہے کہ اس کے مذہب کی کوئی بنیاد نہیں ہے"۔ (مسلمانوں کا عروج و زوال' ابو الحسن علی ندوی)

" ۶۲۸ء میں ہرقل نے ایرانیوں پر فتح پائی' اس کے بعد اس نے عیسائیوں کے باہم بر سرپیکار اور متحارک مسلکوں کو جمع کرنے اور ان کے اندر موافقت اور مصالحت پیدا کرنے کی سعی کی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ لوگ حضرت مسیح کی فطرت کے موضوع پر بحث کرنے سے پرہیز کریں کہ ان کی فطرت ایک تھی یا دو تھیں۔ وہ اس بات کا اقرار کریں کہ اللہ کا ارادہ اور فیصلہ ایک ہی ہے۔ ۶۳۱ء کے اوائل میں یہ بات طے ہوگئی کہ مینو تھیلین مذہب ہی حکومت اور کلیسا دونوں کا سرکاری مذہب ہوگا۔ ہرقل نے مختلف فرقوں کو ختم کرکے ایک مسلک پر ہونے کی سعی کی اور اس کے لیے ہر حربہ استعمال کیا' مگر مصر کے قبطیوں نے اس بدعت اور تحریف سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور شدید مخالفت کی' اور اپنے پرانے عقیدے کو جاری رکھنے کے لیے جان کی بازی لگادی۔ یہ لوگ اس کے دشمن ہوگئے۔ ہرقل نے دوبارہ مختلف فرقوں کو ایک کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ لوگ صرف اس پر متحد ہو جائیں کہ اللہ کا ارادہ ایک ہے۔ رہا یہ کہ اللہ کا ارادہ نافذ کس طرح ہوتا ہے۔ اس پر بحث نہ کی جائے۔ اس نے حکم دیا کہ اس موضوع پر کوئی مناظرہ نہ کیا جائے۔ ایک سرکاری پیغام مرتب کرکے مشرق کے اطراف و اکناف میں پھیلایا۔ اس سے بھی مصر کا مذہبی طوفان نہ رک سکا۔ اس پر اسے غصہ آیا اور دس سال تک وہ مصر کے لوگوں پر شدید ترین ظلم اور ستم کرتا رہا۔ اس نے جو مظالم کیے ان کی روئیداد پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کو اذیت ناک سزا دی جاتی' پھر انہیں دریا میں غرق کردیا جاتا۔ مشعل جلاکر ان کے جسموں پر بجھائی جاتی۔ یہاں تک کہ بدن کی چربی پگھل کر زمین پر گرتی۔ ریت کے بوروں میں قیدیوں کو بند کرکے دریا برد کردیا جاتا اور اس طرح کی دوسری لرزہ خیز سزائیں دی جاتیں"۔ (ماذا احسر العالم ابوالحسن ندوی' ص ۲ تا ۵)

اہل کتاب کے درمیان یہ اختلافات اور یہ عداوتیں اس کے بعد تھیں کہ ان کے پاس دلائل آچکے تھے۔

مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ (۹۸ : ۴) لیکن یہ علم اور یہ دلائل ان کے لیے مفید نہ تھے' خواہش نفس اور گمراہی ان کو حق سے دور کرتی چلی جارہی تھی۔ حالانکہ دین اپنی اصلی اور ابتدائی شکل میں بالکل واضح تھا اور دینی عقائد بالکل واضح اور صاف تھے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝۵

"اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں' اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرکے' بالکل یکسو ہوکر' اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے"۔

یہ اصول تمام ادیان کا اصل الاصول ہے کہ اللہ وحدہ کی عبادت کرو' دین صرف اللہ کا ہو' شرک اور اہل شرک سے

دور ہو' نماز قائم کرو' زکوۃ ادا کرو۔

وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (۹۸ : ۵) "یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے" یعنی انسانی ضمیر و شعور میں عقیدہ خالص ہو۔ صرف اللہ کی بندگی اور غلامی ہو' جو اس عقیدے پر مبنی ہو' اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا جائے' یعنی زکوۃ دی جائے۔ جس شخص نے بھی ان اصولوں کو حقیقت کا روپ دے دیا تو اس کا ایمان قائم ہو گیا' جس طرح اہل کتاب کو اس کا حکم دیا گیا تھا۔ اور جس طرح اللہ کے تمام رسولوں کو یہی حکم دیا گیا تھا اور تمام رسولوں اور امتوں کا دین دراصل ایک ہے' عقیدہ ایک ہے' جس پر تمام رسولوں کا اتباع رہا ہے اور اس عقیدے اور عمل میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس میں افتراق و اختلاف کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ بے حد صاف ستھرا' سادہ اور آسان ہے۔ لہٰذا اہل کتاب کے ہاں زیر بحث اور زیر جدال عقائد کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ اللہ کے دین میں وہ چیزیں ہیں۔

ان لوگوں کے پاس اس سے قبل ان کے رسولوں کے ذریعہ بھی دلائل آگئے تھے۔ اس کے بعد پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھی یہ دلائل آگئے تھے جو پاکیزہ صحیفے پڑھتے ہیں اور ان کے سامنے ایسے عقائد پیش کرتے ہیں جو واضح' سادہ اور آسان ہے لہٰذا صحیح راستہ واضح ہو گیا اور جو لوگ کفر کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔ ان کا انجام بھی واضح ہو گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۞ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ

رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۞ ع ۸

۲۲ "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے' یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کیے' وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں۔ ان کی جزا ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جس نے اپنے رب کا خوف کیا ہو"۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول ہیں اور جو دین لے کر آئے ہیں وہ آخری دین ہے اس سے قبل یوں تھا کہ جب بھی انسانیت گمراہ ہوتی اور راستے سے ہٹ جاتی اللہ رسول بھیج دیتا' یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا اور لوگوں کو وقفے وقفے سے مہلت ملتی رہی کہ لوگ اپنی اصلاح کر لیں لیکن اللہ کی مشیت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک جامع' مانع اور مکمل دین بھیج کر رسولوں کے اس سلسلے کو ختم کر دے۔ یہ آخری مہلت ہے۔ لوگ اس آخری دین کو قبول کر کے نجات پا لیں گے یا انکار کر کے ہلاک و برباد ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ کفر اور شرک شر کے قائم مقام اور شر کی علامت بن جاتا ہے اور شر کی

کوئی حد نہیں ہوتی اور ایمان خیر کا قائم مقام ہو جاتا ہے ۔ اور ایمان کے نتیجے میں خیر اپنی انتہاؤں تک پہنچ جاتا ہے ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اُولٰٓئِکَ ھُمْ شَرُّ الْبَرِیَّۃِ (۹۸ : ۶) "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یقیناً جہنم کی آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے ' یہ لوگ بد ترین خلائق ہیں" ۔ یہ ایک قطعی حکم ہے اور اس میں کوئی جدل و جدال نہیں ہے ۔ اگرچہ اہل کتاب اور مشرکین کے بعض اعمال اچھے ہوں ' بعض آداب خوب ہوں اور بعض تنظیمات مفید ہوں ۔ جب تک ان لوگوں کو حقیقت ایمان حاصل نہیں ہوتی ۔ اور وہ اس آخری دین اور آخری نبی پر ایمان نہیں لاتے ۔ اس اٹل حکم میں ہم محض لوگوں کے بعض ظاہری اچھے اعمال کی وجہ سے شک نہیں کر سکتے اس لیے کہ کفار کے اعمال دراصل نیکی اور بھلائی کے اصل سرچشمے سے دور ہوتے ہیں ۔ اور وہ ایک مضبوط اور درست نظام زندگی کا حصہ نہیں ہوتے ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ (۹۸ : ۷) "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں" ۔ یہ بھی ایک قطعی حکم ہے جس میں کسی قیل و قال کی گنجائش نہیں ہے ۔ اس کی شرط بھی واضح ' صاف اور اٹل ہے ۔ یعنی یہ کہ جو "ایمان" لے آئیں ۔ یہ نہ ہو کہ وہ کسی ایسی سرزمین میں پیدا ہوئے ہوں جو مسلمان سرزمین ہونے کی مدعی ہو ' یا کسی ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے ہوں جس کا دعویٰ یہ ہو کہ وہ مسلمان گھرانا ہے یا محض یہ کہ کوئی چند کلمات ادا کرتا ہو ' نہیں بلکہ ایسا ایمان جو زندگی کے اندر عملاً نمودار ہوتا ہو ۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ "اور انہوں نے نیک کام کیے" ۔ اور ان کا ایمان اور اقرار ایمان محض الفاظ اور کلمات ہی نہ ہوں ' جو صرف ہونٹوں پر ہوتے ہیں ' صالحات وہ افعال ہیں جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہو ' جن میں اخلاق بھی ہوں ' اعمال بھی ہوں اور طرز عمل اور معاملات بھی ہوں اور اعمال میں سب سے بڑا عمل یہ ہے کہ اللہ کی شریعت کو زمین پر قائم کیا جائے اور لوگوں کے درمیان فیصلے اللہ کی شریعت کے مطابق ہوں ۔ جو لوگ یہ کام کریں وہ ہیں بہترین خلائق ۔

جَزَآؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا (۹۸ : ۸) "ان کی جزاء ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے" ۔ ایسے باغات جن کی نعمتوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہاں مکمل امن ہو گا ۔ اور ان کے فنا ہونے اور رک جانے کا کوئی خطرہ نہ ہو گا ۔ فنا ہونے اور امن و اطمینان کا ختم ہو جانا ہی دنیا کی تمام سہولیات اور طیبات کا مزہ خراب کر دیتا ہے اور ان تروتازہ باغوں کے نیچے نہروں کا بہنا اس طرف اشارہ ہے کہ ان باغات میں تازگی اور بہار دائمی ہو گی اور یہ زندگی اور جمال سے بھرپور ہوں گے ۔

اس دائمی نعمت و رحمت کی تصویر کشی میں سیاق کلام دو قدم اور آگے جاتا ہے ۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ (۹۸ : ۸) "اللہ ان سے راضی ہو

اور وہ اللہ سے راضی ہوئے"۔ یہ رضامندی اللہ کی جانب سے ہے اور یہ تمام نعمتوں سے برتر اور تمام خوشیوں سے تروتازہ ہے۔ خود ان اہل ایمان کے دلوں میں جو رضامندی ہے وہ رب کی رضامندی ہے۔ اور یہ رضامندی ہے کہ ان کے بارے میں تقدیر الٰہی جو فیصلہ کرتی ہے وہ اس پر راضی ہیں۔ اور اللہ نے ان پر جو انعامات کیے ہیں اس پر بھی وہ راضی ہیں اور اپنے اور اللہ کے درمیان پائے جانے والے تعلق پر بھی راضی ہیں۔ یہ ایسی رضامندی ہے کہ اس سے انسان گہری خوشی اور مسرت و اطمینان محسوس کرتا ہے۔ یہ انداز کہ "اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں"۔ ایک ایسا انداز ہے جس کی تعبیر کسی دوسرے الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (۹۸ : ۸) "یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جو اپنے رب کا خوف کرتا ہو"۔ یہ آخری تاکید ہے' یہ کہ یہ سب کچھ اس پر موقوف ہے کہ کسی کا تعلق باللہ کیسا ہے۔ اور اس تعلق کی نوعیت کیسی ہے۔ یاد رہے کہ کسی دل میں جب خدا کے خوف کا شعور پیدا ہوتا ہے تو یہ شعور انسان کو نیکی پر آمادہ کرتا ہے اور ہر قسم کی کج روی سے انسان کو روکتا ہے۔ یہی شعور ہے جو انسان کی آنکھوں کے سامنے سے تمام پردے ہٹا دیتا ہے۔ اور انسان کا دل اللہ واحد و قہار کے سامنے براہ راست کھڑا ہوتا ہے' اور اس شعور کی وجہ سے انسان کی عبادت اور اس کے اعمال صالحہ ہر قسم کی شرک' ریاکاری سے پاک ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ جو شخص اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ اس کا دل غیر اللہ کے ڈر سے خالی ہو جاتا ہے' کسی دوسرے کی رو رعایت وہ نہیں کرتا۔ یہ شعور انسان کو یہ یقین دلا دیتا ہے کہ اللہ تمام ایسے اعمال کو رد کر دیتا ہے جن میں اس کی رضامندی کے سوا کوئی اور جذبہ بھی ہو' اللہ غنی بادشاہ ہے' اس کے لیے تو خالص عمل ہو گا ورنہ وہ اسے رد کر دے گا۔

اس مختصری سورت میں یہ چار عظیم حقائق قلم بند کیے گئے ہیں اور قرآن نے ان حقائق کو اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا ہے اور یہ اسلوب ان چند سطروں والی سورت میں بہت اچھی طرح نمایاں ہے۔

--- ooo ---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الزلزال ۔ ۹۹

۱ --- تا --- ۸

سورۃ الزلزال ایک نظر میں

بعض مصاحف اور بعض روایات کے مطابق یہ سور مدنی ہے اور بعض دوسری روایات کے مطابق یہ کمی ہے۔ ہمارے نزدیک وہ روایات قابل ترجیح ہیں جو کہتی ہیں کہ یہ سورت کمی ہے۔ اس کا انداز گفتگو اور اس کا موضوع دونوں یہ تقاضا کرتے ہیں کہ یہ کمی ہے۔ یہ سورت دراصل غافل دلوں کے لیے ایک سخت جھٹکا ہے۔ موضوع سخن ' انداز کلام اور منظرکشی اور لفظی اثرات سب کے سب انسانی قلوب کو جھنجھوڑتے ہیں۔ یہ سورت دراصل ایک چیلنج ہے ' ایک سخت پکار ہے جو زمین اور اہل زمین کے اندر ایک زلزلہ پیدا کر دیتی ہے۔ اور لوگ گویا مدہوش ہو جاتے ہیں اور جب وہ ہوش میں آتے ہیں تو وہ میدان حشر میں حساب و کتاب کے لیے اپنے آپ کو کھڑا پاتے ہیں اور چند مختصر فقروں میں یہ سب کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پورے پارے میں ایسا ہی انداز گفتگو ہے اور یہ سورت گویا اس انداز کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

---:():():---

درس نمبر ۲۹۹ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۸

سورۃ الزلزال (۹۹)　　مدنیۃ (۹۳)

آیاتها ۸　　رکوعها ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝١ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝٢ وَقَالَ الْإِنسَانُ
مَا لَهَا ۝٣ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝٤ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝٥

اللہ کے نام سے جو بے انتا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

”جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی ' اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی ' اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے؟ اس روز وہ اپنے (اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے (ایسا کرنے کا) حکم دیا ہو گا۔

یہ ہے منظر قیام قیامت کا ' اس دن زمین نہایت شدت سے ہلا ماری جائے گی اور ایک شدید زلزلہ برپا ہو گا اور زمین کے پیٹ کے اندر جو کچھ ہو گا ' وہ اسے باہر پھینک دے گی اور اس نے ایک طویل عرصے سے انسانی جانوں کا جو بوجھ اٹھا رکھا ہو گا ' یا اس کے اندر جو معدنیات ہوں گے وہ ان کو اٹھا کر باہر پھینک دے گی ' گویا اس بوجھ کو باہر پھینک کر وہ ہلکی ہو جائے گی ۔

یہ ایک ایسی تصویر کشی ہے کہ سننے والے اپنے پاؤں کے نیچے کھڑی ہر چیز متزلزل محسوس کرتے ہیں کہ وہ ڈگمگا رہے ہیں ' لڑکھڑا رہے ہیں ' ان کے قدموں کے نیچے سے زمین کانپ رہی ہے ' دوڑ رہی ہے ' یہ ایک ایسا منظر ہے جس کو دیکھ کر انسان ان تمام امور سے قطع تعلق کر لیتا ہے جو انسان کو اس زمین سے وابستہ کرتے ہیں اور جن کے بارے میں انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ ثابت اور باقی ہیں ۔ قرآن اس قسم کے مناظر سے جو اثرات قائم کرنا چاہتا ہے ۔ یہ ان میں سے پہلا اثر ہے اور قرآن کی یہ منفرد آیات سنتے ہی یہ اثر انسان کے اعصاب تک منتقل ہو جاتا ہے ۔ یہ تاثر اس وقت اور گہرا ہو جاتا ہے ۔ جب قرآن کریم میدان حشر میں کھڑے اس ”انسان“ کے تاثرات قلم بند کرتا ہے ' جو ان مناظر کو دیکھ رہا ہو گا۔

وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا (۹۹ : ۳) ”اور انسان کہے گا ' یہ اس کو کیا ہو رہا ہے؟“ یہ ایک ایسے شخص کا

سوال ہے جو ایک اچانک ' خوفناک منظر کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے ' جو ایسا منظر دیکھ رہا ہوتا ہے جو نادیدنی ہو ' جو ایسی صورت حالات سے دوچار ہوتا ہے جس کو وہ سمجھ نہیں پا رہا ہوتا ' اور ایک ایسے منظر کو دیکھ رہا ہوتا ہے ' جس پر وہ نہ خاموش ہو سکتا ہے ' اور نہ صبر کر سکتا ہے۔

مَا لَهَا (۹۹ : ۳) "اسے کیا ہو گیا ہے"۔ کیا سبب ہے کہ ایک زلزلہ برپا ہے اور زمین ہے کہ مسلسل حرکت کر رہی ہے اور اس کے قدم ہی نہیں جمتے اور وہ ادھر ادھر لڑھک رہا ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ جو سہارا ہاتھ میں آئے اسے لے ' لیکن اس کے ماحول میں ہر چیز حرکت کر رہی ہے ' اور شدید زلزلے کی زد میں ہے۔

انسان نے اس سے قبل زلزلے اور آتش فشانی کے عمل دیکھے ہوئے تھے اور زلزلے اور آتش فشانی کے دوران خوف اور بے چینی سے وہ دوچار رہا ہے۔ اس نے ہلاکتیں اور بربادیاں دیکھی ہیں لیکن جب وہ قیامت کا زلزلہ دیکھتا ہے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ دنیا کے زلزلوں اور آتش فشانیوں اور اس کی موجودہ حادثے کے درمیان کوئی مماثلت نہیں ہے۔ یہ کوئی اور ہی عمل ہے ' کوئی اور ہی حادثہ ہے۔ اس حادثے کا کوئی حقیقی سبب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ نہ اس کی کوئی مثال ہے۔ یہ ایک نہایت ہی ہولناک واقعہ ہے اور پہلی مرتبہ پیش آ رہا ہے۔

يَوْمَئِذٍ (۹۹ : ٤) "اس دن"۔ جس دن یہ زلزلہ واقعہ ہو گا اور انسان اس کے سامنے دہشت زدہ ہو گا۔ اس دن۔

تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا (۹۹ : ٤) "وہ اپنے (اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی"۔ اس دن یہ زمین اپنی خبریں دے گی اپنے حالات بتائے گی اور اپنی پوری کہانی بیان کرے گی۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (۹۹ : ٥) "کہ تیرے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہو گا"۔ اس کو حکم دیا ہو گا کہ وہ اپنی حرکت تیز کر دے اور اپنے سکان کو خوب جھٹکے دے اور اپنے اندر کی چیزیں باہر پھینک دے اور یہ کام وہ رب کے حکم کی اطاعت میں کر رہی ہے۔

وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ "اور وہ اپنے رب کے حکم کی اطاعت کرے گی اور اس کا حق یہی ہے"۔ لہٰذا وہ اپنے حالات بتائے گی۔ غرض یہ صورت حال اور یہ منظر اس بات کا خوب اظہار کر رہا ہے کہ اس وقت اللہ کے احکام و اشارات کیا ہوں گے۔

اب یہاں حالات ایسے ہیں کہ انسان ششدر رہ گیا ہے ' سورت کی گھن گرج اور زور دار بیان سے خوف و ہراس کی فضا ہے ' ہر سو دہشت اور حیرانی کا دور دورہ ہے۔ اضطراب اور بھگدڑ ہے ' ایسے حالات میں انسان کا سانس پھولا ہوا ہے۔ اور وہ پوچھ رہا ہے کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔

مَا لَهَا (۹۹ : ۳) "اسے کیا ہو گیا ہے --- ایسے حالات میں جواب ایک نئے منظر کی صورت میں آتا ہے ' یہ ہے منظر حشر و نشر ' حساب و کتاب اور میزان و جزاء کا ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ﴿٦﴾ فَمَن
يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ﴿٧﴾ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا ۱
يَرَهُ ﴿٨﴾ ع ۸
۲۴

"اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں ۔ پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا"۔

ایک لمحہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ قبروں سے اٹھتے چلے آرہے ہیں ۔

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا (۹۹ : ۶) "اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے"۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مختلف گروہوں مختلف اطراف سے چلے آرہے ہیں ۔ یوں لگتا ہے کہ گویا وہ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں ۔

كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ "گویا کہ یہ لوگ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں" یہ ایک ایسا منظر ہے جو اس سے قبل انسان نے کبھی نہیں دیکھا' یہ کہ لوگوں کی نسلیں' اگلوں پچھلوں کی یہاں سے اور وہاں سے اٹھ رہی ہیں ۔ جس طرح دوسری جگہ آیا ۔

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا "وہ دن جبکہ زمین پھٹے گی اور وہ اس میں سے تیزی تیزی سے نکل بھاگیں گے"۔ منظر یوں ہے کہ تاحد نظر انسان ہی انسان نظر آتے ہیں ۔ جو قبروں سے اٹھ رہے ہیں اور تیزی سے بھاگ رہے ہیں ۔ کسی طرف کسی کو توجہ نہیں ہے ۔ آگے اور پیچھے' دائیں اور بائیں کچھ نہیں دیکھ رہے ہیں ۔ نظریں اٹھی ہوئی ہیں ۔

مُّهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ "پکارنے والے کی طرف سر اٹھائے تیزی سے دوڑ رہے ہیں"۔ گردنیں بلند کی ہوئی' نظریں پھٹی ہوئی ۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ (۸۰ : ۳۷) "ہر شخص کو اس دن بس اپنی پڑی ہوگی"۔
یہ ایک ایسا منظر ہے جس کی تصویر کشی کسی انسانی زبان میں نہیں کی جا سکتی ۔ "ہولناک" اور "خوفناک" "حیرت زدہ کر دینے والا" اور "مدہوش کر دینے والا"۔ غرض یہ اور اس قسم کے تمام دوسرے الفاظ اس منظر کی تصویر کشی سے عاجز ہیں ۔ ہاں صرف خیال و تصور کو ہم کسی قدر آگے بڑھا سکتے ہیں اور اس منظر کی تصویر کشی میں الفاظ کی بجائے خیال کی جولانی ہو سکتی ہے ۔ اپنی وسعت اور طاقت کے حدود کے اندر اندر ۔

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ (۹۹ : ۶) "اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں"۔ اور یہ پھر اس منظر سے بھی شدید تر بات ہے ۔ اف' ان کے سامنے تو ان کے اعمال پیش ہو رہے ہیں! کیا یہ اپنے اعمال کا سامنا کر سکیں گے؟ کیا اس سزا کا مقابلہ کر سکیں گے ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے بعض اوقات خود اپنے اعمال کا مقابلہ نہایت ہی تلخ ہوتا ہے ۔ انسان بعض اوقات خود اپنے اعمال کا

سامنا کرنے سے بھاگتا ہے حالانکہ لوگوں کو ان کا پتہ نہیں ہوتا' لیکن جب توبہ و ندامت کے وقت خود انسان کے اعمال اس کے سامنے آکر کھڑے ہوتے ہیں تو وہ سخت نادم ہوتا ہے' اپنی نفسیات' اپنے ضمیر سے بھاگتا ہے' چہ جائیکہ کھلی عدالت میں اسے پیش ہونا ہو اور سب کے سامنے اس پر فرد جرم لگتا ہو اور عدالت کا سربراہ رب ذوالجلال ہو جو جبار اور متکبر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی کو اس کا عمل دکھانا بھی دراصل ایک خوفناک سزا ہے' صرف یہ بات کہ کوئی اپنا جتھا دیکھے اور جو کچھ اس نے کیا ہے اس کا سامنا کرے۔ خصوصاً ایسے اوقات میں جبکہ حساب و کتاب ایسا ہو کہ اس میں ذرہ ذرہ درج ہو' نہ شر کا ذرہ چھوڑا گیا ہو اور نہ خیر کا ذرہ چھوڑا گیا ہو۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ (۷) وَ مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (۹۹ : ۸) "پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا"۔ پرانے مفسرین ذرے کی تفسیر مچھر کے برابر کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے ذرہ وہ اڑنے والا چھوٹا ایٹم ہے جو سورج کی روشنی میں نظر آیا کرتا ہے۔ دراصل اس دور میں یہ وہ چھوٹی سے چھوٹی مقدار تھی جس کا وہ لوگ تصور کر سکتے تھے لیکن آج کے جدید زمانے میں ہم جانتے ہیں کہ ذرہ کیا ہے۔ وہ ایک متعین جسم ہے اور یہ یہ ذرہ سے بہت چھوٹا ہے جو فضا میں اڑ رہا ہوتا ہے اور جو سورج کی روشنی میں نظر آتا ہے اس لیے کہ ہوا میں اڑنے والی یہ چھوٹی سی مقدار محض آنکھ سے دیکھی جا سکتی ہے۔ رہے ایٹم تو وہ صرف خوردبین کے ساتھ لیبارٹری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ سائنس دان اس ذرے کو دراصل اپنے ذہن اور عقل سے دیکھتے ہیں اور اس کے آثار کو آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ پس قیامت کے دن اس ذرے یعنی ایٹم جتنی بھلائی یا برائی کی کوئی بھی جزاء و سزا ہوگی۔ یہ چھوٹی سی نیکی اور بدی بھی اس کے کرنے والے کے سامنے پیش ہوگی۔ اور وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔

یہاں آکر ہر انسان چوکنا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے خیر و شر سے غافل نہیں رہتا' اور یہ نہیں کہتا کہ یہ تو چھوٹا سا عمل نیک ہے یا یہ تو چھوٹی سی برائی ہے اور اس کا کوئی حساب و کتاب نہ ہوگا۔ اس نہایت ہی باریک اور لطیف ترازو کے سامنے ہر شخص کانپ اٹھتا ہے کہ جہاں ذرے کو بھی تولا اور ناپا جائے گا۔

اس جہاں میں تو ایسی کوئی میزان نہیں ہے جو اس قدر ناقابل وزن ذرے کو بھی ناپ اور تول سکے۔ البتہ قلب مومن میں جو تقویٰ کا میزان ہے وہ ذرے کو ہی ناپتا اور تولتا ہے۔ کیونکہ ایک مومن تو ذرے کے برابر گناہ سے بھی ڈرتا ہے۔ افسوس کہ اس جہاں میں ایسے سخت دل بھی ہیں جو پہاڑوں جیسے جرائم سے بھی نہیں ڈرتے' بلکہ ایسے سنگدل لوگ بھی ہیں جو خیر کے ایسے ایسے پہاڑوں کو بھی مٹانے کے درپے ہیں جن کے سامنے اس زمین کے اونچے اونچے پہاڑ بھی ہیچ ہیں۔

یہ نہایت ہی سخت دل ہیں' پتھروں جیسے سخت۔ یہ پتھروں کی طرح زمین کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں اور یہ دل جب قیامت کے دن آئیں گے تو اپنے گناہوں کے بوجھوں کے نیچے پس کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ [1]

---

[1] یہ پیراگراف خود سید قطب پر صادق آتا ہے جسے قسی القلب ناصر نے اس جہاں سے مٹایا' حالانکہ وہ نیکی کے ایک بلند پہاڑ تھے۔

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ العٰدیٰت ۔ ۱۰۰

۱--- تا --- ۱۱

سورۃ العٰدیٰت ایک نظر میں

اس سورت کا سیاق کلام نہایت سریع الحرکت جھلکیوں کے انداز میں چلتا ہے۔ انداز نہایت سخت اور نہایت موثر ہے جس طرح کوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف کودتا ہے یا چھلانگ لگاتا ہے 'نہایت ہلکے انداز میں' تیزی کے ساتھ اور آگے بڑھتے ہوئے۔ یہاں تک کہ یہ جھلکیاں آخر تک پہنچ جاتی ہیں۔ آخری فقروں میں الفاظ' معانی' موضوع اور اثرات تھم کر پرسکون ہو جاتے ہیں 'جس طرح گھوڑ دوڑ میں مقابلہ جیت کر دوڑنے والا آخر کار پرسکون ہو جاتا ہے۔

ذرا غور سے دیکھیے اس منظر کو 'صبح سویرے کا وقت ہے۔ گھوڑے جنگجو سواروں کو لیے ہوئے تیزی سے دوڑ رہے ہیں اور ہانپ رہے ہیں۔ ان کی ٹاپوں سے چنگاریاں اٹھ رہی ہیں' غبار دھویں کی طرح آسمانوں تک اڑ رہا ہے۔ وہ دیکھو یہ سوار دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ دشمن کو حملے کی توقع نہیں' دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی 'جس کا منہ جدھر ہے ادھر بھاگ رہا ہے۔

اس عجیب منظر کے کرداروں کی قسم کھاتے ہوئے 'نفس انسانی کی ایک جھلک' کہ یہ سخت منکر اور کافر ہے' اور اس کے ساتھ ساتھ دولت کا پجاری ہے۔

اور اس کے بعد ایک دوسرا منظر زمین اور قبرستان پھٹ رہے ہیں اور لوگ ان میں سے چیونٹیوں کی طرح باہر نکل رہے ہیں 'پھر انسانی دل و دماغ پھٹ رہے ہیں اور ان میں پوشیدہ تمام راز اگلے جا رہے ہیں۔

سورت کے آخر میں منظر یہ ہے کہ گرد و غبار چھٹ جاتا ہے۔ انکار و جحود اور حرص و بخل ختم ہو جاتے ہیں۔ لوگ تمام کے تمام قبروں سے نکل کر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور رب کے سب اللہ کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور آخری انجام یہ ہے۔

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ (۱۰۰ : ۱۱) "یقیناً ان کا رب ان سے اس دن خوب باخبر ہے"۔

الفاظ کے ترنم میں بھی سختی 'خشونت اور کرختگی ہے۔ اور یہ اس شور و شغب کی فضا سے ہم آہنگ ہے جو قبروں کی اکھاڑ اور لوگوں کے خروج سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس فضا سے بھی متناسب ہے جس میں دلوں سے خفیہ راز بڑی شدت سے نکالے جا رہے ہیں۔ پھر انکار و ہٹ دھرمی اور بخل اور دولت پرستی کی فضا سے بھی ہم آہنگ ہے۔ ان سب درشت معانی کی تصاویر کو سجانے کے لیے جو فریم تجویز ہوا ہے وہ قبروں سے نکلنے کے ہائے و ہو 'اور ایسے تیز رفتار گھوڑ سواروں کے شور سے تیار ہوا ہے جن کے کھروں کی ٹکر سے چنگاریاں اٹھ رہی ہیں اور علی الصبح دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں' جو گرد و غبار اڑاتے ہیں' جو دشمن کے اندر جا گھستے ہیں اور دشمن کی توقع ہی نہیں ہوتی' غرض ان سخت و کرخت معانی کے لیے یہ مناسب فریم ہے۔ گو فریم تصویر سے لی گئی ہے اور تصویر فریم کے کرخت میٹریل سے بنی ہے۔ (التصویر الفنی فی القرآن)

---○○○---

درس نمبر 300 تشریح آیات

1 -- تا -- 11

سُورَةُ الْعٰدِيٰتِ مَكِّيَّةٌ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝۱ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۝۲ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝۳ فَاَثَرْنَ بِهٖ
نَقْعًا ۝۴ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝۵ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝۶ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ
لَشَهِيْدٌ ۝۷ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝۸

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قسم ہے ان (گھوڑوں) کی جو پھنکارے مارتے ہوئے دوڑتے ہیں' پھر (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں جھاڑتے ہیں' پھر صبح سویرے چھاپہ مارتے ہیں' پھر اس موقع پر گرد و غبار اڑاتے ہیں' پھر اسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جا گھستے ہیں' حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے' اور وہ خود اس پر گواہ ہے' اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے"۔

اللہ تعالیٰ یہاں سواروں کے دستے کی قسم اٹھاتے ہیں۔ ان کی ایک ایک جنگی حرکت کو ترتیب کے ساتھ لایا جاتا ہے۔ جب یہ دستہ اپنے حملے کا آغاز کرتا ہے اور تیز رفتاری کے ساتھ منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ گھوڑے پھنکار مارتے آگے جا رہے ہیں۔ یہ اپنے سموں سے پتھروں سے چنگاڑیاں نکالتے جاتے ہیں۔ پھر عین صبح کے وقت یہ دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں' یہ حملہ نہایت سرعت کے ساتھ ہوتا ہے اور اچانک ہوتا ہے۔ حملہ کے وقت گھوڑوں کی بھگدڑ سے غبار اڑتا ہے۔ کیونکہ دشمن حملے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور اس کی حرکات غیر مرتب ہیں' جب یہ دستہ دشمن کی صفوں میں خلاف توقع جا گھستا ہے تو سخت انتشار و اضطراب برپا ہو جاتا ہے۔

یہ کسی بھی حملہ کے وہ پے در پے اقدامات ہیں جن سے عرب خوب واقف تھے۔ اس قسم کے دستے اور گھوڑوں کی حرکات کی قسم کھانے کا مطلب یہی ہوا کہ اسلام میں اس قسم کے معرکے بہت محبوب ہیں' یہ اللہ کو بھی محبوب ہیں' اللہ ایسی حرکات کو اچھی نظروں سے دیکھتا ہے اور یہ پسندیدہ قدرریں ہیں۔

پھر' یہ مناظر اور جنگی ایکشن ان معانی سے زیادہ ہم آہنگ ہیں جن پر یہاں قسم اٹھائی جارہی ہے' جیسا کہ ہم نے تبصرے میں وضاحت کی ۔جس مفہوم اور معنی پر قسم اٹھائی جارہی ہے ۔یہ انسان کی ایک نفسیاتی بیماری ہے اور یہ انسان کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب انسان نفسیات ایمان سے خالی ہوں ۔قرآن مجید اس حقیقت کی طرف بار بار اشارہ کرتا ہے تا کہ لوگ اس کے خلاف جدوجہد کریں ۔اس لیے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ انسانی نفسیات کے اندر یہ بیماری کس قدر گہری جڑیں رکھتی ہیں ۔اور انسانی شخصیت پر اس کے کتنے اثرات ہوا کرتے ہیں ۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (٦) وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ (٧) وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (٨) (۱۰۰ : ٦ تا ٨) "حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے اور وہ خود اس پر گواہ ہے اور وہ مال اور دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے" ۔بے شک انسان اپنے رب کی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے اور اللہ کے فضل و کرم کا عملی انکار کرتا ہے ۔اور اس کی یہ ناشکری اور کفران نعمت کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے ۔اس کے افعال سے اور اس کے اقوال سے' چنانچہ اس کے اعمال و اقوال ہی اس کے اس جرم پر گواہ ہوتے ہیں ۔گویا آفتاب آمد دلیل آفتاب' وہ اپنے اوپر خود گواہ بن جاتا ہے' اور قیامت میں بھی ایسا ہی ہو گا ۔

وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ (۱۰۰ : ۷) "وہ خود اس پر گواہ ہے" ۔اور ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ سچائی کی شہادت خود اپنے خلاف دے گا ۔جس میں کوئی شک اور نزاع نہیں ۔

وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۱۰۰ : ۸) "اور یہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے" ۔یہ اپنی جان اور اپنے مفاد کو بہت ہی محبوب رکھتا ہے ۔اس لیے اسے دولت کے ساتھ بہت محبت ہے' دولت کو یہاں "خیر" سے تعبیر کیا گیا ہے' کیونکہ انسان سمجھتا ہے کہ اس کی بھلائی مال و متاع اور اقتدار و حکومت میں ہے جو دنیا کے ساز و سامان ہیں ۔

یہ ہے انسان کی فطرت' یہ ہے اس کا مزاج اور یہ تب بدل سکتا ہے جب اس کے مزاج اور اس کی نفسیات میں ایمان داخل ہو جائے ۔ایمان کی وجہ سے اس کے تصورات' اس کی قدریں اور اس کے پیمانے ہی بدل جاتے ہیں ۔اس کی ترجیحات بدل جاتی ہیں ۔جب اس کی نفسیات میں ایمان داخل ہوتا ہے تو پھر انکار اور ناشکری اللہ کے فضل کے اعتراف اور شکر میں بدل جاتی ہے ۔جبکہ بخل اور دولت کی محبت' ایثار اور محبت سے بدل جاتی ہے ۔یہ ایمان انسان کو ایسی قدریں عطا کرتا ہے جن کے لیے انسان حرص' لالچ' منافست اور جدوجہد کرتا ہے ۔اور یہ قدریں مال و دولت اور اقتدار اور حکومت سے زیادہ بلند ہوتی ہیں' اور وہ تمام دنیاوی اور حیوانی قدروں سے برتر ہوتی ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایمان کے بغیر نہایت ہی چھوٹا اور حقیر ہوتا ہے' جس کی امیدیں حقیر' جس کی ترجیحات حقیر اور جس کے اہداف حقیر ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ بہت عظیم مقاصد نظر آئیں ۔جوں جوں انسان کا حرص اور اس کی طمع بڑھتی ہے اور جوں جوں اس کا لالچ شدید ہوتا ہے' اس کے مقاصد بلند ہوتے ہیں' وہ زمینی قدروں کے دلدل میں گرتا جاتا ہے ۔اس کی تمام سرگرمیاں اس عمر کے لیے ہوتی ہیں ۔وہ اپنی ذات کے اندر محدود اور قید ہو جاتا ہے اور اس قید سے اسے رہائی صرف اس صورت میں نصیب ہو سکتی ہے جب وہ اس دنیا سے ایک بڑی دنیا کے ساتھ مربوط ہو جائے ۔

جو اس دنیا سے بہت بلند اور دور ہے' جو اس کی ذاتی محدود دنیا سے بہت وسیع ہے۔ وہ ایسی دنیا ہے جو اللہ ازلی کی تخلیق ہے' جس میں تمام امور اللہ ازلی و ابدی کی طرف لوٹتے ہیں۔ اور جس میں اس محدود دنیا کی سرحدیں ایک وسیع اور لازوال دنیا سے جاملتی ہیں۔

چنانچہ سورت کی آخری جھلک اسی کے بارے میں ہے 'تاکہ انکار اور ناشکری کا علاج ہو سکے 'تاکہ خود غرضی اور مفاد پرستی کی بیماری کا علاج کیا جاسکے تاکہ نفس پرستی کے قلعے کو توڑ کر حقیقی انسان کو اس سے رہائی دلائی جا سکے۔ چنانچہ حشر و نشر کے منظر کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ انسان اس دنیا پرستی اور خود غرضی کو' مارے خوف کے بھول جائے اور خواب خرگوش سے بیدار ہو کر چوکنا ہو جائے۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝۹ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝۱۰

"تو کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ (مدفون) ہے اسے نکال لیا جائے' اور سینوں میں جو کچھ (مخفی) ہے اسے برآمد کر کے اس کی جانچ پڑتال کی جائے گی"۔

یہ ایک شدید اور موثر منظر ہے۔ قبروں سے انسانوں کا نکالا جانا' اس عمل کے لیے "بعثرہ" کا شدید لفظ لایا گیا ہے اور پھر اس منظر میں ان رازوں کو کھینچ کھینچ کر باہر نکالا جارہا ہے جن کو نفوس انسانی نے دبائے اور چھپائے رکھا تھا۔ حصلت کا لفظ اس کے لیے استعمال ہوا ہے کہ گویا سرکاری کارندے زبردستی حاصل کر رہے ہیں۔ سرکاری تحصیل دار پہنچے ہوتے ہیں اور نہایت شدید پکڑ دھکڑ کا منظر ہے۔

کیا انسان نہیں جانتا کہ اسے اس قسم کے منظر سے گزرنا ہے۔ اسے کچھ یاد ہے ان حقائق کے بارے میں' یہ حقائق تو ہر انسان کی فطرت میں ہیں۔ اگر اسے علم ہے اور یاد ہے تو بس اس کی اصلاح کے لیے تو یہی کافی ہے۔ اس علم کا جواب نہیں دیا جاتا کہ اگر وہ جانتا تو کیا ہوتا؟ تم خود ہی سوچ لو کہ کیا ہوتا۔ بہت کچھ ہو جاتا۔ اگر انسان اس بات کو جانتا' بہت بڑے بڑے نتائج برآمد ہو جاتے' مجرد اس علم سے۔ یہ سب حرکات اور یہ جھلکیاں ایک آخری سکون و قرار پر ختم ہوتی
۱ ہیں جس تک پہنچ کر ہر حرکت اور ہر بات اپنے ٹھکانے تک پہنچ جاتی ہے۔

۱۱ ع اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝۱۱

۲۵ "یقیناً ان کا رب اس روز ان سے خوب باخبر ہو گا"۔ سب لوگ رب کی طرف لوٹنے والے ہیں اور اس دن ان کے امور' ان کے رازوں اور ان کے حالات سے اللہ نہایت ہی اچھی طرح خبردار ہو گا۔ اس دن کی قید نہیں ہے' اللہ تو ہر وقت اور ہر دن ان کے حالات سے خبردار ہے۔ لیکن یہاں "یومئذ" کا لفظ نہایت موثر ہے۔ اور اس کے آثار انسان کو اس دن کے بارے میں چوکنا کر دیتے ہیں۔ یہ کہ اللہ اس دن خبردار ہو گا یعنی کوئی سزا سے نہ بچ سکے گا۔ حساب و کتاب نہایت علم و خبرداری پر مبنی ہو گا۔ یہی ضمنی مفہوم ہی یہاں اہمیت رکھتا ہے۔ غرض یہ پوری سورت ایک ہی مسلسل منظر ہے۔ ایک خوفناک و ہیبت ناک منظر' معانی' الفاظ اور انداز بیان سب کچھ بدل جاتا ہے اور یہ منظر اختتام پذیر ہوتا ہے اور یہ قرآن کے معجز انداز کلام کا ایک مخصوص پہلو ہے۔

--- ○○○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ القارعۃ ـ ۱۰۱

۱-- تا-- ۱۱

سورۃ القارعۃ ایک نظر میں

القارعہ کے معنی ہیں کھٹکھٹانے والی یعنی قیامت' الطامہ، الصاخہ، الحاقہ، الغاشیہ سب قیامت کے صفاتی معنی ہیں۔ القارعہ قیامت کو اس لیے کہا گیا کہ یہ اپنی ہولناکیوں سے انسانی قلوب کو جھنجھوڑ دے گی اور خوفزدہ کر دے گی۔

یہ پوری سورت ایک ہی خوفناک منظر پر مشتمل ہے۔ اس کا مفہوم' اس کے واقعات اور اس کا انجام سب کے سب کھٹکھٹانے والے ہیں۔ یہ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر ہے۔ اس منظر میں انسان اپنی کثرت کے باوجود نہایت ہی چھوٹے اور حقیر نظر آتے ہیں۔ ان کو اس میں۔

كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ (۱۰۱ : ٤) بکھرے ہوئے پروانوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ اس طرح اڑتے ہیں' اس طرح بکھرے پڑے ہیں اور سب کے سب موت کی آغوش میں چلے گئے ہیں جس طرح پروانے اڑ اڑ کر چراغ پر مرتے اور جلتے ہیں اور پھر ادھر ادھر بکھرے پڑے ہوتے ہیں۔ اور اپنے اوپر کوئی قابو نہیں رکھتے۔ نہ ان کے نزدیک اس ہلاکت کا کوئی مقصد ہے' اور نہ وہ کوئی مقصد اپنے پیش نظر رکھتے ہیں اور نہایت ہی مضبوط اور اونچے پہاڑ اس طرح ہلکے اور اڑتے نظر آتے ہیں جس طرح دھنی ہوئی اون۔ جسے ہوا کے جھونکے ادھر سے ادھر اڑاتے پھرتے ہیں' یہاں تک کہ ایک سانس بھی ان کو اڑا لیتی ہے۔ معانی کی جو تصویر اس فریم میں سجائی گئی ہے۔ اسے القارعہ کا نام دینا نہایت ہی موزوں ہے۔ یہ لفظ اپنی سخت آواز' اپنے حروف کی سختی کی وجہ سے پہاڑوں اور انسانی دلوں کے کھٹکھٹانے کے مفہوم کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے اور انسانی قلب و شعور پر اس کے نہایت ہی اچھے اثرات پڑتے ہیں اور انسان آگے حساب و کتاب کے منظر کو دیکھنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

--- ooo---

درس نمبر۲۱۰ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۱۱

سُوْرَۃُ الْقَارِعَۃِ مَکِّیَّۃٌ (۱۰۱) (۳۰) اٰیَاتُهَا ۱۱ رُکُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْقَارِعَۃُ ﴿۱﴾ مَا الْقَارِعَۃُ ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَۃُ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے"۔ بات کا آغاز ایک منفرد لفظ سے ہوتا ہے القارعہ۔ گویا یہ ایک گولہ ہے جو آکر گرتا ہے اس کی کوئی صفت یا کوئی خبر سیاق کلام میں نہیں ہے۔ یہ اس لیے تاکہ یہ لفظ اپنی آواز' اپنے اثر اور اپنی شدت سے فضا میں ایک گونج پیدا کر دے' جس کا ایک طویل اشارہ ہے۔ اس کے فوراً بعد پھر ایک سوال آتا ہے:

مَا الْقَارِعَۃُ (۱۰۱:۲) "کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی؟" گویا وہ ایک نامعلوم' پوشیدہ اور خوفناک بات ہے جو کئی سوالات کو جنم دیتی ہے۔ اس کے بعد پھر ایک سوال کے ذریعہ پہلے سوال کا جواب دیا جاتا ہے کہ تم نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے؟

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَۃُ (۱۰۱:۳) "تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟" یہ اس قدر عظیم حادثہ ہوگا کہ تمہارے قیاس و ادراک کے دائرہ سے باہر ہے۔ تمہارا تصور اسے نہیں چھو سکتا۔

اب اس عظیم حادثہ کے کچھ واقعات بتا کر اس کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ اس کی تعریف اور حقیقت بیان نہیں کی جاتی۔ کیونکہ اس کی حقیقت کا ادراک ممکن ہی نہیں ہے جیسا کہ پہلے کہہ دیا گیا اور واقعات یہ ہیں:

یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ﴿۴﴾ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴿۵﴾

"وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کی طرح ہوں گے"۔

یہ تو تھا اس کھٹکھٹانے والی اور عظیم حادثے کا پہلا منظر۔ اس کو دیکھتے ہی دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اڑنے لگتا ہے' انسان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور وہ یوں محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس دنیا کی ہر وہ چیز جس کا سہارا وہ لے سکتا تھا' اڑی

اڑی سی جارہی ہے ۔ وہ ہوا میں اس طرح اڑتی ہے جس طرح ذرے اڑ رہے ہوتے ہیں اور اچانک آخری اور مکمل خاتمہ سامنے آجاتا ہے ۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۶﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ﴿۷﴾ وَ اَمَّا
۱ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ﴿۹﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ؕ﴿۱۰﴾ نَارٌ
۱۱ع حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾ؑ
۲۶

”پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے ' وہ دل پسند عیش میں ہو گا ' اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کی جائے قرار گہری کھائی ہوگی اور تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ“ ۔ ترازو کے پلڑوں کے بھاری ہونے اور خفیف ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ پیمانے جن کا اللہ کے ہاں اعتبار ہے اور وہ پیمانے جن کا اللہ کے ہاں کوئی وزن نہیں ہے ' یہ بات قرآن کریم کے مجموعی انداز بیان سے معلوم ہوتی ہے ۔ واللہ اعلم!

رہے وہ عقلی اور لفظی مباحث جو ان امور کے بارے میں مفسرین و متکلمین کرتے ہیں ۔ یہ قرآن کریم کے ساتھ ناانصافی ہے ۔ یہ مباحث وہی لوگ کرتے ہیں جو قرآن کریم کی حقیقی ترجیحات اور اہتمامات سے واقف نہیں ہوتے ۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ (۱۰۱ : ۶) ”پھر جس کی قدریں اہم ہوں گی“ اور اللہ کے ہاں وہ درست ہوں گی ۔

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۱۰۱ : ۷) ”وہ دل پسند عیش میں ہو گا“ ۔ اور اس عیش کی تفصیلات مجمل چھوڑ دی گئی ہیں ۔ یعنی ایسا عیش ہو گا جس پر وہ راضی ہو گا ' بہترین نعمت یہ ہے کہ کسی حالت پر انسان راضی ہو ۔

فَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (۱۰۱ : ۸) ”جس کے پیانے ہلکے ہوئے“ ۔ اللہ کے اعتبار اور معیار کے مطابق ۔

فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (۱۰۱ : ۹) ”تو اس کی ماں گہری کھائی ہے“ ۔ ماں دراصل بچے کی جائے پناہ ہوتی ہے ' تو ایسے لوگوں کی جائے پناہ جہنم کی گہری کھائی ہوگی اس لیے یہ ان کی ماں ہوئی ۔ کیا ہی خوب انداز تعبیر ہے جو موقع و مقام کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے ۔ یہاں عذاب کو مجمل رکھا گیا ہے تاکہ آیت مابعد میں اس کی وضاحت ایسے انداز میں کی جائے جو بہت ہی موثر ہو ۔

وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ (۱۰۱ : ۱۰) ”اور آپ کو کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے“ ۔ یہ قرآن کریم کا معروف انداز بیان ہے کہ کسی چیز کو ہولناک بتانے کے لیے یہ کہ دینا کہ تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا ہے ؟

اور پھر اس کے بعد ایک جواب آتا ہے اور یہ آخری لمحہ ہوتا ہے ۔

نَارٌ حَامِيَةٌ (۱۰۱ : ۱۱) ”یہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے“ ۔ اور جن لوگوں کے پیمانے ہلکے اور ناقابل اعتبار ہوئے ' یہ گرم آگ ان کی ماں ہوگی ۔ اس ماں کی جھولی میں وہ آرام کریں گے اور وہاں آرام و راحت پائیں گے یا تم سمجھ گئے کہ اس ماں کے ہاں وہ کیا آرام پائیں گے جو گہری کھائی ہے اور جس کے اندر گرم آگ ہے ۔ یہ اچانک طنزیہ انداز اس قدر حقیقی ہے اور اس قدر تلخ ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا ۔

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ التکاثر ۔ ۱۰۲

۱ --- تا --- ۸

درس نمبر۳۰۲ تشریح آیات

۱-- تا-- ۸

اس سورت کی چوٹ نہایت جلیل القدر' خوفناک اور گہرے اثرات کی حامل ہے ۔ اس طرح جس طرح کسی ایسے شخص کی آواز ہوتی ہے جو لوگوں کو خطرے سے آگاہ کرتا ہے اور اونچی جگہ پر کھڑا ہے ۔ اور اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخ رہا ہے اور وہ ایسے لوگوں کو خبردار کر رہا ہے جو سوئے ہوئے ہیں' غافل ہی نہیں بلکہ مدہوش ہیں اور گویا گہری نیند میں ہیں اور بغیر دیکھے آگے بڑھ رہے ہیں اور ایک گہری کھائی میں گرنے ہی والے ہیں ۔ ان کی آنکھیں بند ہیں' ان کے حواس معطل ہیں' اس لیے یہ خبردار کرنے والا اپنی پوری قوت سے چیلنج کر رہا ہے ۔

سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ (۱۶)
(۱۰۲) اٰیاتها ۸ — رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

"تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو" ۔

اے حالت مدہوشی میں سرپٹ دوڑنے والو' اے لاپرواہی کی حالت میں مال اور اولاد کی کثرت اور دنیا کے سازوسامان کی بہتات کے لیے جدوجہد کرنے والو' تم تو ان سب چیزوں کو اسی جہاں میں چھوڑ کر جانے والے ہو' اے دنیا کی مشغولیتوں میں دھوکہ کھانے والو' اے مال و اولاد کو چھوڑ کر جانے والو' ایک ایسے چھوٹے سے گڑھے' قبر میں جانے والو' قبر میں تو نہ مال ہوگا' نہ اولاد ہوگی اور نہ وہاں کوئی فخر ہوگا اور اظہار برتری ہوگا' جاگو' اور دیکھو' غور کرو ۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (۱) حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲ : ۲) "تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو" ۔ لیکن قبر کی سیر کے بعد وہاں تمہارے لیے ایک خوفناک منظر ہے' نہایت سخت اور زوردار انداز میں ان

کے دلوں کو یوں کھڑکھڑایا جاتا ہے۔

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝۳ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝۴

"ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا"۔ ان خوفناک الفاظ کو مکرر کہا جاتا ہے اور اس تکرار کے بعد جو بھاری بات آتی ہے اس کی وجہ سے یہ تاکید نہایت گہری اور خوفناک ہو جاتی ہے اور یہ لوگ اس ہولناک امر کی حقیقت کو نہیں جانتے کیونکہ یہ مدہوشی میں ہیں اور رات دن دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝۵

"ہرگز نہیں، اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا)"۔

اب اس خوفناک حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۝۶

"تم دوزخ دیکھ کر رہو گے"۔ اس کے بعد اس حقیقت کی تاکید کی جاتی تاکہ دلوں پر اس کا خوف طاری ہو۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۝۷

"پھر (سن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اسے دیکھ لو گے"۔ اور اب آخری ضرب ایسی سخت لگائی جاتی ہے کہ ایک غافل سے غافل انسان بھی بیدار ہو کر رہ جاتا ہے، چوکنا ہو جاتا ہے اور جو منہ کے رخ سرپٹ دوڑ رہا ہے وہ بھی ذرا رک کر اس طرف توجہ کرتا ہے اور بڑے سے بڑے مالدار کا عیش بھی مکدر ہو جاتا ہے، وہ کانپنے لگتا ہے اور اس کے دل پر ان نعمتوں کے حوالے سے خوف طاری ہو جاتا ہے۔

ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝۸ ع ۸

"پھر ضرور اس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی"۔ ۲۷

تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ نعمتیں تم نے کہاں سے حاصل کیں۔ کہاں ان کو خرچ کیا۔ کیا اللہ کی اطاعت کر کے حاصل کیا اور اللہ کی اطاعت میں خرچ کیا یا اللہ کی معصیت کر کے حاصل کیا اور معصیت میں خرچ کیا۔ حلال راستہ سے کمایا اور حلال راہ میں خرچ کیا یا حرام راستہ سے کمایا اور حرام میں خرچ کیا۔ کیا تم نے ان نعمتوں کا شکر ادا کیا؟ کیا ان کا حق ادا کیا۔ کیا اس میں دوسروں کو شریک کیا یا خود ہی استعمال کرتے رہے۔

یہ سوالات لازماً تم سے ہوں گے کہ یہ دولت کس طرح اکٹھی کی اور کس طرح تم نے اس پر تفاخر کیا۔ یہ دولت اور

یہ انعامات تمہیں اپنی مدہوشی اور غفلت کی وجہ سے ہلکی نظر آتی ہیں ۔ اور کھیل نظر آتی ہیں لیکن ان کے پیچھے تو ایک بھاری ذمہ داری ہے اور ایک سخت جوابدہی ہے ۔

یہ سورت 'نہایت ہی مختصر سورت اپنی تفسیر آپ ہے ۔ یہ انسانی احساس پر چھا جاتی ہے 'اسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور انسانی قلب و نظر اس کی گرفت میں بوجھل نظر آتے ہیں ۔ انسان یکلمہ دنیا کی حقیقت پاکر 'اس کی حقیر لذتوں اور کم قیمت ترجیحات کو چھوڑ کر فکر آخرت میں مشغول ہو جاتا ہے جبکہ عام لوگ جن کے دل ان حقائق اور اثرات سے فارغ ہوتے ہیں وہ ان حقیر چیزوں کے لیے سرمست رہے ہوتے ہیں ۔

یہ سورت اس دنیا کو اس طرح پیش کرتی ہے جس طرح ایک طویل فلم میں ایک سیکنڈ کی ایک جھلک ۔

اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ (۱) حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲ : ۱ ۔ ۲) "تم کو تکاثر کی دھن نے قبرستان پہنچایا" ۔ ان چند الفاظ میں پوری دنیاوی زندگی کی جھلک دکھا کر اسے لپیٹ لیا جاتا ہے ۔ پھر دائمی اور حیات جاوداں کی فلم چلتی ہے ۔ طویل زمانے میں اور مجرمین ابدالاباد تک بوجھ اٹھاتے پھریں گے ۔ یہ تصور نہایت ہی خوبصورت انداز تعبیر میں دیا جاتا ہے اور اصل حقیقت اور انداز بیان یکساں ہو جاتے ہیں ۔

ایک عظیم خوفناک اور گہرے معانی رکھنے والی سورت جو شخص بھی سمجھ کر پڑھے گا 'جس کے اثرات زمین سے طوفان کی شکل میں اٹھ کر فضاؤں میں جاکر دور بلند مطالع پر نمودار ہوتے ہیں 'جس کے معانی نہایت ٹھوس ہیں اور دل و دماغ کے سمندر میں نہایت ہی گہرائیوں میں جاکر قرار پکڑتے ہیں تو اس کا دل بوجھل ہو جاتا ہے ۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر زندگی کی ایک جھلک اور چمک 'اپنے نتائج و اثرات کے لحاظ سے کس قدر طویل ہے ۔ تو ہر باشعور شخص اخروی زندگی کی طویل تیاری کی راہ پر چل نکلتا ہے ۔ اور اس راہ میں پھر وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے حوالے سے بھی حساس ہو جاتا ہے ۔

--- ○○○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ العصر۔ ۱۰۳

۱-- تا -- ۳

درس نمبر ۳۰۳ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۳

یہ مختصر سورت جو صرف تین آیات پر مشتمل ہے' مکمل اسلامی نظام پیش کرتی ہے ۔ تمام انسانوں کے لیے اسلام کی نظام چاہتا ہے' یہ ایمانی تصور حیات کے نمایاں خدوخال کو نہایت اور دقیق شکل میں پیش کرتی ہے ۔ چند کلمات میں دستور حیات کو قلم بند کر دیا جاتا ہے ۔ امت مسلمہ کو بتا دیا جاتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے فرائض کیا ہیں اور یہ تمام صرف ایک آیت میں بتا دی گئی ہیں یعنی آیات تین ہیں ۔ یہ ہے قرآن مجید کا حقیقی اعجاز اور یہ اللہ ہی کی قدرت ہے جو ایسا کلام کر سکتی ہے ۔

سوال یہ ہے کہ وہ عظیم حقیقت کیا ہے جسے یہ سورت ریکارڈ کرتی ہے اور وہ دستور حیات کیا ہے؟ اور یہ دستور حیات پوری انسانیت کے لیے ہے اور یہ حقیقت تمام زمانوں میں یہی ہے کہ انسان کی کامیابی کا منہاج صرف ایک ہی ہے' ایک ہی راستہ نجات کا ہے جسے یہاں پیش کر دیا گیا ہے ۔ صحیح راستے کے نشانات وہی ہیں جو اس سورت نے قلم بند کر دیئے ہیں اور یہ کہ اس کے سوا جس قدر راستے اور طریقے ہیں وہ ٹیڑھے ہیں' تباہی کے ہیں ۔ فقط ایمان' عمل صالح' حق کی وصیت اور صبر کی تلقین کی راہ ہی درست راہ ہے ۔

آیاتها ۳　سُورَةُ الْعَصْرِ ۱۰۳　مَكِّيَّةٌ (۱۳)　رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ ۝١ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝٢ إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ
تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣

”زمانے کی قسم' انسان درحقیقت خسارے میں ہے' سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے' اور نیک اعمال کرتے رہے' اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے“۔

سوال یہ ہے کہ ایمان کیا چیز ہے؟ ۔۔ ہم یہاں ایمان کی فقہی تشریح و تعریف نہیں کرتے ۔ ہماری بات ایمان کے مزاج' اس کی قدروقیمت اور زندگی پر اس کے اثرات تک محدود ہے ۔

ایمان دراصل وہ رابطہ ہے جو یہ چھوٹی' محدود' انسانی مخلوق' اس حقیقت کے ساتھ قائم کر لیتی ہے جو ازلی' ابدی

اور باقی رہنے والی ہے اور جو اس کائنات کی اصل ہے اور جس سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ انسانی مخلوق اس حوالے سے اس کائنات کے ساتھ بھی مربوط ہو جاتی ہے کہ دونوں کا خالق ایک ہے' اور پھر یہ حضرت انسان ان قوانین قدرت سے بھی مربوط ہو جاتا ہے جن کے مطابق یہ جہاں چلتا ہے اور انسان ان قوتوں سے بھی مربوط ہو جاتا ہے جو اس کائنات میں عمل پیرا ہیں اور انسان اپنی حقیر اور محدود ذات کے خول سے باہر آکر کائنات کی وسعتوں میں داخل ہو جاتا ہے ۔ اس طرح وہ اپنی محدود قوت کی حدود سے نکل کر' ان "لامحدود قوتوں میں داخل ہو جاتا ہے' جو اس کائنات کے اندر پائی جاتی ہیں اور یہ کائنات انسان کے مقابلے میں اس قدر بڑی ہے کہ اس کی حدود ہی انسان کے علم سے باہر ہیں' پھر انسان اپنی محدود عمر کے دائرے سے نکل کر قیامت اور قیامت کے بعد آنے والے زمانوں کے لامحدود زمانوں میں داخل ہو جاتا ہے ۔

مخلوق انسانی کا یہ رابطہ جو قوت' جو وسعت' جو آزادی عطا کرتا ہے' اس کے ساتھ ساتھ' مزید اس کو یہ ذوق بھی عطا کرتا ہے کہ یہ انسان اس پوری کائنات اور اسکے اندر پائے جانے والے حسن و جمال سے بھی لطف اٹھا سکے ۔ اور ان مخلوقات کو بھی دیکھ سکے جو اس کی روح کے ساتھ محبت کرنے والی ہے ۔ اس رابطے کی وجہ سے زندگی کا مختصر سفر انسان کے لیے ایک تفریحی سفر بن جاتا ہے یا کسی نمائش کی ایک سیر بن جاتی ہے جو اللہ نے اس انسان کے لیے ہر مقام' ہر جگہ اور ہر زمانے میں سجا رکھی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت بڑی خوش قسمتی ہے' اعلیٰ درجے کی خوشی اور تفریح ہے اور اس پوری کائنات کے ساتھ ایک دوستی ہے' اور یہ وہ دولت ہے جس کے مقابلے میں کسی اور دولت کی کوئی قیمت نہیں ہے' یہ ایک ایسا نقصان بھی ہے کہ اگر کوئی اس سے محروم ہو جائے تو اس سے بڑا نقصان اور گھاٹا اور کوئی نہیں ہے ۔

پھر' ایمان کے بنیادی عناصر بھی وہ ہیں جو انسانیت کے بھی بنیادی عناصر ترکیبی ہیں :

(۱) ایک الہ کی بندگی سے انسان کو صرف ایک اللہ واحد کے علاوہ تمام اطاعتوں' بندگیوں اور پرستشوں سے نجات ملتی ہے ۔ یوں انسانوں کے اندر یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ تمام بندے ایک مقام رکھتے ہیں اور باہم مساوی ہیں ۔ لہٰذا یہ کوئی معقول رویہ نہیں ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی بندگی کرے یا ایک اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے اپنا سر جھکائے یہاں سے انسان کو آزادی کی حقیقی نعمت نصیب ہوتی ہے! یہ وہ آزادی ہوتی ہے جو انسانی ضمیر سے پھوٹتی ہے اور اس تصور سے پھوٹتی ہے جو بطور حقیقت واقعیہ موجود ہو اور وہ تصور یہ ہے کہ اس کائنات میں صرف ایک حقیقی قوت ہے اور ایک ہی حقیقی معبود ہے ۔ چنانچہ اس تصور حیات و تصور کائنات کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ انسان آزاد ہو اور اس عقیدے کا منطقی نتیجہ بھی یہی ہے کہ انسان آزاد ہو۔

(۲) انسان میں ربانیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے تمام تصورات' اپنی تمام قدریں اور پیمانے اپنی تمام ترجیحات' اپنا تمام دستور اور قانون اللہ سے اخذ کرتا ہے ۔ اور اس کے روابط اللہ سے' اس کائنات سے' اور لوگوں سے' اللہ کے احکام و قوانین کے مطابق قائم ہوتے ہیں ۔ اس کی زندگی سے اس کی ذاتی خواہش اور اس کی ذاتی مصلحتیں معدوم ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ اللہ کی شریعت اور عدل لے لیتا ہے ۔ مومن کے شعور میں اس کے نظام زندگی کی قدر و قیمت بلند ہو جاتی ہے' اس کی شخصیت جاہلیت کے تصورات اور اقدار سے بلند ہو جاتی ہے ۔ جاہلی ترجیحات ختم ہو جاتی ہیں اور وہ تمام رابطے ختم ہو جاتے ہیں جو زمین اور اس دنیا اور مادی تصورات

پر مبنی ہوں۔ اگرچہ یہ انسان ایک فرد ہو' اس لیے کہ ایک مومن فرد بھی اپنے تصورات 'اپنی قدریں اور اپنی ترجیحات براہ راست اللہ سے لیتا ہے 'کیونکہ یہ قدریں ہی زیادہ برتر' زیادہ محترم اور زیادہ انتفاع اور قابل لحاظ ہوتی ہیں۔

(۳) ایمان کے نتیجے میں خالق و مخلوق کے تعلق کا بھی تعین ہو جاتا ہے۔ الوہیت اور بندگی' خدائی اور عبودیت کے مقام کا بھی تعین ہو جاتا ہے اور یہ تعلق صاف و ستھرا ہو کر سامنے آتا ہے۔ یہ تعلق جو ایک فانی انسان کو ایک لافانی ذات سے جوڑتا ہے۔ بڑی سادگی اور قابل فہم انداز میں متعین اور واضح ہو جاتا ہے اور اس راہ میں انسان کو کسی واسطے کی ضرورت نہیں رہتی۔ تعین مراتب سے دل میں نور اور روح میں اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ نفس انسانی میں محبت اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ تردد' خوف 'قلق' اضطراب ختم ہو جاتے ہیں۔ مراتب کی اس وضاحت سے انسان ناحق استکبار بھی نہیں کرتا اور نہ افترا پردازیاں کر کے 'من گھڑت تصورات کے بل بوتے پر دوسرے انسانوں پر اپنے لیے برتر مقام کا دعویٰ کرتا ہے۔

(۴) ایمان کی وجہ سے اہل ایمان کو اسلامی نظام حیات پر استقامت نصیب ہوتی ہے۔ پس مومنین کے ہاں بھلائی کوئی عارضی امر نہیں ہوتا نہ کوئی اتفاقی منفرد حادثہ ہوتا ہے ' بلکہ اسلامی نظام ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جس کے حقیقی اسباب ہوتے ہیں اور اس کے کچھ حقیقی مقاصد ہوتے ہیں اور اسلامی نظام کو چلانے والے باہم فی اللہ مربوط لوگ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں سے ایک سلیم جماعت تشکیل پاتی ہے 'جس کا ایک ہی مقصد ہے 'ایک ہی ممتاز جھنڈا ہوتا ہے۔ یہ جماعت ایک تاریخی جماعت ہوتی ہے اور اس کی گزشتہ رفتہ نسلیں بھی آنے والی نسلوں سے مربوط ہوتی ہیں اور آنے والی نسلیں ماضی سے مربوط ہوتی ہیں۔ اور یہ تعلق ایک مضبوط تعلق ہوتا ہے۔

(۵) اس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ انسان نہایت مکرم ہے۔ انسان خود اپنی نظروں میں بلند ہو جاتا ہے اور مومن کے ضمیر میں یہ حیا جاگزیں ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس کے نتیجے میں وہ اس مرتبے سے گر جائے 'جس کی طرف اللہ نے اسے اٹھایا ہے اور یہ وہ اعلیٰ و ارفع مقام ہے جس تک پہنچنے کا کوئی انسان تصور نہیں کر سکتا ہے کہ وہ اللہ کے ہاں معزز ہے۔ ہر وہ مذہب یا فلسفیانہ تصور جو انسان کو خود اپنی نظر میں گراتا ہے اور اس کو ایک حقیر مخلوق قرار دیتا ہے جو معتبر انداز میں بعد پیدا ہوئی۔ وہ دراصل انسان اور عالم بالا میں دوری پیدا کرتا ہے اور اس قسم کا مذہب یا فلسفہ انسان کو گراتا ہے اور اس کو گراوٹ کی طرف لے جاتا ہے۔ اگرچہ وہ اسے یہ بات بصراحت نہ کہے۔

چنانچہ ڈارون اور فرائیڈ کے فلسفے اور مارکسی نظام وہ بدترین فلسفے اور نظام تھے جنہوں نے انسان کو بدترین مصیبت میں مبتلا کیا اور اسے انسانیت 'فطرت اور انسانی لحاظ سے غلط رخ دیا اور اسے یہ باور کرایا کہ ہر گراوٹ ' ہر گندگی اور ہر حقارت دراصل انسانی زندگی کا طبعی اور لازمی حصہ ہے۔ یہ کوئی قابل تعجب بات ہی نہیں ہے ' لہٰذا اس میں شرمندہ ہونے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ چنانچہ یہ فلسفے اور یہ نظام دراصل انسانیت کے خلاف ایک گھناؤنا جرم ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان سے نفرت کی جائے۔ (سید کی روح کیا آپ کو یہ اطلاع مل چکی

ہے کہ مارکسیت کے تمام بت اشتراکی دنیا سے گرادیئے گئے ہیں)۔

(۶) فقط یہ تصور کہ انسان اللہ کے نزدیک ایک مکرم مخلوق ہے ' انسانی شعور کو پاک و صاف کر دیتا ہے ' پھر یہ تصور کہ اللہ سب کا نگران ہے اور وہ علیم بذات الصدور ہے ۔ اس سے بھی انسانی شعور صاف ہوتا ہے ' ایک سلیم الفطرت انسان جس کی فطرت کو کارل مارکس ' فرائیڈ جیسے لوگوں کی تحریروں نے مسخ نہ کر دیا ہو ' وہ اس بات سے حیا کرتا ہے کہ اس جیسا دوسرا انسان اس کے دل کے رازوں اور اس کے برے خیالات پر مطلع ہو ۔ اور ایک سچا مومن جو یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے سینے کے تمام رازوں اور دفینوں سے اللہ باخبر ہے ۔ وہ اس تصور سے کانپ اٹھتا ہے کہ اس کے دل میں یہ یہ خیالات ہیں ۔ اس سے وہ اپنے شعور ' احساسات چھوڑتا ہے اور دل کو بھی صاف کرتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان پیدا ہوتے ہی انسان کے اندر ایک اخلاق حسن پیدا ہو جاتی ہے وہ ایمان رکھتا ہے کہ ایک الله ہے جو عادل ' رحیم کریم اور درگزر کرنے والا ہے ۔ حلیم ہے اور محبت کرنے والا ہے ' وہ شر کو پسند نہیں کرتا ' خیر کو پسند کرتا ہے ۔ وہ آنکھوں کے خائن کو بھی جانتا ہے اور دلوں کے بھیدوں کا جاننے والا ہے ۔

(۷) پھر یہ تصور کہ انسان کو ارادے کی آزادی دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ کی جانب سے اس کی مکمل نگرانی ہو رہی ہے ' اور اس کے نتیجے میں ایک کے اندر احساس اور بیداری پیدا ہو جاتی ہے اور جو سمجھ داری اور تدبر پیدا ہوتا ہے اس کے نتیجہ میں انسان اپنے آپ کو ایک ذمہ دار مخلوق تصور کرتا ہے ۔ اور یہ ذمہ داری فقط انفرادی ذمہ داری نہیں ہے ۔ یہ ایک اجتماعی ذمہ داری ہے اور ہر بھلائی کا یہ حق ہے کہ اس کے حوالے سے انسان ایک ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرے اور دوسرے انسانوں کے حوالے سے بھی ذمہ داری کا احساس کرے ۔ اور یہ ذمہ داری اللہ کے سامنے ہے ۔ اس لیے جب ایک مومن کوئی بھی حرکت کرتا ہے تو اس کا احساس و شعور یہی ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملے اور ہر قدم پر اپنے دل میں سوچتا ہے اور قدم اٹھانے سے پہلے ہی نتائج پر غور کر لیتا ہے ۔ اس لیے کہ اس تصور کے مطابق انسان ایک ایسی مخلوق ہے جسے اس دنیا میں ایک پوزیشن حاصل ہے ۔ اس لیے اس کائنات کے نظام میں وہ ایک ذمہ دار مخلوق ہے ۔

(۸) ایمان کے آثار میں سے ایک اہم اثر یہ ہے کہ ایک مومن دنیا کے مفادات پر اس طرح نہیں ٹوٹ پڑتا جس طرح کتے ہڈیوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں ۔ ایمان کے اشارات و اثرات میں سے ایک اشارہ اور اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کو اختیار کرتا ہے جو اللہ کے نزدیک اعلیٰ مقصدیت رکھتی ہو ' اور جو "خیر" ہو اور باقی رہنے والی ہو ۔

وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳ : ۲۶) "مقابلے کرنے والے لوگ مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو بھلائی میں مقابلہ کریں" ۔ اللہ کے ہاں جو انعامات ہیں ان میں باہم مقابلہ انسان کو اس دنیا سے بلند کرتا ہے ' اس کے قلب کی تطہیر کرتا ہے اور انسان صاف و ستھرا ہو جاتا ہے ۔ نیز اس سے ایک مومن کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے ۔ وہ دنیا کی سرحدوں سے نکل کر آخرت میں بھی سرگرم ہوتا ہے ۔ زمین کے ساتھ ساتھ وہ عالم بالا میں بھی جولانی دکھاتا ہے اور یہی بات اس کے اندر یہ قوت پیدا کرتی ہے کہ وہ نتائج کی پرواہ کیے بغیر نیکی کرتا چلا جائے یا نتائج کے بارے میں عجلت

نہ کرے ' اس لیے کہ وہ بھلائی اس لیے چاہتا ہے کہ وہ بھلائی ہے اور اس لیے کہ اللہ کی مرضی اسی طرح ہے ' یہ اس کی ذمہ داری نہیں ہے کہ اس چھوٹی سی محدود عمر میں بھلائی کے نتائج بھی نکلیں ۔ اس لیے کہ جس اللہ کے لیے یہ بھلائی کی جارہی ہے وہ زندہ ہے ' وہ مرتا نہیں ہے ۔ وہ بھولتا نہیں ' وہ کسی چیز سے غافل نہیں ۔ پھر یہ دنیا حقیقی دار الجزاء بھی نہیں ہے اور تمام حسابات اس جہاں ہی میں چکنے والے نہیں ۔ لہٰذا مومن خیر کو جاری رکھنے کے لیے اس سرچشمے سے مدد لیتا ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ خیر کی تحریک جاری رہتی ہے ۔ یہ کوئی وقتی جوش نہیں ہوتا اور نہ کوئی انفرادی واقعہ ہوتا ہے ۔ یہی ایمانی جذبہ ہے جس کی وجہ سے 'ایک مومن کے اندر اس قدر قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے رشتہ کے مقابلے میں کھڑا ہو جاتا ہے ' چاہے یہ شر کسی ایک ڈکٹیٹر اور سرکش کی صورت میں ہو یا جاہلی تصورات و ترجیحات کے دباؤ کی شکل میں ہو ' یا انسان کی خواہشات نفس کی صورت میں ہو ۔ یہ انفرادی دباؤ کسی فرد پر یوں پڑتا ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ دنیا مختصر ہے ' عمر قلیل ہے اور اس میں عیش و عشرت کر لینا چاہئے ۔

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

یا یہ اس قدر مختصر ہے کہ اس میں نیکی کے نتائج نہیں نکل سکتے ۔ اور ہمارے لیے یہ چانس نظر نہیں آتا کہ ہم باطل پر 'حق کا غلبہ دیکھ سکیں ۔ اس لیے ایمان اس صورت حالات کا علاج کرتا ہے اور بنیادی علاج ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان ہی زندگی کی اساس ہے ' زندگی کی جڑ ہے اور اس سے بھلائی کی تمام شاخیں پھوٹتی ہیں اور اس کا ہر پھل انہی جڑوں سے متعلق ہوتا ہے ۔ اور اگر ایمان نہیں ہے تو گویا درخت کی جڑ کٹ گئی ہے اور اس کی تمام شاخیں مرجھا کر خشک ہو جائیں گی اور اگر وہ خشک نہ ہوں تو پھر وہ شیطانی پھل ہو گا اور اس کو دوام اور فروغ حاصل نہ ہو گا ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان وہ مرکز اور محور ہے جس کے ساتھ اعلیٰ زندگی کی تمام تاریں مربوط ہیں اور اگر ایمان نہیں ہے تو زندگی ایک غیر مربوط حرکت ہے اور ایمان کے بغیر اس زندگی کو کوئی ثبات و قرار نہیں ہے ۔ خواہشات اور میلانات جدھر جائیں 'کسی کو کھینچ لے جائیں ۔

ایمان دراصل ایک نظام ہے اور اس کی وجہ سے تمام متفرق اعمال ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے یہ اعمال باہم ہم آہنگ ہو جاتے ہیں ۔ ایک سمت میں ہو جاتے ہیں ۔ ایک ہی حرکت ' ایک ہی محرک ' اور ایک ہی ہدف رکھتے ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ہر اس عمل کو کالعدم قرار دیتا ہے جو اس اصل پر مبنی نہ ہو ۔ جو اس محور کے گرد نہ گھومتا ہو اور جو سرچشمہ ایمان سے نہ پھوٹتا ہو ۔ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام عقائد اس معاملہ میں بالکل اوپن اور صریح ہے ۔ سورہ ابراہیم میں ہے ۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ (۱۴ : ۱۸) "جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ان کے اعمال کی مثال راکھ کی طرح ہے کہ تیز و تند آندھی ایک طوفانی دن میں اسے اڑائے پھرے ۔ جو اعمال بھی انہوں نے کئے

تھے ان میں سے وہ کچھ بھی نہ پا سکیں گے"۔ اور سورہ نور میں ہے ۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا (۲۴ : ۳۹) "جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے چٹیل میدان میں سراب 'پیاسا اسے پانی خیال کرے لیکن جب اس کے پاس پہنچے تو وہاں کچھ نہ پائے"۔ یہ نصوص بصراحت بتا رہی ہیں کہ اعمال جب تک ایمان پر مبنی نہ ہوں' اسلام میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے ۔ اعمال کی تہہ میں جذبہ یہ ہونا چاہئے کہ خالق کائنات نے یہ حکم دیا ہے اور ان کا مقصد اس کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہئے ۔ اور یہ منطقی نتیجہ ہے اس عقیدے کا جو تمام امور کو اللہ کی طرف لوٹاتا ہے اس لیے جس عمل کا تعلق ایمان سے کٹ گیا وہ اپنا مفہوم اور قیمت کھو بیٹھا۔[1]

ایمان اس بات کی دلیل ہے کہ صاحب ایمان کی فطرت درست ہے اور اس کی شخصیت کی ساخت صحیح سالم ہے اور وہ اس پوری کائنات کے ساتھ ہمقدم ہے ۔ اور وہ اپنے ماحول میں پائے جانے والی فطرت کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ اس لیے وہ اس کائنات میں زندہ رہ رہا ہے ۔ اور جس مومن کی شخصیت صحیح سالم ہوتی ہے اس کے اور اس کائنات کے درمیان ایک توافق ہوتا ہے اور یہ توافق اور یہ اتحاد صرف ایمان کا ثمرہ ہوتا ہے کیونکہ اس کائنات میں ایسے دلائل و اشارات موجود ہیں' جو یہ بتاتے ہیں کہ ایک ہی دست قدرت صانع کائنات ہے اس لیے انسان اور کائنات کے درمیان سے یہ توافق ختم ہو جائے تو یہ بات اس پر دلیل ہوگی کہ اس انسان کی شخصیت میں خلل آگیا ہے اور انسان کی وہ صلاحیت ختم ہوگئی ہے ۔ جس کی وجہ سے وہ اس کائنات سے دلائل و اشارات اخذ کرتا ہے اور اس فساد کی وجہ سے انسان گھاٹے ہی میں رہے گا ۔ اگرچہ بظاہر کچھ اعمال نیکی کی چھاپ والے معلوم ہوتے ہیں لیکن ایمان نہ ہونے کی وجہ سے یہ اعمال ناقابل قبول ہوں گے ۔۔ غرض مومن کی دنیا وسیع' جامع' لمبی' بلند' خوبصورت اور کامیاب ہوتی ہے ۔ جس کے مقابلے میں ان لوگوں کی دنیا جو مومن نہیں ہیں' چھوٹی' حقیر' گری ہوئی' کمزور اور نامراد اور بدبختی پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ اور انجام خسران اور نامرادی ہوتا ہے ۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۱۰۳ : ۳) "اور نیک اعمال کرتے رہے"۔ نیک عمل درحقیقت ایمان کا قدرتی پھل ہوتا ہے اور جب ایمان کسی قلب میں جاگزیں ہوتا ہے تو عمل صالح اس کی ذاتی حرکت ہوتی ہے (جس طرح

(۱) استاد محمد عبدہ' نے آیت فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (۷) وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹ : ۸) "جو ذرہ برابر نیکی کرے گا' اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا اسے دیکھ لے گا" کے تحت لکھا ہے کہ "بعض علما نے اس پر اجماع لکھا ہے کہ کافر کو اس کی کوئی نیکی قیامت میں نفع نہ دے گی اور اس کے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی' لیکن یہ ایک بے بنیاد بات ہے"۔ ہم سمجھتے ہیں یہ مسئلہ اجماع کا نہیں قرآن کی صریح نصوص کا ہے اور قرآن و سنت اس معاملہ میں بالکل واضح ہیں ۔ (سید قطب)

دل متحرک ہوتا ہے) لہٰذا ایمان ایک متحرک اور مثبت حرکت کا نام ہے جونہی وہ کسی شخصیت میں بیٹھتا ہے تو وہ عمل صالح کی شکل میں نمو دار ہوتا ہے ۔ اسلامی نقطہ نظر سے ایمان ایسا ہی ہوتا ہے ۔ اسلام میں کسی ایسے ایمان کا تصور نہیں ہے ۔ جو بجھا ہوا ہو اور جس کے نتیجے میں کوئی حرکت نہ پیدا ہوتی ہو' جو پوشیدہ ہو اور زندہ شکل میں مومن کی ذات سے باہر نہ آتا ہو' اگر اس کے اندر اس قسم کی طبعی حرکت نہ ہو تو وہ ایمان کھوٹا اور مردہ ایمان ہے' ایمان تو ایک پھول ہے جس کی خوشبو کو روکا نہیں جا سکتا ۔ جہاں پھول ہو گا' اس سے خوشبو پھوٹتی رہے گی ۔ اور اگر کسی شخص میں ایمان کی بو نہیں ہے تو گویا وہ موجود ہی نہیں ہے ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان حرکت 'عمل اور تعمیر کا نام ہے ۔ اور یہ سب امور اللہ کی طرف سے متوجہ ہوتے ہیں ۔ ایمان میں سکیڑ نہیں ہے' نہ وہ منفی چیز ہے ۔ نہ وہ ضمیر کی تہوں میں جاگزیں ہوتا ہے ۔ نہ ایمان نیک خواہشات کا نام ہے ۔ جن کی پشت پر کوئی حرکت نہ ہو' یہ اسلام کا کھلا مزاج ہے جو اسلام کو ایک اعلیٰ تعمیری ذات بنا دیتا ہے اور یہ قوت عملی زندگی کے اندر کی مرکزی قوت محرکہ ہوتی ہے ۔

یہ ہے مفہوم اس بات کا کہ ایمان کو اسلامی نظام حیات کے ساتھ متعلق ہونا چاہئے' اسلامی نظام حیات چونکہ ایک مسلسل حرکت کا نام ہے' جو اس پوری کائنات میں چل رہی ہے' اور یہ حرکت ایک قوت مدبرہ نے پیدا کی ہے اور اس کا ایک ہدف ہے اور انسانیت کی قیادت ایمان کے ہاتھ میں دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی قیادت وجود میں لائی جائے جو حرکت کا ایک ایسا منہاج وجود میں لائے جو اس پوری کائنات کے مزاج کے مطابق ہو' بالفاظ دیگر ایک اچھی' پاک تعمیری جدوجہد کو برپا کرنا جو اللہ کی طرف سے آئے ہوئے نظام زندگی کے شایان شان ہو ۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳ : ۳) "جو ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہتے ہیں" ۔ حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کے اعمال میں سے امت مسلمہ کے خدوخال اچھی طرح واضح ہوتے ہیں ۔ امت مسلمہ ہی کے خطوط پر جماعت مسلمہ بھی قائم ہوتی ہے ۔ اس کا ایک خاص وجود اور شخصیت ہوتی ہے ۔ اس کے افراد کے درمیان ایک امتیازی رابطہ ہوتا ہے ۔ تمام لوگوں کی سمت ایک ہوتی ہے' اس امت یا جماعت کو اپنے وجود کا شعور بھی ہوتا ہے' اور اس کے جو فرائض ہیں وہ بھی اس کے پیش نظر ہوتے ہیں' اور یہ امت یہ جانتی ہے کہ اس نے ایمان اور عمل صالح کے حوالے سے کیا کچھ کرنا ہے؟ اور وہ جانتی ہے کہ ایمان و عمل صالح کے زاویہ سے اس نے پوری انسانیت کی قیادت بھی کرنی ہے' لہٰذا ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے امانت کبریٰ کو لے کر اٹھنا ہے ۔

غرض لفظ "تواصی" اور اس کے اس مفہوم' اس کے مزاج اور حقیقت ہی میں سے امت مسلمہ کا وجود نمو دار ہوتا ہے' یا ایک باہم متحد جماعت کا تصور ابھرتا ہے ۔ یعنی ایسی امت جو ممتاز ہو' جو دانش مند ہو' جو اس کرۂ ارض پر سچائی' بھلائی اور عدل و انصاف کے قائم کرنے کی ذمہ دار ہو ۔ یوں امت مسلمہ کی یہ نہایت ہی اعلیٰ اور خوبصورت تصویر ہے ۔ اسلام اس طرح کی امت چاہتا ہے' ایک ممتاز' قوی' دانش مند اور حق اور بھلائی کی نگرانی کرنے والی امت ۔ جس کے افراد ایک دوسرے کو ہروقت حق کی نصیحت کرتے ہوں اور صبر کی تلقین کرتے ہوں ۔ باہم محبت اور تعاون سے زندگی بسر کرتے ہوں' ان کے درمیان ایک خصوصی اخوت کارفرما ہو ۔ جسے قرآن مجید وصیت سے تعبیر کرتا ہے ۔

حق کی تلقین اس لیے ضروری ہے کہ حق کو لے کر چلنا ایک دشوار کام ہے 'اس دنیا میں بے شمار ایسے عوامل ہیں جو انسان کو سچائی کی راہ سے دور لے جاتے ہیں۔ خواہشات نفسانیہ 'مصلحتیں ' قومی اور خاندانی تصورات ' سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کے مظالم ' ظالموں کے ظلم ' حد سے گزرنے والوں کے تجاوز اور تعدیاں وغیرہ۔ ایک دوسرے کو نصیحت کرنے سے دراصل یاددہانی ہوجاتی ہے۔ انسان کے حوصلے بڑھتے ہیں اور اغراض و مقاصد کے لحاظ سے افراد جماعت کے درمیان اتحاد اور یگانگت پیدا ہوتی ہے۔ اور ذمہ داریاں اٹھانے میں دراصل ایک دوسرے کا بوجھ اٹھایا جاتا ہے۔ نصیحت سے تمام انفرادی رجحانات اکٹھے ہوکر کئی گنا ہوجاتے ہیں اور وہ تمام لوگ جو سچائی کے نگران اور حامی ہوتے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ حق اور صداقت کی حفاظت کے کام میں میرے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔ جو اس کو نصیحت کرتے ہیں' اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس سے محبت کرتے ہیں' اس کی پشت پر کھڑے ہیں۔ اور یہ بھی اسے شرمندہ ہونے نہ دیں گے۔ یہ دین ہی دراصل حق ہے اور اس دین کی حفاظت ایک جماعت ہی کر سکتی ہے۔ جو باہم متعارف ہو' باہم کفیل ہو' اور ایک دوسرے کی معاون ہو اور ایک دوسرے کی کمزوریاں پوری کرنے والی ہو۔

اور صبر کی تلقین بھی بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ ایمان وعمل صالح پر گامزن رہنا اور حق و انصاف کی نگرانی کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اس میں صبر اور مصابرت اور نفس کے اندر کے عوامل کے خلاف سخت جہاد کی ضرورت ہے اور نفس سے باہر کے عوامل کے خلاف جہاد کی بھی ضرورت ہے اور اس راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر و مشقت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح باطل کے استکبار اور فخر پر صبر کرنا' راستے کی طوالت پر صبر کرنا اور کامیابی کی سست روی پر صبر کرنا اور راستے کے نشانات کا ناپید ہونا اور مٹ جانا اور ان پر صبر کرنا۔

صبر کی تلقین سے انسانی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور لوگوں کے اندر ایک اجتماعی احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہم سب کا ہدف واحد ہے' رخ ایک طرف ہے' اس طرح اس سے سب کو ایک سہارا ملتا ہے۔ کارکن اس راہ میں کام کرتے ہوئے باہم شیروشکر ہوجاتے ہیں اور نہایت عزم' ثابت قدمی اور اپنے مقصد پر اصرار کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ نیز اس سے کئی اور اجتماعی صفات بھی پیدا ہوتی ہیں اور یہ کئی اسلامی جماعت کے استحکام کے لیے ضروری ہیں کیونکہ اسلام جماعتی فضا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسلام کا ظہور بھی ایک سوسائٹی کی شکل میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی سوسائٹی ہی نہیں ہے تو اسلام نہ ہوگا اور یہ سراسر خسارہ ہوگا۔

قرآن نے ہمارے لیے جو دستور وضع کیا اور جس کے مطابق کسی سوسائٹی کو ایک کامیاب اور خسران دنیوی اور اخروی سے محفوظ قرار دیا ہے۔ اگر ہم اس دستور کی عینک لگاکر اس وقت دنیا کے حالات کا جائزہ لیں تو ہمارے سامنے دنیا کی یہ خوفناک تصویر آئے گی کہ اس وقت پوری دنیا مکمل خسارے سے دوچار ہے۔ اس خسارے کا زیادہ خوفناک پہلو یہ ہے کہ آخرت سے بھی پہلے ہم محض دنیاوی نقطہ نظر سے بھی سخت خسارے میں پڑچکے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت نے اس بھلائی سے مکمل روگردانی اختیار کرلی ہے' جس کے فیوض و برکات اللہ نے انسانوں کے لیے عام کردیئے تھے۔ نیز اس دنیا سے وہ اقتدار اعلیٰ ختم ہوچکا ہے جو ایمانی اور اسلامی ہو' جو بھلائی اور حق و انصاف کے اصول پر قائم ہو۔ اس تصویر کا نہایت ہی بھدا پہلو یہ ہے کہ مسلمان یا زیادہ صحیح الفاظ میں وہ لوگ جو اس زمین پر بسنے والے دوسرے انسانوں کے مقابلے میں' اس بھلائی اور خیر سے بہت دور پڑگئے ہیں' وہ اس نظام زندگی سے بہت دور ہوگئے جو اللہ نے ان کے

لیے پسند فرمایا تھا۔ انہوں نے اس آئین و دستور کو پامال کر دیا جو اللہ نے ان کے لیے تجویز کیا تھا۔ جسے اللہ نے خسارے اور ناکامی سے نجات پانے کا واحد راستہ قرار دیا تھا۔ خصوصاً وہ علاقے جہاں سے اس بھلائی کے جھنڈے سب سے پہلے بلند ہوئے تھے۔ انہوں نے خود ان جھنڈوں کو گرا دیا ہے، جو ان کے لیے اللہ نے بلند کیے تھے۔ یہ تھے ایمان کے جھنڈے۔ اور نہایت بدقسمتی یہ ہے کہ جن علاقوں سے اللہ کے دین کے یہ جھنڈے بلند ہوئے تھے انہوں نے نسلی قومیت کو اپنا لیا ہے حالانکہ اس زمین کی تاریخ شاہد ہے کہ نسلی قومیت کے ذریعہ کبھی بھلائی تک کوئی قوم نہیں پہنچ سکی۔ ان لوگوں نے جس نسلی قومیت (عرب نیشنلزم) کے جھنڈے بلند کر رکھے ہیں۔ یہ قومیت اس کے پاس اسلام سے پہلے بھی تھی، لیکن اس کی وجہ سے نہ اس زمین پر انہوں نے کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام دیا اور نہ آسمان میں ان کا کوئی کارنامہ ریکارڈ ہوا، جب اسلام آیا تو عربوں کے ذریعہ اس نے ایک ایسا جھنڈا بلند کیا جو صرف اللہ کا جھنڈا تھا، اس میں کوئی اور عنصر شریک نہ تھا، یہ اللہ کے نام سے تھا، نام میں بھی کوئی شریک نہ تھا، یہ صرف اللہ کی طرف منسوب تھا، جس میں کوئی اور نسبت نہ تھی، صرف اللہ کا رنگ تھا، کوئی اور رنگ نہ تھا۔ اس جھنڈے کے زیر سایہ عربوں کو عروج نصیب ہوا۔ وہ دنیا کے قائد بن گئے۔ اور ان کی قیادت بھلائی کی قیادت تھی۔ ایک قوی قیادت تھی، دانشمند قیادت تھی اور ہر پہلو سے کامیاب قیادت تھی۔ یہ قیامت عربوں کی تاریخ میں بھی پہلی بار کامیاب ہوئی اور انسانی تاریخ میں بھی اسلامی انقلاب انسانیت کے لیے ایک نمایاں کامیابی تھی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی مشہور کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے فصل "اسلامی اقتدار اور مسلمان قائدین" میں فرماتے ہیں:

"مسلمان میدان میں آئے، دنیا کی رہنمائی کی باگ انہوں نے اپنے ہاتھ میں لی اور ان بیمار قوموں کو رہنمائی کے اس منصب سے معزول کیا جس پر وہ قابض ہو گئی تھیں اور جس کو انہوں نے کبھی صحیح طور پر استعمال نہ کیا تھا۔ مسلمانوں نے پوری دنیا کے انسانوں کو اپنے ساتھ لیا اور متوازن اور صحیح رفتار سے اپنی صحیح منزل کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ ان میں وہ تمام خصوصیات جمع تھیں، جو ان کو تمام اقوام کی رہنمائی کے منصب جلیل کا اہل ثابت کرتی تھیں اور ان کی نگرانی اور قیادت میں قوموں کی فلاح اور سعادت کی ضمانت دیتی تھیں۔ یہ امتیازی خصوصیات کیا تھیں وہ یہ ہیں:

(۱) ان کے پاس آسمانی کتاب اور خدا کی شریعت تھی، وہ اپنی جانب سے قانون سازی اور شریعت سازی نہ کرتے تھے، اس لیے کہ انسانی قانون سازی جاہلیت، ظلم اور غلطیوں کا سرچشمہ ہوتی ہے اور جب انسان انسانوں کے لیے قانون بناتے ہیں تو ہر روز ان میں ردوبدل اور ترمیم ہوتی رہتی ہے جبکہ آسمانی کتابیں ان غلطیوں سے محفوظ ہوتی ہیں۔ مسلمان اپنے روز مرہ کے معاملات اور سیاست اور سیادت میں اندھا دھند چلنے اور اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے سے محفوظ تھے۔ ان کے پاس وحی الٰہی کی روشنی تھی جس کے سہارے وہ چلتے تھے۔ اور جس سے زندگی کی تمام راہیں اور موڑ ان کے لیے روشن تھے۔ ان کا ہر قدم روشنی میں پڑتا تھا۔ اور ان کو اپنی منزل مقصود صاف نظر آتی تھی۔ سورہ انعام (۱۲۲) میں ہے۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِيْ

الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (٦ : ١٢٢) "کیا وہ جو پہلے مردہ تھا' پھر ہم نے اس میں جان ڈالی اور اس کو ایک روشنی عطا فرمائی جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے' کیا وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہے کہ اندھیرے میں گھرا ہوا ہے' وہاں سے نکل نہیں سکتا۔

ان کے پاس ایک خدائی قانون اور شریعت تھی جس کے مطابق وہ لوگوں کے درمیان فیصلے کرتے تھے۔ وہ حق و انصاف کے علم بردار بنائے گئے تھے اور ان کو سخت سے سخت اشتعال اور برہمی اور عداوت' اور نفرت کی حالت میں بھی یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سچائی اور انصاف کا دامن نہ چھوڑیں اور یہ نہ ہو کہ وہ حق و انصاف کے معاملے میں انتقام لیں۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (٥ : ٨) "اے ایمان والو' ہر وقت انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لیے تیار رہو' اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں مجبور نہ کر دے کہ تم انصاف کو چھوڑ دو' عدل کرو' یہ بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ کو ان باتوں کا علم ہے جو تم کرتے ہو"۔

(۲) وہ حکومت اور قیادت کے منصب پر مستحکم اخلاقی تربیت اور تہذیب نفس کے بعد فائز ہوئے تھے۔ انہوں نے دنیا کی عام حکمران قوموں اور اہل حکومت کی طرح اپنے تمام اخلاقی عیوب اور نقائص کے ساتھ' پستی سے بلندی کی طرف جست نہیں لگائی تھی' بلکہ ایک طویل عرصہ تک وحی الٰہی ان کی اصلاح و تربیت کرتی رہتی تھی اور سالہا سال وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل نگرانی اور تعلیم میں رہے تھے۔ آپ ان کا تزکیہ فرماتے رہے' ان کی مکمل تربیت فرمائی۔ زہد و ورع کی زندگی کا عادی بنایا' عفت و امانت' ایثار و قربانی' خوف خدا کا ان کو خوگر کیا۔ حکومت و مناصب کی حرص و طمع ان کے دل سے بالکل نکال دی۔ آپ کا ارشاد تھا "بخدا ہم کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کو سپرد نہیں کریں گے جس نے فرمائش کی یا جس کو اس کی خواہش ہے"۔ ترفع' سربلندی اور اعزاز کا شوق اور فتنہ و فساد کی خواہش سے ان کے دل بالکل صاف ہو گئے تھے' ان کے کانوں میں' رات دن قرآن مجید کے یہ الفاظ پڑتے تھے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (٢٨ : ٨٣) "یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو عطا کریں گے' جو دنیا میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور فساد کے خواہاں نہیں اور اچھا انجام پرہیز گاروں کے لیے ہے"۔

اس لیے وہ حکومت کے عہدوں اور منصبوں پر پروانہ وار نہ گرتے تھے' بلکہ اس کے برعکس وہ ان کو قبول کرنے سے گریز کرتے تھے اور ان کی ذمہ داریوں کو سوچ کر کے وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ ان میں سے

جس کو بھی کسی منصب کی پیش کش کی جاتی وہ پیچھے ہٹتا تھا۔ اور اپنے کو اس بار کا قابل نہ سمجھتا تھا۔ چہ جائیکہ ان میں سے کوئی اپنا نام حکومت کے لیے پیش کرے۔ یا اپنی ذات کے لیے پروپیگنڈا کرے۔ پھر وہ جب کسی ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو اس کو مال غنیمت یا لقمہ تر نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کو اپنے ذمہ ایک امانت اور اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتے تھے۔ اور یقین رکھتے تھے کہ اللہ کے سامنے ان کو حاضر ہونا ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز کا جواب دینا ہے۔ اور وہ یہ آیت ہمیشہ پڑھتے تھے :

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (٤ : ٥٨) "مسلمانو' اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کو پہنچا دو اور جب فیصلہ کرنے لگو تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ کرو"۔ نیز یہ ارشاد۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٦ : ١٦٥) "اور اسی نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے اور تم میں سے بعض کو دوسروں پر درجے دیئے ہیں تا کہ تمہیں آزمائے' ان انعامات میں جو تمہیں دی گئیں۔ بے شک تمہارا پروردگار بڑی سزا دینے والا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

(۲) وہ کسی قوم کے خدمت گزار اور کسی نسل اور وطن کے نمائندے نہ تھے' جن کے پیش نظر محض اس قوم اور نسل کی خوشحالی ہو' یا وہ کسی قوم کی برتری اور اسے تمام اقوام پر قیادت و سیادت کا مقام دلانے کے قائل ہوں۔ اور یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ ہماری قوم قیادت کرنے کے لیے ہے اور باقی اقوام صرف محکوم بننے کے لیے ہیں۔ وہ عالم عرب کے حدود سے باہر اس لیے نہ نکلے تھے کہ دنیا پر عرب شہنشاہیت قائم کریں۔ اور اس کے زیر سایہ راحت اور عشرت کی زندگی گزاریں۔ اور اس کے زیر حمایت دوسروں پر فخر و تکبر کریں۔ نہ اس لیے کہ لوگوں کو رومیوں اور ایرانیوں کی غلامی سے نکال کر عربوں کی اور اپنی غلامی میں داخل کرائیں۔ وہ صرف اس لیے نکلے تھے کہ وہ بندگان خدا کو اپنے جیسے تمام لوگوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی میں داخل کریں۔ مسلمانوں کے سفیر ربعی ابن عامر نے یزدگرد شاہ ایران کے بھرے دربار میں اس حقیقت کا اعلان کیا۔ انہوں نے کہا اللہ نے ہم کو اس لیے بھیجا ہے کہ لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی کی طرف اور دنیا کی تنگی سے رہائی دے کر اللہ کی وسعتوں کی طرف' اور مذاہب کے ظلم و ستم سے رہائی دلا کر اسلام کے عدل و انصاف میں لائیں۔ بس دنیا کی تمام قومیں اور تمام انسان ان کی نگاہ میں ایک حیثیت رکھتے تھے۔ اگر فرق تھا تو محض دین کا تھا۔ غرض رسول اللہؐ کے اس ارشاد پر ان کا پورا عمل تھا "سب لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ عجمی کو عربی

پر فضیلت ہے' ماسوائے تقویٰ کے"۔
اور سورۂ حجرات کی آیت ۱۳ میں ہے

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (۴۹: ۱۳) "اے لوگو' ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے' اور تمہیں قوم قبیلے میں تقسیم کیا تاکہ تمہارا باہم تعارف ہو' اللہ کے نزدیک تم میں سے مکرم وہی ہے جو زیادہ متقی ہے"۔

حاکم مصر حضرت عمر بن العاص کے بیٹے نے ایک موقعہ پر ایک مصری کو کوڑا مارا اور اپنے باپ دادا پر فخر کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس مصری کو اس سے بدلہ لینے کا حکم دیا۔ اور عمر ابن العاص سے کہا "کب سے تم نے لوگوں کو غلام بنا لیا حالانکہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں"۔

ان فاتحین اور حکمرانوں نے دین و علم و تہذیب کی بخشش میں کبھی بخل اور تنگ دلی سے کام نہیں لیا اور حکومت اور مناصب حکومت کے بارے میں کبھی وطنیت اور رنگ و نسل کا لحاظ نہیں کیا' وہ تو ایک ابر کرم تھے جو تمام عالم پر محیط تھا۔ اور اس کا فیض سب کے لیے عام تھا۔ جو سارے عالم کو سیراب کرتا گیا اور زمین کے ہر حصے نے اس کو دعائیں دیں اور مخلوقات نے اپنی اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق اس سے نفع اٹھایا۔

ان لوگوں کے زیر سایہ اور زیر حکومت دنیا کی تمام قوموں کو بلا اختلاف رنگ و وطن اور دین' علم و تہذیب اور حکومت میں اپنا پورا پورا حصہ لینے اور عربوں کے ساتھ تعمیر نو میں شریک ہونے کا پورا پورا موقعہ ملا۔ بلکہ ان کے بہت سے افراد بہت سی فضیلتوں میں عربوں سے سبقت لے گئے تھے اور ان میں ایسے ائمہ اور فقہا اور محدثین پیدا ہوئے جو خود عربوں کے سر کا تاج اور مسلمانوں کا سرمایہ افتخار تھے۔

(۴) انسان مجموعہ ہے جسم' قلب اور عقل کا۔ انسان حقیقی فلاح و سعادت اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا اور انسانیت کو متوازن ترقی اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان کی یہ تمام قوتیں متناسب طور پر' اس کے مرتبہ کے شایان شان' نشوونما اور پرورش نہ پائیں۔ دنیا میں صالح تمدن کا اس وقت تک وجود نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسا ہی دینی' اخلاقی' عقلی اور مادی ماحول نہ قائم ہو جائے۔ جس میں انسان کے لیے پوری پوری سہولت سے کمال تک پہنچنا ممکن ہو اور تجربہ نے ثابت کر دیا کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی زندگی کی رہنمائی اور تمدن کی جہاز رانی ان لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو جو روحانیت اور مادیت دونوں کے قائل ہوں۔ اور دینی اور اخلاقی زندگی کا نمونہ کامل ہوں اور عقل سلیم اور علم صحیح سے متصف ہوں۔ (ص ۱۰۰ تا ۱۶۴)

اور ایک دوسرے فصل دور خلافت راشدہ کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں :

"چنانچہ ہم کو تاریخ میں خلافت راشدہ کے دور سے زیادہ ان تمام حیثیتوں سے مکمل اور کامیاب دور کا علم نہیں' اس دور میں روحانی' اخلاقی' دینی و علمی' روحانی وسائل و سامان' انسان کامل اور صالح تمدن کے وجود میں لانے میں ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ اس حکومت میں' جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین حکومتوں میں تھا' ایسی سیاسی و مادی قوت کے

جو تمام معاصر قوتوں سے فائق و برتر تھی۔ اعلیٰ اخلاقی نمونے اور اعلیٰ معیار کام دیتے تھے۔ تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاق اور فضیلت بھی اپنے پورے عروج پر تھی۔ فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق اور افادیت دونوں کی ترقی بھی جاری تھی۔ چنانچہ اسلامی حکومت کی غیر معمولی وسعت' آبادی کی انتہائی افزونی عیش و عشرت کے وسائل و اسباب ترغیبات کے باوجود' جرائم' بداخلاقی کے واقعات بہت کم پیش آتے تھے۔ فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ اور فرد و جماعت کا باہمی تعلق حیرت انگیز طریقے پر تھا۔ یہ ایک معیاری دور تھا جس سے زیادہ ترقی یافتہ دور کا انسان خواب بھی نہیں دیکھ سکا۔ اور اس سے زیادہ مبارک اور پربہار زمانہ فرض ہی نہیں کیا جاسکتا"۔ (ص ۱۶۷) یہ تھے اس دور سعید کے بعض خدوخال جس میں انسانیت نے ایک مختصر سے عرصے کے لیے سورہ عصر کے وضع کردہ اسلامی دستور کے زیر سایہ زندگی بسر کی۔ اس عرصہ میں لوگوں پر ایسے لوگوں کی ایک ایسی ایمان والی جماعت کی حکومت تھی جس نے ایمان کے جھنڈے اٹھائے تھے اور عمل صالح اس کا پروگرام تھا اور حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین اس کا شعار تھا۔

یہ ایک ایسا سنہری دور تھا جس کا مقابلہ اس بربادی سے ہرگز نہ کیا جا سکتا۔ جس سے آج پوری انسانیت دوچار ہے۔ معرکہ' خیرو شر میں پوری انسانیت خسارے اور تباہی میں مبتلا ہے۔ پوری انسانیت نے' اس عظیم خیر کی طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں' جو کبھی عربوں نے پوری انسانیت کے لیے عام کر دی تھی' اس دور میں جب کہ انہوں نے اسلام کے جھنڈے اٹھا رکھے تھے۔ اور اس وقت وہ پوری انسانیت کے قائد اور رہنما تھے اور اس کے بعد کے ادوار میں جب انہوں نے یہ جھنڈے پھینک دیئے تو وہ قافلہ انسانیت کے خادم بن گئے جبکہ یہ قافلہ بھی بربادی کی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے اور جاتے جاتے یہ حالت ہو گئی ہے کہ پوری انسانیت نے شیطانی جھنڈے اٹھا لیے اور ان میں سے کوئی جھنڈا انسانی جھنڈا نہیں ہے۔ پوری انسانیت نے باطل کے جھنڈے اٹھا لیے' کہیں بھی حق کا کوئی جھنڈا نظر نہیں آتا۔ پوری انسانیت نے اندھے پن اور گمراہی کے جھنڈے اٹھا لیے ان میں کہیں بھی ہدایت اور نور کا کوئی ایک جھنڈا نظر نہیں آتا۔ سب جھنڈے خسارے کے ہیں' کامیابی کا کوئی ایک جھنڈا بھی نظر نہیں آتا۔ اللہ کا وہ جھنڈا جس کے ذریعہ عرب دنیا پر چھا گئے تھے۔ آج بھی موجود ہے۔ یہ جھنڈا آج بھی کسی اٹھانے والے ہاتھ کا منتظر ہے۔ کسی ایک جماعت یا قوم کی ضرورت ہے جو اس جھنڈے کے نیچے بھلائی' ہدایت' صلاح اور فلاح کی راہ پر چلے۔

یہ ہے' اس جہاں میں نفع و نقصان کی کہانی۔ یہ دنیاوی عظمت اپنی جگہ بہت بڑی کامیابی ہے لیکن اگر ہم اس کا تقابل اخروی کامیابی کے ساتھ کریں تو یہ بہت ہی حقیر ہے۔ اصل نفع و نقصان آخرت کا ہے۔ وہاں ہی حقیقی نفع و نقصان ہے۔ اس لیے کہ وہ طویل زندگی ہے۔ اور ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی ہے۔ اور ہمیشہ رہنے والا جہاں ہے۔ اصل منافع اور اصل خسارہ وہاں ہے یعنی جنت' اللہ کی رضامندی کا منافع یا جہنم' اللہ کی ناراضگی کا خسارہ۔ آخرت میں جہاں انسان اپنے اعلیٰ ترین ترقی و کمال تک پہنچ سکا ہو گا یا اس قدر گر چکا ہو گا کہ اپنی انسانیت میں کھو بیٹھا ہو گا۔ وہ ایک پتھر کی قدر و قیمت تک گر جائے گا اور راحت و آرام میں پتھر سے بھی کم ہو گا۔

يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَٰلَيْتَنِي كُنْتُ تُرَٰبًا (۷۸: ۴۰)

"جس دن ہر شخص وہ کچھ دیکھ لے گا جو اس نے کما کر آگے بھیجا اور کافر کہے گا کاش کہ میں مٹی ہو جاتا"۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سورت ایک فیصلہ کن اور دو ٹوک راہ حق بتاتی ہے' یہ بتاتی ہے کہ تمام راہیں خسارے کی ہیں ماسوائے ۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

(۳ : ۱۰۳) "ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے اور حق کی وصیت کی اور صبر کی وصیت کی"۔ اور یہ ایک ہی راہ ہے اس میں تعدد نہیں ہے' یہ ایمان اور عمل صالح کی راہ ہے ۔ایک اسلامی جماعت کے قیام کی راہ ہے ۔ایک ایسی جماعت 'کی راہ جو حق کی نصیحت کرتی ہو اور جو خیر کی تلقین کرتی ہو' جو سچائی کی سپاہ ہو اور صبر اس کی تنخواہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ راستہ ایک ہے ۔یہی وجہ ہے کہ جب بھی رسول اللہ کے دو ساتھی ایک دوسرے سے ملتے تو تب جدا ہوتے جب وہ سورہ عصر پڑھ لیتے ۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے کو سلام کہہ کر چلے جاتے ۔ دراصل ان کا باہم معاہدہ ہوتا تھا کہ اس انقلابی دستور پر چلیں گے وہ باہم معاہدہ کر لیتے تھے کہ ایمانی صلاح کی راہ پر گامزن رہیں گے ۔حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہیں گے ۔ اور اس کا عہد کرتے تھے کہ وہ اس دستور کے چوکیدار رہیں گے اور اس جماعت کے فرد رہیں گے جو اس دستور پر گامزن ہوگی ۔

---○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ -- ۳۰

سورۃ الھمزۃ ۔ ۱۰۴

۱ -- تا -- ۹

درس نمبر ۳۰۴ تشریح آیات

۱ ـ تا ـ ۹

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ (۱۰۴) مَكِّيَّةٌ (۳۲)
آيَاتُهَا ۹ رُكُوْعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝۱ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۝۲ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ
اَخْلَدَهٗ ۝۳ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝۴ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝۵ نَارُ
اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝۶ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝۷ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝۸ ۱
فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝۹ ع ۹
۲۹

"تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے' جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں' وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ' خوب بھڑکائی ہوئی' جو دلوں تک پہنچے گی۔ وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اس حالت میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں (گھرے ہوئے ہوں گے)"۔

یہ سورت بھی قرآن کے البم کی تصاویر میں سے ایک تصویر ہے۔ اور یہ تصویر دعوت اسلامی کے ابتدائی ایام کی حقیقی تصویر ہے لیکن یہ ایک ایسی تصویر ہے کہ ایسی تصاویر ہر سوسائٹی میں ملتی ہیں۔ یہ ایک گھٹیا اور چھوٹے درجے کے انسان کی تصویر ہے' ایک ایسے شخص کی جسے دولت دی گئی ہے اور دولت کی پرستش اور محبت اس پر چھا جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا چھوٹا ظرف اب طاقت نہیں رکھتا کہ اسے سمیٹ لے یا ہضم کرلے۔ ایسا شخص سوچنے لگتا ہے کہ دنیا میں تو "مال" اور "دولت" ہی اعلیٰ قدر ہے۔ یہ ایک ایسی قدر و قیمت ہے جس کے مقابلے میں تمام اقدار ہلکی ہیں' چاہے وہ ایمان کی قدریں' معانی کی قدریں ہوں' حقائق و عقائد کی قدریں ہوں اور وہ سوچتا ہے کہ چونکہ اسے مال دے دیا گیا ہے۔ اس

لیے اسے تمام اعزازات دے دیئے گئے ہیں اور وہ لوگوں کی عزتوں اور حقوق کا مالک ہے ۔

پھر یہ دولت مند یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ دولت کا دیوتا علی کل شئی قدیر ہے ' وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور کوئی ایسا کام نہیں ہے جو دولت کا دیوتا نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ وہ سمجھتا ہے کہ دولت کے ذریعہ سے موت کو بھی ٹالا جا سکتا ہے ۔ زندگی کو دائمی بنایا جا سکتا ہے ۔ اللہ کے نظام قضا و قدر و نظام جزاء و سزا کو بدلا جا سکتا ہے ۔ اگر کوئی حشر و نشر ہوا اور حساب و کتاب ہو بھی گیا تو وہاں بھی مال لگ سکتا ہے ۔

چنانچہ ایسا شخص رات دن مال کے حصول کی جدوجہد کرتا ہے ۔ دولت کو گنتا رہتا ہے اور گنتے گنتے مزے لیتا ہے ۔ پھر اس مال کی وجہ سے اس کی فسق و فجور کی آگ بھڑکتی ہے ۔ وہ لوگوں کے حقوق پامال کرتا ہے ' ان کی آزادی سلب کرتا ہے اور ان کی عزت و شرافت کو پامال کرتا ہے ۔ وہ لوگوں کو طعنے دیتا ہے اور ان کی برائیاں کرتا ہے ۔ اپنی زبان سے ان کی عیب جوئیاں کرتا ہے اور اپنے رویے اور اپنی حرکات کے ذریعہ ان کے عیب نکالتا ہے ۔ کبھی ان کی حرکات کی نقل اتارتا ہے ' کبھی ان کی آواز کی نقل اتارتا ہے ۔ کبھی ان کی صفات کو حقارت سے دیکھتا ہے ' منہ زبانی یا اشارات کے ساتھ ' کبھی ایک حقارت آمیز نظر سے اور کبھی گری ہوئی حرکات سے ۔

یہ تصویر نفس انسانی کی تصاویر میں سے نہایت ہی حقیر اور گری ہوئی تصویر ہے ۔ اس میں ایمان اور مروت نام کی کوئی چیز نہیں ہے ۔ اسلام ایسی گری ہوئی تصاویر کو سخت ناپسند کرتا ہے ' کیونکہ اسلام ایک بلند اخلاقی معیار رکھتا ہے ۔ اسی لیے اسلام نے بار بار مزاح ' طعنہ زنی اور عیب جوئی سے لوگوں کو منع کیا ہے ۔ البتہ اس سورت میں ان چیزوں کو نہایت ہی مکروہ شکل میں پیش کیا ہے اور ایسے گرے ہوئے اخلاق کا مظاہرہ کرنے والوں کو سخت دھمکی بھی دی ہے ۔ اس سورت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ دعوت اسلامی کے ابتدائی دنوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کی جماعت کو ایسے ہی حالات سے گزرنا پڑا تھا ' چنانچہ بعض مالداروں کی ان حرکات کو سختی سے رد کیا گیا اور ان کو برے انجام کی سخت ترین دھمکی دی گئی ۔ یہ حرکات کرنے والوں کے نام بھی بعض روایات میں بتائے گئے ہیں لیکن یہ روایات پختہ نہیں ' لہٰذا یہی پس منظر مناسب ہے جو ہم نے بیان کر دیا ۔

ایسے شخص کو یہاں جو دھمکی دی گئی ہے وہ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی شکل میں ہے ' جس میں عذاب کی ایسی تصویر ہے جو مادی بھی ہے اور معنوی بھی ہے ۔ آگ کی مادی اور حسی تصویر بھی کھینچی گئی ہے اور معنوی تصویر بھی ۔ یہاں جرم و سزا اور طریقہ سزا اور عذاب کی فضا کے درمیان تقابل کی مناسبت کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ ایک ایسے ھمزہ (جو اشاروں سے لوگوں کا مذاق اڑاتا ہے) اور ایسے لمزہ (جو دوسروں کی صفات اور عزت پر زبان درازی کرتا ہے) کی تصویر کھینچی گئی ہے ۔ جس کا مشغلہ مال جمع کرنا ہے اور جو اس مال کو قاضی الحاجات بھی سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ یہ مال ہی اسے دوام بخشے گا جو مال کی وجہ سے اپنے آپ کو برتر سمجھتا ہے ۔ اور جو مال ہی کو تمام قوتوں کا سرچشمہ سمجھتا ہے ' لیکن ایسے شخص کی تصویر کے بالمقابل ایک دوسرے شخص کی تصویر ہے جو پرے پھینکا ہوا ہے ' ناقابل التفات ہے اور الْحُطَمَةِ "چکنا چور کر دینے والی جگہ" میں پھینک دیا گیا ہے ۔ یہ سزا اس کے لیے اس لیے تجویز ہوئی ہے کہ اس کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کی کبریائی اور بڑائی کے زعم کو بھی پاش پاش کر دے اور یہ الْحُطَمَةُ ہے کیا نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ (۱۰۴ : ۶) "اللہ کی آگ خوب بھڑکائی ہوئی" ۔ اس آگ کو اللہ کی آگ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نادر

اور غیر معمولی آگ ہے' اس سے سننے والے پر ہوش ربا خوف اور دہشت طاری ہو جاتی ہے۔

الَّتِی تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (۱۰۴: ۷) "جو دلوں تک پہنچے گی"۔ اس شخص کے دل تک 'جس کے ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃٍ (۱۰۴: ۱) کا فعل قبیح ابھرتا ہے اور جس کے اندر مزاح' تکبر اور غرور کا مواد چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ تصویر اس طرح مکمل ہوتی ہے کہ اس پھینکے ہوئے 'نظرانداز کیے ہوئے اور پاش پاش کر دیئے گئے شخص کو جس آگ میں پھینکا گیا ہے وہ اس کے روبرو سربند کر دی گئی ہے۔ کوئی اس سے نکل نہ سکے گا۔ کوئی وہاں اس کو پوچھنے کے لیے نہ آئے گا۔ اس آگ میں بھی یہ شخص ستونوں کے ساتھ بندھا ہوا ہو گا' جس طرح مویشیوں کو باڑوں میں باندھ دیا جاتا ہے۔ اس تصویر کشی کے لیے الفاظ کا جو رنگ استعمال کیا گیا ہے وہ بہت ہی شدید اور شوخ ہے۔

عَدَّدَہٗ --- کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ --- تَطَّلِعُ --- مُّمَدَّدَۃٍ پھر جملوں کی جو تراکیب ہیں وہ بھی نہایت موکد اور زوردار ہیں۔

كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ (٤) وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْحُطَمَةُ (٥) نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ

(۱۰۴: ۶) "ہرگز نہیں' وہ شخص تو لازماً ایک چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ وہ اللہ کی آگ ہے 'خوب بھڑکائی ہوئی"۔ پہلے اسے مجمل لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

الْحُطَمَۃ جہنم کے لیے صریح نہیں ہے اور یہ مبہم لفظ تھا۔ اس کے بعد اسے مزید خوفناک بنانے کے لیے سوال کیا تھا۔ اور اس کے بعد جواب دیا گیا اور تشریح کر دی گئی۔ یہ تمام اسالیب تاکید اور ہولناکی اور عظمت کے بیان کے لیے آتے ہیں' اور پھر انداز بیان تاکید کے ساتھ تہدید آمیز بھی ہے۔

وَیْلٌ "ہلاکت ہے اس کے لیے"۔ لَیُنْۢبَذَنَّ "اسے ضرور پھینکا جائے گا"۔ الْحُطَمَۃ "پاش پاش کرنے والی ہیں"۔ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ (۱۰۴: ۶) "اللہ کی آگ جو خوب بھڑکائی ہوئی ہے"۔ الَّتِی تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (۱۰۴: ۷) "جس کے اثرات دلوں تک پہنچیں گے"۔ اِنَّھَا عَلَیْھِمْ مُّؤْصَدَۃٌ (۱۰۴: ۸) "اونچے ہوئے ستونوں میں بندھے ہوئے ہوں گے"۔ اس تصویر کشی کے لیے جو الفاظ چنے گئے ہیں ان میں تصویری اور شعوری مناسبت ہے ہمز اور لمز کا فعل بد کرنے والے شخص کے ساتھ۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم دعوت اسلامی کی رفتار پر نظر رکھ رہا تھا اور یہ قرآن ہی تھا جو روز مرہ کے واقعات پر تبصرہ کر کے رہنمائی کرتا تھا اور یہ بروقت راہنمائی ایک ایسا ہتھیار تھا جو دشمنوں کی سازشوں کا تانا بانا کاٹ کر رکھ دیتا تھا بلکہ ان پر ایک خوف طاری کر دیتا تھا اور اہل ایمان کی روحیں اطمینان سے سرشار ہو جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دو تصویروں کی جو مذمت فرمائی ہے اس میں ہمیں حکمت کے دو نکات نظر آتے ہیں۔

(۱) یہ کہ اسلامی سوسائٹی اخلاقی گراوٹ کو قبول نہیں کرتی۔ اور اس قسم کے لوگ جہاں اور جس معاشرے میں ہوں

وہ قابل مذمت ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی مدافعت فرماتا ہے اور ان کو اس بات سے بچاتا ہے کہ لوگوں کے اس توہین آمیز رویے سے کہیں ان میں احساس کمتری پیدا نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس سورت میں ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے' اللہ دیکھ رہا ہے' اللہ اسے ناپسند کرتا ہے' اس پر ان کو سزا دے رہا ہے' اس طرح اہل ایمان روحانی تائید پاتے ہیں' اور ان کے اندر اخلاقی برتری کا احساس پایا جاتا ہے اور ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کے خلاف جو سازشیں ہو رہی ہیں وہ بہت ہی گھناؤنی ہیں اور گھٹیا لوگوں کی طرف سے ہیں۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الفیل ۔ ۱۰۵

۱ -- تا -- ۵

سورۃ الفیل ایک نظر میں

اس سورت میں ایک ایسے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ' جو جزیرۃ العرب میں بہت مشہور تھا۔ یہ واقعہ بعثت نبوی سے قبل پیش آیا تھا ' اور اس سے یہ بات عیاں ہو گئی تھی کہ اس خطہ مبارکہ پر اللہ کا کس قدر کرم ہے اور یہ کہ اللہ نے اسے منزل نور اور مہبط ہدایت اور آخری وحی کے مرکز کے لیے منتخب کر لیا ہے ' اور یہ علاقہ جدید نظریہ کا گہوارہ قرار دیا ہے اور یہ کہ یہ نقطہ آغاز ہے جہاں سے یہ جدید عقیدہ پوری دنیا میں جاہلیت کا پیچھا کرنے والا تھا۔ اور اس طرح اللہ کے منشا اور ہدایت کے مطابق دنیا میں ہدایت ' حق اور بھلائی نے ثبوت و قرار پکڑنا تھا۔

اس حادثہ کے بارے میں جو متعدد روایات وارد ہیں ۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ یمن کے حبشی حاکم ابرہہ نے یمن میں ایک کنیسہ بنایا ' یہ اس وقت کی بات ہے جب ابرہہ نے یمن کو فتح کر لیا اور یہاں سے ایرانیوں کو نکال دیا ۔ یہ کنیسہ اس نے حبشہ کے بادشاہ کے نام سے بنوایا اور اس میں برتری اور عظمت کے تمام اسباب فراہم کیے ۔ مقصد یہ تھا کہ تمام عرب بشمول اہل یمن و اہل شمال خانہ کعبہ کا جو بے حد احترام کرتے تھے اور ان کو اس سے جو بے حد محبت تھی ' ان کو بیت اللہ سے موڑ کر اس نئے گرجا کا گرویدہ بنا دیا جائے ' اس نے شاہ حبشہ سے اپنی اس پالیسی کی منظوری بھی لی ۔

لیکن عربوں کے دل سے اپنے مقدس مقام خانہ کعبہ کی محبت نہ نکلی کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی اولاد سے ہیں اور انہوں نے اس گھر کو تعمیر کیا ہے اور یہ ان کی شناخت ہے کیونکہ عرب نسب اور قوم پر بہت فخر کرتے تھے ۔ اور عربوں کے عقائد اور نظریات ' ان کی نظر میں انہی کمزوریوں کے باوجود ان کو اہل کتاب کے معتقدات اور نظریات سے بہتر نظر آتے تھے کیونکہ اہل کتاب کے نظریات بھی اصل حقیقت سے بہت دور ہو گئے تھے ۔

جب ابرہہ نے دیکھا کہ لوگ خانہ کعبہ سے اس کے بنائے ہوئے کنیسہ کی طرف نہیں لوٹ رہے ہیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ خانہ کعبہ کو منہدم کر دیا جائے ۔ اس نے ایک ہزار لشکر تیار کیا جس کے آگے ہاتھیوں کا دستہ تھا اور ان کے آگے پھر ایک بڑا ہاتھی تھا جو ان کے نزدیک جنگ میں بہت مشہور تھا۔ عربوں کو ابرہہ کے ارادے کی اطلاع ہو گئی اور وہ اس بات سے بہت پریشان ہوئے کہ اب ان کا یہ مقدس گھر گرا دیا جائے گا۔ اہل یمن کے روساء اور بادشاہوں میں سے ایک شخص ذونفر نے اپنی قوم کو بلایا۔ پورے بلاد عرب میں سے جن لوگوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا۔ ان کے ساتھ ابرہہ سے لڑا لیکن وہ شکست کھا گیا اور ابرہہ نے اسے گرفتار کر لیا۔

اس کے بعد ابرہہ کا راستہ نفیل ابن حبیب خثعمی نے روکا ' جس کے ساتھ دو قبیلے تھے اور تمام دوسرے عرب قبائل نے بھی ایک بڑی تعداد میں اس کا ساتھ دیا۔ ابرہہ نے ان کو بھی شکست دی اور نفیل مذکور کو قیدی بنا لیا۔ نفیل اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ عرب کے علاقوں میں ابرہہ کے لیے گائیڈ کا کام کرے گا۔

جب یہ طائف پہنچا تو ثقیف کے کچھ لوگ اس سے ملے اور انہوں نے کہا کہ جس گھر کو وہ گرانے نکلا ہے وہ طائف

میں نہیں ہے ۔ وہ تو مکہ میں ہے ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ انہوں نے لات بت کے لیے جو گھر بنایا تھا' اس کا منہ اس سے موڑ دیں ۔ انہوں نے اس کو خانہ کعبہ تک پہنچنے کے لیے گائیڈ دیئے ۔

جب ابرہہ مکہ اور طائف کے درمیان مقام مغمس تک پہنچا تو اس نے اپنے جرنیلوں میں سے ایک جرنیل کو مکہ بھیجا تو اس نے پورے تہامہ کے علاقے سے مال مویشی پکڑ کر ابرہہ کے پاس بھیجے ۔ جن میں قریش کے مال مویشی بھی تھے ۔ اور عبد المطلب سے ابن ہاشم کے دو صد اونٹ بھی تھے ۔ عبد المطلب اس زمانے میں قریش کے سردار تھے ۔ چنانچہ قریش ' کنانہ ' ھذیل اور دوسرے قبائل جو خانہ کعبہ کے اردگرد تھے ' نے ارادہ کیا کہ ابرہہ کے ساتھ لڑیں ۔ انہوں نے جب جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ ابرہہ کے ساتھ نہیں لڑ سکتے ۔ تو انہوں نے آخر کار لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا ۔

ابرہہ نے اپنا ایک ایلچی مکہ بھیجا تاکہ ' یہاں کے سردار کو مل کر یہ کہہ دے کہ وہ لوگوں کے ساتھ لڑنے کے لیے نہیں آیا ۔ اس کا مقصد صرف اس گھر کو ڈھانا ہے ۔ اگر وہ اس کی راہ نہ روکیں تو اسے ان کے خون بہانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔

ابرہہ نے اپنے ایلچی کو ہدایات دیں کہ اگر مکہ کا سردار لڑنا نہیں چاہتا تو اسے ساتھ لے آئے ۔ اس موضوع پر جب عبد المطلب نے اپنے لوگوں سے بات چیت کی تو ان سے کہا کہ ہم جنگ نہیں چاہتے اور نہ جنگ کی طاقت رکھتے ہیں ۔ یہ اللہ کا گھر ہے اور اللہ کے دوست ابراہیم خلیل اللہ کا گھر ہے ۔ اگر اللہ اس کا دفاع کرے تو یہ اس کا گھر اور حرم ہے ۔ اور اگر اللہ ابرہہ کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ اس کو گرا دے تو اس کی رضا ۔ ہم تو دفاع کی قوت نہیں رکھتے" ۔ اس مشورے کے بعد عبد المطلب ابرہہ کے ایلچی کے ساتھ چلے گئے ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عبد المطلب تمام لوگوں میں نہایت خوش شکل ' رعب دار اور پروقار شخص تھے ۔ جب ابرہہ نے انہیں دیکھا تو ان کا بڑا احترام کیا ۔ اور یہ پسند نہ کیا کہ انہیں تخت سے نیچے بٹھائیں ۔ اور یہ بھی اس نے مناسب نہ سمجھا کہ تخت کے اوپر وہ اس کے مساوی بیٹھیں ۔ چنانچہ ابرہہ اپنے تخت سے اترا تو فرش پر بیٹھا اور عبد المطلب کو بھی ساتھ بٹھایا ۔ اس کے بعد اس نے اپنے ترجمان سے کہا کہ "اسے کہو تم کیا چاہتے ہو؟" تو انہوں نے جواب دیا" میرا مطالبہ یہ ہے کہ بادشاہ دو سو اونٹ دے دے جو میری ملکیت ہیں" ۔ جب عبد المطلب نے یہ کہا تو ابرہہ نے اپنے ترجمان سے کہا کہ اسے یوں کہو : "جب میں نے تمہیں دیکھا تو تمہاری شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا ۔ لیکن جب تم نے میرے ساتھ بات کی تو میں سمجھتا ہوں کہ تم کچھ بھی نہیں ہو ۔ کیا تم مجھ سے صرف دو سو اونٹوں کے بارے میں بات کرتے ہو؟ اور اس گھر کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہتے ۔ جو تمہارا دینی مرکز ' تمہارے باپ کا دینی مرکز ہے اور میں اسے گرانے کے لیے آیا ہوں" ۔ اس پر عبد المطلب نے کہا :"میں تو ان دو سو اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر کا مالک موجود ہے اور وہ عنقریب اس کا دفاع کر لے گا" ۔ اس پر ابرہہ نے کہا" وہ میرا مقابلہ نہیں کر سکتا" ۔ عبد المطلب نے کہا تم جانو اور تمہارا کام ۔ اس کے بعد ابرہہ نے عبد المطلب کے اونٹ لوٹا دیئے ۔

عبد المطلب مکہ واپس ہوئے ' بات چیت کے بارے میں لوگوں کو مطلع کیا اور حکم دیا کہ شہر کو خالی کر دو اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ لے لو ۔ اس کے بعد عبد المطلب اٹھے اور قریش کے کچھ دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ ہو لیے ۔ عبد المطلب نے خانہ کعبہ کا کنڈا پکڑا اور اس کے ساتھ کچھ دوسرے لوگ کھڑے ہو گئے ' وہ اللہ سے زاری کرنے لگے '

اس کی مدد کے طلبگار ہوئے اور روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے اس موقعہ پر یہ اشعار پڑھے

لاھم ان العبد یمنع رحلہ فامنع رحالك

لا یغلبن صلیبھم ومحالھم ابدا محالك

ان کنت تارکھم وقبلتنا فامر ما بدا لك

"(۱) اے اللہ ہر بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے' تو اپنے گھر کی حفاظت فرمایا۔ (۲) ان کی صلیب اور ان کی تدبیر تیری تدبیر پر غالب نہ آئے۔ (۳) اگر تو ان کو ہمارے قبلے کو اپنے حال پر چھوڑتا ہے تو بھی جس طرح چاہے حکم دے"۔

ابرہہ نے اپنی فوج اور ہاتھی کو اپنی منزل کی طرف بڑھایا' مکہ کے قریب آکر ہاتھی پر بیٹھ گیا اور مکہ کے اندر داخل نہ ہوا۔ انہوں نے بے حد کوشش کی کہ ہاتھی کو مکہ میں داخل کریں مگر وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اور یہ بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے بھی ثابت ہے جب حضورؐ کی اونٹنی قصواء مکہ کے باہر آکر بیٹھ گئی۔ تو لوگوں نے کہا کہ قصواء بگڑ گئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ قصواء بگڑ کر نہیں بیٹھ گئی اور نہ یہ اس کی عادت ہے' لیکن اسے اس ذات نے روک دیا ہے جس نے ہاتھی کو روکا تھا"۔ (بخاری) اور صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا "اللہ نے مکہ سے ہاتھی کو روکا اور اپنے رسولؐ اور اہل ایمان کو اس پر مسلط کر دیا۔ اور آج مکہ کا احترام اسی طرح لوٹ آیا جس طرح کل وہ محترم تھا۔ یاد رہے کہ یہ بات ہر سننے والا غائب تک پہنچا دے"۔ لہٰذا یہ ایک مستند بات ہے کہ اصحاب فیل کے دن اللہ نے ہاتھی کو مکہ سے روک دیا تھا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ اللہ نے اس لشکر اور اس کے قائدین کو ہلاک کر دیا۔ اس لشکر پر غول کے غول پرندے بھیجے گئے' یہ پرندے ان پر کیچڑ سے بنی ہوئی کنکریاں پھینکتے تھے اور اس کے نتیجے میں اس لشکر کی حالت یہ ہوگئی جس طرح درختوں کے خشک پتے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں جس کی تفصیل قرآن نے بیان کی ہے۔ ابرہہ کا جسم بھی متاثر ہوا۔ یہ لوگ اسے اٹھا کر لے گئے۔ اس کا پورا پور اگر رہا تھا۔ اسے صنعا تک پہنچایا گیا۔ اور جس طرح روایات میں آتا ہے کہ اس کی موت یوں ہوئی کہ اس کا سینہ شق ہوا اور اس کا دل اس سے باہر نکل آیا۔

روایات میں ان پرندوں کے غولوں کے بارے میں اختلاف ہے کہ ان کی شکل کیسی تھی' حجم کیا تھا' ان پتھروں کا حجم کیا تھا' ان کی نوعیت اور اثرات کیسے تھے جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے۔ اس سال مکہ میں چیچک اور خسرہ کی وبا بھی پھوٹی۔

وہ لوگ جو یہ میلان رکھتے ہیں کہ خوارق عادت واقعات اور معجزات کے دائرے کو تنگ کر دیں اور واقعات کو اللہ کے ان قوانین کے اندر اندر دیکھا جائے جو اللہ نے جاری کیے ہیں اور جو مالوف ہیں' یہ خیال کرتے ہیں اور زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ واقعہ چیچک اور خسرے کی وجہ سے پیش آیا۔ الا یہ کہ لفظ "طیر" کا اطلاق عربی میں ہر اڑنے والی چیز پر ہوتا ہے جس میں مکھی مچھر شامل ہیں جو جراثیم کو ادھر ادھر منتقل کرتے ہیں۔

امام مفتی محمد عبدہ پارہ عم کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "اگلے روز لشکر میں چیچک اور خسرہ کی وبا پھوٹ پڑی۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ چیچک کی یہ پہلی وبا تھی۔ یعقوب ابن عتبہ کا قول ہے کہ چیچک کی وبا سب سے پہلے اسی سال پھیلی اور خسرہ بھی اسی سال دیکھا گیا۔ اس وبا نے ان کے اجسام پر انوکھے اثرات ڈالے۔ لوگوں کے جسموں سے گوشت کٹ کر گرنے لگا جب یہ

واقعات شروع ہوئے تو لشکر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔لوگ بھاگنے لگے ۔ اس بیماری کا اثر ابرہہ پر بھی ہوا۔اس کے جسم کا گوشت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرنے لگا۔یہاں تک کہ سینہ تک پھٹ گیا اور صنعا پہنچ کر مر گیا"۔

"اس پر روایات متفق ہیں اور اس کو ماننا چاہیے۔سورت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیچک اور خسرہ ان پرندوں کی وجہ سے پھیلا جو لشکروں کی صورت میں غول در غول ہوا میں اڑ کر آتے اور لشکر پر برستے؟"

"یہ اعتقاد کیا جا سکتا ہے کہ یہ پرندے مچھر اور مکھی کے جنس سے تھے جن کی وجہ سے جراثیم پھیلتے ہیں ۔ اور سنگریزے اس خشک مٹی کے ہوں گے جسے ہوائیں اڑاتی ہیں ۔ اور جانوروں' پرندوں اور مچھروں اور مکھیوں کے ذریعہ ادھر ادھر منتقل ہوتے ہیں ۔یہ زہریلا غبار انسانوں کے مساموں میں داخل ہو جاتا ہے اور اس سے پھوڑے اور زخم پیدا ہو جاتے ہیں ۔بدن خراب ہو جاتا ہے اور گوشت کٹ کر گرتا ہے ۔یہ پرندے 'مکھی اور مچھر اللہ کے لشکروں میں سے ہیں اور انہی کے ذریعہ اللہ کئی لوگوں کو ہلاک و برباد کرتا ہے ۔یہ چھوٹے سے جانور جن کو جرثومہ اور جراثیم کہا جاتا ہے' یہ بھی اللہ کے لشکر ہیں ۔ اور ان لشکروں کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے ۔ باغیوں اور سرکشوں کو ہلاک کرنے کے لیے اللہ کی قدرت اس پر موقوف نہیں ہے کہ وہ پرندے بڑے بڑے ہوں' پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرح یا یہ کہ وہ عنقا کی طرح عجیب و غریب پرندے ہوں یا ان کے مخصوص رنگ ہوں ۔ نہ اللہ کی قوت سنگریزوں کے سائز پر موقوف ہے ۔ اور نہ ان تفصیلات پر کہ جسم پر ان کے اثرات کس طرح نمودار ہوئے ۔کیونکہ ہر شے دراصل اللہ کی فوج کی حیثیت رکھتی ہے ۔

وفي كل شيء له آية – تدل على انه واحد

"اور ہر چیز میں اللہ کے نشانات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہی وحدہ لاشریک ہے"۔

اس کائنات کے تمام قوانین اللہ کی مطیع فرمان ہیں ۔چنانچہ اللہ نے اس سرکش انسان کی سرزنش کے لیے ایسے پرندے بھیجے' جنہوں نے اس تک خسرے اور چیچک کے جراثیم پہنچا دیئے' وہ ہلاک ہوا' اس کی فوج تتر بتر ہو گئی ۔یہ لوگ مکہ میں داخل نہ ہو سکے اور اہل مکہ پر یہ اللہ کا خاص فضل و کرم تھا' جو ان کی بت پرستی کے باوجود ان پر کیا گیا۔اور یہ کام اللہ نے اپنے گھر کی حفاظت کے لیے کیا اور یہ بات تمہید تھی رسول آخر الزمان کی آمد کے لیے تاکہ وہ آئیں اور اپنے آخری دین سے اس گھر کو مزید مستحکم کر دیں ۔اس طرح اللہ نے بیت اللہ کے مخالفین پر عذاب نازل کیا جو بغیر کسی جواز کے اس کو ڈھانے کے لیے آئے تھے اور انہیں تباہ کر دیا"۔

اس سورہ کی تفسیر میں یہی بات قابل اعتماد ہے اور اگر اس کے خلاف کوئی صحیح روایت بھی ہو تو اس کی تاویل کرنا چاہئے ۔ تاویل کے بغیر قبول کرنا درست نہ ہو گا۔کیا یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ نہیں ہے کہ جو سرکش ہاتھی جیسے قوی الجثہ حیوان کا سہارا لیتا ہے' اسے اللہ ایک چھوٹے سے حیوان جرثومے کے ذریعہ جو صرف خوردبین سے نظر آتا ہے' تباہ و برباد کر دے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دانش مند انسان کے لیے یہ عظیم تر معجزہ ہے اور عجیب و غریب ہے"۔

ان آیات کی تفسیر میں دو انتہائی آراء اختیار کی گئی ہیں' ایک یہ جس طرح امام عبدہ کہتے ہیں کہ یہ خسرے کی اور چیچک کی وبا تھی جس کے جراثیم پرندوں کے پاؤں کے ساتھ اٹی ہوئی مٹی کے ذریعہ پھیلے اور دوسری یہ کہ جس طرح روایات میں آتا ہے کہ پرندے جو پتھر پھینکتے تھے وہ بذات خود لوگوں کے سروں اور جسموں کو جلا دیتے تھے' یہ پتھر جسموں

کے اندر داخل ہو کر ان کو ریزہ ریزہ کر دیتے تھے اور اس طرح کر دیتے تھے جس طرح خشک پتھروں کے ٹکڑے ہوتے ہیں جس طرح کھایا ہوا بھوسہ ہوتا ہے۔ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے کون سی صورت زیادہ اللہ کی قدرت پر دلالت کرتی ہے یا اس واقعہ کی تفسیر کے لیے کون سی بہتر ہے۔دونوں کا امکان بہرحال ہے۔اور اس بات کا امکان ہے کہ اللہ کسی قوم کو اس ذریعہ سے ہلاک کرے جو معلوم و مالوف ہو یا کسی ایسے ذریعہ سے ہلاک کرے جو ہمارے حد ادراک سے ماوراء ہو اور ہم ابھی اسے جان نہ سکے ہوں۔

اللہ کی سنت فقط یہ نہیں ہے جسے لوگ جانتے ہوں اور اس کے جاری رہنے کے وہ عادی ہوں۔جبکہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ انسان ابھی تک سنن الٰہیہ کے بالکل ایک معمولی حصے کو معلوم کر سکا ہے اور اس کا علم اس کی طاقت کے حدود کے اندر ہے اور جس قدر سنن الٰہیہ کو انسان نے اپنے طویل تجربات اور اس کے نتیجے میں آنے والی معلومات و مدرکات کے ذریعہ معلوم کیا ہے جن باتوں کو لوگ معجزات کہتے ہیں وہ بھی دراصل اللہ کے جاری کردہ قوانین ہیں' یہ عجیب اور خارق عادت اور معجزہ صرف انسان کو نظر آتے ہیں۔انسانی محدود علم کے مطابق وہ معجزہ ہوگئے ہیں۔

لہٰذا ایسے خوارق کا ذکر پڑھ کر ہم نہ کوئی تردد کرتے ہیں اور نہ فضول تاویلات کرتے ہیں۔بشرطیکہ وہ روایات صحیح ہوں اور نصوص و روایات میں ایسی بات ہو جو معجزہ نظر آتی ہو اور لوگوں کے مالوف اور عادی طریقے کے برعکس ہو اور معجزہ ہو نیز یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اگر کوئی واقعہ انسانی مشاہدات کے مطابق ہو تو وہ کم اعجازی شان رکھتا ہے بمقابلہ اس واقعہ کے جو انسانی مشاہدے اور مالوف طریقے کے خلاف ہو' اور خارق عادت ہو۔کیونکہ وہ سنن الٰہیہ جو معروف و مشاہد ہیں' وہ بھی انسانی قدرت کے مقابلے میں معجزانہ شان رکھتی ہیں۔سورج کا طلوع و غروب ہر دن ہمارے مشاہدے میں ہے۔اور ہم اس کے عادی ہیں لیکن یہ نظام اپنی جگہ ایک معجزہ ہے۔ایک بچہ کی پیدائش نہایت ہی روٹین کی بات ہے۔ ہر وقت بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن بچے کی ولادت ایک بڑا معجزہ ہے۔اگر کوئی چاہے تو اس کا تجربہ کر لے۔اور پرندوں کا اس لشکر پر مسلط کیا جانا' چاہے وہ جو بھی پرندہ ہو' اور ان کے ذریعہ ایسے جراثیم اس لشکر کی طرف منتقل کیا جاتا جن سے چیچک اور خسرہ کی وبا پھوٹ پڑے اور یہ جراثیم ایک مخصوص وقت میں مخصوص جگہ پر پیدا کرنا جس پر ایک لشکر حملے کے لیے تیار ہو۔اس انداز کا واقعہ بھی ایک معجزہ ہے بلکہ یہ معجزہ اپنے اندر کئی معجزات رکھتا ہے اور اس سے اللہ کی تقدیر اور اس کی قدرت کی وسعت معلوم ہوتی ہے۔یہ معجزہ اس شکل کے معجزے سے کم نہیں جس میں کچھ مخصوص پرندے' مخصوص شکل کے پتھر اٹھائے ہوئے غول در غول آئیں' ایک مقررہ وقت میں لشکر پر حملہ آور ہوں اور وہ پتھر اس لشکر کے جسم میں معجزانہ نتائج پیدا کر دیں۔اگر حقیقت بین نظر سے دیکھا جائے تو دونوں صورتیں معجزانہ ہیں اور دونوں برابر کا اعجاز رکھتی ہیں۔

جہاں تک اس مخصوص واقعہ کا تعلق ہے تو ہماری رائے یہ ہے کہ یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو معمول کے مطابق نہیں ہے بلکہ خارق العادت اور غیر مالوف ہے۔اللہ نے غیر معمولی قسم کے پرندے بھیجے جو ابابیل تھے۔روایات میں ان کا حجم اور شکل اور صفات بھی بتائی گئی ہیں' لیکن ضروری نہیں ہے ایسی تمام روایات کو قبول کیا جائے۔کیونکہ ایسے مقامات پر مبالغہ کیا جاتا ہے اور بات کو خوفناک بتایا جاتا ہے۔بہرحال یہ پرندے غیر معمولی پتھر اٹھائے ہوئے تھے اور یہ جسموں پر غیر معمولی اثرات ڈالتے تھے۔

ہم اس واقعہ میں اس کے غیر معمولی ہونے کی طرف اس لیے مائل نہیں ہیں کہ اس صورت سے اللہ کی قدرت پر کچھ زیادہ روشنی پڑتی ہے یا حقیقت واقعہ میں کوئی عظمت پیدا ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ اس سورت کی فضا' واقعہ کے حالات میں یہ تفسیر زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ اس طرح اس گھر کی دھاک دلوں میں بٹھانا چاہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس گھر کی حفاظت اس لیے کرنا چاہتا تھا کہ یہ انسانوں کے لیے امن اور پناہ کی جگہ تھی اور اس کی اس حیثیت پر حرف نہ آئے۔اور اس لیے بھی کہ نبی آخرالزمان آنے والے تھے اور وہ اس دنیا کو ایک نئی نظریاتی سوسائٹی اور ایک نیا نظریہ دینے والے تھے اور اللہ کو منظور یہ تھا کہ یہ نیا عقیدہ مکہ سے آزادی کے ساتھ ترقی کرے اور نہایت آزادانہ فضا میں یہاں سے پھیلے اور کوئی خارجی قوت اس پر اثرانداز نہ ہو' اور یہاں کوئی ایسی بین الاقوامی قوت نہ ہو کہ وہ اس نئے عقیدے کو اس کے سرچشمے کے اندر ہی دبا دے اور گھیر لے۔اور اس لیے کہ یہ واقعہ سب لوگوں کے اور سب نسلوں کے لیے عبرت خیز ہو' اور قریش کو' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد' یہ بتایا جائے کہ دیکھو تم پر اس گھر کی وجہ سے اللہ کے کیا کیا احسانات ہوئے اور یہ کہ اس گھر کا نگران اللہ ہے' اس کی حرمت لازمی ہے اور اس واقعہ سے عبرت پکڑو۔ ان حالات میں مناسب یہی ہے کہ یہ واقعہ غیر معمولی ہو اور اس کے تمام اجزاء اور تمام عناصر غیر معمولی ہوں' فضا بھی غیر معمولی ہو تو ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ بتکلف اسے ایک معمولی واقعہ کی شکل میں پیش کریں۔

روایات میں اس واقعہ کے نتیجے میں جو اثرات بتائے گئے ہیں' وہ اثرات بالعموم چیچک اور خسرے کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوتے۔ اس واقعہ میں فوج اور اس کے کمانڈر کے اجسام ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور ان کے پورے پورے گر گئے۔اور سینہ پھٹ کر دل باہر آ گئے۔ یہ واقعات چیچک اور خسرے کی بیماری میں کب ہوتے ہیں اور خود سورت بتاتی ہے کہ اس واقعہ کے اثرات غیر معمولی تھے۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ (۱۰۵:۵) "ان کو جانوروں کے کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا"۔اس میں اس واقعہ کے غیر معمولی ہونے کی طرف براہ راست اشارہ ہے۔

عکرمہ کی روایت اور یعقوب ابن عتبہ نے جو بیان کیا وہ اس بارے میں منصوص نہیں ہے کہ ابرہہ کی فوج یا وہ چیچک یا خسرے سے ہلاک ہوا' ان روایات میں صرف یہ بات صراحت سے کہی گئی ہے۔کہ اسی سال عرب میں چیچک اور خسرہ کی وبا پہلی مرتبہ پھیلی۔ ان کے اقوال میں اس طرف اشارہ تک نہیں ہے کہ ابرہہ یا اس کا لشکر اس وبا میں مبتلا ہوا۔اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پرندے اور پھر ان جراثیم کو صرف ابرہہ اور اس کے لشکر کی طرف منتقل کر رہے تھے اور یہ جراثیم عرب کے باشندوں پر اثر نہ ڈالتے تھے تو یہ بات بذات خود ایک خارق عادت معجزہ بن جاتی ہے۔اگر اس تاویل کے بعد بھی صورت معجزہ ہی کی رہ جاتی ہے تو پھر اس معجزے کو ایک معمولی اور مالوف واقعہ کی شکل دینے کے تکلف کی ضرورت کیا ہے۔ محض اس لیے کہ یہ لوگوں کے فہم کے اندر آ جائے۔ حالانکہ واقعہ کا ماحول اور پس منظر یہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ معجزہ ہو۔

ہم ان حالات اور محرکات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جن کا دباؤ اس عقلی مکتب فکر پر تھا' جس کے صدر نشین ایک دور میں استاد محمد عبدہ تھے۔ان محرکات کی وجہ سے اس مکتب فکر نے قرآن مجید کی تفسیر میں اور اسلامی تاریخ کی تعبیر میں خارق

عادت واقعات اور معجزات کے دائرے کو محدود کرنے کی کوشش کی ۔ ان حضرات کی کوشش یہ تھی کہ ان معجزات اور واقعات کو ان قوانین قدرت کے مطابق بنایا جائے جو اس کائنات میں جاری ہیں ۔ اس دور میں عامۃ المسلمین کے ذہنوں پر عجیب و غریب خرافات چھائے ہوئے تھے اور کتب تفسیر اور اسلامی تاریخ اسرائیلی خرافات سے بھری پڑی تھی ' اور یہ دور ایسا تھا کہ اس میں سائنس اور جدید انکشافات کا فتنہ اپنے عروج پر تھا اور لوگ دین کی اساسیات میں بھی شک کرنے لگے تھے اور فتنہ تشکیک اپنے عروج پر تھا ۔ اس مکتبہ فکر کی پالیسی یہ تھی کہ دین کو عقل کے مطابق بنا کر عوام الناس میں دین پر اعتماد از سرنو بحال کیا جائے ۔ اس لیے ان لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ دین کو خرافات سے پاک کیا جائے ۔ پھر ان لوگوں نے مسلمانوں کے اندر ایک ایسی فکر پیدا کی جس کے نتیجے میں مسلمان اس کائنات میں جاری و ساری سنن الہیہ کو بھی سمجھنے لگے اور یہ بھی سمجھنے لگے کہ یہ سنن الہیہ اٹل ہیں ۔ اور جس طرح انسانی حرکات و سکنات ان سنن الہیہ کے تابع ہیں اسی طرح اس کائنات کے عظیم الجثہ کرات کی حرکات بھی انہی قوانین کے مطابق ہیں ۔ اور یہ فہم اور یہ شعور قرآن کریم کے عین مطابق ہے ۔ کیونکہ پورے قرآن میں لوگوں کو بار بار اس طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ ان قوانین فطرت پر غور کریں جو اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہیں اور اٹل ہیں ۔ ان کے اندر تسلسل ہے اور تمام منفرد اور بکھرے ہوئے واقعات ان سنن کے مطابق ہیں ۔

اگرچہ اسی مدرسہ فکر پر ایک طرف سے خرافات کا دباؤ تھا ' دوسری طرف سے سائنسی خرافات کا دباؤ تھا ' لیکن اس دو طرفہ دباؤ کی وجہ سے یہ مدرسہ بھی توازن قائم نہ رکھ سکا اور اس کے اوپر کچھ برے اثرات بھی پڑے ۔ یہ مدرسہ بہت محتاط ہو گیا اور انہوں نے یہ قرار دیا کہ وہ سنن الہیہ جن کو انسانوں نے سمجھ لیا ہے وہ کلی ہیں اور ان کے اندر استثناء ممکن نہیں ہے ۔

چنانچہ استاد محمد عبدہ ' ان کے شاگرد استاد سید رشید رضا اور استاد شیخ عبدالقادر مغربی کی تفاسیر میں عام روش یہ اختیار کی گئی کہ جس قدر معجزات و خوارق عادت قرآن میں مذکور تھے ان کی ایسی تاویلات اور تعبیرات کی گئیں کہ وہ سائنس اور عقل انسانی کے مطابق ہو جائیں اور ایسے واقعات ہو جائیں جو معمول کے مطابق ہوتے ہیں اور انہوں نے بعض معجزات کی ایسی تفسیر کرنے کی کوشش کی کہ وہ معقول بن جائیں ۔ غرض انہوں نے تمام غیبی حقائق سے مکمل اجتناب کیا اور اس سلسلے میں سخت احتیاط سے کام لیا ۔

ہم اس بات کو بھی سمجھتے ہیں کہ اس مکتب فکر نے کن عوامل کے تحت یہ روش اختیار کی اور اس کی قدر بھی کرتے ہیں ۔ لیکن ہم اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس مکتب فکر نے مبالغے سے کام لیا اور قرآن کریم کے ایک دوسرے اٹل فیصلے کو نظر انداز کر دیا کہ اللہ کی مشیت بے قید ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ اور اللہ کی قدرت ان قوانین پر بھی حاوی ہے جو خود اللہ نے اس کائنات میں جاری کیے ۔ اللہ کی مشیت کی یہ بے قیدی اور یہ آزادی اس بات کی نفی کرتی ہے کہ عقل کوئی آخری حاکم اور سپریم جج ہے اور عقل کی معقولات ہی آخری معیار ہیں ۔ اگر کوئی بات ان معقولات کے خلاف ہے تو وہ قابل استرداد ہے اور اس کی تاویل ضروری ہے جیسا کہ ان حضرات کی تفاسیر اس روش سے اٹی پڑی ہیں ۔

نیز اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ اللہ کی سنن صرف ان سنن تک محدود نہیں ہیں جن کو تمہاری عقل نے ادراک کر لیا ہے ۔ جن سنن الہیہ کو انسان نے سمجھا ہے وہ قوانین قدرت کا نہایت ہی معمولی حصہ ہیں ۔ اللہ کے

قوانین قدرت جو ہمیں معلوم ہیں اور جو معلوم نہیں (معجزات) دونوں دراصل اللہ کی قدرت پر دال ہیں اور اللہ کے نظام قضا و قدر کی دقت اور شمول پر دلیل ہیں۔ہمیں چاہئے کہ ہم نہایت احتیاط سے کام لیں اور خرافات اور قصے کہانیوں کی نفی بھی اعتدال سے کریں۔کسی خاص معاشرے میں پائے جانے والے مروج افکار سے متاثر نہ ہوں اور نہ کسی دور میں مروج اور قبول عام رکھنے والے افکار کو بے سوچے سمجھے قبول کریں۔

اس قسم کی قرآنی آیات کی تفسیر کے لیے ایک محفوظ اصول و انداز ہے۔مناسب ہے کہ یہاں اس کی وضاحت کر دی جائے۔ وہ یہ کہ ہمیں کسی آیت پر اس طرح غور نہیں کرنا چاہئے کہ ہم پہلے اپنے ذہنوں میں کچھ اصول طے کرلیں' کچھ عوامی سوچوں کو قبول کرلیں اور ان موضوعات پر اپنے طور پر فیصلے کرلیں اور پھر آیات میں تاویل کریں بلکہ ہماری روش یہ ہونی چاہئے کہ ہم خالی الذین ہوکر قرآنی آیات سے نتائج اخذ کریں۔ان آیات سے ایمان اور عقیدہ اخذ کریں اور ان آیات سے اپنی فکر اور اپنی سوچ اور اپنا ادراک اخذ کریں۔اگر ان آیات میں کوئی بات طے شدہ ہو تو اسے طے شدہ سمجھیں۔یہ اس لیے کہ جس چیز کو ہم عقل انسانی سمجھتے ہیں اور قرآنی اور تاریخی اور کائناتی واقعات کو اس کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں یہ تو انسان کے محدود تجربات کا نتیجہ ہے اور نہایت غیر یقینی چیز ہے۔

یہ عقل اگرچہ ایک مطلق قوت ہے اور یہ انفرادی واقعات و تجربات کے اندر محدود نہیں ہے۔بلکہ عقل ان انفرادی واقعات سے ماوراء ایک مجرد حقیقت ہے لیکن یہ مجرد عقل بھی بہرحال ہمارے محدود وجود کے اندر ہی کی حقیقت ہے اور ہمارا وجود محدود اور مقید ہے۔اصل وجود باری تعالیٰ کا ہے جو غیر محدود اور لا انتہا ہے۔اور یہ قرآن اس اصل وجود کی طرف سے نازل ہوا ہے۔لہٰذا اصل حاکم وجود مطلق اور اس کا قرآن ہے۔اور قرآن جو فیصلے کر دے ہمارا مقام یہ ہے کہ ہم اپنے فیصلے اور اپنے عقلی فیصلے قرآن سے اخذ کریں۔اس لیے یوں کہنا درست نہیں ہے کہ اس نص کا مفہوم عقل سے متصادم ہے لہٰذا اس کی تاویل ضروری ہے۔اور اس قسم کی عبارات اس مکتب فکر کے لوگوں کے کلام میں بہت سی ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم ہروہم اور ہر کہانی اور تمام خرافات کے سامنے سپرانداز ہو جائیں۔ہمارا مطلب یہ ہے کہ عقل قرآن کے فیصلوں کو پرکھنے کے لیے معیار نہیں ہے۔جب قرآن کریم کا مفہوم اور اس کی تعبیر واضح اور سیدھی ہو' تو پھر یہ آیت ہی فیصلہ کرے گی کہ ہماری عقل اس کو کس طرح سے اخذ کرے اور کس طرح ہم اس آیت کی روشنی میں اپنے تصورات کے اصول وضع کریں اور ہمارا علم الکلام اس کی روشنی میں کس طرح وضع ہو' اور پھر تمام کائناتی حقائق کے بارے میں قرآنی منطق اور قرآنی طرز استدلال کو کس طرح متعین کیا جائے۔

اب ہم سورۂ فیل اور اس میں بیان کردہ قصے کے مدلولات کی طرف آتے ہیں۔

--- ○○○---

درس نمبر ۳۰۵ تشریح آیات

۱-- تا-- ۵

آیاتہا ۵ سورۃ الفیل مکیۃ رکوعہا ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ
تَضْلِيْلٍ ۝ وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ
ا سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝
ع ۵
۳۰

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو ان کے اوپر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے، پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے (جانوروں کا) کھایا ہوا بھوسا"۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (۱۰۵: ۱) "تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟" یہ سوالیہ انداز تعجب انگیزی کے لیے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ عجیب واقعہ تھا، اور اس میں بہت بڑی عبرت ہے اور اس میں عظیم معانی پوشیدہ ہیں۔ یہ واقعہ عربوں میں معروف و مشہور تھا۔ بلکہ اس واقعہ سے عربوں میں کیلنڈر شروع ہو گیا تھا اور یہ اہم تاریخ بن گیا تھا۔ لوگ کہتے فلاں واقعہ ہاتھی والوں کے سال ہوا، اور فلاں واقعہ عام الفیل سے دو سال پہلے ہوا۔ اور فلاں واقعہ عام الفیل کے دس سال بعد واقع ہوا۔ اور مشہور روایت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش بھی عام الفیل میں ہوئی اور یہ تقدیر کے فیصلوں کے مطابق عجیب اتفاق تھا۔

غرض اس سورت میں کوئی ایسا واقعہ بیان نہ ہوا تھا جسے وہ نہ جانتے ہوں۔ یہ ایک واقعہ تھا جو ان کے علم میں تھا اور قرآن نے ان کو یاد دلایا۔ اور مقصد اگلی جانب کی طرف متوجہ کرنا تھا۔

اس کے بعد کا فقرہ بھی سوالیہ ہے لیکن استفہام تقریری ہے، یعنی ایسا سوال جس کا جواب اثبات میں ہوتا ہے۔

اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ (۱۰۵ : ۲) "کیا اس نے اس کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا" ۔ یعنی ان کے مکر و تدبیر کو اس طرح بے راہ نہیں کر دیا کہ وہ نشانے پر نہ لگے اور اپنی منزل تک نہ پہنچے ۔ اسی طرح جس طرح ایک انسان راہ گم کر دے اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ قریش کو یاد دلاتا ہے کہ اس نے ان پر انعام و احسان کیا ۔ ان کی حمایت کی اور اس گھر کو بچایا اور اس وقت بچایا جب وہ خود ابرہہ کے لشکر جرار کا سامنا کرنے سے قاصر تھے ۔ شاید کہ وہ شرم کریں اور اس ذات باری کا انکار نہ کریں ۔ جس نے ان کی مدد نہایت کمزوری اور عاجزی کی حالت میں کی تھی ۔ ان کا کردار اس وقت بعینہ اسی طرح کا ہے جس طرح ابرہہ کا تھا ۔ وہ مکہ کے مٹھی بھر مسلمانوں کو اپنے غرور اور قوت کے بل بوتے پر روند ڈالنا چاہتے تھے ۔ ان کو چاہئے کہ ذرا اس زور آور کا حال یاد کریں جس نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تھی اور اس کی حرمت کو پامال کرنے کا ارادہ کر لیا تھا ۔ اللہ یہ طاقت رکھتا ہے کہ جس طرح اس نے بیت اللہ کو بچایا' اسی طرح اس کی دعوت کو لے کر چلنے والی حزب اللہ کو بھی بچائے ۔

سوال یہ ہے کہ اللہ نے پھر ان کی مکاری کو کس طرح گمراہ اور خطا کر دیا' تو اس کی تصویر کشی بھی قرآن کریم نہایت خوبصورت انداز میں کرتا ہے ۔

وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ (۳) تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ (۴) فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ (۵) (۱۰۵ : ۳ تا ۵) "اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو ان کے اوپر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے' پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے (جانوروں کا) کھایا ہوا بھوسا" ۔

اَبَابِيْلَ (۱۰۵ : ۳) کے معنی جھنڈ کے ہوتے ہیں ۔

سِجِّيْلٍ (۱۰۵ : ۴) فارسی سے معرب ہے اور دو لفظوں سے مرکب ہے "سنگ گل" یعنی مٹی کو پکا کر اس سے پتھر بنا دیا گیا تھا' یا ایسے پتھر تھے جو کیچڑ کے ساتھ آلودہ تھے ۔

كَعَصْفٍ (۱۰۵ : ۵) کے معنی ہیں درختوں کے خشک پتے ۔ عصف کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ ماکول ہے ۔ یعنی کھایا ہوا' ہے یعنی پتوں کی حالت یہ ہے کہ ان کو حشرات الارض نے کھا کر پیس دیا ہے' یا حیوانات نے چبا کر ریزہ ریزہ کر دیا اور پیس دیا ہے ۔ یہ ایک حسی تصویر کشی ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرندوں کے جھنڈ ان پر پتھر مارتے تھے تو ان کے اجسام ریزہ ریزہ ہو جاتے تھے ۔ لہذا ایسی تاویلات کی ضرورت نہیں ہے کہ چیچک یا خسرے کی وجہ سے ان کے اجسام ریزہ ریزہ ہو گئے ۔

اس واقعہ میں جو حقائق بیان ہوئے وہ کئی زاویوں سے ہمارے لیے عبرت انگیز اور بصیرت افروز ہیں :

(۱) اس سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ وہ اپنے گھر کی حمایت اور اس کا بچاؤ مشرکین کے ذریعہ انجام دے ۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو اس گھر کی طرف منسوب کرتے تھے' وہ اسے بچانے کی کوشش بھی کرتے اور اس میں پناہ بھی لیتے ۔ جب اللہ نے ارادہ کیا کہ وہ اس گھر کو بچائے اور اس کی حفاظت کرے

اور اس کی حمایت کا اعلان کرے اور اس گھر پر غیرت کرے' تو اللہ نے مشرکین مکہ کی حالت اس طرح کر دی کہ وہ اس جارح قوت کے سامنے بے بس ہو جائیں اور قدرت الٰہیہ بالکل عیاں ہو کر اپنے گھر کی حفاظت کرے جو ایک محترم گھر ہے تاکہ بیت اللہ کی حفاظت میں مشرکین کا کوئی تاریخی کردار نہ ہو۔ جس کے تحت حمیت جاہلیت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ یہ نکتہ اس بات کو بھی ترجیح دے دیتا ہے کہ اس حملہ آور لشکر کی ہلاکت میں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی اور معجزانہ انداز اختیار کیا۔ اور ان کی ہلاکت میں کوئی عام مالوف طریقہ اختیار نہ کیا گیا تھا۔ یہ بات زیادہ مناسب اور قرین قیاس ہے۔

خانہ کعبہ کی حمایت میں اس کھلی مداخلت کا تقاضا یہ تھا کہ قریش اور بیت اللہ کے اردگرد پھیلے ہوئے عرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد خود اسلام میں داخل ہوتے اور بیت اللہ کی خدمت اور فوقیت پر فخر نہ کرتے اور بیت اللہ کے اردگرد انہوں نے بت پرستی کا جو جال پھیلا رکھا تھا وہ ان کے اسلام میں داخل ہونے کے لیے مانع نہ ہوتا مگر افسوس کہ انہوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں اس حادثہ کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ اہل قریش کو شرمندہ کیا جائے اور یہ گویا ان پر تنقید ہے اور ان کے معاندانہ موقف پر تعجب کا اظہار ہے کہ کیوں نہ انہوں نے اس واقعہ سے کوئی عبرت لی۔

(۳) اس سے تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ نے اہل کتاب' ابرہہ اور اس کے لشکر کو توفیق نہ دی کہ وہ اس گھر کو گرا سکیں اور اس مقدس سرزمین پر اپنی حکومت قائم کر سکیں۔ اگرچہ اس کے پاسی مشرک ہوں اور اگرچہ اس گھر کے متولی بھی مشرک ہوں' تاکہ یہ گھر کسی بھی استعماری قوت کے تسلط سے آزاد رہے۔ اس علاقے میں کوئی بیرونی سازش کارفرما نہ ہو۔ اور اس سرزمین کی آزادی محفوظ ہو تاکہ اللہ کی تقدیر میں یہاں سے جو جدید دین اور جدید نظریہ اٹھنے والا تھا وہ آزادی کی فضا میں نمودار ہو۔ اس پر کسی حکومتی اقتدار کا دباؤ نہ ہو۔ اور کوئی بیرونی ڈکٹیٹر یہاں سرکشی نہ کر سکے اور کوئی دین اس دین سے برتر نہ ہو جو تمام ادیان کو اپنی گرفت میں لینے والا تھا اور جو پوری انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ اپنے ہاتھ میں لینے والا تھا۔ جو تمام انسانوں پر اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کرنے والا تھا' جو پوری انسانیت کی رہنمائی کرنے والا تھا' کسی سے رہنمائی لینے والا نہ تھا۔ یہ تھی اللہ کی تدبیر نبی آخر الزمانؐ اور آپؐ کے دین کے لیے۔ یہ بات اس وقت ہو رہی تھی' جب کہ لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ اس نئے دین کا قائد اسی سال پیدا ہو گیا ہے۔

آج عالمی صلیبیت اور عالمی صیہونیت مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کو نہایت فاجرانہ اور لالچی نظروں سے دیکھتے ہیں اور ان کے ان مکارانہ منصوبوں کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں' لیکن اس سورت سے ہمیں جو اشارات ملتے ہیں ان سے ہمیں ایک گونہ اطمینان نصیب ہو جاتا ہے کہ اسلام کے مقامات مقدسہ کے خلاف ان کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جس اللہ نے اپنے گھر کو اہل کتاب سے اس وقت بھی بچایا جب اس کے متولی اور مجاور مشرک تھے تو وہ اس کی حفاظت آج بھی کرے گا۔ اسی طرح اللہ اپنے نبی کے شہر کو بھی ان سازشوں اور للچائی ہوئی مکارانہ نظروں سے بچائے گا۔

(۴) چوتھی بات یہ کہ اس کرۂ ارض پر ماضی میں عربوں کا کوئی قابل ذکر کردار نہ تھا بلکہ اسلام سے قبل ان کا کوئی

وجود ہی نہ تھا۔ یمن میں وہ اہل فارس اور حبشیوں کے غلام تھے۔ اگر کہیں جنوبی عرب میں ان کی کوئی حکومت قائم بھی ہوئی تو وہ ایرانیوں کے زیر انتداب تھی۔ شمال میں شام کا علاقہ رومی مملکت کے تحت تھا۔ یہ علاقہ یا تو براہ راست رومی سلطنت کے تحت ہوتا یا وہ یہاں اپنے زیر حمایت کوئی عربی سلطنت قائم کرتے۔ صرف جزیرۃ العرب کا قلب ہی ایسا علاقہ تھا جو کسی غیر حکومت کے اثر ورسوخ سے پاک تھا لیکن اس علاقے کا کوئی عالمی کردار نہ تھا۔ یہ ایک پسماندہ بدوی علاقہ تھا۔ اس علاقے میں جب قبائلی جنگ چھڑ جاتی تو یہ چالیس چالیس سال تک جاری رہتی۔ اس انتشار کی وجہ سے ان علاقوں کے باشندوں کی کوئی وقعت قریبی ممالک کے ہاں نہ تھی۔ ان کی جو جنگی حیثیت تھی اس کا اظہار ہاتھی والوں کی مہم کے دوران ہو گیا تھا کہ وہ کسی بیرونی حملہ آور کے مقابلے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔

عربوں کو عالمی کردار ادا کرنے کا موقعہ، سب سے پہلے اسلام کے جھنڈے تلے نصیب ہوا۔ ان کی ایک ایسی عالمی مملکت وجود میں آئی جس کی کوئی حیثیت تھی اور لوگ اس کا شمار بھی کرتے تھے۔ یہ دراصل سیلاب کی طرح ایک عالمی انقلاب تھا۔ اس انقلاب میں کئی مملکتیں بہہ گئیں، کئی تخت گر گئے اور انسانیت کی قیادت کا مقام عربوں کو حاصل ہو گیا۔ یہ اس وقت ہوا جب اس کرۂ ارض پر سے گمراہ اور کھوئی قیادتوں کے اختیارات زائل کر دیئے گئے۔ سوال یہ ہے کہ عربوں کو یہ مقام کب اور کیوں حاصل ہوا؟ یہ مقام انہیں اس وقت حاصل ہوا جب انہوں نے اس بات کو بھلا دیا کہ وہ عرب ہیں۔ انہوں نے علاقائی، نسلی اور لسانی عصبیت کے نعروں کو بھلا دیا۔ انہوں نے صرف اس بات کو یاد رکھا کہ وہ مسلم ہیں اور صرف مسلم ہیں۔ انہوں نے صرف اسلام کے جھنڈے بلند کیے اور وہ ایک عظیم نظریہ حیات لے کر اٹھے اور اسے تمام انسانوں تک پہنچا دیا۔ وہ انسانیت کے لیے رحم اور اس کے لیے بھلائی کے حامل بن گئے۔ انہوں نے نہ قومیت کا نعرہ بلند کیا، نہ نسلی عصبیت کا، بلکہ وہ ایک آسمانی ہدایت پر مبنی فکر لے کر اٹھے اور اسے ایک آسمانی ہدایت کے طور پر لوگوں تک پہنچایا۔ انہوں نے دین اسلام کو ایک دنیاوی مذہب اور دنیاوی نظریہ کے طور پر نہ لیا جس سے ان کا مقصد صرف یہ ہو کہ دنیا کی اقوام کو اپنا غلام بنا دیں۔ وہ عرب سے باہر صرف جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلے، ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ کوئی عربی امپیریلزم قائم کر دیں، تاکہ اس کے زیر سایہ اس زمین پر خوب پھریں اور چگیں۔ ان کی ناک اونچی ہو، اور وہ دنیا میں اس شہنشاہیت کی وجہ سے بڑے بن جائیں اور لوگوں کو رومیوں اور فارسیوں کی حکومت سے نکال کر عربوں کی حکومت میں داخل کر دیں بلکہ وہ اس لیے اٹھے تھے کہ لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ وحدہ کی بندگی میں داخل کریں۔ جیسا کہ یزدگرد کی مجلس میں مسلمانوں کے نمائندے حضرت ربعی ابن عامر نے کہا۔ ”اللہ نے ہمیں اس لیے اٹھایا ہے کہ ہم لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں۔ اور دنیا کی تنگ دامنی سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں داخل کر دیں اور عوام کو دوسرے ادیان کے ظلم سے نکال کر اسلام کے انصاف میں داخل کریں“۔

یہ وہ وقت تھا جب دنیا میں عربوں کا وجود قائم ہوا، ان کو قوت ملی، ان کی قیادت قائم ہوئی، لیکن یہ دعوت اللہ کے لیے تھی اور یہ جہاد اللہ کی راہ میں تھا۔ یہ قوت ایک عرصہ تک قائم رہی، ایک زمانے تک وہ انسانیت کے قائد رہے، جب تک کہ وہ اپنے طریقے پر قائم رہے۔ جب انہوں نے اسلامی نظریہ حیات سے انحراف کیا اور وہ قومی عصبیت کے داعی بنے اور انہوں نے اللہ کے جھنڈے بلند کرنے کی بجائے عصبیت کے جھنڈے اٹھا لیے، تو زمین نے ان کو پرے پھینک دیا،

اقوام عالم نے انہیں روند ڈالا کیونکہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا تو اللہ نے ان کو چھوڑ دیا اور جس طرح انہوں نے اللہ کو بھلایا اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا۔

سوال یہ ہے کہ اسلام کے سوا عربوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اگر وہ اسلامی عقیدہ' اسلامی تصورات اور افکار کو ایک طرف رکھ دیں تو ان کے پاس کیا چیز ہے جو وہ انسانیت کے سامنے پیش کر سکتے ہیں؟ اور اگر کسی قوم کے پاس انسانوں کے لیے کوئی پیغام نہیں ہے تو وہ قوم ہی کیا ہے؟ تاریخ عالم گواہ ہے کہ جن اقوام نے کبھی انسانیت کی قیادت کی' ان کے پاس ایک فکر تھی' ایک پیغام تھا جو انہوں نے انسانیت کو دیا۔ جن اقوام کے پاس کوئی پیغام نہ تھا مثلاً تاتاری' جنہوں نے پورے مشرق کو روند ڈالا اور بربر جنہوں نے عالم عرب پر سے رومیوں کی سلطنت کو ختم کیا۔ یہ لوگ طویل عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے' بلکہ یہ ان اقوام ہی کے اندر پگھل گئے جن کو انہوں نے فتح کیا تھا۔ یاد رہے کہ عربوں نے انسانیت کو جس نظریہ سے نوازا وہ فقط اسلامی نظریہ حیات تھا۔ اس نظریہ کی وجہ سے وہ عالمی قیادت کے منصب پر فائز ہوئے۔ جب انہوں نے اس نظریہ کو پس پشت ڈال دیا تو اس کرۂ ارض پر ان کا کوئی کام ہی نہ رہا۔ تاریخ سے ان کا کردار ختم ہو گیا۔ آج عرب اگر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اس سبق کو یاد رکھیں۔ اگر وہ قوت اور قیادت چاہتے ہیں ورنہ ان کی کوئی حیثیت قائم نہیں ہو سکتی۔ اللہ ہی ہے جو گمراہوں کو ہدایت دے سکتا ہے۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۂ قریش ـ ۱۰٦

۱ -- تا -- ۴

درس نمبر ۳۰۶ تشریح آیات

۱ ـ ـ تا ـ ـ ۴

سُوْرَةُ قُرَيْشٍ (۱۰۶) مَكِّيَّةٌ (۲۹)
آیاتها ۴ — رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ ﴿۲﴾ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا
۱ الْبَيْتِ ﴿۳﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ۬ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾
ع۴
۳۱

”چوں کہ قریش مانوس ہوئے (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس ' لہٰذا ان کو چاہئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچاکر کھانے کو دیا اور خوف سے بچاکر امن عطا کیا“۔

خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد ' جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے سامنے دست بدعا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی ۔ دعا یہ تھی :

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (۲ : ۱۲۶) ”اے میرے رب ' اس شہر کو امن کا شہر بنادے اور اس کے باشندوں کو پھلوں کی روزی دے“۔ تو اللہ نے اس گھر کو امن کا گھر بنا دیا اور ڈکٹیٹروں اور جباروں کے تسلط سے آزاد رکھا ۔ جو شخص بھی اس گھر میں پناہ لیتا وہ امن پاتا اور اس کے اردگرد جو اقوام و افراد رہتے تھے ' وہ ہروقت خائف رہتے تھے اور اس گھر کو یہ اعزاز اس وقت بھی حاصل رہا جب اس کے باسیوں نے بت پرستی شروع کر دی ۔ شرک کا ارتکاب شروع کیا اور اپنے رب کے ساتھ ساتھ انہوں نے خانہ کعبہ میں بت بھی رکھ دیے اور یہ اعزاز اللہ نے اس لیے بحال رکھا کہ اس گھر سے اللہ نے کچھ کام لینا تھا ۔

پھر جب اصحاب الفیل نے اس گھر کو منہدم کرنے کا ارادہ کر لیا جس کی تفصیلات سورت الفیل میں گزر گئی ہیں ' اللہ نے اس گھر کے امن کی حفاظت فرمائی اور اس کے احترام کو بحال رکھا جبکہ اس کے ماحول میں لوگوں کی حالت یہ تھی ۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (۲۹ : ۶۷) ”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک ایسا حرم بنایا ہے جو امن کی جگہ ہے ' جبکہ لوگوں کو اس کے گرد و پیش سے اچک لیا

جاتا ہے"۔ جب فیل کا واقعہ ہوا تو عربوں کے دلوں میں بیت اللہ کا احترام بڑھ گیا۔ اور اس بات کا پورے جزیرۃ العرب میں غلغلہ ہو گیا۔ اسی طرح اس واقعہ کی وجہ سے اہل مکہ اور بیت اللہ کے مجاوروں کا احترام بڑھ گیا اور اس وجہ سے وہ نہایت امن و امان کے ساتھ پورے عرب میں چلتے پھرتے۔ اور یہ جہاں بھی ٹھہرتے لوگ ان کی رعایت اور احترام کرتے۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے قافلوں کے لیے دو عمومی راستے بنا لیے۔ یہ راستے مکہ سے شمال کی طرف شام تک جاتے اور مکہ سے جنوب کی طرف یمن تک جاتے' اہل مکہ نے دو تجارتی سفر بھی منظم کر لیے۔ سردیوں کے موسم میں وہ یمن کے سفر پر جاتے اور گرمیوں کے موسم میں یہ شام کی طرف نکل جاتے۔

باوجود اس امر کے جزیرۃ العرب کے اطراف و اکناف میں امن و امان کی حالت کچھ اچھی نہ تھی' ڈاکے اور لوٹ مار ہر طرف عام تھے' لیکن بیت اللہ کے احترام کی وجہ سے قریش کے یہ تجارتی سفر پر امن رہتے اور یہ قریش کی ایک ممتاز خصوصیت ہو گئی تھی۔ اور اس وجہ سے ان کے سامنے رزق کے وسیع ذرائع کھل گئے تھے۔ اور وہ نہایت اطمینان سے اور امن و سلامتی سے یہ تجارتی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ قریش ان مفید اور نفع بخش سفروں کے عادی ہو گئے تھے۔ اور وہ ان کے بغیر چین سے نہ بیٹھتے تھے۔

جس طرح بعثت نبویؐ کے بعد واقعہ فیل کو بطور احسان ان کے سامنے پیش کیا گیا' اس طرح اس سورت میں بتایا گیا کہ یہ بھی اللہ کا احسان ہے کہ تم سردیوں اور گرمیوں کے سفر کے عادی ہو گئے ہو' اور ان سفروں سے تمہیں بہت تجارتی نفع ہوتا ہے۔ ان کا علاقہ بنجر اور خشک ہے اور وہ اس کے اندر نہایت ہی خوش گوار اور خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے اور اس فضل و کرم ہی کی وجہ سے وہ خوف سے مامون ہیں۔ چاہے وہ بیت اللہ کے جوار میں اپنے گھروں میں ہوں یا وہ اپنے سفر میں ہوں' اس گھر کے احترام کی وجہ سے وہ ہر قسم کی زیادتی اور ظلم سے محفوظ ہیں۔

اللہ اپنا یہ احسان ان کو یاد دلاتا ہے کہ وہ حیا کریں اور اس گھر میں اللہ کے سوا' اس کے اور شریکوں اور بتوں کی بندگی نہ کریں کیونکہ یہ گھر اس کا ہے' وہی رب ہے اور اسی نے اس گھر کو امن دیا ہے جس کے اندر وہ مزے سے رہتے ہیں' اس گھر کے نام سے ان کے سفر محفوظ ہیں اور سفروں سے یہ صحیح سالم گھروں کو لوٹتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قریش چونکہ گرمیوں اور سردیوں کے سفر کے عادی ہو گئے ہیں تو انہیں چاہئے کہ صرف اس گھر کے رب کی بندگی کریں جس نے ان سفروں کے دوران ان کے امن و امان کا بندوبست کیا اور انہیں اس سفر کا عادی بنایا جس کی وجہ سے انہیں مالی مفادات ملتے ہیں۔

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ (۳) الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ (۱۰۶ : ۴) "لہٰذا ان کو چاہئے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا"۔ ان کی زمین کی پیداوار کی جو حیثیت ہے' اس کے مطابق ان کی حالت تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ وہ بھوک سے مرتے' لیکن اللہ نے ان کے لیے کھانے پینے کا بندوبست فراوانی سے کیا اور وہ پیٹ بھر کر کھانے لگے۔

وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۱۰۶ : ۴) "اور خوف سے بچا کر انہیں امن دیا"۔ ان کی جو جنگی قوت تھی' ان کے ارد گرد جو سوسائٹی تھی' اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ ہر وقت خائف رہتے لیکن اللہ نے ان کا یہ خوف امن سے بدل دیا۔

یہ ایک ایسی یاد دہانی ہے جس کی وجہ سے انسان کے اندر حیا پیدا ہوتی ہے' وہ شرمندہ ہوتا ہے اور اپنے رویے پر نظر ثانی کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ قریش یہ بات جانتے تھے کہ اس گھر کی اہمیت کیا ہے اور اس گھر کے احترام کی وجہ سے ان کی زندگی پر جو اثرات تھے وہ ان سے بھی بے خبر نہ تھے۔ اور یہ بات بھی اپنی جگہ تھی کہ انتہائی شدید اور کربناک حالات میں وہ صرف اس گھر کے رب ہی کو پکارتے تھے۔ مثلاً دیکھیے کہ عبدالمطلب ابرہہ کا مقابلہ فوج سے نہیں کرتے اور نہ اس کی قوت کے مقابلے میں مادی قوت فراہم کرتے ہیں۔ وہ اس گھر کے رب سے خطاب کرتے ہیں' جو اس کا حقیقی متولی اور حامی تھا۔ اس موقعہ پر عبدالمطلب نے نہ کسی بت کی طرف توجہ کی اور نہ کسی معبود کی طرف اور نہ انہوں نے ابرہہ سے یہ کہا کہ اس گھر کے بت سے الٰہ ہیں وہ اس کی حمایت کریں گے۔ بلکہ انہوں نے یہ کہا "میں تو اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر کا ایک مالک ہے' وہ خود اس کی حفاظت کرے گا"۔ لیکن جاہلیت پر کبھی منطق اور حقیقت کا اثر نہیں ہوا کرتا۔ اور نہ جاہلیت حق کو تسلیم کرتی ہے اور نہ وہ معقول بات کی طرف لوٹتی ہے۔

یہ سورت' اپنے موضوع اور فضا کے اعتبار سے سورت فیل کا تسلسل ہے۔ اگرچہ یہ مستقل سورت ہے اور دونوں کے درمیان مصاحف میں بسم اللہ الرحمان الرحیم درج ہے۔ قرآن کی ترتیب نزولی سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ الفیل اور سورہ القریش کے درمیان ۹ سورتیں نازل ہوئیں' لیکن مصحف میں ان کو ایک دوسرے کے ساتھ اس لیے پیوست کیا گیا ہے کہ اس میں موضوع و مضمون کی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الماعون ۔ ۱۰۷

۱-- تا-- ۷

سورۃ الماعون ایک نظر میں

بعض روایات کے مطابق یہ سورت مکی ہے اور بعض کے مطابق مکی اور مدنی ہے۔ (پہلی تین آیات مکی ہیں اور باقی مدنی ہیں) میرے خیال میں یہ راجح بات ہے۔ اگرچہ مضمون کے اعتبار سے سورت ایک ہی یونٹ ہے۔ اس کا روئے سخن بھی ایک ہی طرف ہے اور اس میں اسلامی نظریہ حیات کا ایک عمومی اصول بیان کیا گیا ہے۔ اسلامی نظریہ حیات کا یہی اصول ہے جو ہمیں آمادہ کرتا ہے کہ ہم اس سورت کو مدنی سمجھیں۔ کیونکہ اس میں جو اصول بیان ہوا ہے وہ مدنی موضوعات میں سے ہے۔ یعنی نفاق اور ریاکاری سے اجتناب یاد رہے کہ جن روایات میں آیا ہے کہ یہ مکی ہے۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ہم اس کی آخری چار آیات کو مدنی نہ تصور کریں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون اور موضوع کی مناسبت سے ان کو ان کے ساتھ ملا دیا گیا ہو۔ نزول کے بارے میں اس قدر کافی ہے۔ اب ہم موضوع مضمون کی طرف آتے ہیں اور اس عظیم حقیقت پر بات کرتے ہیں جو اس میں بیان کی گئی ہے۔

--- ○○○---

درس نمبر ۳۰۷ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۷

آیاتها ۷ — سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ (۱۰۷) مَكِّيَّةٌ (۱۷) — رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝۱ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝۲ وَلَا يَحُضُّ
۱ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝۴ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ
۷ ع سَاهُوْنَ ۝۵ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝۶ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝۷
۳۲

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

''تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں''۔

یہ چھوٹی سی سورت جو صرف سات آیات پر مشتمل ہے اور آیات بھی چھوٹی چھوٹی ہیں، ایک عظیم حقیقت پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ یہ گویا شعائر اسلام کو بدل کر رکھ دیتی ہے اور اس پر غور کرنے سے انسان کو ایمان و کفر کا مفہوم مکمل طور پر بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سے آگے یہ سورت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کا مزاج کیا ہے۔ اور اس میں انسانیت کے لیے کس قدر عظیم خیر اور بھلائی پوشیدہ ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کے لیے اپنا آخری مشن بھیج کر اللہ نے اس پر کتنا عظیم رحم کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دین چند ظاہری رسوم عبادات اور دینی شعائر ہی کا نام نہیں ہے۔ اس میں دینی مراسم اور شعائر اور عبادات اس وقت تک مفید نہیں ہوتے جب تک ان میں خلوص نہ ہوئے اور ان کی ادائیگی صرف رضائے الٰہی کے لیے نہ ہو۔ اور جب ان کی وجہ سے قلب انسانی میں ایسے آثار پیدا نہ ہوں جو انسان کو عمل صالح پر ابھارتے ہیں اور جب تک یہ آثار ایسا طرز عمل اختیار نہ کریں جن کے ذریعہ انسانی زندگی اصلاح آخرت پذیر ہو۔ اور اس دنیا میں بھی ان

کے نتیجے میں اصلاح اور ترقی نہ ہو۔

پھر یہ دین چند متفرق اجزاء اور ٹکڑوں میں بٹا ہوا دین نہیں ہے کہ انسان ان میں سے جس جزء کو چاہے ' لے کر نکل جائے اور جس جزء کو چاہے ترک کر دے ۔ یہ ایک مکمل نظام زندگی ہے اور منہاج حیات ہے ۔ اس کے مراسم عبودیت اور اس کے شعائر باہم پیوست ہیں ' اس کے انفرادی فرائض اور اجتماعی احکام باہم مربوط اور معاون ہیں ۔ اس کے تمام اجزاء کا مقصد ایک ہے اور وہ انسانیت کے ساتھ متعلق ہیں ' یہ کہ انسانیت کو قلبی اور روحانی تطہیر نصیب ہو ۔ ان کی زندگی سنور جائے ۔ لوگ باہم معاون ہوں ' ایک دوسرے کے کفیل ہوں ' اور بھلائی ' ترقی اور اصلاحات کی راہ میں ہمقدم ہوں ۔ اور ان کی زندگی اللہ کی رحمتوں کا نمونہ ہو۔

انسان اپنی زبان سے کہتا ہے کہ میں مسلم ہوں ' وہ مسلمان ہے اور دین اسلام کے تمام احکام اور فیصلوں کو قبول کرتا ہے ' وہ نماز پڑھتا ہے ' نماز کے علاوہ دوسرے مراسم عبودیت بھی سرانجام دیتا ہے ' لیکن اس کے باوجود حقیقت ایمان اور دین وایمان کی تصدیق اس سے کوسوں دور ہوتی ہے ۔ اس لیے کہ حقیقت ایمان کے کچھ آثار ہوتے ہیں ' یہ آثار بتاتے ہیں کہ ایمان کی حقیقت موجود ہے ۔ جب یہ آثار نہ ہوں تو کوئی کس طرح کہہ سکتا ہے کہ ایمان کی حقیقت موجود ہے ۔ اگر آثار نہ ہوں تو محض اقرار ایمان ہے اور چند ظاہری مراسم عبودیت ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ایمان کی حقیقت کسی دل میں پوری طرح بیٹھ جائے تو وہ فوراً عمل صالح کی شکل میں نمودار ہوتی ہے ۔ جیسا کہ ہم نے سورہ العصر میں تفصیلات دی ہیں ۔ اگر کسی کا ایمان اس اسلوب سے متحرک نہیں ہوتا تو ظاہری علامت تو یہ ہوگی کہ ایمان اصلا موجود ہی نہیں ہے ۔ یہ وہ عظیم حقیقت ہے جس کو یہ سورت ایک مکمل قرار داد کی شکل میں پیش کرتی ہے ۔

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (١) فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (٢) وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (٣) (۱۰۷ : ۱ تا ۳) "کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے ۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا" ۔ آغاز ایک ایسے سوال سے ہوتا ہے کہ تمام لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں تاکہ ایسے شخص کی بابت علم حاصل کر سکیں کہ کون ہے وہ شخص جو دین کی تکذیب کرتا ہے اور اس بات کی صراحت قرآن مجید کر رہا ہے کہ ایسا شخص مکذب دین ہے ۔ چنانچہ جواب آتا ہے ۔

فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (٢) وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (٣) (۱۰۷ : ۲ تا ۳) "وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا" ۔

ایمان اور دین کی جو روایتی تعریف ہے اس کو دیکھتے ہوئے قرآن کی یہ صراحت بادی النظر میں انوکھی معلوم ہو سکتی ہے ' لیکن یہ اصل حقیقت ہے کہ جو شخص یتیم کو دھکے دیتا ہے وہ دراصل دین کی تکذیب کرتا ہے ۔ یتیم کو دھکے دینے کا مطلب اسے ایذا دینا اور اس کی توہین کرنا ہے ۔ اور

وَلَا يَحُضُّ (۱۰۷ : ۳) کے معنی یہ ہیں کہ وہ دوسرے لوگوں کو اس کام پر نہیں اکساتا اور مسکینوں کا

خیال نہیں رکھتا۔ اگر اس نے صداقت کے ساتھ دین اسلام کو قبول کیا ہوتا اور اس کے دل میں حقیقی تصدیق ہوتی تو وہ یتیم کو دھکے نہ دیتا' اور مساکین کو کھانے کے لیے اکسانے اور تحریک چلانے پر لوگوں کو آمادہ کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کا اقرار اور تصدیق صرف زبانی فعل نہیں ہے بلکہ وہ ایک ذہنی اور قلبی انقلاب ہے جس کے نتیجے میں انسان خود بخود بنی نوع انسان پر رحم اور نیکی کرنے لگتا ہے۔ ان لوگوں پر جو امداد اور مراعات کے مستحق ہوں۔ اللہ کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ لوگ اپنی زبان سے محض چند کلمے جپتے جائیں۔ ان کلمات کے ساتھ ساتھ اللہ کا مطالبہ کچھ اعمال کا بھی ہے جو یہ تصدیق کریں کہ ایمان موجود ہے' ورنہ ایمان محض ایک ہوائی ذرہ ہوگا جو فضا میں ادھر ادھر اڑتا رہتا ہے۔

ان تین آیات میں اس حقیقت کو جس طرح نہایت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے اس کی مثال پورے قرآن میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ اسلامی نظریہ حیات کی روح ہے اور اس دین کا یہ مزاج ہے۔

ہم یہاں اسلام اور ایمان کی فقہی تعریفات اور ان کے حدود و قیود کے مباحث اور اختلافات میں داخل ہونا نہیں چاہتے۔ یہ تعریفات اس لیے کی جاتی ہیں کہ ان پر شرعی اور قانونی حقوق و فرائض کا فیصلہ کیا جاسکے۔ اس سورت میں جو بات کہی گئی ہے وہ اس حقیقت نفس الامری کا اظہار کرتی ہے جو اللہ کے ہاں معتبر ہے اور جو اللہ کے معیار کے مطابق ناپی تولی جاتی ہے۔ اللہ کے ہاں جو حقائق ہوتے ہیں وہ ان حقائق سے الگ ہوتے ہیں جن کے مطابق شرعی اور قانونی معاملات طے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس حقیقت اور اس اصول کے مطابق بعض عملی صورتوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (٤) الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (٥) الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاءُوْنَ (٦) وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (٧) (١٠٧ : ٤ تا ٧) "پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں' جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں"۔ یہ ان لوگوں کے لیے بددعا ہے یا دھمکی۔ ان لوگوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ وہ لوگ جو ریاکاری کرتے ہیں اور جو معمولی ضرورت کی چیزیں بھی دوسروں کو نہیں دیتے۔

یہ لوگ نماز تو پڑھتے ہیں مگر نماز کو قائم نہیں کرتے' یہ نماز کی حرکات تو پوری کرتے ہیں۔ اس کے اندر پڑھی جانے والی دعائیں بھی پڑھتے ہیں' لیکن ان کا دل و دماغ نماز کے اندر نہیں ہوتا۔ ان کی روح نماز کی حقیقت سے بیگانہ ہوتی ہے۔ ان کی سوچ ان معانی سے دور ہوتی جو وہ پڑھتے ہیں۔ جو قرات' جو دعائیں اور جو ثنائیں وہ پڑھتے ہیں اس سے ان کی روح دور ہوتی ہے' گویا وہ اپنی نماز سے جسے وہ پڑھ رہے ہوں' غافل ہوتے ہیں۔ اسے صحیح طرح ادا نہیں کرتے۔ اللہ کے ہاں مطلوب یہ ہے کہ نماز کو صحیح طرح قائم کیا جائے۔ فقط ادائیگی مطلوب نہیں ہے اور نماز قائم تب ہوتی ہے کہ اسے دینی روح اور اس کے معانی کے ساتھ پڑھا جائے اور جس میں اللہ کی ذات مستحضر ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جس نماز کو وہ پڑھ رہے ہوتے ہیں ان کی زندگی میں اس نماز کے آثار پیدا نہیں ہوتے کیونکہ وہ نماز کی حرکات کے دوران غافل ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ معمولی ضرورت کی چیز (ماعون) بھی دوسروں کو نہیں دیتے۔ دوسروں کے ساتھ کوئی امداد' نیکی' بھلائی نہیں کرتے۔ حالانکہ نماز کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نمازی اللہ کے بندوں کے ساتھ بھلائی کرے اور ان سے معمولی ضرورت کی چیز نہ روکے۔ اس لیے جو لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں وہ دراصل حقیقی نماز

نہیں ادا کر رہے ہوتے ۔ لہٰذا اللہ کے نزدیک حقیقی اور سچی عبادت کا معیار یہ ہے کہ ایک انسان اپنے بنی نوع انسان سے معمولی ضرورت کی اشیاء نہ روکے ۔ ان کی معاونت سے دستکش نہ ہو ۔

یوں ہم دین کی ایک دوسری لائفک حقیقت کو سامنے اپنے آپ کو کھڑا پاتے ہیں اور یہ اسلامی نظریہ حیات کا تقاضا ہے وہ یہ کہ ایک قرآنی آیت نمازیوں کو کھلی دھمکی دے رہی ہے کہ وہ ہلاکت سے دوچار ہوں گے کیونکہ وہ نماز کو صحیح طرح قائم نہیں کر رہے ۔ بلکہ وہ ایسی حرکات کر رہے ہیں جن میں کوئی روح نہیں ہے ۔ وہ ان حرکات میں اللہ کے دربار میں حاضر نہیں ہوتے ۔ خالص اللہ کے نہیں ہوتے 'بلکہ محض لوگوں کو دکھاوے کے لیے وہ نماز پڑھتے ہیں 'اس لیے ان کی نماز سے وہ آثار نمودار نہیں ہوتے جو حقیقی نماز سے ہوتے ہیں 'نہ ان کے دل پر نماز کا اثر ہوتا ہے 'نہ ان کی عملی دنیا پر وہ اثر انداز ہوتی ہے ۔ لہٰذا یہ نماز ذرہ بے قیمت ہے 'ایک غبار ہے بلکہ نمازی کے لیے یہ نماز ایک وبال و ہلاکت ہے ۔

ان تصریحات کے بعد ہماری سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ جاتی ہے کہ اللہ لوگوں کے پاس رسول کیوں بھیجتا ہے اور لوگوں سے کیوں مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ایمان لائیں اور بندگی کریں؟ ــــ اس ساری جدوجہد سے اللہ کا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے ۔ وہ تو غنی بادشاہ ہے ۔ اس لیے مقصود یہ ہے کہ خود انسانوں کی زندگی سنور جائے ان کی بھلائی مقصود ہے ۔ ان کے قلوب پاک ہوں اور زندگی کامیاب ہو 'وہ ان کے لیے ایک ایسی زندگی چاہتا ہے جو پاکیزہ شعور اور اعلیٰ نظریات پر قائم ہو ۔ جس کے اندر لوگ ایک دوسرے سے کفیل ہوں جن کی ذہنیت شریفانہ ہو 'جن کے اندر محبت اور بھائی چارہ ہو 'جن کا تصور اور طرز عمل دونوں پاک ہوں ۔

اے کاش ! انسانیت اس بھلائی کو چھوڑ کر کدھر جا رہی ہے ۔ اس رحمت کو چھوڑ کر کہاں بھٹک رہی ہے اور اس خوبصورت اور حسین و جمیل مقام بلند کو چھوڑ کر کن پستیوں میں گری ہوتی ہے یا کہاں وہ جاہلیت کے پیچیدہ اور تاریک راہوں میں گم گشتہ ہے حالانکہ اس کے سامنے نور 'اسلام کا نور' مرکزی چوک میں موجود ہے ۔

--- ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الکوثر ۔ ۱۰۸

۱-- تا-- ۳

سورۃ الکوثر ایک نظر میں

یہ سورت خالص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق ہے جس طرح سورت الضحیٰ اور سورہ الشرح آپؐ کے لیے تھی۔ یہ سورہ آپؐ کا غبار خاطر دور کرتی ہے اور یہ پیشن گوئی کرتی ہے کہ آپؐ کو خیر کثیر دیا گیا ہے اور آپؐ کے دشمنوں کو اس میں دھمکی دی گئی ہے کہ انکی جڑ کاٹ دی گئی ہے' لہٰذا آپ کو چاہئے کہ اپنے رب کا شکر ادا کریں۔

چنانچہ یہ سورت ابتدائی دور میں دعوت اور داعی کی زندگی کی ایک جھلک ریکارڈ کرتی ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر طرف سے سازشیں کی جا رہی ہیں اور آپؐ کو اذیت دی جا رہی ہے اور آپؐ کی دعوت کا راستہ روکا جا رہا ہے اور اس دور میں اللہ اپنے بندے پر جس طرح مہربان اور اہل ایمان کے مٹھی بھر دستے پر جس طرح مہربان تھا اس کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔ چنانچہ اس سورت میں آپؐ کو اطمینان دلایا جاتا ہے' اور آپؐ سے روشن مستقبل کا وعدہ کیا جاتا ہے اور آپؐ کے دشمن کے بارے میں تاریک مستقبل کی پیشن گوئی کی جاتی ہے کہ ان کی جڑ کٹنے والی ہے۔

وہ ہدایت' خیر اور ایمان کی حقیقت کو ایک طرف رکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں کثرت' برکت اور دوام اور پھیلاؤ ہے۔ اور دوسری جانب گمراہی' شرک اور کفر کو رکھا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ان کی قسمت میں قلت' خسارہ اور جڑ کٹنا لکھا ہوا ہے۔ اگرچہ غافل لوگ اس کے برعکس سوچتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۳۰۸ تشریح آیات

۱-- تا-- ۳

آیاتها ۳ سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ (۱۰۸) مَكِّيَّةٌ (۱۵) رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۱

۳ع اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿۲﴾ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿۳﴾

۲ ۳

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"(اے نبیؐ) ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو، تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے"۔

روایات میں آتا ہے کہ قریش کے اوباش رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر وقت پیچھا کرتے تھے۔ آپؐ کی دعوت کے خلاف سازشوں میں لگے رہتے تھے اور آپؐ کے ساتھ طنز و مزاح کرتے رہتے تھے۔ اس طرح وہ بزعم خود عوام الناس کو آپؐ کی دعوت حق سننے سے باز رکھتے تھے جو آپؐ لے کر آئے تھے۔ ان اوباشوں کے سرخیل عاص ابن وائل، عقبہ ابن ابو معیط، ابولہب، ابوجہل وغیرہ تھے۔ یہ کہتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم "ابتر" ہیں، یعنی ان کی نرینہ اولاد نہیں ہے۔ ان میں سے بعض نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اسے چھوڑ دو، اس کی کوئی اولاد نہیں ہے، جب یہ مر جائے گا تو یہ تحریک خود بخود ختم ہو گی۔

عرب معاشرے میں چونکہ نرینہ اولاد کی بہت بڑی اہمیت تھی، اس لیے ان کے ہاں پروپیگنڈے کی اس سازش کا کافی اثر تھا۔ آپؐ کے مخالف اور دشمن اس گھٹیا پروپیگنڈے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور آپؐ کے قلب مبارک پر اس کا بہرحال اثر ہوتا تھا۔ اس وجہ سے یہ سورت نازل ہوئی کہ آپؐ کا غبار خاطر چھٹ جائے۔ آپؐ خوشی اور تازگی محسوس کریں اور آپؐ کو جو خیر کثیر دے کر بھیجا گیا تھا، اس کی حقیقت اچھی طرح دلوں میں بیٹھ جائے، اور یہ سمجھا دیا جائے کہ دراصل "ابتر" تو آپؐ کے دشمن ہیں اور وہ اس انجام تک پہنچنے والے ہیں کہ ان کی جڑ کٹ جائے اور ان کا نام و نشان مٹ جائے۔

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ (۱۰۸ : ۱) "ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا ہے"۔ کوثر کثرت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بے حد و حساب اور یہ مفہوم اس کے بالکل برعکس ہے جس کو ہر احمق آپؐ کی طرف منسوب کرتا تھا یعنی ہم نے آپؐ کو جو کچھ دیا ہے وہ ایک عظیم اور لامحدود فیض ہے۔ یہ مسلسل جاری رہے گا اور اس کا سلسلہ کٹنے والا نہیں ہے۔ جو شخص بھی غور کرے کہ وہ فیض کثیر کیا ہے' جو اللہ نے اپنے نبی کو دیا تو وہ اسے پا سکتا ہے جس طرف بھی وہ نگاہ کرے اسے موجود پائے گا۔

سب سے پہلے آپؐ کو جو منصب رسالت دیا گیا وہ خیر کثیر ہے' آپؐ کا عظیم سچائی سے رابطہ قائم ہوا۔ اس عظیم وجود سے آپؐ کا رابطہ ہو گیا جس کے سوا کوئی موجود نہیں ہے یعنی ذات باری سے اور جس شخص کا تعلق ذات باری سے قائم ہو جائے وہ سب کچھ پا لیتا ہے۔

پھر یہ خیر کثیر اس قرآن کی شکل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ پورا قرآن نہیں' اس کی ایک ایک سورت خیر کثیر ہے اور ہر سورت ایک ایسا سرچشمہ ہے جس کے فیوض ختم نہیں ہوتے۔

پھر پورا عالم بالا آپ پر درود و سلام بھیجتا ہے اور ان لوگوں پر بھی درود و سلام بھیجتا ہے جو آپؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اس طرح آپؐ کا اسم مبارک اس پوری کائنات میں اللہ کے نام کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔

پھر آپؐ کی سنت کی صورت میں بھی خیر کثیر موجود ہے اور یہ سنت اس جہاں کے اطراف و اکناف میں زندۂ جاوید ہے۔ لاکھوں کروڑوں لوگ آپؐ کی سنت پر چل رہے ہیں' لاکھوں کروڑوں لوگ آپؐ کے پروانے ہیں اور قیامت تک کروڑوں انسان آپؐ پر درود و سلام بھیجتے رہیں گے۔

پھر یہ کوثر اس خیر کثیر کی شکل میں بھی موجود ہے جس سے یہ پوری دنیا فیض یاب ہوئی اور پوری انسانی تاریخ میں یہ فیوض جاری ہیں۔ چاہے ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو' چاہے وہ ایمان لائیں یا نہ لائیں۔ لیکن اس سرچشمے کے اثرات ان پر پڑے اور کسی نہ کسی طرح وہ فیض یاب ہوئے۔

غرض یہ کوثر وہ خیر کثیر اور عظیم ہے جس کا شمار ممکن نہیں ہے۔ اور ہم اپنی کم مائیگی کے ساتھ اگر اس کا شمار کریں تو ہم اس کی قدر و قیمت کو کم ہی کر دیں گے۔

یہ درحقیقت ایک کوثر ہے اور اس کے فیوض کی انتہا نہیں ہے۔ اسی کے علوم و معارف کے لیے حدود و قیود نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اسے کوثر کہہ کر مجمل چھوڑ دیا اور ہر "خیر" اس کے دائرے میں آ جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ خیر۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ کوثر ایک نہر ہے جو جنت میں ہے۔ اور یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے تو حضرت ابن عباسؓ نے اس بارے میں کہا کہ وہ نہر بھی منجملہ اس خیر کثیر میں سے ہے جو آپؐ کو دی گئی ہے۔ گویا یہ کوثر الکوثر کا ایک حصہ ہے۔ یہ نہایت ہی مناسب تطبیق ہے جو اس بارے میں کی جا سکتی ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ (۱۰۸ : ۲) "پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو"۔ اس خیر کثیر کے موکد تذکرے کے بعد' جو مکہ میں تحریک اسلامی کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا کرنے والوں اور دعوت اسلامی کے

خلاف سازشیں کرنے والوں کے علی الرغم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپؐ اس خیر کثیر کے عطا کیے جانے پر اللہ کا شکر ادا کریں اور اللہ کا پہلا شکر یہ ہے کہ انسان بندگی میں اور تمام تقریبات میں صرف اللہ وحدہ لاشریک کی طرف متوجہ ہو' اور صرف اسی کو یاد کرے۔ نماز میں بھی اور قربانی میں بھی۔ نماز بھی خالص اللہ کے لیے ہو اور قربانی بھی خالص اللہ کے لیے ہو۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (۱۰۸ : ۲) "یعنی اللہ ہی کے لیے نماز پڑھو اور اللہ ہی کے نام کی قربانی کرو" اور شرک کرنے والوں کے شرک کی کوئی پرواہ نہ کرو' اور اللہ کی بندگی کرو اور ان کے ساتھ شریک ہو کر کسی اور کی بندگی نہ کرو' اور اللہ کی قربانی میں اللہ کے سوا کسی اور کا نام نہ لو۔

قرآن کریم بار بار اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ تمام ذبیحوں پر صرف اللہ کا نام لو' اور یہ کہ جن ذبیحوں پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو' وہ حرام ہیں اور ان کا کھانا حرام ہے اور جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو' ان کا کھانا بھی حرام ہے۔ یہ اس لیے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو ہر قسم کے شرک کے آثار اور شائبوں سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ صرف عقیدے سے شرک کو پاک کرنا مقصود اسلام نہیں ہے بلکہ قرآن انسان کی پوری زندگی سے شرک کی نفی کرتا ہے شرک کے تمام معانی اور تمام مفاہیم کے اعتبار سے اس کی نفی کرتا ہے' اس لیے کہ یہ دین وحدت اور توحید کا دین ہے۔ اور اس کی توحید کا نظریہ ہر پہلو سے مکمل ہے۔ اس لیے یہ دین آخر دم تک شرک کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے تمام مظاہر سے اس کے نشان مٹاتا ہے۔ قرآن کریم اتنے دور تک شرک کا پیچھا کرتا ہے کہ اسے کسی کمین گاہ میں دم لینے نہیں دیتا۔ انسانی نفسیات' انسانی ضمیر اور انسانی فکر سے اس کا صفایا کرتا ہے۔ اسلامی عبادات سے اسے مٹاتا ہے۔ انسانی زندگی کے رسم و رواج سے اسے دور کرتا ہے اس لیے کہ زندگی ایک باہم پیوست کل (ایک نظام) ہے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے اور حصے بخرے نہیں کیے جا سکتے۔ اس لیے اسلام پوری انسانی زندگی سے شرک کے اثرات کو ختم کرتا ہے اور پوری زندگی کا رخ اللہ وحدہ کی طرف پھیر دیتا ہے۔ اور اسے پوری طرح واضح' صاف اور ستھرا بناتا ہے' چاہے قربانیوں اور ذبیحوں کا مسئلہ ہو یا عبادات و عقائد کا ہو یا رسوم و تقالید کا۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (۱۰۸ : ۳) "تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے"۔ پہلی آیت کا فیصلہ یہ تھا کہ آپؐ کی جڑ نہیں کٹی بلکہ آپ تو الکوثر کے مالک ہیں' اور اس آیت میں شکاری اپنے جال میں پھنس جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابتر نہیں بلکہ آپؐ کے دشمنوں کی جڑ کٹ چکی ہے اور جو لوگ آپ کو ناپسند کرتے ہیں ان کا نام و نشان مٹ جانے والا ہے۔

اور اللہ کی یہ دھمکی سچی ثابت ہوئی' ان لوگوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ اس دنیا سے ان کا تذکرہ ہی ختم ہو گیا جبکہ حضرت محمدؐ کا نام بلند ہوا اور آپؐ کے مراتب بڑھتے ہی رہے۔ آج ڈیڑھ ہزار سال کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں کی گئی پیش گوئی سچی ثابت ہو چکی ہے۔ اور اس آیت کا مصداق آج ایک واضح شکل میں ہمارے سامنے ہے جو ان لوگوں کے سامنے اس قدر واضح نہ تھا جنہوں نے ان آیات کو پہلی مرتبہ سنا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان' سچائی اور بھلائی کی جڑ کبھی نہیں کٹ سکتی۔ ان چیزوں کی جڑیں تو زمین میں گہری ہوتی ہیں۔

اور شاخیں آسمانوں کی فضا میں دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں بلکہ کفر' باطل اور شر کی جڑ کٹی ہوئی ہوتی ہے ۔ اگرچہ وہ بظاہر تروتازہ اور پھلا پھولا نظر آئے ۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ کا معیار انسانوں کے معیار سے مختلف ہے ۔ انسانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ دھوکہ کھا جاتے ہیں ۔ فریب میں آجاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کے معیار دراصل حقائق کا تعین کرتے ہیں ۔ اس سورت میں جو مثال دی گئی ہے' یہ ہمارے لیے ایک دائمی اور لازوال مثال ہے ۔ ذرا سوچئے تو سہی' وہ لوگ کہاں ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گھٹیا زبان استعمال کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہم نے عوام کو گمراہ کر دیا ہے اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ختم ہو گیا ہے ۔ اس کا راستہ روک لیا گیا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کہاں ہیں ۔ ان کا ذکر کہاں ہے' ان کے آثار کہاں ہیں' اس کے مقابلے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن کو وہ ابتر کہتے تھے' ان کو تو ہر پہلو سے حظ وافر دیا گیا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات ممکن نہیں ہے کہ دعوت الی اللہ' سچائی اور بھلائی کی تحریک ختم ہو جائے اور اس کی جڑ کاٹ دی جائے ۔ اور نہ اس تحریک کے داعی ابتر ہو سکتے ہیں اس لیے کہ اس تحریک کا محرک زندۂ جاوید' باقی' لازوال اور ہمیشہ رہنے والا ہے ۔ بلکہ کفر' باطل اور شر ختم ہونے والے ہیں اور ان کے حاملین کا نشان بھی مٹنے والا ہے ۔ اگرچہ کسی مختصر دور کے لیے یہ چیزیں مستحکم اور لازوال نظر آتی ہوں اور ان کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہوں ۔ یہ ہے [illegible] جو اللہ فرماتا ہے' اور سازشی اور مکار جو کچھ کہتے تھے وہ جھوٹ تھا اور جھوٹ ہے اور ہمیشہ جھوٹ رہے گا ۔

--- ○○○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الکافرون ـ ۱۰۹

۱ -- تا -- ۶

سورۃ الکافرون ایک نظر میں

عرب اللہ کے منکر نہ تھے ' لیکن ان کی نظروں سے وہ اوصاف اوجھل تھے جن سے اللہ نے اپنے آپ کو متصف فرمایا تھا یعنی احد ''اکیلا'' اور صمد ''جو کسی کا محتاج نہ ہو اور سب اس کے محتاج ہوں''۔ چنانچہ وہ کچھ دوسرے لوگوں کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے تھے اور اللہ کی قدر اس طرح نہ کرتے تھے جس طرح اللہ کی عبادت کرنے کا حق ہے۔ وہ اللہ کے ساتھ کئی بتوں کو شریک کرتے تھے۔ یہ بت انہوں نے یا اپنے اسلاف کی طرف منسوب کر رکھے تھے یا بڑے اکابر کی طرف یا فرشتوں کی طرف۔ یاد رہے کہ یہ لوگ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اور یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ اللہ اور جنوں کے درمیان نسب اور رشتہ ہے۔ مدت گزرنے کے بعد انہوں نے یہ نسبت بھلا دی اور ان الہوں کی بندگی شروع کر دی اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ان بتوں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ان کو اللہ کے زیادہ قریب کرتے ہیں۔ سورہ زمر (۳) میں کہا گیا ہے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (۳۹ : ۳) ''ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے ذریعے اللہ تک ہماری رسائی ہو جائے''۔ قرآن کریم نے ان کی یہ بات نقل کی ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ زمین و آسمان کی تخلیق اللہ نے کی ہے اور شمس و قمر کو بھی اللہ ہی نے مسخر کیا ہے اور آسمانوں سے پانی بھی اللہ ہی اتارتا ہے۔ سورت العنکبوت (۶۱) میں ہے :

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۲۹ : ۶۱) ''اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ اور سورج اور چاند کس کے تابع فرمان ہیں تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے''۔ اور آگے اسی سورت (۶۳) میں کہا گیا ہے۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۲۹ : ۶۳) ''اگر تم ان سے پوچھو کون ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا پھر اس سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے''۔

وہ جب قسمیں کھاتے تو اللہ کے نام کی کھاتے 'واللہ' باللہ اور تاللہ اور اپنی دعاؤں کا آغاز بھی وہ اللھم سے کرتے تھے۔ لیکن اللہ پر ایمان رکھنے کے باوجود شرک نے ان کے عقائد و تصورات ' ان کے رسم و رواج ' ان کے مراسم

عبودیت کو خراب کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے مزعومہ خداؤں اور دیوتاؤں کو اپنے مویشیوں' اپنی فصلوں اور اپنی اولاد میں شریک کر لیا تھا' اور اس سلسلے میں وہ اس قدر آگے بڑھ گئے تھے کہ وہ اپنے بیٹوں کو بھی بعض اوقات بتوں پر قربان کرتے تھے۔ سورہ انعام (۱۳۶ تا ۱۴۰) میں قرآن مجید یہ صراحت کرتا ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآءِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (١٣٦) وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ (١٣٧) وَقَالُوْا هٰذِهٖ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (١٣٨) وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (١٣٩) قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (١٤٠) (٦ : ١٣٦ تا ١٤٠)

"انہوں نے اللہ کے لیے خود اس کے کھیتوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لیے ہے' بزعم خود' اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے' پھر جو چیز ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا' جو اللہ کے لیے ہے وہ ان شریکوں کو پہنچ جاتا ہے' کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ؟ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے لہٰذا انہیں چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیوں میں لگے رہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں' حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے۔ پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی۔ اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے' اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افترا کیا ہے' عنقریب اللہ انہیں افترا پردازیوں کا بدلہ دے گا۔ اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لیے مخصوص ہے۔ اور ہماری

عورتوں پر حرام' لیکن اگر وہ مردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں جو انہوں نے گھڑ لی ہیں۔ ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم اور سب باتوں کی اسے خبر ہے۔ یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی وجہ سے قتل کیا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اللہ پر افترا پردازی کر کے حرام ٹھہرالیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے"۔

ان کا اعتقاد تھا کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں۔ وہ یہ یقین بھی رکھتے تھے کہ وہ اہل کتاب سے زیادہ ہدایت پر ہیں۔ یہ اہل کتاب ان مشرکین کے ساتھ جزیرۃ العرب میں رہتے تھے کیونکہ یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔ عیسائی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں اور خود یہ اہل عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جنوں کی اللہ کے ساتھ رشتہ داری ہے' لہٰذا وہ اہل کتاب کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ ہدایت یافتہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ ملائکہ اور جنوں کی نسبت اللہ کی طرف اس عقیدے سے زیادہ قریب الفہم ہے کہ عزیر علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ جبکہ یہ سب عقائد شرکیہ ہیں۔ اور شرک میں کوئی درجہ بھی اچھا نہیں ہے۔ البتہ وہ اہل کتاب کے مقابلہ میں اپنے عقائد کو بہتر سمجھتے تھے۔

جب آپؐ کی بعثت ہوئی اور آپؐ نے فرمایا کہ میں دین ابراہیم پر ہوں تو انہوں نے کہا جب ہم بھی دین ابراہیم پر ہیں تو ہمیں پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے باوجود ان کے ہاں ایک منصوبہ تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کر لی جائے۔ انہوں نے آپؐ کو یہ پیشکش کی تھی کہ آپؐ ان کے معبودوں کے سامنے جھک جائیں اور وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الٰہ کے سامنے جھک جائیں گے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے الٰہوں پر تنقید نہ کریں' ہم ان کے الٰہ پر تنقید نہ کریں گے۔ اس کے علاوہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں پر جو شرائط عائد کریں آپ کی مرضی۔

ان لوگوں کے خیالات اور تصورات چونکہ مختلف النوع تھے۔ وہ ایک طرف اللہ کی عبادت کا دم بھرتے تھے اور دوسری جانب دوسرے الٰہوں کے بھی پجاری تھے اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ ان کے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان زیادہ فاصلے نہیں ہیں۔ اور اتحاد ممکن ہے۔ اور کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر باہم فیصلہ ہو سکتا ہے جس میں دونوں فریقوں کی رضا پیش نظر ہو۔

اس خیال کو پوری طرح رد کر دینے کی خاطر اور اس کوشش کا راستہ پوری طرح بند کر دینے کی خاطر اور اسلامی عبادات اور مشرکانہ عبادت' اسلامی نظام اور جاہلی نظام' اسلامی عقائد اور کافرانہ عقائد اور اسلامی طرز زندگی اور کافرانہ طرز زندگی کے درمیان مکمل فرق کر دینے کی خاطر یہ دو ٹوک بات کی ضرورت تھی اس لیے یہ سورت نازل ہوئی۔ جس کے اندر یہ بات نہایت تاکیدی انداز میں مکرر سہ کرر بیان کی گئی تاکہ اس موضوع پر بات ختم ہو جائے۔ توحید اور شرک کے اتحاد کے تمام راستے بند کر دیئے جائیں اور ہر قسم کی سودا بازی کی جڑ کاٹ دی جائے اور راستے کے نشانات واضح ہو جائیں اور نہ سودا بازی ہو اور نہ بحث و مباحثہ ہو۔

درس نمبر ۳۰۹ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۶

آیاتها ۶ سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ (۱۰۹) مَكِّيَّةٌ (۱۸) رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱﴾ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ
مَآ اَعْبُدُ ﴿۳﴾ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ﴿۴﴾ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ
اَعْبُدُ ﴿۵﴾ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴿۶﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"کہہ دو کہ اے کافرو' میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو' نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو' جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے' اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین"۔

انکار کے بعد انکار' تاکید کے بعد تاکید اور قطعیت کے بعد قطعیت۔ نفی' قطعیت اور تاکید کے تمام صیغے اور اسالیب اس سورت میں جمع کر دیے گئے ہیں۔

قُلْ "کہہ دو"۔ یہ دو ٹوک خدائی حکم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عقیدہ اور یہ نظریہ ماموّر من اللہ ہے۔ یہ اللہ وحدہ کا حکم ہے اور اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذاتی فیصلہ نہیں ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے اور اس حکم سے سرتابی نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ کوئی ایسا وجود ہے جو اللہ کے حکم کو رد کر سکے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (۱۰۹ : ۱) "کہہ دو اے کافرو"۔ اللہ نے ان کو اس لفظ سے پکارا جس کا اطلاق ان پر حقیقی معنوں میں ہوتا ہے۔ ایک ایسی صفت سے ان کو بلایا گیا جو ان کے اندر فی الواقعہ موجود ہے۔ در حقیقت وہ کسی دین کے پیرو نہ تھے اور در حقیقت وہ مومن نہ تھے' وہ کافر تھے۔ لہٰذا تمہارے اور ان کے درمیان کوئی نکتہ اشتراک نہیں ہے۔

اس طرح سورت کے آغاز ہی سے یہ اشارہ دے دیا جاتا ہے اور چھوٹتے ہی یہ بات واضح کر دی جاتی ہے کہ ایک

مسلم مومن اور کافر کے درمیان کبھی بھی اتحاد نہیں ہو سکتا۔

لَآ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ (۱۰۹ : ۲) "میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو"۔ میری عبادت تمہاری عبادت سے مختلف ہے اور میرا معبود تمہارے معبود سے مختلف ہے۔

وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ (۱۰۹ : ۳) "نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں"۔ اس لیے کہ تمہاری عبادت میری عبادت سے مختلف ہے اور تمہارا معبود میرے معبود سے سوا ہے۔

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ (۱۰۹ : ۴) "اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم نے عبادت کی ہے"۔ یہ پہلے فقرے کی تاکید ہے لیکن یہ جملہ اسمیہ منفیہ کے ذریعے نفی ہے۔ جملہ اسمیہ منفیہ نہایت مضبوطی' دوام اور تسلسل کے مفہوم میں کسی امر کی نفی کرتا ہے۔

وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ (۱۰۹ : ۵) "نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں"۔ یہ دوسرے فقرے کی تاکید ہے تاکہ اس معاملے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر مکرر تاکیدات کے بعد شک و شبہ کی کوئی گنجائش بھی نہیں رہتی۔

اس کے بعد نہایت اجمالی طور پر ایک ہی فقرے میں دونوں گروہوں کے درمیان ایسی تفریق کر دی جاتی ہے جس میں کوئی اتحاد نہیں رہتا۔ اس قدر اختلاف پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد کوئی اتصال نہیں رہتا' دونوں کے درمیان اس قدر جدائی ہو جاتی ہے کہ جس کے بعد کوئی ملاپ متصور نہیں رہتا۔

لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِىَ دِيۡنِ (۱۰۹ : ۶) "تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے"۔ میں یہاں اپنے موقف پر ڈٹا ہوں اور تم اپنے موقف پر ڈٹے ہو' دونوں کے درمیان کوئی پل نہیں ہے جس پر یہ فریق مل سکیں۔ دونوں کے درمیان مکمل جدائی ہے۔ ایک واضح امتیاز اور گہری جدائی۔

یہ مکمل جدائی ضروری بھی تھی' تاکہ کفر و اسلام کے درمیان پائے جانے والے جوہری تضاد کے خدوخال واضح تر ہو جائیں' جن کو دیکھتے ہوئے ہر کوئی سمجھ لے کہ دونوں کے درمیان مصالحت اور کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اختلاف بنیادی نظریات میں ہے۔ اصل تصور اور منہاج زندگی' دونوں میں مختلف ہے اور طرز زندگی بھی بالکل جدا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ توحید ایک مکمل نظام ہے۔ شرک ایک متضاد نظام ہے۔ ان کا باہم ملاپ ممکن ہی نہیں۔ توحید ایک ایسا نظام اور تصور ہے جو انسان کو اس پوری کائنات کے ساتھ اللہ وحدہ لاشریک کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس جہت اور سمت کا تعین کر دیتا ہے جہاں سے انسان نے اپنی پوری زندگی کے لیے ہدایات لینی ہے' عقائد بھی اور قانون بھی۔ اقدار حیات اور پیمانے بھی۔ آداب اور اخلاق بھی' غرض اس زندگی اور اس کائنات کے بارے میں مکمل فلسفہ انسان اسی جہت سے لیتا ہے اور یہ جہت جہاں سے مومن یہ سب کچھ لیتا ہے ذات باری تعالیٰ کی جہت ہے جس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہے۔ اس

لیے اسلامی نظام زندگی میں زندگی کے تمام معاملات اسی اصول پر قائم ہوتے ہیں اور اس نظام میں اللہ کی ذات کے ساتھ کوئی شرک نہیں ہوتا۔ اسی طرز پر زندگی چلتی ہے ۔ یہ فیصلہ کن جدائی اسلامی نقطہ نظر سے داعی کے لیے بھی ضروری ہے اور جن کو دعوت دی جا رہی ہے ۔ ان کے لیے بھی ضروری ہے ۔

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ یہ خالص اسلامی تصور حیات اور جاہلی تصور حیات آپس میں مل جاتے ہیں خصوصاً ان سوسائٹیوں میں جنہوں نے پہلے خالص اسلامی تصور کو قبول کر لیا ہوتا ہے لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ان کے اندر انحراف پیدا ہو جاتا ہے ' اس قسم کی سوسائٹیوں کے سامنے جب خالص ایمانی دعوت پیش کی جاتی ہے اور ان کے سامنے اسلامی نظام کو سیدھے سادھے طریقے سے بغیر کسی ملاوٹ کے پیش کیا جاتا ہے تو یہ لوگ اس دعوت پر بہت سختی کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کے مقابلے میں ان لوگوں کا رویہ زیادہ معقول ہوتا ہے جن تک کبھی اسلامی دعوت پہنچی ہی نہیں ہوتی ۔ اس لیے کہ جن سوسائٹیوں نے اسلام قبول کیا ہوتا ہے اور بعد کے ادوار میں وہ منحرف ہو چکی ہوتی ہیں ' وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتی ہیں کہ وہ بھی تو ہدایت پر ہیں حالانکہ ان کے عقائد و اعمال میں صالح کے ساتھ فاسد کی ملاوٹ ہو چکی ہوتی ہے ۔ ایسی سوسائٹیوں میں کام کرنے والے ان داعیوں کو بھی بعض اوقات دھوکہ لگ جاتا ہے جو ایسی سوسائٹیوں کے صالح جانب کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے برے پہلو کو بدلنا چاہتے ہیں اور خود ایسی سوسائٹیوں کے برے پہلو سے دھوکہ کھا جاتے ہیں اور یہ دھوکہ نہایت خطرناک ہوتا ہے ۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام ' اسلام ہے اور جاہلیت جاہلیت ہے ۔ ان کے درمیان بہت بڑا فرق ہے ۔ اصل طریق کار یہ ہے کہ لوگ جاہلیت سے پوری طرح نکل آئیں اور جاہلیت کے ہر رنگ سے پوری طرح نکل کر اسلام کی طرف ہجرت کر آئیں ۔

اس سلسلے میں پہلا قدم یہ ہوتا ہے کہ داعی مکمل شعور کے ساتھ جاہلیت سے نکل کر اسلام کی طرف آ جائے ۔ اپنے تصورات اور نظریات کے لحاظ سے ' اپنے اعمال اور طریق کار کے لحاظ سے اور یہ جدائی ایسی ہو کہ ان دونوں کے درمیان کوئی مصالحت نہ ہو ' کوئی تمدنی مصالحت نہ ہو اور جب کوئی پوری طرح جاہلیت سے نکل کر اسلام میں آ جائے تو اس کے بعد پھر دونوں کے درمیان کوئی تعاون باقی نہیں رہتا ۔ پھر یہ نہیں ہوتا کہ اسلام کی گدڑی میں کسی دوسرے کلچر کے پارچے اور پیوند لگیں ' نہ کچھ لو اور کچھ دو کا اصول چلتا ہے ۔ نہ ادھر سے جھکاؤ اور ادھر سے جھکاؤ ہوتا ہے ۔ اگرچہ جاہلیت اسلام کے روپ میں آئے اور اسلام کے عنوان سے بات کرے ۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی داعی کے لیے سب سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ اس زاویہ سے اس کا ذہن صاف ہو ' یہ بنیادی بات ہے ۔ وہ مکمل شعور رکھتا ہو کہ وہ اس سوسائٹی سے ایک بیگانہ شخص ہے ' اس کا اپنا دین ہے اور میرا اپنا دین ہے ۔ ان کا اپنا طریقہ ہے ۔ میرا اپنا طریقہ ہے ۔ اور وہ ایک قدم بھی ایسے لوگوں کی راہ پر نہیں چل سکتا ۔ لہٰذا اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ہی راستے پر چلے اور بغیر کسی مداہنت کے وہ اپنے راستے میں اس طرح ڈٹا ہوا ہو کہ اس کا ایک قدم بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے ۔ غرض مکمل برات کا اعلان ضروری ہے ' مکمل جدائی ضروری ہے اور صریح اور فیصلہ کن بات ضروری ہے ۔

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (۱۰۹ : ۶) "تمہارا اپنا دین ہے اور میرا اپنا دین ہے"۔

آج کے داعیان حق اس بات کے محتاج ہیں اور ان کے لیے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ وہ جاہلیت جدید کے مقابلے میں اپنی مکمل برات کا اعلان کریں اور دو ٹوک اور فیصلہ کن جدائی کا اعلان کر دیں ۔ آج کے داعی اس شعور کے محتاج ہیں کہ وہ اچھی طرح جان لیں کہ دراصل وہ مکمل جاہلانہ اور کافرانہ معاشرے میں از سرنو اسلام کا اجراء و احیا چاہتے ہیں اور ان کو ایسے معاشروں سے سابقہ درپیش ہے جو پہلے صحیح مسلمان تھے ۔ان پر ایک طویل عرصہ گزر گیا۔

فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَسِقُونَ "ان پر بہت مدت گزر گئی اور ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر فاسق ہو گئے ہیں"۔اس کے علاوہ کوئی درمیانی صورت نہیں ہے ۔ نہ کچھ لو اور کچھ دو کا معاملہ ہو سکتا ہے ' نہ یہ بات ہے کہ سوسائٹی تو اسلامی ہے 'چند عیوب کی اصلاح چاہئے 'کہیں تو درست ہے ایک پارچہ لگنا درکار ہے 'اصل طریقہ یہ ہے کہ اسلام کی طرف اسی طرح مکمل دعوت دی جائے جس طرح آغاز اسلام میں داعی حق نے مکمل دعوت دی تھی ' جبکہ وہ ایک جاہلی سوسائٹی کو بدل رہے تھے ۔ اسلام اور جاہلیت کے درمیان مکمل جدائی اور تفریق ضروری ہے ۔ یہ ہے میرا دین ' خالص اپنے عقائد و نظریات میں ' اپنی شریعت اور قانون میں ' اپنے تصورات و افکار ہیں یہ سب اللہ سے ماخوذ ہیں ۔ اس میں شرک کا کوئی شائبہ اور آمیزہ نہیں ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو ' انسانی طرز عمل کے ہر رخ پر ۔

اس فیصلہ کن جدائی کے سوا کوئی چارہ نہیں ورنہ جاہلیت کے ساتھ التباس رہے گا۔ اسلامی کلچر میں دوسرے کلچروں کی پیوند کاری ہو گی اور جو بھی تحریک چلے گی وہ کمزور اور ضعیف بنیادوں پر ہو گی ۔ اسلامی دعوت و تحریک کے لیے ضروری ہے کہ وہ جرات مندی کے ساتھ دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں دی جائے اور یہی طریق کار تھا داعی اول کا۔ وہ صاف صاف کہتے تھے ۔

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (۱۰۹ : ۶) "تمہارے لیے تمہارا دین ہے ۔ میرے لئے میرا دین ہے"۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ النصر ۔ ۱۱۰

۱-- تا -- ۳

سورۃ النصر ایک نظر میں

اس مختصر سورت کے دو پہلو ہیں' ایک تو یہ ہے کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک خوشخبری ہے کہ آپؐ کو فتح نصیب ہونے والی ہے اور اس فتح کے نتیجے میں لوگ جوق در جوق آپؐ کے دین میں شامل ہوں گے جو اللہ کا دین' اس لیے جب یہ موقعہ آجائے تو آپؐ کے لیے ہدایت یہ ہے کہ پھر آپؐ اللہ کی حمد و ثنا کریں اور تسبیح و تہلیل کرتے رہیں اور اللہ سے بخشش طلب کریں۔

ایک تو یہ پہلو ہے دوسرا یہ ہے کہ یہ سورت اس دین اور اس نظام اور اس نظریہ حیات کے حقیقی مزاج کو واضح کرتی ہے کہ اسلامی نظریہ حیات انسانت کو آزادی' رفعت اور کرامت اور خلوص عطا کرتا ہے اور ایک روشن مستقبل اور ایک بلند و برتر مقام عطا کرتا ہے۔ وہ مقام جس تک وہ نہ اس نظریہ سے پہلے پہنچ سکی اور نہ بعد میں۔ اور آئندہ بھی انسانیت کو یہ رفعت صرف اسلام کی روشنی میں نصیب ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اسلامی دعوت پر لبیک کہے۔

اس سورت کے نزول کے بارے میں متعدد روایات وارد ہیں۔ ہم ان میں سے امام احمد کی روایت کو لیتے ہیں: محمد ابن عدی روایت کرتے ہیں داؤد سے' وہ شعبی سے' وہ مسروق سے' وہ کہتے ہیں: حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری زمانے میں۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ بڑی کثرت سے پڑھتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: "میرے رب نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ تم اپنی امت میں ایک علامت پاؤ گے اور جب تم نے وہ علامت دیکھ لی تو اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اس سے طلب مغفرت کرو۔ بے شک وہ مغفرت کرنے والا ہے"۔ میں نے وہ علامت دیکھ لی ہے اور وہ یہ ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱) وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (۲) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۳) (۱۱۰: ۱ تا ۳) "جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو' بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے"۔ (امام مسلم از طریق داؤد ابن ہند)

امام ابن کثیر کہتے ہیں اس سورت میں فتح سے مراد فتح مکہ ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب کے تمام قبائل فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے کہ فتح ہو تو وہ اسلام قبول کریں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم

اپنی قوم پر غالب ہوگئے تو وہ نبی برحق ہوں گے ۔ جب اللہ نے فتح مکہ نصیب کی تو تمام عرب فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہوگئے ۔ دو سال نہ گزرے تھے کہ تمام جزیرۃ العرب نے ایمان قبول کر لیا ۔ اور تمام قبائل عرب اقرار ایمان کرنے لگے ۔ الحمد للہ ۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں عمرابو سلمہ کی یہ روایت نقل کی ہے ۔ جب فتح مکہ ہو گیا تو تمام اقوام دوڑ کر اسلام قبول کرنے لگیں اور رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں ۔ اس سے قبل تمام قبائل فتح مکہ کے انتظار میں تھے ' ان کا کہنا یہ تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کی قوم کو ایک دوسرے کے مقابلے میں چھوڑ دو ۔ اگر وہ اپنی قوم پر غالب آگئے تو وہ نبی ہیں (بخاری)

اس سورت کے ظاہری مفہوم اور عبارت کے ساتھ یہ روایت مطابقت رکھتی ہے ۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) "جب اللہ کی نصرت آجائے اور فتح ہو" ۔ تو اس میں کسی ایسے امر کی طرف اشارہ ہے جو آنے والا ہے ۔ اور اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی جاتی کہ جب یہ امر واقع ہو جائے تو آپؐ نے یہ یہ کام کرنے ہوں گے ۔

ایک دوسری روایت بھی اس موضوع پر ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے ۔ اس روایت اور مذکورہ بالا روایت جس کو ہم نے اختیار کیا ہے ان کے درمیان تطبیق کوئی مشکل کام نہیں ہے ۔

امام بخاری کہتے ہیں ' کہ موسیٰ ابن اسماعیل نے بیان کیا ابو عوانہ سے ' انہوں نے ابوبشر سے ' انہوں نے سعید ابن جبیر سے ' انہوں نے ابن عباسؓ سے ۔ وہ فرماتے ہیں حضرت عمر مجھے شیوخ بدر کے ساتھ اپنے ہاں بلایا کرتے تھے ۔ بعض نے اس بات کو محسوس کیا کہ یہ حضرت عمرؓ کے پاس ہمارے ساتھ کیوں جاتے ہیں ۔ ان کی عمر کے تو ہمارے لڑکے ہیں ' تو انہوں نے کہا کہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں تم جانتے ہو ۔ ایک دن حضرت عمر نے ان لوگوں کو بلایا اور مجھے بھی ان کے ساتھ بلایا ۔ میں سمجھ گیا کہ آج حضرت عمر نے مجھے ان لوگوں کے ساتھ اس لیے بلایا ہے کہ انہیں دکھائیں ۔ تو حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا ۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ بعض نے کہا ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ کی حمد بیان کریں ' اس سے مغفرت کی دعا کریں اس لیے کہ اس نے ہماری نصرت کی اور ہمیں فتح نصیب ہوئی اور بعض دوسرے خاموش ہوگئے اور انہوں نے کوئی بات نہ کی ۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا ابن عباس تمہاری بھی یہی رائے ہے؟ تو میں نے کہا نہیں ' تو انہوں نے فرمایا پھر تمہاری رائے کیا ہے ۔ تو میں نے کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "اجل" کا اظہار ہے ۔ اللہ نے پہلے سے آپ کو بتا دیا (کہ اس دنیا میں اب آپ کا وقت کم ہے) اللہ نے فرمایا ۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) "جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح ہوگئی تو یہ علامت ہے آپ کی وفات کی ۔ اس لیے آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کریں اور اس سے دعائے مغفرت کریں بے شک اللہ بخشش کرنے والا ہے ۔ تو حضرت عمر ابن الخطابؓ نے فرمایا میرے علم میں بھی وہی بات ہے جو تم کہتے ہو ۔ (بخاری)

یہ بات ہماری رائے کے ساتھ متضاد نہیں ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی بتائی ہوئی علامت دیکھی ہو اور یہ بات سمجھ گئے ہوں کہ ان کا فریضہ ادا ہو چکا ۔ اور یہ کہ وہ عنقریب رفیق اعلیٰ کے

ساتھ ملنے والے ہیں ۔ یہ ہے مفہوم حضرت ابن عباس کے قول کا کہ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی بات کی گئی ہے ۔

ہاں ایک دوسری حدیث جسے امام بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ جب سورت ۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور کہا " مجھے میری موت کی اطلاع دے دی گئی ہے " تو وہ رو پڑیں اور پھر ہنس پڑیں ۔ اور آپؓ نے فرمایا مجھے حضورؐ نے خبر دی کہ مجھے میری موت کی اطلاع دی گئی ہے تو میں رو پڑی اور پھر حضورؐ نے فرمایا " صبر کرو تم میرے اہل و عیال میں سب سے پہلے مجھ سے ملو گی " ۔ اس پر میں ہنس پڑی ۔

اس حدیث میں اس سورت کے نزول کا وقت متعین کر دیا گیا ہے ۔ گویا یہ اس وقت نازل ہوئی جب علامت واقع ہوگئی تھی اور تمام عرب فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوگئے تھے ۔ جب یہ سورت علامت کے مطابق نازل ہوئی تو حضورؐ نے اس بات کو سمجھ لیا کہ اب رحلت کا وقت قریب ہے ۔ مگر ہم نے جو پہلی بات کی ہے وہ زیادہ قابل اعتماد اور مضبوط ہے ۔ اور آیت کی ظاہری عبارت سے بھی زیادہ قریب ہے ۔ خصوصاً اگر یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ حضرت فاطمہؓ کے ہنسنے اور رونے کی حدیث کو ایک دوسرے انداز سے بھی نقل کیا گیا ہے اور اس کو یہ ترجیح دیتے ہیں ۔

حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو فتح کے سال بلایا اور ان کے ساتھ سرگوشی میں کوئی بات کی تو وہ رو پڑیں ۔ اس کے بعد آپؐ نے ان سے مزید کوئی بات کی تو وہ ہنس پڑیں ۔ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہؐ فوت ہوئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ سے رسول خداؐ نے کیا بات کی تھی کہ آپؓ رو پڑیں اور پھر ہنس پڑیں ۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے رسول خداؐ نے یہ اطلاع دی کہ آپؐ جلد ہی فوت ہو جائیں گے تو میں رو پڑی ' اس کے بعد مجھے انہوں نے یہ اطلاع دی کہ تم جنت کی عورتوں کی سردار ہو گی ' ماسوائے مریم بنت عمران کے ' تو میں ہنس پڑی ۔

یہ روایت نص قرآنی کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے ۔ اور امام احمد کی روایت کے ساتھ بھی متفق ہے ۔ خلاصہ یہ کہ اللہ اور رسول اللہؐ کے درمیان ایک علامت تھی اور وہ تھی ۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ (۱۱۰ : ۱) اور جب فتح ہو گئی تو معلوم ہو گیا کہ حضورؐ کی رحلت اور رفیق اعلیٰ سے ملنے کا وقت قریب آگیا ہے ۔ اس وقت آپؐ نے یہ بات حضرت فاطمہؓ کے گوش گزار کی جیسا کہ حضرت ام سلمہؓ نے روایت فرمائی ۔

ان سب روایات سے ہم ایک دائمی اور مستقل نکتہ اخذ کرتے ہیں کہ اس مختصر سورت میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ انسانیت کو ایک نہایت اعلیٰ مقام تک بلند کرنا چاہتا ہے ۔ وہ کیا سربلندی ہے ؟

---000---

درس نمبر ۳۱۰ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۳

آیاتہا ۳ سورۃ النصر (۱۱۰) مدنیۃ (۱۱۴) رکوعہا ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا ۝۲ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝۳

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

"جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور (اے نبیؐ) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو' اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو' بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے"۔ اس سورت کی پہلی آیت ہی میں ایک متعین اشارہ ہے' اور یہ اشارہ کائناتی واقعات کے بارے میں ایک خاص تصور پیدا کرتا ہے اور اس تصور میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ ان واقعات میں اہل ایمان کا کردار کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار کیا ہے ۔ اور انسانی زندگی اور ان کائناتی واقعات و حادثات میں اہل ایمان اور نبیؐ کے دائرہ کار کی حد کیا ہے ۔ یہ اشارہ اس فقرے میں ہے ۔

اذا جآء نصر اللّٰہ (۱۱۰ : ۱) "جب اللہ کی مدد پہنچ جائے" میں ہے ۔ تمام دارومدار اللہ کی نصرت پر ہے اور اللہ کا وقت مقرر ہے' جس شکل میں نصرت آئے گی وہ بھی متعین ہے' جس مقصد کے لیے یہ نصرت ہوگی وہ بھی مقرر ہے ۔ نبی اور اس کے ساتھیوں کا اس کی آمد کے سلسلے میں کوئی اختیار نہیں ہے ۔ اور نہ ان کا نصرت الٰہیہ میں کچھ کردار ہے ۔ نہ اس نصرت کے سلسلے میں ان کی ذاتی کمائی کا کوئی دخل ہے ۔ نہ ان کی ذاتوں کا کوئی حصہ ہے ۔ یہ نصرت ایک ایسا واقعہ ہے جو اللہ کے فیصلے کے مطابق ان کی خصوصیات سے نہیں' باہر سے آتی ہے ۔ ان کے لیے یہی اعزاز کافی ہے کہ اللہ یہ نصرت بظاہر ان کے ذریعہ لاتا ہے اور ان کو اس نصرت کا چوکیدار مقرر کرتا ہے اور یہ اس نصرت اور فتح کے امین

ہوتے ہیں ۔ پس فتح و نصرت میں ان کا حصہ یہی ہوتا ہے کہ لوگ جوق در جوق دین اسلام میں داخل ہوتے ہیں ۔ وہ بھی اور دوسرے لوگ بھی ۔

اس اشارے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فکر کی روشنی میں ۔ اس اعزاز اور تکریم کے حوالے سے جو ان کے ہاتھوں نصرت اور فتح کے ظہور کے سلسلے میں ہوا ۔ رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کی حیثیت کا تعین ہو جاتا ہے ۔ ان کی شان اور حیثیت اب یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر سراسر سپاس بن جائیں ۔ اللہ کی حمد و ثنا کریں اور اپنی کوتاہیوں پر مغفرت کی دعا کریں ۔ یہ حمد و ثنا اور شکر اس بات پر کہ اللہ نے ان کو اسلامی انقلاب کا امین اور نگراں بنایا اور اپنے دین کی نصرت فرماکر اور اسے غالب فرماکر پوری انسانیت پر احسان فرمایا ۔ رسول اللہ فاتح ہوئے 'لوگ فوج در فوج اس خیر کثیر میں داخل ہوئے حالانکہ اس سے قبل وہ اندھے تھے 'گمراہ تھے اور سخت خسارے میں تھے ۔

استغفار کس لیے 'یہ ان نفسیاتی عوامل کے لیے ہے جو نہایت لطیف انداز میں دلوں میں داخل ہو کر بیٹھ جاتے ہیں ۔ جب کوئی قوت ایک طویل اور ان تھک جدوجہد کے بعد بر سر اقتدار آتی ہے تو فتح و کامرانی کے نشے میں اس کی نفسیات میں ایک قسم کا غرور چپکے سے داخل ہو جاتا ہے 'پھر مشکلات اور قربانیوں کے بعد انسان سے خوشیوں میں کچھ کوتاہیاں بھی ہو جاتی ہیں ' ان خفیہ نفسیاتی وائرس سے صرف توبہ و استغفار کے ذریعہ بچا جا سکتا ہے 'اس لیے یہاں استغفار کا حکم دیا گیا ہے ۔

یہ استغفار اس لیے بھی ہے کہ طویل جدوجہد کے زمانے میں ان تھک حالات کے نتیجے میں شدید مشکلات اور نہایت گھرے کربناک حالات کی وجہ سے انسانی قلب میں تھکن آجاتی ہے ۔ انسان سمجھتا ہے کہ اللہ کی نصرت کے پہنچنے میں دیر ہو گئی ہے 'اور داعی کو ہلا مارا جاتا ہے ۔ جیسا کہ بقرہ (۲۱۴) میں کہا گیا ہے ۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (۲ : ۲۱۴) "کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں ان حالات سے سابقہ پیش نہیں آیا جن سے تم سے پہلے اہل ایمان کو سابقہ پیش آیا تھا ۔ وہ فقر و فاقہ اور شدائد و آلام سے دوچار ہوئے اور ہلا مارے گئے یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھ کے اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی 'سنو اللہ کی مدد قریب ہے" ۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ استغفار کرو ۔

استغفار کا حکم اس لیے بھی دیا گیا کہ اللہ کی حمد و ثنا میں انسان سے تقصیر ہو جاتی ہے ۔ پس انسان کی جدوجہد جس قدر بھی زیادہ ہو 'وہ محدود ہوتی ہے اور انسان ضعیف ہے ۔ اور اللہ کی نعمتیں ہمیشہ بے شمار ہیں اور اس کا فیض عام ہے ۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴ : ۳۴) "اگر تم اللہ کے احسانات کو شمار کرو تو تم ان کا استقصا اور احاطہ نہیں کر سکتے" ۔ لہٰذا اس تقصیر پر استغفار کا حکم دیا گیا ۔

فتح و کامرانی کے موقعہ پر تسبیح و استغفار میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ فخر و مباہات کے مقام پر نفس کے اندر یہ شعور پیدا کیا جائے کہ انسان تو ہمیشہ عجز اور تقصیر کے مقام پر ہوتا ہے ۔ لہٰذا اسے چاہئے کہ وہ بڑوں کی سطح سے ذرا نیچے اتر

آئے۔ اور اپنے رب سے اپنی تقصیرات کی معافی طلب کرے۔ اس طرح انسانی شعور اور انسانی نفسیات سے فخر و مباہات کے میلانات کا صفایا ہو جاتا ہے۔

اگر ایک فاتح کے دل میں یہ شعور بیٹھ جائے کہ وہ عجز اور تقصیر کا پتلا ہے اور اسے اپنی تقصیرات پر اللہ سے دعائے مغفرت کرنا چاہئے تو ایسا فاتح کبھی بھی مفتوح لوگوں پر ظلم اور تعدی کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ ایسا شخص تو یوں سوچتا ہے کہ یہ تو اللہ کی ذات ہے جس کی نصرت کی وجہ سے وہ ان لوگوں پر مقتدر اعلیٰ بن گیا ہے۔ اگر اللہ کی نصرت نہ ہوتی تو وہ تو بندۂ ناچیز و پر تقصیر ہے اور اللہ نے جو اس کو اقتدار دیا ہے تو یہ اس لیے دیا ہے کہ اللہ مفتوح لوگوں کے بارے میں کوئی خیر اور بھلائی چاہتا ہے۔ درحقیقت فتح تو اللہ کی نصرت سے میسر ہوتی ہے۔ نصرت بھی اس کی ہے اور فتح بھی اس کی ہے اور یہ فاتح کی فتح نہیں بلکہ اللہ کے دین کی فتح ہے۔ اور تمام امور کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور تمام فیصلے اللہ کی طرف لوٹتے ہیں۔

یہ ہے وہ روشن اور بلند مرتبہ افق، جس کے اوپر نظریں مرکوز کرنے کے لیے قرآن پوری انسانیت کو دعوت دیتا ہے کہ وہ درجہ بدرجہ اس بلند افق تک بلند ہوتی چلی جائے۔ جو شرافت اور نیکی کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ اس تک پہنچ کر انسان بڑا بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی بڑائی سے دستکش ہو جاتا ہے۔ یہاں اس کی روح آزاد ہو کر مسرت حاصل کرتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اللہ کی غلامی اختیار کر لیتی ہے۔

غرض یہ ایک آزادی ہے جس میں انسان اپنی ذاتی اور مادی بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور انسان اللہ کی روحانی مخلوق میں سے ایک مخلوق بن جاتا ہے اور یہ ایک ایسے مقام تک جا پہنچتا ہے کہ اللہ کی رضا اس کی رضا بن جاتی ہے اور یہ مقام حاصل کرنے کے بعد پھر وہ مجاہد بن جاتا ہے اور اس کی جدوجہد کا رخ یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کی صورت میں بھلائی کی نصرت کرے اور حق کو حقیقت بنا دے اور پھر اسلامی نظام کے قیام کے بعد وہ اس زمین کو ایسی ترقی دے اور دنیا کو ایسی قیادت فراہم کرے کہ دنیا شر و فساد سے پاک ہو جائے۔ یہ قیادت صالح، پاک اور تعمیری ہو۔ اور اس کا مقصد ہر بھلائی کو پھیلانا اور ترقی دینا ہو۔ اور اس طرح تمام امور کا رخ اللہ کی طرف پھیر دے۔

انسان اگر اپنی ذات کے محدود کنویں کا مینڈک ہو اور اس میں قید ہو تو پھر اس کی آزادی کی مساعی عبث بن جاتی ہیں۔ وہ آزادی کے بعد اپنی خواہشات کا غلام ہوتا ہے۔ شہوات اور خواہشات میں گرفتار ہوتا ہے۔ انسان اگر خواہشات نفسانیہ کے دائرہ نشیب سے آزاد نہ ہو تو دوسری آزادیاں عبث ہیں۔ اسلام چاہتا ہے کہ دوسری آزادیوں کے ساتھ انسان نفسانی خواہشات سے بھی آزاد ہو جائے تاکہ وہ اللہ کو یاد کرے اور اس کا غلام ہو۔

یہ ہیں آداب نبوت، جو نبوت کے ساتھ لازم رہے ہیں اور اللہ کی مرضی یہ ہے کہ انسانیت ان آداب نبوت کے آفاق تک بلند ہو جائے۔ اور اگر وہاں تک نہ بھی پہنچ سکے تو اس کی نظریں اس افق پر رہوں۔ دیکھئے یوسف علیہ السلام اس مقام تک پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مصر کے تمام خزائن اقتدار ان کے ہاتھ میں آچکے ہیں۔ ان کا خواب سچا ہو چکا ہے۔ انہوں نے جب والدین کو اپنے تخت پر اٹھایا تو بھائیوں نے ان کے سامنے سجدہ کیا، اور حضرت یوسف نے والدین سے کہا کہ باپ! یہ ہے میری خواب کی تعبیر، اللہ نے تو اسے حقیقت بنا دیا۔ اللہ کا احسان دیکھئے کہ اس نے مجھے قید سے نکالا، آپ لوگوں کو دیہات سے مصر لایا حالانکہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان نزاع ڈال دیا تھا۔ بے شک میرا رب لطیف تدابیر اختیار کرتا ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔

غرض ایسے موقعہ پر حضرت یوسف علیہ السلام بلندی ' سرفرازی اور خوشی اور انبساط کے ماحول سے نکل آتے ہیں اور ذکر و فکر میں مشغول ہو کر اپنے رب کی حمد وثنا کرتے ہیں۔ وہ اقتدار کے عروج پر ہیں ان کے تمام خواب حقیقت بن گئے ہیں لیکن ان کی دعوت یہ ہے :

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (۱۲: ۱۰۱) "اے میرے رب! تو نے مجھے اقتدار بھی دیا 'اور مجھے باتوں کی تہ تک پہنچنے کا علم بھی دیا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا و آخرت میں میرا کارساز ہے۔ مجھے اسلام پر موت دے اور نیکوکاروں کے زمرے میں مجھے شامل کر"۔ یہاں جاہ و اقتدار پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ اہل و عیال اور بہن بھائیوں کا یہ اجتماع اور ایک عرصہ بعد رشتہ داروں اور والدین کی ملاقات کی خوشی کافور ہو جاتی ہے۔ اب اس آخری منظر میں ہمیں ایک ایسا فرد نظر آتا ہے جو رب تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا رہا ہے اور سوال یہ ہے کہ میرا اسلام محفوظ ہو اور میری سوسائٹی صالحین کے ساتھ ہو۔ اور یہ مرتبہ اللہ کے فضل و کرم سے ہی مل سکتا ہے۔

اب حضرت سلیمان علیہ السلام کے آداب زندگی ملاحظہ ہوں۔ وہ بھی ایسے حالات میں ہیں کہ طرفۃ العین میں ملکہ سبا کا تخت ان کے سامنے ہے۔ دیکھئے قرآن ایسے حالات میں قوت و جاہ کے حالات میں ان کی کیفیات کس طرح ریکارڈ کرتا ہے۔

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَ مَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ (۲۷: ۴۰) "جب سلیمان نے تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا پایا۔ تو وہ پکار اٹھے یہ میرے رب کے فضل و کرم سے ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفران نعمت کا مرتکب ہوتا ہوں۔ اور جو کوئی شکر کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا اور جو ناشکری کرے گا میرا رب غنی اور بزرگ ہے"۔

اور یہی تھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روش۔ آپؐ کو اپنی پوری زندگی میں یہی ادب اختیار کیا اور نصرت و فتح کے موقعہ پر جسے اللہ نے آپ کے لیے خاص علامت قرار دیا تھا۔ تو حضور اپنی سواری کے اوپر جھکے ہوئے جا رہے تھے۔ آپؐ مکہ میں اسی طرح سر جھکائے ہوئے داخل ہوئے۔ آج آپ اس مکہ میں جس نے آپ کو اذیتیں دی تھیں 'جس نے آپ کو گھر سے نکالا تھا۔ جس نے آپ کے ساتھ پے درپے جنگیں لڑیں 'جو آپؐ کی دعوت کی راہ میں معاندانہ طور پر ڈٹ گیا تھا۔ جب آپؐ کو نصرت اور فتح نصیب ہوئی تو آپؐ نے فتح و کامرانی کے شادیانے نہ بجائے۔ آپ رب کا شکر ادا کرتے ہوئے جھکے جا رہے تھے۔ حمد وثنا میں مشغول تھے اور جس طرح رب تعالیٰ نے آپؐ کو تلقین کی تھی۔ آپؐ تسبیح و تہلیل اور استغفار کر رہے تھے۔ جیسا کہ آثار میں آتا ہے کہ آپ کے بعد آپؐ کے صحابہؓ کا رویہ بھی ایسا ہی رہا۔ اللہ ان سے راضی ہو۔

یوں بشریت ایمان کے ذریعہ سربلند ہوئی۔ انسانیت کا چہرہ روشن ہو گیا۔ وہ صاف و شفاف ہو گئی۔ اب انسانیت عظمت 'قوت اور آزادی کے مقام بلند تک پہنچ گئی۔

---○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ اللھب ۔ ۱۱۱

۱--- تا--- ۵

سورۃ اللھب ایک نظر میں

ابولہب کا نام عبدالعزی ابن عبدالمطلب تھا۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ "ابولہب" کے نام سے اس لیے مشہور ہوگیا کہ وہ شعلے کی طرح سرخ چہرہ رکھتا تھا۔ یہ اور ان کی بیوی' ام جمیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ اذیت دیتے تھے ۔ اور دعوت اسلامی کے جانی دشمن تھے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے حسین ابن عبداللہ بن عبید اللہ ابن عباس نے بتایا' کہتے ہیں میں ربیعہ ابن معاذ دیلمی کو یہ کہتے سنا "میں اپنے والد کے ساتھ تھا اور جوان تھا کہ ایک نوجوان شخص (رسول اللہ) کو میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک ایک قبیلے کے پاس جاتے ہیں (اور ان کے پیچھے ایک دوسرا شخص ہے جو حسین و جمیل ہے اور بڑے بڑے بالوں والا ہے اور بھینگا ہے) اور کہتے ہیں: "اے بنی فلاں میں تمہاری طرف اللہ کی طرف سے رسول بناکر بھیجا گیا ہوں۔ میں تمہیں یہ حکم دیتا ہوں کہ صرف اللہ کی بندگی کرو' اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' میری تصدیق کرو' اور میری حمایت و مدافعت کرو تاکہ میں اس چیز کو نافذ کرسکوں جس کے ساتھ مجھے اللہ نے رسول بناکر بھیجا ہے"۔ یہ نوجوان جب اپنی بات سے فارغ ہوتا تو اس کے پیچھے کھڑا یہ دوسرا شخص یہ کہتا "اے بنی فلاں یہ شخص یہ چاہتا ہے کہ تم لات اور عزیٰ کو چھوڑ دو' اور بنی مالک ابن اقمس کے ان دوستوں کو بھی چھوڑ دو جو تمہارے حلیف ہیں اور اس بدعت اور گمراہی کو قبول کرلو جو یہ لے کر آیا ہے۔ اس کی بات نہ سنو اور نہ اس کی اطاعت کرو"۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا یہ شخص کون ہے؟ تو انہوں نے کہا "یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔ (امام احمد و امام طبرانی)

یہ ایک نمونہ ہے ابولہب کی سازشوں کا جو وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے خلاف کرتا رہتا تھا۔ ام جمیل' اس کی بیوی اس سلسلے میں اس کی معاون تھی۔ ان کی مہم نہایت ظالمانہ اور شدید تھی۔ ام جمیل کا نام اروی بنت حرب ابن امیہ ہے۔ یہ ابو سفیان کی بہن تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوت کے خلاف ابولہب کا یہ رویہ اول روز سے تھا۔ امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ' حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ وادی بطحا کی طرف نکلے اور ایک پہاڑ پر چڑھ گئے اور پکارا "یاصباحاہ" اس پر قریش سب کے سب پہاڑ پر جمع ہوگئے۔ تو آپؐ نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ اگر میں تم سے کہوں کہ دشمن تم پر صبح کو حملہ کرنے والا ہے یا شام کو تو کیا تم میری بات کی تصدیق کروگے؟ تو انہوں نے کہا "ہاں"۔ تو آپؐ نے فرمایا "سنو میں تمہیں ایک شدید عذاب سے ڈراتا ہوں جو تم پر آنے والا ہے۔ اس پر ابولہب نے کہا "کیا تم نے ہمیں اس لیے جمع کیا تھا تم ہلاک ہوجاؤ"۔ اس پر اللہ نے یہ سورت نازل کی۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (۱۱۱ : ۱) "ٹوٹ گئے ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ ہلاک ہوا"۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ اٹھا اور اپنے ہاتھ جھاڑنے لگا اور اس نے کہا ہلاکت ہو تم پر سارا دن؟ کیا تم نے ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا تو اللہ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

جب بنو ہاشم نے ابو طالب کی قیادت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا فیصلہ کیا' اگرچہ انہوں نے آپ ؑ کے دین کو قبول نہ کیا تھا لیکن عصبیت کے اصولوں کے مطابق انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا فیصلہ کیا تو ابولہب بنو ہاشم سے نکل گیا۔ اور اس نے آپ ؑ کے خلاف قریش کے ساتھ حلیفانہ معاہدہ کیا۔ اور جب انہوں نے حضور اکرمؐ اور بنو ہاشم کے ساتھ مقاطعہ کیا اور اس سلسلے کی تحریر پر ابولہب نے بھی دستخط کیے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بنو ہاشم کو قحط سے ڈرا کر اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالے کر دیں۔

آپ ؑ کی دو صاحبزادیاں رقیہ اور ام کلثوم ابولہب کے دو بیٹوں کی مخطوبہ تھیں۔ یہ رشتہ بعثت سے قبل ہوا تھا۔ ابولہب نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ ان کو طلاق دے دیں تاکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر خاندانی بوجھ بڑھ جائے۔

یوں ابولہب اور ان کی بیوی ام جمیل نے آپ ؑ کے خلاف شدید جنگ جاری رکھی ہوئی تھی۔ یہ دونوں دعوت اسلامی کے شدید دشمن تھے اور یہ جنگ انہوں نے اپنی پوری زندگی جاری رکھی۔ کسی وقت بھی اس میں انہوں نے کوئی رو رعایت نہ کی۔ ابوجہل کا گھر حضور اکرمؐ کے گھر کے قریب تھا اس لیے آپ ؐ کو اذیت دینے کے مواقع بھی اس کو بہت ملتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ام جمیل کانٹے جمع کرتی اور حضورؐ کے راستے میں رکھ دیتی۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ لکڑیاں اٹھانا حضورؐ کے خلاف فتنے اٹھانے۔ آپ ؐ کو اذیت دینے اور آپ ؑ کے خلاف سازشیں کرنے سے استعارہ ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۳۱۱ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۵

سُوْرَةُ اللَّهَبِ (۱۱۱) مَكِّيَّةٌ (۶)
آیاتها ۵ رکوعها ۱
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۞ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۞ سَيَصْلٰى ۱
نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۞ وَّامْرَاَتُهٗ ۚ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۞ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۞ ۵ ع
۳۶

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔ ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور (اس کے ساتھ) اس کی جورو بھی ' لگائی بجھائی کرنے والی ' اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہو گی"۔

یہ سورت اللہ کی طرف سے اس لیے نازل ہوئی کہ ابولہب اور اس کی بیوی کی طرف سے برپا کی ہوئی جنگ میں حضور کی حمایت کی جائے۔ گویا یہ معرکہ اللہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (۱۱۱ : ۱) "ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ"۔ تبت ' تباب سے مشتق ہے جس کے معنی ہلاکت ' تباہی اور انقطاع کے ہیں۔ یہاں تبت کے معنی ہیں بددعا کے اور دوسرے تب کے معنی ہیں کہ وہ ہلاک ہو گیا تباہ ہو گیا اور اس کا سلسلہ کٹ گیا۔ یہ خبر ہے وقوع بددعا کی۔ سورت کے آغاز ہی میں اس مختصر آیت میں بددعا اور اس کی تکمیل کا مکمل منظر ہے۔ گویا معرکہ ختم ہو جاتا ہے اور پردہ گر جاتا ہے۔

اس کے بعد ' آنے والی دوسری آیت میں حقیقت واقعہ کا بیان ہے۔

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ (۱۱۱ : ۲) "اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا"۔ اس کے ہاتھ ٹوٹ گئے ' وہ ہلاک و برباد ہو گیا۔ اس کا مال اور اسلام کے خلاف جدوجہد اس کے کچھ کام نہ آئی اور اس کی دولت اور اس کی مکاریاں اسے ہلاکت سے نہ بچا سکیں۔

یہ تو تھا اس کا انجام دنیا میں ۔ آخرت میں اس کا انجام کیا ہو گا؟

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۱۱۱ : ۳) "ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا"۔لھب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آگ بہت شدید اور شعلہ بار ہو گی اور سخت بھڑکی ہوئی ہو گی ۔

وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۱۱۱ : ٤) "اور اس کی جورو لکڑیاں اٹھانے والی" بھی اس آگ میں ڈالی جائے گی' اس حال میں کہ وہ لکڑیاں اٹھائے ہوئے ہو گی اور اس حال میں کہ ۔

فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۱۱۱ : ۵) "اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہو گی"۔ اور اس رسی کے ساتھ اسے آگ میں باندھ دیا جائے گا یا یہ رسی وہ ہو گی جس کے ساتھ لکڑیاں باندھی جاتی ہیں ۔اگر اس کا حقیقی معنی لیا جائے تو وہ وہاں بھی لکڑیوں اور کانٹوں کا گٹھا اٹھائے ہوئے جہنم میں جائے گی اور اگر مجازی معنی لیا جائے تو معنی یہ ہو گا جو شرارت کی آگ کو بھڑکاتی ہے ۔اور فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے کی سعی کرتی ہے ۔

اس سورت کا طرز ادا اس کے موضوعات اور معانی کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ سورت کی فضا کے مناسب طرز تعبیر اختیار کیا گیا ہے ۔ اس سلسلے میں میری کتاب "قرآن میں مناظر قیامت" سے چند سطریں یہاں نقل کرنا ضروری ہیں ۔ ان کا یہاں نقل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اس سورت کے نزول سے ام جمیل کے دل میں ایک ایسا تیر لگا جس کی وجہ سے وہ برافروختہ ہو گئی اور پاگل ہو کر رہ گئی ۔

"ابولہب (شعلوں کا باپ) ایک ایسی آگ میں تپایا جائے گا جو شعلہ زن ہو گی اس کی عورت جو حضورؐ کی راہ میں خار دار جھاڑیاں لا کر ڈالتی تھی وہ جہنم میں اس حال میں گرائی جائے گی کہ اس کے گلے میں مونجھ کی رسی بندھی ہو گی"۔

"الفاظ بھی باہم متناسب اور صوتی ہم آہنگی رکھنے والے' تصاویر بھی باہم' یک رنگ' بس جہنم میں اس کو گرایا جائے گا وہ شعلہ بار ہے ۔ اس میں شعلوں کے باپ (ابولہب) کو گرایا جائے گا۔ اس کی عورت لکڑیاں لاتی ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں ڈالتی ہے اور آپؐ کو ایذائیں دیتی ہے' خواہ حقیقی معنی لیا جائے یا استعارہ ۔لکڑیوں سے آگ کو بھی بھڑکایا جاتا ہے اور ان لکڑیوں کو رسیوں میں باندھ کر لایا جاتا ہے ۔ اس لیے جہنم شعلہ زن میں اسے مونجھ کی رسی سے باندھ دیا جائے گا۔ اور اسے اس رسی سے باندھ دیا جائے گا جس سے وہ لکڑیاں لاتی تھی ۔ تاکہ سزا ایسی ہو جیسا اس کا جرم تھا۔ اور یہ تصویر اپنے سادہ رنگوں کے ساتھ سامنے آئے اور اس کے رنگ میں لکڑیاں' رسی' آگ اور شعلے ہوں ۔ اور اس آگ میں میاں بیوی دونوں تپ رہے ہیں"۔

ایک دوسرے زاویہ سے بھی اس سورت میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔ الفاظ کی صوتی جھنکار' لکڑیوں کے گٹھے کے باندھنے کی آواز اور گردن کو رسی سے باندھنے کی آواز بھی باہم یکساں ہیں ۔ ذرا پڑھئے ۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (۱۱۱ : ۱) ان الفاظ میں شدید صوتی درشتگی ایسی ہی ہے جس طرح لکڑیوں کے گٹھے کو باندھنے میں سختی ہوتی ہے ۔ جس طرح یہ الفاظ شدید ہیں اسی طرح گردن میں رسی باندھنے کا عمل اور

اسے کھینچنا شدید ہے۔ اور پوری سورت میں اسی طرح کی کٹھن کی فضا ہے"۔

اس طرح صوتی ترنم' عملی کشاکش کی آواز' اور سورت کی حرکات کی جزئیات کے درمیان گہری مناسبت اور ہم آہنگی ہے۔ پھر الفاظ بھی ہم جنس' اور تعبیر میں یکسانی کا لحاظ' سب کے سب سورت کی فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ پھر یہ تمام چیزیں سبب نزول اور سورت کے پس منظر کے ساتھ بھی جڑی ہوئی ہیں۔ یہ سب فنی خوبیاں صرف پانچ مختصر فقروں میں ملحوظ خاطر رکھی گئی ہیں اور قرآن کی مختصر ترین سورتوں میں سے ایک میں اس فنی کمال کو ظاہر کیا گیا ہے۔

اس سورت کی ان فنی خوبیوں کی وجہ سے اور بے پناہ اثر کی وجہ سے ام جمیل کا تاثر یہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں اس کی ہجو کی ہے۔ یہ سورت فوراً مکہ میں پھیل گئی تھی' جس میں میاں بیوی کی مذمت کی گئی تھی' ان کو دھمکی دی گئی تھی اور نہایت بھدی تصویر کھینچی گئی تھی۔ یہ ایسی تصویر کشی تھی جس نے ایک خود پسند عورت کے دل کو چور چور کر دیا۔ جسے اپنے نسب و حسب پر بہت ہی غرور تھا۔ جو اپنے آپ کو بہت ہی اونچے گھرانے کی عورت سمجھتی تھی۔ لیکن قرآن نے اس کی تصویر کشی یوں کی :

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (٤) فِي جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (١١١ : ٥) "عورت' جو لکڑیاں اٹھانے والی ہے اور جس کے گلے میں چھال کی رسی بندھی ہوئی ہے"۔ یہ نہایت ہی عام صورت حالات ہے جو عربوں میں عام تھی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھ تک یہ تذکرہ پہنچا ہے کہ ام جمیل حمالة الحطب نے جب اس سورت کے نزول کے بارے میں سنا کہ یہ اس کے بارے میں اور اس کے خاوند کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ گئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی مٹھی پتھروں سے بھری ہوئی تھی' جب یہ ان دونوں کے پاس آکر کھڑی ہوئی تو اللہ نے اس کی آنکھوں پر اس طرح پردہ ڈال دیا کہ وہ صرف ابوبکر کو دیکھ سکتی تھی۔ تو اس نے کہا: "ابوبکر کہاں ہے تمہارا ساتھی' مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے میری ہجو کی ہے۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے ملتا تو میں ان پتھروں سے اسے مارتی۔ خدا کی قسم میں بھی تو شاعرہ ہوں اس کے بعد اس نے یہ شعر پڑھا

مذمما عصينا　　　　　وامره ابينا

وہ محمد نہیں بلکہ مذمت کیے ہوئے ہیں' ہم نے ان کی نافرمانی کی ہے اور ان کے احکام ماننے سے انکار کر دیا یا ان کے دین کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

یہ واپس چلی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہؐ سے کہا: کیا اس نے آپؐ کو نہیں دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا "اس نے مجھے نہیں دیکھا' اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر کو مجھ سے کھینچ لیا تھا"۔

حافظ ابوبکر بزار نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے' جب سورہ

تَبَّتْ يَدَآ اَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ (١١١ : ١) نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی حرم میں آئی۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ کعبہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا حضورؐ اگر

آپ ؐ ایک طرف ہو جائیں تو یہ آپ ؐ کو اذیت نہ دے سکے گی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" میرے اور اس کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا"۔ یہ آئی اور حضرت ابوبکرؓ کے پاس کھڑی ہوگئی اور کہا :"ابوبکر تمہارے ساتھی نے ہماری ہجو کی ہے"۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا :"اس گھر کی قسم انہوں نے ایسا نہیں کیا' وہ نہ شعر کہتے ہیں اور نہ ہی پڑھتے ہیں"۔ تو اس نے کہا آپ ؐ تو سچے ہیں۔ جب واپس گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا"حضور ؐ کیا اس نے آپ ؐ کو نہیں دیکھا؟ تو آپ ؐ نے فرمایا"جب تک وہ کھڑی رہی فرشتے مجھ پر ستر پھیلاتے رہے جب تک وہ چلی نہیں گئی"۔

غرض اس کا پارہ اس قدر چڑھ گیا تھا کیونکہ یہ سورت پھیل گئی تھی' اس نے اسے اپنی ہجو سمجھا۔ اس زمانے میں ہجو صرف اشعار میں ہوتی تھی۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے جائز طور پر ہجو کی تردید کر دی۔ اور وہ بہت سچے مانے جاتے تھے لیکن ان آیات میں اس کی جو حقارت آمیز تصویر کشی کی گئی ہے وہ اس دائمی کتاب میں ریکارڈ کر دی گئی ہے۔ اللہ کی کتاب بھی لازوال ہے اور ان دونوں کی مذمت بھی لازوال ہوگئی۔ اور یہ ایسی تصویر ہے جو ایک بولتی تصویر ہے۔ یہ ہے سزا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؐ کی دعوت کے خلاف سازش کرنے کی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی دعوت اسلامی اور داعیان حق کے خلاف اس قسم کی سازشیں کرتے ہیں ان کی قسمت میں دنیامیں بھی ناکامی لکھی ہوئی ہے۔ وہ یہاں بھی ہلاک اور برباد ہوں گے۔ اور آخرت میں بھی وہ ایک سخت سزا پائیں گے۔ یہ ان کی مناسب سزا ہوگی۔ دنیا میں لکڑہاروں کی رسی جس ذلت کی طرف اشارہ کرتی ہے' آخرت میں بھی یہ رسی اس کے گلے میں ہوگی اور یہ ذلت کی کافی نشانی ہوگی۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الاخلاص ۔ ۱۱۲

۱--- تا --- ۵

سورۃ الاخلاص ایک نظر میں

صحیح روایات میں آتا ہے کہ یہ مختصر سورت پورے قرآن کے ایک تہائی حصے کے برابر ہے۔امام بخاری فرماتے ہیں : حدیث بیان کی اسماعیل نے ' مالک سے 'انہوں نے عبدالرحمن ابن عبداللہ ابن عبدالرحمن ابن صعصعہ سے 'انہوں نے اپنے والد سے 'انہوں نے ابوسعد سے ' وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو یہ پڑھتے سنا۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲ : ۱) یہ اسے بار بار پڑھ رہا تھا۔جب صبح ہوئی تو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا' یہ تذکرہ کرنے والا یہ تاثر دے رہا تھا کہ یہ بہت کم ہے جو پڑھنے والا پڑھ رہا تھا' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے 'یہ سورت تو ایک تہائی قرآن کے برابر ہے''۔
یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے اس لیے کہ جس توحید کے اعلان کرنے کا حکم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲ : ۱) ''کہہ دو کہ وہ اللہ یکتا ہے''۔یہ عقیدہ توحید انسانی ضمیر کا بھی عقیدہ ہے ' یہ اس کائنات کی تفسیر بھی ہے اور یہ زندگی کا ایک نظام بھی ہے لہذا یہ سورت اسلامی نظام زندگی کے اہم ترین خطوط کا ایک بنیادی نقشہ پیش کرتی ہے۔

--- ooo---

درس نمبر ۲۱۳ تشریح آیات

۱ -- تا -- ۴

سُورَۃُ الْاِخْلَاصِ (۱۱۲) مَکِّیَّۃٌ (۲۲) — اٰیَاتُہَا ۴ — رُکُوْعُہَا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ۧ

۱ ع ۴ ۳۷

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"کہو' وہ اللہ ہے' یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے"۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲ : ۱) "کہو' وہ اللہ ہے یکتا"۔ احد کا لفظ واحد سے زیادہ گہرا ہے کیونکہ احد' واحد کے مفہوم پر مزید اضافہ کرتا ہے' کہ اس کے ساتھ اور کوئی چیز حقیقتاً موجود نہیں ہے اور اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے یعنی وہ یکتا ہے۔

"احد" میں وجود کی احدیت کا اظہار ہے' یعنی اس کی حقیقت کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کے سوا اور کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔ اللہ کے سوا جس قدر موجودات ہیں وہ اپنا وجود اللہ سے اخذ کرتی ہیں اور وہ اپنی حقیقت اللہ کی حقیقت سے لیتی ہیں۔ وہ فاعلیت میں بھی یکتا ہے لہٰذا اللہ کے سوا اس پوری کائنات میں کوئی اور موثر اور کوئی اور فاعل نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ایک نظریہ اور عقیدہ ہے جو انسان کے ضمیر میں جاگزیں ہوتا ہے اور یہ دراصل اس کائنات کی تفسیر بھی ہے۔ جب کسی دل میں یہ عقیدہ بیٹھ جاتا ہے اور عقل اس کا تصور کر لیتی ہے۔ اور اس پوری کائنات کی تفسیر اس کی روشنی میں ہو جاتی ہے تو انسانی دل پر کوئی اور تصور نہیں چھاتا اور انسانی قلب میں کسی اور سوچ کا شائبہ نہیں رہتا۔ اور انسانی قلب اس واحد ذات واجب الوجود کے سوا کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا' کیونکہ دراصل موجود تو یہی ذات یکتا ہے اور فعال اور مؤثر بھی یہی واحد ذات ہے۔

پھر اس کائنات میں جو چیزیں بھی پائی جاتی ہیں ان کے ساتھ قلب انسانی کا رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ہونا یہ چاہیے تھا

کہ انسانی دل سے ماسوی اللہ کے وجود کا شعور ہی ختم ہو جائے۔ اگر یہ شعور ختم نہ بھی ہو، تعلق ختم ہو جاتا، اس لیے کہ اللہ کے وجود کے سوا تمام دوسری اشیاء کے وجود کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور اس پوری کائنات میں اللہ کے ارادے کی فاعلیت اور تاثیر کے سوا کوئی اور چیز فعال اور موثر بھی نہیں ہے۔ لہذا عقیدۂ توحید کے بعد قلب انسانی کسی ایسی چیز سے کیوں متعلق ہو جو نہ حقیقتاً موجود ہے اور نہ کسی چیز میں فعال و موثر ہے۔

اب جب دل اللہ یکتا کے سوا تمام اشیاء کی حقیقت کے تصور ہی سے خالی ہو گیا اور اس میں ماسوی اللہ سے تعلق ہی نہ رہا۔ تو اب یہ دل صحیح میں آزاد ہوتا ہے، وہ ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس دل کی تمام خواہشات ختم ہو جاتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ خواہشات ہی دراصل پاؤں کی زنجیریں ہوتی ہیں۔ پھر خوف بھی اس دل سے ختم ہو جاتا ہے اور یاد رہے کہ اس خوف کی وجہ سے بھی انسان پابند سلاسل ہو جاتا ہے۔ انسان کے دل سے مرغوبات کیوں ختم ہو جاتی ہیں اس لیے کہ جب وہ اللہ کو پالیتا ہے تو وہ سب کچھ پالیتا ہے اور وہ ڈرتا اس لیے نہیں کہ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی فعال نہیں۔

جب انسانی شعور میں یہ حقیقت اچھی طرح بیٹھ جائے کہ انسان کو اس کائنات میں صرف اللہ کی حقیقت نظر آتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر اس کائنات میں انسان کو جو وجود نظر آئے گا اس میں بھی اسے یہی حقیقت نظر آئے گی۔ اس طرح پھر انسانی قلب کو ہر چیز میں دست قدرت نظر آتا ہے اور اس کے بعد پھر انسان اس درجے پر فائز ہوتا ہے کہ اسے اس کائنات میں اللہ کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

اس عقیدے اور تصور کے نتیجے میں انسان سوچنے لگتا ہے کہ ظاہری اسباب بھی ہیچ ہیں۔ اصل اور حقیقی سبب مسبب الاسباب ہے یعنی ذات باری تعالیٰ۔ یہ وہ نکتہ ہے جس کی طرف قرآن نے بہت توجہ کی ہے اور اسے اسلام کی ایمانیات میں داخل کر کے ذہنوں میں بٹھانے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ ظاہری اسباب کو برطرف کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ اصل سبب مشیت الٰہیہ ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸ : ۱۷) "جب تم نے پھینکا تو دراصل تم نے نہیں پھینکا مگر اللہ نے پھینکا"۔ اور آل عمران (۱۲۶) میں یہ کہا گیا:

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۳ : ۱۲۶) "فتح و نصرت صرف اللہ کی طرف سے ہے"۔ اور الدھر (۳۰) میں ہے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۷۶ : ۳۰) "اور تم نہیں چاہتے الا یہ کہ اللہ چاہے"۔ اسی طرح کی بے شمار اور آیات ہیں۔

جب انسان اسباب ظاہری کو برطرف کر دیتا ہے تو پھر اسے نظر آتا ہے کہ تمام امور اللہ کی مشیت سے طے پاتے ہیں۔ پھر اس سے اس کے دل میں اطمینان پیدا ہو جاتا ہے اب وہ تمام مرغوبات اللہ سے طلب کرتا ہے اور تمام مکروہات سے بچنے کے لیے اللہ کے ہاں پناہ ڈھونڈتا ہے اور ظاہری عوامل، ظاہری اسباب اور موثرات جو کچھ کرتے نظر آتے ہیں، اس کائنات میں ان کی کوئی حقیقت اس کی نظروں میں نہیں ہوتی۔

یہ تھے وہ مقامات جن کو عبور کرنے کی سعی صوفیاء کرتے رہے۔ لیکن ان مقامات کی کشش ان کو کہیں دور ہی لے گئی۔ صوفیا اس بات کو سمجھ نہ سکے کہ اسلام لوگوں کو بلاکر ان مقامات بلند تک ضرور لے جاتا ہے لیکن وہ ان کو اس دنیا کی عملی زندگی کے تمام نشیب و فراز کے اندر رکھتے ہوئے اور ہر طرح کی انسانی زندگی کے اندر رہتے ہوئے اور اس زمین پر اللہ کی نیابت کے فرائض کی ادائیگی کرتے ہوئے ان مقامات تک پہنچاتا ہے۔ وہ اس دنیا کی زندگی میں بھرپور حصہ بھی لیتے ہیں اور اسے ہیچ بھی سمجھتے ہیں۔ وہ اس کائنات میں رہتے ہیں لیکن وہ حقیقی موجود صرف اللہ کو سمجھتے ہیں۔ وہ تمام واقعات و حادثات میں فعال اور موثر اللہ کو سمجھتے ہیں۔ اور اس طریقے کے سوا اسلام کوئی دوسرا طریقہ نہیں اپناتا' نہ چاہتا ہے۔ پس اس کے نتیجے میں ایک مکمل نظام زندگی وجود میں آتا ہے۔ یہ نظام اس کائنات کی اس تشریح اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شعور' تصورات اور رجحانات کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نظام زندگی کے خدوخال کیا ہیں؟

(۱) اس نظام کا ایک اپنا نظام عبادت ہے جس میں صرف اللہ کی بندگی کی جاتی ہے۔ وہ اللہ جس کے وجود کے سوا کسی وجود کی کوئی حقیقت نہیں' جس کی فاعلیت کے سوا کوئی اور فاعلیت نہیں۔ اور اس کے ارادے کے سوا کسی اور کا ارادہ موثر نہیں۔

(۲) یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں ایک انسان ہر حالت میں' امید میں اور خوف میں صرف اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ خوشی اور غم میں' امیری اور فقیری میں' غرض ہر حال میں اس کا رخ صرف اللہ وحدہ کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس نظام میں ہر شخص یہ جانتا ہے کہ جب اللہ کے سوا کسی اور چیز کا وجود ہی حقیقی نہیں۔ تو پھر اس کی طرف توجہ اور پکار کا فائدہ کیا ہوگا۔ جب اللہ کے سوا اور کوئی نہ فاعل ہے اور نہ موثر تو پھر اس کی طرف توجہ سے حاصل کیا ہوگا۔

(۳) یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں ہدایات صرف اللہ سے لی جاتی ہیں۔ عقائد و نظریات' اقدار اور پیمانے' شریعت اور قانون' ادارے اور انتظام' رسوم و رواج' آداب و تقالید سب کی سب اللہ سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہر قسم کی ہدایت اور رہنمائی صرف اللہ وحدہ سے لی جاتی ہے۔ جو حقیقت واقعہ میں بھی اور ایک مسلم کے ضمیر میں بھی واحد موجود ہے۔

(۴) یہ نظام ایک نظام تحریک اور عمل ہے۔ اور یہ تحریک و عمل صرف اللہ وحدہ کے لیے ہے۔ اس کی رضا کے حصول کے لیے اس کے قرب کے حصول کے لیے۔ اس امید پر کہ اس تک پہنچنے کی راہ میں تمام پردے اور رکاوٹیں دور ہوں گی۔ اور گمراہی کے تمام شوائب سے انسان محفوظ ہو گا' چاہے یہ پردہ اور رکاوٹیں نفس انسانی کے اندر ہوں' یا انسانی ماحول کی چیزوں اور انسانوں کی طرف سے ہوں۔ جن میں خود انسان کی ذلت' انسان کا خوف اور اس کی خواہش اور اس دنیا میں اس کی مرغوب اشیاء سرفہرست ہیں۔

(۵) یہ ایک ایسا نظام ہے کہ مذکورہ بالا امور کے ساتھ ساتھ وہ قلب بشری اور اس کائنات کی تمام موجودات کے درمیان' محبت' انس' تعاون' یگانگت کا تعلق پیدا کرتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا کے بندھنوں سے آزادی کے معنی یہ نہیں کہ انسان اس کو مکروہ سمجھے' اس سے نفرت کرے' اس سے بھاگے اور اس کے برتنے سے اجتناب کرے۔ اس لیے کہ دنیا کی اشیاء سب کی سب اللہ کے دست قدرت کے کرشمے ہیں۔ ان کا وجود اللہ کے وجود سے ماخوذ ہے۔ اور سب اشیاء پر اسی حقیقت کی پرتو پڑتی ہے' لہٰذا یہ سب چیزیں محبوب ہیں کیونکہ یہ اللہ کے تحفے ہیں جو حبیب ہے۔

(۶) یہ نظام نہایت بلند اور آزاد نظام ہے' اس کی نظروں میں زمین ایک چھوٹی سی گیند ہے' دنیا کا سازوسامان بے قیمت ہے اور ان پردوں اور رکاوٹوں سے آزادی سب کی تمنا ہے لیکن دنیا کی غلامی سے آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان دنیاوی امور سے الگ تھلگ ہو جائے اور اس دنیا کو یونہی مہمل چھوڑ دے ۔یا اس سے نفرت کرے' اور اس سے بھاگے' بلکہ اسلامی نظام کا تقاضا یہ ہے کہ جہد مسلسل ہو' دائمی جدوجہد برپا ہو' انسانیت کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے تک ترقی دی جائے' اور انسان کی زندگی پوری طرح آزاد اور فری ہو۔پس دنیا کی زندگی کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ منصب خلافت الٰہیہ ہے جس کی اپنی ذمہ داریاں ہیں لیکن ان ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے انسان ان کا غلام بھی نہیں ہے ۔ان سے آزاد بھی ہے جیسا کہ ہم نے اس کی تشریح کی ۔

دنیا سے چھٹکارے کا ایک تو وہ طریقہ ہے جو گرجوں نے تجویز کیا لیکن اسلام صومعاتی رہبانیت کا قائل نہیں ہے اس لیے کہ انسان نے خلافت ارضی کے فرائض بھی سرانجام دینے ہیں اور انسانوں کو ایک اچھی قیادت کی بھی ضرورت ہے ۔ اور یہ دونوں امور انسان کی نجات اور فلاح اور اس دنیا کی غلامی سے چھٹکارے کے لیے ضروری ہیں ۔یہ راہ بہت دشوار ہے ۔ یعنی انسان کی انسانیت کا تحقق صرف اسی صورت میں ممکن ہے ۔اس طرح انسان کی شخصیت میں روحانیت کا غلبہ ہو جاتا ہے ۔اور یہ ہے آزادی' انسان کی روح دنیاوی آلائشوں سے آزاد ہو کر اپنے اصلی مصدر کی طرف آزاد ہو جاتی ہے اور انسان کو اللہ نے پیدا کر کے جس دنیا میں چھوڑا ہے اس میں کام کرتے ہوئے بھی وہ اپنی اعلیٰ روحانی مقام اور حقیقت کو برقرار رکھتا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ رسالت کے آغاز میں دعوت کو صرف عقیدۂ توحید تک محدود رکھا گیا اور مندرجہ بالا معنوں میں عقیدۂ توحید کو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش کی گئی کیونکہ اس معنی میں توحید انسانی قلب و ضمیر میں بیٹھا ہوا ایک عقیدہ بھی ہے ۔اس کائنات کی تفسیر و تشریح اور تعبیر بھی ہے اور ایک مکمل نظام حیات بھی ہے ۔اس مفہوم میں عقیدۂ توحید صرف الفاظ نہیں جن کا اقرار زبان سے کر دیا جائے اور صرف انسانی ضمیر و شعور کا پختہ یقین بھی نہیں ہے جو صرف ضمیر و شعور کے اندر ہی پوشیدہ ہو' یہ سب کچھ ہے' پورا دین ہے بلکہ اس عقیدے کی تفصیلات ہیں ۔اس کے کچھ نتائج ہیں اور یہ تفصیلات اور یہ نتائج اس عقیدے کے طبعی اور لازمی نتائج ہیں ۔اور یہ نتائج قوانین طبیعیہ کی طرح سامنے آتے ہیں ۔اگر دین میں یہ عقیدہ موجود ہو۔

اہل کتاب کے اندر جو انحراف پیدا ہوا' جس نے ان کے عقائد و تصورات' ان کی عملی زندگی کو برباد کر دیا' اس کا آغاز بھی پہلے پہل حقیقی عقیدۂ توحید کے مٹ جانے کی وجہ سے ہوا۔ عقیدۂ توحید کے مٹنے کے بعد پھر دوسرے انحرافات پیدا ہوئے ۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام کے نظریہ توحید کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہ انسانی زندگی کے اندر نہایت گہرائی تک اترتا ہے ۔اسلام چاہتا ہے کہ انسانوں کی پوری زندی اس عقیدے پر استوار ہو' اور انسانوں کی زندگی کا عملی نظام پورے کا پورا عقیدۂ توحید کی اساس پر قائم ہو۔جس طرح اس کے اثرات تصورات و عقائد میں ہوں اسی طرح شریعت و قانون میں بھی ہوں ۔اور اس طرح کے آثار میں سے بڑا اثر اور اس کے نتائج میں سے بڑا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی پر شریعت الٰہیہ کی حکمرانی ہو ۔اگر اقرار توحید کے بعد یہ آثار نمودار نہ ہوں تو یہ سمجھا جائے گا کہ عقیدۂ توحید موجود نہیں ہے ۔

اس لیے کہ اسلام کا عقیدۂ توحید جب دل میں اترتا ہے تو وہ ارکان حیات اور نظام حیات اور اعمال کی شکل میں اگتا ہے۔

اس کا مفہوم کہ اللہ ''احد'' ہے' یہ ہے کہ وہ ''صمد'' ہے' یعنی وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اور سب اس کے محتاج ہیں۔ اور یہ کہ نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ اور اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ لیکن ''احد'' کے بعد ان دوسرے مفاہیم کو محض وضاحت کے لیے الگ ذکر کیا گیا ہے۔

اَللّٰہُ الصَّمَدُ (۲:۱۱۲) ''اللہ سب سے بے نیاز ہے''۔ صمد کا لغوی معنی ہیں وہ جس کی اجازت کے بغیر کوئی امر طے نہ ہوتا ہو اور اللہ تو وہ سردار ہے جس کے سوا کوئی سید اور سردار نہیں ہے۔ وہ اپنی الوہیت میں یکتا ہے اور سب اس کے غلام ہیں۔ اور وہی وحدہ قاضی الحاجات ہے۔ وہی ہے جو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے' اور ہر بات کا فیصلہ اس کے حکم سے ہوتا ہے اور اس فیصلے میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہوتا۔ اور یہ مفہوم خود لفظ احد میں بھی مکمل طور پر موجود ہے۔

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ (۳:۱۱۲) ''نہ اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے''۔ اللہ کی ذات وہ حقیقت ہے جو ازلی اور ابدی ہے۔ اور اس کی ذات ایک حال سے دوسرے حال میں بدل نہیں سکتی۔ اس کی صفت یہ ہے کہ وہ کامل مطلق ہے اور تمام حالات میں ذات باری کامل ہوتی ہے۔ ولادت کا عمل سب کو معلوم ہے کہ پھٹنے اور بڑھنے سے عبارت ہے۔ عدم سے وجود میں آنا یا نقص سے کمال کی طرف بڑھنا دراصل ولادت کی علامات ہیں اور اللہ ان چیزوں سے پاک ہے۔ پھر ولادت کے لیے زوجیت کی ضرورت ہے اور پھر زوجہ ہمیشہ زوج اور خاوند کی ہم جنس ہوتی ہے۔ اور یہ بھی اللہ کے لیے محال ہے' اور خدا کے احد ہونے کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا۔

وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ (۴:۱۱۲) ''اور کوئی اس کا ہمسر نہیں''۔ نہ اس کا کوئی مماثل ہے اور نہ برابر ہے۔ نہ وجود کی حقیقت کے اعتبار سے' نہ فاعلیت کے اعتبار سے' اور نہ اللہ کی کسی ذاتی صفت میں۔ اور یہ بات بھی لفظ ''احد'' میں موجود ہے۔ وہ چونکہ احد ہے اس لیے اس کا کوئی کفو نہیں ہے۔ یہ سب فقرے ''احد'' کی تاکید و تشریح ہیں۔ یہ عقیدہ اس زرتشتی عقیدے کی تردید کرتا ہے کہ اللہ خیر کا الٰہ ہے اور شر کا الٰہ کوئی اور ہے۔ یہ ثنائی عقائد کے پیروکاروں کا خود ساختہ عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ ایران میں مروج ہے۔ چنانچہ قدیم ایرانی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ایک خیر کا الٰہ ہے اور دوسرا شر کا الٰہ ہے۔ ایک نور کا الٰہ ہے اور دوسرا ظلمت کا الٰہ ہے اور جزیرۃ العرب کے جنوب میں بعض لوگ یہ عقائد رکھتے تھے جہاں ایرانیوں کی حکومت تھی۔

یہ سورت اسلام کے عقیدۂ توحید کو پوری طرح ثابت کرتی ہی۔ جس طرح سورۃ الکافرون کا موضوع یہ تھا کہ عقیدۂ توحید اور شرک کے درمیان کوئی مصالحت اور مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا دونوں سورتوں کا موضوع مختلف زاویوں سے عقیدۂ توحید ہی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم روز مرہ کے معمولات کا آغاز صبح کی دو سنتوں سے کرتے تھے اور ان میں یہ دو سورتیں پڑھتے تھے۔ اور صبح کی سنتوں میں ان کا پڑھنا بامقصد تھا اور یہ بات واضح بھی ہے۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الفلق ۔ ۱۱۳

۱-- تا-- ۵

سورۃ الفلق ایک نظر میں

یہ سورت اور اس کے بعد آنے والی سورت ابتداءً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہدایات ہیں اور اس کے بعد ان کا اطلاق تمام اہل ایمان پر بھی ہوتا ہے 'کہ تمام خطرات سے بچنے کے لیے اللہ کے حظیرۂ امن میں آجاؤ' اللہ کی حفاظت اور پناہ میں آجاؤ۔ یہ خطرات ظاہری ہوں یا مخفی۔ معلوم ہوں یا مجہول۔ تمام خطرات سے اور خصوصاً فلاں فلاں خطرات سے۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنے حظیرۂ امن اور اپنی پناہ گاہ کا دروازہ کھولتا ہے اور نہایت شفقت اور محبت سے ندا دیتا ہے کہ آؤ یہ محفوظ مقام ہے' یہ جائے پناہ ہے تمہارے لیے 'تم یہاں مطمئن ہو جاؤ گے۔ آؤ' آؤ میں جانتا ہوں کہ تم ضعیف ہو' تمہارے بہت سے دشمن ہیں' تمہارے لیے پر خطر مقامات ہیں۔ اور یہاں امن' اطمینان ہے اور حفاظت و سلامتی ہے۔

اس لیے دونوں سورتوں کا آغاز یوں ہے :قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳ : ۱) ''کہو' میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی''۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴ : ۱) ''کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی''۔ اس کے نزول کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے بارے میں متعدد روایات ہیں۔ ان روایات سے وہ تبصرہ اور وہ فضا ثابت ہوتی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نہایت فرحت و انبساط اور نہایت گہرائی اور کشادگی سے لیا۔

حضرت عقبہ ابن عامر سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :''کیا تم نے ان آیات پر غور کیا جو آج کی رات مجھ پر نازل ہوئیں؟ ایسی آیات اس سے قبل ہرگز نہیں دیکھی گئیں وہ یہ ہیں۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳ : ۱) اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴ : ۱) ہیں۔ (مالک' مسلم' ترمذی' ابوداؤد' نسائی) حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا ''اے جابر پڑھو''۔ میں نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں کیا پڑھوں۔ آپؐ نے فرمایا :پڑھو'

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳ : ۱) اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴ : ۱) میں نے ان کو پڑھا۔ آپؐ نے فرمایا ''انہیں پڑھو ان جیسی سورتیں تم نہ پڑھوگے''۔ (نسائی) زر ابن حبیش سے روایت ہے' کہتے ہیں :میں نے حضرت ابی ابن کعبؓ سے 'معوذتین کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا ''ابوالمنذر تمہارے بھائی ابن مسعودؓ ان کے بارے میں یہ کہتے ہیں۔ (حضرت ابن مسعود ان کو اپنے مصحف میں نہ لکھتے تھے۔ لیکن بعد میں وہ صحابہ کرامؓ کی جماعت کی رائے کی طرف پلٹ گئے تھے اور ان کو اپنے مصحف میں لکھ لیا تھا)۔ توانہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا آپؐ نے فرمایا مجھ سے کہا گیا ''کہو''۔ تو میں نے کہا کہو۔ تو ہم اسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضور اکرمؐ نے کہا۔

غرض یہ تمام روایات اس پر مسرت اور پسندیدہ فضا کا اظہار کرتی ہیں جس کا ہم نے تذکرہ کیا۔

درس نمبر ٣١٣ تشریح آیات

١ -- تا -- ٥

سُوْرَۃُ الْفَلَقِ (١١٣) مَكِّيَّةٌ (٢٠) — اٰیَاتُهَا ٥ — رُكُوْعُهَا ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

١ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝١ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝٢ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا
٥ ع وَقَبَ ۝٣ وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝٤ وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝٥
٢٨

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"کہو ' میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی ' ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے ' اور رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے ' اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شر سے ' اور حاسد کے شر سے جب کہ وہ حسد کرے "۔

اس سورت میں اللہ اپنی وہ صفات بیان فرماتا ہے ' جس کے ذریعہ اس شر سے پناہ حاصل ہوتی ہے ' جس کا ذکر اس سورت میں کیا گیا ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (١١٣ : ١) "کہو ' میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی "۔ فلق کے معانی میں سے ایک معنی صبح کا ہے اور ایک معنی "فلوق" کا بھی ہے۔ بایں معنی کہ ہر وہ چیز جس سے وجود اور زندگی پھوٹتی ہے جس طرح سورہ انعام (٩٥) میں کہا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰی یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ (٦ : ٩٥) "اللہ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالنے والا ہے"۔ اور اگلی آیت (٩٦) میں ہے۔

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَ جَعَلَ الَّیْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا (٦ : ٩٦) "وہ صبح کو پھاڑ کر نکالنے والا ہے ' اس نے رات کو وجہ سکون بنایا۔ اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا"۔

اگر فلق کے معنی صبح کا لیے جائیں تو معنی یہ ہوں گے ۔ صبح کے وہ رب جو روشنی پھیلا کر ہر چیز کو اس شر سے محفوظ کر دیتا ہے جو اندھیروں میں مستور ہوتی ہے اور اگر فلق سے مراد مخلوق ہو تو معنی یہ ہوں گے ۔ پناہ مانگتا ہوں مخلوق کے رب کی جو اپنی مخلوق کے شر سے پناہ دینے والا ہے ۔ لہٰذا دونوں صورتوں میں مفہوم بعد کے فقرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے ۔

مِن شَرِّ مَا خَلَقَ (۱۱۳ : ۲) "ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی یعنی مطلق اور اجمالاً تمام مخلوق کے شر سے ۔ اللہ کی مخلوقات میں سے بعض جب بعض سے ملتی ہیں تو اس اتصال سے بعض اوقات شر پیدا ہوتا ہے جبکہ بعض حالات میں مخلوقات کے ملاپ اور اتصال سے خیر اور نفع پیدا ہوتا ہے ۔ لہٰذا چاہا جاتا ہے کہ مخلوق کے شر سے پناہ مانگو تاکہ خیر ہی خیر رہ جائے ۔ اور اللہ کی ذات جو اس مخلوقات کی خالق ہے وہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ اس کو ایسی راہ کی ہدایت دے اور ایسی تدابیر کرے کہ ان سے خیر نمودار ہو اور شر کا ظہور نہ ہو ۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (۱۱۳ : ۳) "اور رات کی تاریکی کے شر سے جب وہ چھا جائے"۔ غاسق کے لغوی معنی کو دنے والے کے ہوتے ہیں اور وقب پہاڑ کے اس سوراخ کو کہتے ہیں جس سے پانی نکلتا ہے ۔ یہاں غاسق سے مراد رات ہے یعنی رات اور اس میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں یعنی وہ رات جب وہ پھوٹ کر زمین پر چھا جاتی ہے ۔ یہ رات بذات خود خوفناک ہوتی ہے اور اس وقت اس کی خوفناکی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب اس میں ہر خفیہ اور نامعلوم خطرہ درپیش ہو سکتا ہے مثلاً کوئی وحشی درندہ حملہ آور ہو جائے 'کوئی چور گھس جائے ۔ کوئی فریب دہندہ دشمن ہاتھ دکھا جائے ۔ کوئی زہریلا کیڑا مکوڑا اور سانپ کاٹ جائے ۔ پھر رات کے وقت خیالات و وساوس انسان پر حملہ آور ہوتے ہیں ۔ دکھ اور درد یاد آتے ہیں ۔ شعور و جذبات اور خواہشات و میلانات کی گھٹن زوروں پر ہوتی ہے 'اور تمام شیطانی قوتیں کھل جاتی ہیں اور ہر طرف سے برے اشارے ملتے ہیں 'اور انسانی شہوت رات کو زوروں پر ہوتی ہے ۔ غرض رات کے وقت ہر ظاہری اور خفیہ بلائیں حملہ آور ہوتی ہیں کیونکہ اس وقت اندھیرے چھائے ہوئے ہوتے ہیں ۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (۱۱۳ : ٤) "اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے"۔ گرہوں میں پھونکنے والیاں کون ہیں؟ وہ جادوگرنیاں جو انسانی حواس پر سحر انگیزی کر کے اذیت دیتی ہیں جو اعصاب کو دھوکہ دیتی ہیں 'انسانی نفس کو اشارات دیتی ہیں اور انسانی شعور کو متاثر کرتی ہیں ۔ جو دھاگوں میں گرہیں ڈالا کرتی تھیں اور ان میں پھونکا کرتی ہیں جیسا کہ جادوگروں کی عادت ہوتی ہے ۔

جادو چیزوں کی حقیقت اور ماہیت نہیں بدل سکتا ۔ نہ کوئی نئی حقیقت پیدا کر سکتا ہے البتہ احساس و شعور پر ایسی تخیلاتی حالت طاری ہو جاتی ہے جس طرح کہ جادوگر چاہتا ہے ۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں سورہ طٰہٰ (۶۵ تا ۶۹) میں قرآن کریم اس کی تصویر کشی کی ہے ۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰی اِمَّآ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰی (۶۵) قَالَ بَلْ اَلْقُوْا فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی (۶۶) فَاَوْجَسَ

فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی (٦٧) قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی (٦٨) وَ اَلْقِ مَا فِیْ
یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی (٦٩)

(۲۰: ٦٥ تا ٦٩) "جادوگر بولے: موسیٰ تم پہلے پھینکتے ہو یا ہم پہلے پھینکیں؟ موسیٰ نے کہا: "نہیں تم ہی پھینکو"۔ یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں' ان کے جادو کے زور سے موسیٰ کو دوڑتی محسوس ہونے لگیں اور موسیٰ اپنے دل میں ڈر گیا۔ ہم نے کہا مت ڈرو' تو ہی غالب رہے گا۔ پھینک جو تیرے ہاتھ میں ہے۔ ابھی ان کی ساری بناوٹی چیزوں کو نگل جاتا ہے۔ یہ جو کچھ بنا کر لائے ہیں یہ تو جادو کا فریب ہے۔ اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا خواہ کسی شان سے وہ آئے"۔

ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں سانپ نہ بن گئے تھے۔ البتہ حضرت موسیٰ اور عوام نے یہ خیال کیا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں سانپ ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ اپنے نفس میں ڈر گئے اور اللہ کی طرف سے ان کو تسلی دینے کی ضرورت پیش آئی۔ لیکن حقائق اس وقت سامنے آئے جب عصائے موسیٰ فعلاً اژدھا بن گیا اور ان کی رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل گیا۔

یہ ہے حقیقت سحر اور ہمیں چاہئے کہ ہم اسے اسی طرح تسلیم کریں۔ اس طرح یہ جادو لوگوں پر اثر ڈالتا ہے اور جادوگروں کے اشارے کے مطابق لوگوں کے حواس کو متاثر کرتا ہے۔ یہ انسانی نفسیات اور انسانی شعور میں خوف پیدا کرتا ہے اور لوگوں کو اذیت دیتا ہے۔ اور انسانی حواس اس طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جدھر جادوگر چاہتا ہے۔ جادوگری کی حقیقت بیان کرنے اور گرہوں میں پھونکنے کے مفہوم میں بس یہی کافی ہے۔ یہ ایک شر ہے جس سے بچنے کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی پناہ مانگو اور اللہ کی پناہ میں آ جاؤ۔

بعض روایات میں آتا ہے۔ ان میں سے بعض اگرچہ متواتر نہیں مگر صحیح ہیں کہ لبید بن اعصم یہودی نے مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا' بعض روایات میں آتا ہے کہ اس کا اثر چند دن تک رہا اور بعض میں آتا ہے کہ کئی مہینوں تک رہا۔ یہاں تک کہ آپؐ یہ خیال کرتے کہ آپؐ اپنی بیویوں کے پاس گئے ہیں حالانکہ آپؐ نہ گئے ہوئے تھے۔ اور بعض اوقات یوں محسوس کرتے کہ آپؐ نے کوئی کام کیا ہے' حالانکہ آپؐ نے نہ کیا ہوتا تھا' جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے اور پھر یہ سورتیں اس جادو کے بتانے کے لیے جھاڑ پھونک کے لیے نازل ہوئیں اور جب جادو کی وہ چیز حاضر کر لی گئی اور اس پر یہ سورتیں پڑھی گئیں تو وہ گرہیں کھل گئیں اور وہ برا اثر ختم ہو گیا۔ جس طرح بعض روایات میں آتا ہے۔

لیکن یہ روایات عصمت انبیاء کے بنیادی عقیدے کے خلاف ہیں کہ آپؐ اپنے تمام افعال اور تبلیغ میں معصوم عن الخطاء ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ آپؐ کے اقوال و افعال سنت اور شریعت ہیں۔ یہ روایات اس سے بھی متصادم ہیں۔ پھر قرآن نے صراحت سے اس الزام کی تردید کی ہے کہ آپؐ پر جادو کیا گیا ہے کیونکہ مشرکین یہ الزام لگاتے تھے کہ آپؐ پر کسی نے جادو کر دیا ہے تب آپ یہ باتیں کرتے ہیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک یہ روایات مستبعد ہیں۔ پھر خبر واحد کے ساتھ عقائد کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ عقائد کا ماخذ قرآن ہے اور احادیث سے عقائد تب ہی ثابت ہوتے ہیں جب وہ تواتر کی حد تک پہنچ جائیں اور جن روایات کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے وہ متواتر نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ راجح قول یہ ہے کہ یہ سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں جس سے ان روایات کی بنیاد ہی کمزور ہو جاتی ہے۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (۱۱۳ : ۵) "اور حاسد کے شر کے لیے جب وہ حسد کرے"۔ حسد کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کے اوپر اللہ کا کرم دیکھ کر کوئی برا تاثر لے اور یہ خواہش کرے کہ اس بندے پر سے اللہ کی نعمت زائل ہو جائے۔ چاہے اس تاثر کے بعد حاسد اس بندے سے نعمتوں کے دور کرنے کے لیے سعی بھی کرے۔ یا محض ذہنی تاثر کی حد تک رک جائے کیونکہ اس تاثر کے بعد ممکن ہے کہ وہ اس بندے کے خلاف کوئی شر عملاً بھی اٹھائے۔

اس کائنات کے بعض اسرار، نفس انسانی کے بعض راز اور جسم انسانی کے بعض رموز ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں ابھی تک ہمارا علم نامکمل ہے۔ اس لیے ہمیں بہت سختی سے ان کا انکار نہیں کرنا چاہئے۔ بعض پر اسرار واقعات ان میدانوں میں واقع ہوتے ہیں اور ہم ان کی ماہیت تک نہیں پہنچ سکتے۔ مثلاً دور سے خیالات کی منتقلی کا عمل، جب دو افراد کے درمیان رابطہ ہو جاتا ہے، ایسے روابط کی خبریں اس قدر تواتر سے آ رہی ہیں کہ انسان ان میں شک نہیں کر سکتا، کیونکہ اس پر بہت تجربات ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں اور جو معلومات ہمیں دستیاب ہیں ان کی کوئی معقول توجیہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔ مثلاً مقناطیسی عمل تنویم جو آج کل مکرر تجربے میں آ رہا ہے لیکن اس کے راز سے کوئی واقف نہیں ہے۔ دور سے خیالات کی منتقلی اور مقناطیسی عمل تنویم (ہپناٹزم) کے علاوہ جسم انسانی اور انسانی نفسیات کے بہت افعال جن کی تہہ تک ابھی تک انسان نہیں پہنچا۔

حاسد جدوجہد کرتا ہے اور اپنے اس تاثر کو اس شخص کی طرف بطور شر منتقل کرتا ہے تو ہم اس آثار کی اس منتقلی کا محض اس لیے انکار نہیں کر سکتے کہ ہمارے علم اور ہمارے آلات تجربہ کی رو سے اس انتقال کی کیفیت کو ابھی سمجھ نہیں سکے۔ اس لیے کہ نفس انسانی کے بارے میں ہماری معلومات ابھی تک ابتدائی ہیں اور یہ قلیل علم جو ہمیں حاصل ہوا ہے وہ محض اتفاقی طور پر ہمیں حاصل ہوا ہے۔ اس کو حقیقت کی شکل دینا ابھی تک باقی ہے۔

بہرحال حاسد کا شر ہوتا ہے اور اس سے اللہ کی پناہ مانگنا چاہیے اور اللہ کی حفاظت میں اپنے آپ کو داخل کرنا چاہئے۔ یہ اللہ کا فضل وکرم ہے کہ وہ اپنے رسولؐ کو ہدایت فرماتا ہے کہ وہ اللہ کی پناہ میں آئیں اور آپؐ کے واسطہ سے آپؐ کے بعد آنے والی پوری امت کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ بھی اللہ کی پناہ میں آئے۔ جو ہر قسم کے شر سے پناہ گاہ فراہم کرنے والا ہے۔

امام بخاری نے، اپنی سند کے ساتھ، حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ حضور اکرمؐ جب رات بستر پر لیٹتے تو دونوں ہتھیلیوں کو ملا لیتے، پھر ان میں۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲ : ۱) --- قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳ : ۱) --- قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴ : ۱) پڑھ کر پھونکتے۔ اور پھر پورے جسم پر ہتھیلیوں کو پھیرتے، جہاں تک ممکن ہوتا۔ سر اور چہرے سے شروع کرتے، اور جسم کے سامنے کے حصے پر جس قدر ممکن ہوتا اور یہ عمل آپؐ تین بار کرتے۔ (اس حدیث کو اصحاب سنن نے اس طرح روایت کیا ہے)۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ششم

پارہ --- ۳۰

سورۃ الناس ۔ ۱۱۴

۱-- تا -- ۶

درس نمبر ۳۱۴ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۶

آیاتها ۶ سُورَةُ النَّاسِ (۱۱۴) مَكِّيَّةٌ (۲۱) رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ﴿۳﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۱
الْخَنَّاسِ ﴿۴﴾ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ﴿۶﴾ ع ۶
۳۹

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"کہو' میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب' انسانوں کے بادشاہ' انسانوں کے حقیقی معبود کی' اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے' جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے"۔

اس سورت میں پناہ مانگنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ انسانوں کے پروردگار' انسانوں کے بادشاہ' اور انسانوں کے الہٰ کی پناہ گاہ میں پناہ لینے کے اعلان کا حکم ہے اور جس چیز سے پناہ مانگنے کا حکم ہے وہ بار بار وسوسہ ڈالنے والے شیطان کا شر ہے' جو لوگوں کے دلوں تک جا پہنچتا ہے اور وہاں وسوسہ اندازی کا کام کرتا ہے اور جو جنوں سے بھی ہے اور انسانوں سے بھی ہے۔

یہاں رب تعالیٰ کی جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے یعنی رب' بادشاہ' الہٰ اور معبود' یہ وہ صفات ہیں جو بالعموم شر کا دفعیہ کرتی ہیں اور دفعیہ اس شیطان کے شر سے کیا جاتا ہے جو دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اور بار بار چھپ کر آتا ہے۔

صفت رب کے معنی ہیں' مربی' نگہبان' حامی' ہدایت دینے والا۔ ملک کی صفت کے معنی ہیں حاکم متصرف' مقتدر۔ الہٰ کے معنی ہیں بلند و برتر' حاوی اور مقتدر اعلیٰ۔ یہ وہ صفات ہیں جن میں شر سے بچانے کا عنصر شامل ہے' وہ شر جو دلوں تک خفیہ انداز سے پہنچ جاتا ہے۔ اور انسان کے بس میں یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ اس خفیہ طور پر در آنے والے شر کا دفاع کر سکے۔

اللہ تو سب چیزوں کی پرورش کرنے والا ہے۔ سب کا مالک ہے' سب کا حاکم ہے لیکن یہاں ان صفات کی نسبت الناس کی طرف کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان یہ احساس کریں کہ اللہ کا مقام پناہ اور مقام حفاظت ان کے بہت قریب ہے۔

اور یہ اللہ کا بہت بڑا کرم ہے کہ وہ اپنے حبیبؐ اور اس کی امت کو اس طرف متوجہ کرتا ہے اور اپنے حظیرہ میں پناہ لینے کی دعوت دیتا ہے۔ اور اس دعوت میں اپنی صفات کی یاد دہانی بھی کراتا ہے کہ شیطان کی بعض ایسی خفیہ کارروائیاں بھی ہیں جن کا دفاع تم رب' الہٰ اور بادشاہ عالمین کی مدد کے سوا نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ شیطان ایسے مقام سے حملہ

آور ہوتا ہے۔ جس کا تمہیں شعور ہی نہیں ہوتا اور وہ ایسی راہ سے آتا ہے جس راہ سے اس کے آنے کا خیال تک نہیں ہوتا۔ وسوسہ کے معنی نہایت خفیہ آزار کے ہیں۔ خنوس کے معنی ہیں واپس ہو کر چھپ جانے کے ہیں اور خناس وہ ہوتا ہے جو یہ عمل ازروئے فطرت بہت زیادہ کرتا ہے۔ اس آیت میں پہلی صفت کو عمومی انداز دیا گیا ہے۔

الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (١١٤: ٤) "جو وسوسہ ڈالتا ہے اور جو بار بار پلٹ کر آتا ہے"۔ البتہ وسواس اور خناس کے کام کو متعین کر دیا گیا ہے۔ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ (١١٤: ٥) "جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے"۔ اور اس کے بعد اس کی حقیقت کو بھی کھول دیا گیا ہے۔ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (١١٤: ٦) "وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے"۔ یہ ترتیب گفتگو انسان کو بے حد چوکنا کر دیتی ہے۔ انسان فوراً متنبہ اور متوجہ ہو جاتا ہے تاکہ وہ معلوم کرے کہ یہ خطرناک کام کرنے والا کون ہے۔ (کیونکہ آغاز کلام میں اسے عمومی انداز میں بیان کیا گیا ہے)۔ اور یہ اپنے اس خطرناک کام کو کس طرح انجام دیتا ہے۔ تاکہ وہ اس کی مسلسل نگرانی کرے اور اس کے دفاع میں جدوجہد کرے۔

جب نفس انسانی ' اس بیداری اور تجسس پر برانگیختہ ہونے کے بعد معلوم کر لیتا ہے کہ یہ وسوسہ اندازی کرنے والا لوگوں کے دلوں میں گھس کر وسوسہ اندازی کرتا ہے اور یہ کام وہ نہایت خفیہ انداز میں اور غیر محسوس طریقے سے کرتا ہے اور پھر جب نفس یہ معلوم کر لیتا ہے کہ یہ جنات میں سے بھی ہے جو ایک خفیہ مخلوق ہے اور یہ انسانوں میں سے بھی ہے جو نہایت خفیہ انداز میں جنوں کی طرح وسوسہ اندازی کرتے ہیں ' جس طرح شیطان کرتا ہے۔ تو نفس انسانی اس عمل کی مدافعت کے لیے تیار ہو جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کی کمین گاہ ' اس کے مقام حملہ ' اور اس کے انداز حملہ کو اچھی طرح جان چکا ہوتا ہے۔

جناتی مخلوق کس طرح حملہ آور ہوتی ہے اور وسوسہ اندازی کرتی ہے۔ اس کے طریقہ کار کو تو ہم اچھی طرح نہیں جانتے۔ البتہ نفس انسانی پر اس کے آثار اور عملی زندگی میں اس کے نتائج کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آدم و ابلیس کی کشمکش بہت قدیم ہے۔ اور انسانیت کے خلاف اس جنگ کا اعلان تو شیطان نے پہلے سے کر رکھا ہے اور یہ اس داعیہ شر کی وجہ سے ہے جو خود اس کی تخلیق میں موجود ہے یعنی تکبر ' حسد اور انسان کے خلاف دشمنی کی وجہ سے۔ اس سلسلے میں اس نے اللہ سے یہ کام کرنے کی مہلت بھی قدیم سے مانگ رکھی ہے اور اسے دے دی گئی ہے اور یہ اجازت اللہ نے اس حکمت کی بنا پر دی ہے جسے صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن انسان کو بھی اللہ نے اس معرکہ میں ' مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا ہے ' اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔ اسے ایمان کی ڈھال فراہم کی گئی ' اسے ذکر الہٰی کا اسلحہ دیا گیا ہے اور اللہ کی پناہ گاہوں میں داخل ہونے کے لیے مضبوط قلعے دیئے گئے ہیں۔ اگر انسان اپنی ڈھال ' اپنا اسلحہ اور اپنے قلعوں کو نظر انداز کر دے تو یہ اس کی اپنی کوتاہی ہوگی اور وہ خود اس کے نتائج کا ذمہ دار ہوگا۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان انسان کے قلب پر چھا جاتا ہے۔ جب ابن آدم اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ غافل ہوتا ہے تو پھر وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ (بخاری)

رہے انسان تو ان کی وسوسہ اندازیوں کے بارے میں ہم بہت کچھ جانتے ہیں اور ان کی بعض کارروائیاں تو ایسی ہیں کہ جو شیطان کی وسوسہ اندازی سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

انسان کے ایک برے ساتھی ہی کو لیجئے۔ یہ اپنے رفیق کے دل میں غفلت کے وقت شرارت کا ایک ذرہ اتار دیتا ہے '

اسے خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ کہاں سے حملہ آور ہوا' یہ بیچارہ اس حملے کا دفاع بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ دوست تو محفوظ و مامون ہے۔

ہر بر سر اقتدار شخص کے ساتھ کچھ شیطان حاشیہ نشین لگ جاتے ہیں۔ اور اسے قہار و جبار بنا دیتے ہیں' پھر اس سے فساد فی للارض کراتے ہیں اور وہ نسلوں اور فصلوں کو برباد کرتا چلا جاتا ہے۔

کان بھرنے والے چغل خور لوگ جو نہایت چکنی چپڑی باتوں کرتے ہیں اور نہایت خوبصورت انداز گفتگو ہوتا ہے ان کا۔ یوں لگتا ہے کہ موصوف تو صریح حق گو آدمی ہیں اور اس کی باتوں میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اور وہ لوگ جو شہوات کا ساز و سامان فروخت کرتے ہیں' جو انسانی جبلت کی راہوں سے حملہ آور ہوتے ہیں اور اس قدر شدید اور پر کشش طریقے سے کام کرتے ہیں کہ صرف قلب کی بیداری ہی اس حملے کا دفاع کر سکتی ہے اور صرف اللہ کی معاونت اور مدد ہی بچا سکتی ہے۔

آج دسیوں خفیہ وسوسہ انداز' اپنے دام تزویر پھیلائے انسانیت کی راہ میں بیٹھے ہیں۔ یہ نہایت خفیہ طریقوں سے' نفس انسانی کی خفیہ ترین راہوں سے' جن کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں' حملہ آور ہوتے ہیں' یہ لوگ جنی شیطان سے زیادہ خفیہ انداز میں کام کرتے ہیں۔ اور نہایت خفیہ اور غیر محسوس طریقے سے نفس انسانی کے اندر گھس کر وسوسہ ڈالتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ضعیف ہے اور وہ ان عیاروں کی ان چالوں کا دفعیہ نہیں کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ ان کو خبردار کرتا ہے' ان کو مسلح کرتا ہے' ان کو ڈھال اور قلعے فراہم کرتا ہے کہ وہ اس خوفناک جنگ میں مقابلہ کر سکیں۔

یہاں ایک بات قابل توجہ ہے اور اس وسوسہ ڈالنے کی ایک صفت نہایت بامعنی بتائی گئی ہے کہ وہ ''الخناس'' ہے۔ اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ خفیہ طور پر چھپ کر بیٹھتا ہے۔ اور جونہی کوئی موقعہ ملتا ہے۔ خفیہ انداز مین گھس کر وسوسہ اندازی کرتا ہے لیکن یہ لفظ دوسری طرف سے یہ تاثر بھی دیتا ہے کہ یہ نہایت بودے کردار کا مالک ہے۔ اگر دیکھیں کہ شخص چوکنا ہے' اور بیدار ہے' تو یہ چھپ جاتا ہے اور یہ انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے۔ جب کوئی اس کے مقابلے میں آئے تو یہ جہاں سے آتا ہے ادھر بھاگ جاتا ہے اور چھپ جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اچھی مثال دی ہے اور کیا ہی خوب تصویر کشی ہے۔

فاذا ذکر اللہ خنس واذا غفل وسوس ''جب آدمی اللہ کو یاد کرے تو یہ چھپ جاتا ہے اور جب غافل ہو کر وسوسہ اندازی کرتا ہے''۔ یہ نکتہ انسان کو ایک گونہ قوت فراہم کرتا ہے کہ وہ جرات سے اس خناس کا مقابلہ کر سکے۔ یہ خناس ہے' چھپ کر بھاگتا بھی ہے۔ اور جب کوئی مومن ہتھیار لے کر آتا ہے تو یہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔

لیکن دوسری جانب حقیقت واقعہ یہ ہے کہ آدم و ابلیس کا معرکہ ایک طویل معرکہ ہے جو اس دنیا میں ختم نہ ہو گا۔ شیطان قیامت تک چھپ کر اور موقعہ تلاش کر کے حملہ آور ہوتا رہے گا۔ اس لیے اس کے مقابلے میں مسلسل بیداری ضروری ہے۔ صرف ایک دفعہ بیدار ہونا کافی نہیں۔ یہ جنگ جاری ہے اور قرآن نے اس کی مختلف مقامات پر نہایت ہی خوبصورت تصویر کشی کی ہے اور سورہ اسراء (۶۱ تا ۶۵) میں عجیب تر ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا (۶۱) قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا

قَلِيْلًا (٦٢) قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا (٦٣) وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (٦٤) اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا (٦٥) (١٧:٦١ تا ٦٥) ''اور یاد کرو جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو' تو سب نے سجدہ کیا' مگر ابلیس نے نہ کیا' اس نے کہا ''کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے''۔ پھر وہ بولا دیکھئے تو سہی کیا یہ اس قابل تھا کہ تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دے تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں۔ پس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے''۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اچھا تو جا' ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں' تجھ سمیت ان سب کے لیے' جہنم ہی بھرپور جزاء ہے۔ تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے' پھسلا لے۔ ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھالا' مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا۔ اور ان کو وعدوں کے جال میں پھانس --- اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں--- یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہو گا اور توکل کے لیے تیرا رب کافی ہے''۔

اس معرکے کی یہ تصویر کشی اور اس کے یہ محرکات' خواہ براہ راست شیطان کی طرف ہو' یا اس کے کارندوں کی طرف سے ہو' انسان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس میں انسان کمزور اور مغلوب نہیں ہے۔ انسان کا رب' اس کا بادشاہ اور اس کا حاکم و معبود پوری مخلوق پر حاوی ہے۔ اس نے اگرچہ ابلیس کو اجازت دے دی ہے کہ وہ ابن آدم کے خلاف یہ جنگ جاری رکھے' لیکن یہ شیطان بھی اللہ کے کنٹرول میں ہے۔ اللہ نے اسے صرف ان لوگوں پر غلبہ کا اختیار دیا ہے جو اپنے رب' اپنے بادشاہ اور اپنے معبود سے غافل ہیں لیکن جن لوگوں کے دلوں میں اللہ کی یاد زندہ رہتی ہے وہ شیطان اور اس کی ریشہ دوانیوں سے بچے رہتے ہیں۔ خیر اور بھلائی کو دراصل اس قوت کا سہارا حاصل ہے جس کے سوا قوت کا اور کوئی سرچشمہ نہیں ہے۔ بھلائی کی پشت پر وہ حقیقت ہے جس کے سوا کوئی اور حقیقت نہیں ہے۔ بھلائی کی پشت پر رب' بادشاہ اور الہ العالمین کی قوت کا سہارا ہے اور شر کی پشت پر خفیہ طور پر وسوسے ڈالنے والا ڈرپوک شیطان ہے جو چھپ کر کام کرتا ہے۔ سامنا نہیں کر سکتا اور اللہ کے صحیح بندے جو اللہ کی پناہ میں ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں وہ شکست کھاتا ہے۔

وہ حقیقت جس پر خیر قائم ہے اور وہ چیز جس کے سہارے شر قائم ہے یہ اس کی بہترین تصویر کشی ہے اور خیر و شر کا یہ بہترین تصور ہے۔ پھر انسان کی ہمت بندھانے اور شر کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ تصور خیر و شر کا بہترین تصور ہے۔ اور انسان کو قوت اعتماد اور اطمینان سے بھر دیتا ہے۔

خدا کا شکر ہے آغاز میں بھی اور آخر میں بھی اسی پر انسان کو اعتماد کرنا چاہئے اور وہی ہے جو توفیق دینے والا ہے۔ وہی ہے جس سے مدد طلب کرنا چاہئے اور وہی ہے جو مدد کرتا ہے۔

---ooo---

(مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۹۵ء' بوقت ۲۰:۱۰ رات سید معروف شاہ شیرازی)

(اختتام کپوزنگ ۱۷ مئی ۱۹۹۷ء بوقت ..: ۴ صبح قارئین سے مترجم اور ناشر ''فی ظلال القرآن'' کے لئے خصوصی دعاؤں کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور توشہ آخرت بنادے آمین ثم آمین۔ سید عارف شاہ شیرازی)